

کشتکول

1

Pakistanipoint

Waqar
Azeem

انوار صدیقی

کلید کامیابی

اکتوبر کی 24 تاریخ کو ”کشلول“ کا آخری صفحہ مکمل کر کے سکون کا سانس لیا۔ آخری سطر تک خدا سے یہی دعا کرتا رہا کہ ”لوح و قلم“ کے ذریعہ مجھے جو عزت ملی ہے اس کا بھرم قائم رہے۔

کشلول کی کہانی آپ سسپنس ڈائجسٹ میں ماہ بہ ماہ پڑھ چکے ہیں اس لئے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔ حسب ”دستور“ درخواست کروں گا کہ آپ اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں ضرور آگاہ کریں۔ اس لئے کہ آپ کی مثبت تنقید اور قیمتی مشوروں کی روشنی میں جو پلمہ میں نے لکھا وہی آپ کی پسندیدگی کی سند بھی ہے جو مجھے ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھنے پر آمادہ کرتی راتی ہے۔

”کشلول“ میں نے برادر محمد علی قریشی کے بے حد اصرار پر اپنے سابقہ ناول ”ابوالہول“ کے لے چھ سال بعد لکھنا شروع کیا جس کی بھٹک عزیزم معراج رسول کے ادارے کو ملی تو ثمر عباس صاحب نے اس کے شروع کے صفحات پڑھنے کو مانگے۔ پھر موصوف نے اسے سسپنس ڈائجسٹ میں قسط وار شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے برخوردار محمد علی سے بات کی۔ الہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ قسط وار اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اب یہ کتابی مکمل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

محمد علی قریشی کا ادارہ ”کشلول“ سے قبل میرے کم و بیش سولہ ناول شائع کر چکا ہے۔ اس ضمن میں مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ محمد علی قریشی ایک اچھے دوست ہیں۔ لین دین کے معاملات میں کمرے ہونے کے ساتھ ساتھ پُر خلوص اور خوبصورت شخصیت کے مالک ہیں۔

یہ اتنی رائے میں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فقط پبلشر ہیں۔ بقراط بن کر کبھی کتابی مارلی لہانی کے گراف میں ”مین میکھ“ نکالنے کی کوشش کبھی نہیں کرتے۔ یہی صفت ”کلید کامیابی“ بھی ہے۔

انوار صدیقی

24 اکتوبر 2013ء

لیاقت حسین کا تعلق ضلع نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا۔ اس کا باپ سرداروں میں شمار ہوتا تھا۔ والد لے اس کے کاروبار میں خوب برکت دی تھی اس لئے دولت کی ریل پیل بھی تھی۔ لیاقت ماں باپ کا لاڈلا ہوتا تھا اس لئے وہ لوں ہی اس سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ اکیس سال کی مدت میں وہ انوکھا لڑکا بن گیا اور والدین لے درمیان بھی کوئی تنازع کوئی اختلاف نہیں ہوا تھا، لیکن شادی کا معاملہ شروع ہوا تو لیاقت حسین اور والدین لے درمیان پہلی رسا کشی نے جنم لیا۔ سردار سرفراز خان روز اول ہی اپنے حلقوں میں سر بلند رکھنے کا عادی تھا۔ وہ لیاقت حسین کیلئے اپنے معیار اور برابر والوں میں اعلیٰ لالی لے باپ کو زبان بھی دے چکا تھا۔ ماں نے جب لیاقت حسین کو باپ کی مرضی سے آگاہ کیا تو لیاقت حسین کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اربابوں کے لیشین پر بجلی سی کوند گئی ہو ماں کی بات سن کر اس لے دل میں طوفان مچنے لگا۔

فرصت لیاقت حسین کی زندگی کا حسین خواب تھی۔ اگرچہ وہ ایک غریب باپ کی بیٹی تھی، لیکن والد لے اسے حسن کی دولت سے نوازنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ لیاقت حسین نے تین سال لے فرصت کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں بٹا رکھا تھا۔ فرحین کے علاوہ اس کے والدین بھی لیاقت حسین کو پسند کرتے تھے، مگر ان کے درمیان شادی کے کوئی عہد و پیمان نہیں ہوئے تھے۔ لیاقت حسین جانتا تھا کہ وہ ماں باپ کا لاڈلا ہے اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ سرفراز خان نے برادری والوں کا اپنے حلقے میں اپنی ”پگ“ کبھی نیچے نہیں ہونے دی تھی۔ نظریں اور سر کسی کے سامنے جھکانا اس کی سرشت لے خلاف تھا۔ وہ دوسروں سے اپنی بات منوانا جانتا تھا۔ اپنی سر بلندی کو برقرار رکھنے کی خاطر اس لے ہمیشہ حالات سے سمجھوتہ کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔

لیاقت حسین کی والدہ نے اپنے شوہر کے اشارے پر جب شادی کے معاملے میں لیاقت حسین کا عندیہ لینے کی کوشش کی تو لیاقت حسین سوچ میں پڑ گیا۔ فرحین اس کی پسند ہی نہیں اس کی اندکی کا سب سے حسین خواب بھی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنے کے سلسلے میں زبان دے چکا تھا، اس لے مہد کیا تھا کہ خواہ سر بلند پہاڑیاں بھی اس کے اور فرحین کے راستے میں حائل ہوئیں تو وہ ان سے بھی ٹکرا جائے گا۔ سرفراز خان کا خون ہونے کی وجہ سے وہ بھی کسی کو زبانی دے کر پیچھے ہٹنے کا

عادی نہیں تھا، لیکن جب ماں کا مقدس رشتہ درمیان میں حائل ہوا تو وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ ماں نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے بڑی محبت سے پوچھا۔

”کیا بات ہے میرا جان، تم کس سوچ میں گم ہو گیا؟“

”کچھ نہیں ماں۔“ لیاقت حسین نے ماں کے احترام کو ملحوظ رکھا۔ ”یہی سوچ رہا ہوں کہ تجھے کیا

جواب دوں۔“

ماں نے لیاقت حسین کے چہرے کے تاثرات پر نظر ڈالی تو اس نے اولاد کے دل کا چور پکڑ لیا، وہ ماں تھی..... ماں جو اولاد کے ہر سکھ دکھ میں برابر کی شریک ہوتی ہے۔ وہ حساس آلہ ہوتی ہے جو اولاد کے دل کی ایک ایک دھڑکن کو دریافت کر لیتی ہے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ یہ نہ جانتی کہ اس کا بیٹا، اس کے جگر کا ٹکڑا، فرحین کے عشق کا اسیر ہے۔ ایک پل کو وہ خاموشی رہی، پھر مدھم آواز میں بولی۔

”لیاقت! میرا جان! تو جانتا ہے کہ تیرا باپ اپنی مرضی کا پکا ہے۔ وہ..... وہ شاہ پری کے والد کو اپنا زبان دے چکا ہے۔“

”میں بھی اسی کا خون ہوں ماں۔“ لیاقت حسین نے ماں کے ہاتھ کو محبت سے تھام لیا۔ بڑی خوبصورتی سے اپنے دل کی بات واضح کر دی۔ ”انسان ہو کر..... پریوں کے بارے میں سوچنا..... یہ بدعت ہے ماں۔ اپنا مولوی صاحب نے شرعی تعلیم دیتے وقت بھی ہم کو یہی بولا تھا کہ بدعت گمراہی ہے اور گمراہی انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے۔“

”میں واقف ہوں ماں کا جان، یہ بھی خبر ہے کہ تو فرحین کو پسند کرتا ہے۔ فرحین ہم کو بھی بہت پیارا لگتا ہے۔ تیرا اس کا جوڑ چاند اور سورج کا جوڑ ہوگا، لیکن تیرا باپ..... وہ..... نہیں مانے گا۔ پتھر میں جونک نہیں لگتا لیاقت۔“

”جانتا ہوں ماں۔“ لیاقت حسین نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”اس لئے کہ وہ پتھر ہوتا ہے..... پتھر جس کے سینے میں بھی دل کے بجائے پتھر ہی ہوتا ہے۔“

ماں لیاقت حسین کا جواب سن کر لرز اٹھی۔ سرفراز خان سے شادی کے بعد اس نے اکیس بائیس سال میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ وہ ایک اچھا سردار ہے، بہت ساری خوبیاں بھی ہیں اس میں لیکن..... اس نے کبھی کسی معاملے میں سر تسلیم خم کرنا نہیں سیکھا تھا۔ فرحین کی خوبصورتی اور حسن اخلاق کی تعریف اکثر خود سرفراز خان نے بھی بیوی سے کی تھی، لیکن ایک غریب لڑکی کو بہو بنانے کا تصور بھی اس کے نزدیک نخل میں ٹاٹ کا پہوند لگانے سے کم نہ ہوتا، وہ اپنی پگ نیچی کرنے پر موت کو ترجیح دینے کا عادی تھا۔ لیاقت حسین نے ماں کی خاموشی میں جیسے کرب کو محسوس کیا تو تڑپ اٹھا۔

”تیرے قدموں تلے میرا جنت ہے ماں، تو حکم دے تیری خاموشی کی خاطر ہم اپنا زندگی بھی قربان کر سکتا ہے۔“

”خدا تجھے سلامت رکھے۔“ ماں کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ ”میں ماں ہوں میرا جان جگر..... ماں جو اولاد کیلئے اپنا زندگی بھی قربان کر دیتا ہے اس کا دل کے سکون کو براہ نہیں کرتی۔ میں..... میں

تیرے راستے کی دیوار نہیں بنوں گی۔ فرحین باحیا اور عزت دار لڑکی ہے۔ میرا دل بھی بولتا ہے کہ وہ تجھے شاہ پری سے زیادہ سکھ دے گی۔“

”پھر.....؟“ اس نے ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں وعدہ نہیں کرتی۔ تیرے باپ کو راضی کرنے کا کوشش ضرور کروں گی۔“ ماں نے صدق دل سے کہا تو لیاقت کو سکون آ گیا لیکن یہ سکون بڑا عارضی تھا۔ دوسرے ہی دن سرفراز خان نے اسے باہر اپنی بیٹھک میں بلایا۔

”تمہارا ماں نے فرحین کیلئے ہم سے بولا تھا، لیکن میں شاہ پری کے والد کو زبان دے چکا ہوں۔ پورا جہانگیرہ جانتا ہے کہ سرفراز خان زبان کا دھنی ہے۔ مرد کا زبان بھی ایک ہوتا ہے۔“ لیاقت نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش کھڑا رہا۔

”ہم تم کو اپنا فیصلہ سنا چکا، اب تم بولو۔ سرفراز خان کا فیصلہ منظور ہے یا نہیں؟“

”مم..... میں بھی فرحین کو زبان دے چکا ہوں۔“ لیاقت حسین نے مدھم مگر ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”سمجھا..... تم کو ہمارا فیصلہ منظور نہیں۔“ سرفراز خان اٹھ کر بیٹھک میں ٹھہرنے لگا۔ اس کے چہرے کے تناؤ میں ذرا برابر فرق نہیں آیا۔ کچھ دیر تک وہ کسی کشمکش میں مبتلا رہا، پھر دوبارہ بیٹے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”شاہ پری اور تمہارا فرحین کا راستہ الگ الگ ہے۔ تم فرحین کو زبان دے چکا ہے تو مرد بن کر اپنا قول پورا کرو..... لیکن اس کیلئے تمہیں بہت قیمت چکانا ہوگا۔“

”وہ کیا.....؟“

”تم کو ماں باپ، یہ گھر یہ شہر، یہ ضلع سب کچھ چھوڑنا پڑے گا۔“ سرفراز خان نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”ہم ادھر تمہارا صورت دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔“

لیاقت حسین سر جھکائے بیٹھک سے باہر آ گیا۔ اس نے اپنے حق کیلئے کوئی احتجاج نہیں کیا، آواز بلند نہیں کی۔ اس نے شرعی تعلیم کے دوران ایک حدیث میں پڑھا تھا کہ باپ اگر مشرک ہو تو بھی احترام واجب ہے۔ قرآن مقدس میں بھی والدین کا احترام ہر صورت میں اولاد کیلئے فرض قرار دیا گیا تھا، ماسوا اس کے کہ ان کا کوئی حکم قرآن و سنت اور شریعت کے منافی ہو۔ وہ سر جھکائے گھر کے اندر داخل ہوا تو ماں تڑپ کر سامنے آ گئی۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”ہم کو خبر تھا جان مادر کہ تیرا باپ ہمارا بات نہیں سنے گا۔ اس کے دل کی جگہ پتھر کا کوئی ٹکڑا ہے جس کو کوئی بھی موم نہیں کر سکتا۔“

”پھر..... اب تیرا کیا حکم ہے ماں؟“ لیاقت نے ڈبڈبائی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

”ہم پھان ہے لیاقت۔“ ماں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”قول دے کر پیچھے نہیں ہٹنا..... تو..... تو فرحین کا ہاتھ تھام لئے ایک بدنصیب ماں کا دعائیں تیرے ساتھ ہیں..... اس کا دل گواہی

دیتا ہے کہ قدرت بھی تیرا مدد ضرور کرے گا۔“

لیاقت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑی سعادت مندی سے آگے بڑھ کر ماں کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کیلئے ماں کی زبان سے نکلی ہوئی دعائیں ہی ہفت اقلیم کی دولت سے کہیں زیادہ قیمتی تھیں۔ تادیر ماں اور بیٹا ایک دوسرے کے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کا اندازہ لگاتے رہے پھر ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”تو فرحین کو لے کر کہاں جائے گا؟ کہاں کہاں بھٹکتا پھرے گا ماں کے دل کا کلکڑا؟“

”اس کا فکر مت کر ماں.....“ لیاقت حسین نے ماں کو تسلی دی۔ ”گل خان سے اپنا بیچنے کا یار نہ ہے۔ وہ کراچی میں کام کرتا ہے۔ اس کا پتا میرے پاس ہے۔ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے ماں! وہ تو میرا بچپن کا یار ہے اور..... پھر تیری دعائیں بھی تو ہیں میرے ساتھ۔“

”خدا تجھے ہمیشہ سکھی اور آباد رکھے ماں کی جان۔“ ماں پھر لیاقت کو سینے سے لگا کر رونے لگی۔ خود لیاقت کے سینے میں بھی طوفان ٹھانٹیں مار رہا تھا۔ وہ بھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا تو ماں کی خلش اور فزوں ہو جاتی۔ اس کے راستے میں اور کئی رکاوٹیں بھی آ جاتیں۔ سرفراز خان اگر اپنی ہٹ پوری کرنے کی خاطر فرحین کے باپ کو بلا کر اس پر بھی اپنا نادر شاہی حکم صادر کر دیتا تو وہ بھی رشتہ دینے سے مجبوراً منہ موڑ لیتا!

ایک ہفتہ کی شش و پنج کے بعد فرحین کے بوڑھے والد نے اس کا نکاح خاموشی سے لیاقت حسین کے ساتھ پڑھا دیا۔ شادی کے موقع پر لیاقت کی ماں بھی کسی بہانے شریک ہو گئی۔ اس نے فرحین کو گلے لگا کر ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں..... اور..... لیاقت حسین انہی دعاؤں کے ساتھ خدا کا نام لے کر..... فرحین کا ہاتھ تمام کر کراچی جانے والی بس میں سوار ہو گیا..... ماں نے کچھ پس انداز کی ہوئی رقم اور کچھ قیمتی زیورات سرفراز خان سے چھپا کر بیٹے کے حوالے کئے تھے۔ بس کا کلکٹ خریدنے کے بعد بھی پاس کافی رقم موجود تھی۔ روزمرہ کی ضرورت کا تھوڑا سامان بھی تھا جو ایک چھوٹے سوٹ کیس اور ٹھٹھری کی صورت میں ان کے ساتھ تھا۔ لیاقت حسین کو کسی بات کا ملال نہیں تھا؛ شاید اس لئے کہ ماں کی محبت بھری دعائیں اور نیک تمناؤں اس کے ساتھ تھیں۔ وہ اس کیلئے آنے والی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھیں۔

❖❖❖

کراچی پہنچ کر لیاقت کو گل خان کا پتا تلاش کرنے میں بہت زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ رکشے والے نے اسے اجنبی جان کر لمبا راستہ ضرور اختیار کیا۔ میٹر کے حساب سے بہت زیادہ پیسے بھی وصول کئے، لیکن بہر حال اسے گل خان کے ٹھکانے تک پہنچا دیا تھا۔ ماں کی دعائیں ساتھ تھیں اس لئے گل خان کی تلاش کے بعد سر چھپانے کا دوسرا مرحلہ بھی آسانی سے طے ہو گیا۔

گل خان کراچی کی قدیم بستی خاموش کالونی میں رہتا تھا، جہاں غریب طبقے اور مختلف فرقے کے لوگ ایک زمانے سے مل جل کر رہتے تھے غریبوں کی اس بستی کا ایک نام حاجی فرید گوٹھ بھی

ہے۔ یہیں سڑک سے ملحقہ سالوں پرانا قبرستان بھی تھا جو گوبرنالے کے قریب واقع ہے اسی قبرستان کے بائیں ہاتھ پر بیٹھار کپے کپے مکانات بھی موجود ہیں جو زبان خاموشی سے اپنے مکینوں کی غربت کا احوال سناتے نظر آتے ہیں۔ گل خان جس ڈبڑھ کمرے کے مکان میں رہتا تھا اس کا دروازہ بستی کی جانب کھلتا تھا اور ایک کھڑکی قبرستان کی سمت کھلتی تھی۔ کچھ عرصے لیاقت حسین نے گل خان کے گھر مہمانداری میں گزارنے مگر پھر جگہ کی کمی کے باعث اسے اپنی الگ رہائش کا انتظام کرنا پڑا، لہذا اسے بھی اسی قطار میں چار پانچ گھر چھوڑ کر ایک مکان آٹھ سو روپے ماہوار پر مل گیا، جس پر کئی چھت کے بجائے سینٹ کی چادریں پڑی تھیں۔ اس کا ایک دروازہ اور کھڑکی قبرستان کی طرف کھلتی تھی جبکہ ایک دروازہ دوسری جانب بھی تھا۔

لیاقت حسین کیلئے یہ گھر بھی فرحین کے ساتھ زندگی گزارنے کیلئے کسی جنت سے کم نہیں تھا، مگر ایک بات اس کی پریشانی کا سبب بنی تھی۔ مکان کا کرایہ پیشگی ادا کرنے اور گھر کو معمولی چیزوں سے سنوارنے کی خاطر جو رقم خرچ کرنا پڑی اس کے بعد اس کے پاس بہت کم رقم باقی بچی تھی البتہ زیور محفوظ تھا، مگر وہ اسے گنوا نا نہیں چاہتا تھا۔ گل خان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کیلئے جلد ہی کہیں کام دھندا تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ خود لیاقت حسین بھی صبح لکھتا اور روزی روزگاری تلاش میں مارا پھرتا۔ رات گئے گھر آتا تو تھک ہار کر سو رہتا۔ فرحین کو تنہائی کی پریشانی اس لئے نہیں تھی کہ گل خان کی بیوی زریںہ اور وہ بہت جلد ایک دوسرے سے سگی بہنوں کی طرح گل مل گئی تھیں۔

وقت جیسے جیسے گزرتا گیا لیاقت حسین کی پریشانی بڑھتی گئی۔ اسے کراچی آئے بیس دن گزر چکے تھے لیکن ابھی تک وہ سر روزگار نہیں ہوا تھا۔ یہ خیال اسے اندر ہی اندر پریشان کر رہا تھا کہ اگر کوئی کام نہ ملا تو روکھی سوکھی کھانے کیلئے بھی جیب کی کٹنگی اسے پریشان کرتی رہتی تھی۔ وہ مرد تھا تنہا ہوتا تو حالات سے مقابلہ کر لیتا لیکن اپنے سے زیادہ اسے فرحین کی فکر تھی، جس نے نامساعد حالات میں بھی اس کا ہاتھ تھامنے سے گریز نہیں کیا تھا۔

بزرگوں کا قول ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ نیکی کرے تو خداوند کریم بھی اس پر اپنی رحمتوں کا در کھول دیتا ہے۔ ایک ایسے ہی حادثے نے لیاقت حسین کی ہر مشکل آسان کر دی۔ ایک شام وہ تھکا ماندہ واپس اپنی بستی میں داخل ہوا تو ایک دو منزلہ مکان کی چلی منزل میں واقع دکانوں میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ خاصا جھوم اکٹھا تھا۔ لیاقت حسین بھیڑ جیتا ہوا آگے بڑھا، مکان کے باہر ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا لوگوں سے فریاد کر رہا تھا۔

”خدا کیلئے کوئی مدد کرے۔ میری بوڑھی، معذور ماں اور بیوی اندر موجود ہیں، انہیں بچا لو میرے بھائیو! تمہیں خدا کا واسطہ۔“

آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، لوگ اس کے اندر چھلانگ مار کر اپنی زندگی داؤ پر لگانے سے کتر رہے تھے، لیکن بوڑھے کی رقت بھری آواز لیاقت حسین کی مردانگی کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ اسے فرحین کا خیال بھی تو تھا، لیکن یک لخت اسے یاد آ گیا کہ بچپن میں قرآن مقدس حفظ کرتے ہوئے

”میرے بچو! ایک بات گمراہ سے باندھ لو۔ رسول مقبولؐ کا فرمان ہے کہ جب تو مد طلب کرے تو اللہ ہی سے مد مانگ۔ یاد رکھ ساری دنیا جمع ہو کر تجھے فائدہ پہنچانا چاہے تو وہ تجھے کسی بات کا فائدہ اور نفع نہیں دے سکتی۔ سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے مقدر کر رکھا ہے اور اگر سارے لوگ مل کر تجھے نقصان پہنچانا چاہیں تو وہ تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے سوائے اس نقصان کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے مقدر کر رکھا ہو۔ اس لئے میرے بچو! کبھی نیکی کرتے وقت کسی نفع و نقصان کی فکر نہ کرنا۔ جو کچھ تمہارے مقدر میں لکھ دیا گیا اسے کوئی قوت نہیں ٹال سکتی۔“

لیاقت حسین کو معلم کے کہے ہوئے جملے یاد آئے تو جیسے کسی غیبی قوت نے اسے ایک معذور عورت کی زندگی بچانے کی خاطر آمادہ کر دیا۔ ہجوم اسے روکنا رہا، لیکن وہ خدا کا نام لے کر شعلوں کو پھلانگنا نظروں سے غائب ہو گیا۔ ہجوم میں چہ گوئیاں شروع ہو گئیں۔ ادھیڑ عمر کے متاثرہ فریادی کے دل سے لیاقت حسین کیلئے دعا نکلنے لگی، پھر لوگوں نے دیکھا کہ لیاقت حسین جھلنے کے باوجود معذور عورت اور اس کی بہو کو شعلوں سے چھین کر لے آیا۔ اس کے بعد اسے اپنا ہوش نہیں رہا۔ جھلسے ہوئے لباس کی تپش اور سانس کی گھٹن نے اسے بے ہوش کر دیا۔

دو روز بعد اسے ہوش آیا تو فرحین اس کے سر ہانے موجود تھی۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گیا۔“ اس نے آنسوؤں کو پلو میں جذب کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ ”بہت سارے لوگ تمہیں دیکھنے کو آچکا ہے۔ جس کا ماں کو تم نے بچایا اس کا بیٹے کا لڑکا بھی گل بھائی کے ساتھ دن میں چھ چکر لگاتا ہے۔ اسی خدا کا بندے نے تمہارا علاج کیلئے دوا دارو بھی کیا ہے لیکن تم.....“

”آگے کچھ نہ کہنا لیاقت کا زندگی..... میں اور تمہارا فکر نہ کروں یہ بات پھر کبھی بھول کر بھی نہ سوچتا۔“ لیاقت حسین نے بیوی کی بات کا مفہوم بھانپ لیا تھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”ہم نے خدا کا نام لے کر جس عورت کا زندگی بچانے کا کوشش کیا تھا۔ وہ اب کیسا ہے؟“

”وہ ہسپتال میں ہے لیکن شکر ہے کہ تمہارا جسم آگ سے نہیں جلا۔ ایک دو چھوٹا موٹا زخم ادھر ادھر آیا ہے اس واسطے بوڑھے کا چپٹا تمہارے لئے ایک مرہم دے گیا تھا۔ وہ ہم برابر لگاتا رہتا ہے۔“

”تم ہمارے قریب ہے تو پھر سارے زخم بھی اوپر والے کی مرضی سے بھر جائیں گے۔“

”زرینہ بہن اور گل بھائی تمہارا واسطے بہت فکر مند ہے۔ دونوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔“

فرحین نے کہا۔ ”دو روز سے زرینہ اور گل بھائی ہمارے واسطے کھانا اور ناشہ بھی لاتا ہے۔“

لیاقت حسین اور فرحین کی گفتگو جاری تھی کہ باہر سے گل خان نے آواز دی۔ فرحین نے اٹھ کر دروازہ کھولا، پھر لپک کر پردے میں چلی گئی۔ دو منٹ بعد گل خان لیاقت حسین کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک جوان آدمی اور بھی تھا۔

”بھائی سے ملو.....“ گل خان نے اس کا تعارف کرایا۔ ”یہ اس عورت کا پوتا ہے جس کو تم نے بچایا تھا۔“

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ نوجوان نے جس کا نام احمد شاہ تھا، بڑی اپنائیت سے لیاقت حسین سے دریافت کیا۔

”سب اوپر والے کا کرم اور آپ کا مہربانی ہے۔“

گل خان کے پیچھے پیچھے زرینہ بھی آگئی تھی اس نے فرحین کے ساتھ مل کر قبوہ تیار کر کے باہر بھیج دیا۔ احمد شاہ گل خان اور لیاقت حسین کے درمیان قبوہ بننے کے دوران بہت ساری گفتگو ہوتی رہی، پھر احمد شاہ نے پوچھا۔

”لیاقت بھائی گل خان نے بتایا ہے کہ آپ کو ملازمت کی تلاش ہے؟“

”جی ہاں.....“ لیاقت حسین نے احمد شاہ کو امید بھری نظروں سے دیکھا۔ ”کیا آپ اس سلسلے میں ہمارا کوئی مدد کر سکتا ہے؟“

”آپ اپنا فرض پورا کر چکے اب میرے اوپر بھی کچھ فرض جتا ہے۔“ احمد شاہ نے بے تکلفی سے کہا۔ ”میں گفتگو کے علاقے میں ایک بڑے تاجر کے گھر ڈرائیور کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ میں نے موقع نکال کر آپ کا ذکر کیا تھا صاحب سے۔“

”پھر.....؟“ لیاقت حسین کی بے چینی بڑھنے لگی۔

”ان کے پاس فی الحال کوئی اسامی خالی نہیں ہے۔“

لیاقت حسین کی نظروں میں امید کے روشن ہونے والے دیے ٹمٹمانے لگے۔

”لیکن آپ فکر نہ کرو۔“ احمد شاہ نے کچھ توقف سے کہا۔ ”سیٹھ عثمان صاحب سے بھی اپنی تھوڑی بہت سلام دعا ہے۔ اپنے صاحب سے بھی ان کا بہت یارانہ ہے۔ کل میری ڈیوٹی نہیں ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ کو ڈائریکٹ عثمان صاحب کے بیٹکے پر لے چلتا ہوں۔ دل کہتا ہے کہ وہ میری بات پر غور ضرور کریں گے۔“

گل خان نے بھی احمد شاہ کی ہاں میں ہاں ملائی تو لیاقت حسین بھی آمادہ ہو گیا۔ دوسرے دن احمد شاہ اسے اپنی ہنڈا موٹر سائیکل پر بٹھا کر سیٹھ عثمان کے بیٹکے پر لے گیا۔ اس وقت صبح کے کوئی گیارہ کا عمل رہا ہوگا۔ لیاقت حسین نے باہر ہی سے سیٹھ عثمان کی عالی شان کوٹھی پر نظر ڈالی تو اس کا دل اندر سے ڈوبنے لگا۔ ایک ہزار مربع گز پر تعمیر شدہ وہ کوٹھی بے حد خوبصورت تھی، باہر گیٹ پر ایک باوردی گاڑ بھی موجود تھا۔ لیاقت حسین کو وہاں اپنی دال گئی نظر نہیں آئی۔ وہ معمولی درجے کی شلوار قمیض میں لمبوس تھا۔ سیدھا سادا آدمی تھا اس لئے اس نے احمد شاہ کی موٹر سائیکل رکتے ہی دہلی زبان میں کہا۔

”بھائی احمد شاہ! میرا بات مانو تو واپس لوٹ چلو۔“

”کیوں بھلا.....؟“

”ادھر تو ہم کو اندر جانے کا اجازت بھی مشکل سے ملے گا۔ میرا وجہ سے تمہیں بھی شرمندگی ہوگا۔“

”اوہ.....“ احمد شاہ مسکرا دیا۔ ”آپ فکر نہ کریں یہ کراچی ہے جہاں ایک ہی علاقے میں مختلف چھتوں کے نیچے مختلف ذہنیوں کے لوگ سانس لیتے ہیں۔ سیٹھ عثمان کا تعلق اس قبیلے کے لوگوں سے ہے جو انسانوں کی قدر کرتے ہیں۔ کسی بات سے انکار کرتے وقت بھی خیال رکھتے ہیں کہ سامنے والے کی دل آزاری نہ ہو۔ ایسا نہ ہوتا تو میں بھول کر بھی آپ کو یہاں نہ لاتا۔“

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ احمد شاہ نے آگے بڑھ کر گارڈ سے کچھ بات کی جس نے آہنی پھاٹک کے ساتھ لگی ایک سفید مستطیل شے کو آہستہ سے دبایا۔ جواب میں پھاٹک کا ایک مختصر چوکور حصہ کھلا اور ایک چہرہ نظر آیا۔ گارڈ نے اس چہرے سے کچھ کہا جس کا آغواں حصہ بھی بمشکل نظر نہیں آ رہا تھا، عموماً ہونے والا حصہ دوبارہ بند ہو گیا۔ لیاقت حسین دل میں خدا سے دعائیں مانگتا قدم بڑھاتا احمد شاہ کے قریب چلا گیا۔ گارڈ نے اسے نظر بھر کر دیکھا، پھر ٹوٹی پھوٹی زبان میں بولا۔

”پریشان ہونے کا ضرورت نہیں ہے بھائی۔ امارا صاحب آدمی کو اوپر سے نہیں اندر سے دیکھتا ہے۔“

لیاقت حسین سمجھ گیا کہ گارڈ کا تعلق بھی کسی پہاڑی علاقے سے ہے، لیکن لباس اور ماحول کے اثرات نے اس کی شخصیت بدل دی تھی۔ اس کی پیار بھری میٹھی زبان سن کر لیاقت حسین کی نگاہیں بڑی حد تک رفع ہو گئی۔ گیٹ پر پانچ منٹ انتظار کے بعد ایک سفید پوش ملازم نے اسے اور احمد شاہ کو کوٹھی کے اندر لے جا کر اس ملاقاتی کمرے میں بٹھا دیا جہاں کی ہر چیز اپنی زبان سے اپنی بیش بہا قیمت کا اظہار کر رہی تھی۔

”سیٹھ عثمان قسمت کا سکندر ہے میرے دوست۔“ احمد شاہ نے اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھاتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ ”اس کے سر پر کسی بڑے کا سایہ نہیں ہے۔ دور پرے کے کچھ عزیز دار ہوں تو ہوں۔ اس کوٹھی میں صرف وہ اور اس کی بیگم رہتی ہے۔ گھر میں کئی ملازم ہیں، سیٹھ عثمان کی عمر بھی چالیس بیالیس سے زیادہ نہیں۔ بہت نیک، تجرّ، غریب پرور بندہ ہے۔ زبان کا کھرا بھی ہے بات دل میں نہیں رکھتا۔“

”یہ سب تو بڑا خوبی کا بات ہے۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا۔

اسی وقت سادہ سے لباس میں ایک صاف ستھرا اور پروقار شخص دوسرے دروازے سے اندر داخل ہوا تو احمد شاہ تیزی سے سلام کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ لیاقت حسین نے بھی دھڑکتے دل سے اس کی پیروی کی۔

”کیسے ہوا احمد شاہ؟“ آنے والا جو سیٹھ عثمان کے سوا کوئی اور نہیں تھا، اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ اس کے لب و لہجے میں تصنع یا بناوٹ نام کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اس کے اشارے پر احمد شاہ اور لیاقت حسین بھی بیٹھ گئے۔

”آپ کی دعا ہے صاحب۔“ احمد شاہ نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ ”آپ کو سلام کرنے کی خاطر چلا آیا۔“

”کوئی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہہ ڈالو احمد شاہ۔“ سیٹھ عثمان نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔ جواب میں احمد شاہ نے اپنے مکان میں لگنے والی آگ اور لیاقت حسین کی انسان دوستی کی پوری روداد سنا ڈالی، پھر بڑی عاجزی سے بولا۔

”اپنا یہ محسن بیروزگار ہے صاحب! اگر آپ مہربانی کر دو تو اپنے کندھے سے کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“

سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو نظر بھر کر دیکھا۔ بڑی اپنائیت سے بولا۔ ”آپ کا تعلق غالباً کسی پہاڑی یا سرحدی علاقے سے ہے؟“

”جی ہاں صاحب!“ لیاقت حسین نے اپنا پتا ٹھکانا بتانے سے گریز کرتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

”آپ کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟“

لیاقت حسین ایک لمحے کو گڑبڑا گیا، پھر دبی زبان میں بولا۔ ”ملازمت کا ضرورت مجھے ہے صاحب، میرے والد کو نہیں۔“

”اوہ.....“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ”شاید آپ کسی وجہ سے بتانا پسند نہیں کر رہے۔“

”ایسی ہی بات ہے صاحب۔“

”آپ کو کس قسم کے کام آتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا کام جو آپ کو پسند ہو؟“ ”ضرورت انسان کو سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے صاحب۔ آپ جو بولے گا، میں انکار نہیں کروں گا۔“

سیٹھ عثمان کی نظریں لیاقت حسین کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ اسے اپنے تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھ رہا تھا، کمرے میں ایک منٹ تک خاموشی مسلط رہی، پھر سیٹھ عثمان نے پہلو بدل کر کہا۔

”آپ مجھ سے کتنی تنخواہ کی توقع رکھتے ہیں؟“

”دو ٹائم کا کھانا عزت سے مل جائے، گھر کا کرایہ کیلئے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتا پڑے..... انسان کو اس سے زیادہ کالاج نہیں کرنا چاہئے۔ آگے اوپر والا مالک ہے صاحب، وہ ناراض نہ ہو، اسی میں بندے کا بھلائی ہے۔“

”چلیں اسی اعتبار سے بتادیں کہ آپ کی تنخواہ کتنی ہونی چاہئے کہ آپ کا گزارہ بھی ہو جائے اور خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ بھی نہ پھیلاتا پڑے۔“

لیاقت حسین دل ہی دل میں اپنی روزمرہ کی ضرورتوں اور دیگر اخراجات کا حساب لگانے لگا۔ یہ فکر بھی لاحق تھی کہ اگر ملازمت نہ ملی تو مکان کا کرایہ دو وقت کی روٹی بھی ملنا مشکل ہوگی۔

”اپنا گزارہ تین ساڑھے تین ہزار میں بھی ہو جائے گا صاحب۔“ اس نے کسمسا کر بڑی عاجزی سے کہا۔

”یہ کراچی ہے بھائی لیاقت۔“ احمد شاہ نے اسے سمجھایا۔..... ”تم کو ابھی ادھر کے بازار کا بھاؤ نہیں معلوم۔“

”چھوڑ دو احمد شاہ۔“ سیٹھ عثمان نے اٹھتے ہوئے نہایت اپنائیت سے کہا۔ ”تخوہ کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو۔“

احمد شاہ کے ساتھ لیاقت حسین بھی اٹھ کھڑا ہوا، پھر اس وقت اس کی آنکھیں پھٹک پڑیں جب سیٹھ عثمان نے جیب سے اپنا پرس نکال کر سوسو کے دس نوٹ لیاقت حسین کو دیتے ہوئے کہا۔ ”اس رقم سے تم اپنے لئے دو جوڑے سفید سلوا لینا، اچلے اور سفید مجھے پسند ہیں اور یہ رقم نہ تمہاری تخوہ کی مد میں ہے نا ہی ایڈوانس..... پہلی تاریخ سے ادھر میرے بنگلے پر آ جانا، کام اور تخوہ کا فیصلہ کر کے میں احمد شاہ کو ایک دو روز میں بتا دوں گا۔ باقی باتیں یہ تمہیں سمجھا دے گا۔ صرف ایک بات کا خیال ہمیشہ رکھنا۔ میں دروغ گوئی اور کام چوری کو پسند نہیں کرتا۔“

لیاقت حسین نے کانپتے ہاتھوں سے رقم لے لی، پھر یہ کہہ کر باہر آ گیا۔ ”ہم آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا صاحب۔ آپ کا اس احسان کو بھی ہمیشہ یاد رکھے گا، یہ ایک مرد کا زبان ہے۔“



چھ ماہ گزر گئے۔

لیاقت حسین کی زندگی بڑے آرام اور سکون سے گزر رہی تھی۔ اس کی ماہانہ تخوہ چار ہزار مقرر کی گئی تھی، جو اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ فرحین نے کئی بار نماز شکرانہ ادا کی تھی، لیکن لیاقت حسین کو آسودہ زندگی گزارنے کے بعد بھی قلبی سکون نہیں تھا۔ جو کام اس سے لیا جا رہا تھا وہ برائے نام تھا۔ اسے بنگلے کے اندر چوکیداری کے فرائض انجام دینے پڑ رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں وہ بنگلے کے اندر بارہ پندرہ چکر لگاتا، پھر واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ اس کا خیال تھا کہ احمد شاہ کی سفارش پر سیٹھ عثمان نے اسے خدا ترسی کے طور پر مدد کرنے کی خاطر اندرونی بنگلے کے اطراف کی چوکیداری سونپ دی تھی۔ چار پانچ ماہ وہ خاموش رہا، لیکن رفتہ رفتہ اس کی طبیعت اکتانے لگی۔ وہ صدقے یا خیرات پر اپنے مستقبل کی تعمیر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہر چند کہ وہ سیٹھ عثمان کا احسان مند تھا، جس نے آڑے وقت میں اس کی مدد کی تھی، لیکن لیاقت حسین کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا تھا وہ اسے غیرت دلاتا رہتا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ سیٹھ عثمان سے بات کرے، لیکن کوئی مناسب وقت نہیں ملا، لیکن چھ ماہ گزرنے کے بعد اس کی طبیعت اکتانے لگی۔ وہ کام جو اسے سونپا گیا تھا وہ کوئی گھریلو ملازم بھی کر سکتا تھا، جن کی تعداد بھی چار سے زیادہ ہی تھی۔ اندر زنان خانے میں ملازمین کام کرتی تھیں، کھانے پکانے کیلئے ایک ادھیڑ عمر کا خانا ماں الگ تھا، جو دس بارہ سال سے خدمت انجام دے رہا تھا۔

چھ ماہ تک لیاقت حسین پوری ایمانداری سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتا رہا، پھر جب اس کی اکتاہٹ ناقابل برداشت ہونے لگی تو ایک دن اسے اتفاق سے سیٹھ عثمان سے بات کرنے کا موقع میسر آ گیا۔ اس کی ڈیوٹی کے اوقات صبح دس سے شام چھ بجے تک تھے۔ جب وہ گھر واپس جانے لگتا تو اکثر سیٹھ عثمان اور اس کی خوبصورت بیوی راحیلہ بیگم کو باہر لان پر شام کی چائے پیتے دیکھتا، لیکن کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ گھر کی ملازموں اور گھٹ پر تعینات ڈیوٹی گارڈ سے بھی اس کی اچھی خاصی سلام دعا ہو گئی تھی۔ سب ہی راحیلہ بیگم کی تعریف کرتے تھے، جو نہ صرف خوبصورت، حسین اور پروقار شخصیت کی مالک تھی بلکہ شوہر کی طرح خود بھی ملازموں کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرتی تھی۔ ان کی بیماری دکھ اور ضرورتوں کا خیال رکھتی، داسے درے سنے ان کے کام آتی۔

راحیلہ بیگم کی عمر بھی پینتیس چھتیس سے زیادہ نہیں تھی، لیکن جسم کی تراش خراش اور چہرے پر کھلی ایک ملکوتی مسکراہٹ اس کی عمر کو بہت کم ظاہر کرتی تھی۔ وہ اپنی صحت کا خیال رکھتی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ شوہر کی طرح صوم و صلوة کی پابند بھی تھی۔ اس کے حسن و خوبصورتی کا سب سے بڑا راز انہی پاکیزگی تھی جس نے اسے ہر دستہ بڑ بنا دیا تھا۔ وہ برقع پہننے کی عادی نہیں تھی، لیکن اس کی کشادہ پیشانی کا اوپری حصہ سر کے بال اور کان پر ہمیشہ لباس سے میچنگ کلر کا ایک حجاب ضرور ہوتا جو پشت کے علاوہ اس کے سینے کی پردہ پوشی بھی کرتا تھا۔ یہی حسن، پاکیزگی اور معصومیت راحیلہ بیگم کی طبیعت کا خاصہ تھا۔

شام کے چھ بجے تو لیاقت حسین نے حسب معمول بنگلے کی پشت پر تعمیر ملازموں کے کمروں کے ساتھ بنے ایک خالی کمرے میں جا کر اپنا سفید لباس تبدیل کیا، پھر باہر جاتے وقت اس کو صرف سیٹھ عثمان لان پر رکھی بید کی دیدہ زیب کرسی پر تنہا بیٹھے چائے پیتے نظر آ گئے۔ باقی چار پانچ کرسیاں خالی تھیں۔ میز پر چائے اور کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ شاید راحیلہ بیگم کسی کام سے اندر چلی گئی تھیں یا ابھی باہر ہی نہیں آئی تھیں۔ بہر حال لیاقت حسین غیر اختیاری طور پر قدم اٹھاتا سیٹھ عثمان کے قریب جا کر رک گیا۔ اس کے شعور میں اس وقت بھی وہی ایک خیال کچھ کے لگا رہا تھا کہ سیٹھ عثمان نے صرف اس کی مدد کی خاطر خدا ترسی کی بنیاد پر ملازم رکھ لیا ہے۔

”کیا بات ہے لیاقت حسین؟“ سیٹھ عثمان نے اس کو قریب کھڑا دیکھ کر سادگی سے پوچھا۔

”کچھ کہنا ہے؟“

”جی مالک.....“ لیاقت حسین جو چھ ماہ میں اپنے علاقے کی کھڑی زبان کے بجائے اب ٹوٹی پھوٹی مقامی زبان بھی سیکھ گیا تھا، مدھم آواز میں بولا۔ ”آپ نے مجھے جو ڈیوٹی کرنے کو دیا ہے۔ وہ میری خدمت کے مقابلے میں ماہانہ تخوہ سے بہت کم ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”میرا مطلب یہ ہے مالک کہ جو مرد ذات ہو، جو ان ہو، وہ صدقہ خیرات کا مستحق نہیں ہوتا۔“ وہ روانی میں اپنا مقصد بیان کرتا رہا۔ ”بچپن میں مولوی صاحب نے بھی یہی تعلیم دیا تھا کہ نوجوان آدمی

کولق حلال کا کمائی کھانا چاہئے۔“
”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔“ سیٹھ عثمان نے تعجب سے پوچھا۔ ”یہ صدقہ خیرات کا ذکر کہاں سے درمیان میں آگیا؟“

”آپ ہم کو دو وقت فرسٹ کلاس چائے دیتا، ایک وقت کا کھڑا کھانا دیتا اور چار ہزار روپے تنخواہ بھی دیتا۔ صرف اس بات کا کہ میں دن میں پندرہ سولہ بار بیٹکے کا گھوم پھر کر چکر لگائے۔ اتنا چکر تو کوئی ملازم بھی کھانا ہمیں کرنے کیلئے لگا سکتا ہے، پھر یہ تنخواہ کس بات کی؟“

”اوہ.....“ سیٹھ عثمان مسکرا دیا، پھر اس سے پیشتر کہ کوئی تفصیلی جواب دیتا، راحیلہ بیگم قدم اٹھاتے آگئیں۔ لیاقت حسین نظریں جھکا کر واہسی کے ارادے سے پلٹا تو سیٹھ عثمان نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ بدستور مسکرا کر بولے۔ ”تم جو شکایت مجھ سے کر رہے ہو وہی بیگم صاحبہ سے کرو گھر کے ملازموں کا چارج بھی انہی کے ذمے ہے۔ میں باہر کے معاملات دیکھتا ہوں۔“

”کیا بات ہے لیاقت حسین؟“ راحیلہ بیگم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑے ملنسار لہجہ میں پوچھا۔ ”تمہیں کس قسم کی شکایت ہے؟“

لیاقت حسین، راحیلہ بیگم سے نظریں ملا کر بات کرنا بھی گناہ سمجھتا تھا، اس لئے خاموش کھڑا بیٹھتا رہا۔ اس کی یہ مشکل سیٹھ عثمان نے حل کر دی تو راحیلہ خاتون کے گداز ہونٹوں سے ایک قہقہہ ابل پڑا، پھر وہ سنجیدگی سے بولیں۔

”تمہیں اور کیا کام آتے ہیں؟“

”ادھر ہم گاؤں میں کھیتی باڑی بھی کرتا تھا، گھوڑوں کو تربیت بھی دیتا تھا اور سارے مردوں والے کام کرتا، کبھی بابا کہیں مہمان داری پر جاتا تو اس کی جیب بھی چلاتا تھا۔ اپنے پاس پکا لائسنس بھی ہے۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ راحیلہ بیگم، لیاقت حسین کے بارے میں پہلے ہی شوہر سے سن چکی تھیں کہ وہ محنتی، جھاکش اور ایماندار ہے، چنانچہ مسکرا کر بولیں۔ ”اگر تم تنخواہ کو ڈیوٹی کے مقابلے میں زیادہ سمجھ رہے ہو تو یہ بات مجھے پسند آئی۔“

”شکر یہ بیگم صاحبہ۔“ لیاقت حسین نے خوشی کا اظہار کیا، لیکن بدستور نظریں جھکائے کھڑا رہا۔

”ڈرائیور تو ہمارے پاس پرانا ہے اس لئے ہم خود سے اسے نکال نہیں سکتے۔ ہاں، اگر تمہیں کھیتی باڑی سے شوق ہے تو پھر تم مالی بابا کے ساتھ مل جل کر پودوں کی دیکھ بھال کر لیا کرو، وہ بوڑھے آدمی ہیں، تمہیں دعا بھی دیں گے۔“

لیاقت حسین خوش ہو گیا۔ وہ راحیلہ بیگم سے زیادہ کھل کر بات کرنے سے بھی شرماتا تھا، اس لئے فوجی انداز میں سلام کر کے تیز تیز قدم بڑھاتا پھانگ کی جانب چلا گیا۔

”آپ کا اندازہ غلط نہیں تھا۔“ اس کے جانے کے بعد راحیلہ بیگم نے اپنے لئے چائے بناتے

ہوئے شوہر سے کہا۔ ”لیاقت مجھے شریف ہونے کے ساتھ ایماندار اور ایسا وفادار آدمی بھی لگا ہے جو وقت پڑنے پر کسی کی خاطر اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتا ہے۔“

”میں نے اسی لئے وقتی طور پر ملازم رکھ لیا تھا ورنہ آپ بھی جانتی ہیں، آپ کا یہ خادم کاروباری آدمی ہے۔ یہاں بات بات پر دشمنیاں جنم لیتی ہیں اسی لئے دن رات ہمارے مسلح آدمی بیٹکے کے اطراف سادہ لباس میں اپنی ڈیوٹی انجام دیتے رہتے ہیں۔ لیاقت حسین نے آپ کے آنے سے پیشتر دہلی زبان میں اپنی تنخواہ کو صدقہ خیرات سے تعبیر دے کر مجھے بھی خاص طور پر بے حد متاثر کیا ہے۔“

”اپنے ڈرائیور کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ راحیلہ بیگم نے شوہر کی بات سن کر سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”تین سال سے کام کر رہا ہے۔ خاموش طبیعت کا مالک ہے اور..... لیکن آپ نے اس وقت اچانک ڈرائیور کے بارے میں کیوں پوچھا؟“

”لیاقت حسین کے بارے میں آپ کا جواب سن کر۔“ راحیلہ بیگم نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے بدستور پر خیال انداز میں کہا۔ ”کسی کے بارے میں بغیر کسی سبب منفی انداز میں سوچنا بھی خدا کو پسند نہیں، لیکن معلومت اور دور اندیشی کے کچھ اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں جس کا حکم دیا گیا ہے۔“

سیٹھ عثمان نے جواب نہیں دیا۔ محبت بھری نظروں سے راحیلہ بیگم کو دیکھتے رہے۔ ”پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ایسی ناقابل شکست قوت خرید جو اکثر انسان کو دوست سے دشمن بھی بنا دیتی ہے۔“

”جی.....!“ سیٹھ عثمان نے چونک کر بیوی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”میں کسی کی نیت پر شبہ یا الزام نہیں لگا رہی، لیکن انسان کی نیت میں خرابی آنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔“

”گویا آپ کہنا چاہتی ہیں کہ میرے کاروباری حریف مجھے ختم کرانے کے سلسلے میں سب سے پہل اور آسان طریقہ یہ اختیار کر سکتے ہیں کہ میرے ڈرائیور وحید کو خرید لیں اور اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔“

”کیا ایسا ہونا بعید از قیاس ہے؟“ راحیلہ بیگم نے بڑی معصوم مسکراہٹ لبوں پر بکھیر کر کہا۔ ”میں وحید کی نیت اور اس کی آج تک کی وفاداری پر شبہ بھی نہیں کر رہی، لیکن کیا ہمارے مشترکہ دشمن اس انداز میں نہیں سوچ سکتے؟“

”میرا مشورہ ہے کہ آپ کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر اس امکانی قیاس پر دوبارہ غور کریں۔“ سیٹھ عثمان نے کچھ زور درج انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا، پھر چائے کی پیالی میز پر رکھتے غجلت میں اٹھے اور خاموشی سے اندر چلے گئے۔

راحیلہ بیگم حیرت زدہ رہ گئیں۔ انہیں یک لخت گمان ہوا کہ شوہر کے دل میں ان کی طرف سے

کوئی بال آگیا ہے۔ ایک لمحے کو وہ گم سم بیٹھی رہیں پھر شوہر کے پاس پہنچنے کیلئے تیز تیز قدم اٹھانے لگیں۔ سیٹھ عثمان اپنی سٹری میں بیٹھے کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ راحیلہ بیگم دبے قدموں ان کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ شوہر سے غلطی تھیں، مزاج آشنا تھیں، سمجھ گئیں، کوشاں ہو کر وحید کے سلسلے میں ان کا شبہ بھی ناگوار گزر رہا ہے۔ راحیلہ بیگم نے محض ایک امکانی بات کا اظہار کیا تھا۔ کسی پر بلاوجہ الزام لگانا ہرگز مقصود نہ تھا۔ چند لمحے وہ خاموش کھڑی رہیں، پھر انہوں نے اپنے ہاتھ بڑی محبت سے شوہر کے کانڈھوں پر رکھے تو سیٹھ عثمان نے چونک کر کہا۔

”آپ.....“

”ناراض ہیں مجھ سے؟ آپ نے چائے بھی ٹھیک طرح نہیں پی۔“
”بس یونہی دل نہیں چاہا۔“ انہوں نے راحیلہ بیگم کو ٹالنے کی کوشش کی۔ ”آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھ جائیں۔“

”ایک بیوی کی حیثیت سے آپ کی زندگی کی فکر کرنا کیا میرا فرض یا حق نہیں ہے؟“ راحیلہ بیگم کی آواز فرط جذبات سے رندھ گئی۔ ”خدا گواہ ہے کہ میں نے کسی کی ایمانداری پر کوئی شبہ نہیں کیا تھا“ ایک امکانی بات کہی تھی، لیکن آپ کو کوئی دکھ ہوا ہو تو میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔“

سیٹھ عثمان تیزی سے اٹھے راحیلہ بیگم سے انہیں کبھی دکھ نہیں پہنچا تھا۔ وہ ان کی زندگی کا سب سے بیش بہا اور قیمتی سرمایہ تھیں۔ ان کے درمیان شادی کے نو سال بعد بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ خود راحیلہ بیگم کو بھی اس کا احساس تھا، لیکن سیٹھ عثمان نے کبھی اشارتاً بھی اس موضوع پر زبان نہیں کھولی تھی۔ وہ دین دار آدمی تھے، جانتے تھے کہ خدا کی مرضی کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔ اس وقت انہیں وحید کے سلسلے میں راحیلہ بیگم کی بات گراں ضرور گزرتی تھی، لیکن وہ غما نہیں تھے، صرف بیوی کو یہ احساس دلانا مقصود تھا کہ بلاوجہ بھی کسی کے بارے میں اس وقت تک برا نہ سوچو جب تک تمہارے شے کی تصدیق نہ ہو جائے، لیکن بیوی نے جب معافی طلب کی تو ان کے اندر محبت کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ انہوں نے اٹھ کر راحیلہ بیگم کو ہاتھ پھیلا کر سینے کی گہرائیوں میں سمیٹ لیا، بڑی محبت اور انکساری سے بولے۔

”آپ کو میری جان کی قسم دوبارہ کبھی یہ خیال بھی دل میں نہ آنے دیجئے گا کہ میں زندگی میں کبھی آپ سے ناراض ہونے کا سوچ بھی سکتا ہوں۔“

شوہر کے جملوں نے راحیلہ بیگم کی پریشانی دور کر دی۔ ہل بھر کیلئے جو احساس انہیں کچھ کے لگا رہا تھا، وہ جاتا رہا۔ دل کا غبار چھٹا تو انہوں نے خمار آلود نظریں اٹھا کر شوہر کو دیکھا، التجا آمیز محبت کے لہجے میں کہا۔

”میری درخواست ہے کہ کبھی اپنی راحیلہ سے ایک ہل کیلئے بھی غفلت کا اظہار نہ کیجئے گا۔ آپ شوہر ہیں، آپ کو خوش رکھنا، آپ کے اچھے برے کا خیال رکھنا میرا حق ہے، مجھے اس حق سے کبھی محروم نہ کیجئے گا۔“

”وعدہ رہا۔“ سیٹھ عثمان نے بیوی کی غزالی آنکھوں میں ڈوب کر کہا، پھر دوبارہ اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرنے کی خاطر ذرا جھک کر اپنی بات کی مہر صداقت ہوٹوں کی زبانی راحیلہ بیگم کی پیشانی پر ثبت کر دی۔ ہل بھر میں فضا جس پر بس لمحے بھر کو ہلکا سا غبار طاری ہوا تھا، ساری کٹافٹوں سے پاک ہو گئی۔ راحیلہ بیگم نے دوبارہ چائے بنا کر دی، پھر دونوں محبت بھری باتوں میں محو ہو گئے۔ ساری دھند دور ہو گئی۔ دونوں اس طرح گھل مل کر باتیں کرنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

لیاقت حسین ہر چند کہ مالی کا ہاتھ بٹانے والی بات سن کر وقتی طور پر خوش ضرور ہوا۔ راحیلہ بیگم کی فراخ دلی نے اسے اس گھر کا مزید نمک خوار بنا دیا۔ بوڑھا مالی بھی خوش تھا کہ لیاقت حسین کے ہاتھ بٹانے سے کچھ دیر آرام کا موقع مل جاتا۔ مالی ایک سائے میں بیٹھا اپنے تجربے کی روشنی میں ہدایات دیتا رہتا۔ لیاقت حسین کسی ہونہار شاگرد کی طرح اس کی باتوں پر عمل کرتا رہا، پھر اس نے مالی ہا سے پا چمکنے کے بعد کماری کی اطراف میں گلاب کی قطار لگا دی۔ راحیلہ بیگم نے دس پندرہ دن بعد کماری کی طرف نئے نئے پودوں اور ان کی معصوم ٹہنیوں پر نئے نئے سرخ گلاب کے پھول کھلے دیکھے تو خوش ہو گئیں۔ اس روز انہوں نے مالی بابا کی سفارش پر لیاقت حسین کو پورے سو روپے بطور انعام میں دیئے۔

دو مہینے اور گزر گئے۔ لیاقت حسین کی وفاداری اور ایمانداری نے سیٹھ عثمان کے بعد راحیلہ بیگم کی نظروں میں بھی ایک مقام حاصل کر لیا۔ اس نے جو محنت کی تھی وہ رائیگاں نہیں گئی۔ وقت اپنی مسافت طے کرتا رہا، سب ہی خوش تھے لیکن.....

اس دن سیٹھ عثمان شام کو دفتر سے لوٹے تو لیاقت حسین نے بھی محسوس کیا کہ وہ کچھ تھکے تھکے اور پریشان سے لگ رہے ہیں۔ لیاقت حسین نے معمول کے مطابق انہیں سلام کیا۔ سیٹھ عثمان نے جواب دیا، لیکن خلاف توقع اس کی خیریت دریافت کئے بغیر تیزی سے گھر کے اندر چلے گئے۔

راحیلہ بیگم نے بھی شوہر کے چہرے کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ ان کی خاموشی کے پیچھے کوئی گہری فکر ضرور لاحق ہے۔ انہوں نے فوراً ہی بات چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اندر لاؤنج میں شام کی چائے کا اہتمام کرنے لگیں۔ سیٹھ عثمان لباس تبدیل کر کے ہاتھ منہ دھو کر آئے اور لوازمات سے انصاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ روزمرہ کی طرح باتیں بھی کرنے لگے، لیکن راحیلہ بیگم کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی ایسا مسئلہ ضرور ہے جسے وہ چھپانے یا ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چائے کے دوران راحیلہ بیگم بھی روز کی طرح ہنستی بولتی رہیں۔ جب ان کے اشارے پر ملازم ناشتے کا سامان سمیٹ کر لے گیا تو سیٹھ عثمان روزمرہ کے معمول کے مطابق کچھ دیر آرام کرنے کی خاطر دیوان پر لیٹ گئے۔ راحیلہ بیگم حسب معمول ان کے برابر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں، پھر انہوں نے وہی زبان میں شوہر کو کریدنا۔

”کیا بات ہے؟ آج آپ کچھ فکر مند نظر آ رہے ہیں؟“

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کل ایک اہم کاروباری میٹنگ ہے، اگر خدا نے کامیاب کر دیا تو لاکھوں کا فائدہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”اس میں فکر کیا بات ہے؟“ راحیلہ بیگم نے پہلو بدل کر کہا۔ ”نفع اور نقصان پہنچانا بھی اسی قادر مطلق کے اختیار میں ہے جس نے اپنے لطف و کرم سے ہمیں پہلے ہی نوازا رکھا ہے۔“

”میں سو فیصد آپ کی بات سے متفق ہوں لیکن.....“ سیٹھ عثمان کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”آپ کو میری قسم.....“ راحیلہ بیگم نے شوہر کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر کہا۔ ”جو بات بھی ہے مجھے بتادیں۔“

سیٹھ عثمان ہونٹ چبانے لگے، لیکن بیوی کی دی ہوئی قسم پر زبان کھولتے ہوئے بولے۔ ”دراصل ایک خاص گروپ کے سربراہ کی یہ خواہش ہے کہ میں کل کی میٹنگ میں سرے سے شریک ہی نہ ہوں تو میرے حق میں بہتر ہوگا۔“

”یہ تو ایک طریقے سے صریحاً دھمکی ہے۔“ راحیلہ بیگم نے کسمسا کر پوچھا۔ ”آپ کا اشارہ کہیں شیخ حامد کی طرف تو نہیں ہے؟“

”آپ کا خیال درست ہے۔“

”کیا اس نے آپ کو خود فون کیا تھا؟“

”نہیں۔ اس کے بزنس فیجر افضل خان کا فون آیا تھا میرے پاس۔ شیخ حامد خود کبھی سامنے نہیں آتا۔ اپنے ہاتھ پاؤں بچانے کی خاطر ہی وہ ہمیشہ افضل خان کو آگے رکھتا ہے۔“

”اور یہ افضل خان کس قماش کا آدمی ہے؟“ راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”مختصر اُپوں سمجھ لیں کہ شیخ حامد نے اسے ملازمت دے کر اس کی شرارتوں اور خباثتوں کو ایک طرح سے تحفظ فراہم کر دیا ہے۔“

”اوہ..... ایسی صورت میں آپ نے کل کی میٹنگ کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“ راحیلہ بیگم کے چہرے پر ٹھکرات کے سائے لہرانے لگے۔

”آپ کا کیا مشورہ ہے؟“ سیٹھ عثمان نے بیوی کی رائے معلوم کی۔

”میرا خیال ہے زندگی کا رو بار سے زیادہ اہم ہے۔ ویسے بھی ہمارے پاس خدا کا دیاسب کچھ ہے۔“

”بات پیسوں کی نہیں ہے۔“ سیٹھ عثمان نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اگر میں نے ایک بار شیخ حامد کی بات مان لی تو وہ مجھے بزدل اور ڈرپوک سمجھ کر اور شیر ہو جائے گا۔ وہ لنگا افضل خان بھی بزنس گروپ میں اس بات کو بڑے فخر سے بیان کرتا پھرے گا جس سے میرے کاروبار کی ساکھ کو بھی نقصان ہو سکتا ہے۔“

”ایسی صورت میں کیا مناسب نہ ہوگا کہ آپ ڈی ایس پی سراج کو قبل از وقت حالات سے آگاہ کر دیں۔ وہ آپ کا کلاس فیلورہ چکا ہے اور ہمارا اس کا ملنا جلنا بھی ہے۔“

”یہ خیال آیا تھا میرے ذہن میں لیکن..... بات سراج کے کانوں تک پہنچی تو معاملات قانونی صورت اختیار کر لیں گے۔ میں تمہارے کچہری سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں اس لئے کہ ہمارے اخباری نمائندے ایسی خبروں کی کھوج میں لگے رہتے ہیں۔ معمولی خبروں کو بھی نمک مرچ لگا کر عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اچھے خاصے شریف آدمی کو اپنی عزت بچانا مشکل ہو جاتی ہے۔“

”لیکن ہمیں کوئی نہ کوئی حل تو ڈھونڈنا ہوگا۔“

”میرا یقین ہے کہ سب سے بڑا کارساز، مبتبب الاسباب، عزت اور ذلت دینے والا ہمارا رب ہے جس کے اشارے کے بغیر ایک ذرہ بھی جنبش کرنے سے قاصر ہے۔“ سیٹھ عثمان نے پر اعتماد لہجے میں بیوی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ بھی اس حقیقت سے واقف ہیں۔ ہمیں اس کی ذات پر ہمدرد کرنا ہوگا۔ سرکار کی حدیث بھی یہی ہے کہ اگر مدد بھی درکار ہو تو اسی قادر مطلق سے طلب کرو وہ تمہاری مدد ضرور کرے گا۔“

”میں آپ کی بات سے متفق ہوں لیکن دیدہ و دانستہ خطروں سے کھیلنا بھی مصلحت کے خلاف ہے۔“

”انسان کا اپنا قبلہ اور عقیدہ درست ہو تو خدا بھی اس کی حفاظت ضرور کرتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں یہ سوچ کر میرے حق میں صرف اس خداوند کریم سے دعا کریں جس نے لوح محفوظ پر سب کچھ قبل از وقت رقم کر دیا ہے۔ وہی اٹل ہے۔“

شوہر کی دلیل حق بجانب تھی۔ راحیلہ بیگم نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس روز شوہر کے سونے کے بعد انہوں نے دو رکعت نفل حاجات پڑھی اور پروردگار سے اپنے سہاگ کو قائم رکھنے کی خاطر ہاتھ اٹھا کر رو کر دعائیں کرتی رہیں، پھر نماز سے فارغ ہو کر شوہر کے قریب ہی بستر پر لیٹ گئیں۔

دوسری صبح وہ شوہر کے ساتھ ناشتے میں مصروف تھیں جب ایک خادمہ نے سامنے آ کر سیٹھ عثمان سے کہا۔

”صاحب، وحید آپ سے فوری ملنا چاہتا ہے۔ اس کے گاؤں سے کسی کا پیغام آیا ہے کہ پہلی فرمت میں آکر ماں سے مل لو اس کی حالت نازک ہے۔“

سیٹھ عثمان نے وحید کو اسی وقت اندر بلوایا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والے ٹھکرات کے گہرے نقش دیکھ کر سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم نے یہی اخذ کیا کہ وہ ذہنی طور پر بہت زیادہ پریشان ہے۔

”ماں کے سلسلے میں تمہیں کیا خبر ملی ہے؟“ سیٹھ عثمان نے بڑی شفقت سے دریافت کیا۔

”بتانے والے نے یہی کہا کہ شاید اس کا آخری وقت قریب ہے۔“ وحید نے پریشان لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی اس غریب کی بیماریاں اس کا پیچھا پکڑے ہوئے ہیں۔ ساٹھ باسٹھ کی عمر بھی سینکڑوں بیماریوں کی ایک بیماری ہے صاحب۔“ وحید کی آواز رندہ گئی۔ ”آپ اجازت دیں تو دو

گھٹنے بعد والی گاڑی پکڑ کر چلا جاؤں، پھر نہ جانے ماں کا آخری دیدار بھی نصیب ہونہ ہو۔“
”ایسی حالت میں ہماری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔“ راحیلہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم صاحب سے بات کر دو میں ایک منٹ میں اندر سے آتی ہوں۔“
”کیا تمہیں اس سے پہلے ماں کی بیماری کی اطلاع نہیں تھی؟“ سیٹھ عثمان نے بڑی اپنائیت سے دریافت کیا۔

”بیمار تو وہ غریب مہینوں سے تھی صاحب۔ میں دوا دارو کیلئے اسے روپے بھیجتا رہتا تھا لیکن حالت اچانک نازک ہو جائے گی، اس بارے میں تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“
راحیلہ بیگم اپنے کمرے سے نکل کر پھر سامنے آگئیں۔ انہوں نے ایک بند لگافہ وحید کو دیتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا۔ ”اس میں کچھ پیسے ہیں اس کو ایڈوائس نہ سمجھنا۔ گاڑی پہنچنے ہی ماں کو کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھانا۔ اگر ہسپتال میں بھی داخل کرنا پڑے تو دیر نہ کرنا، صرف کسی طرح ایک فون کر دینا، تمہیں جتنی رقم درکار ہوگی وہ تمہیں فوری پہنچ جائے گی۔“
وحید نے ہاتھ بڑھا کر لگافہ لے لیا، پھر رونے لگا۔

”اوپر والے پر بھروسہ رکھو وحید۔“ سیٹھ عثمان نے اس کی دلجوئی کی۔ ”موت اور زندگی صرف اور صرف اسی کے اختیار میں ہے۔ انسان کو اس کی رمتوں سے بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔“
وحید زیادہ دیر نہیں رکا۔ منہ بسورتا ہوا رخصتی سلام کر کے اٹھ قدموں واپس چلا گیا۔ سیٹھ عثمان کچھ فکر مند نظر آنے لگے کسی بھی دفتری کارندے یا گھریلو ملازم کو تکلیف میں دیکھ کر اس کا گہرا اثر قبول کر لیتا ان کی فطرت میں شامل تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا وحید کی ماں اور اس کے حق میں بہتر ہی کرے گا۔“
”آپ نے وحید کو کتنی رقم دی ہے؟“
”فی الحال میں نے دس ہزار دیئے ہیں لیکن آپ فکر نہ کریں۔ وحید کا فون آتے ہی میں اس کی ہر ممکن مدد اپنا فرض جان کر ادا کروں گی۔“

”آپ نے مجھ پر احسان کیا جو اسے دس ہزار دے کر میری پریشانی کسی قدر کم کر دی۔“
”ایک درخواست کروں آپ سے؟“ راحیلہ بیگم نے شوخ نظروں سے شوہر کو دیکھا۔
”آپ حکم دیں۔“

”میری خاطر دل پر کوئی بوجھ نہ لیں ورنہ میں بھی آپ کی طرف سے پریشان ہونے کا حق رکھتی ہوں۔“

سیٹھ عثمان نے دل ہی دل میں بیوی کی عظمت کو سلام کیا۔ ہونٹوں پر ایک تبسم بکھیر کر خوش نظر آنے لگے۔

”آپ کو دفتر کیلئے کس وقت نکلتا ہے؟“
”اس کی فکر نہ کریں۔ میں دفتر فون کر کے کسی اور ڈرائیور کو بھی بلا سکتا ہوں لیکن میں نے آج

گھر پر ہی آرام کرنے کا فیصلہ کیا ہے، میننگ کیلئے کچھ ضروری تیاریاں بھی کرنی ہیں۔ شام کو فریش ہو کر ساڑھے پانچ بجے آرام سے نکلوں گا۔“

”دفتر سے کسی ڈرائیور کو بلانے کے بجائے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیاقت حسین کو وحید کے آنے تک اس کی ذمہ داری سونپ دیں۔“ راحیلہ بیگم نے دبی زبان میں کہا۔ ”آپ نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جاں نثار آدمی ہے۔ نہ ہوتا تو بمزنی آگ کے شعلوں میں کود کر کسی معذور عورت کی جان بچانے کی ہمت نہ کرتا۔“

”اگر آپ کا یہی مشورہ ہے تو خاکسار بسر و چشم..... آپ کے حکم پر سر تسلیم ختم کرتا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے ماحول پر طاری بوجھل پن کو دور کرنے کی خاطر اتنی محبت اور خلوص سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا کہ راحیلہ بیگم کے دل کا سارا بوجھ اتر گیا۔ انہوں نے اسی وقت لیاقت حسین کو وحید کی واپسی تک ڈرائیور کے فرائض ادا کرنے کا حکم صادر کیا تو لیاقت حسین بھی خوش ہو گیا۔

سیٹھ عثمان اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ راحیلہ بیگم نے باورچی خانے میں جا کر خانساں کو کھانے کی تیاری کیلئے ضروری ہدایات دیں، پھر شوہر کے پاس کمرے میں آگئیں۔ چھٹی کے دن ان کا یہ معمول تھا کہ ایک ایک لمحہ شوہر کے قریب رہ کر گزارتی تھیں۔

لیاقت حسین کو عارضی طور پر جو فرض سونپا گیا وہ اس پر بے حد خوش تھا۔ باہر آتے ہی اس نے سب سے پہلے یہ خوشخبری گاڑ کو سنائی، پھر کپڑے تبدیل کر کے گاڑی کو دھونے اور اس پر پالش وغیرہ کرنے میں تن من دھن سے مشغول ہو گیا۔ غفور نامی بوڑھا مالی بھی اپنے کام سے فارغ ہو کر لیاقت حسین کے پاس آ گیا۔ بڑی اپنائیت سے بولا۔

”صاحب کو تو شام میں جانا ہے اللہ کے بندے تم ابھی سے کیوں جان مارتے ہو؟“
”تم نہیں جانتا چاچا، ہم کو آج جو ڈیوٹی سونپا گیا ہے اس نے ہمارا دل کتنا بڑا کیا ہے۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا۔ ”ہم اس گاڑی کو دھو دھلا کر نئی ٹوپی ڈھن کی طرح چمکا دے گا۔ صاحب دیکھے گا تو اس کو بھی خوشی ہوگی۔“

”یہ شہر ہے لیاقت پتر..... گاڑی دھونے چکانے کے بعد ایک دو چکر بھی آس پاس لگا کر ضرور دیکھ لیتا۔ اس طرح تمہارا ہاتھ بھی صاف ہو جائے گا۔“

”کیسا بات کرتا ہے چاچا۔“ لیاقت حسین نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”ہم ادھر پہاڑی علاقے میں بڑا بڑا ٹرک بھی چلاتا رہا ہوں۔ تمہارے شہر کا ڈرائیور لوگ بھی ان راستوں پر جہاں نیچے گرنے سے بچاؤ کیلئے کوئی روک نہیں ہوتی، گاڑی چلاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ ادھر شہر میں یہ چھوٹا موٹا گاڑی چلاتا تو ہمارا اٹلے ہاتھ کا کھیل ہے، پھر بھی تمہاری نصیحت پر عمل کرنے کا خاطر صاحب کے جانے سے ایک گھنٹے پہلے تھوڑا تھوڑا اثراتی ضرور لے لے گا۔“

”یہ وحید اچانک کیوں چھٹی لے کر چلا گیا؟“ مالی نے دریافت کیا۔
”ادھر گاؤں میں اس کی ماں کا حالت زیادہ خراب ہو گیا ہے۔“ لیاقت حسین نے بتایا۔ ”بہت

دنوں سے وہ بیمار تھی۔

”حیرت ہے.....!“ بوڑھے مالی نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”کل رات تک وحید نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ میرے ہی کمرے میں بیٹھا ریڈیو پر فلمی گانے سن کر منک رہا تھا۔ وہ تو رات بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔“

”ہوتا ہے چاچا ہوتا ہے۔“ لیاقت حسین نے اپنی سوچ کے مطابق جواب دیا۔ ”کبھی کبھی انسان غم غلط کرنے کا خاطر بھی اپنا دل پشانداری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے مقدر میں کیا لکھا ہے بندے کو کیا خبر۔“

بوڑھا مالی سر ہلاتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لیاقت حسین گاڑی کو دھونے کے بعد اس کی پالش کر کے چکانے میں جت گیا۔ ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد وہ کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کی خاطر عقی صے کے خالی کمرے میں آرام کرنے چلا گیا، لیکن مالی چاچا کے کہنے کے مطابق اس نے طے کر لیا تھا کہ صاحب کے جانے سے پہلے وہ گاڑی بیٹکلے سے نکال کر سٹیئرنگ پر اپنا ہاتھ بھی تھوڑا صاف کرنے کی خاطر قرعہ سڑکوں کے ایک دو چکر ضرور لگا لے گا۔ اسی بہانے گاڑی کی ٹرائی بھی لے لے گا۔ بریک اور گئیر کی کارکردگی کا اندازہ بھی لگا لے گا جو ضروری تھا۔

سیٹھ عثمان کو ٹھیک ساڑھے پانچ بجے لکنا تھا۔ لیاقت حسین پوری طرح تیار ہو کر گاڑی کی ٹرائی لینے کی خاطر ٹھیک ساڑھے تین بجے اسے بیٹکلے سے باہر لے گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے بریک آزمایا تو وہ اسے کچھ نرم محسوس ہوا۔ ایک دو بار بریک آزمانے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ بریک کو کس وقت استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے بعد اس سڑک کے ایک دو چکر لگانے کے بعد گاڑی کو باہر لا کر روک دیا۔ ہارن بجا کر مسکراتے ہوئے گاڑی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا، پھر اتفاقاً اس کا پاؤں گچ سے ہٹا تو گاڑی ایک جھٹکا کھا کر بند ہو گئی۔ لیاقت حسین کو خود اپنی غلطی پر ہنسی آگئی لیکن گاڑی کو دوبارہ سٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے کوئی ایسی بات محسوس کی کہ یک لخت پریشان ہو گیا۔

اس نے گاڑی کو سٹارٹ کر کے گیٹ کے اندر لانے کے بجائے بائیں جانب موڑا اور دس پندرہ گز دور اس خالی پلاٹ کے قریب لا کر کھڑا کر دیا، جس پر جنگی گھاس کہیں کہیں اگی نظر آرہی تھی۔ گاڑی روکنے کے بعد اس نے سوچ سمجھا کر انجن بند کیا۔ تیزی سے باہر نکل کر بونٹ اٹھا کر انجن کے قریب ہو کر اس آواز کو سننے لگا جو گیٹ پر اتفاقاً گاڑی بند ہوجانے کے بعد اس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔

بمشکل ایک جو منٹ کے بعد ٹک..... ٹک..... ٹک کی وہ آواز اسے واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ لیاقت حسین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس نے برق رفتاری سے ڈکی کھول کر اس میں سے ٹول بکس نکالا، پھر ایئر فلٹر کا اوپر ڈھکن کھولے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہاں درمیان میں بڑی احتیاط سے ایک دیسی ساخت کا بم رکھا ہوا تھا۔ بم کے ساتھ ہی ایک چھوٹی گھڑی بھی تھی جس کی سرخ سوئی متحرک ہوتے..... وقت ٹک ٹک کی آواز پیدا کر رہی تھی۔

لیاقت حسین اپنے شہر میں متعدد بار ایسے بموں کے استعمال اور وقت کے تعین کا اندازہ بہت

قریب سے لگا چکا تھا۔ سرخ متحرک سوئی اور ہندسوں پر غور کرنے کے بعد اس کے رے سب اوسان بھی خطا ہو گئے۔ سیٹھ عثمان کو گھر سے ٹھیک ساڑھے پانچ بجے لکنا تھا اور بم پھٹنے کا وقت چھ بجے فکس کیا گیا تھا۔ لیاقت حسین نے ایئر فلٹر کا ڈھکن بند کرنے کے بجائے اس کو اوپر ہی نکال دیا، پھر وہ بونٹ بند کرنے کے بعد تیزی سے بیٹکلے کی طرف دوڑ پڑا۔ اس کے بیٹکلے میں ایک آتش فشاں جوش مار رہا تھا، ذہن میں مالی چاچا کے کہے ہوئے الفاظ بھی گونج رہے تھے۔ ”کل رات تک وحید نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ میرے ہی کمرے میں بیٹھا جی ریڈیو پر فلمی گانے سن کر منک رہا تھا۔ وہ تو رات بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔“

”نمک حرام..... غدار..... خنزیر کا ختم۔“ لیاقت حسین دل ہی دل میں وحید کو گالیاں بک رہا تھا۔

”کیا بات ہے لیاقت حسین؟“ گاڑی نے اس کی بوکھلاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ ”تم نے گاڑی کو ادھر کیوں چھوڑ دیا۔“

”دروازہ کھولو..... جلدی مجھے صاحب سے ملنا ہے۔“

”کیا ہو گیا؟“ گاڑی نے پھانک کھولتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ”کچھ ہم کو بھی تو پتا چلے۔“

”ادھر ہی کھڑے رہو۔ گاڑی کے قریب مت جانا۔“ لیاقت حسین اپنا جملہ مکمل کرتے ہی بیٹکلے کی طرف بھاگا، پھر اس نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر دروازے پر لگے سفید سوئچ پر اپنی انگلی پوری قوت سے جمادی اندر مسلسل بجتنے والی گھنٹی کی آواز اسے بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے سوئچ سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ایک منٹ بعد ہی ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے لیاقت کو ناگوار لہجے میں مخاطب کیا۔ ”گھنٹی مسلسل کیوں بج رہی ہے۔ کیا آفت آگئی؟“

”صاحب کو بلاؤ..... فوراً۔“ لیاقت حسین نے جھلا کر کہا۔ ”ہم کو ابھی ملنا ہے جلدی کرو جلدی۔“

ملازمہ اس کی وحشت دیکھ کر اپنے قدموں منہ ہی منہ میں کچھ بد بداتی اندر چلی گئی۔ لیاقت حسین بے چینی سے باہر ہی ٹپٹلے لگا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اگر وحید کہیں سامنے ہوتا تو شاید صاحب تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ کرتا۔ اس کی وحشت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دو منٹ بعد سیٹھ عثمان کے ساتھ ساتھ راحیلہ بیگم بھی باہر آگئیں۔ گھنٹی کی مسلسل آواز نے انہیں بھی پریشان کر دیا تھا۔

”کیا بات ہے لیاقت حسین؟“ سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کے چہرے پر طاری وحشت دیکھ کر دریافت کیا۔ ”تم اس قدر پریشان کیوں نظر آ رہے ہو؟“

”صاحب..... وہ ادھر آپ کا گاڑی ٹھیک چھ بجے ایک دھماکے سے اڑ جائے گا۔“

”کیا بری فال زبان سے نکال رہے ہو۔“ راحیلہ بیگم نے تملاکر سوال کیا۔ ”تم ہوش میں تو

”صاحب.....“ لیاقت نے راحیلہ بیگم کی بات کا جواب دینے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر سیٹھ عثمان سے درخواست کی۔ ”پولیس کو بلاؤ صاحب..... وہ وحید..... نمک حرای کر کے فرار ہو گیا ہے۔ آپ کا گاڑی میں بم فٹ کر گیا ہے جو چھ بجے پھٹ جائے گا۔ ہم گاڑی کو بیٹھکے سے دور خالی پلاٹ پر چھوڑ آیا ہے۔“

لیاقت حسین کی بات سن کر راحیلہ بیگم سکتے کی کیفیت سے دوچار ہو گئیں۔ لیاقت حسین کی دیوانگی گواہی دے رہی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

”چلو..... میں دیکھتا ہوں ابھی تو چھ بجنے میں دو گھنٹے.....“

”نہیں..... خدا کیلئے نہیں۔“ راحیلہ بیگم نے شوہر کا ہاتھ تھام کر منت کی۔ ”آپ اسی وقت فوری طور پر اپنے ڈی ایس پی دوست کو فون کریں۔ میں آپ کو کسی قیمت پر باہر نہیں جانے دوں گی۔“

بیوی کی بات سن لینے کے بعد سیٹھ عثمان نے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ لیاقت حسین کو باہر رکنے کی تاکید کرتے ہوئے اندر آ گئے۔ راحیلہ بیگم کے مشورے پر انہوں نے ڈی ایس پی سراج کو فون ملانا شروع کر دیا۔ دو تین نمبروں کو آزمانے اور دوسری طرف سے بتائے جانے والے نئے نمبروں کو ڈائل کرنے کے بعد بالآخر ان کا رابطہ سراج سے ہو گیا۔ انہوں نے مختصر لیاقت حسین کی دی ہوئی اطلاع سراج کے گوش گزار کر دی۔

”تم خود کو اور بھابی کو بھی گاڑی سے دور رکھو، کسی ملازم کو بھی قریب جانے سے روکو۔ میں ابھی بم ڈسپوزل سکواڈ کے ایک واقف کار کو لے کر جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”فی الحال اس کا تذکرہ کسی اور سے نہ کرنا۔“ سیٹھ عثمان نے درخواست کی۔

”میں معاملے کی نزاکت اور تمہاری پوزیشن سمجھ رہا ہوں میرے آنے کا انتظار کرو۔“

سیٹھ عثمان نے فون بند کر کے بیوی کی طرف دیکھا جس کے چہرے کا سارا حسن ایک خطرناک خبر سن کر ہی دھندلا گیا تھا۔ انہوں نے بیوی کو تسلی دی، پھر لیاقت حسین کو اندر بلا کر خاموشی سے امبی سٹڈی میں لے گئے۔ راحیلہ بیگم بھی شوہر کے ساتھ تھیں۔ لیاقت حسین نے سیٹھ عثمان کے استفسار پر پوری کہانی دہرائی۔ بوڑھے مالی کا وہ جملہ بھی بتا دیا جو ابھی تک اس کے کانوں میں گنبد کی صدا کی طرح گونج رہا تھا۔

”حیرت ہے..... مجھے وحید سے یہ امید نہیں تھی۔“

”خدا کا شکر ادا کریں کہ لیاقت حسین بروقت کام آگیا“ آپ اس سے باتیں کریں میں دو رکعت شکرانے کے نفل پڑھ کر آتی ہوں اور..... آپ گھر سے باہر قدم نکالنے کی غلطی نہ کیجئے گا۔ آپ کو میری قسم۔“

راحیلہ بیگم پلٹ کر جلدی میں چلی گئیں تو سیٹھ عثمان پھر حالات پر غور کرنے لگے۔ کچھ دیر

خاموش رہے پھر دوبارہ لیاقت حسین کی طرف دیکھا جو ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ کار میں بم فٹ ہے.....؟“

”ہم کو پکا یقین ہے صاحب۔“ اپنے شہر میں کئی ایسی وارداتیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اپنا ایک معمولی غلطی عین وقت پر کام آگیا ورنہ.....“ لیاقت حسین نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔ وہ بے حد جذباتی نظر آ رہا تھا۔

”کیسی غلطی.....!“

”بس قدرت کو منظور تھا صاحب۔“ لیاقت حسین نے نظریں جھکا کر سنجیدگی سے کلچ سے پاؤں ہٹ جانے والی غلطی بیان کر دی۔ ”بیگم صاحبہ نے مجھے جو کام سونپا تھا اس کی خوشی میں اتنا گن تھا کہ ایک چھوٹا سا بھول ہو گیا۔ اس میں بھی اوپر والے کا کچھ مصلحت ہی تھا صاحب۔“

”یقیناً وہی زندگی اور موت پر اختیار کل رکھتا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے دبی زبان میں کہا۔ ”تم سے بھول نہ ہوتی تو سب کچھ تباہ ہو جاتا۔ میری وجہ سے تم بھی ناگہانی آفت کا شکار.....“

”ایسا مت بولو صاحب۔“ لیاقت حسین نے التجا کی۔

”آپ اور بیگم صاحبہ کا سہاگ کو خدا قائم رکھے۔ آپ پر سے تو دس لیاقت حسین بھی قربان ہو جائیں تو بھی کم ہے۔“

سیٹھ عثمان نے بڑی عقیدت بھری نظروں سے لیاقت حسین کو دیکھا۔ کچھ دیر گم مسم رہے پھر ایک سرد آہ بھر کر بولے۔

”ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ وحید کبھی میرے ساتھ ایسی گری ہوئی حرکت بھی کر سکتا ہے۔“

”کافر سب کچھ کر سکتا ہے صاحب۔“ لیاقت حسین پھر جذباتی ہونے لگا۔ ”وحید کو لمبا مال دے کر خریدنے والا ابھی کوئی کافر ہی کا بچہ ہوگا۔“

”تم باہر جا کر گیٹ پر کو۔“ سیٹھ عثمان نے کچھ سوچ کر ہدایت کی۔ ”گاڑی کے قریب جانے کی غلطی مت کرنا۔ یہ بھی خیال رکھنا کہ کوئی دوسرا بھی اس کے پاس نہ جائے۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔ آپ بے فکر ہو جاؤ میں اپنا فرض سے غافل نہیں ہوں گا۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا، پھر پلٹ کر تیزی سے باہر چلا گیا۔

پینتالیس منٹ بعد ڈی ایس پی سراج بھی سادہ لباس میں کسی آدمی کے ساتھ آگیا۔ گیٹ پر لی رک کر اس نے لیاقت حسین کو اس آدمی کے سامنے کچھ ضروری ہدایات دیں، پھر خود اندر آگیا۔

بہاں سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم دونوں ہی اس کے منتظر تھے۔

سراج نے سیٹھ عثمان سے دوستانہ انداز میں ہاتھ ملایا۔ راحیلہ کی طرف دیکھ کر شکوہ کیا۔ ”عثمان لی نبوی سے تو اب آپ بھی بخوبی واقف ہو گئی ہوں گی لیکن مجھے آپ سے ایسی امید نہیں تھی کہ ایک

بیانی چائے کو بھی نہیں پوچھیں گی۔“

”آپ جیسے تو سکون سے۔“ راحیلہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ ”چائے کے ساتھ بھی بہت کچھ

آجائے گا۔

”کیا تمہارے ساتھ کوئی اور نہیں آیا؟“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔
”اطمینان سے بیٹھ جاؤ جو آدمی آیا ہے وہ لیاقت حسین کے ساتھ باہر اپنا کام کر رہا ہے ہم یہاں سکون سے بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں۔“

راحیلہ بیگم سراج کی طبیعت سے واقف تھیں ڈی ایس پی ہونے کے باوجود عثمان سے ابھی تک دوستوں کی طرح ملتا تھا اور اسے بڑی اپنائیت سے بھالی کہتا تھا۔ وہ ملازم کو چائے لانے کو کہنے کیلئے اٹھ کر چلی گئیں تو سیٹھ عثمان نے بدستور سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا ہم باہر نہیں چل سکتے؟“

”مجھے تم سے کسی عکسندی کی توقع بھی نہیں تھی۔“ سراج ہاتھ تھام کر سیٹھ عثمان کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”مرد الحق“ تم نے ہی تو کہا تھا کہ اس واقعہ کی تفسیر نہیں چاہتے ورنہ مجھے گھر جا کر لباس تبدیل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب بھی اگر تم کہو تو متعلقہ تھانے کو فون کر کے ایس ایچ او کے ساتھ چار پولیس والوں کو بھی بلا لوں۔ میڈیا کے لوگوں کو فون کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ وہ خود ہی خوشبو سونگھتے ہوئے آجائیں گے۔ کیا خیال ہے؟“

”پلیز سراج..... کچھ دیر کیلئے سنجیدہ ہو جاؤ۔“

”ابھی نہیں، پہلے ذرا ناشتے کے ساتھ انصاف کر لوں۔“ سراج نے چائے کی ٹرائی کے ساتھ راحیلہ بیگم کو بھی قریب آتے دیکھ کر قدرے بلند آواز میں کہا۔

ملازم ٹرائی چھوڑ کر اٹلے قدموں واپس چلا گیا تو سراج نے سمسوں کی پلیٹ اٹھا کر ہاتھ میں لے لی راحیلہ بیگم چائے بناتے ہوئے خوشی سے بولیں۔ ”پیٹ بھر کر کھائیے۔ مجھے خوشی ہوگی اندر اور بھی تیار ہو رہے ہیں۔“

”خدا آپ کے شوہر کے دوست کو زندگی عطا کرے۔“ سراج نے تازہ بنے سمسوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی یہی مہمان نوازی دیکھ کر دل کڑھتا ہے کہ کس کنجوس سے.....“

”آپ بھالی کو بہت دنوں سے ساتھ نہیں لائے۔“ راحیلہ بیگم نے سراج کا جملہ کاٹ کر پوچھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ سراج کے جیلے کی تان پھر اس کے شوہر پر ٹوٹے گی۔

”اس وقت تو عثمان کے فون پر ایمر جنسی میں آنا پڑا۔ ویسے بھی آپ کو علم ہوگا کہ ہماری بیگم کو سماجی کاموں اور خواتین کی آنے دنوں کی محفل آوارگی سے ذرا کم ہی فرصت ملتی ہے۔“

کچھ دیر تک یہی بات ہوتی رہی۔ سراج حسب معمول سیٹھ عثمان کو راحیلہ بیگم کے سامنے چھیڑتا رہا، پھر جب ایک ملازم نے اس کو کسی کے آنے کی اطلاع دی تو اس نے راحیلہ بیگم سے دریافت کیا۔

”بھالی اگر آپ اجازت دیں تو اسے اندر ہی بلوا لوں۔“

”کون ہے.....؟“ راحیلہ بیگم نے پوچھا۔

”بم ڈسپوزل سکوڈ کا ایک ذمہ دار آفیسر ہے۔ میرا پرانا واقف کار ہے۔“

”بلا لیں وہ بھی چائے میں شریک ہو جائیں گے۔“

ملازم اٹلے قدموں واپس چلا گیا، پھر اس آدمی کو بھی اندر لے آیا جس کا نام ریاض تھا۔ سیٹھ عثمان نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ راحیلہ بیگم آنے والے مہمان کیلئے چائے بنانے لگیں، لیکن ان کے کان بدستور سراج کی باتوں کی طرف لگے تھے جو ریاض کے آتے ہی سنجیدہ ہو کر اس سے باتوں میں مشغول ہو گیا تھا۔ سیٹھ عثمان کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔

”خدا کا شکر ہے آپ کے دوست کی کوئی نیکی کام آگئی۔“ ریاض نے تفصیل بیان کی۔ ”کار میں جس بم کو فٹ کیا گیا تھا وہ انتہائی طاقتور تھا۔ اگر کہیں بلاسٹ ہوتا تو قرب و جوار کی دو چار اور گاڑیوں کے پرچے بھی ان میں موجود مسافروں سمیت فضا میں دور دور تک بکھر جاتے۔“

”اس رب کریم کا ہزار ہا شکر کہ اس نے آئی بلا ٹال دی۔“ راحیلہ بیگم نے جھرجھری لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔

”لیاقت حسین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ بم سے متعلق ضروری گفتگو کرنے کے بعد سراج نے ریاض ہی سے دریافت کیا۔

”آپ پولیس آفیسر ہیں۔ مجھ سے زیادہ مجرموں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ بہر حال میں نے اس کی گفتگو سے یہی اندازہ قائم کیا ہے کہ وہ ناصرف قتل اور ایماندار ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر شاید بالوں کی خاطر اپنی زندگی کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔“

”میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔“ راحیلہ بیگم نے تائید کی۔ ”وہ فرشتہ رحمت نہ ہوتا تو ہمیں بروقت اطلاع بھی نہ دیتا اور.....“ راحیلہ بیگم کچھ کہتے کہتے اب دیدہ ہو کر خاموش ہو گئیں۔

”پلیز مسٹر ریاض۔“ سراج نے ریاض سے کہا۔ ”آپ نے بم تو اپنی تحویل میں لے لیا ہوگا لیکن اس خبر کو.....“

”آپ میری طرف سے مطمئن رہیں لیکن جس نے بھی یہ مذموم حرکت کی ہے اسے سزا دینا بھی ضروری ہے۔“ ریاض نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ اس سے عثمان میرا کام ہے۔“ گفتگو کے دوران ریاض کی ضروری کال آگئی تو وہ بڑی جلدت میں معذرت کر کے چلا گیا۔

سراج نے دوبارہ میشری اور دیگر لوازمات سے انصاف کرتے ہوئے سیٹھ عثمان سے کہا۔

”اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”اگر تمہارا اشارہ وحید کی طرف ہے تو وہ واپس آنے کی حماقت نہیں کرے گا۔“

”میں نے وحید کے نہیں تمہاری آئندہ مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا تھا۔“ ”مصروفیات تو بہر حال جاری رہیں گی۔“ سیٹھ عثمان نے گہری سانس لی۔ ”گھر پر بیٹھ گیا تو ذمہ اور شیر ہو جائیں گے۔“

”اسی لئے میرا مشورہ ہے کہ تم کسی بزنس ہی کے حوالے سے مہینے دو مہینے کیلئے بھالی کو لے کر

کے فرشتوں کے ذہنوں میں بھی تمہارا خیال نہیں آئے گا۔
”پھر ٹھیک ہے۔“

سیٹھ عثمان سراج کو رخصت کر کے واپس اندر آیا تو راحیلہ بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔
”کیا بات ہوئی سراج بھائی سے اور آپ نے ان کے مشورے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”پہلے میں آپ سے ایک اور بات پر شرمندگی کا اظہار کروں گا۔“ سیٹھ عثمان نے بڑی محبت اور صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ ”آپ نے وحید کے بارے میں جو خیال ظاہر کیا تھا اس وقت مجھے آپ کی بات ناگوار محسوس ہوئی تھی لیکن اب..... اب میں آپ سے شرمندہ ہوں۔“

”ایسی باتوں سے میاں بیوی کے درمیان محبت میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے۔“ راحیلہ بیگم کے لبوں پر ایک قاتلانہ مسکراہٹ ابھری تو سیٹھ عثمان کے دل سے ایک بوجھ اتر گیا۔ کچھ دیر تک وہ محبت بھری باتیں کرتے رہے۔ راحیلہ بیگم کو خوشی تھی کہ شوہر نے سراج کے مشورے پر دو مہینے کیلئے باہر جانے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

اس خیال سے کہ کہیں سیٹھ عثمان اپنا ارادہ تبدیل نہ کر دیں۔ راحیلہ بیگم نے اگلے ہی دن اپنی ایک دور پرے کی مگر قابل اعتماد عزیزہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ان کی غیر موجودگی تک وہ راحیلہ بیگم کے بیٹکے میں قیام کریں گی۔ گھر کے ملازمین پرانے اور بھروسے کے تھے پھر بھی باری باری سب کو ذمہ داری کا احساس دلانے کے بعد انہوں نے جانے کی مختصر تیاری بھی مکمل کر لی۔ اس دن تمام ضروری مصروفیات کے باوجود انہیں شوہر کا بڑی شدت سے انتظار رہا جو دفتر کے ضروری کام نمٹانے اور ورکنگ سٹاف کو ضروری کاروباری ہدایت کیلئے دفتر چلے گئے تھے۔ دن میں بھی وہ تین چار بار فون کر کے ان کی خیریت بھی دریافت کر چکی تھیں۔

شام کو سیٹھ عثمان واپس لوٹے تو ناشتے کے بعد راحیلہ بیگم نے پوچھا۔
”سب خیریت تو رہی؟“

”جی ہاں۔“ سیٹھ عثمان نے بغیر کسی تردد کے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جو کام مجھے مل سکتا تھا اور جس کی خاطر مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تھی وہ شیخ حامد کو بھی نہیں ملا۔ ایک تیسری پارٹی فائدہ اٹھالے گئی۔“

”اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت شامل ہوگی۔ ویسے اور کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟“
”شیخ حامد کا فون آیا تھا۔ وہ بناوٹی طور پر اظہار تاسف کر رہا تھا کہ میرے نہ آنے کی وجہ سے ایک تیسری پارٹی فائدہ اٹھالے گئی۔“ سیٹھ عثمان نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں نے بھی یہی ظاہر کیا کہ مجھے اس کام سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی ورنہ میٹنگ میں ضرور شریک ہوتا۔“

”آپ نے دانشمندی کا ثبوت دیا۔ بہر حال وہ یہی سمجھ رہا ہوگا کہ افضل خان کے فون نے اثر کیا ہوگا۔“ راحیلہ بیگم نے گفتگو کا موضوع بدل کر پوچھا۔ ”آپ نے جہاز کی سیٹوں کیلئے کیا کیا؟“

کسی غیر ملکی دورے پر نکل جاؤ۔“ اس بار سراج نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہاری اور بھابی کی موجودگی میں شاید اس پلان پر آزادی سے کام نہ کر سکو جو میں نے سوچا ہے۔“
”سراج بھائی۔ آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی۔“ راحیلہ بیگم نے سراج کے مشورے سے متفق ہو کر اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا۔ ”میں خود بھی گھر میں سکون سے نہ رہ سکوں گی۔“
”اگر آپ دونوں کی رائے یہی ہے تو.....“

”آپ بھی سعادت مند شوہر ہونے کا ثبوت دیں گے اور بھابی کی پریشانی کے پیش نظر کوئی بہانہ تراشنے سے گریز کریں۔“ سراج نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ ”ویسے تمہارے چلے جانے کے بعد مجھے ایک نقصان ضرور ہوگا۔“

”وہ کیا؟ سیٹھ عثمان نے وضاحت چاہی۔

”بھابی کی مہمان نوازی یاد آتی رہے گی۔“ سراج نے بڑی عقیدت سے راحیلہ بیگم کو دیکھ کر کہا تو سیٹھ عثمان نے سکون کا سانس لیا۔

”اس سلسلے میں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ راحیلہ بیگم نے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا۔ ”میں کسی نہ کسی ذمہ دار عزیزہ کو چھوڑ کر ہی جاؤں گی۔ آپ صرف ایک فون کر دیں تو میری غیر موجودگی میں بھی آپ کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔“

”کیا آپ پورا گھر لٹوانا چاہتی ہیں۔“ سیٹھ عثمان نے پہلی بار سراج کو چھیڑنے کی خاطر کہا۔ ”اس سے بھتر ہوگا کہ دو مہینے کے ناشتے پانی کا چپک لکھ کر آپ سراج کو دیں اور پورے گھر کی خیر منائیں۔“

”سن رہی ہیں بھابی۔“ سراج نے اٹھتے ہوئے مصنوعی ناراضی کا اظہار کیا۔ ”آپ کے شوہر کے اس ذلت آمیز سلوک کے بعد اب میں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔“

راحیلہ بیگم مسکراتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ سیٹھ عثمان سراج کا ہاتھ تھام کر بولے۔

”چلیے۔ آپ کو باہر تک چھوڑ آؤں ورنہ کہیں آپ دوبارہ نہ بیٹھ جائیں۔“

باہر آنے کے بعد سراج نے ایک بار پھر سیٹھ عثمان کو تاکید کے وقت طور پر وہ اگر راحیلہ بیگم کو لے کر کہیں سیر و تفریح کیلئے چلا جائے تو وہ زیادہ آسانی سے کام کر سکے گا۔

”کوئی پلان ہے تمہارے ذہن میں؟“

”ہاں.....“ سراج نے خالص پولیس والوں جیسے انداز میں کہا۔ ”وحید صرف ایک مہرہ تھا جسے استعمال کیا گیا۔ اصل جڑ یقیناً افضل خان ہوگا۔ میرے پاس اس کی ایک فائل موجود ہے جس کو شیخ حامد اپنے تعلقات کی وجہ سے اب تک دیوتا رہا۔ تمہارے جانے کے بعد میں کسی پرانے حوالے اس سے ملاقات کروں گا۔ تم جانتے ہو کہ میری مخصوص ملاقات ذرا دوسرے قسم کی ہوتی ہے۔“

”جیسا تم مناسب سمجھو لیکن بہر حال اسے میری ذات پر.....“

”نہیں.....“ سراج نے بات منقطع کر دی۔ ”میں جس انداز میں اسے ٹریپ کروں گا۔ اس

”آپ کا کوئی حکم میں نے آج تک ٹالا ہے جواب اس کی جسارت کروں گا۔“ سیٹھ عثمان نے والہانہ انداز اختیار کیا۔ ”اگر سیٹھ بک ہوگئی تو ہم دو روز بعد روانہ ہو جائیں گے۔ میں نے ٹریولنگ ایجنٹ سے بات کر لی ہے۔“

”میں نے بھی آج ہی ساری تیاری مکمل کر لی ہے۔ صرف ایک کام رہ گیا ہے۔ اب آپ آگئے ہیں تو وہ بھی کئے لیتی ہوں۔“

”ایسا کیا کام ہے جو میری موجودگی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔“ سیٹھ عثمان نے بیوی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے پوچھا۔

”پلیز.....“ راحیلہ بیگم نے قدرے شرما کر کہا۔ ”آپ ایسا کریں کہ لیاقت حسین کو اندر بلوا لیں۔“

”خیریت.....؟“

”ابھی تک ہم نے اسے کوئی انعام نہیں دیا جس کا وہ مستحق ہے۔“

”یہ خیال کل میرے ذہن میں بھی آیا تھا، لیکن میں نے فوری طور پر اسے پورا کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس لئے کہ لیاقت حسین جاں نثار ہونے کے ساتھ ساتھ حساس اور غیور بھی ہے۔ بہر حال میں اسے بلواتا ہوں لیکن اس بات کا ذرا خیال رکھئے گا کہ اس نے ہمارے ساتھ جو نیکی کی ہے اس کا مول نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا احسان ہم شاید بھی نہ اتار سکیں۔“

دس منٹ بعد لیاقت حسین نظریں جھکائے راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان کے سامنے اندر لاؤنج میں کھڑا تھا۔

”لیاقت حسین۔“ راحیلہ بیگم نے سنبھل کر گفتگو کی ابتدا کی۔ ”کل جو سراج صاحب آئے تھے وہ تمہارے صاحب کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ ان کے مشورے پر دو تین روز بعد ہم لوگ دو مہینے کے تفریحی دورے پر باہر جا رہے ہیں۔“

”آپ کا فیصلہ ایک دم ٹھیک ہے بیگم صاحبہ۔“ لیاقت حسین نے نظریں جھکائے ہوئے دبی زبان میں جواب دیا۔ ”جب حالات گرما گرم ہوں تو پھر اوپر والے نے بھی یہی حکم دیا ہے کہ اپنا زندگی کی خاطر وقتی طور پر دشمن کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ کیا خبر کل نیلی چستری والا اس کا فرکو بھی شرمندہ کر دے جو صاحب کیلئے برا سوچ رہا تھا۔“

”میں نے سارے ملازموں کو ضروری ہدایات دے دی ہیں کہ ہمارے جانے کے بعد بیٹکے کا خیال رکھیں۔“ راحیلہ بیگم نے کہا پھر ایک بند لفاظی لیاقت حسین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ”اس میں کچھ رقم ہے جو ہماری غیر موجودگی میں کام آسکتی ہے۔ اسے ایڈوانس خواہ نہ سمجھنا۔“

”پھر.....؟“ لیاقت حسین نے نظر اٹھا کر سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں بے چینی اور کرب دونوں شامل تھے۔

”دیکھو لیاقت حسین۔ دنیا میں کوئی بھی رقم کسی کے خلوص یا قربانی کا نعم البدل نہیں ہو سکتی لیکن

ہر مسلمان کا کچھ اخلاقی فرض بھی ہوتا ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں صاحب.....“ لیاقت حسین نے کسمسا کر دبی زبان میں جواب دیا۔ ”ہم آپ کا ملازم ہے۔ آپ یا بیگم صاحبہ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا، لیکن.....“ وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اس کی پانچویں جینے لگیں۔

”تم چپ کیوں ہو گئے؟“ سیٹھ عثمان نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”جو دل میں ہے کہہ دو..... ورنہ اندر کی محض اور بڑھ جاتی ہے۔“

”صاحب..... ہم غریب ضرور ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ کسی نیکی اور فرض کو ادا کرنے کے بعد بندہ اگر اس کا مول تول کر لے تو خدا کو یہ بات اچھا نہیں لگتا۔“

سیٹھ عثمان کو پہلے ہی یہ احساس تھا کہ لیاقت حسین غیور طبیعت کا مالک ہے۔ ان سے کوئی وہاب نہ بن پڑا تو راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین سے بڑی انکساری اور اپنائیت سے سوال کیا۔

”لیاقت حسین، تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟“

”آپ اس گھر کا مالک ہیں بیگم صاحبہ۔“

”کیا مسلمان ہونے کے باوجود میرے اور تمہارے درمیان صرف مالکین اور ملازم کا رشتہ ہے اور کوئی رشتہ نہیں ہے؟“

لیاقت حسین ایک لمبے لمبے لہجے میں بولا۔ ”ہمارے سرکار کا کہنا ہے کہ سب مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہے اس لئے کسی دوسرے کو حقیر نہ سمجھو۔ جسے تم حقیر سمجھتے ہو ہو سکتا ہے وہ خدا کا نظروں میں تم سے زیادہ اچھا ہو۔ ہم کو گاؤں میں مولوی صاحب نے یہی تعلیم دیا تھا۔ اس لئے کہ ہم کو نہیں معلوم۔“

”پھر تم نے فلان اندازہ کیوں قائم کر لیا۔“ راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین کو کبھی ہوئی بات سے یاد دلانے کے لئے کہا۔ ”کیا تم مسلمان ہونے کے ناتے میرے بھائی اور تمہاری بیوی میری بہن نہیں ہو سکتی؟“

”ہاں، ہاں، ہاں.....“

”اگر ہاں، ہاں، ہاں.....“

”بیگم صاحبہ، ہاں، ہاں، ہاں.....“ سیٹھ عثمان نے خندہ پیشانی سے کہا۔ ”تم بھی ادا نہ کرو۔ ایک بات اور سمجھ لو جو رقم صرف انسانیت کی بنیاد پر دی جائے وہ بھی حسن اطاعت اور لبلی لہائی ہے۔ اس سے منہ پھیر لینا بھی دوسرے کی دل شکنی کا سبب بن سکتا ہے۔“

لیاقت حسین نے ایک لمحہ تامل کیا پھر ہنسی سے ہنس کر لافہ قہام لیا۔

”آج میں تمہیں ایک ذمہ داری اپنا سمجھ کر سونپ رہی ہوں۔“ راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین کے تاثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے اس کی محض کم کرنے اور اپنی دلی خواہش کے پیش نظر کہا۔ ”ہماری

غیر موجودگی میں تمہیں تمام تر اختیارات ہوں گے۔ تم ہمارے جانے کے بعد ہر بات کا خیال رکھو گے۔“

”آپ اس کا فکر نہ کریں بیگم صاحبہ۔ ہم آپ کو زندگی میں کبھی مایوس نہیں کرے گا۔ یہ ایک مسلمان کا وعدہ ہے۔“

کچھ دیر بعد لیاقت حسین سلام کر کے چلا گیا تو راحیلہ بیگم کے علاوہ سیٹھ عثمان نے بھی سکون کا سانس لیا.....!



ذمے داریاں بڑھ جانے کے بعد لیاقت حسین اکثر دیر سے گھر آنے لگا، لیکن آج اسے خلاف توقع کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ گل خان کی بیوی ساڑھے نو بجے رات تک فرحین کے پاس رہی، پھر اپنے گھر چلی گئی۔

فرحین نے زرینہ کے جانے کے بعد لائین کو اٹھا کر ایک طرف رکھا، پھر بستر پر لیٹ کر لیاقت حسین کے بارے میں سوچنے لگی۔ لیاقت حسین کے ساتھ شادی کرنا اس کی دلی خواہش تھی اور اس سودے میں اسے گھانا بھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ دن نگلی ترشی میں ضرور گزرے، پھر خدا نے اس کی سن لی۔ سیٹھ عثمان کے ہاں ملازمت مل جانے کے بعد اسے کسی بات کی فکر نہیں رہ گئی تھی۔ لیاقت حسین کو ہر ماہ جو تنخواہ ملتی تھی وہ اس میں سے بھی تھوڑا بہت کسی اچانک پیش آنے والی ضرورت کی خاطر پس انداز کر لیتی تھی۔ چوکیداری کے بعد لیاقت حسین کو بڑے صاحب کی ڈرائیوری کا فرض سونپا گیا تو اس کی تنخواہ بھی چار ہزار کے بجائے پورے پانچ ہزار ہو گئی تھی۔ فرحین نے اس روز بھی شکرانے کے دو نفل ادا کئے تھے اور اس وقت بھی اس نے اس ”واحدہ لاشریک لہ“ کے حضور سجدہ ریز ہو کر بڑی عاجزی سے گڑگڑا کر اس کا شکر ادا کیا تھا جب اس کے شوہر کی وفاداری پر ایک مسلمان کہہ کر کسی بہن نے دس ہزار کی خطیر رقم اس کے ہاتھ پر آنکھ بند کر کے رکھ دی تھی، پھر اس روز اسے راحیلہ بیگم کے اندر چھپی وہ پر خلوص عورت بھی نظر آگئی جب روائگی سے قبل اس نے فرحین کو گھر بلا کر اسے ایک بہن کہہ کر گلے لگایا تھا۔ یہ وہ اعزاز تھے جو اسے اور اس کے شوہر کو خدا کی مرضی سے عطا ہوئے تھے۔

فرحین چار پائی پر لیٹی انہی باتوں کو یاد کر رہی تھی جب اسے مکان کی عقبی کھڑکی کی طرف سے جو قبرستان کی سمت کھلتی تھی کسی کی آواز ایسی مدھم سنائی دی جیسے کوئی خوش ہو کر ہنس رہا ہو۔ فرحین ہنسی کی اس آواز پر چوکی۔ آج تک اس نے قبرستان کی جانب سے متعدد بار رونے دھونے سسکیوں اور آہوں کی آواز سنی تھی لیکن آج کسی کے گھٹے گھٹے انداز میں ہنسنے کی آواز سن کر اسے تعجب بھی ہوا، پھر رات کے گیارہ سوا گیارہ بجے اسے پہلی بار ہی قبرستان کی طرف سے ایسی کوئی آواز سنائی دی تھی۔ دن بھر وہ پردے کے خیال سے کھڑکی بند ہی رکھتی تھی، لیکن عشاء کی اذان کے بعد اسے ہوا آنے کی خاطر کھول دیتی تھی۔ اس نے کھڑکی پر ایک ہلکے سیاہ کپڑے کا پردہ بھی سی کر ڈال دیا تھا۔ حکومت کی جانب سے بھی اس قدیم قبرستان میں گنجائش نہ ہونے کے سبب نئے مردے دفنانے پر پابندی عائد

تھی، لیکن کبھی جھوپڑیوں میں رہنے والے کسی گھر میں موت ہو جاتی تو وہ اپنا مردہ اسی قبرستان میں پرانی اور لاوارث قبروں کے درمیان دفن کرنے کیلئے تھوڑی گنجائش نکال لیتے تھے۔

فرحین نے اٹھ کر لائین کی روشنی مدھم کی، پھر دبے قدموں کھڑکی کے قریب آگئی۔ پردے اور چوکت کے درمیان تھوڑی سی جگہ بنا کر اس نے باہر دیکھا۔ اندھیرے کے سبب کچھ دیر تک تو کچھ بھی نظر نہ آیا، پھر وہی کھٹی کھٹی ہنسی کی آواز دوبارہ ابھری تو فرحین نے اس انسانی ہولے کو دیکھ لیا جو کھڑکی سے تقریباً دس گز دور اس طرح اٹھتا نظر آیا جیسے کسی منہدم قبر سے کوئی مردہ برآمد ہوا ہو۔ فرحین ارپاک نہیں تھی، پھر بھی ایک انجانے خوف کی لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ اس کے بعد اس نے ہولے کو ایک عجیب حرکت کرتے دیکھا۔ وہ اپنا لباس اتار کر کاندھوں پر ڈال رہا تھا۔ مادرِ ادا برہنہ ہو کر ناپٹے لگا تو فرحین نے گھبرا کر کھڑکی کو آہستہ سے بند کر لیا۔ اس کا دل کسی نادیدہ خوف سے دھڑکنے لگا۔ دیوار سے لگی کھڑکی اس شخص یا شیطان کے بارے میں سوچنے لگی جو آدھی رات گئے ہیں ان قبرستان میں برہنہ ناچ رہا تھا۔ وہ خوف سے سبھی اس کے بارے میں غور کر رہی تھی کہ دروازے پر کون سی آواز سن کر اس طرح گھبرا گئی جیسے وہ اپنے ہوش میں نہ رہی ہو، پھر اس نے اپنا دروازہ کھول دیا۔ لیاقت حسین نے حسب معمول دروازے پر دستک کے ساتھ ہی اسے آواز بھی دی تھی یہ اس کا ہمیشہ کا معمول تھا۔

لیاقت حسین اندر آ گیا تو فرحین نے دروازہ بند کر لیا، پھر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی شوہر کے پاس آ کر بولی۔ ”کیا بات ہے۔ آج تم کو پھر دیر ہو گیا؟“

”ادھر بنگلے پر صاحب کا دوست پولیس آفیسر سراج صاحب مجھ سے ملے آیا تھا۔ اس کا ساتھ ہاتھوں میں دیر ہو گیا۔“

”پولیس کا آفیسر تم سے ملے آیا تھا؟“ فرحین نے پوچھا۔ ”سب خیریت تو ہے؟“

”اب تو خیر ہی خیر ہے لیاقت کا جان۔“ اس نے فرحین کو بانہوں میں سمیٹ کر کہا۔ ”آج اپنے دل کا ایک اور ارمان پورا ہو گیا۔“

لیاقت حسین نے جب اپنے لباس کے نیچے سے ایک نیا پستول نکال کر فرحین کو دکھایا تو فرحین ہلکا سا گھبرا گیا۔ شادی سے پہلے بھی اسے معلوم تھا کہ لیاقت حسین نے بندوق چلانا سیکھ رکھا ہے۔ اس کا اٹنا بھی مضرب تھا، لیکن باپ کی مخالفت کی وجہ سے وہ اپنے لئے کوئی ذاتی اسلحہ نہیں خرید سکا تھا۔ ان اس کی ایمانداری کے سبب یہ ارمان بھی پورا ہو گیا۔

”یہ تم کو کدھر سے مل گیا؟“

”سراج صاحب نے دیا ہے۔ صاحب شاید اس کو بول کر گیا تھا۔ اس کا ساتھ ہی ہمارے لے گا اسٹنس بھی بنا کر دیا ہے جس پر سرکاری ٹھپا لگا ہے۔“

لیاقت حسین فرحین کو جیب سے اسٹنس نکال کر دکھانے لگا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ بار بار دہائی اور جوش بھرے انداز میں فرحین کو بھی گلے سے لگا لیتا تھا۔ فرحین بھی شوہر کو خوش دیکھ کر خوش

تھی۔

”کیا آج کھانا کھانے کا ارادہ نہیں ہے؟“ اس نے شوہر کے بازوؤں میں کسماتے ہوئے پوچھا۔

”اپنا من پسند اور اصلی خوراک تو تم ہے جان جگر۔“ لیاقت حسین نے بیوی کو شیر نظر سے دیکھا۔ ”آج کھانے کا چمٹی کرو۔“ لیاقت حسین ذرا کھسک کر بیوی کے اور قریب ہو گیا۔ اس کی سانسیں بکینے لگیں۔ فرحین نے کبھی شوہر کی کسی بات سے منہ نہیں موڑا تھا۔ وہ اس کا محبوب بھی تھا اور مجازی خدا بھی..... شوہر کی سانسوں کی تپش اپنے گالوں پر محسوس کر کے وہ بھی کھینچنے لگی۔ جذبات بھجان انگیز ہونے لگے تو دونوں کی بہکی بہکی سانسیں بھی ہم آغوش ہونے لگیں۔ شوہر کی بانہوں میں سمٹ کر فرحین کو ہمیشہ ایک نئی لذت کا احساس ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ محبت کی حسین وادیوں کی سیر کر رہی تھی جب باہر سے گل خان کی آواز سن کر جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا طوفان ایک دم ختم گیا۔ گل خان اس کے گھر کے قریب نہیں تھا۔ اس کی آواز قبرستان کی طرف کچھ دور سے سنائی دی وہ اپنی زبان میں لیاقت کو باہر آنے کا کہہ رہا تھا۔

”یہ کباب میں ہڈی کدھر سے آگیا۔“ لیاقت حسین نے فرحین کو چھوڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ فرحین بھی لباس درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی لمحے اسے یاد آگیا کہ شوہر کے آنے سے پیشتر اس نے قبرستان میں کیا دیکھا تھا۔ ”کہیں گل خان نے بھی تو وہ تماشا نہیں دیکھ لیا؟“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”یقیناً یہی بات ہوگی ورنہ اس وقت اسے لیاقت حسین کو آواز دے کر باہر بلانے کی اور کیا ضرورت پیش آسکتی تھی؟ گل خان نے دروازے پر دستک دی ہوتی تو اور بات تھی۔“ وہ لپک کر دوبارہ عقبی کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ اس نے پردہ تھوڑا سا ہٹا کر باہر دیکھا تو دل دھک دھک کرنے لگا۔ گل خان اور اس کا شوہر اسی قبر کے پاس کھڑے تھے جس کے قریب اس نے کسی دیوانے یا شیطان نما بیولے کو برہنہ ہو کر خوشی سے ناچتے دیکھا تھا۔ فرحین کے دل میں انجانے وسوسے ابھرنے لگے۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ آواز دے کر شوہر کو واپس بلا لیتی۔ نصف رات گئے کسی قبرستان میں عام طور پر ضرورتاً بھی لوگ جانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ فرحین نے اپنے گاؤں میں عورتوں کی زبانی سن رکھا تھا کہ رات کے وقت قبرستان میں بھوت پریت کا راج ہوتا ہے گندی رو جس بھگتی پھرتی ہیں، لیاقت حسین ان باتوں کو نہیں مانتا تھا۔

فرحین کھڑکی کے قریب کھڑی شوہر کی خیریت کی دعائیں مانگتی رہی لیکن جب اس نے گل خان کو ایک موٹی چارچ روشن کرتے اور شوہر کو زمین پر کھٹے فیک کر شکستہ قبر کے خلا میں آدھے دھڑ سے غائب ہوتے دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکنیں قابو سے باہر ہونے لگیں۔ اس کے ذہن میں یہ خیال تیزی سے کلبلا رہا تھا، ڈنک مار رہا تھا کہ آخر وہ کیا شے ہے جسے قریب سے دیکھنے یا اٹھانے کیلئے لیاقت حسین نے آدھے جسم کو ایک ویران اور اجاڑ قبرستان کی کسی شکستہ قبر میں اتار رکھا تھا۔ لیاقت حسین کی اس حرکت کے بعد گل خان بھی اس کی کمرہاں کر زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ لیاقت حسین کی

طرح اس کی نظریں بھی قبر کے اندر بھگتی نظر آرہی تھیں۔ دور ہونے اور اندھیرے کے سبب وہ شوہر یا گل خان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھی۔ اس لئے فرحین کی پریشانی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

پانچ منٹ گزر گئے پھر فرحین نے گل خان کو اٹھتے دیکھا۔ اس کے بعد لیاقت حسین بھی باہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی شے ضرور تھی جس کے بارے میں گل خان نے گہرا کر کہا تھا۔ ”اپنا اور بھائی کے ساتھ دشمنی مت کر لیاقت! اسے واپس قبر میں پھینک دے۔“ ”میرے ساتھ گھر چل گل خان۔“ لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”آرام سے بیٹھ کر دیکھتے ہیں کہ کیا چکر ہے؟“

”میری بات مان لے میرا دوست۔ یہ کام کسی پلید کا فر کا بچے نے کیا ہے۔“ گل خان کا دوسرا جملہ بھی فرحین کیلئے پریشان کن تھا۔ اس کے معصوم دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ لیاقت حسین، گل خان کی بات سن کر گھر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ فرحین کھڑکی کے قریب سے ہٹ کر دروازے کے قریب آگئی۔ دو منٹ بعد گل خان اور لیاقت حسین بھی بیرونی دروازے سے ہوتے ہوئے کچے مچن میں آگئے۔ لیاقت حسین نے دروازے کے قریب رکھی لائٹین کی لو بڑھادی، پھر وہ تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد فرحین نے شوہر کے ہاتھ میں جو شے دیکھی، اس سے اس کا پورا وجود طوفانوں کی زد میں آئے ہوئے کسی معصوم اور نازک پودے کے مانند کپکپانے لگا۔ اس کی آنکھیں حیرت کے مارے حلقوں سے اٹھنے لگیں۔

لیاقت حسین کے ہاتھ میں ایک مٹی میں لٹھو لایوں تھا جس میں دس بارہ بڑے سائز کی چمکیلی سونیاں اس طرح گھونپی گئی تھیں کہ آہ نظر آرہی تھیں۔ دونوں سروں پر تازے خون کی جمی ہوئی لکیریں بھی صاف دکھائی دیتی تھیں۔

”یہ..... یہ..... یہ کیا ہے لیاقت؟“ فرحین دروازے کی اوٹ سے غیر ارادی طور پر سوال کر بیٹھی۔

”یہ گل خان بولتا ہے کہ کسی خنزیر کے ختم نے کسی دشمن کا جان لینے کیلئے یہ گندرا عمل کیا ہے۔“ لیاقت حسین نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس میں جو سونیاں ہیں وہ کسی غریب کے بدن کا سارا خون پی کر اسے مار ڈالیں گی۔“

”پھر.....؟“ فرحین نے لرزتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم اس کو ادھر گھر میں کیوں لے آیا؟“ ”دوست میرا بات مان لے۔“ گل خان نے بھی پریشان کن لہجے میں کہا۔ ”دیر نہ کر، اس منوس بلا کو واپس جا کر اسی قبر میں ڈال دے۔ میں نے سنا ہے کہ جو بھی اس گندے عمل میں روڑا اٹکائے یا اس کی لپیٹ میں آجائے تو وہ بھی بلا فضول خطرے میں پڑ جاتا ہے۔“ ”گل خان.....“ لیاقت حسین نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔ ”اگر کبھی تم مجھے زخمی حالت میں موت کے منہ سے جاتا دیکھتے تو کیا کرے گا؟“

”ہم تمہارا جان بچانے کی خاطر اپنا زندگی بھی قربان کر دے گا۔“ گل خان نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔

”تم کو اپنا فرحین کا قسم لیاقت.....“ فرحین دروازے کی اوٹ سے گڑگڑانے لگی۔ ”اس جنجال سے اپنا دامن بچائے اس منحوس اور گندے لیوں کو ادھر ہی قبر میں واپس ڈال آ۔“

لیاقت حسین ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک طرف گل خان کی نصیحت اور بیوی کی التجا تھی۔ دوسری طرف اس کے کانوں میں کہیں دور سے اپنے مولوی صاحب کی مدہم آواز ابھرتی سنائی دے رہی تھی۔ اس کی نظریں لیوں پر مرکوز تھیں جس میں سویاں لگی تھیں اور اس میں سے انسانی خون کی ایک مبارک سی لکیر آہستہ آہستہ نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے نظریں سمھا کر گل خان کی سمت دیکھا۔

”گل خان..... کیا تم جانتا ہے کہ یہ پلید عمل کا پتھر کیوں چلایا گیا ہے؟“

”ہاں.....“ گل خان نے تیزی سے جواب دیا۔ ”کسی کافر کا بچہ نے اپنے دشمن کو جان سے مارنے کی خاطر غیر مذہب کے کسی خنزیر سے یہ خطرناک اور گندامل کرایا ہے۔ جب تک وہ غریب مر نہیں جائے گا لیوں سے خون کا لکیر بہتا رہے گا۔“

”اور اگر کوئی یہ ناپاک سویاں نکال کر پھینک دے تو.....؟“

”تم کو خدا کا واسطہ.....!“ فرحین پھر تڑپ کر بولی۔ ”میں ہاتھ جوڑ کر بولتا ہے کہ بھائی گل خان کا بھی کہا مان لے اس گندی بلا کو واپس اسی جگہ پھینک دے جہاں سے اٹھا کر لایا ہے۔ ورنہ کر لیاقت۔“

لیاقت حسین فرحین کو دل و جان سے چاہتا تھا، اسی کو اپنانے کی خاطر اس نے اپنا گھر بار بھی چھوڑ دیا تھا، اپنی ایک الگ دنیا بنا لی تھی جہاں قدرت کی مہربانی سے وہ بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ اس کی زندگی میں ایک ماں کی یاد کے سوا اور کوئی دکھ نہیں تھا۔ اسے باپ کی یاد بھی ستاتی تھی لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے فرحین کو پانے کی خاطر دل پر جبر کر کے ہر چیز سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس وقت وہی فرحین اس کو ہاتھ جوڑ کر خدا کا واسطہ دے رہی تھی۔

ایک لمحے تک لیاقت حسین شش و پنج میں مبتلا رہا، پھر لیوں کو گھورتے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا.....!!

لیاقت کسی گہری سوچ میں پوری طرح مستغرق تھا۔ کوئی گتھی تھی جو اس کے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔ خاموش کھڑا وہ خاصی دیر تک کسی الجھن کو سلجھانے کی کوشش میں مبتلا رہا۔ گل خان قریب کھڑا اپنے دوست کے فیصلے کا منتظر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لیاقت حسین ناویدہ اور ناپاک گندی قوتوں کو چھیڑ چکا تھا۔ گندے عمل کا کاٹ کرنے سے تو بڑے بڑے عامل بھی گھبراتے ہیں۔ سب جانتے تھے کہ اگر وہ سفلی کا توڑ نہ کر سکے تو ہولناک تباہی موت کی آخری سانسوں تک ان کا تعاقب کرتی رہے گی۔ دوسری طرف فرحین دروازے کی آڑ میں کھڑی خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ اس کا شوہرا اپنا ارادہ

تبدیل کر دے۔ جو منظر اس نے شوہر کے آنے سے پہلے کھڑکی کی اوٹ سے قبرستان میں دیکھا تھا، وہ بھی اس کیلئے کچھ کم پریشان کن نہیں تھا۔ گل خان کی باتیں سن کر وہ دہل گئی تھی کہ جو سویاں لیوں میں بیوست تھیں وہ کسی کا خون چوس رہی تھیں، اس وقت تک ان کا عمل جاری رہے گا جب تک وہ شخص ہلاک نہ ہو جائے، جس پر وہ پلید عمل کیا گیا تھا۔ گل خان نے لیاقت حسین کو یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اگر اس نے اس گندے عمل کو توڑنے کی کوشش کی تو پھر شیطانی قوتیں اس پر جھپٹ پڑیں گی۔ جینا محال کر دیں گی۔

فرحین کی معصوم زبان خدا سے منتیں مان رہی تھیں۔ اس کی نظریں لیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ سویوں کے کناروں سے خون کی بہتی لکیر اسے واضح طور پر نظر آرہی تھی اور اس کا شوہر اس پر نظریں جمائے جانے کس الجھن میں گرفتار تھا۔ اگر گل خان کا خیال نہ ہوتا تو وہ تیزی سے باہر آکر شوہر کے قدموں سے لپٹ جاتی، چیخ چیخ کر فریاد کرتی کہ وہ اس جنجال سے جان چھڑانے کی خاطر ناپاک لیوں کو اسی قبر میں پھینک آئے جہاں سے لایا ہے۔

گزر تے وقت کا ایک ایک لمحہ گل خان اور فرحین کیلئے کسی عذاب سے کم نہیں تھا، جب لیاقت حسین نے لیوں سے نظریں ہٹا کر گل خان کی طرف دیکھا۔

”گل خان۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے ابھی کہا تھا کہ اگر تم نے کبھی مجھے موت کے منہ میں جاتے دیکھا تو اپنی زندگی بھی ہماری جان بچانے کیلئے قربان کر دے گا۔“

”ہاں.....“ گل خان نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں گل خان کی دوستی پر بھروسہ نہیں ہے؟“

”تم میرے لئے جو جان کی قربانی دے گا، وہ کس کے حکم سے دے گا؟“

”خدا کا حکم یہی ہے اور تم اپنا پرانا یار بھی ہے.....“ گل خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کسی کا مدد کرنا تو بڑا ثواب ہے۔ تم بھی ایک معذور کا زندگی بچانے کی خاطر آگ میں کود گیا تھا۔“

”اب بھی میں نے خدا کے نام پر یہی فیصلہ کیا ہے۔“ لیاقت حسین کی آواز میں گرج شامل تھی۔ ”کسی کی جان بچانا خدا کا حکم ہے۔“

”نہیں لیاقت! نہیں.....“ فرحین اندر سے روتے ہوئے چیخ اٹھی۔ ”خدا نے یہ بھی کہا ہے کہ تم جان بوجھ کر اپنا زندگی خطرے میں نہ ڈالو۔ ایک بات اور بھی دھیان میں رکھو کہ گندا اور پلید عمل کرنے والا خدا اور رسول پر ایمان نہیں رکھتا۔“

”اسی لئے تو وہ کافر ہوتا ہے، مشرک ہوتا ہے اور مشرک کو موت کے گھاٹ اتارنا بھی اللہ کا حکم ہے۔“ لیاقت حسین نے کہا، پھر اس نے لیوں میں بھی ہوئی سوئی نکالنے کی کوشش شروع کر دی، لیکن اسے تعجب ہوا کہ وہ سوئی نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ پوری طاقت استعمال کرنے کے بعد بھی ایک وئی نہ نکال سکا، وہ بار بار مختلف سویوں کو آزماتا رہا، لیکن ہر بار اسے ناکامی ہوئی۔ وہ بری طرح تھلا ہا تھا۔

”میرا دوست.....“ گل خان نے التجا کی۔ ”ان ناپاک سویوں پر گندا عمل کر کے پھنسا یا گیا ہے یہ آسانی سے نہیں نکلے گا۔“

”لیاقت.....“ فرحین چیخ اٹھی۔ ”کیا تم اپنا فرحین کا بات بھی نہیں مانے گا؟“

”گل خان.....“ لیاقت حسین نے فرحین کی سنی اسنی کردی بڑے جذباتی انداز میں گل خان سے بولا۔ ”تم مجھے ایک پلاس لادو انکار کرے گا تو پھر میں باہر جا کر کسی اور کا دروازہ کھٹ کھٹائے گا۔“

گل خان کی منت سماجت اور فرحین کی تڑپ بھی لیاقت حسین کے ارادے کو متزلزل نہ کر سکی مجبوراً گل خان پلاس لانے کا بول کر باہر نکل گیا۔ فرحین دوڑ کر شوہر کے قدموں سے لپٹ گئی۔

”لیاقت..... ہم تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا۔ اپنا ارادہ ترک کر دو کیا تم اپنا دل اپنا جان جگر کا بات نہیں مانے گا؟“

”ہم خدا کو کیا منہ دکھائے گا دلبر؟“ لیاقت حسین نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”مولوی صاحب کی تعلیم نے ہم کو ایک ہی بات سکھایا ہے۔ کبھی گناہ سرزد ہو جائے تو بندے پر لازم ہے کہ نیکی کر لیا کرے اس لئے کہ نیکی گناہ کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے لوہے کو زنگ چٹ کر دیتا ہے۔“

”وہ اور بات ہے لیکن تم پلید عمل کا توڑ کرنے جا رہا ہے جو کوئی کافر کا بچہ نہ کیا ہے اور.....“

”اس پر بھروسہ رکھو جان لیاقت..... ہم خدا کیلئے ایک نیک قدم اٹھائے گا تو وہ غفور الرحیم دس بار ہم کو اپنا رحمت سے نوازے گا۔“

باہر سے گل خان کے قدموں کی آہٹ ابھری تو فرحین اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی بیگی پلکوں پر التجا کپکپا رہی تھی۔ شوہر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی وہ پھر کمرے میں چلی گئی۔ گل خان پلاس لے آیا تھا۔ اس نے ایک اور کوشش کی کہ لیاقت حسین اپنی حماقت سے باز آجائے لیکن لیاقت نے دل میں جو ٹھان لی تھی اسے پورا کئے بغیر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پلاس پر پوری طاقت صرف کرنے کے بعد ہی لیاقت حسین بمشکل سویوں کو جو خون میں لتھری ہوئی تھیں، لیوں سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ ٹھکن سے اس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا، سویاں نکالنے کے بعد پلاس کے ذریعے اس نے پورے لیوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنا شروع کر دیا۔ اس پر ایک جنون سا طاری تھا۔ گل خان خاموش کھڑا لیاقت کی وحشت کو سہی سہی نظروں سے سنکتا رہا۔ کمرے کے اندر فرحین مصلیٰ بچھائے سر بسجود تھی۔ خدا سے گڑگڑا کر بڑی عاجزی سے شوہر کی سلامتی اور خیر کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

لیاقت حسین نے کام مکمل کر کے پلاس گل خان کو واپس کیا، لیوں کے ٹکڑوں اور خون آلود سویوں کو اپنی تھیلی پر جمع کیا، پھر اسے گھر سے دور جا کر پھینک آیا۔ گل خان ایک بل کو اس سے دور نہیں ہوا ساتھ ساتھ رہا۔ قبرستان سے واپسی پر جب اس نے لیاقت حسین کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے تاثرات دیکھے تو دبی زبان میں بولا۔

”میرا دوست۔ تم نے اپنا من مانی کر ڈالا ہمارا کوئی بات نہیں سنا، لیکن اب ایک بات تو مان لو۔“

”تم ہمارا بھائی ہے گل خان۔ پرانا جوڑی دار۔“ لیاقت حسین نے جذباتی انداز میں گل خان کو گلے لگا لیا، پھر بولا۔ ”ہم خدا کے راہ میں جو نیکی فی سبیل اللہ کرنا تھا کرچکا، اب تم جو بولے گا ہم اس سے انکار نہیں کرے گا۔“

”وعدہ.....!“

”ایک دم پکا وعدہ..... مردوں والا۔“ لیاقت حسین نے گل خان کو یقین دلایا۔

”ادھر منگھو پیر کے پاس کسی پہنچے ہوئے بزرگ نے ڈیرا جما لیا ہے۔“ گل خان نے کہا۔ ”وہ بس اچانک کہیں سے آکر کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ گیا تھا۔ بوڑھا آدمی سفید ڈاڑھی ہے اس کے پاس ایک قبیع تھا جس پر وہ سر جھکائے دن رات کچھ پڑھتا رہتا ہے۔ نماز بھی ادھر زمین صاف کر کے پڑھ لیتا تھا لوگ اسے کھانا پانی ترس کھا کر پہنچانے لگے، لیکن نے اسے کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ وہ دن رات آنکھیں بند کئے قبیع کے دانوں کو گھماتا رہتا ہے کسی سے نہ کوئی بات کرتا نہ آنکھ اٹھا کر کسی کو دیکھتا۔“ گل خان نے اپنی بات جاری رکھی۔

”پھر لوگوں نے اس کو بزرگ سمجھ کر بڑی سی چھو لداری ڈال دی۔ اس وقت وہ بندہ خدا کی کے ساتھ کچھ بات نہیں کیا۔ اپنے آپ میں گم رہتا۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا..... آہستہ آہستہ غریب اور دکھ کے مارے اس کے پاس جمع ہونے لگے، وہ اسے اپنا دکھڑا سناٹے، وہ چپ بیٹھا قبیع کا دانہ گھماتا رہتا، کبھی کبھی گردن کا معمولی جنبش سے ہاں یا نہیں کا اشارہ کر دیتا، جس کیلئے ہاں کا اشارہ کرتا اس کی مراد پوری ہو جاتی۔ نہ کا اشارہ کرتا تو سائل مایوس ہو جاتا۔ ایک سال سے کسی نے اس دیوانے کو کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا..... اب وہاں دن رات ضرورت مندوں کا بھیڑ لگا رہتا ہے اس کیلئے ایک چھوٹی چھو لداری بنا دی گئی ہے۔ روز ادھر ضرورت مندوں کو پرچی دیا جاتا ہے۔ ایک دن میں پرچی بانٹنے والا کل دس پرچیاں بانٹتا ہے۔ اس کے بعد کسی کو چھوٹی چھو لداری میں جانے کی اجازت نہیں ملتا۔ ہم تم کو کل ادھر لے کر جائے گا۔“

”تمہارا اور لوگوں کا کیا خیال ہے؟“ لیاقت حسین نے پوچھا۔ ”وہ بزرگ کون ہو سکتا ہے.....؟“

”خدا کا کوئی نیک بندہ ہوگا.....“ گل خان نے جواب دیا۔ ”اس کے بارے میں لوگوں نے عجیب عجیب باتیں بولی ہیں۔ سچ کیا ہے؟ یہ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔“

”کیسا باتیں.....؟“ لیاقت حسین نے پوچھا۔ گل خان کی باتیں سن کر اس کے اندر ایک انجانا تجسس کروٹیں لینے لگا۔

”کچھ لوگ بولتا ہے کہ کبھی کبھی چھوٹی چھو لداری میں کوئی نظر نہیں آتا..... لوگ سوچتا ہے کہ شاید وہ نیک بندہ کدھری اور نکل گیا، لیکن دوسرے دن یا دوسری صبح وہ دوبارہ اپنا جگہ اسی طرح کسی

دیوانے کی طرح بیٹھا نظر آتا ہے۔“

”حیرت انگیز بات ہے۔“ لیاقت حسین نے کہا۔ ”تمہارا باتیں سن کر خود میرا دل کرتا ہے کہ ایک بار اس کا دیدار کر لوں۔“

”ہم کل ادھر چلے گا۔“

”کل نہیں۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے عذر پیش کیا۔ ”صاحب اور بیگم صاحب کی غیر موجودگی میں ادھر کا سارا ذمہ داری میرا ہے، کل ہم نیا والا بیگم صاحب سے ایک دن کا چھٹی مانگے گا۔ اگر مل گیا تو پرسوں تمہارا ساتھ ضرور چلے گا لیکن۔۔۔۔۔“ لیاقت کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔ ”تم بولا تھا کہ خدا کا وہ نیک بندہ ایک دن میں صرف دس آدمیوں سے ملتا ہے۔ جس کے پاس پرچی ہو۔“

”یہ سارا چکر ادھر کچھ لوگوں نے چلا رکھا ہے ورنہ دیوانہ تو زبان سے نہ بولتا ہے نہ آنکھیں کھول کر دیکھتا ہے، بس کبھی کبھی کسی سائل کا روتا دھونا سن کر اس کا گردن کبھی ہاں کہنے کیلئے اوپر نیچے حرکت کرتا، کبھی نہ بولنے کیلئے دائیں بائیں تھوڑا تھوڑا حرکت کرتا ہے۔“

”ہم اس بزرگ کا قدم پوی کیلئے ضرور اس کے ساتھ ایک ملاقات کرے گا۔“

بات کرتے ہوئے دونوں گھر کے قریب آ گئے رات زیادہ گزر چکی تھی، گل خان ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ لیاقت حسین نے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا، کمرے میں داخل ہوا تو فرحین بدستور جائے نماز پر بیٹھی، ہاتھ اٹھائے خدا کے سامنے اپنے سہاگ کی حفاظت کیلئے بڑی عاجزی سے دعائیں مانگ رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ سن کر اس نے شوہر کو دیکھا تو جلدی سے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھی اور تیزی سے دوڑ کر شوہر کی کشادہ بانہوں سے لپٹ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیاقت حسین کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”خدا کا ذات پر بھروسہ رکھو لیاقت کا جان جگر۔ وہ مبتب الاسباب بھی ہے اور مشکل کشا بھی۔ جو بندہ اس کی راہ میں تنگی کرے وہ اس سے کبھی منہ نہیں پھیرتا اور۔۔۔۔۔ مقدر کا لکھا بھی اٹل ہوتا ہے۔“

”تم اپنا فرحین کا ہاتھ باندھ کر رونے کا بھی ذکر نہیں کیا۔۔۔۔۔؟“ فرحین نے شکوہ کیا، بدستور شوہر کے کشادہ سینے پر سر رکھے سکتی رہی۔ لیاقت حسین نے اسے دوبارہ تسلی دینے کی کوشش کی تو جذباتی انداز میں بولی۔

”ایک بات ہمارا بھی سن لو۔۔۔۔۔ اگر خدا نہ کرے تم کو کچھ ہوا تو تمہارا فرحین بھی کچھ کھا کر جان دے دے گا۔“

”ایسا نہیں ہوگا دلبر۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے اسے گل خان کے ساتھ کسی بزرگ کے پاس جانے والی بات بتائی تو اس نے شوہر کا ہاتھ تھام کر اپنے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”تم کو اپنا فرحین کا زندگی کا واسطہ۔۔۔۔۔ اب بزرگ کے پاس جانے میں کوئی ہیر پھیر نہ کرتا۔“

”ہم زبان دیتا ہے میرا زندگی۔ ہم گل خان کے ساتھ ادھر ضرور جائے گا۔“ لیاقت حسین نے

خلوص دل سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات کا تم بھی یقین رکھو دلبر جان۔۔۔۔۔ بندہ جو کام اوپر والے کی رضا اور اس کا نام لے کر کرے اس میں کبھی گھٹانا نہیں ہوتا۔“

اس رات کھانا کھانے کے بعد جب دونوں سونے کیلئے لیٹے تو فرحین نے شادی کے بعد پہلی بار شوہر کو اس طرح اپنی بانہوں میں سمٹ کر لپٹا لیا جیسے زندگی کی آخری سانسوں تک ایک ہل کیلئے بھی اسے شوہر کی جدائی منظور نہ ہو۔

ڈی آئی جی (کرائمز) حافظ علیم احمد نہایت دیانتدار اور ایماندار آفیسر تھے۔ انہیں صرف علیم احمد کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس وقت وہ حسب معمول اپنے آفس میں ٹھیک آٹھ بجے داخل ہوئے جب وہ سکون سے بیٹھ گئے تو ان کے باوردی اردلی نے اندر آ کر کہا۔

”صاحب۔۔۔۔۔ ڈی ایس پی سراج صاحب نے آپ کو سلام بولا ہے۔“

”وہ کب آئے؟“

”آپ کے آنے سے پہلے ہی آ گئے تھے۔“ سپاہی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ انہیں اندر بھیج دو۔“

سپاہی سلام کر کے چلا گیا تو علیم احمد کے ہونٹوں پر ایک مخصوص مسکراہٹ ابھری۔ سراج براہ راست ان کا ماتحت نہیں تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ سراج بھی ایک کھرا غدر اور ایماندار پولیس آفیسر ہے جو اہم موقعوں پر صرف علیم احمد ہی سے مشورہ کرتا تھا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ علیم احمد نے ایک آدھ بار کوشش بھی کی تھی کہ سراج کو بھی شعبہ کرائمز میں اپنے پاس بلا لیں لیکن اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے افسران اور کچھ حکومتی ارکان کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ ایماندار پولیس افسران ایک جگہ اکٹھا ہوں اور ناجائز غیر قانونی کاموں کی راہ میں موثر رکاوٹیں پیدا کریں۔ چنانچہ علیم احمد نے زیادہ کوشش نہیں کی لیکن وہ محکمہ میں سراج کو اپنا دست راست ہی سمجھتے تھے خود سراج بھی انہیں معتبر سمجھتا تھا۔

سپاہی کے جانے کے بعد سراج نے آفس میں داخل ہو کر علیم احمد کو فوجی انداز میں سلوٹ کیا پھر ان کے اشارے پر میز کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ علیم احمد نے سراج سے گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل میز میں ایک طرف لگے اس سوئچ کو آن کر دیا جو آفس کے دروازے پر لگے سرخ بلب کو روشن کر دیتا تھا جس کا مطلب ہوتا تھا کہ جب تک سرخ بلیک جلیتی رہے کسی کو بھی اندر آنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ انتہائی ایمرضی کی صورت میں انٹرکام پر ڈی آئی جی سے رابطہ کیا جاسکتا تھا۔

”کیسے ہو سراج؟“ علیم احمد نے سراج کے بیٹھنے کے بعد بے تکلفی سے پوچھا۔ ”کیا پھر کوئی اہم معاملہ تمہیں میرے آفس تک لے آیا ہے؟“

”کچھ ایسی ہی بات ہے سر۔“ سراج نے ادب سے جواب دیا۔ ”میں آپ کے گھر بھی آسکتا تھا لیکن مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اب آپ کے گھر پر آنے جانے والوں کی فہرست بھی غلط طور پر۔۔۔۔۔“

”مجھے علم ہے.....“ علیم احمد نے بے پروائی سے کہا۔ ”اچھا کیا جو تم آفس آگئے۔“
کچھ دیر رسی گفتگو ہوتی رہی، پھر سراج نے تفصیل سے سیٹھ عثمان اور شیخ حامد کے واقعہ کو سنا ڈالا
گاڑی میں فٹ کئے جانے والے بم کی تفصیل بھی بتائی۔ شیخ حامد کے ساتھ جب سراج نے افضل
خان کا تذکرہ کیا تو علیم احمد کی کشادہ پیشانی پر شکنیں ابھرنے لگیں، سراج نے اپنی بات مکمل کی تو علیم
احمد نے کرسی پر کسماتے ہوئے سوال کیا۔

”افضل خان وہی تو نہیں جس کی فائل جان بوجھ کے سردخانے میں ڈلوادی گئی ہے۔ اس نے
کسی صوبائی منسٹر کے اشارے پر حسہ نامی کال گرل کیس میں کلیدی کردار ادا کیا تھا لیکن اونچی
سفارشوں پر دودھ کی مکھی کی طرح نکال لیا گیا تھا؟“

”نیں سر.....“ سراج نے پہلو بدل کر سنجیدگی سے کہا۔ ”شیخ حامد نے بھی اسی لئے اپنی فرم میں
اسے ایک اہم عہدہ دے رکھا ہے۔ سارے غلط کام افضل خان ہی سے لیتا ہے اسے بھی برسرِ اقتدار
حلقوں کی حمایت حاصل ہے۔“

”پھر..... تم نے کیا سوچا ہے؟“
”میں نے افضل خان کی فائل خفیہ طور پر سردخانے سے نکلوا کر ایک کاپی تیار کرائی ہے۔“
سراج نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے سیٹھ عثمان اور ان کی بیوی کو دو مہینے کیلئے ملک سے باہر
جانے پر آمادہ کر لیا تھا..... ان کے چلے جانے کے بعد میں کسی بھی موقع پر افضل خان اور شیخ حامد کو
اسی طرح ٹریپ کرنا چاہوں گا کہ انہیں میرے کلاس فیلو عثمان پر شبہ نہ ہو..... اور ان خطرناک اور
زہرے لے سانپوں کو بھی اس طرح پتارے میں بند کر لوں کہ وہ کبھی میرے آگے پھنکارنے کی جرأت نہ
کر سکیں۔“

”دریا میں رہ کر دو خطرناک مگر مچھوں سے ڈھنی مول لینا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔
میں جانتا ہوں کہ شیخ حامد کی پہنچ کہاں تک ہے اس کا ایک اشارہ خدا نہ کرے..... تمہیں ملازمت
سے برطرف بھی کرا سکتا ہے۔ پھر بھی تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”سر! مجھے آپ کی صرف اتنی مدد درکار ہے کہ کسی آڑے وقت میں آپ اس بات کی گواہی
دے سکیں کہ میں ان افسران میں سے نہیں ہوں جو رشوت کھا کر ایمان چھ دیتے ہیں۔“ سراج نے
مزید وضاحت کرنے کی خاطر مدہم آواز میں اپنا پورا پلان سنایا تو علیم احمد اٹھ کر دفتر میں ٹہلنے لگے
سراج کا سوچا ہوا پلان جتنا سودمند ہو سکتا تھا اس سے کہیں زیادہ خطرناک بھی تھا..... خاصی دیر تک
علیم احمد کی گہری سوچ میں مستغرق ٹھہرتے رہے، سراج پر امید نظروں سے ان کے چہرے کا جائزہ لیتا
رہا۔

خود سراج بھی بخوبی واقف تھا کہ اس کا سوچا ہوا منصوبہ کسی ایسے آتش زخیرے سے کم نہیں تھا
جس کو ایک معمولی سی آنچ بھی اس طرح دھماکے کی شکل میں تبدیل کر دینے کیلئے کافی ہے جس میں
سراج کی ساری کارکردگی اور اس کی وردی بھی جل بھن کر راکھ بن جاتی، اس کا نمایاں اس کے اپنے

گھروالوں کو بھی بھگتنا پڑتا۔ اس کی بنی بنائی شہرت اور عزت جسے اس نے برسوں میں کمایا تھا ایک
ہل میں جس نہس ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اندھیرے میں چلائی جانے والی کوئی گولی اس کے وجود
کو ہمیشہ کیلئے خاک میں ملا دے۔

دس منٹ کی طویل خاموشی کے بعد علیم احمد نے دوبارہ اپنی کرسی پر جھکے جھکے انداز میں بیٹھے
ہوئے ٹھوس لیجے میں کہا۔ ”سراج! میں تمہیں اپنا دست راست ہی نہیں بلکہ بہت عزیز بھی رکھتا
ہوں..... تم نے دو خطرناک مجرموں کیلئے جو سکیم بنائی ہے اس پر عمل کرنا بے حد خطرناک ہے لیکن میں
تمہیں خوف کی وجہ سے اپنے فرائض منصبی سے روکوں گا بھی نہیں۔ البتہ یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ
نہایت احتیاط اور دور اندیشی سے ایک ایک قدم بھونک کر اٹھانا..... جہاں جان جانے کا خطرہ ہو
وہاں اس غفور الرحیم نے بھی رعایت دے رکھی ہے۔ رہا سوال میری گواہی کا تو میں بزرگ کی حیثیت
سے بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں، علیم احمد کبھی پینہ دکھانے کی کوشش بھول کر بھی نہیں کرے گا۔“

سراج کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”سر! آپ کے وعدے کے بعد میرا عزم اور پختہ ہو گیا ہے۔“
”میری دعا میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔“ علیم احمد نے سراج کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے
ہوئے کہا۔ ”اپنا بہت خیال رکھنا۔ کبھی میری ضرورت پیش آئے تو تکلفی بھی نہ کرنا.....“

”شکریہ سر.....“ مجھے آپ سے اسی مشفقانہ جواب کی امید تھی..... سراج نے اٹھ کر ٹوپی پہنتے
ہوئے پھر ایک بار انٹیشن پوزیشن میں سیٹ کیا۔ پھر آگے بڑھ کر رخصتی مصافحہ کیا اور تیزی سے گھوم
کر کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

علیم احمد پھر کسی سوچ میں گم ہو گئے.....!!



افضل خان نے جن حالات میں جرم کو اپنایا تھا وہ بھی ایک علیحدہ کہانی ہے۔ کتنی حالات نے
اسے ایک جرم کو چھپانے کی خاطر قاتل بنا دیا تھا۔ پھر وہ رفتہ رفتہ جرم کی دلدل میں اس طرح ڈوب
گیا کہ اب اس کی واپسی ناممکن تھی۔ اگر وہ بالفرض اپنے جرائم قبول کر لیتا تو پھانسی پھنی تھی، وہ مرنا
نہیں چاہتا تھا اس لئے اسے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے باحیثیت لوگوں کا سہارا بھی ملا
اور کسی نئے جرم کی بھاری قیمتیں بھی ملیں لیکن یہ عارضی سہارے ثابت ہوئے تھے جو اپنا کام نکلوانے
کے بعد اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے۔ افضل خان کو سہارا دینے والے خود مجرمانہ ذہنیت کے مالک
تھے۔ خود سامنے نہیں آنا چاہتے تھے اس لئے اپنی ضرورت پوری کرنے کی خاطر عارضی طور پر افضل
خان کو اپنی حمایت کا یقین دلا کر کوئی بھی جرم کرا لیتے۔

چوری، ڈکیتی، اغوا، کالے دھندے کی خاطر ہیر دکن اور ادھر سے ادھر کرتا، قتل و غارت گری،
سرہازار کسی دشمن کی پگڑی اچھا ل دینا، کسی باعصمت کی آبروریزی کر کے اس کی فلم بنانا، پھر اسے
باری کے اشارے پر پناہنے پر مجبور کر دینا..... اور بھی بہت سارے کام ایسے تھے جو قانونی اعتبار سے
مکین نوعیت کے تھے جو افضل خان کی گناہ آلود زندگی کی طویل فہرست میں اضافہ کرتے رہے۔ تین

شیخ حامد کے جیلے کی گہرائی افضل خان بھی سمجھ رہا تھا لیکن وقت اور حالات نے اسے کسی پالتو کتے کی طرح مالک کے سامنے دم ہلانے پر مجبور کر دیا تھا، ایسی پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ پلٹ کر کوئی جواب دیتا، پھر بھی دل پر جبر کر کے حالات کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے بڑی عاجزی سے بولا۔
”میں آپ کو ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ بھی آپ کے کسی حکم سے سر تابی کی غلطی نہیں کروں گا۔“

”حسنہ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ شیخ حامد نے اچانک ایک اونچے کلب کی ڈانسر اور کال گرل کا نام لیا تو افضل خان چونکا۔ ایک ہفتے قبل ہی اس نے حسنہ کو گھر واپس جاتے وقت راستے سے اٹھا لیا تھا، حسنہ نے اس کی جسارت کو وقتی طور پر ہنس کر برداشت کر لیا تھا۔ اس رات وہ پورے تن من دھن سے افضل خان کی ہر ناجائز خوشی میں برابر کی شریک رہی۔ صبح لباس پہننے کے بعد اس نے جاتے وقت افضل خان سے بڑی لگاؤ سے کہا تھا۔ ”تم نے بلاوجہ راستے سے مجھے اغوا کرنے کی زحمت کی۔ ایک اشارہ کر دیتے تو میں خود تمہاری مضبوط بانہوں میں گھٹی چلی آتی۔“

”سچ کہہ رہی ہو.....؟“ افضل خان جو اس وقت پوری طرح نشتے میں تھا لہرا کر کہا۔ ”کلب میں تو تم نے بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا۔“

”تم بھول رہے ہو افضل خان۔“ حسنہ تو بہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔ ”ایسے معاملات میں عورت خود پہل نہیں کرتی۔ مرد کی طرف اشارے کی منتظر رہتی ہے۔“

افضل خان حسنہ کی تو بہ شکن انگڑائی کا اسیر ہو گیا، اس نے ہاتھ بڑھا کر حسنہ کو پھر اپنے سینے سے لگا لیا۔ حسنہ نے کوئی مزاحمت بھی نہیں کی۔ اس کے بعد ایک دو بار خود حسنہ افضل خان کو کلب سے واپسی پر ہاتھ تھام کر اپنے خوبصورت قلبیت میں لے گئی تو افضل خان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ حسنہ ایک تروتازہ پھول تھی، جس کی مہک کلب کے علاوہ بھی دور دور تک پھیل رہی تھی۔ وہ گداز جسم کی مالک ہونے کے علاوہ بے حد حسین بھی تھی، عمر بھی بیس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اپنی شوخ اور چلبلی حرکتوں، پہنا دوں اور رکھ رکھاؤ سے اٹھارہ سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ افضل خان جانتا تھا کہ حسنہ جس سڑک سے گزرتی تھی، ادھر کوئی بھی ٹھنڈی آہ بھرنے سے باز نہیں آتا تھا، اس کے گاہک بیٹھا رہتے لیکن وہ ہر ایک سے تعلقات بڑھانے میں خاصی محتاط واقع ہوئی تھی، جس طرح وہ افضل خان کو دو بار خود سے گھر لے گئی، وہ افضل خان کیلئے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔ حسنہ نے بغیر کسی مول تول کے جس طرح دل کھول کر نوازا تھا، اس کا ایک ایک لمحہ یادگار تھا۔ شراب اور کباب کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ حسنہ نے اسے نئے نئے انداز سے اپنے جسم کے ایک ایک نشیب و فراز سے دل کھول کر سیراب کیا تھا۔

اس وقت شیخ حامد نے اچانک حسنہ کا ذکر کیا تو وہ بس ایک لمحے کو چونکا، پھر مسکرا دیا، اسے علم تھا کہ شیخ حامد بھی اونچے حلقوں میں خاصا صاحب ذوق مشہور تھا، ممکن ہے حسنہ پر بھی اس کی رال ٹپک رہی ہو..... پھر بھی ذرا محتاط انداز میں کہا۔

”وہ ایک اونچے کلب کی ڈانسر ہے جہاں چھوٹے موٹے آدمی قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔ میں

چار بار پکڑا بھی گیا، دو بار جیل بھی گیا جہاں مجرموں، بد معاشوں، پیشہ ور قاتلوں اور جرائم پیشہ افراد کے درمیان رہ کر اس کی مجرمانہ زندگی کو نئی تربیت بھی ملتی رہی۔ اکثر پارٹی اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سزا کی مدت سے پہلے ہی اسے جیل سے باہر نکال دیتے تھے لیکن اس کے باوجود حالات نے افضل خان کو پوری طرح قانون کی نظروں میں اس کے تمام کرتوتوں کے سبب بالکل تنگ کر دیا تھا۔ بار بار تھانے میں حاضری، سنتری اور افسران کی مغلظات سننی پڑتیں تو وہ اندر ہی اندر کھول اٹھتا، مگر مجرم تھا، اس کے جرائم کی تفصیل طویل پکڑ گئی تھی۔ بالآخر کسی مضبوط سہارے کی تلاش کرتے کرتے وہ کسی طرح شیخ حامد تک پہنچ گیا جہاں کچھ اہم شرائط کے بعد اسے تحفظ مل گیا، جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔ اپنی مجرمانہ صلاحیتوں کے بدولت اس نے ترقی بھی کی لیکن ہر ترقی کے پیچھے ایک نئے جرم کا اضافہ بھی ہوتا رہا۔

شیخ حامد تالاب کی بڑی مچھلی تھی، اس کے تعلق اقتداری طبقوں میں بہت اوپر تک تھے۔ اس نے تازہ لیا تھا کہ افضل خان اس کے کام کا آدمی ہے۔ غلط کام کرانے کے بعد اس نے افضل خان کو محض اس لئے بڑی چالاکی سے ”بزنس منیجر“ کی کرسی سوئپ دی تاکہ اگر ذمہ داری اس کی فرم پر آئے تو وہ سارا کچرا افضل خان کے کاندھوں پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جائے لیکن افضل خان کو بڑا عہدہ دینے سے پیشتر اس نے ایک مرکز کے بہت اعلیٰ عہدیدار کے ذریعے افضل خان کی تمام جرائم کی فائلیں سردخانے میں ڈلوادی تھیں۔ جہاں مرکزی حکومت کا بڑا عہدیدار سامنے آجائے تو آئی جی کو بھی آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں۔ فائل سردخانے میں داخل دفتر ہو جانے کے بعد ایک روز شیخ حامد نے اسے اپنے خاص سائونڈ پروف کمرے میں بلایا۔ جسے وہ خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتا تھا۔ افضل خان کو بلا کر اس نے کھل کر کہا۔ ”افضل خان، میں نے تمہارے سارے خطرات دور کر دیئے ہیں۔ اب تمہیں تمہاری جرائم کی فائلیں سردخانے میں جمع ہو جانے کے بعد روز روز تھانوں میں جا کر جی حضوری نہیں کرنی پڑے گی۔“

”میں آپ کا یہ احسان تمام زندگی نہیں بھولوں گا۔“ افضل خان نے شکریہ ادا کیا تو شیخ حامد کے ہونٹوں پر بڑا ہر پلا تسم ابھرا۔

”خالی شکریے سے کام نہیں چلے گا افضل خان۔ ایک بات گرہ سے باندھ لو، میں تمہاری ساری فائلیں بند کر اسکتا ہوں تو ایک اشارے پر وہ دوبارہ زندہ بھی ہو سکتی ہیں، اس بات کو کبھی نہ بھولنا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں جناب.....“

”آج میں تمہیں ایک عزت اور بخش رہا ہوں۔ شیخ حامد نے نیا جال پھینکا۔ ”تمہیں میں اپنا بزنس منیجر بنا رہا ہوں۔“

”سر.....“ افضل خان نے بڑے اعتماد سے اسے اپنی وفاداری اور خدمات کا یقین دلایا۔

”آپ مجھے جو عزت دے رہے ہیں اس کے عوض میں آپ کے کسی بھی حکم سے انکار نہیں کروں گا۔“

”مجھے یقین ہے تم ایسی حماقت کبھی بھول کر بھی نہیں کرو گے۔“

ای ایس بی سراج نے خلاف توقع اسے دیکھ کر ہاتھ ملایا تھا؟ فوری طور پر سپاہی
لہ لہ مارتے ہوئے آ رہا تھا۔ افضل خان کو احساس ہوا کہ اب وہ جس شخص کے ساتھ اور
اس جہت پہ پہلا تھا اس سے شاید سراج بھی یقینی مرعوب ہوا ہوگا۔ افضل خان کرسی پر کچھ اور چڑھا

”جی..... میں سمجھا نہیں۔“ افضل خان نے بمشکل تھوک گل کر سوال کیا۔
 ”جو خوبصورت ناگن تم کو بلیک میل کر سکتی ہے وہ دوسروں کو بھی کر سکتی ہے..... کیا سمجھے.....؟“
 ”کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں سر.....“

ہو کر بیٹھ گیا۔ سراج نے مسکرا کر کہا۔

”کیسے ہوا افضل خان؟ سنا ہے اب تو تم شیخ حامد کے بزنس منیجر بھی بن گئے ہو.....“

”سب اوپر والے کی مہربانی اور آپ جیسے افسروں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

افضل خان کے لہجے میں جو طعنت تھی اسے سراج نے بھی محسوس کر لیا، لیکن ضبط سے کام لیتا ہوا معنی خیز انداز میں بولا۔ ”تمہاری اپنی کارکردگی کو بھی اتنی اہم کرسی تک پہنچانے میں کچھ نہ کچھ دخل تو ضرور ہوگا۔“

چائے آگئی تو ادھر ادھر کی بات ہوتی رہی۔ سپاہی جب خالی پیالیاں لے گیا تو افضل خان نے اپنی قیمتی وقتی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بڑے عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ ”آج آپ کو خاکسار کی یاد کس طرح آگئی؟“

”ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے افضل خان۔“ سراج نے قدرے سنبھل کر کہا۔ ”ایک دیے سے اور بھی کئی دیے روشن کئے جاسکتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں..... اس وقت کسی ایجاد کی ماں اور دیے سے دیا روشن کرنے والی بات درمیان میں کہاں سے آگئی؟“

”تم زیادہ جلدی میں تو نہیں ہو.....؟“

”ہوں تو سہی لیکن پھر بھی آپ کی خاطر پندرہ بیس منٹ نکال سکتا ہوں۔“

”تھینکس.....“ سراج نے افضل خان کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر قدرے رازداری سے پوچھا۔ ”جس بیٹے دریا سے تم ہاتھ دھو رہے ہو کیا اس میں میرے لئے بھی کوئی منجائش نکل سکتی ہے۔“

”آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے.....؟“ افضل کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”کیا شیخ صاحب کا نام درمیان میں لانا ضروری ہوگا؟“

”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“

”یوں سمجھ لو کہ ایک ضرورت آپڑی ہے جس کا میری ایمانداری اور تنخواہ سے پورا ہونا ممکن نہیں۔“ سراج نے سنجیدگی سے..... مگر مدہم آواز میں کہا۔ ”تم چاہو تو ہمارے اور شیخ صاحب کے درمیان رابطے کا کام انجام دے سکتے ہو۔“

”اوہ..... آئی سی۔“ افضل خان نے سکون کا سانس لیا، پھر بڑی فراخ دلی سے پوچھا۔ ”ضرورت کتنی کی ہے.....؟“

”اس کا ذکر اگر میں صرف شیخ صاحب سے کرنا چاہوں تو.....؟“

”شیخ حامد صاحب کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہوتا ہے مسٹر سراج۔“ افضل خان نے اٹھتے ہوئے بڑی شان سے کہا۔ ”پھر بھی..... میں کوشش کروں گا کہ کسی وقت موقع دیکھ کر آپ کا ذکر شیخ صاحب کے کانوں میں ڈال دوں لیکن.....“

”سوچ لو افضل خان۔“ سراج نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر خالص پولیس والوں کے انداز میں کہا۔ ”حسنہ یاد ہے، تمہیں..... اس کا ایک پرانا عاشق جان پھیلی پر رکھ کر سامنے آگیا ہے..... وہ حسنہ کے کیس کو دوبارہ زندہ کرنے کی خاطر دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔“

”آپ اس کو خاموش کرنے کی خاطر سودا کرنا چاہتے ہیں۔“ افضل خان نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”لیکن..... آپ تو ہمیشہ سے بہت ایماندار افسروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔“

”میں نے ابھی تم سے اسی لئے کہا تھا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔“ سراج نے جملہ عمل کر کے بے زاری کا اظہار کیا۔ ”بہر حال تمہارے پاس اگر وقت کم ہے تو تم جاسکتے ہو۔“

افضل خان نے بہت غور سے سراج کے رویے میں تبدیلی محسوس کی تو دوبارہ بیٹھ گیا۔ حسنہ والی بات سے شیخ صاحب کا کیا تعلق؟ میرا مطلب..... اگر یہی سوال انہوں نے مجھ سے کیا تو میں کیا جواب دے گا؟

”میں لی ایمل صرف اتنا اشارہ دے سکتا ہوں کہ مرکزی حکومت کے جس اعلیٰ عہدیدار نے فائل پر عمل لے لیا، اصل راولی فی صی وہ آج کل کتاب میں ہے اس کا علم شیخ صاحب کو بھی ضرور ہوگا۔ تم بھی جاننے والے ہو۔ پولیس کو ملنے والی کار سے کچھ کارآمد کاغذات ملے تھے اس میں ایک پر تمہارا نام بھی درج تھا۔“ سراج نے افضل خان کو پہلی بار تیز نظروں سے دیکھا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم کو بھی علم ہوگا کہ وہ فائل کس کی سلاش پر بند کی گئی تھی۔ کون کون لوگ کیس فائل کو سرد خانے میں ڈالنے کے سلسلے میں دلچسپی لے رہے تھے۔“

”لیکن شیخ صاحب کا بھلا ان باتوں سے.....“

”تم اب جاسکتے ہو افضل خان۔“ سراج نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں اپنی ضرورت پوری کرنے کی خاطر کوئی اور راستہ تلاش کر لوں گا۔“

”آپ تو خفا ہو گئے مسٹر سراج۔“ افضل خان نے سراج کو تہور بھانپ کر چمکتے ہوئے کہا۔ ”شیخ صاحب مصروف آدمی ہیں آپ کی اور ان کی ملاقات ملے کرانے میں کچھ وقت تو لگے گا۔“

”ٹھیک ہے..... میں تمہیں ایک ہفتہ دیتا ہوں اس کے بعد شاید مجھے یہ احساس دوبارہ ہو جائے گا کہ ایمان کو ایک چھوٹی سی ضرورت کی خاطر فروخت کر دینا مردانگی نہیں..... بزدلی ہے میں نے تمہیں جو زحمت دی ہے اسے تم بھی بھول جانا، کسی اور سے اس کا ذکر بھی نہ کرنا۔“

افضل خان نے کچھ جواب دینے کی کوشش کی، پھر ارادہ ترک کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ سراج سے رخصتی مصافحہ کرتے وقت افضل خان کو اس کی سرد مہری کا اندازہ بخوبی ہو گیا تھا۔



حسب وعدہ دو روز بعد گل خان لیاقت حسین کو منگھو پیر لے گیا۔

راستے میں گل خان ایک بار پھر لیاقت کو باور کرانے لگا کہ اس نے سفلے کے عمل کو چھیڑ کر اشدنی کا ثبوت نہیں دیا، لیاقت حسین ہوں ہاں کر کے اپنے دوست کو ٹالتا رہا، اسے پختہ یقین تھا کہ

اس نے جو کچھ کیا اس میں صرف کسی کیلئے خیر کا ثبوت پہلو تھا۔ اس لئے وہ ہر بلا سے محفوظ رہے گا۔ شہر سے نکل کر وہ مضافاتی علاقے میں داخل ہوئے تو لیاقت حسین نے حیرت سے کہا۔
”یار یہ کیسا شہر ہے تمہارا، ادھر گاؤں اور بستیاں بھی نظر آتی ہیں۔“

جواب میں گل خان مسکرا کر بولا۔ ”یہ شہر کا مضافاتی علاقہ ہے جہاں تم ہم جیسے غریب لوگوں نے چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد کر رکھی ہیں۔ یہ بھی قدرت کا کھیل ہے اور مجھے بہت سارے علاقے ایسے ہیں جو اپنے ہی شہر کی طرح ہیں۔“

”تم نے بزرگ صاحب سے ملنے کیلئے ہمارے لئے کوئی نمبر لیا یا نہیں؟“ لیاقت حسین کو یاد آگیا کہ جن لوگوں نے پہنچے ہوئے بزرگ کیلئے چھولداریاں ڈالی تھیں۔ انہوں نے وہاں اپنی ٹھیکیداری جمع رکھی تھی۔ دس بندے روزانہ اور اندر چھوڑنے کی شرط بھی انہوں نے عائد کی تھی۔ بزرگ نے تو کبھی آنکھ کھول کر نہیں دیکھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟ سوائے تسبیح کے دانوں پر دل ہی دل میں کچھ پڑھتے رہنے کے سوا انہیں اور کسی بات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

”سچے اور کھرے اللہ والوں کی پہچان بھی یہی ہے کہ وہ دنیا سے سارا رشتہ ناتا ختم کر کے صرف خدا سے لو لگا لیتے ہیں، پھر پلٹ کر دنیا کی طرف نہیں دیکھتے۔“ لیاقت حسین کے لہجے میں عقیدت تھی۔ ”گاؤں میں مولوی صاحب بھی یہی بولتا تھا۔“

”ایک بات بولو لیاقت؟“ گل خان نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”اب تم کراچی آگیا ہے تو اپنا پٹھانی اردو بھی ٹھیک کر لو۔“

”مجھ گیا تیرا..... تیری بات۔“ لیاقت حسین نے ہنس کر جواب دیا۔ ”وقت اور حالات سب کچھ سکھا دیتے ہیں۔ ادھر سے تمہارا..... تمہارے کراچی کا کوئی بندہ اپنے علاقے میں چلا گیا تو وہ بھی ایک دم سے..... پانچ راغلے اور دل تا کین (آپ خیریت سے ہیں؟ یہاں تعریف رکھیے) نہیں بول سکتا۔“

دونوں اسی قسم کی دلچسپ باتیں کرتے مطلوبہ جگہ کے قریب رکشے سے اتر گئے۔ گل خان کے علاوہ لیاقت کے ذہن میں بھی ایک سوال ابھرا تھا کہ چھولداری کے ارد گرد مردوں اور عورتوں کا جو جھوم تھا اس میں کیا وہ اس بزرگ تک پہنچ بھی سکیں گے؟ جو دنیا سے بے خبر اپنی عبادت میں غرق رہتے تھے۔ ”اب آگئے ہیں تو دل چھوٹا نہ کر میرے دوست۔“ گل خان نے شاید لیاقت حسین کے چہرے پر رقم سوال کو پڑھ لیا تھا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اوپر والا ایسا کوئی راستہ پیدا کر دے کہ ہم بزرگ کے قدموں تک پہنچ جائیں۔“

وہ دونوں جھوم کے اندر داخل ہو کر اس چھولداری کی طرف بڑھنے لگے جہاں عقیدت مندوں کے درمیان کشمکش ہو رہی تھی، بیس پچیس منٹ کی دھکم پیل کے بعد وہ چھولداری سے دس پندرہ قدم کے فاصلے تک پہنچ گئے، لیاقت حسین دیکھ رہا تھا کہ جو آدمی بھی زور زبردستی کر کے چھولداری کے گیٹ کے قریب جاتا تھا اسے منت سماجت کے باوجود ایک ہی جواب ملتا تھا..... ”ایک دن میں پچاس نمبر

نمبر کے بعد دیئے جاتے ہیں جو پانچ دن کیلئے بہت ہوتے ہیں۔ ایک دن میں صرف دس آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت ہے، بغیر پرچی کے کسی کو اندر نہیں جانے دیا جاتا۔“

چھولداری کے دروازے پر موجود دس بارہ بٹے کئے لوگ جو بظاہر فقیری لباس میں نظر آ رہے تھے، ہر آگے پہنچنے والے کو ایک ہی جواب دے کر جھوم کی طرف واپس دھکیل دیتے تھے۔ گل خان اس صورتحال کو دیکھ کر مایوس ہونے لگا، لیکن ایک لگن، ایک جذبہ تھا جو لیاقت حسین نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کر کے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ اچھی خاصی زور زبردستی کرنے کے بعد جب وہ دروازے کے قریب گیا تو ایک بٹے کئے فقیر نما چوکیدار نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر روکتے ہوئے کہا۔

”خدا کو مانو خاں صاحب، کیا تم لوگوں کو ہماری زبان سمجھ نہیں آتی..... ایک بار بول دیا کہ ایک دن میں صرف دس آدمی..... وہ بھی جس کے پاس پرچی ہو۔“

لیاقت حسین دل گرفتہ ہو گیا۔ دھکے کھاتا ہوا پھر جھوم سے باہر آ گیا۔
”مجھے افسوس ہے دوست لیکن تم فکر مت کرو میں کل فجر کا نماز بھی ادھر پڑھوں گا اور پرچی بھی حاصل کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ لیاقت حسین نے دور سے ایک بار پھر چھولداری کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”میرا دل بھی یہی بولتا ہے کہ اندر جو بھی ہے وہ اللہ کا کوئی پہنچا ہوا بندہ ضرور ہے..... ورنہ اتنا جھوم بھی نہ ہوتا.....“

دونوں باتیں کرتے ہوئے کسی رکشے یا ٹیکسی کی تلاش میں بیٹھے تھے کہ ایک ہاتھ پشت سے آ کر لیاقت حسین کے بائیں کندھے پر ٹھم سا گیا۔ لیاقت حسین نے تیزی سے پلٹ کر اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر سفید ریش ناپیتا تھا۔ شاید اس نے ہاتھ کسی کے کاندھے پر رکھ کر اس سے راہ دکھانے کی درخواست کرنی چاہی تھی۔

”آپ کو کدھر جانا ہے بابا؟.....“ لیاقت حسین نے بڑی انکساری سے دریافت کیا۔
”مجھے اس مہذب سے ملنا ہے جو ادھر ایک عرصے سے ڈیرا جمائے بیٹھا ہے۔“ بوڑھے نے مدھم مدھم آواز میں درخواست کی۔ ”مجھے اس کے پاس لے چلو۔“

”ہاں ہاں، کیا نمبر؟“ لیاقت حسین نے عجب انداز میں کہا۔ ”اللہ سے قرب حاصل کر لے، اللہ انسان کا اپنا دل سب سے اہم پرچی ہے، جس نے اسے حاصل کر لیا پھر وہ جنت کا حقدار ہو جاتا ہے۔ سرکارِ دو عالم کا دیدار ہو جاتا ہے اسے۔“

”سبحان اللہ۔“ لیاقت حسین نے عقیدت کا اظہار کیا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”ادھر کا دستور دوسرا ہے بابا..... بغیر پرچی کے.....“

”بیٹا، تم مجھے دروازے تک لے چلو۔“ بوڑھے نے درخواست کی۔ ”ہو سکتا ہے کہ میری بچی نیت کسی کام آجائے اور تم بھی اسی بہانے اس سے مل لو جو نہ جانے یہاں کس ارادے سے۔ کس کے

انتظار میں دھوئی رہا ہے بیٹھا ہے؟“

ناپیتا کی درخواست میں کچھ ایسا اثر تھا کہ لیاقت حسین اس کی درخواست رو نہ کر سکا۔ اس نے پلٹ کر گل خان کو بھی ساتھ لیتا چاہا لیکن وہ شاید ناپیتا کو دیکھے کے بغیر سواری کی تلاش میں آگے نکل گیا تھا۔

”کیا تم کو میری مدد منظور نہیں ہے؟“ ناپیتا نے اس کے کندھوں پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بات نہیں ہے بابا..... وہ میرا ساتھی ادھر ساتھ تھا وہ نظر نہیں آ رہا۔“

”جو کچھ نظر آتا ہے وہ بھی سب دھوکہ اور فریب ہے..... ساتھی بہت مل جاتے ہیں لیکن خدا کے بندے بار بار نہیں ملتے۔“

”چلو بابا..... میں تم کو چھو لداری کے دروازے تک ضرور پہنچا دوں گا“ اس کے بعد تمہارا قسمت۔“

”قسمت کا حال بھی وہی اوپر والا جانتا ہے.....“ ناپیتا نے جواب دیا۔ پھر لیاقت کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ”مقدر کے فیصلے بھی اہل ہوتے ہیں میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں اس سے زیادہ جاننے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔“

بزرگ کی باتوں نے لیاقت حسین کو اس کی ہر ممکن مدد کرنے پر صدق دل سے آمادہ کر دیا۔ وہ پلٹ کر ہجوم کے درمیان جگہ بناتا چھو لداری کی طرف بڑھنے لگا۔ اس بار اسے زیادہ دھواری نہیں ہوئی۔ بوڑھے ناپیتا کے خیال سے اسے آگے بڑھنے کا راستہ ملنے لگا۔ بٹنے کئے فقیر نما چوکیدار اور اس کے درمیان جب فاصلہ کم ہونے لگا تو ناپیتا سفید ریش بوڑھے نے دبی زبان میں کہا۔

”کسی سے کچھ سوال کرنے کی کوشش مت کرنا“ سیدھے قدم اٹھاتے رہو میرا دل کہتا ہے کہ کوئی مجھ بوڑھے ناپیتا کو روکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ آگے اللہ کی مرضی۔“

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر پہلے وہ بھی قسمت آزمایا چکا تھا لیکن دروازے تک پہنچ کر اس کا اور گل خان کا راستہ روک لیا گیا تھا لیکن اس نے ناپیتا کے کہنے کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔ بٹے کئے آدمیوں کے قریب پہنچ کر بھی اس نے کوئی بات نہیں کی۔ آہستہ آہستہ دھڑکتے دل سے ایک ایک قدم اٹھاتا رہا پھر..... اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی..... وہ ناپیتا کے ساتھ سب کے درمیان سے گزرتا اندر چھوٹی چھو لداری تک پہنچ گیا جس کے اندر گل خان کے کہنے کے مطابق اللہ کا کوئی نیک اور برگزیدہ دیوانہ بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باہر چوکیداروں کی نظروں میں آئے بغیر وہ چھوٹی چھو لداری تک کس طرح پہنچ گیا؟ کسی نے روکنا تو درکنار ان دونوں کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ دیکھا بھی ہوگا تو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ ”لیکن کیوں؟ کیا ان کی آنکھوں کے آگے کوئی پردہ تان دیا گیا تھا؟“

”کیا ہوا..... تم رک کیوں گئے؟“ ناپیتا نے سوال کیا۔

”ہم اس چھوٹی چھو لداری تک پہنچ گئے جس میں بزرگ کا ڈیرا ہے۔“

”یقیناً وہی مسبب الاسباب ہے۔“ ناپیتا نے بڑی عقیدت سے کہا۔ پھر بولا۔ ”جب تم نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا تو پہلے تم اندر جا کر اس کا دیدار کر لو جس کی کشش ہمیں یہاں تک پہنچ لائی تھی۔“

”نہیں بابا..... تم نہ ہوتے تو میں شاید یہاں تک بھی نہ پہنچ سکتا“ پہلا حق تمہارا ہے۔“

”مذمت کرو..... تم اندر جاؤ“ میں بعد میں جاؤں گا۔“ ناپیتا اپنا جملہ مکمل کر کے زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تو لیاقت حسین نے اس کی خدمت کے آگے سر جھکا دیا۔ قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا تو اس کی نظروں نے بھی وہی دیکھا جو گل خان نے بتایا تھا۔ دیوانہ سر جھکائے بیچ کے دانوں پر انگلیاں کھانے میں اتنا مستغرق تھا جیسے اور کسی کام سے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ لیاقت حسین نے احتراماً کھٹنے کے بل خود کو فرش پر ٹکا لیا۔ اس کی نظریں بڑی عقیدت سے بزرگ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے بڑی انکساری سے مدھم لہجے میں دیوانے کو مخاطب کیا۔ ”میں بہت مشکل سے آپ کے قدموں تک پہنچا ہوں“ میرے حق میں کچھ دعا کر دیں۔“

جواب میں بزرگ کے جسم کو ذرا سی حرکت ہوئی، پھر اس نے ”ہاں“ کہنے کے انداز میں سر کو معمولی سی جنبش دی۔ لیاقت حسین سرشار ہو گیا۔ گل خان نے یہی بتایا تھا کہ دیوانہ جب اثبات میں سر کو جنبش دے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے اس کے پاس جانے والا سائل اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ”میرے حق میں کوئی دعا کر دو پیر و مرشد.....“ لیاقت حسین نے انکساری سے دعا کی درخواست کی تو دیوانے کے جسم میں ایک کپکپاہٹ سی ہوئی۔ اس کی انگلیوں کی گردش بیچ کے دانوں پر تیز ہو گئیں۔ وہ بدستور نظریں بند کئے بیٹھا رہا لیکن لیاقت حسین نے اچانک دیوانے کے دوسرے ہاتھ کو آہستہ آہستہ جنبش میں آتے دیکھا، اس نے لرزے ہاتھوں سے ایک چنگی مٹی زمین سے اٹھائی پھر اسے ہاتھ بلند کر کے لیاقت حسین کی طرف کر دیا۔

لیاقت حسین پر جیسے شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے بعد کسی غیر مرئی قوت نے اسے گھٹنوں ہی کے بل آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا، جیسے جیسے دیوانے کے قریب ہوتا گیا، اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہونے لگیں، وہ دیوانے کے قریب پہنچ کر رک گیا، غیر ارادی طور پر اس کے دل سے ایک التجا ابھر کر اس کی زبان تک آ گئی۔

”پیر و مرشد..... میں منہ کھول رہا ہوں“ تم اپنے متبرک ہاتھوں سے یہ مٹی بھی میرے منہ میں ڈال دو یہ بھی کرم ہوگا۔“

اس کے بعد وہی ہوا جو لیاقت حسین کے دل کی آواز تھی مٹی کی چنگی اس کے منہ میں ڈال کر دیوانے کا ہاتھ پھر اس کے گھٹنے پر جا کر ساکت ہو گیا۔ لیاقت حسین کو وہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ ایک انجانی سی مسرت کی لہر اس کے وجود میں سنسنے لگی، اس کا دل وہاں سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن بوڑھے ناپیتا کا خیال آیا تو وہ پیچھے کھسکتا ہوا اٹھا پھر..... چھو لداری کے باہر آ گیا جہاں وہ ناپیتا زمین پر بڑے سکون سے بیٹھا تھا۔

”بابا..... تمہاری مہربانی جو مجھے دیوانے کے دیدار نصیب ہو گئے۔ اب تم اندر جاؤ۔“
 ”ابھی نہیں.....“ ناپیتا نے جواب دیا۔ ”اب یہاں تک تم نے میری مدد کی ہے تو میں بھی مل ہی لوں گا لیکن..... تم اب واپس پلٹ جاؤ۔ واپسی میں بھی کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔“
 ”میں چلا گیا تو تم.....“

”ساعتیں گزر جائیں تو پھر پلٹ کر واپس نہیں آتیں، تم میری بات پر عمل کرو۔ ایک بات اور غور سے سن لو اندر جو کچھ ہوا تم اس کا ذکر کبھی..... کسی کے سامنے زبان تک نہ لانا..... دیوانوں کی طرف سے بھی کچھ مصلحتیں منجانب اللہ ہوتی ہیں۔ اب واپس لوٹ جاؤ۔“

لیاقت حسین نے ناپیتا کی بات غور سے سنی۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ ناپیتا بھی اللہ کا کوئی نیک بندہ ہی تھا جو اس کی مدد کیلئے مقرر کیا گیا تھا، اس کے دل نے اس کے خیال کی تصدیق کی تو وہ رکا نہیں خاموشی سے قدم اٹھاتا باہر آ گیا۔ اسے پھر تعجب ہوا کہ کسی نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ مجمع سے گزر کر وہ باہر نکلا تو سامنے گل خان حیران پریشان کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ ”تم..... کدھر چلا گیا تھا؟“ اس نے لیاقت حسین کو دیکھ کر سوال کیا۔

”میں بھی تم کو تلاش کرنے کیلئے ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔“ لیاقت حسین نے ناپیتا بوڑھے کی بات پر عمل کرتے ہوئے اصل بات زبان تک لانے سے گریز کیا۔ ”ادھر اتنا بھیڑ ہے کہ انسان چکرا کر رہ جاتا ہے۔“

”میں تو سوچ رہا تھا کہ کہیں تم واپس تو نہیں چلے گئے؟“
 ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے گل خان؟“ لیاقت حسین نے بڑے پیار بھرے انداز میں جواب دیا پھر گل خان کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا تو اتفاق سے ایک رکشا بھی خالی مل گیا۔

واپسی میں بھی دونوں کے درمیان باتیں ہوتی رہیں، لیکن لیاقت حسین کے ذہن میں بار بار اسی ناپیتا بوڑھے کا خیال ابھر رہا تھا جو شاید اللہ کے حکم پر ہی اس کیلئے فرستہ بن کر آ گیا تھا، اسی کی بدولت وہ دیوانے تک بھی پہنچ گیا اور اس کے ہاتھ سے مٹی کی ایک چنگی بھی کھالی۔ اس نے چلتے وقت لیاقت حسین سے زبان بند رکھنے کی تاکید کی تھی اس میں بھی یقیناً لیاقت حسین کی بھلائی کا کوئی پہلو ضرور ہوگا۔

لیاقت حسین نے دل میں پختہ عہد کر لیا کہ وہ کبھی بھول کر بھی ناپیتا بوڑھے یا دیوانے سے ملاقات کا کوئی ذکر کسی کے سامنے بھی زبان تک آنے دے گا..... دیوانے سے مل لینے کے بعد اس کے وجود کے اندر ایک انجانی مسرت کا احساس بھی ٹھانٹیں مار رہا تھا۔



افضل خان کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کہ سراج کے دفتر میں اپنی طلبی کو آسانی سے فراموش کر دیتا، اس کے ظاہر اور باطن میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ حامد ایسوی ایش کے بزنس نیچر کی صورت میں بظاہر وہ شاندار گاڑیوں میں سوٹ بوٹ پہن کر بڑے بڑے لوگوں سے کاروباری

تعلقات کے معاملات طے کرتا تھا۔ ایک پوش علاقے میں ذی حیثیت افراد کے درمیان رہتا تھا لیکن یہ سب محض دکھاوا تھا۔ اس کا اصل کام شیخ حامد کے بیٹا راجا جاز کام بنانا تھا۔ باس کے اشارے پر ہی اس نے سیٹھ عثمان کو ہمیشہ کیلئے کاروباری حریف سمجھ کر راستے سے ہٹانے کی خاطر ڈرائیور وحید کی ایمانداری کو کثیر رقم کے عوض خرید کر گاڑی میں بم فٹ کرایا تھا لیکن لیاقت حسین کی وجہ سے کام کھوٹا ہو گیا۔ اس کے دوروز بعد ہی سیٹھ عثمان راجیلہ بیگم کو سیاحت کی غرض سے بیرون ملک لے گیا تھا۔

افضل خان کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ سیٹھ عثمان اور سراج کبھی کلاس فیلو بھی رہ چکے تھے اور اب بھی دونوں کا ایک دوسرے کے گھر کا قاعدہ آنا جانا تھا۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں حسد کی فائل کے سلسلے میں سراج کے دفتر میں اپنی طلبی کو بھی افضل خان مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا، اس کے ذہن میں اس طلبی کے پس منظر میں بہت سارے شبہات بھی کلبلا رہے تھے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ سراج کو ایک ایماندار آفیسر سمجھتا تھا لیکن وہ اپنی کسی اہم ضرورت پوری کرنے کی خاطر براہ راست شیخ حامد سے ملنا چاہتا تھا۔ افضل خان کو یہ بات ہضم نہیں ہو سکی۔ اس نے پوچھا بھی تھا کہ جتنی ضرورت ہے وہ پوری کر سکتا تھا، مگر سراج نے انکار کر دیا تھا۔ شیخ حامد سے ملاقات کے سلسلے میں اس نے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے دفتر میں بیٹھا اسی قسمی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ جب شبنم نامی ٹیلیفون آپریٹر نے کمرے میں داخل ہو کر بے تکلفی سے پوچھا۔

”کہاں کم ہو افضل خان؟“ حسب معمول شبنم کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

”تم آج کل کہاں اڑتی پھر رہی ہو؟“ افضل خان نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی نظروں سے کہا۔ ”سنا ہے آج کل تمہاری مصروفیات کچھ زیادہ ہو گئی ہیں۔“

”پہلے یہ سمجھ لو کہ شبنم اڑتی نہیں بلکہ خوبصورت پھول اور پتوں پر مگررتی ہے۔“ شبنم نے ایک خاص ادا سے جواب دیا۔ ”کبھی کبھی گھاس کو بھی نواز دیتی ہے۔“

”میرے سلسلے میں تم نے کس حیثیت کا اندازہ لگایا ہے؟“ افضل خان نے اس کے بھڑکیلے لباس اور جسمانی خطوط پر نظر ڈالتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”تم ذرا اونچی شے ہو اس لئے میں نے بھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔“ شبنم کے جواب میں کھلی دعوت کا اظہار بھی شامل تھا۔

”اس وقت کیسے میری یاد آگئی؟“

”اس وقت مجھے نہیں بلکہ بگ باس کو تمہاری یاد آئی ہے۔“ شبنم نے مسکرا کر کہا۔ ”وس منٹ بعد تمہیں مخصوص کمرے میں طلب کیا گیا ہے۔“

افضل خان سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کو بہت خاص موقعوں ہی پر مخصوص کمرے میں طلب کیا جاتا تھا جس میں داخل ہوتے ہوئے وہ ہمیشہ گھبراتا تھا، لیکن آج اس کیفیت سے نہیں دوچار ہونا پڑا۔ شاید اس لئے کہ وہ بھی بگ باس سے مل کر سراج کے سلسلے میں ذکر چھڑنے کا منتظر تھا۔

ٹھیک دس منٹ بعد وہ مخصوص کمرے میں عقی راستے سے اندر داخل ہوا۔ وہ راستہ صرف مخصوص افراد ہی اختیار کرتے تھے عام حالات میں دفتر کا کوئی کارندہ بھول کر بھی ادھر قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

شیخ حامد کسی گہری سوچ میں غرق تھا اس نے اشارے سے افضل خان کو بیٹھنے کیلئے کہا پھر جیب سے اپنا وہ موبائل نکالا جو مال غنیمت کے طور پر اس نے حاصل کیا تھا اس موبائل سے وہ انتہائی اہم موقعوں پر کسی کو کال کرتا تھا۔ وہ کال محض نمبروں کی بنا پر ٹریس نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے کہ موبائل کا اصل مالک ایک درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو سات آٹھ مہینے پہلے ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

”کیا خبر ہے؟“ شیخ حامد نے کال ملنے کے بعد سنجیدگی سے پوچھا۔ ”تمہاری مہلت پوری ہو چکی.....“

دوسری طرف سے کیا جواب ملا وہ افضل خان نہیں سن سکا لیکن اس نے اچانک بگ باس کے چہرے پر ابھرنے والی شیطانی مسکراہٹ کو خاص طور پر محسوس کیا تھا۔ معاملہ یقیناً اہم نوعیت کا رہا ہوگا۔



”گویا مجھے جو اطلاعات ملی تھیں وہ غلط نہیں تھیں..... بہر حال تم کام جاری رکھو مجھے ہر ہفتہ رپورٹ چاہئے۔“ شیخ حامد نے تحکمانہ انداز میں کہا پھر موبائل آف کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے افضل خان کو اتنی گہری نظروں سے دیکھا کہ وہ بھی دہل کر رہ گیا۔

”تمہاری معلومات گہری سوچ سے عین ٹھیک تھیں“ اس نے افضل خان کو مخاطب کیا۔ ”سیٹھ عثمان تفریق کی غرض سے باہر نکلا گیا۔ وہ میری مدد کی کوششوں سے مل کر یہ محترم لگانے کی کوشش کر رہا ہے کہ خاص آرڈر اسے براہ راست دیا جائے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے سر.....!“ افضل پہلو بدل کر بولا۔ ”یہاں باقاعدہ بڈ (Bid) ہوتی ہے سر بہرہ مخصوص لفافوں میں آخری جاتی ہے جو بعد میں سب کے سامنے کھلتی ہے پھر.....“

”یہ ضروری نہیں ہوتا کہ بڈ یا پارتی ہر چھوٹی بڈ کو تسلیم کر لے۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”وہ اگر چاہے کسی آزمائشی ہونی پارتی کو بغیر بڈ دیئے بھی محض پرانی ساکھ کی بنیادوں پر ڈائریکٹ بھی دے سکتی ہے۔ یہ بتا جا رہی ہے کہ مختصر ہوتا ہے جس کے خلاف کچھ نہیں کیا جاسکتا پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔“

”سمجھ گیا سر.....“

”پھر یہ بھی سمجھ لو کہ سامنے والا کتنی گہری چال چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو.....“ شیخ حامد نے جان بوجھ کر اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔

”نہیں ہونے دوں گا سر.....“

”کیا سوچا ہے.....؟“

”تجسس یا تختہ۔“ جواب میں افضل خان نے بھی مختلط انداز اختیار کیا۔

”نہیں.....“ شیخ حامد کچھ دیر چست پر نظر جمائے کسی سوچ میں گم رہا پھر مسکرا کر بولا۔

”عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ تمہیں بھی اس کا ذاتی تجربہ ہوگا۔“

”جج..... جی..... سر!“ افضل خان شپٹا کر رہ گیا۔

”اس کی واپسی میں میرے حساب سے ابھی چھ ساڑھے چھ ہفتے باقی ہیں۔“ افضل کو پھر اشاروں کنایوں میں ہدایت ملی۔ ”جو بھی قدم اٹھانا سوچ سمجھ کر اٹھانا میں اس معاملے میں ناکامی برداشت نہیں کروں گا۔“

”اوکے..... سر۔“ افضل خان نے بغیر دیر لگائے جواب دیا، پھر اس نے اسی بہانے ڈی ایس پی سراج کا معاملہ بھی بڑی عقلمندی سے چھیڑ دیا۔ ”میں آپ کو ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔“

”ڈی ایس پی سراج اور ہمارا متعلقہ شخص ایک دوسرے کے کلاس فیلورہ چکے ہیں۔“

”انسان زندگی میں اکثر کسی موڑ پر آکر مجبور یوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق آج کل سراج صاحب کو کچھ رقم کی ضرورت پیش آگئی ہے گویا ان کے قدم بھی ڈنگا رہے ہیں۔“

”یہ انفارمیشن تمہیں کسی اور سے ملی ہے یا.....“

”سراج نے مجھے حینہ والی فائل کے سلسلے میں بلایا تھا۔“ افضل خان سمجھ گیا کہ شیخ حامد کو اپنے لائحہ و ذرائع سے اپنے کارندوں کے پل پل کی نقل و حرکت کی اطلاع ملتی رہتی ہے اس لئے اس نے صاف گوئی سے کام لینا مناسب سمجھا۔ ”میں نے آپ کو اس سلسلے میں یوں پریشان نہیں کیا کہ ایسے چھوٹے افسروں کو میں خود بھی ڈیل کرنا جانتا ہوں۔“

”مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں پچھلا سبق یاد رہا.....“ شیخ حامد کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ”میں جھوٹ پسند نہیں کرتا اور..... ایسے لوگوں کو دو تین بار سے زیادہ مہلت دینے کے بھی خلاف ہوں۔“

افضل خان جمر جھری لے کر رہ گیا۔ وہ بگ باس کی وارننگ کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

”کیا سراج نے تم سے کسی رقم کی ضرورت کی بات کی تھی؟“ شیخ حامد نے بدستور سنجیدگی سے پوچھا، اس کی پیشانی پر پل جتنی تیزی سے ابھرے تھے اتنی ہی جلد دور بھی ہو گئے۔

”ہیس باس..... میں نے اپنی جیب خاص سے اس کی مدد کا عندیہ بھی دیا تھا لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

”وہ آپ سے ایک ملاقات کا خواہشمند ہے۔“ افضل خان نے بڑی خوبصورتی سے بات بتائی۔ ”ممکن ہے اسے کوئی ایسی مشکل درپیش ہو جس کا حل صرف آپ ہی نکال کر اسے چھٹکارا دلا سکتے ہوں۔“

”ہوں.....“ شیخ حامد ایک پل کو خاموش ہوا..... پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”حسنہ کی فائل کا تذکرہ کس طرح درمیان میں آگیا؟“

”ہو سکتا ہے کہ سراج نے غلط بیانی سے کام لیا ہو لیکن اس نے یہی کہا تھا کہ مرنے والی کا کوئی عاشق اس فائل کو دوبارہ زندہ کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

شیخ حامد کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”اس کا باپ بھی اس فائل کو روری اوپن نہیں کر سکتا۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ کے مقابلے میں سراج صاحب کی حیثیت کسی چوٹی سے زیادہ نہیں ہے جسے جب چاہے قدموں تلے.....“

”ون منٹ۔“ شیخ حامد نے ہاتھ اٹھایا تو افضل خان کی زبان کو بریک لگ گیا۔ شیخ حامد پھر ہمت کی طرف دیکھنے لگا شاید کوئی آخری نتیجہ اخذ کرنا چاہتا تھا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے افضل خان کی طرف دیکھا۔ ”تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

”میں آپ کے مقابلے میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔“ افضل خان نے انکساری سے کام لیا۔

”جو آپ کا حکم ہو گا اسی پر عمل بھی ہو گا۔ کہیں تو میں اسے بھی.....“

”جلد بازی نہیں.....“ شیخ حامد نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔ ”تم اسے جب چاہے یہاں آنے کا کہہ دو لیکن..... ظاہر یہی کرنا کہ میں تمہاری خوشامد کے بعد ہی اس ملاقات پر آمادہ ہوا ہوں۔“

”رائٹ سر.....“

شیخ حامد نے انٹرکام اٹھا کر پشیش اسسٹنٹ سے اپنا شیڈول معلوم کیا، پھر ریسپوررکھ کر افضل خان سے کہا۔

”کل چار بجے کا وقت ہے میرے پاس..... تم سراج کو لا سکتے ہو تو لے آؤ۔“

”اوکے باس۔“

مخصوص کمرے سے نکل کر افضل خان نے سکون کا سانس لیا، پھر اسی دن اس نے فون پر سراج کو اس کی اطلاع بھی دے دی۔ دوسری جانب سے کوئی واضح جواب نہیں ملا لیکن اگلے دن ٹھیک چار بجے ڈی ایس پی سراج سادہ لباس میں شیخ حامد کے ساتھ اس کے مخصوص کمرے میں موجود تھا۔

”افضل خان نے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ شیخ حامد نے چہیتے ہوئے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔“ سراج نے بھی انکساری سے جواب دیا۔

”یہ حسنہ اور اس کی کسی کیس فائل کا کیا معاملہ ہے؟“ شیخ حامد نے بڑی مصومیت سے پوچھا۔

”افضل بتا رہا تھا کہ آپ نے.....“

”جی ہاں۔“ سراج نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ تک پہنچنے کیلئے کوئی نہ کوئی راستہ تو اختیار کرنا تھا۔“

”اوہ..... آئی سی۔ پولیس والا جھکٹا اکثر کامیاب ہوتا ہے۔“ شیخ حامد نے بے تکلفی سے کہا، پھر دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کو بیس منٹ اور دے سکتا ہوں ایک ضروری مینٹگ میں جاتا ہے۔“

”میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔“

”نہیں..... اب آگئے ہیں تو بلا تکلف یہ بھی بتا دیں کہ آپ کو کتنی رقم کی ضرورت ہے جس کی

”اب اجازت چاہوں گا اور ہاں..... ایک بار واقعیت ہوگئی ہے تو اب آتے جاتے رہے گا۔“
”سر کے بل آؤں گا۔“ سراج بھی اٹھ گیا، پھر بڑی گرجوٹی سے ہاتھ ملا کر اگلے قدموں واپس

چلا گیا۔

فتح حامد نے اس کے جاتے ہی سیدھا ہاتھ دراز میں ڈال کر ان دونوں سوچ کو آف کر دیا جو سراج کے کمرے میں داخل ہونے سے قبل اور رخصت ہوتے وقت کی تمام گفتگو اور مووی بھی بنانے کا کام انجام دے رہے تھے۔ سراج کے باہر نکلتے ہی اس کے ہونٹوں کی زہریلی مسکراہٹ پھیل کر مزید گہری ہوتی چلی گئی۔ اسے اس بات کا شہ بھی نہ ہو سکا کہ سراج کی قمیض کی دونوں آستینوں پر لگے گولڈن کف لنکس (Cuff Links) اور قمیض میں لگے گولڈن بٹن کے اندر آواز ریکارڈ کرنے اور مووی بنانے کے انتہائی حساس لیننز کے ذریعے تیار ہونے والے لمپس سراج کی پتلون کی علیحدہ علیحدہ جیبوں میں محفوظ ہو چکے تھے۔

اسی رات تقریباً دو بجے سراج حسب پروگرام ڈی آئی جی علیم احمد کی رہائشگاہ پر موجود تھا، اس کام کیلئے اس نے اپنی گاڑی کے بجائے ایک دوست کی بندوین کا استعمال کیا تھا۔ علیم احمد نے شپ کی کئی گفتگو اور تیار شدہ مووی کو اپنے چھوٹے پروجیکٹر کے ذریعے بڑی توجہ سے دیکھا، پھر خاصی دیر خاموشی سے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”تم نے ایسی حیرت انگیز جرات سے یہ کام انجام دیا ہے کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا، شیر کی کچھار میں گھس کر اسے گولی مار دینا اور بات ہے لیکن جال کے ذریعے قابو کرنا ایک خطرناک عمل ہے۔“

”میں ایک بات اور عرض کرنا چاہوں گا۔“ سراج نے بات جاری رکھی۔ ”مجھے یقین ہے کہ فتح حامد جیسا چالباز اور خطرناک مگر مجھ بھی مجھ سے ملا ہوگا تو وہ بھی کچھ سوچ کر کسی پلان کے تحت ملا ہوگا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ میرے ایس پی صاحب بھی اس کی جیب میں پڑے ہیں۔“
”مجھے اس کا علم ہے۔“ علیم احمد کسمسا کر بولے۔ ”صرف وہی نہیں بلکہ ہمارے اور بھی بہت سے اہم افسران اس سے ماہانہ بھتہ وصول کر رہے ہیں لیکن..... تم کیا کہنا چاہ رہے تھے.....؟“

”جس کمرے میں فتح حامد نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کمرہ صرف مخصوص موقعوں پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔“ سراج پہلو بدل کر بولا۔ ”میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ وہاں بھی گفتگو شپ کرنے اور مووی تیار کرنے کا کہیں نہ کہیں کوئی خفیہ سٹم ضرور موجود ہوگا۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا۔“ علیم احمد نے تائید کی۔ ”پچاس کے بجائے ایک لاکھ دینا اور واپس نہ لینے والی بات کے علاوہ بھی اس کی باتوں میں ایسے اشارے موجود ہیں جن سے بظاہر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہاری خدمات خریدنے کی خاطر سودے بازی کر رہا ہے۔ مگر تم مطمئن رہو اب میں بھی تمہارا ایک گواہ موجود ہوں۔“

”اسی یقین کی وجہ سے میں نے اپنے اس ٹریپ پلان پر عمل کرنے سے پیشتر آپ سے مشورہ

خاطر آپ کو کسی حسد کیس کا حوالہ دینا پڑا۔“ فتح حامد نے پھر تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ”میں ہمیشہ سے پولیس والوں سے دوستی رکھنے کا قائل ہوں، آپ کے ایس پی صاحب سے بھی اچھی خاصی سلام دعا ہے۔“

”ضرورت تو تقریباً پچاس ہزار کی ہے لیکن اپنے لئے نہیں۔“ سراج اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ ایس پی والی بات وہ جان بوجھ کر گول کر گیا۔

”میں سمجھا نہیں۔ اگر آپ کو اپنے لئے ضرورت نہیں ہے تو کسی دوسرے کیلئے.....“
”میں عرض کرتا ہوں۔“ سراج نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”دراصل ایک بیوہ کا بیٹا زندگی اور موت کے دروازے پر کھڑا ہے، اگر اس کا فوری آپریشن نہ ہو تو وہ بیوہ لاوارث ہو جائے گی۔“
”اگر یہ بات ہے تو آپ مجھے خدمت کا موقع دیں، میں صرف آپ سے اس کا نام اور ایڈریس دریافت کروں گا، اس کے بعد آپریشن کے جتنے بھی اخراجات ہوں گے وہ میں اپنی جیب خاص سے دوں گا۔“

”سوری! بات کچھ ایسی ہے کہ میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتا۔“
”ایسی صورت میں تو میں یہی سمجھوں گا کہ ضرورت دراصل آپ ہی کو ہے؟“
”یہی سمجھ لیں۔“ سراج نے لمبی سانس لی۔

جواب میں فتح حامد معنی خیز انداز میں مسکرایا، پھر اس نے دراز کھول کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میز پر اس طرح ڈال دی کہ خود سراج بھی حیران رہ گیا۔ ”گن لیجئے، پورے ایک لاکھ ہیں۔“ فتح حامد نے سراج کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر کہا۔
”لیکن میں نے تو صرف پچاس ہزار.....“

”کلف نہ کریں۔“ فتح حامد نے الفاظ چباتے ہوئے ایک خاص انداز میں کہنی میز پر ٹیک کر قدرے مدغم آواز میں کہا۔ ”دوستوں کا حساب کتاب دل میں ہوتا ہے، میں آپ سے اس حقیر رقم کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کروں گا۔ آپ اسے ہماری اور اپنی دوستی کی پہلی قسط سمجھ لیں۔“

سراج نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر اس نے گڈی کو اٹھا کر ایک نظر غور سے دیکھا، پھر اسے بڑی بے پروائی سے پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ ”مجھے آپ سے یہی امید تھی کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔“ فتح حامد پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”مرکزی حکومت کے کچھ دوستوں سے بھی میری دوستی ہے، ان کے ساتھ بھی لین دین کا حساب بغیر کھاتے کے چلتا رہتا ہے، آپ کو بھی اگر کبھی مشکل درپیش آجائے تو میں بھی آپ کے کسی کام آنے سے گریز نہیں کروں گا، کبھی آزما کر دیکھ لیں۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ سراج دوبارہ اس طرح انکساری پر اتر آیا جیسے اس ایک لاکھ کے عوض وہ اپنی ایمانداری کا سودا کر رہا ہے۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا خاص خیال رکھوں گا۔“

”اصول بھی یہی ہے۔ تالی دونوں ہاتھ سے بچتی ہے۔“ فتح حامد نے کہا، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

کرنا ضروری سمجھا تھا۔

”تم نے دورانندی کی کا ثبوت دیا تھا۔ اب میرا ایک مشورہ اور ہے۔“
”آپ حکم دیں سر.....“

”ان دونوں کی ایک ایک کیسٹ تم مجھے بھی فراہم کر دو ایک سیٹ اپنے پاس رکھنا تاکہ ہم دونوں میں سے اگر کوئی ایک فریق کم ہو جائے تو دوسرا موجود رہے کیسٹ کے ساتھ ہی تم نے جس ارادے سے یہ نیک کام کیا ہے اس کی باقاعدہ تحریری رپورٹ بھی اپنے دستخط کے ساتھ ٹاپ کانفی ڈینشل اور سیکریٹ لکھ کر مجھے دے دینا۔ وہی تمہاری ایمانداری اور صلاحیتوں کا ثبوت ہوگا۔“
”میں نے بھی یہی سوچا تھا سر..... لیکن ایک لاکھ کی رقم کہاں رکھی جائے گی؟“ سراج نے پوچھا۔

”اسے میرے پاس چھوڑ دو میں اس کے ایک ایک نوٹ کی کاپی ذاتی طور پر فوٹو سیٹ کر کے اپنے دستخط اور سرکاری مہر کے ساتھ محفوظ کر دوں گا۔ جس کی نقل تمہیں بھی دے دوں گا تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے رہا تم کا معاملہ تو میں اسے بھی اپنے خفیہ ریمارکس کے ساتھ کسی ایماندار واقف کار کے لاکر میں محفوظ کرادوں گا“ اس کام کی اطلاع بھی تمہیں ایک خاص اور ٹاپ سیکریٹ آفیشل لیٹر کی صورت میں مل جائے گی۔“
”میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا سر۔“

”ایک بات کا خیال اور رکھنا.....“ عظیم احمد نے دوستانہ انداز میں تاکید کی۔ ”جب تک میں نہ کہوں فی الحال مجھ سے ملاقات سے گریز کرنا۔ ایک سیکریٹ اور ان لسٹڈ (Un Listed) موبائل نمبر دے رہا ہوں اسے بھی انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کرنا۔“
ساڑھے تین بجے رات کو جب سراج واپسی کیلئے روانہ ہوا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ کئی بار اس نے پشت کے دروازے میں لگے چوکور رنگین شیشے سے جھانک کر جائزہ لیا۔ عقب میں دور دور تک سڑک سنسان پڑی تھی، تعاقب میں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

❖❖❖

جس رات فرحین نے قبرستان میں ایک شخص کو دنگا ناچتے دیکھا تھا اس رات سے اس کا سارا سکون برباد ہو گیا تھا۔ وہ شاید ایک وفادار بیوی ہونے کے ناتے شوہر کو کبھی اس جنجال کی خبر نہ دیتی۔ ذاتی طور پر بھی وہ بحالت مجبوری قبرستان کے قریب رہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ سرچھپانے کیلئے کوئی نہ کوئی چھت تو درکار تھی ویسے بھی اس نے یہی سن رکھا تھا کہ پرانے قبرستانوں کو بدروصل، بھوت پریت کے علاوہ جرائم پیشہ افراد بھی اپنا مسکن بنا لیتے ہیں۔ اس رات شاید گل خان یا زرینہ نے بھی کھڑکی سے وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا جو فرحین دیکھ چکی تھی۔ فرحین نے دورانندی سے کام لیا شوہر کو کھانا دینے کے بعد وہ پیار بھرے لمحات کا تصور کئے بیٹھی تھی لیکن لیاقت ہیہہ کی طرح کچھ اس طرح مہربان ہوا کہ اچانک گل نے اسے باہر سے آواز دی۔ نورین، گل خان اور لیاقت حسین کے درمیان

جو گفتگو ہوئی وہ اب فرحین کے دل میں اٹھتے بیٹھتے کانٹوں کی طرح چبھتی رہتی۔

تین روز سے وہ سوتے سوتے اچانک اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ اسے خواب میں قبرستان کا وہ منظر دکھائی دیتا۔ کہیں دور سے آنے والی ایک آواز اس کے کانوں میں ابھرتی تو وہ مضطرب ہو کر جاگ جاتی، ساری رات لیاقت کے قریب لیٹی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہتی، اس کی زندگی کی دعائیں مانگتی رہتی۔ ان باتوں کا ذکر اس نے زرینہ سے بھی نہیں کیا تھا، حالانکہ جب لیاقت حسین ڈیوٹی پر رہتا اور گل خان بھی اپنے کام پر چلا جاتا تو زرینہ کام کاج سے فارغ ہو کر فرحین ہی کی طرف آ جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اور فرحین باہر سانبان میں تخت پر بیٹھی ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھیں۔ گل خان، لیاقت حسین کو لے کر ایک بزرگ کے پاس گیا ہوا تھا۔ ”خدا کرے لیاقت بھائی کامیاب ہو جائے۔“ زرینہ نے صدق دل سے کہا۔ ”ورنہ گل خان یہی بتاتا ہے کہ ادھر بٹے کئے قسم کے غلط لوگوں نے غریب بزرگ کو آمدنی کا دھندا بنا لیا ہے۔ نمبر کے ذریعے دس آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت ہوتی ہے اس کے علاوہ دس پندرہ ایسے افراد کو بھی اجازت مل جاتی ہے جو بد معاشوں کی مٹھیاں گرم کرتے ہیں۔“

”سچ کہہ رہی ہے؟“ فرحین نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”اپنی طرف تو ایسا نہیں ہوتا۔“
”ادھر ک بات الگ تھا فرحین لیکن ادھر سارا غلط کام پیسوں سے ایک منٹ میں چور دروازے سے ہو جاتا ہے۔ جو لوگ سیدھا اور قانونی طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ بار بار دھکے کھانے کے بعد بھی کامیاب نہیں ہوتے۔“

”ہو سکتا ہے کہ اپنے لیاقت کے ساتھ کوئی معجزہ ہو جائے اور بزرگ بابا سے اس کی ملاقات ہو جائے۔“ فرحین نے دل سے دعا کی۔

کچھ دیر یہی موضوع زیر بحث رہا اس کے بعد زرینہ نے کسمسا کر کہا۔
”ویسے اس روز لیاقت بھائی نے جو کیا اچھا نہیں کیا۔“
”میں سمجھی نہیں.....؟“

”ادھر ایک دو بار پہلے بھی سفلی کرنے والے آتے رہے ہیں۔ کئی واقعات مجھے معلوم بھی ہیں جنہیں سوچتی ہوں تو آج بھی دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔“

”ہوا کیا تھا.....؟“ فرحین نے بے چینی سے سوال کیا۔

”تفصیل سنانے کی ہمت نہیں ہے میرے اندر لیکن اتنا بتا سکتی ہوں کہ جس نے بھی ان کندے عمل کے سچ ٹانگ پھنسی اس کا انجام خطرناک ہی ہوا۔ عا کش نامی ایک خوبصورت دلہن تو آج بھی مجھے یاد ہے۔“ زرینہ جھرجھری لے کر بولی۔ ”نئی نئی دلہن بن کر اس علاقے میں آئی تھی۔ اس کا مرد کسی ٹھیکیدار کے ہاں ملازم تھا، دونوں بڑے خوش رہتے تھے۔ عا کش نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے اپنی پسند کی شادی کی ہے ورنہ گھر والوں کے علاوہ کچھ ایسے قریبی رشتے دار بھی مخالفت کر رہے

”ایک بات میں بھی تجھے بتا رہی ہوں زریہ لیکن تو بھی کسی سے کچھ نہ کہنا۔“
”خیر تو ہے۔“ زریہ ہنستا۔

”ابھی تک تو خیر ہی ہے لیکن دو روز سے میں بھی بڑے ڈراؤنے خواب دیکھ رہی ہوں۔“
فرحین نے چھت پر نظر جماتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”خواب میں مجھے دہلا پٹلا کالا بھجنگ آدی نظر آتا ہے اس کے جسم پر بھی کوئی لباس نہیں ہوتا۔ وہ خنزیر کا قہم اپنا بڑا دانت نکال کر ایک ہی بات بولتا ہے۔ پر تاب گھوٹ تمہارا اور تمہارے بچی کا ایسا کر یا کرم کرے گا کہ تمہاری آتما بھی سدا ویاکل رہے گی۔۔۔۔۔ وہ بعد میں جانے کیا ہے جو بھوانی کے نام بار بار دہرا کر خوشی سے ناپنے لگتا ہے میں نے اتنا کالا اور گندا آدی پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

زریہ نے فرحین کی بات سنی تو وہ بھی خوفزدہ ہو گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اس کے ساتھ فرحین بھی اٹھ گئی۔

”کون۔۔۔۔۔؟“ زریہ نے صحن میں آکر آواز لگائی تو باہر سے لیاقت حسین نے جواب دیا۔
”میں ہوں۔۔۔۔۔“

زریہ نے سکون کا سانس لیا۔ فرحین کے دل سے اس وقت بھی یہی دعا نکلی کہ ”میرے مالک لیاقت اور بزرگ کی ملاقات ہو گئی ہو۔“ زریہ ایک طرف صحن میں پردے کے آڑ میں ہو گئی تو فرحین نے دروازہ کھول کر لیاقت کو اندر بلا لیا۔ زریہ لپک کر باہر نکل گئی جہاں گل خان موجود تھا۔ ”کیا ہوا لیاقت۔۔۔۔۔؟“ فرحین نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔ ”کیا تمہارا ملاقات بزرگ بابا سے ہو گیا؟“
”آج بغیر نمبر کے نہیں ہو سکا لیکن۔۔۔۔۔ کل گل خان فجر کے وقت نمبر لے آئے گا تو دو چار دن میں ضرور ملاقات بھی ہو جائے گا۔“ لیاقت نے بزرگ کی ہدایت کے مطابق زبان بند رکھی مگر فرحین کی پشت تھپتھا کر محبت سے بولا۔ ”حوصلہ رکھو میرے دل کا بلبل لیاقت کو کچھ نہیں ہوگا۔“
”خدا کرے ایسا ہی ہو۔۔۔۔۔“ فرحین نے دھڑکتے دل سے کہا پھر لیاقت کو منہ ہاتھ دھونے کا کہہ کر وہ کھانا نکالنے چلی گئی۔ صبح سے اس نے خود ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔

لیاقت نے پہلی ہی نظر میں فرحین کے چہرے کو پڑھ لیا تھا۔ وہ اس کی محبوبہ تھی جس کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ فرحین کی وجہ سے پریشان ہے۔ وجہ کیا تھی؟ شاید صرف اتنی کہ اس نے لیٹوں کے سلسلے میں اس کا کہا نہیں مانا تھا۔
فرحین کھانا لے کر آگئی۔ خود بھی شوہر کے ساتھ کھانے لگی لیاقت حسین کچھ دیر بیوی کے ساتھ ہنستا بولتا رہا پھر اس نے فرحین کے دل میں جھانکنے کی خاطر اسے کریدا۔

”کیا بات ہے جان جگر۔۔۔۔۔؟ تم مجھے کچھ پریشان دکھائی دیتا ہے؟“
”وہ۔۔۔۔۔ زریہ نے ایک قصہ سنایا تھا۔ بس اسی وجہ سے ذرا افسوس ہو رہا تھا۔“

”قصہ کیا تھا۔۔۔۔۔؟“
”خالص عورتوں کا بات ہے۔“ فرحین نے زبردستی ایک قاتلانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر

تھے جو عائشہ کا رشتہ اپنے بیٹے کیلئے مانگ رہے تھے۔ ماپوس ہونے کے بعد ان کم بختوں کے دل میں شیطان نے انتقام کی آگ بھڑکا دی۔ لڑکے نے کسی یار دوست کے کہنے پر ایک ایسے شخص سے ملاقات کی جو گندا عمل کرتا تھا۔ عائشہ اور اس کا مردان باتوں سے بے خبر اچھی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن دو مہینے کے بعد جو کچھ ہوا اس نے پورے علاقے کو سو گوار کر دیا تھا۔ دو روز تک تو گل خان نے بھی گھر میں چولہا نہیں جلتے دیا۔۔۔۔۔ ایمان سے کہتی ہوں کہ وہ بہت پیاری اور معصوم لڑکی تھی لیکن اس کا اور اس کے جوان شوہر کا جو انجام ہوا اسے یاد کر کے آج بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔“
”ہوا کیا تھا۔۔۔۔۔؟“ فرحین نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

زریہ کچھ دیر چپ رہی پھر اداس لہجے میں بولی۔ ”اس روز عید کا دن تھا سب لوگ نماز پڑھ کر لوٹے تھے۔ گلی میں سارے مرد ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے جب عائشہ کے مرد کو اچانک خون کا الٹی ہوا اور وہ غریب سب کے سامنے تڑپ تڑپ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ عائشہ کو اس وقت کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ وہ اپنے خوبصورت لباس میں ہی بیچ مارتی باہر نکل آئی۔ خون میں لت پت بے جان شوہر کی لاش سے لپٹ کر بین کر رہی تھی کہ پھر کسی حرام کے قہم نے شیطانی جنتر منتر پڑھ کر پھونک دیا۔ عائشہ ابھی شوہر سے لپٹی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی جب خدا جانے کہاں سے نیلی آگ کا شعلہ بلند ہوا جس نے مرنے والے کے ساتھ عائشہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا باقی لوگ چیخ مارتے دور ہو گئے۔ پورے علاقے میں ایک وحشت پھیل گئی تھی پھر۔۔۔۔۔ ان دونوں کی لاشیں جل کر اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ انہیں الگ کرنا بھی ممکن نہ رہا۔ بزرگوں کے مشورے پر دونوں کو جیسے تیسے دفن کر دیا گیا۔“

فرحین کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس سینے کے اندر ہی گھٹ کر رہ جائے گی۔ زریہ کو عائشہ کی روداد سنانے کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے فرحین کی کیفیت پر غور کرتے ہوئے پریشان انداز میں کہا۔

”خود کو سنبھال فرحین اور مجھے معاف کر دے جو نہ جانے میں پاگل کچھ سوچے سمجھے بغیر تجھے پوری کہانی سنائی چلی گئی گل خان کو خبر ہوئی تو وہ بھی ناراض ہوگا۔“

”فکر نہ کر زریہ۔۔۔۔۔“ فرحین خود کو سنبھال کر بولی۔ ”میں کچھ دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

زریہ نے ہاتھ تمام کر زبردستی فرحین کو کمرے میں لے جا کر پٹنگ پر لٹایا اسے پانی لا کر پلایا۔ کچھ دیر بعد فرحین کی حالت قدرے سنبھل گئی تو زریہ اداس لہجے میں بولی۔

”پیاری بہن تو بھی لیاقت بھائی کو کچھ نہ بتانا۔“

”پریشان مت ہو زریہ میں تیری بات کسی سے نہیں کہوں گی۔“

”میرا ایک مشورہ مانے گی۔“ زریہ نے اس کی پیشانی کو آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے کہا۔
”اب تو لیاقت بھائی کی تنخواہ بھی ٹھیک ٹھاک ہو گئی ہے۔ تو ایسا کر کسی طرح انہیں سمجھا بجا کر اس بستی میں ہی قبرستان سے ہٹ کر کوئی دوسرا مکان لے لے۔ میں گل خان سے بھی کہوں گی۔“

کہا۔ ”مردوں کو بتانے والا نہیں ہے۔“
”ہم سے بھی پردہ کرے گا؟“

”کیوں..... کیا تم مرد نہیں ہے۔“ فرحین نے اسے شوشی سے گھورا۔

لیاقت حسین نے مسکرا کر کہا۔ ”ابھی ڈیوٹی پر جانا ہے رات کو تفصیل سے سوچ کر جواب دوں گا۔“

فرحین شرمناک لیاقت کی نظروں میں مچلنے والے جذباتی طوفان کو دیکھنے لگی۔ لیاقت حسین کھانا کھا کر اپنے کام پر چلا گیا۔ فرحین گھر کے کاموں سے فراغت پا کر پلنگ پر لیٹی تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے ذہن میں زرینہ کا سنایا ہوا عائشہ اور اس کے معصوم شوہر کے بھیا تک انجام والا واقعہ گونجنے لگا۔ دیر تک وہ اس بات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتی رہی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ شاید اس لئے کہ لیاقت کے ساتھ وہ کچھ ایسے حالات میں الجھ چکی تھی۔ تادیر وہ اپنے آپ سے الجھتی رہی، پھر نیند کا ایک جھونکا ایسا آیا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ کچھ دیر پرسکون نیند سوتی رہی۔ لیکن اس کی نیند میں خلل ڈال کر اسی پر تاب گھوش کا مکروہ ہویا اس کے سامنے آ گیا۔ اس کے دانت غلیظ تازہ تازہ خون سے تھڑے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آرہا ہو۔ فرحین نے حقارت سے اس کی طرف سے نظریں پھیرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا وجود شل ہونے لگا۔ یوں جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اس کے جسم کی ساری قوتیں سلب کر لی ہوں۔ ”بہت دیا کل نظر آرہی ہے تو سندرہ؟ مجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟“ پر تاب گھوش نے خباثت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

فرحین نے اس پر لعنت بھیجنے کا سوچا، لیکن اس کی زبان نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کسی بے جان بت کے مانند اڑ کر رہ گئی لیکن آنکھوں اور دھڑکتے دل سے اس مکروہ لعنت کی منحوس صورت دیکھنے پر مجبور تھی جس کا سیاہ جسم اس وقت بھی لباس کی قید سے آزاد نظر آرہا تھا۔ ”تمہارے پتی کے بچاؤ کا کیول ایک ہی طرح ہے میری سندرہ کٹار..... وہ تمہارے لئے ایک بالک پیدا کرے تم ایک ماتا کی طرح اس کو اپنی چھاتی سے دودھ پلاؤ“ اسے پال پوس کر بڑا کرو اور..... اور جب وہ چار سال کا گول منول ہو جائے تو میں اسے بھوانی کے چرنوں میں بھیٹ چڑھا سکوں اس کے بعد تمہیں بقی مل جائے گی۔“

فرحین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ پر تاب گھوش جو کچھ بکواس کر رہا تھا وہ کسی بھی ماں یا باپ کیلئے ممکن نہیں تھا اس کا دل چاہا کہ ایسی بد فال زبان سے نکالنے والے کا منہ نوچ لے زبان گدی سے کھینچ لے لیکن وہ اس خواہش کو بھی پورا کرنے سے قاصر تھی۔ پر تاب گھوش اسے گھورتے ہوئے حقارت سے بولا۔

”جو کچھ تیرے من میں چل رہا ہے وہ میں سن رہا ہوں لیکن تو نہیں جانتی کہ پر تاب کی شہتی اپرم پار ہے۔ بھوانی کی کرپا سے میں نے وہ شہتی پراپت کر لی ہے جسے کوئی اور سپنوں میں بھی نہیں

سوچ سکتا۔ تو اگر میری شہتی کا چٹکار دیکھنا چاہتی ہے تو بول تیرا پتی ابھی گیا ہے میری شہتی اسے دوبارہ بالوں سے پکڑ کر تیرے سامنے لا سکتی ہے۔ پر تو یہ تو برداشت نہ کر سکے گی کہ تیرا پتی جس نے میرے جتر منتر کو چھیننے کی بھول کی تھی خود اپنے ہاتھوں میں اپنا کٹا ہوا سر لے کر آئے اور پھر تیری نظروں کے سامنے تڑپ کر جیون سے سارے بندھن توڑ لے۔ بول سندرہ کیا تو پر تاب کی شہتی کا تماشا دیکھنا پسند کرے گی؟“

جو زبان پر تاب گھوش بول رہا تھا وہ فرحین کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آرہی تھی لیکن وہ اس کا مطلب کچھ کچھ سمجھ رہی تھی جب شوہر کے کئے ہوئے سر اور تڑپ تڑپ کر موت کے منہ میں جانے کی بات اس کے کانوں سے ٹکرانی تو وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔ اسی چیخ سے وہ بیدار بھی ہو گئی۔ وہ اپنے پلنگ پر تھی۔ اس نے گہرا کر ادھر ادھر دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اپنا شبہ دور کرنے کی خاطر اس نے چھوٹے سے کچے کچے گھر کا ایک ایک حصہ کھنگال ڈالا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا..... شاید اس نے پھر دن میں بھی کوئی خواب دیکھا تھا جس نے وجود کے ایک ایک جوڑ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

فوری طور پر فرحین نے دل میں لاجول پڑھی۔ وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر دو رکعت نفل ادا کئے، پھر سر بسجود ہو کر خدا کے حضور گڑگڑا کر لیاقت اور اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ اس نماز کی برکت اور خدا سے لو لگانے کے سبب ہی تھا کہ فرحین کے دل کا خوف کم ہونے لگا۔ بڑی دیر تک وہ سجدے میں پڑی اللہ کے رحم و کرم اور نظر عنایت کی بھیک مانگتی رہی۔



ایس پی آغا منظور اور ڈی ایس پی سراج ایک ندی کے دو ایسے کنارے تھے جو کبھی نہیں مل سکتے تھے اعلیٰ افسران کو کبھی اس بات کا بخوئی علم تھا کہ آغا منظور شیخ حامد کا خاص آدمی تھا اس نے کئی مرتبہ اس بات کی کوشش بھی کی تھی کہ سراج کی جگہ کسی اور ڈی ایس پی کی تعیناتی اپنے ساتھ کرا لے۔ سراج چونکہ ایماندار اور کھرا آفیسر تھا اس لئے کسی کے حکم سے بھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ ہاں اگر کوئی احکام باقاعدہ تحریری صورت میں ہوں اور کام کی نوعیت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہو تو وہ اسے کر گزرنے سے دریغ بھی نہیں کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک دو معاملات میں آغا منظور نے اسے ملوث کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن سراج کے پاس چونکہ تحریری ثبوت موجود تھے اس لئے اس کے خلاف کوئی فائل نہیں کھولی جاسکی۔

بحیثیت ماتحت وہ آغا منظور کے ساتھ اکثر میٹنگ میں شریک بھی ہوتا تھا لیکن دیدہ دانستہ وہ ایس پی کی کسی رائے پر اختلافی نوٹ نہیں لکھتا تھا۔ جانتا تھا کہ دریا میں رہ کر مگر چھ سے بیر لینا بھی مناسب نہیں۔ بہر حال وہ کسی بھی ایسے کام میں ملوث نہیں ہوتا تھا جس میں پھنس جانے کا ذرا بھی خدشہ موجود ہو۔ دونوں کی ملاقاتیں صرف سرکاری طور پر ہوتی تھیں یا اس وقت جب آغا منظور کی طرف سے اسے طلب کیا جائے۔

اس وقت بھی جب ایک کانسٹیبل نے اس کے کمرے میں آکر آغا منظور کے بلاوے کی اطلاع

دی تو سراج نے اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ ”ٹھیک ہے میں دس منٹ میں آتا ہوں۔“ ان دس منٹ میں اس کے ذہن میں کئی ایسے مکمل کیس ابھرے جس پر اس کے اور ایس ہی کے درمیان ڈسشن کی توقع تھی وہ ہر کیس کے بارے میں مناسب جواب دینے کیلئے خود کو ذہنی طور پر آمادہ کرتا رہا پھر اچانک کسی خیال پر مسکراتے ہوئے اٹھا اپنی کیپ اٹھا کر سر پر سجا لی اور قدم اٹھا تا ہیڈ کوارٹر کی سمت چل پڑا جہاں مختلف علاقوں کے ایس پیز اور ڈی آئی جی وغیرہ کے دفاتر تھے۔ اپنی گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔

پولیس ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوتے ہوئے بھی اسے مین گیٹ پر کھڑے ڈیوٹی گارڈ نے بھرپور سلیوٹ پیش کیا شاید اس لئے کہ پولیس کانسٹیبل کے معاملے میں وہ خاصا مہربان تھا۔ اسے علم تھا کہ کوئی بھی پولیس پارٹی یا تھانہ انچارج جب ناکام ہوتا ہے یا گردش کا شکار ہوتا ہے تو سارا ملہ کانسٹیبل پر ڈال دیتا ہے۔ سراج کے ہمدردانہ رویے ہی کا نتیجہ تھا کہ شہر کے بیشتر کانسٹیبل اس کی بے حد عزت کرتے تھے اور کسی آڑے وقت میں اسی سے مشورہ بھی کرتے تھے۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر سراج نے اپنی گاڑی ایس پی آغا منظور کے دفتر کے سامنے روکی۔ ایک کانسٹیبل نے لپک کر دروازہ کھولا سراج نے اس کے سلام کا جواب مسکرا کر دوستانہ انداز میں دیا پھر مطلوبہ کمرے میں داخل ہو کر اس نے آغا منظور کو سلیوٹ کیا ٹوپی اتار کر میز پر رکھی اور سامنے والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا اس کا چہرہ اس وقت اندرونی جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا دونوں کمرے میں تنہا ہی تھے۔

کچھ دیر رسمی گفتگو کے بعد آغا منظور نے کہا۔ ”میں ایک خاص فائل آپ کو مارک کرنا چاہتا ہوں سوچا کہ اگر آپ سے مشورہ کر لوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“ ایس پی کے لب و لہجے میں کچھ عجیب سا سہنس تھا جسے سراج نے خاص طور پر محسوس کیا۔

”آپ مجھے بغیر مشورے کے بھی کوئی فائل مارک کر سکتے ہیں۔“ سراج نے مسکرا کر محتاط لہجہ اختیار کیا۔ ”میں آپ کے ہر تحریری آرڈر پر عمل کرنے کا پابند ہوں۔“

”یہ فائل ذرا دوسری نوعیت کی ہے۔“ آغا منظور نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”یہ سمجھ لیں کہ اس کا کچھ تعلق مجھ سے بھی ہے رہا احکامات پر عمل کرنے کا مسئلہ تو میں آپ کو دوست زیادہ اور ماتحت کم سمجھتا ہوں۔“ آخری جملہ خاص طور پر ایک خاص انداز میں کہا گیا۔

”یہ آپ کی محبت ہے۔“ سراج نے انکساری سے جواب دیا۔

”آپ نے پچھلے دنوں غالباً افضل خان کو کسی وجہ سے دفتر طلب کیا تھا؟“

”جی ہاں۔“ سراج مختصر جواب دینے کے بعد سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”اس کے بعد آپ شاید شیخ حامد سے بھی اس کے دفتر جا کر ملے تھے۔“

”جی ہاں۔“ اس نے پھر صرف اقرار کیا۔

”مسٹر سراج آپ کے علاوہ دوسرے افسران بھی اس بات سے ضرور واقف ہوں گے کہ شیخ

حامد سے میرے دوستانہ مراسم ہیں آج کے دور میں کسی بڑے آدمی سے دوستی قائم رکھنا وقت کی ضرورت ہے اور قانوناً جرم بھی نہیں ہے۔“

”میں آپ سے متفق ہوں سر۔“ سراج نے بھی مصلحتاً سنبھل کر کہا۔ ”اسی لئے میں نے بھی آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔“

آغا منظور سراج کے ذمہ جملے پر چونکا پھر سنجیدگی سے اصل موضوع کی طرف آگیا۔ ”آپ نے غالباً میڈم روبی کا نام ضرور سنا ہوگا۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔“ سراج نے دلچسپی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری اطلاع کے مطابق وہ ایک کروڑ پتی بیوہ ہے۔ شوہر کی زندگی میں وہ خاصی محتاط زندگی گزارنے کی عادی تھی لیکن اس کے بعد۔۔۔۔۔“ سراج نے اپنا جملہ دیدہ دانستہ نامکمل چھوڑ دیا۔

”آپ جو بات کہتے کہتے رک گئے وہ میں بھی جانتا ہوں۔“ ایس پی آغا منظور نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب وہ بے حد ماڈرن اور آزاد خیال ہو گئی ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ آپ اگر کچھ وقت نکال کر اس کی سرگرمیوں اور ملنے جلنے والوں پر نظر رکھیں تو مجھے خوش ہوگی۔“

”سر۔۔۔۔۔“ سراج نے کسمسا کر سوال کیا۔ ”کیا میڈم روبی کسی خلاف قانون سرگرمیوں میں ملوث ہے؟“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن۔۔۔۔۔“ آغا منظور خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ توقف سے بولا۔

”سنا ہے ادھر کچھ دنوں سے وہ ریبنو کلب میں بھی نظر آ رہی ہے۔“

”آئی سی۔“ سراج نے کریدنے کی کوشش کی۔ ”کیا اس کلب کے بارے میں کوئی خفیہ رپورٹ بھی مرتب کرنی ہوگی۔“

”جی نہیں۔ آپ کو صرف میری خاطر ان افراد کی فہرست تیار کرنا ہے جن سے میڈم روبی زیادہ بے تکلف ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں سر۔۔۔۔۔“ سراج نے اس بار بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ”یہ کام تو میں بغیر فائل مارک کئے بھی آپ کی خاطر انجام دے سکتا ہوں۔“

”تھینکس۔۔۔۔۔“ ایک لمحے کی پرسوج خاموشی کے بعد آغا منظور نے دبی زبان میں کہا۔ ”شیخ حامد سے میری دوستی کی بات اور ہے لیکن یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ افضل خان کا ماضی کیا رہ چکا ہے۔“

”جی ہاں۔“ سراج افضل خان کے نام پر چونکا تھا۔

”آج کل میڈم روبی اس شخص میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہے۔“

سراج افضل خان اور میڈم روبی کا نام سن کے دل ہی دل میں مسکرا دیا وہ جانتا تھا کہ خود ایس



سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کے چلے جانے کے بعد لیاقت حسین کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔

راحیلہ بیگم نے گھر کی دیکھ بھال کیلئے اپنی ایک عزیزہ کا بندوبست کرنے کے باوجود اسے خاص طور پر اس بات کی تاکید کی تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں اسے تمام تر اختیارات حاصل ہوں گے۔ ہر اعتبار سے ہر بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ لیاقت حسین نے ایک پٹھان کی زبان سے قول دیا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی راحیلہ بیگم یا سیٹھ عثمان کو ماپوس نہیں کرے گا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کا وہ وعدہ بہت اہم تھا۔ اسی وعدے اور قول کو نبھانے کی خاطر وہ صاحب لوگوں کے جانے کے بعد اپنی ذمہ داریوں کو زیادہ وقت دینے لگا تھا۔

اس کی ایک نیکی اور ذہانت کام آگئی تھی جس نے بروقت اس گھر کو بچا لیا تھا جہاں کا وہ نمک کھاتا تھا اس کی ایک ذمہ داری نبھانے کا سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم اتنا بڑا صلہ دیں گے یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہیں وحید ڈرائیور لیاقت حسین کو مل جاتا تو وہ اس نمک حرام کو بھی اس کے جرم کی پاداش میں زندہ درگور کر دیتا لیکن ڈی ایس پی سراج نے بتایا تھا کہ اس کی خدمات خریدنے والوں نے اسے ملک کی سرحد پار کر کے کہیں دور بھجوا دیا تھا۔

لیاقت حسین کی جاں نثاری اور ایمان داری کی وجہ سے سراج بھی اس پر خاصا مہربان ہو گیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ شہر آتے ہی اسے قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا وہ ہر طرح سے اپنے معاشی حالات سے نہ صرف مطمئن تھا بلکہ خدا کا شکر ادا کرتا رہتا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ محسوس کر رہا تھا کہ فرحین اس سے لیموں میں گندے علم کے ذریعے پھنسانی جانے والی سویاں نکالنے والی بات سے خوش نہیں تھی۔ کوئی اور بات بھی تھی جو وہ لیاقت کو بتانے سے کترار ہی تھی۔ دوپہر کو ڈیوٹی پر آنے سے پیشتر اس نے طے کر لیا تھا کہ واپسی پر وہ فرحین کا دل ٹٹولنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ وہ فرحین کو ہر حال میں خوش دیکھنا اور رکھنا چاہتا تھا۔

ساڑھے سات بجے ڈیوٹی ختم کر کے اور رات والے چوکیدار کو ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ گھر کیلئے نکل رہا تھا کہ سراج کی گاڑی احاطے میں داخل ہوئی۔ لیاقت کو رکنا پڑا۔

”کیسے ہو لیاقت.....؟“ سراج نے گاڑی سے نکلتے ہی بے تکلفی سے اس کی خیریت دریافت کی۔

”سب اوپر والے کی مہربانی اور آپ لوگوں کی عنایت ہے۔“

”مٹھ.....!“ سراج مسکرایا۔ ”اب تو تم اچھی اردو بولنے لگے ہو۔“

”کوشش کر رہا ہوں صاحب کہ نئے شہر میں قدم جمایا ہے تو ادھر کے طور طریقے بھی اپنا سکوں۔“

”اور تو سب خیریت ہے نا.....“

پی آغا منظور بھی اپنے ذاتی شوق میں کس قماش کا آدمی تھا۔ ابھی تک کوئی سکنیڈل اس لئے منظر عام پر نہیں آسکا تھا کہ وہ ذاتی زندگی میں اس قدر محتاط تھا کہ خود اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہتا تھا لیکن بہر حال یہ بات سراج کے علم میں تھی کہ وہ کئی بڑی پارٹیوں میں میڈم روبی کے ساتھ بھی گھلتے ملتے دیکھا گیا تھا۔ سراج نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”سر کیا میڈم روبی اور افضل خان والی بات شیخ حامد کے علم میں بھی ہے؟“

”بھوی سکتی ہے لیکن شیخ حامد نے اپنے کسی کارندے پر ایسی بندش بھی نہیں لگا رکھی کہ وہ اپنی سوشل لائف بھی اپنی مرضی سے نہ گزارے۔“ آغا منظور نے الفاظ چباتے ہوئے دہی زبان میں کہا۔ ”البتہ وہ اس بات کو کبھی پسند نہیں کرتا کہ کسی کارندے کی سوشل لائف اس کے ذاتی کاروباری معاملات اس کے سخت اصولوں یا کسی مفاد سے ٹکرائے۔“

”میرے لئے اور کوئی خدمت.....؟“ سراج نے مسکرا کر پوچھا۔

”آپ کی اور شیخ حامد کی ملاقات اس کے کس آفس میں ہوئی تھی.....؟“

”میرا ذاتی خیال ہے وہ ایک مخصوص آفس تھا جس کو شیخ حامد غالباً خاص خاص موقعوں پر ہی استعمال کرتا ہے۔“ سراج نے ایس پی کے سوال کی گہرائی بھانپ لینے کے باوجود بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

”ایک مشورہ دوں۔ اگر آپ برا محسوس نہ کریں؟“

”میں کسی کے مخلص مشوروں پر کبھی برا نہیں مانتا سر..... اور آپ تو.....“

”اس وقت میں ایک کولیگ اور دوست کی حیثیت سے آپ کو ایک مشورہ دے رہا ہوں۔“ آغا منظور نے ایک طویل سانس لے کر بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم سرکاری آفیس ہونے کے باوجود کبھی کبھی وقت کے دھارے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن ایک تجزیہ میری زندگی کا ٹھوس ہے۔ اگر پولیس افسران مل کر ایک جیسے کی صورت میں کام کریں تو عوام یا پریس بھی ان کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے۔“

”میں آپ سے صد فیصد متفق ہوں سر.....“ سراج نے غلوں دل سے تائید کی۔

”آپ کیا پتہ پسند کریں گے چائے یا کافی.....؟“

”پھر کبھی سہی سر.....“ سراج نے اٹھتے ہوئے کہا پھر کیپ سر پر رکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ایس پی کو سیٹھ کیا اور تیزی سے پلٹ کر اس کے دفتر سے باہر نکل گیا۔ اس کے ذہن میں اس وقت بھی بہت سارے جملے ایسے گونج رہے تھے جو آغا منظور نے میڈم روبی کی سرگرمیوں اور آزاد خیالی کے بارے میں کہے تھے۔ خاص طور پر اس نے جس سرسری انداز میں رینو کلب میں افضل خان اور میڈم روبی کے ایک ساتھ دیکھے جانے والی بات کہی تھی وہ سراج کی نظروں میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی جسے سوچ کر اس کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ بھی بڑی شوخ اور معنی خیز نظر آ رہی تھی۔

”سب ٹھیک ہے صاحب لیکن.....“ لیاقت نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”کبھی وہ نیک حرام وحید واپس آجائے تو مجھے ضرور بتا دیجئے گا۔“

”اگر وہ آج بھی گیا تو تم کیا کرو گے؟“ سراج نے دوستانہ انداز میں سوال کیا۔

”آپ نے اسلحہ کا جو تحفہ دیا اس کا ثرائی بھی لے لوں گا۔“ لیاقت کے جواب میں اس کے اندر کا انسان بھی جھلک رہا تھا۔

”وہ کام میرے ذمے چھوڑ دو۔ تم عثمان کی غیر موجودگی میں گھر کی دیکھ بھال کرتے رہو۔“
”جو حکم صاحب.....“

سراج اندر چلا گیا تو لیاقت حسین بھی گیٹ پر گاڑڈ کو اطلاع دے کر گھر کیلئے روانہ ہو گیا۔
فرحین اس کی راہ دیکھ رہی تھی لیکن لیاقت حسین اس وقت بھی یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ فرحین کی مسکراہٹ کے پیچھے ایک درد کی کک بھی موجود تھی۔

کھانے کے دوران وہ ہمیشہ کی طرح فرحین سے ہنسنے ہنسانے والی گفتگو کرتا رہا۔ جب بستر پر گیا تو اس نے شوخ نظروں سے فرحین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یاد ہے تم نے جاتے ہوئے کیا بات کہا تھا اور میں نے کیا جواب دیا تھا؟“

جواب میں فرحین مسکرا دی پھر لیاقت کو ٹالنے کی خاطر سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے شادی کے بعد سے کبھی کسی بات پر تم کو نہ نہیں بولا جو بات تم نے کہا تمہارا فرحین نے مان لیا، لیکن آج تم کو بھی میرا ایک بات ماننا ہوگی۔“

”تمہارے لئے لیاقت کا جان بھی حاضر ہے دلبر..... بولو کیا بات ہے؟“

”اب ہمارے پاس اوپر والے کا دیا بہت کچھ ہے۔“ فرحین اس کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے بڑے پیار سے بولی۔ ”ہم اسی بستی کے آس پاس کوئی اور اچھا مکان بھی لے سکتے ہیں، میرا مطلب ہے کہ آج ہم صرف دو ہیں لیکن اوپر والے کا کرم ہوا تو.....“ فرحین نے شرما کر جملہ ادھوڑا چھوڑ دیا۔
”کیا کوئی خوشی کا بات ہے جو تم لیاقت سے چھپا رہی ہو؟“ لیاقت نے وارفتگی سے پوچھا۔

”ابھی کچھ نہیں ہے لیکن ہمیں مایوس بھی نہیں ہونا چاہئے۔“

لیاقت کے ذہن میں جو شبہات تھے وہ پھر کلبلانے لگے، لیوں والے معاملے میں شاید گل خان کی تشویشناک باتوں نے ابھی تک اس کے اعصاب پر قبضہ جمارکھا تھا، لیاقت نے فرحین کو پیار سے مخاطب کیا۔

”دلبر..... لیاقت کا جان، کیا تم کو خدا کی ذات پر بھروسہ نہیں ہے؟“

”یہ میں نے کب کہا.....“

”نہ سہی لیکن لیاقت کا دل گواہی دے رہا ہے کہ تمہارا دماغ میں ابھی تک اس پلید کا دھیان ہے جس کا فر کے حتم نے کسی کی زندگی لینے کی خاطر گند اعلم کیا تھا۔“

”ہاں.....“ فرحین نے جھکی جھکی نظروں سے اقرار کیا۔ ”جب سے وہ سفلی والا چکر چلا ہے، ہم کو

ایک دن بھی سکون نہیں ملا، رات کو سوتے میں بھی الٹا سیدھا خواب نظر آتا ہے اور.....“
”خواب بس وہم ہوتا ہے اور آدمی کے اندر خوف کا نام ہے میرا جان۔“ لیاقت نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”کیا وہی نیکی ہمارے کام نہیں آئی، بڑے صاحب نے میری ترقی کر دی، ہمارا تنخواہ بھی ایک دم بڑھا دیا۔ اب میں چوکیدار نہیں بڑے صاحب کا ڈرائیور ہے، ایک پولیس کے بڑے آفیسر نے مجھے اسلحہ اور لائسنس بھی تحفے میں دیا، بیگم صاحب باہر جاتے ہوئے ادھر کی ساری ذمے داری مجھے سونپ گیا ہے، کیا یہ سب اسی نیکی کا نتیجہ نہیں ہے؟ کیا یہ مکان ہمارے لئے خوش قسمتی کا نشانی نہیں ہے.....؟“

”میں تمہارا بات سمجھتا ہے لیکن.....“ فرحین ضبط نہ کر سکی تو اس نے رورو کر خواب کی ساری بات شوہر کو بتادی۔

لیاقت ایک لمحے کو گھبرا گیا، پھر پر اعتماد آواز میں بولا۔ ”تم فکر نہ کرو، اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا، میں گل خان سے بات کر کے کسی مولوی صاحب سے بات کرتا ہوں۔“
”اور اگر تمہارا فرحین کو کچھ ہو گیا.....؟“

لیاقت نے فرحین کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”خدا کیلئے کوئی بری بات زبان سے نہ نکالنا۔ خدا پر بھروسہ رکھو اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا..... اور اگر اس نے ہماری قسمت میں خدا نہ کرے کچھ پریشانیاں لکھ دی ہیں تو وہی اسے ٹال سکتا ہے۔ بندہ ہر حال میں عاجز اور بے بس ہے، قسمت کا لکھا اس کے سوا کوئی نہیں ٹال سکتا۔“

جواب میں فرحین نے زرینہ کی سنائی عائشہ والی کہانی بھی دہرا دی تو لیاقت پھر ایک لمحے کو پریشان ہو گیا، وہ جانتا تھا کہ جادو برحق ہے لیکن اس کو کرنے والا جہنمی ہے۔ تادیروہ فرحین کی پریشانی کے بارے میں غور کرتا رہا، پھر اس نے فرحین سے پوچھا۔ ”گل خان تو ادھر نہیں آیا۔ اس نے گل منگھو پیروالے بزرگ کا نمبر لانے کو بولا تھا۔“

”نہیں..... گل خان بھی نہیں آیا اور زرینہ نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں بولا۔“

”میں ابھی گل خان کے پاس جا کر بات کرتا ہوں، مسجد کے پیش امام بھی اللہ والے ہیں، گل خان کے ساتھ ان سے بھی ملاقات کروں گا۔“

فرحین کچھ نہیں بولی۔ لیاقت نے مقدر میں لکھی جانے والی بات غلط نہیں کہی تھی۔ فرحین نے بھی اپنے شہر میں قرآن اور اس کا ترجمہ اپنی ماں سے پڑھ رکھا تھا، وہ بھی سمجھتی تھی کہ اوپر والے کی مرضی کے بغیر تیز آمدی بھی ایک سوکھے ہوئے پتے کو اس کی جگہ سے نہیں ہلا سکتی لیکن جو خواب وہ دیکھ چکی تھی اس نے ایک عورت کو ضرور الجھا دیا تھا۔

جس گھر میں اس نے قدم جمایا تھا، وہی معمولی گھر اس کیلئے خوش نصیبی کا سبب بھی بن گیا تھا۔ وہ ہر بات سمجھ رہی تھی، سوچ رہی تھی، مگر دل اس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر میں جو خواب اس کی پلکوں تلے گزر چکا تھا اس میں کسی کافر پر تاب گھوش نے اس کے بچے کے بارے میں قربانی والی جو

بات کي تھی اس نے ایک ماں کی مٹا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ابھی وہ ماں نہیں بنی تھی، ایسی کوئی علامت بھی ظاہر نہیں ہوئی تھی لیکن ماں کا ایک مقدس تصور ہر عورت کی طرح شادی کے بعد اس کے اندر بھی وقت کے ساتھ ساتھ اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا، یہ قدرتی امر تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ جب قدرت نے اس کی گود ہری کی اور لڑکا دیا تو وہ اسے پورے تن من دھن سے پال پوس کر بڑا کرے گی۔ اسے اچھی تعلیم دلوائے گی، جب وہ دس جماعتیں پاس کرے گا تو وہ بڑے فخر سے اپنے بیٹے کا ہاتھ تھام کر ایک بار اپنے مغرور سر سر فراز خان کے سامنے ضرور جائے گی، سینہ تان کر بڑے فخر سے کہے گی۔

”دیکھو بابا سر فراز خان..... یہ تمہارا پوتا ہے۔ تم نے جس اولاد کو ایک غریب اور معصوم لڑکی کی خوشیوں کو قدموں تلے چپکنے کی خاطر نکال دیا تھا، یہ اسی لیاقت خان کا خون ہے جو اللہ کی مہربانی سے دس جماعتیں پاس کر چکا ہے، میرے رب نے اسی کے خون کو یہ عزت دی ہے جسے تم نے کل اپنی بات اونچی رکھنے کی خاطر گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ اس ماں کا دل بھی اپنی روایت تلے چل دیا تھا۔“

فرحین کے دل میں اور بھی حسرتیں پردان چڑھ رہی تھیں۔ اگر وہ تصور میں کبھی اپنے چار پانچ سال کے گول مٹول بچے کو کسی پلید پتھر کی مورتی کے قدموں میں قربان ہوتے بھولے سے بھی سوچتی تو اس کی ممتا تڑپ اٹھتی۔ اولاد تو ماں کیلئے وہ نعمت ہوتی ہے جس کو ایک معمولی سی پھانس بھی چھہ جائے تو ماں کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ فرحین ابھی ماں نہیں بنی تھی لیکن اس نے بذات سفلی کرنے والے کی گندی زبان سے جو بات سنی تھی وہ اسے بھی بھولنے کو تیار نہیں تھی۔

فرحین اپنے خیالوں میں محو تھی جب لیاقت حسین چالیس منٹ بعد دوبارہ آگیا۔ وہ گل خان کے ساتھ علاقے کے کسی بزرگ سے پانی پڑھوا کر لایا تھا، بزرگ نے یقین دلایا تھا کہ اس کو گھر کے چاروں کونوں میں چھڑکنے کے بعد اول تو گھٹانے خواب آنا بند ہو جائیں گے۔ بصورت دیگر کوئی جانی پہچانی صورت سامنے آکر اس پلید قوت کو بھاگ جانے پر مجبور کر دے گی۔ خود لیاقت حسین کو بھی اس بات پر اس لئے کچھ کچھ یقین ہو رہا تھا کہ منگھو پیر والے دیوانے سے بھی وہ جن حالات میں ملا تھا اور ناپتا سفید ریش بزرگ جس طرح اسے دیوانے تک لے گیا تھا، وہ باتیں خواب نہیں تھیں۔ ان کے پشت پر اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور شامل ہوگی۔ شاید اسی لئے لیاقت حسین کو اس بات کی تاکید بھی کی گئی تھی کہ وہ دیوانے کے ہاتھ سے ”ریت کی چٹکی“ کھانے والی بات کبھی اور کسی کے سامنے زبان تک نہ لائے۔ لیاقت نے اس کا سچے دل سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔

فرحین لیاقت حسین کے گل خان کے ساتھ آنے پر ایک طرف ہو گئی۔ لیاقت نے گل خان کے ساتھ مل کر پھونکا ہوا پانی مکان کے چاروں کونوں میں بڑی احتیاط سے چھڑک دیا۔ جاتے جاتے جو بات گل خان نے لیاقت حسین سے کہی تھی وہ بھی فرحین نے سن لی تھی۔

”تم خوش قسمت ہے لیاقت جو بابا جی نے تمہارے لئے پانی دم کر دیا اور نہ وہ بستی کے لوگوں سے زیادہ تریاک بات ہی کہتا ہے۔ جو مانگنا ہے خدا سے مانگو..... میں بھی اسی کا محتاج ہوں۔“

”تم منگھو پیر والے بزرگ صاحب سے ملاقات کا نمبر لایا۔“ لیاقت حسین نے یوں ہی فرحین

کو تسلی دینے کی خاطر پوچھ لیا۔

”دو روز سے چکر لگا رہا ہوں لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ ادھر کے ٹھیکیدار نیا نمبر کسی کو نہیں دے رہے۔ کسی کے پاس پرانے نمبر ہیں ان کو بھی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹالا جا رہا ہے۔“

”کوئی خاص وجہ.....؟“

”سمجھ میں نہیں آتا..... بس ادھر کے کرتا دھرتا ہر شخص سے کوئی نہ کوئی ٹال مٹول کر دیتے ہیں۔ میں کل وقت نکال کر پھر جاؤں گا۔“

گل خان چلا گیا تو فرحین نکل کر سامنے آگئی۔ دونوں سونے کے ارادے سے پلنگ پر لیٹے تو لیاقت نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو میری جان۔ اب کوئی پلید تصور میں بھی تمہارے قریب نہیں آئے گا اور اگر وہ آیا تو کوئی رحمانی قوت اس کو دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ فرحین نے شوہر کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پانی ڈالنے کے بعد سے کوئی بات ایسی ضرور ہے کہ میرا دل بھی کم گھبرا رہا ہے۔“

”اللہ کے کلام میں بڑی برکت ہوتی ہے۔“ لیاقت حسین نے صدق دل سے کہا پھر فرحین کو بانہوں کے حصار میں لے کر میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔

وہ رات سکون سے گزر گئی، صبح فرحین نے حسب معمول ناشتہ تیار کیا۔ لیاقت حسین تیار ہو کر نوکری پر جانے لگا تو اس نے ایک بار پھر فرحین کو بڑے پیار سے سمجھایا۔

”تم گھبرا نا..... سب ٹھیک ہی ہوگا ویسے میں نے گل خان کو بول دیا ہے کہ زریہ اپنا کام کاج سے فارغ ہو کر تمہارے پاس آجائے پھر میرے آنے کے بعد ہی گل خان اسے واپس لے جائے گا۔“

”اور اگر زریہ نے گل خان کے آنے کے بعد اس کے پاس جانے کا ضد کیا تو.....؟“ فرحین نے شوخی سے سوال کیا۔ لیاقت حسین اس کی بات کا مطلب سمجھ کر مسکرا دیا، پھر فرحین کے گالوں پر محبت سے ہاتھ پھیر کر اسے خدا حافظ کہتا ہوا ڈیوٹی پر روانہ ہو گیا۔



افضل خان اپنے تین کروں کے کشادہ لکڑی اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اس نے سکون کا سانس لیا، جب تک شیخ حامد شہر میں رہتا، وہ اس کے کاموں میں رات گئے تک مصروف رہتا تھا۔ شیخ حامد جب بھی شہر سے کہیں باہر جاتا، افضل خان کو قبل از وقت آگاہ کر دیتا، چنانچہ آج بھی اس نے شام چھ بجے دفتر سے اٹھتے وقت افضل خان کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا تھا۔

”میں آج تین چار روز کیلئے ملک سے باہر جا رہا ہوں، میری غیر موجودگی میں ان باتوں کا خیال رکھنا جس کیلئے میں نے تاکید کر رکھی ہے۔“

”آپ مطمئن رہیں بک باس، آپ کی غیر موجودگی میں ہمیشہ زیادہ محتاط رہتا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ شیخ حامد نے کسی زہریلے ناگ کی طرح بل کھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”واپسی پر مجھے سب کی تفصیلی رپورٹیں اپنے ایک اہم کارندے سے ملتی رہتی ہیں، بہر حال میرے جانے کے بعد شام چھ بجے کے بعد سے صبح نو بجے تک تم اپنی سوشل لائف انجوائے کر سکتے ہو، لیکن احتیاط شرط ہے۔“

”شکریہ سر!“ افضل خان نے انکساری سے جواب دیا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ایک بات معلوم کرنے کی جرات کر سکتا ہوں؟“

”کیا.....؟“

”کہیں آپ سیٹھ عثمان کی بیرونی سرگرمیوں کا توڑ کرنے کے ارادے تو.....“

”مثبت آپ.....“ شیخ حامد نے اسے تنہی نظر سے دیکھا۔ ”دوبارہ کبھی اس قسم کے ذاتی سوالات کی حماقت نہ کرنا..... ناؤ گیٹ لاسٹ۔“

”سوری سر.....“ افضل خان کسی پالتو کتے کی طرح دم دبا تا پلٹ کر باہر آ گیا۔

اس وقت اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد بھی اس کے کانوں میں بگ باس کا ایک خاص جملہ صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔ ”واپسی میں مجھے سب کی تفصیلی رپورٹیں اپنے ایک کارندے سے ملتی رہتی ہیں۔“ وہ اہم کارندہ کون تھا جو ابھی تک افضل خان کی نظروں میں نہیں آ سکا تھا؟

خاصی دیر تک وہ بگ باس کے جملے کی بازگشت سن رہا، پھر اس نے سر جھٹک کر اس مسئلے کو پس پشت ڈال دیا۔ شیخ حامد نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنی سوشل لائف انجوائے کر سکتا ہے۔

نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے ٹی وی آن کر دیا، پھر شراب اور اس کے ساتھ دیگر لوازمات نکال کر میز پر رکھے اور پینے میں مشغول ہو گیا۔ یہ بات اس نے بہر حال طے کر لی تھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس ”خفیہ آدی“ کا کھوج بھی ضرور نکالے گا جو اس کیلئے کبھی اندھیرے میں سالنسر لگے پستول کی وہ گولی ثابت ہو سکتا تھا جس پر..... تڑپ تڑپ کر مر جانے کا حکم ہوتا تھا۔

تین پیگ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد افضل خان اپنی سوشل لائف کو انجوائے کرنے کی خاطر ان موڈرن اور آزاد خیال لڑکیوں اور خواتین کے ناموں پر غور کرنے لگا جو اس کے اشارے پر کبھی ”نہ“ نہیں کہتی تھیں۔ اس کی نظریں ٹی وی سکرین پر تھیں جس پر فیشن کے مخصوص چینل سے کسی غیر ملکی فیشن شو کی جھلکیاں بڑی تفصیل سے دکھائی جا رہی تھیں۔

ساڑھے سات بجے تک چار پانچ پیگ پینے کے بعد وہ پوری طرح تریک میں تھا، فیشن شو کی ماڈل گرلز جس انداز میں جدید اور مختصر لباس کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھیں وہ افضل خان کی اشتہا کو اور بھڑکا رہی تھیں، اس کے ذہن میں کئی استعمال شدہ چروں کے نام یکے بعد دیگرے ابھر رہے تھے۔ شیخ حامد کی تین چار دونوں کی غیر موجودگی میں وہ اپنی تمام راتیں رنگین بنانا چاہتا تھا۔ اچانک ایک گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک نیا نام بجلی بن کر کودا۔ اس نے

دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت سوا آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے گلاس میز پر رکھ کر کارڈ لیس فون اٹھایا۔ رینو کلب کے نمبر گھمانے لگا۔ اس کے ذہن میں میڈم روبی کا حسین اور گداز جسم کھیلانے لگا۔ میڈم روبی بیوہ ہونے کے باوجود نکلنے ہوئے قد اور ایسے ٹھوس جسم کی مالک تھی جس کے اندر جنس مخالف کیلئے بے پناہ مقناطیسی قوتوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ استعمال شدہ جسموں کے مقابلے میں وہ اب بھی بالکل تروتازہ لگتی تھی۔

شوہر کی موت سے قبل اس کو کبھی کسی پبلک گید رنگ میں شاذ و نادر ہی دیکھا جاتا تھا لیکن شوہر کے انتقال کے بعد اس نے جس انداز میں ہوٹلوں، کلبوں اور تفریحی مقامات پر جانا شروع کر دیا تھا وہ سب کیلئے حیرت انگیز بات تھی۔ وہ ہر کس و ناکس سے بے تکلف ہونے کی عادی نہیں تھی لیکن اس کا لوچ دار اور گداز جسم ہر محفل میں مرکز نگاہ بن جاتا تھا، خاص طور پر ان بڑے لوگوں کیلئے جو دن میں بہت لئے دیئے رہتے تھے، لیکن رات میں اپنی خواب گاہوں کو ہمیشہ نئے نئے جسموں سے گل و گلزار بنانے کے عادی تھے۔

سال سوا سال قبل روبی کے کروڑ پتی شوہر خالد ریاض کا انتقال ہانگ کانگ میں بزنس کانفرنس اینڈ کرنے کے بعد ہوٹل جاتے ہوئے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہوا تھا۔ میڈم روبی کو شوہر کی موت کی اطلاع دی گئی تو وہ پہلی فلائٹ سے شوہر کی لاش وطن واپس لانے کیلئے ہانگ کانگ پہنچ گئی۔ غیر ملکی اور ملکی ایجنسیوں نے بھی میڈم روبی کو احتیاطاً پوسٹ مارٹم کرانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس نے کسی مشورے پر عمل نہیں کیا۔ لاش کو چارٹرڈ پلین سے واپس لانے کے بعد اس نے رسم و رواج کے مطابق سپرد خاک کر دیا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد چار ماہ تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ پھر اس نے شاید اپنے غم کو بھلانے کی خاطر سوشل زندگی اختیار کر لی تھی۔ رینو کلب چونکہ شہر کا سب سے مشہور اور مہنگا کلب تھا اس لئے اس نے وہاں کی رکنیت بھی اختیار کر لی جہاں ممبروں کے سوا کسی اور کو مین گیٹ سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

”ہیلو.....“ تین بار نمبر ٹرائی کرنے کے بعد رینو کلب کی خوبصورت اور نوخیز ریپیشنٹ نے کال ریسیو کی۔ ”ماریا فرام رینو کلب اینڈنٹ یوسر.....“

”کیسی ہو ماریا.....“ افضل خان نے بے تکلفی سے پوچھا، ماریا کو بھی وہ پہلے استعمال کر چکا تھا۔

”اوہ افضل خان۔“ ماریا نے مدہم آواز میں پوچھا۔ ”آج تم کلب نہیں آئے“ کہیں اور مصروف ہو؟“

”اوہ..... نو۔“ افضل خان نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا۔ ”اس وقت بھی ایک آفیشل ڈیوٹی نبھا رہا ہوں، منجبر سے بات کرنی تھی۔“

”بیڈلک.....“ ماریا نے شوخی سے جواب دیا۔ ”منجبر اس وقت کسی کام سے باہر گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں دوبارہ کال کر لوں گا۔“ افضل خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ ماریا

سے میڈم روبی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھنا چاہتا تھا، فیجر سے اس کی موجودگی یا غیر موجودگی کے بارے میں دریافت کرنا زیادہ مناسب تھا، پھر اس سے پیشتر کہ وہ کارڈ لیس آف کرنا ماریا کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”تم جو آفیشل کام کر رہے ہو اس میں اور کون تمہارے ساتھ ہے؟“
”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ آج میڈم روبی بھی ابھی تک کلب نہیں آئی۔“ ماریا نے بے تکلفی سے کہا۔
”سب ہی کا یہ خیال ہے کہ وہ مالدار خاتون تمہارے اندر دلچسپی لے رہی ہے۔“
”تمہارا وہم ہے ورنہ آج تک اس کا کوئی نہ کوئی سکیٹنڈل ضرور مشہور ہو چکا ہوتا۔“
”مجھ سے کچھ چھپانے کی تو.....“

”ڈونٹ لی سلی ماریا.....“ افضل خان نے اس بار قدرے بے زاری کا اظہار کیا، پھر سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔

ماریا نے جس شے کا اظہار کیا تھا وہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ خود افضل خان نے بھی ایک دو موقعوں پر محسوس کیا تھا کہ میڈم روبی اس کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہشمند ہے لیکن ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ یہ بات بھی درست تھی کہ اس وقت بھی اپنے خلوت کدے کو سجانے کی خاطر افضل خان کے ذہن میں اسی خوبصورت بیوہ کا خیال ابھرا جس کے قرب کیلئے وہ بھی بھل رہا تھا۔

ماریا سے رابطہ ختم ہونے کے بعد افضل خان نے گلاس میں پہنی ہوئی شراب حلق میں اندلی پھر کہیں جانے کیلئے اٹھ کر لباس تبدیل کرنے کیلئے پرتول ہی رہا تھا کہ کال بیل کی آواز سن کر چونکا۔
”اس وقت کون آسکتا ہے؟“ افضل خان نے سنجیدگی سے سوچا۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں کسی بن بلائے مہمان سے ملاقات کرنے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود وہ ایسے فرد کے بارے میں نہ سوچ سکا جس کو اس نے آنے کی دعوت دی ہو پھر.....

”ٹرن.....ن.....ن“ کال بیل کو دوسری بار بجایا گیا تو افضل خان نے احتیاطاً ایک پستول اٹھا کر سیف میں اڑسا، پھر اس نے دروازے کے قریب جا کر ”ہیجک آئی“ کے ذریعے آنے والے کو دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ اس وقت دروازے کے باہر اسے جو چہرہ دکھائی دیا وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میڈم روبی کو کوریڈور میں کھڑے دیکھ کر اسے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازہ کھول دیا، کوریڈور میں اسے میڈم روبی کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آیا۔

”میں یہاں آکر آپ کے کسی کام میں مغل تو نہیں ہوئی؟“ میڈم روبی نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ افضل خان نے اسے اندر بلانے کے بعد دروازہ بند کرتے ہوئے سنبھل کر کہا۔ ”میں اس اپارٹمنٹ میں تنہا رہتا ہوں اس لئے آپ.....“
”آپ چاہیں تو اپنا شغل جاری رکھیں۔“ میڈم روبی نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر ایک

صوفے پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں ان چیزوں سے شوق نہیں رکھتی لیکن برا بھی نہیں مانتی“ میرے شوہر بھی اپنے پلانے کے عادی تھے۔“
”کیا آپ نے ان کا بھی ساتھ.....“

”ایک دو بار ان کے اصرار پر ایک آدھ پیگ پی بھی چکی ہوں لیکن مجھے اس سے کوئی رغبت نہیں ہے۔“ میڈم روبی نے افضل خان کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا، پھر ٹی وی پر چلنے والے فیشن شو کی جھلکیاں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا آپ نے ابھی تک.....“

”جی ہاں آپ کا اندازہ درست ہے.....“ وہ روبی کے سراپا حسن پر نظر ڈالتے ہوئے پہلی بار قدرے بے تکلفی سے بولا۔ ”یوں سمجھ لیں کہ میرا کام ایسی نوعیت کا ہے کہ میں شادی کے بارے میں کبھی سوچ ہی نہیں سکا۔“

”میں سمجھ رہی ہوں.....“ روبی نے شوخی سے کہا۔ ”بیوی آجائے تو شوہر پر بندشیں عائد کرنا شروع کر دیتی ہے اور آپ..... آپ جیسے مصروف آدمی کیلئے..... جو شاید خود بھی اپنی دن بھر کی تمام مصروفیات کا علم نہ رکھتا ہو کسی ہاؤس وائف کو افورڈ کرنا بے حد مشکل ہے۔“

افضل خان ترنگ میں ہونے کے باوجود میڈم روبی کے جملے کو سن کر چونکا۔ ”کیا آپ کو میری مصروفیات کا کوئی اندازہ ہے یا محض قیاس اور میرے شوق کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کر رہی ہیں؟“
میڈم روبی نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے کچھ سوچا، پھر خاصی بے تکلفی سے بولی۔
”مسٹر افضل! اب جبکہ میں خود سے آپ تک آگئی ہوں تو میرا خیال ہے کہ ہمیں بے تکلفی سے دوستوں کی طرح گفتگو کرنی چاہئے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”مم..... میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی تصور کروں گا۔“
جواب میں میڈم روبی ایک خاص ادا سے مسکرائی۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم مجھے دوست کی حیثیت سے قبول کر لو گے۔“

”آپ کی ذرہ.....“
”آپ نہیں..... اب تم بھی مجھے تم کہہ کر مخاطب کرو.....“ روبی نے اس کی بات کاٹ دی۔
”دوستوں کے درمیان رسمی تکلفات بھی اچھے نہیں لگتے۔“

افضل خان کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو اس کے اندر نشے کی کیفیت بڑھنے لگی، اپنے لئے اس نے ایک بڑا پیگ تیار کیا پھر اسے ہاتھ میں لے کر میڈم روبی کے صوفے پر آگیا۔
”دوستوں کے درمیان فاصلے بھی اچھے نہیں لگتے۔“ اس نے میڈم روبی کی نشیلی آنکھوں میں جھانکا، پھر ایک ہی گھونٹ میں آدھا گلاس غناٹ پی گیا۔

”آئی ڈونٹ مائنڈ.....“ جواب میں وہ بھی مسکرا دی، پھر قدرے سنجیدگی سے بولی۔ ”بہر حال ایک محدود فاصلہ پھر بھی ضروری ہے۔“
”ایک بات کہوں۔“ افضل خان کے اندر کا شیطان چلنے لگا۔ ”تم..... برا تو نہیں مٹاؤ گی۔“

”کہہ کر دیکھ لو.....“ روبی نے اس کی نشلی آنکھوں کی تہ میں جھانکنے کے بعد کہا۔
”میری خاطر..... جسٹ فار کمپنی سیک..... آدھا پیگ میری خواہش پر پی لو۔“ افضل خان کی آواز کپکپا رہی تھی۔ یہ کپکپاہٹ پہلی بار ہوئی تھی ورنہ وہ قابو میں آئی خوبصورت چیزوں کو جھپٹ لینے کا عادی تھا..... روبی تو اس کے اپارٹمنٹ تک خود بغیر بلائے آئی تھی لیکن کوئی بات تھی جو افضل خان کو اس جسارت کو لگام دے رہی تھی۔

”او۔“ کے اگر تم دوستی کے نام پر صرف آدھے پیگ کی بات کر رہے ہو تو اپنے ہاتھوں سے بنا دو..... مگر اس سے زیادہ کیلئے اصرار نہ کرنا۔ پلیز!“

افضل خان نے اپنا گلاس رکھ کر دوسرے گلاس میں آدھا پیگ بنا دیا سوڈا ملانے لگا تو میڈم روبی نے اسے روک دیا۔

”اسے رہنے دو میں اس کے بغیر ہی پی لیتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میرے شوہر نے بتایا تھا کہ جو لوگ سوڈا ملا کر پیتے ہیں ان کے جسم پر جھریاں جلد..... نمودار ہونے لگتی ہیں ویسے ٹھنڈا پانی ملایا جاسکتا ہے۔“

افضل خان نے روبی کو حیرت سے دیکھا، پھر ٹھنڈا پانی ملانے کے بعد گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”میرے ہاتھ سے صرف ایک گھونٹ مجھے خوشی ہوگی۔“

”سوچ لو افضل خان.....“ وہ نہایت لگاؤ سے بولی۔ ”خوشیوں کی خاطر انسان کو ایک دوسرے کیلئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بعد میں کہیں تمہیں افسوس نہ ہو۔“

”میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں روبی۔“ اس نے بھی جواب میں صرف روبی کہہ کر مخاطب کیا تو..... روبی نے اس کے ہاتھ سے ایک گھونٹ پی لیا، پھر گلاس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

افضل خان پر روبی کے قرب کا نشہ بڑھ رہا تھا لیکن وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تھا اس لئے بہت ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اپنے اپارٹمنٹ میں وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس کا علم دوسروں کو ہو اس کی بدنامی ہو اور اس کی بھنک شمع حامد کے کانوں تک پہنچ جائے۔ اس کے اپارٹمنٹ کے بجائے کوئی اور جگہ ہوتی تو شاید اب تک وہ روبی کو کب کا پچھاڑ چکا ہوتا۔ اس سے پیشتر بھی وہ اپنے واقف کاروں کے ہونٹ یا گھروں کے تنہا کمروں میں ان گنت ایسی خواتین کو بھی روند چکا تھا جو پہلی بار دھوکہ کھا کر کسی ظالم مرد کے فریب کا شکار ہوئی تھیں۔ اس کے بعد یا تو انہوں نے خودکشی کر لی تھی یا پھر اسی لائن پر چلنے پر مجبور ہو گئی تھیں لیکن..... میڈم روبی کوئی عام عورت نہیں تھی۔ افضل خان کے ہاتھوں شکار ہونے کے بعد بھی اگر وہ چاہتی تو اس کی زندگی برباد کر سکتی تھی اس لئے افضل خان بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔

”افضل.....“ میڈم روبی نے کچھ دیر بعد دوسرا چھوٹا گھونٹ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم جانتے ہو کہ میں اس وقت تمہارے اپارٹمنٹ تک کیوں چلی آئی ہوں؟“

”اس لئے کہ میں نے تمہیں دل سے یاد کیا تھا۔“ افضل خان اس کے کچھ اور قریب ہو گیا۔
”میں سمجھ رہی ہوں افضل، شراب زیادہ چڑھ رہی ہو تو کسی شباب کا قرب اسے دو آتشہ کر دیتا ہے لیکن ابھی تم اس قسم کی کوئی جسارت نہیں کرو گے۔“

”پھر.....؟“ افضل خان نے اسے بہکی بہکی نظروں سے دیکھا۔
”پہلے میری ایک درد بھری کہانی سن لو..... اس کے بعد اگر تم نے مرد بن کر میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تو میں شاید تمہیں مایوس بھی نہ کروں۔“

افضل خان اس وقت ایک ہی محبت بھری داستان سننے کے موڈ میں تھا ایسی داستان جو کھلے اوراق پر لکھی ہو اس کی جلد بند نہ ہو جس کے ایک ایک اتار چڑھاؤ پر اسے مکمل اختیار ہو جسے وہ جہاں سے چاہے پڑھ سکتا ہو جس سطر کو چاہے چوم سکتا ہو۔

”اگر میں تم سے وعدہ کر لوں کہ میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کو آمادہ ہوں تو.....؟“
”میں کام ہونے کے بعد دام چکانے کی عادی ہوں اس لئے تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے مشورہ دے رہی ہوں کہ مجھے ایک کمزور عورت سمجھنے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

روبی کی تلخ اور کھری بات سن کر افضل خان کو یوں محسوس ہوا جیسے لذیذ کباب کے درمیان کوئی ہڈی آگئی ہو وہ اندر ہی اندر تملانے لگا اسے نشے کی کیفیت کچھ کر گزرنے پر آسار ہی تھی لیکن ذہن کے ایک کونے میں یہ خیال بھی چھ رہا تھا کہ میڈم روبی کی نفرت اسے عرش سے مٹھیت کر دوبارہ فرش پر لے آئے گی یہ بھی ممکن تھا کہ بگ باس بھی اس کی جسارت کو قائل معافی نہ سمجھتا۔

”ایک بات اور سن لو.....“ اس نے افضل کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بگ باس کا چہیتا ایس پی آغا منظور بھی میرے طلب گاروں میں سے ایک ہے۔ تم نے میرے اعتماد اور دوستی کیلئے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اگر داغدار کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام بھی تمہاری غلطی کے عین مطابق ہوگا۔ شاید اس لئے کہ محبت اور جنگ میں ہر قسم کے ہتھیار کا استعمال جائز ہوتا ہے۔“ آخری جملہ ادا کرتے وقت روبی نے ایک بار پھر بڑی لگاؤ بھری نظروں سے افضل خان کو دیکھا۔

”تمہیں حاصل کرنے کیلئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ وہ گلاس خالی کرتے ہوئے بولا۔ اس کی بھوکی نظریں اس وقت بھی روبی کے جسمانی گداز اور نشیب و فراز پر کسی بھوکے گدھ کی طرح منڈلا رہی تھیں۔

”میرے شوہر کا انتقال کسی اتفاقیہ حادثے کا نتیجہ نہیں تھا۔“ میڈم روبی نے گلاس میں بچی شراب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”باقاعدہ ایک پلاننگ کے تحت کچھ لوگوں نے انہیں اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا۔“

”تمہارے شوہر کا کاروبار کیا تھا؟“ افضل خان نے بے دلی سے دریافت کیا۔
”نام نہیں پوچھو گے؟ ان کا نام خالد ریاض تھا۔“ روبی نے خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ

ہے۔“
افضل خان کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”روبی ڈیر! جب تم نے میرا انتخاب کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ یہاں تک آنے سے پہلے میرے بارے میں کچھ تحقیقات بھی ضرور کر چکی ہوگی؟“

”ہاں..... میں انکار نہیں کروں گی۔ میں مکمل یقین کرنے کے بعد یہاں آئی ہوں اب اگر تم بھی ایک بار دل میں پختہ ارادہ کر لو تو وہ کام تم ہی سب سے زیادہ آسانی سے کر سکتے ہو۔“
افضل خان اس وقت نشے میں تھا اس لئے بات کی گہرائی نہ بھانپ سکا لیکن جب اس کے دوبارہ اصرار پر میڈم روبی کے ہونٹوں پر شیخ حامد کا نام آیا تو پلک جھپکتے میں اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ روبی کا ہاتھ اس نے بوکھلاہٹ میں ایسے چھوڑ دیا جیسے اب تک کسی ناگن کا پھن تھا سے بیٹھا ہو۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر کمرے کے دیوار قالمین پر ادھر ادھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ میڈم روبی نہایت اطمینان سے بیٹھی اس کی کیفیت کا اندازہ لگا رہی تھی۔

دوسری طرف افضل خان عجیب شش و پنج میں پڑ گیا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ شاید شیخ حامد کو اس کے قریب ہونے کے سبب بہت آسانی سے جہنم رسید کر سکتا تھا۔ اس کام کے عوض جو آفر دی گئی تھی وہ بھی اس قدر پرکشش تھی کہ وہ فوری طور پر اس سے دست بردار ہونے کو بھی تیار نہیں تھا۔

”میں اب چلتی ہوں افضل!“ میڈم روبی نے نہایت اطمینان سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے علم تھا کہ تم میرے دشمن کا نام سن کر چکرا جاؤ گے لیکن ابھی بات صرف میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ اگر تم چاہو تو سوچنے سمجھنے کے بعد انکار بھی کر سکتے ہو لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ اس وقت تمہارے اپارٹمنٹ میں میرے اور تمہارے درمیان جو بھی گفتگو ہوئی ہے اسے اپنے ذہن سے بھی کھرچ کر نکال پھینکنا ورنہ اگر میں شیخ حامد کیلئے پچاس لاکھ تمہیں ایڈوائس دے سکتی ہوں تو تمہارے لئے کسی اور کو بھی دو چار لاکھ میں آمادہ کر سکتی ہوں یہ کام زیادہ آسان بھی ہوگا۔ تمہارا ماضی کیا رہا ہے اس کا اندازہ تم خود بھی ٹھنڈے دل سے لگا لیتا..... اوکے..... بائی۔“

میڈم روبی تیزی سے دروازہ کھول کر نکل گئی تو افضل خان نے اسے فوری بند کیا پھر اپنے لئے نیا گلاس تیار کرنے لگا۔ وہ صبح ہونے سے پیشتر کوئی آخری فیصلہ کر لیتا چاہتا تھا جو اس کیلئے نہایت دشوار تھا۔ ایک طرف اگر زندگی تھی تو دوسری طرف موت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک مشکل اور بھی درپیش تھی۔ اگر شیخ حامد ہی روبی کے شوہر کا قاتل تھا تو روبی کے اس کے اپارٹمنٹ تک آنے کی خبر سننے کے بعد وہ اس ملاقات کی گہرائی تک کھوج لگانے کی کوشش ضرور کرے گا اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔



لیاقت حسین کے کہنے کے بموجب گل خان نے بھی زریہ کو تاکید کر دی کہ وہ دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے بعد فرحین کے پاس رہے۔ لیاقت حسین ڈیوٹی کے بعد آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک

قیستی پتھروں کی بیرونی منڈی کے بے تاج بادشاہ تسلیم کئے جاتے تھے۔ کئی غیر ملکی بینکوں میں ان کے کروڑوں ڈالرز اب بھی موجود ہیں جو اب میرے نام ہو چکے ہیں لیکن..... مجھے دولت نہیں اس دشمن کا سر چاہئے جس نے میری زندگی برباد کی.....“
”کتنی پرانی بات ہے.....؟“

”ایک سال سے کچھ اوپر ہو چکا ہے۔“ روبی نے سرد آہ بھری۔
”اور تم اب تک خاموش رہیں کیا اس کی بھی کوئی خاص وجہ تھی؟“

”ہاں..... میں چاہتی تھی کہ دشمنوں کو اس بات کا یقین آجائے کہ میں ان کے ناپاک منصوبوں سے واقف نہیں ہوں.....“ روبی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”آستین کے سانپ کا سر پکھلنے میں اس وقت زیادہ مزہ آتا ہے جب اس کو بے خبری میں ہلاک کیا جائے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے اور تم..... تم یہ کام کر سکتے ہو۔“

”کیا نام ہے اس کا.....؟“

”نام بتانے سے پہلے میں کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہوں.....“ روبی نے اس بار گلاس کی پٹی ہوئی شراب ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتاری پھر بڑے سلیجے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میں نے ماڈرن بننے کا یہ طوق اسی لئے اپنے گلے میں ڈالا ہے کہ اپنے مرحوم شوہر کا انتقام لے سکوں..... میں تمہیں اس کام کیلئے پچاس لاکھ آنکھ بند کر کے دے سکتی ہوں اور..... تمہاری کامیابی کی صورت میں تم سے شادی کرنے کے بعد اپنے نام کی آدمی جائیداد جس کی مالیت کروڑوں میں بنتی ہے تمہارے نام کروں گی۔ تم کو یقین نہ ہو تو میں کسی تھرڈ پارٹی کے پاس جو ہم دونوں سے واقف ہو اپنے عہد کی تحریری ضمانت بھی رکھوانے کو تیار ہوں۔ اس سے قبل کسی کو اپنے جسم سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی اس لئے کہ یہ بدترین گناہ ہے۔“

”تم اس کا نام بتاؤ.....“ افضل خان کو اپنا مستقبل روشن اور تابناک نظر آیا تو اس نے بڑی اپنائیت سے روبی کا ہاتھ تھام لیا۔

”ایک ضروری بات اور قبل از وقت ذہن نشین کر لو..... کام ہونے کے بعد میں فوری طور پر تم سے نکاح کر کے اس ملک کو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر چھوڑ دوں گی بیرون ملک پہنچ کر ہم اپنے ذاتی مکان میں نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

”اس سے زیادہ کسی کی زندگی کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔“ افضل خان لالچ میں جذباتی ہونے لگا۔ ”تم مجھے صرف اس کا نام اور پتا دو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے اس طرح دوسری دنیا کا..... سفر کراؤں گا کہ اس کی روح بھی ششدر رہ جائے گی۔“

”پھر غور کر لو افضل“ کہنا آسان ہوتا ہے لیکن کر گزرتا ہے حد دشوار ہوتا ہے۔“ روبی نے کسمسا کر کہا۔ ”تم انکار کر دو گے تو بات یہیں ختم ہو جائے گی۔ میں کوئی دوسرا کام کا آدمی تلاش کر لوں گی۔ عورت ایک بار جو بات دل میں ٹھان لے پھر اس سے پیچھے ہٹنا اپنی سب سے بڑی توہین سمجھتی

آجاتا تھا اس کے بعد زرینہ چلی جاتی تھی۔

فرحین کو دو روز تک سکون ملنے کے بعد اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ پر تاب گھوش یا وہ جو بھی گندی بلا تھی اب کم از کم اس کے مکان میں چھڑ کے گئے پانی کی وجہ سے نہیں آئے گی۔ لیاقت حسین کے علاوہ خود زرینہ نے بھی یہی کہا تھا کہ اس قسم کی بدروحوں انسان کو ڈرا تو سکتی ہیں لیکن اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ اس وقت بھی وہ فرحین کو یہی سمجھا رہی تھی۔

”تم نے جو کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا، وہی تمہیں خواب میں بھی نظر آ رہا تھا، بھوت پریت اور گندی بلائیں انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ جو خدا کو منظور ہو وہی سچ ہے، ہمارا تمہارا ایمان بھی ہے کہ اس پاک ذات پر یقین کرو جو دونوں جہانوں کا مالک ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”اور تم نے جو عائنہ اور اس کے شوہر والی خوفناک موت کی بات کی تھی، کیا وہ غلط تھی؟“

فرحین نے زرینہ کو یاد دلایا تو وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئی، اس نے جو کچھ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا وہی واقعہ اس نے فرحین کو سنا دیا تھا، اب اس کی تردید نہیں کر سکتی تھی۔

”وہ..... وہ بات بھی غلط نہیں ہے۔“ اس نے فرحین کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔ ”چار ذات کا پلید لوگ جو گندا عمل کرتا ہے وہ بھی کبھی کبھی انسان کا جان لے لیتا ہے مگر اس میں بھی اوپر والے کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عائنہ اور اس کے خاوند کو شہید کا رتبہ مل گیا ہو، سب اوپر والے کی مرضی ہے۔ انسان کو ہر حال میں اپنا فرض پورا کرتے رہنا چاہئے۔ کل کیا ہوگا؟ کیا ہونے والا ہے؟ یہ بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

”زرینہ، ایک بات پوچھوں تم برا تو نہیں مانو گی؟“ فرحین نے ڈراؤنے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی۔

”میں تمہاری کسی بات کا برا کیوں مناؤں گی۔ پوچھو تم کیا پوچھنا چاہتی ہو۔“ زرینہ نے محبت سے فرحین کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”تمہاری شادی کو کتنا سال ہو گیا؟“

”اوہ.....“ زرینہ نے فرحین کی بات کا مفہوم جان کر کہا۔ ”ابھی کل چار سال ہوا ہے لیکن گل خان کی ابھی مرضی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ فرحین نے حیرت کا اظہار کیا۔

”مطلب یہ ہے کہ وہ بولتا ہے کہ عورت ماں بننے کے بعد بچے کا زیادہ خیال رکھتا ہے، اس لئے وہ ابھی ایک سال اور انتظار کرے گا۔“

”اور تم.....“

”میں گل خان سے الگ نہیں ہوں فرحین۔“ زرینہ نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”دنیا کی ہر عورت شادی کے بعد ماں بننا چاہتی ہے، میں بھی چاہتی ہوں کہ میرے گھر میں بھی بچے کے مصوم قہقہے گونجیں لیکن جب شوہر نہ چاہے تو.....“

”اور تو کوئی بات نہیں؟“ فرحین کے اندر تجسس کلبلانے لگا۔

”نہیں..... گل خان ہم کو دل و جان سے چاہتا ہے، مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔“ زرینہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ویسے بھی یہ سب اللہ کی مرضی پر ہے، جب مقدر میں لکھ دے گا تو پھر گل خان بھی مجبور ہو جائے گا۔“

فرحین نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کیا لیاقت بھائی کو بھی جلدی نہیں ہے؟“ زرینہ نے فرحین کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

”نہیں، ایسا بات نہیں ہے لیکن تم ٹھیک بولا۔“ فرحین نے شپٹا کر کہا۔ ”جب تک اوپر والے کو منظور نہ ہو ہم کیا کر سکتا ہے۔“

باتوں باتوں میں آٹھ بج گئے تو فرحین کو لیاقت کی فکر ہوئی، کچھ دیر پہلے گل خان آ گیا تھا۔ اس نے باہر سے آواز دے کر زرینہ سے فرحین کی خیریت بھی پوچھی، یہ بھی کہا کہ لیاقت کے آنے تک وہ فرحین ہی کے پاس رہے۔

”تم پریشان مت ہو۔“ زرینہ نے بھی فرحین کو بے چین دیکھ کر کہا۔ ”لیاقت بھائی خوش قسمت ہے جو ادھر آتے ہی قدرت نے اسے نیکیوں کے سبب اتنی جلدی نواز دیا ورنہ گل خان کو پورے دو سال تک ادھر ادھر دھکے کھانے پڑے تھے۔“

”لیاقت ابھی دس پندرہ منٹ میں آجائے گا۔“ فرحین نے گل خان کے خیال سے کہا۔ ”تم جانا چاہو تو جاؤ، اب تو دو روز سے سکون ہی ہے۔“

”صاحب لوگوں کے باہر جانے کی وجہ سے لیاقت خان بھائی کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔“ زرینہ بولی۔ ”کبھی کبھی گل خان کو بھی کام زیادہ ہو تو دس ساڑھے دس بھی بج جاتے ہیں۔“

”تم کو ڈر نہیں لگتا؟“

”صرف خدا سے ڈرنا چاہئے میری بہن۔“ زرینہ نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ”وہ راضی رہے تو سب راضی، ورنہ انسان کو پھر دنیا میں بھی اس کے گناہوں اور خدا سے بے خبری کی سزا تو ضرور ملتی ہے۔“

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا تو فرحین نے گل خان کے خیال سے کہا۔ ”تم اب جاؤ زرینہ، دو گھر کا فاصلہ تو ہے، لیاقت آ گیا تو ٹھیک ورنہ اگر مجھے ڈر لگا تو تم کو باہر آ کر آواز دے لوں گی۔“

”پکا وعدہ۔“ زرینہ نے اٹھتے ہوئے سوال کیا تو فرحین نے شوخی سے کہا۔

”مجھے خبر تھا، گل خان بھائی کا آواز سن لینے کے بعد تمہارا دل بھی جانے کو بے چین تھا۔“

زرینہ نے جواب میں فرحین کو گلے لگا لیا، وہ اس کے سچ کو ٹال بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد فرحین نے دروازے کو اندر سے بند کیا، پھر لائسن کی روشنی اور تیز کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ دو روز سے سکون کے باوجود وہ قبرستان کی سمت کھلنے والی کھڑکی لیاقت حسین کے آنے کے بعد ہی کھولتی تھی۔ آج بھی اس نے نہیں کھولی، پٹنگ پر لیٹ کر لیاقت حسین کے دیر سے آنے کے

بارے میں سوچنے لگی، دو روز سے وہ جلدی آرہا تھا۔ آج دیر تک رکنا پڑا تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ قدرت نے اس کے ساتھ جو مہربانی کی تھی وہ اس پر بھی شکر گزار تھی۔ اس نے لیاقت کے ڈرائیور ہونے کے بعد اچھے خاصے پیسے بچانے شروع کر دیے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی اگلی تنخواہ تک اس کے پاس کچھ پیسے اور جمع ہو جائیں تو وہ لیاقت سے اصرار کر کے ایک معقول رقم اس کی ماں کو بھی بھیجے گی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کو پیسے کی ضرورت نہیں ہوگی، سرفراز خان کی حویلی میں اس کے پاس دنیا کا دیا بہت کچھ تھا۔ دولت کے گھمنڈ اور چھوٹے بڑے کے فرق کی وجہ سے ہی تو اس نے فرحین کو بھی بحیثیت بہو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا تھا۔ لیاقت سے بھی منہ کھول کر کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اس کی پسند قبول نہیں کر سکتا تو پھر باپ بیٹے کے راستے بھی جدا ہو جائیں گے۔ لیاقت فرحین کو نہیں چھوڑ سکتا تھا، اس لئے اس نے اس کی خاطر باپ کو چھوڑ دیا لیکن اس ماں کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔ اسے فرحین پسند نہ ہوتی تو وہ چوری چھپے اس کی شادی میں بھی شریک نہ ہوتی۔ بعد میں لیاقت نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کیم اس کو شہر کی پسند کے مقابلے میں فرحین زیادہ عزیز تھی۔ اسی کی دعاؤں کی وجہ سے لیاقت کا نصیب جاگ رہا تھا، اسے لیاقت کے پیسوں کی ضرورت بھی نہیں تھی، لیکن دنیا کی ہر ماں کی طرح اس کا بھی لیاقت کی کمائی پر کچھ حق بنتا تھا۔ اولاد کی کمائی کے دس روپے بھی ماں کو بے حد عزیز ہوتے ہیں۔ لیاقت نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا، لیکن وہ اس ذمے داری کو اپنا فرض سمجھ کر پورا کرنا چاہتی تھی اپنی طرف سے اس ماں کو سکون پہنچاتا چاہتی تھی جس نے فرحین ہی کی خاطر اپنے بیٹے کی جدائی کا غم بھی برداشت کر لیا تھا۔ پھر وہ اسے فراموش کس طرح کر سکتی تھی؟

ان ہی خیالوں میں گم نہ جانے کس وقت اسے نیند آگئی، پھر اس نے جو کچھ دیکھا وہ بے حد حسین اور دل پسند تصور تھا۔ اس کے مکان کے صحن میں ایک اڑھائی تین سال کا چاند جیسا معصوم اور حسین گول منول بچہ کھڑا تھا، فرحین کھانا تیار کر رہی تھی، بچہ بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا، فرحین اسے پیار سے میرا بہلو کہہ کر آواز دیتی تو وہ خوش ہو جاتا، پھر اس رنگ برنگے فٹ بال کے ساتھ کھیل میں لگ جاتا جو شاید کسی نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ خواب دیکھنے کے باوجود فرحین کا دل کسی ماں کی خوشیوں سے سرشار ہو رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی اپنا کام کر کے اس بچے کے قریب جانا چاہتی تھی جو اسے خوابوں میں مل گیا تھا۔ وہ اسے اپنی ممتا کے جذبات سے اپنی بانہوں میں سیٹھ کر، اس کے گول گول روئی جیسے نرم گالوں کو چومنا چاہتی تھی۔ اپنی ممتا کی مہر ثبت کرنا چاہتی تھی لیکن پھر اس نے اچانک بچے کے رونے کی آواز سنی تو تڑپ کر اس کی طرف نظر اٹھائی۔

وہ منظر اس قدر روح فرسا اور ہولناک تھا جسے دیکھ کر وہ ساری جان سے لرز اٹھی۔ اپنی جگہ دم سادھے کھڑی، پھٹی پھٹی نظروں سے اپنی بے بسی کا تماشا اس طرح دیکھتی رہی جیسے وہ خوف سے پتھر کا بت بن گئی ہو۔ معصوم بچہ زمین پر بے بس پڑا اور ہاتھ اور ایک تنگ دھڑنگ آدی اس کے اوپر چھرا لئے بیٹھا تھا۔ اس نے پھرے والا ہاتھ بلند کیا تو فرحین نے چیخا چاہا لیکن اس کی آواز جیسے سینے میں گھٹ کر دم توڑ گئی، لیکن..... قبل اس کے کہ وہ مخوں شیطان مفت آدی بچے پر چھرے سے وار

کرنا اچانک لیاقت نے پشت سے آکر اس کا ہاتھ تھام لیا، پھر وہ آدی جیسے چھوڑ کر ہو گیا۔ لیاقت کے ہاتھ گلنے ہی حیرت انگیز طور پر جیسے فضا میں تحلیل ہو گیا۔ فرحین نے بچے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کہیں نظر نہ آیا۔ وہ گھبرا کر صحن کی طرف دوڑا تو دروازے سے ٹکرا کر گر گئی پھر.....

لیاقت کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ باہر دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ فرحین ہڑبڑا کر اٹھی، اس نے لپک کر دروازہ کھولا۔ لیاقت کے قدم اندر رکھتے ہی اس سے بے تحاشا لپٹ کر روتے ہوئے بولی۔

”تم..... تم ٹھیک وقت پر آگیا ورنہ وہ..... وہ.....“ فرحین کا ذہن ابھی تک خواب کے زیر اثر تھا۔ ”وہ میرا بہلو کو ذبح کر دیتا.....“

”لیاقت کی جان..... تم کس کی بات کر رہی ہو.....؟“ لیاقت نے تعجب سے سوال کیا۔

”وہی کا فر کا ختم جو.....“ فرحین یک لخت ہوش میں آگئی، اس نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔ وہ یقیناً

کچھ دیر پہلے کوئی عجیب اور ڈرانا خواب دیکھ رہی تھی لیکن اس نے لیاقت کو بھی دیکھا تھا جس نے سامنے آتے ہی اس مخوں کا ہاتھ نہ پکڑ لیا تو شاید وہ بچے کو مارنے میں کامیاب ہو جاتا۔ بعد میں لیاقت بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا، پھر اسی کی آواز سن کر وہ ہولناک خواب ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بڑی حیرت سے لیاقت کو دیکھنے لگی۔ اس نے بھی گل خان کے ساتھ دم کیا ہوا پانی مکان کے چاروں کونوں میں ڈالنے سے پہلے یہی کہا تھا کہ جس بزرگ نے وہ پانی دم کیا تھا اس نے یہی یقین دلایا تھا کہ یا تو اب کوئی عفریت اس گھر کے اندر قدم رکھنے سے گریز کرے گا یا کوئی اس کے سامنے آکر اسے بھاگنے پر مجبور کر دے گا۔ یہی ہوا تھا کہ لیاقت کے پشت سے دیو بجھ لینے کے بعد ہی وہ تنگ دھڑنگ آدی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

”..... یہ سب کیا ہو رہا ہے لیاقت؟“ فرحین کمرے میں آکر دوبارہ لیاقت سے لپٹ کر بولی۔ ”میں نے آج پھر ایک خواب دیکھا تھا۔“ اس نے شوہر کو تفصیل بتاتے ہوئے بڑی معصومیت مگر حیرت سے یقین دلایا۔ ”میں نے تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ تمہارے سوا کوئی اور نہیں تھا جس نے اس کا فر کا بچے کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میری بات کا یقین کرؤ میں تم سے جھوٹ نہیں کہہ رہی۔“

”ہم کو تمہاری باتوں کا یقین ہے دلبر..... تم سچ بول رہی ہو۔“ لیاقت نے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ ”سب خدا کا مجرہ اور اس نیک بندے کی کرامت ہے جس نے مجھے پانی دم کر کے دیا تھا۔ اسی کی دعاؤں کا اثر ہے کہ قدرت نے میرے کسی ہم شکل کو بھیج دیا اور وہ پلید ڈر کر بھاگ گیا۔“

اب شاید وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔

”آج تمہیں دیر کیسے ہو گیا؟“ فرحین نے پوچھا۔

”سراج صاحب اپنے ساتھ لے گیا تھا۔“

”خیریت تو ہے؟“

”ہاں.....“ لیاقت حسین نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں پولیس میں بھرتی ہو جاؤں

رات ٹھیک پونے آٹھ بجے لیاقت حسین نے سارے کام نمٹا کر بوڑھے مالی بابا غفور کو اپنے جانے کی حسب معمول اطلاع دی تو غفور نے مسکرا کر کہا تھا۔

”لیاقت پتر..... تو یہ روز روز مجھے جانے کی خبر کیوں دیتا ہے؟ گارڈ کو بول کر چلا جایا کر۔“
”اس کو بھی بول کر جاتا ہوں چاچا“ لیکن تم سب سے پرانا آدمی ہے میرا بزرگ بھی ہے اس لئے میں تم کو بھی بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

”خدا تجھے سلامت رکھے پتر..... میں نماز میں بھی تمہارے لئے دعا کرتا ہوں۔“
”سب تمہاری دعاؤں کا نتیجہ ہے چاچا۔ اسی لئے تو تم کو گھر کا بڑا مانتا ہوں۔“
لیاقت حسین غفور چاچا کی دعا لے کر نکلا، گیٹ کے ڈیوٹی گارڈ کو بھی اپنی روانگی کا کہہ کر وہ جانے لگا تو سراج کی گاڑی دیکھ کر رک گیا۔ وہ گیٹ کے باہر اپنی گاڑی موڑ رہا تھا۔ لیاقت کو دیکھ کر سراج نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”کہاں جا رہے ہو لیاقت.....؟“
”ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہا ہوں صاحب۔“
”گاڑی میں بیٹھو میں تمہیں راستے میں ڈراپ کر دوں گا۔“
لیاقت تھوڑا سا ہچکچایا، پھر سراج کے اصرار پر اس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ کر پوچھا۔
”آپ کب آئے تھے صاحب.....؟ اور باہر ہی باہر سے واپس بھی جا رہے تھے۔“
”ابھی دو منٹ پہلے..... لیکن ایک ضروری کال آگئی تو اب اس کام کیلئے ڈیوٹی دینے جا رہا ہوں۔“

”کیا آپ لوگوں کا ڈیوٹی دن رات کا ہوتا ہے؟“
”نہیں..... ایسا نہیں ہے۔“ سراج نے اسے سمجھایا۔ ”دفتر کے اوقات مقرر ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی قانونی معاملہ پیش آجائے تو پھر دن ہو یا رات، کسی وقت بھی اسے دیکھنا بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔“

”آپ اس وقت اکیلے جائیں گے؟“ لیاقت نے حیرت سے سوال کیا۔
”ہاں.....“ سراج نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”کسی کی دورہ کر صرف نگرانی کرنی ہے ضرورت محسوس ہوئی تو قریبی قحانے سے مدد بھی آجائے گی۔“ پھر پھر کر سراج نے لیاقت سے کہا۔ ”تم کو اگر گھر جانے کی جلدی نہ ہو تو تم بھی چلو، مشکل سے کھنے آدھے کھنے کا کام ہے واپسی میں میں تمہیں تمہارے گھر کے قریب چھوڑ دوں گا۔ کیا خیال ہے؟“

سراج کا انداز دوستانہ تھا اس لئے لیاقت نے انکار بھی نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ایک پولیس آفیسر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کسی کی نگرانی کے شوق نے بھی اسے اکسایا۔ سراج کی پیشکش بھی اس کیلئے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی۔

دس منٹ بعد سراج نے شہر کے پوش علاقے میں پہنچ کر اپنی گاڑی ایک ایسی جگہ پارک کی

تو زیادہ کامیاب ہو سکتا ہوں۔“

”ایسا مت کرنا۔“ فرحین گھبرا کر بولی۔ ”میں نے سنا ہے کہ پولیس کسی کا دوست نہیں ہوتی، تم بھی پولیس بن کر ہمارا دوست نہیں رہے گا۔“

لیاقت اس کی سادگی پر ہنس دیا، تادیر وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، فرحین خود اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ زریںہ کی کچھ باتیں اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تھیں، یہ کہ خدا کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ خدا کے سوا بندے کو کسی اور سے نہیں خوفزدہ ہونا چاہئے۔ وہی مسبب الاسباب ہے۔ لیاقت سے بار بار مکان تبدیل کرنے کے حوالے سے بھی اس نے طے کر لیا تھا کہ اب کا تقاضا نہیں کرے گی۔ اس کے مقدر میں جو لکھ دیا گیا تھا وہ اس مکان میں بھی پورا ہو سکتا تھا، جگہ بدل دینے سے قسمت کا حال یا مقدر کا لکھا نہیں بدل سکتا۔

لیاقت رات گئے تک فرحین کی دل جوئی کرتا رہا، پھر فرحین نے دلی زبان میں اس کی ماں کو رقم بھیجنے کی بات کی تو لیاقت حسین کو یوں لگا جیسے فرحین نے اس کے دل کی خواہش پڑھ لی ہو۔ فرحین کی محبت اور اس کا وقار اور بلند ہو گیا۔ پھر اس نے رقم کے ساتھ فرحین کو بھی مہینے پندرہ دن کیلئے اپنے شہر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا، اس نے فرحین سے یہ بات کہی تو وہ یک لخت سنجیدہ ہو گئی۔
”تم ساتھ نہیں چلے گا؟“

”ادھر صاحب اور بیگم صاحب کی غیر موجودگی میں میرے ذمے داری بڑھ گئی ہے اور اب سراج صاحب بھی ہم پر مہربان ہو گیا ہے۔“ لیاقت حسین نے اسے سمجھایا۔ ”تم رقم لے کر خود چلی جاؤ تو میری ماں کو بھی خوشی ہوگی، تمہارے گھر والوں کو بھی خوشی ہوگی۔ میں گل خان سے بات کروں گا، وہ بتا رہا تھا کہ شاید ہفتہ دس دن بعد وہ اور زریںہ بھی جانے والے ہیں۔ تم ان دونوں کے ساتھ چلی جاؤ تو مجھے پریشانی بھی نہیں ہوگی۔ صاحب لوگوں کے آجانے کے بعد میں اگلے سال تمہارے ساتھ ضرور چلوں گا، مجھے بھی ماں کی یاد آتی ہے۔“

”میرے چلے جانے کے بعد تمہیں کھانا کون بنا کر دے گا۔ کون تمہارا خیال رکھے گا؟“
”ادھر صاحب کے بیٹکے پر بھی دور روٹی کھا سکتا ہوں، میری فکر مت کرو لیکن واپس جلدی آ جانا ورنہ لیاقت کا دل تمہارے بغیر اداس رہے گا۔“

فرحین نے اس کی بات مان لی۔ وہ باتیں کرتے کرتے سو گئی تو لیاقت ان باتوں پر غور کرنے لگا جن کا تذکرہ ڈی ایس پی سراج نے کیا تھا۔ اس نے بھی حیرت اور تعجب کا اظہار کیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے ان تمام باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس کے اٹنے ہاتھ پر فرحین سر رکھے ہوئے تھو خواب تھی۔ سیدھے ہاتھ سے لیاقت اپنے پیٹ کی اس جگہ کو بار بار ٹٹول کر محسوس کر رہا تھا جس کے پارے میں سراج نے بھی سوال کیا تھا، لیکن لیاقت حسین نے ان نشانات کو پرانا بتا کر بڑی خوبصورتی سے بات کو ٹال دیا تھا۔

جہاں سے وہ دور دور تک دیکھ سکتا تھا۔ لیاقت نے گاڑی سے اترنے کی خاطر دروازہ کھولا چاہا تو سراج نے اسے روک دیا، پھر سامنے ایک چار منزلہ گھوڑی اپارٹمنٹ کی سمت اشارہ کر کے بولا۔ ”ہمیں یہیں بیٹھ کر سامنے کے اس اپارٹمنٹ کی نگرانی کرنی ہے جہاں باہر مدھم روشنی کا نیلا بلب روشن نظر آ رہا ہے۔“

”مگر..... یہاں سے تو آپ اس کے اندر جھانک کر کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتے۔“ لیاقت نے معصومیت سے کہا تو سراج ہنس کر بولا۔ ”ہمیں اس کے اندر جھانک کر دیکھنا ہی نہیں ہے لیکن ایک خاتون پر نظر رکھنی ہے جو شاید کچھ دیر بعد اپنی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں آئے گی، کس اپارٹمنٹ میں جاتی ہے یہ سب کچھ ادھر گاڑی میں ہی بیٹھے بیٹھے دیکھنا ہے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا صاحب۔“ لیاقت کے اندر تجسس ابھرنے لگا۔ ”وہ کس وقت آتی ہے؟ کس وقت جاتی ہے؟ وہ تو آپ ادھر بیٹھے بیٹھے دیکھ سکتے ہیں لیکن وہ کس منزل پر کس کے مکان پر جائے گی؟ یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوگی؟“

”جس آدمی نے مجھے اطلاع دی ہے وہ سادہ لباس میں بلڈنگ کے آس پاس کہیں موجود ہے عورت بلڈنگ میں کہاں جاتی ہے یہ دیکھنا اس کی ڈیوٹی ہے جس کی اطلاع وہ مجھے موبائل پر دے گا۔“

لیاقت کے ذہن میں اس عورت اور نیلے بلب والی عمارت کے سلسلے میں بھی بہت سے سوالات ابھر رہے تھے لیکن اس نے خود پر کنٹرول رکھا ایک ہی دن میں وہ ان معاملات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ شاید سراج بھی اس کی کریدنے والی باتیں پسند نہ کرتا۔ اس لئے لیاقت نے بھی اپنی توجہ اسی عمارت کے صدر دروازے کی طرف منتقل کر لی۔

سات آٹھ منٹ بعد ایک چمپاتی قیمتی گاڑی اسی عمارت کے قریب آ کر رکی۔ گاڑی کی روشنیاں بند کرنے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا جو عورت اس میں سے باہر آئی وہ حسین کھلانے کی مستحق تھی اس کے جسم پر قیمتی لباس موجود تھا۔ تیز قدم اٹھاتے وہ عمارت کے اندر داخل ہوئی تو سراج نے کہا۔

”یہی وہ خاتون ہے جس کی نگرانی کرنی ہے لیکن تم میری ایک بات کا خیال رکھنا جب تک میں نہ کہوں تم گاڑی سے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کرو گے۔“

”ٹھیک ہے صاحب.....“ لیاقت نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

جس سڑک پر وہ اپارٹمنٹ واقع تھا اس پر برائے نام ٹریفک نظر آرہی تھی دور دور تک کوئی دکان نہیں تھی اس لئے کوئی راہ گیر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف ایک عجیب سا دیران سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ گاڑیوں کے آنے جانے کا سلسلہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیاقت خاموش بیٹھا اس گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے ایک خوبصورت خاتون اتر کر عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ دس منٹ اور گزر گئے لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ سراج کس وجہ سے اس عورت کی نگرانی کر رہا تھا؟

دس منٹ بعد لیاقت نے ایک ویگن نما گاڑی کو اس عمارت اور اس کے بعد دوسری عمارت کی درمیانی پتلی سڑک پر آ کر رکنے دیکھا، ویگن کی لائٹس بجھادی گئیں لیکن کوئی اس میں سے اتر نہیں۔ اس ویگن کو بڑی سڑک سے تقریباً دس فٹ دور ہی روکا گیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب یہاں کوئی نہ کوئی ہنگامہ بھی ہو سکتا ہے؟“ سراج کی بات سن کر لیاقت چونکا۔

”کیسا ہنگامہ صاحب.....؟“ اس نے مدھم آواز میں سراج سے پوچھا۔

”ویگن کی لائٹس بند ہونے کے بعد کوئی اس سے باہر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی جو خاتون اندر گئی ہے یہ ویگن اسی کے تعاقب میں آئی ہے۔ ممکن ہے ہماری طرح وہ بھی اس کی نگرانی کر رہے ہوں..... یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے خاتون کی واپسی کے بعد اسے اغوا کرنے کی کوشش بھی کی جائے۔“

”اغوا..... وہ کیوں.....؟“ لیاقت نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کی وجہ بعد میں معلوم ہوگی فی الحال تم میری ہدایت پر عمل کرنا۔ گاڑی نے نیچے نہ اترنا۔“ سراج نے اسے دوبارہ تاکید کی۔

لیاقت سنبھل کر بیٹھ گیا، سراج کی بات سن کر اسے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک منٹ بعد ہی سراج کے موبائل پر سنگل موصول ہوا۔

”ٹھیک ہے..... میں نے بھی اسے دیکھ لیا ہے..... نہیں کسی اور کوئی فی الحال بلانے کی ضرورت نہیں..... میں دیکھ لوں گا۔ چاہو تو تم بھی دور دورہ کر تعاقب کرنا لیکن میری اجازت کے بغیر کوئی کارروائی نہیں ہوگی..... بائی۔“ سراج نے بات ختم کر کے احتیاطاً اپنا سروس آٹو میک پستول نکال کر گود میں رکھ لیا۔

دونوں کی نگاہیں مطلوبہ عمارت کے صدر دروازے پر مرکوز تھیں۔ وقت سست رفتاری سے گزرتا رہا، پھر کوئی تقریباً چالیس منٹ کے بعد وہی خوبصورت خاتون عمارت کے صدر دروازے سے باہر آئی، گاڑی کے قریب جا کر وہ دروازہ کھولنا چاہتی تھی لیکن اچانک اس کی گاڑی کے عقب میں چھپے دو بٹے کئے نقاب پوش برق رفتاری سے نکل کر خاتون کی طرف لپکے ایک نے اسے پشت سے دیوچ لیا، دوسرا ہاتھ میں پستول لئے دائیں بائیں کی نگرانی کر رہا تھا۔ سراج اپنی گاڑی میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا، لیکن لیاقت حسین برق رفتاری سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سراج ایک لمحے کو گھبرا گیا، پھر موقع کی نزاکت محسوس کر کے وہ بھی اپنے سروس آٹو میک پستول کے دستے پر گرفت مضبوط کرتا لپک کر باہر نکل گیا۔ اتنی دیر میں لیاقت حسین دوڑتے ہوئے اس آدمی کے سر پر پہنچ گیا جو خاتون کے دیوچے بندوبست کی طرف لے جا رہا تھا، پستول والے نے اسے لٹکا کر دور رہنے کی دھمکی دی تھی لیکن لیاقت حسین کا ہاتھ فضا میں بلند ہو کر دوسرے آدمی کی کپٹی پر اس شدت سے پڑا کہ وہ عورت کو چھوڑ کر سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے شخص نے لیاقت حسین پر یکے بعد دو فائر کئے۔ ایک

اندر تھانے کی پولیس بھی ایبویلنس کے ساتھ آگئی۔ سراج کی ہدایت پر دونوں آدمیوں کو جو بے ہوش کی حالت سے دو چار تھے، دونوں کو ایبویلنس میں ڈال دیا گیا، بندویں کو ایک پولیس والا سٹارٹ کر کے تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

”آپ تو خیریت سے ہیں سر۔“ تھانے سے آنے والے سب انسپکٹر نے دریافت کیا۔

”ہاں..... میں ٹھیک ہوں، تم جا کر ان دونوں کو لاک اپ کر دو لیکن میرا نام درمیان میں نہ آنے پائے۔ تم نے خود گشت کے دوران میں ان دو افراد کو ایک خاتون کو اغوا کرتے دیکھا تھا۔ زخمی خاتون کو بھی تم نے اپنے کسی آدمی کے ذریعے اس کی کار میں قریبی ہسپتال روانہ کر دیا ہے۔ اس کی خبر گیری کو بھی تمہارے ذمے ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ساری کارکردگی کا پورا کریڈٹ تمہیں ملے۔“

”شکریہ سرا“ سب انسپکٹر نے بڑی سعادت مندی سے سراج کا شکریہ ادا کیا۔ سراج نے اسے خاتون کا نام بھی بتا دیا۔ یہ بھی کہا کہ اسے بھی نہیں معلوم کہ زخمی خاتون کس عمارت سے باہر آئی تھی اور اسے کیوں اغوا کیا جا رہا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہو اس لئے کہ جس خاتون کا اغوا کرنے کی کوشش کی گئی وہ بے حد مالدار عورت ہے۔ اسی کی مزاحمت پر اسے زخمی کیا گیا تھا۔“

سب انسپکٹر کے جانے کے بعد سراج کے ذہن میں پھر لیاقت حسین کا تصور ابھرا۔ اس نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا وہ کسی سائنس فکشن فلم کا ایک حصہ تو قرار دیا جاسکتا تھا لیکن عملی زندگی میں اس قدر عجیب خیز..... ناقابل یقین اور حیرت انگیز صورت حال کم از کم سراج کی آٹھ سالہ پولیس سروس میں پہلے کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ وہ اسے صرف حیرت انگیز واقعہ ہی قرار دے سکتا تھا۔

سراج گاڑی میں آکر بیٹھا تو لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

”صاحب..... آپ جس خاتون کیلئے آئے تھے وہ کدھر گئی؟“

”لیاقت حسین..... میری ایک بات غور سے سنو۔“ سراج اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”تم میرے ساتھ ضرور آئے تھے لیکن اب تم کسی خاتون کے بارے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولو گے اس بارے میں ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاؤ گے۔ یہ میرا حکم ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب..... میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔“ لیاقت حسین نے سادگی سے جواب دیا۔

اس وقت اپنے گھر میں بھی وہ انہی خیالوں میں گم تھا جب پیٹ کھلانے کی خاطر اس کا سیدھا ہاتھ قیض کے اندر چلا گیا۔ دو مقام پر اسے اپنے پیٹ کی جلد پر ایسے زخم محسوس ہوئے جو بھر چکے تھے لیاقت حسین کو خود بھی تعجب ہوا۔ اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر اس نے سوتی ہوئی فرمیں کے سر کے نیچے سے ہاتھ نکالا، پھر لائینلے کر صحن میں آیا اور تیز روشنی میں جائزہ لیا تو خود بھی حیرت کا شکار ہو گیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے وہ دو مندرل گہرے زخموں کے ایسے نشان بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا جو اس سے پیشتر اسے کبھی نہیں نظر آئے تھے وہ بڑی دیر تک ذہنی کشش میں مبتلا رہا۔ ذہن کو کربد تار رہا۔ حیرت کے عالم میں ان مندرل زخموں کے بارے میں سوچتا رہا لیکن ایسا کوئی حادثہ اسے

کوئی نشانہ چوک کر خاتون کے جسم پر کہیں لگی تو وہ لہرا کر گاڑی کے قریب ہی گر پڑی۔ لیاقت نے جنونی کیفیت میں دوڑ کر ہسپتال والے کو پکڑنا چاہا تو اس نے دو فائر مزید کر دیئے۔ ہسپتال میں سائلنسر فٹ ہونے کی وجہ سے صرف ٹچ..... ٹچ کی آواز ہی ابھری تھی جسے سراج نے سن لیا تھا۔ وہ ایسی پوزیشن میں نہیں تھا کہ جوابی فائر کرتا اس لئے کہ سامنے لیاقت حسین تھا، پھر بھی بلند آواز میں ہسپتال والے کو لکھارا۔

”رک جاؤ ورنہ شوٹ کر دوں گا۔“

عمارت سے ایک سادہ لباس والا بھی دوڑتے ہوئے باہر نکلا، لیکن اسے بھی دیر ہو چکی تھی، قریب سے دو فائر ہونے کے بعد سراج کو یقین تھا کہ لیاقت حسین زندہ نہیں بچے گا لیکن اس وقت اس کی نگاہیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب لیاقت کے بجائے ہسپتال والا دردناک آواز حلق سے خارج کرتے ہوئے زمین پر گرا۔ لیاقت حسین بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا۔

”خاتون بری طرح زخمی ہے صاحب۔“ سادہ لباس والے نے سراج کو انعام کیا۔

”تم اسے اسی کی گاڑی میں لے کر ہسپتال پہنچو میں آتا ہوں۔“ سراج نے اسے حکم دینے کے بعد لیاقت حسین کی طرف دیکھا، جس کی آنکھ سے ایسا تاثر ابھر رہا تھا جیسے وہ خواب کی حالت سے دو چار ہو وہ خود سے بھی انجان نظر آ رہا تھا۔

”لیاقت حسین، تم ٹھیک تو ہو؟“ سراج نے قریب جا کر اسے جھنجھوڑا تو وہ اس طرح چونکا جیسے کوئی خواب ٹوٹ گیا ہو۔

”کک..... کیا ہوا صاحب؟“ اس نے نارمل انداز میں سراج سے سوال کیا۔ ”کیا وہ لوگ خاتون کو اغوا کر کے لے گئے؟“

سراج کو اس کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔ اس نے فوری طور پر لیاقت کی قیض پر نظر ڈالی وہاں اسے خون کا کوئی قطرہ بھی نظر نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی نظر ہسپتال سے چلائی جانے والی گولیوں کے خالی خول پر پڑی جو لیاقت کے قدموں کے قریب ہی پڑے تھے۔ سراج چکرا کر رہ گیا۔ اس نے لیاقت کی قیض اونچی کر کے اپنا تجسس دور کرنے کی کوشش کی تو اس کے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ لیاقت حسین کے پیٹ پر دو ایسے واضح نشان موجود تھے جو گولی لگنے کے بعد مؤثر علاج کے بعد بھرتو جاتے ہیں لیکن اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ سراج نے قیض چھوڑ کر لیاقت کو تیز نظروں سے گھورا۔

”میں نے تمہیں گاڑی سے اترنے سے منع کیا تھا..... یا وہ تمہیں؟“

”یاد ہے صاحب لیکن میں..... میں شاید آپ کو دشمن کے قریب دیکھ کر آپ کی خاطر باہر آ گیا تھا۔“ لیاقت نے پلکیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

سراج نے اسے دوبارہ گاڑی میں جا کر بیٹھنے کا حکم دیا تو لیاقت خاموشی سے قدم اٹھاتے واپس جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سراج نے فوری طور پر قریبی تھانے کو حادثے کی اطلاع دی تو دس منٹ کے

یاد نہیں آیا جس کی روشنی میں وہ ان زخموں کے بارے میں اپنے آپ کو مطمئن کر سکتا۔ پھر نیند پوری کرنے کیلئے وہ دوبارہ فرصین کے قریب آکر لیٹ گیا، کچھ دیر اس کا ذہن بھٹکتا رہا، پھر وہ گہری نیند سو گیا۔

دوسرے دن لیاقت کے ذہن کو دو حیرت انگیز جھٹکے اور برداشت کرنے پڑے۔ صبح جب وہ ڈیوٹی پر جانے سے قبل نہانے گیا تو اس نے نفسیاتی طور پر پھر پیٹ کے زخموں کو دیکھنا چاہا لیکن اس کا ذہن ایک لمبے کون ہو گیا۔ کل جن زخموں کو اس نے روشنی میں پورے ہوش و حواس کے عالم میں دیکھا تھا اس وقت ان کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس نے لیاقت حسین کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ وہ حسب معمول نہا دھو کر ڈیوٹی پر چلا گیا، دن بھر اپنے کاموں میں مشغول رہا۔ اسے سراج کا انتظار تھا، وہ آتا تو اس خاتون کے بارے میں پھر اس کو کیریدنے کی کوشش ضرور کرتا، لیکن اس دن سراج نہیں آیا۔

ٹھیک پونے آٹھ بجے دو کاموں سے فارغ ہو کر گھر آیا تو راستے میں گل خان اپنے مکان کے سامنے پتھر کی چوکی پر بیٹھا شاید اسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ رکی علیک سلیک کے بعد گل خان نے اسے ایک اور حیرت انگیز اطلاع دی۔

”آج ہم پھر جہارے لئے نمبر لینے ادھر منگھو پیر گیا تھا لیکن..... وہاں تو میدان بالکل صاف تھا نہ کوئی چھو لدا رہی تھی نہ ہی لوگوں کا جھوم۔ میں نے ایک دو آدمیوں سے معلومات کیا تو پتا چلا کہ وہ بزرگ چار چھ روز پہلے ایسا گیا کہ پھر واپس پلٹ کر نہیں آیا۔ ادھر ہی ایک بوڑھے ناپیتا سے بھی ملاقات ہوئی وہ عجیب بات کہہ رہا تھا۔“

لیاقت ناپیتا بوڑھے کے حوالے پر چونکا۔ ”کیا کہہ رہا تھا وہ.....؟“

”وہ کہہ رہا تھا کہ دیوانہ جس کام سے وہاں کسی پروانے کا انتظار کر رہا تھا، اسے نواز کر چلا گیا۔ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔“

لیاقت حسین کے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا جب ایک ناپیتا بوڑھے ہی نے اسے دیوانے کے پاس لے چلنے کی درخواست کی تھی۔ اس وقت بھی اس نے یہی کہا تھا کہ نہ جانے وہ دیوانہ کس ارادے سے اور کس کے انتظار میں ادھر دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ لیاقت کا خیال تھا کہ اسے اور ناپیتا کو بھی بغیر نمبر کے اندر نہیں جانے دیا جائے گا، مگر کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اندر جا کر ناپیتا سستانے کے بہانے چھوٹی چھو لدا رہی کے باہر رک گیا تھا، لیاقت کو اندر بھیج دیا جہاں دیوانے کے ہاتھوں کو شاید پہلی بار حرکت میں دیکھا گیا، اس نے آنکھیں کھولے بغیر اٹھنے لگے ہاتھ سے خاک کی چٹکی اٹھا کر لیاقت کے منہ میں ڈال دی، پھر صبح پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ واپسی پر لیاقت حسین نے بوڑھے ناپیتا سے اندر جانے کو کہا تو وہ اسے ٹال گیا البتہ واپسی میں بھی اس نے یہی کہا تھا کہ ”کسی سے کچھ سوال جواب نہ کرنا، سیدھے قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاؤ..... اور..... ساعتیں گزر جائیں تو پھر پلٹ کر واپس نہیں آئیں۔ تم میری بات پر عمل کرنا، ایک بات اور غور سے سن لو..... اندر جو کچھ ہوا، تم

اس کا ذکر کبھی کسی کے سامنے زبان تک نہ لانا۔ دیوانوں کی طرف سے بھی کچھ مصلحتیں، منجانب اللہ ہوتی ہیں۔ اللہ بھی ان کی مدد فرماتا ہے جو خلق خدا کی بھلائی کیلئے کام کرتے ہیں۔“

لیاقت کے ذہن میں بوڑھے ناپیتا کے جملے گونج رہے تھے۔ اسے یاد تھا کہ واپسی میں کسی نے ان دونوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت گل خان نے بھی کسی ناپیتا بوڑھے کا ذکر کیا۔ یہ بھی بتایا کہ ناپیتا نے گل خان سے بھی اشاروں کنایوں میں یہی کہا تھا۔ ”دیوانہ جس کام سے وہاں کسی پروانے کا انتظار کر رہا تھا، اسے نواز کر چلا گیا، اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔“

”تم کیا سوچ رہے ہو لیاقت؟“ گل خان نے لیاقت کو مخاطب کیا۔ ”سب مقدر کی بات ہے، جانے وہ کون خوش نصیب تھا دیوانہ جسے نواز کر چلا گیا؟ تم پریشان مت ہو، پروا والا سب کا نگہبان ہے۔“

”تم نے ٹھیک کہا.....“ لیاقت نے مختصر جواب دیا، پھر اس نے گھر کے دروازے پر جا کر فرصین کو آواز دی اور خود دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا، جب فرصین نے اسے بتایا کہ زریہ نہ جا چکی ہے تو وہ پلٹ کر اندر آ گیا۔ اس کے ذہن میں جو کچھ کل شام سے الجھ رہی تھی وہ جیسے اچانک ہی سلجھ گئی تھی اس کے ذہن میں ایک جملہ گند کی صدا بن کر چکرانے لگا۔

”وہ خوش نصیب تم ہی ہو لیاقت حسین! دیوانہ تمہارا ہی منتظر تھا۔ وہ تمہیں نواز کر اب کسی اور طرف نکل گیا۔“



زیادہ پی لینے کے سبب افضل خان کی آنکھ صبح ذرا دیر سے کھلی لیکن وہ پریشان نہیں ہوا۔ اس لئے کہ شیخ حامد کو بیرون ملک گئے ابھی صرف ایک دن ہی گزرا تھا، اس کے علاوہ باہر کے کام کی دیکھ بھال بھی افضل خان کے ذمے تھی، اس سے سوائے بگ باس کے اور کوئی باز پرس نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے اٹھ کر نیم گرم شاور لیا تو اس کے ذہن پر طاری بھاری پن چھٹنے لگا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد اس کے ذہن میں سب سے پہلے میڈم روبی کا خیال آیا، اس نے ایک بار پھر روبی کی پرکشش آفر پر غور کیا، پھر موبائل اٹھا کر اس کا نمبر ملانے لگا۔ اس کی آنکھیں کسی شکاری عقاب کی طرح روشن نظر آرہی تھیں۔

”ہیلو.....“ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز ابھری تو وہ سنبل کر بولا۔

”مجھے میڈم روبی سے بات کرنی ہے۔“

”سوری..... وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے بھی سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ میڈم کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”آپ..... افضل خان نے مختصر لہجے میں اپنا مقصد واضح کرنے کی کوشش کی۔

”میں ریڈ کر اس ہسپتال کی میڈمز بول رہی ہوں۔“ سنجیدگی سے جواب دیا گیا۔

”ڈاکٹر کا خیال ہے؟ میڈم کو کب تک خوش آجائے گا؟“ افضل خان اور محتاط ہو گیا۔ روبی کے ہوش میں نہ آنے والی بات نے اسے چونکا دیا تھا۔

”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

”کیا وزیرز کو میڈم سے ملنے کی اجازت ہے؟“

”اس کا جواب ڈاکٹر ہی دے سکتے ہیں۔“ دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔

افضل خان موبائل رکھ کر سوچنے لگا۔ کل رات کے وقت واپسی میں شاید میڈم روٹی کسی حادثے سے دوچار ہو کر ہسپتال پہنچ گئی ہو، ممکن ہے ایک پیگ کا نشہ ہی اس حادثے کا سبب ہو، لیکن ہسپتال کی ہیڈ نرس کے لب و لہجے کی سنجیدگی نے افضل خان کو بھی ڈسٹرب کر دیا تھا۔ رات وہ اسی کے اپارٹمنٹ سے گئی تھی، ہو سکتا ہے اس نے یہ بات ڈاکٹر کو بتا دی ہو کہ وہ کہاں سے آ رہی تھی؟ کس سے ملنے گئی تھی؟ اس کے علاوہ بھی بہت سارے امکانات تھے سب سے بڑی پریشانی کا سبب خود میڈم روٹی کی زبان سے نکلی ہوئی وہ اہم بات تھی جسے سن کر افضل خان بھی بوکھلا گیا تھا۔

بگ باس کو واپسی کے بعد اگر میڈم روٹی کے کسی حادثے کی اطلاع ملتی تو یہ بات اتنی اہم نہ ہوتی لیکن اسے یہ کھوج ضرور ہوتی کہ وہ افضل خان کے اپارٹمنٹ تک کیوں گئی تھی؟ ان دونوں کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہوئی تھی؟ افضل خان کیلئے اب ضروری ہو گیا تھا کہ میڈم روٹی کے بارے میں مزید تفصیلات جاننے کی کوشش کرے لیکن اس طرح کہ کسی کو اس کی پریشانی کا علم نہ ہو۔ کسی فوری خیال کے تحت اس نے اپارٹمنٹ سے باہر نکل کر صبح کا وہ تازہ انگریزی اخبار اٹھا لیا جو روز اسی جگہ ڈالا جاتا تھا۔ اندر آ کر اس نے جلدی جلدی اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ تیسرے صفحے پر اسے وہ خبر مل گئی جس کی اسے تلاش تھی۔ میڈم روٹی کی ایک تصویر بھی ساتھ لگی ہوئی تھی۔ سٹاف رپورٹر کے حوالے سے لکھا گیا تھا کہ..... ”گزشتہ رات ڈیفنس کے ایک پوش علاقے میں سب انسپکٹر مسٹر پولیس والوں کے ساتھ معمول کے گشت پر تھا جب اس نے دو مشکوک آدمی دیکھے جو کسی عورت کو سہارا دے کر اپنی وین کی طرف لے جا رہے تھے۔ سب انسپکٹر کو ان کا شبہ ہوا تو اس نے دور سے ان افراد کو لکڑا کر جنہوں نے کوئی جواب دینے کے بجائے پولیس کی چیپ پر فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس نے جوابی فائرنگ کی تو دونوں مشکوک افراد نے ہتھیار ڈال دیے لیکن اس عرصے میں ان گندگاہان کی جانب سے چلائی جانے والی ایک گولی میڈم روٹی کے بائیں بازو پر لگی جو اس دوران میں خود کو چھڑا کر اپنی قریب کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ مذکورہ سب انسپکٹر نے زخمی خاتون کو بے ہوشی کی حالت میں اپنے ایک سپاہی کے ساتھ اس کی گاڑی میں فوری طور پر ریڈ کر اس ہسپتال روانہ کیا اور دونوں مجرموں کو جو پولیس کے مطابق پہلے بھی اغوا برائے تاوان کی کئی وارداتوں میں ملوث رہ چکے ہیں لاک اپ کر دیا۔ ہسپتال ذرائع کے مطابق اگرچہ میڈم روٹی کے زخم بہت زیادہ خطرناک نہیں ہیں لیکن اگر انہیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہوش نہ آیا تو کبھی کوئی خطرناک رخ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ ہسپتال کے وی آئی پی روم نمبر بی ون کے باہر پولیس کا پہرا لگا دیا گیا ہے۔ میڈم روٹی کے ہوش میں آنے کے بعد سنسنی خیز افکاشات کی توقع کی جا رہی ہے۔“

اگرچہ افضل خان کے اپارٹمنٹ کا نام نہیں آیا تھا لیکن اخباری رپورٹ پڑھ لینے کے بعد اس

کی پریشانی ضرور بڑھ گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ دونوں زیر حراست مجرم میڈم روٹی کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے ہوں گے۔ واپسی پر انہوں نے روٹی کو اغوا کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن پولیس نے بروقت ان کا پلان چوہنٹ کر دیا۔ بہر حال میڈم روٹی کے ہوش میں آ جانے کے بعد یا پھر عدالت میں دوران تفتیش اس کے اپارٹمنٹ کا نام بھی ضرور آئے گا۔ یہ بات افضل خان کیلئے کسی طور پر مناسب نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ روٹی کے ہوش میں آنے کے بعد پولیس افسران اس سے تفتیش کریں، کسی نہ کسی طرح افضل خان کا اس سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

افضل خان ابھی کوئی راستہ نکالنے کے بارے میں غور ہی کر رہا تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کچھ تامل کے بعد ریسیور اٹھا لیا۔ ”افضل خان.....“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”میں شبنم بول رہی ہوں۔“ دوسری جانب سے افضل خان کے دفتر میں کام کرنے والی ٹیلیفون آپریٹر کی آواز ابھری۔ ”تم نے آج کا اخبار دیکھا؟“

”کوئی خاص خبر.....؟“

”ہاں..... مشہور کرڈو پتی خالد ریاض کی بیوہ کو کل رات کچھ لوگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران میں پولیس کے راؤنڈ پر آ جانے سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے..... بہر حال پولیس اور مجرموں کے درمیان ہونے والی فائرنگ کے دوران میں میڈم روٹی بھی زخمی ہو گئی اور اس وقت وہ ریڈ کر اس ہسپتال میں گزشتہ بارہ چودہ گھنٹوں سے بے ہوش پڑی ہے۔“

”تمہیں اس خبر سے کیا دلچسپی ہے؟“ افضل نے بظاہر بے پروائی سے دریافت کیا۔

”اسے جس علاقے سے زخمی حالت میں پایا گیا ہے اسی ایریا میں تمہارا اپارٹمنٹ بھی ہے۔“

”کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ افضل خان نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

”کچھ دنوں سے یہ خبر گشت کر رہی ہے کہ میڈم روٹی کسی وجہ سے تمہاری شخصیت میں دلچسپی لے رہی تھی۔ شاید تم بھی.....“

”نان سینس۔“ افضل خان جھلا گیا۔ ”میں اس قسم کی بے ہودگی پسند نہیں کرتا“ آئندہ خیال رکھتا۔“

”تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو شاید میں بھی الجھ جاتی۔“ شبنم نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

”بگ باس کے آنے میں شاید دو دن اور باقی رہ گئے ہیں۔“

”بگ باس کا ان باتوں سے کیا تعلق؟“ افضل خان نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔

”ان باتوں سے نہ سہی لیکن تم سے تو ہے.....“ شبنم کا لہجہ اس بار بھی معنی خیز تھا۔

”میں آدھے گھنٹے میں دفتر پہنچ رہا ہوں۔“ افضل خان نے تھلا کر کہا پھر فون بند کر دیا۔ اس کے اندر ایک نیا خطرہ سر اٹھانے لگا۔ بات اگر صرف روٹی تک ہوتی تو ٹھیک تھا لیکن شبنم نے خاص طور پر بگ باس کا نام کیوں لیا تھا؟ کیا اپارٹمنٹ کے حوالے سے وہ اسے ڈرانا چاہتی تھی یا کسی طرح وہ بھی اس راز سے واقف تھی جس کا انکشاف گزشتہ رات روٹی نے کیا تھا؟ شبنم روٹی کو کس طرح اور

کس حیثیت سے جانتی تھی؟ دونوں کے درمیان اگر کوئی تعلق تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ اگر تعلق نہیں تھا تو پھر شبنم کو روپی کے زخمی ہونے یا نہ ہونے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اور بھی کئی سوالات تھے جو اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے؟ اسے یہ بھی علم تھا کہ خود شبنم بھی ملازمت کے اوقات ختم ہونے کے بعد کس قسم کی زندگی گزار رہی تھی؟ اس کی ذاتی تصریحات کس نوعیت کی تھیں؟

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد افضل خان نے دفتر پہنچ کر سب سے پہلے اسے ہی اپنے آفس میں طلب کیا۔ شبنم سوچ بورد دوسری آپریٹر کے حوالے کر کے افضل خان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت بھی وہ نڈراورے خوف ہی نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس بھی حسب سابق نہایت ماڈرن تھا۔

”کوئی خاص حکم؟“ اس نے خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے افضل خان سے مدہم لہجے میں دریافت کیا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو اسے بھی اپنی خوش قسمتی ہی سمجھوں گی۔“

”تم نے فون پر بگ باس کا حوالہ کیوں دیا تھا.....؟“

”میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر یہ بات بگ باس کے کانوں تک نہ پہنچے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ کروڑپتی بیوہ کو اس وقت اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ تمہارے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ سے نکل کر واپسی کے ارادے سے اپنی گاڑی میں بیٹھنے جا رہی تھی۔“

”آئی۔ سی.....“ افضل نے مسکرا کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کی ٹھان لی۔ ”گویا اب تم میری ذاتی مصروفیات کا بھی کھوج لگانے کا کام انجام دے رہی ہو؟“

”تم جانتے ہو کہ میرا نام شبنم ہے جو خوبصورت پھولوں پر.....“

”ون منٹ.....“ افضل خان اس کی بات کا ٹک کر یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں دفتر میں اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتا۔ بگ باس کا بھی یہی حکم ہے کہ کسی بھی سٹاف ممبر کی سوشل لائف کا کوئی تعلق اس دفتر سے نہیں ہونا چاہئے۔“

”ریڈ کراس ہسپتال کے ایک دو کارندوں کو میں بہت قریب سے جانتی ہوں۔“ شبنم نے افضل خان کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بڑی رازداری سے کہا۔ ”میں کوشش کر رہی ہوں کہ کسی طرح پولیس کی تفتیش شروع ہونے سے پیشتر روپی تک پہنچ کر اس سے بات کر لوں۔“

”کس قسم کی بات.....؟“ افضل خان نے اس بار قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ شبنم کی زبانی ریڈ کراس ہسپتال کے دو تین کارندوں سے واقفیت والی بات اس کے بھی کام آسکتی تھی۔

”بہی کہ وہ تمہاری بلڈنگ میں سرے سے گئی ہی نہیں تھی۔“ شبنم نے عجیب انداز میں کہا۔ ”وہ وہاں گاڑی سے اتری ضرور تھی جیسا کہ پولیس کے ریکارڈ پر بھی درج ہو سکتا ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ اسے تمہارے ہی اپارٹمنٹ میں جانا مقصود ہو؟ برابر کی کسی عمارت میں وہ اپنی کسی واقف کار سے بھی ملنے جاسکتی ہے۔“

”تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟“ افضل نے کسمسا کر سوال کیا۔ ”میری بلڈنگ میں صرف میرا ہی

اپارٹمنٹ نہیں ہے اور بہت سارے لوگوں کی رہائش بھی مختلف اپارٹمنٹ میں ہے۔“

”اوکے..... اگر تمہیں بھی اس بات کا خوف نہیں ہے تو میں بلاوجہ ہی پریشان ہوئی۔“ وہ اپنا جملہ مکمل کر کے اٹھنے کیلئے پرتو لے لگی تو افضل خان نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ شبنم کی ذاتی واقفیت سے اسے جو سہولت مل رہی تھی وہ اسے کھوتا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مفاہمت کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تم میڈم کو بہت قریب سے جانتی ہو؟“

”ہاں۔ میں اس بات سے انکار نہیں کروں گی۔“ اس بار شبنم نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

”کیا وہ تمہاری پرانی واقف کار ہے؟“

”سوری..... میں اس سوال کا جواب فی الحال نہیں دے سکوں گی۔“

”اس کے شوہر کی حادثاتی موت کے سلسلے میں تم کیا کچھ جانتی ہو؟“

”میں نہیں سمجھ سکتی کہ تم اس قسم کے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟“ شبنم نے بڑی خوبصورتی سے بات گھماتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت اہم مسئلہ یہ ہے کہ میڈم کے سلسلے میں تمہارا نام کسی طرح درمیان میں نہیں آنا چاہئے۔“

”اور اگر ہماری کوشش کے باوجود ایسا نہ ہو سکا تو؟“

”تو..... ممکن ہے کہ بگ باس کے اور تمہارے راستے جدا ہو جائیں اور تم جانتے ہو کہ بگ باس کی ناراضگی مول لینا کتنا مہنگا پڑے گا۔“ شبنم نے یک لخت جذباتی انداز میں جواب دیا۔ ”میں فی الحال تمہیں بگ باس کے قریب اور زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسی میں ہم دونوں کا مفاد بھی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ افضل خان نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ ”اگر تم میڈم سے مل کر میرے اپارٹمنٹ کا ذکر درمیان سے ختم کر سکتی ہو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔“

”اور اس محنت کا انعام کیا دو گے؟“ شبنم شوخ ہونے لگی۔

”جو تم مانگو.....“ افضل خان ترنگ میں آ کر بولا۔ ”کہو تو ایک دو دن میں ایڈوانس ادائیگی بھی کر دوں۔“

”اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔“ شبنم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم دوسری آپریٹر کو بلا کر میرا کام سنبھالنے کی تاکید کر دو۔ میں فوری طور پر ہسپتال جانا پسند کروں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مقدر سے کام بن جائے۔“

شبنم کے جانے کے بعد افضل خان نے سکون کا سانس لیا۔ دوسری آپریٹر کو بلا کر اسے شبنم کی ڈیوٹی انجام دینے کی ہدایت کی۔ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں ایک ہی سوال رہ رہ کر کلکلا رہا تھا۔ شبنم اور میڈم روپی کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس کا ذاتی خیال تھا کہ وہ میڈم کے شوہر کی حادثاتی موت کے سلسلے میں بھی بہت کچھ جانتی ہوگی..... لیکن یہ صرف قیاس تھا.....

دی بات صرف علیک سلیک تک ہی رہی۔

”جن حرامزادوں کو آپ نے تحویل میں لیا ہے ان کا کیا بیان ہے؟“ ایس پی نے تیز لہجے میں سب انسپکٹر سے سوال کیا۔ انداز جارحانہ ہی تھا۔

”انہوں نے تسلیم کر لیا ہے سر کہ وہ میڈم کو اغوا کر کے.....“

”وہ بکواس کر رہے ہیں.....“ ایس پی نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر ہی میز پر ہاتھ مارتے ہوئے غصے سے کہا۔ ”آپ ان کے حلق میں ڈنڈا ڈال کر اصلیت اگلوں کی کوشش کریں۔“

”ٹھیک ہے سر.....“ سب انسپکٹر نے بے چارگی سے کہا۔ اس کے سوا وہ غریب کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

”مم..... میں خوش ہوں کہ آپ نے میڈم کو ان خطرناک لوگوں سے بروقت بچا لیا۔“ ایس پی نے اس بار قدرے ستائشی انداز اختیار کیا۔ پھر تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”لیکن میں سمجھتا ہوں وہ

اصلیت کو زبان تک لانے سے آخری وقت تک گریز کریں گے۔ آپ ان دونوں کو اے ون قسم کا

ڈرائنگ روم ٹریسٹ دیں۔ میں نے آپ کے ایس پی سے بھی بات کر لی ہے۔“

”جی بہتر ہے سر.....“

”میڈم کا کیا بیان ہے؟“

”میں اس وقت انہی کی طرف جا رہا تھا سر.....“ سب انسپکٹر نے وضاحت کی۔ ”کچھ دیر پیشتر

ہی جس سپاہی کو میڈم کے کمرے پر تعینات کیا گیا تھا اس نے اطلاع دی تھی کہ میڈم کو ہوش آگیا ہے

میں نے ڈاکٹر سے بھی اس بات کی تصدیق کر لی تھی۔“

”ٹھیک ہے.....“ آپ جائیں لیکن مجھے اس بیان کی رپورٹ دینا نہیں بھولیے گا۔“

”رائٹ سر.....“ سب انسپکٹر نے اٹھ کر پھر زوردار سیٹھ کیا اور ایڑیوں کے بل گھوم کر تیزی

سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”آپ کا شبہ کس پر ہے؟..... میرا مطلب یہ ہے کہ آخر وہ کون شخص ہے جو میڈم کو زندہ نہیں

دیکھ سکتا؟“ سراج نے سب انسپکٹر کے جانے کے بعد آغا منظور کو کریدنے کی کوشش کی۔ ”کوئی نہ کوئی

خاص وجہ تو ہوگی۔“

”سوری.....“ ایس پی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”میں اس وقت زبان کھولنے سے قاصر ہوں

لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس نے میڈم کے سلسلے میں باقاعدہ پلاننگ کرنے کے بعد ہی یہ قدم

اٹھایا ہوگا۔“

”میرے لئے کیا حکم ہے.....؟“

”کسی وقت موقع نکال کر اگر آپ بھی ان دونوں گرفتار ملزمان کو نفسیاتی طور پر ٹٹول لیں۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی کارآمد بات ان کے منہ سے نکل جائے جو میرے شبے کی تصدیق کر سکے۔“ ایس پی

نے ان دونوں کی شان میں پولیس لائن میں مروجہ گالیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

”رائٹ سر۔“ سراج نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ایس پی کے کمرے سے نکل کر سیدھا اپنے

ایس پی آغا منظور اپنے دفتر میں بیٹھا بار بار دانت پیس رہا تھا اور چیدہ چیدہ اخبار میں شائع ہونے والی میڈم روبی کی خبر پر نظر ڈال رہا تھا۔ جب سراج نے داخل ہو کر اسے سلام کیا اور نہایت معصومیت سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ایس پی نے اسے فون پر طلب کیا تھا۔

”تم نے آج کا اخبار دیکھا؟“ آغا منظور نے اپنا اشتعال ضبط کرتے ہوئے سراج کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔ میڈم روبی کے بارے میں پڑھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی۔“

”میں نے متعلقہ تھانے کے سب انسپکٹر کو فوری طور پر طلب کیا ہے۔ وہ بھی آتا ہی ہوگا۔“

”اخبار کی اطلاع کے مطابق دو افراد جو پہلے بھی اغوا کے جرم میں ملوث رہ چکے ہیں اس وقت

پولیس کی تحویل میں.....“

”یہ پریس رپورٹوں کی کہانیاں ہیں۔“ آغا منظور تملاکر بولا۔ ”جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں وہ

ممکن ہے ہماری لسٹ پر پہلے سے موجود ہوں، لیکن روبی کے اغوا کا مقصد تادان حاصل کرنا نہیں تھا۔“

”جی میں سمجھا نہیں.....“ سراج نے تعجب کا اظہار کیا۔ وہ ایس پی کے غیظ و غضب کو محسوس کر

رہا تھا۔ اس کی وجہ بھی سمجھ رہا تھا۔ سراج کی ذاتی معلومات کے مطابق آغا منظور نہ صرف میڈم روبی

سے دوستی کا خواہشمند تھا بلکہ اس سے شادی کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس کی بیوی دو سال قبل ایک موڈی

مرض کا شکار ہو کر فوت ہو گئی تھی۔ اس کے ہاں شادی کے بعد آٹھ سال گزر جانے کے باوجود کوئی

اولاد نہیں ہوئی تھی۔ یہی غم اس کی بیوی کو ایک جان لیوا مرض بن کر موت کی دہلیز تک لے گیا تھا جس

کے بعد آغا منظور کی دلچسپی اس کو روڑ پتی بیوہ میں جنون کی حد تک بڑھتی جا رہی تھی۔

”فی الحال میں آپ کو تفصیل سے سمجھا بھی نہیں سکتا..... لیکن اتنا پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا

ہوں کہ روبی کے اغوا ہوجانے کی صورت میں دو چار یادیں بارہ روز تک اسی قسم کی گرما گرم خبریں

شائع ہوتی رہتیں کہ اغوا کنندگان اور روبی کے وکیل کے درمیان لین دین کی سودے بازی طے ہو

رہی ہے پھر..... پھر کسی دن اس غریب کی مسخ شدہ لاش کسی ایسے دیرانے سے برآمد ہوتی، جہاں کتے

اور گوشت خور پرندے اسے بھینڈ ڈرے ہوتے۔“

”سر.....“ سراج نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”یہ بات آپ اس قدر یقین سے کس

طرح.....“

”جو باتیں میں جانتا ہوں وہ آپ نہیں جانتے۔ میں اس موقع پر کسی بات کا اظہار بھی نہیں

کر سکتا اس لئے کہ شاید میرا وجود بھی خطروں کی زد میں آجائے لیکن..... اگر روبی کو کچھ ہوا تو پھر شاید

میں بھی خاموش تماشا بنی نہیں رہ سکوں گا۔“

سراج کوئی اور سوال کرنا چاہتا تھا کہ وہی سب انسپکٹر آگیا جسے سراج نے اغوا کنندگان کا سارا

کریڈٹ دے دیا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے ایس پی کو زوردار سیٹھ کیا۔ پھر اس کے

اشارے پر وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ سراج نے اس وقت دیدہ و دانستہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں

آفس پہنچا۔ آغا منظور کی باتیں اس کے ذہن میں بدستور گردش کر رہی تھیں، اگر اس کا خیال تھا کہ کوئی میڈم روہی کو اغوا کر کے ہلاک کرنا چاہتا تھا تو ایس بی یقیناً اس کا نام بھی جانتا ہوگا لیکن اگر مجرم صرف روہی کی موت کا خواہاں تھا تو اسے اغوا کرنے کا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دین میں بیٹھے بیٹھے بھی روہی کے جسم کو خود کار آتش رائل کے ذریعے چھلنی کرایا جاسکتا تھا۔ مجرم بھی آسانی سے فرار ہو جاتے اور کسی پرشے کی گنجائش میں نہ ہوتی لیکن..... اگر آغا منظور کے ذہن میں کوئی خاص نام محفوظ تھا تو وہ بعد میں بھی زبان کھول سکتا تھا۔

سراج خاصی دیر تک اس ججال سے الجھتا رہا، پھر فون پر ہونے والی گھنٹی نے اس کی توجہ منتشر کر دی۔

”ہیلو..... ڈی ایس بی سراج۔“ اس نے حسب عادت ریسپور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں بڑے سلیجے ہوئے اور مہذب انداز میں کہا۔

”میں آپ کو پندرہ منٹ پہلے بھی کال کر چکی ہوں لیکن آپ شاید سیٹ پر نہیں تھے۔“
 ”کون بول رہا ہے؟“ سراج نے سنبھل کر سوال کیا۔ وہ آواز اس نے پہلی بار سنی تھی یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ بولنے والی اپنا لب و لہجہ بدل کر گفتگو کر رہی ہے۔

”میں کوئی فرضی نام بھی لے سکتی ہوں، مگر اس سے کیا فائدہ ہوگا۔“ اس بار صاف گوئی سے جواب دیا گیا۔ ”دوسری بات یہ بھی بتا دوں کہ میں ایک پبلک کالنگ ہاؤس سے بات کر رہی ہوں اس لئے میرا نمبر ٹریس کرانے کی کوشش میں اپنا قیمتی ووٹ ضائع نہ کیجئے گا۔“
 ”کیا بات کہنی ہے؟“ سراج نے خشک انداز اختیار کیا۔

”میں میڈم روہی کے سلسلے میں آپ سے ایک خاص بات عرض کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ سنا پسند کریں گے؟“

روہی کے نام پر سراج چونکا۔ اس نے اپنا لہجہ نرم کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ ”اگرچہ اس کیس سے میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اگر آپ کوئی مفید اطلاع دینا چاہیں تو اسے یقیناً توجہ سے سنوں گا۔“

”صرف اتنا عرض کروں گی کہ میڈم کو اغوا کرنے والی کارروائی محض دکھاوا تھی۔“

”کیا مطلب.....“ سراج چونکا۔ ”آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“

”کچھ لوگ میڈم کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔“

”وہ کون لوگ ہیں؟ کیا آپ ان کے نام.....“

”ابھی نہیں.....“ دوسری جانب سے سراج کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”اس وقت

میں آپ کو جو ٹیکو دے رہی ہوں اس کو ذہن میں محفوظ رکھیں تاکہ بوقت ضرورت آپ کیلئے کارآمد ہو۔ دوسری بات یہ عرض کر دوں کہ آپ چونکہ سیٹھ عثمان کے دوست، ہمدرد اور کلاس فیلو بھی ہیں اس لئے میں نے بھی آپ کو دوست ہی سمجھ کر فون کیا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو کم از کم کوئی اشارہ ہی دے دیں جو میرے لئے کارآمد ہو۔“

”سوری۔“ دوسری جانب سے مختصر جواب کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

”سراج اس کال سے الجھ کر رہ گیا، جو بات کچھ دیر پہلے آغا منظور نے اپنے دفتر میں بیٹھ کر کہی تھی، اسی سے ملتی جلتی خبر کسی نامعلوم خاتون نے اسے فون پر بھی دی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ خاتون نے سیٹھ عثمان کا محض تعارفی حوالہ دیا تھا لیکن ایس بی آغا منظور نے کسی مصلحت کی بنا پر کسی کے نام کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ بہر حال دونوں کی باتوں کا لب لباب ایک ہی تھا۔ کوئی شخصیت میڈم روہی کو نہایت چالاکی سے موت کے گھاٹ اتارنے کی خواہاں تھی۔ وہ شخصیت کون تھی؟ روہی کے مر جانے کی خواہش اس کے دل میں کیوں چل رہی تھی؟ دونوں ہی سوال اہم تھے لیکن ان کا جواب کم از کم سراج کی پہنچ سے ابھی بہت دور تھا۔



لیاقت حسین نے صبح ڈیوٹی پر پہنچ کر سب سے پہلے اندر کام کرنے والی پرانی ملازمہ سے رات بھر کی خیریت دریافت کی، پھر کونھی کا ایک چکر لگا کر بوڑھے غفور کے کمرے میں اس کی خیریت دریافت کرنے چلا گیا۔ غفور گزشتہ دو روز سے کمر کی تکلیف اور بخار میں مبتلا تھا۔

”اب آپ کیسے ہو بابا.....؟“

”بس زندہ ہوں لیاقت پتر۔“ غفور نے اسے شفقت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”طبیعت کا کیا بتاؤں، سب سے بڑی بیماری تو انسان کا بڑھاپا ہے، اس عمر میں طبیعت نرم و گرم تو ہوگی۔ معمولی بخار ہے ایک دو روز میں لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”غفور بابا! تم جانتے ہو کہ بیگم صاحبہ نے جاتے وقت مجھے اس کونھی کے تمام سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا۔“

”جانتا ہوں پتر اور خوش بھی ہوں..... تم نے بروقت دشمنوں کی چال کی خبر نہ دی ہوتی تو.....“ غفور جملہ پورا کرتے کرتے رک گیا۔ ”نیک آدمی کو اس کی وفاداری، نیکی اور ایمان داری کا پھل بھی ضرور ملتا ہے۔“

”میں یہاں صاحب کی غیر موجودگی میں کچھ ضروری کام بھی کرنا چاہتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ بیگم صاحبہ کو بھی آنے کے بعد کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

”ضرور کرو پتر..... غفور کی دعا میں بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“

”اور اگر بعد میں تم نے میری تبدیلی پسند نہ کی۔ کوئی اعتراض کیا تو پھر.....؟“

”تو نے یہ کیسے سوچ لیا پتر کہ میں تیری کسی بات کے خلاف آواز نکالوں گا۔“

”ہاں بات۔“

”سولہ آنے پکی۔“ غفور نے کھانستے ہوئے جواب دیا تو لیاقت یک لخت سنجیدگی سے بولا۔

”پھر میں تم ہی سے شروع کرتا ہوں۔“ لیاقت نے بڑی اپنائیت سے حکم چلایا۔ ”دو روز سے

تم نال منول کر رہے ہو لیکن آج تم نے زبان ہار دی ہے تو جلدی سے منہ پر ہلکا سا پانی کا چھپکا مار کر تیار ہو جاؤ! اتنی دیر میں میں گاڑی ادھر لاتا ہوں تمہیں اسی وقت میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چل کر دوالانا ہوگی۔“

”رہنے دے لیاقت پتر“ میں نے ایک دہی علاج.....“

”تم نے ابھی زبان دی تھی غفور بابا۔ اور ابھی قول بھی ہار رہے ہو۔ ٹانٹ تیار ہو جاؤ۔“ لیاقت اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے گاڑی لینے چلا گیا تو غفور اسے دل سے دعائیں دیتے ہوئے چارپائی سے اٹھ کر جانے کو آمادہ ہو گیا۔

ڈاکٹر سیٹھ عثمان کا واقف کار تھا اس نے غفور کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد ہسپتال ہی سے ضروری دوائیں بھی مفت دلوا دیں اور ایک ہفتہ مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ واپسی کے راستے میں لیاقت نے غفور سے کہا۔

”سن لیا اپنے کان سے بابا۔ ڈاکٹر نے ایک ہفتہ تمہیں مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔“
”وہ تو ٹھیک ہے پتر لیکن پودوں میں بھی انسان کی طرح زندگی ہوتی ہے وقت پر انہیں کھاد اور پانی نہ ملے تو وہ.....“

”اس کی فکر مت کرو۔“ ایک دو روز میں تمہاری ڈیوٹی کر لوں گا پھر کسی نوجوان مالی کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ تو پھر دیکھ بھال کرنا تمہاری ہی ذمہ داری ہوگی۔“
غفور کی دعا لے کر وہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ اس شام اس کی ملاقات سراج سے بھی ہو گئی۔ لیاقت نے باہر لان میں چائے پانی کا بندوبست کیا پھر سراج کے اشارے پر اس کے قریب ہی لان پر بیٹھ گیا۔

”میں تم سے ایک ضروری بات معلوم کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ بات صرف ہمارے درمیان ہوگی۔“ سراج نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ ”تم اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گے۔“
لیاقت حسین نے نے ہامی بھری اور سنہل کر بیٹھ گیا۔

”اچھی طرح غور کر کے بتاؤ کہ کیا کراچی آنے سے قبل تمہارا کسی سے ایسا جھگڑا یا ٹکراؤ ہوا تھا جس میں تم زخمی ہو گئے ہو؟“

”میں آپ کا مقصد سمجھ رہا ہوں صاحب لیکن میرا کبھی کسی کے ساتھ ایسا کوئی جھگڑا نہیں ہوا جس میں مجھے کوئی لگی ہو۔“ لیاقت نے نظریں جھکا کر جواب دیا پھر بولا۔ ”اس رات میں نے گھر جا کر تیز روشنی میں بھی وہ دو نشان بڑی حیرت سے دیکھے تھے ایسا ہی لگا تھا جیسے کوئی خطرناک زخم بھرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے اپنا نشان چھوڑ گیا ہو لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ سراج نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ ”تم کچھ کہتے کہتے خاموش کیوں ہو گئے؟“

”کیا کہوں صاحب۔“ لیاقت حسین نے نہایت سادگی اور معصومیت سے جواب دیا۔ ”مجھے

خود بھی حیرت ہے کہ جو نشان میں نے رات کو دیکھے تھے وہ صبح نہاتے وقت کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ میں کئی بار اپنی تسلی کر چکا ہوں۔“

”کیا تم کو اس کی کوئی وجہ بھی نہیں معلوم؟“ سراج نے اسے ٹوٹتی نظروں سے دیکھا۔
”معلوم ہوتی تو آپ سے کبھی نہ چھپاتا۔“ لیاقت نے دل پر جبر کر کے جھوٹ بولا۔ وہ اس بزرگ اور بوڑھے پاپا کی کبی ہوئی بات زبان تک نہیں لاسکتا تھا۔

”کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں اس روز گاڑی سے باہر نہ نکلنے کی تاکید کی تھی؟“
”یاد ہے صاحب.....“

”پھر..... تم اچانک گاڑی سے نکل کر باہر کیوں گئے؟“ سراج نے قدرے افسرانہ انداز اختیار کیا۔

”میں..... میں تو گاڑی سے نہیں اترتا تھا۔“ لیاقت نے اس بار بڑے یقین سے کہا۔ ”بھلا آپ کا حکم کس طرح نال سکتا تھا؟“

”یہ تو یاد ہو گا کہ تم میرے دوبارہ کہنے پر گاڑی میں جا کر بیٹھے تھے؟“
”میں جھوٹ نہیں بولوں گا صاحب۔“ لیاقت نے عجیب انداز میں ذہن پر زور ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے صاحب لیکن گاڑی سے اترنا مجھے یاد نہیں۔“

”گاڑی سے اترنے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟“ سراج کی نظریں لیاقت حسین کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”کیا کیا تھا صاحب.....؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔“ لیاقت نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ لئے۔ ”صاحب مجھے کچھ بھی یاد نہیں بلکہ..... میں نے آپ سے پوچھا بھی تھا کہ اس خاتون کا کیا بنا؟“

سراج نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا وہ تجربے کا رافیسر تھا اس کی نگاہیں اور دل گواہی دے رہے تھے کہ لیاقت حسین نے اس وقت بھی جو جواب دیے وہ غلط نہیں تھے۔ ایک سیدھا سادا شخص اس انداز میں دروغ گوئی کبھی نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے گھاگ مجرم بھی پولیس کے سامنے زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتے تھے لیکن لیاقت حسین نے جو کہانی پیٹ کے زخموں کے بارے میں بتائی تھی وہ پراسرار بھی تھی اور حیرت انگیز بھی..... ان زخموں کی تصدیق کیلئے وہ اس وقت بھی لیاقت حسین کو اندر گیراج میں لے گیا۔ اس نے لیاقت کی میضی اٹھوا کر بڑی توجہ اور تفصیل سے اس کے پیٹ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ لیاقت نے غلط نہیں کہا تھا جو نشان سراج نے اپنی نظروں سے دیکھے تھے خود لیاقت حسین نے بھی ان کی تصدیق کی تھی لیکن اب وہ حیرت انگیز طور پر غائب تھے۔ یہ سب ناقابل یقین تھا۔ گیراج سے نکل کر دونوں دوبارہ لان میں آ گئے۔ سراج نے کرسی پر بیٹھے ہوئے لیاقت حسین کو محبت سے مخاطب کیا۔

”لیاقت حسین تم نے ان نشانات کے بارے میں کسی اور سے تو کچھ نہیں کہا؟“

میڈم روبی اس وقت اپنے بستر پر لیٹی گزرے ہوئے حادثے کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ اپنے مرحوم شوہر کی موت کے بارے میں اس نے پہلی بار افضل خان کو اصلیت سے آگاہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ افضل خان شیخ حامد کے سب سے قریب ہے اسی لیے اس نے افضل کی شخصیت میں دلچسپی لینی شروع کی تھی اور بالآخر ایک جواہر کھیلنے کا ارادہ کر کے اس کے پارٹمنٹ بھی چلی گئی تھی۔ اسے علم تھا کہ ان دنوں شیخ حامد ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ ہر چند کہ افضل خان نے کوئی حتمی جواب نہیں دیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ روبی کی پرکشش آفر سے انکار کرنے کے بارے میں بھی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔

افضل خان کے پارٹمنٹ سے نکلنے ہی اچانک وہ آدمیوں نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک فرشتہ صفت انسان نے اچانک اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اسے بچا لیا تھا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل جانے کی خاطر اپنی کار کی سمت لپکی تھی، لیکن اس کے بائیں بازو میں جیسے کسی نے ناقابل برداشت قسم کی آگ بھردی تھی اس نے خود کو سنبالنے کی کوشش مگر بے ہوش ہو گئی۔ پھر اس کی بے ہوشی ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق پورے سترہ گھنٹے گزر جانے کے بعد ختم ہوئی تھی اور..... اب وہ بڑی سنجیدگی سے کچھ سوالوں کا جواب تلاش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ کون لوگ تھے جو اسے اغوا کرنا چاہتے تھے؟ کیا ان کا تعلق بھی شیخ حامد سے تھا یا وہ اسے مولیٰ آسامی سمجھ کر تاوان حاصل کرنے کی غرض سے اغوا کی تاک میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے؟ کیا اس واردات میں افضل خان پر بھی شبہ کیا جاسکتا تھا؟ اور وہ خدا کا نیک بندہ کون تھا جس نے جان پر کھیل کر اسے بچانے کی کوشش کی تھی؟ وہ زندہ بھی تھا یا ملزموں نے اسے مار دیا تھا؟ وہ انہی خیالات میں گم تھی جب اس نے ایک خاتون کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ چہرہ کچھ شناسا تھا لیکن وہ پہلے باقاعدہ اس سے کبھی نہیں ملی تھی۔

”ذہن پر زور نہ دیں۔“ شبنم نے بڑے دوستانہ انداز میں اس کے قریب جا کر کہا۔ ”میں یہاں ایک ڈاکٹر سے ملنے آئی تھی آپ کے حادثے کی خبر سنی تو خیریت دریافت کرنے آ گئی۔“

”میرا خیال ہے کہ..... میں تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں؟“ میڈم روبی نے مدہم مگر متزن آواز میں کہا۔

”ضرور دیکھا ہوگا۔“ شبنم مسکرائی۔ ”ایک دو بار کسی سہیلی ممبر کے ساتھ میں بھی رینیو کلب آ چکی ہوں۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”خدا کا شکر ہے کہ آپ ہوش میں آ گئیں۔“ شبنم نے بڑی اچنائیت کا اظہار کیا۔ ”باہر پولیس کا پہرہ ہے، لیکن میں ایک واقف کار ڈاکٹر کی وجہ سے آپ تک آ گئی..... اب اجازت چاہوں گی۔“

”ون منٹ۔“ میڈم روبی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنا تعارف تو کرنا یا نہیں.....“

”جی..... میرا نام شبنم ہے۔“

”کیسے کہتا صاحب؟.....“ لیاقت نے بے بسی سے کہا۔ ”اگر کسی سے کہتا تو وہ بھی مجھے دیوانہ یا پاگل ہی سمجھتا۔“

”ٹھیک ہے..... تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس پر مجھے یقین ہے لیکن.....“ سراج نے پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”تم ان نشانات کے بارے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

لیاقت نے بڑی مصیبت سے اقرار کر لیا۔ پھر کسمسا کر پوچھا۔ ”صاحب اس خاتون کا کیا بنا؟..... کیا اس کے ذہن اسے اغوا کر کے لے گئے؟“

”نہیں.....“ سراج نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”وہ خاتون ہسپتال میں داخل ہے۔ پولیس نے ان دو افراد کو گرفتار کر لیا ہے جو خاتون کو اغوا کرنا چاہتے تھے لیکن..... تم اس سلسلے میں کسی اور سے مت کچھ کہنا۔“

”صاحب..... ایک بات بولو؟“ لیاقت حسین کے لہجے میں انکساری تھی۔

”بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”صاحب..... میں آپ کا اور اس گھر کا غلام ہوں پھر آپ لوگوں کے بارے میں کسی اور کے سامنے زبان کس طرح کھول سکتا ہوں؟ میں نمک حرام نہیں ہوں صاحب۔“

”پریشان مت ہو لیاقت۔“ سراج نے اس کے جواب اور اس کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑی اچنائیت کا اظہار کیا۔ ”میں بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔“

”خدا آپ کو خوش رکھے صاحب“ لیاقت حسین نے دل سے دعا دی پھر..... سراج کے جانے کے بعد بھی اس دیوانے کے بارے میں غور کرتا رہا جو اسے پراسرار صلاحیت سے نواز کر کہیں اور نکل گیا تھا۔



یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ شبنم کو متعلقہ سب انسپٹر کے آنے سے پیشتر ہی میڈم روبی سے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے اسے دروازے پر روکا ضرور تھا لیکن ریڈ کر اس کے عملے کے جونیئر ڈاکٹر کی سفارش پر اسے اجازت مل گئی۔ یہ وہی وقت تھا کہ جب سب انسپٹر کو اچانک ایس پی منظور نے فوری طور پر طلب کر لیا تھا۔

”پیارا نام ہے..... ویسے تم کام کیا کرتی ہو؟“

”ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ٹیلیفون آپریٹر ہوں۔“

ملٹی نیشنل کمپنی کے حوالے پر میڈم روہی نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا نام ہے اس کمپنی کا؟“

”میرا خیال ہے کہ آپ کو شاید اس کا نام سن کر زیادہ خوشی نہ ہوگی۔“ شبیم نے بڑی ڈیوہمی سے ہنسی کر کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”میں شیخ حامد کی کمپنی کے ہیڈ آفس میں ملازم ہوں۔“

”آئی۔سی۔“ میڈم روہی شیخ حامد کا نام سن کر کسمپاسی پھر اس نے شبیم کو ٹیوٹی نظروں سے دیکھا۔

”تم نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ تمہاری کمپنی کا نام سن کر مجھے خوشی نہیں ہوگی؟“

”فی الحال میں جلدی میں ہوں اس لیے صرف اتنا عرض کر دوں کہ ہم دونوں کا دشمن ایک ہی ہے۔“

”میں سمجھی نہیں.....؟“ میڈم روہی کے ذہن کو شبیم کا جواب سن کر جو ذہنی جھٹکا لگا وہ قدرتی امر تھا۔

”اس وقت میں آپ کے پاس ایک مختصر سی درخواست لے کر آئی ہوں۔“ شبیم نے کمرے میں چاروں طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑی رازداری سے کہا۔ ”آپ کو جن لوگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی ان کا مقصد شاید تاوان حاصل کرنا ہو، لیکن افضل خان بہت گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی درخواست ہے کہ اگر آپ اس سے ملاقات اور اس کے اپارٹمنٹ میں جانے کا ذکر کسی طرح اپنے بیان میں شامل نہ کریں تو وہ آپ کا شکر گزار ہوگا۔“

”ٹھیک ہے.....“ روہی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”میں اس کا نام خود بھی درمیان میں لانا پسند نہیں کروں گی۔“

”بہت بہت شکریہ.....“

”کیا تم میرے ہسپتال سے ریلیز ہونے کے بعد دوبارہ کسی وقت مل سکتی ہو؟“

”آپ کو اس وقت جو تجسس ہو رہا ہے میں اسے سمجھ سکتی ہوں۔“ شبیم بے حد سنجیدہ ہو گئی۔

”میں یقیناً کوشش کروں گی کہ کوئی مناسب موقع نکال کر آپ سے کم از کم ایک بار تفصیلی ملاقات کروں۔ چلتے چلتے یہ ضرور عرض کروں گی کہ میں نے موجودہ جاب کچھ سوچ سمجھ کر ہی حاصل کی ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر دشمن کو میری حقیقت یا اصلیت کا علم ہو گیا تو وہ مجھے کسی پاؤں کے نیچے آئی جیونی سمجھ کر پھل ڈالنے میں ایک ہل کی بھی تاخیر نہیں کرے گا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، لیکن ایک بات یہ بھی سمجھی نہ بھولنا کہ مارنے والے کے حق میں بچانے والا زیادہ طاقت رکھتا ہے۔“

”میں اب اجازت چاہوں گی۔“ شبیم ہاتھ ملانے کے بعد جانے کیلئے پلٹی تو روہی نے تیزی سے کہا۔

”مجھے ایک اہم بات اور معلوم کرنی ہے۔“

”پوچھئے۔ اگر میرے علم میں ہوئی تو بتانے سے گریز نہیں کروں گی۔“

”ٹھیکس.....! تم نے اخبارات میں میرے حادثے کی تفصیل ضرور پڑھی ہوگی۔ ایک نامعلوم شخص نے جو سادہ سے لباس میں تھا حیرت انگیز طور پر گھبراہٹ ہونے کے باوجود مجھے اغوا کرنے والوں کے گھنچے سے گھنچ لایا تھا، وہ کون تھا؟“

”اخبارات میں صرف علاقہ پولیس اور سب انسپکٹر کے علاوہ کسی اور کا کوئی ذکر نہیں ہے“ شبیم نے جواب دیا۔

”وہاں سادہ لباس میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہوگا بھی تو اخبارات میں اس کا ذکر نہیں ہے۔“

”کسی لاش کی اطلاع بھی نہیں شائع ہوئی؟“

”جی نہیں.....“

”اوکے۔“ میڈم روہی نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر کر کہا۔ ”اپنا وعدہ یاد رکھنا، ہسپتال کے جھیلوں سے نجات ملنے کے بعد میں تمہاری ملاقات کا انتظار بڑی شدت سے کروں گی۔“

شبیم نے دوبارہ وعدہ کیا پھر وہ خاموشی سے نکلتی چلی گئی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ کسی بہانے میڈم روہی سے ذاتی طور پر بھی ملی تھی اس خوشی کے پشت پر اس کی زندگی کا ایک راز تھا جس نے اسے اپنے بدترین دشمن کے دفتر میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ روہی کی طرح وہ بھی کسی اپنے کے لئے شیخ حامد سے پرانا حساب کتاب چھٹا کرنے کیلئے بے حد مضطرب تھی۔



اخبار نے علاقہ سب انسپکٹر کے حوالے سے میڈم روہی کے بارے میں جو مزید خبر شائع کی تھی اس میں یہی لکھا تھا کہ میڈم روہی جو ایک کروڑ پتی بیوہ ہے، پوش علاقے کے فلک نور پارٹمنٹس میں اپنی ایک سبیلی سے ملنے گئی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ اپنی سبیلی کے اپارٹمنٹ میں رہی۔ واپسی میں وہ اپنی کار میں بیٹھنے جا رہی تھی جب اسے دو افراد نے اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن پولیس کی گشتی پارٹی نے اسے بروقت بچا لیا۔ پولیس کو اپنے بیان میں اس نے یہی ظاہر کیا تھا کہ اس کا کوئی دشمن نہیں ہے جس پر وہ شبے کا اظہار کر سکے۔ اس کا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ کسی پیسہ درگروہ نے اسے تاوان کی خاطر اغوا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ آخر میں یہ بھی درج تھا کہ میڈم روہی نے متعلق سب انسپکٹر کو اپنی جیب خاص سے تیس ہزار بطور انعام دیے ہیں اور آئی جی سے اس کی ترقی کی سفارش بھی کی ہے۔ جن دو افراد کو پولیس نے گرفتار کیا تھا انہوں نے عدالت کے روبرو اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ اس سے چوتھر بھی وہ ایک بار چھ ماہ قید با مشقت کی سزا بھگت چکے ہیں۔

افضل خان نے پوری تفصیل پڑھنے کے بعد سکون کا سانس لیا۔ میڈم روہی نے اس کے اپارٹمنٹ یا اس سے ملاقات کے سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ شبیم نے گزشتہ روز اسے میڈم سے اپنی ملاقات کے بارے میں جو تفصیل بتائی تھی وہ غلط نہیں تھی، افضل خان نے شبیم کی اس مہربانی کو بھی اسی زاویہ نگاہ سے دیکھا تھا کہ وہ بھی افضل خان کو پسند کرتی تھی۔ دبی زبان اور اشاروں

”جس حد تک بھی جاسکو میری طرف سے اس کی پوری اجازت ہے۔“
 ”اوکے باس۔“ افضل خان نے کسمسا کر مدھم آواز میں کہا۔

”تم نے میرے اس نئے حکم کی کوئی وجہ نہیں پوچھی؟“

”میرا کام آپ کے حکم کی پیروی کرنا ہے۔“ افضل خان نے سعادت مندی کا اظہار کیا۔ ”میں نے وجہ جاننے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔“

”اچھا کیا تم نے۔“ شیخ حامد پہلی بار مسکرایا۔ ”میں آئندہ بھی تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ کسی بات کو کریدنے کی کوشش کرو لیکن..... میڈم روبی کے بارے میں تم کو یہ ضرور بتانا پسند کروں گا کہ وہ بھی میرے مخالف گروپ سے تعلق رکھتی ہے۔“

”ایسی صورت میں تو اسے راستے سے.....“

”نہیں.....“ شیخ حامد کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ”ناگن کا پھن چل دیئے کے بجائے اسے بین کی لے پر ناچتے ہوئے دیکھنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ تم سمجھ رہے ہو میری بات؟“
 ”نہیں سر.....“ افضل خان نے بھی زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”ایسی تصویریں بلیک میلنگ اسٹنٹ جو اس ناگن کی نظریں ہمیشہ نیچی رکھے۔“

”کام ہو شیاری سے کرنا.....“ شیخ حامد یک لخت دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں میڈم روبی کے سلسلے میں تمہاری ناکامی کی کوئی وجہ نہیں سنوں گا۔“
 ”ایسا کبھی نہیں ہوگا باس.....“

”میرے پاس ایک اطلاع اور بھی ہے۔“

”وہ کیا باس؟“ افضل خان نے دریافت کیا۔

”وحید کی ناکامی کا سبب کون تھا؟ اس کا نام جانتے ہو؟“

”وہ..... سیٹھ عثمان کا ملازم لیاقت حسین تھا جواب وہاں ڈرائیوری کے فرائض.....“

”میڈم کے سلسلے میں اخبارات میں جو تفصیل آئی ہے وہ مکمل نہیں ہے۔“ شیخ حامد نے افضل خان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئی کہا۔ ”اس رات میرے خبر کی اطلاع کے مطابق ڈی ایس پی سراج بھی کہیں قریب ہی گاڑی میں بیٹھا اس خوبصورت ناگن کی نقل و حرکت و اچ کر رہا تھا اس کے ساتھ لیاقت حسین بھی تھا۔“ شیخ حامد ایک ہل کو خاموش ہو گیا۔ ”اسی کجنت کی وجہ سے خوبصورت ناگن ہمارے پٹارے میں آتے آتے رہ گئی۔“

”یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔“ افضل خان نے پہلو بدل کر بگ باس کے جیلے کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔

”سراج کس لیے میڈم روبی کی نگرانی کر رہا تھا؟“

”یہ بھی معلوم ہو جائے گا، لیکن اب لیاقت حسین پر بھی نظر رکھو.....“ شیخ حامد نے کسی زنجی ناگ کی طرح بل کھا کر حکم دیا۔ ”وہ کہاں رہتا ہے؟ اس کے ساتھ اور کتنے نمک حلال افراد ہیں؟“

کناویوں میں اس کا اظہار بھی کر چکی تھی لیکن افضل خان نے ابھی تک اس طرح کا قدم اٹھانے سے محض اس لیے گریز کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایک ہی دفتر میں کام کرتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وہ خود بھی اسے پسند کرتا تھا مگر بگ باس کے اچانک نازل ہونے والے عتاب سے ہمیشہ خوفزدہ رہتا تھا۔ بہر حال اخبار تفصیل سے پڑھنے کے بعد اس نے سکون کا گہرا سانس لیا تھا لیکن اس کا یہ اطمینان دوسری صبح دفتر پہنچتے ہی ختم ہو گیا۔ وہ وقت پر دفتر پہنچا تھا اس کے سیٹ پر بیٹھنے کے آدھے گھنٹے بعد چہرہ اس نے اسے بگ باس کی آمد کی اطلاع دی پھر پندرہ بیس منٹ میں اس کی طلبی کا حکم بھی آ گیا۔ حسب معمول اس وقت بھی شیخ حامد اپنے مخصوص ساؤنڈ پروف کمرے میں موجود تھا۔ اس کے تہوار جیسے نظریں آ رہے تھے۔ افضل خان کے سلام کا جواب بھی اس نے اشارے سے دیا۔ پھر اسی کے اشارے پر وہ سامنے والی خالی نشست پر بیٹھ گیا۔

شیخ حامد کچھ دیر خاموش بیٹھا سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو میز کے شیشے پر دباتا اٹھاتا رہا پھر اس نے افضل خان سے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔ ”میری غیر موجودگی کے درمیان کوئی خاص رپورٹ؟“

”باقی سب ٹھیک رہا لیکن۔“

”میڈم روبی کے اغوا کی تفصیل میں سن بھی چکا ہوں اور اس کی تفصیلات اخبار میں بھی دیکھ چکا ہوں۔“ شیخ حامد نے اس کا جملہ کاٹ کر بدستور خشک انداز میں کہا۔ ”اخبار میں جس اپارٹمنٹ کا ذکر ہے وہ شاید تمہارے اپارٹمنٹ کے بہت قریب ہے۔“
 ”نہیں باس.....“ افضل خان نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

”میڈم روبی کے بارے میں تم کیا جانتے ہو.....؟“

”وہ ایک کروڑ پتی بیوہ ہے..... اس کے شوہر کا انتقال کہیں بیرون ملک ہوا تھا، شوہر کی زندگی میں وہ ایک مکمل گھریلو عورت تھی، لیکن اس کے بعد ادھر غالباً ایک یا ڈیڑھ ماہ سے وہ بالکل ماڈرن انداز میں منظر عام پر آئی ہے۔ فائیسٹار ہونٹوں کے بیکیوٹ ہالز اور کئی وی آئی پی ٹائپ کلبوں کی ممبر بھی ہے۔“

”تمہاری اس سے کوئی ذاتی واقفیت.....؟“ شیخ حامد کی عقابانی نظریں بدستور افضل خان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی.....“ افضل خان نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”وہ میرے لبوں سے خاصی اونچی چیز ہے، مردوں سے زیادہ گھلنا ملنا بھی پسند نہیں کرتی۔“

”میرا خیال ہے کہ تم بھی ریڈیو کلب کے باقاعدہ ممبر ہو اور وہاں کے منبر سے تمہاری خاصی بے تکلفی بھی ہے۔“

”نہیں باس، لیکن.....“

”میں چاہتا ہوں کہ تم روبی سے دوستی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔“ شیخ حامد کا لہجہ تھکسانہ تھا۔

لیاقت حسین کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ اندر سے بلاوا آ گیا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب گھر کی دیکھ بھال کرنے والی بیگم صاحبہ نے اسے طلب کیا تھا۔ وہ کوشی کے دروازے پر پہنچا تو وہاں ایک ملازمہ اس کی منتظر تھی اسے اندر بلا لیا گیا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر کی خاتون کھڑی تھیں۔ لیاقت حسین نے ان پر نظر پڑتے ہی سلام کرنے کے ساتھ ساتھ نظریں بھی جھکا لیں۔ پہلی نظر میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ نیک دل اور بردبار خاتون تھیں۔

”سنا ہے تم آج دو گھنٹے لیٹ آئے ہو؟“

”جی ہاں میں نے کل.....“

”مجھے علم ہو چکا ہے کہ تم نے بیوی کو اس کے گھر بھیجا ہے۔“ خاتون نے مہذب لہجے میں کہا۔

”کیا تمہارے گھر میں کوئی اور بھی رہتا ہے؟“

”جی نہیں.....“ لیاقت نے دبی زبان میں جواب دیا ”اور تو کوئی بھی نہیں ہے۔“

”میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔“ خاتون نے جواب کے ساتھ ایک حکم بھی سنا دیا۔ ”آج سے دونوں وقت کا کھانا اور ناشتا تم ادھر کوشی پر ہی کرو گے۔ میں کسی قسم کا انکار نہیں سنوں گی۔ کل راحیلہ اور عثمان کا فون آیا تھا۔ ان دونوں کا بھی یہی حکم ہے۔“

”آپ لوگوں کا حکم سر آکھوں پر۔“ لیاقت حسین نے بڑی عقیدت سے جواب دیا۔ ”اب میں وقت پر آؤں گا لیکن رات کو ذرا دیر سے جایا کروں گا۔“

”یہ تمہاری مرضی ہے لیاقت حسین۔“ اس بار بے حد اپنائیت اور پیار بھرے لہجے میں کہا گیا ”عثمان اور راحیلہ بھی تمہیں ملازم نہیں بلکہ گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے ہیں اور بھی کسی قسم کی ضرورت ہو تو کسی تکلف سے کام نہ لینا۔ مجھے خوشی ہوگی۔“

”بڑی مہربانی بیگم صاحبہ“ لیاقت نے کہا پھر سلام کر کے نظریں جھکائے جھکائے واپس آ گیا۔ نئی بیگم صاحبہ نے اس سے جس محبت اور اپنائیت کا اظہار کیا تھا وہ بھی اس کیلئے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔

اس روز اس نے دوپہر کا کھانا بوڑھے مالی غفور کے ساتھ اسی کے کمرے میں کھایا۔ کھانا ختم کر کے وہ گھر کے باہر چکر لگانے نکلا گیت سے نکلتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ گل خان کو گھر کے سامنے دیکھ کر اس کے ذہن میں بے شمار دوسرے سراپا بھارنے لگے۔ گل خان بھی اسے دیکھ کر لمبے قدم اٹھاتا قریب آ گیا۔

”کیا بات ہے گل خان؟“ لیاقت نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”کیا تم لوگ گیا نہیں.....؟“

”لیاقت..... میرے یار، گل خان پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ”بس روانہ ہونے سے چندرہ منٹ پہلے ہم حاجت پورا کرنے ذرا ادھر گیا واپس آیا تو پتہ چلا کہ کچھ نقاب پوش ایک لینڈ کروزر جیسا بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر آیا۔ جب وہ باہر نکلے تو ان کی تعداد چار تھی سب کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ..... وہ تیری فرحین اور اپنی زرینہ کو زبردستی گھسیٹ کر لے گئے۔ کنڈیکٹر نے انہیں روکنے

کس وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے؟ کس وقت جاتا ہے؟ مجھے یہ ساری تفصیل درکار ہے۔ جو شخص دوبارہ میرا راستہ کاٹ جائے میں اسے زیادہ دنوں برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”میں سمجھ رہا ہوں باس لیکن کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم کوئی شارٹ کٹ.....“

”نان سینس.....“ شیخ حامد کے تہور اچانک ہی خطرناک ہو گئے۔ ”جتنا حکم دیا جائے صرف اسی پر عمل کیا کرو..... میں نے تم سے کوئی مشورہ طلب نہیں کیا تھا..... ناؤ گیٹ لاسٹ.....“

”سوری سر.....“ افضل خان نے سب سے انداز میں کہا پھر تیزی سے اٹھ کر کسی پالتو کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

✦✦✦

گل خان زرینہ اور فرحین کو لاری اڈے پہنچانے کے بعد لیاقت حسین ٹھیک ساڑھے دس بجے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ اس نے بس کے ٹکٹ اور سینس دوروز پہلے ہی بک کر لیے تھے۔ ایک دن پہلے اندر کی پرانی ملازمہ اور گارڈ کو بھی مطلع کر دیا تھا کہ وہ ڈیوٹی پر ڈیڑھ دو گھنٹے لیٹ آئے گا۔ اسے فرحین کے چلے جانے کی خوشی بھی تھی اور اپنی تنہائی کا احساس بھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس طرح فرحین کو جن خوابوں نے پریشان کر رکھا تھا وہ ان سے کچھ دور ہو جائے اور مینے ڈیڑھ مینے گھر والوں سے بھی مل آئے۔ یہ بھی جانتا تھا کہ فرحین اور گل خان کی غیر موجودگی میں اس کا وقت گزرانا مشکل ہو جائے گا۔

فرحین کی خواہش تھی کہ لیاقت حسین کی ماں کیلئے جمع کی ہوئی رقم بھی ساتھ لے جائے۔ لیکن لیاقت حسین نے اسے سمجھا بجا کر وہ رقم ایک روز پہلے ہی منی آرڈر کر دی تھی اس نے اپنے گھر والوں کو بھی فرحین کی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی اس لیے کہ فرحین کو اچانک دیکھ کر گھر والوں کو جو خوشی ہوئی اسے وہ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈیوٹی پر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے پرانی ملازمہ کو اطلاع دی پھر حسب معمول کوشی کا ایک راؤنڈ لگانے کے بعد چاچا غفور کے پاس آ گیا۔ اس نے ایک روز قبل ہی گل خان کے توسط سے جوان مالی کا انتظام کر لیا تھا۔ راؤنڈ لیتے وقت اس نے نئے ملازم رب نواز کو کام میں مصروف دیکھا تھا۔

”اب طبیعت کیسی ہے غفور بابا.....؟“

”اوپر والے کا کرم اور تیری مہربانی ہے پتر ڈاکٹر کی دوائی سے آرام بھی ملا اور.....“ غفور نے لیاقت کو شفقت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو نے نئے مالی رب نواز کو رکھ کر میرا کام ہلکا کر دیا ہے۔ رب تیرا بھلا کرے۔“

”بھروسے کا آدمی ہے بابا..... میں نے ٹھونک بجا کر اطمینان کر لیا تھا میرے دوست کا واقف کار بھی ہے۔“

”اپنا کام بھی چنگی طرح جانتا ہے پتر۔“ غفور نے کہا۔ ”سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے پودوں سے محبت بھی ہے۔“

کی کوشش کی تو اسے بھی رائفلوں کے بٹ مار کر نیچے گرا دیا..... مسافروں میں سے بھی کوئی مدد کیلئے سامنے نہیں آیا۔ جانے وہ کون خدا کی غوار تھے؟“

لیاقت حسین کو زمین اپنے قدموں تلے سرکتی محسوس ہوئی۔ اس کا چہرہ غصے سے چپ کر سرخ ہونے لگا۔

غصے کی شدت سے لیاقت حسین کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ گل خان نے زرینہ اور فرحین کے اغوا کی خبر سنا کر ایک لمحے کو اسے بالکل گنگ کر دیا تھا، اس کے اندر طوفانِ ٹھانٹیں مار رہا تھا، اس شہر میں اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ اتنا دولت مند بھی تھا نہیں کہ وہ معمولی تاوان کی ادائیگی ہی کر سکتا پھر؟ ان دونوں کو کیوں اغوا کیا گیا؟ کس نے اغوا کیا؟..... اس کے ذہن میں مختلف خیالات ابھر رہے تھے، جب گل خان کی آواز اس کے کانوں سے نکلرائی۔ ”کیا سوچ رہے ہو لیاقت“ ہمیں فوری طور پر اس معاملے کی رپورٹ تھانے میں درج کرانی چاہئے۔“

”نہیں..... ہم کو سب سے پہلے سراج صاحب سے بات کرنی ہوگی لیکن..... کسی نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟“

”کدھر سے کرتا.....“ گل نے جھلا کر جواب دیا۔

”ان خنزیر کے بچوں نے نمبر پلیٹ کے اوپر سیاہ چڑے کا کور ڈال رکھا تھا۔ ان کے چہرے بھی نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ خدا جانے وہ دونوں کس حال میں ہوگا.....؟“

”تمہاری ادھر کسی سے کوئی پرانی دشمنی تو نہیں چل رہی تھی؟“

”نہیں.....“

”پھر..... ان کو ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہی تو سوچنے کی بات ہے“ گل خان نے ہاتھ مسلتے ہوئے جواب دیا۔ ”گاڑی میں اور بھی لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں لیکن میرا دل بولتا ہے کہ وہ کسی کے اشارے پر صرف ہماری آبرو کا جنازہ اٹھانے آئے تھے۔ خدا ان خانہ خرابوں کا بیڑا غرق کرے۔“

لیاقت حسین کے ذہن میں بھی قسم قسم کے شبہات ابھر رہے تھے۔ وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے گل خان کو ساتھ لے کر دوبارہ بس اڈے پر پہنچ گیا۔ رات تک وہ دونوں وہاں دکانداروں، ٹھیلے والوں، ٹکٹ گھر والوں اور دوسری بسوں میں کام کرنے والے لوگوں سے اس بارے میں پوچھتے رہے لیکن کہیں سے بھی کوئی مفید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ سراج کے دفتر پہنچ گیا لیکن اس وقت وہاں صرف ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ وہ لیاقت کو ایک دو بار دیکھ چکا تھا اس لیے نرمی سے بولا۔

”صاحب کا ڈیوٹی تو شام چھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔“

”پھر..... اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟“ لیاقت نے پوچھا۔

سپاہی نے تھوڑی جیل و جت کے بعد اسے گھر کا پتا بتا دیا۔ گل خان نے رکشا نہیں چھوڑا تھا وہ اس کا واقف کار بھی تھا اور قریب ہی بستی میں رہتا تھا۔ لیاقت اس کے ساتھ بیٹھ کر سراج کی رہائشگاہ کی طرف چل پڑا۔ اسے یقین تھا کہ سراج ہی اس کیلئے کچھ کر سکتا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں وہ اور گل خان کہاں کہاں پھرتے۔

رات کے تقریباً پونے گیارہ بجے سراج نے لیاقت حسین اور گل خان کو دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔ لیاقت حسین نے ایک ہی سانس میں اسے ساری کہانی سنا ڈالی پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”کچھ کرو صاحب..... ورنہ ہم دونوں برادری میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔“

سراج ان دونوں کے ساتھ لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ فوری طور پر وہ کچھ کر گزرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، تاہم وہ لیاقت حسین کی سنائی ہوئی کہانی پر غور کرتا رہا پھر اس کے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا، جو لوگ لینڈ کروزر میں پوری تیاری سے آئے تھے۔ ان کی پشت پر کوئی لمبا ہاتھ بھی ضرور ہوگا۔ وحید ذرا نیور کی غداری اگر کام آجاتی تو سیٹھ عثمان کی موت یقینی تھی لیکن لیاقت نے بروقت اپنے تجربے کی بنا پر ٹائم بم کی اطلاع دے کر مجرموں کی امیدوں پر اوس ڈال دی تھی۔ اس کے بعد میڈم روبی کے اغوا کی ناکامی میں بھی لیاقت حسین نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ممکن ہے ان دونوں کامیوں کی وجہ سے کسی دشمن نے لیاقت حسین کو وقتی طور پر ایک وارنٹک دینے کی خاطر فرحین اور زرینہ کو اغوا کر لیا ہو۔ زرینہ ساتھ تھی اس لیے وہ بھی لپیٹ میں آگئی۔

سراج کا ذہن کسی نتیجے پر پہنچنے کی خاطر تانے بانے بنا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ وحید کی غداری کی پشت پر شیخ حامد اور افضل خان کا ہاتھ شامل تھا، اسی لیے اس نے وقتی طور پر سیٹھ عثمان اور راجیلہ کو دو مہینے کیلئے بیرون ملک بھیج دیا تھا۔ ڈی آئی جی کراچی کو اعتماد میں لے کر اس نے شیخ حامد کو ٹریپ کرنے کا خطرہ بھی مول لے لیا تھا لیکن میڈم روبی کے اغوا سے شیخ حامد کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ ایک لحظت سراج کے ذہن میں ایک نئے شے نے سر ابھارا۔ ہو سکتا ہے کہ میڈم روبی کے اغوا میں بھی کسی نہ کسی زاویے سے شیخ حامد ہی کا ہاتھ شامل ہوئے بھی ایسے وقت اغوا کیا جا رہا تھا جب خود شیخ حامد ملک سے باہر تھا۔ اس نئے خیال نے سراج کو اور بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

”ہمارے لیے کیا حکم ہے صاحب.....“ لیاقت نے سراج کی طویل خاموشی سے تنگ آ کر دہلی زبان میں پوچھا۔

”میں تمہارے ہی معاملے پر غور کر رہا تھا۔“ سراج نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو تمہاری اور گل خان کی بیوی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ انہیں لے گئے ہیں وہ تم سے کسی وقت رابطہ کرنے کی کوشش بھی کریں۔ اگر ایسا ہو تو تم ان سے سنبھل کر بات کرنا، خود کو قابو ہی میں رکھنا ورنہ بات پھر بڑھ بھی سکتی ہے۔“

”صاحب.....“ لیاقت حسین نے ہاتھ جوڑ کر منت کی۔ ”اگر آپ کو کسی پلید پر شبہ ہے تو مجھے بتا دو۔ میں فرحین اور زرینہ بہن کی خاطر موت سے بھی نکلانے کو تیار ہوں۔“

”پریشان مت ہو۔“ سراج نے اسے سمجھایا۔ ”جو لوگ لینڈ کروزر میں بیٹھ کر آئے تھے ان کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔ تم ان کے قریب بھی نہیں جاسکو گے۔“

”لیکن ان خدائی خواروں کو ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ اس بار گل خان نے سوال کیا۔

”میرے کہنے پر صرف چوبیس گھنٹے صبر سے کام لو۔“ سراج نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔

”اس کے بعد میں تمہارے ساتھ شریک ہونے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔“

”سراج صاحب! آپ مجھے خالی.....“ لیاقت نے پہلو بدل کر کچھ کہنا چاہا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ سراج لیاقت کا ہاتھ تھام کر ایک طرف لے گیا۔ اسے سمجھاتے ہوئے

بولتا۔ ”جن لوگوں نے تمہارے صاحب کی گاڑی میں ٹائم بم فٹ کرایا تھا۔ مجھے یہ ان ہی کی شرارت

معلوم ہوتی ہے۔“ پھر اس نے میڈم روبی کے حوالے سے بھی وہی زبان میں کہا۔ ”تم نے جس طرح

اس خاتون کو اغوا ہونے سے بچایا وہ تمہیں بھی یاد نہیں رہا۔“ سراج سانس لینے کے بعد بولا۔ ”تم کوئی

خاص بات زبان تک نہیں لانا چاہتے تو میں اصرار بھی نہیں کروں گا لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے

سوچو..... جو کچھ ہوا کیا وہ تمہارے لیے کسی عجوبے سے کم ہے؟“

”آپ جو کچھ کہہ رہے ہو صاحب وہ میں بھی سمجھ رہا ہوں لیکن آپ یقین کرو کہ میں اس دن

گاڑی سے نیچے نہیں اترتا تھا۔“ لیاقت نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ لیکن ان باتوں کا فرحین اور

زرینہ کے انخوا سے کیا تعلق تھا؟ یہ بات اس کے دماغ میں نہیں آ رہی تھی۔

”مجھے تمہاری بات کا یقین ہے، لیکن تم میری خاطر صرف چوبیس گھنٹے خاموش رہو..... کسی سے

کچھ نہ کہنا۔ اس دوران اگر کوئی تم سے کسی ذریعے سے رابطہ کرے تو مجھے فوری اطلاع دینا۔ میں جس

نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں اگر وہ درست ہوا تو پھر میں چوبیس گھنٹے کے بعد وہی کروں گا جو تم کہو

گئے لیکن اس وقت تک تمہارا رگری دکھا تا تمہاری بیوی اور زرینہ دونوں کے حق میں خطرناک بھی

ثابت ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب..... جو آپ کا حکم لیکن میرے اندر جو آگ بھڑک رہی ہے وہ میرے سوا

اور کوئی نہیں جانتا۔“ لیاقت حسین کی آواز رندہ گئی۔ سراج نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”فکر مت کرو..... فرحین اور زرینہ میرے لیے بھی اتنی ہی قابل احترام ہیں جتنی تم دونوں کیلئے

لیکن میں نے جو مدت مقرر کر دی ہے اس کے دوران کوئی جلد بازی نہ کر بیٹھنا۔ میں تمہیں اس بات کا

یقین دلاتا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہوں گی ان کی عزت پر کوئی ہاتھ ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کرے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو صاحب ورنہ ہم اپنی عزت کی خاطر کسی قربانی دینے سے منہ نہیں

موڑے گا۔“

سراج نے جو باتیں اس کے دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کسی حد تک لیاقت حسین کی

سمجھ میں آ رہی تھی لیکن گل خان واپسی میں بھی رہ رہ کر بل کھا رہا تھا اس نے لیاقت سے پوچھا بھی

تھا۔

”پولیس والا آفیسر تم کو علیحدہ لے جا کر کیا بات کر رہا تھا؟“

”چوبیس گھنٹے تک دل پر پتھر رکھ لو گل خان۔“ لیاقت حسین نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”ہم دونوں کے دل پر ایک ہی جیسا گھاؤ لگا ہے جس نے بھی ہماری عزت اور آبرو پر ہاتھ ڈالا ہے وہ

جب بھی بے نقاب ہوگا میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا بعد میں چانسی کا پھندا بھی برداشت کر لوں

گا۔“

”مگر تمہارے سراج صاحب نے.....“

”وہ تجربہ کار آفیسر ہے۔“ لیاقت نے گل خان کو مطمئن کرنے کی خاطر جواب دیا۔ ”اس کی

مدد کے بغیر ہم اپنا خون جلانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔“

گل خان نے پھر کوئی سوال نہیں کیا لیکن وہ لیاقت حسین کی بات سے پور طرح مطمئن بھی

نہیں ہوا۔

❖❖❖

افضل خان اس وقت شغل سے نوشی میں مصروف تھا۔

شیخ حامد کا ایک اور نیا معاملہ نمٹانے کے بعد وہ ٹھیک آٹھ بجے اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا۔ نیم

گرم پانی سے نہالینے کے بعد اس کی دن بھر کی تھکن دور ہو گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا پٹھانہٹی وی دیکھ رہا

تھا ایک پیگ ختم ہو جاتا تو دوسرا تیار کر لیتا لیکن اس تمام مشغولیت کے باوجود اس کا ذہن اس وقت

بھی بگ باس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیاقت حسین کے بارے میں اس نے تمام معلومات

حاصل کر کے اوپر سے ملنے والی ہدایت کے مطابق لیاقت حسین کی بیوی کے انخوا کے سلسلے میں ان

افراد کی ٹیم تشکیل دی تھی جن کو محض غیر قانونی سرگرمیوں کی خاطر پالا جا رہا تھا۔ شیخ حامد کے الفاظ اس

کے ذہن میں گونج رہے تھے..... ”جو شخص دوبار میرا راستہ کاٹ جائے میں اسے زیادہ دونوں

برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

افضل خان کو اس بات کا علم تھا کہ لیاقت حسین نے ہی سیٹھ عثمان کی گاڑی میں نصب شدہ ٹائم

بم کا کھوج نکال کر سیٹھ عثمان کو موت کا لقمہ بننے سے بچا لیا تھا لیکن یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ

اسی لیاقت حسین نے میڈم روبی کے انخوا کو بھی حیرت انگیز طور پر بردت ناکام بنا دیا تھا اس اطلاع

کے ساتھ بگ باس نے ایک اہم بات اور کہی تھی۔ ”لیاقت حسین ہی کی وجہ سے ایک ناگن ہمارے

پٹارے میں آتے آتے رہ گئی۔“ ناگن کے حوالے سے اس نے میڈم روبی کا نام بھی لیا تھا۔ اسے

راستے سے ہٹا دینے کے بجائے یہ بھی کہا تھا کہ ”ناگن کا پھل کچل دینے کے بجائے اسے بین کی لے

پر ناچتے ہوئے دیکھنا مجھے زیادہ پسند ہے۔“ اس کے بعد بگ باس نے اسے میڈم کو محبت کے جال

میں پھنس کر حد سے گزر جانے کی اجازت بھی دے دی تھی اور..... بگ باس کی دو باتیں یہ ثابت

کرنے کیلئے کافی تھیں کہ اسی نے میڈم روبی کے شوہر کو کسی بزنس ڈیلنگ کے سبب اپنے راستے سے

ہٹا دیا ہوگا۔

”مجھے میڈم سے بات کرنی ہے۔“
 ”وہ اس وقت آرام کر رہی ہیں۔“ فون اٹھانے والی نے جواب دیا۔
 ”میں افضل خان بول رہا ہوں.....“ اس نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”تم میڈم کو میرا نام بتادو۔
 ات ازارجنٹ۔“

”ہیلو.....“ ایک منٹ بعد روٹی کی آواز سنائی دی۔
 ”اس وقت کیسے کال کر لیا.....؟“
 ”ہسپتال آنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا لیکن آپ کی طرف سے فکر مند ضرور تھا۔“ افضل خان

نے بڑے پیار سے کہا۔ ”آپ بھولنے والی چیز بھی نہیں ہیں۔“
 ”لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو۔ ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ رمی تکلف.....“
 ”یاد آ گیا..... سوری..... اب بتاؤ کہ تم کیسی ہو؟“

افضل خان نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی سے کہا۔ ”میں اس وقت تمہارے حادثے کی منحوس خبر کو
 بلیک ڈاگ کے لیے لے لے گھونٹوں کے ذریعے بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“
 ”گنڈ..... ویسے تم نے میری آفر پر کہاں تک غور کیا؟“

دوسری جانب سے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا گیا۔
 ”فون پر یہ بات مناسب نہیں ہوگی۔“
 ”میں جانتی ہوں..... چلو پرستیج ہی بتادو۔“
 ”فی الحال اتی فیصد.....“

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔“ دوسری جانب سے محبت بھرا انداز اختیار کیا گیا۔ ”باقی بیس فیصد
 پورا کرنے میں کتنا وقت لو گے؟“

”یہ آپ پر منحصر ہے۔“ افضل خان نے گلاس خالی کر کے لہراتے ہوئے بڑی ٹھیلی آواز میں
 کہا۔
 ”ایڈوائس؟“

”غلط سمجھیں میں تمہارے صحت مند ہونے پر باقاعدہ سیلی بریٹ کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”سوری..... میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ ویسے بھی لوگوں کے درمیان اٹھنا بیٹھنا اور کھانا
 ملنا مجھے پسند نہیں ہے۔“ روٹی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے تمہاری ماڈرن دنیا میں کیوں قدم رکھا
 ہے؟ تم جان چکے ہو۔“

”او۔ کے۔“ افضل خان نے چار ڈالنے میں دیر نہیں کی۔ بڑی اپنائیت سے بولا۔ ”یہ جشن
 صحت مخصوص ہوگا۔ بالکل ایکس کلیو سیو (Exclusive) صرف تم اور میں۔ میرے اپارٹمنٹ
 میں۔“

”تھوڑی سی ترمیم کر لو۔“ روٹی نے بھی بے تکلفی کا اظہار کیا۔ ”تمہارے اپارٹمنٹ کی شرط

افضل خان کا ذہن ان باتوں کے ساتھ ساتھ روٹی کے بارے میں بھی سوچنے لگا۔ پہلی ہی
 ملاقات میں اس نے شوہر کا انتقام لینے کی خاطر اس جو پیشکش کی تھی وہ بھی خود اسی کی طرح حسین تھی
 اب زیادہ پرکشش بن گئی تھی اس لیے کہ بگ باس نے روٹی کے ساتھ کھلنے ملنے اور اسے بے آبرو کر
 کے ایسی تصاویر حاصل کرنے کا اشارہ دیا تھا جس کے بعد روٹی جیسی باعزت عورت بھی اس کے
 اشاروں پر تاجپے کیلئے مجبور ہو جاتی۔ افضل خان کے تصور میں روٹی کا حسین اور گداز جسم ابھر تو اس
 کے ہونٹوں پر شرابی مسکراہٹ پھیل گئی۔ گلاس خالی کرنے کے بعد وہ دوسرا پیگ تیار کر رہا تھا۔ جب
 قریب رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ افضل خان نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”کام خیر و خوبی سے انجام پا گیا جناب۔“ دوسری طرف سے کسی نے سرسراتے لہجے میں کہا۔
 ”ہم نے انہیں لاری اڈے سے دیوچ لیا، لیکن گیپوں کے ساتھ ایک گھن بھی پس کیا۔“
 ”کیا مطلب.....؟“ افضل خان نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ ایکلی نہیں تھی جناب اس کے ساتھ اس کی ایک سہیلی اور اس کا مرد بھی تھا۔“ دوسری جانب
 سے بے پروائی سے جواب ملا۔ ”اس نے ہمارے انارڈانے کو بچانے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے
 چار چھ بٹ مار کر اس کی ساری تن فن بھی نکال دی۔“

”کہاں رکھا ہے دونوں کو.....؟“
 ”وہیں جہاں ایسی خوبصورت تلیاں رکھی جاتی ہیں۔“
 نمبر تھری..... انڈر گراؤنڈ..... ویسے دونوں ہی تروتازہ مال ہیں۔ کیا آپ کی طرف سے اجازت

ہے؟“ آخری جملے بڑے بازاری انداز میں کہے گئے۔
 ”نہیں.....“ افضل خان نے خشک لہجے میں کہا۔
 ”باس کے اشارے کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کا مطلب صرف موت ہوتا ہے..... دردناک

موت۔“
 ”چار پانی کیا جائے.....؟“
 ”وہی جو سب کو ملتا ہے ویسے بگ باس انہیں زیادہ دن نہیں رکھے گا۔“
 ”پھر.....“

”اپنے کام سے کام رکھو۔ اوپر سے جو آرڈر ملے گا وہ بھی تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔ کوئی غلطی
 بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ.....“ افضل خان نے جملہ ادھورا چھوڑ کر لائن کاٹ دی، پھر اس نے سب سے
 پہلے بگ باس کو فرمیں اور زرینہ کے قابو میں آ جانے کی اطلاع دی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے

بعد اس نے دو چار لمبے لمبے گھونٹ لیے پھر کچھ سوچ کر روٹی کے گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اسے
 اطلاع مل گئی تھی کہ روٹی کو سچ ہی ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ تین چار گھنٹوں کے بعد کسی
 خاتون نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو.....“

منظور نہیں۔ ایک بار آکر جو بھگت چکی ہوں اسے دوبارہ افورڈ نہیں کر سکتی۔ ایسا کرتی ہوں کہ تاریخ اور کسی فائیسٹار ہوٹل کا رانچ میں کروں گی باقی سبلی بریش تمہاری جیب پر منحصر ہے۔“

”اوکے۔ مجھے تمہاری یہ شرط بھی پسند ہے۔“

”یہ شرط نہیں، صرف تجویز تھی۔“ اس بار صاف گوئی سے کہا گیا۔ ”شرط یہ ہوگی کہ تم بار بار کی ملاقاتوں پر اصرار نہیں کرو گے اور..... باقی بیس فیصد پر بھی اپنی آمادگی ظاہر کر دو گے۔“

”اوکے ڈارلنگ.....“ افضل خان نے بڑی جسارت سے اسے ڈارلنگ کہا۔ ”ڈن مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔“

”ٹھیک ہے..... ڈاکٹر نے جیسے ہی مجھے صحت مند سمجھ کر چلے پھرنے کی اجازت دی، سب سے پہلے تمہیں اس کی اطلاع دوں گی۔“

”بھینکس..... ویسے اب زخم کیا ہے؟“

”کس زخم کی بات کر رہے ہو تم.....؟“ روبی کے جواب میں کک تھی شاید اس سوال کے ذریعے وہ اسے یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ جب تک اس کے مرحوم شوہر کا قاتل زندہ ہے اس کی روح پر لگا زخم بھی تازہ رہے گا۔

”ڈونٹ وری سویٹ ہارٹ.....“ افضل خان نے دل میں خوش ہوتے ہوئے اسے لفظوں میں تسلی دینے کی خاطر کہا۔ ”بات جب ہنڈرڈ پرسنٹ ڈن ہو جائے گی تو تمہارے سارے زخم ایک ایک کر کے بھر جائیں گے اوکے بائی۔“

”بائی افضل.....“ دوسری جانب سے بھی افضل خان کو ہموار کرنے کیلئے پیار کا اظہار کیا گیا۔

”جگ باس از ہنڈرڈ پرسنٹ کریکٹ (Correct)۔“ افضل خان نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے ایک غلیظ مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر معنی خیر انداز میں کہا ”تاگن کا سر کچلنے کے بجائے اس کا سپیرے کی بین پر تھمنا، بل کھانا، پھن مارنا اور بے بسی میں رقص کرتے رہنا زیادہ چارمنگ ہوتا ہے۔“

افضل خان نے اپنی کامیابی کا تصور کر کے تیسرا پیگ حلق سے نیچے اتار اتار اسے اپارٹمنٹ میں اپنی تنہائی کا احساس ڈسنے لگا، روبی سے فون پر گفتگو کرنے کے بعد وہ ترک میں آ گیا تھا۔ شباب کے با شراب اس وقت اسے بے چین کر رہی تھی اس نے گھڑی کی سمت نظر ڈالی۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اس کے ذہن میں اپنی تنہائی دور کرنے کی خاطر کئی تاہ ابھرے لیکن دروازے پر اس نے دالی دستک نہ اسے چونکا دیا۔ حسب معمول وہ اپنا آٹومیک ریوالور لے کر اٹھا۔ دروازے کے قریب جا کر میک آئی کے ذریعے باہر دیکھا تو ریولیو کلب لی ماریا سکرٹ اور تنگ بلاؤز میں باہر راہداری میں گھڑی تھی۔ وہ استعمال شدہ کی فہرست میں درج تھی لیکن اس وقت افضل خان کو نشے کی حالت میں وہ بھی کوئی حور نظر آئی۔

افضل خان نے دروازہ کھولا تو ماریا کے لباس اور جسم سے اٹھتی مہک نے اسے دیوانہ کر دیا۔

اپنا آٹومیک ریوالور صوفے کی طرف اچھال کر اس نے لات مار کر دروازہ بند کیا پھر ماریا کو اپنی کشادہ بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”مم..... میں ابھی تمہاری ہی طرف کلب آنے کا سوچ رہا تھا۔“ اس نے ماریا سے جھوٹ بولا۔

”آج تم بھی مجھے بہت یاد آ رہے تھے ڈیئر اس لیے میں کلب سے اٹھ کر سیدھی تمہاری طرف آ گئی۔“

پھر افضل خان اور بے باک ماریا دروغ گوئی کرتے ہوئے شرافت کے تمام لبادے اتار کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں حد سے گزر گئے۔ ایلٹس بھی خوشی میں رقص کرنے لگا۔



سراج کی چوبیس گھنٹوں والی شرط نے لیاقت حسین اور گل خان کو مجبور کر دیا تھا۔ ویسے بھی شہر میں ہزاروں کی تعداد میں اس قسم کی گاڑیاں تھیں جس میں فرمین اور زرینہ کو اغوا کیا گیا تھا۔ سراج کے گھر سے واپسی کے بعد بھی گل خان اور لیاقت حسین سر جوڑے بیٹھے اس دشمن کے بارے میں غور کرتے رہے۔ سراج کی وجہ سے لیاقت حسین کی پھر بھی کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی لیکن گل خان رہ رہ کر پیچ و تاب کھا رہا تھا اس دشمن سے انتقام کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ اپنی مادری زبان میں اغوا کرنے والوں کو مغالطات سناتا رہا تھا۔ ”کیوں اپنی زبان گندی کرتا ہے گل خان؟“ لیاقت نے کہا ”خدا سے دعا مانگ کہ وہ ساتھ خیریت سے واپس آ جائیں۔“

”تم کیا بات کر رہا ہے لیاقت حسین؟ اگر ان کو ساتھ خیریت کے آتا ہوتا تو وہ خنزیر ختم بس اڑے پر اس طرح سینکڑوں آدمیوں کے سامنے سے زرینہ اور فرمین بہن کو نہ لے جاتے اور..... لوگوں کا خون بھی اتنا سفید ہو گیا ہے کہ کوئی مدد کو سامنے نہیں آیا۔“

”کیسے آتا.....؟“ لیاقت حسین نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”ان کے پاس تمہارے کہنے کے مطابق چار چار نقلیں تھیں جو بھی سامنے آتا وہ اسے فوراً بھون دیتے۔ تم عام آدمیوں کی بات کرتا ہے ایسے موقعوں پر تو پولیس والے بھی ادھر ادھر چھپر ہو جاتے ہیں مجرم فرار ہو جاتے تو سینہ تان کر مرد بچوں کی طرح سامنے آ جاتے ہیں دو چار موٹے مرغوں کو پکڑتے ہیں پھر جیب گرم کر کے انہیں بھی چھوڑ دیتے ہیں۔“

”خدا جانے وہ دونوں کس حال میں ہوں گی؟“ گل خان نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بھی بے بسی نمایاں تھی۔

”دعا کرو کہ ان دونوں کی عزت محفوظ رہے۔ ایک بار وہ مل جائیں تو پھر ہم دشمنوں کا کھوج لگا کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔“

رات دو بجے تک گل خان لیاقت کے مکان پر بیٹھا رہا پھر تھک ہار کر اسے گھر چلا گیا۔ لیاقت

حسین چار پائی پر لیٹ کر سراج کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ وہ خود بھی سمجھ رہا تھا کہ زریہ مفت میں فرحین کے ساتھ لیٹے میں آگئی ورنہ وہ صرف فرحین کو اٹھانے آئے ہوں گے۔ ان کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں اور رائل والے ڈیکٹ شامل تھے تو وہ خود بھی بڑے لوگ ہوں گے۔ سراج نے کہا تھا کہ وہ اغوا کی جانے والی عورتوں کو بے عزت نہیں کریں گے۔ جلد ہی کہیں زندہ یا مردہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ یہ حرکت صرف اسے دھمکی دینے کیلئے کی گئی تھی۔ سراج نے اسے ٹائم بم سے سیٹھ مٹان کی جان بچانے کا حوالہ بھی دیا تھا۔ جن لوگوں نے وحید ڈرائیور کا ایمان خرید کر غداری پر اکسایا تھا اسے پولیس سے بچانے کی خاطر ملک سے باہر بھیجا تھا وہی لیاقت کے دشمن بھی بن گئے لیکن وہ چاہتے تو لیاقت حسین کو جان سے مار کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر سکتے تھے لیکن فرحین نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟ لیاقت حسین کو معلوم تھا کہ سیٹھ عثمان کو مروانے میں اس کے دوست نما دشمن بزنس میں شیخ حامد کا ہاتھ تھا لیکن میڈم روٹی والی بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ذاتی طور پر اسے یہی یاد تھا کہ وہ گاڑی سے نیچے نہیں اترتا تھا سراج نے اسے یہی حکم دیا تھا۔ وہ اس کے حکم کی خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا مگر سراج کا کہنا تھا کہ اس نے گاڑی سے اتر کر ان بد معاشوں سے لڑکی کو چھڑا لیا تھا۔ لیاقت حسین اسے دیوانے سے ملاقات کا کرشمہ سمجھ رہا تھا مگر ناپیتا بزرگ کی تاکید کے بعد وہ اس سلسلے میں زبان نہ کھولنے کا عہد کر چکا تھا۔

رات گئے تک وہ چار پائی پر لیٹے کر دیش بدلتا رہا مگر فرحین کی یاد اسی کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح فرحین سے دشمنی کا بدلہ لینے والوں کے بارے میں عقلی گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ جب قبرستان کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے کسی نے اس کا نام لے کر آواز دی وہ آواز سراج کی تھی جسے لیاقت حسین ہزاروں میں پہچان سکتا تھا وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف آگیا سانسے سراج سادہ لباس میں کھڑا تھا۔

”صاحب..... آپ؟“ لیاقت نے تعجب سے پوچھا۔

”گل خان تو نہیں ہے اندر.....؟“

”نہیں صاحب..... وہ ابھی آدھے کھٹے پہلے اپنے گھر گیا ہے۔ دشمنوں کا کوئی سراغ ملا صاحب؟“ لیاقت حسین نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔

”میں اسی سلسلے میں تمہیں ساتھ لینے آیا ہوں۔ خاموشی سے نکل کر باہر سڑک پر آ جاؤ جہاں سیاہ رنگ کی کار کھڑی ہے گل خان کو ساتھ لانے کی حماقت نہ کرنا۔“

”ابھی آیا صاحب.....“

سراج کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا تو لیاقت حسین جلدی جلدی لباس تبدیل کر کے باہر نکلا دروازے کی باہر سے کھڑی لگائی پھر تیزی سے مچی پکی آبادی کی تنگ گلیاں طے کرتے ہوئے باہر سڑک پر آ گیا جہاں سراج سیاہ رنگ کی کار میں موجود تھا۔ لیاقت خاموشی سے دروازہ کھول کر اگلی نشست پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ سراج نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے اپنا ہتھیار ساتھ لے لیا ہے؟“

”وہ آپ کا تحفہ ہے صاحب“ میں جب بھی گھر سے باہر نکلتا ہوں وہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔“

”مجھے ایک سراغ ملا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے تمہاری عورتوں کو کہاں رکھا ہے“ سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے سادہ لباس میں اپنے ساتھیوں کو ادھر پہلے سے روانہ کر دیا ہے تاکہ مجرم کسی اور طرف نہ نکل سکیں۔“

”خدا کرے آپ کی اطلاع درست ہو صاحب۔“

”ایک بات دھیان سے سنو لیاقت حسین تم وہاں کسی سے الجھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اگر تمہاری عورتیں مل جائیں تو انہیں خاموشی سے لے کر نکل چلیں گے۔ گھر پہنچنے سے پہلے اپنی عورتوں سے بھی کوئی بات نہ کرنا۔“

”ٹھیک ہے صاحب ہماری عورتیں اگر عزت سے مل گئیں تو ابھی ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔“

”کل صبح تم ڈیوٹی پر جانے سے پہلے گیارہ بجے مجھ سے آفس میں ملو گے۔ اس کے بعد ہی میں اغوا کنندگان کے خلاف کسی قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کروں گا۔“

لیاقت حسین نے اس بار بھی سراج کی بات مان لی۔

”ہم آپ کے کسی حکم سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کریں گے صاحب۔“

راتے میں سراج اس کو مختلف تدابیر کے بارے میں اونچ نیچ سے آگاہ کرتا رہا۔ تقریباً چالیس منٹ بعد سراج کی گاڑی صنعتی علاقے کے ایک ایسے حصے میں جا کر رکی جہاں مختلف کمپنیوں کے گودام بنے ہوئے تھے۔ سراج تھوڑی دیر تک گاڑی میں بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس نے لیاقت کو ایک گودام کی طرف دور سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس گودام کے صدر دروازے پر سرخ بڑے دائرے کے اندر تین کا ہندہ لکھا ہوگا۔ تم پشت کی طرف سے اندر جانا۔ اندر پہنچ کر بائیں ہاتھ پر ایک آفس ہوگا۔ اس آفس کے واش روم کے اندر سے ایک خفیہ راستہ نیچے سے خانے میں جاتا ہے میری اطلاع کے مطابق..... تمہاری عورتوں کو وہیں رکھا گیا ہے۔“

مجھے نیچے جانے کا راستہ کدھر ملے گا؟“ لیاقت حسین نے بڑی مستعدی سے سوال کیا وہ پوری طرح جانتی و چونند نظر آ رہا تھا۔

”آفس کے اندر جو الماری رکھی ہے تمہیں اسے ہٹانا ہوگا۔ پشت پر ایک ٹائل لگا ہوگا۔ اسے ایک طرف سے ہلکا سا دبانے پر وہ ابھر کر ایک طرف ہو جاتا ہے۔ اندر ایک پیش بٹن ہوگا تم اسے دبانا تو نیچے جانے کا راستہ بھی واش روم میں خود بخود کھل جائے گا لیکن ایک بار پھر غور سے سن لو تم وہاں کسی بھی صورت میں کسی کو جان سے مارنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ چپ چاپ اپنی عورتوں کو لے کر

نکل آتا۔ باقی فیصلے کل ہوں گے۔“
”اور اگر کسی نے مجھے زبردستی روکنے کی کوشش کی تو.....؟“

”میرا خیال ہے کہ تمہیں میدان صاف ملے گا۔ شاید وہ اس قابل نہ ہوں کہ تمہارا راستہ روک سکیں“ سراج نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں ادھر گاڑی میں ہی تمہارا انتظار کروں گا۔“
”ٹھیک ہے صاحب.....“ لیاقت حسین مشینی انداز میں دروازہ کھول کر گاڑی سے نچے اتر گیا۔ اس کی نظروں میں عقابی چمک موجود تھی، گاڑی سے اتر کر وہ اس گودام کی طرف بڑھنے لگا جس کی طرف سراج نے اشارہ کیا تھا، گیٹ کے قریب پہنچ کر اسے وہ سرخ رنگ کا گول دائرہ بھی نظر آ گیا جس کے درمیان تین لکھا تھا، گیٹ پر ایک مسلح گارڈ بھی تھا جس نے لیاقت حسین کو ایک نظر دیکھا پھر گشت لگانے میں مصروف ہو گیا۔ لیاقت لمبے لمبے قدم اٹھاتا گودام کی پشت پر آ گیا جہاں قد آدم دیوار تھی، ایک گیٹ بھی تھا جو اندر سے بند تھا۔ ایک لمبے کو لیاقت نے صورتحال کا جائزہ لیا پھر اس نے گیٹ سے دور جا کر دیوار پھلانگ کر اندر جانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک دوبار کوشش کے بعد وہ دیوار کے آخری حصے کو تھام کر کسی نہ کسی طرح زور لگا کر اوپر پہنچ گیا۔ دور دور تک سنا تھا اس لیے وہ آہستہ سے دوسری طرف لٹک کر زمین پر آ گیا، زمین پر قدم جمانے کے بعد اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن کوئی بندہ بشر نظر نہیں آیا، پھر بھی اس نے نیچے سے پستول نکال کر اسے لوڈ کیا اور اس کے دستے پر گرفت مضبوط کر کے سیاہ رنگ کے اس لمبے چوڑے گیٹ کی جانب پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگا جو تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ اندر کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ اس سے چپک کر کھڑا اندر کی سن گن لیتا رہا۔ پھر پنجنوں کے بل اندر داخل ہو گیا۔ ایک مدھم بلب چمکتے سے لٹکا ٹھٹھا رہا تھا۔ لیاقت کے قدم اس آفس کی جانب بڑھنے لگے جوشیے کا بنا ہوا تھا لیکن اس وقت خالی نظر آ رہا تھا۔ اسی آفس میں وہ الماری بھی موجود تھی جس کی بابت سراج نے اسے بتا دیا تھا۔ لیاقت حسین نے الماری کو چھیڑنے سے پیشتر ایک نظر دوش روم میں جھانکا جو خالی پڑا تھا۔ دوش روم کی دیواروں پر ٹائلز لگے تھے، بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرش ماربل کا بنا ہوا تھا۔ لیاقت حسین نے باہر آ کر الماری کو زور لگا کر ایک طرف ہٹایا تو اس کے پیچھے دیوار پر ایک سبز رنگ کا ٹائل لگا ہوا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے اس نے ٹائل کے ایک کونے پر ہاتھ رکھ کر دبایا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس نے دوسرے کونے پر اسی عمل کو دہرایا تو کسی میکینکی نظام کے تحت وہ دیوار سے ابھر کر ایک طرف ٹھٹکتے لگا پھر وہ پیش پیش بھی سامنے آ گیا۔ سراج کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے لیاقت حسین نے پیش پیش کو دبایا تو ہلکی سی گھر گھر اہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ پستول پر گرفت جما کر دوبارہ دوش روم میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے کی دیوار کا پانچ..... بائی تین فٹ کا حصہ اندر کی طرف دب کر ایک طرف چلا گیا تھا۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچا پھر اس نے خدا کا نام لے کر ان سیز جیوں کو طے کرنے کے بعد اس نے زمین کے چار بائی چار حصے پر قدم رکھا تو بائیں جانب کی دیوار کا حصہ بھی دروازے کی صورت میں سلائیڈ ہو کر کھل

گیا۔ اندر تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن کسی کی آواز نہیں آ رہی تھی، لیاقت حسین نے دروازے سے گزر کر اندر دیکھا تو چونک اٹھا، چار بڑے کٹے فرد سامنے فرش پر مدھوش پڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک غیر ملکی لڑکی بھی اسی عالم میں تھی۔ میز پر شراب کی بوتلیں اور گلاس نظر آ رہے تھے، شاید وہ زیادہ پینے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے، لڑکی کا نیم عریاں جسم دیکھ کر یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ان چاروں نے اس تہا لڑکی کو درندوں کی طرح جگہ جگہ سے بھینچوڑا تھا۔

لیاقت حسین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، اس نے قدم آگے بڑھایا تو سیدھے ہاتھ پر ایک اور دروازہ نظر آیا۔ اس نے لپک کر اسے کھولا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ اندر فرش پر فرحین اور زرینہ قریب قریب پڑی تھیں، ان کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ لیاقت نے قریب جا کر دیکھا، دونوں کی سانسیں چل رہی تھیں لیکن ان کے لباس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انہما کرنے والوں نے شاید انہیں قابو کرنے کے لیے کوئی خواب آور دوا ضرور پلا دی تھی لیکن ان کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ لیاقت کے لئے اکیلے ان دونوں کو باہر لے جانا ممکن نہیں تھا، اسے جلدی بھی تھی اس لیے کہ باہر جو بد معاش بے ہوش پڑے تھے ان کے قریب ہی ان کی رائفلیں بھی پڑی تھیں۔ کوئی ایک بھی ہوش میں آ جاتا تو لیاقت کیلئے زندگی یا موت کا کھیل ناگزیر ہو جاتا۔

اس نے جھک کر فرحین کا بازو تھام کر دو تین بار ہلایا تو اس نے نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کون ہے..... ہم..... مجھے..... سس..... سونے دو۔“

”میں لیاقت ہوں جان، جگر، ہوش میں آؤ..... ہمیں یہاں سے بہت کم وقت میں نکلنا ہے ورنہ میں بھی مارا جاؤں گا۔“

لیاقت کی آواز دو تین بار سن کر فرحین جھومتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تم..... تم یہاں..... کیسے آ گیا.....؟“ اس نے بدستور غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

”ہمت کرو لیاقت کا جان.....“ اس نے فرحین کے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں زرینہ کو بھی سنبھالنا ہوگا۔“

”ہم..... ادھر کیسے..... آ..... آ گیا؟“ فرحین نے بہ مشکل جملہ مکمل کیا۔

لیاقت حسین کیلئے ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو اسے پانی کا بھرا ہوا

ایک جگہ اور گلاس نظر آ گیا، اس نے چلو میں پانی بھر کر دو تین زوردار چھپکے فرحین کے چہرے پر

مارے تو وہ ہوش میں آ گئی۔ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی ”وہ..... لوگ کدھر غرق ہو

گیا..... جو ہم کو ادھر اٹھا لایا تھا؟“

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد پانی کے چھینٹوں سے زرینہ بھی نیم بیدار ہوئی تو لیاقت کی مشکل

کچھ آسان ہو گئی، اس نے فرحین کو ہاتھ تھام کر اٹھایا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے گل میں ڈال لیا۔ زرینہ کو

فرحین نے سنبھالا۔ وہ تینوں باہر آئے تو فرحین نے بے ہوش پڑے آدمیوں کی طرف تھوک کر کہا۔

”یہی تھے وہ ماں کے خضم جو..... ہم کو ادھر لائے تھے تم..... ان سب کو گولی مار دو۔“

”پہلے تم دونوں کو چل کر گھر چھوڑ دوں پھر ان چاروں کو بھی جہنم رسید کرنا نہیں بھولوں گا۔“

گرتے پڑتے وہ کسی نہ کسی طرح باہر آ گیا۔ لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ فرحین اور زرینہ کو دیوار پر کس طرح چڑھائے گا لیکن گودام سے باہر نکل کر اسے وہ بظنی دروازہ بھی نظر آ گیا جو غالباً عام دروازے کیلئے بنایا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے دروازے کو صرف اندر سے بولٹ کیا گیا تھا۔ لیاقت حسین باہر نکلا تو سراج سامنے ہی گاڑی لیے کھڑا تھا۔ لیاقت نے دونوں عورتوں کو پچھلی سیٹ پر کسی طرح بٹھا کر دروازہ بند کیا پھر اس کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہی سراج نے گاڑی کو تیز رفتاری سے چلانا شروع کیا۔ راستے بھر ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ گھر کے قریب گلی کے کونے پر پہنچ کر اس نے سراج سے بڑی عاجزی سے کہا۔

”صاحب..... آپ کا یہ احسان لیاقت کبھی نہیں بھولے گا۔“

”ٹھیک ہے..... جلدی کرو مجھے ابھی اور بہت سے معاملے بھی نمٹانے ہیں۔“

لیاقت فرحین اور زرینہ کو لے کر گلی میں داخل ہوا جو بالکل سناں پڑی تھی وہ گل خان کے گھر کے سامنے سے گزر کر اپنے گھر میں داخل ہوا۔ پانچ منٹ بعد فرحین بھی زرینہ کو اس کے مکان کے اندر چھوڑ کر واپس آ گئی۔ اس پر اب بھی غنودگی طاری تھی چار پائی پر لیاقت کے برابر لیٹ کر وہ بھی اس طرح بے سدھ ہوئی کہ کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ لیاقت پہلے ہی بے سدھ نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔



شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر صبح ہی صبح چار اشتہاری مجرموں اور ایک کلب کی کال گرل کی لاش پائے جانے سے ہر طرف سنسنی پھیل گئی۔ ایس پی علاقہ آغا منظور کے علاوہ ایس ایچ او بھی پولیس والوں کی ٹیم کے ہمراہ صبح آٹھ بجے سے ضروری قانونی کارروائی میں مصروف تھے۔ ڈی ایس پی سراج کو کال کر کے بلا لیا گیا ان پانچ لاشوں کو دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ جائے وقوعہ پر ایبویلنس کے علاوہ فنگر پرنس لینے والا عملہ بھی موجود تھا لوگوں کے جھوم کی وجہ سے ٹریفک پولیس نے آنے جانے والی گاڑیوں کو متبادل راستوں کی طرف موڑنا شروع کر دیا۔

سراج کے آتے ہی ایس پی آغا منظور اسے ایک طرف لے گیا اس کے چہرے پر بھی تشویش اور الجھن کے ملے جلے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ ”یہ لاشیں کب دریافت ہوئیں.....؟“ سراج نے تفصیل معلوم کرنے کی خاطر پوچھا۔

”ہمارے لیے جو پریشانیوں کھڑی کی گئی ہیں وہ کسی سوچی سمجھی سکیم سے متعلق نظر آتی ہیں۔“

آغا منظور نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”چاروں اشتہاری مجرم ہیں ان میں سے دو کیلئے حکومت کی طرف سے انعام کا اعلان بھی کیا گیا لیکن ان حرام زادوں کی گرفتاری عمل میں نہیں آ سکی اور اب ان کی لاشوں کا اس طرح سرعام پایا جانا ہماری نیندیں بھی حرام کر سکتا ہے۔ ان کے جسموں کو گولیوں

سے چھلنی کرنے کے بعد یہاں پھینکا گیا ہے جبکہ کال گرل کو محض دل کے مقام پر ایک گولی مار کر زندگی سے نجات دلائی گئی ہے۔“

”میں آپ سے متفق ہوں سر لیکن ایسا کون شخص کر سکتا ہے؟“

”جو بھی ہو لیکن..... اب وہ شاید اپنا دماغی توازن یقیناً کھو بیٹھا ہے جس کا علاج ضروری ہے۔“

سراج نے فوراً ہی کوئی دوسرا سوال نہیں کیا ایس پی کے جملے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اصل مجرم کا نام ضرور کلبلا رہا تھا۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟ سراج صرف سوچ کر رہ گیا۔

”میں فی الحال آفس جا رہا ہوں ادھر بھی اوپر والوں کے فون کھڑکھڑا رہے ہوں گے۔“ ایس پی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنی نگرانی میں ساری کارروائی مکمل کر کے پانچوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کیلئے روانہ کروا دیجئے گا۔“

”رائٹ سر..... لیکن کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسا نام ہے جس کے بارے میں ان لاشوں سے متعلق.....“

”سوری..... اس وقت کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا۔“ ایس پی آغا منظور نے کسی مصلحت کے پیش نظر ازاداری سے کام لیا پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا تو کچھ رپورٹروں نے سراج کو گھیر لیا۔

”جناب..... آپ ان لاشوں کے سلسلے میں کچھ عرض کریں گے؟“

”آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ابھی پہنچا ہوں۔“ سراج نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ ”آپ حضرات تو اپنی معلومات کے مطابق خبریں شائع کر دیں گے ہمیں اس کا خیالہ بھگتنا پڑے گا۔“

”ہم جو کچھ لکھیں گے وہ ان پانچوں کی تصویر کے ساتھ ہی شائع ہوگا۔“ دوسرے رپورٹر نے بھرپور طنز کیا۔

”چاروں مرد اشتہاری ملزم تھے لڑکی بھی بدکار تھی اس کے علاوہ یہ لاشیں آسمان سے تو نہیں ٹپکی ہوں گی اس کی پشت پر بھی بڑے بڑے لوگوں کا ہاتھ ضرور شامل ہوگا جو صبح ان کو لا کر ایسی مصروف سڑک کے درمیان پھینک گئے ہیں۔ یہ دیدہ دلیری نہیں تو اور کیا ہے؟“

”آپ درست فرما رہے ہیں لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور مکمل تفتیش کے بغیر میں کچھ بھی کہنے سے معذور ہوں“ سراج نے غصے کے بجائے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر لاشوں کے قریب آ گیا جہاں پولیس کی بھاری نفری نے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا تھا۔ ساڑھے گیارہ تک سراج کو جائے حادثہ پر کھڑا پڑا پھر علاقہ ایس ایچ او کی نگرانی میں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کرنے کے بعد ہی وہ بڑی مشکل سے اخباری نمائندوں کو تالتے ہوئے سوا بارہ بجے آفس پہنچا۔ لیاقت حسین وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ کچھ بولکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے لیاقت؟ تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟“ سراج نے اعصابی فٹکن دور کرنے کی

خاطر ہاتھوں کو دونوں اطراف پھیلا کر ایک خاص انداز میں ورزش کی پھر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔
”صاحب..... وہ..... وہ دونوں رات کو کسی وقت گھر آگئی ہیں؟“ لیاقت نے کچھ عجیب انداز سے کہا۔

”تم کیا اپنی بیوی اور اس کی سہیلی کی بات کر رہے ہو؟“ سراج نے چونک کر سوال کیا۔
”جی ہاں صاحب.....“ لیاقت نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ”وہ فرحین بولتی ہے کہ رات میں کسی گودام کے تہ خانے سے انہیں بچا کر لایا ہوں جبکہ میں تو رات بھر گھر پر ہی تھا۔“
سراج دوبارہ چونکا پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے لیاقت حسین کے سلسلے میں میڈم روبی کو اغوا کرنے والوں سے بچانے کی بات یاد آگئی۔ اس وقت بھی لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے اس سچائی کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر کچھ ویسے ہی تاثرات نظر آ رہے تھے۔ لیاقت حسین جو باتیں کر رہا تھا انہیں وہ مافوق الفطرت واقعات کے سوا اور کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

”تمہاری بیوی نے اور کیا بتایا ہے؟“ سراج نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔
”یہی کہ اسے اور زرینہ کو چار لوگ لاری اڈے سے گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ انہیں شہر سے دور کسی تہ خانے میں رکھا گیا تھا جہاں چار بد معاش نقاب میں چہرہ چھپائے اور رائفلیں لیے ساتھ ساتھ تھے۔“ لیاقت نے فرحین کی سنائی ہوئی تفصیل دہراتے ہوئے کہا ”گاڑی میں بٹھانے کے بعد ان دونوں کی آنکھوں پر کالے کپڑے کی پٹیاں باندھ دی گئی تھیں اس لیے وہ کوئی راستہ نہیں بتا سکتیں۔ آنکھوں کی پٹیاں تہ خانے والے کمرے میں لے جانے کے بعد کھول دی گئی تھیں۔ صرف ان کے ہاتھوں کو خالوں نے پیچھے باندھ دیا تھا۔ وہاں ایک آوارہ لڑکی بھی پہلے سے موجود تھی، شراب کباب کا دور بھی چلا تھا، فرحین اور زرینہ نے شور کرنے کے لیے آوازیں نکالیں تو انہیں زبردستی پانی میں کوئی بے ہوش کی دوا ملا کر پلا دی گئی تھی۔ فرحین اور زرینہ کا بیان ہے کہ میں ان دونوں کو وہاں سے نکال کر گھر پہنچایا تھا اور.....“

لیاقت کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”اور کیا..... تم خاموش کیوں ہو گئے؟“

”صاحب..... وہ بولتی ہے کہ آپ ہی ہم سب کو اپنی گاڑی میں گھر کے کزن تک چھوڑ کر گئے تھے“ اس کے ساتھ ہی اس نے فرحین کی سنائی ہوئی پوری کہانی دہرا دی۔
”اوہ.....“ سراج نے دیدہ و دانستہ مسکرا کر بڑے سہل سے کہا۔ ”دیکھو لیاقت حسین..... جو کچھ تم یا تمہاری بیوی کہہ رہی ہے ممکن ہے وہ اپنی جگہ غلط نہ ہو مگر تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔“

”آپ حکم دو صاحب..... لیاقت آپ پر جان قربان کرنے کو بھی تیار ہے۔“

”مجھے سوچ کر بتاؤ..... کیا کوئی روحانی قوت تمہارے علم میں ہے جو تمہاری مدد کرتی ہو.....؟“

”روحانی قوت.....“ لیاقت حسین نے ٹائینا بزرگ کو زبان بند رکھنے کا جو قول دیا تھا وہ اسے نہیں توڑ سکتا تھا۔

”کیا بات ہے۔ تم چپ کیوں ہو؟“ سراج نے اس ٹنٹلتی نظروں سے دیکھا۔

”صاحب..... جب ہم اپنے شہر سے چلا تھا اس وقت ہماری ماں نے ایک دعا دی تھی کہ اوپر والا ہر ہر قدم پر غیب سے میری مدد کرے۔“ اس نے اصل باتوں کو دہرانے کے بجائے معصومیت سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے ایک ماں کی دعا مجھے لگ گئی ہو۔ اوپر والا تو مالک کل ہے صاحب..... کوئی بات بھی اس کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے.....“ سراج نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”ماں کی دعائیں اولاد کیلئے بڑی بابرکت ہوتی ہیں لیکن..... تمہیں ایک بات کا اب خیال رکھنا ہوگا۔“
”وہ کیا صاحب.....“

”جو کچھ تمہاری گھر والی کہہ رہی ہے اسے مان لو..... اصلیت کیا ہے اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہو ورنہ تاثیر جاتی رہے گی، میں نے بزرگوں سے یہی سنا ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب..... اب میں ایسا ہی کروں گا۔“

ایک بات تمہیں اور بتا دوں لیکن اس سلسلے میں بھی اپنی زبان بند ہی رکھنا۔“ سراج نے پہلو بدل کر کچھ سوچتے ہوئے کر کہا۔ ”جن چار آدمیوں کا ذکر تمہاری بیوی نے کیا ہے وہ اشتہاری مجرم تھے جن کی لاشیں آج صبح ایک معروف سڑک پر پڑی پائی گئی ہوں۔ کل تک ان کی تصویریں بھی اخبار میں آجائیں گی۔ اپنی بیوی کو وہ تصویر دکھا کر معلوم کرنا کہ وہ وہی لوگ تھے جنہوں نے زرینہ اور اسے اغوا کیا تھا؟“

”ٹھیک ہے صاحب۔“

”ایک خوشخبری میرے پاس بھی ہے تمہارے لیے۔“ سراج نے کہا۔ ”تمہارے صاحب بیگم صاحب ایک ہفتے بعد واپس آ رہے ہیں۔“

لیاقت حسین نے خوشی کا اظہار کیا، پھر سراج سے دو چار باتیں کرنے کے بعد کام پر چلا گیا لیکن..... اس کے ساتھ دوبار جو حیرت انگیز واقعات رونما ہو چکے تھے وہ اس کے ذہن میں انتشار پیدا کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا بات ہے کہ جو کارنامے وہ کر گزرتا ہے اس کا پتہ دوسروں کو چل جاتا ہے، لیکن وہ خود بے خبر رہتا ہے؟ یہ بات خود اس کیلئے بھی ایک معما بن گئی تھی۔



دوسرے دن شائع ہونے والے اخباروں نے مصروف شاہراہ پر پائی جانے والی پانچوں لاشوں کی تصویروں کے ساتھ پولیس کیخلاف نمک مرچ لگا کر جو خبریں پہلے صفحات پر نمایاں طور پر شائع کی تھیں اس نے نہ صرف پورے شہر میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا بلکہ مرکزی حکومت کے متعلقہ ذمے داروں نے بھی صوبائی پولیس کے آئی جی ڈی آئی جی اور پولیس افسروں سے سختی سے باز پرس شروع

کر دی تھی۔ سراج صبح سے دفتر میں بیٹھا مستقل ایس بی آغا منظور سے رابطے میں تھا۔ اسی کے مشورے کی روشنی میں وہ فون کا لڑکا جواب بھی دے رہا تھا۔ تقریباً بارہ بجے آغا منظور کا فون پھر موصول ہوا غالباً اس کی قوت برداشت اعلیٰ حکام کی سرزنش سن کر جواب دے چکی تھی۔

”مسٹر سراج۔“ اس نے بے انتہا جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی فون کا ریسیور اٹھا کر ایک طرف ڈال دیں۔ اٹ از ٹوچ (It is too much) جو حکام مجرموں کے لنگوٹیا یا رہیں اس وقت وہ بھی اس طرح باز پرس کر رہے ہیں جیسے ان سے زیادہ معصوم اور فرض شناس کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ نان سینس۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے فون انجیج کر دیں تاکہ سکون کے ساتھ کچھ سوچ سکیں، میں نے ڈی آئی جی صاحب سے بھی بات کر لی ہے۔“

”سر..... کیا آپ مجھے بھی بتائیں گے کہ وہ کون لوگ ہیں جو مجرموں کو بے نقاب کرنے کے بجائے ہم پر غرارہ ہیں؟“

”ہم اور آپ ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے اس لیے ان کے نام لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ویٹ از آل۔“ دوسری جانب سے جھلا کر کال منقطع کر دی گئی۔ سراج نے ایس بی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے نہ صرف فون کا ریسیور میز پر رکھ دیا بلکہ اپنے ڈیوٹی کانسٹیبل کو بھی بلا کر تاکید کر دی کہ جو بھی ملنا چاہئے اس سے کہہ دے کہ وہ کسی افسر سے مصروف گفتگو ہے۔

سنتری کے جانے کے بعد سراج نے بھی ذہنی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے۔ ان لاشوں کے سلسلے میں اسے بہر حال کچھ نہ کچھ قانونی کارروائی تو کرنی تھی۔ سوچوں کے زاویے اس کے ذہن میں پھیلے تو اسے گزشتہ روز ایس بی کا کہا ہوا ایک جملہ بھی یاد آ گیا۔ ”ہمارے لیے جو پریشانیاں کھڑی کی گئی ہیں وہ کسی سوچی سمجھی سکیم سے متعلق نظر آتی ہیں۔“ اس نے اس جملے کے ساتھ یہی بھی کہا تھا کہ..... اب وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے جس کا علاج ضروری ہے۔“ سراج نے ان جملوں کی وضاحت چاہی تو جواب میں یہی کہا گیا۔ ”سوری..... اس وقت کچھ کہنا قابل از وقت ہوگا۔“

ایس بی آغا منظور کے جملوں سے یہی لگتا تھا کہ وہ کسی مخصوص شخص پر شبہ ضرور کر رہا ہے۔ سراج نے ابھی ہوئی کڑیاں تلاش کرنے کی خاطر ذہن پر زور دیا تو اسے میڈم روہی کے اغوا کے سلسلے میں اپنے ایس بی کا کہا ہوا ایک اور جملہ یاد آ گیا۔ اس وقت بھی اس نے سراج کی ایک بات کو ٹالنے کی خاطر گول مول جواب دیا تھا۔ ”سوری“ میں اس وقت زبان کھولنے سے قاصر ہوں، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس نے میڈم کے سلسلے میں باقاعدہ پلاننگ کرنے کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا ہوگا۔“

ایس بی کے جملے سراج کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے اسی حوالے سے اچانک اس کے ذہن میں شیخ حامد کا خیال ابھرا جس نے ایس بی کو باقاعدہ خرید رکھا تھا اس کے اس خیال کی تصدیق دبی زبان میں ڈی آئی جی کراٹھوعلیم احمد نے بھی کی تھی۔ سراج یہی سمجھتا تھا کہ اس کا ایس بی آغا منظور بھی میڈم روہی کے طلب گاروں میں سے ہے نہ ہوتا تو وہ سراج کو اپنے دفتر بلا کر

اسے روہی کی خفیہ طور پر نگرانی کرنے کی ہدایت بھی نہ دیتا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر سراج نے شیخ حامد کو ٹولنا بھی ضروری سمجھا، خود شیخ حامد نے سراج کو ایک لاکھ روپے میں خریدنے کے بعد کہا تھا۔ ”ایک بار واقفیت ہو گئی ہے تو اب آتے جاتے رہتے گا۔“

سراج نے کافی غور و خوض کے بعد ریسیور اٹھایا اور شیخ حامد کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ پوری طرح محتاط ہو کر بیٹھ گیا تھا اسے شبہ تھا کہ شیخ حامد کے نمبروں پر کی جانے والی کالیں ٹیپ بھی ہوتی ہوں گی جسے بعد میں بطور بلیک میلنگ کے استعمال کیا جاتا ہوگا۔

”ہیلو..... شبینم فرام حامد گروپ آف کمپنیز۔“ دوسری جانب سے ٹیلی فون آپریٹر کی مترنم آواز ابھری تو سراج کو اس کی آواز کچھ آشنا سی لگی۔ اس نے خود کو بے پروا ظاہر کرتے ہوئے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”آپ شاید ٹیلیفون آپریٹر بول رہی ہیں؟“

”میں پلیز..... آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”شیخ حامد سے کال ملا دیں۔“ سراج نے قدرے دنگ آواز میں کہا۔

”اے آئی نو یور گڈ نیٹم پلیز (کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں)“ اس بار بھی مہذب لہجے میں سوال کیا گیا۔

”سراج.....“ سراج نے مختصر نام بتایا۔

”آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟“ شبینم کے لہجے کا تجسس محسوس کر کے سراج کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ اسے پوری طرح یاد آ گیا کہ شبینم نامی آپریٹر کی آواز اس نے پہلے۔ کب اور کس موقع پر سنی تھی۔

”آپ مسٹر حامد کو صرف اتنا بتا دیں جو میں نے کہا ہے۔“ سراج نے دیدہ و دانستہ الجھنے والا انداز اختیار کیا۔

”میں کوئی مزید حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”ون منٹ پلیز۔“ اس بار شبینم نے روایتی جواب دیا، میں چیک کر کے آپ کو جواب دیتی ہوں۔“

سراج کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اسی آواز نے میڈم روہی کے اغوا کے سلسلے میں اسے کسی پبلک فون بوتھ کر کے کہا تھا۔ ”کچھ لوگ میڈم کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔“ سراج کے وضاحت کرنے پر اس نے جواب دیا تھا..... ”ابھی میں اپنا نام ظاہر نہیں کر سکتی۔ اس وقت میں آپ کو جو کیوڈ دے رہی ہوں اس کو ذہن میں محفوظ رکھیں تاکہ بوقت ضرورت آپ کیلئے کارآمد ثابت ہو۔“ اس کے ساتھ ہی پبلک فون کا حوالہ دے کر لائن منقطع کر دی گئی تھی..... سراج کے ذہن میں پلچھ کڑیاں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں جب شبینم کی آواز دوبارہ ابھری۔

”بات کریں پلیز.....“ اس نے جواب دے کر لائن شیخ حامد سے ملادی تھی۔
 ”ہیلو ڈی ایس پی صاحب..... کیسے ہیں آپ؟“ شیخ حامد نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”بہت دنوں بعد آپ نے یاد کیا۔“
 ”ایک بار پہلے بھی آنے کا ارادہ کیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ آپ تین چار روز کے بیرون ملک کے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔“
 ”بزنس میں آئے دن ادھر ادھر آتا جاتا تو لگا ہی رہتا ہے۔ آپ سنائیں اس وقت میری یاد کیسے آگئی؟“

”آپ کو ایک ممکنہ خطرے کے تحت حفظ ماتقدم کے طور پر فون کرنے کی جرات کی ہے۔“
 سراج نے جان بوجھ کر انکساری سے کہا۔ ”آج کا اخبار تو آپ نے دیکھا ہوگا؟“
 ”ہاں..... ایک سرسری نظر ڈالی تو تھی لیکن مجرم اور کیڑے کوڑے تو آئے دن ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔“ شیخ حامد نے سپاٹ انداز میں پوچھا۔ ”آپ کو کیا تشویش لاحق ہے.....؟“
 ”اوپر سے سخت باز پرس ہو رہی ہے سر.....“ سراج نے پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر درخواست کی۔ ”بہت سے پولیس آفیسروں کی اکھاڑ پچھاڑ اور دور دراز علاقوں میں تہا دلے کی خبریں بھی مل رہی ہیں۔ آپ کو اسی وجہ سے کال کیا ہے کہ.....“

”ڈونٹ وری مسٹر سراج“! بڑے یقین سے جواب دیا گیا۔ ”ہم جب کو ایک بار دوست کہہ دیں تو اس کا خیال بھی ضرور رکھتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ کیا ہوگا آپ اس کا غم نہ کریں لیکن آپ کا تبادلہ نہیں ہوگا۔“

”بہت بہت شکریہ شیخ صاحب۔“ سراج نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کی اس نوازش کو بھی یاد رکھوں گا۔“
 ”نوٹھینکس مسٹر سراج۔ دوستوں کا حساب دل میں ہوتا ہے۔“ اس جیلے کی ادائیگی کے ساتھ ہی لائن کاٹ دی گئی۔

سراج نے ریسپورڈ پھر میز پر رکھ دیا اور بے چینی سے اٹھ کر اپنے دفتر میں ٹھیلے لگا۔ جو کڑیاں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں وہ صرف اور صرف شیخ حامد کو مشکوک ثابت کر رہی تھیں لیکن وہ اب بھی اس پر ہاتھ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ افضل خان کے ساتھ شبنم کا بھی شیخ حامد گروپ آف کمپینز میں کام کرنا اس کیلئے زیادہ حیرت انگیز نہیں تھا، مگر جو بات اسے بار بار کھٹک رہی تھی وہ شبنم کا سراج کو فون کال کر کے میڈم روبی کے سلسلے میں یہ بتانا تھا کہ..... ”کچھ لوگ میڈم روبی کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔“ یہ جملہ اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ خود شبنم نے بھی شیخ حامد کی خلاف زبان کھولنے کی کوشش کی تھی۔ ”کیا وہ بھی کسی خاص مقصد کی وجہ سے وہاں کام کر رہی تھی.....؟ وہ مقصد کیا تھا؟“

سراج کچھ دیر تک غور و فکر کرتا رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر فون پر لیاقت حسین سے رابطہ کیا۔

دس منٹ کے انتظار کے بعد دوسری جانب سی لیاقت حسین کی آواز سنائی دی تو اس نے تیزی سے سوال کیا۔

”آج کے اخبار میں جو تصویریں چھپی ہیں اس کے بارے میں تمہاری بیوی کا کیا کہنا ہے؟“
 ”اس نے ان سب کو شناخت کر لیا ہے صاحب۔“
 ”کیا تمہاری بیوی اگر کوشش کرے تو اس جگہ کا پتا بتا سکے گی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے واپسی میں اس نے شاید کچھ ایسے علاقوں کو دیکھا ہوگا جنہیں دوبارہ دیکھنے پر وہ اس کی تصدیق کر سکے؟“

”میں آج اس سے یہ بھی معلوم کر لوں گا صاحب۔“

لیاقت حسین نے کہا۔ ”ویسے وہ بار بار ایک ہی بات بتاتی ہے کہ جہاں اسے رکھا گیا تھا وہ..... علاقہ نہیں جانتی۔ اسے اغوا کرنے والوں نے جس جگہ رکھا تھا وہ گودام لگتا تھا۔“
 ”ٹھیک ہے..... تم آج اس سے تفصیل سے بات کر لو میں کل کسی وقت کوٹھی پر آ کر تم سے ملاقات کروں گا۔“

سراج نے لائن کاٹ دی۔ وہ فون پر زیادہ کھل کر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو بات کر چکا تھا شاید وہ بھی اسے براہ راست لیاقت حسین سے مل کر کرنی چاہئے تھی لیکن.....
 لیاقت حسین سے بات کرنے کے بعد اس کی نظروں میں ابھرنے والی چمک اس بات کی غماز تھی کہ شاید اس نے اصل مجرم تک پہنچنے کی خاطر کوئی خاص پلان اپنے ذہن میں ضرور مرتب کر لیا تھا۔

اسی شام سراج اور ایس پی آغا منظور کو ڈی آئی جی کرائمر کے دفتر میں طلب کر لیا گیا۔ مرکزی حکومت نے بطور خاص چاروں اشتہاری مجرموں کا کیس حافظ عظیم احمد کے حوالے کر دیا تھا۔ سراج آغا منظور کو اپنی گاڑی میں لیتے ہوئے گیا۔ راستے میں ایس پی کا موڈ خاصا خراب ہی دکھائی دے رہا تھا۔

”خدا جانے یہ ڈی آئی جی کرائمر ہر خاص معاملے میں ہوم فشر کی نظروں کا تار اکیوں بن جاتا ہے؟ کیا کیس فائل کو اس کے نام مارک کر دینا ہمارے لیے باعث تو ہین نہیں ہے؟“

”سب اوپر والوں کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے سر.....“

سراج نے غیر جانب داری سے کام لیا۔ ”جس کو پینا چاہے وہی سہاگن والی مثال ہے۔“

”سننا ہے کہ وہ آپ کو خاص طور پر پسند کرتا ہے؟“

”افسر کا بلاوا آجائے تو جانا پڑتا ہے سر..... اس وقت آپ کو بھی جانا پڑ رہا ہے۔“ سراج نے دبی زبان میں کہا۔ ”پسند اور ناپسند والی بات بھی افسر ہی کی مرضی ہے۔ ہمیں ہر حال میں تابعداری کرنا پڑتی ہے۔“

ڈی آئی جی کرائمر نے اٹھ کر بڑے اہتمام سے ان دونوں سے ہاتھ ملایا پھر ایس پی سے

”میں نے ذاتی طور پر اس کیس کو لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن پھر بھی فائل میرے نام مارک کر دی گئی۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ دونوں حضرات کو کھنص اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ بھی اگر میرے ساتھ تعاون کریں تو ذاتی طور پر میں آپ دونوں کا شکر گزار ہوں گا۔“

”ہم نے پہلے بھی کبھی تعاون کرنے سے انکار نہیں کیا جناب۔“ ایس پی نے اس وقت بھی کسمسا کر جواب دیا۔

”یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔“ ڈی آئی جی نے حسب عادت مہذب لہجے میں کہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی آگئی ہے۔ اس میں وہی کچھ ہے جس کی توقع ایسے موقعوں پر کی جاتی ہے۔ مجرموں کو اس وقت شوٹ کیا گیا جب وہ بے ہوشی بوجہ کثرت شراب نوشی کے عالم میں تھے۔ موت کا وقت لاش ملنے سے قبل یعنی رات تقریباً ڈھائی اور تین کے درمیان کا ظاہر کیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ اور ان چاروں کو گولی مارنے کی وجہ کیا تھی؟“

”میں آف دی ریکارڈ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس قسم کے اشتہاری مجرموں کی پشت پناہی میں بڑے بڑے لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔“ ایس پی نے جڑبڑ ہو کر کہا۔ ”وہی ایسے قاتلوں کو پالتے ہیں اور کسی ناکامی کی وجہ سے ٹھکانے بھی لگا دیتے ہیں بعد میں سارا کچرا ہم پولیس والوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔“

”میں آپ کی رائے سے صد فی صد متفق ہوں لیکن کاغذ کا پیٹ بھرنے کیلئے کچھ نہ کچھ کارروائی تو بہر حال کرنی ہوتی ہے۔“

”بہر حال“ ڈی آئی جی نے اس بار قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے کل شام چھ بجے اپنے آفس میں پریس کے مخصوص نمائندوں کو بلا دیا ہے اگر آپ دونوں بھی شرکت کریں تو بہتر ہوگا۔ عوام کو مطمئن کرنے کی خاطر یہ سب کچھ بھی ضروری ہے۔“

ایک گھنٹے کے بعد وہ ڈی آئی جی آفس سے نکلے، ایس پی کی گاڑی اس کا ڈرائیور لے کر آگیا تھا اس نے گاڑی میں بیٹھے وقت سراج سے کہا۔ ”کل کی کانفرنس کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”رپورٹرز ہم سب سے دھواں دھار سوالات کریں گے۔“ سراج نے اسے اچکا کر جواب دیا۔ ”بال کی کھال ادھیڑ تا ان کا حق بھی ہے اس سے پیشتر بھی سنگین معاملات میں ہمیں ڈپلومیسی سے کام لینا پڑا ہے۔ اس بار بھی ہمیں اپنی پوزیشن بچانے کی خاطر کچھ نہ کچھ تو جواب بہر حال دینا پڑے گا۔ خاموش رہے تو یہ رپورٹرز ہمارا جینا بھی دو بھر کر دیں گے۔“

”میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ کل ہمیں ہنگامی صورتحال سے واسطہ پڑے گا لیکن..... میرا ذاتی خیال

ہے کہ اب فائل چونکہ پیشل کر انمز برانچ کے حوالے کر دی گئی ہے اس لیے ہمارا جواب ایک ہی ہونا زیادہ مناسب ہوگا۔“

”وہ کیا سر.....؟“

”یہی کہ لاشیں ہم نے دیکھی تھیں مگر اصل مجرم کون ہے؟ لاشیں آسمان سے پئی تھیں یا کسی درخت سے؟ اس کا اندازہ ضروری قانونی کارروائی اور تفتیش کے بعد ہی لگایا جاسکتا تھا مگر..... اب چونکہ کہیں کو زیادہ ذمے دار افسران کو مارک کر دیا گیا ہے اس لیے میرا ذاتی مشورہ ہے کہ کل ہمارا خاموش رہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ زیادہ تر جوابات ڈی آئی جی کر انمز ہی دیں تو مناسب ہوگا۔“

”رائٹ سر.....“ سراج نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

”میں خیال رکھوں گا کہ تو یوں کا رخ کس سمت موڑتا ہے۔“

”ایک بات اور.....“ ایس پی نے اس بار مدہم آواز میں پوچھا۔ ”میڈم روبی کے اغوا کے سلسلے میں کیا پروگریس ہوئی؟“

”ابھی تک یہ بھی ایک معما ہے سر..... لیکن“ سراج نے ایک لمحے کے توقف کے بعد وہی جملہ دہرا دیا جو اس نے فون پر سنا تھا۔ ”میرا ذاتی خیال ہے کہ کچھ لوگ میڈم کو زندہ رکھنا پسند نہیں کرتے..... جو لوگ ایک بار ناکام ہو گئے وہ دوبارہ زیادہ منظم طریقوں سے اپنی مذموم حرکت کو کامیاب بنانے کی کوشش سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔“

”آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟“

”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا..... مگر قیاس یہی ہے کہ بڑی مچھلیوں کا شکار صرف تجربے کار مائی گیری کرتے ہیں۔“

”میری ایک ذاتی ریکورڈ ہے“ ایس پی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”آپ میڈم کی حفاظت کا خیال رکھیں۔ رہا ماہر شکاریوں کا معاملہ تو ان سے بھی بعد میں حساب کتاب ضرور ہوگا۔“

ایس پی اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کی کار کے حرکت میں آنے کے بعد سراج کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ بھی کچھ کم معنی خیز نہیں تھی۔



شبتم کی شخصیت کچھ کچھ بے نقاب ہو جانے کے بعد سراج کو بحیثیت ایک ذمے دار پولیس آفیسر کے سب سے زیادہ فکر اسی کروڑ پتی بیوہ کی تھی جسے کچھ لوگ زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ میڈم روبی کی حفاظت کے ساتھ اب اس کیلئے ضروری ہو گیا تھا کہ لیاقت خان کی رہائشگاہ کے آس پاس بھی کچھ قابل اعتماد سادہ لباس میں پولیس والے تعینات کرائے جائیں اس نے فون پر ملنے والی کسی نامعلوم شخص کی خبری کی روشنی میں فرحین اور زرینہ کو جس گودام تین سے لیاقت خان کے ذریعے بازیاب کرا لیا تھا وہ شیخ حامد کے سوا کسی اور کی ملکیت نہیں تھی۔

”سر.....“ سراج نے قدرے ہچکچا کر کہا۔ ”آپ سے ایک ذاتی درخواست اور کرنا چاہتا ہوں۔“

”کہو.....“ دوسری جانب سے بے تکلفی اور بزرگانہ شفقت کا اظہار کیا گیا۔
”سر..... آپ اگر ایک دوبار میرے ایس پی صاحب کی موجودگی میں مجھ سے اپنی تکلفی کا اظہار کر دیں تو بڑی نوازش ہوگی۔“
”خیریت.....؟“

”مجھے کل کی کانفرنس میں خاموش رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔“ سراج نے دبی زبان میں وجہ بتادی۔

”آئی سی۔“ علیم احمد نے اس بار بھی بے تکلفی سے کہا۔ ”میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ بھی چاروں لاشوں کے پس منظر میں نظر آنے والی شخصیت کو بھانپ گیا ہے۔ حالات کے پیش نظر وہ اپنے شعور نظر کو ناراض کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔“
”آپ کا اندازہ درست ہے سر۔ اس کے علاوہ ہمارے ایس پی صاحب میڈم روبی کی وجہ سے بھی فرسٹریشن کا شکار ہیں۔“

”کیا مطلب؟.....“ دوسری جانب سے حیرت کا اظہار ہوا۔ ”یہ میڈم روبی کا نام درمیان میں کہاں سے آگیا؟“ سراج نے جواب میں میڈم روبی کے اغوا کی کہانی سناتے ہوئے کہا۔ مجھے خاص طور پر ہدایت دی گئی ہے کہ میں میڈم کو پروٹیکشن دینے کا خیال رکھوں۔“
”اس کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی؟“

”جی سر..... دراصل ایس پی صاحب دوبارہ اپنا گھر آباد کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں کسی قسم کی فکر بھی نہیں رہے گی۔“
”ونڈرفل.....“ ڈی آئی جی نے بے تکلفی سے کہا۔

”گویا شادی کے ساتھ ساتھ وہ میڈم کی کروڑوں کی جائیداد پر بھی نظر جمائے ہوئے ہے۔“
”خیال تو یہی ہے سر، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا آسانی سے ہمارے مطلوبہ شخص سے دشمنی افروز کر سکتا ہے؟“

”ہو بھی سکتا ہے اس لئے کہ جو جرائم پیشہ ہوں وہ کسی نہ کسی طرح ایڈمنٹ کر لیتے ہیں، ان کے درمیان دوبارہ بھی پھوٹ پڑ سکتی ہے۔ یہی جرائم پیشہ لوگ اکثر اپنی ذاتی رنجشوں کے سبب ہمارے لیے کراہ بھی ثابت ہوتے ہیں، مجھے یقین ہے وہ گناہ منجر پھر ہمارے کام آئے گا۔“
”ابھی تک تو اس نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔“

”ڈونٹ وری۔“ میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ آپ کو ایک بار اپنے لیے کارآمد سمجھ لینے کے بعد دوبارہ پھر کسی نہ کسی مقصد کی خاطر ضرور کال کرے گا۔ اوکے۔ ہائی۔“
دوسری جانب سے فون منقطع ہو گیا۔ سراج ڈی آئی جی کی کبھی پہلی بات پر غور کرنے لگا۔

گاڑی میں بیٹھ کر گھر جاتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں کچھ سوالات چھ رہے تھے۔ ”اگر لیاقت کی بیوی کو اغوا کرانے میں براہ راست شیخ حامد ہی ملوث تھا تو اس کی لیاقت حسین سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ فرحین کے اغوا میں شیخ حامد کے کسی ایسے درکر کا ہاتھ ہو جو لیاقت کے مکان کے آس پاس کہیں رہتا ہو اور فرحین کے بارے میں جانتا ہو کہ وہ گھر پر تنہا رہتی ہے، پھر کوئی مواقع غنیمت دیکھ کر اسے اٹھالایا ہو لیکن..... اس کے ساتھ زرینہ کو اغوا کرنے کا کیا جواز بنتا تھا جو لیاقت حسین کے سب سے قریبی دوست کی بیوی تھی؟“ سراج ہر پہلو سے عقلی گھوڑے دوڑانے میں مصروف تھا لیکن گھوم پھر کر اس کے ذہن میں شیخ حامد ہی کی شخصیت ابھرتی تھی اس لیے کہ فرحین اور زرینہ کی بازیابی کے بعد ہی ان چار اشتہاری مجرموں کی لاشیں منظر عام پر آئی تھیں جن کی تصویریں دیکھنے کے بعد فرحین نے بھی ان کو بحیثیت اغوا میں ملوث قرار دیا تھا۔ اس کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔

شیخ حامد جیسے گھاگ آدمی کے لئے ان چاروں کی موت ضروری تھی ورنہ کسی وقت قانون کے ہتھے چڑھ جانے کے بعد ان کی زبان بھی کھل سکتی تھی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ سیٹھ عثمان اور راحیلہ کی واپسی کی اطلاع کے بعد مزاج کیلئے ان کی حفاظت کا مسئلہ بھی بے حد اہم تھا۔ اگلے دن ہونے والی پریس کانفرنس کے سلسلے میں ایس پی آغا منظور نے جو خاموشی اختیار رکھنے کی بات کی تھی وہ بھی سراج کے ذہن میں چھ رہی تھی۔ ایس پی روز اڈل سے ڈی آئی جی کو کراہمز کو پسند نہیں کرتا تھا جس کی وجہ علیم احمد کی دیانت داری تھی مگر سراج نے شیخ حامد کو ٹریپ کرنے کے سلسلے میں بھی صرف اور صرف علیم احمد کی شخصیت پر اعتماد کیا تھا۔ ایس پی کی خاموش رہنے کی تاکید سے اسے گھٹن ہی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ خاصی دیر تک ذہنی طور پر کسی ایسے درمیانی راستے کے بارے میں غور کرتا رہا جو اس کی ذاتی پوزیشن کو بھی تحفظ فراہم کر سکے اور متوقع خطرات سے قانونی حیثیت میں بھی عہدہ برآ ہونے میں کام آ سکے۔

گھر پہنچ کر رات کے کھانے کے بعد بھی وہ درپیش معاملات پر غور و فکر کرتا رہا پھر کچھ سوچ کر اس نے ڈی آئی جی کو کراہمز کے ان لسٹ نمبروں پر کام کیا۔ دوسری گھنٹی کے بعد دوسری جانب سے خود علیم احمد نے کال ریسیو کی۔ سراج نے چند رسمی جملوں کے بعد اسے فرحین اور زرینہ کی بازیابی کی تمام روداد پوری تفصیل سے سنا دی۔

”گڈ.....“ دوسری جانب سراج کو سراہتے ہوئے کہا گیا۔ ”گویا ہم دونوں نے جو اندازے قائم کیے تھے وہ بالآخر درست ثابت ہوئے۔“

”میرا ایمان ہے سر کہ انسان اگر اپنے فرائض میں کسی بخل سے کام نہ لے تو اس کے نتائج بھی بہتر ہی نکلتے ہیں۔“
”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔“

شیخ حامد اس وقت اپنے آفس میں کسی بھوکے درندے کی طرح ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا چہرے کے تاثرات سے عیاں تھا کہ سخت غصے اور اشتعال کی حالت سے دوچار ہے۔ ایک کرسی پر افضل خان بھی دم سادھے بیٹھا ”جل تو جلال تو آئی بلا کونال تو“ کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ جو پانچ لائیں پولیس کے مجھے کیلئے دردمندی تھیں، اخبارات آئے دن نئی نئی سرخیاں لگا رہے تھے۔ اعلیٰ افسران سے مرکزی حکومت کی جانب سے شدید باز پرس ہو رہی تھی۔ عوامی نمائندے بھی احتجاج کر رہے تھے۔ انہیں افضل خان ہی نے شیخ حامد کے حکم پر اپنے خاص آدمیوں سے اسی رات ٹھکانے لگوا دیا تھا جس پر روز کسی نہ کسی طرح فرحین اور زرینہ ان کے قبضے سے نکل گئی تھیں، کال گرل کو اس لیے ٹھکانے لگوانا پڑا کہ بعد میں زبان بھی کھول سکتی تھی۔

بہر حال شیخ حامد کے خطرناک تیور دیکھ کر افضل خان بھی سہما بیٹھا تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ دونوں کس طرح وہاں سے نکل گئیں؟ شیخ حامد نے کرسی پر بیٹھ کر میز پر دونوں ہاتھ مارتے ہوئے افضل خان کو شدید غصے کے عالم میں گھورا۔

”ان کو بے ہوشی کی دوا پلا دی گئی تھی۔ ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے تھے۔ یہ بات تم نے کبھی تھی پھر ان کو بے ہوشی کی حالت میں کیا جن بھوت اٹھا کر لے گئے تھے؟“

”سر.....“ افضل خان نے بغلیں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے ان چاروں نے یہی بتایا تھا۔“

”اوکے.....“ شیخ حامد دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

”اس اہم موقع پر وہ کال گرل وہاں کہاں سے نازل ہو گئی؟ ان چاروں نے بے تحاشی پالی ہوگی اور پھر بار بار اس کے ساتھ منہ کالا کرنے کے بعد خود بھی مردوں کی طرح اوندھ گئے ہوں گے۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن اس کا جواب تو وہ اگر زندہ ہوتے تو وہی.....“

”شٹ اپ.....“ شیخ حامد حلق کے بل چلا کر بولا۔

”تم جانتے ہو کہ میں اس قسم کے جواب سننے کا عادی نہیں ہوں پھر تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟..... ذمے داری تمہاری تھی، تم خود بھی ادھر جا کر صورت حال کا جائزہ لے کر اپنا اطمینان کر سکتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”سر..... میں اپنی غلطی تسلیم.....“

”نو.....“ شیخ حامد غڑایا۔ ”آئی ڈونٹ لائیک سپیلی ٹیل موونگ ڈاگز (مجھے صرف دم ہلاتے ہوئے کتے پسند نہیں ہیں) میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری باتوں کا جواب دو۔“

”رائٹ سر.....“ اس نے بگ باس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو پیش کے سبب گہری سرخ نظر آ رہی تھیں۔

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ کیا چیخ و پکار ہو رہی ہے۔ مائی فٹ! لیکن وہ دو کتے کا ایس پی بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہا ہے اور.....“ شیخ حامد کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ ”میڈم روبی کے سلسلے..... میں تم نے کیا تیر مارا ہے؟“

”آپ جو چاہتے ہیں سر وہ تین چار روز میں ہو جائے گا۔“

”گڈ..... اب یہ زیادہ اہم ہے، تصویریں میرے قبضے میں ہوں گی تو کل وہ ڈرنی ڈاگ بھی میرے سامنے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکے گا۔“

باس کا اشارہ کس کی طرف تھا؟ افضل خان نے اس بارے میں پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

”ایک خاص انفارمیشن اور بھی ہے تمہارے لیے۔“

شیخ حامد نے کہا۔ ”عثمان اور اس کی بیوی ایک ہفتے کے اندر آنے والے ہیں۔“

”مجھے آپ کا حکم یاد ہے سر.....“ افضل خان نے مستعدی سے جواب دیا۔

”جو کچھ ایک بار ہو گیا اسے رپیٹ نہیں ہونا چاہئے۔“

اس نے افضل خان کو خطرناک نظروں سے گھورا اس بار تم کو بھی شکار کے ساتھ اس وقت تک موجود رہنا ہوگا جب تک میں اجازت نہ دوں۔“

”اوکے سر۔“

”گودام کے گاڑنے بھی ان چاروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتایا ہوگا؟“

”اس کا یہی کہنا ہے کہ وہ چاروں دونوں عورتوں کے ساتھ عقی راسے سے اندر گئے تھے اس کی اطلاع انہوں نے گاڑ کو بھی دی تھی۔“ افضل خان نے کسمسا کر کہا۔ ”سر اگر آپ کی اجازت ہو تو میں لیاقت کی بیوی کو دوبارہ.....“

”نہیں.....“ شیخ حامد نے تیزی سے کہا۔ ”ابھی اس کو دوبارہ چھیڑنا مناسب نہیں ہوگا، ممکن ہے کہ ان کی خفیہ طور پر نگرانی کی جارہی ہو لیکن لیاقت حسین.....“

”آپ اشارہ کریں تو اسے اوپر پہنچا دیا جائے۔“

”فی الحال کسی کو چھیڑنا مناسب نہیں ہے مگر..... میں لیاقت حسین کو زیادہ دنوں برداشت بھی نہیں کر سکتا۔“

افضل خان خاموش ہوا تو شیخ حامد نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

”ڈی آئی جی کراؤمر کی نگرانی ضروری ہے، مجھے یہ اطلاع ملتی رہنی چاہیے کہ وہ کیا تیر مارنے کی کوشش کر رہا ہے؟“

”سر.....“ افضل خان سنبھل کر بولا۔ ”وہ کسی قیمت پر کہنے والی چیز نہیں ہے ورنہ.....“

میڈم کا فیصلہ کن جواب سن کر نرس مجبوراً خاموش ہو گئی۔ ملازمہ نے پوچھا۔

”میرے لیے کیا حکم ہے۔ مجھے تو وہ لڑکی کسی قریبی بنگلے میں کام کرنے والی ملازمہ لگتی ہے۔“

”تم اس لڑکی کو میرے پاس لے آؤ اور اس بات کا خاص خیال رہے کہ جب تک وہ لڑکی

میرے کمرے میں رہے تم باہر دور دور سے اس بات کی نگرانی کرو کہ کوئی تیسرا فرد میرے کمرے کے قریب نہ آئے..... وہ لڑکی میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس کے یہاں آنے کا ذکر بھی کسی دوسرے کے سامنے نہیں ہونا چاہئے۔“

نرس نے میڈم روبی کے چہرے پر اچانک نمودار ہونے والی گہری سنجیدگی دیکھی تو وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد میڈم تھوڑا سا بستر پر اوپر کھسک کر نیم دراز ہو گئی۔ دو ٹیکوں کا سہارا لے کر..... اس نے اپنے آرام کا بھی خیال رکھا تھا۔ شبنم کو اسی نے ملاقات کی دعوت دی تھی لیکن اتنی رات گئے۔ اس نے دیوار گیر کھاک پر نظر ڈالی رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

کچھ دیر بعد شبنم کمرے میں داخل ہوئی تو میڈم روبی کو ایک لمحے کیلئے تعجب ہوا پھر وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر سکی۔ شبنم نے اپنے چہرے کی خوبصورتی دور کرنے کیلئے جو میک اپ کیا تھا اور لباس زیب تن کر رکھا تھا اس سے بظاہر ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ گھریلو ملازمہ ہے جس کے بائیس گال پردھم کا ایک گہرا نشان بھی نظر آ رہا تھا جو بھر جانے کے بعد بھی بد نما دکھائی دیتا تھا۔

اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد ملازمہ نے دروازہ اندر آ کر بند کیا پھر پچھلے دروازے سے نکل کر باہر چلی گئی۔ میڈم نے اسے ایک بار پھر یہی تاکید کی تھی وہ کسی کی غفلت برداشت نہیں کرے گی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے شبنم کی طرف دیکھا تو اس نے بڑی مصحوبیت سے کہا۔

”جیک صاحب جی۔ میرا بچہ ادھر گاؤں میں بیمار ہے اگر آپ ہمارے صاحب کو فون کر کے سفارش کر دیں تو وہ مجھے چھٹی دے دیں گے میرا گاؤں جانا بہت ضروری ہے۔“

”فائن.....“ میڈم نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا تمہیں اداکاری کا شوق رہ چکا ہے۔ لباس اور انداز گفتگو بدلنے کے بعد تم نے آواز پر بھی خاص عبور حاصل کر لیا ہے۔“

”کرنا پڑتا ہے“ شبنم نے اس بار اپنی اصلی آواز میں کہا پھر کرسی گھسیٹ کر میڈم کے بستر کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”جب ہکاری کتے ہر طرف گھوم رہے ہوں تو پھر احتیاط تو کرنی پڑتی ہے۔“

”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی“ میڈم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

”آپ نے گھر آنے کا اصرار نہ کیا ہوتا تو بھی میں کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر آپ سے ایک بار ملنے کی کوشش ضرور کرتی۔“ شبنم نے یک لخت سنجیدگی اختیار کر لی۔

”ایسی کیا بات ہے جو تم مجھے اتنی اہمیت دے رہی ہو.....؟“

”سوری..... آپ شاید بھول رہی ہیں کہ میں نے ہسپتال میں کہا تھا کہ شاید میرا اور آپ کا دشمن ایک ہی ہے۔“

میڈم روبی جواب سن کر کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی۔

”تم نے اس بات کا یقین کیسے کر لیا کہ میرا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے؟“

”آپ کے اس سنجیدہ سوال کے جواب میں ایک بات میں بھی پوچھنے کا حق رکھتی ہوں۔“ شبنم نے کسمسا کر کہا۔ ”جس مہذب خاتون نے بیس کی تفریح کا ہوں میں بھی بغیر حجاب کے جانا پسند نہ کیا ہو۔ وہ شوہر کے انتقال کے سال بھر بعد میں اس قدر ماؤرن کیوں بن گئی؟..... اور اسے افضل خان جیسے خطرناک شخص کے اپارٹمنٹ میں تنہا جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟“

میڈم روبی اس طرح چونکی جیسے اسے پھونے ڈنک مار دیا ہو شبنم کو سنجیدگی سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”تم میرے بارے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی ہو میری بیس کی زندگی کے بارے میں تمہیں کس طرح معلوم ہوا۔“

آپ کے دونوں سوال کا ایک ہی جواب ہے۔“ شبنم معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”ہم دونوں کا دشمن ایک ہی ہے۔ نہ ہوتا تو میں جان پر کھیل کر کسی آدم خور درندے کے اتنے قریب جانے کی کبھی بھول کر بھی غلطی نہ کرتی۔“

”لیکن.....“ میڈم نے کچھ کہنا چاہا۔

”آپ نے میرے کہنے پر افضل خان کے اپارٹمنٹ میں جانے کی حقیقت کو بھی اپنے پولیس کو دیئے جانے والے بیان میں بدل دیا تھا۔“ شبنم نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا۔

”کوئی نہ کوئی تو وجہ ضرور ہوگی؟“

”تم نے ابھی تک میرے سب سے اہم سوال کا جواب نہیں دیا۔“ میڈم نے کسمسا کر اپنی بات دہرائی۔ تمہیں میری بیس کی باتوں کا علم کس طرح ہوا؟“

ایک لمحے کیلئے بیڈروم میں خاموشی طاری رہی پھر شبنم نے دلی زبان میں کہا۔

”کیا آپ کو بیس کے کسی فیشن شو میں انجلا نای کوئی ماڈل پسند آئی تھی جسے آپ نے بطور خاص اس کی خوبصورتی پر فارمنس پر انعام بھی دیا تھا؟“

میڈم کی نظروں میں تجسس جاگنے لگا کچھ توقف سے بولی۔

”ہاں..... مجھے وہ خوبصورت ہندوستانی ماڈل یاد ہے جس نے فیشن ماڈلنگ میں بہت ساری ماڈلز کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن تم انجلا کو کس طرح جانتی ہو؟“

”اس طرح کہ اسے اپنے شوہر کی دردناک موت کے بعد انجلا کا نام دوسری بار اختیار کرنا پڑا تھا۔“ شبنم نے ایک سرد آواز بھر کر جواب دیا ”شاید اس لیے کہ وہ اگر دوبارہ انجم آرا کا نام اختیار رکھتی تو پھر اس کے اپنے بھی اسکے خون کے پیاسے ہو جاتے۔ شاید اس کا انجام بھی اپنے شوہر کی موت سے زیادہ اذیت ناک ہوتا۔“

میڈم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور حیرت سے شبنم کو دیکھتی رہی۔

”انجلا خوبصورت جسم کی مالک تھی شاید اسی لیے بہت جلد ٹاپ ماڈل میں شمار ہونے لگی۔ دنیا میں ماڈلز کی زندگی بڑے ٹھاٹس باٹ سے بسر ہوتی ہے۔ اس کے چاہنے والے اس کو قریب سے ایک نظر دیکھنے کیلئے ترستے ہیں لیکن انجلا..... وہ بدنصیب عورت ہر بھٹے کی رات اپنے بستر پر بچھی

سے زیادہ اذیت ناک ہوتا۔“

میڈم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور حیرت سے شبنم کو دیکھتی رہی۔

چادر کی طرح روندی جاتی تھی۔ اس کے عوض اسے یورو یا اس کے جسمانی حسن کو سرائے والے خوبصورت جملوں کے بجائے گندی گندی فحش گالیوں سے نوازتے تھے۔ وہ اس طرح بھنبھوڑی جاتی تھی جس طرح شیر کے شکار کو اس کا پیٹ بھر جانے کے بعد لکڑی گیکھے بھی بے دردی سے نوچتے کھوسنے ہیں۔ جنگل میں صرف شیر، چیتوں اور لکڑی گیکھوں کا قانون چلتا ہے، مردار احتجاج کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔“ شبنم کی آواز رندھ گئی، جب جسم اور روح کا رشتہ ٹوٹ جائے تو پھر مردے پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں ہوتا..... اس کی زبان بند ہوتی ہے، صرف روح آہ و بکا کرتی ہے جسے انسان کے کان سننے کی قوت نہیں رکھتے۔“

”تم..... تم انجلا کو کس طرح جانتی ہو.....؟“ میڈم نے حیرت سے پوچھا۔

”میں انجلا کو نہیں..... صرف انجم آرا کو جانتی ہوں جو..... جو میری معصوم ماں تھی۔“ شبنم کی خوبصورت آنکھیں بے اختیار آنسو چھلکنے لگیں۔ میڈم اس کے دل کا غبار چمٹ جانے کا انتظار کرتی رہی۔ اس کے اپنے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ یہ سن لینے کے بعد انجلا کو دوبارہ اپنا نام تبدیل کرنا پڑا اور وہ شبنم کی ماں تھی، اس کا تجسس بھی بڑھنے لگا۔

تین چار منٹ تک شبنم کی سسکیاں ابھرتی رہیں پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”میرے باپ نے انجلا سے شادی کی یہی ایک شرط رکھی تھی کہ وہ مسلمان ہو جائے، اس نے اپنے پیار کی خاطر وہ شرط قبول کر لی۔ وہ بڑے گھرانے کے ایک جاگیردار کی اکلوتی راج کمار تھی، بات بچھلی تو جاگیر کے تمام ہندو پنڈت اور پجاری میرے باپ کے دشمن بن گئے لیکن میری ماں نے دورانہی سے کام لیا، اس نے اپنے گھر والوں کو دھواں دھواں لایا کہ کچھ حاسدوں نے غلط خبر اڑا دی ہے۔ جاگیردار نے فوری طور پر پنڈتوں سے مہورت نکلوا کر اہی کا رشتہ اپنے برابر والوں میں کر دیا، میرے ماں خاموش رہی، خاموشی سے اپنے حصے کی دولت اور قیمتی زیورات جمع کرتی رہی پھر لگن منڈپ بننے سے تین رات پہلے وہ خاموشی سے اپنا سب دھن دولت سمیٹ کر ایئر پورٹ پہنچ گئی جہاں اس سے محبت کرنے والا پہلے سے موجود تھا۔ میرا باپ بھی کھاتے پینے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے پاس بھی دولت کی فراوانی تھی۔ دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی دوسرے ملک میں جا کر زندگی بسر کریں گے۔“ شبنم نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میرے ماں باپ کو کسی واقف کار نے یہ مشورہ دیا تھا کہ لندن یا امریکہ جانے کے بجائے فرانس کی طرف نکل جائیں۔ انہوں نے دوست کا مشورہ قبول کر لیا۔ شادی کے تین سال بعد میں بد نصیب اس دنیا میں آ گئی، میرے والدین بہت خوش تھے۔ دو سال بعد میرے والد ہمیں لے کر سوئٹزرلینڈ آ گئے۔ انہوں نے فرانس جا کر جو کاروبار اختیار کیا وہ خوش قسمتی سے بے حد کامیاب رہا، والد صاحب نے ایک دو کمرے کا خوبصورت اپارٹمنٹ پیرس میں بھی خرید لیا تھا، ان کا ارادہ تھا کہ میرے بالغ ہو جانے کے بعد سوئٹزرلینڈ سے پیرس شفٹ ہو جائیں گے اور دشمنوں سے بہت دور پرسکون زندگی گزاریں گے لیکن..... قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔“

شبنم سانس لینے کے لئے رکی پھر سرد آہ بھر کر اپنی کہانی کا درد بھرا حصہ سنانے لگی۔

”اس وقت میری عمر سات سال تھی، میں سوئٹزرلینڈ کی ایک ایسے سکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں امیر کبیر لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کا محض خواب دیکھا کرتے ہیں۔ میرے والد کو کاروباری سلسلے میں آس پاس کے ملکوں کا سفر کرنا پڑتا تھا، اس لیے انہوں نے میرے لیے سکول کے قریب ہی ایک بورڈنگ ہاؤس میں میرا بندوبست کر دیا تھا۔ بیرون ملک کی غیر آلود فضا میں میری ماں کا حسن روز بروز گھبرتا جا رہا تھا، ایک بار کسی بے تکلف دوست نے مشورہ بھی دیا تھا کہ اگر میری ماں پیرس جا کر شوقیہ طور پر ہی ماڈلنگ شروع کر دے تو وہ چار شوز کے بعد ہی ٹاپ ماڈلز میں شمار ہونے لگے گی۔ ایک ایک شو میں ہزاروں یورو کماسکتی ہے، میرے والدین نے اس مشورے کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔ انجلا سے انجم آرا بننے کے بعد میری ماں نے اسلامی تعلیم میں بھی خاص دسترس حاصل کر لی تھی، وہ باہر نکلتی تو ہمیشہ حجاب کا استعمال کرتی جس کے سبب اس کے قدرتی حسن اور رنگ و روپ میں اور نکھار آ جاتا تھا، ایک بار میں نے اپنے والد کو ماں سے کہتے سنا تھا۔ ”انجم تم تو شادی کے بعد دس گیارہ سال بڑی لگنے کے بجائے اور زیادہ کم سن اور حسین ہوتی جا رہی ہو۔“ میں اس جملے کو سن کر وہاں سے ہٹ گئی تھی، ماں نے کیا جواب دیا، میں نے سننے کی کوشش نہیں کی لیکن میرے باپ نے جو کہا وہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔“

شبنم نے ایک لمحے رک کر درد بھری آواز میں اپنی کہانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”ان دنوں میرے والد میری ماں کے ساتھ لندن میں ایک کاروباری سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں ایک فائیو سٹار ہوٹل میں پورا وی آئی پی سوٹ بک کرا رکھا تھا۔ وہ سفر میرے والد کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔ جہاں انہیں ایک دوسرے بڑے اور عیاش سرمایہ دار نے میری ماں کے سامنے اس کے وی آئی پی سوٹ میں مار دیا تھا، مارنے سے پہلے اس بے غیرت قاتل نے میرے والد کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بے بس کر دیا تھا۔ وہ کمینہ میری ماں کو اس کے شوہر کے سامنے برہنہ کر کے اس کی شرافت کی دجھیاں اڑاتا رہا، اس کے دو نقاب پوش بدعاش بھی کمرے میں سائلنسر لگے پستول لیے کھڑے تھے۔ وہ حرامزے بھی میری ماں کی عزت لئے کا تماشا دیکھتے رہے پھر انہوں نے اپنے حرامزادے مالک کے اشارے پر میرے باپ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ میری ماں پر سکتہ طاری ہو گیا، اس رات دونوں نقاب پوش بھی میری ماں کو شکاری کتوں کی طرح بھنبھوڑتے رہے۔ ان کے جانے سے پیشتر ان کا باس دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری ماں کے نیم برہنہ جسم پر وہ تصاویریں ڈال دیں جو نقاب پوشوں کے ساتھ اتاری گئی تھیں۔ یہ بھی حکم دیا گیا کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کا انجام بھی مرنے والے سے مختلف نہیں ہوگا۔ پھر وہ چلے گئے۔“ شبنم کی سسکیاں دوبارہ ابھرنے لگیں۔ میڈم اس کو دیکھتی رہی جب شبنم کے آنسو تھے تو اس نے پوچھا۔

”کیا اس بے غیرت کا نام بھی شیخ حامد تھا۔“ اس کے لہجے میں دنیا جہان کی نفرتیں اور انتقامی جذبہ بھل رہے تھے۔

”آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے۔“

”پھر؟..... تمہاری ماں نے کیا کیا؟“

”اسے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں چھوڑا گیا تھا“ شبنم نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ”اس نے میرے والد کی موت کو قتل ہی ظاہر کیا..... کسی کا نام زبان پر نہیں لائی۔ پولیس والوں کو اس نے مفروضہ قاتلوں کے حلیے بھی غلط بتائے۔ ایک ماہ تک اسے لندن ہی میں رکنا پڑا پولیس کی جانب سے کلیئرٹس ملنے کے بعد وہ پہلی فلائٹ سے سویٹزر لینڈ پہنچی۔ اس نے وہاں کے مکان کو فروخت کر دیا۔ پھر وہ پیرس جا کر دوبارہ انجلا بن گئی۔ کسی کے مشورے پر غور کرنے کے بعد ہی اس نے اپنا غم غلط کرنے اور وقت گزرنے کی خاطر فیشن ماڈلنگ شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹاپ ماڈلز میں شمار ہونے لگی۔ لوگ اسے خوش قسمت سمجھتے رہے۔ اس کے اندر کا زخم کوئی نہ دیکھ سکا..... خود مجھے بھی ماں نے ہر اس موقع پر ٹالنے کی کوشش کی جب میں نے اس سے دوبارہ انجلا بننے کا سبب پوچھا۔ باپ کی قتل کی خبریں اخبار اور ٹی وی پر بھی سن چکی تھی لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں آ سکا کہ میرا باپ جو ہر بیچ و خم سے مردوں کی طرح مقابلہ کرنے کا عادی تھا۔ اسے قتل کیوں اور کس وجہ سے کیا گیا؟ پھر جب میری عمر بارہ سال ہوئی تو ایک روز ماں نے مجھے کال کی اور تمام اصلحوں سے آگاہ کیا۔ اس نے رو رو کر یہ بھی کہا کہ وہ درندہ پیرس میں بھی اس کو کھلونے کی طرح استعمال کرتا رہا۔ اس روز اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اپنے باپ کے قاتل سے انتقام ضرور لوں جسے غالباً میرے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں تھا..... وہ..... وہ میرے لیے میری ماں کی زندگی کی آخری کال تھی۔ اس لیے کہ دو روز بعد مجھے ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے علم ہو گیا کہ پیرس کی پولیس نے میری ماں کو اس کے اپارٹمنٹ سے مرزہ حالت میں خود اسی کی انفارمیشن پر برآمد کیا تھا۔ شاید زہر کھانے کے بعد اس نے پولیس کو خود اپنی موت کی اطلاع دی تھی۔ لاش کے قریب ہی ماں نے..... صرف میری زندگی کے تحفظ کی خاطر ایک تحریر بھی چھوڑی تھی جس میں لکھا تھا۔ ”میں زندگی کے ہنگاموں سے تنگ آ کر خود اپنی مرضی سے زہر کھا رہی ہوں، میری موت میں کسی کو ملوث نہ سمجھا جائے۔“

”یہ غلط بھی ہو سکتا ہے.....“ میڈم نے ہونٹ چباتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”عین ممکن ہے ہمارے مشترک دشمن نے اسے خودکشی کرنے اور تحریر لکھنے پر مجبور کیا ہو۔“

”شاید ایسا ہی ہو.....“ شبنم نے ٹھنڈی سانس لی۔

”ماں کی موت کے بعد میں نے پیرس جانے کی غلطی نہیں کی میں بینک سے رقم نکالوانے گئی تو فیجر نے مجھے بتایا کہ میرے اکاؤنٹ میں کسی انجمن نامی خاتون نے بیس لاکھ یورو کا پے آرڈر جمع کرایا تھا۔ میں وہ تمام رقم لے کر..... سویٹزر لینڈ کو خیرباد کہہ کر فوری طور پر برلن چلی گئی۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ میں پانچ سال تک کسی مفروضہ مجرم کی طرح اپنے ٹھکانے شہروں شہروں بدلتی رہی۔ پھر یہاں آگئی اور خاصی دشواریوں کے بعد بالآخر اس سانپ کے دفتر میں بحیثیت ٹیلیفون آپریٹر کی اسامی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جو میرے باپ اور میری ماں دونوں کو ڈس چکا

ہے۔ اب مجھے اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہے۔“

”آئی سی.....“ میڈم نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ ”تم نے اس کی کمپنی میں ملازمت کیوں حاصل کی؟“

”اس شکاری کے افضل خان کی وجہ سے جو میرے والدین کے قاتل سے سب سے نزدیک رہتا ہے“ شبنم نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں اجازت چاہوں گی۔ جاتے جاتے یہ بھی مشورہ دوں گی کہ آپ بھی افضل خان سے محتاط رہیں۔ شیخ حامد کے ایک اشارے پر وہ خود آپ کو بھی گولی مار دینے کی حد تک جاسکتا ہے۔ وہ گلے گلے اس کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے لیکن وہی ایک ایسا شخص ہے جو ہمارے دشمن کو سب سے آسانی سے ٹھکانے بھی لگا سکتا ہے۔“

شبنم کے جانے کے بعد اس رات میڈم بھی نہیں سو سکی، نرس نے اسے نیند کا انجکشن بھی دیا لیکن وہ بھی زیادہ موثر ثابت نہیں ہوا البتہ اس کے سوتے جاگتے ذہن پر ایک دھند سی ضرور طاری ہو گئی تھی۔



افضل خان کیلئے میڈم روٹی کو جلد از جلد ٹریپ کرنے اور اسے بلیک میل کرنے کی خاطر کیمبرے کی خفیہ حالت میں اس کی شرمناک حیا سوز اور قس تصویریں حاصل کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ شیخ حامد نے اسے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا حکم دیا تھا۔ ذاتی طور پر بھی وہ میڈم کا اسیر تھا اور اس کی وصل کی لذتوں سے سرشار ہونے کیلئے بے چین تھا۔

تین روز سے وہ برابر اس کی خیریت دریافت کرنے اور جشن صحت منانے کیلئے اپنی بے چینی کا اظہار کر رہا تھا، لیکن اسے کسی نہ کسی بہانے ٹالا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرحین اور زینہ کے ہاتھ میں آکر پراسرار طور پر نکل جانے کے سبب بگ باس کا غصہ عروج پر تھا پانچ لاشوں کی کہانی نے اخبار کی زینت بن کر اس کے غصے کی شدت کو اور بھڑکا دیا تھا۔

اس وقت بھی بگ باس کی فرمائش کو جلد از جلد پورا کرنے کی خاطر وہ اپنے ذہن میں مختلف منصوبے بنا رہا تھا لیاقت حسین نے درمیان میں آکر میڈم روٹی کے اغوا کو ناکام نہ بنایا ہوتا تو شاید یہ درد مری بھی اس کے سر سے ٹل جاتی۔ ہر چند کہ بگ باس نے ٹھل کر اس بات کا اقرار نہیں کیا تھا کہ میڈم کو اغوا کرانے میں اسی کی کوشش کو دخل تھا لیکن افضل خان اتنا بچہ بھی نہیں تھا کہ ہوا کا رخ نہ بھانپ سکتا۔ بہر حال شبنم کی وجہ سے میڈم نے اس کے اپارٹمنٹ والی بات گول کر دی تھی ورنہ شاید حامد کا غصہ حد سے گزر جاتا۔ میڈم کے سلسلے میں ایک الجھن یہ بھی درپیش تھی کہ وہ زنی ہونے کے بعد زیر علاج تھی اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو شاید افضل خان اسے ریٹینو کلب یا کسی اور جگہ آتے جاتے وقت راستے سے بھی اٹھوا کر وہ سب کچھ کر گزرتا جو شیخ حامد کے علاوہ اس کی اپنی دلی خواہش بھی تھی لیکن موجودہ صورت میں وہ میڈم کو اس کی کوششی سے اغوا کرانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ مختلف راستوں پر غور کرنے میں مصروف تھا۔ جب فون کی گھنٹی بجی۔ افضل خان نے نفرت سے فون سیٹ کو گھورا جس

”ہاں آں.....“ افضل خان نے ایک گھونٹ لے کر بے تکلفی سے کہا۔ ”ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے.....“

”تم سے پرانی واقفیت کی بنا پر ایک بات قبل از وقت بتا دوں۔“ دوسری جانب سے بھی دوستانہ انداز میں جواب ملا۔ ”شی از اے ڈی فیکل ٹارگٹ۔ تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔“

”اوہ نو.....“

افضل خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”وہ بات نہیں جو تم سمجھ رہے ہو..... اوکے میں تم سے کل کسی وقت ملتا ہوں پھر سارا پروگرام سیٹ کر لیں گے۔“

”ایز یوش۔“

افضل خان نے رابطہ ختم کر کے شیخ حامد کے وہ نمبر گھمانے شروع کر دیے جو انتہائی اہم مواقع پر استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ دوسری جانب سے کال تقریباً بیسینڈ بعد ریسیو کی گئی۔ خود شیخ حامد نے ریسیور اٹھایا تھا، جواب میں افضل خان نے میڈم سے ہونیوالی تفصیل اور تاج محل ہوٹل کے علاوہ رابرٹ کلاؤک کا نام بھی بتا دیا۔

”میں ان انگریز نسل کے دو غلے کتوں پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتا لیکن تم فکر مت کرو..... میں ڈائریکٹ اس کے مالک سے بات کرتا ہوں، اس کے بعد رابرٹ بھی تمہارے اشاروں پر دم ہلانے پر مجبور ہو جائے گا۔ تمام کام خوبصورتی اور پوری مہارت سے انجام دینا۔ ٹارگٹ ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہیے اس کا خیال رکھنا۔“

دوسری جانب سے بات ختم کرنے کے ساتھ ہی ریسیور رکھنے کی آواز ابھری تو افضل خان نے سکون کا لمبا سانس لیا پھر اس نے دوسرے ہی دن روم نمبر چار سو آٹھ کی چابی لے کر حسب نشا اس کی سجاوٹ کے ساتھ ساتھ ”ناگن کا زہر کشید“ کرنے کے دوسرے انتظامات بھی نہایت مہارت سے شروع کر دیئے۔ شیخ حامد نے غلط نہیں کہا تھا، رابرٹ کلاؤک سے افضل خان کی پرانی شناسائی تھی لیکن بگ باس کا حوالہ مل جانے کے بعد وہ سچ ہی دم ہلاتا پھر رہا تھا۔

افضل خان نے ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ اس رقیب کا بھی بندوبست کر لیا تھا جو افضل خان کے بعد میڈم کے ساتھ لکڑ بھٹکے والا سلوک کرتا اور اس کی تصاویر افضل خان تیار کرتا پھر اس کے خیال کے مطابق زہریلی ناگن بھی اس کی بین پر لہرا بنے پر ہمیشہ مجبور ہی رہتی۔

درمیان کا ایک دن اور گزر گیا پھر اگلے روز افضل خان ٹھیک ساڑھے سات بجے ریسپشن پر بنفس نفیس موجود تھا۔ میڈم رومی حسب وعدہ ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل میں داخل ہوئی۔ رو پہلے رنگ کے ماڈرن ٹائپ شلوار سوٹ میں وہ سچ کوئی خوبصورت ناگن ہی دکھائی دے رہی تھی۔ افضل خان نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا پھر پانچ منٹ بعد ہی وہ روم نمبر چار سو آٹھ میں موجود تھے۔ میڈم رومی نے وہاں کی سجاوٹ دیکھی تو مسکرا کر بولی۔

نے اسکی محویت کو ڈسٹرب کیا تھا۔

”ہیلو.....“ اس نے ریسیور اٹھا کر سرد لہجے میں کہا۔

”افضل خان آن لائن۔“

”کیا بات ہے مائی ڈیر..... تم اس وقت کچھ اچھے ہوئے لگتے ہو؟“ دوسری جانب سے میڈم رومی کی آواز سن کر اس کی ساری جھلاہٹ کا فور ہو گئی۔

”تمہارے ہی بارے میں غور کر رہا تھا۔“ اس نے یکدم اپنا لہجہ تبدیل کر لیا۔

”مجھ میں غور کرنے والی ایسی کیا بات ہے؟“ میڈم کے لہجے میں لگاؤ تھی۔

”اس سوال کا جواب میں فون پر نہیں دے سکوں گا۔“

وہ فری ہونے لگا۔ ”تم سامنے ہوگی تو تفصیل سے بتاؤں گا تم کیا ہو.....؟“

”اچھا!..... اگر یہ بات ہے تو پھر پرسوں کے جشن صحت کی تیاریاں ابھی سے شروع کر دو۔“

میڈم نے بے تکلفی سے کہا پھر سنجیدگی سے بولی اپنی شرط کے مطابق میں نے تاج محل کا انتخاب کیا ہے۔ تم وہاں کے منیجر مسٹر رابرٹ کلاؤک سے مل لو۔ وہ تمہیں کمرانمبر بتا دے گا اور تمہارے ساتھ مکمل تعاون بھی کرے گا۔ میں نے اسے فون کر دیا ہے۔“

”بہت بہت شکریہ ڈارلنگ“ افضل خان نے خوشی کا اظہار کیا پھر مدہم لہجے میں بولا ”یہ دو روز کس طرح گزریں گے؟“

”ایک بات اور سن لو..... جو آفر میں نے تمہیں دی ہے اس کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کر کے آنا..... بائی۔“

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ افضل خان کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی، اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میڈم رومی..... میں سارے فیصلے کر چکا ہوں، ایک آخری شیج دینا باقی رہ گیا ہے۔ اس کے بعد شاید تم افضل خان کے بوٹ کو بھی پالش کرنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔ بگ باس تمہیں ناگن کہتا ہے اور افضل خان..... ہاہا..... ہاہا..... افضل خان ناگوں کا سارا زہر نکالنے میں بہت پہلے پی ایچ ڈی کر چکا ہے۔“

میڈم رومی کا فون آ جانے کے بعد اس نے خوشی کے اظہار کے طور پر ایک ڈبل پیگ بنا کر دو تین لمبے لمبے گھونٹ لیے پھر تاج محل کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ آپریٹر کی آواز ابھرنے کے بعد اس نے جزل منیجر رابرٹ کلاؤک سے لائن ملانے کی درخواست کی جو فوراً ہی قبول کر لی گئی۔ چند سیکنڈ بعد ہی رابرٹ کلاؤک لائن پر تھا۔

”منیجر رابرٹ“ میں افضل خان بول رہا ہوں۔“

”مجھے میڈم رومی کا فون مل چکا ہے۔“ دوسری طرف سے بے تکلفی سے ششہ اردو میں جواب ملا۔ ”میں نے فوراً فلوور پر روم نمبر چار سو آٹھ تک کر دیا ہے۔ سنا ہے تم میڈم کا جشن صحت منانے کیلئے بے چین ہو.....؟“

”تم نے زبردست اہتمام کر ڈالا ہے۔“

”اٹ ازمائی پلیز۔۔۔۔۔“

افضل خان اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر بولا پھر دونوں آنے سائے صوفوں پر بیٹھ گئے، بائیں ہاتھ پر کھڑکی تھی جس پر خوبصورت پردے موجود تھے اس کے ساتھ ڈبل بیڈ بھی تھا، دیگر سجاوٹ بھی ویسی ہی تھی جیسی فائیو سٹار ہوٹل میں ہوتی ہے۔ افضل خان نے خاص طور پر موتیا اور گلاب کے تازہ پھولوں سے پورے کمرے کو مہکا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا خوبصورت پھول عورتوں کی کمزوری ہوتے ہیں۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی بات ہوتی رہی۔ افضل خان نے بوتل کھول کر دو گلاس تیار کیے۔ شیشے کی گول میز پر وہ کیک بھی موجود تھا جسے جشن صحت کی علامت کے طور پر روبی کو کاٹنا تھا۔

”اور کیا کیا اہتمام کر ڈالے ہیں تم نے۔۔۔۔۔؟“ روبی نے بے تکلفی سے پوچھا اس بے تکلفی میں بھی ایک وقار موجود تھا۔

”پہلے ڈرنکس۔۔۔۔۔ پھر کیک تمہارے ہاتھوں کتنے پر اپنی قسمت پر رشک کرے گا۔ آخر میں ڈنر ہوگا اور اس کے بعد جوتم کہو۔۔۔۔۔“

”اگر آج میں شیریں پینے پر اصرار کروں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔۔۔۔۔؟“ روبی نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت شوفی سے کہا۔

”شکر ہے کہ تم نے اپنی کسی پسند کا اظہار تو کیا۔“ افضل خان نے خوشی کا اظہار کیا پھر اس نے فون سروس پر شیریں کی ایک نئی بوتل طلب کی جو بہ مشکل دس منٹ میں آگئی۔ بیڑے کے جانے کے بعد میڈم نے بوتل کی سیل پر ایک نظر ڈالی پھر اس نے اپنے ہاتھ سے اسے کھول کر ایک پیگ تیار کیا۔ افضل خان نے مسکرا کر کہا۔

”آئی ایم سوری ڈارلنگ۔ مجھے یہ خیال پہلے سے رکھنا چاہئے تھا کہ شیریں خواتین کی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔“

”نیو مائنڈ۔۔۔۔۔ آئندہ خیال رکھنا۔۔۔۔۔“

روبی نے دو تین سپ لیے پھر قدرے سنجیدگی سے بولی۔

”میرا خیال ہے کہ کیک کتنے سے پیشتر اگر ہم اپنے مطلب کی بات کر لیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”ایز یوش۔۔۔۔۔“

افضل خان نے سر تسلیم خم کیا تو روبی مسکرائی پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”تم نے میرے دشمن کو شکانے لگانے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”تم نے دور اندیشی سے کام لے کر میرا درست انتخاب کیا ہے۔“ افضل نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”میں جتنا بگ باس سے قریب ہوں اتنا کوئی اور نہیں ہے۔۔۔۔۔ اس لیے میرے لیے یہ کچھ

دشوار بھی نہیں ہوگا لیکن۔۔۔۔۔ ایک شرط میری بھی ہے۔۔۔۔۔“

”مجھے تمہاری ہر وہ شرط منظور ہے جس میں ایک شریف عورت کی عزت کو شادی سے پہلے کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔“ روبی نے بے تکلفی سے جواب دیا۔

”دو روز کے اندر میں تمہیں کسی غیر ملکی بینک اکاؤنٹ کا ایک نمبر دوں گا۔ جس روز اس میں پچاس لاکھ کی رقم جمع کرادی گئی اس کے چار روز کے اندر تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔ تمہارے دشمن کا قصہ ہمیشہ کیلئے پاک ہو جائے گا۔“

”ڈن۔۔۔۔۔۔“ روبی نے پر جوش انداز اختیار کیا۔ ”مجھے تمہاری یہ صاف گوئی پسند آئی۔“

”ایک بات اور۔۔۔۔۔“ اس بار افضل خان نے اس کے سراپا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے خاصی بے تکلفی سے کہا۔ ”آج اس جشن کے موقع پر مجھے ایک حد تک تمہاری پرستش کرنے کی اجازت بھی درکار ہوگی۔“

”اوکے۔۔۔۔۔“

روبی نے کچھ توقف سے جواب دیا۔

”ایک حد تک ہی اجازت ہوگی مگر تم اس کو پھلانگنے کی حماقت نہیں کرو گے۔“

”پردانہ شمع پر نچھاور ہونے کی خاطر اسے ہمیشہ روشن دیکھنا چاہتا ہے۔“ افضل نے اٹھ کر روبی کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے قرب کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔“

اس نے روبی کا ہاتھ تھام لیا۔ میڈم نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ افضل خان نے تیسرا بیگ ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ابھی تک ایک بھی ختم نہیں کیا اسے ایک گھونٹ میں اپنے خوبصورت وجود میں اتار لو تو پھر کیک کاٹا جائے اس کے بعد ہی ڈنر کا آرڈر دوں گا۔“

روبی نے ایک لمحہ تامل کیا پھر ایک ہی گھونٹ میں گلاس ختم کر دیا۔ افضل خان نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا تو روبی کو اپنا ذہن کچھ کچھ بھاری بھاری سا لگا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا، کیک کاٹنے کے بعد افضل خان نے پر جوش انداز میں اسے دونوں ہاتھوں میں سمجھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد افضل خان نے فون سروس پر ڈنر سرو کرنے کا آرڈر دیا۔ دوسری طرف میڈم بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ شیریں کے محض ایک پیگ پینے کے بعد اسے اپنے ذہن پر بھاری پن بڑھتا کیوں محسوس ہو رہا تھا؟ ایسی صورت میں کہ جب اس نے بوتل کی سیل بھی خود اپنے ہاتھ سے توڑی تھی، پیگ بھی خود ہی تیار کیا تھا۔ اس سے پہلے ایک پیگ سے اسے کبھی اتنا غم نہیں ہوا تھا۔

”کس سوچ میں کم ہو گئیں سویٹ ہارٹ۔“ افضل خان نے دوبارہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر ہلکے سے دباتے ہوئے پوچھا۔ ویسے وہ یہ دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا کہ سیل بند بوتل کے اندر جس بے ہوشی کی دوا کی ملاوٹ کی گئی تھی وہ اپنا اثر دکھانا شروع کر چکی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔“

روبی نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”یہ سوچ رہی تھی کہ تم نے میری خاطر کتنا اہتمام کر

ڈالا ہے۔“

دروازے پر دستک ہوئی تو افضل خان اٹھ کر دوسرے صوفے پر چلا گیا پھر اس کے ”کم ان“ کہنے پر ڈنڑلا کر دوسری کھڑکی کے قریب بھی ٹھیل پر سرود کر دیا گیا۔ ہوٹل کے کارندوں کے جانے کے بعد افضل خان نے اپنے اور روہی کے لیے الگ بوتلوں سے دو پیگ تیار کیے تو روہی نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ فی الحال میرے لیے ایک پیگ ہی کافی تھا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈیر۔“ افضل خان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کھانے کے دوران میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔۔۔۔۔ کم آن ڈیر“ آج میری خوشی کی خاطر میری درخواست قبول کرلو۔ آئندہ میں مجبور نہیں کروں گا۔“

روہی نے مسکرانے پر اکتفا کیا لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ بہت احتیاط سے کام لے گی۔ اس کے ذہن پر طاری ہونے والی ہلکی مگر پوہل پوہل سی غنودگی بھی اسے سنبھل کر قدم اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس غنودگی کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔

کھانے کی میز پر بیٹھ کر اس نے احتیاط سے کھانا شروع کیا۔ افضل خان ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوش دکھائی دے رہا تھا بار بار روہی کو ایک چھوٹا گھونٹ لینے پر اکسارہا تھا۔ ویسے اس کا تجربہ اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ بے ہوشی کی دوا جس مقدار میں روہی کے جسم میں پہنچ گئی تھی وہ اگلے پندرہ منٹ کے اندر اندر اسے بالکل ہی شن کر دے گی جس کے بعد اسے اس ناگن کا سارا زہر کشید کرنے کا پورا پورا موقع ملے گا۔ وہ اپنی پیاس بجھانے کے بعد فحش تصویروں کے وہ سیٹ تیار کرنے کا منصوبہ بھی بنا چکا تھا۔ ایک اپنے لیے تاکہ روہی بگ باس کے علاوہ اس کی بانسری کی لے پر بھی تاجپے پر مجبور رہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔

ٹھیک اسی وقت ڈی ایس پی سراج گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے منہ بنا کر ریسپونڈ اٹھا لیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ سراج اسپیکنگ۔۔۔۔۔“

”لیاقت بول رہا ہوں۔“

دوسری جانب سے لیاقت حسین کی آواز ابھری۔

”ایک بار میں نے میڈم روہی کی عزت بچا کر نیکی کمائی تھی اس وقت یہ ذمے داری آپ کو سونپ رہا ہوں۔۔۔۔۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔“

”تم کہاں سے بول رہے ہو؟“

سراج کو لیاقت حسین کا انداز گفتگو کچھ بدلا بدلا سا لگا جیسے وہ خواب کی حالت میں زبردستی بول رہا ہو۔

”تاج محل ہوٹل، کمر نمبر چار سو آٹھ میں افضل خان نے دھوکے سے میڈم کو شراب میں بے ہوشی کی دوا پلا دی ہے۔ میں منٹ بعد وہ بے ہوشی کی حالت سے دوچار ہو جائے گی پھر افضل خان شیخ

حامد کے حکم پر نہ صرف اس کے ساتھ منہ کالا کرے گا بلکہ اس کی فحش اور بے ہودہ تصاویر بنا کر زندگی بھر اس کی پاکیزگی کو پامال کرتا رہے گا۔ یہ کام میں آپ کو سونپ رہا ہوں۔ وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک ایسی نیکی کر گزریں جس کا ثواب آپ کو دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔“

”لیکن تمہیں یہ اطلاعات کہاں۔۔۔۔۔“

”خدا حافظ!“

”مختصر جواب کے بعد لائن کاٹ دی گئی۔“

سراج بوکھلا کر رہ گیا۔ لیکن پھر اسے لیاقت حسین کی پچھلے دو موقعوں پر کبھی جانے والی عجیب اور حیرت انگیز باتیں یاد آئیں تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی۔ اس نے اسی وقت ایک اسپیکر کو فون کر کے فوری طور پر تاج محل ہوٹل پہنچنے کے آرڈر جاری کیے پھر خود بھی بڑی عجلت میں اپنی کار میں بیٹھ کر تیز رفتاری سے تاج محل ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں لیاقت حسین کی شخصیت کا وہ پراسرار پہلو اجاگر تھا جس کی ابھی تک وہ کوئی توجیہ تلاش نہیں کر سکا تھا۔



”کم آن ہنی!“ افضل خان نے اسے باتوں میں الجھانے کی کوشش کی۔ ”میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔“

”مم..... میں اب گھر جاؤں گی۔“ روبی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر وہ اٹھی تو لڑکھڑا کر رہ گئی۔ ”بے ہوشی کی دوا تیزی سے اپنا کام کر رہی تھی اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں دیوار کا سہارا لیا تو افضل خان نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

”آتی جلدی کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

”افضل خان!“ روبی نے اس بار بدلے ہوئے انداز میں کہا۔ ”مجھے تم سے اس کی توقع نہیں تھی۔“

”میں سمجھا نہیں“

”تم نے شاید وہ بات یاد نہیں رکھی جو میں نے تم سے تمہارے اپارٹمنٹ میں کہی تھی۔“ روبی نے اپنے ڈوبے ذہن پر قابو پاتے ہوئے نفرت سے کہا۔ ”دشمن کے مقابلے پر تم میرے لیے زیادہ آسان ٹارگٹ ہو گے۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کر کے اچھا نہیں کیا۔“

”تیر مکان سے نکل جائے تو واپس نہیں آیا کرتا میری جان۔“ افضل خان تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر روبی کے قریب پہنچ گیا۔ ”رہا اچھے اور برے کا سوال تو میں نے اس پر بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس لیے میرا مشورہ ہے اب تم خود کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرو۔ اسی میں بہتری ہے۔ آج تم پوری طرح میرے ڈسپوزل پر ہو اس لیے.....“

”خبردار! میرے قریب آنے کی کوشش مت کرنا.....“ روبی نے عمارت سے اسے متنبہ کیا لیکن افضل خان پر اتنا کھلاڑی تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ شکار جال میں پھنس چکا ہے۔ اب اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ کوئی دایلا کر سکے اس لیے اس نے آگے بڑھ کر بڑی بے تکلفی سے روبی کی خوبصورت کمر کے گرد اپنے ہاتھوں کا حلقہ تنگ کر دیا۔ جواب میں روبی نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ وہ بہ مشکل اتنا کہہ سکی۔

”پلیز افضل خان..... مجھے جانے دو اس نیکی کے عوض میں تم کو منہ مانگی رقم.....“

”دستخط شدہ لیٹرز اور بلیٹک چیک ہاتھ میں ہو تو خالی جگہ پر کس بی رقم کا اندراج کیا جاسکتا ہے“ افضل کی گرفت اور تنگ ہو گئی۔ وہ روبی کو آہستہ آہستہ خوبصورت بیڈ کی طرف لے جا رہا تھا۔ جہاں اس خوبصورت ناگن کا زہر کشید کرنے کا پروگرام تھا۔ روبی اس کے مضبوط بازوؤں میں کسما رہی تھی۔ افضل خان کے اندر کا شیطان اس کے حسین گدرائے اور مہکتے جسم کے قرب سے بے چین ہو رہا تھا۔

روبی کو بیڈ پر لٹا کر وہ خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا، سرسراتے لہجے میں بولا۔

”تم نے اپنی دانست میں شیمپن کا آرڈر دے کر میرے بھڑکے جذبات کو کچلنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ بھول گئی تھی کہ شکاری شکار سے زیادہ ہوشیار ہوتا ہے۔“

میڈم روبی کو ہرگز نہ دلا لہجہ احساس دلا رہا تھا کہ اس کے دشمنوں کے ہاتھ اس سے کہیں زیادہ لمبے ہیں۔ اس نے شیمپن کی سیل بند بوتل اپنے ہاتھوں سے کھولی تھی لیکن افضل خان نے یقیناً پوری پلاننگ پہلے سے کر لی ہوگی۔ ہر ممکن صورتحال پر غور کیا ہوگا۔ سیل بند بوتلوں میں بھی بے ہوشی کی دوا پہلے سے شامل کرائی ہوگی۔

موجودہ صورتحال نے شدت سے احساس دلایا تھا کہ اس نے شبنم کے سمجھانے کے باوجود افضل خان سے محتاط رہنے کی بات نظر انداز کر کے ایسی غلطی کی تھی جس کا اب کوئی تدارک ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک ایک لقمہ سنبھال سنبھال کر لے رہی تھی۔ ساتھ ہی اپنے ذہن کو پوری طرح جاگتے رہنے پر بھی مجبور کر رہی تھی۔

”کیا بات ہے مائی سویٹ ہارٹ؟“ افضل خان نے اس سے بڑی لگاؤ سے پوچھا۔ ”جشن صحت کے اس خوشگوار موقع پر تم کچھ بھی بچھی بچھی سی نظر آ رہی ہو۔“

”افضل خان.....“ روبی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خوشی کی خاطر میں یہاں آ گئی لیکن اس وقت بھی مجھے کچھ تھکان سی محسوس ہو رہی ہے۔“

”ایٹ..... ڈرنک..... اینڈ بی پی پی“ افضل خان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ ”پریشان مت ہو ہم اس وقت کسی دیرانے میں نہیں ایک فائیو سٹار ہوٹل میں بیٹھے ہیں جہاں چکی بجاتے ہم ہر قسم کی امداد اور آرام طلب کر سکتے ہیں۔“

”یو آر رائٹ لیکن.....“ روبی نے اپنی ذہنی غنودگی کے پیش نظر کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ”مناسب ہوگا کہ میں فوراً گھر پہنچ کر ڈاکٹر کر دکھاؤں جشن صحت تم جب چاہو دوبارہ منا سکتے ہو۔“

”ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو.....“

”کہیں تمہیں پچاس لاکھ ایڈوانس دینے والی بات بری تو نہیں لگی؟“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ”نان سنس“ روبی نے تیزی سے کہا۔ ”پچاس لاکھ یا دس کروڑ بھی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، تم سے جو بات ڈن ہو گئی ہے میں اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ تم آج ہی اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر دو۔ رقم کل شام تک جمع کرا دی جائے گی۔“

میں مصروف تھا کہ اس کا موبائل گنگنا تے ہوئے بیدار ہو گیا۔ وہ کباب میں ہڈی برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن کال بگ باس کی بھی ہو سکتی تھی اس لیے اس نے سکرین پر نظر ڈالنا ضروری سمجھی۔ ایک نیا نمبر دیکھ کر وہ جھلا گیا۔ اس نے ایک لمحے کو سلسلہ منقطع کرنے کا سوچا مگر کسی تجسس نے اسے کال اٹینڈ کرنے پر مجبور کر دیا۔

”ہیلو“ اس نے مدہم آواز میں کہا، اس کی خمار آلود نظریں اس وقت بھی روٹی کے جسم پر منڈلا رہی تھیں۔

”جتنی جلدی ممکن ہو کمرے سے باہر نکلو اور لفٹ کے بجائے اس راستے سے فرار ہونے کی کوشش کرو جو ایرجنسی کے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔“

”کون بول رہا ہے؟“ افضل خان نے ایک اجنبی کی آواز سن کر سوال کیا۔

”بلیک ٹائیگر۔“ دوسری جانب سے تحکمانہ انداز اختیار کیا گیا۔ ”میرے حکم پر فوری عمل کرو ورنہ پھر بگ باس..... بائی۔“

دوسری جانب سے بگ باس کے حوالے کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ افضل خان کا دماغ جھلا کر رہ گیا۔ اس نے اسی نمبر کو ملانے کی کوشش لیکن کسی نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ اس کی نظریں روٹی کے نیم عریاں جسم پر منڈلا رہی تھیں۔ ابھی آدھا پردہ اٹھا تھا۔ کھیل بھی شروع نہیں ہوا تھا، وہ ایک عجیب شش و پنج میں مبتلا تھا جب اس کے محتاط ذہن کے ایک گوشے میں بگ باس کا کہا ہوا ایک جملہ ابھرا۔

”تم حرف آخر نہیں ہو..... میرے کچھ اور بھی خفیہ لوگ ہیں جو تمہاری ایک ایک حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ مجھے سب کی کارکردگی کی رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ کبھی ڈبل کر اس کرنے کی حماقت بھول کر بھی نہ کرنا۔“ اس جملے کے ابھرتے ہی افضل خان کو بلیک ٹائیگر کا پیغام یاد آیا تو اس کی چھٹی حس بھی بیدار ہو گئی۔ اس حکم پر عمل کرنے کی صورت میں وہ کسی چوہے کی طرح کسی پنجرے میں بھی قید ہو سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے بچاؤ کو روٹی کے آدھے برہنہ جسم پر ترجیح دی۔ بڑی تیزی میں اپنی چیزیں سمیٹ کر کمرے سے باہر نکلا۔ اس نے دوسرے کمرے میں جا کر لکڑی جھگے کو بھی ہوشیار کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی اور تیزی سے اس راستے پر لے لے قدم اٹھانے لگا جو صرف ایرجنسی کے وقت استعمال کیا جاتا تھا۔

پندرہ منٹ بعد سراج نے روم نمبر چار سو آٹھ میں قدم رکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لیاقت حسین نے اسے فون پر جو اطلاع دی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ میڈم روٹی کی حالت دیکھ کر وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ غالباً افضل خان کو ریڈ کی اطلاع مل گئی ہوگی۔ اس نے فوری طور پر آگے بڑھ کر اوڑھنے والی شال میڈم کے جسم پر ڈال دی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی اس علاقے کے تھانے کا انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ آ گیا۔ میڈم روٹی کو بستر پر بے ہوشی کے عالم میں دیکھ کر وہ بھی چونکا تھا۔ کمرے میں میزوں پر کھانے کی بھی ڈشیں اور گول میز پر شراب و کباب کا اہتمام دیکھ کر اس کیلئے بھی

”میری بات مان لو افضل! مجھے بریادمت کرو۔“
روٹی کی آواز رندہ گئی وہ سمجھ رہی تھی کہ چند لمحوں بعد وہ بے ہوشی سے دو چار ہو جانے کے بعد پوری طرح اس درد سے کمر و کرم پر ہوگی جو اپنی من مانی کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

”برباد نہیں کروں گا جان من.....“ افضل خان نے اس کے دونوں ہاتھوں پر گرفت جما کر اس کے مخروطی ہونٹوں کا رس چوستے ہوئے جواب دیا۔ ”تم میرے لیے اب ایسا حسین اور چلتا پھرتا بینک ہوگی جس کے اسٹراٹگ روم میں کبھی کبھار کیس کی کمی نہیں ہوتی۔“

روٹی افضل کے مضبوط ہاتھوں کے حصار میں کسی پچھی کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اس کی قوت مدافعت رفتہ رفتہ دم توڑ رہی تھی، آنکھوں میں اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ وہ صرف محسوس کر سکتی تھی کہ افضل خان کے غلیظ ہاتھ بڑی بے باکی سے اس کے جسمانی نصیب و فراز پر ادھر ادھر حرکت کر رہے تھے۔ اس کی گرم گرم سانسیں اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں مگر وہ بے بس تھی۔

”مائی سویٹ ہینی!“ افضل خان بھکی بھکی آواز میں بولا۔ ”ابھی تم کچھ کچھ ہوش میں ہو۔ اگر اجازت دو تو تمہیں اس لباس کی قید سے بھی آزاد کر دوں! کچھ انجوائمنٹ تم بھی کر لو ورنہ ہوش کم ہو جانے کے بعد پھر تالی ایک ہاتھ سے ہی بچے گی لیکن بچے گی ضرور۔“

روٹی کے کانوں میں جیسے کسی نے کھولتے ہوئے گرم گرم سیسہ انڈیل دیا ہو، افضل خان کے بے ہودہ جملوں کو سن کر ایک آخری بار زور لگا کر پھڑپھڑانے کی کوشش کی پھر اس کا ذہن گھپ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ افضل خان کے کمروہ ہونٹوں پر بڑی گھٹاؤنی مسکراہٹ پھیل کر گہری ہوتی چلی گئی۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی تیز روشنیاں بند کر دیں۔ شکار اب پوری طرح اس کے کمر و کرم پر تھا۔ بے ہوشی کے بعد بھی روٹی کے سانسوں کا زیروم محسوس کر کے افضل خان کے جسم سے چیونٹیاں لپٹ گئیں۔ اس نے ایک ایک کر کے روٹی کا لباس اتارنا شروع کیا۔ اس کے اپنے خون کی گردش بھی تیز ہو رہی تھی۔ ایک مشکل ٹارگٹ تھی جس کو تصویروں کی شکل میں محفوظ کرنے کا حکم اسے بگ باس نے دیا تھا۔ اسی بہانے وہ اپنی ہوس..... مٹانے اور مستقبل کا پروگرام بھی طے کر چکا تھا، اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔

جہاں آڈینس ہوں وہاں پروہ اٹھوانے کی خاطر لوگ سیٹیاں بجانا شروع کر دیتے ہیں مگر..... اس وقت وہ تنہا تماشا ٹائی تھا، آہستہ آہستہ پردہ ہٹا کر پوری طرح ایک ایک پیش منظر کا لطف لے رہا تھا۔ پوری رات پڑی تھی برابر کے کمرے میں وہ خوش قسمت بھی تھا، جس کو شیر کا پیٹ بھر جانے کے بعد لکڑی جھگے کا کردار ادا کرنا تھا اور افضل خان کو اس کی تصویریں اور مووی بنانی تھی، پہلے وہ جی بھر کر اپنی بھوک مٹانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ آہستہ آہستہ بے نقاب ہوتے حسین جسم پر ”مخصوص“ کا لیبل چسپاں کر دیتا۔ کسی کو اس کے خوبصورت وجود کو چھونے کی اجازت نہ دیتا لیکن وہ شیخ حامد کا حکم نہ ماننے کی ہیکنا سزا بھی جانتا تھا۔ اس لیے اس کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔ وہ بڑی مہارت سے اس خوابیدہ حسن کی ملکہ کے جسم کو آہستہ آہستہ برہنہ کرنے کے عمل

”آپ سپاہیوں کو باہر تعینات کر دیں تاکہ کوئی بھی غیر متعلقہ شخص یا ہوٹل کا عملہ بھی بغیر اجازت اندر نہ آ سکے۔ ہمیں میڈم کی اس پوزیشن کو اخباری نمائندوں سے ہر قیمت پر محفوظ رکھنا ہوگا۔“

”سُر کیا ہمیں اس کمرے سے فکٹر پرنٹ اٹھانے اور ضروری تصویریں لینے کی کارروائی بھی نہیں کرنی ہوگی؟“

”میں سمجھ رہا ہوں سر!“ اسپیکر نے تائید کی۔ ”ہمیں میڈم کی پوزیشن بچانے کی خاطر خاص خیال رکھنا ہوگا ورنہ اخباری نمائندے اس کا جینا حرام کر دیں گے..... تمک مریج لگا کر روزانہ فنی من گھڑت سرخیاں لگا رہیں گے۔“

”ایک خاص بات اور بھی ہے امید ہے آپ تعاون کریں گے۔“ سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”یہ کیس یا تفتیش صرف آپ کریں گے۔ میرا نام درمیان میں نہ آئے تو بہتر ہوگا۔“

”کوئی خاص وجہ؟“ انکسٹر نے مدہم لہجے میں پوچھا۔
 ”پانچ لاشوں کے سلسلے میں بھی میرا نام آچکا ہے، اب اگر اس کیس میں بھی نام آ گیا تو میڈیا کے لوگ میرا جینا دو بھر کر دیں گے۔“

”ٹھیک ہے سر! یزپوش۔“

انسپکٹر کو تفصیل سے تفتیشی کاموں کی ہدایت دینے کے بعد سراج کو ہوٹل کے منیجر رابرٹ کلارک کو بھی میڈم روہی کو اپنی گاڑی تک پہنچانے کے سلسلے میں اعتماد میں لینا پڑا۔ اسے یقین تھا کہ منیجر بھی سراج کے حکم کے بعد اپنی زبان کھولنے کی غلطی نہیں کرے گا اس لیے کہ ہوٹل کے بہت سے پرائیویٹ معاملات میں خود وہ بھی ملوث رہ چکا تھا جس کے ثبوت سراج کے پاس موجود تھے۔

نیچر نے بڑی رازداری سے میڈم روبی کو برقعے میں چھپا کر مخصوص راستے کے ذریعے اپنے خاص آدمیوں کی مدد سے سراج کی گاڑی تک پہنچا دیا۔ اس کیلئے سراج کو اپنی کار بھی ہوٹل کے عقبی

جسے کی طرف لے جاتا پڑی جورات کو آٹھ بجے کے بعد ہی بالکل سناں ہو جاتا تھا۔

میڈم کو اس کے گھر پہنچانے اور اس کی خاص سیکرٹری کو زبان بند رکھنے کی ہدایت دینے کے بعد ہی اس نے سیٹھ عثمان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ راستے میں وہ کسی ممکنہ تعاقب کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ لیاقت حسین کا مسئلہ سراج کے ذہن میں الجھ رہا تھا۔ وہ اس حد تک تو سمجھ گیا تھا کہ کوئی قوت ہے جو لیاقت حسین کی نیک کاموں میں مدد کر رہی ہے لیکن وہ طاقت اسے کہاں سے حاصل ہوئی؟ اسے کیسے قبل از وقت کسی بات کا علم ہو جاتا تھا۔ وہ کوئی کام کر گزرتا تھا لیکن اسے بعد میں اس طرح بھول جاتا تھا جیسے کچھ بھی یاد نہ ہو۔ اسی کی روحانی قوت نے آج میڈم روبی کو ایک بار پھر رسوا ہونے سے بچا لیا تھا ورنہ شاید وہ کسی کمند دکھانے کے قابل بھی نہ رہتی۔

سراج لیاقت حسین سے مل کر اسے ٹٹولنا چاہتا تھا کہ اس نے وہ اطلاع کیسے فراہم کی تھی؟ افضل خان کا نام بھی اسی نے لیا تھا جو شیخ حامد کا پالتو غنڈا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی سراج کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میڈم روہی کو ایک بار پہلے بھی اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس روز بھی وہ افضل خان کے اپارٹمنٹ سے نکل گئی اور آج..... آج بھی وہ افضل خان کے ساتھ اس ہوٹل میں موجود تھی۔ لیاقت حسین نے خاص طور پر اسی کا نام لیا تھا، سراج کا ذہن اسی ایک نکتے پر غور کر رہا تھا کہ جب میڈم روہی افضل خان کے اپارٹمنٹ تک جا چکی تھی تو پھر اسے ہوٹل میں ملنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ افضل خان عیاش بھی تھا لیکن میڈم روہی اس قماش کی خاتون نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو کم از کم ایس پی آغا منظور اس سے شادی کرنے کا خواب بھی نہ دیکھتا اور..... آغا منظور کے حوالے سے سراج کے ذہن میں ایک اور خیال نے سر ابھارا۔ آغا منظور کے کہے ہوئے کچھ مخصوص جملے اس کے ذہن میں ابھرے تو شیخ حامد کی شخصیت اسکے دماغ میں اسپارک کرنے لگی۔ ہو سکتا تھا کہ شیخ حامد ہی کے حکم پر افضل خان نے میڈم روہی کو کسی جال میں پھانسنے کی کوشش کی ہو مگر کیوں؟ شیخ حامد اور میڈم روہی کے درمیان ایسا کون سا مسئلہ تھا جس کو حل کرنے کی خاطر اسے دوبارہ نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی اور..... دونوں ہی موقعوں پر لیاقت حسین اسے کسی نہ کسی طرح بچانے میں کامیاب رہا۔

اس وقت گیارہ بج رہے تھے جب سراج کی گاڑی دیکھ کر سیٹھ عثمان کا ڈیوٹی مار ڈبھانگتے ہوئے باہر آیا۔

”گیت کھولوں صاحب لیکن اس وقت سب سو رہے ہیں۔“

”لیانت حسین آج ڈیوٹی سے کس وقت گیا تھا؟“ سراج نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”روز کے مقابلے میں آج وہ ساڑھے سات بجے چلا گیا تھا۔ میں نے جلدی جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے یہی بتایا تھا کہ اسے کوئی ضروری کام کرنا ہے“ گاڑو نے کہا۔

”روز تو وہ نوبے کے لگ بھگ جاتا ہے، کوئی خاص بات ہے صاحب؟“

رہے ہیں۔ گھر میں صبح اطلاع دے دینا۔“

”ٹھیک ہے صاحب!“ گاڑو نے کہا پھر سراج نے واپسی کیلئے گاڑی موڑی تو وہ سلام کرتے ہوئے دوبارہ اندر آکر اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔

شبہنم کسی سائے کی طرح میڈم روہی کی ذات سے قریب ترین رہنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ شیخ حامد سے مقابلے کے لیے وہ شبہنم کے زیادہ کام آسکتی تھی۔ اس نے میڈم سے ملاقات کے وقت اس بات کا مشورہ دیا تھا کہ وہ افضل خان کے سلسلے میں محتاط رہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میڈم کے لیے افضل خان ہی وہ زہر قاتل تھا جسے وہ اپنے دشمن کے خلاف سب سے آسانی سے استعمال کر سکتی تھی جہاں انتقام لینے کی جلدی ہو وہاں انسان اکثر غیر اختیاری طور پر بھی جذباتی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد روز کسی نئے میک اپ میں میڈم کی ٹوہ میں لگی رہتی تھی۔

اتفاق سے اس روز اس نے میڈم کو گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کا تعاقب کرتے ہوئے ہوٹل پہنچی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ڈرائیور کے ہونے کے باوجود وہ خود گاڑی کیوں ڈرائیو کر رہی تھی جبکہ ڈاکٹر نے اسے مزید کچھ دنوں آرام کا مشورہ دیا تھا۔ میڈم کے ساتھ ہی ایک لفٹ میں سوار ہونا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ لہذا لفٹ کے سامنے گول دائروں کی شکل میں رکھے ہوئے ان صوفوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی جو مہمانوں کیلئے بطور انتظار گاہ مخصوص تھا۔ آس پاس کچھ اور افراد بھی موجود تھے۔ شبہنم نے یونی ایک فیشن میگزین اٹھا کر اس کے اوراق الٹنے پلٹنے شروع کر دیے لیکن اس کی نظریں رہ رہ کر ادھر ادھر بھی دیکھ رہی تھیں اندازہ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی متوقع مہمان کی منتظر ہو اس دوران میں وہ سوئڈ بوئڈ دراز قد آدمی بھی نظر آ گیا جو مین گیٹ کے سامنے والے صوفے پر تنہا بیٹھا پائپ سے شغل کر رہا تھا۔ ایک دوبار اس کی نظریں بھی اٹھی چکی تھیں۔ ممکن ہے وہ محض اتفاق امر ہو لیکن نہ جانے کیوں شبہنم کے ذہن میں یہ خیال بڑی سرعت سے ابھرا کہ کہیں وہ اسی کی نقل و حرکت کو نوٹ نہیں کر رہا؟ اس خیال نے اسے اور محتاط کر دیا۔ وہ آدمی اسے پہلی بار نظر آیا تھا لیکن کوئی بات ضرور تھی جس نے شبہنم کو اس کی طرف سے چونکار بننے کا احساس دلایا تھا۔

وہ دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا پہناوے اور رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے اس کا تعلق اونچے لوگوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ اس نے سنہری فریم کا لائٹ کلر چشمہ لگا رکھا تھا جو اس کی شخصیت کو اور بھی نمایاں کر رہا تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ اٹھائیس اور تیس کے درمیان لگایا جاسکتا تھا۔ شبہنم نے بے پروائی سے میگزین کو اس طرح سامنے کر لیا کہ اس کی شکل چھپ گئی لیکن اب وہ ایک خاص زاویے سے اس پر نظر رکھ سکتی تھی۔ اس کی چھٹی حس رہ رہ کر اس دراز قد والے شخص کیخلاف نامعلوم سے شک میں مبتلا کر رہی تھی۔

بیس منٹ تک وہ اپنی جگہ بیٹھا پائپ کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا، بے ظاہر وہ بے پروا نظر آ رہا تھا لیکن پھر شبہنم نے اسے جیب سے موبائل نکالتے دیکھا۔ دور ہونے کے سبب وہ اس کی گفتگو نہیں سن

سکتی تھی لیکن اس کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مخصوص مسکراہٹ ابھرتے دیکھ کر شبہنم نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ جو کال اسے موصول ہوئی وہ خاص نوعیت کی تھی۔ کال ختم کرنے کے بعد اٹھ کر اس بک سال کی طرف گیا جہاں اس وقت کوئی اور نہیں تھا۔ غیر اختیاری طور پر شبہنم بھی اپنے صوفے سے اٹھی بک شاپ کے قریب ہی ایک بوتیک کی شو ونڈو میں جدید تراش خراش کے زناہ ملبوسات بڑی نفاست سے پلاسٹک کے بنے ماڈلز کے ذریعے ڈسپلے کیے گئے تھے وہ ان کو قریب جا کر دیکھنے لگی۔ دراز قد کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے اس نے شبہنم کا کوئی نوٹس بھی نہیں لیا۔ پھر شبہنم نے اسے موبائل پر کسی بڑے مدہم لہجے میں کوئی پیغام دیتے سنا تھا۔ وہ پوری بات ٹھیک سے نہیں سن سکی لیکن سراج اور بلیک ٹائیگر دو ایسے نام تھے جو اس کی سماعت سے ٹکرانے کے بعد اس کے لیے تجسس کا سبب بن گئے۔ اس کے بعد اس نے دراز قد والے کو لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوٹل سے باہر جاتے دیکھا تھا۔

شبہنم کا تجسس بے سبب بھی نہیں تھا۔ بلیک ٹائیگر یقیناً کوئی کوڑ تھا جو اصل نام کی جگہ استعمال کیا گیا تھا، وہ کون تھا؟ اس نے خفیہ کوڈ اختیار کر کے کس سے بات کی تھی؟ گفتگو کے بعد وہ جس بے پروائی مگر جلدت میں باہر چلا گیا تو وہ بھی تعجب خیز تھا۔ ابھی وہ ان باتوں پر غور کر رہی تھی کہ اس نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ بھی خاصی تیزی سے وینٹنگ لاونج کا راستہ عبور کرے لفٹ کی طرف گیا تھا۔ شبہنم کے ذہن کے ایک گوشے میں خطرے کی سرخ بقی جلنے بجھنے لگی۔ بلیک ٹائیگر کے حوالے کے بعد ہی سراج کے نام کا معاملہ ہوا تو اس نے محسوس کر لیا کہ کہیں کوئی خطرہ ضرور موجود ہے۔ اس نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ محتاط انداز میں ٹھیلے ہوئے باہر آئی۔ ٹیکسی کر کے اس نے صدر کے علاقے میں اسے رخصت کر دیا پھر اس نے ایک قدرے محفوظ جگہ پہنچ کر میڈم کے موبائل پر یکے بعد دیگرے تین بار کال کی۔ دوسری جانب ٹھننی بجتی رہی لیکن کال ریسپونڈ نہیں کی گئی جس کا مطلب یہی تھا کہ میڈم کسی خطرے سے دوچار ہو گئی ہے۔ سراج کی آمد اس کے شہجے کی تصدیق کر رہی تھی۔ ہوٹل سے باہر آتے وقت اس نے پولیس کی ایک جیپ بھی دیکھی تھی جس سے ایک انسپکٹر اور دو کانسٹیبل نیچے اتر کر ہوٹل کے صدر دروازے کی جانب لپکے گئے باقی دو سپاہی جیپ میں ہی تھے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر شبہنم کو اپنی ذاتی حیثیت بھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ ”ممکن ہے کچھ لوگ دور رہ کر اس کی نگرانی بھی کر رہے ہوں“ یہ سوچ کر اس نے پہلے قریب و جوار کا جائزہ لیا پھر ایک ٹیکسی پکڑ کر اسے نیو ٹاؤن چلنے کو کہا۔ کہیں کوئی خطرہ ضرور تھا جو رہ کر اسے بے چین کر رہا تھا۔ نیو ٹاؤن پہنچ کر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ یوں ہی قریب کی بیکری سے روزمرہ کے استعمال کی چند چیزیں خریدیں پھر ایک قریبی بلڈنگ کے مرکزی دروازے سے داخل ہو کر اس کے عقبی راستے سے باہر نکل گئی۔ پچھلی جانب ایک دو افراد کے علاوہ کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے وہ پتلی سڑک عبور کی اور دوسری شاہراہ پر نئی ٹیکسی پکڑ کر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس دوران میں اس نے اندازہ

لگا لیا تھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا۔

اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اس نے فوری طور پر چہرے سے ریڈی میڈ میک اپ اتارا پھر سکون سے بیٹھ کر حالات کے بارے میں غور کرنے لگی۔ میڈم کا ہوٹل میں تنہا جانا، بلیک ٹرانسپورٹ کا حوالہ..... سراج کی ہوٹل میں آمد..... پولیس چیپ کا بعد میں آنا..... یہ ساری باتیں اس بات کی نشاندہی کرتی نظر آ رہی تھیں کہ کوئی خاص بات ضرور ہے.....؟ اور وہ بات کیا ہو سکتی ہے؟ کچھ لمحے وہ اس پر غور کرتی رہی پھر اس نے کچھ سوچ کر فون پر افضل خان کے نمبر ڈائل کیے لیکن دوبارہ کی کوشش کے باوجود کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے میڈم کے موبائل کو پھر آزمایا۔ دوسری جانب سے اس کی لیڈی سیکرٹری کی آواز ابھری۔

”مجھے میڈم روپی سے بات کرنی ہے۔“ شبیم نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

”سوری اس وقت میڈم کسی سے بات نہیں کر سکتیں۔ مہذب مگر سنجیدہ آواز میں جواب ملا۔“
”ڈاکٹر ابھی انہیں نیند کی دوا دے کر گیا ہے۔ میڈم کو اس حالت میں ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا۔ آپ اپنا نام بتا دیں صبح میڈم کو اطلاع دے دی جائے گی۔“

”انجم بول رہی ہوں۔ صبح میں دوبارہ فون کر لوں گی۔“ شبیم نے انجم کے نام سے میڈم کو اپنا حوالہ دینا ہی مناسب سمجھا تھا۔

موبائل بند کر کے وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا اپارٹمنٹ بلڈنگ کے ٹاپ فلور پر تھا جہاں اس کے علاوہ کوئی اپارٹمنٹ نہیں تھا۔ اس لیے اس بات کا خطرہ بھی نہیں تھا کہ کسی نے اسے میک اپ میں آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ بہر حال اس کے اندر ایک خدشہ بڑی تیزی سے اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ دو اور دو چار کرنے کے بعد اس نے وقتی طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ میڈم کسی نہ کسی خطرے سے ضرور دوچار ہوئی ہوگی۔ بلیک ٹرانسپورٹ کے حوالے سے جو پیغام دیا گیا تھا وہ بھی اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ سراج اور پولیس چیپ کی آمد اور اب میڈم کی سیکرٹری کا نیند کی دوا دینے کا جواب..... یہ تمام حوالے اس کے شے کو ہوا دے رہے تھے لیکن وہ خطرہ کیا تھا؟ میڈم کو کیا حادثہ پیش آ سکتا ہے؟ اور افضل خان کا اپنے اپارٹمنٹ میں اس وقت موجود نہ ہونا؟ یہ ساری بکھری ہوئی کڑیاں شبیم کے ذہن میں کلبلا رہی تھیں۔

سب سے اہم کڑی بلیک ٹرانسپورٹ کا کوڈ تھا۔ کون تھا وہ؟ اس معے کو حل کرتے ہوئے شبیم کے ذہن میں ایک لخت شیخ حامد کا نام ابھرا تو وہ خوف سے جھرجھری لے کر رہ گئی..... کہیں وہ بگ باس کا ہی کوئی خفیہ درکرز تو نہیں تھا جو دوسروں پر نظر رکھنے کیلئے تعینات کیا گیا تھا.....

❖❖❖

افضل خان کیلئے بلیک ٹرانسپورٹ کا کوڈ خاصا پریشان کن تھا۔

اس کی نظریں نرم و گرم بستر پر میڈم روپی کے گدرائے ہوئے جسم کے نشیب و فراز پر پھٹک رہی تھیں کہ اچانک بلیک ٹرانسپورٹ کی ترنوالے کے درمیان کباب کی بڈی بن کر آ گیا تھا۔ وہ ریفرنس

اس کیلئے نیا ضرور تھا لیکن جب بگ باس کی کہی ہوئی بات اس کے ذہن میں ابھری تو اس نے دوسری جانب سے ملنے والے حکم کو نظر انداز کر دینا مناسب بھی نہیں سمجھا۔ میڈم کے بکھرے ہوئے خوابیدہ اور حسین جسم کے عریاں حصوں پر ایک حسرت نظر ڈالتے ہوئے امیر جمی کے راستے سے نکل کر پارکنگ لاٹ تک آ گیا۔ پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ساحل سمندر کی طرف جانے والی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ساحل سمندر کی طرف جانے والی سنان سڑک پر نکل گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر واقعی کوئی خطرہ لاحق تھا تو اس کا تعاقب بھی ضرور کیا جا رہا ہوگا لیکن اسے دور دو تک تعاقب کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو وہ جھلا گیا۔

”ڈبل کر اس.....“ اس کے ذہن میں یہ اصطلاح بڑی سرعت سے ابھری تو وہ اپنی حماقت پر تمللانے لگا۔ اس کی نظروں کی دستوں میں ابھی تک میڈم کا خوبصورت وجود بکھرا ہوا تھا۔ نشے کی کیفیت سے زیادہ اس حسین بدن کا نشہ اس پر ابھی تک طاری تھا اس کے عیاش ذہن میں فوری طور پر ایک خیال ابھرا۔ میڈم نے اس کی دسترس میں آنے سے پیشتر بھی یہی کہا تھا۔
”دشمن کے مقابلے میں تم میرے لیے زیادہ آسان ٹارگٹ ہو گے۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کر کے اچھا نہیں کیا۔“

ہوسکتا ہے کہ میڈم نے پہلے ہی سے حفظ مقدم کے طور پر کسی کو بلیک ٹرانسپورٹ کے فرضی نام سے اپنا نجات دہندہ بنالیا ہو جس نے غالباً طے شدہ پروگرام کے تحت میڈم کی طرف سے کسی کال کا ایک مقررہ وقت تک انتظار کرنے کے بعد بلیک ٹرانسپورٹ کے کوڈ کا حوالہ اور بگ باس کے الفاظ استعمال کر کے میڈم کو بچانے کی خاطر افضل خان کو دہاں سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔

”نان سینس۔“ افضل خان نے جھلا کر خود کو مخاطب کیا پھر دانت کچکپاتے ہوئے بولا۔ ”اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی خوبصورت ناگن آج تیرا زہر ضرور کشید کیا جائے گا۔“ افضل خان نے اپنا جملہ مکمل کر کے اسٹیرنگ گھمانے کی کوشش کی لیکن کسی نے پچھلی نشست سے ہاتھ بڑھا کر ایک بھیگا ہوا رومال اس کی ناک پر مضبوطی سے رکھتے ہوئے کہا۔ ”گاڑی روک دو ورنہ تمہاری موت کے خانے میں ایک سیڈنٹ کی وجہی درج ہوگی۔“

افضل خان کا ذہن رومال کی تیز خوشبو کی وجہ سے بڑی سرعت سے خوابیدہ ہو رہا تھا اس نے حکم کی تعمیل میں بریک پر پاؤں رکھ کر دباؤ بڑھایا پھر..... اسے کچھ یاد نہیں رہا وہ بے ہوشی سے دوچار ہو کر اسٹیرنگ پر منہ کے بل اوندھا کر گیا۔

وہ کتنی دیر اس کیفیت سے دوچار رہا اسے اس کا احساس نہیں ہو سکا پھر رخ پانی کے بار بار ڈالے جانے والے چھینٹوں نے اس ہڑبڑا کر آنکھ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ سامنے جو شخص کھڑا تھا اس کو ایک دو بار پلٹیں جھپکا کر دیکھنے کے بعد وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ موت کا تصور اس کے پورے جسم میں سننا گیا۔ وہ شخص اس کیلئے کوئی اجنبی نہیں بلکہ شیخ حامد تھا جو اس کے سامنے کچھ فاصلے پر نہایت اطمینان سے دوسرے صوفے پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ ایک گھٹسے ہوئے مضبوط جسم

کا پستہ قد شخص اور بھی تھا جس نے بگ باس کے اشارے پر مزید پھینٹے مارنے کا عمل روک دیا تھا۔
”بب..... باس!“ افضل خان سنبل کر اپنی نشست پر سیدھا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پیر آزاد تھے لیکن ذہن کچھ سمجھنے سے قاصر ہو رہا تھا۔
شیخ حامد کی خوشخوارہ نظریں اسے ٹھٹکی باندھے گھورتی رہیں پر اس نے بڑے سرد لہجے میں افضل خان کو مخاطب کیا۔

”پریشان مت ہو ابھی تمہاری موت کا وقت نہیں آیا لیکن تمہیں کچھ عرصہ اسی جگہ چھپ کر رہنا پڑے گا۔“

”بب..... باس وہ..... میں..... مم.....“
”منمنناؤ مت.....“ شیخ حامد کا لہجہ اور سرد ہو گیا۔

”ابھی تم بگ باس کی نظروں میں ایک کارآمد کارندے ہی ہو لیکن ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کون تھا جس نے تمہیں ایک خوبصورت موقع سے فائدہ اٹھانے سے محروم کر دیا؟“

”مم..... میں نے سارے انتظامات طے کر رکھے تھے۔ حسین ناگن بھی بے سدھ ہو کر میرے رحم و کرم پر بستر پر بکھری پڑی تھی لیکن بلیک ٹائیگر.....“

”وہ میرا خاص آدمی ہے جو ایسے موقعوں پر آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ اس نے بروقت تمہیں موت کے منہ سے بچالیا۔“

”پھر.....“ افضل خان نے اطمینان کی سانس لے کر بگ باس کی طرف دیکھا۔

”پھر میرا کام اور تمہارا مشن ادھورا رہ گیا۔“ شیخ حامد کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر کر گہری ہونے لگی۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح غزایا۔ ”کسی نے ہوٹل میں ہونے والے ڈرامے کی اطلاع ڈی ایس پی سراج کو دے دی تھی۔ وہ بڑی سرگرمی سے روم نمبر چار سو آٹھ سے شہادتیں اکٹھی کر رہا ہے اور..... وہ خارش زدہ زر خرید بلڈاگ..... ایس پی آغا منظور مجھے تھکیا دیں کی کوشش کر رہا ہے..... سن آف اے فچ۔“

”کہیں رابرٹ کلاک نے تو.....؟“

”نہیں.....“ شیخ حامد اس کا جملہ کاٹتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”وہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

”اور کون ہو سکتا ہے؟“

”تم ادھر ہی سکون سے رہو۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”جب تک میری گڈ بکس میں ہو کوئی تمہارے اوپر ہاتھ نہیں ڈال سکتا اور جس دن نظروں سے گر گئے وہ دن تمہاری اذیت ناک موت کا حتیٰ دن ہوگا۔“

پھر شیخ حامد تیزی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ افضل خان نے سکون کا سانس لیا۔ وہ اس وقت بگ باس کی شخصیت اور بلیک ٹائیگر ہی کو اپنے لیے فرشتہ رحمت سمجھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ

تصور تیزی سے ابھر رہا تھا کہ اگر اس کو گاڑی میں بے ہوش نہ کیا جاتا، نشے کی کیفیت میں وہ دوبارہ میڈم کے جسم کو تسخیر کرنے کے ارادے سے واپس ہوٹل پہنچ جاتا تو شاید گلے گلے تک پولیس کے ٹھانجوں میں جکڑ کر رہ جاتا۔ دہلی ہوئی فائلیں سرد خانوں سے پھر ایک ایک کر کے ٹکنا شروع ہو جاتیں۔

بگ باس کے ساتھ وہ پستہ قد آدمی بھی چلا گیا تو افضل خان نے اٹھ کر کمرے کا جائزہ لیا جہاں زندگی سکون سے گزارنے کی تمام ضروری اشیاء موجود تھیں۔ اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ وہ کسی نامعلوم عمارت کا تہ خانہ تھا جہاں بگ باس نے اسے سکون سے کچھ دن آرام کا مشورہ دیا تھا۔ افضل خان کے پاس شیخ حامد کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ تادیر اپنی پابندی پر غور کرتا رہا۔ سوچتا رہا کہ اگر تاج ہوٹل کے کمرے سے پولیس کو اس کے ٹھکانے پر پتہ چلے گا تو اس کی قانونی پوزیشن کیا ہوگی؟ بگ باس اسے بچانے کی خاطر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گا یا کچھ دنوں کیلئے اسے قربانی کا بکرا سمجھ کر پولیس کے حوالے کرنے میں کسی پس و پیش کا مظاہرہ بھی نہیں کرے گا؟

وہ تہ خانے کے کمرے کے ایک بستر پر نیم دراز تھا۔ حالات کی اونچ نیچ اور اپنے مستقبل کے بارے میں غور کر رہا تھا جب اسے اچانک شبہ کا خیال آیا جو کئی بار قریب آنے کی کوشش کر چکی تھی۔ خود افضل خان نے ایک ہی دفتر میں کام کرنے کی وجہ سے اسے زیادہ قریب ہونے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن شبہ نے میڈم روبی کا بیان بدلانے میں اس کے ساتھ ایک دوست کی طرح بھرپور تعاون کیا تھا۔ وہ اس آڑے وقت میں بھی کم از کم باہر کے معاملات کی تھوڑی بہت خیر خبر ضرور دے سکتی تھی۔

افضل خان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا موبائل نکالنے کی کوشش کی مگر اسے مایوسی ہوئی۔ اس کا والٹ اور دوسری تمام چیزیں موجود تھیں لیکن موبائل موجود نہیں تھا جس کا صرف ایک ہی مطلب اخذ کیا جاسکتا تھا۔ شیخ حامد نے اس نامعلوم عمارت کے تہ خانے کے کمرے اور بیرونی دنیا کے تمام تعلقات شاید عارضی طور پر ختم کر دیئے تھے۔ افضل خان نے جھلا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے جسم کو اس وقت صرف آرام کی ضرورت تھی کل کیا ہوگا؟ کیا ہونے والا ہے؟ اس کے بارے میں اس نے زیادہ الجھنا مناسب نہیں سمجھا..... دور اندیشی کا تقاضا بھی یہی تھا۔

آنکھ بند کرتے ہی میڈم کا نیم عریاں جسم پھر اس کے تصورات میں کسی کن سمجھورے کی مانند چمکنے لگا۔



سراج کو یقین تھا کہ دفتر پہنچنے کے بعد اسے سراٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ میڈم روبی کے سلسلے میں تفتیشی رپورٹ ملنے کے بعد اسے پرانی فائلوں میں بھی سرکھپانا پڑے گا۔ اس لیے گھر سے نکل کر وہ سیٹھ عثمان کے بنگلے پر پہنچا۔ پہلے اس نے گھر والوں سے سیٹھ عثمان کے سلسلے میں ایئر پورٹ

جانے اور ساتھ لانے کے بارے میں گفتگو کی اس کے بعد وہ باہر آ گیا جہاں لیاقت حسین موجود تھا۔
”کیسے ہو لیاقت حسین ہو؟“ اس نے لیاقت حسین سے کچھ سوالات کرنے سے پہلے اس کی خیریت دریافت کی۔

”اللہ کا کرم ہے صاحب۔“ لیاقت حسین نے بالکل نارمل انداز میں جواب دیا، اس کا چہرہ کسی بھی قسم کی اضطراب کی کیفیت سے بیکس عاری تھا۔

”سنا ہے کل رات تم جلدی چلے گئے تھے؟“

”جی صاحب میں نے اور عمر گل نے فرحین اور زرینہ کو اپنے شہر بھیج دیا ہے۔“

”سب خیریت تو ہے؟“

”آپ کی مہربانی ہے صاحب لیکن جو لوگ ایک بار ہماری عزت پر ہاتھ ڈال چکے ہیں۔ وہ خبیث دوبارہ بھی کچھ کر سکتے ہیں۔“ لیاقت حسین نے فیصلہ کن انداز میں تفصیل بتائی۔ ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ فرحین کے آنے سے پہلے کسی ایسی رہائش گاہ کا بندوبست کر لوں گا جہاں کوئی خطرہ نہ ہو۔“

”اچھا خیال ہے لیکن ابھی جلدی نہ کرنا۔“ سراج نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”اپنے صاحب کو آ لینے دو پھر کوئی فیصلہ بھی کر لیں گے۔“

”جیسا حکم صاحب۔“

سراج لیاقت حسین سے گفتگو کرتے ہوئے باہر اپنی گاڑی تک آ گیا پھر اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”تم نے اپنے گھر والوں کو کب تک روانہ کیا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ کس وقت بس میں بٹھایا تھا؟“

”فرحین اور زرینہ عمر گل خان کے ساتھ بس اڈے گئے تھے۔ میں ادھر پونے آٹھ بجے پہنچا تھا، بس کے روانہ ہونے کے بعد ہی لاری اڈے سے واپس آیا تھا۔“

”اور کوئی بات؟“ سراج نے اس کو مزید ٹٹولنے کی خاطر سوال کیا۔

”اور سب ٹھیک ہے صاحب، جب آپ ہیں تو پھر فکر کس بات کی؟“

”لیاقت حسین کیا تمہیں یاد ہے کہ کل رات تم ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان کہاں تھے؟“

”بس ٹھیک آٹھ بجے چل دیا تھا، اس کے بعد گل خان کسی دوست کے پاس چلا گیا اور میں گھر واپس آ گیا تھا۔“

لیاقت حسین نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

”راستے میں تم کہیں رکے بھی تھے؟“

”بازار کی طرف سے آیا تھا صاحب، ایک دکان سے گھر کیلئے ایک دو چیزیں بھی خرید لی تھیں اور کہیں نہیں گیا تھا۔“

”کسی واقف کار کو راستے سے کوئی فون تو نہیں کیا تھا؟“

”کیا بات ہے صاحب؟“ لیاقت حسین نے حیرت سے دریافت کیا۔ ”آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“

”صرف اتنا کہ تم نے کسی یار دوست کو فون تو نہیں کیا تھا؟“ سراج نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”ادھر سوائے گل خان کے اپنی کسی اور سے یاری دوستی نہیں صاحب، پھر فون کے کرتا.....؟“

لیاقت حسین نے بدستور سراج کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا، ”میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”کوئی خاص بات نہیں ہے“ سراج نے اس بات پر یقین کر لینے کے بعد کہ لیاقت حسین دروغ نہیں کر رہا، بے تکلفی سے کہا۔ ”لیاقت حسین، فرض کر لو کہ اگر تمہیں کسی موقع پر میری ضرورت پیش آئے تو کیا تم میرے دفتر یا گھر کے نمبر پر فون کر سکتے ہو؟ میرے نمبر یاد ہیں تمہیں؟“

”زبانی نہیں یاد صاحب لیکن میں نے ڈائری میں لکھ لیا ہے جو ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے۔“

”لیاقت حسین نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”کوئی ضرورت ہوئی تو آپ کے علاوہ اور کس کو فون کروں گا؟ یہ ظاہر آپ کے علاوہ میری ڈائری میں صاحب کے دفتر اور موبائل کے سارے نمبر بھی نوٹ ہیں۔“

”اور کوئی بات؟“ سراج نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے یوں ہی پوچھ لیا۔

”آج رات اپنا صاحب اور بیگم صاحب آ رہا ہے۔ ان کو لینے کیلئے ایر پورٹ بھی جانا ہے۔“

”میں بھی ادھر آؤں گا۔“ سراج نے کہا پھر وہ دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کو لیاقت حسین نے جو جواب دیے وہ اس کیلئے غیر متوقع نہیں تھے، دو موقعوں پر پہلے بھی وہ دیکھ چکا تھا کہ لیاقت حسین جب کسی روحانی قوت کے تابع ہوتا ہے تو یکسر بدل جاتا ہے بعد میں اسے گزرے ہوئے لمحات بھی یاد نہیں رہتے۔ سراج کو یقین تھا کہ گزشتہ رات بھی جب اس نے سراج کو فون کیا ہوگا، اس وقت بھی وہ یقیناً کسی پر اسرار روحانی قوت کے زیر اثر رہا ہوگا یہ باتیں سراج کے لئے کسی الجھنے سے کم نہیں تھیں۔

دفتر جاتے ہوئے راستے میں ایس پی آغا منظور کی کال ریسیور کرنے کے بعد سراج کو سیدھا

اسی کی طرف جانا پڑا۔ ایس پی کے آفس میں تاج محل کے علاقے کا انسپکٹر مع فائل کے پہلے ہی سے

موجود تھا۔ سراج نے کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی بھانپ لیا کہ اس وقت آغا منظور کا مزاج

ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خراب نظر آ رہا تھا۔ سراج کے سلام کا جواب بھی اس نے سر کی معمولی جنبش

سے دیا تھا۔ ایک لمحے سکوت طاری رہا پھر ایس پی نے کسمسا کسب سے پہلے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

کمرے میں ان تینوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ باہر دروازے کی سرخ لائٹ بھی آن کر دی گئی جس کا

مطلب یہ تھا کہ اس وقت کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔

”فائل میں جو رپورٹس موجود ہیں اس کو کسی نے تو نہیں دیکھا؟“

”جی نہیں۔“ انسپکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ڈی ایس پی صاحب نے کل جائے وقوعہ پر ہی مجھے اس کیس کی حساس نوعیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ میں نے ذاتی طور پر اپنی نگرانی میں ساری رپورٹس حاصل کی ہیں۔ میرے علاوہ اور کوئی ان کے بارے میں تفصیل سے واقف نہیں ہے۔“

”میڈم کا نام تو درمیان میں کہیں نہیں آیا؟“

”جی نہیں سر۔“ انسپکٹر نے مستعدی سے جواب دیا۔

”آنا بھی نہیں چاہئے۔“ ایس پی نے بدستور ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میں اس معاملے میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔“

”رائٹ سر!“

”موقعہ واردات سے وہ جس باسٹرو کے پرنٹس ملے ہیں۔ کیا آپ نے اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی؟“

”جی نہیں سر!“ انسپکٹر نے کہا۔ ”اس سلسلے میں آپ کی اور ڈی ایس پی صاحب کی ہدایت کی روشنی میں ہی کوئی کارروائی کروں گا۔“

”مگر.....“ ایس پی نے ایک بار پھر فائل کے فکٹر پرنٹس اور مشتبه افراد کے پرنٹس اور اس کے بارے میں ماہرین کے فیصلے کی رپورٹ پر نظر ڈالی پھر سراج کی سمت دیکھا۔

”آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”میرے خیال میں صرف دو ہی طریقے ہیں۔“

سراج نے سنجیدگی سے لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”یا تو ہم ذاتی طور پر کوئی بولڈ اسٹیپ لیں یا پھر آپ اپنی فائنڈنگس ٹاپ کا فیڈنشل کے لیبل کے ساتھ ٹاپ لیول تک پہنچا دیں۔ پھر دیکھیں گے اوپر سے کیا جواب آتا ہے۔“

”میرے ذہن میں بھی دو طریقے ہیں مگر آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔“ ایس پی نے اپنا دامن بچانے کی خاطر ایک بار پھر سراج کو کریدنے کی کوشش کی۔ وہ ذاتی طور پر خود کو ذمہ دار نہیں کھلواتا چاہتا تھا۔ سراج نے اس کی بات سننے سے پیشتر اپنا دامن بچا لیا۔

”میں آپ کے کسی آرڈر کی خلاف نہیں جاؤں گا لیکن چوائس بہر حال آپ ہی کی ہوگی۔“

آغا منظور سراج کے اس سیاسی جواب کو سن کر اندر ہی اندر کھول اٹھا لیکن وہ ایک ہی تالاب میں رہ کر کسی دوسرے مگرچھ سے حیر لینے کا خطرہ بھی نہیں مول لینا چاہتا تھا۔

”سر!“ انسپکٹر نے دبی زبان میں کہا۔ ”جس مخصوص شخص کے فکٹر پرنٹس کو ماہرین نے بھی زیادہ اہمیت دی ہے وہ اس سے پیشتر بھی کئی واردات میں ملوث رہ چکا ہے مگر..... ٹاپ لیول سے ملنے والے احکام کے بعد ہمیں انہیں مجبوراً داخل دفتر کرنا پڑا تھا شاید اس بار بھی۔“

”انسپکٹر!“ ایس پی نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کا علم سب کو ہے انڈراستینڈ۔“

”سوری سر!“ انسپکٹر ہچکچا کر خاموش ہو گیا۔

”مسٹر سراج!“ ایس پی نے سراج کو مخاطب کیا۔

”کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم اس سلسلے میں ڈی آئی جی کرائمز کو بھی شامل کر لیں۔ اس کے مشورے کے بعد قدم اٹھانا ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔ پانچ لاشوں کی فائل بھی ان ہی کے پاس ہے اور موجودہ فائل..... یہ بھی میرے اندازے کے مطابق اسی سلسلے کی ایک لہم کڑی ہے۔“

”میں آپ کے اس خیال سے سو فیصد متفق ہوں۔“

سراج نے بے حد سنجیدگی سے تائید کی۔ ”اس طرح اوپر والوں کے کسی ممکنہ عتاب سے بھی محفوظ رہیں گے۔“

”ایک بات میں آپ کو کھل کر بتا دوں..... اس معاملے کو میں آسانی سے فائل نہیں ہونے دوں گا۔“

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا وہ سمجھ رہا تھا کہ میڈم روہی کی وجہ سے خود ایس پی بھی تملایا ہوا تھا۔

”انسپکٹر!“ ایس پی نے دوبارہ انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

”تاج ہوٹل کے منیجر رابرٹ کلارک کا کیا کہنا ہے؟“

”میں نے ابھی تک اس کا تحریری بیان نہیں لیا“ آپ سے مشورہ کرنے کے بعد ہی ایسا کروں گا لیکن زبانی طور پر اس نے یہی کہا ہے کہ سب سے پہلے ہوٹل کا کمر ایک کرنے کیلئے میڈم ہی کا فون موصول ہوا تھا اس کے تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہوٹل کے ایک پارٹنر کا فون آیا تھا جس نے منیجر کو ہدایت کی تھی کہ وہ افضل خان کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے۔ کوئی غفلت برداشت نہیں کی جائے گی۔“

انسپکٹر کا جواب سن کر ایس پی چونکا پھر اس سے پیشتر کہ وہ کسی رد عمل کا اظہار کرتا اس کے ان لہجہ فون کی گھنٹی بجی جس کا نمبر صرف اہم ترین شخصیات کو معلوم تھا۔ اس خیال سے کہ شاید موجودہ کیس کے بارے میں کہیں اوپر سے اسے کال کیا گیا ہو اس نے ہچکچا کر ریسور اٹھا لیا۔ ”ایس پی آغا منظور۔“

”آپ کیلئے ایک اہم اطلاع ہے محترم ایس پی صاحب۔“ دوسری جانب سے کسی نے خاصے ترش انداز میں مخاطب کیا تھا۔

”کون بول رہا ہے؟“ آغا منظور کا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز اس کیلئے قطعی غیر مانوس تھی۔

”اس سوال کا جواب ضروری نہیں ہے۔“ اس بار بھی ٹھوس لہجے میں کہا گیا۔ ”فی الحال تمہاری اطلاع کے لئے بتا رہا ہوں کہ جب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔“

”واٹ نان سنس۔“ ایس پی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو؟“
 ”بکواس کو حقیقت کا روپ دیا جا چکا ہے مائی ڈیر..... تمہیں یقین نہ آئے تو افضل خان کے
 اپارٹمنٹ جا کر خود تصدیق کر لو۔ اگر وہ اس وقت اپارٹمنٹ میں ہوتا تو اس کی بھی وہی حالت ہوتی
 جس کنڈیشن میں تمہیں اس کا اپارٹمنٹ نظر آئے گا۔“
 ”کیا مطلب؟“ ایس پی چونکا۔

”اسے وقتی طور پر منظر عام سے ہٹا دیا گیا ہے، لیکن ہم اسے چوہے کے ٹل سے بھی نکال لیں
 گے گڈ بائی۔“ دوسری جانب سے لائن کاٹ دی گئی۔
 ایس پی نے جھلا کر ریسور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔
 ”کس کا فون تھا سر؟“ سراج نے دبی زبان میں پوچھا۔

”ہمارے مطلوبہ مجرم کو انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ فوری طور پر ایک اطلاع کی
 تصدیق بھی کرنی ہے۔“ ایس پی نے صرف اتنا کہا پھر دوسرے فون کا ریسور اٹھا کر کسی کے نمبر
 کھمانے لگا۔ کال ملنے پر اس نے تحکمانہ انداز میں کہا تھا۔
 ”فوری طور پر کسی ذمے دار ماتحت کو افضل خان کے اپارٹمنٹ بھیج کر معلوم کرو کہ وہاں کی
 پوزیشن کیا ہے..... راستہ نکالنا تمہارا کام ہے مجھے میں منٹ کے اندر اندر تفصیلی رپورٹ درکار ہوگی
 اٹ از ٹاپ ارجنٹ۔“

”افضل خان کے اپارٹمنٹ میں کیا ہوا.....؟“ سراج نے دلچسپی سے سوال کیا۔
 ”کسی نے وہاں کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر کے سارے سامان کو کھنڈر کی شکل میں تبدیل کر دیا
 ہے۔“ ایس پی نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”ابھی دوسرے فون پر یہی کہا گیا کہ..... اب اینٹ کا جواب
 پتھر سے دیا جائے گا۔“

”کون ہو سکتا ہے جناب اور..... اسے آپ کا ان لسٹ نمبر کیسے معلوم ہوا؟“ سراج نے بھی
 حیرت کا اظہار کیا۔

ایس پی جواب دینے کے بجائے کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس
 بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ بھی اسی سوال کا جواب تلاش کر رہا ہے جو سراج نے کیا تھا۔ پھر میں
 منٹ سے پہلے ہی فون پر اس اطلاع کی تصدیق کر دی گئی جو ایس پی کو درکار تھی۔

”سر..... اپارٹمنٹ لاک نہیں تھا، ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی لیکن پورے اپارٹمنٹ کے تمام
 قیمتی ساز و سامان کو توڑ پھوڑ کر غارت کر دیا گیا ہے، کوئی شے بھی سلامت نظر نہیں آئی، کچن کو توڑ پھوڑ
 کر مکمل طور پر برباد کر دیا گیا ہے۔“

”پاس پڑوس والوں کا کیا کہنا ہے؟“ ایس پی نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔
 ”انجی ہم نے صرف آپ کے حکم کی تصدیق کی ہے آپ کہیں تو دو چار پڑوسیوں کے بیانات
 بھی.....“

”نہیں.....“ ایس پی نے اس بار کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”اپارٹمنٹ جس طرح بند تھا اسی طرح
 بند کر کے خاموشی سے تھانے واپس لوٹ جاؤ جب تک کوئی اطلاع نہ ملے مزید کسی کارروائی کو از خود
 کرنے سے گریز ہی کرنا۔“
 ”ایزیووش سر۔“

ایس پی ریسور رکھ کر پھر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ سراج کے علاوہ انسپکٹر نے بھی محسوس کیا تھا
 کہ اب اس کے چہرے پر وہ جھلاہٹ اور غصے کی کیفیت نظر نہیں آ رہی تھی جو پہلے دونوں نے محسوس
 کی تھی۔ وجہ کا سبب دونوں کے علم میں نہیں آ سکا۔

”کیا رپورٹ ملی سر؟“ سراج نے کچھ توقف سے دریافت کیا۔
 ”اسی صورتحال کی تصدیق کی گئی ہے جس کی اطلاع ابھی کچھ دیر پہلے ملی تھی۔“ ایس پی نے
 سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

”کیا ابھی تک کسی نے رپورٹ درج نہیں کرائی؟“
 ”نہیں۔“ اس بار ایس پی نے خلا میں گھورتے ہوئے عجیب لہجے میں خود کلامی کا اندر اختیار
 کیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ محض پولیس کو سنا گیا کرنے کی خاطر ایک پری پلانڈ ڈرامہ ہو۔ یہ
 بھی ممکن ہے کہ کسی نے تنگ آ کر جوانی کا کارروائی کی ٹھان لی ہو اور بھی کئی باتیں ممکن ہیں۔ اپارٹمنٹ
 کی تباہی کے ساتھ افضل خان کے اغوا کی ایف آئی آر بھی کسی کیلئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔“
 ”میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟“ انسپکٹر نے دبی زبان میں سوال کیا۔

”آپ یہ فائل میرے پاس چھوڑ جائیں اور پہلی فرصت میں ہوٹل کے منیجر کا تحریری بیان
 حاصل کریں۔ اسے یہ بھی باور کرا دینا ضروری ہے کہ زبان بند رکھنا اس کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔“
 ”اوکے سر!“ انسپکٹر نے اٹھ کر سیلیوٹ کیا پھر پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”کبھی کبھی پاؤں کے نیچے دبی ہوئی چوٹی بھی کاٹ لینے کی ٹھان لیتی ہے۔“ انسپکٹر کے جانے
 کے بعد آغا منظور نے سراج سے معنی خیر لہجے میں کہا۔ ”میرا اندازہ اگر درست ہو تو اب اس نئے کھیل
 میں پولیس کیلئے کوئی درمیان راستہ اختیار کرنے میں زیادہ سہولتیں میسر ہوں گی۔ بہر حال ہمیں سوچ
 سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔“

”سر.....!“ سراج نے ذرا کھل کر کہا۔ ”اگر افضل خان کے اپارٹمنٹ کو تباہ کر دیا گیا ہے تو پھر
 اس میں ڈرامے والی ہی صورت زیادہ واضح نظر آتی ہے۔“

”آپ کے ذہن میں کس کا نام ابھر رہا ہے؟“ آغا منظور نے سراج کو غور سے دیکھا۔
 ”سوری سر!“ سراج نے مسکرا کر مدہم لہجے میں جواب دیا۔ ”جہاں تک کھل کر بات کرنے کا
 سوال ہے تو ہم دونوں ایک ہی پوزیشن میں ہیں۔“

ایس پی سراج کے جواب پر چونکا ضرور لیکن پھر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ شاید مناسب بھی
 یہی تھا۔

”ایک وضاحت اور چاہوں گا سر!“ سراج نے کہا۔ ”ابھی آپ نے کسی چیونٹی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ وہ کون ہے؟“

”میں آپ ہی کا جواب آپ کو واپس کرتا ہوں۔“

ایس بی نے دوستانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”ہم دونوں ایک ہی پوزیشن میں ہیں۔“

سراج نے محض مسکرا نے پر اکتفا کیا۔ وہ آغا منظور کے ساتھ بے تکلف بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔

خطا روی کا مشورہ اسے ڈی آئی جی کراؤن نے بھی دیا تھا۔

✠✠✠

ہوش میں آتے ہی میڈم روہی اس طرح چوکی جیسے کوئی بھانک خواب دیکھتے دیکھتے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔ نیم غنودگی کے باوجود اس کا ذہن گزری ہوئی باتوں کو یاد کر رہا تھا لیکن ایک خاص موڑ تک پہنچ کر اس کے آگے اندھیرا پھیلنے لگتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے افضل خان کی بے حد ضد کے بعد جشن صحت منانے پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا تھا لیکن شرط یہ رکھی تھی کہ تقریب ہوئے تاج محل میں ہوگی جہاں اس کے اور افضل خان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوگا۔ اس بات کو بغیر کسی عذر کے تسلیم بھی کر لیا گیا۔ ایک بار افضل خان کے اپارٹمنٹ جانے کے بعد وہ اغوا ہونے سے بال بال بچی تھی۔ کسی فرشتے نے اسے دشمن کے شکنجے سے اپنی جان پر کھیل کر بچا لیا تھا۔ اسے کس لوگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی؟ ان کا مقصد کیا تھا؟ وہ کسی حد تک شیخ حامد کی ذات پر شبہ کر رہی تھی لیکن بہر حال اس نے خطا رہنے کا عہد بھی کر لیا تھا۔ ہوئے تاج محل کے منجر رابرٹ کلاک کی وجہ سے اس نے وہی جگہ مناسب سمجھی تھی۔ شیمپین کی سیل بند ہوئی بھی اس نے کسی خطرے سے محفوظ رہنے کی خاطر منگائی تھی لیکن شاید افضل خان نے کسی سوچی سمجھی سکیم کے تحت بھرپور انداز میں پلاننگ کر رکھی تھی۔

میڈم کو امید نہیں تھی کہ افضل خان اس آخری حد تک بھی جانے کی حماقت کرے گا لیکن اسے یاد آ رہا تھا کہ غنودگی کی حالت میں اسے ہانہوں میں سمیٹنے کے بعد افضل خان نے کیا کہا تھا؟ سارے گھناؤنے جملے اس کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر ابھر رہے تھے لیکن جس وقت اسے ڈبل بیڈ پر زبردستی لٹایا گیا تھا اس کے بعد اس کا ذہن معطل ہو چکا تھا۔ بعد میں کیا کچھ ہوا؟ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

اس وقت وہ کمرے میں صرف ایک نرس کے ساتھ تھی۔ شاید اس کی سیکرٹری تھریسیا نے اس کی گزشتہ رات کی حالت کے پیش نظر ڈاکٹر اور نرس کو کال کر لیا تھا۔ چند لمحوں تک وہ ذہنی خلفشار میں مبتلا رہی پھر نرس سے بولی۔

”آپ میری سیکرٹری کو بلا دیں اور کچھ دیر باہر ہی ٹھہریں! اسکے ساتھ مجھے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

نرس خاموشی سے باہر چلی گئی! ایک منٹ بعد تھریسیا اندر داخل ہوئی۔ اس نے کسی وجہ سے اندر

آنے کے بعد دروازے کو بھی لاک کر دیا تھا۔ میڈم روہی نے اس کی حرکت کو خاص طور پر محسوس کیا۔ یہ بات بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی کہ تھریسیا گزشتہ آٹھ سال سے اس کے ساتھ بے تکلف دوستوں کی طرح کام کرنے کے باوجود اس وقت اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ پھر میڈم نے کسی استفسار کی ضرورت نہیں محسوس کی! وہ تھریسیا کی نظریں ملانے کی وجہ کچھ سمجھ رہی تھی۔

”میں کل رات کس وقت واپس آئی تھی؟“ اس نے کچھ توقف کے بعد تھریسیا کو مخاطب کیا۔

”آپ خود نہیں آئی تھی۔“ تھریسیا نے مدہم لہجے میں جواب دیا۔ ”ڈی آئی جی ایس بی مسٹر سراج آپ کو چھوڑ گئے تھے۔ آپ کی گاڑی اس وقت گیراج میں موجود ہے۔“

میڈم..... سراج کا نام سن کر چونک کھلی بار بھی اس کی معلومات کے مطابق سراج ہی نے اس کی مدد کی تھی! مگر کسی وجہ سے اس کا نام درمیان میں نہیں آیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ سراج کے ساتھ کوئی اور بھی تھا جس نے فائزنگ کے باوجود اسے اغوا کرنے والوں کے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ وہ کچھ دیر تھریسیا کو دیکھتی رہی جس پر اسے مکمل اعتماد تھا۔ تھریسیا جرمن خواتین کی طرح آٹھ سال کے تجربے کے بعد وہ میڈم کے لیے ہر معاملے میں بہترین دوست اور رازدار ثابت ہوئی تھی۔

”مسٹر سراج نے تم سے کچھ کہا بھی ہوگا؟“ اس نے کچھ توقف کے بعد سوال کیا۔

”جی ہاں! ان کا مشورہ تھا کہ آپ کی طرف سے کسی فوری کارروائی سے گریز کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میڈم نے اسے گہری نظروں سے ٹولا۔

”میں مسٹر سراج کے مشورے سے پوری طرح متفق ہوں۔“ تھریسیا نے ایک اچھٹی نظر میڈم کے چہرے پر ڈالی پھر دوبارہ نظریں جھکا کر بولی۔ ”اگر بات پریس تک پہنچ گئی تو بلاوجہ کی بدنامی ہوگی۔“

”جس وقت میں واپس آئی اس وقت شاید میں پوری طرح ہوش میں نہیں تھی؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے! میں نے بڑی رازداری سے آپ کو بیدارم تک پہنچایا تھا۔ ایک اہم فرض مسٹر سراج نے ہمارے لیے آسان کر دیا تھا۔“

”وہ کیا؟“

”رات کا ڈیوٹی گارڈ“ مسٹر سراج نے خالص پولیس والے انداز میں اسے تنبیہ کر دی تھی کہ اس کی زبان کسی بھی موقع پر نہیں کھلی چاہئے ورنہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“

میڈم روہی کے مضطرب ذہن میں پھر سے سوالات کی یلغار شروع ہو گئی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے ساری جھجک بالائے طاق رکھ کر تھریسیا کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔

”جس وقت میں واپس آئی اس وقت تم نے کچھ نہ کچھ تو اندازہ ضرور لگایا ہوگا؟ میرا مطلب ہے کہ تم میری طرح ایک عورت کی حیثیت سے وہ بات سمجھ سکتی ہو جو میرے وجود میں نشتر بن کر چھ رہی ہے۔ پلیز! میری بات کا کھل کر جواب دینا اور میرا ضمیر مجھے کچھ کے لگا تار ہے گا۔“

”مم..... میں پورے یقین سے کوئی حتیٰ فیصلہ نہیں کر سکتی البتہ آپ کے میک اپ اور چہرے کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر ضرور پہنچی ہوں کہ اگر مسٹر سراج نے بروقت آپ کی مدد نہ کی ہوتی تو شاید.....“ تھریسیا نے جان بوجھ کر اپنا جملہ مکمل نہیں کیا۔

”آج کے اخبارات.....“

”میں نے آپ کے کہے بغیر تمام اخبارات چھان ڈالے ہیں۔“ تھریسیا نے میڈم کے اطمینان کی خاطر اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔ ”آپ سے متعلق کوئی خبر نہیں ہے۔“

”سراج نے دوبارہ فون تو نہیں کیا؟“

”نہیں.....“

میڈم نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔ اس وقت دوپہر کے سوا گیارہ کا عمل تھا۔ اس کا ذہن الجھنے لگا۔ اس کا خیال تھا بیشتر افسران شیخ حامد کی مٹھی میں ہوں گے لیکن سراج نے اسے گھرتیک لانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی جبکہ اسے غالباً اس بات کا علم بھی ہوٹل مینجمنٹ کے ذریعے ہو چکا ہوگا کہ روم نمبر چار سو آٹھ میں اس کے ساتھ خان افضل بھی موجود تھا اس کے ساتھ کئی اور خیال بھی میڈم کے ذہن میں کسی بگولے کی طرح چکرانے لگے۔ اسے ہوٹل سے واپس لاتے وقت وہاں کے کچھ ملازموں نے بھی ضرور دیکھا ہوگا..... بات ان کے ذریعے آج نہیں توکل تک منظر عام پر بھی آ سکتی تھی۔ فوری طور پر اس نے ہوٹل کے منیجر کو فون کرنے کا سوچا لیکن پھر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

”آپ کس الجھن میں گرفتار ہیں.....؟“ تھریسیا نے میڈم کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

”تھریسیا!“ میڈم نے اسے ایک بے تکلف سہیلی کی طرح مخاطب کیا۔ ”اس وقت مجھے پرسنل سیکریٹری کے بجائے ایک سہیلی کے کچھ مفید مشورے درکار ہیں۔“

”آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔“ تھریسیا نے اس بار میڈم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے غلوں سے کہا۔

”میں اگر آپ کے کسی کام آ سکتی تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔“

”موجودہ پوزیشن میں میری جگہ تم ہوتیں تو..... پہلا قدم کیا اٹھاتیں؟“

”میں سب سے پہلے مسٹر سراج کا شکریہ ادا کرتی جس نے ابھی تک آپ کے سلسلے میں تمام تر احتیاط اور رازداری سے کام لیا ہے۔ اس کے بعد..... میرا ذاتی خیال ہے کہ اب پانی سر سے گزرنے لگا ہے فیصلہ آپ کو کرنا ہے لیکن میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اس لیے اتنا ضرور کہوں گی کہ اب دوسری پارٹی کو بھی اس بات کا احساس دلانا ضروری ہو گیا ہے کہ..... آپ تر نوالہ نہیں ہیں۔“

”جھینکس فار پورگنڈ ایڈوائس“ میڈم نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ”میرے ذہن میں بھی یہی وہ باتیں گونج رہی تھیں۔ اب تک میں کسی ججبال سے دور رہ کر بلاوجہ اپنی بزدلی کا ثبوت دیتی رہی مگر اب..... ایسا نہیں ہوگا۔“

”ایسی چویشن میں بھی میری ایڈوائس یہی ہوگی کہ کوئی قدم اٹھانے سے بیشتر مسٹر سراج کو اعتماد میں لینے کی کوشش کریں کسی نہ کسی پر تو بہر حال بھروسہ کرنا ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میڈم نے سنجیدگی سے کہا پھر اس نے فون بستر پر منگوا کر سراج کے دفتر کے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔

سراج اس وقت دفتر میں ہی ملا۔ دوسری جانب سے یہی جواب ملا کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں ایس پی کے دفتر گیا ہوا ہے۔ اس کا نام بھی دریافت کیا گیا مگر میڈم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ دوپہر دو بجے تک اس نے تھریسیا کے ذریعے پھر دوسرے فون سے سراج سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔

شام کو ناشتے کے بعد وہ تھریسیا کے ساتھ لان میں بیٹھی باتوں میں مشغول تھی جب اس کے موبائل پر کسی نے کال کی۔ نمبر جانا پہچانا نہیں تھا اس لیے میڈم نے موبائل تھریسیا کی طرف بڑھا دیا۔

”ہیلو“ تھریسیا نے فون آن کر کے سپاٹ لہجہ اختیار کیا۔

”میرا خیال ہے کہ کل رات آپ سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔“ دوسری جانب سے پر اعتماد لہجے میں جواب ملا۔ ”اس وقت مجھے میڈم سے بات کرنی ہے۔ دن میں شاید وہ مجھے کنکٹ کرنے کی کوشش کر چکی ہیں۔“

”بات کریں۔“ تھریسیا نے موبائل میڈم کی طرف بڑھاتے ہوئے اشارے سے یہ بھی بتا دیا کہ سراج کی کال ہے۔

”ہیلو روبی بول رہی ہوں۔“

”آپ نے غالباً مجھے کال کیا تھا۔“ سراج کی آواز ابھری۔ ”میں اسے اپنی بد قسمتی ہی کہوں گا کہ اس وقت میں ایس پی آفس میں ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں مصروف تھا۔“

”مم..... میں نے آپ کا شکریہ ادا کرنے کی خاطر کال کی تھی۔“

”کس بات کا شکریہ؟“

”کل آپ نے میری جس طرح مدد کی مجھے کسی پولیس آفیسر سے اس کی توقع نہیں تھی۔“ اس بار میڈم نے سراج کو آذمانے کی خاطر بوجھ کر صاف گوئی سے کام لیا۔

”آپ جن حالات سے گزری ہیں اس کے تحت آپ کا اندازہ کچھ غلط بھی نہیں ہے۔“ سراج نے برامانے بغیر سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اور..... ہر پولیس آفیسر ضمیر فروش بھی نہیں ہوتا۔ رہا آپ کا شکریہ ادا کرنے کا سوال تو اس سلسلے میں یہی کہوں گا کہ میں نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنا فرض سمجھ کر کیا تھا۔ یقین کرنا نہ کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔“

”ایک شرط پر یقین بھی کر لوں گی۔“

”قبل از وقت کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”پہلی بار کسی شخص نے جان کی بازی لگا کر مجھے اغوا ہونے سے بچا لیا تھا۔ وہ کون تھا؟“
”میں اس سے واقف ہوں لیکن کسی مصلحت کی بنا پر اس وقت اس کا نام نہیں لے سکتا۔۔۔۔۔
البتہ جواب قرض رہا۔“

”مسٹر سراج۔“ اس بار میڈم نے قدرے بے تکلفی سے کام لیا۔ ”کیا ہم کسی وقت براہ راست مل سکتے ہیں؟“

”آپ ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کریں۔“ سنجیدگی سے جواب ملا۔ ”یہ مشورہ میں ایک مخلص دوست کی حیثیت سے دے رہا ہوں۔ ایک بات اور۔۔۔۔۔ اس وقت میں جس نمبر سے بات کر رہا ہوں اسے احتیاط سے نوٹ کر لیں۔۔۔۔۔ ان پر جب بھی چاہیں رابطہ کر سکتی ہیں۔ فوری جواب نہ ملے تو اسے میری مجبوری سمجھ لیں۔“

”میرا دل کہتا ہے کہ آپ پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔“
”کسی پر اعتماد کرنے سے پیشتر اچھی طرح اسے پرکھ کر دیکھ لیتا ہی دانشمندی ہوتی ہے۔ ورنہ کبھی کبھی یہی اعتماد انسان کو کوئی ایسا نقصان بھی پہنچا سکتا ہے جس کا تدارک ممکن نہیں ہوتا۔“
”میں۔۔۔۔۔ شاید آپ کا اشارہ سمجھ رہی ہوں۔“

”ایک سوال میں بھی آپ سے پوچھنا چاہوں گا۔“
”بے حد سنجیدگی مگر مدغم آواز میں پوچھا گیا۔“ ہوٹل کے ناخوشگوار واقعے کے بعد کیا آپ کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی بھی کی گئی ہے؟“

”جی نہیں۔۔۔۔۔“ میڈم چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ ”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“
جواب میں سراج نے کچھ سوچ کر افضل خان کے اپارٹمنٹ میں ہونے والی توڑ پھوڑ کی پوری تفصیل دہراتے ہوئے کہا۔ ”یہ اطلاع اپنی ذات تک ہی محدود رکھیں تو بہتر ہے۔۔۔۔۔ بائی۔“
دوسری جانب سے رابطہ ختم ہوا تو میڈم کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ افضل خان کے سلسلے میں جو بات اس کے علم میں آئی وہ اس کے لئے حیرت انگیز ہی تھی۔ ذاتی طور پر اس نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ اس میں بھی یقیناً اس کے دشمن کا ہاتھ ہوگا۔ شاید اس طرح افضل خان کو تحفظ دینے کی خاطر کوئی شاطرانہ چال چلی گئی ہوگی۔

”کوئی نئی خبر۔۔۔۔۔؟“ تھریسیا نے میڈم کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر روبی زبان میں پوچھا۔

”ہاں۔“ میڈم نے تھریسیا کو ملنے والی اطلاع کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس میں میرے دشمن کا ہاتھ شامل ہے تو پھر افضل خان کو کہیں انڈر گراؤنڈ کر کے پولیس والوں کو اس کے اغوا کا تاثر دیا جائے گا۔“

”آئی۔ سی۔“ تھریسیا نے کسمسا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم بھی دشمنوں کی کمیٹی کا منہ توڑ جواب دیں۔ فوری طور پر میں آپ کو اپنے گھر کی سیورٹی کی خاطر گارڈز کی

تعداد میں اضافے کی تجویز پیش کروں گی۔“

میڈم نے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ اس کے ذہن میں اس وقت سراج کی کھری کھری باتوں کے علاوہ اس کی شخصیت کے کئی نئے پہلو اجاگر ہو رہے تھے۔ اس کا دل یہی کہہ رہا تھا کہ سراج پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

❖❖❖

دوسری شام کو شائع ہونے والے اخباروں نے پولیس افسروں کے ذہن میں ابھرنے والے شبہات کو دور کر دیا۔ افضل خان کے بارے میں اور اس کے اپارٹمنٹ میں ہونے والی توڑ پھوڑ کے سلسلے میں جو ایف آئی آر درج کرائی گئی۔ اس کی روشنی میں اخباری نمائندوں نے کلی پھندے لگا کر خاصی گرم سرخیاں لگائی تھیں۔ ایک مقبول اخبار کے نمائندے نے جو سری لگائی تھی وہ عوام الناس کے لیے توجہ کا مرکز بن گئی۔

”شیر کی کچھار میں لومڑیوں کی دال گل گئی۔“

”عوام الناس میں یہ خبر یقیناً دلچسپی اور حیرت کا سبب ہوگی کہ شہر کے معروف تاجر شیخ حامد جو مرکزی حکومت کے منتخب نمائندوں میں بھی خاصا اثر رکھتے ہیں۔ ان کے بزنس نیجر افضل خان کو اس قدر پر اسرار طور پر اغوا کیا گیا کہ پڑوسیوں کو کانوں کان بھنک تک نہ مل سکی۔ جن مجرموں نے شیر کی کچھار میں گھس کر دن دھاڑے افضل خان جیسے خاص آدمی کو اغوا کیا انہوں نے نہایت آرام و سکون سے ان کے اپارٹمنٹ میں بھی دل کھول کر حسب منشا توڑ پھوڑ کی جس کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ڈرائنگ روم، بیڈ روم کی تمام قیمتی اشیاء اور دیوار پر لگی قیمتی پینٹنگز کے ساتھ ساتھ انہوں نے کچن کے کسی ساز و سامان کو بھی اس کی اصل شکل میں نہیں رہنے دیا۔ پورے اپارٹمنٹ کو کھنڈر بنا کر افضل خان جیسے نامی گرامی شخص کو بھی اغوا کر کے لے گئے جو پولیس کی لسٹ پر کئی بار نمایاں حیثیت سے اجاگر ہوا لیکن اتفاق سے کسی معاملے میں بھی اسے کوئی قابل ذکر سزا نہیں ملی۔ حامد گروپ آف کمپنیز کو جو ان کرنے کے بعد چھوٹے موٹے پولیس افسران بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کتراتے تھے۔

ہمارے اخبار نے جب شیخ حامد سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی تو ہر فون کال پر نوکسنس کہہ کر لائن کاٹ دی گئی۔ کاروباری حلقوں میں بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے کہ افضل خان جیسی نامور شخصیت کے اغوا میں کسی قریبی تاجر یا صنعت کار کا ہاتھ بھی شامل ہو سکتا ہے۔ پولیس بھی یہ کہہ کر کچھ کہنے سے گریز کر رہی ہے کہ جب تک مکمل تفتیش نہ ہو جائے اور فکر پرنس کی رپورٹ سامنے نہ آجائے وہ مکمل کر کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں سنسنی خیز افشاقات کی توقع کی جارہی ہے۔ ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ملحقہ تھانے کے علاوہ دوسرے افسروں نے بھی اپنے فون مصروف کر رکھے ہیں تاکہ ان کی ذاتی مصروفیات میں خلل نہ پڑے۔“

سراج اس وقت اپنی بیوی الماس کے ہمراہ سیٹھ عثمان اور راجیلہ بیگم کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا

تھا، جب اس خبر کی تفصیل کو پڑھ کر وہ بھی حیران رہ گیا۔ ایس پی نے گزشتہ روز ہی کسی نامعلوم کال کے بعد افضل خان کے اپارٹمنٹ کے بارے میں خفیہ معلومات حاصل کر لی تھیں اور ملحقہ تھانے کے کارندوں کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ جب تک کوئی ایف آئی آر نہ درج کرائی جائے وہ کوئی کارروائی نہ کریں اس نے سراج سے یہ شبہ بھی ظاہر کیا تھا کہ یا تو کسی چیونٹی نے ہی بالآخر پلٹ کر کاٹ لینے کا راستہ اختیار کیا ہے یا پھر ساری کارروائی محض ڈرامہ تھا جو پولیس کو فریب دینے کیلئے رچایا گیا ہے۔ سیٹھ عثمان نے بھی اس خبر پر تعجب اور حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہم کل رات ہی کی فلائٹ سے آئے اور آج یہ حادثہ پیش آ گیا۔“

راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

”اسی کو کہتے ہیں کہ سرمنڈواتے ہی اولے پڑے۔“ الماس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تعجب اس بات پر ہے کہ میرے یار نے غالباً جہاز میں ہی ساری پلاننگ کی اور گھرا آتے ہی دھماکہ کرایا۔“ سراج نے بیوی کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے سیٹھ عثمان کو پھینٹنے کی خاطر کہا تو راحیلہ نے سراج کو بڑی اپنائیت سے گھورا۔

”آپ کو اس وقت مذاق سوجھ رہا ہے اور ادھر ممکن ہے کہ فتح حامد نے ہمارے آتے ہی پھر اپنی شرارت کا مظاہرہ کر دیا ہو۔“

”اس سے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔“ سیٹھ عثمان نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”افضل خان کو اغوا کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے ضرور اس میں کسی بہت قریب کے کسی آدمی کا ہاتھ شامل رہا ہوگا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ الماس نے شوہر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”اس معاملے میں لومزی کا کردار کس نے ادا کیا ہوگا؟“

”ہمیں یہ اطلاع کل شام ہی مل گئی تھی۔“ سراج نے سنجیدگی سے میڈم روپی کی ہوٹل والی کہانی کو درمیان سے حذف کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے ایس پی صاحب سے کل ہی کسی نامعلوم شخص نے فون پر کہا تھا کہ اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔ یہ جملہ بھی زور دے کر کہا گیا تھا کہ اگر اپارٹمنٹ کو کھنڈر کی شکل میں تبدیل کرتے وقت افضل خان وہاں ہوتا تو اس کی لاش کی حالت بھی ٹوٹے پھوٹے سامان سے مختلف نہ ہوتی۔“

”کیا فون کرنے والے نے اس واردات کی وجہ نہیں بتائی تھی؟“ راحیلہ بیگم نے کسماکس سوال کیا۔

”نہیں..... لیکن دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔“ سراج نے بدستور کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”یا تو سارا ڈرامہ خود بڑی مچھلی نے رچایا ہے یا پھر کسی کے ممبر کا پیاناہ بھی چھلک سکتا ہے۔“

”بڑی مچھلی والی بات تو میں سمجھ گیا مگر ممبر کا پیاناہ.....“

سیٹھ عثمان نے سراج کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”ممبر کا پیاناہ کس کا چھلک سکتا ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے کیا صرف تم ہی اس بلیو ویل کی مخالف پارٹی کی لسٹ پر ہو؟“

”آپ کی حتی رائے کیا ہے؟“ الماس نے شوہر سے دریافت کیا۔ ”افضل خان جیسے مگر مجھ کو کس نے جال میں پھانسا ہوگا؟“

”یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر اسی یقین اسی بات کا ہے یہ محض ڈرامہ ہے۔“ سراج نے محتاط انداز میں کہا۔ ”کسی ذاتی وجہ سے خود اس کے آدمیوں نے افضل خان کو انڈر گراؤنڈ کیا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کسی غلطی کی وجہ سے اسے ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیا گیا ہو۔ اگر میرا آخری اندازہ درست ہوا تو اس کی لاش بھی بہت جلد منظر عام پر آ جائے گی۔“

”گو یا اس بار فتح حامد نے ایک شخص کو اغوا کرا کے کئی اور مقاصد بھی پورے کرنے کی ٹھانی ہوگی۔“

”بہ ظاہر یہی نظر آتا ہے۔“

پھر اس سے پہلے کہ سیٹھ عثمان کچھ کہتے سراج کا موبائل فون جاگ اٹھا۔ اسکرین پر ایس پی کے نمبر روشن تھے۔

”ہیلو سراج اسپیکنگ“ سراج نے سب کو خاموش رہنے کو اشارے سے کہا۔

”آپ نے شام کے اخبار دیکھے؟“ دوسری جانب سے سوال کیا گیا۔

”دیکھ چکا ہوں سر..... اور اس بات کا یقین ہے کہ اوپر سے افضل خان کو فوری تلاش کرنے اصل مجرموں کو کفر کردار تک پہنچانے اور ان سے آہنی ہاتھ سے منٹنے کے گھسے پٹے جیلے بھی ادا کیے جا رہے ہوں گے۔“

”پھر آپ نے کیا نتیجہ نکالا؟“

”وہی جو میں کل عرض کر چکا ہوں۔“ سراج نے بھی رازداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں آپ کے آفس میں پہنچ رہا ہوں۔“

سراج غمت میں چلا گیا تو الماس کندھے اچکا کر بولی۔ ”آپ لوگوں کو مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں سراج کو وقت نہیں دیتی لیکن میرے میاں کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ میرے لیے کتنا وقت نکال سکیں گے۔“

”یہ غلط بات ہے الماس۔“ راحیلہ بیگم شوفی سے بولیں۔ ”میں سراج بھائی کیخلاف کچھ نہیں سن سکتی۔“

”میرا خیال ہے کہ الماس کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی۔“

سیٹھ عثمان نے الماس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ ”سراج کا لُج کے زمانے ہی سے لاابالی آدمی واقع ہوا ہے۔“

جواب میں الماس مسکرا دی راحیلہ نے کھنکھارتے ہوئے شوہر کو محبت بھری نظروں سے گھورا۔

”سوچ سمجھ کر بات کریں۔ الماس ابھی کچھ دیر میں چلی جائے گی۔ آپ کو میرے ساتھ ہی رہنا

ہے۔“

”اس جملے کیخلاف بھی ایف آئی آر درج کرائی جاسکتی ہے۔“ الماس نے کہا ”کسی کو دھمکی دینا بھی تعزیرات پاکستان میں قاتل گرفت جرم ہے اور راحیلہ بھابی آپ کو یہ بھی بھولنا نہیں چاہیے کہ میں بری بھلی جیسی بھی سہی لیکن ایک ذمے دار پولیس آفیسر کی باقاعدہ نکاح شدہ بیوی ہوں۔“

کچھ دیر اسی قسم کی معصوم نوک جھوک جاری رہی پھر الماس بھی دوبارہ جلد آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی تو راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے شوہر سے کہا۔

”ہمارے واپس آتے ہی افضل خان کے حوالے سے شائع ہونے والی خبر..... اچھا شگون نہیں ہے۔“

بہر حال بنگالی پاڑے کی منجوان آباد اور تنگ و پر پیچ گلیوں کی وجہ سے علاقے کی پولیس اور جرائم پیشہ افراد کے درمیان آنکھ بچولی کا سلسلہ جاری رہتا۔

اسی بدنام پاڑے کے خارجی راستے کے کنارے واقع ایک اسی گز کے رقبے پر بنے ہوئے کچے مکان کے اندر چار افراد فرش پر بچھے قالین پر جوا کھیلنے میں لگن تھے۔ مکان کی حالت باہر سے زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن اندر کا معاملہ باہر سے بدرجہا بہتر تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

جوا کھیلنے والے چاروں افراد صورت شکل کے اعتبار سے بھی بد معاش ہی لگتے تھے۔ ہر ایک کے سامنے شراب کے ساتھ اس کے لوازمات بھی نظر آرہے تھے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان چاروں کے ساتھ ہی ان کے ریوالور اور کارتوس کی پیشیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے قالین پر پڑے چھوٹے نوٹوں کی تعداد بھی اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ ان کے پاس مال کی کمی نہیں تھی۔ جیتی ہوئی رقیں ہر شخص کے سامنے بکھری پڑی تھیں۔

چاروں کے درمیان وہ بازی چھس کر رہ گئی تھی۔ دو افراد نے پتے پھینک کر شراب اور سگریٹ سے شغل شروع کر دیا۔ باقی دو بدستور ایک دوسرے کی فیس ریڈنگ کرنے اور ایک دوسرے کو پتا پھینکنے کے مختلف ہتھکنڈے آزمارہے تھے۔ بورڈ پر پڑی رقم بھی چار ساڑھے چار ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

”کیا بات ہے رنگیلے؟“ ایک ملوث جواری نے اپنے تینوں پتوں کو آہستہ آہستہ گھس کر دیکھتے ہوئے دوسرے سے کہا۔ ”کوئی ترپل چھس گئی ہے کیا؟“

”نہیں۔“ دوسرے نے اپنے مخاطب کو ڈانچ دینے کی کوشش کی۔ ”ایک کے بجائے وہ نادھوری چھس گئی ہیں انہی کے نام پر قسمت آزمایا رہا ہوں۔ ویسے میں سمجھ رہا ہوں دھرمیندر مہاراج کہ تو کون سا سکہ اچھا ل کر مجھے کچا کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟“ دوسرا مسکرا دیا۔

”اسی بات پر گہرے تنگ کے نام پر ایک چال اور“ سامنے والے نے سوسو کے چارنوٹ مزید گڈی میں شامل کر دیئے۔

”مگر راؤنڈ چھس گئی ہے شاید“ دوسرے نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد اس نے بھی چار سو کی

رقم ردی کاغذوں کی طرح ڈھیری میں ڈال دی۔

”ایسا کر.....“ پہلے نے تجویز پیش کی۔ ”گھر کی بات ہے، چل ساری رقم ففٹی ففٹی کر لیتے ہیں۔“

”سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے؟“ دوسرے نے گلاس اٹھا کر ایک لمبا گھونٹ لے کر کہا۔ ”شوکیوں نہیں مانگ لیتا“

”چل رنگیلے تیرا کہا مان رہا ہوں“ پہلے نے مزید چار سو ڈال کر سرسراتے لہجے میں کہا ”شوکر دے۔“

دوسرے نے کارڈ شو کر دیے۔ پہلے نے ایک لمحے کو منہ بنایا پھر اپنے تین پتے کھولتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ لے میری جان! اپنا دھرم مند تیری مادھوری پر چڑھ بیٹھا۔ اس کے پاس بادشاہ بیگم اور غلام تھا“ پتا نیچے ڈالنے کے بعد اس نے نوٹوں کی گڈی بھی اپنی طرف کھینچ لی۔

”آج تیری گڈی چڑھی ہوئی ہے۔“ تیسرے نے جیتنے والے کو مبارک دی۔

جیتنے والے نے مسکرا کر تاش کے پتے سمیٹ کر انہیں دوبارہ پھینکا شروع کیا۔ اسی وقت ایک پانچواں شخص اندر داخل ہوا وہ پہلا ہر کسی سوکھے ہوئے جھینگے کی طرح دبلا پتلا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ہلاکی ذہانت تھی۔ اس کے سارے ساتھی اسے استاد انفارمر کے نام سے یاد کرتے تھے اس لیے کہ وہ ظاہری شخصیت کے برخلاف انتہائی چالاک اور پھرتیلا آدمی تھا۔ کسی قتل و غارت گری میں اس نے کبھی کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن مخالفین کے ساتھ گھل مل کر ایسی دور کی خبریں لاتا تھا کہ سب ہی اس خوبی کا اعتراف کرتے تھے وہ سلا بنگالی نظر آتا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک مڑاڑا اخبار دیا ہوا تھا۔

”کیا خبر ہے شرلاک ہومز؟“ کمرے میں پہلے سے موجود ایک شخص نے جس کے گلے پر بہت گہرے زخم کا واضح نشان موجود تھا استاد انفارمر کو نئے نام سے مخاطب کیا۔

”بڑی گرما گر خبر ہے۔“ استاد انفارمر نے جس کو محلے کے پیسٹر پاس پڑوس والے چارلی کے نام سے جانتے تھے اخبار کھول کر قالین پر بچھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے کارناموں کی تعریف سارے اخبار والوں نے کی ہے۔ شیر اور لومڑی کی سرخی لگائی ہے۔ مجھے کئی جگہ سے یہی خبر ملی ہے کہ ادھر پولیس کے بڑے بڑے سورا بھی بھلیں جھانکتے پھر رہے ہیں۔ اپنا بگ باس زندہ ہا..... آ..... آ.....“

چارلی اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ گردن پر زخم کے نشان والے نے اچانک ہی الٹا ہاتھ اتنی قوت سے گھمایا تھا کہ چارلی لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ باقی تینوں افراد بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ زخمی کے نشان والا ان کا لیڈر تھا لیکن اس وقت یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ چارلی کو کس جرم کی سزا دی گئی ہے۔

”کیا بات ہے جیرے استاد؟“ ایک ساتھی نے پوچھا۔

”دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ حرام کے ختم۔“

جبرے استاد نے خونخوار نظروں سے بدستور چارلی کو گھورتے ہوئے خطرناک لہجے میں مخاطب کیا۔ ”کتنی بار سمجھ چکا ہوں کہ زبان بند رکھا کر ایک چنگاری بھی پورے جنگل کو جلا کر بھسم کر سکتی ہے۔ تیری زبان پر پولیس اور باس کا نام کیوں آیا؟ کیا زندگی سے عاجز آ گیا ہے؟“

”بھول ہو گیا استاد۔“ چارلی جواب میں اس طرح گڑگڑانے لگا جیسے اس سے انجانے میں کوئی ناقابل معافی جرم سرزد ہو گیا ہو، کپکپاتے ہوئے بولا۔ ”آئندہ کیلئے کان پکڑ کر توبہ کرتا ہوں۔“

باقی تینوں کو اخبار کی سرخی دیکھ کر اصل بات کا اندازہ ہوا تو وہ بھی چارلی کو تھپڑ لاتوں اور گھونٹوں سے نوازنے لگے۔ ان کیلئے چارلی کے مقابلے میں اپنی زندگی کی اہمیت زیادہ تھی۔ سب کے منہ سے ملغظات گالیاں ایلنے لگیں۔ نشے کی حالت میں وہ کچھ زیادہ ہی بہک گئے تھے۔ یہ بھی فراموش کر بیٹھے کہ جس چارلی کو اس وقت وہ پرانی روٹی کی طرح دھن رہے تھے وہی کئی موقعوں پر ان چاروں کو بروقت پولیس کی ریڈ کی اطلاع دے کر قانون کے شکنجوں میں پھنسنے سے بچا بھی چکا تھا۔

چارلی کی پوزیشن اس وقت اس فٹ بال جیسی تھی جن پر ٹیم کے چار کھلاڑی ایک ساتھ جھپٹ پڑے ہوں اور اس کے حصول کی خاطر زوردار کک لگا رہے ہوں۔ دائیں بائیں قلابازیاں کھانے اور ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے سوا وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

”بس کرو۔“ جبرے استاد کے حکم کے ساتھ ہی باقی تینوں کے ہاتھ پاؤں بھی رک گئے۔

چارلی نے اطمینان کی سانس لی لیکن اس کی دلی دلی سسکیاں بدستور ابھرتی رہیں۔

”دوبارہ کوئی غلطی کی تو تیری ٹانگیں چیر کر ایک سے دو چارلی بنا دوں گا۔“ ایک دراز قد والے نے غزاکر کہا۔

”خزیر کی کھوپڑی میں ہر وقت حسینہ کلبلائی رہتی ہے۔“ دوسرے نے چارلی کی محبوبہ کو کھگانے کی کوشش کی۔

”اسی کے لپٹنے میں اس کی عقل بھی ابھی رہتی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔“ تیسرے نے چٹاٹا لیتے ہوئے گلاس خالی کیا پھر چارلی کو گھور کر بولا۔

”ہفتے میں کتنی بار اس بھلے بھڑی کے ساتھ داؤ بیچ لڑاتا ہے؟ ویسے تیری حسینہ ہے بھی ایک دم کسی چھپاکی طرح جاندار بھی نہیں دیکھتی ہے تو اس طرح بدکتی ہے جیسے قصائی کو دیکھ کر قربانی کا جانور۔“

”حسینہ کی یاد اچھی دلائی تم نے۔“ چھریرے بدن والا تیز لہجے میں بولا۔ ”کیا خیال ہے؟“

آج چارلی کی طرف سے ہم بھی موج میلہ نہ کر لیں۔“

”بات تو تم نے سولہ آنے میرے دل کی کہی ہے لیکن.....“ بولنے قد والے ساتھی نے لہرا کر کہا۔ ”وہ اکیلی پچھیا ہم چار ساندوں کو برداشت کرنے میں کہیں اوپر کا کھٹ نہ کٹالے۔“

”کیوں چھی بھارت؟“ دوسرے نے براہ راست چارلی کو دیکھا۔ ”تو کیا بولتا ہے؟ کیا تیری رانی میں اتنا دم ختم ہے کہ ہم کو جیل لے گی۔“

”میں تمہاری آگے ہاتھ جوڑتا ہوں استاد۔“ چارلی جبرے کو دیکھ کر گڑگڑانے لگا۔ ”غلطی میری تھی مجھے جو چاہے سزا دے دو لیکن حسینہ کے ساتھ میں شادی بنانے والا ہوں اس لیے اس کو معاف کر دو۔“

”کسی اور کو پکڑ لو“ دراز قد والے نے نشے میں جھومتے ہوئے کہا۔ ”تو نے اپنا کھیل خراب کیا ہے اب تو ہی کسی اور کا بندوبست بھی کرے گا۔ چل اٹھ کر کھڑا ہو جا جلدی سے کوئی پھر پھر کیا تو تیری خیر نہیں۔“

وہ..... وہ..... شادا کی بڑی بہن چلے گی؟“ چارلی نے مردہ آواز میں کہا۔ ”وہ دھندا بھی کرتی ہے ایک بار اس سے دوستی پکی کر لو تو پھر وہ اپنی دوسری جاننے والیوں کی بھی لائن لگا دے گی لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ دراز قد والے نے چارلی کو غصے سے گھورا۔ ”بولتے بولتے تیری نانی کیوں فوت ہو گئی؟“

”بات نانی دادی کی نہیں میں تمہیں صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اوپر سے کسی عورت کے ساتھ چکر چلانے کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔“ چارلی نے ڈرتے ڈرتے جملہ مکمل کیا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہے تو“ استاد نے اسے ایک اور ٹھوکر لگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”کسی کو ہمارے ٹھکانوں کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہئے اور ایسی صورت میں جبکہ ہم سب ساتھ ہوں تو پھر کوئی ہل بازی مناسب بھی نہیں رہے گی۔ ویسے بھی ہم جیسوں کی مٹی ہمیشہ کسی نہ کسی عورت ہی کے ہاتھوں پلید ہوتی ہے۔“

”پھر تو نشہ اتارنے کا ایک ہی علاج ہو سکتا ہے۔“ ایک گٹھے ہوئے اور درمیانہ قد والے نے جبرے استاد کو آنکھ مار کر چارلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”آج کیوں نہ ہم پوری کے بجائے پراٹھے پر گزرا کر لیں۔“

چاروں اس جملے پر تہقہ لگا لگا کر لوٹ پوٹ ہو گئے اور چارلی اندر ہی اندر کسی پھرے ہوئے طوفان کی طرح چل رہا تھا۔ جن کی زبان پر آج اس کی محبوبہ کا نام آ گیا تھا وہ کل اسے آدم خور بھیڑیوں کی طرح بھنبھوڑنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ چارلی کسی قیمت پر بھی اپنی حسینہ کی عزت کی دھجیاں اپنی نگاہوں کے سامنے اڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا..... یہی اس کا آخری فیصلہ تھا۔



وہ تین دن افضل خان کی آزاد زندگی کے سب سے اذیت ناک دن تھے۔ اس کی آزادی اس طرح ایک نامعلوم عمارت کے زمین دوز کمرے تک سلب کر کے محدود کر دی جائے گی۔ یہ بات اس نے خواب میں بھی نہیں سوچتی تھی۔ وہاں زندگی گزارنے کے لیے ضرورت کی تمام اشیاء موجود تھیں لیکن وقت گزارنے کیلئے کسی قسم کا کوئی الیکٹرانک سامان موجود نہیں تھا اس کا موبائل بھی لے لیا گیا تھا ایک پستہ قد اور گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا آدمی ضرور تھا جو صبح و شام اس کے کھانے اور ناشتہ

”ابھی تک تم بگ باس کی نظروں میں ایک کامیاب کارندے ہی ہو جب تک گڈ بکس میں ہو کوئی تمہارے اوپر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ جس دن نظروں سے گر گئے..... وہ دن تمہاری زندگی کا آخری اور اذیت ناک دن ثابت ہوگا۔ کچھ دن ادھر سکون سے رہو۔“

افضل خان کے منتشر ذہن میں اور بھی بہت ساری سرد و گرم باتیں ابھر رہی تھیں۔ جب پستہ قد والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا پھر اس نے دروازہ سے بند کرنے میں بھی بڑی جَلَت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے میں کچھ تازہ پھل اور جوس کا گلاس بھی نظر آ رہا تھا۔ افضل ہونٹ چباتے ہوئے آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنے والا ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھ کر جانے کے ارادے سے پلٹا تو افضل خان نے اسے مخاطب کیا۔

”آج پورے تین دن گزر گئے لیکن بگ باس.....“

پستہ قد والا انتہائی سکون سے پلٹا۔ اس نے بڑے خشک اور معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

”بگ باس نے تمہیں یہاں سکون سے رہنے کو کہا تھا؟ کیا تم اس ہدایت کو بھول گئے؟“

”نہیں، لیکن کچھ باتیں ہیں جو میرے ذہن کو الجھا رہی ہیں۔“ افضل خان نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”جب بگ باس یا اس کا کوئی نمائندہ آئے تو اسی سے پوچھنا۔“ اس بار بھی سنجیدگی سے جواب ملا۔ ”میرا کام صرف تمہارے لئے دانہ پانی لانا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بات کی اجازت نہیں.....“

”کیا یہاں وقت گزارنے کیلئے ٹیلی ویژن کا بندوبست.....“

”ممکن نہیں۔“ سوال مکمل ہونے سے پہلے ہی دو ٹوک انداز میں کہا گیا۔ ”میرا ایک ذاتی مشورہ بھی ہے کسی مرض سے پہلے بھلی چنگی زندگی کو غنیمت جانو۔ شام ہو تو صبح کا انتظار نہ کیا کرو بلاوا کسی وقت بھی آ سکتا ہے اور تیسری اور آخری بات..... موت سے پہلے جو سانسیں باقی رہ گئی ہیں انہیں غنیمت ہی جانو۔“

افضل خان تمللا کر رہ گیا۔ پستہ قد والے کے جانے کے بعد اس نے مجبوراً تازہ پھل کے دو چار کٹے ہوئے پیس منہ میں ڈالے پھر جوس کا گلاس اٹھا کر اسے ایک گھونٹ ہی میں ڈکار گیا۔ پستہ قد والے کے آخری تینوں جملے اس کے کالوں میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے۔ وہ افضل خان کیلئے تضحیک سے کم نہیں تھے، لیکن اسے زہر کے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے کی مجبوری کا احساس بھی تھا۔ اس کو افضل خان کی خدمت یا نگرانی پر مامور کیا ہوگا تو کچھ اختیارات بھی ضرور دیے گئے ہوں گے۔ حالات کی نزاکت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ صبر کا مظاہرہ کرتا۔

اسی شام خود شیخ حامد بھی آ گیا، اس کا چہرہ کسی تاثر کی عکاسی نہیں کر رہا تھا لیکن سنجیدگی اور آنکھوں کی سرخی اس بات کا اظہار ضرور کر رہی تھی کہ وہ اندر سے کچھ الجھا ہوا تھا۔ چندرسی جملوں کے بعد اس نے افضل خان کو مخاطب کیا۔

”تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

باقاعدہ اہتمام کرتا تھا لیکن اس نے بھی اپنے ہونٹ سی رکھے تھے۔ باہر کی دنیا کے بارے میں کوئی معلومات فراہم کرنا یا اس کے بارے میں افضل خان کے کسی سوال کے جواب میں وہ اسے صرف خشک اور تنبیہ آمیز نظروں سے دیکھتا تھا جیسے کہنا چاہتا ہو۔

”تمہارے حق میں یہی بہت ہے کہ بگ باس نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا ورنہ وہ گلاب کے مہکتے پھولوں کو بھی کسی کاٹنے سمیت برداشت کرنے کا عادی نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ صرف اسی کمرے تک خود کو محدود کر لو..... باہر کیا ہو رہا ہے اس کا زیادہ تجسس کرو گے تو ہو سکتا ہے تمہاری گنی چنی سانسیں بھی تم سے چھین لی جائیں.....“

افضل خان کو مجبوراً اس کی سرد مہری برداشت کرنا پڑتی۔ وہ اس وقت ایسی پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنی آزادی کے بارے میں کچھ سوچنے کی بھی کوشش کرتا..... شیخ حامد ہی نے اب تک اسے پھانسی کے پھندوں سے بچا رکھا تھا۔ اسی کی بدولت وہ کچھ عام سینہ تن کر آزادی سے گھومتا پھرتا تھا۔ اس کا ایک اشارہ ہی افضل خان کو موت کے گھب اندھیروں میں ہمیشہ کیلئے غرق کر دینے کیلئے کافی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میڈم روٹی کا معاملہ دو تین روز میں دب جانے کے بعد وہ پھر کھلی فضا میں سانس لے سکے گا لیکن..... جانے کیوں اب ہرگز رتا لحد اس کی انجمن میں اضافہ کر رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ کسی ذہنی دوندے کے مانند اپنے اس مختصر سے تہ خانے..... میں ادھر سے ادھر چکراتا پھر رہا تھا۔ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود اس نے ہمیشہ کھلی فضا میں سانس لی تھی لیکن اب بتدریج گھٹن کا احساس اس کو بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔ وہ بخوبی سمجھ رہا تھا کہ وہاں سے اس کے فرار کی کوئی کوشش ممکن نہیں ہو سکتی۔ باہر شیخ حامد کے دوسرے مسلح افراد بھی یقیناً موجود ہوں گے جنہیں یہ حکم بھی ضرور دیا گیا ہوگا کہ وہ کسی بھی ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کیلئے پوری طرح آزاد ہیں۔ اس کے ہاتھ پر بندھی رسٹ وایچ ہی وہ واحد ذریعہ تھی جو اسے گزرتے دنوں وقت اور تار بجنوں کی معلومات پہنچا سکتی تھی۔ وہ اپنے ذہن کی کٹافٹوں کو دور کرنے اور جوڑ پھٹوں کو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ باہر کی دنیا کے بارے میں بے شمار خیال اس کے ذہن کو کچھ کے لگا رہے تھے۔ ”میڈم روٹی کے ہوش میں آنے کے بعد کچھ نہ کچھ کارروائی تو ضرور ہوگی؟ قانون کے محافظوں کا کیا رد عمل ہوگا؟ اس کی اپنی منظر عام سے گمشدگی کو کن زاویوں سے دیکھا جا رہا ہوگا؟ پولیس نے ہوٹل کے فیجر رابرٹ کلاؤک سے بھی کچھ نہ کچھ پوچھ کچھ ضرور کی ہوگی؟ اس نے کیا بیان دیا ہوگا؟ اور اس کے دفتر کے عملے کے لوگ جو اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے بھی اس کے نام سے خوفزدہ رہتے تھے وہ اس کے بارے میں ضرور مختلف قیاس آرائیاں کر رہے ہوں گے؟ بگ باس نے انہیں مطمئن کرنے کی خاطر کوئی نہ کوئی تاثر اشارت سہی لیکن ضرور دیا ہوگا۔

اور بھی بے شمار سوالات تھے جو اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ وہ ان کے مختلف جوابات سوچ سوچ کر کبھی اپنے دل کو تسلیاں دے لیتا..... کبھی اس کی تشویش اور دو چند ہو جاتی۔ اسے اپنی زندگی کی ایک موہوم سی امید اس لیے بھی تھی کہ شیخ حامد نے خود اپنی زبان سے کہا تھا۔

افضل خان اپنی بے چارگی پر اند ہی اندر تمللا کر رہ گیا۔ اس کے سوا اس کے اختیار میں اور تھا ہی کیا؟ پھر اسی رات پستہ قد والا رات کا کھانا لے کر آیا تو اس کے چہرے پر بڑی فاتحانہ مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ افضل خان دل پر جبر کر کے کھانے کی جانب متوجہ ہوا تو پستہ قد والے نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”کس وقت کہاں کیا ہو رہا ہے اس کی بھینک اپنے بگ باس کو کسی نہ کسی طرح ضرور مل جاتی ہے۔“

”تم.....“ افضل خان جھلا گیا۔ ”کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”اپنے بگ باس کی طوطی پورے ملک میں بول رہی ہے۔ جاتے جاتے وہ تمہارے لیے ایک پیغام اور دے گیا ہے۔“ پستہ قد والے نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔ ”کل چیف منسٹر نے پولیس کے محکمے کے سارے سوراؤں اور تیس مار خانوں کو طلب کیا ہے۔ اس میں جو بھی چھان چھنک ہوگی اس کی روشنی میں ہی تمہارے بارے میں بھی کسی آزادی کے پروانے کا انحصار ہوگا۔“

پستہ قد والا اپنا جملہ مکمل کر کے مسکراتے ہوئے اگلے قدموں واپس چلا گیا۔ افضل خان ایک بار پھر تمللا کر رہ گیا۔ نیا پیغام اس کیلئے کوئی بلا سنڈ چال ہی تھی جس میں جیت کے ساتھ ساتھ ہار کے امکان بھی تھے۔

رات کا کھانا بستی کے درمیانہ درجے کے ہوٹل میں کھانے کے بعد وہ باہر نکلے تو گل خان نے لیاقت حسین سے کہا۔

”تم چلو۔ میں ایک چھینک اور دو پیالیاں لے کر آتا ہوں۔ کڑک چائے کے بغیر طبیعت سیر نہیں ہوگی۔“

لیاقت حسین کو بھی اس وقت چائے کی خواہش ہو رہی تھی اس لیے اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی پھر سیدھا گھر آ گیا۔ فرحین کے بغیر اس کی راتیں چین سے نہیں گزر رہی تھیں۔ فرحین کے علاوہ اسے ماں باپ کی یاد بھی تنہائی میں ستاتی تو وہ مضطرب ہو جاتا۔ وہ ماں کا احسان مند تھا جس نے فرحین کے حق میں اپنی مرضی کا اظہار کر کے اس کا دل رکھ لیا تھا۔ اس کی دعائیں تھیں جو وہ پھل پھول رہا تھا لیکن اسے باپ سے بھی کوئی شکوہ نہیں تھا۔ لیاقت حسین روز اول سے اس بات سے واقف تھا کہ سرفراز خان جس کے ساتھ سردار بھی لکھا جاتا تھا سخت اور ٹھوس اصولوں کا مالک تھا۔ وہ اپنی بات منوانے کا عادی تھا دوسروں کی مرضی پر اپنی مرضی کو پس پشت ڈالنا اس کی عادت کی خلاف تھا۔ لیاقت حسین کے ساتھ بھی شادی کے معاملے میں اس نے کوئی داویلا نہیں کیا صرف اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ اگر وہ باپ کے مقابلے میں اپنی پسند کو ترجیح دینا چاہتا ہے تو اس کی طرف سے کھلی اجازت ہے لیکن نافرمانی کے جرم میں اس نے لیاقت حسین کے اوپر اپنی عالی شان حویلی کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ بہر حال وہ اس کا باپ تھا۔ اس کی ماں کا سہاگ تھا جسے وہ کسی قیمت پر دل کے نہاں

”مجھے ہر قسم کے کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کا آرام ہے لیکن.....“

”اس سے زیادہ کی حالات اجازت بھی نہیں دیتے۔“ بگ باس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”ہوسکتا ہے کہ تمہیں انہی حالات کو دو تین دن اور برداشت کرنا پڑے اس کے بعد تمہیں اغوا کرنے والوں کی طرف سے رہائی بھی مل سکتی ہے لیکن آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر تاکہ تم اس بات کی نشاندہی نہ کر سکو کہ تم کو شہر کے کس علاقے میں اور کہاں رکھا گیا تھا۔“

”مجھ کیا بگ باس.....“ افضل خان نے دماغ حاضر رکھ کر سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

”یہی طریقہ مناسب بھی ہوگا۔“

”پولیس کو اغوا کی سستی خیز داستان سنانے کے بعد..... تم کسی بھی ہوٹل میں ایک دو دن قیام کرو گے۔ اس کے بعد تمہارے لیے کسی نئے اور مناسب اپارٹمنٹ کا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔“

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا تو شیخ حامد نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”تمہیں اغوا کرنے سے پہلے تمہارے اپارٹمنٹ کو کھنڈر بنانے کی خاطر ان تین نقاب پوشوں نے وہاں کی ہر قیمتی اور قابل استعمال چیز کو بڑی بے دردی سے توڑ پھوڑ کر تمہیں اپنی طاقت کا تماشا دکھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہاں لے جایا گیا اس کے بارے میں تمہیں کسی قسم کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں باس۔“ افضل خان نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ ”میڈم روبی نے کس رد عمل.....“

”اس نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ پولیس نے کوئی کیس بنانے کی حماقت نہیں کی۔ ڈی ایس پی سراج نے جو کچھ کیا میں اسے عقلمندی ہی کہوں گا لیکن ابھی یہ طے کرنا باقی ہے کہ اس کی وفاداری میں کھرے اور کھوٹے کی مقدار کیا ہے؟“ شیخ حامد نے زہریلے انداز میں کہا پھر کچھ توقف سے بولا۔

”تمہارے لیے ایک اطلاع اور بھی ہے۔ راجیلہ اپنے شوہر سیٹھ عثمان کے ساتھ واپس آگئی ہے۔“

راجیلہ کے نام پر زور دیتے ہوئے شیخ حامد نے افضل خان کو سوالیہ نظروں سے گھورا۔

”مجھے یاد ہے سراج! افضل خان نے دل پر جبر کر کے گرم جوشی سے جواب دیا۔ ”صرف آپ کے اشارے کی دیر ہوگی اور میں میڈم کو بھی.....“

”نہیں۔“ شیخ حامد نے غرا کر حکمانہ انداز اختیار کیا۔

”میرے اشارے کے بغیر کسی ہیرو بننے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا اور.....“ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کسی سے بھی غیر ضروری سوالات کے سلسلے میں آئندہ محتاط ہی رہنا۔“

پھر شیخ حامد تیزی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے پستہ قد والا بھی تھا۔ افضل خان کو بگ باس کے آخری جملوں کی روشنی میں یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی پشت پر اسی مضبوط جسم کے مالک پستہ قد والے کی کارفرمائی شامل رہی ہوگی۔

قبرستان کے اندر کی جانب رات گئے کوئی اہم ضرورت ہی اس کے دروازے تک پہنچ لائی تھی۔ وہ اندھیرے میں آگے بڑھتا رہا۔ دس پندرہ قدم چلنے کے بعد اس نے مدھم آواز میں سراج کو مخاطب کیا۔

”صاحب آپ کدھر ہیں.....؟“

”ناک کی سیدھ میں چلے آؤ۔“ لیاقت حسین پھر چل پڑا لیکن جب وہ اس قبر کے قریب پہنچا جہاں سے اس نے گندے عمل والا لیٹو نکالا تھا تو اچانک ایک کتبے کی آڑ سے جو آدمی اٹھ کر سامنے آیا اسے دیکھ کر ایک لمحے کو لیاقت حسین بھی ششدر رہ گیا۔

وہ ایک دراز قد کالا بھنگ فٹھس تھا جس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹی نظر آ رہی تھی۔ ماتھے پر چندن کی آڑی ترجھی لکیریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ سرانڈے کے جھلکے کی طرح گھٹا ہوا تھا، سب سے نمایاں اس کی سرخ سرخ آنکھوں کی پتلیاں تھیں جو آنکھوں کے حلقوں کے درمیان دیکتے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے گلے میں رنگ دانوں والی مالا میں بہن رکھی تھیں۔

کسی خطرے کا احساس ذہن میں ابھرتے ہی لیاقت حسین نے اپنے پستول کو پھرتی سے نیچے سے باہر نکال لیا۔ دینگ آواز میں سامنے والے کو لکھارا۔ ”کون ہے تم..... پلٹ انسان۔“

”دھیان سے دیکھ مورکھ۔ میں وہی پر تاب بھوش ہوں جس کے ایک عمل کو تو نے درمیان میں آ کر کھٹا کر دیا تھا۔“ جواب میں ٹھکتی ہوئی حقارت بھری آواز ابھری۔ ”تو نے اپنے گھر کے چاروں اور دیکھا میں تمہیں ہادی ہیں لیکن دیکھ لے مورکھ میری مہمان کشی تجھے کھن کے بال کے انوسار کھینچ کر بستر سے باہر نکال لائی۔ اب دھرتی کی کوئی شکتی تجھے کالی کے بھاری کے کشت سے مکتی نہیں دلا سکتی..... جے بھوانی، الکھ زجن،“ اس نے جملہ ختم کر کے نعرے لگائے۔

”اچھا ہوا تجھے تیری موت میرے سامنے کھیٹ لائی۔“ لیاقت حسین نے پستول اس کی سمت کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ”مچ.....“ فائر کی مدھم آواز سنائی دی اس کے ساتھ ہی لیاقت حسین پر جھرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے زندگی میں اسے پہلی بار کسی خوف کا احساس ہوا اس کے پستول سے نکلے ہوئی گولی گندا عمل کرنے والے منخوس کے پیٹ میں سوراخ کر کے آر پار ہو گئی تھی لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہا، البتہ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی کوندنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے نہ جانے کیا منتر پڑھ کر ہاتھوں کو لیاقت کی سمت کر کے غصے سے جھٹکا تو لیاقت حسین کو ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے اس کا پورا وجود دل ہو کر رہ گیا ہو۔ اس نے دوسرا فائر کرنے کی خاطر ٹریگر کو دبائے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ کسی مادرانی قوت نے اس کے پورے جسم کو جیسے پتھر کا بنا دیا ہو۔ پستول اس کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر گر پڑا۔ لیاقت حسین اپنی جگہ جمجھک رہا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا سن سکتا تھا لیکن اس کی زبان کچھ بولنے سے قاصر تھی۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

”اب سانپ کیوں سوگھ گیا تجھے؟“ چار ذات پر تاب بھوش کی منخوس دکر وہ آواز لیاقت حسین

خانوں سے دور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ گل خان چائے لے کر آ گیا۔ دونوں کے درمیان پھر گفتگو کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ زرینہ کے جانے کے بعد گل خان بھی اپنا بیشتر وقت لیاقت حسین کے ساتھ گزارتا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر گل خان نے پوچھا۔

”فرصین کے جانے کے بعد تو وہ پلید کا ختم پھر تمہیں نظر نہیں آیا؟“

”نہیں۔“ لیاقت حسین نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”مسجد کے امام صاحب نے آخری ملاقات میں یہی کہا تھا کہ انہوں نے گھر کے چاروں طرف اللہ کے نام کا حصار باندھ دیا ہے۔ کوئی گندی قوت اس حصار کو نہیں توڑ سکتی۔“

”خدا کا شکر ہے کہ اس غیبیٹ کے بچے سے نجات مل گیا۔“

”گل خان!“ لیاقت حسین نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ ”میرا دل بولتا ہے کہ اب فرصین کے آنے سے پہلے پہلے میں کسی دوسری جگہ گھر لے لوں۔ ادھر فرصین کو اس گندے عمل والے کا فرکی وجہ سے سکون نہیں ملتا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ گل خان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ ”ہماری دوستی ہمیشہ قائم رہے گی میں زرینہ کو ساتھ لے کر تم سے ملنے آیا کروں گا لیکن ایک بات میری بھی مان لو جو مکان بھی لو اس کو پہلے اپنے امام صاحب سے بول کر خدا کے نام کا حصار بھی پکا کر لیتا۔“

”تم نے دل خوش کر دیا میرے یار۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہاری دوستی میرے آڑے آ جائے گی۔“

”ایسا بھی نہیں ہوگا لیاقت حسین۔“ گل خان نے ایک کپ ختم کرنے کے بعد اپنے اور لیاقت حسین کا خالی کپ دوبارہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”دل میں میل نہ ہو تو انسان سات سمندر دور رہ کر بھی دل کے قریب ہی رہتا ہے۔ فاصلے میری تیری محبت میں بھی حائل نہیں ہوں گے۔“

ایک بچے رات تک وہ جاگتے رہے ہوٹل والا لڑکا آ کر کیتلی اور گلاس لے جا چکا تھا، پھر گل خان بھی اپنے گھر چلا گیا تو لیاقت چارپائی پر ٹانگیں پسا کر لیٹ گیا۔ والدین اور فرصین کی یادیں اس کو پھر ستانے لگیں وہ ان سے دور ہونے کے باوجود دل ہی دل میں دنیا جہاں کی میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا پھر نیند کی آغوش میں گم ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

دوبارہ اس کی نیند اس وقت خلل انداز ہوئی جب اس نے سراج کی آواز بہت واضح طور پر سنی تھی۔ ”لیاقت حسین! باہر آؤ۔“ سراج کسی خاص وجہ سے اسے باہر بلا رہا تھا۔ لیاقت حسین مشین انداز میں اٹھا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ سراج اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ لیاقت حسین کو اٹھا دیکھ کر سڑک پر موجود اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ لیاقت حسین نے دروازے کو باہر سے کھڑی لگائی پھر وہ بستی سے نکلنے والے راستے کی سمت دو قدم ہی اٹھا سکا تھا کہ سراج کی آواز سے قبرستان کی طرف سے آئی سنائی دی۔

اندھیرے کے سبب لیاقت حسین کو سراج نظر نہیں آیا لیکن وہ آواز کی سمت کا تعین کر کے

کے کانوں میں گونجی۔ ”تو کالی کے مہمان سیوک کو نمٹ کرنے کے سنے دیکھ رہا تھا مورکھ..... پرتو اب میں تجھے ایسا شواپ دوں گا جسے تو سارا جیون بھوکتا رہے گا۔ تیری آتما بھی کبھی شانت نہ ہو سکے گی تو بھکاریوں کے انوسار دھرتی پر رلتا پھرے گا لیکن کوئی تجھے شرف نہیں دے گا۔“

پرتاب بھوش اپنی جگہ کھڑا اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اسے موت سے بدتر زندگی کا پیغام سن رہا تھا، لیکن لیاقت حسین اپنی جگہ سے جنبش کرنے کے قابل نہیں تھا۔ پرتاب بھوش نے اپنی بات ختم کرتے ہی گلے سے ایک رنگ برنگی مالا اتار لی۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ بدبانے لگے۔ وہ کسی منتر کا جاپ پڑھ رہا تھا۔ اس کی شعلہ بار نظریں جس کی پلکوں نے جھپٹنا بند کر دیا تھا۔ لیاقت حسین کو قہر آلود انداز میں گھور رہی تھیں۔ ان میں شعلوں کا بھڑکتا رقص جاری تھا۔ لیاقت حسین اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ طاغوتی قوتوں نے اسے کسی جوانی کا رروائی سے یکسر محروم کر دیا تھا۔ پرتاب بھوش نے اپنا منتر پڑھ کر مالا پر پھونکا پھر اسے لیاقت حسین کی طرف اچھال دیا۔ ایک ثانیے کیلئے موت کا بھیا تک تصور لیاقت حسین کے ذہن میں ابھرا لیکن دوسرے ہی پل اس نے مالا کو فضا میں کسی نادیدہ شے سے ٹکرا کر نیچے گرتے دیکھا۔ پرتاب بھوش حیرت سے اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے حیرت سے سر اٹھا کر بادل کے اس سفید کلوے کو دیکھا جو لیاقت حسین کے سر پر حلق نظر آ رہا تھا۔ پرتاب بھوش ہونٹ چبانے لگا پھر اس نے قہر آلود نظروں سے لیاقت حسین کو گھورتے ہوئے تملکا کر کہا۔

”میں نے جیون میں کبھی ہار نہیں مانی لیکن..... ابھی کوئی مہا پرش تیرے اوپر مہربان ہے۔ پرتو میری نظریں دیکھ رہی ہیں کہ تیرے بھوش میں کیا لکھا ہے۔ جو ہشتک آج تیرے اوپر مہربان ہے وہ کل نہیں ہوگی۔ سے سے کی بات ہے آج بازی تیرے ہاتھ ہے کل جیون کے کسی موڑ پر تیرے پگ اوش سنسار کی سندرتا میں کہیں نہ کہیں رچ جاسیں گے پھر بازی میرے ہاتھ ہوگی.....“ پرتاب بھوش نے بل کھاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”چاہے تیرے کارن مجھے دس جنم لینے پڑیں میں تیرا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ میری بات یاد رکھنا، وہ گھڑی کب آئے گی ابھی میں نہیں بتا سکتا لیکن کالی کبھی اپنے مہمان سیوک کو نراش نہیں کرتی۔ دیر سویر کی اور بات ہے پر دے میری ہی ہوگی میرے کہے کو گانٹھ مار لے۔ میں جو چٹاونی آج دے رہا ہوں اسے کل پورا بھی میں ہی کروں گا۔“

پرتاب بھوش اپنی ناکامی کے احساس سے کسی زخمی ناگ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو لیاقت حسین کو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بندشیں جنہوں نے اسے جکڑ رکھا تھا ٹوٹ چکی ہیں..... اس کے اندر جو طوفان تھم گیا تھا وہ دوبارہ جاگ اٹھا۔ اس نے لپک کر اس مکروہ شخص کو پوری قوت سے دبوچ لیا مگر پھر جو کچھ ہوا وہ بھی اس کیلئے کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ پرتاب بھوش اس کے گھنچوں میں بس ایک پل کو کسمپاسا تھا پھر اس کا بدبودار وجود جیسے ہوا میں تحلیل ہو کر لیاقت حسین کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ اسی لمحے لیاقت حسین اس طرح چونکا جیسے وہ کوئی خواب دیکھتے دیکھتے بیدار ہو گیا ہو۔ اس نے خود کو مکان کے اندر چار پائی کے بجائے قبرستان میں کھڑے دیکھا تو بڑی سنجیدگی

سے سوچنے لگا کہ وہ اندر سے باہر کس طرح آ گیا؟ بس دو تین لمحے وہ اسی الجھن میں گرفتار رہا پھر دوبارہ خواب بیداری کی کیفیت سے دوچار ہو کر گھر کی جانب آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ دروازے کی کنڈی بھی اس نے نشینی انداز میں ہاتھ بڑھا کر کھولی۔ گھر کے اندر داخل ہو کر دروازے کو دوبارہ بند کیا اور اندر اپنے کمرے میں جا کر خاموشی سے چار پائی پر لیٹ کر اس طرح آنکھیں موند لیں جیسے کوئی غیبی یا پراسرار قوت اسے گائیڈ کر رہی تھی۔



چیف منسٹر آفس کے کانفرنس روم میں اس وقت پولیس کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے ایس پی سے لے کر اوپر تک سارے افسران موجود تھے۔ صرف دو ڈی ایس پیز کو مدعو کیا گیا تھا۔ ایک سراج اور دوسرا لودھی جو شیخ حامد کے علاقے کا ڈی ایس پی ہونے کے علاوہ اس کا خاص آدمی بھی تھا۔ شیخ حامد ہی کی وجہ سے وہ کئی سینئر افسروں کا حق مار کر اس عہدے تک پہنچا تھا۔ اوپر سے لے کر نیچے تک سب ہی کو علم تھا کہ یہ طلحی کیوں ہوئی تھی۔ سوائے ڈی آئی جی کرانمر علیہم احمد کے سب ہی منتظر نظر آ رہے تھے۔

چیف منسٹر اپنے چیئر سے نکل کر کانفرنس روم میں داخل ہوا تو سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے جو کانا پھوسی ہو رہی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ چند لمحے کانفرنس روم میں خاموشی طاری رہی پھر چیف منسٹر نے لا اینڈ آرڈر اور شہر میں جرائم کے موضوع پر مختصر روشنی ڈالی ان اعداد و شمار کے مطابق جو اسے انفارمیشن سیکرٹری نے فراہم کیے تھے اس پر سرسری تبادلہ خیال کیا پھر ایک گھونٹ پانی حلق سے نیچے اتارنے کے بعد اس نے پیشانی پر ہل ڈالتے ہوئے کہا۔

”پچھلے دنوں دہشت گردوں نے جو افراتفری پھیلائی ہوئی ہے اس نے عام شہریوں کے سکون پر بھی سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔ پانچ اشتہاری مجرموں جن کے سر کی مختلف قیمتیں مقرر تھیں۔ ان کی لاشوں کا صبح اندھیرے ہی شہر کی معروف ترین شاہراہ پر پایا جانا ہم سب کیلئے ایک بڑا چیلنج ہے۔ متعلقہ تھانے کے افراد ابھی تک مجرموں کی نشاندہی کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں جو یقیناً نااہلی کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے معروف بزنس مین شیخ حامد کے بزنس منیجر کا اغوا بھی ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے۔ اغوا کرنے والوں نے مغوی کے اپارٹمنٹ کا حلیہ جس انداز میں بگاڑا آپ کو اس کی تفصیل بھی بخوبی معلوم ہے لیکن چھتیس گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی ہماری کارکردگی صفر ہی رہی۔ اس کے علاوہ بھی اخبارات جن باتوں کی خصوصاً جرائم سے متعلق جو نشاندہی کرتے رہے ہیں ہمارے پاس ان کا بھی کوئی معقول جواب نہیں ہے یہ صورتحال ہم سب کیلئے شرمناک ہے۔“

چیف منسٹر نے باری باری سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ایک گھونٹ پانی کا اور حلق سے اتارنے کے بعد قدرے ٹھوس لہجے میں کہنا شروع کیا..... ”مرکزی حکومت سے جو جواب طلحی ہو رہی ہے اسبلی میں جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں ہمارے پاس ان کا جواب ہے؟ کب تک ہم اور آپ بغلیں جھانکتے اور الٹی سیدھی تاویلیں پیش کرتے رہیں گے؟ حیرت اور افسوس کے علاوہ شرم کا مقام

ہے کہ ابھی تک پولیس کی جانب سے کوئی نمایاں پیش رفت نہیں ہوئی۔ پانچ لاشوں کی سرخیاں ختم نہ ہو سکیں کہ اخبارات کے ہاتھ بچ حامد کے برٹس میجر افضل خان کے اغوا کا موضوع آگیا۔ اس کا جواب کون دے گا..... کیا اب مجھے اپنی کرسی چھوڑ کر آپ حضرات کی کرسیوں پر بیٹھ کر کام کرنا ہوگا؟

کانفرنس میں سب ہی دم سادھے بیٹھے تلخ حقائق اور چیف منسٹر کے تیز و تند جملوں کو سن رہے تھے متعلقہ افسروں نے اپنی اپنی نشستوں پر کسمپاسا شروع کر دیا تھا لیکن ڈی آئی جی کریمز عظیم احمد کسی ٹھہرے ہوئے طوفان کی طرح خاموش بیٹھا تھا اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔

کانفرنس روم میں ایک منٹ تک سکوت طاری رہا پھر چیف منسٹر نے قدرے خشک انداز میں کہا۔

”پانچوں اشتہاری مجرموں کی فائل کس کے پاس ہے؟“

”لاشیں دستیاب ہونے کے دو روز بعد اسے میرے پاس روانہ کر دیا گیا تھا۔“ علم احمد نے متعلقہ فائل کا ایک فلیک شدہ ورق کھولتے ہوئے کہا۔ ”مرنے والوں کے فنگر پرنٹس کے بارے میں جو رپورٹ آئی ہے وہ.....“

”وہ اوپر والوں کے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی منسٹر عظیم احمد صاحب۔“ چیف منسٹر نے الجھ کر کہا۔ ”یہ بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جو ابھی تک کھلے عام دندناتے پھر رہے ہیں؟ اور پولیس کی نظروں سے یا تو دور ہیں یا انہیں جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے؟“

”میں آپ کی دوسری بات سے اتفاق کروں گا۔“ عظیم احمد نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟“

”فنگر پرنٹس کی رپورٹس اس بات کا ٹھوس ثبوت پیش کرتی نظر آ رہی ہیں کہ مرنے والوں کا کیس جب بھی زیر تفتیش آیا پولیس کی طرف سے اس کی مکمل چھان بین کرنے سے پیشتر ہی اوپر سے احکامات آگئے اور انویسٹی گیشن آفیسرز کو مجبوراً وہ فائل سرخانی کے حوالے کرنی پڑیں۔“

”اور اب وہ اصل مجرم آسمان سے گر کر زمین پر آگئے؟“ چیف منسٹر نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں.....“ عظیم احمد نے دہی آواز مگر بے خوف لہجے میں جواب دیا۔ ”لاشوں کا اچانک منظر عام پر آنا کسی اور بات کی نشاندہی کرتا ہے۔“

”وہ بھی بتادیں؟“ چیف منسٹر کا لب ولہجہ بدستور جارحانہ تھا جو اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے ڈی آئی جی کریمز کا انداز گفتگو پسند نہیں آیا تھا۔

”محترم میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ بڑے لوگ ایسے ہیں جو غنڈہ عناصر اور دہشت گردوں کی نہ صرف پشت پناہی کرتے ہیں بلکہ ان کی پرورش بھی کرتے ہیں۔ جب تک وہ ان کے

کام آتے رہتے ہیں قانون سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ جس دن ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے اس دن ان کی لاشوں کو منظر عام پر لا کر پولیس کی کارکردگی کو چیلنج کیا جاتا ہے۔“ افسروں کے درمیان چہ گولیاں شروع ہو گئیں۔

چیف منسٹر عظیم احمد کو سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کی اس قسم کی رپورٹس میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں.....“ چیف منسٹر نے پہلو بدل کر کہا۔ ”کسی ذمے داری کو اپنے سر سے ٹالنے کی خاطر اس قسم کی باتیں کرنا بڑا آسان ہے جناب لیکن اس سے کچھ اور بھی ظاہر ہوتا ہے۔“

عظیم احمد چیف منسٹر کے آخری جملے پر تمللا اٹھا۔ بڑی سنجیدگی سے اس نے بلا جھجک دریافت کیا۔

”سر..... میں آپ کے آخری جملے کا واضح مطلب نہیں سمجھ سکا.....؟“

”آپ کے ریٹائرمنٹ میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟“ چیف منسٹر نے خشک انداز میں سوال کیا۔

”باقی ایک دن بھی نہیں رہا ہے جناب..... ایک سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔“ ”میں آپ کی فائل دیکھ چکا ہوں“ چیف منسٹر عظیم احمد کے جواب پر تمللا اٹھا۔ ”آپ کو دو سال کا ایکسٹینشن مل گیا ہے۔“

”یہ بھی اوپر والوں کا حکم تھا سر..... میں نے اس کے لیے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔“ عظیم احمد نے برجستہ کہا۔

”میں آج بھی عزت کے ساتھ گھر جانے کو تیار ہوں۔“

”آپ نے ابھی کہا تھا کہ اوپر والے یا صاحب اختیار لوگ اپنے ذاتی مقاصد کیلئے شرسپند عناصر کی پرورش کرتے ہیں۔“ چیف منسٹر کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ اس کے جملے کی ساخت نے اکثر افسران کے ہونٹوں پر لطیف تبسم بکھیر دیا لیکن کچھ افسران زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ چیف منسٹر جن نظروں سے عظیم احمد کو دیکھ رہا تھا اس میں تحقیر کا پہلو نمایاں تھا۔

”مجھے خوشی ہے جناب کہ میں نے اشتہاری مجرموں کی لاشوں کے سلسلے میں جو وضاحت کی تھی وہ آپ نے سمجھ لی۔“

عظیم احمد نے چیف منسٹر کی سخت رویا رکس کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”مذکورہ فائل میرے پاس چار روز پہلے آئی ہے اور میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں اس کی تفصیلی رپورٹ اور اپنی ایماندارانہ فائینڈنگس آپ کو پیش کر دوں گا۔“

چیف منسٹر عظیم احمد کا یہ جواب پسند نہیں آیا۔ اس نے بیزارگی سے اپنے شانوں کو ہلا کر باقی افسران کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے مجبوراً اوپر کے احکامات کی وجہ سے عظیم کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ پھر اس نے باقی افسران پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”وہ لاشیں کس کے علاقے میں پائی گئی

”سر.....“ ایس پی آغا منظور نے اپنا مائیک آن کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔ ”جس روز لاشیں ملی تھیں میں نے اسی دن سے پوری جدوجہد شروع کر دی تھی لیکن پھر اوپر سے آرڈر آگئے کہ فی الحال تفتیش روک دی جائے۔ بعد ازاں وہ فائل ڈی آئی جی کراٹر عظیم احمد صاحب کو اوپر کے حکم کے مطابق بھیج دی گئی تھی۔“

”کچھ نہ کچھ چھان بین تو آپ نے بھی کی ہوگی۔“ چیف منسٹر نے سوال کیا۔

”جی ہاں..... میں نے ایک دو باتوں کو خاص طور پر نوٹ کیا تھا۔ لیکن اس کی رپورٹ میں آپ کو مینٹگ ختم ہونے کے بعد آپ کے جیمبر میں دے دوں گا۔“

عظیم احمد نے معنی خیز نظروں سے متعلقہ ایس پی کو دیکھا لیکن صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اس انداز کو سامنے بیٹھے افسران نے خاص طور پر محسوس کیا تھا۔ وہ سب ہی عظیم احمد کی ایمانداری اور صاف گوئی کے معترف تھے۔

”افضل خان کے اغوا کی تفتیش کا کیا بنا؟“ چیف منسٹر نے آغا منظور کی طرف سے نظریں ہٹا کر سوال کیا۔

”وہ..... میں ڈیل کر رہا ہوں جناب۔“ سراج نے مائیک آن کر کے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”شیخ حامد ہمارے شہر ہی کے نہیں بلکہ پورے ملک کے سرفہرست بزنس مین اور صنعت کار شمار کیے جاتے ہیں۔ میں ابھی تک تو ان سے ذاتی طور پر نہیں ملا لیکن اب منسٹر افضل خان کے پراسرار اغوا کے سلسلے میں ان سے ایک ملاقات ضروری ہے۔ اس کے بعد اپنی رپورٹ مکمل کرنے میں مجھے زیادہ آسانی ہوگی۔“

”کوئی خاص کلیو ملا ہے آپ کو؟“

”جی ہاں..... لیکن تفتیش اور رپورٹ مکمل کرنے سے پیشتر میں اس ضمن میں کچھ کہنا قبل از وقت سمجھتا ہوں لیکن سب اشارے بہت واضح ہیں سر..... میرے پوائنٹ آف ویو سے منسٹر افضل خان کو اغوا کرنے میں کسی ایسی شخصیت کا ہاتھ ضرور شامل ہے جو کسی وجہ سے محترم شیخ حامد کو یا تو کوئی مخصوص نقصان پہنچانا چاہتا ہے یا پھر مغوی پر جبر و تشدد کر کے کوئی ایسا بزنس سیکرٹ اگلوانے کی کوشش کرے گا جو اس کے لئے مفید اور شیخ حامد صاحب کیلئے نقصان کا باعث بنے۔“

ڈی آئی جی کراٹر کے علاوہ ایس پی آغا منظور نے بھی چونک کر سراج کی طرف دیکھا۔

”مجھے اپنے ذرائع سے ایک اہم اطلاع اور بھی ملی ہے۔“ چیف منسٹر نے کسمسا کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ آپ ہمارے ملک کے ایک اور بڑے صنعت کار اور بزنس مین سیٹھ عثمان کے کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں؟“

”میں سمجھا نہیں سر..... آپ کو جو اطلاع ملی ہے اس کی تصدیق کرتا ہوں لیکن ایک کھرے پولیس آفیسر کیلئے اس کی وردی اور اس کے فرائض ذاتی دوستوں یا کلاس فیلو اور بلڈ ریلیشن سے زیادہ

”گڈ.....“ چیف منسٹر نے کہا پھر کسمسا کر بولا۔ ”اگر میں کہیں فائل آپ کے بجائے کسی اور کے حوالے کر دوں..... تو؟“

”یہ فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے سر۔ میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر کیس فائل کسی اور.....“ عظیم احمد نے بولنا چاہا۔

”سوری منسٹر عظیم.....“ چیف منسٹر نے ڈی آئی جی کراٹر کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر کہا۔ ”میں نے آپ سے رائے نہیں مانگی۔“

عظیم احمد اپنی کرسی پر پہلو بدل کر رہ گئے۔ اسی لمحے چیف منسٹر جیمبر سے ان کی پرسنل سیکرٹری نے باہر آ کر سرخ رنگ کی ایک فائل چیف منسٹر کے سامنے رکھی پھر اگلے قدموں واپس چلی گئی۔ چیف منسٹر نے فائل کھول کر ایک نظر ڈالی پھر اسے ایک طرف رکھتے ہوئے دوبارہ سراج سے مخاطب ہوا۔

”منسٹر سراج۔ میں فی الحال ایک ہفتے کا موقع آپ کو دے رہا ہوں۔ آپ نے کہا تھا کہ کسی دشمن نے شیخ حامد کو پریشان کرنے کی خاطر اس کے بزنس ٹیجر کو اغوا کیا ہے؟“

”نہیں سر..... میں نے صرف ایک خیال ظاہر کیا تھا.....“ سراج نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

”دوسرا امکان اغوا برائے تاوان کا بھی ہو سکتا ہے..... مگر چھتیس گھنٹے گزر جانے کے بعد یہ امکان زیادہ اہم نظر نہیں آتا۔“

”کوئی وجہ؟“

”ظاہر ہے سر.....“ سراج نے جواب دیا۔ ”اگر بات اغوا برائے تاوان کی ہوتی تو منسٹر شیخ

حامد سے اب تک اس کا مطالبہ کیا جا چکا ہوتا۔“

”ہو سکتا ہے کہ کیا جا چکا ہو اور آپ کو اس کا علم نہ ہو سکا ہو..... یا آپ کو انفارم کرنا کسی وجہ سے

ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔“ ایس پی اینٹی کرپشن نے پہلی بار زبان کھولی۔

”میں نے صرف اپنے خیال کا اظہار کیا تھا سر۔“ سراج نے برجستہ جواب دیا۔ ”اندرونی

حقائق اگر متعلقہ تفتیشی افسران کے علم میں نہ لائے جائیں تو پھر..... وہ کیا کر سکتا ہے۔“

خاصی دیر افضل خان کے اغوا اس کے اپارٹمنٹ میں ہونے والی سنگین نوعیت کی توڑ پھوڑ اور

پانچ شہدائی مجرموں کی لاشوں کے بارے میں مختلف افسران اپنا اپنا خیال ظاہر کرتے رہے پھر

نیف منسٹر نے دوبارہ عظیم احمد کو مخاطب کیا۔

”آپ ان لاشوں کے بارے میں اپنی فائڈنگس جلد از جلد مکمل کر کے مجھے براہ راست بھجوا

یں۔“

”ایز یوش سر.....“ عظیم احمد نے خشک انداز میں جواب دیا پھر ہاتھ بڑھا کر اپنا مائیک آف

کیا۔ چیف منسٹر کے علاوہ دوسرے سامنے بیٹھے افسران نے بھی عظیم احمد کے بگڑے ہوئے تیور

سے متنبہ ہو کر اس شخص میں کچھ نہیں کہا۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد دوسرے کمرے میں لائٹ ریفریشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ علیم احمد نے اس میں بھی شرکت نہ کر کے کھلے لفظوں میں اس بات کا خاموش اظہار کر دیا تھا وہ کسی کے دباؤ میں آکر کام کرنے کا عادی نہیں تھا۔

❖❖❖

شیخ حامد کو جیسے ہی وزیر اعلیٰ کی پولیس کانفرنس کی تفصیلی رپورٹ اپنے مخصوص موبائل پر موصول ہوئی وہ اٹھ کر اپنے وسیع و عریض پرسنل آفس میں ٹہلنے لگا۔ وہ خاص طور پر ڈی ایس پی سراج کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ کانفرنس کے دوران میں سراج نے جس طرح ایک دیبک آفیسر کی طرح کھل کر دو ٹوک باتیں کی تھیں اس کیلئے کئی مختلف پہلو اس وقت شیخ حامد کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ اس نے گزشتہ دنوں سراج کی فون کال ریسرو کرنے کے بعد گفتگو کے دوران میں اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اگر اشتہاری مجرموں کی لاشوں کے سلسلے میں پولیس والوں میں کوئی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی بھی تو سراج کے تباہی کے ثبوت نہیں آئے گی۔ شاید اس پہلو کے پیش نظر سراج نے وزیر اعلیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کی تھی۔ دوسرا پہلو یہ بھی اس کے حق میں جاتا تھا کہ اس نے میڈم روبی کو بھی یہ حفاظت رازداری سے اس کے گھر پہنچانے کے علاوہ افضل خان کے نام کو بھی منظر عام پر نہیں آنے دیا تھا حالانکہ وہ اس معاملے کی آڑ میں ڈھکے چھپے لفظوں میں بھی شیخ حامد کے خلاف تھوڑا بہت زہر تو اگل سکتا تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے علاقے کے انسپکٹر کو جو بیان رجسٹر میں اندراج، روم بکنگ کی روشنی میں دیا تھا اسے بھی ہوا دی جاسکتی تھی اور افضل خان کے منظر عام سے غائب ہو جانے کے اہم مسئلے کو بھی اس نے پولیس کے تمام سینئر آفیسر کی موجودگی میں شیخ حامد سے کسی کی دھمکی کا شاخسانہ قرار دیا تھا۔

انہی زاویوں کی روشنی میں اس نے بروقت وزیر اعلیٰ کی پرسنل سیکرٹری کو فون کر کے یہ تجویز ایک فائل میں رکھ کر کانفرنس روم تک پہنچا دی تھی کہ سراج کی جگہ فی الحال کسی اور کو انکوائری آفیسر نہ مقرر کیا جائے۔ یہ مثبت پہلو تھے جو سراج کے حق میں جاتے تھے لیکن شیخ حامد مٹی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک نکتہ یہ بھی رہ رہ کر خطرے کی سرخ حقی کی طرح اسپارک کر رہا تھا کہ ممکن ہے کہ محض شیخ حامد پر اپنی وفاداری ظاہر کرنے کی خاطر سراج نے مصلحتاً زبان نہ کھولی ہو لیکن درپردہ وہ سیٹھ عثمان کو اپنی ان چالبازیوں سے کوئی فائدہ پہنچانا چاہتا ہو.....؟

وہ خاصی دیر تک نہایت باریک بینی سے ایک ایک نکتے پر غور کرتا رہا پھر اس نے ایک دوسرا موبائل نکالا اس میں ان رجسٹرڈ سٹیمپڈ پیڑھی جس کو ٹریس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اپنی ریوالونگ چیز پر بیٹھ کر اس نے جوتوں سمیت دونوں ٹائلیں میز کے ایک کونے پر ٹکائیں پھر کسی کے نمبر بیچ کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت کسی لومڑی جیسی چالاکی چمک رہی تھی۔ ایک منٹ بعد ہی موبائل پر ایک بھرائی ہوئی۔

آواز ابھری۔

”کون ہے؟“

”بی بی ایس اے۔“ شیخ حامد نے اپنی مخصوص شناخت کرائی۔

”بی بی فور آن دی لائن سر.....“ دوسری جانب سے بھی کوڈورڈ میں جواب ملا۔

”تمہیں ایک اہم ذمہ داری سونپ رہا ہوں لیکن کسی قسم کی غفلت کا مظاہرہ نہ کرنا.....“

”بلیک ٹائیگر جانتا ہے بگ باس کہ غفلت کرنے والوں کی پہلی ہی سزا آخری ثابت ہوتی ہے۔“

”گڈ..... مجھے تمہارا جملہ پسند آیا۔“

”میں حکم کا منتظر ہوں بگ باس۔“ اس بار بھی سعادت مندی کا اظہار کیا گیا۔

”سراج کی ایک ایک نقل و حرکت پر نظر رکھو۔“ شیخ حامد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”ڈے اینڈ نائٹ ڈاک واج۔“ مجھے دو روز بعد تمہاری رپورٹ درکار ہوگی۔ وہ کہاں جاتا ہے؟ کس سے ملتا ہے؟

گھر کے اندر یا باہر کتنا وقت گزارتا ہے؟ اس کے چہرے کے تاثرات کیا ہوتے ہیں؟ مجھے ایک بات کی تفصیل رپورٹ درکار ہوگی۔“

رائٹ باس.....“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”جسے انڈر گراؤنڈ کیا گیا ہے اس کی نگرانی کے سوچی جائے؟“

تم میری طرف سے نمبر تھری کو فون کر کے ضروری ہدایت کر دو..... ویسے میرا خیال ہے کہ اب وہ زیادہ بے چینی کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔“

”اور کوئی حکم.....؟“

”نمبر تھری کو ڈیوٹی سونپنے سے پیشتر اگر مناسب سمجھو تو..... اندر والے کو یہ خوشخبری دے دو کہ اب اس کی قید کے دن گئے چنے رہ گئے ہیں..... ہو سکتا ہے کہ دو روز بعد ہی اسے کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع میسر آجائے۔“

”اوکے باس۔“

شیخ حامد نے موبائل بند کرنے کے بعد ایک لمحے کو کچھ غور کیا پھر اپنے آفس کے ریگولر فون کا ریسپورڈ اٹھا کر سیٹھ عثمان کے نمبر گھمانے لگا۔ رابطہ قائم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

”ہیلو مائی ڈیر عثمان.....“ شیخ حامد نے چپکتے ہوئے دوستانہ انداز میں گفتگو شروع کی۔ ”نور کیسا رہا؟“

”ونڈرفل.....“ دوسری جانب سے سیٹھ عثمان کی آواز ابھری۔ ”آپ کیسے ہیں؟ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟“

”سب کچھ ونڈرفل ہے۔“ شیخ حامد نے کہا۔ ”آج شام کا کیا پروگرام ہے؟“

”ایز یو ہلی..... چھ بجے دفتر سے اٹھ کر سیدھا گھر ہی جاؤں گا۔“

”بھابی نے خوب انجوائے کیا یا نہیں؟“ شیخ حامد نے اپنائیت سے دریافت کیا۔

”اس کا بس چلے تو سال میں کم از کم مجھے دوسرے اسے لے کر باہر جانا پڑے۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔ ”بیرون ملک جا کر وہ ہمیشہ بہت انجوائے کرتی ہے۔“
”ہونا بھی چاہئے.....“ ادھر بیٹھ کر بھابی کو دن بھر تمہارے انتظار کے سوا اور کیا کام رہ جاتا ہے۔“

”کیسے فون کیا.....؟“

”آج ڈنر پر میں نے تمہیں اور بھابی کو بلائے کا ارادہ کیا ہے۔“ شیخ حامد نے کہا۔ ”پلیز..... تم کوئی بہانہ نہیں کرو گے ورنہ مجھے براہ راست بھابی کو فون کرنا پڑے گا۔“
”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ سیٹھ عثمان نے اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بڑے لوگوں کے ڈنر کا وقت بھی بتا دو؟“

”ٹھیک نو بجے.....“ شیخ حامد نے جواب دیا۔ ”میں اب کوئی ایکسکوز نہیں سنوں گا اور..... ایک بات اور سن لو جلدی بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“
”اوکے۔“

”بائی.....“ شیخ حامد نے ریسپور کریڈل پر رکھ دیا اور معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک اس بات کی ترجمانی کر رہی تھی کہ وہ اپنے ذہن میں کسی خاص منصوبے کو ترتیب دے رہا تھا۔



ایمرٹس ایئر لائن کا طیارہ اس وقت بادلوں سے بہت اوپر پرواز کر رہا تھا۔ فرسٹ کلاس کے کابین میں اس وقت کل تین مسافر سفر کر رہے تھے لیکن اتفاق سے ان کی نشستیں بھی ایک دوسرے سے دور دور تھیں۔ رنگ اور نسل کے اعتبار سے بھی وہ مختلف ممالک کے باشندے نظر آ رہے تھے لیکن اتفاق سے وہ تینوں فرینکفرٹ ایئر پورٹ سے جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ جہاز کی اب آخری منزل کراچی کا انٹرنیشنل ایئر پورٹ تھی۔ فرینکفرٹ ایئر پورٹ سے روانگی کے بعد رات کا کھانا بھی انہوں نے اپنی اپنی نشستوں پر لیا تھا پھر ان تینوں نے فضائی میزبان سے اپنی اپنی پسند کی شراب طلب کی تھی۔

ان تینوں میں سب سے نمایاں وہ سیاہ فام تھا جو درمیانہ قد اور چھریرے جسم کا مالک تھا اس کے سر کے بال تھکڑے پائے تھے مگر ان کی لمبائی شاید ایک یا ڈیڑھ انچ سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں تھی اس کی آنکھیں گول تھیں پتلی کی رنگت زردی مائل تھی۔ کان اور پیشانی دونوں اس کے قد کے اعتبار سے میل کھاتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ بظاہر وہ پچیس سال کے پینے میں نظر آتا لیکن عمر کے اعتبار سے اس کے گفتگو کا انداز بوڑھوں جیسا تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی اس نے کئی بار ایئر ہوسٹس کو اپنے پاس کسی نہ کسی ضرورت سے طلب کیا تھا۔ شاید اسے یہ بات بری لگی تھی کہ محض سیاہ رنگت کی وجہ سے وہ اس کے مقابلے میں ایک پستہ قد اور چھینی صوت شکل والے چائیز میں زیادہ دلچسپی لے

رہی تھی جو رفتہ رفتہ اس فضائی میزبان سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ تیسرا مسافر جو دراز قد اور سفید فام تھا وہ ایک فیشن میگزین میں منسلک بیوٹیز کی نیم عریاں تصویروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ صورت شکل کے مقابلے میں باقی دو مسافروں کے مقابلے میں وہ زیادہ جاذب نظر تھا لیکن اس نے ایئر ہوسٹس کے کئی بار اپنے آس پاس چکر لگانے کے باوجود کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس سے مایوس ہونے کے بعد ہی ایئر ہوسٹس کی ساری توجہ چائیز کی طرف ہو گئی تھی جو بے حد سخت جان اور ٹھوس کسرتی جسم کا مالک تھا۔

اچانک سیاہ فام اپنی نشست سے اٹھا اور گلاس ہاتھ میں لیے لیے چائیز کے برابر والی خالی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ ”میرے لیے سالش کا جولاؤ.....“ اس نے ایئر ہوسٹس سے مسکرا کر کہا۔ ”ابھی لائی.....“ ایئر ہوسٹس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی پھر وہ تیزی سے لہرائی بل کھاتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”مالی دیر.....“ سیاہ فام نے چائیز سے کہا۔ لہجہ مدہم اور رازدارانہ ہی تھا۔ ”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تمہارا نام لوچن ہے۔“

”بہت خوب.....“ چائیز نے اسے خشکیں نظروں سے گھورا۔ ”آپ شاید دوسروں کو قسمت کا حال بتانے میں بھی مہارت رکھتے ہوں گے؟“

”کسی حد تک تمہارا اندازہ غلط بھی نہیں ہے“ اس نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اب چونکہ لوچن کا نام سن کر تمہارے اندر کا تجسس جاگ اٹھا ہے تو میں اپنا تعارف بھی کرا دوں۔ میرا نام ہاشم ہے۔ ہاشم فرام ساؤتھ افریقہ۔“

لوچن سیاہ فام کا نام سن کر ایک ٹائپ کو چونکا پھر مسکرا کر بولا۔ ”میرے دوست“ تم نے شاید اس علم پر پوری دسترس نہیں حاصل کی جس کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ویسے اس طرح کسی سے بے تکلف ہونے کا طریق کار کم از کم مجھے سخت نا پسند ہے۔“

”اوہ وہ.....“ جو بظاہر فیشن میگزین میں شائع ہونے والی خوبصورت لڑکیوں کی برہنہ تصویروں سے دل بہلا رہا ہے..... مجھے اپنے اور تمہارے مقابلے میں زیادہ گہرا اور بردبار نظر آتا ہے..... اس کا نام یقیناً ڈوما ہوگا۔“

”تم اس قسم کی فضول باتوں سے کیا ظاہر کرنا چاہتے ہو؟“ چائیز کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

”نہیں میرے دوست.....“ سیاہ فام نے مدہم آواز میں کہا۔ ”یہ درست ہے کہ ہمیں منہ مانگا معاوضہ دیا جا رہا ہے لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو..... کیا ہم الگ الگ رہنے کے بجائے اگر جہاز اترنے سے پیشتر ہی ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں تو یہ ہمارے حق میں بہتر ثابت نہ ہوگا۔ ایک ساتھ مل بیٹھنے کے بعد ہم کسی بڑے وقت میں ایک دوسرے کے کام بھی آسکتے ہیں۔“
”اب تک تم تنہی پی چکے ہو؟“ چائیز کے لہجے میں ترشی اتر آئی۔

”تم شاید اس وقت گلاس کی تعداد معلوم کرنا چاہتے ہو.....“ ہاشم کے نام سے خود کو متعارف کرانے والے نے چبھتے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”شراب ہمارے لیے پانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی..... میرا تعلق جنوبی افریقہ کے جس حصے سے ہے وہاں بارہ سال کی عمر کے بچے بھی ایسی چھٹی چھوٹی منکیوں میں پینے کے عادی ہوتے ہیں جن میں کم از کم چار پیگ تو ضرور ہوتے ہیں۔“

”آئی سی.....“ چائینز نے جھلا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب مجھے بھی سکون سے بیٹھنے کی خاطر کسی دوسری نشست کا انتخاب کرنا ہوگا۔“

”تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“ ہاشم نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ”لیکن جانے سے پہلے یہ اچھی طرح سوچ لو..... کہ ہمیں صرف ایک کلیو دیا گیا ہے..... سیون اشارز..... اس حوالے سے ملنے والے احکامات پر ہمیں آنکھ بند کر کے ہی موت کے منہ میں بھی چھلانگ لگانے پر آمادہ ہونا پڑے گا۔ کیا ایسی صورت میں قبل از وقت ہمارا گھوڑا مناسب نہ ہوگا؟“

چائینز جو اپنی نشست سے آدھا اٹھ چکا تھا۔ سیون اشارز کے حوالے پر دوبارہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے تک وہ کسی ذہنی خلفشار میں مبتلا رہا پھر جب ایئر ہوسٹس سائنس کا جو کی بھری ہوئی پلیٹ ٹرے میں رکھ کر واپس چلی گئی تو چائینز نے جسے لوچن کے نام سے منسوب کیا گیا تھا کسماکس بولا۔

”تم..... شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے سیاہ قام کی تائید کی۔

”ٹھیک نہیں..... بہت زیادہ ٹھیک.....“ ہاشم معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”پچیس ہزار امریکن ڈالرز کا ایڈوانس جو ہمیں صرف ذاتی جیب خرچ کیلئے دیا گیا ہے یقیناً بے حد پرکشش ہے۔ دیگر تمام اخراجات کی ذمہ داری ”سیون اشارز“ یا اس کے نمائندوں کی ہوگی لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ ہماری پوزیشن کوئی ذاتی کوڈ ورڈ طے کر لینے کے بعد زیادہ محفوظ رہے گی یا ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر؟“

لوچن نے تیسرے مسافر کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا پھر ہونٹ چباتے ہوئے بڑی رازداری سے بولا۔

”کیا تم اس کا نام بھی جانتے ہو؟“



”ہاں..... اس کا نام ڈوما ہے اور وہ بیروت سے تعلق رکھتا ہے۔“ ہاشم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے خوبصورت لڑکیوں میں زیادہ دلچسپی ہی کسی دن اس کی موت کا سبب بن جائے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ لوچن چونکا۔

”اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی ایک محبوبہ کو پہلے ہی وہاں روانہ کر دیا ہے جہاں ہمیں جہاز سے اتر کر مختلف ہوٹلوں میں علیحدہ علیحدہ ٹھہرنے کی ہدایت ملی ہے۔ ممکن ہے اس کی محبوبہ پہلے ہی وہاں اپنے لیے کمرہ کرا چکی ہو اور بعد میں ڈوما اس کے ساتھ اتفاقاً دوستی کا ڈراما رچانے کی کوشش کرے۔“

”کیا تم اس کی محبوبہ کے نام سے بھی واقف ہو؟“ لوچن نے ایک بار پھر حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں..... اور یہ بھی جانتا ہو کہ اس کا تعلق امریکا کے ایک نائٹ کلب سے ہے۔“ ہاشم نے چٹارے لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”لڑکی خاصی نمکین ہے مگر میرا تجربہ کہتا ہے کہ نمک کی زیادتی کبھی کبھی زہر سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔“

”ہوں.....“ لوچن نے ایک بار پھر تیسرے مسافر کی جانب دیکھا جو بدستور فیشن میگزین دیکھنے میں منہمک تھا۔

”تم شاید یہ سوچ رہے ہو مائی ڈیز لوچن کہ ہم اسے کس طرح اپنے پروگرام میں شامل کر سکتے ہیں۔“ ہاشم نے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔ ”تم درمیانی نشستوں پر جا کر بیٹھو۔ اسے وہاں لانا میری ذمہ داری ہوگی۔“

لوچن نے اس کی تجویز پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی پھر اسے یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوا کہ ہاشم نے تیسرے شخص کے پاس جا کر مدھم آواز میں کوئی ایسی ہی بات کہی تھی کہ وہ ایک بل کو چونکا، لیکن ہاشم کے ساتھ ہی اٹھ کر لوچن سے ایک سیٹ چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ ہاشم نے درمیانی نشست سنبھال لی تھی۔ کچھ دیر تک وہ تیسرے شخص سے جس کا نام ڈوما ہی تھا گفتگو میں مصروف رہا پھر وہ تینوں سرجوڑ کر آپس میں کانا پھونسی کرنے لگے، لیکن اپنی منزل قریب آنے سے ایک گھنٹہ پیشتر ہی اٹھ کر اپنی اپنی نشستوں پر چلے گئے۔ بظاہر ایسا ہی لگا جیسے فضائی سفر کے درمیان تین اجنبی مسافر وقت گزارنے کی خاطر ایک دوسرے سے ملے تھے پھر ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن گئے۔ ہاشم اور ڈوما دونوں ہی کے چہروں سے بے فکری عیاں تھی لیکن..... لوچن جو مارشل آرٹ کا ماہر ہونے کے علاوہ متعدد بار

وہ ذہنی حادثہ کیا تھا؟ بلیک ٹائیگر کا پاس ورڈ استعمال کرنے والا گفتگو ختم کرنے کے بعد فوری طور پر وہاں سے کیوں ہٹ گیا؟ سراج اور علاقے کے تھانے والوں کی آمد کا مقصد کیا تھا؟ یہ تین سوالات شبنم کو الجھا دینے کے لیے کافی تھے۔ ایک چوتھا اندیشہ بھی اس کی رگوں میں خون کی سردلہر بن کر گردش کر رہا تھا۔ اگر میک اپ کے باوجود شبنم کی اصلیت بھانپ لی گئی تھی تو اس کا وجود بھی بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے کسی معصوم خرگوش سے کم نہیں تھا۔ اسے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ بگ باس اس کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا تو اسے موت کے حوالے کرنے میں ایک پل کی بھی تاخیر نہ کرتا۔

تین روز تک اس نے جس انداز میں شیر کی کچھار میں بیٹھ کر ڈیوٹی انجام دی تھی، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ بلیک ٹائیگر کے اتفاق نظر میں آ جانے کے بعد افضل خان کے قلیٹ میں ہونے والی توڑ پھوڑ اور خود افضل خان کی اچانک گمشدگی نے بھی اسے اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اخبارات نے جن جلی سرخیوں کے ساتھ نمک مرچ لگا کر افضل خان کی خبر کو ہوا دی تھی وہ بھی اس کے لیے کچھ کم تشویشناک نہیں تھا۔ اس ضمن میں شبنم کے ذہن میں دو نام ابھرے تھے۔ ممکن ہے اس ہوٹل میں یہ صورت پیش آئی ہو جو سانحہ گزرا تھا اس نے میڈم کو بھی جوابی کارروائی پر اکسایا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خود بگ باس نے ہوٹل میں ہونے والے کسی حساس حادثے کو محسوس کرنے کے بعد شطرنج کے گھوڑے والی چال چلی ہو۔ اس نے خود ہی افضل خان کے اپارٹمنٹ میں توڑ پھوڑ بھی کرائی ہو اور وقتی طور پر اس کے اغوا کی ایف آئی آر درج کرنے کے بعد قانون کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہو کہ اس واردات کی پشت پر اس کے کسی دشمن کا ہاتھ شامل ہے۔

بہر حال تین روز سے شبنم نے اپنی تمام بیرونی مصروفیات کو یکسر ختم کر رکھا تھا۔ خود کو اپنے اپارٹمنٹ سے دفتر اور دفتر سے سیدھے اپارٹمنٹ واپس آنے تک محدود کر لیا تھا۔ اس دوران میں اس نے میڈم کے علاوہ کسی اور کو بھی فون کرنے کی غلطی نہیں کی تھی، لیکن اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ میڈم کو فون کر کے اس کی خیریت دریافت کر لے۔

کافی غور و خوض کے بعد اس نے فون اسٹینڈ کو گھسیٹ کر قریب کیا، پھر اس نے ریسیور اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فون پر ہونے والی کال بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں پھر ڈانوں ڈول ہو گئیں۔

”رات کے سوا بارہ بجے کون فون کر سکتا ہے؟“ اس نے سوچا پھر چوتھی ٹھنٹی بجنے کے بعد اس نے ریسیور اٹھا کر نیند میں ڈوبی آواز بنا کر پوچھا۔

”ہیلو..... کون.....؟“

”تین روز سے کہاں غائب ہو..... سوئٹ چاکلیٹ!“

”نان سینس!“ شبنم نے جھلا کر کہا۔ ”کون ہو تم.....؟“

”تمہاری یہ ادا میں تو دل پر برچھیاں چلاتی ہیں“ ہنسی۔ ”بولنے والے نے بہکی بہکی آواز میں

دوسری مختلف پارٹیوں کے لیے بھی منہ مائی اُجرت پیشگی لینے کے بعد اپنے جرائم پیشہ تجربوں کا بھرپور مظاہرہ کر چکا تھا، اس وقت بار بار کن اکھیوں سے ہاشم کا طرف دیکھ رہا تھا..... شاید اس لیے کہ سابقہ موقعوں پر اسے کبھی کسی سیاہ فام باشندے کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لوچن نے اپنی عام زندگی میں جنوبی افریقہ کے دور دراز قبیلوں میں بسنے والوں کے سلسلے میں بڑی عجیب و غریب کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کہانیاں پڑھنے والوں کی دلچسپی کی خاطر کسی رائٹر کی من گھڑت ہوں گی، مگر سیاہ فام ہاشم..... لوچن کو وہ بھی کسی پراسرار کہانی کا مادرائی ہیرو محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہاشم کو اپنے سابقہ تجربوں کی بنیاد پر نگاہوں نگاہوں میں تول رہا تھا پھر..... اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی بن کر کودا..... ”کہیں خود ہاشم ہی تو وہ پراسرار شخص نہیں جس کے اشارے پر لوچن اور ڈوما کو بگ کیا گیا تھا؟“

اس وقت رات کے سوا بارہ کا عمل تھا، لیکن شبنم اس وقت بھی اپنے بستر پر نیم دراز کی گہری سوچ میں غرق تھی۔ تاج محل ہوٹل میں نظر آنے والا دراز قد اور سنہری فریم کے لائٹ کمر گلاسز استعمال کرنے والا شخص اس کے ذہن کے گوشوں میں اس وقت بھی کسی خطرناک بچھو کے مانند رہ کر ڈنگ مار رہا تھا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ موبائل ریسیو کرنے کے بعد وہ جس انداز میں اٹھ کر تنہائی میں گیا تھا اسے محسوس کر کے شبنم کا تجسس بھی جاگ اٹھا تھا، جس کے نتیجے میں بلیک ٹائیگر کا پاس ورڈ بھی اس کے علم میں آ گیا تھا۔

دراز قد والے نے اسی پاس ورڈ کا حوالہ دینے کے بعد ہی کسی کو فوری طور پر ایمر جنسی کے وقت استعمال کیے جانے والے راستے سے فرار ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ اس کی پوری گفتگو نہیں سن سکی تھی، لیکن بلیک ٹائیگر اور سراج کا نام سن لینے کے بعد اس کے ذہن میں فوری طور پر افضل خان کی پک کا نام ابھر اٹھا۔ اس کے بعد ذہن میں یہ اندیشہ بھی سر اٹھانے لگا کہ شاید میڈم کو بھی کسی خطرے سے دو چار ہے؟ اس تجسس کو وہ فوری طور پر دور کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ سب سے پہلے ضروری تھا کہ وہ مزید کسی کی نظروں میں آئے بغیر واپس گھر پہنچ جائے۔ اگر بلیک ٹائیگر کا پاس ورڈ استعمال کرنے والا بگ باس کا کوئی آدمی تھا تو شبنم کی وہاں موجودگی کی سرجری بھی بعید از قیاس نہ ہوتی۔

اپنے اپارٹمنٹ تک جانے کے بعد بھی اس کا دل کسی انجانے خوف سے دھڑکتا رہا، کسی امکانی تعاقب کی وجہ سے اس نے مختلف سواریاں بدلیں اور کئی راستے اختیار کیے تھے۔ اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لیا، لیکن عارضی میک اپ سے چھٹکارا پانے کے بعد جب اس نے میڈم کو فون کیا تو ہوٹل میں اس کے ذہن میں ابھرنے والے خدشے نے یقینی صورت اختیار کر لی۔ دوسری جانب سے تمہریا نے میڈم کی جو کیفیت بتائی تھی وہ بھی اس بات کی جانب اشارہ کرنے کے لیے کافی تھی کہ وہ کسی ذہنی حادثے سے دو چار ہونے کے بعد ہی گھر پہنچی ہوگی، ورنہ کسی ڈاکٹر کی آمد اور نیند کا انجکشن لگانے کی نوبت پیش نہ آتی۔

کہا۔ ”سامنے ہوتی ہو تو محبت جتنی ہو نظروں سے اوجھل ہوتی ہو۔۔۔۔۔“

”بکواس بند کرو۔۔۔۔۔ ایڈیٹ۔“ شبیم نے جھلا کر ریسور کریڈل پر تقریباً پنج دیا۔ اس قسم کی رانگ کالز اسے پہلے بھی موصول ہوتی رہی تھیں، مگر اس وقت نہ جانے کیوں اس کا دل اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ دوسری جانب سے بولنے والا شاید اجنبی نہیں۔۔۔۔۔ کوئی خاص واقف کار تھا جو فلٹ کرنے کے بہانے اس بات کی ٹوہ لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس وقت اپارٹمنٹ میں موجود ہے یا نہیں۔ اس نے فوری طور پر میڈیم کو کال کرنے کا خیال ترک کر دیا پھر اس آواز کے بارے میں ذہن کو کریدنے لگی جس نے کچھ دیر پہلے اسے کال کیا تھا۔

اس سس کالز کی وجہ سے وہ رات کو دو بجے کے بعد ہی سو سکی تھی لیکن صبح وقت سے پہلے ہی اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گئی۔ بگ باس وقت کی پابندی کا قائل تھا، دیر سے آنے والوں کی قاعدہ باز پرس ہوتی تھی، جس کا عذر معقول نہ ہوتا یا بگ باس کو پسند نہ آتا اسے فوراً ہی فارغ ہونے کے احکامات صادر کر دیے جاتے تھے۔

دوپہر کو گیارہ بجے تک وہ بڑی مستعدی سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتی رہی، پھر اس وقت اس کے ہاتھ پاؤں محاورتا نہیں بلکہ حقیقتاً پھول گئے جب بگ باس کی پرسل سیکر یڈی نے اسے یہ اطلاع دی کہ باس نے اسے اپنے پرسل آفس میں طلب کیا ہے۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب اس کا بلاوا آیا تھا۔ شبیم نے اپنی جگہ دوسری آپریٹر کو ڈیوٹی سونپی پھر دل ہی دل میں اپنی خیریت کی دعائیں مانگتے ہوئے اس نے بگ باس کے پرسل آفس پر تعینات گارڈ سے کہا کہ اندر اس کے آنے کی اطلاع پہنچا دی جائے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے پہلی بار دھڑکتے ہوئے دل سے باس کے آفس میں قدم رکھا۔ اس کے دل دو ماغ میں سیکڑوں دسو سے کلہلا رہے تھے لیکن خلاف توقع شیخ حامد نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو اسے کچھ تقویت کا احساس ہوا۔ وہ بڑی سعادت مندی سے سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گئی لیکن نظریں اٹھا کر بگ باس کے چہرے کی سمت دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی۔

”تمہارا نام شاید شبیم ہے؟“ نابل انداز میں سوال کیا گیا۔

”جی ہاں۔“ شبیم۔۔۔۔۔ جواب دیتے ہوئے گڑبڑائی۔

”میں نے تمہیں ایک پرسل کام کے سلسلے میں اس وقت زحمت دی ہے۔“

”میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی تصور کروں گی۔“ پہلی بار اس نے بگ باس کی طرف نظر اٹھا کر

بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔

”آج رات کو تمہارا کوئی مخصوص پروگرام تو نہیں ہے؟“ شیخ حامد نے بے تکلفی سے سوال کیا کہ تو وہ پھر گڑبڑا گئی۔ مخصوص پروگرام کے حوالے سے کیا جانے والا سوال اس کی سمجھ میں نہ آ سکا تھا۔

”گھبراؤ نہیں۔۔۔۔۔“ شیخ حامد نے قدرے سنجیدگی سے وضاحت کی۔ ”میں تمہاری جیسی اسامات اور خوبصورت لڑکیوں کے سلسلے میں زیادہ پابندیاں عائد کرنے کا قائل نہیں ہوں۔۔۔۔۔ تم شاید اپنے

اپارٹمنٹ میں بھی تنہا رہتی ہو؟“

”لائف انجوائے کرنا اس عمر کا تقاضا بھی ہو سکتا ہے لیکن۔۔۔۔۔ اس بات کا خیال رہے کہ تم جس

کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہو اس کا تعلق کس قماش کے لوگوں سے ہے۔“

شبیم نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ذہن میں اس وقت کئی اندیشے سراٹھا رہے تھے۔

”اگر آج رات تمہارے پاس وقت نہیں ہے تو میں کسی اور کا بندوبست بھی کر سکتا ہوں۔“ شیخ حامد نے گول مول انداز میں کہا۔

”مم۔۔۔۔۔ میں فارغ ہوں سر۔۔۔۔۔!“ اس نے تھوک گل کر بہ مشکل جواب دیا۔

”گڈ۔۔۔۔۔“ شیخ حامد نے اس بار اصل مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”گزشتہ رات سے میری

مسز کی طبیعت تاساز ہے اس لیے وہ شاید ان مہمانوں کو ٹھیک طور پر اینڈ نہ کر سکے گی۔ یہ ذمہ داری

تمہیں نبھانی پڑے گی بشرطیکہ تمہیں کوئی اعتراض۔۔۔۔۔“

”مجھے آپ کے حکم سے بھلا کس طرح انکار ہو سکتا ہے سر!“ شبیم نے اپنی آمادگی کا اظہار کرنے میں دیر نہیں کی۔

”فائن۔۔۔۔۔“ شیخ حامد نے تھوڑے توقف کے بعد معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”ایک بات

تمہیں قبل از وقت بتا دوں۔۔۔۔۔ میری مسز میرے کردار کو بہت صاف ستھرا بھی نہیں سمجھتی ہو سکتا ہے کہ

وہ تمہیں بھی مشکوک نظروں سے دیکھے لیکن تم اس کا کوئی نوٹس نہ لیتا۔ میں بھی اس بات کی پروا بھی

نہیں کرتا کہ کون میرے بارے میں کیا رائے ہے۔“

”مجھے کس وقت آنا ہوگا سر۔۔۔۔۔؟“

”ٹھیک آٹھ بجے۔“ شیخ حامد نے اس بار تحکمانہ انداز اختیار کیا۔ ”لباس صاف ستھرا ہو

اور۔۔۔۔۔ تھوڑا سا میک اپ بھی ضروری ہے۔“

”رائٹ سر۔۔۔۔۔“ شبیم نے اس بار بھی سعادت مندی سے جواب دیا۔

”تم نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ میں نے کن معزز مہمانوں کو انوائٹ کیا؟“ شیخ حامد نے میز

پر کئے ہوئے پیپر ویٹ پر ہاتھ جما کر اسے زور سے گھماتے ہوئے چھوڑ دیا، پیپر ویٹ چکراتا ہوا میز

پر پھیر کر گیا۔ شبیم اسے اٹھانے کی خاطر اٹھنا چاہتی تھی لیکن شیخ حامد نے اسے اشارے سے منع

کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں نے جس مہمان اور اس کی خوبصورت اور حسین وائف کو ڈنر

کا انوائٹ کیا ہے وہ۔۔۔۔۔ سیٹھ عثمان ہے، میرا سب سے بڑا کاروباری حریف۔۔۔۔۔ اینڈ آئی ہیٹ

ہم۔“

شبیم رنگ رہ گئی۔ شیخ حامد کا وہ انوکھا مگر خطرناک روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی، لیکن کسی قسم کا

خوف اس کی ہونٹوں میں نہیں تھی۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ سیٹھ عثمان کو دعوت دینے کے پیچھے

اس کی نیک نیتی کو کوئی دخل نہیں تھا۔

”اب تم جاسکتی ہو مگر ایک بات کان کھول کر سن لو..... میرے اور تمہارے درمیان جو بات ہوئی ہے اسے بھول جانا۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔ ”صرف اتنا یاد رکھنا کہ تمہیں ٹھیک آٹھ بجے میری کٹھی پر پہنچنا ہے۔“

”رائٹ سر.....“ وہ جانے کے ارادے سے اٹھی۔ شیخ حامد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے پرسنل آفس سے باہر نکلنے کے بعد شبنم نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی آدم خود مگر مجھ کے منہ میں جا کر زندہ سلامت باہر نکل آئی ہو۔

❖❖❖

تاج محل ہوٹل میں پیش آنے والے حادثے کے بعد میڈم روبی آج پہلی بار گھر سے نکلی تھی۔ اس وقت وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کی پرسنل سیکریٹری تھریسا بھی اس کے ساتھ تھی۔ پہلے اس کا پروگرام ریڈیو کلب جانے کا تھا، لیکن راستے میں اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر کے کار کار رخ ساحل سمندر کی سمت جانے والی کشادہ سڑک کی طرف موڑ دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آرہی تھی، جب تھریسا نے اسے دہی زبان میں مخاطب کیا۔

”میرا خیال ہے کہ گرے رنگ کی ایک ہائی روف ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ تمہارا اندازہ درست ہو لیکن.....“ میڈم نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کہا۔ ”میں کوشش کے باوجود ابھی تک اسی شک سے دو چار ہوں جو میرے اعصاب کو جھنجھوڑ دینے کے لیے کافی تھا۔“

”ریلیکس.....“ تھریسا نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

”جو ہو چکا ہے اب اس کو یاد کرنے سے کیا حاصل۔ ہمیں آئندہ کے لیے بہت محتاط روی سے کام لینا پڑے گا۔ جو ڈراما دشمنوں نے اسٹیج کیا ہے اس کے توڑ کے لیے اب کوئی فوری کارروائی ناگزیر ہوگئی ہے۔“

”میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔“

”کوئی تاخیر ہمارے لیے.....“

”تھریسا.....“ میڈم نے اس کی بات کاٹ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں اپنے شوہر کی موت کو آسانی سے بھول سکتی ہوں؟“

”میں سمجھ رہی ہوں کہ اس وقت آپ کس کیفیت سے دو چار ہیں لیکن.....“

”فی الحال میں صرف اس ایک اہم بات پر غور کر رہی ہوں کہ سراج ہمارے لیے کسی حد تک کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔“

”سوری میڈم.....“ تھریسا نے کسمسا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”پولیس والوں کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔ ہر شخص کو اپنا مفاد زیادہ عزیز ہوتا ہے پولیس والے تو قدم قدم پر کینچل بدلنے کے عادی ہوتے ہیں۔“

”جانتی ہوں لیکن رسک لیے بغیر جیت اور ہار کا کھیل مزہ نہیں دیتا۔“ میڈم کا لہجہ سپاٹ تھا، تھریسا نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا پھر عقبی شیشے پر نظر ڈال کر بولی۔

”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم کچھ راستے تبدیل کر کے اس بات کا یقین کر لیں کہ گرے کلر کی ہائی روف کا ایک مخصوص فاصلے سے ہمارے پیچھے پیچھے آنا کیا معنی رکھتا ہے۔“

”نہیں.....“ میڈم نے اس بار بھی بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ساحل پر اس وقت لوگوں کا خاصا جھوم ہوگا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہی سوچا جائے گا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔“

”آپ بہتر سوچ سکتی ہیں مگر..... پُر جھوم مقامات پر پیشہ ور قاتلوں کے لیے کسی دشمن کو راستے سے ہٹانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مجرم کو فرار کے موقعے جھوم کی بھگدڑ اور افراتفری بھی فراہم کر دیتی ہے۔“

میڈم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار اچانک تیز کر دی عقبی شیشے کی طرف اس نے ایک یار بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی لیکن تھریسا پوری طرح ہوشیار تھی۔

”اب شہجے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔“ اس نے میڈم کو کسی متوقع خطرے کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ ”تعاقب کرنے والی ہائی روف نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی ہے۔“

”تم نے شاید کسی انسان کو بے بسی کو موت مرتے نہیں دیکھا۔“ میڈم نے بے حد کرب سے جواب دیا۔

”جہاں ماہر شکاریوں کی تعداد زیادہ ہو اور شکار ان کے جال میں پوری طرح پھنس جائے۔ اپنے بچاؤ کے لیے صرف موت کے انتظار کے سوا کچھ بھی نہ کر سکتا ہو۔ وہاں بھی درندہ صفت قاتل اپنے شکار کو تڑپا تڑپا کر مارنے کو زیادہ ایڈوانس جڑھتے ہیں۔“

”میڈم پلیز.....“ تھریسا نے یلکھت فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”گاڑی واپس موڑ لیں۔ آپ کی طبیعت اس وقت.....“

”غلط خیال ہے تمہارا..... میں اس وقت بالکل نارمل ہوں۔“ میڈم نے ہونٹ چباتے ہوئے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”تم جس خطرے کو محسوس کر رہی ہو وہ کسی بھی وقت کہیں بھی پیش آ سکتا ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور..... تم نے شاید وارنلر کو کبھی دلچسپی سے نہیں دیکھا، کوئی بم بلاسٹ ہونے کے بعد جب انسانی جسم کے اعضا منتشر ہو کر فضا میں اڑتے دور دور بکھرتے نظر آتے ہیں تو اکثر تماشا بین جوش میں تالیاں بجانا شروع کر دیتے ہیں۔ جانتی ہو وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟..... وہ موت اور زندگی کا کھیل دیکھتے وقت کسی ایک فریق سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ جب مخالف گروپ کے لوگ مارے جاتے ہیں تو وہ اپنے جوش پر قابو نہیں پاسکتے۔ خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔“

”میڈم..... پلیز، آپ کی طبیعت اس وقت.....“

”تم کچھ حقائق سے لاعلم ہو۔ شاید اس لیے گھبرا رہی ہو۔“ میڈم نے عجیب انداز میں جواب

بارک کیے جانے کے بعد ایک دوسری کار بھی اس کے سیدھے ہاتھ پر آ کر رکی اس کار میں ایک مختصر ٹیلی موجود تھی۔ تھریا پوری توجہ سے حالات کا جائزہ لے رہی تھی اس کا خیال تھا کہ اگر اس کے ذہن میں تعاقب اور خطرے کا ابھرنے والا خیال غلط نہیں تھا تو ہائی روف سے اترنے والا چند لمحوں میں کھل کر اس کی نظروں کے سامنے آ جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہائی روف کے برابر رکنے والی کار دو منٹ بعد ہی تھوڑی سی ریورس ہوئی پھر واپسی کے راستوں پر اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

”تھریا.....“ میڈم نے بچوں کی طرح تھریا کا ہاتھ تھام کر سمندر کے ساحل کی طرف اشارہ کیا جہاں مرد عورتوں اور بچوں کی خاصی تعداد جمع تھی، تین بچے ہر قریب آنے والی بلند لہر پر اس طرح چھلانگ لگا رہے تھے جیسے پانی پر سلاؤڈ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ”ڈراغور سے ان بچوں کو دیکھو کیسی سویٹ اور معصوم اچھل کود کر رہے ہیں، جیسے انہیں دنیا کے ہنگاموں سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ ہو۔“

یو آر اراٹ میڈم..... ویسے کیا مناسب نہ ہو گا کہ ہم ہوٹل کے فرسٹ فلور پر بیٹھ کر سمندر اور ساحل پر موج میلہ کرنے والوں کا نظارہ کریں۔“

”اسی بہانے ایک ایک آئس کریم فالودہ بھی چل سکتا ہے۔“ میڈم نے ہوٹل کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اس کے بعد ہم بھی ساحل کنارے چلیں گے۔“

”ایز پووش.....“ تھریا، میڈم کو لے کر میزبیاں طے کرتے ہوئے ہوٹل کے اوپر حصے کی طرف لے گئی جہاں تین چار فیملیز اور بھی تھیں۔ اس فلور سے وہ گرے کمر کی ہائی روف کی پوزیشن اور کسی متوقع دشمن پر بھی نظر رکھ سکتی تھی۔

میڈم نے آئس کریم فالودہ کا آرڈر دیا پھر دوبارہ ساحل پر اچھلنے کودنے والے بچوں کو دیکھنے لگی۔ تھریا کی نظریں بار بار ہائی روف کی جانب اٹھ رہی تھیں اس کے اور بظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، ہو سکتا تھا کہ وہ اندر نشستوں پر لیٹے ہوں اور واپسی میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر اپنی عملی طاقت کا مظاہرہ کریں۔

آئس کریم فالودہ آنے کے بعد میڈم اس طرح اسے کھانے میں مصروف ہو گئی جیسے ایک عرصے سے کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی، تھریا نے بھی اپنا گلاس ہاتھ میں اٹھالیا لیکن..... ایک خوفناک دھماکے کی آواز اس قدر اچانک اور شدت سے ابھری کہ تھریا کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر الٹ گیا، کئی عورتیں اس اچانک ہونے والے دھماکے سے چیختے چلانے لگیں۔ ساحل پر موجود افراد بھی ہانگوں کی طرح اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف دوڑنے لگے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی، فہرست فلور پر بیٹھی فیملیز بھی نیچے چلی گئیں۔

تھریا نے پلیٹ کر ہائی روف کی سمت دیکھا جس کی باڈی کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ کر بکھر چکی تھی اور آگ کے شعلے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ تھریا نے کسی خیال کے پیش نظر

دیا۔ ”جانتی ہو تھریا کہ جب کوئی شخص پہلی بار کسی کو قتل کرتا ہے تو اس کے اندر خوف ہی خوف بھرا ہوتا ہے۔ پھانسی کا پھندا اس کی نظروں کے سامنے لٹکتا نظر آتا ہے۔ اپنے ارادے میں کامیابی کے باوجود وہ کسی خوشی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کا خود اپنا انجام اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر اس خوف کو ہوا دیتا رہتا ہے۔ سب سے پہلے وہ زندہ رہنے کے لیے فرار کا راستہ تلاش کرتا ہے، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ دو چار زندگیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کا خوف دل سے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر لاش کے اوپر جوتے سمیت اپنے پاؤں رکھ کر کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ دوسرے خوفزدہ ہو کر پناہ کی تلاش میں دوڑ دھوپ شروع کر دیتے ہیں۔ قانون کے رکھوالے بھی عادی جرائم پیشہ لوگوں سے دور ہی دور رہتے ہیں۔ جب وہ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد موقع واردات سے چلا جاتا ہے تو وہی قانون کے محافظ سینڈتان کر سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک نظام ہے جو موت اور زندگی کی آنکھ چوٹی کو مزید پراسرار بنا دیتا ہے۔“

تھریا بہت زیادہ الجھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میڈم اس وقت ہوش مندی کی باتیں نہیں کر رہی۔ شاید تاج محل ہوٹل کے سامنے اس کی شخصیت کو اس حد تک مجروح کر دیا تھا کہ وہ فرسٹریشن کے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو گئی تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب تھریا نے اسے اس قسم کی باتیں کرتے سنا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا، لیکن اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میڈم اس کے خیال کے مطابق جس قسم کی بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی وہ اس کے اندر کا غبار تھا جو کسی آتش فشاں کے پھرے ہوئے لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ ایسے میں اس سے کچھ کہنا اس کی ذہنی کیفیت کو اور زیادہ متاثر کر سکتا تھا۔ اس نے میڈم کو ہمدردی سے دیکھا، پھر عقب نما آئینے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ گرے کمر کی ہائی روف جو بالکل نئی دکھائی دیتی تھی بدستور اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کی نمبر پلیٹ پر نظر پڑی تو تھریا کی بے چینی دو چند ہو گئی وہ کسی ڈیلر کی عارضی نمبر پلیٹ نظر آ رہی تھی۔ اس قسم کی گاڑیوں کا کسی جرم میں استعمال ہونا زیادہ موثر ثابت ہوتا تھا۔ پولیس ان کے فرضی نام کے مالکوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔ جب تک چھان بین کی جاتی، مجرم قانون کی دسترس سے دور جا چکا ہوتا تھا۔

میڈم نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ پندرہ منٹ بعد اس نے ساحل پر پہنچ کر ایک میٹے ہوٹل کے قریب دوسری گاڑیوں کی قطار میں اپنی گاڑی روکی۔ پھر اطمینان سے اتر کر باہر آ گئی، ہوا کے سرد جھونکوں نے اس کے خوبصورت بالوں کو منتشر کر دیا۔ تھریا نے میڈم کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ دور سمندر کی موجوں کے کراؤ اور اتار چڑھاؤ کے دلکش مناظر سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ شاید اس کے ذہن کے گوشے میں ہائی روف سے کسی متوقع خطرے کا احساس ہی مٹ چکا تھا۔

تھریا نے آگے بڑھ کر میڈم کو پرنیکشن دینے کی خاطر اس کے سیدھے ہاتھ پر پوزیشن سنبھال لی پھر اس نے نظریں گھما کر دیکھا، گرے کمر کی ہائی روف تقریباً پچاس ساٹھ گز دور ایک ایسی جگہ پارک کی گئی جہاں زیادہ رش نہیں تھا۔ اس میں سے جو شخص اتار تھریا اس کو پوری طرح نہیں دیکھ سکی، صرف ایک جھلک دیکھ کر وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی کہ وہ کوئی دراز قد آدمی تھا۔ ہائی روف کے

پلٹ کر میڈم کی جانب دیکھا، جس کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل کر بتدریج گہری ہو رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ خوفناک دھماکا اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔

”میڈم.....“ تھریا نے اسے معنی خیز لہجے میں مخاطب کیا۔

”یاد کرو مائی تھریا..... یہ جملہ تم نے ہی کہا تھا کہ..... اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم بھی دشمنوں کی کمینگی کا منہ توڑ جواب دیں۔“ میڈم نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”یہ دھماکا اسی پروگرام کا ایک ذاتی تجربہ تھا..... میں اپنے دشمن کو پشت سے وار کرنے کے بجائے لکار کر کسی خارش زدہ کتے کی طرح سسکا سسکا کر مارنے کا تہیہ کر چکی ہوں۔“

جواب میں تھریا نے اپنے بھرپور تعاون کا اظہار کرنے کی خاطر میڈم کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔



حسب عادت وہ آٹھ بجے کے بجائے سات بج کر پچیس منٹ پر ہی شیخ حامد کے عالی شان بیٹکے کے باہر ٹیکسی سے اتری تھی اس نے لائٹ اینڈ ڈارک کلر کا آف دہانٹ شلوار سوٹ پہن رکھا تھا، چہرے پر ہلکا میک اپ بھی تھا جس نے اس کے خوبصورت چہرے اور جوان شخصیت کو اور نکھار دیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کرایہ وصول کرتے وقت اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کی نگاہوں کا مفہوم بھانپ کر تھملا اٹھی، لیکن پھر خود کو سنبھال کر بیٹکے کی سمت قدم بڑھانے لگی۔

”کس سے ملنا ہے؟“ گیٹ پر موجود گارڈز میں سے ایک نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

”میرا نام شبیم ہے، بگ باس نے مجھے کسی دعوت کے اہتمام کے لیے بلایا تھا۔“ گارڈ نے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو دونوں جانب لان کے خوش رنگ سبزے اور حد بندی کی دیوار کے ساتھ گلے قیمتی اور انمول پودوں کو دیکھ کر مسکرا دی۔ ایک خطرناک آدمی کا بھلا ان خوبصورت گل بوٹوں سے کیا تعلق؟ اس نے سوچا پھر اسے خود ہی یہ خیال بھی آ گیا کہ جو لوگ اوپر سے بیٹھے اور اندر سے کسی خطرناک کو برے سے زیادہ زہریلے ہوتے ہیں، انہیں بھی اپنی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کو بھی دنیا دکھاوے کے لیے نبھانا پڑتا ہے۔

روش عبور کر کے وہ دروازے کے قریب پہنچی تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت سامنے آ گئی۔ اس نے کوئی سوال کرنے کے بجائے شبیم کا ایک نظر میں جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ غالباً شبیم بی بی ہیں۔“

”ہاں.....“

”اندر تشریف لے جائیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”بڑے صاحب ابھی نہیں آئے لیکن بیگم صاحبہ آپ ہی کی راہ دیکھ رہی ہیں۔“

شبیم نے اس کے جیسے ہوئے لہجے کو محسوس کیا، لیکن دل پر جبر کر کے اندر داخل ہوئی تو وہاں کی سجاوٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہلکے نیلے رنگ کے ٹائلز کو دیکھ کر بالکل ایسا

محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نیچے صاف و شفاف پانی بھی ضرور ہوگا۔ عالی شان بیٹکے کا وہ حصہ بیرونی ہال تھا جہاں قیمتی فرنیچر بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا، وہ خود کو سنبھالتی آگے بڑھی تو بائیں جانب نظر آنے والے کمرے کا دورازہ کھلا اور ایک پینتیس چالیس سال کی عورت اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے نہایت قیمتی ساڑی پہن رکھی تھی۔ لباس کے رنگ اور اس پر موجودہ کام کی مناسبت سے زیورات کا انتخاب بھی اس پر سج رہا تھا۔ بذات خود بھی وہ گداز جسم اور خوبصورت خند و خال کی مالک تھی۔ بادی آکھوں میں سرے کی ہلکی سیاہ لکیر نے اس کی آنکھوں کے حسن کو مزید نکھار دیا تھا، لیکن ان خوبصورت غزالی آنکھوں میں دور دور تک ویرانیوں کا راج نظر آ رہا تھا۔ زندگی اور زندگی کی سرتریں برائے نام بھی نہیں تھیں۔ شاید شبیم اس کے سامنے ٹھک کر رک گئی۔ اتنے قیمتی لباس میں نظر آنے والی کوئی ملازمہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولی۔ شیخ حامد کے ہاں ملازمت کے دوران میں اس نے بہ خوبی اندازہ لگایا تھا کہ اس کی ذاتی لغت میں ناممکن کا کوئی لفظ موجود نہیں تھا۔

”تم شاید شبیم ہو.....؟“ دروازے کے پچوں بچ کھڑی عورت نے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ہاں.....“

”کیا کام کرتی ہو؟“ اس بار بھی خشک لہجہ اختیار کیا گیا۔

”ٹیلی فون آپریٹر ہوں.....“ شبیم نے اس بار بھی مختصر جواب دیا۔

”اوہ.....“ عورت کے چہرے پر ایک پچا پچا معنی خیز تبسم ابھر آیا۔ ”لوگوں کو ایک دوسرے سے رابطے میں لانے کا کام انجام دے رہی ہو..... کبھی خود بھی کسی سے رابطہ کیا ہے؟“ عورت کے آخری جملے میں طنز کے ساتھ ساتھ تحقیر کا پہلو بھی نمایاں تھا۔

”جی.....“ اس نے چونک کر سوال کیا۔ ”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی؟“

”ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ عورت نے سپاٹ لہجے میں اگلا سوال کیا۔ ”کب سے ملازم ہو۔“

”ڈیڑھ یا دو سال سے.....“ شبیم نے جواب دیا تاہم عورت کا انداز گفتگو اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

”پھر تم نے جو کہا..... وہ غلط نہیں ہوگا۔ اس بار عورت نے ہونٹ چباتے ہوئے بڑے درد بھرے انداز میں کہا۔ ”میری اور تمہارے بگ باس کی شادی کو..... شاید اٹھارہ یا بیس سال گزر گئے، جب میں اتنے عرصے میں اسے پوری طرح نہیں سمجھ پائی تو تم سال ڈیڑھ سال میں بھلا کیا سمجھ پاؤ گی۔“

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ شبیم نے اس کی جلی کٹی باتوں کے باوجود مسکرا کر کہا۔ ”آپ کی طرح آپ کی شخصیت بھی بڑی خوبصورت اور دلکش ہے۔“

اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن..... میں مشین نہیں ہوں کہ خود کو استعمال کرنے والے کو اس کی مرضی کے مطابق سو فیصدی نتائج دے سکوں اور پھر..... خدا کی مرضی کے آگے بندے کا اختیار بھی نہیں چلتا..... بولو کیا تم میرا کام کر سکو گی؟ یہ تمہارا ایک بے بس عورت پر بڑا احسان ہو گا۔ وہ روانی میں کہتی گئی۔ ”حامد نے تم جیسی خوبصورت اور حسین لڑکی کو محض اس لیے بلایا ہو گا تا کہ میرے زخموں پر نمک پاشی کر سکے لیکن تم میرے لیے بہت کارآمد بھی ہو سکتی ہو..... شاید..... شاید یہ موقع مجھے دوبارہ نمل سکے۔ پلیز انکار نہ کرنا میں.....“ صبا نے اگلا جملہ ادا کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ لیے۔

شبشم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ صبا کی کہانی نے اس کے اندر بگ باس سے ذاتی انتقام کے جذبوں کو اور بھڑکا دیا تھا، لیکن وہ کوئی جواب دینے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اسے خوف تھا کہ بگ باس کسی نہ کسی طرح صبا کی باتوں کو ضرور سن رہا ہو گا۔ شاید اسی لیے اس نے شبشم کو بھی محض آزمانے کا ایک موقع تلاش کیا ہو؟..... شبشم کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس کی چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ وہ اس وقت اچانک شدید خطروں سے دو چار ہو گئی ہے۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک غلط جملہ بھی اس کے لیے کسی اذیت ناک موت کا سبب بن سکتا تھا۔

”تنت..... تم چپ کیوں ہو لڑکی۔“ صبا نے اسے جذباتی لہجے میں مخاطب کیا۔ ”کیا..... تم انیک عورت ہو کر بھی کسی دوسری عورت کے اوپر ایک چھوٹا سا احسان نہیں کر سکتیں.....؟“

”میڈم.....“ اچانک شبشم نے سپاٹ لہجے میں بڑی تندی سے جواب دیا۔ ”آپ نے جو خود ساختہ کہانی سنائی ہے میں اس پر یقین نہیں کر سکتی۔ میرا ذاتی مشورہ ہے کہ آپ کو فوری طور پر کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کرنا چاہیے..... ویسے بھی بگ باس کی اجلی شخصیت پر آپ بیوی ہو کر کیچڑ اچھال رہی ہیں وہ..... وہ آپ کو زیب نہیں دیتی۔“

دوسرے ہی لمحے اس کی بات کا جواب ایک بھرپور تھپڑ سے دیا گیا۔ صبا ٹیکم ایک دم ہی پھر گئی تھی، لیکن اسی وقت بند دروازے کو غالباً کسی دوسری چابی سے کھول کر شیخ حامد سامنے آ گیا۔ وہ صبا کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا، لیکن یہ کیفیت تین سیکنڈ سے زیادہ برقرار نہ رہ سکی۔

اس نے کینٹلی بدل کر بڑے پیار بھرے انداز میں بیوی کو مخاطب کیا۔ ”میں نے پہلے ہی تم سے آرام کرنے کو کہا تھا۔ ڈاکٹروں کا بھی یہی مشورہ ہے۔“

صبا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پتھر کی بے جان مورتی بنی کھڑی سب کچھ نفرت سے برداشت کرتی رہی۔ اس کے اندر کا کرب صرف اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔

”سوری شبشم.....“ شیخ حامد نے شبشم کو بڑے مہذب انداز میں مخاطب کیا۔ ”تم باہر جا کر ریلکس کرو میں ابھی آتا ہوں۔“

شبشم نے سکون کا سانس لیا پھر وہ دھڑکتے ہوئے دل سے باہر آ گئی۔ کچھ دیر بعد شیخ حامد بھی

”نام نہیں پوچھو گی..... میرا نام صبا ہے شاعروں نے بھی اس نام کو بہت سراہا ہے..... شروع شروع میں خود مجھے اپنی خوبصورتی پر بڑا ناز تھا لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے ایک بار پھر شبشم کو بڑی گہری اور ٹھوٹی نظروں سے دیکھا۔ ”مہمان نو بجے آئیں گے..... حامد نے ساڑھے آٹھ بجے آنے کا کہا ہے ابھی اس کے آنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں، تم میرے کمرے میں آ جاؤ۔“ اس نے دورانے سے ہٹ کر راستہ دیا تو شبشم مسکراتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی گئی وہاں کی ہر شے ہی قابل تعریف تھی سوائے خود صبا کے۔ جس کی بہم باتیں ابھی تک اسے سمجھ نہیں آتی تھیں۔

اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد صبا نے کمرے کو اندر سے بند کیا پھر شبشم کے قریب آ کر مدھم اور پراسرار انداز میں بولی۔

”میں نے اٹھارہ بیس سال قریب رہ کر جو تجربہ کیا ہے وہ تم مزید دس سال گزر جانے کے بعد بھی نہیں کر سکو گی۔“

”جی.....“ شبشم نے پہلی بار اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”میں..... میں آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتی۔“

”میرے پاس وقت کم ہے۔“ صبا نے ہونٹ چباتے ہوئے شبشم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو لیکن دل یہی کہہ رہا ہے کہ شاید ابھی تک تم اپنے باس کے ہاتھوں شکار نہیں ہوئی ہو، وہ اتنی جلدی کسی سے بے تکلف بھی نہیں ہوتا۔“

”میڈم.....“ شبشم نے تنھے غصے سے پھڑپھڑانے لگے۔ ”یہ آپ کسی قسم کی گفتگو.....“

”مجھے غلط نہ سمجھو۔“ صبا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”مجھے ایک ایسے دوست کی ضرورت ہے جو میرے کام آ سکے۔ تم عورت ہو اس لیے میرا درد آسانی سے سمجھ سکتی ہو۔ تم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟..... مم..... مم..... میں اس کے عوض تمہیں منہ مانگی قیمت دینے کی پوزیشن میں ہوں۔“

”کیسا کام.....؟“

”اپنے بگ باس کو کسی بھی طرح زہر دے دو۔“ صبا نے بڑی رازداری سے اس کے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔

”میری زندگی پر یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہو گا..... نہیں! انکار مت کرنا.....“ اس نے بڑی بے بسی کے عالم میں بھرائی ہوئی آواز میں التجائی۔ ”جانتی ہو مجھے کس جرم کی پاداش میں عمر قید یا مشقت کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے۔ وقت کم ہے، کوئی سوال نہ کرنا، صرف میری چٹان لو۔“ صبا کی آواز رندھنے لگی تو اسے جلدی سے لٹواٹھا کر بھیگی پلکوں کو خوفزدہ انداز میں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تین بار لڑکیوں کو جہنم دیا تھا لیکن ان کی صورتیں نہیں دیکھ سکی۔ مجھے ہر بار یہی بتایا گیا کہ تینوں چکیاں پیدائش کے بعد ہی..... فوت ہو گئی تھیں لیکن یہ جھوٹ..... ہے حامد نے مجھ سے دروغ گوئی کی ہوگی اس لیے کہ وہ..... وہ ہر بار ایک وارث کی توقع کرتا تھا۔“ صبا نے اپنی غناک کہانی جاری رکھی۔ ”وہ

کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس نے شبیم کو خانساں سے ملو کر ضروری ہدایات دیں پھر مہمانوں کا استقبال کرنے کی خاطر خود باہر چلا گیا۔ ڈنر کے دوران میں بھی صبا بیگم ایک پل کے لیے بھی ڈانٹنگ ٹیبل پر نظر نہیں آئیں۔ ان کی عدم موجودگی کو شبیم کے علاوہ راحیلہ بیگم نے بھی محسوس کیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے چھپتے ہوئے انداز میں کہا بھی تھا۔ ”کیا بات ہے حامد صاحب..... آپ نے آج ہماری بھائی کو کہاں چھپا دیا ہے؟“

”اس کی طبیعت دو پہر کو اچانک خراب ہو گئی تھی..... مجھے فیل ڈاکٹر کے مشورے پر اسے فوراً ہسپتال منتقل کرنا پڑا۔“ شیخ حامد نے سنجیدگی سے دروغ گوئی کی۔ ”پریشانی کے باوجود میں نے ڈنر منسوخ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”برا کیا آپ نے۔“ راحیلہ نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

”اگر مجھے بہتک بھی مل تو میں نہ آتی۔“

”آپ نہ آئیں تو مجھے دکھ ہوتا.....“

”چلیں کوئی بات نہیں.....“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ”بھائی کے آنے کے بعد دوبارہ بھی آ جائیں گے۔ اسی بہانے ایک ڈنر مل جائے گا۔“

”وہائی ناٹ..... وہائی ناٹ۔“ شیخ حامد نے بے تکلفی کا اظہار کیا پھر مہمانوں کی کار میں بیٹھنے اور ان کی کار کے گیٹ سے باہر نکلنے کے وقت تک وٹ کرنے کی خاطر ہاتھ لہراتا رہا۔

شبیم دور کھڑی تھی لیکن..... اس کے ذہن میں بگ باس کا وہ جملہ اس وقت بھی گونج رہا تھا جو اس نے سیٹھ عثمان اور اس کی بیوی کی دعوت کے بارے میں اپنے پرسنل آفس میں بیٹھے ہوئے شبیم سے کہا تھا۔ ”میں نے جس مہمان اور اس کی حسین وائف کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے وہ..... سیٹھ عثمان ہے..... میرا سب سے بڑا کاروباری حریف..... اینڈ آئی ہیٹ ہم۔“

مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد شیخ حامد نے شبیم کی واپسی کے لیے بڑی دریاہلی سے اسے گھر تک ڈراپ کرنے کی خاطر ڈرائیور کو بلا کر ضروری ہدایت دی پھر تنہائی میں شبیم کو ایک بند لفافہ دیتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”تم میرے انتخاب پر پوری اتریں..... یہ تمہاری خوش قسمتی بھی ہے، میں تم کو اپنے کچھ خاص کاموں کے سلسلے میں بھی موقع دیتا رہوں گا۔“

گھر جاتے وقت بھی شبیم کے ذہن میں وہ جذباتی کہانی گونج رہی تھی جو مسز حامد نے اسے سنائی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ صبا بیگم نے جو کہانی اسے سنائی تھی وہ حرف بہ حرف سچ تھی۔



قید تنہائی میں افضل خان کو وہ پانچواں دن تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر منفی خیالات نے جنم لیتا شروع کر دیا تھا۔ پستہ قد شخص روزانہ اس کے لیے کھانا اور ناشتہ باندی سے لا رہا تھا وہ از خود کوئی گفتگو نہیں کرتا تھا بگ باس کی نظروں میں اس کی کیا حیثیت تھی؟ افضل خان ابھی تک اس کا درست اندازہ نہیں لگا سکا۔ وہ کوئی

سوال کرتا تو پستہ قامت اس کا جواب ہمیشہ ایسے انداز میں دیتا جیسے وہ افضل خان کو اس کی موجودہ حیثیت کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا ہو..... پھر افضل خان نے پچھلے چھتیس گھنٹوں سے اس سے بات کرنا یکسر ترک کر دی تھی۔ آخری بار اس نے افضل خان کو داپس جاتے جاتے رک کر بڑے عجیب انداز میں کسی کا پیغام سنایا تھا۔

”ہوسکتا ہے کہ اگر قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو تم دو روز بعد اس منجرے سے نجات پانے میں کامیاب ہو جاؤ۔“ اس کا لہجہ بے حد سپاٹ تھا۔ ”لیکن یہ سب آئندہ پیش آنے والے حالات پر منحصر ہے۔“

”یہ تمہارے اپنے ذہن کی اختراع ہے یا تم کسی کا پیغام سنارہے ہو؟“ افضل خان نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ بات بگ باس نے کسی کی معرفت کہلوائی ہے..... میرا کام صرف تمہیں اطلاع دینا تھا۔“ افضل خان نے بھنا کر پوچھا۔ ”چیف منسٹر کانفرنس کا اونٹ کس کروٹ بیٹھا؟“

”سوری..... وہاں مجھے نہیں بلایا گیا تھا ورنہ تمہیں تفصیل سے ضرور آگاہ کرتا۔“ اس بار بھی اس نے بات مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔

”میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میرے مقابلے میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟“ افضل خان نے اسے تحارت سے گھورا۔

”فنی الحال اپنی حیثیت کے بارے میں غور و فکر کرنا تمہارے لیے زیادہ صحت مند ثابت ہو گا۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا پھر مسکراتے ہوئے باہر جا کر دو روزہ بند کر دیا۔ اسی وقت سے افضل خان نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب خود سے اسے مخاطب نہیں کرے گا۔

پچھلے چھتیس گھنٹوں میں وہ صرف اپنے مستقبل کے بارے میں ہی غور کرتا رہا تھا۔ بگ باس کی ناراضی کی صورت میں شاید وہ تہ خانے کا کراہی اس کی آخری آرام گاہ ثابت ہوتا لیکن..... ایک بار کھلی فضا میں نکل جانے کے بعد اسے کچھ نہ کچھ ضرور سوچنا تھا اپنے مستقبل کے بارے میں..... وہ جس پوزیشن سے آج دو چار تھا یہ صورت حال آئندہ بھی پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کا صرف ایک ہی توڑ ممکن تھا کہ وہ میڈم روبی کو دی گئی آفر آنکھ بند کر کے قبول کر لیتا..... اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ شیخ حامد کے قریب ترین ہونے کی وجہ سے اسے کسی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا اس کے بعد اگر وہ وقت ضائع کیے بغیر پہلی فلائٹ سے ملک کی سرحد پار کر جاتا تو پھر قانون کے حرکت میں خاصا وقت لگتا..... اس درمیانی وقفے میں وہ میڈم کی مدد سے اور بھی کئی آپشن پر عمل کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں اور بھی کئی منصوبے کلہلاتے رہتے تھے جن پر اگر وہ عمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو بگ باس کے خطرے کی تلوار اس کے سر پر مستقل نہیں منڈلا سکتی تھی۔ اندرونی طور پر وہ میڈم کی مالی پوزیشن کے بارے میں چھان بین کر چکا تھا جو اگر آئندہ بیس سال تک بھی اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھتی تو اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ ہوتی۔

رات کے بارہ بجے وہ بنگرے میں بند کسی جنگلی درندے کی طرح ٹہلتا رہا تھا، پھر بستر پر لیٹ کر آئندہ کے منصوبوں پر غور کرتا رہا۔ وہ کس بے خبری کے عالم میں نیند کی کیفیت سے دو چار ہوا اسے یاد نہیں لیکن دوبارہ جب کسی نے اسے جھجھوڑ کر چکا یا تو اس نے سب سے پہلے اپنی دہی گھڑی کی طرف نظر ڈالی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ بستر سے بولکھلا کر اٹھنے کے بعد..... اسے دو تین نقاب پوش بھی نظر آ گئے جو اس کے سر پر مسلط تھے پستہ قد آدمی دروازے پر روی ساخت کی چھوٹی مگر دور مار انگل لیے موجود تھا۔

”کیا بات ہے.....؟“ افضل خان کی جگہ دوسرا کوئی ہوتا تو شاید اس کی حالت بھی مختلف نہ ہوتی، باری باری اس نے تینوں نقاب پوشوں پر نظر ڈالتے ہوئے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”اتنی رات گئے مجھے کیوں ڈسٹرب کیا گیا ہے؟“

جواب میں ایک نقاب پوش نے دوسرے کو اشارہ کیا جس نے قریب رکھے ہوئے جگ سے ایک گلاس پانی بھرا اور اشارہ کرنے والے کے قریب آ گیا۔ شاید وہ موت کا اذیت ناک تصور ہی تھا جو افضل خان کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرہوں کی صورت میں نمودار ہو رہا تھا۔

”لو! اسے پھانک کر پانی پی لو۔“ اشارہ کرنے والے نے جیب سے ایک پڑیا نکال کر افضل خان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”جلدی کرو ہمارے پاس وقت کم ہے۔“

”یہ..... یہ..... اس..... میں کیا ہے؟“ افضل خان کسی انجانے خوف کو محسوس کر کے ہکھلانے لگا۔

”اس کا اندازہ تمہیں دو تین گھنٹے بعد ہی ہوگا۔“ نقاب پوش نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم گفتگو میں وقت ضائع نہیں کر سکتے..... شاباش! جلدی کرو۔“

”افضل خان کی آنکھوں میں موت کے سائے کھپانے لگے لیکن وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے پاس دیئے گئے حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ اس نے ہمیشہ موت کی آنکھیں ڈال کر مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ کبھی بزدلی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ اس نے اس وقت بھی اپنی بولکھلا ہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ خاموشی سے پڑیا کھول کر اس کے اندر موجود ہلکے نیلے سفوف کو منہ میں ڈالا اور ایک ہی گھونٹ میں حلق کے نیچے اتار گیا۔

”گڈ.....“ نقاب پوش نے کہا۔ ”اب تم دوبارہ لیٹ جاؤ..... زیادہ سے زیادہ بیس منٹ بعد ہم اپنا دوسرا کام بھی شروع کر دیں گے۔“

افضل خان بدستور خاموش کھڑا رہا۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو چکا تھا، فرار کے سارے راستے بند تھے اس لیے اس نے بستر پر لیٹنے میں دیر نہیں لگائی۔ دو منٹ بعد ہی اس نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ بے ہوش کا غلبہ اس کے ذہن پر پوری شدت اور تیزی سے ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بے چارگی اور بے بسی پر مسکرا دیا، پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے خیال میں اس آخری وقت میں تین مسلح نقاب پوشوں اور دروازے پر خود کار رائفل لیے تعینات پستہ قد رکھوالے کی موجودگی میں اسے

کسی بہادری کا مظاہرہ کرنے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوتا۔

بے ہوشی یا شاید موت کے سرد ہاتھ بڑی سرعت سے اس کے سوچتے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں کو سلب کر رہے تھے۔ ایک لمحے کو اس نے دل میں سوچا کہ جتنی سانسیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس میں دل کھول کر اس انداز میں فاتحانہ ہتھیار لگائے جس طرح وہ اپنے کسی شکار کو دم توڑتے دیکھ کر لگتا تھا، لیکن وہ اس پر عمل نہ کر سکا۔ اندھیرے کی ایک دبیز چادر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے کر پوری طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔

تین ساڑھے تین گھنٹے وہ اسی کیفیت سے دو چار رہا پھر اس نے ہوش آنے پر دوبارہ آہستہ آہستہ آنکھ کھولی تو خود کو ایک کچرا کنڈی کے غلیظ اور نقص زدہ ڈھیر پر پڑا پایا۔ اس نے اپنے جسم پر نظر ڈالی جو بے لباس نظر آیا۔ وہ مادر زاد برہنہ حالت میں پڑا تھا، اس کا جوڑ جوڑ پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ جسم پر نظر آنے والی موٹی موٹی خون کی بدھیاں اس بات کی ترجمانی کر رہی تھیں کہ اسے پوری طرح بڑے ظالمانہ انداز میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا پھر اس کے دشمن شاید اسے مردہ سمجھ کر اسے کچرا کنڈی پر آخری رسومات کے لیے کسی رفاہی ادارے کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے تھے۔

اسے ابھی تک شبہ لاحق تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے؟ زخموں سے اٹھنے والی ٹیسس اسے زندگی کا احساس دلا رہی تھیں، لیکن درد کی شدت اور زخموں کو نوعیت یہ احساس بھی دلا رہی تھی کہ شاید اب وہ کچھ ہی گئی جتنی سانسیں اور لے سکے گا۔ اس نے پوری قوت جمع کر کے کسی کو مدد کے لیے پکارنے کی کوشش کی، لیکن اس کی آواز نقاہت کی وجہ سے اس کی اپنی قوت سماعت تک بھی بہ مشکل پہنچ سکی تھی۔ نقصان سے اس کا دم بری طرح گھٹ رہا تھا۔ اس نے زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گیا، پھر اچانک اسے کسی گاڑی کے قریب آ کر رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے گردن گھما کر دوسری جانب دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسی جدوجہد میں وہ دوبارہ بے ہوشی کی کیفیت سے دو چار ہو گیا۔ قریب سے ابھرنے والی آوازیں اسے بے ہوشی کے بعد دور ہوتی چلی گئی تھیں۔



لیاقت حسین بڑی مستعدی سے گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا۔

پچھلی نشستوں پر سیٹھ عثمان اور راجیلہ بیگم بیٹھے انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ لیاقت حسین نے اپنی والدہ کے کہنے پر پہلے قرآنی تعلیم حاصل کی تھی، پھر اسے حفظ کے لیے دو سال لگانے پڑے۔ بعد میں اس نے ایک مڈل اسکول میں داخلہ لیا، لیکن چھ جماعتوں سے آگے نہ پڑھ سکا۔ سرفراز خان جیسے مغرور سرمایہ دار کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اسے لیاقت کا غریب لڑکوں کے درمیان کلاس میں بیٹھنا پسند نہیں تھا، چنانچہ والدین کے درمیان ہونے والی کشمکش دور کرنے کی خاطر اس نے از خود چھٹی جماعت سے آگے پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ راجیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان کے درمیان ہونے والی باتیں اس کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آ رہی تھیں، لیکن جو تھوڑی بہت سہہ بدھ تھی اس سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ راجیلہ بیگم اس دعوت کے سلسلے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار

کر رہی تھیں جبکہ سیٹھ عثمان اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ کبھی کبھی انسان کو مجبوراً حالات سے سمجھوتا بھی کرنا پڑتا ہے۔

لیاقت حسین نے بہت قریب سے اپنے مالکان کا مطالعہ کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے ان کے درمیان کبھی کسی جھگڑے یا فساد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کا اندازہ کچھ اس وقت بھی لیاقت حسین کو ہوا تھا جس دشمنوں نے سیٹھ عثمان کی گاڑی میں وحید ڈرائیور کو خرید کر ٹائم بم رکھوا دیا تھا۔ سراج نے مشورے کے بعد بھی سیٹھ عثمان بیرون ملک جانے کو تیار نہیں تھے، لیکن راحیلہ بیگم کے اصرار پر وہ آمادہ ہو گئے تھے اور اب انہوں نے فیح حامد کی دعوت بھی قبول کر لی جو لیاقت حسین کی نظروں میں بھی دشمن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

ہفتے کی وجہ سے اس وقت رات کے گیارہ بجے بھی خاصا ٹریفک رواں دواں تھا۔
”لیاقت حسین.....!“ اچانک سیٹھ عثمان نے دعوت کے موضوع پر بات ختم کرنے کی خاطر اسے مخاطب کیا۔ ”تم نے کھانا تو کھا لیا تھا؟“
”جی ہاں صاحب۔“ لیاقت حسین نے مختصراً جواب دیا۔ راحیلہ بیگم کی موجودگی میں وہ عموماً کم بات کرتا تھا۔

”لیاقت.....“ اس بار راحیلہ بیگم نے اسے مخاطب کیا۔ ”سنا ہے تم نے اپنی بیوی کو والدین کے پاس بھیج دیا ہے؟“
”سال بھر سے زیادہ ہو گیا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ وہ کچھ دنوں اپنے گھروالوں سے بھی مل آئے۔“

”کیا تمہارے گھروالے تمہیں یاد نہیں آتے.....؟“
”یاد کیوں نہیں آتے لیکن میں بعد میں کبھی چلا جاؤں گا۔“ لیاقت حسین نے دل گرفتہ انداز میں جواب دیا۔ اس نے ابھی تک کراچی میں کسی کو بھی اپنے باپ کی حیثیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

”سنا ہے تم جس جگہ رہتے ہو اسے چھوڑ کر دوسرے کسی مکان میں منتقل ہونا چاہتے ہو.....؟“ سیٹھ عثمان نے سوال کیا تو لیاقت نے سکون کا سانس لیا۔

”جی صاحب.....!“
”کوئی خاص وجہ؟“
”وہ جگہ تنگ پڑتی ہے صاحب اور قبرستان قریب ہونے کی وجہ سے میری گھروالی کو ڈر بھی لگتا ہے۔“

”تمہیں خوف نہیں محسوس ہوتا.....؟“ راحیلہ بیگم نے پوچھا۔
”ڈر کس بات کا؟“ اس نے بے پروائی سے کہا۔
”میں نے قرآن حفظ کر رکھا ہے جی۔ تھوڑی حدیث بھی پڑھی ہے اس لیے خدا کے سوا کسی

سے نہیں ڈرتا۔ موت تو برحق ہے۔ وہی ابدی زندگی بھی ہے جہاں انسان کو مستقل رہنا ہے دنیا تو مسافر خانہ ہے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں یوں رہو جیسے کہ اجنبی یا راہ چلتا مسافر.....“

”سبحان اللہ۔“ راحیلہ بیگم نے سراہتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”تمہاری فرحین کب تک واپس آ جائے گی؟“

”ابھی تو اسے گئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔ مہینہ دو مہینے تو نکال کر آئے گی۔“
”تم ابھی کسی مکان کے سلسلے میں پریشان مت ہونا۔“ سیٹھ عثمان نے بڑی اہمیت سے اسے مخاطب کیا۔

”میں اپنے برابر تعمیر شدہ بنگلے کو خریدنے کی بات کر رہا ہوں دعا کرو کہ کامیاب ہو جاؤں۔ اس میں ایک دو کمروں کی انگیسی بھی ہے وہ تمہاری ضرورت کے لیے کافی ہوگی۔“
”آپ دوسرا بنگلہ کیوں خرید رہے ہیں صاحب؟“ لیاقت نے روانی میں پوچھ لیا پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کے لیے تو ایک ہی بنگلا.....“
”میں دوسرے بنگلے کو اپنا صدر دفتر بنانے کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔“
اس کے بعد راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان کے درمیان پھر انگریزی میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

لیاقت حسین اس وقت سیٹھ عثمان کے بنگلے کی طرف جانے والی کسادہ اور قدرے تنگ سڑک پر سفر کر رہا تھا جب اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن پر ہلکی ہلکی غودگی طاری ہو رہی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ غالباً مرغن غذا کھانے کا نتیجہ ہے لیکن دوسرے ہی لمحے ایسا لگا جیسے اس کا ہتھ پاؤں اور نظریں تو کام کر رہی تھیں۔ ذہن بالکل خالی اور معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر ایک اپنی پہچانی آواز اس کے ذہن میں گونجتی ہوئی ابھری جو اس کی اپنی آواز سے حیرت انگیز طور پر ملتی جلتی تھی۔ اس آواز نے لیاقت حسین کو مخاطب کیا۔

”تمہیں کھانے میں بیہوشی کی دوا دی گئی ہے۔ دشمن نے تمہیں سیٹھ عثمان اور اس کی بیوی کو حادثاتی موت سے دو چار کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ کچھ دیر میں ایک ٹرک تمہارے تعاقب میں آ جائے گا۔“

”تم..... کون ہو؟“ لیاقت حسین نے خواب بیداری کی کیفیت میں سوال کیا لیکن اس کی آواز خود اس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی وہ کسی روبوٹ کی طرح اسٹیرنگ سمجھا رہا تھا۔

”میں..... تمہارا ہم زاد ہوں۔“ وہی آواز اس کے وجود میں گونجتی ہوئی ابھری۔ ”اللہ کے کسی برگزیدہ بندے نے مجھے تمہارا محافظ بنا دیا ہے۔ تمہیں کسی متوقع خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ کسی کے ساتھ نیکی پر اکسانا میری ذمہ داری ہے تم نے کسی معذور کی جان بچانے کی خاطر جو قدم اٹھایا تھا وہ قابل تحسین ہی تھا۔ بعد میں کسی نامعلوم انسان کو گندے علم سے محفوظ کر کے تم نے اپنی جان کو

گوئی۔ ”ایک بار پھر ذہن نشین کر لو موت اور زندگی اور پر والے کے ہاتھ میں ہے اس کے راز کو کوئی اور نہیں پاسکتا..... ڈاکٹر اور حکیم صرف اپنے تجربات کی روشنی میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ ہوتا وہی ہے جو مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ رفتار بڑھالو۔“

لیاقت حسین کے پاؤں کا دباؤ ایکسی لریٹر پر بتدریج بڑھنے لگا، سڑک تقریباً سنان ہی تھی! تعاقب میں آنے والے ٹرک نے اپنی رفتار طوفانی کر دی۔ لیاقت حسین کا ذہن سامیں سامیں کرنے لگا۔ اس نے اپنی اسپڈ اور بڑھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ٹرک ہر لمحہ قریب آتا جا رہا تھا..... قریب..... اور قریب پھر..... لیاقت حسین کا پورا وجود جیسے کسی بھونچال کی لپیٹ میں آ گیا ہو، ٹرک سے ٹکرانے کے بعد اس کی کار کسی کھلونے کے مانند فضا میں اچھلی، اس کا سر پوری شدت سے چھت سے ٹکرایا۔ اسے صرف اتنا ہی یاد رہا کہ کار دوبارہ سڑک پر واپس گری تھی لیکن اس کے بعد دوسری ٹکر پہلے سے زیادہ شدید تھی جس نے لیاقت حسین کے تمام حواس غصہ کو پلک جھپکتے میں معطل کر دیا۔ ساری قوتیں گھپ اندھیروں میں مدغم ہو گئیں۔



ساحل سمندر پر ہونے والے دھماکے میں کسی کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہم ڈسپوزل اسکواڈ کے عملے نے یہی رپورٹ دی تھی کہ تباہ ہونے والی گاڑی میں دیسی ساخت کا ٹائم بم پہلے سے فٹ تھا لیکن وہ ہائی روف کس نے خریدی تھی؟ وہ خود سامنے کیوں نہیں آ رہا تھا؟ یہ بات تحقیقاتی آفیسر کے لیے بھی کسی معصے سے کم نہیں تھی۔ گاڑی کے آس پاس سے کہیں کوئی لاش بھی برآمد نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی کے انجن نمبر اور دیگر نمبروں کی روشنی میں سات آٹھ گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اس کے ڈیلر کا پتا چل گیا جہاں سے اسے خریدا گیا تھا لیکن وہاں سے بھی جو معلومات حاصل ہوئیں وہ بھی پولیس کے لیے حیران کن ہی تھیں، ڈیلر کے ریکارڈ کے مطابق وہ ہائی روف ایک رفاہی ادارے کے نام پر فروخت کی گئی تھی۔ خریدنے والے کے دستخط اور نام کی تصدیق کی خاطر پولیس جب اس رفاہی ادارے کے مالکان تک پہنچی تو وہاں سے یہی جواب ملا کہ پچھلے دس ماہ سے اس ادارے نے کوئی نئی ہائی روف نہیں خریدی تھی۔ نہ ہی وہ اس نام کے کسی آدمی سے واقف تھے جو پولیس کو ڈیلر نے فراہم کیا تھا۔ بعد میں ایک سائز کے رجسٹریشن کے ڈیپارٹمنٹ نے بھی یہی تحریری بیان دیا کہ اس انجن اور چیسس نمبر کی کوئی ہائی روف پچھلے پندرہ دنوں میں رجسٹریشن کے لیے نہیں آئی جبکہ ڈیلر کا ریکارڈ ظاہر کرتا تھا کہ اسے دھماکے سے صرف چوبیس گھنٹے پہلے فروخت کیا گیا تھا۔ رقم کی ادائیگی بھی کیش کی صورت میں کی گئی تھی، چنانچہ پولیس نے یہی خیال ظاہر کیا کہ اسے دہشت گردوں کی کسی تنظیم نے شہر میں کوئی واردات کرنے کے ادارے سے حاصل کیا ہوگا۔

سراج کے لیے اس ہائی روف سے اہم دھماکا افضل خان کی منظر عام پر واپسی تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے سے اس ہسپتال میں موجود تھا جہاں افضل خان کو انتہائی نگہداشت وارڈ کے ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ سراج کو جو اطلاعات فراہم کی گئیں اس کے مطابق افضل خان کو برہنہ حالت میں

ایسا روگ لگا لیا تھا جس کا توڑ سوائے خدا کے اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ تمہاری یہ انسان دوستی بارگاہ ایزدی میں پسند کی گئی پھر اس قادر مطلق نے تمہیں نوازنے کے لیے اپنے ایک برگزیدہ بندے کو تمہارے لیے وسیلہ بنا دیا۔ تمہیں وہ سفید ریش ناپینا یاد ہے؟ وہ بھی اللہ کا فرستادہ تھا جس نے دیوانے کی چھو لداری تک پہنچنے میں تمہاری مدد کی تھی۔ یہ سب کچھ تمہارے لیے عطیہ خداوندی ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتا..... اور..... جو راستے سے بھٹک جائیں تو بھی وہ صاحب اختیار ہے تدبیر اور تقدیر کے کھیل میں چٹ پٹ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔“

”اس وقت میں اپنے مالکوں کا تحفظ کس طرح کر سکتا ہوں؟“

”توبہ کر لو.....“ اسی آواز نے کہا۔ ”موت اور زندگی بھی اسی کے اختیار میں ہیں۔ وہی ہوگا جو اسے منظور ہوگا، لیکن بعد میں تمہیں کچھ یاد نہیں رہے گا۔ یاد آجی جائے تو اپنی زبان کو لگام دیے رکھنا۔ کچھ معاملات میں خداوند کریم نے بھی اپنے نیک بندوں پر شفقت فرماتے ہوئے بعض امور میں عہد اسکوٹ فرمایا ہے۔ ان کے متعلق حکم ہے کہ تم بھی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زبانوں کو قفل لگا دو۔ زبان کھل جائے تو انسان بڑے خسارے میں رہتا ہے۔ میری اس بات کو فراموش کرنے کی غلطی کبھی نہ کرنا ورنہ.....“

کانوں میں گونجنے والی آواز معدوم ہو گئی۔ لیاقت حسین کے ذہن میں کلبلانے والے بہت سارے سوالات گھٹ کر رہ گئے۔ ذہن پر جیسے اچانک دھند کی دیوار چادر پھیل گئی ہو۔ اس نے پیش آنے والے متوقع خطرے سے سیٹھ عثمان کو آگاہ کرنا چاہا لیکن نہ وہ اپنی زبان کو متحرک کر سکا، نہ اشاروں کی زبان استعمال کرنے کی صلاحیت باقی رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور نظریں مشینی انداز میں حرکت کر رہے تھے، لیکن اس میں اس کے اپنے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس نے عقب نما آئینے پر نظر ڈالی لیکن کسی ٹرک کا کوئی نشان اسے دور در تک نظر نہ آیا۔

”لیاقت حسین.....“ پشت سے سیٹھ عثمان کی آواز ابھری۔ ”آگے سے گاڑی بائیں ہاتھ پر موڑک سپراسٹور پر روک لینا بیگم صاحبہ کو کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔“

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کچھ دیر آگے جانے کے بعد کار کو سپراسٹور کی طرف موڑ دیا جہاں اور بھی کچھ گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد بھی وہ حسب معمول اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا اس نے کوشش کی تھی کہ حسب معمول تیزی سے نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھولے لیکن وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکا۔

سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم اتر کر اسٹور کے اندر چلے گئے تو اس نے نہ جانے کے باوجود گاڑی کو پارکنگ کی جگہ سے نکالا اور کھلی سڑک پر ڈرائیونگ کرنے لگا، ایک منٹ بعد اس کی نظر اچانک عقبی شیشے کی طرف اٹھی اس کا وجود سنسنے لگا، پشت سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے سے ایک ٹرک اپنی رفتار بڑھاتا آگے آ رہا تھا۔

”امتحان کا وقت آ گیا لیاقت حسین۔“ وہی سماعت آشنا آواز پھر اس کے کانوں میں

کچرا کنڈی میں پڑے سب سے پہلے ایک نمازی نے مسجد سے آتے وقت دیکھا تھا۔ جس نے فوری طور پر ملحقہ تھانے کو اس کی اطلاع دی تھی۔ پھر ایک رفاہی ادارے کی ایبولینس کے ذریعے ڈھی کو ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں اسے افضل خان کی حیثیت سے شناخت کرنے کے بعد سب سے پہلے سراج کو اطلاع دی گئی تھی۔ ہسپتال کے متعلقہ ڈاکٹر بھی بڑی تندی سے اس کو اینڈ کرنے لگے۔

اس وقت سراج اسی ہسپتال کے متعلقہ وارڈ کے بڑے ڈاکٹر کے کمرے میں موجود تھا۔ ”مریض کو جس تشدد سے دوچار کرنے کے بعد کچرا کنڈی پر پھینکا گیا“ اس کے بعد اس کا زندہ بچ جانا بھی تعجب کی بات ہے۔ ڈاکٹر بے حد سنجیدگی سے سراج کو بتا رہا تھا۔ ”مریض کی حالت خطرناک حد تک مخدوش ہے، ہم اپنی سی کوشش ضرور کر رہے ہیں لیکن اگر وہ اگلے چوبیس گھنٹوں کے بعد بھی پوری طرح ہوش میں نہ آیا تو کیس مایوس کن بھی ہو سکتا ہے۔“

”آئی سی“ گویا فی الحال چوبیس گھنٹوں تک مریض کوئی بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوگا۔ ”یو آر رائٹ۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”عام حالت میں بھی ہم اس قسم کے مریضوں کو زیادہ سے زیادہ ذہنی سکون پہنچانے والی ادویات دیتے ہیں تاکہ ان کا ذہن متاثر نہ ہو سکے اس کے ساتھ زخموں کی مرہم پٹی بھی دیگر ضروری دواؤں کے ساتھ تسلسل سے جاری رہتی ہے۔“

”آپ کی رائے میں کیا مریض جانبر ہو سکے گا؟“ سراج نے کسمسا کر دریافت کیا۔ ”ڈاکٹر کی حیثیت سے ہماری کوشش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ مریض زندگی کی طرف لوٹ آئے لیکن.....“ ڈاکٹر نے شانے اچکا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سراج ڈاکٹر سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد باہر آ گیا جہاں متعلقہ تھانے کا ایک سب انسپٹر موجود تھا۔ سراج نے اس کو قریب بلا کر سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا آپ نے میری ہدایت کے مطابق سادہ لباس والوں کو مریض کی نگرانی پر مامور کر دیا ہے؟“

”ییس سر.....“ سب انسپٹر نے جواب دیا۔ ”ڈاکٹر نے بھی یہی ہدایت جاری کی ہے کہ جب تک وہ اجازت نہ دیں کسی کو بھی مریض کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ دی جائے لیکن اگر آن ڈیوٹی اسٹاف کے کسی فرد کو استعمال کیا گیا تو.....“

”آپ جس شبے کا اظہار کر رہے ہیں وہ میں بھی سمجھ رہا ہوں لیکن اگر اغوا کرنے والوں کو مریض کو مارتا ہی مقصود تھا تو پھر اس کی موت کا انتظار کیے بغیر اسے آزاد بھی نہ کرتے۔“

”میں نے ایک امکانی خطرے کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی تھی سر.....“

سراج کوئی جواب دینا چاہتا تھا لیکن اسی وقت اس کی نظر شیخ حامد پر پڑی جو ایک سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سب کارڈز کے ساتھ راہداری میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا رخ بھی بڑے ڈاکٹر کے کمرے کی طرف ہی تھا۔ چہرے پر ایسے تاثرات نظر آرہے تھے جیسے وہ بڑی مشکلوں سے اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ سراج بھی محتاط ہو گیا پھر ایس ایس پی اور شیخ حامد کے پیچھے پیچھے وہ بھی

دوبارہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا جو شیخ حامد کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”افضل خان میرا دست راست ہے۔“ شیخ حامد نے بغیر کسی تمہید کے اپنے غصے کا اظہار کیا۔ ”میں ہر قیمت پر اسے زندہ دیکھنا پسند کروں گا۔ اس سلسلے میں اخراجات کی فکر نہ کرنا۔“

”ہماری کوشش بھی یہی ہوگی کہ مریض اپنے پیروں سے چلتا ہوا ہسپتال سے رخصت ہو۔“ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”دنیا کے کسی گوشے میں سے کسی ماہر کی ضرورت ہو تو اسے بلانے میں کوئی تاخیر نہ کرنا۔ یہ شیخ حامد کی عزت اور وقار کا معاملہ ہے۔“

”آپ مطمئن رہیں..... ہم کسی کوتاہی سے کام نہیں لیں گے۔“

شیخ حامد بڑے ڈاکٹر کو ضروری ہدایت دینے کے بعد سراج کی طرف پلٹا اس کے چہرے پر اس وقت بھی جلالی کیفیت طاری تھی۔ ”مسٹر سراج..... وزیر اعلیٰ نے اغوا کرنے والوں کو زندہ یا مردہ عوام کے سامنے لانے کی خاطر آپ کو صرف ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔ آپ کے پاس اب دو دن کی مہلت اور رہ گئی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے.....“ سراج نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ ایس ایس پی کی موجودگی میں وہ زیادہ باتیں کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

”کوئی معمولی سا کلیو بھی ہاتھ لگے تو آپ براہ راست مجھے بھی اطلاع دے سکتے ہیں۔ میں مجرموں کو منظر عام پر لانے کے سلسلے میں آپ سے ہر قسم کا تعاون کروں گا۔“

شیخ حامد نے اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد رکنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہونٹ چباتا ہوا پلٹ کر واپس جانے لگا ایس ایس پی کے علاوہ اس کے ذاتی گارڈ بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

”سر.....“ شیخ حامد اور ایس ایس پی کے جانے کے بعد سب انسپٹر نے دبی زبان میں سراج کو مخاطب کیا۔ ”جہاں ایک بڑے سرمایہ دار کی اتنی بالادستی ہو وہاں قانون کی بھلا کیا حیثیت ہوگی؟“

سراج نے اس کے چبھتے ہوئے طنز کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”نو مینٹن لیکن ایک بات ضرور یاد رکھنا۔ اگر سامنے والا اتنا اناڑی ہو جسے بادشاہ اور غلام کے درمیان فرق نہ معلوم ہو تو اس کے ساتھ کھیلنے میں کوئی لطف بھی نہیں آتا۔“

”آپ مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں سر..... لیکن کیا آپ بادشاہ اور غلام کی حیثیتوں کی تشریح نہیں کریں گے؟“ سب انسپٹر نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”تمہاری ترقی ابھی حال میں ہوئی ہے مائی فرینڈ.....“ سراج نے دوستانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”وقت کے ساتھ تمہیں بھی اس بات کا تجربہ ہو جائے گا۔ ہاتھی اور چیتوں میں اگر ٹھن جائے تو کون کس کے حق میں زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔“

”آئی ایم سوری سر.....“ سب انسپٹر نے سراج کو باقاعدہ سلیوٹ کرتے ہوئے شرمندگی کا اظہار کیا۔ ”میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔“

کیا پھر تیزی سے ہسپتال سے نکل کر کھلی سڑک پر آگیا۔ اس کے ذہن میں اس وقت میڈم کا ساحلی علاقے پر ہونے والے سے متعلق وہ سوال صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔ خاصی دیر تک وہ اس سوال کے علاوہ ان باتوں پر بھی غور کرتا رہا جو اس کے اور میڈم کے درمیان ہو چکی تھیں۔ افضل خان جیسے شیطان کے ہاتھوں سے بچ نکلنے کے بعد خود میڈم کے ذہن میں بھی اپنے ممکنہ دشمنوں کے بارے میں بہت سارے سوالات ابھرے ہوں گے۔ یہ بھی سوچا ہو گا کہ پہلی بار اسے افضل خان کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہوتے وقت ہی اغوا کی کوشش کیوں کی گئی؟ دو اور دو چار کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی ہوگی، لیکن ان تمام باتوں کا ساحلی علاقے پر ہونے والے دھماکے سے جھلا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ سراج سوچتا رہا، غور کرتا رہا۔ کئی امکانی پہلوؤں پر عقل کے گھوڑے دوڑاتا رہا پھر اس کے ذہن میں یقیناً کوئی ایسا خیال ابھرا تھا جو اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بن کر پھیل گیا۔

آفس پہنچ کر سراج کچھ ضروری فائلیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن فون کالز کے سلسلے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ ریسیور اٹھا کر میز پر رکھ دے اور کچھ دیر سکون کا سانس لے سکے۔ اخباری رپورٹروں نے افضل خان کی بازیابی کے سلسلے میں اگلے سیدھے سوالات کرتا شروع کر دیے تھے۔ ہر چند کہ سراج نے سب کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ افضل خان کے بارے میں اخبار والوں کو کوئی بھٹک نہ ملے لیکن کسی نہ کسی ذریعے سے بات ان کے کانوں تک پہنچ گئی۔ سراج چونکہ اسی کیس کا انکوائری آفیسر تھا اس لیے اخباری رپورٹر پچھنے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ رہے تھے۔

ریسیور ایک طرف رکھنے کے بعد اس نے سکون کے چند ہی لمحے گزارے تھے کہ آفس پر تعینات اس کے کانشیل نے ایک چٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”سر..... اس نمبر سے آپ کو تین چار بار کال کیا گیا تھا۔ اسے آپ سے کوئی ضروری اور اہم بات کرنی تھی۔“

سراج نے اس نمبر کو غور سے دیکھا، یادداشت کو کریدنے کے باوجود وہ یہ نہ یاد کر سکا کہ وہ نمبر کس کا تھا، پھر اس نے میز پر ایک طرف رکھا ہوا ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ کانشیل نے کہا۔

”فون کرنے والے نے کہا تھا کہ وہ آپ کو ساڑھے گیارہ بجے دوبارہ کرے گا۔“

”پھر..... ان نمبروں کے لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے جھلا کر کانشیل سے دریافت کیا۔

”میرے دریافت کرنے پر اس نے یہی نمبر لکھوائے تھے، لیکن یہ بھی کہا تھا کہ کسی پبلک کال آفس کے نمبروں سے بات کر رہا ہے۔ آپ آئیں تو تاکید کی جائے کہ اس کے فون کا انتظار کریں۔“ کانشیل نے وضاحت کی۔ ”اس کی گفتگو سے یہی لگ رہا تھا سر کہ وہ آواز بنا کر بول رہا ہے ممکن ہے اس کو کوئی ضروری اور اہم بات آپ سے کرنی ہو۔“

سراج نے کانشیل کو اشارے سے رخصت کیا، پھر اس نے جھلا کر چٹ کو کئی ٹکڑوں میں منقسم کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ساڑھے گیارہ بجے میں ابھی دس منٹ باقی تھے پھر بھی اس نے

”اٹ از فائن۔“ سراج دوبارہ مسکرا دیا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ ایک ادنیٰ سی مثال نے تمہیں جلد بازی میں کیے گئے فیصلے کا احساس دلایا۔ ایک بات کو پولیس کی ملازمت میں ہمیشہ یاد رکھنا۔ جلد بازی میں اٹھایا گیا کوئی قانونی قدم بھی عدالت میں اکثر کسی قابل وکیل کے تجربوں اور چرب زبانی کے مقابلے میں بے وقعت ہو جاتا ہے۔ کسی پر جال پھینکنے سے پیشتر اگر ایک پولیس آفیسر اس کی طاقت اور جسامت کو نظر انداز کر دے تو میں اس کو دانش مندی نہیں کہوں گا۔“

”میں آپ کی بات کی گہرائی کو سمجھ رہا ہوں جناب..... آئندہ اپنی عملی زندگی میں ان باتوں کا خاص خیال رکھوں گا۔“

”ایک بات اور ذہن نشین کر لو۔“ سراج نے معنی خیز انداز اختیار کیا۔ ”جب عہدے کو بالائے طاق رکھ کر دو پولیس آفیسروں کے درمیان بے تکلفی سے کوئی بات ہو تو اسے بھی ہمیشہ امانت سمجھ کر محفوظ رکھنا شرط ہے۔ میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔“

اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد سراج نے دور رہ کر نگرائی پر مامور سادہ لباس والوں کا سرسری جائزہ لیا پھر علاقے کے انسپٹر کو مختار رہنے کی تاکید کرتا ہوا پارکنگ گیٹ میں آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ گاڑی اسٹاٹ کرتا، اس کا ان رجسٹرڈ سم والا موبائل وائبرٹ کرنے لگا۔ سراج نے دائیں بائیں نظر ڈالی پھر اٹنی جیب میں پڑا ہوا موبائل نکال کر کان سے لگا لیا۔ اس سم کے نمبر صرف دو چار افراد کو ہی معلوم تھے اس کا خیال تھا کہ وہ کال سیٹھ عثمان یا ڈی آئی جی کرائم نے کی ہوگی لیکن دوسری جانب میڈم روبی کی مانوس آواز سن کر وہ چونکا۔ پھر اسے یاد آگیا کہ وہ نمبر اس نے میڈم کو کبھی یاد تھا۔ اس بات کی تاکید بھی بطور خاص کی تھی کہ ان نمبروں کو بہت ہی اہم موقعوں پر استعمال کیا جائے۔ بہر حال وہ اس کال کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”سراج بول رہا ہوں۔“ اس نے مدھم بھجے میں کہا۔

”آپ کو نا وقت فون کرنے کی معذرت چاہوں گی لیکن میں نے سنا ہے کہ شاید.....“

”آپ نے ٹھیک سنا ہے۔“ سراج نے نامکمل جملے کے باوجود میڈم کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹروں نے ابھی تک اس کے بارے میں کوئی امید افزا بات نہیں کی۔“

”بڑا مگر مجھے بھی اس کو دیکھنے آیا تھا؟“

”کسی بڑے کاروباری ادارے کا جی ایم جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہی کی طرح کاروباری معاملات میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔“ سراج نے اس بار بھی گول مول جواب دیا۔

”ساحل پر ہونے والے دھماکے بارے میں کوئی سراغ ملا؟“ میڈم نے پوچھا۔

”آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”اپنے بیڈروم میں.....“

”میں کچھ دیر بعد آپ کو کال کر لوں گا۔ مصروفیت کی وجہ سے اس وقت معافی چاہتا ہوں۔“ سراج نے جملہ مکمل کر کے موبائل دوبارہ جیب میں ڈالا، گاڑی اسٹاٹ کر کے اسے رپورس

”جی ہاں..... آپ کا نادیدہ خادم.....“
 ”خام نہیں بلکہ محسن کہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔“ سراج نے سنجیدگی سے اعتراف کیا۔ ”دنیا کی تمام پولیس سراغرساں ایجنسیوں کی کامیابی کا راز کسی نہ کسی مجبر کی اطلاع ہی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ جو افسران اس کا اعتراف نہیں کرتے وہ.....“

”مغرب بھی دوسم کے ہوتے ہیں۔“ دوسری جانب سے بات کاٹ کر کہا گیا۔ ”ایک وہ جسے کسی مجبری کے عوض دولت کا لالچ ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جو اپنی زندگی کی بازی لگا کر پولیس کو سو فیصد مجرموں تک پہنچاتا ہے۔ اسے مال کے بجائے پولیس سے اپنی جان کا تحفظ درکار ہوتا ہے۔ آپ مجھے دوسری قسم کے تجربوں میں شار کریں تو بہتر ہوگا۔ مال کی میرے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔“
 ”کس قسم کا تحفظ یا ضمانت درکار ہے؟“ سراج نے دوستانہ انداز میں دریافت کیا۔

”صرف اس بات کی یقین دہانی کہ میں جو شرط رکھوں اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ یہ بھی آپ نے وزیر اعلیٰ کانفرنس میں جس دلیری کا ثبوت دیا اس کے پشت پر کوئی سی طاقت تھی۔“ اس بار مکمل کر کہا گیا۔ ”یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ دو ہاتھ ہونے کے باوجود تین چار کشتیوں کا توازن سنبالنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“
 سراج ایک لمحے کو چونکا پھر اس نے دینی زبان میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم کو میری زبان پر اعتماد ہو تو میں تمہیں ہر قسم کا تحفظ دینے کو تیار ہوں۔ ویسا ہی عمل ہوگا جیسا تم چاہو گے بشرطیکہ کام بہت زیادہ غیر قانونی بھی نہ ہو۔“

”میں آپ کے ٹائپ سے واقف ہوں اس لیے زبان پر بھی اعتبار کر سکتا ہوں۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”ڈراما ایجنج کرنے والے سامنے آ کر جو ہمدردی کر رہے ہیں۔ وہ محض دکھاوا ہے۔ کوئی کردار اگر سرکاری غفلت کا شکار ہو کر اپنے انجام تک پہنچ جائے تو پھر اصل مجرم بھی شیر بن جاتا ہے۔“

”آئی سی.....“ سراج نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں کہ ڈراما ڈائریکٹر کون ہے؟“

”دو کردار اور بھی قریب ہی موجود ہیں۔“ اس بار بھی بات گھما پھرا کر کہی گئی۔ ”وہ اگر روشنی میں آ جائیں تو ڈراما کرنے والے بھی ہکا بکا رہ جائیں گے۔ زبانیں کھلوانا پھر آپ کے اختیار میں ہو گا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ انہیں جو کام سونپا گیا ہے۔ اس کو پورا کرنے کے لیے ہائی الٹ رہنے کا حکم دیا گیا ہے صرف ایک مخصوص سنگٹل ملنے کے بعد وہ ساری رکاوٹیں ہونے کے باوجود موت اور زندگی کی بازی سے کھیلنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔“

”میں دو کرداروں والی بات نہیں سمجھ سکا۔ کیا ہم کھل کر گفتگو نہیں کر سکتے؟“ سراج نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”ٹھیک ہے“ آپ لائن بند ہونے کے بعد ریسورسنگ رکھ دیں“ میں دس منٹ کے انداز انداز

احتیاطاً ریسورسنگ اٹھا کر واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک منٹ بعد ہی فون کی گھنٹی کی آواز ابھرنے لگی۔ اس نے فون کو جھلا کر دیکھا پھر ریسورسنگ اٹھا کر مجبوراً کان سے لگا لیا۔
 ”سراج.....“ اس نے حسب معمول مختصر اپنا تعارف کرایا۔

”میں ہاٹ لائن نیوز کا نمائندہ بول رہا ہوں۔“ دوسری جانب تلخی سے کہا گیا۔ ”بہت دیر سے آپ سے کال ملانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن آپ نے شاید اسے انہجج کر رکھا ہے۔“

”جی ہاں.....“ سراج کا مودہ پھر آف ہو گیا۔ ”آپ حضرات جو رائے قائم کر لیں وہی درست ہوتی ہے۔ میں خود بھی حیران ہوں کہ فون انہجج رکھنے کے باوجود میں آپ کی کال کس طرح اینڈ کر رہا ہوں۔ اس حیرت انگیز اور ناقابل یقین حقیقت کا ذکر بھی اپنی اخباری رپورٹ میں ضرور شامل کر لیجیے گا۔ بڑی نوازش ہوگی۔“

”میں آپ کی ابھن سمجھ رہا ہوں مسٹر سراج۔“ اس بار قدرے شستہ لہجے میں کہا گیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ دوسری نیوز ایجنسیاں بھی آپ کو مسٹر افضل خان کی بازیابی کے بارے میں فون کر رہی ہوں گی۔“

”آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“
 ”صرف اتنا کہ اس کی بازیابی کس وقت..... کس طرح ہوئی اور بحیثیت انکوائری آفیسر آپ اس سلسلے میں کیا کہنا پسند کریں گی۔“
 ”محض دو باتیں.....“ سراج نے تمللا کر کہا۔

”بازیاب ہونے والا شخص بے ہوشی کی کیفیت سے دو چار ہے۔ ڈاکٹروں نے ابھی ہمیں اس سے اگلے چوبیس گھنٹوں تک دور رہنے کا مشورہ دیا ہے..... اور کچھ؟“
 ”اسے کس ہسپتال میں رکھا گیا ہے اور اس کی بازیابی کس طرح ہوئی؟“

”سوری..... میں فی الحال ان دونوں سوالات کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ سراج نے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی لائن منقطع کر دی۔ ساڑھے گیارہ بجے کے اختصار کی مجبوری کے سبب اسے اسی قسم کی ایک دو کالیں اور بھی بھگتانی پڑیں۔ اس کے بعد ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے جو کال موصول ہوئی وہ کسی نیوز ایجنسی کی طرف سے نہیں تھی۔

”میں آپ کو وقفے وقفے سے تین بار پہلے بھی کال کر چکا ہوں۔“ سراج کے کال اینڈ کرنے پر دوسری جانب سے کہا گیا۔

”کس سلسلے میں؟“ سراج نے سنبھل کر محتاط انداز اختیار کیا۔ دوسری طرف سے بولنے والا اس وقت بھی آواز بنا کر گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”گودام نمبر تین۔ دو عورتیں!..... کیا اتنا حوالہ کافی ہوگا؟“

”اوہ..... تو یہ تم ہو.....؟“ سراج کے ذہن میں فرحین اور زرینہ کے اغوا کے بارے میں پورا منظر نامہ گھوم گیا۔

کی جرأت کر سکتے تھے۔ وہ اسی کے حکم پر ہسپتال کی ٹالیں اپنی کنپٹیوں پر رکھ کر ٹریگر دبانے کا مظاہرہ کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ لاش ملنے کی صورت میں ان کی زبانوں کو بولنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک ڈرامائی غفلت سارے بنے بنائے کھیل کو تباہ کرنے کو کافی ہوتی۔

سراج کا ذہن بڑی تیزی سے ان دو مجرموں کو زندہ و سلامت گرفتار کرنے کے مختلف منصوبوں پر غور کرتا رہا۔ ان کی گرفتاری میں زیادہ نفرت کی نہیں زیادہ داندیشی اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ بیس منٹ تک وہ کانٹا وائیکشن کے مختلف آزمودہ طریقوں پر غور کرتا رہا پھر..... کچھ سوچ کر اپنے سیکریٹ موبائل پر ڈی آئی جی کرائمرز کے مخصوص نمبروں کو شیخ کرنے لگا۔



دفتر سے اٹھنے کے بعد سراج نے گھر جاتے ہوئے ایک بار پھر ہسپتال جا کے ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ افضل خان بدستور بے ہوشی کی حالت سے دو چار تھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ صبح سے پیشتر وہ پولیس کو کوئی بیان دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوگا۔ ہسپتال میں تعینات سادہ لباس والوں کی طرف سے بھی اطمینان کر لینے کے بعد سراج نے دور ہی دور سے ایک سرسری نظر ہول ڈیٹان پر بھی ڈالی جو ہسپتال سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر شاپنگ سینٹر کے قریب مین روڈ پر ہی واقع تھا، مطلوبہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنے کے سلسلے میں ڈی آئی جی کرائمرز نے بھی اس بات کی تائید کی تھی کہ اس مہم میں کم سے کم افراد شامل ہوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ سراج نے خاصی تفصیل کے ساتھ پورا پلان ذہن میں مرتب کر رکھا تھا، اس وقت بھی وہ ڈیٹان ہول کی لوکیشن دیکھنے کے بعد اپنے منصوبے کو انتہائی موثر طور پر عملی جامہ پہنانے کے بارے میں مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا جب اس کے موبائل کی واہریشن نے اس توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اسکرین پر میڈم کے نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کرتے ہوئے کہا۔

”معذرت خواہ ہوں کہ مصروفیت کی وجہ سے آپ کو جوابی کال نہ کر سکا۔“

”حالات کے پیش نظر میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ آپ کو سرکھانے کی بھی فرصت نہیں ہو گی..... جال میں آنے والا کمرچھ کیا ابھی تک سانس لے رہا ہے؟“

”آپ نے صبح ساحلی علاقے پر ہونے والے دھماکے کے بارے میں دریافت کیا تھا۔“ سراج نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے۔ ہم پولیس والے عقل سے بالکل ہی پیدل ہوتے ہیں؟“

”میں سمجھی نہیں.....“ دوسری طرف سے تعجب کا اظہار کیا گیا۔

”میں تاج محل ہوٹل والے سانحے کو درمیان میں نہیں لانا چاہتا، لیکن بہر حال آپ کو اس بات کا اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا کہ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔“ سراج نے بدستور سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ”ایک دوست کی حیثیت سے..... آف دی ریکارڈ..... میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ دشمن کے مقابلے کے لئے تیار رہنے کا اختیار دوسروں کی طرح آپ کو بھی ہے لیکن..... دھماکا خیز طریق کار سے

آپ کو دو بار کال کرتا ہوں۔“

سراج نے اس کی ہدایت کے مطابق ریسیور میز پر رکھ دیا لیکن وہ بات نہیں سمجھ سکا تھا کہ جب فون انکج ہوگا تو وہ فون کس طرح کرے گا؟ اس کا خیال تھا کہ شاید دس منٹ کا وقفہ کسی خاص وجہ سے رکھا گیا ہے۔ وہ بھی اسی معنی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا ان رجسٹرڈ سم والا موبائل واہریت کرنے لگا۔ اسکرین پر جو نمبر روشن ہوا وہ اس کے لیے بالکل نیا تھا، پھر بھی اس نے کال اینڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

”ہیلو۔“ سراج نے اپنا نام لینے کے بجائے صرف ہیلو کہنے پر اکتفا کیا۔

”آپ کا خادم بول رہا ہوں۔“ اسی مخمکری آواز ابھری جو دس منٹ پہلے اس کے آفس کے نمبروں پر بات کر رہا تھا۔

”تمہیں میرا یہ نمبر کہاں سے ملا؟“ سراج نے تعجب کا اظہار کیا۔

”یہ بات اتنی ضروری نہیں جتنا ان دو کرداروں کا مسئلہ اہم ہے۔“ دوسری طرف سے بات جاری رکھی گئی۔

”وہ آپ کو اس وقت ہوٹل ڈیٹان کے کمر ایک سو دو میں ملیں گے۔ ایک درمیانہ قد اور دوسرا بونے قد والا ہے۔ ان کو قابو کرنے میں کوئی اوچھا ہاتھ نہ ڈالے گا..... وہ اپنی گرفتاری پر اپنی موت کو زیادہ ترجیح دیں گے دونوں میک اپ میں ہیں۔“

”کون لوگ ہیں وہ؟“ سراج نے پوچھا۔ اتنی جلدی مجرموں کا سراغ ملنے سے اس کی رگوں میں دوڑتے خون کی گردش بھی تیز ہونے لگی۔

”بگ باس کے زر خرید شکاری کتے۔“ دوسری جانب سے نفرت کا اظہار کیا گیا۔ ”چار اشتہاری مجرموں کے قتل میں بھی ان دونوں کا ہاتھ شامل تھا، ان کے علاوہ دو اور بھی ہیں جن کی اطلاع میں بعد میں دوں گا۔ آپ کے عظیم احمد صاحب کو بھی ان ہی کی تلاش ہے۔ مناسب یہی ہوگا کہ انہیں گرفتار کر کے افضل خان کے سلسلے میں کھٹا لے کے بعد عظیم صاحب کے حوالے کر دیں..... ہو سکتا ہے کہ انہیں پولیس کسٹڈی میں موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی جائے۔“

”تم نے کسی کو تحفظ دینے کی بات کی تھی؟“ سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ممکن ہے پولیس کے چھاپے کے وقت وہ بھی لپیٹ میں آجائے، لیکن وہ جرم نہیں ہو گا۔“ دوسری جانب سے جواب ملا۔ ”اگر ایسا ہوا تو میں آپ کو آپ کا وعدہ بھی ضرور یاد دلاؤں گا۔“

”میں بھی تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتا ہوں کہ اپنے وعدے کو ہر قیمت پر نبھاؤں گا خواہ اس کے لیے کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔“ سراج نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں ملا بلکہ رابطہ ختم کر دیا گیا۔

مخبر نے جو اطلاع دی تھی وہ اہم بھی تھی اور اس پر عمل کرنے کے لیے خاصی محنت بھی کرنی ضروری تھی، جو لوگ شیخ حامد کے اشارے پر چار اشتہاری مجرموں کو گولی مار کر عام شاہراہوں پر پھینکنے

گریز کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”آپ نے دوست کہا ہے تو میں بھی آپ کے اندازے کی تردید نہیں کروں گی۔“ جواب میں میڈم نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”میرا مقصد صرف اپنے دشمن کو یہ باور کرانا تھا کہ میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوں جتنا وہ سمجھ رہا ہے۔“

”اس کے باوجود میں آپ کو محتاط رہنے ہی کا مشورہ دوں گا؟“

”آپ نے کچھ دنوں پہلے مجھ سے کسی کا نام بتانے کا وعدہ کیا تھا۔“ دوسری جانب سے بے تکلفی کا اظہار کیا گیا۔

”یاد ہے آپ کہ.....؟“

”کچھ دنوں اور انتظار کر لیں۔ موجودہ چویش سے منٹ لوں تو پھر تفصیل سے بات ہوگی۔“

”ٹھیک ہے..... میں انتظار کر لوں گی لیکن اس وقت میں آپ سے ایک اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”میرے لائق کوئی خدمت.....؟“

”آپ نے مجھے زندہ رہنے کا جو موقع فراہم کیا تھا اس کے پیش نظر میں آپ پر اندھا اعتماد کرنے لگی ہوں۔“ میڈم نے بے حد سنجیدگی سے کھل کر بات کی۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ..... آف دی ریکارڈ ہی سہی..... لیکن میرے اس اعتماد کو بھی مجروح نہ ہونے دیں گے۔ ایک اور ایک مل کر گیارہ بھی ہو سکتے ہیں جس کے مقابلے میں.....“

”میں آپ کا مقصد سمجھ رہا ہوں۔“ سراج نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”آپ نے جس اعتماد کا اظہار کیا ہے اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کچھ پکڑاٹھکانے لگانے کی خاطر مجھے بھی آپ کا تعاون درکار ہو.....“

”میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھوں گی۔“ جواب میں خوشی کا اظہار کیا گیا۔

سراج نے گفتگو کو طویل دینے کی کوشش نہیں کی۔ میڈم نے کچھ پکڑاٹھکانے لگانے میں تعاون والی بات پر جس خوشی کا اظہار کیا۔ وہ سراج کے اس اندازے کو تقویت دینے کے لیے کافی تھا کہ جن لوگوں نے ساحلی علاقے پر ایک نئی ہائی روف کر دھماکے سے اڑایا اور کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر چھوستر ہو گئے۔ وہ شریف لوگ بھی نہیں ہوں گے۔ میڈم نے شیخ حامد جیسے گرد گھٹال سے ٹکر لینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کے لیے کوئی ٹیم بھی ضرور تشکیل دی ہوگی جس میں جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے نامی گرامی اجرتی قاتل اور ایسے ہی جیلے قسم کے بد معاش بھی شامل ہوں گے جن کے لیے موت کے منہ میں چھلانگ لگانا کسی تفریح سے کم نہیں ہوتا۔ ہو سکتا تھا کہ میڈم نے انڈر ورلڈ سے تعلق رکھنے والوں کی خدمات بھی خرید لی ہوں۔ جو سیر پر سوا سیر ہونے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں گے۔

سراج کا ذہن اسی نکتے پر غور کر رہا تھا جب اس کی نظر عقب نما آئینے کی طرف اٹھی۔ اس نے چونکنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ وہ پہلے بھی اس بات کو نوٹ کر چکا تھا کہ چیف منسٹر کانفرنس کے بعد

سے اس کو برابر وادج کیا جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مخصوص مسکراہٹ ابھری..... وہ ایک ایماندار پولیس آفیسر تھا جسے اس قسم کے ہچکنا چھکنڈوں سے مرعوب نہیں کیا جاسکتا تھا۔

سپراسٹور میں داخل ہونے کے بعد سیٹھ عثمان نے راحیلہ بیگم سے کہا تھا۔ ”آپ کو اس وقت کون سی خاص چیز یاد آگئی جو صبح نہیں لی جاسکتی تھی؟“

”کیا مطلب.....؟“ راحیلہ نے حیرت سے جواب دیا۔ ”میں تو سمجھی تھی کہ شاید آپ کو کچھ لینا ہے اس لیے آپ نے گاڑی ادھر موڑ والی ہے۔“

سیٹھ عثمان نے جواب دینے کے بجائے اپنے ذہن پر زور دیا لیکن انہیں کچھ یاد نہیں آیا۔ ایک ٹائپ کے لیے راحیلہ بیگم کے جملے پر غور کرتے رہے پھر کچھ کہے بغیر تیزی سے باہر کی جانب لپکے انہیں سراج کی کہی ہوئی کچھ باتیں یاد آ گئیں۔ سراج نے انہیں مختصر طور پر یہی بتایا تھا کہ کوئی روحانی قوت ہے جو لیاقت حسین کی مدد کرتی ہے۔ لیاقت حسین اس کی ہدایت کے مطابق عمل کر کر رہا ہے لیکن بعد میں اسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس حوالے سے اس کو سراج نے میڈم روبی کے اغوا کی کچھ تفصیل کے علاوہ فرحین اور زریہ کے اغوا اور بازیابی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ ساتھ ہی نیکہ بھی کی تھی کہ اس سلسلے میں لیاقت حسین کو نہ کریدا جائے۔ لیاقت کے مکان تبدیل کرنے والی بات بھی سیٹھ عثمان کو سراج کے ذریعے ہی معلوم ہوئی تھی اسی لیے انہوں نے لیاقت حسین کو اپنے لیے بے حد کارآمد سمجھتے ہوئے نیا بنگلا خریدنے اور اس کی انگیسی والی بات بھی اس کے کان میں ڈال دی تھی۔

اسی وقت وہی باتیں سیٹھ عثمان کو پریشان کر رہی تھیں راحیلہ بیگم نے سپراسٹور کے اندر جو بات کی تھی اس نے سیٹھ عثمان کو چھنجوڑ کر رکھ دیا تھا انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ انہوں نے گاڑی اسٹور کی جانب موڑنے کی بات نہیں کی تھی سراج کی باتوں کی روشنی میں ان کے دل میں فوری طور پر یہی گمان ہوا تھا کہ ممکن ہے کسی روحانی طاقت نے کسی قسم کا خطرہ محسوس کر کے لیاقت حسین کو اس سے آگاہ کر دیا ہو اور لیاقت نے اپنے ساتھ ساتھ راحیلہ بیگم اور سیٹھ عثمان کو بھی خطرے میں محسوس کر کے انہیں سپراسٹور پر اتار دیا ہو..... لیکن راحیلہ بیگم نے کس کی آواز سنی تھی جس پر انہیں سیٹھ عثمان کی آواز کا گمان ہوا تھا؟ یہ بھی ایک معمہ تھا۔

سپراسٹور کے باہر گاڑی کے علاوہ لیاقت حسین بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیٹھ عثمان کو اس بات کا خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ وہ اس وقت محض لحاظ و مروت کی بنا پر شیخ حامد جیسے دوست نما دشمن کے گھر سے ڈنکر کے واپس لوٹ رہے تھے۔ ممکن ہے شیخ حامد نے ان دونوں کو راستے سے ہٹانے کی خاطر کوئی خطرناک پلان بنایا ہو جس کا علم لیاقت حسین کو ہو گیا ہو اور وہ.....

”کیا بات ہے؟ آپ اس وقت جلدی میں باہر کیوں آ گئے؟“ راحیلہ بیگم نے قریب آ کر تعجب سے سوال کیا۔

”وہ..... لیاقت حسین اور گاڑی..... دونوں نظر نہیں آ رہے؟“

”اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟“ راحیلہ بیگم نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ ”ہو سکتا ہے وہ پٹرول لینے یا ٹائر میں ہوا بھروانے چلا گیا ہو۔ ڈونٹ وری..... آ جائے گا تھوڑی دیر میں.....“

”میرا خیال ہے کہ میں نے سراج سے شیخ حامد کے ڈنروالی بات چھپا کر اچھا نہیں کیا؟“ سیٹھ عثمان کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط تھی۔

”کیا بات ہے عثمان.....؟“ راحیلہ بیگم نے شوہر کو بہت غور سے دیکھا۔ ”آپ کس وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں؟“

”سراج نے واپسی کے بعد ایئر پورٹ پر بھی یہی کہا تھا کہ ہمیں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہوگا۔“

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس ڈنر کے بارے میں سراج کو اطلاع دینی ضروری ہے، لیکن آپ مروت میں دعوت قبول کرتے وقت یہ بھی فراموش کر بیٹھے کہ گاڑی میں بم والی بات کے بعد سراج ہی نے ہمیں دو مہینے باہر جا کر گزارنے کا مشورہ دیا تھا۔“

”میں کاروباری معاملات میں پولیس کو بار بار درمیان میں لانا مناسب نہیں سمجھتا۔“ سیٹھ عثمان نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”شیخ حامد بھی ضرور جانتا ہوگا کہ سراج میرا نہ صرف کلاس فیلورہ چکا ہے بلکہ ہمارے لیے کسی فیملی ممبر سے بھی کم نہیں ہے۔ مجھے سراج کی پوزیشن کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہر بات میں اسے ملوث کر کے میں اسے کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔“

”آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔“ راحیلہ بیگم نے شوہر کی بات تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن..... شیخ حامد کی ڈنروالی بات سراج کے علم میں کسی نہ کسی ذریعے سے ضرور آئے گی۔ اس وقت وہ ہم سے شکوہ کرنے میں حق بجانب ہوگا۔“

”میں اس وقت سراج کے بجائے صرف لیاقت حسین کے بارے میں پریشان ہوں۔“

”پریشان ہوں..... سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ راحیلہ بیگم نے شوہر کے چہرے پر طاری الجھن کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ”کم آن عثمان، مجھے بتائیں کہ آپ کس گھر میں مبتلا ہیں؟“

سیٹھ عثمان عجیب شش و پنج میں مبتلا تھے۔ ایک طرف راحیلہ بیگم کی تشویش تھی دوسری جانب لیاقت حسین کا خیال۔ وہ بیوی کو مطمئن کرنے کی خاطر کوئی مناسب جواب دینا چاہتے تھے کہ اچانک ایک پولیس چیٹرونگ ڈیوٹی کی جپ ان کے قریب آ کر تیزی سے رکی ایک ایس آئی نے بڑی عجلت میں ان کے قریب آ کر دریافت کیا۔

”آپ کس کا انتظار کر رہے ہیں.....؟“

”کیا مطلب.....؟“ سیٹھ عثمان کی کشادہ پیشانی ٹھکن آلودہ ہو گئی۔ ”کیا کسی کا انتظار کرتا بھی

پولیس کی نظروں میں.....“

”پلیز.....“ اے ایس آئی نے ان کا جملہ کاٹ کر پوچھا۔ ”کیا آپ سیٹھ عثمان ہیں؟“

”جی ہاں۔“ سیٹھ عثمان نے اس کے چہرے پر طاری کسی سنگین تشویش کو محسوس کرتے ہوئے اس بار قدرے بے چینی سے کہا۔ ”کیا بات ہے..... آپ کو میری تلاش.....“

”سر..... وہ وہ آپ کی کار یہاں سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر کسی حادثے سے دو چار ہو کر خطرناک حد تک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی ہے۔“

”میرے ڈرائیور کا کیا بنا.....؟“ سیٹھ عثمان نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔

”وہ زخمی ہوا ہے..... معجزاتی طور پر اتنے بڑے ایکسیڈنٹ سے دو چار ہو کر زندہ بچ جانا کرشمہ ہی کہا جاسکتا ہے۔“ اے ایس آئی نے کہا۔ ”بہر حال، ہم نے فوری طور پر ایک رفاہی ادارے کی ایسولینس بلوا کر زخمی کو ہسپتال بھیج دیا ہے۔ ہمارا ایک سپاہی بھی اس کے ساتھ ہے۔ ڈرائیور ہوش میں تھا اور اس ہی نے ہمیں بتایا کہ وہ آپ لوگوں کو یہاں چھوڑ کر جا رہا تھا۔“

”ایکسیڈنٹ کی نوعیت کیا تھی.....؟“ سیٹھ عثمان نے بے چینی سے پوچھا۔

”ابھی کچھ تحقیق سے نہیں کہا جاسکتا لیکن..... اندازہ یہی ہے کہ کسی جہی ڈیوٹی ٹرک نے پشت سے ٹکر ماری ہوگی، ممکن ہے اس کے بریک بروقت کام نہ کر سکیں ہوں..... اس نے بعد میں بھی رکنے کی کوشش نہیں کی۔“ اے ایس آئی تفصیل دہراتا رہا۔ ”یہ بھی غنیمت ہوا کہ آپ کی کار غالباً اچھلنے کے بعد ڈرائیور کے برابر والی سیٹ کے رخ گری ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“

”کیا ایکسیڈنٹ کے بعد ڈرائیور بھی ہوش میں تھا؟“ راحیلہ بیگم نے سوال کیا۔

”جی ہاں..... اتنے شدید ایکسیڈنٹ کے بعد انسان کا ہوش بحال رکھنا آسان نہیں ہوتا، لیکن اللہ نے بڑا کرم کیا۔“

”میں نے پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد ہی اسے اسپتال روانہ کیا ہے۔ دوسری شکل میں

ہمیں آن دی اسپتال ہی پوری قانونی کارروائی.....“

”اس ٹرک کے بارے میں کوئی معلومات ہوئی.....؟“ سیٹھ عثمان نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”جی نہیں..... جائے حادثے کے آس پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا۔“ اے ایس آئی نے جواب دیا۔ ”کمرشل ایریا ہونے کے سبب دکانیں بھی بند ہو چکی تھیں ورنہ کوئی عینی شاہد بھی مل جاتا۔“

سیٹھ عثمان نے اس کا جواب سننے کے بعد سب سے پہلے فون کر کے اپنی دوسری گاڑی طلب کی پھر سراج کے نمبر ملانے لگا۔ ”سوری.....“ دوسری طرف سے سراج ہی نے کال ریسرو کرنے کے بعد بے تکلفی سے کہا۔ ”سارے دن کی ڈیوٹی کرنے کے بعد اس وقت کمر سیدھی کرنے لیٹا ہوں۔“

”تمہیں ایک اہم اطلاع دی گئی تھی.....“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اس وقت گھر کے

قریب والے سپراسٹور کے باہر سے بول رہا ہوں۔ راحیلہ بھی میرے ساتھ ہے۔“

”خیریت.....؟“ اس بار سراج نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”تم آواز سے ہی کچھ اپ سیٹ لگ

رہے ہو کیا بات ہے؟“

”ہماری کار کا ایکسٹنٹ ہو گیا ہے..... لیاقت حسین کو پولیس پٹرونگ جیب پر تعینات ایک اے ایس آئی نے اسپتال روانہ کر دیا ہے۔“

”کیا ایکسٹنٹ کے وقت تم دونوں گاڑی میں نہیں تھے؟“ سراج نے گہرا کرسوال کیا۔

”نہیں.....“

”پٹرونگ جیب کہاں ہے.....؟“ سراج نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔

”جیب اور ایک اے ایس آئی دونوں موجود ہیں۔ تم بات کر لو۔“

سیٹھ عثمان نے موبائل اے ایس آئی کی طرف بڑھا دیا جس نے سراج کو پہچان کر صرف وہ روداد بیان کی جو سسٹن سٹرک پر اس کے مشاہدے میں آئی تھی۔ اس کے بعد اس نے یس سرکہہ کر موبائل دوبارہ سیٹھ عثمان کی جانب بڑھا دیا۔

”تم اس وقت کہاں سے آرہے تھے؟“ سراج نے اس بارے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔

”میں فوری طور پر راجیلہ کو پتکے پر ڈراپ کرنے کے بعد اسپتال پہنچ رہا ہوں، تم بھی ادھر ہی آ جاؤ.....“ سیٹھ عثمان نے..... سوال کا جواب دینے کے بجائے صرف اتنا کہا اور موبائل آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔

پولیس جیب جانے کے بعد راجیلہ بیگم نے شوہر کو فکر مندی سے دیکھا۔ اسی وقت دوسری گاڑی آگئی اس لیے سیٹھ عثمان نے بغیر کسی روکل راجیلہ بیگم کے لیے دروازہ کھولا۔ پھر دوسری جانب سے آ کر بڑی بجلت میں خود بھی بیٹھ گئے۔

”اپنی گاڑی کا کیا ہوا سر؟“ دوسری گاڑی کے ڈرائیور نے سوال کیا۔

”اس کا ایکسٹنٹ ہو گیا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے مختصر جواب دیا۔ ”بیگم صاحبہ کو گھر اتارنے کے بعد ہمیں ریڈ کر اس اسپتال چلنا ہے۔“

”لیاقت حسین تو خیریت سے ہے؟“

”ہاں.....“ سیٹھ عثمان نے کہا پھر ان کے ذہن میں وہی باتیں گونجنے لگیں جو سراج نے لیاقت حسین کے بارے میں کسی روحانی قوت کے حوالے سے گوش گزار کی تھیں۔ اس کے علاوہ پولیس کے آن راؤنڈ ایس اے آئی کے بیان کی روشنی میں وہ اس فرار ہو جانے والے ہیوی ڈیوٹی ٹرک کے بارے میں بھی غور کر رہے تھے جو موقع واردات سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کوئی بات تھی جس کی بنا پر انہیں اے ایس آئی کا خیال ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ ایسی صورت میں ٹرک ڈرائیور ہارن دے کر لیاقت حسین کو بھی متوقع خطرے سے آگاہ کر سکتا تھا۔ وہ سٹرک بھی اتنی نشادہ تھی کہ اس پر سے بیک وقت تین ٹرک بھی ایک ساتھ گزر سکتے تھے۔

سیٹھ عثمان کے ذہن میں راجیلہ بیگم کو گھر ڈراپ کر کے اسپتال جاتے وقت بھی ایک خیال بار بار ابھر رہا تھا۔ وہ ایکسٹنٹ جان بوجھ کر کیا گیا تھا..... اس کی پشت پر کس کا ہاتھ تھا..... اور..... لیاقت حسین کو اس کی اطلاع کس طرح ہوگئی جو وہ دونوں کو سپراسٹور پر چھوڑنے کے

بعد آگے جانے پر مجبور ہو گیا..... چاہتا تو خود میں اپنی جان بچانے کی خاطر کار سے باہر آ جاتا..... لیکن اس نے ایسا نہیں کیا..... اس کی کیا وجہ تھی.....؟“

❖❖❖

سیٹھ عثمان کے اسپتال پہنچنے کے دس منٹ بعد سراج بھی آ گیا۔ اس کے چہرے سے شدید تھکن کے اثرات مترشح تھے۔ رسی گفتگو کے بعد اس نے سب سے پہلے لیاقت حسین کی خیریت دریافت کی۔

”ڈاکٹروں نے بھی اس حادثے پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔ ”لیاقت حسین کے جسم پر معمولی چوٹیں آئی ہیں لیکن ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اندرونی چوٹوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اندازہ چوٹیں کھنسنے گزرنے کے بعد ہی ممکن ہے۔“

”لیاقت سے تمہاری کوئی بات ہوئی.....؟“

”نہیں۔ ڈاکٹروں نے اسے سکون آور گولیاں دی ہیں۔ میری ہدایت کے بعد اب وہ اسے پرائیوٹ وارڈ میں منتقل کر رہے ہیں۔“

”تمہاری گفتگو کا انداز بتا رہا تھا کہ تم کچھ زیادہ ہی نروس ہو؟“ سراج نے اسے ملوثی نظروں سے دیکھا۔ ”جہاں تو خیریت سے ہیں؟“

”ہاں۔“

”ون منٹ.....“ سراج نے چونکتے ہوئے کہا۔

”موبائل سے ملنے والی اطلاع کے مطابق ایکسٹنٹ سپراسٹور سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور ہوا تھا۔ لیاقت حسین تم لوگوں کو چھوڑ کر کہاں جا رہا تھا؟“

”نبی سوال مجھے پریشان کر رہا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے پوری تفصیل دہراتے ہوئے کہا۔ ”راجیلہ کا کہنا ہے کہ میں نے لیاقت حسین کو سپراسٹور جانے کو کہا تھا جبکہ مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں۔ اس کے بعد حالات کے پیش نظر جب مجھے تمہاری فراہم کردہ روحانی والی معلومات کا خیال آیا میں فوری طور پر سپراسٹور سے باہر آیا لیکن..... ہونے والی بات ہو چکی تھی۔“

”کیا مطلب.....؟“ سراج نے وضاحت طلب انداز میں پوچھا۔ ”کیا تمہارا خیال ہے کہ لیاقت حسین نے کسی خطرے کو محسوس کر لیا تھا جو وہ تم دونوں کو ڈراپ کر کے آگے نکل گیا؟“

”سوری سراج.....“ سیٹھ عثمان نے اسے شیخ حامد کی دعوت والی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”راجیلہ نے کہا بھی تھا کہ مجھے اس کی اطلاع سب سے پہلے تمہیں دینی چاہیے تھی لیکن.....“

”ڈونٹ وری..... میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی انسان مردت میں بھی اس قسم کی دھوٹوں کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“ سراج نے سیٹھ عثمان کی مشکل آسان کرنے کی خاطر اس سے کسی قسم کی باز پرس کرنے سے گریز کیا پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ”شعبے کے طور پر ذہن میں سب سے پہلے اسی مگر مجھ کا نام ابھرتا ہے لیکن حادثے میں استعمال ہونے والا ٹرک جب تک سامنے نہیں

کہا۔

”آپ کے مشورے سے اتفاق نہ کر کے اس نے یقیناً ایسی غفلت برتی ہے جس کی سزا بھی اب آپ کو ہی دینی ہوگی۔“

”خدا آپ کو اور ہماری الماس کو خوش رکھے۔“

راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”ویسے آپ کی نظروں میں کون ہو سکتا ہے وہ.....؟“

”ملاقات ہونے پر اطمینان سے بات ہوگی۔“ سراج نے جملہ مکمل ہوتے ہی موبائل آف کر دیا۔

میڈم روپی کو خلاف توقع کمرے میں آتا دیکھ کر اسے تعجب ہی ہوا تھا۔

”آپ؟..... اس وقت اور یہاں.....؟“ سراج نے اس کے قریب آنے پر حیرت کا اظہار کیا۔

میڈم نے سراج کو جواب دینے کے بجائے سیٹھ عثمان سے اپنا تعارف کرایا۔ ”میں مرحوم خالد ریاض کی بیوہ ہوں۔“

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر.....“ سیٹھ عثمان نے گرجبوشی کا مظاہرہ کیا۔ ”خدا غریق رحمت کرے آپ کے شوہر سے میری کافی ملاقاتیں رہتی تھیں لیکن آپ.....“

”میں اس زمانے میں پردے کی عادی تھی.....“ میڈم نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ویسے آپ کا نام بہت سن رکھا ہے۔“

”کبھی غریب خانے پر تشریف لائیے۔“ سیٹھ عثمان نے خوش اخلاقی سے دعوت دی۔ ”مجھے خوشی ہوگی۔“

”ضرور آؤں گی.....“

”اس وقت آپ کا یہاں کیسے آتا ہوا.....؟“ سراج نے دریافت کیا۔

”میرے ایک شخص کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اسے دیکھنے چلی آئی۔“ میڈم کا لہجہ معنی خیز تھا۔ سراج کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میڈم کا اشارہ لیاقت حسین کی طرف تھا۔

”آپ کو کس طرح پتا چلا.....؟“ سراج نے تعجب کا اظہار کیا۔

”ڈھونڈنے سے تو خدا ابھی مل جاتا ہے بشرطیکہ لگن سچی ہو۔“ میڈم نے بستر پر پڑے لیاقت حسین کو بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا پھر سیٹھ عثمان سے حادثے کی نوعیت کے بارے میں دریافت کیا۔

سراج کے ذہن میں کئی خیالات ابھر کر گڈمڈ ہونے لگے۔ اس نے سوچا۔ ”اگر لیاقت حسین کو پیش آنے والے حادثے میں شیخ حامد کا ہاتھ شامل تھا تو اس کے کچھ لوگ اس وقت بھی کہیں آس پاس ضرور منڈلا رہے ہوں گے۔ اس صورت..... میں سیٹھ عثمان کی موجودگی زیادہ تشویش طلب نہیں تھی۔ بگ باس کو بھی علم تھا کہ وہ اور عثمان کلاس فیلورہ چکے ہیں مگر میڈم روپی نے سامنے آ کر نکون کی

آتا، ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

”مجھے تو اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ لیاقت کو سپراسٹور سے دور جانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اگر کچھ محسوس کر چکا تھا تو ہمیں بھی.....“

”تم بھول رہے ہو.....“ سراج نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”سکون آور دواؤں کے اثر سے باہر آنے کے بعد لیاقت حسین کو شاید خود بھی یاد نہ ہوگا کہ اس نے کہا خطرہ محسوس کیا تھا۔ یاد آ گیا تب بھی وہ زبان نہیں کھولے گا۔ پہلے بھی دو تین موقعوں پر میں اس کا مشاہدہ ذاتی طور پر کر چکا ہوں۔“

اسی وقت ہسپتال کے ایک وارڈ بوائے نے آ کر اطلاع دی کہ مریض کو پرائیویٹ وارڈ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

”تمہارا کیا خیال ہے.....“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کیا شیخ حامد ایسی حماقت کر سکتا ہے کہ دعوت کے فوراً ہی بعد کسی خطرناک منصوبے پر عمل بھی کر بیٹھے؟“

”سوچتا ہوگا.....“ سراج نے کہا پھر وہ دونوں اس کمرے میں آ گئے جہاں لیاقت حسین کو منتقل کیا گیا تھا۔ جو ڈاکٹر اسے اٹینڈ کر رہا تھا وہ بھی اس وقت ایک نرس کے ساتھ موجود تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے..... مریض کو کب تک ہوش آ جائے گا؟“ سراج نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن ڈیڑھ دو گھنٹے ضرور لگیں گے۔“

”آپ نے مریض کا مکمل چیک اپ تو کر لیا ہے نا؟“ سیٹھ عثمان نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ کہیں کسی جوڑ وغیرہ کو کوئی.....“

”ڈونٹ وری..... میں ہر طرح سے اپنا اطمینان جدید مشینوں کے ذریعے کر چکا ہوں۔“

ڈاکٹر ایمر جنسی کال پر ایک اور مریض کو دیکھنے چلا گیا تو سراج نے کچھ سوچتے ہوئے سیٹھ عثمان سے کہا۔

”کوشش کرنا کہ شیخ حامد اور اس کی دعوت کا کوئی ذکر درمیان میں نہ آنے پائے.....“

سیٹھ عثمان نے اثبات میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔ اسی لمحے سراج کا موبائل جاگ اٹھا، اسکرین پر راحیلہ بیگم کے نمبر دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

”مجھے یقین تھا کہ آپ صرف قابل اعتماد آدمی ہی سے تفصیل معلوم کریں گی۔“

”لیاقت حسین تو خیریت سے ہے؟“ راحیلہ بیگم نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اپنے جاں نثار ڈرائیور کی خیریت دریافت کی۔

”قدرت نے اسے بچا لیا لیکن اس کی تمام تر ذمہ داری جس مشکوک شخص پر عائد کی جاسکتی تھی وہ بھی میری نظروں میں آ گیا۔“ سراج نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

”گڈ.....“ دوسری جانب سے خوشی کا اظہار کیا۔

”کون ہے وہ.....؟“

”وہی جسے آپ نے ضرورت سے زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے۔“ سراج نے بدستور سنجیدگی سے

”سوری.....“ سراج نے اس کی خیار آلود آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میرے رات کو وقت ناوقت آنے سے تمہاری نیند ڈسٹرب ہوتی ہے۔“

”آپ نے میرے مشورے کے بارے میں نہیں پوچھا؟“

”کہو.....“

”میرا خیال ہے کہ اب آپ کو اس ملازمت کو چھوڑ دینا چاہیے۔“
 ”یہ خیال آپ کے ذہن میں آیا تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟“ سراج نے چونک کر پوچھا۔
 ”کیوں.....؟“ الماس نے جن نظروں سے سراج کو دیکھا اس میں ایک عورت کی فحش بھی
 شامل تھی۔ ”کیا آپ نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ہماری ازدواجی مسرتوں میں آپ کی وردی کے
 فرائض.....“

”آئی ایم سوری ڈارلنگ۔“ سراج نے کروٹ لے کر الماس کو خود سے اور قریب کر لیا۔ اس وقت اس کے تھکے ہوئے ذہن کو ایک خوبصورت بیوی کا قریب ہی سکون پہنچا سکتا تھا۔ اس بات کو محسوس کر کے الماس نے بھی ہاتھ بڑھا کر شوہر کے خوبصورت بالوں کو چھڑتے ہوئے کہا۔

”اگر درمیان میں کوئی فون آ گیا تو آپ پھر یہی کہیں گے کہ ون منٹ ڈارلنگ اور آپ کا یہ ون منٹ کسی کے جذبات کو روند کر بے مزہ کر دیتا ہے۔ پھر آپ ہی شکایت کرتے ہیں۔“

۱ الماس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں، ٹائٹ گاڈن سے سرکشی کرتا ہوا اس کا جسم مچل جانے کو تھا۔ سراج کے موبائل پر ابھرنے والی نیون سن کر وہ کسی ناگن کی طرح ہنسنے لگا اور غسل خانے میں جا کر ٹھنڈے پانی سے نہانے میں مصروف ہو گئی۔۔۔۔۔ سراج نے بیوی کے جذبات کو محسوس کیا لیکن وہ اس کال کو بھی منقطع نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ روشن اسکرین پر میڈم روبی کے نمبر جھللا رہے تھے۔ وہ موبائل آن کرتا ہوا تیزی سے اٹھ کر بارہا لاونج میں آ گیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ سراج پول رہا ہوں۔“

میں اس وقت آپ سے لیاقت حسین کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“
 ”جب آپ اس کے بارے میں پہلے سے واقف تھیں تو پھر.....“
 ”میں کچھ اور باتوں سے بھی واقف ہو چکی ہوں اسی لیے آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہوں۔“ دوسری جانب سے بے حد سنجیدگی سے کہا گیا۔
 ”میں سمجھا نہیں.....“ سمران نے وضاحت چاہی۔
 ”آپ کا اشارہ کن باتوں کی طرف ہے؟“

”لیاقت حسین کو جس ہیوی ڈیوٹی ٹرک کے ذریعے مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ آپ اسے کیوں بھول رہے ہیں؟“ میڈم نے سرسرااتے لہجے میں جواب دیا۔ ”ساحلی علاقے پر ہونے والا دھماکا کسی کے لئے ایک وارننگ ہی تھا، لیکن دشمن نے شاید اسے سنجیدگی سے محسوس نہیں کیا۔“

”آپ ابھی ٹرک کی بات کر رہی تھیں؟“ سراج نے اسے یاد دلایا۔

محل اختیار کر لی تھی۔ شیخ حامد ان تینوں کی ایک جگہ موجودگی کو کئی زاویوں سے دیکھ سکتا تھا۔ جو لوگ چیف خسر کا نفرنس کے بعد سے سراج کے شب و روز کی مودمنٹ وایج کرنے میں مامور تھے وہ بھی کہیں آس پاس ہی مڈلا رہے ہوں گے۔“

”کیا بات ہے سراج؟“ سیٹھ عثمان نے دریافت کیا۔ ”تم کہاں کھو گئے.....؟“

”ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے.....“ سراج نےنجیدگی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے میں کل بھی تم سے ملاقات نہ کر سکوں۔ تم لیاقت حسین کا خیال رکھنا۔ میں موبائل پر خیریت دریافت کرتا رہوں گا۔“

”اتنی رات گئے بھی آپ لوگوں کو سکون نہیں ملتا.....؟“ میڈم نے سراج سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

”پولیس کی ملازمت میں آرام اور سکون کی بات وہ کرتے ہیں جنہیں اپنے فرائض کا احساس نہیں ہوتا۔“ سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر دیدہ و دانستہ میڈم سے رخصتی جملے کہے بغیر صرف سیٹھ عثمان سے ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے ممکنات کے طور پر کچھ پوشیدہ نظروں کو اس سے بھی تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ لیاقت حسین کے کمرے میں اس کی اور میڈم کی ملاقات محض اتفاقی تھی۔ باہر آ کر اس نے راہداری میں ایک سرسری نظر ڈالی پھر پارکنگ لاٹ کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ اس کے ذہن میں اس وقت پھر ڈیٹا ہونٹ اور اس کے کمرانمبر ایک سودو میں موجودان دو افراد کا خیال گردش کرنے لگا جو خیر کی اطلاع کے مطابق اسٹینڈ ہائی کی پوزیشن میں تھے۔ اوپر سے ایک گرین سگنل ملنے کے بعد وہ ہر قیمت پر افضل خان کو پولیس کسٹڈی کے باوجود موت کے گھاٹ تک پہنچانے کی کوشش ضرور کرتے..... اس خیال کے ساتھ ہی وہ اس منصوبے پر بھی دوبارہ غور کرنے لگا جو اس نے بہت غور و خوض کے بعد پلان کیا تھا۔

گھر جاتے وقت اس نے متعدد بار عقب نما آئینے پر نظر ڈالی نظر لیکن غالباً اس وقت اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا۔ سراج کو اس بات کا خدشہ ضرور لاحق ہو گیا تھا کہ اگر شیخ حامد کو کہیں اس کے اور میڈم ربوہ کے گلے جوڑ کی اطلاع مل گئی تو اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ اس کے پاس میڈم سے تعارف حاصل کرنے کا ایک جواز بہر حال محفوظ تھا۔ تاج محل ہوٹل کے معاملے کو میڈیا تک جانے سے روکنے میں اس کی کوششوں کا دخل تھا۔ یہی ایک پلس پوائنٹ تھا جو وہ بوقت ضرورت استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک سوال یہ بھی گونج رہا تھا کہ اگر میڈم کیاقت حسین کے بارے میں پہلے سے واقف تھی تو پھر سراج سے اس ضمن میں کیوں اصرار کرتی رہی تھی؟

سراج نے کمر بچھ کر گاڑی گیراج کے بجائے پورٹیکو ہی میں چھوڑی اور اندر جا کر لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر الماس کے برابر لیٹ گیا۔ اسے علم تھا کہ اگلا دن اس کے لیے کس قدر اہم اور ہنگامہ خیز ثابت ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ الماس سوچگی ہوگی لیکن وہ جاگ رہی تھی، سراج کے بستر پر دروازہ ہوتے ہیں اس نے پلٹ کر اس سے بڑی اپنائیت سے کہا تھا۔

”آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔“

”ہسپتال میں آپ نے لیاقت حسین کے سلسلے میں ایک شکوہ کیا تھا..... وہ غلط نہیں تھا۔ مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ کس نے موت کے منہ میں چھلانگ لگا کر مجھے اغوا ہونے سے بچایا تھا۔ آپ کو میں صرف آزار ہی تھی۔“

”ٹرک کے بارے میں آپ کو کیا معلوم ہے؟“ سراج نے جھلا کر پوچھا۔

”وہ میرے آدمیوں کی نظروں میں اچکا ہے۔“ اس بار میڈم نے بڑے چیلنجنگ لہجے میں جواب دیا۔ ”اطلاعا عرض ہے کہ میرے صرف ایک اشارے پر وہ بھی ایک دھماکے سے برباد کر دیا جائے گا۔“

”وہ کس کی ملکیت ہے؟“ سراج نے سنسناتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”ٹرک کی تباہی کے ساتھ ساتھ ممکن ہے وہ ڈرائیور بھی زندگی سے محروم کر دیا جائے جو حادثے کے وقت اسے چلا رہا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ اس قدر جذباتی انداز کا مظاہرہ آپ کے حق میں مناسب نہیں ہو گا۔ پلیز اپنی معلومات مجھے فراہم کر دیں اس کے بعد..... آپ جیسا چاہیں گی ویسا ہی ہو گا۔“

”آپ نے ٹرک کی ملکیت کے بارے میں دریافت کیا تھا..... اس کے لیے اتنا عرض کر دوں کہ ٹرک اور اس کے ڈرائیور کی خدمات کی عارضی طور پر منہ مانگے داموں خریدا گیا تھا..... کس نے خریدا تھا..... یہ آپ بھی سمجھ رہے ہوں گے۔ ہائی۔“

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ سراج نے فوری طور پر میڈم سے دوبارہ رابطہ کے بارے میں سوچا لیکن کسی خیال سے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔ اس کا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ کسی بڑے مگر چمچ کی توجہ اگر ایک شکاری کے بجائے کئی شکاریوں کی طرف ہٹ جائے تو پھر اسے آسانی سے شکار کیا جاسکتا۔



ڈیشان ہوٹل کے روم نمبر ایک سو دو میں موجود دونوں افراد اچھی پوزیشن میں نظر آ رہے تھے۔ درمیانہ قد اور گٹھے ہوئے جسم والے نے جینز کے اوپر جیکٹ پہن رکھی تھی گلے میں ہلکے بزرنگ کا بوٹے دار لمبا ریشتی رومال بھینگے کے قریب ٹائی جیسی ٹائٹ لگا کر ڈال رکھا تھا۔ وہ کسی اسسٹنٹ فلم کا ہیرو ہی لگ رہا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی جو بوٹے قد کا مالک تھا اس نے جینز کے اوپر جیکٹ کے بجائے گہرے چاکلیٹ کمر کی کالے چار خانوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ دونوں ہی میک اپ میں تھے لیکن میک اپ بھی اس مہارت سے کیا گیا تھا کہ فوری کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ درمیانہ قد والا بار بار اپنی دہی گھڑی پر اس طرح نظریں ڈال رہا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

صبح ناشتے کے وقت وہ ٹائٹ سوٹ میں ملبوس تھے لیکن ناشتے سے فارغ ہوتے ہی بڑی پھرتی اور مہارت سے اپنے لباس اور حلیے دونوں تبدیل کر لیے تھے۔ خاصی دیر تک وہ اپنی اپنی سوچوں میں مستغرق رہے پھر درمیانہ قد والے نے جسے اس کا ساتھی خاص خاص موقعوں پر کیپٹن کے نام سے

یاد کرتا تھا بوٹے قد والے کو مخاطب کیا۔

”کیپٹن۔ ہم جس کا انتظار کر رہے ہیں اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ روز وہ زیادہ سے زیادہ

ساڑھے آٹھ بجے تک آ جاتا تھا لیکن آج نو بجے کے بعد بھی دور دور تک اس کا کوئی نشان نہیں۔“

”اس کے دو مطلب ہی ہو سکتے ہیں۔“ کیپٹن کہہ کر مخاطب کیے جانے والے نے سنجیدگی سے

خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تک اس کی غیر حاضری کے صرف دو مطلب ہو سکتے ہیں..... یا تو

لائسنس خیز نہیں ہے یا پھر ممکن ہے بگ باس نے اسے کسی وجہ سے روک دیا ہو گا۔“

”گو یا آپریشن آج کے بجائے کل کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے.....؟“

”یہ بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔“ کیپٹن نے شانے اچکا کر کہا۔ ”ہمیں اڑتالیس گھنٹے ہائی

الٹ رہنے کو کہا گیا تھا۔ ہیڈ آف دی اسٹیٹ کی مرضی پر منحصر ہے۔ کسی وقت بھی آپریشن کا سگنل دیا

جاسکتا ہے۔“

”یور آر ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ“ میجر نے اپنے ساتھی کی تائید کی۔ کچھ توقف کے بعد اس کا ذہن

پھر الجھنے لگا۔ ”ایک بات میری سمجھ سے باہر ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”جب پھانسی پانے والے کے چہرے پر سیاہ کپڑا پہنا دیا گیا تو کھٹکا دبانے میں کیسی

ہلکی ہٹ.....؟“

”بات سولہ آنے درست ہے لیکن..... یہ سوچنا ہمارا کام نہیں۔“ کیپٹن نے بے پروائی سے

جواب دیا۔ ”ہمیں صرف ایکشن کے آرڈر سے مطلب رکھنا ہے۔ اسی بات کی خاطر ہمیں بگ باس

نے..... پناہ دے رکھی ہے۔“

”مچھلی بھارت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے.....؟“ میجر نے چارلی کے سلسلے میں سوال

کیا۔

”بھارت سے زیادہ مجھے مچھلی پسند ہے..... جل پری!“ کیپٹن نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے

ہوئے بایں آنکھ ہلکی سی جھپکائی۔ ”تم نے شاید حسین کو کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ کسی رس بھرے تربوز کی

طرح ہر وقت اندر ہی اندر چٹکتی دکھائی دیتی ہے۔“

”اس وقت میں اسی جل پری کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”خیریت.....“ کیپٹن نے اسے چونک کر دیکھا۔

”کیا تم بھی.....؟“

”نہیں.....“ میجر نے بے حد سنجیدگی نے کہا۔ ”اس روز پتے کھیلنے وقت تم نے اس کو پوری

سے پراٹھا بنانے والی جو بات کہی تھی۔ وہ اسے اچھی نہیں لگی.....“

”پھر؟.....“

”یہ مجھی بھارت اوپر سے بڑے معصوم لگتے ہیں لیکن اندر ہی اندر کسی سب میرین (sab

میں دریافت کیا۔

”ابھی تک مندی کا رجحان ہے۔“ چارلی نے دونوں ہاتھ کینٹی سے لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے صورت حال کی وضاحت کر دی کہ افضل خان ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔

”اوہ.....“ میجر شانے اچکاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”آج تو بالکل فلی ہیرو کی طرح ایکٹنگ کر رہے ہو۔“

”دوپہر کے کھانے کا کیا پروگرام ہے؟“ چارلی نے دریافت کیا۔

”کیا ہم کو آج بھی ادھر ہونے کے کمرے میں ہی لچ کرنا پڑے گا؟“ کینٹن کے لب و لہجے

میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

”ہاں.....“ میجر نے کینٹن کا موڈ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بتانے کی کوشش کی۔ ”رات کا کھانا جو

بیرالایا تھا وہ قابل اعتماد ہی رہا تھا..... شاید دوپہر کا بھی وی لائے گا۔“ آخری جملہ ادا کرتے

ہوئے اس نے چارلی کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”ہاں.....“ چارلی نے دانت نکالتے ہوئے بنگالی انداز میں اردو بولی۔ ”تم ایک دم ٹھیک

بولتے۔“

”ادھر کیا بام مچھلی نہیں ملتا۔“ کینٹن نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ”وہ جو ایک دم ہاتھ

میں آتا آتا پھسل کر نکل جاتا ہے۔“

”شور با والا کھانا ہے یا فرانی۔“ چارلی اس کا مفہوم نہیں بھانپ سکا تھا۔

”مچھلی لادو..... شور با اور فرانی کا فیصلہ ہم بعد میں کر لے گا۔“ کینٹن نے شوخی سے کہا۔ ”ایک

دم شوندر شوندر (سندر۔ سندر (زندہ والا مچھلی..... لائف انجوائے کرنے کا ہے..... کیا۔“

”موذاک کرتا.....“ چارلی نے دل پر جبر کر کے مسکرانے کی کوشش کی۔

میجر خاموش کھڑا کینٹن کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا۔ چارلی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر

اس نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ اسے کینٹن کا آخری جملہ سن کر اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا اشارہ کس مچھلی

کی طرف ہے.....؟ میجر کے سمجھانے کے باوجود کینٹن چارلی کو حسینہ کے سلسلے میں چھیڑنے سے باز

نہیں آ رہا تھا۔

”چارلی.....“ اس نے چارلی کی توجہ مبذول کرنے کی خاطر کہا۔ ”ہمارے روم کے دروازے

کا میچک آئی کام نہیں کر رہا..... اس کا فوری طور پر ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے۔“

”اوکے.....“ چارلی نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے میجر کی طرف

دیکھا۔ ”میں اسے ٹھیک کراتا ہوں لیکن..... دوپہر کے کھانے کا کیا پروگرام ہے؟“

”ہم ادھر ہی ہونے میں کھانا پسند کریں گے۔“ میجر نے جواب دیا۔ ”ہمارا بار بار باہر جانا ٹھیک

نہیں ہے۔ ضروری کام سے نکلیں گے تو پھر ادھر واپس پلٹ کر بھی نہیں آئیں گے۔“

”باس بھی یہی بولتا.....“ چارلی نے پھر بنگالی مکس اردو بولی۔ ”ادھر کام فٹش۔ ادھر پھر کچھ

(marine) کی طرح خطرناک بھی ہوتے ہیں۔“

”میں سمجھی نہیں.....“ کینٹن کی پیشانی پر سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ ”تم نے سب میرین کا حوالہ

کیوں دیا؟“

”تم شاید ایک اہم بات نظر انداز کر رہے ہو۔“ میجر پہلے سے زیادہ سرد لہجے میں

بولا۔ ”ہمارے بچے اور ٹھکانے کا علم بھی بھات کے سوا کسی اور کو نہیں ہوتا ہے۔ رابطے کی وجہ سے میں

اسے مجبوراً بھگت رہا ہوں ورنہ.....“ میجر جملہ مکمل چھوڑ کر ہونٹ کاٹنے لگا۔

”آئی سی۔“ کینٹن اس طرح چونکا جیسے اس کے پاؤں اچانک بجلی کے تاروں سے چھو گئے

ہوں۔ ”کیا وہ ہماری خبر کی حماقت کرنے کی بھی سوچ سکتا ہے؟“

”اس کا خیال ابھی سے رکھو.....“ میجر نے مٹھیاں سمجھنے لگیں۔ ”روحیں اندازہ تو لگا سکتی ہیں لیکن

ہمیں بتا نہیں سکتیں۔“

کینٹن کی رگیں پھڑپھڑانے لگیں۔ اسی وقت دروازے پر کسی نے وقفے وقفے سے تین بار

دستک دی۔

”ہش.....“ میجر نے مدھم آواز میں کینٹن کو اشارے سے بتانے کی کوشش کی مچی بھارت

دروازے پر موجود ہے۔ پھر وہ بجلی ہولسٹر سے اپنا سالنسر سے لگا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا پستول

نکالتے ہوئے دروازے کے قریب ہو گیا۔ اس نے میچک آئی سے باہر دیکھنے کو کوشش کی لیکن وہ پہلے

روز ہی سے خراب تھی۔ میجر نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کسی موقع خطرے کو محسوس کر کے وہ دیوار

سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی کینٹن نے بھی فرش پر اوندھا لٹ کر اپنا پستول نکال لیا

تھا۔

ایک منٹ بعد پھر کسی نے تین بار وقفے وقفے سے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ میجر نے

اپنی پوزیشن تبدیل کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر بولٹ کھول دیا۔ آنے والا چارلی کے سوا کوئی اور نہیں

تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے فوری طور پر دروازہ دوبارہ اندر سے بند کیا پھر کینٹن سے مخاطب ہوا۔

”کیا بات ہے؟..... تم فرش پر اوندھے کیوں پڑے ہو؟“

”محسوس کر رہا ہوں کہ نیچے کوئی..... ہے بھی یا نہیں.....“ کینٹن نے آنکھ جھپکاتے ہوئے کہا

پھر پستول کو دوبارہ فیض کے اندر ڈال کر پتلون میں اڑتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے؟ تمہیں دیر کیوں ہو گئی؟“

میجر بھی پستول ہولسٹر میں رکھتے ہوئے سامنے آ گیا۔ چارلی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے

دبی آواز میں کہا۔

”آج آرام کرو..... باہر کا موسم زیادہ گرم نہیں ہے لیکن آج رات یا کل دوپہر کسی وقت موسم

کے بارے میں کوئی نئی صورت حال سامنے آ سکتی ہے۔“

”مارکیٹ کا کیا ریٹ چل رہا ہے؟“ میجر نے اشاروں کنایوں میں افضل خان کے بارے

دنوں کے لیے ایک دم انڈر گراؤنڈ۔“

”تم باس کو کب سے جانتے ہو؟“ میجر نے اسے ٹولنا چاہا۔

”بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ مگر باس کو ہم سے کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں ملا۔“

”جی زمین سے ساڑھے چار فٹ اوپر نظر آرہے ہو۔“ کیپٹن نے پھر اس کا معجمہ اڑانے کی کوشش کی۔ ”باس خوش نہ ہوتا تو تم بھی اب تک انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہوتا۔ ویسے بائی داؤے کیا باس بھی سی فوڈ (sea food) سے.....“

”کیپٹن۔“ میجر نے اسے جھلک کر دیکھا تو کیپٹن مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

”میں میجک آئی کا بول کر آتا ہوں۔“ چارلی نے عجیب انداز میں کہا۔ ”ساتھ میں کھانے کا مینو بھی لیتا آؤں گا۔“

”کبھی کبھی تم اوپر ہونے لگتے ہو۔“ میجر نے چارلی کے جانے کے بعد دورازہ بند کرتے ہوئے کیپٹن کو مخاطب کیا۔

”ہمیں بگ باس نے قانون سے جو پروٹیکشن دی ہے وہ کوئی اور نہیں دے گا۔ چارلی اس کا خاص آدمی نہ ہوتا تو اسے ہماری دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی نہ سونپی جاتی۔“

”مائی فٹ.....“ کیپٹن کے اندر کا شیطان چل گیا۔

”میں نے کبھی موت کے خوف سے کسی کی غلامی نہیں کی دو دو ٹکے کے آدمیوں کے آگے مصطفیٰ بھی سر جھکا تا میری سرشت کے خلاف ہے۔ اس بار بھی نہیں جو شمن سونپا گیا ہے وہ بھی موت کے منہ میں چھلانگ کے مترادف ہے۔ مقابلہ ہوا تو سینے پر گولی بھی ہم ہی کھائیں گے۔ خاص آدمی اور پروٹیکشن دینے والے دور بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں گے۔ ہونہ.....!“

”بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم چار آدمی اتفاق سے ایک ساتھ ہوئے ہیں۔ کوئی چھوٹا بڑا نہیں لیکن ایک دوسرے کو سمجھانا اور سمجھنا بھی ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔“

”کوئی دوسری بات کرو.....“ کیپٹن نے بدستور الجھ کر جواب دیا۔ ”میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا عادی ہوں۔ ہنس بول کر۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میجر نے موضوع بدل دیا۔

”کیا بگ باس افضل خان کو..... جو اس کا دست راست رہ چکا ہے راستے سے ہٹا کر غلطی نہیں کر رہا ہے؟“

”یہ سوچنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔“ کیپٹن کے لہجے میں تنہی گھلنے لگی۔ ”کل تک وہی کسی لیڈر کی طرح ہمارے اوپر حکم بھی چلاتا رہا ہے۔ اب ہمارے ہی ہاتھوں اس کی قسمت میں مرنا بھی لکھ دیا گیا..... کیا تم اسے بھی تفریح نہیں کہو گے؟“

میجر نے کیپٹن کو غور سے دیکھا پھر خاموش ہو کر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔



سراج اس وقت ہسپتال میں بڑے ڈاکٹر سے گفتگو کر رہا تھا جس نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ مریض کو ہوش آنے میں دس بارہ گھنٹے اور بھی لگ سکتے ہیں۔ یہ اطلاع سراج کے لیے تشویش ناک تھی۔ وہ افضل خان کے جلد از جلد ہوش میں آنے اور اس کا بیان قلم بند کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اس کے استفسار پر ڈاکٹر نے کہا تھا۔

”موجودہ حالت میں مریض کو جلد ہی ہوش میں لانے کا عمل اس کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“

”لیکن.....“

”آئی ایم سوری آفیسر۔“ ڈاکٹر نے سراج کی بات سنے بغیر کہا۔ ”تشدد کے علاوہ مریض کو غالباً برین شاکنس بھی پہنچائے گئے ہیں جس کی وجہ سے بے ہوشی کا وقفہ طوالت اختیار کر رہا ہے۔ ٹیم کے دوسرے ماہرین کا یہی مشورہ ہے کہ مریض کو ہوش میں لانے کے بجائے اس کے از خود ہوش میں آنے کا انتظار کیا جائے۔ پہلی صورت میں مریض اپنا ذہنی توازن بھی کھو سکتا ہے۔“

ڈاکٹر کی رائے سن کر سراج کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ افضل خان جیسے اہم مجرم کے سلسلے میں وہ جلد بازی کرنے کا اصرار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شیخ حامد نے تاج محل ہوٹل میں ناکام ہونے کی جو سزا اسے دی تھی وہ درست نہیں تھی۔ لیکن شاید میڈم روبی کے جال میں آکر نکل جانے کے احساس نے اسے افضل خان کے خلاف انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنی ایک متوقع کامیابی کو اس نے افضل خان کی کسی معمولی حماقت سے تعبیر دینے کے سلسلے میں جلد بازی کا مظاہرہ کر کے دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ یہ بات اس کے فرشتوں کی سمجھ میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ میڈم روبی کو رسوائی سے بچانے میں کسی روحانی یا غیبی قوت کا عمل دخل بھی ہو سکتا ہے۔ خود سراج کو اس شیطانی کھیل کی اطلاع لیاقت حسین نے دی تھی۔ بعد میں خود لیاقت حسین کو بھی اس سلسلے میں کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ بہر حال افضل خان عتاب کا شکار ہو کر بدترین حالت سے دو چار تھا۔ دوسری جانب خود لیاقت حسین نے دی تھی ایک ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ سراج کو صبح بیدار ہوتے ہی نامعلوم منبر نے جو پیغام دیا تھا وہ اس کے ذہن میں گولے کے مانند رہ کر چکر رہا تھا۔

سراج ذیشان ہوٹل میں موجود دو اہم مجرموں کو گرفتار کرنے کی خاطر ڈی آئی جی کرانمر سے مشورے کے بعد مکمل تیاری کر چکا تھا لیکن منبر کی نئی اطلاع نے اسے کئی الجھنوں کا شکار کر دیا..... اس نے صبح ہی صبح سراج کو فون کر کے کہا تھا۔

”پکنک کے لیے آپ نے جو تیاریاں کر رکھی ہیں اس پر فوراً روانگی میں کچھ تاخیر کر دیں۔“

”کوئی خاص وجہ؟“

”میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد آپ کو اس کی وجہ بھی بتا دوں گا۔“

”کیا جس راستے سے ہم جانے والے ہیں وہ.....“

”لہذا راستہ ہے۔“ حسب معمول اشاروں میں جواب دیا گیا۔ ”درمیان میں سڑک کا کچھ حصہ اچھی حالت میں نہیں ہے۔“

”تو کیا آج کا پروگرام.....“

”کچھ دیر میرے دوسرے فون کا انتظار کر لیں۔“ اس بار بھی سراج کی بات کاٹ کر کہا گیا۔ ”میں اسی طرف جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کوئی شارٹ کٹ ہمارے لیے زیادہ آسانی پیدا کر دے۔ جو لوگ تیار ہیں۔ انہیں تیار ہی رہنے دیں۔“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

سراج کے پاس سوائے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر ڈی آئی جی کرائمر کو بھی شارٹ کٹ والی بات بتا دی۔

”میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر کوئی شارٹ کٹ میسر آ جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”کیا دوسری پارٹی متبادل راستے سے باخبر نہیں ہوگی؟“

”ہو بھی سکتی ہے لیکن ہمیں بہر حال گائیڈ کے مشورے پر عمل کرنا ہوگا۔“

”رائٹ سر.....“

ڈی آئی جی سے رابطہ ختم کرنے کے بعد اس نے گمرانی پر مامور عملے کے انچارج سب انسپکٹر مکارم کو بلا کر بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ”مجھے معتبر ذرائع سے خبر ملی ہے کہ کچھ لوگ مریض کو اغوا کرنے یا پھر ناکامی کی صورت میں اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ آپ سب کو چوکس کر دیں۔“

”ڈونٹ وری سر..... میں جانتا ہوں کہ مریض ہمارے لیے کس قدر اہم ہے۔ میرے آدمی جان کی بازی کھیل کر بھی دشمنوں کی چال کو ہر قیمت پر ناکام بنانے کی کوشش کریں گے۔“

”ممکن ہو تو اسپتال کے باہر اور داخلی دروازوں پر بھی مزید نفری تعینات کر دیں۔“

”ایزیووش.....“ سب انسپکٹر نے پُر جوش انداز میں کہا پھر وہ نئی ہدایت پر عمل کرنے کی خاطر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے راہداری عبور کر کے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سراج کے ذہن میں مخبر کی اطلاع کے متعلق مختلف خیالات چکرارہے تھے۔ اس نے ذیشان ہوٹل کے آس پاس صرف وہ قابل اعتماد کمانڈو تعینات کر رکھے تھے۔ انہیں صرف ایک اشارہ کرنے کی دیر تھی۔ مطلوبہ آدمیوں کو ہوٹل سے کسی سوچی سمجھی جگہ پر منتقل کرنے کی خاطر اس نے بلٹ پروف گاڑی کا انتظام بھی کر رکھا تھا جس کے رنگین شیشے باہر والوں کو اندر کے حالات سے قطعی لاعلم ہی رکھتے۔ سارا پروگرام ایک فائل ٹائمنیبل کے تحت طے تھا جب مخبر نے کسی شارٹ کٹ کی بات کر کے دوسری کال کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔ ممکن ہے اس نے سراج کی اسکیم سے زیادہ آسان کوئی راستہ تلاش کر لیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے مطلوبہ افراد سے ساز باز کر کے پولیس کو دودھ رکنے کی خاطر شارٹ کٹ کی پیشکش کر کے اتنی مہلت حاصل کرنی چاہی ہو کہ وہ اپنے ڈبل گیم میں کامیاب ہو سکے۔ دونوں ہی صورتوں میں سراج کو اس کے دوسرے فون کا انتظار کرنا تھا۔ اور بھی کئی ممکن

خداشات پروگرام کی اچانک تبدیلی کی وجہ سے اس کے ذہن میں سراج بھار رہے تھے جب اس کے خاص موبائل نے واٹس ایپٹ کرنا شروع کیا۔ سراج نے پھرتی سے اسے جیب سے نکال کر روشن اسکرین پر نظر ڈالی جس پر اس کے دو منتخب کمانڈوز میں سے ایک کا نمبر مع کوڈ کے چمک رہا تھا۔

”میں.....“ سراج نے موبائل آن کر کے بڑے مدہم لہجے میں پوچھا۔ ”کوئی خاص خبر.....؟“

”سر..... پندرہ منٹ پیشتر ایک مریل ٹائپ کا بنگالی اوپر گیا تھا۔ اس وقت وہ نیچے کاؤنٹر پر کھڑا انجیر سے بات کر رہا ہے۔“

”ہمارے مطلوبہ افراد کہاں ہیں؟“

”وہ ابھی تک اپنے ڈربے سے باہر نہیں نکلے۔“ سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔ ”ہمارے لیے کیا حکم ہے؟“

”میرے دوسرے فون کا انتظار کرو..... لیکن ایک بات کا خیال رکھنا، وہ دونوں کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہ نکل سکیں۔“

”سر..... میں نے اس امکان پر غور کر لیا تھا کہ ممکن ہے ان چوہوں کی حفاظت پر کچھ بلیاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوں۔ ان کو درمیان میں آنے سے روکنے کی خاطر بھی کچھ ساتھی پوری طرح تیار نہیں۔“

”گڈ.....“ سراج نے تعریفی انداز اختیار کیا پھر وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دوسری طرف کال کا سگنل سنائی دیا۔ ”میں تمہیں دوبارہ فون کرتا ہوں۔“ سراج نے رابطہ ختم کر کے دوسری آنے والی کال انیڈ کی۔

”میں نے آپ کو شارٹ کٹ بتانے کے لیے فون کیا ہے۔“ مخبر کی آواز سنائی دی۔ اس نے پورا پلان سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کے آدمیوں نے میرے کہنے کے مطابق ہوشیاری سے ایکشن لیا تو پھر وہ کسی طاعون زدہ چوہوں ہی کی طرح جال میں پھنس جائیں گے۔“

”تمہارا پلان شاندار ہے۔“ سراج نے اس کی تجویز سن کر خوشی کا اظہار کیا۔ ”میں دومنٹ کے اندر نئی ہدایت جاری کرتا ہوں۔“

”تیسرے آدمی کو اگر کسی طرح فرار ہو جانے کا موقع دیا جائے تو مناسب ہوگا ورنہ..... مجھے بعد میں آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانا پڑے گا۔ اس کے پھنس جانے کی صورت میں آپ کے اور اس کے..... دونوں کے لیے کچھ دشواریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔“

”اوکے۔ میں کوشش کروں گا کہ میرے آدمی اسے کسی طرح نکل جانے کا موقع فراہم کر سکیں۔“

مخبر نے جو پلان بتایا تھا وہ یقیناً شارٹ کٹ ہی تھا۔ سراج نے فوری طور پر سینئر کمانڈو کو نئے احکامات جاری کیے پھر گمرانی کے عملے کے انچارج کو دوبارہ الرٹ رہنے کی تاکید کرنے کے بعد اس نے ہسپتال سے باہر آ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دفتر کی طرف روانہ

ہو گیا۔ مقصد دشمنوں پر یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ کمانڈو ایکشن کے وقت ہوٹل یا اسپتال سے قریب نہیں تھا۔ ڈی آئی جی کرائمز نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا۔

”غصہ یا جھنجھلاہٹ انسان کے ذہن کو کمزور کر دیتی ہے۔“ میجر نے طویل خاموشی کے بعد اپنے ساتھی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں تمہیں صبر و تحمل سے کام لینے کا مشورہ دوں گا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اس وقت ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ یہ معاملہ کامیابی سے طے پا جائے تو پھر آئندہ کے لیے بھی سوچیں گے۔“ میجر کا آخری جملہ معنی خیز تھا۔

”نائن پلس ٹو.....“ کیپٹن نے بہت غور سے میجر کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کی۔

”موسم ایک نہیں چار ہوتے ہیں۔“ میجر نے غلامی گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”سائبریا میں خشک سالی کا موسم آنے سے پہلے ہی وہاں کے پرندے بھی ایشیائی ملکوں کی طرف ڈار کی شکل میں پرواز شروع کر دیتے ہیں۔“

”اور ہمارے شکاری ان کو مارنے کی خاطر پہلے سے تیار رہتے ہیں۔“

”ہاں..... میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میجر بے پروائی سے بولا۔ ”لیکن نقل مکانی ان پرندوں کی اپنی ذاتی پسند اور فیصلہ ہے اس میں کسی کے حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔“

”میں تمہارا اشارہ سمجھ رہا ہوں لیکن کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟“ کیپٹن نے کچھ توقف سے استفسار کیا۔ ”ہمارے سارے ویک پوائنٹس بگ باس کو معلوم ہیں۔ تحفظ دیتے وقت بھی ہم سے یہی کہا گیا تھا کہ.....“

”فیصلہ سناتے وقت کوئی جج مجرم سے کبھی یہ نہیں کہتا کہ تمہیں تھانے والوں کی چھتروں سے بچنے کی خاطر جیل بھیج رہا ہوں۔ وہاں جا کر فرار ہونے کی کوشش کرنا۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“

”ہر غلط کام میں رسک پہلی شرط ہوتی ہے مائی ڈیر۔“ میجر نے ہونٹ کاٹتے ہوئے گمبیر لہجے میں جواب دیا۔ ”جیل کی دیواریں توڑنا تو ہے کے زیورات سے گلو خلاصی حاصل کرنا بھی آسان نہیں ہوتا لیکن کھلی ہوا میں آزادی سے سانس لینے کا تصور ہی فرار ہونے والے کے حوصلوں کو ہوا دیتا ہے۔“

”کیپٹن نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کچھ دیر کی غور و فکر میں ڈوب رہا پھر بولا۔

”کیا ہمارے باقی دو ساتھی بھی ہماری رائے سے متفق ہو جائیں گے؟“

”اجتماعی فرار کی کوشش ننانوے فیصد ناکامی سے دوچار ہوتی ہے۔ کوئی ایک کسی ایک کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بھاڑا پھوڑ دیتا ہے جس کا نتیجہ سب کو بھگتنا پڑتا ہے۔“ میجر نے ٹھوس آوازیں کہا۔ ”اس وقت ہم دو ہیں۔ تم اگر مجھ سے متفق نہیں ہو تو میں درخواست کروں گا کہ اس وقت

میرے اور تمہارے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اسے سیکر فراموش کر دیتا۔“

”ڈن.....“ کیپٹن نے گہری سنجیدگی سے وعدہ کیا پھر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”غصے اور جھنجھلاہٹ پر کنٹرول کرنے کا مشورہ تم نے غالباً چھی بھارت کے پس منظر میں دیا تھا؟“

”ہاں.....“

”ایک سوال میں بھی کروں گا..... اگر بگ باس کو حکم دے کہ حینہ کو ایک رات کے لیے اس کے عشرت کدے میں پہنچا دے تو کیا وہ انکار کر دے گا؟“

”نہیں.....“ میجر نے جواب دینے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ”چھی بھارت کے فرشتے بھی خود حینہ کا بناؤ سنگھار کر کے اسے باس کے خاص کمرے تک پہنچانے پر خوش خوشی آمادہ ہو جائیں گے..... اس کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہو گا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ حینہ سے یہ بھی کہہ دے کہ وہ بگ باس کو پوری طرح اپنے جسم کے گداز اور حسین بیچ و خم میں الجھانے کے بعد کوئی زہریلی سوئی چھو کر اس کا قصہ تمام کر دے لیکن وہ رسک نہیں لے گا۔ اس لیے کہ بگ باس کے دوسرے شکاری جانور بھی پوری طرح محتاط رہتے ہیں۔ وہ حینہ کی ٹکا بونی کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کریں گے۔“

”ہو سکتا ہے تمہاری سوچ درست ہو لیکن میں چھی بھارت سے حینہ کے سلسلے میں صرف مذاق نہیں کرتا۔“ کیپٹن نے آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں حینہ کے عشق میں جھلا نہیں ہوں لیکن ایک بار منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر اسے کسی ہرنی کی طرح گرا کر تڑپتا ہوا مچلتا دیکھنے کی خواہش سے دست بردار بھی نہیں ہو سکتا۔“

”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“ میجر نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہاں.....“ کیپٹن حقارت سے مسکرا دیا۔ ”اپنے مقابلے پر میں چھی بھارت اور اس کی جل پری کو زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ اس ہم سے فارغ ہونے کے بعد میرا پہلا خوبصورت ٹارگٹ حینہ ہی ہوگی۔“

میجر ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ اسی وقت دروازے پر پھر تین بار وقفے وقفے سے دسک کی آواز سنائی دی۔ میجر نے نگاہوں نگاہوں میں کیپٹن کو اس بات کی تلقین کی وہ فی الحال حینہ کے سلسلے میں اپنے دلی جذبات کا کوئی مظاہرہ کرنے سے گریز ہی کرے پھر اس نے دروازے کے قریب جا کر ڈور لاک میں لگی چین کی حد تک جھری کر کے اپنا اطمینان کرنے کی ضرورت کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔

”میں ہوں.....“ دوسری جانب سے چارلی کی آوازیں سن کر اس نے چین بھی لاک سے الگ کر دی لیکن دروازہ کھلتے ہی جو کچھ ہوا وہ میجر یا کیپٹن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ چارلی کے ساتھ ہی دو گئیے ہوئے جسم کے جوان جن کے چہرے بھی مخصوص جالی کے ماسک کے اندر چھپے ہوئے تھے، کمرے میں آ کر آندھی اور طوفان کی طرح ٹوٹ پڑے۔ چارلی کو ایک طرف دھکا دے کر

”تمہارا تعاقب تو نہیں ہو رہا.....؟“
 ”اگر ایسا کیا گیا تو تعاقب کرنے والوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔“ منٹھے ہوئے جسم والے نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”ہمیں اپنے ملٹری کمانڈو ڈویژن سے بھی کچھ ضروری ہدایات ملی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

”اوکے..... میں بعد میں دوبارہ رابطہ قائم کروں گا۔“
 ”رائٹ سر.....“ کال ختم ہوئی تو موبائل بھی آف کر دیا گیا۔

سراج نے دوسری جانب سے گفتگو ختم کرنے کے فوراً بعد ڈی آئی جی کرائمز کو فون کیا۔ طے شدہ پروگرام کی کامیابی کی اطلاع دینے کے بعد اس نے پرجوش لہجے میں کہا تھا۔
 ”میرا خیال ہے کہ اگر ہم فوری طور پر انٹر ویکشن کے لیے تیاری کریں تو.....“
 ”نہیں.....“ دوسری جانب سے فوری جواب ملا۔ ”میں نے ملٹری کی ہائی کمان سے بات کی تھی۔ ان کا مشورہ ہے کہ کل صبح تک وہاں جانے کی آپریشنل پرمیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔“
 ”رائٹ سر.....“

”دوسری جانب سے کوئی مزاحمت تو نہیں کی گئی؟“ ڈی آئی جی کرائمز سے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ابھی تک اس بارے میں کہیں سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔“

”آیم نمبروں کا کیا ہوا.....؟“

”اسے کل رات ہی چلیس کر دیا گیا ہے۔“

”مگنڈ.....“ دوسری طرف سے سراپتے ہوئے کہا گیا۔

”کل صبح تک ہمیں دشمن کے رد عمل کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔“

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔



انہوں نے کیپٹن اور میجر کو اپنے ہسپتال کی زد میں لے لیا جس پر سالنسر بھی فٹ تھا۔ یہ عجیب ساخت کا ہسپتال میجر اور کیپٹن نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

بگ باس کی جانب سے ان دونوں کو اس خاص مشن کے لیے یہی ہدایت ملی تھی کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنی زندہ گرفتاری نہیں دیں گے ورنہ پھر ان کی موت ان کے تصور سے بھی زیادہ بھیانک اور اذیت ناک ہوگی۔ چنانچہ ان دونوں نے ہسپتال کی پروا کیے بغیر زندگی کی بازی لگانے کی ٹھان لی مگر دوبارہ جو کچھ ہوا وہ بھی ان کی مجرمانہ زندگی کے لیے اٹوکھا تجربہ تھا۔ جالی کے ماسک والوں نے ان کے ارادے بھانپ کر ٹریکروں پر دبا دیے۔ دونوں کے ہسپتال سے زردی مائل دھوئیں کا ایک گولا سا کھلا پھر اس نے برق رفتاری سے اپنا حجم بڑھا کر اس طرح میجر اور کیپٹن کے چہروں کو اپنے حصار میں لیا کہ وہ کسی جوابی کارروائی سے یکسر محروم ہو گئے۔ دھوئیں کے گولے کی شکل میں بے ہوش کر دینے والی ایسی گیس کو فائر کیا گیا تھا جس نے دونوں کو ہلک جھپکتے میں پانچوں حواس خمسہ سے یکسر محروم کر دیا۔ وہ کئی ہوئی بے جان شاخوں کی طرح فرش پر گر کر کبھر گئے۔ پھر جتنی دیر میں دونوں کمانڈوز اپنے شکار کی ضروری پیکنگ کرتے چارلی موقع پا کر فرار ہو گیا جس کو حسب وعدہ اس کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ بظاہر یہی محسوس ہوا تھا کہ اصل مجرموں پر قابو پانے کی جلدی میں دونوں کمانڈوز اس کی موجودگی سے بے نیاز ہو گئے تھے لیکن یہ بھی طے شدہ پلان کا ایک ضروری حصہ تھا۔

پندرہ منٹ کے مختصر عرصے میں دو بستر بند ہوٹل ڈیٹان کے عقبی راستے سے باہر لائے گئے ان کے ساتھ دو سوئڈ یونٹ افراد بھی تھے جنہوں نے آنکھوں پر مرکری گلاسز والا چشمہ پہن رکھا تھا۔ ہوٹل کے عملے کے لباس دو آدمیوں نے ان بستر بندوں کو اس ہلٹ پروف گاڑی کی ڈکی میں منتقل کر دیا جو خاصی کشادہ تھی، پچھلی دو نشستوں کو فولڈ کر کے اس مزید گنجائش بڑھا دی گئی تھی۔ بستر بند لوڈ ہونے کے بعد ہلٹ پروف گاڑی ڈی پلی سڑکوں کو عبور کر کے تین منٹ بعد کشادہ روڈ پر آگئی جو ہوٹل ڈیٹان سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ دور تھی پھر اگلی نشستوں پر ڈرائیو کرنے والے کے برابر بیٹھے ہوئے منٹھے ہوئے جسم والے نے موبائل نکال کر سراج کے نمبر شیخ کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

”آپریشن سکسس فلی کمپلیڈ سر..... بستر بند کو کہاں پہنچانا ہے؟“

”ملٹری اسپیس ڈویژن کی نٹل نمبر تھری میں۔“

”سوری سر..... وہاں جانے کے لیے آپریشنل پرمٹ ہونا ضروری ہے۔“

”ڈونٹ وری..... پرمٹ تمہیں داخلی دروازے پر ہی ہینڈ اوور کر دیا جائے گا۔ بات طے ہو گئی ہے۔“

”اور کوئی خاص بات؟“

”تیسرے کا کیا ہوا؟“ دوسری جانب سے دریافت کیا گیا۔

”طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے نظر انداز کر دیا گیا۔“

کے بل ڈھیر ہو کر ترپنے لگا۔

”خبری کسے کی تھی.....؟“ شیخ حامد نے گرج کر پوچھا۔

ایک بل کو چارلی کے ذہن میں آیا کہ وہ زندگی بچانے کی خاطر سراج کا نام زبان پر لے آئے لیکن اس نے فوراً ہی اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ میجر اور کیپٹن کے علاوہ ابھی وہ خطرناک دہشت گرد آزاد تھے۔ ان کو بھی غداری کا علم ہو جاتا تو اس کی حسینہ بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ وہ بھی اس پر اچھی نظر نہیں رکھتے تھے۔ چارلی کی غداری اور بگ باس کے ہاتھوں عتاب کی خبر سننے ہی وہ حسینہ کے خوبصورت وجود کی دھجیاں اڑا ڈالنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ اس کے جسم کا ایک ایک بچہ ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ اسی کی خاطر تو چارلی نے بگ باس کم از کم اپنی زندگی میں وہ حسینہ کے اجلے ریشمی جسم کو میلے ہاتھوں سے داغدار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”دوغلے کتے..... میں نے تجھ سے کچھ پوچھا تھا.....“ شیخ حامد کے تیور انتہائی خطرناک ہو گئے۔

”مم..... میں..... میں نے غداری نہیں کی سر..... وہ میری لاعلمی میں میرے پیچھے.....“ شیخ حامد کے سر کو ہلکی سی جنبش ہوئی، اسی لمحے دوسرا فائر ہوا۔ چارلی ماہی بے آب کی طرح ترپنے لگا، اس کے دوسرے گھٹنے کی ہڈی بھی کرچیوں میں بدل گئی۔ وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے جانور کی طرح کرب سے چلا رہا تھا۔

”حسینہ کو تھیلی لگانے کی خاطر تو نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا.....؟ ڈرٹی ڈاگ!“ شیخ حامد نے انتہائی سرد آواز میں کہا پھر اس نے تالی بجائی تو چارپٹے کٹے آدمی اور اندر آ گئے۔

”نیس باس.....!“ چاروں نے بیک وقت بگ باس کو مخاطب کیا۔

شیخ حامد نے آخری بار چارلی سے زبان کھولنے کو کہا لیکن اب وقت گزر چکا تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ اب حسینہ بھی ایک اپانچ کے ساتھ زندگی گزارنا پسند نہیں کرے گی۔ وہ بگ باس کی طرف ملتچی نظروں سے دیکھ کر حلق کے بل چیخا۔

”ہاں..... میں نے خبری کی تھی..... میں غدار ہوں..... تہ..... تہ..... تم مجھے گولی مار دو پھر بھی میں زبان نہیں کھولوں گا..... مارو گولی، میرا جسم چھلنی کرا دو لیکن میری زبان بند ہی رہے گی، سنا تم نے..... تم اور تمہارے شکاری کتے میری بوٹیاں چا ڈالیں پھر بھی میں زبان بند رکھوں گا۔“

شیخ حامد کا چہرہ غضب ناک ہو گیا، سب ہی کا یہی خیال تھا۔ بگ باس چارلی کی بکواس سن کر ایک ہاتھ کو معمولی سی جنبش دے گا، دوسرے یہ لمحے چارلی کا پورا وجود گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، کچھ دیر تک بگ باس کی قہر آلود نظریں چارلی کے چہرے پر مرکوز رہیں پھر اس نے نئے آنے والے چاروں بٹے کٹے آدمیوں کو مخاطب کیا۔

”تم باسی ہانڈی میں منہ مارتے مارتے تھک چکے ہو..... آج تمہیں بالکل تازہ شکار ملے گا لیکن میری شرط یہی سن لو.....“ شیخ حامد نے کسی زنجی شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے اس

چارلی کی آنکھوں کی پٹی کھولی گئی تھی تو اس کے سامنے شیخ حامد ایک صوفے پر بیٹھا تھا، اس کمرے میں صوفے کے علاوہ فرنیچر کی اور کوئی چیز نہیں تھی، شیخ حامد کے کمرے میں اس کے تین مسلح گارڈز تھے جن کے چہرے ماسک میں چھپے ہوئے تھے۔

کمرے میں روشن بلب سے چارلی نے اس بات کا اندازہ لگانے میں غلطی نہیں تھی کہ اسے بارہ گھنٹے بعد ہی ہوش میں آنے کے بعد شیخ حامد کے روبرو پیش کیا گیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ ہوٹل ڈیشان سے فرار ہونے کے بعد وہ بنگالی پاڑے میں اپنے مکان تک بہ آسانی پہنچ گیا تھا لیکن اس کے بعد شیخ حامد کے آدمیوں نے اس مکان ہی میں پہنچ کر کلوروفارم میں بھیجا ہوا رومال سو گھنٹے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا چارلی کے پاس کوئی دوسرا آپشن بھی نہیں تھا اور اب..... اسے پوری طرح ہوش میں آنے کے ایک گھنٹے بعد ہی بگ باس کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

”میں تمہیں کمانڈر کی موجودگی کے باوجود بچ نکلنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔“ شیخ حامد نے سپاٹ لیجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”اتفاق ہی تھا سرور نہ میں بھی پھنس جاتا۔“ چارلی نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ وہ شیخ حامد کی نظروں میں ابھرنے والی سرخی دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ اس کے ستارے بھی گردش میں آ چکے ہیں۔

”یہ بھی شاید اتفاق تھا کہ جو لوگ میرے آدمیوں کو لے گئے وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئے تھے؟“ شیخ حامد کسی زنجی ناگ کی طرح بل کھانے لگا۔

”وہ..... وہ.....“ چارلی نے پھکاتے ہوئے اپنے بچاؤ میں ایک اور کمزور دلیل پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”ان دونوں نے اوپر جاتے ہوئے مجھے اچانک اسلحے کے زور پر بس بے کر دیا تھا۔“

”انٹرسٹنگ.....“ شیخ حامد نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ”انہوں نے تمہیں اسلحے کے زور پر اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کیا پھر اتنے غافل ہو گئے کہ تم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گئے..... باسٹرڈ..... سن آف اے بچ!“ اس نے آخری دو باتیں کرخت لیجے میں ادا کیں پھر اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلی نے مخصوص انداز میں جنبش کی۔ پشت پر کھڑے گارڈ کے پستول سے ”ٹچ“ کی آواز نکلی۔ چارلی اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ سیدھے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوئی تو وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اذیت ناک انداز میں چیختا ہوا شیخ حامد کے سامنے منہ

کے ساتھ چنگیزی بربریت کا ثبوت نہیں دیا تو پھر تم کو بھی زندگی سے محروم کر دیا جائے گا۔“ چارلی بار بار موت کی ہمیک مانگ رہا تھا وہ جان کی بازی لگا کر اپنی حسینہ کی عزت کو محفوظ رکھنے کا خواہش مند تھا لیکن بگ باس کے حکم کے بعد جو کچھ اس کی نظروں نے دیکھا وہ بھی ناقابل یقین تھا۔

شیخ حامد نے چاروں کو اپنا فیصلہ سنانے کے بعد ایک گاڑی کو انگلی سے کچھ اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حسینہ کو برابر کے کمرے سے تھمٹ کر باہر لے آیا۔

”شروع ہو جاؤ.....“ شیخ حامد نے دوبارہ چاروں بٹے کئے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ ”میں تمہیں صرف بیس منٹ دیتا ہوں۔ تازہ خوراک کو اس بے دردی سے کھا جاؤ کہ اس کی سانسیں بھی اس کے حسین جسم میں گھٹ کر بند ہو جائیں ورنہ پھر تم چاروں کو گولی مار دی جائے گی۔“

چارلی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں..... بگ باس کا اشارہ پا کر وہ چاروں بھوکے گدھ کی طرح حسینہ پر چھٹ پڑے۔ ہل بھر میں انہوں نے اس کے لباس کو تار تار کر دیا پھر بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس کے گداز جسم کو بھینچنے لگے۔ حسینہ کی چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں لیکن وہ اپنے بچاؤ میں کچھ بھی نہ کر سکی

چارلی بھی کم مہم رہ گیا۔ وہ ان چار انسانوں کو دیکھ رہا تھا جو درندوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ایک خوبصورت نازک اور گداز جسم کو چار چار انسان بڑی بے دردی سے بھینچ رہے تھے۔ کمرے میں موجود ہر شخص کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ خود چارلی بھی مہبوت ہو کر اس شیطانی کھیل کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شیخ حامد کی نظریں بار بار دقتی گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ وہ بڑے پرسکون انداز میں چاروں درندوں کو گزرتے وقت کا احساس دلا رہا تھا..... اٹھارہ منٹ..... پندرہ منٹ..... دس منٹ..... پانچ منٹ.....!

اس کی گنتی شمار کرنے کے ساتھ چاروں بھوکے بھیڑیوں کی حالت بھی جنونی ہوتی جا رہی تھی حسینہ بارہ پندرہ منٹ بعد ہی بے ہوش ہو گئی تھیں لیکن وہ چاروں اس کے جسم کے نازک ترین حصوں کو درندوں کی طرح بھینچ رہے تھے۔ چارلی نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لیں شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس نے جس کی پاکیزگی کو محفوظ کرنے کی خاطر غدار کی کو بطور ہتھیار استعمال کرنا چاہا تھا وہ کسی کام نہ آسکا..... حسینہ کے بدن کو جھٹکے ان چار درندوں کی وحشیانہ جارحیت سے لگ رہے تھے ورنہ اس کی سانسیں اس کے وجود سے سارے رشتے توڑ چکی تھیں۔

بیس منٹ..... اور اینڈ..... اسٹاٹ۔“

شیخ حامد کے اس جملے کے ساتھ ہی وہ چاروں ہانپتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چارلی نے آنکھوں کے درمیان ہلکی سی جھری کر کے دیکھا۔ حسینہ کا نازک جسم جگہ جگہ سے اس طرح ادھرا ہوا تھا جیسے کسی آدم خور نے اپنے من پسند حصوں سے پیٹ بھرنے کے بعد شکار کو اگلے وقت کے لیے چھوڑ دیا ہو۔

وہ خون میں لت پت تھی۔ اس کی ہیئت بدل چکی تھی۔ اس کے گالوں سے خون ابل رہا تھا اس کے سینے کو جیسے چاپر (chopper) سے زبردستی گزارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کی رانوں کا گوشت بھی جگہ جگہ سے ادھرا نظر آ رہا تھا۔ جسم کے نازک حصوں سے خون ہی خون جاری تھا۔

شیخ حامد کے اشارے پر ایک گاڑی نے اس کے پھول جیسے جسم کو جس کی ساری نازک پھنکھریاں چرما کر بکھر چکی تھیں پاؤں سے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر دبی زبان میں بولا۔

”اس کی سانسیں اکھڑ چکی ہیں باس..... کھیل جیت کے فیصلے کے ساتھ ختم ہو گیا۔“ ”نہیں.....“ شیخ حامد دھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کھیل ابھی ختم نہیں ہوا۔“ اس نے نظریں گھما کر چارلی کو دیکھا۔

”مادہ مر جائے تو پھر نر کی زندگی بھی کس کام کی.....“ اس نے آخری فیصلہ بھی صادر کر دیا۔ ”اس باسٹرڈ کو بھی اس کی محبوبہ کے پاس پہنچا دو پھر..... ان دونوں کو لے جا کر کہیں قریبی ویران جنگل نما علاقے میں چھوڑ آؤ..... ان کی بچی کچی بوٹیاں اگر چیل کوؤں اور دوسرے جانوروں کے کام آ جائیں تو کیا برا ہے۔“

وہ اپنا حکم سن کر لمبے لمبے قدم اٹھاتا دو گاڑیوں کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ باقی افراد حسینہ اور چارلی کے مردہ جسموں کو سینٹنے لگے۔ اس لرزہ خیز سزانے سب ہی کے ذہن میں بہت سارے سوالات پیدا کر دیے تھے لیکن اس کے اظہار کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جس زمین دوز سرنگ میں وہ داخل ہو چکے تھے اس سے نکاسی کا ایک ہی راستہ تھا۔ موت، عبرتناک اور اذیت ناک موت.....!

❖❖❖

سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم اس وقت ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے جب ایک وارڈ بوائے نے آکر لیاقت حسین کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی۔

”آپ حضرات چلیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں ایک ضروری فون کر کے آتا ہوں۔“ سیٹھ عثمان نے دبی زبان میں راحیلہ بیگم کو بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ لیاقت حسین سے کسی بات کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہ کریں۔ وہ دونوں قدم بڑھاتے مریض کے کمرے میں تھانز اسے بار بار سمجھا رہی تھی۔ ”ڈاکٹر نے تمہیں آرام کا بولا ہے۔“

”میں ادھر اسپتال میں کیسے آ گیا.....؟“ لیاقت حسین نے حیرت بھرے انداز میں نرس سے سوال کیا۔

”پریشان مت ہو.....“ سیٹھ عثمان نے قریب جا کر کہا۔ ”ہماری گاڑی کو کسی نے پشت سے نگر مار دی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔“

”نگر مار دی.....؟“ لیاقت حسین نے بدستور حیرت سے کہا۔ ”مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں ہے صاحب.....!“

”اس لیے کہ لکڑی کی وجہ سے تم بے ہوش ہو گئے تھے۔“ راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”ہم تمہیں فوری طور پر ہسپتال لے آئے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن تمہیں ابھی ایک دودن آرام کرنا ہوگا۔“

”صاحب! لیاقت حسین نے بڑی معصوم نظروں سے سیٹھ عثمان کو دیکھا۔“ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے آپ کو اور بیگم صاحبہ کو سپر اسٹور پر اتارا تھا پھر..... پھر.....“ لیاقت حسین جملہ نہیں کر سکا۔ اس کے آگے اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

”پھر تم نے شاید گاڑی کسی مناسب جگہ پارک کرنے کی کوشش کی تھی جب گڈز کمپنی کے ٹرک نے ہماری کار کو پیچھے سے ہٹ کیا تھا۔“ سیٹھ عثمان نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”قصور اس کا بھی نہیں تھا اس لیے کہ اس کے بریک نے عین وقت پر اسے بھی دھوکا دے دیا۔“

”اپنی گاڑی کو زیادہ نقصان تو نہیں ہوا.....؟“

”تم گاڑی کو چھوڑ دو۔“ راحیلہ بیگم نے بڑے خلوص سے پوچھا۔ ”تمہاری طبیعت اب کسی ہے.....؟“

”بدن میں درد تو ہے لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں کہ میں اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر ادھر ادھر آرام کروں۔“ لیاقت حسین نے بڑے حوصلے سے جواب دیا۔ ”چھوٹا موٹا جھکا آ گیا ہوگا۔ چلنے پھرنے سے خون کی گردش کے ساتھ ساتھ آرام بھی آ جائے گا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن تمہیں بہر حال ڈاکٹر کے کہنے پر ایک دودن آرام کرنا ضروری ہے.....“ سیٹھ عثمان نے اس کے شانوں کو چھوٹھپاتے ہوئے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا۔ ویسے انہیں اس بات پر تعجب بھی ہو رہا تھا کہ لیاقت حسین کو اس شدید ایکسیڈنٹ کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا جس نے ان کی گاڑی کو اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ اسے دوبارہ ٹھیک کرایا جاسکے۔

”خدا کا شکر ہے صاحب کہ آپ اور بیگم صاحب اس وقت گاڑی میں نہیں تھے.....“ لیاقت حسین نے کہا پھر چونک کر پوچھا۔ ”ٹرک والے کو تو سراج صاحب نے اندر کرا دیا ہوگا؟“

”نہیں.....“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ”قصور اس کا نہیں بریک تھا اس لیے ہم نے اس حادثے کی کوئی رپورٹ نہیں کی۔“

”تمہارے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے.....“ راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”تمہارے صاحب پڑوس کے جس بٹکلے کو خریدنے کی بات کر رہے تھے آج صبح اس کا سودا بھی پکا ہو گیا ہے..... اب تم اور فرحین اسی بٹکلے کی انیکسی میں رہو گے..... فرحین کے قریب ہونے سے مجھے بھی آرام ہو جائے گا۔ تم بھی بسوں میں دھکے کھانے سے بچ جاؤ گے۔“

”صاحب.....“ اچانک لیاقت حسین نے سیٹھ عثمان کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟“

”تمہیں اس کا شبہ کیوں کر ہو گیا؟“

”بس.....“ لیاقت حسین نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ”میرا دل بولتا ہے کہ کہیں نہ کہیں.....“

”کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔“ راحیلہ بیگم نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔ ”بٹکلے کی بات طے ہونے کے علاوہ ایک خوش خبری اور بھی ہے تمہارے لیے..... تمہارے صاحب نے اب ایک نئے ماڈل کی گاڑی لینے کا ارادہ بھی کر لیا ہے۔“

لیاقت حسین نے جواب میں خوشی کا اظہار کیا لیکن اس کے دماغ میں نہ جانے کیوں ایک خیال رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی غلا ضرور ہے۔ کوئی بات ایسی..... جو اس سے چھپانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پھر اس کے کانوں میں کہیں دور سے ایک مدہم سی آواز سنائی دی۔

لیاقت حسین..... خود کو سنبھالو..... جو گزر گئی اسے بھول جاؤ۔ خدا کی مصلحتیں سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ جتنا کریدو گے اتنا ہی اور ابلتے جاؤ گے۔“

”کیا بات ہے لیاقت حسین.....؟“ سیٹھ عثمان نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم کیا سوچ رہے ہو.....؟“

”سوچتا..... سوچتا کیا ہے صاحب۔“ لیاقت حسین نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”آپ جیسے مہربان لوگ تو بندوں کے لیے ایک نعمت ہوتے ہیں۔ جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔“

”تم ادھر دو روز اور آرام کر لو.....“ راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”کل تک بٹکلے کی ادائیگی وکیل کے ذریعے کر کے ہمیں اس کا قبضہ بھی مل جائے گا۔ پرسوں تم آ کر پرانے مکان سے اپنا سامان بھی لے آنا لیکن..... نئے مکان کی ساری سیٹنگ فرہین آنے کے بعد اپنی مرضی سے کر لے گی۔“

”ٹھیک ہے بیگم صاحب.....“

سیٹھ عثمان اور راحیلہ کچھ دیر بعد چلے گئے تو لیاقت حسین کے دماغ میں پھر وہی پراسرار آواز گونجنے لگی۔ وہ اس پر غور کرتا رہا۔ الجھتا رہا پھر چونک اٹھا..... ”وہ آواز تو اس کی اپنی تھی۔“ اس کے دل نے گواہی دی تو وہ ایسے سوالات کی گہرائیوں میں غوطہ کھانے لگا جس کی کوئی اتھاہ نہیں تھی۔



وہ سرخ رنگ کی اسپورٹس کار تھی جو خان گڈز ٹرانسپورٹ کے سامنے رکی تھی۔ اس میں سے جو شخص اترا وہ ایک سیاہ فام تھا۔ درمیانہ قد اور چہرے جسم کا مالک۔ اس نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ٹیکوں والی سفاری ٹائپ فلاپی ہیٹ نظر آ رہی تھی۔ دونوں شانوں پر نہایت جدید قسم کے کیمرے لٹک رہے تھے ایک کیبزن کا ہینڈ بیگ بھی تھا۔ آنکھوں پر اسوک کلر کے گلاسز تھے۔ گلے میں ایک پاورفل دور بین بھی بھول رہی تھی۔ یہ ظاہر وہ کوئی سیاح ہی نظر آتا تھا جسے فوٹو گرافی کا شوق بھی جنون کی حد تک تھا۔ ورنہ دودو کیمروں کا رکھنا فضول ہی تھا۔ اس وقت اس نے جس جگہ گاڑی پارک کی تھی اس کے دونوں اطراف گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفاتر ہی واقع تھے، چھوٹے چھوٹے آفس کے

ساتھ ہی بڑے بڑے آہنی دروازوں والے شیڈ بھی تھے جہاں سینکڑوں کی تعداد میں لوڈنگ ٹرکس پارک تھے۔

گاڑی روکنے کے بعد اس نے انکیشن سے چابی نکال کر جیب میں ڈالی پھر نیچے اتر کر قریب کے دفتر میں گیا جہاں ایک بھاری بھرکم شخص چھوٹی سی میز کی دوسری جانب شلوار قمیض پہنے بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا باہر اسٹول پر بیٹھا ہوا شخص اس کا ملازم لگ رہا تھا۔

دفتر میں داخل ہو کر سیاہ فام نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بھاری بھرکم شخص کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے ایک ایسا صاف ستھرا بڑا ٹرک درکار ہے جس پر تقریباً نو آدمی مع کیمپنگ کے ساز و سامان کے آسانی سے سفر کر سکیں۔ وہ ٹرانسپورٹر کو خاصی دشواری کے بعد سمجھا کہ اسے وہ ٹرک اپنی حکامری پارٹی کے لیے درکار ہے جسے دس سے بارہ روز اس کی پارٹی کے ساتھ رہنا ہوگا۔ بھاری بھرکم شخص نے کچھ ضروری سوال جواب کے بعد اس کی مدد سے معذوری ظاہر کر دی۔

”جتنا پیسا مانگتا ہے گا لیکن ٹرک اگر نیا ہو تو ونڈرفل.....“
”نو..... نو..... سو ری۔“

”شوگی ری مارا.....“ سیاہ فام نے اس کے طرز عمل پر نفرت کے اظہار کے طور پر اپنی زبان میں کچھ کہا پھر باہر آ کر دوسری کپنیوں کے دفتر باری باری جھانکنے لگا۔ آٹھویں آفس میں بیٹھے ہوئے شخص نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ اس کے آفس کے باہر شہباز گڈز ٹرانسپورٹ کا بورڈ آویزاں تھا۔ کچھ دیر تک سیاہ فام حسب معمول اس شخص کو بھی اپنی ضرورت سے آگاہ کرتا رہا۔ میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا گول منول آدمی سیاہ فام کی باتوں کو پورے دھیان سے سنتا رہا پھر اس کی مکمل بات سن کر بولا۔

”ہمارے پاس ایک نیا ٹرک ہے جو یہی ڈیوٹی کے لیے بھی ایک دم فرسٹ کلاس ہے۔“ اس نے بڑے کاروباری انداز میں بات جاری رکھی۔ ”اگر تم بولو گے تو اس پر دھوپ سے بچنے کی خاطر ترپال کی عارضی چھت بھی کھینچی جاسکتی ہے۔“

”فائن..... ویری گڈ.....“ سیاہ فام نے خوشی کا اظہار کیا پھر کاروباری انداز میں اپنا مافی الضمیر سمجھاتے ہوئے دریافت کیا۔

”موری یا مہی!..... آئی مین..... ہاؤچ منی..... اردو کڑا؟“

”ون ویک..... ٹوئٹی تھاؤنڈ.....“ گول منول آدمی نے دوبارہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کھولنے اور بند کرنے کے بعد اسے سمجھانے کی کوشش کی پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”ایوری ایکسٹراڈے..... ففٹین ہنڈرڈ..... فائنل۔“

”اوکے..... اوکے.....“ سیاہ فام نے گردن ہلاتے ہوئے اس کی پیشکش کو بغیر کسی حیل و حجت کے منظور کر لیا تو ٹرانسپورٹر نے مزید وضاحت کی۔ ”گیسولین..... نیول چارجز ایکسٹرا..... یور ہڈک۔“
”لیس..... آئی نو..... نیور مائنڈ.....“ سیاہ فام نے اثبات میں سر کو جنبش دی پھر گھٹنے کے قریب

والی زپ پاٹ سے پانچ ہزار روپے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”ایڈوانس..... ڈن۔“
”رواگئی..... کوئنگ وین“ گول منول آدمی نے انگریزی کی گردن مروڑتے ہوئے دریافت کیا۔

”ٹو ڈیز..... آفٹر۔“ سیاہ فام نے کہا پھر ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”لی شوماری گا..... آئی لائیک..... سی وی ویگل.....“

”اوکے.....“ گول منول آدمی نے پانچ ہزار کا ایڈوانس سمیٹ کر جیب میں رکھنے کے بعد باہر بیٹھے اپنے ملازم سے کہا۔ ”منورے..... اس کالین کو اندر لے جا کر وہ ٹرک دکھا دے جو دو روز سے پیچھے کھڑا ہے۔“

”اگر اس نے سامنے کی باڈی پر ڈینٹ کے بارے میں معلوم کیا تو کیا گولی دوں.....؟“
”تو بھی نرا جنگلی ہے..... کہہ دینا کہ کسٹم ڈیلیوری کے وقت وہ اسی حالت میں ملا تھا۔“ گول منول آدمی نے آنکھ مار کر اسے سمجھایا۔ ”زیادہ پھیلنے کی کوشش کرے تو بول دینا کالین کو وہ چاہے تو ڈینٹ بھی نکلوا دیا جائے گا..... موٹی آسانی ہے۔ کم عقلی سے کام لیا تو تیرا کمیشن بھی مارا جائے گا“ اندر جا کر کالین کے سامنے ماثوبین کر کھڑا رہا تو بات نہیں بنے گی۔

ملازم آدمی دروازہ کھول کر سیاہ فام کو اندر لے گیا..... سیاہ فام وہاں موجود پانچوں ٹرک کو دیکھتا رہا پھر ملازم اسے کسی طرح بھیج تان کر اس ٹرک تک لے گیا جو سب سے آخر میں کھڑا تھا دوسرے ٹرکس کے مقابلے میں نسبتاً بڑا بھی تھا اور نیا بھی لگ رہا تھا۔ سیاہ فام کسی ماہر کی طرح اسے چاروں طرف سے..... اور اوپر نیچے سے دیکھتا رہا پھر اس نے بھی حسب توقع ٹرک کے سامنے کی طرف نظر آنے والے اس معمولی ڈینٹ کے بارے میں دریافت کیا جو بہت زیادہ نمایاں بھی نہیں تھا لیکن اس ڈینٹ کے مقام پر اوپر بجیل باڈی ٹرک کے علاوہ کہیں کہیں گرے ٹرک بھی نظر آ رہا تھا۔ سیاہ فام اس نشان کو غور سے دیکھتا رہا پھر ملازم نوجوان کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ”ایکیڈنٹ؟“

”نو..... کسٹم ڈیلیوری ٹیم.....“ سیاہ فام اس کی بات سن کر مسکرایا۔ جیب سے سوسو کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے رازداری سے بولا۔ ”آئسٹی رپورٹ..... فار یو اوٹلی۔“

ملازم نے ادھر ادھر دیکھا پھر نوٹ لے کر اپنے نیفے میں جلدی سے اڑس لیا۔
”نیمبر شو بو.....“ سیاہ فام روانی میں بول گیا پھر مسکرا کر وضاحت کرنے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے اشارے سے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی..... ”ون..... گی لاس..... واٹر..... گولڈ۔“

”ابھی لایا۔“ ملازم نے جواب دیا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر کی طرف چلا گیا۔
سیاہ فام نے عقبی دروازے کی طرف جا کر ٹرک کے پیچھے ڈھیل کے درمیان ادھر ادھر کچھ دیکھا پھر اس نے بینڈ بیگ سے دو بائی تین انچ کی ایک چھٹی سی پلاسٹک میڈ..... چاروں جانب سے سیلڈ

”گلد..... میرے آدمی تمہاری کارکردگی کو داچ کر رہے تھے۔ دوسری جانب سے سرسراتے ہوئے انداز میں جواب ملا۔ پھر پوچھا گیا۔ ”بلاست ٹائم کیا فکس کیا ہے؟“

”میری رسٹ داچ کے مطابق ٹھیک نو بجے دھماکا ہو جائے گا۔ اس وقت میری گھڑی میں سات بج کر اکیس منٹ ہو رہے ہیں۔“

”ایک بات یاد رکھنا.....“ اس بار دوسری جانب سے تنبیہی انداز اختیار کیا گیا۔ ”جو لوگ فل مینٹ ایڈوائس کرتے ہیں وہ کسی بات سے غافل بھی نہیں ہوتے..... ہمارے پاس غلطی کو نظر انداز کرنے کا کوئی تصور بھی نہیں ہے۔ جو لوگ ہمیں ڈاچ دینے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزائیں بھی جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مقرر ہیں۔“

ہاشم نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھری..... وہ سوچنے لگا کہ بیروت سے تعلق رکھنے والے دراز قد اور دلکش صورت کے مالک ڈوما کو کیا سزا ملے گی جس نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی گرل فرینڈ کو بھی دوسری فلائٹ سے بلانے کی حماقت کی تھی؟ کیا سیون اسٹار کا کوڈ استعمال کرنے والے اس کے پروگرام سے واقف نہیں ہوں گے؟

❖❖❖

طے شدہ پروگرام کے تحت ڈی ایس پی سراج اور ڈی آئی جی کرائمز آدھے گھنٹے کے وقفے کے ساتھ ملٹری ہیڈ کوارٹر میں ٹھیک ساڑھے چھ بجے سے موجود تھے۔ بیس منٹ کے بعد ان دونوں کے علاوہ ملٹری انٹیلی جنس کا ایک کرنل بھی ان کے ساتھ ملٹری کی بلٹ پروف گاڑی میں اگلی نشست پر بیٹھا اسپیس ڈویژن کی طرف سفر کر رہا تھا۔ دس منٹ تک کرنل بڑی سنجیدگی سے ایک فائل میں لگے کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا پھر اس نے خود ہی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے پولیس آفیسرز سے اپنا تعارف کرایا۔

”آئی ایم کرنل رشید پرویز۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ ہی ان دو مجرموں کی زبان کھلوانے کا ٹاسک ملا ہے جو ابھی تک کسی خاص وجہ سے خاموش ہیں۔ ہمارے جوانوں نے ان پر فی الحال کوئی سختی بھی نہیں کی۔“

جواب میں باری باری سراج اور ڈی آئی جی کرائمز علیم احمد نے بھی اپنا مختصر تعارف کرایا پھر علیم الدین نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کرنل..... کی یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم کھل کر بات کریں؟“

”یہ بہت اہم ہے۔ اس کے بغیر ہم کوئی لائحہ عمل بھی طے نہیں کر سکتے۔“ کرنل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کرنل منسلق کی زبان کھلوانے کی خاطر ان کا پس منظر اور لائف ہسٹری کا بھی معلوم ہونا ضروری ہے۔“

”جو مجرم زندہ ہمارے ہاتھ آ گئے وہ بھی ہمارے کمانڈوز اور کسی مخبر کی مہربانی تھی ورنہ انہیں

ڈبیا نمائے نکالی اس کے ایک طرف ہائی پاور میگنیٹک (magnetic) سائڈ پر لگی ہوئی پیپر ٹیپ کھینچ کر علیحدہ کی پھر..... دونوں ٹائر کے درمیان باڈی کے اوپری حصے پر ایسی جگہ فکس کر دیا کہ بہ ظاہر اسے ایک نظر میں آسانی سے تلاش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اپنا کام بہ مشکل ایک منٹ میں مکمل کرنے کے بعد وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور ادھر ادھر گھوم کر ٹرک کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے خود اپنی پسند کو سراہ رہا ہو۔ ملازم پانی لایا تو اس نے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر پانی پیا پھر اس کے گلے میں دوستانہ انداز میں ہاتھ ڈالے باہر والے آفس میں آ گیا۔

”گلفر آ گیا دڑبے وچ.....؟“ کول منول آدمی سے گرجوٹی سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا پھر اس نے یہ بھی باور کرا دیا کہ وہ کل صبح تک اپنا سارا سامان بھی ملازموں کے ذریعے بھیج دے گا اس لیے کہ اگلے دن شام ہی کو ان کی روانگی متوقع ہے۔

”نو مارو..... فل مینٹ ایڈوائس۔“ کول منول شخص نے اسے ادائیگی کے سلسلے میں بڑی صاف گوئی سے آگاہ کیا۔ جواب میں سیاہ فام نے اپنی آمادگی کا بڑی خندہ پیشانی سے اظہار کیا پھر اگلے قدموں اس سرخ اسپورٹ کار کی طرف قدم بڑھانے لگا جو تقریباً تیس فٹ دور پہلے والی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے سامنے پارک تھی۔

سیاہ فام نے اسپورٹنگ کار کو اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے اس سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہ رہا ہو تیز تیز قدم اٹھاتا..... کشادہ سڑک پر آیا پھر ایک ٹیکسی کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے استفسار پر اس نے بڑی روانی سے مقامی زبان بولتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ایک سیاح ہے۔ بڑے دکھ سے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ جنگلی جانوروں اور آزاد پرندوں کو دنیا کے بیشتر ممالک میں مختلف طریقوں سے کسی نہ کسی طرح ان کی آزادی سلب کر کے محض لوگوں کو تفریح کے لیے رکھا جاتا ہے۔ اس نے زولوجیکل گارڈن (zoological garden) چلنے کی ہدایت دیتے ہوئے اس بات کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھ رہا ہے جس میں دنیا میں مختلف ممالک میں موجود چڑیا گھروں میں رکھے گئے ایسے جانوروں کی تصاویریں بھی شامل ہوں گی جنہیں انتہائی غیر صحت مندانہ ماحول میں لوگوں کی تفریح کی خاطر رکھا جا رہا ہے۔

اسی شام اس نے ٹھیک سات بجے اپنے موبائل فون پر ایک متوقع کال ریسیو کی۔

”ہیلو..... ہاشم اسپیکنگ۔“ سیاہ فام نے بے پروائی سے کال ریسیو کی۔

”سیون اسٹار.....“ دوسری جانب سے بھرائی نسوانی آواز میں کوڈ ورڈ بتانے کے بعد سوال کیا گیا۔ ”آپریشن کے سلسلے میں کیا رپورٹ ہے؟“

”ہنڈرڈ پرسنٹ سکسس فل۔“ اس بار بھی نارمل انداز میں جواب دیا گیا۔

”سرخ اسپورٹس کار پر تم نے کوئی فنکر پرنس تو نہیں چھوڑے؟“

”ہاشم نے زندگی میں بھی کوئی کچا کام نہیں کیا۔“

یہی ہدایت دی گئی تھی کہ کسی قیمت پر بھی زندہ گرفتاری نہ دیں۔
 ”آئی سی۔“ کرنل پرویز نے لمبا سانس لیا۔ ”کیا ان کی پشت پر بھی بیورو کریٹ کا ہاتھ ہے؟“

”یس!“ عظیم احمد نے صاف گوئی سے جواب دیا۔
 ”آپ نے فتح حامد کا نام کہیں کسی حوالے سے ضرور سنا ہوگا۔“
 ”اوہ.....“ کرنل نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

”ویٹ بلا ڈی راسکل (rescal) میں اس کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ مجبوری یہ ہے کہ فوجی انتظامیہ کو آپ کی سول گورنمنٹ کے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں۔ ہم خود بھی اس گند میں ملوث نہیں ہونا چاہتے۔ ملٹری کی اپنی ایک علیحدہ شناخت ہوتی ہے۔ سول حکومت کے کاموں میں الجھ کر ہم اپنا ایجنڈا بھی خراب نہیں کرنا چاہتے لیکن.....“ کرنل نے کچھ توقف سے کسمسا کر بھرپور انداز میں گفتگو جاری رکھی۔ ”جو مجرم ہماری کسٹڈی میں دیئے گئے انہیں ہر قیمت پر بچ اگنا ہوگا۔ مجھے خاص طور سے اوپر سے یہ احکامات ملے ہیں کہ پس پردہ رہ کر بھی ہر طرح سے آپ دونوں حضرات سے تعاون کیا جائے۔“

”شکریہ کرنل!“ ڈی آئی جی کرانمر نے مہذب لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر آپ کے اشتراک سے ہم ان دونوں کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ بھی ہمارے لیے ایک بڑی کامیابی ہو گی۔“

”کیا بات ہے آفسیر؟“ کرنل نے سراج سے پوچھا۔
 ”آپ کس سوچ میں گم ہیں؟“

”سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم جرائم کے معاملات میں ہمیں ملٹری کی سپورٹ بھی حاصل ہو تو شاید ہمارے چلک میں بھی جرائم کا گراف تیزی سے نیچے آجائے۔“
 ”نوٹس.....“ جواب میں کرنل نے شانے اچکا کر مختصر مگر معنی خیز اعزاز میں کہا۔

چالیس منٹ بعد وہ ضروری پابندیوں سے گزرنے کے بعد ملٹری آپیس ڈویژن کی نسل نمبر تین کے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں ذیشان ہوٹل سے گرفتار کیے جانے والے مجرموں کو رکھا گیا تھا۔ ملٹری کے دو مسلح گارڈ کرسی پر مضبوط کھنچوں میں جکڑے ہوئے کے باوجود ان کے سروں پر موجود تھے مگر..... وہ دونوں اس طرح پرسکون نظر آ رہے تھے جیسے کسی مہمان خانے میں بیٹھے ہوں۔

آنے والے تینوں تفتیشی افسران تین کرسیوں پر بیٹھ گئے جو مجرموں کے سامنے تقریباً دس فٹ کے فاصلے سے موجود تھیں۔ ان کی آمد کے بعد میجر اور کیپٹن کے نام سے آپس میں گفتگو کرنے والے دونوں مجرموں نے نظریں گھما کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یکے بعد دیگرے دونوں کی نظریں جھپکیں وہ کوئی مخصوص اشارہ ہی تھا جس کے تباد لے کے بعد ہی وہ بڑی بے جگری سے مسکرائے تھے۔

”تم اب تک جس غلط فہمی میں مبتلا تھے اسے ذہن سے نکال دو۔“ کرنل پرویز نے ٹھہرے

ہوئے سنجیدہ انداز میں دونوں کو مخاطب کیا۔ ”ہم اپنے مجرموں کو زبان کھولنے کی خاطر بڑے جدید اور سائنٹیفک طریقے استعمال کرتے ہیں۔“

”یہ ہمارا پہلا تجربہ ہوگا۔“ درمیانے قد والے کیپٹن نے بڑی سادگی سے کہا۔
 ”مجھے یقین ہے کہ تم دونوں میرے ساتھ کوآپریٹ کرو گے ورنہ.....“ کرنل کا لب ولہجہ بہ تدریج سرد ہونے لگا۔

”اصلیت تمہیں ہر حال میں اگنی ہوگی۔“
 ”ہم آپ کی زبان سمجھ رہے ہیں آفسیر“ چھریرے بدن والے میجر نے کھنچوں میں کسمسا کر سنجیدگی سے کہا۔

”غلط فہمی اور غلط فیملی۔ شاید آپ کی ڈکشنری میں اس کا فرق سلیس اردو میں لکھا ہو لیکن ہم..... جدید ٹیکنالوجی بولنے کے عادی ہیں۔“

کرنل پرویز کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے اپنے مخاطب پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ سول اور ملٹری کے طریق کار میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

”میں آپ کو سمجھاتا ہوں کرنل.....“ کیپٹن کھلانے والے نے مصعومیت سے وضاحت کی۔ ”جو لوگ غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں وہ جان بچانے کی خاطر فر فرسا رہا کیا یا اگلے لگتے ہیں مگر..... غلط فیملی کے گروپ سے تعلق رکھنے والے اس بات کو سمجھتے ہیں کہ زبان نہ کھولنے کی صورت میں بھی ان کا وہی انجام ہوگا جو زبان کھولنے کی صورت میں..... پھر بلا ضرورت چڑے کی زبان کو لپ لپ کرنے کی زحمت کیوں دی جائے۔ یو اندر اسٹیڈ!“

”پاسٹڈ.....“ کرنل کے ضبط کرنے کا ٹیپر پچر ایک دم ہی آخری ڈگری پر پہنچ گیا۔ گرج کر بولا۔ ”ہم تمہاری غلط فہمی کو بھی اپنے اشاروں پر کسی رپوٹ کی طرح چلنا سکھا دیں گے۔“

”میری بات سمجھتے کی کوشش کرو۔“ اس بار ڈی آئی جی کرانمر نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ ”تم اگر جرائم کی دنیا کے حرف آخر ہو تو میرے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہو گے..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ سچ اگل دینے کے بعد تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا کر.....“

”امر کنکھ رگڑا.....“ چھریرے بدن والا مسکرا دیا۔

”یہ تکنیک بہت پرانی ہو چکی ہے ڈی آئی جی صاحب..... تم ایماندار آفسیر ہو۔ ہم واقف ہیں..... یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے ماتحت بھی تمہیں زبردستی جھیل رہے ہیں۔ اندر سے وہ بھی تم سے نفرت ہی کرتے ہیں۔ تمہاری ایمانداری کو پسند نہیں کیا جاتا۔“

”تمہیں اس وقت غالباً اپنی پوزیشن کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔“ سراج نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ تمہارے باقی دو ساتھی بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کو بھی علم تھا کہ قانون نے بہت زیادہ رعایت کی تو پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے اپنا انجام جانتے ہوئے بھی زبانیں کھول دیں۔ شاید انہیں آخری وقت میں یہ احساس

ہو گیا ہے کہ انسان اگر آخری سانس لیتے وقت اک نیکی کر جائے تو اس کے اجر سے اسے محروم نہیں کیا جاتا۔“

”ہاتھ جکڑے ہوئے ہیں ڈی ایس پی ورنہ تمہارے اس سفید جھوٹ پر تالیاں ضرور بجاتا۔“ منجھکے خیر مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا گیا تو کرل غصے سے بھنا کر اٹھ کھڑا ہوا اس کی پیشانی پر آڑی ترجمی لکیروں کا..... پھیلا ہوا جال اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس کی قوت برداشت اپنی حد سے گزر چکی ہے۔

”آئرن ماسک۔“ کرل نے ہونٹ چباتے ہوئے سرد اور سفاک لہجے میں آرڈر دیا دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور ایک سیاہ پوش دو آئرن ماسک لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے وہ ماسک دونوں مجرموں کے چہرے پر پہنا کر اس کی پشت پر لگے ہوئے تاروں کو بجلی کی اس ہائی ٹینشن لائن سے کنکٹ کر دیا جو کرسی کی پشت پر زمین پر موجود تھی۔

”میں تم دونوں کو لاسٹ وارننگ دے رہا ہوں۔“ کرل نے دونوں مجرموں کو باری باری دیکھا پھر غضب ناک لہجے میں بولا۔ ”بجلی کا سوئچ آن ہوتے ہی تم دونوں کی مکروہ صورتیں ہیٹ ہونے کا عمل شروع کر دیں گی۔ زندگی اور موت کا فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے۔ ماسک فل ہیٹ ہونے کے بعد تم دونوں کے چہروں کو پھسل ہوئی چربی کی صورت میں منتقل کرنے میں پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لے گا۔ کیا کہتے ہو؟“ کرل نے ان دونوں کو کسی سفاک نظروں سے گھورا۔ ”کیا فیصلہ کرو گے؟ یس..... یا..... نو؟“

”تم جس جدید اور سائنٹفک طریقے سے ہم جیسے مجرموں کو موت کی نیند سلانے کی دھمکی دے رہے ہو وہ ہمارے لیے کسی سوتیلی ماں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی..... ہم بہت پرانے اور تجربے کار کھلاڑی ہیں۔ اس پار یا اس پار کرنے میں پانچ سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لیتے۔“

”مسٹر سراج.....!“ چہرے پر بدن والے نے سراج کو مخاطب کیا۔ ”اپنے آخری ورلڈ ٹور پر روانہ ہونے سے پیشتر تمہیں ایک بیج ضرور بتانا پسند کروں گا۔ ہمارے دوسرے دونوں ساتھیوں نے ہٹ لسٹ پر تمہارا نمبر آن ٹاپ رکھا ہے۔ ان کے ہاتھوں بیج گئے تو پھر بگ باس بھی تمہیں کسی پالتو کتے کی طرح بڑی اذیت ناک موت سے ہمکنار کرے گا۔“

”شٹ اپ!“ کرل حلق کے بل چلا یا پھر اس کا سیدھا ہاتھ فضا میں بلند ہو گیا۔ ”میں صرف پانچ تک کاؤنٹ ڈاؤن کروں گا تم نے ہاں بھی بھری تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا“ انڈرا سٹینڈ۔“

”پانچ تک گننے میں تم اپنا ٹائم ہی ویسٹ کرو گے۔“ گھٹے ہوئے جسم والے نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ہم دوسروں کی مرضی کی نہیں اپنی مرضی کی موت پسند کرنے کے عادی ہیں۔“ اس نے اپنے جملے کو مکمل کرنے کے بعد دوسرے ساتھی کی جانب دیکھا دوسرے نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ اس کے بعد ان دونوں نے اپنے منہ کو اس طرح گول گول گھمایا جیسے کسی اینٹی سپنک سے منہ کو اندر ہی اندر صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ کیفیت صرف بیس پچیس سیکنڈ تک رہی پھر دونوں

کے چہرے اس طرح ان کی گردنوں پر جھول گئے جیسے ان میں زندگی کی کوئی رقی باقی نہ رہی ہو پھر..... ان کے ہونٹوں سے چھوٹے چھوٹے بلبلوں کی شکل میں جو رطوبت خارج ہوئی اسے دیکھتے ہی علیم احمد اور سراج بھی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بعد میں کرل نے جس ملٹری ڈاکٹر کو فوری طلب کیا اس نے بھی یہی تصدیق کر دی کہ دونوں کی موت کا سبب کوئی سرجل الٹا شیر نہ رہی تھا جسے بڑی مہارت سے ان دونوں نے مٹر کے دانے سے بھی چوتھائی حصہ کم چھوٹے کپسول کی صورت میں غالباً ڈاڑھوں کی کسی خلا میں بوقت ضرورت استعمال کرنے کی خاطر چھپا رکھا تھا۔

کرل پرویز اپنی اس ناکامی پر بری طرح تمللا رہا تھا۔ سراج اور علیم احمد کے چہروں پر بھی مایوسی کے گہرے بادل منڈلانے لگے۔ دونوں مجرموں کی لاشیں ملٹری کے نو جوانوں نے کرل پرویز کے حکم کے مطابق خفیہ طور پر شل تھری سے ہٹا دیں۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈی آئی جی کرائمز اور سراج کو سی آف کرتے وقت ٹھوس لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

”ہم اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ موجود معاملے میں کسی طرح بھی ملٹری کا انوالومنٹ ظاہر ہو۔ آپ دونوں کو اس کا خیال رکھنا ہوگا۔“

”مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ ہے۔“ علیم احمد نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر سراج کے ساتھ اسی گاڑی میں بیٹھ گئے جس میں کچھ دیر پیشتر کرل پرویز بھی ان کا ہم سفر تھا۔ آدھے راستے تک دونوں کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ شاید دونوں ہی کو اس بات کا ملال تھا کہ دو اہم مجرم ان کے ہاتھ آنے کے بعد بھی آخری وقت میں انہیں سرخ جھنڈی دکھا گئے تھے۔ پھر گفتگو کی ابتدا ڈی آئی جی کرائمز نے کی۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پہلی فرصت میں دوبارہ اپنا استعفیٰ لکھ کر حکومت کے چوالے کر دوں گا۔“

”کیوں سر؟“ سراج نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا آپ اتنی جلدی.....“ ”جو پولیس آفیسر وقت پر ریٹائر ہونے کے باوجود اپنی ڈیوٹی سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ میں انہیں بھی بزدل ہی کہتا ہوں۔“ فرائض کی ادائیگی آخری سانس تک ہم پر فرض ہوتی ہے۔“

”پھر آپ.....“

”میرا خیال ہے کہ میں کرسی چھوڑ دینے کے بعد تمہارے زیادہ کام آسکوں گا۔“ علیم احمد نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”لیکن مخالف گردپ کے لوگ اس انداز میں نہیں سوچیں گے۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ان کی سوچ مثبت نہ ہو۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے.....؟“ سراج نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

”تم جذبات میں آکر کوئی حماقت کا ثبوت نہیں دو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔“ علیم احمد نے بڑی

سنجیدگی سے اپنی بات جاری رکھی۔ ”میرے کرسی چھوڑ دینے کے بعد..... تمہیں شیخ حامد کی سرپرستی حاصل رہے گی۔“

”سر.....“ سراج چونکا۔ ”یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں نے ابھی کہا تھا کہ تم کسی حماقت سے گریز کرو گے۔“ عظیم احمد نے ڈرائیور کی وجہ سے بدستور مدغم لہجے اور انگریزی زبان کا استعمال جاری رکھا۔ ”میں تمہیں جو گر کی بات بتا رہا ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کرو..... نیول فورس میں جنگ کے دوران میں کسی سب میرین کا رول سب سے اہم ہوتا ہے۔ امید ہے تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔“

سراج جواب میں کسمسا کر رہ گیا۔ ڈی آئی جی کرائمر نے ”سب میرین“ کا حوالہ دے کر اسے جو راہ دکھانے کی کوشش کی تھی وہ وقت کی نزاکت کے اعتبار سے مؤثر ترین طریقہ ثابت ہو سکتی تھی لیکن..... شاید وہ اس اہم نکتے کو فراموش کر گیا تھا کہ خشکی اور سمندر میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

”سر.....“ اچانک ڈرائیور نے کہا۔ ”ذمن کی ایک کار ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ کیا حکم ہے؟“

”ڈسپوز کرادو۔“ سراج نے فیصلہ کرنے میں تاخیر نہیں کی۔

جواب میں گاڑی کے ڈرائیور نے جیب سے موبائل نما ایک وائی ٹائپ آلہ نکال کر اس کے دو چارٹن شیخ کر کے واپس جیب میں ڈال لیا۔ دوسرے ہی لمحے عقب میں کچھ فاصلے پر آنے والی سفید کار کو ایک ملٹری کی جیب نے اوور ٹیک کرنے کی خاطر اسپید تیزی۔ سفید کار کے برابر آتے ہی جیب سے سپیڈ فائزنگ کی تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری۔ سفید کار کے دو ٹائز دھماکوں کے ساتھ پھٹے تو وہ لہرائی ہوئی سڑک پر داہنے ہاتھ لگے بل بورڈ کے کعبے سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ جیب سے ایک فائز اور کیا گیا۔ سفید کار سے شعلے سے بھڑک اٹھے۔ جیب تیزی سے اسپید بڑھاتی اس کار سے بھی آگے نکل گئی جس میں ڈی آئی جی اور سراج ستر کر رہے تھے۔

”تم میرے فیصلے سے پریشان نہ ہونا۔“ ڈی آئی جی نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”جھکے کی ذمے داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد میں تمہارے اور قانون کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوں گا۔“

”ان آہنی ہاتھوں کی تیغ کئی کون کرے گا جس کا حوالہ بھی خود قانون بتانے والے ہر بڑی واردات کے بعد اپنی دھواں دار تقریروں میں دیتے ہیں؟“ سراج جذباتی ہونے لگا۔

”لطف تو یہی ہے کہ ہمیں جس حد بندی میں رکھا گیا ہے اسی میں ہم پوری دیانت اور ذمے داری سے اپنا کام انجام دیں۔“

”آپ کے جانے کے بعد اس سیٹ پر کون آئے گا؟“ سراج نے مضحل لہجے میں سوال کیا۔

”سنیاری سے تو کسی اور کا حق بنتا ہے لیکن میرا ذاتی خیال ہے تمہارے آغا منظور کے کسی کے منظور نظر ہونے کی وجہ سے زیادہ امکانات ہیں۔“

”میڈم کی وجہ سے اب ان دونوں کے درمیان کو لڈو شروع ہو چکی ہے۔“

”اسی لیے میں چاہوں گا کہ میرے بعد میری کرسی پر آغا منظور براجمان ہو۔“ عظیم احمد نے مسکرا کر جواب دیا۔

جواب میں سراج نے ڈی آئی جی کو کرائمر کو وضاحت طلب انداز میں دیکھا تو عظیم احمد نے بے حد سنچیدگی سے کہا۔

”بحری جنگ کے دوران میں دشمنوں کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کچھ ایسی ہی کھینچا تانی کسی سب میرین کے لیے جگہ بناتی ہے اور کامیابی کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ آئی وٹ یو آل دی بیٹ.....“



شیخ حامد کا چہرہ اس وقت کسی ایسے آتش فشاں کی طرح سرخ ہو رہا تھا جو کثیف دھواں اڑانے کے بعد ایک دھماکے سے اپنے اندر کا سارا لاوا اہل دینے کے لیے بے چین ہو۔ ہونٹ چباتے کے ساتھ ساتھ وہ موبائل پر دوسری جانب سے دی جانے والی..... بلیک ٹائیگر کی رپورٹ بھی سن رہا تھا۔

”ڈی آئی جی کرائمر اور سراج تہا داپس لوٹے ہیں، کرنل پرویز ان کے ساتھ نہیں تھا۔ نمبر تھری کی رپورٹ کے مطابق پولیس والوں نے قبرستان میں کچھ دیر پتھر دو تابوت دفن کیے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ.....“ دوسری جانب سے جملہ مکمل نہیں کیا گیا۔

”رک کیوں گئے؟“ شیخ حامد نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”بولتے رہو۔“

”خیال یہی ہے کہ وہ دونوں تابوت ہمارے ہی ساتھیوں کے ہوں گے۔“

”اور.....“ شیخ حامد کے لہجے میں کسی سانپ کی پھنکار محسوس ہو رہی تھی۔

”جس ٹرک نے ایکسیڈنٹ میں کام دکھایا تھا، کل رات تقریباً نو بجے وہ بھی دھماکے سے اڑا دیا گیا، اس کے ساتھ قرب وجوار کے.....“

”غیر ضروری باتوں میں وقت مت برباد کرو۔“ اس بار سرد لہجہ اختیار کیا گیا۔ ”افضل خان کی کیا خبر ہے؟“

”ہمارے آدمیوں نے جان پر کھیل کر وہاں تک رسائی حاصل کر لی تھی لیکن وہ بستر پر موجود نہیں تھا۔“ بلیک ٹائیگر کی آواز بجھے لگی۔ ”شاید کسی نے اس کی خبری کر دی تھی۔ افضل خان کی جگہ ایک وارڈ بوائے چادر اوڑھے گہری نیند سو رہا تھا۔“

”ڈیوٹی نرس کیسے لپیٹ میں آ گئی؟“

”وہ بھی ایک اتفاق ہی تھا جب باس ہمارے آدمی کا کام ہونے کے بعد واپسی کے ارادے سے پلٹے تھے جب نرس کی موت اسے راستے میں لے آئی وہ..... وہ اگر اچانک بدحواس ہو کر شور نہ مچاتی تو.....“

”کچھ کہانیاں میرے پاس بھی ہیں وہ بھی ذہن نشین کر لو۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے

دیا تھا۔ وہ ہر قسم کا نقصان ہنس کر برداشت کرنے کا عادی تھا لیکن کسی کے مقابلے میں شکست تسلیم کرنا اس کی سرشت کے خلاف تھا۔ اس کے چار شکاری کتے ہاتھ سے نکل گئے تھے دو کی موت کی تصدیق بلیک ٹائیگر نے کر دی تھی۔ باقی دو کی موت کے اسباب اس کے ذہن میں کسی پھوکی طرح ڈنگ مار رہے تھے۔ لیاقت حسین کے مقابلے میں بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس نے ایک ہی داؤد میں سیٹھ عثمان کو ختم کرانے کے ساتھ ساتھ لیاقت حسین کا قصہ بھی پاک کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ سیٹھ عثمان سپراسٹور پر اترنے کی وجہ سے بال بال بچ گیا۔ بعد میں ہونے والے خطرناک ایکسیڈنٹ میں بھی لیاقت حسین معمولی زخمی ہوا تھا۔ اس کے بعد اچانک جو جوانی جیسے شروع ہوئے ان کے بارے میں شیخ حامد نے بھول کر بھی غور کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی لیکن..... اب وہ سنجیدگی سے ایک ایک امکان پر غور کر رہا تھا۔

سیٹھ عثمان سیدھا سادا بزنس میں تھا۔ اس سے کسی انتہائی قدم اٹھانے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ سراج کی ایک ایک نقل و حرکت کی رپورٹ اسے مل رہی تھی۔ ڈی آئی جی کراچی جیسے ایماندار آدمی سے بھی وہ غافل نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ علیم احمد کی ذاتی کوشش اور اثر و رسوخ کی وجہ سے ذیشان ہوٹل سے پکڑے جانے والے دو مجرموں کی زبان کھلوانے کی خاطر ملٹری افسران کو شال تفتیش کر لیا گیا ہو لیکن..... ٹرک کے دھماکے کا ذمہ دار کون تھا؟ بنگالی پاڑے کی پڑ پڑ گلیوں میں اس مکان کی نشاندہی کس نے کی تھی جہاں باقی دو خطرناک مجرم روپوش تھے؟ ان کو کھانے لگانے کے احکامات کس سورمانے صادر کیے؟..... وہاں تک ان کی رسائی کس طرح ممکن ہوئی؟..... ایکسیڈنٹ میں استعمال کیے گئے ٹرک ڈرائیور کو حادثے کے بعد فوراً ہی صرف گھر تک محدود رہنے کو کہا گیا تھا پھر..... اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان؟ کس میں اچانک اتنا دم خیم پیدا ہو گیا تھا جس نے شیخ حامد کے مقابلے پر آنے کی حماقت کی تھی؟ کیا اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ہاتھی کا شکار کرنے کی خاطر کسی شیر کا دل گردہ درکار ہوتا ہے؟ تو..... پھر اس نے کس وجہ سے مقابلے پر آنے کی کوشش کی تھی؟

اور بھی بے شمار سوالات تھے جو اس کے شیطانی ذہن میں ابھر رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب شیخ حامد نے اپنے ذہن کو ٹٹولنے کی زحمت گوارا کی تھی ورنہ اس کی آنکھ کے ایک اشارے پر اس کے پروردگار جرم پیشہ افراد جن کی فائلیں سرد خانے میں پڑی سڑک رہی تھیں اس کے مخالف کو موت کی ابدی نیند سلانے میں ایک لمحے کی بھی غفلت نہیں کرتے تھے۔

بڑی دیر تک وہ ذہنی جمناسٹک کرتا رہا پھر اس کے ذہن میں ایک ہی نام ابھرا میڈم روبلی! ہو سکتا تھا کہ افضل خان کی ناکامی کے بعد میڈم کے ذہن میں شیخ حامد ہی کا نام ابھرا ہو۔ شاید اسے بعد میں اس بات کی ہینک بھی مل گئی ہو کہ افضل خان نے کس مقصد کی خاطر اسے شیر کی سیل بند بوتل میں بھی شامل بے ہوشی کی دوا کے ذریعے ٹریپ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اگر کیمبرے کی خفیہ حالت میں اس کے خوبصورت اور گداز برہنہ جسم کو تصاویر یا مووی کی صورت میں محفوظ کر لیا جاتا تو پھر وہ کسی سے نظر ملانے کے بھی قابل نہ رہتی۔ اسی سوچ کے مختلف زاویوں نے

سلسلہ کلام جاری رکھا۔“ بنگالی پاڑے میں ہمارے باقی آدمیوں کو بھی ختم کر دیا گیا۔ چارلی اور حسین بھی غائب ہو گئیں۔ خاص ذرائع سے یہ بھی اطلاع مل رہی ہے کہ کل دفتر چھوڑنے سے پہلے حافظ مولوی قاری مفتی اور فرشتہ صفت علیم احمد نے بھی پے درپے ناکامیوں سے بھوکھا کر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔“ شیخ حامد بیچ دتا بکھا رہا تھا۔“ جس ٹرک کو اڑا دیا گیا اس کا ڈرائیور بھی لاپتا ہے۔“

”اوہ.....“ بلیک ٹائیگر نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”یہ سب کون کر رہا ہے؟“

”ریش.....“ شیخ حامد ایک دم ہی پھٹ پڑا۔ ”تم کس مرض کی دوا ہو.....؟“ وہ تھکسانہ لہجے میں غزایا۔ ”معلوم کرو کہ کس نے اپنی موت کو دعوت دی ہے؟ مجھے کل شام تک مکمل تفصیل درکار ہو گی..... اور.....“

موبائل آف کرنے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے مخصوص کمرے میں کسی بھوکے کے مانند ٹپٹنے لگا جو سوالات اس نے بلیک ٹائیگر سے کیے تھے ان میں سے بہت سے جوابات خود اس کے پاس بھی نہیں تھے۔ وہ خاصی دیر تک دیرینہ قائلین کو قدموں تلے روندتا رہا پھر اس نے میز کے قریب آ کر ایک جھپٹے سے فون کا ریسیور اٹھایا اور سراج کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں جھج رہی تھیں ایک منٹ بعد ہی دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔

”سراج اسپیکنگ۔“

”شیخ حامد بول رہا ہوں۔“ اس نے دھمکتی آواز میں اپنا تعارف کرایا۔ ”ایک ضروری کام پیش آ گیا ہے۔“

”کب حاضر ہو جاؤں؟“ دوسری جانب سے بڑی فرمانبرداری سے دریافت کیا گیا۔

”یہاں نہیں..... اسپتال میں۔“ شیخ حامد نے الفاظ چباتے ہوئے فیصلہ کن لہجہ اختیار کیا۔ ”میں دو گھنٹے بعد افضل خان کی عیادت کی خاطر وہاں پہنچ رہا ہوں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہونی چاہیے۔ کچھ اہم اور فاضل باتیں کرنی ہیں۔“

”او۔۔۔۔۔“ سراج نے اس بار بھی نرم آواز میں کہا۔

”میں وقت سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔“

شیخ حامد نے کسی رکی ہائے ہو..... یا بائی بائی کی ضرورت نہیں سمجھی ریسیور کو واپس رکھ کر بس ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک سی ابھری دوسرے ہی پل اس نے انٹرکام پر اپنی سیکرٹری سے رابطہ قائم کیا۔

”میس باس۔“ دوسری جانب سے ایک مترنم نسوانی آواز ابھری۔

”دس منٹ بعد شبنم کو میرے ساؤنڈ پروف کمرے میں بھیج دینا۔“

”رائٹ باس.....“ مستعدی سے جواب ملا۔

شیخ حامد دوبارہ اپنی چیئر پر بیٹھ گیا۔ پے درپے ہونے والی ناکامیوں نے اسے بری طرح الجھا

اسے انتقام لینے پر اکسا دیا ہوگا۔ دولت کے بل بوتے پر ممکن ہے اس نے بھی دو تین بد معاش اور اٹھائی گیروں کی خدمات حاصل کر لی ہوں، لیکن کوئی نہ کوئی اس کی پشت پناہی بھی ضرور کر رہا تھا جس نے اسے خاص اور اہم اطلاعات فراہم کی ہوں گی۔ اس بھیدی کا نام اگلوآنے کی خاطر میڈم کوٹھنچوں میں جکڑنا ضروری تھا۔ ”تم میرے انتخاب پر پوری اتریں یہ تمہاری خوش قسمتی بھی ہے۔ میں تمہیں اب اپنے کچھ خاص کاموں کے سلسلے میں موبغ دیتا رہوں گا۔“

شیخ حامد کے وہ آخری جیلے اس کی قوت سماعت میں اکثر گونجتے رہتے۔ اس نے شیخ حامد کے ہاں محض اپنی بد نصیب ماں اور بے قصور باپ کی دردناک اموات کا انتقام لینے کی خاطر ملازمت اختیار کی تھی اسی منصوبے کے تحت اس نے افضل خان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن..... دفتر سے افضل خان کی مسلسل غیر حاضری نے اسے مزید چونکا دیا تھا اسے اصل صورت حال کا علم بہت زیادہ نہیں تھا لیکن اس کا ذہن گواہی دے رہا تھا کہ خود افضل خان بھی شاید زیر عتاب آگیا ہے۔ شبنم نے کئی بار اس پہلو پر بھی غور کیا تھا کہ وہ خاموشی سے کوئی خوبصورت بہانہ تراش کر ملازمت سے مستعفی ہو جائے اور میڈم روہی کے ساتھ مل کر اپنے انتقام کی خاطر کوئی نیا پلان تشکیل دے۔ ایک دو بار اس نے اپنا استعفیٰ لکھ بھی لیا لیکن بعد میں اسے ریزہ ریزہ کر کے تلف کر دیا۔ فوری طور پر وہ بگ باس کو ایسا موقع نہیں فراہم کرنا چاہتی تھی جو اس کی پوزیشن کو مشکوک کر دیتا۔

اس وقت بھی سوچ بورڈ پر پوری تندی سے اپنے فرائض انجام دینے وقت اس کے ذہن میں مختلف پلان ابھر رہے تھے جب اسے شیخ حامد کی سیکریری نے انٹرکام پر بڑے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

”میں سب سے پہلے تمہیں اس بات پر مبارک پیش کروں گا کہ تم نے بگ باس کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔“

”جی.....!“ اس نے شپٹا کر کہا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

”باس نے تمہیں ٹھیک دس منٹ بعد اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں طلب کیا ہے۔“ اس بار بھی چیختے ہوئے انداز میں اسے بگ باس کا حکم سنایا گیا پھر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

شبنم کے ذہن میں پھر خشک آندھی کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھی کہ بگ باس کی پسند اور ناپسند دونوں ہی اس کے حق میں خطرناک ہو سکتی تھیں پانچ چھ منٹ تک وہ ذہنی انجمن میں جتلا رہی۔ شیخ حامد کی سیکریری کا جملہ بدستور اس کے وجود میں ببول کے کانٹے کے مانند چھ رہا تھا۔ ایک ایک منٹ اسے کوئی آخری فیصلہ کر گزرنے پر اکسارہا تھا چھٹی حس میں کوئی نادیدہ خطرہ رہ رہ کر کھلا رہا تھا پھر..... شبنم نے دل کڑا کر کے ایک آخری فیصلہ کر لیا..... کہ پہلی فرصت میں اس ملازمت سے کوئی خوبصورت بہانہ کر کے سبکدوش ہو جائے گی۔ ذہن کو پوری طرح علیحدگی پر آمادہ کرنے کے بعد اس نے وقت مقررہ پر ساؤنڈ پروف کمرے میں قدم رکھا تو خود کو بہت ہلکا چمکامسوں کر رہی تھی۔ اس نے شیخ حامد کے چہرے پر منڈلانے والے تہر و غضب کا بھی کوئی

خاص نوٹس نہیں لیا۔ خاموشی سے اشارے ملنے پر خود کو سنبھالتے ہوئے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیسی ہو..... شبنم۔“ شیخ حامد نے گہری نظروں سے اس کے لباس..... اور لباس کے اندر روپوش جسمانی خطوط کے گراف کی لکیر کے ایک ایک نشیب و فراز..... اتار چڑھاؤ کو توجہ سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے اس کی خیریت دریافت کی۔ اس کے چہرے کا تناؤ بھی بہ تدریج کم ہونے لگا۔

”آپ کی نظر عنایت ہے سر.....!“ شبنم نے سنبھل کر جواب دیا۔

”میں نے تمہیں اس وقت ایسے مخصوص کام کے لیے بلایا ہے جو میرے خیال میں تم بڑی آسانی سے انجام دے سکتی ہو۔“

”میں خادم ہوں سر..... آپ کے لیے کوئی کام سر انجام دیتا یقیناً میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے لیکن.....“ شبنم نے کچھ کہنا چاہا لیکن شاید وہ بگ باس کا خوف ہی تھا جو الفاظ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔

”کم آن.....“ شیخ حامد نے اس بار بے تکلفی کا مظاہر کیا۔ ”تم اگر چاہو تو مجھے بگ باس کے بجائے اپنا ہمدرد یا دوست سمجھ کر بھی جو چاہو کہہ سکتی ہو۔ بات دل میں رہ جائے تو گھٹن کا احساس بھی شدت اختیار کرنے لگتا ہے۔“

”سر.....!“ شبنم نے دوبارہ اپنا مقصد بیان کرنے کی خاطر پیش بندی ضروری جان کر دلی زبان میں کہا۔ ”ادھر کچھ دنوں سے میں بہتر محسوس نہیں کر رہی ہوں..... شاید..... شاید مجھے آرام کی ضرورت ہے۔“

”اوکے۔“ شیخ حامد نے دریا دلی سے جواب دیا۔

”تم سوچ بورڈ کا تھکا دینے والا کام کسی اور کو سونپ دو۔ اس کے علاوہ میں تمہیں آرام کرنے کی خاطر دس روز کی چھٹی بھی دوں گا۔ دوپے (with pay) میں نے جس کام کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے وہ تمہارے لیے دلچسپ بھی ہے اور ایڈونچر بھی دس روز کے دوران میں تم سے موبائل پر بھی رابطہ کر سکتا ہوں۔“ شیخ حامد نے کچھ توقف سے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں ایک موبائل اور سم بھی دوں گا جو کہیں کسی موبائل کمپنی کے رجسٹر پر درج نہیں ہوگی..... وجہ بھی سن لو میں نہیں چاہتا کہ اپنے مخالفین کے پاس کوئی ثبوت چھوڑ دوں جو میرے خلاف کبھی استعمال ہو سکے..... انڈر اسٹینڈ۔“

”بھلا آپ کا کون مخالف ہو سکتا ہے؟“ شبنم نے بڑے اعتماد سے مسکرا کر کہا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ جملہ ادا کرتے وقت اس کے دل میں نفرت کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

”تم نے ابھی تک کام کی نوعیت نہیں پوچھی.....؟“ اس نے شبنم کو اس بار قدرے برہم نظروں سے دیکھا۔

”سر.....!“ شبنم نے ایک بار پھر کسمسا کر بڑی ہمت سے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو کام مجھے سونپ رہے ہیں وہ کسی اور کو سونپ دیں اور..... اور.....“

”اور کیا.....؟“ شیخ حامد کے تہر بدلتے لگے۔ وہ کسی کا انکار یا مشورہ سننے کا عادی نہیں تھا۔

”مم.....مم..... میں ملازمت سے ریزائن کرنا چاہتی ہوں۔“ شبنم نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھال کر کسی نہ کسی طرح اپنی خواہش ظاہر کر دی۔ جواب میں شیخ حامد کے ہونٹوں پر ایک غلیظ مسکراہٹ پھیل کر بھری ہوئی لگی۔

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“ اس کا لب ولہجہ یک لخت ساٹ ہو گیا۔
 ”آخری فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے سر.....“ شبنم نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔ ”میں تو صرف درخواست کر سکتی ہوں۔“

”اگر میں تمہاری درخواست رد کر دوں تو.....؟“ اس نے شبنم کو چھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ میری درخواست پر.....“
 ”سوری.....“ شیخ حامد نے اس کا جملہ کاٹ کر بڑے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”تم اب اس پوزیشن میں بھی نہیں رہ گئی ہو کہ میری مرضی کے بغیر ریزائن بھیج کر گھر بیٹھ جاؤ۔“

”مم..... میں سمجھی نہیں..... سر!“ شبنم نے چونک کر اسے وضاحتی نظروں سے دیکھا۔ کسی نا دیدہ خوف سے اس کے وجود کے اندر اٹھل پھٹھل بھی شروع ہو چکی تھی۔ جواب میں شیخ حامد نے دراز کھول کر ایک بڑے سائز کا بادامی انویلیپ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا اور خود اٹھ کر اس عقبی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ دور دور تک کے مناظر دیکھ سکتا تھا۔

”تم اب اس پوزیشن میں بھی نہیں ہو کہ میری مرضی کے بغیر ریزائن بھیج کر گھر بیٹھ جاؤ۔“ شیخ حامد کے دو جیسے شبنم کے ذہن پر بجلی بن کر گرے تھے اس جملے میں ایسا چٹخ تھا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے دھڑکتے دل سے انویلیپ کو کھول کر دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ پہلی تصویر پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کی اپنی نگاہیں بھی شرم سے جھک گئیں ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ پھر اسے یاد آ گیا کہ جس دن وہ دعوت کے بعد گھر پہنچی تھی تو اسے بڑی شدت سے نیند آرہی تھی۔ اپارٹمنٹ میں وہ تنہا رہتی تھی اس لیے اسے کسی کا خوف بھی نہیں تھا۔ چہنچ کرنے کی خاطر اس نے ٹائٹ سوٹ نکالا تھا اور کا سامنے سے کھلا ڈھیلا ڈھالا تنگی فرائک پہننے کے بعد اس نے شلوار اتار کر ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہننا چاہا تھا لیکن نیند کا ایسا جھوٹکا آیا کہ وہ بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کے ذہن میں یہی تھا کہ صبح اٹھ کر پوری طرح چہنچ کر لے گی۔ اکیلے کمرے میں کون اس کی پرائیویسی کو دیکھے گا؟ اس نے لیے فرائک کے سامنے کے ٹیبل بھی بند نہیں کیے۔ بستر پر لیٹ کر اسے دیکھے کی ہوا لگی تو اس کو ٹھنڈک کا خوشگوار احساس ہوا تھا پھر وہ آنکھ بند کرتے ہی بے خبر ہو گئی تھی۔

شبنم کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد گول لاک کا پیش بٹن دبا کر اسے اندر سے لاک کر دیا تھا لیکن..... شاید شیخ حامد کے حکم پر اس کے کسی کارندے نے اپارٹمنٹ کی ڈبلی کیٹ چابی پہلے ہی سے تیار کر لی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ شرم ناک تصویریں بھی اس کے سامنے نہ رکھی جاتیں۔ وہ زبان کھولنے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہی تھی اسے استغنیٰ دینا تو دور کی بات تھی۔ اس نے نہ چاہنے کے باوجود کسی خیال سے ان چاروں سکس بائی ایٹ سائز تصویروں پر نظر

ڈالی۔ تصویر میں وہ ٹانگوں اور سینے کے اعتبار سے بالکل عریاں ہی نظر آرہی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ تنہا تھی ورنہ تصویریں اتارنے والا ہر پوز میں خود کو بھی اس کے ساتھ شامل کر سکتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ذہن کو ٹٹولا، اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے صبح دفتر جاتے وقت لاک پر ہوش و حواس کھولا تھا، لیکن اس کا ذاتی اعتماد تھا جو اسے کسی خطرناک سازش کا سراغ دے رہا تھا۔ کوئی اور ان مخرب اخلاق تصویروں کو دیکھتا تو اس کے وضاحتی بیان کی کوئی اہمیت نہ ہوتی..... نظریں جھکائے وہ اپنی پوزیشن کا صحیح تعین بھی نہ نہیں کر پاتی تھی کہ بگ باس کی پاٹ دار آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”ان تصاویر کے دوسرے پرنٹ اور ٹیٹو میرے پاس تمہاری امانت کے طور پر محفوظ رہیں گے۔ گو کہ تم اب اس پوزیشن میں نہیں رہ گئی ہو کہ میں تمہیں کسی بات کا یقین دلاؤں لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ رعایت ہی کی ہے۔ جب تک تم میرے اشارے پر میرے لیے کام کرتی رہو گی ان تصاویروں کے بارے میں ہر بات راز رہے گی۔ بصورت دیگر.....“

”سر! مم..... مم..... میرا جرم کیا تھا؟“ شبنم نے بڑی نحیف اور مردہ سی آواز میں دریافت کرنے کی جسارت کی۔

”تصور تمہارا ہوتا تو شاید.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک کر بولا۔ ”صبا بیگم کی زندگی کا راز..... اس کی وہ کہانی جو اس نے تمہیں سنانے کی غلطی کی تھی اور وہ تمہارے کانوں تک پہنچ گئی۔ یہ تصویریں اس سلسلے میں تمہاری زبان پر قفل کا کام سرانجام دیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ خود صبا بیگم کو بھی زبان کھولنے کی ناقابل تلافی سزا بھگتنی پڑے ممکن ہے کہ تم ہی اس کہانی کو مادی شکل میں اسے کے آخری انجام تک پہنچاؤ..... پھر..... تمہاری ضرورت ختم ہو جائے گی لیکن..... اس سے پیشتر تمہیں میرے لیے کچھ ضروری کام بھی کرنے ہوں گے۔“

”وہ کیا.....؟“ شبنم نے دل کی دھڑکنوں پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی پوزیشن اب اس معصوم اور کمزور پودے سے مختلف نہیں تھی جو آندھی کی زد میں پوری طرح آ گیا تھا۔ ایک تند جھونکا ہی اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔

شیخ حامد پلٹ کر میز پر آ گیا۔ اس نے لفاظی اٹھا کر دراز میں ڈالا پھر ٹھوس لہجے میں بولا۔
 ”رینوکلب میں تمہارا آنا جانا بھی رہ چکا ہے؟“
 ”ہاں میں انکار نہیں کروں گی۔“

”کبھی میڈم روبی سے ملی ہو..... یا..... ملنے کا کوئی اتفاق ہوا ہے؟“ اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ اس کی عقابانی نظریں شبنم کے چہرے پر مرکوز تھیں جو پوری طرح اس کے جال میں پھنس چکی تھی۔

”میں میڈم کو جانتی ہوں..... ایک..... ایک بار اس کے گھر بھی جا چکی ہوں۔“
 ”مگ.....“ شیخ حامد کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پورے طمطراق سے ابھری۔ ”تمہیں سارے کام چھوڑ کر میڈم روبی سے دوستی بڑھانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ جو چاہو جواز پیش کرو لیکن

اسے اس طرح اپنے اعتماد یا اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کرو کہ وہ تمہیں اس دنیا میں سب سے قابل اعتماد سمجھنے لگے۔“ اس نے ایک لمحے کے بعد بڑے خوشخوار لہجے میں کہا۔ ”یہ میری درخواست نہیں، میرا حکم ہے، شیخ حامد کا حکم ہے۔ شیخ حامد کا حکم جسے نالے کا انجام تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔“

”میں ویسا ہی کروں گی جیسا آپ چاہیں گے لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”کیا بات ہے؟ جو چاہو کھل کر کہو۔“ اس بار شیخ حامد نے پینتیرا بدل کر قدرے نرم لہجے میں کہا۔

”میں دوبارہ کی درخواست کروں گی۔“ اس نے رندگی ہوئی آواز میں اس طرح کہا جیسے آہنی سلاخوں کے پیچھے مقید کوئی قیدی، نظر جیسے بے رحم اور درندہ صفت ظالم سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ ”میں اپنی بربادی پر موت کو ترجیح دینا پسند کروں گی اس لیے.....“

”فکر مت کرو۔“ شیخ حامد نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں خود بھی نہیں چاہوں گا کہ تمہارے پھول جیسے نازک مگر مہکتے جسم کو کوئی پامال کرے، مگر اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا..... اور کچھ؟“

”میڈم کی مالی حیثیت سے آپ بھی واقف ہوں گے۔ اس کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی خاطر کرائے کی گاڑیوں کے اخراجات.....“

”تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟“ اس کا ہلکا سا سوال کرنے سے پہلے ہی سوال کیا گیا۔

”جی ہاں..... ڈرائیونگ لائسنس بھی ہے، میں نے شوقیہ ڈرائیونگ سیکھنے کی خاطر ایک ڈرائیونگ سکول سے.....“

”فکر مت کرو۔ تمہارے لیے ایک گاڑی کا بندوبست کر دیا جائے گا۔“

”سر.....“ شبنم نے ہمت کر کے مردہ سی آواز میں پوچھ ہی لیا۔ ”کیا کام مکمل ہو جانے کے بعد آپ مجھے باعزت طور پر اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے آزاد کر دیں گے؟“

”یہ حالات پر منحصر ہے، مگر اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا کہ اگر کبھی تم نے مجھے ڈبل کر اس کرنے کی کوشش کی تو پھر اس کا انجام بھی اچھا نہیں ہوگا۔“

وہ خاموش بیٹھی دل کی دھڑکنوں کو شمار کرتی رہی، جس دلدل میں وہ پھنس چکی تھی اس کا صرف ایک ہی علاج تھا۔ بگ باس کی موت!..... لیکن اس سوچ کا انجام تک پہنچانا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ خاصی دیر تک وہ سر جھکائے بیٹھی شیخ حامد کی طرف سے دی جانے والی ہدایات ذہن نشین کرتی رہی پھر..... جانے کے لیے لرزتے قدموں پر بہ مشکل کھڑی ہوئی تو بگ باس نے بڑے ٹھوس لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”ایک بات غور سے سن لو..... میرے نادیہ ہاتھ کان اور آنکھیں تمہاری ایک ایک حرکت کو کسی حساس کلوزسرکٹ کیس کے کی طرح واچ کرتے رہیں گے..... تم اپنے اپارٹمنٹ کے بند کمرے میں بھی بستر پر لیٹ کر سانس لوگی تو وہ بھی مجھے سنائی دیتی رہے گی۔“

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دے کر اس کی بات سننے اور سمجھنے کا اقرار کیا پھر سر جھکائے

کمرے سے نکل گئی۔ اس کے ذہن میں گرم لو کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔



سفید فام دراز قد اور خوبصورت شکل کا مالک ڈوما جس کا تعلق بیروت سے تھا اس وقت ایک پر سکون ساحلی علاقے میں اپنی حسین بے باک اور گداز جسم کی مالک گرل فریڈ میرینا کے ساتھ کرائے پر حاصل کردہ ہٹ کے اندر زندگی کی لذتوں سے اپنے حصے کا لطف کشید کر رہا تھا۔ دونوں کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز برائے نام بھی نہیں تھی۔ وہ جس تہذیب سے تعلق رکھتے تھے وہاں برہنگی اور جسم کی نمائش کو محبوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ امریکا کے ایک نائب کلب میں نیلے رقص کا ہجوان انگیز مظاہرہ کرنے والی ہر شو میں اپنا آئٹم ختم کرنے سے دو منٹ پہلے اپنے جسم سے اس مختصر زیر جامہ بھی اتار کر تماش بینوں کی طرف اچھال دیتی تھی جو برائے نام ہی اس کے مخصوص حصوں کو تماش بینوں کی لچائی ہوئی نظروں سے پوشیدہ رکھتا تھا، اس آخری دو منٹ کے وقت ہال میں بیٹھے ہوئے افراد کھڑے ہو کر سیٹیاں بجانا شروع کر دیتے..... پھر میرینا ان کے دلوں پر بجلیاں گراتی، فضا میں اگلیوں کے اشارے سے بوسے اچھالتی، لہراتی بل کھاتی اسٹیج سے چلی جاتی تھی۔ شور اس کے جانے کے بعد بھی جاری رہتا پھر لوگوں کی رگوں میں دوڑتے اور جوش مارتے خون کی گردش بہ تدریج کم ہوتی تو وہ شراب و کباب میں مگن ہو جاتے تھے۔

فضائی سفر کے دوران سیاہ فام ہاشم نے بھی تیسرے مسافر لوچن سے اس کے بارے میں یہی کہا تھا کہ..... ”ڈوما نے طے شدہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کو بھی پہلے جہاز سے خاموشی سے روانہ کر دیا ہے۔“ لڑکی کا نام دریافت کرنے پر اس نے چپنی باشندے اور مارشل آرٹ کے ماہر سے یہ بھی کہا تھا..... ”ہاں..... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا تعلق امریکا کے ایک نائٹ کلب سے ہے۔“ پھر اس نے پتھر سے لیتے ہوئے کہا تھا..... ”لڑکی خاصی تمکین ہے، مگر میرا تجربہ کہتا ہے کہ تمک کی زیادتی کبھی کبھی زہر سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔“

اس وقت ڈوما شراب کے نشے میں بدست میرینا کے اسی تمکین جسم سے سیرال ہو رہا تھا جب اس کے مخصوص موبائل نے وائبرٹ کرنا شروع کیا۔ دوسرے ہی لمحے ڈوما نے میرینا کو انگلی ہونٹ پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر موبائل آن کر کے کہا۔

”ییس..... ڈوما میر.....!“

”سیون اسٹارز“ دوسری جانب سے ایک بھرائی ہوئی نسوانی آواز میں اور انداز مخاطب ان دو کالوں سے مختلف تھا جو وہ پہلے سن چکا تھا۔

”آپ کی آواز مجھے بدلی بدلی محسوس ہو رہی ہے.....“ اس نے اپنی ذہانت اور شبے کا اظہار کیا۔

”فائن.....“ جواب میں کہا گیا۔ ”تمہاری میموری یقیناً قابل رشک ہے لیکن تمہیں صرف یہ ہدایت ملی تھی کہ تمہیں سیون اسٹارز کے کوڈ کے حوالے سے جو بھی حکم دیا جائے اس پر عمل کرنا ضروری

ہے..... بدلی ہوئی آواز یا عورت اور مرد کی آوازوں کے پلک میں الجھنے کی کوشش دوبارہ نہ کرنا.....“
 ”او کے..... فائن۔“ ڈوما نے شانے اچکا کر بے پروائی سے جواب دیا۔ اس کی بے تاب نظریں اس وقت بھی میرینا کے گداز جسم کے کشیب و فراز پر منڈلا رہی تھیں جو بستر پر خاص اسٹائل سے لیٹی سگریٹ کا دھواں اڑا رہی تھی۔

”تم نے بنگالی پاڑے میں جس طرح بھیس بدل کر اور شاطرانہ انداز میں ان دو مطلوبہ افراد کو ٹھکانے لگایا وہ ہمیں پسند آیا۔ اس کے لیے تمہیں پانچ ہزار ڈالر بطور انعام عہدہ سے دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ تم تمہیں کسی طرح تمہارے ہوٹل کے کمرے تک پہنچا دی جائے گی..... ہم اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں اور طے شدہ معاہدے پر عملی کرنے والوں کو ہمیشہ پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔“

”جھنکس.....“ ڈوما نے میرینا کو دیکھ کر بائیں آکھ جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”انہی ماہرانہ صلاحیتوں اور کارکردگی کی وجہ سے ابھی تک قانون کے آہنی ہاتھ میری گردن کو بھی نہیں پہنچ سکے۔“
 ”اسی رپورٹ کے بعد ہی تمہیں بھاری اور منہ مانتے معاوضے پر آگنج کیا گیا ہے لیکن..... ضرورت سے زیادہ چالاکی بھی کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔“

”میرے لیے کوئی اور حکم.....؟“ ڈوما نے آخری جملہ دوسرے کان سے اڑاتے ہوئے سوال کیا۔

”تم اس وقت کہاں اور کس کے ساتھ ہو.....؟“ اس بار بے حد سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔
 ”میں سمجھا نہیں.....“ ڈوما نے ہچکچانے کی کوشش کی۔ اس کی نگاہیں میرینا پر جم کر رہ گئی تھیں۔ سوال کی نوعیت بھانپنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی اسے اپنی چالاکی کا یقین تھا جو کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

”میں سمجھاتی ہوں.....“ دوسری جانب سے جھکمانہ انداز اختیار کیا گیا۔ ”تم نے جو معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اسے چوبیس گھنٹے کے اندر پہلی فلائٹ سے خود سے دور کر دو..... کیا مجھے مزید وضاحت کی ضرورت ہے؟“

”آئی ایم سوری لیکن.....“ ڈوما نے بوکھلا کر کہا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ جملہ مکمل کرنا دوسری جانب سے زیادہ سرد لہجے میں کہا گیا۔

”نو آگوشن..... چوبیس گھنٹے کی مہلت بہت ہے..... دوسری شکل میں مجھے جو طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ وہ شاید تمہارے اور تمہاری گرل فرینڈ دونوں ہی کے لیے انتہائی ذلت آمیز ہو..... یہ تمہارے لیے سیون اسٹارز کی طرف سے پہلی اور لاسٹ وارننگ ہے..... بائی۔“

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ ڈوما نے میرینا کی طرف دیکھا جو اس کے انتظار میں سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر فضا میں چھوڑ رہی تھی۔ ڈوما نے طے کر لیا تھا کہ وہ سیون اسٹارز کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرے گا لیکن وہ اس آخری لمحے میں بھی میرینا کے ساتھ انجوائے

کرنیکی خواہش کو دل سے نہیں نکال سکا۔

❖❖❖

افضل خان ہوش میں آچکا تھا لیکن ڈاکٹروں نے اسے اب بھی خطرے سے باہر قرار نہیں دیا تھا اس وقت بھی نیم غنودگی کی کیفیت سے دو چار بستر پر پڑا بری طرح کراہ رہا تھا ڈاکٹروں کی ماہرانہ رائے تھی کہ اغوا کرنے والوں نے اس پر جو شدید تشدد کیا تھا اس کے اندرونی اثرات کو ختم ہونے میں دو تین ہفتے اور بھی سکتے تھے۔

سراج، شیخ حامد کی متوقع آمد سے خاصی دیر قبل اسپتال پہنچ گیا تھا اس نے سادہ لباس والوں کو بھی خاص طور پر زیادہ محتاط رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ اس وقت وہ افضل خان کے کمرے میں تنہا ہی تھا ڈیوٹی نرس کو اس نے کچھ دیر کے لیے باہر بھیج دیا۔ وہ افضل خان سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنے کا خواہش مند تھا۔

”اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ اس نے افضل خان کی نگاہوں میں دور تک جھانکتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”زندگی سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی۔“ افضل خان نے نقاہت سے جواب دیا۔ ”آپ اس وقت ایسی پوزیشن میں ہیں کہ میری مشکل دور کر سکیں۔“
 ”کوئی خاص فرمائش؟“

”ہاں.....“ افضل خان نے کرب کو چھپاتے ہوئے ہتھی لہجے میں جواب دیا۔ ”ڈاکٹر سے کہیں کہ ایک آخری انجکشن لگا کر مجھے اس اذیت سے نجات دلا دے جو میرے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔“

”اس کی فرمائش تم اپنے بگ باس سے بھی کر سکتے ہو۔“ سراج نے طنز کیا۔ ”وہ کچھ دیر میں تمہاری خیریت دریافت کرنے کی خاطر آنے والا ہے، تم نے بھی اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اس کی خاطر زندگی داؤ پر لگاتے رہے۔ اب ایک فرمائش کرنا تو تمہارا حق بھی بنتا ہے۔“

افضل خان نے جواب میں ہونٹ پہنچ لیے وہ سراج کے جیلے کی گہرائی کو سمجھ کر اندر ہی اندر ہیچ وٹاب کھا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ وہ میڈم کے بدن کو روند کر اس کی مووی اور تصاویر بنا کر باس کی خدمت میں پیش کر دیتا تو اس کی حیثیت میں چار چاند لگ جاتے۔ اس نے جو پلاننگ کی تھی اس میں ناکام بھی نہیں رہا تھا۔ میڈم نے سیل بند بوتل منگا کر اپنی دورانہشی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید بھول گئی تھی کہ شیخ حامد کا دست راست ہونے کے سبب اس کے لیے کوئی بات ناممکن نہیں تھی۔ اس نے تاج محل ہوٹل کے بارشینڈر سے مل کر پہلے ہی سے عورتوں کی پسند کی کچھ مخصوص شراب کی ایسی سیل بند بوتلیں بھی تیار کرائی تھیں جن میں بے ہوشی کی دوا شامل تھی۔ میڈم اس کے جال میں پوری طرح پھنس گئی تھی۔ بے ہوشی کے عمل کے دوسرے اسٹیج میں پہنچنے کے بعد اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کسی دلدل میں پھنس چکی ہے اس نے افضل خان کو اپنے رعب میں لینے کی کوشش بھی کی تھی لیکن

وہ بھی پرانا تجربہ کار اور گھاگ شکاری تھا، میڈم کو اپنے بازوؤں میں دیوچ کر مسہری تک لے گیا تھا لیکن پردہ اٹھانے میں اس سے تاخیر ہوئی، اسے امید نہیں تھی کہ اچانک بلیک ٹائیگر کی کال اس کے رنگ میں جھٹک ڈال دے گی..... پھر جو کچھ ہوا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

بلیک ٹائیگر کے خطرے سے آگاہ کرنے کے فوراً ہی بعد وہ چور راستے سے نکل گیا تھا۔ وہ میڈم کو دیوچنے کی لالچ میں خود دیوچ لیا گیا تھا۔ اسے ناقابل برواشت حالات میں رہنا پڑا۔ انعام کے بجائے وہ بگ باس کے عتاب کا شکار ہو گیا پھر اسے جس حالت میں کچرا کنڈی سے اٹھایا گیا تھا وہ بھی اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کیفیت کو وہ فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

”اب کیا سوچ رہے ہو.....؟“ سراج نے اسے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔
”م..... میں غلطی پر تھا۔“ اس نے ہونٹ چباتے ہوئے بڑی اذیت سے کہا۔ ”اسی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔“

”بہت جلدی احساس ہو گیا.....“

”پلیز مسٹر سراج!“ اس نے شرمندگی کا اظہار کیا۔

”آپ اگر مجھے کانٹوں میں تھینے کے بجائے میری مشکل آسان کرادیں تو میں اور میری روح دونوں.....“

باہر سے کچھ آوازیں ابھریں۔ نرس دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو افضل خان نے خاموشی اختیار کر کے آنکھیں بند کر لیں، سراج بھی نرس کے قریب جا کر اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے افضل خان کی کیفیت کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہو۔

دو منٹ بعد شیخ حامد نے کمرے میں قدم رکھا تو سراج نے نہ چاہنے کے باوجود ڈی آئی جی کرائمز کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھ کر اس سے بڑی گرجوٹی سے ہاتھ ملایا۔ شیخ حامد اس کا ہاتھ بے تکلفی سے تھام کر افضل خان کے قریب آ گیا جس نے مجبوراً آنکھیں کھول دی تھیں لیکن ان آنکھوں میں زندگی کی امنگ دور دور تک کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ شیخ حامد کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے براہ راست ہاتھ کے اشارے سے نرس کو باہر بھیج دیا۔ سپاٹ آواز میں افضل خان سے مخاطب ہوا۔

”میں تمہیں زندگی کی طرف واپس لوٹ آنے کی مہارک بادپیش کرتا ہوں۔“

”تھینکس..... باس۔“ افضل خان نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

”کیا پولیس تمہارا بیان لے چکی ہے؟“

”جی ہاں.....“ افضل خان کے بجائے سراج نے کہا۔ ”بیان کی روشنی میں کسی ایسی پارٹی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا جو اغوا برائے تاوان کی لسٹ پر موجود ہیں۔“

”پھر.....“ اس نے افضل خان کے چہرے سے نظر ہٹا کر سراج کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”پولیس نے کچھ نہ کچھ تو ضرور سوچا ہو گا۔“

”ابھی صرف امکانات پر غور کیا جا رہا ہے۔“ سراج کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ ”ابھی کوئی حتمی رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔“

”میں آپ سے بعد میں باتیں کروں گا۔“ شیخ حامد نے کھردرے انداز میں جواب دیا پھر اس کی نظریں دوبارہ افضل خان کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ سیدھا ہاتھ جیب میں رینگ گیا۔ چند لمحوں بعد افضل خان کے چہرے کا بخور جائزہ لیتا رہا پھر اس نے ہاتھ جیب سے باہر نکال لیا۔ جملائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میری اطلاع کے مطابق تمہیں تاج محل ہوٹل سے فرار ہونے کے بعد اغوا کیا گیا تھا۔ یہ بھی تمہاری خوشی نصیبی ہی ہے ورنہ جس انداز میں تمہارے اپارٹمنٹ کو تھس نہس کیا گیا اسی طرح وہ تمہیں بھی روست کر دینے کے موقعے کو شاید ضائع نہ کرتے۔“

افضل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بگ باس جیسے خطرناک آدمی کے سامنے وہ اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”میڈم روبی کو تم تاج محل ہوٹل میں کیوں لے گئے تھے.....؟“ شیخ حامد نے کسی سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے سوال کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر سراج نے اگر میرے خیال سے معاملے کو نہ سنبھال لیا ہوتا تو تمہاری حماقت سے میری کاروباری ساکھ بھی متاثر ہو سکتی تھی۔“

”آئی..... ایم سوری باس۔“ افضل خان نے دل پر جبر کر کے کمزور لہجے میں جواب دیا۔
”عیاشی کے لیے تمہیں کیا ایک مجبور بیوہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ملا تھا.....؟“ شیخ حامد کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔

”تم یہ بھی بھول گئے کہ میرے بزنس گروپ میں تمہاری حیثیت کیا ہے۔“
افضل خان بدستور خاموش رہا۔ شیخ حامد کچھ دیر اس سے ایسے ہی سوالات کرتا رہا جو اس کے مطلب کے تھے جن کے جوابات اور..... افضل خان کی خاموشی دونوں یہی ظاہر کرتی تھیں کہ افضل خان نے جو کچھ کیا وہ اس کا نتیجہ بھگتا وہ اس کی ذاتی بے پروائی تھی۔ شیخ حامد کا اس سے دور کا بھی سروکار نہیں تھا۔ سراج کو اس طفلانہ ”شوآف“ کی توقع نہیں تھی۔

”اب تم نے کیا سوچا ہے.....؟“ شیخ حامد نے بڑے سرد لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا اب بھی تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکو گے؟“

”پلیز مسٹر حامد.....؟“ سراج چپ نہ رہ سکا۔ ایک اچھٹی نظر افضل خان کے چہرے پر ڈالتے ہوئے شیخ حامد سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ افضل خان کو جو سزا مل چکی ہے وہی کافی ہے۔“

”یہ آپ کا ذاتی خیال ہے لیکن میں اس شخص کو دوبارہ بحیثیت بزنس میجر کے عہدے پر قبول کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”اس کے باوجود آپ اس کی سرپرستی سے منہ بھی نہ پھیریں۔“ سراج نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”میں آپ کے فیصلے سے متفق ہوں لیکن میرا ذاتی خیال ہے افضل خان کو دودھ کی بھٹی کی طرح نکال کر پھینک دینا بھی.....“ سراج نے معنی خیز انداز میں جملہ مکمل جھوڑ دیا۔

”فی الحال میں کوئی آخری فیصلہ نہیں کر سکتا البتہ آپ کی سفارش پر غور ضرور کروں گا۔“
 ”جسٹیس!۔“ سراج نے اس بار اطمینان کا سانس لیا۔ ویسے وہ بھانپ چکا تھا کہ شیخ حامد کے پینٹ کے سیدھے ہاتھ کی جیب میں چھپا کوئی حساس ٹیپ ریکارڈ تمام گفتگو ریکارڈ کر رہا تھا۔
 افضل خان امید و قیام کی کیفیتوں سے دو چار تھا۔ شیخ حامد کے کمرے سے جانے کے بعد ہی اس نے سکون کا گہرا سانس لیا تھا۔ سراج بھی شیخ حامد کے ساتھ ساتھ تھا۔ کمرے کے باہر رانداری میں اسے شیخ حامد کے دوسرے لباس والے گارڈ بھی نظر آ گئے۔ شیخ حامد سراج سے باتیں کرتے ہوئے اپنی کار تک آیا۔ ڈرائیور نے تیزی سے نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔
 ”تم دوسری گاڑی میں آنا۔۔۔۔۔“ اس نے ڈرائیور کو حکم دیتے ہوئے سراج کی طرف دیکھا۔ ”مجھے اس وقت ڈی ایس پی صاحب سے اکیلے میں کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“
 اشارہ بہت واضح تھا، سراج مسکرا دیا پھر اس نے اگلی نشست پر بیٹھنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی نہیں کیا، شیخ حامد نے ڈرائیور سیٹ سنبھال لی۔
 گاڑی اسپتال کے کپاؤنڈ سے نکل کر ساحلی علاقے کی طرف موڑ دی گئی۔ سراج نے گفتگو کی ابتدا نہیں کی۔ دس منٹ تک مکمل خاموشی رہی پھر شیخ حامد نے بڑی سنجیدگی سے پہل کی۔
 ”مسٹر سراج۔۔۔۔۔ آپ کو شاید علم ہوگا کہ آپ کے ڈی آئی جی کرائمر نے ذاتی بنیادوں پر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے؟“
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔ یہ بھی خبر کرم ہے کہ اس کرسی پر ایس پی آغا منظور کی تعیناتی کی سفارش کی گئی ہے۔“
 ”سفارش والی بات آپ نے غلط نہیں سنی۔۔۔۔۔“ شیخ حامد نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ”یہ بھی بتا دوں کہ سفارش میں نے ہی کی ہے۔ دو روز کے اندر آرڈر بھی آ جائیں گے۔“
 ”فائن۔۔۔۔۔“ سراج نے خوشی کا اظہار کیا اس وقت بھی اس کے ذہن میں ”سب میرین“ کی اہمیت والی بات گونج رہی تھی۔
 ”میں تاج محل ہوٹل والے معاملے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔ اصل صورت حال اگر اخباری نمائندوں کے ہاتھ لگ جاتی تو۔۔۔۔۔“
 ”مجھے اس بات کا احساس تھا۔“ سراج نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”ایک لاکھ کی رقم ابھی تک مجھ پر قرض ہے۔“
 ”فارگیٹ دیٹ۔۔۔۔۔“ شیخ حامد مسکرا کر بولا۔ ”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ دوستوں کا اس دل میں ہوتا ہے لیکن کچھ باتیں ہیں جن کے بارے میں اب کل کر بات کرنا ضروری ہو گئی ہے۔“ آخری جملہ سنجیدگی سے ادا کیا گیا۔
 ”کیا آپ کا اشارہ سمجھ رہا ہوں۔“ سراج نے سنبھل کر سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر آپ کا اشارہ ذیشان ہوٹل والے آپریشن کی طرف ہے تو وہ میری مجبوری تھی۔۔۔۔۔ اس کی تمام تر پلاننگ ڈی

آئی جی کرائمر کی تھی۔۔۔۔۔“ اس نے بات جاری رکھی۔ ”اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ کو اس کی خبر بھی ضرور ہوگی ان دونوں نے زبان کھولنے کے بجائے موت کو ترجیح دی تھی۔۔۔۔۔ بعد میں ہمارا تعاقب کرنے والی سفید کار کو بھی مسٹر عظیم احمد کے حکم پر ہی ڈسپوز کیا گیا تھا۔“
 ”اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ کو اس کا علم بھی ضرور ہوگا؟“
 ”بنگالی پاڑے سے پولیس کو دو مطلوبہ مجرموں کی لاشیں ملی تھی۔“ سراج نے بے پروائی سے کہا۔
 ”ان کے بارے میں پولیس کو کہاں سے معلومات حاصل ہوئی تھیں؟“ شیخ حامد نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔
 ”آئی ڈونٹ نو۔۔۔۔۔“ سراج نے سپاٹ آواز میں کہا۔
 ”ان دونوں کو کس نے اور کیوں قتل کیا؟ فی الحال میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“
 ”کیا میں آپ کی بات پر یقین کر لوں۔۔۔۔۔؟“ اس بار شیخ حامد کے سوال میں چھین بہت واضح تھی۔
 ”ایزی یوش۔۔۔۔۔“ سراج نے مسکرا کر شیخ حامد کو مخاطب کیا۔ ”بحیثیت ایک پولیس آفیسر کے ہم دیدہ دانستہ قانون کی نظروں میں دھول بھی نہیں جھونک سکتے۔۔۔۔۔ تعاون ایک حد تک کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے آنکھ بند کر کے ایک دوسرے پر اعتماد کرنا بھی شرط ہے۔“
 شیخ حامد ایک ہل کو تھلا کر رہ گیا لیکن فوراً ہی اس نے کینچلی بدلنے میں دیر بھی نہیں کی۔
 ”میڈم روہی کے سلسلے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟ کیا وہ میرے مقابلے پر آنے کی حماقت کر سکتی ہے؟“
 ”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔۔۔“ سراج نے شانے اچکا کر کہا۔ ”میں ہر بات کا جواب دیتا پسند نہیں کرتا لیکن۔۔۔۔۔ فی الحال جو دھند طاری ہے اس کو جھٹکنے میں زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا۔“
 ”افضل خان کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ سراج نے میڈم کا موضوع بدل دیا۔ ”میری ذاتی رائے ہے کہ اسے اہم ذمے داری نہ سہی مگر ایک موقع تو ضرور دیا جاسکتا ہے۔“
 ”میں آپ کو ابھی تک دوست سمجھ رہا ہوں اس لیے آپ کی بات نہیں ٹالوں گا مگر ایک بات کھل کر واضح کر دوں۔۔۔۔۔ میں ڈبل کر اس کرنے والوں کو نظر انداز کرنے کا عادی نہیں ہوں۔۔۔۔۔ ان کو اپنے اشاروں پر چلانے کی ٹرکس (tricks) بھی جانتا ہوں۔“
 ”گلد۔۔۔۔۔“ سراج نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔
 ”کسی بھی انسان کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ موقع کی مناسبت سے اپنے کارڈز استعمال کرے۔“ وہ شیخ حامد کے جملے میں کھلی وارننگ کو بھانپ گیا تھا۔
 تقریباً آدھے گھنٹے تک شیخ حامد اور سراج کے درمیان اسی قسم کی ذومحلی گفتگو ہوتی رہی پھر سراج کو دوبارہ اسپتال ڈراپ کرنے کے بعد وہ گاڑی کا اسٹیرنگ ڈرائیور کے حوالے کر کے پچھلی

سیٹ پر چلا گیا..... سراج نے اس وقت بھی بڑی گرجبوشی سے مصافحہ کیا تھا، شیخ حامد کا انداز بھی دوستانہ تھا لیکن..... گاڑی اسپتال کے احاطے سے باہر نکلی تو اس کے چہرے کے تاثرات بھی تبدیل ہو گئے۔ نشست کی پشت سے سرٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں..... ذہن سراج کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کرنے کے سلسلے میں شیطانی انداز میں تانے بن رہا تھا۔

ڈاکٹر کے مشورے کے باوجود لیاقت حسین نے ہسپتال میں پڑے رہنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اسے وہاں ہر قسم کی سہولت حاصل تھی لیکن وہ آرام طلبی کا عادی نہیں تھا۔ نوشہرہ میں بھی کبھی جب وہ بیمار پڑتا تو ماں فوری طور پر ڈاکٹر کو طلب کرتی۔ ڈاکٹر سردار سرفراز خان کی بڑی حویلی کا نام سننے ہی دوڑے چلے آتے تھے۔ ماں اسے اپنے شفیق ہاتھوں سے دوا پلاتی تو وہ اکسیر ثابت ہوتی۔ مارے باندھے وہ کھٹے دو کھٹے بستر پر لیٹتا پھر اپنے کاموں میں جت جاتا اس کے تنگی ساتھی بھی یہی کہتے تھے کہ بیماری کو بستر پر لیٹ کر پالو گے تو وہ کمزوری کم کرنے کے بجائے جسم کو اور گھلا دے گی ہاتھ پاؤں حرکت میں رہیں تو بیماری خود پچھا چھڑا کر بھاگ جاتی ہے لوہے کی بھی یہی خاصیت ہوتی ہے وہ استعمال میں رہے تو اس کی کارکردگی متاثر نہیں ہوتی دھوپ اور پانی میں پڑا رہے تو زنگ آلودہ ہو جاتا ہے۔ ایک بار لوہے کو زنگ یا کسی ٹھٹھے پھل کو پھسوند گئے تو وہ اپنی اصلیت کھودیتا ہے۔ لیاقت حسین بھی اسی ماحول میں پل کر بڑا ہوا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی ساری باتیں ایک کان سے سنیں دوسرے سے اڑا دیں۔ وہ حرکت میں برکت کا قائل تھا۔

سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم اس کے ممنون احسان تھے انہوں نے بھی اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے تو لیاقت حسین کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔

سیٹھ عثمان نے جو نئی گاڑی خریدی تھی وہ پہلے والی کے مقابلے میں زیادہ قیمتی اور پاورفل تھی۔ اسی کمپنی کی لینڈ کروزر لیاقت حسین کے باپ کے پاس بھی تھی۔ اسپتال سے فارغ ہو کر وہ باہر آیا تو نئی چمچانی گاڑی دیکھ کر اسے بہت ساری بھولی بھری باتیں یاد آئیں ماں کا لاڈ پیار باپ کی شفقت کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کے خود ساختہ اصول جس کی وجہ سے اسے گھر چھوڑنا پڑا تھا اور فرحین کا خوبصورت اور محسوس سا چہرہ بھی جس نے لیاقت حسین کا ہاتھ تھام کر اس کی محبت کا مان رکھ لیا تھا وہ آخری جملے بھی اس کے کانوں میں گونجنے لگے جو ماں نے اسے نوشہرہ کو خیر باد کہتے ہوئے بڑے پیار سے کہے تھے۔

”خدا تم کو اور فرحین کو زندگی کی ڈھیر۔ آری خوشیاں نصیب کرے۔ ماں کی دعائیں بھی تمہارے ساتھ جاری ہیں کبھی خود کو تنہا نہ سمجھنا ماں کا سایہ ہر گھڑی ہر پل تم دونوں کے ساتھ رہے گا۔ رب سے میری دعا ہے کہ تم نئی زندگی کے سفر میں اتنی ترقی کرو کہ تمہارے پاس بھی خدا کی ہر نعمت موجود ہو کبھی تنگی اور ترشی تمہارے آڑے نہ آئے۔ پھولو پھلو آباد رہو۔“

یہ ماں کی دعاؤں کی انتیجہ تھا کہ کراچی آتے ہی اس کے دن پھر گئے۔ کچھ دن اس نے

قبرستان کے ساتھ بنے مکان میں گزارے تھے۔ وہاں اسے کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔ گل خان اور راحیلہ نے اسے یا فرحین کو اپنے آبائی شہر سے دور ہونے کا احساس کبھی نہیں ہونے دیا تھا لیکن ایک بدکار سفلی کا عمل کرنے والا ضرور ان کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا تھا۔

اسپتال سے باہر نکل کر وہ نئی گاڑی کے پاس آ کر رک گیا اس نے بڑے پیار سے گاڑی کو دیکھا سیٹھ عثمان کو مبارکباد دی پھر اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا تو سیٹھ عثمان نے اسے آرام کی خاطر روکنا چاہا لیکن راحیلہ بیگم نے ان کا ہاتھ تھام لیا انہیں لیاقت حسین کے چہرے پر دکتی خوشی کا احساس تھا۔ اسے گاڑی چلانے سے روکا جاتا تو شاید اسے دکھ ہوتا۔

لیاقت حسین نے انکیشن میں لگی چابی کھائی تو نئی کار یکدم ہی اسٹاپ ہو گئی اس کا دل مسرت سے جھوم اٹھا۔ نوشہرہ میں جب وہ باپ کو ایسی طاقت ور اور قیمتی گاڑی چلاتے دیکھتا تھا تو اس کے دل میں بھی ارمان بچل جاتے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کبھی باپ کی طاقتور اور منہ زور گاڑی کو اپنی مہارت سے زیر کرے لیکن اس کی حسرت کبھی پوری نہ ہو سکی۔ آج ماں کی دعاؤں سے وہ ارمان بھی پورے ہو رہے تھے۔ وہ بڑی احتیاط سے جانے پہچانے راستوں سے گزرتا رہا فرحین اس کے ساتھ ہوتی تو وہ بھی خوش ہو جاتی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ شاید فرحین کو بھی کسی نہ کسی طرح اس کے اس کے حادثے کی اطلاع مل چکی ہوگی۔ وہ بھی ادھر بے چین ہوگی۔ ماں کے دل سے بھی اولاد کے حق میں دعاؤں کا سلسلہ جاری ہو گیا ہوگا اور اب..... اب جب اسے لیاقت کے تندرست ہونے کی اطلاع ملے گی تو وہ سب سے پہلے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر دو رکعت شکرانے کی ضرور پڑھے گی۔ فرحین کے دل کی بے چین دھڑکنوں کو بھی قرار مل جائے گا۔

”کیا سوچ رہے ہو لیاقت حسین؟“ راحیلہ بیگم نے جو اپنی دور بین نظروں سے لیاقت حسین کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں چپ نہ رہ سکیں۔ ”کیا گھر والے یاد آ رہے ہیں؟“

”ہاں.....“ لیاقت حسین نے دبی زبان میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ”سوچ رہا ہوں کہ اب فرحین کو واپس بلا لوں۔ اسے کسی نہ کسی ذریعے سے میری بیماری کی اطلاع مل گئی ہوگی..... وہ..... وہ بھی بے چین ہوگی۔“

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔ ”تمہارے گھر پاس پڑوس میں کوئی نہ کوئی فون تو ضرور ہوگا۔ تم نمبر بتا دو۔ میں ابھی گھر چلتے ہی تمہاری صحت تو وہ طول سا ہو گیا۔ بات بتا کر بولا۔“

”مجھے ایسا کوئی نمبر یاد نہیں ہے ورنہ ضرور بتا دیتا۔“

”فکر مت کرو..... گھر پہنچتے ہی خط لکھ کر پوسٹ کر دو۔“ راحیلہ بیگم نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو گہری نظروں سے دیکھ کر بڑی فراخ دلی سے کہا۔

”تم جاؤ تو فرحین کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کو بھی بلا لو۔ وہ بھی خوش ہوں گے۔“

”یہ بھی لکھ دوں گا۔“ لیاقت حسین نے دل مسوس کر جواب دیا۔ اس کی دلی تمنا بھی تھی کہ ماں کچھ دنوں کو آئے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ اس کی دعاؤں نے اس کے لیاقت حسین کو کس طرح نوازا ہے لیکن..... وہ جانتا تھا کہ ماں اپنے سہاگ کو ناراض نہیں کرے گی اور سردار سرفراز خان بھی اپنی اونچی پگ بچتی نہیں ہونے دے گا۔ اس کے علاوہ وہ سیٹھ عثمان پر اپنے والد کی حیثیت بھی نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

لیاقت حسین نے گاڑی سیٹھ عثمان کے خوبصورت بنگلے کے سامنے روکی تو راحیلہ بیگم نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔ ”یہ تم نے گاڑی کہاں روک دی؟“ لیاقت حسین ایک ہل کے لیے گھبرا سا گیا پھر اس نے کسی خیال سے پوچھا۔ ”کیا آپ لوگوں نے گھر بھی بدل دیا ہے؟“ ”نہیں.....“ راحیلہ بیگم نے اچانکیت سے جواب دیا۔ ”آج ہم نے تمہاری انیکسی کا افتتاح کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔“

لیاقت حسین نے برابر کے بنگلے پر نظر ڈالی تو بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ سیٹھ عثمان کا پرانا اور قابل اعتماد گاڑی بنگلے کے گیٹ کے سامنے موجود تھا۔ لیاقت حسین نے گاڑی کا رخ نئے بنگلے کی طرف کیا تو گاڑی نے بڑی مستعدی سے پھاٹک کھول دیا۔ راحیلہ بیگم کے مطابق اس نے گاڑی بنگلے کی انیکسی کے سامنے لے جا کر روک دی۔ اسے بتایا جا چکا تھا کہ اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد اسے فرمین کے ساتھ وہیں قیام کرنا ہے۔ انیکسی کے دروازے پر دیکھ کر لیاقت کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے ڈبڈبائے لگیں۔

گاڑی سے اتر کر وہ سیٹھ عثمان کے ساتھ اس خوبصورت انیکسی میں داخل ہوا جو دو کمروں پر مشتمل ایک مختصر لاؤنج کے علاوہ کچن، باتھ روم وغیرہ بھی بنگلے کی شان سے مطابقت رکھتے تھے۔ انیکسی کے باہر دو اطراف پھولوں کی کیاری تھی جس کو دیکھ کر فرمین کا دل یقیناً بارغ باغ ہو جاتا۔

پہلے کمرے میں قدم رکھتے ہی لیاقت حسین کھڑکی اور دروازوں پر پڑے خوبصورت پردوں کو دیکھ کر چونکا۔ سامنے ایک سنگل بیڈ کا اہتمام بھی تھا۔ دوسرے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اسے اپنا ساز و سامان بھی نظر آ گیا جو گل خان کے ساتھ والے گھر میں تھا۔ اس کمرے میں کھڑکیوں اور دروازوں پر بھی میچنگ کالر کے پردے نظر آ رہے تھے۔ کچن بھی صاف ستھرا تھا جہاں ایک چھوٹا فریج بھی تھا۔ باتھ روم بھی معیاری تھا۔ وہ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کے ساتھ خاموش تماشائی کی حیثیت سے ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا تھا۔

”فی الحال تم یہاں رہو گے..... فرمین آ جائے تو پھر اس کی پسند سے گھر بھی ڈیکوریٹ ہو جائے گا اور ضرورت کی باقی چیزیں بھی آ جائیں گی۔“ ”بیگم صاحب.....“ لیاقت حسین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”آپ کے احسانات نے مجھے خرید لیا ہے۔“

”مجھے گناہ گار مت کرو.....“ راحیلہ بیگم نے خلوص دل سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ ”میں خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ تمہیں ہم غیر نہیں بلکہ گھر کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے نہیں بلکہ تمہاری بے لوث محبت اور قربانیوں نے ہمیں خرید لیا ہے۔“ ”میرا خیال ہے کہ اس وقت جذباتی باتیں کرنے کے بجائے تم آرام کرو۔“ سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو مخاطب کیا۔

اسپتال سے تو تم آ گئے ہو لیکن اب میرے اور بیگم صاحب کے کہنے سے تمہیں چوبیس گھنٹے تک مکمل آرام کرنا ہو گا۔“ ”ٹھیک ہے صاحب.....“ لیاقت حسین نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”بھوک پیاس لگے تو کچھ سامان فریج میں رکھا ہے..... کچن کا کام فرمین آنے کے بعد سنبھال لے گی۔ اس کے آنے تک تم حسب معمول کھانا اور ناشتہ اسی طرح سے ہمارے گھر میں کھاتے رہو گے۔“

”جیسا آپ کا حکم.....“ لیاقت حسین نے ممنونیت سے جواب دیا۔ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کے جانے کے بعد بھی لیاقت حسین اپنی قسمت پر رشک کرتا رہا پھر نہا دھو کر تازہ دم ہونے کے بعد اس نے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر کرسی پر بیٹھ کر غرض سے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ماں اور فرمین کا چہرہ بار بار ابھر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرمین واپس آ کر اس نئے گھر کو دیکھے تو خوشی سے ناچ اٹھے گی۔ گھر تبدیل کرنے کا فیصلہ لیاقت حسین نے فرمین کے جانے کے بعد ہی کر لیا تھا۔ گل خان سے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن قسمت کسی بنگلے کی خوبصورت انیکسی اس کی جھولی میں ڈال دے گی۔ اس کا تصور اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد اس کے ذہن میں سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کی وہ باتیں گونجنے لگیں جو انہوں نے پرانی گاڑی کے ایکسیڈنٹ کے بارے میں کی تھیں۔ ڈاکٹر نے اس سے کچھ اور کہا تھا۔ ”تم خوش قسمت ہو جو تمہاری کوئی نیکی کام آگئی ورنہ..... تمہاری گاڑی کا جو ششستر ہوا اس کے بعد تمہارا راج جانا بھی کسی مجرے سے کم نہیں۔“ ڈاکٹر نے کئی مواقع پر اسے حادثے کی سنگین نوعیت کے بارے میں تھوڑا تھوڑا کر کے سب کچھ بتا دیا تھا لیکن لیاقت حسین کو ذہن پر بار بار زور دینے کے باوجود اس اندوہناک حادثے کے بارے میں کوئی بات یاد نہیں آ سکتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اسی بات پر غور کرتے کرتے غنودگی کی کیفیت سے دو چار ہوا تو کہیں دور سے ایک مانوس آواز اس کے وجود کے سنائے میں گونجنے لگی۔

”انسان بڑا خود غرض اور ارجان فراموش ہوتا ہے۔ پہلے شیطان کے ورغلانے پر صراط مستقیم سے ہٹک جاتا ہے۔ جھوٹی مسرتوں کے فریب میں مبتلا ہو کر اس خداوند قدوس کو یکسر فراموش کر دیتا ہے جس نے اسے زندگی جیسی انمول نعمت عطا کی۔ چند روز زندگی کی پرفریب مسرتوں میں مبتلا ہو کر وہ

یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اسے ایک عارضی مسافر خانے میں کسی آزمائش کے لیے وقتی قیام کے لیے روح جیسی پاکیزہ دولت سے مالا مال کیا گیا تھا، عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر وہ خدا اور اس کے محبوب کے سارے احکامات کو فراموش کر دیتا ہے۔ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ اس کی رسی دراز ہوتی رہتی ہے پھر..... جب اسے کوئی جھٹکا لگتا ہے کوئی برا وقت اس کے جھوٹے خوابوں کی تکمیل کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے تو وہ پھر خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ گزرا کر معافی طلب کرتا ہے۔ جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو وہ دونوں جہانوں کے مالک سے کیے گئے تمام وعدے تمام تمسین فراموش کر کے پھر سے شیطان کا چیلہ بن کر لہو و لعب میں غرق ہو جاتا ہے۔

لیاقت حسین اس آواز کو سن رہا۔

انسان خدا کی فیاضی پر کبھی صدق دل سے غور نہیں کرتا، اس کی مقدس کتاب میں لکھی روشن باتوں پر توجہ نہیں دیتا۔ یہ بھی نہیں سوچتا کہ وہ کسی نیکی کا تصور بھی کرتا ہے تو اسے اس کے نیک عمل میں شمار کر لیا جاتا ہے۔ اگر وہ نیکی کے ارادے کو عملی طور پر پورا کر دے تو حدیث کے مطابق اس کے اعمال تارے میں دس اور کبھی کبھی سات سو سے بھی زیادہ نیکیاں رقم کر دی جاتی ہیں..... اور..... جب خاکی انسان کسی گناہ کا ارادہ کرے اور جب تک اس پر عمل نہ کر لے پھر بھی اس کے اعمال تارے میں صرف ایک ہی گناہ درج ہوتا ہے، مگر انسان کبھی یہ بھی غور نہیں کرتا کہ روز حساب کہیں دس اور سات سو کے مقابلے میں ایک ایک گناہ مل کر دس اور سات سو پر سبقت نہ لے جائیں۔

”میری بات دھیان سے سنو لیاقت حسین.....“ کچھ توقف کے بعد وہی آواز پھر ابھری۔ ”ابلیس نے بھی ناری ہونے کے گھمنڈ میں آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو ملعون قرار پایا..... اس دنیا میں جہاں تم سانس لے رہے ہو۔ ایک نہیں ہزاروں اور لاکھوں ابلیس موجود ہیں جو ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں..... شیخ حامد بھی کسی ابلیس سے کم نہیں..... غرور اور تکبر نے اس کے لیے توبہ کے دروازے بھی بند کر دیے ہیں۔ وہ تمہارے محسن سیٹھ عثمان اس کے ایماندار دوست ڈی ایس پی سراج کو بھی نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ میڈم روبی کو بھی وہ اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے مضطرب ہے۔ کچھ اور بھی ہیں جو اس انسانی ابلیس کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تمہیں خدا کے ایک برگزیدہ بندے نے اپنے رب ہی کی مرضی سے ایک روحانی طاقت سے نواز دیا تھا۔ وہ تاجدار ریش دراز بھی اسی خدا کا ایک فرستادہ تھا جس نے درمیان کی تمام رکاوٹوں کو ایک اشارے سے دور کر کے تمہیں اس مجذوب تک پہنچانے میں مدد کی تھی پھر..... تم خدا کی کس کس نعمت کو ٹھکراؤ گے۔ کس طرح منہ پھیر سکو گے؟..... خود اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھو خدا کے کرم اور ماں کی دعاؤں نے ہی تمہیں عزت بخش دی ہے۔ تم اس مالک دو جہاں کے احسانوں کا شکر ادا کر چاہو بھی تو ادا نہیں کر سکتے لیکن جو کچھ تمہیں عطا کیا گیا اس کے ذریعے تم کچھ لوگوں کو شیخ حامد جیسے ملعون ابلیس کے عتاب سے ضرور بچا سکتے ہو۔ اس نیک کام میں اس رب کریم کی رحمتیں بھی قدم قدم پر ساتھ دیں گی۔ یہی نیکیاں روز قیامت تمہیں دوزخ کے عذاب سے نجات دلائیں گی۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟“ لیاقت حسین نے غنودگی کی کیفیت میں دریافت کیا۔
”صرف ایک نیت..... جس میں کوئی کھوٹ کوئی ریاکاری شامل نہ ہو۔ باقی مشکل وہ آسان کر دے گا جو سب کا نجات دہندہ ہے۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں.....؟“

”عہد۔ کسی مظلوم کو کسی ظالم کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کا عہد۔ سچے دل سے پھر اس پر عمل کرتے وقت صرف اس قادر مطلق کو یاد رکھنا جو زندگی اور موت پر قادر ہے لیکن..... ابھی تمہارے لیے کبھی ایک آخری امتحان باقی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”گندے عمل کرنے والے کافر پر تاب گھوشن کے کہے ہوئے آخری جملوں کو کبھی فراموش نہ کرنا۔ وہ پتیرے بدل بدل کر تمہارے قدم کو ڈمگانے کی خاطر کئی حسین جال بن رہا ہے..... ان کا خیال رکھنا ورنہ.....“

”ورنہ کیا ہوگا.....؟“ لیاقت حسین کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی لیکن کوئی آواز نہیں ابھری۔

”جو کچھ میرے بس میں تھا میں نے تمہارے کانوں میں ٹپکا دیا..... اس سے آگے مجھے زبان کھولنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔“

لیاقت حسین گہری نیند سے ایسے ہڑبڑا کر اٹھا جیسے کی کاری ضرب نے اسے پیدا کر دیا ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھتا رہا..... بستر سے اتر کر اس نے پوری انیکسی کا ایک ایک کونا چھان مارا لیکن وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا..... وہ ایسا کیوں کر رہا تھا یہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔ سوکھے حلق کو تر کرنے کی خاطر اس نے فرج سے بوتل نکال کر ایک گلاس پانی پیا پھر مشینی انداز میں دوبارہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ وہ اس آواز کو پہلے بھی کہیں سن چکا ہے..... کہاں؟ اسے کوشش کے باوجود یاد نہ آ سکا پھر وہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا۔



تھریا نے شبنم کو بڑی گرجوٹی سے خوش آمدید کہا پھر دوسرے ہی لمحے ایک خیال نے اسے مختاپ کر دیا۔ حالات نے کھل کر مقابلے کی جو صورت اختیار کر لی تھی اس کا اندازہ شاید شیخ حامد کو بھی ہو گیا تھا۔ دوستی اور دشمنی میں ہر حربہ استعمال ہوتا ہے۔ جیت اسی کی ہوتی ہے جو زیادہ دوراندیشی سے اپنے دشمن پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے۔

شبنم بہت دنوں بعد آئی تھی۔ وہ شیخ کے دفتر میں کام کرتی تھی، ناممکن نہیں تھا کہ شیخ اسے بھی کسی طرح اپنے جال میں پھانس کر میڈم کے خلاف کرنے کی پلاننگ پر غور کر چکا ہو۔ اس فوری خیال نے تھریا کو ڈپلومیسی اختیار کر دینے پر آمادہ کیا، اس نے شبنم کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد دوستانہ انداز میں کہا۔

”کہاں غائب رہیں اتنے دنوں؟ میڈم بڑی شدت سے تمہاری منتظر تھیں۔“ تھریا نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی خاطر سنجیدگی سے کہا۔ ”تاج محل ہوٹل میں ہونے والی گھناؤنی سازش میں اگر خطرناک مگر کچھ کا داؤ کا میاب ہو جاتا تو.....“

”یہ تمہاری ذاتی رائے ہے“ بگ باس کا اس معاملے سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ”شبم نے کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پر تھریا کی طرف بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”جو کچھ بھی ہوا اس میں صرف اور صرف افضل خان کی ذاتی بد معاشی کا عمل دخل تھا جس کا خمیازہ وہ ابھی تک بھگت رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ باس اس کے لیے بھی کوئی انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور ہو جائے۔“

شبم کی بات سن کر تھریا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ تیز نظروں سے شبم کو گھور رہی تھی۔ شبم نے زبان کھولنے کے بجائے اس کاغذ کی طرف اشارہ کیا جسے ابھی تک تھریا نے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ شبم کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نے بھی تھریا کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے شبم کا اشارہ پا کر بے تکلفی سے کہا۔

”میڈم شاید باتھ لے رہی ہیں۔ میں ابھی جا کر انہیں تمہاری آمد کی اطلاع دیتی ہوں۔“ تھریا اٹھتے ہوئے بولی۔

”مجھے یقین ہے کہ میڈم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“

تھریا اٹھ کر اندر چلی گئی، میڈم اپنے کمرے میں ہی تھی۔ تھریا نے اسے شبم کے آمد کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ وہ کاغذ بھی تھما دیا جس پر ایک خاص پیغام درج تھا۔ میڈم نے شبم کی آمد پر یکدم اٹھ کر باہر جانے کی کوشش کی تھی۔ اسے شبم کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ وہ دونوں شیخ حامد سے انتقام لینے کی خاطر کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھیں۔ تھریا نے میڈم کو پہلے وہ تحریر پڑھنے کا مشورہ دیا جو شبم نے شیخ حامد کی طرفداری کرتے وقت اس کی طرف بڑھادی تھی۔ میڈم نے کاغذ کی تہ کھول کر اس پر درج تحریر پڑھنی شروع کی جو غامض سنسنی خیز تھی، لکھا تھا۔

”میڈم..... میں آپ سے کل کر کوئی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ صرف اتنا عرض کروں گی کہ اس خطرناک مگر کچھ نے مجھے بھی پوری طرح قابو کر لیا ہے۔ کچھ ایسی تصاویر میرے اپارٹمنٹ کے پس منظر میں اتار لیں جو اگر منظر عام پر آگئیں تو میرے پاس سوائے خودکشی کے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوگا۔ وہ اب مجھے چارہ بنا کر آپ کو ٹریپ کرنے کے خواب دکھ رہا ہے۔ میں اس کے کسی حکم سے انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں ورنہ..... وہ تصویریں منظر عام پر بھی آ سکتی ہیں۔ آپ سے گفتگو کے دوران بھی مجھے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر اس خطرناک دشمن کی تعریف کرنی پڑے گی جو میرے والدین کی دردناک موت کا ذمے دار ہے۔ میں صرف آپ کے تعاون ہی سے اس کے ناپاک وجود کو ختم کر سکتی ہوں۔ آپ کو جو خاص بات کرنی ہو وہ لکھ کر کریں۔ اس آڑے وقت میں مجھے صرف آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو شاید مجھے خودکشی کے علاوہ اور کوئی راستہ میسر نہیں آئے گا..... بد نصیب شبم۔“

میڈم نے اس تحریر کو دوبارہ بہت غور سے دیکھا پھر اس نے تھریا کی طرف نظر اٹھا کر سوال کیا۔

”تمہارا اس تحریر کے بارے میں کیا خیال ہے.....؟“

”دفنی..... دفنی.....“ تھریا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہمیں تصویر کے دونوں رخ دیکھنے ہوں گے۔ ہم جلد بازی میں کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”لیکن میرا دل کہتا ہے کہ شبم کی تحریر اس کی بے بسی کی ترجمان ہے۔“ میڈم نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کی مرحوم ماں سے میں پیرس میں مل چکی ہوں۔ وہ ٹاپ ماڈل ہونے کے باوجود گھٹن کا شکار تھی۔ شبم کا مستقبل بنانے اور اسے شیخ حامد جیسے ذلیل انسان کی نظروں سے دور رکھنے کی خاطر مرحومہ نے بڑی قربانیاں دی تھیں پھر اس نے اپنی بیٹی ہی کی بھلائی کے پیش نظر خودکشی سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ میرا دل کہتا ہے کہ کم از کم شبم جو اپنی زبان سے مجھے اپنی دکھ بھری اذیت ناک کہانی سنا چکی ہے۔ کم از کم میرے ساتھ ڈیل کر اس کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔“

”میں نے صرف اپنی رائے دی تھی۔“ تھریا نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ”آخری فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے۔“

میڈم ایک لمحے تک کچھ سوچتی رہی پھر کسمسا کر بولی۔

”ایک چھوٹا سا چانس لے کر دیکھتے ہیں۔ اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں ہوگا اور اصلیت بھی کھل کر سامنے آ جائے گی۔“

”ایز یولائیک.....“

”تم چل کر شبم کے پاس بیٹھو، میں چنچ کر کے آتی ہوں۔“

تھریا کے جانے کے بعد میڈم نے بھی ایک کاغذ پر شبم کے جواب میں کچھ لکھا پھر وہ دس منٹ بعد اس طرح لباس تبدیل کر کے اور بال بنا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی جیسے سچ بجھتا ہے لینے کے بعد آئی ہو۔

شبم اور میڈم دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑی محبت سے بغل گیر ہوئیں۔ تھریا ناشتے کا اہتمام کرنے اندر چلی گئی۔ ”کہاں رہیں اتنے دنوں.....“ میڈم نے دیدہ و دانستہ شکوہ کیا۔

”دفتری مصروفیات کے علاوہ کچھ ذاتی کاموں میں بھی ابھی رہی۔“

”افضل خان کے بارے میں جو سنا جا رہا ہے وہ کہاں تک درست ہے؟“ میڈم نے یک لخت سنجیدگی سے سوال کیا۔

”سوری میڈم.....“ شبم نے بڑی خوبصورتی سے اپنا رول ادا کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو ہماری ذات تک ہی محدود رہے تو مجھے خوش بھی ہوگی۔“

”آئی سی.....“ میڈم نے طنز کیا۔ ”شیخ حامد کے سحر نے شاید تمہیں بھی اپنے.....“

”میڈم..... پلیز!“

”یہ آپ کا ذاتی خیال ہے.....“ شبنم نے پہلو بدل کر کہا۔ ”ویسے کوشش کر لینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ قسمت آزمانے میں تھوڑا رسک ہے لیکن اگر کام بن گیا تو پھر شہنائی بھی بج سکتی ہے۔“

شبنم سے گفتگو کے دوران میڈم نے اپنا تحریر شدہ پرچہ تقریباً کی طرف بڑھا دیا تھا۔ وہ اس تحریر میں درج پروگرام کو غور سے پڑھتی رہی تمام زاویوں سے غور کرتی رہی پھر وہ سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر اپنی تائید کا ووٹ دیتے ہوئی بولی۔ اس کا خطاب میڈم سے تھا۔

”میں شبنم کی مخلصانہ رائے اور آپ کی خاموش نیم رضامندی دونوں پر مسرت ہی کا اظہار کروں گی۔“

ہلکے پھلکے ناشتے کے دوران ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پھر شبنم کے جانے کے بعد میڈم نے اس کی اور اپنی تحریروں کو نذر آتش کر کے اس کی راکھ بھی داش بین میں بہا دی۔ اپنی خواب گاہ میں آنے کے بعد اس نے تقریباً کونجیدگی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں اب افضل خان کے اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد اس پر بھی نظر رکھنی ہو گی۔ شبنم کی طرح شاید وہ بھی اس بڑے مگرچھ کے جوہر میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔“

”لیکن آپ کے سلسلے میں اس نے جو سازش کی تھی وہ اس قابل نہیں ہے کہ اب اس کے بارے میں.....“

”وہ اس کی مجبوری تھی.....“ میڈم نے سرد اور خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”اس کی پلاننگ میں بھی کسی اور کا ہاتھ تھا۔ یہ بھی نہ بھولو کہ محبت اور جنگ میں کسی بھی ہتھیار کے استعمال کو ناجائز نہیں سمجھا جاتا۔ ہر گولی پر کسی نہ کسی کی موت کا پیغام درج ہوتا ہے۔ گولی داغنے کے بعد اس کے خول کو ٹھوکر مار کر راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ وہ کسی کام کا بھی نہیں رہتا.....“

”یو آر رائٹ میڈم.....“ تقریباً اس کی دورانہنسی کو سراہتے ہوئے جواب دیا۔ میڈم نے خاموشی اختیار رکھی اس کی نظریں خلا میں کسی ممکنہ کامیابی کی تلاش میں اپنے ٹارگٹ پر مرکوز تھیں۔

چہرے کی رنگت میں معمولی تبدیلی ڈاڑھی اور مونچھوں کے اضافے کے بعد وہ کوئی ترقی یا بھونٹانی باشندہ ہی نظر آ رہا تھا، سر بھی عجیب وضع قطع کی گول میلی کچلی ٹوپی نے اس کی ہیئت بالکل تبدیل کر دی تھی۔ پتہ قد ہونے کے باوجود وہ ٹھوس اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ کمرے میں وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کھڑے ناک و نقشے کا ایک دراز قد شخص اور بھی تھا جس نے لمبیا کلر کی شلوار کھینچ پہن رکھی تھی اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا اس کے ہاتھ غیر مضبوط رسیوں سے کرسی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، عمر پینتیس چھتیس سال کے لگ بھگ نظر آ رہی تھی۔ پہلی نظر میں دیکھ کر یہی تاثر ملتا تھا کہ وہ دوراتوں سے ایک ہل بھی سونہیں سکا..... ڈاڑھی والا..... اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”زندگی پیاری ہے تو اس کا نام زبان سے اگل دو جس نے تمہیں گرے کلر کی کار کو روند ڈالنے

”اوکے.....“ میڈم نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر تمہیں برا لگتا ہے تو میں تمہارے بگ باس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی۔“

”شکریہ.....“

”ایک ذاتی سوال کر سکتی ہوں.....؟“

”پوچھئے.....“

”تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی.....؟“

”اپنے منہ سے تو کسی سے نہیں کہہ سکتی۔“ شبنم نے جان بوجھ کر شوفی سے جواب دیا۔ ”اگر آپ کی نظر میں کوئی مناسب رشتہ ہو تو ضرور بتائیے گا۔“

”تمہارے لیے ایک نہیں ہزاروں رشتے مل سکتے ہیں مگر..... ایک شرط پر.....“

”وہ کیا.....؟“

”تم میرے پاس رہو..... ایک دوست، ایک عزیز سہیلی کی حیثیت سے..... تو مجھے خوشی ہو گی۔ میری تنہائی بھی دور ہو جائے گی، تمہیں رہنے کھانے پینے کے علاوہ کسی قسم کی بھی فکر نہ ہوگی۔“

”تنخواہ کتنی ملے گی؟“ شبنم نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔ خود اپنی عریاں تصاویر دیکھ لینے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ شیخ حامد ہر لمحہ چوکنا رہتا ہے اپنی شیطانی کھوپڑی میں ہر وقت کوئی نہ کوئی خطرناک پلان مرتب کرتا رہتا تھا۔ اپنے کارندوں سے کسی وقت غافل نہیں رہتا۔ کسی نہ کسی طور پر ہر شخص کی رپورٹ اسے اپنے ان خفیہ آدمیوں سے ملتی رہتی ہے جن پر وہ بے دریغ دولت خرچ کرتا تھا، ہو سکتا تھا کہ اس وقت کسی خفیہ سیکریٹ ڈیوائس کے ذریعے وہ اس کے اور میڈم کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن رہا ہو۔ اس نے شبنم کو ایک خاص براؤز کا موبائل دیتے وقت یہ ہدایت بھی خاص طور پر کی تھی کہ وہ سوتے جاگتے، کسی..... وقت بھی خود سے دور نہ کرے۔ ممکن ہے اس میں کچھ ایسی خوبیاں بھی ہو جو صرف اسی کے علم میں ہوں۔ اس لیے محتاط رہنا ضروری تھا۔

”جتنی تم اپنے منہ سے طلب کرو گی..... اس سے دو گنی۔“

”آفر بری نہیں ہے..... آرام سے سوچ کر جواب دوں گی۔“

تقریباً ناشتے کی ٹرے کے ساتھ داخل ہوئی تو وہ بھی حسب معمول ہنسنے بولنے میں مصروف ہو گئی۔ اس دوران میڈم نے جو تحریر شبنم کے جواب میں لکھی تھی وہ بھی شبنم نے وقفے وقفے سے پڑھ لی۔ میڈم نے جو پلاننگ کی تھی وہ قابل عمل ضرور تھی لیکن بڑے مگرچھ کو اس سازش کا شبہ بھی ہو جاتا تو وہ شبنم کے حق میں بھی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ شبنم نے میڈم کے لکھے ہوئے کاغذ کو اسے واپس کرتے ہوئے بڑے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”آپ نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے.....؟“

”اس عمر میں..... ایک بیوہ سے کون اپنی قسمت پھوٹنے پر تیار ہو گا۔“ میڈم نے بے اختیار ہنس کر کہا۔ ویسے وہ شبنم کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

لیکن..... اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اس کے چہرے پر ایک زبردست مکا لگا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ سیاہ فام ہاشم کے ساتھ ہی ایک دوسرا شخص بھی کمرے میں داخل ہوا تھا جس نے لوچن کے سنہلے سے پہلے دروازے کو اندر سے بولٹ کرنے کے بعد اس پر سائلنسر لگا آٹومیک پستول تان لیا۔ پھر بڑے سفاک لہجے میں وارننگ بھی دی گئی۔

”کوئی آواز نکالی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔ ہاتھ اوپر اٹھا لو.....“

لوچن کے پاس فوری طور پر حکم کی تعمیل میں ہاتھ اٹھانے کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ہاشم کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ لوچن کو صورت حال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ مخالف گروپ نے پہلے ہاشم کو قابو کیا ہو گا اور اب اسی کے ذریعے وہاں تک بھی آگئے تھے جہاں لوچن اس ڈرائیور کی زبان کھلوانے کی کوشش کر رہا تھا جس نے لیاقت حسین کی گاڑی کو عقب سے نگر مار کر بجائیں ہزار کھرے کیے تھے۔

”تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے ہاشم سے شکوہ کیا۔

”ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے میرے دوست اور..... ماں کے بغیر ایک بھنگا بھی پیدا نہیں کیا جاسکتا۔“ ہاشم نے بڑی رازداری سے داہنی آنکھ جھپکا کر جواب دیا۔ ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”تم..... تم کبواس کر رہے ہو.....“ لوچن نے تمللا کر جواب دیا۔ ”اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مروانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”شٹ اپ.....!“ آٹومیک پستول والے نے غزا کر کہا پھر لوچن سے بولا۔ ”اس شخص کی رسی کھول دو جسے تم مارنے کا خواب دیکھ رہے تھے ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ اس کو اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم جتنا یہ بتا چکا ہے۔“

لوچن نے ایک بار پھر ہاشم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا پھر وہ جھلا کر کرسی پر بندھے ہوئے آدمی کی رسیاں کھولنے لگا۔ ہاشم کے علاوہ آٹومیک پستول والا بھی پوری طرح محتاط تھا وہ لوچن کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہا تھا۔

رسیاں کھولتے وقت لوچن بار بار اپنے غصے کا اظہار کرتا رہا۔ اس کی نظریں رہ رہ کر ہاشم کی سمت اٹھ رہی تھیں جس نے کسی دشمن کو وہاں لانے کی حمایت کی تھی۔ باہر رات کی تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اسی اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر ہاشم کو بے بس کرنے والا اسے وہاں تک لے آیا تھا۔ لوچن نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی اس وقت رات کے سوا بارہ کا عمل تھا۔ باہر سڑکوں پر یقیناً ٹریفک کا بہاؤ بھی نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

”وقت مت ضائع کرو.....“ پستول والے نے لوچن کو دھمکی دی۔ ”کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو خود بھی ضائع ہو جاؤ گے۔“

لوچن نے ہونٹ چباتے ہوئے بڑی بے بسی سے پستول والے کو دیکھا پھر دوبارہ جلد بازی میں اس کا پاؤں رسی میں الجھا تھا توازن سنبھالنے کی خاطر اس نے الٹا ہاتھ فرش پر لٹکایا تھا پھر جیسے

کا حکم دیا تھا۔“

”شہباز گڈ ٹرانسپورٹ کے منیجر نے مجھے اس کام کے پچیس ہزار دیے تھے۔“ کرسی پر بندھے ہوئے شخص نے بیزاری کا اظہار کیا۔ ”یہ بات میں تمہیں پہلے بھی دو داری بتا چکا ہوں۔“

”صرف پچیس ہزار کی خاطر تم تین آدمیوں کو زندگی سے محروم کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے؟“

”ادھر پنڈ میں زمین کی آخری قسط ادا کرنے کی خاطر مجھے روپوں کی ضرورت تھی۔ اگر آخری قسط وقت پر ادا نہ کی جاتی تو اصل کے علاوہ سود بھی چڑھ جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ زمیندار کاغذوں میں ہیر پھیر کر کے ہمیں زمین سے بالکل ہی محروم کر دیتا۔“

”اور اس لیے تم نے کسی بے قصور کو محروم کرنے کی ٹھان لی تھی.....“ پستہ قد چھٹی شکل والے نے اس کی سوچی ہوئی آنکھوں میں جھانکا پھر ہاتھ میں دبے ریوٹ کا سرخ بن دیا تو لوہے کی کرسی میں کرنٹ دوڑنے لگا اس کی چھینیں پھر بلند ہونے لگیں..... ”زبان کھول دو شاید اس قابل رہو کہ اپا بھوں کی طرح سڑکوں پر بھیک مانگ سکو۔“

”تمہیں میری گل پر یقین نہیں آتا تو شہباز گڈ کے منیجر کو سامنے لے آؤ۔“ جھٹکے لگنے بند ہوئے تو کرسی پر پسینے میں شرابور شخص نے رو دینے والے انداز میں درخواست کی۔ ”وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ وہ انکاری ہو جائے تو پھلے تم مجھے مار بھی دیتا۔“

”سوری.....“ چھٹی صورت کے پستہ قد والے نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ”جب اس کی آنکھیں ہی نہیں رہیں تو وہ تمہاری آنکھوں میں کچھ بھی نہ ڈال سکے گا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”ہم نے اس گڈ کمپنی کو بھی دھماکے سے اڑا دیا ہے۔“ اس بار سفاکی سے جواب دیا گیا۔ ”ہو سکتا ہے تمہیں بھی روٹ بنا دیا جائے۔“

”نہیں.....“ کرسی سے بندھا ہوا شخص چیخ اٹھا۔ ”میں مر گیا تو میری کڑی کے ساتھ ایک معصوم بچہ بھی در بدر ہو جائے گا۔“

پستہ قد چھٹی شکل والا ایک لمحے تک اسے گھورتا رہا پھر اس کی انگلی سرخ بن کو پیش کرنے کے لیے حرکت میں آنے ہی والی تھی کہ دروازے سے پردسک دی گئی۔ پستہ قد شخص ریوٹ کو کرسی پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر اچانک ہی اضطراب کی کیفیت پھیل گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے باہر سے ابھرنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”میں ہاشم ہوں میرے عزیز..... ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ قیدی کے لیے اوپر سے ایک نیا حکم صادر ہوا ہے۔“

پستہ قد والے نے جو لوچن کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ جہاز میں اپنے ہم سفر سیاہ فام ہاشم کی آواز پہچان کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے دروازہ کھولنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا

بجلی سی کوئڈ گئی، لوچن کا ہاتھ زمین پر نکتے دیکھ کر ہی ہاشم نے ہاتھ بندھے ہونے کے سبب سیدی ٹانگ کا گھٹنا آٹوینک پستول والے کے نازک مقام پر مارا۔ اسی لمحے لوچن جو مارشل آرٹ کا ماہر تھا کسی پھر کی طرح زمین پر پکھڑاتا ہوا قریب آیا دونوں شانے زمین پر ٹکا کر اس نے ٹانگیں بلند کیں، قینچی بنا کر اس نے آٹوینک پستول والے کی گردن میں ٹانگیں پھنسا کیں پھر اس نے خود قلابازی کھائی تو آٹوینک پستول والا بھی اپنا توازن کھو بیٹھا، فضا میں اڑتے ہوتے دوسری جانب چاروں خانے چت گرا۔ اس کی گردن بدستور لوچن کے پیروں کے شکنجے میں تھی دشمن کے زمین پر گرتے ہی لوچن نے زمین پر لیٹ کر ایک جھٹکے سے کروٹ لی تو ”چٹ“ کی ہلکی سی آواز ابھری پھر دشمن کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کا آٹوینک پستول بہت پہلے ہی اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ یہ سب اس قدر آفاقیانہ ہوا کہ ہاشم بھی ایک لمحے کو دم بخود رہ گیا پھر اس نے بڑی مصصویت سے لوچن کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ مر گیا.....؟“

”ہاں.....“ لوچن کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھا۔

”تم..... اسے یہاں کیوں لائے تھے.....؟“

”یہ ثابت کرنے کے لیے ایک اور ایک ہمیشہ گیارہ ہوتے ہیں۔“ ہاشم بے پروائی سے مسکرایا۔ ”کیا تم میرے ہاتھ نہیں کھولو گے؟“

لوچن نے ہاشم کے ہاتھ کھولنے کے بعد کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا جو درہشت سے بری طرح سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ”اس کا کیا کرتا ہے.....؟“ اس نے ہاشم سے دریافت کیا۔

”یوگا سواما..... میرا مطلب ہے کہ..... گٹ رڈ آف ہم۔۔۔۔۔۔“ ہاشم نے مسکرا کر کہا۔

لوچن نے بجلی کی طرح جھپٹ کر کرسی پر موجود شخص کی گردن میں اٹے ہاتھ کا پھندا ڈال کر ایک جھٹکا دیا تو اس کی گردن بھی سینے پر جھول کر رہ گئی۔ لوچن نے پھر ہاشم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اب کیا پروگرام ہے.....؟“

”ہمیں فوری طور پر اپنے ٹھکانے ہی نہیں اپنے حلیے بھی بدلنے ہوں گے۔“ ہاشم نے سنجیدگی سے جواب دیا وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ موبائل کی گھنٹی کی آواز نے اسے چوٹکا دیا۔ اس نے جلدی سے لپک کر آٹوینک پستول والے کی جیب سے اپنا موبائل نکال کر کان سے لگاتے ہوئے آن کر دیا۔

”لائنگ فیلو اسپیکنگ!“ ہاشم نے کہا۔ ”ہم نے دو آدمیوں کو پارسل کر دیا ہے۔“

”کوڈ کے تبادلے کے بغیر آئندہ گفتگو کرنے سے پرہیز کرنا۔“ دوسری طرف سے نسوانی آواز ابھری۔ ”جس نے تمہارے اوپر ہاتھ ڈالا تھا وہ اگر زندہ بچ جاتا تو مناسب ہوتا لیکن نیو مائنٹ..... میں تمہاری کارکردگی پر خوش ہوں۔“

”آپ کو حالات کا علم.....“

”تمہاری حفاظت کے لیے ہم نے کچھ دوسرے کارندے بھی مقرر کر رکھے ہیں۔“

”اب کیا حکم ہے؟..... کیا ہمیں اپنی رہائش بدلی ہوگی؟“

”تم چاہو تو ہوٹل کے بجائے کچھ دنوں کے لیے کسی گیٹ ہاؤس میں منتقل ہو جاؤ۔ لوچن کا ہوٹل تبدیل کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”میں ایک سوال کرنا چاہوں گا.....“

”پوچھو.....؟“

”جس نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تھا اس کا تعلق کس گروپ سے تھا؟ ہاشم نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔ اس کی نگاہوں میں انتقادی شعلے بھڑک رہے تھے۔

”ڈونٹ وری..... ہو سکتا ہے تمہیں اپنے اگلے مشن میں اس گروپ کے لیڈر کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ کرنے کا موقع دیا جائے۔“

”دونوں ڈیڈ باڈیز کا کیا ڈسپوزل کرنا ہے؟“

”جہاں پڑی ہیں وہیں چھوڑ دو..... اس کا بندوبست دوسرے متعلقہ ورکرز کریں گے اور اینڈ آل۔“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ ہاشم نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے لوچن سے کہا۔

”میں اس شخص کو جان بوجھ کر یہاں تک لایا تھا۔“

”کیا مطلب.....؟“ لوچن چونکا۔ ”کوئی خاص وجہ.....؟“

”ہاں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا اور کون ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔“ ہاشم بے پروائی سے بولا پھر مرنے والے پر اپنی نظریں ڈال کر کہا۔ ”اس کا ٹکٹری پہلوان کے لیے میں اکیلا بھی بہت کافی تھا۔“

”تم جانو.....“ لوچن نے سپاٹ لیجے میں جواب دیا۔ ”کبھی کبھی زیادہ خود اعتمادی کسی بڑے خطرے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔“

”یو آر ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ..... ہاشم نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”خطروں سے کھیلنا ہی ہمارا پروفیشن ہے۔“

جواب میں لوچن نے ایک بار پھر ٹیٹوئی نظروں سے ہاشم کو دیکھا پھر انہوں نے اس جگہ سے نکلنے میں دیر نہیں لگائی جس کا انتخاب سیون اسٹارز نے کیا تھا۔



شبشم کے جانے کے بعد بھی تھریا اور میڈم روبی کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ جو باتیں شبشم نے کاغذ پر لکھ کر کی تھیں اس کے بارے میں تبادلہ خیال ہوتا رہا پھر تھریا نے اچانک بڑی سنجیدگی سے میڈم سے پوچھا۔

”شبشم کے بارے میں آپ نے کیا اندازہ لگایا ہے؟“

”گفتگو کے درمیان تم بھی موجود تھیں۔“ میڈم نے اس کا سوال سن کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”تم نے کیا رائے قائم کی ہے؟“

”بظاہر وہ اداکاری کرتی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن..... ہمیں ایک بات کے سلسلے میں سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا۔“ تھریا نے کسما کر کہا۔ ”اس بارے میں ہمارے درمیان کوئی دورائے نہیں ہو سکتیں کہ شبنم ہمارے دشمن شیخ حامد کے دفتر میں کام کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی کوئی کمزوری خطرناک مگر چھپے کے ہاتھ آگئی ہو اور وہ اسی کے اشارے پر.....“

”نہیں.....“ میڈم بات کاٹ کر بولی۔ ”شبنم ایسا نہیں کر سکتی۔“

”زیادہ خود اعتمادی ہمیشہ کارآمد نہیں ہوتی۔“ تھریا نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”افضل خان کے سلسلے میں آپ ایک تجربہ کر کے.....“

”پلیز تھریا۔“ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا پھر توقف سے بولی۔

”شبنم کی دکھ بھری کہانی تمہیں نہیں معلوم..... میں جانتی ہوں۔ میری طرح وہ بھی شیخ حامد سے اپنا کچھ حساب کتاب چمکا کرنے کی خاطر مجبوراً وہاں ملازمت کر رہی ہے۔“

”بہر حال.....“ تھریا نے پہلو بدل کر جواب دیا۔

”ہمیں آنکھ بند کر کے اس پر اعتماد کرنے سے گریز کرنا ہوگا۔“

میڈم کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کا موبائل منگٹانے لگا۔ اس نے موبائل کی طرف توجہ دی جس پر سراج کا نام نظر آ رہا تھا۔ کال ریسو کرنے میں میڈم نے خامی غلت کا مظاہرہ کیا۔

”خیریت تو ہے..... اس وقت آپ کو میری یاد کیسے آگئی؟“ اس نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔

”سوری.....!“ دوسری جانب سے بھی شوخی کا اظہار ہوا۔ ”آپ اس وقت اگر ڈسٹرپ ہوئی ہیں تو مجھے کوئی دوسرا وقت بتا دیں جسے میں آپ کو یاد کرنے کے لیے مخصوص کر لوں۔“

”میں مذاق کر رہی تھی۔“ میڈم نے کھل کر جواب دیا۔ ”آپ کے لیے میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔“

”شکریہ.....“ دوسری جانب سے سراج یلکھت سنجیدہ ہو گیا۔ ”مجھے آپ کو ایک اہم خبر دینی ہے..... شیخ حامد کو موجودہ ہنگاموں کی پشت پر آپ کا ہاتھ نظر آ رہا ہے۔“

”آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟“ میڈم نے محتاط انداز اختیار کیا۔

”سائل پر ہونے والے دھماکے کے بعد بھی میں نے آپ کو محتاط رہنے کی ایڈوائس کی تھی۔“

”پولیس والوں کا انداز کم از کم میرے ساتھ.....“

”غلط خیال ہے آپ کا.....“ سراج نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”پولیس کے انداز میں سوچتا تو اس وقت آپ کو فون نہ کرتا۔ میں نے آپ کو کچھ ذاتی رائے قائم کرنے کے بعد ہی فون کیا ہے۔ فی الحال اگر آپ کچھ دنوں کے لیے اپنی سرگرمیاں بند کر دیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”اس درائی ڈوگ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں ہی ہر بات کی ذمہ دار ہوں؟“

”کاش میں اس وقت آپ کے قریب ہوتا۔“ سراج کے لہجے میں شوخی اور شرارت کھل مل گئی۔

”کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”شاعروں کے ایک خیال کی تصدیق ہو جاتی.....“

”ادہ.....“ میڈم کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا، وہ سراک کا مفہوم سمجھ کر گھٹا ہو گئی، کچھ توقف سے بولی۔

”ایک بات یاد رکھیے گا۔ آپ کی ایک دکھتی رگ میری ہم جنس بھی ہے..... میں کسی رفاچی ادارے کی امداد کے بہانے سے الماس کو دعوت دے کر اسے اپنی سہیلی بھی بنا سکتی ہوں۔“

”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر ٹھنڈے دل سے عمل کیجیے۔“ سراج دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ نے یقیناً ناپ تول کرنے کے بعد کسی ٹیم کا انتخاب کیا ہو گا لیکن جو شبہ کیا جا رہا ہے اس کے جواز بھی موجود ہیں۔“

”میں سمجھی نہیں.....؟“

”افضل خان کو جو مشن سونپا گیا تھا اس کے ناکامی کے بعد اسے بھی راستے سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن بگ باس کو مایوسی ہوئی اب میری سفارش پر شاید اسے کچھ سانسیں ادھار مل جائیں۔“

”آپ کی سفارش پر.....“ میڈم چونکی۔ ”کیا آپ کو امید ہے کہ وہ ڈرنی ڈوگ کسی کی سفارش بھی سن سکتا ہے۔ خاص طور پر پولیس والوں کی۔“

”سارے پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے محترمہ۔“ سراج نے پھر شوخی سے کہا۔ ”الماس نے بھی شادی سے پہلے میری کھوپڑی کے بارے میں خامی چھان بین کرانے کے بعد ہی ہاں کی تھی۔“

”اوکے..... میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گی۔“ میڈم نے سنجیدگی سے کہا۔

”بہت بہت شکریہ اس نوازش کا۔“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

”مسٹر سراج کا فون تھا؟“ تھریا نے دریافت کیا۔

”ہاں.....“ میڈم نے شیخ حامد کے حوالے سے بات کی۔ ”اسے میرے اوپر شبہ ہے، مسٹر سراج کا خیال ہے کہ میں کچھ دنوں کے لیے اپنی سرگرمیوں میں کمی کر دوں۔“

”میں اس مشورے کی تائید کروں گی۔“ تھریا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”دشمن کو اندھیرے میں شکار کیا جائے تو وہ چوکنا ہونے سے پہلے ہی شکار ہو جاتا ہے۔ بصورت دیگر وہ بھی اپنے حربے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔“

”شبنم نے جو پروگرام بتایا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ میڈم نے موضوع بدلا۔ ”کیا وہ قابل عمل ہے؟“

”ہاں..... لیکن ہمیں اس میں حفظ ماتقدم کے طور پر کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔“
 ”آئی سی۔“ میڈم مسکرا دی۔ ”گوتم تم آنکھ بند کر کے اس پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہو۔“
 ”کل کر گفتگو کرنے کی اجازت بھی آپ نے دی ہے۔“ تھریا نے جواب دیا۔ ”دوسری شکل میں.....“

”اس کے آگے کچھ مت کہنا تھریا.....“ میڈم کی آواز فرط جذبات سے بھرا گئی۔ ”میں تمہیں ملازمہ نہیں ایک دوست ایک ہمدرد ایک بہن کی طرح عزیز رکھتی ہوں ورنہ اس دنیا میں اب میرا.....“
 ”میرا خیال ہے کہ اس وقت کو لڈ کافی ہم دونوں کے لیے مناسب رہے گی۔“ تھریا نے بڑی اپنائیت سے کہا پھر اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی اور میڈم..... ٹشو سے آنکھوں کی نمی خشک کرنے لگی۔
 اس کے ذہن میں سراج کا مشورہ بھی کلبلا رہا تھا۔



فرحین کے واپس آ جانے کے بعد لیاقت حسین کے دل سے تنہائی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا، انیسویں کو دیکھ کر فرحین کی خوشی قابل دید تھی۔ انیسویں کی تزئین و آرائش میں خود راحیلہ بیگم نے بھی داغے درغے سننے بھر پور حصہ لیا تو اس جگہ کا حسن اور گھر گیا..... ہر شے کا حسن دو بالا ہو گیا۔

فرحین کے ذریعے لیاقت حسین کو گھر کا حال احوال بھی تفصیل سے معلوم ہوا۔
 ”اماں نے تمہاری ترقی کا سن کر سب سے پہلے شکرانے کی نماز پڑھی تھی۔ وہ ہر وقت ہم دونوں کیلئے دعائیں کرتی رہتی ہے۔ میرے ساتھ آنا بھی چاہتی تھی لیکن.....“
 ”سردار سرفراز خان کی اوجھی پگ نے اس کا راستہ روک لیا ہوگا۔“ لیاقت حسین کے دل کی تلخی زبان تک آ گئی۔

”ایسی بات بھی نہیں ہے.....“ فرحین نے سچائی کا اظہار کیا۔ ”میں تم سے غلط نہیں بولے گا..... اس بار چاچا سرفراز نے مجھے دیکھ کر آنکھیں نہیں پھیرا۔ میرا سر پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا لیکن اس کا آنکھیں بولتا تھا۔ وہ تمہارا خیریت معلوم کرتا تھا۔“
 ”پھر..... اماں تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئی.....؟“ لیاقت حسین نے بے چینی سے دریافت کیا۔

”وہ آ جاتا تو چاچا سرفراز اکیلا رہ جاتا لیکن اس نے اماں کو روکا بھی نہیں۔“ فرحین نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”وہ ہمارا ساتھ آ جاتا تو چاچا تمہارا یاد میں اور بے چین ہو جاتا..... تم اس کا خون ہے لیاقت۔ وہ تم کو بھول نہیں سکا۔ زبان سے کچھ نہیں کہتا یہ اور بات ہے۔“
 ”اماں کو پیسے کب دیے تھے.....؟“ لیاقت حسین نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ.....“

”ہم تمہارا مطلب سمجھ گیا۔“ فرحین نے پھر نوشرہ کی زبان میں اردو بولی۔ ”ہم جو کچھ لے گیا تھا وہ چاچا کے سامنے اماں کے ہاتھ میں دیا۔ چاچا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں اس کا حالت دیکھتا تھا۔ وہ کچھ بھی ہے لیکن تمہارا باپ ہے۔ اندر سے تڑپ کر رہ گیا، مگر زبان نہیں ہلایا۔“
 فرحین پوری تفصیل سے ساری باتیں بتاتی رہی۔ لیاقت حسین سنا رہا، اندر ہی اندر دل مسوس کر رہا تھا پھر اپنا غم چھپانے کی خاطر بولا۔ ”اب تم ادھر کراچی آ گئی ہو..... صاحب یا بیگم صاحب

کے سامنے کھڑا زبان میں بات نہ کرتا۔
 ”نہیں کروں گی۔“ فرحین نے مسکرا کر وعدہ کیا پھر ذرا سینہ تان کر بولی۔ ”دو تین مہینے کی بات ہے اس کے بعد میں تمہارے ساتھ گٹ اپ بھی کرنے لگوں گی۔“
 ”گٹ پٹ.....“ لیاقت حسین نے اسے بازوؤں میں سیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو میری دلبر جان ہے فرحین بغیر گٹ پٹ کے بھی مجھے پیاری لگتی ہے۔“
 ”میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔“ فرحین نے لیاقت حسین کی گردن میں بائیں ڈال کر جواب دیا۔
 ”بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ میں ان سے گٹ پٹ پڑھنا شروع کر دوں۔“
 ”گٹ پٹ نہیں..... انگریزی میں کہا ہوگا۔“
 ”ہاں..... وہی انگریزی۔“ فرحین نے خمار آلود نظروں سے لیاقت کو دیکھا۔ ”ایمان سے کہنا میں فر فر انگریزی بولتی کیسی لگوں گی؟“
 ”ایک دم فرسٹ کلاس۔“ لیاقت حسین نے اس کے بالوں میں انگلی پھیرتے ہوئے پیار سے جواب دیا۔
 ”کھل گئی نہ تیری قلبی۔“ وہ معنوی غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”اس کے مطلب یہ ہوا کہ ابھی میں تجھے ایک دم فرسٹ کلاس نہیں لگتی۔“
 ”رات ہو لینے دے پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔“ لیاقت حسین کا لہجہ نشیلا ہونے لگا۔
 ”ارے ہاں.....“ فرحین کو کچھ یاد آیا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”تیرے حادثے کی خبر سن کر ادھر سب پریشان ہو گئے تھے۔ اماں کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔ تیری زندگی کی خاطر وہ دن رات خدا سے دعائیں کیا کرتی۔ چاچا سرفراز بھی غمگین ہو گیا تھا۔ اس نے اماں کو تسلی دی تھی یہی کہا تھا کہ غم نہ کر خدا نے چاہا تو وہ پھر بھلا چنگا ہو جائے گا۔“
 لیاقت فرحین کو دیکھتا رہا، گھر کا تازہ دودھ اور گھی کھا کر وہ مہینہ بھر میں ہی پھر ویسی ہو گئی تھی جیسی شادی سے پہلے لگتی تھی..... ماں نے جو چیزیں بھیجی تھیں فرحین وہ لیاقت حسین کو دکھانے لگی لیکن لیاقت کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
 ”ایسے کیوں دیکھ رہا ہے گھور گھور کر؟“ فرحین نے اسے چھینڑنے کی خاطر منہ بنا کر کہا۔ ”کیا پہلے کبھی نہیں دیکھا؟“
 ”ٹھیک ہے.....“ لیاقت حسین اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تجھے میرا دیکھنا برا لگ رہا ہے تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔“

”دل سے کہہ رہا ہے.....؟“ فرحین کی نظروں میں خمار چھلک اٹھا۔

اس رات انیکسی کے پرسکون ماحول میں لیاقت حسین نے سارے کاموں سے فارغ ہو کر فرحین کو محو نظروں سے دیکھا تو وہ اس کی نظروں کی تپش سے موم کی طرح پکھل گئی۔ ایک ماہ کی دوری جیسے دونوں کیلئے عذاب بن گئی تھی۔ بھولا ہوا سبق وہ بار بار دہراتے رہے دونوں پر ایک جنون

ساحاری تھا جس کا اظہار برملا کیا گیا پھر دونوں ایک دوسرے میں بیہوش ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

دوسری صبح لیاقت حسین نہادھو کر ڈیوٹی کا لباس پہن کر جانے لگا۔ فرحین ابھی تک تازہ گلاب کی پتھریوں کی طرح بستر پر بکھری پڑی تھی رات کا خمار اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔ لیاقت حسین جاتے جاتے رک گیا، دبے قدموں قریب جا کر اس نے فرحین کے گداز ہونٹوں کو چھوا تو فرحین نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔

”جلدی سے اٹھ کر نہادھو کر کوئی اچھا سا جوڑا پہن لے، بیگم صاحبہ تجھے دوبارہ بلوا چکی ہیں۔“ فرحین کے جسم کو جیسے کرنٹ لگ گیا؟ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی، لیاقت حسین اس کو کھلا ہٹ پر ہنس دیا۔ اس نے فرحین کو جگانے کیلئے جھوٹ بولا تھا۔ نہ بولتا تو وہ اس خوبصورت گھبراہٹ کو حیا کی سرخیوں کے ساتھ گھلتا ملتا بھی نہ دیکھ پاتا۔ وہ مسکراتا ہوا قدم مارتا دوسرے بیٹکے پہنچ گیا، گاڑنے اسے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔

”سیٹھ صاحب نے تو بتایا تھا کہ ابھی تم کچھ دن اور آرام کرو گے۔“ اس نے لیاقت حسین سے کہا۔

”بستر پر پڑے پڑے جوڑ پٹھے اکڑنے لگے تھے.....“ لیاقت نے کہا پھر وہ حسب معمول گاڑی کو اچھی طرح کپڑا مار کر پورٹیکو میں لے آیا۔ سیٹھ عثمان کی تحفے میں دی جانے والی دتی کھڑی پر نظر ڈالی تو مطمئن نظر آئے لگا۔ سیٹھ عثمان وقت کی پابندی کے عادی تھے۔ ابھی ان کے باہر آنے میں پورے سات منٹ باقی تھے لیاقت حسین پوری طرح مستعد نظر آ رہا تھا جب دوسرا ڈرائیور آ گیا۔
 ”تم؟“ اس نے لیاقت حسین کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا پھر ہاتھ ملا کر کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ تم بھلے چٹکے ہو گئے۔“

”ایک دم فٹنگ فٹنگ۔“ لیاقت نے بڑے ترمیم میں جواب دیا پھر گاڑی کی چابی ہوا میں لہراتا ہوا بولا۔ ”آج سے ہم ڈیوٹی پر آ گیا..... تم بیگم صاحبہ کی ڈیوٹی سنبھال لو۔“
 سیٹھ عثمان ٹھیک وقت پر باہر آئے، راحیلہ بیگم بھی انہیں خدا حافظ کہنے کی خاطر ساتھ تھیں، دونوں نے لیاقت حسین کو ڈیوٹی کیلئے آمادہ دیکھا تو انہوں نے نگاہوں نگاہوں میں ایک دوسرے کو دیکھا پھر راحیلہ بیگم نے سر کی معمولی جنبش کا جو اشارہ کیا وہ لیاقت حسین کے حق میں ہی تھا۔ دونوں نے گاڑی کے قریب آ کر لیاقت حسین کو اس کی صحت مندی کی مبارک دی پھر راحیلہ بیگم نے دوسرے ڈرائیور سے کہا۔ ”اب تم میری گاڑی پر ڈیوٹی دو گے۔“



ڈی ایس بی لودھی اس وقت بالکل نئی کلف لگی وردی میں تھا۔ شیخ حامد کی گڈ بکس میں ہونے کی وجہ سے وہ خاصا نڈر ہو گیا تھا۔ بگ باس کی سفارش ہی کے سبب وہ گزشتہ تین سال سے اسی علاقے میں تعینات تھا جس میں شیخ حامد کا دفتر تھا، ہر ماہ اسے ایک خاصی معقول لگی بندھی رقم ٹھیک وقت پر

بچ رہی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تب بھی وہ کسی وفادار پالتو جانور ہی کی طرح اس کے اشاروں پر دم ہلانے پر مجبور تھا، وہ شیخ حامد کے اثر و رسوخ سے پوری طرح واقف تھا، اس لیے ان کی مخالفت کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

تین سال کے طویل عرصے میں اسے آج پہلی بار بگ باس نے اپنی عمارت کے آفس میں طلب کیا تھا۔ شاید اسی دن کے لیے اس نے نئی وردی کو بہت سنبھال کر رکھا تھا۔

دفتر کے مین فلور پر قدم رکھنے کے بعد اس کی نظریں سب سے پہلے شبنم پر پڑی تو اس کے ہونٹوں نے سیٹی بجانے کے انداز میں گول دائرے کی شکل اختیار کی۔ لیکن وہ سیٹی بجانے کی جرأت نہیں کر سکا۔ وہ ریپشن کاؤنٹر کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کر کے سیدھا شبنم کے سامنے جا کر رک گیا۔ سوچ بورڈ پر مختلف کال ملانے کے سلسلے میں وہ پوری طرح منہمک تھی۔ ہاتھوں کی حرکت نے اس کے جسم کے دوسرے حصوں کو بھی اسی مناسبت سے متحرک کر رکھا تھا جسے لودھی بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا، کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر آہستہ سے اس نے شبنم کو مخاطب کیا۔

”ہیلو.....“

شبنم نے اس کی طرف توجہ دی تو جھلا کر رہ گئی۔ لودھی کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ کس ٹائپ کا آدمی ہے۔ جس انداز میں اس نے ”ہیلو“ کہا تھا وہ بھی چھپووروں جیسا تھا۔ اس کی نظریں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ کسی خوبصورت لڑکی کی خاطر کس حد تک اپنی سطح سے نیچے گر سکتا ہے۔

”فرمائیے..... کیسے زحمت کی؟“ اس نے عینکے لہجے میں لودھی سے دریافت کیا۔

”مجھے شیخ صاحب نے طلب کیا ہے۔ اسی علاقے میں تعینات ہوں۔“ لودھی نے وہاں آنے کا مقصد بیان کرنے کے ساتھ اپنی تعیناتی کا ذکر بھی کر دیا۔ شبنم اس کی نظروں میں ابھرنے والی پسندیدگی کی جھلک دیکھ کر جھلس اٹھی۔

”آپ..... ری..... سب..... شن..... کاؤنٹر پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔“ شبنم نے اسے شرمندہ کرنے کی خاطر رک کر سمجھانے کی کوشش کی۔ ”آپ وہاں جا کر مس نیوفر سے دریافت کریں..... وہ آپ کو ملاقاتوں کا وقت بھی..... فر فر بتا دے گی۔“

لودھی بے شرمی سے مسکرا دیا۔ شبنم کا جواب تلخ اور طنزیہ ہونے کے باوجود اسے برا نہیں لگا، اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا پھر ریپشن کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

”ڈی ایس پی لودھی!“ اس نے متعلقہ کاؤنٹر پر جا کر سنجیدگی سے اپنا تعارف کرایا۔ ”شیخ حامد صاحب نے طلب فرمایا ہے۔“

نیوفر نے اس کو جواب دینے کے بجائے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر بگ باس سے رابطہ قائم کیا پھر ریسیور رکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو پندرہ منٹ انتظار کرنے کو کہا گیا ہے۔ سامنے ریپشن روم میں تشریف رکھیں۔“

لودھی نے نیوفر کے خشک لہجے میں بیزاری کی جھلک بھی محسوس کی لیکن وہ شیخ حامد کی وجہ سے

مجبوراً مسکرا کر ”تھینکس“ کہتا ہوا ”انتظار گاہ“ والے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔

شیخ حامد اس وقت اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں تنہا ہی تھا لیکن اس نے لودھی کو فوری طلب نہیں کیا۔ لودھی کی آمد کا سن کر اس کے ذہن میں پھر سراج کے کہے ہوئے کچھ جملے گونجنے لگے اس نے شیخ حامد کی باز پرس کے جواب میں کہا تھا۔

”یقین کرنا نہ کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے..... بحیثیت ایک پولیس آفیسر کے ہم دیدہ و دانستہ قانون کی نظروں میں وصول بھی نہیں جھوٹک سکتے۔ تعاون ایک حد تک کیا جاسکتا ہے۔ اس کیلئے ایک دوسرے پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرنا بھی شرط ہے.....“ اس نے سراج کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خاطر بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

”میں آپ کو ابھی تک دوست سمجھ رہا ہوں لیکن..... ایک بات واضح کر دوں، میں ڈبل کر اس کرنے والوں کو نظر انداز کرنے کا عادی نہیں ہوں، لوگوں کو اپنے اشاروں پر چلانے کے ٹکس بھی جانتا ہوں۔“ جواب میں سراج نے معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے بڑی دیدہ دلیری سے کہا تھا۔

”گڈ..... کسی بھی انسان کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ موقع کی مناسبت سے اپنے کارڈز استعمال کرے۔“

وہ تلخ جملے شیخ حامد کیلئے کسی چیلنج سے کم نہیں تھے۔ اس نے سراج کے کارلر کا کلف نکالنے کی ٹھان لی تھی، اسی مقصد کیلئے اس نے ڈی ایس پی لودھی کو طلب کیا تھا، جو اسی کی سفارش کی بدولت کئی سینئرز کا حق مار کر ڈی ایس پی کے عہدے تک پہنچا تھا۔ ایک لمحے تک وہ اپنے ذہن میں کچھ پلان مرتب کرتا رہا پھر اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کہا تھا۔

”لودھی کو اندر بھیج دو۔“

دو منٹ بعد ہی لودھی اس کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھا تھا۔

”تمہارے تبادلے کی فائل پھر مود ہوئی تھی، لیکن میں نے اسے روک دیا۔“ شیخ حامد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جب تک تم میری گڈ بکس میں ہوعیش کرتے رہو۔“

”اپنا خادم ہی سمجھئے.....“ لودھی نے کسمسا کر متانت سے جواب دیا۔ ”میں آپ کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔“

”کبھی ایسی حماقت بھول کر بھی نہ کرنا، ورنہ میرے ایک فون پر تمہاری وردی بھی اتر سکتی ہے۔“

جواب میں لودھی کسمسا کر رہ گیا۔ وہ کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

”میں نے اس وقت تمہیں ایک خاص کام کے سلسلے میں بلایا ہے۔“

”آپ حکم کریں.....“ لودھی نے کسی تنخواہ دار ملازم کی طرح سعادت مندی سے کہا۔

”سراج سے کس حد تک واقف ہو.....؟“ شیخ حامد نے اسے گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں

سوال کیا۔

”بہت زیادہ تعلقات نہیں ہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اب اس میں وہ پہلی جیسی تن پھن نہیں رہے گی۔“ لودھی نے دبی زبان میں وضاحت کی۔ ”ڈی جی کرائمر کی سپورٹ کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگا تھا۔ اب اس کرسی پر آپ کے آغا منظور صاحب آگئے ہیں اس لیے.....“

”فضول باتوں سے پرہیز کرو۔“ شیخ حامد نے اسے جھڑک دیا۔ کچھ توقف سے سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”میں سراج کو ایک جھکا دینے پر غور کر رہا ہوں۔ حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہو گیا ہے۔“

”یہ تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے سر..... اے کہیں اندرونی علاقے میں ایسی جگہ پوسٹ کرا دیں جہاں شدت کی گرمی ہر سال نیا ریکارڈ قائم کرتی ہے۔ ہفتہ دس دن میں ہی ساری افسری بھول کر پھر آپ ہی کے قدموں میں آگرے گا۔“

”نان سنیں!“ شیخ حامد نے ناگواری کا اظہار کیا۔ ”میں اپنے حریف کو ہمیشہ لکار کر نیچا دکھانے کا عادی ہوں۔“

”پھر جیسا آپ حکم دیں..... میں ہر طرح تیار ہوں۔“ لودھی نے کہنیوں کے بل آگے جھکتے ہوئے رازداری سے کہا۔ ”کچھ بندے بہت دنوں سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے عیش کر رہے ہیں..... آپ کا صرف ایک اشارہ کافی ہے۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مسٹر سراج کے دماغ کے کیڑے بھی جھاڑ دیئے جائیں گے۔“

”رہش!“ شیخ حامد نے اسے جھڑک دیا۔ پھر سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو ملتے ہوئے بڑے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”کیڑے جھاڑنے کے لیے میری فورس میں بھی ایسے جیالے موجود ہیں جو میری خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ایک ہل کی بھی دیر نہیں کریں گے۔“

”پھر.....؟“ لودھی نے ہونٹوں کی طرح منہ پھاڑ کر وضاحت چاہی۔

”ایڈیٹ.....“ شیخ حامد نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”شکار کو ایک گولی مار کر ختم کر دینا میرے اصولوں کے خلاف ہے۔ لطف تب آتا ہے جب شکار قدموں میں پڑا موت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار ہو..... سسک رہا ہو..... زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو اور..... شکاری اس پر ترس کھانے سے پہلے آخری بار دریافت کرے..... کیا معاف کرنے کے بعد تمہاری دم ہمیشہ ایک اشارے پر ہلنا شروع کر دے گی؟“

”میں سمجھ رہا ہوں سر.....“ لودھی نے پہلو بدل کر ہونٹ کاٹتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔

”الماس..... ڈی ایس پی سراج کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ نہ ہوتی تو وہ اسے اتنی آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت بھی نہ دیتا اگر اسے کچھ دنوں کے لیے چھوڑ کر دیا جائے تو ہم سراج کو اپنی ٹرس ڈکٹیٹ (Terms Dictate) کر سکتے ہیں۔“

”گڈ.....“ شیخ حامد نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا تم ایسا کر سکو گے؟“

”آپ حکم کریں..... باقی کام خادم کا ہے۔“

”لیکن ایک بات سوچ لو..... میں ناکامی کے سلسلے میں کوئی عذر نہیں سنوں گا۔“ شیخ حامد کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی..... ”ڈو..... اور..... ڈائی (Do or Die) والی صورت حال ہوگی۔“

”مجھے منظور ہے سر.....“ لودھی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”دوروز کے اندر اندر کام ہو جائے گا۔“

”ایک بات کا خیال رکھنا..... میں جانتا ہوں کہ عورت کے معاملے میں تمہاری نیت بھکنے میں دیر نہیں لگتی لیکن تمہیں الماس کے سلسلے میں محتاط رہنا ہوگا..... اپنی حد اور میرے حکم سے تجاوز کرنے کی غلطی نہ کرنا۔“

”رائٹ سر.....“

”او۔“ کے گیت لاسٹ!“ شیخ حامد نے مسکراتے ہوئے کہا تو لودھی نے جلد اٹھ کر اسے باقاعدہ سیلوٹ کیا پھر ایڈیٹوں کے بل گھوم کر اپنے تلے قدم اٹھاتا ساؤنڈ پروف کمرے سے باہر نکل گیا۔

لودھی کے جانے کے بعد شیخ حامد بھی اٹھا لیکن اسی لمحے اس کے موبائل نے واہریت کرنا شروع کر دیا، اسکرین پر بلیک ٹائیگر کے حروف چمک رہے تھے۔ شیخ حامد نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”کیا رپورٹ ہے.....؟“ اس نے ضروری خفیہ کوڈ کے تبادلے کے بعد بے پروائی سے سوال کیا لیکن..... اس کے چہرے کا سکون زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی خون کی ڈوریاں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ دوسری جانب سے اسے جو رپورٹ دی جا رہی تھی وہ اس کیلئے ناقابل برداشت ہی تھی.....!



”ہر کہ آمد عمارت نو ساخت“ کے پیش نظر آغا منظور نے بھی ڈی آئی جی کرائمر کا عہدہ سنبھالنے کے دو تین دن بعد ہی پہلے ایک پریس کانفرنس کال کی تھی جس میں جرائم کے گراف کو گرانے کے سلسلے میں اس نے ایک رسم کے تحت..... اپنی سخت پالیسی کے دعوے کیے تھے۔ پریس سے اپنے تعلقات بڑھانے کی خاطر اس نے خاصا اہتمام کیا تھا۔

پریس رپورٹرز اس قسم کے دعوے پہلے بھی سن چکے تھے۔ انہیں علم تھا کہ تمام نئے آنے والے شروع شروع میں اپنی ساکھ بنانے کی خاطر نئی پالیسیاں مرتب کرنے اور ان پر عمل کرنے پر لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں۔ کچھ ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن جب بیورو کریسی ان کے آڑے آجاتی ہے تو وہ بھی آنکھ بند کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پریس کے تجربہ کار رپورٹرز جانتے تھے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ آغا منظور اپنے دو سینئر افسران کو بھلا لگ کر جس کرسی پر براجمان تھا اس کی وجہ بھی ان کے علم میں تھی۔ بیشتر پریس کے نمائندوں کو اس بات کا علم تھا کہ آغا منظور کی پشت پر شیخ حامد کا نام ہے اس لیے وہ بہت غور سے اس کی تقریر سنتے رہے۔ وہ تقریر ختم کرنے کے بعد

محض دکھاوے کے طور پر ایک دوسوال کر کے خاموش ہو گئے۔ جو اس میدان میں نووارد تھے وہ بال کی کھال ادھیڑنے لگے۔

”آپ کی طرح ہر آنے والا آفیسر یہی کہتا ہے کہ وہ جرائم پیشہ افراد کی بیخ کنی کیلئے کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کرے گا لیکن بعد میں جب اوپر سے احکام ملتے ہیں تو وہ بھی.....“

”ون منٹ.....“ آغا منظور نے مسکرا کر کہا۔ ”میں آپ کی بات کی تردید نہیں کروں گا لیکن یہی صورت آپ حضرات کے ساتھ بھی ہے۔ آپ جان کی بازی لگا کر موقع واردات تک پہنچتے ہیں حقائق معلوم کرتے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں اپنی خبر تیار کرتے ہیں لیکن آپ کے اخبارات کی بھی اپنی اپنی پالیسیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے آپ کی رپورٹ بھی عوام کے سامنے نہیں آ پاتی..... آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے..... چھوٹی بڑی مچھلیاں ہر تالاب میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے درمیان رہ کر ہی چھوٹی مچھلیوں کو بھی گزارہ کرنا پڑتا ہے۔“

”گویا آپ بھی ان بڑی مچھلیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے؟“ ایک نوجوان رپورٹر نے پر جوش انداز میں چہچہتا ہوا سوال کیا۔

”ایسا نہیں ہوگا لیکن ہمیں بہر حال مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی خاطر کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور اختیار کرنا پڑے گا۔“

”کیا آپ کے علم میں ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو بڑے مجرموں کی پشت پناہی کرتے ہیں؟“ دوسرے رپورٹر نے تند لہجہ اختیار کیا۔

”سوری.....“ اس بار آغا منظور نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”ہمارے پاس اس قسم کی کوئی فائل نہیں ہے اس لیے کہ چہرے آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ نئی پالیسی آ جائے تو اس پر ہمیں اور آپ کو مل کر عمل کرنا پڑتا ہے۔“

”آپ کے پاس کچھ ایسے مجرموں کے نام تو ضرور ہوں گے جو بڑے بڑے جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود ابھی تک آزادی سے سانس لے رہے ہیں؟“

”آپ کا سوال بہت اہم ہے لیکن اس کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں۔ پولیس کا کام ہے کہ مجرم کو گرفتار کر کے اسے عدالت کے روبرو پیش کر دے۔ وہاں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ہمیں عدالت کے فیصلوں کے سامنے سر جھکا کرنا پڑتا ہے۔“

”گویا ہماری عدالتیں.....“

”جی نہیں..... میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جس کی آپ کوئی گرما گرم سرفی بنا سکیں۔“ آغا منظور نے بڑی خوبصورتی سے رپورٹر کے سوال کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیں اور بیرونیوں میں بھی درجہ بندی ہوتی ہے..... جو جتنا بڑا مجرم ہوتا ہے اتنا بڑا وکیل بھی کھڑا کر دیتا ہے..... جج کے فیصلے ہمیشہ وکیلوں کے دلائل پر ہوتے ہیں۔ پولیس بھی اس بات سے واقف ہے کہ کالی بیٹھریں ہر جگہ موجود ہیں۔ حقائق کے پیش نظر قانون کی پیچیدہ شقوں کی روشنی میں کچھ رعایتیں بھی حاصل ہوتی ہیں

جس کا قاعدہ مجرم کو مل جاتا ہے..... ہم فیصلوں کے خلاف اپیل تو کر سکتے ہیں لیکن ان سے انکار نہیں کر سکتے۔“

ایک گھنٹے تک سوالات کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ آغا منظور پرانا کھلاڑی تھا، کئی سینئر رپورٹر اس کی مٹھی میں بھی تھے وہ ہر بات کا جواب دیتا رہا پھر پریس کانفرنس ختم ہو جانے کے بعد سب معمول بات آئی گئی ہو گئی۔

پریس کانفرنس کے دو گھنٹے بعد آغا منظور نے اپنے حلقے کے تمام سینئر پولیس آفیسروں کو طلب کیا تھا۔ اس میٹنگ کے دوران بھی وہ اپنے نئے عہدے کی حیثیت میں کچھ بدلا بدلا نظر آیا۔ اس نے تمام تھانہ انچارج کو کھلے لفظوں میں تاکید کی تھی کہ وہ کسی قسم کی غفلت کو برداشت نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ پوری فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی ڈیوٹیاں پوری پابندی اور دیانتداری سے نبھائیں۔ تقریباً چالیس منٹ تک وہ نرم و گرم انداز میں مختلف ہدایتیں دیتا رہا پھر اس نے وہ میٹنگ بھی برخاست کر دی لیکن خاص طور سے دو افسروں کو روکے رکھا جس میں سے ایک سراج تھا اور دوسرا ایس پی اورنگ زیب تھا جو کچھ دنوں پیشتر ہی دوسرے شہر سے ٹرانسفر ہو کر آیا تھا اور اب ترقی حاصل کرنے کے بعد آغا منظور کی سیٹ پر اس کی تعیناتی ہوئی تھی۔

اپنے پرانے ریکارڈ کے مطابق ایس پی اورنگ زیب ایک قانون پسند آفیسر تھا، اس کا تعلق ایک ایسی فیملی سے تھا جس میں کئی افراد صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں بھی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے جس کی وجہ سے وہ قانونی معاملات میں کسی کے ساتھ رعایت کرنے کا عادی نہیں تھا، بحیثیت ڈی ایس پی بھی اس نے کبھی کسی غلط کام کے سلسلے میں کسی کے سامنے جھکنا نہیں سیکھا تھا۔ آغا منظور کو اس کا اپنی ماتحتی میں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی خاص وجہ شیخ حامد تھا جس سے وہ فی الحال کوئی بگاڑ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

رکی تعارف اور کچھ پریس کانفرنس کی باتوں کے بعد آغا منظور نے سنبھل کر گفتگو کی ابتداء سراج سے کی وہ اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر اورنگ زیب کو اپنی پالیسیوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

”مسٹر سراج.....“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”بحیثیت ایس پی مجھے آپ کا تعاون ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ اب بھی مجھے آپ سے زیادہ بہتر کارکردگی کی امید ہے لیکن موجودہ پوزیشن میں ہمیں فاصلوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا۔“

”فاصلے.....؟“ سراج چونکا۔ ”میں سمجھا نہیں سر کہ آپ کی فاصلوں سے کیا مراد ہے؟“

”غلط نہ سمجھیں.....“ وہ کسمسا کر بولا۔ ”بحیثیت ڈی آئی جی کرناٹمز کے میرا ہر ایک سے زیادہ میل جول بھی مناسب نہیں ہوگا۔ آپ واقف ہیں کہ مسٹر سلیم احمد اور آپ کے مراسم کو کبھی لوگوں نے غلط رنگ دیا تھا۔“

سراج جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ آغا منظور نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا پھر

اورنگ زیب سے مخاطب ہوا۔

”آپ کی فائل میں نے بہت غور سے پڑھی ہے۔ آپ کی کارکردگی بے مثل رہی ہے لیکن چھوٹے صوبوں اور بڑے شہروں میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں ایسے لوگوں کو مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے جن کے تعلقات ہماری اور آپ کی سوچ سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔“

”مجھے اس کا اندازہ ہے سر..... لیکن قانون تو سب کیلئے ایک ہی ہوتا ہے۔“

”ضرور ہوتا ہے مگر یہاں ہمیں اپنی پانچ انگلیوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے جو برابر نہیں ہوتیں.....“

آغا منظور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اگر ہم ایک دوسرے سے تعاون رکھیں تو معاملات زیادہ آسانی سے نمنائے جاسکتے ہیں۔“

”میں آپ کو اپنے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

سراج کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آغا منظور جس کی سفارش پر ڈی آئی جی کراچی کی کرسی پر بیٹھا تھا اس کے بارے میں وہ ابھی سے اورنگ زیب کو بریفنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

”ایک بات کا خاص خیال رکھیے گا۔“ آغا منظور نے کچھ توقف سے کہا۔ ”کوئی رپورٹ فائل کرنے سے پیشتر اگر ہم اسے قبل از وقت ڈسکس کر لیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔“

”سر..... کیا ہمارے علاقے میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو قانون سے زیادہ قوت رکھتے ہیں؟“

اورنگ زیب نے دبی زبان میں سوال کیا۔

”اس کا اندازہ آپ کو آہستہ آہستہ ہو جائے گا۔ میں نے آپ کو بریفنگ اس لیے دی ہے کہ..... آپ اندھیرے میں نہ رہیں۔“

”شکریہ سر.....“ اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ کسی سے میرا کلیش نہ ہو لیکن کسی مجرم کے سامنے گھنٹا ٹکینے کی پالیسی پر عمل کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔“

آغا منظور نے اورنگ زیب کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ چاہتا تو شیخ حامد کے تعاون سے محض چند گھنٹوں میں اس کا تبادلہ بھی کر سکتا تھا لیکن میڈم روٹی کے باعث وہ فوری طور پر شیخ حامد سے اس مسئلے پر بھی بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ سراج نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کر دبی زبان میں کہا۔

”سر..... میرا خیال ہے کہ کرسی کا تجربہ ہر آفیسر کے لیے اس کی رہنمائی کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔“

اورنگ زیب نے تیزی سے نظریں گھما کر سراج کی طرف دیکھا لیکن قبل اس کے کہ وہ سراج کے معنی خیز جیلے کا کوئی معقول جواب دیتا، سراج کے موبائل پر کسی کی کال ریسیو ہوئی۔ نمبر شناس نہیں تھے لیکن سراج نے دیدہ دانستہ وہاں سے وقتی طور پر ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ ”ایکسیکوز می سر۔“ کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے میں ایک طرف چلا گیا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اورنگ زیب سے الجھنا

بھی نہیں چاہتا تھا۔

”ہیلو..... ڈی ایس پی سراج اسپیکنگ.....“ اس نے موبائل آن کر کے بڑے مہذب لہجے میں کہا۔

”میں نے کسی سے سنا ہے کہ تم پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے.....“ دوسری جانب سے کسی عورت کی آواز ابھری جس میں کرب کی آمیزش بھی صاف محسوس کی جا رہی تھی۔

”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا.....؟“

”میرے پاس تعارف کرانے کا وقت نہیں ہے آفیسر لیکن ایک مجبور عورت اپنی آخری سانسیں پوری کرتے وقت تمہارے اوپر اعتماد کر رہی ہے..... اس کے اعتماد کو..... ٹھیس نہ پہنچانا۔“

آخری سانسوں والی بات سن کر سراج یک لخت بیحد سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”کیا آپ.....؟“

”ہاں آفیسر..... میں زہر پی چکی ہوں اس لیے..... میری بات غور سے سن لو..... مم..... میں صبا..... بیگم شیخ حامد بول رہی ہوں..... میں نے ایک تفصیلی خط لکھ کر..... سائڈ ٹیبل کے گلڈان کے نیچے..... دب..... دیا ہے۔“ اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا گیا۔ ”شاید ت..... تم..... اس خط کے مضمون کے ذریعے..... اے..... اے..... ایک ایسے مجرم کو پھپ..... پھانسی کے تختے تک پہنچا..... سکوجس نے..... مجھ..... مجھے حرام موت مرنے پر مجبور کر دیا..... میں ایسا قدم..... مم..... نہ اٹھاتی تو..... شاید مم..... میرا انجام زیادہ..... وہ..... اذیت ناک ہوتا..... مم میں..... تم پر بھب..... بھروسہ کر..... رہی..... ہوں..... ام..... مم..... مسٹر سراج..... مجھے مایوس نہ..... آ..... نا..... کر..... نا..... خدا..... خدا..... آ..... آ.....“

دوسری جانب سے کسی محسوس شے کی گرنے کی آواز ابھری تو سراج نے تیزی سے کہا۔

”ہیلو..... ہیلو..... کیا آپ تک میری آواز پہنچ رہی ہے.....؟ ہیلو..... ہیلو.....“ سراج کی کوشش نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ دوسری سمت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ سراج کو اپنے کانوں پر ٹھین نہیں آ رہا تھا لیکن تعذیب بہر حال شرط تھی۔ وہ موبائل آف کرتے ہوئے تیزی سے قدم اٹھاتا آغا منظور کے قریب آ کر بولا۔

”سر..... ہمارے لیے ایک بری خبر ہے.....“

”کس کی کال تھی.....؟“ آغا منظور نے سنبھل کر پوچھا۔

”ہو سکتا ہے کسی نے محض مذاق کیا ہو لیکن اس وقت ہمارا فوری طور پر شیخ حامد کی کوشی پر پہنچنا ضروری ہے۔“

”شیخ حامد!“ آغا منظور سراج کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چونکا۔ ”سب خیریت تو ہے.....؟“

”صبا بیگم..... شیخ حامد کی سسر.....“ سراج نے کہا۔ ”اسی قانون تھا لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“

”باتوں سے اور پھر گفتگو کے اچانک ختم ہو جانے سے یہی لگتا ہے جیسے..... اس نے خودکشی کر لی ہے۔“

”خودکشی.....؟“ آغا منظور اچھل پڑا۔ ”کیا آپ کا موبائل نمبر اس کے پاس تھا؟“

”یہی تو تجب کی بات ہے سر..... میں نے آج سے پہلے کبھی فون پر اس سے بات نہیں کی، آمنا سامنا بھی نہیں ہوا۔“

”آپ تھانے فون کر کے کوشی پہنچیں۔ میں مسٹر اورنگ زیب کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔“ آغا منظور نے ایس ایس پی کی طرف دیکھ کر کہا۔

سراج تیزی سے آئی جی کرائمر کے دفتر سے نکلا، فوری طور پر اس نے علاقے کے تھانہ انچارج کو حادثے کی اطلاع دی۔ یہ بھی ہدایت کی کہ آئی جی کرائمر کے آنے تک لاش اور جائے حادثہ کی کسی چیز کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔ پھر سراج تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیخ حامد کی کوشی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے صبا بیگم سے کبھی بات نہیں کی۔ پھر اس کا موبائل نمبر اسے کسی طرح ملا..... خاص طور پر صبا بیگم نے اسی کو اپنی حرام موت کی اطلاع دینی کیوں ضروری سمجھی؟..... وہ کون تھا جس نے سراج اور اس کے نمبروں کے بارے میں مرنے والی کو آگاہ کیا تھا؟ موبائل بھی یقیناً تحویل میں لیا جائے گا جو اس بات کی گواہی دے گا کہ مرنے والی نے آخری کال کس کو کی تھی؟..... شیخ حامد اس نکتے کو کس انداز میں سوچے گا.....؟ اگر مرنے والی کے آخری جملے حقیقت پر مبنی تھے تو شیخ حامد کا سراج کی طرف سے مشکوک ہو جانا قدرتی بات تھی؟ دو دن پہلے ہی سراج اور شیخ حامد کے درمیان اسپتال میں کچھ ٹھوس اور سخت جملوں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ ان حالات میں بہت سارے اور خدشات بھی جنم لے سکتے تھے؟

شیخ حامد کی کوشی کے باہر علاقہ انچارج کی جیب اور ایسیو لینس موجود تھی، سارا عملہ باہر کھڑا نظر آ رہا تھا۔ شاید انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ سراج کے دریافت کرنے پر تھانہ انچارج نے اس کے شبہ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

”گارڈز کا کہنا ہے کہ شیخ حامد یا ڈی ایس پی لودھی کے آنے تک کسی کو اندر نہیں جانے دیں گے۔“

تین گارڈز پوری طرح مسلح دروازے پر تعینات تھے۔ سراج ان کی طرف بڑھا۔ اسی وقت لودھی کی جیب بھی اس کے قریب آ کر رکی۔ اس نے سراج سے رکی انداز میں ہاتھ ملایا پھر سرد لہجے میں پوچھا۔

”کیا آپ کو حادثے کی اطلاع مل چکی ہے.....؟“

”ڈی آئی جی کرائمر نے بتایا تھا..... وہ بھی ایس پی اورنگ زیب کے ساتھ پہنچنے والے ہیں۔“ سراج نے کچھ سوچ کر یہ ظاہر کرنے سے گریز کیا کہ حادثے کی اطلاع براہ راست اسی کو دی گئی تھی۔

گارڈز نے کوشی کا پھانگ کھول دیا۔ پولیس افسران اور عملہ اندر داخل ہوا تھا کہ آغا منظور اور ایس پی اورنگ زیب بھی آگئے۔ صبا بیگم کے کمرے کا دروازہ آغا منظور نے کھولا، اس کے پیچھے پیچھے ایس پی اورنگ زیب تھا، سراج نے دیدہ و دانستہ ہاتھ کے اشارے سے لودھی کو پہلے اندر چلنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ تھانہ انچارج بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

سراج نے جو صورت حال دیکھی وہ فون پر ہونے والی گفتگو اور کسی وزنی شے کے گرنے کی آواز کے عین مطابق تھی، صبا بیگم کی لاش اس کی مسہری کے ساتھ فرش پر اوندھی پڑی تھی، مسہری سے گرتے وقت شاید اس نے قریب رکھی میز کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی جو اس کے سامنے الٹی پڑی تھی، اس پر موجود برش بھی بکھر گئے تھے۔ سائڈ کے دونوں لیپ اپنی جگہ موجود تھے، اس کے ساتھ خوبصورت اور وزنی گلدان بھی موجود تھے۔ سراج کے ذہن میں وہ آخری تحریر ابھرنے لگی جو صبا بیگم کے کہنے کے مطابق کسی گلدان کے نیچے ڈالی تھی..... جس کے ذریعے مرنے والی کے خیال کے مطابق شیخ حامد کو پھانسی کے پھندے تک پہنچایا جاسکتا تھا۔ وہ کسی طرح اس تحریر کو حاصل کرنا چاہتا تھا کہ کسی اور کی نظر نہ پڑ سکے۔ یہ خاصا مشکل کام تھا لیکن سراج کسی نہ کسی طرح اس کو ممکن بنانے پر پوری طرح آمادہ تھا۔

آغا منظور کے حکم پر سب سے پہلے فوٹو گرافرز نے مختلف اینگل سے جائے واردات کو محفوظ کیا۔ ساری تصویروں میں وہ موبائل بھی یقیناً آیا ہو گا جو مرحومہ کے سیدھے مگر بے جان ہاتھ کے قریب ہی پڑا تھا۔ فوٹو سیشن کے بعد فنکر پرنٹس ایکسپرٹ نے اپنا کام پوری مہارت سے انجام دینا شروع کیا۔ بعد ازاں سارے افسران موت کے امکانات پر توجہ دینے لگے۔ لودھی، سراج کے ساتھ ساتھ لگا تھا، لیکن اس وقت وہ بھی لپک کر سننے ایس پی اورنگ زیب کے قریب چلا گیا جس نے مرنے والی کے اٹنے ہاتھ کی بندھنی کھول کر وہ شیشی برآمد کر لی تھی جو یقیناً کچھ دیر قبل زہر سے بھری ہوئی۔ ایس پی کے اشارے پر فوٹو گرافرز اس شیشی کو بھی ہاتھ میں دے ہوئے محفوظ کرنے لگے، سب کی نگاہیں اسی شیشی کی طرف تھیں جب سراج نے بڑی خوبصورتی سے بستر کے سیدھے طرف والے گلدان کے سامنے جا کر اسے اپنی پشت سے پرے کیا پھر پلک جھپکتے میں وہ تہ کیے کاغذ کو دوسروں کی نظر بچا کر اپنی جیب میں رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کاغذ کو حاصل کرنے کے بعد وہ لودھی کے قریب چلا گیا۔

”کیا شیخ حامد صاحب کو ابھی اطلاع نہیں ملی.....؟“ اس نے سرسری طور پر دریافت کیا۔

”آپ کا کیا خیال ہے.....؟“ لودھی نے خشک لہجے میں منہ نہ کر کہا۔ ”کیا ان کو اطلاع ہے

اور وہ جان بوجھ کر یہاں موجود نہیں ہیں؟“

جواب میں سراج نے لودھی کو ٹیکھی نظروں سے دیکھا، شاید یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے بہت سینئر تھا اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ترقی حاصل کی جبکہ لودھی کو اس کے عملے کے کچھ لوگ بھی ”سفارشی ٹو“ کے نام سے یاد کرتے تھے۔

”کیا آپ کے خیال میں ان کا اس وقت یہاں موجود نہ ہونا حیرت انگیز نہیں ہے؟“ سراج نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”جب آپ یہاں آگئے تو پھر شیخ صاحب کو حادثے کی اطلاع بھی ضرور مل چکی ہوگی۔“

لودمی کی پیشانی شکن آلود ہوگئی وہ اپنی نظروں میں ابھرنے والی نفرت پر قابو نہ پاسکا لیکن کوئی جواب دینے کی حسرت بھی اچانک شیخ حامد کے کمرے میں داخل ہونے کے سبب اس کے دل میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

شیخ حامد کا چہرہ کسی قسم کے جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔ ایک لمحے تک دروازے پر کھڑا وہ مرنے والی کی لاش کو گھورتا رہا پھر اس نے سب کو نظر انداز کر کے براہ راست لودمی کی طرف خشکی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”کسی نے ابھی تک یہاں کی چیزوں کو ہاتھ تو نہیں لگایا.....؟“

”جی نہیں.....“ لودمی نے فوری جواب دیا۔ ”فی الہال صرف فوٹو سیشن اور فنکر پرنٹس اٹھانے کا کام ہوا ہے اور..... ابھی ایک منٹ پیشتر..... ایس پی صاحب نے بیگم صاحبہ کے اٹلے ہاتھ میں دبی ایک خالی پیشی برآمد کی ہے۔“

شیخ حامد کی نظریں اورنگ زیب کی طرف گھوم گئیں ان نظروں میں نفرت اور جھلاہٹ کا ملا جلا تاثر بھی صاف پڑھا جاسکتا تھا۔

”تمہارا نام شاید ایس پی اورنگ زیب ہے؟“ اس نے آپ کے بجائے ایس پی کو تم کہہ کر مخاطب کیا تو اورنگ زیب کے چہرے پر بھی ایک رنگ آکر گزر گیا جواب میں اس نے بھی شیخ حامد کو سر سے پاؤں تک کچھ ایسے انداز میں دیکھا جیسے احساس دلانا چاہتا ہو کہ اس کا شمار ان افسروں میں نہ کیا جائے جو بڑی پھیلیوں کے سامنے نظریں اور گردن جھکانے کے عادی ہوتے ہیں۔ ڈی آئی جی کراٹمز نے صورتحال کشیدہ ہوتے دیکھی تو قدم اٹھاتا دونوں کے درمیان آ گیا۔

”ہم نے ابھی ضابطے کی کارروائی کی ابتدا کی ہے.....“ اس نے نرم لہجہ اختیار کیا۔ ”اب آپ آگئے ہیں تو آپ کی اجازت ہی سے باقی کارروائی بھی ہوگی۔“

”کس قسم کی کارروائی.....؟“ شیخ حامد نے کسی زخمی کی طرح بل کھا کر سوال کیا۔

”ہمیں اس خودکشی کے محرکات بھی معلوم کرنے ہوں گے۔“ آغا منظور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”مرحومہ کے چہرے کی نیلی رنگت اور منہ سے نکلتا ہوا جھاگ یہی نشاندہی کر رہا ہے کہ موت کسی مہلک زہر کا نتیجہ ہے۔“

”کیا خیال ہے آپ کا؟“ جواب میں شیخ حامد تمللا کر بولا۔ ”جب میں گھر پر موجود نہیں تھا تو مرنے والی کو زہر کس نے پینے پر مجبور کیا ہوگا؟“

”آپ کی ذات پر شبہ کا سوال نہیں ہے مسٹر حامد۔“ ایس پی اورنگ زیب نے آغا منظور کے قریب آکر شہتہ الفاظ میں کہا۔ ”ایسے خودکشی کے کیسز میں ضابطے کی تمام کارروائی اہم ہوتی ہے۔“

”کیا تمہارا اشارہ اب پوسٹ مارٹم کی طرف ہے؟“ شیخ حامد کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور گہری ہونے لگی۔

”جی ہاں.....“ اس بار بھی ایس پی نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔ ”ایسے کیسز میں پوسٹ مارٹم سب سے اہم ہوتا ہے۔ اسی رپورٹ کی روشنی میں.....“

”اگر میں تمہیں لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کی اجازت نہ دوں تو.....؟“ شیخ حامد کا لہجہ اور سرد ہو گیا۔ لگا ہوں میں سرخی پھیلنے لگی۔

”آپ کی مرضی نہ ہوگی تو ہم اصرار نہیں کریں گے۔“ آغا منظور نے بات نبھانے کی کوشش کی لیکن اورنگ زیب خاموش نہ رہ سکا۔

”سرنے ٹھیک کہا مسٹر حامد..... اگر آپ تحریری طور پر.....“

”کیا تم آئی جی کی موجودگی میں اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے۔“ شیخ حامد کا پارہ چڑھنے لگا۔ ”ایک بات اور ذہن نشین کر لو..... صوبائی اور مرکزی وزراء اور سینئر بھی مجھے مسٹر نہیں..... صرف شیخ حامد..... یا شیخ صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔“

”مسٹر اورنگ زیب نے ابھی یہاں جوائن کیا ہے۔“ آغا منظور نے بڑی مصلحت سے شرمندگی کا اظہار کیا۔ ”میں انہیں آپ کے بارے میں سمجھا دوں گا۔“

آغا منظور کے جواب پر اورنگ زیب کے چہرے پر ناگواری کے شدید تاثرات ابھرے تھے۔ اس نے ایک نظر بھر کر شیخ حامد کو دیکھا پھر پلٹ کر آئی جی کراٹمز سے درخواست کی۔ ”سرنے.....“

آپ اگر اس کیس میں میرا نام تفتیشی افسروں کی فہرست میں نہ شامل کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

پھر اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اٹیشن پوزیشن میں آکر آغا منظور کو سیلٹ کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

شیخ حامد کی تمللاہٹ بھی قابل دید تھی اورنگ زیب کے جملے اس کیلئے کھلا چیلنج تھے لیکن وہ موقع کی نزاکت کے سبب اپنا غصہ پی گیا۔

”آئی ایم سوری سرنے.....“ آغا منظور نے شیخ حامد کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر دبی زبان میں کہا۔

ایک لمحے تک ماحول پر کھنچاؤ کی کیفیت طاری رہی پھر شیخ حامد نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”اس سانحے کی اطلاع سب سے پہلے کس کو ملی تھی؟“

”مجھے.....“ لودمی بول پڑا۔ ”آپ کی ملازمہ نے اطلاع دی تھی سرنے.....“

سراج نے ایک پل کیلئے سکون کا سانس لیا لیکن اس کی نظریں بار بار اس موبائل کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اس بات کا اہم گواہ تھا کہ اس سے آخری کال سراج ہی کو کی گئی تھی۔ اس بات کا علم ہو جانے کے بعد شیخ حامد کے ذہن میں ایک نہیں بہت سارے اہم سوالات ابھر سکتے تھے۔

کچھ دیر ماحول پر ایک سوگوار سی خاموشی طاری رہی شیخ حامد مرنے والی کو قتل کی باندھے گھور رہا

تھا۔ اس کے دل میں یقیناً اس کیلئے نفرت ہی نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی لیکن نظروں سے اس نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ لودھی اس کے قریب ہی کسی ملازم کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”مسٹر آغا منظور.....“ شیخ حامد نے بیوی کی لاش سے نظر اٹھا کر آئی جی کرائمر کو دیکھا۔ ”میں اپنی مسز کی لاش کو انی مرضی سے دفن کرنا پسند کروں گا..... پوسٹ مارٹم کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنی رپورٹ میں جو چاہیں ظاہر کریں۔ میری طرف سے پوری اجازت ہے لیکن..... اگر آپ حضرات کسی قسم کی تفتیش کرنا پسند کریں تو اس کیلئے مجھ سے براہ راست سوال جواب کیے جائیں۔ میں اسے پسند نہیں کروں گا کہ میرے کسی گھریلو ملازم کو بلاوجہ تختہ مشق بنایا جائے..... سب میرے اعتماد کے لوگ ہیں۔“

”آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا سر.....“ آغا منظور کے بجائے لودھی نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ ”کیس میرے علاقے میں رجسٹرڈ ہوا تو اس کی انکوائری بھی میں ہی کروں گا۔“

”اس میں شبہ کی کیا گنجائش ہے؟“ آغا منظور نے لودھی کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ ”جب یہ سانحہ آپ کے حلقے میں ہوا ہے تو کسی دوسرے حلقے میں اس کا اندراج کیسے ہو سکتا ہے؟“

”سوری سر.....“ لودھی نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”اس وقت میری زبان سے غلط جملہ نکل گیا۔ شاید اس لیے کہ مرحومہ بھی شیخ صاحب کی طرح میرا خیال رکھتی تھیں.....“

سراج بدستور خاموش کھڑا رہا۔ شیخ حامد نے بھی اسے مخاطب نہیں کیا۔ شاید ہسپتال میں کچھ تیز و تہد جملوں کے الفاظ اب بھی اس کے ذہن میں منفی انداز میں گونج رہے تھے..... سراج کو ان سب باتوں سے زیادہ اس موبائل کی فکر تھی جو صبا بیگم کی لاش کے قریب پڑا تھا۔



شیخ حامد نے صبا بیگم کو سپرد خاک کرنے میں خاصی غلط کامظاہرہ کیا اس لیے جنازے میں لوگوں کی تعداد بھی خلاف توقع بہت کم تھی، لیکن دوسرے دن اس کی کونٹھی پر بڑے بڑے لوگوں کی آمد کا تانتا بندھا رہا ان میں مرکزی وزراء کے علاوہ صوبائی کابینہ کے بھی بیشتر چہرے نظر آ رہے تھے پولیس کے اعلیٰ افسران بھی دودو چار چار کی ٹولی میں شرکت کر رہے تھے۔ آغا منظور اور سراج نے بھی پرے سے لیے حاضری ضروری سمجھی، لیکن ایس پی اورنگ زیب شریک نہیں ہوا۔ شیخ حامد ہر شخص کا فردا فردا شکریہ ادا کرتا رہا وہ صبا بیگم کی موت سے دکھی نہیں تھا، لیکن خودکشی کے سبب کچھ الجھا ہوا نظر آتا تھا۔ اس غم کے مونتے پر بھی اس نے اپنے اثر و رسوخ کا پورا پورا استعمال کیا تھا مقامی پولیس میں سے کسی ایک نے بھی مرنے والی کی خبر نہیں شائع کی، ایک اخبار نے ”شیخ حامد کو صدمہ“ کا ایک باکس ضرور لگایا تھا مگر اس میں موت کا سبب ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔

حاضری لگا کر واپس جاتے وقت آغا منظور نے سراج سے کہا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ اورنگ زیب نے شیخ حامد کو جس انداز میں ناراض کر دیا ہے وہ رنگ ضرور لائے گا۔“

”شیخ حامد کو بھی ماتحتوں کی موجودگی میں کسی ایس پی کے ساتھ مہذب انداز اختیار کرنا لازم

تھا۔“ سراج کرکسما کر جواب دیا۔ ”بہر حال اورنگ زیب کے عزیز بھی مرکز اور صوبائی اسمبلیوں میں کچھ کم نہیں ہیں۔ جیت کس کی ہوگی اور کون شرمندگی کا شکار ہوگا۔ کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔“

”آپ شیخ حامد کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتے۔“ آغا منظور نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ”جہانگیرہ اور بہت چالاک آدمی ہے جہاں تعلقات میں پک محسوس کرتا ہے وہاں طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتا۔“

”اس کی فکر مجھے بھی ہے۔“ سراج نے صبا بیگم کی آخری کال کے حوالے سے کہا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ مرحومہ کے پاس میرا موبائل نمبر کہاں سے آگیا؟“

”اوہ.....“ آغا منظور نے ہونٹ چپاتے ہوئے جواب دیا۔ ”شیخ حامد مرنے والی کا موبائل ضرور چیک کرے گا اس کے بعد وہ آپ سے باز پرس بھی کرے گا۔“

”میں بھی اسی بات پر غور کر رہا ہوں کہ اسے کون سراج کی لاش لگا جاسکتا ہے۔“ سراج نے ہسپتال کی باتیں دہراتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرے خلاف پہلے ہی کھڑا ہوا ہوگا۔ صبا بیگم سے میری پہلی اور آخری گفتگو بلتی پرنسپل ہی کا کام انجام دے گی۔“

اس بارے میں بھی سوچیں گے۔“ آغا منظور نے کہا۔ پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس موقع پر میڈم روٹی کو بھی شیخ حامد سے اس کی طور پر ضرور مل لینا چاہئے۔“

”میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے.....“ سراج حاکم نہ کر سکا۔ اس کے موبائل نے اس کی توجہ بٹا دی، پھر لودھی کا نام چمکا دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ”ہیلو..... سراج اسپیکنگ!“

اس نے خشک انداز میں کال رد کر دی۔

”اس وقت آپ کہاں لال کھتے ہیں؟“ وہ اپنی ماں سے سوال کیا گیا تو سراج کی طبیعت اور مکرر ہو گئی۔

”کوئی خاص ضرورت پیش آگئی ہے؟“ سراج نے اسے سنجیدگی سے ٹولنے کی کوشش کی۔

”خاص ضرورت نہ ہوتی تو آپ کو بلاوجہ ڈسٹرب بھی نہ کرتا۔“ لودھی نے بدستور خشک انداز میں جواب دیا۔ ”شیخ صاحب نے ایک ضروری کام مجھے سونپا ہے جس کا تعلق آپ ہی سے ہے۔“

”اس وقت میں بھی ایک ضروری کام سے کہیں جا رہا ہوں۔ ویسے بانی داوے۔“ شیخ صاحب نے جو کام میرے حوالے سے آپ کے سپرد کیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟“

”آپ کا موبائل نمبر جو بیگم صبا نے آخری بار استعمال کیا تھا۔“ دوسری جانب سے چیخے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔

”وہ کال مجھ ہی کو کی گئی تھی۔“ سراج نے دبنگ لہجہ اختیار کیا۔ مرحومہ نے مجھ سے صرف ایک ہی بات کہی تھی کہ وہ حالات کا مقابلہ کرتے کرتے شک چکی ہے۔ اب آرام کرنا چاہتی ہے..... آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ میری مرحومہ سے وہ پہلی اور آخری گفتگو تھی۔“

”کیا اب موبائل کے نمبروں کی بھی کوئی ڈائریکٹری.....“

”مسٹر لودھی.....“ سراج نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں ہر کس وناکس سے بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔“ جیلے کے اختتام کے ساتھ اس نے موبائل آف کر دیا۔
”کس کی کال تھی؟“ آغا منظور نے سراج کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو بھانپ کر دہی زبان میں دریافت کیا۔

”ڈی ایس پی لودھی تھا۔“ سراج نے بدستور کشیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”شیخ حامد کی وجہ سے اب یہ اپنی اوقات سے بڑھنے لگا ہے۔“

”مرحومہ کی آخری کال کے بارے میں کیا اسی کو ذمے داری سونپی گئی ہے؟“

”کچھ اسی قسم کی ڈینگ مار رہا تھا۔“

”مسٹر سراج.....“ آغا منظور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میڈم روبی میری کمزوری ہے۔ یہ بھی جانتے ہو گے کہ مگر مجھ بھی ایسے ہی شکار کی تلاش میں رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم دونوں کا.....“

”میں سمجھ رہا ہوں سر لیکن..... میں لودھی جیسے آدمیوں کو اپنے اوپر مسلط بھی نہیں ہونے دوں گا۔“

”خود میں بھی اسے پسند نہیں کروں گا مگر..... مجھے یقین ہے کہ وہ شیخ حامد سے اور زیادہ قریب ہونے کی خاطر بات کو غلط انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا موقع بھی ضائع نہیں کرے گا۔“

”آئی ڈونٹ کیئر فار دیٹ۔“ سراج نے تند لہجے میں جواب دیا پھر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

”شہر میں جو نئی وارداتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”وٹوک سے فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن..... میرا ذاتی خیال ہے اس میں حامد گروپ کے حریف گروپس میں سے کسی ایک کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈی آئی جی کرائمر کا جواب سن کر اس بات کا اطمینان ضرور ہو گیا کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں کم از کم میڈم روبی کا خیال نہیں ابھرا تھا۔



اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے بارہ کا عمل تھا جب الماس ایک رفاہی ادارے کی میٹنگ میں شرک کرنے کے بعد گھر واپس لوٹ رہی تھی، حسب معمول اس کی گاڑی کے اسپید میٹر کی سوئی پچھتر اور اتنی کلومیٹر کے درمیان متحرک تھی جب ایک موٹر کائنٹے ہوئے اچانک ایک کھٹار قسم کی پرانے ماڈل کی آسٹن اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔ الماس نے فل بریک لگا کر حادثے سے بچنے کی کوشش کی تو پیہوں کی چرچر اہٹ کی تیز آواز بلند ہو کر دور تک پھیلتی چلی گئی۔ اس کی گاڑی کا رخ بھی بدیل ہو گیا۔ جس روڈ سے اس نے واپسی کا راستہ اختیار کیا تھا اس پر اس وقت زیادہ ٹریفک نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی کوئی اور گاڑی موجود ہوتی تو ایکسیڈنٹ بھی ضرور ہوتا..... گاڑی کے رکنے اور گھومنے کے ساتھ ساتھ الماس کی کھوپڑی بھی گھوم گئی۔ وہ جھلا کر نیچے اتری اس نے طے کر لیا تھا کہ

آسٹن میں اگر کوئی نارزن کا پردادا بھی ہوا تو وہ اسے بھی معاف نہیں کرے گی۔ بڑے غصے میں لپکتی ہوئی وہ آسٹن کے قریب گئی۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ الماس کے ذہن میں کسی خطرے کا خیال تیزی سے ابھرا۔ گاڑی خالی دیکھ کر فوری طور پر اسے احساس ہو گیا تھا کہ یا تو وہ خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ اسے لاوارث چھوڑ دیا گیا..... یا پھر کسی نے اس کا راستہ بلاک کرنے کی خاطر دیدہ و دانستہ اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔ اس خیال کے ساتھ اس کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا۔ گاڑی سے باہر آتے وقت وہ اپنا لیڈیز اعشاریہ دو پانچ کا آئوٹینک پستول بھی اٹھانا بھول گئی تھی جو رات میں سفر کرتے وقت ہمیشہ برابر کی سیٹ پر ہی اس کی دسترس میں ہوتا تھا۔ اس نے جھلا کر واپسی کے لیے قدم اٹھائے لیکن ان تین نقاب پوشوں کو دیکھ کر رک گئی جو اس کو پوری طرح گھیر چکے تھے۔ قریب ہی فٹ پاتھ کے ساتھ ایک سیاہ رنگ کی وین بھی پارک نظر آ رہی تھی۔ ان کا چوتھا ساتھی یقیناً وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہوگا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ الماس نے اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دیے۔ اس وقت بھی اسے یہ خیال تھا کہ وہ ایک ڈینگ پولیس آفیسر کی بیوی ہے۔

”اپنا خادم ہی سمجھئے۔“ ایک درمیانہ قد نقاب پوش نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ انکار کی صورت میں ہمیں مجبوراً آپ کے جسم کو ہاتھ بھی لگانا پڑے گا۔“

”اوہ.....“ الماس نے چپچپے ہوئے انداز میں کہا۔ ”یقیناً کسی نے تمہاری خدمات بڑے بڑے لوگوں سے خریدی ہوں گی۔ میں تمہیں اس سے زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔ یہ بھی بتا دوں کہ میں ایک سینئر ڈی ایس پی کی بیوی ہوں جو بہر حال تمہیں تلاش کر لے گا اس کے بعد اپنا انجام بھی سوچ لو۔“

”ہمیں ساری تفصیل معلوم ہے لیکن آپ کو ہر صورت میں ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا.....“

ہمیں آپ کو پورے احترام سے اٹھانے کی ہدایت ملی ہے۔ آپ نے انکار کیا تو مجبوراً ہمیں طاقت استعمال کرنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟.....“ الماس نے جھلا کر پوچھا۔ وہ اب بھی ان تینوں سے مرعوب نظر نہیں آ رہی تھی۔

”جی ہاں..... کسی ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ فیصلہ کن لہجے میں جواب ملا تو الماس نے ایک لمحے کو کچھ سوچا۔ وہ گندے ہاتھوں کو اپنے جسم کے ساتھ دھینگا مشتی کی اجازت نہیں دے سکتی تھی اس لیے خاموشی سے قدم اٹھاتی وین میں جا کر پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئی..... دو مسلح نقاب پوش اس کی سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ایک آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر سیاہ وین سنان سڑک پر دوڑنے لگی۔ ڈرائیور خاصی برق رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ الماس صرف گزرتے وقت کا اندازہ لگاتی رہی۔ سیاہ وین کے سیاہ شیشوں کے سبب وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ راستوں کا تعین کر سکتی۔ بیس منٹ تک خاموشی رہی پھر الماس نے کچھ سوچ کر سامنے بیٹھے آدمیوں کو مخاطب کیا۔

”کیا تم کو علم ہے کہ تمہیں میرے اغوا کا حکم کن لوگوں نے دیا ہے؟“
 ”ہم صرف آم کھانے سے مطلب رکھتے ہیں..... پڑگنا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔“
 ”اور اگر آم بعد میں ترش ثابت ہوا تو؟“ الماس نے انہیں اپنی حیثیت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”ہم جس راستے کے مسافر ہیں اس پر پیچھے مڑ کر دیکھنا بیکار ہے۔“ دوسرے نے پہلو بدل کر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ہمیں اپنا آخری انجام بھی معلوم ہے اس لیے موت سے بھی ڈرنا حماقت ہی سمجھتے ہیں۔“

”عادی جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہو؟“ اس نے نفرت کا اظہار کیا۔
 ”ہم آپ کے اندازے کی تردید نہیں کریں گے۔“ جواب شانے اچکا کر انتہائی بے پروائی سے دیا گیا۔

الماس نے اس سے مزید بات کرنی مناسب نہیں سمجھی، دس منٹ مزید گزر گئے تو وین کے ڈرائیور نے ایک مخصوص انداز میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ یقیناً وہ اس بات کی سگنل ہو گا کہ وہ کامیاب واپس لوٹے ہیں۔ تین چار منٹ بعد وین بتدریج رفتار کم کرتے ہوئے رگ گئی۔ پہلے دونوں نقاب پوش نیچے اترے پھر ان کے اشارے پر الماس بھی باہر نکلے اس نے نظر گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ اس وقت وہ کسی چھوٹے مکان کے باہر ایسے احاطے میں کھڑی تھی جس کی چار دیواری کی اونچی دیواروں کے سبب باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے مکان کی سمت غور کیا جو درمیانہ درجے کا کوارٹر لگ رہا تھا۔

دونوں نقاب پوش اسے چند قدموں کے فاصلے پر کور کیے موجود تھے جب ان کا تیسرا ساتھی بھی اگلی نشست سے اتر کر سامنے آ گیا شاید اس مشن کا سربراہ وہی تھا۔

”میں شکر گزار ہوں میڈم کہ آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔“ اس نے سامنے آ کر الماس کو مخاطب کیا۔ ”اب آپ اندر چل کر ایک کمرے میں آرام کریں جہاں آپ کی چوکیداری کیلئے خاص لوگ موجود ہوں گے۔ ہمارے ذمے آپ کو بخیر و عافیت اسی کمرے تک پہنچانے کا حکم ملا تھا۔“

”پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو؟“ الماس نے مسکرا کر اس بات کا اظہار کرنے کی کوشش کی کہ وہ اب بھی خوف زدہ نہیں ہے۔

”میں نے آپ سے اندر چلنے کی درخواست کی تھی۔“ جواب میں اس کو اس ہاتھ سے مکان کی سمت اشارہ کیا گیا جس میں اعشاریہ تین آٹھ کا پستول بھی موجود تھا اس پر سائلنسر بھی فٹ تھا۔

الماس نے خاموشی سے قدم کوارٹر نما مکان کی طرف اٹھائے۔ اندر چار دوسرے نقاب پوش بھی موجود تھے جنہوں نے اسے ایک ایسے دس بائی دس کے کمرے میں پہنچا دیا جہاں ایک پلنگ کے علاوہ ایک میز اور دو کرسیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ اسی باتھ روم بھی تھا۔ وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک نقاب پوش اندر رہا باقی نے باہر جا کر دروازہ بند کر دیا تو الماس کو پہلی بار خطرے کا

احساس ہوا۔ اس نے قدرے ہچکچا کر نقاب پوش سے سوال کیا۔
 ”تم کب تک میرے سر پر مسلط رہو گے؟“

”پریشان مت ہوں.....“ نقاب پوش نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
 ”یہاں تک لانے والوں نے آپ کی تلاشی نہیں لی اس لیے میں اس وقت تک آپ کے ساتھ رہوں گا جب تک اصل آدمی نہیں آ جاتے..... وہ نہایت تفصیل سے آپ کی جامہ تلاشی لیں گے۔ اس کے بعد.....“ وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو کر مسکرانے لگا۔ اس کے زردی مائل دانت نمایاں ہو گئے۔

”اس کے بعد کیا ہوگا.....؟“ الماس نے اس کی مسکراہٹ پر تملکا کر سوال کیا۔
 ”ناگن اس وقت تک خطرناک ہوتی ہے جب تک اس میں زہر موجود ہو..... زہر نکل جانے کے بعد وہ بے ضرر ہو جاتی ہے۔“

”تم..... تم کیا بکواس کرنا چاہ رہے ہو.....؟“ الماس غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”مم..... میں نیچرل تصویروں کی بات کر رہا ہوں۔“ نقاب پوش کا لہجہ معنی خیز ہو گیا اس نے لپٹائی ہوئی نظروں سے الماس کے جسمانی نشیب و فراز پر نظر دوڑاتے ہوئے مستی بھرے لہجے میں کہا۔ ”خوبصورت عورتوں کا زہر بھی ان کے لباس میں ہوتا ہے..... لباس اتر جائے تو پھر زہر بھی تصویروں کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ناگن کسی کو ڈسنے کی غلطی بھی نہیں کرتی۔ اشاروں پر پھن بھاتی رہتی ہے۔“

الماس اس کا جواب سن کر کانپ اٹھی۔ اس کا مقصد بہت واضح تھا۔ اگر اغوا کرنے والے اس کی برہنہ تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر وہ زبان کھولنے کی پوزیشن میں نہ رہتی۔ سراج بھی بے بس ہو جاتا۔ الماس کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ کوئی ایسی صورت کہ وہ اغوا کرنے والوں کو ”بلیک میلنگ اسسٹ“ حاصل کرنے سے روک سکے نقاب پوش کا آخری جملہ سن کر اس کا سرا طنطنہ جھانگ کے مانند بیٹھنے لگا تھا۔

اسی لمحے کسی نے مخصوص انداز میں بند دروازے پر تین چار بار دستک دی تو نقاب پوش بھی الارٹ ہو کر دروازے کی طرف لپکا۔ اس کے ساتھ ہی الماس کے دل کی دھڑکنیں بھی ڈانوا ڈول ہونے لگیں۔



سوئم کی رسی کارروائی بھی ادا ہو گئی تو شیخ حامد نے سکون کا سانس لیا۔ اسے اپنی اہمیت اور وسیع تعلقات کے علاوہ اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ صبا بیگم نے خودکشی جیسا اقدام اٹھا کر اس کی قوت کو اندر سے کس قدر کمزور کر دیا تھا۔ اگر لاش کا پوسٹ مارٹم ہو جاتا اور زہر خورانی کی میڈیکل رپورٹ اخبارات کے ذریعے طشت از بام ہو جاتی تو پھر وہ قائل سرد خانے تک پہنچانے کے سلسلے میں دانتوں پینا آ جاتا جو پولیس کے اعلیٰ افسران اس سے ڈرتے تھے وہ بھی شیر ہو جاتے۔ اس کی بنی

بنائی ساکھ بھی خراب ہو جاتی۔ وہ فاتحہ خوانی کے بعد کچھ دیر آرام کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں گیا تو وہاں بھی فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ اس موقع پر وہ کسی کال کی جانب سے منہ بھی نہیں پھیر سکتا تھا اس کے خاص کارندے ان افراد کی فہرست تیار کر رہے تھے جو اس کے غم میں کسی زاویے سے بھی شریک ہوئے تھے۔ بذات خود وہ آنے جانے والوں کے چہرے اپنے ذہن میں محفوظ کر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں کچھ لوگوں کے چہرے رہ رہ کر ابھر رہے تھے۔ سیٹھ عثمان کے ساتھ اس نے دوبارہ میل ختم پیسا ہضم کرنے والی چال چلی تھی لیکن وہ اور راجیلہ بیگم بھی اس کے غم میں ہاتھ بٹانے کیلئے پیش پیش رہے تھے اور بھی کچھ حریف کاروباری افراد نے رسم دنیا نبھانے کی خاطر شرکت کی تھی لیکن دو جانے پہنچانے چہرے ایسے تھے جو ابھی تک سامنے نہیں آئے تھے۔ ایک ایس پی اورنگ زیب جس نے پوسٹ مارٹم کرانے کے سلسلے میں اس سے قانونی انداز میں کل کر گفتگو کی تھی پھر اپنی ناراضی کا اظہار کر کے اسے سلام کیے بغیر چلا گیا تھا۔ شیخ حامد بھی اس کے اونچے تعلقات سے بخوبی واقف تھا اس لیے اس نے بھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ دوسرا اہم نام میڈم روہی کا تھا۔

اس وقت وہ ان دونوں ناموں پر غور کر رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ شیخ حامد نے برا سامنہ بنا کر ریسیور اٹھایا لیکن دوسری جانب سے میڈم روہی کی آواز سن کر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بڑے سوگوار لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”شیخ حامد مجھے صبا بیگم کی موت پر دکھ کا صرف اظہار کرنا بڑی رکی بات لگتی ہے۔ آپ پر کیا گزری ہوگی؟ میں اس کا اندازہ بھی لگا سکتی ہوں برسوں کا ساتھ ایک نازک رشتے کے ٹوٹ جانے سے بڑا جال کھل ہوتا ہے۔ انسان کی نظریں برسوں اسے قرب و جوار میں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ میں اس حادثے سے دوچار ہو چکی ہوں اس لیے آپ کے دل کی کیفیت کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتی ہوں۔ اس موقع پر میں آپ کے غم میں برابر کی شریک ہوں اور اس بات کیلئے معذرت خواہ ہوں کہ ذاتی طور پر شریک نہیں ہو سکی۔ حوصلے سے کام لیجئے گا، وقت ہر ذمہ کیلئے تریاق بن جاتا ہے زندگی کے کاروبار چلتے رہتے ہیں۔ کوئی کسی کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر اس کے غم کی پیمائش نہیں کر سکتا جس پر گزر جاتی ہے وہی جانتا ہے۔“

”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے اس موقع پر مجھے فون کیا۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”یہ میرا فرض تھا۔“ دوسری جانب سے مرنے والی کی بخشش کیلئے دعا کی گئی۔

”کبھی تشریف لائیں، مجھے خوشی ہوگی۔“ شیخ حامد نے دبی زبان میں کہا۔ ”آپ کے شوہر خدا ان کی مغفرت کرے میرے واقف کاروں میں سے تھے۔ ہمارے درمیان کبھی کاروباری تعلق نہیں رہا لیکن جب بھی ملے کھلے دل سے ملے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ میڈم نے ایک سرداہ بھر کہا۔ ”وہ اکثر آپ کا ذکر کرتے تھے۔“

”کچھ وقت گزر جائے تو میں آپ کو باقاعدہ انوائسٹ کروں گا۔“

”اس تکلف کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ چالیسواں گزر جائے تو میں خود حاضری دوں گی۔“

کچھ دیر بعد گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا تو شیخ حامد بڑی سنجیدگی سے میڈم روہی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے ذہن میں فون پر اس کی سوگوار باتوں کا ایک ایک جملہ بار بار گونج رہا تھا۔ اس میں کوئی بناوٹ، کوئی دکھاوا نہیں تھا جس کا مطلب یہی لیا جاسکتا تھا کہ شاید وہ اپنے شوہر کی اندوہناک موت کی اصلیت سے ابھی تک واقف نہیں تھی۔ شیخ حامد خاصی دیر تک میڈم روہی کی باتوں کو مختلف زاویے سے اپنے اندازوں کی کسوٹی پر پرکھتا رہا پھر آنے والی کالوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لیاقت حسین سوتے سوتے اچانک اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا جیسے اس کا جسم بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہو۔ کچھ دیر تک وہ نئے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ انیسویں کے خوابناک ماحول میں فرحین اس کے برابر آرام دہ بستر پر بکھری پڑی تھی۔ شاید نئے ماحول نئی جگہ کی وجہ سے کسی انجانے احساس کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے ذہن کو جھک کر طویل انگڑائی لی پھر سونے کے ارادے سے دوبارہ لیٹا تو ایک مانوس آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”یہ وقت سونے کا نہیں ہے۔۔۔۔۔ تمہیں شاید اب رات بھر جاگنا پڑے۔“

”ہم زاد۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین کی زبان سے بے ساختہ یہی لفظ ادا ہوا۔ شاید اس لیے کہ جو آواز اس کے کانوں میں ابھری تھی وہ سو فیصدی اس کی اپنی آواز تھی جسے وہ دو موقعوں پر پہلے بھی سن چکا تھا۔

”میری بات غور سے سنو۔۔۔۔۔“ وہی آواز پھر اس کی قوت سماعت میں ابھری۔ ”فوری طور پر تیار ہو کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کو فون کر کے بلا لو۔“

”اس وقت؟“ لیاقت حسین نے دل ہی دل میں سوچا پھر اس خوبصورت دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی جس میں رات کے بارہ بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔

”سراج صاحب کو کوئی وجہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ تم کو کسی وجہ سے ان کی فوری مدد درکار ہے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“

”وقت کم ہے۔۔۔۔۔“ اس کا جملہ رد کر کے کہا گیا۔

”سراج صاحب کی گاڑی تم ڈرائیو کرنا۔۔۔۔۔ میں تمہاری رہنمائی کرتا رہوں گا۔“

”مگر صاحب اس وقت آنے کی وجہ ضرور دریافت کریں گے؟“ لیاقت حسین کے ذہن میں تجسس سا بیدار ہوا۔

”تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔ باقی باتیں میں سنبھال لوں گا۔ صرف ایک بات کا خیال

رکھنا کہ اگر تم ایک ہی وقت میں دو جگہ دیکھے جاؤ تو اس کے بارے میں صرف حیرت اور لاعلمی کا اظہار

کرنا۔ کوئی ایسی سیدھی توجیہ پیش کرنے کی حماقت نہ کرنا۔
”دو جگہ دیکھا جاؤں.....“ لیاقت حسین نے بوکھلا کر کہا۔ ”میں تمہاری بات کا مقصد نہیں سمجھا؟“

”میں تمہارا ہم زاد ہوں..... ہم زاد جسے تم شیطان یا جن..... جو چاہے سمجھ لو..... کہیں کتابوں میں یہ بھی لکھا ملے گا کہ وہ ہم شکل جو ہر انسان کے ساتھ ہی دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی رہتا ہے اور ساتھ ہی مر جاتا ہے۔ کچھ حریص لوگ اسے قابو کرنے کی خاطر ہزاروں جتن بھی کرتے ہیں۔“

”تم کفر کی باتیں کر رہے ہو.....“ لیاقت حسین کے وجود میں ایمان کی روشنی جگمگانے لگی۔
”کفر اور ایمان کے راستے بھی خدائے بزرگ و برتر نے وضع کیے ہیں۔ اسی لیے خالی انسان کو ہمارے سرکار علیہ السلام نے بھی نصیحت فرمائی ہے کہ دنیا میں یوں رہو جیسے کہ اپنی راہ چلتا مسافر..... اور یہ بھی فرمایا کہ ”تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے وہ اپنے ہاتھ (طاقت) سے روکے۔ اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے منع کرے..... اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے برا جانے جو ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے.....“ یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ ایک ظلم کدہ ہے اس کے بارے میں مت الجھو..... جیسا کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔ وقت گزر گیا تو ایمان پر حرف آ جائے گا۔ کفر ہی کفر باقی رہ جائے گا۔“

لیاقت حسین کا ذہن الجھنے لگا۔ وہ کسی ہم زاد کے تصور پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن کسی بزرگ کی ایک ملاقات کے بعد اس کے ساتھ جو بھی ہوا۔ ہوتا رہا اسے وہ فراموش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر موقع پر اسے نیکیاں، نیکیاں ہی نظر آتی تھیں، جو کچھ بھی اسے یاد تھا ہر بار اسے حیرت میں مبتلا کر دیا کرتا تھا..... وہ دونوں صورتوں میں مجبور تھا۔ اسے زبان کھولنے سے روک دیا گیا تھا۔ اگر وہ حکم عدولی کرتا تو شاید ان نعمتوں سے محروم کر دیا جاتا جو منجانب اللہ ہی اسے حاصل ہوئی تھیں..... جو ذریعہ بنا تھا اس میں بھی مشیت ایزدی کو دخل تھا..... گزری باتیں یاد آئیں تو وہ تیزی سے اٹھا..... سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کی مہربانی تھی جو اسے فون کی سہولت بھی فراہم کر دی گئی تھی۔ اس نے ٹائٹ بلب کی روشنی میں جلدی جلدی سراج کے گھر کے نمبر گھمانے شروع کر دیے۔ جلدی کس بات کی تھی؟ اسے خود بھی اس کا کچھ علم، کوئی اندازہ نہیں تھا۔ کوئی نادیدہ قوت تھی، کوئی روحانی طاقت جو اسے عمل کرنے پر اکسا رہی تھی، ذہن عجیب کشمکش سے دو چار تھا۔

”ہیلو..... سراج!“ دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔ وہ کسی وجہ سے ابھی تک جاگ رہا تھا۔

”سر..... م..... میں لیاقت حسین بول رہا ہوں۔“ اس نے قدرتی طور پر بوکھلائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”سب خیریت تو ہے.....؟“ سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”تم کچھ بوکھلائے ہوئے

لگ رہے ہو؟“
”جتنی جلدی ممکن ہو میری انکیسی پر آ جائیں..... میں ریسپورر رکھ کر باہر دروازے کی طرف جا رہا ہوں۔“

”بات کیا ہے.....؟“ سراج نے بے چینی سے معلوم کیا، لیکن سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔
سراج اس وقت سونے کی تیاری کر رہا تھا، لیکن لیاقت حسین کے فون نے کسی خطرے کا احساس دلایا۔ اگر بات اہم نہ ہوتی تو رابطہ اس قدر غلط میں نہ ختم کیا جاتا۔ سراج کے ذہن میں ہزاروں وسوسے جاگ اٹھے۔ اس نے دیر نہیں لگائی۔ اپنا سروس ریوالور نکلیے کے نیچے سے نکال کر جیب میں ڈالتے ہوئے برق رفتاری سے باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پتکے سے باہر نکلا پھر اس نے حالات کے پیش نظر نہایت برق رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ لیاقت حسین نے اسے فوری پہنچنے کی تاکید کی تھی، صرف اپنی انکیسی کا حوالہ دیا تھا۔ کوئی تفصیل بتائے بغیر لائن کاٹ دی تھی۔ ان باتوں کی روشنی میں سراج کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ بات اہم نہ ہوتی تو لیاقت حسین بھی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ نہ کرتا۔

بیس منٹ بعد وہ سیٹھ عثمان کے برابر والے پتکے پر پہنچا تو لیاقت حسین اسے باہر ہی کھڑا نظر آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ستا نظر آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے لیاقت حسین؟“ سراج انجن بند کیے بغیر تیزی سے اتر آیا۔ ”فرصت تو خیریت سے ہے؟“

”مم..... مجھے کچھ نہیں معلوم صاحب.....“ لیاقت حسین نے مصیبت سے اپنی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا، پھر لپک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سراج کو مجبوراً دوسری نشست پر بیٹھنا پڑا۔ اس کی انجمن بڑھتی جا رہی تھی۔ لیاقت حسین نے پہلے بھی اتنی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔
کہاں چل رہے ہو.....؟“ اس نے لیاقت حسین کو جھلا کر مخاطب کیا۔ ”اصل بات کیا ہے؟ کچھ بتانے سے کیوں گھبر رہے ہو؟“

”میں..... سچ کہہ رہا ہوں صاحب۔“ لیاقت حسین نے روفار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کہیں پہنچنے کا حکم ملا ہے۔ کہاں؟ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔“

سراج نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ اگر اس خود اپنی نظروں سے دو تین موقعوں پر لیاقت حسین کو ایسی ہی کیفیت سے دو چار نہ دیکھا ہوتا تو شاید وہ اس کے ساتھ اس وقت کوئی نرم سلوک نہ کرتا۔ کچھ سوچ کر سراج نے خاموشی اختیار کر لی۔ اسے حیرت تھی کہ لیاقت حسین بار بار یہی جملہ دہرا رہا تھا کہ اسے کچھ نہیں معلوم پھر..... وہ گاڑی کو مختلف راستوں سے کس طرف لے جا رہا تھا؟

دس بارہ منٹ بعد لیاقت حسین نے بالکل مشینی انداز میں گاڑی..... خلاف معمول خاصی اونچی چار دیواری والے مکان کے پھانک کے قریب روکی اور برق رفتاری سے دروازہ کھول کر اتر گیا۔ سراج نے احتیاط سے کام لیا، وہ گاڑی سے اتر کر اس کی آڑ میں کھڑا رہا۔ حالات کو پوری طرح سمجھے

سراج نے الماس کو روانہ کرنے کے بعد متعلقہ حلقے کے تھانے کو فون کر کے جائے وقوعہ پہنچنے کی ہدایت کی پھر وہ الماس کے اغوا کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ ذلیل حرکت کون کر سکتا ہے؟ اس کے ذہن میں صرف شیخ حامد کا نام بار بار ابھر رہا تھا، اس وقت وہ جس مکان میں کھڑا تھا وہ بھی ڈی ایس بی لودھی کے حلقے میں آتا تھا۔ وہ چاہتا تو ملحقہ تھانے کے عملے کو گھر جا کر بھی کسی اور کے ذریعے ان مسلح نقاب پوشوں کی اطلاع دے سکتا تھا لیکن اس وقت اس پر ایک جنوب سوار تھا۔ الماس اس کی بیوی تھی، وہ اس کے اغوا کے معاملے میں مصیحتوں کو نظر انداز کرنے پر پوری طرح آمادہ تھا۔ ضمن نے چمپ کرکیتی سے اس پر وار کیا تھا۔ وہ انہیں لٹا کر جواب کا معمم ارادہ کر چکا تھا۔

پندرہ منٹ کے اندر تھانہ انچارج انسپٹر دانش چار مسلح سپاہیوں کے ساتھ آ گیا۔ کسی زمانے میں وہ سراج کا سب سے پسندیدہ اور قابل اعتماد ماتحت بھی رہ چکا تھا۔

”سر..... آپ؟“ اس نے سراج کے قریب جا کر سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی گاڑی نظر نہیں آ رہی۔“

”اطمینان سے سب سمجھا دوں گا..... پہلے اپنے لودھی صاحب کو خبر ہونے سے پہلے ان مجرموں کی باقاعدہ پرچی تیار کر لو۔“

انسپٹر نے سب کے نقاب اتار کر دیکھے۔ تینوں نقاب پوش پولیس کو مطلوب مجرموں کی فہرست میں درج تھے، ان کے بعد انسپٹر دانش ایک سادہ لباس والے کو دیکھ کر چونکا۔

”یہ فرنانڈس اس وقت یہاں کیسے آ گیا؟“

”کون ہے یہ.....؟“ سراج نے تیزی سے سوال کیا۔

”یہ ایک بدنام فوٹو گرافر ہے۔ سر۔ شرفا کو بلیک میل کرنے کیلئے خاصا مشہور بھی ہے، ہم ایک عرصے سے اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کیلئے جال بچھا رہے تھے، پھر ہماری ہی ایک لیڈی کا ٹیلیفون نے

بھیس بدل کر اسے رنگے ہاتھوں پکڑوا دیا۔ ہم نے اس کا دس روز کا ریمانڈ لے رکھا ہے۔ اس کا یہاں ہونا حیرت انگیز ہی ہے۔ یہ جیل کی سلاخوں سے باہر کیسے آیا.....؟“

”تم ضابطے کی کارروائی کرو۔“ سراج نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”کاغذات میں میرا نام بھی خاص طور سے لکھ دو۔ کہانی میں بتاتا ہوں، میں ادھر کسی سے ملنے آیا تھا، کسی لڑکی کے زور زور سے شور

مچانے کی آواز سن کر ادھر آیا تو لڑکی نظر نہیں آئی۔ شاید بچانے والوں کو بروقت صورتحال کی اطلاع مل گئی تھی جو خاموشی سے لڑکی کو لے گئے۔ اغوا کرنے والوں کا حال دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ لڑکی کو بچانے والے نہ صرف مسلح تھے بلکہ تعداد میں بھی زیادہ تھے۔ انہوں نے قتل و غارت سے بچنے کی

خاطر اغوا کرنے والوں کو جس ہال میں پہنچایا وہ تمہارے سامنے ہے۔“ سراج نے انسپٹر دانش کو ایک فرضی کہانی سناتے ہوئے کہا۔ ”کاغذات میں اس بات کا ذکر ضرور کرنا کہ فرنانڈس ریمانڈ پر تھا لیکن موقع واردات پر بھی وہ کمرے سمیت موجود پایا گیا۔“

”سر.....“ دانش نے کچھ کہنا چاہا لیکن سراج نے افسرانہ انداز میں اس کو بولنے کا موقع نہیں

بغیر وہ غلت میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا پھر..... اس نے دیکھا کہ لیاقت حسین مکان کے پھانک کے کھلے سے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سراج بھی لپکا۔ اس کی نظریں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا، وہ بھی پھانک کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو ایک لمحے کو خشک کر رک گیا، دو مسلح نقاب پوش محن میں بے ہوش پڑے دیکھ کر اسے خطرے کا اندازہ بھی ہو گیا۔ وہ سنبھل کر سامنے کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو اس کو اپنی نظروں پر بھی یقین نہیں آیا۔ الماس اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی، کمرے میں اس کے علاوہ ایک اور مسلح نقاب پوش بھی موجود تھا۔ دو سادہ لباس والے اور ان کے قریب ہی فوٹو گرافری کا کچھ سامان بھی بکھرا پڑا تھا۔ وہ تینوں بھی بے سدھ نظر آ رہے تھے۔ الماس کی نظریں لیاقت حسین پر جمی ہوئی تھیں۔ سراج کو اندر آتا دیکھ کر وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ لیاقت حسین کی طرف اشارہ کر کے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے..... انک انک کر بولی۔

”اگر..... یہ وقت پر نہ آ جاتا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ خدا نے اسے فرشتہ بنا کر میری مدد کو بھیج دیا۔“

سراج کو موقع کی نزاکت سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ لیاقت حسین خاموشی سے مشنی انداز میں باہر نکل گیا۔ اس نے الماس کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”یہ..... یہ..... بد معاش مجھے اغوا کر کے لائے تھے۔“ الماس نے بیہوش افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کے ارادے نیک نہیں تھے، اگر لیاقت حسین وقت پر نہ آ جاتا تو.....“

الماس کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر اس نے بڑی حیرت سے کہا۔ ”مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ تنہا لیاقت حسین نے ان تین مسلح نقاب پوشوں اور ان کے دو ساتھیوں کو کس طرح قابو کیا۔ دو تین فائر بھی کیے گئے تھے لیکن لیاقت حسین حیرت انگیز طور پر ان کے نشانے کی زد میں نہیں آ سکا پھر..... سب کو

ٹھکانے لگانے کے بعد شاید وہ آپ کو فون کرنے چلا گیا تھا۔“

الماس کی بات سن کر خود سراج بھی چکرا گیا۔ لیاقت حسین اس کے ساتھ اپنے گھر سے اسی کی کار میں بیٹھ کر آیا تھا۔ پھر، دوسرا لیاقت حسین کون تھا.....؟ اسے میڈم روبی کے اغوا کیے جانے کا

واقعہ یاد آ گیا۔ اس وقت بھی اس نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ گاڑی سے نیچے اترا تھا لیکن اس وقت کا معاملہ زیادہ پیچیدہ تھا۔ سراج نے اس پر غور کرنے کے بجائے الماس کو ہاتھ تھام کر

باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لیاقت اس کی کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں خوابیدہ خوابیدہ سی نظر آ رہی تھیں، چہرہ بھی جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔

”لیاقت حسین.....“ سراج نے الماس کو پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد..... اس کے قریب جا کر کہا۔ ”تم بیگم صاحبہ کو میرے گھر چھوڑ دو اور میرے آنے تک تم بھی وہیں ٹھہرنا۔“

لیاقت حسین نے صرف اثبات میں سر کو خفیف سی جنبش دی پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے دوبارہ کھلی سڑک پر آ گیا۔ راستے میں اس کے اور الماس کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

”میں کاغذات پر بطور گواہ دستخط کرنے کو بھی تیار ہوں..... اس واردات کی پشت پر مجھے کچھ اپنوں کے چہرے بھی نظر آرہے ہیں۔“

”شاید ڈی ایس پی صاحب اسے پسند نہ کریں۔“ دانش ہچکچا کر بولا۔ ”ویسے بھی وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ آپ کا نام آجانے کے بعد.....“

”اوکے.....“ سراج نے دوسرا حربہ اختیار کیا۔ ”اگر تم کو کسی بات کا اندیشہ لاحق ہے تو میں براہ راست ڈی آئی جی کراٹمز کو فون کر کے یہاں آنے کی درخواست کروں گا..... پھر وہی سب درج کیا جائے گا جو اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں۔“

ڈی آئی جی کراٹمز کا حوالہ سننے کے بعد انسپکٹر نے ویسے ہی کاغذات تیار کیے جو سراج چاہتا تھا، حقیقت بھی وہی تھی، تفصیل میں بدنام فونو گرافر فرنانڈس کا نام بھی تحریر میں لایا گیا جو دس روز کیلئے حوالات میں بند کیا گیا تھا۔ سراج نے بطور گواہ اس مشیر نامے پر دستخط کرنے کے بعد انسپکٹر سے کہا۔

”میں موقع کا عینی گواہ ہوں، کاغذات پر میرے دستخط بھی ہیں، اسے کسی صورت میں بدلنے کی حماقت نہ کرنا..... ہو سکے تو اس کی ایک نقل مجھے بھی فراہم کر دینا..... میرا وعدہ ہے کہ تمہاری اجازت کے بغیر اسے کہیں استعمال نہیں کروں گا۔ یہ بات آف دی ریکارڈ ہے۔“

”ایک چھوٹی سی درخواست کروں گا سر.....“ مجرموں کی گرفتاری، ان کے پاس سے برآمد ہونے والے اسلحے کی تفصیل وغیرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے سراج کو ایک طرف علیحدگی میں جا کر درخواست کی۔ ”اگر ممکن ہو تو آپ میری اپنے حلقے کے کسی بھی تھانے میں پوسٹ کرادیں۔“

”کوشش کروں گا لیکن..... کاغذات کی ایک کاپی کا وعدہ یاد رکھنا۔“

”آپ کیسے جائیں گے..... آپ کی گاڑی.....“

”قریب ہی اس جگہ موجود ہے جہاں میں کسی سے ملنے آیا تھا۔ لڑکی کی چیخوں کی آواز سن کر میں نے گاڑی پر آنا مناسب نہیں سمجھا۔“ سراج نے بڑی خوبصورت سی ایک فرضی کہانی گھڑتے ہوئے کہا۔ ”لیکن افسوس..... دوسری پارٹی میرے آنے سے پہلے ہی لڑکی کو بچا کر لے گئی ورنہ کیس زیادہ مضبوط ہو جاتا.....“

”میں کوشش کروں گا سر کہ فرنانڈس کی زبان کھلوا سکوں، وہ یقیناً پوری تفصیل سے واقف ہو گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس بار سراج نے بے تکلفی سے انسپکٹر دانش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مدہم آواز میں دریافت کیا۔ ”کیا اس واردات میں تمہارے لودھی صاحب کی شرافت کا بھی کوئی دخل نہیں ہوگا؟“

”میں آپ سے متفق ہوں سر۔“ انسپکٹر نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ”کئی موقعوں پر

موصوف ہی کی وجہ سے فرنانڈس پر ہمارا ریڈ کا میاب نہیں ہو سکا۔ جب مجرموں اور ہمارے ڈانڈے ملے ہوں تو پھر ان کو گرفت میں لانا بھی آسان نہیں ہوتا۔“

انسپکٹر دانش دوبارہ سراج کو سیلوٹ کر کے اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ مجرموں کی گاڑی بھی اسی کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ سراج نے سڑک تک پیدل مارچ کیا پھر اتفاق سے ملنے والی ایک خالی ٹیکسی پکڑ کر گھر آ گیا جہاں الماس بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

لیاقت حسین کو دوسرے کمرے میں بٹھایا گیا تھا، سراج کے اصرار پر الماس نے بے کم وکاست پوری تفصیل بیان کر دی۔

”پریشان مت ہو لیکن آئندہ کسی پولیس گارڈ کو کچھ عرصے تک ساتھ رکھو تو زیادہ مناسب ہو گا۔“ سراج نے کسی تھے ہوئے طوفان کی طرح خود کو بکھرنے نہیں دیا۔

”یہ کن لوگوں کی حرکت ہو سکتی ہے؟“

”تم فکر مت کرو..... وہ جو بھی ہوئے میں انہیں سمندر کی تہ سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا.....“

سراج لیاقت حسین کی طرف جانے کیلئے گھوما تو الماس نے اسے روک کر سنجیدگی سے پوچھا۔

”یہ لیاقت حسین کیا کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہے؟“

”ہاں.....“ سراج نے فوری جواب دیا۔ ”میں بھی کئی موقعوں پر ایسا ہی محسوس کر چکا ہوں لیکن..... آدمی ایماندار، نڈر اور بے خوف بھی ہے۔ عثمان کو بھی اسی کی ذہانت موت کے منہ سے بچانے میں کام آئی تھی لیکن کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کر جاتا ہے جو سمجھ میں نہیں آتیں..... تم سے کیا کہہ رہا تھا؟“

”پوچھ رہا تھا کہ اس وقت وہ ہمارے گھر کس طرح آ گیا؟“

”کیا..... اسی نے تمہا سب پر قابو پا لیا تھا؟“ سراج نے اپنی تسلی کیلئے پوچھا۔

”ہاں..... مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔“ الماس نے بتایا۔ ”غالب پوش مسلح تھے اس لیے وہ ایک نہتے آدمی کو دیکھ کر اسے گھیرنا چاہتے تھے مگر..... جب دو زمین بوس ہوئے تو تیسرے نے دوبار گولی بھی چلائی تھی لیکن تیسرا فائر کرنے کی حسرت پوری نہ کر سکا، لیاقت حسین کا الٹا ہاتھ حرکت میں آیا تو وہ بھی بے ہوش ہو گیا۔ سادہ لباس والوں کے ساتھ اس کا سلوک ناقابل یقین ہی تھا۔ اس نے ان دونوں کی گردنیں ہاتھ میں دیوبچ کر پوری قوت سے ایک دوسرے سے ٹکرا دی تھیں۔ دونوں پلک جھپکتے میں ڈھیر ہو گئے، اس کے بعد وہ شاید آپ کو اطلاع کرنے چلا گیا تھا مگر آپ اتنی جلدی.....“

”میں اسے گھر چھوڑ کر آتا ہوں پھر تفصیل سے بات کروں گا۔“ سراج نے بات ٹالتے ہوئے جواب دیا پھر دوسرے کمرے میں آ گیا جہاں لیاقت حسین کسی ذہنی الجھن میں مستغرق نظر آ رہا تھا۔ سراج کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گھر جاتے ہوئے راستے میں بھی وہ کسی ذہنی نگہکش میں مبتلا تھا۔

سراج کو اس بات کا اندازہ تھا کہ کوئی روحانی قوت اس کی مدد کر رہی تھی اس لیے اس نے لیاقت حسین سے زیادہ سوال جواب بھی نہیں کیے۔ البتہ لیاقت حسین سے زیادہ سوال جواب بھی نہیں

”مسٹر لودھی کے فون کے بعد انسپکٹر دانش نے بھی کال کی تھی وہ..... وہ کچھ بوکھلایا بوکھلایا محسوس ہو رہا تھا۔“

”بیٹھے جاؤ.....“ اس نے کچھ سوچ کر کہا پھر دراز سے اپنا خاص موبائل نکال کر کسی کے نمبر پر گھونکے، اس کی نظریں بدستور پرسنل سیکرٹری کے چہرے پر منڈلا رہی تھیں جو روزانہ صبح اسے مسکراتی نظروں سے خوش آمدید کہہ کر استقبال کرتی تھی۔ اس کا انتخاب خود شیخ حامد نے چند ماہ پیشتر کیا تھا۔ خوبصورت جسم کی مالک تھی، اگر ماڈلنگ کی فیلڈ اختیار کرتی تو تہلکہ مچا دیتی۔ اس کے جسمانی نشیب فراز میں جنس مخالف کیلئے شش کوٹ کوٹ کر بھری تھی، شیخ حامد نے پہلی ہی نظر میں اس کا انتخاب کر لیا تھا، اس کی تنخواہ بھی خود مقرر کی تھی، اس کا نام کنول تھا، خود بھی وہ کنول کے پھول ہی کی طرح سرسبز و شاداب نظر آتی تھی۔ وہ کسی معصوم کا خواب تھی۔ کسی ماہر سنگ تراش کا حسین شاہکار تھی۔ اس کے گال کا گداز دلوں پر بجلی گراتا تھا۔ کنول کا پھول گدلے تالاب میں کھلتا ہے۔ کنول نے بھی ایک غریب گھر میں جنم لیا تھا، اسے اپنی قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ نایاب ہیرا تھی، پکھراج تھی، صاف و شفاف اور خوشنما موتی تھی جسے شیخ حامد نے اپنے لیے وقف کر لیا تھا، اتنی تنخواہ مقرر کر دی تھی کہ کوئی دوسرا گا ہک اس کی بولی نہ لگا سکے۔ بڑے بڑے سودے کرتے وقت جب سامنے والی پارٹی چہرہ پھر کرتی تو وہ اسے کام کے بہانے اپنے آفس میں طلب کرتا۔ سودا کرنے والا اپنا نفع نقصان بھول کر کنول کی ایک جھلک دیکھ کر موم ہو جاتا۔ معاہدے پر دستخط کرنے سے اس کی ساری حجت ہل پھر میں دور ہو جاتی۔

کنول شیخ حامد کیلئے بیر چیک تھی لیکن ابھی تک اس نے اسے کیش نہیں کیا تھا، وہ چاہتا تو روپیہ ریزگاری بھی بن سکتا تھا لیکن اس نے سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح نہیں کیا..... اس پارس پتھر کو سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کی نظریں اس وقت کنول کے چہرے پر بہک رہی تھیں جب دوسری جانب سے کال ریسپونڈ کی گئی۔ شیخ حامد نے منہ پر ہاتھ رکھ کر مدھم آواز میں کوئی کوڈ استعمال کیا پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

”لودھی مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے..... اور انسپکٹر دانش نے میرے نمبر ملانے کی حماقت کیوں کی؟“

جواب میں جو کچھ کہا گیا اسے سن کر شیخ حامد کے چہرے پر کھنچاؤ کی کیفیت تیزی سے ابھرنے لگی، اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی سرخی اس بات کی علامت تھی کہ وہ بڑی مشکل سے کسی بات کو زبردستی حلق کے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کنول اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی۔ خاصی دیر تک شیخ حامد دوسری جانب سے سنائی جانے والی کہانی سن کر ہونٹ چباتا رہا پھر بڑے سرد لہجے میں بولا۔

”دونوں نمک حراموں کو منع کر دو کہ بھول کر بھی مجھ سے ملنے یا فون کرنے کی حماقت نہ کریں..... ڈونٹ دری..... میں اسے بھی سنبھال لوں گا..... اتنی جلدی نہیں..... حالات کے پیش نظر

کیے۔ البتہ لیاقت حسین نے اس سے بھی یہی پوچھا تھا کہ وہ کچھ دیر پیشتر گھر پر سو رہا تھا پھر..... سراج کے گھر کس طرح پہنچ گیا؟ جواب میں سراج نے کہا تھا کہ وہ خود اسے کسی کام سے لایا تھا، لیاقت حسین کو شاید سراج کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اس نے مزید کچھ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی لیکن سراج محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو.....؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا صاحب۔“ لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ”کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی کھائی درمیان میں آگئی ہو جسے میں عبور نہیں کر پاتا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ سراج نے مسکرا کر کہا۔ ”جس وقت میں تم کو لے گیا تھا اس وقت تم شدید نیند کی کیفیت سے دوچار تھے۔ اسی لیے الجھ رہے ہو..... گھر جا کر آرام کرنا۔ صبح تک تم بالکل تازہ دم ہو جاؤ گے۔“

لیاقت حسین نے جواب میں مزید کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اپنا ارادہ ملتوی کر کے پیچھے بھاگتی ہوئی سڑک پر نظریں جمادیں۔



شیخ حامد کی گاڑی حسب معمول پارکنگ الاٹ کے اس حصے میں رکی جو اس کیلئے مخصوص تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو مسلح گاڑ تیزی سے اتر کر نیچے آ گئے۔ انہوں نے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد ڈرائیو کو گرین سگنل دیا جس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ شیخ حامد بڑے مطمئن سے نیچے اتر کر ایک گاڑ کے ساتھ اس لفٹ میں سوار ہو گیا جو اس نے ذاتی خرچ سے صرف اپنے آفس تک جانے کیلئے لگوائی تھی۔ لفٹ سے ایک منٹ بعد باہر نکل کر سیدھا اپنے ذاتی آفس میں داخل ہوا۔ اس وقت وہ بے حد پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اپنی آرام دہ نشست پر بیٹھنے کے بعد اس نے حسب عادت نظر گھما کر وہاں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا پھر سامنے رکھی ہوئی فائل کو کھولنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کی خوبصورت پرسنل سیکرٹری اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی جو شیخ حامد کیلئے غیر متوقع تھی۔

”خیریت.....“ اس نے پرسنل سیکرٹری کو مخاطب کیا۔ ”تم آج صبح ہی صبح بھی بھیجی کیوں نظر آ رہی ہو؟“

”ڈی ایس پی لودھی کا فون دوبار آچکا ہے۔ وہ آپ سے فوری طور پر ملاقات کرنے کا خواہش مند ہے۔“

”تم نے وجہ نہیں دریافت کی؟“

”کی تھی لیکن..... وہ کوئی خاص اطلاع ہوگی جو وہ صرف آپ کو دینا چاہتا ہے۔“

”اس کے فون سے تمہاری سنجیدگی کا کیا تعلق ہے.....؟“ اس نے تیز نظروں سے پرسنل سیکرٹری کو کرید۔

ٹھنڈا کر کے کھانے کی ضرورت ہے..... نہیں، اس پر صرف نظر رکھو۔ اس نے چار بار کسی منحوس سیاہ بلی کی طرح میرا راستہ کاٹنے کی غلطی کی ہے..... ٹھیک ہے، میں تمہیں دوبارہ کال کروں گا۔“ شیخ حامد نے موبائل آف کر دیا۔ اس کے چہرے پر بڑی خوفناک سنجیدگی طاری تھی۔

”کیا ہوا سر؟“ کنول نے مصحومیت سے پوچھا۔ ”کوئی بری خبر ہے؟“
”نہیں..... شیخ حامد نے اسے دیکھ کر بڑے زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں بری خبروں پر بھی مسکرانے کا عادی ہوں۔ بزنس میں نفع و نقصان ہوتا رہتا ہے لیکن..... میں بساط کا رخ پلٹنے کے فن سے بھی واقف ہوں۔“

”کیا میں آپ کے کسی کام آ سکتی ہوں.....؟“
”ہاں.....“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”تم اپنے دفتر میں جا کر آرام کرو..... کوئی ملنے آئے تو مجھ سے پوچھتے بغیر ہی اسے منع کر دینا۔“

”ایز یو دس سر.....“ کنول اٹھ کر لہراتی بل کھاتی چلی گئی تو شیخ حامد کسی بھوکے شیر کی طرح اٹھ کر دفتر میں ٹپٹنے لگا۔ موبائل پر اسے بلیک ٹانگیر نے الماس کے انوار..... سراج اور لیاقت حسین کی بروقت مداخلت اور لودھی کی کمزور پلاننگ کے علاوہ ان قانونی کاغذات کے بارے میں بھی پوری تفصیل دہرا دی جس پر سراج نے بھی بطور گواہ دستخط کیے تھے..... لیاقت حسین کے بارے میں کچھ ایسی ناقابل یقین کہانی بھی سنائی تھی جس پر شیخ حامد کو پوری طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر وہ اپنے وسیع و عریض آفس میں ٹھہلا رہا، پھر اس نے فون کر ریسپورڈ اٹھا کر مرکزی وزیر داخلہ سے براہ راست رابطہ قائم کیا۔ ”میں شیخ حامد یول رہا ہوں۔“ اس نے دوسری جانب سے وزیر داخلہ کی آواز سن کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بہت عرصے بعد آپ کو ایک چھوٹی سی زحمت دے رہا ہوں۔“

”تکلف چھوڑیں شیخ صاحب۔“ دوسری جانب سے بے تکلفی سے پوچھا گیا۔ ”یہ فرمائیں، کام کیا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں کہ ایس پی اورنگ زیب کو فوری طور پر کسی دوسرے صوبے میں ٹرانسفر کر دیا جائے۔“

”نہایت..... ابھی تو وہ تبادلہ ہونے کے بعد ہی تعینات ہوا ہے۔ اتنی جلدی اس سے کیا شکایت ہو گئی؟“

”کیا میں نے کوئی مشکل کام کہہ دیا ہے.....؟“ شیخ حامد نے چپے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔
”آپ کو شاید اس کے بارے میں پوری طرح علم نہیں ہے۔“ تھوڑے توقف سے کہا گیا۔ ”مرکز میں اس کے بھی کچھ واقف کار اور ایک دو عزیز دار بھی اونچے عہدے پر تعینات ہیں اس لیے فوری طور پر اسے ہٹانا مشکل ہے۔ ویسے بھی پولیس کی بساط پر کسی ایس پی کی حیثیت گھوڑے جیسی ہوتی ہے جو ہر سمت ڈھالی گھر بھلا تک سکتا ہے، آپ اگر اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کریں

تو بہت فائدے میں رہیں گے۔“

”میرے لائق کوئی خدمت ہو عرض کریں۔“ شیخ حامد نے موضوع بدل کر سنجیدگی سے کہا۔
”آپ شاید خفا ہو گئے..... میں آپ کو پھر کسی وقت تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“ وزیر داخلہ نے جواب دیا۔ ”اس وقت ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ ویسے میں کوشش کروں گا اورنگ زیب خود آپ سے مل کر.....“

”بہت شکریہ چودھری صاحب!“ شیخ حامد نے اس بار خشک انداز میں جواب دیا۔
”میں اس سے ملنا پسند نہیں کروں گا۔“ اس نے اپنا جملہ مکمل کر کے ریسپورڈ ایک طرف ڈال دیا پھر موبائل اٹھا کر اس پر..... بلیک ٹانگیر کے نمبر ملائے، ضروری پاس ورڈز کے تبادلے کے بعد اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”فرٹائڈس کو پہلی فرصت میں زہر دے کر ختم کر دو..... اس کو کسی بیان دینے کیلئے عدالت تک جانے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔“

”نہیں ملے گا باس.....“ دوسری جانب سے سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”اس کا دوپہر کا کھانا اس کی زندگی کی آخری خوراک ثابت ہوگا۔“

”جن نقاب پوشوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان کے ساتھی اپنے آدمیوں کو پولیس کسٹڈی سے چھڑانے کیلئے تھانے پر حملہ بھی کر سکتے ہیں۔“ شیخ حامد کا جملہ معنی خیز تھا۔ ”تھانے میں شعلے بھڑکیں گے تو قانونی کاغذات بھی راکھ ہو جائیں گے..... کوئی سنسناتی ہوئی گولی..... انکسٹر دالیں کیلئے بھی پیغام اجل ثابت ہو سکتی ہے..... بطور گواہ دستخط کرنے والے کو میں خود دیکھ لوں گا۔ ابھی اس کو کچھ دن اور خوش ہو لینے دو کہ اس کی عزت کی دجیاں اڑتے اڑتے رہ گئی ہیں۔“

”جس نے چوتھی بار راستہ کاٹا ہے، اس کیلئے کیا حکم ہے.....؟“
”اسے بھی گئی جتنی باقی سانسیں پوری کر لینے دو۔“ شیخ حامد کسی زخمی ناگ کی طرح پھینکا رہا پھر اس نے موبائل آف کیا، ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے شبنم کو فوری طور پر اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں بلوانے کا فیصلہ کر لیا۔



ایس پی اورنگ زیب اور سراج اس وقت ڈی آئی جی کرائمر کے آفس میں موجود تھے۔ انہیں فون پر کال کیا گیا تھا۔ دونوں پندرہ منٹ کے وقفے سے آگے پیچھے آغا منظور کے دفتر میں داخل ہوئے۔ تینوں افسران اپنی اپنی جگہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہے تھے خاص طور سے اورنگ زیب زیادہ اکھڑا اکھڑا نظر آ رہا تھا۔ اسے اپنے ذرائع سے خبر مل گئی تھی کہ شیخ حامد نے براہ راست وزیر داخلہ سے اس کے فوری تبادلے کی درخواست کی تھی۔ اس کے علاوہ دوپہر کو ایک پولیس چوکی پر ہونے والی خونخوار واردات کی تفصیل بھی اسے مل چکی تھی جس میں سلاخوں کے پیچھے بند ایک قیدی کی موت کے بعد اس کے جتنے کے لوگوں نے پھر کر حملہ کر دیا تھا، کچھ شر پسند عناصر جو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، پولیس نے اپنے دفاع کے لیے آنسو گیس کے شیل کے علاوہ

بے دریغ ہوائی فائرنگ کر کے حملہ آوروں کو تھانے میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پھرے ہوئے لوگوں کا سیلاب ساری بندشوں کو توڑ کر تھانے میں داخل ہوا پھر وہاں توڑ پھوڑ کرنے کے بعد آگ بھی لگا دی گئی۔ تھانہ انچارج انسپٹر دانش کو ایک گولی نے زندگی کی قید سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آزاد کر دیا۔ تھانے میں موجود بیشتر فرنیچر اور ریکارڈز جل کر خاک ہو گیا۔ بعد میں پولیس کی بھاری نفری نے موقع واردات پر پہنچ کر حالات پر قابو پایا۔ پندرہ افراد کو حراست میں بھی لے لیا گیا۔ زخمی ہونے والوں میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی بھی شامل تھا جسے پولیس اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اس کی چوٹیں زیادہ خطرناک نہیں تھیں۔

شام کے اخبارات نے نمک مرچ لگا کر مختلف انداز میں اپنی معلومات کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کی..... مذکورہ تھانہ چونکہ ایس بی اورنگ زیب کے حلقے میں تھا اس لیے ایک اخبار نے ”نئے ایس بی کا شاندار استقبال“ کی سرخی لگا کر گرما گرم رپورٹ شائع کی تھی..... مرنے والے کے بارے میں..... جو بدنام فوٹو گرافر فرائڈس کے سوا کوئی نہیں تھا، بیشتر اخبارات نے کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی تھی۔

ڈی آئی جی کرائمر نے دونوں افسران کے آنے کے بعد دروازے پر ہلکی سرخ بقی کا سوچ آن کر دیا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب کسی کو بھی اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایس بی اورنگ زیب کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ وہ بظاہر کسی فینشن کا شکار نہیں تھا لیکن سراج بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ذاتی طور پر وہ سمجھ رہا تھا کہ تھانے پر ہونے والے حملے، انسپٹر دانش کی موت اور جلاؤ گھیراؤ کی پشت پر کس کا ہاتھ ہوگا۔ اسے اس بات کا بھی ملال تھا کہ انسپٹر دانش اپنی موت سے بیشتر اس دستاویز کی نقل بھی نہیں پہنچا سکا تھا جو سراج کیلئے سب سے زیادہ اہم تھی۔ شیخ حامد کو اس کی اطلاع لودھی یا اس کے پالتو غنڈوں نے ضرور پہنچا دی ہوگی پھر اسی بڑے مگر چمچ کے اشارے پر ایسے سارے ثبوت منانے کی تحریکیں کارروائی کا راستہ اختیار کیا ہوگا، انسپٹر دانش کی موت بھی ضروری سمجھی گئی ہوگی۔ عدالت میں اس کا بیان بے حد مؤثر ثابت ہو سکتا تھا۔

سراج کے ذہن میں گرم آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔ شیخ حامد نے الماس پر ہاتھ ڈال کر اس کی غیرت کو لٹکا رہا تھا۔ اگر وہ اپنی مذموم پلاننگ میں کامیاب ہو جاتا تو شاید سراج کو بھی مجبوراً اس کے سامنے جھکنا پڑتا۔ الماس پر جو جیتی تھی اس کی اطلاع شیخ حامد کو بھی ہوگی، اپنی ناکامی پر وہ یقیناً تملایا ہوگا۔ لیاقت حسین نے بروقت وہاں پہنچ کر پھر ایک نئی پراسرار کہانی کو ہوا دی تھی۔ سب سے تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں دو جگہ دیکھا گیا تھا، الماس نے بھی وقت کا حساب کتاب کرنے کے بعد حیرت ہی کا اظہار کیا تھا۔

سراج کی گھٹن کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی قانونی حیثیت میں بھی ان تمام باتوں کو کھل کر منظر عام پر نہیں لاسکتا تھا۔ بات الماس کے بجائے کسی اور کی ہوتی تو دوسری بات تھی۔ اسے ان تین نقاب پوشوں کا خیال بھی تھا جو الماس کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ فرائڈس کا وجود مٹ چلا تھا۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی نہیں ہو سکا لیکن جن لوگوں نے الماس کو اغوا کیا ہوگا، جو اس کی بھرائی پر تعینات کیے گئے تھے ان کا خیال بھی سراج کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔ جس تھانے میں واردات ہوئی تھی وہ سراج کے حلقے میں نہیں تھا..... پھر..... اسے کیوں بلایا گیا تھا..... کیا ڈی آئی جی کرائمر کو شیخ حامد یا اور کسی ذریعے سے اصل صورت کا علم ہو گیا تھا؟ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا جب آغا منظور نے سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”شام کو شائع ہونے والے اخبارات آپ حضرات کی نظروں سے بھی ضرور گزرے ہوں گے، میں نے اس وقت اسی سلسلے میں آپ حضرات کو زحمت دی ہے۔“

”آپ کا حکم تھا، میں حاضر ہو گیا سر..... لیکن حادثہ جس علاقے میں ہوا.....“

”اس سے آپ کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔“ آغا منظور نے کہا۔ ”مجھے آپ کی کارکردگی کا بخوبی علم ہے، اس کے علاوہ بھی ہمارے درمیانی ذاتی انڈر اسٹینڈنگ بھی رہ چکی ہے۔ میں نے آپ کو اپنی ذاتی پسند پر کال کیا ہے۔“

”شکریہ سر.....“ سراج نے اطمینان کا سانس لیا۔

”مجھے بھی خوشی ہے کہ اس وقت آپ بھی میرے استقبال میں شریک ہیں۔“ اورنگ زیب نے اخبار کی سرخی کے حوالے سے کہا پھر پہلو بدل کر بولا۔ ”آج جس کرسی پر میں ہوں۔ ہو سکتا ہے کل آپ اس پر بیٹھے ہوں۔“

”مسٹر اورنگ زیب.....“ آغا منظور نے اس کے لب و لہجے کی تلی کی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس وقت آپ دونوں کو کچھ سنجیدہ گفتگو کیلئے انوائٹ کیا ہے۔“

”میں سنجیدہ ہوں سر.....“ اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ ”اگر میرے تہادلے کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں تو آپ کا پہلا انتخاب بھی مسٹر سراج ہی ہوں گے۔“

”تہادلہ.....“ آغا منظور نے چونک کر پوچھا۔ ”یہ تہادلے کا خیال آپ کے ذہن میں کہاں سے آ گیا؟“

”مرکز میں کچھ چھوٹے موٹے تعلقات میرے بھی ہیں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مسٹر حامد نے وزیر داخلہ سے آج صبح ہی میرے فوری تہادلے کی درخواست کی تھی۔ سر جنڈی دیکھ کر اکثر جانور بھی بدک جاتے ہیں۔“

”آپ..... کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ آغا منظور نے کسمسا کر پوچھا۔ سراج بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

”جو حادثہ پیش آیا وہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔“ اورنگ زیب نے بے پردائی سے کہا۔ ”یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ آج اس حادثے سے پہلے تھانہ انچارج مرحوم انسپٹر دانش نے بھی مجھے فون کیا تھا..... وہ مجھے کسی کیس کے قانونی کاغذات دکھانے کا خواہش مند تھا میں نے اسے شام کا وقت دیا تھا لیکن.....“ اورنگ زیب نے جملہ مکمل نہیں کیا۔

”میں دخل اندازی کیلئے معذرت خواہ ہوں۔“ سراج نے ایس پی کو براہ راست مخاطب کیا۔
”کیا انسپکٹر دانش نے اس فائل کے بارے میں کوئی کارآمد بہت بھی کی تھی؟“

”سوری.....“ اورنگ زیب نے جواب دینے سے گریز کیا۔ منسوب صورت حال چونکہ بدل چکی ہے اس لیے میں قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

”کیا آپ تھانے پر حملہ ہونے اور انسپکٹر دانش کی موت کے سلسلے میں کسی خاص شخص پر شبہ کر رہے ہیں؟“ آغا منظور نے دہلی زبان میں دریافت کیا۔

”اصل مجرم کون ہے؟ تھانے پر حملے میں کون لوگ ملوث تھے؟ اس کے پیچھے کیا مصلحتیں کار فرما تھیں؟ خاص طور پر انسپکٹر دانش ہی کو نشانہ کیوں بنایا گیا اور..... وہ کون سی اہم فائل تھی جو مرحوم مجھے دکھانا چاہتا تھا؟ ان ساری باتوں کا جواب مکمل تحقیق کے بعد ہی سامنے آ سکتا تھا۔“

سراج کے علاوہ آغا منظور بھی اورنگ زیب کے تیر محسوس کر رہا تھا لیکن اس نے کھل کر کچھ کہنے سے گریز کیا اور بڑی خوبصورتی سے بات بنانے کی کوشش کی۔

”کبھی کبھی ایسے اتفاقات بھی رونما ہوتے ہیں جو بہت سے امکانات کو جنم دیتے ہیں مگر..... کسی محسوس شواہد کے بغیر ہم کسی کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ بھی نہیں کر سکتے۔“

”میں آپ سے متفق ہوں سر.....“ اورنگ زیب نے ٹھوس لہجے میں کہا لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ذاتی طور پر کسی مجرم کو ذہن میں محفوظ کر چکا ہے۔

سراج کے اندر بھی اچھل پھٹل ہو رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اس حادثے سے پیشتر کسی کی زبان پر الماس کا نام نہ آ گیا ہو، ذاتی طور پر اس کے ذہن میں شیخ حامد ہی کا نام گونج رہا تھا۔ آغا منظور نے باری باری دونوں افسران کو دیکھا، پھر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں آپ دونوں حضرات کو یہ مشورہ دوں گا کہ قیاس اور امکانات کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ہمیں ایسے ثبوت درکار ہوں گے جو اصل مجرم کو قانون کے شکنجوں میں جکڑنے کی خاطر مؤثر ثابت ہوں۔ میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ مجرم خواہ کوئی ہو، میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا..... تعلقات اپنی جگہ لیکن کچھ واقف کار اگر اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں انہیں بھی کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔“

”مسز حامد کی ڈیڈ باڈی کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا جبکہ ساری علاماتیں یہی ظاہر کر رہی تھیں کہ مرنے والی نے یا تو خودکشی کی ہے، یا اسے زہر دیا گیا ہے۔“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”آپ کے خیال میں کیا.....“

”مجھے کی کوشش کریں مسٹر اورنگ زیب۔“ آغا منظور نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ ”اگر مقتول کے ورثاء نہ چاہیں تو ہم انہیں مجبور نہیں کر سکتے۔“

”میرا خیال اس کے برعکس ہے۔“ اورنگ زیب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”ورثاء میں ماں باپ اور بھائی بہن کے سلسلے میں تو خیر ہم اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہیں لیکن شوہر اور بیوی کا

معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ذاتی اغراض و مقاصد، کسی مالی فائدے کے تحت ایک فریق نے دوسرے کو زہر دینے کی کوشش کی ہو، ایسی شکل میں قانون بھی اپنے وسیع اختیارات استعمال کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔“

”میں انکار نہیں کروں گا لیکن..... ہم دوسروں سے مختلف بھی نہیں ہیں۔ کہیں کہیں چشم پوشی بھی ضروری ہوتی ہے۔“ آغا منظور نے مجبوری کا سہارا لیا۔ ”کہیں کہیں حالات ہمارے بس سے باہر بھی ہو جاتے ہیں۔ اوپر والوں کی بھی سخی پڑتی ہے۔ نہ سنیں تو چھٹی ہو جاتی ہے۔ آپ کی مثال سامنے ہے..... اگر مرکز میں آپ کی جڑیں مضبوط نہ ہوتیں تو شاید اس وقت آپ بھی ہمارے درمیان نہ ہوتے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”آئی ایگری دیو یوسر.....“ اورنگ زیب نے پہلی بار نرمی کا مظاہرہ کیا۔ ”لیکن کسی مجرم کو برداشت کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے..... زیادہ ڈھیل دی جائے تو پھر گلی کا کتا بھی شیر بن جاتا ہے۔“

”موجودہ کیس میں آپ کے تحقیقی آفیسر بنانا پسند کریں گے؟“ آغا منظور نے گفتگو سیٹنے کی کوشش کی۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی اس خدمت کو حاضر ہوں۔“

”آپ.....؟“ سراج کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”آپ میری فکر نہ کریں مسٹر سراج..... بس ایک بات ضرور یاد رکھیں کہ ہمیشہ لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔“ اورنگ زیب نے جو مثال دی تھی اس سے سن کر آغا منظور بھی کسمانے لگا، لیکن اس نے فوری طور پر کسی کو انکوائری آفیسر مقرر کرنے کے سلسلے میں جلد بازی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ خاصی دیر تک اس حادثے کے مختلف پہلوؤں پر غور ہوتا رہا پھر آغا منظور نے میٹنگ ختم کی تو اورنگ زیب اور سراج ایک ساتھ ہی باہر نکلے تھے۔

آغا منظور کی موجودگی میں بھی ایس پی اورنگ زیب نے جس صاف گوئی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اسے سراج نے بھی خاص طور پر محسوس کیا تھا، الماس کے معاملے میں شیخ حامد کا حساب چکنا کرنے کیلئے اسے کسی ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی پشت پر ہاتھ رکھ سکے۔ اسی خیال کے پیش نظر وہ اورنگ زیب کو اس کی گاڑی تک چھوڑنے گیا تھا۔ اورنگ زیب گاڑی میں بیٹھنے لگا تو سراج نے روک کر کہا۔

”سر..... میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ..... شیور۔“ اورنگ زیب بڑے دوستانہ انداز میں سراج کا بازو تھام کر گاڑی سے کچھ دور لے گیا۔ ”فرمائیے..... میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟“

”انسپکٹر دانش آپ کو جو فائل دکھانا چاہتا تھا اس میں ایک قانونی کاغذ پر میں نے بھی بطور آئی وٹنس دستخط کیے تھے۔“ سراج نے مدغم لہجے میں کہا، پھر الماس کا نام درمیان سے نکال کر وہی فرضی

کہانی سنادی جو وہ انسپکٹر وائس کو سنا چکا تھا۔

”آئی سی۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے الفاظ کو کھینچ کر ادا کیا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ لودھی بھی اس حادثے میں برابر کا شریک ہے۔ مجھے یہ اطلاع مل چکی ہے کہ وہ شیخ حامد کا خاص آدمی ہے۔“

”بدنام فوٹو گرافر فرائڈس کو بھی اسی لیے راستے سے ہٹا دیا گیا ہے کہ اگر اس کی زبان کھل جاتی تو کچھ مخصوص چہرے بھی بے نقاب ہو جاتے۔“ سراج نے ہونٹ کانٹے ہوئے تاسف کا اظہار کیا۔ ”انسپکٹر وائس کو بھی اسی لیے ختم کر دیا گیا کہ وہ اس دستاویز کی نقل مجھے نہ پہنچا سکے۔“

”ویری سیڈ۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے دکھ کا اظہار کیا۔ ”کاش آپ مجھے یہ بات کل رات یا آج صبح ہی بتا دیتے۔“

”مجھے اس بات کا شبہ تھا سر کہ شاید آپ مجھے بھی۔۔۔۔۔“

”ہاں۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”کچھ کہانیاں آپ کی بھی میرے کانوں تک ضرور پہنچی ہیں لیکن اب۔۔۔۔۔“

”وہ کہانیاں کسی حد تک درست ہیں۔“ سراج نے سنجیدگی سے اعتراف کیا۔ ”میں کسی مگر مجھ کو اپنے جال میں پھانسنے کی خاطر جال پھینکتا رہا ہوں۔۔۔۔۔ آؤٹ گوٹنگ ڈی آئی جی کرائمز مسٹر علیم احمد کے پاس کچھ باتوں کا۔۔۔۔۔“

”آپ نے جس انداز میں اعتراف کر لیا وہی میرے لیے بہت ہے۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ہر طرح سے آپ کی مدد کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ مجھ پر اعتماد کریں۔“

جواب میں سراج نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا پھر اورنگ زیب کے جانے کے بعد وہ بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گھر جاتے ہوئے اسے اپنی ایک غلطی کا احساس بھی شدت سے ہوا۔۔۔۔۔ جو پرچہ صبا شیخ حامد نے مرنے سے پیشتر اس کیلئے چھوڑا تھا، ابھی تک وہ اسے بھی نہیں پڑھ سکا تھا۔

سراج نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی پھر۔۔۔۔۔

مرنے والی صبا بیگم کے آخری کربناک الفاظ اور۔۔۔۔۔ اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان ادا کیے جانے والے جملے اس کے کانوں میں سنسنے لگے۔



فرحین بیگم کی خوبصورت انکسی میں آکر بے حد خوش ہوئی تھی۔ راحیلہ بیگم نے اس کی واپسی کے بعد اسے اپنے ساتھ بازار لے جا کر شاپنگ کرائی تھی۔ انکسی کو پوری طرح سیٹ کرنے میں بھی وہ پیش پیش رہی تھی۔ فرحین کے آجانے سے خود راحیلہ بیگم کو وقت گزارنے کیلئے ایک ساتھی بھی مل گیا تھا۔ ادھر لیاقت حسین اپنی ڈیوٹی پر سیٹھ عثمان کو لے کر دفتر روانہ ہوتا، ادھر فرحین کا بلاوا آ جاتا پھر وہ شام تک راحیلہ بیگم کے پاس رہتی، ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن سلیقہ شعار ضرور تھی۔ راحیلہ بیگم نے اسے اپنے بے شمار لباس دیے تھے جنہیں پہن کر فرحین پھولے نہیں سہاتی تھی۔

اسپتال سے واپسی کے بعد لیاقت حسین پھر پوری طرح ڈیوٹی کا پابند ہو گیا تھا لیکن اس روز اس کی آنکھ دیر سے کھلی، وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ عام طور پر وہ آٹھ بجے اٹھنے کا عادی تھا، نہادھو کر کرناٹا کرتا پھر اجلی وردی پہن کر ٹھیک پونے نو بجے تک سیٹھ عثمان کے بیٹنگے میں گاڑی کو کپڑا مارنے کے بعد پورٹیکو میں آکر کھڑا ہو جاتا۔ سیٹھ عثمان وقت کے بے حد پابند تھے۔ وہ نو بجے راحیلہ بیگم کے ساتھ باہر آتے۔ لیاقت حسین ان کا برف کیس لے کر گاڑی میں رکھتا پھر سیٹھ عثمان کے بیٹنگے کے بعد وہ اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لیتا۔ جب تک گاڑی بیٹنگے سے نکل کر دور نہ ہو جاتی، راحیلہ بیگم دروازے پر کھڑی ہاتھ ہلاتی رہتیں، سیٹھ عثمان مسکرا کر اس کا جواب دیتے رہتے لیکن آج۔۔۔۔۔

لیاقت حسین حمزی سے بستر سے نیچے اترنا، غسل خانے میں جا کر پانی کا ایک چھپکا منہ پر مارا۔ منہ پونچھتے ہوئے باہر آکر اس نے جلدی جلدی وردی پہنی پھر اس نے فرحین کو آواز دی لیکن فرحین گھر پر موجود نہیں تھی۔ یقیناً وہ راحیلہ بیگم کی طرف چلی گئی ہوگی۔ لیاقت حسین نے دل کو تسلی دی۔ اس کے ساتھ اسے غصہ بھی آ رہا تھا، جب کسی وجہ سے اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلتی تھی تو فرحین ہی اسے بڑے پیارے سے جگاتی تھی لیکن آج اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے کچن میں جا کر دیکھا تو اس کا ناشا چھوٹی سی فولڈنگ ٹیبل پر پلیٹوں سے ڈھکا موجود تھا۔ جلدی جلدی اس نے ناشا کیا پھر چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ قدم مارتا سیٹھ عثمان کے بیٹنگے پر پہنچا تو ڈیوٹی گارڈ نے مسکرا کر کہا۔

”آج تم آرام کرو۔ صاحب دوسرے ڈرائیور کے ساتھ چلا گیا۔“

لیاقت کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس سے بڑی کوتاہی ہو گئی ہو، کچھ دیر وہ گارڈ کے ساتھ کھڑا باتیں کرتا رہا۔

”تمہاری گھر والی نے تمہیں جگانے کی کوشش کی تھی لیکن بیگم صاحبہ نے اپنی ملازمت کو بھیج کر اسے بلوا لیا۔“

”سب خیریت تو ہے؟“ لیاقت حسین نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”صاحب کہہ رہا تھا کہ تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہے اس لیے تمہیں نہیں جگا یا گیا۔“

لیاقت حسین کے ذہن سے دھند چھٹنے لگی، کچھ یادیں اس کے دماغ میں ابھرنے لگیں۔ رات وہ کسی وقت خلاف معمول جاگا تھا۔ کسی نے اس سے باتیں بھی کی تھیں۔ اس کے بعد وہ گھر سے باہر نکلا تھا جہاں سے ڈی ایس پی سراج کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ پھر اس نے خود کو سراج کے گھر پر پایا تھا، الماس بیگم نے اس سے کچھ باتیں بھی کی تھیں۔۔۔۔۔ لیاقت حسین اپنے ذہن پر زور دیتا رہا لیکن کوشش کے باوجود اسے یہ یاد نہیں آیا کہ وہ سراج کے ساتھ کہاں اور کیوں گیا تھا۔۔۔۔۔ الماس بیگم کے ساتھ اس کی کیا باتیں ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ وہ واپس کب آیا تھا۔۔۔۔۔؟ شاید، شاید اسی لیے اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھل سکی۔

”کیا سوچ رہے ہو لیاقت حسین؟“ گاڑو نے اسے ٹولنے کی کوشش کی۔

”وہ..... تم..... میں رات بھر جاگتا رہا اس لیے صبح وقت پر نہیں اٹھ سکا۔“ لیاقت نے افسردہ انداز میں کہا۔ ”خدا جانے صاحب نے کیا خیال کیا ہوگا میرے بارے میں۔“
 ”پریشان مت ہو میرے دوست!“ گاڑو نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اور تمہاری گھر والی دونوں خوش قسمت ہیں جو صاحب اور بیگم صاحب دونوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔“
 لیاقت حسین کوئی معقول جواب سوچ رہا تھا کہ ایک ملازم نے قریب آ کر کہا۔
 ”لیاقت حسین، تمہیں بیگم صاحب اندر بلا رہی ہیں۔“

لیاقت حسین گاڑو کی بات کا جواب دینے کے بجائے تیزی سے گھوم کر بیٹھنے کے دروازے پر آ گیا جہاں سے فرحین اسے اندر لے گئی۔ راحیلہ بیگم لاؤنج میں ایک صوفے پر بیٹھی تھیں، فرحین بھی ان کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے نگاہوں نگاہوں میں لیاقت حسین سے پوچھا تھا۔ ”سچ بتانا..... فرحین تمہیں بیگم صاحبہ کے ساتھ بیٹھی کسی لگ رہی ہے؟“
 ”لیاقت حسین.....“ راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین کو اپنائیت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جانتے ہو فرحین ابھی مجھ سے تمہاری کیا شکایت کر رہی تھی.....؟“
 ”اس کی باتوں میں نہ آیا کریں بیگم صاحب۔ نئی کٹھی میں آنے کے بعد سے یہ بڑی بڑی باتیں کرنا سیکھ گئی ہے۔“

”خبردار لیاقت حسین!“ راحیلہ بیگم نے فرحین کو خوش کرنے کی خاطر مسکرا کر مصنوعی خفگی سے کہا۔ ”فرحین اب میری سہیلی بن گئی ہے اس لیے میں اس کے خلاف کوئی بات نہیں سنوں گی۔“
 فرحین نے بھی اسی وقت ہلکی سی زبان باہر نکال کر منہ چڑایا تو لیاقت حسین دل ہی میں مسکرا دیا۔ فرحین کی بات اور تھی، وہ عورت ذات تھی لیکن لیاقت حسین، سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم دونوں کی پر خلوص محبتوں کا مقروض تھا اس لیے خاموش کھڑا رہا۔
 ”فرحین مجھے بتا رہی تھی کہ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ وقت پر کھانا نہیں کھاتے۔ رات کو بھی آرام نہیں کرتے۔“

”آئندہ خیال رکھوں گا۔“ لیاقت حسین نے مسمی صورت بنا کر جواب دیا پھر نظریں جھکا کر بولا۔ ”میں شرمندہ ہوں کہ آج وقت پر صاحب کی ڈیوٹی کیلئے حاضر نہیں ہو سکا۔“
 ”اس غیر حاضری کی وجہ بھی جانتے ہو.....؟“

”جی.....“ اس نے گہرا کر راحیلہ بیگم کی طرف دیکھا۔

”سراج صاحب نے تمہاری سفارش کی تھی کہ آج تمہیں آرام کرنے دیا جائے۔ تم کل رات شاید ان کے ساتھ کہیں گئے تھے؟“

”کہاں گیا تھا.....؟“ لیاقت حسین نے معصومیت سے کہا۔ ”مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ وہ اپنے ساتھ مجھے گھر لے گئے تھے پھر واپس بھی چھوڑ گئے تھے۔“

”اور کہیں نہیں گئے تھے.....؟“ اس بار راحیلہ نے بھی اسے کریدنے کی کوشش کی۔

”میں نیند میں تھا اس لیے..... کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

”یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی.....“ فرحین نے کسمسا کر پھر لیاقت حسین کو چھیڑنے کی خاطر راحیلہ بیگم سے کہا۔ ”ڈپٹی صاحب نے اسے اسلحہ کا تحفہ بھی دے کر اس کا دماغ ساتویں آسمان پر کر دیا ہے۔ بالکل پولیس والوں کی طرح اونچی اونچی باتیں کرنے لگا ہے۔ جو بات اس کے پیٹ میں اتر جائے پھر آسانی سے باہر نہیں آتی.....“

”لیاقت حسین.....“ راحیلہ بیگم نے اس بار لیاقت حسین کو تنبیہ کی سے دیکھا۔ ”صبح سات بجے سراج صاحب کا فون تمہارے صاحب کے پاس آیا تھا، وہ بتا رہے تھے، کل رات تم نے ان کے ساتھ جا کر کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔“

لیاقت حسین کا ذہن پھر الجھنے لگا۔ کوئی بات اس کے لاشعور میں ضرور کلبلا رہی تھی۔ وہ سراج صاحب کے گھر گیا تھا تو بلا کسی مقصد کے یونہی نہیں گیا ہوگا..... لیکن اس کے بعد کہاں گیا تھا؟ اس نے کیا کارنامہ انجام دیا تھا؟ یہ بات اس کے شعور میں نہیں آ رہی تھی۔ الماس بیگم نے بھی اس سے کچھ خاص باتوں کی تفصیل جاننے کی کوشش کی تھی۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ دیتا بھی کیسے جبکہ صرف اسے اتنا یاد تھا کہ وہ سراج صاحب کے گھر میں موجود تھا۔ سراج صاحب اسے خود واپس چھوڑنے آئے تھے، راستے میں لیاقت حسین نے اپنی زہنی گریہوں کو کھولنے کی خاطر ان سے بھی یہی معلوم کیا تھا کہ وہ ان کے گھر کیسے پہنچ گیا؟ جواب میں سراج صاحب نے بھی گول مول جواب دے کر اسے ٹال دیا تھا۔

لیاقت حسین کو اگر کچھ یاد تھا تو صرف اتنا کہ..... گل خان کی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد کسی نابینا ریش دراز بزرگ نے اسے اللہ کے اس برگزیدہ دیوانے تک پہنچا دیا تھا جس نے اسے ایک چمکی خاک سے نوازا تھا پھر..... اس کے بعد سے وہ بھی کہیں نظر نہیں آیا..... لیاقت حسین نابینا کی تنبیہ کے بعد اس بات کو زبان تک نہیں لاسکتا تھا۔ بڑی سختی سے اسے یہی تاکید کی گئی تھی۔

خود راحیلہ بیگم کو بھی پوری بات کا علم نہیں تھا۔ سیٹھ عثمان نے دفتر کیلئے تیار ہوتے وقت صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ سراج اسے رات کسی ذاتی کام سے لے گیا تھا اس لیے اسے کم از کم ایک دن آرام کرنے دیا جائے۔ لیاقت حسین کو کم صدم دیکھ کر وہ بات ٹالنا چاہتی تھیں جب فرحین نے شوخی سے کہا۔

”دیکھا آپ نے..... اب یہ ڈپٹی صاحب کا ایک دم پکا والا چمچ.....“

”ایسا مذاق میں بھی نہیں کہتے فرحین۔“ راحیلہ بیگم نے اسے پیار سے سمجھایا۔ ”لیاقت حسین، ہم سب کیلئے کیا ہے یہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔“

اس بار لیاقت حسین کو بھی زبان چڑانے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد وہ راحیلہ بیگم کو سلام کر کے اپنے قدموں باہر چلا گیا۔ اس کے ذہن میں جو باتیں الجھ رہی تھیں وہ بدستور الجھتی رہیں۔

ڈاکٹر نے افضل خان کا ضروری معائنہ کیا پھر دبی زبان میں بولا۔
 ”میرا مشورہ ہے کہ آپ اسپتال سے جانے کے بعد بھی کم از کم ایک ہفتے تک بیڈ ریست ضرور کریں۔“

”ٹھیک ہے۔“ افضل خان نے کہا۔ ”میں خود بھی ابھی کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔“
 ”زندگی ایک نعمت ہے افضل صاحب، اس کا خیال رکھیے گا۔“ ڈاکٹر نے اس بار مدہم لہجے میں کہا۔ ”میں ابھی آپ کو سسٹر کے ذریعے ڈسچارج سلپ بھیج دوں گا۔ آپ کا آج تک کا بل مسٹر حامد نے پے کر دیا ہے۔“
 ”کیا اب میں یہاں.....“ افضل خان اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ ڈاکٹر کا آخری جملہ سن کر اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

”رہ سکتے ہیں لیکن جزل وارڈ میں، اس کے اخراجات بھی آپ کو.....“
 ”نہیں.....“ افضل خان نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں اپنے گھر پر زیادہ کمفرٹ ایبل محسوس کروں گا۔“
 ”وش یو آل دی بیسٹ۔“ ڈاکٹر ہیڈ نرس کے ساتھ راؤنڈ لینے کی خاطر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

افضل خان کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری۔ ڈاکٹر نے کھلے لفظوں میں ظاہر کر دیا تھا کہ اب بگ باس نے اس کی بیماری کے اخراجات برداشت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے ذہن میں اپنا ماضی کھیلانے لگا۔ کل تک وہ حامد ایسوسی ایٹس کا بزنس منیجر تھا، آفس اسٹاف کے علاوہ کاروباری حلقے میں بھی اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہ بگ باس کا دست راست تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران بھی شیخ حامد کی وجہ سے اس پر ہاتھ ڈالنے سے کتراتے تھے لیکن اب وہ ایک ہی جھٹکے سے عرش سے فرش پر واپس آ گیا تھا۔

میڈم روبی کو بھی وہ بگ باس کے اشارے پر ٹریپ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو گیا تھا۔ اگر وہ اس کی مووی اور برہنہ تصاویر بھی بنوانے میں کامیاب ہو جاتا تو بگ باس اسے سر پر اٹھا لیتا لیکن..... قسمت کی خرابی اس کے آڑے آ گئی۔ کسی طرح سراج کو اس کے پروگرام کی خبر ہو گئی..... بلیک ٹانگیر کی بروقت اطلاع ملنے کے بعد وہ موقع سے فرار ہو گیا۔ مگر اس کے بعد اسے جن اذیت ناک حالات سے گزرنا پڑا وہ اس کی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ حامد نے خود کو معصوم ظاہر کرنے کی خاطر اسے آزمائشوں کی جس چکی میں پسیا وہ بھی ایک المیہ تھا..... اس کے ساتھ ڈبل کراس والا گیم کھیلا گیا۔ کچرا کنڈی میں برہنہ حالت میں برآمد کیے جانے کے بعد اسے یقین تھا کہ اس کی سانسیں اب گنی چنی رہ گئی ہیں۔ شیخ حامد کے جرائم کی ڈکسٹری میں کسی اہم غلطی کو معاف کر دینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے اغوا کا ڈراما رچانے کی پلاننگ میں اس کا اپارٹمنٹ بھی شامل تھا جسے توڑ پھوڑ کر برباد کر دیا گیا۔

افضل خان کو پورا یقین تھا کہ جس اسپتال میں اسے رکھا گیا ہے وہاں سے بھی وہ زندہ نہیں سکے گا۔ اس کی موت یا قتل کا ملبا بھی پولیس پر ڈال دیا جاتا لیکن..... شاید سراج کی سفارش اس کے کام آگئی تھی۔ ڈاکٹر نے آخری جملے سن لینے کے بعد اس کا ذہن چکر اٹھا گیا تھا۔ اس کے پاس سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ شیخ حامد نے اسے اس کے سابقہ عہدے پر بحال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ البتہ اتنا ضرور اقرار کیا تھا کہ وہ سراج کی سفارش پر غور کرے گا۔

اس کا ذہن بری طرح چکر رہا تھا۔ اسپتال سے نکل کر وہ کہاں جائے گا؟ شیخ حامد کی نگاہیں بدلنے کے بعد کوئی بھی اس کی مدد کرنے کا رسک نہیں لے گا۔ اسے میڈم روبی کی وہ آفر یاد آئی جو اس نے پہلی بار اس کے اپارٹمنٹ پر آ کر دی تھی۔ اگر وہ اس آفر کو قبول کر لیتا اور بگ باس کو کسی طرح ٹھکانے لگا دیتا تو شاید اس وقت وہ بیرون ملک میں کسی شاندار کوشی میں مقیم ہوتا۔ اس کے بعد تاج محل ہوئی اس کی قسمت کی خرابی نے اسے میڈم روبی کی نظروں میں بالکل ہی تنگ کر دیا ہوگا۔ وہ اس کے دروازے پر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے ذہن میں دو چار پرانے ساتھیوں کے نام ابھرے مگر اسے یقین تھا کہ تاریکی میں سایہ بھی انسان کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی بھی شیخ حامد کے مقابلے میں اس کی مدد کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی انہی خیالات میں غرق تھا جب سسٹر نے کمرے میں داخل ہو کر اسے ڈسچارج سرٹیفکیٹ تھما دیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے سسٹر کو الوداع کہا پھر خاموشی سے نیچے جانے والی لفٹ پر سوار ہو گیا، اسے فوری طور پر کوئی آخر فیصلہ کرنا تھا۔ جس شہر میں وہ اونچے حلقوں میں سر اٹھا کر چلتا تھا وہاں اب وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا بھی پسند نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ہی طریقہ تھا..... خودکشی!..... حرام موت! انسان موت کی نیند سو جائے تو سارے دلدر دور ہو جاتے ہیں۔ وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ کسی کی نظروں میں نفرت دیکھنے کے قابل نہیں رہتا..... بہرا ہو جاتا ہے اس لیے اپنے بارے میں کسی کی تلخ باتیں بھی سن کر اسے ملال بھی نہیں ہوتا..... ہر غم سے نجات پا لیتا ہے۔ اس کیلئے یہی ایک راستہ تھا جس کو اپنانے کا فیصلہ کر لینے کے بعد اس کے ذہن پر طاری بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔

سراج نے اس کی سفارش کر کے جو احسان کیا تھا وہ بھی اسے یاد آ رہا تھا۔ شیخ حامد کے جیلے بھی اس کے وجود میں گونج رہے تھے..... ”میں وعدہ نہیں کرتا“ البتہ آپ کی سفارش پر غور کروں گا۔“ ان جملوں کی آزمائش کیلئے بھی اس نے بگ باس کے سامنے جانا فضول سمجھا تھا۔ اگر وہ اسے نفرت سے دھککا دیتا تو دفتر والوں کی نظروں میں اور گر جاتا۔

اسپتال سے نکل کر باہر آیا تو زندگی کے ہنگامے دیکھ کر اسے اپنی حالت پر ہنسی آگئی۔ اس وقت اس کی جیب بھی خالی تھی۔ بالکل جی دست ہو گیا تھا، ساحل سمندر یا کسی بلند عمارت تک جانے کی خاطر بھی اسے پیدل ہی سفر کرنا تھا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زیادہ دیر اپنے قدموں پر جم کر نہیں کھڑا رہ سکے گا۔ کچھ اندرونی زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے بھی ایک ہفتے مزید بیڈ ریست کا مشورہ دیا تھا لیکن..... جب بیڈ ہی نہیں تھا تو ریست کا خیال بھی

بڑا اذیت ناک تھا۔ اس نے سڑک پر دوڑتی بھاگتی زندگی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر دو چار قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس نے شبیم کو اسپتال کے پاس ایک گاڑی سے اترتے دیکھا۔ گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی..... افضل خان کو تعجب ہوا پھر وہ مسکرا دیا۔ ”شاید میرے بعد بگ باس کی نظر عنایت نے شبیم کی ترقی کر دی ہو۔“ اس نے سوچا پھر وہ نظریں جھکا کر شبیم کی نظروں سے دور ہو جانا چاہتا تھا کہ اتفاق سے شبیم نے بھی اسے دیکھ لیا، ایک لمبے لمبے قدم اٹھاتی اس کے قریب آگئی۔

”تم یہاں.....؟“ اس نے افضل خان کو حیرت سے دیکھا۔ ”میں اس وقت تمہاری خیریت ہی دریافت کرنے آئی تھی۔“

”کیا بگ باس کو علم ہے کہ تم مجھ سے ملنے آئی ہو.....؟“

”ہو بھی سکتا ہے۔“ اس نے شانے اچکا کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”لیکن اس وقت تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں ابھرا؟“

”مجھے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا ہے۔“ افضل خان نے خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”تعجب ہے.....“ اس نے افضل خان کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ ”تم ابھی مکمل طور پر صحت مند نظر نہیں آ رہے ہو پھر.....“

”ڈاکٹر نے جو فیصلہ کیا اس میں بگ باس کا اشارہ بھی ضرور شامل ہوگا۔“

”یہ تمہارا ذاتی خیال ہے“ شبیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو بگ باس مجھے بھی ضرور آگاہ کر دیتا۔“

”یہ گاڑی.....“ افضل خان نے اس کی گاڑی کی سمت دیکھا۔

”باس کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔“ شبیم نے جواب دیا۔

”اوہ..... گویا اب تمہاری اہمیت بڑھ گئی ہے.....“ شبیم نے افضل خان کے جواب میں کھلے طنز کی تلخی محسوس کر لی تھی لیکن انجان بن کر معصومیت سے سوال کیا۔

”تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“

”میرے جواب پر شاید تمہیں یقین نہ آئے۔“ افضل خان کے ہونٹوں پر بڑا زہر ملا تبسم جاگ اٹھا۔

”قبل از وقت کیے گئے فیصلے اکثر غلط بھی ثابت ہوتے ہیں.....“ اس بار شبیم نے مسکرا کر کہا۔

افضل خان حالات کی ستم ظریفی پر ترپ اٹھا۔ بے حد سنجیدگی سے بولا۔ ”اس وقت مجھے کہیں

قریب، کسی ایسی چھ سات منزلہ عمارت کی تلاش ہے جو میری مشکل آسان کر دے۔“

”کیا مطلب.....؟“ شبیم چوکی۔ ”کیا تم نے خودکشی کی ٹھان لی ہے؟“

”اب یہی ایک راستہ باقی رہ گیا ہے۔“ افضل کان ہونٹ چبانے لگا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تمہارا اپارٹمنٹ رہائش کے قابل نہیں رہا۔ پولیس نے ابھی تک اسے تالا لگا رکھا ہے لیکن.....“ شبیم نے ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”اسی شہر میں میرا ایک چھوٹا موٹا فلیٹ بھی ہے۔“

”تم..... تم بگ باس کی ناراضی مول لے سکوگی.....؟“

”میرے ساتھ چل کر گاڑی میں بیٹھو باقی باتیں راستے میں اور فلیٹ پر پہنچنے کے بعد بھی ہو سکتی ہیں۔“

جواب میں افضل خان نے شبیم کو بہت غور سے دیکھا..... کچھ کہنے کے بجائے وہ قدم اٹھاتا اس کی گاڑی کی آگلی نشست پر بیٹھ گیا..... کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر شبیم نے سنجیدگی سے گفتگو کی ابتدا کی۔

”ہو سکتا ہے مجھے تمہارے ساتھ یہ ہمدردی مہنگی پڑے لیکن بگ باس نے مجھے تم سے دور رہنے کا کوئی اشارہ بھی نہیں دیا۔“

”تم چاہو تو کوئی رسک نہ لو..... مجھے یہیں کہیں راستے میں اتار دو۔“ افضل خان نے بھی آواز میں جواب دیا۔

”باس سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟“ شبیم نے پھر کچھ توقف کے بعد دریافت کیا۔ جواب میں افضل خان نے ڈبٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی موجودگی میں شیخ حامد سے ہونے والی تمام باتیں تفصیل سے دہرا دیں۔

”میرے مقابلے میں تم باس سے زیادہ قریب رہ چکے ہو.....“ شبیم نے سنجیدگی سے کہا۔

”پولیس کے ڈی ایس پی اور ایس پی باس کی نظروں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے..... اگر اسے تمہارے بارے میں غور نہ کرنا ہوتا تو وہ اس کا اظہار کھل کر بھی کر سکتا تھا۔“

”کیا مطلب.....؟“ افضل خان شبیم کا جواب سن کر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

کیا بگ باس اب بھی مجھے کوئی چانس دے سکتا ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی، مگر میرا خیال ہے کہ باس کو شاید ابھی تمہاری ضرورت ہو.....“

”میں سمجھا نہیں۔“ افضل خان نے وضاحت چاہی۔

”تمہیں شاید کچھ اہم معاملات کا علم نہیں ہے۔“ شبیم نے بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ایک

فحخص ہے جو آج کل باس کیلئے خاصا ناقابل برداشت ثابت ہو رہا ہے۔ ممکن ہے تمہیں ایک آخری

چانس اور دیا جائے۔“

”تنت..... تم کس کی بات کر رہی ہو؟“

”میں فی الحال اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نکالنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں جو بگ باس کے

لیے ناقابل برداشت ہو۔“ شبیم نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ ”خودکشی کے مقابلے میں اگر تم بگ باس کیلئے کسی آخری امتحان میں کامیاب ثابت ہوئے تو ممکن ہے باس تمہاری سابقہ کوتاہیوں کو بھی

معاف کر دے..... کیا یہ چانس لینا تمہارے لیے زیادہ کارآمد نہیں ہوگا؟“
 ”تم..... جانتی ہو کہ وہ شخص کون ہے؟“ افضل خان نے کسماکسم کر در یافت کیا۔
 ”ہاں..... لیکن باس کی مرضی کے بغیر اس کا نام زبان تک نہیں لاسکتی۔“ شبنم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”تم مجھے کیا مشورہ دو گی؟“ افضل خان نے شبنم کو کریدنے کی کوشش کی۔

”میں تمہارے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتی لیکن..... اتنا اندازہ ہے کہ باس نے تمہیں ہیرا سمجھ کر ہی اپنا دست راست بنایا ہوگا۔“ شبنم نے معنی خیز انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”جو لوگ بلا سنڈھیلنے کے عادی ہوں وہ چانس لینے میں ہچکچاتے بھی نہیں۔“
 افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں شبنم کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور شبنم..... اسے یقین تھا کہ شیخ حامد نے ساؤنڈ پروف کمرے میں بلا کر اسے جو کام سونپا تھا وہ اس سلسلے میں اپنا پارٹ پلے کرنے میں صد فیصد کامیاب رہی تھی۔



شبنم کے فلیٹ میں قدم رکھنے کے بعد افضل خان کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے قسمت نے اسے نئی زندگی عطا کر دی ہو، وہ خاموشی سے ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے کسی بلندی سے گرتے ہوئے شبنم نے اچانک پیچھے سے ہاتھ تھام کر زندگی کی سمت واپس مھینٹ لیا ہو۔
 اسپتال سے ڈسچارج کیے جانے کے بعد اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ وہ بگ باس کے ہاتھ کھینچ لینے کے بعد زندگی کی خوشیوں سے یکسر محروم ہو چکا ہے جبکہ وہ قسمت کے ہاتھوں پر بھیسی کا شکار ہوا تھا۔ بگ باس کے حکم کے عین مطابق وہ میڈم کو ٹریپ کرنے میں نہ صرف پوری طرح کامیاب ہو گیا تھا بلکہ انتہائی دور اندیشی سے پلاننگ کرنے کے بعد میڈم کو خواب آور شراب پلانے میں بھی سرخرو ہو گیا تھا۔ اسے صرف آدمے کھننے کی مہلت اور مل جاتی یا اس نے میڈم کے نشیے جسم اور جھپٹتی آنکھوں کے خمار کی تعریف میں وقت ضائع کرنے کی غلطی نہ کی ہوتی تو نہ صرف وہ میڈم کے گھر پہلے جسم سے اپنی ہوس کی بھڑکی آگ بجھانے میں کامیاب ہو جاتا بلکہ بلیک میٹنگ کی اسکیم بھی پوری ہو جاتی، اس کے بعد شیخ حامد میڈم کو اپنے اشاروں پر نچانے میں پوری طرح کامیاب ہو جاتا۔ افضل خان کو اس شاندار کامیابی پر خاطر خواہ انعام بھی ملتا لیکن عین وقت پر سارا بتا دینا ٹھیک چوہٹ ہو گیا تھا..... وہ پولیس کی آمد کی اطلاع پر فوری فرار نہ ہوتا تو رینگے ہاتھوں پکڑا جاتا۔
 اس کے بعد..... بگ باس نے اپنی پوزیشن بچانے کی خاطر جو پلاننگ کی تھی وہ افضل خان کے حق میں تباہی کا باعث ہوئی۔ اسے اپنے آدمیوں کے ذریعے انخوا کر کے تھک دکان تازہ بنایا گیا۔ اس کے اپارٹمنٹ کو تباہ کر دیا گیا۔ جس حالت میں اسے رہائی ملی اس سے تو بھر تھا کہ مر گیا ہوتا۔ لیکن وہ زندہ تھا، بے قصور ہونے کے باوجود بگ باس کے انتہائی عتاب کا شکار بن گیا۔ اسپتال سے اسے جس خوبصورت انداز میں نکالا گیا تھا اس کے بعد افضل خان کے پاس اپنے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ تھا، خودکشی!..... دردناک موت!..... لیکن عین وقت پر شبنم نے ہوا کے کسی خوشگوار جھونکے کی طرح سامنے آ کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

خود شبنم کا کردار بھی اس کیلئے غور طلب تھا۔ بگ باس کی دشمنی کے باوجود وہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی جرأت کر سکتی تھی؟ یہ بات اس کے سان و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ وہ انہی حالات میں مستغرق تھا جب شبنم پہنچ کرنے کے بعد دوبارہ اس کے سامنے ہنسی مسکراتی آ گئی۔ پھولدار ڈھیلے ڈھالے ٹائٹ سوٹ میں بھی وہ قیامت ہی نظر آ رہی تھی۔ کبھی افضل خان نے بھی اس

تیرنیم کش میں اپنا چلہ چڑھانے کی آرزو کی تھی لیکن اس وقت وہ اپنی محنت کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سوچ سکتا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ شبنم نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔ ”تم اس قدر گرم صم کیوں نظر آ رہے ہو؟“

”شبنم.....“ افضل خان نے اسے بڑی سنجیدہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں علم ہے کہ مجھے بگ باس کے حکم پر اسپتال سے نکالا گیا ہے؟“

”ہوسکتا ہے، ایسا ہی ہو لیکن.....“

”میرا خیال ہے کہ تم نے نادانستگی میں ایک ایسا قدم اٹھا لیا ہے جو تمہارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ شبنم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ممکن ہے بگ باس نے تمہیں ناقابل معافی سمجھ کر نظریں پھیر لی ہوں لیکن مجھے تم سے دور رہنے کا کوئی اشارہ نہیں ملا۔“

”نہ سہی لیکن میں.....“ افضل خان اچانک مچلا ہونٹ کاٹنے ہوئے اٹھ گیا۔ ”میں اپنی وجہ سے تمہیں کسی عتاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔“

”مگر اس وقت کہاں جاؤ گے؟“

”میں یقین سے صرف ایک بات کہہ رہا ہوں کہ اس وقت میری جیب میں کوئی معمولی زہر خریدنے کیلئے بھی ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے اس لیے..... صرف ایک ہی راستہ ہے کہ میں.....“

”تمہیں کتنے روپے درکار ہیں؟“ شبنم نے اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم روپوں کا کیا کرو گے؟“

”اپنے منحوس وجود کو لے کر اس شہر سے کہیں اتنا دور چلا جاؤں گا کہ کوئی واقف کار نہ ہو۔“

”غلط گمان ہے تمہیں.....“ شبنم ایک لمحے کو سنجیدہ ہو گئی۔ ”اس ملک میں رہ کر تم بگ باس کی دسترس سے دور نہیں جا سکو گے۔“

”پھر..... صرف ایک ہی بچاؤ کی صورت ہے کہ میں اپنے وجود کو ختم کر دوں۔“ افضل خان نے کسی بارے ہوئے جواری کی طرح سپر ڈال دی۔

شبنم کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کا موبائل واٹر بیٹ کرنے لگا۔ اس نے بڑی تیزی سے اسے نکال کر آن کرتے ہوئے کان سے لگا لیا۔ ایک لمحے تک کچھ سنتی رہی۔ افضل خان کی نظریں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شبنم کے چہرے پر کچھ دیر پیشتر نظر آنے والے زندگی سے بھرپور رنگ پھیکے ہوتے جا رہے تھے۔

”آئی ایم سوری باس۔ لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ..... مم..... میں معافی کی خواہگار ہوں۔

یس باس، میں سن رہی ہوں..... تھینک یو باس..... او۔ کے۔ دس دن سے گیارہواں دن نہیں ہوگا آئی ایم تھینک فل اس۔“

موبائل بند کر کے شبنم نے اس انداز میں سکون کا سانس لیا جیسے پستول سے نکلی ہوئی کوئی گولی اس کے کان کے قریب سے سننا تھی ہوئی گزر گئی ہو۔

”کون تھا؟“ افضل خان نے سہجے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

”بگ باس..... اسے خبر مل گئی ہے کہ تم اس وقت میرے پارٹنر میں موجود ہو۔“ شبنم نے دوبارہ اطمینان کا طویل سانس لے کر جواب دیا۔ ”باس نے تمہیں دس روز کی رعایت دے دی ہے۔“

”اس کے بعد.....؟“

”اس کے بعد میں تمہیں یہاں نہیں رکھ سکوں گی۔“

موت کے سرد ہاتھ ایک بار پھر افضل خان کو اپنا حلقہ تنگ کرتے محسوس ہوئے۔ وہ بگ باس کی خصلت سے واقف تھا، اس کی ڈکٹری میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اپنی خاطر وہ شبنم کو بھی کسی دشواری میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا، ایک لمحے توقف سے بولا۔

”میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن ہو سکتا ہے کہ دس روز کے اندر باس کسی وقت بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لے۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں تمہیں دوست ہونے کی حیثیت سے کسی بھی مشکل میں نہ پڑنے دوں۔“

”ڈونٹ وری.....“ شبنم نے پر اعتماد انداز میں کہا۔ ”ایسا نہیں ہوگا۔ فی الحال تم نہا دھو کر فریش ہولو۔ اتنی دیر میں میں تمہارے لیے کچھ کھانے کا اہتمام کر لوں، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“

افضل ہچکچا رہا تھا۔ اسے دس روز کی عارضی زندگی کی ضرورت نہیں تھی لیکن شبنم کے اصرار پر اس نے بات مان لی۔ گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد اس نے وہی لباس دوبارہ پہن لیا۔ ذہن نہانے کے سبب کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ شبنم نے اس کیلئے انڈے اور پراٹھے تیار کر لیے تھے۔ افضل خان خاموشی سے لقمے زہر مار کرتا رہا، اس کے ذہن میں دس دن کی سہلت رہ رہ کر دوسو ڈال رہی تھی پھر اسے شبنم کی کبھی ہوئی باتوں کا دھیان آیا تو اس نے چونک کر کہا۔

”تم نے کہا تھا کہ کوئی شخص ہے جو بگ باس کیلئے دردسرن رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ بگ باس مجھے ایک آخری چانس سے قسمت آزمائے کا موقع فراہم کر دے۔“

”ہاں..... میں نے غلط نہیں کہا تھا لیکن وہ محض ایک امکانی بات تھی۔“ شبنم نے گھما پھرا کر کہا۔ ”باس کی مرضی کے بغیر زبان کھولنا میرے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”لیکن اس وقت میرے اور تمہارے سوا اس کمرے میں.....“

”میں تمہیں محتاط رہنے کا مشورہ دوں گی۔“ وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”تم شاید بھول رہے کہ میڈم کے سلسلے میں تم کامیابی سے بہت قریب پہنچ چکے تھے لیکن..... اگر بگ باس کے کسی کارندے نے تمہیں فرار ہونے کا مشورہ نہ دیا ہوتا تو اس وقت تم کہاں ہوتے.....؟“

”آئی سی،“ افضل خان کسمسا کر بولا۔ ”میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو شاید بگ باس نے تمہیں

باپ کی خوشیوں میں، میں بھی شریک ہو گئی۔ پھر جلد ہی دفتر والوں نے ابا کو ایک درمیانی درجے کے علاقے میں دوسو گز کا مکان لے کر دیا جس کی فسطیں تنخواہ سے کتنے لگیں۔ میں میٹرک کا نتیجہ آنے کے بعد کالج میں داخل ہو گئی۔ ہماری غربت کے دن بڑی تیزی سے گزرنے لگے، میں اس خواب کو اللہ رب العزت کا کرم اور احسان سمجھ رہی تھی لیکن بعد میں تعبیر سامنے آئی تو حقیقت کھلی کہ والد کی ترقی، تنخواہ میں ہر دو تین ماہ خاطر خواہ اضافہ اور خوشحالی بیشک اللہ کے حکم سے تھی لیکن اس طرح وہ شاید کسی غریب کے صبر اور کسی اہلیس کے تہر کی آزمائش کر رہا تھا جس کے نتیجے میں میری شادی شیخ حامد سے ہو گئی جو عمر میں مجھ سے کم از کم بیس سال بڑا تھا۔ یہ فرق اس کی دولت اور ابا کی غربت اور مجبوری کے سبب نظر انداز ہو گیا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اہلیس صفت شیخ حامد انسان سے زیادہ کسی خبیث آدم خور درندے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

یہ شادی نہیں، ایک سودا تھا جو حالات کی ستم ظریفی کے تحت طے پا گیا تھا۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ شادی کے بعد چار سال تک میں اپنی قسمت پر رشک کرتی رہی پھر جب میرے شوہر کی شخصیت پر چڑھالغ اتر ا اور اس کی اصلیت سامنے آئی تو وقت گزر چکا تھا۔ شادی کے دو سال بعد ہی میرے والد ایک حادثاتی موت کا شکار ہو گئے تھے۔ میں اس وقت اسے ایک حادثہ ہی سمجھتی تھی لیکن آج میں بڑے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس حادثے کی پشت پر بھی میرے شوہر کی خباثت کا فرما ہو گی۔

آج تقریباً چالیس سال کی عمر کے بعد میں اس خبیث کے چہرے سے وہ نقاب گھسٹ کر علیحدہ کر رہی ہوں جس کے پیچھے اس کی مکروہ اصلیت چار سال تک ڈھکی چھپی رہی۔ میرا شوہر دولت، شہرت اور خود کو سب سے بڑا کہلانے کی خاطر اپنی تمام حدود کو پھلانگ جانے کا عادی ہے۔ وہ ایک آوارہ، بدقماش، عیاش اور کسی چالاک لومڑی کی خصلتوں کا مالک ہے، کسی فرعون وقت کی طرح۔ شادی کے پانچ سال بعد ہی وہ عیاشی کے لیے گھر میں آوارہ عورتوں کو لانے لگا، میں نے احتجاج کیا تو مجھے بھی اپنے اس غلیظ کھیل میں زبردستی شامل کیا جاتا یہاں تک کہ میری برداشت کی دھجیاں اڑنے لگیں، ایک ہی حمام میں تین ننگے ہوتے تھے، مجھے زبردستی ایک آرائشی ستون سے باندھ کر کھڑا کر دیا جاتا، میرے جسم کو زبردستی بے لباس ہونا پڑتا، میری نظروں کے سامنے میرا شوہر آوارہ لڑکیوں کے ساتھ شراب اور شباب کے گھناؤنے کھیل میں بدست ہو جاتا۔ بازاری عورتوں کے ساتھ مل کر میرے ڈھلتے جسم پر گندے اور غلیظ جیلے چست کیے جاتے، تحارت آمیز تنبیہات سے نوازا جاتا۔ میں بے بس کھڑی آنسو بہاتی رہتی..... لیکن..... صبر کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے۔ شادی کے بعد میں نے اچھے اور برے حالات کے باوجود تین لڑکیوں کو جنم دیا لیکن میرے درندہ صفت شوہر نے ہر تینوں کو ڈاکٹروں کی مٹھی گرم کر کے ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ دولت کی ہوس کی خاطر اور اپنے سامنے دوسرے کاروباری حریفوں کو نیچا دکھانے کی خاطر میرے شوہر نے غنڈے اور بد معاش پال رکھے تھے جو کسی کی پگڑی اچھالنے یا موت کے گھاٹ اتارنے میں ڈرا دیر نہیں کرتے

اب کا کل احمد سمجھنا شروع کر دیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”میریم والی بات تمہارے علم میں کس طرح آئی؟“

شبیم نے غور سے افضل خان کو دیکھا پھر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمہاری خود اعتمادی بحال ہو رہی ہے۔“

”یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔“

”جب تک بک پاس کی سمت سے کوئی واضح اشارہ نہ ملے میں تمہیں کچھ بتانے کا رسک نہیں لے سکتی..... آئی ایم سوری۔“

افضل خان تھکا کر رہ گیا۔ اس وقت ایسی پوزیشن میں بھی نہیں تھا جب وہ سابقہ حیثیت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈھیل کر شبیم سے باز پرس کر سکتا..... شبیم بھی اپنی بات مکمل کر کے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”میں صابہ خاتون بلا کسی جبر و کرہ اپنی زندگی کی یہ آخری تحریر رقم کر رہی ہوں۔ اگر یہ تحریر خاتون کی پاس داری کرنے والوں کے کسی کام آگئی تو میں یہ سمجھوں گی کہ میری موت رائیگاں نہیں گئی۔ زندگی اس روئے زمین کی سب سے زیادہ قیمتی اور حسین نعمت ہے لیکن میں شاید اس دنیا کی سب سے بد نصیب عورت ہوں جو خود اپنے ہاتھوں اس نعمت سے محروم ہونے پر مجبور ہو گئی ہوں۔“

بچپن میں سال قبل جب میں اٹھارہ سال کی تھی کہ مجھے گدڑی کا کھل کہا جاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں ایک غریب ملازم کی بیٹی تھی جس نے بڑی منت اور مرادوں کے بعد شہر کی ایک نواحی بستی میں آنکھ کھولی تھی لیکن میری ماں مجھے پیدا کرنے کے بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ میرے غریب باپ نے مجھے کسی نہ کسی طرح پال پوس کر بڑا کیا تو مجھے خداوند کریم نے حسن کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ میری ہم عمر سہیلیوں نے اس وقت مجھے صرف صبا کا نام دیا تھا، جب میں نویں جماعت میں چڑھ رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ میں مشرق سے چلنے والی صبح کی تازہ ہوا کے جموگوں اور گل و بہرہ پر گرنے والے شبیم سے بھی زیادہ تروتازہ، شاداب، پاکیزہ اور حسین ہوں..... مکی حسن، خوبصورتی اور رنگ روپ میرے لیے زندگی کا عذاب بن گیا۔ میں ابھی میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی کہ ایک دن میرے باپ نے مجھے دفتر سے واپس آ کر گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”صبا بیٹی..... تو میرے لیے بڑی خوش نصیب ثابت ہو رہی ہے۔“

باپ کو خوش دیکھ کر میں نے سوال کیا۔ ”کیا بات ہے ابا، آج آپ بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔“

”صبا بیٹی۔ آج سے میں نے نئے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی ہے، تنخواہ بھی پہلی ملازمت سے دو گنی ہے۔“

تھے۔ میں ان آخری سانسوں کے درمیان ان کی مختصر تفصیل درج کر رہی ہوں جس کی تفتیش کرنے کے بعد پولیس اور قانون کے نمائندے (اگر کہے ہوئے نہ ہوں تو) بہ آسانی اس آدم خور انسان کو جس کا نام شیخ حامد ہے، پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتے ہیں۔ اگر میری آخری تحریر کسی کام آسکی تو میں سمجھوں گی کہ خدا کی مرضی کے خلاف خودکشی کرنے کا یہ عمل رائیگاں نہیں ہوا۔ ایک مجبور اور بے بس عورت، جس کے باپ کا کمزور سہارا بھی اس سے چھین لیا گیا تھا۔ آخر کس حد تک وہ نامساعد حالات، تذلیل اور بے شری برداشت کر سکتی تھی جس کی اجازت شریعت میں بھی کہیں نہیں ملتی۔

میں زہر کا گھونٹ حلق کے نیچے اتارتے وقت اپنے خدا سے یہی دعا کروں گی کہ یہ تحریر کسی ایسے خدا ترس انسان کے ہاتھ لگے جو شیخ حامد جیسے خون آشام درندے کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا کر اپنی عاقبت سنوارنے کا نیک کام سرانجام دے سکے۔ بد نصیب مبارک و شیخ حامد.....

ڈھٹی سپر سنڈنٹ سراج اس خط اور اس میں درج تفصیل کو تیسری بار نہایت غور سے پڑھنے میں مصروف تھا جب الماس کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ سراج نے کھلے ہوئے کاغذ کو غیر ارادی طور پر تھک کر لیا تو الماس نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

”یہ کس کا نامہ محبت ہے جو اتنی توجہ اور انہماک سے پڑھا جا رہا ہے؟“

عام حالات میں شاید سراج اس اہم تحریر کو الماس سے بھی خفیہ رکھنے کے اصول پر عمل کرتا لیکن اپنی گھریلو زندگی کو خوشگوار رکھنے کی خاطر اس نے ہاتھ میں دبا ہوا صابنیم کا آخری خط اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لو..... تم بھی پڑھ لو..... شاید تم اس کو پڑھنے کے بعد میری کوئی رہنمائی کر سکو.....“

الماس نے خط مکمل پڑھ لیا تو اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہو گئی۔ اپنے انخوا اور لیاقت حسین کی بروقت مداخلت کا تصور کر کے وہ بھی جبر جبری لیے بغیر نہ رہ سکی۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”میرا مشورہ ہے کہ سب سے پہلے آپ اس اہم ترین دستاویز کی دو تین فوٹو کاپی کرائیں پھر اسے اپنے یا میرے لا کر میں محفوظ کر دیں۔“

”مرنے والی نے ایک بڑے اور خطرناک مگر مجھ کے بارے میں جو تفصیل درج کی ہے اس کے تین چار کردار آج بھی زندہ ہیں جو قانون کا تحفظ ملنے کے بعد اگر اپنی زبان کھول دیں تو مرنے والی کی آخری خواہش بھی پوری ہو سکتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ قدرت نے آپ کو ایک اہم فرض سونپ دیا ہے جس کی تکمیل آپ کیلئے ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔“ الماس سنجیدگی سے بولی۔ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کی ایک نقل علیم احمد صاحب کو ضرور پہنچا دیں۔“

”تمہاری تجویز مقبول ہے لیکن وہ تو ریٹائر ہو چکے ہیں۔“

”ہاتھی مرنے کے بعد بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔“ الماس نے برجستہ جواب دیا۔ ”علیم احمد

صاحب حافظ قرآن بھی ہیں جنہوں نے کبھی اس ڈرٹی ڈاگ سے سمجھوتا نہیں کیا جو اپنے تعلقات اور دولت کے زعم میں بے قابو ہو چکا ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی علیم احمد صاحب کو مرکز اور صوبے کے اکثر بڑے عہدیدار اب بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایک آسان طریقہ اور بھی ہے اس اہلیس کے تکبر کو خاک میں ملانے کا.....“ آخری جملہ الماس نے بڑے جذباتی انداز میں ادا کیا۔

”وہ کیا.....؟“

”مجھے صرف آپ کے اشارے اور اجازت کی ضرورت ہوگی.....“ الماس نے مٹھیاں بھیج کر کہا۔ ”میں اس درندے کو اس کے دفتر میں گھس کر موت کے گھاٹ اتار دوں گی۔ پھر جو ہو..... سو ہو۔“

”فیک ایزی.....“ سراج نے الماس کے تیور دیکھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں تمہیں یہ نیک کام کرنے سے منع نہیں کر سکتا لیکن اس کے بعد ہماری بنی بنائی عزت اور شہرت کو جو نقصان پہنچے گا وہ میرے لیے بھی ناقابل برداشت ہوگا۔ تمہارے بعد میں بھی اپنی جان پر کھیل جانے سے گریز نہیں کروں گا۔“

کچھ دیر اسی قسم کی جذباتی باتیں ہوتی رہیں، پھر سراج نے الماس سے عہد کیا وہ مرحومہ صبا بیگم کی آخری خواہش کو پورا کرنے کی خاطر کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرے گا۔

”مجھے آپ پر اعتماد ہے لیکن نیک کام کی تکمیل میں.....“

الماس اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی، سراج کے خاص موبائل کی مخصوص آواز ابھری تو اس نے جلدی سے اسے آن کیا۔ سنجیدگی سے کہا۔ ”ہیلو..... سراج دس ایڈ۔“

”میں بول رہی ہوں.....“ دوسری جانب سے میڈم کی آواز ابھری تو سراج نے الماس پر نظر ڈالتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”میں اس وقت آپ سے کھل کر بات نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے کہ میرا ویک پوائنٹ میرے سامنے موجود ہے۔“

”مڈ.....“ میڈم نے جواب دیا۔ ”آج میں الماس سے بھی ضرور بات کروں گی لیکن اس سے پہلے آپ کو اہم اطلاع دینی ضروری ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”بگ باسٹرز کے اشارے پر افضل خان کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس وقت افضل خان ایسی معاشی کمپری کا شکار ہے کہ اس کے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا لیکن اب اسے شبنم اپنے اپارٹمنٹ میں لے گئی ہے۔ یقیناً اس میں بھی بگ باسٹرز کی کوئی خطرناک چال ہوگی ورنہ شبنم افضل خان کو پناہ دینے کی غلطی کبھی نہ کرتی۔“

”آپ کس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں؟“ سراج یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ الماس قریب کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

”شہر نچ کے کھیل میں گھوڑے کی چالیں وزیر سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ اکثر شاطر کھلاڑی گھوڑا بچانے کی خاطر وزیر کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اس وقت گھوڑا چاروں طرف سے مایوس ہو چکا ہے۔ اس کے پٹنے سے پیشتر بگ باسٹرڈ اسے اپنے کسی بھی دشمن کے خلاف بہ آسانی استعمال کر سکتا ہے۔“

”آئی سی.....“ سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے پر خیال انداز میں کہا۔ ”میں آپ کی اس اطلاع کو فراموش نہیں کروں گا۔“

”ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ شینم پر کوئی آج نہ آنے پائے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“

”مجھے آپ سے کچھ شکوے اور شکایتیں بھی لاحق ہو گئی ہیں۔“ میڈم نے سنجیدگی سے کہا۔

”کسی دشمن نے کان بھرے ہوں گے۔“ سراج نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”فی الحال آپ الماس کو موبائل دے دیں، باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔“

”جو حکم آپ کا.....“ سراج نے سعادت مندی سے کہا پھر ہونٹوں کی جنبش سے میڈم روٹی کا نام لینے کے بعد موبائل الماس کے حوالے کیا اور خود لمبے لمبے قدم اٹھاتا اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔ الماس کے مشورے پر وہ صبا یقیم کی اس آخری تحریر کو اپنے کمپیوٹر کے ٹاپ سکرین فولڈر میں مخصوص پاس ورڈ کے ساتھ محفوظ کر دینا چاہتا تھا۔

الماس رمی تعارف کے بعد میڈم روٹی سے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگی۔



لودی کو معمولی زخم آئے تھے لیکن پھر بھی اس نے اندرونی تکلیف کا بہانہ کر کے اسپتال میں ایک دو دن مزید قیام کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، شیخ حامد کی وجہ سے اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے اسے یہ خوشی اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس قیام کا تعلق لودی کی کسی تکلیف سے نہیں تھا۔ اصل وجہ نرس ڈورٹی کی وہ حسین پیشہ وارانہ مسکراہٹ تھی جو اکثر مریضوں کو پسند تھی، لودی سے پیشتر کچھ متوسط طبقے کے پیٹ بھرے افراد بھی غلط فہمی کا شکار ہو چکے تھے لیکن انہیں بھی مایوسی ہوئی۔ ڈورٹی نرس ہونے کے باوجود اچھے، بلند کردار اور اخلاق کی مالک تھی۔ حسب معمول وہ اس روز بھی دوا دینے کی غرض سے لودی کے قریب آئی تو اس کے ہونٹوں پر وہی دل آویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو مریضوں کو وقتی سکون دیتی تھی۔ ویسے بھی وہ حسین نقوش اور گداز جسم کی مالک تھی۔

”نرس.....“ لودی نے اس کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ڈورٹی.....“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کل بھی میرا نام پوچھ چکے تھے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ لودی نے شوخی سے جواب دیا۔ ”لیکن سبق کئی بار دہرایا جائے تو اچھی طرح یاد ہو جاتا ہے۔“

”اوہ..... گویا آپ کو بعد میں بھول جانے کی عادت ہے؟“ ڈورٹی کے لہجے میں بڑا لطیف طنز تھا۔ ”اگر آپ کہیں تو لکھ کر دے دوں تاکہ آپ کو یاد رہے۔“

”کھلنے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔“ لودی نے ڈھٹائی سے ایک قدم بڑھانے کی کوشش کی۔

”جوبات یا صورت دل پر نقش ہو جائے وہ زیادہ دیر پا ثابت ہوتی ہے۔“

”آئی سی.....“ ڈورٹی نے مسکرا کر اسے دوبارہ نجل کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ شاید

ایکسپانری ڈیٹ پر دھیان دینے کے عادی ہیں؟“

”آپ کی باتیں بھی آپ کی طرح حسین اور دلکش ہیں۔“ لودی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یو آر

رائلی بیوٹی فل اینڈ چارمنگ!“

”پلیز مسٹر لودی۔“ وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی۔ ”دوا لیجئے۔ مجھے آپ کے علاوہ جزل

وارڈ میں دوسرے مریضوں کو بھی اینڈ کرتا ہے۔“

”میں یہاں سے جانے کے بعد بھی آپ کو یاد رکھوں گا۔“ لودی نے رومانٹک لہجہ اختیار کیا۔

”دوا..... اور علاج ضروری ہے۔“ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا گلاس اور گولیاں پھر لودی کی

طرف بڑھا دیں، پہلے کے مقابلے میں وہ کچھ اور سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”آپ شاید میری بات کا برامان گئیں؟“

”پلیز مسٹر لودی.....“ وہ تلخ انداز میں بولی۔ ”میں اپنے فرائض اور آپ کے آفیشل عہدے

سے بخوبی واقف ہوں لیکن انسان اپنی لمٹ کر اس نہ کرے تو سب کیلئے مناسب ہوتا ہے۔“

پولیس کے محکمے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے کے علاوہ لودی کو شیخ حامد کا منظور نظر ہونے کا

سمجھنا بھی تھا۔ پہلے بھی وہ کئی موقعوں پر اپنی مراعات کے سبب میزبانی اگلیوں سے سچی نکال چکا تھا۔

نرسوں کے بارے میں اس کی ذاتی رائے بھی اس کے مزاج کے عین مطابق کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔

اس نے یک لخت سنجیدگی اختیار کر لی، چہیتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم ایک بات بھول رہی ہو

مس ڈورٹی..... پولیس والوں سے عداوت بھی اکثر بڑی جھگڑی ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے وسیع

اختیارات بڑے بڑے طرم خانوں کو بھی.....“

لودی اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کی نظر دروازے کی جانب اٹھی تو وہ ایک دم سنبھل گیا۔

خلاف توقع ایس پی اورنگ زیب کی آمد نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ لودی کی نظروں کے تعاقب

میں ڈورٹی نے بھی پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھا تو اس کے اندر اٹھتا ہوا طوفان اور پھر گیا۔ اس

نے خاموش انداز میں اپنی نفرت اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے دواؤں کی گولیاں ڈسٹ بن میں

پھینکیں پھر..... جھلاتی ہوئی اورنگ زیب کے قریب سے گزر کر باہر چلی گئی۔

اورنگ زیب نے سچویشن کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ سنجیدگی سے قدم اٹھاتے ہوئے لودی

کے بستر کے قریب آکر بڑے پروقار انداز میں ایڑی چیئر پر بیٹھ گیا۔

”آپ نے کیوں تکلیف کی سر.....؟“ لودی نے لیٹے لیٹے ہی بڑے خوشامد انداز میں کہا۔

”میں ایک دوروز میں دس چارج ہو جاؤں گا۔“

اس کا مشورہ ڈاکٹروں نے دیا ہے یا یہ آپ کا ذاتی فیصلہ ہے؟“ ایس پی نے چہیتے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

”ڈاکٹروں کا.....“ لودھی نے دل ہی دل میں تمللا کر جبراً اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

”اس وقت آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“

”پہلے سے بہت بہتر ہوں سر..... کچھ اندرونی چونٹیں باقی رہ گئی ہیں۔“

”کیا میں اس وقت آپ سے اہم موضوع پر کچھ گفتگو کر سکتا ہوں؟.....“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر سنجیدگی اختیار کر لی۔

”خیریت تو ہے سر.....؟“ لودھی اس اچانک سوال پر گھبرا گیا۔

”فی الحال ابھی کسی کو آپسٹلی انکوائری آفیسر مقرر نہیں کیا گیا لیکن..... بحیثیت علاقہ ایس پی، میں ذاتی طور پر تھانے پر ہونے والے تباہ کن حملے اور انسپکٹر دانش کی موت کے بارے میں کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

جواب میں لودھی کسمسا کر رہ گیا۔

”مسٹر لودھی..... کسی انسپکٹر کی آن ڈیوٹی موت اور جرائم پیشہ عناصر کا اس طرح دھڑلے سے کسی تھانے پر حملہ کرنا یقیناً ہمارے لیے باعث شرم ہے۔ کیا اس بات سے اتفاق کریں گے؟“

”جی ہاں سر۔“

”کیا آپ کسی ایسے شخص یا گروپ کا نام نہیں جانتے ہیں جو کھلے عام اتنی جرات کا مظاہرہ کر گیا اور ابھی تک صرف مشتبہ افراد کے علاوہ کسی قابل ذکر مجرم کی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی۔“ اورنگ زیب کے لب و لہجے میں تلخی گھٹنے لگی۔ ”علاقے کا ڈی ایس پی ہونے کی حیثیت میں آپ کے پاس ایسے افراد کی کوئی لسٹ ضرور ہوگی جو.....“

”فی الحال میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا سر“ لودھی نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”ویسے یہ ظاہر یہی تاثر ملتا ہے کہ اس واردات میں بدنام فوٹو گرافر فرنانڈس کے واقف کار شامل ہوں گے۔ ایسے موقع پر شر پسند عناصر بھی لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ میں شریک ہو جاتے ہیں اس لیے.....“

”ون منٹ.....“ اورنگ زیب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہم سب سے اہم بات ہے کہ جب فرنانڈس پولیس لاک اپ میں تھا تو وہ وہاں سے نکل کر باہر کس طرح گیا.....؟“

”میں سمجھا نہیں سر.....؟“ لودھی نے بڑی دیدہ دلیری سے جھوٹ بولا۔ ”میری معلومات کے مطابق تو حملہ آوروں نے اسے لاک اپ میں ہی جلا کر رکھ کر دیا تھا۔“

”ونڈرفل.....“ اورنگ زیب نے تیور بدل کر لودھی کو گھورا۔ ”گویا آپ کے خیال کے مطابق وہ لوگ فرنانڈس کے دوست تھے اور تھانے کی تباہی کے وقت فرنانڈس کو پولیس تحویل سے نکال کر لے جانے کا اصل مقصد بھول گئے تھے؟“

لودھی بری طرح شپٹا گیا۔ کوئی جواب بن نہ پڑا تو سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میں حادثے کی اطلاع ملتے ہی جائے وقوعہ پر گیا تھا لیکن زخمی ہونے کے سبب مجھے

اسپتال پہنچا دیا گیا تھا اس لیے.....“

”شاید آپ کو اس بات کا علم بھی نہ ہوگا کہ تھانے پر حملہ ہونے سے پیشتر مرحوم انسپکٹر دانش نے کسی خبر کی اطلاع ملنے پر فرنانڈس کو کسی اور اسپاٹ سے گرفتار کیا تھا جہاں وہ کچھ بلیک میلنگ فوٹو گراف بنانے کے لیے جیل سے نکال کر لے جایا گیا تھا۔ فرنانڈس کی رنگے ہاتھوں گرفتاری کا آؤٹ ڈور مشیر نامہ اور قانونی دستاویز بھی تیار کیے گئے تھے؟“

”جی..... مم..... میں۔“ لودھی، اورنگ زیب کی معلومات سن کر ہکھلانے لگا پھر بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ”سر..... کیا ایسی کوئی دستاویز ملی ہے جو.....“

”سوری.....“ اورنگ زیب نے تیزی سے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ ”فی الحال میں آپ کی اس طفلانہ معصومیت کے اظہار پر خاموشی کو ہی ترجیح دوں گا۔“

”سر.....“ لودھی نے اپنی وقت بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے پھر جوتوں سمیت ایس پی کی آنکھوں میں مچھنے کی کوشش کی۔ ”اگر آپ کے پاس کوئی ایسی اطلاع ہے تو میں یہاں سے فارغ ہوتے ہی شریپنڈوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں دیر نہیں کروں گا۔“

”گنڈ.....“ ایس پی نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”لیکن ایسے سنگین معاملات کی بیخ کنی کیلئے ضروری نفری کے بجائے سرغنہ پر چال ڈالا جائے تو امن وامان کی صورت زیادہ دیر پر پا ہوتی ہے۔“

”آپ بجا فرما رہے ہیں سر لیکن سرغنہ.....“

”میں نے آپ کے سلسلے میں پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی فوری طور پر آپ سے ملنا ضروری سمجھا تھا۔“ ایس پی اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ میری اطلاع کے مطابق بہت نڈر، دور اندیش اور بولڈ آفیسر ہیں۔ کسی نے اس بات کی تائید بھی کی ہے کہ آپ کی معلومات کا ذخیرہ دوسرے ہم پلہ افسران سے کہیں زیادہ ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے لودھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے دہنگ لہجے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے آئندہ تعاون کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ آپ کی پرسنل انفارمیشن کیلئے ایک اہم بات اور بتا دوں۔ میں اپنے فرض کی ادائیگی کے وقت سوائے اللہ کے کسی اور بات سے نہیں ڈرتا..... وٹس یو گنڈ لگ۔“

اورنگ زیب اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد تیزی سے پلٹا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے لب و لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے لودھی کو بگ بگاس کے حمایتی ہونے کے باوجود بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فرنانڈس کے سلسلے میں ایس پی کی معلومات بھی اس کیلئے کچھ کم پریشان کن نہیں تھیں۔ ”وہ معلومات ایس پی کو کہاں سے ملیں؟“ یہ سوال بڑی دیر تک لودھی کے ذہن میں کسی بگولے کے مانند گردش کرتا رہا۔

شیخ حامد اس وقت اپنے خاص بیڈ روم میں ایک غیر ملکی اور بے باک، کسن حسینہ کے گداز جسم سے گتھا کسی اور ہی دنیا کی حسین وادیوں میں جھکولے کھا رہا تھا، جب اس کے موبائل کی مدھم موسیقی گنگنائی۔ شیخ حامد کو ایسا ہی لگا جیسے خوش ذائقہ نوالے کے بیچ کوئی کنکری آگئی ہو۔

”واٹ نان سینس۔“ حسینہ نے تملاکرا اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ ”ہواؤ ڈسٹرنگ؟“

”ڈونٹ وری سویٹ ہارٹ..... اٹس از بی ارجنٹ۔“ شیخ حامد نے پہلو بدل کر حسینہ کو اپنے ہاتھوں کے حصار میں گھسیٹ لیا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھالیا۔

”کون ہے؟“ اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

”سوری سر..... میں بلیک ٹائیگر بول رہا ہوں، آپ کو ایک اہم اطلاع دینی تھی ورنہ.....“

”بکو..... کیا بات ہے؟“

پھر دوسری طرف سے اورنگ زیب اور ڈی ایس پی لودھی کے بارے میں جو تفصیل بیان کی گئی اسے سن کر شیخ حامد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”فکرمٹ کرو..... میں اس کو بھی جلدی ہی ڈسپوز کر دوں گا۔“ اس نے موبائل کو پا اور ڈ آف کرنے کے بعد حسینہ کو بڑی وحشت کے عالم میں بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔

”کیا بات ہے ڈارلنگ؟..... یہ..... تم ایک دم اتنا وحشی کیوں ہو گیا.....؟“ حسینہ نے احتجاج کیا۔

”شٹ اپ.....“ اس نے غصے میں جواب دیا پھر اپنی ہوس کی تپش سرد کرنے کے بعد تیزی سے اٹھا اور دبیز قالین پر پڑا اپنا گاؤں پہننے ہوئے خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔

”سیلفش..... سن آف اے فک۔“ غیر ملکی حسینہ جسے شیخ حامد نے شاید بیچ منجھدار میں چھوڑ دیا تھا، تملاکرا ابھی پھر..... بڑی دیر تک وہ کسی پھری ہوئی زخمی شیرنی کی طرح شیخ حامد کی شان میں اپنی نفرت کے اظہار کے طور پر فحش اور مغفلت گالیاں بکتی رہیں۔ وہ اپنی تہذیب کا عملی مظاہرہ کرنے میں حق بجانب بھی تھی۔



لیاقت حسین لباس تبدیل کر کے ناشتے کی میز پر آیا تو فرحین پہلے سے اس کی منتظر تھی، خلاف توقع وہ اس وقت بہت خوش نظر آ رہی تھی، چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا۔ لیاقت حسین نے اسے بڑی توجہ سے دیکھا پھر دوسری کرسی پر بیٹھنے ہوئے بولا۔

”کیا بات ہے جان لیاقت، آج تو صبح صبح کچھ بدلی بدلی نظر آ رہی ہے؟“ اس کا اشارہ ہلکے میک اپ کی طرف تھا۔

”آج صاحب کے جانے کے بعد میں اور بیگم صاحبہ شاپنگ پر جائیں گے۔“ فرحین نے اسے چھیڑنے کی خاطر پوچھا۔ ”سچ بتانا، کیسی لگ رہی ہوں؟“

”دونہر کی میم نظر آ رہی ہے۔“

”جل گیا ناں.....“ فرحین روٹھ سی گئی۔

”مجھے تجھ کو منانے کا ہنر بھی آتا ہے لیکن.....“

”لیکن کیا.....“ فرحین اس کے نامکمل جھلے پر تملاکرا رہ گئی۔ ”چپ کیوں ہو گیا؟ کہہ دے کے بندر یا لگ رہی ہوں۔“

”وہ بھی دو نمبر کی۔“ لیاقت حسین نے دل کی بات کہہ ڈالی۔ ”دیکھ فرحین..... خوبصورت وہی بھلی لگتی ہے جو قدرت نے عطا کی ہو، تو ہوا تھا پی کر کے اس میں ردو بدل کرنا مجھے تجھے زیب بھی نہیں دیتا۔“

”اور بیگم صاحبہ جو.....“

”میں نے اپنی اور تمہاری بات کی تھی۔ بیگم صاحبہ کی بات اور ہے۔ ان کیلئے اس لیے جائز ہے کہ اول تو صاحب کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ صاحب نے انہیں منع بھی نہیں کیا۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں شرکت کرنے کے علاوہ خود بیگم صاحبہ بھی میک اپ نہیں کرتیں اور اس چہرے میں زیادہ بھلی نظر آتی ہیں جو اوپر والے نے بنا دیا ہے۔ بڑی بری پارٹیوں میں جانے کیلئے میک اپ ایک فضول فیشن بن گیا ہے۔“

”کیا تجھے میرا میک اپ ٹھیک اپ کرنا بھلا نہیں لگا؟“ فرحین نے سپاٹ لہجے میں شوہر سے سوال کیا۔

”ہاں.....“ لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”اور تو مجھے بغیر سرنی پوڈر کے زیادہ خوبصورت اور تروتازہ لگتی ہے۔ گلابی گلابی سی، مہکتے پھول کی طرح.....“

فرحین نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے ناشتا کرنے لگی لیاقت حسین کو ڈیوٹی پر جانے کی دیر ہو رہی تھی اس لیے اس نے بھی جلدی جلدی ناشتا کیا پھر حسب دستور اس نے کمرے سے باہر جانے سے پہلے فرحین کے گداز ہونٹوں سے اپنے دن بھر کی پیاس کا کچھ حصہ ضرور حاصل کر لیا تھا۔ فرحین نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاہم میک اپ پر تبصرے والی بات اس کے دل کو اچھی نہیں لگی تھی۔

لیاقت حسین ٹھیک وقت پر سیٹھ عثمان کے پورٹیکو میں پہنچ کر ان کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ روزمرہ کے معمول کے مطابق سیٹھ عثمان ٹھیک نو بجے راحیلہ بیگم کے ساتھ باہر آئے۔ لیاقت حسین نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سیٹھ عثمان کے بیٹھنے کے بعد وہ تیزی سے اپنی سیٹ کی طرف جانے کو لپکا تو..... راحیلہ بیگم نے اسے آواز دے کر کہا۔

”لیاقت، آج میں اور فرحین شاپنگ کیلئے جا رہے ہیں۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔“

”شکریہ بیگم صاحبہ..... خدا اور آپ کی عنایت سے سب کچھ ہے ہمارے پاس۔“

گاڑی ہٹنے سے نکل کر کھلی شاہراہ پر آئی تو سیٹھ عثمان نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”لیاقت حسین..... اس روز رات کو سراج تمہیں اپنے بیگلے پر کیوں لے گئے تھے..... کیا کوئی

خاص کام درپیش تھا؟

”مجھے صرف اتنا یاد ہے صاحب کہ ڈپٹی صاحب مجھے رات گئے گھر سے لے گئے تھے پھر مجھے اپنے گھر سے واپس آ کر چھوڑ گئے۔“

”کام کیا تھا؟“

”میں نیند میں تھا، مجھے یاد نہیں ہے کہ.....“

”مجھے تمہاری بات کا سو فیصد یقین ہے۔“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہارے کئی احسانات ہمارے اوپر بھی ہیں اور اب سراج پر بھی تم نے جو احسان کیا ہے وہ بھی قابل فخر ہے۔“

”کیسا احسان صاحب.....؟“ لیاقت حسین نے معصومیت سے کہا۔ ”مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں۔ ڈپٹی صاحب نے آپ کو کیا بتایا ہے؟“

”اس رات الماس سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“

”ڈپٹی صاحب کے بیٹے پر.....“ لیاقت حسین الجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ”میں نے ان کے ڈرائنگ روم میں بیگم صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ بھی کچھ پریشان نظر آ رہی تھیں۔“

”میں ایک شرط پر تمہیں بتا رہا ہوں لیکن تم اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گے، سراج یا فرحین سے بھی نہیں۔“ سیٹھ عثمان نے قدرے توقف سے بات جاری رکھی۔ ”اس رات تم نے الماس کو ایک بڑی مصیبت سے عین وقت پر بچا لیا تھا۔“

لیاقت حسین کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ یہی بات سراج نے بھی کہی تھی لیکن اس وقت بھی اس کے ذہن میں دھند ہی طاری رہی تھی۔ وہ ایسے کسی سامنے کے بارے میں قطعی واقف نہیں تھا۔

”صاحب۔“ اس نے پوری ایمانداری سے سیٹھ عثمان کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے ایسی کوئی.....“

”قسم مت کھاؤ۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے کہ تم غلط بیانی نہیں کر رہے۔“

”صاحب..... ایک درخواست کروں گا۔“ لیاقت حسین نے اداس انداز میں درخواست کی۔

”آپ مجھے دماغی علاج کرنے والے کسی ماہر کو ضرور دکھا دیں۔ ہو سکتا ہے کہ شہر آنے کے بعد میری یادداشت.....“

”اس وہم کو اپنے دماغ میں بھول کر بھی جگہ نہ دینا۔“ سیٹھ عثمان نے بڑے خلوص و محبت سے کہا۔ ”تم ذہنی طور پر مکمل صحت مند ہو لیکن..... ایک دو باتیں ہیں جو تم نے مجھے بھی کھل کر نہیں بتائیں۔“

”میں سمجھا نہیں صاحب؟“ سیٹھ عثمان کے جملے سے اس کے دل کو ٹھیس لگی۔ ”میں نے آپ سے کبھی کوئی بات.....“

”مجھے معلوم ہے کہ تم نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی ہوگی۔“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ ”میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم ایک ذہین اور بے حد خوددار انسان ہو۔ شاید اسی لیے تم نے مجھے

اپنے والد کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

لیاقت حسین لاجواب ہو گیا پھر اس سے پیشتر کہ وہ کوئی مناسب جواب دیتا ایک سنگل بند ہونے کے سبب اس نے گاڑی روک دی، اسی لمحے دو آدمی گاڑی کے قریب آئے اور دروازے کھول کر بڑی سرعت سے عقبی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

”کوئی حماقت کرنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ ہمارے خاموش پستول تم دونوں کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دیں گے۔“ سرد لہجے میں کہا گیا، اس کے ساتھ ہی لیاقت حسین کی گردن پر کسی پستول کا دباؤ بھی ڈالا گیا۔ لیاقت حسین کو بڑی شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا، فرحین کے میک اپ اور سیٹھ عثمان کی باتوں میں الجھ کر وہ دروازوں کو لاک کرنا بھول گیا تھا۔ اب یاد آیا تو دیر ہو چکی تھی لیکن اس نے

دل میں ٹھان لی تھی کہ آخری سانس تک کسی نہ کسی طرح وہ سیٹھ عثمان صاحب پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔

سنگل کھلا تو وہ گاڑی دوبارہ حرکت میں لانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا، فوری طور پر اس کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی۔ وہ انہو ابرائے تاون کی خاطر سیٹھ عثمان کو ساتھ لے جانے کی کوشش کریں گے۔

”تم لوگوں کو ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ سیٹھ عثمان نے ہمت کر کے ان افراد سے پوچھا جو عقبی نشستوں پر براجمان تھے۔

”خاموش بیٹھے رہو.....“ سرد اور سفاک لہجے میں جواب ملا۔ ”ہم جو کہیں اس پر عمل کرتے رہو، اسی میں تمہاری خیریت ہے۔“

”کتنی رقم درکار ہے؟“

”تم کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔“ دوسری آواز ابھری۔ ”ہم اٹھائی گیرے نہیں ہیں اور..... فی الحال تم سے ہمیں کوئی سروکار بھی نہیں ہے..... ہم صرف تمہارے اس جیلے ڈرائیور کی کھوپڑی کا چپک اپ کرانے کیلئے ساتھ لے جائیں گے۔“

”میں گلے گلے تیار ہوں۔“ لیاقت نے دلیری سے جواب دیا۔ ”تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گا لیکن صاحب پر.....“

”گاڑی اگلے راؤنڈ اباؤٹ سے بائیں ہاتھ پر موڑ لینا.....“ عقب سے اس کی بات کاٹ کر تھمنا نہ لہجے میں کہا گیا۔

لیاقت حسین نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ اسے علم تھا کہ وہ راستہ ایک تفریحی مقام کی طرف جاتا تھا جہاں پیک آؤرز (peak Hours) میں ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ حکم کی تعمیل کرتے وقت وہ پستول اس کے پاس موجود تھا جو سراج نے دیا تھا۔ سیٹھ عثمان ساتھ نہ ہوتے تو وہ جان پر کھیل کر بھی پانسا پلٹنے کی کوشش ضرور کرتا۔ راؤنڈ اباؤٹ سے بائیں ہاتھ گھومنے کے بعد کچھ آگے ایک سفید وین کھڑی تھی۔ لیاقت حسین کو اسی دین کے پیچھے

گاڑی روکنے کا حکم ملا پھر ایک شخص اسے پستول سے کور کرتا ہوا دین کے اندر تک لے گیا۔ سیٹھ عثمان نے دین کے نمبر لوٹ کرنے کی کوشش کی جس پر غیر علاقے کا نمبر نظر آ رہا تھا۔ دوسرا شخص ان کے سر پر مسلط تھا، وہ درمیانے قد کا مالک تھا لیکن اس وقت اس کا چہرہ بڑی چابکدستی کے ساتھ کسی ماہرانہ انداز میں تیار کردہ اسکن کلر ماسک میں قریب سے صاف نظر آ رہا تھا۔ دین کی نمبر پلیٹ بھی یقیناً جعلی ہی ہوگی۔

”تمہیں میرے ڈرائیور سے کیا دشمنی ہے؟“ سیٹھ عثمان نے ایک اور کوشش کی۔

”ہمیں اس کا بھی علم نہیں ہے۔“ سرد لہجے میں جواب ملا۔

”جو رقم تمہیں دی گئی ہے یا طے کی گئی ہے میں تمہیں اس کا دو گنا.....“

”بکواس بند کرو۔“ حقارت سے کہا گیا۔ ”تم غلط اندازہ لگا رہے ہو۔ ہم بکاؤ مال نہیں ہیں۔“

اسی وقت دین کی طرف سے اشارہ ملا تو وہ سیٹھ عثمان کو تھرا آلود نظروں سے گھور کر بولا۔ ”تم میرے جانے اور دین کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد تک ڈرائیو تک سیٹ پر جانے کی غلطی نہیں کرو گے۔ ہمارے دوسرا بھی ہیں جو تمہیں نظر نہیں آ رہے لیکن..... اگر تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو پھر تمہاری زندگی کی بھی ضمانت نہیں دی جاسکتی، دیسی ساخت کا ایک معمولی بم بھی تمہیں اور تمہاری گاڑی کو تباہ کر دینے کے لیے بہت کافی ہوگا۔“ اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ بھی لمبے لمبے قدم اٹھاتا دین میں چلا گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی دین تیزی سے حرکت میں آئی اور اسپید بڑھانے لگی۔ سیٹھ عثمان نے دین کے نظروں سے اوجھل ہو جانے تک اپنی سیٹ نہیں بدلی پھر..... انہوں نے سب سے پہلے سراج سے موبائل پر رابطہ قائم کیا۔

”خیریت.....“ دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔ ”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”میں اس وقت مشکل میں ہوں۔“ سیٹھ عثمان نے مختصراً کہا۔ ”دو نامعلوم پیشہ ور بد معاش

لیاقت حسین کو گن پوائنٹ پر انخوار کر کے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

”تم اس وقت کہاں ہو.....؟“ سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ سیٹھ عثمان جواب میں وہ

لوکیشن بتانے لگے جہاں وہ موجود تھے پھر..... اس وقت تک انہوں نے اپنی سیٹ تبدیل نہیں کی جب تک سراج نہیں آ گیا۔ انہیں اپنی جان کو کوئی متوقع پیش آنے والے خطرے سے بھی کہیں زیادہ لیاقت حسین کی فکر تھی۔

”اب تمہارا کیا پروگرام ہے.....؟“ سراج نے پوری تفصیل دریافت کرنے کے بعد سوال

کیا۔

”لیاقت حسین ہم دونوں کیلئے کتنا اہم اور اہمول ہے اس کا اندازہ تمہیں بھی ہوگا۔“ سیٹھ عثمان

نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”اس وقت میں ایسی اعصابی کیفیت سے دوچار ہوں کہ دفتر کے بجائے سیدھا گھر واپس جاؤں گا۔“

”ڈونٹ وری مائی ڈیز.....“ سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ

وہ لیاقت حسین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ تم گھر جاؤ“ میں فوری طور پر راستوں کی ناکابندی کرانے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں۔“

سیٹھ عثمان نے سراج کو پر امید نظروں سے دیکھا پھر گاڑی میں بیٹھ کر گھر لوٹ گئے۔ فرحین اور راحیلہ بیگم گھر پر تھیں، دونوں بازار جانے کو تیار نظر آ رہی تھیں۔ راحیلہ بیگم نے شوہر کو خلاف توقع اتنی جلدی واپس آتے دیکھا تو چونکے بغیر نہ رہ سکیں۔ سیٹھ عثمان کے چہرے پر موجود تاثرات بھی بتا رہے تھے کہ وہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ راحیلہ بیگم بے چین ہو کر ان کے قریب چلی گئیں۔

”کیا بات ہے؟“ آپ اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے۔ خدا خواستہ آپ کی طبیعت تو خراب نہیں؟“

”اندر کمرے میں چلیے۔“ سیٹھ عثمان نے فرحین کی وجہ سے مدھم لہجے میں کہا پھر کمرے میں پہنچ کر اصل صورت حال سے آگاہ کیا تو راحیلہ بیگم بھی تڑپ اٹھیں۔ لیاقت حسین انہیں بھی بہت عزیز تھا۔ فرحین کا خیال بھی انہیں پریشان کر رہا تھا۔ اسے شوہر کے انخواہ ہونے کی خبر ملتی تو وہ بھی یقیناً مضطرب ہو جاتی۔

”آپ سراج بھائی کو دوبارہ فون کریں، میں فرحین کا خیال رکھتی ہوں۔“

”نہیں..... ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کیجیے گا۔“ سیٹھ عثمان نے بیوی کو سمجھایا۔ ”فی الحال جب تک سراج کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملے، فرحین کو اصل صورت حال کا علم نہ ہو تو بہتر ہے، آپ اسے یہی بتا دیں کہ میں نے اسے کسی ضروری کام سے بھیجا ہے۔ میری طبیعت راستے میں بگڑ گئی تھی اس لیے واپس آ گیا۔“

”خدا غارت کرے ان لوگوں کو جو ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں۔“ راحیلہ بیگم نے دل سے جھوٹا دعا دی۔

”میں بھی یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ لوگ خاص طور پر لیاقت حسین کو کیوں لے گئے ہیں؟“

”اللہ اس غریب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔“ راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین کیلئے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا پھر فرحین کی طرف چلی گئیں۔

سیٹھ عثمان ایک صوفے پر نیم دراز ہو کر سراج کو موبائل پر ٹریس کرنے لگے جس کا نمبر مستقل آنچل مل رہا تھا۔



سفید دین میں ڈرائیور اور ایک گن مین پہلے ہی سے موجود تھے۔ لیاقت حسین کو پوری طرح گھیرنے اور دین کے حرکت میں آ جانے کے بعد اگلی نشست پر بیٹھے رائفل بردار نے جوان کا سر غنہ لگتا تھا لیاقت کی طرف دیکھ کر نفرت اور حقارت سے کہا۔

”آج چوہا پھنس گیا حال میں..... میں نے تو سنا تھا کہ تو کوئی اونچی شے ہے۔“

لیاقت نے کوئی جواب نہیں دیا، ابھی تک اس کی تلاشی نہیں لی گئی تھی۔ سراج کا پستول اس کے

پاس تھا۔ اسے ایسے کسی سنہری موقع کی تلاش تھی جب وہ بساط کا رخ پلٹ سکتا۔
”اب تو یہ بالکل بھیگی ملی بنا بیٹھا ہے۔“ دوسرے نے بھی مذاق اڑایا۔ ”ہمیں بتایا گیا تھا بڑا پھنے خاں ہے، آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے، اونٹ خود کو سب سے زیادہ قد آور ہی سمجھتا ہے۔“ تیسرے نے تنقید کی۔

”کوئی جواب نہ دینا لیاقت حسین۔“ لیاقت حسین کو خود اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ اس نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا، وہ سمجھ گیا کہ اس کا ہم زاد اس سے مخاطب تھا۔ ”میں ان لوگوں کو تمہاری تلاش سے باز ہی رکھوں گا۔“

”ان کی پشت پر کون لوگ ہیں؟“
”بھول جاؤ۔۔۔۔۔ تم صرف اتنا یاد رکھو کہ کچھ دور جا کر ان کی دین کسی وجہ سے رک جائے گی اس کے دوبارہ حرکت میں آنے تک یہ سب تمہاری جانب سے بالکل غافل ہوں گے۔ تمہیں خاموشی سے گاڑی سے اتر جانا ہے، اس کے بعد میں مادی شکل میں تمہاری جگہ لے لوں گا۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی بات درمیان سے اچک لی گئی۔
”تم یہاں سے سیدھے گھر جاؤ گے، میرے تمہارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں، وہ تمہیں یاد نہیں رہیں گی۔ تم سے کوئی سوال کیا جائے تو بس ایک ہی بات پر ڈٹے رہنا۔ سیٹھ عثمان نے تمہیں کسی کام سے بھیجا تھا جو نہیں ہو سکا۔ خود وہ طبیعت خراب ہونے کے سبب واپس لوٹ گیا تھا۔ میری بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔“

”کیا تم بھی مجھے ان دشمنوں کا نام نہیں بتا سکتے جو۔۔۔۔۔“
”میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔“ پھر بات رد کر کے جواب ملا۔ ”لیکن جتنی اجازت ہے اس حد کو پھلانگنے کی کوشش کی تو جل کر خاکستر ہو جاؤں گا۔ ہم سب کسی ایسی لازوال قوت کے تابع ہیں جسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔“

لیاقت حسین نے پھر کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

”کیا بات ہے تیس مار خان۔“ اگلی نشست والے نے پھر اسے تاؤ دلانے کی کوشش کی۔ ”ہم نے تو تمہارے بڑے بڑے کارنامے سن رکھے تھے۔ اس وقت ثانی کیوں مر گئی؟“

لیاقت حسین تمللا کر رہ گیا۔ تینوں دشمن اس کی بے بسی کا مذاق اڑاتے رہے، اسلحے کے زور پر۔۔۔۔۔ اگر وہ نہتے ہوتے تو شاید لیاقت حسین ان سے دودھ ہاتھ کر گزرنے میں کسی بزدلی کا مظاہرہ بھی نہ کرتا۔ وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑاتا رہا۔ پھر دین جو برق رفتاری کا مظاہرہ کر رہی تھی، ایک دیر ان جگہ پہنچ کر روک دی گئی۔

”کیا بات ہے؟“ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے سرغنہ نے ڈرائیور کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔
”مجھے شبہ ہے کہ پچھلے پیسے کی ہوا کم ہو گئی ہے۔ ایک منٹ میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

ڈرائیور نیچے اتر گیا۔ ہمزاد کی آواز بہت قریب سے سنائی دی۔ ”تم اب نیچے اتر جاؤ لیاقت حسین، میں نے ان تینوں کو بے حس کر دیا ہے۔ وقت کم ہے، جلدی کرو۔“
لیاقت حسین نے بہ مشکل جگہ بنا کر دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا، اسے بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص سے ٹکرا کر نیچے اترنا پڑا تھا لیکن وہ بے خبر بیٹھا رہا۔۔۔۔۔ ایسا ہی لگا جیسے اسے ساپ سونگھ گیا ہو، لیاقت حسین کے باہر نکلنے کے دس سیکنڈ بعد دین دوبارہ حرکت میں آ گئی۔ لیاقت حسین واپسی کے راستے پر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ تقریباً چالیس منٹ تک وہ پیدل چلتا رہا۔ اسے کوئی ٹیکسی یا رکشا نظر نہیں آیا۔ ایک دو پرائیویٹ گاڑیوں کو ہاتھ اٹھا کر لفٹ مانگنے کی کوشش کی لیکن وہ تیزی سے رکے بغیر گزر گئیں۔ پندرہ منٹ بعد اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو سیٹھ عثمان کا پتا بتا کر تھکے تھکے انداز میں سیٹ سے ٹیک لگالی۔ اس کو اپنا ذہن بالکل خالی خالی لگ رہا تھا۔ چہرے کے تاثرات غمازی کر رہے تھے کہ وہ کسی خاص بات پر غور کر رہا تھا۔

فون کی کھنٹی بجتے ہی شیخ حامد نے اس طرح لپک کر ریسپورڈ اٹھا لیا جیسے اسے کسی متوقع کابل کا شدت سے انتظار ہو۔

”بلیک ٹانگیر بول رہا ہوں۔“ دوسری جانب سے ضروری کوڈ اور پاس ورڈ بتانے کے بعد کہا گیا۔ ”جن افراد کو ضروری کام سونپا گیا تھا وہ ہماری مطلوبہ شے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ اسے مطلوبہ مقام پر پہنچا کر دوبارہ اطلاع کریں گے۔“

”سیٹھ عثمان کو تو نہیں چھیڑا گیا۔۔۔۔۔؟“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔
”نوسر۔۔۔۔۔ آپ نے جو ہدایتیں دی تھیں، کام اس کے عین مطابق ہوا ہے۔“
”اپنے آدمیوں کو دوبارہ تاکید کر دو کہ جو مال حاصل ہوا ہے اس میں زیادہ ٹوٹ پھوٹ نہیں ہونی چاہئے لیکن اس کی اتنی مرمت ضروری ہے کہ پانچویں بار کسی کام کا نہ رہ سکے۔۔۔۔۔ میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو؟“

”نیس باس۔۔۔۔۔ سمجھ گیا، اور کوئی حکم۔۔۔۔۔؟“

”میں نے آج وہ ٹینڈر حاصل کر لیا ہے جس کی خاطر سیٹھ عثمان کے راستے سے بھیگی ملی کی طرح ہٹ جانے کے بعد اب رستم علی آغا خانی مقابلے پر آنے کی غلطی کر رہا ہے۔“

”اجازت ہو تو کسی جماعت خانے میں اس کیلئے بھی دفنانے کا بندوبست شروع کر دوں؟“
”جلد بازی نہیں لیکن۔۔۔۔۔ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چباتے ہوئے

کہا۔ ”میری معلومات کے مطابق وہ بھی کچھ ایسے جرائم پیشہ بد معاشوں کی پشت پناہی کر رہا ہے جو قانون کو سنگین جرائم میں مطلوب ہیں۔ میں پہل کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔“

”ایک بات عرض کرنا چاہوں گا۔“
”کہو۔۔۔۔۔“

”دشمن کو سزا اٹھانے سے پیشتر ہی کچل دیا جائے تو اندیشے باقی نہیں رہتے۔“
 ”نہیں.....“ اس کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔ ”جتنا کہا جائے صرف اتنا کرو..... میں نے نمبر نو کو بھی ضروری ہدایت کر دی ہیں، فی الحال زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“
 شیخ حامد نے ریسور رکھ کر شبنم کی طرف دیکھا جو اس وقت اس کے ساؤنڈ پروف کرے میں موجود تھی۔ میک اپ میں اس کا حسن پہلے کے مقابلے میں زیادہ کھرا کھرا لگ رہا تھا۔
 ”گڈ.....“ شیخ حامد نے اسے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔ ”اب تم نے جینے کا جو نیا انداز اختیار کیا ہے وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ سودمند، چارمنگ اور گڈ لکنگ ہے۔ دوبارہ پیچھے ہٹ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہ کرنا، یہ میرا ذاتی مشورہ ہے۔“
 ”میں آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کروں گی۔“ وہ سعادت مندی سے بولی۔
 ”فائن.....“ اس نے شبنم کو بہ دستور لپٹائی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ ”جانتی ہو میں نے تمہیں افضل خان کے بارے میں کیوں رعایت دی تھی؟“
 ”ہے کوئی شخص جو بہت زیادہ سرا بھارنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ شبنم نے دہی زبان میں بگ باس کو خوش کرنے کی خاطر کہا۔ ”ایسے موقع پر افضل خان کے پاس کوئی دوسری چوائس بھی نہیں ہوگی۔ تخت یا تختہ والی صورتحال ہے۔“
 ”ونڈرفل.....“ خطرناک مگر مجھ نے شبنم کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔ ”تم اب سمجھ دار ہوتی جا رہی ہو۔ اسے اس طرح اکسانا کہ وہ اس بات کا اندازہ نہ کر سکے کہ پشت پر میری مرضی بھی شامل ہے۔“
 ”ڈونٹ وری سر..... میں ایسا ہی کروں گی۔“
 ”ڈش یو آل دی بیسٹ..... میں باقی باتیں تمہیں موبائل پر سمجھا دوں گا۔“ شبنم بگ باس کا اشارہ پا کر ابھی اور تیزی سے باہر چلی گئی تو شیخ حامد اپنے مخصوص موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر بے حد خشک اور سنجیدہ لہجے میں مخاطب ہوا۔ ”اپنے کچھ کارندے رسم علی کی نقل و حرکت پر تعینات کر دو لیکن..... میری طرف سے اشارہ ملے بغیر کوئی حماقت نہ کرنا۔“
 ”رائٹ سر.....“ دوسری جانب سے مختصر اُ کہا گیا۔
 ”مجھے ہر دو گھنٹے بعد حالات اور مطلوبہ شخص کی ذاتی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہنا.....“
 ویٹ از آل۔ ”بات مکمل کر کے شیخ حامد علی نے موبائل آف کر دیا۔ اس کی نگاہوں میں اس زخم خوردہ ناگ کی چمک ابھرائی جس کی ناگن اسے بیچ منہ حار میں دغا دے کر ساتھ چھوڑ گئی ہو۔



سیٹھ عثمان کے علاوہ راحیلہ بیگم بھی لیاقت حسین کی طرف سے بے حد فکر مند تھیں، سراج کا فون دوبارہ آچکا تھا لیکن اس طرف سے بھی کوئی خاص خبر نہیں مل سکی۔ سفید وین کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ متعلقہ ٹکٹ کے ذمے داروں نے بھی اس نمبر کو جعلی قرار دے دیا جو وین پر دیکھا گیا تھا۔ راحیلہ

بیگم نے فرحین کو شوہر کی طبیعت کا بہانہ کر کے ٹال دیا تھا اس کے بعد سے وہ شوہر ہی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی لیاقت حسین کی زندگی اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔
 دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ دونوں کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔
 ”آپ کا شہ کن لوگوں پر ہے؟“ راحیلہ بیگم نے خود کو بہلانے کی خاطر پوچھا۔
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....“ سیٹھ عثمان کسمسا کر بولے۔ ”اگر انہوں نے اغوا کا کامیاب پروگرام بنایا لیا تھا تو پھر مجھے صحیح وسلامت کیوں چھوڑ گئے؟“
 ”خدا کیلئے ایسی بات منہ سے نہ نکالے۔“ راحیلہ بیگم نے شوہر کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری عقل بھی کام نہیں کر رہی کہ ان کی لیاقت حسین سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“
 ”ہو سکتا ہے کہ یہ پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہو جس کا ذکر لیاقت حسین نے ہم سے کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔“
 ”ایسی کوئی بات ہوتی تو کم از کم فرحین مجھے ضرور بتا دیتی۔“
 ”پھر آپ کیا نتیجہ اخذ کر رہی ہیں؟“
 ”آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ لیاقت حسین کی گاڑی کو کمر کیوں ماری گئی تھی؟ دشمنوں کا مقصد ہم سب کو ایک ساتھ ختم کرنے کا تھا۔ شاید انہیں ہمارے راستے میں سپر اسٹور پر اتر جانے کی اطلاع بر وقت نہ ملی ہو۔“
 ”میرے ذہن میں بھی سب سے پہلے شیخ حامد ہی کا نام ابھرا تھا لیکن اگر بات وہی ہے جو آپ سوچ رہی ہیں تو پھر اس بار مجھے کیوں نظر انداز کر دیا گیا؟“
 ”اس لیے کہ آپ نے اب اس کے مقابلے پر اتنا کم کر دیا ہے۔“ راحیلہ بیگم نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن دودھ کے جلے کو چھاپھ بھی پھونک پھونک کر پینے سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔“
 ”ہو سکتا ہے آپ کا اندازہ درست ہو۔ فی الحال یہ دعا کریں کہ لیاقت حسین خیر و عافیت سے گھر آجائے ورنہ ہم فرحین کو کیا منہ دکھائیں گے۔“
 ”میرا دل کہتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ حدیث میں بھی یہی لکھا ہے کہ جو شخص دنیا میں کسی کی پریشانی میں کام آئے یا کسی مومن کی دنیا میں تکلیف رفع کرے گا تو خداوند قدوس قیامت کے روز اس کی تکلیفوں کو رفع فرمائے گا۔ لیاقت حسین عبادت گزار ہے اور سب کا کام آتا ہے۔ اس مشکل وقت میں میرا دل کہتا ہے کہ خدا بھی غیب سے اس کی مدد فرمائے گا۔“
 سیٹھ عثمان کچھ جواب دینا چاہتے تھے کہ ایک ملازمہ نے آ کر اطلاع دی کہ لیاقت حسین دروازے پر موجود ہے۔ اور صاحب سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔
 سیٹھ عثمان کے علاوہ راحیلہ بیگم بھی اس طرح چٹکیں جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ لیاقت حسین کے بارے میں گھر میں کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اسے دو ڈھائی گھنٹے پہلے اغوا کر لیا گیا تھا۔

سیٹھ عثمان نے بیوی کی طرف حیرت سے دیکھا جو خود بھی حیران و پریشان نظر آرہی تھیں پھر..... وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے پر آئے تو انہیں لیاقت حسین کو پرسکون حالت میں سامنے کھڑا دیکھ کر اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔

”تم.....!“ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ انہیں بہ دستور اپنی قوت پر پٹائی پر شبہ ہو رہا تھا۔
”صاحب.....“ لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ”آپ نے مجھے جس کام سے بھیجا تھا وہ نہیں ہو سکا۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

سیٹھ عثمان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لیاقت حسین نے حرف بہ حرف وہی جملہ کہا تھا جو انہوں نے فرحین کو تسلی دینے کی خاطر راحیلہ بیگم سے کہا تھا۔ پھر وہ جملہ لیاقت حسین کی زبان سے کیسے ادا ہوا؟ کیا وہ محض اتفاق تھا؟

”آپ آرام کریں صاحب۔“ لیاقت حسین نے انہیں گم صدمہ دیکھ کر کہا۔ ”میں ادھر ہوں، کوئی کام ہو تو یاد کر لیجیے گا۔“

سیٹھ عثمان نے اس وقت بھی کوئی سوال جواب مناسب نہیں سمجھا۔ صرف اتنا کہا۔ ”تم گھر جا کر کپڑے تبدیل کر لو۔ آج میں گھر پر آرام کروں گا۔“

لیاقت حسین کے جانے کے بعد انہوں نے بیوی سے ذکر کیا تو وہ بھی ششدر رہ گئیں، کچھ توقف سے بولیں۔ ”سراج بھائی کا اندازہ غلط نہیں ہے کہ کوئی غیبی قوت لیاقت حسین کی مدد کر رہی ہے۔“

”ہو سکتا ہے لیکن..... حیرت اس بات کی ہے کہ ان تینوں نے لیاقت حسین کو خاموشی سے چھوڑ دینے کا رسک کیوں لیا؟“

”مجھے بھی تعجب ہے..... بہر حال آپ سراج بھائی کو فون کر کے بتا دیں کہ لیاقت حسین، صحیح سلامت واپس آ گیا ہے۔ وہ اسی کی خاطر بھاگ دوڑ میں لگے ہوں گے۔“

سیٹھ عثمان نے بیوی کے مشورے پر سراج کو آگاہ کیا تو ایک لمحے کو اس کی طرف سے بھی خاموشی رہی پھر اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”تم نے اس سے انکار کرنے والوں کے بارے میں کوئی پوچھ کچھ تو نہیں کی؟“

”نہیں لیکن..... مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ میں نے راحیلہ کو فرحین کی دلجوئی کی خاطر اسے جو بات سمجھائی تھی وہی جملہ جواب کی صورت میں لیاقت حسین کی زبان سے کس طرح ادا ہوا؟“

”پریشان مت ہو..... میں کچھ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں، رات کو آؤں گا تو تمہیں بھی سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“

”کیا تمہیں اس بات پر تعجب نہیں ہو رہا کہ جو شر پسند اسے زبردستی لے گئے تھے انہوں نے اسے چھوڑ دینے کا رسک کیوں لیا؟“

”ابھی مت الجھو.....“ سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ ”رات کو تفصیل سے بات ہوگی۔“
سیٹھ عثمان نے موبائل آف کر دیا لیکن ان کے ذہن میں مختلف پریشان کن خیالات بڑی تیزی سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ راحیلہ بیگم کے دماغ میں بھی دوسرے سراٹھانے لگے تھے۔

اس وقت رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ شیخ حامد شراب و شباب سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا جب اچانک وہ کچھ خلاف معمول آواز اور شور و غل سن کر اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا جیسے قیامت آگئی ہو۔ کمرے کی لائٹس آن کرنے کے بعد اس نے کال تکل بجائی، ٹائٹ ڈیوٹی ملازم دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، وہ بھی یو کھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

”یہ شور و غل کیسا ہے؟“ اس نے ملازم سے جھلا کر سوال کیا۔
”سر ہم پر حملہ ہو گیا ہے۔“ ملازم گھبرایا ہوا تھا۔

شیخ حامد کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے ہنگلے کے دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا، تیز تیز قدم اٹھاتا عقبی کھڑکی کی طرف بڑھا، دبیز پردے کو ڈرا سا ہٹا کر اس نے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی جو بال بال بچ گیا۔ کھڑکی میں روشنی کی جھری نظر آتے ہی باہر سے دو شعلے فضا میں برق رفتاری سے لپکے۔ کھڑکی کا شیشہ چور چور ہو کر فرش پر بکھر گیا۔ شیخ حامد اچھل کر دیوار سے چپک گیا پھر اس نے جیب سے اپنا موبائل نکال کر بلیک ٹائیگر کے نمبر ڈائل کیے۔ کال فوراً ہی ریسپونڈ کر گئی۔

”تم اس وقت کہاں مرے ہوئے ہو؟“ وہ کسی شیر کی طرح دھاڑنے لگا۔ ”میرے ہنگلے کو دونوں طرف سے گھیر کر فائرنگ ہو رہی ہے۔“

”میں ہنگلے سے زیادہ دور نہیں ہوں سر.....“
”یہ سؤر کے بچے کون ہیں جنہوں نے اپنی موت کو دعوت دی ہے؟“

”ابھی اس کا علم نہیں ہوا۔ ہمارے گارڈز انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ بلیک ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”عملہ آدہ تین مختلف گاڑیوں میں وقفے وقفے سے آئے تھے اس لیے ہمارے آدمیوں کو کچھ دشواری ہو رہی ہے۔“

”بکومت.....“ شیخ حامد گرجا۔ ”میں ان حرامیوں کو کیا مفت میں پال رہا ہوں جو ان کی غفلت سے ایک سنسناتی ہوئی گولی نے میری خواب گاہ کا شیشہ بھی چکنا چور کر دیا۔ میں اگر فائرنگ کی زد میں آجاتا تو.....“

”مجھے افسوس ہے سر لیکن..... حملہ اس قدر منظم طریقے سے.....“
”نان سنس۔“ اس کے منہ سے پھر گالیوں کا طوفان اٹھنے لگا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ دشمنوں کو حملہ کرنے سے پیشتر تمہیں اور تمہارے حرام خور محافظ دستے کے افراد سے باقاعدہ انویٹیشن کارڈ لے کر آنا چاہیے تھا۔“

”سوری سر، میں خود آگے جا کر دیکھتا ہوں۔“
”ریش..... ابھی تک کس بات کا انتظار کر رہے تھے.....؟“ شیخ حامد نے جھلا کر فون آف کر دیا پھر کچھ سوچ کر اس نے فون اٹھایا اور ایس بی اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ہیلو..... اورنگ زیب بول رہا ہوں۔“
”تم اس وقت غالباً غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے ہو۔“ شیخ حامد نے نفرت کا اظہار کیا۔
”کون بکواس کر رہا ہے؟“ جواب بھی اسی لب و لہجہ میں دیا گیا۔
”میں شیخ حامد بول رہا ہوں۔“ اس نے بڑے تکبر سے اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”اس وقت کیا تکلیف لاحق ہو گئی.....؟“ دوسری جانب سے بے پروائی سے سوال کیا گیا۔
”تم علاقے کے ایس بی ہو اور ابھی.....“
”پلیز شیخ حامد..... تمیز سے بات کریں، میں آپ کا ماتحت نہیں ہوں۔“ اس بار اورنگ زیب کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

”میرے گھر پر کچھ شری پسندوں نے حملہ کر دیا ہے۔ آپ کے کارندے اس وقت کہاں ہیں؟ کیا حسب دستور وہ مجرموں کے فرار ہونے کے بعد اپنی فطرتیں دکھانے کی خاطر آئیں گے؟“
”میں نیا ذیابوں مسٹر حامد.....“ اورنگ زیب نے سرد لہجہ میں جواب دیا۔ اس کے لہجہ میں طنز بھی شامل تھا۔ ”آپ کے شہر کا یہ پرانا دستور ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں بھی مرکز کے کسی وزیر سے بات کرنی چاہئے تاکہ پرانے دستور بدلے جاسکیں اور پولیس اور عوام دونوں اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی حماقت نہ کریں۔“
”میں نے آپ کو لیکچر سننے کی خاطر فون نہیں کیا۔“ شیخ حامد بری طرح تملایا لیکن اس بار اس نے ”تم“ کا صیغہ نہیں استعمال کیا تھا۔

”لیکچر نہیں..... میں اصول کی بات کر رہا ہوں شیخ صاحب، ویسے آپ کی اطلاع کیلئے بتا دوں کے تھانے کی پولیس پارٹی موقع واردات پر موجود ہے۔ میں خود بھی نکل رہا تھا کہ آپ کا فون آ گیا۔ آپ کے اکثر پڑوسیوں کے فون بھی آرہے ہیں۔“
”میں آپ کا منتظر رہوں گا۔“ شیخ حامد نے معطلہ جواب دیا۔ وہ دریا میں رہ کر مچھلیوں سے بھر بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

”سوری، میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ سچو لین کو فوری کنٹرول کرنا میرے لیے زیادہ اہم ہو گا۔ رہا ملاقات کا سوال تو ابھی میرے تہادلے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایک ہی شہر میں تو ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“ دوسری جانب سے جواب کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
”باسنڈ.....“ شیخ حامد بری طرح تملایا کہ وہ گیا۔ تہادلے کے حوالے سے ایس بی نے جو ڈھکا چھپا طنز اور ملاقاتوں کا ذکر کرتا وہ بگ باس کے منہ پر بھر پور طمانچے سے زیادہ کاری ثابت ہوا۔

”ڈونٹ وری ایس بی..... میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔“
باہر سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں کچھ کی ضروری آگئی تھی لیکن فائرنگ تھوڑے تھوڑے وقفے سے جاری تھی، خطرناک مگر کچھ کسی بھوکے درندے کے مانند ٹہل رہا تھا۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر مخالفین کے کئی چہرے بار بار ابھر رہے تھے پھر ایک لخت اسے رستم علی آغا خانی کا خیال آیا۔ ٹینڈر میں ناکامی کے بعد اس نے جس انداز میں شیخ حامد سے ہاتھ ملا کر مبارکبادی تھی اس میں کھلا چیلنج بھی موجود تھا۔ وہ مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا جب ملازم نے آکر ملحقہ تھانے کے انسپکٹر کی آمد کی اطلاع دی۔

”بلالاد.....“ اس نے جھلا کر کہا۔
”سر.....“ انسپکٹر کے دو منٹ بعد کمرے میں داخل ہو کر اسے باقاعدہ سلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم حالات پر قابو پا چکے ہیں۔“
”حملہ کرنے والے کون تھے؟“ بڑی رعوت سے سوال کیا گیا۔
”جو دو لاشیں ملی ہیں وہ پولیس کو متعدد جرائم میں پہلے سے مطلوب تھے۔“
”کس پارٹی کے ہو سکتے ہیں؟“
”مغرور مجرم تھے سر..... ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان کی پشت پر کس کا ہاتھ ہو گا۔“
”ہمارے گارڈز کی کیا اطلاع ہے.....؟“
”تین مارے گئے دو معمولی زخمی ہیں۔ انہیں میں نے اسپتال بھجوا دیا ہے۔“ انسپکٹر نے کہا پھر عقبی کھڑکی کے شیشوں کو بکھرا دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”یہ کیسے ہوا سر..... کیا انہوں نے.....“
”ڈونٹ بی سلی۔“ شیخ حامد نے جھلا کر کہا۔ ”حملہ آور یہاں دشمنی کی غرض سے آئے تھے۔ دوستی کا پیغام دینے نہیں۔“
”سوری سر.....“

”تمہارا ایس بی کہاں ہے.....؟“
”وہ قرب و جوار کے لوگوں کا بیان لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سارے کاغذات ان ہی کی نگرانی میں تیار ہوئے ہیں۔ انسپکٹر نے کہا۔ ”آپ کی رہائش گاہ پر آپ کے گارڈز کے ساتھ کچھ دنوں کیلئے پولیس کے سادہ لباس والوں کو تعینات کرنے کا حکم بھی.....“
”اپنے ایس بی کو منع کر دینا۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔“ شیخ حامد نے ایس بی سے تلخ باتوں کی جھلاہٹ انسپکٹر پر اتارنے کی کوشش کی۔ ”دشمن کے کارندے پولیس کے کسی آدمی کو بھی منہ مائٹے داموں خرید سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ پولیس فورس میں بھی بے شمار کالی بھیڑیں موجود ہیں جن کو ان کے عہدے کے اعتبار سے خریدا جاتا ہے۔“
”میرے لیے کیا حکم ہے سر.....؟“ انسپکٹر نے کسمسا کر دریافت کیا۔
”کیٹ لاسٹ..... تم جانو اور تمہارا ایس بی۔“

”لیکن تمہاری یہ زبان جو ابھی ٹھوٹے اگل رہی ہے کچھ دیر بعد قینچی کی طرح نہیں چل سکے گی۔“ داہنی سٹ والا کسمسا کر سرد آواز میں بولا۔ ”ہم تمہیں اپنے اشاروں پر بچ بولنے پر مجبور کر دیں گے۔“

”شٹ اپ.....“ رائٹل برادر اپنے مضے پر قابو نہ پاسکا۔ ”تمہاری یہ ساری اکڑفوں ابھی کچھ دیر بعد دوسرے راستے سے نکل جائے گی۔“

”بہت زیادہ مفتی اعظم بننے کی کوشش نہ کرو۔“ اگلی نشست والا غزایا۔ ”ہم نے بڑے بڑوں

کو خنک کر دیا ہے۔ تم کس کھیت کی مولیٰ ہو۔“

اس بار لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہ مرعوب بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی کی رفتار ذرا دم ہوئی پھر وہ اٹنے کا تھہر پڑنے کے بعد روک دی گئی۔ کسی شٹر کے اٹھنے کی

آواز ابھری۔ اس کے بعد وین ڈھلوان اترنے کے بعد مکمل روک دی گئی۔ بشر بنڈھونے کی آواز دوبارہ سنائی دی پھر وین کا انجن بھی بند کر دیا گیا۔ اس جگہ آنے سے پانچ منٹ قبل لیاقت حسین کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی تھی اس لیے کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس نے راستے میں بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

دین کا انجن بند ہونے کے بعد اسے گھسیٹ کر نیچے اتارا گیا۔ اس وقت سرخسہ نے ہماری آواز میں کہا تھا۔

”اے اندر لے جانے سے بیشتر حاشی بھی لے ڈالو۔ ہو سکتا ہے اس کے پاس کوئی اسلحہ یا ہتھیار موجود ہو۔“ دو آدمیوں نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن لمباقت حسیں کے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی زبان بند کر رکھی تھی۔ دو افراد نے اس کے ہاتھوں کو ختم کر آگے کی سمت دھکا دیا۔ کچھ دور اس نے کسی دروازے کے بند ہونے کی آواز سنی۔ اس کے بعد اسے کسی لوہے کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ دونوں ہاتھ پشت پر کر کے پہلے اس کو ریشم کی پتلی رسی سے پوری طرح جکڑا لیا گیا پھر پاؤں کو بھی کرسی کے دونوں پیروں سے جکڑ دیا گیا۔ اسے پوری طرح بے بس کرنے کے بعد آٹھوں کی پٹی کھول دی گئی۔

انسپکٹر سیلوٹ کر کے اٹلے قدموں چلا گیا تو شیخ حامد نے موبائل پر کسی مخصوص نمبر ”ٹو“ سے رابطہ قائم کیا، لائن مل جانے کے بعد اس نے سخت لہجہ سوال کیا۔ ”جہیں جس شخص کی نگرانی پر لگا یا گیا تھا اس کی رپورٹ کیا ہے.....؟“

”میں اور میرے خاص آدمی مستقل اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ ابھی تک کہیں باہر نہیں نکلا۔ عام طور پر اس کا یہی معمول ہے، یہ بات ہم نے اسی کے ایک آدمی سے معلوم کی تھی..... پارٹیوں میں سے بھی وہ صرف کسی خاص میں جاتا ہے۔“

”ٹیلی فون ایکس چینج میں کوئی واقف کار ہے؟“

”میں سمجھ گیا سر.....“ دوسری جانب سے فوری جواب ملا۔ ”میں آدھے گھنٹے کے اندر اندر آپ کو ایسے تمام نمبروں کی فہرست فراہم کر دوں گا جہاں اس کے نمبروں سے رابطہ قائم کیا گیا ہے لیکن.....“

”رک کیوں گئے؟ کیا کہنا چاہتے تھے.....؟“

”میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر یہ ایسی کی حرکت ہے تو پھر اس نے فون پر کسی سے گفتگو کرنے کے بجائے شاید موبائل کو ترجیح دی ہو۔“

”یو آر..... رائٹ..... پھر بھی تم فون نمبرز مجھے پہلی فرصت میں فراہم کر دو۔“ شیخ حامد نے موبائل آف کر دیا پھر اپنے بستر پر لیٹ کر لائٹ بند کر کے نائٹ بلب آن کر دیا لیکن..... اس کا ذہن براہِ اس دشمن کی کھوج لگانے میں مصروف تھا جس نے پہلی بار اس کے مکان پر حملہ کرنے کی حماقت کی تھی۔



سفید وین کے پچھلے پسے کی ہوا چپک کرنے کے بعد ڈرائیور نے دوبارہ تیز رفتاری کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ لیاقت حسین کو قابو کرنے والے دونوں مسلح افراد اس کے داییں بائیں پوری طرح محتاط نظر آ رہے تھے، اگلی نشست پر بیٹھا ہوا راکشل برادر وین کے حرکت میں آتے ہی دوبارہ لیاقت حسین کو خوشحال نظروں سے گھورنے لگا جواب قدرے مطمئن اور بے پروا نظر آ رہا تھا۔

”جانتے ہو ہم نے اس وقت پیک آؤرز کے باوجود تمہیں کیوں اغوا کیا ہے؟“ اس کے لہجے میں سفاکی تھی۔

”میں صبح کا ناشتا کر کے نکلا تھا۔ شاید تم لوگوں نے دوپہر کے کھانے کا کچھ اہتمام کیا ہوگا۔“

”اچھا..... مجھے خوشی ہے کہ تم قربانی کا بکرا بننے کے باوجود بوکھا ہٹ کا شکار نہیں ہو..... ورنہ عام حالات میں ایسے موقعوں پر انخوا ہونے والوں کے چہروں پر یتیمی رستی نظر آتی ہے۔“

”موت جب برحق ہے تو اسی وقت آئے گی جو مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ رونے دھونے یا واوا بلا بچانے سے ملک الموت کو متاثر نہیں کیا جا سکتا۔“

وہ بارہ بائی پندرہ کا کرا تھا جس کی دیواروں پر اذیت پہنچانے والے خطرناک آلات لٹکے نظر آ رہے تھے۔ لیاقت حسین جس لوہے کی ٹھوس کرسی پر بیٹھا تھا وہ شاید اسی مقصد کیلئے زمین میں فکس تھی کہ گر نہ سکے، کمرے میں سوائے ایک بید کی کرسی کے مزید کوئی اور سامان نہیں تھا۔

”ایک نظر چمت پر بھی ڈال لو جان جگر!“ سرغنہ نے مکررہ انداز میں مسکراتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ ”شاید اسے دیکھ کر تمہیں جواب دینے میں کسی حماقت کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہ ہو۔“

جواب میں لیاقت حسین نے اوپر نظریں اٹھائیں جہاں لوہے کی دو زنجیریں اور اس کے آخری سرے پر لوہے کے مضبوط کڑے جمول رہے تھے جس سے اذیت دینے والے کو الٹا لٹکایا جاسکتا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم پوری طرح اپنی موجودہ پوزیشن کا درست طور پر اندازہ لگا چکے ہو مگر؟“

”ہاں..... مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ مجھے آرام دہ بستر پر سلائے نہیں لائے ہو گے۔“

”تم کس کے ملازم ہو یہ ہم جانتے ہیں لیکن کچھ باتوں کی تصدیق ضروری ہے اس لیے ہم نے تمہیں اٹھا لیا ہے۔“ سرغنہ بید کی کرسی گھسیٹ کر اس سے دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی دائیں بائیں موجود تھے، ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ لیاقت حسین کے ساتھ برا سلوک کرنے کیلئے پوری طرح آمادہ ہیں۔

”پوچھو.....“ لیاقت حسین نے بے پروائی سے کہا۔ ”اگر وہ باتیں میرے علم میں ہوئی اور کوئی مصلحت اڑے نہ آئی تو میں سچ بولنے سے گریز بھی نہیں کروں گا۔“

”پہلی بار تم نے میڈم روبی کو اغوا کرنے والوں کے ہاتھوں سے بچانے کی حماقت کس کے اشارے پر کی تھی؟“

”میرے دل نے مجھے اکسایا تھا۔ کسی مجبور اور کمزور عورت کی عزت اور عصمت بچانا ایک مسلمان کا فرض بھی ہے۔“ لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اس وقت تمہارے ساتھ اور کون موجود تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم.....“

”جھوٹ بول رہے ہو۔“ سرغنہ نے گرج کر کہا۔ ”تمہارے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج بھی تھا۔“

”جب تمہیں یقین ہے تو پھر مجھ سے کس بات کی تصدیق کر رہے ہو؟“

”سینئر عثمان اور اس کی بیوی کو ہراسنور میں اتار کر تم اکیلے گاڑی لے کر کیوں چلے گئے تھے؟“ چپتے ہوئے سرد لہجے میں اگلا سوال پوچھا گیا۔

”اس وقت میں بے ہوشی کی حالت سے دوچار تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ شاید دعوت میں مجھے جو کھانا ملا تھا وہ زہر آلود تھا۔“

”پھر تم بچ کس طرح گئے؟“

”خدا کی مرضی.....“

لیاقت حسین کے جواب پر سوال کرنے والے کے ایک ساتھی نے لپک کر اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اتنی شدت سے گھسیٹا کہ وہ چیخ اٹھا لیکن فوراً ہی خاموش ہو گیا۔

”اس وقت تم نے اگر ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا تو تمہاری موت بھی خدا کی مرضی سے بڑی المناک ہوگی۔“ سرغنہ بل کھا کر قہر آلود لہجے میں بولا۔

لیاقت حسین ہونٹ چپانے لگا۔ اس کا چہرہ اندرونی جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔

”فرحین اور گل خان کی بیوی، زرینہ کو تم نے کس کی فراہم کردہ معلومات پر باز یاب کیا تھا؟“

”اس میں بھی مشیت ایزدی کا دخل تھا۔“

”کنجھر.....“ سرغنہ غصے سے کانپتا ہوا اٹھا پھر اس کے حکم پر لیاقت حسین کو کرسی کے فٹنجنوں سے نکال کر چمت سے الٹا لٹکا دیا گیا، اس کے سر کے نیچے ایک آگلیٹھی رکھ دی گئی جس کا ایک سوئچ آن کرتے ہی لوہے کے کوئلے نما ٹکڑے بڑی تیزی سے سرخ ہونے لگے۔

”ہم تم سے پھر وہی سوال کریں گے۔“ سرغنہ نے بل کھاتے ہوئے سوال دہرایا۔ ”فرحین اور زرینہ کو جہاں رکھا گیا تھا اس کا علم تم کو کس ذریعے سے ہوا.....؟“

”مم..... میں نہیں جانتا کہ میں وہاں کس طرح پہنچ گیا تھا۔“ لیاقت حسین کے چہرے پر پہلی بار اذیت کے تاثرات نمایاں ہوئے۔

”میڈم کو دوسری بار سراج نے کسی نہ کسی کی اطلاع پر عین وقت پر بچا لیا تھا۔ تم اس کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”مجھے اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم.....“

”جس نے بھی ہماری خدمات تمہاری خاطر مدارات کیلئے حاصل کی ہیں اس کے ہنگلے پر حملہ کرنے والے کس کے آدمی تھے؟“

”یہ بات میں پہلی بار تمہاری زبان سے.....“

”لیاقت حسین کا جملہ مکمل نہ ہو سکا، سرغنہ کے اشارے پر اس کے سیدھے ہاتھ پر کھڑے ہوئے آدمی نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے لیکن دونوں نشانے شاید خطا ہو گئے تھے۔ اس نے جھلاہٹ میں پورا پستول خالی کر دیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ سرغنہ غصے سے دانت پیسنے لگا، وہ جانتا تھا کہ جس نے گولیاں چلائی تھیں وہ بڑا ماہر نشانے باز تھا پھر لیاقت حسین کس طرح محفوظ رہا.....“ آگلیٹھی کو اتنا بھڑکا دو کہ اس..... کے ختم کا بھیجا پگھل کر قطرہ قطرہ بن کر ٹپکنے لگے۔“ سرغنہ نے غصے سے کانپتے ہوئے حکم دیا۔

فائر کرنے والا ابھی تک اپنی ناکامی پر ششدر تھا۔ وہ لیاقت کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کی محویت دیکھ کر دوسرا آدمی لپک کر دیوار کے قریب گیا، اس نے ایک سوئچ آن کیا تو آگلیٹھی میں آگ بھڑک اٹھی، وہ بورڈ کے قریب دیوار پر لگی ایک چرخنی کو آہستہ آہستہ بلند ہونے لگے۔

جب وہ لیاقت حسین کے سر سے ڈیڑھ فٹ دور رہ گئے تو اس نے چرخی روک دی۔

سرخند کی نظریں لیاقت حسین کے وجود پر مرکوز تھیں جس کا پورا وجود شعلوں کے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ دھکتے گولے کے مانند سرخ ہونے لگا تھا لیکن اس کے چہرے پر کرب یا اذیب نام کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی البتہ اس کی نظریں قہر آلود انداز میں سرخند کے چہرے پر مرکوز تھیں، اس کی پکوں نے جھپٹنا بھی موقوف کر دیا تھا..... دوسری جانب سرخند کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل و دماغ پر برف سی جسنے لگی ہو، ایک لمحے تک وہ کم مہم کھڑا رہا پھر اس نے اپنے آدیوں کو کسی روپوت کی طرح حکم دیا۔

”اس کو نیچے اتار کر دوبارہ کرسی سے باندھ دو۔ میں سارا قصہ ہی پاک کر دوں گا۔“

”ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔“ چرخی کے قریب کھڑے ہوئے شخص نے احتجاج کیا۔ ”اگر یہ مر گیا تو ہماری آدمی رقم ڈوب جائے گی۔ ہم سے یہی کیا گیا تھا کہ اسے ہر قیمت پر.....“

”بکومت.....“ سرخند نے لیاقت حسین کی آنکھوں میں بہ دستور جھانکتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تمہاری رقم کی ادائیگی میرا ذمہ ہے جو تمہیں مل جائے گی۔“

سرخند کے دونوں ساتھیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر چرخی واپس گھمادی گئی، لیاقت حسین کو چھت سے اتار کر دوبارہ لوہے کی کرسی پر ہاتھ پاؤں جکڑ کر بٹھا دیا گیا۔ اس کی نظریں بہ دستور سرخند کی نظروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ”اب ہتھول کو دوبارہ لوڈ کر کے پورا جھیر خالی کر دو۔ سرخند کی تھکناہ آواز کمرے میں گونجی، دونوں ساتھیوں نے ریو اور لوڈ کر کے لیاقت حسین کو الوداعی نظروں سے دیکھا پھر ان کے ہتھول گولیاں اگلنے لگے۔ دونوں نے غیر اختیاری طور پر لیاقت حسین کے بجائے ایک دوسرے کو جہنم رسید کر دیا تھا۔ سرخند کی نظریں پوری طرح لیاقت حسین پر جمی ہوئی تھیں۔ دوشمنوں کے مرنے کے بعد لیاقت حسین نے بڑی مصومیت سے سرخند سے کہا۔

”اب تم اپنے ناپاک وجود کے گھناؤنے قصے کو بھی پاک کر دو..... یہی اوپر والے کو منظور ہے۔“

سرخند نے کسی سعادت مند بچے کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنی رائفل کا دستہ زمین سے اٹھا دیا، اس کی نال اپنے حلق میں ڈالی پھر سیدھا ہاتھ بڑھا کر ٹریگر دبا دیا۔ قاتر کی آواز کے ساتھ ہی اس کی کھوپڑی ترخ گئی، کسی کئی ہوئی شاخ کے مانند وہ لاٹکڑا کر زمین پر اوندھے منہ گرا پھر موت کی ابدی نیند سے دو چار ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی حیرت انگیز تھا۔ لیاقت حسین کے جسم کو جس ریختی رسی سے جکڑا گیا تھا وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ پھر اس کا وجود بھی ہواش حطیل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سراج بڑی سنجیدگی سے لیاقت حسین کے ساتھ سوال جواب کر رہا تھا۔ لیاقت حسین نے اسے بھی وہی بیان دیا جو وہ اس سے قبل سیٹھ عثمان کو دے چکا تھا۔ یہی کہ اسے سیٹھ عثمان نے کسی کام سے

راستے میں اتار دیا تھا اور خود گاڑی لے کر واپس گھر آ گئے تھے۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ یا ایسی علامت نہیں تھی جس سے سراج اس کے بیان کی تردید کر سکتا۔ الماس نے افوا کے بارے میں بھی سراج سے اپنی نشوونما کا اظہار کیا تھا کہ لیاقت حسین کو الماس کے افوا کی خبر کس طرح ملی جبکہ اسے رات بارہ بجے کے لگ بھگ افوا کیا گیا تھا۔ سراج خود بھی اس کا گواہ تھا کہ لیاقت حسین نے اسے افوا والی رات بارہ بج کر چالیس منٹ پر فون کیا تھا۔ اس وقت اس نے سراج کو اپنے گھر آنے کو کہا تھا پھر سراج کے بجائے اس کی کار بھی لیاقت حسین نے ڈرائیو کی تھی۔ لیاقت حسین نے سراج کے استفسار پر یہی کہا تھا کہ اسے کسی خاص جگہ پہنچنا ہے جس کے بارے میں اس کے ذہن میں سوئے وقت اچانک خدشہ کھلبلا یا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کچھ یاد نہیں تھا پھر الماس کو ایک مکان سے بازیاب کرانے کے بعد وہ دوبارہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ واپسی پر اس نے بڑی مصومیت سے سراج سے دریافت کیا تھا کہ اسے وہ اپنے گھر کیوں لے گیا تھا؟

جہاں تک ان باتوں کا تعلق تھا، سراج کو یہی شبہ ہوا تھا کہ کوئی فیسی طاقت لیاقت حسین کی رہنمائی کرتی ہے۔ تین مسلح آدمیوں کا لیاقت حسین کو زبردستی افوا کرنا اور پھر بغیر کسی تشدد کے واپس کر دینا تعجب خیز ہی تھا..... یہ بات بھی اسے الجھا رہی تھی کہ لیاقت حسین نے خاص طور پر وہی جملہ کس طرح دہرایا جو اس کی بیوی کو وقتی طور پر تسلی دینے کی خاطر سیٹھ عثمان نے راحیلہ بیگم سے کہا تھا۔

”صاحب.....“ لیاقت حسین نے سراج کو کم مہم اور سنجیدہ دیکھ کر دبی زبان میں پوچھا۔ ”کیا آپ کو میری بات پر اعتماد نہیں ہے؟“

”یہ بات نہیں ہے لیاقت۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔ ”ہمیں صرف یہ بات پریشان کر رہی ہے کہ تمہیں کن لوگوں نے افوا کرنے کی حماقت کی تھی اور پھر اتنی آسانی سے.....“

”میں نہیں سمجھا صاحب۔“ لیاقت حسین نے عجیب الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے کسی نے افوا نہیں کیا تھا۔ آپ نے مجھے دفتر جاتے وقت راستے میں کسی کام سے اتار دیا تھا اور خود واپس آ گئے تھے۔ شاید آپ کی طبیعت خراب تھی۔“

”فرحین اب کیسی ہے.....؟“ سراج نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

”بھلی چلتی ہے صاحب۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ لیکن ایک منٹ.....“ سراج نے فوری طور پر کچھ سوچ کر کہا۔ ”میں نے تمہیں اس وقت ایک اور کام سے بلایا تھا۔“

”حکم دیں صاحب.....“ لیاقت حسین نے سعادت مندی سے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے مجھے ایک ہفتے یا دس روز کیلئے تمہاری ضرورت پڑے۔“

جواب میں لیاقت حسین نے سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”میری طرف سے تمہیں ہر بات کی اجازت ہے۔“

”فرحین سے خاص طور پر پوچھ لینا۔“ سراج نے معنی خیز مگر دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”کہیں

اے کوئی.....“

”وہ بھی میری طرح آپ کی بہت احسان مند ہے صاحب۔ وہ بھلا کیا اعتراض کرے گی۔“
کچھ دیر بعد لیاقت حسین کو رخصت کر دینے کے بعد سراج نے سیٹھ عثمان سے کہا۔
”مجھے یقین ہے کہ لیاقت حسین جو کہہ رہا ہے وہ غلط نہیں ہوگا۔“ اس نے بات جاری رکھی۔
”ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی کسی روحانی طاقت کا دخل ہو۔“

”پھر بھی..... یہ تو معلوم کرنا چاہئے کہ جن لوگوں نے سرعام اغوا کیا، وہ کون تھے؟ کس کے ایما پر انہوں نے پیک آؤر میں اتنی دلیری کا ثبوت دیا اور..... اتنی شرافت سے چھوڑ کیوں دیا.....؟“
اسی وقت باہر سے راحیلہ بیگم کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی تو سراج نے کہا۔
”عثمان..... پلیز، الماس کے بارے میں، میں نے تمہیں اس وقت جو تفصیل بتائی ہے وہ

بھائی کے سامنے زبان پر نہ لانا۔“
”آئی نو.....“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ”عورتیں راز داری کے معاملے میں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔“

راحیلہ بیگم نے شوپہر کے ساتھ سراج کو لان پر بیٹھا دیکھ کر گاڑی پور ٹیکو سے پہلے ہی رکوئی اور اتر کر سیدھی ان کی طرف آ گئیں۔

”آپ کب آئے؟“ انہوں نے قریب جا کر سراج سے پوچھا۔
”ایک گھنٹے سے بغیر چائے کافی کے بیٹھا آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔“ سراج نے حسب معمول سیٹھ عثمان کو چھیڑا۔ ”خدا کے اس نیک بندے نے ایک گلاس ٹھنڈے پانی کو بھی نہیں پوچھا۔ یہی کہتا رہا کہ اپنی بھائی کو آجانے دو پھر سب ساتھ مل کر کوئلہ کافی پئیں گے۔“
”اور آپ کیوں میرے بغیر ہی ناشا کرنے کا سوچ رہے تھے.....؟“ راحیلہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا تو سراج نے آسمان کی سمت نظر اٹھا کر کہا۔
”قرب قیامت کی دلیلیں ہیں۔ آج پہلی بار گھنٹا دیور کے بجائے شوہر کی طرف جھک رہا ہے۔“

راحیلہ بیگم مسکرا دیں پھر بات بتاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو عثمان کو خوش کرنے کی خاطر کہہ رہی تھی ورنہ بھائی تو بھائی ہوتا ہے۔“

سراج نے بچوں کی طرح سیٹھ عثمان کی طرف دیکھ کر تالی بجاتی پھر وہ کچھ فخر بھی چست کرنا چاہتا تھا کہ اس کا موبائل گھٹناتے لگا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی۔
ایس پی اورنگ زیب کا نام دیکھ کر اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ ”سراج بول رہا ہوں۔“
”معروف نہ ہوں تو کچھ دیر کیلئے غریب خانے پر تشریف لے آئیں۔“ دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز بھری۔

”سمر..... خیریت تو ہے؟“

”آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں جو قطعی فحی اور ذاتی نوعیت کی ہیں۔“
”رائٹ سر..... پندرہ منٹ کے اندر حاضر ہوتا ہوں۔“ سراج نے کہا پھر اٹھتے ہوئے راحیلہ بیگم سے شوخی سے کہا۔

”عثمان کی دعا قبول ہوگئی..... یہ فیض نہیں چاہتا تھا کہ میں رات کا کھانا بھی کھا کر جاؤں اس لیے ایس پی کی کال آگئی۔“

”آپ واپسی پر آجائیں..... میں اتنی دیر میں آپ کے پسند کی ڈشیں بھی تیار کر لوں گی۔“
”میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری تندرستی کا خیال رہتا ہے لیکن یہ آپ کے شوہر نام دار.....“
سراج نے سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا پھر مسکراتا ہوا چلا گیا، اس نے واپسی کے لیے معذرت کر لی تھی۔



ایس پی اورنگ زیب نے بڑے پرتپاک انداز میں سراج کو اپنے ڈرائنگ روم میں خوش آمدید کہا۔ سراج نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ دفتر اور گھر کے رکھ رکھاؤ میں اس کے انداز میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ گھر میں وہ کسی ملنسار دوست کی طرح ملا تھا۔ دفتر میں وہ اس کے برخلاف سنجیدہ اور محتاط رہنے کا عادی تھا۔

”میں نے اس وقت آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ رسی گفتگو کے بعد ایس پی نے بے تکلفی ہی سے دریافت کیا۔

”جی نہیں..... اس وقت میں اپنے کلاس فیلو اور دوست سیٹھ عثمان کے کھلے لان میں بیٹھا آرام کر رہا تھا۔“

”گڈ..... ہم پولیس والوں کو عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ٹینشن رہتی ہے اس لیے ہمارے لیے ریلیکس ہونا بھی اشد ضروری ہے۔“
”میں آپ کے خیال سے متفق ہوں سر۔“

”بائی داوے۔“ ایس پی نے صوفے پر پہلو بدل کر قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آپ کے یہ سیٹھ عثمان وہی تو نہیں جن کی گاڑی میں بم نصب کر دیا گیا تھا اور آپ نے انہیں دو مہینے کیلئے باہر جانے کا مشورہ بھی دیا تھا۔“

سراج چونکا۔ ”آپ کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی سر.....؟“
”مجھے اس کے علاوہ بھی آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔“ ایس پی نے اس کا جھس بڑھاتے ہوئے زیر لب مسکرا کر اضافہ کیا۔ ”مثلاً یہ کہ آپ نے کسی خاص وجہ سے انتہائی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے فیض حامد سے اس کے دفتر جا کر ایک کثیر رقم بھی وصول کی تھی۔“

سراج ہکا بکا رہ گیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے غور کرنے لگا کہ ایس پی نے اس وقت اسے کس مقصد سے بلایا تھا؟ پہلے دوستانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کیا اور اب آہستہ آہستہ اسے شک کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟ وہ سنبھل کر محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی حیرت بلاوجہ نہیں تھی، فیض حامد سے لین دین کا

اصل مقصد کیا تھا اس کی وجہ سوائے ریٹائر ہونے والے ڈی آئی جی کمر مرعیم احمد کے کسی اور کے علم میں نہیں تھی۔ ایس پی اورنگ زیب اس وقت دوسرے شہرے میں تعینات تھا۔
”اس جائز یا ناجائز لین دین کے موقع پر آپ نے بڑی تھکندی سے اپنے حساس اور خفیہ کمرے سے اس کی عکس بندی بھی کی تھی۔“

سراج کے ذہن کو دوسرا جھٹکا لگا، اسے اس بات کا شبہ شروع سے تھا کہ بگ باس نے بھی اسے بلیک میل کرنے کی خاطر خفیہ کمرے سے اس کی ویڈیو ضرور تیار کی ہوگی۔ ”تو کیا..... اس خطرناک مگر چھپے ایس پی اورنگ زیب کو وہ ویڈیو دکھا کر اس سے متفر کرنے کی کوشش کی تھی.....؟“ سراج کے ذہن میں یہ خیال بڑی سرعت سے ابھرا لیکن اس نے کسی بات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی نظریں بہ دستور ایس پی کے چہرے کے بدلنے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ”میں ذاتی طور پر آپ کو ایک ایماندار، بڑے خوف اور ڈرے دار پولیس آفیسر سمجھتا ہوں لیکن.....“ ایس پی نے پہلو بدل کر گہری سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”حیرت اس بات پر ہے کہ شیخ حامد جیسے گرگ باراں دیدہ اور خطرناک دشمن تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر افضل خان جیسے تھرڈ ریٹ بد معاش کو آپ نے کیا سوچ کر استعمال کیا؟“

”سر.....“ سراج نے کسمسا کر انکار یا اقرار کرنے کے بجائے پہلو تہی اختیار کرنے کا درمیانی راستہ اختیار کیا۔ ”ضروری تو نہیں کہ جو باتیں آپ تک پہنچی ہوں ان میں صداقت بھی ہو..... یہ بھی عین ممکن ہے کہ پچھلی ملاقات میں میرے اور آپ کے درمیان ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی جو گفتگو ہوئی تھی اس کی بجائے دوسروں کو مل گئی ہو یا..... کسی نے دورہ کر اندازہ قائم کیا ہو اور اب اس نے ہمارے درمیان تلخ پیدا کرنے کی خاطر ایک فرضی کہانی.....“

”نہیں..... میں آپ کے اس مفروضے سے قطعی متفق نہیں ہوں۔“ ایس پی نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

”اگر آپ نے تمام باتوں پر یقین ہی کر لیا ہے تو پھر میں کیا صفائی پیش کر سکتا ہوں؟“ سراج نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

”مائی ڈیز مسٹر سراج۔“ ایس پی نے دوبارہ پہلو بدل کر سراج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”جو کثیر رقم آپ نے شیخ حامد جیسے خراٹ مجرم سے وصول کی تھی۔ اگر میں اس کا کوئی دستاویزی ثبوت پیش کر دوں تو آپ کیا بہانہ بنانے کی کوشش کریں گے؟“

”میں اب اجازت چاہوں گا سر.....“ سراج نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ نے اس وقت مجھے آف دی ریکارڈ باتوں کیلئے.....“

”پلیز سٹ ڈاؤن.....“ اورنگ زیب نے پھر بڑے مہذب انداز میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی کچھ باتیں رہ گئی ہیں جنہیں سننے کے بعد شاید آپ اسے آف دی ریکارڈ سمجھنے کے بجائے آئندہ میرے اوپر زیادہ اعتماد کرنے لگیں۔“

بات سراج کی سمجھ میں نہیں آئی پھر بھی وہ بادل ناخواستہ بیٹھ گیا۔
”آپ نے دو موقعوں پر میڈم روبی کو تحفظ دینے میں جو کردار ادا کیا، اس کا علم ان دشمنوں کو بھی ضرور ہوگا جو مجھے اور آپ جیسے آدمیوں کو خریدنے کی خاطر کسی بھی گھٹاؤ نے طریقے کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔“

”میں میڈم کے سلسلے میں آپ کی معلومات سے انکار نہیں کروں گا۔“ سراج نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”ان کے بارے میں مجھے بہت ساری ایسی باتوں کا علم ہے جو شاید کسی اور کو نہ ہو۔“
”ممکن ہے آپ کا اندازہ درست ہو لیکن..... اگر ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں تو عوام و خواص دونوں کو بہتر طور پر تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔“

”میں اس سے انکار نہیں کروں گا سر۔“ سراج نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ابھی تک تو وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس وقت اسے بلانے کا اصل مقصد کیا تھا۔ ”اس مقصد کیلئے ہمیں ایک دوسرے پر مکمل اعتماد کرنا ہوگا۔“ اس نے کچھ توقف سے کہا۔

”مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔“ ایس پی نے ٹھوس لہجے میں اظہار کیا۔ سراج کو اس کے جواب میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں محسوس ہوئی لیکن شیخ حامد کے ساؤنڈ پروف کمرے میں ہونے والی لین دین کے معاملے میں اس کا ذہن بہ دستور الجھ رہا تھا۔

”شبتم اس وقت جو کردار ادا کر رہی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا ذاتی خیال کیا ہے؟“ میری معلومات کے مطابق اس نے افضل خان کو بھی اپنے اپارٹمنٹ میں پناہ دی ہے جبکہ شیخ حامد نے اس کی سرپرستی سے منہ موڑ کر اسپتال سے ڈسچارج کر دیا تھا۔ کیا شبتم اس بگ کریمنل کی مخالفت مول لینے کی پوزیشن میں ہے.....؟“

”میرا خیال ہے کہ شبتم بغیر شیخ حامد کے اشارے پر اتنا بولڈ اسٹیپ اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“ ایس پی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کیا وہ شبتم کے ذریعے ایک پٹے ہوئے مہرے کو کسی خاص محاذ پر استعمال کرنے پر غور کر رہا ہے؟“

”وہ محاذ ہم دونوں میں سے بھی کوئی ایک ہو سکتا ہے۔“ سراج نے دیدہ دلالت ایس پی کا نام لینے کی غلطی نہیں کی ورنہ میڈم نے اسے کچھ ایسا ہی اشارہ دیا تھا۔

”میں ناواقف نہیں ہوں مسٹر سراج.....“ ایس پی نے اس بار بڑے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”وہ محاذ آپ نہیں..... میں یا پھر رستم علی آغا خانی بھی ہو سکتا ہے جو آپ کے دوست مسٹر عثمان کے درمیان سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد شیخ حامد کا اب سب سے بڑا کاروباری حریف بن کر سامنے آ رہا ہے۔“

سراج حیرت سے اچھل پڑا۔ رستم علی کا نام وہ پہلی بار شیخ حامد کے حریف کی حیثیت سے سن رہا تھا۔

”آپ کو شاید یہ بھی سن کر تعجب ہوگا کہ شیخ حامد در پردہ مجھے بھی اپنا سب سے بڑا مخالف سمجھ رہا ہے۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا پھر مسکرا کر بولا۔ ”اب میں مناسب سمجھوں گا کہ ان باتوں سے بھی پردہ افشا دوں جو آپ کے ذہن میں یقیناً چھ رہی ہوں گی۔ میں نے رقم کی لیکن دین کے سلسلے میں جتنی باتیں آپ سے کی ہیں وہ مجھے کسی ایسے شخص سے معلوم ہوئی ہیں جو آج بھی ہمارے محکمے میں سب سے زیادہ معتبر اور بولڈ سمجھا جاتا ہے۔ میں علیم احمد صاحب کی بات کر رہا ہوں، جن کی شخصیت میرے لیے کسی سرپرست سے زیادہ قابل احترام ہے۔ وہ بھی مجھے اپنے خاندان کے فرد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آپ کو میں نے اس وقت انہی کے مشورے پر بلایا ہے تاکہ ہمارے درمیان آئندہ کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ آپ کی اطلاع کیلئے یہ بھی بتا دوں کہ آپ نے جو دستاویز اور تحریری بیان اپنی بے گناہی اور قانون کی مدد کرنے کی خاطر علیم احمد صاحب کے پاس محفوظ کرائے تھے اب انہوں نے اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی اپنا رکھوا دی ہے۔ یہ سب اس اعتماد پر کیا ہے کہ خدا نخواستہ وہ نہ ہوں تو میں آپ کا تحفظ اپنا فرض سمجھ کر ادا کر سکوں۔“

ایس بی اورنگ زیب کے جیلے سن کر سراج نے سکون کا طویل سانس لیا۔ اس کے ذہن سے جیسے کوئی وزنی بوجھ اچانک اتر گیا تھا۔



شیخ حامد اپنی مخصوص لفٹ سے اتر کر آفس میں داخل ہوا تو کنول اس کے قدموں کی مخصوص آہٹ پا کر اپنے آفس سے نکل کر اس کے استقبال کیلئے سامنے آگئی۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ حسب دستور اس کے ہونٹوں کے بیضوی اعصاب پر ایک دل آویز تبسم چل رہا تھا۔ شیخ حامد اس کے خوبصورت اور گلاب جیسے تروتازہ جسم کی سوندھی سوندھی مہک کو خوبابوں میں محسوس کر کے ہی تروتازہ ہو جاتا تھا۔ جب سے کنول نے آفس جو ان کیا تھا اس کی بھی روزمرہ کی اولین ڈیوٹی یہی تھی کہ وہ بگ باس کے آتے ہی اپنی خواب آلود نگاہ نیم باز اور حسن کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس کو خوش آمدید کہے۔ یہی اس کی سب سے اہم ڈیوٹی بھی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے تمام تر تکیل کاٹھوں سے لیس ہو کر اس کے سامنے باد بہاری کے جھونکوں کی طرح آگئی تھی۔ کسی ارغوانی چمکتے ہوئے جام کی طرح لیکن..... بگ باس کے چہرے پر گہری خجید کی دیکھ کر وہ اپنی جگہ سمت کر رہ گئی۔

شیخ حامد کے چہرے پر جلاہٹ مسلط تھی، مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ اس خوبصورت متحرک نشے کی جاعدار بوتل کے اندر چمکتی شراب کو دیکھ کر اپنا غم غلط نہ کر سکتا۔

رات گھر پر ہونے والے حملے نے اس کے ذہن کو بری طرح الجھا رکھا تھا۔ اورنگ زیب سے ہونے والی تلخ کلامی کی کڑواہٹ بھی اس میں شامل تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ اسے سات گھنٹے گزر جانے کے باوجود حملہ کرنے والوں کے بارے میں کوئی خاص اطلاع نہیں ملی تھی۔ ان تمام تر پریشانیوں کو نظر انداز کر کے اس نے کنول کے اس جیتے جاگتے، مہکتے پھول کو دیکھا تو ذہن پر ہلکے ہلکے نشے کی ترنگ کا احساس ہوا۔ اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔

کنول نے اس وقت تیل باٹم ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ اس چست لباس نے اسے دو آتھہ بنا رکھا تھا۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز چست لباس سے سرکشی کرتے نظر آرہے تھے۔ شیخ حامد نے کنول کو صرف ”آخری حربے“ کے طور پر استعمال کرنے کیلئے بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ کسی کاروباری معاملے میں سودا نہ بیٹنے کی صورت میں ہی وہ اسے پارٹی کے سامنے لاتا تھا اور..... کنول جس انداز میں اس کی آؤ بھگت کرتی تھی وہ پارٹی کو ”بگلا بھگت“ بنا دیتا۔ وہ رائی کی مہنگی شراب کی طرح رگوں میں سرایت کر جاتی پھر..... سامنے والی پارٹی..... گویا ”عمل تنویم“ کے زیر اثر آکر معمولی رد و بدل کے بعد ڈیل پر دستخط کرنے پر آمادہ ہو جاتی..... اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتوں کو ڈنگ لگ جاتا۔ کاروبار کی تمام تر سوچ بوجھ اور دور اندیشیاں بھی کنول کی بلوری آنکھوں سے چھلکتی شراب کی مستیوں میں غرق ہو جاتیں۔ شیخ حامد بذات خود بھی کچھ ایسی ہی کیفیتوں سے دو چار ہو گیا۔

کسی آدم خورشیر کی کچھار پر ایک ذرا خطرہ محسوس ہو تو وہ جب تک خطرے کے اسباب نہ معلوم کر لے، سکون سے نیند نہیں لیتا، شیخ حامد کو بھی اس وقت سکون کی ضرورت تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی ذہنی سکون کی خاطر خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ دل بہلانے کا عادی تھا، یہی وجہ صبا نیگم کی حرام موت کا سبب بن گئی تھی جس نے اس کے ذہن کو اس حد تک جھٹکا پہنچایا تھا کہ وہ ایس بی اورنگ زیب جیسے اثر و رسوخ رکھنے والے سے بھی الجھ گیا تھا۔ اب کسی نامعلوم دشمن نے براہ راست اس کے ہنٹلے کونٹانہ بنایا تھا۔ اس وقت اسے ذہنی انتشار کو دور کرنے کی خاطر سکون کی ضرورت تھی۔ سکون کے لیے عورت کا چمکتا بل کھاتا جسم اس کیلئے ہمیشہ بڑی موثر دوا ثابت ہوتی تھی۔ کنول بھی ایک ایسی سیل بند بوتل تھی جس کو اس نے اپنے کاروبار کیلئے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ اس کے ذہنی انتشار کو دور کرنے کا ذریعہ بھی بن سکتی تھی۔ اس کی نظریں کنول کے جسمانی پیچ و خم پر پھسلنے لگیں۔

”کیا بات ہے سر.....؟“ کنول نے کسی مسیحا کی طرح دریافت کیا۔ ”آپ آج خلاف توقع کچھ ڈسٹرب نظر آرہے ہیں؟“

”ہاں..... کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

شیخ حامد خاموشی سے جا کر اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ وہ کنول کے سلسلے میں خلاف عادت بڑے صبر اور احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”آپ کچھ پیند کریں گے.....؟“ کنول اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا قریب حامد کے لیے کڑی آزمائش تھی، پہلے وہ ہمیشہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر گفتگو کرتی تھی۔ آج اس کی چہرے کے بالکل قریب آگئی تھی، اس کے جسم کی مہک اور تپش کا احساس شیخ حامد کو گدگدانے لگا۔

”نہیں.....“ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”میں دفتر میں پینے کے اصول کے خلاف ہوں۔“

”آپ نے اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتائی۔“ کنول نے ایک ہمدرد کی حیثیت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“

جواب میں فح حامد نے کنول کی طرف دیکھا تو اس کی سحر آلود آنکھوں کا نشہ بے خود کر گیا، غیر اختیاری طور پر اس نے سیدھا ہاتھ کنول کی کمر میں ڈال کر ایک ذرا اشارہ دیا تو وہ کسی کچے ہوئے پھل کی طرح اس کی آغوش میں آگری۔ ایک لمحے کو فطری شرم کے احساس نے کنول کو بوجھلا دیا۔ اس نے ہچکچا کر ایک مرد کی آغوش سے دور جانے کی کوشش کی لیکن فح حامد کے ہاتھوں کے حصار سے نہ نکل سکی۔

”اس وقت صرف تم مجھے سکون پہنچا سکتی ہو۔“ اس کا ہاتھ ہٹکنے لگا۔

”سر..... یہ دفتر ہے اور میں.....“ ایک مرد کی ہلکی ہوئی گرم پیش خود اس کے سینے میں بھی پھل چلا رہی تھی۔ اس نے جھل کر کہا۔ ”یہ گناہ ہے سر، جس کی دلدل سے ابھی تک میں محفوظ رہی ہوں.....“

”پریشان مت ہو، میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔“ فح حامد نے خلاف توقع اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ کنول کسی پھلی کی طرح تڑپ کر اس کے جال سے نکل گئی۔ اس کے سینے کے زیر و بم ابھی تک اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ ”فی الحال تم اپنے کمرے میں جاؤ، ضرورت ہوئی تو تم سے انتظار کام پر رابطہ کر لوں گا۔“

”آ..... آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں سر.....؟“ اس نے سبے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ملازمت سے چھٹی مل جانے کا احساس اس کے کمزور وجود میں اترنے لگا، وہ جانتی تھی کہ بدن کا معاوضہ اسے موجودہ تنخواہ سے کہیں زیادہ مل سکتا تھا لیکن وہ تنخواہ عزت کے ساتھ کہیں اور نہیں مل سکتی تھی۔ جو حامد ایسی ہی ایش میں مل رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ تم دوپ کا کافی بنا لاؤ۔“ فح حامد نے اسے محبت سے دیکھا۔ ”آج میں تمہارے ساتھ کافی پیوں گا۔ آئے سامنے..... دور دور بیٹھ کر۔“

کنول نے اسے ممنونیت سے دیکھا پھر اٹے قدموں اپنے لمحہ آفس میں چلی گئی۔ فح حامد کے ذہن میں پھر رستم علی آغا خانی کا نام کروٹیں لینے لگا لیکن ابھی اس کے شہجے کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی جس کے سبب وہ کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں موبائل گنگنا یا۔ اسکرین پر لودھی کا نام دکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے موبائل آن کر کے خشک لہجے میں سوال کیا۔

”سر..... میرے آدی برابر سراغ لگانے میں مصروف ہیں لیکن.....“

”اور کوئی خاص بات.....؟“ اس نے الجھ کر بات کاٹی۔

”میں نے ایک اور پرانے شکار پر اپنے اعتماد کے کچھ لوگ لگا رکھے تھے آج وہ ہمارے قبضے میں آ گیا تھا۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”سیٹھ عثمان کا ڈرائیور لیاقت حسین جو چار مرتبہ ہمارا راستہ کاٹ چکا ہے۔“

”ریش.....“ فح حامد تملتا اٹھا۔ ”تمہیں اس کام کے لیے کس نے اجازت یا حکم دیا تھا؟“

”آپ کا پرانا نمک خوار ہوں سر اس لیے.....“

”لیاقت حسین اس وقت کہاں ہے.....؟“ اس نے لودھی کی بات سنے بغیر جھلا کر پوچھا۔

”وہ میرے آدمیوں کے قبضے میں آ گیا تھا سر لیکن حیرت انگیز اور پراسرار طور پر مطلع آدمیوں

کو موت کے گھاٹ اتار کر صاف نکل گیا۔“

لودھی جیسے جیسے تفصیل بیان کر رہا تھا، فح حامد کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ ”لودھی.....“

پوری بات سننے کے بعد اس نے بے حد سرد انداز میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسپتال میں علاج کے

دوران تمہارا کوئی دماغی اسکر و ضرور ڈھیلا چھوڑ دیا گیا ہے۔“

”میری بات کا یقین کریں سر..... اس شخص کے اوپر یقیناً کسی جنات کا سایہ.....“

”بکو اس بند کرو۔“

فح حامد کا ذہن لودھی کی بات سن کر اور کمزور ہو گیا..... کنول..... کافی کے ساتھ آگئی تھی اس

لیے اس نے موبائل آف کر کے اپنے غصے پر بڑی حد تک قابو پالیا تھا۔ کافی پیتے وقت بھی اس نے

کئی بار کنول کو نظر بھر کر دیکھا تھا پھر خود کو مصروف رکھنے کی خاطر اس نے موبائل اٹھا کر بلیک ٹائیگر

کے نمبر ملائے، کنول سر جھکائے کافی پینے میں مصروف تھی۔

”کوئی سراغ ملا.....؟“ اس نے رابطہ قائم ہونے کے بعد سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”جن دو آدمیوں کی لاشیں ملی ہیں وہ ایک مقامی بد معاش گینگ کے آدی تھے۔“ دوسری سمت

سے جواب ملا۔ ”میں نے بذات خود اس بد معاش کے اڈے پر جا کر اسے کھگانے کی کوشش کی تھی۔

اس کا کہنا ہے کہ دو روز پہلے ان دونوں مرنے والوں نے کسی وجہ سے ایک دن کی چھٹی مانگی تھی۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ فح حامد کی پیشانی پر شکنیں ابھرنے لگیں۔ ”میرے اندازے اور

دوسرے اطلاعات کے مطابق حملہ کرنے والے دو سے زیادہ کی تعداد میں تھے۔“

”میں یہی بتانا چاہتا تھا کہ حملہ کرنے والے افراد نے ہمیں دھوکا دینے کی خاطر دوسرے مقامی

اڈوں سے بھی کچھ آدی کرائے پر حاصل کر لیے تھے۔“

”اور کوئی خاص رپورٹ.....؟“

”آپ کے ساتھ اس وقت کوئی اور ہے.....؟“

”ہاں..... فح حامد نے کنول پر نظر ڈالی جو بہ دستور کافی پینے میں مصروف تھی۔

”رستم علی آغا خانی کل شام سے ابھی تک اپنی کوٹھی کے اندر ہی ہے۔ میرے آدی اس کی

نگرانی پر مامور ہیں۔ جیسے ہی کوئی کام کی بات معلوم ہوئی، آپ کو فوری اطلاع دوں گا۔“

”مجھے اطلاع نہیں..... رزلٹ چاہیے.....“ اس نے ٹھلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”مخالفوں کو

زیادہ ڈھیل دینا بھی میرے اصول کے خلاف ہے۔“

”آپ صرف اشارہ کر دیں سر.....“ دوسری جانب سے جواب ملا۔ ”جس طبقے سے ہمارے

مشتبہ شخص کا تعلق ہے وہ زیادہ جیدار نہیں ہوتے۔ معمولی سختی ہی سے ان کی زبان فر فر چلنے لگتی ہے۔

”مکمل ہو تو اسے دو گھنٹے کے اندر اندر اٹھا لیا جائے۔“

”ابھی نہیں..... میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

شیخ حامد نے موبائل آف کیا تو کنول نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کچھ سہے سہے انداز میں بولی۔ ”سر..... آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں؟“

”کیوں..... تمہیں اس کا اندازہ کیسے ہوا؟“



”سر.....!“ کنول آبدیدہ ہو گئی۔ ”آپ میرے محسن ہیں۔ ہر ماہ جو تنخواہ دیتے ہیں اس کا تصور تو میرے خواب میں بھی نہیں تھا۔ آپ کے ہاں ملازمت کرنے سے پہلے ہمارا گزارا کس طرح ہوتا تھا شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ”میرے معصوم باپ کو صرف اتنی سی بات پر قتل کر دیا گیا تھا کہ اس نے کسی واقف کار کی ناجائز خواہش پر سر تسلیم خم کرنے کے بجائے اسے تھپڑ مار دیا تھا۔ دوسرے ہی دن میرے باپ کو دفتر کے بعد ایک ٹیوشن پڑھانے کے بعد گھر آتے وقت سرعام قتل کر دیا گیا۔“ کنول کی آواز بھرانے لگی۔ ”تین کرائے کے بد معاش جو ڈھانٹا باندھے ہوئے تھے ایک پک اپ سے کوڈ کر اچانک سامنے آ گئے۔ انہوں نے بھری پری شاہراہ پر میرے والد کو چاقوؤں اور خنجر کے وار کر کے موت کی نیند سلا دیا۔ وہاں سینکڑوں افراد موجود تھے۔ کسی نے ان لفظوں کے ہاتھ سے ایک ایسی قیمتی جان بچانے کا رسک نہیں لیا جو اپنے گھر کا واحد کفیل تھا۔ جان سب کو عزیز ہوتی ہے سر..... انہیں بھی عزیز ہوگی جو وہاں اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ مجمع کاٹی کی طرح پھٹ گیا۔ میرے باپ کے جسم پر اکیس گہرے زخم آئے تھے..... شاید اس کے مرنے کے بعد بھی ایک کمزور عورت کو اپنی عزت بچانے کے جرم میں سزا دی گئی تھی۔“ کنول کی ہچکیوں نے ایک لمحے کیلئے اسے خاموش کیا تو شیخ حامد نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تمہیں اس شخص کا پتا معلوم ہے جس نے تمہاری ماں کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تھی؟“

”پرانے زخموں کو دوبارہ کریدنے سے کیا فائدہ سر؟“ اس نے سسکتے ہوئے، رومال میں آنسو جذب کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس حادثے کو بھی دس سال بیت گئے..... میری ماں نے محلے والوں کے مشورے پر اسی دن خاموشی سے اس جگہ کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ دیا تھا جس دن میرے والد کی تدفین ہوئی تھی۔ میری عمر اس وقت شاید سات یا آٹھ سال کی رہی ہوگی۔ کئی بار میں نے ماں کو کریدنے کی کوشش کی لیکن کوئی خوف جس نے اس کی زبان میں تالے ڈال رکھے ہیں اور اب تو میں نے اصرار کرنا بھی چھوڑ دیا۔“

”آئی۔ سی.....“ اس نے کنول کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔ ”اس وقت تم جس مکان میں ہو

”وہ.....“

”وہ میرے والد کے دور پرے کے عزیز داروں کا ہے۔“

”گزر اوقات کس طرح ہوتی تھی؟“

”ماں نے میری پردوش کیلئے سلائی کڑھائی کا کام سیکھ لیا تھا۔ اسی سے گزارا ہو رہا تھا۔ دو آدمیوں کا خرچ ہی کتنا ہوتا ہے۔“

”تمہاری تعلیم کا کیا ہوا.....؟“

”میں نے کسی نہ کسی طرح میٹرک کر لیا تھا سر پھر..... میں بھی ماں کے کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔“ کنول نے دلی زبان میں کچھ توقف سے کہا۔ ”آپ نے مجھے ملازمت دے کر بہت بڑا احسان کیا ہے سر..... میری ماں کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہو گیا ہے لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے یک لخت خاموش ہو گئی پھر سکتے ہوئے بولی۔ ”آج پہلی بار آپ نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو مجھے مرحوم باپ کی دردناک موت یاد آگئی..... شاید..... شاید آپ کو میرا مزاحمت کرنا برا لگا ہو؟“

”ڈنٹ لی سلی.....“ اس نے کنول کو تسلی دی، اوپری دل سے اپنی غلطی کا ڈھکے چھپے لفظوں میں اقرار کرتا رہا پھر اچانک اس سے ایک ایسا سوال کر دیا کہ کنول کو اپنی سماعت پر دھوکا ہونے لگا۔

اس نے حیرت سے شیخ حامد کو دیکھا۔

”مجھے احساس ہے کہ میری تمہاری عمروں میں بڑا فرق ہے لیکن تمہیں وہ تحفظ ضرور مل جائے گا جو ابھی تک نہیں مل سکا۔“ اس نے ریو الویک چیز سے اٹھ کر اپنا منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔

”انکار کی صورت میں بھی میں برائیاں مانوں گا۔ تم اپنی ماں سے بھی مشورہ کر لیتا۔“

”آپ محسن ہیں سر..... جو پیشکش کر کے آپ نے مجھے تحفظ دینے کی بات کی ہے وہ کسی شریف ماں بیٹی کیلئے سب سے اہم بات ہے لیکن..... آپ کے اور میرے اسٹیشن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے۔“ اس نے کھلے لفظوں میں کہا۔ ”اقرار کرنے کی صورت میں تمہیں اور تمہاری ماں کو ایک شاندار کوٹھی میں منتقل کر دوں گا۔ وہاں تم دونوں کو ہر قسم کی آسائش حاصل ہوگی۔ ایک بات کا خیال بھی رکھنا ہوگا؟“

”وہ کیا..... سر؟“

”یہ شادی خفیہ ہوگی اور..... خفیہ رہے گی، میں اپنے دشمنوں کو ہنسنے کا موقع دینا پسند نہیں کروں گا۔ تمہیں دھوکا بھی نہیں دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ شیخ حامد کا وعدہ۔“

”میں آپ کا پیغام ماں تک ضرور پہنچا دوں گی۔ فیصلہ کرنا اسی کا حق ہے ویسے..... ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ یقیناً میرے حق میں فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔ م..... میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کیلئے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔“

کنول خاموشی سے کافی پیئے بغیر کھڑی ہو کر اپنے آفس میں چلی گئی۔ شیخ حامد کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب اسے اپنے دوسرے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔



چھرہ بر سیدن، درمیانے قد اور گھٹھے ہوئے جسم کا مالک سیاہ فام ہاشم اس وقت ایک فور اسٹار

ہوٹل کے ساتویں فلور کی بالکونی میں کھڑا، دور بین آنکھیں سے لگائے ساحل سمندر پر ہونے والی چہل پہل دیکھنے میں مشغول تھا، اس کے جسم پر اس کا رواپتی لباس، پیلے رنگ کی کھنٹوں تک کی ہاف پینٹ اور پیکاک بیلوکلر کی نیگی شرٹ نظر آرہی تھی۔ جنوبی افریقہ میں بھی وہ اکثر و بیشتر اسی لباس کو پسند کرتا تھا۔ اس کی دور بین کا فوکس ایک چھ ساڑھے چھ برس کا بچہ تھا جو گلے میں موٹر ٹیوب ڈالے آنے والی لہروں پر بار بار چپ لگا رہا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی ماں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

خوبصورت اور معصوم بچے ہاشم کی کمزوری تھی۔ اس لیے کہ شادی کے بعد اس کا ایک ہی بچہ تھا جو پانچ ساڑھے پانچ سال کا ہونے کے بعد ایک قدرتی حادثے کا شکار ہو گیا تھا، اولاد کے غم میں اس کی بیوی بھی اسے داغ مفارقت دے گئی تھی۔ ساحلی علاقے کے سبب ہی اس نے اس فور اسٹار ہوٹل کو ترجیح دی تھی، ورنہ اس سے بہتر کسی فائیو اسٹار میں بھی ٹھہرنے کا مجاز تھا۔ وہ اس بچے کو بڑی محویت سے دیکھنے میں مصروف تھا جب موبائل کی کھنٹی کی میوزک ٹیون دوسری بار سنائی دی۔ اس نے دوسری بار بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا چائیز شریک کا راسے فون کر رہا ہوگا جو کسی بھی ٹاسک کے مکمل ہو جانے کے بعد بھی کئی دن تک دوسووں کا شکار رہتا اور بال کی کھال نکالتا رہتا تھا۔ ہاشم کو اس کی زیادہ دور اندیشی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی لوچن اسے ابھی تک پارٹی سربراہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھا، یہ غلط فہمی اسے جہاز میں اس وقت لاحق ہوئی تھی جب لوچن ایئر ہوسٹس سے دل بہلانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ ہاشم کباب میں ہڈی بن کر اس کے راستے میں آگیا تھا پھر اس نے تیسرے مسافر ڈوما کے بارے میں جب لوچن کو بتایا تھا کہ وہ معاہدے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے تو لوچن کو اس پر تعجب ہی ہوا تھا۔ اس کے بعد اسے لوچن اسی غلط فہمی کا شکار تھا کہ ہاشم ہی دراصل کوڈ ”سیون اسٹار“ کا استعمال کسی عورت کے ذریعے اپنی اصلیت کو چھپانے کیلئے کر رہا ہے لیکن..... جب تیسری بار موبائل کی میوزک ٹیون گونجی تو ہاشم نے کمرے میں آ کر موبائل آن کر دیا۔

”ہاشم اسپیکنگ!“ اس نے بے پردائی سے کہا۔

”سیون اسٹار.....“ دوسری جانب سے کوڈ ورڈ کے ساتھ ہی نسوانی آواز ابھی۔ ”تم شاید کسی ضروری کام میں مصروف تھے؟“

”میرا خیال تھا کہ غالباً حسب معمول لوچن کے پیٹ میں درد ہو رہا ہوگا۔“ اس نے سنجیدگی اختیار کی۔ ”کسی کام کے مکمل ہو جانے کے بعد وہ مختلف شبہات میں مبتلا ہو جانے کا عادی ہے۔“

”اس بار وہ کسی بات پر غور کر رہا ہے.....؟“ بہ دستور سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

”لوچن کا خیال ہے کہ میں نے چار مقامی لوگوں کو اپنی خصوصی پلاننگ کے تحت ہائر

(HIRE) کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں نے کل وقوع کا جائزہ لینے کے بعد ہی تین اطراف سے بیک وقت فائرنگ کرنے کا

پلاننگ کی تھی۔“ ہاشم نے وضاحت کی۔ ”اگر ہم تینوں نے تنہا تنہا رہ کر اس پر عمل کیا ہوتا اور کوئی ایک بھی دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتا تو باقی دو بھی زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔“

”میں تم سے متفق ہوں لیکن مقامی بد معاش زیادہ قائل بھروسا نہیں ہوتے، دولت کا لالچ دے کر انہیں منہ مانگے داموں خریدنا بھی جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ جگا اس معاملے میں پہلے ہی بدنام ہے۔“

”اس کا اصل نام جہانگیر بٹ ہے۔“

”جانتی ہوں۔۔۔۔۔ پہلے وہ سیدھے راستوں کا مسافر تھا ایک کیس میں مجرم نہ ہونے کے باوجود پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ دو ہفتے جیل میں عادی مجرموں کے درمیان رہ کر باہر نکلا تو اسے احساس ہوا کہ طاقت اور دولت کے بغیر اوسط درجے کے لوگوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اس لیے وہ عادی مجرم بن گیا اور اب ایک گینگ کا مالک ہے۔ پولیس کو ہر ماہ پابندی سے طے شدہ رقم ملتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ جگا کے سلسلے میں چشم پوشی کرتی ہے۔ بہر حال، دوسری جانب سے بات مختصر کر کے کہا گیا۔

”جگا باسٹرو کے زرخیز کتے بوسو گھنٹے ہوئے جگا تک پہنچ گئے ہیں۔ جگا نے فی الحال انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ مرنے والے دونوں افراد دو روز کی چھٹی پر تھے، وہ اس کے گینگ میں بھی نئے نئے شامل ہوئے تھے۔“

”پھر۔۔۔۔۔ پریشانی کس بات کی ہے؟“ ہاشم نے روانی میں دریافت کیا۔ ”مرنے والے دوبارہ جگا کے خلاف گواہی دینے نہیں آئیں گے۔“

”ہاشم۔۔۔۔۔“ دوسری جانب سے تنبیہ کی گئی۔ ”تم شاید بھول رہے ہو کہ کس سے بات کر رہے ہو؟“

”آئی ایم سوری لیکن۔۔۔۔۔“

”دو آدمی جو مفور ہو گئے ہیں اگر وہ پکڑے گئے تو۔۔۔۔۔؟“ چیتے ہوئے سرد لہجے میں سوال کیا گیا۔

”ہاشم ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھ کر کام کرنے کا عادی ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”وہ اگر سامنے آ بھی گئے تو گواہی دینے کیلئے زندہ نہیں رہیں گے۔“

”میں تمہاری صلاحیتوں سے واقف نہ ہوں تو تمہارا انتخاب بحیثیت رنگ لیڈر کے کبھی نہ کرتی۔۔۔۔۔ ممکن ہو تو جگا سے فون پر رابطہ قائم کر کے پہلی فرصت میں معلوم کرو کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔۔۔۔۔ ان کو قتل از وقت وارنگ دے دی جائے تو مناسب ہوگا۔“

”آئیڈیا برا نہیں ہے لیکن اگر انہوں نے اسے ہماری کمزوری سمجھ کر منہ کھولنے کی کوشش کی اور مزید کچھ رقم کا مطالبہ کیا تو۔۔۔۔۔؟“

”ہمارے ملک میں کمیٹی والے بھی بھونکنے والے آوارہ کتوں کو زہریلی گولیاں دے کر ختم کر دیتے ہیں۔ تمہیں بھی پوری اجازت ہے لیکن میں غیر ضروری خون خرابا پسند نہیں کرتی۔“

”ایک مشورہ اور چاہتا ہوں۔“ ہاشم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کوئی مرض دائمی صورت اختیار

کر جائے تو مریض کو صرف ایک خوراک دینے سے کام نہیں جتا۔“

”آئیڈیا برا نہیں ہے لیکن۔۔۔۔۔ کیا تم تنہا اس کام کو کرنے کی جرأت کر سکو گے؟“

”میرے آگے پیچھے رونے والا کوئی نہیں ہے۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”میرے ذمے اس کا ایک پچھلا قرض بھی ہے جسے میں چلتا کرنا چاہوں گا۔“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ ہاشم معنی خیز انداز میں مسکرایا، وہ سمجھ گیا تھا کہ ”آخری فیصلے“ کے حوالے سے اس کا امتحان لیا گیا ہے۔ اس نے جواب دینے میں پوری احتیاط سے کام لیا۔ ”مجھے سیون اسٹار کے کوڈ سے متعلق تمام شرائط یاد ہیں۔ جب تک اس حوالے سے لائن کلیئر کا سگنل نہ ملے میں خود سے کوئی اقدام نہیں کروں گا۔ سوائے ایک صورت میں۔“

”اس صورت کی وضاحت ضروری ہے؟“

”کوئی ایسا موقع بھی آتا ہے جب انسان پوری طرح ٹریپ ہو کر خود کو بچانے کی خاطر چھوٹیشن کے اعتبار سے اپنی مرضی کا مالک ہو جاتا ہے۔“

”تم دور اندیش ہونے کے علاوہ تجربہ بھی رکھتے ہو۔۔۔۔۔“ اس کی وضاحت کو سراہا گیا۔ ”سیون اسٹار گروپ نے یقیناً تمہارے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی۔۔۔۔۔ میری طرف سے تمہیں اپنا قرض چکانے کی اجازت ہے لیکن۔۔۔۔۔ تحت یا تختہ کے علاوہ کوئی اور غلطی نہ کرنا، اس بات کی بجائے لوچن یا ڈوما کو نہیں ہونی چاہئے۔“

دوسری طرف سے جملہ مکمل ہونے کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ ہاشم کے چہرے پر ابھرنے والے خوشی کے تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ وہ فتح حامد سے اپنا حساب بے باقی کرنے میں وقت نہیں لے گا۔ اسے یاد تھا کہ کچھ لوگ اسے اس وقت ہونٹل سے اغوا کر کے اس جگہ تک لے گئے تھے جہاں لوچن اس گڈز ٹرانسپورٹ کے مفور ڈرائیور کو بازیاب کر کے لیاقت حسین کی گاڑی کو ٹکڑا مارنے کے سلسلے میں اس کی زبان کھلوانے کی خاطر تار چر کر رہا تھا۔ ہاشم کو اپنے اغوا کرنے کا وہم و گمان بھی نہیں تھا اس لیے وہ بری طرح پھنس گیا تھا، ایسے وقت میں بھی اس کے ذہن کی مشین برابر کام کر رہی تھی۔ اغوا کرنے والے اسے اور لوچن کو ایک ساتھ ختم کرنے کے موڈ میں تھے، یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے اور لوچن کے درمیان نورا کشتی والی ٹکرا بھی ہوئی تھی، خود لوچن کو خطرے کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے جھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرائیور کی بندشوں کو کھولنے کی کوشش تھی پھر۔۔۔۔۔ اپنے مارشل آرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بازی پلٹ دی تھی، اغوا کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ اور ہاشم دوبارہ آزادی حاصل میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اسی رز ہاشم نے اس شخص کا نام جاننے کی درخواست کی تھی جس کے کارندوں نے اغوا کیا تھا۔

”سیون اسٹار“ کی طرف سے اسے اجازت مل گئی تو وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ وہ اس قرض کو

واپس کرنے کی خاطر فوری طور پر پلاننگ کرنے میں محو تھا جب دروازے پر دستک کی آواز سن کر چوک اٹھا۔ پلک جھپکتے میں اس نے اپنا بے آواز آٹومیک ریوالور نیکے کے پیچھے سے نکال کر نیگی شرٹ کے اندر کر کے ہاف پینٹ میں اڑسا پھر دروازے کے قریب جا کر میک آئی میں دیکھا۔ آنے والی ہوٹل کی خوبصورت ہوسٹس تھی جو دو بار پہلے بھی اسے ”مخصوص ٹائپ“ کے لوگوں میں شمار کر کے اپنی اداؤں سے نواز چکی تھی۔ ہاشم نے کچھ سوچ کر دروازہ کھول دیا۔

”اگر آپ معروف نہ ہوں تو میں کمرے کی ضروری صفائی کر دوں؟“ حسب معمول اس نے ہاشم کی آنکھوں میں گہرائی تک جھانکا۔ ”بیڈ کی چادریں اور پلو کو زنجی تبدیل کرنے ہیں۔“

”کل ہی تو آپ نے تبدیل کیے تھے؟“

”ہم خاص طور پر غیر ملکی ٹورسٹ کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔“ ہوسٹس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”میں اس وقت شاور لینے جا رہا تھا۔“ ہاشم نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ ”اگر آپ شام کی چائے میرے ساتھ بیٹا پسند کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔ اس وقت مجھے تنہائی کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔“

”او۔ کے، ایز یوش۔“ اس نے معنی خیز اور دلربا انداز میں جواب دیا پھر مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔

ہاشم نے دروازہ بند کرنے کے بعد سکون کا گہرا سانس لیا۔



شبم نہا دھو کر اپنے کمرے سے پوری طرح چھینج کر کے ناشتے کی میز پر آئی تو افضل خان نے اسے سر سے پاؤں تک بہت غور سے دیکھا، اس وقت وہ خامسے ماڈرن ڈریس میں تھی جبکہ پہلے خود بہت لمبے دیے رکھنے کی عادی تھی۔ افضل خان اس تبدیلی کو معنی خیز انداز میں سوچ رہا تھا۔ اسے شبم کے فلیٹ میں آنے پورے سات روز گزر چکے تھے۔ بگ باس کی دی ہوئی رعایت ختم ہونے میں صرف تین دن رہ گئے تھے۔ ”اس کے بعد کیا ہوگا؟“ وہ پہلے والی پوزیشن میں ہوتا تو شاید سات دنوں میں شبم کو شیشے میں اتارنے کی بھرپور کوشش کرتا۔ مگر سیدھی انگلی سے نہ نکلتا تو وہ انگلی میز می کرنے کے فن سے بھی واقف تھا لیکن موجودہ حالات میں ہر گزرنے والا دن ایک سخت امتحان تھا۔ ان حالات میں جبکہ اس کا مستقبل تلوار کی نوک پر تھا، وہ شبم کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”خلاف توقع تم پہلے کے مقابلے میں اب بہت سنجیدہ ہوتے جا رہے ہو؟“ شبم نے توس پر مکھن لگاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”تم بھی پہلے اتنی ماڈرن اور بے باک نہیں تھیں۔“ وہ دہی زبان میں بولا۔

”کبھی حالات اور کبھی کچھ مجبوریاں انسان کے اندر بڑی نمایاں تبدیلیاں پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔“

”تم کس وجہ سے مجبور ہوئیں؟“

”کوئی اور بات کرو۔“ اس نے بیزاری کا اظہار کیا پھر سنجیدگی سے بولی۔ ”باس نے تمہیں جو رعایت دی تھی اس کے ختم ہونے میں۔“

”جانتا ہوں۔“ افضل خان نے کسمسا کر کہا۔ ”صرف تین دن اور رہ گئے ہیں لیکن تم پریشان نہ ہو۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے میں اس بے پہلے ہی۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ شبم نے اسے نشلی نظروں سے دیکھا۔ ”میری اجازت کے بغیر تم کوئی ایسی غلطی نہیں کرو گے۔“

”سوری۔۔۔۔۔ میں تمہیں اپنی وجہ سے پریشانی میں نہیں ڈالوں گا۔“

”بات پریشانی کی نہیں تمہارے آخری فیصلے کی ہے۔“ اس نے افضل خان کو تنکیسی نظروں سے دیکھا پھر چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔

”میرا آخری فیصلہ۔۔۔۔۔ تعجب ہے تم ایسی بات کہہ رہی ہو جس پر میرا بھی پاگلوں کی طرح قہقہہ لگائے کوئی چاہ رہا ہے۔“ افضل خان کے جواب میں اس کا اعصابی تناؤ اور ٹوٹ پھوٹ کا احساس چھلک رہا تھا۔ ”میرا فیصلہ وہی ہے جو یہاں آنے سے پہلے تھا، میں نے جس شہر میں کسی بھی وجہ سے راج کیا ہو، وہاں بھکاری کی طرح زندہ رہنے پر موت ہی کو ترجیح دوں گا۔ تم نے جتنے دنوں اپنی چھت کے نیچے سہارا دیا، اس کیلئے تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”ایک سوال کروں؟“ اس نے افضل خان کی آنکھوں میں خوار آلود نظروں سے دیکھا۔ ”بے تکلفی سے جواب دو گے؟“

”پوچھو۔۔۔۔۔“

”حالات کی تبدیلی سے پہلے تم مجھے شکار کرنے کی خاطر نہیں سوچتے تھے؟“ اس کے لہجے میں بے باکی بھی شامل ہو گئی۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ نظریں جھکا کر بولا۔ ”مگر میں نے بارہا اس خواہش کو بگ باس کے خوف کی وجہ سے پورا کرنے کی جسارت نہیں کی۔“

”سات روز تک میرے ساتھ تنہا رہنے کے بعد بھی تمہیں کبھی اس کا خیال نہیں آیا۔۔۔۔۔؟“

شبم نے اسے مزید ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ شاید اس لیے کہ جب موت کا تصور ذہن کو مایوسی کی انتہاء پر پہنچا دے تو اس وقت انسان کو پیٹ بھرے کی باتیں نہیں سوجھتیں۔“ افضل خان نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”تم نے ابھی میرے کسی آخری فیصلے کی بات کی تھی؟“

”میں نے غلط نہیں کیا تھا؟“ وہ یک لخت سنجیدہ ہو گئی۔ ”آخری فیصلہ تم ہی کو کرنا ہے لیکن۔۔۔۔۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اپنے اپارٹمنٹ میں لاتے وقت میں نے تم سے کہا تھا کہ بگ باس کسی شخص سے خوش نہیں ہے۔ شاید وہ تمہیں کوئی آخری چانس دے اور کامیابی کی صورت میں اس کی تکلفی کچھ کم ہو

میں نگاہیں ڈال کر قد زے رومانک اور جذباتی انداز میں کہا۔ ”میں فیصلے کا اختیار تمہیں دیتا ہوں۔ شاید میں سات دنوں تک اس عارضی زندگی کا کچھ بوجھ ہلکا کر سکوں جو تم نے رسک لے کر.....“

”کیا تم میرے کسی بھی فیصلے کو قبول کر لو گے؟“ جواب میں شبنم نے بھی رومانک انداز اختیار کیا۔

”آزما کر دیکھ لو۔“

”میرے مشورے پر اگر تم ان دونوں کو فی الحال کوئی سبق دے سکو تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”پہلے تم کسے ترجیح دو گی؟“

”رستم علی آغا خانی۔“ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”نئے ایس بی کے سلسلے میں، میں اس حد تک تمہیں آگاہ کر سکتی ہوں کہ مرکزی حکومت میں اس کے بھی دو چار خاص واقف کار ہیں۔ نہ ہوتے تو شاید اب تک اس کا تبادلہ بھی ہو چکا ہوتا۔“

”ہم جیسے کارندوں کیلئے یہ سوچنا ضروری نہیں ہوتا کہ ہمارا شکار کتنا اہم ہے۔ اس سے زیادہ باس کا اشارہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم کوئی اوچھا وار کرنے سے دریغ کرو گے۔“ شبنم نے دبی زبان میں جواب دیا پھر خاص انداز سے الوداعی بوسہ ہوا میں اچھالتی، اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر دفتر کے ارادے سے باہر چلی گئی۔ افضل خان نے دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔ اس وقت وہ زندگی موت کے دہانے پر کھڑا کوئی آخری فیصلہ کر رہا تھا۔ اس کا ذہن شبنم کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا جو خلاف توقع بہت زیادہ بے باک اور ماڈرن ثابت ہو رہی تھی۔ اس تبدیلی کے عقب میں اسے بگ باس کی خواہش ہی نظر آرہی تھی۔

دفتر پہنچ کر شبنم نے سب سے پہلے کنول کے ذریعے بگ باس کو اپنی آمد کی اطلاع دی، اسے یقین تھا کہ اگر افضل خان اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو کسی بھی ذریعے سے بگ باس کے کانوں تک پہنچ چکی ہے تو وہ اسے اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں بلانے میں دیر نہیں کرے گا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں ثابت ہوا۔ دو منٹ بعد اسے کنول کی طرف سے مخصوص کمرے میں پہنچنے کی ہدایت بھی مل گئی۔ ہدایت کے مطابق وہ پورے دس منٹ ساؤنڈ پروف کمرے میں شیخ حامد کے سامنے بیٹھی رہی۔

”کیا تمہیں اس وقت مجھ سے کوئی ضروری کام تھا؟“ خطرناک مگر مجھ نے اس انداز میں مخاطب کیا جیسے وہ کسی بات سے مطلق آگاہ نہیں ہے۔ شبنم نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ سنبھل کر بولی۔

”اگر میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا تو معذرت خواہ ہوں لیکن کچھ ضروری بات کرنی تھی۔“

”اب ان عارضی تکلفات کو چھوڑو مائی ڈیز.....“ شیخ حامد نے اس کو بے تکلفی سے جواب دیا۔

”میرے اوپر تمہارے درمیان سے سارے پردے جب سرک چکے ہیں تو اب ہمیں ایک دوسرے

جانے۔ یہ تمہارا امتحان بھی ہوگا۔“

”کون ہے وہ؟“

”پہلے ایک ہی تھا۔ اب دو ہو گئے ہیں۔“ اس نے افضل خان کے صبر کو آزمانے کی خاطر اوپر سے ملنے والی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم کس کا انتخاب کرتے ہو؟“

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ پہلے کے مقابلے میں تم زیادہ عقلمند ہو گئی ہو۔ بہر حال، مجھے بتاؤ کہ ان دونوں مخالفین کا نام کیا ہے؟“

”ایک آغا منظور کی جگہ آنے والا نیا ایس بی اورنگ زیب اور دوسرا.....“ اس نے توقف سے کہا۔ ”تم شاید اس کو پہلے سے جانتے ہو گے۔ میں سیٹھ رستم علی آغا خانی کی بات کر رہی ہوں۔“

”اس نے کیا کیا؟“ افضل خان نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ایک خیال ہے کہ باس کے ہنگلے پر حملہ کرنے والے اسی کے پروردہ افراد بھی ہو سکتے ہیں۔“

”یہ کس کا خیال ہے..... تمہارا یا..... بگ باس کا؟“

”آم کھانے سے مطلب رکھو۔“ شبنم کا لب و لہجہ کاروباری ہو گیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کو دیئے گئے موبائل کا کوئی خفیہ میکنزم اس وقت بھی اس کی آواز کو کسی دوسرے برقی آلے پر بھی ٹرانسمٹ (Transmit) کر رہا ہوگا اس لیے بہت محتاط انداز میں بولی۔ ”میں نے اپنے انداز سے تمہیں دونوں نام بتا دیئے ہیں۔ فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے۔“

افضل خان تھلا کر رہ گیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ شبنم اب پوری طرح بگ باس کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ ایک لمحے تک وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بڑی بے پردائی سے پوچھا۔

”اگر میں ایک پرانے واقف کار کی حیثیت سے فیصلے کا اختیار تمہیں دوں تو تم کس کا نام تجویز کرو گی؟“

”مجھے دفتر جانے کی جلدی ہے۔“ وہ چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کوئی جلدی نہیں ہے تم شام تک سارے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد بھی کوئی حتمی فیصلہ کر سکتے ہو۔“

”بگ باس کی کیا خواہش ہے؟..... وہ ان دونوں کو کوئی سبق دینا چاہتا ہے یا انہیں ہمیشہ کیلئے راستے سے ہٹانا پسند کرے گا؟“

”میں نے تم سے روز اول بھی اپنا اندازہ ہی ظاہر کیا تھا۔“ محتاط لہجے میں جواب دیا گیا۔ ”اس وقت بھی میرا خیال ہے ان دونوں کو کوئی ایسا سبق دینا ضروری ہے کہ ہمارے شبہات دوبارہ سر اٹھانے کی جرات نہ کر سکیں۔“

”ٹھیک ہے.....“ افضل خان کے تجربے نے اسے باور کرا دیا کہ شبنم کھل کر بگ باس کا نام لینے سے گریز کر رہی تھی، پہلے وہ بھی اسی اصول پر کار بند رہا کرتا تھا چنانچہ اس نے شبنم کی نگاہوں

سے بلا جھک، بے تکلفی سے بات کرنی چاہئے۔“

”شکریہ باس.....“ اس نے دل پر جبر کر کے بگ باس کا اشارہ بھانپ کر قدرے برداشت سے کام لیا۔ ”میں آپ سے افضل خان کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔“

”اوہ.....“ اس بار بھی لاطمی کا بے حد کھلا ہوا مظاہرہ کیا گیا۔ ”کوئی خاص بات.....؟“

”میں نے آج ناشتے پر اس کے ساتھ کھل کر بات کی تھی۔“

”کرسی لے کر میرے قریب آ جاؤ.....“ اس نے شبیم کے گدرائے ہوئے چہرے پر نظر جمائے جمائے بڑی فیاضی کا اظہار کیا۔ ”کسی درکر کو اپنے قریب بیٹھنے کی آفر میں پہلی بار دے رہا ہوں۔“

شبیم انکار نہ کر سکی، جبراً زبردستی مسکراتی ہوئی کرسی لے کر اس کے قریب چلی گئی۔ اس نے دبی زبان میں باس کی آفر کا شکریہ بھی ادا کیا۔

”مجھے یقین ہے کہ زندگی اور عزت دو ایسی قیمتی اور کمزور چیزیں ہیں جن کو بچانے کی خاطر انسان اکثر مجبوری کا شکار ہو جاتا ہے۔“ اس نے بے تکلفی سے اپنا ہاتھ شبیم کے شانوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”افضل خان بھی اس وقت ایسی ہی کھٹکش سے دوچار ہوگا۔“

”نیس باس.....“ وہ کسمسا کر بولی۔ ”میں نے اسے بھی مشورہ دیا ہے، اسے ہمارے دونوں حریفوں کو کم از کم اتنی سزا ضرور دینی ہے جو انہیں اس بات کا احساس دلا دے کہ وہ دوبارہ آپ کی طرف بھول کر بھی نگاہیں اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔“

”دونوں کون؟“ اس بار بھی مصصوبیت سے دریافت کیا گیا۔

”نیا ایس بی اور رستم علی آغا خانی.....“

جواب میں خطرناک مگر چھ نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا، اس کے ہاتھوں کی حرکت شبیم کے شانوں پر بتدریج بڑھنے لگی، نظریں خلا میں کچھ تلاش کرتی رہیں پھر اس نے ہاتھ کی جنبش روک کر شبیم کی طرف دیکھا۔

”مجھے تمہارا مشورہ پسند آیا لیکن فی الحال رستم علی کے کچھ بیچ ٹائٹ کرنے کی زیادہ ضرورت ہے، ایس بی کے بارے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے..... اس کیلئے میں نے کچھ اور پلان بنایا ہے۔“

”ایزیووش..... سر!“

”میڈم سے تمہاری بے تکلفی کس حد تک ہو چکی ہے؟“ سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔

”آپ کے حکم کے مطابق میں میڈم کو بڑی حد تک شیشے میں اتار چکی ہوں۔“

”گڈ.....“ شیخ حامد نے بڑی بے تکلفی سے شبیم کے گالوں پر ہاتھ پھیرا..... معنی خیز لہجے میں

سرسراہے ہوئے کہا۔ ”میں بھی اسے شیشے میں اتار کر اس کا زہر نکالنا چاہتا ہوں..... زہر نکال دیا جائے تو پھر ناگن بھی اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔“

شبیم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، زبردستی مسکراتے پر مجبور ہو گئی۔

”کیا تم اس کو کسی تفریحی مقامات پر لے جا سکتی ہو.....؟“

”ابھی تک ایسا تجربہ نہیں ہوا.....“ اس نے مصلحتاً حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بڑی

راز داری سے جواب دیا۔ ”ایک دوبارہ کوشش میں کامیاب ہو جانے کے بعد پورے یقین سے اس

ناگن کا زہر بھی نکالنے کا پروگرام زیادہ مناسب ہوگا۔“

”تمہارا جواب سن کر مجھے خوشی ہوئی۔“ شیخ حامد کا ہاتھ شبیم کے جسم پر ادھر ادھر بٹکنے لگا تو شبیم

نے کسمسا کر کہا۔

”یہ دفتر ہے سر.....!“

”گھبراؤ مت..... میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ ایک حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں

کروں گا۔“

شبیم خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ سات آٹھ منٹ تک شیخ حامد اس کے جسمانی گداز سے خود کو

عارضی سکون پہنچاتا رہا پھر اس نے شبیم کو جانے کی اجازت دی تو وہ اس وقت بھی مسکراتی ہوئی اٹھ کر

تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر آ گئی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اس وقت ہی اس خطرناک

مگر چھ کو زندہ درگور کرنے سے گریز نہ کرتی۔

اس روز دفتری اوقات میں بھی وہ بگ باس کے موجودہ برتاؤ پر غور کرتی رہی۔ کھیل ایک بار

شروع ہو جائے تو ہمیشہ درمیان میں نہیں رکنا، کبھی کبھی اس کا اختتام بھی عمل میں آ جائے تو جیت اور ہار

کا وقت ہاتھوں سے نکل جاتا ہے، شیر کے منہ میں خون کا ذائقہ بدلنے لگے تو وہ ہر کسی کو ہٹاڑ کھانے

سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ شبیم اپنی تصاویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ چکی تھی، خطرناک مگر مجھ میڈم کو بھی اسی

کے ذریعے سے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

تنہا عورت جو خود بے بس ہو چکی ہو کسی خطرناک مجرم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لوہے کو کانٹے کی

خاطر ہمیشہ لوہا ہی کا رآمد ہوتا ہے، یہ مثال وہ بچپن سے سنتی چلی آئی تھی۔ شبیم کو بھی ان نازک حالات

میں کسی ایسے مرد کی ضرورت تھی جو شیخ حامد کے مقابلے کی ہمت رکھتا ہو، انہی خیالات کے تیز بہاؤ میں

اسے افضل خان کا خیال آیا جب وہ باس کا دست راست تھا اس وقت شبیم کے علاوہ خود میڈم نے بھی

اسے استعمال کرنے کی ضمانتی تھی لیکن افضل خان نے اپنی فطرت کے مطابق ڈبل کر اس کی پالیسی اپنا

لی مگر اس وقت وہ زندگی کے بجائے موت کو اپنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لوہا گرم ہو تو اسے معمولی ضرب

لگا کر بھی اپنی خواہش کے مطابق موڑا جاسکتا ہے۔ شبیم نے ایک بار حالات کے پیش نظر افضل خان کو

آزمائے کی ٹھان لی۔ وہی اس کیلئے آخری آپشن تھا۔

دن بھر وہ اپنی سوچ کو مختلف زاویوں سے پرکھنے کے بعد ایک آخری فیصلہ کرنے میں کامیاب

ہو گئی۔ دفتر سے اپارٹمنٹ پہنچی تو افضل خان سامنے ہی ایک صوفے پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق

تھا۔ شاید جو دو نارٹ گٹ اسے دیئے گئے تھے وہ ٹاپ کلاس اشتہاری جرموں کو بھی استعمال کر سکتا تھا

لیکن موجودہ حالات میں اسے تنہا اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کا سخت امتحان درپیش تھا۔ وہ اس وقت موت کے کنویں میں تھا جہاں جیت کے امکان کم اور بربادی کے امکان بہت زیادہ تھے۔

”کیا بات ہے گریٹ خان۔“ شبنم نے اسے دوستانہ انداز میں گریٹ خان کے خطاب سے نواز تو افضل خان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تڑپ کر رہ گئی۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

”تم نے جو امتحان کا پرچہ صبح دیا تھا اسی کو موثر طریقے سے حل کرنے کے منصوبے بنا رہا ہوں۔“

”اوہ..... کم آن۔“ وہ ہنڈ بیگ ایک طرف اچھال کر افضل کے برابر ہی بیٹھ گئی۔ ”مجھے اب بھی امید ہے کہ بگ باس کو خوش کرنے کیلئے تم جان کی بازی لگا کر بھی اپنا کھویا ہوا مقام کسی حد تک حاصل کر سکتے ہو..... ہاتھی مرنے کے بعد بھی سوال لاکھ سے کم کا نہیں ہوتا۔“

”کسی حد تک سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ جواب میں اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا گیا۔

”بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ بگ باس کے خوف سے پھر محتاط ہو گئی، سپاٹ لہجے میں بولی۔

”اس کی جگہ اگر میں بھی ہوتی تو شاید میں بھی فوری طور پر تمہیں تمہارا کھویا ہوا مقام واپس نہ کرتی، اس کو حاصل کرنے کی خاطر تمہیں ایک نئے سرے سے محنت کرنی ہوگی، بڑے پاؤں پیٹنے پڑیں گے۔“

”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ مجھے ذاتی مفاد کی خاطر جب قربانی کا جانور بنا دیا گیا تو پھر بگ باس سے.....“

”ہوش میں رہو، افضل خان۔“ شبنم نے بھڑک کر تیز لہجہ اختیار کیا پھر پرس کھول کر ایک تحریر شدہ پرچہ افضل خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بہ دستور انتہائی درشت آواز میں بولی۔ ”اگر تم نے بگ باس کیلئے کوئی غلط بات زبان سے نکالی تو پھر تمہیں میرے اپارٹمنٹ میں ایک ہل کیلئے جگہ نہیں ملے گی۔“

افضل خان، شبنم کے اس تشکیک آمیز جملے پر تھلا کر رہ گیا پھر اس نے تکیا ہوا پرچہ کھول کر دیکھا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پرچہ پر صرف ایک مختصر مگر اہم پیغام درج تھا۔ ”ہماری اس کمرے میں ہونے والی گفتگو بھی دوسری جانب سنی جا رہی تھی۔ محتاط رہنا، ویسے میں تمہارے ساتھ ہوں، کوشش کروں گی کہ تمہارے کسی کام آسکوں۔“

”مجھے تمہارے جواب کا اندازہ تھا۔“ افضل خان نے پوزیشن کی نزاکت سمجھ کر کینپلی بدلی۔

”بگ باس کے میری ذات پر بے شمار احسانات ہیں، میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن خدا گواہ ہے کہ میڈم کے سلسلے میں مجھے.....“

”وہ بھی ایک مصلحت تھی۔“ شبنم نے بہ دستور روکھے لہجے میں اس کا جملہ درمیان سے اچک لیا۔ ”تم تصویر کا دوسرا رخ کیوں نظر انداز کر رہے ہو؟“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”تمہیں اب جو موقع ملا ہے وہ بھی بگ باس ہی کی مہربانی ہے ورنہ اسے رعایت دینے کی کیا ضرورت تھی.....؟“

”میں اس بات کو نظر انداز نہیں کر رہا لیکن اب میرے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ میں تنہا دو خطرناک محاذ سر کر سکوں۔“

”یہ سوچنا میرا کام نہیں.....“ اس نے تیزی سے دو ٹوک جواب دیا پھر توقف سے بولی۔

”ویسے میں کوشش کروں گی کہ بگ باس سے تمہارے لیے کچھ مزید رعایت حاصل کر سکوں۔“

”وہ آمادہ نہیں ہوگا.....“ افضل خان نے نوراکشتی جاری رکھی۔

”ہو بھی سکتا ہے..... کوشش کر لینے میں کچھ حرج بھی نہیں ہوگا۔“

”کیا تمہیں اعتماد ہے کہ تم اس سخت لوہے کو موم کر سکوگی؟“

”فضول باتوں سے پرہیز کرو.....“ اس نے تلخ انداز میں جواب دیا پھر کچھ تامل کے بعد بولی۔ ”تم صرف اپنی پسند بتا دو، تمہارے لیے دونوں میں کون سا نارگٹ زیادہ آسان ہوگا؟“

”رستم علی آغا خانی۔“

”ٹھیک ہے، تم اس محاذ کو تین دن کے اندر سر کر لو تا کہ مجھے بگ باس کے سامنے زبان کھولنے کا موقع مل سکے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے نارگٹ کیلئے تمہیں مزید وقت مل جائے۔“

اس کے بعد شبنم نے گفتگو کا موضوع بدل دیا پھر نہانے کی خاطر واش روم میں چلی گئی۔ افضل خان کو شبنم کے دیئے ہوئے خفیہ اشارے سے مایوسی کے گہپ اندھیروں میں امید کی ایک مدھم سی کرن نظر آنے لگی۔



لیاقت حسین اس وقت خلاف توقع کچھ زیادہ ہی خاموش خاموش تھا۔

فرحین نے اس تبدیلی کو خاص طور پر محسوس کیا۔ لیاقت حسین نے اسے صرف شریک حیات نہیں کیا بلکہ اپنے ہر معاملے میں شریک رکھتا تھا۔ سراج کی پوچھ گچھ سے اسے جودکھ ہوا تھا وہ بھی اس نے فرحین سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہر چند کہ سراج اور سیٹھ عثمان دونوں اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے لیکن اسے حیرت اس بات پر تھی کہ جب سیٹھ عثمان نے دفتر جاتے وقت اسے اپنے کام سے راستے میں چھوڑ دیا تھا تو پھر اس سے کس بات کی چھان بین کی جا رہی تھی؟ ہم زاد کی ہدایت کے بعد اسے اپنے اغوا کیے جانے اور رہائی حاصل کرنے والے حیرت انگیز واقعات کی کوئی بات یاد نہیں تھی۔ ہر بات اس کے ذہن سے حرف غلط کی طرح حذف ہو چکی تھی۔ صرف ایک بات ایسی تھی جو لیاقت حسین کو روز اول کی طرح یاد تھی۔ دیوانے کا ایک چنگی خاک سے نوازا نا پھر منظر عام سے غائب ہو جانا۔ دیوانے سے اس کی ملاقات ایک ناپیدائش دراز بزرگ کے طفیل ہوئی تھی، وہ بھی شاید خدا کی طرف سے اسی کام کیلئے تعینات کیا گیا تھا۔ اسی کی ہدایت پر لیاقت خان نے گل خان کو

..... کچھ نہیں بتایا تھا۔ نابینا بزرگ کی ہدایت اکثر اس کے ذہن میں صدائے بازگشت کی طرح مختلف مواقع پر گنبد کی صدابن کر گونج چکی تھی۔

”دیوانے سے اپنی ملاقات اور ایک چمکی خاک کا ذکر کبھی بھول کر بھی اپنی زبان پر مت لانا ورنہ بڑے خسارے میں رہو گے۔“ یہی ایک بات تھی جو اس نے فرحین سے بھی راز میں رکھی تھی۔

اسے کب، کہاں سے، کس وقت اور کس طرح اغوا کیا گیا تھا؟ کن پر اسرار حالات میں وہ واپس آ گیا تھا، لیاقت حسین کو کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھی یہ جانتا تھا کہ سیٹھ عثمان اور سراج پر کسی دیوانگی کا دورہ نہیں پڑا ہو گا جو ان دونوں نے اس سے سوال جواب کیے تھے۔ اس کے علاوہ ایکسڈنٹ والی بات بھی اسے ایک معما ہی لگی تھی۔ سراج کو اگر اس پر اعتبار اور اعتماد نہ ہوتا تو پولیس کے جھگے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہونے کے باوجود ہفتہ دس دن کیلئے اسے اپنے ساتھ رہنے کی بات بھی زبان پر نہ لاتا۔ الماس کے بارے میں بھی اسے ایک ہی بات یاد تھی، وہ گھر پر سو رہا تھا لیکن کسی طرح آنکھ کھلنے پر اس نے خود کو سراج کے گھر میں اس کے ڈرائنگ روم میں پایا تھا۔ اس موقع پر الماس نے بھی اس سے دبی زبان میں کچھ سوالات کیے تھے، وہ ان کا بھی جواب دینے سے قاصر تھا۔ واپسی کے وقت اس نے سراج سے پوچھا تھا کہ وہ اس کے گھر میں کس طرح پہنچ گیا؟ سراج بھی گول مول جواب دے کر ٹال گیا تھا۔

اس وقت بھی اس کا ذہن انہی باتوں کی کھوج میں الجھ رہا تھا جب فرحین اس کے قریب آ گئی۔ ”تیری کھوپڑی میں جو ایک بات سما جائے وہ مشکل ہی سے نکلتی ہے۔“ اس نے پیار سے ٹھکڑہ کیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو جان لیاقت لیکن.....“ اس نے فرحین کے قرب کو باعث تسکین سمجھتے ہوئے اپنے ذہن کی گرہ کو سلجھانے کی کوشش کی۔ ”میں تمہاری بات مانتا ہوں لیکن..... جو باتیں میرے ساتھ پیش آ رہی ہیں، اس کا علم دوسروں کو جو جاتا ہے..... میں بے خبر رہتا ہوں، یہ کیسی بے خبری ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے.....؟“

”میری بات دھیان سے سنے گا؟“ فرحین نے بڑی اپنائیت سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھتے ہوئے کہا تو لیاقت حسین نے اس کو کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی گود میں سیٹھ لیا۔

”میں سنجیدہ ہوں اور تمہیں مستی سوچھ رہی ہے۔“ وہ ہچل کر بولی۔

”اس طرح تمہاری بات میرے کھوپڑی میں زیادہ آسانی سے آ جائے گی۔“ لیاقت کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

”دنیا یوں ہے کہ مرد زیادہ عقلمند ہوتا ہے لیکن عورت کی عقل مردوں سے زیادہ کام کرتی ہے۔ جو بات مرد کی کھوپڑی میں نہیں آتی، عورت وہ بھی جان لیتی ہے۔“

”اچھا.....“ لیاقت حسین نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ”تیری کھوپڑی کیا سمجھ رہی ہے؟“

”بڑے کہتے ہیں کہ انسان جب دوسروں کے ساتھ نیکی کرتا ہے تو اوپر والا بھی اس کی حفاظت کرتا ہے۔“ وہ کسماتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ ”تو نے بھی سنا ہو گا کہ جو بندہ اللہ کی ذات پر توکل کر لے وہ بغیر حساب کتاب کے جنت میں جائے گا۔“ اس نے بات جاری رکھی۔ ”تیرے ساتھ ماں کی دعا میں بھی ہیں جو قدم قدم پر تیرے کام آتی ہیں۔“

”اس لیے میں ہر بات بھول جاتا ہوں؟“ لیاقت حسین نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔

”میں مذاق نہیں کر رہی.....“ فرحین بہ دستور سنجیدہ رہی۔ ”اوپر والے کی مصلحت اس کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ رہا تیری کھوپڑی کا سوال تو وہ ہوائی جہاز کے کل پرزوں کی طرح کام کرتی ہے مگر..... کچھ باتیں خدا کے حکم سے تیرا بھول جانا ہی بہتر ہو گا اور..... تو یہ کیوں بھول رہا ہے کہ ماں کی دعاؤں ہی نے ہمیں اس پلید چار سے محفوظ رکھا جو دشمن بن گیا تھا۔ صاحب اور نیگم صاحب کا دوسری کوشی خریدنا، ہمارا کچھ مکان سے نکل کر بیٹھنے کی اس انہی تک.....“

”انہی نہیں جان لیاقت..... انہی سی۔“

”چل ہٹ پرے.....“ فرحین کسی مچھلی کی طرح اس کی آغوش سے ہچل کر نکل گئی۔ ”تو میرا مذاق اڑائے گا تو پھر میں نیگم صاحب سے تیری شکایت لگا دوں گی..... کام کی باتوں کے وقت بھی تجھے اپنی سوجھتی رہتی ہے۔“

”اچھا..... چل دور بیٹھ کر بتا دے، تو کیا سمجھانا چاہ رہی تھی؟“

”آج تو جس قابل ہے وہ سب اللہ کا کرم اور تیری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے، میری ایک بات کو اپنی کھوپڑی میں بٹھالے، اوپر والے پر بھروسہ رکھ..... اور بال کی کھال نکالنا چھوڑ دے تیری ساری الجھن دور ہو جائے گی۔ کبھی کبھی تیرا دماغ کسی بات کو بھول جائے تو اسے بھی اوپر والے کی مرضی سمجھ کر لمبے لمبے غوطے لگانے کی عادت ختم کر دے۔“

”شاباش ہے..... نیگم صاحبہ کی محبت نے تجھے بڑی بڑی باتیں سکھا دی ہیں۔“ لیاقت حسین نے کسی حد تک اس کی باتوں سے قائل ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے وعدہ کر لیاقت.....“ فرحین نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”تو آئندہ اس طرح منہ بنا کر گہرے سمندر میں ڈبکی لگانے کی غلطی نہیں کرے گا، تجھے اداس دیکھ کر میرا دل بھی برا ہونے لگتا ہے۔“

”سچ کہہ رہی ہے؟“

”نہیں..... تیرے ساتھ ٹھٹھول کر رہی ہوں۔“

”برامان گئی میری جان.....“

”تو بات ہی ایسی کر دیتا ہے کہ دل اندر سے، تیز آنچ پر رکھی ہوئی ہانڈی کی طرح جلنے لگتا ہے۔“

”میں تیرا کہاں لوں تو کیا انعام دے گی؟“ لیاقت حسین نے اس کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر

ہونوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیکہ.....“ فرہین اس کو ٹھیکہ دکھا کر منہ چڑاتی ہوئی تیزی سے کترا کر انکی سے باہر نکل گئی۔ اسے راحیلہ خاتون کے پاس جانے کی جلدی نہ ہوئی تو وہ لیاقت کی خوشی سے منہ بھی نہ موڑتی۔

میڈم روبی اور تھریسا دونوں ہی اس وقت کہیں جانے کے موڈ میں تھیں جب شبنم گھر میں داخل ہوئی۔ میڈم نے بڑے پرتپاک انداز میں اسے خوش آمدید کہا، جبکہ تھریسا نے گلے ملنے کے بجائے صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ وہ شبنم سے مخفا نہیں تھی لیکن اب وہ جس مقصد سے میڈم سے تعلقات استوار کر رہی تھی، وہ اس کیلئے مشکوک تھا۔ میڈم نے ہر چند کہ شبنم کے بارے میں اس کے ماضی کے حوالے سے بھی تمام وضاحتیں کر دی تھیں، مگر شبنم کی ایک خاص بات اس میں کام کر رہی تھی اس لیے یہ بات کم از کم تھریسا کے دل میں گونجنے لگی تھی کہ اس کا راندے پر آنکھ بند کر کے مکمل اعتماد کر سکے۔ ایسی صورت میں کہ وہ میڈم کی دست راست بھی تھی اور اس کے تحفظ کا خیال رکھنا اس کی اولین ترجیح تھی، اس نے شبنم کے بارے میں ذاتی طور پر مختلف انداز میں سوچا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس کی بھی کوئی ایسی ڈکٹی ہو جاسکے کہ شبنم کے ہاتھ آگئی ہو جو اسے اشارے پر ناپچنے پر مجبور کر رہی ہو۔ میڈم کا تاج ہول والا سا تھا اس کیلئے سب سے بڑی روشن مثال تھا۔ اگر میڈم کا اندھا جونا کام ہو جاتا؟ افضل خان کی دوست نماوشنی اگر کامیاب ہو جاتی؟ میڈم کی قائل اعتراض تصاویر اس کے ذریعے فحش حامد کے قبضے میں چلی جاتی تو شاید خود میڈم کے پاس بھی دو ہی راستے ہوتے۔ خطرناک مگر چھ کے اشاروں پر جانچنا، یا بڑی سے بچنے کیلئے خودکشی۔ اس نے میڈم سے اس گہرائی کی حد تک شبنم کے موجود کردار کے بارے میں تفصیل سے بات نہیں کی تھی۔ بہر حال شبنم کی طرف سے وہ پوری طرح مطمئن بھی نہیں تھی۔

”کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے؟“ شبنم نے بے تکلفی سے دریافت کیا اور ادھر ادھر دیکھ کر ہاتھ میں دباحتہ تحریری پیغام اس کی طرف بڑھا دیا۔

”تم بڑے موافقے سے آگئیں۔“ میڈم نے پرچہ لیتے ہوئے بہ دستور بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

”میں نے اس وقت بڑی مشکل سے تھریسا کو مجبور کر کے رہینو جانے کا پروگرام مرتب کیا ہے۔“

”گڈ.....“ شبنم نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”گھومنا پھرنا، تفریحی مقامات پر آنا جانا، مکمل نفاذ میں سانس لینا بھی اچھی صحت اور زندگی کی علامت ہے، گھر میں کتنی ہی آسائشیں کیوں نہ میسر ہوں لیکن گھٹن کا احساس پھر بھی ہوتا رہتا ہے۔“

”یو آر رائٹ.....“ میڈم نے تائید کی۔ ”تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اگر وقت ہو تو تم بھی ساتھ چلو۔“

”ایز یوش.....“ آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتی۔“

”فائن.....“ میڈم نے بڑی خوبصورت سے کچھ وقت حاصل کرنے کی خاطر کہا۔ ”تم جب

تک تھریسا کے ساتھ چل کر گاڑی میں بیٹھو، میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔“

میڈم تیزی سے پلٹ کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ شبنم کی دی ہوئی پرچی کھول کر پڑھی تو اس کا پورا وجود تھما اٹھا۔ لکھا تھا..... ”جو ڈراما افضل خان کی ہدایت کاری میں ٹیل ہو گیا۔ وہ اب میرے ذمے کیا گیا ہے۔ میں آپ کو ہوشیار رہنے کا مشورہ دوں گی۔“ ایک لائن کا وہ پیغام میڈم کیلئے کسی چیلنج سے کم نہیں تھا۔ وہ غصے کی شدت سے لرزنے لگی پھر اس نے خود پر تیزی سے قابو پانے کی کوشش کی۔ پرچی کو ریزہ ریزہ کر کے کوڑ میں بہا دیا۔ بالوں کو ایک آخری ٹچ دیتے ہوئے ہنسی مسکراتی باہر آ گئی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر شبنم کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے تھریسا سے پوچھا۔ ”کیا گفتگو ہو رہی تھی.....؟“ شبنم اس کے اشارے پر پچھلی نشست پر آگئی تھی۔

”میں شبنم کو بتا رہی تھی کہ آپ کھڑے کھڑے پرسہ دینے کی خاطر فحش حامد کے گھر پر بھی ہو آئی ہیں۔“ تھریسا نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا کیا آپ نے.....“ شبنم نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر محتاط انداز میں بولی۔ ”لیکن ایک بار انسان کو کسی بات کا تجربہ ہو جائے تو پھر اسے زیادہ محتاط.....“

”تمہارے بگ باس سے ملنے سے پیشتر میرا بھی یہی خیال تھا کہ لیکن اب اس میں وہ شدت نہیں رہی۔“

”کیا مطلب.....؟“

”میں نے شاید پہلے نہیں بتایا۔ تمہارے باس سے ہمارے بہت پرانے لیکن فیملی جیسے تعلقات بھی رہ چکے ہیں۔“

”پھر..... آپ باس سے اتنے عرصے دور کیوں رہیں؟ میرا مطلب ہے کہ میں نے کبھی آپ کو باس سے ملنے جلنے نہیں دیکھا۔“

”وقت کے گھاؤ، بڑے گہرے ہوتے ہیں مائی ڈیئر..... تم ابھی کسں ہو، ان باتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی خاطر انسان کو کبھی کبھی بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔ حالات کے شکنجوں میں خود کو گھونٹ لینا اس کی مجبوری ہوتی ہے۔“ میڈم نے لہجہ سوغوار بنا کر کچھ توقف سے بات جاری رکھی۔

”ایک مشرقی عورت کو بیوی کا غم، دنیا کے رسم و رواج، خاندان والوں کی جاء، بے جا تنقید سے بچنے کی خاطر اور..... اس لازوال محبت کو قائم رکھنے کیلئے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ بندشیں عائد کرنی لازم ہوتی ہیں۔ میں آج بھی روٹھ کر چلے جانے والے سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی کل کرتی تھی۔ ان کی موت کے بعد میں مکمل آزاد تھی۔ کوئی میرے اوپر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا پھر بھی میں نے ان کے پیار کو دل کی گہرائیوں میں سمو کر اپنی سوشل لائف ایک دم ترک دی۔“ وہ سرد آہ بھر کر بولی۔

”لوگ یہی کہتے ہیں کہ خالد ریاض کو مرے ایک زمانہ بیت گیا لیکن وہ..... وہ آج بھی میرے دل میں روز اول کی طرح ہر سانس کے ساتھ دھڑکتے ہیں، یہی دھڑکنیں تو دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہیں۔ باقی سب فریب ہے۔“

”خود کو سنبھالیں میڈم.....“ تھریا نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ”آج ایک عرصے بعد آپ نے ریجنو جانے کا پروگرام بنایا ہے، خود کو وقت اور حالات کے گراف میں سمونے کی کوشش کریں۔ یہ بھی آپ کی صحت کیلئے ضروری ہے۔“

”تم سناؤ شبنم.....“ میڈم نے کچھ توقف کے بعد شبنم سے سوال کیا۔ ”تمہاری حامد ایسوی ایس میں کیسی گزر رہی ہے؟“

”فرسٹ کلاس.....“

”اگر کبھی میری سفارش کی ضرورت پڑے تو گریز نہ کرنا۔“

”شکریہ میڈم.....“ اس نے ابھی حال ہی میں میری ترقی کی ہے۔“ اس نے دل پر جبر کر کے خطرناک مگر چمکے تعریف کی۔

”مجھے اندازہ ہے کہ وہ اپنے اسٹاف کا خیال رکھنے کا عادی ہے لیکن.....“ میڈم کچھ کہتے کہتے دیدہ دانستہ خاموش ہو گئی۔

”لیکن کیا.....؟“ شبنم نے بے چینی سے دریافت کیا، اسے ڈر تھا کہ کہیں میڈم کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو بگ باس کی پیشانی پر ایک ناگوار شکن کا اضافہ کر دے۔

”ترقی کے ساتھ ہی اگر تم فلیٹ کے بجائے کسی چھوٹے موٹے ذاتی مکان میں منتقل ہو جاؤ تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“ میڈم نے بڑے غلوں سے کہا۔ ”اگر تم برانہ مانو تو میں اس ضمن میں..... ایک بزرگ اور دوست کی حیثیت سے بھی تمہاری مشکل ذاتی حیثیت میں.....“

”ابھی نہیں میڈم.....“ شبنم نے اسے ممنونیت بھری نظروں سے دیکھا۔

”سمجھ گئی۔“ تھریا نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اگر تنہا کسی مکان میں نہیں رہنا چاہتیں تو جلدی سے ایک سے دو ہونے کیلئے کسی کا انتخاب کر لو۔ اس کے اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔“

”اگر آپ اتنی فیاضی کا اظہار کر رہی ہیں تو مجھے بیک وقت ایک کے بجائے دو کا انتخاب کرنا پڑے گا۔“ شبنم نے شوخی سے جواب دیا۔

”نان سینس.....“ میڈم نے برا منہ بنا کر کہا۔ ”یہ تمہارے ذہن میں دو کا خیال کس طرح آ گیا؟“

”میں سمجھ گئی.....“ تھریا نے برجستہ کہا۔ ”آج کل ہر چیز میڈان چائنا ہوتی ہے۔ دو ہوں تو ایک خراب ہو جانے کی صورت میں دوسرا.....“

تھریا جملہ مکمل نہ کر سکی۔ اس کی بات پر میڈم کے علاوہ خود تھریا اور شبنم بھی اپنا بے ساختہ تہقہ نہ روک سکیں، پانچ منٹ بعد ہی تھریا نے اپنی کار کلب کی وی آئی پی پارکنگ میں ممبر شپ کارڈ دکھانے کے بعد روکی تھی۔

رہنمائی سے گزر کر وہ تینوں مین ہال میں داخل ہوئیں تو وہاں بیٹھے ہوئے اکثر پرانے ممبران کی نظریں میڈم کی جانب گھوم گئیں، وہ اب بھی ٹھوس جسم اور پرکشش نشیب و فراز کی مالک تھی۔

استقبالہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ماریا بھی جو ڈیوٹی کے اوقات میں ہمیشہ میک اپ سے لیس اور بھڑکیلے مغربی مختصر لباس میں رہنے کی عادی تھی، ہنستی مل کھاتی میڈم کے قریب آ گئی۔

”آج بہت عرصے بعد آپ کے دیدار ہوئے۔ کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“

”آج بھی ذاتی مصروفیات سے بہ مشکل وقت نکال سکی ہوں۔“ میڈم نے خوشگوار سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔

تھریا نے ہال میں بیٹھے ہوئے ملکی اور غیر ملکی ممبران کا سرسری جائزہ لیا تو وہ مطمئن ہو گئی۔ میڈم کے تحفظ کی خاطر اس نے اس کے علم میں لائے بغیر جو حفاظتی انتظامات کیے تھے وہ اسے حسبِ مشا نظر آ گئے۔ راستے میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی اس نے کئی بار کن انگیوں سے بیک ویو مرر میں اس سیاہ رنگ کی وین کو دیکھا تھا جو بڑی احتیاط سے کبھی لمحہ دو لمحہ کیلئے نظروں سے اوجھل ہوتی پھر سامنے آ جاتی۔

میڈم نے سات نمبر کی میز پر بیٹھنے کو ترجیح دی جس پر ”مخصوص“ درج تھا، اس کا بندوبست بھی تھریا نے کیا تھا۔ ریزرویشن کے وقت بھی اس نے میڈم کا نام نہیں لیا تھا۔ ماریا انہیں ان کی نشستوں پر چھوڑ کر اپنی سیٹ پر چلی گئی۔ ہال میں موسیقی کی مدھم دھن اور لباس سے پھوٹنے والی مختلف پسندیدہ سینٹ کی مہک اور مدھم خواب ناک روشنی کا اہتمام بھی بے حد رومانٹک تھا۔ نشستوں کے درمیان ”کینی لباس“ میں لمبوس کسن اور بے باک لڑکیاں اعلیٰ قسم کی مختلف ڈرنکس اور اس کے لوازمات لیے گردش کر رہی تھیں۔ حسبِ معمول سب ہی اپنے اپنے رنگ میں نظر آ رہے تھے۔ میڈم نے اپنے لیے کولڈ کافی کا آرڈر دیا جبکہ تھریا اور شبنم نے سافٹ ڈرنکس کو ترجیح دی تھی، چند منٹ بعد ہال کی موسیقی رک گئی۔ ایک جانب ٹیون ٹائپ مختصر اسٹیج کے برقی تقے جھلکانے لگے پھر ”رمبا سبنا“ کی میوزک شروع ہوئی تو تین چار جوڑے اسٹیج پر جا کر اس کی دھن پر رقص کرنے لگے۔ سب ہی کی نظریں اسٹیج کی طرف اٹھ گئیں۔ شبنم بھی دوسروں کی طرح ماحول کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب کلب کا ایک پرانا ممبر جس سے اس کی علیک سلیک تھی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔

”ہیلو مس شبنم.....“ اس نے میڈم اور تھریا سے مہذب انداز میں ایکسیوڈ کرنے کے بعد شبنم کو مخاطب کیا۔ ”کیا آپ میرے ساتھ رقص کرنا پسند کریں گی؟“

”نو..... سوری۔“ اس نے مسکرا کر مایوس کن جواب دیا تو رقص کی فرمائش کرنے والا نو نمبر کی میز کی جانب چلا گیا جہاں دو تین کال گرلز موجود تھیں۔ ان میں سے ایک نے رقص پر بخوشی آمادگی کا اظہار کر دیا۔

”تم اس شخص کو جانتی ہو؟“ میڈم کے بجائے تھریا نے شبنم سے مدھم لہجے میں سوال کیا۔

”یہی کلب میں ایک دو بار..... ہائے ہیلو ضرور ہوئی ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ میں اس کی آفر قبول کر لیتی۔“

”ہے کون.....؟“

”میں اس سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔“ شبنم نے کاندھے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا لیکن تھریسا اس کے جواب پر مطمئن نہیں تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اسٹیج پر رقص کرتے ہوئے اس شخص کی نظریں کئی بار شبنم کی جانب اٹھ چکی تھیں۔ میڈم کو لڑکانی کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے رہی تھی۔ ڈانس کا میوزک ختم ہوا تو رقص کرنے والے افراد کی جسمانی جنبش بھی ختم ہو گئی۔ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔



سراج نے ایس بی اورنگ زیب کے آفس میں داخل ہو کر باقاعدہ سلیوٹ کیا تو اورنگ زیب نے اسے حیرت سے دیکھا پھر بے تکلفی سے مسکرا کر مخاطب کیا۔ ”عظیم احمد صاحب کے درمیان میں آ جانے کے بعد اب ہمارے درمیان اس قسم کے رسمی تکلفات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت اچانک کیسے آنا ہوا، سب خیریت تو ہے؟“

”عظیم صاحب کے حوالے کے بعد ہی اس وقت میں ایک اور ضروری دستاویز کی نقل آپ کے حوالے کرنے آیا ہوں۔“ سراج نے اشارہ پا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی محبت میرے لیے اب آفیسر سے زیادہ بڑے بھائی سے کم نہیں ہے۔“

”اس نوازش کا شکریہ.....“ اورنگ زیب نے اپنائیت کا اظہار کیا۔ ”کس قسم کی دستاویز ہے؟“ جواب میں سراج نے مرحومہ صبا بیگم کے آخری خط کی ایک کاپی اس کے سامنے رکھ دی۔ اورنگ زیب نے ڈیوٹی کانشیل کو بلا کر چائے کا آرڈر دیا پھر اس کے بعد وہ خط کے مطالعے میں محو ہو گیا۔ ہر سطر کے اختتام کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا، مکمل تحریر پڑھنے کے بعد وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

”یہ تو ایک مظلوم عورت کے ساتھ درندگی کی انتہا ہے۔ ایک شوہر اپنی بیوی کی تذلیل بازاری عورتوں کی موجودگی میں اس حد تک بھی کر سکتا ہے، ایسا تو طوائفوں کے دلدل بھی نہیں کرتے، جنگلی قبائلی کے ان پڑھ وحشی درندہ صفت انسانوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ نام کے ساتھ شیخ لگا ہو تو انسان کم از کم اس کی حرمت کا خیال رکھتا ہے، لیکن بگ باسٹرڈ تو اس سے بھی گیا گزرا ہے۔“

”ہر فرعون کیلئے اللہ ایک موٹی بھی ضرور بھیج دیتا ہے۔“ سراج نے کسمسا کر کہا۔ ”اس شہر میں آپ کی تعیناتی بھی شاید اسی کی مصلحت ہو، میں اس خط کو پڑھ کر خود بھی لرز اٹھا تھا۔“

”اس تحریر میں جن اشتہاری مجرموں کا ذکر ہے یا جن بدنام فاحشہ عورتوں کا حوالہ دیا گیا ہے، آپ ان میں سے کسی کو جانتے ہیں.....؟“ میرا مقصد ہے کہ ہم انہیں قانون کے تحفظ کا یقین دلا کر باقاعدہ گواہ بنا سکیں اور اگر کچھ اشتہاری مجرم بھی ہاتھ لگ جائیں تو ہم یہ آسانی اس فرعون سے بدر شخص کو چھانی کے پھندے تک لے جا سکتے ہیں۔ مرحومہ نے بھی اسی آخری خواہش کا اظہار کیا ہے۔“

”میں آپ کے ساتھ۔ آخری حد تک مکمل تعاون کرنے کو گلے گلے تیار ہوں لیکن اگر آپ کسی وقت عظیم احمد سے ملاقات کر لیں تو شاید وہ بہتر طور پر اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔“

”یور آر رائٹ۔“ اورنگ زیب نے خط تہ کر کے دراز میں رکھی ایک پرسل فائل میں محفوظ کیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ہمیں اس کام کیلئے کچھ اور ایماندار پولیس ورکرز کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں اپنے خاص ذرائع سے اس کا بندوبست بھی کر لوں گا۔ ممکن ہوا تو ایک دو روز میں وقت نکال کر عظیم احمد سے ان کے گھر جا کر تفصیلی ملاقات بھی کر لوں گا۔“

کانشیل چائے کی ٹرے لیے داخل ہوا تو ان کے درمیان موضوع بدل گیا۔ حسب معمول کانشیل نے ایس بی آفس کے اس کمرے میں اسکرین کے پیچھے جا کر چائے تیار کی پھر دونوں افسران کے سامنے سرو کر کے اٹلے قدموں واپس چلا گیا۔

”سر.....!“ سراج نے کانشیل کے جانے کے بعد دبی زبان میں کہا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ آپ کو اپنی حفاظت کیلئے بھی فی الحال ایسے سادہ لباس والوں کی ایک ٹیم تشکیل دینی ضروری ہے جو ہر وقت آپ کی طرف سے چوکس رہیں۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ اورنگ زیب نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”آپ یہ مشورہ کس بنیاد پر دے رہے ہیں؟“

”میں کسی وجہ سے انفارمر کا نام نہیں بتا سکتا لیکن یہ بات مجھے ایسے ذریعے سے معلوم ہوئی ہے جو ہمارے دوست ہی ہیں۔“ سراج نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”بگ باسٹرڈ آپ کو..... خدا خواستہ..... راستے سے ہٹانے کیلئے ایک ایسے شخص کو تعینات کر سکتا ہے، جس کے پاس اس پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا آپشن نہیں ہوگا۔“

ایس بی ایک لمحے تک سرج کو نئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”آپ کا اشارہ غالباً افضل خان کی طرف ہے جو آج کل شیخ حامد کے دفتر میں کام کرنے والی شبنم نامی لڑکی کے فلیٹ میں ٹھہرا ہوا ہے؟“

”آپ کو اس کا اندازہ کس طرح ہوا سر.....؟“ سراج چونکا۔

”میں اس شہر میں نیا ضرور ہوں لیکن مجھے بگ باسٹرڈ کا کچھ بیک گراؤنڈ پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شبنم اس فلیٹ میں تنہا رہتی ہے اور ڈبل بی کی اجازت کے بغیر وہ کسی پٹے ہوئے مہرے کو پناہ دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔“

”یور آر رائٹ سر.....“ سراج نے تائید کی۔ ”لیکن آپ کو متوقع خطرے کی اطلاع مجھے کسی اور مستند ذریعے سے ملی ہے۔“

”ڈونٹ وری..... میں آپ سے اس کا نام دریافت نہیں کروں گا لیکن آپ نے بڑا بھائی بنایا ہے تو آپ کی بات کا یقین کرنا میرے اوپر لازم ہے، بہر حال آپ اس ضمن میں پریشان نہ ہوں۔ میں نے ڈیوٹی رپورٹ کرنے سے پیشتر ہی اپنی حفاظت کا کچھ ایسا انتظام کر لیا تھا کہ دشمن کو کامیابی نہ

ہو سکے۔ اب اگر اوپر والے ہی کو منظور نہ ہو تو پھر بندہ کیا کر سکتا ہے۔“

”ایک درخواست اور کروں گا، سر۔“

”کم آن سراج..... دو بھائیوں کے درمیان کم از کم تنہائی میں تم آئندہ اس قسم کی..... سر اور بیرونی والی فارمیٹیو سے پرہیز ہی کرنا.....“ اورنگ زیب نے اس بار سراج کو ”تم“ کے بے تکلفانہ انداز میں مخاطب کیا۔ ”اب بولو، کیا کہنا چاہتے تھے؟“

”میں چاہتا ہوں کہ شیخ حامد اب بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہے کہ میں اسی کا خاص نہیں تو کام کا آدمی بہر حال ہوں۔“

”گلد..... تم فکر مت کرو، کبھی آئندہ ایسی نوبت آئے تو تم میری موجودگی میں بھی اسے سپورٹ کر سکتے ہو۔“

”یہ صرف نوراشتی ہوگی سر.....!“

”پھر وہی سر.....؟“ اورنگ زیب نے محبت سے ٹوکا۔

”سوری.....“ سراج نے ہنس کر کہا پھر اٹھ کر اپنے آفس کیلئے روانہ ہو گیا۔ احتیاطاً اس نے راستے میں کئی بار بیک ویو مرر پر نظر ڈالی۔ بہ ظاہر اس کا اندازہ یہی تھا کہ اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے جو پچھلے دنوں بڑی شد و مد سے جاری تھا۔

❖❖❖

شہر کے سب سے زیادہ مہنگے اور پوش علاقے میں لائٹ گرے کلر کی دو منزلہ کوٹھی اس وقت بہ ظاہر رات کے اندھیروں میں کسی بیوہ کی طرح ادا اس نظر آ رہی تھی لیکن کوٹھی کے باہر موجود گارڈز بہ دستور پوری طرح جاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ کوٹھی کے اطراف سنگا پوری ناریل کے درخت موجود تھے۔ قریب و جوار کی کوٹھیوں کے برعکس جہاں صرف ایک یا دو دم پاور کے بلب موجود تھے۔ اس دو منزلہ کوٹھی کے چاروں کونوں پر انرجی سیورز کی روشنی رات کی تاریکی سے ہم آغوش ہو کر بڑا طلسماتی منظر پیش کر رہی تھی۔ اس کوٹھی کی چار دیواری بھی دوسری کوٹھیوں کے مقابلے میں قدرے اونچی تعمیر کرائی گئی تھی۔

کوٹھی کے اندرونی حصے میں ڈیزھفٹ اونچے چوترے پر ڈھاکا گھاس کا خوبصورت فیلانی لان ہر دو جانب موجود تھا، گیٹ سے پورے ٹیک جانے کا راستہ سرخ ٹائلز کی وجہ سے ریڈ کارپٹ کا منظر پیش کرتا تھا۔ لان میں چار دیواری کے ساتھ قیمتی پودوں کو بڑے سلیقے اور مہارت سے لگا گیا تھا۔ اس میں زیادہ پودے بیرون ملک سے درآمد کیے گئے تھے جن کے پھولوں کی مہک بھی اپنی مثال آپ تھی۔ کوٹھی کے پچھلے حصے میں ایک طرف فیلانی لان تھا اور دوسری طرف سروسز کوارٹرز تھے جن کو ایک حد بندی کی دیوار کھڑی کر کے فیلانی لان سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ غرضیکہ وہ عمارت ہر اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔

کوٹھی کی دونوں منزلوں پر سامنے کی جانب نصف دائرے کی شکل میں کشادہ راہداری عمارت

کے حسن میں اضافہ کرتی نظر آتی تھی۔ ہر منزل پر تین بڑے سائز کے کمرے، کشادہ لاؤنج اور ڈرائنگ روم کم ڈرائنگ روم موجود تھے۔ ڈرائنگ اور ڈرائنگ کو بہ وقت ضرورت درمیان میں موجود ویلیوٹ کے پردوں کے استعمال سے علیحدہ بھی کیا جاسکتا تھا لیکن اس کی نوبت شاذ و نادر ہی پیش آتی تھی۔ کچن، ہاتھ، پاؤڈر روم اور ڈرائنگ روم بھی غیر ملکی اسٹائل پر تعمیر کیے گئے تھے، عمارت کے اندر رہائشی حصوں کو ڈیکوریٹ کرنے کیلئے ایک غیر ملکی ڈیکوریٹر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

اس پر شکوہ کوٹھی کے باہر، براس کی پلٹ پر رستم علی آغا خانی کا نام اور کوٹھی کا نمبر جلی حروف میں دور سے نظر آتا تھا۔ رستم علی کوٹھی کی پہلی منزل پر اپنی بیوی شائلہ بیگم کے ساتھ رہتے تھے جبکہ دوسری منزل پر ان کا اکلوتا لڑکا دارا رستم علی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا جو جن نژاد تھی۔ شادی کے بعد اس نے مشرقی انداز کے لباس کا استعمال شروع کیا تو مغرب اور مشرق کے امتزاج نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے۔ اس کا نام روشنا تھا جو مذہب تبدیل کرنے کے بعد دارا نے تجویز کیا تھا۔ دونوں منزلوں پر علیحدہ علیحدہ لائبریری بھی موجود تھی۔ دوسری منزل پر روشنا نے اپنی پرانی ہالی کو برقرار رکھنے کی خاطر ایک دیدہ زیب فٹش ایکوریم بھی بنا رکھا تھا۔ شام کی چائے وہ اور دارا اسی ایکوریم کے سامنے بیٹھ کر پینے کے عادی تھے۔ دارا بیرون ملک سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد باپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ کاغذات میں اس کی حیثیت مینجنگ پارٹنر ظاہر کی گئی تھی۔

اس وقت رات کے تقریباً دو کا عمل تھا جب مذکورہ کوٹھی کے عقبی حصے کے سمت دو بلاک چھوڑ کر ایک نئے ماڈل کی کروا دو چار جھلکے لینے کے بعد رستم علی نے۔ بہ ظاہر یہی نظر آتا تھا کہ اس میں کوئی فنی خرابی پیش آگئی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شبنم موجود تھی جو ضروری میک اپ کے بعد آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود اپنے آپ کو پچھاننے سے انکار کر چکی تھی، برابر والی سیٹ سے اترنے والا جوان خلاف معمول اسٹیل براؤن کلر کے جامنگ سوٹ میں نظر آ رہا تھا۔ وہ افضل خان تھا جسے کوئی بھی پلاسٹک میک اپ کے بعد اس کی اصلی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑی سے اتر کر اس نے ہونٹ کھول کر تین چار منٹ ادھر ادھر کل پرزوں کو ٹٹولا پھر ہونٹ بند کر کے شبنم کے قریب آ کر دبی زبان میں بولا۔

”تم نے اس موقع پر کثیر رقم خرچ کر کے جو اہتمام کیا ہے، میں اسے کبھی فراموش نہیں کروں گا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ..... یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔“ آخری جملہ اس نے قدرے جذباتی انداز میں ادا کیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”اگر میں کام کرنے میں ناکام ہو گیا تو پولیس کے ہتھے چڑھنے کے بجائے موت ہی کو ترجیح دوں گا، تم بگ باس کو میرا آخری سلام کہنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دینا کہ میڈم کے سلسلے میں میری پلاننگ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ پولیس کو اس کی اطلاع کیسے ہوئی، میں نہیں جانتا۔“

”او کے۔“ شبنم نے آگے پیچھے دیکھ کر تیزی سے جواب دیا۔ ”آئی وٹ یو بیسٹ آف لک..... جلدی کرو، احتیاط سے کام لینا۔ کامیابی کی صورت میں تم بگ باس کی ہمدردی کے مستحق بھی

ہو سکتے ہو۔“

افضل خان نے الوداعی نظروں سے شبنم کو دیکھا پھر جامنگ کرنے کے انداز میں بنگلوں کے درمیانی راستے پر ہولیا۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد کولا دوبارہ حرکت میں آ کر برق رفتاری سے فرائے بھرنے لگی۔ دس منٹ بعد افضل خان جامنگ کرتا ہوا مطلوبہ کوشی کے عقبی حصے کی طرف پہنچ گیا۔ اس نے کوشی کے ساتھ بنی ہوئی فٹ پاتھ کا آخری سرے تک چکر لگانے کے بعد جیسے ہی واپسی کا ارادہ کیا ایک مسلح گارڈ کہیں سے نکل کر اچانک اس کی پشت پر پہنچ کر رک گیا۔ سرسراتے لہجے میں بولا۔

”رک جاؤ ورنہ میں گولیاں چلانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“

افضل خان جامنگ کر کے انداز میں ہی گھوما اور گارڈ کو تھارت سے گھورنے لگا، اس وقت بھی وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے جامنگ میں مشغول تھا۔

”کون ہو تم اور اس وقت.....“

”شٹ اپ.....“ گارڈ کا جملہ درمیان سے اچک کر افضل خان نے دنگ لہجے میں کہا۔ ”رستم انکل نے تمہیں جس کام پر مامور کیا ہے صرف اسی سے تعلق رکھو ورنہ اگر دارا کو بھی معلوم ہوا کہ تم نے کس کو دارنگ دینے کی حماقت کی تھی تو کوئی انعام پانے کے بجائے عتاب کا بھی شکار ہو سکتے ہو۔“

”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ گارڈ اس کا دنگ لہجہ سن کر مرعوب نظر آنے لگا۔

”میں تمہیں جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا لیکن تم نے چونکہ فرض شناسی کا ثبوت پیش کیا ہے اس لیے بتا دوں کہ میں دو بلاک پیچھے رہنے والے ڈاکٹر جہاں زیب کا بیٹا ہوں، ایک ہفتہ پہلے ہی لندن سے آیا ہوں اس لیے شاید تم واقف نہ ہو لیکن اتنا ضرور جاننے ہو گے کہ ڈاکٹر جہاں زیب..... رستم انکل کے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ تم اپنا اطمینان کرنے کی خاطر ان کے بیٹے دارا کو جگا کر یہاں بلا لیتو تو تمہاری مزید تسلی بھی ہو جائے گی۔“

”آپ اتنی رات کو بھی.....“

”ایڈیٹ.....“ افضل خان نے بہ دستور اپنی جامنگ کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”غیر ممالک میں صرف مرد ہی نہیں، بوڑھی عورتوں اور جوان لڑکیوں کو بھی جس وقت فرصت ملتی ہے وہ اپنی صحت کا خیال رکھنے کی خاطر سڑکوں کی فٹ پاتھ پر جامنگ کرتے نظر آتے ہیں لیکن تم ان باتوں کو.....“

”سوری سر.....“ گارڈ پوری طرح افضل خان کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ گر رکنے والا کوئی مٹھوک فرد ہوتا تو اس طرح اچھل کود کرنے کے بجائے اس کے سامنے ہاتھ اٹھائے رہا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک ڈاکٹر کو بھی سیٹھ رستم علی کی کوشی پر آتے دیکھا تھا۔

”بابائی داوے.....“ افضل خان نے اپنی جسمانی ورزش جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”پہلے تو صرف انکل کے مین گیٹ پر گارڈز ہوا کرتے تھے۔ اب انہیں کسی بات کا خوف ہے کہ.....“

”میں اپنی ڈیوٹی کا پابند ہوں جناب۔“ گارڈ نے سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”اصل بات کیا ہے یہ سیٹھ یا پھر ہماری کمپنی کو معلوم ہوگی۔“

”گڈ..... مجھے خوشی ہے کہ اب پاکستان میں بھی تم لوگ فرض شناسی سے کام کر رہے ہو جس کے لیے تم انعام کے بھی مستحق ہو۔“ افضل خان نے اوپری جیب میں ہاتھ ڈال کر سوسو کے نوٹ نکالے پھر گارڈ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میری طرف سے یہ تمہارا انعام ہے۔“

”شکر یہ جناب.....“ گارڈ ہاتھ میں دبی ریپٹر کو کاندھے سے لٹکاتا ہوا انعام لینے کی خاطر افضل خان کے قریب آ گیا۔ یہی اس کی پہلی اور آخری غلطی تھی جو اسے بھیگی پڑی۔

افضل خان نے، جو جرائم کی دنیا کی جانی مانی شخصیت تھا، ایک پل میں گارڈ کا ہاتھ اس طرح اچانک تمام کر موڑا کہ وہ کراہ کر رہ گیا، پھر کلورہ قلم کے رومال نے باقی کام کر دکھایا۔ قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا، افضل خان اسے بغل میں ہاتھ ڈال کر اندھیرے میں لے گیا پھر اسے بیہوش کرنے، اپنا اور اس کا لباس تبدیل کرنے اور اسے مزید تاریکی میں اس طرح نکال کر بٹھانے میں یہ مشکل دس منٹ لگے تھے کہ کوئی اسے دیکھتا تو فوری طور پر یہی گمان کرتا کہ جامنگ کرنے والا تھک کر سکون کا سانس لینے کی خاطر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔

گارڈ کی وردی تبدیل کرنے کے بعد چہرے کا پلاسٹک میک اپ چھپانے کی خاطر اس نے بیری کیپ کو پیشانی پر زیادہ جھکا لیا۔ اتفاق ہی تھا جو اس کی اور گارڈ کی جسامت ملتی جلتی تھی ورنہ لباس میں زیادہ فرق ہونے کی صورت میں اسے پہچانا بھی جاسکتا تھا۔ لباس تبدیل کرتے وقت افضل خان نے وہ ضروری چیزیں بھی جو جامنگ کرتے وقت اس نے لباس کے نیچے چھپا رکھی تھیں نکال کر وردی کے اندر رکھ لیں۔ شاید قدرت بھی اس کی مدد کر رہی تھی جو وہ ملازموں کے عقبی راستے والے آہنی پھاٹک کو آزمایا رہا تھا کہ اندر سے کسی عورت کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ کسی مرد سے مخاطب تھی۔

”تو جان پر کھیل کر آتو گیا تھا ہیر و بن کر..... لیکن دوبارہ جب تک وردیوں کی دہی ختم نہیں ہو جاتی ادھر کا رخ بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ بلا فوجول مارا جائے گا۔“

”کیوں.....؟“ مرد نے بھکی آواز میں پوچھا۔ ”کیا تو دوبارہ میری مدد نہیں کرے گی؟“

”میرے باپ کی توبہ.....“ جواب ملا۔ ”یہ تو میرا وقت طے تھا جو میں دروازے کے قریب چھپی کھڑی تھی ورنہ کام کرنے والوں کو سمجھا دیا گیا ہے کہ دس بجے کے بعد اپنی اپنی ڈھلیوں سے ادھر ادھر نہ ہوں..... بس نکل جلدی، باہر دیکھ سنبھل کر جانا۔ کوئی آواز دے تو بھانسنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ ٹھانٹیں کی آواز سے تیرا نکٹ بھی کٹ جائے گا۔“

”اگر روکنے والا پوچھے کہ میں اندر کیا کرنے آیا تھا تو.....؟“

”کہہ دینا کہ کھانے پکانے والے کا سگے والا ہے۔ دو روز پہلے آیا تھا، طبیعت خراب ہو گئی تھی اسی نے روک لیا تھا۔ نام پوچھے تو بابا رمضان بتا دینا..... اب پھوٹ جا جلدی سے.....“

اس کے ساتھ ہی اندر سے بولٹ کھولا گیا تھا، ذرا سی جبری ہوتے ہی افضل خان ان دونوں کو

”اس..... دروئے نے بھی اسی حرامی کی وجہ سے اپنی رشوت..... جو جبر دیتی ہے وصول کی تھی۔“

افضل خان کی آنکھیں کسی خیال سے چپکنے لگیں۔ وہ ملازمہ کو ضروری دھمکی دے کر دوبارہ دروازے پر لے آیا۔ پستول کی نال اس کی چھاتیوں کے پچوں بچ رکھ کر بولا۔ ”ادھر ہی خاموش کھڑی ہو..... وہ پھیرا لگاتا ہوا ادھر آئے تو اسے آواز دے کر بلا لیتا۔“

”ٹھٹھ..... ٹھٹھ..... ٹھٹھ.....“ ٹھیک ہے۔“ جواب دیتے وقت وہ موت کے تصور سے ہی زرد پڑ گئی تھی۔ افضل خان کو بارہ تیری منٹ تک صبر آزما انتظار کرنا پڑا پھر دوسرا گارڈ بھی ملازمہ کے اشارے پر کمرے میں قدم رکھتے ہی ایک کاری ضرب لگنے کے بعد چکرا کر ڈھیر ہو گیا۔ افضل خان نے اسے بھی کلوروفام سنبھالیا اور گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔ نوجوان ملازمہ دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھے شاید اپنی آواز بند رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”سنو.....“ اس نے ملازمہ پر دوبارہ پستول تان کر سفاک آواز میں کہا۔ ”تمہیں مجھے سیٹھ رستم علی کے کمرے تک پہنچانا ہوگا۔“

”نن..... نن..... وو..... وہ مجھے..... م..... مار ڈالیں گے۔“

”انکار کی صورت میں، تمہارا انجام اس سے زیادہ اذیت ناک ہوگا۔“

”نن..... نہیں..... م..... ابھی مرنا نہیں چاہتی۔“ وہ بہ دستور ہکلاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں بڑے مالک کے کمرے تک راستہ دکھا سکتی ہوں لیکن..... درواجا کھلوانا تمہاری جہد داری ہو گا۔“

”منظور ہے۔“ افضل خان نے اقرار کر لیا۔

نوجوان ملازمہ بری طرح تھرتھرا رہی تھی لیکن اس نے ملازموں والے راستے سے افضل خان کی رہنمائی کر دی۔ ایک ہاتھ کے اشارے سے اس نے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرا ہاتھ اس نے اپنے منہ پر جما رکھا تھا۔ نگاہوں سے خوف جمنا تک رہا تھا۔ راہداری میں بند شیڈ کے اندر سے مدہم روشنی جھللا رہی تھی۔

”دروازہ میں کھلوانا ہوں لیکن اگر اندر سے کوئی سوال کیا گیا تو جواب تم دوگی۔ کہہ دینا کہ گارڈ ملنے کو آیا ہے۔“

ملازمہ نے اثبات میں سر کو جنبش دی، اس کی آنکھیں خوف سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ افضل خان نے پستول پر گرفت مضبوط کی، اس کے ساتھ ہی اس نے ریپٹر پر بھی دوسرا ہاتھ جمالیا۔ اندر ہونے والی کسی نائٹ بلب کی ہلکی روشنی کھڑکی کے شیشوں پر نظر آ رہی تھی۔

افضل خان نے دستک دینے سے پیشتر چھت کے علاوہ ادھر ادھر نظر دوڑا کر کسی کلوز سرکٹ کیمرے کے امکانات کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر دروازے پر دستک دی۔ دوسری یا تیسری دستک پر کسی عورت کی آواز ابھری۔

پچھے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا، سائلنسر لگے پستول کا بٹ مار کر اس نے جوان کو کلوروفام سے ہلے بھر میں دو تین گھنٹے کی نیند سلا دیا پھر سہمی ہوئی ملازمہ کو گھورا جس کا جوان سینہ دھمکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ایک گارڈ کو سامنے دیکھ ہی اس کی روح فنا ہونے لگی تھی۔

”تو کون ہے.....؟“ اس نے گارڈ جیسے لہجے میں ملازمہ کو لکارا۔

”مم..... میں..... ادھر کام کرتی ہوں۔“ اور ایک ایک کر بولی۔ ”یہ میرا سگے والا تھا دو تین دن پہلے گاؤں سے.....“

”کو ارڈ میں چل کر بات کر۔“ افضل خان نے نوجوان کو کاندھے پر ڈال کر نو عمر ملازمہ کو دہی زبان میں مخاطب کیا۔ ”مجھے بھی گاؤں کا سگے والا سمجھ کر سیدھی طرح سودا غنا دے ورنہ ابھی بڑے سیٹھ کو.....“

”نن..... نہیں وروی بابو.....“ ملازمہ نے سہم کر ہاتھ جوڑ لیے۔ ”میں تمہاری بات سے انکاری نہیں ہوں۔ پر بعد میں اس حرامی کو بھی سڑک پھلانگ کی اجازت دے دینا۔“

افضل خان نے ملازمہ کا بازو تھام کر چپ رہنے کو کہا پھر اسی کی رہنمائی میں وہ اس کے کو ارڈ تک آ گیا جہاں اس وقت کوئی اور نہیں تھا۔ پوری طرح اپنا اطمینان کر لینے کے بعد اس نے سہمی سہمی ملازمہ کو بالوں سے پکڑ کر سرد آواز میں پوچھا۔

”تو یہاں اکیلے رہتی ہے؟“

”ہاں آں..... آں۔“ وہ کراہ کر بولی۔

”خاموشی سے میری باتوں کا جواب دے ورنہ تجھے اور تیرے اس یار کو جان سے مار دوں گا۔“ افضل خان کا لہجہ اور سرد ہو گیا۔ ”میں وہ نہیں..... جو تو سمجھ رہی ہے۔“

”بھلے کوئی بھی ہو لیکن مجھے جان سے نہ مارنا۔“ ملازمہ بید بختوں کی طرح لرزنے لگی۔ ”جو تم کہو گے میں..... وہ، وہ، وہی کروں گی۔“

”تیرا سیٹھ رستم علی کس منزل پر رہتا ہے؟“

”پپ..... پپ..... پہلی..... من..... منزل پر۔“ ملازمہ بڑی مشکل سے اپنا جملہ ادا کر سکی۔ ”تو مجھے اس کے کمرے تک پہنچا دے تو تیری اور تیرے یار کی زندگی کی ضمانت دیتا ہوں ورنہ.....“ افضل خان نے جملہ ادھر اچھوڑ کر پستول تان لیا۔ ”جلدی فیصلہ کر لے..... میرے پاس وقت کم ہے۔“ اس کے لہجے میں درندگی شامل ہو گئی۔

”مم..... میں..... کک کوش..... کک..... رتی ہوں لیکن..... بب..... ببلو بھی ایک وروی پھیرے لگاتا..... رہتا ہے۔“

”سمجھ گیا۔“ افضل خان کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ”تو شاید اس کے ہاتھ بھی منہ کالا کر چکی ہے ورنہ اس وقت تیرا یہ دوسرا یار بھی یہاں زندہ نہ ہوتا..... سچ بتا دے۔“

”کون ہے.....؟“

افضل خان نے پتول پھر ملازمہ کی چھاتی پر رکھ کر جواب دینے کا اشارہ کیا۔

”میں ہوں بیگم صاحبہ..... گلابو۔“

”گلابو..... اس وقت کی مصیبت پیش آگئی؟“

”میں باہر والے گارڈ صوب کو لائی ہوں۔ وہ بڑے مالک سے کوئی جروری بات کرنا چاہتے

ہیں۔“

دوسری طرف خاموشی رہی۔ افضل خان کا دل دھڑکنے لگا، وہ سر سے کفن باندھ کر آیا تھا، خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتا تھا، ملازمہ کو دروازے کے ساتھ چھوڑ کر خود دیوار سے چپک گیا۔ پانچ منٹ تک سکوت برقرار رہا پھر کسی عورت نے دروازہ کھولا جو ٹائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔ افضل خان لپک کر ملازمہ کو ساتھ لیتا ہوا آنے والی سے ٹکرا گیا۔ سامنے بستر پر کوئی محو خواب تھا۔ نفل اس کے بیگم رستم علی کچھ سمجھ پاتی۔ افضل خان نے دمکی دے کر ملازمہ کو اندر کی طرف فرش پر گرادیا اور ریپٹر کی نال سیدھی کرتا ہوا بدلی ہوئی آواز میں غرایا۔

”خبردار..... آواز نکالنے یا شور مچانے کی کوشش کی تو بھون کر رکھ دوں گا۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

”کک..... کون ہو تم.....؟“ شائلہ رستم علی نے سہی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ”کیا بات کرنی

ہے؟“

”میں تمہارا گارڈ نہیں..... تم دونوں کی موت ہوں۔“ اس نے سوتے ہوئے آدی کو بھی شامل کر لیا۔ ”جگا داسے۔“ وہ حکیمانہ انداز میں بولا۔

شائلہ رستم علی آغا خانی کیلئے وہ کھر درالب ولجہ ہی کسی خطرے سے کم نہیں تھا۔ اس نے شوہر کو جگانے میں دیر نہیں کی۔ رستم علی ہر بڑا کر اٹھا تو موت کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر اس کے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ گلابو بھی حشر حشر کانپنے لگی۔

”کک..... کیا بات ہے؟“ انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کون ہو تم..... کیا چاہتے ہو.....؟“

”میرے پاس وقت کم ہے رستم علی۔“ افضل خان غرا کر بولا۔ ”زندگی چاہتے ہو تو میرے کہنے پر کسی بے جان کھ پتلی کی طرح عمل کرتے رہو۔ کسی حماقت کا ثبوت دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ میرے علاوہ تم دونوں اور شاید تمہارے بیٹے اور اس کی بیوی کو بھی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ میں تمہا نہیں مردوں گا۔“

رستم علی کی آنکھیں سر پر منڈلاتے خطرے کو دیکھ کر اپنے حلقوں میں چکرانے لگیں۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

”تمہیں سانپ کیوں سوکھ گیا؟..... کاروباری زندگی میں تو تم نے بڑے بڑے سودے منائے ہیں۔ اس وقت موت اور زندگی کا بیو پار کرنے سے کیوں چپکرا رہے ہو؟“

”تم..... کیا چاہتے ہو؟“ رستم علی نے ہارے ہوئے جواری کے انداز میں دریافت کیا۔

”تمہاری اور تمہاری بیوی کی سہاگ رات والے انداز میں ایک تازہ تصویر۔“ اس نے زہرے انداز میں ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”دو تین پوز لینے کے بعد میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو

زندہ چھوڑ کر واپس جانے کا وعدہ کرتا ہوں..... کیا خیال ہے؟“

”قت..... تم..... شاید اپنے ہوش میں نہیں ہو۔“ رستم علی نے جھلا کر کہا۔ ”تمہارا مطالبہ پورا کرنے کے بجائے میں موت کو ہی ترجیح دوں گا۔“

”یہ موت بڑی اذیت ناک ہوگی۔ اس کا ایک نمونہ دیکھ لو۔“ افضل خان نے کہا پھر اس نے پلک جھپکتے میں فائر کیا۔ ”ٹنچ“ کی مدھم آواز کے ساتھ ہی ملازمہ گلابو قیمتی قالین پر گر کر کسی مایہ بے آب کی طرح تر پنے لگی، اس کے بائیں شانے سے خون ابل رہا تھا۔

”اب تمہارا کیا جواب ہے؟“ اس نے سفاک نظروں سے رستم علی کو گھورا۔ ”ملازمہ کے بعد کیا

تم اپنی قیمتی بیوی کو بھی اسی اذیت میں دیکھنا پسند کرو گے؟“

”نن..... نن..... نہیں۔“ شائلہ بیگم نے مردہ آواز میں ہاتھ جوڑ لیے۔ ”م..... میں ابھی مرنا

نہیں چاہتی۔ مجھ..... مجھے نہ مارنا، پلےز۔“

”م..... میں تمہیں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔“ رستم علی نے کاروباری انداز میں کہا۔ ”تم

اپنا پہلا مطالبہ واپس لے لو۔“

”سوری..... میں نے جو کہہ دیا وہ کہہ دیا..... ہاں یا نہیں..... کیا کہتے ہو؟“

”تم..... کس کے لیے کام.....“

”فضول باتیں مت کرو.....“ اس نے پتول کا رخ شائلہ بیگم کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”میں تین تک گنوں گا اس کے بعد۔ تم دونوں کی لاشوں کی تصویر بھی میرے لیے کافی ہوگی۔“

”میں تمہیں تین کروڑ اس وقت بھی کیش دے سکتا ہوں۔“

”ون.....“ افضل خان نے جواب میں گنتی شروع کر دی، اس کی نظریں رستم علی پر مرکوز تھیں،

پتول کا رخ شائلہ بیگم کی طرف تھا، گلابو شاید بے ہوش ہو گئی تھی اس لیے ساکت نظر آ رہی تھی۔

”پانچ کروڑ.....“

”تو..... افضل خان کے لہجے میں دردنگی جاگ اٹھی۔

دو کی گنتی مکمل ہوتے ہی شائلہ بیگم کی کیفیت موت کے خوف سے دیوانوں جیسی ہو گئی۔ اس

نے شوہر کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا پھر شاید اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا جو اس نے ایک ہی

جھٹکے میں اپنا ڈریسنگ گاؤن بھاڑ کر اس طرح جسم سے علیحدہ چھینک دیا جیسے وہ اس کے لیے کفن سے

زیادہ کریناک ثابت ہو رہا تھا۔ اس کا اوپری جسم برہنہ ہو گیا تو اس نے شوہر کی طرف دیکھ کر سسکتے

ہوئے کہا۔ ”مجھے موت سے بچا لو..... میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

رستم علی بیوی کو اس حالت میں دیکھ کر بوکھلا گیا، اس کی سودے بازی دم توڑ گئی۔ افضل خان کی

طرف دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

”تم ہماری تصویر کا کیا کرو گے؟“

”فرمت کے اوقات میں دیکھوں گا۔“

”ایک بار میری آفر پر بھی غور کر لو..... میں رقم دینی بھی کر سکتا ہوں۔“

جواب میں افضل خان کی گرفت پستول کے دستے پر چلی تو شانلہ بیگم نے اپنی برہنگی کی باقی کسر بھی پوری کر دی۔ ہڈیانی انداز میں شوہر سے بولی۔

”میں تمہیں دارا کی زندگی کا واسطہ دیتی ہوں۔ ایک مجبور ماں کو اپنی ضد کی بحیثیت مت چڑھاؤ۔“

”جلدی کرو سیٹھ.....“ افضل خان نے سرد لہجے میں وارننگ دی۔ ”تم دونوں کی موت کے بعد بھی میں اپنے مقصد کی تصویریں بنا سکتا ہوں۔“

رستم علی نے بیوی کی طرف دیکھا پھر خود بھی جلدی جلدی اپنا ٹائٹ سوٹ اتارنے لگا۔ شانلہ کی کیفیت دیکھنے کے بعد وہ اپنی عزت کے جنازے میں آخری کیل ٹھونکنے پر مجبور ہو گیا۔ شانلہ بیگم نے شوہر کو سر تاپا برہنہ دیکھا تو دوڑ کر اس سے لپٹ گئی پھر اس نے خود کو بستر پر گرانے کے ساتھ ساتھ شوہر کو بھی گھسیٹ لیا۔ افضل خان نے اٹے ہاتھ سے حساس مودی بنانے والی ڈوائس جیب سے نکال لی۔

شانلہ بیگم نے جنونی انداز میں شوہر کو دونوں بازوؤں میں سمیٹ رکھا تھا، جو کچھ وہ کر رہی تھی اس میں ہوس کو کوئی دخل نہیں تھا، محض دیوانگی اور زندگی بچانے کی خواہش تھی۔ موت سر پر سوار ہو تو کوئی ان لمحوں کو خوشگوار بنانے کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رستم علی بیوی کے ساتھ محض جنونی اداکاری کا رول نبھا رہا تھا جب گارڈ کے لباس میں کھڑے افضل خان کی فاتحانہ آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”اب کھیل تماشا ختم کر دو رستم علی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے زندگی کو موت پر ترجیح دی۔“

”تم..... تم اب ہمیں مارو گے تو نہیں؟“ شانلہ بیگم نے بڑی رحم طلب نظروں سے سوال کیا۔

”نہیں..... تم اب لباس پہن سکتی ہو۔“

ایک منٹ بعد ہی وہ دونوں ڈریسنگ گاؤن پہن کر مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ شانلہ بیگم کا جسم اب بھی پیٹے ہوئے گاؤن سے جھانک رہا تھا۔

”جانے سے پہلے میں تمہیں ایک آخری وارننگ اور دے رہا ہوں۔“ افضل خان نے بہ دستور بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میرے کمرے سے باہر نکلنے کے آدھے گھنٹے بعد تک تم دونوں کسی حماقت کا ثبوت نہیں دو گے۔ باہر میرا ایک گونگا اور بہرا ساتھی پوری طرح محتاط ہے۔ وہ صرف اسلحہ کی زبان میں گفتگو کرنے کا عادی ہے۔“

”م..... میں اب بھی تم سے ایک سودا کرنے کو تیار ہوں۔“ رستم علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے

بڑی سرد آواز میں کہا۔ ”تم تصویریں اور ٹیلیو جھے واپس کر کے منہ مانگی رقم حاصل کر سکتے ہو۔“

”وعدہ نہیں کرتا۔ تمہارے مطالبے پر غور ضرور کروں گا۔“ افضل خان نے سرسراتے ہوئے دوبارہ وارننگ دی۔ ”آدھے گھنٹے تک تم دونوں کوئی حماقت نہیں کرو گے۔“ جملہ مکمل کر کے وہ تیزی سے پلٹا، دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے بڑی احتیاط مگر برقی رفتاری سے واپسی کا سفر طے کیا تھا۔

عمارت کے عقبی حصے کی جانب اب بھی پہلا والا گارڈ بے ہوشی کی کیفیت میں دیوار سے ٹیک لگائے موجود تھا، افضل خان نے ادھر ادھر دیکھا پھر دوبارہ اس کے جسم سے اپنا جاگنگ والا لباس اتار کر پہنا۔ اس کا لباس اسی کے جسم پر ڈال دیا۔ وقت ضائع کیے بغیر وہ دوبارہ بڑے اطمینان سے جاگنگ کرتا ہوا اسی مخصوص پوائنٹ کی طرف جا رہا تھا جہاں اسے شبینم نے ڈراپ کیا تھا۔ اپنا مشن کامیابی سے پورا کرنے میں اسے چالیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے جبکہ شبینم نے اسے واپس کرنے کیلئے ایک گھنٹے کا وقت دیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ افضل خان کے واپس نہ ہونے کی صورت میں وہ پندرہ منٹ کے وقفے سے صرف دو چکر اور لگائے گی پھر واپس اپنے اپارٹمنٹ کی طرف لوٹ جائے گی۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہی نئے ماڈل کی کرولا اس کے قریب پہنچ کر رک گئی، نمبر بھی وہی تھے لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر شبینم کی جگہ کوئی مرد موجود تھا۔ افضل خان ایک لمبے کوالچہ گیا۔ اس کے ذہن میں بگ باس کا خوفناک تصور ابھرا جو کسی واردات میں کوئی سراغ چھوڑنے کا عادی نہیں تھا۔ میڈم روپی کے سلسلے میں بھی اس نے افضل خان کے بے قصور ہونے کے باوجود اسے کسی بیکار پرزے کی طرح کباڑ خانے کی طرف پھینک دیا تھا۔ کہیں اس وقت بھی وہ کام مکمل ہو جانے کے بعد مجھے اپنے راستے سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دور تو نہیں کرنا چاہتا؟ اس تصور ہی سے اس کے جسم میں موت کی سرد لہر دوڑ گئی۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آنے والے نے اسے گھورا۔ ”جلدی کرو..... کم آن۔“

افضل خان نے خاموشی سے تعمیل کی، اس کے سیٹ سنبھالتے ہی گاڑی نے حرکت کی پھر برق رفتاری سے سنان سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

”شبینم کہاں ہے؟“ اس نے تھوڑے تو وقف سے دریافت کیا۔

”تمہارا سوال میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔“ دوسرے شخص نے بڑے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہاری جگہ اگر میں ہو تو شاید میں بھی یہی سوال کرتا۔ ڈونٹ وری..... وہ پروگرام کے عین مطابق نہیں آئی، کسی بدلی ہوئی صورت میں، میں تمہارے لیے شبینم کے مقابلے میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتا ہوں۔“

”ہم اس وقت کہاں جا رہے؟“ افضل خان نے کسمسا کر دوسرا سوال کیا۔

”فی الحال تمہیں دو روز تک شبینم کے فلیٹ سے دور رہنا ہو گا۔“ سنجیدگی سے جواب ملا۔

”حالات اگر سازگار ہوئے تو شبنم تم سے خود مل لے گی۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“
 ”میں نے جو کامیابی حاصل کی ہے۔ کیا اس کے ثبوت تمہارے حوالے کر دوں؟“ افضل خان
 نے کچھ سوچ کر اسے پھر نولنے کی کوشش کی۔

”مجھے ہیر و بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ بے پروائی سے شانے اچکا کر جواب ملا۔ ”اوپر سے
 ملنے والی ہدایت صرف اتنی ہے کہ میں تم کو پک کر کے ایک محفوظ جگہ تک پہنچا دوں۔ تمہارے لیے
 ایک چیز بھی میرے پاس ہے۔“ اس نے جیب سے ایک موبائل نکال کر افضل خان کی طرف
 بڑھاتے ہوئے ہدایت کی۔ ”تم اس پر صرف کال ریسیو کرو گے۔ کسی کو کال کرنے کی غلطی مت کرنا۔
 بگ باس اپنی ہدایت کی خلاف ورزی کرنے والوں سے کس طرح پیش آتا ہے؟ اس کا اندازہ تمہیں
 بھی بخوبی ہوگا؟“

افضل خان نے موبائل لے کر جیب میں ڈال لیا پھر ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ پون
 گھنٹے بعد اسے کسی عمارت کے اندر چھوڑ دیا گیا جہاں موجود دو مسلح گارڈ اسے کور کرتے ہوئے اپنے
 ساتھ عمارت کے اندر لے گئے۔



سفید رنگ کی میٹر و کیب اس وقت پوش علاقے کی سمت جانے والی اس سڑک سے گزر رہی تھی
 جو متوازی سڑک سے تقریباً دس بارہ فٹ کی بلندی پر تھی، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا سرحدی علاقے کا
 باشندہ نظر آنے والا دراصل پستہ قد اور مارشل آرٹ کا ماہر لوچن تھا جس نے میک اپ کے بعد اپنی
 اصلی شخصیت کو بڑی مہارت سے چھپا لیا تھا۔ کیب چلانے والے ڈرائیوروں کی وردی نے اس کی
 ظاہری حالت کو خاصا اجاگر کر دیا تھا، اس کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں لیکن ذہن عقبی نشست پر تھا
 جہاں ہاشم اپنی اصلی صورت میں بیٹھا بڑی توجہ سے ذیلی سڑک کے کنارے بنے ہوئے مختلف وضع
 قطع کے مکانات اور دکانوں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

لوچن کو ٹیکسی ڈرائیور کا رول ادا کرنے کی ہدایت بھی ہاشم ہی نے مخصوص کوڈ ”سیون اسٹار“
 کے حوالے سے دی تھی لیکن کام کی نوعیت نہیں بتاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لوچن کے ذہن میں یہ شبہ
 ایک بار پھر کلبلانے لگا کہ وہی اس مہم کا سربراہ ہے جس نے لوچن کے علاوہ بیرونی باشندے ڈوما کا
 بھی انتخاب کیا تھا۔ سیون اسٹار کا مخصوص کوڈ استعمال کرنے والی بھی غالباً ہاشم ہی کی کوئی ماتحت رہی
 ہوگی۔ یہ سب اس وقت سے لوچن کے ذہن میں جزیں مضبوط کر رہا تھا جب ہاشم نے پہلی بار اس
 سے جہاز میں ملاقات کی تھی اور ڈوما کے بارے میں کچھ خدشات ظاہر کیے تھے جو بعد میں درست
 ثابت ہوئے۔

ہاشم اس وقت گرے کلر کے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔ ہوشگ کو اس نے اپنے ہوٹل کے
 بجائے ایک تجارتی مال کے باہر سے بہ طور مسافر آنیج کیا تھا۔ اس میں بھی یقیناً ہاشم کی کوئی مصلحت
 رہی ہوگی جس کا علم ہوشگ کو مطلق نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے سے وہ صرف ڈرائیور کا رول ادا کر رہا تھا،
 ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی، ہاشم کی اس بے اعتنائی پر وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا،
 جب پچھلی نشست سے ہاشم نے اسے پہلی بار مخاطب کیا۔

”رائٹ ہینڈ پر کشمیری فرنیچر کی دکان پر ایک نظر ڈال لو، واپسی پر ہمیں وہیں رکنا ہے۔“
 ”کیا اب تمہیں کسی پرائیویٹ مکان میں رہنے کی ہدایت ملی ہے جو اس کیلئے فرنیچر درکار
 ہے؟“

”میرے پاس تمہاری مس انڈر اسٹینڈنگ کا کوئی..... علاج نہیں ہے۔“ ہاشم نے بے پروائی
 سے جواب دیا۔ ”ایک بار پھر یہی کہوں گا میری ذاتی پوزیشن بھی تم سے یا ڈوما سے مختلف نہیں ہے۔“

آدی کی طرف اشارہ کیا جو میز پر بیٹھا تھا۔ ہاشم قدم بڑھاتا میز کے قریب چلا گیا۔

”مسٹر قدیر.....؟“

”جی، تشریف رکھیے۔“ چہرے بدن والے شخص نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہاشم نے اپنے شانوں سے مختصر سائیک اتار کر فرش پر رکھتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”مجھے دراصل جے، بی سے ملنا ہے۔“

”کون جے، بی؟“ مخاطب کیا جانے والا چونکا۔ ”آپ شاید غلط جگہ آگئے ہیں، یہاں اس نام

کا.....“

”آپ مسٹر وزیر ہی ہیں نا؟“

”جی ہاں، لیکن.....“

”کسٹمر سروس نمبر ایف..... تھری فور (F-34) جے، بی کیلئے اتنا حوالہ کافی ہوگا۔“ ہاشم نے مسکرا کر کہا۔ اس بار اسے مزید نہیں کریدا گیا۔ فون سیٹ پر ایک نمبر بیچ کرنے کے بعد میز پر بیٹھے ہوئے شخص نے مختصر ہاشم کا دیا ہوا حوالہ دہرایا پھر ہاشم کو لے کر دکان کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ لکڑی کی عارضی پارٹیشن سے گزر کر وہ دوسری طرف گئے۔ یہ حصہ بہ ظاہر ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کا تھا جہاں ایک بھاری جسامت کا شخص دیواروں کی صفائی میں مصروف تھا۔ قدیر نے ہاشم کو اس شخص کے ساتھ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”ان کو بڑے سیٹھ سے ملو دو۔“ اس کے بعد ہاشم کو اندر ہی اندر کئی بھول بھلیوں سے گزارنے کے بعد ایک مختصر کمرے میں روکا گیا۔ ساتھ آنے والا اندر چلا گیا۔ ہاشم بہ دستور تارل نظر آ رہا تھا لیکن وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر صورت حال سازگار نہ ہوئی تو ہوشنگ کے فرشتے بھی اس تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ کچھ دیر بعد اسے ساتھ لانے والا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ ”آپ اندر جاسکتے ہیں۔“ اس نے ہاشم سے کہا پھر قریب رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

ہاشم نے بے پروائی سے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو دس بائی دس کے مختصر کمرے میں اس نے ایک شخص کو سامنے رپوا لونگ چیز پر بیٹھے دیکھا، اس کی میز کے ساتھ دوسری چار کرسیاں بھی موجود تھیں۔ ہاشم نے اس شخص کو غور سے دیکھا جو گھٹھے ہوئے بدن اور تھکے نقش کا مالک تھا، اس کے تپور بتا رہے تھے کہ وہ سخت گیر طبیعت کا مالک ہے، آنکھوں کی مخصوص چمک اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ کسی کے ساتھ رعایت کرنے کا عادی نہیں ہے۔ اس کی کرسی کے بائیں جان ایک خونخوار السیشین بیٹھا اپنی زبان لپٹا رہا تھا۔

”بیٹھو.....“ ہاشم کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ ”تمہارے کام میں ہمارے گلینے ضائع ہو گئے۔ مجھے ان کی پروا نہیں، تمہارا کام ہو گیا تھا پھر کیسے آتا ہوا؟“

”میرا نام ہاشم ہے اور تم.....“

”تم جگہ ہی سے مخاطب ہو۔“ جواب دینے والے نے سر دلیجے میں کہا۔ ”اگر تم غیر ملکی گاہک نہ ہوتے تو میں تم کو اندر بلانے کی زحمت بھی نہ کرتا۔ مقامی لوگ ڈبل کراس کرنے کی حماقت کرتے

”لیکن زیادہ تر ہدایتیں تمہارے ہی ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں۔“

”ہو سکتا ہے یہ محض اتفاق ہو۔“ ہاشم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”مطلوبہ فرنیچر کی دکان میں مجھے تنہا جانا ہوگا لیکن پوری طرح محتاط رہنا۔ ہمیں وہاں کچھ غیر یقینی صورت حال بھی پیش آ سکتی ہے۔“

”کشمیری فرنیچرز ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ شہر میں فرنیچر کی اور بھی بے شمار دکانیں موجود

ہیں۔“

”تم نے شاید روڈ سائڈ پر بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی دکانوں اور کچے کچے مکانوں کی ساخت پر غور نہیں کیا۔ یہ ایک پرانی کالونی ہے جو ابھی تک ماڈرن حالات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہو سکی، شاید اس لیے کہ یہاں مختلف کلاس کے لوگ آباد ہیں جو اپنی اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلا رہے ہیں۔“

”کیا ہم یہاں صرف فرنیچر خریدنے آئے ہیں؟“ لوچن نے کسمسا کر سوال کیا۔

”نہیں..... ہاشم نے اس بار ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے یہاں ایک ایسے شخص سے ملاقات کرنی ہے جو کسی اچھی شہرت کا مالک نہیں ہے۔ فرنیچر کا کاروبار محض ڈھونگ ہے، میرا خیال ہے کہ فرنیچر کی دکان کے اندر ہی اندر کچھ چور راستے بھی ہوں گے جسے پولیس وغیرہ کی ریڈ کے وقت استعمال کیا جاتا ہوگا۔ مجھے صرف یہی بتایا گیا ہے کہ جس شخص سے ملاقات کرنی ہے وہ ایک جرائم پیشہ گروہ کا سردار ہے۔“

”ملاقات کی نوعیت کیا ہوگی؟“ لوچن نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”سوری..... میں سیون اسٹار کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ تمہیں اور ڈوما کو بھی یہی

ہدایت ملی ہوگی۔“

لوچن نے پھر سوال نہیں کیا۔ کشمیری فرنیچرز کی دو منزلہ عمارت پر ایک نظر وہ بھی ڈال چکا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے ذیلی سڑک پر آتے ہوئے اپنی نئی ماڈل کرو لاکیب مطلوبہ دکان سے کچھ پہلے ہی روک دی، ہاشم خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ گاڑی کچھ فاصلے پر روکنے کی مصلحت وہ بھی بھانپ چکا تھا، وہاں سے کسی متوقع خطرے کو بے آسانی بھانپا جاسکتا تھا۔

فرنیچر کی وہ دکان چوڑائی میں زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن لمبائی میں شاید اسے دو پلاٹوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ شوروم کے اندر ہی اسے وہ گول زینہ بھی نظر آ گیا جو دکان کی پہلی منزل پر جاتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ مختلف فرنیچر کو دیکھتا رہا۔ دکان پر دو افراد نظر آ رہے تھے، ایک ملازم تھا جو ہاشم کے ساتھ ساتھ تھا، دوسرا ایک میز پر اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ غالباً وہ منجر رہا ہوگا۔

”آپ کو کس قسم کا فرنیچر درکار ہے؟“ ملازم نے ہاشم کے ساتھ چلتے چلتے اسے کاروباری انداز

میں مخاطب کیا۔

”میری بات فون پر کسی قدیر صاحب سے ہوئی تھی۔“ ہاشم نے جواب دیا تو ملازم نے اس

ہیں اس لیے میں ان سے کم ہی ملتا ہوں۔“

”یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن میں اس وقت ایک خاص کام سے آیا ہوں۔“ ہاشم نے کاروباری انداز اختیار کیا۔ ”تمہارے نگ جو باقی بچ گئے تھے ان کے بارے میں کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

”کام ہو جانے کے بعد اب ان سے تمہارا کیا تعلق رہ جاتا ہے؟“ درشت لہجے میں دریافت کیا گیا۔

”صرف اتنا کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔“ ہاشم نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”انہیں اپنی زبان بہر حال میں بند رکھنی ہوگی۔ اس کی ضمانت کون دے گا؟“

”اوہ.....“ جگانے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”آدی دور اندیش اور تجربے کا معلوم ہوتے ہو۔“

”نہ ہوتا تو کسی پارٹی نے منہ مانگے داموں پر افریقہ کے وحشی قبیلے سے یہاں درآمد بھی نہ کیا ہوتا۔ کام کھرا کرتا ہوں اس لیے بیرونی منڈی میں ڈیمانڈ بھی ہے۔“

”خوشی ہوئی تم سے مل کر۔“ اس بار جگانے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”فکرت کرو، جو دو پیش باقی رہ گئے ہیں وہ زبان نہیں کھولیں گے۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔“

”تھینکس۔“ ہاشم نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جواب دیا پھر نوٹوں کی ایک گلدی نکال کر میز پر بے پروائی سے ڈال دی۔

”یہ..... کیس لیے؟“ جگانے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”جو کچھ ضائع ہو جائیں ہم اس کی قیمت بھی ضرور ادا کرتے ہیں۔“

”ہم جو سودا کرتے ہیں اس میں ٹوٹ پھوٹ بھی شامل ہوتی ہے۔ تم یہ رقم واپس اٹھا لو۔“

”نہیں جگانے.....“ ہاشم نے اٹھتے ہوئے سلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے مجھے پھر کوئی کام پیش آئے۔ تم میری طرف سے یہ رقم ان کی فیملی کو دے دینا۔“

جگانے مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاشم سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہارا یہ کاروباری انداز اچھا لگا۔ جب بھی جگانے کی ضرورت پیش آئے، دوست بن کے ایک آواز دینا۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔“

ہاشم کا تجربہ گواہی دے رہا تھا کہ جگانے اپنی زبان کا دھنی ہے۔ وہ مطمئن ہو کر باہر نکلا، باہر بیٹھا ہوا شخص پھر اس کی رہنمائی کرتا ہوا فرنچیز کے شوروم تک لے آیا۔ قدری میز پر ایک اور شخص بیٹھا تھا جسے دیکھ کر ہاشم چونکا۔ وہ دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا، پہناوے اور رکھ رکھاؤ سے اس کا تعلق اونچے لوگوں میں شمار کیا جاسکتا تھا، اس نے سنہری فریم کا لائٹ کلر والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ ہاشم کی دور رس نگاہوں میں مخصوص چمک پیدا ہوئی یہ اس بات کا پیش خیمہ تھا کہ وہ اسے کہیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ پھر قدر تو ہاشم نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ اس شخص کو اپنے ہوٹل کے باہر بھی ایک دو بار منڈلاتا

دیکھ چکا تھا۔ جگانے کے ٹھکانے پر دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ وہ بھی کسی بڑی پارٹی کا خاص آدمی ہوگا۔ فوری طور پر ہاشم کے ذہن میں ایک ہی آدمی کا نام ابھرا شیخ حامد اور دوسرے ہی لمحے وہ تیز قدم اٹھاتا شوروم سے باہر آگیا۔ احتیاطاً اس نے باہر کھڑی گاڑی کے نمبر بھی ذہن نشین کر لیے۔ اس کی چھٹی حس پوری طرح بیدار تھی۔



سیٹھ عثمان نے اپنا ذاتی آفس نئے بنگلے میں شفٹ کر لیا تو راحیلہ بیگم نے سکون کا سانس لیا، ذاتی آفس کے علاوہ انتظامیہ کا مخصوص شعبہ اور کچھ کاروباری سیکشن بھی نئے بنگلے میں بہ آسانی سما گئے تھے۔

اس روز نئے آفس میں وہ پہلا دن تھا جب راحیلہ بیگم خود بھی شوہر کے ساتھ دفتر گئی تھیں۔ آفس کا رسمی افتتاح بھی انہی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مٹھائی بھی تقسیم کی گئی۔ لیاقت حسین اور فرحین بھی خوش تھے لیکن ڈی ایس پی سراج کی غیر موجودگی کو سیٹھ عثمان کے علاوہ راحیلہ بیگم بھی محسوس کر رہی تھیں۔ مختصر سی تقریب کے بعد جب وہ شوہر کے ساتھ نئے آفس میں گئیں تو انہوں نے اس کا اظہار شوہر سے بھی کیا۔ شاید اس لیے کہ سراج ہی نے وقتی طور پر انہیں کچھ دنوں کے لیے باہر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں نئے بنگلے کی خریداری اور پرسنل آفس شفٹ کرنے کا پروگرام بھی سراج ہی کی دوڑ دھوپ اور مشوروں کا مہون منت تھا۔

”اس موقع پر مجھے سراج کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس موقع پر بھی سراج نے دور اندیشی ہی کا ثبوت دیا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔

”ایک پولیس آفیسر ہونے کی حیثیت سے اس کیلئے نیوزل رہنا بھی ضروری ہے۔“

”کیوں؟“ کیا شیخ حامد کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ سراج آپ کا کلاس فیلو ہے اور ہمارے

درمیان فیملی ٹرمز ہیں؟“

”یقیناً ہے، اور اسی وجہ سے سراج نے احتیاط سے کام لیا ہوگا۔“

”سراج بھائی خود نہیں آئے تو کم از کم ہماری خوشی کی خاطر الماس کو ہی بھیج سکتے تھے۔“ راحیلہ بیگم نے شکوہ کیا۔

”آپ کچھ بھی کہیں لیکن میں ان دونوں سے شکوہ ضرور کروں گی۔“

سیٹھ عثمان بیوی کو کچھ اونچ نیچ سمجھانا چاہتے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی، انہوں نے ریسور اٹھا لیا۔

”ہیلو.....“

”نیا آفس مبارک ہو۔“ دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔ ”کیسا فیل کر رہے ہو؟“

”آج پہلا دن ہے لیکن کچھ مسائل یہاں بھی سرا بھار رہے ہیں۔“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے

کہا۔

”خیریت.....؟“

”میرا ذاتی خیال ہے کہ تمہاری پوزیشن اب زیادہ نازک ہو رہی ہے۔“ اس بار سیٹھ عثمان نے

بیوی کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھ کر جواب دیا تو راحیلہ بیگم پر شوہر کے پہلے جملے سے پیدا ہونے والا تناؤ یکھت ختم ہو گیا۔ انہوں نے ریسیور چھٹ کر کان سے لگا لیا۔

”فکرمٹ کرو..... میں جانتا ہوں دشمنوں کے کان ضرور کھڑے ہوں گے لیکن مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔“ دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔

”بہت خوب..... گویا اب آپ مجھے بھی دشمن سمجھنے لگے۔“ راحیلہ بیگم نے بناوٹی غصے کا اظہار کیا۔ ”کم از کم آپ سے اس کی امید نہیں تھی۔ شاید اس لیے آپ اور الماس دونوں غیر حاضر ہیں۔“

”سب سے پہلے میری اور الماس کی طرف سے مبارک باد قبول کریں اور یہ بھی فیصلہ کریں کہ الماس کو جو دکھ پہنچا ہے اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔“

”کیسا دکھ.....؟“

”انوی ٹیشن نہ ملنے کا۔“ سراج نے شکایت کی۔ ”میں تو خیر واقف ہوں کہ عثمان شروع ہی سے کنجوس واقع ہوا ہے لیکن الماس کو امید تھی کہ کم از کم آپ اسے ضرور بلائیں گی۔“

”سراج بھائی.....“ راحیلہ بیگم نے تیزی سے کہا۔ ”آپ کی یہ پولیس والی چال بالکل نہیں چلے گی۔ مجھے واقعی دکھ ہوا ہے آپ دونوں کے شریک نہ ہونے کا.....“

”کیا کچھ لے دے کر بھی مک مکائیں ہو سکتا؟“ سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا تو راحیلہ بیگم مسکرا دیں۔

”الماس کی خاطر گنجائش نکال سکتی ہوں۔ آپ کو پہلی فرصت میں مجھے اور عثمان کو ایک شاندار ٹریٹ دینی ہوگی۔“

”مجھے منظور ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ بہت سستا چھوٹ گیا۔“ سراج نے دیور بھائی کے رشتے کے تحت اطمینان کا سانس لے کر جواب دیا۔ ”میرے علاقے میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل بھی آتا ہے۔“

آپ جب چاہیں پروگرام بنالیں۔“

”ہوٹل نہیں..... آپ کو گھر پر سارا اہتمام کرنا ہوگا۔ میں آج ہی الماس سے بات کر کے پروگرام طے کر لوں گی۔“

”منظور ہے لیکن ایک شرط پر.....“

”وہ کیا.....؟“

”الماس آپ کو انوائٹ کرے گی لیکن عثمان کو بلانے پر غور کرنے کے بعد ہی جواب دوں گا۔“

کچھ دیر بعد راحیلہ بیگم کی گفتگو ختم ہوئی تو ملازم نے داخل ہو کر ایک کارڈ سیٹھ عثمان کے سامنے رکھ دیا جسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرتے دیکھ کر راحیلہ بیگم نے پوچھا۔

”کس کا کارڈ ہے؟“

”شیخ حامد باہر گاڑی میں موجود ہے..... مجھے اس کی امید نہیں تھی۔“

سیٹھ عثمان کے ساتھ ہی راحیلہ بیگم بھی باہر آ گئیں جہاں شیخ حامد اپنی شاندار گاڑی میں موجود تھا، سیٹھ عثمان نے بذات خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو شیخ حامد مسکراتا ہوا باہر آ گیا۔

”ایسی بھی کیا بے مروتی کہ آپ نے چپکے چپکے نیا آفس قائم کر لیا۔“ شیخ حامد نے مخصوص انداز میں شکوہ کیا۔ ”ہمیں اطلاع بھی نہ دی۔“

”ہم نے یہ سب کچھ سادگی سے کیا ہے۔“ راحیلہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ تشریف لائیں اور خود دیکھ لیں کہ ہم نے کسی کو مدعو نہیں کیا۔“

شیخ حامد ایک نظر بیٹھکے پر ڈالتا ہوا اندر اس کمرے میں آ گیا جو خاص خاص کاروباری پارٹیز سے ملنے کی خاطر مخصوص تھا۔

”میرا بن بلائے آ جانا آپ کو برا تو نہیں لگا؟“ اس نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے باری باری عثمان اور راحیلہ کو وضاحتی نظروں سے دیکھا، اس کے جملے میں طنز کے علاوہ برتری کا احساس بھی جھلک رہا تھا۔

”قطعاً نہیں..... یہ تو ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے آپ انہوں کی طرح ہماری خوشیوں میں شریک ہو گئے۔“ سیٹھ عثمان نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ راحیلہ بیگم اہتمام کی خاطر اجازت لے کر باہر چلی گئیں تو شیخ حامد نے چپتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”کیا آپ نے تجارتی علاقے میں گھر کے قریب اپنا آفس بنانے کو کسی خاص وجہ سے ترجیح دی ہے؟“

”جی نہیں..... یہ بنگلا خالی پڑا تھا اس لیے میں نے صرف اسے اپنا پارٹ ٹائم آفس بنایا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”زیادہ تر وقت تو آپ لوگوں کے درمیان ہی گزرے گا۔“

”بہر حال دیکھ لیں کہ مجھے بروقت ہینک مل گئی اور میں آپ کو مبارک باد دینے آ گیا۔“

”یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے غیریت نہیں برتی۔“

دونوں کے درمیان اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ راحیلہ بیگم نے اتنی دیر میں خاصا اہتمام کر لیا تھا، شیخ حامد نے تکلف سے کام نہیں لیکن زیادہ دیر کا بھی نہیں۔ اس کے جانے کے بعد راحیلہ بیگم نے دبی زبان میں کہا۔

”میرا ذاتی خیال ہے کہ شیخ حامد یہاں صرف اپنی خوشی کا اظہار کرنے نہیں آیا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوگا۔“

”شاید.....“ سیٹھ عثمان نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”کچھ لوگوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خواہش زیادہ شدت سے ہوتی ہے، میں سمجھ رہا ہوں کہ اس کے آنے کا اصل مقصد کیا تھا۔“

وہ شاید یہ باور کرانے آیا تھا کہ میں اس کے خوف سے میدان چھوڑ کر بھاگ رہا ہوں۔“

”دفع کیجئے..... دوسرے کیا سمجھتے ہیں، ہمیں اس کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ راحیلہ

بیم نے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیا، اس روز وہ خاصی دیر تک شوہر کے ساتھ آفس میں رہی بعد میں گھر آئیں۔ ذاتی طور پر وہ بھی شیخ حامد کی اچانک آمد کا اصل مقصد نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ جو شخص کسی کو دعوت میں بلا کر تخریبی کارروائی کے حربے اختیار کر سکتا تھا، اس سے کوئی نیک توقع بھی وابستہ نہیں کی جاسکتی تھی۔



اس بار افضل خان کے ساتھ اس کی نگرانی کرنے والوں کا وہ سلوک نہیں تھا جو میڈم روبی والے معاملے کی ناکامی کے بعد۔ وہ غلطی نہ ہونے کے باوجود بھگت چکا تھا۔

دوروز سے اسے ایک بیڈروم میں رکھا گیا تھا۔ یہاں اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی لیکن ایک بار بگ باس کی دوغلی پالیسی اور مصلحتوں کا ہدف بننے کے بعد وہ خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ ایک ہی جھٹکے نے اس کی ساری خوش فہمی دور کر دی تھی۔ اگر شبینہ نے اسپتال سے نکالے جانے کے بعد بروقت اسے اپنے فلیٹ میں سر چھپانے کی جگہ نہ دی ہوتی تو شاید وہ خودکشی کے ارادے کی تکمیل کرنے کے بعد اخباروں کی سرخیاں بن کر رہ گیا ہوتا۔ شبینہ نے خود کو نیوٹرل ثابت کرنے کی خاطر جو کچھ کہا تھا اس کی پشت پر بھی یقیناً بگ باس کی مرضی ضرور شامل رہی ہوگی۔ وہ ایک کمزور لڑکی تھی جبکہ بڑے بڑے سودا بھی بگ باس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے گریز ہی کرتے تھے۔ افضل خان کے اس شہجے کو اس وقت تقویت مل گئی جب شبینہ نے اسے بگ باس کے دو مخالفین کے بارے میں بتا کر یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ اس نادرو موقع سے فائدہ اٹھائے تو بگ باس اس سلسلے میں نرم بھی پڑ سکتا ہے۔ اس آفر کے پیچھے بھی افضل خان کو بگ باس کی چالاکی محسوس ہوئی تھی۔ شبینہ کو یقینی طور پر اسی نے اشارہ کر کے افضل خان کے ساتھ ذاتی ہمدردی کا مشورہ دیا ہوگا۔ اس کا ثبوت بھی اس روز مل گیا جب شبینہ نے ایک موقع پر افضل خان کو ایک مختصر چٹ پر یہ پیغام لکھ کر دیا تھا۔ ”ہماری اس کمرے میں ہونے والی گفتگو دوسری جانب بھی سنی جا رہی ہے۔ محتاط رہنا۔ ویسے میں تمہارے ساتھ ہوں، کوشش کروں گی کہ تمہارے کسی کام آسکوں۔“ اس پرچے کو پڑھ لینے کے بعد افضل خان کے اس شہجے کی تصدیق ہوئی تھی کہ شبینہ نے اسی کے اشارے پر اسے پناہ دی تھی۔

شبینہ کا وہ خاموش پیغام، اس وقت بھی افضل خان کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ بگ باس کا دست راست ہونے کی حیثیت میں بھی اس نے کئی بار شبینہ کو اپنی طرف جھٹکے محسوس کیا تھا۔ اگر وہ آفس میں ایک ساتھ کام نہ کر رہی ہوتی تو شاید افضل خان اسے بھی شکار کر چکا ہوتا لیکن اب وہ شبینہ کی اپنی ذات میں اس دلچسپی کو دوسری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے شیخ حامد کی فرم میں ملازمت محض اچھی تنخواہ کی خاطر نہیں کی ہوگی۔ اگر وہ غلط قسم کی لڑکی ہوتی تو بھول کر بھی افضل خان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوشش نہ کرتی۔ بگ باس کی سخت پالیسی سے وہ بھی ناواقف نہیں رہی ہوگی۔ اس نے جو قدم افضل خان کی طرف بڑھانے کی کوشش کی تھی اس میں یقیناً کوئی مصلحت رہی ہوگی۔ کوئی ایسی افتاد جس میں اسے افضل خان کی مدد درکار ہوگی۔ اس مشکل کا کوئی نہ کوئی تعلق بھی بگ باس سے

ضرور ہوگا ورنہ وہ افضل خان کے بجائے کسی اور کو بھی شیشے میں اتارنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ رستم علی آغا خانی سے ٹکراؤ کے سلسلے میں شبینہ نے خلاف توقع ذاتی طور پر بھی افضل خان کی مدد کی تھی۔ شاید اسی وجہ سے افضل خان نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اس نارگٹ کو حاصل کر لیا تھا۔ جس شخص نے اسے شبینہ کی عدم موجودگی میں واپسی میں پک کیا تھا اس نے بھی یہی کہا تھا کہ ”تمہیں دو دوز تک شبینہ کے فلیٹ سے دور رہنا ہوگا۔ حالات اگر سازگار ہوئے تو شبینہ تم سے خود ہی مل لے گی۔ فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

بہر حال بگ باس کے دیئے مشکل محاذ کو سر کر لینے کے باوجود افضل خان کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا۔ ایک بار اپنے ناکرہ نگاہ کی اذیت ناک سزا بھگتتے کے بعد اس نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ اپنا راست الگ بنانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ پہلے وہ اس پوزیشن میں تھا کہ اگر چاہتا تو اس خطرناک مگر مجھ کو بہت قریب سے شکار کر سکتا تھا۔ اب حالات نے بگ باس کو بھی پہلے سے زیادہ محتاط کر دیا ہوگا لیکن..... وہ اس کے باوجود اسی دغا بازی کی پالیسی پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا جو اس کے ساتھ عمل میں آچکی تھی۔

جس کمرے میں اسے رکھا گیا تھا وہاں سے اسے باہر نکلنے کے علاوہ ہر قسم کی سہولت حاصل تھی لیکن وہ متواتر اپنی زندگی کے آنے والے باب کو اپنے انداز میں رقم کرنے کے بارے میں غور و فکر کرتا رہا۔ اس وقت بھی شام کا ہلکا ناشتا کرنے کے بعد وہ ایک ایڑی چیز پر بیٹھا انہی خیالوں میں گم تھا جب اس کو دیئے گئے موبائل پر پہلی بار کال کی گئی..... اس نے سنبھل کر موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی جہاں کسی نمبر کے بجائے ”ان نون“ درج تھا۔

”ہیلو.....“ اس نے موبائل آن کر کے سنجیدگی سے انیڈ کیا۔

”تم نے اپنی نئی زندگی کا پہلا ہرڈل (Hurdle) کامیابی سے پھلانگ لیا ہے۔“ دوسری جانب سے شیخ حامد کی کھردری آواز سنائی دی جس میں حقارت کا پہلو بھی شامل تھا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ شبینہ نے تمہاری جو سفارش کی تھی اسے اس میں مایوسی نہیں ہوئی۔“

”میں آپ دونوں کا شکر گزار ہوں۔“ افضل خان نے دل پر جبر کر کے جواب دیا۔

”اب کیا سوچا ہے؟“ سپاٹ اور سرد لہجے میں دریافت کیا گیا۔

”میں اس وقت کچھ سوچنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”گڈ..... مجھے تمہارا جواب پسند آیا، جب انسان ہر طرف سے مایوس ہو جائے تو اسے اسی انداز میں بات کرنا چاہئے۔“

”میں مایوس پھر بھی نہیں ہوں۔“ افضل خان نے دیدہ دانستہ خوشامدی انداز اختیار کیا۔ ”اس

بات کی توقع رکھتا ہوں کہ آپ مجھے آزمائش کے کچھ اور مواقع بھی ضرور دیں گے۔“

”ضروری نہیں ہے۔ تم جو مقام کھو چکے ہو اس کے بارے میں خواب میں بھی نہ سوچنا۔“

اس بار افضل خان نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، کسمسا کر رہ گیا۔

”خاموش کیوں ہو گئے؟“

”میں..... میں ایک درخواست کروں گا۔“

”کہو۔“

”آپ ایک بار حکم دے کر دیکھیں، میں آپ کے اشارے پر خود اپنی شہ رگ پر چھری پھیر لوں گا۔“

”زندگی سے اتنی جلدی مایوس ہو گئے۔“ طنزیہ لہجہ میں کہا گیا۔ ”کبھی تو اسی شہر میں تم سینہ تان کر اور سر اٹھا کر چلتے تھے؟“

”وہ بھی آپ کی مہربانی تھی.....“

”ایک بات کا خیال رکھنا..... جب انسان کے گھٹنے عارضی لگا دیئے جائیں تو اس کو دوبارہ اپنے قدم زمین پر جما کر چلنے میں بڑی اذیت ناک قوت برداشت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔“

”م..... میں ہر امتحان کیلئے تیار ہوں۔“ افضل خان نے مردہ آواز میں جواب دیا۔

”میڈم والے کیس میں تمہیں جو سزا ملی تھی اس کے بارے میں تمہارا اندازہ ہے.....؟ تم ایک ہی جھکے میں اپنا سب کچھ کو بیٹھے تھے۔“

”میں اسے مصلحت کا نام دوں گا۔“ افضل خان نے پھر دل پر جبر کیا۔ ”جو کچھ ہوا میں اس پر شاک کی نہیں ہوں۔“

”فائن.....“ شیخ حامد کے لہجے میں نمرودیت اتر آئی۔ ”مجھے ہر حال میں دم ہلاتے شکاری کتے زیادہ پسند ہیں۔“

افضل خان خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس وقت وہ اس سے زیادہ کچھ کر گزرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

”آزمائش صداقت کی کسوٹی ہوتی ہے..... کبھی فرصت ملی تو اپنے قدموں میں تمہارے لیے کوئی جگہ نکالنے کے بارے میں غور کروں گا۔“

”میرے لیے یہ بھی بہت ہوگا۔“

”شبیم ابھی کچھ دیر میں تمہارے پاس آ رہی ہے۔“ اس بار سرد لہجہ میں کہا گیا۔ ”اس کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوا تو افضل خان کے پورے وجود میں چنگاریاں چمکنے لگیں۔

ایک بار پھر وہ ”تخت یا تختہ“ کی راہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک اسلحہ بردار اندر داخل ہوا، چھ گھنٹے کی شام کی ڈیوٹی میں وہی نظر آتا رہا تھا، افضل خان نے پہلے ہی روز محسوس کیا تھا کہ وہ بظاہر اس پوزیشن کا حامل نہیں ہے جسے اس نے وقتی طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ فون پر گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے کے پانچ منٹ بعد ہی کمرے میں اس کی آمد نے افضل خان کو ایک لمحے کو چونکنے پر مجبور کر دیا لیکن وہ پرانا اور منجھا ہوا کھلاڑی تھا، اس نے خود کو ایسا ظاہر کیا جیسے وہ مچی نیند میں بیدار ہو گیا

ہو۔

”آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“ آنے والے نے سپاٹ آواز میں دریافت کیا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو ناشتا کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے..... میں نے یوں ہی مہمان نوازی کی خاطر دریافت کر لیا تھا، اوپر سے یہی آرڈر ملا ہے کہ آپ کا ہر طرح خیال رکھا جائے۔“ وہ جانے کے ارادے سے پلٹا تو افضل خان نے کچھ سوچ کر اسے روکتے ہوئے بڑے مایوس انداز میں دریافت کیا۔

”کیا یہاں غم غلط کرنے کی دوا مل سکتی ہے؟“

”کھل کر بات کریں..... ہم کو معمول میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجہ میں جواب دیا۔

”م..... میں، اس وقت دھسکی پینے کا خواہش مند ہوں۔“ افضل خان نے دیدہ و دانستہ زندگی سے بے حد مایوس ہو جانے والا انداز اختیار کیا۔ آنے والا جواب دینے کے بجائے خاموشی سے پلٹ گیا۔ پانچ منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دھسکی کا گلاس بھی موجود تھا۔

”اے میری موجودگی میں حلقے کے نیچے اتار لیں۔ ہم کوشیشے کا گلاس یا پوٹل دینے کی اجازت نہیں ہے۔“

”کیوں.....؟“ افضل خان نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”انسان جب زندگی سے مایوس ہو جائے تو پھر خودکشی سے بھی گریز نہیں کرتا۔“

”میں ایسا کوئی قدم یہاں سے جانے کے بعد بھی اٹھا سکتا ہوں.....؟“

”وہ ہماری ذمہ داری نہیں ہوگی۔“

جواب میں افضل خان نے مایوسی اور جھلاہٹ کا ملا جلا رد عمل ظاہر کیا پھر گلاس ہاتھ میں لے کر دوہی گھونٹ میں ختم کر کے بے زاری سے فرش پر بچھے ہوئے قالین پر اچھال دیا۔ اسلحہ بردار نے معنی خیز نظروں سے افضل خان کو گھورا پھر گلاس اٹھا کر خاموشی سے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

افضل اٹھ کر کمرے میں ٹھنلے لگا، اس کے ساتھ جو نفسیاتی حربے استعمال کیے جا رہے تھے وہ ان کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ساتھ شبیم کی آمد کا بھی شدت سے خضر تھا۔ بگ باس کے تلخ لہجے نے اس کے اپنی بقاء کی جنگ لڑنے کے ارادے کو اور مہمیز کر دیا تھا۔ آدھے گھنٹے تک اس کے ذہن میں مختلف منصوبے ابھرتے رہے۔ اسے میڈم روپی کی آفر یاد آئی۔ اگر اس وقت وہ بگ باس کے مقابلے پر خاموشی سے میڈم کا ہاتھ تھام لیتا۔ اس کی حسین پیشکش کو قبول کر لیتا تو اس وقت حالات یکسر مختلف ہوتے، بگ باس کا قصہ پاک کرنے کی خاطر اسے کوئی دشواری نہ ہوتی۔ وہ اس سے بہت قریب تھا، کسی بھی موقع پر کسی اور کی گردن پھنسا کر پولیس کے پھندے سے بھی گلو خلاصی حاصل کر سکتا تھا لیکن اب..... اب شاید میڈم بھی اس کی طرف پلٹ کر دیکھنا گوارا نہ کرے۔ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر اس نے خود اپنے بیروں پر کلباڑی ماری تھی اور بھی کئی نام اس کے ذہن میں ابھر رہے

تھے لیکن وہ جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے اسے مالی طور پر خود کو مستحکم کرنا تھا۔ سر چھپانے کی خاطر کوئی مستقل ٹھکانا تلاش کرنا تھا۔ ان مرحلوں کو طے کرنے کی خاطر خاصا وقت درکار تھا۔

وہ اپنے خیال میں گم تھا جب قدموں کی آہٹ سن کر تیزی سے پلٹا..... شبنم اس کے سامنے موجود تھی، ساتھ میں مسلح گارڈ بھی کھڑا تھا۔ افضل خان اپنا منجلا ہونٹ کاٹنے لگا، وہ مسلح شخص کو یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ ابھی تک کسی ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے، شبنم بھی اس کی کیفیت کو محسوس کرتی رہی پھر اس نے گارڈ سے کہا۔

”تم جاؤ..... دروازہ باہر سے بند کر لیتا۔“

”کچھ دیر پہلے ہمارے مہمان نے دسکی کے پیگ پیے ہیں“ گارڈ نے شبنم کو باخبر کرنے کی خاطر اپنا فرض ادا کیا۔

”تم فکر نہ کرو..... میں محتاط رہوں گی، ضرورت پڑی تو وہی سنگٹل دوں گی جو طے ہوا ہے۔“

”جو حکم میڈم۔“ گارڈ افضل خان پر اچھٹی نظر ڈال کر اگلے قدموں واپس چلا گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز بھی سنائی دی۔

”اس وقت کیسا ٹھیک کر رہے ہو؟“ شبنم نے گارڈ کے جانے کے بعد سنجیدگی سے افضل خان کو مخاطب کیا۔ ساتھ ہی اس نے بائیں آنکھ کی پلکوں کو ہلکا سا جھپکا کر افضل خان کو محتاط رہنے کا اشارہ بھی کر دیا۔

”ایک بار پھر خودکشی کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔“ افضل خان نے مایوسی کا اظہار کیا۔

”کوئی خاص وجہ.....؟“

”جگ باس کا فون آیا تھا۔ وہ مجھے اپنے قدموں میں بھی جگہ دینے کو آمادہ نہیں ہے۔“

”جلد بازی میں کوئی حماقت مت کرنا..... ذمہ بھرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔“ شبنم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جگ باس کی طرف سے میں تمہیں پہلے بھی باور کرا چکی ہوں کہ وہ تمہارا کھویا ہوا مقام نہیں دے سکتا۔ اس کی جگہ تم ہوتے تو شاید تم بھی کچھ ایسا ہی فیصلہ کرتے۔“

”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو لیکن..... تم نے تصویر کے دوسرے رخ پر غور نہیں کیا۔“

”کس نتیجے پر پہنچنے کی بات کر رہے ہو؟“

”جان بوجھ کر انجان بننے کی اداکاری مت کرو۔“ افضل خان نے تمللا کر پوچھا۔ ”فرض کر لو میری جگہ تم ہوتیں..... تمہیں بھی وہی مقام حاصل ہوتا جو مجھے حاصل تھا لیکن کیا تم جگ باس کی مخالفت اور ناراضی مول لے کر اس شہر میں کہیں پناہ حاصل کر سکتی تھیں؟“

”میں تمہاری اس دلیل سے انکار نہیں کروں گی مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ جگ باس نے میری سفارش پر تمہیں خدمت کا ایک موقع دینے سے انکار بھی نہیں کیا۔“

”اور میں نے بھی تمہاری سفارش کا بھرم رکھنے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا کر کامیابی حاصل کی ہے۔ جگ باس کی توقع کے عین مطابق میں نے اس کے دشمن کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ اب نظریں اونچی کر کے بات کر سکے۔“ اس نے مایوسی کا اظہار کیا۔ ”تم شاید اس وقت مجھ سے میری کامیابی کا ثبوت حاصل کرنے آئی ہو؟ اس کے بعد کیا ہوگا؟ تم بھی یقین سے نہیں کہہ سکتیں۔“

”میں سمجھ رہی ہوں۔ حالات نے تمہیں منفی سوچوں میں الجھا رکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ میں تم سے ضروری چیزیں لینے آئی ہوں لیکن تمہیں اس بات کا یقین بھی دلا سکتی ہوں کہ موجودہ کامیابی کے بعد جگ باس تمہیں.....“

”کچھ کہنے سے پہلے وہ چیزیں مجھ سے لے لو۔“ افضل خان نے حساس کیمرا جیب سے نکال کر شبنم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ کوئی سودے بازی کروں۔ تم نے مجھے کچھ دن زندگی کی ضمانت دے کر جو مہربانی کی تھی اسے اس کا بدل سمجھ لو۔“

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں..... میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ کسی سے کچھ بارگین کر سکوں۔“

”تمہیں چوبیس گھنٹے بعد یہاں سے جانے کی اجازت مل جائے گی۔ جو لوگ سینہ تان کر سامنے آ رہے تھے، اب انہوں نے پولیس تک جانے کا ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔ باس نے تمہاری آزادی کا پروانہ بھی جاری کر دیا ہے۔“

”اس میں بھی تمہاری سفارش کا دخل ہوگا؟“

”ہاں..... اور میری ہی سفارش پر تمہارے لیے کچھ ضروری رعایتیں بھی دی گئی ہیں۔“ شبنم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”یہاں سے باہر نکل کر تم کسی بھی ہوٹل میں کچھ دن سکون سے رہ سکتے ہو، حالات کا رخ دیکھنے کے بعد تمہاری کسی معقول رہائش کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ تمہارے اخراجات تمہیں کسی نہ کسی طرح سے ملتے رہیں گے۔“

”اس کے بعد.....؟“

”ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرنا پڑے جس کا کوئی تعلق کسی بھی طرح جگ باس سے نہیں ہوگا۔ ساری مراعات تمہیں ملتی رہیں گی، البتہ جب تک باس کی اجازت نہ ہو تم اس سے بالکل الگ تھک رہو گے۔“

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خالی خالی نظروں سے شبنم کو دیکھتا رہا جو کل تک اس کے ایک اشارے پر کسی کھ پتلی کی طرح عمل کرنے پر مجبور تھی، آج وہی پوزیشن افضل خان کی تھی۔

”خاموش کیوں ہو؟ کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے؟“

”یہاں سے نکلنے کے بعد کیا میں تم سے آزادی سے مل سکتا ہوں؟“

”اس پر پی ان الحال کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی۔“ اس نے شانے اچکا کر بے پروائی سے کہا۔ ”تم میرے فلیٹ پر، میرے ساتھ رہ چکے ہو۔ اس کا علم جگ باس کے علاوہ مختلف ایجنسی کے

لوگوں کو بھی ہے۔“

”یقیناً ہوگا..... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان سے کوئی سر پھرا ہی بگ باس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت کر سکے گا۔“

”تمہارے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ جو کچھ مل رہا ہے اسی پر قناعت کرو..... کل کیا ہوگا؟ اس کیلئے تمہیں وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

شبیم نے افضل خان کا دیا ہوا حساس کیمرا اپنے بیگ میں رکھا پھر بڑے لوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ رقم تمہارے کام کا معاوضہ نہیں..... صرف انعام کی ایک قسط ہے۔“

”میرے اوپر کچھ پابندیاں بھی ضرور عائد ہوں گی؟“

”کوئی خاص نہیں..... لیکن تمہیں اپنے ماضی کی طرح اب بھی ان تمام معاملات میں محتاط رہنا ہوگا جسے باس پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا، تم عقل مند ہو اور تجربے کا رہی..... میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے؟“

”ٹھیک ہے.....“ افضل خان نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ”میں باس کی نظروں سے گرنے کے بعد بھی اس کا وفادار رہوں گا۔“

”میں اب چلتی ہوں۔“ شبیم نے کہا پھر جاتے وقت بھی اس نے افضل خان کو ایسی ہی نظروں سے دیکھا جیسے اسے سمجھانا چاہ رہی ہو کہ..... میری طرف سے بدگمان نہ ہونا..... کچھ مجبوریاں مجھے بھی لاحق ہیں جنہیں فوری طور پر پھلانگنا میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔



نوٹ: اس پر اسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات

حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیں

کشمکش

2

Pakistanipoint
Waqar
Azeem

انوار صدیقی

ایس پی اورنگ زیب کے لیے وہ چٹ غیر متوقع نہیں تھی جو ڈیوٹی کانسٹیبل نے اس کی میز پر رکھی تھی۔ اس پر ڈی ایس پی لودھی کا نام درج تھا۔ اورنگ زیب نے ایک لمحہ کچھ سوچا پھر کانسٹیبل سے بولا۔

”تم مسٹر لودھی کو آدھے گھنٹے تک ملاقاتی کمرے میں بٹھاؤ پھر اندر بھیج دینا۔“
 ”رائٹ سر.....“

کانسٹیبل سیلوٹ کر کے باہر چلا گیا تو اورنگ زیب نے وہ فائل دراز سے نکال کر سامنے رکھ لی جس کی وجہ سے اس نے لودھی کو اس وقت طلب کیا تھا، اس فائل میں لودھی کے فوری طور پر معطل کئے جانے کے احکام موجود تھے جو اسے براہ راست ہوم سیکریٹری کی طرف سے ملے تھے۔ ان احکامات کی پشت پر خود اورنگ زیب کا ہاتھ تھا جس کا علم اس کے بعد مرکزی حکومت کے ایک ذمے دار آفیسر کے علاوہ کسی اور کو نہیں تھا۔ اس تمام کارروائی میں سراج کا غائبانہ ہاتھ بھی شامل تھا۔ اورنگ زیب کے اصرار پر اس نے الماس کا نام درمیان سے نکال کر وہ تمام کہانی سنائی تھی جو اسے معلوم تھی۔ لیاقت حسین کا نام بھی اس نے درمیان سے حذف کر دیا تھا، لیکن خود سراج کو بھی اس بات کی ہلک نہیں تھی کہ اورنگ زیب لودھی کو اپنے مخصوص ذرائع استعمال کر کے معطل بھی کرادے گا۔
 آدھے گھنٹے بعد لودھی نے کمرے میں داخل ہو کر اورنگ زیب کو سیلوٹ کیا پھر اس کا اشارہ پا کر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مسٹر لودھی.....“ اورنگ زیب نے سنبھل کر سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”انسپکٹر دانش کی ہراساں موت اور تھانے کی تباہی کے سلسلے میں آپ نے اب تک کیا انکوائری کی ہے؟“
 ”سر..... مجھے اس میں فرنانڈس فوٹو گرافر اور اس کی پشت پناہی کرنے والی مافیا کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔“

”گویا یہ بات آپ کے علم میں تھی کہ فرنانڈس کسی گھناؤنے کام میں ملوث تھا اور..... کوئی مافیا ہی اس کی پشت پناہی کر رہی تھی؟“
 لودھی ایک لمحے کو گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”میری کوشش تھی سر کہ طرح فرنانڈس پر بھرپور ماتھالوں لیکن کوئی ٹھوس ثبوت میرے ہاتھ نہیں آسکا تھا۔“
 ”کہا آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ انسپکٹر دانش نے اسے مافیا کے درمیان میں آنے سے قبل

کہاں اور کن حالات میں گرفتار کیا جائے جبکہ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ قحانے کے لاک اپ میں تھا۔“

”میں وہی بتانا چاہتا ہوں سر۔۔۔ انسپٹر وائس نے اسے گرفتار کرنے کے بعد مجھے فون پر اطلاع دی تھی، میں نے اس کے فوراً بعد ہی اس کی چھان بین بھی شروع کر دی لیکن بھر جو صورت حال سامنے آئی وہ دوسروں کی طرح خود میرے لیے بھی ناقابلِ یقین تھی۔“ ”لودھی نے اپنی بات جاری رکھی۔“ ”مجھے اس بات کی توقع تھی کہ فرناٹس کی پشت پناہی کرنے والے اے ایٹا سٹین قدم اٹھانے کی بھی جرأت کر سکتے ہیں۔“

”یو آر رائٹ۔۔۔“ ”اورنگ زیب نے زہر خند لہجے میں کہا۔“ ”اس بات کا انہوں مجھے بھی ہے کہ دہشت گرد یا باغی کے لوگ کوئی خطرناک قدم اٹھانے سے پیشتر ہم پولیس والوں کو اپنے ارادے سے آگاہ کیوں نہیں کر سکتے۔“

لودھی جواب میں کسمسا کر رہ گیا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ ”اورنگ زیب نے دوبارہ جارحانہ انداز اختیار کیا۔“ ”کیا فرناٹس بغیر پولیس کی نئی ٹیم کے حالات سے کل کر چلا گیا ہوگا؟“

”یو ٹی روٹ بھی قحانے کے دیگر ریکارڈ کے ساتھ ہی ضائع ہو گیا ورنہ۔۔۔“

”میں آپ کا ہم خیال نہیں ہوں۔“ ”اورنگ زیب نے اس کی بات کاٹ کر سد لہجے میں کہا۔“ ”میری اطلاع کے مطابق کسی بڑے گمراہ کے اشارے پر فرناٹس کو گرفتار کرنے کی کوششیں بھی نہیں کی گئیں۔“

لودھی اپنی نشست پر پہلو بدلے لگا۔ اورنگ زیب نے لوہا گر دیکھ کر سرسراے لہجے میں کہا۔

”میرے پاس اس آڈٹ سرچ مشین نامے کی ایک نقل بھی ہے جس کو منظر عام پر لانے سے روکنے کی خاطر یہ سارا تا تک کھپلا تھا۔ اگر وہ مشین نامہ سامنے آجائے تو اب بھی کچھ بڑے لوگوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔“

”سر۔۔۔“ ”لودھی نے ڈھیت بن کر جوتوں سمیت اورنگ زیب کی آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کی۔“ ”ہم اس مشین نامے کی روشنی میں اب بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

”سوری۔۔۔“ ”اورنگ زیب کا لہجہ اوجھڑ گیا۔

”میں کیا کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ کسی خاص سرخندے کے گرد اپنا گھبراہٹا مغبوط کرنے کے بعد ہی میں کوئی قدم اٹھانے کا عادی ہوں۔“

”میں ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں سر۔۔۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔“

”آپ جس علاقے میں تعینات ہیں اس میں آپ کو کتنا عرصہ گزر گیا؟“ ”جیسے ہوئے لہجے میں

سوال کیا گیا۔

”تیار دلہ کسی افسر کے ذاتی اختیار میں نہیں ہوتا سر۔۔۔“ ”لودھی بھر تذبذب کی کیفیت سے دوچار

ہو گیا۔

”گڈ۔۔۔ اب آپ نے ایک مطلب کی بات کی ہے۔“ ”اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔“ ”میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ کوئی ایسا شخص درمیان میں ضرور ہے جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر آپ کا تھلاہلا پنہ نہیں کرتا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”یہ آپ کی ذاتی رائے ہے سر۔۔۔ ورنہ میں ایسے کی آدمی سے۔۔۔“

”سٹر لودھی۔۔۔“ ”اورنگ زیب نے جھلا کر میز پر ہاتھ دارتے ہوئے کہا۔“ ”میں نے آپ کو

یہاں کسٹڈین بننے کی خاطر طلب نہیں کیا تھا۔ یہ بھی باور رکھو کہ کسی سے مرعوب ہونے کا عادی نہیں

ہوں اس لیے بھر ہونگا کہ آپ میرے ساتھ یہی طرح تعاون کریں۔“

”آپ کھم دیں سر۔۔۔ میں انکار نہیں کروں گا۔“

لودھی نے پھر مصمیت کا اظہار کیا۔

”جس رات انسپٹر وائس نے فرناٹس کو حوالہ سے دور گرفتار کیا تھا۔۔۔ اس رات وہ کس کی

تصویر یہاں بنانے کی خاطر وہاں گیا تھا؟“

”یہ بات میں کیسے بتا سکتا ہوں، اگر فرناٹس زندہ ہوتا تو میں اس کے فرشتوں سے بھی سب

کچھ پوچھ لیتا۔“

”آئی سی۔۔۔“ ”اورنگ زیب نے اسے خفارت سے گھورا۔“ ”گویا تم اب بھی کسی کے

اشارے پر زبان بندی رکھنے کی پالیسی جاری رکھو گے؟“

”سر۔۔۔ میں پروٹس کرتا ہوں۔“ ”لودھی نے تھلا کر کہا۔“ ”آپ میرے اوپر بغیر کسی ثبوت

کے بے بنیاد الزام۔۔۔“

”شٹ اپ۔۔۔“ ”اورنگ زیب نے چیخ کر کہا پھر اس کی معطلی کے حکم نامے کو فائل سے نکال کر

سامنے ڈالے ہوئے بڑے سفاک لہجے میں حکم دیا۔“ ”ریسٹو۔۔۔ اینڈ گٹ لاسٹ!“

لودھی نے ایک نظر اس آڈیو پر ڈالی۔ ایک ٹاپے کے لیے ہونٹ چبائے پھر اس کی کاغذی

وصول کرنے کے دستخط کرنا ہوا تھا اور اورنگ زیب کو کیلوٹ کے بغیر نکل گیا۔

”کھل اب شروع ہوگا باسٹر۔“ ”میں تمہیں اور تمہارے گندے مگر چھ کو بتاؤں گا کہ قانون

کے ہاتھ کتنے دراز اور طاقت ور ہوتے ہیں۔“ ”لودھی کے جانے کے بعد اورنگ زیب نے خود کاغذی

کے انداز میں کہا پھر ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

❖❖❖

سیمن اسٹارک کی جانب سے شیخ حامد سے دودو ہاتھ کرنے کی کلین چٹل جانے کے بعد ہاشم کی

دلی مراد برآئی تھی، اگر وہ سیمن اسٹارک کا پندہ نہ ہوتا تو شاید اب تک سکون سے نہ بیٹھتا۔ اس کا تعلق

جنوبی افریقہ کے ایک غیر فیمینڈ قبیلے سے تھا جہاں صرف طاقت کی پوجا کی جاتی تھی کسی کو

باردیا یا امر جانا ان کے لیے ایک پسندیدہ کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا، اپنی اسی بے مگروری اور

کے

ہاشم نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔“ میزبان خاتون نے اس کی نظروں میں دور تک جھانکا، اس کی نظروں میں سہلی دعوت سی تھی۔

”میں کسی وجہ سے زیادہ سنجیدہ بھی نہیں ہو سکتا۔“ ہاشم نے یکا یک سنجیدگی اختیار کر لی۔

”کوئی خاص وجہ.....؟“

”میرا تعلق جس قبیلے سے ہے وہاں کے رسم و رواج بھی عجیب و غریب ہیں۔ ہم اپنے دیوتاؤں کو خوش کیے بغیر کسی غیر عورت کے زیادہ قریب نہیں جاسکتے ورنہ.....“ ہاشم نے دیدہ و دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئے.....؟ اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لئے آپ کر کیا کرنا پڑتا ہے؟“

”ایک ایسی رسم کی ادائیگی جسے مہذب دنیا کی عورتیں پسند نہیں کرتیں۔“ ہاشم نے بدستور سلمہ کی سے میزبان خاتون کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم اس کے پابند ہیں ایسا نہ ہوتا تو شاید ہم اس وقت دور دور نہ بیٹھے ہوتے۔“

”کہہ کر دیکھیں۔“ وہ بے تکلف ہونے لگی۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی رسم کی ادائیگی میں بھی آپ کے ساتھ تعاون کروں۔“

”اگر آپ آمادہ ہو جائیں تو مجھے خوشی ہوگی لیکن..... ایسا ہوتا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ ہاشم کے لیے میں ادای اترنے لگی۔“ ہم اس معاملے میں بڑے بد نصیب ہیں، دیوتاؤں کی ناراضی ہمارے اوپر جو آسانی عتاب نازل کرتی ہے اس کا تقور ہی بڑا ہمایا تک ہوتا ہے، اس لیے ہم سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔“

”آپ ہمارے غیر ملکی مہمان ہیں مسٹر ہاشم۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ کر ہاشم کے سامنے بڑھ کر بیٹھا اور قریب چلے آئی۔ ”آپ کو عرض رکھا ہمارا فرض بھی ہے۔ اسکا کیا دم ہے جو آپ کی خاطر پوری نہیں کر سکتی؟ اس نے چلے گئی ہے ہاشم کا ہاتھ تمام کراہت سے دبا ہوا۔ ”ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔“

”ایک گلاس خون.....“ ہاشم نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”ہم جہاں بھی جاتے ہیں دیوتا کی ایک مورتی ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ کسی عورت سے ملاپ کرنے سے پیشتر ہمیں اس مورتی کو تازہ

انسان سے سب کا چہرہ ہوتا ہے اس کے بعد ہی ہم ایک ہو جاتے ہیں۔ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے

اس نے انعام لے کر کہا تھا۔ ”تمہارا قرب میرے لیے
کچھ نہیں، کچھ..... کیا تم مجھے گلاں خون دے کر دیوڑھی خرشتوی حاصل کرنے میں
مدد کرو گی، میں اس کے عوض تمہیں مٹا مانگا انعام دے سکتا ہوں۔“

”مم..... میں..... کل رات کی ڈیوٹی پر ہوں۔“ میزبان خاتون نے کسمسا کر خود کو ہاشم الگ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی مجھے دوسرے کمروں کو بھی اینٹن کرنا ہے..... کل..... کل..... میں

عادت نے اس کی شہرت قبیلے کے

موت کی آگ میں کوکر جانے کی عادت نے اس کی شہرت قبیلے کے دور دراز علاقوں میں پھیلا دی تھی اس کے بعد جب ایک بار اس کی خدمات کو مذہب دنیا کی ایک تنظیم نے منہ مانگے داموں خریدا تو ہاشم کو بھی اپنی قدرو قیمت کا اعزازہ ہو گیا۔ اپنے پہلے ہی مشن میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ دوسری ایسی تنظیموں کی فہرست میں بھی شامل ہو گیا جو غربی کارروائیوں کی خاطر مختلف حکومتوں کو اپنے ایجنٹ پہنچائی کرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک تنظیم کے ذریعے پہلی بار کسی ایشیائی ملک میں اسے خدمت کا موقع ملا تھا۔ یہاں بھی ایک مخصوص پاس ورڈ کے ذریعے حرکت میں آنے کا حکم ملا تھا۔

چمکے سے ملے کے بعد ہاشم کا پردگراں تھا کہ وہ پہلی فرمت میں منصوبہ بندی کر کے اپنے اس دشمن کو چوکنی کی طرح مسل دے گا جس کے کر کے اسے چھاننے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگر کوئی جن نے بروقت اپنی ذہانت سے پانا پھٹنے کی خاطر موت کا رسک نہ لیا ہوتا تو شاید دونوں ہی مارے جاتے۔

وہ چمک اے اصول پسندی اور دوستانہ رویے سے مطمئن ہونے کے بعد ہی باہر نکل رہا تھا جب اس کی نظر اچانک دروازہ والے کمرے کی جسم کے مالک اور سنہری فریم کا چشمہ لگائے ہوئے فرد پر پڑی۔ ہاشم اسے اپنے ہونٹ کے باہر بھی ایک دو بار منڈلاتا دیکھنے کے بعد اسے چمک کے اڈے پر بھی دیکھ کر ہی ہاشم کی چمکی حس اچانک بیدار ہو گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چمک کے ملنے کے بجائے خود ہاشم کا تعاقب کرتا ہو وہاں تک پہنچا ہو۔ بہر حال، وہ دونوں ہی صورتوں میں ہاشم اس درمیانی خصلے کو بھی دور کرنے کے بارے میں طے کر چکا تھا، راستے کے جھاڑ جھنگ کو صاف کے بغیر وہ عام حالات میں بھی منزل تک جانے کا عادی نہیں تھا۔

اس نے وہابی میں بھی کسی تعاقب پر خاص توجہ رکھی تھی، لیکن اس بات کا یقین آ جانے کے بعد کہ اس کا چچا نہیں گیا کیا اس کا شہرہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ نظریں چار ہو جانے کے بعد شاید وہ بھی محتاط ہو گیا ہو۔ حفظ الانقام کے طور پر اس نے دور دور تک خود کو ہوٹوں کے کمرے تک ہی محدود رکھا۔ صرف سیون اسٹار کے حوالے سے اس نے احتیاطی تدابیر لی، ایجنٹ ڈوبا کو تاکید کر دی تھی کہ وہ دور دورہ کر کے موقع ملنے کے پیش نظر پوری طرح چسکے رہے۔ ولی زبان سے اس نے اپنی نظروں میں آنے والے مشکوک شخص کا سرسری حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ یہ تاکیدی بھی کر دی تھی کہ اس کی خبر لوچن کو نہ دی جائے۔

دو روز سے اس نے خود کو اپنے کمرے تک ہی محدود کر رکھا تھا۔ کھانا اور ناشتا بھی روم سروس کے ذریعے منگوا رہا۔ اس عرصے میں اسے مجبوراً روم سروس کی اس میزبان خاتون سے بھی دوستی نبھانی پڑی جو اس وقت بھی اس کا سر کھانے میں مصروف تھی۔

”آپ دروازے سے باہر نہیں گئے؟“ اس نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔ ”کمرے میں تھا بند بند آج کا دل نہیں گھبرااتا؟“

”جی نہیں..... آپ کی وجہ سے دل لگا رہتا ہے۔“

دروازے کی آؤش ہو کر ڈوما سے رابطہ کیا۔

”ہم..... کیا بنا ہے؟“ دوسری جانب سے سٹ لہجے میں سوال کیا گیا۔

”کیا تم آس پوزیشن میں ہو کسی طرح اسے قابو کر سکو؟“

”نہیں.....“ جواب ملا۔ ”میں تھا ہوں اس لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ البتہ اس کا تعاقب کیا جاسکتا ہے۔“

”اس میں بھی رسک ہے لیکن ہے اس کا کوئی دوسرا سٹیج بھی آس پاس موجود ہو۔“ ہاشم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کی نظریں دروازے کی آؤ سے مطلوبہ شخص پر نہیں جھاس وقت موبائل پر کسی کے نمبر پیش کر رہا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں سیون اسٹار کی جانب سے کیا احکامات ملے ہیں لیکن..... میرا ذاتی خیال ہے کہ اسے فوری طور پر فٹکا لگنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئے گی، زیادہ رسک لیتا بھی ہمارے اصول کے خلاف ہے۔“

”ٹھیک ہے.....“ اگر وہ نہیں جانتے تو اس کا تعاقب کرو۔ میں سیون اسٹار کی مرضی معلوم کر کے تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔“

ہاشم نے سلسلہ منقطع کر کے نظریں دوبارہ اسپورٹس کار پر جمادیں جو ایک لمبے بعد ہی حرکت میں آگئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ڈوما اس کے تعاقب میں کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اسپورٹس کار نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی ہاشم کا ذہن اپنے شکار کے بارے میں کوئی آخری نتیجہ اخذ کرتا رہا پانچ سات منٹ بعد اس نے دوبارہ ڈوما سے رابطہ قائم کر لیا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”ہسٹال روڈ پر۔“

”کیا احاطہ ہے..... کوئی دوسری کار تو تمہارا تعاقب نہیں کر رہی؟“

”نہیں۔“

”میں نے سیون اسٹار سے بات کر لی ہے۔“ ہاشم نے ایک آخری فیصلہ کر کے پرسکون انداز میں کہا۔ ”دوسرے بھی تمہارے مشورے کو پسند کیا گیا ہے۔ کسی مناسب جگہ موقع دیکھ کر سوٹ کیس پارسل کرو۔“ میں دو گھنٹے بعد تم سے دوبارہ رابطہ قائم کروں گا۔“

”ایک مشورہ میں بھی دیتا ہوں گا۔“ دوسری جانب سے ڈوما نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ہے کہ کچھ اور فزنی بھی تمہاری بھرائی پر مامور ہو..... ایسی صورت حال میں تمہارا کسی دوسری جگہ فٹک ہو جانا زیادہ برہ ہوگا۔“

پر پشیمان مت ہو مائی ڈیر..... میں خطرات سے کیلئے کا عادی ہوں۔“ ہاشم نے اپنے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

سوچ کر جواب دوں گی۔“

”ہائیز.....“ ہاشم اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ خود کو حدے جذباتی پوز کر رہا تھا۔ ”قرب آ کر اب تم دور جانے کی بات نہ کرو ورنہ..... ورنہ شاید پوتاؤں کو خوش کرنے کی خاطر مجھے زبردستی کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ جس قسم کے بیماری ہیں اس سے مراد کو بھرتا دیا تھا۔ دیتا اپنے کسی بیماری کی بزدلی بھی برداشت نہیں کرتا۔ جس اس کی خوشی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔“

”ٹھ..... ٹھیک ہے.....“ میں کل تمہارے ساتھ ہی ہوں گی۔“ خاتون نے سبے ہوئے انداز میں جھوٹی ہائی بھری۔ ”تمہاری خاطر..... میں ایک کے بجائے دو دو..... گلاس..... خون بھی دے سکتی ہوں۔“

”ہائیز.....“ ہاشم نے اس کا ہاتھ سمیٹ کر زبردستی چوم لیا۔ ”کل میں بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گا۔“

میزبان خاتون ہاشم کے دور ہوتے ہی جبراً مسکرائی ہوئی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہاشم نے پھر تہہ نہ لگایا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے دن اس نازک ادا خاتون کی جگہ اس کا استعفیٰ ہی ہوگا والوں کو موصول ہوگا۔ غاصی دیر تک وہ خود اپنے ڈار سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر اس نے سکون کا سانس لے کر بیٹھے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کا موبائل کھلتا ہے۔ تیزی سے اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اس پر ڈوما کے نام کا کوڈ چمک رہا تھا۔

”ہیلو.....“ ہاشم نے سنجیدگی سے کال انیڈی۔

”دور در کے حکم دینے والے انتظار کے بعد آج مجھے تمہارا مطلوبہ نظر افکار آ گیا۔“ ڈوما نے مدغم آواز میں کہا۔ ”اس وقت تمہاری بالکونی کے سین سامنے والے ڈرگ اسٹور میں کیا ہے تم بھی ایک نظر دیکھ کر تصدیق کر لو۔“

”تم اس وقت کہاں ہو.....؟“ ہاشم نے بالکونی کی طرف جاتے ہوئے سوال کیا۔

”گھر مت کرو..... میں جہاں ہوں وہاں تک اس کی نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔“

”ہو نہ رکھنا..... میں دیکھتا ہوں۔“ ہاشم ہٹتا ہوا بالکونی میں آ کر اس طرح اٹھوئی لینے لگا چپے دیر تک سونے کے بعد صحن اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالکونی میں گئے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے اپنا مطلوبہ شخص نظر آ گیا۔ اس وقت وہ دھری میں سوٹ میں لمبیوں تھا۔ چہرے پر حسب دستور سنہری فریم کا لائٹ بکس والا چشمہ بھی موجود تھا۔

ڈرگ اسٹور سے نکل کر وہ اپنی اسپورٹس کار میں بیٹھا۔ دائیں بائیں دیکھنے کے بعد اس نے ایک سرسری نظر ہاشم کے کمرے کی طرف ڈالی تھی۔ ہاشم اس وقت دوسری سمت دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نگاہ کا وسیع دائرہ اپنے شکار کی طرف سے غائب نہیں تھا۔ ہاشم نے ایک اور اٹھوئی لی پھر پلٹ کر کمرے میں آ گیا۔ ”میں نے جس شخص کو اسٹار کیا ہے، وہی میرا مطلوبہ آدمی ہے۔“ اس نے

فرمین کے بار بار سمجھانے کے بعد لیاقت حسین نے بھی ان پر اسرار و واقعات سے الجھنا کر کر دیا تھا جو دوسروں کے کہنے کے مطابق رونما تو ہوئے تھے۔ جبکہ وہ بھی شریک ہوتا تھا لیکن ان واقعات کی تفصیل دوسروں کو معلوم ہوتی تھی۔ خود لیاقت حسین بھول جاتا تھا۔ دوسرے اس سے معلومات کرتے تو اس کا الجھ جانا قدرتی امر تھا لیکن فرمین کے سمجھانے کے بعد اس نے اپنے ذہن کو اس ایک بات سے مطمئن کر لیا تھا کہ جو کچھ ناقابل یقین صورتیں اس کے ساتھ پیش آ رہی تھیں ان کا کوئی نہ کوئی تعلق اس ایک جتنی خاک سے ضرور تھا جس سے بزرگ نے اسے نوازا تھا اور پھر غائب ہو گیا تھا۔ تاپنا بزرگ کی فصاحت کے چٹن نظر اس نے وہ بات ذہن کے سات پر دلوں میں چھپائی تھی۔ اس سے یہی کہا گیا تھا کہ اگر اس نے اس سرستہ راز کو زبان پر لانے کی غلطی کی تو شاید یہ خسارے سے دو چار ہو جائے گا۔

اس وقت وہ صبح کا ناشا کرنے کے بعد ڈیوٹی پر جانے کو تیار ہو رہا تھا کہ فرمین نے اس کے قریب آ کر کہا۔

”کیا بات ہے۔ آج تو کچھ زیادہ ہی سکھیں پھیر رہا ہے سر میں۔“
”سچ بتا دوں۔“ لیاقت حسین نے فرمین کے سراپا پر نظر ڈال کر اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ ”تو برا تو نہیں مانے گی؟“

”جل نہ بتا۔“ فرمین نے غمزے سے جواب دیا۔ ”جب تیرے پیٹ میں مروڑ ہوگی تو خود ہی اگل دے گا۔“

”بیگم صاحب کی وجہ سے اب تو نے خاصی پٹ پڑ باتیں کرنی سیک لی ہیں۔“
”سراج صاحب کی صحبت نے تجھے بھی پکڑ بازی کے راستے بتا دیے ہیں۔“ فرمین نے سنجیدگی سے چھیڑا۔ ”جب ہی تو بھول جانے والی باتیں کر کے مصلحت پر پردہ ڈال رہا ہے۔ اس لیے کہ کہیں تیرا الجھاؤ نہ پھوٹ جائے۔“

جواب میں لیاقت حسین نے فرمین کے چہرے پر پھوٹی شفق کو دیکھا تو اس کے دل کے گدگدی سی ہوئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے فرمین کو دلو چا پھر سرسرائی آواز میں کہا۔ ”اگر میں ڈیوٹی پر جانے میں آدھے گھنٹے کی دیر کروں تو بیگم صاحب سے میری سفارش کر دے گی۔“

”دماغ چل گیا ہے تیرا؟“ فرمین اس کا مقصد مجاہد کر شرماتے ہوئے بولی۔ ”زیادہ سستی نہ کیا کر۔ جلدی سے تیار ہو کر ڈیوٹی پر جا۔“ مجھے بھی بیگم صاحب کی طرف جانا ہے۔“

لیاقت حسین نے اس کی بات مان لی۔ وہ خود بھی ڈیوٹی کے معاملے میں پابندی وقت کا قائل تھا لیکن جاتے جاتے بھی وہ حسب معمول اس کی پیشانی کا بوسہ لیتا نہیں بھولا تھا جو روزمرہ کا معمول تھا۔ ایسی سے نکل کر وہ سیدھا برابر اگلے پہلے پہنچے تو باہر سراج کی گاڑی دیکھ کر رک گیا۔

”ڈیوٹی صاحب کب آئے؟“ اس نے گاڑی سے پوچھا۔
”ابھی دس منٹ پہلے ہی آئے ہیں۔“

لیاقت حسین گاڑی کو گیراج سے نکال کر پورنگیو میں لے آیا۔ دس منٹ بعد سراج اور عثمان صاحب ایک ساتھ ہی نکلے تھے۔ سراج سرسری طور پر لیاقت حسین سے اس کی خیریت دریافت کر کے چلا گیا۔ عثمان صاحب اپنے دفتر آگئے۔ حسب معمول لیاقت حسین نے ان کے دفتر میں جانے کے بعد ان کا بریف کیس بھیکے فست سے اٹھایا اور دفتر میں چلا گیا جہاں عثمان صاحب کی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ لیاقت حسین خاموشی سے بریف کیس رکھ کر جانے لگا تو عثمان صاحب نے اسے اشارے سے روکنے کو کہا۔ وہ ہاتھ بانٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دو منٹ بعد انہوں نے فون سے فارغ ہو کر لیاقت حسین سے کہا۔

”سراج آج مجھ سے تمہارے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔“

”سب خیر تیرے تو ہے صاحب۔“

”وہ تمہیں ہفتہ دن کی خاص وجہ سے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔“

”جیسا آپ حکم ہوگا میں ویسی ہی کروں گا۔“ اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”لیاقت حسین۔“ سیٹھ عثمان نے قدرے غصیدگی سے دریافت کیا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کچھ دن تمہیں اپنے ساتھ کیوں رکھنا چاہتا ہے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب کوئی کام ہوگا تو ڈیوٹی صاحب کو۔“

”ایک بات کہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم پر نہیں مانو گے۔“

”آپ شرمندہ کر رہے ہیں صاحب۔ میں بھلا آپ کی کسی بات کا برا کیسے مان سکتا ہوں۔“

”سراج کے علاوہ میرا اور بیگم صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر ایسی باتیں ہمارے ہوش و حواس میں ہوتی ہیں جس میں تم بھی شریک ہوتے ہو لیکن۔ وہ باتیں بعد میں تمہارے ذہن میں محفوظ نہیں رہتیں۔“

لیاقت حسین ہونٹ چپا کر رہ گیا۔ جو بات عثمان صاحب دریافت کر رہے تھے وہ خود بھی اس کا بار الجھ چکا تھا لیکن۔ ڈور کا کوئی سرا حاش نہ کر سکا تھا۔ اس وقت بھی سیٹھا کر رہ گیا۔ کچھ تامل سے بولا۔

”صاحب۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ۔۔۔“

”فہمیں۔ فہمیں۔“ عثمان صاحب نے اس کی الجھن کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ تمہیں کچھ باتیں یاد نہیں رہتیں۔ تم جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش نہیں کرتے۔ سراج اور بیگم صاحب کی بھی یہی سوچ ہے۔“

”ایسا کیوں ہوتا ہے صاحب؟“ لیاقت حسین نے اس بار بڑی عاجزی سے دریافت کیا۔

”اللہ کی قسمیں دیں پھر جانتا ہے ہم صرف اتنا جانتے ہیں تم نے اب تک انجانے میں جو اگلی قدم اٹھایا ہے اس میں دوسروں کی بھلائی ہی شامل تھی۔“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تمہاری الجھاؤ داری یا کوئی اور ادعا کو پسند آگئی ہو جس کے سبب وہ تمہیں نواز رہا ہو۔ تم نے

اب تک میرے اور سراج کے علاوہ..... دوسرے جن لوگوں پر بھی جو احسان کیا ہے، وہ سب اس کے شکر گزار ہیں۔“

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ذہن میں بھر بھگولے اٹھنے لگے۔ سیٹھ عثمان نے اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

”ہوسکتا ہے کہ سراج آج یا کل کسی وقت تمہیں لینے آجائے۔ تم فرمین کی طرف سے پریشان مت ہونا۔ نیکیہ صاحبہ اس کا خیال رکھیں گی۔“

لیاقت حسین جواب میں چمک بھکا چاہتا تھا کہ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ سیٹھ عثمان نے رسیبدر اٹھا کر ”بیلا“ کہا لیکن دوسری جانب سے بولنے والے کی آواز سننے ہی وہ بے حد حیرت کی سے بولے۔

”پانچ لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی خان صاحب، برٹس میں کوئی بڑی رقم ایک جگہ جمع کرنا تو ساری دولتیں خراب ہو جاتی ہے..... میں مانا ہوں کہ اب تک آپ نے میری ڈیمانڈ وقت پر پوری کی ہے لیکن میری بھوریوں پر بھی غور کریں۔ بات اگر صرف رقم کی ہوتی تو میں ساتھ تعلقات کی وجہ سے آپ سے تقاضا نہیں نہ کرتا لیکن جیروں ملک سے جن کا روپاری لوگوں کے آرزو پورے نہیں ہو رہے، وہ بھی تقاضا کر رہے ہیں..... میں نے کسی وجہ سے اسے کام میں انویسٹ کیا تھا لیکن

مال کی سپلائی میں اگر بے قاعدگی ہوگی تو ہماری فرم کی رپہیشن بھی متاثر ہوگی۔ ساری مکمل سامان کا ہے۔ یہ آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ میں آپ کی پریشانی سمجھ رہا ہوں لیکن کسی سے آپ کی دوستی یا دشمنی آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میرا بھلا اس کی خاطر نہیں..... ہاں، اس اونچے جگہ بھی ہوتی رہتی ہے لیکن آپ کی طرف سے مال سپلائی نہ ہونے کے سبب ہمارے برٹس پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ بھی اس پر غور کریں۔“

سیٹھ عثمان کی انھیں بڑی جتنی جاری تھی۔ چند لمحوں کے بعد دوسری جانب سے کی جانے والی بات سننے پر بھر بھکا کر بولے۔ ”شک ہے، میں ایک ہفتے اور انتظار کر لیتا ہوں لیکن اس کے بعد باہر والوں کی ڈیمانڈ پوری کرنے کی خاطر مجھے کوئی لکارت دے دو جو چیزیں خریدی ہوئی ہیں ان کی قیمت کا

آپ کو بھی اندازہ ہوگا..... معاہدے کی دوسرے جو زیادہ لاگت آئے گی اس کی ساری ڈسے داری آپ پر ہوگی..... یہ سوچنا آپ کی دوسری ہے، میری نہیں..... سیٹھ عثمان نے جھلا کر فون بند کر دیا۔

”کیا بات ہے صاحب..... کس کا فون تھا؟“ لیاقت حسین نے غیر اختیاری طور پر پوچھ لیا۔

”ایک مارشل سپلائی کرنے والی پارٹی جس نے وقت پر دل نہیں بھیجا اور اب مزید مہلت مانگ رہے ہیں۔“

مارشل کے کاروبار کے حوالہ اس کر لیاقت حسین کے دل میں اپنے والد سردار فرزا خان کا خیال ابھر آیا۔ وہ بھی بڑے چیلنے پر مارشل سپلائی کا کام کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ سوات (یونیر) سے آنے والا جیتی پتھر اسی کے علاقے میں آتا تھا جہاں اسے کرش کرنے کے بعد مختلف صورتوں میں ڈھالا جاتا تھا۔ نوشہرہ سے جہانگیرہ تک بے شمار چھوٹے بڑے تاجر اس کام میں ملوث تھے جو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی خاطر اوچھے بھٹکنے سے بھی انکار کرتے تھے۔ بعد میں ان کی دشمنیاں

پشت در پشت چلتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ لیاقت حسین اس بات سے بھی واقف تھا اس کا باپ خان سردار فرزا خان مارشل سپلائی کرنے والے بڑے تاجروں میں شمار ہوتا تھا۔ ایک دو بار کچھ دوسرے کاروباری لوگوں نے اسے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی، لیکن بعد میں ہونے والی سخت کارروائی کے بعد وہ بھی ایک ایک کر کے سردار فرزا خان کی اوچھی حریف کی تک ہاتھ باندھے چلے آئے تھے۔ لیاقت حسین اپنے خیالوں میں گم تھا جب سیٹھ عثمان نے اسے مخاطب کیا۔

”تم کیا سوچتے ہو؟“

”آپ کو نقصان ہو اور مجھے دکھ نہ ہو.....“ لیاقت حسین نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”تمہارا دردور نہیں ہے لیاقت حسین..... برٹس میں اس قسم کے مکمل ٹھانے ہوئے رستے ہیں۔ تم گہرمت کرو، میرا جتن نقصان ہو گا وہ معاہدے کی رو سے مال سپلائی کرنے والے کو بھگتنا پڑے گا۔“

لیاقت حسین خاموشی سے دفتر سے باہر گیا لیکن اس کے ذہن میں باپ کا جو خیال آیا تھا اس نے اسے اندر سے مضطرب ضرور کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کسی معاملے میں لپک دکھانے کا حامی نہیں تھا۔ پتھر کا کاروبار کرتے کرتے اس کا دل بھی پتھر ہو گیا تھا جو اس نے فرمین کے ساتھ اسے شادی کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی اپنی حریفی کے دروازے سے بھی اس پر بند کر دیے تھے، لیکن لیاقت حسین اولاد ہونے کے ناتے باپ کی اس شفقت اور محبت کو بھی فراموش نہیں کر سکا تھا جو اس نے لیاقت حسین کو پال پوس کر جوان کرنے کی خاطر کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو بیٹے اس کے

اور باپ کے درمیان پیدا ہوئی تھی وہ بھی نہ کسی ضرور بھر جائے گی، لیکن وہ وقت کب آئے گا؟ اسے اس کا اور اک نہیں تھا۔ ہر چند کہ سیٹھ عثمان نے کاروباری پارٹی کا کوئی نام یا حوالہ نہیں دیا تھا لیکن ایک غلط فہمی جو اندر ہی اندر اس کے خون کو جوش دلارہی تھی۔ اس کی رگوں میں کرش کرنے والا خون بھی فراز خان کے علاوہ کسی اور کا نہیں تھا۔

سیٹھ عثمان کے آفس سے نکل کر وہ باہر لان میں رکھی ہوئی ایک بیکہ کی کرسی پر بیٹھ گیا قریب ہی اہل کام کا چڑیا بھی موجود تھا۔

”کیا بات ہے لیاقت بھائی؟“ اس نے کریدنے کی کوشش کی۔ ”تم اس وقت اپنی عادت کے مطالبہ موڈ میں نہیں نظر آ رہے۔ تھی تو اچھا ہے؟“

”رات دیر سے نیند آئی، اسی کی کچھ ٹھنک باقی رہ گئی ہوگی۔“ لیاقت حسین نے بات بنانے کی خاطر جواب دیا۔

”تم مھر جا کر وہ گھڑی اور کر سیدی کر لو۔ صاحب نے یاد کیا تو میں لپک کر تمہیں آواز دے لوں گا۔“

”نہیں..... میں ڈیوٹی کے وقت آرام نہیں کرتا۔ طبیعت میں تھوڑی بہت اونچے نیچے تو ہوتی رہتی ہے۔“ لیاقت حسین چڑچڑی سے باتیں کر کے دل بہلانے لگا۔ کچھ دیر بعد آفس کی گھنٹی بجی تو چڑچڑی

قدم اٹھاتا اندر چلا گیا۔ لیاقت حسین نے اس بات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی جو اسے ابھاری تھی۔ کیا ضروری ہے کہ حقیقت جانے بغیر وہ اپنی جان بھگان کرتا؟ اس نے طویل الجھڑائی کے کراس سوچے سے نجات حاصل کرنی چاہی۔ اسی وقت ایک مالوس آواز اس کے وجود کے احاطے میں گونجی۔

”قدرت کا نظام اور اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں لیاقت حسین۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اس کی دیکھ نہ پہنچ سکے۔“ یہ آواز لیاقت حسین کی اپنی آواز تھی جو اس کے اندر سے اترتی تھی۔

”ہم زاد.....“ لیاقت حسین تسکیر کر چھوٹ گیا۔

”جو دھوکے میں دل کی گھرائیوں سے ابھرتا ہے وہ بے سبب نہیں ہوتا۔ اس میں بھی خدا کی کارگرگی مضمر ہوتی ہے۔“

”تو کیا وہ.....“

”وقت کا انتظار کرو۔“ اس کی بات رد کر کے کہا گیا۔ ”ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس کے کارخانے میں دیر سو بھر بھی نہیں ہوتی تمہاری بے چینی سے وہ چینیوں سے لیکن فی الحال اسے کھانگے کی کوشش نہ کرو۔ جو تم نہیں دیکھ سکتے وہ میں دیکھ سکتا ہوں اس لیے یہی مشورہ دوں گا کہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا۔ وقت اور حالات خود تمہاری رہنمائی کریں گے۔“

”تم جب چاہتے ہو ہدایت دینے آ جاتے ہو لیکن اگر کبھی مجھے تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو.....؟“

”تمہاری یہی معصوم باتیں کائنات کے مالک کو بھی پسند ہیں۔ اس حق نہ بنو۔ میں تمہارا ہمراہ ہوں تو تم سے کبھی دور بھی نہیں رہتا لیکن..... جب مجھے اجازت ہوتی ہے تو تمہیں اچھے برے سے آگاہ بھی کر دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے اختیار رکھی نہیں ہے۔“

”داخل کا ٹرک بھیجے والی پالی کون ہے؟“ لیاقت حسین نے بے چینی سے سوال کیا۔

”میں نے تمہیں کریدنے سے منع کیا ہے۔ دوبارہ اس معاملے میں زبان کو قابو میں رکھنا۔ جو کچھ ہانڈی میں ہے وہ خود باہر آ جائے گا اس کے علاوہ ایک اشارہ اور دوسرے رہا ہوں..... کچھ تو میں پھر سرابدار نے کی کوششوں میں مصروف ہیں، ان سے ہوشیار رہنا۔“

”کس کی بات کر رہے ہو.....؟“ لیاقت حسین نے بے چینی سے دریافت کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا تو وہ اندر ہی اندر اٹھنے لگا۔



شبنم اس وقت فصیح حامد کے ساؤنڈ پروف کرے میں تھی جب کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی قحطانہ مسکراہٹ ابھرتی تھی۔ اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے وہ شبنم کے قریب آ کر رکھا۔ ایک لمحے اس کے سر ابا کا غور جارتہ لیا پھر متنی خیر لہجے میں بولا۔

”کیا تم اس خوبصورت سووی کو دیکھ چکی ہو؟“

”نہیں..... شبنم نے تیزی سے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے افضل خان سے جو کام لیا ہے اس کی نتائج میری توقع سے کہیں زیادہ خوبصورت اور شاندار ہیں۔“

شبنم بات کی جڑ تک پہنچ کر مسکرائی۔ وہ سمجھ گئی کہ جب اس باتم علی اور اس کی بیوی کی سووی کو دیکھنے ہی کی خاطر کمرے سے گیا ہوگا۔ اس نے سکون کا سانس لیا لیکن اس گھٹانے کے مسئلے پر وہ مکمل کر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تم اپنی اس شاندار کارکردگی پر مجھ سے کیا توقع رکھتی ہو؟“ فصیح حامد نے بے تکلفی سے اس کے دونوں شانوں پر ہلکے وقت ہاتھ رکھے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

شبنم خوش ہونے کے بجائے اندر ہی اندر کسم پئی دل پر جبر کر کے بولی۔ ”آپ نے جو مراعات مجھے دے رکھی ہیں وہی بہت ہیں۔“

”خیر اخیاں ہے کہ تم اب ایک ایسے اخصام کی منتحق ہو جو افضل خان کو بھی اس بات کا احساس دلا سکے کہ پانچویں صرف مالک کے اشارے پر دم ہلانے کے عادی ہوتے ہیں۔ کسی وجہ سے بھی ہو سکتا ان کے لیے کے فائدہ مند ثابت نہیں ہوتا۔“

”میں سمجھی نہیں ہاں۔“

”افضل خان کا خوبصورت اپارٹمنٹ یاد ہے تمہیں.....؟“

”ہاں..... اسے شاید پولیس نے ابھی تک سبیل کر رکھا ہے؟“ شبنم کا جھجس جائے لگا۔

”وہ بھی میری عرضی سے ہوا تھا اور اب.....“ فصیح حامد نے شبنم کے قریب ہوتے ہوئے سر ہرائی آواز میں کہا۔ ”اب جو کچھ ہوگا وہ بھی میرے اشارے پر ہوگا۔“

شبنم کسمانے لگی۔ وہ فصیح حامد کے بڑے ہوتے قدم اور ارادے سے بھانپ چکی تھی، لیکن اس کی طبعی طور پر اتاری ہوئی غریب اخلاق تصویریں اس کے پیروں میں طوق غلامی ثابت ہوتی تھیں۔ اس سے خوشتر کہ وہ کوئی درخواست بھی فصیح حامد نے اپنے بھدے ہونٹوں سے اس کے ہونٹ لگا دیے ایک لمحے تک اس کی کمر پر ہاتھ پھیلتا رہا پھر طبعی طور پر ہٹا۔

”میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں..... دس روز بعد تم افضل خان کے قلیٹ کی مالک ہوگی۔ اس مرحلے میں اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت اعزاز میں دیکوریت کیا جائے گا۔ اس کے اہدوم اگر چاہو تو افضل خان کو بھی سر چھپانے کی جگہ دے سکتی ہو۔“

”کیا اسے ساتھ رکھنا مناسب ہوگا؟“ شبنم نے اپنے نازک اور سینکے رومال سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے زبردستی مسکرائے کی کوشش کی۔

”ہاں..... جب تک میں اسے پورے طرح آزمائے لوں، اسے آزادی سے کھائیں رکھا جا سکتا۔“

شبنم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فصیح حامد نے اپنی ایزی چیز پر بیٹھے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”جو افراد تیزی سے ترقی کرتے ہیں کبھی ایک معمولی سی بھول نہیں دوبارہ ذہن پر لے آتی

دوم 17 شکل

”او۔۔۔۔۔ کے پاس.....“ جواب میں تاجدار کی کا انداز اختیار کیا گیا۔ ”میں نے پہلے بھی اسے آپ کی ہی خواہش پر لفت دی تھی۔“

”میں نے تمہارے اتنے بے بارے میں جو کہو کہا تھا وہ مجھے یاد ہے..... اس لیے اب تم دوبارہ میرا منہ کڑی کی کوشش بھول کر بھی نہ کرنا۔“

”عاشت پاس.....“

تھیں گے جانے کے بعد صبح حامد نے انٹرکام کے ذریعے کنول کو دوبارہ طلب کیا۔ صبح سے اسے
 ڈوٹن جو فوج پرانی تھی تھیں۔ دوشانہ کار کیا گیا ہیں۔ ”ایک شادی کے سلسلے میں کنول کی ماں رضامندی
 دوسری دم خیمہ ہوئی جواب سنیہ رحم علیہا خانی کو اس کے سامنے سی پالتو جانور کی طرح دم
 سامنے بھجور کر سکتی تھی۔“

”تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ آج میں کتنا خوش ہوں۔ تمہاری ماں کی ہاں نے میری اس بات کو پورا کیا ہے جو روز اول سے میرے دل میں چل رہی تھی۔“

”میں بھی اس اپنی خوش قسمتی ہی کوں گی۔“ نول کے جیسی ہونٹ کپکپانے لگے۔

”میری کوشش ہوگی کہ میں بہت جلد تم سے نکاح کر لوں لیکن..... میں نے کہا تھا کہ یہ شادی رہے گی۔ تب نہیں ہر وہ چیز حاصل ہوگی جس کا میں وعدہ کر چکا ہوں مگر..... تمہیں بہر صورت اپنی اپنی ہانڈی رکھنی ہوگی اور میں..... میں تم سے بے وفائی نہیں کروں گا۔“

”رستم علی کے خلاف حسب فشا کامیابی حاصل کر لینے کے بعد میں بھی آپ سے ایک پرانی خواہش پر غور کرنے کی درخواست کروں گی۔“

”میں اس مثال سے کیا سمجھوں؟“ شبنم نے ڈرتے ڈرتے وضاحتی نظروں سے سوال کیا۔

”میرا وعدہ قائم رہے گا۔ جو فاصلہ ہمارے درمیان ہے میں اسے پھلانگنے سے حتی الامکان

”کیوں؟..... کیا تمہیں میرے وعدے پر یقین نہیں ہے؟“ شیخ حامد کا لہجہ جارحانہ ہو گیا۔
 ”سہ..... میرا یہ مطلب؟“

”بھارتو ایسا ہی لگتا ہے.....“ شبنم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”بچھل ملاقات میں میزم نے بتایا تھا

”آئی سی.....“ اس نے جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔ ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ میڈم کا اس حد تک خیال رکھتے ہیں۔“

”تم نے افضل خان کے ذریعے سیلوں پر ستم علی آقا خانی کے خلاف ایک بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس تنازعہ کو میرے ذہن پر قائم رہنے دو۔“ اس بار بگ باس کا لہجہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ ”افضل

”مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔“

”دفتر بابا ہر کسی کو اس بات کی چھبک نہیں ہونی چاہیے اور.....“ اس نے بڑی اپنائیت سے کنول کے کپکپاتے ہاتھوں کو منہ پھولی سے گرفت میں لے کر کہا۔ ”کل تم دفتر آنے کے بجائے اپنا اتھنہ کسی کئی کے ہاتھ روانہ کر دینا۔“

کنول نے اسے حریت اور وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”میں اسٹاف کو یہی تاثر دوں گا کہ تم نے اپنی والدہ کی بیماری کی وجہ سے ملازمت چھوڑی ہے

اس کے بعد.....“

صبح حامد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے ہاتھ پر پیار سے دباؤ ڈالا تو کنول کا چہرہ تب کر گہرا ہو گیا، صبح حامد کے اندر کا عیاں آدھی بھی سراپا ہمارے لیکن اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور کنول نے گہرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ صبح حامد نے جھلا کر فون کا ریسورڈ اٹھایا..... ”کون.....؟“

”اب کیا بکواس کرنا چاہتے ہو.....؟“ صبح حامد کے چہرے پر ہچکچاہٹ کی کیفیت بتدین بڑھنے لگی۔ ”تم نے اس بائزرڈ کے آفس جانے سے پہلے مجھ سے اجازت نہیں لی تو اب کیا بتانا چاہتے ہو.....؟“

”سر..... وہ.....“ اودھی بھلکانے لگا۔

”مجھے حالات کا علم اپنے دفتر رائج سے ہو گیا ہے۔ جو کچھ ہو چکا اسے بھول جاؤ اور..... اپنی زبان بند ہی رکھنا، سلاپ کے ریلوں کا زور توڑنے کی خاطر انسان کو کبھی بھی اپنے ہاتھ سے بند بھی توڑنے پڑتے ہیں۔ تمہاری حیثیت کسی معمولی بندے سے زیادہ نہیں ہے۔ تم شاید میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے۔“

”نیس باس..... لیکن وہ.....“

”گھٹ لاسٹ.....؟“ اس بار خرا کر کہا۔ ”جو کہا گیا ہے اس کا دھیان رکھنا ورنہ.....“

صبح حامد نے جھلا کر ریسورڈ پر پڈل پر دھکا دیا، کنول اس کا موڈ خراب دیکھ کر بولی۔

”آپ اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کریں، ڈراڈز ای بات پر.....“

”تم ٹی الحال اپنے کمرے میں جاؤ۔“ صبح حامد نے بہ دستور تنبیہ کی سے کہا تو وہ خاموشی سے

اٹھ کر چلی گئی۔

کنول کے جانے کے بعد حامد نے اپنا خاص موبائل نکال کر بلیک ٹائیگر کے مخصوص کوڈ فنچ کیے۔ دوسری جانب سے فون سنائی دیتی رہی لیکن کال پر ریسپونڈ نہیں کی گئی۔ وہ جھلا گیا۔ اس سے چشمہ اسیا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے سلسلہ متقطع کر کے دو تین بار پتے سر سے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں۔

اودھی کی فون کال نے اس کا موڈ خراب کر دیا تھا، بلیک ٹائیگر کی خاموشی اسے مگرں گزر رہی تھی، وہ مضیاں میچھ کر ہونٹ کاٹنے لگا، اسے کسی بھی ماتحت کی عدم تعمی برداشت کرنے کی

عادت نہیں تھی، ایک لمحہ تامل کے بعد اس نے دوسرے خاص آدمی کو کال کرنے کی خاطر موبائل اٹھایا۔ اسی وقت اس کا اپنا موبائل گھٹکانے لگا۔ روشن ڈائل پر وہی نمبر ابھرا جس سے وہ رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

”تم اس وقت کہاں ہو.....؟“ سہاٹ لیجے میں سوال کیا گیا۔

”سر..... میں اس وقت نمبرون کی تباہ شدہ گاڑی سے خاصا دور کھڑا حالات کا جائزہ لے رہا ہوں۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو.....؟“ صبح حامد حیرت سے اچھل پڑا۔ ”یہ حادثہ کیسے ہوا؟“

”ابھی تفصیل نہیں بتا سکا سر لیکن..... ایک بری خبر ضرور دے سکے ہوں۔“ دلی زبان میں جواب ملا۔ ”تباہ شدہ گاڑی سے اس کی ڈیڈ باڈی ہی برآمد ہوئی ہے غالباً کسی دوسری گاڑی نے قریب سے گزرتے ہوئے اسے نشانہ بنایا اور جھم میں شم ہو گئی۔“

”تفصیل معلوم کر کے مجھے دوبارہ کال کرو۔“ صبح حامد کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے شدت سے انتظار ہے گا۔“

دوسری جانب سے ”نیس سر“ کہہ کر سلسلہ متقطع کر دیا گیا۔ صبح حامد کے چہرے پر تنقیرات کے گہرے بادل مٹلانے لگے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر نمبرون کی اطلاع درست ثابت ہوئی؟ بلیک ٹائیگر کو اس کے خیال کے مطابق ٹھکانے لگا دیا تو تھا یہ ایک بڑا نقصان تھا۔ بلیک ٹائیگر جس مشن پر کام کر رہا تھا اس کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ صبح حامد کی کوئی پر حملہ کرنے والے کون لوگ تھے۔ آج صبح بھی اسے گھر سے نکلے ہوئے بلیک ٹائیگر کی کال موصول ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ”باس، میں نے ایک اہم سرائع تلاش کر لیا ہے جس کے بعد مجھے ان لوگوں تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا جنہوں نے آپ پر حملہ کر کے اپنی موت کی کوڈی دی تھی۔“

”کون لوگ ہیں.....؟“

”زیادہ سے زیادہ دو بارہ گھنٹے اور انتظار کر لیں، اس کے بعد میں تفصیل سے ان کی نشاندہی کر دوں گا۔“

”کیا اس سرائش میں ایک سے زیادہ پارٹیاں ملوث ہیں؟“

”شام تک پارٹی کی نشاندہی بھی ہو جائے گی۔ ٹی الحال ایک سرائع ملا ہے۔ اسے قابو کرنے کے بعد باقی کرہیں بھی خود بخود چلی جائیں گی۔“ بڑے اصرار سے کہا گیا تھا۔ ”آپ گھر نہ کریں، میں انہیں پاتال کی دے سے بھی کال کر جنم ریسرڈ کر دوں گا۔“

”گھڑ..... کام ہویشاری سے کرنا۔“ بساط کب پلٹ جائے؟ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ آئی ڈی ویس پوئلڈ ایک اینڈ آئی ڈی بیٹ۔“

صبح حامد کو بلیک ٹائیگر کی صلاحیتوں پر بڑا گھمبیر تھا لیکن اس..... یہ گھمبیر بھی خاک میں مل گیا تھا۔ ایک مہم میں امیدی کو شاید نمبرون نے دور سے جو اعزازہ قائم کیا تھا وہ غلط ثابت ہو لیکن..... دو

کھنے کے بعد اس کی تصدیق بھی ہوگئی تو وہ کچی دودھ سے کے مانند اپنا ہی دھم چائے پر مجبور ہو گیا..... اسے بلیک ناچر کی موت سے زیادہ اس بات کا حال تھا کہ اس کے دشمنوں کا نام اس کی زبان پر آئے کیوں رہ گیا تھا؟



لیاقت حسین اس وقت سراج کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔

جس روز سیٹھ عثمان نے اسے بتایا تھا کہ سراج اس کو لینے آئے گا اسی رات تقریباً گیارہ بجے سراج اسے لینے آ بھی گیا تھا۔ اس وقت لیاقت حسین فرمین کے ساتھ بیٹھا منٹگو میں مصروف تھا۔ سراج والی بات اس نے فرمین کو بھی بتادی کی۔ اس کا خیال تھا کہ فرمین دس روز تک اس سے ملکہ رہنے پر احتجاج کرے گی لیکن فرمین نے اسے جھپٹنے کی خاطر کیا تھا۔

”تمہارے سراج صاحب بھی مجھے جیسے رخصت کرتے ہیں۔ پولیس والے ایک بے چاری یہی کو بیڑیاں پہنا کر گھر میں ڈال لیتے ہیں، اس کی طرف کوئی غلط نظروں سے دیکھے تو اسے قاتلے میں بند کر کے پرانی روٹی کی طرح ذبح ڈالتے ہیں لیکن خود ادرھ اور مہارے مارنے سے بھی ہاتھیں آتے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ لیاقت حسین نے فرمین کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اپنے سراج صاحب ایسے نہیں ہیں۔ میں نے انہیں کبھی غلط راستے پر چلنے نہیں دیکھا۔“

”میں دیکھا تو اب دیکھ لے گا۔“ فرمین نے یہ دستور معنی خیز اعزاز میں جواب دیا۔ ”پولیس کے ٹھکانوں میں کیا نظری کی کمی ہے جو وہ جتنے بھی توپ کچھ کر لے جا رہے ہیں۔ ضرور کوئی خاص چکر ہو گا۔ میری بان تو انکار کر دے کوئی خوبصورت بھانڈا بنا کر۔ بزرگوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ پولیس والوں کی دوستی اور دشمنی سے اللہ ہی محفوظ رکھے۔“

”چھوڑ ان باتوں کو۔“ یہ بتاؤ میرے بغیر دے لے گی، اکیلے دس بارہ دن؟“ لیاقت حسین نے بڑی محنت سے اس کی آنکھوں میں جمنا لگا۔

”جگ ہتا دوں۔“

”ہاں۔“ تجھے میری قسم۔“ لیاقت حسین اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا، اس کی زلفوں سے کھیلنے لگا۔

”م۔ میں بیگم صاحب کی طرف چلی جاؤں گی۔“

اس بار فرمین اپنے پیار کو چھپانے لگی۔ ”تیرے بنا اس اکیلی انکس میں میرا دل نہیں لگے گا۔“

”یہی بات تو سراج صاحب کے سامنے کہو بتا۔“

لیاقت حسین نے مصحوبیت سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ تیرا کہا کبھی نہیں تائیں گے۔“

”دماغ چل گیا ہے تیر۔“ فرمین نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا باتیں کسی اور کے سامنے زبان سے نہیں نکالی جاتیں اور۔ تیرے سراج صاحب، وہ تو ایک نمبر کے کھاگ ہوں گے۔ کیا سوچیں گے میرے بارے میں؟“

ان کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں جب سراج بھی آ گیا۔ لیاقت حسین نے اٹھ کر دروازہ کھولا فرمین جھاگ کر بچن کی طرف چلی گئی۔ سراج نے پہلی بار انکس کی اس صے میں قدم رکھا تھا۔ وہاں کے رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر بولا۔

”فائن۔۔۔۔۔“ اس نے لیاقت حسین سے کہا۔ ”تمہاری گھروالی نے تو اسے بڑی خوبصورتی سے سجا رکھا ہے۔“

”یہ سب بیگم صاحبہ کی مہربانی ہے، ورنہ ہمارے پاس دوٹوٹے پھوٹے بکسوں اور ایک بستر کے علاوہ اور کیا تھا۔“

لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کہا۔

”سب سے قیمتی چیز تمہارا اور اس کا شادی ہے، لیاقت حسین! جس کے سامنے ان عارضی سہاؤ کی چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں۔“

لیاقت حسین انکساری سے کہتا کہ وہ کیا۔ اس کے اصرار پر سراج بیٹھ گیا۔ فرمین جلدی سے چائے کی ٹرے لیے سامنے آئی، کچھ بکسلش اور حسین چڑیں میں ٹرے میں بڑے سیلفے سے رکھی ہوئی تھیں۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔“ سراج نے کہا پھر لیاقت حسین کے ساتھ چائے پینے لگا۔ کچھ دیر ادرھ اور کھٹگو ہوئی رہی پھر سراج اصل مقصد کی طرف آیا تو لیاقت حسین نے مسکرا کر کہا۔

”میں آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔ صاحب نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آپ لینے آئیں گے۔“

”تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا فرمین۔؟“

سراج نے اس بار فرمین کے چہرے کے تاثرات پڑھتے ہوئے دریافت کیا۔

”ملازمت تو ملازمت ہوئی صاحب۔“ فرمین نے نظریں جھکا کر دم نیچے میں کہا۔ ”اس میں فرما جو داری کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ لیاقت کی طرح میں بھی آپ کے کسی حکم سے انکار تو نہیں کر سکتی۔“

”آئی سی۔؟“ سراج نے پولیس والوں کی چال چلی۔ ”ٹھیک ہے، میں لیاقت کو ساتھ نہیں لے جا رہا۔ اب تو خوش ہو۔“

”میں نے منع تو نہیں کیا صاحب؟“ فرمین اپنی صاف گوئی پر سہم کر کھڑی ہوگئی۔ ”آپ شوق سے لے جائیں لیاقت کو۔ یہ اگر آپ کے کسی کام آگیا تو یہ بھی ہمارے لیے بڑی عزت والی بات ہوگی۔“

”دل سے کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ سراج نے اسے ٹھوٹا لیکن اس کا پولیس تجربہ بتا رہا تھا کہ فرمین کو لیاقت حسین کی جدائی منظور نہیں ہے۔

”دل میرے پاس کہاں ہے صاحب۔۔۔۔۔“ وہ نظریں جھکا کر روشنی سے بولی۔ ”وہ تو آپ کے

لیاقت حسین کے پاس ہے۔“

فرمین کے جواب پر سراج بھی لا جواب ہو گیا۔ خود لیاقت حسین کو بھی حیرت تھی کہ فرمین نے ایک ہی جملے میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد لیاقت جانے لگا تو سراج نے جیب سے ایک ناموہاں نکال کر فرمین کو دیتے ہوئے کہا: ”اس میں لیاقت حسین کے علاوہ میرا اور لباس کا نمبر بھی موجود ہے، تم جب چاہو ہم سے بات کر سکتی ہو۔ کوئی دشواری پیش آئے تو راجیل رہنمائی کر دیں گی۔“

گھر سے جاتے وقت بھی فرمین نے لیاقت کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ اس وقت لیاقت ابھی آنکھوں کے تاثرات میں غوطہ کھا رہا تھا جب سراج نے اسے بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

”لیاقت حسین..... جانتے ہو..... میں تم کو دس بارہ روز تک اپنے ساتھ کیوں رکھنا چاہتا ہوں؟ مجھے تمہاری ان پوشیدہ قوتوں کی ضرورت ہے جو تمہاری رہنمائی کرتی ہیں لیکن اس طرح کہ بعد میں تمہیں بھی کچھ یاد آدیں رہتا۔“

لیاقت حسین خاموش رہا۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا، سراج نے بات جاری رکھی۔

”میں نے محسوس کیا ہے کہ جب بھی تم نے خدا کی راہ میں کوئی نیک کام کی غنائی..... وہ مخفی قوتیں تمہارے کام آتی ہیں، میں بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کچھ ایسے ہی شیطان مفت مردود لوگوں کے غرور کو خاک میں ملاتا چاہتا ہوں جو فرعون بن بیٹھے ہیں، ان کے ہاتھ اٹتے بے ہیں کہ قانون کی بالادستی بھی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ایسے بدکرداروں کی سرکوبی کرنے میں اگر تم میرے کام آئے تو مجھے بھی سرخرو ہونے کا موقع مل جائے گا۔“

”لیکن صاحب..... جب مجھے کچھ یادیں رہتا تو میں بھلا آپ کی کیا رہنمائی کر سکوں گا؟“ لیاقت حسین نے سادگی سے جواب دیا۔

”یہ سب اس قادر مطلق پر چھوڑ دو۔ جو دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔“ سراج نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔

”میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب بھی تمہارے دل میں کوئی اٹوٹا خیال آئے۔ کوئی بھی ایسا بات جو خود تمہاری سمجھ سے بالاتر ہو۔ وہم بلا تکلف مجھ سے کہہ دو گے۔“

”میں اب بھی آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا صاحب.....“ لیاقت حسین نے الجھتے ہوئے کہا۔ ”جب مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا تو میں اس بات کا فیصلہ کس طرح کروں گا کہ کون سی بات آپ کے مقصد کی ہوگی؟“

”تم صرف میری کبھی ہوئی بات پر عمل کرو۔ کیا سمجھ ہے کیا غلط، یہ اوپر والے کی مرضی پر چھوڑ دو۔“

”ایک درخواست میں بھی کروں گا۔“
”کہہ.....“

”جو بات میری زبان سے غیر اختیاری طور پر نکلے تو آپ اس کا تذکرہ مجھ سے بعد میں بھی نہ کریں۔ مجھے کچھ یادیں رہتا تو بلا وجہ ذہن میں ایک کاٹا سا چھارہ جاتا ہے۔“
”میں نے تمہیں ہمیشہ دوست سمجھا ہے لیاقت حسین، اب بھی ایک دوست کی طرح تمہاری بات کا خیال رکھوں گا۔“

”شکر یہ صاحب۔“ لیاقت حسین نے اسے تفکر نہ نظروں سے دیکھا پھر وہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ کچھ بھولی بھری یادیں اس کے ذہن میں کھیلنے لگیں، خاص طور سے اس کے ذہن میں ایک بار پھر سچے سچے عثمان اور اس کی ماربل چلائی کرنے والی پارٹی کی باتیں گونجنے لگیں، وہ سینہ چٹان اور سراج کے دوستانہ تعلق سے بخوبی واقف تھا۔ شاید سراج اس پارٹی کے سلسلے میں لیاقت حسین کی ذہنی مکملش کو دہرانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہو؟ ایک پل کو اس کا دل چاہا کہ وہ سراج کو اس سلسلے میں کریدے لیکن..... دوسرے ہی لمحے سچے سچے اس کی سماعت میں صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگے۔ ”ان باتوں کوئی امانی ٹھکانے کی کوشش نہ کرو۔ وقت کا انتظار کرو۔ وقت اور حالات خود تمہاری رہنمائی کریں گے۔ اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔ جو کچھ یادیں ہیں وہ یہ خود باہر آ جائے گا۔“

”کس خیال میں گم ہو لیاقت حسین؟“ سراج بے تکلفی سے سوال کیا۔ ”کیا تمہیں فرمین سے وقتی دوری پسند نہیں ہے؟“

”نہیں صاحب.....“ اس نے چمک کر جواب دیا۔

”میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔“

”اور کیا سوچ رہے تھے؟“

”اگر میں آپ کے کسی کام نہ آ سکا تو.....“

”اس سلسلے میں اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔ صرف ایک بات یاد رکھو، زندگی اور موت کی طرح کامیابی یا ناکامی بھی اللہ ہی کے اختیار کی بات ہے..... میں ہر حال میں صراطِ مستقیم پر چلنے کا کہا گیا ہے، آگے جو اسے منحور ہو۔“

لیاقت کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سراج کا موہاں کتنے لگا۔ دوسری طرف سے ڈی آئی جی کرانمر آغا منظر کے نمبر روشن دیکھ کر وہ چمکا۔ ”اس وقت کیسے یاد کیا سر.....؟“ اس نے موہاں آن کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”ابھی کسی نامعلوم شخص نے مجھے ایک حیرت انگیز اطلاع دی ہے۔“ ڈی آئی جی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا تعلق سی سائڈ کے اس کرکٹس ایریا سے ہے جہاں آج ہی ایک سپورٹس کار کا حادثہ ہوا تھا، پولیس کو اس میں سے ایک خون آلود لاش بھی ملی تھی جسے گولی مار کر ہلاک

دارا نے ماں کا جواز منظر سے دل سے سنا۔ سن کر حلق کے نیچے بھی اتار لیکن اس کا دل اس کہانی کو سامنے پر تیار نہیں تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی جھول ضرور تھا جو اس کے اندر کے جھس کا اہار رہا تھا۔ بڑس میں باپ کے ساتھ شریک ہونے کے ناتے اسے بھی تمام کیفیت کا احساس تھا، بازاری ادب بچ، بڑس کی روٹنگ اور دیگر حالات کی خبریں بھی اسے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے ملتی رہتی تھیں۔ اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ بڑس کا ایک اہم شعبہ بڑس رانیئر (BUSINESS RIVALRY) بھی ہے۔ اس ضمن میں اس کی ذاتی فہرست میں بھی محض حامد ایسیو ایش کا نام ٹاپ پر تھا۔ ان عی شہادت کی بنا پر ترم علی نے اپنی اور مگر کی حفاظت کی خاطر انکس سکیورٹی گارڈز کی خدمات حاصل کی تھیں۔ دارا نے اس سلسلے میں باپ سے دلی زبان میں استفسار بھی کیا تھا لیکن رستم علی نے اسے حفاظتی احتیاط ظاہر کر کے بات ٹال دی تھی۔

باپ کے ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد اس نے ڈیوٹی گارڈز کو کسی ذریعے سے ٹھونے کی کوشش کی تھی۔ گارڈز کے متنازع بیانات میں اسے پوری طرح اہم نہیں ہو سکے، ماں کی وضاحتیں بھی اسے مطمئن نہیں کر سکی تھیں۔ صرف اس کی چھٹی حس متواتر اس بات کا احساس دلاری تھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے جس کو ظاہر کرنے سے کر یز کیا جا رہا ہے۔

”ماں.....“ اچانک دارا نے بڑی تنبیہ کی سے ماں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ لگاتے ہوئے دور کا کوئی سرا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی کا دوبارہ ابھرنے کی وجہ سے ڈیڑے اپنے دل پر زیادہ اثر لے لیا ہو؟“

”مم..... مم..... میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ شاید بیگم کسمار کا ہونٹ چپاتے ہوئے بولیں۔

”وہ مجھ سے اپنے کاروبار کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔“

”او۔ کے۔ آپ پریشان نہ ہوں، خدا سے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

چار روز چھوڑ کر..... دارا ذاتی طور پر معاملے کی کرید کرتا رہا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ چھٹے روز وہ ہسپتال سے گھر آیا تو روشن نے دلی زبان میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کے ڈیڑے کو کوئی بیماری لاحق نہیں ہے، ہسپتال میں شفٹ ہو کر شاید اپنے کسی دشمن کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ سرینڈر (SURRENDER) کرنے کی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار ہیں۔“

”واہٹ؟“ دارا نے روشن کو پر جھس نظروں سے گھورا۔ ”تم اس قدر یقین سے یہ بات کیسے کہہ رہی ہو؟“

”آج میں نے اپنی خاص ملازمہ کو ٹھونے کی کوشش کی تھی۔ وہ جھپٹے کچھ دنوں سے مجھے پریشان نظر آ رہی تھی۔“

”جیجی کیا لگا.....؟“ دارا نے بے صبری سے دریافت کیا۔

”وہ بہت گھبراہٹ ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے زبان کھولی ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ اگر اس کا حوالہ درمیان میں ہوگا تو اس کی لگی لگائی ملازمت بھی جاتی رہے گی۔“ روشن نے بات جاری رکھی۔ ”جس رات آپ کے ڈیڑے ہسپتال شفٹ ہوئے تھے اسی رات ہماری ایک ملازمہ کو بھی ایک ہسپتال میں خدیہ طریقے سے داخل کرایا گیا۔ میرا اشارہ گھایو کی طرف ہے۔ اس کے بائیں شانے پر گولی لگی تھی۔“

”گولی کی قسم؟“ دارا نے چپکتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہ خبر تمہاری ملازمہ کو کس طرح معلوم ہوئی؟“

”جو ڈرائیور جیسی کے ذریعے گھایو کو خدیہ طور پر لے گیا تھا اس نے رازداری کی قسم دے کر یہ بات بڑی مشکل سے اگلی ہے۔“ روشن نے مزید وضاحت کرتے وقت مسکرا کر کہا۔ ”وہ ڈرائیور اور میری ملازمہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

دارا ایک نکت سے حد بنجیدہ ہو گیا، گھایو کی خبر سننے کے بعد اس کے ذہن میں بے شمار سوال گزرتے ہوئے گئے۔ وہ تنبیہ کی سے سوچنے لگا۔ ”وہ واردات کوئی کے اندر ہوئی تھی تو گھایو کو زخمی کرنے والا باہر ہی سے آیا ہوگا۔“ کیا وہ صرف گھایو کو زخمی کرنے کی خاطر انکس گارڈز کا حلقہ توڑنے کا ریسک مول لے سکتا تھا؟ انہیں..... تو پھر اس کا اصل ٹارگٹ کون تھا؟ اس کی پشت پر یقیناً کسی خفیہ ٹاک فوجن کا ہاتھ شامل ہوگا جس نے اپنے کسی تجربے کا آدمی کو اپنا مقصد پورا کرنے کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ کیا ہوگا۔ وہ کون تھا؟ اور..... اور ماں نے ڈیڑے کو ٹھونے اور..... کارپٹ کا داغ صاف کرنے کی جو کھانی ستائی تھی اس میں کس حد تک صداقت تھی؟“

پھر داغ پر ذرا زور دینے کے بعد درمیان کی تمام گرہیں خود بخود کھلتی گئیں۔ ایک امکانی خاکہ اس کے ذہن میں بڑی سرعت سے تشکیل پانے لگا۔

”گھایو کی کام سے ڈیڑے کے کرے میں کئی ہوگی۔ اسی وقت دشمن کا ہر کارہ دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ گھایو نے خوفزدہ ہو کر ہانپنے یا شور مچانے کی حماقت کی ہوگی، تو وہ بھی لپیٹ میں آئی محض گھایو کی خاطر کوئی دیوانہ رستم علی کی خواب گاہ میں رات گئے داخل ہوئے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا اصل ٹارگٹ یقیناً رستم علی رہا ہوگا لیکن..... وہ منزل تک پہنچنے کے بعد واپس کیوں چلا گیا؟ اپنے ٹارگٹ کو زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ ماں نے ڈیڑے کی ”الٹی“ دلی بات اس حقیقت کو چھپانے کی خاطر گھونے کی کوشش کی ہوگی کہ گھایو کے دشمن سے چپکتے والے خون کو ڈیڑے نے صاف کیا ہوگا۔ اس کام کو انجام دینے کی خاطر وہ کسی ملازم کو طلب نہیں کر سکتے تھے۔ ایک حقیقت کو مخ کرنے کی خاطر کئی کہانیاں بنی گئی تھیں۔ آخر روز بعد ڈیڑے ڈاکٹروں سے سلیکٹرس حاصل کر کے گھر آ گئے، دودھ دز آرام کرنے کے بعد دفتر جاتا بھی شروع کر دیا؟“

دارا کی ابھمن بڑھتی جاتی گئی، وہ معاملے کی تک پہنچنے کی خاطر اس وقت بھی بستر پر لیٹا

کردیش بدل رہا تھا جب روشن کھک کر قریب آگئی، دارا کے خوبصورت بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیر کر پچھا۔

”کچک اٹ ایزی ڈار کنگ..... ڈیٹ نے جو کچھ کیا اس میں ان کی کوئی مصلحت بھی ضرور ہی ہوگی۔“

”اکی اگمری دیو لیکن..... جو شخص ڈیٹ کے پیڑروم تک پہنچ گیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ کیوں لوٹ گیا؟“

”دو ہی صورتیں ممکن ہیں.....“ روشن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہوسکتا ہے کہ گھایو کے دشمنی ہونے کے بعد وہ یوگلا کر فرار ہو گیا ہو یا پھر جہاز سے ڈیٹ نے اس کی ڈیٹا میٹر چوری کر دی ہو۔“

”کیسی ڈیٹا میٹر؟“ دارا نے بیوی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم رینسم (RANSOM) کے امکانات کو کیوں نظر انداز کر رہے ہو۔ ممکن ہے ڈیٹ نے اس کی مطلوبہ رقم دے کر جان چھڑائی ہو۔“

”ایسی صورت میں بھی ہماری خاموشی دشمنوں کا حوصلہ مزید بڑھا دے گی۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ تم جوتی کا مشورہ نہیں دوں گی۔ ٹوری طور پر جہاز کی ڈیٹا میٹر کے کسی سوچے سمجھے منصوبے کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔“

دارا نے حالات کی روشنی میں روشن کی بات سے اتفاق کیا۔ بات گھر کی چار دیواری سے نکل کر اگر میڈیا تک پہنچ جاتی تو برقیں کی سادھ کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پولیس درمیان میں آجاتی تو رستم علی کی زندگی کو خطرے کے امکان کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتے۔ جو خطرناک لوگ ایک بار گارڈز کا حلقہ بھلا لگ کر اپنے مطلوبہ پیڑروم تک پہنچ سکتے تھے، وہ بات بڑھ جانے کی صورت میں رستم علی آغا خانی کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے میں بھی دیر نہ لگاتے۔ بہت کچھ ممکن تھا۔

”میں بہت سوچ سمجھ کر اور ڈیٹ کو اعتماد میں لینے کے بعد ہی کوئی ایسا پلان بنانا ہوگا کہ کسی طرح سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

دارا رستم علی نے قہقہے طور پر اپنا اضطراب کم کرنے کی خاطر روشن کے سینکے وجود کو اپنے اور قریب کر لیا لیکن..... زندگی میں پہلی بار اسے خطرے کے بادل اپنے گرد بھی منڈلاتے نظر آ رہے تھے۔



شبنم ذہنی طور پر بری طرح الجھ کر رہ گئی تھی۔ عام حالات میں شاید وہ ایک دن بھی ملازمت برقرار نہ رکھتی لیکن کچک ہاس نے کسی خطرے کا آئینہ نگاہ آکھیں کی طرح اسے بھی اس طرح اپنے بچوں میں جھڑا تھا کہ اسے فریج میں نہ ہوئی اور اب..... جب اس کی قابل اعتراض تصویریں اس کی لاطی میں اتار کر محفوظ کر لی گئیں۔ وہ جال میں پھنس گئی کسی بے بس پھل جی کی طرح پھل پھلا رہی تھی۔

شیخ حامد نے اس سے مروا پر کہا تھا کہ اس کے کچھ ضروری کام ختم جائیں تو وہ اس کے استعفیٰ پر ہر دوری سے غور کرے گا لیکن اب شبنم کو اس کی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ غیر اخلاقی حرکتوں کے سلسلے میں بھی ایک حد سے تجاوز نہ..... کرنے کا یقین دلانے کے باوجود اب وہ رفتہ رفتہ حد کو چھلانگ لگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شبنم کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ خاص طور پر جب کچک ہاس نے رستم علی آغا خانی والی عہد اخلاق سمودی دیکھنے کے بعد شبنم کو سراہتے ہوئے خوشی کے اظہار کے طور پر بے تکلفی سے اس کے ہونٹوں کو چوم لیا تھا، شبنم نے اس زہر کو بھی دل پر جگر کے برداشت کر لیا لیکن اب وہ بڑی تنہائی سے غور کر رہی تھی کہ اگر کچک ہاس کی شکل میں ”آکھیں“ کی پیش قدمی اسی طرح جاری رہی تو شاید وہ بعد میں کسی کو موت دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ کوئی ایسا وقت آنے سے پیشتر اگر اس کے اختیار میں ہو تو موت کو زندگی پر ترجیح دینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

اس وقت بھی وہ بستر پر نیم درازاں کی خیالات کی پریشان کن کھچن سے دوچار تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار افضل خان کا تصور سرا بھر رہا تھا۔ افضل خان کی تمام قربانیوں کے باوجود اسے میڈیم کے انفرادے معاملے میں، جس میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی، کچک ہاس نے کھن اپنی مصلحتوں کے پیش نظر بڑی سنگین صورت سے دوچار کر دیا تھا۔ عرش سے اتار کر فرش پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ اگر قسمت نے یادری نہ کی ہوتی۔ رستم علی آغا خانی اور اس کی اورنگ زیب کی سرکوبی کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو شاید افضل خان اسپتال سے نکلے جانے کے بعد موت ہی کو ترجیح دیتا۔ اس آڑے وقت پر بھی کچک ہاس نے شبنم کے ذریعے افضل خان کو داؤ لگانے کا منصوبہ بنا لیا تھا جس میں افضل خان قسمت کی یادری سے کامیاب ہو گیا۔ تاکہ کسی کی صورت میں وہ یا تو موت کو گلے لگا لیتا یا پھر باقی زندگی قید کی معصیتیں برداشت کرتے کرتے گزار دیتا۔ لاٹری اپنے نام نکلنے کے بعد کچک ہاس نے

اس کے حق میں کچھ روایت کر دی تھی لیکن ابھی وہ اس خیال سے کہ ”کہیں افضل خان پلٹ کر اسے ڈک نہ مار دے“ اس کی طرف سے قہار رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے شبنم کو بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ افضل خان کے قلیت میں مداخلت ہونے کے بعد اسے بھی ساتھ رکھے تاکہ اس کی ایک ایک ہل کی گھبراہٹ کی جا سکے۔

عام حالات میں شاید افضل خان کو ساتھ رکھنے پر آمادہ نہ ہوتی، لیکن موجودہ صورت حال میں صرف ایک اہم کھادت ”بھئی بیروں تلے چھتی بھی پلٹ کر اپنے دشمن کو کاٹ لینے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔“ اس کے کالوں میں صدائے گفت بین کر گوج رہی تھی۔ ”بھئی مرنے کے بعد بھی سوالا کہ کا ہوتا ہے۔“ اس روایت کے مطابق شاید افضل خان کی ماضی کی ناقابل بیان سختیاں بھی اس کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں ضرور گوج رہی ہوں گی۔ شبنم اس تحریک کو اپنے خوبصورت قرب سے ایک شخص پہنچا کر چنگاری سے شعلہ بنا سکتی تھی۔ یہ خیال کئی دلوں سے اس کے ذہن میں دروہ رہا اب رہا تھا۔ اس منصوبے پر عمل کر کے وہ اپنا پرانا انتقام بھی پورا کر سکتی تھی جس کے پیش نظر اس نے حادثہ ایسی ہی ایش میں ملازمت حاصل کی تھی۔

افضل خان کو اپنے حق میں پوری طرح ہمدرد کرنے کے بعد وہ میڈم روڈی کو بھی ساتھ لاکر ایک مضبوط محاذ قائم کر سکتی تھی۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ جبک باس کے اندر سے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیڈر پر ہراس میں کوئی آنکھیں اٹھ چھپا کر ساڈر پروف کرے میں اس سے ملاقات کرنی دہل پر جبر کر کے خطرناک آنکھیں کو اس کا من پسند چادر ڈالے اور پھر خاموش پھول کی تمام گولیاں اس کے منہوں و جود میں اتار دیں لیکن..... اس نے ابھی تک کبھی اس خطرناک منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسے اس بات کا خیال بھی تھا کہ وہ شخص اپنی پر جھائیں سے بھی محتاط رہے گا عادی ہو، وہ اپنی حاضقی تدابیر اختیار کرنے سے غافل نہ ہوگا۔ کہیں نہ کہیں کوئی ایسا خفیہ نظام ضرور ہوگا جو اس کے پاس پہنچے سے پہلے اس کی نظروں میں آنے والے کا پورا پورا انکسرے ضرور چمک کر دیتا ہوگا۔ اس شخص کے بعد شبنم بھی کوئی رسک نہیں لے سکتی تھی۔

دیوار گیر کلاک نے رات گیارہ کا اعلان کیا تو وہ چنگی۔ پر سکون نیند کی خاطر اس نے ذہنی غفلت کو جو چمک کر نائٹ بلب روشن کیا۔ لائٹ آف کی پھر بستر پر دراز ہوئی۔ طویل بھائی لے کر اس نے آنکھیں موندیں تو موبائل پر ہونے والی منگناہٹ نے اس کے ذہن کو پھر منتشر کر دیا۔ روشن اسکرین پر جبک باس کا گونڈہ زہر دیکھ کر اس کا سکون بھر غارت ہو گیا۔

”نیں باس!“ اس نے دل پر جبر کر کے فون آن کر لیا۔ وہ رات دس بجے کے بعد ہی موبائل آف کرنے کی عادی تھی۔

”میں نے اس وقت جنہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ سرسری انداز میں پوچھا گیا۔

”آپ حکم دیں سر..... اس وقت کیسے یاد گیا؟“ شبنم نے قہار انداز اختیار کیا۔

”تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ افضل خان آج دوپہر ”استار ان“ نامی ہوٹل میں

فلٹ ہو گیا ہے۔ تم میرے طے شدہ منصوبے کے تحت اس سے مل سکتی ہو لیکن..... اس بات خیال رکھنا کہ کوئی تمہارا تعاقب نہ کر رہا ہو۔“

”کوئی خاص بات.....؟“ شبنم نے تعاقب کے حوالے سے دہلی زبان میں دریافت کیا۔

”کچھ چیخندیں کے پر کل آئے ہیں.....“ معنی خیز انداز میں کہا گیا۔ ”آج میرے استہوار کا ایک آدمی بھی کام آگیا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا ممکنہ تعاقب بھی کیا جائے..... ویسے میں نے تمہاری سیکورٹی پر کسی کو تعینات نہ کر دیا ہے۔ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں اپنے خاص لوگوں کا خاص عمل رکھتا ہوں۔“

”ممنکس باس..... ویسے بائی دی ڈے، کیا ہمارے آدمی کی موت کسی رد عمل کا نتیجہ تو نہیں ہے؟“

”ہو بھی سکتا ہے لیکن سمندر میں ایک قطرہ کم ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”یو آر ریلی کریت باس.....“ شبنم نے مجبوراً سانسٹی جملے اختیار کیے۔

”مطلوبہ اپارٹمنٹ کچھ دلوں میں عمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد تمہیں ویرا ہی عمل کرنا ہے جیسا میں نے پلان کیا ہے۔“

”میں انکار نہیں کروں گی باس لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہوں گی۔“

”کہو..... تمہارے بات کا خیال رکھنا کہ میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔“ دوسری جانب سے ہات لہجے میں جواب دیا گیا۔

”میں انکار کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں۔“ وہ روانی میں کہہ گئی پھر تیزی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا تمہا مختلف گروپ کے لوگ یا ایجنسی والے افضل خان کی طرف سے بالکل ہی بے خبر ہوئے؟“

”اوہ.....“ کچھ توقف سے بات جاری رکھی گئی۔ ”میں تمہاری دور اندیشی سے انکار نہیں کروں گا، لیکن تم نے شاید تصویر کے دوسرے رخ پر غور نہیں کیا ہوگا۔ جس طرح دوسرے ہماری سن گن لپچی لگر میں ہوں گے اس طرح ہم بھی ایسے جیسے سارے چروں کو بے نقاب دیکھ لیں گے۔ خطرناک کے مکمل میں کچھ غلط جالیں بھی سامنے والے کھلاڑی کو غلط بھی سن جلا کرنے کی خاطر دیدہ و دانستہ چل جاتی ہے۔“

”میں نے اس پر پہلے غور نہیں کیا تھا سر.....“ شبنم نے جبک باس کی مبارک جال پر ششدر ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے اس حد تک گھبراہٹ نہیں جھانکا تھا۔ آپ کی اسکیم کا جواب ہے۔“

”میری باتوں پر عمل کرو کی تو تم بھی کندل بن جاؤ گی۔“

”مجھے یقین ہے باس.....“ شبنم نے اس کی کمینگی کا سانسٹی انداز میں اعتراف کیا پھر وہ کچھ اور

لگا لکھا چاہتی تھی لیکن دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

شبنم کا ذہن ہر مستقبل کے غیر قطعی حالات سے خیرد آزما ہونے کے مختلف منصوبوں پر غور کرنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہر حال میں اس دلدل سے لگتا چلا پھرتی جہں میں وہ روز بے روز و منستی جاری تھی۔



سراج صبح سے دو تین بار ایس بی اورنگ زیب کو فون کر چکا تھا لیکن اس سے رابطہ ممکن نہیں ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈی آئی جی کی میٹنگ میں جانے سے ڈیٹر اورنگ زیب سے اس سلسلے میں متشکو ہو جائی۔ اسے میٹنگ کی نوعیت کا بھی علم ہو جاتا۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے وہ اپنے آفس سے نکلا۔ اس کے ذہن میں کئی خیالات گمزدہ ہو رہے تھے۔ یو جی کے مسئلے کے جانے کی اطلاع اسے اپنے ذرائع سے مل چکی تھی۔ یہ کوئی ایسی سبکدوش بات بھی نہیں تھی جو بھیڑی ہو سکتی لیکن ڈی آئی جی نے اسپورٹس کار کے حوالے سے کسی آدمی کی موت کی اطلاع دے کر اسے چھوٹا دیا تھا جو بیج حامد کا دست راست تھا۔ وہ ایسی کئی دیکھی بھالی صورتوں سے واقف تھا جو اس کے تعاقب میں لگے رہتے تھے لیکن اہم بات یہ تھی کہ حادثے میں موت کا فکرا ہونے والے کے بارے میں یہ بھی کیا گیا تھا کہ وہ جب ہاس کی بلیک فورس کا سرخند تھا۔ اس خبر کی اطلاع کس نے دی تھی؟ اس اہم سوال کی روشنی میں سبکی سوچا جاسکتا تھا کہ اطلاع دینے والا بھی بڑے مگر چھٹا کو کوئی قریبی آدمی ہوگا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے کن بنیادوں پر بیج حامد کے خلاف وہ اطلاع ڈی آئی جی کو دی ہوگی؟ کیا کسی وجہ سے وہ بیج بیج حامد کے مخالف ہو گیا تھا؟ یا یہ محض ایک ڈراما تھا جو بیج حامد کے اشارے پر چلایا جا رہا تھا اور بھی بہت سے امکانات ہو سکتے تھے لیکن ڈی آئی جی نے اسے میٹنگ میں آنے کی دعوت دینے سے ڈیٹر ایس بی اورنگ زیب کے سلسلے میں بھی کڑی لینے کی کوشش کی تھی، آخر کیوں؟ کیا اس اسپورٹس کار کے حادثے سے اس نے بیج کا کوئی تعلق تھا؟ یا یو جی کے مسئلے کے اندر ڈی آئی جی کو بیج حامد کی طرف سے کسی ہتھیار کا خدشہ لاحق تھا؟

آفس سے نکلنے کے پانچ منٹ بعد ہی اسے اپنے مخصوص نمبر پر میڈم روہی کی کال موصول ہوئی۔ سراج نے سوال اُن کر کے کان سے لگا لیا کہ چوب کال اعتبار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت میری یاد کیسے آگئی؟ بڑے آدمی اور آپ جیسی بالدار خواہشیں تو دہر دہر کرکے سونے کی عادی ہوتی ہیں؟“ ”الٹا س نے کیا صبح میری آئی جی سے آپ سے کوئی ایسا بات کہی ہے جو آپ اس وقت مرچیں چبانے کے موڈ میں ہیں۔“ دوسری جانب سے بھی اسی انداز میں جواب ملا جس انداز میں سراج نے بات چیمپیری تھی۔

”اس وقت کیسے فون کر لیا؟“ سراج نے مسکرا کر کہا۔ ”میں دراصل ڈی آئی جی کی میٹنگ اسٹیڈ کرنے جا رہا ہوں۔“

”کوئی اہم بات ہے؟“ سفیدی کے پوچھا گیا۔

”یہ میٹنگ انجیر کی ایجنڈے کے سے ہے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”اوہ، کے میں آپ کو پھر کی وقت اطمینان سے فون کروں گی۔“

”اطمینان ہم پولیس والوں کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔“ آپ کم از کم کال کرنے کا مقصد ہی بتا دیں، ورنہ نایک بے چینی ہی رہے گی۔“ سراج نے اسے ٹولنے کی خاطر سفیدی کے سے دریافت کیا۔

”جی ہاں ہم بائیں جہں آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں میٹنگ سے فارغ ہو کر آپ کو بھی فرصت میں کال کروں گا۔“ اس نے جواب دے کر موبائل آف کر دیا۔

میڈم روہی کے فون سے سراج کو اور ابھار دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میڈم نے صبح ہی صبح فون کیا ہوگا تو اس کی کوئی خاص وجہ بھی ہوگی ورنہ وہ آفس ٹائم میں اس سے رابطہ قائم کرنے کی غلطی بھی نہ کرتی۔ ایک خیال اس کے ذہن میں یہ بھی آیا کہ کبھی میڈم روہی نے جن اہم باتوں کا حوالہ دیا تھا اس کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور پر یو جی کے مسئلے یا اسپورٹس کار کے حادثے میں ہلاک ہونے سے تو نہیں تھا؟

ٹھیک پونے گیارہ بجے سراج نے اپنی گاڑی ڈی آئی جی کے دفتر کے قریب پارک کی جہاں اورنگ زیب کی کار بھی اسے نظر آئی تھی۔ تین تین قدم اٹھاتا وہ آفس کے اندر داخل ہوا۔ چیرائی سے اپنی آمد کی اطلاع کرانے کے بعد اسے فوراً بلا لیا گیا، کمرے میں ایس بی اورنگ زیب پہلے سے موجود تھا لیکن اس کے چہرے کا تاثرات بھی ظاہر کرتے تھے کہ شاید ابھی تک ڈی آئی جی نے باقاعدہ اس آجاک کال کی جانے والی میٹنگ کا آغاز نہیں کیا تھا۔ سراج ڈی آئی جی کو سلیوٹ اور اورنگ زیب سے ہاتھ ملانے کے بعد بیٹھ گیا تو ڈی آئی جی نے ڈیوٹی کا کشیش کو اندر طلب نہ کر کے اسے ہدایت دی کہ جب تک وہ اسے خود سے طلب نہ کرے نہ کسی کو اندر آنے دیا جائے نہ ہی ڈسٹرب کیا جائے۔ ان احکامات کو جاری کرنے کے بعد وہ اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ باری باری سراج اور اورنگ زیب کو سفیدی کے دیکھا پھر تپے تلے بیچے میں گنگو کا آغاز کیا۔ ”اس سے ڈیٹر کے میں آپ حضرات کو زحمت دینے کا اصل مقصد بیان کروں، یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ پولیس کی ملازمت پھولوں کی بیج سے زیادہ کانٹوں کا بیڑ ہے جس پر ہمیں مشکل ہی سے سکون ملتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پانچوں اگلیاں برابر ہوتی ہیں لیکن سبھی میں سے چاہنے کے باوجود حالات سے بھگوتا کرنا پڑتا ہے۔ ایک عام مثال ہے کہ زیادہ کھینچنے سے مضبوط سے مضبوط رہی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسا بخاری اور قانون پسندی ہماری اہم ضرورت ہے لیکن..... صورت حال اکثر ہمیں کسی نہ کسی گھبرائی سے بھی دوچار کر دیتی ہے۔ اوپر والوں کے احکامات اور حکومت کی پالیسیاں بھی آڑے آجاتی ہیں۔ موسم کی طرح حالات بھی اپنا رخ بدلتے رہتے ہیں، چنانچہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ وقت کے ہمارے کا بھی خیال رکھیں۔ آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟“

آغا منظور نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد سامنے بیٹھے دونوں افسروں کو سوالیہ نظروں سے

دیکھا۔

”میں آپ سے متفق ہوں سر۔۔۔“ سراج نے جواب دینے میں جھلکی۔ ”میں کو کھانچوں میں پھانسنے کی خاطر ہمیں کچھ سہری چال بھی پڑتے ہیں اور ایسے وقت کا انتظار کرتا ہوتا ہے جب ہم چال کا دوسرا کونا کھینٹ کر اسے بے بس کر سکیں۔“
 ”ون سنٹ۔۔۔“ آغا منظور نے کہا۔ ”اور اگر آپ کو چال کا دوسرا سرا کھینچنے سے پیشتر میں اپنا وار کر جائے تو۔۔۔؟“

”رنگ تو بہر حال لینا پڑتا ہے۔“ سراج نے بدستور تنبیہ کی سے کہا۔ ”پانسا الٹا پڑ جائے تو ہماری آنکھیں بھی چوٹ ہو جاتی ہے۔ شکار کے بجائے یہ خود شکار بن جاتے ہیں۔“
 ”آپ کیا کہیں گے؟“ آغا منظور نے ایس بی اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔

”میں آپ دونوں کی رائے سے انگری کرتا ہوں لیکن اگر پولیس آفیسر کی اپنی پوزیشن کسی مجرم سے زیادہ مضبوط ہو تو اسے بلا وجہ چال بیٹنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔“
 ”میں انفرادی نہیں۔۔۔۔۔ اجتماعی بات کر رہا ہوں۔“ آغا منظور نے کسسا کر وضاحت کی۔ ”جہاں ہم ورک نہ ہو وہاں کسی ایک انفرادی کھلاڑی کا مکمل پوری ٹیم کھلتی ہے یہی دو چار کر دیتا ہے۔“

”میں اس پوائنٹ سے ڈس انگری نہیں کروں گا۔“
 ”پھر آپ یہ بھی مامیں گے کہ ٹیم کی خفگی کا تمام تر ذمہ داری یا تو پیمانے کے سر قیود دی جاتی ہے یا پیکلنگر زکوہ و رازم گھبرا دیا جاتا ہے؟“
 ”عام حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اورنگ زیب نے بدستور تنبیہ کی سے جواب دیا۔
 ”سر۔۔۔“ سراج نے اس سٹیٹنگ کی غرض و نفاذ مجھے کی خاطر دلی زبان میں کہا۔ ”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم کل کر اصل مقصد کی بات کریں؟“

”میرا خیال ہے کہ اسے ایسے دیدہ دلیر مجرم نے ہمارے خلاف کوئی زہر اگلا ہے جو ابھی تک کسی پہاڑ کے نیچے نہیں آیا، اس لیے خود کو سب سے زیادہ قند آور سمجھ رہا ہے۔“
 اورنگ زیب نے ایک امکانی وضاحت کی تو آغا منظور نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”یو آر رائٹ مسٹر اورنگ زیب۔“ وہ تھملا کر بولا۔ ”آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ میں اس وقت کسی ایسے ہی مجرم کی بات کر رہا ہوں جو تمنا نہیں ہے۔ اس خزانے کے کچھ ایسے غداروں کو بھی لینا ہم خیال بنا رکھا ہے جو ہم سے بہت اونچی اونچی کر سیں پر بیٹھے ہیں۔ جنہیں ہم نے اور آپ ہی نے اپنا قیمتی دوش دے کر اسلیوں تک پہنچایا ہے۔ وہ جو چال مٹ رہے ہیں ہمیں اس کا تو ذکر کرنے کی خاطر اجتماعی انداز میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔“

”بات کیا ہے سر۔۔۔“ سراج نے پھر براہ راست ڈی آئی جی سے دریافت کیا۔
 ”مجھے علم ہے کہ ڈی ایس بی لوڈی کے معطلی کے احکامات آپ کے اشارے پر ہم نیکریزی

نے جاری کیے تھے۔“ ڈی آئی جی نے ایس بی اورنگ زیب کو دیکھ کر غصہ کرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”وہ اس کا مستحق تھا لیکن آپ نے وہ آرڈر اسے براہ راست دینے کے بجائے میرے ذریعے سرکرائے ہوئے تو زیادہ مناسب ہوتا۔“

سراج صورت حال کی نزاکت جان کر چپ بی رہا۔ اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کی بات سن کر ایک لمحہ توقف کیا پھر بڑے پرسکون انداز میں وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں سر۔۔۔۔۔ کس طرح حادہ جو مجھے اپنا دشمن سمجھ رہا ہے اسے لوڈی کی معطلی ہمیں نہیں ہونی ہوگی یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ لوڈی کو میری ذاتی رپورٹ پر سپرینڈنٹ کیا گیا لیکن میں وہ آرڈر آپ کے بجائے خود مکمل کیے۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ میں اپنی وجہ سے آپ کو یا کسی اور کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔“

”لیکن اب آپ کے بجائے جو سوالات مجھ سے پوچھے جارہے ہیں ان کا جواب کون دے گا؟“

”اگر بات تحریر میں ہے تو آپ اس ضمن میں بھی میرا تحریری جواب طلب کر لیں۔ میں ساری ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہوں۔“

”پلیز مسٹر اورنگ زیب۔“ آغا منظور تھملا کر بولا۔ ”بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ لوگوں سے الگ نہیں ہوں، لیکن سے کہ آپ جو شکار کھل کر کھینچا چاہتے ہیں میں اس کے لیے پیمانے تیار کر رہا ہوں تجربہ کار شکاری کسی بدست قہمی کے سامنے کھڑے ہو کر اسے شوٹ کرنے کا رنگ بھی نہیں لینے لیتے لیکن۔۔۔۔۔ اگر آپ مجھے اب تک غلط سمجھتے رہے ہیں تو پھر آج میں کل کر آپ دونوں سے اس بات کا اعتراف بھی کر لوں کہ میرا اور آپ کا دشمن الگ الگ نہیں۔ ایک ہی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ میں اپنے حالات کے پیش نظر کسی مناسب موقعے اور وقت کا منتظر ہوں جبکہ آپ کسی اور وجہ سے خطرہ مول لینے کو طوری طرح آمادہ ہیں۔ مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا۔“

اورنگ زیب نے آغا منظور کا رنگ دیکھ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ غلط بھی نہیں تھا اس کی تجربہ کار نظرس ڈی آئی جی کی تصویر پر دیکھ کر کچھ دیر اپنے حلقوں میں گردش کرتی رہیں پھر۔۔۔۔۔ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”آئی ایم سوری سر۔۔۔۔۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ جو قدم بھی اٹھاؤں میں اس میں آپ کا مشورہ بھی شامل ہو کر ایک بات مکمل از وقت واضح کر دوں، میں صرف آپ کا لحاظ کر سکتا ہوں، کسی اور نے اگر میری عزت سے کھینچنے کی کوشش کی تو اسے اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔“

سراج نے سکون کا سانس لیا۔ ماحول کا تناؤ جس انداز میں ڈی آئی جی نے کم کیا تھا وہ اس سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لوڈی کی بحث ختم ہوئی تو آغا منظور نے اس اسپورٹس کار کا ذکر مختصر دیا جس میں ہلاک ہونے والے کی لاش اس نے سر دھانے میں رکھوا دی تھی۔ دلی زبان میں یہ بھی بتا دیا کہ کی بجائے فون پر اس کے بارے میں کیا معلومات فراہم کی گئیں۔

”میں آپ سے ہر بات شیئر کرنے کو تیار ہوں سر..... لیکن یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ اگر کبھی میرا اور انکوپس کا آجنا سامنا ہوا تو میں کبھی مصیحت کے پیش نظر خود کو کنٹرول نہیں کروں گا۔“
 ”انکوپس.....“ ڈی آئی جی نے یہ دستور سنا کر تھکے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ ”آپ نے اس کے لیے بے حد مناسب نام رکھا ہے۔“

میٹنگ کا اختتام بڑے دوستانہ ماحول میں ہوا۔ باہر آکر اورنگ زیب نے سراج سے پوچھا۔
 ”آپ کو اس میٹنگ کی اطلاع کیسے ہوئی؟“
 ”ڈی آئی جی نے فون کر کے بتایا تھا اور شریک ہونے کو بھی ان ہی نے کہا تھا۔“
 ”کیا رائے ہے اب آپ کی میٹنگ کے بعد.....؟“
 ”میرا خیال ہے کسی انتہائی ٹاپ میکریٹ بات کے علاوہ اگر ہم مل کر کام کریں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“
 ”میں نے بھی یہی سوچا ہے۔“ اورنگ زیب نے اپنی دبی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”کچھ رات کا آپ کا کوئی خاص پروگرام تو نہیں ہے؟“
 ”جی نہیں.....“

”پھر آپ آج میرے ساتھ ڈنر کریں، کچھ ضروری باتیں اور بھی ہیں جو میں آپ سے ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔“
 سراج نے پروگرام طے کیا پھر دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے کسی ممکنہ تعاقب کا شہ دور کرنے کے بعد حسب وعدہ میڈیم روٹی کا کال کیا۔
 ”شکر ہے کہ آپ کو جلدی اپنا وعدہ یاد آ گیا۔“ دوسری جانب سے میڈیم کی آواز ابھری۔
 ”میں تو سمجھتی تھی کہ شاید میٹنگ کے بعد آپ بھول ہی جا سکیں۔“
 ”اوہ.....“ سراج نے خوشی سے کہا۔ ”کیا الماس کے کہنے پر آپ نے اب میری گمرانی کی ذمہ داری بھی مول لے لی ہے۔“
 ”ایسی بات نہیں ہے۔ بس اتفاق ہی ہے کہ مجھے کسی ذریعے سے آپ کی مصروفیت کا علم ہو گیا۔“

”آپ مجھ سے کچھ اہم باتیں کرنے کو کہہ رہی تھیں۔“ سراج نے اسے سنجیدگی سے یاد دلایا۔
 ”میرا خیال ہے کہ آپ شاید چنگ کے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔“
 ”جی ہاں..... یہ ظاہر وہ ایک دوکار دھار چلا رہا ہے لیکن یہ بات ہمارے ریکارڈ پر ہے کہ در پردہ ایک باقاعدہ گینگ کا لیڈر بھی ہے۔“ سراج نے چنگ کے نام پر چمکتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک بار سزا بھی کاٹ چکا ہے۔“

”اور شاید اسی سزا کی مہربانی نے اسے مجرم بنا دیا۔“
 ”میں سمجھتا نہیں.....“

”سر..... کیا خبر کے بارے میں آپ کو کچھ اعزاز ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟“ سراج نے سوال کیا۔
 ”نہیں..... میں نے اس کی آواز پہلی بار سنی ہے۔ بعد میں یہ بھی تصدیق ہوئی کہ اس نے کسی ہتھیار سے کال کی تھی۔“

”فون بھٹ کس علاقے میں ہے.....؟“
 ”اس کا جواب میں دے سکتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جس علاقے میں ہتھیار ہوگا، خبر کا تعلق اس علاقے سے نہیں ہو سکتا اس نے اگر انکوپس کے بارے میں زبان کھولی ہے تو ہر طرح سے اپنے بچاؤ کی تدابیر بھی ضرور اختیار کریں گے۔“
 ”یو۔ آر۔ رائٹ؟“ آغا منظور نے اس کی تائید کی۔
 ”اس سلسلے میں کچھ شبہات کا اظہار بھی میں کروں گا۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے کہا۔ ”اٹل سرد خانے سے جو بھی وصول کرے گا ہم اس کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جو آدمی اس کام پر تعینات کیے گئے ہیں انہیں سرد خانے سے ہٹا لیا جائے۔“

”میں سمجھتا نہیں.....“ آغا منظور نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا ہمارے لیے یہ جانتا ضروری نہیں ہے کہ اس کی موت حادثاتی تھی یا.....؟“
 ”اسے کسی دشمن نے گولی مار کر ہلاک کیا ہے۔“
 ”وہاں.....“ ڈی آئی جی چونکا۔ ”آپ یہ بات اتنی تھیں سے کیسے کہہ رہے ہیں؟“
 ”میں اپنے ذرائع سے اس کی تصدیق کر چکا ہوں۔“ اورنگ زیب نے معنی خیز اعزاز میں مسکرا کر کہا۔ ”وہ میرے مشکوک افراد کی لسٹ پر تھا۔“
 ”آئی۔ سی۔“ سراج نے نظریں گھما کر اس کی تائید کی۔ ”اگر وہ آپ کی لسٹ پر تھا تو آپ کے پاس اس کے بارے میں کچھ ضروری معلومات بھی ہوں گی؟“

”خبر کا یہ اعزاز غلط نہیں ہے کہ وہ انکوپس کا خاص آدمی تھا۔ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”میرے جو آدمی اس کی گمرانی کر رہے تھے اس کا یہی بیان ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ محتاط رہنے کا عادی تھا۔ کبھی اسے انکوپس کے دفتر کے آس پاس بھی نہیں دیکھا گیا۔ البتہ ایک بار اتفاق سے میرے ساتھ لباس والے نے اسے بلیک ٹائیکر کا کوڈ استعمال کر کے کسی سے بات کرتے سنا تھا۔“
 ”کیا اسے گولی مارنے کی اطلاع بھی آپ کو ملی.....؟“

”جی نہیں.....“ اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کا سوال کاٹ کر جواب دیا۔ ”گولی مارے جانے کی تصدیق مجھے بھی پولیس کے ذریعے ملی تھی۔“
 ”او۔ کے۔“ ڈی آئی جی نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں کہا۔ ”مرنے والے کا کھوج لگانا بھی اب آپ کی ذمہ داری ہے۔ میں نے جو آدمی تعینات کیے تھے ان کو ہٹا دیتا ہوں۔“

پلیس کی اس انوکھی درخواست کو قبول نہیں کریں گے۔“

”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے کھرا جواب دیا۔ میں نے آپ کی بات کا برا نہیں مانا، میرا ذاتی اندازہ بھی یہی تھا کہ یہ کام مشکل ہوگا لیکن خدا اگر چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔“

”وہ بھی اس لیے کہ وہاں کسی کمرچھپایے ایک چنچنی کے درمیان بھی کوئی حروت نہیں ہوگی۔ جو کچھ نامہ اعمال میں لکھا ہوگا اسی کے مطابق انصاف بھی ہوگا۔“

”ایک اطلاع اور بھی آپ کو فراہم کر رہی ہوں۔“ میڈم رولی نے سنجیدگی پر رقرار رکھی۔ ”افضل خان، تین چار دن انڈر گراؤنڈ رہنے کے بعد شٹارٹن میں قیام پذیر ہو گیا ہے۔“

”یہ اطلاع میرے لئے اہم ہے لیکن.....“

”میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ پھر میری سرگرمیوں کے بارے میں کوئی سوال کریں گے۔“ میڈم نے بات درمیان سے ایک کر کہا۔

”کیا مجھے اس کا حق نہیں ہے؟“ سراج نے اپنا نیت کا اظہار کیا۔

”لباس کے رشتے سے اب آپ کو پہلے سے زیادہ حق حاصل ہے مگر فی الحال آپ میری فکر نہ کریں۔ ہو سکتا ہے میں ایک دو روز میں آپ کو پھر فون کر کے کچھ نئی معلومات بھی فراہم کر دوں۔“

”جو تمام آدمی بھی سرخوٹانے میں آرام کر رہا ہے انہیں اس میں.....“

”میرا ہاتھ براہ راست شامل نہیں ہے۔“ میڈم نے اس بار بھی معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

پھر ساتھ ہی رابطہ بھی ختم کر دیا۔

سراج کا ذہن میڈم کی تنگدلی روشنی میں قیاس آرائیوں کے سوا اور کچھ نہ کر سکا، لیکن چکا والی کہانی سن کر وہ بڑی سنجیدگی سے اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ میڈم جنس راستے پر تیزی سے قدم اٹھا رہی ہے وہ اس کے لیے ایک عورت ہونے کے سبب سے حد خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ آفس پینچنگ نیک وہ ان ہی خیالات میں الجھا رہا پھر..... دفتر میں قدم رکھنے سے ہی ایک نئی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ لیاقت حسین کو دفتر میں چھوڑ کر کیا تھا؟ لیکن وہاں ہی میں لیاقت حسین اسے دفتر میں نہیں ملا۔ اس نے سپاہی سے دریافت کیا تو اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

”وہ منت پہلے تک وہ آفس ہی میں تھا سر..... پھر کسی ضروری کام کا کہہ کر چلا گیا، ہو سکتا ہے کوئی خاص حاجت کی وجہ سے کہیں قریب گیا ہو۔“

”ہاں ہو سکتا ہے۔“ سراج نے اپنے ذہنی کا ٹیشل کا مطلب سمجھ کر اطمینان کا سانس لیا، مگر لیاقت حسین ایک محنتے بعد بھی واپس نہیں لوٹا تو اس کی توشیش میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔

چکا کو جیل میں سزا کانٹنے کے بعد جو تجربہ ہوا تھا اس نے اسے وقت سے پہلے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ جیل سے باہر آنے کے بعد اس نے غموں کی وجہ حالات پہلے تھے اب نہیں رہے جواب تھے وہ آئندہ نہیں رہیں گے۔ اسے پتے میں تین دن باقاعدہ تھانے میں حاضری لگانی پڑتی، پولیس

”ہمارے جیل کا حوالہ کسی قدر صاف سٹھرا ہے۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ ایک بار کوئی شریف آدمی بھی دس پندرہ روز کے لیے وہاں کی یا تار کر لے تو وہ بھی پورا پابند ہو جاتا ہے۔“

”آپ چکا کو کس طرح جانتی ہیں؟“ سراج نے تسلی کر سوال کیا۔

”زیادہ نہیں۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ کبھی بار اس نے جو سزا کا حق بھی وہ آپ کے قانون کی مہر پائی تھی۔“ میڈم رولی نے اس بار بھی تنقیدی انداز اختیار کیا۔ ”زندہ رہنے کے لیے جب کوئی راستہ نہ رہے تو پھر انسان جہاں تکیر بٹ کے بجائے چکا ہی کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔“

”آپ مجھے اس وقت کیا یاد کرانا چاہتی ہیں؟“ سراج نے کسمسا کر سوال کیا۔ ”خاص طور پر آپ نے اس وقت چکا کی کاموشوں کیوں چھیڑ دیا؟“

”اس لیے کہ اب وہ خطرناک مگر مجھ کی آنکھوں میں بھی بری طرح کلک رہا ہے۔ کس کا سننے کی طرح، جسے زیادہ چھپنے پر بے دردی سے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔“ میڈم نے بڑے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”آپ کا قانون بھی شاید اس کی لاش کو سکون کی سانس لے کر دفن کر دے گا۔“

”کیا آپ اپنی ان معلومات کا ذریعہ بتانا پسند کریں گی؟“ اس بار سراج نے مختلا لہجے میں سوال کیا۔

”آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ مگر مجھ سے میرے مرام کس قسم کے ہیں؟“

”اسی لئے تو دریافت کر رہا ہوں کہ آپ کو اندر کی باتیں کس طرح معلوم ہو سکیں؟“

”جو لاش سرخوٹانے میں رکھوائی گئی ہے اس کی قبر تو غالباً آپ کو بھی مل چکی ہوگی۔ اس لیے اب یہ بات اندر کی نہیں رہی۔“ میڈم نے بدستور حق حاد سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”فی الحال میں آپ کو اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ مرنے والا خطرناک مگر مجھ کا بہت قیمتی آدمی تھا اور مرنے سے دو روز قبل وہ چکا کے خیرے خشکانے پر دیکھا گیا تھا۔“

”آئی سی۔“ سراج چونکا۔ ”کیا اسپورٹس کار والے کی موت میں چکا کا ہاتھ تھا یا..... ایسا سمجھا جا رہا ہے؟“

”چکا کے فرشتوں کو بھی اس کا علم بعد میں ہوا ہے کہ مرنے والا کوں تھا اور مگر مجھ کے لیے اس کی کیا اہمیت تھی لیکن بہر حال اب اسی کو قاتل عتاب سمجھا جا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اب چکا کو بھی محض شبہ کی بنا پر خشکانے لگا دیا جائے۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن آپ کو ان تمام باتوں کا علم کس طرح ہوا؟“

”سوئی سٹرسراج..... میں اس وقت آپ کو جو کچھ بتا رہی ہوں اس کی تفصیل سے آگاہ نہیں کر سکتی، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اگر قانون کسی طرح چکا کو اس ناک موقع پر تحفظ فراہم کر دے تو وہ کسی فرعون کے حق میں سوئی ہی ثابت ہوگا۔“

”ممکن ہے آپ کا اندازہ درست ہو لیکن میرے لیے یہ تقریباً ناممکن ہی ہے۔“ سراج نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”کہ کوئی ٹھوس ثبوت ہو تو بھی شاید وہ اپنے دے مگر مجھ کے مقابلے میں

آفیروں کی بلا وجہ جھڑکیاں مٹتی رہیں۔ دو فقیوں والوں کے علاوہ تمام کا کشمیل بھی اسے ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جسے وہ انسان نہیں کوئی پالتو جانور تھا جس کو اپنے نہیں صرف دوسروں کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ اس کی اپنی مرضی کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔

جگا ان حالات میں بھی بہت دلوں تک پہنچی اور پرنے پر چلنے کی کوشش میں بھٹکا رہا، لیکن جب قانون کی نوبت آگئی تو اس کے ذہن میں پولیس کے ایک ہیڈ کاشمیل کی بات کو گنجے کی جمل جانے سے بیشتر بھی وہ اس سے واقف تھا۔ جمل سے واپس آنے کے بعد بھی اس نے ہر طرف سے پوچھنا ہوتا ہے کہ بعد اسی سے رابطہ کیا اس کا نام اداوعلی تھا۔ بظاہر وہ بھی متوسط طبقے کا ایک آدمی لگتا تھا لیکن جگا جانتا تھا کہ اس کا اصل کیا تھا۔ اس نے چلنے والوں پر اپنی حیثیت قائم رکھنے کی خاطر شرافت اور ایمانداری کا جو خول پہنچا تھا وہ اصل نہیں تھا۔

اس کی مالی حالت ان لوگوں سے بھی زیادہ بہتر تھی جو پوش علاقے کے بنگلوں میں رہتے تھے۔ بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومتے تھے۔ اداوعلی ان لوگوں سے کہیں زیادہ دولت مند تھا۔ اس نے فرضی نام سے کئی کاروبار کر رکھے تھے جہاں بظاہر اس سے کم حیثیت کے لوگ بڑی بڑی تحفہ ہوں پر ملازمت کرتے تھے۔ اس نے کئی ناموں سے مختلف پارٹنرش اور پلانز میں دو تین اور چار کروڑ کے گولڈری فلیٹس خرید رکھے تھے جن سے ہر ایک خلیفہ رقم بطور کرایہ وصول ہوتی تھی۔ اس کی پشت پر اس کا ایک بڑا کھانا مزید دار جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا تمام سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اداوعلی نے اسے ایسے داؤد بیچ سکھا دیے تھے جن کی وجہ سے کوئی اس پر شبہ نہیں کرتا تھا۔

اداوعلی کی اصل حیثیت کا علم بھی کچھ لوگوں کو تھا جن میں ایک چچا بھی تھا جو جیل جانے سے قبل اس کے پردوں میں رہتا تھا۔ اداوعلی سے اس کی دوستی پرانی تھی۔ جمل سے رہائی ملنے کے بعد اداوعلی نے اسے دہلی زبان میں سمجھا یا بھی تھا۔

”دیکھ جھانگیر نے تیرے اوپر حالات دیکھنے کا شہ گنگ کیا ہے جو وہی کا کچھڑوں پر لگا یا ہوا وہ سیاہ نشان ہے جو پچاس دھلائیوں کے بعد بھی جوں کا توں رہتا ہے۔ لباس پھٹ کر چھوٹا ہوا جاتا ہے لیکن وہ نشان نہیں ہٹتا۔ اب تیری اس شرافت کو بھی ایسا ہی داغ لگ گیا ہے اور وہ وقت کے ساتھ کم ہونے کے بجائے اور چمکا ہوتا جائے گا۔ اس لئے میری مان تو شرافت کا لبابہ اتار چیک۔ تیرے پیچھے اب کوئی رونے والے نہیں رہے۔ والا بھی نہیں رہا۔ ایک نئی تالاب یا یاد یا کاپانی ختم ہو جائے تو چچی اڑان بھرنے پر مجبور ہو جائے ہیں۔ تو بھی اب انہی سے سبق حاصل کر۔ جیل یا تاراکر آیا تو اب پرانا لباس بھی اتار چیک۔ میری طرح ساہوکار بن کر رام رام چیتا شروع کر دے۔ میں تیرا پرانا لنگوٹیا ہوں جو مدد ہو سکی اس سے منہ کی نہیں چھیدوں گا جب چاہے آزاد کر دیکھ لیا۔“

جگا کو اس کی دہری شخصیت کی اصل حقیقت معلوم تھی۔ وہ ان راستوں پر چلنے پر آمادہ نہیں ہوا اور علی پر چھوڑ کر ایک دوسری نئی شے میں آباد ہو گیا۔ میمنز بھٹکا رہا، سیدھی اور کئی ماہ کی تلاش میں۔ کئی بار اس نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں بھی کیں۔ ایمانداری سے کام کیا تو اس کی قدر بھی کی گئی لیکن

جب بھی اس کے مالکوں کسی ذریعے سے اس کے جمل جانے اور سزا کانٹنے کی اطلاع ملتی وہ اسے نفرت سے دھکا کر ہر طرف کر دیتے۔ بار بار کے تجربوں کے بعد جب قانون کی قوت بھی حجاب دینے کی قوت ہو چکی تھی تو جگا بار کرتی بہ نقدیر دو بارہ اداوعلی کے پاس آ گیا۔ اداوعلی نے اس کی حالت کسی تجربے کار جو ہر کی طرح پرکھی تو مسکرا کر یولا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا جھانگیر کے کہ چوٹھا لگ چکا ہے وہ چھپائے نہیں چپے گا۔ پرتو نے میرا کہا نہیں نا۔ اب تو بے کیا خانی ہے؟“

”میں تھک بار کرتی رہے پاس آ گیا ہوں۔“ اس نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”ایک ناکرہ مٹا دی مزاحیہ شخص ہو گئی میں نے ایسا بھی نہیں سوچا تھا۔“

”جبر پر انسان کو سب کچھ کھاتا ہے میرے یار۔۔۔۔۔ اس دنیا میں جینے کی خاطر انسان کو بار بار چولے بدلنے پڑتے ہیں۔“ اداوعلی نے کہا۔ ”تکے کی مثال لے لے سب سے وفادار جانور ہوتا ہے۔ وقت پڑے تو مالک کی زندگی بچانے کی خاطر اپنا آپ داؤ پر لگا دیتا ہے لیکن ہر بھی مالک کے ساتھ ایک دوسرا خزانہ پر نہیں بیٹھ سکتا۔ کھلی میں ربح حاجت کے لیے لٹکے تو بچے بھی اسے ہٹا دیتے ہیں۔“

”تیری باتیں دل کو گئی ہیں لیکن۔۔۔۔۔“ اداوعلی نے دوستی بھانے کی خاطر کہا۔ ”میں کل بھی تیرا لنگوٹیا تھا۔۔۔۔۔ آج بھی میں تو ایسا کر رہی ہوں۔“ اداوعلی نے کہا۔ ”تکے کی مثال لے لے سب سے وفادار جانور ہوتا ہے۔ وقت پڑے تو مالک کی زندگی بچانے کی خاطر اپنا آپ داؤ پر لگا دیتا ہے لیکن ہر بھی مالک کے ساتھ ایک دوسرا خزانہ پر نہیں بیٹھ سکتا۔ کھلی میں ربح حاجت کے لیے لٹکے تو بچے بھی اسے ہٹا دیتے ہیں۔“

”یہ تو کیا کہہ رہا ہے اداوعلی؟“ جگا نے اسے حیرت سے گھورا۔ ”تو اگر میرا لنگوٹیا ہونے کی بات کرتے تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ جھانگیر نے کبھی اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔“

”دوسرا طریقہ تھی تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ جھانگیر نے کبھی اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔“

”میں اس سختی کی ضرورت لے کی لیکن اس طے میں نہیں۔۔۔۔۔ تجھے روز روز اپنا میس بدلنا پڑے گا۔“

”کیا کیا تھیر کھینچی میں کام کا دلوں کا؟“

”تو اب کہاں کھڑا ہے؟“ جواب میں اداوعلی نے اسے مخفی خیر اعجاز میں گھورا۔ ”یہ دنیا بھی ایک تھیر ہے جہاں گھر کے لوگ یہاں بھی آئے دن کروٹیں لیتے ہیں۔ موسم کے ساتھ ساتھ رنگ دھبہ بھی بدلتے ہیں۔ سیدھے سچے اور کھرے راستے پر بھی جب والا لاکھ کو سخت امتحان میں ڈالتا ہے تو وہ بھی ٹیٹا کر چوکھا راستہ بدل کر بھول بیٹھیں میں کم ہو جاتے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک ہوں جس کی فراہمی گنڈے داؤ پر ہوتا ہوں ایک بار پڑش امام صاحب فرما رہے تھے کہ انسان کو جنت بھی آسانی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے نہیں مل جائے گی۔ بڑے پاپ بیٹھے پڑیں گے سخت امتحانوں سے گزرتا ہو گا۔ پھر مرٹ ملنے کی کچھ امید ہوگی۔ چھوٹے بڑے سب اس

بات سے بھی واقف ہیں کہ یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے۔ چند روز کے کھیل کرتے ہیں۔ اصلی اور بکی زندگی باور پھی کی ہوگی لیکن..... کتنے لوگ اسے سمجھتے ہیں سمجھ بھی لیں تو امتحان سے گھبرا کر ان کے قدم ڈانگنا جاتے ہیں۔ یہ مشیروں کی بات اور ہے جو بھگدڑ کی ایک معمولی چار چار دن چس کر گزارہ کر لیتے تھے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر ہر امتحان سے گزر جاتے تھے لیکن اب..... ایسے اچلے لوگ آئے ہیں جنک برابر ہو کر رہ گئے ہیں۔ کل کے بارہے میں ان کی مجلس ہمیں کھوڑی کا نہیں کرتی۔ آج دو اور دو چار سطر طرح کرتا ہے؟ اس کا غم سب کو اندر ہی اندر پیٹے آگے کی مصلیٰ کی طرح کھاتا رہتا ہے۔ میں تجھ سے زور بردستی نہیں کر رہا۔ حساب کتاب والے دن سب کو اپنی اپنی بھینٹی پڑے گی۔ میں نے دوست سمجھ کر تجھے ابھی برسی دیوں سمجھا دینا آگے جو تیر مرضی۔ جہن جھٹ کر اپنا حق مانگ یا پھر فقیروں کی طرح زندگی گزار دے۔“

چکا کی روز تک کھوٹے اور کھرے کی لکڑی میں گھلتا رہا پھر ایک روز تھانے کی حاضری کے وقت ایک پھول والے نے ذرا سی بات پر اس کو ماں باپ کی کنڈی گالیوں سے نوازا تو وہ برداشت نہ کر سکا۔ اس روز وہ جلد بازی پر عمل کرتے ہوئے جاگیر بٹ سے چکا بن گیا۔ اداوعلی نے اسے زندہ رہنے کے سنے کر بتائے تو اس نے قانون کے ستائے ہوئے لوگوں کا ایک گروہ بنی بنایا۔ اداد علی نے اس کی مائی مدد کر کے ایک دو برس تک مری کرادیئے۔ اسی نے کہا تھا۔

”جہاں تیرے“ میری ایک بات دھیان سے سن رہے اور گانڈھا لگے۔ یہ جو بڑے بڑے راجپوت اداوعلی بادشاہ کو کر رہے ہیں جن کی کہانیاں میرے سننے پہنچے کتابوں میں پڑھتے ہیں یہ سب سیاہ و سفید کے بالک ہوتے تھے۔ کوئی ان کے سامنے ہمارے گھٹا نہ تھا۔ لیکن ان کے گھلوں کے اندر بھی چور راستے ضرور ہوتے تھے جو اپنے لوگوں کی بغاوت یا کسی طاقت ور بادشاہ کے حملے کے آڑے وقت دم دبا کر ان ہی چور راستوں سے گھاتے میں کام آتے تھے۔ آج کے دور میں بھی ہر بدعاش کسی نہ کسی برسی کی آڑ لیتا ہے۔ یہ بڑے گر کی باتیں ہیں میرے پار..... پانچ اگلیاں برابر نہیں ہوتیں لیکن ہمارے جہاد سے دھندے میں بھی چور راستے ضروری ہوتے ہیں جو بڑے وقت میں کام آتے ہیں۔ برسی کی آڑ میں سارے دھندے چھپو ہو جاتے ہیں کیا سمجھا؟“

جہاں گھٹ نے چکا بننے سے پہلے اداوعلی کی ایک ایک بات کو گروہ سے باندھ لیا۔ برسی کی آڑ میں وہ اپنی سفید پوشی بھی قائم کیے ہوئے تھا۔ کل جب کو پولیس کے اہلکار اسے دیکھ کر اس کی ماں بہن کو کھانا اپنا پیڑائی حق سمجھتے تھے زور زور سے سلام کرنے لگے۔ چکا نے ٹینگ لیڈر بننے کے بعد ہر ایک کے دھنیے باندھ دیے تو وہ بھی اس کے آگے پیچھے دم بلانے لگے۔

اداوعلی کے چور راستے والی بات نے اسے اپنی پرچھا میں سے بھی چوس رہنا سکھا دیا تھا۔ اس نے ایک اصول بنا رکھا تھا۔ دو تین راتوں سے زیادہ ایک ٹھکانے پر نہیں رہتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے انہیں بدلتا رہتا تھا۔ شراب ان کے پیٹے کی کمزوری تھی لیکن بازاری عورتوں کے سلسلے میں اس نے لنگوٹ کو بھی ڈھیلا نہیں ہونے دیا۔ برسی میں ترقی کرنے کے بعد اس نے اداوعلی

کی پائی پائی سو بیاج کے ادا کر دی۔ ہفت پندرہ دن میں دونوں کی ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ پائس کے کسی اقدام کی خبریں اسے اداوعلی کے ذریعے بھی ملتی رہتی تھیں۔ اس روز بھی جب سپورٹس کار میں ایک ناٹیکر زندگی کی بازی ہار گیا تھا تو اداوعلی ہی نے اسے فون کیا تھا۔

”چکا..... تجھے خبر ہے کہ مرنے والا کون تھا؟“
”فتح حامد کو کوئی خاص بندہ تھا۔“

”خاص نہیں..... خاص اٹالس۔“ اداوعلی نے اسے باور کرایا۔ ”وہ اس وڈے پینے خان کا دست راست تھا۔ خبر دو اس کی موت پر پینے خان کی چیٹھک میں کیڑے کھلا رہے ہیں۔ اس کے دوسرے زرخیز بھکاری بھی تھے جو ہر طرف ذن کی لوسو کھتے رہے ہیں۔ سرکاری چیٹھ بھی گھات لگائے ملک حلال کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔“

”کیا تمہیں پتا ہے کہ اسے کس نے شکار کیا؟“

”نہیں..... لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ مرنے سے پیشتر کن کن لوگوں سے ملا تھا۔ پینے خان نے حکم دیا ہے کہ ایسے تمام لوگوں کو خاص طور پر پیمانہ چپک کر دیکھا جائے۔ جس پر اداوعلی شبہ ہو اسے دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹا دیا جائے۔ میں تمہیں بھی مختار رہنے کا مشورہ دوں گا۔ اداوعلی بائیں نظر رکھنا۔ رب راکھا۔“

چکا نے موبائل بند کر دیا پھر اسے اچانک خیال آ گیا کہ وہ خاص اٹالس آدی مرنے سے دو روز پیشتر اس سے ملنے بھی آیا تھا۔ اس روز وہ دروازہ کا سیاہ خام افروغی بھی آیا تھا جو پینے خان کے کسی مخالف گروہ کے لیے کام کر رہا تھا۔ ممکن ہے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیا ہو انہی صورت میں چکا کی شخصیت پر بھی بلاوجہ ”لبی بھگت“ کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔ اس اچانک خیال کے بعد چکا نے فوری طور پر عملی طور پر روپوشی ضروری سمجھی۔ اس نے اپنے اعتماد کے آدمیوں کو کسی جوابی کارروائی کے ممکنہ اندیشوں سے بچنے کے لیے ضروری تاکید بھی کر دی۔

دو روز سے وہ ہر بارہ کھٹے بعد اپنے ٹھکانے بھی تبدیل کر رہا تھا۔ اداوعلی کے ذریعے اسے ضروری معلومات بھی مل رہی تھیں۔ ذاتی طور پر بھی وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ فتح حامد ایک معمولی سی چوٹ بھی کٹنے پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اس کے گرے میں اس کے اشارے پر خود اپنی کھپڑوں پر بھی ہتھول رکھ کر کوئی دشمنے کے عادی تھے۔ ایک معمولی سا شبہ بھی اسے ممکنہ دشمن کو راستے سے ہٹا دینے کے لئے بہت ہوتا۔

اس وقت بھی چکا اپنے ایک محفوظ ٹھکانے پر تھا۔ رات اس نے اسی جگہ کے نیچے برسی تھی۔ وہاں کے کھانے کے بعد وہ حسب معمول دوسرے ٹھکانے پر جانے کا پروگرام طے کر چکا تھا۔ وہ جس جگہ کے نیچے رات بسر کرتا وہاں اس کے دوسرے جاں ناکر سامنے بھی آس پاس رہتے تھے، کسی کو اگے کرے تنگ جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے اپنے کسی کارندے کو بھی اس تک کی مرحلوں سے ہو کر گزرنے کے بعد رسائی کی اجازت ملتی تھی۔

ہوتی کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی نہ کرتے۔ نووارد کی جسارت چگا کے لئے ناقابل فہم تھی۔ اس نے ایک جھگڑے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے دوسرا ہاتھ استعمال کرتے ہوئے پستول نووارد کی کینٹھی پر رکھ دیا۔ بڑے سفاک لہجے میں غزایا۔ ”کیا میں یہ جھجھکیاں تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟“

”میں بھی تم کو کبھی بات یاد کرنا چاہتا ہوں۔“ نووارد نے معینی انداز میں چگا کے دوسرے ہاتھ پر ضرب لگائی تو پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی چگا کے لیے کسی بار فٹم کے طلسمات کی محضر سے زیادہ تعجب خیز تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود نووارد اس کو اطمینان سے کمرے سے نکال کر باہر آیا تو دروازے پر موجود سراسخی نے چگا کو بڑی حیرت سے مخاطب کیا۔



امداد علی کے بعد اس کے اپنے آدمیوں نے بھی یہ ہوسنگھ لی تھی کہ شیخ حامد کے گرے میں اس کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔ مقصد ایک ہی ہو سکتا تھا کہ چگا کو محض مرنے والے کا ٹکندہ قابل تصور کر کے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ خود چگا بھی کسی ایک ایسے لمحے کی تلاش میں تھا کہ اس خطرناک دشمن کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کر دے۔ شاید وہ رسک لینے سے بھی گریز نہ کرتا لیکن امداد علی نے اسے بھی مشورہ دیا تھا کہ شیخ حامد کے سطلے میں وہ کسی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے سے گریز ہی کرے۔ اس نے امداد علی کے اس مشورے کو بھی قبول کر لیا۔ کردہ کا سرخندہ ہونے کے باوجود وہ بات بات پر خون خرابہ کرنے کا عادی نہیں تھا۔ ہاتھ پاؤں بچا کر اپنی سادہ برقعہ اور کتے کا مشورہ بھی اسے امداد علی نے دیا تھا جس پر وہ روز اول سے کاربند تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے پہلی بار اپنی زندگی بچانے کی خاطر بلاوجہ حالات کے ساتھ آٹھ گچھلی کھیلنے کا آخر کار عمل اختیار کرنا پڑ رہا تھا۔

چگا کے ذاتی اصول دوسرے گروہ کے سرخنداؤں سے مختلف تھے۔ وہ بدھاشا میں بھی ایمانداری کا قائل تھا۔ دولت کے لالچ یا اپنی بات اونچی رکھنے کی خاطر اس نے کبھی کسی دوسرے چھوٹے بدھاشوں کو ٹھک کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے اس کے اصولوں کو دوسرے گروہ کے بڑے بھی سراہتے تھے۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا شیخ حامد کے بارے میں مختلف زاویوں سے غور کر رہا تھا جب اس کے کمرے کا دروازہ اچانک کھلا۔ اسے کچھ سی آدی کے بجائے ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر اسے خطرے کا احساس ہوا۔ ہلک جھپٹنے میں اس نے نہایت بھرتی سے اپنا پستول اٹھا کر آنے والے پر تان لیا۔ چگا کی لگارتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

”کون ہو تم؟“

آنے والے نے چگا کی گھن گرج کا ٹوٹ نہیں لیا۔ اطمینان سے کھڑا چگا کو دیکھتا رہا۔ اس کا وہ اطمینان بھی چگا کے لئے حیرت انگیز ہی تھا۔ ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ چگا کے لہجے میں سفاکی ٹھٹھکی گئی۔ ”کیا زندگی سے ٹھگ آچکے ہو؟“

”نووارد نے اس بار بھی کوئی ٹوٹ نہیں لیا۔ پٹلیں جھپکائے بغیر وہ چگا کو خوابیدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں کو جھنک ہوئی اس کی سپاٹ آواز کمرے میں گونجی۔ ”جتنی جلدی ممکن ہو میرے ساتھ کل چلو! اسی میں تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔“

”تم نے شاید صرف چگا کا نام سنا ہے۔ اگر پوری طرح واقف ہوتے تو.....“

”فصل بائیس میں اطمینان سے کر لیتا۔“ نووارد طلسمی انداز میں چگا کو تیز نظروں سے گھورتا رہا۔ اس کی پٹلیں ایک بار بھی نہیں جھپکی تھیں۔ اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھا۔ چگا کا ہاتھ تھمتے ہوئے بھی اس نے پستول پر کوئی توجہ نہیں دی جو چگا کے دائیں ہاتھ میں موجود تھا۔

چگا بلاوجہ خون خرابے کا عادی نہیں تھا اس کے ایک اشارے پر اس کے جاں نثار نووارد کی ٹکا

ارامیہ کو کس طرح نظر آگیا؟ کیا وہ بھی اسی قہقہے کا پراسرار فرد تھا؟

”فکرت کرو۔“ نووارد نے مسکرا کر کہا پھر جگہ کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے بولا۔
”تمہیں اجرت کے ساتھ انعام بھی ملے گا۔“

”آپ کو میرا بات بارگاہ ہو تو معاف کر دیتا صاحب۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالنے
ہوئے لہجے سے کہا۔ ”جو مسافر گا دے کر نکل جائے، میں اس کو بھی دل سے معاف کر دیتا
ہوں۔“

ٹیکسی چل پڑی، جگہ کا ذہن بدستور سنبھلتا رہا، اس وقت وہ جن حالات سے دو چار تھا وہ
طلم ہوش رہا کی کہانیوں سے زیادہ ناقابلِ فہم تھے۔ اس کی نظریں بار بار نووارد کی طرف اٹھ رہی تھیں
جو بڑا پرسکون نظر آ رہا تھا۔ جگہ کے ذہن میں بے شمار سوالات گولڈ ہو رہے تھے لیکن کوشش کے
باوجود وہ نووارد سے ان سوالوں کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کر سکا۔ میں صحت بعد جگہ کو حیرت کا
ایک اور جھٹکا لگا۔ نووارد نے ٹیکسی کو سروس روڈ کی دوسری جانب اس سڑک پر سٹپ کر کہا جہاں سروس
روڈ رجسٹر کر کے دنگل تھا جہاں جگہ کو دوپہر کے کھانے کے بعد آقا تھا۔ نووارد نے ٹیکسی سے نیچے اتر کر
ایک بڑا ٹوٹ ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھا۔ کسی رقم کی واپسی کا اکتھار بھی بغیر جگہ کا ہاتھ تمام کر سروس
روڈ پر آگیا، جگہ کی معمول کی طرح اس کے ساتھ قدم ملا کر بڑا ستارہ ہانپنے سے کچھ درد رک کر نووارد
لے جگہ کو کچھ خرابیہ انداز میں مخاطب کیا۔

”جو کچھ تم نے دیکھا یا سنا اس کے بارے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا۔ کھوج لگانے کی کوشش
کی تو خود بھی اس طرح کم ہو جاوے گا کہ اپنا سراغ بھی نہ پاسکے۔“
”کیا میں اپنے محسن کا نام دریا فت کر سکتا ہوں؟“ جگہ نے ہمت کر کے سوال کیا۔ اس سے
زیادہ وہ کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہ کر سکا۔

”صرف ایک نام ذہن میں محفوظ کر لو جگہ تیرے بٹ۔“ نووارد نے جگہ کی نگاہوں میں لگا تھا
اڑل کرٹوں آواز میں کہا۔ ”ڈپٹی پیر شیڈنٹ سراج، اگر اس کی طرف سے بھی کوئی حکم ملے تو اکتھار
کرنے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔ میں کون ہوں؟ یہ بات بھول جاؤ۔ میری ہدایت کا خیال رکھنا، جو
کچھ ہو گیا اسے بھی زبان پر نہ لانا ورنہ بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

جگہ ڈی ایس پی سراج کا نام سن کر چونکا لیکن اس سے خوشتر کہ وہ نووارد سے کچھ معلوم کر تا وہ
کسی چھلاوے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جگہ کا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ وہ ٹیکنگ لیڈر تھا، سوت
سے اکھیں ملا کر مسکرانے کا عادی تھا لیکن غیر مرئی اور جن بھوت کی قوتوں سے لڑنا کسی کے اختیار
میں نہیں ہوتا۔ جگہ کے ذہن میں نووارد کے لیے کسی باوقی انطرت ہستی کا ابھرنے والا تصور بھی اتنا
اگر تھا کہ وہ سرمائی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ اس کے مساموں سے پیسے چھوٹنے لگے، جسم اس طرح
کھپکھپانے لگا جیسے سردی لگ کر بخار آ رہا ہو۔ ذہن پر اچانک طاری ہونے والی خوف و ہشت کی
طمان بند تیرن پڑے تھیں۔ اسے ہل محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا پر اڑا جو بد بخار کی شدت سے پھسکا

”اس وقت کہاں جا رہے ہو استاد۔ ابھی تو تم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا؟“
”میرا ذکر زبان پر مت لانا۔“ نووارد نے سرماسے لپٹے میں جھکنا نہ انداز اختیار کیا تو جگہ کے
جسم میں ایک سرولہر دوڑ گئی۔ وہ کسی ایسی طلسمانی چوٹین سے پہلے بھی دو چار نہیں ہوا تھا۔ بدروحوں
اور جن بھوتوں کے بارے میں اس نے صرف پراسرار کہانیاں سنی یا پڑی تھیں لیکن اس وقت وہ ج
ج کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پچھلی ٹھنڈوں سے نووارد کو دیکھا جو اسے نظر آ رہا تھا، لیکن
شاید دروازے پر موجود شخص اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ اسی شش و پنج کی کیفیت میں جھلا تھا جس
نووارد نے اسے بدستور چاٹ آواز میں مخاطب کیا۔ ”اپنے ساتھی سے کہو کہ تم کسی وقت کسی اہم کام
سے تنہا نہیں جا رہے ہو۔ یہ تاکید بھی کرو کہ تمہارے سارے آدمی بھی اس جگہ سے ایک گھنٹے کے
اندر اندر جہر سینگ سائیں لو و نو دیکھا رہو جا سکیں ورنہ وہ بھی لپٹے میں آ جائیں گے۔“

جگہ کا ذہن مطلوب ہو رہا تھا، اس کی پچھلی جسمی حس کام نہیں کر رہی تھی۔ داغ میں صرف ایک
جملہ صدائے گشت کی نگرین کر کو بیج رہا تھا۔ ”جو کچھ کہا جا رہا ہے اس پر عمل کرنے میں غلت سے کام لو۔ ہوتا
ہمیشہ وہی ہے جو اوپر والے کو منظور ہو۔“ جگہ نے تن پر نقد پر خود کو حالات کے خوالے کرنے کی ٹھان
لی، وہ خائف نہیں تھا لیکن ناپید اور پراسرار قوتوں سے ٹکرنا بھی اس کے بس کی بات نہیں
تھی۔ نووارد کے مشورے پر اس نے فوری طور پر ایک گھنٹے کے اندر وہ جگہ خالی کرنے کی تاکید کی
پھر..... اپنے ساتھی کی تمام باز پرس کو کالتا ہوا نووارد کے ساتھ قدم ملاتا..... مکان سے باہر آ گیا۔

”استاد، اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“ باہر موجود گاڑی نے بھی اسے تعجب سے دیکھا۔ ”ہم نے
تمہارے ڈرائیور کو دہے گاڑی لانے کو بولا تھا، ابھی تو.....“

”ایک ضروری اطلاع کے پیش نظر فوری جا پڑا رہا ہے۔“ جگہ نے نہ گاڑی کو بھی ٹالتے ہوئے
کہا۔ ”میں کوئی ٹیکسی پکڑوں گا۔“

عمارت سے نکل کر وہ سڑک پر آیا تو ایک خالی ٹیکسی بھی نظر آئی جس کے ڈرائیور نے نووارد کو
دیکھا تو اطمینان کا سانس لیتا ہوا باہر آ گیا۔ ”مولانا کا کرم ہے جو تم آ گئے۔“ ڈرائیور نے نووارد کو مخاطب
کیا۔ ”میں سمجھا تھا کہ آج پھر کوئی چوٹ دے گیا۔ پچھلے بھی ایک دو موٹے پر سواری سامنے کے
دروازے سے گئی اور پچھلے راستے سے چوٹ گئی۔ وہ ناچارہ گیا۔“
جگہ پر پھر چرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ نووارد نے جگہ کے آدمی بھی نہیں دیکھ سکے تھے، جیسے

جا رہا ہو۔ وہ تھر تھرا کنب رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے مہیب اندیرے قہر کے گنگے۔ قدموں پر کھڑا رہتا دھواں ہو رہا تھا۔ اسی کیفیت میں لوکھڑتا ہوا وہ اس بار قدم آگے بڑھا تو اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس کا حلقہ بچھا نظروں کے سامنے تھا گیت پر موجود گارڈز نے جگا کو دیکھا راسخل سنیاں ہوا جگا کی طرف لگا لیکن جگا کی سرسائی کیفیتوں نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ سنہلنے سنہلنے جگا کی وہ ڈنگ تاتا ہوا زین پر اچر ہو گیا نظروں کے سامنے اندیرا سا چھانے لگا اور اس کا ذہن دغا دیا مالیا سے بے خبر ہو گیا۔

وہ سختی دیر بے ہوشی کی کیفیت سے دو چار رہا، جگا کو پاؤں پٹھن تھا۔ گزرے وقت کا ایک حصہ اس کا احساس اسے اس وقت ہوا جب دوبارہ اس کے پوچھل پچھلوں میں زندگی کی رقص پیدا ہوئی۔ اس کی نظریں گھڑی پر پڑیں، کامل پانچ گھنٹے بعد اس کی گھنٹ کو ذرا سہارا ملا تھا پھر..... اس نے دوبارہ آنکھ بند کرنا چاہی تو ایک بالوں آواز نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر داہنی جانب دیکھا، اس کا خاص ماتحت اس کے سامنے کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”تمہیں اچانک یہ کیا ہو گیا استاد؟“ تم میں خبر کے بغیر ادھر کب اس کو اس طرح آگئے؟ کسی کو خبر بھی نہیں دی۔“

”میرے سب..... سب ساتھی تو..... خیریت سے ہیں؟“ جگا نے ڈوبے ذہن کو چگانے کی خاطر رک رک کر سوال کیا۔

”خدا کا شکر ہے استاد، تمہارے کہنے پر اگر ہم نے عین وقت پر ٹھکانا خالی کرنے میں ڈرا دیر کی ہوئی تو سب مارے جاتے۔“

”وہ..... وہ میں نہیں..... وہ..... وہ.....“ جگا نے قسم قسم کر کچھ کہا پتا لیکن پر اسرار نوادہ کے سمجھی جیسے کالوں میں گونجے تو اس نے جلدی سے آنکھیں موند کر خاموشی اختیار کر لی۔

♦♦♦♦♦

پوش علاقے کے اس سنے ہلاک میں چار سو اور چھ سو گز کے پلاس کو دو حصوں میں منقسم کر کے جدید طرز کے بڑے خوبصورت اور دیدہ زیب دن اینٹ ہنگے تعمیر کئے گئے تھے، پچھلے حصے میں مچن، ڈرائنگ، ڈائننگ کے علاوہ ایک بیڈروم اور مختصر سالانہ ڈیجنگ بھی تھا۔ اوپر حصے میں دو کسادہ روم اور ایک اسٹری کے علاوہ خوبصورت ٹیئر میں لگا لیا تھا جہاں شام کے وقت کچھ نعلی گھاس میں بیٹھ کر بیرونی ماحول سے لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا، بارش کے دنوں میں بھی یہ ٹیئر اپنے کمینوں کے لیے دل بہانگی کا موقع فراہم کرتا تھا۔ اسی علاقے میں لب مزک سے ایک ہلاک چھوڑ کر وہ شاندار بنگلا بھی تھا جس میں کنول اور اس کی ماں ایک روز قبل شفٹ ہوئے تھے۔ کنول اس کی رہائش گاہ میں آنے کے بعد بہت خوش تھی جسے اسی کے نام خرید گیا تھا۔ اسے وہاں کوئی انتظام نہیں کرنا پڑا ضرورت کی برائے وہاں پہلے سے موجود تھی، خوبصورت فرنیچر سے آراستہ بیڈروم اور مچن کے علاوہ بیرونی حصے میں ایک مختصر سالانہ بھی تھا جو ڈرائنگ روم کے پورے ہٹانے کے بعد نظر آ سکتا تھا ٹیئر پر بیٹھنے کے

لیے بھی اعلیٰ اور قیمتی ایزی جیمیز جو جھس، آسانش کو آرام کا ہر وہ سامان جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا وہاں پہلے سے موجود تھا۔ گیت پر باوردی کا گارڈ بھی نصیبات تھا، ایک نئی کار بھی موجود تھی۔ کنول کسی شوق تخیلی کی طرح پورے گھر کے ایک ایک گوشے میں اڑتی پھر رہی تھی، کبھی وہ بیڈروم کی سجاوٹ کو دیکھتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے جاتے ہیں کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہے۔ ٹیئر پر جاتی تو سراسر سمندر کی سمت سے چلنے والی، ہنگی ہواؤں کی مہک اس کے ذہن میں نئی تازگی پیدا کر دیتی، جدید سامان سے لیس مچن میں جاتی تو ایسا لگتا جیسے اسے ہفت اظہار کی دولت مل رہی ہو۔ مختصر لان پر جاتی تو مینجے چھوٹی خوشبو اس کا استقبال کرتی، بیرونی دروازے پر آکر وہ ڈیوٹی گارڈ کو چوری چوری دیکھتی تو اسے احساس ہوتا کہ وہ تحفہ اسے مل گیا ہے جس کے نہ ہونے سے اس کے باپ کو بھرے بازار میں بیرونی سے کچل کر دیا گیا تھا۔ پارکنگ میں موجود گھرے میروں لکری گاڑی دیکھتی تو اسے اپنے اچانک کے الٹ پھیر میں جیسے اس کا باپا پلٹ کر رہ گئی تھی۔

ایک گھنٹے سے وہ اپنے نئے آشیانے کے ایک ایک حصے میں پکرائی پھر رہی تھی۔ جب تک ہار کر ڈرائنگ روم میں آکر ڈراستانے کے لیے تخیلی تو اس کی نظر اپنی ماں پر پڑی جو قریب ہی کھلے شیشے کے دوسری جانب بیٹے لان کے ایک پورے کو کھنگی بانہ سے دیکھنے میں مصروف تھی۔ وقت نے اس کے چہرے کو ضرور کھلایا تھا لیکن اس کے..... نفوس اب بھی اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ حسن کی وہ متحرک صورت کبھی سے حد حسین اور پرکشش بھی رہی ہوگی۔ کنول ماں کے چہرے پر حسنی سنجیدگی دیکھ کر چوٹگی، ایک لمحے تک دور بیٹھی اس کی نظروں کا تعاقب کرتی رہی پھر اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ ماں نے اس کی طرف توجہ دی تو وہ اس کی گود میں سر رکھ کر بڑے لاڈ سے صوفے پر دراز ہو گئی، ماں کی نظروں میں جھانکتے ہوئے پونچھا۔

”کیا بات ہے ماں۔ کیا تمہیں ایسا یہ چھوٹا سا پر سکون ٹیئر پسند نہیں آیا؟“

”بچلیاں زیادہ تر کسی کے ٹیئر پر ہی مگر رہتی ہیں۔“ وہ روانی میں کہہ گئی پھر کنول کی دلجوئی کی خاطر بات بدل کر بولی۔ ”تمہاری خوشی میں میری خوشی بھی ہے لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو ان بھی مجھے پریشان کر دیتی ہیں۔ عورت کے سر پر کوئی مضبوط ساپان نہ ہو تو.....“

”ہیلو ماں.....“ کنول نے کچل کر کہا۔ ”میں نے تمہیں تحفہ دینے کی خاطر سب کچھ کیا ہے۔“

ماں نے کنول کی وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔

”نہال کی ہار جیجہ بلا شرکت غیرے صرف اور صرف میرے نام ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟“

”وقت بڑا خالم ہوتا ہے کنول۔ حالات جب طوفان کا روپ اختیار کرتے ہیں تو عورت کی کزوری اس کے منہ زور چھوڑوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔“

”تمہیں کس بات کا خوف ہے.....؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اچھے اس مامی کا جو ایک مرد کے چلے جانے سے حسد و خاشاک کی طرح تباہ ہو گیا تھا۔“

”ان ہی حالات کو دوبارہ سنوارنے اور بتانے کی خاطر میں نے بھی حالات سے مجبوراً سمجھوتا

”کیا ہے۔“
”کنول.....“ ماں نے اسے تجربے کا نظروں سے دیکھا۔ ”یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ کیا تجھے یہ رشتہ پسند نہیں ہے؟“

”تم نے بھی اسے صرف میری خاطر منظور کیا ہوگا؟“
اس نے ماں کو دیکھتے ہوئے عجیب لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے بھی اپنی ملازمت عزیز تھی، دولت اور مرد کے آگے کوئی کڑی عورت اکیلے کچھ نہیں کر سکتی۔ میں خوشی سے ماں نہ کرتی تو حالات میری نظریں جھکا دیتے۔ بہت سے خنلوں کو بہت قرب سے دیکھنے کے بعد ہی میں نے فیصلہ کیا تھا۔“ وہ نظریں جھکا کر روانی میں پڑتی رہی۔ ”فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت مجھے بغیر قیمت کے روئے دیا جاتا۔ میری زندگی پر پہلانی اور آوارہ ہونے کا ٹھپا لگ جاتا۔ اب ایک کاغذ کے ٹکڑے پر دو گواہوں کی موجودگی میں جو کچھ ہوگا اس پر قانون یا مذہب کے ٹھیکے دار اٹھائیں نہیں اٹھا سکیں گے۔ حالات سازگار نہ رہے تو تمہاری طرح مجھے میری صرف بیٹی کا روگ لگ جائے گا۔“
”کنول.....“ ماں نے اسے خن نظروں سے گھورا۔ ”یہ..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“
”دبی جو بچ ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر ماں کے چہرے پر چلے نظرات کو دیکھا پھر زبردستی مسکرا کر بولی۔

”عمروں کے فرق سے کچھ نہیں ہوتا ماں۔ عزت کا بھرم قائم رہے یکساں سب سے بڑی بات ہے۔“
”تو چاہے تو اب بھی انکار کر سکتی ہے۔“ ماں نے اس کی باتوں کی گہرائی سمجھتے ہوئے بھی اس کی دل جوئی کی خاطر خوش لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہم جس طرح بھی موہاری پہلی کڑا نہیں گئے۔ پہلے بھی حالات کی گردش برداشت کر رہے تھے۔ اب بھی کسی نہ کسی طور زندگی گزر جائے گی لیکن تیری خوشیاں مجھے زیادہ عزیز ہیں۔“
”اسی طرح تمہارا سایہ بھی میرے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، میں اس نعمت سے محروم نہیں ہونا چاہتی۔“

”کیا مطلب.....؟“ ماں نے کنول کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
”جان بوجھ کر انجان نہ بنو ماں۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دل پر جبر کر کے جواب دیا۔ ”کل کسی نے میری خاطر مجھے باپ کے سامنے سے محروم کر دیا تھا۔ اب بھی کوئی میری خاطر مجھے تمہاری سامنے سے محروم کر دے گا۔ تاریخ بھی اسی طرح اپنے آپ کو دہرائی رہی ہے۔“
”میں سمجھتی نہیں..... کیا میری بیٹی کے پیچھے بھی.....“

”پلیز ماں.....“ اس نے تڑپ کر ماں کو پتلی نظروں سے دیکھا۔ ”اپنی زبان پر قابو رکھو..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، جو کچھ بیت گیا، جو کچھ ہو رہا ہے دیکھتی جاؤ اور ماں کی زبان سے بنی حق میں نیک دعائیں کرتی رہو۔ اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔“

ماں جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی جب باہر کنول نے اپنے گیت پر ایک سیاہ رنگ کی بڑی گاڑی کو رکستے دیکھا، گاڑی کو دیکھ کر دروازے پر فیصلت مار گڑ بھی انٹیشن پر زینٹن میں آگئی۔ کنول کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، اس نے ماں کو اشارہ کیا تو وہ ایک کرے چمپے والے کمرے میں چلی گئی۔ کنول نے دوبارہ گیت کی سمت دیکھا، فصیح حاد کو گاڑی سے اتر کر اندر آؤ دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنی پہلی پائلیں خشک کر کے ایک دل آویز نیم اپنے گداز ہوٹوں پر بچا لیا۔ دل کی دھڑکن کو سنبھالتی اراکھ سے نکل کر فصیح حاد کے استقبال کی خاطر مرکزی دروازے پر آگئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے منگرائی نظروں سے اس کا استقبال کیا۔

”تمہیں یہ چھوٹا سا کمرہ پسند آیا.....؟“ فصیح حاد نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پچھا۔
”یہ میری توقع سے کہیں زیادہ حسین اور دلچسپ ہے۔“ اس نے دل پر جبر کر کے جھوٹ بولا۔

”ہوگا لیکن تم میرے لیے اس سے زیادہ حسین ہو۔“ اس نے کنول کو کمر میں ہاتھ ڈال کر خود سے قرب کر لیا پھر ذرا کلف سے دی زبان میں سوال کیا۔
”تمہاری ماں کہاں ہیں.....؟“

”اوپر ہی تھیں۔ آپ کے آنے کی وجہ سے کمرے میں چلی گئیں۔“
فصیح حاد نے جواب کنول کا ہاتھ تمام کر اوپر جانے والی بیڑھیوں کا رخ کیا، وہ اس کے ساتھ قدم ملا کر بیڑھیوں سے لے کرتی ہوئی بائری کی طرف جانے لگی۔ اوپر ایک بیڑم میں پہنچ کر فصیح حاد نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ کنول کی گہری جھلنا خود بصورت آنکھوں میں جھانکنا رہا پھر اس کے ہونٹوں کا طویل بوسہ لیتے ہوئے بستر پر خن دراز ہو گیا۔ کنول اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ وہ فصیح حاد کو بڑی دہانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی جب فصیح حاد نے سرسراے لہجے میں سوال کیا۔
”تمہارے درمیان یہ عارضی دوری آج رات ختم ہو جائے گی لیکن..... میری بات یاد رکھنا، ہاتھ دھو کر کھانا کھا کر بعد میں تمہیں اور تمہاری ماں کو زبان بند کر سکتی ہوں گے، جب تک میں اجازت نہ دوں۔“

”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔“ کنول نے براعتاد لہجے میں جواب دیا۔
”کھانا کھا کر جوتھر میں تم سے پھر کھل کر ایک سوال کرنے آیا ہوں۔ تم اس شادی پر خوش تو ہو؟“

”خوش نہ ہوتی تو اس وقت اس چھت کے نیچے نہ ہوتی۔“
”تمہاری ماں نے کسی مجبوری کا سودا تو نہیں کیا؟“
”آپ کا کیا خیال ہے؟“ اس نے بات نہ لانے کی خاطر فصیح حاد کو بغور نظروں سے دیکھا۔
”میں..... میں تمہاری ساتھ کسی مجبوری کا سودا نہیں کرنا چاہتا۔“ جواب کھرے اور بے باک انداز میں دیا گیا۔ ”تم میری حیثیت اور شاید میری طاقت سے بے خبر بھی نہ ہوگی۔ اگر مجھے محض وقت

جہر سے بدن اور درمیانہ قد والا سیاہ خام ہاتھ جس کا تعلق جنوبی افریقا کے ایک غیر مذہب ملاتے تھے۔ اس وقت بڑا مذہب اور بردیا نظر آ رہا تھا، وہ اس وقت جس میک اپ میں تھا اس سے کبھی گمان ہوتا تھا اس کا تعلق ویسٹ انڈیز کے کسی نوآبادیہ ملاتے سے ہوگا، فریج کٹ ڈاڑھی اور آنکھوں پر پٹھے کے اضافے نے اس کی اصلیت کو اس حد تک تبدیل کر دیا تھا کہ وہ میک اپ کرنے کے بعد خود بھی اپنی ہمارت پر ششدر ہو گیا۔ علیحدگی وہ تہذیبی اس کے لیے ناگزیر تھی۔

سیون اسٹار کی طرف سے خطرناک گھر گھر کا کر یا کریم کرنے کی اجازت ملنے کے بعد وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ انتقام لینا اس کی کمرشٹ میں شامل تھا۔ بیچ حامد کے گرگوں نے جس طرح اسے ایک موٹے پر فریب کر لیا تھا وہ اس کی زندگی کا سب سے خوفناک دن تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ فحش کے ہاتھوں سے زندہ بچ سکے گا، پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اسے یقین تھا کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اس کی زندگی کا زریں اصول تھا، اسی اصول تھا اس نے اپنے خواہ کرنے والوں کے ساتھ کوئی جدوجہد نہیں کی تھی، کسی موقع کی تلاش میں وہ ان کے ساتھ خاموشی سے اس جگہ تک چلا گیا تھا جہاں لوچن شہزاد گڈز فریڈرٹ کے ایک مخصوص شخص کی زبان کھلوئے کی خاطر اس پر قہر ڈگری کا اذیت تاکہ اسکو استعمال کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ کواہا تک دیکھ کر کھلکا گیا تھا۔ خود ہاتھ نے بھی سوچا تھا کہ اس نے وہاں جا کر کسی جھگڑا کا ثبوت نہیں دیا تھا کیونکہ اس حالات میں بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس نے ایک ایسا آزمودہ نسخہ استعمال کیا کہ لوچن نے بھی مارشل آرٹ کا ماہر بڑی دور اندیشی سے بازی کا رخ پلٹ دیا تھا۔ ہاتھ نے اس موٹے پر لٹے کر لیا تھا کہ بیچ حامد کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کی تربیت بھی ان ہی لمباؤں پر ہوئی تھی کہ آخری سانس تک دشمن کے اپنے دشمن کو مار دے۔ وہ سیون اسٹار کا پابند نہ ہوتا تو شاید پہلی فرصت میں کوئی مناسب پلاننگ کر کے اپنے دشمن کو مار دیتا یا خود مارتا لیکن وہ حامد کے خلاف دروزی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے خون کے گھونٹ کی کر خاموش ہو گیا لیکن بیچ حامد کے مکان پر کامیاب حملہ اور اسے پوری طرح ہراساں کرنے کی پلاننگ میں کامیاب ہو جانے کے بعد سیون اسٹار کی طرف سے بھی گرین سگنل مل گیا تھا۔ یہ بھی ہدایت تھی کہ کام اس طرح کیا جائے کہ کوئی ریسک نہ ہو مگر حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا تو ہاتھ نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کر ڈالی۔

تشریف فرما جہر کے خفیہ کمرے میں بیچا سے ملاقات کے بعد وہاں ہی کے وقت ایک چہرہ نظر آ گیا وہ ہے پہلے بھی اپنے ہوٹل کے آس پاس مسئلہ لاکھ چکا تھا تو رسی طور پر اس وقت ہاتھ نے کبھی سمجھا تھا کہ شاید اس وقت بھی اس کا تعاقب کیا جا رہا ہوگا۔ اپنے اس شے کو دودھ کرنے کی خاطر اس نے اور دکان ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کی۔ ڈوڈا کو سیون اسٹار کا حوالہ دے کر اس نے غلطی آوی کی طرف سے اس کا شہر یقین میں بدل گیا تو اس کے ذہن میں ایک مصلحت نے سر ابھارا۔

گزارتا ہوتا شاید اس وقت تم مجھ سے نظریں ملا کر بات نہ کر رہی ہو میں۔“
”آپ..... آپ اب بھی ایسی ہی پوزیشن میں ہیں۔“ کنول نے ہونٹ چپاے ہوئے قدرے تنبیہ کے جواب دیا پھر نظریں جھکا لیں۔

”تم نے اپنی ماں کے سلسلے میں میری بات کا جواب نہیں دیا؟“
”نہیں نے سب کچھ میری مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی زندگی گزار چکی ہیں اور اب مجھے بھی اپنی زندگی گزارنے کا اختیار ہے۔“ کنول نے کچھ سوچ کر اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے لیکن..... ایک بار کسی نے مجھے بالوں گرل کا پروفیشن اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس میدان میں غیر متوجع کامیابی حاصل کر سکتی ہوں۔“

”پھر..... تم نے اس کی بات ماننے سے گریز کیوں کیا؟“ بیچ حامد نے اسے معنی خیز انداز میں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”اس لیے کہ میں لوگوں کے ہاتھوں میں کھوٹا نہیں بننا چاہتی تھی۔“

”اسی لیے میں نے بھی تم سے ملینا مناسب نہیں سمجھا۔“ بیچ حامد نے دوبارہ اسے اپنی آغوش میں سینٹے ہوئے بڑی کر بٹھی سے کہا، کچھ دیر تک دونوں کی ہنسی ہنسی سانس آجس میں گڑ بڑ ہوتی رہی پھر کنول نے کھپائی آواز میں کہا۔

”رات آنے سے زیادہ دیر نہیں ہے، اس کے بعد آپ کو مجھ پر ہر طرح کا اختیار ہوگا۔“
”جھینکس.....“ بیچ حامد نے اسے اپنے گھٹنوں سے آزاد کرتے ہوئے مسکرا کر دیکھا۔ ”اچھا کیا جو تم نے مجھ پر وقت ٹوک دیا۔“

کچھ دیر بعد وہ کنول کے ساتھ نیچے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کنول اس کے کپڑے بغیر ماں کو سامنے لے آئی، بیچ حامد سنبھل کر بیٹھ گیا، اس نے کنول کی ماں کو ایک نظر بخود دیکھا پھر رسی طور پر ان سے بھی وہی سوال کیا جو کنول سے پچکا تھا۔

”میں نے اپنی بیٹی کو آزادی دی تھی تو اس پر مجھے اعتماد بھی تھا۔“ کنول کی ماں نے دل پر پتھر رکھ کر اپنی مرضی کے خلاف کہا۔ ”آپ نے کنول کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، وہ بھی ہم پر ایک احسان ہی ہے۔“

”آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔“ بیچ حامد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب اجازت چاہوں گا۔ رات کو دوبارہ حاضر ہوں گا۔“

کنول اس کو چھوڑ دے دروازے تک آئی پھر وہاں ہی پر اس نے ماں کو بتا دیا کہ اس کا اور بیچ حامد کا نکاح خاموشی سے ہو جائے گا۔ یہ اطلاع دیتے وقت اس کی خوب صورت آنکھوں میں جو حسرت ابھری وہ ایک ماں کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکی۔

راستے کی ان چھوٹی موٹی رکاوٹوں کو بھی دور کر دیا جائے جو اس کے شیخ حامد کے درمیان کوئی دشواری پیدا کر سکتی تھیں۔

اپنے پروگرام کے تحت اس نے ڈوما سے یہاں کہا تھا کہ کسی طرح مشیتِ مخلص کو قاپو کر لیا جائے۔ اس طرح وہ اس کی زبان کھلو کر اور بہت سی کامیابی میں بھی مطمئن کر سکتا تھا۔ ڈوما کے مجبوری ظاہر کرنے کے بعد اس نے جلد بازی میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ مطلوبہ شخص کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ حکم اگر وہ اپنی ذاتی حیثیت میں دیتا تو شاید ڈوما اس کی تعمیل میں کسی نہ کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی کرتا چنانچہ کچھ عرصے کے لیے اس نے موہاں کا رابطہ متقطع کیا پھر اسے دوبارہ کال کر کے یہی کہا کہ..... "سیون اسٹار کی طرف سے بھی کریں مکمل ملاپ کے کاٹنا درمیان سے نکال دیا جائے۔"

ڈوما کو ضروری ہدایت دینے کے بعد ہی اس نے فوری طور پر ہوٹل سے نکلنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ ڈوما نے کسی اسے بھی مشورہ دیا تھا چنانچہ ہاشم نے نہ صرف ہوٹل تھیل کر دیا بلکہ اپنا حلیہ بھی اس مہارت سے بدلا کہ خود بھی اپنے آپ کو شناخت نہ کر سکا۔

اس وقت وہ کسی ہوٹل کے بجائے ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس کے انٹرکٹیفیو روم میں بیٹھا پیش آنے والے حالات پر غور کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک خیال ابھر رہا تھا۔ جتنی جلد ممکن ہو، بڑے گھر چھ کا کر یا کر م بھی کر دیا جائے۔ سانپ کو آستین میں پالتا اور دودھ پلٹا بھی اس کے اصولوں کے خلاف تھا۔ دوسرا ایک خیال یہ بھی کسی خطرے کا احساس دلایا تھا کہ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سیون اسٹار کا مخصوص کواڈ استعمال کرنے میں بھی جلد بازی کا مظاہرہ کر ڈالا تھا۔ اگر وہ خود رابطہ قائم کر کے صورت حال کی وضاحت کر دیتا تو میں ممکن تھا کہ سیون اسٹار کی جانب سے بھی ڈوما کو از خود سیون اسٹار کے ہائی مینجمنٹ کے ذہن لانے کی بھول کی تھی۔ ان حالات میں بھی یہ ضروری تھا کہ وہ مزید وقت ضائع کے بغیر اپنے ذہن سے اپنا حساب کتاب برابر کر لے جس کی اجازت اسے بہر حال مل چکی تھی۔ وہ ان ہی باتوں پر غور کر رہا تھا جب موہاں نے واہبریت کا شروع کیا۔ اسکرین پر ڈوما کے نمبر دیکھ کر اس نے موہاں آن کر کے کانوں سے لگا لیا۔ "سوری....." اس نے معذرت کی۔ "کچھ حالات ایسے تھے کہ میں تمہیں دو گھنٹے بعد فون نہیں کر سکا، کیا خبر ہے؟"

"موٹ کیس پارسل کر دیا گیا ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟"

"جواب میں ہاشم نے اسے اپنا پتا سمجھانے کے بعد پوچھا۔ "کوئی نئی خبر؟"

"ہاں....." ایک لمحو توقف کے بعد ڈوما نے نا خوشگوار اعزاز میں جواب دیا۔ "یہ پہلا اتفاق ہے کہ کسی ٹیم کے ایک ممبر نے اپنے کسی دوسرے ساتھی کے گھر میں چائنی کا پھندا ڈالنے کی کوشش کی ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو.....؟" ہاشم، ڈوما کا جواب سن کر بری طرح چونکا، اس کے ذہن میں

خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

"تم ایک تجربہ کار آدمی ہو میرے دوست۔" اس بار بھی ڈوما کے لیے میں طنز کی آمیزش تھی۔ "اپنی زندگی بچانے کی خاطر کسی اور گھر میں پھندا ڈالنا بہر حال تمہیں زیب نہیں دیتا تھا..... ویٹ از آل۔" دوسری جانب سے رابطہ متقطع کر دیا گیا۔

ہاشم نے فوری طور پر پے در پے تین بار ڈوما کے نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن دوسری جانب سے موہاں بند ملا۔ یہ پھندے کے حوالے سے بات اس کے ذہن میں اچلی تھی۔ وہ بھی کچھ دیر شش و پنج میں مبتلا رہا، ایک ماٹھے کو اس کے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا کہ زندگی بچانے کی خاطر سارے معاہدوں کو پالانے طاق رکھ کر بجلی فائٹ سے فرار ہو جائے لیکن اس نے اس بزدلانہ خیال کو خود ہی ترک کر دیا۔ وہ جس پیٹھے سے مسلک تھا اس میں موت اور زندگی دونوں کا داروہار اصول پسندی پر تھا۔ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی حالات کے پیش نظر ضروری سمجھی تھی لیکن بہر حال سیون اسٹار سے اجازت نہیں لی تھی۔ اس نے فراکا امبر نے والا خیال رد کر کے سیون اسٹار سے رابطہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ تین گھنٹیوں کے بعد دوسری جانب سے کال ریسپونڈ کی گئی۔

"کیا بات ہے؟" کال دا گواری سے وصول کی گئی تھی۔

"میں ایک اہم پیشین کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔"

"اب اس کا وقت گزر چکا ہے۔" یہ دستور سدر لہجے میں جواب ملا۔ "تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے غداری کی ہے اور غداری کی ایک سزا ہوتی ہے یہ بات شاید تم بھی جانتے ہو گے۔"

"لیکن....."

"بحث فیصلوں ہے۔" اس کی بات رد کر کے سات اعزاز میں کہا گیا۔ "ہم پھند نہیں کریں گے کہ مرنے والے کی وجہ سے کسی طور پر کوئی ایجنسی ہمارے اوپر شبہ بھی کرے۔" "تیر تو بہر حال مکان سے نکل چکا ہے۔ لیکن، میں اپنی تسلیم کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی نہیں کروں گا۔"

"تم اس پوزیشن میں بھی نہیں ہو۔"

"اب میرے لیے کیا حکم ہے؟" ہاشم نے دنگ آواز میں سوال کیا۔

"سرخ پھسول....." دوسری جانب سے فیصلہ سنا دیا گیا۔ "ایجنسی والوں کو تمہاری جیب سے ایک تحریر بھی ملی چاہے جس میں اس بات کو قبول کیا جائے کہ تم نے اسپورٹس کار والے کو ذاتی دشمنی کی وجہ سے قتل کیا تھا۔"

"اوکے سڈیم۔" ہاشم نے مسکرا کر مردوں کی طرح جواب دیا۔ "سرخ پھسول کھانے کے بعد میں ذاتی طور پر عرصہ کر دوں گا کہ ہاشم نے بیحد موت کی نگاہوں میں دکھائی ڈال کر مسکراتا سیکھا ہے۔ اوکے، ایڈمنڈ بائی۔" موہاں بند کرنے کے بعد ہاشم کچھ دیر تک خاموش رہا پھر اس نے

حالات کی ستم خیزی پر کسی غم کا اظہار کرنے کے بجائے دل کو لال کر زندگی سے بھر پور تقیہ لگانے شروع کیے۔ اس کے بعد آرام سے صوفے پر بیٹھ کر اس نے اپنا پسندیدہ جیکل جبر سرچ سے مشغول کیا، پھر جب سے ایک سرخ کپسول نکال کر منہ میں ڈال لیا کپسول کو چپانے سے پیشتر اس نے سیون اسٹار سے کیے گئے وعدے کے مطابق علاقے کے قہانے کا فہرہ لکھنا تمام اور ایڈریس بھی تفصیل سے سمجھا دیا۔ اس عرصے میں اس کی نظریں بہ دستور دی اسکرین پر پرمی رہی تھیں۔ فون کرنے کے بعد اس نے سرخ کپسول کو چپا لیا۔ دس صفحے کے اندر راتر وہ زندگی کی بازی بھی ہار گیا۔



شیخ حامد نے شبنم کو افضل خان کا گھڑی اہرامنٹ دینے کی جو خوشخبری سنائی تھی، وہ شبنم کے لیے حالات کے پیش نظر کسی طرح مناسب نہیں تھی۔ وہ ایک باس سے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی لیکن وہ اس پہلو پر بڑی تنبیہ کیے سے غور کر رہی تھی کہ اگر وہ بھی افضل خان کی جگہ ہوتی تو شاید اس فلیٹ کے سلسلے میں ایک تفریاتی کسری اور مکمل کا شکار ضرور ہو جاتی۔ افضل خان چاہے اس بات کو زبان سے نہ کہتا لیکن دل میں اسے اس کا احساس ضرور ہوتا۔

وہ تنبیہ کی سے اس مسئلے پر غور کر رہی تھی۔ اگر اس نے افضل خان کے ساتھ مل کر جگہ باس کے خلاف کوئی خفیہ منصوبہ بنانے کی ضرورت پر غور نہ کیا ہوتا تو اور بات تھی لیکن اب وہ دوسرے زاویے سے تمام پہلوؤں پر غور کر رہی تھی۔ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھی کہ اپارٹمنٹ والی آفرو کو بھیانے رو کر دیتی۔ جگہ باس انکار سننے کا عادی نہیں تھا۔ شبنم کی جو کمزوری تصویر کی شکل میں اس کی تحویل میں تھی، اس نے شبنم کو کسی آخری قدم سے بھی روک رکھا تھا۔ اگر وہ کسی موقع سے فائدہ اٹھا کر جگہ باس کو فٹکانے بھی لگاتی تو تصویریں سامنے آ جانے کی صورت میں پریس چھانی کا پھندا اسی کے گلے میں ڈال دیتی۔ ایک تھوڑا عورت ہونے کی وجہ سے بھی وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کا رستہ نہیں لے سکتی تھی۔

شیخ حامد نے ایک باہر کھڑائی کی طرح شبنم کو ہر طرف سے نہ صرف اپنے فکروں میں جکڑ رکھا تھا بلکہ اس کے ذریعے وہ افضل خان سے بھی اپنی سب مانی کر رہا تھا۔ افضل خان اگر زبان بند نہ رکھتا تو جگہ باس کی اور ذریعے سے بھی اس کے اور افضل خان کے تعلق کو منظر عام پر لاسکتا تھا۔

شبنم کی ذاتی معلومات کے مطابق، افضل خان کے اسپتال کے قاریغ ہونے کے بعد اس کے فلیٹ میں کچھ مدت قیام کی اطلاع بھی پریس کے رپورٹرز کو پہنچی تھی۔ اب جگہ باس نے اسے پھر افضل خان کو اپنے ساتھ رکھنے کا حکم دیا تھا جس سے وہ انکار نہیں کر سکتی تھی لیکن یہ ضرور سمجھ رہی تھی کہ جگہ باس نے اس کے گرد کھڑا کیا تھا اس میں وہ پوری طرح پھنس چکی تھی۔ اب اس دلدل سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ افضل خان کو صورت حال سے مکمل طور پر آگاہ کر دے کہ بعد مکمل کر یہ بھی ظاہر کر دیتی کہ اس نے اپنی آزادی کے لیے کیا پلان بنایا ہے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ

غور افضل خان کے بیٹے میں بھی کرم رما کہ کے اندر کوئی ایسی چنگاری ضرور دہی ہوگی جو بھڑک کر شعلہ بننے کا موقع تلاش کر رہی ہوگی۔ لیکن یہ وہ اپنے طور پر غلط اندازہ قائم کر رہی ہو لیکن بہر حال وہ اس اندر سے جو نکلنے پر مجبور تھی۔ اسی غرض سے اس نے ایک خلیہ بانگ رستہ لیتے ہوئے اپنے ذاتی منصوبے اور اس کے مکمل پلان کو مختصر آئٹم کے اپنے پریس میں ڈال لیا تھا اور اس وقت اسٹار ان ہوئی کی طرف جاری تھی جہاں جگہ باس کی اطلاع کے مطابق افضل خان مقیم تھا۔ اس اطلاع کی فراہمی کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ افضل خان سے مل کر جگہ باس کے منصوبوں کے مطابق اپنا کردار ادا کرے۔

”اسٹار ہوئی“ جاتے وقت بھی شبنم کے ذہن میں اس کے ذاتی منصوبے کے مختلف پہلو کھلا رہے تھے۔ ناکامی کی صورت میں اس کا حشر اس کی توقع سے کہیں زیادہ بھیانک ثابت ہوتا۔ افضل خان جس مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچ رہی تھی وہ افضل خان بھی اسی صورت کو استعمال کر کے جگہ باس نظروں میں سرخرو ہونے پر غور کر سکتا تھا۔ بہر حال شبنم اس کے لیے بھی پوری طرح آمادہ تھی، وہ جانتی تھی کہ ”بلائنڈ“ بچوں پر جیت کا اٹھنا کر کے والے انکار بڑائی بری طرح ہار بھی جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں بار بار ”نورسک، نوکیم“ کا فارمولا بھی کسی ٹیون سائن یورڈ کی طرح مل بھج رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں تھوچی جب ایک مسئلہ پر رستے کے بعد اس کی نظر ”مفتی شبنم“ پر پڑی۔ گھر سے سرخ رنگ کی وہ جپے تنے سرسری طور پر پیچھے آ کر دیکھ چکی تھی، اس بار اس کے ذہن میں خطرے کا مسئلہ بن کر ابھری۔ جگہ باس نے بھی اسٹار ان ہوئی اور افضل خان سے ملنے کا مشورہ دیتے وقت کہا تھا کہ وہ کسی مکندہ تاقب کے خطرے کو نظر انداز نہ کرے۔ کسی اہم باہت مارے جانے کے بعد جگہ باس بھی خاصا حوازا ہو گیا تھا۔ ”وہ کون تھا؟“ شبنم کو اس کی تفریح تھی لیکن وہ اس جپے کو پہلے بھی کسی موقع پر دیکھ چکی تھی جو پڑی پڑی شہنشاہ لودی کی ملکیت تھی۔ وہ یہی جگہ جانتی تھی کہ لودی کی مٹاب میں سے اور جگہ باس بھی اس سے خوش نہیں ہے۔ ایسی صورت میں لودی کا اس کے تاقب میں آنا سنی خیر ہی تھا۔

شبنم نے ایک لمبے کوسو چاہا کہ وہ افضل خان کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دے لیکن پھر کسی عمل سے اس کے ہونٹوں پر ایک قسمی خیر غمیر جاگ اٹھا۔ مشکل کھلنے کی شبنم نے ایک دو موز کاٹنے کے بعد مذکورہ جپے کو پیچھے آتے دیکھا تو اپنے پرگرام میں تھوڑی تبدیلی کر دی۔ اسٹار ان ہوئی جانے کے بجائے وہ اس کے قریب واقع ایک تین منزلہ رہائش گاہ میں چلی گئی۔ یہ عمارت خود کو عالم ظاہر کر رہی تھی لیکن اس نے جپے کو کچھ فاصلے پر رستے دیکھ لیا تھا، ایک دکان سے کاسٹیک کے ایک دو آٹم فریڈ سے وقت اس نے لودی کو بھی اندر آتے دیکھ لیا۔ اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر وہ دیدہ وادید رہائش گاہ اسٹور کی تیسری منزل پر لطف کے ذریعے چلی گئی جہاں چلی دو منزلوں کے مقابلے میں کم رہا ہوتا تھا۔ ایک دو اسٹالوں پر وقت گزارنے کے بعد وہ جزل اور میڈیکل سامان فروخت کرنے والی دکان پر رکی تو لودی بھی اسی کاؤنٹر پر آ گیا۔ اس نے دکان کے سیلز مین سے ایک آجکشن طلب

کرنے کے ساتھ ہی اس طرح شبنم کی طرف دیکھا جسے وہ ملاقات محض ایک اتفاق ہو۔

”ہیلو.....“ اس نے روایتی اعزاز میں شبنم کو پوری توجہ سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں کیا لینے آئیں؟“

”ایک ضروری دوا لیکن جی چوکیں اور نہیں مل رہی تھی۔“ شبنم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر رہی تھی کہ ممکن ہے جب باس کا کوئی سادہ لباس دلا جائے گا تو وہی لودی یا اس کی گھمائی پر مامور ہو۔

”حیرت ہے۔“ لودی نے اس بار دہلی زبان میں بے تکلفی کا اظہار کیا۔ ”جو خود بخود اسرار کا علاج ہو گیا وہ بھی کسی دوا کی ضرورت کی محتاج ہو سکتی ہے؟“

”جی بھی وقت اور حالات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔“ شبنم نے تکی کے بجائے جان بوجھ کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اس بات کی تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ لودی کے تعاقب کرنے کا خیال کہیں اس کا دھم نہ ہو۔

”یہ بات بھی بھم نہیں ہوئی اس لیے کہ آپ تو.....“ کچھ کہتے کہتے لودی نے اپنا جملہ کسی فوری خیال سے اوجھڑا چھوڑ دیا۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئے.....؟“ شبنم نے اسے لفت دینے کی ٹھان لی۔

”اس لیے کہ ایک بار دفتر میں آپ نے میرے ساتھ بڑا خشک اعزاز اختیار کیا تھا۔“

”اوہ.....“ شبنم نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”دفتر میں کچھ بندشیں بھی ہوئی ہیں جس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور سنا ہے، آج کل آپ کی لائف کسی کر رہی ہے.....؟ سنا ہے کہ آپ کو.....“ اس بار شبنم نے بھی دیدہ وادب جملہ نامہ لپکھ چھوڑ دیا۔

”ٹھیک سنا ہے آپ نے؟“ لودی نے اس کے قریب ہوتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ایس بی اورنگ زیب نے ذاتی درخواست کی وجہ سے اپنے اثر ورسوخ استعمال کر کے مجھے معطل کر دیا ہے۔“

”کیا.....؟“ شبنم نے چونک کر بڑی خوبصورت اداکاری کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ ”کیا آپ کی طرف سے کسی نے جہابی کارروائی نہیں کی؟“

”اس میں بھی کچھ مصلحت ہے۔ ایس بی نے مجھ سے دشمنی مول لے کر خود اپنے پیروں پر کھڑا ہی مارا ہے..... وہ بھی کچھ ڈون کا مہمان ہے، اس کا تبادلہ ہو جانے کے بعد حالات پھر سازگار ہو جائیں گے۔“

لودی کا مطلوب آجکشن لایا گیا تو منٹکوں کا سلسلہ شپ ہو گیا۔ شبنم نے بھی اپنا ہل ادا کیا۔ دونوں ایک ساتھ واپسی کے ارادے سے پہلے تو لودی نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ”اس وقت آپ سے اتفاقہ ملاقات ہوگئی تو ایک ضروری کام بھی یاد آ گیا۔“

”حیرت ہے۔“ شبنم نے اسی کا جملہ واپس کرتے ہوئے شرفی سے کہا۔ ”جو خود دوسروں کے

کا کام آتا ہو اسے کیا کام چس آسکتا ہے؟“

”میں اپنی ذاتی اور نجی حیثیت میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“ خلاف توقع لودی نے بھیجی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اس وقت اگر آپ میرے کام آ جاویں تو میں ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

”تھیریت.....؟“ شبنم نے اسے ٹھوٹی نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ دیر ہی تھی کہ لودی اس سے درخواست کرے گا، اس کا اعزازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ لودی نے ایک لمحے تامل کے بعد عاجزی سے کہا۔

”باس کسی وجہ سے میری ایک غلطی پر ناراض ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ڈی آئی جی کو بھی مجھے معطل کرنے سے بچتر اپنی ملازمت کے بارے میں ضرور غور کرنا پڑتا۔“

”آئی جی.....؟“ شبنم نے انجمن بین کر پوچھا۔ ”باس آپ کی کس غلطی پر عتاب ہے؟ اور میں اس سلسلے میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟“

”آ.....؟ آپ کوئی مناسب موقع دیکھ کر باس سے میری سفارش کر دیں۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کی بات رد نہیں کرے گا۔“ لودی کے تعاقب کی وجہ شبنم کی سمجھ میں آگئی۔

”آپ میرے مقابلے میں باس سے زیادہ قریب رہ چکے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اس کے لیے اہل ہوتے ہیں۔“ شبنم نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ”وہ کسی کی مداخلت بھی پسند کرنے کا عادی نہیں ہے۔“

”میں یہ بھی جانتا ہوں لیکن میں نے آپ سے درخواست کی ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کی ہے۔“ لودی نے اسے مخصوص اعزاز میں دیکھ کر دہلی زبان میں کہا۔ ”مکن ہے کہ میری ذاتی معلومات نامہ ہوں، پھر بھی میں آپ سے سفارش کی درخواست واپس نہیں لوں گا۔“

”شبنم، لودی کے جواب پر دل ہی دل میں چونکی، اسے علم تھا کہ جب باس اور لودی کے تعلقات کس قسم کے تھے، لودی اپنی رخ سے کر کے بھی صلح حامد کی غی ضرورتیں پوری کرنے میں بھی فرم نہیں کرتا تھا، یہ بات شبنم کے علم میں تھی اس لیے اس نے لودی کی معلومات کے بارے میں وضاحت طلب کرنے میں ہل وچل کا مظاہرہ کیا۔ کچھ توقف کے بعد بولی۔

”میں کوئی یقینی وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ بہر حال، اگر آپ کے کسی کام آسکی تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”میرے لیے آپ کا اتنا جواب بھی بہت ہے۔“

لودی نے اس بار قدرے استوار سے کہا پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا لفت کی طرف چلا گیا۔ شبنم نے اس کے ساتھ ساتھ جتنی جگہ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پراسنور سے نکل کر اس نے اپنی گاڑی میں چڑھ کر یوں ہی دو چار منٹوں کا چکر لگایا۔ لودی کی جیب اس کے تعاقب میں دو در در تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لے کر گاڑی کا رخ ہوئی اسٹار ان کی طرف موڑ دیا۔ پندرہ بیس منٹ

بعدہ افضل خان کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود تھی۔ رسی جھلوں کے تھالے کے بعد افضل خان نے شہید کی کہ۔

”میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تمہاری سفارش پر مجھے آزاد دنیا میں سانس لینے کا موقع مل گیا۔“

”آجکھ بھی ملتا رہے گا۔ بشرطیکہ تم باپ کی کاٹھار ہونے کے بجائے عقلمندی سے کام لو۔“

”میرے لیے کوئی نیا حکم.....؟“

”ایک اہم خبر سنانا چاہتی ہوں۔“ شہین نے افضل خان کو نظروں کے مخصوص اشاروں سے کچھ

سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جگہ پاس تمہارے لگژری اپارٹمنٹ کو جدید اعزاز میں شیک کر رہا ہے۔“

”کیا میں اس خواب پر یقین کر لوں؟“ جواب میں یہ دستورِ حرمت اور توجہ کا اظہار کیا گیا تھا۔

”ہاں..... لیکن کچھ ترسیم کے ساتھ۔“ شہین نے غصے آواز میں کہا۔ ”یہ ہم دونوں کی کارکردگی کا

ملا جلا انعام ہوگا۔“

”میں سمجھ نہیں.....؟“

”میرے ایک سوال کا مکمل کر صاف گوئی سے جواب دو کیا تم میرے ساتھ رہنا گوارا کرو

میں؟“

”یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔“ افضل خان نے جذباتی اعزاز میں کہا۔ ”کیا جگہ

باس کو میرا اور تمہارا ایک ساتھ رہنا گوارا ہوگا؟“

”اس کا اشارہ نہ ہوتا تو میں اس موضوع پر زبان کھولنے کی جرأت بھی نہ کرتی۔ اب تم کیا کہو

میں؟“

”میرا خیال ہے کہ میرے پاس تمہارے کسی مشورے پر عمل کرنے کے علاوہ اہلِ خیال کوئی

آپشن بھی نہیں ہے۔“

”مجھے تمہارا جواب پسند آیا۔“ شہین نے دیدہ و دلالت اپنی برتری کا اظہار کیا۔ ”تم کو شاید ایک

طویل عرصے تک اسی اعزاز میں رہی ایکٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد بھی سب کچھ پاس کی

مرحی پر منحصر ہوگا۔“

”میں جانتا ہوں۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اگر جگہ پاس نے آڑے وقت میں میرا ہاتھ نہ تھما

ہوتا تو شاید میں بہت پہلے قانونی قید میں اچھٹے کے بعد زندگی کی بازی ہار چکا ہوتا۔“ افضل خان نے

کسی بارے ہوئے جاری کی طرح اعتراف کیا۔ ”میں اس احسان کو زندگی کی آخری سانسوں تک

فراوانی نہیں کر سکتا، خواہ حالات کیسے ہی ہوں۔“

تمہارے پاس تھا۔“

شہین نے جاتے وقت اپنا پرس کھول کر ٹائپ شدہ خط نکالا پھر اسے فرش پر گرالتے ہوئے لیے

لیے قدم اٹھاتی چلی گئی۔ افضل خان نے اس کے جانے کے بعد کاغذ کا یہ ظاہر بے کار مٹھ کھول کر

تفصیل سے پڑھا تو اس کی آنکھوں میں کسی ایسے آدمِ خوردہ سے جیسی چمک ابھری جو اپنے کسی

پسندیدہ شکار پر بھٹ پڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہو۔ اس نے ٹائپ شدہ مضمون کو کئی بار تفصیل

سے پڑھا پھر پہلی فرصت میں اسے جلا کر اس کی راکھ دوش تین میں بھادی۔

❖❖❖

لہہ کھل تندی کے ادارے سے لگتا تھا۔ سراج کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں بیٹھے سے اچھٹن ہو رہی تھی۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ عرصہ باہر نہیں رہا تھا لیکن گھڑی دیکھنے کے بعد اس کا ذہن بھی پکارا کر رہ گیا۔ کچھ دیر تک وہ اسی کیفیت سے دوچار رہا پھر اس نے سراج کی جانب دیکھ کر بڑی عاجزی سے درخواست کی۔

”صاحب..... ایک بات عرض کروں اگر آپ برائے نام ہیں۔“

”کہو.....“ سراج نے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت دیکھ کر دریافت کیا۔ ”کیا کہنا چاہتے

”ہم“

”آپ مجھے دماغ کا علاج کرنے والے کسی ڈاکٹر کو.....“

”لیاقت حسین.....“ سراج نے اس کا جملہ کاٹ کر تیزی سے کہا۔ ”اس سے خوشتر بھی جو

ہمیں تمہارے ساتھ ہو چکی ہیں ان کو مت کریدو۔ زیادہ الجھو گے تو بات اور خراب ہو جائے گی

اور..... یہ بھی یاد رکھو کہ میں تمہیں ساتھ لاتے وقت کیا تھا.....“

”وہ تو مجھے یاد ہے صاحب لیکن میرے ساتھ بار بار ایسا کیوں ہوتا ہے.....؟“ لیاقت حسین

نے اچھٹن کر جواب دیا۔ ”آپ کی اور بڑے صاحب کی بات اور ہے لیکن دوسرے ان باتوں پر چھین

فہم کر رہے ہیں۔ کہیں پھنس گیا تو آپ کو بھی میری وجہ سے پریشانی ہوگی۔“

”پریشان مت ہو..... صرف اتنا یاد رکھو کہ میں تمہیں دوست سمجھتا ہوں اور خدا کی رحمانی

رحم میں بھی درپردہ سے کچھ نیکی اور بھلائی کے کام کر رہی ہیں۔ تمہیں جو باتیں یاد نہیں رہیں تو یہ بھی

خدا کی مشیت ہوگی۔ جب بھی تمہارے ذہن میں کوئی تجویز، کوئی نیا خیال ابھرے۔ مجھے ایک

دوست کی حیثیت سے ضرور بتا دینا۔“ سراج نے اسے تسکین سے ہار دکر نے کی کوشش کی۔ ”ہم

دلوں برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی خاطر کام کر رہے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ سیدھے اور بے ماسے

پر چلنے والوں کے لیے کانٹوں سے زکرا بھی ایک آزار بن سکتی ہے۔ میرے علاوہ حنان بھی تم پر

اعتماد کرتا ہے۔ ذہن پر کوئی بوجھ نہ محسوس کرو، تم ڈیڑھ گھنٹے کہاں رہے؟ یہ بھی یاد کرنے کی کوشش نہ

کرو، آئے والہ وقت ہم دونوں کی خود رخصتی کر دے گا۔“

”آپ کی بڑی مہربانی صاحب جو اتنا خیال رکھتے ہیں مگر ایک درخواست میری بھی بقول

کرنا۔“ لیاقت حسین نے درخواست کی۔ ”میں آپ کے کمرے کے بجائے اگر کہیں باہر بیٹھا رہوں

تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

”فہم ہے.....“ سراج نے اس کی نفسانی الجھن کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کا بھی

بہت اہم کر دوں گا لیکن اب تم دوبارہ کسی ذہنی کشش کا شکار ہونے کی حالت میں نہیں کرو گے۔“

لیاقت حسین کے سلسلے میں سراج کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈیوٹی کا شیبل کے بیان کے مطابق وہ دس پندرہ منٹ میں واپسی کا کہہ کر کہیں قریب ہی کسی فوری ضرورت کے لیے گیا تھا لیکن ڈیڑھ گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی وہ واپس نہیں آیا تھا۔ اچانک کہاں اور کیوں چلا گیا؟ تھوڑی دیر کا کہہ کر جانے کے باوجود اس کی واپسی کیوں طویل پکڑتی جا رہی تھی؟ سراج ان ہی سوالات کے بارے میں غور کر رہا تھا جب لیاقت حسین انتہائی پر سکون حالت میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی یا الجھن کے تاثرات نہیں تھے۔ سراج اسے ٹھوٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کے بارے میں چونکہ وہ کچھ پر اسرار باتوں سے بھی واقف تھا اس لیے اس نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیاقت حسین اس کی اجازت حاصل کر کے بیٹھ گیا تو سراج نے سادگی سے پوچھا۔

”کہاں چلے گئے تھے لیاقت حسین؟ میں بڑی دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔“

”دس منٹ کے لیے تو گیا تھا صاحب۔“ لیاقت حسین نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”آپ

کی ضرورت تھی تو سواکل پر تنگ دیدیتے، میں واپس آجاتا۔“

سراج شبہا کر رہ گیا۔ لیاقت حسین کے جواب میں کوئی اور ادراکی، تصنع یا بناوٹ نہیں تھی لیکن یہ

بھی حقیقت تھی کہ اس کی واپسی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہی ہوئی تھی۔

”میرے کا شیبل کا کہنا ہے کہ تم کسی فوری ضرورت کا کہہ کر گئے تھے۔“ سراج نے دوستانہ

انماز میں کہا۔ ”جب دفتر میں تمام بھتیجے موجود ہیں تو تمہیں کہیں اور جانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں نے آپ کی غیر موجودگی میں کمرے میں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔“ لیاقت حسین نے

کسمار کر کہا۔ ”آپ نے جو عزت دی ہے وہ میری توقع سے زیادہ ہے صاحب لیکن دوسرے لوگ

اسے عجیب نظروں سے دیکھیں گے۔ آپ برائے نام ہیں تو میں کمرے کے بجائے باہر کرسی ڈال کر بیٹھنے

میں زیادہ سکون محسوس کروں گا۔“

”صرف اسی لیے تم ڈیڑھ گھنٹے تک سوچ و چار کرنے کی خاطر کہیں چلے گئے تھے؟“

سراج نے پہلی بار اس کی غیر حاضری کے سلسلے میں غفلت کا اظہار کیا تو لیاقت حسین نے اسے

عجیب نظروں سے دیکھا پھر، تصدیق کی خاطر جب اس نے دفتر میں گئی دیکھا کہ گھڑی پر نظر ڈالی

تو اس کے چہرے پر ایک انتہائی پریشانی سی طاری ہو گئی، وہ ڈیوٹی کا شیبل سے دس پندرہ منٹ کا

علم نہیں ہے۔“

”دوست خیال ہے تمہارا۔“ لوچن نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ زیادہ روگ پانا میرے اصول کے خلاف ہے۔“

”تمہاری اطلاع ہے کہ میں نے آپ کے عرض سے کہ میں نے ہوش کی رہائش ترک کر کے ایک واقف کار طبی کے ساتھ عارضی طور پر اپنا بیسٹ کر لیا ہے۔“

”واں کوئی خوبصورت لڑکی بھی ہوگی۔“ لوچن نے اسے چھپرنے کی کوشش کی۔ ”معاذ ہی رہتا۔ پہلے بھی تمہاری نائنٹ کلب کی ڈانس فرینڈ کو سیون اسٹار نے چوبیس گھنٹے کی مہلت میں بیک نوپولین کر دیا تھا۔“

”اس بار یاد نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ سیون اسٹار کوئی الخال آم کھانے سے مطلب ہے، بیڑ گھٹنے کا وقت اس کے پاس بھی نہیں ہے۔“

”اب تک کتنے پیگ مطلق کے نیچے اتار چکے ہو؟“ لوچن نے سیون اسٹار کے حوالے پر دریافت کیا۔

”میں اس وقت پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔“ ڈوما نے سناٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا تم کچھ دیر کے لیے سنجیدگی سے میری بات نہیں سن سکتے؟“

”من رہا ہوں لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ مجھے کسی گرل فرینڈ کے بجائے من ہاتھ زیادہ عزیز ہے اس لیے زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔“

”تمہاری مرضی۔ مگر شاید ہاشم کے بارے میں من کرم کو بھی سن ہاتھ سے منڈھوٹا پڑ جائے۔ سنجیدگی سے سنو، ہاشم اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“

”واٹ.....“ لوچن کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے بجلی کا جھکا لگا ہو۔ اس نے حیرت سے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا حادثہ پیش آ گیا ہے؟“

”حادثہ نہیں ہائی ڈیئر۔ سیون اسٹار کے حکم پر اس نے سرخ کپسول چبا کر نجات حاصل کر لی ہے۔“ ڈوما نے بات جاری رکھی۔ ”اس حکم کی قبیل نہ کرتا تو شاید اس موت کے گھاٹ اتارنے کا فرض بھی مجھے ادا کرنا پڑتا۔ کچھ دیر پہلے ہی ہاشم کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے انھوا لیا گیا ہے۔“

”اسے کس جرم کی مراد دی گئی ہے؟“

”جواب میں ڈوما نے مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔“ سیون اسٹار نے فوری طور پر تمہارے لیے بھی یہی حکم جاری کیا ہے کہ کسی ایسی جگہ چناؤ جہاں پولیس تم تک نہ پہنچ سکے۔“

”لیکن ہاشم کی ایک غلطی کی سزا ہم کو کیوں دی جا رہی ہے؟ میرا یا تمہارا اس کی غدار سے کیا تعلق ہے؟“

”نہی کیکن..... ہاشم کا سپورٹ اور ضروری سامان پولیس کی تحویل میں ہے..... پولیس کی تفتیش کا دائرہ وسیع ہوا تو ہمارے ہاشم بھی لست پڑ سکتے ہیں اس لیے کہ جس ثلاثہ سے ہم یہاں پہنچے

”ان فرنگیوں کے رنگ ڈھنگ بھی نرالے ہوتے ہیں صاحب۔“ لیاقت حسین نے ایک عام بات کی۔ ”یہ کسی نہ کسی طرح ہر معاملے میں اپنی برتری اور گوری سی رنگت کے اندر چھپے بیسوں کا اظہار کرنے میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔“

سراج نے اس تبصرے پر کوئی جواب نہیں دیا۔ دفتر پہنچ کر اس نے دوبارہ مرنے والے کا ذکر چھیڑ دیا پھر سوچی سمجھی انکیم کے پیش نظر اس نے مرنے والے کے کلوز اپ بھی لیاقت حسین کو دکھائے لیکن وہ ان تصویروں کو دیکھ کر نہ چونکا، نہ کسی بات سے اس کا اظہار ہوا کہ اس نے مرنے والے کو کبھی کہیں دیکھا بھی ہو۔ البتہ تصویر پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے اتنا ضرور کہا تھا۔

”یہ کوئی فرنگی تو نہیں ہے صاحب.....“

”یہ ظاہر تمہارا اندازہ درست ہے مگر جب تک لاش کی چیر چھاڑ کی تفصیلی رپورٹ نہ آ جائے کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔“

”کیا لاش کا کوئی والی دارت بھی سامنے نہیں آیا۔“

لیاقت حسین نے کسمسا کر پوچھا۔ ”ہوٹوں میں یا کہیں کمرے پر رہنے والوں کا بھی کوئی نہ کوئی پتا ٹھکانا تو تحریری شکل میں ضرور ہوتا ہوگا۔“

”تمہارا خیال درست ہے، خوشخبری کرنے والے نے خود کو سیاح بتایا تھا اور اپنی ضروری دستاویز بھی گیسٹ باڈس والوں کو دکھائی تھیں۔ پولیس نے وہ تمام ثبوت اور مرنے والے کے کمرے سے اس کی سفری دستاویزات اپنی تحویل میں لے لی ہیں۔ وہ کون تھا؟ کب یہاں آیا تھا اور کہاں کہاں ٹھہرا تھا؟ اس کی تفتیش کے بعد ہی تمام معلومات حاصل ہو سکیں گی۔“

لیاقت حسین نے کوئی مزید سوال نہیں کیا۔ سراج بھی کچھ ضروری کالیں کرنے میں مصروف ہو گیا، لیاقت حسین نے مرنے والے کی تصویر دیکھنے کے بعد کوئی ایسا تاثر ظاہر نہیں کیا تھا جس سے سراج کے شبہ کے تصدیق ہو سکے۔

لوچن اس وقت ساحل سمندر کی ایک ہٹ کی بالائی منزل پر صرف ایک برائے نام ٹیکر پہنچے چاروں خانے چت لیٹا سن ہاتھ لے رہا تھا جب اس کے موبائل پر منسلک آواز شروع ہوئے۔ اس وقت وہ پوری طرح سے اپنے مشغل سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن اسے جہاں موبائل کی طرف توجہ دینی پڑی جس پر ڈوما کا نمبر بج لگا رہا تھا۔

”ہیلو.....“ لوچن نے برا سامنے بنا کر موبائل آن کر لیا۔

”کہاں سے بات کر رہے ہو؟.....“ ڈوما نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”جھٹ کے اوپر اور آسمان کے نیچے آکھ بند کیے سن ہاتھ لے رہا ہوں۔ تم نے اس وقت کیسے یاد کیا؟“

تھے اس کے فرست کلاس کے مسافروں میں ہماری بد نصیبی سے کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ ہم دونوں کا نام بھی جہاز کے مسافروں کی فہرست پر موجود ہوگا۔“

”تم شاید حیک کہہ رہے ہو لیکن ہاشم.....“ لوچن کچھ کہتے کہتے رک گیا، اب تک اس کے ذہن میں یہی شبہ تھا کہ ہاشم ہی کسی عورت کو استعمال کر کے سیون اسٹار کے کوڑے ڈر لیے ان کو کاٹنے کر رہا تھا لیکن اس کی موت کی اطلاع نے اس کے لیے کی تردید کر دی تھی۔

”خاموش کیوں ہو گئے؟“ ڈوما نے تجسس کا اظہار کیا۔ ”کیا تمہیں ابھی تک یہی گمان ہے کہ میں نشے کی حالت میں ہوں؟“

”ڈوما.....“ لوچن نے اس کا جملہ نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے اس شخص کا حلیہ بتانا پسند کرو گے جسے ہاشم نے سیون اسٹار کا کوڑا استعمال کر کے ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا۔“

جواب ڈوما نے اسپورٹس کار والے کا جو حلیہ بیان کیا اس سن کر لوچن دوبارہ چونکا۔ اسے فوری یاد آ گیا کہ ہاشم سے اس کا آشنا سامنا کچھ دنوں پیشتر اس وقت ہوا تھا جب وہ چگا سے ملنے شہر فرنچرڈ پر گیا تھا، وہاں ہی پر ہاشم نے دہلی زبان میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ لوچن ابھی کے بعد دیگرے اس کی اور ہاشم کی موت کی کئی سبھانے کی کوشش کر رہا تھا جب ڈوما نے اسے سرسراہی آواز میں مخاطب کیا۔

”سیون اسٹار کا حکم ہے کہ ہمیں کچھ دنوں کے لیے ذاتی طور پر بھی خود کو پولیس کی نظروں سے بچانا ہے اس لیے فوری طور پر ہمیں کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے اس وقت تمہیں یہی اطلاع دینے کا فرض ادا کیا ہے۔ اب تم چاہو تو بس ہاتھ لیے رہو۔“

دوسری جانب سے سلسلہ منتقل کر دیا گیا لوچن نے سائل علاقے سے فوری واپسی میں بڑی جگت کا مظاہرہ کیا۔ اس کا ذہن بدستور ہاشم اور حادثہ میں شہ ہلاک ہونے والے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ چگا کا خیال بھی ان دونوں کے ساتھ ہی لوچن کو ابھرا ہوا تھا۔



امدادی نے جس پتائے پر اپنا کالا وھدا پھیلا رکھا تھا اس کے بعد اسے ملازمت کی ضرورت بھی نہیں تھی چنانچہ اس نے ایک جھلی میڈیکل سٹریٹیکٹ کی بنیاد پر وقت سے پیشتر ہی پولیس کی بیڈ کانسٹیبل سے گھومنا حاصل کر لی تھی لیکن وہ اب بھی مرن سن لینے کی خاطر پرانے دوستوں اور ساتھیوں سے رابطہ رکھتا تھا کہ حالات سے پوری طرح باخبر رہے۔ اسے فتح حامد کے بارے میں بھی خاصا کچھ معلوم تھا لیکن وہ دوسروں کے معاملے میں ناگاہک ابھار کے اصول کے خلاف تھا۔ خود شیشے کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر اچھالنا بھی اس کے نزدیک ملاوچہ کے خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن چگا کی بات اور جی۔

چگا سے اس کے مراسم بہت دیرینہ تھے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ چگانے بڑے کیڑے کے

ہمعاہوں کی پشت پناہی کر کے اپنی ٹیم مضبوط بنا رکھی تھی لیکن وہ بھی بلاوچہ کے کٹ وخن کا عادی نہیں تھا البتہ اس نے دوسرے ڈاے پاڑوں پر اپنی دھاک ضرور بٹھا رکھی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ فتح حامد کے گھر لے سکتا تھا لیکن بلاوچہ کی کے ساتھ اچھا اس کے اصول کے خلاف تھا۔ امدادلی نے بھی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کم از کم فتح حامد سے اچھے کی کوشش بھی نہ کرے۔ اسی نے حالات کے پیش نظر چگا کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اسپورٹس کار والے کے ساتھ کے بعد چگا کو کے لیے دباؤ عطا ہو جائے اس لیے کہ مرنے والا فتح حامد کا دست راست تھا اور فتح حامد کسی بھی مشتبہ آدمی کو پھینکے گا عادی نہیں تھا۔

امدادلی ایک پرانے دوست کی حیثیت سے بھی چگا کا خیال رکھتا تھا۔ بیٹے میں ایک دوبار اس کی خیریت بھی معلوم کر رہا تھا۔ کچھ بھی اس سے رابطہ کر کے اس کا حال احوال دریافت کرتا رہتا تھا۔ دونوں کے درمیان خاصا پرانا یا رشتہ تھا۔ خاص طور پر چگا اس کا احسان مند تھا جس نے آڑے وقت میں بھی اس کے ساتھ دوستی نبھانے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ اسے جہانگیر بٹ سے چگانے میں امدادلی کا ہاتھ تھا۔ چگا امدادلی سے کوئی بات چھپانے کا عادی نہیں تھا۔ زیادہ تر مشورے بھی اسی سے لیتا تھا، امدادلی کے ڈر لیے اسے خاص طور پر پولیس کے حکم کے بارے میں خاص خاص خبریں بتاتی رہتی تھیں۔

چگا ہر آڑے وقت میں امدادلی سے اپنی الجھنیں شیئر کرنے کا عادی تھا لیکن ہر اسرار نوادری ملاقات کے بارے میں اس نے ابھی تک زبان نہیں کھولی تھی۔ وہ ماورائی کہا نیوں پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن جو کچھ اس نے جانتی آٹھوں سے دیکھا تھا اسے فراخ دلی سے اس کے بس سے ہر بات۔ وہ نوادار کا احسان مند بھی تھا۔ اگر اس نے بروقت چگا اور اس کے آدمیوں کو آنے والے خطرے سے باخبر نہ کیا ہو تا تو شاید چگا اور کچھ خاص سامی اسی غمارت کے لیے میں ڈن ہو جاتے جسے دھماکے سے الٹا کیا گیا تھا۔ وہ دھماکا سننے اور کچھ مقصد کے تحت کیا تھا اس کے بارے میں چگا کو صرف فتح حامد پر شبہ تھا، لیکن یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس کا اندازہ درست ہی ہو۔ ممکن تھا کسی دوسرے کردہ کے سرخندے سے حالات سے فائدہ اٹھا کر چگا کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہو اور بھی بہت سے امکانات تھے۔

بہت دیر سے وہ اسی قسمی کو سبھانے کی کوشش کر رہا تھا جس اس کا خاص کارندہ اس کی ہدایت پر اس کے پاس پہنچ گیا، اس کے چہرے پر ابھی تک دھماکے سے پیدا ہونے والے تاثرات موجود تھے۔

”ہماری نفری کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟“ چگانے اس سے تفصیل جاننے کی خاطر پوچھا۔ ”نہیں استاد..... جہاد بروقت اطلاع نے نفری کو تو بچا لیا لیکن اس عمارت میں ہمارا کچھ سامان ضرور ضائع ہو گیا۔“

”انسان زندہ رہے تو سامان بھی دوبارہ جمع کر لیتا ہے۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ، صرف یہ معلوم

ہے لیکن آج کل دونوں بہت محل مل رہے ہیں۔ یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ نیا ایس بی بھی خاصی پہنچ والا ہے۔ اسی لیے اس نے شیخ حامد سے پچھلے ہی لے رکھا ہے۔“

”ڈی ایس بی سراج کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟“ جگہ نے سوال کرنے کے بعد بات بتاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ وہ اصول کا پابند اور فرض شناس آفیسر ہے؟“

”میرا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ پولیس کی گاڑی بچھاڑی سے انسان جتنا دور رہے اتنا ہی بہتر ہے تم خاص طور پر سراج کے لیے کیوں معلوم کر رہے ہو؟“

”یوں ہی۔“ جگہ نے پھر بات کو ل کرنے کی کوشش کی۔ ”پچھلے دنوں میرا ایک واقف بے گناہ رگڑے میں آگیا تھا قاتل کے بعد سراج ہی نے اسے ذاتی فیصلے پر چھوڑ بھی دیا تھا۔“

”میں بھی دو تین سیٹے ان کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ دوسروں کے مقابلے میں وہ بہر حال زیادہ انصاف پسند ہے۔“

”کچھ دیر تک امداد علی اور جگہ کے درمیان مشترک امور پر گفتگو ہوتی رہی پھر جگہ نے کہا۔

”گیسٹ ہاؤس سے جس کی لاش ملی ہے اس کا نام کسی طرح معلوم ہو سکے تو مجھے ضرور بتانا۔“

”کوئی خاص بات معلوم کی ہے؟“

”ہاں.....“ جگہ نے سیاہ قلم ہاتھ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”اگر گیسٹ ہاؤس میں ملے والی لاش ای سی کے تو پھر اس میں بھی شیخ حامد ملوث ہوگا۔“

”کیوں؟ تم اسے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو؟“

”جس روز اسپورٹس کار کے حادثے میں سر نے والا میری فرنیچر والی دکان پر آیا تھا ای روز ہاتھ بھی مجھ سے ملا تھا۔ وہ کسی دوسری پارٹی کے لیے کام کر رہا تھا۔ تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ شیخ حامد کی رہائش پر حملہ کرانے کی خاطر ہاتھ نے چار بندے مجھ سے بھی حاصل کیے تھے۔“ جگہ نے تفصیل دہراتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”بڑا کھرا اور معالے کا پکا بندہ تھا۔“

”کیا اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کس پارٹی کے لیے کام کر رہا تھا؟“

”نہیں.....“

”پھر یہ معاملہ بھی کھنگالنا پڑے گا۔“ امداد علی نے سنجیدگی سے اظہار خیال کیا۔ ”کنوین کانا ہوگا کہ دوسری پارٹی کون ہے جو شیخ حامد جیسے خطرناک آدمی سے پتہ لارہی ہے؟“

”بندہ سر پر کفن یا باندھ لے تو طوقان کا منہ پھیر جا سکتا ہے۔“ جگہ نے پھر بری لے کر جواب دیا۔ ”میں بھی زیادہ دونوں تک جھگڑا نہیں چھانی کا مکمل جاری نہیں کر سکا، لیکن تم سے مشورہ کرنے کے بعد شیخ حامد کو بھی دیکھ لوں گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔“

”جلد بازی سے کام نہ لیتا۔“ امداد علی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”مگر اس کی نوبت آتی مئی تو پھر میں بھی تیرے ساتھ ہی شانہ بشانہ رہوں گا۔ کچھ چھوٹا منہ فرض مجھے بھی نشانہ ہے۔“

”یہ ہونی بات..... ایک اور ایک مل کر ہم کیا کرہ ہو جائیں گے۔“ جگہ نے خوشی کا اظہار کیا پھر

کرنے کی کوشش کر کہ کس سر پھر سے نے جگہ کے ساتھ جلاوہ بھی مول لینے کی کوشش کی ہے۔“

”کئی نام ذہن میں کلارہ ہے ہیں اساتذہ لیکن ابھی یقین سے کسی ایک کی طرف اپنی نہیں اٹھائی جا سکتی۔“

”طینتان سے معلوم کرو لیکن یہ خیال رہے کہ ہماری خاموشی دشمن کو اور مغرور بھی کر سکتی ہے۔“

”تم فکر نہ کرو استاد۔“ میں نے ایک دو کھو بی لگائے ہیں۔ جس نے بھی اپنی موت کو موت دی ہے وہ زیادہ دنوں تک پچھر میں نہیں رہ سکے گا۔“

”باتی لوگ کہاں ہیں؟“

”میں نے انہیں دوسرے ٹھکانوں پر ادھر ادھر بانٹ دیا ہے۔ ہمارا ہی احوال کسی ایک جگہ زیادہ تعداد میں رہتا بھی مناسب نہیں ہے۔“

”جگہ کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر قمر حراہٹ ہوئی۔ امداد علی کا نام دیکھ کر اس نے موبائل آن کر لیا۔“

”سنا ہے تمہارے کسی ٹھکانے کو آڑا دیا گیا ہے؟ سب خبر تو ہے؟“

”اتفاق ہی سمجھو تو ہم نے دھماکے سے کچھ دیر پہلے وہاں سے کوچ کر لیا تھا ورنہ.....“

”تمہارا دھیان کس کی طرف جا رہا ہے؟“

”ادمان ٹھیک ہو جائیں تو اس پر غور کریں گے۔“ جگہ نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”تمہاری کیا اطلاع ہے؟“

”میرا شبہ ای ولدا لہرام کی طرف ہے جس کا خاص اہتمام بندہ دھکار کیا گیا تھا۔“ امداد علی نے کہا۔ ”آج بھی ایک گرم گرم تازہ لاش پولیس کے ہاتھ لگی ہے میں تمہیں اس کے بارے میں تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔“

”جگہ بڑی سنجیدگی سے دوسری جانب سے فراہم کی جانے والی تفصیل سنا رہا۔ امداد علی نے گیسٹ ہاؤس سے ملنے والی لاش کا جو طے بیان کیا وہ جگہ کے لیے نیا تھا لیکن جب اس کے سیاہ قلم غیر ملکی ہونے کے بارے میں معلوم ہوا تو جگہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

”یار امداد علی..... جہاز سے خبر نہ کیا بتایا ہے مرنے والے کے بارے میں؟“

”صرف ایک بات اہم ہے.....“ دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”پولیس نے مرنے والے کا جو اسپورٹ قبضے میں لیا ہے اس کی تصویر خود کشی کرنے والے کی شکل سے نہیں ملتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے ٹیک اپ کیا ہوا ہو۔ ابھی یہی اطلاع نہیں ملی، لاش کا پوسٹ مارٹم ہو جائے تو پھر سے صبر ہے کا بید بھی کل جائے گا۔“

”اسپورٹ پر کوئی نام تو ہوگا۔؟“ جگہ نے کرید کی۔

”جو کچھ میرے ہاتھ لگے ہے اسے اتفاق ہی سمجھو۔“ امداد علی نے جواب دیا۔ ”انس بی اورنگ زیب کے علاوہ ڈی ایس بی سراج بھی ساتھ ساتھ نظر آئے تھے، حالانکہ دونوں کا علاقہ الگ الگ

خیال کیا تھا۔

اس وقت بھی دارا کے ذہن میں روشناس کی زبانی سنی ہوئی کہانی گونج رہی تھی۔ اس نے اپنے ذرائع سے اس بات کی تصدیق بھی کر لی تھی کہ اس کی گھر ملیہ ملازمہ گلابو ابھی تک ایک اسپتال میں زیر علاج تھی جہاں اس کے مرض کی نوعیت کو دوسرا رنگ دیا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اگر کوئی نئے والی کہانی سامنے آجانی تو پتیس اور قانون کے محکمہ دار اسپتال کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے کہ انہوں نے قانون کے علم میں لائے بغیر اسے داخل کین کیا؟ دارا کے لیے یہ قانون بھی الوکھا تھا۔ اس نے دنیا کے جو سماجک دیکھے تھے وہاں کے اسپتال کا قانون اس سے مختلف تھا، وہاں انسانی جان کو سب سے پہلے بچانا ڈاکٹروں کا اولین فرض تھا۔ پتیس کو اس کی نوعیت سے آگاہ کرنا قانونی حیثیت رکھتا تھا۔

دور در سے وہ اسی الجھن میں گرفتار تھا۔ ایک دو بار اس نے باپ سے بھی مکمل کربات کرنے کی کوشش کی لیکن کئی وجوہ سے خون کا گھونٹ کی کرپ رہا مگر یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی کہ جو کاروباری حریف آج اس کے باپ کو غیر قانونی حرکت سے کھٹے کھینے پر مجبور کر رہے تھے۔ کل اسے بھی اپنا ہدف بنانے سے گریز نہ کرتے۔ اسی خیال کے چین نظر آج وہ ایک آخری فیصلہ کر کے باپ کے پرنس آفس میں آیا تھا لیکن رستم علی کو ایک اہم میٹنگ میں جانا تھا اس لیے وہ اسی کمرے میں بیٹھ کر حالات کا جائزہ لے رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی، اس نے غیر اختیاری طور پر ریسپونڈر اٹھا کر کان سے نکال لیا۔ عام حالات میں وہ باپ کی کال ریسپونڈ کرنے کے اصول کے خلاف ہی تھا۔

”ہیلو.....“ اس نے باوجود جیس میں حسب معمول ایک رٹا ہوا جملہ دہرایا۔ ”رستم علی گروپ آف انڈسٹریز.....“

”مجھے خوش ہے کہ تم نے گلابو کی خاطر بھی دور اندیشی سے کام لیا۔“ دوسری جانب سے کسی نے ہانزار لی دیکھ میں اپنی برتری ظاہر کرنے خاطر بڑی دھجک آواز میں کہا۔ ”آئندہ بھی اس بات کا حوالہ رکھنا کہ تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کر زبان کول سکھ۔ دوسری شکل تم بھی جانتے ہو کہ جو لغوت حاصل کیے گئے وہ تمہیں کسی کو مت دکھانے کے بجائے غونگنی پر مجبور کر دیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”تم.....“ دارا نے تیز لہجہ میں جواب دیتا چاہا لیکن لکھت کسی فوری خیال سے خود پر قابو پاتے ہوئے پسپائی کا اعجاز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو.....؟“

”صرف ان کاروباری معاملات میں کسی کو گنگے کی طرح تمہاری خاموشی جن کے بارے میں تمہیں ایسا کرنے کا حکم دیا جائے۔“ اس بار بھی تعجب آمیز انداز میں کہا گیا۔

”کیا فون کے بجائے آئے سامنے بیٹھ کر بات تمہیں کر سکتے؟“ دارا نے اپنی رگوں میں کھلے ہوئے خون کی شدت پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”تم نے غلط انداز دیا گا رستم علی..... میں وہ نہیں بول رہا جو تم سمجھ رہے ہو؟“

اس نے دوبارہ ہاشم کے بارے میں مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

”تو فکر نہ کر..... میں مرنے والے کا نام بھی مطمئن کرتا ہوں، کل تک بتا سکوں گا..... رب راکھا۔“

”رب راکھا.....“ جگانے موہاں آف کا پھر اپنے ساتھی سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔

دارا رستم علی کو بیرون ملک سے تعلیم مکمل کر کے واپس آئے تقریباً ڈیڑھ سال گزر چکے تھے لیکن پانچ سال تک وہاں کے ماحول نے اس کے ذہن پر جو گہرے نقوش مرتب کیے تھے اس کا اثر ابھی تک اس کے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ وہاں کی تہذیب اسلام کے سٹائی ضروری لیکن وہاں کا رہن سہن، اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی، صاف سترا ماحول اور خاص طور پر قانون کی بالادستی نے اس قدر متاثر کیا تھا کہ وہ ابھی تک اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ وہاں قانونی معاملات میں جج اور جوری جو فیصلہ کرتے اس میں چھوٹے بڑے کی فیز سے بالاتر ہو کر صرف جرم کی نوعیت اور اس کی شدت کو پرکھتا تھا۔ اسی کے مطابق فیصلہ بھی سنایا جاتا تھا۔ وہاں کسی قسم کے سفارش یا رشتہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اس ملک کے باشندوں کے علاوہ دوسروں سماج کے بڑے بڑے سفارت کاروں کو بھی کم از کم جرائم اور اس کے سدباب کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں دی جاتی تھی، قانون کے فیصلے کا معیار سب کے لیے یکساں تھا۔

دارا نے وہاں کی وارداتوں کی تفصیل اخبارات اور ٹیلی وژن پر بھی دیکھی اور پڑھی تھی سب سے تعجب اسے ایک ایسے کیس میں ہوا جہاں ایک ملک کے فرماں روا کو بھی جوگی اعتبار سے اس ملک پر فوقیت رکھتا تھا، اپنے ایک شہزادے کے سلسلے میں بھی قانون کے سامنے زبان کھولنے اور کسی قسم کا احتجاج کرنے سے گریز کرنا پڑا۔ قانون کے ذمے داروں نے شخص ایک ہفتے کی ساعت کے بعد واردات میں ملوث شہزادے کو حرقہ قید کی سزا سنائی تھی۔ اس کیس میں ملوث شہزادے نے بھی یہ سوچ کر اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا کہ جو ملک کی معاملات میں اس کے باپ کے سامنے سر جھکا کر رہتا تھا، اس کے ساتھ یقیناً اپنی بیجوری کے تحت رعایت سے کام لے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قانون کا فیصلہ شہزادے کے باپ کو بھی تسلیم کرنا پڑا لیکن..... وہی دارا اور اب اپنے ملک میں حکومت کو ہر بات کر دہوں کا ٹھنک ادا کرنے کے بعد بھی ایک ایسے معاملے میں بے بس تھا جہاں ایک مشہد کاروباری حریف نے اس کے باپ کو اس کی اپنی محبت کے بیچے اپنے شکاری توں کے ذریعے زبان بند کر کے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی ایک گھر ملیہ ملازمہ کو کوئی بار گردنی کر دیا گیا تھا جس علاج کی خاطر بھی چوری چھپے ایک اسپتال میں داخل کر لایا گیا۔ وہ ملازمہ قانون کے لیے ایک اہم اور ناقابل تردید شہادت تھا لیکن سیکرٹرم آف آف خان جو جیجیرس کا کامس کا عہد صدارت وہ بھی اس جرم یا مجرموں کے خلاف زبان کھولنے سے خوفزدہ تھا، قانون تو دور کی بات تھی، اس نے خود دارا اور اس کی جرس خدادیدی روشناس کو بھی اس معاملے کی کوئی جھجک نہیں لگنے دی تھی۔ دودھ کی بھی کسی ہی طرح انگ رکھنا مناسب

راست یہ تھا کہ دارا ذاتی طور پر ان محاطات کی چھان بین کر کے اینٹ کا جواب بھرتے دیتا یا پھر..... خاموشی سے باپ کو حالات کے رحم و کرم پر تھا چھوڑ کر خود روشا کے ساتھ ہمیشہ کے لئے بیرون ملک چلا جاتا۔ تاہم وہ ان تمام مکہ آپشنز پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک آخری فیصلہ کر لیا۔ اپنی ذاتی حیثیت میں مشتبہ کو کوئی لکھ کر پردے سے اپنا راز دارا اینٹ کا جواب بھرتے دینے کا فیصلہ۔ اس اہم فیصلے کی روشنی میں اس نے اپنے ایک پرانے جگرزی دوست عارف سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

عارف دارا کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا اور چار ہائیڈروجن سے بحیثیت میجر رٹائر ہوا تھا۔ اس کی ریٹائرمنٹ میں اس کی عمر کا نہیں بلکہ ایک حادثے کا دخل تھا جس کے بعد اسے تمام اعزازات اور تمغہ شجاعت سے نوازنے کے بعد رٹائر کیا گیا تھا۔ میجر عارف ایک بڑے خوف اور فرض شناس افسر تھا۔ اپنی ذہانت کا درگزی اور بڑے باپ کا بیٹا ہونے کے سبب اعلیٰ سطحوں میں اس کا اثر و رسوخ تھا۔ عارف اور دارا کی ہر دوں پندرہ دن بعد کا قاتل بھی ہوئی تھی۔ ان ملاقاتوں میں وہ ہمیشہ بے تکلف دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے دنیا چھان کی باتیں کرتے تھے۔ میجر عارف..... رٹائر ہونے کے دو ماہ بعد ہی ایک اور صدمہ لاحق ہوا تھا۔ اس کی محبوب بیوی جسے وہ بے پناہ چاہتا تھا ایک حادثہ کا شکار ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اس سلسلے کے بعد دارا برابر اس کا ٹھکانے کی اپنی ہی فرنگ کو کوشش کرتا رہا تھا۔ روشنائی بھی دارا کا پھر پر ساتھ دیا تھا جس کی وجہ سے میجر عارف نے جلد ہی اپنے غم کو دل کے نکال دیا تھا۔

دارا نے ایک آخری فیصلہ کر کے اسی وقت عارف کو کال کیا پھر اسی شام دفتر سے اٹھ کر وہ سیدھا عارف کے پاس چلا گیا۔ اس موقع پر اس نے روشا کو ساتھ لیتا مناسب نہیں سمجھا۔ عارف سے بہت دیر تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ عارف بھی اس کے ساتھ مکمل دل کر باتیں کر رہا تھا لیکن پھر اچانک اس نے دارا کو بغیرہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو تم نے آج کسی خاص وجہ سے روشا کو ساتھ لا کر مناسب نہیں سمجھا۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تمہاری مطلوبہ ذہانت ابھی تک برقرار ہے۔“

”کوئی خاص مسئلہ درپیش ہے؟“ عارف نے بدستور تنقید کی سے دریافت کیا۔

”ہاں..... لیکن ایک شرط ہے۔“ دارا نے تسکنا کر جواب دیا۔ ”تم اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔ روشا سے بھی نہیں۔“

عارف نے اقرار میں گردن کو جنبش دی۔ وہ دارا سے تفصیل جاننے کا شہر تھا۔ دارا نے کچھ وقت کے بعد اسے پوری تفصیل سنائی۔ جو فون کال رسیڈ ہوئی تھی اس کے بارے میں بھی بتا دیا۔ گاہ کے سلسلے میں روشا نے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ بھی دہرا دیں۔ اپنا منصوبہ بغیر کسی ترمیم کے چلان کر دیا۔ عارف پوری توجہ سے سنتا رہا پھر کچھ وقت کے بعد بولا۔

”بھیر..... تم کون ہو.....؟“

”ہاں کے حکم پر دم بلانے والا ادنیٰ ایک خادم..... جو زبان چلانے کے علاوہ باس کے حکم پر اپنی کتھی پر پھول رکھ کر لپٹی دبانے سے بھی کبھی دریغ نہیں کرتا۔“ دوسری جانب سے بولنے والے کا لب و لہجہ سرد و سفاک ہو گیا۔ ”جو کہا گیا ہے۔ اسی پر تم بھی دم بلاتے رہو۔ زبان کھولنے یا کوئی چال چلنے کی غلطی تو پھر تمہارے بیٹے اور اس کی خوبصورت بیوی کا نمبر بھی آسکتا ہے۔“

دارا کا چہرہ جسے سے سرخ ہو گیا۔ اسے جس بات کا خطرہ تھا وہ بات کھل کر اب اس کے سامنے آ رہی تھی۔ اس نے پہلو بدل کر تھلائے ہوئے کہا۔ ”ایک بات تم بھی یاد رکھو، بات اگر دارا یا روشا تک پہنچی تو پھر میں بھی برداشت نہیں کروں گا۔“

”کیا کرو گے آغا خانی.....؟“ خشک انداز میں سوال کیا گیا۔ ”اب خودکشی کرنے کے سوا تمہارے پاس اور کیا آپشن رہ گیا ہے؟“

”جب انسان مرنے کی ٹھان لے تو پھر وہ اپنے ساتھ دوسرے کو ختم کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔“ دارا نے اس بار بھوک کر جواب دیا۔ ”میں سیٹھ عثمان نہیں ہوں جو تمہارے سامنے ہتھیار ڈال گیا۔“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے.....؟“

”میں تم جیسے پالتو، دم بلانے والوں سے بات نہیں کر سکتا۔“ دارا نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”اپنے جگہ باس سے کہو کہ مجھ سے براہ راست بات کرے۔“

”تمہیں یہ جرات بھی کتنی بڑے گی۔“ دوسری جانب سے ڈھکے چھپے انداز میں ایک وارننگ دینے کے ساتھ ہی لائق منتقل کر دی گئی۔ دارا کا پورا چہرہ درگنگ آغا بات اب اس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ وہ باپ کے کمرے سے اٹھ کر اپنے دفتر میں آ گیا۔ اپنے ذرائع سے اس نے یہ معلوم کرانے کی کوشش کی کہ کچھ درجی آخری بار کس نمبر سے رستم علی کے نمبر کو کال کیا تھا۔ جواب اس کی توقع کے عین مطابق تھا، مذکورہ کال کی بلیک ہتھ سے کی گئی تھی۔

دارا کا ذہن اس وقت اس قاتل بھی نہیں رہا تھا کہ پرکون انداز میں دفتر کی امور کو دیکھے، اس کے ذہن میں ”ضلع حادہ“ کا نام کسی نیند ساز کی طرح خطرے کی علامت بن کر بار بار جمل جھ رہا تھا۔ اس کے پاس حالات کی روشنی میں صرف تین آپشنز تھے۔ پہلا یہ کہ روشا کے ذریعے جو کچھ معلوم ہوا تھا اور اس نے بھی جس انداز میں اصل باتیں چھپانے کی خاطر ایک فرضی کہانی سنائی تھی اسے نیکر ذہن سے نکال دیتا۔ صرف اپنے کام سے کام رکھتا لیکن..... رستم علی کی واحد اولاد ہونے کے رشتے سے یہ بات اس کے لئے ممکن نہیں تھی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ باپ سے مکمل کر بات کرتا اور وہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرتا جس کے منظر عام پر آنے کے بعد..... فون کرنے والے کی دھمکی کے مطابق رستم علی زبان کھولنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کسی کو دیکھا نہ بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ ایسا کیا ثبوت تھا جس کے سامنے آ جانے کے بعد اس کا باپ زندگی پر موت کو ترجیح دیتا؟ تیرا

”تم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ مجھے پسند آیا۔ حالات کے پیش نظر اگلے کو تہما چھوڑ دیتا تمہیں زیب بھی نہیں دے گا۔“

”ایک بات اور.....“ دارا نے کہا۔ ”بہتر ہو گا کہ تم کوئی ایسا مشورہ دو کہ میں بھی منظر عام پر نہ آؤں۔ مجھے اپنی فکر نہیں لیکن دشمن رو دشا کو بھی اپنا ہدف بنا سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر شاید میں کسی بھی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر کچھ بھی کر کر دوں گا۔“

”ریلیکس۔“ عاقل نے دارا کو سمجھایا۔ ”جلد بازی اور جذبات پر اگر انسان کی گرفت کمزور پڑ جائے تو پھر وہ کوئی جگہ نہیں جیت سکتا۔ تمہاری تمام باتوں کو سمجھ رہا ہوں۔ تم پر فی الحال سامنے نہیں آنا چاہتے تو نہ ڈانٹیں ایک بار دشمن کے بارے میں یقین ہو جانے کے بعد تمہیں یہی اہل کو بہر حال سامنے آنا پڑے گا۔“

”جو آراء رائے.....“ دارا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر ضرورت پڑے تو پھر میں ڈانٹ کے بجائے خود سامنا کرنے سے پیچھے بھی نہیں ہٹوں گا۔“

”تمہیں اس بات کا شہرہ کی حد تک ہے کہ شیخ حامد ہی ہمارا وارنٹر کریمل ہے؟“ عاقل نے بڑی تنقید کی سے دریافت کیا۔

”نہ تو فیصلہ.....“ دارا نے بڑے احماد سے کہا۔ ”ڈیڈ سے پیشتر وہ باسٹر ڈسٹریکٹ مٹان کو بھی میدان سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر چکا ہے۔“

”اوکے..... پہلے اسی کو چپک کر لیتے ہیں۔“ میجر عاقل نے بڑے سکون سے کہا پھر اپنا موبائل اٹھا کر کسی کے کمرے پر فحش کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے موبائل کا مایک آن کر دیا تاکہ دارا بھی تعمیلی گفتگو سن سکے۔

”ہیلو..... ڈاٹ، ڈاٹ، ڈاٹ، دن فور آن دی لائن۔“ دوسری جانب سے کسی نے خوش آواز میں مخصوص کوڈ نمبر سے اپنی شناخت کرائی۔

”اف از آپریشن حریفی سکس۔“ عاقل نے بھی کوئی مخصوص ریفرنس دیا۔

”ہیلو سر..... کیسے یاد کیا خادم کو.....؟“ اس بار بے تکلفی کے ساتھ بڑے مہذب انداز میں پوچھا گیا۔

”تمہاری ضرورت پیش آگئی ہے۔ کام ٹاپ سیکرٹ نوعیت کا ہے اس لیے میں نے تمہیں تکلیف دینے کے لئے.....“

”نو فار سلیٹن سر.....“ عاقل کی بات کاٹ کر کہا گیا۔

”میں اب بھی آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کا نام بتائیں۔“

”ایک مشتبہ شخص کی نقل و حرکت واضح کرنی ہے۔“ عاقل نے تنقید کی سے مطلب کیا بات کی۔ ”ایک ہفتے بعد تمہاری رپورٹ کے بعد ہی کوئی فائل آپریشن کا فیصلہ کر دوں گا۔ میرا ذاتی ہی کام سمجھنا۔“

”آپ نام اور پتا بتا دیں سر..... میں آپ کو واپس نہیں کروں گا۔“

جواب میں عاقل نے شیخ حامد کا نام اور دیگر ضروری کوائف بتانے کے بعد کچھ دیر جھلے ادا کیے پھر کال منقطع کر دی۔

”کون تھا.....؟“ دارا نے تنقید کی سے دریافت کیا۔

”ہے ایک کمانڈر کا سب سے ذہین آدمی.....“

عاقل نے جواب دیا۔ ”کسی وجہ سے آج بھی میری بے حد عزت کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک ہفتے کی مہلت بھی بہت ہوگی۔ اتنا باصلاحیت ہے کہ کسی سب میرن کے چہرے میں سوراخ کرنے کا کام انجام دینے میں بھی کچھ کچھ کا مٹا ہوا نہیں کرے گا۔“

”گلاب کے سلسلے میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟ کیا میں کسی ذریعے سے اس کی زبان سے سچ اگوانے کی کوشش کروں۔ ہو سکتا ہے وہ اس شخص کی کچھ نشتا ہی کر سکے جس کی کوئی نے اسے موت اور زندگی کی کشمکش سے دو چار کر دیا تھا۔“

”یہ ذمہ داری بھی میرے اوپر چھوڑ دو۔ پولیس کے مجھے کچھ سینٹر آفیسرز سے بھی میری سلام دعا ہے۔“ عاقل نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ بھی ڈاٹ، ڈاٹ، دن فور کی طرح میری عزت کرتے ہیں۔ کہنے والے لوگ بھی نہیں ہیں۔“

دارا نے عاقل کا جواب سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس کے درمیان کچھ دوسرے موضوعات پر مکمل کر رہی مذاق کی بے تکلفانہ باتیں شروع ہو گئیں۔ دارا کو محسوس ہو رہا تھا کہ عاقل سے اپنی پریشانی بانٹنے کے بعد اس کے ذہن سے جیسے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔



”آپ نے نہ بلایا تو میں خود رپورٹ دینے آتی۔“
 ”کوئی خاص بات؟“

”میں نے افضل خان کو پوری طرح کھال کر دیکھ لیا ہے۔“ شبنم نے سنبھل کر کہا۔ ”وہ اب اس ہڑت میں نہیں ہے کہ آپ کے کسی قسم سے انکار کر سکے۔ میں نے اسے اپارمنٹ میں ساتھ رہنے والی بات بھی بتادی۔ اس نے کسی خاص رومل کا اظہار نہیں کیا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ شیخ حامد نے ایک گھونٹ لیے ہوئے شبنم کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ ”اسے دکھتو ہوگا کہ اب اس اپارمنٹ میں اس کی حیثیت وہ نہیں ہوگی جو پہلے تھی۔“

شبنم نے کسمار کو بڑی زبان میں جواب دیا۔ ”میں نے اس پر پی ایچ ای ملال ہے ظاہر کیا ہے کہ اس اپارمنٹ کو سٹے سے سٹے پر فخر کر کے ہم دونوں کو مشترکہ طور پر بلور حسن کارکردگی انعام دیا گیا ہے۔“

شیخ حامد نے کسی رومل کا اظہار کرنے کے بجائے شبنم کو وضاحت طلب نظروں سے گھورا۔
 ”سوری سر۔۔۔۔۔“ شبنم نے پہلو بدل کر کہا۔ ”میں نے یہ بات اس لیے کی ہے کہ کچھ دنوں ساتھ رہ کر افضل خان کو قریب سے چیک کروں اور۔۔۔۔۔ خود اس کو اس طرح پوز کروں کہ اسے خود بھی میری حیثیت کا اعزاز ہو جائے۔ اس کے بعد وہ جس رومل کا مظاہر کرے گا وہ ہمارے لیے زیادہ کارآمد ہوگا۔“

”مگن۔۔۔۔۔“ شیخ حامد نے اس بار خشک لہجے میں اسے سناہنے کے ساتھ ساتھ خمیر بھی کی۔
 ”تمہاری یہ پالیسی زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے لیکن اتنا خطرہ نہ رہتا۔ مجھ سے مشورہ کیے بغیر اتنا کچھ بھی ایسی غلطی نہ کرنا۔“

”اوکے باس۔“ شبنم نے شپٹا کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

”افضل خان کی دم کچھ سیدھی ہوئی یا نہیں؟“
 ”ہاں ویسی۔۔۔۔۔“ شبنم نے سنجیدگی سے کہا پھر افضل خان کے وہ آخری جملے لفظ بلفظ دہائے جو اس نے بگ باس کے سلسلے میں اور اس کی سابقہ مہربانیوں کا بلور خاص ذکر کرتے ہوئے کہے تھے۔

شیخ حامد نے ایک بار پھر۔۔۔۔۔ کن انہیوں سے کنول کے بندہ دروازے کی جانب دیکھا۔ گلاس میں بٹی لال پری کو ایک ایک گھونٹ میں حلق کے نیچے اتارا پھر شبنم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا اس کے بملوں کے اندر تمہیں کسی دامن والے سانپ کا خیال نہیں آیا جو ایک طرف خطرہ دیکھ کر بڑی عیاری سے دوسرا رخ اختیار کرتا ہے۔“ شیخ حامد نے سرسراپی آواز میں کہا۔ ”محبت اور جنگ میں بھی ہر قسم کے حربے استعمال کرنے کا ہوا جز سمجھا جاتا ہے۔“
 ”اس شے کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن۔۔۔۔۔ اگر افضل خان نے ایسا کیا تو وہ اس کی

شیخ حامد اس وقت اپنے مخصوص ساؤنڈ پروف کمرے میں بیٹھا دوسرا چیک ختم کر رہا تھا۔

عام حالات میں وہ دفتر میں بیٹے پلانے کے خلاف تھا لیکن۔۔۔۔۔ آج وہ خلاف معمول بہت خوش تھا۔ اس کی نظریں بار بار کنول کے کمرے کے اس دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اس وقت بند تھا۔ دفتر کے لوگوں کو اس بات پر حیرت تھی کہ کنول نے اپنا چاک ملازمت سے استعفیٰ کیوں دے دیا ہے؟ یہ بات بھی قابل توجہ تھی کہ بگ باس نے وہ استعفیٰ منظور کس طرح کر لیا؟ سب ہی محسوس کر رہے تھے کہ کنول ایک حسین اور مہولہ گیند تھی اور شیخ حامد اس قسم کی حسین لڑکیوں کو آسانی سے اپنے چال سے لٹکے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔ ایسا صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب وہ اس ہیرے کی تراش خراش سے بھی پوری طرح سیر ہو کر اپنی چاس بھانجے اور اس کی حریفیں اچھی طرح پوری ہو جائیں۔ کنول کو اس نے جو خاصی مراعات دے رکھی تھیں وہ بھی اس کے پہلے کی اور خاتون درکر کو حاصل نہیں تھی۔ پھر کنول کا اپنا چاک ملازمت ترک کر دینا اور بگ باس کی خاموشی۔ دونوں ہی ایسے سوال تھے جن کا جواب دفتر کے لوگوں کے لیے توجہ خیر تھا۔ مگر وہ اس بار سے میں صرف دل ہی دل میں سوچ سکتے تھے زبان کھولنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔

شیخ حامد کا دفتری اوقات میں شراب نوشی کا رٹا بھی خلاف معمول تھا۔ خوشی بھی ساؤنڈ پروف کمرے میں قدم رکھتے وقت چوٹی تھی۔ اس کے اپنے ذہن میں بھی کچھ خطرات تھے سزا بھارت شروع کر دیا تھا۔ ”ہو سکتا ہے اس شراب نوشی کا شمار اسی کی ذات پر سرزد ہوتا۔“ یہ تصور ہی اس کے لیے کسی بھونچال سے کم نہیں تھا، لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے اپنے ذہنوں والیں لوٹ جاتی۔ اس لیے اس کی عزت کا بھرم بھی ”عزب اخلاق تصویروں“ کی شکل میں شیخ حامد کے پاس محفوظ تھا۔ وہ جبراً مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ شیخ حامد نے اسے مسکرا کر ہنسنے کا اشارہ کیا پھر ایک چسکی لے کر کنول کے بندہ دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے عجب انداز میں بولا۔

”آج تم خلاف معمول زیادہ میک اپ اور ٹپ ٹاپ کٹڈیشن میں نہیں ہو۔۔۔۔۔ کوئی خاص وجہ؟“

”صبح آٹھ دیر سے کھلی تھی اس لیے موقع نہیں ملا۔“
 ”مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ تم نے کل کا دن کن مصروفیات میں گزارا تھا۔“ شیخ حامد نے شبنم کے خدو خال پر ایک اپنی نظر ڈال کر کہا۔

”یہ سوچتا میرا کام ہے جان میں.....“ اس بار فتح حامد نے شبنم کو بخور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان نظروں میں ایک نیچے ہوئے شرابی کے لٹکھڑے قدم دیکھ کر شبنم کو بھری آگئی لیکن اس وقت سامنے رکے ہوئے موبائل کی دھڑکن نے فتح حامد کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس نے مسکریں پر نظر آنے والے فہرود کو دیکھ کر موبائل اٹھا کر کانوں سے لگا لیا۔ بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کیا رپورٹ ہے؟“

”ہاس..... ڈی ایس بی اور ایس بی میں آج کل کچھ زیادہ ہی گھٹنے لگی ہے۔ ہاشم کے معاملے میں بھی دونوں بڑی سرگرمی دکھا رہے ہیں۔“

”اس کی موت کی پشٹ پرکس کا تھم ہے؟“

”اس نے خودکشی نہ کی ہوئی تو ہم نے اس کا قصہ پاک کر دیا ہوتا لیکن یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ.....“

”نان سٹس؟“ فتح حامد نے جھلا کر کہا۔ ”جتنا پوچھا گیا ہے صرف اس کا جواب دو۔“

”سوری ہاس..... میں نے آدی پیچھے لگا دیئے ہیں جس نے ہم سے پہلے شکار کر لیا ابھی اس کا کھوج نہیں ملا لیکن.....“

”دوسرے بازو کی کیا رپورٹ ہے؟“ اس بار بھی دوسری طرف سے پورا جملہ نے بغیر سوال کیا گیا۔

”ہم نے وہ پورا لٹھکانا ہی اڑا دیا تھا“ مگر وہاں سے کوئی لاش نہیں ملی۔“

”بھلا“ جہاد ایس کا کردگی پر کیا انعام دیا جائے؟“ فتح حامد کا لہجہ ایک دم ہی خطرناک ہو گیا۔

”ہم کوشش کر رہے ہیں ہاس..... بہت جلد اس کا سراغ بھی لگا لیں گے۔“ دوسری طرف سے عاجزی کا اظہار کیا گیا۔ ”ہمارے لوگ پوری طرح محتاط اور چوکے تھے“ مطلوبہ آدی کیسے اور کس طرح نکل گیا یہ بات.....

”ریش.....“ فتح حامد نے میز پر ہاتھ دارتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ ”میں پراسرار کہانیاں سننے کا عادی نہیں ہوں۔“ تمہیں صرف دو روز کی ملت اور دی جاری ہے۔“

”رائٹ سر.....“

”جو لوگ سر جوڑ رہے ہیں، انہیں بھی اس ایک بچے شاک کی ضرورت ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ بات مرہم بنی سے گزر کر قبرستان تک نہ پہنچے۔“

”مجھ کیا پاس.....“

”آج رات کے لیے جو ہدایت دی ہے اس کا خیال رکھنا۔“ فتح حامد نے ہونٹ چپاتے

ہوئے کہا پھر موبائل آف کر دیا۔

”ہاس.....“ شبنم نے ہمت کر کے دل زبانی میں پوچھا۔ ”کیا میں کسی کام آسکتی ہوں؟“

”شکول کے ملازمت چھوڑنے کے سلسلے میں دفتر میں کیا چنگوٹیاں ہو رہی ہیں.....؟“ فتح حامد نے شبنم کی بات ٹال کر اسے تلوخی نظروں سے دیکھا۔

”سب خاموش ہیں کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن.....“ نظارہ بیکی اعجازہ ہو رہا ہے کہ سب کو اس بات پر حیرت ہی ہو رہی ہے۔“

”کیوں..... اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے؟“

”میں یقین سے کہہ نہیں کہہ سکتی.....“ شبنم نے جان بچانے کی کوشش کی۔

”مجبور ہوں“ فتح حامد نے اٹھانا بھی انسان کی مرثیت اور خصلت میں شامل ہے۔ تم اپنی ہی مثال لے لو۔“ فتح حامد نے نیچلی بدل کر شبنم کے سراپا پر نظر ڈالی۔ ”کیا تم اس پوزیشن میں ہو کہ میری کسی بھی خواہش سے انکار کر سکو۔“

”نہیں.....“ شبنم ہٹکا کر رہ گئی۔

”وجہ.....؟“

”میری ایک غفلت یا کمزوری آپ کے پاس محفوظ ہے.....“ اس نے نظریں جھکا کر صاف گولی سے جواب دیا۔

”میں اپنی زندگی کو موت کے حوالے تو کر سکتی ہوں لیکن..... انکار نہیں۔“

”بچو آ رہا رشت.....“ فتح حامد نے فتانہ نہ سکا رشت کہا۔ پھر ایک سرود آہ بھر کر بولا۔ ”شکول کے سلسلے میں مجھ سے ایک چوک ہو گئی۔ اس سے پیشتر کہ میں اس کے پرکرتا وہ ہاتھ سے نکل گئی“

میں اب بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ اسے اپنے قدموں میں جھکا سکوں“ لیکن مجھے اپنی رہنمائی کا زیادہ خیال ہے۔“

”شبنم نے نظریں اٹھا کر جب ہاس کو دیکھا، لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

”فارمٹ دیا آپ..... یہ بتاؤ کہ افضل خان سے ملاقات کے دوران تم نے اور کیا محسوس کیا؟“

”میں اب وہ آپ کے اشاروں پر اپنے گلے میں چٹائی کا پھندا ڈالنے سے بھی انکار نہیں کرے گا۔“

”اور کچھ.....“

”ایک بات اور بھی ہے ہاس۔“ شبنم نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی کے بارے میں غور کرتے ہوئے بڑی صاف گئی سے اس کی ملاقات کا پورا احوال بھی سنایا۔ شاید جب ہاس بھی یہی کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ شبنم کو شہید تھا کہ اس کا تعاقب بھی ضرور کیا گیا ہوگا۔

”تمہارا کیا مشورہ ہے لودھی کے سلسلے میں؟“

”ہم کسی کو شکار کرنے کی خاطر بطور چارہ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“ شبنم نے ہچکچا کر جواب دیا۔

”گفٹ..... مجھے تمہارا یہ مشورہ پسند آیا۔“ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر شبنم کے قریب آ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر جس بے باکی سے جبکہ اس کے گال کو چھوا وہ شبنم کے خون میں نفرت کی لہر دوڑانے کے لیے کیا تھا۔ وہ ذرا سی کسمائی تو شیخ حامد نے اس کے گالوں پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ ”ڈونٹ ڈری سوئٹ ہنٹی..... مجھے اپنا وعدہ یاد ہے میں ایک حد سے تمہارا نہیں کروں گا۔“

”ہاس.....“ شبنم نے وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ایک سوال کر سکتی ہوں؟“

”پوچھو.....“ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ تمہارا سوال میرے لئے ناقابل برداشت نہ ہو۔“

”آج خلاف معمول آپ نے دفتر میں.....“

”سے فوٹی کیوں کی؟“ شیخ حامد نے خود ہی اس کا جملہ پورا کیا پھر بے تکلفی سے اس کے شانوں کو دباتے ہوئے بولا۔

”کچھ باتیں راز کی بھی ہوتی ہیں جن کو زبان تک لانا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ مثلاً تمہارا اپنا راز..... جو میری مٹی میں بند ہے۔“

شبنم ایک بار پھر کسم کسم گئی۔ دس منٹ بعد ساؤنڈ پر دف کرے سے نکلنے وقت بھی اس کے دل میں جبکہ اس سے نفرت اور محارت کا سیلاب رہ رہ کر اٹھ رہا تھا۔ خیال یہ بھی ذہن کے گوشے میں کھلبلا رہا تھا کہ شیخ حامد بار بار اس دروازے کی سمت کیوں دیکھ رہا تھا جہاں کنول بیٹھا کرتی تھی۔ وہ دروازہ تو کنول کے استغفیٰ نے اس پر بند کر دیا تھا۔

سیاہ فام ہاشم کے سپورٹس کے اندراجات نے سراج کی بہت ساری مشکلات حل کر دیں۔ ایئر کیمپ کی مینی فیسٹ کے ذریعے یہ بات بھی اس نے نوٹ کی تھی کہ ذکورہ ملاٹ سے صرف تین غیر ملکی مسافر فرسٹ کلاس میں آئے تھے جن میں سے ہاشم خود بھی کر چکا تھا۔ سراج نے ذکورہ ملاٹ کی ایئر ہوٹس سے بھی ملاقات کی جس نے یہ بات بڑے یقین سے کہی تھی کہ خود کی کرنے والے نے ایک دوسرے کا پیئرز مسافر لوجنس سے بھی کچھ دیر محل کر بات چیت کی تھی لیکن تیسرا مسافر اس میں شریک نہیں ہوا تھا۔ تینوں مسافروں کی تفصیلات ایک دوسرے سے دور دور تھیں اور بظاہر وہ پہلے سے ایک دوسرے سے واقف نہیں کلتے تھے۔

ہاشم کی تفصیلی رپورٹ کے علاوہ سراج کے ذہن میں میڈیم کی شخصیت بھی خاصی اہمیت اختیار کر چکی تھی۔ شیخ حامد کے گھر پر ہونے والے حملے کے بارے میں میڈیم نے محل کر انفرامیں کیا تھا، لیکن اتنا ضرور کہا تھا کہ پاؤں کے نیچے دو بیٹی چینی پیسٹ کا کٹنے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ میڈیم نے جبکہ کے بارے میں بھی جن معلومات کا اظہار کیا تھا انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ سپورٹس کار میں جس شخص کو کوئی مار کر ہلاک کیا گیا وہ جبکہ باس کا

عام آدمی تھا جس کی موت کے بعد جبکہ بھی بگ باس کی لسٹ پر آ گیا تھا۔ یہ بھی بڑے وثوق سے کہا تھا کہ راز سپورٹس کار والے کو کوئی باری مٹی بھی اس سے دور روز قبل وہ جبکہ کے خلیہ کھانے پر دیکھا تھا جہاں کی وجہ سے جبکہ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میڈیم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اس دہلے پر قانون جبکہ کو تحفظ دے تو وہ بہت کام بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

جبکہ کے علاوہ میڈیم نے افضل خان کے بارے میں بھی یہ بات کی تھی کہ وہ تین چار روز انڈر گراؤڈ رہنے کے بعد ہوٹل سٹارن میں نظر آیا تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر سراج کے ذہن میں باہم اہم سوالات کا ابھرا قدرتی امر تھا۔ میڈیم روٹی کو جبکہ جیسے گینگ لیڈر اور سپورٹس کار میں مرنے والے کی خلیہ ملاقات کا علم کس طرح ہوا؟ وہ جبکہ کو کس وجہ سے تحفظ فراہم کرنے کا مطالبہ کر رہی تھی؟ جبکہ سے میڈیم کا کیا تعلق تھا؟ اسے سپورٹس کار میں گولی کا نشانہ بننے والے کے بارے میں یہ یقین کس طرح اور کہ وہ بگ باس کا دست راست تھا؟ اس کے علاوہ میڈیم نے کہا تھا کہ وہ ایک دو راز میں کچھ اہم معلومات بھی فراہم کرے گی۔ کیا ان معلومات کا تعلق ہاشم کی خود کشی سے بھی ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میڈیم کی نہ کسی طور ہاشم سے بھی واقف تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ہاشم کے علاوہ لوچن اور جہاز کے تیسرے مسافر سے بھی بے خبر نہ ہو؟ اور بھی بہت ساری باتیں سراج کے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ خاص طور پر میڈیم کا بگ باس کے بارے میں ایک جملہ رہہ کر سراج کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

”آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ مگر مجھ سے میرے مراسم کس قسم کے ہیں؟“

سراج نے ذاتی طور پر جبکہ کے بارے میں بھی اپنے خاص کارندوں سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ وہ بھی موقع محل دیکھ کر کہیں انڈر گراؤڈ ہو گیا ہے۔ ایک مکان کو دھکا کے سے اڑا دیئے جانے والی واردات کی اطلاع بھی سراج کو چلی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مکان کے بلے سے کسی انسانی لاش کے کوئی باقیات بھی نہیں ملے تھے۔ پھر اس دھماکے کا مقصد کیا تھا۔

شام تک وہ ذاتی طور پر ابھار رہا۔ پھر اندھو کر فریش ہونے کے بعد اس نے اورنگ زیب کے گھر انڈر پر جانے سے پہلے میڈیم روٹی کو کال کرنا بھی ضروری سمجھا۔

”اس وقت کیسے یاد آیا؟“ دوسری جانب سے میڈیم کی ناؤں آواز ابھری۔

”میں اس وقت آپ سے اپنی سرکاری حیثیت میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ سراج نے بڑی بھینگی کہہ۔

”اگر ممکن ہو تو میں آپ کے ساتھ تعاون سے گریز بھی نہیں کروں گی۔“ میڈیم روٹی نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

”آپ جبکہ کو اور سپورٹس کار میں مرنے والے کو کس طرح جانتی ہیں؟“

”وہ بری سیکل.....“ میڈیم نے سنبھل کر کہا۔ ”اگر بگ باس کا کوئی نمائندہ جبکہ سے ملے اور اس کی دہات حاصل کرنے کی خاطر پلاننگ کر سکتا ہے تو یہ حق دوسروں کو بھی حاصل ہے۔“

”آپ کی ذاتی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ آج ایک غیر ملکی نے بھی ڈرم فل نائی گیسٹ ہاؤس میں زہر کھا کر خودکشی کر لی ہے۔“ سراج نے کچھ سوچ کر ایک فرسٹ کارڈ استعمال کیا۔

”میں نہیں سمجھی کہ آپ یہ بات میری اطلاع کی خاطر کیوں دے رہے ہیں؟“ میڈم نے سہاٹ لہجے میں حیرت کا اظہار کیا۔ ”ضروری تو نہیں کہ پولیس کی طرح میں بھی شہر میں ہونے والے تمام حادثات کا باقاعدہ ریکارڈ رکھوں۔“

”کیا آپ نے بھی کسی حوالے سے لوچنگ ہاشمی یا ڈوما نام بھی سنا ہے؟ یہ تینوں غیر ملکی ایک ہی فلائٹ سے یہاں آئے تھے۔“

”آئے ہوں گے لیکن میں ان کے بارے میں کیا کر سکتی ہوں۔“

”آپ نے جس جگہ کا قانونی تحفظ دینے کی بات کی تھی وہ بھی کچھ دنوں سے انڈر مرگراؤنڈ ہے۔“ سراج نے تھملا کر کہا۔

”میرا خیال ہے کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ سپورٹس کار میں مارا جانے والا دو روز قبل جگہ سے ملا تھا اور جگہ پاس اسے بھی مشکوک سمجھ کر قاتل عتاب سمجھا تھا ہے۔ اسی صورت میں جگہ کی رپورٹس کو میں اس کی دانش مندی ہی قرار دے سکتی ہوں۔“

”آپ نے کچھ نئی اطلاعات فراہم کرنے کی بھی بات کی تھی؟“

”ضرور کی تھی لیکن اب مجھے اس کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ اس وقت آپ اپنی سرکاری حیثیت میں بات کر رہے ہیں جبکہ میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا بھروسہ دار محسن ہی سمجھا ہے۔ ابھی سمجھتی ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ میری اور آپ کی دو دو ملاقات ناگزیر ہو گئی ہے۔“ سراج نے خود کو غصہ دار کھینے کی کوشش کی۔

”اس میں ہم دونوں کے لیے کچھ نئے خطرات پیدا ہونے کا امکان بھی ہے۔ بہر حال اگر آپ سرکاری حیثیت میں محرم رہیں گے تو میں انکار بھی نہیں کروں گی۔“

”اوکے میں آپ کو دوبارہ فون کروں گا۔“ سراج نے اچھ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر وہ لمبائت حسنین کے ساتھ ایس بی اورنگ زیب کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ فوری طور پر دن بھر کی دوڑ دوپ کے بعد حاصل ہونے والی معلومات اورنگ زیب کے علم میں لانا ضروری سمجھ رہا تھا۔

چکیں مشن بعد وہ اورنگ زیب کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تمام معلومات بڑی وضاحت سے بیان کر رہا تھا۔ میڈم روہی کا ذکر کرتا سنا اس نے جان بوجھ کر مناسبت نہیں سمجھا تھا۔

”شکر ہے سراج۔“ اورنگ زیب نے بڑی اچانکتی سے کہا۔ ”آپ نے ایک دن میں ہی جو معلومات حاصل کر لیں وہ بہت اہم ہیں لیکن کیا آپ کو سپورٹس کار میں سر کرنے والے اور ہاشمی خودکشی میں بھی کوئی تعلق نظر آتا ہے؟“

”ابھی سکا ہے مگر ابھی بغیر کسی خوش بخت کے تم چھین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

”اگر آپ نہیں کو کس حد تک ان وارداتوں میں ملوث سمجھا جا سکتا ہے؟“ اورنگ زیب نے ہونٹ چاہتے ہوئے سوال کیا۔

”سپورٹس کار دالے کی موت اس کے کھانے میں نہیں ڈالی جا سکتی۔“ سراج نے جواب دیا۔

”وہ اسی کا خاص آدھی تھا لیکن سیاہ ہاشمی کی موت کا معاہدہ ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا۔ بہر حال یہ سپورٹس کار دالے کی موت کا رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔“

”گڈ۔۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے سناٹا انداز میں جواب دیا۔ ”میں بھی ان ہی امکانات پر غور کر رہا ہوں لیکن خودکشی والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آپ کو نہیں کہ ہاتھ ہوتا تو پھر سیاہی قائم کو اسے سکون کے بجائے کسی دیکھی اذیت ناک مرحلے سے گزار کر موت کے حوالے کیا جاتا۔“

”پہلے مارلم کی رپورٹ کیا کہانی سناتی ہے؟“ سراج نے پوچھا۔

”موت کسی سرخ السلاخ زہر کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جن حالات اور پوزیشن میں لاش کو دیکھا اس سے بھی کچھ ظاہر ہوتا ہے کہ سر نے دالے کے کسی درجے سے انحراف پر پہنچنے کی ٹھان لی تھی ورنہ وہ آخری وقت تک نلی ڈرن سے لطف اندوز نہ ہو رہا ہوتا۔“

”میں آپ کے خیال سے متفق ہوں۔ میں نے ایک دو آدمیوں کو لوچنگ اور ڈوما کی تلاش کا کام بھی سونپ دیا ہے۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کے ہاتھ آجائے کے بعد خودکشی کی سعی سمجھانے میں آسانی ہو۔“

”اسی بی اورنگ زیب ایک لمحے خاموش رہا پھر اس نے سراج کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جگہ کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں۔“ سراج جگہ کے حوالے پر چونکا پھر تھیل کر بولا۔ ”پولیس ریکارڈ کے مطابق اسے ایک ٹینک لیزر یا ظاہر کیا گیا ہے لیکن وہ صرف ایک بار گرفتار ہوا تھا اس کی سزا بھی اسے مل چکی ہے اس کے بعد وہ ہمارے ریکارڈ کے حوالے سے کسی معاملے میں ملوث نہیں پایا گیا۔ ہو سکتا ہے پولیس کے ٹیم کے کچھ کامچیز بھی اس کا تحفظ کریں ہوں۔“

”میں نے آج جگہ کی فائل کو بہت غور سے پڑھا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ مجرم نہیں تھا۔ جس معاملے میں اسے سزا ملی وہ اس کا صحیح طور پر دفاع بھی نہیں کر سکا۔“ اورنگ زیب نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ”کوئی بھی سزا یافتہ مجرم ہمارے معاشرے میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس لیے ایسی معاشی پریشانی دور کرنے کی خاطر اسے کچھ نہ کچھ کوتاہی پڑتا ہے۔“

سراج کے ذہن میں میڈم کی باتیں صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگیں۔ اس نے بھی جگہ کے بارے میں ایسے ہی تاثرات کا اظہار کیا تھا اور اب اورنگ زیب جیسا خوش کردار کا حامل ایک ذمے دار پولیس آفیسر بھی ان ہی خطوط پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

”آپ نے جو رائے قائم کی ہے میں اس سے انکار نہیں کروں گا، لیکن موجودہ معاملات میں

”کا تعلق بھی کسی نہ کسی زاویے سے ہو سکتا ہے۔“ اورنگ زیب نے سراج کے منظر کو اپنی سوچ کے مطابق آگے بڑھاتے ہوئے تنبیہ کی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ آکٹوپس جگا کی پشت پناہی کر رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس پارٹی نے آکٹوپس کے مکان پر حملہ کر دیا تھا جگا کے آدمی اس کے لیے کام کر رہے ہوں۔ دونوں ہی صورت میں جگا کا نام درمیان میں لیا جاسکتا ہے۔“

”دوسری پارٹی کون ہو سکتی ہے؟“ سراج نے جان بوجھ کر انجان بننے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کے ذہن میں کوئی نام ہے؟“

”ہاں.....“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک پارٹی تو آپ کے کلاس فیلو سیٹھ عثمان کی بھی ہو سکتی ہے جسے آکٹوپس کے سامنے اپنی شرافت کی وجہ سے گھٹنے دینے پڑے لیکن..... میں نہیں سمجھتا کہ سیٹھ عثمان جیسا ایک اور اہل پسند کا درباری شخص کوئی غلط اقدام اٹھانے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہو۔ کل تک میرے ذہن میں یہی ایک نام تھا مگر آج ایک نام اتفاقاً تیری اسٹ پر اور آگیا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ سراج نے دلچسپی لیے ہوئے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ پہلے ہم ڈنر کے ساتھ اضافہ کر لیں پھر باقی باتیں بھی ہوتی رہی گی۔“

کھانے میں اورنگ زیب نے خاص اہتمام کیا تھا۔ ڈاننگ ٹیبل پر اس نے بکے چمکے مذاق اور تفریح کی باتیں کیں۔ کھانے کے بعد اس نے کوئلہ کافی کا اہتمام موسم کی مطابقت سے کیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ ڈاننگ روم میں آئے تو اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔

”میرے ملازم نے اس آدمی کو نظر انداز نہیں کیا جو آپ کے ہمراہ آیا تھا۔ کیا وہ آپ کا ملازم میرا مطلب ہے کہ پرائیویٹ ڈرائیور یا کوئی اعتماد والا آدمی ہے۔“

”وہ سیٹھ عثمان کا ڈرائیور ہے میں نے اسے دس بارہ روز کے لیے اپنے پاس بلا لیا ہے۔“ سراج نے کہا پھر اس نے دہلی زبان میں لیاقت حسین کے بارے میں کچھ باتیں بھی اورنگ زیب کو بتا دیں۔

”حضرت انگیز۔“ اورنگ زیب نے سراج کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ لیاقت حسین کے سر پر کسی ہریان جن یا کسی پیچھے ہوئے بزرگ کا سایہ ہے؟“

”میں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہ یقیناً آپ کے دونوں خیالوں میں سے کسی ایک کی تائید ضرور کرتا ہے۔“

”ہو بھی سکتا ہے اس لیے کہ خدا کے مجھ سے ہر دور میں کسی نہ کسی طور پر درخشا ہوتے رہتے ہیں جنہیں ہماری سو فی عظیمیں تسلیم نہیں کرتیں۔ میں آپ کے مشاہدوں سے بھی انکار نہیں کروں گا۔“

”ڈنر سے قبل آپ نے کسی دوسری پارٹی کا ذکر کیا تھا۔“ سراج نے موضوع بدل کر اسل مقصد کی طرف آنے کی کوشش کی۔ ”کیا عثمان کے علاوہ کوئی اور نام بھی سامنے آیا ہے؟“

”ہاں.....“ اورنگ زیب نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ ”کھانے کے بعد اگر ہم کچھ دیر ساصل پر چل قادی کر لیں تو کیا حرج ہے؟“

”اچھا خیال ہے۔“ سراج نے بے تکلفی سے کہا۔ ”ساصل کا سکون بخش ماحول ہم لوگوں کے لیے کسی ٹانگ سے کم بھی نہیں ہے۔“

”دلی سینڈ یہ بہت مناسب ہے۔“ اورنگ زیب جواب دینے کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ سراج بھی اس کے ساتھ باہر آگیا۔ جہاں دونوں کی گاڑیوں کے علاوہ ڈرائیور بھی موجود تھے۔ اورنگ زیب نے لیاقت حسین سے بڑی محبت کے ساتھ معافہ کیا پھر اس نے سراج ہی کی گاڑی میں بارہا جاتے تو ترجیح دی۔

اس وقت رات کے دس کا عمل رہا ہوگا۔ اورنگ زیب کے کہنے پر لیاقت حسین نے ساصل کی طرف جانے والا راست اپنا لیا۔ ساصل پر پہنچ کر اورنگ زیب بڑی دیر تک سراج کے ساتھ چل قادی کرتا رہا۔ سراج کو اس کی بے پروائی پر حیرت بھی تھی لیکن اورنگ زیب بے فکر نظر آ رہا تھا۔ ایک لمبا چکر لگا کر گاڑی کی طرف واپس آئے وقت اورنگ زیب نے سراج کے دل کا چور چکڑے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے آپ اس وقت ماحول سے لطف اندوز ہونے کے بجائے کسی اور بات سے فکر مند ہیں؟“

”میں انکار نہیں کروں گا۔“ سراج نے تنبیہ کی سے جواب دیا۔ ”آکٹوپس کا زور بھی سمندر کے آس پاس زیادہ چلتا ہے اور میں آپ کو باخبر بھی کر چکا ہوں کہ ہمارے مشترکہ دشمن کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانے سے دریغ نہیں کریں گے۔“

”اور میں نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ آپ کے شہر میں ڈیوٹی جوائن کرنے سے پیشتر ہی میں نے اپنی سیکورٹی کا معقول بندوبست کر لیا تھا۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس وقت بھی کچھ مخصوص لوگ آکٹوپس کی طرف سے پوری طرح چوکس ہوں گے۔ ویسے موت اگر گھم دی گئی تو اس کے مقرر کردہ وقت اور جگہ کو کوئی بھی ٹال نہیں سکتا۔“

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ گاڑی میں بیٹھ کر دوبارہ شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ سراج نے ایک بار پھر دوسری پارٹی کا ذکر چھیڑا تو اورنگ زیب نے تنبیہ کی سے کہا۔

”میں اس وقت اسی پارٹی کے ایک ذہنی کی عیادت کے لیے جا رہا ہوں۔ فی الحال ہمیں سب کچھ ان آپس کی کہنا ہے۔ یہ کام ایک دیر پر دوست نے مجھے سونپا ہے آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ وہ بھی سیٹھ عثمان کی طرح ایک شریف آدمی ہے لیکن غالباً آکٹوپس نے کسی طور اسے بھی اپنے چنگل میں دبوچ لیا ہے۔“

نصف رات گئے اورنگ زیب کی ہدایت پر لیاقت حسین نے ایک فنی ہسپتال کے مرکزی دروازے پر گاڑی روکی تو ایک گاڑی قدم اٹھاتا ہوا قریب آگیا۔

”اندر پارکنگ کی اجازت نہیں جناب اس لیے.....“

”ایسا نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ مجھے آپ کی پوزیشن کا خیال رہے گا، ویسے اگر میں جاہوں تو آپ بھی۔۔۔۔۔“

”میرا وہ مطلب نہیں جناب جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر اپنی کرسی پر پہلو بدلے لگا۔ ”آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں لکھ کر دیتے پر آمادہ ہوں لیکن ذاتی طور پر میں اس مریض کے بارے میں۔۔۔۔۔“

”ڈونٹ وری ڈاکٹر۔“ اورنگ زیب نے اسے تسلی دی۔ ”میں از خود بھی اس کا ردوائی کو اختیار رکھے کے حق میں ہوں۔ آپ کی تحریر کی ضرورت اس لئے درکار ہے کہ ہم کسی مجرم کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتے ہیں اور۔۔۔۔۔ جس کے حکم پر مریض کو داخل کیا گیا اس کی زبان کھولنی بھی ضروری ہے۔“

”اس کا کیا قصور ہے؟“ ڈاکٹر نے حیرت سے دریافت کیا۔

”صرف اتنا کہ وہ کسی خوف کی وجہ سے اس شخص کا نام زبان تک لانے سے گریز کر رہا ہے جس کی وجہ سے ایک غریب اور بے قصور ملازم کو ان حالات کا شکار ہونا پڑا۔“

”آئی سی۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر نے طویل سانس لی پھر اس نے اپنے آفس کے لیٹر ہیڈ پر وہ تحریر بھی لکھ کر اورنگ زیب کے حوالے کر دی جس کا مطالعہ کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر کے کمرے سے نکل کر اورنگ زیب باہر جانے لگا تو سراج نے پوچھا۔

”ہم یہاں کس مریض کی خاطر آئے تھے؟“

”سیٹھ رستم علی کی ایک خادمہ۔۔۔۔۔ گلابو جسے گولی لگنے کے بعد یہاں داخل کرایا گیا ہے۔“ اورنگ زیب نے تفصیل بیان کی۔ ”میرے ایک پرانے دوست نے یہ اطلاع مجھے دے کر ضروری تفتیش پر آمادہ کیا ہے۔“

”کیا ہم مریض کو کربدنے کی کوشش نہیں کریں گے؟“ سراج نے ایک قانونی نکتہ پیش کیا۔

”ہوسکتا ہے کہ وہ اس شخص کی نشاندہی کر دے جس نے گولی ماری تھی۔“

”وقت کی بربادی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ رستم علی نے گلابو کے سلسلے میں اپنے بیٹے اور دو بھائیوں کو بھی ایک سنگ انداز سے میں رکھا ہے۔ جس نے واردات کی ہوگی وہ بھی اپنے اصلی سلیبے میں سامنے نہیں آیا ہوگا۔“

”آؤ نہیں۔۔۔۔۔؟“ سراج نے اورنگ زیب کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے مختصراً کہا۔

”شاید۔۔۔۔۔“

”لیکن ڈاکٹر کی تحریر۔۔۔۔۔“

”رستم علی کی زبان سے سچ بھگانے کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ پھر وہ سراج کے ساتھ آکر بارگاز کی میز پر بیٹھ گیا۔

لیات حسین اسٹیٹنگ پر پوری طرح مستعد نظر آ رہا تھا۔ سراج اور اورنگ زیب کے درمیان، علم علی اور زینبی ہونے والی ملازمہ کی بات ہو رہی تھی جب لیات حسین نے اچانک اسٹیٹنگ کو اس

گاڑ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکا۔ ”اورنگ زیب نے اپنا مخصوص شانتی کارڈ نکال کر اسے دکھایا تو وہ سلام کرتا ہوا اگلے قدموں واپس لوٹ گیا۔ گیٹ کھولا گیا تو لیات حسین نے گاڑی اندر لے جا کر پارک کر دی۔ اس وقت ہسپتال میں زیادہ درش نہیں تھا۔ اورنگ زیب سراج کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا سیدھا بڑے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا جو ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ کسی مریض کے بارے میں دیکس کر رہا تھا۔

”فرمائیے۔“ ڈاکٹر نے اورنگ زیب کو مہذب لیجے میں مخاطب کیا۔

”آپ فارغ ہو گئیں۔۔۔۔۔ ہمیں آپ سے کچھ ضروری معلومات کرنی ہیں۔“

معلومات کے حوالے پر بڑے ڈاکٹر نے انہیں چھینے کا اشارہ کیا پھر دو تین منٹ بعد لیڈی ڈاکٹر کو فارغ کرنے کے بعد اس نے دوبارہ اورنگ زیب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”ہم بھی عوام ہی کے خادم ہیں۔“ سراج نے اس بارے اپنا کارڈ نکال کر ڈاکٹر کو دکھایا پھر اورنگ زیب کا تعارف بھی مخصوص انداز میں کرایا۔ ”مائی سینئر آفیسر۔“

”مجھے خوشی ہوگی اگر آپ حضرات کے کسی کام آسکا۔“

”ہمیں آپ کے پرائیویٹ روم نمبر تحریری ہنڈ ریڈ لکھنی کی مریض کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔“ اورنگ زیب نے ڈاکٹر کو گہری نظروں سے دیکھا۔

”مریض کی حالت اب خاصی بہتر ہے ہوسکتا ہے اسے کل یا پرسوں ڈسچارج کر دیا جائے۔“

ڈاکٹر نے کسمار کر جواب دیا۔

”اسے کیا مرض لاحق تھا؟“

”اس کا داخلہ میرے ایک ماتحت ڈاکٹر نے کیا تھا۔“ ڈاکٹر نے ہونٹ چپاتے ہوئے صاف گولی سے جواب دیا۔

”میں آپ سے حقیقت چھپانے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن جس وقت وہ ہسپتال لائی گئی تھی اس کے جسم سے خاصا خون بہہ چکا تھا۔ ہم پولیس کی کارروائی میں پڑے تو اس کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہوسکتا تھا اس کے علاوہ جس شخص نے ہمیں فون کیا تھا وہ بھی ہمارے ہسپتال کا ایک ڈسے وار فری ہے اس لیے ڈاکٹر ان ڈیوٹی کو۔۔۔۔۔“

”میں آپ کی مجبوری سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر۔“ اورنگ زیب نے تسلی کی ہے کہا۔ ”ہم اس وقت قانونی چارہ جوئی کی خاطر نہیں آئے ہیں۔ آپ سے ایک ضروری تعاون کی درخواست کرتا چاہتے ہیں۔ ہمیں آپ ایک تحریری رپورٹ خطہ طور پر فراہم کر دیں کہ مریض کس حالت میں لائی گئی تھی اور آپ کے ڈاکٹر نے کس ڈیٹی کے کہنے پر اسے ہسپتال میں داخل کیا تھا؟“

جواب میں ڈاکٹر نے کسی صورت بنا کر کہا۔ ”تحریر لکھ دینے کے بعد تو میں بھی گلے گلے پھنس سکتا ہوں۔“

تیزی سے گھمایا کہ گاڑی دو پیچوں پر چڑھا کر پھر سیدھی ہو گئی۔ اورنگ اور سراج بھی تو ازن کھوپٹے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ سراج لیاقت حسین سے کچھ پوچھتا، قریب ہی کہیں سے ایک دھماکہ سنائی دیا۔ اس کے بعد فضا گولیوں کی ترتر اہٹ سے گونجنے لگی۔ فائرنگ کا انداز ایسا ہی تھا جیسے دو مختلف پارٹیاں آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے کو پتہ کرنے کی خاطر اندھا دھند گولیاں چلائے ہیں۔ الجھ گئی ہوں۔ سراج کے صبح کرنے کے باوجود لیاقت حسین بھی ہیڈ لائٹس بجھانے کے بعد دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔



شیخ حامد نے پوش علاقے کے اس دن پلنٹ ہنگلے تک پہنچنے میں غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہنگلے پر پہنچنے کے بعد ہی اس نے قاضی اور دو گواہوں کو بھی طلب کر لیا۔ کنول سے اس کی شادی کی رسم پچھن آدیوں کی موجودگی میں ادا ہوئی پھر وہ تینوں رخصت ہو گئے۔ کنول کو اس کی ماں نے دعاؤں سے نوازا کر پہلی منزل پر اس کے چلے مروری تک پہنچا دیا۔ اس خوشی کے موقع پر بھی اس کے متا بھرے دل میں لاکھوں حسرتیں تڑپ رہی تھیں۔ وہ بیٹی کو صدق دل سے دعا دے رہی تھی۔

”خدا تمہیں ہمیشہ خوش و خرم و آباد رکھے۔ دو دھول تہاؤ، پوتوں پھلو۔ اللہ تمہیں زندگی کی تمام خوشیاں نصیب کرے۔“

”ماں.....“ کنول نے ماں کی ہچکوں پر رز زتے آنسو دیکھے، ان میں خوشی کی جگہ ایک عورت کی بے بسی اور بے چارگی شامل تھی۔ ”کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ میں باقاعدہ نکاح میں آنے کے بعد.....“ وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔

”جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کی ہوا پر والا کرتا ہے میری بیٹی۔ خدا تمہارے نصیب اچھے کرے۔“

ایک طرف ماں بیٹی خوشیوں کی آس میں ایک دوسرے کو تسلی دے رہی تھیں، دوسری جانب شیخ حامد ہوش پر کسی دھم بھجے میں ہدایت دے رہا تھا۔

”کام ہوش سے کرنا۔ تینوں میں سے کسی ایک کا زندہ رہنا بھی تمہاری موت ہو گا لیکن.....“

حادثہ اس طرح پیش آنے کے کسی کو شک نہ ہوا اور ہر چیز مل کر راکھ ہو جائے۔

”ایسا ہی ہو گا باس۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”ہم کیا کام نہیں کر رہے۔“

”تم نے نہیں پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟“

”ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے۔ کریہ کرنا بھی ہمارے اصول کے خلاف ہے۔“

”گڈ.....“ شیخ حامد نے کہا پھر احتیاطاً گاڑی کا ٹنبر، ماڈل اور ٹرک بھی بتا دیا جو اس نے کسی ار پے سے کرائے پر حاصل کر لی تھی۔ فون سے قاریغ ہونے کے بعد وہ اوپر جانے والا زینہ طے کر رہا تھا جب اس نے کنول کی ماں کو کمرے سے نکلنے دیکھا۔

”مجھے بھی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ اس نے کنول کی ماں کا راستہ روک کر ڈھٹائی دھار غراست کی۔

”خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔“ کنول کی ماں نے زخمی میں بند کپڑے مردانہ انگوٹھی نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کنول کے علاوہ یہ انگوٹھی بھی میرے مرحوم شوہر کی یادگار ہے جو میں اس خوشی کے موقع پر آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔“

”ایک درخواست مجھے بھی کرنی ہے۔“ شیخ حامد نے انگوٹھی کو حفاظت سے جیب میں ڈالتے ہوئے تنقید سے کہا۔ ”فی الحال میں اس شادی کو دوسروں پر ٹھاکر نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ کاروباری وجوہات درپیش ہیں۔“

”کنول مجھے بتا چکی ہے۔ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔“ وہ کھڑا کر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی بچے آگئی۔

شیخ حامد قاتحانہ انداز میں جلد عروسی میں داخل ہوا جہاں کنول سہلی سہالی چٹنی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ کنول کے قریب آ کر اس کا گھونٹ پلٹتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

”میں نے جو کہا تھا وہ وعدہ پورا کر دیا۔ اب تمہاری باری ہے۔“

کنول نے نظریں اٹھا کر شیخ حامد کو دیکھا۔ نئے کے رخسار سے اس کی آنکھیں بھی نشلی ہو رہی تھیں۔ ”میں آپ کی فکر گزار ہوں جو آپ مجھے عزت سے حاصل کر رہے ہیں۔“

”یہ عزت تمہیں اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک تم مجھ سے وفادار رہو گی۔“

”وفاداری سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ شیخ حامد نے کنول کے اور قریب ہو کر کہا۔ بیٹے سوچ کے ڈرے اس نے تیز روشنیوں میں کھین تو کمرے کا ماحول اور بھی خراب ناک ہو گیا، وہ تلکھات کا عادی نہیں تھا اس لیے کنول نے بھی کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا، خود کو پوری طرح اس کے حسب نفا اس کے حوالے کر دیا۔ شیخ حامد کل کھینے کا عادی تھا اس لیے بہت جلد اپنے اصلی رنگ میں آ گیا۔

شیخ حامد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس وقت کوئی کمرے کی چھت پر اونڈنا لپٹا روشن دان کے ذریعے نائٹ لائٹس والے پاورل اور اس مختصر سے مودی کمرے کے ذریعے اس بیچانی میل کے ایک ایک لمحے کی سحر کشی کر رہا ہو گا جس نے وہاں تک پہنچنے کیلئے اپنے کسی ساتھیوں سے مدد لی تھی جو تھوڑی تھوڑی دور تک شیخ حامد کی گاڑی کا تعاقب اپنی کار اور موٹر سائیکل پر کرتے رہے تھے اور جلد عروسی کی اس چھت تک پہنچنے والا کتنے کمانوں کی چٹوں سے گزر کر وہاں تک پہنچا تھا۔ جو زبرد، زیرو، دن فور کے کوڈ کے حوالے سے فٹری کمانڈر کا سب سے ذہین آدمی سمجھا جاتا تھا۔



مکان میں آئے انہیں پہ مشکل آدھا گھنٹہ گزارا تھا۔ تینوں افراد کے چہرے پر کچھ سنجیدگی مسلط تھی۔ ”استاد۔۔۔“ ایک ساتھی نے چکا کو مخاطب کیا۔ ”آخر ہم کب تک اس طرح ٹھکانے سے رہیں گے۔ ہماری روپوشی کو دشمن ہماری کمزوری اور بزدلی سمجھ کر اور شیر ہو سکتا ہے۔“

”تمہارے پاس جاں نثاریں کی کی بھی نہیں ہے۔“ دوسرے نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا ایک اشارہ بھی کافی ہے۔ ہم دشمن کو اس کے گھر میں گھس کر بھی جہنم رسید کرنے میں دریغ نہیں کریں گے۔“

”سب ہی تمہارے فیصلے کے منتظر ہیں۔“ پہلے نے بے جگری سے دوسرے کی تائید کی۔ ”تم صرف دشمن کا نام اور ٹھکانا بتا دو۔ باقی کام ہم نفا دیں گے۔ ایسا چکا کھا کام کریں گے کہ وہ نام اللہ کا۔۔۔“

”مجھے تم لوگوں کی زندگی اپنے سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کے علاوہ میں زیادہ کشت و خون کا بھی حامی نہیں ہوں۔“ چکا نے بڑے سکون سے جواب دیا مگر اگر سیدھی اگلیوں سے کل آئے تو۔۔۔“

”تم مثال دیتے ہیں غلطی کر رہے ہو استاد۔“ دوسرے نے ہنسی کی۔ ”سیدھی اگلیوں سے بھی نہیں، اگلی نیڑی کیے بغیر کام بھی نہیں چلا۔ خالی پائی اگلی کی میں ڈوبنے سے کتا بے لذت والی بات ہوتی ہے۔“

”ہم ہمیشہ کھانا کھینے آئے ہیں استاد۔ اس بار تمہاری مصلحت ہمارے لیے نہیں پڑ رہی۔ ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس میں صرف سخت یا سختی کی بات کی جاتی ہے۔“

”مجھے لگ دیتے والی باتیں تھیں تو دوسرے اڈے پازے والے بھی چھاتی لٹائے کی کوشش کریں گے۔“

”بھڑا کر کے کھانے کی عادت ڈالو۔“ چکا کسسا کر بولا۔ ”مگر گرم نوالے لینے سے منہ بھی جل سکتا ہے۔ میں نے جو خاموشی اختیار کی ہے اس کی کچھ وجہ ہے۔ بات مکمل کر صاف ہو جائے تو میں درجی نہیں کروں گا۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔۔۔ ہم نے تمہارے ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا ہے تو پھر تمہاری کسی مصلحت کے آڑے آنے کی غلطی بھی نہیں کریں گے۔“

چکا کوئی معقول جواب سوچ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر واٹس ایپس ہوئی۔ اسکرین پر روشن ہونے والا نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”کوئی نئی خبر؟“

”اس وقت کہاں ہو۔۔۔؟“ دوسری جانب سے امداد ملی کی آواز ابھری۔

”جنگی آبادی خبر تین کے ٹھکانے پر۔۔۔ اس وقت کیسے فون کیا؟“ چکا نے پھر اپنا سوال

”کچھ اچھی بری خبریں ملی ہیں۔“ سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”خودکشی کرنے والے کا نام باشم تھا۔ پوسٹ مارٹم کے وقت اس کے چہرے سے نیک اپ کا بھرم بھی نکل گیا۔“
 ”..... وہ خودکشی نہیں کر سکتا۔“ جگہ نے بڑے یقین و حیرت سے کہا۔ ”بڑا مرد آدمی تھا۔ کسی نہ کسی نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔“
 ”تمہارا دھیان کدھر جاتا ہے؟“
 ”وہی حرام کا بیج جس کا ٹھہروں کوئی مار کر جنم رسید کر دیا گیا تھا۔ میں نے تم سے اسی پر شبہ کا اظہار کیا تھا۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ ٹھیک ہو..... میرے مخبر نے بتایا ہے کہ کمرے سے سوائے اس کے اور جن لوگوں کے فکڑ پڑتے تھے وہی وہ سب پرانے تھے اور گیسٹ ہاؤس میں کام کرنے والوں ہی کے ہیں۔“

”اور کیا خبر ہے؟“
 ”ایک کھینے پہلے ہی کی بات ہے۔ ایک اسپتال کے قریب والی سڑک پر تیرے سراج صاحب کی کار اٹھنے لگتی رہی۔“ اداوہلی نے بات جاری رکھی۔ ”شکر ہے کہ دھماکا کچھ دور ہو اور نہ گاڑی بھی لپیٹ میں آجاتی۔“

”سراج صاحب تو خیریت سے ہیں۔“ جگہ نے بے چینی سے سوال کیا۔
 ”گاڑی میں سراج صاحب کے ساتھ ایس بی اورنگ زیب بھی تھے، وہ بال بال بچ گئے۔ سراج صاحب کی بھی قسمت اچھی تھی کہ بعد میں کی جانے والی دھواں دھار قاتلنگ سے ان کا ایک بازو معمولی زخمی ہوا ہے، فی الحال انہیں پولیس اسپتال میں رکھا گیا ہے۔“
 ”اس واردات میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“ جگہ نے تھلا کر دریافت کیا، اس کے چہرے پر خون کی گردش بدتر توجہ بڑھ رہی تھی۔

”ابھی اس کا کھوج نہیں ملا۔ یہی معلوم ہوا کہ نشانہ کون تھا۔“ اداوہلی نے وضاحت سے کہا۔
 ”اطلاع کے مطابق دو پارٹیاں ٹھہرائی گئیں، ایک کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ پولیس کے ساتھ لپاس والے بھی ہو سکتے ہیں۔ نیا ایس بی کی اوپری بیچ والا بندہ ہے اس کی بڑے بیچ سے اسی دن ٹھن کی جی جی جب اس نے بیچ کی ٹیکہ کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کی تجویز پیش کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کو ٹھکانے لگانے کی خاطر چال بنا گیا ہو۔ سراج صاحب سفت میں لپٹے میں آگئے ہوں۔“
 ”پانی اب سر سے اوچھا ہونے لگا ہے میرے یار۔“ جگہ نے جکڑے ہوئے انداز میں کہا۔ ”بیچ کو اب بغدادی قاعدہ پر عانا ضروری ہو گیا ہے۔ تو نے نہ درکار ہوتا تو شاید میں.....“

”ابھی جلدی مت کرنا.....“ اداوہلی نے بات کا ٹکڑا سنجیدگی سے کہا۔ ”ایک دو دن اور صبر کر لے۔ میں اندر کی خبریں نکال رہا ہوں، کچھ اور حال احوال معلوم ہوتا پھر رحزن تھے کہ پروگرام بھی بنا لیں گے۔ میں بھی تیرے ساتھ ہوں گا۔“

”کتنے کی دم کی کبا خبر ہے؟“ جگہ نے نفرت سے دریافت کیا۔
 ”جب تک کبھی نہ نٹ کی گئی تھی ہی رہے گی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ سراج صاحب کو پولیس اسپتال میں کب رکھا جائے گا؟“
 ”یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے ضروری مرہم پٹی کے بعد کسی بڑے اسپتال میں داخل کر دیا جائے لیکن تو خاص طور پر سراج صاحب کیلئے کیوں بے چین ہے؟“
 ”ان کا ایک احسان ہے ہمارے اوپر..... وہ چٹکا کرتا ہے۔“ جگہ نے کہا پھر بات بدل کر آگیا۔ ”دونوں افراد کہاں گئے تھے..... میرا مطلب ہے کہ حادثے سے پہلے کہیں نہ کہیں تو گئے ہوں گے۔“

”سنائے وہ ایک نجی اسپتال ہی گئے تھے لیکن بڑے ڈاکٹر سے ملنے کے بعد ہی واپس بھی آئے۔ کوئی نہ کوئی اہم بات تو ضرور ہوگی۔“

”بہت صبر کر لیا اداوہلی۔“ جگہ نے تلک کھا کر کہا۔ ”اب نہ چپا کر بیٹھے سے کوئی فائدہ بھی نہیں آگا۔“ کتنے زیادہ جھوٹے گیس تو ان کے گلے میں کھنسی والے بھی آنکڑاٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔
 ”میں میرے کہنے سے دو دن اور صبر کر لے۔ اس کے بعد ہم دونوں بھی مل کر ایک اور ایک گھبراہٹ میں آجائیں گے۔“

اداوہلی نے رابطہ منقطع کر دیا تو جگہ بے چینی سے ٹپٹنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح سراج سے مل کر اس کی تحریرت دریافت کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ ذہن کے ایک گوشے میں بیچ خالد کی مناسب گوش مالی کا دھیان بھی کلپا رہا تھا۔

”تمہارے یار نے کیا خبریں سنائی ہیں استاد.....؟“ جگہ کے ساتھیوں نے دریافت کیا۔
 ”اب میں جگہ نے مختصر تفصیل دہرائی تو ایک ساتھی نے ہونٹ کاٹنے ہوئے کہا۔

”استاد اگر برا نہ مانو تو ایک مثال میں بھی سناؤں؟“
 ”جب تک تم کسی کی ماں کے ساتھ بار نہ نہیں کاٹو گے وہ جنہیں باپ بھی نہیں بولے گا۔“ جگہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سراج کی تحریرت معلوم کرنے کی دمن اس پر بدستور ہے جیئن کر رہی تھی۔



دارا اس وقت ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد دفتر جانے کیلئے تیار ہو رہا تھا جب اسے صبح عاقل کی کال ریسیو ہوئی تو کمرے میں دارا کے سواروشا بھی گئی اس لیے دارا نے چوٹے بغیر دوستانہ انداز میں کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

”تمخیرت..... آج صبح میری کیسے یاد آگئی؟“
 ”آئی سی.....“ دارا کا جواب سن کر عاقل نے سوال کیا۔ ”کیا روشا بھی کسی قریب موجود

”ہاں۔۔۔ وہ شکایت بھی کر دی تھی کہ تم بہت عرصے سے آؤٹنگ کا کوئی پروگرام نہیں بنایا۔“ دارا نے پھر سے تعلق سے بات بنائی۔
 ”اوکے“ تم دفتر فتح کر فون کر لیتا، تمہارے مطلوبہ شخص کے بارے میں کچھ اہم بات سامنے آتی ہے۔“

”یہ تمہارا اور روشا کا معاملہ ہے۔ ہاں، وہ میرے قریب ہی موجود ہے، میں فون اسی کو دے رہا ہوں۔“ دارا نے روشا کو قریب بلاتے ہوئے کہا پھر باہر لیو جس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”عاطف کا فون ہے۔ کھیں آؤٹنگ کا پروگرام بنائو۔ حالات کے سبب ممکن ہونے لگی ہے۔“

”اوکے۔“ روشا نے مسکرا کر کہا پھر ریسیور کے کر اس نے شکایت انداز میں کہا۔ ”میں نے سنا تھا اور دیکھا بھی ہے کہ فطری والے بات کے دمی ہوتے ہیں لیکن آپ بہت دنوں سے چنگ کے سلسلے میں ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ جی نہیں، اب یہ ایکنیڈ نہیں چلے گا۔۔۔۔۔ لوگوں کو سوچنے دیں لیکن آپ کو بہر حال حالات سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ فونی ہونے کے ناطے آپ کو بہت سے کام لینا چاہئے۔ محاذ جنگ پر بھی بہت سے عزیز ساتھ ساتھ چاکلہ میچر جاتے ہیں لیکن جوفی رہتے ہیں ان کے حوصلے پست ہونے کے سہارے اور بلند ہوجاتے ہیں۔ محض کا احساس بھی جنگ جیتنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ قانون۔ یہ ہوئی نا بات۔ میں دارا سے بات کر کے آپ کو فون کر دوں گی۔“

”کیا کہہ رہا تھا۔۔۔؟“ دارا نے اپنی بے چینی نالے ہوئے روشا کو پیار سے ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ فی الحال وہ روشا کو میجر عاطف سے اپنی ملاقات کا نہیں بتانا چاہتا تھا۔

”عاطف نے میری بات مان لی ہے۔“ روشا نے شوہر کی ٹائی کی ٹاٹ درست کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”کل میں ڈنر پر بلایا ہے۔ وہیں آؤٹنگ کا پروگرام بھی سنٹ ہو جائے گا۔“
 ”گلد۔۔۔۔۔ وہ بھی تمہاری بات نہیں ٹال، ابھی کبھی تو مجھے شہ ہونے لگتا ہے کہ کھیں۔۔۔۔۔“ دارا نے شوقی سے شروع کیا جانے والا جملہ اوجھڑا چھوڑ دیا۔ روشا کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟“

”ڈونٹ بی جنکس۔“ روشا نے شوہر کو پیار سے دیکھا۔ ”میں جرمن دوں ہوں، ایک دم اور جنگل اور جرمن صورت زندگی میں بھی اپنے سیٹھ سے بے وفائی نہیں کرتی۔“

”آئی نو ویٹ امی۔ ایڈر پراؤڈ آف۔“ دارا نے روشا کے یاقوتی ہونٹ چرے پھر بگ اٹھا کر دفتر کیلئے روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ میجر عاطف کی کال کے سلسلے میں ہی سوچتا رہا۔۔۔۔۔ دفتر فتح کر اس نے سب سے پہلے اسی کو موبائل پر کال کیا۔ رابطہ ہونے پر بے چینی سے بولا۔ ”اب ساڈا کیا خبر ہے؟“

”ایک شرط پر۔۔۔۔۔ اب کل کے ڈنر کے اخراجات جنہیں برداشت کرنے ہوں گے۔“

”خیک ہے۔۔۔۔۔“ دارا نے ہائی بھرے میں دیر نہیں کی۔

”تم نے جس پر شبہ کا اظہار کیا تھا وہ رعین حراج ہونے کے علاوہ انتہائی خطرناک بھی ہے۔“

عاطف نے سووی بنانے والی اطلاع کو مطلع چھپاتے ہوئے کہا۔ ”شہر میں اس نے دانا چھتے کے بہت سارے ٹھکانے بنا رکھے ہیں، کل رات ہی مجھے ایک پوش علاقے میں کسی کے ساتھ پوری طرح ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک قابل غور اطلاع اور بھی ہے۔ جس منگلے میں اس نے سات کڑی ہے وہاں اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی تین افراد ایک سیاہ رنگ کی پرائی کروٹا میں لٹکے تھے لیکن انہیں اہل ملانیک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔“

”کیا مطلب؟۔۔۔۔۔“

”منگلے سے روٹا کے تقریباً بیس منٹ بعد وہ ایک ویران علاقے سے گزر رہے تھے جب عقب سے آنے والی ایک بندوین نے قریب آ کر اس پر فائرنگ کر دی تھی۔ کروٹا قابو سے باہر ہو کر ایک منگلے کی باؤنڈری وال سے گھرا کر اپنی تو اس سے آگ بھڑک اٹھی۔ علاقہ پولیس کو حادثے کی اطلاع شاید اسی منگلے کے کینڈوں نے دی ہوئی، بہر حال ان کی مدد بر وقت پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی جل کر جہ ہو چکی تھی۔ اندر موجود تینوں افراد کو مکمل بن چکے تھے۔ پولیس کو فوری طور پر کوئی ثبوت نہیں ملا۔“

”کھیں؟“ دارا نے حیرت سے دریافت کیا۔ ”جس دین سے فائرنگ ہوئی تھی وہ تمہارے اکاؤنٹ کے کسی ساتھی سے تو دیکھی ہوگی۔“

”تم نے ایک قلمی دنیا کی بات کے ساتھ ہی ایک اہم بات کو نظر انداز بھی کر دیا ہے۔“
 ”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“

”وہ کمائڈوز میرے کہنے پر دن و نونہ کے لیے کام کر رہے تھے۔ ایسی صورت میں کوئی ورد سر چالے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ دوسری شکل میں بھی وہ صرف اپنے کمانڈنگ آفیسر کو مطلع کرتے۔“

”تمہارا انداز وہ کیا ہے؟“ دارا نے پوچھا۔ ”مرنے والے کون تھے؟ کیا میرے مطلوبہ شخص لے لیٹیں کسی رقابت کی بنیاد پر راستے سے ہٹایا ہوگا۔“

”آم کھانے سے مطلب رکھو۔“ عاطف نے کہا۔ ”دوسری اطلاع یہ ہے کہ تمہاری ملازمہ کو خود اہل کی سٹارڈ پر اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر انچارج نے تحریری طور پر ہیکہ بیان دیا ہے۔“
 ”گھابو نے کیا تفصیل بیان کی؟“

”میرے کہنے پر جن افسران نے ڈاکٹر سے ملاقات کی انہوں نے گھابو سے ملنا مناسب نہیں سمجھا۔ دیکھیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان کی گاڑی پر بھی پلاسٹک بم چمک گیا تھا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر بچ گئے۔ حادثے کے بعد موقع واردات پر دو بار نیوں کے درمیان فائرنگ کا تہارہ بھی ہوا تھا لیکن کوئی لاش نہیں ملی۔ ممکن ہے مرنے والے کے ساتھی اسے اٹھا لے گئے ہوں۔“

”آئی سی۔۔۔۔۔“ دارا نے کھسکا کر سوال کیا۔ ”اس حادثے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟“

”تفتیش بڑی سرگرمی سے ہو رہی ہے۔ ایسے میں ذاتی خیال ہے کہ کوئی نہ کوئی گلاب سے ملے جیلے والوں کی گھرائی بھی ضرور کر رہا ہوگا۔“ عاقل نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ جن دو پارٹیوں کے درمیان فائرنگ ہوئی تھی ان میں سے ایک تمہارے مطلوبہ شخص کی ہو۔“

”پھر..... اب تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

”تم سامنے نہیں آنا چاہتے تو فی الحال صرف دور رہ کر تماشا دیکھتے رہو۔ میرے جن دوستوں کو ذمہ داری سونپی ہے وہ انتہائی فرض شناس ہونے کے ساتھ ساتھ کہنے والے بھی نہیں ہیں۔“

”لیکن ایک پریکٹس اور بھی ممکن ہے۔“ دارا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جو دیدہ و دلیر جیلے ڈیڈ کے بیڑے میں دم بچھ سکتے ہیں وہ انہیں دفتر یا کہیں راستے سے بھی اٹھا کر ہم پر دباؤ ڈالنے سے گریز نہیں کریں گے۔“

”فائرنگ اس..... تمہارے ڈیڈ ہونے کے علاوہ میرے اگلے بھی ہیں۔“ عاقل نے بے پروائی سے جواب دیا۔ پھر ڈرنے کے اخراجات ادا کرنے کا وعدہ یاد دل کر رابطہ منقطع کر دیا۔

دارا کے ذہن میں بہت سارے سوالات گھبرا رہے تھے لیکن..... میجر عاقل نے ازخود ان کی وضاحت نہیں کی تھی اس لیے دارا نے اسے گریڈنگ میں مناسب نہیں سمجھا۔ اس بات کا اطمینان ضرور ہو گیا کہ عاقل نے رستم علی آغا خانی کے تحفظ کے خیال کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔

سراج کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ گوئی اس کے بازو کا کچھ گوشت ہی اویڑ سکی تھی۔ کچھ معمولی خراشیں اورنگ زیب کو بھی آئی تھیں لیکن وہ رات بھر ایک لمبے کیلئے بھی سراج کے پاس سے نہیں ہٹا تھا۔ سراج کے ہمراہ اسے انکار کے باوجود اس کے قریب ہی رہا تھا۔ پولیس سرجن نے ضروری مزاحمتیں ہی کے بعد مشورہ دیا تھا کہ سراج کو کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کر دیا جائے لیکن اورنگ زیب نے کسی وجہ سے وہ رات پولیس اسپتال ہی کے ایک سائیڈ روم میں گزارنا مناسب سمجھا۔ صبح دو بجے سراج کی کچھ بھی آگئی جب ڈی آئی جی کراخو آغا منصور وہاں سادے لباس ہی میں صبح دس بجے آ گئے جبکہ اورنگ زیب نے سرجن کے علاوہ وہاں کے عملے کو بھی سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اس حادثے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔ سراج سے بھی اس نے کئی گزارش کی تھی کہ وہ حتی الامکان زبان بند ہی رکھے۔

”یہ حادثہ کب اور کہاں ہوا؟“ ڈی آئی جی نے باری باری اورنگ زیب اور سراج کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”میں سنا ہے کہ ایک بلاسٹ ہونے کے علاوہ شدید فائرنگ بھی ہوئی تھی؟“

”آپ کو کس نے اطلاع دی؟“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”محققہ قاتنے کے اس ایچ او نے کچھ ویرنل خبر دی ہے لیکن آپ لوگ.....“

”مسٹر جنرل رات میرے کمر پر ڈرنے نہ آئے تھے۔“ اورنگ زیب نے بدستور سمجھا

”یہ سنا ہوا ہے۔“ میں نے انہیں دیکھا تھا۔ ڈرنے کے بعد میں مسٹر سراج کے ہمراہ اسپتال ایک مریض کی کمرہ پر گیا تھا۔ وہاں سے واپس ہوتے وقت کھات لگے ہوئے دو لوگوں نے ہم دونوں کو جیکب آباد لے جانے کی کوشش کی لیکن..... کامیاب نہیں ہو سکے۔ فائرنگ کا تبادلہ میرے پرائیویٹ میں ہوا۔ ان دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ اگر میں نے حسب ضرورت اس کا خیال نہ رکھا ہوتا تو شاید کسی کو کھنکھارے۔“

”آپ کا اشارہ.....“

”اس باسٹرڈ کی طرف ہے جو اب کم از کم میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔“ اس بار اورنگ زیب نے مکمل کراہتی نگریت کا اظہار کیا۔

”اوہ..... آغا منصور نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ دونوں کو یقین ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔“

”شکر ہے میرے.....“

”میرا خیال ہے کہ مسٹر سراج کی طبیعت میں تبدیلی کا کیا مطلب ہے؟ کم از کم کچھ دن آرام کرنا ضروری ہے۔“ آغا منصور نے کہا۔

”میں نے اسپتال کا آئیڈیڈ ڈراپ کر دیا ہے۔“ اس بار بھی اورنگ زیب نے جواب دیا۔

”سراج کو ان ہی کے گھر پر شفٹ کرنا چاہئے۔“ ان کی گھرائی کی ذمہ داری بھی میں اپنے مخصوص نمونہ کو سونپوں گا۔“

”گڈ نائٹ.....“ آغا منصور نے تاکید پر اس نے گزشتہ رات جیلے والی کرولا اور ان تین لادروں کی تفصیل دہرائی جو قابل شناخت ہو چکے تھے..... فی الحال انہیں سرخاٹے میں رکھا دیا گیا تھا۔

”مسٹر.....“ سراج نے مکمل باری باری کر لیا۔ ابھی تک کہیں کسی نے گمشدگی کی اطلاع بھی اورنگ زیب کو کرائی؟“

”میں نے ہدایت جاری کر دی ہے، جہاں بھی اطلاع درج ہوئی مجھے فوری باخبر کیا جائے گا۔“

”گاڈ ہی کی اور شپ کسی نہ کسی کے نام تو ضرور ہوگی؟“ اورنگ زیب نے کہا۔

”جیسٹر پلیس کی ہے وہ پہلی جاگت ہوئی ہے..... بہر حال، کچھ دوسرے ٹیکنیکل اندراجات سے کوشش کی جا رہی ہے۔“

ڈی آئی جی نے دلتے دلتے ہی اورنگ زیب اور سراج کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہے۔ اس وقت اس کے کمرے میں ان تینوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ آغا منصور کے جانے کے دو گھنٹے بعد اورنگ زیب نے اپنے ڈرائیگ سے ایک پرائیویٹ ایسیو بیس کے ذریعے سراج کو اس کے گھر لے کر دیا۔ الماس نے اورنگ زیب کا ٹکڑیہ ادا کیا تو اس نے مجھے انداز میں مگر بڑی اپنائیت سے کہا تھا۔

”ابھی نہیں سسراراج..... بادل پوری طرح چھٹ جائیں تو پھر صرف شکر یہ سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو باقاعدہ لکھ کر تقسیم کرنا ہوگا۔“

کچھ دیر بعد الماس کسی کام سے اندر گئی تو اورنگ زیب نے کمرے کو اندر سے پلٹ کر لیا۔ سراج کے قریب ایک ایڑی جینر پر بیٹھ ہوئے بولا۔ ”سسراراج..... آج میں آپ سے مکمل کر ایک آخری فیصلہ کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ بتا دوں کہ آپ نے کیا تہمت حسین کے بارے میں جو کہہ رکھا تھا۔ وہ اس سے زیادہ پر اسرار..... واحد حاضر جغ غائب ثابت ہو رہا ہے۔“

”کوئی خاص بات؟“

”گھڑی کو بلاست ہونے سے قبل اچانک اس نے خطرناک اعزاز میں اسٹیزنگ کا قاتل قرار فائزنگ کا تبادلہ شروع ہونے کے بعد وہ آپ کے روکنے کے باوجود ہار لہر گیا تھا لیکن اب..... وہ ان دونوں باتوں کو سامنے پر مطلق آبادہ نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے جو کچھ ہوا اس میں خدا کی مہربانی شامل تھی۔“

”اس بات کو میں پہلے بھی کئی موقعوں پر آزا چکا ہوں..... سب کچھ کرنے اور خطروں میں بلا سوچے سمجھے کود پڑنے کے باوجود اس کو جیتی ہوئی ایسی کوئی بات یاد نہیں رہتی۔“

”اس سے ڈسٹر ایسے جو واقعات ہو چکے ہیں کیا آپ مجھے اس کی تفصیل بتانا پسند کریں گے؟“ اورنگ زیب نے غامض اعزاز میں سراج کو ٹھونکنے کی کوشش کی تو سراج کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں جو وہ مکمل کرنا اب تک نہیں لانا چاہتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی ہچکچاہٹ محسوس کی تو بڑے جذباتی اعزاز میں بولا۔

”سسرانہیں..... صرف سراج..... اگر تم مجھے اپنا دوست بھدرو یا بھائی سمجھتے ہو تو آج کچھ چھپانے کی غلطی نہ کرو، پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، اب سوائے ٹ فائٹ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جنہیں کوئی تکلف ہے تو میں مجبور بھی نہیں کروں گا لیکن..... میں نے اب ایک آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

سراج نے اورنگ زیب کا وہ رنگ نہیں دیکھا تھا۔ اس کی باتوں میں آہنی چٹانوں کی سختی موجود تھی۔ وہ شیخ جامد کی خصلت اور اس کے اثر و سورش سے بھی واقف تھا۔ کل رات جو ہوسکا تھا وہی اس بات کی دلیل تھی کہ دشمن پوری طرح گمات لگاے بیٹھا تھا۔ لیکن ہے اس کا نشانہ صرف اورنگ زیب ہوتا مگر..... اورنگ زیب کے نہ ہونے کے بعد بھی بس ایک کسی قیمت پر رنگ ڈھنگ نہیں بدل سکتا تھا۔ سراج اکیلا ہو جانے کے بعد پھر بے بس ہو جاتا۔ صرف ایک رہ جاتا۔ ایک اور ایک کیا رہ نہیں ہو سکتا تھا۔

”اوکے..... تم اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔“ اورنگ زیب نے سراج کی خاموشی محسوس کر کے بے پروائی سے کہا۔ ”میں نہیں مجبور بھی کروں گا۔“

”سسر..... کچھ باتیں ایسی ہیں جو.....“

”سسرانہیں.....“ اورنگ زیب نے ٹوکا۔ ”جو بھی کہنا ہے دوست کچھ کر کہو، میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔“

سراج نے اورنگ زیب کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے لب و لہجے کی گرمی اور سچائی کو محسوس کرنا تو چپ نہ رہ سکا۔ ایک ہی سانس میں اس نے تمام مصلحتیں بالائے طاقت رکھ دیں۔ جو کچھ اس کے علم میں تھا وہ تفصیل سے بیان کرتا چلا گیا۔ اورنگ زیب خاموش بیٹھا پوری توجہ سے ایک ایک بات لکھ لکھ کر رہا۔ میڈم روہی اور چنگا کی باتیں اس حد تک تھیں جس کی اس نے اپنی گہرائی تک ان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ سراج چپ ہوا تو اورنگ زیب کچھ دیر غور و فکر میں ڈوبا رہا پھر غصے لہجے میں بولا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھ پر اعتبار کر لیا۔ میں بھی تمہارے اعتماد کو خیس نہیں پہنچاؤں گا۔ جو باتیں اس وقت میرے علم میں آئی ہیں ان میں سے جگا میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ میڈم روہی نے اسے تحفظ دینے والی بات کچھ غور و فکر کے بعد یہ بھی کہی ہوگی۔“

”ہوسکتا ہے لیکن قانون کی نظروں میں وہ بہرحال ایک سزا یافتہ مجرم ہے۔“

”جانتا ہوں اسی لیے کہہ رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے معنی خیز اعزاز میں جواب دیا۔ ”لیکن یہ بھی نہ بھولو کہ لوہے کو کلوہا کی سلا سکتا ہے۔ آئوٹوہیں جن لوگوں کو کھدو کی طرح استعمال کر رہا ہے وہ بھی سب قانون کو کسی نہ کسی صورت میں مطلوب ہیں۔“

”میری ذاتی اطلاع یہ ہے کہ پچھلے کچھ دنوں سے جگا بھی کبھی روپوش ہے۔“ سراج نے دہلی دہان میں کہا۔

اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے سوچا رہا پھر پہلو بدل کر خلا میں گھورے ہوئے بولا۔ ”جنہیں یاد ہوگا کہ میں نے گیسٹ ہاؤس میں ملنے والی غیر ملکی کی لاش کو دیکھنے کے بعد ایک سوال کیا تھا کیا اس کا کوئی تعلق اسپورٹس کار میں مرنے والے سے ہو سکتا ہے؟ میڈم روہی نے بھی ان ہی خطوط پر کوئی نتیجہ اخذ کیا ہوگا۔ چنگا کی روپوشی بھی کبھی ظاہر کرتی ہے کہ ہاشم کی موت میں بھی آئوٹوہیں کا ہاتھ ہوگا اور.....“ اورنگ زیب نے بولتے بولتے چپک کر سراج کو دیکھا۔ ”کیا تمہیں اس بات پر شبہ نہیں ہے کہ آئوٹوہیں کے مکان پر ہونے والے حملے میں ملے ہوئے روہی کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے؟“

”میڈم نے مکمل کر اس کا اکتہار نہیں کیا تھا۔“ سراج نے دہلی زبان میں جواب دیا۔

”اس کی جگہ کی بھی ہوتا تو اتنی ہی دانش مندی کا ثبوت دیتا جتنا میڈم نے دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہاشم بھی میڈم ہی کا کوئی نمائندہ ہو۔“

”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“ سراج نے سنجیدگی سے درپاؤ کیا۔

”پہلے ایک وعدہ کرو۔“ اورنگ زیب نے اٹھ کر سراج کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے ان واقعات جو باتیں کی ہیں اس کی ہیک بھی ڈی ڈی جی کرنا نہیں چاہیے۔ اس نے ہمارے

ساتھ رہنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن اسے یہ بھی یاد ہوگا کہ اس کی ترقی میں آکٹوپس کی سفارش کو خاص دخل تھا۔

”آپ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی درخواست کرتا۔“ سراج نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
 ”کل رات جیلے والی سیاہ کرولا اور اس میں سے برآمد ہونے والی تین نا قابل شناخت لاشوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ اورنگ زیب کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ اس حادثے کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آج کل اس قسم کی وارداتیں آتے دن دہری ہیں۔“ مفید بھی ہوتا ہے کہ مرنے والوں کی فوری شناخت نہ ہو سکے، جب تک پولیس کوئی آخری نتیجہ اخذ کرے جو مرنے والے کی دسترس سے دور نکل جائے۔“

اورنگ زیب کوئی جواب دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر سنگٹل ملے، اس نے کال رسیورکے میں جگت کا مظاہرہ کیا۔ جو نمبر اسکرین پر ابھرا وہ یقیناً اس کیلئے اہم ہو گا۔ ”کیا خبر ہے؟“ اس نے موبائل آن کر کے منیجر کی سے سوال کیا، مکہ دیر دوری جانب سے دینے جانے والے جواب کو پوری توجہ سے سنا رہا پھر جوش انداز میں بولا۔ ”میں اسی پرانے ریفرس پر اپنے ایک اتحاد کے آدمی کو بھیجتا ہوں، وہ تم سے مطلوبہ چیز آپ کے گاہے۔“ گزرتا۔
 اس اہم ٹھونک کے بعد ہمارے لیے مکہ حزیہ آسانیاں ہو جائیں گی۔ ریسٹ ایشر، سب مکہ میری ذات تک بکھد رہے گا۔ ہاں، ہاں بکھد رہا ہوں۔ ڈیوٹ ہے یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تمہاری دوستی کی خاطر میں نے بھی وہی کام ہی تو کرنا چاہتے تھے۔“ فائن۔ میں تمہیں دو گھنٹے بعد تفصیل سے بتاؤں گا۔ ڈنٹ دوری ہائی ڈارلنگ۔“ گھنگھو فتح ہونے کے بعد اورنگ زیب نے موبائل آف کیا تو اس کی آنکھوں میں بالکل ایسی ہی چمک ابھری تھی جیسی کسی شیر یا چیتے کی آنکھ میں اپنے شکار پر چھپنے سے پہلے ابھرتی ہے۔ سراج نے اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”کس کا فون تھا؟“

”اُسی پرانے دوست کا جس کے کہنے پر ہم کل رات اسپتال گئے تھے۔“
 ”لیکن اس وقت تو آپ نے۔“

”جو بھی کہا تھا وہ رازداری کا تقاضا تھا جواب ہائی نہیں رہا۔“ اورنگ زیب نے سراج کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا پھر اس نے میجر عارف کا نام پھر کیے بغیر گھابو کے ذہنی ہونے اور ادارہ رستم علی کے جن شبہات کی کہانی سنا دی وہ بھی سراج کے لیے بڑی سنسنی خیز تھی۔

”آپ کا شبہ کس پر ہے؟“ سراج نے کسمسا سوال کیا۔
 ”کل کیا ثابت ہو گا اس کے بارے میں یقین ہے کہ نہیں کہ سکتا لیکن لیال میرے شبہات کے تمام پہلو اور زاویے ایک ہی نام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ آکٹوپس۔“
 ”آکٹوپس کہتے وقت اورنگ کی نگاہوں میں جو نفرت انگیز چمک ابھری، وہ بھی بے حد خوفناک

فی۔

”تم ریسٹ کرو۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شام تک دوبارہ واپس آؤں گا اور ہاں۔۔۔ اپنے پراسرار لیات حسین کو بلا کر اس سے مل لو، وہ کل رات سے تمہارے آس پاس ہی مٹلا رہا ہے۔ کسی کے پاس ٹارگٹ کی طرح۔“ اورنگ زیب نے ایک بار پھر سراج کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈالا پھر اسے دس کرنا ہوا دروازہ کھول کر چلا گیا۔

اورنگ زیب کے جانے کے بعد الماس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں غمی جھلک تھی۔ سراج نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ”بڑی بات ہے۔۔۔۔۔۔ بہادر بچے اور بچیاں رویا نہیں کرتے۔“
 ”آپ جو کچھ دے ہیں وہ بات نہیں ہے۔“ اس نے شوہر کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں لکھی کرتے ہوئے کہا۔ ”آج آپ کے ایس بی صاحب نے جاتے جاتے جو نوکٹ اس سے میری آنکھیں چمک اٹھیں۔“
 ”کیا ہوا؟“

”آج انہوں نے جاتے وقت کسی بزرگ کی طرف میرے سر پر ہاتھ کر رکھا تھا۔ اب آپ کا ایک بڑا بھائی اور زندہ ہو گیا ہے اس لیے کسی بات کی گزرتہ کریں۔“
 ”ہاں۔۔۔۔۔۔ آج وہ مجھے بھی سسر سراج کے بجائے صرف سراج کہہ کر بڑی محبت سے بات کر رہے تھے۔“

”اورنگ زیب صاحب کی بات اور ہے لیکن۔۔۔۔۔۔ اس نے سراج کو تیز نظروں سے گھورا۔
 ”میرے علاوہ کوئی دوسری عورت اگر آپ کی خاطر بے چینی کا اظہار کرے تو وہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔“

”خدا کا شکر ہے کہ میں اسپتال نہیں گیا ورنہ وہاں پولیس افسروں کو خوش رکھنے کی خاطر عام طور

سے کسی غیر بصورت نرس کی تعینات کی جاتی ہے۔“
 ”میں نرس کی نہیں آپ کی رونی صاحبہ کی بات کر رہی ہوں جو آپ کے گھر آنے سے اب تک مجھ پر آپ سے بات کرنے میں بے چینی کا اظہار کر چکی ہیں۔“ الماس نے مسکرا کر کہا۔ پھر خوشی سے پوچھا۔ ”کیا مجھے دکھانے کی خاطر یہ کھلی والا ڈراما تیار کیا ہے یا آپ کا روٹی ہے۔“

”اسے میری ایک کھڑی بات بری لگی ہے۔“ سراج نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ملے اسے اپنی سرکاری حیثیت کا احساس دلانے کے بعد کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی جس کا اس نے بلا مطلب نکال لیا۔ بات اسی کے بدلنے کی تھی لیکن۔۔۔۔۔۔“

اسی وقت الماس کا فون پھر گنگنا یا تو اس نے سراج کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی ان ہی باتوں کا فون ہے۔“ پھر موبائل آن کر کے منیجر کی سے بولی۔ ”آئی ایم سوری رہی لیکن ڈاکٹروں نے صحت کو ایک مقررہ عمل بیزاریٹ کا کہا ہے۔ بات چیت کرنے سے منع بھی کیا ہے۔“
 ”انہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟“ دوسری طرف سے میڈم نے بے چینی کا اظہار کیا۔ ”میرا

مطلب ہے کہ پولیس سرجن نے گولی لگنے کے بعد غصے کا اظہار تو نہیں کیا؟..... گھر آنے کے بعد آپ کو کچھ نہ کچھ صورت حال کاظم تو ضرور ہوا ہوگا؟

”ابھی تک اس بی ادبک زب نہ تھی سے اندر سے کراہنے کیے بیٹھے ہیں۔ میں بھی اندر نہیں گئی۔“ الماس نے شرارتی سنجیدگی پر فرار رکھی۔ ”میں بھی دعا کر رہی ہوں۔ آپ سے بھی یہی درخواست کروں گی۔“ الماس نے جملہ عمل کر کے موبائل سراج کی طرف بڑھا دیا۔

”گو کروںی حرج نہ ہو تو میں آپ کے گھر آ کر انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔“ روہنی کی آواز ابھری۔ ”میں صرف دعا ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ان لوگوں کے خلاف کر سکتی ہوں جنہوں نے چھپ کر ایک ایسا انداز امر کو ہدف بنانے کی بڑا نہ حرکت کی ہے لیکن پلین۔ یہ بات آپ سسر سراج سے نہ کہیے گا ورنہ وہ.....“

”اب بھی آجیٹل حیثیت میں آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے گا۔“ سراج نے سرسراہے لہجے میں جملہ مکمل کر دیا۔

”اوہ.....“ دوسری جانب سے سراج کی آواز سن کر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ ”الماس کی اس وقت کی شرارت تو میرے ذمے ادھار رہی۔ بہر حال، آپ کی آواز سن کر خوشی ہوئی۔ اب طبیعت کیسی ہے؟“

”خدا کا شکر ہے کہ ذبحہ وارنٹ ایضاً ہوتے ہوئے رہ گیا، معمولی زخم آیا ہے، دو چار روز زلوت پٹ کر دوبارہ کھڑا ہو جاؤں گا۔“

”کیا میں عداوت کیلئے حاضر ہونے کی درخواست کر سکتی ہوں؟“ بڑی انکساری سے پوچھا گیا۔

”فی الحال مناسب نہیں ہوگا۔“ سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”کچھ اہم واقعات اور بھی رونما ہوئے ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں لیکن دشمن اس وقت پوری طرح محاط ہوگا۔ آپ کا براہ راست مجھ سے ملنا شاید اسے گوارا بھی نہ ہو۔ یہ بات بھی آپ سے سرکاری حیثیت میں نہیں بلکہ الماس کی بہن سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔“

”شکر ہے سراج صاحب، میں اس سے رشتے میں زیادہ قانعہ میں رہوں گی۔“ میڈم نے خوشی سے کہا۔ ”آپ ڈرامو موبائل الماس کو دے دیں تاکہ میں اس کی تحریک بھی دریافت کر لوں۔“

سراج نے موبائل الماس کی طرف بڑھا دیا جو بڑی دیر تک اس سے رشتے پر مکمل کر سکتی ہوئی رہی۔ سراج کے ذہن میں ایک بار پھر ایس بی ادبک زب کے کچھ آخری فیصلے ابھرے لگے جو قانونی اعتبار سے مناسب نہیں تھے۔ جب تک الماس فون پر بات کرتی رہی اس کا ذہن ان ہی خطوط پر سوچتا رہا جس پر ادبک زب نے قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ الماس فارغ ہوئی تو سراج نے لیاقت حسین کو اندر بلا لیا جس کے چہرے کی اداسی اور آنکھوں کی دیرانی اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ سراج کیلئے کس قدر پریشان تھا۔

”پریشان مت ہو لیاقت حسین۔“ سراج نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”تمہاری ہی دعا کا نتیجہ ہے کہ کوئی زیادہ کارگر مجاہد نہیں ہوئی ورنہ.....“

”لیکن بات بھی زبان سے نہ نکالے صاحب۔“ لیاقت حسین نے ردی ہوئی آواز میں حیرتی سے کہا۔ ”غدا ان کو غارت کرے جو آپ جیسے نیک لوگوں کے دشمن بن گئے ہیں۔“

”تمہاری بروقت ذہانت کام آئی۔ اگر تم نے گاڑی کو فوری طور پر نہ موڑا ہوتا تو شاید ہم پلاسٹک بم کی زد میں آ جاتے۔“

لیاقت حسین نے جواب میں کچھ نہیں کہا، اس کے چہرے پر ابھرے والا اضطراب بتا رہا تھا کہ اسے ایسی کوئی بات یاد نہیں جس کا ذکر سراج سے پیشتر ادبک زب بھی کر چکا تھا۔ سراج نے اس کے چہرے کے تاثرات سمجھتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے لیاقت حسین، ہم کس سوچ میں کم ہو گئے؟“

”صاحب..... وہ آپ کے ایس بی صاحب.....“ اس نے رک رک کر اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ ”وہ بھی کچھ ایسی ہی باتیں بتا رہے تھے جو مجھے یاد نہیں۔ غدا مجھے کیا بیماری ہوگئی ہے؟ کیا روگ ہے جو میری جان سے چٹ گیا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ تم کو فرمیں سے بہت زیادہ پیار ہے۔“ الماس نے لیاقت حسین کی ذہنی کلیت کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”تم ایسا کرو، جب تک سراج گھر پر نہیں تم دو چار روز کے لیے فرمیں کے پاس چلے جاؤ اس کے بعد پھر آ جانا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے تنگ صاحب؟ میں اپنے دشمن کو ایسی حالت میں ایک پل کیلئے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کہو تو میں تنگ حسان سے بات کر کے فرمیں کو یہاں بلوا لوں۔“ الماس نے نئی پیشکش کی۔ ”میں سب کچھ کر رہا ہوں تنگ صاحب کہ آپ بھی مجھے بھانپنے لگیں۔“ گواہ بنا کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے کچھ باتیں یاد نہیں رہیں..... ایسا کیوں ہوتا ہے صاحب؟“ اس نے آخری جملہ کہتے وقت سراج کی طرف غور سے دیکھا۔

”میں جنہیں سمجھا چکا ہوں کہ اوپر والا تمہاری سنی کی وجہ سے جنہیں نواز رہا ہے۔ جنہیں کوئی فادہ نہیں ہے۔ جو باتیں جنہیں یاد نہیں رہتی اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔“ سراج نے ہلکے سے کہا۔ ”آجندہ تم ایسی بات پر غور نہ کرنا۔ اسی میں بہتری ہے۔“

لیاقت حسین نے سر کی جھٹ سے اقرار کیا لیکن ذہنی طور پر وہ ابھی الجھا ہی رہا۔ الماس اور سراج دونوں خاصی دیر تک اس کی دلجوئی کرتے رہے۔ لیاقت حسین کے جانے کے بعد الماس نے سراج سے کہا۔

”آپ کا کیا مشورہ ہے..... میں راجیل سے کہہ کر فرمیں کو دو تین روز کیلئے اپنے ہاں نہ بلا لوں؟“

”اس سے بات نہیں بنے گی۔ میں لیاقت حسین کے معاملے میں اب درگزر سے کام لیتا ہوں گا۔“ سراج نے کچھ توقف سے کہا۔ ”میں شام کو اورنگ زیب صاحب سے یہی کہوں گا کہ اس موضوع پر وہ بھی زیادہ کرپنہ کریں۔“

کچھ دیر بعد الماس سراج کو آرام کا مشورہ دے کر گھر کیلے کام میں مصروف ہو گئی لیکن سراج کا ذہن بدستور لیاقت حسین کے بارے میں الجھا رہا۔ خاص طور پر وہ یہ جاننے کیلئے بے چین تھا کہ دفتر سے دس پندرہ منٹ میں واپسی کا کہہ کر لیاقت حسین ڈیڑھ گھنٹے تک کہاں غائب رہا تھا؟ واپسی پر بھی اس نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ پندرہ میں منٹ سے زیادہ غیر حاضر نہیں رہا مگر..... دفتر کی کھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد خود وہ بھی حیرت کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ عرض اس نے کہاں گزرا؟ یہ سوال لیاقت حسین سے زیادہ سراج کیلئے اہم ترین تھا۔



دو تین راتوں کا خمار اس وقت بھی شمع حادہ پر ایک نثر سلاطی کر رہا تھا۔ کنول کے ساتھ وہ لمب صورت اور حسین لمے گزرا ہوا چٹا چہرہ بڑے پایاگاہ تھے۔ وہ سل بند بوس کی ایسی چمکنی شراب کی جس کا تیز نشہ صبح حادہ کو ذہنی عمر میں بھی جوانی کی یاد دلا رہا تھا۔ اگر حالات اور گرد و پیش کا اظہار نہ ہوتا تو اس کے قرب کو بینوں ایک پل کیلئے بھی خود سے دور نہ رکھتا لیکن بیوی کی خودکشی کے بعد وہ اپنی جہت کے نیچے کنول کو بحیثیت بیوی بھی جگہ دیتا، تو اس کے حریف اور قانون اس کا جینا فرام کر دیتے۔ وہ موجودہ حالات میں بھی خوش تھا۔ کنول سے اس نے جو سودا کیا تھا وہ زیادہ مہنگا نہ تھا۔ یہ کہہ کر دل کو تسلی دے رہا تھا کہ جو لطف جی کی کبریٰ کو چوری چھپے، درخت سے تو ذکر کھانے میں ہے وہ بازار سے خرید کر کھانے میں کہاں؟ وہ اس کا خریدار ہوا مگر سودا جی پھر بھی وہ اسے چوری چھپے کھانے پر مجبور تھا۔

عام طور سے وہ ٹھیک دس بجے دفتر پہنچ جانے کا عادی تھا لیکن اس وقت گیارہ بجے بھی اپنی غراب گاہ میں بیٹھا کنول کے بیچ دغ کے خیالی تصور سے دل بہلا رہا تھا جب اس کے مخصوص سوپاں ملے اور بے تکیا کیا۔ اس نے روشن اسکرین پر نظر ڈالی تو کال رسیور کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ خبر کو کا لیاقت حسین حادہ نے وقتی طور پر بلیک بائیک کی ڈسے داریاں بھی سوچ رکھی تھیں۔

”کیسے فون کیا؟“ اس نے سوپاں آن کر کے خشک لہجے میں سوال کیا۔

”جیہاں تم نہیں دینی تھیں۔“

”مطلوبہ گاڑی کو سب لوڈ سٹر پر روانہ کر دیا گیا ہے ابھی تک کسی نے نہ اپنا سامان کھینچا ہے نہ گاڑی کے بارے میں کوئی تفتیش نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔“ جواب بڑے اطمینان سے دیا گیا۔ ”آئندہ بھی یہی طریقہ رہے گا، میں نے اس کی ساری شناختیں پہلے ہی کھوج کر مٹا دی تھیں۔“

”ان کو واجب قیمت ادا کر دی گئی ہے۔ وہ زبان ہونے کی غلطی کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں

”مگر.....“ صبح حادہ نے تعریف کی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی۔

”اطلاعات لی ہے کہ اسپتال کے قریب ہونے والے بلاسٹ میں دو آدمی بھی ضائع ہو گئے ہیں۔“

”اچھا ہی بندے تھے۔“ فوری جواب ملا۔ ”ہم نے لاشیں اسی وقت اٹھائی تھیں جن کو رات

”فائرنگ کی حماقت کیوں کی گئی تھی؟ میں نے صرف ایک وارننگ دینے کو کہا تھا۔“

”سیرانیال ہے کہ وہ اسے اپنے لپے کے ساتھ لہاس والے تھے۔ ابتداء ہی کی طرف سے کی گئی۔ ایک آدمی کام آگیا تو میں بھی چوٹی کا ردائی کر پڑی، ایسا نہ کرتے تو زیادہ نقصان بھی ہو سکتا تھا۔“

”تمہاری کارکردگی ابھی تک اطمینان بخش ہے لیکن چکا کا کیا بنا؟“

”اس کی تلاش جاری ہے۔ آخری ٹھکانا ہم نے بروقت اڑا دیا تھا لیکن وہ نہ جانے اپنے آدمیوں سمیت۔“

”یہ کہانی پہلے بھی سن چکا ہوں۔“ اسے خشک لہجے میں وارننگ دی گئی۔ ”چکا کی روپوشی ہمارے لیے اہم ہے اسے کی طرح بھی نہیں کرو۔“

”رائٹ سر۔“

”سراج کو سٹے باسٹرنے اسپتال کے بجائے گھر پہنچا دیا ہے۔“ شیخ حامد ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اس کی وجہ سے سراج بھی پرکٹانے کی پوزیشن میں آگیا ہے۔“

”آپ صرف اشارہ کریں۔ ہم پورا شیمن پھونک کر رکھ کر دیں گے۔“

”حماقت کی باتیں مجھے پسند نہیں۔ دشمن کی دھمکی رگ اگرتا ہوں آجائے تو میرا اشاروں پر تپتے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک کوشش ہو چکی تھی جسے سراج نے بروقت ناکام بنا دیا۔ ورنہ اس وقت وہ میرے قدموں میں پڑا ہوتا۔“

”اب کیا حکم ہے؟“

”اسی فوجی بیرے (الماس) کو دوبارہ قابو کرنے کا پلان بناؤ لیکن میں اب دوسری بار ناکامی برداشت نہیں کروں گا۔“

”رائٹ باس۔ کام ہو جائے گا۔“

”نہ ہو تو تم بھی مجھے اطلاع دینے کے بجائے وہی راست اختیار کرنا جو گیسٹ ہاؤس میں سرنے والے نے اختیار کیا تھا۔ انتہائی سربلجے میں جملہ مکمل کرنے کے بعد شیخ حامد نے موبائل آف کر دیا۔ کچھ دیر وہ کسی خیال میں گم رہا پھر اس نے سراج کی خبریت دریافت کرنے کا ارادہ کر کے موبائل دوبارہ آن کر لیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں کسی کوڑیالے ساپ ہی کی طرح چمک رہی تھیں۔

کالے رنگ کی وین اس عمارت سے تقریباً پانچ گز دور جا کر روک دی گئی جس میں افضل خان کا اپارٹمنٹ تھا۔ دین سے اترنے والے دونوں افراد خوش لباس تھے، صورت شکل سے بھی وہ مہذب ہی نظر آ رہے تھے لیکن مذکورہ بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی ایک مسلح گارڈ کلر ان کے ہارٹے میں حائل ہو گیا۔

”کہاں جاتا ہے جتنا؟“ اس نے مہذب لہجے میں سوال کیا۔

”کیا مطلب؟“ ایک نوجوان نے گارڈ سے وضاحت طلب نظروں سے کہا۔ ”کیا اس عمارت میں بغیر اجازت داخل ہونا بھی منع ہے؟“

”پہلے نہیں قیاس۔ لیکن اب تمام اپارٹمنٹ کے کینوں کا بھی حکم ہے کہ کسی بھی شخصے آنے والوں کو بغیر معلومات کے لفٹ یا میزجیوں تک نہ جانے دیا جائے۔ میں ان کا ملازم ہوں صاحب اس لیے اپنی ڈپٹی سے مجبور ہوں۔“

”گڈ۔۔۔۔۔“ دوسرے نوجوان نے گارڈ کی فرض شناسی کو سراہا۔ ”ہمیں افضل خان سے ملنا ہے آج ہی دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ میں آگئے ہیں۔ شاید ان کے ساتھ جو حادثہ گزر چکا تھا سی کی بنیاد پر تمہاری خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں۔“

آپ کا اعزاز درست ہے سر۔۔۔۔۔ گارڈ نے کہا۔ ”آپ اپنا نام بتا دیں، میں احتیاط کے اہل ہے اس سے مطمئن کر لیتا ہوں۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ میں خود احتیاط کر اپنے دوست سے بات کر لیں۔“

”تشریف لائیں صاحب۔۔۔۔۔“ گارڈ انھیں لفٹ کے قریب بنے ایک مختصر کمرے میں لے گیا جہاں سے عمارت کے تمام اپارٹمنٹ والوں سے گفتگو کی جاسکتی تھی۔ یہی اس کی فطری حق تھی۔ وہ آگے چلے اندر داخل ہوئے تھے۔ پھر اس سے پیشتر کہ گارڈ احتیاط پر رابطہ قائم کرتا پست پر موجود نوجوان نے نہایت مہارت سے جیب میں رکھا ہوا ردیال نکال کر گارڈ کے منہ اور ناک پر بھجوا دیا۔ ردیال میں لگی مہک خاصی زوداثر تھی، گارڈ نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن خود کو بخران کی آہنی گرفت سے آزاد نہ کر سکا۔ اسے اسے ہوش ہونے میں چند منٹیں سیکڑ گئے تھے۔ دوسرے نوجوان نے اہل کلر کا ادھر ادھر جھانکا پھر دونوں نے ل کر گارڈ کو اس کی کرسی تک لے جا کر اس طرح نکال دیا کہ اچھے والا بھی کچھ نہ سو رہا ہے۔ اس کام سے قاریغ ہو کر دونوں لفٹ میں داخل ہوئے پھر مطلوبہ منزل کا کھن دبا دیا۔ لفٹ کے حرکت میں آتے ہی ایک نوجوان نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اس بات کا مکمل رکھنا کہ ہمیں سی ایس ایلامکان دنگھن فساد سے پرہیز کرنا ہے۔“

”جانتا ہوں۔“ دوسرے نے مسکرا کر جواب دیا۔ اس کے بعد ان کے درمیان کوئی اور بات نہیں ہوئی۔

لفٹ کے رکنے اور خود کار دروازے کے کھلنے کے بعد وہ اس راہداری میں آگئے جس میں پورے عمارت کا پینٹ ڈالا ہوا تھا، ہر دو اپارٹمنٹ کے درمیان جھیل کے جگہ جگہ ٹکڑوں میں مٹی پلائی نظر آ رہے تھے۔ دونوں خاموشی سے قدم اٹھاتے افضل خان کے فلیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئے، ایک کے دونوں ہاتھ جھٹوں کی جیب میں رینگ گئے، دوسرے نے جیب سے ایک تار کا ٹکڑا نکال کر چابی کے سوراخ میں ڈالا، ہل بھر میں کلک کی آواز سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ایک نے جیب سے جرسن ساخت کا آؤٹیک ہتھول نکال کر افضل خان اور شہینہ پر تان

لپک کر دونوں ہاتھ اس کی کنٹینوں پر بجائے بھر کی ایک رگ کو سلاک وہ بے ہوش ہو کر اس کے ہاتھوں میں جمول گئی۔ دوسرے ہی لمحے نوجوان نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس کے گرتے ہوئے کو سنبھالا پھر اس حسین بوجھ کو کانٹے پر ڈال کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ دوسرے نوجوان نے پتول واپس جیب میں ڈال لیا۔

واپسی کے وقت دونوں ہی پر سکون تھے، شبنم کو ساتھ لے جانے کا اعزاز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے انگریزی کی حالت میں کسی قریبی اسپتال میں طبی امداد کیلئے لے جا رہے ہوں۔ وہیں تک پہنچنے کے دوران انھیں کسی مزاحمت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔

وہ کتنی دیر بے ہوشی سے دو چار رہی اسے اس کا اعزاز بھی نہیں تھا۔ ہوش آنے پر اس نے خود کو ایک نرم گرم بست پر پڑا پایا تھا، وہ بڑا کراچی۔ دتی ٹھوڑی پر نظر ڈالی تو یہ تصویر بھی اس کے وجود کو ڈسنے کیلئے کافی تھا وہ رات بھر کی دوسرے کے دسترس میں گزار چکی ہے۔ اس نے ارد گرد نظر ڈالی۔ وہ ایک مختصر کمر تھا جہاں ایک بیڈ، دو ایڑی چیئر اور ایک میز کے علاوہ اور کوئی فرنیچر نہیں تھا، بست سے اتر کر کمرے کے امداد دروازے کو آ کر آیا جو حسب توقع باہر سے بند تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی ایک چار پائی چار کا ہاتھ روم بھی موجود تھا۔ کمرے کی ساخت بتا رہی تھی کہ وہ کسی پختے کا بیسٹ ہے یا پھر بے خانہ بھی ہو سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں بے بعد دیکرے مختلف سوال گردش کرنے لگے۔ "وہ اس وقت کسی کی قید میں تھی؟ کیا اس کی کوئی ذاتی مالک کی طور پر اس تک پہنچ گئی جس نے اسے زیر عتاب کر دیا تھا؟ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر اسے اغوا کرنے والے کون تھے؟ ان کا مقصد کیا تھا اور افضل خان کو چھوڑ دینے کا رسک کیوں لیا گیا تھا۔ ہوش آنے پر وہ جب باس کو اس کو دو ادویوں کی تفصیل ملحط بنا سکتا تھا جنہوں نے شبنم کو اغوا کیا تھا۔ کیا اغوا کرنے والوں کو اس کا کوئی عذر نہیں تھا؟ کیا اغوا کرنے والوں کو اس بات کا اعتقاد تھا کہ اس کے اور افضل کے آپارٹمنٹ میں منتقل ہوتے ہی کارروائی مکمل میں لائی جائے؟"

بڑی دیر تک وہ خود اپنے سوالات کا جواب تلاش کرتی رہی پھر دروازے پر ابھرنے والی آہٹ محسوس کر کے دوبارہ بست پر بیٹھ گئی۔ فوری طور پر وہ اس بات کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ کسی ذہنی کشش سے دوچار ہے۔ دروازہ تیزی سے کھولا گیا، ایک درمیانہ قد اور کھٹے ہوئے جسم کا مالک بڑی ہوشیاری سے سامنے آیا تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا، اس کا کوئی ساتھی بھی پیچھے موجود تھا جس نے اندر داخل ہونے والے کے اشارے پر دروازہ دوبارہ باہر سے بند کر لیا۔

"مجھے توقع تھی کہ تم اب تک پوری طرح ہوش میں آ چکی ہو گی۔" آنے والے نے اطمینان سے کہا پھر ایڑی چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہاں فی الحال کوئی تکلیف نہیں ہوئی؟"

"مجھے یہاں کیوں اور کس مقصد سے لایا گیا ہے؟" شبنم نے اپنے اوسان بحال رکھتے ہوئے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"مقصد نیک ہی ہے۔۔۔۔۔ برا ہوتا تو تم اس حال میں نہ ہوتیں۔" سپاٹ اور شکک لہجے میں جواب ملا۔

"تم کون ہو؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تمہارا کیا اعزاز ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے مجھے اغوا کر کے اپنے ہیروں پر کھڑائی ماری ہے۔" شبنم نے اسے اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خاطر کہا۔ "اب تک میرے واقف کاروں کو کبھی اطلاع مل چکی ہو گی۔"

"تمہارا خیال غلط نہیں ہے۔" نوار نے بڑے سکون سے مگر متنی فخر اعجاز میں جواب دیا۔

"جو موہاں جھیں دیا گیا تھا اس پر کچھ دیر پہلے ٹھوڑے ٹھوڑے وقتے سے منسل موصول ہوئے پھر دوسرے جانب کسی نے مخصوص ڈیٹا کو استعمال کیا جس کے نتیجے میں موہاں کل کرنا کارہ ہو گیا۔"

"اس کا مطلب بھی یہی ہوا کہ ہمارے آدمیوں کو کبھی حالات کی تکمیل مل چکی ہے۔"

"ہم بھی یہی سمجھا چاہتے تھے۔۔۔۔۔" نوار نے مسکرا کر کہا پھر یکھت بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "مگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون کو تو ہم بلاوجہ تمہارے ساتھ کو برا سلوک بھی نہیں کریں گے۔"

"کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟"

"فی الحال تمہیں تصویر دیکھ کر یہ بتانا ہے کہ وہ کون ہے؟" نوار درمیانہ اعجاز میں اظہار

اس نے ایک بندہ شبنم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تم لفافے میں موجود تصویر کو دیکھ کر کوئی اداکاری نہیں کرو گی۔"

شبنم نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا، وہ بہ دستور خود کو پر سکون ظاہر کر رہی تھی لیکن لفافے سے

ہر آدھ ہونے والی تصویر کو ایک نظر دیکھتے ہی اس طرح چوکی چھپے کی زہر پلے چھوئے اسے ڈک مار دیا

ہو۔ وہ تصویر کنول کے سوا کسی اور کی نہیں تھی۔ جب باس کی منظور نظر، جس کے ملازمت چھوڑنے کے

بعد سب ہی بکے ذہنوں میں مختلف سوالات ابھر رہے تھے، کسی نے زبان کھولنے کی جرأت تک نہیں

کی تھی۔ اب اسی کنول کی تصویر اسے شاخت کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ آخر کیوں؟ کیا تصویر

مائل کرنے والے اس کی حقیقت سے واقف تھا یا اس میں بھی "پوپ" کی کوئی صورت

ظاہر تھی۔ تصویر میں کنول کا صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس چہرے کو غالباً کسی گروپ وغیرہ سے علیحدہ

کیا گیا تھا۔

"کیا کوئی رسی ہو۔۔۔۔۔؟" نوار نے اسے تیز نظر دے سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ جب تم لوگوں نے یہ تصویر حاصل کی ہے تو اس کے متعلق کچھ نہ کچھ

معلومات بھی ضرور رکھتے ہوں گے۔ پھر مجھ سے کس بات کی تصدیق چاہتے ہو؟"

"میں اپنا سوال ایک بار پھر دہرا رہا ہوں۔" نوار نے کچھ سے پہلے سے زیادہ کڑھکی آگئی

ھی۔ "پو کس کی تصویر ہے؟"

قریبی عزیزہ کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔ ”ہمیں لیاقت حسین کی فوری روانگی کا بندوبست کرنا ہو گا۔“

”کیا لیاقت حسین کا جانا مناسب ہو گا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کی موتوں پر ہجرت انگریزوں پر ہماری جان بچا چکا ہے۔ سراج بھی اسی خیال سے اسے دس بارہ روز کے لیے لے گیا تھا، آپ ابھی بتا رہے ہیں کہ گاڑی پر ہونے والا حملہ بھی لیاقت حسین کی کسی شیعہ مدد پر بدقت حرکت سے جان لیا ثابت نہیں ہوا، ایسی صورت میں.....“

”بہر حال، ہمیں لیاقت حسین کو اطلاع تو دینی ہے۔ ہم اپنی اہم خبر کو چھپا کر کسی خود غرضی کا ثبوت بھی نہیں دے سکتے۔“ سیٹھ عثمان نے اٹھتے ہوئے تنبیہ کی ہے کہا۔ ”میں سراج سے بات کرتا ہوں۔“

”میں فرمین کو.....“

”ابھی اتنی جلدی نہ کریں۔ لیاقت حسین کو آ لینے دیں، وہ ہو گا تو فرمین کو زیادہ مناسب طریقے سے دلا سکا می دے سکتے گا۔“

سیٹھ عثمان نے پہلے سراج کو اطلاع دی پھر لیاقت حسین سے بھی براہ راست بات کی۔ آدمی گھنٹے کے اندر لیاقت حسین بھی آ گیا۔ سیٹھ عثمان اسے پرسردینے کی خاطر باہر گئے تو لیاقت حسین نے بڑی متانت سے درخواست کی۔

”صاحب..... آپ یا بیگم صاحب میرے فرمین کے ساتھ جانے پر اصرار نہ کریں تو مہربانی ہوگی۔ میں سراج صاحب کو ان حالات میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

”تم پہلے بھی نہیں گئے تھے۔“ سیٹھ عثمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”فرمین کے علاوہ تمہارے گھر والے بھی کیا سوچیں گے؟“

”آپ پریشان نہ ہوں صاحب، میں فرمین کو ساری باتیں سمجھا دوں گا۔“ لیاقت حسین نے بڑی خوبصورتی سے بات بتاتے ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ بعد میں فرمین کو لینے چلا جاؤں تو باقی سب کے گلے کھوئے بھی دور کروں۔“

”میں بڑی دبی نہیں کروں گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسے موقع پر تمہاری وہاں فرمین کے ساتھ موجود کی زیادہ مناسب ہوگی۔“

”فیک ہے..... میں فرمین سے بات کرتا ہوں۔ عیساء وہ مشورہ دے گی ایسا ہی کروں گا۔“

راجپوتہ بیگم نے فرمین کو لیاقت حسین کی آمد کی اطلاع دی تو وہ کسی پھول کی طرح خوشی سے مکمل اٹھی۔ اسی وقت لیاقت حسین کے ساتھ اپنی ایکس میں چلی لی لیکن اس کے کچھ دور بعد لیاقت حسین نے دوبارہ سیٹھ عثمان سے مل کر بتا دی کہ فی الحال فرمین تنہا جانے کی۔ بعد میں وہ ہوسکتا ہے کہ اسے لینے چلا جائے۔ سیٹھ عثمان نے زیادہ اصرار مناسب نہیں سمجھا، فوری طور پر فرمین کو روانہ کرنے کا سارا

”اے کرا دی لیکن..... ان کے ذہن میں ایک بار پھر یہ خیال رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ لیاقت حسین نے کسی وجہ سے اپنے پرستے گھریلو حالات کل کر پہلے کی نہیں بتائے تھے۔ اب بھی اس نے فرمین کو ہفت میں کچھ شرکت کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ مگر کیوں؟ آخر وہ کیا راز تھا جو لیاقت حسین مکمل کر صاف بیان کرنے سے گریز کر رہا تھا؟

فتح حامد نے اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے والی نرس کو بھوکے نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت کاغذ لکھ رہی تھی مگر فیک ہونے کے سبب اس نے جو سادہ لباس پہن رکھا تھا وہ بھی اتنا تنگ تھا کہ اسے لباس ہونے کی صورت میں شاید وہ اتنی پریشان نظر نہ آتی جتنی اس وقت نظر آ رہی تھی۔ مئی اس کے لیے جسم کی ٹھوس ساخت کو بھی اچا کر رکھا تھا۔

کنول سے شادی کرنے کے بعد فتح حامد کا پرانا واقف کار ڈاکٹر برلاس اس کے کہنے پر دوبارہ لڑوں کو اضافی طاقت کے انجکشن لگانے کی خاطر اس کے گھر بھیج چکا تھا۔ پہلے جو بیس آئی تھیں وہ دوبارہ پرکشش نہیں تھیں اس لیے فتح حامد نے ان پر تو ج نہیں دی لیکن موجودہ دسکی نرس کے جسمانی طبع و طراز اسے بیگانہ انگیزے کے تحت کچھ اٹھیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”تمہارا نام؟“ اس نے نرس کو مخاطب کیا۔

”جولینا.....“ نرس نے پیشہ وارانہ اعزاز میں جواب دیا پھر سراج میں دو ابھرنے لگی، اس کی نظریں سراج پر مرکوز تھیں لیکن فتح حامد اس اعزاز کو خاص طور پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے نقوش اور صورت نہیں تھیں جیسے اور جنہیں بلاشبہ تھے، وہ انجکشن تیار کرنے کے بعد فتح حامد کے قریب آئی تو اس نے نرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے بے باک اعزاز میں پوچھا۔

”جانتی ہو یہ انجکشن کس کام آتا ہے؟“

”ایکٹرا اسٹریٹھ (Extra Strength) حاصل کرنے کے لیے۔“ جولینا نے بے لاری سے جواب دیا۔

فتح حامد نے آستین اوپر اٹھا کر بازو کھول دیا، جولینا انجکشن لگانے کی خاطر اور قریب آئی تو اس کے جسم اور لباس پر لگے سینٹ کی سوئی سوئی خوشبو فتح حامد کو بے چین کرنے لگی۔ اس وقت اگر اسے کنول کے پاس نہ جانا ہوتا تو شاید وہ آدمی خود کی طرح جولینا کو بلا تکلف دیوچ لینا لیکن وہ بہر حال اس قابل نہیں تھی کہ اسے کنول جیسی چمکنی کلی پر ترجیح دے دیتی۔

”ڈاکٹر برلاس کے ہاں بھی آئی ہو؟“

”ہاں.....“ جولینا نے انجکشن لگاتے ہوئے یہ دستور بے نیازی سے کہا۔ ”عام طور سے میں کسی کے گھر پر ویزٹ نہیں کرتی لیکن ڈاکٹر برلاس نے آپ کے لیے خاص طور پر میری ڈیوٹی لگا دی۔ اس لیے کہ آج نصف ڈیوٹی کی نرس کی وجہ سے نہیں آئی تھی۔“

”میں آئندہ تم ہی کو طلب کیا کروں گا۔“ فتح حامد نے فروع لائے اعزاز میں کہا۔ ”تمہیں کوئی

گوئیوں کے ساتھ ہی شعلے بھی اگل رہی تھیں۔ راکٹ پر ایک ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے اس نے دوسرے ہاتھ سے موبائل نکالا اور ڈی آئی جی کرانچر آغا منصور کے نمبر بچ کرنے لگا۔

”بیلو! شیخ حامد صاحب۔“ دوسری جانب سے ڈی آئی جی کرانچر کی آواز ابھری۔ ”اس وقت کیسے یاد؟“

”میرے بھٹکے پر کچھ حرا میوں نے دوسری بار حملہ کر دیا ہے۔“ شیخ حامد نے چلائے ہوئے کہا۔ ”تمہارا وہ بیٹا اس لیے کہاں ہوا ہے؟“

”پریشان نہ ہو سر۔۔۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔“ اسی بار دوسری طرف سے بھی پریشانی کا اظہار کیا گیا۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ اس بار بھی اگر مجرم گرفتار نہ ہوئے تو پھر مجھ سے کوئی ٹھکرو نہ کرنا۔“ شیخ حامد نے کال منقطع کر دی اسی لمحے اسے شبنم کا خیال آیا۔

کنول کی طرف جانے کے خیال نے اسے اس قدر محو کر رکھا تھا کہ اسے یاد نہیں رہا کہ اس نے دو بار شبنم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں بار ٹھنک چکی رہی لیکن۔۔۔ کال ریسیو نہیں کی گئی تو اس نے کسی خطرے کے پیش نظر شبنم والا موبائل خاص ٹھیک سے چلا کر آ کر دیا تھا۔ وہ کسی قسم کا رسک لینے کا عادی نہیں تھا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا کہ شاید وہ اور افضل خان سے سرے سے اپارٹمنٹ ملنے کی خوشی کو انجانے کر رہے ہوں گے۔ ایسی کسی صورت کے انکشاف کے بعد وہ شبنم کو اس ”غفلت“ کی مناسب سزا دینے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا لیکن۔۔۔ اب اس کا ذہن کچھ بے شمار امکان پر غور کر رہا تھا۔ شاید حملہ کرنے والوں نے شبنم کو بھی اغوا کر لیا ہو؟ ورنہ وہ وہ موبائل کو اینٹھ کر سننے میں دیر نہ کرتی۔ اس خیال نے شیخ حامد کے غصے کو اور مزید کر دیا۔

باہر تاریکی میں گوئیوں کی تڑپا ہٹ جاری تھی۔ وہ دوسرے کمرے سے نکل کر نیچے جانے والے زینوں کی طرف بار بار راکٹ کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط کرے، اسے دیکھتا تھا کہ اس کے کارندے جو ایک کو بھی غافل رہنے کے عادی نہیں تھے، حملہ کرنے والوں سے پوری مستحضری سے برسرِ پیکار ہوں گے۔ دل ہی دل میں وہ حملہ کرنے والوں کو بھی مغلظات تک رہا تھا جنہوں نے اضافی قوت والے انجکشن اور کنول کے ساتھ ہونے والے پروگرام کا سہارا لیا تھا۔

وہ ابھی اُدھے زینے طے کر پایا تھا جب ایک مسلح کارندہ اس کے قریب آیا اور ٹھہر کر دیکھنے لگا۔

یہ۔۔۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں باس۔۔۔ باہر۔۔۔ تو۔۔۔“

”سن رہا ہوں سب کچھ لیکن لوگ کس مرض کی دوا ہو۔۔۔؟“ اس نے قریب آنے والے کو حقارت سے جواب دیا۔ ”دفع ہو جاؤ۔۔۔ جا کر حملہ کرنے والوں کو گھیرنے کی کوشش کرو۔ کب تک حرام کی کھاتے رہو گے؟“

آنے والا جس تیزی سے آیا تھا۔ اسی تیزی سے لوٹ گیا۔ شیخ حامد وہیں بیڑیوں پر بیٹھ گیا۔ گھپ اندھیرے میں ہار کھیلے میں جانا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ کوئی سہانہ سی ہوئی کوئی اس کے وجود کو بھی چاٹ جانے سے گریز نہ کرتی۔ اسی وقت موبائل پر سٹیبل ملے، اسکرین پر کنول کے نمبر دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے موبائل آن نہیں کیا۔ اندر ہی اندر مجلس کر رہ گیا۔ سارا پروگرام سہاناں ہو گیا تھا، اضافی طاقت کا انجکشن بھی ضائع کیا۔ اس نے لائن آف کر کے دوبارہ آن کی اور شبنم کے نمبروں کے بجائے افضل خان کے نمبر بچ کرنے لگا۔

”بیلو۔۔۔ افضل بول رہا ہوں باس۔۔۔“ دوسری جانب سے افضل خان کی بھی بھی آواز ابھری۔

”شبنم کہاں مری ہوئی ہے۔۔۔؟“ اس نے کراخت لہجے میں سوال کیا۔

”وہ۔۔۔ اسے دو افراد کچن اپارٹمنٹ پر اغوا کر کے لے گئے ہیں کل رات کی بات ہے۔“

”تخت۔۔۔ تم۔۔۔ باسزوف۔“ شیخ حامد کا پارہ ایک دم ہی چڑھ گیا۔ ”تم نے مجھے فوری اطلاع کیوں نہیں دی۔ اب تک کس کا انتظار کر رہے تھے؟“

”میں نے شبنم کو بچانے کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے گریز نہیں کیا تھا لیکن وہ وہ تھے اور۔۔۔“

”کہانیاں مت سناؤ۔۔۔ میرے سوال کا جواب دو۔ تم نے کیا کیا میں اس کی بات نہیں کر رہا۔“

”میں ابھی کچھ دیر قتل ہی ہوش میں آیا ہوں۔“ اس بار مختصر جواب دیا گیا۔

”وہ کون ہو سکتے ہیں۔۔۔؟“

”میں نے انہیں پہلی ہی بار دیکھا تھا۔ وہ ظاہر وہ پردہ نشین نہیں لگتے تھے۔“

”تم نے پولیس کو اطلاع دینے کی حثیت تو نہیں کی؟“

”آپ کی اجازت کے بغیر میں نے کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔“

”اچھا کیا۔۔۔“ شیخ حامد نے غل کھاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر بڑے سر دہلچے میں غم دیا۔

”بھری بات غور سے سنو۔ تم اپنا سامان لپیٹ کر جتنی جلدی ممکن ہو اس اپارٹمنٹ کو چھوڑ کر کسی ہوٹل میں شفٹ ہو جاؤ۔ کوئی سراغ چھوڑنے کی حثیت نہ کرنا اور۔۔۔ شبنم کے سلسلے میں اپنی زبان پر تالے

ال لو۔ کسی سے کچھ کہنے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔“

”راشتہ باس۔۔۔“

”اپارٹمنٹ دس پندرہ منٹ کے اندر اندر چھوڑ دو۔۔۔ چونکہ ار کا منہ بھی اپنے سلسلے میں بند کرنا گھبراہٹ ہی ڈے داری ہوگی۔ کوئی غلطی کی تو اس کی سزا ابھی جانتے ہو۔ کہیں شفٹ ہونے کے بعد

موبائل بند کر کے شیخ حامد ہونٹ چپانے لگا۔ شاید اس وقت کو بھی پر حملہ کرنے والے بھی وہی

لوگ ہوں گے جنہوں نے شبیم کو اغوا کیا ہوگا۔ ایک کامیابی حاصل کرنے کے بعد ان کی موت ہی نے انہیں درغلا یا ہوگا۔ اس نے راکل پر اپنی گرفت جما کر دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن پے درپے ہونے والے تین دھاوکوں نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ وہ سیرکیوں سے لٹکھڑاتا ہوا پیچھے فرش پر آگیا۔ تینوں دھماکے کے تین حصوں میں کے گئے تھے۔ گیٹ کی طرف بھی فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا لیکن پھر اس کی جیڑی میں بدترجی آگئی، شاید کوئی ایک پارٹی پسپا ہو کر میدان چھوڑ رہی تھی۔ فتح حامد لباس مہاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جنونی کیفیت سے دوچار تھا لیکن اس کیفیت کے باوجود بی اگال کچھ کر کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ وہ چلا یا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا۔ اس بار اس نے براہ راست مرکزی حکومت میں اسے تنگ حلالوں کو فون کرنے کی فضا دی تھی لیکن پھر پولیس کی سائزن بھائی گاڑیوں کی آواز سن کر رک گیا۔ فائرنگ بھی ختم ہو رہی تھی۔ وہ چلا تا ہوا دروازے کے قریب آگیا۔ گیٹ کا ایک سٹچ چوکیدار دوڑتا ہوا سامنے آگیا۔

”صاحب۔ پولیس کی گاڑیاں آگئی ہیں۔“

”جا کر دیکھو کون ہے۔“ اس نے کرحش لہجے میں حکم دیا۔ ”لائٹ جلا دو اور۔۔۔ کوئی ڈسے دارا فیر ہو تو اسے اندر آنے دینا، چھوٹا سونا آدی ہو تو باہر ہی سے دھکا کر دینا۔“

چوکیدار اگلے قدموں واپس چلا گیا۔ ہٹکے کی روشنیاں دوبارہ آن ہو گئیں۔ فتح حامد ہونٹ چپاتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ صفے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پانچ سات منٹ بعد ڈی آئی جی کے کمر خیز علاقے کے انسپکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان کے کچھ کہنے سے چیئر ہی وہ غیر ارادی طور پر راکل ہاتھ میں لیے کھڑا ہو گیا۔ انتہائی عداوت سے علاقے کے انسپکٹر کی طرف خنخوران نظروں سے گھورتے ہوئے غرایا۔

”اب تک تم اور تمہارے عملے کے لوگ کہاں مرے ہوئے تھے؟“

”کام ڈاؤن سر۔۔۔“ ڈی آئی جی نے آگے بڑھ کر فتح حامد کو بھاننے کی کوشش کی۔ ”علاقے کی پولیس غافل نہیں تھی لیکن ابھی وقت میں پولیس کی نظری ہر مکان پر۔“

”یو۔۔۔ گیٹ لاسٹ! فتح حامد نے انسپکٹر کو تھکانا، اعتماد میں سماں طلب کیا۔ ”وہ ڈی آئی جی کا اشارہ یا کر ہونٹ کا قاتلانے قدموں ہاں رکھ لیا تو اس نے آقا منظور کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”تم شاید بھول گئے کہ تمہاری ترقی میں بھی میرا ہاتھ تھا۔“

”میں نے بھی اس سے انکار بھی نہیں کیا لیکن۔۔۔“

”عملہ کرنے والے کون تھے؟“ فتح حامد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”قائد انسپکٹر اور اس کے عملے نے کیا تیر مارا؟“

”ہم نے چار آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ ان کی زبان کھولنے کی خاطر کوئی دقیقہ فرزداشت نہیں کریں گے۔“ آقا منظور نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے ہدایت کر دی ہے کہ آئندہ سے مادہ لباس والوں کا ایک دستہ باقاعدہ ہٹکے کے ارد گرد نظر رکھے۔“

”ہٹکے میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے اسے چھپیں گئے کے اندر اندر ہٹک کرانا بھی تمہاری اے داری ہوگی۔“

”سب کچھ آپ کے حسبِ مفاہوا جائے گا۔“ ڈی آئی جی نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک گزارش میں بھی کروں گا جتنوں کی موجودگی میں اگر آپ۔۔۔“

”پھر کسی وقت تمہاری درخواست پر غور کروں گا۔“ اس نے بدستور پھرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ پھر ہونٹ چپاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا وہ نیا ایس پی کہاں مرا ہوا ہے۔ کیا اسے جھٹکی اطلاع نہیں ملی یا۔۔۔“

”وہ بھی آن ڈیوٹی ہے۔ جو افرادر گرفتار ہوئے ہیں انہیں اسی نے گھیرا تھا۔“

”کس پارٹی کے لوگ ہیں۔؟“

”ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ ظاہر صورت شکل سے جرائم پیشہ نظر آتے ہیں۔“ فتح حامد جواب دینے کے لیے پرتول رہا تھا کہ جب اس کے دوسرے موبائل پر کال رسیو ہوئی۔ اسکرین پر روشن ہونے والا نمبر نیا تھا پھر بھی اس نے موبائل آن کر لیا۔ خشک اور کرحش لہجے میں سوال کیا۔

”کون ہے۔۔۔؟“

”آج جو کچھ ہوا اسے پہلی اور آخری وارنگ سمجھو۔“ دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔ ”ہم چاہتے تو براہ راست تمہاری خواب گاہ کو بھی ٹارگٹ بنا کر جھیں روٹ کر دیتے لیکن ہم جیو اور دوسرے کو بچنے دو کے اصول کے متکل ہیں تم سے بھی آئندہ ایسی توقع ہے۔“

”لو کی کس جرم میں اغوا کیا گیا ہے؟ کیا اسے بھی تم مراد ہی گی کا نام دو گے؟“ فتح حامد نے اسے کرپنے کی خاطر سوال کیا۔

”کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟ ہم تمہاری طرح لڑکیوں پر رال چکانے کے عادی نہیں ہیں۔“

”بگاہہ کرنے کا مقصد کیا تھا؟“

”صرف تمہیں یہ یاد کرنا چاہتے ہیں کہ تم ہی حرف آخز نہیں۔“ انتہائی سٹاک لہجے میں جواب ملا۔ ”ہم بھی اینٹ کا جواب پھر سے دے سکتے ہیں۔ پہلا ثبوت آج تمہیں مل چکا ہے۔“

”اسے اپنے باپ کا نام بھی بتا دو جس کی ناجائز اولاد وہوئے کے سبب تم اپنی اوقات بھول رہے ہو۔۔۔؟“ فتح حامد کا پارہ ایک دم ہی چڑھ گیا۔

”انتظار کرو۔۔۔ اس کا جواب بھی تمہیں بہت جلد مل جائے گا۔“ دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ فتح حامد مل کھا کر رہ گیا۔

”کون تھا جانتا۔۔۔“ آقا منظور نے دلی زبان میں پوچھا۔

”فضول ہے۔۔۔“ اس نے ڈی آئی جی کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”جو سم استعمال کی گئی ہے وہ ان رجسٹرڈ ہی ہوگی۔“

گ۔ آپ کے کارندوں سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی البتہ..... ہو سکتا ہے کہ انہیں دس بارہ گھنٹے تک روکا جائے..... کچھ خانہ پر ہی تو کرنی ہوگی۔“

ڈی آئی جی کے جانے کے بعد اس نے سب سے پہلے کول کوفون کر کے مختصر صورت حال سے آگاہ کیا پھر نمبر نو سے رابطہ قائم کر کے آئندہ کیلئے اپنی رہائش گاہ کی حفاظت کی خاطر ضروری دماغیں دینے لگا۔ یہ بھی کہا کہ وہ خاص طور پر رستم علی کو بھی چیک کرے، کہیں اس کے پشت پر اس کا ہاتھ تو نہیں۔



”کیا، کیوں کر رہا تھا؟“

”بھئی کہ وہ پولیس کی کلا کر دی کو آئندہ بھی ضرور آزماے گا۔“ فتح حامد نے تھلا کر جواب دیا پھر اس نے شبنم کے انخوا کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”کل رات کسی نے اسے بھی اسی اپارٹمنٹ سے انخوا کر لیا ہے جو پہلے افضل خان کی تھائی کا سبب بن چکا تھا۔ میں نے باقاعدہ رپورٹ درج نہیں کرائی لیکن..... اسے باز یاب کرانے کی ڈسے داری بھی نہیں سونپ رہا ہوں۔“

”آپ کا شہر کس پر ہے۔؟“

”احقانہ سوال ہے.....“ اس نے فطرت کا اظہار کیا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا تو اب تک میرے کارندے انخوا کرنے والوں کو موت کی نیند سلا کر اسے باز یاب کر چکے ہوتے۔ تم بھی رازداری سے کام لیتا۔ میں اسے پندرہ نہیں کروں گا کہ اخبارات کو میرے کاروبار پر ہنسنے کا کوئی موقع ملے۔ شبنم میری خاص ددگر کسی اس کا خیال رہے۔“

”وہ اس سنے اپارٹمنٹ میں کب شفٹ ہوئی تھی؟“ ڈی آئی جی نے دریافت کیا۔

”دو روز پہلے کی بات ہے۔“

”ویری سیٹ۔“ آغا شکور نے کسمار کر ایک خیال کا اظہار کیا۔ ”انخوا کرنے والے کیا اس بات کے انتظار میں تھے کہ اس کو شفٹ کرنے کے بعد ہی انخوا کیا جائے..... میرا مطلب ہے کہ وہ اسے.....“

”یہ معلوم کرنا بھی پولیس کا کام ہے۔“

”اوہ کے سر..... میں اس معاملے کو بھی دیکھتا ہوں۔“

ایک بار پھر کتول کی کال مخصوص موبائل پر موصول ہوئی۔ فتح حامد نے اس بار بھی اسے انیٹر کرنے کے بجائے لائن کاٹ دی۔ دس سیٹ بعد دوبارہ موبائل ٹکٹنا تو اس نے جھلا کر روشن اسکرین کی طرف دیکھا لیکن نمبر نو کی کال دیکھ کر اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”کوئی خاص بات.....؟“

”باس..... پولیس نے جن چار افراد کو حراست میں لیا ہے ان میں تین اپنے آدمی بھی شامل ہیں۔“

فتح حامد نے موبائل آف کر کے ایک لمبے کو کچھ سوچا پھر ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔

”تمہارے ایس بی نے جو تیرہ ماہے ہیں اس کی رپورٹ بھی مجھے مل گئی ہے۔“

”مم..... میں سمجھا نہیں؟“

”جن چار آدمیوں کو اس نے حراست میں لیا ہے اس میں تین میرے آدمی تھے جو جھکے کی حفاظت پر تہنیتات تھے۔“

”اوہ.....“ ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں یہاں سے سیدھا پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ آپ اپنے کسی آدمی کو بھیج دیں۔ میں صرف پورے آئی کی زبان بھلوانے کی ہدایت کر دوں

اے اگلی جانتا ہوں کبھی کبھی پرانی واقعت بھی کام آجاتی ہے۔
 ”کیا وہ تمہارے کہنے سے آئندہ مال وقت پر سہلائی کر دے گا۔“
 ”کوشش کرنے میں کیا حرج ہے صاحب۔“

”تم یہ بات براہ راست عثمان سے بھی دریافت کر سکتے تھے؟“ سراج نے کہا۔ ”اس میں شک کی کیا بات تھی۔“

”میں نے مناسب نہیں سمجھا صاحب۔۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے بھرمٹ کی۔ ”آپ کسی طرح اس پارٹی کا نام معلوم کر دیں لیکن میرا نام نہیں۔ یہ میری درخواست ہے۔“
 سراج کے جواب دینے سے خوشتری الماس آگئی۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے سراج کو اپنے پروگرام سے باخبر کرنے کے بعد لیاقت حسین سے بھی سراج کا خیال رکھنے کی تاکید کی پھر جانے کے ارادے سے چلی گئی جب اسے دوبارہ رونا پڑا۔

”بیکم صاحب۔ آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔“ لیاقت حسین نے خلاف توقع بڑی تنجیدی سے کہا۔ ”ایک دو چیزیں مجھے بھی خرید کر فرمیں کہ کھجواںی ہیں۔“
 ”فیک ہے۔۔۔۔۔۔“ سراج نے کہا پھر بے تعلقی سے بولا۔ ”ایک شرط پر تمہیں جانے کی اجازت دے سکتا ہوں کہ تم الماس کے کسی حکم سے انکار نہیں کرو گے۔“
 ”میں ایسی جرات بھی نہیں کر سکتا صاحب۔“

سراج کو جواب دینے کے بعد لیاقت حسین بھی الماس کے ساتھ باہر آ گیا۔ الماس نے اپنے ڈرائیور کو کمر پر رہنے کی ہدایت کر دی۔ اسٹیشنر لیاقت حسین نے سنبھال لیا۔ الماس کی ہدایت پر لیاقت حسین نے گاڑی شہر سے دور واقع ایک بڑے شاہک مرکز کے گیٹ پر روکی۔ الماس کے اترنے کے بعد وہ گاڑی کو پارکنگ میں لے گیا۔ الماس نے کہا تھا کہ وہ شاہک سے فارغ ہو کر اسے فون پر مطلع کر دے گی۔ اس نے لیاقت حسین سے راستے میں پوچھا بھی تھا کہ اسے فرمیں کے لیے کیا چیزیں لینی ہیں۔ جواب میں لیاقت حسین نے کہا تھا کہ وہ واپسی میں صدر کے علاقے سے لے گا۔

الماس گاڑی سے اتر کر چلی گئی۔ اندر جا کر اس نے لفٹ کے ذریعے دوسری منزل کا رخ اختیار کیا جہاں میٹریشا تنوک کے دماؤں فروخت ہوتی تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک وہ مطلوبہ اشیاء خرید خرید کر ٹرائی میں رکھتی رہی پھر لفٹ کی طرف جانے لگی تو شاہک مرکز کے پوٹیار میں لمبوں جو ان کے قریب آ کر اسے اپنی خدمت پیش کی۔ الماس نے سامان سے بھری ٹرائی اس کے حوالے کر کے سکون کا سانس لیا لیکن ایک کم معروف کمیشن کے راستے میں پہنچ کر اس کا سکون برقرار نہ رہ سکا۔

”میدم۔۔۔۔۔۔“ پوٹیار میں لمبوں جو ان کے اسے سرسراستے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”ہمارے آس پاس تین آدمی اور بھی موجود ہیں۔ آپ چاہیں تو اطمینان کر لیں لیکن۔۔۔۔۔۔ اگر آپ نے شور

لیاقت حسین اس وقت سراج کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ فرمیں کے جانے کے بعد اسے کسی بات کی فکر نہیں تھی، اس نے خاص طور پر الماس سے درخواست کی تھی کہ اسے سراج کی خدمت کا پورا پورا موقع دیا جائے چنانچہ جب الماس دوپہر کام میں مصروف ہوئی تو لیاقت حسین سراج کے آس پاس ہی منتظر رہتا تھا۔ اس وقت بھی سراج کے بے حد سجدہ کرنے کے بعد ہی اس نے کرسی پر بیٹھنا مناسب سمجھا تھا۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے صاحب؟“ حسب معمول اس نے سراج سے پہلا سوال یہی کیا۔

”خدا کے کرم سے بالکل ٹھیک ہوں، بس دو روز اور مسہری توڑنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوں گا۔“
 ”اتنی جلدی کیا ہے صاحب۔۔۔۔۔۔ دینا کے وعدے تو چلتے رہتے ہیں۔“
 ”فرمیں کا کوئی فون آیا۔۔۔۔۔۔؟“ سراج نے موضوع بدل کر دریافت کیا۔
 ”وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے ساتھ جانا چاہئے تھا۔ بھلی بات بھی تم ناں گئے تھے۔“
 ”آپ کو اس حال میں چھوڑ کر چلے جانا میرے بس میں نہیں تھا۔“ لیاقت حسین نے بڑی عقیدت سے کہا پھر نیکی سے اسے ایک بھولی بات یاد آگئی۔ اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر پہلو بدل کر بولا۔ ”صاحب، آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، لیکن اس شرط پر کہ آپ میری بات کا بھرم رکھ لیں گے۔“

”سب خیریت تو ہے؟“ سراج نے اسے ٹوٹتی نظروں سے دیکھا۔
 ”ہمارے صاحب نے داخل کا کارڈ بار بھی شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ضروری بات معلوم کرنی ہے۔“ لیاقت حسین نے بڑی خوبصورتی سے بات سمجھا پھر اکر کی۔ ”ایک روز میں نے صاحب کو فون پر کسی سے بات کرتے سنا لیا تھا۔“ اس نے نئی نئی تفصیل دہرا کر کہا۔ ”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ وہ پارٹی کون ہے جس نے وقت پر صاحب کو مال سہلائی نہیں کیا تھا۔“
 ”تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟“

”صاحب کے پانچ لاکھ کا معاملہ ہے۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا۔ ”میں بھی اسی علاقے کا ہوں، دو چار کاروباری لوگوں کو بھی جانتا ہوں، ہو سکتا ہے کہ جس نے مال سہلائی کرنے میں دیر کی ہو

”معاذ اللہ! طریقہ اختیار کرنے کا دور گزر چکا ہے میڈم۔“ ٹرائی چلانے والے نے سادگی سے کہا۔ ”آپ کے گھر سے نکلنے کے بعد ہمارے آدمی آپ کی نگرانی کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں، پھر بھی، اگر آپ کا خواب سچا ہوتا تو ہم بھی اس کا بندوبست کر چکے ہیں۔“

تہیں کرتے ہوئے وہ لفٹ تک آگئے۔ الماس کے ستارے شاید گردش ہی میں تھے کہ لفٹ میں اس کے ٹرائی والے اور اس کے تین سادہ لباس والوں کے ساتھ صرف دو خواتین اور ایک بچی سوار ہوا تھا، ان سے کچھ مدد کرنے کی درخواست ان کے حق میں بھی جان لیا ہو سکتی تھی۔ نیچے چلنے کے ٹرائی والے نے وہ راستہ اختیار کیا جس کو صرف یونیفارم والے ملازم ہی کسی مخصوص کسٹر کے ساتھ اٹھارہ کر سکتے تھے، باقی تین سادہ لباس والے بھی زیادہ قائل نہ رہیں تھے۔

دو پہر کا وقت ہونے کے سبب باہر زیادہ روشنی نہیں تھا۔ لیاقت حسین کی موجودگی بھی صرف اسی صورت میں ممکن تھی جب الماس نے اسے اپنی داہنی کی اطلاع دی ہوئی۔

شاہجک مرکز سے ان کے باہر نکلنے ہی ایک سیاہ رنگ کی پک اپ ان کے قریب آ کر رکی۔

”آپ کی سواری حاضر ہے میڈم۔“ ٹرائی والے نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”آپ تشریف رکھیں۔ ہم ٹرائی کا سامان اتارتے ہیں۔“

الماس نے حیرت بھری نظروں سے دیکھا، سیاہ پک اپ کو دیکھ کر اب اسے اپنا انجام بھی تاریک ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا کہ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ ایک تھک تھک کرنے کے بعد اس نے پہلا قدم اٹھایا یہی تھا کہ قریب موجود تین سادہ لباس والوں میں سے ایک کہتا ہوا گھر۔ اس کی بائیں کتلی سے خون کا فوارا ابل رہا تھا، دوسرے ساتھیوں کے چہرے بھی ایک اور کسی بے آواز اسطے سے چلائی جانے والی گولی کا شکار ہو کر اندر سے منہ زہر ہو گیا۔ جو سطر باہر موجود تھے، ان کو وہ آدمیوں کے مرنے کا احساس ہوا تو ان کے درمیان جھگڑا مچ گئی ٹرائی والا ایک کہ الماس کے قریب آیا۔ الماس کا ہاتھ تھام کر اس نے پک اپ کی جانب جانے کی کوشش کی لیکن وہ بھی ڈکرا تا ہوا موت کے منہ میں چلا گیا۔ گولی اس کی گردن کو چھانڑی ہوئی گزر گئی تھی، تیسرے سادہ لباس والے نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے گرتے ہی سیاہ پک اپ حرکت میں آ کر تیزی سے موقع واردات سے فرار ہو گئی، الماس مسم کھڑی جھڑپ کا پتہ ہی تھا جب شاہجک مرکز کے ڈیوٹی گارڈز کے علاوہ پولیس کی ایک موبائل بھی سائرن بجاتی سامنے آ گئی۔ شاید کسی نے اس موبائل کو خطرے کی اطلاع دی تھی۔

الماس نے سکون کا سانس لیا لیکن اسی وقت دو مسلح ڈیوٹی گارڈز لیاقت حسین کو تشدد کا نشانہ بناتے کھینٹ کر پولیس کی طرف لے آئے۔ اسے پولیس کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

”یہ ہے وہ..... جو بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگ رہا تھا.....“ پولیس والوں نے سب سے پہلے لیاقت کو کھینٹ کر موبائل میں ڈالا، اس کے ہتھولہ کو قبضے میں لیا پھر الماس سے بولے۔

چھانے کی کوشش کی تو پھر ہم آپ کو آخرت کے سفر پر روانہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ بھی نہیں محسوس کریں گے..... خیریت اسی میں ہے کہ آپ خاموشی سے ہمارے کہنے پر قدم اٹھاتی رہیں۔“

الماس نے تیزی سے نظریں گھما کر دیکھا، یونیفارم والے نے غلط فہم کیا تھا، تین افراد جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹھوڑے ٹھوڑے قائلے پر اس پاس موجود تھے جو اسے گھور رہے تھے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی الماس کے جسم میں ایک سرد لرزہ دوڑ گئی۔ وہ ایک پولیس آفیسر کی بیوی تھی اس لیے یہ بھی جانتی تھی کہ شور مچانے کی صورت میں اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہو چکی تھی۔ اسے اس بات کا انشویں بھی ہوا کہ لفٹ کی طرف جانے سے جیستہ اس نے لیاقت حسین کو فون بھی نہیں کیا تھا شاید اس لیے کہ اسے نیچے چلنے کی کڑی سیکورٹی کی دوچار چیزیں اور بھی مل سکتی تھیں۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ الماس نے پوچھنا ہی محسوس کرتے ہوئے ذہن زانی میں پوچھا۔

”ایک ہی درخواست ہے کہ آپ کوئی ہوشیاری دکھانے کی حاجت نہ کریں ورنہ اس بارے میں اوپر سے خطرے کی صورت میں وسیع اختیارات دے دیے گئے ہیں، ہم اس پر عمل کرنے میں دیر بھی نہیں کریں گے۔“

”کوئی اور صورت ممکن نہیں ہے؟“

”فقط انمازے نہ قائم کریں۔“ خشک لہجے میں جواب دیا گیا۔ ”ہم بکاؤ بال نہیں ہیں۔“

”مجھے مارنے کی صورت میں تم لوگ بھی نہیں بچ سکو گے.....“ الماس نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔

”معلوم ہے..... یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت کچھ نا معلوم لوگ ہماری نقل و حرکت کی بھی نگرانی پر مامور ہیں، دوسروں نے چھوڑ دیا تو وہ ہمیں زیادہ اذیت ناگ انجام سے دوچار کر دیں گے اس لیے کسی نا قابل برداشت چارچہ سے بچنے کی خاطر ہم بھی آسان موت کو ترجیح دیتا پسند کریں گے۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟“ الماس نے ایک اور فرمپ کا ڈاؤ استعمال کرنے کی کوشش کی۔

”ڈی ایس بی مسزمر راج کی بیگم۔“ ساٹ اور بے پروا انماز میں جواب دیا گیا۔

”یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ایک بار خطرے سے دوچار ہونے کے بعد میں نے احتیاطی تدابیر نہ اختیار کی ہوں گی۔“

”میں سمجھا نہیں.....“

”جس گاڑی میں آئی ہوں اس کے ساتھ ایک دوسری کار بھی میری حفاظت کیلئے موجود تھی۔“

الماس نے قدرے دنگ لہجے میں کہا۔ ”نیچے چلنے کر کیا صورت پیش آئے گی۔ اس کا انمازہ ابھی سے نکالو۔“

نہیں ہوں۔ تمہارے پاس دو راستے ہیں، یا تو شرافت سے کل کے میرے سوال کے جواب دو۔
 تعاون کی صورت میں تمہارے ساتھ نرم سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ کسی کی پشت پناہی کے گمخاند میں رہے
 تو دردناک موت تمہارا مقدر بھی بن سکتی ہے۔ فی الحال کسی کے پاس کوئی دستاویزی ثبوت بھی نہیں
 ہے کہ تمہیں حراست میں لیا گیا تھا۔ اس لیے کسی خوش فہمی کا فکار نہ ہونا۔ تمہیں پوچھنے والوں کو تمہاری
 قبر کا نشان بھی نہیں ملے گا۔ میں مردوں کی طرح محلِ کرم سے دھوک بات کروں گا۔ تمہاری عافیت
 بھی اسی میں ہے کہ کسی آقا کا پی سے کام نہ لیتا، تعاون کرنے کی صورت میں، میں تمہارے کسی کام
 آنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ یہ کسی پولیس آفیسر کا نہیں، ایک مرد کا وعدہ ہے۔“

وہ چاروں اس کی بات توجہ سے سنتے رہے، انہوں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا، بظاہر وہ
 ہراساں یا خوفزدہ بھی نظر نہیں آ رہے تھے اس لیے کہ وہ اس قسم کی باتیں سننے کے عادی ہو چکے
 تھے۔ اورنگ زیب ان کو ٹوٹنے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے بے حد سردہری سے انہیں
 مخاطب کیا۔

”تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”مجھے سوچ رہے ہیں کہ کیا جواب دیں۔“ ایک دراز قد والے نے شانے اچکا کر کہا۔ ”ہمیں
 کس جرم میں مہال لایا گیا ہے ہم یہ بھی نہیں جانتے۔“
 ”تمہارے قبضے سے جو بغیر لائسنس کا اسلحہ ملے اس کے لیے کیا کوہمے؟“
 ”آپ کس اسلحہ کی بات کر رہے ہیں؟“ دوسرے نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”ہم اس وقت آپ
 کے قبضے میں ہیں، آپ جو چاہیں الزام ہمارے سر قیوب دیں لیکن عدالت میں ہمارا بیان یہی ہوگا
 کہ۔“

”شف اپ۔۔۔“ اورنگ زیب نے گرج کر جواب دیا۔ ”ہرانے اور مجھے بے جھکندوں کو
 بھول جاؤ۔ شرافت کی زبان نہیں سونو گے تمہارا عدالت تک جانے کا خواب بھی تمہارے ساتھ ہی
 دفن ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے جناب۔۔۔“ تیسرے نے بھی اپنے دو ساتھیوں کی طرح بے جگری سے کہا۔
 ”پھر۔۔۔ آپ بولتے رہیں، ہم سنتے رہیں گے۔“

”کیا تمہارا بھی یہی جواب ہے؟“ اورنگ زیب نے جو تھے کو سفاک نظروں سے گھورا۔
 ”میں تسلیم کرتا ہوں سر کہ میں نے گولیاں چلائی تھیں لیکن کسی کو مارنا نہیں، صرف خوفزدہ کرنا
 مقصود تھا۔“

اس کے جواب پر اورنگ زیب کے علاوہ باقی تین بھی چکے تھے۔ چوتھے آدمی کو ان تینوں
 نے بڑی حقارت سے گھورا تھا۔ اورنگ زیب کو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ
 چوتھا شخص جو درمیانہ قد اور دہرے جسم کا مالک تھا اس کا تعلق باقی تینوں میں سے نہیں تھا۔
 ”تم نے کس کو خوفزدہ کرنے کی خاطر گولیاں چلائی تھیں؟“

”آپ کو ہمارے ساتھ ملحقہ قتلے تک چلنا ہوگا۔“
 الماس نے ایک لمبے کے لیے سوچا کہ وہ اپنا تعینل تعارف کرا دے لیکن اس نے مجمع میں
 اپنی تشہیر مناسب نہیں سمجھی، خاموشی سے قدم اٹھائی انکی نشست پر موبائل کے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ
 گئی۔ لیاقت حسین نے بھی گرفتاری کے بعد کوئی احتجاج نہیں کیا تھا، اس کو قافلو کرنے والوں نے اس کا
 لباس چھانڈا تھا، جو درگت بنائی تھی وہ بھی قافلہ رخصتی میں گراں سے بھی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالا
 تھا۔

موبائل کے حرکت میں آتے ہی الماس کا ذہن بھی تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس کے دماغ
 میں کئی پراسرار سوالات ابھر رہے تھے۔ لیاقت حسین کو اس کے اغوا کیے جانے کی اطلاع کس طرح
 ہوئی۔۔۔۔۔ اس نے اچانک ان چاروں اغوا کرنے والوں کو موت کے گھاٹ کیوں اتار دیا؟ ایک بھی
 زندہ باقی نہ رہا تو پولیس اس کو زبان کھولنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ پشت پر کام کرنے والا ہاتھ بھی بے
 نقاب ہو جاتا۔ کیا لیاقت حسین اتنا ہی دیوانہ ہو گیا تھا کہ اس نے اس اہم کھیلے پر بھی غور نہیں کیا۔
 پہلی بار بھی الماس کو اغوا کرنے والوں سے بچانے میں لیاقت حسین کا ہاتھ تھا۔ اس بار بھی یہی کام
 آیا۔ اس نے عین وقت پر الماس کے ساتھ جا کر فریضین کیلئے سامان خریدنے والی بات کیوں کی
 تھی؟ کیا اسے پہلے سے علم تھا کہ کیا جوشین پیش آسکتی ہے؟ اگر ایسا تھا تو اس نے غل ازل وقت اس
 خدشے کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ ایسی کیا مصلحت تھی جس نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کروا دیا تھا۔
 اسے بھی الماس کے اغوا کیے جانے کا علم بعد میں ہی اور ڈر پیلے سے ہوا۔ وہ ڈر پیلے کیا تھا۔۔۔۔۔“

مخصوص مارچر سیل کے ساؤنڈ پروف کرے میں وہ تمام خطرناک اور ضروری سامان موجود تھا
 جو کسی مجرم کی زبان کھولنے کے لیے بہت موثر ہو سکتا تھا۔

کمرے میں ابس بی اورنگ زیب اور دو دیگر اہلکاروں کے علاوہ چاروں مجرم بھی تھے۔
 جنہیں شیخ حامد کے پھیلے کے باہر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ چاروں جھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے
 ہوئے تھے، دوسرے کار کے اہلکار بھی ان کی پشت پر موجود تھے جو اسٹارن ڈیوٹی کے احکامات پر آنکھ بند
 کر کے عمل کرنے کے عادی تھے، مڑبان کی چیخ و پکار اور دم توڑتی سکیوں پر بھی وہ ہمیشہ گونگے اور
 بہرے خاموش کھڑے رہتے تھے، وہ موت اور زندگی کے اس ہولناک کھیل کو دیکھتے دیکھتے اس کے
 عادی ہو چکے تھے۔

اورنگ زیب کی خوفناک نظر میں ان چاروں کو باری باری دیکھ رہی تھیں جو بظاہر بے پروا نظر آ
 رہے تھے۔ دس منٹ تک ان کے درمیان ایک خاموش اور اصرار جگ جگ جاری رہی پھر اورنگ
 زیب نے ان چاروں کو ایک وقت انتہائی سفاک لکھ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اس حقیقت
 سے ضرور واقف ہو گے کہ تمہیں کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے اور۔۔۔ اس مہمان خانے میں کس مقصد
 کے تحت لایا گیا ہے؟ ایک بات اور بھی کان کھول کر سنو۔ میں کسی کے رعب میں آنے والا آفیسر

”اسی فرد کو جس نے سب کا بیٹا حرام کر دیا ہے۔“ اس بار بھی تلخ لہجے میں جواب دیا گیا۔ اس نے کسی کا نام نہیں لیا لیکن اورنگ زیب کبھی کیا کہ فرد کے حوالے سے اس کا اشارہ شیخ حامد ہی کی طرف تھا۔ ساتھ کمرے ہوئے باقی تینوں بہ دستور سے نفرت سے دیکھ رہے تھے۔

”تمہارا تعلق کس گروپ سے ہے؟“ اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ اس بار انداز جا رہا نہ تھیں تھا۔

چوتھے فرد نے باقی تینوں کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ اورنگ زیب نے ایک لمبے کوچہ سوچا پھر اس نے ایک اہلکار کو اشارہ کیا کہ چوتھے شخص کو سائیلڈ روم میں منتقل کر دیا جائے۔ اورنگ زیب کے حکم کی تعمیل کرنے کے بعد وہ دوبارہ واپس آ گیا۔

”اب تم تینوں کیا کرو گے؟“

”ہم نے ان حرا میوں کو مارنے کی کوشش کی تھی جو پٹیل کے ارادے سے آئے تھے۔“ تینوں میں سے ایک نے تلخ انداز میں کہا۔

”کس کے پٹیل کی بات کر رہے ہو؟“

”یہ تم بھی جانتے ہو..... پھر ہم سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“ دوسرے ساتھی نے چمک کر کہا۔

”تمہاری زبان پر اس کا نام مرتے دم تک نہیں آئے گا تم بھی اپنے دل کی حسرت ادا کر دو کیونکہ تم سے پہلے جو افسران جہاں خوف کو سامنے آئے تھے۔ ایک تجربے کے بعد وہ بھی پٹیل کی بنی ہوئی گتے تھے۔“

”گٹ.....“ اورنگ زیب نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ مجھے اب تمہارا جواب پسند آیا۔ تمہارے مشورے کے مطابق ایک تجربے میں بھی ضرور کروں گا۔ پٹیل کی کون جتا ہے اور شیر کون؟ اس کا اندازہ تمہیں بھی ہو جائے گا اور تمہیں پٹیل لگانے والے کو بھی۔“

پھر اورنگ زیب کے حکم پر ان تینوں کو کچا کر کے چمپ سے لٹتی زنجیروں میں باندھ کر اٹا لٹکا دیا گیا۔ خود وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بڑے سکون سے بولا۔ جب انتہیاں باہر آئے لگیں تو جتا دینا۔ رعایت کی گنجائش تمہاری زبان کوٹنے سے مشروط ہوگی۔“

”پھر سوچ لو آفیسر.....“ ایک نے زلزلہ کر کہا۔ ”تمہیں یہ کارروائی بہت مہنگی پڑے گی۔“

اورنگ زیب نے اس کے جواب میں سادہ لباس اہلکاروں کو دوسرا حکم دیا جس کے بعد ان کے سروں کے نیچے ٹیکس کے برز آن کر دیئے گئے۔ ”ہم نے زبان کھول دی جب ہی تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے ہم جس کیلئے کام کرتے ہیں۔ دوسرے نے جواب دیا۔

”پریشان مت ہو.....“ اورنگ زیب نے اپنی دہی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”پھر پندرہ منٹ بعد آگ کی لوینز اور تمہاری زنجیریں نیچے ہوتی رہیں گی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تم فر پوئے لگے گے۔“

تینوں نے زبانیں بند رکھیں۔ مگر رتے وقت کے ساتھ ان کے فضا میں معلق جسموں اور بھڑکی

آگ کی لپٹوں کا فاصلہ کم ہوتا رہا، تین منٹ بعد ان کے چہرے سرخ ہونے لگے، انہوں نے اپنا منہ بند کر رکھا تھا لیکن حالت بدتر جھیر ہوئی جا رہی تھی پھر پندرہ منٹ بعد ایک چپخنے لگا۔ ”بگ باس کو خبر ہو گئی تو تمہارا احرام ہم سے بھی بیک ہوگا۔ ابھی بگ وقت ہے تمہارے پاس۔“

”پر امت کرو میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔

پندرہ منٹ اور گزر گئے تو تینوں ہی کی حالت غیر ہونے لگی، ان کے مدد شدت تکلیف سے کھل گئے، کھایا پیا ہوا پیرا نے لگا تو ایک نے سچ کر کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”مجھے پٹیل کی بلیاں یاد آ رہی ہیں..... تم بھی آج اپنے آدم خورد کو کھاؤ۔“

”ہم سر جائیں گے لیکن زبان نہیں کھولیں گے۔“ دوسرا سچے ہونے بولا۔

”تم مرد کے سچے ہوتو اپنے باتو تلوں سے کھو کہ میں گولیاں مار دوں۔“ تیسرا بلبلا نے لگا۔

اورنگ زیب نے زبان نہیں کھولی، بھڑکی آگ اور تین لگے ہوئے مجرموں کے درمیان کھٹکٹ جا رہی تھی ڈی آئی کی سرے میں داخل ہوا، اس نے تینوں مجرموں پر ایک اپنی ہوئی نظر ڈالی پھر سادہ لباس والوں کو مل روکنے کا اشارہ کر کے اورنگ زیب کو لے کر باہر چلا گیا۔

”چھٹا مجرم کہاں ہے؟“ اس نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

”اس نے زبان کھول دی ہے۔ میں اس کا بیان بعد میں لوں گا۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ تینوں حرام زادے جو فضا میں بھل رہے ہیں..... شیخ حامد کے ذاتی چہرے دار ہیں جو حکمر کی حفاظت پر مامور تھے، میں اس کے ایک آدمی کو ساتھ لایا ہوں، وہ ان کی شناخت کر لے گا۔“ ڈی آئی جی ہونٹ چپاتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہ سب پولیس کی واہنڈ لسٹ پر بھی ہیں لیکن.....“

”آپ انہیں چھوڑنا چاہتے ہیں؟“ ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم کسی ایک کو یہ ظاہر نہ ہوگا کہ وہ ابھی تک اس پاسٹر کے لیے کام کرنے پر مجبور ہے۔ اس طرح ہم اندک بائیں بھی معلوم کر سکیں گے۔ پٹیل، مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں نے آپ لوگوں سے جو وعدہ کیا ہے اس پر بھی قائم رہنے کو تیار ہوں لیکن یہ بھی نہ بھولیں کہ میری اور سراج کی پہنچ وہاں تک نہیں ہے جہاں تک اس کی اور آپ کی ہے..... اب فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے، میں آپ پر ان تینوں کو چھوڑنے کی خاطر زور نہیں دوں گا۔“

اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کے اعزاز مخاطب کو اپنے تجربوں کی روشنی میں ٹولا۔ وہ ہر تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں تھا لیکن یہ بھی سوچ با تھا کہ آغا منصور کو ہٹا کر ڈی آئی جی مرکز سے تبدیل ہو کر آ گیا تو اسے ایک وقت میں کئی محاذ پر زور آزمائی کرنی پڑے گی۔ سراج کے ساتھ بھی ایسی ہی کوئی صورت پیش آنے کے بعد وہ بالکل تمہارہ جاتا۔ کچھ دیر غور و خوض کرنے کے بعد اس نے

ڈی آئی جی سے کہا۔

”آپ جانتے ہیں تو ان تینوں کو چھوڑ دیں، میں چوتھے مجرم کو لے کر جا رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لیے کارآمد ہوں۔“

ڈی آئی جی نے سکون کا سانس لے کر اس کی تجویز منظور کر لی۔ اورنگ زیب نے دوبارہ تاجرہ روم میں قدم نہیں رکھا۔ چوتھے مجرم کو دوسری جانب سے بلا کر اپنی گاڑی میں بٹھا کر قحانے کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر اس کا ڈرائی گاڑ ساہ لہاس میں موجود تھا۔

”تم کس کے آدمی ہو؟“ دس منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے چوتھے مجرم سے سوال کیا جو..... اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔

”آپ نے جگہ کا نام ضرور سنا ہوگا۔“

”آئی۔سی“ اورنگ زیب جگہ کا نام سن کر چونکا پھر اس نے دوبارہ خشک لہجے میں سوال کیا۔

”کیا تمہیں صرف فتح حامد کو ہراساں کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا؟“

”آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے صاحب۔“ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”میرے ساتھ کچھ دوسرے ساتھی بھی تھے جو پولیس کے آنے سے پہلے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے میں بھانگا تو شاید وہ تین، جو آپ کے قبضے میں ہیں مجھے زندہ نہ جانے دیے۔“

”کیا تم ان کو جانتے ہو.....؟“

”ایک سے بڑی خونی واقعہ ہوں جو تینوں میں سب سے اہم ہے، اسے تین افراد کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا لیکن فتح حامد کے خاص آدمیوں نے اسے دودھ کی کھمی کی طرح قانون کے قلعوں سے صاف بچا لیا۔ اصل واردات کی فائلیں بھی غائب کر دی گئیں۔“ اس نے کچھ توقف سے پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ”فتح حامد نے ایسے قاتلوں اور دہشت گردوں کی ٹیم بنا رکھی ہے، کچھ اور لوگ بھی میری نظر میں ہیں۔“

”جگہ کہاں ہے؟ میں نے سنا ہے کہ وہ کبھی کسی وجہ سے روپوش ہے۔“

”آپ نے غلط فہمیاں سنا صاحب۔ وہ روپوش نہیں ہے لیکن قتل و غارت گری کے خلاف ہے اس لیے سانسے نہیں آ رہا۔ جس دن آگیا تو فتح حامد کو بھی دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔“

اورنگ زیب بہت دیر تک اس سے بڑی کارآمد باتیں معلوم کرتا رہا پھر بولا۔

”تمہارا نام کیا ہے.....؟“

”کبھی اکرم تھا صاحب لیکن اب وہی متحضر کے نام سے مشہور ہوں۔“ اکرم نے لمبی سانس لے کر جواب دیا۔ ”مجھے بھی قانون کی نظر میں مشغور سمجھا جا رہا ہے جو گاڑوں سے بھاگ کر ادھر شہر میں آ گیا۔ جگہ نہ تھانہ نہ دی ہوئی تو شاید قاتلوں سے تنگ آ کر مجرم بھی بن جاتا۔“

”کیا جرم تمہارے نام پر لگا تھا؟“

”گناہوں میں میری ایک پڑوس کی جوان لڑکی کا چکر تھا صاحب جسے زمیندار کے آدمی اغوا کر

کے لے گئے تھے، میرا نام بلا دیکھو یاد کیا میں صاف انکار ہو گیا تھا، جب اغوا میں ملوث نہیں تھا تو پھر دہری نہیں تھا لیکن..... آٹھ دس روز بعد اس لڑکی کی ادھری ہوئی اور روندی گئی لاش میرے گھر کے قریب کھیتوں میں ملی تو میں گرفتاری کے ڈر سے فرار ہو گیا۔“

”تمہارے گھر والوں کا کیا بنا ہوگا؟ اورنگ زیب نے اسے ٹھونکنے کی کوشش کی۔

”گھر میں میرا رونے والا کوئی تھا صاحب، ماں کے مرنے کے بعد باپ نے دوسری شادی کر لی تھی، وہ بھی مجھے اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ اس لیے کہ وہ خود بھی اچھی نہیں تھی۔ زمیندار کے لوگوں سے بھی اس نے جھگڑا کر رکھا تھا۔ اسی کے اشارے پر پڑوس کی لڑکی کو بھی اغوا کیا گیا تھا، میں فرار نہ ہوتا تو وہ میرا نام لینے سے دریغ نہ کرتی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا جگہ کے ہراساں کرنے کے بعد فتح حامد اس کا پچھا چھوڑ دے گا؟“

”کتنے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی جناب۔“ اکرم نے کسمپور کہا۔ ”یہی بات میں نے اور دوسرے ساتھیوں سے بھی استاذ کی کھوپڑی میں بھنائے کی کوشش کی تھی ایک بار تخت یا تختہ والا کھیل کر لیں۔ جو جیتے وہی سکندر۔ لیکن استاد نے ہار ہی بات نہیں مانی۔“

”مہرتم لوگوں نے بلاوہ خود کو خطرے میں ڈالنے کی غلطی کیوں کی؟“ اس بار اورنگ زیب نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”میں آپ سے جھوٹ نہیں بیوں گا صاحب۔“ اکرم نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”کچ کیا ہے یہ اوپر ہی والے کو معلوم ہو گا لیکن میرا خیال ہے کہ استاد نے یہ ہراساں کرنے والا قدم کی اور کے شعور پر اٹھایا ہے۔“

”اور کون سے تمہاری کیا مراد ہے.....؟“

”مجھے اس کا نام نہیں معلوم جناب لیکن سنا ہے وہ کوئی بیوہ عورت ہے۔ وہ بھی فتح حامد سے کوئی پرانا حساب پکڑنا چاہتی ہے۔ استاد کے آدمی اس عورت کیلئے بھی کام کرتے رہتے ہیں۔“

اورنگ زیب بیوہ عورت کے حوالے پر چونکا لیکن اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اکرم سے پوچھا۔

”اب تم کیا چاہتے ہو؟ قانون نے بہر حال جنہیں غیر قانونی حرکت میں ملوث پا کر گرفتار کیا ہے۔“

”آپ کے دم و کمر پر ہوں صاحب..... چاہیں تو اندر کر دیں یا چھوڑ دیں۔ میں جہر پھر بھی نہیں کروں گا۔“

اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا لیکن کچھ دیر بعد اس نے گاڑی ایک سنسان راستے کے درمیان روک دی، اکرم سے اترے کو کہا تو وہ بچے اترے کے بعد ہاتھ باندھ کر بولا۔

”صاحب..... اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرا سواہل نمبر نوٹ کر لیں، کبھی ضرورت پڑے تو یاد کر لیجئے گا۔ میں آپ کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔“

اورنگ زیب نے اسے بہت غور سے دیکھا پھر ڈینس بورڈ پر پڑے بیڑ کو اٹھا کر دی پتھر کا موہاں نمبر لوٹ کر لیا۔

”میں آپ کا احسان بھی نہیں بھولوں گا صاحب۔“ اس نے اورنگ زیب سے کہا۔ ”کم از کم ایک بار اس خادم کو خدمت کا موقع ضرور دیجئے گا۔“

”تم نے کہا تھا کہ تم ان تینوں میں سے ایک کو جانتے ہو، جو سب سے اہم ہے؟“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا صاحب۔ اسی واقعیت کی وجہ سے اس نے مجھے جہنم رسید نہیں کیا۔

اب بھی یہی فرصت میں وہ مجھے تلاش کر کے استاد کی پہنچے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ اورنگ زیب نے سر دلچسپہ میں جواب دیا۔ ”تم ان تینوں کے

پتے لگانے کا کونج لگا کر مجھے بتاؤ گے اس کے بعد باقی کام میرے ذمے ہو گا۔“

”آپ کا موہاں نمبر.....“

”میں خود تم سے ایک دو روز میں رابطہ قائم کروں گا۔“ اورنگ زیب نے سپاٹ آواز میں کہا

پھر جواب کا انتظار کیے بغیر تھریکریک کرنا شروع کر دیا۔

شبنم کا ذہن اس وقت بھی ان لوگوں کے بارے میں الجھ رہا تھا جنہوں نے اسے افوا کیا تھا۔ اڑتا کیس کھٹے گزر جانے کے باوجود ابھی تک اسے وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی اسے تنگ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی نگرانی کرنے والے خاموشی سے اسے کھانا اور ناشتہ دیتے پھر خاموشی ہی سے برتن اٹھا کر داہن چلی جاتے تھے۔ کنول کی تصویر شناخت کرانے کے بعد اس سے کسی قسم کی باز پرس بھی دوبارہ نہیں کی گئی تھی۔ سب سے زیادہ فکر اسے موہاں کی تھی جسے متنبش کرنے والے کے بیان کے مطابق کسی خفیہ ڈپارٹمنٹ کے ذریعے جلادیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ جب باس کو اعزازہ ہو چکا تھا کہ وہ غلط باتوں میں پھنس چکی ہے۔

وہ غلط ہاتھ کس کے تھے؟ یہ سوال اسے ذہنی طور پر اس وقت بھی الجھا رہا تھا۔ افضل خان کو ایک جرم کی یادداشت میں جو طویل سزا جھگڑتی پڑی تھی وہ بھی اس کے علم میں تھی، اس حقیقت کا بھی اسے علم تھا کہ میڈم کو افوا کرنے کی پلاننگ میں افضل خان نے کوئی بھول نہیں رہے دیا تھا لیکن پولیس کی ریڈ کے بعد ای کو قربانی کا بکرا نہیں بننا پڑا تھا۔ جب باس اپنا دامن بچانے کی خاطر کسی بھی کارندے کو قربان گاہ پر چڑھانے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ تو کیا وہ بھی کسی ایسی ہی پھونک کا شکار ہو گئی تھی؟

کنول کے بارے میں کیے جانے والے سوالات کی روشنی میں ابھی تک وہ بھی نتیجہ اخذ کر سکی تھی کہ جب باس شاید ابھی تک اس کے ملازمت چھوڑ دینے کی غلطی کو ملنے کے نتیجے میں اتار رکھا تھا۔ ممکن ہے وہ اس غلطی دینے کے بعد کسی ملازمت کے تحت کہیں روپوش ہو گئی ہو اور جب باس کو اس بات کا شبہ ہو کر بحیثیت خاتون درکر ہونے کے شہیم بھی کسی طرح کنول کے استعفیٰ کے راز سے واقف ہو گئی۔

یہ خیال وقت کے ساتھ ساتھ شہیم کے ذہن میں جڑ جکڑا جا رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور افوا کرنے والے کوئی اور ہوتے تو اس کے ساتھ اس قدر شرافت کا سلوک بھی نہ کرتے۔ اس کا ذہن ہمہ وقت اس خیال کے تانے بانے سلجھانے میں الجھا رہتا۔ اب بھی وہ ان ہی زاویوں پر غور کر رہی تھی جب دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پہلے ایک شخص اس کے لیے کھانے کی فرسے لیے امداد آیا اس کے بعد حسب معمول ایک گمنام بھی سامنے آ گیا وہ خاموشی سے دونوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا، کھانے کی فرسے میز پر رکھنے والا ڈیوٹی انجام دینے کے بعد چپ چاپ داہن لوٹ گیا، اس کے ساتھ ہی گمنام بھی جانے کے ارادے سے گھوما تھا جب شبنم نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے پلٹ کر شہیم کو خشک نظروں سے دیکھا۔

طرب ابھی تک صرف ہوسکتے پھر سے ہیں۔
 "کیا تمہارا تعلق کسی سرکاری ایجنسی سے ہے؟"
 "مطلب کی بات کرو۔ تم نے کیوں اور کیا کہنے کے لیے ہمیں پیغام بھیجا تھا؟"
 "کیا تم ہی حرف آخر ہو؟" شبنم نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بات جاری رکھی۔
 "تمہاری طرح میں بھی محتاط رہنا پسند کروں گی۔"
 "میں سمجھا نہیں۔"
 "تم سے بڑا کوئی آدمی، جس کا چہرہ میرے لیے ابھی بھی نہ ہو۔ اس کے سامنے آنے کے بعد
 ہی میں کوئی آخری فیصلہ کر سکتی ہوں۔"
 "اگر ہم تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیں تو.....؟"
 "پھر شاید میری موت کے بعد فرشتے ہی میری زبان کھلوا سکیں گے۔" وہ شانے اچکا کر

بولی۔

"غلط گمان سے تمہارا....." اس کو مخاطب کرنے والے نے بل کھا کر کہا۔ "اوپر سے صرف
 ایک اشارے کی دیر ہے، اس کے بعد میں بھی زبان کھلوں گے کے ہزاروں نئے معلوم ہیں۔"
 "یہ تمہاری ذاتی سوچ ہے۔" شبنم نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔
 "اور کچھ کتنا چاہو گی؟"
 "کہنے کے لیے بہت کچھ ہے میرے پاس لیکن اس کی ایک ہی شرط ہے..... کوئی ایسا شخص
 جس کو میں جانتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری یہ بات اور تیک پہنچا دیں گے لیکن ایک بات ابھی سے سن لو۔"
 جواب میں بے حد تنبیہ سے کہا گیا۔ "اس کے سامنے آنے کے بعد بھی تم نے زبان نہ کھولی تو پھر
 تمہارے پاس زندگی کی بیکمانگت کا بھی کوئی جواز باقی نہیں بچے گا۔"
 "مجھے منظور ہے....." شبنم نے غصے سے جواب دیا تو آنے والا اسے ٹوٹتی نظروں سے
 دیکھنے کے بعد اگلے قدموں واپس چلا گیا۔

شبنم کا ذہن پھر مختلف سوالات کے جواب تلاش کرنے لگا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر آئندہ
 آنے والا ایجنسی کا کوئی قائل اعتماد آدمی ثابت ہوا تو وہ زبان کھولے میں دیر نہیں کرے گی۔ وہ جس
 چوبیس من میٹھی، اس میں اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اعصاب کو پرسکون رکھنے کی خاطر اس
 نے اٹھ کر مختصر کمرے میں چل قدمی شروع کر دی۔ بار بار اس کے ذہن میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب
 اسے اغوا کرنے والوں نے بڑی جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن انہوں نے صرف اسے کیوں
 اغوا کیا؟ افضل خان کو کس لیے چھوڑ دیا گیا؟ کیا انہیں افضل خان سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا یا.....
 اسے بعد میں موت کے کھاتے اتار دیا گیا تھا؟ غاصی دیر تک مختلف دوسرے اس کے ذہن میں
 ابھرتے ڈوبتے رہے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی توقع کے خلاف ہی تھا۔ اسی وجہ سے اس نے محتاط

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے؟" شبنم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔
 "سوری میڈم! مجھے آپ کے ساتھ کسی قسم کے سوالات جوابات کی اجازت نہیں ہے۔" اس
 نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔
 "مجھے یہاں لانے والے کون لوگ ہیں؟" اس نے گن مین کو گھورا۔
 "وی..... جنہوں نے مجھے آپ کی گمرانی پر متعین کیا ہے۔"
 "وہ کب آئیں گے؟"
 "ان کی مرضی پر منحصر ہے۔" اس بار بھی سپاٹ لیجے میں جواب ملا۔ "میں ملازم ہوں، صرف
 اپنی ڈیوٹی کا پابند ہوں۔"
 "کیا تم میرا کوئی پیغام بھی ان کو نہیں پہنچا سکتے؟"
 "پیغام کیا ہے.....؟"

"میں ان سے ملتا جا رہی ہوں۔ تمہارے لیے ایک ملازم کی حیثیت سے اتنا ہی جانتا جا رہی
 ہے۔" شبنم نے تھلا کر کہا۔ "ان کی کوئی کال آنے تو میرا پیغام ضرور دے دیتا۔"
 گن مین نے اسے تیز نظروں سے دیکھا پھر مدھمکھیر کر باہر چلا گیا۔ شبنم اس کے جانے کے
 بعد کھانے میں مشغول ہوئی۔ خود کو زندہ رکھنے کی خاطر کھانے کو زہر مار کر اس کی مجبوری بھی تھی۔
 کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کی خاطر بستر پر دراز ہوئی۔ اس کی سوچوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا
 پھر ذہنی ورزش کرتے کرتے اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔ دوبارہ وہ اس کی آنکھ کی آہٹ پر ہی مٹی گئی۔ وہ
 بڑبڑا کر بھی تو ہی شخص اس کے سامنے موجود تھا جس نے اس سے کوئی کی تصویر شناخت کرائی تھی۔
 شبنم اپنے بے ترتیب لباس کو خشک کرتی ہوئی ابھی، دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالنے کے بعد اسے
 اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا اس وقت شام کے سائے چارہ گھل چکا۔ اس نے آنے والے کو بہت
 غور سے دیکھا پھر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ گنگو کا آغاز کرنے سے خوش یہ معلوم کرنا ضروری تھا
 کہ اس کا تعلق کسی پارٹی سے ہے۔

"تمہارا پیغام مجھے ملا تھا۔" آنے والے نے دو چار منٹ کی خاموشی سے بعد سپاٹ لیجے میں
 گنگو کی ابتدا کی۔ "کیا تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف پیش آ رہی ہے؟"
 "مجھے کتنے دنوں تک یہاں رکنا مقصود ہے؟"

"اس کا آسان جواب میں نے پہلی ملاقات میں دے دیا تھا۔" اس نے بہ دستور مد لہجے میں
 کہا۔ "ہماری طرف سے کوئی رعایت تمہاری زبان کھولنے سے مشروط ہے۔ ہمیں کوئی جلدی بھی نہیں
 ہے۔ ہم اطمینان سے کوئی آخری فیصلہ کر سکتی ہو۔"
 "تک پاس کو اگر اطلاع ہو گئی تو تمہارا انجام بھی تمہاری توقع کے خلاف ہو گا۔"
 "ہم بھی اسی خراب انجام کے انتظار میں ہیں۔" بے پروائی سے جواب ملا۔ "وہی اسے
 اطلاع ہو گئی ہے لیکن..... تم کہاں ہو؟ کسی سال میں ہو؟ یہ جاننے کے لیے اس کے کھوجی کتے ہر

”ہم ابھی تک تم نے کسی کو سیدھے منہ جواب نہیں دیا؟“

”یہ اس لیے ہے کہ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔“

”پھر یہ بھی ضرور جانتی ہوگی کہ گھبراہٹ بگ باس اور اس کے حکام کی کتنی رات بیری موت کے اظہار میں کھات لگائے بیٹھے ہیں۔“

”اس کا علم نہ ہوتا تو شاید میں زبان کو ملنے پر آمادگی کا اقرار بھی نہ کرتی۔“

”بیٹھو۔“ جواب میں اورنگ زیب نے کمرے میں رنگی واحد کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ شبنم ایک لمبے کونچکائی پھر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تمہاری اطلاع کیلئے بتا دوں کہ ابھی میں تمہارے بگ باس کے علاقے سے ہی واپس آ رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے اسے مختصر اعلان آوروں اور شیخ حامد کے حلقے سے دے کر افراد کے درمیان ہونے والی فائرنگ اور چاروں قیدیوں کی گرفتاری اور رہائی کے بارے میں بتایا پھر کچھ توقف سے دریافت کیا۔ ”تم اس بارے میں کیا کہو گی؟“

”میں بھی جن حالات سے گزر رہی ہیں تک پہنچی ہوں اس کا ہر لمحہ ایک جواہری تھا۔“ شبنم نے سرد آہ بھر کر بڑے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ ”جوئے میں بار اور جیت دونوں کا فتنی فتنی جاس ہوتا ہے۔ رستہ تو لیتا پڑتا ہے لیکن یہ بھی بے باکی سے بتا دوں کہ آپ کا ڈی آئی جی بگ باس کے ہاتھوں لکا ہوا ہے۔“

”کیا تم جانتی ہو کہ افضل خان کس قماش کا آدمی ہے اور اس کا ماضی کیا تھا؟“ اورنگ زیب نے ڈی آئی جی والی بات کو نظر انداز کر کے سوال کیا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔“

”پھر تم اپنا نقلیہ چھوڑ کر اس کے اپارٹمنٹ میں کیوں شفٹ ہوئی تھیں؟“

”اسے بھی میری زندگی کا ایک جواہر سمجھ لیں۔ دیکھیں اس میں بگ باس کے حکم کا دخل بھی تھا، میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔“

”کنول میری معلومات کے مطابق تم سے زیادہ خوبصورت اور حسین تھی، پھر وہ استغنیٰ دے کر کس طرح آزاد ہو گئی؟“ اورنگ زیب نے چپے ہوئے اعزاز میں سوال کیا۔ اس کی نظریں شبنم کا ایک سر رے کرنے میں مصروف تھیں۔

”شاید اس لیے کہ کنول کی کوئی کمزوری باس کے ہاتھ نہیں آسکتی تھی۔“ وہ روانی میں کہہ گئی۔ غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب اورنگ زیب نے سرسراہٹ لہجے میں کہا تھا۔

”آئی سی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری کوئی کمزوری ایسا ہے جو تمہیں بگ باس کے ہر حکم پر عمل کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔“

”ایسا ہی سمجھ لیں۔“ شبنم نے تھکا ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس نے میری لاطمی میں کچھ مواد درج کر دیا ہے لیکن میرا کردار اب بھی بے داغ ہے۔“

روٹی کے تھاقوں کے چیش نظر کسی واقعہ کار کے سامنے زبان کو ملنے کے تھاقوں کے چیش نظر کسی واقعہ کار کے سامنے زبان کو ملنے کی شرط عائد کی تھی۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ اس وقت وہ کس کی دھڑکن میں تھی؟ تقریباً نصف شب گزرنے کے بعد جب نیند کا غبار اس کے چہرے کو پھیل کر ہاتھ اس وقت دروازے کے کھلنے کی ہوائیں آواز دے اس کے ڈوبنے ذہن کو بیدار کر دیا۔ وہ لباس درست کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی پھر دروازہ کھلنے کے بعد جو فرد اندر داخل ہوا اس کو ایک نظر دیکھتے ہی اس کے پورے جسم میں سنسنی ہی دوڑ گئی۔

آنے والا ایسی ہی اورنگ زیب کے سوا کوئی اور نہیں تھا جس کے بارے میں وہ بہت کچھ سن چکی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ بگ باس بھی اس کے تھاقوں کی کوشش میں کام ہو چکا تھا۔ وہ غار اور بے خوف افسر تھا، نہ ہوتا تو بگ باس کے سامنے وہ بھی دوسرے افسروں کی طرح سر ہنڈ کر سکتے ہیں دیر نہ کرتا۔

شبنم دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی تھی۔ اورنگ زیب کی آنکھوں کی سرخی اس بات کی گواہی دے کر تھی نظر آ رہی تھی کہ اس وقت وہ اچھے موڈ میں نہیں ہے۔ ایک لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”مجھے بیکار تم نے اپنی مشکلات میں کی ہیں۔۔۔۔۔ اور اضافہ کر لیا ہے۔“ اورنگ زیب نے غصے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”یہ آپ کا خیال ہے آفسیر، میرا نہیں۔“ شبنم نے بڑے سلیجے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”شاید آپ کے سامنے آ جانے سے میری بہت ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔“

”کس لیے یاد کیا تھا؟“

”مجھے اس طرح یہاں لانے کا کیا مقصد تھا؟“

”تمہارے ہاں کو صرف اتنا یقین دلانا کہ تمہیں کسی ایجنسی کی نہیں بلکہ اس کے کسی کی چوٹ کھائے ہوئے دشمنوں نے اغوا کیا ہے۔“

”کیا اسے اس کا یقین آ سکتا ہوگا؟“

”نہ آیا ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میرے زبان کھول دینے کے بعد قانون میری ہر طرح مخالفت کرے گا؟“ شبنم نے اس بار سلیجے ہوئے اعزاز میں سوال کیا۔ اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کچھ دیر وہ شبنم کو اپنے تجزیوں اور مشاہدوں کی کسوٹی پر توڑ رہا پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔

”پہلے تمہیں ہمارے سوالوں کا جواب دینا ہوگا۔۔۔۔۔ تیار ہو؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں کم از کم آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”گڈ۔۔۔۔۔ ویسے بائی دی وے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھے پر اندھا اعتماد کیوں کر رہی ہو؟“

”تم نے افضل خان کو دوست بنا کر جو پروگرام مرتب کرنے کی کوشش کی تھی کیا اس کی خبر اسے بھی تھی؟“

”آپ نے جو تنبیہ اذ کیا ہے وہ آپ کی ذہانت کی دلیل ہے۔“ شبنم نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نے جو کچھ سوچا تھا ابھی تک اس کا علم کی اور کوئیں ہے۔ البتہ ایک ہستی ہے جس کو ہمیں نے اشارہ یہ عندیہ ضرور دیا تھا کہ میرے لیے دلدل سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ بغاوت۔“

”وہ ہستی کس کی ہے؟“

”سوری۔۔۔ میں اس کا نام ہی اہمال نہیں لے سکتی ورنہ اس کے لیے بھی بہت ساری مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔“ شبنم نے دلی زبان میں کہا۔

اورنگ زیب نے کچھ دیر خاموشی گزار کر شبنم کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر کچھ سوچ کر اس نے جیب سے موبائل نکال کر کسی کے نمبر پر کیے ساتھ ہی لائن نکلتی ہوئے پراپتیکر بھی آن کر دیا۔

”ہیلو۔۔۔ دوسری طرف سے ایک ذہنی آواز ابھری شبنم اسے سن کر چڑھ گئی۔“

”میں ایس بی اورنگ زیب بول رہا ہوں۔ کیا میڈم روٹی سے بات کر سکتا ہوں؟“

”بول رہی ہوں۔۔۔ دوسری جانب سے حیرت کا اظہار کیا گیا، اس وقت آپ نے کیسے کال کیا؟ سراج صاحب کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”مجھے اس وقت آپ سے ایک دوسرے موضوع پر کچھ اہم بات کرنی ہے۔“

”فرمائیے۔۔۔“

”کیا آپ شبنم نامی کسی خاتون سے واقف ہیں؟“ اورنگ زیب نے شبنم کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”اچھی طرح جانتی ہوں لیکن میری معلومات کے مطابق کسی وجہ سے اسے ابھی انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا ہے۔“ دوسری طرف سے ہمتی خیر انداز میں جواب ملا۔ ”بظاہر اس کے اغوا کا ذرا با ضرورت سنج کیا گیا ہے لیکن اسی طرح افضل خان کے ساتھ بھی ایک لمبا مکمل کیلا گیا تھا، مسٹر سراج کو بھی اس کی تفصیل معلوم ہے۔“

”اگر اغوا کی کارروائی ڈرامائی تھی تو افضل خان کو کیوں زخمی حالت میں چھوڑ دیا گیا؟“

”ممکن ہے اس میں بھی کوئی مصلحت ہو دیے آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ افضل خان اب اس اپارٹمنٹ میں نہیں ہے۔ اپنا سامان سمیٹ کر وہ فوری طور پر اپارٹمنٹ سے شفٹ ہو کر کہیں اور چلا گیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ پانچ گھنٹے سے نہ ہوتا تو پھر آپ اس کے صرف زخمی ہونے اور ہوش میں آنے کے فوراً بعد اپارٹمنٹ سے شفٹ ہو جانے کو کس خانے میں فٹ کریں گے؟“

”آپ نے جوئی معلومات فراہم کی ہیں اس کیلئے شکر گزار ہوں لیکن اس وقت میں آپ کو کسی اور مقدمہ سے زحمت دی ہے۔“

”اگر میں آپ کے کسی کام آسکی تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”کیا شبنم پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟“ اورنگ زیب نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بے حد اہمیت سے دریافت کیا۔

”پہلا مرحلو تو اسے تلاش کرنا یا یا یا ذیاب کرنا ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔۔۔ میں نے صرف اعتبار کرنے کے سلسلے میں آپ کی اہلی رائے معلوم کی تھی۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس پس منظر میں یہ سوال کر رہے ہیں۔ بہر حال، میں اتنا جانتی ہوں کہ اگر آپ کا قانون اس کے ساتھ رعایت کرنے کے علاوہ اس کی ہد کرے تو وہ بے حد کارآمد ثابت ہو سکتی ہے، بشرطیکہ آپ اسے زعمہ یا ذیاب کر سکیں۔“

”شکریہ۔۔۔ اورنگ زیب نے مختصر جواب دینے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا پھر شبنم کو مخاطب کر کے قدرے نرم لہجہ میں کہا۔ ”میڈم نے آپ کو ہمارے تعاون کا شوق قرار دیا ہے۔“

”کیا اب بھی میں اپنے آپ کو قیدی ہی سمجھوں؟“ شبنم نے سکون کا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، آپ کی حیثیت اب بدل گئی ہے لیکن میں فیصلے کا اختیار بھی آپ کو ہی دے رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”آپ اگر چاہیں تو جس طرح سے ہم آپ کو لائے ہیں اسی طرح خوبصورتی سے فرار ہونے کا موقع بھی فراہم کر سکتے ہیں، ہم سے دوستی نہائی آپ کو مشکل میں بھی ڈال سکتی ہے اس لیے کہ میں نے اب اس پار یا اس پار کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”میں آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے کو ترجیح دوں گی۔“ شبنم نے اورنگ زیب کو یقین دلایا۔

”فرار کا ذرا آپ کے ہم باں کو بھرم نہیں ہوگا۔“

”کسی آخری نتیجے پر پہنچنے میں جلدی نہ کریں۔ اطمینان سے سوچیں کچھ کر فیصلہ کریں۔ میں مکمل کسی وقت دوبارہ آؤں گا پھر آپ سے اطمینان سے تفصیلی بات ہوگی۔“ اورنگ زیب نے دوستانہ انداز میں کہا پھر اگلے قدموں واپس جانے لگا تو شبنم نے اسے روک کر کہا۔

”کیا آپ میرے لیے کسی موبائل کا بندوبست کر سکتے ہیں جس کی کم ان رجسٹرڈ ہو۔“

”مکمل مع آپ کی یہ فرمائش پوری ہو جائے گی لیکن۔۔۔ میڈم کو جو غلط فہمی ہے اسے دور کرنے کی غلطی نہ کیجئے گا، اس وقت میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔“

”میں اس کی اہمیت کو سمجھتی ہوں۔“ شبنم نے اقرار کیا پھر اورنگ زیب کے جانے کے بعد اس نے سکون کا لمبا سانس لیا۔ اب وہ اس مختصر سے کمرے کو اپنے لیے سب سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ سمجھ رہی تھی۔

پولیس موبائل کی پہنچی نشست پر لیاقت حسین کو تین مسلح سپاہیوں نے دبوچ رکھا تھا جبکہ چھاپا جو تین فیٹوں والا حوالدار تھا اس نے چار افراد کے قاتل کو حراست میں لینے کے بعد موٹوں کو تالاؤ دینا شروع کر دیا تھا۔ دین کے چلتے ہی اس کی زبان بھی مشغلتا اگلنے لگی، وہ گالیاں بکتے بکتے کبھی ٹھوکر دیا اور کبھی راکٹ کے بٹ سے بھی لیاقت حسین کو مارنے میں مشغول تھا، باقی تین سپاہی بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہاتھ چلانے لگتے لیکن لیاقت حسین نے کوئی احتجاج نہیں کیا، البتہ ایک بار اس نے جی کڑا کر کے یہ ضرور پوچھا تھا۔

”تم لوگوں نے مجھے کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟ کہاں لے جا رہے ہو؟“

”یہ تو عادی قاتل دکھائی دیتا ہے استاد“ ایک سپاہی نے لیاقت حسین کو نفرت سے ٹھوکر مارتے ہوئے حوالدار سے کہا۔ ”حزای جرم کی نوعیت پوچھ رہا ہے۔“

”ہم تمہیں تمہاری بہادری کا انعام دینے کیلئے ساتھ لائے ہیں۔“ حوالدار نے لیاقت حسین کو ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے راکٹ کے بٹ سے راتو رات اس چپ نہ روہا۔

”کیا تم لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ دین میں ایک خاتون بھی موجود ہے۔ تمہانے پیچھے تنک سکون سے نہیں بٹھ سکے؟“

”آپ خاتون ہیں اسی لیے تو ابھی تک آپ کی مائل شروع نہیں کی۔“ حوالدار نے موٹوں پر تالا دیتے ہوئے الماس کو تین نظروں سے دیکھا۔ ”یہ کام تمہارا انچارج ضرور کرے گا تو پھر آپ کو بھی سکون۔“

”شب آپ۔۔۔۔۔“ الماس مضرب نہ کر سکی تو پھر کر بولی۔ ”تمہانے پیچھے کے بعد تم سب کی بیٹیاں بھی ازسرنو ہیں۔ بجز ہرے کاب خاموش رہو۔“

”ہماری بیٹی کے بجائے اپنے لباس کی خیر نمائیں لی۔“ حوالدار نے تلخا کر جواب دیا۔

”ایسی گینڈہ بچکیاں ہم پہلے بھی۔۔۔۔۔“

”منہ بند رکھو نا۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین پھر گیا۔ حوالدار کو تھرا آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب اگر تمہاری گندہ زبان سے ایک لفظ بھی۔۔۔۔۔ بھی مت بول۔“

تینوں سپاہیوں کے علاوہ حوالدار بھی لیاقت حسین پر اچانک تھرن کر نوا، وہ جملہ مکمل کرنے کے بجائے کراہنے لگا۔ الماس خون کا گھونٹ لی کر خاموش رہی۔ دس من بعد موبائل قاتل کے احاطے میں داخل ہو کر وی کی لیاقت حسین کو بدستور ٹھوکر مار کر پیچھے اتار کیا، الماس ہونٹ چباتی بچے اڑتی تو ایک مسلح سپاہی اس کے قریب پہنچ گیا۔ حوالدار اس وقت بھی سید تانے آگے آگے چلے لگا۔ لیاقت حسین کا لباس تقریباً تار تار ہو رہا تھا، اسے دیکے مار مار کر ممرات کے اندر لایا گیا، دو

سپاہیوں نے اسے گولی پر ہاتھ مارے ہوئے تھا انچارج کے کرے میں دھکا دیا، ان کے ساتھ حوالدار بھی تھا لیکن جب الماس نے کرے میں قدم رکھا تو سب ہی ششدر رہ گئے، دو پھولوں والا سب انسپکٹر الماس کو دیکھ کر طرح طرح کی اٹھا جیسے اسے موت کا فرشتہ آ گیا ہو۔

”مم۔۔۔۔۔ میڈم، آپ۔۔۔۔۔؟“ اس نے الماس کو دیکھ کر بھلائے ہوئے کہا۔

الماس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر پرس سے موبائل نکالا پھر اس کے ماسٹر شوہر کے بجائے اورنگ زیب کو فون کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ سب انسپکٹر کے اشارے پر حوالدار اور اس کے تینوں ساتھی خاموشی سے سر جھکا کرے سے باہر نکل گئے۔ لیاقت حسین الماس کے پیچھے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کی حالت غریبی ہو رہی تھی۔ چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں سے خون کی لکیریں بھی نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں۔ سب انسپکٹر دوبارہ سیٹ کے قریب چلا گیا لیکن اس نے پیٹنے کی جرات نہیں کی تھی۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ موبائل پر دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز سنائی دی۔“ ”سراج تو خیریت سے ہے۔“

”میں اس وقت آپ سے اپنی خیریت کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“ الماس نے سنجیدگی اور جھلاہٹ کے ملے جلے انداز میں جواب دیا۔ ”اس وقت گھر سے نہیں۔۔۔۔۔ آپ کے ملائے کے ایک پولیس آفیسر سے بات کر رہی ہوں۔“

”خیریت۔۔۔۔۔؟“

جواب میں الماس نے مختصر الفاظ میں اورنگ زیب کو اپنے انوا کیے جانے اور لیاقت حسین کے ہاتھوں دشمنوں کے موت کے گھاٹ اترنے کی اطلاع دے کر کہا۔ ”آپ کتنی دیر میں آ سکتے ہیں۔“

”زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”میں نے ابھی سراج کو اطلاع نہیں دی۔ آپ بھی آئیں نہ بتائیں ورنہ وہ پریشان ہوں گے۔“ الماس نے تیزی سے کہا پھر دوسری طرف سے جواب سن کر موبائل آف کر کے ہونٹ چبانے لگی۔

”آئی ایم ایکس میٹرکلی سوری میڈم۔“ سب انسپکٹر نے معذرت طلب کرنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ اگر براہ راست بھی قاتل کو اطلاع دے دیتیں تو یہ رخصت نہ ہوتی۔“

الماس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے لیاقت حسین کی لگڑھی جس کے ہاتھوں سے چار آدمی قتل ہو چکے تھے۔ اسی جرم میں اسے زد و کوب بھی کیا گیا تھا۔ اس نے ٹھوکر لیاقت حسین کو دیکھا پھر بڑی اچانکیت سے بولی۔ ”تم پریشان نہ ہو، میں نے اس فی صاحب کو اطلاع کر دی ہے، وہ آکر سب ٹھیک کر دیں گے۔ تم پر کل کا کوئی مقدمہ نہیں بن سکتا اس لیے کہ جولوگ مارے گئے وہ یقیناً اشتہاری مجرم ہی ثابت ہوں گے۔“

”کس کا قتل ہو گیا؟“ لیاقت حسین نے بڑی مصموبیت اور حیرت سے دریافت کیا۔ ”میں تو ابھی تک یہ سوچ رہا ہوں کہ پولیس والے ہمیں کس جرم میں یہاں تک گھسیٹ لائے۔ انہوں نے آپ کی شان میں بھی۔۔۔۔۔“

کے لباس کا بندوبست بھی کریں۔ بی، کوئک۔“

سب انپکٹر نے لیاقت حسین کے ساتھ فوری طور پر وہاں سے ٹل جانے میں ہی خیریت سمجھی تھی۔ اورنگ زیب اس کے جانے کے بعد پھر کچھ لوگوں کو ضروری کال کرنے لگا۔ کچھ عرصے میں وہ اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھا جب تک اسے پولیس کے مختلف درجوں سے باقاعدہ رپورٹ نہیں مل گئی کہ چاروں مردے والے پولیس کو کتنے سال سے مطلوب تھے۔ ان کی فائلیں بھی سرخاؤں سے لکوائی گئیں تھیں۔ ان حقائق کی روشنی میں اس نے اپنی موجودگی میں ضروری دستاویز تیار کرائیں لیکن ان میں لیاقت حسین یا الماس کا ذکر درمیان میں نہیں آنے دیا، فائرنگ کے سلسلے میں اس نے یہی جواز بنایا تھا کہ پولیس نے بوقت موقع واردات پر پہنچ کر پوچھشن کنٹرول کرنے کی کوشش کی تو مطلوبہ مجرموں نے فائرنگوں کا دیوار پولیس کی جوابی فائرنگ کے نتیجے میں چار مجرم کام آگئے، باقی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جن کی سرگرمی سے تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ اس تمام کارروائی سے فارغ ہو کر وہ لیاقت حسین کو ساتھ لے کر سرانج کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب انپکٹر نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ سرانج کی گاڑی کو شاہچنگ سٹیز سے اٹھا کر اس کے مکان پر پہنچا دیا گیا تھا راستے میں اس نے کسی خیال سے لیاقت حسین سے دریافت کیا۔

”تمہارا پتہ تو اس وقت کہاں ہے جو سرانج صاحب نے دیا تھا؟“

”اس وقت بھی میری کرکری ٹیٹ میں موجود ہے صاحب۔“ لیاقت حسین نے سادگی سے جواب دیا۔ ”صبح ناشتے کے بعد سے رات کو سوتے وقت تک ہے میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔“

اورنگ زیب نے ایک لمبے کو سوچا کہ پتہ تو لگوا کر اس کے بیگزین میں موجود گولیاں شمار کر لے لیکن پھر اس نے یہ کام سرانج کے لیے چھوڑ دیا، وہ لیاقت حسین کی یادداشت کو بار بار کرید نہیں جانتا تھا لیکن اسے پولیس کے محلے پر ضرور غصہ آ رہا تھا جنہوں نے لیاقت حسین کو حراست میں لینے کے باوجود اس کی جامد تلاش ضروری نہیں سمجھی تھی۔ اس قسم کی خوش فہمیاں اکثر پولیس والوں کیلئے موت کا سبب بھی ثابت ہوتی تھیں۔



شیخ حامد اس وقت دفتر سے واپسی کے بعد لباس تبدیل کرنے میں مصروف تھا جب موبائل مگنٹانے لگا۔ اس نے ایک اچھٹی ہوئی نظرفون اسکرین پر ڈالی۔ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اس کی طرف توجہ بھی نہ دیتا۔ مگر واپسی کے بعد اہم لوازمات کے ساتھ شام کی چائے لے لیتے ہوئے وہ کسی سے بات کرنے کا عادی نہیں تھا، یہ خاصی پرانی عادت تھی لیکن اس وقت کنول کے نمبر دیکھ کر اس نے فوری طور پر موبائل اٹھا کر آن کر تے ہوئے کان سے لگایا۔

”اس وقت کیسے فون کیا؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کیا اب مجھے بھی بات کرنے کی خاطر آپ سے وقت لینا پڑے گا؟“ کنول نے شکوہ کیا۔

”کیسی بات کر رہی ہو جان سن۔“ شیخ حامد نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دراصل میں نے

”ایسے موقعوں پر پولیس کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے لیکن قسم کی بات کا غم نہ کرو۔“ الماس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے چہرے پر طاری تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ وہ ابھی تک صورت حال کی اصل نوعیت سے بالکل بے خبر رہا تھا۔

دس منٹ بعد اورنگ زیب تقریباً دوڑتا ہوا تھا جس میں داخل ہوا تو پورے محلے میں کھلبلی مچ گئی۔ سب انپکٹر کے کمرے میں پہنچ کر اس نے الماس کے بعد لیاقت حسین کو دیکھا تو اس کی پیشانی پر بے شمار سطوٹیں ابھرنے لگیں۔ اس نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے الماس کو مخاطب کیا۔

”میں آپ کو مگر جانے کا مشورہ دوں گا۔ میرا ڈرائیور آپ کو ڈراپ کر دے گا۔“

”اس کا کیا ہے گا؟“ الماس نے اٹھتے ہوئے انگریزی میں لیاقت حسین کے بارے میں دریافت کیا۔

”یہ میری ذمہ داری ہے آپ مگر پہنچیں، میں اسے اپنے ساتھ لے کر ہی آؤں گا۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”مجھ کی کارروائی ضروری ہے لیکن مجھے مجھے جینیں ہے کہ مرنے والے پولیس کو پہلے سے مطلوب ہوں گے۔“

الماس جانے کے لیے تیار ہوئی تو لیاقت حسین نے اٹھ کر بڑی عاجزی سے کہا۔

”صاحب کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائیے گا۔ وہ بلاوجہ پریشان ہوں گے۔“

”نہیں بتاؤں گی۔“ الماس نے لیاقت حسین کو تسلی دی پھر وہ اورنگ زیب کے ساتھ قدم اٹھاتی باہر آ کر اورنگ زیب کی گاڑی میں بیٹھ گئی روانہ ہونے سے قبل اس نے اورنگ زیب کو بتا دیا کہ اس کی کار شاہچنگ سٹیز پر کھڑی ہوگی۔

”ڈونٹ ڈری۔۔۔ میں اسے ابھی مگ لیتا ہوں۔“

الماس چلی گئی تو اورنگ زیب قدم اٹھاتا اس بج اوکے کمرے میں آ گیا۔ سب انپکٹر ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا، اورنگ زیب نے اسے بیٹھے کا اشارہ کیا پھر فون اٹھا کر کچھ محافطہ محکموں کے لوگوں کو ضروری ہدایات دینے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے لیاقت حسین کی طرف دیکھا جو اس وقت سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔

”تم نے ایک بار پھر جواں مردی کا بیعت دے کر سمرانج کو دشمنوں سے بچالیا۔“

”آپ کن دشمنوں کی بات کر رہے ہیں صاحب۔“ لیاقت حسین نے بہ دستور حیرت سے کہا۔

”میں تو بیگم صاحب کے انتظار میں کھڑا تھا جب پولیس والوں نے نہ جانے کب اور کیوں ہم دونوں کو موبائل مین بیٹھے پر مجبور کر دیا۔ بلاوجہ میری درگت بھی بادی۔۔۔ یہ سب کیوں ہوا صاحب؟“

”بھئی بھئی ہم بھی غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن اب میں آ گیا ہوں تو سب سے باز پرس بھی کر لوں گا۔“ اورنگ زیب نے لیاقت حسین کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر اسے تسلی دی پھر سب انپکٹر کو دیکھ کر خشک لہجے میں بولا۔ ”آپ فوری طور پر اسے ساتھ لے جا کر مرہم پٹی کرائیں اور اس

ابھی تک ناشائیں نہیں کیا۔

”آپ شاید شام کے ناشے کی بات کر رہے ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ تمہاری طرف بھی اس وقت شام ہی ہوگی؟“ اس نے کنول کو پیار سے چھیڑنے کی خاطر سوال کیا۔

”میں وقت کی نہیں ناشے کی بات کر رہی ہوں۔“ کنول نے سر اُدھر کو مہر کو جواب دیا۔ ”میں نے تو صبح سے ناشائیں کیا اور اس وقت تک مجھے نہیں لگاؤں پھر جب تک آپ نہیں آئیں گے۔“

”ایسا مت کرو ڈارلنگ۔“ فتح حامد نے اسے ریشہ حلیٰ ہو جانے والے اعزاز میں منانے کی کوشش کی۔ ”ناشہ پانی سے منہ موڑ لو گی تو وہ خوب صورت اور حسین لکھ رہا ہو جائے گا جس نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا ہے۔“

”خالی خولی باتیں.....“ کھوکھ کیا گیا۔ ”مجھ سے پوچھیں، میرے دل پر کیا ریت رہی ہے۔ آپ دو روز سے غائب ہیں، میں ایک ایک پل کانٹوں پر لوٹ رہی ہوں اور اماں کی باتیں الگ سن رہی ہوں۔“

”کیا مطلب؟.....“ وہ چونکا۔ ”اماں جس قسم کی باتیں کر رہی ہیں؟“

”انہوں نے میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر شادی کی اجازت دیدی تھی لیکن ماں، ماں ہوتی ہے۔“ کنول نے وضاحت کی۔ ”کیا انہیں احساس نہ ہوگا کہ آپ نے دو روز سے پلٹ کر مصورت بھی نہیں دکھائی۔ وعدہ کر کے بھی نہیں آئے۔“

”میں نے سببیں حالات کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ تمہارے بغیر میں بھی بے چین ہوں لیکن کچھ حرا حرا دے بلا وجہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ تم شہنم سے واقف ہو؟“

”ہاں..... صرف نام کی حد تک۔“

”اسے بھی کسی نے اُٹھا کر لیا ہے؟“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“

”تم فکر نہ کرو۔ میرے دشمناری کتے ہرست ان کی یوسٹو پھر رہے ہیں۔ میرے دشمنوں کو چھڑا رکھانے میں وہ بھی نہیں لگائیں گے، تم صرف اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھو میری جان.....“

”آپ خود ب آئیں گے؟“

”آج یا کل کسی وقت بھی ضرور آؤں گا لیکن ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“

”تم اپنی خوراک اور پھل فروٹ سے غنا نہیں ہوگی۔“

کنول سے بات ختم کر کے اس نے لاؤنج میں آکر ناشہ کیا پھر اس نے شام کے اخبارات کی طرف نظر ڈالنے کی کوشش کی تھی جب دوسرے موبائل کی مخصوص آواز ابھری۔ فتح حامد نے پلٹ کر دیکھا، نمبر نو کی کال تھی، اس کے چہرے پر ایک دم ہی رزلے جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔

”جنگ کہاں مرا ہوا ہے کرانے کاٹھ۔ کچھ اچھا چلا اس کا.....“ وہ موبائل آن کرتے ہی گر بنے گا۔

”میرے آدمی اس کی.....“

”بکواس بند کرو۔ صبح تک کوئی سراغ نہ ملے تو خود اپنی خبر بھی نہ دیتا۔ زہر کھا کر قصہ پاک کر لیتا، مجھے سکون کی نہیں، کارآمد لوگوں کی ضرورت ہے۔“

”میں نے زہر پلا کپسول اس وقت بھی پھینکی تھا کہ وہاں پر رکھا ہوا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی بار آپ نے کیا شرط رکھی تھی؟“

”نن ترانیاں نہیں۔ کھل کر بات کرو۔ کیا بکواس کرنا چاہتے ہو؟“

”میرے چار آدمیوں نے آج دوپہر مسز سراج..... الماس بیکم کو ساحلی علاقے کے قریب والے بڑے شاہک مرکز سے اُٹھا کر لیا تھا۔ اسے پلازہ سے باہر بھی لے آئے تھے لیکن وہیں میں بٹھانے سے پیشتر ہی لیاقت حسین نے درمیان میں آکر بازی کا رخ پلٹ دیا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ فتح حامد طلق کے گل چھا۔ ”کیا تمہارے جنگی سوزاں ایک پر قابو نہیں پاسکتے؟“

”مجھ میں نہیں آتا باس۔ وہ انسان نہیں بلکہ کوئی مغریت ہی ہے جو چار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر خود صرف ان لوگوں کے ہاتھوں معمولی زخمی ہوا۔“

”الماس کا کیا پتا.....“

”فائزرنگ کے بعد وہاں جھگڑا بچ گئی تھی، کسی نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی ہوگی، موبائل الماس اور لیاقت حسین کو قحانے لے گئی۔ ہمارے مردہ آدمیوں کو بھی بعد میں اٹھا لیا۔“

”اس وقت وہ کہاں ہے؟“ فتح حامد نے ہاتھ مسلتے ہوئے الماس کے بارے میں سوال کیا۔

”اس کے قحانے پیچھے کے کچھ دیر بعد ایس بی اورنگ زیب میں بھی دھانچہ لگیا تھا۔ اس نے الماس کو اپنی گاڑی میں فوراً ہی گھر روانہ کر دیا پھر کاغذی خانہ پوری کرنے کے بعد وہ لیاقت حسین کو بھی اپنی گاڑی میں بٹھا کر ڈی ایس بی سراج کی رہائش گاہ کی طرف چلا گیا۔“ نمبر نو نے بات مکمل کرنے کے بعد جینجی کے کہا۔ ”مجھے یاد ہے باس..... آپ نے کہا تھا کہ ناکی کی صورت میں آپ کو کھل دکھانے کے بجائے خود ہی سیاہی موم حلیٰ کی طرح زہر پلا کپسول کھا کر اپنا قصہ پاک کر لوں۔“

”ایک منٹ.....“ فتح حامد تیزی سے بولا۔ ”الماس کے فحوا کے سلسلے میں ایس بی کے حکم نے کیا لکھا ہے؟“

”یہ بھی اہم نکتہ ہے باس۔“ نمبر نو نے کہا۔ ”میں نے اطلاع لکھوائی ہے اس کے مطابق الماس لیاقت حسین کا نام کہیں نہیں آیا۔ شاہک مرکز پر ہونے والی فائزرنگ کو کھندہ ڈھکی کارنگ دے کر فٹنا دیا گیا ہے، جس میں پولیس نے اپنی کار کوئی کو ہڑ چاڑھا کر بیان کرنے کے بعد ہمارے چار

کر اپنا رنگ بجانے کی کوشش شروع کی۔“ فتح حامد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی اسی شہر میں کاروبار کرتا ہوں آغا صاحب۔ اس لیے کاروباری سینٹروں کے اتار چڑھاؤ کی خبر رکھتا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی لیکن اب آپ نے کہا ہے تو اس کی تہنیت بھی ضرور کروں گا۔“

”نہ کرو، جب بھی میرا کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس وقت دو باتیں کہنی تھیں..... شبنم کے انخوا کو نظر انداز کرنا اور..... یہ بھی نہ بھولنا کہ میں کاروباری میدان کے ایک ایک چپے کی خبر رکھتا ہوں اور تمہارے ان افسروں کی بھی جو میری خاص سٹ پر موجود ہیں۔ سلسلہ منقطع کرنے کے بعد وہ اظہر کا لادج میں غلطے لگا۔ اس کے ذہن میں ایک وقت کئی مسائل اٹھ رہے تھے۔ شبنم کی بازیابی میں تاکا، الماس کا دوبارہ ہاتھ میں آکر نکل جانا اور..... لیاقت حسین جس نے دونوں مرتبہ الماس کے انخوا کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ میڈم روہی کے سلسلے میں بھی اس کے آڑے آچکا تھا۔

پے در پے رونما ہونے والے حالات کی روشنی میں اب وہ لیاقت حسین کی دغل اندازی کو محض اتفاق نہیں سمجھ سکتا تھا۔



حسب وعدہ شبنم کو اگلی صبح ایک موہاٹن فون فراہم کر دیا گیا تھا۔ اورنگ زیب کی ملاقات کے بعد سے اس کی گھر مانی کرنے والے اس کے ساتھ بہت مہذب انداز میں پیش آرہے تھے۔ موہاٹن مل جانے کے بعد شبنم نے فوری طور پر میڈم روہی سے بات کرنا چاہی تھی، لیکن پھر اس نے اورنگ زیب کی ہدایت پر ایسا نہیں کیا، اس نے واضح طور پر منع کیا تھا کہ میڈم کو اس بات کا علم نہیں ہوتا چاہئے کہ شبنم کہاں اور کن باتوں میں ہے۔ میڈم سے بات ہوئی تو وہ شبنم کو اس کی گمشدگی کے بارے میں ضرور کر دیتی۔ اس لیے بہتر تھا کہ اس سے فی الحال کوئی رابطہ نہ کیا جائے۔ میڈم کے بعد اس کے ذہن میں افضل خان کا تصور ابھرا، اس نے اورنگ زیب کو یہ بات مکمل کر نہیں بتائی تھی کہ وہ افضل خان کے ساتھ نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے سے پیشتر ہی ایک مشنر کے لاج محل ملے کر بجلی تھی۔ اسی خیال کے پیش نظر وہ افضل خان کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بگ باس کے ذہن میں شبنم کے انخوا کے بعد کچھ شبہات ضرور ابھرے ہوں گے، شبنم بگ باس کیلئے بہت کارآمد ثابت ہو رہی تھی اس لیے وہ اسے یکسر نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس ضمن میں اس نے افضل خان سے بھی باز پرس ضرور کی ہوگی، ہو سکتا ہے اسے کوئی سزا بھی دی ہو۔ انخوا کے امکانات کے کچھ خدشات کے پیش نظر ممکن ہے افضل خان کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا ہو۔ خاصی دیر تک وہ غلط فہمیوں سے سوچتی رہی پھر اس نے ڈرتے ڈرتے افضل خان کے نمبر بیچ کیے۔ دوسری جانب سے چچی گھنٹی کے بعد کال ریسپیو کی گئی۔ آواز افضل خان ہی کی تھی۔

”میں شبنم بول رہی ہوں۔ تم خبریت سے تو ہو؟“

”تم خود کہاں ہو؟“ افضل خان نے شبنم کی آواز سن کر بے چینی کا اظہار کیا۔ ”جہیں انخوا کرنے والے کون تھے؟ کہاں رکھا گیا ہے جہیں؟“

”مجھے ابھی تک اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔“ شبنم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”انہوں نے اپنی زبان پر تالے ڈال رکھے ہیں۔ فی الحال میرے ساتھ کوئی شخص بھی نہیں ہوئی۔“

”تمہارا موہاٹن نمبر کس طرح بدل گیا؟“ افضل کان نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے صدمہ کیا۔

”وہ..... انخوا کرنے والوں نے میری سم کال لی ہے۔“ شبنم نے بات جتانے کی کوشش کی۔

”میری درخواست پر سنے نمبر کی سم دی گئی ہے۔“

”اس وقت تمہارے پاس اور کون ہے؟“ افضل خان کا لہجہ مختلط ہو گیا۔

”کوئی بھی نہیں..... میں صرف تمہاری خیریت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“ شبنم نے کچھ کہنا چاہا لیکن دوسری جانب سے سلسلہ فوراً ہی منقطع کر دیا گیا۔ اس نے فوری طور پر دوبارہ نمبر ملانے کی غلطی نہیں کی۔ اس نے سوچا، ممکن ہے کچھ لوگ افضل خان کی گھرائی کر رہے ہوں جن کے خوف سے لائن کاٹ دی گئی ہو۔ اس شے کے ساتھ ہی اسے اپنی جلدی بازی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ بگ پاس افضل خان سے خوش نہیں تھا، اس کے انگوٹے کے بعد بگ پاس کے کچھ کارندے افضل خان کی گھرائی پر ضرور قہقہات ہوں گے۔ وہ ان ہی باتوں پر غور کر رہی تھی جب اس کا موبائل ڈائریکٹ کرنے لگا۔ اسکرین پر نمبر دیکھ کر اس نے کال ریسپونڈ کرنے کا ارادہ کیا پھر یہ سوچ کر کہ شاید اورنگ زیب نے اسے کال کیا ہو اس نے کچھ تذبذب کے بعد موبائل آن کر لیا مختصر کہا۔

”ہیلو.....“

”تم اس وقت خیریت سے تو ہو؟“ اجنبی لہجے سے سوال کیا۔

”تم کون ہو.....؟“ اس نے مختلط لہجے میں دریافت کیا۔

”دوست ہی سمجھو.....“ ساہٹ آواز میں جواب ملا۔ ”تمہیں کہاں رکھا گیا ہے؟ صرف اتنا بتا دو ہم جہیں ہر قیمت پر بازیاب کر لیں گے۔“

شبنم نے لائن کاٹ دی، اس کا دل تیزی سے دھوک رہا تھا، اس کا شہر درست ثابت ہوا۔ جو لوگ افضل خان کی خیر گھرائی پر قہقہات تھے انہیں شاید افضل خان کے موبائل سے وہ آخری نمبر بھی ضرور مل گیا ہو گا جس پر بات کی گئی تھی اور اب وہ اس سے پتا دریافت کر رہے تھے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی غلطی کا ازالہ کس طرح کرے۔ موبائل پر دوبارہ ڈائریکٹ ہوئی تو اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ وہی نمبر دوبارہ روشن اسکرین پر چمک رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے موبائل آن کر لیا۔

”کون پریشان کر رہا ہے؟“ اس بار اس نے صفا کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔

”اب لائن ڈسکنکٹ نہ کرنا درنہ افضل خان کی زندگی کی حفاظت بھی ختم ہو جائے گی۔“ دوسری جانب سے نتیجہی لہجے میں وارننگ دی گئی۔ ”سیدھی طرح بتا دو کہ تم کہاں ہو.....“

”کوئی جواب نہ دیتا م..... میری.....“ دوسری جانب سے افضل خان کی دم دم آواز ابھری پھر شاید جو لوگ قریب کھڑے تھے انہوں نے اسے قابو کر لیا تھا، دم دم آوازیں بھی ابھریں پھر دوبارہ سخت لہجے میں کہا گیا۔ ”تم تین تک گنیں گے پھر تم افضل خان کے حلق سے نکلے والی موت کی آخری کراہ بھی سن لو گی۔“

شبنم نے جواب دینے کے بجائے لائن منقطع کرنے کے ساتھ ہی موبائل بھی آف کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر جا کر تین بار جلدی جلدی دسک دی تو پھر ادا دینے والا سامنے آ گیا۔

”کیا کام ہے میڈم.....؟“ اس نے شبنم کی ہیکلہاٹ کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”مجھے فوری طور پر اورنگ زیب صاحب کو ایک اہم پیغام دینا ہے۔ ان کا موبائل نمبر کیا ہے؟“ شبنم نے بڑی عجلت میں کہا۔ جواب میں دروازہ کھولنے والے نے اسے نمبر بتانے کے بجائے جب سے اپنا موبائل نکال کر ایک دوپٹن دبا کر اسے شبنم کی طرف بڑھا دیا۔

”کیا بات ہے؟ اس وقت کیسے فون کیا؟“ دوسری جانب سے اورنگ زیب کی مانوس آواز ابھری۔

”میں شبنم پوچھ رہی ہوں۔“ شبنم نے تجزی سے کہا پھر ایک ہی سانس میں سب کچھ کہتی چلی گئی۔

”پریشان مت ہو..... لیکن اب دوبارہ سوچ کچھ کر ہی کسی واقف کار کو فون کرنا۔“

”وو..... وہ افضل خان کو.....“

”کچھ نہیں ہو گا..... اس کی بات کاٹ کر کہا گیا۔ ”وہ میرے ہی آدمی تھے۔“

”وو.....“ شبنم نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ دوسری جانب سے رابطہ ختم ہو گیا تھا اس لیے اس نے موبائل واپس کیا پھر کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اگر ایس بی اورنگ زیب نے افضل خان کی گھرائی کا خیال نہ رکھا ہوتا تو شاید وہ ایک ہم خیال ساتھی سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو جاتی۔

”کس کی کال تھی؟“ سراج نے اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات کو بدلے دیکھ کر سوال کیا۔

”ایک سادہ لباس والے کا فون تھا۔“ اورنگ زیب نے کہا پھر کسی اور کا نمبر بچ کر لگے۔ دوسری جانب سے رابطہ ہونے پر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے دیکھتا ہوں کہ بات کرنی ہے۔“

”بول رہا ہوں۔“ کچھ توقف سے جواب ملا۔

”تمن آدھیوں کے بارے میں تم نے اب تک کچھ نہ کچھ تو معلوم کر لیا ہو گا؟“

”معاف کیجئے گا صاحب، میں آپ کی آواز نہیں پہچان سکا تاہم آج آج اسے ایسا نہیں ہو گا۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”تینوں میں صرف ایک میرا برانا واقف کار تھا۔ اس کا نام راجو ہے، اسی کی وجہ سے میں بچ گیا لیکن اب وہ میری تلاش میں ہیں۔ اس نے مجھے اپنے ساتھیوں سے بھی دور رہنے کا اشارہ دیا ہے۔“

”تمہیں یہ بات کس نے بتائی.....؟“

”خود راجو نے کہا ہے صاحب۔ وہ بھی اب فرعون سے خوش نہیں ہے۔ آپ کیلئے ایک اہم اطلاع اور بھی ہے کیا آپ لیاقت حسین نا کی بندے سے واقف ہیں؟“

ہاں۔ کیا وہ خود لیاقت حسین کے کسی کام نہ آئیں گی؟
”یہ پہلو ہے میرے ذہن میں لیکن کوئی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے سے رسک کم ہو جائے گا۔“

الماس کے آجانے سے اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جس کی ٹرسے لے آئی تھی۔
”کیا گفتگو ہو رہی تھی جو میرے آتے ہی آپ دلوں کو مغمم ہو گئے؟“ الماس نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

”میں سراج سے کہہ رہا تھا کہ خدا خواستہ اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو ہمیں اتنی خدمت کرنے والی بھائی شاید دوبارہ نہ ملتی۔“
”پھر.....“ الماس نے سراج کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے کیا جواب دیا؟“

”سراج کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ لیکن آپ آگئیں اس لیے ان کے دل کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔“ اورنگ زیب نے جو کالگیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔
”انسر چاہے بھائی ہی ہو لیکن انسر ہی ہوتا ہے۔“ سراج نے شرارت کیا۔ ”مجھے بھی انسر کا کہنا تو بہر حال ماننا پڑا۔“

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔
”مجھے اس وقت آنکھیں کے خلاف ایک محاذ کو مضبوط کرنے کی خاطر اس وقت کسی سے ملنا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ میں بھی کل ڈیوٹی جان کر لوں۔“ سراج نے کہا۔ ”بستر پر پڑے پڑے تو ہاتھ بھی نہیں کھلیں گے۔“

”تم الماس سے مشورہ کرلو۔ جیسا ہی مشورہ دیں ویسا ہی کرو۔“ اورنگ زیب نے اس بار دوستانہ انداز میں کچھ بڑی محبت سے الماس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا کرے سے نکل گیا۔
سراج نے الماس کو لیاقت حسین کو درپیش خطرے کے بارے میں بتایا پھر وہ تنہائی کے اس کے بارے میں جانتی تدابیر پر غور کرنے لگا۔



لیاقت حسین اس وقت کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے بعد اٹھا تھا، وہ اندر سراج کے پاس جانے کو سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل پر گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی تو فرحین کا نمبر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ گاؤں جانے کے بعد سے وہ اس کی پہلی کال تھی۔ لیاقت حسین نے کئی بار اسے فون کرنے کا سوچا تھا لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا، فرحین اپنی مزیدہ کی موت کی خبر سن کر مٹی تھی، اس موقع پر لیاقت حسین نے اسے خود سے کال کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ چنانچہ اس وقت

”اطلاع کیا ہے؟“ اورنگ زیب نے کسمسا سوال کیا۔
”راجہ کی اطلاع کے مطابق فرعون نے اس بندے کے لیے ”شوث ایٹ سائٹ“ کا حکم جاری کیا ہے۔“

”ایک کام کر سکتے ہو؟“
”آپ صرف حکم دیں صاحب۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔“
”راجہ اور اس کے دونوں ساتھیوں کا گھٹ پیک بنا کر فرعون کے گھر کے قریب کہیں ڈال دو۔“ اورنگ زیب نے عمارت سے کہا۔

”کل تک کام ہو جائے گا صاحب۔ ایک اجازت میں بھی جاؤں گا۔ کیا کسی فوری ضرورت پر میں آپ کے نمبر پر کال کر سکتا ہوں؟“
”اوہ..... لیکن صرف ایمر جنسی کے مقاصد پر.....“ اورنگ زیب نے رابطہ منقطع کر دیا پھر اس نے سراج کو دیکھ کر تفصیل بتائی تو سراج نے بڑی تنہید کی ہے کہا۔

”ہمیں ہر قیمت پر لیاقت حسین کو پروٹیکشن دینا ہوگی۔ ایک صورت تو یہ ممکن ہے کہ اسے فوری طور پر غصہ مچا دے فرحین کے پاس بھیج دیا جائے۔“
”ایک صورت اور بھی ہے.....“ اورنگ زیب معنی خیز انداز میں بولا۔ ”ہم آنکھیں سے لیاقت حسین کے معاملے میں پارکینک بھی کر سکتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ سراج نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
”تمہاری وقتی بیماری کی وجہ سے میں نے تمہیں کچھ باتیں نہیں بتائی تھیں۔“ اورنگ زیب نے اسے مختصراً اکول اور ختم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”توکل اس وقت آنکھوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بے سودا کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”مگر آپ کیلئے خطرات بڑھ جائیں گے۔“
”خطرات سے کھینچنا ہمارے فرائض منصبی میں بھی شامل ہے۔“ اورنگ زیب نے غلامی گھورتے ہوئے کہا۔ ”آنکھیں کو نیچا دکھانے کی خاطر میں اسے اس قدر بے بس اور لاچار کر دوں گا کہ وہ خود اپنے آپ کو گولی مارنے پر مجبور ہو جائے گا۔“
”ختم کے مسئلے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟“ سراج نے کسمسا سوال کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ بھی ہمارے کام آ سکتی ہے۔“

”ہاں۔ یہی بات تمہاری میڈم روٹی نے بھی بڑے جین سے کہی تھی۔ میں نے شہنم کو آزمانے کی خاطر اسے آزاد کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن وہ ہماری رہنمائی مدد کرنے کو تیار ہے۔“
”کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم لیاقت حسین کو صرف گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیں۔“
سراج نے پھر لیاقت حسین کا ذکر چھیڑا تو اورنگ زیب نے پہلو بدل کر حد بندی کی ہے کہا۔
”آپ کا کیا خیال ہے.....؟“ جو نادیہ تو شمس دوسروں کی خاطر لیاقت حسین کی مدد کر رہی

وہاں تھوڑی بات تھی۔

”مجھ سے ایک وعدہ کر لیاقت..... تو چند باقی نہیں ہوگا۔“ فرمین کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں غلط سوچ رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ شاہ پری کو یہ بات بھی کسی طرح معلوم ہوگئی ہے کہ تو کہاں کام کر رہا ہے۔ شاید اسی لیے اس نے وہ بات میرے کان میں ڈالی ہے۔ خاص طور پر یہ بھی کہا تھا کہ میں اس سلسلے میں کسی کے سامنے بھی سوچ بچ کر زبان کھولوں ورنہ بابا کی رازداری کا بھرم بھی ٹوٹ سکتا ہے۔“ فرمین نے دہی زبان میں بات جاری رکھی۔ ”میرا خیال ہے کہ تو معاملے کی تھیک سیٹی کیا ہوگا۔ پراپک بار کا دھیان رکھا، اگر میرا نام فتح میں آگیا تو امان بھی مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ شاہ پری یہ بھی شکوکہ کرے گی، اس کی بات سے اعزاء وہرہا ہے کہ شاید کاروبار والی بات بابا اور ہمارے صاحب کے بیچ ہوگئی۔“

”میں سمجھ رہا ہوں، تو فکر نہ کر۔“ لیاقت حسین نے ہونٹ چپاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں کل کسی وقت تجھ سے بات کر دوں گا۔“

”اپنی بات نہیں کرے گا۔“ فرمین نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ ”میرے بغیر تیرا گزارا کیسے ہو رہا ہے؟“

”حساب کتاب جمع کر رہا ہوں میری دلبر۔“ لیاقت حسین نے سرود آہ بھری۔ ”تو آئے گی تو سارا جمع خرچ برابر کر دوں گا۔“

”نیکو صاحب اور صاحب کیسے ہیں۔ ان سے میرا سلام کہنا۔“

”میں ابھی تک سراج صاحب کی طرف ہوں۔ ادھر کیا تو حیران سلام بھی پہنچا دوں گا۔“

دوسری طرف کوئی آگیا تھا اس لیے فرمین نے کل بات کا یاد لاکر رابطہ منقطع کر دیا۔ لیاقت حسین کے ذہن میں پانچ لاکھ کی رقم اور بیسہ ٹھکان کی فون والی گفتگو گونجنے لگی۔ اسے اس بات پر بھی تعجب تھا کہ شاہ پری کو اس بات کا علم کس طرح ہوا کہ شہر میں وہ کس کے پاس ملازم ہے؟ اس سلسلے میں اس کا شبہ گل خان کی گھروالی زریہ کی طرف گیا جس کی زمانے میں شاہ پری کے ساتھ ہی ایک مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کرنے آئی تھی۔ بہر حال، وہ محض عمل ہوگئی تھی لیاقت کے ذہن میں الجھتی جا رہی تھی۔



وہ سرحدی علاقے کا کوئی سنان دویران پہاڑی سلسلہ تھا جہاں فلک بوس پہاڑیاں نہ جانے کب سے سرفاٹے کھڑی تھیں۔ اس وقت سورج چوڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا، اس کی نقش سے پہاڑوں پر کہیں کہیں بھی برف پھیل رہی تھی۔ دور دور تک کسی انسان کا سایہ تک نظر نہیں آ رہا تھا جب سنگار پہاڑ کے عودی محل کے گنگ غار سے ایک دیوالاگل کر سائے آگیا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی غلط اور جنگلی چوپایا ہی محسوس ہوا تھا لیکن غار سے کچھ دور آنے کے بعد جب وہ پیروں پر کھڑا ہوا تو اس کی شکل واضح ہوئی۔

جب فرمین نے اس سے رابطہ کیا تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔

”فرمین..... جان جگرا“ اس نے موبائل آن کر کے بڑے پیار سے کہا۔ ”سب خیریت تو ہے؟“

”خیر، گھر میں اس وقت بھی پرسہ دینے والی عورتیں بیٹھی ہیں۔ میں تجھ سے بات کرنے کی خاطر موقع نکال کر باہر نکلیں کہ قریب آگئی ہوں۔“ فرمین نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارے سراج صاحب کیسے ہیں؟“

”اب خطرے کی کوئی بات نہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن میں ڈیوٹی بھی جوائن کر لیں۔ تو سنا وہاں میرے بارے میں کسی نے پوچھا تو نہیں؟“

”کیسی باتیں کر رہا ہے..... سب ہی بار بار تجھے یاد کرتے ہیں۔ اماں بھی روز تیری خبریت معلوم کرتی رہتی ہے۔ البتہ بابا۔“

”کیا ہوا بابا کہ؟“ لیاقت حسین باپ کے حوالے پر تڑپ اٹھا۔ ”اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جھلا چکا ہے لیکن کچھ پریشان پریشان رہتا ہے۔“ فرمین نے جواب دیا۔ ”میں نے اماں کو بھی بارشٹو لے کر کوشش کی مگر اس نے بات ٹال دی، کل رات تیری شاہ پری سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اب تو بڑی گوری جتنی ہوگئی ہے۔ شادی کے بعد بڑا رنگ روپ نکال رہی ہے۔“

”تو ابھی بابا کی بات کر رہی تھی پھر یہ شاہ پری درمیان میں کہاں سے آگئی؟“ لیاقت حسین نے جھلا کر پوچھا۔ اسے شاہ پری سے کوئی عیر نہیں تھا لیکن اسی کی وجہ سے باپ کی حویلی چھوڑی پڑی تھی اس لیے وہ اس کا ذکر سنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

”شاہ پری کے نام پر مرحمتیں میں چلائے گا؟“ فرمین نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”اب تو خبر سے وہ کچھ دنوں میں ماں میں بھی بننے والی ہے اسی نے تو مجھے تیرے بابا کی پریشانی کی وجہ بھی بتائی ہے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اس نام کی کوئی نہ معلوم ہو۔“

”کیا پریشانی ہے بابا کہ؟“ لیاقت حسین نے تڑپ کر ردو یافت کیا۔

”شاہ پری بتا رہی تھی کہ شہر میں کسی بڑی کاروباری پارٹی سے پانچ چھ لاکھ کی رقم کے سلسلے میں کچھ بات خراب ہوگئی ہے۔“ فرمین نے بات جاری رکھی۔ ”تیرے بابا کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے لیکن.....“

”لیکن کیا..... تو چپ کیوں ہوگئی؟“ لیاقت حسین نے فرمین کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ پانچ چھ لاکھ روپے کی خاطر کاروباری تعلقات متاثر ہونے کی بات پر وہ خود بھی چونکا تھا۔ اس کے ذہن میں بیسہ ٹھکان کی وہ گفتگو گونجنے لگی جو اس نے اتفاقاً سن لی تھی، مارشل کے آسٹریکی چلائی کے سلسلے میں وہ بات ابھی تک اس کے داغ میں محفوظ تھی۔ اس نے سراج سے بھی اس سلسلے میں مدد چاہی تھی لیکن بات مکمل نہیں ہو سکی تھی، اس وقت فرمین نے وہی ذکر چھیڑا تو اس کے بے چین

وہ ایک درمیانہ قد کا دبلا چلتا انسان تھا، جس کے جسم پر اس وقت پہلی لنگوٹی کے سوا کوئی لباس نہیں تھا، اس کے سر کے لیے لمبے بال میل میں پکٹے ہوئے دونوں شانوں پر بکھرے نظر آ رہے تھے۔ داڑھی جھاڑ جھکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھی۔ گرد کی تپوں نے اس کی جلد کی اصلی رنگت بھی چھپا رکھی تھی لیکن اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں جن سے وہ قرب و جوار کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس کی ظاہری حالت دیکھنے کے بعد ایسا ہی لگتا تھا جیسے وہ ایک طویل عرصہ کے بعد کھلے آسمان کے نیچے غار سے نکل آیا ہو۔ چاروں طرف غور و زائے کے بعد اس نے سر اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا، اس کی خون آنکھوں میں پوری طرح کھلی تھیں۔ وہ تپتے سورج کو خاصی دیر تک ہاتھ سے دیکھتا رہا پھر اس نے دیشانہ آواز میں پھری قوت سے ”الکھ زنجی“ کا نعرہ بلند کیا پھر ”جے بھیرودی“ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے، آنکھیں بند کر لیں۔ دمدم آواز میں کچھ بدبانے لگا۔

اس کی جلد کی رنگت میل کیل کے نیچے چمپ کر رہ گئی تھی، لیکن اس وقت وہ خود کو بے حد تروتازہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم وہ اسی انداز میں بدبانا رہا پھر اس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں، اس کی آنکھوں میں اب سرخی کے علاوہ ایسی چمک بھی نظر آ رہی تھی جیسے اس نے کڑی آزمائشوں سے گزر کر کوئی بڑی کامیابی حاصل کر لی ہو۔ وہ ان چاروں طرف پھیلی سر بلند پہاڑیوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کی نظروں میں بڑی حقیر ہوں۔ اس کے سات کوہنوں پر بھی اب بڑی پر اسرار اور خوفناک مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس نے ایک بار پھر تپتے سورج کی سمت دیکھ کر ”الکھ زنجی اور جے بھیرودی“ کے نعرے بلند کیے پھر وہ لمبے قدم اٹھاتا اپنی پہاڑی راستوں پر چلتے چلا گیا جہاں غار سے باہر نکلا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ راستے اس کے دیکھے بھالے ہوں۔

وہ بڑے الجھاک کے بلند یوں کی طرف جا رہا تھا جب سیاہ بادلوں کا ایک گھڑا نمودار ہوا۔ پھر موٹی موٹی بوندیں برسا شروع ہو گئیں۔ ان بوندوں نے اس کے میل کو اتارنا شروع کیا تو اس کی حالت عجیب ہو گئی۔ جسم پر سیاہی کے درمیان کہیں کہیں سفیدی چمکنے لگی۔ وہ ان باتوں سے بے پروا قدم اٹھاتا رہا۔ بارش کے موٹے موٹے قطرے اس کے جسم کی غلاقت کو دھو رہے، اس کے بدن پر جا بجا میل چھٹ جانے کے سبب جلد کی اصل رنگت ابھرتی رہی۔ وہ اپنی دھن میں مست قدم اٹھاتا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں دو سنگلاخ چٹانوں کے بیچ ایک دروازہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے نظریں سمجھا کر ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا پھر آڑا ہو کر اس دروازے میں پھنسا پھنسا دوسری طرف نکل گیا جہاں کچھ خورد و پہاڑی درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک ایسے ہی درخت کے نیچے کچھ دیر سناٹے کے خیال سے چاروں خانے چت لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں موند لیکن پھر سے پر تھکن کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔

بارش کچھ دیر برس چکی تو سیاہ بادلوں کا گھڑا فضا میں عقلم ہو گیا۔ سورج کی تپش پتھروں کو دوبارہ گرمانے لگی لیکن وہ بدستور آنکھیں بند کیے دینا و مانیا سے بے خبر نظر آ رہا تھا۔ جب ہی ایک

اولی آواز اس کے کانوں میں سنر کی گھنٹوں کی طرح جھنجھٹائی ہوئی ابھری۔ ”مہاراج کب تک سنے رہو گے؟“

چٹان پر لیٹے ہوئے شخص نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے قریب ہی ایک سنر کی بیٹھی اسے پکارا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، اس نے جو ساری باندھ رکھی تھی وہ پھیک کر اس کے جسم کے قریب و دراز سے لپٹ گئی تھی، بار ایک کپڑے سے اس کا گندری جسم آگے بچھو کر رہا تھا، اس کے سینے پر ایک گھٹا لگیا تھا۔ ننگے بازو اور سر پر شکم نے اس کی جوانی کو اور پھر پرنا بنا دیا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کی اور سی جھانے وہ چٹان پر دوڑا شخص کو بڑے پریم اور غبار آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سراپا حسن و جمال تھی، ایسی جوانی کسی جو کمیت کو کھلیاں بنانے اور آبادی کو ویران بنانے کی قوت رکھتی تھی۔ اس وقت اس نے بے ہنگم لنگوٹی باندھے شخص کو بڑی حقیقت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی دس چمکاتی نظروں میں عیاری عیار بھرا تھا۔ اس کی کشتلانی آواز سن کر چٹان پر لیٹے ہوئے شخص نے آنکھیں کھول دیں۔

”تو..... کون ہے تو؟“ اس نے حقارت سے غور و اور نیم عریاں لڑکی کو سر سے پاؤں تک محسوس کیا۔

”میں تمہاری دای، جہماری کیول، جہماری پھارن ہوں مہاراج۔“ وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔ ”دیوی کی ایک سیما ہے کہ میں تمہارے چروں میں رہوں۔ تمہاری سیوا کروں، تم کو جیون میں بھی زناش نہ کروں..... تمہارا سہا بھلاؤں۔“

”کس دیوی کی بات کر رہی ہے؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے تہہ اب بھی بدلے ہوئے تھے۔

”مہاراج.....“ پھاری نے ہاتھ باندھ کر معصومیت سے سوال کیا۔ ”کیا تمہارا شہ نام پر تاب بھوش نہیں ہے؟“

”تیرا کیا نام ہے؟“

”دای کو مدھو کہتے ہیں۔“ وہ لپک کر بولی تو اور سنر لگنے لگی۔

”کس دیوی نے تجھے مجھے دان کیا ہے؟“ پر تاب نے مدھو کو بڑے دھیان سے دیکھا۔

”مدھو کی دیوی نے تمہارا.....“

”کالی کا سن کر پر تاب نے مدھو کے چمکنے جسم کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

”باقی ہوں مہاراج.....“ مدھو کا روپ اس جواب کے ساتھ ہی اور کھرا تھا۔ وہ کھمک کر پر تاب کے اور قریب آ گئی۔

”میرے بارے میں کیا بتایا ہے مہان دیوی نے؟“

”تم نے دیوی کے کارن جو جاپ کیا تھا اس میں تم سہل ہو گئے ہو۔ تمہاری فطرتی اب ایدم پار

ہو گئی ہے۔“

پر تاب نے اپنے میلے کپلے ہاتھ بڑھا کر مدھو کو اپنی بانہوں میں سیٹھ لیا۔ اس کے بالوں کو چرتے ہوئے بولا۔ ”جانتی ہے میں نے یہ چاہ کس کار کیا تھا؟“
 ”دبوی کی کر پاپے مہاراج۔“ مدھو نے پر تاب کے غلیظ سینے سے اپنے گال رگڑتے ہوئے کہا۔ ”ایک دشت ہے جو بار بار تمہارا راستہ کاٹ رہا تھا۔ اسی موڑ کے تمہارے لیوں والے کالے منتر کا توڑ کیا تھا۔“ مدھو کچھ کہتے کہتے رک گئی تو پر تاب نے اس کے گلے بالوں کو سختی میں جلا کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا۔
 اسے تیز نظروں سے مٹھرتے ہوئے بولا۔ ”تو..... تو چپ کیوں ہو گئی؟“ یہ کہتے کہتے رک مٹی؟“

”م..... میں نہیں مہاراج۔“ وہ تھلا کر مصمیت سے پولی۔ ”دبوی نے کہا تھا کہ وہ مسلا بھی کسی شتی کے کل پر تمہارے آڑے آ گیا تھا۔“
 ”اب اس کی شتی اس کے کسی کام نہیں آئے گی۔“ پر تاب سیدھوٹ کر بولا۔ ”مجھ سے نظریں چار کرے گا تو اس کی میاں مر جائے گی۔ جلا کر جسم کر دوں گا اس پنج ذات کو..... دبوی کی دان کی ہوئی شتی بھی میری سہانیا کرے گی۔“

”بھوش میں کیا لکھا ہے؟ میں نہیں جانتی مہاراج پر تو اتنا اوش بھجتی ہوں کہ جسے دبوی کا آشیر باد پراپت ہو جائے وہ امر ہو جاتا ہے۔“ مدھو نے بڑی لگاوت سے کہا۔ پھر دوبارہ پر تاب کی چھاتی پر سر رکھ کر کسمسا نے لگی۔ اس کی خود پیردی کا انداز بھی بڑا جونی تھا۔ شاید دبوی کی آگیا کا پالن کرنے کی خاطر وہ مست ہو رہی تھی ورنہ بھول کر بھی اس گند سے تھڑے پر تاب کے قریب جانا بھی گوارا نہ کرتی۔

”کیا تو دیکھ سکتی ہے کہ اس سے مدھو سلا کہاں ہے؟“ پر تاب نے مدھو کے گول گالوں کو چومتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں مہاراج..... میں کیول ایک بچار ہوں۔“ مدھو نے مدھ برساتی نظروں سے پر تاب کو دیکھا۔ ”تم مجھے اپنے چڑوں میں سو بچا کر لو۔ یہ بھی میرے لیے بڑے مان کی بات ہو گی..... دبوی کی بھی یہی آگیا ہے۔“

”تو کیا اس سٹے کو اپنی سندرتا کے چال میں چھانے کی خاطر کوئی روپ بھی نہیں بدل سکتی؟“
 پر تاب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”روپ اوش بدل سکتی ہوں مہاراج اپنے تن کی اتنی سے پھلا بھی سکتی ہوں لیکن کوئی سراپ (سزا) نہیں دے سکتی۔“

”میرے لیے یہی کافی ہے۔“ پر تاب کے غلیظ ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی، غلاؤں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ”میں نے یہی کہا تھا کہ ایک نایک دن اس کے پاؤں اوش رہت جائیں گے پھر

برقی اس کی بچاڑی پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے وہ بھی روٹھ جائے گی۔ اس دن دپے (جیت) میری ہو گی۔“

”مہاراج.....“ مدھو نے پر تاب کے گلے میں بانیں ڈال کر پچھتے ہوئے کہا۔ ”تم چاہ کے منتر پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہو مہاراج..... کچھ دیر سستو، میں اپنے شریر کی گری سے چھین چھک چھک کر سلا دوں گی۔ آنکھیں موند کر مدھو کی چھاتی پر سر رکھ کر کچھ دیر آرام کرو۔ مجھے بھی اپنی سید کا موقع دو مہاراج..... تمہاری سید کرنے سے میری بھلتی بھی ہو جائے گی۔“

مدھو کی گرم گرم سانسیں، اس کے گول شریر کی چھیز چھاڑ پر تاب کو لبھا رہی تھیں۔ گرماری تھیں..... وہ کچھ دیر اس کے ساتھ دھینکا مشتق کرتا رہا پھر تھک ہار کر دیکھنے والاؤں میں کم ہوتا چلا گیا۔



"Г....."

شکول

”فصول بات مت کرو۔“ ستم علی جھلا گیا۔ ”ہمارا تعلق جس کیونٹی سے ہے وہ رشوت کا کاروبار کبھی نہیں کرتی۔“

منافع ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات اور بھی ہے۔“ دارا نے ہلہو بدل کر قدرے سنجیدگی سے کہا۔
”میں نے ٹینڈر حامد الہیوی ایش کے مقابلے پر ملا ہے۔ اس لیے میں اسے ایک پیسج سمجھ کر قبول کرنے پر بے حد خوش ہوں۔“

”اسی پیسج کی خوشی میں ایک آخری فیصلہ میں نے بھی کیا ہے۔“ سیٹھ رستم علی نے دارا کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم روشا کو لے کر گوری طور پر لندن چلے جاؤ۔“
”دلیکس۔“

”پوری بات سنے بغیر درمیان میں یولنا کا ردباری اصول کے خلاف ہے۔“ رستم علی نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ”لندن آفس کے کچھ معاملات الجھ گئے ہیں۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا وہاں ہونا ضروری ہے۔“
”آئی سی۔“ دارا نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ”ایک مشورہ میں بھی دوں گا۔“
”کہو۔“

”آپ کی طبیعت پچھلے دنوں خراب تھی۔ تم کو بھی ای کی پریشانی تھی، ایسی صورت میں اگر آپ ماں کو لے کر چلے جائیں تو یہ تبدیلی آپ دونوں کی صحت کے لیے زیادہ مفید ہوگی۔“
”تم میری فکر مت کرو۔ میں اب بالکل تارل ہوں۔“

”سوری ڈی۔“ دارا نے کسمسا کر قدرے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”کچھ معاملات ایسے ہیں کہ وقتی طور پر میں بھی دو چار سینیٹ تک باہر نہیں جاسکتا۔“
”کوئی خاص وجہ؟“ رستم علی نے بیکہ کوئی نئی نظروں سے دیکھا۔

”کچھ ذاتی معاملات ہیں۔“
”اسکی کیا بات ہے جو تم مجھے نہیں بتا سکتے؟“
”مم۔ میں، ان باتوں کو زبان پر نہیں لانا چاہتا۔“
”روشا کا کوئی معاملہ ہے؟“
”نہیں۔“

”پھر۔۔۔ اور کیا مجبوری ہے؟“
”سوری ڈی۔“ دارا نے ہونٹ چپاتے ہوئے جواب دیا۔ ”کچھ ایسی ہی بات ہے کہ میں آپ اور ماں کو چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتا۔“

رستم علی نے دارا کا جواب سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر وہ دارا کے چہرے پر نظر جمائے بیٹھے رہے پھر سنبھل کر سنجیدگی سے کہا۔ ”کچھ باتیں ایسی ہیں جو سن بھی تمہارے ساتھ ڈسکس نہیں کروں گا لیکن تمہارے نہ جانے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ میں ٹینڈر کی آخر سے ایک ہفتے کے اندر اس پر عمل کرنے سے معذوری کا اظہار کروں جیسا کہ میرے اختیار میں ہے۔“

”لیکن آپ ایسا۔“

”ضروری نہیں کہ میں تمہاری کسی بات کا جواب دوں۔“ رستم علی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

”آئی سی۔“ دارا نے کسمسا کر زبان کھلنے کی کوشش کی۔ ”ڈی۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری آفر کے مقابلے میں حامد الہیوی ایش کی آفر پانچ پیسے کم تھی۔ اصولی طور پر ٹینڈر بھی ای پارتی کے حق میں ملنا چاہیے تھے لیکن۔۔۔ میں نے ذاتی کوشش کر کے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اب اگر ہم پیچھے ہٹے تو دوسری پارٹی اسے ہماری بزدلی ہی کہے گی۔“

بیٹے کا جواب سننے کے بعد رستم علی کیلئے آخری نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں تھا۔ کچھ دیر قبل فون کرنے والے کا آخری جملہ رستم علی کے ذہن میں صدائے بازداشت بن کر گونجتا رہا۔ دارا کے جواب نے یہ صحیحاً عمل کر دیا تھا کہ دور دراز ہی لے کر کال کرنے والے سے بات کی ہوگی۔

”ڈی۔“ دارا نے باپ کے ذہن میں ہونے والی کشش کو محسوس کرتے ہوئے ذہنی زبان میں کہا۔ ”اگر میری کسی بات سے آپ کو کدھ پہنچا ہو تو آئی ایم سوری لیکن میرا خیال ہے کہ ایک شخص کی خاموشی کسی دوسرے شخص کو بہت ساری غلط فہمیوں کا شکار کر دیتی ہے اور۔۔۔“

ای وقت اخراج کام کا بڑا بولا تو سیٹھ رستم علی نے ریسیدر اٹھا کر بیہوشی سے کہا۔
”میں اس وقت مصروف ہوں، مجھے دوبارہ ڈسٹرب۔“

”سر۔۔۔ آفس سیکرٹری نے رستم علی کا جملہ مکمل ہونے سے جو شہر تیوی سے کہا۔“ ایس بی مسٹر اورنگ زیب میرے آفس میں موجود ہیں۔ وہ آپ سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔“
”ٹھیک ہے۔۔۔ دو منٹ بعد وہیں میرے کمرے میں بھیج دیتا۔“ سیٹھ رستم علی نے پر خیال انداز میں کہا پھر دارا کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تم اپنے آفس میں جاؤ۔۔۔ کوئی پولیس ایس بی کسی کام کے سلسلے میں مجھ سے ملے آیا ہے۔“

دارا نے باپ سے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اپنا ارادہ ترک کر کے اٹھا اور خاموشی سے چلا گیا۔
دو منٹ بعد ہی ایس بی اورنگ زیب سادہ لباس میں رستم علی کے سامنے موجود تھا۔ نگہ جملوں کے بعد اورنگ زیب نے محتاط انداز میں اصل مقصد پر گفتگو شروع کی۔

”میں یہاں ایک خاص مقصد کے لیے آیا ہوں۔ یہ بھی بتا دوں کہ کافی الجال یہ دوستانہ اور قطعی فی ملاقات ہے جو آپ کے تعاون نہ کرنے کے بعد سرکاری صورت بھی اختیار کر سکتی ہے۔“

”آفسیر، میں آپ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے پر آمادہ ہوں لیکن قبل از وقت کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔“ رستم علی نے اپنی حیثیت کے ملاحظہ کر کے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بہت زیادہ پرسش ہوتی ہیں۔ شاید آپ بھی اپنی کسی پرسش بات کو غاہر کرنا پسند نہیں کریں گے۔“

”میں آپ سے جو فیصلہ اتفاق کرتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے بدستور سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ”میں جس مقصد کے پیش نظر اس وقت آپ کے پاس آیا ہوں وہ یقیناً آپ کا بالکل پرسش

معاملہ ہے لیکن اس کی نوعیت اس روز سے آتش صورت اختیار کر چکی ہے جس روز اسپتال سے واپسی کے وقت مجھ کو اور میرے ایک ساتھی ڈپٹی پیر شہنشاہت سراج کو..... ایک دھماکے کے ذریعے ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔“

اورنگ زیب کو اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی۔ اسپتال کا نام درمیان میں آنے کے بعد رستم علی کے چہرے پر نظر آنے والی وقتی سکون بھی اندرونی الجھل بن کر ظاہر ہونا شروع ہو گیا..... اورنگ زیب نے لوہا گرم دیکھ کر دوسری ضرب لگائی۔ ”مسٹر رستم علی۔ آپ اسپتال کے ڈسٹی بھی ہیں۔ بڑے ڈاکٹر نے آپ کو غالباً ہمارے وہاں وزٹ کرنے کے بارے میں ضرور آگاہ کیا ہوگا ہمیں آپ کی حیثیت اور شرافت کا خیال نہ ہوتا تو ہم آپ کی ملازمہ گلابو سے مل کر اس کا بیان بھی ریکارڈ کر سکتے تھے۔“

رستم علی تمہم بیٹھا اورنگ زیب کو کچھ دیر دیکھتا رہا پھر جیسے جیسے اعزاز میں بلولا۔
 ”آپ کیا جانا چاہتے ہیں آفسیر؟“
 ”گلابو پر کوئی کس نے چلائی تھی؟ اس کا نام جانا پسند کروں گا۔“
 ”اس کا نام خود مجھے بھی نہیں معلوم۔“ رستم علی نے کسمار کر جواب دیا۔ ”وہ میرے لیے بھی اجنبی ہی تھا۔“

”میری ذاتی معلومات کی روشنی میں آپ نے اپنے مختصہ کیلئے گارڈز کا ایک دستہ بھی تعینات کر رکھا ہے۔ پھر مجرم کس طرح ان سب کو آواز دے کر آپ کی خواب گاہ تک پہنچ گیا اور..... ملازمہ گلابو اس وقت آپ کی خواب گاہ میں کیا کر رہی تھی؟“

رستم علی نے دلی زبان میں حادثے کی مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”گوئی چلانے والا میرے ایک گارڈ کو بے ہوش کر کے اس کی وردی پھین کر تنگے کے عقبی راستے سے داخل ہوا پھر..... اس نے میری خواب گاہ تک پہنچنے کی خاطر گلابو کو ڈرا دھماکا کر اپنے اشاروں پر چلنے کیلئے مجبور کر دیا تھا..... میری وائف نے گلابو کی آواز سننے کے بعد ہی بیڈ روم کا دروازہ کھولا تھا۔ اس وقت میں سو رہا تھا۔ میری مسزن نے مجھے بعد میں آواز دے کر بیدار کیا تھا۔“
 ”آئی سی..... لیکن آنے والے نے جو یقیناً کسی خاص مقصد کے بغیر نہ آیا ہوگا، اس نے گلابو کو کیوں ڈنکی کیا؟“

”وہ..... وہ..... دراصل وہ خوف زدہ کرنے کا ایک نفسیاتی حربہ تھا۔“
 ”پھر.....“ اورنگ زیب نے رستم علی کی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں دریافت کیا۔ ”گارڈ کے لباس میں آنے والا یقیناً کوئی عادی اور پیشہ ور مجرم رہا ہوگا۔ وہ آپ سے کیا چاہتا تھا؟“

”وہ..... وہ..... جس مقصد سے آیا تھا وہی کے پورا ہونے کے بعد ہی اس نے مجھے اور میری وائف کو زندہ چھوڑ دیا تھا۔“

”آپ نے اس کی باقاعدہ رپورٹ ملحقہ تھانے میں کیوں نہیں کی؟“

”اپنی عزت..... شہرت اور دنیا کے ذرے۔“ رستم علی نے کسی ہارے ہوئے جوار کی انداز میں دم آدھام میں جواب دیا۔ ”اس رات کو کچھ ہوا اس کی اطلاع میرے بیٹے اور بہو کو بھی نہیں ہے..... میں نے جان لو بھ کر انہیں کچھ نہیں بتایا یا اس لیے کہ جوان خون جلدی اشتعال میں آجاتا ہے۔ بات پچھلتی یا طول اختیار کرتی تو مجرم جوانی کا ردروائی بھی کر سکتا تھا۔“

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے بے دستور نرم انداز میں سوال کیا۔ ”مجرم یا مجرموں نے آپ سے کتنی تم انڈھی۔“ میرا ذاتی اندازہ ایک کرڈ سے کم بھی نہیں ہے اور..... کیا آپ اتنی بڑی رقم نقدی کی صورت میں گھر میں رکھتے ہیں؟“

”بلکہ مسٹر اورنگ زیب۔“ اس بار رستم علی نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”میں آپ سے ذاتی درخواست کروں گا کہ جو بات جہاں دفن ہوگئی ہے اسے وہیں جگہ دفن رہنے دیں زیادہ نہ کر دیں۔ بلکہ.....“
 ”مجھے شرمندہ نہ کریں رستم علی صاحب۔“ اورنگ زیب نے اسے تسلی دی۔ ”میں آپ سے پہلے ہی وعدہ کر چکا ہوں کہ تعاون کرنے کی صورت میں بات صرف میری ذات تک محدود رہے گی۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ بس ایک آخری سوال اشارے کی صورت میں اور کروں گا اس کے بعد آپ کا قیمتی وقت براد نہیں کروں گا۔“

رستم علی نے جواب دینے کے بجائے حسرت بھری نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھا۔ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر فحش لہجے میں کہا۔ ”اس شہر میں میرا ذاتی دشمن بھی صرف ایک ہے..... شیخ حامد، جسے میں انگوٹھیں کے نام سے یاد کرتا ہوں۔ اسی نے سینو میں چھین شریف کا ردروائی انسان کو بھی اپنے معاملے میں گھسنے کیلئے مجبور کر دیا تھا۔ وہ مجرم جو آپ کی خواب گاہ تک پہنچا گیا تھا..... کیا وہ اسی انگوٹھیں کے اشارے پر نہیں چل رہا تھا؟“

سینو رستم نے جواب میں نظریں جھکا لیں تو اورنگ زیب نے جیب سے اچھا ڈرائنگ کارڈ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ جانے کے ارادے سے اٹھ کر بڑی فحش آواز میں بلولا۔ ”اس پر میرے وہ اندر بھی درج ہیں جس پر آپ کسی وقت بھی مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ جاتے جاتے ہی بھی عرض کروں کہ اب آپ کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ایک واقف کار کی حیثیت سے مجھ پر فرض ہو گی۔“

سینو رستم نے جواب میں کچھ نہیں کہا، خاموشی سے اورنگ زیب کو رخصت کرنے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ اورنگ زیب کی شخصیت سے نہ صرف متاثر ہوا تھا بلکہ اس کا احسان مند بھی تھا اورنگ زیب نے شخصی معافی کرم جوٹی سے کیا پھر کچھ سوچ کر دلی زبان میں بلولا۔ ”آپ کو میرا ذاتی مشورہ ہے کہ ان معاملات سے دارا کو بالکل ہی الگ رکھیں تو مناسب ہوگا۔“

”بہت بہت شکر یہ مسٹر اورنگ زیب لیکن اس وقت آپ نے مجھے خدمت کا کوئی موقع نہیں

دیا۔ کم از کم چائے ہی۔“

”ڈوبو رہی۔ کبھی موقع ملا تو ذرا بھی آپ کے ساتھ ضرور کروں گا۔“ اورنگ زیب نے دوبارہ رستم علی کا ہاتھ گرم جوش سے دبایا پھر پلٹ کر تیز قدم اٹھا تا کر سے سے باہر نکل گیا۔

لیاقت حسین کے ذہن میں فرمیں کی سوا بل پر کی ہوئی باتیں اس وقت بھی لچل چاری تھیں۔ کل تک وہ شاہ پری کے نام سے اچھا تھا۔ اسی سے شادی نہ کرنے کے سبب اسے باپ کی شفقت اور اپنی حویلی سے محروم ہونا پڑا تاہن آج شاہ پری کی وجہ سے پانچ لاکھ کی رقم کا وہ معما حل ہو گیا تھا جس نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ فرمیں بنے تھا تھا ”بابا کے پاس بیویں کی کی نہیں ہے لیکن اسے دوسرے کی غلطی کی وجہ سے اپنی کاروباری ساکھ خراب ہو جانے کا غم ضرور لائق ہے۔“ ”لیاقت حسین باپ کی اس مشکل کو حل کرنے کا حتمی تھا۔ اس نے ابھی تک سیف عثمان کو اپنے والد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اپنی اصلیت اور حیثیت کا اظہار کر کے وہ باپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سیف عثمان بھی ملازمت دیتے وقت ضرور سوال کرتے کہ جب وہ اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے تو اسے ملازمت کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے بھی وہ اپنا مستقبل بنانے کی خاطر خود اپنے بیروں پر بھروسہ ہونے کا ارادہ نہ کر کے لکھا تاہن اس وقت وہی ایک خاموشی اس کے لیے سوانہ روح بن گئی تھی۔

لیاقت حسین کو یقین تھا کہ اپنی موجودہ حیثیت میں اگر وہ سیف عثمان کو حقیقت سے آگاہ کر دیتا تو اس کے باپ اور عثمان کے درمیان پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی دور ہو سکتی تھی لیکن وہ اس کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سراج کا وسیلہ بھی اس کے کام آ سکتا تھا۔ مگر اسے یہ بھی منظور نہیں تھا۔ وہ کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا جس سے اس کے باپ اور سیف عثمان کے درمیان پیدا ہونے والی وقتی جھگڑا بھی دور ہو جائے اور اس کی اتنا کوئی بھی نہ پہنچے۔ فرمیں نے ٹھٹھکے کے دوران اس شے کا اظہار بھی کیا تھا کہ شاہ پری کو کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ لیاقت حسین کہاں ملازمت کر رہا ہے لیکن اس نے عمل کر اقرار نہیں کیا تھا۔ لیاقت حسین کے ذہن میں اس صورت حال کو حل کرنے کے مختلف طریقے گلہ ہو رہے تھے۔ جب اس کے ذہن میں ایک باتوں آواز ابھری جو کسی غیر کی نہیں اس کی اپنی ہی آواز تھی۔

”کب تک عقلی گھڑے دوڑاتے رہو گے؟ صورت حال نے جو پیچیدہ صورت اختیار کر لی ہے اسے حل کرنا تمہارے لیے جوئے شیر لانے سے کم بھی نہیں ہے۔“

”میں نے کبھی بایں ہونا نہیں سیکھا۔“ لیاقت حسین نے دل ہی دل میں اپنے ہمزاد سے کہا۔ ”انسان اگر ہمت سے کام لے۔ خدا پر ہر وسوسہ کو تو وہ ناممکن بھی ممکن بنا دیتا ہے۔“

”یہ بات ہے تو پھر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ سب کچھ اسی پر چھوڑ دو۔ اب تک جو ہوتا رہا وہ بھی اسی خدا کو منظور تھا۔ آئندہ جو ہوگا وہ بھی اسی کی مرضی کے عین مطابق ہوگا۔“

”جانتا ہوں لیکن..... انسان کو اس کی مرضی کے پیش نظر سوچنے اور سمجھنے کا اختیار بھی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے سے بھی مسئلہ نہیں ہوتے۔“

”کل کیا ہوگا..... کیا ہونے والا ہے یہ تم نہیں جانتے۔ میں بھی ایک حد تک تمہیں چوٹا سکتا ہوں۔ زبان کھولنے کا اختیار میرے پاس بھی نہیں ہے۔“

”ہاں..... میں نے پڑھا ہے کہ ہزار انسان کے ساتھ یہ پیدا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مر بھی جاتا ہے مگر..... میں عام کتا ہی باتوں پر ایمان نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب مکن عزت باتیں اور فرسودہ کہانیاں ہوں۔ جو صورت حال میرے ساتھ پیش آتی رہی ہے میں اس سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔“

”پھر؟ تم اس وقت کس سے باتیں کر رہے ہو؟“

”میں اسے دل و دماغ کی جنگ اور ٹکڑا کا نام دوں گا۔“

”اور وہ باتیں جو حادثاتی طور پر تمہارے ساتھ پیش آ چکی ہیں لیکن بعد میں دوسروں کی تصدیق کے باوجود تمہیں یاد نہیں آئیں، ان کے بارے میں کیا کہو گے۔“

”میں اسے سچی امدادوں گا۔ اس کا ذکر مقدس کتابوں میں بھی ہے اور جب اللہ کی مدد شامل حال ہو تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔“

”اس معاملے میں میں کوئی وضاحت نہیں کروں گا بہر حال، دو باتوں کا خیال رکھنا۔ جو خطرات انسان کو درپیش ہیں اس کی حفاظت بھی خداوند کریم کے اختیار میں ہے۔ آنے والے دنوں میں تمہاری کوئی آواز نہیں بھی ہو سکتی ہے۔ ذہن اور آنکھوں کو ملکا رکھنا۔“

”تم کن باتوں کی نشاندہی کر رہے ہو؟“ لیاقت حسین نے دوبارہ اس جملے کو دل میں دہرایا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا پھر..... اندر سے سراج کا بلاؤہ آگیا۔ وہ ملازم کے ساتھ اندر چلا گیا۔ سراج کو اذیت پر بیٹھا دیکھ کر اسے غصہ ہوئی گی۔

”بھٹو لیاقت حسین۔“ سراج نے اسے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت مجھے تم سے ایک اہم اور ضروری بات کرنی ہے۔“

”آپ کی کوئی بات یا حکم میرے لیے فیرا نہیں ہوگا۔“

”اتیس بی صاحب کو اطلاع ملی ہے کہ ہمارے کچھ مشیز کہ فرمیں بھی نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے تم بغیر میری اجازت کے کہیں جانے کی غلطی نہ کرنا۔“

”آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے صاحب؟“ لیاقت حسین نے دلی زبان میں پوچھا۔

”وہ کبھی تمہیں نہیں ہوتا۔“ سراج نے یہ دستور تنبیہ کی کہا۔ ”بھی وہ خود پردے میں رہتا ہے اس کے پردہ جرائم پیشہ اس کے اشاروں پر عمل کرتے ہیں اس لیے ہر حال میں احتیاط شرط ہے۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ لیاقت نے بات جاری رکھی ہے۔ ”خدا کا شکر ہے کہ اب آپ کی

”ہاں..... کل سے میں ڈھونڈی بھی جان کر لوں گا۔“

سراج سے بات کرنے کے بعد لیاقت حسین دوبارہ باہر آ گیا۔ کچھ دیر قبل بھی اسے ذہن اور آنکھ کھل رکھنے کا مشورہ ملا تھا لیکن موت اور زندگی کے بارے میں اس کا اعتقاد تھا کہ خدا نے جو وقت تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ اٹل ہوتا ہے۔ انسان کی تمام اعتدالی تدابیر دھری کی دھری رو جاتی ہیں۔

لیاقت حسین کمر سیڑھی کرنے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں پھر فریمن کی فون پر فراہم کردہ اطلاع پھرانے لگی، وہ انھیں بند کر کے سیٹھ عثمان اور اپنے باپ کے درمیان پیدا ہونے والی محنت ختم کرنے کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ذہن میں پریشان خیالوں کی پلٹاڑ شروع ہوئی تو اس کی آنکھ کچھ دیر کو لگ گئی۔ اس کا پوچھل ذہن نیند کے عالم میں بھی کام کرتا رہا پھر..... وہ ایک آخری نتیجہ اخذ کرنے کے بعد دوبارہ اٹھا..... اس نے ملے کر لیا تھا کہ ڈاڈا کی طور پر سیٹھ عثمان سے مل کر وہ اپنے باپ کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرے گا خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔

اپنے ارادے پر عمل کرنے کے آخری فیصلے کے بعد اس نے سراج کی طرف سے ملنے والی ہدایت کو بھی یکسر فراموش کر دیا۔ وہ قدم اٹھاتا سراج کی کوشی سے باہر نکلا۔ ایک عسکی پتھر کے سیٹھ عثمان کے پتھر پر پہنچ گیا۔ ان سے ملاقات کرنے میں بھی اسے انتہائی دقت نہیں اٹھانی پڑی۔ اسے فوراً اندر طلب کر لیا گیا۔ سیٹھ عثمان اور راجیلہ بیگم دونوں لاؤنج میں موجود تھے۔

”کیسے ہو لیاقت حسین؟“ راجیلہ بیگم نے بڑے غلغلے اور اہمیت سے پوچھا۔

”مالک کا کرم اور آپ لوگوں کی دعاؤں سے خیریت ہے۔“

”اس وقت کیسے آنا ہوا.....؟“ سیٹھ عثمان نے سوال کیا۔ ”سراج کی طرف تو سب خیریت ہے۔“

”سب ٹھیک ہے صاحب۔“ سراج صاحب کل سے ڈھونڈی پر بھی جا میں گئے۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”صاحب، مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”کیا بات ہے؟“

”صاحب..... وہ..... دراصل میں نے ملازمت کے بعد سے اب تک آپ کو اپنے والد کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن اب.....“ لیاقت حسین جھجکا تو راجیلہ خاتون نے مسکرا کر کہا۔

”آج جنہیں اس بات کا خیال کس طرح آ گیا؟ صاحب نے تو تم سے کئی بار پوچھا تھا۔“

”اب میں چاہتا ہوں کہ صاحب کا دل والد صاحب کی طرف سے صاف ہو جائے۔“ لیاقت حسین نے کہا پھر نظر سنبھکا کر ایک ہی سانس میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو اس کے دل پر ایک بار بوجھ بنا ہوا تھا۔

”اوہ.....“ سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو بہت فور سے دیکھا پھر کچھ تامل سے بولے۔ ”مجھے

یہ جان کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ تم سردار فراز خان کے بیٹے ہو۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں تم کو یقیناً کسی بھڑ اور مناسب ملازمت کی آفر کرتا۔ اب بھی کوئی نقص گزرا، میں تمہارے لیے.....“

”آپ نے جو احسان کیے ہیں صاحب، وہی بہت ہیں۔“ لیاقت حسین کی آواز رندہ گئی۔

”آپ بس اتنا احسان کریں کہ والد صاحب کی جانب سے جو سامان پہنچنے میں دیر ہوئی اسے درگزر کر دیں اور..... ایک درخواست اور بھی کروں گا.....“ لیاقت حسین نے عاجزی کا اظہار کیا۔ ”والد صاحب کو یہ نہ معلوم ہونے دیں کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں..... انہیں میرے بارے میں جان کر زیادہ دکھ ہوگا۔“

”یہ سب کچھ سوچنا اب میرا کام ہے۔“ سیٹھ عثمان نے اٹھ کر لیاقت حسین کے دونوں شانوں پر سے کپڑے سے اٹھ کر کہہ۔ ”اس بات کا یقین بھی کرو کہ اب میرا دل تمہارے والد کی طرف سے کھینچنے کی طرح صاف ہو گیا ہے۔“

”شکر یہ صاحب.....“ لیاقت حسین کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے۔

”ایک بات میری بھی سن لو.....“ راجیلہ بیگم نے شوہر کی دیکھا دیکھی بڑے پیار سے کہا۔ ”ہم سے بھی اب تک اگر کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو اسے.....“

”میں ہاتھ جوڑتا ہے بیگم صاحب..... اس سے آگے کچھ مت کہیے گا۔“ لیاقت حسین نے پھر عاجزی کا اظہار کیا۔

”ایک شرط.....“ سیٹھ عثمان نے موٹے سے قاعدہ اٹھا کر کہا۔ ”تمہیں پہلے کی طرح اب بھی ہماری کسی بات ماننے سے انکار نہیں ہوگا۔“

”آپ حکم دیں..... میں انکار کی گستاخی نہیں کروں گا۔“

لیاقت حسین کو خوشی تھی کہ وہ اپنے والد کی پوزیشن صاف کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سیٹھ عثمان نے اس سے ہر بات ماننے کا اقرار کر لیا تھا لیکن کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ راجیلہ بیگم کے بے حد اصرار پر اس روز لیاقت حسین کو سب کے ہمراہ ایک ہی میز پر بیٹھ کر ناشتا کرنا پڑا۔ ناشتے کے دوران وہ زیادہ تر خاموشی ہی رہا پھر والدیں جانے لگا تو سیٹھ عثمان نے سوال کیا۔

”تم کس گاڑی پر آئے تھے؟“

”میں ٹیکسی پر آ تھا صاحب.....“

”بہر حال، اب تمہیں میرا ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔“ راجیلہ بیگم نے شوہر کا مقصد سمجھ کر کہا تو لیاقت حسین انکار نہ کر سکا۔ خلاف توقع تو وہ اس وقت حواظ نظر رہا تھا۔ منگھو کے دوران بھی اس نے خود کو لیے دیئے رکھا تھا۔ سیٹھ عثمان اسے باہر تک دھت کرتے آئے تھے۔

راتے میں راجیلہ بیگم کے ڈرائیور نے اس کے ساتھ محل کرکھٹو کرنی چاہی لیکن خلاف توقع لیاقت حسین صرف ہوں، ہاں میں حجاب دیتا رہا گاڑی اس وقت بڑے چوک سے گزر کر ایک قدرے دیرانے کی طرف گھومی تھی جب لیاقت حسین نے راجیلہ بیگم کے ڈرائیور سے دہلی زبان

میں سوال کیا۔

”تمہارے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز ہے؟“
 ”نہیں لیاقت بھائی! ہم تو رائیبروں کا اسلحہ سے بھلا کیا کام۔“
 ”اگر کوئی آزاد وقت نہ ملتا تو کیا کرو گے؟“

”انتا بڑل اور ڈرپوک بھی نہیں ہوں!“ اس نے لیاقت حسین کو سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”خالی ہاتھ سے بھی کم از کم دو تین کو تو پھڑکا سکتا ہوں لیکن آپ نے اس وقت پر ذکر کیوں چھیڑ دیا؟“
 ”برا وقت دوست نامزد کر نہیں آتا۔“ لیاقت حسین بدستور سنجیدگی سے بولا پھر تکی بیٹھے پر

نظر ڈال کر کہا۔ ”ہمارے پیچھے جو سفید کار اور دین آ رہی ہیں ان سے محتاط رہنا۔“
 ”میں سمجھا نہیں.....“ اس نے لیاقت حسین کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”گاڑی تیزی سے آگے بڑھا کر داہنی جانب بڑی عمارت کے پاس روک لو.....“
 راجیلہ بیگم کا ڈرائیور حریف کی سوال کرتا چاہتا تھا جب کہ بعد دیکر وہ دودھا کے ہوئے پھر اس نے اگر اسٹیئرنگ کنٹرول نہ کیا ہوتا تو وہ یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو جاتا، کسی ماہر نشاندہ باری سائیکسٹر کے اسلحہ سے فائر کر کے گاڑی کو پھیلنے والے ٹائر ناکارہ کر دیے تھے۔ لیاقت حسین پوری طرح متلا تھا۔ وہ اپنا پتول نکالنا ہوا اپنی سمت کا دروازہ کھول کر بڑی احتیاط سے روڈ پر ایک ہاتھ کے بل گرا پھر خود کو حیرت انگیز طور پر رد کر رہا ہوا مرکز کے کنارے نئی تعمیر ہونے والی تجارتی عمارت تک پہنچ گیا۔ پیچھے آنے والی کار اور دین کچھ اور قریب آ کر روک دی گئیں۔ کئی گولیاں چلائی گئیں لیکن کار گریں ہوئیں۔

عمارت کے قریب پہنچ کر لیاقت حسین نے ایک چوڑے بلیک آؤٹ لے لی، اس نے مرکز کی دوسری جانب دیکھا، راجیلہ بیگم کا ڈرائیور نہیں نظر آ رہا تھا۔

”تم ہماری نظروں میں ہو لیاقت حسین!“ کار کے اندر سے کسی وینڈ کنٹرول مائیک کے ذریعے کہا گیا۔ ”ہم تمہیں ارنا چاہیں تو ایک دہی بھی استعمال کر سکتے ہیں جو تمہارے جسم کو دھجیوں میں تبدیل کر دے گا۔“

لیاقت حسین نے جواب دینے کے بجائے پھرتی سے پتول دالا ہاتھ باہر نکال کر کیے بعد دیگر فائر کیے۔ اس کا نشانہ خطائیں ہوا۔ کار کے اگلے دونوں بائیں جانبی وھاکوں سے پھٹ گئے۔ دین کاری پش پر کھڑی تھی۔ دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔ لیاقت حسین محفوظ پوزیشن لیے اس کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا، کار کا انجن شاید بند نہیں کیا گیا تھا۔ لیاقت حسین نے اسے ڈگمگاتے ہوئے قریبی عمارت کی طرف بڑھتے دیکھا۔ شاید اس میں جو جرم موجود تھے وہ بھی کسی محفوظ پوزیشن کی تلاش میں تھے۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا، عمارت کے قریب جا کر دروازہ دی گئی پھر اس کے دونوں دروازے پوری طرح کھول دیے گئے۔ لیاقت کی گرفت پتول پر مضبوط تھی اس کی اگلی ٹانگہ پر بھی ہوتی اور نظریں کار پر مرکوز تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ کار کے اندر سے جو لوگ باہر نکل کر پوزیشن لینے

کی کوشش کریں گے وہ انہیں ایک ایک کر کے جہنم رسید کر دے گا لیکن پھر جو کچھ ہوا وہ بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ کار سے کسی کے باہر نکلنے سے پیشتر ہی دین اس کے سامنے لا کر روک دی گئی۔ لیاقت حسین نے دین پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ وہ بڑی تیزی سے پتول کے بیگزین بدل رہا تھا لیکن اس عرصے میں کار والے نیچے اتر کر پوزیشن سنبھال چکے تھے۔ دین شاید بلیٹ پوزیشن تھی جو اس کی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن لیاقت حسین نے پہلی فرصت میں اس کے دو ہاتھ بھی ناکارہ کر دیے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ فائرنگ کی بے درپے آزادوں سے علاقے کا سکون بھی برباد ہو گیا تھا۔ لیے غاروں کا دونوں جانب تجارتی اور بائیں فائنٹوں سے اس جگہ کی کوہمیت سمجھنے کی خاطر تاکا جھانکی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیاقت حسین نے کار کے سامنے دین آ جانے سے پیشتر بڑی دو انٹیکس سے کام لیتے ہوئے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان ہی اطمینان تھا۔ خوف یا پریشانی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ پانچ منٹ خاموشی رہی پھر لیاقت حسین کو دوسری جانب سے لٹاکر کر کہا گیا۔

”تم چاروں طرف سے گھیر لیے گئے ہو لیاقت حسین۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں دیکھتے ہی گولی باردی جائے لیکن ہم تمہیں زندہ گرفتار کر کے لے جائیں گے۔“

”اتنا دم ختم سے تو بڑلوں کی طرح آؤ میں کیوں جیسے.....“ نظروں کا لبادہ اتار کر مردوں کی طرح سامنے آ جاؤ پھر آج یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ کون مرد ہے اور کون نامزد.....“

”پہلے تم اس کا ثبوت دو۔ پھر ہم بھی تمہاری بات سامنے سے انکار نہیں کریں گے۔“ دوسری آواز لیاقت حسین کے بائیں جانب والی عمارت سے سنائی دی۔ مطلب صاف ظاہر تھا، انہوں نے اب ایک نہیں بلکہ سوچے باندھے گئے تھے۔ شاید وہ ہر قیمت پر اسے زندہ گرفتار کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لیاقت حسین کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی ہراساں مسکراہٹ ابھری، وہ پتول نیچے کر کے سامنے آنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن اسی لمحے ایک نئی صورت حال نے اسے پریشان کر دیا..... وہ راجیلہ بیگم کا ڈرائیور تھا جسے دشمن کے دو آدمی گھسیٹے ہوئے سامنے لے آئے، ایک نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر جکڑ رکھے تھے، دوسرے کے ریوایور کی نال اس کی کٹھن پر بھی ہوئی تھی۔

”کیا کیا ارادہ ہے لیاقت حسین؟“ ریوایور والے نے لٹکارا۔ ”کیا تم اپنے ساتھی کی لاش دیکھنا پسند کر دے گے۔ صرف تین تک تمہیں سے پھر اس کا بھیجا کھوپڑی سے نکال کر تمہارے سامنے ڈال دیں گے۔“

لیاقت حسین کے چہرے پر اس وقت بھی ایک ہراساں اور انجانی مسکراہٹ ابھری لیکن دوسرے لمحے ہی وہ پتول سے سیہ تانے سامنے آ گیا، وہ بائیں ٹارنل ہی نظر آ رہا تھا، اس کے چہرے پر کئی بھی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کے سامنے آتے ہی تین اطراف سے تین اور نقاب پوش خود کار جدید قسم کی رائلٹیں لیے سامنے آ گئے۔ ایک نے لیاقت حسین سے دو قدم کے فاصلے پر رک کر اس کا

افضل خان اس وقت ہوئی کے کرے کو اندر سے لاک کے بیٹھا تھا جب شبنم کی کال موصول ہوئی۔ نئے نمبر کو دیکھ کر وہ جھجکا۔ کال ریسیور کرنے کے بعد وہ چٹکا کر شبنم نے اس کے در یافت کرنے پر ہی بتایا تھا کہ اسے انوار کرنے والوں نے پرانی سہ اپنے قبضے میں لے کر اسے نئی سہ دے دی ہے۔ یہ بات افضل خان کو ہنسنے نہیں ہو سکی۔ وہ شبنم کو یہ کہہ کر اصلی صورت حال معلوم کرنا چاہ رہا تھا جب دو آدمیوں نے اچانک اسے پیچھے سے دبوچ کر موبائل اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا پھر ان میں سے ایک نے بات کرنے کی کوشش کی..... لیکن دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا اس نے دوبارہ آنے والے نمبروں کو ملا کر بات کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی وارننگ دی تھی کہ اگر زبان نہ کھولی تو وہ افضل خان کو دوسری دنیا میں پہنچا دیں گے۔ اس مومنے پر افضل خان نے جان پر کھیل کر بلند آواز میں شبنم کو زبان کھولنے سے منع کیا تھا۔ وہ جن حالات سے دوچار تھا ان میں اسے زندگی کی امید بھی بہت کم تھی۔ جن لوگوں نے اسے کے زور پر شبنم کو انوار کیا تھا وہ اسے بھی کھانے لگانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ پہلے ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟ اسے اس بات پر بھی حیرت رہی تھی۔ جب پاس نے فوری طور پر اپارمنٹ سے چلے جانے کا حکم کیوں دیا تھا؟ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ اس وقت بھی دو آدمیوں کا دروازہ کھول کر اچانک اندر آ جانا اس کے لیے حیرت انگیز ہی تھا۔ شاید ان کے پاس ماسٹر کی یا پھر ڈی کیٹ موجود ہو۔ وہ بہر حال شبنم کو زبان بند رکھنے کی ہدایت کر چکا تھا اس لیے کہ شبنم ہی نے اسے خود بھی سے روک کر ایک بار پھر قسمت آزمائے کا موقع فراہم کیا تھا۔

اچانک اندر آنے والے کھنچے ہوئے اور غصے جیسوں کے مالک تھے، ان کے چہرہ بتا رہے تھے کہ وہ کسی قسم کے بھی مقابلے سے فوری منتفی کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ افضل خان ان دونوں کو لگا ہوں لگا ہوں میں تو دل رہا تھا، جب قدرے دروازہ قدرے سے انے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں مخاطب کیا۔

”تم اس وقت سڑکی سے بات کر رہے تھے؟“

”سوری.....“ افضل خان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں اس سلسلے میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔“

”کیا یہ آخری فیصلہ ہے؟“

”ہاں..... کم از کم اس وقت تک جب تک تم اپنا تعارف نہیں کراؤ گے۔“

”تم نے کیا اندازہ لگا لیا ہے؟“

”تمہیں میری گرائی پر نصیحت کیا گیا ہے۔ کس نے کیا ہے؟ یہ تم بتاؤ گے۔“ افضل خان نے شانے اچکا کر خود کو بے پروا دل کرنے کی کوشش کی۔

”ہم تمہاری زبان بھی کھول سکتے ہیں۔“ دوسرے نے کرخت لہجے میں کہا۔

”یہ تمہارے اختیارات کی بات ہے۔“

”تمہیں اپارمنٹ سے ہوئی شفٹ ہونے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟“ پہلے نے سوال کیا۔

”جب تمہیں میری نقل و حرکت پر مامور کیا گیا ہے تو اس کا جواب بھی تمہیں معلوم ہوگا۔“

”ہمارے ذہن میں صرف ایک نام محفوظ ہے..... شیخ حامد۔“ اس نے کچھ سوچ کر کہا پھر ”اب تمہارا کیا جواب ہوگا۔“

”یہ بات بیشتر لوگوں کے علم میں ہے کہ میں شیخ حامد ہی کے دفتر سے تعلق رکھتا ہوں۔“

”ہوں نہیں..... تھا، ہو۔“ دوسرے کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

”جب تمہیں تفصیل معلوم ہے تو مہر و مت کیوں ضائع کر رہے ہو۔“ افضل خان نے بہ دستور عقلا انداز میں جواب دیا۔

”کیا تمہیں علم ہے کہ تمہاری ساتھی لڑکی کو کن لوگوں نے اور کس مقصد سے انوار کیا ہے؟“

”اس کا علم بھی تم دونوں کو بہتر ہوگا۔“

افضل خان کا جواب سن کر دوسرا آدمی آگے بڑھا تھا لیکن اس کے ساتھی نے اسے روک دیا۔

”اتنی جلد بازی نہ کرو۔“ میں اوپر سے معلوم کرتا ہوں کہ اس کی زبان کھولنے کی خاطر کون سا نسخہ زیادہ کارآمد ہوگا۔“ پھر اس نے موبائل نکال کر کسی کا نمبر ملا یا۔ دوسری جانب سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے افضل خان کو احتیاط سے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ ”یہ تمہیں ہمارے سوالات کے شرافت سے جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ کیا سلوک کیا جائے؟“

”ہم نے کوشش کی تھی لیکن اس نے بلند آواز میں لڑکی کو زبان بند رکھنے کی تاکید کر دی تھی۔ یہ ظاہر ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔“ خشک ہے، ہم اس کو تنبیہ کر دیتے ہیں لیکن اس نے عمل نہ کیا تو؟“

”اوکے۔“ کون کرنے والے نے موبائل آف کر کے افضل خان کو سخت لہجے میں مخاطب کیا۔

”فی الحال تمہاری جان بچ گئی ہے لیکن بہت زیادہ ڈھیل دینے کے اصول کے بھی خلاف ہیں..... تمہیں ہمارے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنی ہوگی۔ اوپر سے فوری طور پر بھی حکم ملا ہے۔“

”زبان بند رکھنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ افضل کان نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

”ہم اس وقت جا رہے ہیں لیکن تم سے بہت زیادہ دور بھی نہیں رہیں گے، ہمارے جانے کے بعد اگر کوئی آئے تو اس سے ہمارے بارے میں کچھ نہیں ہو گے۔“

”تم شاید میرے ساتھ چھپے اور اپنی والا کھیل کھیل رہے ہو؟“ افضل خان مسکرایا۔ ”جب میں تمہارے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تو.....“

”نکواس مت کرو۔“ دوسرے کے چہرہ پھر خراب ہونے لگے۔ ”جتنا کہا جا رہا ہے صرف اسی کو کان کھول کر سن۔“

اس بار افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں اسے کچھ دیر گھورنے کے بعد واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد افضل خان نے دوبارہ کرے کو اندر سے لاک کیا۔ اس کا ذہن ان دونوں کے بارے میں کوئی آخری نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس کو موبائل پر منگنل ملا، کمرے سے جاتے وقت اس کا موبائل اسے واپس کر دیا گیا تھا جس پر اسے حیرت بھی ہوئی تھی۔

سکتل ملنے کے بعد اس نے موبائل پر روشن خبروں کو غور سے دیکھا، وہ اس کے جانے پہچانے نہیں تھے۔ "شاید اب اسے دوسری طرح آزمانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔" یہ سوچ کر اس نے لائن کاٹ دی لیکن ایک منٹ بعد ہی دوبارہ کال کی گئی، اس بار بھی وہی نمبر اسکرین پر نظر آ رہے تھے۔ افضل خان نے کچھ لمبے سوچ کر موبائل آن کر کے کانوں سے لگا لیا۔

"ہیلو....." اس نے ساٹ لہجے میں کہا۔

"تم نے پہلی کال کیوں کاٹ دی تھی؟ کیا اس وقت بھی کوئی کمرے میں موجود تھا؟"

"تم کون پل رہے ہو.....؟" اس نے تنبیہ کی سے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے ڈبل ٹی کا ریفرس ہی کافی ہوگا....." دوسری جانب سے مختصر ا کہا گیا۔ "میں اسی کا نمائندہ پل رہا ہوں۔"

"کیا جانتا چاہتے ہو.....؟"

"کچھ دیر قبل تمہارے کمرے میں جو دو آدمی آئے تھے وہ کون تھے.....؟"

"تمہاری طرح میں ان سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہوں..... ممکن ہے انہیں بھی میری گھرائی پر تعینات کیا گیا ہو۔" افضل خان نے گول مول جواب دیا۔

"چند مخصوص حالات میں مجھے بلیک ٹانگیر کا حوالہ استعمال کرنے کی بھی اجازت ہے..... اب کیا کہو گے؟"

افضل خان، بلیک ٹانگیر کے حوالے پر چٹکا۔ اس نے بکھٹ تنبیہ کی اختیار کرتے ہوئے۔ "اب میں تم سے کل کر بات کر سکتا ہوں۔ وہ دونوں کون تھے؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں کسی سادہ لباس والے ہوں۔"

"ہمارے دشمنوں کی بھی کال چلی ہو سکتی ہے..... تمہاری ان سے کیا بات ہوئی تھی؟"

"وہ شبنم کے بارے میں میری زبان کھلوانا چاہتے تھے لیکن میں نے زبان نہیں کھولی۔ وہ دوبارہ آنے کو کہہ گئے ہیں۔" افضل خان نے دیدہ دانش خنبری طرف سے کی جانی والی کال کا تذکرہ کیے بغیر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "کسی سرفز کی ہدایت کی روشنی میں وہ میرا موبائل واپس کر کے چلے گئے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ تاکید کی ہے کہ میں ان کا تذکرہ بھی کسی اور سے نہ کروں۔"

"اوہ..... ایسی صورت میں تم میری کال ختم ہوئی ہے اس کال کے تمام کوائف ڈیلیٹ کر دیتا....." تنبیہ کی سے کہا گیا۔ "ان کوئی احوال نہ ملے گی کوشش کرو۔ میں ایک دو روز میں ان کا کھوج بھی نکال لوں گا۔"

پھر اس سے پیشتر کہ افضل خان کو کوئی اور بات کرنا کال منقطع کر دی گئی، اس نے ہدایت کے عین مطابق پہلی فرمت میں اس کال کے تمام کوائف ڈیلیٹ کرنے میں بھی خاصی محنت کا مظاہرہ کیا تھا۔

ایس بی اورنگ زیب کے موقع واردات پر پہنچنے کے بعد محققہ تھانے کا عملہ اور پولیس فورس کی کچھ اور گاڑیاں بھی پہنچ گئیں۔ اورنگ زیب کی ہدایت پر سڑک پر دونوں سمت پولیس تعینات کر کے راستے بلاک کر دیئے گئے۔ علاقے کے لوگوں نے بھی قانون نافذ کرنے والے مختلف اداروں کو فون پر اس خونی گھراؤ کی اطلاع دی تھی جس میں سات آٹھ انسانی قتل کی کہانی بھی سنائی تھی۔

پیشین کو کنٹرول کرنے کے بعد اورنگ زیب نے سب سے پیشتر لیاقت حسین کا ہاتھ قہام کر اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ پھر علاقہ پولیس کے اسپیکر کو ایک طرف کھڑے ہو کر کارروائی کے مختلف پہلوؤں پر بریفنگ دینے لگا۔

"جس بندے کو میں نے اپنی گاڑی میں بٹھایا ہے وہ میرا ذاتی واقف کار ہے۔ حادثے کی اطلاع اسی نے مجھے دی تھی میں نہیں چاہتا کہ اس کا نام کسی بھی طرح درمیان میں آئے ورنہ کچھ جانے پہچانے مجرم بھی چھوٹا ہو جائیں گے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو بھی کسی نامعلوم فرد کی طرف سے فون کر کے اطلاع ملی تھی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں سر....." اسپیکر نے کہا۔ "سب کچھ آپ کی ہدایت کی روشنی میں ہوگا۔"

"جو لاشیں نکھری پڑی ہیں وہ یقیناً پولیس کو مطلوبہ مجرموں کی ہوں گی جن کو ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔"

"سر..... کیا آپ کو اس قسم کے کسی مقابلے کی توقع پہلے سے تھی؟"

"نہیں..... اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس واردات کی پشت پر کس کا ہاتھ ہے۔" اورنگ زیب نے سر لہجے میں اعتراف کیا۔ "جو آدمی میرے ساتھ جائے گا وہ اسی کے جان کے دشمن تھے۔"

"ایسی صورت میں تو میرا خیال ہے کہ آپ اگر اس کا تحریری بیان لے لیں تو....."

"نہیں..... لیال جی میں اس کا نام کسی صورت درمیان میں نہیں لانا چاہتا۔"

"فہم آئے گا سر..... لیکن جن لوگوں نے یہ معاملہ ڈراما ایچ کیا ہے وہ تو جانتے ہوں گے؟"

"ہاں..... اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ان کو آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔" اورنگ زیب نے قدرے درخت لہجے میں جواب دیا پھر کچھ توقف سے بولا۔

"کوشش کیجیے گا کہ میڈم کے لوگ بھی مرنے والوں کی تصاویر نہ بنا سکیں۔"

”او کے سر..... میں اپنی ہی کوشش ضرور کروں گا۔“

”آپ ضروری کارروائی کے بعد لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیں..... مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آپ کی تمام کافذی کارروائی کی رپورٹ مل کر پختہ شکل تک پہنچانے کی ضرورت ہوگی..... ممکن ہو تو مرنے والوں کی ہسٹری بھی معلوم کر کے اپنی رپورٹ کے ساتھ مجھے پہنچا دیں اس کے بعد ہی میں آپ کو کسی جوابی کارروائی کے لیے مزید ضروری کارروائی دے سکوں گا۔“

”سر.....“ انسپکٹر نے اورنگ زیب کی بات پوری طرح سمجھنے کے بعد دبی زبان میں کہا۔ ”کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ اس مجرم کو بھی فوری طور پر حراست میں لے لیں جو اس حادثے کا ذمے دار ہے۔“

”آپ کا مشورہ قانون کے عین مطابق ہے لیکن.....“ اورنگ زیب نے ہونٹ کانٹے ہوئے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”اس کو حراست میں لینے کا خواب انہی ہمارے اہل افسران اور عہدیدار بھی نہیں دیکھ سکتے۔“

”آئی سی۔“ انسپکٹر نے جرت کا اظہار کیا پھر وہ ضروری کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ لیاقت حسین نے حملہ کرنے والے جس نقاب پوش کو زندہ چھوڑ دیا تھا وہ مردوں سے بھی بدتر حالت سے دو چار تھا۔ سب سے پہلے اس کی تصاویر لی گئیں پھر اورنگ زیب نے ایک سب انسپکٹر کو قریب بلا کر ہدایت دی۔ ”اسے ایجو لینس میں ڈال کر تھانے پہنچا دیں میں بھی ادھر آ رہا ہوں۔“

”جو حکم سر.....“ انسپکٹر سے کہہ دیں کہ اس ذبحی کا شمار بھی قتل اذوت قریب المرگ لوگوں میں لکھ لیں۔“ اورنگ زیب نے ذبحی کو حراست بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ حضرات کارروائی جاری رکھیے میں آدھے گھنٹے بعد تھانے پہنچ جاؤں گا کوئی ضروری مشورہ یا کارروائی درکار نہ ہو تو بلا کر رابطہ کر لیں۔“

”راست سر.....“ ماتحتوں کو ضروری ہدایتیں دینے کے بعد وہ اپنی گاڑی کی سمت گھوما تو اس کی نظریں سیٹھ حٹان کی گاڑی پر پڑی ایک لمحے کو اس نے رک کر کچھ سوچا پھر سب انسپکٹر کو دوبار قریب بلا کر کہا۔ ”آپ کو ایک زحمت اور دے رہا ہوں۔“ اس نے مطلبے کا رکی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کو کسی طرح ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی قیام گاہ تک پہنچا دیں اس کا حوالہ بھی درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔“

سب انسپکٹر سے فارغ ہو کر وہ اپنی گاڑی میں آ گیا۔ لیاقت حسین اگلی نشست پر گم صم بیٹھا باہر کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ اورنگ زیب نے گاڑی اشارت کر کے واپسی کے لیے موڑ دی۔ موج واردات سے کچھ دور آنے کے بعد اس نے لیاقت حسین کو بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

”تم سوج میں گم ہو؟“

”میں مگر پر لیتا ایک ذاتی مسئلے پر غور کر رہا تھا صاحب پھر..... آپ کے ساتھ اس وقت گاڑی میں کس طرح آ گیا؟“

لیاقت حسین کے چہرے سے عیاں الجھن اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ غلط بھی نہیں ہے۔ اورنگ زیب اپنی نشست پر کسسا کر رہ گیا عام حالات میں شاید وہ لیاقت حسین کے جواب کو تسلیم نہ کرتا مگر سراج بھی اسے بتا چکا تھا کہ کوئی روحانی قوت ایسی ہے جو لیاقت حسین کی رہنمائی کرتی ہے وہ اس قوت کے تحت جو مل کر رہا ہے اس کے عمل ہو جانے کے بعد گزری ہوئی باتیں اس کے ذہن سے بخوبی یاد آتی ہیں جس کا اثر وہ ذاتی طور پر لے کر لکھتا رہتا ہے۔ سراج نے اورنگ زیب سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ لیاقت حسین کو اس مسئلے پر زیادہ نہ کریدے چناں چہ اس وقت بھی اورنگ زیب نے لیاقت حسین کے جواب پر کسی رد عمل کا اظہار کرنے کے بجائے دوستانہ اعزاز میں کہا۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ لے آیا تھا مگر..... تم شاید ابھی تک اپنے ذاتی مسئلے پر غور کرنے میں مصروف ہو؟“

”صاحب..... آپ مجھے قتل تو نہیں دے رہے ہیں؟“ لیاقت حسین نے دبی زبان میں سوال کیا۔

”جہیں یہ خیال کیوں آ رہا ہے کہ میں غلط بھائی کر رہا ہوں؟“

”وہ..... وہ.....“ لیاقت حسین نے گھڑبڑا کر کہا۔

”دراصل میں اکثر کچھ باتیں بھول جاتا ہوں۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے جس کا اعزاز مجھے سراج صاحب کی باتوں سے بھی ہو چکا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے صاحب؟“

”اس لیے کہ تم ضرورت سے زیادہ وقار اور عقل ہو۔“

”آ..... آپ اس وقت مجھے ساتھ کیوں لائے تھے؟“ لیاقت نے دوسرے اعزاز میں خود کو تکی دینے کی خاطر سوال کیا۔ ”میرا مطلب ہے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”ذہن پر زور نہ دو۔“ اورنگ زیب نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے ایک حادثے کی رپورٹ ملی تھی میں اس وقت سراج کے پاس تھا۔ آنے سے پہلے دوسراٹ کی خاطر ہمیں بھی ساتھ لے آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ تم اس وقت گہری نیند میں تھے شاید اسی لیے ہمیں یاد نہیں کچھ دیر بعد منگ ہے کہ نیند کا غمار اتارنے کے بعد ہمیں یاد آ جائے۔“

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس جواب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا اورنگ زیب نے اس کی کیفیت محسوس کر کے گفتگو کا رخ بدل کر پوچھا۔

”تمہاری بیوی شاید آج کل اپنے گھر گئی ہوئی ہے؟“

”جی ہاں صاحب..... اس کے ایک قریبی رشتے دار کی موت ہو گئی تھی اس لیے اس کا جانا

اہم تھلا؟“ قمریہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”براہ راست نہیں تھا، لیکن وہ کسی ضرورت کے وقت کام آسکتے تھے۔“ میڈم نے سنبھل کر جواب دیا بھربرات بدل کر بولی۔ ”اس وقت تمہیں شاید یہ سبھی ضروری کام ہے ورنہ عام طور پر تم میری اسٹڈی میں کم ہی آتی ہو۔“

”آپ کا اعزاز غلط نہیں ہے۔“ قمریہ نے غصہ لہجے میں متھکو کا آغاز کیا۔ ”پر سٹل سیکریٹری ہونے کی حیثیت سے میرا فرض بھی ہے کہ آپ کے تمام دیکھ سکے گا خیال رکھوں۔“

”ہاں۔ اور تمہیں یہ اعزاز بھی ہوگا کہ میں تمہیں پر سٹل سیکریٹری کے علاوہ اپنا راز دار بھی سمجھتی ہوں۔“ میڈم روہنی نے مزید وضاحت کرنے کے بعد بے تکلفی سے پوچھا۔ ”تو کیا بات ہے؟“

”جگ باس کے بھٹکے پر چمکے کے ساقیوں کا حملہ آپ ہی کے اشارے پر ہوا تھا میں نے بھی جانتی ہوں کہ آپ نے براہ راست چمکے کے بات نہیں کی تاہم کے بعد میں نے ہی اونچن کے ذریعے اسے پیغام بھیجا تھا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ چمکے نے اس بار اس حملے کا کوئی حوالہ نہیں لیا۔“ قمریہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”معاوضہ نہ لینے کی وجہ میرے علم میں ہے۔ جگ باس کے خیال میں بلکہ ٹانگیر کی موت میں چمکے کے آدمیوں کو قتل رہا ہوگا۔ اس لیے کہ بلکہ ٹانگیر نے ہم کو وہیں دیکھا تھا۔ ہاں تاہم کی خوشخبری کا معاملہ تو اسے بھی میں نے ہی آپ کی ہدایت پر کڑو سیون اسٹار کے حوالے سے احکامات جاری کیے تھے۔“

”مجھے تمام باتوں کا علم ہے۔ تم اس وقت کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میڈم نے وضاحت طلب لہجے میں قمریہ کو مخاطب کیا۔

”ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی بات اور ہے میڈم۔“ قمریہ سے بڑے غلوں سے سمجھانے والا انداز اختیار کیا۔

”اس نے آپ کے ساتھ احسان کیا تھا لیکن ہر پولیس آفیسر پر اعتماد کرنا میرے خیال میں واقعی ہندی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی دوستی اور دشمنی دونوں ہی انگریزیت منگی ثابت ہوتی ہے۔“

”تمہارا اشارہ غالباً اس کی اپنی اورنگ زیب کی طرف ہے؟“

”میں انکار نہیں کروں گی۔“ قمریہ نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”آج اس کی اپنی اورنگ زیب اپنی ذاتی رجحان کی وجہ سے جگ باس کے خلاف ہے۔ اس نے سراج کے توسط سے آپ کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا کر آپ کو چمکے کے ذریعے جگ باس کی رہائش گاہ پر حملے کی خاطر اپنے مفاد میں استعمال کیا، لیکن کل اپنا متعطل کل جانے کے بعد ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناتے وہ آپ سے چمکے کے بارے میں محو جوش بھی کر سکتا ہے۔“

”میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔“ میڈم نے کسمار کہا۔ ”لیکن اس سراج نے اس کی اپنی اورنگ زیب کو میرے حوالے سے کہہ بتایا ہوگا تو مجھ کو سمجھ کر ہی بتایا ہوگا۔“

”میں نے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ حالات کے چرچ نظر کوئی بھی ذمہ دار پولیس آفیسر

ضروری تھا۔“

”تم ساتھ کیوں نہیں گئے۔۔۔۔۔؟“

”میں۔۔۔۔۔۔ میں سراج صاحب کو کچھ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا صاحب! ان کے بڑے احسان ہیں مجھ پر۔“ کیاقت حسین نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”جب وہ میری ضرورت کا ہر طرح خیال رکھتے ہیں تو میں انہیں بھاری کی حالت میں چھوڑ کر کیسے چلا جاتا۔“

”پیو کو واپس لینے کو جاؤ گے؟“

”سراج صاحب سے اجازت مل ہی تو جاؤں گا صاحب۔“

”کیا مطلب؟“ اورنگ زیب نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”انہوں نے آج ہی مجھ کو تانگیر کی جگہ میں ان کی اجازت کے بغیر مگر سے باہر بھی نہ نکلوں۔ کوئی سربراہ دشمن ان کے علاوہ مجھے بھی نقصان پہنچانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ میں ان کے حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔“

”مگر۔۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ کچھ دیر بعد تمہارے ذہن سے خنجر کا شمارازے کا تو جب باتیں تمہیں یاد آ جائیں گی۔“

کیاقت حسین نے تجسس بھری نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھا، لیکن کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اورنگ زیب نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اس کا ذہن اس دشمن کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کے لیے تھوڑی جتنی کے بعد کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کیاقت حسین کے آخری جواب کی روشنی میں یہ بات بھی مزید واضح تھی کہ اس کو راستے سے ہٹانے کی خاطر دشمنوں نے گھبرنے کی کوشش کی ہو گی لیکن کسی روحانی قوت کے کھٹنے نے ان کی بسا پلٹ دی تھی۔ سراج کی سٹائی ہوئی کہانیوں کے مطابق پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔



ناشتے سے فارغ ہو کر میڈم روہنی اپنے اسٹڈی میں آ کر کچھ قانون کو الٹ پلٹ دیکھی تھی جب دروازے پر دسک نہ کر پوچھا۔ ”کون ہے۔۔۔۔۔؟“ پھر دسک کی آواز سن کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ فائیکس اس وقت بھی اس کے سامنے میز پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ کسی خاص فائل کی تلاش میں ہے۔

”کیا بات ہے میڈم۔؟“ قمریہ نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر دریافت کیا۔ ”کہا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“

”ہو سکتا ہے کہ وہ فائل میں نے اپنے بیڈ روم کے لا کر رکھ دی ہو۔“ میڈم نے سرسری طور پر جواب دیا پھر قانون کو ایک طرف ہٹا کر کسی کی پشت سے ٹک لگائی۔

”کوئی خاص فائل نہیں تھی۔“ میرے ایک دو پر سٹل یلوتے جوت اس وقت مجھے یاد آ گئے تھے۔ ”کیا ان کا تعلق بھی کچھ موجودہ حالات سے ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کچھ حادثے متعلق کوئی

”ٹھیک ہے..... تم اگر یہی مناسب سمجھتی ہو تو بلا دو.....“ میڈم نے سپاٹ لیجے میں جواب دیا۔
 ”بہت دنوں سے کوچن اور ڈومبار پکارتے ہیں..... کیا انہیں واپس بھیج دیا جائے؟“
 ”نہیں.....“ میڈم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”میں انہیں ایک آخری بار اور استمال کرنا چاہتی ہوں۔ جہیں کل تک اس پروگرام سے بھی مطلع کر دوں گی۔“
 قمریہ جانے کے ارادے سے اُٹھی تو میڈم نے اسے روک کر کہا۔
 ”جہلی ملاقات میں تم اشاروں کتابوں میں بھی آغا منظور کو گھر بلانے کے بارے میں کچھ نہیں کہو گی۔“

”اتنا میں بھی سمجھتی ہوں کہ ہمیں دوسرا قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔ میز پر ایک ساتھ بیٹھیں گے تو یہی اعزاز ہو جائے گا کہ خود آغا منظور بھی اس دھوکے کو کس ہیں منظر میں دیکھتا ہے۔“ قمریہ نے بڑے سنجے ہوئے اعزاز میں دور اندیشی کی بات کی پر قدم اٹھانی اسٹری سے نکل گئی۔



لباقت حسین کو سراج کے مکان پر چھوڑنے کے بعد اورنگ زیب نے سرسری طور پر سراج کو مختصر واقعات سے آگاہ کیا۔ پھر مدبرانہ ملاحظہ تھا نے پچھلے سب انکسپلر کو اس کمرے تک لے گیا جہاں دُئی مجرم جگہ فرش پر بڑا کراہ رہا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کو دیکھا تو تڑپ کو بلا۔
 ”میرے پاؤں پھلے بندھے ہیں۔ رکھو لیکن ہاتھ کھول دو تاکہ اپنے دھوکوں کو کھاسکوں۔“
 ”میں اسکیا ہوں اب تمہاری گلجی بھی دور ہو جائے گی۔“ اورنگ زیب کے اشارے پر کمرے کو اندر سے بند کر دیا گیا۔ ٹیارہ چر کرنے والے دستکدار اور تجربے کار سپاہی کمرے میں آکر کھڑے ہوئے۔ سب انکسپلر بھی موجود رہا۔

”جس آدمی نے تمہارے آدمیوں کو تنہا بھون ڈالا تھا وہ تمہاری آتی جاتی سانسوں کو بھی قتم کر سکتا تھا۔ لیکن تم نے زبان کھولنے کا وعدہ کر کے وقتی طور پر زندگی کی جھپک مانگی تھی جو تمہیں مل گئی۔ اب کیا ارادہ ہے؟“ اورنگ زیب نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔ ”زندگی یا موت.....“
 ”میں تم سے انکیلے میں بات کرنا پسند کروں گا۔“ دُئی نے ہونٹوں کے سامنے ہتھے خون کے لہجوں کو ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ ”کیوں.....؟ اس کی وجہ تم بھی جانتے ہو گے۔“

اورنگ زیب نے دُئی کو غور سے دیکھا۔ پھر اس نے سب انکسپلر سیٹ سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ کراخانی ہونے کے بعد دُئی نے کراچے ہوئے کہا۔ ”مجھے زندگی کی کوئی تنہا بھی نہیں ہے لیکن کوئی وجہ بھی جو میں نے زندگی کی جھپک مانگی تھی۔“
 ”پھر کچھ..... سیدھی طرح میرے سوالات کے جواب دو۔“ اورنگ زیب نے بگڑتے ہوئے حیرت سے اسے مخاطب کیا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”تم نیزگی کھر ہو۔ یہ بات ہمارے بڑوں کو بھی معلوم ہے۔“ دُئی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

کسی آڑے وقت میں ہمارے کام آسکتا ہے۔“ قمریہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس ضمن میں کیا میں آپ سے ذاتی سوال کر سکتی ہوں۔“
 ”میں نے تمہیں ہر قسم کا اختیار دے رکھا ہے۔“ میڈم نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ ”کیا معلوم کرنا چاہتی ہو؟“
 ”ذاتی ہی آغا منظور کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟“
 ”میں بھی نہیں.....“

”ٹھیک ہے اسے انتقام لینے کی خاطر آپ نے افضل خان کو اجازت میں لینے کی خاطر بہت بڑی پیش کش کی تھی۔“ قمریہ نے دلی زبان میں اپنا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی۔ ”کیا افضل خان کے مقابلے میں جو آپ کے احماد کو دھوکا دینے پر مل گیا تھا..... آپ آغا منظور کو اجازت میں نہیں لے سکتیں۔ جبکہ یہ بات آپ کے علم میں بھی ہے وہ آپ کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ مسٹر سراج بھی اس ضمن میں آپ کو اشارہ دے چکے ہیں۔“

میڈم نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ قمریہ کا متعقد سمجھنے کے بعد اس نے ایک سرد آہ بھری۔ کچھ دیر غلامی دیکھتی رہی پھر بڑے اعتماد سے دلی زبان میں کہا۔

”قمریہ..... مائی ڈیزیزم اس راز سے واقف ہو کر میں اپنے مرحوم شوہر کے قاتل سے انتقام لینے کی خاطر ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ افضل خان کو بھی کام کا آدمی سمجھ کر میں نے ایک جوا کیلا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے..... اس کے علاوہ ایک عورت کیا ایک بار دھوکا کھانے کے بعد اپنے مستقبل کے بارے میں کسی دوسرے مرد کے سامنے بھی زبان کھول سکتی ہے.....؟ اس کے ساتھ ہی ابھی یہ بات بھی پوری طرح واضح نہیں ہے کہ آغا منظور کس حد تک بگ باں کی فحشی مول لے سکتا ہے..... مسٹر سراج نے یہ ضرور کہا ہے کہ اب وہ بھی تنگ آمد ہے جبکہ آمد کے فارمولے پر عمل کرنے پر آمادہ ہے۔ لیکن کیا میرا براہ راست اس سے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں مکمل کر بات کرنا مناسب ہو گا؟“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں کسی دن کسی بہانے سے اسے یہاں کھانے پر بلانے کی کوشش کروں۔“
 ”کیا تمہارا کرو گی؟“

”جہلی جاب جاب مسٹر سراج نے آپ کو افضل خان کی بلڈنگ کے باہر والے ناخوشگوار واقعے سے محفوظ کیا تھا۔ اس وقت وہ آغا منظور بھی یہاں ہے۔ آپ کی عمرانی پر مامور تھا۔ لباقاقت حسین مجاہد وعدہ یں کر سامنے آ گیا۔ اب مسٹر سراج بھی ہم بلاست کے سبب ہنس پر ہیں اور لباقاقت حسین پر بھی قاتلانہ حملے کی اطلاع آپ کو سراج سے مل چکی ہے۔ ہم ان تمام مضموعات پر بھی بات کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسے کے بعد اور بھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ اس طرح آپ کو بھی آغا منظور کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع میسر آ جائے گا۔“

دیا۔ ”میں بھی جانتا ہوں کہ اگر میں نے زبان کو بلی یا بند رکھی۔ دونوں ہی صورتوں میں مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا شاید۔ اسی لیے میں نے وقتی طور پر کسی مصلحت سے زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ اسے میری بڑی سے تعمیر نہ دیتا۔“

اورنگ زیب نے اسے تھوٹھوں سے گھورا۔ کچھ توقف سے بولا۔ ”تم نے تمہاری بات کرنے کی شرط کیوں لگائی تھی؟“

”کالی بیٹریں ہمارے قاصدین میں بھی ہیں۔“ زفی نے پھر منہ صاف کرنے کی خاطر فرش پر تھوک کر کہا۔

”تمہارے لوگ بھی لوٹ کی گڈیوں کی خوشبو سگھ کر انیمان بچ دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کی تعداد ہم سے زیادہ ہے۔“

”اب کیا کہنا جاوے گا؟“

”جو سامنے سر کیٹے ہیں ان میں میرا نام بھی شامل کرادو۔۔۔۔۔ اس کے بعد جب تک میری سانس چل رہی ہے تم کو مجھے کسی ایسی جگہ رکھنا ہوگا کہ ہمارے کسی بڑوں کو بھی میری زندگی کی بھیک نہ ملے۔“

”تم کس کے لیے کام کرتے ہو۔۔۔۔۔؟“

”جس کو بولی سب سے زیادہ۔۔۔۔۔“ زفی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر کر تھیں

میں تبدیل ہوئی۔ ”جو قانون کی نظروں میں انعام یافتہ قرار دے دیا جائے پھر ضرورت مندوں میں اس کی بولی بھی چڑھ جاتی ہے۔“

”میں نے کہا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔“ اورنگ زیب نے ایک بار پھر بگڑے ہوئے حیرے اسے اپنی حیثیت اور میری وقت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”آرام سے بات کرو آفیسر۔ میں بھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے کسی مصلحت کی وجہ سے زندگی طلب کی تھی۔“ زفی کے حیرے بدلتے گئے۔ ”کہ تمہارے پاس میری بات سننے کے لیے وقت نہیں ہے تو پھر اپنے آدم خور کتوں کو دوبارہ اندر بلا لو۔ میں اب تم سے نرم یا زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔“

اورنگ زیب تھلا کر رہ گیا۔ لیکن اس کی تجربے کا نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ زفی کی باتوں کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کمرے میں کچھ دیر موت کا سناٹا طاری رہا پھر اورنگ زیب نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

”کھل کر بات کرو۔۔۔۔۔ لیکن وقت کا خیال بھی رکھو نہ ایک بار پولیس کی فائل رپورٹ تیار ہو جائے تو اس میں رد و بدل کی گنجائش بھی بہت کم رہ جاتی ہے۔“

”جانتا ہوں۔۔۔۔۔“ زفی نے کراہ کر کہا پھر اورنگ زیب کی نظروں میں نظریں ڈال کر ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”میں کسی کی موت کی خبر سننے تک زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ جس دن تم مجھے اس کی سانس

اٹھانے کی خوشخبری سنانا اس دن مجھے تعویذ سنا کر ہر اہم کر دیتا۔ میں ثابت کر دوں گا کہ مردوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔“

”کسی کی موت کی خوشخبری سننا چاہتے ہو؟“

”وہی جس نے لیاقت حسین کے دلچھ وارنٹ جاری کیے تھے۔۔۔۔۔ وہ وہ تمہارے ساتھ بھی بہت جلد کوئی آخری معرکہ کرنے کے بارے میں غور کر رہا ہے۔“ زفی نے مسکرا کر کہا۔ ”تم بھی اس کا نام جانتے ہو آفیسر۔“

”تمہاری زبان اس کا نام لیتے ہوئے کیوں لرز رہی ہے؟“ اورنگ زیب نے جھلا کر دریافت کیا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں صبح حادہ کی بات کر رہا ہوں آفیسر۔ جس نے تمہارے جھگے کی بڑی بڑی کرسیوں کو منہ مانگے داموں خرید کر رکھا ہے۔ کیا تم انکار کر دو گے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب کے چہرے پر آنکھوں کا نام سننے کے بعد ایک رنگ آکر گزر گیا۔

”مجھے تمہارا کھرا جواب سن کر خوشی ہوئی۔“ زفی کی آنکھیں کسی ہیچ سے چمکنے لگیں۔

”تم نے جس مگر پچھ کا نام لیا ہے وہ خود سامنے نہیں آتا۔“ اورنگ زیب نے زفی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اپنے خریدے ہوئے تجربوں کو آگ میں جھونکتا رہتا ہے۔ تم ان لوگوں کے نام سے بھی ضرور واقف ہو گے۔“

”سب کے ناموں سے کوئی واقف نہیں ہوتا لیکن میں دو تین نام ضرور جانتا ہوں۔“ زفی نے رد کی شدت سے کراہ کر کہا۔ ”جو اس کا سب سے قابل احترام و مہرہ تھا اسے ہمارے مطلقوں میں بھی بلک ٹائیکر کے نام سے پہچانا جاتا ہے لیکن تم بھی جانتے ہو کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“

”اسپورٹس کار میں مارا گیا تھا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن اس کی موت حادثہ نہیں تھی۔ کسی نے اس حادثے سے قبل اسے شوٹ کر دیا تھا مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے۔ تفصیل تم جانتے ہو گے۔“

”ہائی دو تین کون کون تھا؟“

”تین نہیں۔۔۔۔۔ میں صرف دو کے نام جانتا ہوں۔“

زفی نے کھٹکا کر ٹھوٹے ہوئے جواب دیا۔ ”بلک ٹائیکر کی جگہ کس کو بلی یہ مجھے نہیں معلوم لیکن اس وقت راجوئی شخص کی گڈی اونچی اڑ رہی ہے۔ وہ تمہارے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ لیکن تم۔۔۔۔۔ تم بھی کسی اونچی کرسی سے ملنے والے صخر پر اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ میں نے غلط تو نہیں کہا۔“ آخری جملہ ادا کر کے وقت زفی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھی ابھر آئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہوا تھا مگر میں نے بھی اس قسم کی بڑی بڑی کچھ سوچ سمجھ کر کی تھی۔“ اورنگ زیب نے بھی جواب میں مسکرا کر کہا۔ ”تم راجو کی موت کی خبر بھی جلد سن لو گے۔ میں نے بھی جکی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔“

”میں سمجھتا ہوں سر..... آپ کے حکم کے خلاف درزی نہیں ہوگی۔“

سب آپکٹر کے جانے کے بعد اورنگ زیب نے دوبارہ اندر آ کر کمرہ بند کیا پھر آپکٹر کو فون کر کے زخمی کو مردہ ظاہر کرنے کے سلسلے میں ضروری ہدایتیں دینے لگا۔ مینٹ بعد ایوبینس آنے کی اطلاع ملی تو اورنگ زیب نے کمرے کے دروازہ دوبارہ کھول دیا۔ دروازے پر موجود دو بھٹی اس کے اشارے پر اندر آ گئے۔ زخمی نے اپنی آنکھیں بند کر کے نہ صرف سارا جسم اکڑا لیا بلکہ سانسیں بھی روک لی تھیں۔



پتہ تھا کہ وہ فرنج کٹ ڈاڑھی والا جس فوراً سار ہوئی کے گیسٹ لارڈج میں بیٹھائی دی دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ صبح حامد کے مین آفس سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ فرنج کٹ ڈاڑھی کے علاوہ اس کے چہرے پر ناک سے ذرا نیچے بائیں جانب والا سیاہ لہجی اس کی گندی رنگت کو اور اجاگر کر رہا تھا۔ اس نے اس وقت اسی قسم کا اسپرنگ لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جو عام طور سے گولف کھیلنے والے کھلاڑی پہنتے ہیں۔ آنکھوں پر مونے فریم کی عینک اس کے چہرے پر بے حد خوشنما نظر آ رہی تھی۔ جس اٹھناک سے وہ نی دی دیکھ رہا تھا اس سے بظاہر بھی اعزازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس فرصت ہی فرصت ہے۔ اس کے قریب ہی ایک سنہری بیگ بھی موجود تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے دس گھنٹے کا تھا۔

ٹھیک دس بج کر پینتالیس منٹ پر فرنج کٹ ڈاڑھی والے کا موبائل واہیر بیٹ ہوا تو اس نے فوراً ہی اسکرین پر نمبر دیکھ کر اسے آن کر لیا۔ ”ہیلو..... کیا پروگرام ہے.....؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر دہلی زبان میں پوچھا۔

”میں گیسٹ تھرو کے باہر سیاہ رنگ کی دین میں موجود ہوں اس پر ایک کوریئرز دس کا نام لکھا ہو گا۔ آ کر پچھلے حصے میں بیٹھ جانا پھر پروگرام بھی فائل کر لیں گے۔ دین کے ڈرائیور سے کوئی بات مت کرنا۔“

”اوکے.....“ فرنج کٹ ڈاڑھی والے نے جو لوہن کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ موبائل آف کیا۔ سنری بیگ اٹھا کر کانٹھوں سے لٹکا یا پھر گیسٹ تھرو کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ پانچ منٹ بعد وہ باہر نکلا۔ سیاہ دین سامنے ہی پارک تھی وہ خاموشی سے دین کی پشت پر گیا۔ شاید اسے اتار دیکھ لیا گیا تھا جو پشت کا دروازہ کھول دیا گیا لوہن خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ پچھلے حصے میں سر تاپا سیاہ چست لباس میں موجود شخص ڈوما تھا جس نے سیاہ دین کے حرکت میں آنے کے بعد لوہن سے تنجیدگی کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔

”جیہیں سیون اسٹار کی جانب سے کوئی نئی ہدایت تو نہیں ملی؟“

”نہیں.....“ لوہن نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میں صرف مین آفس کو تہاہ کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ پوری عمارت

”ایسی بات نہیں ہے آفیسر.....“ زخمی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”اوپر تک نکلتی ہو اور پیچھے کھڑا مضبوط ہو تو بچی کو لایاں بھی پکچ ہو جاتی ہیں۔ تم لوگ بھی ہم پر ای سے لے جاتے ہیں ڈالتے کہ ہمارے گرد گھٹال کا گھونٹا بھی مضبوط ہے“ لیکن ایک مشورہ میرا بھی سن لو..... راجو کی موت ہمارے کھونٹے کی بیشک پر بیاز کتر سے ہے کم نہیں ہوگی۔ ایک بار پوچنا ہونے کے بعد وہ بھی زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔ وہ سکتا ہے کہ تمہیں بھی صورت نظر آتی ہے گو ملی مار دینے کا حکم صادر کر دیا جائے۔ فی الحال وہ بھی تمہارے کھونٹوں کی وجہ سے رعایت سے کام لے رہا ہے۔“

”دوسرا کون ہے.....؟“ اورنگ زیب نے اس کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑاتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اسے دیکھا نہیں، لیکن بلیک ناٹنگر کے بعد وہ خبر دو کے نام سے جانا چکنا جاتا ہے۔“ زخمی نے رک رک کر اطمینان سے جواب دیا۔ ”کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں وہ پولیس ریکارڈ پر اسلام ڈنکا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔“

”تم کس نام سے مشہور تھے؟“ اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”مرنے والے اپنا نام نہیں بتایا کرتے آفیسر۔“ زخمی غصے سے اعزاز میں بولا۔ ”قتی جلدی بھی کیا ہے۔ تم میرا نام بھی کاغذی خانہ پری کرنے کی خاطر کسی بھی مجرم کے کھاتے میں ڈال دینا۔ کیا فرق پڑے گا؟“

”کتنی دیر تک سانس روک سکتے ہو؟“

”بھئی اس کی پریکٹس نہیں کی، مگر تم اپنے بھتیگوں کو میری لاش سینے کے لیے بلاؤ۔ دو منٹ یا اس سے کچھ اوپر تک آج سانس روکنے کی کوشش بھی کر لوں گا۔“

”ایک بات اور.....“ اورنگ زیب نے کچھ سوچ کر سرسراے لیے میں دریافت کیا۔ ”شبنم نامی لڑکی جو تمہارے گرد گھٹال کے پاس کام کرتی تھی وہ آج کل کہاں غائب ہے؟“

”اس کی تلاش کرنے کی ذمہ داری بھی نمبر دو کو دی گئی ہے..... یہی سنا ہے کہ گرد گھٹال نے تمہارے ڈی آئی جی کو بھی کام نام نہا ہے۔“

”پہنچی سپرینٹنڈنٹ سراج کی گاڑی پر اسپتال کے قریب کس نے بم کا دھماکا کیا تھا؟“

”وہ تم لوگوں کو صرف دارنگ کے لیے تھا۔“ زخمی نے سانس درست کرتے ہوئے تنجیدگی سے کہا۔ ”مگر مارا مقصود ہوتا تو تم دونوں اس وقت زندہ بھی نہ ہوتے..... میں غلط بیانی نہیں کر رہا۔ جن لوگوں کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا وہ بھی میری خبر دو کے خاص آدمی تھے جو بھی اچھا وارد نہیں کرتے۔“

”ٹھیک ہے تم مرے کو تیار ہو جاؤ میں بھتیگوں کو بلاتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے مدغم آواز میں کہا پھر دروازہ کھول کر کچھ فاصلے پر موجود سب آپکٹر کو بلا کر کہا۔ ”آپ کسی پرائیوٹ ایویونیس کو کال کر لیں۔“ زخمی کی لاش میں خود ہکا نے لگانے کے لیے لے جاؤں گا۔ اس عرصے میں بھتیگوں کو طلب کر لیں مگر زبان بند ہی رکھیں۔“

”او کے۔“ لوچن نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”ہم طے شدہ وقت کی بہر حال میں پابندی کرنے کے عادی بھی ہیں لیکن..... کو کوئی ایک فریق کسی وجہ سے نہ پہنچ سکا تو دوسرا کیا کرے گا.....؟“

”وہ آخری فیصلہ کرنے کا محاذ ہوگا۔“ ڈوڈا نے صاف گوئی سے کہا پھر وہ دونوں ہی اپنے سفری بیگ میں موجود پلاسٹک بم اور دیگر ضروری چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔ دونوں کے چہروں سے سکون ہی سکون ظاہر ہو رہا تھا۔ ڈوڈا نے گیارہ منٹ پر لوچن کو مطلوبہ عمارت سے ایک بلاک پیچھے اتارا اور خود اکی شست پر بیٹھ کر اپنی پوزیشن کی طرف روڑا نہ ہولیا۔

لوچن نے دین سے اترنے کے بعد اس طرح طویل گھڑائی کے کرجم کے مختلف حصوں کو گھمایا جیسے وہ طویل سفر کے بعد اپنے اوپر عاری ہونے والی تھکان دور کر رہا ہو۔ اس عمل سے فارغ ہوتے وقت اس نے نظریں گھما کر قرب و دوار کا جائزہ بھی لے لیا پھر نہایت سکون سے سیٹی پر ایک مفری لیون الاپا ہوا اگلے بلاک تک پہنچنے کی خاطر شارٹ کٹ استعمال کرتا قدم بڑھانے لگا۔ گیارہ منٹ پر وہ مطلوبہ عمارت کے مٹی صے کی سامنے والی فٹ پاتھ پر موجود تھا۔ اس کے شپے کے مین مطابق مطلوبہ عمارت کی پشت پر بھی دو گاڑزائیٹ رائٹ کرنے میں مصروف تھے۔ لوچن کا سیدھا ہاتھ چٹون کی جیب میں ریبک کیا جہاں اس کا خطرناک آؤٹریک موجود تھا جس کے ذریعے وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر ایک منٹ میں چھ فائز کر سکتا تھا۔ ایک پل میں اس نے آؤری فیصلہ لیا پھر دوسری فٹ پاتھ کی سمت جانے لگا۔ دونوں گاڑزائے روڈ کراس کرتے دیکھ کر رک گئے۔ ان دونوں کی نظریں لوچن پر مرکوز تھیں جو اس وقت بھی بظاہر سستی سمجھانے میں مگن تھا۔

”ہالٹ.....“ ایک گاڑے نے رائل سیدی کر کے لوچن کو دیک کر آواز میں مخاطب کیا۔ ”تم کون ہو..... کہاں جاتا ہے؟“

لوچن جواب دینے کے لیے سوچ رہا تھا جب کہیں سے ایک فائز ہوا جس نے لوچن سے سوال کیا تھا وہ ٹکسز کا ڈھیر ہو گیا دوسرے گاڑے نے پوزیشن لینے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر لوچن کے لیے کافی تھی اس نے آؤٹریک نکال کر فائز کیا دوسرا گاڑہ بھی موت کی نیند سو گیا۔ لوچن کے لیے یہ بات حیرت انگیز تھی کہ پہلے گاڑہ کو مارنے والا کون تھا؟ کوئی دوست ہی رہا ہوگا دشمن خود دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو چکا ہوتا۔ گاڑہ پر کسی رائل سے چلائی جانے والی گولی کی آواز بھی رات کے ستارے میں دور تک گونجی تھی۔ لوچن کے پاس سوچنے کا زیادہ وقت نہیں تھا اس نے سفری بیگ سے دو پلاسٹک بم نکالے دانت سے ان کا سفلی بیچ بنا کر اس کے کپے بعد دگر سے ان کو بیخ حادہ کے آفس کی دیوار پر مارا تو آفس گبر بادہ ایک شط کے روپ میں بھڑک اٹھا تیرا بم اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر آفس کی شپے کی کمز کی بار۔ اس کا نشانہ خطائیں گمایا اندر سے شط اسٹھے اور شیشوں کے ٹکڑے ٹوٹ کر بچنے کرنے سے چھانے کی آوازیں ابھریں۔ لوچن حفظ انقدم کے طور پر سڑک پر اعدا ہو گیا۔ تیزی سے لکھنوں کے مل ریلنگ ہوا مکمل فٹ پاتھ پر آ گیا۔ اس کی وہ احتیاط بروقت ثابت ہوئی جتنی ہوئی عمارت کی داخلی موڑ سے ایک جیب برق رفتاری سے گھوم کر تیزی سے اس بڑک پر آ

کذا خاص طور پر بگ باس کے خاص آفس کو جھلا کر رکھ کر دیا جائے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ ڈوڈا نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا اس عمارت اور بگ باس کے آس پاس اس کی گمرانی کی خاطر گاڑزائے مسل چھپا کر نہیں ہوں گے؟“

”یقیناً ہوں گے۔“ لوچن نے کہا۔ ”نہ ہوتے تو یہ کام سستے دماؤں کی مقامی مداحا سے بھی لیا جا سکتا تھا۔ یقیناً مجھے پتہ ہے کہ ہمیں اس کے لیے خاص احتیاط اور دو اندیشی سے کام لینا ہو گا۔ باقاعدہ گھراؤ کا قوی امکان ہے۔“

ڈوڈا نے فوری کوئی جواب نہیں دیا۔ لوچن بھی کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”میرا ذاتی خیال ہے کہ اس بم کے بعد ہماری بھی کچھ بلی کر دی جائے گی۔“

”تمہیں کس طرح اندازہ ہوا؟“ ڈوڈا نے اسے چونک کر وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”ایسے چھوٹے سونے کا ماس میں ہم جیسے بین الاقوامی شہرت یافتہ لوگوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ مقامی لوگ زیادہ کارآمد ہوتے ہیں۔ بہر حال اب میں خود بھی آگیا ہوں۔“

”کیا تم نے اس عمارت کے پورے حصوں کو اندر باہر سے دیکھ رکھا ہے؟“ ڈوڈا نے سوال کیا۔

”تم نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔“ لوچن نے تنبیہی سے جواب دیا۔ ”البتہ میں جو نقشہ فراہم کیا گیا ہے اور جن حصوں کو ہائی لائٹ کیا گیا ہے اس کا بغور جائزہ لے چکا ہوں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ بگ باس کے مخصوص آفس کو نشانہ بنانے کی خاطر ہم سے یہ ایک آؤری عمارت کے پچھلے صے کی جانب جانا ہوگا۔ دوسرے کے لیے صدر دروازے سے اندر داخل ہونے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہمیں اسٹے کے علاوہ ان پلاسٹک بموں کا استعمال کرنا ہوگا جو آگ بھڑکانے کے کام آتے ہیں۔ کیا تم نے پوری تیاری کر لی ہے؟“

”ہاں میں مکمل کاغذ سے پوری طرح لیس ہوں۔“ ڈوڈا نے ایک پل توقف کے بعد سوال کیا۔ ”تم کس صے کی طرف سے انکین شروع کرنا پسند کرو گے؟“

”پچھلے صے سے۔“ لوچن نے بے پروائی سے کہا۔

”تم مجھے اس طرف ایک بلاک چھوڑ کر اتار دینا۔ میں پچھلے صے میں آگ لگانے کے بعد وہاں موجود گاڑزائے اور گمرانی کرنے والوں کو سبکی تاڑ دوں گا کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں اور پچھلے حصوں کو خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ ایسی صورت میں صدر دروازے کی نظری بھی پچھلی طرف تو بہ دے گی۔ تم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عمارت میں داخل ہو سکتے ہو۔ ڈوڈا چار آدمیوں کو پھر بھی ختم کرنا ضروری ہوگا اس میں رعایت نہ کرنا۔“

”رائٹ.....“ ڈوڈا نے گہری تنبیہی سے جواب دیا۔

”طے شدہ پروگرام ہے ہوگا کہ ہم ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اپنا کام شروع کریں گے اور بہر حال بارہ بجے تک اپنی اس دین تک پہنچیں گے جو قریبی پوسٹ آفس کی عمارت کے عقب میں ہماری شہر ہوگی۔ او کے۔“

مئی جس پر ایک طرف خود لوچن اور دوسری جانب دوسرے گاڑوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ جب میں تین مسلح گاڑی نظر آ رہے تھے۔

لوچن نے برق رفتاری سے ایک اور پلاسٹک بم نکالا۔ جب کچھ فاصلے پر تھی مگر اس کی ریخ میں آگئی تو اس نے بم کو اس طرف اچھالا پھر آٹونیک سے سہلے فائر بھی شروع کر دی آگ کے شعلوں کے ابھرتے ہی جب فٹ پاتھ سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ لوچن نے تیزی سے لپک کر بلڈنگ کے کونے پر پہنچ کر اس کی آڑ لے لی اور دوسری جانب سے اندھا معاند ہونے والی فائرنگ کی لپیٹ میں بھی آ سکا تھا۔ جو گاڑی جیتی ہوئی جیب کے ذمے کی بات میں بندھ رہی تھی وہیں سے ان کی کھوپڑی الٹ جاتا بھی جیتی امر قاتلوچن نے آٹونیک کا سیکڑ بن بلا پھر آگے بڑھنے والوں کو روکنے کی خاطر گاتار فائرنگ کی اس کے بعد پلٹ کر دوڑنے لگا۔ وہ اپنے حصے کا کام کر چکا تھا جسے حامد ذاتی آفس اور اس کا قلم پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھا۔ سڑک بند کرنے کے بعد وہ رک گیا۔ اب وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اس علاقے سے دور نکلتا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ سوال بھی رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ جس نے پہلی گولی گاڑ پر چلائی وہ کون تھا؟ وہ ان ہی خیالوں میں غرق تھا جب اچانک عقب سے کچھ آہٹ سن کر چٹکا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی 'عقب سے سر پر کیا جانے والا حملہ اتنا بھر پور تھا کہ وہ پھرا کر رہ گیا پھر اس نے جب خود کو دھنیں باوردی اور سب پولیس والوں کے چنگل میں دیکھا تو اسے سڑی جگ میں آٹونیک کے فاصلے میٹر کے علاوہ ایک دو دھنیں اب بھی موجود تھیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا پولیس کے ہاتھوں کیسے لیتا رہا؟ اسٹار کو کسی طور پر پھنسنے آئے گا۔ خود بھی وہ اس کے لیے آدہ نہیں تھا۔ مگر اس نے وقتی طور پر کچھ دیر کے لیے خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا پھر سانس درست کرنے کے بعد پوچھا۔

”مجھے کس جرم میں گرفتار کر رہے ہو؟“

”پریشان مت ہو.....“ ایک بڑی بڑی منجھ والے پولیس مین نے کہا۔ ”تھانے چل کر ہم اپنی تسلی کر لینے کے بعد ہی تمہارے سوالات کے جواب دیں گے۔ ابھی چوچ بند رہو۔“ لوچن پھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دوسرے پولیس والے نے ایک جھکے سے اس کا بیگ اتار لیا۔ اس افتاد کے بعد لوچن نے جتنی سے اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب اس کے ذہن میں ڈوما کا خیال ابھر رہا تھا۔ پولیس والے اسے دبوچ کر کچھ دور لے گئے پھر ایک پولیس جیب قریب آ کر رکی تو پولیس والوں نے اس کی تفصیلی جانچ لینے کے بعد کچھ دیر کے بعد جیب میں بیٹھا دیا۔ پاتھ تھکے پر کر کے ان میں جھٹکوا یاں بھی ڈال دی گئیں۔

”تم اکیلے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک پھول والے نے پلٹ کر اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”تھانہ آ جانے دو پھر ایمین سے پوری کہانی بھی سن دوں گا۔“ لوچن نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”کیا حکم ہے صاحب.....؟“ منجھ والے نے اپنی مخصوص زبان میں ایک پھول والے افسر سے پوچھا۔ ”ابھی سے اس کی چیکنی شروع کر دیں؟ تھانے پہنچنے تک اس کا سارا کلف بھی اتر جائے گا۔“

”نہیں.....“ اے ایس آئی نے ہونٹ چپاتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ خاص مجرم نظر آتا ہے۔ ہمارے بڑے افسران اس سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔ میں نے انہیں فوری طور پر حادٹے کی اطلاع کر دی تھی۔“

ٹھیک اسی وقت دو صدور دروازے پر موجود مسلح گاڑوں کو موت کے گھاٹ اتار کر عمارت میں داخل ہو چکا تھا بلڈنگ کی عقب سے کچھ بگاڑا گاڑیوں اس کے کالوں تک پہنچی تھیں لیکن جوہم اسے سوچتی تھی وہ اسے اصرار چھوڑ کر جانے کے لیے خود کو آدہ نہ کر سکا۔ عمارت میں داخل ہونے کے بعد وہ تیزی سے میز صاف بنے کرتا ہوا پورے طرف مارا تھا جب کسی چیز کے چلنے کی آواز کے منتظر ہو کر مائی کی یہ اس بات کی علامت تھی کہ لوچن پشت کی جانب آگ لگائے گا۔ کالوں میں کاماب ہو گیا تھا۔ ڈوما کے ذہن میں ابھرے والے احساس ہی اس کے خون کو گرہا گیا اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی پہلی منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے دفتر کے بیرونی دروازے کو آڑ بایا جو بند نہیں تھا، لیکن ہے اندر کچھ افراد موجود ہوں اس نے اپنے آٹونیک کے دستے پر گرفت مضبوط کی پھر دروازہ کھولا ہوا اندر داخل ہو کر بغلی دیوار سے چپک گیا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہ ریشیشن تھا ہال اندر سے اسے ہر چیز واضح طور پر نظر پیش آ رہی تھی وہ دو دستہ آئی پولیشن میں کھڑا رہا پھر سامنے کا ایک دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی آگ کی لپٹ کی روشنی بھی نظر آئی جو اندر دی حصے میں کھیں گئی تھی دروازہ کھلنے ہی دو افراد بھی اس کے سامنے آ گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایک نے اچھے ہوئے انداز میں کہا۔

”مجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے دوسرے آدی کہاں مرکب گئے۔ دو گاڑی پشت پر بھی تعینات تھے مسلح افراد کی جیب بھی راونڈ پر بھی۔ پھر یہ آگ.....“

”میں نے فائر پر گینڈے کوفون کر دیا ہے مگر.....“ دوسرے کے سچے سے بھی وحشت چک رہی تھی۔ ”میں نہیں جانتا کہ بیگ پاس رات کی ڈیوٹی دینے والوں میں سے کسی ایک کو بھی معاف کر سکے گا۔ ایک دو کی غلطی کی سزا سب کو بھگتنی پڑے گی۔“

”ادھر دفتر کے اندر بھی ہمارے تین چار آدی تھے وہ کہاں گئے؟“ پہلے نے مردہ آواز میں سوال کیا۔

”وہ..... وہ شاید یہی تانے سو رہے ہوتے تھے۔“ دوسرے نے جھلا کر کہا۔ ”میں پولیس کو بھی فون کرتا ہوں۔“ اپنا جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی اس نے جیب سے غالباً اپنا موبائل نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر وہ گرہا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

”ٹھیک“ کی مدد آواز ہونے کے باوجود اس کا دوسرا ساتھی جو یقیناً پیش قدمی ہی تھا خطرے کی بو

”تمہارے ساتھ اور کون تھا؟“ دوسرے نے رائل کے ہٹ سے ڈواکے زخمی کندھے پر شدید ضرب لگا کر دیوالوں کی طرح کہا۔ ”حرام کے غم..... مرے وقت تو ہمارے لیے کچھ آسانیاں پیدا کر دو۔“

جواب میں ان دونوں نے ڈوما کو یہ حاشا رائیقل کے بت سے دھتا پھر اس کو پھانسیا گئے تھے۔
 بچہ اتر گئے جہاں سے کچھ آدمیوں کی تیز خیز بات کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ڈوما نے بڑی
 مشکلوں سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا موبائل اس کے پاس ہی تھا۔ موبائل نکال کر اس نے اس کی
 سم نکال کر منہ میں رکھ کر چپنا شروع کر دیا۔ موبائل قدموں میں ڈال کر اسے توڑا پھر غلامی دیکھتے
 ہوئے مسکرا کر کہا۔

✦ ✦ ✦

رائل برادری کی توجہ مشکل کرنے کی خاطر اس نے دوسرے ہاتھ میں دیا ہوا آتشیں ہتھیار نکال کر پھینک دیا۔ وہاں پہنچے جہاں وہ پہلے دیکھا تھا۔ وہاں کے آواز کے ساتھ ہی اس کی ہڈیوں کے شعلے لگے تو پورا ماحول جگمگا اٹھا۔ رائل والے کی نظریں شعلوں کی طرف اٹھی تھیں کہ ڈراما کے انٹریک سے لگتی ہوئی دوسری گولی اس کے وجود کو لگتی تھی۔ شعلوں کی روشنی میں میدان بظاہر صاف نظر آیا تو ڈراما نے بیگ سے دو گولے نکال کر دائیں بائیں اچھال دیے۔ شعلوں کے بلند ہوتے ہی وہ اٹھ کر تیزی سے پیچھے واپس جانے والے زینوں کی طرف پلکا اُڑے۔ زمین نہیں تھا کہ اتنی جلدی اپنا مقصد پورا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اسے محفل اٹھا تھا کہ آتشیں کارآمد تو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں پورے طور

”تنت.....تم جیت کر بھی ہار گئے۔“ ڈومانی نے زہر خند سے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا باپ تمہیں مجھ سے زیادہ اذیت ناک موت سے دو.....دو.....دو چار کرے گا۔ ہاس.....ہاسٹروڈس۔“

”یو آر رانگ..... سن آف اے.....“ ڈوما اکھڑتی ہوئی سانس سنبھال کر قاتمانہ انداز میں

”کیا سمجھوں.....؟ کیا شادی کے بعد سے روشنا نے تمہیں کنٹرول میں لے رکھا ہے۔“ میجر عاقل نے شوق سے سوال کیا۔

”ایسی بات نہیں ہے لیکن ڈیڑھ پرانے وقت کے بزرگ ہیں کلب میں آنا چاہنا پسند نہیں کرتے روشنا ان ہی کی وجہ سے احتیاط کرتی ہے ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ اس نے کس شوق سے کلب جوآن کیا تھا۔ ہم نے اچھا خاصا ایک حلقہ بھی بنالیا تھا۔“

”ڈونٹ وری۔۔۔ تم روشنا کو راضی کر لوں اس اگل کو منالوں گا۔ اوکے رات کھانے پر ملاقات ہو رہی ہے۔“ میجر عاقل نے موہاں آف ایک پھر دوستوں کے قریب جا کر اس نے دارا اور روشنا کو واپس کلب لانے کا دعویٰ کیا تو سب ہی نے ”قرری چیئرس فار میجر عاقل“ کا نعرہ بلند کیا۔

اے ایس آئی نے حقانے پہنچ کر لوچن کے متعلق جانچوں کو ضروری ہدایت دی پھر وہ واپس اچھ اوکے کمرے میں آ گیا جہاں اس وقت ایس بی اورنگ زیب کے علاوہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج بھی موجود تھا۔ اے ایس آئی انہیں جانے دھوے کے متعلق بریفنگ دے رہا تھا۔ جب مرنے والے گاؤڑ اور ڈوما کی تصویروں کا سیٹ بھی آ گیا اورنگ زیب اے ایس آئی سے معلومات حاصل کر رہا تھا۔ سراج نے تصویریں اٹلی پٹری شروع کر دیں۔ ڈوما کی تصویر سامنے آئی تو وہ چونکا۔ ہاشم کی موت کی تصدیق کرتے وقت ملکی ایئر لائن نے جو معلومات اور فرسٹ کلاس کے مسافروں کی تفصیل فراہم کی تھیں ان میں ڈوما کی تصویر کی صورت میں جس سے تیسرے مسافر کی معلومات حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اے ایس آئی بریفنگ دے کر چلا گیا تو سراج نے اورنگ زیب بھی ڈوما کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

”آئی سی؟“ اورنگ زیب نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”گو یا تمین میں سے دوسرے ہیں۔ اب صرف ایک باقی ہے لیکن..... کیا آپ کو اندازہ ہے کہ یہ تینوں کس پارٹی کے لیے کام کر رہے تھے؟“

”یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن حالات کی روشنی میں میرا ایک اندازہ ہے جو ممکن ہے غلط بھی ہو کہ یہ تینوں شاید میڈم کے لیے کام کر رہے تھے۔“

”کیا آپ میڈم اس کا اقرار کریں گی؟“

”ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ آپ کے آسانے پر کم از کم چگا سے کام بھی لے رہی ہے۔“

”میں بعد میں میڈم کو بھی ٹولنے کی کوشش کروں گا ان خیال جو حملہ دار گرفتار کر کے لایا گیا ہے اس سے دودھ پا بھی نہیں ہو جائیں۔“

اسے ایس آئی کی رہبری میں وہ اس کمرے تک پہنچے جہاں لوچن کو ایک لوہے کی کرسی پر پوری طرح کس کر باندھ رکھا تھا۔ ایس آئی نے ہائی پاور کی بجلی کا کچھ تاری بھی شلک تھا جو بھرمی زبان کھولنے کی خاطر بہت کا آمڈ ثابت ہوتا تھا۔

رینارڈ میجر عاقل اس وقت کلب میں اپنے دوستوں کے ساتھ تفریح میں مصروف تھا جب اس کے موہاں پر دارا رستم کی کال رہی۔ وہ پوچھا کہ کیا خبر دو دوستوں سے اگلیسے ذکر کے تھوڑی دور چلا گیا۔ اسے شہر تھا کہ دارا نے اسے بلا مقصد نہیں منایا تھا۔ اس کا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔ رستم دو چار سطوں کے بعد ہی دارا نے میجر عاقل کو باپ کی پریشانی سے آگاہ کر دیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ پولیس ایس بی اورنگ زیب نے بھی رستم ملے سے اس کے دفتر آکر ملاقات کی تھی۔

”ایس بی کی آمد کا مقصد کیا تھا؟“ میجر عاقل نے دریافت کیا۔

”ڈیڑھ اور ایس بی کی ملاقات بند کرے میں ہوئی تھی، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ملاقات بھی کچھ خاص نوعیت ہی کی تھی۔“

”اب تم کس وجہ سے پریشان ہو؟“

”جو ٹیڈر میں نے سہر حال کسی نہ کسی طرح زیادہ آفر دینے کے باوجود حاصل کیا ہے اس نے صفحہ حامد کو ضرور مشتعل کر دیا ہو گا۔ ڈیڈی کی اندیشہ ہے وہ مجھے اور روشنا کو باہر جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ دوسری صورت میں ممکن ہے وہ ٹیڈر قبول کرنے سے انکار کر دیں۔“

”آئی سی گویا تمہارا یہاں سے چلے جانا شرط قرار دیا گیا ہے۔“

”ہاں..... لیکن فی الحال میں نے انکار کر دیا ہے۔“

”اب کیا چاہتے ہو؟“

”صفحہ حامد کی تھوڑی سی کوشش تاکہ وہ ڈیڈی کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔“ دارا نے بے حد سنجیدگی سے درخواست کی۔ ”تم یہ کام زیادہ آسانی سے کر سکتے ہو۔“

”ہو جائے گا۔“ میجر عاقل نے کہا۔ ”ڈونٹ وری لیکن ایک شرط پر.....“

”وہ کیا؟“

”تمہیں کلب کے لیے بھی تھوڑا وقت نکالنا پڑے گا۔ ہمارے سرکل کے اکثر لوگ تمہاری اور روشنا کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔“ عاقل نے بے تکلفی سے کہا۔ ”کچھ دنوں بعد ہم ایک فنیسی ڈریس پروگرام بھی اراٹج کر رہے ہیں جنہیں اور روشنا کو بھی اس میں حصہ لینا پڑے گا۔“

”رات کے کھانے پر آ جاؤ۔ براہ راست روشنا سے بھی بات کر لینا اگر وہ تیار ہوگئی تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

اورنگ زیب اور سراج کمرے میں داخل ہوئے۔ اسے ایس آئی کو باہر ہی روک دیا گیا۔ سراج اس وقت لوچن کو سامنے زندہ حالت میں دیکھ کر دوبارہ چٹکا۔ اورنگ زیب بھی لوچن کو غور سے دیکھنے لگا جو اس وقت بھی اس طرح بے پروا نظر آ رہا تھا جیسے وہ قیدی نہ ہو۔ بس ایک لمے کے لوچن کی نظروں میں بھی اورنگ زیب اور سراج کو سامنے دیکھ کر ایک چمکی سی ابھری لیکن اس نے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ”تم غیر ملکی ہو مسٹر“ اورنگ زیب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے لوچن کو تنبیہ کی ہے صاحب کیا۔ ”مجھے اس بات کا تجربہ ہے کہ غیر ملکی مجرم ہونے کے باوجود صل کر بات کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ مشرقی دایلوں پر اپنی سادہ برتری کا احساس انہیں اب بھی ہے۔“

”میں اس وقت غیر ملکی نہیں۔ صرف مجرم ہوں آفیسر۔“ لوچن نے سستی خیر انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”تم مجھے ہانس پر چڑھانے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے جس پر دنیا کی کوئی طاقت اپنا دخل سلسلہ نہیں کر سکتی۔“

”میری اطلاع کے مطابق تم نے بیچ حامد کے آفس کو آفس گیر ہارے کے پلاسٹک بھوں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔“ اورنگ زیب نے قدرے خشک لہجے میں سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ ”اس کے علاوہ تم نے تقریباً پانچ ہندے بھی مار دیے۔ تم کیا کر رہے تھے؟“

”میں نے نفری کا شکار نہیں کیا، ممکن ہے پانچ کے ساتھ دو ایک اور بھی لپٹے میں آ گئے ہوں۔“ لوچن نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”رباعی حامد کا آفس تو اس کام کے لیے مجھے خاص طور پر تعینات کیا گیا تھا جو مجھے ہر قیمت پر کرنا تھا۔“

”کس کے اشارے پر؟“

”میں جس کو زبان دیتے ہیں اس کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتے۔ ویسے جہاں ہماری اطلاع کے لیے یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ ہم اس کے نام سے واقف بھی نہیں۔ جو احکامات ملتے تھے اس کے لیے ایک خاص کو درڈ پہلے سے ملے ہو گیا تھا۔“

”احکامات مرد کی آواز میں ہوتے تھے یا کبھی کبھی کوئی عورت بھی۔“ سراج نے سمجھا پھر اکر کریدنے کی کوشش کی۔

”سوری آفیسر۔ میں اس معاملے میں بھی زبان بند رکھے گا عہد کر چکا ہوں۔“ لوچن نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”کیا تمہارے کچھ اور ساتھی بھی تھے۔“ اس بار سراج نے مختلا انداز میں لوچن کو مخاطب کیا۔

”ایکس سوری آفیسر۔“ لوچن عجیب انداز میں مسکرایا۔ ”میں بین الاقوامی سطح کے مجرم ہیں۔ سر جاتے ہیں لیکن دوسرے کا نام نہیں لیتے۔“

”کچھ دیر پہلے تمہارا ایک ساتھی اور بھی تھا جو فرار ہوتے وقت کام آ گیا۔ اس کے حساب میں

بھی کئی قتل درج کیے گئے ہیں۔“ اورنگ زیب نے ڈوبا کی آخری تصویر نکال کر لوچن کو دکھائی۔ لوچن نے زبان سے کچھ نہیں کہا چہرہ آگے کر کے تصویر کو ہونٹوں سے چم لیا۔ یہ بھی اس کا خاص احترام ہی تھا۔

”تمہارا نام میری معلومات کے مطابق لوچن ہے؟“ سراج نے دوسرا سوال پوچھا۔

”ہاں۔“ لوچن نے سستی خیر انداز میں جواب دیا۔

”اس بار میں نے اسی نام کا انتخاب کیا تھا۔ ایک بار جس نام کا انتخاب ہو جائے اسے ہم دوسرے معاہدے میں کبھی استعمال نہیں کرتے۔“

”تمہارا ایک ساتھی کچھ دنوں پہلے خودکشی کر چکا ہے۔“ سراج نے بات جاری رکھی۔ ”اس کی لاش ہمیں ایک پرائیویٹ ریسٹ ہاؤس سے ملی تھی۔“

”ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن۔۔۔۔۔ اگر اس نے خودکشی کی ہوگی تو یقیناً اپنی کسی غلطی کے احتیاف کے بعد ہی کی ہوگی۔“ اس بار بھی لوچن نے گول مول جواب دیا۔

”جو خودکشی انسان بھی خوشی اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ جس کی پشت پر اس کو اس وقت ہوا کہ اس نے کسی معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ وہ ہماری نظروں میں قابلِ غر ہوتا ہے اس لیے کہ ہم عام حالات میں کسی سے خوف زدہ ہو کر اس قسم کا بزدلانہ قدم نہیں اٹھاتے۔“

”جس جہاز میں تم یہاں آئے تھے اس کی فرسٹ کلاس میں صرف تین ہی مسافر تھے۔“ اورنگ زیب نے سراج کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہا۔ ”دو کام آ گئے۔ تیسرے تم ہو۔“

”جب تمہیں کسی ذریعے سے اطلاع ملی تھی تو پھر اب اپنا اور میرا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟“ لوچن کے لہجے میں یک لخت کرشماتی آگئی۔ ”یہ دوہرے دل سے نکال دو کہ میں تمہاری تختیوں سے ٹھک آ کر خودکشی کر لوں گا۔ ویسے یہ بھی بتا دوں کہ مرنا جیتنا کسی ہمارے اپنے اختیاری بات ہے۔ ہم زبان کھولنے کے بجائے مردوں کی طرح مرجانا پسند کرتے ہیں۔“

”اور اگر تم تمہیں زندہ رکھنا چاہیں تو۔۔۔۔۔“ سراج نے سوال کیا۔

”یہ جہاں مرضی کی بات ہے۔“ لوچن نے شانے اچکا کر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میں تمہارے سامنے نرمی کی درخواست نہیں پیش کروں گا۔“

”ذہریلا کپکپول۔۔۔۔۔؟“ اورنگ زیب نے اسے سخت نظروں سے گھورا۔

”اس کے علاوہ اور بھی بے شمار طریقے ہیں جن سے شاید تم کو ابھی تک واقف بھی نہ ہو۔“

”جگا کا نام کبھی سنا ہے؟“

”کبھی دیکھا نہیں۔“ صرف سنا ہے کہ اسے تمہارے چیل خانے کے گنڈے کا محل سے مجرم بنا دیا ہے۔“ لوچن نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ”اب بھی وہ قتل و غارت گری سے پرہیز ہی کرتا ہے۔“

”ایک اہم سوال اور.....“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ”کیا تمہارے ساتھ کوئی تیسرا آدمی تھا جس نے پہلی گولی چلا کر عمارت کے عقبی حصے پر دو گارڈز میں سے ایک کو ہلاک کیا تھا۔ اس کی موت رائل کی گولی سے ہوئی تھی جبکہ تمہارے پاس سے آٹومیک پتول اور پلاسٹک بم بھی مل سکے ہیں۔“

”میں تمہاری معلومات کو پہنچ نہیں کروں گا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں بھی نہیں جان سکا کہ وہ کون مہربان تھا۔ اس نے بروقت کام نہ دکھایا ہوتا تو شاید اس وقت میں بھی تمہارے ہتھے نہ چڑھ پاتا۔ موت کی پرسکون نیند سو رہا ہوتا۔ ہو سکتا ہے اسے پوشیدہ طریقے سے ہماری حفاظت پر مامور کیا گیا ہو۔“

”ہم تمہیں حذر ڈھری سے دو جارہیں کریں گے۔“ اورنگ زیب نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”ایک شرط پر..... تم کوئی نہیں کرو گے۔“

”تم سوچ لو آفیسر..... ہم کسی قسم کی باریکبک کرنے کو بھی اپنے اصول کے خلاف ہی سمجھتے ہیں۔“

”ہم بھی جلدی میں قدم اٹھانے سے گریز ہی کرتے ہیں۔“ اورنگ زیب نے ہونٹ چبائے ہوئے کہا پھر سراج کے ساتھ اٹھ کر باہر آگیا۔

”آپ کا لوچن کے بارے میں کیا اندازہ ہے؟“ سراج نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

”کام کا آدمی ہے..... ہمیں اس کے ساتھ مکمل رعایت سے کام لینا ہوگا۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے بات جاری رکھی۔ ”وہیے میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کا تعلق میڈم دولی سے ہوگا۔ آپ نے بھی وہی ذاتی زبان میں شے کا اظہار کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میڈم نے لوچن اور اس کے ساتھی کو صرف آٹومیک سے آٹمس کو آگ لگانے کا کام سونپا ہو اور جگہ کے کسی آدمی کو ان کی حفاظت پر مامور کر دیا ہو۔ جو اپنا کام کر کے نکل گیا ہو۔“

اسی اچانک دفتر میں پہنچ کر اورنگ زیب نے ڈپٹی انسپٹر کو ہدایت دی۔

”آپ کوشش کر کے گرفتار ہونے والے مجرم کا کم از کم وہی دن کا ریماڈنڈ حاصل کریں۔ اس کی عمرانی پر ڈسے دار میں کو تعینات کریں اور..... جب تک میں نہ کہوں آپ حضرات مجرم کے ساتھ کوئی سخت رویہ بھول کر بھی اختیار نہ کریں۔ دیگر معاملات میں آپ کو ضابطے کی کارروائی کرنے کا مکمل اختیار ہوگا۔“

”اوکے سر.....“

”ایک خاص بات اور..... مجرم کو ایسے لاک اپ میں رکھا جائے جہاں تک عمرانی کرنے والوں کے سوا کسی اور کی پہنچ ممکن نہ ہو۔ کسی کو ملاقات کی اجازت بھی نہ دی جائے۔ کوئی اثر و رسوخ استعمال نہ کرے تو آپ فوری طور پر کسی دقت بھی مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔“

”میں آپ کے حکم کی اہمیت کو سمجھ رہا ہوں سر..... آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

”مگنڈ.....“ اورنگ زیب کچھ اور ضروری ہدایت دے کر اٹھ رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ اس اچانک نے کال اینڈ کی پھر ریسپور اورنگ زیب کی جانب بڑھا جے کہہ۔

”ڈی آئی جی صاحب کی کال ہے سر..... آپ کے لیے۔“

”ہیلو سر.....“ اورنگ زیب نے ریسپور لے کر بڑے سکون سے اینڈ کیا۔ ”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”ابھی آپ کے آٹومیک فون آیا تھا۔“ ڈی آئی جی آغا منحور نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کا موبائل فون مسلسل بند آ رہا ہے۔ شاید سگنل نہیں آ رہے ہوں گے۔ میں نے آپ کو گھر پر کال کیا وہاں سے معلوم ہوا کہ آپ متعلقہ تھانے پر ملیں گے۔ آپ کو شاید اطلاع مل گئی ہوگی کہ کسی نے آٹومیک کے طور پر دونوں جانب سے حملہ کر کے وہاں آگ لگا دی ہے اس کے بیان کے مطابق اس کے گارڈز اور حفاظتی دستے کے دس بارہ آدمیوں کو بھی ہلاک کیا گیا ہے۔“

”اوجھری جا رہا ہوں سر..... مرنے والوں کی فہمی بھی کرلوں گا لیکن اس وقت کچھ نہیں کر سکتا ان کی تعداد کے بارے میں۔“ اورنگ زیب نے سرد انداز میں جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”میرے لیے کوئی خاص ہدایت.....“

”میں آپ کو ان کے ساتھ ہوں لیکن..... ذرا ہاتھ باندھ رکھیے گا۔ وہ اس وقت فون پر باتوں کی طرح چل رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے ہمارے سطلے میں مرکز میں اپنے واقف اداروں سے بھی اپنی پیڈی شکایتیں کی ہوں۔“

”فکر نہ کریں سر..... اگر کوئی آفت آئے تو آپ بلا کلف میرا نام لے کر اپنی پوزیشن کیئر کر سکتے ہیں۔“ اورنگ زیب کے چہرے پر بھی ناگوار تاثرات ہی ابھرے تھے۔ ”اوپر والوں کو میں سنباں لوں گا۔“

”پھر کبھی..... اگر معلومات سے کام لیا جائے اس میں زیادہ دانش مندی ہوگی۔“

”اس کی ذمہ داری بھی آٹومیک کے طرز عمل پر ہوگی۔ اس کے سب سے بڑی پوزیشن کا خیال نہیں کیا تو شاید مجھے کچھ الفاظ میں اسے بتانا ہوگا کہ ایک ذمہ دار اس بی کے کیا فرائض ہوتے ہیں اور وہ کس حد تک قانون کی طاقت کا استعمال کر سکتا ہے۔“ اورنگ زیب نے جملہ مکمل کرتے ہی دوسری جانب سے کسی بات کا انتظار کر کے بغیر ریسپور رکھ دیا۔ پھر سراج کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا لیے لیے قدم اٹھاتا اس اچانک اس کے آفس سے نکل کر باہر کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس وقت وہ کوئی بھی قانونی قدم اٹھانے سے قسمی روٹی نہیں کرے گا۔ راستے میں اس نے سراج سے بھی زیادہ بات نہیں کی جائے وقوعہ پر پہنچ کر اس نے تمام زاویوں سے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا۔

اس شام حسب معمول سیٹھ عثمان اور راجلہ بیگم سراج کی رہائش گاہ پر آئے تو لیاقت حسین نے ہی ان کا استقبال کیا تھا۔ الماس بیگم راجلہ بیگم کا ہاتھ تھام کر اندر لے گئیں سیٹھ عثمان لیاقت حسین سے بات کرنے لگے۔

”لیاقت حسین... تم نے وعدہ کیا تھا روزانہ دینی قحیٰ کہ سر دار سرفراز خان کا نام ظاہر ہونے کے بعد بھی تم ہم سے ملو گے نہیں اختیار کرو گے ہم جو کچھ تم اس پر آگے بند کر کے پہلے کی طرح عمل کرو گے۔“

”آپ کچھ دیں صاحب۔ لیاقت حسین آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کرے گا۔“ لیاقت حسین نے بڑے اصرار سے جواب دیا۔

”ایک مشکل کام درپیش ہے تم چاہو تو وہ مشکل دور ہو سکتی ہے۔“

”میں نے آپ کا تمک کہا یا یہ صاحب۔“ لیاقت حسین جذباتی ہو گیا۔ ”آپ کی خاطر اگر مجھے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی دینا پڑے تو میں پیچھے نہیں ہوں گا۔“

سیٹھ عثمان خاموشی سے اصرار کرتے گئے۔ آدھے گھنٹے بعد لیاقت حسین کو بھی طلب کر لیا گیا۔ لاؤنج میں سراج اور الماس بیگم کے علاوہ راجلہ بیگم اور سیٹھ عثمان بھی موجود تھے۔ لیاقت حسین ان کے سامنے ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

”لیاقت حسین۔“ سراج نے اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے آج پہلی بار یہ معلوم ہوا ہے کہ تم غلط بیانی بھی کرتے ہو۔“

لیاقت حسین نے ایک لمبے کو کچھ سوچا پھر دہلی زبان میں کہا۔ ”میں انکار نہیں کروں گا صاحب لیکن کسی بھی غیرت بھی انسان کو مسلط غلط بیانی پر مجبور کر دیتی ہے۔“

”غلطی بہر حال غلطی ہوتی ہے جس کی سزا بھی ضرور ملتی ہے۔“ سراج کے لب و لہجے سے اپنائیت مہیاں تھی۔

”آپ جو سزا دیں گے مجھے منظور ہوگی صاحب۔“ لیاقت حسین نے بہ دستور سنجیدگی سے جواب دیا۔

”جسٹیس سراج صاحب نہیں بلکہ راجلہ سراج سے کہہ کر ارادہ کر سکتے ہیں۔“ الماس نے کہا۔ ”فوری طور پر جہیں موجود ملازمت سے برطرف کیا جا رہا ہے۔“

لیاقت حسین نے چمک کر سیٹھ عثمان کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر کئی سوالات گزرتے ہوئے تھے جب سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم جانتے ہو لیاقت حسین کہ میں بیگم صاحبہ کے کسی حکم سے انکار نہیں کرتا۔ جو فیصلہ ہو چکا ہے اسے واپس لیتا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ البتہ میں اپنے ذاتی اختیار سے جہیں اپنے نئے دفتر کا سپردا کر مقرر کر رہا ہوں اور فوری طور پر جہاں سے خواہ میں ہزار روپے کر رہا ہوں۔“

لیاقت حسین کنگ رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ جاگتے ہیں کوئی خواب دیکھ رہا ہو پھر جب

غائر بریگیڈ نے ہرے دھڑ کو مکمل تباہ ہونے سے کسی حد تک بچا لیا تھا لیکن جو کچھ تباہ ہو چکا تھا وہ بھی بچ حامد کے زخموں پر لگی ہوئی مریض سے کم نہیں تھا۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت فتح حامد اپنے گھر پر ہی بیٹھا فون کھڑا رہا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی تفتیشی ٹیم کے ساتھ ایک ایک حصے کا جائزہ لیا پھر اس نے وہاں موجود پولیس آفیسر سے اپنے سامنے پوری رپورٹ بھی تیار کرائی۔ سراج بھی حتی الامکان اس کا ہاتھ بنا رہا۔



لیاقت حسین کی زندگی میں جو ایک انقلاب آیا وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ فرمیں سے شادی کے بعد وہ جس بے سرو سامانی میں سب کچھ چھوڑ کر گھر سے نکلا تھا اس وقت اس کے ساتھ ماں کی دعاؤں کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ سیٹھ عثمان کے پاس ملازمت کے بعد اس کے برے دن دور ہو گئے تھے۔ اس نے انسانیت کے نام سے بعد پر سکون زندگی گزارا تھا جب اسے اتفاقاً سیٹھ عثمان دیا تھا وہ مختلف حالات سے گزرنے کے بعد پر سکون زندگی گزار رہا تھا جب اسے اتفاقاً سیٹھ عثمان اور اپنے باپ کے درمیان کاروباری تعلقات کا پہلی بار علم ہوا۔ جو باتیں اس نے سن لی تھیں اس سے یہی نتیجہ نکلا تھا کہ کسی مال کی سپلائی میں تاخیر کے سبب سیٹھ عثمان کو جو کاروباری پریشانی لاحق ہوئی تھی اس نے ان دونوں کے درمیان ایک دھاڑی پیدا کر دی تھی۔ پہلے اسے صرف یہ تھا کہ مال سپلائی کرنے والا کوئی تھا اس کے ذہن کے ایک گوشے میں اپنے والد کا خیال آیا تھا جس نے اسے تکلیف میں مبتلا کر دیا تھا پھر ساری بات اس روز واضح ہوئی جس روز فرمیں نے اسے فون پر بتایا تھا کہ سر دار سرفراز خان ہی وہ کاروباری تھا جس سے سیٹھ عثمان کی گھبراہٹ ہوئی تھی۔

حقیقت جان کر لیاقت حسین کی بے چینی قدرتی تھی اس کے دلوں میں بھی باپ کا لہو گردش کر رہا تھا۔ وہ باپ کی اصول پسندی سے واقف تھا۔ وہ سچا اور کھرا انسان تھا کسی کو زبان دے کر پیچھے ہٹا سے منظور نہیں تھا۔ لیاقت حسین کی پسند معلوم ہونے سے بیشتر ہی وہ شاپری کے والد کو زبان دے چکا تھا۔ اس نے زبردستی اپنی مرضی لیاقت حسین پر مسلط کرنے کی کوشش بھی نہیں کی لیکن اپنا یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ شاپری کے علاوہ اگر لیاقت حسین نے کسی اور کو شریک حیات بنایا تو اس کی حوصلی میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ ماں نے فرمیں کے حق میں فیصلہ لیا تو لیاقت حسین نے باپ کی حوصلی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ کراچی آنے کے بعد بھی وہ کسی مرحلے پر واپس نہیں ہوا۔ اس نے جو دینی تعلیم حاصل کی تھی اس کی روشنی میں وہ کسی بھی ضرورت مند کی مدد کرنے سے بھی گریز کرتا تھا قدرت کو اس کی ادا مہلتی تو اس نے کسی کو وسیلہ بنا کر اسے اپنی رحمتوں سے نواز دیا۔ اس کی زندگی میں غمزدگی آگیا تھا جب اسے سیٹھ عثمان اور اپنے باپ کے درمیان کسی بدترکی کی ہینک مل گئی۔ اس شخص کی تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے ہر پہلو پر غور کیا پھر اس نے براہ راست سیٹھ عثمان سے مل کر پہلی بار یہ بتا دیا کہ دوسرا سرفراز خان کا لکھتہ جگر ہے۔ اس کی صاف کوئی پرستہ نہیں اور راجلہ بیگم دونوں نے قحیٰ کا اظہار کیا تھا اور اب قدرت نے اسے پھر نوازنے کی ضمانت بھی لی۔

شیخ حامد کے لیے وہ ساتھ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے فراموش کر دیتا۔

یہ پہلا موقع تھا جب کسی نے اس کی شرک پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی تھی۔ اس کے کارندے اسے ایک ایک پل کی رپورٹ دے رہے تھے۔ وہ سمجھنے سے وہ سنا کر بھی خون اور بھی اپنے مختلف موہن پر کاٹیں کر رہا تھا۔ ہر کال کے ساتھ لے والی نئی اطلاع اس کے لیے جلیبی پر تیل کا کام کر رہی تھی۔ دفتر چل جانے کا معاملہ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے مٹل کے نیچے اتار لیتا۔ یہ اس کی شہرت اور ساتھ ہر ایک کا رعبہ تھی جس نے اسے دوایز کر دیا تھا۔ اسے عمارت اور ساز و سامان کے چلنے یا تباہی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ سارے ریکارڈز کا کافی مختلف کمپیوٹرز پر محفوظ کرتا رہتا اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ خود دوسروں کو نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتا تھا اس لیے یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ اس کے مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں ہوگی۔ کوئی بھی کسی وقت چھوٹے موٹے دوایز کر کر سکتا تھا اسی مقصد سے وہ ہر نئی فائل کو کسی الماری یا دروازہ میں محفوظ کرنے سے پیشتر اس کا مکمل ڈیٹا کمپیوٹر پر محفوظ کرنے کا عادی تھا۔ اس کام میں ایک صنف کی تاجیر بھی اسے منحوس نہیں تھی۔ جو عمارت چل کر خاستر ہو چکی تھی وہ چندہ میں روز میں دو بارہ مرمت کرانی جاسکتی تھی لیکن وہ کسی دشمن کو سزا دھانے سے پیشتر ہی چل دینے کا عادی تھا اس لیے پہلی بار جس کسی نے بھر پور وار کیا تو صفے سے پاگل ہی ہو گیا تھا۔

اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں ایک بدستور دوایز کے ساتھ کنول سے مجبور اور رہنے کا غم غلط کر رہا تھا جب خبر دینے اسے آگ کی اطلاع دی گئی۔

”پاس کسی نے ہمارے آفس کو دونوں طرف سے آگئی ہم پھینک کر آگ لگا دی ہے۔“

”کیا ایک رہے ہو؟“ وہ آغوش میں کھٹی ہوئی۔ ابے لاس دوایز کو صفے سے ایک طرف دھکیلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کون لوگ تھے؟“

”ابھی اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوا۔ صرف اتنی اطلاع ملی ہے کہ وہ تعداد میں غالباً دو ہی تھے۔ دونوں غیر ملکی تھے۔ ایک موٹے پر مارا دیکھو سرے کو پولیس ساتھ لے گئی ہے۔“

”جو حرام کے ختم ہم نے پال رکھے تھے وہ کہاں مر گئے تھے؟“

”ان میں سے بھی آدھے کام آگئے۔ جو زندہ ہیں اس کے بیانات لیے جا رہے ہیں۔“

”جس حرام اسے کی لاش ملی ہے وہ کون تھا؟“ کسی پارٹی سے تعلق تھا اس کا؟“

”ابھی تعین نہیں ہو سکی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان دونوں کا تعلق اسی سیاہ قلم جی سے تھا جس کی لاش کچھ دنوں پیشتر ایک مقامی گیسٹ ہاؤس سے لی گئی۔“

”خیال نہیں؟“ وہ کسی زہر لیے نام کی طرح پھنکارتے ہوئے ہوا۔ ”مجھے درست اطلاع ملنی چاہیے۔“

”کسی حد تک خبر کو مصدق بھی کہا جاسکتا ہے۔“

”مکمل کر بات کرو۔ میں معطل کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”ہمارے ایک پولیس کے افکار نے بتایا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تین غیر ملکی ایک ہی جہاز

میں ایک ساتھ یہاں آئے تھے ایک سیاہ قلم جو پوسٹ مارٹم کی کہانی کے مطابق خود کشی کر چکا ہے۔ دوسرا ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں کام آگیا۔ تیسرے کو پولیس ساتھ لے گئی ہے۔“

”آئی سی۔“ شیخ حامد نے غلام مسکوتے ہوئے بڑے زہر لیے لہجے میں کہا۔ ”جگا کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“

”وہ ابھی تک ایڈر کرناؤٹ ہی ہے۔“

”اسے فوری تلاش کر ضروری ہے۔“ شیخ حامد نے چیخ کر حکم دیا۔ ”جوسیاہ قلم مر چکا اس حرای کو جگا کے شکلاتے پر ہی دیکھا گیا تھا۔ لیکن.....“ شیخ حامد جملہ مکمل کیے بغیر دھاڑا۔ ”وہ میرا سب سے کارآمد آدمی تھا جسے کوئی بارہوی گھر اس کے بعد سے جگا بھی منظر عام سے ہٹ گیا۔ اس ساری کہانی کے پیچھے مجھے جگا ہی نظر آ رہا ہے۔ اسے کسی طرح بھی تلاش کرو اب میں تم لوگوں کی غفلت برداشت نہیں کر سکتا۔“

”راہٹ م۔“ دوسری جانب سے مختصر جواب دیا گیا۔

”جس غیر ملکی کو پولیس نے گئی ہے وہ اس وقت کہاں ہے؟“

”غلام کے قتلے میں۔ میری معلومات کے مطابق وہاں ایسی بی اورنگ زیب پہلے موجود تھا پھر..... پھر ای نے پولیس پارٹی کے ساتھ جانے حادثہ کی تفصیلی رپورٹ بھی جائزہ لینے کے بعد اپنی موجودگی میں موقع پر ہی تیار کرانی ہے۔“

اورنگ زیب کا نام شیخ حامد کے زخموں پر تنک سے کم نہیں تھا۔ اس نے ایک انتہائی ہوئی نظر بدستور دوایز پر ڈالی جو بدستور بسز کی ٹنگوں پر بگھری پڑی بڑی ہے پڑائی سے سگریٹ پینے میں مصروف تھی۔ وہ ایک لمبے تنک سے خالی خالی نفلوں سے ٹھوٹا ہوا پھر بڑے سرد لہجے میں سوال کیا۔

”جو لوگ عمارت کی چوکیداری پر تعینات تھے ان میں سے کتنے مارے گئے؟“

”کچھ تعداد نہیں جی معلوم ہوئی لیکن اب اطلاع کے مطابق آٹھ سو کام آگئے ہیں۔“

”باقی جو بچے ہیں ان تک حراموں کو بھی گولی بار دو۔“

دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ شیخ حامد نے انتظار بھی نہیں کیا پھر فوراً طور پر فون پر ڈی آئی کی پکڑ سے رابطہ کیا۔

”مجھے حادثے کی اطلاع ملی چکی ہے جناب میں.....“

”میری اطلاع کے مطابق حملہ آواروں کا ایک غیر ملکی ساتھی پولیس کی حراست میں ہے؟“

”میں ابھی متعلقہ قاتل کو فون کر کے.....“

”اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے آغا منظور۔“ شیخ نے اس کی بات کاٹ کر تھلا تے ہوئے کہا۔ ”مجھے گرفتار ہونے والے کی تمام تفصیل سچ تک درکار ہوگی تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ اب میں مرکز کے ان پڑھاموں کو بھی ہل کر رکھ دوں گا جو ہر ماہ پابندی سے دم ہلاتے ہوئے مجھے سلام کرتے ہیں تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے؟“

”آپ پریشان نہ ہوں جناب..... میں براہ راست اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔“ ڈی آئی جی نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”تم مجھے پھر دلاس دینے کی باتیں کر رہے ہو۔“ اس نے بدستور جھامٹ کا مظاہرہ کیا۔ ”نئے ایس پی کے آنے کے بعد سے تم بھی مجبور نظر آ رہے ہو۔“

”اسی بات نہیں ہے لیکن.....“

”میری بات کا خیال رکھنا..... مجھے صبح تک پوری تفصیل درکار ہوگی۔“ اس نے ایک بار بھر ڈی آئی جی کی پوری بات سننے بغیر کہا پھر جھار کر سیور کر ڈیل پڑھکا دیا۔ اٹھ کر چند لمبے تک ادھر ادھر کی دھجی دھندے کی طرح ہلکتا رہا پھر بستر پر پڑے شکار کے قریب آ گیا۔ غیر ملکی وہ شیزہ نے اٹھ کر اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔ شیخ حامد اس کے ساتھ بھوکے شیر کی طرح لپٹ گیا۔ چند لمبے اس کے جوان جسم کے نشیب و فراز کو سمجھوڑتا رہا پھر اسے دوبارہ بستر پر چھوڑ کر اس نے موبائل انیڈ کیا۔ دوسری طرف سے نبرہ کی کال آئی۔

”سر..... جو پولیس کی حراست میں ہے اسے سخت پہرے میں رکھا گیا ہے کسی کو بھی اس کے قریب.....“

”نان سنس.....“ شیخ حامد حلق کے بل چیخا۔ ”کال کا مقصد بیان کرو؟“

”وہ..... اس کا نام لوچن ہے سر..... چھٹی باشندہ ہے۔ اس کا تعلق ایک بین الاقوامی تنظیم سے ہے جو ضرورت مندوں کو منہ لگائی رقم کے عوض بندے فراہم کرتی ہے۔“

ایک ہی سانس میں بات جاری رکھی گئی۔ ”جو ہمارے گاؤں کا نشانہ بنا اس کا نام ڈوبا ہے اس کا تعلق بیروت سے تھا۔ وہ بھی اس تنظیم کا سرگرم کارکن تھا۔“

”جس نے خود کشی کی وہ ہاشم تھا؟ کیوں؟“

”یہی سر.....“

”یہ بات تھوڑی سے دوڑ دھوپ کے بعد میرا گھر ملے ملازم بھی معلوم کر سکتا تھا۔“ اس نے بڑی نفرت کا اظہار کیا۔

”اصل سوال یہ ہے کہ ان حرامزادوں کو کس پارٹی نے یہاں آنے کی دعوت دی تھی؟“

”میں کوشش میں لگا ہوں سر لیکن.....“

”اب کوشش سے کام نہیں چلے گا۔“ وہ جھلا کر بولا۔

”مجھے رزلٹ چاہیے۔“

”اوہ کے سر.....!“

”ون منٹ.....“ شیخ حامد نے اچانک ذہن میں ابھرنے والے کسی خیال کے تحت سرسراتے

لہجے میں کہا۔

”لیاقت حسین بھی ہاتھ آتے آتے نکل گیا۔ تم اس کے بارے میں اب کیا کہو گے؟“

”وہ..... وہ..... سب کچھ حیرت انگیز ہی تھا سرورن.....“

”ایک بات پر غور کرو۔“ اس نے نبرہ کی بات کا ٹکڑا بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”لیاقت حسین کے بیچ کرکل جانے کے بعد ہی آگ لگنے والی کارروائی کی گئی ہے۔“

”اوہ.....“ نبرہ چونکا۔ ”ہوسکتا ہے سرکہ پھر اس میں ایجنسی کے کچھ لوگ بھی شامل ہوں۔“

”نہیں.....“ شیخ حامد نے اس کے خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ ”ایجنسی کے لوگ بین الاقوامی تنظیم سے کبھی دہشت گرد نہیں ایپورٹ کرتے۔ لیکن ایک بات طے ہے..... جو کچھ وہاں میں کسی نہ کسی زاویے سے لیاقت حسین کا سرور درمیان میں آتا ہے۔“

”آپ کا یہ اندازہ غلط نہیں ہے سر لیکن لیاقت حسین کچھ دنوں سے ڈپٹی پرنسپل سراج کے بیٹلے پر ہے۔ اس روز بھی وہ اتفاق سے میں نظر آ گیا تھا۔ ہم نے آئینہ لینے میں دیر بھی نہیں کی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی جو وہ.....“

”گولی کے بدلے گولی.....“ شیخ حامد کی آنکھوں میں شعلے ناچنے لگے۔ ”جب تم ڈھکا کے نام سے مشہور تھے اس وقت ہمارا بھی یہی اصول تھا.....“

”آپ صرف اشارہ کر دیں سر..... عمل کرنا میرا کام ہے۔“

”صرف ایک دن اور انتظار کرو اس کے بعد لیاقت حسین جس جہت کے بھی نیچے ہوا ہے بھی آگ لگا دو۔ ہائی سپر سٹائل لوں گا۔“

”سمجھ گیا سر.....“

شیخ حامد نے موبائل آف کیا تو بدیسی عورت نے اٹھ کر پھر اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں بڑی تپیلی آواز میں بولی۔ ”کم آن ڈارنگ! اس فٹس ون رازڈ پلیز۔“ اس کی آنکھیں شدت جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں۔ خود پھر دم کی کابے باک انداز بھی قیامت ہی شیخ حامد نے اسے پھر اٹھائی آغوش میں تھمیت لیا۔ یہ صرف اس کی وحشت کا مظاہرہ تھا۔ ورنہ اس کے ذہن میں اس وقت بھی انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ شعلے جس مخالف کی آتش شوق کو سرد کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اسے پھر چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اس کے اندر انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی اس سے مجبور ہو کر اس نے براہ راست ایس پی اورنگ زیب کے کمرے کی طرف رخ کیا۔

”ہیلو..... ایس پی اورنگ زیب بول رہا ہوں.....“

”میں شیخ حامد بول رہا ہوں۔“

”اوہ.....“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”جو ساخہ روٹا ہو چکا اس پر مجھے بھی دکھ ہے۔“

”میں نے جہیں حقیرت کا اظہار کرنے کی خاطر فون نہیں کیا تھا۔“ شیخ حامد بری طرح ہونا گیا۔

”سیرے لائق کوئی حکم.....؟“

”جو سوکر اولاد مر گیا اسے جہنم میں ڈالو۔ میں اسے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں جو

تمہاری حراست میں ہے۔“

”وہ بھی غیر کی ہی ہے لیکن اس نے ابھی تک خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔“ اورنگ زیب نے سہانہ انداز میں کہا۔

”ہم مختلف طریقوں سے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ زیادہ ڈراماگ دوم ٹریسٹ اس لیے نہیں دے رہے کہ اگر وہ بھی مر گیا تو اصل مجرم اور ذمے دار افراد تک پہنچنے میں مشکل بھی پیش آسکتی ہے۔“

”تمہارا چمکڈالی خیال تو ہوگا کہ مجھے نقصان پہنچانے میں کس پاسز کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”مجھے آپ کے نقصان اور اس وقت آپ کی ذہنی کیفیت..... دونوں کا اعزاز ہے سسر حامد لیکن میں فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”کیا یقینی بات اگوانے کی خاطر مجھے کہیں اوپر فون کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی؟“ فتح حامد نے رخ انداز میں اورنگ زیب کو اپنے اثر و رسوخ سے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

”یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے فتح حامد صاحب میں کیا مضمور دے سکتا ہوں۔“

فتح حامد مشورہ والی بات سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ قدرے تیز لہجے میں بولا۔ ”میں تم کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ تم سے مشورہ کر کے کوئی قدم اٹھاؤں۔“ جنہیں شاید اندازہ نہیں ہے میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔“

”اوہ..... کیا آپ نے اس وقت یہی کہنے کے لیے زحمت گوارا کی ہے۔“ اورنگ زیب کے جواب میں بھی کوئی لپکت نہیں تھی۔

”تمہاری فائنل رپورٹ کب تک تیار ہو جائے گی؟“

”پولیس صرف سنجیدگی سے تفتیش کر سکتی ہے محترم..... کوئی تاہم فریم دینا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ فتح حامد نے دانت چپتے ہوئے لائن منتقل کر دی پھر غصے میں کھڑا ہوا ٹیلی فون کے قریب گیا۔ اس بار وہ براہ راست مرکزی وزیر داخلہ کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ اس کا رہا سہا سکون بھی اورنگ زیب سے گفتگو کرنے کے بعد غارت ہو گیا تھا۔

”بیلوئٹ صاحب.....“ دوسری جانب سے وزیر داخلہ کی آواز ابھری۔ ”اس وقت کیسے یاد کر لیا؟“

”آپ کو زحمت تو نہیں ہوئی؟“

”قطعاً نہیں! ابھی پندرہ منٹ جو مشرعی ایک میٹنگ سے آیا ہوں اور آپ کا فون ملنے سے تو ہمیں خوشی ہوئی ہے۔“ دوسری جانب سے خامی بے تکلفی سے کہا گیا۔ ”اور سائین کا رو بار کیسا چل رہا ہے؟“

”کاروبار کو تو آگ لگ گئی جناب۔“ فتح حامد نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ سب خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہوئی تو اس وقت آپ کو زحمت نہ دیتا..... ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے دشمنوں نے میرے آفس اور پرے قہور کو گلار کسب کچھ راہ کا ڈمیر کر دیا ہے۔“

”کوئی گرفتاری بھی ہوئی یا نہیں؟“

”ایک غیر کیمر کی لاش ملی ہے، دوسرا ایس پی اورنگ زیب کے قبضے میں ہے۔“

”ایس پی سے بات کی آپ نے؟“

”آپ بھول رہے ہیں کہ میں آپ سے پہلے اس کے تادلے کی بات کر چکا ہوں۔“ فتح حامد نے یاد دہانی کراتے ہوئے جواب دیا۔ ”س فون کا بھی مجھ میں نے، لیکن اس نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی کہ وہ مجھے نہ تو معلومات فراہم کرنے کا پابند ہے نہ ہی کوئی تاہم فریم دے سکتا ہے۔“

”آغا منظور سے شکایت کی آپ نے؟“

”وہ بھی آپ کی طرح ایس پی کے خلاف کوئی ایکشن لینے سے سکتا ہے۔“ فتح حامد نے الفاظ چلاتے ہوئے کہا۔

”اب تو ایسا راستہ اختیار کرنا پڑے گا کہ براہ راست صدر مملکت یا وزیراعظم تک رسائی حاصل کروں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں فتح صاحب..... میں براہ راست ایس پی سے بات کرتا ہوں وہ آپ کو ہر معلومات فراہم کرنے کا پابند ہے۔“

فتح حامد نے ٹھکر یہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وزیر داخلہ بھی کوئی چھوٹی موٹی شے نہیں تھا۔ یہ سیورہ کہ اس نے سکون کا سانس لیا تو غیر ملکی دوشیزہ نے ہنسنے لگے ہوئے کہا۔

”اگر آپ معروف ہو تو پھر مجھے جانے کی اجازت دو۔“ اس کے لہجے سے بیزاری ہی مترشح تھی۔

”او کے..... گٹ لاسٹ۔“

فتح حامد کا غیر مہذب جواب دوشیزہ کے لیے غیر متوقع تھا اس نے برا سامنے بنا۔ داس دوم میں جا کر لباس پہنا اور خاموشی سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے دس منٹ بعد ہی فتح حامد کے موبائل کی سکرین روشن ہو گئی جس پر اورنگ زیب کا نام بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر قاتمانہ مسکراہٹ چمیل گئی۔ تین گھنٹوں کے بعد ہی اس نے اپنا موبائل آن کر کے خشک لہجے میں پوچھا۔

”اب کیسے یاد کیا؟“

”وزیر داخلہ کے فون کے بعد میرے لیے ضروری تھا کہ آپ سے رابطہ کروں مجھے اس کا حکم بھی دیا گیا ہے۔“ اورنگ زیب نے سبجے ہوئے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”آپ مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں؟“

”جو طرز تمہاری حراست میں ہے اس نے کچھ کچھ اگایا نہیں؟“

”ہم پوری کوشش کر رہے ہیں جناب۔“

”کوشش سے کام نہیں چلے گا۔“ شیخ حامد کا لہجہ تھمسا نہ ہو گیا۔ ”اس کے ملحق میں ڈنڈا ڈال کر سب کچھ اگوا نے کی کوشش کرو۔ مجھے ہر قیمت پر معلوم ہونا چاہئے کہ کس سورما کی اولاد نے مجھے نقصان پہنچانے کی غلطی کی ہے۔“

”سر.....“ اورنگ زیب نے ہلکی بار مرعوب ہونے والا انداز اختیار کیا۔ ”کچھ وقت تو درکار ہو گا۔“

”فیک ہے..... میں تمہیں چوبیس گھنٹے کا وقت دے سکتا ہوں۔“

”شکریہ شیخ صاحب۔ چوبیس گھنٹے کا وقت میرے لیے بہت کافی ہو گا۔ میری کوشش ہو گی کہ اس کے بعد آپ کو شکایت نہ ملے۔“ اورنگ زیب نے بدستور شستہ انداز میں کہا۔ ”جیسا آپ چاہیں گے دیسا ہی ہو گا۔“

شیخ حامد نے ”گڈ“ کہہ کر لائن کاٹ دی۔ اس وقت ہلکی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہر حال ایس بی اورنگ زیب کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لے کر ایک دوسروں کی کالیں اور کہیں پھر سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔



شکول

پر تاب بھوشن اس وقت کالی کے مندر کی ایک کنیٹیا میں کھڑا پجارن مدھو کو تیز نظروں سے نگہور رہا تھا۔

دوبی کے لیے اپنا جاپ پورا کرنے کے بعد اب اس نے اپنی جون بھی بدل دی تھی۔ عام پنڈت پجارن کا روپ اختیار کر لیا تھا اس وقت بھی خاصا صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ گہرے زرد رنگ کی اہلی دھوئی اس کے لیے تنگے جسم پر خاص ج رسی تھی۔ بازو اور سیدھکلا ہوا تھا۔ سیدھے ہاتھ کی کلائی میں لوہے کے دو گنگن تھے، جتنے سینے اور کشادہ پیشانی پر مندر کی دھاریاں پڑی تھیں۔ گلے میں کئی چھوٹی بڑی مالا جھول رہی تھیں۔ ایک گہرے گہرے رنگ کی اکیس موئے دانوں کی مالا بھی تھی جس پر اس وقت اس کی موٹی موٹی اگلیاں تیزی سے گردش کر رہی تھیں، لیکن وہ جن تیز نظروں سے مدھو کو نگہور رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس وقت اچھے موڈ میں نہیں ہے۔

مدھو پوری طرح بن سنور کزدنگ روپ نکال کر اس کی کنیٹیا میں آئی تھی۔ اس کی جھیل کنول جیسی مدھر بھری آنکھوں میں مسی سی سنی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کاجل کی ڈوری نے ان آنکھوں کو اور بھی قائل بنا دیا تھا۔ کنیٹیا میں داخل ہونے سے پہلے اسے پورا دھواں تھا کہ جہاں پجاری اس کے روپ نکھار کو دیکھ کر دیوانہ ہو جائے گا۔ اپنے شریر کی سندرتا پر حاکم کی خاطر اس نے بڑے گھیر کا پنڈلیوں تک ادھکا کھرا بہن رکھا تھا۔ سینے پر رنگ چلی تھی۔ خوب صورت کلائیوں میں اس نے گھا کر سے سے ملتے جلتے رنگ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں، بالوں کا جوڑا باندھ کر اس نے داہنی جانب گیندے کا پھول بھی لگا رکھا تھا۔ مندر کے کٹے سخن سے گزرتے وقت اس نے جس لہرائی چال کا مظاہرہ کیا تھا اس نے وہاں موجود تمام پجارنوں کے سن میں لچکلی مچا دی تھی۔ وہ سب اس کی پجارن کو ہلکی بار دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے، لیکن پر تاب بھوشن اسے کنیٹیا میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر کئی سلوٹیں ابھرنی لگی تھیں۔ انھیں کی گردش بھی ہاتھ میں دلی مالا پر کچھ شدت اختیار کر گئی تھی۔

”کنیٹیا بات ہے مہاراج.....“ مدھو نے اٹھلا کر اسے لہجے کی کوشش کی۔ ”تم اس طرح اپنی دایا کو کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”تو.....“ پر تاب نے اس کے گیندے کے پھول کو خنکارت سے دیکھا۔ ”اے زمین پر ڈال کر چروں تلے روند دے۔“

”مہاراج.....“

”میری آگیا کا پائن کر.....“ پر تاب نے دھوکہ کھانا نہ لہجے میں غصہ کیا۔ ”اسی کے کارن سارا بتا دیا مکمل چھپت ہو گیا۔“

دھو نے جڑ سے سے پھول نکال کر قدموں تلے مسل دیا پھر ہاتھ باعہہ کر بولی۔ ”مہاراج“ کیا داسی سے کوئی بھول ہوئی؟“

”مورکھ..... تو اس سسلے کے پاس پھول لگا کر کیوں گئی تھی؟“

”اس کو پوری طرح شیشے میں اتارنے کے کارن۔ تم ہی نے تو کہا تھا.....“

”ہاں..... یاد ہے مجھے۔“ پر تاب جمل کر بولا۔ ”پرتو اتنی پھول کے کارن اس کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔“

”میں سمجھی نہیں مہاراج۔“ دھو نے مصمیت سے کہا۔ ”وہ دشت تو پوری طرح مجھے اپنی استری جان کر میرے شریر سے سامنے کو بیجا کل تھا۔ پھر اچانک نہ جانے کیسے اسے اپنی بھول کا دھیان آگیا۔ وہ ایک دم چمکا مہاراج پھر..... میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”تو نہیں جانتی لیکن دیوی کی کرپا سے میں پاتال میں بھی جھانک کر دیکھ سکتا ہوں۔“ پر تاب نے ہونٹ چپاتے ہوئے غلا میں مگھور کہا۔ ”وہ کوئی چھپایا جی جس نے اس سسلے کو میرے چال میں بھٹنے بھٹنے بچا لیا اور اب..... اب وہ دور چلا گیا ہے۔“

”کہاں چلا گیا مہاراج؟“

”اپنی استری کو لینے گیا ہے۔ وہ ایک دن میں واپس بھی لوٹ آئے گا۔ پھر میں اسے اس طرح مگھروں کا کہہ گا پھلا سارا حساب برابر ہو جائے گا۔“

”تم نے..... گینے کی پھول کی بات کیوں کی تھی مہاراج؟“

”اسی پھول نے اسے انھن میں ڈال دیا ہے۔“ پر تاب ساٹ لہجے میں بولا۔ ”وہ تیرے شریر سے الگ نہ ہوتا تو وہ جلدی دم دبا کر بھاگنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ مگر میں نے دیوی کی دیا سے جو مہان ہستی پر اپات کی ہے وہ اسے نفٹ کرنے میں بری سہا ادا کر کے گئی۔ پھول نے مکمل خراب کر دیا میں نے تیرے چاروں اور (طرف) جو منزل باعہہ تھا وہ اس سے باہر نہ نکلا تو اس حرای کی نظر میں بھی نہ آتا۔ تو نے بھی جلدی میں واپس آتے ہوئے اس پر دھیان نہیں دیا۔“

پر تاب نے دھوکہ پھر چھپتی نظروں سے دیکھا۔ ”اس سسلے کے شریر کی آگ نے تجھے بھی بھگلا دیا تھا شایہ.....“

”ایسا نہیں ہے مہاراج۔“ دھو نے دوبارہ ہاتھ باعہہ لیے۔ ”دیوی جانتی ہے میں اس کے چلوں کی دھول ہوں۔ میرے من میں کھوت ہوتا تو دیوی کی نظر میں بھی میرے من کا چرہ چکا لیتیں۔ پھر شایہ مجھے تمہاری سیدہ کر کے نہ بھی نہ ملتا۔“

”دیوی نے تیرے اوپر جو کرپا کی ہے اسے بھولنا مدت در نہ نکٹ ہو کر رہ جائے گی۔“

”ترجمی شکر دو مہاراج۔“ دھو نے اس بار آگے بڑھ کر پر تاب کے ہر تمام لیے اس کی آواز بھی بھر گئی تھی۔

پر تاب کی آنکھیں مگھڑ سے چمک اٹھیں۔ کچھ درود دھوکہ خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے دیکھ کر بتا کر اس سے وہ مسلا کہاں ہے؟“

”مہاراج..... میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں کیول ایک دای ہوں میرے پاس وہ ہستی.....“

”آنکھیں موند لے۔“ پر تاب نے اس کی بات کاٹ کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”من میں دیوی کا دھیان کر لے۔ راستے کے اندھیار سے بھی دور ہو جائی گے۔“

دھو نے دو تین بار آنکھیں چمک چمک پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دو تین منٹ تک اس کے چہرے پر انجمن طاری رہی پھر ہونٹوں پر ایک مکان کھینچنے لگی۔ چمک کر آنکھیں بند کیے ہوئی۔

”ہاں مہاراج..... وہ..... وہی ہے کسی گاڑی میں ڈھیر سارے لوگوں کے بچے بیٹھے۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ سب تمہاری کرپا اور دیوی کی دیا ہے۔“

پر تاب نے آگے بڑھ کر اس کے گماز گالوں کو دھکیلوں کے بچے تھا تو دھو نے آنکھیں کھول دیں ان آنکھوں میں چمک ہی چمک تھی۔ اس نے پر تاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”پہلے ایسا بھی نہیں ہوا تھا مہاراج۔“

”جانتا ہوں۔“ پر تاب عجیب انداز میں مسکرایا۔ ”اب بھی نہ ہوتا مورکھ لیکن یہ سب بھی اسی مہان ہستی کا چمکار ہے جو میں نے دیوی کے لیے مکھن چاپ پورا کرنے کے بعد پر اپات کیا ہے۔“

”یہ..... یہ بھی میرے لیے اچھا ہے۔“ دھو نے بڑی مصمیت سے سوال کیا۔ ”آج وہ چمکار ہو گیا جو میں نے بھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا۔“

”یہ نہیں پوچھنے کی کہ یہ کیسے ہوا؟“ پر تاب اسے مگھوتا ہوا بولا۔ ”پھر مسکر کر پوچھا۔“ پارس پھر کانام کہی سنا ہے؟“

”ناہے مہاراج..... کیانی کہتے ہیں کہ وہ جسے مل جائے وہ قسمت کا دھیان کھلاتا ہے۔“ دھو نے جواب دیا۔ ”میں دھات پر اسے رکھ دیا جائے وہ بھی کھرسا بن جاتی ہے۔“

”جو مہان ہستی کے مالک ہوتے ہیں جن کو دیوی کا خاص آشریہ حاصل ہوتا ہے وہ بھی پارس پھر سے کہ نہیں ہوتے۔“

”میں سمجھی نہیں مہاراج.....؟“ پھر تو پھر ہوتا ہے۔“

”اوش ہوتا ہے۔ پر اسے یہ ہستی اوپر والا دان کرتا ہے۔“ پر تاب نے چھاتی ٹھونک کر جواب دیا۔ ”دیوی نے اپنی کرپا سے مجھے بھی چاپ منزل سے نکلنے کے بعد بھی ہستی دان کر دی تھی۔ تو بولنی بھاگے شالی ہے جو تو نے مجھ سے نکلنے ہی میرے چرن چھو لیے اور..... جب میں نے تیرے غریب سے اپنے شریر کو رگڑا تو..... تو بھی کندن بن گئی۔ پرتو ایک بات دھیان میں رکھنا۔ جب تک تیرا اصلی اجلا ہے تیرے سمیتر کوئی کھوت نہیں آتی تو دیوی کی کرپا سے مرے لوتی رہے گی لیکن..... نجی ذن

شیخ حادرات بہت دیر سے سویا تھا۔ دفتر میں گئے والی آگ اس کے دل و دماغ تک پہنچ گئی تھی۔ اسے نقصان کی فکر نہیں تھی اس کے انٹورس ایجنٹ نے نکل رات ہی اسے فون کر کے کہا تھا کہ تمام ضروری کارروائی زیادہ سے زیادہ پندرہ دن میں مکمل ہونے کے بعد رقم اس کے بینک میں جمع کر دی جائے گی۔ وزیر داخلہ نے بھی پہلی بار اسی نے اورنگ زیب کے مقابلے میں مراد علی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے نتائج حسب فضا آباد ہوئے تھے۔ خود اورنگ زیب نے اسے کال کر کے اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا جو شیخ حاد کے لیے ایک فتح تھی۔

شیخ حاد زیادہ دیر بستر پر دراز ہوا تھا۔ اس کے ذہن کے اندر جو کھلی جی تھی اس کو پرسکون کرنے کی خاطر اسے کم از کم دس گھنٹے پرسکون نیند کی ضرورت تھی اس نے ملازموں کو ہدایت کر دی تھی کہ اسے بلا کسی بہت اہم وجہ کے ڈسٹر نہ کیا جائے لیکن..... ابھی اسے آدھے گھنٹے کا ذہنی سکون نہیں ملا تھا جب اس کے موبائل کی دھم گونجی۔ شیخ حاد نے جھلا کر سکرین پر نظر ڈالی وہ کنول کی کالی تھی۔ ایک لمبے کو اس نے سوچا کہ وہ موبائل کو اٹھا کر دیوار پر آنتی شدت سے مارے کہ پھر وہ ڈسٹر نہ ہو سکے لیکن پھر کسی خیال کے تحت اس نے موبائل آن کر لیا۔

”اس وقت کیسے کال کیا؟“ اس کے لہجے میں بیزاری بھی شامل تھی۔

”سنا ہے کہ آپ کے دفتر کو.....“

”گولی بارود دفتر کو“ وہ تھلا کر بولا۔ ”جہیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا چاہئے۔ ابھی تک کسی فکر میں جاگ رہی ہو؟“

”آپ سے ایک بہت اہم بات اور کرنی تھی۔ اسی نے میری نیند بھی اڑا دی ہے۔“ کنول نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”کیا اہم بات ہے؟“

”ابھی پندرہ منٹ پہلے ایک ان فون کال آئی تھی میرے نمبر پر۔“

”تمہارے نمبر پر؟“ شیخ حاد چٹکا۔ ”تمہارا نمبر میرے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔“

”کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟“

”مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا لیکن..... وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس میری اور آپ کی کچھ ایسی تصویریں ہیں جو اگر منظر عام پر آئیں گی تو ہم کسی کو مرنہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“

”ریش.....“ شیخ حاد جھلا کر اٹھ بیٹھا۔ ”کیسے ممکن ہے؟“

”میں نہیں جانتی لیکن وہ بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا اور.....“

”ناممکن.....“ اس نے کنول کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میرے خاص آفس اور تمہارے بیڈ روم تک کوئی چڑیا کا بچہ بھی نہیں مار سکتا۔“

”آپ ایک بات کیوں نظر انداز کر رہے ہیں۔“ کنول نے جواب دیا۔ ”جو نوادہ میرا

میں نے تجھ سے نظریں پھیر لیں تو پھر تو کوڑے کے ڈھیر میں پڑا پکرا این جانے لگا پھر..... دیوی بھی تجھے شہ مات نہیں کرے گی۔“

”میں سارا جیون تمہارے چروں کی دھول میں رہوں گی مہاراج..... تم جو آگیا وہ اسے کا پاں کرنا اپنا دھرم سمجھوں گی۔“ دھو نے بڑی حقیت سے ہاتھ باندھ کر پرتھوی کے سامنے ڈنڈوت کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے سے ایک بار جو بول ہوگئی ہے اسے کر دو۔“

”ایک بات اور گاٹھ سے باندھ لے.....“ پرتاب نے اسے پھر تیز نظروں سے گھورا۔ ”دیوی نے تجھے کیوں میری سیدہ کرنے کو کہا ہے۔ کبھی بھول کر بھی اگر کسی بٹے کئے بھاری کو دیکھ کر تیرا من لگایا تو پھر نہ تو تھری رہے گی نہ کھاٹ کی۔“

”ایسا میرے جیون میں کبھی نہیں ہوگا مہاراج..... میں وجہ دیتی ہوں۔“ دھو نے جواب دینے میں دیر نہیں کی لیکن پھر فوراً چپک کر بولی۔ ”مہاراج کیا تم نے جس دشمن کے پاس بھیجا تھا اس کا دھرم نشت کرنے کا کارن بھی مجھے اپنے شریر کی رکھا کرنی پڑے گی؟“

”مورکھ.....“ پرتاب کے غلطہ ہونٹوں پر کڑوہ مسکراہٹ چمک گئی سیدتان کر بولا۔ ”تو کالی کی داسی ہے اور میری سیدہ اگر دسی ہے تو پھر یہ بات بھی مجھے نہ بھولنا کہ اپنے دیوی دوتاؤں اور دھرم کے لیے شریر تو کیا جیون کا بلیڈان دیتا بھی کوئی پاپ نہیں۔ دیوی کی بھی یہی سیکھا ہے جس پر بیٹا ہمارا دھرم ہے۔“

”مہاراج..... اب میرے لیے کیا آگیا ہے؟“

”تو نے اچھا روپ لٹالا ہے دھو.....“ پرتاب نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”پھر ابھی نہیں..... جسے میرا سن چاہے گا تجھے ملا لوں گا۔“

دھو اس سے بھی ٹھوڑی دیر۔ اسے آنکھ بند کر کے کسی کو دیکھنے کی کوشش ہی تو وہ تن میں دھن سے خوش تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پرتاب سے ملٹھ دیکھ لیا پھر جب پرتاب نے چھوڑ دیا تو اس نے دھو سے یہ بھی بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”اس مسئلے پر نظر رکھنا۔ کوئی نئی بات معلوم ہو تو قرت مجھے خبر کر دینا۔“

”مہاراج..... تم نے کہا تھا کہ کوئی چھپایا تھی جس نے تمہارا راستہ کھوٹا کر دیا تھا۔ وہ کس کی چھپائی تھی؟“

”اسی کی کھونج میں ہوں.....“ پرتاب نے غل کھا کر کہا۔ ”ایک بار وہ مجھے چل (دھوکا) دے کر کل گئی پھر پرتاب نے ہارنا نہیں سیکھا۔ میں اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ لائوں گا۔ تو..... تو..... اب جا۔“

دھو ہاتھ باندھ کر اٹلے قدموں لٹکایا سے کل گئی تو پرتاب کچھ دیر بعد پھر فرش پر آنتی پاتی مار کر بیٹھ گیا آنکھیں بند کر کے پھر کچھ بدبانا لگا۔

لوڈنگ ٹرک سروس روڈ سے گزرا تھا جس پر سے کٹھی کے گاؤڑ کی توجہ ہٹانے کی خاطر فائرنگ بھی کی گئی۔ ٹرک تیزی سے نکل جانے کے بعد ہمارے آدمیوں نے دیکھا کہ گلوڑی کی تین قدم تابوت نما بیٹیاں سروس روڈ پر پڑی تھیں۔ ان کا کپڑہ باہر سے بھی دیکھا جاسکے اس لئے چہرے کے سامنے والی گلوڑی کو بڑی مہارت سے دائرے کی صورت میں کاٹ دیا گیا تھا۔

”شیخ حامد نے پوری تفصیل سننے کے بعد ملحق کے مل پیچھے ہوئے روایات کیا۔“

”بیٹیاں اب کہاں ہیں.....؟ انہیں کھولا تو نہیں کیا؟“

”آپ کا اطلاع دینا ہمارا پلہ فرض تھا۔ اب آپ جو حکم دیں۔“

”لوڈنگ ٹرک کا نمبر نوٹ ہوا۔“

”اس کا موقع ڈیوٹی گاڑ کو نہیں مل سکا۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”اس کی داہنی ران میں گولی لگی ہے۔ جان بچانے اور پوزیشن لینے کی خاطر گاؤڑ ایک لمبے کو پیچھے بٹے تھے اتنی دیر میں مطلوبہ ٹرک غائب ہو گیا۔“

”باہر والے کہاں مر گئے تھے؟“

”کسی کو اس کی توقع نہیں تھی باس..... لیے آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ لوڈنگ ٹرک سے بے اولڈ گولیاں چاروں طرف چلائی جا رہی تھیں جو کچھ ہوا وہ سوچے سمجھے اور منظم طریقے سے ہوا ہے۔“

”تمہارا خیال اس طرف جا رہا ہے؟“

”پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا باس..... اس لی واریٹک زیب ان کو چھوڑنے پر ڈی آئی جی کے اسرار کے بعد بھی بمشل آمادہ ہوا تھا۔ راجو اور اس کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ہی اس چوتھے آدمی کی پتھر کو بھی آزاد کر دیا تھا۔“

”کی کسی کا آدمی تھا؟“ شیخ حامد نے ہاتھ ملتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ..... دو جگہ کے لیے کام کر رہا تھا۔“

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جگا کو قبر سے کھود کر بھی برآمد کرنے کی کوشش کرو۔“ اس بار شیخ حامد غصے سے لرزتا ہوا چلا یا۔ ”یہ بھی معلوم کر دو کہ ولد الحرام کس کے لیے کام کر رہا ہے؟“

”ہم ہر طرف سے کھنگال رہے ہیں باس۔“ نمبر دو نے کہا۔ ”وہ ہمارے خوف سے کہیں انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہے۔ جس دن کسی کو نظر آ گیا اس دن آپ سے پوچھتے بغیر ہی اسے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔“

”گاؤڑ سے کہو کہ وہ علاقے کے قتانے کو کبھی صورت حال کی رپورٹ کرے۔ ذاتی حیثیت میں..... میں ڈی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔“ شیخ حامد نے ہونٹ چبائے ہوئے موبائل آف کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ فون سے بڑے ٹیش کے عالم میں آقا منصور کے گھر کے نمبر مارا تھا۔

”ہیلو.....“ تیسری چوٹی کھنٹی کے بعد دوسری جانب سے آقا منصور کی نیند میں ڈیوٹی آواز سنائی

موبائل نمبر معلوم کر سکتا ہے وہ.....“

”تم نے کسی نیکی وغیرہ کو تو یہ نہیں دیا۔“ شیخ حامد کے ذہن میں ایک امکانی خیال ابھرا۔

”آپ نے مجھے دو موبائل دیے ہیں۔ ایک صرف آپ کے لیے مخصوص ہے اور دوسرا..... دوسرا نمبر کسی کو نہیں دیا بلکہ اس سے ابھی کوئی کال بھی نہیں کی گئی۔“

شیخ حامد نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ذہن میں ہر شہادت سرا ہمارے لگے۔ دو تین منٹ خاموشی کے بعد ایک مکندہ خیال کے تحت اس نے کنول کے علاوہ خود کو بھی کھلی دینے کی کوشش کی۔

”ہو سکتا ہے کسی نے اپنے مطلوبہ نمبر غلط ملائے ہوں اور تمہارا نمبر مل گیا ہو؟“

”لیکن اس نے وہ دھمکی.....“

”ہائیکس..... اس نے کنول کو سمجھانے کی کوشش کی۔“

”ہو سکتا ہے اس کی آواز سن کر تم گھبرا کر ہو اور اس نے تمہاری خواہیدہ آواز سن کر محض تم سے قہر کرنے کی خاطر ایک امکانی بات کہہ دی ہو اور تم..... دن منٹ..... وہ بات کرتے کرتے چنگا۔“ اس کا جزیرہ تمہارے موبائل پر ریکارڈ ہوا ہے۔ وہ کیا ہے؟“

دوسری طرف سے بتائے جانے والے نمبروں کو نوٹ بک پر لکھنے کے بعد اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”اب تم سوچاؤ میں دیکھتا ہوں کہ کس کی موت آئی ہے۔“ بعد میں شیخ حامد نے اسی وقت ان نمبروں کو چیک کر لیا تو یہ جان کر اس کی نیند اور اچاٹ ہو گئی وہ نمبر ایک ایسے شخص کا تھا جو ایک سال پیشتر کسی ایجنٹس میں کام آ گیا تھا۔ اس کی انکوٹی بھری شوہر کی موت کے بعد پنجاب کے کسی گاؤں میں داہن لوٹ گئی تھی۔ گو یاد وہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں رہا تھا مگر وہ کس کے ہاتھ لگ گیا؟ جس کے ہاتھ لگا اسے کنول کے وہ نمبر بھیے معلوم ہوئے جو شیخ حامد کے سواری اور کے پاس نہیں تھے؟ وہ ان ہی خیالوں سے الجھ رہا تھا جب اس کے دوسرے موبائل نے داہنبر کے کنا شروع کیا۔ سکرین پر آنے والا نمبر اس کے خاص آدمی نمبر ہو گیا تھا۔ تیسری کھنٹی پر اس نے موبائل آن کر کے کانوں سے لگا لیا۔

”اس وقت کیا ضروری کام پیش آ گیا؟“

”باس..... ہمارے ستارے شادید کرش میں آتے جا رہے ہیں۔“

”اب کیا پلاؤ نوٹ پڑا.....؟“ شیخ حامد نے دانت پیچے ہوئے سوال کیا۔

”تین لاشوں کا پتلی بیک پارسل باہر سروس روڈ پر پڑا ہے۔“

”کسی کی لاشیں ہیں.....؟ تفصیل بیان کرو۔“ شیخ حامد کی آنکھوں کی نیند تین لاشوں کا حوالہ

سننے ہی اچاٹ ہو گئی۔

”راجو اور ان دو ساتھیوں کی لاشیں ہیں باس جنہیں آپ کی سفارش پر کوٹھی پر ہونے والے حملے کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔“ نمبر نو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پندرہ بیس منٹ پہلے ایک

دی۔

”شیخ حامد بول رہا ہوں۔“

”اس وقت کیسے یاد کیا.....؟“

”جن حرامیوں نے دفتر کو آگ لگائی تھی وہ ابھی تک دندنا تے پھر رہے ہیں۔“

”فیہریت..... اب کیا ہوا؟“

”میں نے کونھی کے محلے کے بعد اپنے جن آدمیوں کو تمہاری سفارش پر رہا کرایا تھا۔ ابھی کچھ دیر جو عمران کی لاش کی پٹیاں کونھی کے سامنے سرسوں موڈ پر چپک دی گئی ہیں جس کو لوٹک ٹرک کے ذریعے انہیں یہاں ڈسپ کیا گیا ہے اس سے باقاعدہ گولیوں کی بارش بھی کی گئی۔ میری کونھی کا ایک ڈیوٹی گارڈ بھی زخمی ہو گیا۔“ شیخ حامد نے جھنا کر پوچھا۔

”شہر میں تمہاری جو پٹرولنگ پارٹیاں گشت کر رہی ہیں وہ کیا چیک مار رہی ہیں؟“

”جو پٹیاں بھیجی گئی ہیں انہیں وہیں پڑا رہتے دیں۔ میں چندہ منٹ کے اندر دوسرے محلے کے ساتھ آتا ہوں۔“ دوسری جانب سے ہدایت کے ساتھ ہی سلسلہ متعلقہ کر دیا گیا۔

شیخ حامد نے اپنے خاص آدمیوں کو کچھ ضروری کالیں کیں پھر وہ خواب گاہ سے نکل کر نچلے فلور کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اس کے نیچے اترنے کے کچھ دیر بعد آغا منظور بھی اس کے سامنے موجود تھا۔

”ایک ہی رات میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے دو سٹین وارداتیں۔“ شیخ حامد نے پیشانی پر ہل ڈال کر کہنے سے کہا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اگر جواب میں میرے آدمیوں نے بھی کاروباری..... وفات میں شعلے بجھانے شروع کر دیے اور اندھا دھند لوگوں کو موت کے منہ میں جھونک دیا تو تم..... تمہاری فوس اور دوسری تمام ایجنسیوں کی تیندیں ہی بند ہو جائیں گی۔“

”آپ کی پوزیشن سمجھ رہا ہوں شیخ صاحب لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ یقیناً کسی سوچی سمجھی سکیم کے پیش نظر ہو رہا ہے۔ آپ بھی مکمل کرکے پریشن کریں۔“ آپ جس کی طرف انگلی اٹھا دیں، ہم اس کو آنکھ بند کر کے حالات میں ڈال کر اس کی زبان کھولنے کی پوری کوشش کریں گے لیکن.....“

”تم نے ابھی تک شیخ کے انوکھے بارے میں کیا کامیابی حاصل کر لی؟“ جواب میں شیخ حامد کی پیشانی پر بھی سولس ابھرا آئیں۔ ”جیسا چھٹا اور اس کے پاتو بھی کبھی اپنی کسی عزیز کی روباہی میں منہ چھپانے بیٹھے ہیں۔ کوئی نامزد نہیں جو سامنے آئے پھر؟ کیا اس کے نتائج صرف مجھے پہنچتے پڑیں گے؟ تم بھی مجبور ہو بیٹھی ممبر کرتا ہوں تو پھر دنیا کا کاروبار کون چلائے گا.....؟

”جگہ..... جگہ کو انوکھ کر کے والے یا دوسرے ایکے اور اٹھائی گئے؟“

”میں نے آپ کی کسی بات سے نہ پہلے انکار کیا ہے نہ اب کروں گا..... آپ اشارہ کریں تو میں ملازمت چھوڑنے کو بھی تیار ہوں۔“ آغا منظور نے قدرے جبرز ہو کر کہا۔ ”اس کے سوا جو آپ حکم دیں میں وہ بھی کرنے کو آمادہ ہوں۔“

شیخ حامد نے کوئی فوری جواب نہیں دیا پھر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے لی اورنگ زیب اندر آ گیا۔ اس نے خلاف توقع جس مہذب انداز میں شیخ حامد کو سلیوٹ کیا تھا اس سے شیخ حامد کا سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا۔

”کوئی کلیط ملا.....؟“ آغا منظور نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

”جس ٹرک سے لاشوں کی پٹیاں گرائی گئی تھیں وہ ہماری ایک ٹائمٹ پیٹرولنگ پارٹی کی نظروں میں آ گیا ہے۔“

”کوئی گرفتاری بھی ہوئی.....؟“ شیخ حامد نے براہ راست اورنگ زیب سے سوال کیا۔

”مذکورہ ٹرک فیکٹری ایریا کے قریب سڑک کے کنارے پارک ملا ہے اور.....“ اورنگ زیب نے ذرا تامل سے کہا۔ ”اس کی ڈرائیونگ سیٹ سے جس ڈرائیونگر کی لاش ملی ہے اس کے جیب سے برآمد ہونے والے شاتی کارڈ سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کون تھا کہاں ملازمت کرتا تھا۔“

”کون تھا وہ سونا.....؟“ شیخ حامد بڑبڑا کر پوچھا۔

”وہ کوئی سورا نہیں بلکہ ایک مظلوم تھا شیخ صاحب۔“ اورنگ زیب نے دہلی زبان میں کہا۔ ”اسے اس واردات میں اسلحہ کے زور پر استعمال کیا گیا۔ پھر اس کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئی۔“

”کچھ پتا تو چلے کہ کون تھا وہ مجرم یا مظلوم؟“

”وہ ٹرک اور وہ ڈرائیور..... دونوں آپ کی کھنی کے تھے۔“ اورنگ زیب نے بدستور مدد لیے میں انکشاف کیا تو شیخ حامد کے علاوہ آغا منظور بھی کچھ غبر نہ رہ سکا۔

”اب تم مجھے کیا حکم دو گے آغا منظور؟“ شیخ حامد نے دانت پیستے ہوئے بڑے سرزدلجہ میں سوال کیا۔ ”کس سے رابطہ کروں؟ کس کے گلے میں کھنٹی بانڈوں؟ یہ سب میرے ہی ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟ تم سب کس مرض کی دوا ہو؟“

”میں صرف دو روز کی مہلت چاہوں گا شیخ صاحب۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے تو امید ہے کہ ان دو دنوں میں میرے آدی کوئی نہ کوئی سراغ تلاش کر لیں گے ورنہ آپ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس پر میں بھی ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے شرمندگی کا اظہار ہی کر سکتا ہوں۔“

”جو لاشیں میرے آدمیوں کی گشت پیک کی صورت میں ملی ہیں ان کا کیا کروں؟“

”صرف آپ کے اشارے کی ضرورت ہے۔“ اس بار بھی اورنگ زیب نے جواب دیا۔

”ضروری تفتیش کے بعد میں انہیں احترام کے ساتھ دفن کرنے کا بھی بندوبست کروں گا۔ معلقہ تھے میں آپ کے گارڈز سے جو رپورٹ درج کرائی ہے وہی بہت ہے۔“

”سوچ لو اس لیے۔“ شیخ حامد نے اورنگ زیب کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”مگر دو روز میں

مجھ کو کوئی تر نہ پار سکے.....؟“

”اب ہمارے سراج صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟“
 ”خدا کا شکر ہے کہ طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔“ آغا منصور نے مختصر تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔
 ”میرا خیال تھا کہ آپ نے میرے علاوہ سراج کو بھی دعوت دی ہوگی۔“
 ”ان کی دعوت بھی ضرور ہوگی اور آپ کو بھی دوبارہ بلایا جائے گا۔“ قمریہ نے مسکرا کر کہا۔
 ”اس طرح آپ کا آنا جانا بھی لگا رہے گا۔“
 ”آپ قسم دیں تو میں بسترے کر ادھر ہی شفت دو جاؤں۔“ اس بار آغا منصور نے قمریہ کے جملے سے فائدہ اٹھا کر معصوم صورت بنا کر کہا تو میڈم بھی اپنی بے ساختہ فنی ضبط نہ کر سکی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں قدم رکھنے کے بعد سے مہمان کی نظرس کسی نہ کسی بہانے اس کی سمت بار بار ہلک رہی تھیں۔

”آج کل تو خیرہ بستیوں میں بھی بکے الامنٹ کے بغیر قدم لگانے کی جگہ نہیں ملتی۔ آپ اس خوب صورت گھر میں قبضہ نہانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔“
 ”انسان اگر دین میں بھی خواب دیکھ لے تو میرے خیال سے کوئی پابندی نہیں ہے اس وقت تو بھرات ہے۔“

”آپ کی باتوں پر مجھے حیرت ہی ہو رہی ہے۔“ میڈم نے اس کے جواب میں متاثر ہو کر قدرے بے تعلقی سے کہا۔ ”جس لمحے سے آپ کا تعلق ہے وہاں بذریعہ لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں۔“



”ناکامی کی صورت میں اس کا اختیار بھی آپ کو ہوگا۔ آپ جو فیصلہ صادر کریں گے وہ مجھے منظور ہوگا۔“
 کچھ دیر بعد شیخ حامد کی کوشی سے نکل کر باہر آنے کے بعد آغا منصور نے اورنگ زیب کو ایک طرف لے جا کر سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو کوئی عجیب بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ خاص طور پر میری موجودگی میں..... فرض کیجئے اگر آپ مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکتے تو۔“
 ”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں سر.....“ اورنگ زیب نے فنی خیر اعزاز میں جواب دیا۔ ”مجرم تک تو ہم پہلے پہنچ چکے ہیں صرف اس کے ہاتھوں میں لوہے کے شکنج ڈالنے باقی رہ گئے ہیں۔“
 ”میں سمجھ رہا ہوں آپ کا مقصد، لیکن شاید آپ اس آنکھوں کی خطرناک چالوں سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہیں۔“

”واقف ہو گیا ہوں سر..... ایسے لیے تو اب اس کے سامنے جھک رہا ہوں۔“
 ”وہاں.....“ آغا منصور نے حیرت سے اورنگ زیب کو دیکھا۔ ”کیا آپ واقعی اس کے سامنے سر ہڑکرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔“

”فنی الحال.....“ اورنگ زیب نے شانے شانے اپنا کر بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ”دوروں بعد کون کس کے قصہوں میں ہو گا قل از وقت کون تھیں سے کہہ سکتا ہے۔“
 آغا منصور کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس لیے کی جھلکی گہرائی تک پہنچنے سے ہی قاصر تھا۔ بھر..... قل اس کے کہ وہ اورنگ زیب سے مزید وضاحت چاہتا تو حق تعالیٰ کا انہیں کفران کے قریب آگیا۔ ان کے درمیان پیش آنے والی واردات کی قانونی باتیں شروع ہو گئیں تو آغا منصور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد واپس گھر چلا گیا۔



قمریہ نے بڑے دلہانہ انداز میں آغا منصور کا استقبال کیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں میڈم روپی پہلے سے موجود تھی جہاں اس نے آغا منصور کو سادگی سے خوش آمدید کہا۔ خود آغا منصور اس وقت خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی اس نے میڈم کو ایک خاص انداز میں دیکھا تھا جسے میڈم روپی نے بھی محسوس کیا۔
 ”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ہمارے غریب خانے پر آنا منظور کر لیا۔“

”وہ بھی شاید نام کی مناسبت سے۔“ میڈم نے نام کے اعتبار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برجستہ کہا تو آغا منصور صرف لاجواب ہی نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک بار پھر میڈم کو ایسی دلہانہ نظروں سے دیکھا جیسے یہ کہنا چاہ رہا ہو کہ..... ”مگر آپ اس غریب خانے پر مجھ کا سرکار کو بھی سر پہچانے کی خاطر تھوڑی سی جگہ مستقل چٹاؤں پر فراہم کر دیں تو بڑی بندہ پروری ہوگی۔“
 کچھ دیر تک رکی باتیں ہوتی رہیں پھر قمریہ نے تنبیہ کی سے دریافت کیا۔

”آپ شاید.....“

”جی نہیں، میں سنجیدہ ہوں۔“ ذی آئی جی نے سنجیدگی برقرار رکھی۔ ”کبھی کبھی انسان کو مجبوراً بھی اپنے ضمیر کا سودا کرنا پڑتا ہے۔ یہ درست ہے کہ صلح حامد کی سفارش ہی سے میری دوبارہ ترقی ہوئی لیکن یہ کبھی میں ہی زبان خود کھربا ہوں کہ اب ہمارے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا ہے، اگر ہمیں کوئی موقع ملا تو شاید ہم اس کا قصہ پاک کرنے میں کچھ کچھ کاہٹ کا مظاہرہ بھی نہیں کریں گے۔“

”آپ کے اس عہد میں اور کون کون شامل ہے؟“

”فی الحال ایس بی اوریگ زیب ڈنگے کی چوٹ پر سینہ تان کر سامنے آ گیا ہے۔ سراج صاحب پہلے ہی سے آکٹوپس کے خلاف فوجی ٹھوس بیج کر رہے ہیں۔ اب میں بھی اس کی آئے دن کی دھونس سے تنگ آ چکا ہوں۔ آپ چاہیں تو سراج سے معلوم کر سکتی ہیں۔“

”سنا لیجئے میں نے بھی ایسا ہی تھا لیکن.....“ میڈم نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ”اس سے غور فرمادہ ہونے کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی؟“

”جی ہاں.....“ آغا منصور نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مرکز تک اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں اس لیے وہ ہم جیسے انصران کی بھی پروا نہیں کرتا۔ سب سے زیادہ دشمن ایس بی اوریگ زیب کا ہے لیکن کچھ مرام اور پرتک ایس بی کے بھی ہیں جس کی وجہ سے وہ کل کرتا رہا ہے۔ جو کچھ آکٹوپس نے سیٹھ عثمان کے ساتھ کیا پھر رستم توڑی چونک آپ کو بھی ضرور سراج کے ذریعے ملی ہوگی۔“

”جی ہاں.....“ میڈم نے کسمار کہا۔ ”کسی وجہ سے وہ میرا جانی دشمن بھی ہے۔ ایک مرتبہ آپ کی عنایت تھی جو مسز سراج کام آگئے، اس وقت بھی لیاقت حسین فیضی مرد بن کر میرے کام آیا تھا۔ اس کے بعد بھی سراج صاحب نے ایک اور موقع پر مجھے تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ شاید وہ عنایت بھی آپ ہی کی ہدایت کی بنا پر ہوئی ہو۔“ میڈم نے بڑی انکساری سے بات جاری رکھی۔

”میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو مجھ پر قرض تھا۔ ایک بات اور بھی پوچھنا چاہوں گی۔ آپ نے کس کی سفارش پر مسز سراج کو میری حفاظت کی خاطر مامور کیا تھا؟“

آغا منصور نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کچھ توقف سے پوچھا۔ ”سراج نے آپ کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا؟“

”میں آپ کے منہ سے بھی سنا ہند کر دوں گی۔ کوئی قحاح ہو تو جانے دیجئے۔“

”بات قحاح کی نہیں لیکن..... کچھ باتیں ایسی ہوئی ہیں جو اگر انسان خود نہ کرے تو زیادہ مناسب ہوتا ہے۔“

”اور دوسرے کبھی کبھی بات کا بیٹھو بھی بنا دیتے ہیں۔“ میڈم نے سنبھل کر کہا۔ ”وہیے بھی اب ہم اس دور سے گزر چکے ہیں جب انسان اپنے منہ سے کسی بات کا اظہار کرتے ہوئی کچھکا ہوتا ہے۔“

”وہ..... بات دراصل یہ ہے کہ میری بیوی لا ولد ہی فوت ہو گئی تھی۔“ آغا منصور نے ایک سر

”اسی بہانے آپ کی نظر میں آ گیا۔ یہ بھی میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔“ آغا منصور نے میڈم کی نظر میں دور تک جھانک کر دل کی گہرائیوں سے کہا تو میڈم نے لاجواب ہو کر نظریں جھکا لیں۔

”میرا خیال ہے کہ اب میں ڈرا جا کر ایک نظر ڈرا تنگ روم میں بھی جھانک لوں۔“ تھریا ابھی تو آغا منصور نے گھبرا کر پوچھا۔

”کیا میری باتیں آپ کو پسند نہیں آ رہیں؟“

”جی نہیں.....“ تھریا راجت ہوئی۔ ”یہ سوچ کر جاری ہوں کہ ڈرا کہا یوں کیلئے تیار ہونے والے قہرے کو ایک نظر دیکھ لوں۔ کباب کے درمیان میں ہڈی آ جائے تو سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔“

تھریا مسکرا کر چلی گئی تو آغا منصور نے میڈم سے کہا۔

”آپ کی پیکر ڈی غامی کچھ دار نظر آتی ہے۔“

”میں اسے پیکر ڈی سے زیادہ اپنی بہن سمجھتی ہوں۔“ میڈم نے مسکرا کر کہا پھر قدرے سنجیدگی سے ہوئی۔

”جن لوگوں نے سراج صاحب پر حملہ کیا تھا، ان کا کیا بنا؟“

”ایس بی اوریگ زیب کے بیان کے مطابق وہ حملہ صرف ایک دارنگ تھی، بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اس بار بھی افاق سے سیٹھ عثمان کا ڈرائیو لیاقت حسین کا ڈی چلا رہا تھا۔ اس نے بردقت گاڑی کو نہ کاٹا ہوتا تو یہی دارنگ کوئی خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتی تھی۔“

”حملہ کس کے اشارے پر ہوا تھا؟“ میڈم نے یہ بعد سنجیدگی کے سوال کیا۔

”ہمارے ایس بی نے اس کا نام آکٹوپس رکھا ہے۔ ویسے آپ بھی شاید فتح حامد کے نام سے واقف ہوں گی۔“

”اس کے خلاف کوئی ایکشن بھی ہو یا نہیں.....؟“

”کوئی ثبوت ملے بغیر ایسے بڑے گھر مجھ کو آسانی سے نہیں چکڑا جا سکتا۔“

”سنائے کہ پولیس کے کچھ ڈسے دار انصران بھی اس کے ٹھک بھار ہیں۔“ میڈم نے پہلو بدل کر چیتے ہوئے انداز میں کہا۔

آغا منصور نے میڈم کو غور سے دیکھا پھر سنبھل کر بولا۔ ”ان میں کبھی نہیں..... بلکہ اب بھی میرا

نام بھی شامل ہے۔“

آکٹوپس کے کچھ مہربان بھی اس کے ساتھ اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا سلوک کر رہے ہیں۔
”درست سنا ہے آپ نے۔“

”شہنم کے بارے میں کیا خبر ہے..... شاید اسے انوار کیا گیا ہے؟“

”ہاں..... آغا منظور نے اس بار پھر میری اپنی حیثیت کا خیال کرتے ہوئے بات ٹالنے کی کوشش کی۔“ آکٹوپس کو بھی اس کی فکر لاحق ہے۔“

”ہیرا ذاتی خیال ہے کہ اس میں بھی بڑے مگر چھ کی کوئی گہری چال ہوگی۔“ میڈم نے کہا..... ”افضل خان کے ساتھ بھی ڈراما رچایا گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر شہنم کا افضل خان کے اپارٹمنٹ میں شفت ہونا اور پھر وہیں سے اس کا انوار..... اس کے بعد افضل خان کا بھی وہاں شفت ہو جانا..... ممکن ہے کہ شہنم کو بھی کسی پروڈیجٹ میں ناکام ہونے کی سزا دی گئی ہو.....؟“

”میں آپ کے ان اعلیٰوں کو روک نہیں کروں گا لیکن بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے۔“

”ثبوت دینے کی خاطر زبان کوں کھولے گا؟“ میڈم نے کسمار جواب دیا۔ ”افضل خان نے بھی تازہ کی کمی سے آنے والی کسی گولی کے خلاف سے ابھی تک زبان کھولنے کی جرأت نہیں کی۔ اب بھی اس نے شہنم کو انوار کرنے والوں کے طبع کے بارے میں زبان نہ کھولی، نہ کسی پر خلک کا اظہار کیا۔“

”اور بھی بہت سی شہادتیں سامنے آنے سے کتراتے ہیں۔“ آغا منظور نے کچھ توقف سے کہا۔
”لیکن اب جو صورت نظر آ رہی ہے اس نے آکٹوپس کے ہاتھ میری پچھلا دیے ہیں..... کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”آپ کسی قسم کی صورت کی بات کر رہے ہیں؟“ تھریا نے سنجیدگی سے سوال کیا۔
”ایک صورت آج ہی مکمل کر سامنے آئی ہے جس نے کسی ذمے دار آفیسر کو بھی آکٹوپس کے خلاف اور اکسا دیا ہے۔“ جواب دیتے ہوئے آغا منظور نے معنی خیز اعزاز میں میڈم کو نکھکیوں سے دیکھا تو تھریا نے خوشی سے کہا۔

”جج کہا ہے دانشور نے..... بیشتر پولیس والے بغیر لالچ کے کسی کے کام نہیں آتے.....“

جواب میں میڈم کے ساتھ آغا منظور بھی ہنسنے لگے۔

سراج دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا کہ راستے میں اسے ایس بی اورنگ زیب کی کال آ گئی۔

”آپ اپنے آفس جانے کے بجائے سیدھے میرے دفتر آ جا میں۔“

”خیریت تو ہے.....؟“

”ہاں، کچھ حالات درپیش آ گئے ہیں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”فی الحال یہ بتا سکتا ہوں کہ صبح چھ بجے تک ڈیوٹی دتا ہا ہوں۔“

آہ بھر کر غلامی گھورتے ہوئے دم مچے لیے کہا۔ ”بچے ہوتے تو دل بہل جاتا لیکن تمہاری کا احساس بھی کسی انسان کو ڈنٹے لگتا ہے..... آپ بھی اسی غم سے دوچار ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر ہم اپنے غم شیئر (Share) کر لیں تو اس میں کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔“

میڈم نے ذی آئی جی کے چہرے کے تاثرات کو بہت غور سے پڑھا، کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے نظریں پٹی کیے کیے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں جو کچھ کہنے جا رہی ہوں وہ آپ کو برا محسوس ہو لیکن..... پہلی بار میں نے ایک طویل خاموشی کے بعد جب گھر سے باہر قدم نکالا تھا اس وقت بھی میرا صرف ہی ایک مقصد تھا۔ صبح حامد کی صحت نامک موت..... میں افضل خان کے قلیت بھی ایک آفرے کر رکھی تھی۔ اگر وہ میری خواہش کے پیش نظر میرے شوہر کے قاتل کو قتل کر دیتا تو میں اس کو نہ صرف ایک نہایت معقول طے شدہ رقم دیتی بلکہ جائز طریقے سے اس سے نکاح بھی کر لیتی لیکن..... اس نے مجھے دھوکا دیا۔ میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس نے میرے خلاف ایسا ایک مہلک مواد حاصل کرنا چاہا جس کے بعد شاید میں کسی کے سامنے نظریں نہ اٹھا سکی..... اس وقت بھی قدرت کو میری حفاظت منظور تھی جو سسر سراج فرشتہ رحمت بن کر میری مدد کو آ گئے۔“ ایک لمحہ خاموشی کے بعد میڈم نے نظریں اٹھا کر کہا۔ ”یہ باتیں میں آپ کو بتانا پسند کروں گی تاکہ بعد میں آپ کو کوئی شکایت نہ ہو۔“

”آپ جو کچھ فرما رہی ہیں وہ کسی حد تک مجھے معلوم ہے۔ آپ نے خود اپنی زبان سے دہرا دیا۔ یہ آپ کی بڑائی ہے..... میں اس کے باوجود اپنی درخواستیں دائیں بائیں لوں گا۔“
”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ہر قیمت پر شیخ حامد سے اپنے بے نگاہ مرحوم شوہر کا انتقام لینا پسند کروں گی۔“

”نہایت مناسب شرط ہے۔“ آغا منظور نے فوری جواب دیا۔ ”میں بھی اس وقت تک کسی کو اپنا کر اس کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا جب تک آکٹوپس کا وجود ملایمیت نہیں ہو جاتا۔“
”وش پو آل دیہیت۔“ تھریا اچانک تالی بجاتی ہنسی کسرائی سامنے آ گئے پھر اس نے آغا منظور کو مخاطب کر کے خوشی سے کہا۔ ”دیکھا جناب آپ نے..... کہا اب کے درمیان سے ہڈی نکل جانے سے آپ دونوں کا مسئلہ کس قدر جلد آسان ہو گیا۔“

”میں..... اس کا مالیاتی کا سہرا آئی ہی کے سر پہے گا۔“ آغا منظور نے بے تکلفی سے اٹھ کر تھریا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”آپ دعا کیجئے کہ آکٹوپس کے تیرے (سوم) میں اب کوئی تاخیر نہ ہو۔“

”اس کے غم کا لچ بچ بعد میں ہوتا رہے گا۔ فی الحال آپ لوگ اس وقت اپنی خوشی کا ڈنٹا نرل فرما لیں۔“

ڈانگ روم میں کھانے کے دوران تھریا چپکلی رہی۔ جب کچھ دیر میں بے تکلفی کا ماحول ہوا رہا ہو گیا تو تھریا نے ہی دہلی زبان میں آغا منظور سے پوچھا۔ ”سنا ہے کہ آج کل آپ کے

سراج نے تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس نے پی کی تنبیہ سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملہ اہم نوعیت کا حامل ہوگا۔ مگر سہے نکلے۔ وقت اس نے اپنی رہائش پر تعینات گارڈز کو چوک رہنے کے احکامات دینے کے بعد الماس کو بھی تاکہ کر دئی تھی کہ وہ کہیں باہر آنے جانے کی غلطی نہ کرے، آفس کے اندر آتش ہو جانے کے بعد شیخ حامد بیٹھنا اپنے ذہن میں فتنی پھٹکنے سے اختیار کرنے کے منصوبے بنا رہا ہوگا۔ اس کا نزدیک اس طرف بھی کر سکتا تھا۔ ڈوم اور لوہجن کے سامنے آنے کے بعد اس کے ذہن میں بار بار میڈم رونی کا تصور بھی کھلبلا رہا تھا جو سادہ قام افریقی باشندہ ہے ہاشم کی پراسرار خود کشی کے بعد چاہک سامنے آئی تھی۔ ڈوم کی جلی ہوئی لاش شیخ حامد کے دفن کے اندر سے دھنبا ہوتی تھی جبکہ لوہجن کو بھی جانے عارضہ سے فرار ہوتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔ لوہجن گرفتاری کے بعد بھی بڑا پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کے سامنے سختی سے زبان بند کر رکھی تھی، یہ بھی کہا تھا کہ موت اس کے اختیار میں ہے جس کی خاطر وہ جب چاہے حالات میں ہونے کے باوجود ایسے طریقے اختیار کر سکتا ہے جو چھپکھپکی و بیری کے باوجود اسے آزادی کا پروانہ صفا دے۔ ہاشم کی موت میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بھی کسی سرخ الاغ شیر پر ہر کی کہانی بیان کی تھی، بین الاقوامی شہرت رکھنے والے جرائم پیشہ زبان بند رکھنے کی خاطر جن جدید اور حیرت انگیز طریقوں کو اختیار کر رہے تھے اس نے انٹرنیشنل پولیس کو بھی حیرت کر دیا تھا۔ لوہجن نے بھی بڑی لمبی قبری سے اسی بات کا مکمل کر اٹھا کر کیا تھا جس کے بعد اورنگ زیب نے اسے تھرڈ ڈگری ڈرائنگ روم فریڈنٹ دینے کے بجائے صرف لاک اپ کر دینے کو ترجیح دی تھی۔

میڈم سے شاید گفتگو تھی بعد سراج نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ اس نے شیخ حامد سے انتقام لینے کی خاطر ایک کمزور عورت کی وجہ سے خود مکمل کر سامنے آنے کے کرہ کیا ہوگا۔ اس کے پاس دولت کی فراوانی تھی جس سے وہ بین الاقوامی شہرت یافتہ یا اندر لوہجن کے خطرناک لوگوں کی خدمات حاصل کر سکتی تھی۔ سراج سے گفتگو کے دوران اس نے دبی زبان میں یہ بھی کہا تھا کہ کسی بھی بیوروں تلے آنے والی چیونٹی بھی کانٹے سے کرہ نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ ہاشم کی موت کے سلسلے میں اس نے ایئر کینی کے ریکارڈ سے جو معلومات حاصل کی تھیں اس نے یہی افشاد کیا تھا کہ ہاشم ڈوم اور لوہجن ایک ہی فلاح سے الگ الگ بیٹوں پر سسر کرے ہوئے تھے جس سے ہاشم نے کسی خاص وجہ سے زہر کھا کر خود کشی کا راستہ اختیار کیا تھا اور اب پولیس کی تلاش بیکار سے بازو جودہ کچھ عرصے روکٹ رہنے کے بعد سامنے آئے تھے۔ شیخ حامد کے کاہداری دفتر کو آگ لگانے میں ان دونوں کے ہاتھ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، یہ بھی سامنے کی بات تھی کہ اس کام کیلئے کسی نے ان کو حکم دیا ہوگا۔ ذاتی دشمن یا فساد کا سہارا ہوتا دفتر کو برباد کرنے کے بجائے وہ براہ راست شیخ حامد کو موت کے گھاٹ اتارنے کو زیادہ ترجیح دیتے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ ایک اہم نکتہ یہ بھی تھا کہ اسپتال میں جیش آنے والے حادثے کے بعد میڈم نے سراج سے دبی زبان میں چکا کی سفارش بھی کی تھی۔ اگر چہ جیسے کردہ کے سرخ فنگر اس

کی رسائی ممکن تھی تو اور بھی بہت کچھ سوچا جاسکتا تھا۔ اس نے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ سراج اور اورنگ زیب پر ہونے والے بم دھماکے کے سلسلے میں جگ باس کو اس کا موٹر اور موٹر ز جواب بھی دینے میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ان تمام غوس باتوں کی موجودگی میں یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ ہاشم، ڈوم اور لوہجن کی خدمات بھی میڈم سے مستعار لے رکھی ہوں۔ الماس سے کہن کا رشتہ جوڑنے کے بعد اس نے بھی بار سراج سے رد و برہم تلے اور اس کے گھر آنے کو بھی کہا تھا لیکن سراج نے اسی کو لاحق آنے والے خطرات کی بنا پر روک دیا تھا۔ سب سے بڑا وجہ یہ تھا کہ میڈم نے اورنگ زیب کے اشارے کے بعد شیخ حامد کو ہراساں کرنے کی خاطر چکا کو ہمارا کیا تھا۔ سراج کا ذہن اسی تنبیہ مسئلے کو حل کرنے میں الجھ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر دوبارہ مکینل موصول ہوا۔ اس نے نظریں جھما کر برابر والی سیٹ پر پڑے موبائل پر نظر ڈالی تو اسی کی روشن اسکرین پر میڈم رونی کے نمبر نظر آ رہے تھے۔

”ہیلو.....“ سراج نے موبائل اٹھا کر آن کرتے ہوئے کان سے لگا لیا۔ ”اس وقت میری یاد کیسے آگئی؟“

”اب میں آپ کو الماس کے رشتے سے زیادہ قریب محسوس کرتی ہوں اس لیے جب چاہے آپ سے رابطہ بھی قائم کر سکتی ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض نہیں؟“

”جی نہیں لیکن اس وقت میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔“

”آپ کو ایک اطلاع دینی تھی.....“

”ڈوم اور لوہجن کے سلسلے میں.....؟“ سراج نے چیخے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”آپ اگر اصرار کریں گے تو میں آپ کو باپس نہیں کروں گی لیکن اس وقت میں آپ کو ایک اور اطلاع دیتا رہی تھی۔“

”چلیں۔ پہلے آپ وہی اطلاع فراہم کر دیں جس کی خاطر رابطہ قائم کیا ہے۔“

”کل رات کا بڑا آپ کے ڈی آئی صاحب نے ہمارے غریب خانے پر کیا تھا۔“

”اور اس.....“

”عدا آپ ڈر ہضم ہونے کے بعد مجھے دے رہی ہیں۔“ سراج نے خوشگوار موڈ میں شہو کیا۔

”سفارش سب سے پہلے آپ ہی نے کی تھی۔“ میڈم نے قد سے بے باکی سے جواب دیا۔

”موجود حالات کے پیش نظر میں نے آپ کی سفارش اور تھریا کے مشورے کے بعد ہی اسے آغا منظور کی دعوت دینے کی اجازت دی تھی۔“

”تھوہا کسی اور کا نہیں لیکن نگرہ جانے میں آپ کی رضامندی کا دخل بھی ضرور ہوگا۔“

”میں انکار نہیں کروں گی۔“ میڈم نے اس بار بھی غیر تنبیہ کی سے جواب دیا۔ ”ایک بار پہلے میں نے انکی جذبہ کے تحت کسی کے مشورے کے بغیر کبھی ایسی ہی کوشش افضل خان کے سلسلے میں بھی کی تھی جس نے مجھے دھوکا دیا لیکن اس بار میں نے ایسی کوئی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔“

”آپ نے ضرورت مند کو گھر کا راستہ دکھا دیا ہے تو باقی خدمت میں بھی انجام دے سکتا ہوں۔“

”بہت بہتر شکر یہ لیکن اس وقت میں نے آپ کو ایک اور خیال سے فون کیا تھا۔“ میڈم نے بات جاری رکھی۔ ”میں آپ سے لوچن کے بارے میں کچھ بات چاہتی ہوں جو فی الحال اورنگ زیب کے قبضے میں ہے۔“

سراج نے لوچن کے حوالے پر چمک کر سوال کیا۔ ”آپ لوچن کو کس طرح جانتی ہیں؟“

”کم و بیش اس طرح جس طرح میں نے چمکے سلسلے میں آپ سے سفارش کی تھی بعد میں آپ کے حوالے سے میں نے آپ کے اس فی باؤں بھی نہیں کیا تھا۔“

”لوچن کے بارے میں آپ سے مزید کوئی سوال کرنے سے خواہش میں الماس ہی کے رشتے سے آپ کو یہ یاد کرانا چاہوں گا کہ آپ آگ سے کھینے کی کوشش نہ کریں۔“

”میں آپ کے مشورے کی قدر کرتی ہوں لیکن اپنے مرحوم شوہر کا انتقام لیے بغیر شاید میں موت کو بھی نہ قبول کر سکتوں گا۔“

”لوچن کے سلسلے میں کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ سراج غصہ اورنگ زیب کے آفس کے باہر گاڑی پارک کرے ہوئے سوال کیا۔

”کچھ خفیہ چیزیں اور راستے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو آسانی سے دریافت نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس کا کوڈ ورڈ آپ کو نہ معلوم ہو۔“ میڈم نے سچا لہجے میں کہا۔ ”لوچن بھی ایک خاص پاس ورڈ یا کوڈ کے تحت حسب مشا استعمال کیا جاسکتا ہے۔“

”وہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

”سینئر سٹار۔۔۔۔۔“ میڈم نے قدرے توقف سے کہا۔ ”آپ یہ ماسٹر کی اورنگ زیب کے حوالے کر سکتے ہیں لیکن ایک شرط ہے۔ میرا نام کسی صورت درمیان میں نہ آنے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں آپ سے کچھ دیر بعد رابطہ قائم کروں گا۔“

”میں کچھ درخواست کروں گی آپ میرے نام کو سامنے نہیں آنے دیں گے۔“

”او۔۔۔۔۔“ سراج نے مختصر جواب دے کر موبائل بند کیا مگر نیچے اتر کر اورنگ زیب کے دفتر کی طرف قدم بڑھانے لگا جو اس وقت اپنے آفس میں تھا اور سراج کا ہتھکڑی۔ شاید اسی بے چینی کے پیش نظر اس نے نرمی کٹنگو کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

”رات آپ کے جانے کے بعد مجھے اور آپ کے ڈی آئی جی صاحب کو دوبارہ آکٹوئس کے سامنے منہ دکھانے کی خاطر جانا پڑا تھا۔“

”کوئی نئی واردات۔۔۔۔۔؟“

”اسے واردات کے بجائے اگر آپ صور پھونکے جانے کا نام دیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ آئی۔ سی۔ کوئی نیا قابل یقین حادثہ پیش آگیا تھا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”کل رات کو کسی لوڈنگ ڈک کے ذریعے آکٹوئس کو اپنے ان تین آرمیوں کی جینی ہند لاشوں کا قتل بھی موصول ہو گیا جنہیں اس نے ڈی آئی جی سے سفارش کر کے میری حراست سے آزادی کا پروانہ دلایا تھا۔“

”یہ فوجی خبر میرے لیے یقیناً حیرت انگیز ہے۔“

”اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ لوڈنگ ڈک بھی خود آکٹوئس کی ملکیت ثابت ہوا جو پولیس نے ٹائٹ پیٹرولنگ کرنے والے محلے کی انفارمیشن پر آکٹوئس کی فیکٹری کے قریب سے دریافت کر لیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جو مردہ ملنا تھا وہ بھی آکٹوئس کا آدمی تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔“ سراج نے کرسی پر کسسا کر کہا۔ ”جو ڈرائیونگ آکٹوئس کے محلے کے نیچے اتاری گئی ہے اس کی کڑواہٹ کا احساس اسے بھی ضرور ہو گیا ہوگا۔“

”اس سے زیادہ تشویش ناک اطلاع اور بھی ہے۔“ اورنگ زیب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے ڈی آئی جی کی موجودگی میں نہ صرف پولیس کے تاحلی کا اعتراف کر لیا ہے بلکہ یہ زبان بھی دے رکھی ہوں کہ دو تین دنوں کے اندر اگر کسی مشتبہ شخص کو تلاش نہ کر سکا تو اس کو خط غلامی لکھ کر دے دوں گا۔“

”یہ آپ نے کیا غلطی کی؟“ سراج نے تعجب سے پوچھا۔ ”اب مشتبہ شخص کہاں سے پیدا ہو گا؟“

”اس کا جواب آنے والے وقت دے دوں گا۔ اورنگ زیب نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ڈی آئی جی نے مجھے بعد میں اپنی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت جب تیرکان سے گل چکا تھا۔“

”میں اس سلسلے میں کس کام آسکتا ہوں؟“

”صرف اس حد تک کہ تم اپنی زبان بند ہی رکھنا۔“ اورنگ زیب نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ پھر موبائل اٹھا کر کسی کا نمبر پچ کرنے لگا، رابطہ قائم ہونے پر فون لہجے میں بلا۔ ”میں تمہاری اب تک کی کارکردگی سے مطمئن ہوں۔ بات فکری یا احسان کی نہیں، ایک دوسرے کے ساتھ انٹرو اسٹینڈنگ کی ہے۔“

”مجھے یقین ہے۔ فی الحال ایک کام اور درپیش ہے۔“ اورنگ زیب نے اس ہوش کا نام اور کمرہ نمبر بتاتے ہوئے کہا جہاں افضل خان قیام پزیر تھا۔ ”تمہیں آج رات کسی ہفت اپنے خاص آرمیوں کے ساتھ اس کمرے پر فائرنگ کرنی ہے۔۔۔۔۔ نہیں، متعجب اسے ماننا نہیں ہے میرے کچھ ذاتی آدمی بھی اس کی گھرائی پر مامور ہیں، وہ تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے لیکن کچھ اور افراد ممکن ہے کہ اس فائرنگ کے خلاف مداخلت کریں، جنہیں ان میں کسی ایک کی رہائش کا سوراخ لگانا ہے۔۔۔۔۔ ہاں، ہو سکتا ہے کہ ہوش کا حملہ بھی مداخلت کرے، بہر حال۔۔۔۔۔ اگر تم بڑے مگر مجھ کے کسی آدمی کا سراغ نہ لے سکو تو یہ ایک اہم کام ہوگا۔ ضروری نہیں ہے کہ آج ہی یہ کام ہو لیکن جتنی

جلدی ممکن ہے ہو جائے تو بہتر ہوگا، مداخلت کرنے والے کا پتا معلوم کرنے کی خاطر تمہارے کسی اتحاد کے آدمی کا ہونا شرط ہے۔ تمہاری اور تمہارے آدمیوں کی حفاظت میرے ذمے ہوگی۔
گٹھ۔ چکا ہے کہنا کہ فی الحال اندر گرنا ڈنڈی رہے۔ اور۔۔۔ کے۔
”آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔“ سران نے کہا کہ فتح ہونے کے بعد اورنگ زیب سے دریافت کیا۔
”کیا آئندہ کوئی خاص آدمی ہمارے ہاتھ آسانی سے آجائے گا؟“
”تم اس ذمگی کو کیوں فراموش کر رہے ہو جو ہماری تحویل میں ہے۔ اس کی زبان بھی کوئی بڑا لالچ دے کر کھلائی جاسکتی ہے۔“
”آپ نے لوچ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ سران نے موقع دیکھ کر دلی زبان میں سوال کیا۔

”وہ سب سے اہم ہے لیکن۔۔۔ فی الحال میں اس پر آخری حربہ استعمال نہیں کروں گا۔“
”ایک بات مجھے بھی آپ سے دریافت کرنی ہے۔ کیا آپ تل بابا کی کہانی میں کل جاسم سے کے پاس دربار پھینک رکھتے ہیں؟“
”سب داستانوں کی فرغات ہیں۔“
”اسی قسم کی ایک شے آج کسی واردہ نے مجھے آپ کے پاس آتے وقت دی ہے۔“ سران نے سات اعزاز میں کہا۔ ”جو کہ اس نے کہا وہ صرف اے لے قابل عمل ہے کہ میں اس انجمنی کی آواز ایک دوبار پہلے سن چکا ہوں۔ ایک ہوائے پراس کی اطلاع غیبک ثابت ہوئی تھی۔“
”اب کیا اطلاع دی ہے؟“

”اس نے سین انشار کا ایک کوڑا دیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس پاس ورڈ کو لوچن کیلئے استعمال کیا جائے تو وہ بڑی آسانی سے اپنی زبان کھول دے گا۔“
اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے تک وہ سران کو یہ غور دیکھتا رہا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”کیا جس آدمی نے تمہیں یہ کوڑا دیا ہے وہ۔۔۔ میڈم روہی کا کوئی نمائندہ نہیں ہو سکتا؟“

”یہ شہ آپ کو کس طرح ہو رہا ہے۔؟“
”اس لیے کہ تمہارے علاوہ خود مجھے بھی یہ شہ ہے کہ ہاشم، ڈوما اور لوچن تینوں میڈم ہی کے آدمی ہو سکتے ہیں جنہیں ممکن ہے اسی سین انشار کے کوڑے دے دیے انکامات دے جائے ہوں۔۔۔ میرے ایک سوال کے جواب میں لوچن نے بھی خاموشی اختیار کی تھی کہ اس کو انکامات کسی صورت کی طرف سے ملتے ہیں یا مرد کی طرف سے۔۔۔“
”اور۔۔۔“ سران نے چوہنے کی بڑی خوب صورت اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ آپ کا اعزاز درست ہو۔“

”اور۔۔۔ کے۔۔۔ میں اس شے کو بھی کسی خوب صورت اعزاز میں لوچن پر آزما کر دیکھ لوں گا۔“

بہرہ و کچھ اور بھی کہتا چاہ رہا تھا کہ فنون کی گھنٹی بجی، اورنگ زیب نے ریسیور اٹھا کر منگلی کی بھرکام ختم ہونے کے بعد سران سے کہا۔ ”تمہارے محترم ڈی آئی جی صاحب کی کال تھی۔۔۔ مجھے فوری طور پر یاد کیا گیا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔“
”کیا مجھے ساتھ لانے کو کہا گیا ہے۔؟“
”نہیں۔ لیکن تم اس وقت میرے دفتر میں موجود ہو اس لیے میری خواہش پر میرے ساتھ چلے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“
سران نے اس کی بات ماننے سے انکار نہیں کیا۔



لیاقت حسین بڑی حوصلی کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔

بڑے عرصے کے بعد اسے خود اپنی ہی حوصلی میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے ایک عجیب سی افسردگی کا احساس ہو رہا تھا، اس حوصلی کا چنچا چاس کے وجود کا گواہ تھا۔ اس کے درو دیار سے اس کے بچپن اور جوانی کی نہ جتنی سچی گھٹکار یادیں وابستہ تھیں۔ وہ اس حوصلی کی سب سے پسندیدہ شخصیت تھی، ماں باپ دونوں اس کے گمن گاتے تھے، اس لیے کہ شرواعی سے اس کا رحمان مذہبی تعلیم کی طرف تھا، وہ نماز روزے کا پابند تھا۔ اسلامی تعلیمات میں اس کی دلچسپی کی تعریف اس کے استاد کی طرف سرسرفراز خان سے کرتے تھے، اس کے اندازہ ماں کی تربیت اور باپ کی خودداری اور انسان دوستی دونوں کا ہاتھ تھا۔ وہ اپنی ذات سے دوسروں کا کھال رکھنے کا عادی تھا۔ غریبوں میں کھانا ملنا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا اور ہر طرح سے ان کی مدد کرنا اس کی سرشت میں داخل تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سردار سرسرفراز خان ملتے میں اپنی امارت، اپنی تہذیب سے سبب خود کو لیے دیے رکھتے کا عادی تھا، وہ سخت اور غصوں اصولوں کا مالک تھا۔ باہت عادی لیاقت حسین کو بھی ورے میں ملی تھی۔ وہ جو فیصلہ کر لیتا اس سے پیچھے ہٹتا اس لیے بھی باپ کی طرح پسند نہیں تھا لیکن شادی کے معاملے میں پسند نا پسند کی بات نہ باپ اور بیٹے کے درمیان ایک دیوار ضرور حائل کر دی تھی۔ لیاقت حسین اس دیوار کو بھی باپ کی مرضی پر ڈھانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ وہ باپ کی خوشی پر شاید اپنا کبھی گھونٹ لیتا لیکن جب اس نے ماں سے محل کر اپنی پسند اور اپنے دل کا حال بیان کیا اور ماں نے بھی صاف گوئی سے محل کر فرمین کے حق میں ووٹ دیا تو اس کا پلازادون کے اعتبار سے بھاری ہو گیا۔ پہلی بار اس نے باپ سے اپنا حق مانگنے کی خاطر زبان کھولی۔ سرسرفراز خان کو بھی شاہ پری کے باپ کو زبان دینے کا خیال تھا، وہ مرد تھا، سردار تھا، بیٹے کی خوشی کی خاطر بھی اپنی بکری کا شملہ گرانے پر آمادہ نہیں ہوا لیکن اس کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بنا۔ یہ بے شمار سیلنگ تھم سنا دیا کہ لیاقت حسین اگر فرمین کو زبان دے چکا ہے تو خوشی سے اسے اپنا لے لیکن اس صورت میں اسے وہ حوصلی چھوڑنی پڑے گی جہاں سرسرفراز کے فیصلے کو منجنے تھے۔ لیاقت حسین نے ماں کی دعا میں کے فرمین کا ہاتھ قیام کیا تھا اور آج۔۔۔ آج ایک عرصے بعد وہ پھر اسی دلیہر کو بیور کرنے سے بچچا رہا تھا۔

کے ساتھ کسی دھوکا نہ کرنا۔ نہ کبھی کسی غریب کا امداد کرنے سے منہ موڑنا، اوپر والا بھی انہی کو نواز ہے جو اس کے راستے پر قدم اٹھانے سے نہیں ڈرتا۔ موت اور زندگی، اچھا اور برا سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تم اس کے راستے پر چلے گا تو وہ بھی اپنا رحمت کا سارا راستہ تمہارے لیے کھول دے گا۔“

لیاقت حسین ماں کی باتیں سن کر خوش ہوتا رہا، اس کی خاطر عداوت کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس وقت وہ بہت عرصے بعد اپنے گھر کی شیمیری چائے پی رہا تھا اور اس کی لذت اور سوکھی سوکھی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہا تھا، جب فرمین دوپاسر پر ڈانٹیں چلائی گئیں اٹھ کر کھڑی ہوئی، لیاقت حسین نے چمک کر نظریں گھمائی تو وہ بھی چائے کا کپ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے اس کا باپ سردار سرفراز خان کھڑا ہے غیر نظروں سے محذور رہا تھا، اس کی پگڑی کا شلہ اس وقت بھی پوری شان سے اٹھا ہوا تھا۔ لیاقت حسین نے باپ کو ادب سے سلام کیا۔ ”سلام بابا جان۔“

”تم..... ادھر کب آیا؟“ سرفراز خان نے اس سے ٹھوس لہجے میں سوال کیا۔
 ”ابھی یکم دو پہلے آیا ہوں بابا۔“ بس سے اتر کر سیدھا آپ کے قدموں میں چلا آیا۔“

لیاقت حسین نے دم لہجے میں کہا۔ ”آپ سے معافی مانگتے۔“

”فرمین کا اور بات ہے۔“ سرفراز خان نے سچا لہجے میں کہا۔ ”تم نے اس کا داخلہ بند نہیں کیا تھا لیکن تم.....“

”اب تو شاہ پری بھی اپنا گھر کا ہو گیا۔“ لیاقت حسین کی ماں نے شوہر سے اولاد کی سفارش کی۔ ”کیا اب بھی تم لیاقت کیلئے اپنا کھمبہ نہیں بدلے گا۔ وہ تم سے ابھی بھی ناگ رہا ہے۔“

”تم ادھر شہر میں کیا کام کرتا ہے۔“ سرفراز خان نے ہاتھ اٹھ کر بیوی کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”ایک روز پہلے تک کسی کا ڈانیر تھا۔ کل سے میری ترقی ہو گیا ہے۔ لیاقت حسین نے مکمل کر مگر بہ دستور دم لہجے میں باپ کو بتایا۔ ”خیلو نے ہماری محنت اور ایماندار سے خوش ہو کر اپنے دفتر کا سپردا کر بنا دیا ہے۔“

”تمہارا پرانا تنخواہ کتنا تھا۔ اور اب کیا ملے گا؟“ اس بار بھی سرفراز خان نے خشک اور اکھڑا انداز میں سوال کیا، اس کی نظر فرمین پر بد دستور لیاقت حسین کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”پہلے پانچ ہزار ملے تھے پھر ترقی ہوتے ہوئے آٹھ ہزار ملنے لگے، جہاں کام کرتا ہوں وہاں صاحب نے نیا بیگ خریدو تو اس کے اندر بی ہوئی ہائش گا، بھی مجھے مفت دے دی اور اب.....“

”اب آٹھ ہزار سے ایک دم تیس ہزار۔“ سرفراز خان نے تصدیق ہوئی آواز میں کہا۔ ”انتہا ترقی ایک دم کیسے ہو گیا؟“

”سب خدا کی مہربانی اور آپ لوگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

”تم جہاں کام کرتے ہو اس کے مالک کا نام کیا ہے؟“

لیاقت حسین نے جواب دینے میں تاخیر کی تو ماں نے بھراس کی سفارش میں زبان کھولی۔

گاؤں میں داخل ہونے سے خوش اس نے فرمین کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ حویلی جا کر اس کا انتظار کرے، اس نے بس سے اتر کر فرمین کے گھر یا کہیں اور جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ جس محل سے اس کے باپ کا وہاں سے اس کو اپنے ٹھکانے کی واپسی مجرد ہونے کا غصہ ہو، وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کرتا چنانچہ وہ اس وقت اپنا ایک سفری قبیلا لے لے بس اسٹاپ سے سیدھا اپنی حویلی پر گیا تھا، اسے امید تھی کہ شاہ پری کا گھر آباد ہو جانے کے بعد اب اگر اس نے باپ سے معافی مانگی تو شاید اسے قبول کر لیا جائے گا، اسی امید اور تاسیدی کی کی رنہ کشی کے درمیان وہ حویلی کی بیڑیوں پر کھڑا لوگوں کی یکجہتی سے دو چار تھا جب حویلی کا بڑا دروازہ کھلا بھر ماں کی مستابھری آواز اس کے کانوں میں رس گھولی گئی۔

”پانچہراٹلے (خوش آمدید) لیاقت خانا۔“

ماں کی آواز سن کر وہ چلے گا، اس نے دروازے کی سمت فطرتی ڈال دی جہاں اس کی ماں اپنے ہاتھ کشادہ کیے اسے اپنے سینے کی گھرائیوں میں سیٹھ لینے کی آرزو لے کر کھڑی تھی، اس کی پشت پر اسے فرمین بھی نظر آتی تو اس نے قیلا بیڑیوں پر چھڑا اور ایک کمرے کے سینے سے سرگ کر رونے لگا۔

”مجھے پورا یقین تھا ماں کا جان کہ تم ایک دن ضرور ماں کے پاس آئے گا۔ ادھر باہر کیوں کھڑا ہے؟“

”ماں۔ وہ بابا.....“

”تم اب اس کا بھکومت کرو۔“ ماں نے اسے حوصلہ دیا۔ ”شاہ پری کا باپ نے جب اس کا شادی دوسری جگہ بنایا تھا تو پھر ہمارا زبان بھی آزاد ہو گیا۔“

لیاقت حسین اب بھی باپ کے خوف سے پچکارا رہا تھا جب فرمین نے اشارے سے بتا دیا کہ سردار سرفراز خان اس وقت موجود نہیں ہے، لیاقت حسین ماں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کے حصار میں لیے اندر آ گیا۔ ماں کا چہرہ مسرت سے گھار ہو رہا تھا، پرانی خادائیں خاطر عداوت میں لگ گئیں، فرمین بھی بہت خوش تھی لیکن لیاقت حسین کے دل میں ابھی تک باپ کی طرف سے ایک دھوکا سا ساگ تھا پھر بھی اس نے ماں کے اصرار پر اٹھ کر غسل کیا، نیا شلوارسوٹ پہن کر ماں کے سامنے آیا تو اس نے پھر اس کی بلا میں لپٹی خروش کر دی۔ وہ ماں کو اپنے بارے میں سیدھے ٹھکان کا نام درمیان سے نکال کر، ایک ایک بات کی تفصیل بتاتا رہا، ماں کی روشن آنکھوں کی چمک بڑھنے لگی۔

”فرمین نے بتایا تھا کہ تم ادھر شہر میں ایک بہت بڑے بنگلے میں رہتا ہے۔“

”ہاں ماں۔ سب تیری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

”ابھی ہمارا عیار ابھو نے اور خوش خبری بتایا ہے۔“ ماں نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ ”تمہارا شاید تری بھی ہو گیا ہے۔ بڑا آپھیرے میں کیا ہے؟“

”ہاں ماں۔ اب میری تنخواہ ایک دم تیس ہزار روپے ملانہ ہو گئی ہے۔“

”خدا تم کو امداد پہنچا اور دے گا لیکن ماں کا ایک بات یاد رکھنا لیاقت..... ہمیشہ سچ بولنا اور کسی

”اب میں بیٹے کے ترہے سے تم سے ابھی باتگ..... خدا کیلئے اس کا تصور مجھ کر دو۔“

”لیاقت.....“ سرفراز خان نے اس بار قدرے نرم لہجے میں براہ راست لیاقت حسین سے کہا۔

”میں اور مردہ کر بھی اوھر کا خبر کر رہا ہوں۔ میری اطلاع یہ ہے کہ تمہاری ترقی اس لیے ہو کہ تم نے مالک اور اس کی بیوی کا موقع پر جان بچایا تھا، کیا یہ درست ہے؟“

”جان بچانے والی ذات خدا کی ہے بابا.....“ لیاقت حسین نے پھر بات گول کرتے ہوئے نہایت سعادت مندی سے کہا۔

”میں نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دی ہوئی تعلیم کے پیش نظر صرف ان کی نمک حلائی کی تھی۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے دوسرے غلام کو مسلمان کی مدد کی تھی۔“

”فرمین.....“ سرفراز خان نے نظر جمھا کر بہو کو الیہ نفروں سے دیکھا۔

”کیا تم بھی سردار خان کے سامنے تمہا پھر کر بات کرنے کی کوشش کرو گی؟ کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ لیاقت حسین جس کے پاس کام کرتا ہے اس کا نام کیا ہے؟“

”میں آپ کے حکم سے انکار نہیں کر دوں گی۔“ فرمین نے کن انھیں سے لیاقت حسین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کیلئے آدمی کا نام سیف عثمان ہے اور اس کی نیک سیرت بیوی کا نام راجہ بیگم ہے خان بابا..... ان کے بڑے احسانات ہیں ہم دونوں پر۔“

”کیوں لیاقت..... کیا فرمین نے سچ بتایا ہے؟“ سرفراز خان نے دوبارہ بیٹے کو دیکھا۔

”ہاں بابا.....“

”پھر..... تمہاری زبان کو تالا کیوں لگا تھا؟“

”بابا..... وہ دراصل.....“

”مجھے سب کچھ معلوم ہے۔“ سرفراز خان نے کھل کر کہا۔

”آج سیف عثمان سے ہماری گفتگو بھی ہوئی تھی۔ تمہاری خاموشی کی وجہ بھی جانتا ہوں۔ یہ بھی خبر ہے کہ تم سے پہلے اسے میرا نام نہیں بتایا تھا، کچھ دن پہلے زبان کھولی ہے لیکن.....“ سرفراز خان نے کچھ توقف سے کہا۔

”تمہیں چار بڑوں کے سامنے میرے پاؤں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگی ہو گی۔ تمہارا فیصلہ کیا ہے؟“

”میں پورے قبیلے کی موجودگی میں بھی آپ کے بیروں کو چھو کر اور ہاتھ باندھ کر معافی مانگتا اپنے لیے فخر سمجھوں گا۔“

”سچ بول رہے ہو؟“

”میں آپ ہی کا خون ہوا بابا.....“ لیاقت حسین نے بہ دستور لہجے میں جواب دیا۔

”مر جاؤں گا لیکن جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

سردار سرفراز خان کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری۔ ایک لمحے وہ بیٹے کو دیکھتا رہا پھر اس نے مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

”لیاقت حسین دیوانوں کی طرح لپک کر باپ کی کشادہ چھائی سے چٹ گیا۔“

فرمین اور لیاقت حسین کی ماں کی نظریں بھی خوشی کے آنسوؤں سے چمک اٹھیں۔



رات کے دو بجے کا وقت تھا جب سڑک کے جانب کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ ایک جھکار کی تیز آواز سے ٹوٹ کر گر کر افضل خان چڑا کر تھا۔ خطرے کا پہلا احساس ہوتے ہی اس نے جھپٹ کر نیچے کے نیچے سے اپنا لوڈ پتول نکالا اور لینے ہی لینے بستر سے نیچے فرش پر آ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فوری طور پر ٹائٹ بلب کو سوچنے کے ذریعے بند کیا پھر کسی آدم خور گھر کی طرح تیزی سے فرش پر رینگتا ہوا کھڑکی کی جانب بڑھنے لگا۔ ابھی وہ آدھے راستے میں تھا کہ باہر سے گولیوں کی تڑ تڑاہٹ کی آوازیں ابھرنی شروع ہوئیں۔ انداز ایسا ہی تھا جسے دو پارٹیاں کل کر ایک دوسرے سے ٹکرائی ہوں، ایک پارٹی یقیناً ان گولیوں کی راہی ہو گی جنہوں نے شہنم کو اغوا کرنے کے بعد اب اسے بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کی ہو گی۔ ان کے بارے میں وہ ابھی تک کوئی آخری نتیجہ نہیں قائم کر سکا تھا، دوسری پارٹی اس کے گمان کے مطابق قلعہ مائدہ کے خاص آدمی کی بھی ہوسکتی تھی جس نے بلک بلیک کے حوالے سے اس سے بات کی تھی۔ دونوں صورتوں میں اس کی جان کو جو خطرہ لاحق تھا وہ اب اس میں خاموش تماشا بنی نہیں رہ سکتا تھا۔

کھڑکی کے قریب پہنچ کر وہ دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ پہلی فرصت میں پتول کا رخ سڑک کی جانب کر کے دو فائر جھونک دیئے۔ دو دونوں ہی پارٹیاں کو اس بات کا احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ بیدار ہو کر جوابی کارروائی کیلئے پوری طرح آمادہ ہے۔ اس کے فائر کرنے کے فوراً ہی بعد دوسری جانب سے کسی دور بار بار ٹھٹھ کے ذریعے کھڑکی کی سمت فائر کیا گیا۔ سنسنائی ہوئی گولیاں کھڑکی سے گزر کر چھت سے ٹکرائی گئیں۔ وہ تیزی سے آڑ میں ہو گیا۔ جوابی حملے نے اس کو اور زیادہ ہوشیار کر دیا۔ اب شاید اسے شکانے لگنے کا فیصلہ ہو گیا تھا لیکن وہ ترانوہالہ بن کر کسی کے قتل کے نیچے اترنے کو تیار نہیں تھا۔ جو کھیل اب شروع ہوا تھا، وہ اس کا پرانا اور تمہا ہوا کھلاڑی تھا۔ وہ حفظ باقاعدہ کے طور پر ایک کمرے سے دروازے کے قریب آ گیا۔ ایک دو افراد اس کی گھرائی پر بھی کھیں قریب موجود ہوئے تھے جو پہلے کی طرح دروازے کا لاک کھول کر اندر آ سکتے تھے۔

افضل خان کے پتول کے میگزین میں ابھی چار گولیاں اور موجود تھیں، وہ انہیں ضائع نہیں کر سکتا تھا، کسی کی گرفت میں آنے سے بے اختیار وہ کم از کم تین، چاروں گولیوں کو کا آدہ بنانے کی شان چکا تھا۔ پتول کے دسٹے پر اس کی گرفت مضبوط تھی، انھیں کسی پچھتے کے مانند چھٹی ہوئی دروازے پر بھی ہوئی تھیں۔

دوست تک سڑک سے گولیوں کے تادلے کی آواز آتی رہی پھر شاید ایک پارٹی فرار ہو گئی تھی جس کے بعد دوسری پارٹی نے مزید ایک دو ہوائی فائر کرنے کے بعد پولیس سے بیچنے کی خاطر موقع واردات سے دور رہت ہانا مناسب سمجھا ہو گا۔ افضل خان فائرنگ بند ہونے کے بعد بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا..... اس کے کان دروازے کے آس پاس کسی بھی آہٹ کو سننے کی خاطر چناب تھے۔

پانچ منٹ اور گزر گئے۔ دروازے کے باہر کوئی آہٹ نہیں ابھری البتہ بستر پر پڑے ہوئے اس کے موبائل سے کسی بھیٹنگ کے ٹھڑانے جیسی آواز ابھرنے لگی، افضل خان نے بچوں کے بل جیری سے لپک کر موبائل اٹھالیا۔ دروازے کے قریب آ کر اس نے دوبارہ پوزیشن سنبھالی پھر موبائل آن کر کے دنگ آواز میں بولا۔ ”کون ہے۔۔۔؟“

”صرف تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی۔“ دوسری جانب سے وہی آواز سنائی دی جس نے پہلے بلکے ٹانگہ کے حوالے سے فون کیا تھا۔

”اودھ۔۔۔ پہلے تم نے دوسرے نمبر سے کال کیا تھا۔“

”فضول باتوں سے پرہیز کی عادت ڈالو۔۔۔ میں نے تمہاری خیریت پوچھی تھی۔“ خشک لہجے

میں سوال دہرایا گیا۔

”میں کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے ہی بیدار ہو گیا تھا۔ اس وقت میں پتہ تو لے لیا دروازے سے لگا کھڑا ہوں۔“ افضل خان نے بھی جواب میں مردود یہ اختیار کیا۔ ”اب میں نے بھی ان لوگوں سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا ہے جن کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی تھی، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فکرسزا میری پرانی عادت ہے۔“

”گڈ۔۔۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ تم دوبارہ کرس کر لو۔۔۔ ہو سکتا ہے پھر کوئی ذمے داری تمہاری پھر دی جائے اور ایک بات اور۔۔۔“ دوسری جانب سے جملہ مکمل نہیں کیا گیا۔ شاید دروازے پر ہونے والی حیر آواز کی دھبک ابھر گئی لیکن افضل خان نے موبائل آف کر کے جیب میں ڈال لیا، بلند اور تیز لگاری آواز میں آنے والے سے دریافت کیا۔

”کیا بات ہے۔۔۔ کون ہے؟“

”میں ہوئی کا غیر باجوہ ہوں۔“ باہر سے کہا گیا۔ ”تمہاری کھڑکی پر باہر سے گولی چلائی گئی تھی۔ دروازہ کھولو۔۔۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کتنا نقصان ہوا۔ پولیس کو بھی فون کرنا ہے۔“

افضل خان نے مزید اطمینان کر لینے کے بعد دروازہ کھول دیا۔ آنے والا ہوئی کا غیر یہ تھا، جکی نینٹو سے اٹھنے کے بعد وہ بھی جھلایا ہوا تھا۔ کھڑکی کا پکنا چور شیشہ دیکھ کر اس نے افضل خان سے دریافت کیا۔ ”گولی دھننے والے کون لوگ تھے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے انہیں دعوت نامہ بھیج کر بلوایا تھا۔“ افضل خان بھی تھلا کر بولا۔

”میرا مطلب یہ تھا جنہوں نے تمہارے کمرے کا نشانہ لیا ہوگا ان کے ارادے بھی خطرناک ہوں گے۔“

”مجھ سے پہلے یہاں کون کیا یہ دار تھا؟“ افضل خان نے اسے ٹالنے کی خاطر تفتیش کی۔

”ایک مرد اور ایک عورت، ادھر تفریق کی غرض سے آئے تھے۔“ باجوہ نے بتایا۔ ”میں نے مرد کا شہنشاہی کارڈ جمع کرنے کے بعد ہی انہیں کمرہ کیا تھا۔ تمہارے آنے سے دروازہ پہلے ہی وہ چلے

گئے تھے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ عورت گھر سے بھاگی ہوئی ہو جس کے درٹاس کی بوسہ گھٹتے ہوئے اب یہاں پہنچے ہوں۔“

”یہ بھی ممکن ہے تمہارا ایشیاء درست ہو لیکن پولیس کو بہر حال اطلاع دینی ہوگی اس کے علاوہ جنہیں بھی اب دوسرے کمرے میں شفٹ کرنا ہوگا، مالک نے اطلاع ملنے پر مجھے تاکید کی ہے کہ نوٹ چھوٹ کی فوری مرمت کرائی جائے، ہمیں ہوئی کی رپورٹیشن کا بھی خیال رکھنا ہے۔“

”آئی رات گئے کیا کارنگیڈوں کو گھر سے اٹھاؤ گے؟“

”ہمارے کارنگیڈ ادھر ساتھ ہی رہتے ہیں۔“ باجوہ نے کہا۔ ”ان سے یہی معاہدہ ہے کہ نوٹ چھوٹ کی مرمت کی خاطر کسی وقت بھی بلایا جاسکتا ہے۔“

”میں بیج کرہ خالی کر دوں گا۔“ افضل خان نے جملہ کر جواب دیا۔ ”پوری رات برباد نہیں کر سکتا۔“

”ہوئی کی رپورٹیشن کے علاوہ میری ملازمت کا معاملہ بھی ہے۔ میں آپ کو اس سے بہتر کرہ دینے کو تیار ہوں۔“

افضل خان اور اس کے درمیان بحث طویل پکڑ رہی تھی جب موبائل پر پھر وہی نمبر ابھرے جو کچھ دیر پہلے نظر آئے تھے، افضل خان نے ریسپونڈ کر کے فوراً غری کہا۔ ”جی بھائی جی۔۔۔۔۔ خیریت ہے ہوں۔“

”تمہارے کمرے میں غالباً ہوئی کا غیر موجود ہے۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی ہاں۔“

”میرے ایک ساتھی نے جوابی ہوئی میں موجود ہے مجھے فون پر اطلاع دی ہے شاید نیچر تم سے کمرہ خالی کرانے کی اور دوسرے کمرے میں جانے کی درخواست کر رہا ہوگا۔ میں ہوئی کے مالک کی عادت سے بھی واقف ہوں۔ وہ ہر کام مرمت بڑی جلدت میں کرانے کا عادی ہے۔“

”ہاں جی۔۔۔۔۔ اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟“ افضل خان نے غیر متحرک بات کی۔

”تم اپنا ایشیاء جی کا سامان وینڈ بیگ میں رکھ کر ہوئی چھوڑ دو۔“ دوسری جانب سے حکمانہ انداز میں کہا گیا۔ ”سامان کی لگرمت کردو، وہ میرے آدمی کی ذمے داری ہے۔ تم ہوئی سے نکل کر کوئی کرائے کی سواری پکڑو اور جرنل پوسٹ آفس کے صدر دروازے کے سامنے اتر جاؤ، باقی ہدایت جنہیں وہاں پہنچنے کے بعد ملے گی۔“ جملہ مکمل کرتے ہی رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔

”کیا بات ہے جناب؟“ فیچر نے افضل خان کے چہرے پر ابھرنے والی جھلاہٹ دیکھ کر سوال کیا۔ ”کس کا فون تھا؟“

”بڑے بھائی صاحب کا۔۔۔۔۔ میں گھر سے ناراض ہو کر آیا تھا۔ انہوں نے فوراً واپس آنے کی تاکید کی ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ میرے گھر چھوڑنے کا جو مطالبہ تھا وہ پورا کر دیا جائے گا۔“ افضل خان

نے بات بتائی۔ ”میں ونڈ بیگ لے کر نکلتا ہوں، باقی سامان میرا دوست آکر لے جائے گا۔“
 ”جیسے تمہاری مناسب خیال کرو۔“ باجوہ نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر جواب دیا۔ ”ہم
 آپ کی کسی شے کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے، مرمت کا کام بھی میں اپنی گھرائی میں کر اؤں گا۔“
 ”پلیس کو میرے جانے کے بارے میں کیا بیان دو گے؟“

”قہانے کے ڈے آفیسر سے بھی اپنی جان بچان پرانی ہے جناب۔ بیان شیان کیا دیتا ہے،
 ضابطے کی کارروائی کی خاطر کاغذی خانہ پری ہوگی..... ہم بھی بسے پھنڈوں میں نہیں پڑنا چاہتے،
 آپ کے بارے میں بتا دوں گا کہ پرانی واقعیت ہے۔ وقتی طور پر ایک دن کیلئے دوسرے ہوش میں
 شفٹ کر دیا ہے۔“

”خاصے مجددار، ذہین اور گھاگ آدی معلوم ہوتے ہو۔“

”بنا پڑتا ہے جناب..... بغیر کھمکے ہوش کا دھندا بھی نہیں چلتا۔“

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس بگ بسا کے خاص آدی کی ہدایت پر عمل
 کرنے سے سوا انکار کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی، اس نے ضروری سامان اٹھا کر ونڈ بیگ میں ڈالا اور
 ہوش کے باہر آ گیا۔ قسمت ابھی تھی جو اس وقت ایک بیگ ہوا شرابی برقع پوش لڑکی کے ساتھ ہوش
 کے سامنے ٹھیکسی سے اترا۔ جب سے سو کا نوٹ نکال کر اس نے ٹھیکسی ڈرائیور کی سیٹ کی طرف بڑی
 فاضلی سے پھینکا پھر لڑکی کا ہاتھ تھام کر ہوش کے ریسیٹین کچھ طرف چلا گیا۔ افضل خان نے وہی ٹھیکسی
 پکڑ کر اسے جہز پوسٹ آفس کی طرف چلنے کی تاکید کی پھر تھکے ہوئے اعزاز میں پشت سے ٹیک لگا
 لی۔ اس کا ذہن آئندہ چپڑ آنے والے لمحات سے ٹھننے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا
 تھا، ایک بے خیال بھی اسے پریشان کر رہا تھا کہ آخری دوسری پارٹی کون تھی جس نے بڑے محرم مجھ کے
 مضبوط قہقہوں میں کیڑے ہوئے شکار کو اس سے چھیننے کی جرات کی تھی؟

✽✽✽

کمرے میں داخل ہونے والا ایس بی اورنگ زیب اس وقت تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک
 شخص اور بھی تھا جس نے اپنے ہاتھ میں ڈاکٹروں والا پرسٹیک بیگ تمام رکھا تھا۔ اورنگ زیب کے
 چہرے پر بھی خلاف معمول سنجیدگی حادری دیکھ کر شبنم تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میردلی دروازہ ان دونوں کے اندر آتے ہی باہر سے بند کر دیا گیا۔ اورنگ زیب چند لمبے
 کوچھب قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے بڑے سرو لہجہ میں کہا۔ ”کسی نے سچ کہا ہے کہ
 خوبصورت ناگن کو دودھ پلا کر اس کی پردوش کرنا کسی مجھے ہوئے شکاری کیلئے بھی ہمیشہ خطرناک ہی
 ثابت ہوتا ہے۔“

”جی.....“ شبنم نے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”م..... میں سمجھی نہیں؟“

”جو سواگل تم کو دیا گیا تھا وہ اب کہاں ہے؟“

شبنم نے جواب میں سواگل اٹھا کر اورنگ زیب کے حوالے کر دیا لیکن وہ ابھی تک اس کے
 لہجے کی تپتی کاسب میں جاس کی گئی۔

”ایک بات ذہن نشین کرو۔“ اس نے شبنم کو تیشہ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام
 اورنگ زیب ہے جو تمہارے بگ باس کو بھی ہمیشہ جوئے کی ٹوک پر اراتا رہا ہے۔ تم کس کمیت کی
 مولیٰ ہو؟..... افضل خان کو میں اس کی قبر کھود کر بھی برآمد کروں گا لیکن تم..... تمہارا انجام اب ان ہی
 لوگوں کے ہاتھوں خطرناک ہو گا جن کے لیے تم کام کرتی رہی ہو۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں..... میں ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتی۔“

”جو کومت..... کیا تم نے افضل خان کو فون کرنے کا اعتراف مجھ سے نہیں کیا تھا؟“

”سکيا تھا لیکن.....“ اس نے ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتی۔

”وہ مجھے تاہم کبھی میں رکھنے کی خاطر۔ میرا اعتماد حاصل کرنے کیلئے تمہاری ایک خوبصورت چال

تھی، غریب تھا۔“

”نہیں.....“ شبنم نے ایس بی کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی خاطر بڑی عاجزی کا مظاہرہ
 کیا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو میری طرف سے ضرور کوئی بدگمانی ہوئی ہے۔ میں نے دوبارہ افضل سے
 کبھی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔“

”گڈ..... اورنگ زیب کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ابھر کر گہری ہونے لگی۔ ”تم لفظوں کے

”آن دن کنڈیشن اولیٰ.....“ اورنگ زیب نے بدستور خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”اب بھی وقت ہے۔ افضل خان کہاں ملے گا۔ اس کا پتا مجھے بتا دو۔“

”آپ ایک بار پہلے بھی میرے سلسلے میں میڈم کے قصد بق کر چکے ہیں، ایک بار پھر.....“

جواب میں اورنگ زیب کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ”تمہاری میڈم کیا ہے؟ مجھے اس کا اندازہ بھی ہو چکا ہے، اپنا مطلب نکالنے کے بعد میں اسے بھی قانون کے حوالے کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ شبنم نے پھر حرمت کا اظہار کیا۔ ”آپ شاید اچھی طرح واقف ہوں گے کہ میری میڈم بھی آپ کے آکسول کی کردی کا دکھار ہو چکی ہیں، ہم دونوں ہی اس سے انتقام کی خاطر زندگی کی بازی لگ چکے ہیں اور آپ.....“

اورنگ زیب نے اس کی بات پر دھیان دینا مناسب نہیں سمجھا، جیپ سے موہاں نکال کر کسی کے نمبر پر کال لگائے، اس کے چہرے سے بدستور اطمینان اور جھلاہٹ عیاں تھی، رابطہ ہونے کے بعد اس نے سستا حوے افسرانہ لہجے میں ہدایت دی۔ ”چندہ منٹ بعد وین لے کر بتائے ہوئے اسپتال پہنچو..... لڑکی وہیں تمہیں پہنچا دی جائے گی۔ ہاں..... ٹھیک ہے لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو، ڈپٹی پرنسپل سراج کو اس کی بیسک میں تھپس ملنی چاہئے۔ ہاں، اس کے بعد تمہیں کو یہاں بھی ایسا ڈرانسا کرنا ہے جس سے یہی ظاہر ہو کہ مخالف پارٹی کے بدعاش ہمارے آدھیوں کی غفلت اور بے لگاری سے فائدہ اٹھا کر لڑکی کو دوبارہ لے گئے۔ ایک دو آدھیوں کے ڈنگی ہوئے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا..... جس، اسے ازبانی آڑوں، آخری جلد بڑے ٹھکانہ انداز میں ادا کرنے کے بعد اس نے موہاں آف کر کے جیب میں ڈالا، شبنم کو تھوڑا دنگ نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہارے لیے اب بھی زبان کھولنے کا آخری موقع ہے۔ بے ہوشی سے دو چار ہونے کے بعد جو کچھ ہوگا وہ تمہاری اپنی حماقت اور زبان بند رکھنے کا نتیجہ ہوگا۔“

”م..... میرے پاس اب اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے کوئی طریقہ بھی نہیں ہے.....“

”تمہارا یہ آخری ہے، اب بھی مجھے میرے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتا..... میرا نام اورنگ زیب ہے جس کے فیصلے ہمیشہ اٹھتے ہیں، نہ ہوئے تو آج میں اس عہدے پر نہ ہوتا۔“

شبنم کے ذہن پر پہلی ہلکی خفگی اپنا اثر خیر کر رہی تھی۔ تقدیر نے جا چاک اپنا رن تبدیل کیا تھا، اس کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ خند کے خمار سے اس کی پلکیں پوچھل ہونا شروع ہو چکی تھیں لیکن وہ آخری وقت تک اورنگ زیب کو بار بار حرم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی جس کے چہرے سے تاثرات اس بات کی گواہی کر رہے تھے کہ وہ جو فیصلہ کر چکا اس سے کسی قیمت پر پیچھے ہٹے کو تیار نہیں تھا۔

توازن بکڑنے لگا تو شبنم آہستہ سے خود کو سنبھالتی مسمری پر دروازہ مچی پھر جلدی وہ بے ہوشی

الٹ پھیر کے فن سے بھی واقف ہو..... میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے اسے دوبارہ فون نہیں کیا ہوگا۔

تمہاری ہدایت پر وہ تم سے رابطہ کرتا رہا ہوگا۔“

”یہ بھی غلط ہے۔“

”پھر.....“ اورنگ زیب نے گرج کر کہا۔ ”بچ کیا ہے۔ افضل خان وقتی طور پر میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے لیکن میرے جال سے نکل کر زیادہ دور نہیں جا سکے گا مگر اب تمہیں اس کا غیازہ بھگتنا ہوگا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم اب اس ایک ہاس کے ہاتھوں اپنے انجام تک پہنچو گی تمہاری کسی کمزوری کے ذریعے تمہیں ہلکے میں کھل رہا ہے۔“

شبنم ایس بی کے تھوڑے دیکھ کر پہلے ہی خوفزدہ ہو چکی تھی، اب اس نے نکل کر جو کچھ کہا، اسے سن کر ہی وہ لرز اٹھی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”ہیلز۔ آپ مجھے خود کو ملے مار دیں لیکن اس دورے کے حوالے نہ کریں..... میں عزت کی موت مرنا زیادہ پسند کروں گی۔“

”ایک ہی صورت ہے.....“ اورنگ زیب نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے بتا دو کہ افضل خان ہول سے فرار ہو کر اب کہاں رہ رہوش ہوگا؟“

”م..... میں، اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، آپ کو یقینہ کوئی.....“

”کھاس بند کرو۔“ اورنگ زیب نے تلا کر کہا پھر ساتھ کھڑے آدمی سے بولا۔ ”اس لڑکی سے پوچھو کہ کیا یہ خوشی سے انجکشن لگوانے کی یا مجھے اپنے آدھیوں کو اسے بے بس کرنے کی خاطر طلب کرتا پڑے گا۔“

”اگر مجھے کسی زہر کا انجکشن بھی لگوانا چاہیں تو میں انکار نہیں کروں گی لیکن ہیلز میری بات کا یقین کر لیں کہ میں افضل خان کے بارے میں.....“

”شٹ اپ۔ لا چیٹر (Cheater)“ اورنگ زیب کی ذہنی شیر کی طرح اس زور سے دھماکا کہ شبنم سم کر رہ گئی پھر اس نے انجکشن لگوانے میں کسی قسم کی کوئی حراست نہیں کی۔

اس کے ذہن میں آمد عیاں ہی چل رہی تھیں، یہ تصور ہی اس کیلئے بڑا ہمایاک تھا کہ اسے دوبارہ ہاس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ افضل خان بھی تمام تر ترک حلالی کے باوجود پھر کسی قصور کے بگ ہاس کی معطلوں کا دکھار ہو کر بادی کے دہانے تک پہنچ گیا تھا، اس پر جو مظالم ڈھائے گئے شبنم اس کی چشم دید گواہ بھی تھی اور اب..... اب شاید تقدیر اسے بھی بدنامی اور بے حیائی کے آخری انجام تک پہنچانے کا ارادہ کر چکی تھی۔ اسے شہر تھا کہ جو انجکشن اسے لگوا جا رہا تھا وہ بے ہوشی کا ہوگا جس کے بعد وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوگی۔ اورنگ زیب کے ساتھ آنے والا انجکشن لگا کر اورنگ زیب کے اشارے پر چلا گیا تو اس نے دماغی ہوئی آواز میں پھرمت کی۔

”میں ہر طرح سے آپ کے رحم و کرم کی محتاج ہوں۔ ہیلز..... مجھے اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دیں لیکن ذلت کی اس دنیا میں دوا میں نہ ہو جس میں جہاں میرا انجام آپ کے قصور سے بھی زیادہ ہیما یک ہو سکتا ہے۔“

سے دو چار ہو کر ہر چیز، ہر سوچ سے بہ نیاز ہو گئی۔



پرتاب بھوشن اپنے منظر میں اتنی پانی بارے دھونی رائے بیٹھا تھا۔ اس کی اگلیاں موٹے دانوں کی بالا پر تیز تیز چل رہی تھیں، ہونٹ مشینی انداز میں کسی منتر کا جاپ کر رہے تھے۔ وہ اپنے عمل میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے گزرتے وقت کا مطلق احساس بھی نہیں ہوا تھا، برفانی پہاڑیوں کی گھما میں بیٹھک جتا کر اس نے جو کچھ جاپ کیا تھا اس کے عوض کالی کی ہلکتیوں اسے پراسرار شیطانی قوتوں کا مالک بنا دیا تھا جس کے بعد وہ خود کو بہت بلند قامت سمجھ رہا تھا، اس کے دھرم کرم کے مطابق اس کا خیال تھا کہ اب وہ دیوی دیوتاؤں کا آشیر باد حاصل کرنے کے بعد اتنا مہان ہو گیا ہے کہ دھرتی کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یہ اس کا جاپ منتر اور دیوی کی کرپا ہی تھی جس نے اس کو کھمٹری بنا دیا تھا۔ برفانی غار سے نکلے کے بعد اس کی جو حالت تھی اسے دیکھ کر کوئی بھی سمجھا دھورت اس کے قریب آنے سے بھی بچتا مگر نہ کرتی لیکن ایک الہز بچارن اپنے شر کے تمام تر سندرات اور اٹھان کے ساتھ ہی غنی، ملتی جلتی اس کے سامنے آئی تھی، اس کی سندرتہ دیکھ کر خود پرتاب بھی اسے کوئی پتہ ہی سمجھ رہا تھا لیکن جب بچارن نے ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے ڈھرتی کیا اور گہرا لگے تین کے مسافر چمکاتے اس کے من کو بھگاتے ہوئے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ کالی کی بچارن ہے جسے کالی نے پرتاب بھوشن کی داسی بنا کر اس کے سیدہ کرنے کا حکم دیا ہے تو پرتاب کے اندر چھپے شیطان کو احساس ہوا کہ اس نے کالی کیلئے چمک چل کر کے جو طاقت حاصل کر لی ہے اس کے بعد وہ اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں دنیا کی کوئی اور قوت اس کے ساتھ بچا لڑنے کی ہمت نہیں کر سکے گی۔ اس نے جب اپنی تمام تر غلاتوں اور سب پرانی دھول مٹی کے ساتھ بچارن دھوکا اپنے بازوؤں میں سمیٹا، اس وقت بھی دھوکے کوئی اعتراض کرنے کے بجائے خود کو بڑے جاوے اس کے دم و کرم پر چھوڑ کر اس بات کی تصدیق ہی کر دی تھی کہ پرتاب بھوشن نے کالی کیلئے جو دھونی رانی تھی، دینا ہے الگ تنگ ہو کر صرف ایک انگلی کا باندھ کر بلند اور دھواں گزار پہاڑیوں کے ایک غار میں بیٹھ کر جو جاپ کرنے کی غٹائی تھی، وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ لالیت حسین ہے اس کی اس غلطی کا انتقام لے سکتا تھا جو اس نے پرتاب بھوشن کا راستہ ٹھونک کر کے کی تھی۔ کسی کی موت کی خاطر پرتاب بھوشن نے ایک تازہ لیون پر گندہ مکمل کرنے کے بعد اس میں پڑھی ہوئی سونیاں آر پار کردی تھیں جو لیون کے عرق کو اس کے کالے منٹروں کے گندے ہیروں کے ذریعے اس شخص کے جسم کا خون کی رسی تھیں جو اس بات سے ناواقف تھا۔ پرتاب بھوشن اس سے پہلے بھی کسی بار ایسے ہی گندے عمل کے ذریعے کچھ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا، اسے دھوکا تھا کہ جو بھی اس عمل کا تو ذکر کرنے کی کوشش کرے گا وہ بھی اس پلے پلے کے ہیروں کا شکار ہو کر، اڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا کوئی طاقت اس کا بچاؤ نہیں کر سکے گی لیکن جب لالیت حسین نے اتفاقاً گل خان کی زبانی یہ جان لینے کے بعد۔ وہ بلا تکتہ نیز

دوم

سونیاں کسی کی جان لینے کی خاطر لیون میں پھنسی گئی تھیں، ان کو لیون سے نکالنے کی غٹائی تو گل خان کے علاوہ فرخین نے بھی درود کر اس کی منت کی تھی کہ وہ اس ارادے سے باز رہے لیکن لالیت حسین نے کسی کی جان بچانے کی خاطر خدا کا نام لے کر ان سونیاں کو نکال پھینکا تھا اور لیون کو اپنے قدموں سے جلے ڈالا تھا مگر..... قدرت کی لازوال قوتوں نے اس ایک عمل کے عوض لالیت حسین کو نہ صرف تمام باطل اور ناپاک قوتوں سے محفوظ کر دیا تھا بلکہ اپنے کسی برگزیہ بندے کے ذریعے اس طرح نواز دیا تھا کہ کوئی نہ کوئی فیسی اشارہ اسے صراطِ مستقیم سے ہٹنے کی کفر کی گندی چالوں سے محفوظ کر لیتا تھا، لیکن پرتاب بھوشن کو اپنے دھرم کے مطابق اپنے دیوی دیوتاؤں پر پورا دھوکا تھا کہ ان کی طاقت کے آگے تمام طاقتیں بچ جھکیں۔

اس وقت بھی وہ اس پر چھما جس کے بارے میں جاننے کی خاطر کالی کے نام پر ایک منتر کا جاپ کر رہا تھا جس نے لالیت حسین کو دھوکے ایک عارضی روپ کے دھوکے سے بچا لیا تھا بلکہ گیندے کے پھول کی موجودگی نے اسے چونکا بھی دیا تھا۔ پرتاب اپنے گندے عمل میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اسے گزرتے وقت کا کوئی احساس نہیں ہوا، کب دن رات کے اندھیرے میں تبدیل ہوا۔ کب ایک مندر کی بچارن اس کی کنیا میں دروٹن کر کے چلی گئی اور کتنی بار دھوکے چپکے چپکے اس کی کنیا کے اندر جھانک بھی چکی تھی، اسے اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس کی اگلیاں مشینی اعزاز میں بالا کے دالوں کو بھور کر رہی تھیں، اس کے ہونٹوں پر ایک منتر بار بار ابھرتا رہا تھا جب اس کی نظروں کے سامنے چھاپے گھپ اندھیرے میں ایک روشن دائرہ نمودار ہوا۔ اس دائرے کو بند نظروں سے دیکھنے کے بعد پرتاب کے اندر کامیابی کی ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ شاید روشنی جی کالی مانی کی گندی قوتوں کا کوئی چمکتا چھرا، پرتاب نے سبکی جان کر منتر کو اور تیز تیز پڑھا شروع کر دیا۔ اس کے سانسوں کی آواز آہستہ آہستہ زور پوری تھی جب اس کے ہونٹوں نے اچانک ہلنا بند کر دیا۔ اس کے سامنے نظر آنے والے روشنی کے ہالے میں ایک انسانی جیوا دھوکے کی شکل میں ابھرنے لگا۔ پرتاب کے پایہ جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، اس نے سن ہی سن میں دیوی کو یاد کیا پھر لرزتی، کانچی اور گھڑتی جتنی پر چھما جس کو بڑے سمجھنے سے مخاطب کیا۔

”مجھے دھوکا تھا کہ دیوی کی مہمان کشی تھی پرتاب باندھ کر میرے سامنے آنے پر اوٹن مجبور کر دے گی۔ اب مجھے بتا پانی کر تو کون ہے؟..... کیوں میرا راستہ بار بار ٹھونکا کر کے اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے۔ تو نے زبان نہ کھولی تو میری مہمان کشی تھی پرتاب مجھے جلا کر کیم بھی کر سکتی ہے۔“

”نہاں..... تم سمجھتی..... بدبخت!..... جواب میں پرتاب کے کانوں میں ایک دھم آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔“ تو ابی جن گندی اور ناپاک قوتوں پر سمجھ کر رہا ہے وہ ایک فریب اور گندے خواب کے زیور کا پھر بھی جل دے کہ پھر بھگنے کی سوچ رہا ہے لیکن اب تو میرے پٹھے سے

نہیں بچ سکے گا۔“

نے ہسپتالی کئی میں دیا جلا یا تھا وہ کسی مدد بھرے چھلکے پیالے سے کم نہیں ہے۔ آٹھ دن پہلے ادھر آئی ہے۔ بڑا چھاری بھی اس کی تاک میں ہے لیکن ابھی تک اس کی منوں کا منامیں پوری نہیں ہوئیں۔“

”کیا نام ہے اس کا.....؟“

”نام بھی سلونی ہے..... خود بھی کسی کنارے کم نہیں ہے.....“ دھومنے پر تاب کے شانوں سے گال رنگڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ایک اشارہ کیا تو کیا کہے ہوئے چہل کی طرح تمہارے چروں میں گرنے سے انکار بھی نہیں کرے گی۔“

”تجھے برا نہیں لگے گا؟“

”گے گا تو تمہارا جان لیکن تم مرد ہو..... دس جگہ مار کے ہو تمہارا کچھ نہیں بگڑتا لیکن..... ناری کی دھچکا مشتق سے کے ساتھ ساتھ سب کی نظروں میں آ جاتی ہے اور تم کو دیوی کا آئینہ بادی بھی ہے۔ میں کہتے تمہارا ساتھ روک سکتی ہوں۔“

”بھربھی جو چنات کر۔“ پر تاب نے..... ایک مل کو اسے اپنی مغبوط بانہوں میں سٹ لیا۔ گالوں کا ر س چوستے ہوئے بولا۔ ”جب تک تو میری سیر کرتی رہی۔ میں کسی دوسری پھارن کے ساتھ بچ نہیں لڑاؤں گا۔ تو میری بہت محسوس کرنے کی اور بات ہے۔“

”تمہارے لیے کچھ بیجوں..... کچھ پھل فروٹ لا دوں۔“ مدعو نے جواب میں اس کا ہاتھ قہام کر چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کل سے کچھ کھایا۔ میں اسی کارن بار بار تمہاری کٹی میں جھانک رہی تھی۔“

”جو تیرا من کرے لا دے..... میں تیرا من نہیں توڑوں گا لیکن میں نے بھی سو گند اٹھائی ہے کہ جب تک اس پلید مکے کو اور اس کی قہقہیلی لگانے والی چھایا سے دو دو ہاتھ نہیں کر لیتا، پیٹ بھر کو بھونجوں بھی نہیں کروں گا۔“

”جیسی تمہاری مرضی مہاراج۔“ مدعو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”میں تمہارا سیوا سے کبھی منہ نہیں موڑوں گی۔“

مذہبی سے ملنے کی تو پر تباہ کا دھیان بھراس پر چھائی کے بارے میں سوچنے لگا اس نے جوستر پڑھ کر پھونکا تھا وہ اس کے خیال سے روشن دائرے پر غل بھائی پر چھائی کو جلا دیئے کیلئے کافی تھا لیکن اس کے بجائے خود وہ چٹنا ہوا زمین پر لوٹ لوٹ ہو گیا تھا۔ یہیں تک نہیں اس سے ستر کے جاپ میں کوئی بھول چوک ضرور ہو گئی تھی۔ پر تباہ اسی کے بارے میں داغ کی مشینری کی جانچ پڑتال کرنے میں پوری طرح گم تھا۔

✦ ✦ ✦

دارا، روشا اور میجر عاطف اس وقت کلب کے دوسرے ممبران کے ساتھ باہر لان پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے جب میجر کو موبائل پر ابھرنے والے نمبروں کو دیکھ کر موبائل کان سے لگا

”بڑے پھاری سے تیری اور کیا بات ہوئی تھی؟“
 ”میں اس کے پاس نہیں گئی تھی، اس نے مجھے بلوا لیا تھا۔“ مدھو نے کسمسا کر جواب دیا۔
 ”تمہارے بارے میں ٹول رہا تھا۔“

”تو نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے اسے بتا دیا کہ دیوی نے مجھے کیل تمہاری سیوا میں جیون ہتانے کو کہا ہے۔“ اس بار دمرو نے آنکھیں مٹا کر کہا۔ ”بڑا بھاری بھی مجھے ایک نمبر کا گھاگ نظر آتا ہے، مندر کی ایک نئی پھارن ہر روز مات کو اس کی سیوا کرنے جاتی ہے۔“

”جانتا ہوں۔ یہ مندور کے بڑے پجاری اپنی گندی پر براجمان ہونے کے بعد سندھ پجاریوں کو بھی مندور کا پر ساد بھگ کر استعمال کرتے ہیں، جن قریبی پجاریوں پر پہلا ادھیکار ان کا ہوتا ہے پھر دوسرے چھوڑے موٹے پجاری بھی دانا پیچھے رہ جاتے ہیں۔“

”جانتی ہوں۔۔۔ اس نے مجھے بھی شاید اسی کارن بلایا تھا پر تو..... تمہارے لیے دیوی کا دین مجھے کے بعد اس نے دھرم کرم کی باتیں شروع کر دی تھیں۔“

”تمہارے شر کو کاٹھ تو نہیں لگایا تھا۔“ پر تاب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”تم میری طرف سے بھی دل کو نہ کرنا مہاراج.....“ بدھو کھٹک کر پر تپ کے کولہے سے لگ مٹی، مسکرا کر بولی۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ جس دن میرے شریہ کو کسی اور نے ہاتھ لگایا تو دیوی بھی منہ پھیرے گی۔“

پر تاب کی نظریں مدعو کی سرکش جوانی پر پھسلنے لگیں لیکن اس کے ذہن میں ابھی ہاتھ سے نکل جانے والی پر جھانسی کی زہریلے کانٹے کی طرح چھو رہی تھی۔ اس نے صرف مدعو کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تو نے بھی میری چیخ کی آواز سنی تھی؟“

”ہاں مہاراج! تمہیں کیا بار چاہتے تھے، بڑا بیماری مجھے ساتھ لے کر دھر آیا تھا، اس سے تم بھوش میں نہیں تھے۔“ مومو نے دہلی زبان میں کہا۔ ”تم نے مجھے آنے کو منع کیا تھا مہاراج لیکن میں تمہاری طرف سے دو یا تھری مل، دن میں کیا چکر لگاتے تھے، ساتھ کھینے کی میں ایک فی بیماریا نے دیا تھا۔“ جلاکار اچھا لڑکا تھا، اس سے تم کیان دھیان میں تھے۔ آنکھ کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا، جس بیماریا نے دیا جلاکار وہ بھی نراں ہوئی تھی۔“

”کیا مطلب ہے تیرا.....؟“ پر تاب، مدعو کے آخری جملے پر چونکا۔

”تم نہیں جانتے مہاراج لیکن ایک ناری دوسری نار کے من کا مجید جان لیتی ہے۔“ مدھوشونی سے بولی۔ ”جس طرح جوان بھارڈوں کو دیکھ کر بھاریوں کے من میں کھل مٹا ہوتی ہے اسی انوسار کسی ناری کا دل بھی تمہارے جیسے پرش کو دیکھ کر اندر ہی اندر پسپوں کے حال بننے لگتا ہے۔ جس بھارڈ

لیا۔ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کبھی جانے والی بات سننا رہا مگر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”فی الحال مناسب نہیں رہے گا۔ میں جانتا ہوں لیکن اس وقت گفتگو نہیں کر سکتا..... ہاں، میں تمہیں دوبارہ کال کروں گا..... اوکے۔“

میجر عارف نے موبائل آف کیا تو ایک بے تکلف ممبر نے مسکرا کر چیخے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”کس کا فون تھا جس سے اس وقت ہماری موجودگی میں گفتگو نہیں کی جاسکتی تھی؟“

”میتا نے والی بات نہیں ہے۔“ میجر عارف نے بھی مٹی خیر انداز میں جواب دیا تو روشنا بولی۔

”میرا مشورہ ہے کہ آپ کو دوسری شادی کر لینا چاہئے اس طرح تب تک گزارہ ہوگا۔“

”روشنایک کہہ رہی ہے۔“ دارا نے بیوی کی حمایت میں زبان کھولی۔ ”تم جس کی طرف اشارہ کر دو، ہم وہیں بات شروع کر دیں گے۔“

”شکل ہے۔“ دوسرے ممبر نے کہا۔ ”نظری کا بندہ ہے۔ ایک عہاذ پر گزرا نہیں کرتا، جب تک بھائی زندہ رہی اس نے ہمارے اسٹاک کے گودام کو کبھی لاک کر دیا تھا لیکن اب خود اسٹاک متحرک ہو رہا ہے تو ہمارے سمجھنے میں بھی.....“

”یہاں سلیس!“ میجر عارف نے فس کر اس کی بات کاٹی۔ ”تم لوگ جو سمجھ رہے ہو وہ معاملہ نہیں ہے۔“

”پھر ایسی کیا بات تھی جو اس وقت گفتگو نہیں کی جاسکتی تھی۔“ روشنا نے شوشی سے سوال کیا تو میجر نے دارا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیوں دارا ڈائیز..... بتا دوں کس کا فون تھا؟ تم بعد میں ناراض تو نہیں ہو گئے؟“

”اس کی باتوں میں نہ آ رہا روشنا۔“ دارا نے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ اب بلف کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

دوستوں کے درمیان اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی پھر وہ سب اٹھ کر ریفریجریٹ روم میں آ گئے جہاں کلب کے بہت سارے ممبر موجود تھے۔ روشنا کو کلب کی برائی لوکیوں نے گھیر لیا، باقی افراد بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میجر عارف نے موقع دیکھ کر دارا کو ایک طرف آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں نے کاؤنٹر پر جا کر آئس کریم کے اسکوپ لیے پھر میجر عارف نے اصرار اور دیکھ کر کہا۔

”کچھ دیر پہلے جو کال آئی تھی..... وہ کمانڈر ڈاٹ، ڈاٹ، ون فور کی تھی۔“

”کیا اس نے شیخ حامد کے کچھ اسکر وٹاؤٹ کر دیے؟“ دارا نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”اس کی نوبت ابھی نہیں آئی اس لیے کہ شیخ حامد کے ساتھ پہلے ہی بہت برا ہو چکا ہے۔“ میجر عارف نے کمانڈر کی طرف سے ملنے والی اطلاع کو مختصر دہراتے ہوئے کہا۔ ”بزنس فور کے علاوہ آس پاس کی ایک دو عمارتوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ جہاں سے مطلوبہ دشمن کے دس بارہ آدمی بھی مارے گئے ہیں۔ اس کے بعد شیخ حامد کے گھر کے باہر سڑکوں سے تین پیشیاں بھی ملی ہیں جس میں شیخ حامد

کے کارندے موت کا لباس پہنے آرام کی نیند سو رہے تھے۔“

”یہ کب کی بات ہے.....؟“ دارا نے حیرت سے دریافت کیا۔

”غالباً کل رات کی..... اخبارات نے شاید شیخ حامد کے اثر و رسوخ کی وجہ سے فی الحال ان خبروں کو شائع نہیں کیا لیکن..... کمانڈر ڈاٹ، ڈاٹ، ون فور کی انفارمیشن غلط نہیں ہو سکتی۔ اس کا خیال ہے کہ فی الحال پارٹی کو جو بیوی ڈوئل چکی ہے وہی کافی ہے، میں نے اسی لیے کہا تھا کہ اس وقت گفتگو نہیں ہو سکتی۔“

”تم نے ایس بی اورنگ زیب سے خبر کی تصدیق کی؟“

”موقع کہاں ملا..... اب کیے لیتا ہوں۔“ میجر عارف نے موبائل نکال کر اورنگ زیب کے نمبر شیخ کیے پھر اس بی بی نے بھی کمانڈر کی اطلاع کی تصدیق کر دی تو دارا نے کچھ تال سے کہا۔

”ایک پریشانی اب بھی ہے۔ شیخ حامد ان وارداتوں میں ڈیڑے کے ہاتھ ملوث ہونے کے بارے میں بھی غور کر سکتا ہے۔ انتہائی خبیث آدمی ہے۔ بلاوجہ دوسروں سے دشمنیاں مول لیتا پھرتا ہے۔“

”ڈونٹ وری..... اورنگ زیب نے جو مختصر تفصیل بتائی ہے اس میں شیخ حامد اپنے مکندہ دشمنوں کا نام بھی لے چکا ہے۔ ایک ہی رات میں دو بڑے حادثوں نے اس کے دماغ کی چوٹیں بھی ہلا کر رکھ دی ہیں۔“

”اگر یہ بات ہے تو پھر ابھی تم کمانڈر کو روک دو..... بعد میں دیکھا جائے گا۔“ دارا نے جواب دیا پھر وہ بھی میجر عارف کے ساتھ قدم بڑھاتا اس گروپ میں شامل ہو گیا جس میں میجر کے دوست اور روشنا کی پرانی کلب ممبرز شامل تھیں۔



سکھول 255 دوم
کھانا لاتا تھا وہ فی الحال غائب ہے، لیکن میرے سادہ لباس والے اسے بہت جلد دھوڑ نکالیں گے۔“

”کون تھا کھانا لانے والا؟“
”ان ہی کا ایک پرانا واقف کار تھا لیکن وہ اب وہاں نہیں ہے جہاں رہتا تھا..... ہو سکتا ہے دشمنوں کے کسی آدمی نے اسے خرید لیا ہو..... یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی گھر والی کو قادی کرنے کے بعد اسے اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ وہاں کی حالت سے یہی اندازہ ہوتا ہے کچھ لوگوں نے ان دونوں کو غائب کرنے سے پیشتر پورے گھر کے سامان کی بھی تلاشی لی تھی۔ ٹولی ہوئی چوڑی کے گلوں کے علاوہ خون کے دو چاقوئے بھی ایک میز پر پڑے تھے۔“

”میری فکر پریشان.....“ سراج نے کسمار کر دریافت کیا۔
”ان کا نہ پتا ہی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو لوگ اس کارروائی میں ملوث تھے وہ ہر طرح سے پوری طرح محتاط تھے۔“

ایک منٹ خاموشی رہی پھر سراج نے دم بجے میں کہا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا شبنم کو ساتھ لے جانے والے اسے زندہ چھوڑ دیں گے؟“

”فریال جی! ہمیں سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، ویسے اسے بار بجے جانے کے امکانات زیادہ نہیں ہیں۔ اگر صرف اسے مارنا مقصود ہوتا تو وہ ان کے لیے زیادہ آسان تھا۔ یہ بات اور ہے کہ اس میں شاید میرے ایک دو آدمی بھی کام آجاتے۔“

”ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟“
”ہاں منٹ.....“ اورنگ زیب نے سراج کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ کیا تم اب بھی

مجھ سے اس قسم کی اجازت ضروری سمجھتے ہو؟“
”سوری.....“ سراج نے کسمار کر سوال کیا۔ ”آپ نے شبنم کے علاوہ اور بھی ایک دو معاملات

میں ڈی آئی جی کو مطلع نہیں کیا تھا۔“
”اس لیے کہ مجھے اس پر عمل اہم نہیں ہے۔“ اورنگ زیب نے سفیدی اور صاف گوئی سے

کہا۔ ”کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو میں خود اپنے آپ سے بھی شیئر (Share) نہیں کرتا۔ کسی بھی پولیس آفیسر کیلئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ حساس معاملات میں خود اپنی پرچھا میں سے بھی محتاط

رہے لیکن..... تم نے اس وقت خاص طور پر یہ سوال کیا کیونکہ میں تم سے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمارے آغا منظور صاحب بہت زیادہ خطرناک کر کے کھانے کے عادی ہیں اور ایسے لوگ بھی اپنی

دور رس پالیسی کے سبب غلطی کا ارتکاب بھی کر جاتے ہیں۔“
”میں آپ کی اس بات سے سو فیصد متفق ہوں۔“ سراج نے سفیدی سے جواب دیا۔ ”میری اطلاع بھی یہی ہے کہ آپ کا آپس میں ہمارے ڈی آئی جی پر شبنم کی بازیابی کیلئے زیادہ زور ڈال رہا

ہے۔“

اڑتا نہیں گھٹنوں کے اندر جو ٹھیکن واقعات اور حادثات رونما ہوئے تھے انہوں نے خاص طور سے سراج کو ابھمن میں ڈال دیا تھا، فتح حامد کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے سلسلے میں ابھی چھان بین شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک ہی رات میں افضل خان کا ہو سکتا ہے فائرنگ کے بعد چھوٹتا ہوا جانا اور شبنم کا پراسرار طور پر ہاتھ سے نکل جانا ایسا باتیں نہیں تھیں جنہیں آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ افضل خان کی بات اور کسی، اس کی گھرائی بھی اورنگ زیب کے دو آدمی کر رہے تھے لیکن شاید ہو سکتا ہے فائرنگ کرنے والے تعداد میں زیادہ رہے ہوں اس لیے وہ افضل خان کو چھوڑ کر جان بچانے کیلئے موقع سے اصرار دھو گئے ہوں، لیکن شبنم..... اسے خاص طور پر اورنگ زیب اور سراج نے ایک مخصوص مقام پر اپنے خاص آدمیوں کی گھرائی میں رکھا تھا پھر اس کا غائب ہو جانا قویٰ تجزیہ تھا، جو افراد شبنم کی گھرائی پر توجہ تھے انہوں نے یہی بیان دیا تھا کہ رات کا کھانا انہوں نے ایک ساتھ ہی کھایا تھا پھر وہ بے ہوشی سے دو چار ہونے کے بعد اس وقت ہوش میں آئے جب شبنم وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

سراج اس وقت اورنگ زیب کے آفس میں موجود تھا۔ صبح وہ اورنگ زیب کی اجڑت کال کے بعد اتنی جلدی میں نکلا تھا کہ شاید بھی نہیں کر سکا۔ خود اورنگ زیب کے چہرے سے بھی یہی لگ رہا تھا کہ شبنم کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد وہ بھی ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

سراج کو دونوں واقعات کی اطلاع سنانے کے بعد وہ بھی بری طرح الجھ گیا تھا۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر اس نے اپنے مختلف خاص آدمیوں سے فون پر گفتگو بھی کی تھی لیکن شاید دوسری جانب سے کوئی امید افزا خبر نہیں لی تھی جس نے اسے مزید ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”جو کچھ خاص طور پر شبنم کے سلسلے میں ہو گیا وہ بات کسی پراسرار معنی سے کم نہیں ہے۔“

سراج نے دہلی زبان میں کہا۔
”میرا ذہن ابھی تک دھوکھی چکر رہا ہے۔“ اورنگ زیب نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے آدمی میرے ساتھ ڈیل کر اس کرنے کے سلسلے میں بھی غور نہیں کر سکتے لیکن بہر حال جو

کھانا انہوں نے کھایا وہ تیز نشہ آور ضرور تھا۔“
”کھانے میں نشے کی آمیزش کس نے کی ہوگی؟“

”یہی بات غور طلب ہے۔“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”جو آدمی ان کیلئے

”میں بھی جانتا ہوں۔“

سراج کچھ حیرت بات کرنا چاہتا تھا کہ اس کے موہاں پر سٹل ملا۔ نہرو کیسے بھالے نہیں تھے بھر بھی سراج نے موہاں آن کر کے کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو۔۔۔ سراج اسٹیکنگ۔“

”میں آپ کا ایک پرانا خادم بول رہا ہوں جناب۔“

”نام کیا ہے مجھے یاد نہیں آ رہا۔۔۔“ سراج نے سٹل لہجے میں پوچھا، بولنے والے کی آواز مکلی بارسن رہا تھا۔

”میں نے نام پہلے ہی نہیں بتایا تھا، اب بھی آپ اس کو دریافت کرنے کی دعوت نہ کریں۔“ سٹل لہجے میں جو ملا، صاف لگ رہا تھا کہ دوسری جانب سے بات کرنے والا آواز بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔

”اس وقت کیسے یاد کر دیا؟“

”ایک اہم اطلاع دی تھی۔“ جواب میں قحی خیر اعزاز اختیار کیا۔ ”اگر میرا اعزاز غلط نہیں ہے تو اس وقت ایس بی صاحب کے دفتر میں بیٹھے غالباً شبنم ناںی لڑکی کے سلسلے میں الجھ رہے ہوں گے۔“

سراج شبنم کے نام پر چٹکا۔ ”تم اس سلسلے میں کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ جملہ مکمل کرنے کے بعد اس نے موہاں کا اسٹیک بھی آن کر دیا۔

”میں اس قسم کے معاملات میں تاہک نہیں الجھتا لیکن اتفاق سے کوئی بات معلوم ہو جائے تو آپ حضرات کو بتانے بنا جی میں نہیں ملتا۔“

”اس وقت کیا خاص معاملہ درپیش ہے؟“ سراج نے الجھ کر دریافت کیا۔ ”تم نے جو نام لیا ہے اس کے بارے میں کیا بتانا مقصود تھا؟“

”اگر میں آپ حضرات کو اس کا پتا اور مکان بتا دوں تو آپ کیا انعام دیں گے؟“

”غلط اعزاز ہے تمہارا۔“ سراج نے اس با قدر سے حثت لہجے میں کہا۔ ”ابھی تک اس نے بھی کوئی انعام کا اعلان نہیں کرایا جس کو اس کی سب سے زیادہ حثت ہے۔ پولیس کا کام صرف اس کو دھڑکا ہے جو ہمارے لوگ پہلے ہی کر رہے ہیں۔ ایک بات اور سن لو، دوبارہ میرے بارے میں زیادہ سن کن لینے کی حثت نہ کرنا ورنہ اس کا انجام تمہارے حق میں خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں نے اس وقت بھی تمہارا پتہ نہیں لیا تھا آئیے۔۔۔“ دوسری طرف سے بولنے والے نے بھی کینچی بدل کر جواب دیا۔ ”اندھیرے میں ایک تیر چلایا تھا جو شاہ پڑھنے سے نہیں لگا۔“

سراج نے جواب دینے کے بعد اورنگ زیب کے اشارے پر موہاں اس کو دے دیا۔

”ایس بی اورنگ زیب بول رہا ہوں۔ تم کو لڑکی کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“

”جب تمہیں کوئی دیکھیں تو پھر پیٹ میں مروڑ کیوں شروع ہو گیا؟“

”بات مروڑ کی نہیں۔۔۔ فرض کی ادائیگی کی ہے۔“ خلاف توقع اورنگ زیب نے سلیجے ہوئے

اعزاز میں کہا۔ ”لو کی کی بازیابی کے بعد ہم تمہیں دوسری پارٹی سے ایک بڑی رقم بھی دلوا سکتے ہیں۔“

”دوسری پارٹی کسی کی ہے؟“

”آدم کھانے سے غرض رکھو، چل گئے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم میرے بارے میں جانتے ہو تو یہ بھی ضرور جانتے ہو گے کہ میں جو کہتا ہوں اسے کر کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔“

”جال پیچھنے کی کوشش کر رہے ہو؟۔۔۔ میں نے بھی مکی گولیاں نہیں کھیلیں۔“

”بھرم۔۔۔ اپنا اور ہمارا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”دو تین روز میں اس کا جواب دے دوں گا لیکن نے نہرو کی کی سم سے۔۔۔ وہ بھی ان رجسٹرو ہو گی۔“ دوسری جانب سے سلسلہ متعلق کر دیا گیا۔

”کون ہو سکتا ہے؟“ سراج نے کرسی پر پہلو بدل کر پوچھا۔

”ہو سکتا ہے یہ بھی ہمیں ٹولنے کی ایک چال ہو۔“

”اس کا مطلب ہے ہوا کر فون کرنے والا آکٹوپس کا کوئی ایجنٹ تھا جس کو یہ شہ ہو گیا ہے کہ شبنم کہاں تھی اور اب کہاں ہو سکتی ہے؟“

”تم نے ادھر آتے وقت کی تعاقب پر تو ج نہیں دی تھی؟“ اورنگ زیب نے سوال کیا۔

”اس کا خیال رکھنا میری عادت بن چکی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔“

”پھر ایک بات اور بھی ممکن ہو سکتی ہے۔“ اورنگ زیب بہ دستور سفیدی کے بولا۔ ”ممکن ہے اس وقت تمہاری یہاں موجودگی کی اطلاع کسی کالی بھیر نے ڈی آئی بی تک پہنچا دی ہو اور وہ ہماری ملاقات کی وجہ جاننے کیلئے کسی آدمی کے ذریعے نکلے گا۔“

”لیکن شبنم کے ہاتھ سے نکل جانے کی اطلاع اسے کس نے دی ہو گی؟“ سراج نے کہا۔

”شبنم کے بارے میں صحیح صورت حال کی اطلاع ہمارے علاوہ اور کسے تھی؟“

”جی ایک اہم پانٹ ہے جو میرے ذہن میں بھی چمک رہا ہے مگر۔۔۔ ڈونٹ وری!“ اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے سراج کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا پھر وہ دونوں ہی آگے پیچھے قدم اٹھاتے دفتر سے باہر آ گئے۔ اورنگ زیب کے کہنے پر سراج اپنی گاڑی چھوڑ کر اسی کے ساتھ پیچھے گیا۔ دونوں ہی اپنی اپنی کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔

”اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ سراج نے کچھ توقف کے بعد دریافت کیا۔

”کبھی کبھی جھکے ہوئے مسافروں کو سڑکوں پر بے معنی بکھر گرانے سے بھی منزل کا نشان مل جاتا ہے۔“

سراج اس جواب پر چٹکا، اسے کم از کم اورنگ زیب سے ایسے مبہم جواب کی توقع نہیں تھی۔ اب تک وہ اسے فولادی ارادوں کا مالک سمجھتا رہا تھا لیکن اس وقت وہ جواب اس کیلئے کچھ اور تاثر چھوڑ رہا تھا۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

”میرا اعزاز ہے کہ تمہیں میرا جواب پسند نہیں آیا۔“ اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے سراج کو مخاطب کیا۔

”ہاں..... میں انکار نہیں کروں گا۔“ سراج سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”یہ پہلا موقع ہے جب میں.....“

”میں سمجھا نہیں؟“ سراج کی بات کا ڈی گئی تو اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

”دوسری بار بی بی مستقل سننے سے کارڈ استعمال کر رہی ہے۔ اب میری باری ہے۔“ اورنگ زیب نے سرسراہٹ سے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں بھی ایک دوٹی چال چلنے کا اختیار رکھتا ہوں۔ تم دیکھنا، بازی ایسی پلٹا کھانے کی کہ خود آکٹوپس کو بھی دن میں تارے نظر آجائیں گے۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ اس کو دی گئی مہلت کے اندر اندر مجرموں کا سراغ نکالیں گے جو موجودہ حالات کے ذمے دار ہیں؟“

”شاید.....“ اورنگ زیب نے ٹھٹھا ہونٹ چپاتے ہوئے بڑا معنی خیز اعزاز اختیار کیا۔ ”ناکامی کی صورت میں، میں آکٹوپس کے ہر فیصلے کو تسلیم کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ چھارے ڈی آئی جی صاحب بھی اس کے گواہ ہیں۔“

”لیکن ابھی تک ہم کسی نتیجے پر.....“

ٹھیک اسی وقت اورنگ زیب کے موبائل نے واہرٹ کیا تو اس نے سراج کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے موبائل اٹھا کر آن کرتے ہوئے کانوں سے لگا لیا۔ ”ہیلو..... ہاں، اطمینان سے بات کر سکتے ہو..... ملز..... کیا تمہیں یقین ہے اب تک وہ اس کے پاس پہنچ گیا ہو گا؟“ اوکے..... فائن، دوسرے معاملے کا کیا بنا؟“ ڈونٹ روئی! میرے پاس اس کا بھی ایک توڑ موجود ہے..... ابھی نہیں، فی الحال اس کا کھل کر سامنے آنا مناسب نہیں ہوگا۔ حماقت کی باتیں مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ایک نہیں ہوں گے نہیں، اب کوئی ریسک نہ لینا..... ہاں، تم نے جو کام کر دیا ہے جلاب سے کم نہیں ثابت ہوگا۔ میں کال کروں گا۔“ اوکے! اورنگ زیب نے موبائل آف کر کے رکھا پھر گاڑی کو اگلے چوڑا سے بائیں جانب موڑ دیا، موبائل پر بات کرنے کے بعد وہ کسی وجہ سے خاصہ ریلیکس نظر آ رہا تھا۔

”دیکھ کون کون تھا؟“ سراج نے سرسری اعزاز میں دریافت کیا۔

”ہم اس وقت لوچن کے پاس چل رہے ہیں۔“ اورنگ زیب نے سراج کے سوال کو نظر اعزاز کرتے ہوئے بڑے زہریلے اعزاز میں مسکرا کر کہا۔ ”مجھے ایک پرانی مثال یاد آگئی ہے کہ..... لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔“

”ایک بات بڑی صاف گوئی سے کہوں اگر آپ برا.....“

”ڈونٹ بی سٹنی سٹیل، میں تمہیں چھوٹا چھوٹا ایسا کہہ چکا ہوں اس لیے تمہاری کسی بات کے برا ماننے کا سوال ایسی نہیں پیدا ہوتا۔“

”میرا اعزازہ اگر غلط نہیں ہے تو آپ نے کوئی خاص بات ابھی تک مجھے بھی بتائی ضروری نہیں سمجھی۔“

”یو آر۔ رائٹ۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے اعتراف کیا پھر مسکرا کر بولا۔ ”پریشان مت ہو، میں ابی کھلت تسلیم کرنے کی خاطر آکٹوپس کے سامنے تمہا نہیں جاؤں گا۔ ایک سامی اور بھائی کی حیثیت سے تم بھی میرے ساتھ ہو گے۔“

”آپ نے اناجک لوچن کے لئے کارا کیسے کر لیا؟“ سراج نے پہلو بدل کر سوال کیا۔

”لیاقت حسین کے کیس والا ڈی جی کی طرح زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہے۔ میرا اعزازہ ہے کہ شاید لوچن اس کی زبان پر پُر اقل کھولنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔“

”ہو بھی سکتا ہے۔“ سراج کسمایا ”لیکن..... کیا ایک گواہی آکٹوپس کے بیروں میں ذخیرہ ثابت ہو سکتی ہے؟“

”چڑیوں کھنے اور انتظار کرلو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنے سارے سوالوں کا جواب مل جائے۔“ اس بار اورنگ زیب کے چہرے پر جو زہر آلود مسکراہٹ ابھری تو سراج چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ چپے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کیا آپ نے آکٹوپس کے فرمپ کارڈز کے جواب میں کوئی غیر قانونی اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

”ریٹیکس فار ٹوٹل فور آؤٹس..... اس کے بعد قانون کے ماتھے پر بھی تمہیں پسینے ہی پسینے نظر آئیں گے۔“

اورنگ زیب نے سی ڈی آئی سینٹر کے احاطے میں گاڑی داخل کی تو سراج نے اس وقت مزید گفتگو مناسب نہیں سمجھی لیکن اس کا ذہن یہ دستور اس صحیح کو سمجھانے میں منہمک تھا جو اورنگ زیب کی مختلف باتوں نے جنم دی تھی۔



لوچن اور اس اتن نیچے والے پولیس حوالدار میں روز اول سے ٹکھن جاری تھی۔ وہ صورت و شکل کے اعتبار سے بھی بڑا اذیت پسند نظر آ رہا تھا، وہ اچھے خاصے ڈیل ڈول اور خوش جسم کا مالک تھا، اس کی آنکھوں میں ہر وقت حیرت والی سرخیوں بھی اس بات کی غماز تھیں کہ وہ کسی مجرم کے ساتھ رعایت کرنے کا عادی نہیں تھا، چہرے پر گھٹنی ٹھنی اور بڑی لوچدار مونچھوں نے اس کی شخصیت کو اور ہیبت ناک بنا رکھا تھا لیکن..... لوچن کے معاملے میں روز اول سے بڑا بے بس تھا، اورنگ زیب نے مخصوص آرڈر کی وجہ سے وہ ابھی تک اپنے ہاتھ کی جھلی نہیں مناسک تھا۔ خود لوچن بھی اس پر پوری طرح حاوی رہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ جس مخصوص کمرے میں خاص خاص قیدیوں کو کھوسا اور کھر دے فز پر رات بھر بند نہیں آتی تھی وہاں لوچن کی ضد پر اسے آرام کرنے کی خاطر ایک اپرنگ میٹرز بھی فراہم کر دی تھی۔ حوالدار اور لوچن کے درمیان تیز و تند جھلوں کی

جنگ روزی ہوتی تھی۔

اس وقت بھی لوہن دن چڑھنے کے بعد اپنے بستر پر آرام سے بیٹھا بڑے سکون سے بریک فاسٹ کرنے میں مشغول تھا جب وہی جلاد نما حوالدار پورے طعراق سے تالا کھول کے اندر داخل ہوا۔ اس کی نظروں میں اس وقت بھی شطوں کا قص جاری تھا۔ حسب معمول دو سبیل سپاہی بھی حوالدار کے اندر داخل ہوتے ہی لوہن پر انگلیں تان کر پوری طرح محتاط ہو گئے۔ لوہن نے اسے ایک نظر دیکھا، بے پروائی سے شانے بجھ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا پھر شے میں مشغول ہو گیا۔

”نواب ہے ملک کی چاچا ز اولاد“ حوالدار نے بڑی تحارت سے مخاطب کیا۔ ”کب تک منت کا توس اور ٹھکن زہر مار کرتے رہو گے؟“

”آج تم نے کوڑ مارنگ نہیں بولا۔“ لوہن نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔ ”یو بلا ڈی بلڈ۔ تم تہذیب کا معاملہ میں بھی ایک دم ان پچرڈ معلوم پڑتا۔“

”شٹ اپ یو کلکا جیلا کھلیا میں۔“ حوالدار نے بھی اردو، انگلش نا ہی زبان اختیار کی۔ ”ادھر تمہارا گرینڈ فادر تمہارا چچا کھانا دیکھنا مانگا۔ جلدی زہر مار کر کے کم دودھی ہری اپ۔“

”گرینڈ فادر یا..... یا فادر ان لاء۔“ لوہن نے اسے جلانے کی خاطر آٹھ مار کر سوال کیا۔

”زیادہ گٹ پیٹ نہیں چلے گا گائے کے کٹ چیں۔“ ٹین ٹینس میں اسٹینڈ اپ ہو کر تیار ہو جاؤ۔“ حوالدار نے مونچھوں کو خطرناک انداز میں تادڑ سے دھک دے کر بے درجہ میں ٹھک دیا۔

”اوکے، یوشٹ..... ویٹ آؤٹ سائیلی، ام کافی کا کوپ خانی کر کے تمہارے ریکونٹ پر غور کرے گا۔“

حوالدار پیچ و تاب کھ کر رہ گیا۔ بارہا اورنگ زیب اور سراج کی موجودگی کا خیال نہ ہوتا تو وہ لوہن کے ”شٹ“ کے جواب میں آج اس کے جسم کی اتنی تل بائش ضرور کر دیتا کہ وہ آئندہ سے دوبارہ اس کندے لقب سے نوازنے کی بھی جرأت نہ کرتا۔ وہ تل کھاتا ہوا لوہن کو خون آلود نظروں سے گھرا گھورتا رہا۔ لوہن نے آرام سے کافی تم کر کے کپ ایک طرف ڈال دیا پھر سرسالت کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ حوالدار کو خون کے دو گھونٹ اور مجبوراً زہر مار کر پڑے۔ پھر وہ آگے پیچھے قدم اٹھاتے

اس ساؤنڈ پر پروف کرے میں آگے جہاں اورنگ زیب اور سراج موجود تھے۔ لوہن نے ان دونوں کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھا پھر خاموشی سے تیری کری پر بیٹھ گیا، حوالدار، اورنگ زیب کا اشارہ

پاکر باہر نکل گیا خود کار دروازے دوبارہ بند ہو گئے۔

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ اورنگ زیب نے تنگنکو کی ابتدا استغیثگی سے کی۔ ”کیا ہمارے

ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو؟“

”جو کچھ پہلے کہ چکا ہوں، اس میں مزید کوئی ترمیم کرنے کی محتاج نہیں ہے۔“ لوہن نے

شٹ انگریزی میں جواب دیا۔

”ایک بار پھر اپنے جواب پر غور کر لو۔“

”ہمارا تعلق جس قبیلے سے ہے وہاں لوگ صرف ایک بار غور کرتے ہیں۔ بار بار فیصلے تبدیل نہیں کرتے۔“

”لیکن..... تم ہمارا فیصلہ تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔“

”تم دونوں بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔“ لوہن نے باری باری ان دونوں افسران کو دیکھتے ہوئے یہ دستور بے پروائی سے جواب دیا۔ وہ کسی طرح مرعوب نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا تمہارا آخری جواب ہے؟“

”ہیں۔“

اورنگ زیب نے اسے مسکرا کر معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر جب سے ایک موبائل نکال کر اس کی طرف خاموشی سے بڑھا دیا، اس کے بعد اس نے جب سے اپنا موبائل نکال کر کسی کے مہربق کیے۔ سراج خاموش بیٹھا اسے دانے لگوں کے بارے میں غور کرتا رہا۔

”بیل..... دوسری جانب سے رابطہ قائم ہونے پر اورنگ زیب نے سہاٹ لیجے میں کہا۔ ”میں

ایس بی اورنگ زیب اس وقت سراج کے اور لوہن کے ساتھ سی۔ آئی۔ ڈی سینٹر کے ایک ساؤنڈ پروف کرے میں بیٹھا ہوں۔ لوہن ہمارے ساتھ تعاون کرنے سے یہ دستور میں وغیرہ کر رہا

ہے۔ میں نے اسے موبائل دے دیا ہے، اس کے مہربق کر لیں۔“ اورنگ زیب نے لوہن کو دینے

کئے موبائل کے مہربق دوبارہ دہراتے ہوئے کہا پھر موبائل آف کر کے لوہن کو مسکرائی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”میرے ساتھ کوئی تمسنا جرم کیلئے کی کوشش نہ کرنا آفیسر میں جنہیں پتا چکا ہوں کہ تم کسی کے ساتھ غداری کرنے پر مست کو ترجیح دیتے ہیں۔ تم سیاہ فام جماعت کا انجام دیکھ چکے ہو۔“

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر یہ دستور دوستانہ مسکراہٹ مکمل رہی تھی جب لوہن کا موبائل ٹنگٹانے لگا لوہن نے ایک لمبے کیلئے اورنگ زیب کو تلخی نظروں سے پھر

موبائل آن کر کے بولا۔

”لوہن بول رہا ہوں۔“

دو منٹ تک کرے میں گھبراہٹ طاری رہا، دوسری طرف سے جو کچھ کہا جا رہا تھا اس کے تاثرات لوہن کے چہرے پر واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ دو منٹ بعد لوہن نے کسمسا کر کہا۔ ”کیا

میں یہ سوچنے میں حق نہ سمجھتا ہوں کہ تم بھی اس وقت کسی الجھنی کے انھوں مجبور ہو؟“

لوہن کے سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا اس سے ان کو لوہن نے موبائل آف کر کے اپنی

جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر وہ کسی تھوری سوچ میں غرق رہا۔ اس دوران اس کی تجربہ کار نظریں اورنگ

زیب اور سراج کے دماغ کا ایکسرے کرنے میں مصروف رہیں، پھر وہ ایک طویل سانس لے کر

بولا۔ ”میں فوری طور پر تم دونوں کو آخری جواب نہیں دوں گا لیکن..... تم اگر مناسب سمجھو تو مطلب یہ عرض

کوبیرے ساتھ ایک ہی کرے میں بند کر دو اور..... اپنے ہاتھوں کو ہدایت کر دو کہ وہ ہمارے

باہر آنے کے بعد اس نے اورنگ زیب سے پوچھ ہی لیا۔

”آپ نے خون پر کس سے رابطہ قائم کیا تھا؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میڈم۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے تنبیہ کی ہے جواب دیا۔ ”تم نے سیون سار کے حوالے سے جو کہانی سنی تھی میں اسی وقت تمہاری مصلحت کو سمجھ گیا تھا کہ میڈم کا نام درمیان میں نہیں لانا چاہیے تھے۔“

”لیکن آپ نے اتنی جلدی ساری پلاننگ کس طرح کر لی جبکہ میں آپ کے ساتھ ساتھ تھا؟“

”میری پلاننگ کچھ اور تھی لیکن راستے میں جب میرے کسی تجربے نے مجھے موبائل پر ایک خاص اطلاع دی تو میں نے سیون سار کے کوڑے پر غور و فکر کرنے کے بعد ہی سیون سار کا رخ کیا تھا۔“

”ایک بات اب بھی وضاحت طلب ہے۔“ سراج نے دلی زبان میں کہا۔ ”جب میں نے میڈم کا حوالہ نہیں دیا تھا تو پھر صرف میرے اور آپ کے حوالے پر اس نے آپ کی مختصر بات کا مطلب اور مقصد کیسے سمجھ لیا؟“

”میں نے اپنے اور تمہارے نام کے ساتھ ہی لوچن اور سیون سار کی ڈی سینٹر کا حوالہ بھی خاص طور پر دیا تھا۔ اس کے علاوہ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میڈم نے میری ہی گزارش پر جاکے آدیوں کے ذریعے آکٹوپس کو ڈسٹرب کرنے کی خاطر شطرنج گیم کی گولیوں کی آتش بازی کرائی تھی۔“

”ون منٹ۔“ سراج نے کسمار کسمار آدیوں میں کہا۔ ”جب میڈم نے ذاتی طور پر سیون سار کے حوالے سے بات کی تو پھر لوچن کس لیے بس ویش کا مظاہرہ کر رہا تھا؟“

”میرا خیال ہے کہ میڈم نے ابھی اس سے تفصیل سے بات نہیں کی ہوگی۔ صرف اتنا کہا ہوگا کہ ڈی کی زبان طحوانے کے سلسلے میں ہم سے تعاون کرے۔“ اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔

”تفصیل سے میں میڈم کو کسی وقت بات سمجھا دوں گا تا کہ لوچن کی تسلی بھی ہو جائے۔ دراصل ڈی کی زبان کھلانے کے حوالے میں، میں نے میڈم سے سرسری بات کی تھی۔ لوچن کے حوالے سے نہیں بلکہ اس خیال کے پیش نظر کہ ممکن ہے جگہ کا کوئی سماجی ہمارے کام آسان کر دے۔ پولیس پر اعتماد کرنے کے بجائے ایک مجرم دوسرے مجرم کی بات زیادہ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے میڈم نے تمہارے ذریعے لوچن وغیرہ کو کنٹرول کرنے والا پاس ورڈ مجھ تک پہنچایا ہو۔۔۔۔۔“

”بہر حال، مجھے یقین ہے کہ میڈم کی طرف سے اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد اس نے کسی دباؤ کے تحت لوچن کو ہماری مدد کرنے کو نہیں کہا ہے۔ لوچن ہمارے لیے کئی پہلوؤں سے بے حد کارآمد ثابت ہوگا۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ آکٹوپس کا کوئی آدمی اس کے دشمن کے کہنے پر زبان کھول دے گا؟“

”جی؟“

کمرے سے دور رہیں ورنہ تم بھی خاطر خواہ نتائج نہیں حاصل کر سکو گے۔“

”کیا فون کال کے بعد بھی تمہیں کسی قسم کا شبہ لاحق ہے؟“

”اس کا جواب بھی تمہیں کسی نہ کسی طرح دس بارہ گھنٹوں میں مل جائے گا۔“

”اور کے۔“ اورنگ زیب نے سلیجے ہوئے انداز میں کہا۔ ”مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔“

”ایک بات اور سن لو۔۔۔۔۔ لوچن کی نظریں گھب اندھ جڑوں میں بھی بہت دور تک دیکھنے کی قوت رکھتی ہیں۔ اگر مجھے ذاتی طور پر مکمل اطمینان نہ ہو تو تم۔۔۔۔۔ میرے علاوہ اپنے دوسرے حکار سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔“

”جانتا ہوں۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”اور کوئی شرط۔۔۔۔۔“

”کامیابی کی صورت میں میرے ساتھ تمہارا گھسپاٹا قانون کیا برتاؤ کرے گا؟“

”میں کو شش کروں گا کہ تمہیں کسی بھی قسم کی جھجکی سے نجات مل جائے۔“

”اور اگر تم ناکام ہو گئے تو۔۔۔۔۔؟“

”زیادہ سے زیادہ ایک سال۔“ اورنگ زیب نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”اولیٰ حقری ہنڈرڈ اینڈ سیٹھی ٹائیوڈیز۔“

”بھئی کبھی انسان کا اعتماد اسے دھوکا بھی دے جاتا ہے۔“ لوچن کے جواب میں کئی سوالات پوشیدہ تھے۔

”میں اپنا کمینٹ (وضہ) پورا کرنے کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ اورنگ زیب یلخت تنبیہ ہو گیا۔ ”تم نے بعد میں اگر بار بار جانا چاہا تو اس کا بندہ دست بھی کروں گا۔۔۔۔۔ اس ازمائی پر اس۔“

”راستہ۔۔۔۔۔ تم بارہ گھنٹے بعد مجھ سے موبائل پر رابطہ کرنا۔ تمہیں میرا بھی آخری جواب مل جائے گا۔“

اس گفتگو کے بعد لوچن کو واپس اس کے کمرے میں بھیج دیا گیا، اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب نے لوچن کی گھرائی پر تفتیشات عمل کو بھی طلب کر کے واضح طور پر ہدایت کردی تھی کہ وہ لوچن کے کمرے سے کم از کم دس بارہ فٹ دور ہی رہیں۔ کسی ایسی جگہ لے کر کے کہ پہرہ کے جہاں لوچن یا اس کے ساتھ رہنے والے نظروں میں نہ آسکیں۔

”سر، ہم آپ کے حکم کے پابند ہیں لیکن۔۔۔۔۔ اگر قیدی یا قیدیوں نے کسی طور خود کشی کی حافیت کی تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟“ گھرائی پر مامور عملے کے سب اسپینر نے دلی زبان میں ایک امکانی خطرے کا اظہار کیا۔

”کئی احوال تمام تر ذمہ داری میری ہے اور۔۔۔۔۔ تمام چیزیں آف دی ریکارڈ ہیں۔ خود کشی کی صورت میں بھی لاٹوں کو خاموشی سے دقت دیا جائے گا۔“

سراج خاموش تشائش کی طرح کچھ سمجھتا اور دیکھتا رہا لیکن سیون سار کی ڈی سینٹر کی عمارت کے

”نہ سہی..... پھر بھی لوچن ہمارے لیے شلرخ کے کسی گھوڑے سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔“

دونوں میں غامی دیر تک اسی مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی پھر سراج نے دوبارہ دہلی زبان میں شکوہ کیا۔

”ایک بات یہ بھی طے ہے کہ آپ کچھ باتیں مکمل کر مجھ سے نہیں کہتے..... میں نے بھی سیون اسٹار کے حوالے پر دیدہ و دانستہ میڈم کی شخصیت کو بکس پردہ رکھنے کی کوشش کی تھی پھر بھی اگر آپ کو.....“

”پلیز سراج“ اورنگ زیب نے بڑی محبت سے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”تم اور الماس مجھے کتنے عزیز ہو اس کا اعزاز ہمیں ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے دوبارہ گفتگو سے کام نہ لیتا۔ رہا کچھ باتیں راز رکھنے کا سوال تو اس کے سلسلے میں یہ واضح کر دوں کہ کسی بات کا علم اگر اچانک ہو تو اس کا مزہ بھی زیادہ آتا ہے، تجس نیم ہو جائے تو پھر چونک کر اچھل پڑنے والا لطف نہیں آتا۔“

”رائٹ سر.....“ سراج نے خوشی سے مسکرا کر اورنگ زیب کو پیٹنے ہی پیٹتے سیوٹ کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔ ”اب چھٹکے والے ٹھوں ہی کا انکار کروں گا۔“

جواب میں اورنگ زیب بھی ہنس دیا۔



شبنم کی بے ہوشی ٹوٹی تو وہ ایک دم ہی بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے کانوں میں گونجنے والی گولیوں کی تڑاوت کی آواز ایک غلغلہ بانگ لکھ رہی تھی۔ اٹھنے کے بعد اسے اپنی پوزیشن کا احساس ہوا تو وہ صدمت سہتا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ کسی بڑی چمک اپ نما گاڑی میں سبز کر رہی تھی، پچھلی نشست بھی بے حد آرام دہ ہونے کے باوجود اس کے نیم بیدار ذہن کو کچھ کے لگانے لگی، وہ دو آدمیوں کے درمیان پھنسی بیٹھی تھی، دونوں کے ہاتھوں میں انٹینس اسلحہ تھا، اگلی نشستوں پر بھی ڈرامیئر کے علاوہ ایک دراز قد آدمی بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں بھی راکٹس تھی۔ وہ باقی ساتھیوں کا سرخند معلوم ہوتا تھا۔ چمک اپ نما گاڑی تیز رفتار کی مظاہرہ کر رہی تھی۔

گولیوں کی آواز بہ دستور آدمی تھی، اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے بلند آواز میں اپنے باقی ساتھیوں کو مخاطب کیا ”جب تک میں نہ کہوں تم میں سے کوئی جوابی کارروائی کی حماقت نہ کرے۔“

”ہمیں اور کتنا صبر کرنا پڑے گا۔“ شبنم کے سیدھے ہاتھ والا سر دھچکے میں بولا۔ ”حملہ آور قریب آگئے تو بٹ پر فٹ شیٹ بھی سہا ملانے لگیں گے۔“

”گفرت کرو۔ ہمارے دوسرے ساتھی انہیں جواب دے رہے ہوں گے۔“

”مجھے یہ تو سب کچھ پتہ نہیں لگتا ہے۔“ پچھلی نشست سے دوسرے نے کہا۔ ”ایجنسیوں میں بھی اب دو نمبر کے شکاری بھرتی ہونا شروع ہو گئے ہیں، بولی دے کر بکرا لینے والی بات ہے۔“

”ہم نے بھی ہاتھوں میں چڑیاں نہیں پھین رکھی ہیں۔“ سرخند نے کہا پھر اس نے ذرا تھوڑا کو مخاطب کیا۔ ”تم اگلے موڑ سے گاڑی کا رخ ٹیکسری ایریا کی طرف موڑ دو۔ وہاں ہم مکمل کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر سکیں گے۔“

شبنم بھی سچی ان کی باتوں کو سن رہی تھی، گفتگو سے اس نے بھی اعزازہ لگا تھا کہ وہ دوستوں کے نہیں بلکہ دوبارہ دشمنوں کے زخموں میں محض بچا ہے۔ اس کا ذہن اورنگ زیب کے بارے میں اٹھنے لگا۔ اس نے انجکشن لگوانے سے بچوڑ بھی کیا تھا کہ اب اس کا انعام بھی اگلی گولیوں کے ہاتھوں ہو گا جس کیلئے وہ کام کر رہی تھی۔ ایسی ہی بے جوسوال دریافت کیا تھا اس کا جواب شبنم کے پاس نہیں تھا، اس کی بجائیے یہ بھی اس کے آڑے آگئی، بھر حال اسے اورنگ زیب کے اس اچانک بدلے ہوئے برتاؤ اور دوسروں پر تعجب ہی ہوتا تھا۔ یہ خیال بھی اس کی رگوں میں سنسنی پیدا کر رہا تھا کہ اگر وہ دوبارہ چمک اپ کے آدمیوں کے ہاتھوں گئی ہے تو ان کا کیا رویہ ہو گا؟ افضل خان کا مسئلہ اس کیلئے مذاق بن گیا تھا، اسے اورنگ زیب کی زبانی ہی علم ہوتا تھا کہ وہ ہول سے غائب ہو گیا ہے یا کر دیا گیا ہے۔ اس کو افضل خان کے بارے میں صحیح صورت حال کا علم ہوتا تو وہ اورنگ زیب سے اسے پوشیدہ بھی نہ رکھتی۔ اس کے اور سراج کی تحویل میں جانے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے لیکن اب وہی محفوظ ہاتھ اس کیلئے پھر دہال جان بن گئے تھے۔

وہ اپنے خیالوں سے اٹھ رہی تھی جب گاڑی کسی مقام پر پہنچ کر اچانک موڑی گئی۔ کچھ ابھی تک ذہن پر طاری انجکشن کا اثر بھی برقرار تھا جس سے وہ جھکلا کھا کر سیدھے ہاتھ والے سے ٹکرا گئی۔

”خود کو سنبھالو بی بی۔“ اس نے شبنم کو بازاری انداز میں مخاطب کیا۔ ”اگلی جلد بازی نہ کرو بیچ لڑائے کی، کسی شھکارے پر پہنچ کر باس سے دو دو بات ہو جائے تو شاید تم ہمیں انعام میں مل جاؤ۔ پھر سکون سے ہلا گھبرا کر بیٹھ گئے۔“

”کیا معصیت آگئی؟“ اگلی سیٹ والے نے پلٹ کر اپنے ساتھی کو دیکھا۔

”باہر گولیاں چل رہی ہیں اور یہ.....“ اس نے شبنم کو کچھ کر کہا۔ ”یہ ہماری گود میں سر رکھ کر آرام کرنے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔“

”کواس نہیں..... ہو سکتا ہے کہ اس کی بے ہوشی ابھی تک مکمل طور پر ختم نہ ہوئی ہو۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کھلی دوا کے اثر کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے بدن کا غدار بھی مکمل مل گیا ہو۔“

سرخند نے پھر کچھ کہا چاہا لیکن موبائل کی سریلی مٹتی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا، روشن اسکرین پر نظر آنے والے نمبر دیکھ کر وہی وہی سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”میں باس.....“ اس نے موبائل آن کر کے تاجہ لاری کا مظاہرہ کیا۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”ایک منٹ پہلے ہی ہم نے ٹیکسری ایر یا والی کشادہ روڈ کا انتخاب کیا ہے۔ وہاں ہم آسانی سے ٹنٹ لیں گے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ حکمانہ انداز میں کہا گیا۔ ”تم لو کی کو عارضی یکم نمبر آٹھ لے جا کر وہاں کے محلے کے حوالے کر دو، میرے دوسرے افراد صورتحال پوری طرح کنٹرول کر چکے ہیں۔“

”رائٹ باس.....“

”لو کی کو ڈراپ کرنے کے بعد تم گاڑی سمیت ایک ہفتے کیلئے اڈر گر اوٹ ہی رہو گے۔ اگلا حکم بعد میں دیا جائے گا۔“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ سرخندہ نے موہا ل آف کر کے اوپر سے ملے والا گم ڈرائیور کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو بھی سنا دیا۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی استاد،“ شبنم کے سیدھے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے شخص نے ناگوار انداز میں شکایت کی۔ ”خطرے میں ہم نے ہاتھ ڈالا اور پھر بے دوسرے اڑا دیں گے۔“

”فضول باتوں سے پرہیز کرو۔“ سرخندہ نے ہونٹ چاٹتے ہوئے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”باس چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی بڑی بڑی سزا میں دینے کا عادی ہے۔“

پچھلی نشست پر موجود دونوں افراد نے ہونٹ کی لیے لیکن ان کے ہاتھ آزاد تھے۔ شبنم دل پر جبر کر کے ان کی گھٹیا انداز میں کی جانے والی دست درازائی برداشت کرتی رہی..... کسمپاسی رہی، وہ جس پھوٹیشن سے دوچار تھی اس میں اس سے زیادہ کچھ کر رہا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

❖❖❖

دو سفید رنگ کی ایک پک اپ جس کی پشت پر بھی دو آدمیوں کے بیٹھنے کی محفوظ اور آرام دہ جگہ موجود تھی۔ پک اپ میں موجود چاروں افراد پوری طرح مسلح تھے، ان چاروں کی نظریں تقریباً تین منٹ آگے جانے والی سیاہ وین پر مرکوز تھیں جس سے فائرنگ ہو رہی تھی جس گاڑی میں شبنم موجود تھی وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو سفید پک اپ میں پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنے ساتھی سے دریافت کیا۔

”اب کیا حکم ہے؟“ لو کی والی گاڑی نظروں سے گھل چکی ہے۔ کیا اب بھی ہم ونڈ کر نیڈ استعمال کر کے سیاہ وین کو راستہ سے ہٹا کر آگے جانے کی کوشش نہیں کر سکتے؟“

”نہیں.....“ دوسرے شخص نے جو گھٹے ہوئے جسم اور درمیانے قد کا مالک تھا، بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”ہمیں ان میں سے کسی ایک آدھ کو زندہ بچڑنا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ لو کی لے جانے والے سوراخوں کو کون ہیں۔“

”کیا یہ حکم باس کی طرف سے ملا ہے؟“

”ہاں.....“ مختصر جواب دیا گیا فائرنگ کی وجہ سے سڑک پر رواں دوراں ٹریفک قحط کیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دونوں گاڑیوں سے فائرنگ ہو رہی تھی جب اچانک کہیں قریب سے پولیس بیڑوں کی کار کے سائرن کی مخصوص آواز سنائی دینے لگی۔ سفید پک اپ اور بیڑوں کی کار کا درمیانی فاصلہ بھی تقریباً چالیس فٹ رہا ہوگا۔

”اب کیا حکم ہے؟“ پک اپ کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے پھوٹیشن کی جھنکی کو محسوس کرتے ہوئے دوسرے سے کہا۔ ”ہم درمیان میں مینڈوچ ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی ایک کو درمیان سے ہٹانے بغیر ہمارے پاس فرار کا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔“

”ہم اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے۔“ اس نے کسمپاسی جواب دیا۔ ”فی الحال ان دونوں کو دور رکھنا ہوگا۔“

سفید پک اپ کی رفتار فوری طور پر تیز کر دی گئی جس کو محسوس کر کے وین سے ہونے والی فائرنگ بھی شدت اختیار کر گئی، اس کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی پھر اگلے موڑ سے وین کو ساحلی علاقے کی جانب موڑ دیا گیا۔ پولیس بیڑوں کی کار سے ٹکر ہونے والے سائرن کی آواز نے دونوں گاڑیوں میں موجود افراد کو بھی پھوٹیشن سے دوچار کر دیا تھا۔ گھٹے ہوئے جسم والا کسی گہری سوچ میں غرق تھا پھر

اس نے دونوں نشوون کے درمیان کی پاریش کے درمیان مختصر کھڑکی کا سلازنگ کھڑا ایک طرف کر کے ڈرامہ سے کہا۔

”تم اگلے موڑ سے پک اپ وائی جانب موڑ لینا۔“

”ہمارے مطلوبہ گاڑی بائیں جانب موڑی گئی ہے۔“ ڈرامہ نے تیزی سے جواب دیا۔

”اس کی غمرت کرو۔ سامنی راستے پر بھی ہمارے سامنی موجود ہوں گے۔ میں اس سے رابطہ کرتا ہوں۔“ اس نے ہلنٹن کے درمیان کھڑکی کو دوبارہ بند کر دیا۔

”مگر اس راستے پر کوئی نہ تھا تو لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی؟“ دوسرے آدمی نے اپنی تشویش کا اظہار ضروری کیا۔

”ہاں ناٹس ہو گیا تو ہماری حالت بھی خطرے میں پڑ جائے گی؟“

موجودہ حالت نے جو اچانک رخ اختیار کیا تھا اس کے اثرات کھٹے ہوئے جسم والے کے چہرے پر بھی عجب ہو رہے تھے، وہ اپنے سامنی کی بات سن کر مزید مضطرب ہو گیا۔ اسی لمحے ڈرامہ ایک کمارفٹ کی طرف سے درمیان کھڑکی میں غلط پیدار کے کیا گیا۔

”آپ کیلئے کا ہے۔“ جھلکی ادا کھلی کے ساتھ ہی ایک سوبائیں اس کی طرف بڑھا دیا گیا۔

”نہیں ہاں۔“ کھٹے ہوئے جسم والے نے سوبائیں کان سے لگا کر مٹی شیشے پر نظر ڈالنے ہوئے سہاٹ لیے ہیں۔

”تھوہیں کی سوبائیں کے آجانے سے ہماری پوزیشن خراب ہو گئی ہے۔“

”تم۔ تم نے کیا فیصلہ کیا۔۔۔؟“ خشک لہجے میں سوال کیا گیا۔

”میں ہر قیمت پر اپنا مقصد کرنا ضروری ہے۔“

”میں نے تمہارا فیصلہ دریافت کیا تھا؟“ اس بار بھی دوسری جانب سے بات کرنے والے کے لہجے میں کڑھی ہی شامل تھی۔

”دوستوں میں ممکن ہیں۔ میٹر ونگ کار سے چھپا جھڑانا یا ونڈ کرینڈ کا استعمال جس سے پوزیشن زیادہ خطرناک ہو جائے گی۔“

”ایک جواب دو۔“

”وہی طور پر ہمارے لیے پولیس سے نکرنا مناسب نہیں ہو گا اس لیے میں نے لڑکی کا تعاقب کرنے سے گریز کیا۔ فیصلہ کیا ہے۔“ کھٹے ہوئے جسم والے نے اپنا فیصلہ دل پر جبر کر کے سنا دیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ اسی پر عمل کرو۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ لڑکی ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں ہم متاب کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔“

”اس کا فیصلہ ہاں کو کرنا ہے۔“ مجھے نہیں۔“ دوسری جانب سے لائن منتقل کر دی گئی تو وہ تھلا کر رہ گیا۔

”سب کیا انڈر ملتا ہے؟“ برابر پیچھے والے سامنی نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”جواب دینے کے بجائے اس نے ڈرامہ کو دوبارہ وائی جانب موڑنے کو کہا پھر سوبائیں ایک طرف ڈال کر انھیں بند کر کے کسی وائی بھی کو سمجھانے لگا۔ دوسرے آدمی کے چہرے سے بھی

بے چینی مخرج تھی۔

حالات کی گردش اور اسلٹ جیمیر نے افضل خان کے ذہن کو ابھار دیا تھا۔

اسے اسپتال سے جگ ہاں کے گم پر قاصر کیا گیا تھا جبکہ ڈاکٹروں کی نظروں میں اس کی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ اپنے مالی حالات اور سماج حیثیت کے پھوٹ میں اچھ کر اس نے غصہ کی راستہ پسند کیا تھا لیکن شبنم اسے برقت سامنے آ کر اپنے قیث پر لے گئی تھی۔ شبنم کا وہ اقدام بھی تعجب

خیز تھا۔ بعد میں شاید شبنم ہی کی کوششوں سے جگ ہاں نے اسے خدمت کا ایک موقع موعہ ہو دیا تھا۔ میڈم روٹی کی طرح اس نے رستم کی آقا خانی کے مقابلے میں بھی جرات مصدا کی حیثیت دے کر جگ

ہاں کو ایک نئے طرز پر فہم کر دی تھی جس کے خوف سے رستم کی بھی سچ جامد کے سامنے نظریں نہیں اٹھا سکا تھا۔ بعد میں شبنم اور وہ دونوں اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے جو کسی خود افضل خان کی ملکیت تھا۔

اس وقت اس کو سوسہ کی امید تھی کہ شاید وہ اپنا کھویا ہوا مقام یا پھر جگ ہاں کی نظروں میں دوبارہ اہمیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ غصہ کی خواہی پر اسرار وادعات نے اسے پھر ابھارا

دیا۔ شبنم کو لے جانے والوں نے اسے دور دراز کرنا شاد دیکھنے کو کہا تھا۔ کیوں وہ کون لوگ تھے؟ شبنم کے خواہی سے ان کا مقصد کیا تھا؟ یا یہی سوالات تھے جن سے کان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، بعد میں

اسے بھی اپارٹمنٹ چھوڑ کر ہوئی جس شفت ہوئے پر آمادہ کیا گیا۔۔۔۔۔ ہوئی میں بھی اس نے اپنے

سماج تجربوں کی بنیاد پر اندازہ لگا دیا تھا کہ رد و عطف پارٹیاں اس کی عمرانی کر رہی تھیں۔ ایک پارٹی کی نمائندگی جگ ہاں کے خاص آدمی کے سامنے آ جانے کے بعد بے نقاب ہو گئی تھی لیکن دوسری پارٹی

کے بارے میں وہ کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکا تھا۔

افضل خان اپنے حالات سے غور نہ کر رہی تھی، وہ کسی ایسے موقع سے کھتر تھا جب اسے اس بات کا اندازہ ہو جاتا کہ جگ ہاں اسے کون نظروں سے دیکھ رہا ہے، اس کے بعد ہی وہ اپنے مستقبل

کے بارے میں کوئی قدم اٹھا سکا تھا مگر اسے اس کا موقع بھی نہیں ملا۔ عمرانی کرنے والے دونوں گروپ کے درمیان اچانک ٹھن گئی تھی۔ افضل خان کے ہوئی پر ہونے والا حملہ اب نہیں تھا جسے وہ کم

از کم جگ ہاں کی طرف سے کوئی ڈراما سمجھتا، جبر حال جگ ہاں کے لوگوں کی ہوئی تھی اس کا اندازہ افضل خان کو بعد میں سوبائیں پر تلنے والی ہدایت سے ہو گیا۔ جملے کے بعد جب وہ ہوئی کے

منبر سے الگ ہوا تھا تو بلیک ڈائیکر کے حوالے سے بات کرنے والے نے اس سے کہا تھا کہ وہ ایک سفری تھیلا لے کر ہوئی چھوڑ دو اور جزل پوسٹ آفس کے سامنے پہنچ کر دوسری ہدایت کا انتظار

کرے۔ افضل خان کے پاس اس ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔ جزل پوسٹ آفس پر پہنچ کر ٹنگی چھوڑ دینے کے بعد ہی تقریباً بیس منٹ بعد اسے دوبارہ پک کیا گیا، پک

کرنے والے نے بھی بلیک ڈائیکر یا کوڈ استعمال کیا تھا اس لیے وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہو

لیا۔ راستے میں اس نے اپنے ساتھ سفر کرنے والے سے دریافت کیا۔

”مجھے اب کہاں جانا ہے؟“
 ”بے مبری کا مظاہرہ مت کرو۔ ہمیں صرف تمہیں احتیاط سے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دینے کی ہدایت ملی ہے۔“
 ”لیکن جن حالات میں.....“
 ”نہیں.....“ ڈرائیو کرنے والے نے اسے دوبارہ ٹوکا۔ ”سوال جواب سے پرہیز کرو، مجھے بھی اس کی اجازت نہیں ہے۔“

افضل خان نے پھر اس سے کوئی سوال نہیں کیا، آدمے کھینے تک مختلف سنسان سڑکوں سے گزرنے کے بعد اسے آٹھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر کسی محفوظ مقام پر چھوڑ دیا گیا، اپنے قدموں کی حرکت کی بنیاد اور پرانے تجربات کی روشنی میں افضل خان کو اس بات کا اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ اسے کسی ایسے زیر زمین کمرے میں لایا گیا ہے جس کا اوپری حصے سے کم و بیش بارہ میٹر میوں کا درمیانی فاصلہ ضرور تھا، اس کی آٹھوں سے پٹی اتارنے کے بعد اس کے ساتھ آنے والا دواہی چلا گیا۔ افضل خان کا اندازہ غلط نہیں تھا، وہ جس کمرے میں لایا گیا تھا اس میں کمزری یا روشن دھن قسم کی کوئی چیز موجود نہیں تھی، کمرے کا کل رقبہ بھی دس یا بی دس سے زیادہ نہیں تھا۔ ساتھ میں اچھے ہاتھ روم بھی موجود تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ، میز اور دو کرسیوں کے علاوہ فرنیچر نام کوئی اور شے موجود نہیں تھی۔ باہر جانے کا یہ ظاہر ایک ریز دروازہ نظر آ رہا تھا جسے ساتھ آنے والے نے باہر جانے کے بعد بند کر دیا تھا۔

افضل خان کو اپنی بے بسی اور دمگڑوں حالت پر فنی آری تھی، کبھی اسی شہر میں اس کے نام کا ملٹی ہوٹل ہوتا تھا، آج وہ بے بسی کی حالت سے دوچار تھا۔ اس نے سڑکی بیگ کا بندھے سے اتار کر ایک طرف رکھا پھر آرام سے بستر پر دراز ہو گیا، ذہن ٹھکا ہوا تھا اس لیے اسے جلد ہی نیند آگئی۔ صبح دس بجے اسے بیدار کیا گیا۔ یہ فریڈینا شے کی فرسے لانے والے نے اسے اٹھا دیا تھا، وہ اٹھ کر خاموشی سے دواہی روم میں چلا گیا۔ دواہی کمرے میں آیا تو جگہ نے دالا جا چکا تھا، اس نے بے پروائی سے ناشتے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جو ذہن کی صلاحیتوں اور جسمانی توانائی کو برقرار رکھنے کیلئے بھی ضروری تھا، ناشتے سے فارغ ہوئے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذہن کو بارہ کر دیا تو اسے شبنم کی پوزیشن کچھ محکوک سی نظر آئی۔ اس کی دلیہیں بھی معقول تھیں، شبنم نے جب ہاس کی مرضی کے بغیر اسے اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد اپنے ساتھ قبض لے جانے کی ہمت نہیں کی ہوگی، رستم علی کے خلاف استہمال کرنے کا مشورہ بھی اس نے جب ہاس کی ہدایت کے بعد ہی دیا ہوگا۔ افضل خان کے ساتھ ایک ہی صحت کے پیچھے رہنے کا مسئلہ کی مصلحت کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد جن حالات میں اسے نہایت اطمینان اور دلیری سے اٹھا کیا گیا تھا وہ بھی افضل خان کیلئے حیران کن ہی تھا۔ افضل خان کے ہوٹل شفٹ ہو جانے کے بعد اس نے سو بائیں پر رابطہ قائم کرنے کے بعد بھی اپنے اٹھا کاروں کے بارے میں کسی خیال کا اظہار نہیں کیا تھا، اگر وہ واقعی دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی

تھی تو سو بائیں کس طرح دستیاب ہوا؟..... محنتگو کے دوران اس نے ایک بار خود ہی سو بائیں بھی آف کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ افضل خان کو ایک ڈرامے کا منسوب بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب ہاس کے خاص کارندے اس کی مرضی کے بغیر ”چوں“ کرنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

افضل خان، شبنم کے بارے میں غور کر رہا تھا جب دروازہ کھلنے کی آہٹ پا کر چونکا پھر آنے والوں کو دیکھ کر اسے اس بات کا بخوبی اندازہ بھی ہو گیا وہ صبح کے سو اکیس اور کا قیدی نہیں تھا۔ آنے والا اس کا پرانا ساتھی تھا، دوسروں کی طرح وہ بھی پولیس کے ریکارڈ پر مفرد مجرموں کی فہرست میں شامل تھا۔ جب ہاس کا دست راست ہونے کے زمانے میں وہ بھی افضل خان کے حکم پر عمل کرنے کا پابند تھا، اس کا اصل نام کچھ اور تھا لیکن وہ اسلم ڈنگ کے نام سے مشہور تھا۔ انتہائی دلیر، بے خوف اور خطرناک قسم کا آدمی تھا، دو تین بار ایتھلیٹک سلاخوں سے بھی فرار اختیار کر چکا تھا، بالآخر جب ہاس نے اسے کارآمد سمجھ کر اپنی ٹیم میں شامل کر لیا تھا۔

”کیسے ہو افضل خان؟“ اسلم ڈنگ نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا پھر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر انگلیں میز پر رکھ دیں، یہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ افضل خان کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور اور بااختیار حیثیت کا مالک تھا۔

”مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ افضل خان نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔
 ”مجھے بھی تمہاری موجودہ پوزیشن کا دکھ ہے..... بہر حال، مجھے سے کسی خوشی اخلاقی کے مظاہرے کی امید بھی نہ رکھنا۔“ اس نے کمرے اور کمرے سے لے کر جواب دیا۔
 ”مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہے،“ افضل خان مستقبل کر بیٹھ گیا۔ ”میں کس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا سہیلے کی عادی نہیں تھا، میرا تعلق بھی اسی کردہ ہے جس میں اتار چڑھاؤ کو کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔“

”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم نے حالات کے سامنے سر جھکانے کا ارادہ کر لیا ہے، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“ اسلم ڈنگ نے بڑے زہریلے لہجے میں کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔
 ”جب ہاس نے تم پر تھس کر کوئی تو پر پناہ دی ہے، کل کیا ہوگا؟ اس کا اٹھارہ بھی مردن جھکا کر تمہاری تاجدار کے اعزاز پر ہوگا۔“

”یہی بیجا جانتا ہوں.....“
 ”کیا تمہیں اندازہ ہے کہ شبنم کے اغوا میں کون لوگ ملوث تھے؟“ اسلم نے یکفخت گہری تنقید کی سوال کیا۔

”یہی سوال میں تم سے کرنے والا تھا۔“
 ”بہی تم بڑے طریم خان شمار کیے جاتے تھے۔“ اسلم نے طنز کیا، کچھ اندازے تو ضرور قائم کیے ہوں گے۔“

”ہو سکتا ہے کسی مخالف پارٹی..... کسی برائے سر پر عیاش یا پھر ابجینی والوں نے اسے

خو اکا ہوا..... میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

اسلم نے چمک کر سوال کیا۔ ”یہ ابجینی والوں کا خیال تمہارے ذہن میں کیوں آیا.....؟“
 ”میں نے ایک امکانی بات کہی تھی ورنہ میں خود بھی یہ ان ہوں کہ خواہ کرنے والوں سے اگر
 میں نے خود اٹھنے کی کوشش نہ کی ہوتی تو شاید وہ میرے ساتھ کوئی چارخانہ سلجھی ہو نہ کرتے۔“
 جواب میں اسلم نے افضل خان کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا پھر اٹھ کر کمرے میں چلے گیا۔
 اس کے تہہ درپہ تھے کہ وہ کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد اس
 نے افضل خان کو دوبارہ ایکسرے کرنی نظروں سے گھورا۔

”ہوئی میں جو دو افراد تم سے ملتے رہتے تھے وہ کس قماش کے تھے؟“
 ”میری گھرائی پر مامور..... اس کے علاوہ مجھے کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔“
 ”کیا چاہتے تھے وہ؟“

”شہنشاہ کے خواہ کے سلسلے میں وہ میری زبان بھلوانے کے خواہش مند تھے۔“ افضل خان نے
 سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میری لامٹی پر وہ ایک آدھ بار تھوڑے پر بھی آمادہ ہوئے لیکن انہیں ایسا
 کرنے سے روک دیا گیا۔ یہی ان میں سے ایک کی مہربانی یا میری خوش قسمتی تھی کہ اس نے عملی
 جارحیت کا مظاہرہ کرنے سے پیشتر موبائل پر کسی سے رابطہ قائم کیا تھا ورنہ اس کا دوسرا ساتھی کوئی
 رعایت نہ کرتا۔“

”تمہارا کیا جواب تھا.....؟“

”میں اب بھی اسلم ہوں کہ شہنشاہ کو خواہ کرنے والوں کی اسلیٹ کیا تھی اور اسے کس مقدمے
 خواہ کیا گیا۔“

”ابجینی والوں کا خیال تمہارے ذہن میں کیوں اور کس زاویے سے کلپا یا تھا۔“
 ”غیر قانونی حرکت کرنے والے اکثر ذلیل کراس کرنے کی پاسی بھی اختیار کرتے ہیں
 چکے۔“ افضل خان نے سرسراہٹے لہجے میں کہا۔ ”میں بھی ضرورت کے تحت ایسا ہی فارمولا اختیار کر
 کے دوسری پارٹی کو ذہنی جتنا تک کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“

اسلم ڈٹکا کے چہرے پر یہ دستور تازہ کی کیفیت نظر آ رہی تھی، کچھ توقف سے بولا۔ ”مختلف
 پارٹی کے سلسلے میں تمہارے ذہن میں کس کا نام سر فرست ہے؟“

”میں کتنے عرصے سے صاب سے دو چار ہوں اس کا اندازہ تمہیں بھی ہوگا۔ ان ایکشن ہوتا تو
 شاید کسی ایک کی نشان دہی کر سکتا تھا۔“

”ٹھیک ہے..... ہم تینوں امکانیات پر فکر کر کے دیکھ لیں گے۔ فی الحال تم کو کچھ دنوں کیلئے
 ہماری میزبانی کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔“

”جاتا ہوں لیکن ایک سوال میں بھی میرا چاہا ہوا۔“ افضل خان نے اسلم ڈٹکا کو وضاحت
 طلب نظروں سے دیکھا۔ ”مجھے یہاں کس مقدمہ کیلئے لایا گیا ہے؟“

”تم کبھی جگہ ہاس کے رائٹ پیڑ بھی دیکھے ہو، جہازوں اہم راز اب بھی تمہارے دل و دماغ
 میں دفن ہوں گے۔ جگہ ہاس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید تمہیں پہلی فرصت میں ختم کرنے سے گریز بھی
 نہ کرتا۔ تمہیں یہ بھی علم ہوگا کہ شہنشاہ کی وجہ سے تمہاری سی ایف کی ایک راز دار ہو رہی ہے۔“
 افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اندری اندر حائل کر رہا گیا۔

”یہ بھی ہو سکتا ہے جگہ ہاس کی خاص عہدہ پر تم کو بطور ڈاکٹرانٹ استعمال کرے۔ یہ بھی میرا
 ذاتی خیال ہے ورنہ ہاس کے دل میں کیا ہوتا ہے اس کی خبر اس کے فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی۔“
 ”میں نے رستم علی آغا خانی کیلئے بھی جان بھری پر رکھ کر جگہ ہاس کے اشارے کی تعمیل کی تھی۔
 اب بھی انکار نہیں کر گا۔“ افضل خان نے صاف طور اندیشے سے کام لیا۔ ”ہاس کی سرپرستی میں آنے
 سے پیشتر قانون کی نظروں میں کیا پڑ پڑتی تھی تمہیں تو نہیں معلوم ہوگا۔ ہاس نے بروقت میری مدد نہ کی
 ہوتی تو شاید چٹا چٹا کے پھندے تک پہنچ چکا ہوتا، آج بھی میں اس کے احسان کو نہیں بھولا۔“

جواب میں اسلم ڈٹکا کے ہونٹوں پر ایک مردہ کراہٹ ابھرائی۔ اس نے جیب سے ایک
 موبائل نکال کر افضل خان کے حوالے کرتے ہوئے بڑے سرد لہجے میں ہدایت کی۔ ”اس پر تم صرف
 دوسری جانب سے کی جانے والی کال ریسیور کرے۔ خود کسی سے رابطہ قائم کرنے کی اجازت نہ کرنا۔
 ہو سکتا ہے کہ میں ایک دو دن بعد دوبارہ تمہاری حواج پر ہی کیلئے چکر لگاؤں۔“

اسلم ڈٹکا کے جانے کے بعد افضل خان نے موبائل جیب میں ڈالا پھر دوبارہ ہسٹر پر لیٹ کر
 آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ قیامت طور پر سکون سے نیند پوری کرنا اس کی اولین ترجیح تھی۔

اس روز بھی اس کی آنکھ پر سے کبھی لیکن اس صبح کا آغاز اس کیلئے خاصا خوشگوار تھا۔ دولت اور
 طاقت کے ساتھ ساتھ اگر کامیابی کا انوش بھی شامل ہو جائے تو پھر سر اندھ بن جاتا ہے۔ صحیح حامد کی بھی
 اس وقت ایسی ہی کیفیت تھی، دو روز کے اندر اندر اس کو دو کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں، اس کے
 ذریعہ غلاموں نے بالآخر افضل خان کو پھر اپنی قید میں لے لیا تھا، قاتل پارٹی نے معمولی مقابلے کے
 بعد راہ فرار اختیار کر لی تھی اس لیے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس گروپ کے لوگ تھے۔ افضل خان
 کے بعد سے دوسری کامیابی کی اطلاع نمبر نو نے شہنشاہ کی اچانک باز یابی کی دی تھی۔ شہنشاہ کے سلسلے میں
 بھی دوسری پارٹی نے زیادہ حراست نہیں کی تھی۔ افضل خان کے مقابلے میں شہنشاہ کے لئے کی اسے
 زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ذہانت اور کارکردگی کے سبب جگہ ہاس کے زیادہ قریب ہو گئی تھی۔ وہ
 سونے کی چڑیا تھی جس کے پر کترنے کے بعد فیض حامد نے اسے پوری طرح اپنے اشاروں پر چلنے کی
 خاطر مجبور کر دیا تھا، اسی کے مشورے پر اس نے افضل خان کو نظروں سے گرانے کے بعد رستم علی آغا
 خانی کے عہدہ پر لڑنے کا ایک آخری موقع لیا تھا جو افضل خان نے جان بھری پر رکھ کر بڑی دلیری سے
 پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ رستم علی کے خواب گاہ میں جو مائیکروفلم تیار کی گئی تھی وہ اب جگہ ہاس کے
 قبضے میں تھی جس کے بعد سندھ بھٹان کے بعد کے علاوہ اب رستم علی آغا خانی بھی اس کے مقابلے سے

کی۔

”آپ دلاسا تو نہیں دے رہے؟“

کم کن ڈانرگ۔ اب جو فیصلہ میں نے کر لیا ہے وہ اس ہے۔

کنول سے رابطہ ختم کرنے کے بعد بھی صلح حامد نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب کسی نہ کسی طرح کنول کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھے گا۔ پاس اور باری بائیں پلٹتے پلٹتے اس کی نیت بھی بھر چکی تھی۔ وہ کنول کے خوب صورت وجود کے تصور سے شرشار ہو رہا تھا جب نبرد کی کال موصول ہوئی۔

”کیا خبر ہے؟“ صلح حامد نے سٹاٹ لہجے میں گھنگو کا آغاز کیا۔

”دونوں خبریت سے ہیں۔ میں نے اور میرے آدمیوں نے پوری طرح اطمینان کر لیا تھا کہ ان کی گھرائی نہیں کی جا رہی۔“

”شبیم نے کیا کہا ہے؟ اس کے انگوٹھ میں کون ملوث تھا؟“

”وہ یہ ظاہر ظالم نظر آتی ہے اس کے علاوہ اس نے ہمارے زیادہ تر سوالات کے جواب میں ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ وہ آپ کے سوا کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔“

”افضل خان نے کچھ اگلا۔“

”نہیں۔۔۔ وہ اب سب اسی پرانے بیان کو دہرا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ نمبر نو نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ حالات سے بری طرح ٹوٹ چکا ہے، ہم نے بھی گھرائی کے دوران یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ دو پارٹیوں کے بیچ سیلہ بیچ بن کر رہ گیا تھا۔“

”کیک تم اور تمہارے ساتھی تھے۔ دوسری پارٹی کس کی ہو سکتی ہے؟“

”یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن مقابلے کے دوران دوسری پارٹی کے راہ فرار اختیار کرنے سے یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ جگانے کے لوگ رہے ہوں گے۔“

صلح حامد نے ایک منٹ کیلئے کچھ سوچا پھر حکمانہ انداز میں کہا۔ ”شبیم کو اس ٹھکانے پر منتقل کر دو جہاں پہلے افضل خان کو رکھا گیا تھا، میں کسی وقت خود اس سے مل لوں گا۔ گھرائی پر تمہارے اعتماد کے آدی ہونے چاہئیں۔ افضل خان کے بارے میں بعد میں بات کروں گا۔“

موہاں کا رابطہ ختم کر کے وہ اٹھ بیٹھا، داش روم جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا پھر دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتے کی میز پر آ گیا۔

اس وقت دوپہر کے سوا گیارہ کا عمل تھا، یعنی دیر میں اس نے تازہ اخباروں کو الٹ پلٹ کر دیکھا آخر دیر میں اس کے پرانے دادیو عمر کے قابل اعتماد ملازم نے ناشتہ لگا دیا اور خود خاموشی سے حسب معمول ایک طرف ہاتھ بائیں کرکھا ہو گیا۔

صلح حامد ناشتے سے فارغ ہو کر لانچ میں آ کر اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھ گیا۔ سامنے شیشے کی گول میز پر ڈاک سے موصول ہونے والے لٹائے اور دیگر پیکٹ پڑے تھے، اس نے ڈاک رٹ پلٹ کر کچھ مخصوص تلفون کا انتخاب کیا جس میں ایک غیر ملکی ہوائی کال خوبصورت سکس بائی اینٹ کا

ہٹ گیا تھا البتہ اس کا جوان بیٹا داراجے باپ کی مجبوری کا علم نہیں تھا، پر ٹکانے کی کوشش کر رہا تھا، صلح حامد اسے بھی شبیم کو استعمال کرنے کے بعد پسپائی پر مجبور کرنے کے بارے میں اسکیم تیار کر رہا تھا جب شبیم کو اچانک افضل خان کے ایارمنٹ سے اس کی موجودگی کے باوجود آکر لیا گیا۔ اس انگوٹھ کی دلیرانہ واردات کے سلسلے میں صلح حامد کے ذہن میں کئی نام ابھرے تھے لیکن وہ کسی ایک کے بارے میں حتیٰ فیصلے پر نہیں پہنچ سکا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ ان محاطات میں کسی نہ کسی زواہی سے جگا اور اس کے گردو کے افراز ضرور ملوث ہوں گے جو بلیک ٹائیگر کی ہراساں موت کے بعد ہی اچانک منظر عام سے غائب ہو گیا تھا اور تلاش بسیار کے باوجود ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

بہر حال بگ باس کے جیالوں نے افضل خان اور شبیم کو دوبارہ نہ صرف حاصل کر لیا تھا بلکہ ایسی محفوظ جگہ پہنچا دیا تھا جہاں کوئی پرندہ بھی نہیں مار سکتا تھا، اس کے علاوہ صلح حامد کو اس بات کی بھی بہت خوشی تھی کہ اورنگ زیب جیسا اثر و رسوخ رکھنے والا سربراہ پولیس آفیسر بھی ازخود جذبات کا شکار ہو کر اس سے ایک ایسا وعدہ کر چکا تھا جو یہ ظاہر ہوتا مشکل تھا۔ کال کی صورت میں اس نے صلح حامد کے ہر حکم پر سر جھکانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وعدے کی معیاد بھی ختم ہونے میں اب چھ سات گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ اورنگ زیب کے قابو میں آ جانے کے بعد جگا اور اس کے چچے ہونے سر بھر دو کوئی ان کے ٹھکانوں سے نکال کر قدموں تلے روندنا زیادہ آسان ہو جاتا۔

اس وقت صلح حامد اپنے بستر پر نیم دراز ایٹمی خوش بیدوں سے دل بہلا رہا تھا جب موہاں پر کنول کے نمبر بج گئے۔ اس کال کو نیک ٹھون جان کر اس نے فون آن کر کے ریسیور کان سے لگا لیا سرد آؤ بھر کر بولا۔

”کیسی ہو کنول؟ اس وقت میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔“

”جیسے یہ جان کر خوش ہوئی لیکن میری حالت اس سے مختلف ہے۔“ دوسری جانب سے کنول نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا۔

”کیا وہاں نہیں؟“ صلح حامد نے پوچھنی سے دریافت کیا۔

”چند روز سے آپ کی صورت نہیں دیکھی۔“ دوسری طرف سے پیار بھرے اعداد میں شکوہ کیا گیا۔ ”اس سے بہتر تو میں آپ کی ذاتی فیکٹری کی حیثیت میں تھی۔ روز آپ کا دیدار تو ہو جاتا تھا۔“

”ڈونٹ دری مائی سویٹ ہارٹ۔۔۔۔۔۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اب بہت جلد تم بھی میرے ساتھ ایک ہی جہت کے چچے روگی۔ بس جہاں اتنا انتشار کیا ہے وہاں دو ایک دن اور صبر کر لو۔“

”یہ انتشار بھی میرے لیے قیامت ہی ہوگا۔ کیا آپ اپنے من میں ایک رات بھی میرے ساتھ نہیں گزار سکتے؟“

”صرف دو روز اور میرے کہنے سے رک جاؤ پھر۔۔۔۔۔۔ میں جنہیں اپنے پاس ہی بلا لوں گا البتہ۔۔۔۔۔۔ تمہاری والدہ وہیں رہیں گی۔ ان کی خدمت کیلئے ملازم اور یکویدار سب میری ذمہ داری ہو

ہولناک نتائج پر غور کرنے کی زحمت گوارا کر لیتا ہوں ان تصاویر کے منظر عام پر آنے کی صورت میں پیش آسکتے ہیں، تمہاری عزت، تمہاری شہرت اور برسوں کی بنی بنائی جموںی ساکھ ریت کے محل کی طرح ڈھے جانے کی..... دور اندیشی پر عمل کرنے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ میں بھی کبھی تمہارے آڈے وقت بھلے کام آ جاؤں..... تمہاری گھٹیا سوچ کی وجہ سے عارضی طور پر عتاب یا نیتہ..... جگا!“

جگا کا نام پڑھ کر فیح حامد کا خون کھولنے لگا لیکن وہ موصول ہونے والی تصویروں کے پیش نظر اس وقت اس پر یقین میں بھی نہیں تھا کہ جلد بازی میں کوئی قدم اٹھاتا۔ جو تصویریں اسے موصول ہوئی تھیں ان کے ٹھیکیز اور دوسری کا پتھر کی اور کے پاس میں ضرور محفوظ ہوں گی، ان تصویروں کے منظر عام پر آ جانے کے بعد وہ عرش سے گر کر فرش پر آ جا تا اور کسی دم نہ کھانے کے قابل نہ رہتا۔ اس نے تصویریں پر دوبارہ غور کیا، کئی زاویوں سے غور کرنے کے بعد اس کا بھی خیال تھا کہ وہ تصویریں برابر والے مکان سے گزر کر اس کے مکان کے درون اند تک رسائی حاصل کرنے کے بعد بنائی گئی ہوں گی جو کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی، اسے یہ بھی حیرت تھی کہ اس کی اور کنول کی شاؤد کا علم کچھ یا کسی اور کو اور کس طرح ہوا جبکہ اس نے مسکن احتیاط سے کام لیا تھا۔؟؟؟ بہر حال، وہ جو کچھ بھی ہو لیکن اس نے ان تصویروں کے ذریعے فیح حامد کے وجود کو بلا کر دکھایا تھا۔ وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھا ہوا تھا چپا رہا۔ زندگی میں اس نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت چار بے جان تصویریں ہی نے اسے چاروں خانے چت کر دیا تھا۔ جس صبح کا آغاز خوشگوار تو تھا کہ ساتھ ہوا تھا، وہ دن ڈھلنے سے پیشتر ہی اس کے لیے انتہائی اذیت ناک ہو گئی تھی۔

تصویروں کو پینٹ میں ڈال کر وہ چلا یا ہوا اپنی خواب گاہ میں آ گیا، بے بسی کا احساس اس کے ذہن کو کچھ کے لگا رہا تھا جب اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے تیزی سے اٹھے بڑھ کر میسرور اٹھا لیا۔

”کون بول رہا ہے۔۔۔؟“

”میں جگا کا ایک چمنا ساتھی بول رہا ہوں چاب۔“ دوسری جانب سے سپاٹ آواز میں کہا گیا۔ ”آپ سے ایک دوسروںی باتیں کر رہی ہیں۔“

”کیہ۔۔۔“ فیح حامد نے دل پر جبر کر کے جواب دیا۔

”انسٹانکے اپ کیا حکم ہے؟“ عاجزانہ اعماز میں طر کیا گیا۔ ”وہ بیت الخلا میں چمپا ہے یا تازہ ہوا میں سانس لینے کو باہر آ جائے۔“

”جگا سے کہنا کہ براہ راست مجھ سے بات کرنے میں درمیان لوگوں سے بات نہیں کرتا۔“ فیح حامد نے جھٹ کر میسرور کرڈل پر ڈال دیا، اس کے ذہن میں آتش فشاں کا لاوا اہل رہا تھا۔ کنول کے ساتھ اپنی اخلاقی سوز تصویروں کو دکھ لینے کے بعد اس کا سکون غارت ہو گیا تھا، کل تک وہ آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا، مومجھوں کو تاؤ دے رہا تھا، آج زمین پر کھڑا ہے یہی سے ہاتھل رہا تھا۔ اس کا ذہن بڑی غیبیگی سے اس دلدل سے لکڑی کا راستہ تلاش کر رہا تھا جس

سفید لافانی بھی تھا جس پر کسی بیرونی ملک سے تعلق رکھنے والی ایئر ہوسٹ کی یونیفارم والی تصویر بھی تھی، فیح حامد کے نام کی پرنٹ سلف بھی موجود تھی جس پر ”پرنٹل اور پرائیوٹ“ بھی سرخ رنگ سے لکھا تھا۔

چند لمبے تک وہ اس لافانے کو الٹ کر دیکھا رہا، اسے پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے بیرونی ملک سفر کیلئے اس کپڑا کا انتخاب بھی کیا تھا یا نہیں، ہوائی کمپنیوں کے علاوہ بھی اس قسم کے بے شمار پینٹ اسے موصول ہوتے رہتے تھے جس میں گھنٹی کے بروڈر اور پینٹی مواد ہوتا تھا۔ ایک بار اس نے سرسری طور پر میزبان خاتون کی تصویر کو الٹ کر غصہ زاویوں سے دیکھا پھر بڑی بے پروائی سے لافا دکھولا تھا لیکن..... دوسرے ہی لمحے اس کی رنگوں میں دوڑتے خون کی گردش کے ساتھ ہی دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہونے لگیں، اندر سے براہ ہونے والی تصویریں تعداد میں صرف چار تھیں لیکن وہ کسی ناٹم بم سے زیادہ خوفناک تھیں جو فیح حامد کے پورے وجود میں ہولناک دھماکے کرنے کو کافی تھیں۔

پچھنی پچھنی نظروں سے وہ ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا جن میں اس کی اور کنول کی شکلیں بہت واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ کسی نے بڑی مہارت سے اس کی سہاگ رات کی رنگینوں کو مختلف اعماز میں ایکسپوز کیا تھا، تصویریں میں فیح حامد اور کنول دونوں ہی باور زاد پر نظر آ رہے تھے، وہ دیر بھی نظر آ رہی تھی جس پر شراب کی بوتل اور گلاس موجود تھا۔ پچھلوں چیئر کنول نے بھی ایسے ہی کسی نوادہ کے بارے میں بتایا تھا جس نے فون کر کے اسے دھکی دی تھی، فیح حامد نے اس بات کو محض کسی یوانے کی بڑبجھ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ..... اب وہ اپنی نظروں سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جس کے ایک معمولی سے امکان پر بھی اس کے فرشتوں نے بھی غور نہیں کیا تھا، تصویروں کے ساتھ ایک ناپ شدہ خدا بھی تھا۔ وہ اس شدہ کاغذ کو کھول کر اس کا مضمون پڑھنے لگا لکھا تھا۔

”مگ باسڈ..... تمہاری خدمت میں تمہاری ہی سہاگ رات کا قصہ بطور مہارک باج بھیج رہا ہوں۔ یہ تو کھا گفٹ تھیں براہ راست نہ دے سکا اس لیے کہ تم مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو۔ مجھے دیکھتے ہی تمہارے پانچ حکاری کتے مجھے اپنی صفائی میں دھرتی بھی زبان پر لانے کا موقع نہ دیتے۔ تمہارے ہی خوف سے انڈر گراؤنڈ ہو کر مضمون کی سانس لے رہا ہوں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ ان تصویروں کو دل بھر کر دیکھ اور پرکھ لینے کے بعد اپنے نفقہ باج تھیں قسم کے رنگوں کو ہدایت کر دینا کہ وہ میری یا میرے کسی آدمی کی طرف آگہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کریں۔ وہ نہ..... تم بھی کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔ فی الحال یہ یقین دلاؤں کہ تمہارے بلیک مائیگر کی موت کا مجھ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ میری اطلاع کے مطابق اس کی موت میں اس سیاہ مام جی کا ہاتھ تھا جواب خود بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ میرے ہی شکائے پر دونوں کا آتما سامنا ہوا تھا پھر ان کے درمیان موت اور زندگی کا کھیل کیوں ہوا؟ اس کی وجہ مجھ سے زیادہ تم بہتر طور پر جانتے ہو گے..... ہو سکتا ہے کہ آج یا کل میں کسی وقت تم سے فون یا میو باکس سے رابطہ قائم کروں..... ایک بار پھر اپنا

میں حالات کی ستم ظریفی سے بچنے کا یہی تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ ہلٹا رہا، تمام آپشن پر غور کرتا رہا پھر اس نے طے کر لیا کہ وہ فی الحال اس وقت تک خاموشی سے دن گزارے گا جب تک چکا اور تصویروں کے گلیفوزز اس کے ہاتھ نہیں آتے۔ کوئی دوسرا مسئلہ تو وہاں تو ہے بدتر حالات سے بھی ٹکرا جانے سے گریز نہ کرتا۔ جن بدنام زمانہ مجرموں کی پرورش کر رہا ہے وہ بل بھر میں سارے کوئے کھدروں کو کھال کر رکھ دیتے لیکن وہ تصویریں کسی کوئیں دکھا سکتا ہے ایسا معاملہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے وسیع تعلقات سے بھی کام لے سکتا۔

شام تک وہ اپنی خواب گاہ میں رہا پھر جب ملازم نے اورنگ زیب اور سراج کے آنے کی اطلاع دی تو وہ ایک لمبے کوچلا، ایس بی کی آدمی کو دیکھ کر بھی متوجہ نہیں ہوا کہ وہ دے دیے گئے وقت میں کسی مجرم کا سراج نہیں لگا سکتا تھا۔ لیکن اس کی اور سراج کی ایک ساتھ اس کے سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ اس نے ملازم سے ان دونوں کو انتظار کرنے کا کہہ کر کچھ دیر غور کیا پھر لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اورنگ زیب اور سراج دونوں اسے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔ خاص طور پر اورنگ زیب کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اسے سختی ہوئی تھی، اس نے صوفے پر بیٹھنے کے بعد ان دونوں کو اشارے سے بیٹھنے کو کہا پھر کچھ وقت سے دریا یافت کیا۔

”اس وقت کیسے آتا ہوا؟“ اورنگ زیب سے سوال کرتے ہوئے اس نے ایک اچھتی ہوئی نگاہ سراج پر بھی ڈالی تھی۔

”مسٹر حامد“ اورنگ زیب نے سنبھل کر بپے تلے لپچے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”میں کیا ہوں اور کیا نہیں، یہ آپ بھی بخوبی جانتے ہیں، قانونی معاملات میں کسی لپک کا مظاہرہ کرنا میرے اصول اور فطرت دونوں کے خلاف ہے، میں نے خدا کے علاوہ کسی کے سامنے جھکتا نہیں سیکھا لیکن میں اپنے عہد سے بھی ایک قدم پیچھے بھی نہیں ہٹتا۔ کچھ لوگ اعتراض گفت سے نظر سچا کر مٹنے کی تلاش میں رہتے ہیں، میں اس کو بھی بزدلی قرار دیتا ہوں، مرد میدان وہ ہے جو مردانگی ہی سے اپنی گفت بھی تسلیم کر لے۔“

”میں تمہارے نائب اور تمہارے تعلقات سے بھی واقف ہوں لیکن اس وقت کیسے آتا ہوا؟“ صف حامد نے بظاہر انہماں بنے ہوئے بڑے شاطرانہ انداز میں پوچھا۔ سراج کی موجودگی میں وہ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

سراج نے بھی یہ بات محسوس کر لی تاہم خاموش رہا۔

”آئی۔ سی“ اورنگ زیب نے مسکرا کر سراج کو ساتھ لانے کی وضاحت بھی مناسب سمجھی۔ ”مسٹر سراج میرے ساتھی ہیں اور اب تک کے تجربے سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں یہ بھی کی ویش انہی اصولوں کو پسند کرتے ہیں جن پر میں ثابت قدم رہنے کا عادی ہوں۔ میں نے آپ سے مجرموں کے سلسلے میں جو بہت حاصل کی تھی وہ پوری ہوئی۔ مسٹر سراج کو بھی میں نے تمام صورتحال سے آگاہ کر کے ہاتھ بیٹانے کی خاطر اپنے ساتھ شامل رکھا تھا اتفاق ہے

جو ابھی تک ہم مجرموں کا سراج نہیں پاسکے۔ اب آپ جو بھی فیصلہ میرے حق میں کریں۔۔۔۔۔ وہ مجھے منظور ہوگا۔“ اورنگ زیب نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔ ”مسٹر سراج کو میں اسی غرض سے ساتھ لایا ہوں کہ یہ کسی میرے اور آپ کے معاملے میں گواہ نہ ہیں۔ جس طرح میں مجرموں کو فزاکا راستہ نہیں دیتا اسی طرح خود بھی چانس لینے کو پسند نہیں کرتا۔“

”مذلل“ صف حامد نے اپنے اصل رنگ میں جواب دیا۔ ”مجھے خوشی ہوئی کہ تم خود آگے روندے مجھے جیسوں ایسا دولانے کی زحمت بھی کرنی پڑتی۔ کسی ڈیل کے معاملے میں، میں بھی وعدہ خلافی کو اخلاقی جرم سمجھتا ہوں۔“

اورنگ زیب نے جب اس کے جملے کی گہرائی کو بھانپ لیا لیکن صرف کسمسا کر رہ گیا، صف حامد نے رخ بدل کر سراج کو دیکھا۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے مسٹر سراج؟“

”لوٹ لوٹ کر پھر ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا ہوں۔“

”جن مجرموں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا ان کا کوئی پتا چلا؟“ اس نے بڑی مصمویت سے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ ابھی تک ایس بی صاحب اس کے بارے میں بھی چھان بین کر رہے ہیں۔“ سراج نے اورنگ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”ایسی بات نہیں ہے مسٹر حامد۔“ اورنگ زیب نے بھلو بدل کر جواب دیا۔ ”ایک دو کلیو ہاتھ آئے ہیں، بہت جلد ڈور کے دوسرے سرے تک بھی پہنچ جائیں گے۔“

”جگا کے بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں؟“ اچانک صف حامد نے سوال کیا تو اورنگ زیب کے علاوہ سراج بھی چھٹکا۔

”میں یہاں آنے کے بعد اس کی فائل بھی پڑھ چکا ہوں۔“ اورنگ زیب نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”فائل کے اندراجات کے مطابق وہ اپنی سزا کانٹنے کے بعد سے کوئی ڈانی کو دبا کر رہا ہے۔ رہائی کے بعد سے اس کے خلاف کوئی کریمل کیس سامنے نہیں آیا لیکن۔۔۔۔۔ آپ کو اس وقت جگا کا خیال کیسے آگیا؟“

”میں آف دی ریکارڈ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جگا نے اپنے ایک فریگ بنا رکھا ہے، اس کے آدی ضرورت مندوں کو نہ ماگی اجرت پر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔“

”آپ کو اس کا علم کس طرح ہوا؟“ ”سراج نے روانی میں پوچھ لیا۔

”میں اس وقت آف دی ریکارڈ بات کر رہا ہوں۔“ اس نے سراج کو تیز نظروں سے گھورا۔

”حقیقت کیا ہے یہ پوئیس کا محکمہ بھی ضرور جانتا ہوگا۔“

”آپ درست فرما رہے ہیں مسٹر حامد۔“ اورنگ زیب نے نارمل انداز میں جواب دیا۔ ”کچھ ایسی ہی رپورٹس ہمارے پاس بھی ہیں لیکن کسی ثبوت کے بغیر میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اس

استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

خاص دیر تک شیخ حامد کا ذہن اس صحیح کو سلجھانے میں الجھا رہا تھا اس نے کچھ سوچ کر ایس بی اورنگ زیب کے گہرے لٹے۔ دوسری طرف سے کال چلتی تھی پر ریسپونڈ نہ کی۔

”ایس بی اورنگ زیب۔“

”شیخ حامد بول رہا ہوں۔“

”خیریت۔۔۔ ابھی سمجھ آپ کے پاس سے واپس آئے ایک گھنٹہ ہی ہوا ہے۔“

”میں ہمیشہ دن نوں بات کرنے کا عادی ہوں۔“ شیخ حامد نے سہاٹ لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ۔“

”سمجھ گیا۔“ دوسری جانب سے اورنگ زیب نے جملہ کاٹ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ کو شاید میرے ساتھ مسٹر سراج کا آگیا چھانسیں لگا۔“

”پورا راز نہایت۔“

”آئی سی۔۔۔ میں آئندہ خیال رکھوں گا۔“

”گڈ۔۔۔“ شیخ حامد نے گہری تنہید کی ہے کہا۔ ”آپ نے یہ عہد کیا ہے کہ جب تک مجرموں کے ہاتھ میں ہتھیاری نہیں پہناتے۔ میرے ہر حکم پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھیں گے۔“

”نہیں! بشرطیکہ وہ ہم ہمارے قوانین سے تضاد نہ ہو۔“

”میں نے اس وقت خاص طور سے جگہ کے سلسلے میں آپ کو کال کیا ہے۔“ شیخ حامد نے کھٹکھٹو جاری رکھی۔ ”یہ اور بات ہے کہ رہائی کے بعد اس کے خلاف آن ریکارڈ کوئی قابل گرفت ثبوت نہیں ہے لیکن آپ نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اس کے خلاف بکھر پھرنے پر آپ کو بھی ملی ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ میں نے غلط نہیں کیا تھا۔“

”آپ کی اطلاع کے مطابق سزا کاٹنے کے بعد سے وہ کوئی ذاتی کاروبار کر رہا ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔ فائل رپورٹ بھی ظاہر کرتی ہے۔“

”آپ اور۔۔۔ آپ کی فائل رپورٹ!۔۔۔“ شیخ حامد نے قدرے تلخ لہجے میں تھلا کر کہا۔ ”جو لوگ شریفانہ کاروبار کرتے ہیں وہ بھی پراسرار طور پر منظر عام سے غائب ہو کر اندر گراؤ نہیں ہوتے۔“

”میں آپ سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں اور یہ بھی صاف گوئی سے عرض کر دوں کہ میں ذاتی طور پر بھی اس بات کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ایک دو مخصوص ملک کی وارداتوں کے بعد سے جگہ سے روپوش کیوں اختیار کر دی ہے؟ کیا آپ اس کی وجہ جانتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو جلیز مجھ سے تعاون کریں۔“

”مسٹر اورنگ زیب۔۔۔“ اچانک شیخ حامد کا لہجہ بدل کر صریح ہو گیا۔ ”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ اس وقت آپ کس سے مخاطب ہیں۔“

”سوری!۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔۔۔“

کے علاوہ اور بھی کئی سلیب پڑش لوگ بھی ایسے کاروبار میں ملوث ہیں مگر پولیس کسی نہ کسی وجہ سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔“

”شغفم کے بارے میں ابھی تک آپ کے ذہنی آئی جی نے بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔“ شیخ حامد نے موضوع بدل دیا۔ ”وہ میری خاص اور قابل اعتماد رکن تھی۔“

”میں اس وقت آپ کے پاس صرف اعتراف کھٹ کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔“ اورنگ زیب نے ہونٹ چپاتے ہوئے کہا۔ ”اس عہد کے ساتھ کہ جب تک مجرموں کے ہاتھ قانونی زیر نہیں پہنچا دیتا، آپ کے ہر حکم پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھوں گا۔ بشرطیکہ وہ ہم قانون سے تضاد نہ ہو۔“

”فائن۔۔۔“ شیخ حامد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ قدرے رحمت سے بولا۔ ”مجھے توقع تھی کہ آپ جلد یا بدیر ہتھیار ڈال دیں گے۔“

اورنگ زیب کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ سراج بھی اپنی نشست پر کسمانے لگا پھر وہ وہاں زیادہ دیر نہیں رکے تھے، ان کے جانے کے بعد شیخ حامد نے دوبارہ اپنی خواب گاہ میں آ کر نبرد کو کال کیا۔ رابطہ قائم ہو جانے پر بڑے سر دلچسپی میں بولا۔

”میں تم لوگوں کی کارکردگی سے زیادہ خوش نہیں ہوں۔ بلیک ٹائیگر کے بعد سے مجھے اس کی کی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ وہ اصول بھیرا تھا۔ کھرا اور بدو بارغ۔“

”مجھ سے کیا بھول ہو گئی پاس۔۔۔“

”جنگ۔۔۔“ شیخ حامد کے لہجے میں طوفان چمکنے لگا۔ ”اے فوری طور پر تلاش کرو، وہ ہمارے لیے سب سے اہم سے لیکن۔۔۔ اسے اس طرح جبر سے میں بند کر کے میرے سامنے لاؤ کہ خود اس باسز ڈوکھی اس کا علم کل از وقت نہ ہو۔“

”آل رائٹ پاس۔۔۔“

”فی الحال کسی اور سے جھجھڑا کا سلسلہ روک دو، اپنے تمام آدمیوں کو چچا کی تلاش پر لگا دو۔ مجھے دو تین روز میں رزلٹ چاہیے، پانچ روز رزلٹ، ناکامی کی صورت میں تم بھی زیر عتاب آ سکتے ہو۔۔۔ ویش آل۔۔۔“ جیلے کے اختتام کے ساتھ شیخ حامد کے چہرے پر ابھرنے اور غصے کے طے

پلے تاثرات اور گہرے ہونے چلے گئے۔ جبر اخلاقی تصویریں بھر ماس کے ذہن میں کسی بڑے خطرے کی علامت کے طور پر چلنے لگیں۔

”تقریباً ایک گھنٹہ تک شیخ حامد کسی نہ کسی طرح وقت گزارتا رہا، تصویروں کے منسلے نے اس کے ذہن کو بیخود کر رکھا تھا، وہ ابھی تک اس بات کی تدبیر نہیں پہنچا تھا کہ چچا کو کسی کی اور کون

کی شادی کا علم کس طرح ہوا؟ اور جو تصویریں اس نے بھیجی تھیں، ان کو حاصل کرنے کا خیال اس کے دماغ میں کس طرح آیا؟۔۔۔ وہ کئی زاویوں سے غور کرتا رہا ہر ایک خیال اس کے ذہن میں بڑی سرعت سے ابھرا، کیا تصویروں کا متحدہ پیچہ والا جیجی تھا یا کسی نے خاص مصلحت کی بنا پر صرف اس کا نام استعمال کیا تھا؟ اگر وہ جگہ کے سوا کوئی اور تھا تو۔۔۔ کون تھا؟ اسے خاص طور پر جگہ کا نام

”میں فون پر طویل باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ فتح حامد نے بہ دستور تنک مزاحی کا مظاہرہ کیا۔

”اوہ..... یقیناً کوئی خاص بات ہے۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”کیا میں اس وقت آپ سے دوبارہ مل سکتا ہوں؟“

”نہیں..... کل رات دس بجے میں آپ کے لیے وقت نکال سکتا ہوں، آنے سے پہلے مجھے کال ضرور کر لیں۔“ جواب میں پھر سردمہری کا مظاہرہ کیا گیا پھر دوسری جانب سے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔



رُخی کو بسز سے اتار کر دھیل چیز پر قفل کیا گیا تو اس نے بڑی بڑی موچھوں والے ہیڈ کاشیبل سے پوچھا۔ ”تم..... اس وقت مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“
جواب میں ہیڈ کاشیبل کی پیشانی فٹن آلود ہو گئی۔ اس نے رُخی کو کھٹا جانے والی نظروں سے دیکھا لیکن خاموش ہی رہا۔ دوسرے ماتحتوں کی موجودگی میں اس نے زبان بند ہی رکھی، لوچن اور رُخی دونوں ہی خاص قیدی تھے جن کو ایس پی اورنگ زیب کے حکم سے رعایت دی جا رہی تھی ورنہ ہیڈ کاشیبل دو گھنٹے کے اندر اندر ان کو بتا دیتا کہ وہ عام قیدیوں کے حلقے میں بھی جلا دے گا نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ رُخی نے دوسری بار بھی بے پروائی سے سوال کیا تو ہیڈ کاشیبل نے کہا۔

”زبان بند رکھو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“
”لیکن.....“

”مروت..... ابھی تمہیں پھانسی کے پھندے پر نہیں لٹکایا جا رہا، جب اس کا حکم آ گیا تو پھر تمہارے ساتھ ہونے والا دی آئی پی ٹریسٹ بھی لکاسی کے راستے باہر نکال دیا جائے گا۔ میں اگلا پچھلا حساب برابر کرنے میں کوئی رعایت بھی نہیں کرتا۔“

رُخی نے خلاف توقع خاموشی اختیار کر لی لیکن دس منٹ بعد جب اسے لوچن والے حوالاتی کنبہ سے میں لایا گیا تو اس کی نظریں لوچن پر جم کر رہ گئیں تھیں۔ لوچن بھی اسے دیکھ کر ایک لمبے کو چمکا پھر اس نے کڑوا سا منہ بنا کر ہیڈ کاشیبل کو تیشی نظروں سے دیکھا۔

”یہ کیا ٹوٹا پھوٹا کباڑ خانہ اٹھالائے ہو؟ میں اپنے ساتھ سوائے کسی خوبصورت عورت کے کسی اور کا وجود برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”یہ تمہاری سسرال نہیں ہے پتر.....“ ہیڈ کاشیبل نے اس وقت بھی اوپر کے سخت احکام کی بنا پر رعایت سے کام لیا۔ ”رہا یہ لٹرا مار کیٹ کا دوسرا پٹن تو اسے گر بیٹا قار کے حکم پر تمہاری سرپرستی میں دیا گیا ہے۔“

جواب میں لوچن نے بھی اسے دو چار تند و تیز جملے کس دیئے تھے لیکن وہ خون کے گھونٹ پیتا اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ کنبہ سے کو باہر سے قفل لگا کر وہ سب اورنگ زیب کے حکم کے

حالتی اس سے میں فٹ دور چلے گئے تھے۔ لوچین نے ان کے بعد دوبارہ ڈنگی کو دیکھا جو اس وقت بھی کسی سوچ میں کم تھا۔ اس کی تیز حرکتیں نظر میں رہتے لوچین کے چہرے پر ہرگز نہیں۔

”آئی حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو؟“ لوچین نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں چھوٹے سونے عرصوں کی صحت دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا جیتا۔ تم شاید یہ پولیس مقابلے میں فرار ہوئے ہوئے بکے گئے ہو؟ صحت سے بھی اعلیٰ گری رکھتے ہو۔“

”جو تم کوں سا گولہ میڈل لے کر یہاں آرام کرتے آئے ہو؟“ ڈنگی کاب دلچسپی بدل گیا، اس کی نگاہیں اب کسی لوچین کے چہرے پر بکھڑا کر رہی تھیں۔

”تمہاری زبان سے گولہ میڈل ہی کیوں نکلا؟“ لوچین نے سنی خیر اعزاز میں مسکرا کر جواب دیا۔ ”تیک مرے سے اٹھا کے لوگوں نے بھی گولہ چھارت کرنے والوں کی سر پرستی چھوڑ دی ہے۔ فی الحال میرا دلچسپی کا مایع ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم میرے بارے میں غلط سوچ رہے ہو۔“ ڈنگی نے جھلا کر جینٹرا بدلا۔ ”مجھے محض ایک شے کی جیلو پر پولیس نے ڈر لگا دیا ہے۔ میں اگلی دو مہینہ شیڈوں پر پھر کلک فضا میں سانس لے سکوں گا۔“

”آجہ دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“ لوچین نے دہلی زبان میں سوال کیا۔

”کمانی کاسب سے سنا۔ آسان اور نکلیا طریقہ۔“

”لیکن میں ڈنگی کرتا ہوں کہ اگر تم۔“ یا کوئی مجھے اپنا نام بتا دے تو میں اس کے ماضی، حال اور مستقبل کو کسی صحت فروش حیرت کی طرح غما کر کے میں بھی مہارت رکھتا ہوں۔“

”تم بھول رہے ہو کہ ہم اس وقت سرکاری مہمان خانے میں ہیں جہاں تن کا پکڑا بھی اپنا نہیں ہوتا۔“ ڈنگی کے ہوتوں پر ڈنگی کی مسکراہٹ ابھری۔ ”میں تمہیں بطور شخص ایک مہتری بھی نہیں دے سکوں گا۔“

”آج کل دنیا میں فٹنی کے بجائے کریٹ کا رڈ کاراج ہے۔ میں تمہارے ساتھ کریٹ کے دھڑے پر بھی اعتماد رکھتا ہوں۔“

”تم۔۔۔ میرا نام ارباز خان ہے۔“ ڈنگی نے ہچکچا کر کہا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ میری رہائی کب تک ممکن ہو سکے گی؟“

لوچین نے ارباز خان کے نام کو دو چار بار دہرایا پھر انگلیوں پر کچھ حساب کتاب لگائے لگائے ڈنگی اسے بہت خوشنودی سے سمجھا رہا تھا۔ اس منٹ تک خاموشی رہی پھر لوچین اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈنگی کے قریب آگیا، سرسراہٹے لیے میں بولا۔

”تم نے اپنا نام درست نہیں بتایا میری میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ رہائی کی طرف سے چاہیں ہوئے کہ بعد تم بھی یہاں سے جان چھٹی پر رکھ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔“

اس کے بعد۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔ اس کے بعد مجھے صاف نہیں نظر آ رہا۔ ہاں، اگر تم چھائی سے اپنا

اصل نام بتا دو میں ہر بات پورے اصرار سے سو فیصد درست بتا سکتا ہوں۔“

”میرا نام ارباز خان ہی ہے۔“ ڈنگی نے خنجی کے حجاب دیا۔ ”مجھے سمجھ رہا ہوں کہ تم سوائے نکلے بازی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

”یہ تمہاری رائے ہے۔“ لوچین نے سنی خیر اعزاز میں ایک آنکھ جھپکاتے ہوئے حجاب دیا۔ ”ارباز خان کے بجائے اگر تم نے کسی غیر اسلامی نام کا انتخاب کیا ہوتا تو بات یہ نہ ہوتی تھی۔ لیکن درمیان میں نہ لینا، صرف نام ہے لیکن۔ تم نے جلد بازی میں ایک اہم پھٹ کو نظر انداز کر دیا۔۔۔ فرض کرو میں یا پولیس والے تمہارا پیسے سرکاری پانچاڑا دیروں تو نام کی ساری خوبصورتی کا بھرم کتنی دیر قائم رہ سکے گا؟“

”کوئی ہو تم؟“ ڈنگی نے اس بار حیرت کا اظہار کیا۔

”ارباز خان کے حوالے سے اگر میں اپنا نام رازت نام ظاہر کروں تو تمہارا دل بھی کیا ہوگا؟“

لوچین کے ہوتوں پر ایک شریر مسکراہٹ ابھری، اس میں بھی بڑا ہوش نہ رہے سنی چپاں تھے۔

”نہیں۔۔۔ وہ نہیں ہو سکتے۔“ ڈنگی چمکا۔ ”اے۔۔۔ اے۔۔۔ میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔۔۔ م۔۔۔ میری آنکھیں اسے بڑے دھوکے پر یقین نہیں کر سکتیں۔“

”بھراس بات پر یقین کر لو کہ تمہاری طرح میں بھی بلکے ناچنے کے پاس ہڈی پر آنکھ بند کر کے کام کرتا رہا ہوں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اپنی ناگہانی موت سے وہ مدد نظر اس نے مجھے یہ بات بتا دی تھی کہ وہ کسی کیلے کام کر رہا تھا۔ اب کیا مجھے یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ تم بھی شیخ حامد المعروف بیک باں کے ڈنگی پر غلام ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

ڈنگی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ لوچین کو پوری توجہ سے سمجھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں تجسس اور حیرت کے لے چلے تاثرات پھیل کر کمرے ہوتے جا رہے تھے۔

”میرے گاڈی اردو بولنے پر شاید تم کو حیرت ہو رہی ہے؟“ لوچین نے سرسراہٹے لیے میں کہا۔ ”اس آنکھوں کو ذہن سے نکال دو، میں دنیا کی آنکھ زبانیں اسی قدر دھاتی سے بول سکتا ہوں کہ خود اس زبان کے بڑے بڑے اسرار بھی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے کہ تم درست کہہ رہے ہو لیکن میں۔۔۔“

”اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ اگر میں بیک باں کا کارندہ تھا تو میں نے ہمارے ساتھی نے اس کا رو باری آئس کو آگ کیوں لگا دی۔“ لوچین نے ڈنگی کا اوصاف جملہ پھا کیا تو وہ دھڑکنے لگا۔ لوچین نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ”وہ بیک باں کی پولیس کو کھانک دینے کی ایک ذریعہ سے پانچ تھی۔“ لوچین نے بات جاری رکھی۔ ”تم کیا!۔۔۔ ایس بی ایلرنگ زیب جیسا گھماک افسر بھی جکی سمجھ رہا ہے کہ میں بیک باں کے بجائے کسی اور گروپ کا نمائندہ ہوں۔“

”تم نے یہاں سے فرار ہونے والی بات کیوں نہیں کہی؟“ ڈنگی نے کچھ توقف کے بعد دہلی زبان میں سوال کیا۔

”پہلے میری ایک بات دھیان سے سن لو۔“ لوچن نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ گر کی بات ہے۔ ایک بار فرضی نام ضرورت کے تحت اختیار کروا دے دوبارہ بھی زبان سے نہ نکالنا۔“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”اب مکمل جاؤ مائی ڈیز رام دیال؟“ لوچن یکتخت سنجیدہ ہو گیا۔ ”وہیے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم جرائم کی دنیا میں دشمن کے نام سے مشہور ہو۔ اچھا تک نم ہے، کم از کم ہندوستان کے جرائم میں تمہاری حیثیت کسی اتار (دشمن) کے ہم نم بھی نہیں ہے۔“ لوچن نے بات جاری رکھی۔ ”میں نے فی الحال فرار کے معاملے والی بات تم سے اس لیے کی ہے کہ مجھے اس کیلئے تمہاری ضرورت پیش آئے گی۔ جانتے ہو کیوں؟“

”نہیں۔“

لوچن سکرایا پھر جنگ کے قریب جا کر اس نے اطمینان کر لیا کہ کہیں قریب کوئی موجود نہیں تھا۔ بے پروائی سے قدم اٹھاتا وہ دوبارہ دشمن کے قریب آ گیا پھر دم آواز میں بولا۔ ”ایس بی اورنگ زیب اتفاق سے میری فحی میں آ گیا ہے۔ وہ مجھے کسی اور کرپ اور تھیں بک باس کا آڈی بھڑہا رہا ہے۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ میں مر جاؤں گا لیکن زبان نہیں کھولوں گا۔ بہر حال، کسی خاص وجہ سے اس نے مجھے اپنے حق میں رام کر لیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں تمہاری زبان پر پڑے تالے کھولا سکتا ہوں۔ اسی مقصد سے جنہیں میرے پاس لایا گیا ہے۔“ دشمن کی حیثیت سے جنہیں شناخت کر لینے کے بعد ہی میرے ذہن میں ایک خاص منصوبہ بنے۔ ”آگرم بک باس اور اس کے کرپ کے بارے میں کچھ فرضی اور کچھ حقائق اس بی کو بتا دو ہم دونوں مل کر اسے نہایت آسانی سے ذیل کر سکتے ہیں۔“

”فرار ہونے کے بعد کی تم نے کیا پلاننگ کی ہے؟“ دشمن نے کچھ توقف سے سوال کیا۔

”سوری دشمن۔ میں قتل از وقت اپنے فرسپ کارڈز اوپن کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ لوچن کا بچہ ساٹ ہو گیا۔ ”آگرم میرے اوپر اعتماد نہیں کرتے تو پھر تم کو انور تمہارا کام۔“

”جنگ کے نام سے واقف ہو۔؟“ دشمن نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔“ لوچن نے اعتماد سے جواب دیا۔ ”بک باس کے کہنے پر میں اور بلیک ٹائیگر دونوں اس سے ملے رہتے تھے۔ میرا تیسرا ساتھی جو خوشی کر چکا ہے اس کا اور بلیک ٹائیگر کا آتما سامنا جنگ کے ٹھکانے پر ہی ہوا تھا اس کے بعد ہی۔۔۔“

”دن منٹ۔“ دشمن نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ”آگرم اور تمہارا تیسرا ساتھی بک باس کیلئے کام کر رہے تھے تو پھر بلیک ٹائیگر کی موت میں کس کا ہاتھ تھا۔؟“

”ابھی نہیں۔۔۔“ لوچن نے کچھ سوچ کر غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ ”جب تک یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو جاتے، میں تمہارے سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔ اپنے اصول کی بات ہے۔“

”صرف ایک المچن اور درود کر دو۔“ اس بار دشمن نے کسی قدر اپنی آہوگی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہاں سے فرار ہونے کے منصوبے میں پولیس کے کچھ افسران کا ہاتھ بھی شامل ہوگا؟“

”ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“ لوچن نے محتاط لہجے میں کہا تو دشمن پھر کسی سوچ میں گم ہو گیا لیکن بالآخر اس نے لوچن کی باتوں سے متاثر ہونے کے بعد اس بات کا اقرار کر لیا کہ وہ اورنگ زیب کے سامنے کسی حد تک زبان کھولے پر تیار ہے۔

دشمن کا اقرار سن کر لوچن نے اچانک جو ہنگامہ شروع کیا وہ خود دشمن کیلئے بھی قہر تھا، وہ ملحق چھڑا چھڑا کر قہقہہ رہا تو پولیس والوں کی شان میں دل کھول کر گالیاں بک رہا تھا۔ پھر سے پر مامور کیلئے گالیاں دے دے کر بکا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ دن منٹ بعد ہی سامنے آ گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور گھبراہٹ پر مامور مل اس سب انپکٹر کے ساتھ ہی سامنے آ گیا ہوا چھارج تھا۔

”دہان بات سنیں۔“ سب انپکٹر نے کٹھن کے کے باہر ہی سے کرخت لہجے میں لوچن کو مخاطب کیا۔ ”کیوں خور چکا ہے؟“

”میں اس باسڈ کو برداشت نہیں کر سکتا۔“ لوچن نے دشمن کی جانب اشارہ کر کے مرعوب ہوئے بغیر بڑی حماقت سے قہقہہ کر کہا۔ ”دون دن فائو منٹس اس کو ادھر سے لے جاؤ ورنہ میں اسے جان سے مار دوں گا۔“

سب انپکٹر کے علاوہ ہیڈ کانسٹیبل کی آنکھوں میں بھی خون لہرا کر رہ گیا۔ پھر سب انپکٹر نے وہیں کھڑے کھڑے کسی سے موبائل پر رابطہ کیا اس کے بعد وہ تھلا تا ہوا مسلح حملے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے لوچن کو کھانے والی نظروں سے گھورا پھر پچاسیوں کو اشارہ کیا تو وہ دشمن کی ذلیل جیتز کو خاموشی سے باہر لے گئے۔

”جھٹکس سب انپکٹر۔“ دشمن کے جانے کے بعد لوچن نے نااہل انداز میں سب انپکٹر کا شکریہ ادا کیا پھر سنجیدگی سے پوچھا۔ ”ایسیر، کیا تمہیں اس کہانی سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے کہ راون نے لٹکا ڈھانے کی کوشش کیوں کی تھی؟“

سب انپکٹر نے اس بار بھی بارود بھری نظروں سے لوچن کو دیکھا پھر پلٹ کر خاموشی سے لیے لیے قدم اٹھاتا وہاں لوٹ گیا۔



اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

ایس بی اورنگ زیب اپنی خواب گاہ سے ملحقہ اسٹری میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا جب موبائل پر مخصوص سنگل ملا اور اس نے اتنی جلدی میں اسے آن کیا کہ وہ اسی کا کال کا شہر تھا۔

”کیا اطلاع ہے؟“ اس نے مختصر سوال کیا۔

”ہمارا مطلوبہ شکار ابھی پانچ منٹ قبل ایک سیاہ دین میں لٹکا ہے۔“

”جنہیں کیسے تھیں سے کہ دن کے اندر وہی ہوگا؟“

”اندر کے آدمی نے اطلاع دی ہے۔“
”گڈو“ اورنگ زیب نے منجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ”اس وقت اس کا رخ کدھر ہے؟“

”میرا دوسرا ساتھی اس کے تعاقب میں ہے۔ پہلے دین کا رخ دینس ایڑیا کی طرف تھا لیکن اب وہ ہائی وے کی طرف جا رہا ہے۔“

”اگر تمہیں یقین ہے کہ دین میں وہی ہے تو اسے کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہیں لکنا چاہئے۔“ اورنگ زیب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑے جذباتی اعجاز میں ہدایت کی۔ ”ہوسکتا ہے کہ وہ اب بھی کسی تعاقب کے پتلی نظر دوبارہ راستہ تبدیل کرے۔ ممکن ہے کہ دوسری کار بھارے ساتھی کے تعاقب میں بھی ہو۔ اس سے کہو کہ غلط رہے۔ دس منٹ بعد مجھے دوبارہ کال کرنا۔“

اس ہدایت کے ساتھ ہی اورنگ زیب نے موبائل آف کر دیا پھر اس نے دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر پیر سے ایک موبائل نمائے اٹھا کر اس کے چمی میں کھولا، اندر تین بائیں دو کی اسکرین ہی نظر آ رہی تھی جس کے نیچے حروف کے بجائے کچھ ہندسے اور اشاروں کے نشان ~~ہندسے~~ تھے۔ ایک مخصوص سمت سے ہلکا دباؤ ڈالنے کے بعد اسکرین پوری طرح روشن ہو گئی۔ اسکرین پر صرف ایک سرخ رنگ کا نقطہ اس پارک کرتا نظر آ رہا تھا۔ اورنگ زیب نے اس ڈیوائس کے اوپر سرے سے ایک ایڑیل مانا باریک مادی پورا سمجھا تو اس پارک کرتا ہوا نقطہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ تبدیل کرنے لگا۔ اورنگ زیب کی ٹانگیں جھپکنے لگیں، وہ اس نقطہ پر نظر جمائے بیٹھا ہوا، نقطہ حرکت کرتا ہوا..... بائیں جانب ایک جگہ رک گیا تو اورنگ زیب نے ایک ہندسہ دبا کر اسکرین کا منظر تبدیل کیا، اب اسکرین پر سڑکوں کا ایک چال سا نظر آ رہا تھا جس پر گول دائروں میں مختلف نمبر موجود تھے۔ اگلی حالت میں وہ باتے ہی ایک ہندسے کا رنگ تبدیل ہو کر سرخ ہو گیا، اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب کے ہاتھ پر آڈیو ترسیلی سولوش ایمر نے لگنے لیکن اس کی آنکھیں بہ دستور چمک رہی تھیں، تیسرا نمبر آمانے میں اس نے بڑی سرعت کا مظاہرہ کیا، سڑکوں کے چال کی جگہ اگلے اوپر تہیب سے نمبر دیتے تھے، ان کے آگے باریک حروف میں اس نمبر کا مقام بھی درج تھا، وہ اسکرین کو رد کرتا رہا پھر..... ایک جگہ اس نے ہاتھ روک لیا۔ اس کا مطلوب نمبر اور اس کے آگے درج مقام کا نام دونوں سرخ تھے۔ ایک لمحے تک وہ پوری توجہ سے آنکھ دیکھتا رہا پھر اس نے ڈیوائس بند کر کے داہنی رکھ دی اور موبائل پر کرسی کے نمبر بیچ کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہونے میں یہ مشکل چندہ سینکڑے گئے ہوں گے۔

”میں غافل نہیں ہوں سر.....“ غامض پاس ورڈ کے بعد دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”اس وقت بھی میں نے اس بات کے قریب ہی ہوں۔“

”گڈو.....“ مجھے تم سے اسی اعجاز میں عمل کرنے کی امید تھی۔“ اورنگ زیب نے منجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ”غلط رہتا ہو سکتا ہے کہ آدم خود کار رخ بھی اسی طرف ہو۔“
”میں بھی ان ہی خطوط پر غور کر رہا تھا۔“

”میری ہدایت کو نظر انداز نہ کرنا۔“ اس بار اورنگ زیب نے سرسرا تے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”اس بات کی گہرمت کرنا کہ تمہارے ہاتھ سے نکتے خون ہوئے۔ میں سب کچھ سنیاں لوں گا لیکن شیشے میں کسی صورت پال نہ آئے۔ یہ میری ڈسے داری ہے۔“
”ایسا ہو گا جناب۔“

”گڈو لک۔“ اورنگ زیب نے کال منقطع کی پھر اٹھ کر دیوار کا پین پر چمکنے لگا۔ سات آٹھ منٹ بعد موبائل پر دوبارہ مکمل ملاوٹاں نے سمجھت کر اسے آن کرتے ہوئے پوچھا۔
”اب کیا خبر ہے؟“

”میرے آدمی کا تعاقب نہیں کیا گیا اور..... آپ کا اعجاز بھی درست تھا، وہ مختلف راستے بدلنے کے بعد اب اپنے ایک پرانے اور مخصوص نشانے پر گیا ہے۔“
”کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟“

”بہ مشکل دو منٹ ہوئے ہوں گے، میں آپ کو کال کرنے ہی والا تھا کہ آپ کی کال۔“
”میری بات پوری توجہ سے سنو۔“ اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر بے حد منجیدگی سے ہدایت کی۔ ”ہوسکتا ہے کہ وہاں ہنگامے کی کوئی صورت اچانک پیدا ہو جائے، اس صورت میں تم باہر سے حملہ کرنے والی پارٹی کو سپورٹ کرو گے، آپس میں الجھنے کی نوبت آ جائے تو تم میرے نام کا مخفف، اے۔ زیڈ استعمال کر کے بات بگڑنے سے سنیاں کٹے ہو، میں نے دوسری پارٹی کو بھی یہی ہدایت کر دی ہے۔“
”باہر سے کون حملہ کرے گا؟“

”وقت کم ہے۔ تم صرف ہدایت پر عمل کرو۔“ اورنگ زیب نے جلدی میں تاکید کی پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ لباس تبدیل کر کے بڑی جلدی میں باہر نکل رہا تھا جب موبائل پر پھر مکمل موصول ہوئے، روشن اسکرین پر بڑی آئی جی کے نمبر دیکھ کر چمکنے بغیر نہ روکا۔ ایک لمحے تک مخفف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے بہر حال موبائل آن کر کے بڑی سادگی سے کہا۔

”تحریر تو ہے سر..... اس وقت کیسے یاد کر لیا۔“
”آپ نے مقامی طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ڈی آئی جی نے کہا۔“ اس طرح درمیانی راستہ اختیار کر کے ہم زیادہ آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن بہت غلط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ آسانی سے تر لاء بھی نہیں ہے گا، ہمیں مشترکہ طور پر کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا ہو گا جس سے سانس بھی مر جائے اور لائی بھی نہ ڈوئے۔“

”ایسا کوئی طریقہ ہے کہ آپ کے ذہن میں؟“
”اس موضوع پر کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر بات ہوگی۔ فی الحال میں نے آپ کو شہنم کے بارے میں خون کیا ہے۔ شیخ عادل بر حریقہ پر اس کی بازیابی کی خاطر زور ڈال رہا ہے۔“

”میں اور سراج دونوں کوشش کر رہے ہیں سر.....“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ قسمت سے جلد ہی اس کا کوئی سراغ مل جائے، یہ بھی ممکن ہے ہم بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔“

”میں سمجھتا ہوں.....؟“

”ممکن ہے میرا اعزاز غلط ہو لیکن..... خوش قسمتی سے انگوٹھوں کے چمنوں کا کوئی اضافی جذبہ یا مقصد ہوگا تو پھر اسے یقیناً لٹکا دیا ہوگا۔“

”آئی سی۔“ ڈی آئی جی نے چمک کر جواب دیا۔ ”آپ کی بات سمجھ میں آ رہی ہے، بہر حال ہم ابھی کوئی آخری فیصلہ بھی اذیت نہیں کر سکتے۔“

”اس سلسلے میں افضل خان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں.....؟“

”افضل خان کی موجودگی میں شہنشاہ کا افواہ ہونا ابھی تک میرے مطلق کے نیچے نہیں اتر سکا۔“

اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”خوفا تو راجد اور اپنا اپنا ڈھنڈا چھوڑ کر ہوٹوں میں منتقل ہو گیا؟ پھر اسے بھی پھر پر طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہماری گردنوں کے باوجود دوبارہ منظر عام سے ہٹا دیا گیا۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں آپ نے بھی ضرور کوئی رائے قائم کی ہوگی۔“

”میں آپ کا اشارہ سمجھ رہا ہوں لیکن..... انگوٹھوں کو اس قسم کی حرکتوں سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟“

”اس کا جواب تو وی دے سکتا ہے۔“ اس بار اورنگ زیب نے خشک اعزاز میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ایک دو دن میں جزل بیننگ کال کر کے سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ مشترکہ کوشش کر کے ان تمام معمول کوئل کرنے کی کوشش کریں۔“

”نہایت مناسب خیال ہے سر.....“

دوسری جانب سے کال قطع کی گئی تو اورنگ زیب سنی خیر اعزاز میں شانے لپکاتا تیز تیز قدم اٹھاتا باہر آ اور اپنی داکس دیکھ میں بیٹھ کر کھٹکے سے باہر آ گیا۔ اس گاڑی کو وہ خاص خاص موقعوں پر استعمال کرنے کا عادی تھا۔



لیاقت حسین اور فرمین اور اسی کیلئے تیار تھے۔ باہر سردار سرفراز خان کی لینڈ کروزر تیار کھڑی تھی۔ سامان گاڑی میں رکھا جا چکا تھا۔ لیاقت حسین کی ماں نے اسے پیٹھہ کمرے میں بلا کر کہا۔

”توجہ دھر کام کر رہا ہے اور تیری کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں ہے؟“

لیاقت حسین کے چہرے پر تجسس کا ایک رنگ آ کر تیزی سے گزر گیا، ماں کی دلچسپی کی خاطر حیرت سے بولا۔ ”دشمنی کسی ماں؟“

”ماں سے جھوٹ بول رہا ہے۔“ ماں نے کھوکھو کیا۔ ”ہم تیرا ماں ہے لیاقت حسین اور ماں کا دل اپنا جگر کے ٹکڑے کیلئے بھی دیا دے گا جس دھڑکتا۔“

”تو پریشان نہ ہوا کر ماں، میں وہاں بالکل خیریت سے ہوں اور.....“

ماں نے اس کا جملہ کٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”اور تو یہ بھول گیا تیرا پاپا اپنے وقت کا بہت بڑا بزرگ تھا۔ وہ اب دنیا میں نہیں رہا لیکن اب بھی اس کا سایہ ہمارا سر پر رہتا ہے۔ کل رات میں نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ جانتا ہے وہ تیرے لیے کیا بولا تھا؟“

”خواب تو نے دیکھا ہے، ماں، میں بھلا اس کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ لیاقت حسین نے بہ دستور بڑے لاڈ سے جواب دیا۔

”وہ کہہ رہا تھا کہ اگر مرنے میں کوئی پلید کا حکم تیرا دشمن بن گیا ہے اس لیے کہ تو نے اس کے کسی گندے عمل کو اپنا چان پر کھیل کر غارت کر دیا تھا لیکن اوپر والے کی مرضی سے اس کے کسی نیک بندے نے تیری حفاظت کر دی تھی۔“

لیاقت حسین سنجیدہ ہو گیا۔ ماں جو کبھی مرضی ہی وہ غلط نہیں تھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی تو ماں نے اس کے بازوؤں کو قہراً کر پورے اعتماد سے کہا۔

”ایک بات کا بیٹھ یقین رکھنا ماں کا جگر..... جس پر اوپر والا مہربان ہو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں ایک مسلمان کا بچا ایمان ہے۔“

”پھر..... تو کس لیے پریشان ہے؟“ لیاقت حسین نے ماں کو تسلی دی۔ ”جو بھی اچھا ہوگا اسی اوپر والے کی مرضی سے ہوگا۔“

”ہاں..... لیکن تیرا..... پاپا کہہ رہا تھا کہ تیرے پلید دشمن نے تجھے زیر کرنے کیلئے زیادہ طاقت حاصل کر لیا ہے مگر وہ کامیاب نہیں ہوگا، خدا نے چاہا تو وہ حرام کا حکم خود اپنا جال میں الجھ کر مرے گا۔ اس کیلئے تیرا پاپا نے مجھے قرآنی عمل کا تعویذ تیار کرنے کو بولا تھا جو میں نے تیار کر لیا ہے۔“ ماں نے ایک موسم جامد کیا ہوا تعویذ نکال کر لیاقت حسین کو دیتے ہوئے مدغم آواز میں کہا۔

”اس تعویذ کے بارے میں کسی کو کچھ نہ خبر ہونے دینا، فرمین کو بھی نہیں۔ ہر وقت اسے اپنے پاس چھپا کر رکھنا۔ خدا نے چاہا تو تیرا دشمن خود اپنے پھندے میں پھنس کر جہنم رسید ہو جائے گا۔“

لیاقت حسین نے تعویذ سے احتیاط سے جیب میں محفوظ کیا، ماں سے لپٹ کر بڑے پیار اور اعتماد سے بولا۔ ”ماں، تیری دعا میں جب تک میرے ساتھ ہیں پورا دنیا ل کر بھی تیرے لیاقت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

ماں کے ساتھ وہ کمرے سے نکل کر آیا تو فرمین اور سردار سرفراز خان سامنے کھڑے تھے۔ لیاقت اور فرمین جانے کیلئے دروازے تک پہنچے تو سرفراز خان نے فرمین کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”ہمارا لیاقت کا بہت خیال رکھنا فرمین اور..... ہو سکے تو ہم کو معاف کر دینا۔“

”فرمین کو کتنا گناہ نہ ہو بابا..... ہمارا دل میں آپ کا جو عزت پہلے تھا وہ اب بھی ہے۔“ فرمین نے سرفراز خان کے سینے پر بڑی عقیدت سے سر رکھا کر کہا۔ ”آپ ہم دونوں کا بڑا ہے بابا..... غلطی تو

ہم بچوں سے ہو جاتا ہے اس لیے اگر ہم سے....."

"نہیں جان بگرا، آگے کچھ مت بولنا، ہم پہلے ہی بہت خرمندہ ہے۔" سرفراز خاں نے فرمین کے سر پر ہاتھ بھیر کر اسے جھٹکے پھولے کی دعا دی تو لیاقت حسین کی آنکھیں بھی ٹپٹاک ہو گئیں۔ باہر آ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئے تو سرفراز خاں نے لیاقت حسین کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے کہا۔ "تمہارا آنے کے بعد سے دو تین بار ہمارا اور سیٹھ عثمان کا قنصلی بات ہو چکا ہے، اس نے تمہارے لیے جو بیولا ہمیں اس پر فخر ہے۔ اتحاد عداری سے کام میں اوپر والا بھی برکت دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اب بھی اورتی کر گے گا۔"

"بابا..... آپ اور ماں ہمارے پاس کب آئیں گے؟" لیاقت حسین نے باپ سے پوچھا تو اس کی ماں نے کہا۔

"ادھر تمہارا باپ کا کچھ ضروری کام نہ ہوتا تو ہم جہاں ساتھ ہی چلتا لیکن خدا نے چاہا تو ہم بہت جلدی تمہارے پاس ہو گا۔"

لیاقت حسین اور فرمین ماں باپ کی دعا میں نے کروا پس شہر آ گئے۔ سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم نے ایک بار پھر دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد لیاقت حسین تیار ہو کر ڈیوٹی پر گیا تو سیٹھ عثمان نے اسے اندر بلا کر کہا۔

"لیاقت حسین، تم نے شاید اسٹور میں جا کر کئی الماری نہیں دیکھی جسے بیگم صاحبہ نے بڑے اہتمام میں تمہارے لیے خریدیا ہے، اس میں تمہارے لیے دو نئے لباس ہیں جن کو کبھی نہ کر تم کل سے دفتر میں بٹھا کر دو گے۔"

"فرمین کو میں آج کسی وقت اپنے ساتھ لے جا کر شاہک کراؤں گی۔" راحیلہ بیگم نے بڑی اچانکیت سے کہا۔ "اور ایک بات کا خیال رکھنا۔ تم دونوں پہلے بھی ہمارے لیے غیر نہیں تھے لیکن اب دوسری بات ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اب تم کسی تکلف سے کام نہ نہیں لو گے۔ مجھے اور عثمان کو اپنے گھر کے فرد بھی خیال کر دو گے۔"

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کی چھلکتی ہوئی آنکھیں اس کے دل میں تری جاتی کر رہی تھیں جب سیٹھ عثمان نے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اپنے برابر مومن پر بٹھا لیا۔ دوستوں کی طرح کہا۔

"کل رات تمہارے آنے کے بعد ہی میں نے سرفراز خاں سے طویل گفتگو کی تھی، اپنی جنگلی کا اہتمام بھی کیا تھا کہ تمہاری ماں کو لے کر تم لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آیا۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ پندرہ روز کے اندر ادھر ضرور آئے گا۔"

"ماں نے بھی جلدی آنے کا وعدہ کیا ہے۔" لیاقت حسین نے کسمار کر جواب دیا۔

"اگر وہ سیدھی طرح نہ آئی تو مجھے سراسر اجاب بھائی کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔" راحیلہ بیگم نے بے تکلفی سے کہا۔ اسی وقت فرمین نے داخل ہو کر سیٹھ عثمان کو سلام کیا، راحیلہ بیگم نے بڑے

خلوص سے اٹھ کر گلے لگا لیا۔

گفتگو کے درمیان ہلکے ہلکے ہاتھ کا اہتمام ہوا، اس دوران لیاقت حسین بھی سیٹھ عثمان کے ساتھ قہقراہٹ میں مل گیا۔ گفتگو کے بادل آہستہ آہستہ چھٹتے رہے۔

اگلی صبح فرمین ناشتہ بنا رہی تھی جب لیاقت حسین گھر سے گھر کا سفاری سوٹ پہن کر اس کے سامنے آ گیا۔ یہ لباس اس نے زندگی میں پہلی بار پہنا تھا، فرمین نے لیاقت حسین کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی، لیاقت حسین اس خوبصورت لباس میں دنیا کا حسین ترین فرد نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ بت بیتی کھڑی لیاقت حسین کو بڑی اپنائیت سے دیکھتی رہی پھر دوڑ کر بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

"یہ..... یہ کیا کر رہی ہو؟" لیاقت حسین نے بناوٹی خفگی کا اظہار کیا۔ "ہمارے لباس کا استری خراب ہو جائے گا۔"

"کیا کیا تو نے؟" فرمین نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر شوہر کو جھلا کر گھورا۔ "اب یہ فرگینوں کا لباس پہن کر تیری نظریں بھی بدل گئیں؟ کیا یہ لباس تجھے اپنی فرمین سے زیادہ پیارا ہے؟"

"ہے تو نہیں....." لیاقت حسین نے منہ بنا کر جواب دیا تو فرمین جیسے سے تھلا کر بولی۔ "کچھ کر رہا ہے؟..... ایک بار پھر میری قسم کھا کر بول۔"

"لباس میرے تن سے لگا ہوا اس لیے زیادہ اچھا لگ رہا ہے اور تو مجھ سے دور کھڑی بالکل اچھی نہیں لگ رہی۔" لیاقت حسین نے شوخی سے کہا۔ "میری بیاہل بولتا ہے۔ تیری مرضی، مان یا نہ مان۔"

"یہ بات ہے تو پھر جنم میں بھی تیرے لباس کی استری۔" فرمین نے لیاقت حسین کے دل کی بات سمجھی تو اس وقت خود بھی دلیوانی ہو گئی، لیاقت حسین اس کی چاہت تھی، اس کی پسند تھی، نئے لباس کی کشش نے اسے ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا پھر وہ ان لوگوں کو یادگار بنانے سے دریغ کس طرح کرتی۔

فرمین کی خود پوری کی جذباتی اعزاز نے لیاقت حسین کو بھی دلیوانہ کر دیا، طوفان کا زور کچھ دیر بعد چھوٹا تو دلوں ہی پلکان ہو چکے تھے۔

فرمین خود کو سنبھالتی تیزی سے اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی، لیاقت حسین آنکھیں بند کر کے خوابوں کی دنیا میں گم ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ لباس تبدیل کر کے ناشتے سے فارغ ہو کر جانے لگا تو فرمین نے اسے دروازے پر روک کر اس کی کلاںیں لیں، خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے بولی۔

"لیاقت..... مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنے لیے تیرا انتخاب کیا تھا۔ قدرت کو بھی ہمارا ملاپ منظور تھا، ہم دونوں آج جس جگہ کھڑے ہیں یہ بھی اسی اوپر والے کی مہربانی ہے..... آج تو پہلی بار صاحب ہمارا دین کر کسی میز پر بیٹھے جا رہا ہے تو ہاتھ باغھ کر تجھ سے ایک چیز مانگوں گی۔ تجھے قسم ہے..... نکار نہ کرنا۔" فرمین کی آواز کچھکپا رہی تھی۔

”کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے تیری کسی بات سے انکار کیا ہو؟“ لیاقت نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

”پہلے کی بات اور تھی فرمین کی جان لیکن..... اب وقت کے ساتھ ہمارے حالات بھی بدل رہے ہیں اس لیے میرا دل ڈرتا ہے کہ کہیں کرسی میز پر بیٹھنے کے بعد تیری آنکھیں بھی.....“

”چپ ہو جا..... جان لیاقت۔“ لیاقت حسین نے اس کے گمراہ ہونے پر ہاتھ کر کر بڑے احتیاط سے کہا۔ ”دنیا بدل سکتی ہے فرمین لیکن..... لیکن تیرا لیاقت تیرے لیے وہی رہے گا جس کا ہاتھ تمام کرتو نے ایک نئے سڑکا کاغذ کیا تھا۔ ہم دونوں کا یہ مشترکہ سطر زندگی کی آخری سانسوں تک اسی طرح جاری رہے گا..... ان شاء اللہ۔“

جواب میں فرمین کی آنکھوں میں پھر زندگی کے دھبک رنگ آپس میں گملاہ ہونے لگے۔



شیخ کو اس زیر زمین کمرے میں دو روز ڈگر مگر تھے۔ اس عرصے میں اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ گمرانی کرنے والے بدستور کو گتے بھرے پتے ہوئے تھے، صرف ایک بار شیخ حامد کے ایک خاص آدمی نے اس سے یکم دویر کیلئے ملاقات کی تھی۔ اس نے شیخ سے بہت کچھ اگوائے کی کوشش کی تھی لیکن شیخ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ہر بار ایک ہی جواب دیا تھا۔ ”وہ جب باس کے علاوہ پہلے کسی کو جواب دہ نہیں تھی۔ اب بھی صرف اسی کے سامنے زبان کھولے گی۔“

ان دونوں میں وہ مستعد پار اورنگ زیب کے بارے میں غور کرتی رہی جس کی پناہ میں وہ خود کسب سے زیادہ محفوظ سمجھتی تھی، اس کا ریتا ڈاکا ایک اس قدر بڑا چار حادہ ہو چکا تھا کہ اس نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس بات کا علم اس کے فرشتوں کو بھی نہیں تھا کہ افضل خان پر اس کے اپنے اغوا ہونے کے بعد کیا گزری تھی؟ اسے کہاں رکھا گیا تھا؟ اس اغوا سے اس کا کوئی تعلق تھا ہی یا نہیں اور اگر وہ ایجنسی والوں کی گمرانی میں تھا تو پھر فرار کی طرح ہو گیا؟ اس کے فرار میں اس کا ہاتھ تھا؟ کیا جب باس نے اسے اپنے آرمیوں کے ذریعے اغوا کیا تھا یا پھر خود افضل خان نے قید و بند سے آزاد ہو کر کہیں دور چلے جانے کی ٹھان لی تھی؟ حقیقت کیا تھی؟ فحشی علم نہیں تھا مگر اس نے اپنی اورنگ زیب افضل خان کے فرار میں اسی کو مورد الزام ٹھہرا دیا تھا۔ آخر کیوں؟ اس کا جواز کیا تھا؟ اسے اچانک کس جرم کی پاداش میں دوبارہ موت کے حوالے کر دیا گیا تھا؟

خاصی ذہنی جتنا شک کرنے کے بعد اس کے ذہن میں اس سوال کا خیال ابھرا جو اسے خود اورنگ زیب نے دیا تھا، وہ اس سے اعتراف بھی کر چکی تھی کہ ایک بار اس نے سوال پر افضل خان سے رابطہ کیا تھا۔ اس اعتراف کے بعد اسے دوبارہ افضل خان سے رابطہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ وہ خود بھی خط و موٹی بھی لیکن اب..... اب شاید وہی سوال اس کے لیے ایک عذاب بن گیا تھا۔ افضل خان کے غائب ہو جانے کے بعد اسی سوال کی وجہ سے وہ شک اور شبہات کے بیجوں میں پھنس کر رہ گئی تھی، ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے سوچا ہو کہ وہ اس کی پناہ میں ہونے کے باوجود

اسے ذہل کر اس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ افضل خان بہر حال ایک اہم شخصیت کا مالک تھا، اس کا فرار ہو جانا یا اس کے مقابلے کے بعد غائب ہو جانا بھید از قیاس بھی نہیں تھا۔ جب باس کے کہنے پر اس نے دستبرداشتی کاغذی پر جس مہارت اور دلیری کے ساتھ ہاتھ دلا تھا اور جو ثبوت حاصل کر لیے تھے وہ کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں تھی، خود جب باس نے بھی اس سے نظریں پھیر لینے کے باوجود اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا تھا۔

شیخ نے ہر زاویے سے مختلف امکانات پر غور کیا لیکن اس کی کچھ بھی اورنگ زیب کا اچانک اس سے نظریں پھیر لینے کا سبب ایک معما بن رہا۔

افضل خان کے زوال کے بعد کس کا مقابل کیا تھا، یہ بات سراپ اورنگ زیب کے علم میں بھی تھی۔ نہ ہوتی تو اورنگ زیب، شیخ اور افضل خان کے اندر اتنی دلچسپی بھی نہ لیتا، اس نے افضل خان کے ذریعے جب باس کو ڈر کرنے کا کوئی نہ کوئی منصوبہ ضرور بنایا ہو گا جو افضل خان کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہوا ہو گیا۔ اسی صورت میں خود شیخ بھی اگر اورنگ زیب کی جگہ ہوتی تو وہ بھی انہی خطوط پر ضرور غور کرتی جس پر اورنگ زیب نے غور کرنے کے بعد اسے دوبارہ اسی جہنم میں جھونکنے کا پروگرام بنایا تھا جس سے وہ بری شکل سے نجات پا چکی تھی۔

اس وقت بھی کھانے سے خارج ہونے کے بعد ستر پر لیٹ کر حالات کی صحیح سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی جب کمرے کے واحد دروازے کے کھلنے کی آواز اس کے کانوں میں آئی، اس نے نگاہوں کا زوایہ بدل کر آنے والے کو دیکھا تو سمجھ کر کہی۔ شیخ حامد کو اس وقت سامنے دیکھ کر اسے اپنی سانس سینے میں کھینچ کر پھنس ہو رہی تھی۔ وہ دروازے کے قریب ہی کسی آتش نشانی کی طرح سر اٹھائے کھڑا اسے خوفناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

شیخ ایک لمبے لمبے لوگ تھے، مگر شیخ نے خود کو سنسنیاتی اطمینان کھڑی ہوئی۔ شیخ حامد کی تیز نظریں اسے اپنے جسم کا بکھرے کئی خصوصیات ہو رہی تھیں۔ خود شیخ کا دل بھی دھڑک رہا تھا جب شیخ حامد نے اسے قریب آ کر مخاطب کیا۔

”اب کیسی ہو.....؟“ اس کے لہجے میں بڑی گہرائی تھی۔

”آپ کی پناہ میں آنے کے بعد دوبارہ زندگی کا احساس ہو رہا ہے۔“ شیخ نے حالات کے پیش نظر تبدیل کر جواب دیا۔

”جو تمہیں لے گئے تھے، وہ کون لوگ تھے؟“ ساٹ اور خشک لہجے میں سوال کیا گیا۔

”ان کی تعداد اور تھی..... دونوں ہی پر ویشٹل ٹائپ کے بدعاش لگ رہے تھے میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو وہ غالباً جگا کے آدمی تھے۔“

”اس انداز سے کا کوئی سبب بھی ہو گا؟“

”ان کا مقصد خاص طور پر مجھے اغوا کرنا تھا۔ انہوں نے افضل خان سے دور رہنے کو کہا تھا، شاید افضل خان کے مقابلے میں، میں ان کیلئے زیادہ اہم تھی۔“

”افضل خان کا کیا رد عمل تھا؟“

”اس نے اچانک ہی بازی ہٹنے کی خاطر ان دونوں پر حملہ کر دیا تھا لیکن صرف ایک نے مارشل آرٹ کا مظاہرہ کر کے افضل خان کے سارے کسمل نکال دیے۔ دوسرے نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔“

”وہ افضل کو دوبارہ وارننگ دے کر مجھے ساتھ لے گئے تھے۔ افضل خان نے دوبارہ درمیان میں آنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید وہ وقتی طور پر ان دونوں سے خائف ہو گیا تھا۔“ شبنم نے بیان جاری رکھا۔ ”وہ دونوں مجھے لے کر بڑے اطمینان سے لفٹ کے ذریعے نیچے آئے پھر مجھے ایک دین میں ڈال کر اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ میری آنکھ پر پٹی باندھ دی گئی تھی مگر میرے خیال میں وہ مجھے جہاں لے گئے وہ جگہ اپارٹمنٹ سے آدھے گھنٹے کے فاصلے پر نہیں تھی۔ دین کی رفتار اور وقت کے لحاظ سے وہ جگہ ایک مختل اعزاز کے مطابق ہمارے اپارٹمنٹ سے تقریباً بارہ پندرہ میل کے فاصلے پر نہیں رہی ہوگی۔ انہوں نے میری آنکھوں کی پٹی کٹی ایئر رگروائڈ کرے میں لے جانے کے بعد ہی کوئی تھی۔“

”تمہارے انخوا کا کوئی مقصد میری ضرور رہا ہوگا؟“ فیح حامد نے بدستور خشک لہجے میں سوال کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھا شبنم کو نگلیں باندھے غور رہا تھا، اس کی خوفناک آنکھوں میں تجسس تھا۔ ”دور دراز تک انہوں نے مجھ سے کوئی اہم بات نہیں کی لیکن تیسرے دن ایک نقاب پوش نے سامنے آکر مجھ سے صرف آپ کے بارے میں سوالات کیے تھے وہ غالباً میری حیثیت سے خاصی حد تک واقف تھا، لیکن میں صرف ایک بیان پر قائم رہی کہ میں آپ کو صرف آفس کے بک باس کی حیثیت سے جانتی ہوں اور اپنے کام سے کام نہ کرتی تھی۔“

”کیا اس نے تمہارے بیان پر یقین کر لیا تھا؟“

”یقین.....“ شبنم نے کہا۔ ”میرا جواب سن کر سسکا یا تھا پھر اس نے صرف ایک ہی بات کہی تھی کہ اگر میں نے ایک ہفتے کے اندر اندر زبان نہ کھولی تو میرا انجام خطرناک ہی ہوگا۔“

”تمہارے ذہن میں انخوا کرنے والوں کے سلسلے میں خاص طور پر چگا ہی کا نام کیوں آیا؟“

”میں نے ایک امکانی بات کہی تھی ورنہ انخوا کرنے والوں کے سلسلے میں انجینی کے لوگوں پر بھی شبہ کیا جاسکتا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ انجینی کے نام پر فیح حامد چلا۔

”ان کا طرز عمل جاننا نہ ہونے کے باوجود مذہب تھا جبکہ بد فضائل قسم کے افراد ہملت دیے کے بجائے نیڑی سے بھی اپنا مطلب حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔“

فیح حامد نے اس بار انخوا ہی کوئی سوال نہیں کیا۔ انجینی کے حوالے پر اس کی پیشانی بھی کسی خاص وجہ سے شکن آلود ہو گئی تھی، چوکہ وہ بد شبنم کو گھبراہٹا ہوا ہر قدر سے نرم لہجے میں بولا۔

”تم نے میرے آدھوں سے یہ ذہن کیوں کی تھی کہ میرے سوا کسی اور کے سامنے زبان نہیں

کھولتی؟“

”یہ پابندی آپ ہی نے لگائی تھی باس اس لیے میں اس خلاف ورزی کس طرح کر سکتی تھی۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری باتوں کو آرام سے ہم کر لوں گا؟“

”نہیں..... شبنم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں اس وقت اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ اپنی صفائی چیش کر سکوں لیکن آپ کے ایک اشارے پر اب بھی زندگی داؤ پر لگا سکتی ہوں۔ فی الحال میرا کل کر سامنے آنا مناسب نہیں بھی ہوگا۔“

”جو تمہیں لے گئے تھے انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟.....“ فیح حامد نے شبنم کے تشویش و فراز پر ایک گہری نظر ڈال کر سوال کیا تو شبنم اس کا مفہوم سمجھ گئی۔ ہونٹ چپاتے ہوئے کچھ تامل سے بولی۔

”نگہبانی کرنے والے محلے کے ایک فرد نے میرے ساتھ کبھی دست درازی ضروری تھی، لیکن وہ ایک حد سے آگے نہیں بڑھا۔ اسی بنیاد پر میں نے انجینی والوں پر شبہ کیا تھا، بد فضائل بد معاش ہوتے تو.....“

”یہ تمہارا بیان ہے سویت..... میں کیسے اعتبار کر لوں؟“ فیح حامد کی لگاؤ میں خوشیاں چھلنے لگیں۔

”باس.....“ شبنم نے بڑی بے بسی سے جواب دیا۔ ”اگر انہوں نے حد سے تجاوز کیا ہوتا تو

شاید میں اس وقت زندہ نہ نظر آتی۔“

”ایک اہم بات تم نے ابھی تک نہیں بتائی جان من“ فیح حامد کے جھرمچا رہے۔ ”جن لوگوں نے تمہیں جان پر کیل کر انخوا کیا تھا۔ انہوں نے اتنی آسانی سے تمہیں کیوں چھوڑ دیا؟“

”اس میں بھی ایک گہری چال ہے۔“ شبنم نے اورنگ زیب کے آخری جملوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے زبان نہ کھولنے پر نقاب پوش نے تیسری ملاقات پر میرے لیے موت کی بجلی سزا تجویز کی تھی کہ وہ مجھے آپ کے حوالے کر دے۔“

”میں سمجھ نہیں.....“

”افضل خان کی مثال سامنے ہے باس۔“ شبنم نے تسخیل کر جواب دیا۔ ”انخوا کرنے والوں کو یقین ہوگا کہ آپ میری باتوں پر یقین نہیں کریں گے پھر..... شاید افضل خان کی طرح مجھے بھی کوئی سخت سزا دینے کے بعد حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور..... اس وقت میں حالات سے مجبور ہو کر ان کے سامنے ہتھیار ڈال دوں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟..... کیا میں نے اگر تمہیں سزا دی تو وہ موت سے کم ہوگی.....؟“

”موجودہ حالات میں، میں بھی موت ہی کو ترجیح دوں گی۔“ شبنم نے بڑے اعتماد سے اپنا فیصلہ سنایا۔ ”وہ مجھے جو زندگی دیں گے وہ شاید کسی بھاری عورت سے بھی زیادہ گھناؤنی ہوگی۔“

فیح حامد نے اس کے جواب کو غور سے سنا، اس کے ہونٹوں پر بڑی کردہ مسکراہٹ ابھری

کچھ دیر وہ ساٹ نظروں سے شبنم کو گھورتا رہا پھر سسکا کر بولا۔

”میرے قریب آؤ۔“

شبنم قدم بڑھائی اس کے قریب چلی گئی اس کے دل کی دھکنیں بڑھنے لگیں۔

”اپنی بے گناہی کا یقین دلانا ہے تو میرے سامنے پوری طرح کھل جاؤ۔ میں ذہنی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔“

”ہاں۔۔۔“

”تم بھول رہی ہو خوبصورت تھی کہ تمہاری جو تصاویر میرے پاس محفوظ ہیں ان میں بھی تم بے لباس ہی تھیں۔“

”وہ۔۔۔ وہ تصاویر اس وقت کی ہیں جب میں ہوش میں نہیں تھی۔“ شبنم نے ہچکچا کر جواز پیش کیا۔

”اب ہوش و حواس میں میرے حکم پر عمل کرو۔“ فتح حامد کا لہجہ بازاری ہو گیا۔ ”میرے پاس وہ پتلا نہ ہے جو اس بات کو جانچ لے گا کہ جو پردوشل بدعاش تمہیں اٹھانے لگے تھے انہوں نے تمہیں کورا چھوڑا ہے کہ نہیں۔“

”جب۔۔۔ ہاں! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ۔۔۔“

”ایک حد سے آگے نہ بڑھوں گا۔“ فتح حامد نے یقین سے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ ”میں اب بھی اپنے وعدے کا بھرم رکھوں گا بشرطیکہ تمہیں کسی اور نے استعمال نہ کیا ہو۔“

”اب۔۔۔ ہاں میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ مجھ پر دم کریں۔“ شبنم نے اس کے بازوؤں کے حصار میں پھٹنے ہوئے درخواست کی۔ ”اس سے بہتر ہے کہ آپ مجھے گولی مار دیں۔“

”ابھی میں نے تمہارے بارے میں کوئی آخری فیصلہ نہیں کیا باقی اتنی۔“ فتح حامد نے اسے پوری طرح دو بوج کر کے آدم خور کی طرح مخاطب کیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تمہاری بے گناہی ثابت ہونے کے بعد میں پھر تمہیں اپنے قدموں میں بیٹھنے کی جگہ دے دوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بے گناہی نہ ثابت ہونے پر تمہیں اپنے ان جاں نثاروں کے سپرد کر دوں جو برسوں سے کسی عورت کے قرب کو ترس رہے ہیں۔ تم یقیناً ان کیلئے ایسا زود اثر ٹاکہ ثابت ہو گی جو ان کی کارکردگی کو میرے لیے بڑھانے میں بڑا معاون ثابت ہو گا۔“

”ہاں۔۔۔“ اچانک شبنم نے بڑی بے بسی سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”میں آپ کے حکم پر سر جھکانے پر آمادہ ہوں لیکن ایک شرط۔۔۔ آپ مجھے پوری طرح پرکھنے کے بعد۔۔۔ سبکی مار کر ہمیشہ کیلئے ختم کر دیں گے۔ میں بے خبری کی زندگی پر موت کو زیادہ ترجیح دوں گی۔“

”اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ پہلے تم خود کو ہتے سسکا کر بے لباس کر کے میرے حوالے کر دو۔“

”ہاں۔۔۔“ اچانک شبنم نے بڑی بے بسی سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”میں آپ کے حکم پر سر جھکانے پر آمادہ ہوں لیکن ایک شرط۔۔۔ آپ مجھے پوری طرح پرکھنے کے بعد۔۔۔ سبکی مار کر ہمیشہ کیلئے ختم کر دیں گے۔ میں بے خبری کی زندگی پر موت کو زیادہ ترجیح دوں گی۔“

”اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ پہلے تم خود کو ہتے سسکا کر بے لباس کر کے میرے حوالے کر دو۔“

شبنم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتی تھی کہ آنکھوں کی بات پر عمل نہ کرنے کی صورت میں

وہ اس کے ہاتھ بدعاشوں کے ہاتھوں میں ایک کھلوتا بین کر رہ جائے گی۔ اس نے ایک آخری بار جب اس کو رحم طلب نظروں سے دیکھا پھر ہاتھ پشت پر کر کے ایک جھٹکے سے اپنی آنکھوں کی زپ کھول دی، نظریں فرش پر جمائے وہ آہستہ آہستہ خود کو بے لباس کر رہی تھی جب اچانک کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ فتح حامد نے قہر آلود نظروں سے اس ملازم کو دیکھا جو پھرے پر تھا، اب بولکھایا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”قم۔۔۔“ اس نے جب سے اپنا آٹھونیک ریوالور نکال کر پھرے دار پر تان لیا۔

”ہاں۔۔۔ باہر گولیاں تر تار رہی ہیں۔“ پھرے دار نے کا پتے ہوئے کہا۔ ”سردار اور دوسرے لوگ ان کا جواب دے رہے ہیں، آپ دوسرے راستے سے نکل جائیں۔ ہم حملہ آوروں کو اینٹ کا جواب پتھری سے دیں گے۔“

پھرے دار تیزی سے باہر نکل گیا، گولیوں کی آواز فتح حامد نے بھی سن لی تھی، اس نے شبنم کو لباس سیت کر پیچھے آنے کا حکم دیا پھر لمبے قدم اٹھاتا باہر کی جانب لپکا۔

✽✽✽

”اس وقت تم میرے پاس کس لیے آئے ہو۔۔۔؟“

”شٹ اپ۔۔۔“ اسلم ڈکٹا نے پھر کہا۔ ”تم کوئی سوال نہ کرو، صرف میرا حکم سنو۔“
 افضل خان کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا، اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد ہی اس نے خوشی کی ٹھانی لی تھی، اگر ٹھیک درمیان میں نہ آ جاتی تو شاید اس وقت اسے اسلم ڈکٹا جیسے بد معاشوں کے سامنے خون کا گھونٹ بی کر صبر نہ کرنا پڑتا۔ اس نے مسئلہ کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی نظریں اب بھی بڑی محارت سے اسلم ڈکٹا کے تپا پندہ بدو میں چھری تھیں۔
 ”نظریں نیچی رکھو افضل خان۔“ اسلم ڈکٹا پھر کہہ لایا۔ ”بارد کو چنگاری لگ گئی تو یہاں پہرا دینے والوں کو تمہارے جسم کے پچھتوے بھی نہیں ملیں گے۔“

”یہی جملہ میں بھی کہہ سکتا تھا لیکن تم۔۔۔“ افضل خان کی رگوں میں گرم خون بھی چلنے لگا۔ ”تم شاید انتہائی اسلحہ کے بل پر اتر رہے ہو۔ ایک بات اور سن اسلم۔ کسی خطرناک انجام کی فکر مجھے پہلے بھی نہیں تھی، میں سر سے ٹخن باندھ کر زندگی گزارنے کا عادی تھا، اب اس کے احساؤں نے مجھے غریب لیا تو میں نے اپنی جون بھی بدل لی۔ اب بھی میں اسے اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔ اس کے اشارے پر جان بھی دینے سے دریغ نہیں کروں گا لیکن تم۔۔۔ تم آج سچہ اپنی مدد سے تباہ کرنے کی قسطیں بھی نہ کرنا۔“
 اسلم ڈکٹا نے ایک دم پھر کر حملہ کرنے کے انداز میں پیشتر بادل لیکر دوسرے ہی لمحے موبائل کی آواز سن کر اس کے اعصاب کا کھچاؤ کم ہونے لگا، افضل خان پر نظر جمائے جمائے اس نے موبائل جیب سے نکال کر آن کر لیا۔

”میں ہاں۔۔۔ میں اس وقت افضل خان کے قریب ہی ہوں۔“

”اس نے کیا جواب دیا۔۔۔؟“ دوسری جانب سے فصیح حامد کی کشت آواز ابھری۔
 ”مجھے خندہ سے بھرا ہونے پر اس کے ایک دو اسکرین لٹو ہو گئے تھے، انہیں نائٹ کر رہا ہوں، آپ کا حکم اس کے کڑے بھی نہیں ٹال۔۔۔“

”افضل خان سے بات کرنا۔۔۔“ دوسری جانب سے بہ دستور سخت لہجے میں حکم ملا تو اسلم ڈکٹا نے ہونٹ چاٹتے ہوئے موبائل افضل خان کی طرف بڑھا دیا۔

”میں افضل خان بول۔۔۔“

”اسلم بتا رہا تھا کہ خود کو کسی گیسٹ ہاؤس میں دی آئی پی مہمان سمجھ رہے ہو؟“ فصیح حامد نے انتہائی سفاک انداز میں سوال کیا۔

”یہ جھوٹ بول رہا تھا ہاں۔۔۔“ افضل خان نے زندگی کی پروا کیے بغیر مدغم لہجے میں فصیح حامد کا مظاہرہ کیا پھر ایک ہی سانس میں پوری تفصیل دہرا تا چلا گیا۔

”فصیح کیا ہے میں یہ بھی معلوم کر لوں گا۔۔۔“ خلاف توقع کسی غصے کے اظہار کے بجائے سرد لہجے میں جواب ملا۔ ”تم نے شہین سے کہا تھا کہ میرے احساؤں کے عوض تم اپنی تھکری زعمی کا نذرانہ بھی دے سکتے ہو۔“

افضل خان سوئے سوئے ایک دم ہی بڑا کر جا گا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس کی گردن پر کسی نے سوئی چھجودی ہو لیکن کمرے میں اس وقت کوئی دوسرا نہیں تھا، اس نے اپنی دلی گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دو بج رہے تھے، کمرے میں مدغم یاد کا نائٹ بلب روشن تھا، بستر پر لیٹے لیٹے اس نے پھر دایں بائیں دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا، اس کا سیدھا ہاتھ ایک بار پھر گردن پر ہونے والی جھکن پر گیا پھر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا، خون کا وہ قطرہ جو اسے انگلی پر نظر آیا وہ اس کا وہم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تیزی سے بستر سے اتر آ تو اس کی نظریں اسلم ڈکٹا پر جم کر رہ گئیں جو بینگ کے نیچے سے مسکراتا ہوا باہر آ رہا تھا۔

”وو۔۔۔“ افضل خان نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ رات کو دو بجے اس کی آمد افضل خان کیلئے خلاف توقع ہی تھی، پھر جس انداز میں اسے سوئی چھو کر بیدار کیا گیا تھا اس نے بھی افضل خان کی کھوپڑی گرم کر دی۔ اس وقت یہ احساس بھی چھوٹی ڈبک کے مانند اس کے وجود کو کوس رہا تھا کہ جو اسلم ڈکٹا کبھی اس کے حکم پر پائلٹوں کی طرح دم ہلانے کا عادی تھا۔ اس وقت اس کے سامنے سیدتا نہ کھڑا بڑے بھونڈے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”اس طرح دیے بھانڈے کیا دیکھ رہے ہو افضل خان؟“ اس نے کینٹینی بدل کر کہا۔ ”میں کئی بار تمہیں آواز دیں دے چکا تھا، مگر مردوں کی طرح دنیا سے بے خبر سو رہے تھے، میں نے سوئی چھوٹی تو احساس ہوا کہ تم ابھی تک جیہ حیات ہو۔“

”تمہارا یہ اعزاز میرے لیے غنا اور حیرت انگیز بھی ہے۔“ افضل خان نے بہ دستور بگڑے ہوئے تہور سے دریافت کیا۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں مجھے اذیت دینے کا حکم ملا ہے؟“

”حکم۔۔۔“ اسلم ڈکٹا نے محارت سے فرش پر قہقہے ہونے بڑے گھٹیا لہجے میں اپنی بڑائی کی نمائش کی۔ ”تم جس زمانے کی بات کر رہے ہو وہ گزر چکا۔ اب ہر طرف میرا ڈکٹا بچتا ہے اور میرے ماتحت حکم پر بلا چلے، وچرا مل کر تھے، تم بھی اب انہیں ماتحتوں میں خود کو شمار کرو۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ تم پہلے ہی سستی قسم کی ٹاڈی اور بینگ پینے کے عادی تھے شاید اب بھی تمہارے دماغ پر اسی کا اثر۔۔۔“

”کبوا نہیں افضل خان۔۔۔“ اسلم ڈکٹا کی آنکھیں خون اٹھنے لگیں۔ ”تمہاری اوقات اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ دوبارہ تم مجھ سے اونچے مردوں میں بات کرنے کی حقارت نہ کرنا ورنہ۔۔۔“

"میں ہاں..... میں اب بھی یہی کہوں گا۔" افضل خان نے غصے سے کہی۔ اس کی نظریں اسلم ڈکا پر مرکوز تھیں جو کسی زخمی دروے کے مانند رعب یہی کھڑا اس کے اٹھ جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"اور کچھ؟"

"امداد علی کا نام بھی سنا ہے؟"

"میں ہاں..... کسی زمانے میں پولیس کا ایڈکائٹیشنل تھا پھر اس نے اچھا خاصا مال پانی کمانے کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اپنا کاروبار پھیلا رہا تھا۔"

"اور کچھ؟"

"اور..... افضل خان نے چونک کر جواب دیا۔ "امداد علی نے جیل سے رہائی پانے کے بعد چھ گھنٹہ نامی ایک قیدی کی مدد کی تھی جو بعد میں جگہ بن گیا تھا۔ یہ ظاہر وہ دونوں الگ الگ ہیں لیکن اندر سے ان کی جڑیں ملی ہوئی ہیں۔"

"گند..... مجھے خوشی ہے کہ تمہاری یادداشت ابھی زندہ آؤ گئیں ہوئی۔"

"میرے لیے کیا قسم ہے؟"

"مجھے چنگ کی تلاش ہے لیکن وہ مادر پہ خطا کسی چرے کے تل میں چھپا ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ....."

"میں آپ کا اشارہ سمجھ گیا ہاں....." افضل خان نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کا احسان منداور پروردہ ہوں۔ آپ کا خیال موافقہ درست ہے، امداد علی کو چرے دان میں بند کرنے کے بعد چنگ کے سلسلے میں اس کی زبان کھولائی جا سکتی ہے۔"

"ہاں، میں یہی چاہتا ہوں لیکن یہ کام انجام دینے کے باوجود تمہاری موجودہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" جواب میں دو فوک فیصلہ کی سادیا گیا۔

"میں جانتا ہوں ہاں....."

"اسلم ڈکا کو میں نے تمہارے پاس ہی عرض سے بھیجا تھا۔"

"ہاں....." افضل خان نے دل کڑا کر کے سوتے سے فائدہ اٹھا تو ہوئے کہا۔ "ایک گزارش میں بھی کروں گا۔"

"کو کیوں..... ضروری نہیں کہ تمہاری درخواست منظور بھی ہو جائے۔"

"میں عزت کی ذمہ داری اور عزت کی موت کی درخواست کروں گا۔"

"مجھے کیا..... غالباً اسلم بھی آپ آہستہ آہستہ پہل پڑے کالے کی حماقت کرنے لگا ہے۔"

"میرا امتحان درکار ہو تو میں خود ہی اپنا لونا اپنی پرکھ کر لے لی دانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں۔"

"امداد علی کی زبان اگر کھل کر تو تم کو کوئی موقع اور بھی دیا جا سکتا ہے۔" مرد بچے میں جواب

ملتا اس کے ساتھ ہی سلسلہ بھی منتقل کر دیا گیا۔ افضل خان نے موبائل آف کر کے دوبارہ اسلم ڈکا

کی طرف اچھال دیا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت کسی آدم خور پیسے جیسی چمک نظر آرہی تھی۔

"کیا تم دیا ہاں نے.....؟" اسلم نے موبائل جیب میں رکھے ہوئے یہ دستور برتری کا اعزاز اختیار کیا۔

"سوری، میں ہاں کی کہی ہوئی بات تمہیں بتانے کا پابند نہیں ہوں۔"

"مواہن میں اڑنے کی حماقت مت کرنا..... امداد علی والا کام تمہیں زیادہ سے زیادہ چھینیں گئیں۔"

"تم نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا؟"

"مجھے فوری طور پر ایک کام کا ضروری سامان اور اشارہ دے دو پانچ کا ایک آؤ چیک درکار ہو گا۔"

"کیا کسی چرے یا چھپکلی کو ڈکا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں جاننے کے بعد میری مطلوبہ چیزیں فراہم کر دو ورنہ پھر تم ہاں کو جواب دہ ہو گے۔"

"تم کو یہاں سے بھاگنے کی اجازت نہیں ہوگی۔" اسلم ڈکا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "میں یا میرے ہمراہی کے کوئی آدمی تمہارے ساتھ ہو گا۔"

"نہیں....." افضل خان نے دو فوک جواب دیا۔ "میں انہی کو بندش یا شرط قبول نہیں کروں گا۔ تم چاہو تو کم از کم سو گز دور رہ کر میری گھرائی کر سکتے ہو۔"

"بکواس نہیں....." اسلم ڈکا ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ "اپنی اوقات سے اٹھ اڑنے کا خیال اب دل سے نکال دو۔"

"ہاں سے دوبارہ کال کر میری شرط بتا دو۔" یہی تمہارے حق میں مناسب رہے گا۔"

افضل خان کا جواب سن کر اسلم ڈکا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا پھر اس نے جیب سے

موبائل نکال کر بگ ہاں کے نمبر ملائے۔ افضل خان کی شرانگہ کو اس نے تو زور دے کر اپنی زبان میں

بیان کیا، کچھ خدشات کا اظہار بھی کیا لیکن اس کے جواب میں دوسری جانب سے جو کہا گیا اسے سن کر

اس نے موبائل بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اس کی پیشانی پر ابھرنے والی ٹھنوں کا چال بتدریج گہرا

ہوتا رہا، اس کی شکل پر نظریں کچھ دیر افضل خان پر جمی رہیں پھر وہ کچھ کچھ بغیر خاموشی سے پٹا اور

لے لیے قدم اٹھاتا کرے سے باہر نکل گیا۔

افضل خان نے سکون کا گہرا احساس لیا پھر دوبارہ بسز پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

مردم چراغ کی کینکائی تو آپس میں مگلدہ ہوتے سناپوں کو اور زیادہ پراسرار بنا رہی تھی۔ تیز

سانسوں کی سی ٹپلی آواز آپس پر تپ بھونٹ اور سی بجان سلونی کے بھرکتے جذبات کی تر تھانی کر رہی

تھیں۔ جب درد دانے پر کسی نے دوبارہ آہستہ آہستہ ہاتھ مار کر ان کے رنگ میں ہنگ گھٹ دیا۔

سلونی نے اوڑھن صحت کا پتہ پڑا پھر وہ صاف کیا، پر تپ سے تل کھا کر اگلی آواز میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

”میں دھو ہوں مہاراج۔“ باہر سے دھو کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔“ جلدی دروازہ کھولو درندہ غضب ہو جائے گا۔“

”اس سے تیرے اوپر کیا پڑا آن پڑی ہے؟“

”بڑے بھاری کون کن لٹی ہے، وہ کسی سے میں ادھر آ سکتا ہے۔“

بڑے بھاری کا نام کر پرتاب کے کس بل بھی ڈھیلے پڑ گئے، سلونی کرتی پرتی اور مٹی سے باہر نکل اور اپنا لباس بھینچ پک بھینچے میں باہر نکل گئی، چاٹکار ہاتھ سے پوری طرح دھو ہونے سے پہلے ہی قح کلکل گیا تو پرتاب بھی بل کھانے لگا۔ وہ جھینگی نظروں سے دھوکو گھور رہا تھا جو سلونی کے نکل جانے کے بعد اندر آ گئی۔

”میرا کوئی دوش نہیں ہے مہاراج۔“ دھو نے سب سے اعزاز میں کہا۔ ”بڑے بھاری نے ایک دوسری بھاری کو سلونی کو بلانے بھیجا تھا، سلونی اپنی کپڑا میں نہیں لی تو وہ اتفاق سے میرے پاس کھون لگائے آئی۔ میں نے غصہ محسوس کیا تو تمہیں ہوشیار کرنے چلی آئی۔“

پرتاب اب بھی اسے نظروں سے گھور رہا تھا جب باہر سے طے چلے قدموں کی آواز ابھری۔ دھو نے پک کر دروازہ بھیجا پھر ددڑ کر پرتاب سے لپٹ گئی، دونوں ہی الجھ کر بہتر کر گئے تھے جب جمبو پڑی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دھو بڑی خوبصورتی سے اپنا جسم چماتے ہوئے ایک طرف سٹ گئی۔ پرتاب بھی بڑ بڑا کر رہ گیا۔

دروازے پر مندر کا بڑا بھاری کھڑا تھا۔

”تم۔“ پرتاب نے نیچیں بدلتے میں دیر نہیں لگائی۔ ”تم کو اس طرح آدھی رات مجھے کسی کی جمبو پڑی میں بھیجنا آواز دیے اندر محسوس آنا خوبصورت دیتا۔ بڑے بھاری ہوتا اپنی بڑائی کا بھی دھیان رکھا کرو۔“

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔ تم نے دروازہ بھی نہیں بند کیا تھا۔“ بڑا بھاری دھوکو پرتاب کے بہتر پر دیکھ کر شیشا گیا۔

”یہ دیو کی مانند ہے مہاراج۔ کیا یہاں بھی چوری چکاری کا کھڑکا رہتا ہے اور پھر۔۔۔۔۔ تمہیں میری ہی کٹی کا دھیان کیسے آگیا؟ کیا دھوکا تلاش تھی؟“

”نہیں۔۔۔ میں کسی اور کو دیکھ رہا تھا۔“

”کیا کیا اصول چڑھ گئی، جس نے اس سے تمہیں بھی دیا نکل کر دیا ہے؟“

”میں شہا چاہتا ہوں۔“ بڑا بھاری اپنا جملہ پورا کر کے تیزی سے اٹلے پاؤں لوٹ گیا تو دھو نے اور مٹی سے باہر آئے ہوئے کہا۔

”میں نے تم سے جھوٹ نہیں کہا تھا مہاراج۔ اگر میں نے ادھر آئی میں دیر کی ہوتی تو ہمارا بڑا پھوٹ گیا ہوتا۔“ وہ لہجہ خشک کرتے ہوئے اٹھنے لگی۔ ”میں اب چلتی ہوں، تم آرام کر لو۔۔۔۔۔“

”بھوک بھڑکی ہو تو مردار جانور بھی پیٹ بھرے کو بہت ہوتا ہے۔ تو ابھی جیتو ہے میری

بیل۔“ پرتاب نے دھوکا ہاتھ تمام کر کے بہتر پر گرا دیا اور اس کے ساتھ آدھی رہ جانے والی بازی پوری کرنے لگا۔ اس نے دروازے پر بھی دھیان نہیں دیا جو آدھا کھلا ہوا تھا۔

دھوکا ایک دھکی کی حیثیت سے پرتاب کے بازوؤں میں پھنکتی رہی۔ طوفان کا زور ٹوٹا تو اس نے سانس درست کرنے کے بعد کہا۔

”تمہاری دان کی ہوتی تھی نے اب دھوکا بھی اندر میرے میں دور تک دیکھنے کا گر سکھا دیا ہے۔“

”کیا دیکھ لیا تو نے؟“

”اسی دھوکا دیکھا ہے جو تمہارے چنگل سے قح کلکل جاتا ہے۔“

”کس کی بات کر رہی ہے۔۔۔؟“ پرتاب نے چمک کر دھوکے کے لیے بھی سوال کیا۔

”اسی سٹلے کی بات کر رہی ہوں مہاراج جو ڈر کر بھاگ گیا تھا لیکن اب اس کی موت اسے دوبارہ تمہارے قریب لے آئی ہے۔“

”قح کلکل کر رہی ہے؟“

”تم بھی اپنی آنکھیں بند کر کے کھون لگا لو۔۔۔ وہ اپنی دھوکا جتنی کے ساتھ واپس آ گیا ہے۔“ پرتاب کی پیشانی شکن آلود ہوئی، ایک لمبے تک وہ دھوکو کھوتا رہا پھر اس کی بات کی تصدیق کرنے کی خاطر وہ آسن جھا کر بیٹھا اور اپنی آنکھیں سوند لیں۔



ڈی آئی جی کی کانفرنس ختم ہونے کے بعد اورنگ زیب اور سراج ایک ہی گاڑی میں دفتر واپس کے لیے روانہ ہوئے تھے، اورنگ زیب کی سوچ میں غرق تھا، سراج نے کچھ انتقاد کے بعد میرا سکوت توڑی۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟ شہنم کو ہماری حویلی سے نکال لے جانے والے کون لوگ ہوں گے؟“

”میرے آدھی کھون لگا رہے ہیں، ایک دو پیش لی ہیں۔ وہ سکتا ہے کہ ہم جلد ہی اس کا سراغ لگائے میں کامیاب ہو جائیں۔“ اورنگ زیب نے بہ دستور تجویز کی۔ کہا۔ کانفرنس کے دوران بھی وہ خلاف توقع زیادہ تر خاموش ہی رہا تھا۔

”آج کی کانفرنس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ آٹکھوں نے ہمارے ڈی آئی جی کو اوپر سے پریشاں کر دیا ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا تو سترے سترے داروں کی بھیج رہی ہوتی، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا۔ اس کے برعکس اس بات کے زیادہ امکان ہیں کہ شہنم کو اغوا کرنے والے اور زیادہ محتاط ہو جائیں۔“

”میں سمجھ نہیں۔۔۔۔۔؟“

”حیرت ہے۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”کیا تمہیں ہمارے جھگے میں کالی بھیڑیوں کا اندازہ نہیں ہے؟“

سراج نے خاموشی اختیار کر لی پھر وہ کچھ اور کہنے کی خاطر کسسا یا تھا کہ اورنگ زیب کے

موہاں پر سگنل موصول ہوا۔

”ہیلو.....“ اورنگ زیب نے موہاں آن کر کے صرف ہیلو کہتے پر اکتفا کیا۔

”کیا میں آپ سے اس وقت کچھ ضروری بات کر سکتا ہوں؟“ دوسری جانب سے آواز بتا کر کہا گیا۔ کم از کم سراج نے یہی اندازہ لگایا تھا۔

”کر سکتے ہو..... اس وقت میرے ساتھ سراج صاحب کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔“ اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

”آپ کا آٹکھنیں چنگ چنگ پیچھے کی خاطر قربانی کے کمرے کو استعمال کر رہا ہے؟“

”جنگا کیا انٹر گراؤنڈ نہیں ہے؟“

”جنگا تک رسائی حاصل کرنے کی خاطر امدادی کی سیڑھی استعمال کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔“

”اطلاع کس نے دی ہے؟“

”اندر کے جمیڈی نمبر دو..... وہ اپنے مقابلے میں قربانی کے کمرے کی کامیابی کسی طور پسند کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں سے قاب کرنے کی خاطر ڈیل کر اس کر رہا ہو؟“

”اس کی امید صرف میں فیصلہ ہو سکتی ہے۔“ دوسری جانب سے بڑے اعتماد سے کہا گیا۔

”بہر حال آپ کو اطلاع دینی ضروری تھی۔“

”جنگا سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟“

”کل رات بھی وائرلیس پر رابطہ ہوا تھا۔“

”اسپاٹ نمبر کیا تھا؟“

”زیر دسکس، لیکن استاد نے کہا تھا کہ وہ شفٹ کرنے والا ہے۔ اس وقت کہاں ہوگا یہ مجھے نہیں معلوم۔“

”تمہارا کیا خیال ہے..... کیا امدادی زبان بھول دے گا؟“

”یقیناً تو نہیں ہے لیکن موت کی اذیت ناک ممکن بھی کسی اتحاد دشمن بھی پہنچا سکتی ہے۔“

”اندر کے جمیڈی اور قربانی کے کمرے..... دونوں پر نظر رکھو۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے ہدایت کی۔ ”دو گھنٹے بعد دوبارہ کال کرنا۔“ دو گھنٹے کے بعد بھی اگر میں کال ریسپونڈ نہ کروں تو انتظامیہ کار نہ کرنا..... میں خود سے رابطہ قائم کروں گا۔“

”ایک اطلاع اور بھی ہے..... اسٹیم نمبر دو کا ٹھکانا بھی کل رات تبدیل کر دیا گیا ہے۔ میرے مجبر کی اطلاع کے مطابق.....“

”دو گھنٹے بعد کال کرنا۔“ اور رائیڈ آں۔“ اورنگ زیب نے دوسری جانب سے بولنے والے کی پوری بات سنے بغیر سلسلہ ختم کر دیا۔

”کس کی کال تھی؟“ سراج نے تجسس سے دریافت کیا۔

”جنگا کا خاص آدمی ہے۔ میں نے اسے آٹکھنیں کے دباؤ ڈالنے کے بعد ڈی آئی جی کی درخواست پر ان لوگوں کے ساتھ رہا کر دیا تھا جو آٹکھنیں کے آدمی تھے۔“

”میں آپ سے یہ دریافت نہیں کروں گا کہ قربانی کا کمرایا اسٹیم نمبر دو کے کوڈ کس کیلئے استعمال کیے گئے تھے لیکن یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ نے موجودہ اطلاع کے بعد جنگا کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”تم میری جگہ ہوئے تو کیا فیصلہ کرتے؟“ اورنگ زیب نے مسکرا کر سوال کیا۔

”اس وقت ہماری بساوا پر جنگا سب سے اہم ممبر ہے۔ میں اسے ہر قیمت پر تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرتا۔“

”میں بھی ایک تیرے دو شکار کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”میں سمجھا نہیں..... آپ نے کیا پلان بنایا ہے؟“

”اس کا فیصلہ میں دو گھنٹے بعد ہی کر سکتوں گا۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر کمری خیال کے تحت اس نے سراج کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ کر بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”ایک بات کا یقین کر لو سراج..... آٹکھنیں کو چھائی کے چھندے تک پہنچانے میں تم میرے شانہ بٹانہ رہو گے۔ میری دقیق خاموشی کو کوئی اور رنگ نہ دیتا۔ ایک بات اور بھی ذہن نشین کرلو..... تم اور الماس مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہو۔ اگر کبھی موت کے کنویں میں آنکھ بند کر کے چھلاک لگاتے وقت میں تم کو نظر انداز کروں تو اس کا برا بھی نہ منانا۔“

”ایک فیصلہ میرا بھی سن لیجئے۔“ سراج نے پورے ڈوق سے کہا۔ ”میری زندگی میں آپ کسی بھی موقع پر خود کو تنہا نہیں پائیں گے۔“

اورنگ زیب نے سراج کے جملے کو خاموشی سے سنا۔ اس کی طرف بہت غور سے دیکھا پھر کمری سوچ میں غرق ہو گیا۔ دفتر واپس ہونے تک دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔

رات کے اس پچھلے پہر میں بھی میڈم روہی نے صرف پوری طرح بیدار تھی بلکہ ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنی خواب گاہ میں بٹل رہی تھی، اس کے چہرے پر اس وقت نگہرات کے گہرے تاثرات مسلط تھے۔ بیڈ روم میں وہ تنہا نہیں تھی، حیرت انگیز ڈریسنگ بٹل کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی میڈم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ گزشتہ چالیس منٹ سے ان کے درمیان کسی جملے یا مکالموں کا تبادلہ نہیں ہوا تھا، میڈم کے مقابلے میں حیرت انگیز یا مدہوش نظر آ رہی تھی پھر گھٹکی ابتدا بھی اسی نے کی۔

”میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ آپ کی یہ جینی کا اصل سبب کیا ہے..... کیا دوسری پارٹی نے جو پروگرام بنایا ہے، آپ کو اس پر اطمینان نہیں ہے؟“

میڈم نے کسی خیال سے چونک کر تھریا کو یہ غور دیکھا، اس کے پہلے پر ایک لمبے غور کیا پھر چلا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ ”اطمینان نہ ہوتا تو میں اپنے کسی آدمی کو استعمال کرنے کی اجازت بھی کبھی نہ دیتی۔“

”پھر..... کس بات کی فکر آپ کو ابھار رہی ہے؟“

”آم کی تمام قسمیں بازار میں مکملے عام ملتی ہیں لیکن کسی بات سے ایک مکی کیری چرا کر کھانے کا جالط سے وہ سب سے الگ ہوتا ہے۔“

”مطلب؟“

”تھریا نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔“

”میں تم کو بے حد عزیز رکھتی ہوں تھریا لیکن اہلوس ہے کہ تم ایک عورت ہو کر بھی میرے درد کو نہیں سمجھ رہی ہو۔“ میڈم نے اس بار جذباتی انداز اختیار کیا۔ ”میں نے تم سے بار بار کہا ہے کہ وہ دونوں میرے اتحاد کے لوگ ہیں، ان کی دوستی میں کوٹ ہوتا تو آج میں اپنے دشمنوں سے نظرس ملا کر جنگ آواز میں ہتھکڑ کرنے کے قابل بھی نہ ہوتی۔ پہلے شخص نے میرے ساتھ جو جنگی کی اس میں اس کا جو غلط شامل تھا، اس کا اندازہ نہیں ہو گا۔ میری ہی خاطر میرے دشمن کی نظریں بھی اس سے زیادہ ہو گئیں۔“ میڈم نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ”اتحاد نہ ہوتا تو میں اب تک ان سے کنارہ کش ہو چکی ہوتی۔“

”پھر آپ اس وقت اس قدر.....“

”بھینے کی کوشش کر تھریا۔“ میڈم نے مضامین پہنچ کر کہا۔ ”ایک شکار پارٹی میں چار شکاری شامل ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد مصل شکار سے ہوتا ہے لیکن جو خود شکار کرتا ہے اسے زیادہ مزہ آتا ہے، دوسرے کا کام یہی اس کی خوشی نہیں ہوتی۔ خود اس کی چلائی ہوئی گولی سے شکار ڈھکی ہو کر موت اور زندگی کے درمیان تڑپے تو اس کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“

”اوہ.....“ تھریا نے بات سمجھے ہوئے پھلو بدل کر کہا۔ ”میں آپ کے خیال سے متفق ہوں لیکن ایک تباہ عورت بھی نہیں بچاس مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“

”لیکن کوشش.....“

”کوشش آپ کر چکی ہیں لیکن اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔“ تھریا نے بھی میڈم کی بات کاٹ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اتفاق ہی تھا کہ ہر موقع پر قدرت نے آپ کی کسی نہ کسی طور مدد کی، جس کا اعتراف ابھی آپ بھی کر چکی ہیں۔“

”تم.....“ میڈم ایک لمحے کو تھلا کر وہ مٹی پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تم شاید ٹھیک کہہ رہی ہو مگر تم نے ان دشمنوں کو نہیں دیکھا جو میرے مظلوم شوہر کے جسم پر موجود تھے۔ وہ دشمن مجھے بھڑکایا کہ صرف ایک ہی مطالبہ کر رہے تھے۔ روٹی، مجھ سے وعدہ کرو..... تم ان دشمنوں کا گمن گمن کر حساب چمکا کر دے گی۔ مجھے دشمن کرنے کے بعد فراموش نہ کرنا اور..... اور میں نے اسی خاموش خواہش کے احترام میں پوسٹ مارٹم کرائے بغیر خالد ریش کے جسم کو پھر دھاگ کر دیا تھا لیکن

ان دشمنوں کی چیخ، ان کے آخری مطالبے کی آواز آج بھی میرے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہی ہے، میں انہیں آسانی سے کیسے فراموش کر دوں؟ اور عجب عورت کو تو اپنی بے بسی کا احساس بھی دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ تم..... اگر میری جگہ تم ہو تو تم کیا کرتیں؟“

”اس شخص کے مرنے کے بعد اس کی موت کی خوشی میں جشن مناتی..... قطعہ بکھیرتی..... خود کو قتل دینے کا ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے۔“

میڈم نے تھریا کو غور سے دیکھا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ موبائل کی سرخ جلی جلتے بجھنے لگی، میڈم نے اسے گول میرے اٹھا کر ان کرنے میں دیر نہیں لگائی، روشن اسکرین پر نظر آنے والے نمبروں کو دیکھ کر اس نے تیزی سے سوال کیا۔

”کوئی خاص خبر.....؟“

”میں بھی دیکھتا چکا رہا تھا کہ آپ اس وقت سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں۔“ سنجیدگی سے دریافت کیا گیا۔

”جن کی روح دفن ہو وہ منزل قریب دیکھ کر سوتے نہیں، بے چینی سے جاگتے رہتے ہیں..... کیا بتا رہے ہیں؟“

”ہر کام انتہائی لمبی جشن اعزاز میں ملے پائیا۔“ اطمینان سے جواب ملا۔ ”آپ کی منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ اسے حالات کی کوئی ہسک نہیں ملی ہوگی؟“

”کسی امکانی پہلو کو نظر انداز کر دیتا میں ہمارے اصول کے خلاف ہے لیکن میرا خیال ہے کہ جس اعزاز میں ساری پلاننگ کی گئی تھی اسے فول پروف ہی کہا جا سکتا ہے۔ جس شخصیت نے بیانات قلمبند کیے ہیں اسے خود بھی مظلوم تھا کراختی رات گئے اسے کس مقصد سے طلب کیا گیا تھا۔“

”ان میں سے کوئی خبری کر کے کالی بیجڑ ہونے کا کردار بھی ادا کر سکتا ہے۔“ میڈم نے پھر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”یقین ممکن ہے کہ آپ کا شہر درست ہو لیکن میں نے تمام امکانات کے متبادل راستوں پر بھی غور از وقت غور کر لیا تھا۔ جس طرح پلاننگ کی گئی ہے وہ نوسے فیصد ہمارے کامیابی ہی ثابت ہوگی۔“

”ایک بات اور بھی ممکن ہے.....“ میڈم نے بے چینی سے اٹلے ہاتھ کی انگلیاں پہلے ہوئے کہا۔ ”کچھ مجرم ڈرائنگ دم ٹریٹمنٹ سے بچنے کی خاطر بھی حلیف بیان دے دیے ہیں لیکن..... عدالت کے دو دروازے کا خوف ہو جانے کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔“

”نکل چکا اور انتظار کر لیں، ہو سکتا ہے کہ کچھ نئے واقعات ایسے رونما ہوں جن کے بعد آپ کو اس بات کی تسلی ہو جائے کہ ہم نے بھی سبکی گولیاں نہیں کھلی ہیں۔“

”مجھے آپ دونوں کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد ہے، نہ ہوتا تو دوستی کا ہاتھ بھی دراز نہ کرتی۔“

”اگر اجازت ہو تو ایک بات کی مہار کا بدلہ اقل از وقت دے دوں؟“

”کس طرف اشارہ ہے؟“

”میرا..... اشارہ اس تیسری شخصیت کی طرف ہے جس کا ہاتھ آپ نے مستقل تھامنے کا ارادہ کر لیا ہے۔“

”شکریہ.....“ میڈم نے دہلی زبان میں جواب دیا۔ ”اسے میری مجبوری اور وقت کی ضرورت بھی سمجھ لیں۔“

”بہر حال..... آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ہر اعتبار سے درست ہے۔“

میڈم نے فوری طور پر موضوع بدل کر پوچھا۔ ”آپ نے کل تک انتظار والی بات کہہ کر ایک جیس پیدا کر دیا ہے۔ کیا آپ کل از وقت.....“

”آئی ایم سوری.....“ دوسری جانب سے تنبیہ کی سے جواب ملا۔ ”کامیابی سے قفل بند ہانگ دو گے کرتا میرے اصول کے خلاف ہے۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا، میڈم نے موبائل اصول کے خلاف ہے۔“ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا، میڈم نے موبائل بستر پر اچھال دیا تو قہر پانے پوچھا۔

”کوئی نئی اطلاع.....؟“

”ہاں..... جو سہ دان پوری طرح تیار کر لیا گیا ہے۔“

”اب تو آپ کو اطمینان ہو جاتا ہے۔“

”کسی حد تک..... ویسے یہ انہوں میں بھر رہے گا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے مرحوم کی خواہش کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا۔“

”لیکن حالات اب آپ کے حق میں سازگار ہیں۔“ قہر پانے نے میڈم کے قریب آ کر دلجوئی کرنے کے اعزاز میں کہا۔ ”کل کسی نے آپ کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اب آپ اس کے بے دست دبا ہونے کے بعد اسے دل کا قیام بہر حال نکال سکتی ہیں۔“

میڈم نے چونک کر قہر پانے کی سمت دیکھا مگر کچھ سونے کے بعد اس نے غلامی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا یہ مشورہ مجھے پسند آیا، امید کی ایک نظر آن آجائے تو انسان کو بہت سارے فیصلے کا اختیار بھی حاصل ہو جاتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے..... جو کچھ ہوگا، وہ بہتر ہی ہوگا۔“

میڈم نے انہماک میں سر کو جھٹھکی دی تو قہر پانے کچھ دیر بعد خواب گاہ سے باہر چلی گئی، میڈم نے کمر اٹھ کر سے بند کر کے خود کو بستر پر چھٹے تھکے اعزاز میں گرا دیا لیکن اس کی آنکھیں پوری طرح بیدار تھیں، ان آنکھوں میں بے شمار خواب آئیں میں گزشتہ روز سے تھے۔ ایک ایک وقت قہر پانے بھی اپنے کمرے میں بے چینی سے کھل رہی تھی۔ میڈم نے اس کے آخری مشورے پر جو جواب دیا تھا وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر بڑی سنجیدگی اور تشویش سے غور کر رہی تھی۔

ایس بی اورنگ زیب خلاف توقع بہت اچھے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ شام کی چائے اس نے سراج اور الماس کے ساتھ ہی پی لی تھی پھر وہ سب ڈرائنگ روم میں آ گئے جہاں کپ شپ جاری رہی۔ کھنگو کے دوران مختلف ٹیلی فون بھی آتے رہے، ہاتھوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، ساڑھے آٹھ بجے اورنگ زیب نے چائے کا ارادہ ظاہر کیا تو الماس نے کہا۔

”اب کھانے کا وقت ہو گیا تو ہمارے ساتھ ہی وال روٹی کھائیں۔“

”میں بھی سوچ رہا تھا لیکن جب سراج نے نکلفا بھی اکتھا نہیں کیا تو میں نے سوچا کہ کسی ہوش میں جا کر کھالوں۔“

”میں آپ کی اس حکایت کا برا نہیں مانوں گا اس لیے کہ یہ شعبہ الماس کا ہے۔“ سراج نے مسکرا کر کہا۔ ”میں روک لیتا اور آپ کے جانے کے بعد الماس برا مانیں تو اپنا گزرا رہی.....“

”پلیز سراج۔“ الماس نے خوب کونین نظروں سے گھورا۔ ”جہاں اورنگ زیب کیلئے اس قسم کی کوئی بات کبھی مذاق میں بھی نہ کیے گا۔“

”یہ مذاق میں نہیں سنجیدگی سے مجھے ٹانگا چاہتا تھا۔“ اورنگ زیب نے الماس کو اکسانے کی کوشش کی تو سراج نے الماس کو گھور کر رشتے ہوئے کہا۔

”فحک ہے..... پھر، آپ دونوں گھر میں دن سے شوق فرمائیں۔ میں کسی بھیار خانے سے پیٹ بھر کر آ جاتا ہوں۔“

اورنگ زیب نے سراج کا ہاتھ تھام کر دوبارہ اپنے قریب بٹھالیا۔ رات کا کھانا بھی سب نے ایک ساتھ کھا یا پھر اورنگ زیب نے الماس سے فرمائش کی۔ ”آپ اگر میرے لیے بلیک کافی بنا دیں تو میری ہانگ ہوگی۔“

”کیا رات میں بھی گزرنے کا ارادہ ہے؟“ اس باسراج نے اورنگ زیب کو ہاتھ سے اشارہ کر کے الماس کو چھیننے کی کوشش کی لیکن وہ مسکرائی ہوئی اٹھ کر کافی بنانے چلی گئی تو سراج نے سنجیدگی سے اورنگ زیب سے کہا۔ ”اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو آج آپ نے کسی خاص مشق کی تیاری پہلے سے طے کر رکھی ہے؟“

”میں تمہاری ذہانت کی تعریف پہلے بھی کر چکا ہوں۔“ اورنگ زیب نے دہلی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ ”ساڑھے دس بجے ایک ضروری کال آنے کے بعد تم بھی اس مشن میں

میرے ساتھ شریک ہو گئے اور پھر..... ہو سکتا ہے کہ آج کی رات میں ایک منٹ کیلئے بھی آرام کا موقع نہ ملے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ کافی چنے کے بعد میں بھی کیل کاغٹے سے لیس ہو جاؤں۔“

اورنگ زیب نے اثبات میں گردن کو جھٹک دیا، الماس کافی لے آئی تو پھر ان کے درمیان ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، الماس اور اورنگ زیب ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ سراج دوسرے پر تھا۔ ٹھنڈے کے دوران بھی وہ اورنگ زیب کی مشق والی بات کے سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا جب اورنگ زیب نے مکملی باغیچہ کی سے الماس سے کہا تھا۔

”الماس..... کیا میں امید رکھوں کہ تم میرے لیے ہمیشہ کامیابی کی دعا میں کرتی رہو گی.....؟“

”اس وقت آپ کو چاہا کہ اس حوالے کی ضرورت کیسے پیش آئی؟“

”ہو سکتا ہے آج کی رات میرے اور سراج دونوں کیلئے زندگی کا ایک موڑ ثابت ہو۔ میں اور سراج ساڑھے دس بجے کے بعد ایک بہت ہی خاص اور اہم مشق پر روانہ ہوں گے۔ نہیں، تم سراج کو مٹھکوں نظروں سے نہ دیکھو، ابھی تک سراج کو بھی اس بات کا علم نہیں ہے کہ میں نے شام سے تمہارے گھر کیوں ڈیرا جھار رکھا ہے۔“

”کیا آنکھیں کے سلسلے میں کوئی کم رچش ہے.....؟“ الماس نے سنبھل کر پوچھا۔

”ہاں..... لیکن آج کی رات ہمارے لیے مکملی سبزی ہو گی۔ کامیابی کی صورت میں ہمارا جال آنکھوں کے گرد اور مضبوط ہو جائے گا۔“

”خدا آپ دونوں کو اس غون آشام دہنرے کے خلاف کامیابی نصیب کرے جس نے نہ جانے تھے شریف لوگوں کی زندگی کا سکون فارت کر رکھا ہے۔“

”پر دگرام کیا ہے.....؟“ سراج نے پہلو بدل کر دریافت کیا۔

”تم تیار کی کر کے آ جاؤ، کل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں ہو گا۔“

سراج تیزی سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا، اس کی دکانی میں یہ مشکل پندرہ منٹ لگے تھے، اورنگ زیب اور الماس باتوں میں مصروف تھے جب ساڑھے دس بجے اورنگ زیب کے مخصوص موبائل پر مکمل موصول ہوا۔ اس نے فہر دیکھتے ہوئے موبائل آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے سوال کیا۔

”کیا اطلاع ہے.....؟“

”میں نے جگا کو پورے پروگرام سے مطلع کر دیا ہے، وہ آپ کے حکم پر جان بھی دینے کو آمادہ ہے۔“

”دوسرے فریق کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے یا نہیں؟“ اورنگ زیب نے گہری تنیدگی سے کہا۔ ”حزرات ضرور کی جائے لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ کچھ زندگیوں بلا وجہ کام آ جائیں۔“

”بات اس کی سمجھ میں مشکل ہے آئی ہے لیکن اس نے بھی آمادگی ظاہر کر دی ہے.....! قربانی کے بکرے کے بارے میں گھر کے چیدی کو وقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے ویسے امکانات سبکی ہیں کہ وہ آج ہی سرخرو ہونے کی کوشش کرے گا۔“

”اوکے! میں تم سے دوبارہ خود رابطہ کروں گا لیکن دن منٹ.....! میری جیسی کی صورت میں تم بھی مجھے کال کر سکتے ہو..... ٹھیک ہے، دل پک لو لک۔“

اورنگ زیب نے موبائل آف کر کے سراج کو اٹھنے کا اشارہ کیا پھر الماس سے بڑی اہمیت سے یو لالا۔

آج کی ہم میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن تم سراج کی طرف سے پریشان نہ ہونا..... سراج کی زندگی مجھے اپنے سے زیادہ عزیز ہے اور..... ہمیشہ رہے گی۔“

”میں آپ دونوں کے حق میں کامیابی کی دعا کروں گی۔“ الماس نے سراج کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”خدا آپ دونوں کو اس موڑی کے خلاف کامیابیاں نصیب کرے۔“

اورنگ زیب اور سراج باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے، الماس ان کو رخصت کرنے باہر تک آئی تھی۔ گاڑی پر ہاتھیں گاڑے ادا ملے سے باہر نکل کر مکملی سڑک پر آئی تو سراج نے پوچھا۔

”کیا اس اہم ہم میں ہمارے علاوہ ہمارے گھر کے اور بھی لوگ شامل ہوں گے؟“

”نہیں..... مگر میری درخواست پر کچھ مٹھکوں کے اعلیٰ افسروں کی طرف سے مخصوص ہدایت مل چکی ہے۔“ اورنگ زیب نے تنیدگی سے کہا۔ ”میں نے جو پروگرام مرتب کیا ہے اس میں پولیس گھر کے باہر دونوں کے علاوہ کوئی اور فرد شریک نہیں ہو گا۔“

”لیکن بعد میں تو.....“

”اس کی فکر مت کرو..... میں نے موجودہ معاملات میں اپنے مخصوص ذرائع سے وزیراعظم تک کو بریفنگ کرا دی ہے۔“

”آئی سی۔“ سراج نے کسمار کہا پھر دہلی زبان میں پوچھا۔ ”اس وقت ہم کہاں چل رہے ہیں؟“

”تم نے ادا دہلی کے بارے میں ضرور سن رکھا ہو گا۔“ اورنگ زیب نے عقلمی اپنے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”کچھ لوگ اسے انکار کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو پھر آج وہ ادا دہلی کے ذریعے جگہ کے ٹھکانے پر حملہ کرے اسے بھی یہ خیال بنانے سے روک نہیں کریں گے۔“

ادا دہلی کے انکار کی صورت میں اسے زندگی سے بھی محروم کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ سب فیض حامد کے اشارے پر ہو گا؟“ سراج نے چمک کر سوال کیا۔

”جو آپ آراء میں لگن کرمت کرو.....“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے جو جال بنا ہے وہ آنکھوں کی توقع کے خلاف ہی ثابت ہو گا۔ کامیابی کی صورت میں تمہیں

منٹ بعد تنہا ایک خیراتی اوارے کی ایسیوینس میں نکل کر ساحلی علاقے کی طرف جائے گا۔ امداد اعلیٰ سے اس نے سپاٹ نمبر فانیو پر ملنے کو کہا ہے۔“

”اسپاٹ کی وضاحت کرو۔“

”بلیک سی اسنیک بار.....“

”فائن“..... اورنگ زیب نے موبائل آن کر گاڑی کارخ تبدیل کیا پھر ایک منٹ بعد ہی دوپٹہ کی اطلاع کو اپنے مخصوص لوگوں..... کو منتقل کرتے ہوئے ضروری ہدایت دے رہا تھا۔ ”جب تک میری جانب سے کوئی خاص مسئلہ نہ ملے کسی ایکشن کی غلطی نہ کی جائے۔ ایمر بھی کی صورت میں کوئی قدم اٹھایا جائے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ ان تینوں میں سے کوئی مرنے نہ پائے۔“

کال ختم ہوئی تو سراج نے دنی زبان میں کہا۔ ”امدادی اور جگا کاظم مجھے ہو چکا ہے کیا آپ قربانی کے سکرے کو بھی ڈی کوڈ کرنا مناسب سمجھیں گے؟“

”افضل خاں.....“

”نہیں.....“ سراج نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ اس قدر یقین سے کس طرح کہہ رہے

“ہیں؟“

”اس لیے کہ وہ ہوٹل سے مقابلے کے بعد فرار ہو کر یا اغوا کر کے جہاں بھی گیا یا لے جایا گیا میری نظروں سے زیادہ دور نہیں تھا۔“

”اوہ..... اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ پھر.....“

سراج کا عمل مکمل نہ ہوا۔ اورنگ زیب نے اس کاڑی جو اس وقت ساحلی علاقے پر واقع جنگی اسٹیک ہاؤس سے پیشکل دوفر لاک کے فاصلے پر تھی اچانک سڑک پر نفٹے میں دھت کس شہابی کی طرح توڑا تو اس کو کھرا لہا نہ لگی، اس کا سبب وہ دھماکا تھا جو پچھلا ایک ٹائر برست ہونے کے بعد ہوا تھا، اورنگ زیب نے اسٹیکنگ کنٹرول کرتے ہوئے بریک پر دباؤ ڈال کر سراج کو چھلانگ لگانے کی ہدایت کی پھر وہ بھی دروازہ کھول کر دوسری طرف قلابازی کھاتا ہوا تسخیل کیا، دونوں نے اپنے اپنے سرکاری ہتھول لٹال لیے لیکن فائرنگ کے والے اپنا کام کر کے گل چکے تھے۔ دور دور تک پھیلے راستے پر کوئی گاڑی یا مشتبہ افراد نظر نہیں آئے۔ البتہ سراج بڑی برقی رفتار سے کرونگ کرتا ہوا، اس کے قریب آتا تھا۔

”آپ خیریت سے تو ہیں؟“

”ہاں لیکن وہ ہانسز ڈاپٹا کا مکر سے کھل گئے جنہوں نے بڑی مہارت سے کسی خاموش رانگل سے ہیری کی فوٹی سے ایک سٹے ٹائز کا ستھنا اس کر دیا۔“ اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے اس نے تیزی سے موبائل پر کسی کے نمبر بیچ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے جیستری ایک منسلک ملا تو اس نے نمبر دیکھ کر کال ریسیو کر لی۔

”آب اس وقت کہاں ہیں؟“ اور نگ زیب نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

کھشکول 314 دوم

تمہارے بہت سارے سوالات کا جواب بھی مل جائے گا۔ خاص طور پر ان باتوں کا جو میرے علم میں تھیں لیکن میں نے مصلحتاً تمہیں بھی قبل از وقت نہیں بتائیں۔“

سراج نے کوئی ٹھوکہ نہیں کیا لیکن ابھی تک یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی تھی کہ وہ کس قسم پر جا رہے ہیں۔ فوری طور پر اس نے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا اور ذاتی طور پر ذہنی جتنا شک کرنے میں مصروف رہا..... وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا، اور یک ذریعہ شک کا یہ غور جائزہ لیتا ہوا شہر کے مختلف راستوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا جب کیا روخ کے پینتیلیس منٹ پر اس کو دوسری کال موصول ہوئی، اس بار اس نے موبائل آن کرنے کے بعد ہی اس کا انجینئر بھی آن کر دیا تھا۔ سراج پوری طرح متوجہ ہو گیا۔

”کیا خبر ہے.....؟“

”امداد اعلیٰ نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد قربانی بکرے کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ دو افراد معمولی نفی ہوئے ہیں۔“ دوسری جانب سے ایک مانوس آواز ابھری جسے سراج پہلے بھی ایک دو مقبوض پر سن چکا تھا۔

”اب ان کا رخ کدھر ہے.....؟“ اور نگ زیب نے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب امداد علی کے ذریعے جگا کہ باہر آ کر ملاقات کرنے پر رضامند کیا جائے۔“

”کھا کھا آسانی سے انداز کی بات مان لے گا.....؟“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ اعداد علی نے پہلے سے کچھ کو بھی چونکنا کر دیا ہو۔۔۔ ایسی صورت میں وہ اپنی کھمار سے تہا باہر لٹنے کی غلطی نہیں بھیجی کرے گا۔ اس کے کچھ جاننا زور دورہ کر کسی صورتحال سے نمٹنے پہلے بھی تیار ہوں گے“

”ون منٹ..... کیا قربانی کا بکرا تھا اس ہم کو سر کر رہا ہے.....؟“ اورنگ زیب نے سر سراتے لہجے میں سوال کیا۔

”بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس کی لاطینی میں اس کا تقابلی بھی کر رہے ہوں۔ ہمارے دشمن نے کئی محاذ خفیہ طور پر بنائے رکھے ہیں گے قربانی کا بکرا ناکامی کی صورت میں جہنم رسید بھی کیا جا سکتا ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں.... تم ان کی صحیح لوکیشن بتاؤ.....“

جواب میں دوسری جانب سے لائن منقطع کر دی گئی۔ اورنگ زیب اور سراج دولوں ہی چو گئے تھے لیکن انہیں زیادہ دیر پریشان نہیں ہونا پڑا۔ پانچ مہینہ بعد موہن پل پر دوبارہ مکمل لائن اورنگ زیب نے محکمہ لکھنے میں سوال کیا۔ ”تم نے لائن کیوں کاٹ دی تھی؟“

”درست صورت حال معلوم کرنے کی خاطر میں نے استاد سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ آپ کی خاطر وہ جان کی بازی لگانے پر بھی آمادہ ہے۔ وہ دس

”اپنے قریب ہی سمجھیں۔ دیکھئے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم نے آپ کی گاڑی پر حملہ کرنے والوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اندھا مدھنہ فائر مکمل دیا۔ جواب فوری دیا گیا تو وہ جو تعداد میں دو تھے ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئے، میں نے ان کی لاش روانہ کر دی ہے لیکن حادثے کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔“

”ابھما کیا.....“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”آپ کیا میرے لیے کسی.....“

”ایک منٹ انتظار کریں..... ہماری ایک بلک وین آپ تک پہنچ جائے گی۔“ دوسری سمت سے لائن متقطع کر دی گئی۔ ایک منٹ بعد بلک وین بھی نظر آ گئی۔ اورنگ زیب نے وین ڈرائیور کرنے والے کو پچھلی نشست پر بھیج کر بڑی سرعت سے اسٹیزرک سیٹ سنبھال لی، سراج نے بھی دوسری جانب سے پیچھے سے پھرتی گاڑی کا مظاہرہ کیا۔

اس وقت ساحلی علاقہ تقریباً سستان ہی تھا، دس بجے کے بعد چونکہ تمام کاروبار بند کر دینے کا حکم نافذ تھا اس لیے خاصے قاصدوں پر ایک دو گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ مطلوبہ اسٹیک بار کے باہر بھی کوئی گاڑی موجود نہیں تھی، اورنگ زیب نے وین تقریباً پچاس فٹ دور لے جا کر روکی پھر سراج کے ساتھ پیچھے اتر آیا، ان کی نظر میں اس وقت مطلوبہ اسٹیک بار پر سرزد تھیں۔

”کیوں ایسا تو نہیں کر جن لوگوں نے ہمارا راستہ ٹھکانے کی کوشش کی ہے، ان کے دوسرے ساتھیوں نے افضل خان اور ہمارے دوسرے مطلوبہ آدمی کو بھی درمیان ہی سے اٹھالیا ہو.....؟“

”نہیں..... ایسا ہوتا تو کمائنڈرز ایک بجے اطلاع کر دیتے ہوتے۔“ اورنگ زیب نے بڑے چین سے کہا اور اس کا فیصلہ بھی اس وقت دور سے آنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے مل گیا جو مطلوبہ اسٹیک بار ہی کی طرف آ رہی تھی۔ اورنگ زیب اور سراج نے وین کی آڑے آ کر اپنی پوزیشن سنبھال لی جہاں سے وہ آنے والی گاڑی پر نظر رکھ سکتے تھے۔ ان کی توقع کے عین مطابق وہ گاڑی جو گرے ٹرکی ایک ہائی روف تھی، اسٹیک بار کے قریب آ کر رک گئی۔ ہیڈ لائٹس بھی بجا دی گئیں لیکن باہر کوئی نہیں نکلا۔

”جلد بازی میں کوئی قدم مت اٹھانا۔“ اورنگ زیب نے پتھل کے دستے پر اپنی گرفت جماتے ہوئے کہا۔ ”خیراتی ادارے کی ایویلیشن آنے کے بعد ہی اصل صورت حال واضح ہوگی۔“

”آپ کے سٹریٹ کمائنڈرز اس وقت کہاں ہوں گے؟“

”زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو نے پہلے ہی سے کہیں پوزیشن بھی سنبھال رکھی ہو۔“

تین چار منٹ اور گزر گئے۔ گرے ٹرکی ہائی روف سے کوئی باہر نہیں نکلا پھر سراج اور اورنگ زیب کو خود خیراتی ادارے کی ایویلیشن بھی نظر آ گئی جو تیزی سے قاصدہ لے کر پٹی ہوئی ہائی روف کے قریب آ کر رکی تھی، اس کے رستے ہی ڈرائیور کے بالائے سر کے باہر آ گیا، دوسرے ہی لمبے ہائی روف سے بھی ایک شخص پیچھے اتر آ۔ دونوں آپس میں بخش گیر ہوئے، ان کی گرم جوشی کا اظہار ابھی جاری تھا

کہ ہائی روف سے ایک تیسرا شخص اتر آ جس نے ہاتھ میں کوئی آئٹیم اٹھ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے دونوں بغل گیر دوستوں کو قاطع کر کے سرسراے لہجے میں ایک کولکارتے ہوئے بڑے قاتمانہ انداز میں کہا تھا۔

”بچا..... تم جتنی آسانی سے اپنے بل سے نکل کر باہر آ گئے ہو، اب اتنی آسانی سے واپس نہیں جاسکو گے۔“

بغل گیر ہونے والے ایک دوسرے سے ٹکڑھ ہو گئے پھر چکے نے حیرت سے اپنے پاس کھڑے ہوئے ساتھی سے کہا۔ ”ادھارلی..... تم میرے لیے کبھی آئین کے سانپ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو گے؟ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔“

”اطمینان سے سوچ لینا چکا، فی الحال اگر زندگی مزید ہے تو خاموشی سے جیب سے اپنا اسلحہ نکال کر پٹیل پیچک دو۔ اس کے بعد تمہاری آستین کا سانپ جس کا زہر میں پھیلے ہی نکال چکا ہوں تمہارے ہاتھ پت پر باہر سے بھی کوئی گلف نہ کرے گا۔ پھر تم دونوں گاڑی کی پشت پر بیٹھ کر آرام سے ٹھکے حکایت کرتے رہنا..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”اور اگر چکا تمہاری بات ماننے سے انکار کر دے تو.....؟“ چکا نے سرسراے لہجے میں سوال کیا۔

”فی الحال اس پوزیشن میں نہیں ہیں میرے پار۔“ ادھارلی نے ٹھٹھکے خوردہ لہجے میں چکا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”افضل خان اگر تہا ہوتا تو میں بھی دودھ ہاتھ کر کے بازی پلٹ سکتا تھا لیکن جس نے اس کی بجائے بڑے ہاتھ رکھا ہوا ہے اس کے دوسرے ٹھکانے بھی نہیں آس پاس موجود ہوں گے۔ میں نے ابھی ہی تمہارا نہیں ڈال دیئے تھے۔“

”وہ تمہاری مرضی تھی.....“ چکا کے لہجے میں چکاریاں جھنجھے لگیں۔ ”میں مر جاؤں گا لیکن کسی ولد الحرام کے سامنے قیدی بن کر نہیں پیش ہوں گا۔“

”تمہاری مرضی.....“ افضل خان نے جو اس وقت میک اپ میں قاسم اور سفاک لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہاری اکڑی ہوئی لاش بھی میرے لیے بہت کافی ہوگی، جب باس نے صرف چکا کو ساتھ لانے کا حکم دیا تھا..... زندہ یا مردہ کی بات طے نہیں کی تھی۔“

”اس خواب کی تعبیر تمہیں بہت مشکل پڑے گی افضل خان۔“ چکا نے چمک کر کہا۔ ”میں یہاں تمہا نہیں آیا تھا، میرے ساتھ۔“

اسی لمحے کچھ دور سے گولیوں کی ترخراہٹ کی آواز ابھری، اورنگ زیب نے کسی فوری فیصلے کے تحت افضل خان کے پاؤں کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ اس کا نشانہ خالی نہیں گیا۔ افضل خان کے ہاتھ میں جو آئٹیم اسلحہ تھا وہ نکال گیا اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی ٹھٹھکتا ہوا زمین پر ہونچا، چکا اور ادھارلی بھی اس الزام سے ہولکا کر زمین پر لپٹ گئے۔ اورنگ زیب، سراج کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا تیزی سے دوڑ کر افضل خان کے سر پر پہنچ گیا جو غالباً ہوش ہو گیا تھا، اس کے داہنے کھٹے سے

خون اہل رہا تھا۔

گوئیوں کے تھالے سے بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ قریب ہی کہیں دو پرائیاں آہیں میں گھر گئی تھیں، اورنگ زیب کے اشارے پر اہل داخل اور چگا، افضل خان کو اٹھا کر بلیک دین میں لے آئے، دین کا کمانڈر کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ اس نے فون ختم کر کے اورنگ زیب سے کہا۔

”سر۔۔۔ آپ دین کے کردوسرے راستے سے نکل جائیں۔ اوپر سے بھی کھلم ہے۔“

”فائرنگ کسی کے درمیان ہو رہی ہے؟“ اورنگ زیب نے دریافت کیا۔

”ہمارے ساتھیوں نے دو ٹھوکر گاڑیں کوڑے کا اشارہ کیا تھا لیکن انہوں نے جواب میں فائرنگول دیئے۔ ہمارے ساتھی انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

چگا اور اہل داخل نے افضل خان کو اٹھا کر پچھلی طرف ڈالا پھر خود بھی دین میں بیٹھ گئے تو اورنگ زیب نے چگا اور اہل داخل کو حلقہ کر کے کہا۔ ”تم سے جو وعدہ کیا گیا ہے وہ پورا بھی کیا جائے گا۔“

”ہم آپ کے خادم ہیں جناب۔“ چگا نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ ”آپ کیلئے جان بھی حاضر ہے۔“

اورنگ زیب نے ڈرامائیگ سیٹ سنہال کا گاڑی اسٹارٹ کی اور واپسی کیلئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ راستے میں اس نے اپنے ڈی آئی جی کے نمبر لا کر ایک آن کر دیا ساتھ ہی سراج کو اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

”ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ تم ان مشر اورنگ زیب۔ آئی ایم اسٹینڈنگ یو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔“

ایک لمبے بعد دوسری جانب سے آواز آئی بند ہو گئی تو سراج نے حیرت سے دریافت کیا۔

”اس کال کا کیا مطلب سمجھوں؟“

”میں رات تمہارے گھر پر تھا جب کسی نے ساحلی علاقے پر ہونے والی فائرنگ کی اطلاع دی، میں تمہارے ساتھ اپنی گاڑی پر آیا تو کھات لگے کچھ دھنوں نے ہمارے اوپر بھی فائرنگ کی۔۔۔ ہم خدا کی مہربانی سے بچ گئے، بعض ایک ٹارگیٹ پر تانی پڑی۔ اسی افراتفری میں، میں نے ڈی آئی جی صاحب کے نمبر ملائے تھے لیکن قریب کچھ آہستہ سن کر منگتے پر بریڈ ہی کیا تھا۔“ اورنگ زیب نے سچی فخر انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میری گاڑی کال کی بجائے پہلے واپس نہیں آ سکی۔ ساحلی علاقے پر ابھی موجود کی گاڑی کو تلوچش کرنا ہوگا۔“

”اور جو تین مہمان ہمارے ساتھ ہیں ان کے بارے میں کیا کہنا بیان کرنی ہوگی؟“ سراج نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ ایک خاص وقت تک نظری اٹلی جنس کی حویلی میں مہمان نوازی سے لطف اعدوز ہوں گے۔ اس لیے ان کے بارے میں بھولی ہی جاوے۔ اورنگ زیب نے بائیں آنکھ جھپک کر کہا تو سراج نے اسے اس انداز میں دیکھا جیسے وہ کسی پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں الجھ رہا ہو۔



شیخ حامد کی حالت اس وقت قابل دیدہ ہی تھی جب اس نے صبح کے ناشتے کے بعد ٹی وی کھولا تھا۔ خبروں میں اس ہنگامے کے بارے میں طویل کوریج دی گئی جو کشیدرات ساحلی علاقے پر پیش آیا تھا۔ خبر پڑنے والے کے اشتداد پر اس کے نمائندے نے بتایا تھا کہ ”ساحلی علاقے کے علاوہ رہائشی علاقے کی ایک بڑی سڑک پر سے بھی ایک لاش دریافت کی گئی ہے جس کے بارے میں یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ فرار ہوتے وقت وہ یا تو خود گاڑی سے گرا ہوگا یا پھر اس کے ساتھیوں نے اس کے مرنے کا یقین ہو جانے کے بعد کھن ڈن کی علت سے پیچھے کی خاطر اسے ازخود لاوارث چھوڑ دیا۔“ مزید وضاحت پر اس نے کہا تھا کہ ”حقائق قاتنے کے افسران اس حادثے کے بارے میں کوئی بیان دینے سے گریز کر رہے ہیں دوسری ایجنسیاں بھی اس حقیقت سے لاعلمی کا اظہار کر رہی ہیں جبکہ ایک اندازے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو بارنیوں کے درمیان مکمل کر فائرنگ کا تبادلہ کیا گیا پھر وہ دونوں جانے جاتے ہوئے یہی اس طرح چھوڑتے ہو گئیں کہ کسی گاڑیوں کا نذرانہ نہ ہوئی۔“ نمائندے نے ایک اور سوال کے جواب میں یہ بھی کہا کہ ”ساحل پر واقع ایک اسپتال کے قریب دو فرلانگ کے فاصلے پر سینٹر ایس پی اورنگ زیب کی ذاتی استعمال کی گاڑی بھی لی گئی جس کا ایک ٹائر پھٹ گیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں مطلوب ایس پی سے بھی رابطہ قائم کرنے کی متعدد کوشش کی لیکن سینٹر ایس پی نے بھی کوئی تفصیل نہیں بتائی، ان کا ایک ہی جواب تھا کہ انہوں نے اپنے متعلقہ افسران کو تفصیل سے آگاہ کر دیا ہے۔“

”نہز ایجنسی کے نمائندے نے کچھ ایسی افواہوں کو بھی گور کیا جو تعداد میں چھ یا سات تھیں۔ لاشیں ایک دوسرے سے دور دور بکری پڑی نظر آ رہی تھیں۔“

شیخ حامد ناشا درمیان میں چھوڑ کر اٹھ گیا۔ جولاہن ٹی وی پر دکھائی گئی تھیں ان کے چہرے اس کے جانے پہچانے تھے اور ان جرائم پیشہ اور پولیس کو مطلوبہ مجرموں کے تھے جنہیں شیخ حامد نے حکام کی کٹوں کی طرح پال رکھا تھا۔

ٹی وی کی خبروں کے بعد شیخ حامد نے صبح کے اخبارات دیکھے، صرف ایک انگریزی اخبار نے ”اسٹاپ پریس“ کے پاس میں اس حادثے کی مختصر تشدد کی گئی۔ شیخ حامد نے جھلا کر نمبر نو سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب ملنے کے بجائے ”نہز ڈیٹا فیکٹور پاور ڈ آف“ کی صدا بار بار سنائی دی۔ نمبر نو کی خاموشی شیخ حامد کی انجھوں میں اضافہ کر رہی تھی، اس نے نمبر نو کے بعد ایک دو اور احماد کے آدھوں کو فون کیا لیکن کسی سے رابطہ نہ ہو سکا، سب ہی نمبر بندل رہے تھے۔

پانچ سات منٹ تک وہ کسی ڈیجی دورے کی طرح ٹھٹھا رہا اور پچھلا ہونٹ کاٹا رہا پھر اس نے وہ نمبر آڑا یا جہاں افضل خان کو رکھا گیا تھا۔ اس بار اسے ناکا ہی نہیں ہوئی۔

”سب لوگ کہاں سرگئے؟“ رابطہ قائم ہونے پر وہ ہواؤں نے لگا۔ ”جس قیدی کو تمہاری عمرانی میں رکھا گیا تھا وہ کہاں ہے؟“

”کل رات اسلم ڈاک صاحب نے ان سے آخری ملاقات کی تھی سر۔۔۔ پھر وہ مجھے یہ ہدایت کر

کے پلے گئے تھے کہ اگر قیدی کہیں جانے لگے تو اسے روکنے کی کوشش نہ کی جائے۔۔۔۔۔ اس کے بعد کل رات ہی قیدی بھی چلا گیا تھا۔

”اس وقت جہاز سے ڈاکو اور اہلکار صاحب کہاں ہیں؟“

”مجھے نہیں معلوم سر۔۔۔۔۔ میں نے انہیں ابھی فون کیا تھا لیکن۔۔۔۔۔“

فتح حامد نے اس کا جواب سننے کی زحمت نہیں گوارا کی، نمبر نو کا فون بند ملتا اور ٹی وی کی کوریج اس بات کی تصدیق کر رہی تھی کہ گزشتہ رات کے حادثے میں یا تو وہ جنم رسید ہو گیا یا پھر پولیس کی تحویل میں ہو گا۔ افضل خان بھی جہاز میں ہو گا کیونکہ اس کے نمبر بھی بند نہ تھے۔ یہ تمام صورت حال اس کیلئے نہایت مہربان رہی، افضل خان کو چکا کو زندہ یا مردہ لانے کی ہدایت دی گئی تھی، امدادی کو گاؤ پر کرے اسے چکا کو اس کے محل سے نکالنا مقصود تھا جہاں وہ درپوش تھا لیکن بساط یقیناً پلٹ گئی تھی، ساحلی علاقے پر موجود لاشوں کی کوریج کی گئی تھی وہ سب اسلم ڈاکا کے ماتحت تھے۔

”وہ سب ساحلی علاقے پر کس مقصد سے جمع ہوئے تھے کیا امدادی اور چکا ساحلی علاقے پر کہیں روپوش تھے۔۔۔۔۔ جو قصاص ہوا وہ کن پارٹیشن کے درمیان ہوا؟۔۔۔۔۔ ایک پارٹی نمبر ٹو نے تحلیل دی ہوگی۔۔۔۔۔ دوسری کون تھی؟۔۔۔۔۔ ایس بی اورنگ زیب کی گاڑی کس نے ڈاکوہ کی؟۔۔۔۔۔ وہ کس مقصد سے وہاں گیا تھا؟۔۔۔۔۔ کیا اسے کسی نے خبر دی تھی؟ اگر ایسا تھا تو اس بات کے امکان بعید از قیاس نہیں تھے کہ اسلم ڈاکا کے علاوہ امدادی اور چکا بھی غائب پولیس ہی کی حرمت میں ہوں گے جو حالات کو بتانے سے گریز کر رہی تھی؟“ اس کے علاوہ اور بھی بے شمار سوالات تھے جن کی یلغار نے فتح حامد کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ان سوالات کے جوابات ہر قیمت پر معلوم کرنا چاہتا تھا جو اس کے ذہن کو پر آئندہ کر رہے تھے۔ خاصی دیر تک وہ کسی نمبر سے ہوئے خطرناک طوفان کی طرح خاموش کھڑا اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مستلہ توڑتا رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر ڈی آئی جی کے نمبر ڈال کیے۔ اس بار اسے ڈاکا کی نہیں ہوئی۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ڈی آئی جی آفس۔۔۔۔۔ آغا محصور کے بچے کسی ماتحت نے کال ریسیو کیا۔

”فتح حامد بول رہا ہوں۔ آغا محصور سے بات کراؤ۔۔۔۔۔“

دومنت بعد آغا محصور نے کال ایڈیٹر کی توقع حامد نے بڑی مشکلوں سے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی ابھی بی بی خبریں دیکھ کر فارغ ہوا ہوں۔ خاصی گرما گرم صورت حال ہے جسے آپ لوگوں نے خاموشی اختیار کر کے غوام کیلئے اور پر اسرار بنادیا ہے، سب خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہوئی جناب تو میں خود آپ کی کال ریسیو کرتا۔۔۔۔۔ دوسری جانب سے پریشانی کا اظہار کیا گیا۔“ جو کچھ ہوا وہ خود میرے لیے ایک ہی معافی ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا اس کراؤ میں پولیس ایک فرین نہیں تھی؟“

”جی نہیں۔۔۔۔۔ ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ دوسری پارٹی کون تھی۔“ آئی جی نے وضاحت کی۔ ”ہمارے ایک پرنس نے لاشوں کی تصویر سے اس بات کی تصدیق، مردخانے کا ریکارڈ

ات پلٹ کرنے کے بعد بہر حال کر دی ہے کہ ان کے مقابلے پر کس کا ہاتھ تھا یہ نہیں پتا چلا۔“

”اور بھی بہت ساری الجھنیاں ہیں آغا محصور۔“ فتح حامد نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”سی، آئی، اے۔۔۔۔۔ اسٹی کرپشن سیل، اسٹی کرپشن کرائم برانچ، اس کے علاوہ ریجنل اور ملٹری کے بھی بہت سارے شعبے ہیں اور۔۔۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری پارٹی بھی کچھ جیسے اڈوں کی مالکان کی ہو۔“

”یہی معلوم کرنے کی خاطر تمام کوئے کھدروں کو ٹھولا جا رہا ہے۔“

”ایک امکان اور بھی ہے۔۔۔۔۔ اس بار فتح حامد نے جیسے ہوئے جیسے استعمال کیے۔“ ممکن ہے

تم بھی مجھے نالے کی خاطر یہ سب باتیں کر رہے ہو؟“

”آپ یہ شہس کر بنیاد پر کر رہے ہیں؟“ آئی جی نے لہجے میں بھی تاؤ کی کیفیت ابھرائی۔

”تم اپنے بیرونی ایس بی اورنگ زیب کو کیوں فراموش کر رہے ہو۔ اس کی گاڑی بھی تو اسی جگہ سے ملی ہے جہاں کراؤ ہوا تھا۔“

”یہی سوال دوسرے بھی کر رہے ہیں۔“ آئی جی نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”اورنگ زیب

کل رات سراج کے گھر پر تھا جب اسے ہنگامے کی اطلاع ملی تھی۔ وہ فوری طور پر وہاں پہنچا تھا لیکن

کچھ کمات میں پیٹھ لوگوں نے اس کی گاڑی پر بھی گولیاں برسائیں۔ بات صرف ایک ناکہ برست

ہونے پرش گئی، گاڑی کا توازن بگڑا ہی شاید ان دونوں افسران کی زندگی کا پہانہ بن گیا۔ ایس بی

نے کل رات ہی مجھے ساری پوزیشن سے باخبر کر دیا تھا مگر پولیس کے پہنچنے سے پہلے دونوں پارٹیاں جا

چکی تھیں۔“

”میں جہاز سے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ فتح حامد نے دوستانہ انداز میں سوال کیا۔

”دعا کریں کہ میری کرسی محفوظ رہے۔“ اعلیٰ افسروں کے سوالات نے تو فی الحال صبح

ناشتے کی مہلت بھی نہیں دی۔“

”خیرک ہے۔ تم اپنے آفسروں کو بگلتاؤ، میری کسی خدمت کی ضرورت ہو تو تکلف نہ

کرنا۔۔۔۔۔“

فتح حامد نے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی ریسیور کیڈل پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر جھنجس

کی علامتیں پہلے سے زیادہ نمایاں ہونے لگیں۔ نمبر نو افضل خان کے سراغ نہ ملنے کے ساتھ ساتھ

اسے چکا کی بھی کمر لاق تھی جس نے اسے غریب اخلاق تصور یوں کے ذریعے بلیک میل کرنے کی

کوشش کی تھی۔ وہ اس کا نئے کو ہر قیمت پر اپنے راستے سے ہٹانے کا خواہاں تھا۔ وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی جب اس کے موہاں پر سیکل موصول ہوا۔ روشن اسکرین

پر نمبر نو کا حوالہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”تم۔۔۔۔۔ اس نے موہاں آج کر کے خود پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔“ اب تک کہاں

مرے ہوئے تھے؟“

”میں بہت ڈنچی ہوں باس، بڑی مشکلوں سے ایک پرائیویٹ اسپتال سے مرہم بنی کرا کے

اپنے محفوظ ٹھکانے تک آیا ہوں، میں نے اس عرصے میں موہاں بند کر رکھا تھا۔“ اسلم ڈکانے بات جاری رکھی۔“ اگر پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو مصیبت ہی آ جاتی۔“

”افضل خان کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم، اس نے امداد علی کو بہر حال باؤ کر لیا تھا، چکا بھی اپنے مل سے نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ ساحلی علاقے پر وہ تینوں موجود تھے، افضل خان نے چکا کے آتے ہی اس پر پستول تان لیا تھا، میں قریب موجود تھا لیکن پھر..... اچانک سرکاری انجنی والوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے بھی جواب دے کر فٹفٹ کی گھانٹی مچی۔“ آخری بار میں نے افضل خان کو زمین پر گرے دیکھا تھا، اس کے بعد ہم کو اس قدر شدید فائرنگ میں الجھا پڑا کہ فرار کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی.....“

”کس انجنی کے لوگ تھے؟“

”وہ سب سیاہ پتلون اور لمبی آستینوں والی قمیصوں میں تھے۔“ اسلم ڈکانے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے پولیس یا پھر کسی اور انجنی کے کمانڈر دیکھے ہوں، ان کی اچانک مداخلت کا انداز کمانڈر یا کپتان سے ملتا جلتا تھا۔“

”اور کوئی خاص بات؟“ شیخ حامد نے غزاتے ہوئے دریافت کیا۔

”ایس بی اورنگ زیب بھی وہاں موجود تھا، سراج بھی ساتھ ہی ساتھ لیکن..... پولیس کی دوسری گاڑیاں نہیں تھیں، ہمارے ایک خاص آدمی نے ان دونوں کو راستے سے ہٹانے کا فوری منصوبہ بنالیا تھا لیکن ایس بی کی قسمت اچھی تھی کہ ٹائر برست ہونے کی وجہ سے گاڑی کا توازن بگڑ گیا۔ اب وہ دونوں زندہ ہیں یا مردہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“

”لیکن تم..... بہر حال اب بھی اپنی ناکامی کی خبر سنانے کے لیے زندہ ہو..... یوں آف اے چی، باسٹروڈ.....“ شیخ حامد ایک دم ہی آپے سے باہر ہو کر اسے مضحکاتنا سا بھرا اس نے موہاں آف کر دیا۔ اس کے تھوہرہ لہو خطرات کا گواہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں غمزدگی کے لیے کوئی مناسب اور آخری سزا کے بارے میں غور کر رہا تھا جب اس کے فون پر گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھا یا، غصے لپٹے میں بولا۔

”نیں..... شیخ حامد اسٹینکٹ۔“

”تم اس وقت شاید افضل خان کی ناکامی کا غم منارہے ہو گے؟“ دوسری جانب سے کسی نے نہایت سرد اور سفاک لہجے میں کہا۔ ”میری بات غور سے سنو..... ہمیں تمہارے غم سے زیادہ امداد علی اور استاد کی فکر ہے۔“

”کون کہتا ہے کہ میں.....؟“ شیخ حامد نے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہارا جائز باپ۔“ اس بار بھی سختی سے جواب دیا گیا۔ ”مجھے تمہارے سکنوں کی موت کا کوئی غم نہیں ہے۔ صرف استاد کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہوں، انکار کی صورت میں تمہاری اور سکول کی تصویروں منظر عام پر بھی آ سکتی ہیں۔“

”کہو اس مت کرو.....“ شیخ حامد نے تمللا کر کہا۔ ”چکا امداد علی..... دونوں کے بارے میں مجھے بھی کچھ نہیں معلوم۔“

”بہر حال، استاد کو پڑ کرنے کا حکم تمہاری تھا۔ کیا اس سے بھی انکار کرو گے؟“

”نہیں، میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔“ شیخ حامد روانی میں کہتا چلا گیا۔ ”جگہ نے مجھ سے پتلا لانے کی غلطی کر کے اپنی موت ہی کو دعوت دی تھی۔“

”ہر بھی ایک میان میں دو گواہیں برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ تمہیں ایک موقع مل سکتا ہے لیکن اسی صورت میں استاد کا پتا ہمیں بتا دو۔“

”اتحاد بات کر رہے ہو۔“ شیخ حامد طعن کے مل چپٹا۔ ”جب میں جانتا ہی نہیں کہ اب وہ طاحون زدہ چوہا کہاں سے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”اس کے آگے تمہاری رجحانی میں کسکتا ہوں۔“ غصے اور سخت لہجے میں کہا گیا۔ ”کرل احتشام کو جانتے ہو؟ کسی زمانے میں تم دونوں کلاس فیلو تھے اب وہ فٹری ٹیلی فون کا نمبر دے..... غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”لیکن موجودہ معاملے کا کرل احتشام سے۔“

”کیا قتل ہے؟ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ باقی کام تمہارا ہوگا۔“ دوسری جانب سے جملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی غصے آواز میں بات جاری رکھی گئی۔ ”تم کیا کہتے ہو شیخ حامد، تمہارے ڈی آئی جی کو بھی ایک دو ڈیڑی کے ایس بی نے گھنٹن چکر دیا ہے۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“ شیخ حامد نے چونک کر سوال کیا۔

”ایس بی اورنگ زیب کی..... اسی نے اپنے اثر و رسوخ سے کل رات کمانڈر کے ذریعے تمہارے منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا اور..... اب بھی وہ انجان بن رہا ہے۔ میری بات غور سے سنو..... افضل خان، امداد علی اور استاد کو فٹری کی خبر پر محفوظ کسٹری میں رکھا گیا ہے۔“

”آئی سی..... مجھے پہلے ہی شہ تھا کہ اورنگ زیب کی گاڑی ساحلی علاقے.....“

”یہ تمہارا اور ایس بی کا معاملہ ہے۔ کرل احتشام سے بات کر کے مجھے بتاؤ کہ تم استاد کے سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟“

”تم کرل کرل کے بارے میں جانتے ہو کہ وہ میرا کلاس فیلو تھا تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ کس قدر فرض شناس اور محب وطن ہے، مر جائے گا لیکن جگہ کے بارے میں میری بات نہیں مانے گا۔ وہ سکتا ہے کہ سرے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دے۔“

دوسری جانب سے فوراً ہی کوئی مطالبہ نہیں ہوا۔ کچھ توقف سے کہا گیا۔ ”میں کرل احتشام کے سلسلے میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔ تم صرف یہ معلوم کر لو کہ کیا کز شہ رات ای کی آدیوں نے آپریشن کیا تھا؟“

”فرض کو لو اس نے اقرار کر لیا، پھر تم.....“

اس کے جڑوں میں بیڑیاں بن گئیں تھیں، اس نے باسی کھانوں سے بچنے کی خاطر کنول کی تازہ ڈش کو قبول کر لیا تھا لیکن حالات نے اسے کنول سے بھی دور رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ حالات کی قسم ظریفی تھی جس نے جھگ کے بادشاہ کو صرف اپنی کچا رنگ بھدو کر دیا اور..... اور..... اچانک فتح حامد کے ذہن میں صابنیم کی خود کشی کا حادثہ اُٹھ آیا..... اسی ایک عورت کی خود کشی کے بعد اس کے اوپر غصہ کے باروں منڈلانے شروع ہوئے تھے۔ وہی ایک جائز رشتہ تھا جس کی آڑ میں وہ اپنے گھر کی چھت کے نیچے بھی من مانی کرتا تھا، رنگ رلیاں مانتا تھا لیکن اس نے خود کشی کر کے فتح حامد کے لیے دشواریاں پیدا کر دی تھیں پھر اس لیے اورنگ زیب کے آجانے کے بعد سراج بھی اس کے ساتھ مل کر ایک اور ایک گیارہ ہو گئے تھے اس کی جی بھائی بساط کے ہمراہ ایک ایک کر کے بننے لگے، پہلے افضل خان کو حالات کا شکار ہو کر تازہ کردہ گمانوں کی سزا بھگتی پڑی۔ وہ فتح حامد کیلئے کلیدی کردار کا مالک تھا۔ اس کے زوال کے بعد بلک ناٹیک کا سورج بھی گھبرا گیا..... شبنم کو بھی حالات کی گردش نے شکار کر لیا۔ اب اسلم کو ابھی طوفان کی لپیٹ میں تھا۔

فتح حامد کا ذہن بار بار اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ اس کے زوال کا سبب صابنیم کی خود کشی تھی جس کے بعد اورنگ زیب کی شاطرانہ چالوں نے اس کی جڑ بیاؤ کو ہلانا شروع کر دیا تھا۔ کل کی چکا اور اس قسم کے دوسرے ٹینگ لیڈر بھی فتح حامد کے راستوں سے تکرار کر چلنے کے عادی تھے مگر اب اورنگ زیب کی وجہ سے وہ بھی اپنی اوقات سے بڑھ رہے تھے۔ تازہ واقعے کے بعد فون پر ملنے والی ٹپ اور اس کی تصدیق ہو جانے کے بعد فتح حامد کا چوٹنا لازمی تھا۔ اس کے ذہن میں متعدد فنی طریقے ابھر رہے تھے جن کو اختیار کرنے کے بعد وہ اورنگ زیب کی چالوں کو کمزور کر سکتا تھا۔

خاصی دیر تک وہ اپنی کھوئی ہوئی سادھ کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی پلاننگ کرتا رہا پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا..... ممکن ہے کہ شبنم کے خواہش بھی اورنگ زیب کا ہاتھ ہو؟..... اسی نے چکا کو بھی کھلو اور کچھ دہ کی بنیاد پر خرید لیا ہو؟..... اقتدار کی ہوس نے اسلم کو کبھی غصاری پر آمادہ کر دیا ہو؟..... چکا کے سلسلے میں افضل خان کی کامیابی اسے متحیر نہ رہی ہو؟ شبنم بھی اورنگ زیب کی آلہ کار بن کر دوبارہ اس کے پاس آگئی ہو؟..... اس کے علاوہ اور بھی شکوک اور شبہات اس کے ذہن میں گرم ہوا کے تیز و تند تیزوں کی طرح گردش کر رہے تھے۔ اس کا ایلینس ذہن اورنگ زیب کی چالوں کا ڈو کرنے کی خاطر منغوسے بناتا رہا پھر..... ایک مثال اس کے وجود میں سنسنی ہوئی ابھری..... "کشتی طوفان کی زد میں آجائے تو اسے ڈوبنے سے بچانے کی خاطر تجربہ کار صلاح یافتہ جیتے مال بھی سمندر میں چھپ کر بوجھ بٹا کر لیتے ہیں۔" اس خیال کے ساتھ ہی اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ شکوک اور شبہات کو دور کرنے اور کمزور ہوتی ہوئی بازی کا نقشہ بدلنے کی خاطر کچھ مہرے پھٹانا اس کیلئے ضروری ہو گیا تھا، اس کے بعد وہ دشمن کی چالوں کو کمزور کر کے نئے سرے سے اپنی بازی جسا سکتا تھا۔ ان مہروں کے بساط سے ہٹ جانے کے بعد اورنگ زیب کی جی

"مہر، ہم استاد کو ہر صورت میں آزاد کرانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ہمارا کام ہوگا۔ تم صرف میری معلومات کی تصدیق کر دو، میں دس منٹ بعد تم سے دوبارہ رابطہ قائم کروں گا، اگر خیال رہے کہ تم نے اگر ڈبل کر اس کرنے یا ٹال مٹول کی حماقت کی تو وہ تصویریں جس میں لغانے میں بند نہیں رہیں گی۔ میڈیا کے علاوہ ایس بی اورنگ زیب بھی اسے ہر قیمت پر لینے کو آمادہ ہو جائے گا۔" اس جملے کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

فتح حامد نے ریسیور کرکٹ پر رکھا پھر اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ جو معلومات اسے فراہم کی گئی تھیں، ان میں وزن تھا، خاص طور پر اورنگ زیب کے حوالے نے اسے زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ دو چار منٹ تک وہ سچ و تاب کھاتا رہا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر کرنل اعظمیام کے گھر ملائے، ایک دو درمیانی رکاوٹ کے بعد کرنل کی آواز سننے لگی۔

"ہیلو فتح..... اس وقت ہماری یاد کیسے آگئی؟" بھٹکے سے بات کا آغاز ہوا۔

"جہیں کل رات کا محاذ سر کرنے کی مبارکباد دینا مقصود تھا۔"

"دکس بات کی؟"

"جگا سے اپنا بھی کچھ حساب کتاب لکھ کر لے کر۔" فتح حامد نے دورانہنگی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ تمہارے آدمیوں کی تحویل میں ہے۔"

"لیکن جہیں....."

"ڈونٹ وری..... فون پر بات کرتا مناسب نہیں ہوگا۔" میں کل تم سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔" اطمینان سے بات ہو گئی۔ "فتح حامد نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے فون بند کر دیا لیکن اب اس کے وجود میں ایک نیا آتش فشاں پھٹ پڑنے کو ہے۔ قریب قریب فون پر ملنے والی ٹپ کی تصدیق کے بعد اس کے ذہن میں صرف ایک نام صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا..... ایس بی اورنگ زیب..... جس نے بڑی کامیابی سے اسے ڈبل کر اس کیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کسی آخری فیصلے کو ذہن میں مرتب کر رہا تھا جب فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ دوسری جانب سے چکا کے بارے میں ٹپ دینے والے کی آواز ابھری۔

"کیا معلوم ہوا.....؟"

"تمہاری اطلاع غلط نہیں لیکن....."

"شکر ہے فتح حامد۔" جواب بات کاٹ کر دیا گیا۔ "تم نے ہماری ایک مشکل آسان کر دی، استاد کو کیسے نکالنا ہے؟ یہ سوچنا اب ہمارا کام ہے لیکن تم فی الحال چوبیس گھنٹوں تک خاموش ہی رہنا۔" استاد کو آزاد کرانے کے بعد تم سے دوبارہ بات ہوگی۔"

فتح حامد نے صفے سے ریسیور کرکٹ پر رکھا پھر ہاتھ ملنے لگا۔ بساط کا رخ اس اعجاز میں بھی پلٹ سکتا ہے۔ یہ خیال ہی اس کے جنون کو ہوا دینے کی خاطر بہت تھا۔ اب چوبیس گھنٹوں تک خاموش رہنے کی بندش کے حکم نے اس کے تن بدن میں جیسے آگے بھڑکا دی تھی۔ کنول کی تصویریں

جانی بازی بھی کمزور ہو سکتی تھی۔ اس کا فرض اور تک زیب کے علاوہ اگر کوئی اور بھی ہوتا تو وہ بھی ان جیتے جاگتے کرداروں کے ختم ہو جانے کے بعد آسانی سے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

اپنے نئے منصوبے پر غور و فکر کرنے کے بعد شیخ حامد نے قدرے سکون کا سانس لے کر موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے اور ضروری کوڈروڈ کے تبادلے کے بعد اس نے بڑے غصوں بچے میں حکم دیا۔ ”تم شیخ کو ساتھ لے کر آسم ڈاکا کے مکانے پر جاؤ، وہ دُھی حالت میں ہو گا۔ شیخ سے کہنا کہ وہ آسم ڈاکا کو گولی مار کر ختم کر دینے کے بعد میرا کھویا ہوا امانت دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ آسم ڈاکا کے خاموش ہو جانے کے بعد تم شیخ کو بھی گولی مار دیتا۔ تمہاری کامیابی تمہاری ترقی کی ضمانت بھی بن سکتی ہے۔ کام ہوشیاری سے کرنا، اس کے بعد کسی چپکے فون سے قریبی قحانے کو کسی فرضی نام سے حامد نے کی اطلاع بھی کر دینا اور ایڈ آل۔“

شیخ حامد نے موبائل آف کر کے دوسری بار کنول کے نمبر ڈائل کیے، دوسری جانب سے کنول کے بجائے اس کی ماں کی آواز ابھری تو اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ”کنول کہا ہے؟ اس کا موبائل تم نے کیوں استعمال کیا؟“

”آپ کی ہدایت پر وہ جا رہا تھا۔ وقت موبائل مجھے دے گئی تھی۔“ خشک لہجے میں جواب ملا۔ ”میں نے اسے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔“ شیخ حامد تھلا کر بولا۔ ”وہ کب گئی اور کہاں کا کہہ کر گئی ہے؟“

”مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“ اس بار بھی پتہ آواز میں کہا گیا۔ ”اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ آپ نے اسے بلوایا ہے، کہاں؟ اس کی وضاحت اس نے نہیں کی تھی۔“

”گاڑو کہاں ہے؟“ شیخ حامد نے ہونٹ چپاتے ہوئے گھماٹا انداز اختیار کیا۔ ”نیچے جا کر فوری طور پر اس سے میری بات کراؤ۔“

ایک منٹ بعد ڈیوٹی گاڑو نے جو کچھ کہا اس نے سن کر شیخ حامد کے پیروں تلے سے زمین ترک مٹی۔ اس کے بیان کے مطابق کنول جس آدمی کے ساتھ گئی تھی وہ آسم ڈاکا کا دست راست تھا لیکن شیخ حامد اسے خود اپنی نظروں سے نی وی پر ان افراد کی لاشوں میں دیکھ چکا تھا جن کو واضح طور پر متعدد بار کورینج دی گئی تھی۔



لیاقت حسین کو جو کام سونپا گیا تھا وہ زیادہ مشکل نہیں تھا، سپروائزر کے فرائض سمجھنے میں بے مشکل دو دن لگے تھے، کام کرنے والے سب ہی شریف لوگ تھے۔ لیاقت کے کمری پر بیٹھنے کے بعد انہیں احساس ہوا تھا کہ شاید ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھ کر سپروائزر کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ دفتر والوں پر اپنا سکے جمانے کی خاطر کچھ دنوں تک رعب میں رکھنے کی کوشش کرے گا لیکن لیاقت حسین نے روز اول ہی سے اپنی شرافت اور محنت بھری باتوں سے ان کے دل جیت لیے تھے۔ دو روز بعد کسی کام سے

سیخ عثمان کے دفتر میں گیا تو انہوں نے اسے روک کر کہا۔

”تمہارا کام کیسا چل رہا ہے لیاقت حسین؟“

”خدا کا شکر ہے، ہر کام نہایت بخوبی سے انجام دیا جا رہا ہے لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”لیکن کیا.....؟“ سیخ عثمان نے وضاحت طلب انداز میں دریافت کیا۔

”میرے کچھ مانت مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے اور تجربہ کار لوگ ہیں۔ اگر آپ ان میں سے کسی کو.....“

”سمجھ گیا۔“ سیخ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اس بات کی فکر مت کرو، میں جانتا ہوں کہ کون در کس اہلیت کا ہے، اسے اسی کی محنت اور قابلیت کے اعتبار سے مواضع بھی ملتا ہے۔ ویسے میری اطلاع ہے کہ تم نے کرسی سنبھال لی ہے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔“

”یہی آپ کی محبت ہے ورنہ کہاں ایک ڈرائیور انداز کہاں.....“

”لیاقت حسین.....“ سیخ عثمان نے اسے تنبیہ کے ٹوکا۔ ”دوبارہ اس قسم کی بات بھی نہ کرنا۔ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا تم اس سے کہیں زیادہ کے سختی تھے۔ میں تمہارے احسانوں کو بھولا نہیں ہوں۔“

”سر.....“ لیاقت حسین نے قدرے جھج کر پوچھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ آپ نے کسی نئے ڈرائیور کیلئے اشتہار دیا ہے؟“

”ہاں..... کیوں؟“

”آپ نے میری ترقی کے وقت وعدہ کیا تھا کہ جب تک میرا دانہ پانی آپ کے ساتھ لگھا ہوا ہے، آپ کی گاڑی میرے علاوہ.....“

”مجھے یاد ہے.....“ سیخ عثمان نے محبت سے جواب دیا۔ ”ڈرائیور کی ضرورت مجھے آؤٹ ڈور وک کیلئے ہے۔“

”پھر ٹھیک ہے.....“ لیاقت حسین نے سکون کی سانس لی۔ ”کچھ دیر بعد وہ اٹھنے لگا تو سیخ عثمان نے اسے روک کر کہا۔

”ابنسی میں جنہیں تکلیف تو نہیں ہے؟“

”تکلیف کسی؟ میں پہلے بھی تو فرمیں کے ساتھ اسی ابنسی میں رہتا تھا۔“

”میرا مطلب کچھ اور تھا۔“ سیخ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ”قریب رہنے کی وجہ سے راحیلہ، فرمیں کو بار بار بلا لیتی ہیں اور.....“

”یہ نیکی صاحبہ کی مہربانی ہے کہ وہ فرمیں کو اپنے برابر بیٹھے کا موقع دیتی ہیں۔“

”تو پھر آج رات بھی تمہیں دیکر سخت ہارنا ہو گا۔“ سیخ عثمان نے کہا۔ ”راحیلہ نے کچھ خواتین کو رات کمانے پر بلایا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ اس موقع پر فرمیں بھی ان کے ساتھ رہے۔“

"یہ تو ہمارے لیے بڑی عزت کی بات ہے، میں بھلا برا کیوں مانوں گا۔" لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کہا مگر کچھ دیر دلتی معاملات پر تبادلہ خیالات کرنے کے بعد اپنے آئس میں آگیا۔ مغرب کی غماز کے بعد فرمین بن سنور کر کر کے سے باہر نکلی تو لیاقت حسین نے چمپےزے کی خاطر کہا۔

"یہ روپ سنگھار کر کے کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہے؟"
"پہلے یہ تاکر کسی لگ رہی ہوں؟" فرمین نے پوچھا۔
"تو ہر حال میں میرے پتوں کی رانی ہی لگتی ہے۔" لیاقت حسین نے نیکلت سنجیدگی سے کہا۔

"یاد ہے..... آج سٹیجر ہے؟"
"یاد تو ہے لیکن آج تجھے دیر تک میرا انتظار کرنا پڑا گا۔" فرمین نے اس کی بات سمجھ کر بڑے لاڈ سے کہا۔ "تیکم صاحب کی بات نہ ہوتی تو میں انکار کر دیتی لیکن تو ہی تان کر نہ سو جانا۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔"

"خیال ہے تیرا..... بڑے آدمیوں کے ہاں دھتوں کے مقبول پر رات کا کھانا بھی ساڑھے دس گیارہ بجے سے پہلے شروع نہیں ہوتا تھیں وہیے گی پھٹی ہے۔"

"کہتا تو تھیک ہے....." فرمین نے لیاقت حسین کے قریب آ کر کہا پھر اس کی دلجوئی کی خاطر بولی۔ "تو کیے تو میں تیکم صاحب سے چٹاری یا سرورہ کا ہانا کر کے جان چڑھاؤں؟"

"نہیں..... میں تو صرف تجھے آزمانے کی خاطر کہتا رہا تھا۔" لیاقت حسین نے کہا۔ "مٹان صاحب نے آج دفتر ہی میں بتا دیا تھا کہ تیکم صاحب تجھے دعوت کے موقع پر اپنے ساتھ رکھیں گی۔"

جتنی دیر فرمین سنگار میز کے سامنے کھڑی کھوم پھر کر اپنا جانو لپٹی رہی لیاقت حسین اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا، جب وہ جانے لگی تو لیاقت حسین نے حسب معمول اپنا ٹیکس ایک پیار کی شکل میں وصول کرنے سے بھی روک لی نہیں کیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ کا ٹھکانا تھا، وہ جاتا تھا فرمین کی واپسی تمام مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد ہی ہوگی۔ اسے وہاں ہی میں رات کے بارہ بجے بج سکتے تھے، راجا بیکم اسے بھنوں کی طرح پیار کرتی تھیں اس لیے دعوت اور دوسری تقریبات کے موقع پر اسے ساتھ ہی رکھتی تھیں۔

لیاقت حسین نے سوچے کھا کھا یا پھر وہ لینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ سراج کا فون آگیا۔
"کیسے ہو لیاقت حسین.....؟"

"وہی پہلا جیسا صاحب لیکن آپ نے اب بھلا ہی دیا۔" لیاقت حسین نے کھوہ کیا۔
"کچھ دفتر میں مصروفیات بڑھ گئی ہیں جس کی وجہ سے وقت نہیں نکال سکا روز تم ہونے والی

جڑ نہیں۔"
"اس وقت کیسے یاد کیا، کہا میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں؟"

"ابھی نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ ایک روز میں ہمیں تمہاری ضرورت پیش آئے، ایس بی

اورنگ زیب جی جنہیں بہت یاد کرتے ہیں۔"

"میں آپ کا خادم ہوں صاحب، جب ضرورت ہو یاد کر لیجئے گا۔"

سراج سے منگنے کے بعد وہ لباس تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گیا، فرمین کے خیال سے اس نے خواب گاہ کے دروازے کو بند نہیں کیا تھا، کچھ دیر کروٹیں بدلتے کے بعد اسے نیند آنے لگی تو اس نے بید سوچنے سے دوسری جتان بھا کر صرف پچھلے گلابی رنگ کا ایک ٹائٹ بلب چلتے دیا۔ کچھ دیر کروٹیں لینے کے بعد اس کے خراٹے بھی ختم ہوئے شروع ہو گئے۔ بہت دنوں بعد یہ پہلا اتفاق تھا کہ سٹیجر روزہ بستر پر تنہا لیٹا تھا ورنہ یہ رات شادی کے بعد سے اس کے اور فرمین دونوں کیلئے بہت ہم ہوتی تھی۔

لیاقت حسین کب تک نیند کی وادہوں میں ڈوبا رہا اسے یاد نہیں رہا لیکن مگر شاید وہ عذاب ہی کی کیفیت تھی جب اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی سنان ویرانے میں کھنڈر کے درمیان کہیں پھنس گیا ہو جہاں ہر سو پتھر کے عجیب و غریب مجسمے منہ بھاڑ کر اسے گل جانے کو آمادہ نظر آ رہے تھے، وہ گھپ اندھیرے میں ان کے درمیان سے بچتا بچتا نکلنے کی کوشش کر رہا تھا جب ایک قد آور کالا بھنگا انسان اپنی مکروہ شکل کے ساتھ اس کے راستے کی دیوار بن گیا۔ لیاقت حسین کی خوفزدہ نظریں اس سیاہ فام مکروہ شکل انسان کے چہرے پر مرکوز تھیں جب ایک تہہہ اس کی قوت صاحت سے ٹکرایا پھر کسی نے اسے لٹکا کر تھا تھا۔

"مسلمے..... آج تو پوری طرح ہمارے جاں میں پھنس گیا ہے، آج میں تیرے شریر کو دیوی کے جڑوں میں بلیدان کروں گا مگر تیرے خون سے اٹھان کر کے بھوانی کے سامنے اپنی وجہ کا اعلان کروں گا۔ تو بہت بھگتا کر رہا، چھپا رہا پھر تو آج تیری کھاٹ کھڑی ہونے کا سہ آگیا ہے۔"

لیاقت حسین دم سارے کھڑا اس کی یہ افطرت ہوئے کو دیکھ رہا تھا جب کسی نے نہایت نرم گرمخوس آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "لیاقت پتر، تو ان گندری بدردھوں کی کوئی گھومت کر، اپنے خدا کو یاد کر۔ آیت انکری پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے، کوئی گندری طاقت تیرے قریب بھی نہیں چھٹک سکتی گی۔" لیاقت حسین نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ اس کی ماں کی آواز تھی۔ وہ لیاقت حسین کو بھونے کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی جب سیاہ بھنگا ہوئے نے قہقہہ کر کہا۔ "تو جو کوئی بھی ہے میرے راستے سے دور ہو جائیں تو تو بھی جمل کر جسم ہو جائے گی۔" جلتے کے ساتھ ساتھ اس نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے چمکا تو چنگلی جانوروں کے شور و فل کی آواز چاروں طرف سے ابھر نے لگی۔ لیاقت حسین کی ماں کی آواز ان میں دب کر وہ گئی۔

لیاقت حسین نے اپنی دہی گھڑی کے چری پٹے کو نکولا۔ موسم کا مہکا ہوا تھوینڈ اب بھی پٹے کے نیچے موجود تھا۔

"کیا کھانا رہا ہے مسلمے۔ آج رھتی کی کوئی کھستی تجھے شرن (بنا) نہیں دے سکے گی۔ پر تباہ نے تجھے جو شراب دینے کی غالی تھی، دیوی کی کرپا سے وہ آج ضروری پوری ہوگی، تو نے

میرے ایک منتر کو کھنکھانے کے کسی کی جان بچا لی تھی۔ آج تجھے اس کی سزا ادا ہو گئی پڑے گی۔“
 پرتاب کا نام نہ کر لیا تو حسین کے وجود میں پگھلا کر پختہ ہو گئے، اس نے خدا کو دل سے یاد کی بھر دل کڑا کر کہے۔ ”تم اپنی مانی کر لو، لیکن میں جانتا ہوں کہ میں نے جو بھی کیا تھا وہ کسی کی زندگی بچا نے کی خاطر خدا کا نام لے کر کیا تھا۔ اسی لڑاؤ والی قوت نے آج تک میری مدد کی تھی اور اب بھی وہی میری حفاظت کرے گا۔“

”سنئے دیکھنا چھوڑ دے سوکھ۔ آج تو پوری طرح پرتاب کے ہیروں کے چنگل میں پھنس گیا ہے اور۔۔۔ اور تو جس مہم کرم کی بات کر رہا ہے آج وہ بھی بھولانی کی کپا سے نطف ہو جائے گا۔ ایک بار تو محمد اور پلید ہو گیا تو پھر کون کتنی تیری سہا جی نہیں کرے گی۔“

لیاقت حسین نے جواب دینا چاہا لیکن اس نے پیار سے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ بڑبڑا کر اٹھ گیا، ”مہم نائن بلب کی روشنی کے باوجود اس نے فریمن کو پہچان لیا جو اس کے قریب بیٹھی تھی، اس کے ہنر پر ابھی تک وہی لباس تھا جسے مہم نے کراچیہ جگر کی طرف بھیجی تھی۔“

”مہم۔۔۔ تم کب آئیں۔۔۔؟“ لیاقت حسین نے خواب کی باتوں کو ذہن سے ہٹا کر فریمن کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

”تیری خاطر بیگم صاحب سے بات بنا کر آئی ہوں۔۔۔ چھوڑ تو سکی، لباس تبدیل کر لینے دے۔۔۔ دس پندرہ منٹ کا کھد کر آئی ہوں، ابھی وہاں بھی جانا ہے۔“

”ایک دن تو نے دفتر جاتے وقت میرا لباس خراب کیا تھا، آج تیری باری ہے۔“ لیاقت حسین نے فریمن کو پوری طرح دیو لچا تو فریمن نے کہا۔

”دیکھ استری خراب ہو جائے گی۔۔۔ ایک منٹ مہم کر لے، میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔“ فریمن نے کسمار کر لیا تو حسین کے بازوؤں کے حصار سے لٹکنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے

نیم حریاں گماڑ جسم سے چھوٹی ہوئی مہم نے لیاقت حسین کو دیکھ کر رکھا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ فریمن پر حاوی ہو رہا تھا جب اس کے کانوں میں ایک غصہ آواز ابھری۔

”سنجیل جانا دانہ درندہ دلدل میں گر جائے گا۔ موسم جارہا کیا ہوا تعویذ خاموشی سے نکال کر عورت کے سینے پر رکھ دے۔“

لیاقت حسین کی پیش قدمی رک گئی، تعویذ سے متعلق اس کے ذہن میں ماں کی باتیں گونجنے لگیں۔ ایک بار پہلے بھی وہ فریمن کے دھوکے میں غلامی میں گرے کرتے باں بال بچا تھا۔ آج

کسی غیبی آواز نے اسے بروقت تنبیہ دیا تھا۔ اس نے فریمن کو غور سے دیکھا پھر اسے ایک ہاتھ کے حصار میں جڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس دہی گھڑی کے پٹے کے نیچے دبا ہوا تعویذ نکالا تو فریمن کے

روپ میں نظر آنے والی حسینہ نے جھپٹے ہوئے گھٹی مٹائی آواز میں کہا۔
 ”لیاقت۔۔۔ اتنی زور سے نہ جھنجھ۔۔۔ میرا دم۔۔۔ گھٹ رہا ہے۔“
 ”انسان پرستی سوار ہو رہی تو عورت کو بھی من مانی پوری کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ تو، تو اپنی

فریمن ہے۔“ لیاقت حسین نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا پھر تعویذ عورت کے گداز سینے کے درمیان رکھا تو وہ ٹیگٹ ڈھانی انداز میں چپٹنے لگی۔ لیاقت حسین اچھل کر بستر سے نیچے آ گیا، عورت کا جسم پاؤں کی جانب سے بدترتیب سیاہی مائل اختیار کر کے دھویں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ لیاقت حسین نے کمرے کی جھتی روشن کر دی، وہ جھٹی پھنسی نظروں سے عورت کے عینک انجام کو دکھ رہا تھا جب دروازے کی جانب سے ایک مکروہ آواز ابھری۔

”سلے۔۔۔ میری بھانجی کو چھوڑ دے ورنہ میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔“
 لیاقت حسین نے پلٹ کر دیکھا، دروازے کے پتھوں دیوچ پرتاب بھوشن سینہ تانے نکلا، اسے حفاظت ہمہ گیر نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں شعلے جھلک رہے تھے۔ بھانجی دھوکی ڈھانی جھججہ دستور دروازے سے نکلا رہی تھی، جب تک صدمہ سیاہی قائم اور مکروہ صورت پرتاب نے دوبارہ ہل نہ کیا کہہ گا۔

”میرا کہا ناں لے سلے ورنہ تیرا انجام بھی بھیاک ہو گا۔ میرے تیرے ہوتو توں کو بھلو دیکھ لوں گا جس جھتی نے تجھے تعین لگا رکھی ہے اس کی کھات بھی گھڑی کر دوں گا۔“

لیاقت حسین کچھ جواب دینا چاہتا تھا جب کبھی ایک کڑا کا ہوا۔ پرتاب بھوشن کے چہرے پر مردنی چھائی، وہ تیزی سے پلٹ کر باہر کی طرف بھاگا۔ لیاقت حسین اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ کہیں نہیں ملا تو وہ پلٹ کر اندر آ گیا۔ بھانجی کی لاش جل کر کوندہ ہو رہی تھی پھر اس نے راکھ کی شکل اختیار کی جس کے بعد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور راکھ کو بھی سیٹھ لے گیا۔ اعلیٰ چادر پر ایک معمولی سی سلوٹ کلائن بھی نہیں تھا۔ تعویذ بھی غائب ہو گیا تھا۔

جو بھی ہوا وہ کسی مہجر سے گم نہیں تھا۔ لیاقت حسین نے اسی وقت حمل کر کے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر دوبارہ بستر پر لیٹ کر پرتاب بھوشن کے بارے میں سوچنے لگا۔



سراج بھی اس وقت ایس بی اورنگ زیب کے دفتر میں موجود تھا چنانچہ اس کی کالیں بھی اورنگ زیب ہی کے فون پر آ رہی تھیں لیکن تمام کالیں ایک ہیڈ کاشیبل ریسیور پر رہا تھا۔ اورنگ زیب اور سراج دونوں ہی خاموش بیٹھے اپنی اپنی سوچ میں گم تھے جب پھر فون کی گھنٹی بجی اور حسب معمول ہیڈ کاشیبل نے کال ریسیور۔ اس بار اس نے یہ کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کی تھی کہ دونوں افسران باہر گئے ہوئے ہیں لیکن دوسری طرف سے جو باج گئی تھی اسے سن کر ہیڈ کاشیبل نے ایک کانڈ پر جلدی سے ڈبل آئیکس فور لکھ لکھ اورنگ زیب کے سامنے رکھے ہوئے پھون پر کہا تھا۔

”میں غلط بیانی نہیں کر رہا ہوں جناب۔۔۔ صاحب جیسے ہی وہاں آئیں گے میں آپ کا پیغام۔۔۔“

اورنگ زیب نے کانڈ پر ڈبل آئیکس فور لکھا دیکھ کر ریسیور ہیڈ کاشیبل کے ہاتھ سے چھپٹ لیا، معذرت کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔ ”آئی ام سوری سر۔۔۔ لیکن میڈیا کے علاوہ دوسرے

لوگوں نے جینا غدا ب کر رکھا ہے۔“
 ”جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔ دوسری سمت سے، ایک بھاری بھر کم آواز گونجی۔“ لیکن، کیا جہیں یقین ہے کہ تمہاری پلاننگ کامیاب ہو جائے گی؟“

”آپ کا تعاون شامل رہا تو مجھے کامیابی کی پوری پوری امید ہے۔“
 ”جو کچھ کرنا ہاتھ چڑھتا ہے، کرنا تمہارا آؤ کوئیں بھی صبح سے اپنے تعلقات کو کھنگال رہا ہے۔ ایک بات اور بھی ہے، ابھی کچھ دیر پہلے ملٹی انٹلیجنس کے سربراہ کی کال آئی تھی، آؤ کوئیں کوئی طرح خبر مل گئی ہے کہ گزشتہ رات کی کارروائی اسی کے مکائنڈز نے کی تھی۔ کیا تم کو علم ہے کہ کون سی اختتام اور تمہارا مطلوبہ مجرم دونوں کلاں فیلڈ میں رہ گئے ہیں۔“

”جانتا ہوں سر۔۔۔۔۔۔ اسی وجہ سے آؤ کوئیں نے اسے اس کا بھی کیا ہوگا۔“
 ”کیا مطلب؟“ دوسری جانب سے چونک کر وضاحت طلب کی گئی۔

جواب میں اورنگ زیب نے اپنی پلاننگ بتاتے ہوئے جو کچھ کہا اس کے سر اس پر بھی چڑھا تھا۔

”میں تمہارے لیے صرف دعائی کر سکتا ہوں اورنگ زیب۔“ اس بار دوسری جانب سے بڑی اہمیت سے کہا گیا۔ ”تم نے جو پلاننگ کی ہے وہ خدا کرے کامیاب ہو لیکن اگر۔۔۔۔۔۔ آؤ کوئیں کو ایک۔۔۔۔۔۔ لوڑ پوائنٹ بھی مل گیا تو تمہاری بساط پلٹ بھی سکتا ہے۔“

”اکھاڑے میں جیت صرف کسی ایک ہی پہلو ان کی ہوتی ہے سر۔۔۔۔۔۔ لیکن میں نے جو جیت اب تک اٹھا کر لیے ہیں اور جو ایکشن ابھی لیے ہیں ان کی کامیابی کے بعد وہ پوری طرح قانون کے آہنی قلابوں میں ہوگا۔“

”اوکے۔۔۔۔۔۔ ٹی وی پر گزرتا۔۔۔۔۔۔ دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا تو اورنگ زیب نے ریسیور کرینڈل پر رکھنے کے بجائے دو نمبر کھما کر لائن منقطع کر دی پھر ہیکر کا فیلڈ کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے سراج سے مسکرا کر پوچھا۔

”تمہارے ذہن میں کیا سوالات گونج رہے ہیں؟“

”وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی مردہ آدمی کے میس میں کسی اور آدمی کے ڈیرے کنٹرول کو انوار کر لینا ایک قابل تعریف عمل ہے لیکن کیا آپ کو امید ہے کہ وہ بھی آپ کے حق میں بیان دے گی جبکہ وہ باقاعدہ آؤ کوئیں سے شادی بھی کر چکی ہے؟“

”ایسا ہی ہوگا اور یہ بھی تمہارے حق میں ایک پلس پوائنٹ ہوگا۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم شاید یہ نہیں جانتے کہ کنٹرول کے والد کو بھی اسی خون آشام آؤ کوئیں نے سزا باز موت کے گھاٹ اترا دیا تھا اور ایک مجبور عورت تڑپ کر رہ گئی تھی۔ آج بھی اس نے زبان بند کر رکھی ہے، اس وقت بھی خاموش رہی تھی جب آؤ کوئیں نے کنٹرول کے ساتھ محض محفوظ میاشینی کی خاطر کراچ پر حملوایا تھا۔“

”حیرت انگیز۔۔۔۔۔۔ سراج نے تعجب کا اظہار کیا۔“ اسے کم عرصے میں آپ نے آؤ کوئیں کے بارے میں اتنی ساری معلومات کیسے حاصل کر لیں؟ یہ بھی معلوم کر لیا کہ کون سی اختتام اس کا کلاں فیلڈ وہ چکا ہے اور۔۔۔۔۔۔“

”تمہارے سارے سوالات کے جواب میں ایک بات واضح کر دوں تو شاید تم آسانی سے سب کچھ سمجھ لو گے۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”آؤ کوئیں کو کیخبر کدوا رنگ پہنچانے کی خاطر مرکز کی جانب سے میرا انتخاب کیا گیا تھا چنانچہ میں نے یہاں ڈیوٹی جوائن کرنے سے چند ہی بہت ساری معلومات حاصل کر لی تھیں جو اب میرے لیے کارآمد ثابت ہو رہی ہیں۔ تمہیں شاید یہ سن کر تعجب ہوگا کہ تمہاری میڈیم روپی کے شوہر خالد ریاض کی موت میں بھی اسی۔۔۔۔۔۔ آؤ کوئیں کا ہاتھ تھا۔ نہ ہوتا تو میڈیم اس کے خلاف قاتل قائم کرنے کی خاطر پرائز روٹل کے ان تین آدمیوں کی خدمات بھی بھی نہ حاصل کرتی جن میں سے دوسرے بھی ہیں، صرف لوہن زندہ ہے اور۔۔۔۔۔۔ شبنم کی ماں انجلا عرف انجم آرا کی موت بھی اسی ایجنسی کی کئیگی کی جو آج شیخ حامد کی صورت میں ایک عزت دار اور بااثر آدمی بنا بیٹھا نہ جانے کتنے شریف لوگوں کو اپنی خرافات سے پریشان کر رہا ہے۔“

اورنگ زیب بات کرتا ہوا سراج حیرت سے کھلی ہانڈے اسے گھورتا رہا پھر جب وہ خاموش ہوا تو سراج نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ”آپ نے جہاں اتنی باتوں کا اعتراف کر لیا ہے وہاں ایک بات اور بتا دو۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔“ جواب میں اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”تم شاید شبنم کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہو؟“

”کو کیا آپ کو علم ہے کہ وہ کسی طرح تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور اب کہاں ہو گی؟“
 ”ہاں۔۔۔۔۔۔ مجھے اب بھی اس کی ایک ایک نقل و حرکت کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ افضل خان کو بھی دھواں دھار فائزنگ کے تیار لے کے بعد میرے ہی اشارے پر محفوظ راستہ دیا گیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سن لو کہ شبنم اور افضل خان کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ میری پلاننگ کیا تھی اور کیا ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ کیا آؤ کوئیں بھی آپ کی تمام پلاننگ سے بے خبر ہوگا؟“
 ”اس کا اندازہ بھی مجھے ایک دو دن کے اندر ہو جائے گا۔“

جواب میں سراج کچھ اور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ موبائل پر کسی کے نمبر روشن ہوئے۔ اورنگ زیب نے موبائل آن کرنے میں غیر معمولی جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی نئی اطلاع۔۔۔۔۔۔ آئی سی۔۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اب بھی تمہارے ساتھ تعاون کرنے میں کسی ڈیل کس کرنے کے منصوبے پر غور نہیں کر رہا۔۔۔۔۔۔ اوکے۔۔۔۔۔۔ تم وہاں پہنچوں میں مکائنڈز کے چیف آفیسر سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ اوہ۔۔۔۔۔۔ ان دونوں کو ہر قیمت پر بچانا ہوگا۔“
 اورنگ زیب نے موبائل بند کر کے جیب سے پھر وہی مخصوص آپریشن نکال لیا جو موبائل کی

طرح تھا، ضروری بن دبانے کے بعد اسکرین پر بھر ایک سرخ نقطہ ابھر کر حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ اورنگ زیب ایک منٹ اسے بغور دیکھتا رہا پھر اس نے دوسرے بن دبا کر سڑکوں کا وہ جال دیکھا جس پر نقطہ ایک مخصوص سمت میں حرکت کر رہا تھا۔ سراج حیرت سے اس ڈیوائس کو دیکھ رہا تھا جب موبائل پر دوبارہ مکمل موصول ہوا۔ اورنگ زیب نے دوسرے ہاتھ سے موبائل آن کر کے کان سے لگایا، اس کی نظر میں یہ دستور آپریشن کی اسکرین پر مرکوز تھیں لیکن موبائل پر جو اطلاع ملی اس نے اس کی اس نے جواب میں صرف..... ”اوکے“ کہا پھر آپریشن کو بیز پر رکھ کر اس نے بڑی سرعت سے کسی کے نمبر پر کال کرنے شروع کیے۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے غیر معمولی سنجیدگی سے سرسرائی آواز میں کہا تھا۔

”سرخ..... میں ایس کی اورنگ زیب بول رہا ہوں..... جی ہاں، انٹ از ارجنٹ اینڈ ٹاپ پرائز بنی سر..... انٹرورلڈ کا دہشت گرد اور ذہنی دشمن دونوں ہمارے آدھیوں کی غفلت سے قائدہ اٹھا کر فرار ہو گئے ہیں۔ جی ہاں، ابھی ابھی اطلاع ملی ہے..... ایک دو سہائی زخمی بھی ہوئے ہیں، کچھ ذمے دار بے ہوش کی کیفیت سے دوچار ہیں لیکن بہر حال، یہ میرے لیے ایک پریشان کن اطلاع ہے۔ فوری طور پر میں درخواست کروں گا کہ تمام آڈیو ڈیوائس افسران اور گاسٹیلری اسٹاف کو مستعمل کر دیا جائے اور زیر حراست رکھا جائے لیکن میرا نام درمیان میں نہ آنے سے متواسب ہوگا..... جی نہیں، شاید ابھی ہمارے ڈی آئی بی کو اس کی اطلاع نہیں ملی..... شکس..... تنبیہ کیوریٹی سچ سر“

کال ختم کر کے اورنگ زیب آپریشن ساتھ لیتا ہوا تیزی سے کرسی سے اٹھا۔ سراج اس کے ساتھ ہی دفتر سے نکلا، گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے دہلی زبان میں پوچھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے۔ لوچن اور دشمن کے فرار ہونے میں کس کا ہاتھ ملوث ہو سکتا ہے؟“

”یہ بعد میں دیکھا جائے گا..... لی اعلیٰ ہمیں شیمن اور اسلم ڈنکا کو بچانا ہے۔“ اورنگ زیب نے گاڑی کی رفتار تیز کرتے ہوئے کہا، آکٹوئیں سے جوابی کارروائی کے طور پر اب میری کچھ اہم شاہدوں کو ختم کرانے کا منصوبہ بنالیا ہے۔“

”کیا آپ کو علم ہے کہ شیمن اس وقت کہاں ہوگی؟“

”ہاں..... وہ اس وقت آکٹوئیں کے ایک زرخیز کتے کے ساتھ اسلم ڈنکا کی طرف جاری ہے۔ اسے یقین دلایا گیا ہے کہ اسلم ڈنکا کو کوئی مار دینے کے بعد وہ اس کی جگہ لے سکتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ اسلم کے مرتے ہی شیمن کو بھی کوئی مار دی جائے گی۔“

”یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟“

”میرے مخبر نے اور..... اسے اس شخص نے اطلاع دی ہے جو اس وقت شیمن کے ساتھ ہے، یہ بھی سن لو کہ وہ اسلم ڈنکا کا خاص اہلکار آدی ہے۔ نہ ہوتا تو اس قدر اہم بات کو زبان سے نکالنے کی جرات بھی نہ کرتا۔“

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اورنگ زیب کی زبانی پوری صورت حال معلوم ہو جانے کے

بعد وہ دل ہی دل میں اورنگ زیب کی یہ پناہ صلاحیتوں پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا جب ایک نیا خیال بھی اس کے ذہن میں تجزی سے ابھر۔ ”کیوں لوچن اور دشمن کے فرار میں بھی تو اورنگ زیب کی کسی پلاننگ کا دخل نہیں تھا؟“



اس کا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہوتا تھا۔ یہ ظاہر وہ ابھی تک ”ہست دلوڈ“ کی کیفیتوں سے دوچار تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ متحرک ہے لیکن کہاں؟ اس کا ذہن اس بات کی تصدیق کرنے سے قاصر تھا پھر ایک خوش مراد آواز، اس کے کانوں میں پہلی بار واضح طور پر گونجی۔

”یہ کیا گیا یا ابھی زعمہ ہے؟“

”ابھی تک بے ہوشی کی کیفیت سے دوچار ہے۔“ زنانی آواز میں جواب ملا۔ ”ہم نے اسے تکلیف کی شدت سے نجات دلانے کی خاطر خواب آور انجکشن لگایا تھا۔“

”ختم کی کیا کیفیت ہے؟“ یہ دستور خشک لہجے میں پوچھا گیا۔

”قسمت ابھی تھی جو بڑی بچی کی رونہ زندگی بھر نکلنا رہتا۔“

آوازیں اب اصل خان کے ذہن میں واضح طور پر گونج رہی تھیں۔ اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے لیکن آسمان سے آکر کہیں مجبور میں ضرور اتر گیا ہے، اس نے فوراً ہی آنکھ کھولنے کی غلطی نہیں کی۔ خود کو دھوئیں ظاہر کرتا رہا جب اس کے پیروں سے ٹالیا پٹیاں کھولی جا رہی تھیں جب دھم میں شدید تکلیف کے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کراسے جوئے اس سفید کپڑوں میں بیویوں نرس پر نظر ڈالی جو اس کی بائیں پٹیلی کی پٹیاں تقریباً کھول چکی تھیں۔ وہ تکلیف سے دھڑکنے لگے کسی ٹیپ کے اوجھرنے سے ہوئی تھی۔ اس کی کراہ کی آواز سن کر نرس کی نظر میں اس کے چہرے پر پڑیں۔

”گھبراؤ نہیں..... ابھی تم زندہ ہو۔“ نرس نے غمی آمیز بھرپور آواز کا اظہار کیا۔

”میں کہاں ہوں؟“

”خاموش رہو.....“ وہی مراد انھوں آواز داہنی جانب سے سرسرائی ہوئی ابھری پھر ایک درمیانہ انداز میں اس کے سامنے آگیا، اس کی نظر میں بھی ملی جلی کیفیتیں گھڑے ہو رہی تھیں۔ افضل خان نے فوری طور پر کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ اسے اس بات سے طہارت کا احساس ضرور ہوا کہ وہ اس وقت کسی اسپتال میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں گزرے واقعات کی پلکار شروع ہو گئی۔

جب ہاس کی خوشحودی حاصل کرنے اور اسلم ڈنکا کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خاطر اس نے جگا کو اس کے کھانے سے نکال کر تنہا کابوئے کرنے کی ٹھانی لی تھی۔ امداد علی کو قابو کر لینے کے بعد اسے اپنی کامیابی یقینی نظر آرہی تھی۔ صورت حال پوری طرح اس کے قابو میں تھی۔ امداد کے فون کرنے پر جگا نے اس سے ساعلی علاقے کے اسپتال بار پر ملاقات کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا پھر.....

وقت مقررہ پر جگا ایک خیراتی ادارے کی ایجنٹس سے کل کر سامنے آیا تو افضل خان نے امداد ملی سے بڑے خودی کے لہجے میں کہا تھا۔
”کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں تم دونوں کو جہنم رسید کرنے میں کسی کچھامٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔“

امداد ملی کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی سے ہالی روٹ سے کل کر بڑے دوستانہ انداز میں جگا سے بٹگری ہوا تھا جب افضل خان نے سامنے آ کر جگا کو لٹکا رہا تھا۔ اسے اپنی کامیابی یعنی نظر آ رہی تھی جب کسی نے پشت سے اس کی ٹانگ کا ٹٹا نہ لیا تھا۔ فیروز متوجہ شاعر کامیابی کے بعد ناکامی کے اس جھٹکے نے جسے اس کے ذہن کو بھٹکتا مفلوج کر دیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی تھی لیکن اسلحہ ہاتھ سے کل جانے کے بعد دھم میں ہونے والی شدہ پر تکلیف نے اس کے سنبھلنے اور سوچنے کیلئے تمام صلاحیتوں کو بیکار کر دیا۔ اس کی جگہوں کے نیچے گھپ اندھیرے تیرنے لگے۔ اس کا ذہن چمکایا تھا پھر وہ بے ہوشی سے دو چار ہو کر ساحل پر گر رہا تھا اور..... اب ہوش آنے کے بعد وہ کسی اسپتال میں تھا جہاں اس کے دھم کا سانس کا جا رہا تھا لیکن ڈاکٹر نظر آنے والے شخص کے سخت اور سرد طرز خطاب نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اس نے ارد گرد نظر ڈالی، جگا یا امداد ملی اسے نظر نہیں آئے۔ وہ ان کے بارے میں قیاس آرائی کر رہا تھا جب ڈاکٹر نے اس کی پشت پر مکتڑے کسی شخص کو قہقہہ کیا۔ ”اس کو بستر پر لٹاؤ۔“

اس جھٹکے کے بعد ہی افضل خان کو خیال آیا کہ وہ اس وقت دھکیل جیتر پر تھا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر وہ وارڈ ہوائے بھی سامنے آ گیا جو اس کی دھکیل جیتر چلا رہا تھا، اس نے ڈاکٹر کے حکم کی چوری میں افضل خان کو بڑی آسانی سے کرسی سے اٹھا کر قریبی بستر پر ڈال دیا جو مریضوں کے مکانے کیلئے مخصوص تھا۔

افضل خان دم سادھے خاموش پڑا رہا۔ دھم کے معاملے کے دوران نرس اس کو اسسٹ کرتی رہی، ڈاکٹر نے دھم کو دوبارہ صاف کر کے اس پر ضروری دوا لگیں لگیں پھر جتنی دیر میں وارڈ ہوائے دھم کی پٹی کتر۔ نرس نے ڈاکٹر کے کہنے پر اس کے بازو میں ایک انجکشن لگا دیا۔ ”باقی دونوں کا کیا حال ہے؟“ ڈاکٹر نے نرس کو سوال نظر دے دیا پھر دھم کو دوبارہ صاف کرنے لگا۔

”وہ دونوں نازل نظر آ رہے ہیں۔“

”اسے دوا لیں لے جا کر ان دونوں کے پاس چھوڑ دو اور.....“ ڈاکٹر نے ایک بار پھر افضل خان کو جیتر نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں نصرت کو دوبارہ دینا کر دھم ایسا نہیں ہے کہ ہر سر جائے..... ایک دو پٹھوں کے بعد اس کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔“ پھر وہ نرس کا جواب سے بغیر کمرے سے لینٹ رائٹ کرتا جیتری سے کل گیا۔ وارڈ ہوائے اور نرس نے افضل خان کو ڈنڈا ڈولی کر کے پھر دھکیل جیتر پر بٹھا دیا۔ پانچ منٹ بعد مختلف راجدار یوں سے گزارنے کے بعد اسے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں تین اسٹول، ایک بیچ اور ایک آرام دہ کرسی کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں

تھا۔

افضل خان نے ایک ہی نظر میں پوری پھینچن کا پھر غور جائزہ لیا، اس کا ذہن گواہی دے رہا تھا کہ وہ کسی باقاعدہ اسپتال میں نہیں تھا، کسی خاص ایجنسی یا گروہ کی تحویل میں تھا جہاں اس کے دھم کی مرہم پٹی لٹھیں اس کو زبردستی کے خاطر کی گئی تھی۔ جگا اور امداد ملی کے چروں کے تاثرات کچھ اور کہہ رہے تھے۔ پھر اخبار ان کے چروں سے کی تشریحات کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وارڈ ہوائے اسے دھکیل جیتر سے بچنے پر تھک کر کرنے کے بعد باہر گیا اور دو دروازہ بھی باہر سے پلٹ کر دیا گیا۔ افضل خان کا ذہن اس پھینچن کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جب امداد ملی کی سپاٹ اور خشک آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”دیکھ لیا تو نے اپنی پسے خانی کا نتیجہ..... تیرے ساتھ ہم بھی بلاوجہ رگڑے میں آ گئے۔“

”ہم اس وقت کسی کی تحویل میں ہیں؟“ افضل خان نے عجیب سوال کر لیا۔

”ہمم.....“ جگانے اسے خود بخود نظر دے دیکھا۔ ”تم اس کو بھی ایسی سسرال ہی سمجھو جہاں تمہارے ساتھ دوسرا ہی سلوک ہوگا جیسا جلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی لانے پر اس کے سسرال والے کرتے ہیں۔“

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا صرف جگا کو سر نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔

”ایک بات یاد رکھ ڈھیلے!“ امداد ملی نے اپنی سادہ اور پیٹ پولیس والوں کی زبان استعمال کی۔ ”تو اب جس تک سونے پر اچھل رہا تھا، اب وہ بھی تجھے پھٹیل لگانے کی فطرتی نہیں کرے گا۔ جاتا ہے کیوں؟..... ہم اس وقت ٹھری کی ہائی کمان کے چوہے دان میں پھنس گئے ہیں جہاں کسی کی دال نہیں لگے گی، ایک ہی جلاب میں سارا کھایا پینا باہر نکال لیا جائے گا۔“

”تھیں اس کا اعزازہ کیسے ہوا.....؟“ افضل خان ٹھری کی ہائی کمان کے حوالے سے چوہے کے بغیر نہ رہ سکا۔

”جی ہاں جی جانے دے۔ پھر جب اسی کال کوٹھری میں..... منجھ نصرت کی عداوت دوبارہ سچ کی تو تجھے بھی آنے وال کا مجاز معلوم ہو جائے گا۔“ جگانے ٹٹ کا کہا۔ ”اس کی موتی فائل میں سب کا اعمال نامہ درج ہے، تیرے اس حوالی پاس کا بھی جو تجھے چارے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔“

افضل خان نے جگا اور امداد ملی کو باری باری پھر دیکھا پھر غراتے ہوئے بولا۔ ”موتی فائل میں تمہارا بھی سارے ساتھ کثرت ضرورت درج ہوں گے۔ کل جو سزا انہیں دی وہ آج مل جائے گی پھر..... ساتھ ہی جیل میں جلی بھی تمہاری ہے۔“

”بات میری تیری نہیں ہے پاگل دے پتر.....“ امداد ملی نے سختی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”اصل پکڑ لی کے گلے میں کھنٹی ڈالنے کا ہے۔ میں نے پولیس کے جھٹھے میں ایوں پانچ نہیں بیٹے ہیں۔ ہمیشہ اور تیل کی دھار پر نظر کرا کر رہی ہے۔“ اس نے ذرا دم آواز میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”بات اب تیرے بیج کی گولگی کی ہے۔ ٹھری کے بڑوں کو بھی بیج ڈباہری کی ہسٹری شیٹ

مرکوز تھیں۔

”پولیس کی نظروں سے چھپتا پھرتا تھا۔“ افضل خان نے اس بار اپنی مظلومیت کا اظہار کیا۔
 ”میرے خلاف کچھ ایسے بے بنیاد کیس بتائے گئے تھے جن کا براہ راست میری ذات سے کوئی تعلق
 نہیں تھا۔“

”آئی سی۔۔۔۔۔“ میجر نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”جس کیس میں تمہیں پھنسا جا رہا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟“

”ایک بڑے وی آئی پی کی نوجوان لڑکی کے ریب کا چکر تھا۔

”اس لڑکی کا نام گل رخ تھا جو میٹریکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ اسے کالج سے واپس جانے وقت راستے سے انوار کی لڑکیاں۔ انوار کرنے والے اس کو ایک وین میں ڈال کر میٹریکل پٹ لے گئے جہاں دو آدمیوں نے اس کی آبرو لوٹی اور تیرہ راہداری ہٹا رہا۔ اس کے بعد لڑکی کے باپ سے تین کروڑ کا مطالبہ کیا گیا۔ رقم لے جانے کے بعد انوار کرنے والوں نے ٹیلیفون کی واپسی کیلئے بھی سوئے گاڑی کی لیکن ان کا اعتماد انہیں لے ڈوبا۔ پولیس کے ہاؤس ٹریپ (Mouse Trap) میں ایک آدمی رینگے انہوں پکڑا گیا۔ دوسرا فرار ہوئے میں کا ماب ہو گیا تھا۔“

”مجھے اتنی تفصیل نہیں معلوم لیکن پولیس نے میرا نام بھی اس کیس میں شامل کر لیا تھا۔“ افضل خان نے سنبھل کر معصوم بننے کی کوشش کی۔

”جس آدمی نے موسیٰ بنائی تھی اس کا نام جانتے ہو.....؟“

”جناب..... جب میں اس کیس میں شامل ہی نہیں تھا تو کسی کا نام.....“

”میں بتاتا ہوں.....“ میجرز ہر خند سے بولا۔ ”اس کا نام باسٹرڈ..... سن آف اے فک تھا۔“

”افضل خان کسمار اپنی مصیبتوں کا اظہار کر رہا تھا، جب سیمر نصرت نے ایک تصویر فائل سے نکال کر اس کی طرف اچھائی تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کے دیتا کوچ کر گئے۔ وہ افضل خان کی اپنی ہی تصویر بھی دیکھنے کے لیے مخصوص زاویے سے کھینچی گیا تھا کہ اس کے چہرے کے علاوہ ایک شخص کو کوئی دیکھ نہ سکتا۔ اسے پیش منظر میں رکھا گیا تھا۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی خود افضل خان بھی ہلکا کر گیا۔“

”میرے پاس وقت ہے کہ افضل خان.....“ میجر نے بڑے ذہریلے اعزاز میں بات آگے بڑھائی۔ ”اسی تصور کے ذریعے ہمیں ملازمت ملی، پولیس کے ہاتھوں سے بچانے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ جمہوریہ کمنل ہسٹری کی فائل کو سرخانے میں ڈالوا دیا گیا جس میں تم پولیس کو روکا رہتے، یہ کیا کہو گے؟“

افضل خان نے جواب نہیں دیا، حالات اور تصویر کی ثبوت کی بنا پر اس نے خود کو ٹھنڈا ہی کہنے کی ٹھان لی تھی۔

”اب تم کہاں ملازم ہو.....؟“

کامل کرنے کیلئے ٹیوس ٹیوٹ کی ضرورت ہے۔ دو گواہوں اور وکیل کے بغیر نکاح بھی مکمل نہیں ہوتا۔ ہماری فکر میں دیا ہونے کی مت سوچ۔ ہم نے شہادتوں کے خانے میں انگریز لٹکانے کی سوچ لی ہے۔ تو ایسی فکر کرو نہ کھاٹ کھی ہونے میں دیری بھی نہیں ہوگی..... شیخ کی پھیل اب تیرے محلے نہیں لگ سکے گی۔“

اس بار افضل خان نے امداد علی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی ترجمانی کر رہے تھے کہ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

چار گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ دوبارہ کھلا، دو فوجی جوان ایک میز پر کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آرام نہ کری اٹھا کر میز کے ساتھ رکھی پرائسز جلا کر خاموشی سے واپس چلے گئے، کچا اوراد اعلیٰ تھیلر کے بیٹھ گئے، افضل خان بہ دستور لیٹا رہا۔ دونوں فوجیوں کے جانے کے بعد ایک حوالدار ہاتھ میں موٹی سی فائل دے آیا۔ اس نے فائل میز پر رکھ کر باری باری تینوں کو گہری آنکھوں سے دیکھا پھر افضل خان کو حوالدار کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے تخت پر چلے گیا۔

”انکیشن ہو کر بیٹھ جاؤ، ماسٹر تمہاری میڈیکل رپورٹ بھی اسی فائل میں ہے۔ خوش قسمت ہو جو گولی نے ہڈی کو ٹھٹھٹھ نہیں کیا ورنہ اپانچ بھی ہو سکتے تھے۔“

افضل خان خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ تیسری بار کھلا تو چچا اور امداد علی بھی منہ سنبھل کر سیدھے ہو گئے۔ آنے والا میجر نصرت ہی تھا جسے وہ پہلی بار دیکھ چکے تھے، کرے میں داخل ہو کر میجر نصرت کی تیز نظریں افضل خان کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ وہ درمیان دقت اور گھٹنے ہونے جسم کا مالک تھا، اس کی حقانی نظروں میں ذہانت کی مخصوص چمک تھی۔ افضل خان کی نظریں بھی میجر سے چار سو ری تھیں لیکن ایک منٹ بعد ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔ میجر نصرت کی نظروں میں کوئی ایسی ہی خاص بات تھی جو وہ اس سے دیر تک نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ اس نے تھوڑے ہی اہل محل شروع ہو گئی۔

میرے کچھ دیر کسی چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا افضل خان کو کھو رہا تھا پھر اس نے آرام کری پر بیٹھ کر موتی فائل کو کھول لیا، کچھ دیر اس کے صفحات کو الٹا پلٹا رہا پھر ایک صفحے پر پہنچ کر وہ رک گیا، کاغذات کے اندراجات کو دیکھتا رہا پھر اس نے نظریں اٹھا کر دو بارہ افضل خان کو دیکھا۔

”تمہارا اصل نام کیا ہے؟“ اس نے ٹھوس اور قہمے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔
 ”محمد افضل.....“

”خاں کا اضافہ کب اور کیسے ہوا.....؟“ میجر کے لہجے میں کوئی خاص بات سمجی جو اھل خان کسمسا کر رہ گیا، ذرا ختم کر بولا۔

”یہ نام میرے پاس نے ملازمت کے بعد رکھا تھا۔۔۔“

”ملازمت سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟“ میجر کی حیران نظریں بہ دستور افضل خان کے چہرے پر

”دن منٹ“..... میجر نصرت نے کرخت لہجے میں اسے تنبیہ کی۔ ”یہ سوال انکوائری نہیں ہے۔ ہیرا پھیری کرو گے تو پھر گلے گلے تک پھنس جاؤ گے۔ سچ اکل دو گے تو پھر رعایت بھی حاصل کر سکتے ہو..... اب جواب دو..... تم ابھی تک کس کے اشارے پر چل رہے ہو؟..... چکا اور ادا دلی سے تمہاری کیا ذاتی دشمنی تھی جو تم نے ایک کے ذریعے دوسرے کو بھانسنے کی کوشش کی تھی؟“

”مجھے اس کی ہدایت اسل ذکاوت نے دی تھی۔ وہ بھی پولیس کو مطلوبہ مجرموں کی فہرست میں شامل ہے۔“ افضل خان نے پھر بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن خود گھوم کر فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میجر نصرت کی انگلی کے اشارے کے ساتھ سی حوالدار کا ہاتھ بھی گھوم گیا تھا، ضرب لگدی پرگی اور اتنی شدید تھی کہ افضل خان کی ٹانگوں کے سامنے اندھرا چھا گیا تھا۔ اس ہاتھ میں لوہے سے زیادہ سختی اور وزن تھا۔

میجر کی کرخت آواز پھر ابھری۔ ”تم ابھی تک کس کے اشارے پر چل رہے ہو؟“

”وہ بہت دن ہوئے مجھے ملازمت سے برطرف کر چکا ہے لیکن اس کے آدمی اب بھی اسی کے حوالے سے مجھے کام کرنے پر مجبور.....“

”ڈونٹ ہیٹ اباؤٹ دی ٹھن..... میجر کے تھڑکھڑک ہونے لگے۔ ”اس مل ڈاگ کا نام کیا تھا؟“

”ٹھن..... اے..... فیض حامد۔“ افضل خان نے دہلی زبان میں اقرار کر لیا۔

”گٹھ.....“ میجر نصرت نے کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”جہیں ابھی جو تصویر دکھائی گئی تھی وہ بھی اسی کے آدمیوں نے تمہیں پالتو توں کی طرح مالک کے اشاروں پر دم ہلانے کی خاطر اتاری تھی۔ قادر ون ریزن ادا دلی..... تاکہ تم ہو تک نہ سکو..... انڈر اسٹینڈ.....“

افضل خان نے خاموشی ہی میں نجات سمجھی۔ میجر نصرت نے تیزی سے پلٹ کر ادا دلی کی سمت دیکھا۔

”تمہارے ساتھ ریکارڈ میں زیادہ بکرا نہیں ہے لیکن..... پولیس کی ملازمت اور معمولی تنخواہ کے باوجود تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی کرتے ہو؟ اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ ہماری انفارمیشن کے مطابق چکا کو کبھی تم ہی سے مربا دے کر اسٹیشن کیا تھا؟“

”یہ سب مال غنیمت اور اوپر کی کمائی کا کٹہر ہے صاحب بہادر۔“ ادا دلی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”تمہارے اور بکھریوں میں جس کی گوٹ بھی پھنس جاتی تھی وہ شارت کٹ اختیار کرنے کی خاطر مال بانی خرچ کرنے سے روک بیٹھ کر رہا تھا۔ میں صرف اپنے تعلقات کو کشش کرتا تھا صاحب بہادر۔ البتہ یہی رقم میں بسی ڈنڈی مارنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ جب چاہیے حق ہو گئے تو میں نے پولیس کی ملازمت پر بھی چار حروف بھیج دیے۔ یہ اوپر والے کی مہربانی تھی کہ دھندا مندا نہیں ہوا۔“ ادا دلی نے بات جاری رکھی۔ ”جہاں گھر ہے..... (چکا) سے پرانی یادی بھی صاحب بہادر اس لیے میں نے اسے

بھی سیدھے راستے پر لگانے کی خاطر.....“

”فیض حامد نے تمہاری کیا ڈھنسی ہے؟“..... میجر نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

”چکا کی وجہ سے وہ با فضول مجھ سے ادھار کھانے لگا ہے جناب ورنہ کہاں راجا بھوج اور کہاں منگول تھلی.....“

”مسٹر جانتھر بیٹ.....“ میجر نے چکا کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ تم نے سیدھے سادے کاروبار کے ساتھ بیکھنے سے بھی باز رکھے ہیں جن کی خدمات منہ ماگی اجرت وصول کرنے کے بعد فروخت کرتے ہو؟“

”میں انکار نہیں کروں گا جناب۔“ چکا نے صاف گوئی سے کہا۔ ”ایک بار پولیس کے رگڑے میں پھنسنے کے بعد میں نے اپنے ہاتھ مضبوط کرنے کی خاطر کچھ سر بھروسہ کی ٹولی بنائی ہے۔ نہ بنائی ہوتی تو شاید بے گناہ ہونے کے باوجود فیض حامد کے حساب کا شکار ہو گیا ہوتا۔ اس کے علاوہ پولیس کو بدتمیزی دینا رہتا ہوں۔“

میجر نصرت کچھ دیر چکا اور ادا دلی کو دیکھتا رہا پھر اس نے افضل خان کی طرف دیکھا جس نے ابھی تک زمین سے اٹھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ ”اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟“ اس نے دو ٹوک لہجے میں بات کی۔ ”کیا اب بھی فیض حامد کے اشاروں پر ناچو گے یا اس کے خلاف کھادی دینے کو ترجیح دو گے؟..... تمہارا پاس کوئی تیسرا آپشن نہیں ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں صاحب بہادر..... ملٹری والے جب دم پر پاؤں رکھ دیں تو حکومت کا تختہ بھی الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔“ ادا دلی نے افضل خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ کس کمیت کی.....“

”ٹھٹ اپ.....“ میجر نصرت نے ڈپٹ کر ادا دلی سے کہا تو وہ ہاتھ باندھ کر سٹ گیا۔

افضل خان کے چہرے سے قیمتی برسن رہی تھی، وہ ابھی کسی آخری فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک جونیئر آفیسر نے اندر داخل ہو کر ہاتھ میں دبا کرڈ لیس میجر کی طرف بڑھا جاتے ہوئے کہا۔

”سر..... چیف آف دی لائن.....“

میجر نے کرڈ لیس نے لڑکائوں سے لگا لیا۔ اس کے ”ہیلو سر.....“ کہتے ہی دوسری جانب سے کہا گیا۔

”فوری طور پر ایس بی اور تک زیب سے رابطہ قائم کرو۔ اس کے پاس نین اہم نفری اور موجود ہیں جو ہمارے لیے بھد کارآمد ثابت ہوں گی۔“

”کیا انہیں بھی ہیڈ کوارٹر لانا ہے؟“

”نہیں..... نی کو ٹیک۔“ دوسری جانب سے مختصر آجواب کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

میجر نے کرڈ لیس جونیئر آفیسر کے حوالے کرتے ہوئے افضل خان کی طرف دیکھا۔

”میں تمہیں صرف کچھ کی تک کی مہلت اور دے رہا ہوں۔ ابھی طرح سوچ لو کہ جہیں آخری

جواب کیا دیتا ہے۔“

پھر اس سے جو شتر کہ افضل خان کوئی جواب دیتا سمجھتی سی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ ایس بی اورنگ زیب سے فون پر گفتگو کر رہا تھا۔

یعنی ہاشم سے لوچن دیال اور رام دیال کے فراری کی خبر کے ساتھ ان کی گھرائی پر مامور تمام چھوٹے بڑے افسران کی فوری مصطفیٰ کی خبر نے جہاں انجمنی کے لوگوں کو حیران کر دیا، وہاں عوام کو بھی پولیس کے خلاف ڈھلنے کا موقع مل گیا تھا۔ ہر جانب سے پولیس کی کارکردگی پر بھروسہ ہو رہی تھی، کاروباری حلقے کے افراد بھی شہر چارپے تھیں لیکن بیچ مالہ خبر کو بڑھ کر بری طرح تھملا رہا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کی طرح یہ بات خود اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی کہ وہ دونوں ایس بی اورنگ زیب جیسے دوہا دانش اور ایماندار افسر کی گھرائی میں ہونے کے بعد کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کا شیطانی ذہن ان خبر کو آسانی سے من و عن تسلیم کر لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

بیچ حامد کو لوچن سے زیادہ رام دیال کی گھر جی سے اس نے آڑے سے ڈھونڈ لیا آخری حیرت بھجھ کر بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ دشو کی حیثیت سے بڑی ملک میں بھی اس کی دھشت گردی کا ڈھکا بیچ چکا تھا۔ بے شمار وارداتوں میں ملوث ہونے کے باوجود وہ ایک بار بھی کسی انجمنی کی لسٹ پر غور نہ کیا۔ مجرم کی حیثیت سے درج نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا طریقہ واردات ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح عدالت سے صاف بیچ نکلتا تھا لیکن اس کی اپنی بی بی اس کے حق میں ذہن ثابت ہوتی تو اس کے پاس سرحد پار کر جانے کے سوا دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ کلونت سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ عورتوں کی اس کیلئے کوئی کی نہیں تھی لیکن کلونت کو گھر کی صاف ترقی پاؤں کیلئے نظر انداز کر کے اس نے کسی باہری کی ”منجھنی دوش“ پر بھی کچھ صاف کرنے کی بھول نہیں کی تھی جب ایک دن اس نے کلونت کو اپنے ہی ایک ساتھی کے ساتھ الٹ پلٹ کرتے دیکھ لیا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ رام دیال خود چشم دید گواہ تھا اس لیے اسے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی، کلونت کی بے وفائی نے اس کی ساری سوچ یو جھ اور دور اندیشی چھین لی، اس نے اپنے ساتھی کے جسم کو گولیاں مار مار کر چھلنی کر دیا پھر اس نے کلونت کی طرف خونخیزی نظروں سے گھورا۔

”میں نروڈ ہوں رام دیال۔“ کلونت نے بسورتے ہوئے اپنی بے گناہی کا ثبوت دیا۔ ”وہ گردو کی سنگد میں اسے تیرا دوست سمجھ کر شہر بول لیا کرتی تھی لیکن آج اس پانی کے سن میں شیطان آ گیا تھا، میں نے لاکھ بقی کی پرستو۔“

”مجھے تجھ پر پورا پورا دھواں ہے کلونت!“ رام دیال نے آگے بڑھ کر کلونت کے گدرائے ہوئے جسم کو ایک آخری بار اپنے بازوؤں میں جکڑ کر پیادہ کرنا چاہا لیکن پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پلک جھپکتے میں اس نے کرپان نکال کر کلونت پر پے در پے وارے وارے کرنا شروع کر دیے۔ کلونت کے انگ، انگ سے خون کا فوارہ اگلنے لگا، وہ دہائی دہائی رہی لیکن جب تک رام دیال نے اسے

کرپان مار مار کر ناقابل استعمال نہیں بنادیا اس کا ہاتھ چلتا ہی رہا پھر جب کلونت کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے مطلق سے ابل کر باہر آ گئیں، وہ تھمرا کے اس کے قدموں پر اونڈنی گر گئی تو رام دیال اس پر تھوک کر باہر جانے کیلئے پلٹا لیکن اسے وہ بڑھ چکی تھی۔ کلونت کی بیچ و پکار سے اس کے دواڑے پر پورا حملہ جمع ہوا تھا کسی نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی تھی۔

رام دیال نے بازی بیٹنے دیکھی تو ہماگ کر چھٹ پھینچ گیا۔ ایک دوسرے سے ملی جلی چھوٹوں نے آسمانیں فراہم کر دیں، وہ ایک دوسرے کو کھانکنا ہوا آخری مکان کی چھت تک پہنچ گیا۔ یہ اس گاؤں کا آخری مکان تھا جس سے چار فرماگ دور بڑی ملک کی سرحد تھی۔ سرحد کے ہاشم سے ایک دوسرے سے ضرورت کی چیزوں کا تبادلہ کرتے رہتے تھے اس لیے وہاں بھی تخی زیادہ نہیں تھی۔ رام دیال کو بازو کر اس کرنے میں معمولی رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن جب اس نے اپنے ہمراہ ہوا بچہ، سونے کی گھڑی، ہیرے کی انگلی کی علاوہ بدن کے قیمتی کپڑے بھی داد پر لگا دیئے تو اسے چپک کر نکلے والوں نے اپنی آنکھیں داہیں بائیں کر لیں۔ رام دیال پل بھر میں کوسوں کا فاصلہ طے کر کے آبادی تک پہنچ گیا۔ دو درات تک وہ ایک واقف کا گھر لگا رہا پھر وہاں سے بڑے شہر آ گیا جہاں چھت کے پیادوں کی توبہ کی ٹانگری نے اسے رام دیال کی حیثیت سے شناخت کر لیا۔ پھر بیک ٹانگری کی سفارش پر بیچ حامد نے اپنے برے دلوں کیلئے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ رام دیال کے بھانے اسے دوبارہ دشمن کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ دشو کی حیثیت سے اس نے بیک ٹانگری کے ساتھ مل کر کئی اہم اور خطرناک حالات میں اپنے چہرہ رکھتا تو بیچ حامد کی نظروں میں اس کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ اس نے دشو کو بہت سنبھال کر کسی خاص موقع پر استعمال کرنے کو محفوظ کر لیا تھا۔

اورنگ زیب کے ہاتھ لگ جانے کے بعد بیچ حامد کو بھین تھا کہ دشو کی اصلیت نہیں کھلے گی۔ اس کا جرم اثبات نہیں بھی نہیں تھا کہ قانون اسے ایسی سزا دیتا لیکن لوچن نے اسے شناخت کر لیا تھا۔ یہ بات بیچ حامد کے علم میں نہیں تھی۔ اندر ہی اندر لوچن اور دشو کے درمیان ایک چھوڑی پکی تھی لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ لوچن اس کے کسی مخالف گروہ کا نمائندہ ہے۔ دشو یا رام دیال کی اصلیت کھل جانے کے بعد بات بگڑ بھی سکتی تھی۔

بیچ حامد کو دیر سوچنا رہا پھر اس نے براہ راست مرکز میں اپنے ایک زر خرید اعلیٰ عہدے دار کو فون کیا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے ادھر ادھر کی دوستانہ باتوں کے بعد چپچپے ہوئے سچے میں کہا۔ ”دو اہم مجرموں کے فرار کے علاوہ ان کی گھرائی پر مامور عملے کی مصطفیٰ کی اطلاع آپ کو بھی ضروری ملی ہوگی؟“

”جی ہاں۔“ ڈی آئی جی نے انکار کیا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ انہیں جلد دوبارہ گرفتار کر لیا جائے گا۔“

”سکيا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ وہ دونوں براہ راست آپ کے ایس بی اورنگ زیب کی گھرائی میں تھے؟“

”جی ہاں..... اور اسی کے کہنے پر قدام علی کو مصل بھی کیا گیا ہے۔“ دوسری جانب سے بے پروائی سے جواب دیا گیا۔

”جو افراد فرار ہوئے ہیں ان میں ایک عینی باشندہ ہے، لوہن جو انڈر ورلڈ کا آدمی ہے، جس نے میرے آفس کو آگ لگانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس موقع پر اس کا ایک ساتھی بھی مارا گیا تھا اور دوسرا.....“ شیخ حامد نے کچھ توقف سے کہا۔ ”دوسرے کی اصلیت کا علم اگر پڑوسی ملک کو ہو گیا تو پھر یہ معاملہ بین الاقوامی طور پر بھی سنگین صورت اختیار کر سکتا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں؟“ دوسری جانب سے بے حد تنبیہ کے پوچھا گیا۔ ”کون تھا وہ.....؟“

”ایک انتہائی خطرناک مجرم جو اسرائیل کی فہرست میں بھی ہے لیکن اب تک کسی اسے گرفتار نہیں کیا جا سکا شاید اس لیے کہ ابھی تک قانون کے پاس اس پر ہاتھ ڈالنے کی خاطر کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔“

”آپ کو اسے اندر کی بات کس طرح معلوم ہوئی؟“ دوسری جانب سے تنبیہ کے پوچھا گیا۔

”جب آپ حضرات نے اورنگ زیب کو یہاں تعینات کیا وہ بلاوجہ میرے پیچھے پر گیا ہے۔“ شیخ حامد کے شیطانی ذہن نے فوری طور پر ایک کہانی گھڑ لی۔ بڑی چالاکی سے زیر چمڑے ہوئے بولا۔ ”میں نے بھی چڑیا نہیں مہین رکھی جو ایک ایس بی کے سامنے گٹنے لگے دوں، اس کے کچھ جیتے بیری جیب میں بھی پڑے ہیں جو خاص خاص ہاتھ پہنچاتے رہتے ہیں۔ عینی اور دوسرے شخص نے ایک دوسرے کو شناخت کر لیا تھا.....“ شیخ حامد نے ایک لمبے کی سنی خیر خاموشی کے بعد سرسراہٹ لہجے میں کہا۔ ”میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کے فرار میں بھی کوئی مصلحت یا ذاتی لالچ شامل رہی ہوگی۔“

”ایس بی فحش اصولوں کا مالک ہے، اس کے علاوہ اس کے اپنے بھی کچھ تعلقات ہیں جس کی وجہ سے وہ کسی سے بلاوجہ مرعوب نہیں ہوتا لیکن.....“ دوسری طرف سے فحش لہجے میں کہا گیا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے کہ وہ کسی قبت پر بھی کبھی غیر قانونی حرکت میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے آپ کے تجربے بعض حالات کے پیش نظر مٹتے سے قلمہ افغانے کی خاطر آپ کو ایک بے بنیاد فحش دے دی ہو؟“

”مجھے امید تھی کہ آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔“ جواب میں شیخ حامد نے دبی زبان میں کہا۔ ”بہر حال، اب جس کرسی پر بیٹھے ہیں اس کا دائرہ اختیار بھی خاما وسیع ہے۔ کبھی موقع ملے تو پڑوسی ملک کے اپنے ہم منصب سے دشمن اور مارا دیال کے نام لے کر ان کا باہمی تعلق دریافت کرنے کی زحمت ضرور گوارا کر لیجئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح آپ کو لوہن اور دوسرے فریق کے فرار ہونے میں کچھ اہم ہاتھ بھی ملوث نظر آ جائیں۔“

”دن منٹ مائی ڈیئر.....“ دوسری جانب سے لکھت تنبیہ کے کہا گیا۔ ”دشمن..... میرا خیال

ہے کہ یہ نام میں پہلے بھی کہیں نہ چکا ہوں۔ کہاں؟ اس وقت یاد نہیں آ رہا۔“

”آپ صرف شخصیت کے مالک ہیں جناب، میں نے آپ کا خاما جتنی وقت لے لیا۔ اب اجازت چاہوں گا۔“ شیخ حامد نے پہلی بار انکاری کا مظاہرہ کیا۔ ”مگر کبھی سلام دعا کروں گا۔“

”فحش مائی ڈیئر..... تم نے اس وقت میرے ذہن کو کچھ ابھار دیا ہے، مجھے دشمن کے بارے میں اور کچھ بتاؤ۔“ بلیئر۔“

”آپ کی فطرت کے ذہن اسروں میں ایک نام کرل احتتام کا بھی آتا ہے۔ اس سے رابطہ کر لیں، ممکن ہے وہ میرے مقابلے میں آپ کو زیادہ تفصیل سے آگاہ کر سکے۔ میں ایک دو دن میں..... دوبارہ کال کروں گا۔“

شیخ حامد نے رابطہ منقطع کر دیا، اس کے چہرے پر یہ دستور غور و فکر کے گہرے تاثرات طاری تھے۔ اس کے کام کے آدمی آہستہ آہستہ کم ہو رہے تھے۔ بلیک ڈائیکر موت کے بعد سے قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ چکا اور افضل خان کا فطرت کی کوشش میں ہوتا بھی اس کیلئے کوئی اچھا گھون نہیں تھا، اورنگ زیب آہستہ آہستہ اس پر حامی آدمی کے کوشش کر رہا تھا، اسے اپنے سوا کسی اور کی برتری منظور نہیں تھی، اسلم ڈاکا کا رآمدی قاتلین کو قاتل کرنے کا پروگرام عین وقت پر خراب ہو گیا تھا۔ شیخ دینا چاہتا تھا شاید اسی لیے چکا اور امداد علی کو قاتل کرنے کا پروگرام عین وقت پر خراب ہو گیا تھا۔ شیخ حامد کو اس بگنی ہوئی بازی کے پیچھے اسلم ڈاکا کا ہاتھ محسوس ہوا تو اس نے شبنم کے درپے اسے بھی کھانے لگانے کی سوچ لی تھی۔ ایک خبر سے اس نے کئی تانتے لیے کی جو کوشش کی تھی وہ اس کی کامیابی کی خوشخبری سننے کا شہر تھا۔ ابھی اس کے پانچ گھنٹہ کیوں میں کچھ ایسے کا رآمد لوگ اور بھی تھے جو بچے ہوئے مردوں کی جگہ لے سکتے تھے۔

اورنگ زیب کے شلوک و شبہات کو فحش کرنے کی وجہ سے اس نے اسلم ڈاکا اور شبنم دونوں کو ایک ہی جگہ میں سامنے سے ہٹانے کی چال چلی تھی۔ اس کے بعد اس کے ذہن میں صرف دشمن کا نام تھا جو اورنگ زیب کے مقابلے میں کام آ سکتا تھا لیکن اس کے اور لوہن کے فرار ہو جانے کے بعد وہ مزید کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا ذہن کسی اور مقابل کے بارے میں غور کر رہا تھا جب اس کے سوا مال پر کنٹرل ملا، روشن اسکرین پر وہی غیر نظر آ رہا تھا جس نے شیخ حامد کو بتایا تھا کہ چکا امداد علی اور افضل خان کسی ایجنسی کی تحویل میں تھے، اس کی اطلاع فحش بھی نہیں تھی۔ ایک لمبے لمحے وہ اس خبر کو یہ غور دیکھتا رہا پھر فحش آواز میں بولا۔

”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”تمہیں یہ یاد کرانے کی خاطر کہ اب ایس بی اورنگ زیب کا حلقہ تمہارے گرو آہستہ آہستہ نکلتا جا رہا ہے۔“

”میں شام کو شائع ہونے والے اخباروں کی یہ سرپا خبروں پر زیادہ غور نہیں کرتا۔“ شیخ حامد نے جملہ کر کہا۔

دیا۔ ”آپ نے جس نمبر کو بلایا ہے وہ کسی کے استعمال میں نہیں۔ مزید معلومات کیلئے ہماری سکرٹرس سے رابطہ قائم کریں۔“

شیخ حامد بری طرح ہنچ و تاب کھارہا تھا۔ اسے اس وقت دشمنی تلاش تھی جو اس کے ہاتھ آکر دوبارہ چھو ستر ہو گیا تھا۔ یہ بات بھی اس کیلئے تشویش ناک تھی کہ دشمنوں نے لوچین کے بارے میں کوئی بات نہیں سنی تھی۔ یہ بھی حیران کن بات تھی کہ دشمن کو بتلے میں فرار ہونے کے بعد ان باتوں کا علم کس طرح ہو گیا کہ افضل خان اور چنگ کو فوج کے غنیمت ہاتھوں تک پہنچانے میں اورنگ زیب کا ہاتھ تھا۔ ان باتوں کا علم خود اسے بھی کسی نامعلوم فرد کے ذریعے ہوا تھا جو چنگ کو ہر قیمت پر پہنچانے پر آمادہ تھا۔ ”وہ شخص کون تھا؟ اسے اورنگ زیب اور فوجی اہلی جس کے گھوڑے کا علم کس طرح ہو گیا؟ یہ بات پورے یقین سے کس طرح کی تھی کہ چنگ کے بارے میں حالات کا فیصلہ دو دن کے اندر ہو جائے گا؟..... اور..... اس بات کا دعویٰ کس بنیاد پر کیا گیا تھا کہ لوچین اور دشمن کا فرار ہو جانا محض ایک ڈراما تھا؟ نیز جن چہرے داروں کو غفلت کا مرکب سمجھ کر منظر کیا گیا اس میں بھی اورنگ زیب کے مشورے کا عمل دخل تھا؟“

شیخ حامد کا ذہن ان سوالوں کو حل کرنے میں الجھا رہا تھا اس نے اچانک کچھ سوچ کر ایک عرصے بعد ڈی ایس ای ایس کی لودھی کے نمبر ڈائل کی دوسری جانب کال فوراً اٹھنے لگی۔ ”تا بعد ارباب بھی آپ کا خادم ہے جناب۔ اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”میں نے سنا ہے کہ دوبارہ قیامت کے بعد تمہیں سزا کے طور پر دور دراز علاقے کی ایک دیر ان ساحلی چوکی پر قیامت کیا گیا ہے جہاں تم چھپو گے کہ رحم کر کم پر ہو؟“

”آپ کی اطلاع غلط نہیں ہے لیکن..... میرے ساتھ جو بھی ہوا وہ آپ سے وقاداری نبھانے کا انعام ہی ہے۔“ اس بار قدرے سنی تیرا انداز میں جواب ملا۔

”کیا باور رکھنا چاہتے ہو؟“ شیخ حامد نے کرجت لہجے میں سوال کیا۔

”سوری سر..... میرا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“ لیاقت سے کہا گیا۔ ”میں کل بھی آپ کا پروردہ تھا آج آپ کی نظر کم کا محتاج ہوں۔“

”میری بات غور سے سنو..... غوری طور پر براہ راست ڈی آئی جی سے رابطہ کر کے کسی ذاتی ضرورت کے تحت دو ماہ کی رخصت کرو۔ میں ابھی آغا منصور سے بات کر لوں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مجھے زیادہ بھونکنے والے کتے پسند نہیں ہیں۔“

لیاقت حسین نے دو پہر کا کھانا کھانے کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ سیٹھ عثمان کا بلاوا آ گیا۔ ایک منٹ بعد وہ ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

”تمہیں اب دفتر کے کام میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آ رہی؟“

”جب آپ مہربان ہیں تو پھر پریشانی کیسی.....؟“ لیاقت حسین نے انکساری سے جواب دیا۔ ”کام زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔“

”آج تمہارے والد کا فون آیا تھا۔ کاروباری باتوں کے علاوہ میں نے ان سے یہاں آنے کی بھی درخواست کی تھی۔ تمہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سردار سرفراز خان نے اس بار میری دعوت قبول کر لی ہے۔ دو ہفتے بعد آنے کا پکا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ تمہاری والدہ بھی ساتھ ہوں گی۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔“

”تمہارے لیے اہم اطلاع اور بھی ہے جس کی وجہ سے میں نے تمہیں بلایا ہے۔“ سیٹھ

عثمان نے بات جاری رکھی۔ ”ابھی سراج کا فون آیا تھا۔ اسے کسی وجہ سے جہادری ضرورت پڑ گئی ہے۔“

”آپ کا جو حکم ہو۔۔۔“

”تم جانتے ہو کہ سراج سے ہمارے کتنے قریبی اور گھریلو تعلقات ہیں، لیکن اس بار سراج نے تمہارے لیے جو ہدایت دی ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔“

لیاقت حسین جواب دینے کے بجائے سیٹھ عثمان کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔ ”تمہیں آج رات دوپہے کے بعد سٹرل ملٹی گراف آفس کے سامنے پہنچنا ہے، وہاں سے تمہیں کوئی شخص سراج کے حوالے سے پک کرے گا لیکن تمہیں کس کام کے لیے اور کتنے دنوں کے لیے جانا ہے اس کی وضاحت تمہیں کی۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ لیاقت حسین نے کسمسا کہا۔ ”سراج صاحب کے مجھ پر بھی بہت سارے احسانات ہیں میں ان کے کسی کام آسکتا تو یہ بھی بڑی خوش قسمتی کی بات ہو گی۔“

”ایک اہم بات اور بھی ہے۔۔۔ تم اس کا کوئی ذکر فرمیں سے نہیں بھی کرو گے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ لیاقت حسین نے کچھ توقف سے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بتانے چلا گیا تو۔۔۔۔۔“

”تم اس کی گفرت کرو۔“ راجیل اس کا ہر طرح خیال رکھے گی اور میں۔۔۔ یہ بھانہ بنا دوں گا کہ میں نے تمہیں کسی فوری ضرورت کے تحت کسی اہم کام کے لیے بھیجا ہے۔ اور یہ بھی کہ تمہاری واپسی میں دو چار دن بھی لگ سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ یہ مناسب رہے گا۔“ لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے آفس میں آ گیا۔ اس کا ذہن بھی سراج کے پیغام کی اہمیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ہی سراج نے فون پر ہونے والی گفتگو کے دوران کہا تھا کہ وہ سکتا ہے اسے اور اورنگ زیب کو اس کی ضرورت پیش آئے۔ وہ ضرورت کتنی کتنی کہ جس کے پیش نظر اس کی ضرورت اس قدر احتیاط اور راز داری کے ساتھ اسے براہ راست نہیں بلکہ سیٹھ عثمان کے ذریعے رات کو دوپہے اور فرمیں کو مطلع کیے بغیر ایک مخصوص مقام بلایا جا رہا تھا؟

رحیم علی آغا خانی اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا، ایشیو کو ایک اہم کاروباری ڈرافٹ لکھوا رہا تھا جب انعام کے بزرے نے اس کی توجہ اپنی سمت مبذول کر لی۔

”میں۔۔۔۔۔ اس نے ریسپونڈ اٹھا کر نگار کی اطلاع دیا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ اس وقت مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔“

”سوری سر۔۔۔۔۔ لیکن اب میں سزا اورنگ زیب میرے آفس میں موجود ہیں۔ وہ آپ سے

فوری ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“

رحیم علی آغا خانی کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا پھر اس نے ریسپونڈ کو ہدایت کی کہ اس بی کو دو منٹ بعد اندر بھیج دیا جائے۔ انعام کا ریسپونڈ رکھ کر اس نے ایشیو کو جانے کی ہدایت کی پھر کرسی کی پشت سے ٹپک لگا کر اورنگ زیب کی آمد کے متوقعہ بارے میں غور کرنے لگا۔ ایک سیدھا سادا اور اصل پند کا روپاری ہونے کی وجہ سے وہ پولیس سے زیادہ میل ملاپ پسند نہیں کرتا تھا لیکن اورنگ زیب نے اسے پچھلی دو ملاقاتوں میں بے حد متاثر کیا تھا اس لیے دو منٹ بعد اورنگ زیب جیسے ہی آفس میں داخل ہوا اس نے بڑی خندہ پیشانی سے اٹھ کر سرکراتے ہوئے اس کا غیر مقدم کرنے سے گریز بھی نہیں کیا۔

”میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ اورنگ زیب نے پچھتے ہوئے قدم سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اس وقت دراصل مسزودار سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ چونکہ موجود نہیں تھے اس لیے۔۔۔۔۔“

”کیسے ہم فریوں کا خیال آ گیا۔“ رحیم علی آغا خانی نے بے تکلفی سے کہا۔ ”اچھا ہوا جو دارا نہیں تھا ورنہ شاید آپ مجھ سے ملے بغیر ہی چلے جاتے۔“

”میں آپ کے اس خیال کی تردید نہیں کروں گا۔“

”خیر تیر تو ہے۔۔۔۔۔؟“ اس بار وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اورنگ زیب کے جواب نے اسے کچھ الجھا دیا تھا۔

”دراصل میں دارا سے براہ راست اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ جو کام درپیش ہے اس میں آپ کو انوکھا کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔“

”کیسی کہانیاں ہو سکتی ہے؟“ رحیم علی کی پریشانی اس کے لیے بے عیاں ہونے لگی۔

”میں اس بات کا قائل ہوں کہ لوہے پر اپنی وقت خرچ لگائی جائے جب وہ پوری طرح گرم ہو۔“ اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ”اب وہ وقت آ گیا ہے اس لیے۔۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ جس وجہ سے آپ نے اپنی ملازمہ گلوبو کا خاموشی سے علاج کے لیے اسپتال میں داخل کر دیا تھا۔ اب اس کی باقاعدہ طبیعت قریبی قاتلے میں درج کرادی جائے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ رحیم علی کے چہرے پر تشویش کے اثرات گہرے ہونے لگے۔ اس نے کچھ توقف سے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ کے اس مشورے میں بھی ہماری کوئی جھلائی ہوگی لیکن ایک تو اس بات کو کچھ وقت گزر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں پولیس کے پکڑوں میں۔۔۔۔۔“

”ون منٹ مسئلہ۔“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”میں آپ کے دونوں سوالوں کا حل پیش کیے دیتا ہوں۔ پہلی واردات میں آپ نے اپنے بزنس پوائنٹ آف ویو اور کاروباری ساکھ کو برقرار رکھنے کی خاطر درگزر سے کام لیا تھا لیکن اب کسی مظلوم شخص نے اسی پچھلے حوالے سے دوبارہ بذریعہ فون کا ایک بڑی رقم فراہم کرنے کو کہا ہے۔ انکار کی صورت میں وہ آپ کو ناقابل

ناراض نہیں..... گرا..... آپ کی خاص مصلحت کی بنا پر ایسا چاہتے ہیں تو میں انکار بھی نہیں کروں گا۔ جو آپ چاہتے ہیں میں دیا ہی کرنے پر تیار ہوں لیکن ایک درخواست کروں گا۔ دارا کو درمیان سے نکال دو جو ان بھی ہے اور جہانزیبا بھی..... میں نہیں چاہتا کہ وہ کبھی انجمن میں پڑے۔“

”او۔۔۔۔۔ کے ایزد پوش۔۔۔۔۔ اور کنگ زیب دوبارہ بیٹھ گیا۔

”آپ کیا چاہتا پسند کریں گے۔“

”ایک گھاس ٹھنڈا پانی اور اس کے بعد میں جس انداز میں یہاں سے واپس جاؤں گا اس کو آپ کے عملے کے افراد بھی ضرور محسوس کریں گے۔“

”جج..... جی!“ رستم علی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ”اب مجھ سے کیا فطی ہو گئی جو آپ.....“

”پریشان نہ ہوں۔“ اور نگ زیب نے مدغم لہجے میں کہا۔ ”آپ کو میری درخواست پر ایک کام اور بھی کرنا ہوگا۔“

”ووہووہ..... کیا؟“

”.....کیا؟“

”میرے یہاں سے جاتے ہی آپ ڈی آئی جی مسٹر آغا منظور سے فون کر کے یہ شکایت کریں گے کہ میں بار بار آپ کو فون کر کے پریشان کرتا رہتا ہوں اور آج آپ کے دفتر بھی پہنچ گیا۔“

”میں سمجھا نہیں؟..... آپ تو ایک آدھ بار پہلے بھی آچکے ہیں..... اس کے علاوہ میری شکا

کا مقصد بھی ضرور دریافت کیا جائے گا۔ میں اس سلسلے میں کیا کہوں گا؟“ پولیس جس کسی بڑے المذاہر آدمی کو پریشان کرتی ہے تو اس کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔“ اورنگ

نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ماہانہ جبری الاؤنس۔“

”لیکن اس میں آپ کی.....“
”قبل از وقت آپ مصلحت جاننے کی کوشش نہ کریں..... صرف یہ اعتماد رکھیں کہ میں ایک

فیسر ہونے کے علاوہ آپ کا ہمدرد بھی ہوں اور..... دوست بھی۔“

ملازم پانی لے کر آ گیا تو اور محک زب نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کیا پھر تیزی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ اس کے چہرے پر باہر نکلتے وقت غصے اور جھلاہٹ کے تاثرات نمایاں تھے جسے

ملے نے بھی محسوس کیا تھا۔ آفس کی عمارت سے باہر آنے کے بعد اس نے سڑک کے دو

جانب پارک ایک ایسی کار کا دروازہ کھولا جس کے شیشوں پر گہرے سیاہ رنگ کے باریک مخصوص پتھر لگے ہوئے تھے۔ سامنے کے گلاس بھی ایسی ہی ساخت کے تھے جس سے باہر دیکھا جاسکتا تھا لیکن

اعمر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ اور بک زب نے گاڑی میں بیٹھتے ہی حرمت انگیز پھرتی کا مظاہرہ

”کہا اطلاع ہے؟“ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھا رہا تھا۔

فت کیا۔

”مجھے ایک بچہ کلر کی کادر پر شبہ ہے جو دوبار چکر لگا چکی ہے۔“ سراج نے مشتہ کار کے نمبر

حالی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ رہا آپ کیس کا حکم۔ تو میں آپ کو پہلے بھی اپنے قاتلانہ کارنامے پر پوچھتا ہوں۔ چکا ہوں۔ آپ مطمئن رہیں۔ آپ صرف ملحد قاتلہ میں اپنی خفیہ تحریری شکایت کسی طرح پہنچا دیں۔ قاتلہ کا کوئی آدمی اس سلسلے میں آپ سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ وہ قاتلانہ بھی میرے ہی دائرہ اختیار میں ہے۔“

”آپ نے اس سلسلے میں دارا کا انتخاب کیوں کیا تھا؟“

”اس لیے کہ وہ نوجوان ہے اور حالات کو ٹھیک کرنے کا جذبہ بھی اس کے اندر موجود ہے جبکہ آپ بہت زیادہ احتیاط اور دوسرا نکتہ کے پیش نظر کچھ اہم ترین مسئلوں کو بھی ردی کوٹو کری میں ڈال دیتے کو بہتر خیال کرتے ہیں۔“

رحم علیٰ نے نواسہ کی کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی آنکھوں کی بدلتی رنگت اس بات حمایز کر رہی تھی کہ اب وہ ”گڑے مردے اکھاڑے“ کے حق میں نہیں تھا۔ جبکہ دیر تک وہ خالی خالی نظروں سے اوپر نگاہ ڈیپ کو دیکھتا رہا پھر دلی زبان میں بولا۔ ”آپ کو اعزاز ہو چکا ہے کہ پچھلی پریشانی کا ڈسے دار کوں تھا۔ حقانے میں رپورٹ درج کرانے کی بات کہ اس کے علم میں آئی تو..... تو..... آپ بھی جانے ہیں کہ اس کے ہاتھ کتنے لیے ہیں۔ اس کا دوسرا دار ہمارے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

”کسی واردات کے سلسلے میں مجرم کے بارے میں صرف قیاس آرائی کافی نہیں ہوتی۔ محسوس ثبوت کے بغیر دنیا کی کوئی عدالت کسی مجرم کو سزا سنانے کی صحت بھی نہیں کرتی۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں مشراورنگ زیب..... مجھے آپ پر ہر طرح سے پورا پورا اعتماد بھی ہے مگر دریا میں رہ کر کمر مجھ.....“

”اوہ کے..... اورنگ زیب ایک سرد آہ بھر کر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔“ مگر آپ اس معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتے تو میرے پاس ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے

کہا۔ ”آپ کے نام سے ناپ شدہ ایک فرضی شکایت بھی درج ہو سکتی ہے جس پر کوئی دستخط نہیں ہوں گے۔ ایسے معاملات میں پولیس بھی بلاوجہ ملوث ہونا پسند نہیں کرتی۔ بغیر کسی حوالے اور دستخط کے جو

حکامتیں موصول ہوتی ہیں انہیں زیادہ تر تلف کر دیا جاتا ہے، لیکن پولیس مناسب سمجھے تو خفیہ طور پر جہان بین بھی کر سکتی ہے۔" اور رنگ زیب نے ایک لمحہ رک کر رستم علی کی آنکھوں میں جماسکتے ہوئے

”جی ہاں لیکن..... میں اب بھی یہی درخواست کروں گا کہ اگر آپ.....“

”سوری مسٹر رحم علی۔“ اور تک زیب نے پولیس والوں والا انداز اختیار کیا۔ ”میں ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہوں جو یہ بات آپ سے بہتر جانتا ہے کہ کس وقت کیا اقدام اٹھانے کی ضروری ہوتی

”پلیز مشر اورنگ زیب“ ”رستم علی بڑے کرب کے عالم سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔“ ”آپ

1. *Journal of the American Medical Association*, 1997; 277: 1039-1043.

بتاتے ہوئے جواب دیا۔

”فکرت کر..... وہ اپنے ہی آدمی تھے۔“

سراج نے اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں آپ کے ساتھ ہوں لیکن ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا۔“

”کیوں۔“

”آپ جس انداز میں شیر کی کھار میں گھس کر اس کا شکار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“

”اچھے برے نتائج کا امکان ہر کام میں ہوتا ہے۔ رہا شیر کا معاملہ تو میں چان پر بیٹھ کر گولی داغ دیتا بڑے لوگوں کی عیاشی تو کھدکسکتا ہوں لیکن..... بہادری نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ تین تہا نہیں ہوں تم بھی میرے ساتھ ہو۔“

جواب میں سراج نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اورنگ زیب بتدریج کار کی رفتار بڑھانے لگا۔



شبنم دوپہر کے کھانے میں مصروف تھی جب گرائی کرنے والا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ پست قدم اور دھڑلے بدن کا مالک تھا۔ چہرے پر بائیں جانب کٹنی کے قریب ایک پرانا مگر خاصا گہرے دھڑکا نشان موجود تھا غالباً گولی لگنے کا نشان تھا۔ صورت شکل سے پرانا پانی ہی نظر آتا تھا۔ شبنم جاتی تھی کہ خفیہ حکمائوں پر چہرے دینے والے گاڑ ایک مہر دو حد سے تجاوز کرنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے مگر اس وقت وہ جس گھٹیا انداز میں شبنم کے سینہ سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا وہ اسے پسند نہیں آیا اس کے گھورنے کا انداز بھی حد درجہ ناقابل برداشت تھا۔

”کیا بات ہے؟“ شبنم نے کھانے سے ہاتھ روک کر پوچھا۔

”کھانا جلدی ختم کرلو میڈم..... جیہیں میرے ساتھ چاہنا ہے۔“ دو کھچے لیجے میں جواب دیا گیا مگر اس کی نظر اس برابر شبنم کے جسمانی خطوط کا ناپ تول کرنے میں مصروف تھیں اتنی دیر بھی بیکہ بدلے نظر آ رہے تھے۔

”کہاں جاتا ہے؟“

”اسلم صاحب کے خفیہ مکان پر۔“ گاڑ نے کہا۔ ”ابھی بڑے باس کا حکم ملا ہے۔“

”اسلم ڈاکا کیا خود یہاں نہیں آ سکتا تھا؟“

”میں سوائے جب باس کے کسی کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوں لیکن..... تمہاری بات اور ہے۔“ اس نے متنی نیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”میں شاید نہیں خبر نہیں ہے کہ اسلم صاحب ایک مقابلے میں بہادری سے شاہیں غامیس کے دوران زخمی ہو گئے تھے۔ بڑی مشکوں سے فرار ہو کر اپنے خفیہ مکانے تک پہنچے ہیں۔“

”میں وہاں جا کر کیا.....“

”انکار کی کھجانی نہیں ہے میڈم۔“ گاڑ نے اس کی بات کاٹی۔ ”جب باس کے حکم پر صرف عمل کیا جاتا ہے۔ زبان بولانے کی اجازت کسی کو نہیں ہوتی۔“

”ٹھیک ہے تم باہر ظہر دہش دھشت میں آئی ہوں۔“ گاڑ نے کچھ کہنے کی خاطر منہ کھولا پھر خاموشی سے مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ شبنم نے کھانا چھوڑ دیا، واہ روم میں جا کر منہ دھو یا پھر بدن پر ایک چادر ڈال کر باہر آ گئی۔ گاڑ اس کا منتظر تھا اور پوری طرح محتاط تھی۔ اس نے شبنم کو آگے چلنے کو کہا خود اس کے پیچھے پیچھے رہا۔ جس حالت بیڑیاں طے کرنے کے بعد وہ اور پری ہال میں آ گئے جہاں ایک پرانے کالین اور دو چار کرسیوں کے سوا زیادہ سامان نہیں تھا، وہ کسی غیر آباد علاقے میں دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ باہر ایک دین موجود تھی جس پر کسی تجارتی ادارے کے اشتہار لکھے ہوئے تھے۔ شبنم کو دین کی پشت میں بٹھانے کے بعد وہ ایک مچی آبادی میں داخل ہوئی جہاں کے راستے کچے ہونے کے علاوہ زیادہ کشادہ بھی نہیں تھے چھوٹے بڑے اور کچے کچے مکان بھی بغیر کسی کلاسیک کے تعمیر کر لیے گئے تھے۔ یہاں زیادہ تر غریب طبقہ رہتا تھا جو بڑے بڑے مکانات اور بنگلوں میں دن بھر روزی کمانے کی خاطر محنت و مشقت کرتے تھے اور رات کو کمرہوں میں آ کر پڑ رہتے تھے۔

دین مختلف پر پچ اور ٹا ہوا رنگوں سے گزر کر ایک ایسے مکان کے دروازے پر کسی جو آبادی کے دوسرے سرے پر خشک ندی کے دہانے پر بنا تھا۔ مکان کے ٹین کے دروازے پر ایک رنگ آلودہ تالا پڑا تھا۔ پست قدم گاڑ نے پہلے دروازے کے اوپر سے اندر ہاتھ ڈال کر ایک مختصر غلطی دروازہ کھولا اور پھر اس نے ریمارکوں پر گرفت جگا کر شبنم کو کچے اتار۔ شبنم کے پاس اس وقت حکم کی تکمیل کے سوا دوسرا راستہ بھی نہیں تھا لیکن کوئی بات ایسی ضروری تھی کہ اس کا دل کسی ناویدہ خوف سے جھوک رہا تھا۔

آگے پیچھے اندر داخل ہونے کے بعد گاڑ نے غلطی دروازہ اندر سے بند کیا پھر مختصر کے محن کو چار چتر قدموں میں طے کر کے ایک دروازے پر دستک دی۔ دستک دینے کا اندازہ بھی مخصوص تھا۔

”کون ہے؟“ اندر سے کھانسی کے ساتھ ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”یہ میں ہوں اسلم صاحب آپ کا ٹمک خوار عبدالباقی عرف جبرو۔“

اندر سے ایک منٹ بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک بوڑھی عورت تھی جو خاموشی سے باہر آ گئی شبنم اور جبرو نامی گاڑ نے آگے پیچھے اندر قدم رکھا۔ اسلم ڈاکا سامنے ایک تخت پر لیٹا تھا اس کے بائیں شانے اور سینے پر پٹیاں بندھی تھیں جبرو کے ساتھ شبنم کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں ایک چمک سی گوندی۔

”تم..... اس نہیں کر کیوں ساتھ لائے ہو؟“ اس نے شبنم پر نظر ڈالتے ہوئے جبرو کو تیز نظروں سے گھورا۔

ہوں۔“

”میں چکا کو بھی اپنے ساتھ ملانے کو تیار ہوں۔ پھر پولیس چکا کی طرف بھول کر بھی نظر اٹھانے کی جرأت کبھی نہیں کرے گی۔“

”مجھے یقین ہے کہ باس شیخ..... لیکن کچھ جنگی جانور قید و بند میں رہنا پسند نہیں کرتے۔“

”جاتا ہوں پھر بھی تم چکا کو میری طرف سے آفر دے سکتے ہو۔“ شیخ حامد نے حالات کے پیش نظر اپنی مرضی کے خلاف بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

”دیکھوں گا حالات اور موقع پا کر کڑھو نہیں کرتا۔“ ویسے بانی داوے تم اس وقت رات گئے تک کیسے جاگ رہے ہو؟“ مسیحی خیر انداز میں سوال کیا گیا۔ ”کیا کنول کے بعد کوئی بی چکوری تمہارے جال میں پھنس گئی ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔“ شیخ حامد نے زبردستی مسکرا کر جواب دیا۔

”میں سمجھ رہا ہوں میری جان تم بھی ابھی تک اس سے بے خبر ہو۔“ دوبارہ دوسری جانب سے بڑی پرامنراحتی کے جواب ملا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ نیند خراب کرنے کی بجائے آرام سے سینے پر ممبر کا پتھر رکھ کر سو جاؤ۔ جاگتے رہے تو تمہارا سکون مزید تباہ ہو جائے گا۔“

”اب کیا کوئی نئی خبر سنا کر پسند کر دے؟“ شیخ حامد کے لیے میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

”میں اس وقت تمہیں صرف پہلا مصرع سناسکتا ہوں۔ دوسرے مصرعے کی جستجو میں کچھ وقت لگے گا۔“

”مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”ترنم میں نہ سکی..... تحت اللفظ میں نہ لوسر کیا ہے کہ تم جس کا انتظار کر رہے ہو اب وہ خود بھی اپنے اختیار میں نہیں ہے۔“ بات جاری رکھی گئی۔ ”تمہارے ٹوٹے پھوٹے آگلی اور جبرو کے علاوہ اس خوب صورت چیز کو بھی اٹھالیا گیا ہے جو ابھی تک شاید تمہارے بازوؤں کے سقلے میں نہیں پڑ پڑا سکی۔“

”کون لوگ تھے وہ.....؟“ شیخ حامد اس اطلاع پر ہلکا سا گیا۔

”ابھی دوسرا مصرع اچھوڑا ہے مائی ڈیئر..... جیسے ہی عمل ہوا تمہیں بھی ضرور سنا دوں گا۔“ بانی۔ ”اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔“ شیخ حامد نے جھلا کر محفوظ نمبروں کو دوبارہ آزمایا جسے دوسری جانب سے بارڈر آف کیا جانچا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اندر ہی اندر بل کھاتا رہا پھر اس نے ڈی آئی جی کے نمبر ڈائل کیے۔

”ہیلو۔“ چوتھی پر نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔

”شیخ حامد بول رہا ہوں۔ ایک اندر خبر کی تصدیق کرنی ہے۔ کیا چکا اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے؟“

کرنے کی خاطر بے شمار بائز پٹر بلیٹ اختیار کر سکتا تھا لیکن اس وقت وہ بہر حال نصف رات گزر جانے کے باوجود پوری طرح بیدار تھا۔ فی الحال اسے جبرو کے فون کا انتظار تھا۔ اس کی پلاننگ بھی کہ اسلام ڈنکا اور شبنم کی لاشوں کو بھی کسی طرح اور تک زیب سے کھاتے میں ڈال دے گا

شبنم کے اخوا اور اسلام ڈنکا کے پولیس کی نظروں میں آ جانے کے بعد حالات شیخ حامد کے لیے کسی وقت خطرے کی گھنٹی بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ وہ ان دونوں جیٹوں کو ہمیشہ کے لیے فٹن کر دینا چاہتا تھا بعد میں کچھ سوچا جا سکتا تھا لیکن..... اس وقت اسے بڑی شدت سے جبرو کی کال کا انتظار تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بھی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی جب اس کے سواہل پر سنکل ملا روشن اسکرین پر جبرو کے بھانے نامعلوم ہمدرد حوالہ دیکھ کر اس کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی لیکن اس نے جبرو سواہل آن کر لیا۔

”غیریت..... اس وقت تمہیں کیا مشکل پیش آگئی؟“ وہ خشک لہجے میں بولا۔

”مشکل نہیں مائی ڈیئر جب شیخ اس وقت تمہیں ایک خوش خبری سنانے کی خاطر کال کی تھی۔“ پھر مسیحی خیر انداز میں کہا گیا۔ ”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اتنی رات تمہیں کیا تکلیف لاحق ہے۔“

”خوش خبری کیا ہے؟“ اس نے بات کا ٹرپہ دھتور سرد لہجے میں دریافت کیا۔

”میں نے تم سے جگا کے سلسلے میں دو دن کی مہلت چاہی تھی مگر..... کام ایک دن بعد ہی ہو گیا۔“

”کیا مطلب؟“ شیخ حامد جگا کے معاملے پر چلکا۔

”وہ مٹری کے قتلے سے نہایت پا کر پولیس کی تحویل میں آ گیا ہے۔“ بات جاری رکھی گئی۔ ”استاد کی چھان چھک میں فوجیوں نے کسی رعایت کا مظاہرہ نہیں کیا اس کی گلوٹامی اس وجہ سے ہوئی کہ ایک بار سزا پوری کرنے کے بعد اس کا اکاؤنٹ ہائل صاف تھا۔ اب شاید پولیس بھی اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے گی۔ ویسے پولیس کے سمجھے میں بکاؤ میجرز کی تعداد کچھ کم بھی نہیں ہے۔“

”کیسے یقین کروں کہ تم سچ بول رہے ہو؟“

”اپنے زر خری بل ڈاگ ڈی آئی جی کو فون کھڑا کر دو۔ میری اطلاع کی تصدیق کر دے گا۔“

”تم..... تم آخر ہو کیا چیز؟“ شیخ حامد نے سبب سے لہجے میں سوال کیا۔

”پارس پتھر۔ جو کسی چیز سے چھو جا تو اسے بھی کنکن بنا دیتا ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں لیکن..... اس نے کچھ توقف سے پہلے بدل کر دوستانہ انداز اختیار کیا۔“ اگر میں اس پارس پتھر کو اپنے پاس رکھوں تو کیا تم آجودا ہو جاؤ گے؟ میں ہر وقت دے سکتا ہوں یہ بات تم بھی ضرور جانتے ہو گے۔“

”اور تم بھی واقف ہو کہ میں استاد کا کھرا ہمدرد ہوں اس کے ساتھ غداری کا تصور بھی حرام سمجھتا

”آپ کو کیسے علم ہوا؟“ حیرت سے دریافت کیا گیا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری اطلاع غلط نہیں ہے۔“

”مئی ہاں اور میں آپ کے پرائیویٹ نیٹ ورک کی تعریف بھی کروں گا جو آپ کو دوسروں کے مقابلے میں پہلے پولیس کی امدادی باتوں سے باخبر کر دیتا ہے۔“

”اس کی علاوہ اور کوئی خبر بھی ہے تمہارے پاس؟“ شیخ حامد نے اسے جبر اور اسلم ڈٹکا کے سلسلے میں ٹولنے کی کوشش کی۔

”مئی نہیں لیکن آپ کے پاس دوسری کیا خبر ہے؟“ جس سے سوال کیا گیا۔

شیخ حامد نے ایک لمحے کو سوچا کہ جبر اور اسلم ڈٹکا کی خبر سے بھی اسے آگاہ کر دے لیکن اس کا موقع نہیں ملا۔ باہر سے اچانک کئی راتکوں سے ایک ساتھ برست مارا گیا۔ بیٹیا برابر والے سیٹک دم کے کئی شیشے ایک ساتھ ٹوٹنے کی جھلک سنا کر ڈی۔ شیخ حامد نے پلک جھٹکتے میں لائن آف کی۔ ٹریش پر لیٹ کر حالات کا جائزہ لینے کا سوا کچھ نہ دیکھ سکا۔

”ہیلو... ہیلو... شیخ صاحب یہ آوازیں کیسی خفیں؟ سوچیں دے کر موبائل پر ڈی آئی جی کی آواز بہت دور سے ابھرنی سنائی دی۔ شیخ حامد نے اسے منہ کے قریب لاتے ہوئے غرا کہا۔“ کچھ حیرانوں نے کوشی پر حملہ کر دیا ہے۔ فوراً چھپنے کی کوشش کرو۔“ اس نے ڈار شاہی سگم دے کر موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ دیکھتا ہوا بیڑیوں کی مخصوص الماری تک پہنچ کر اس نے ایک ریپیڈ فائر کرنے والی خاص راکٹل کا انتخاب کیا پھر کسی ریز کی گیند کے مانند قلابا ہاں کھاتا ہوا دوسرے کمرے کی جانب لپکا۔

دوسری جانب سے کھڑکیوں اور جیتی قالوں ٹوٹنے کی آوازیوں کا سلسلہ دونوں منزلوں سے جاری ہو گیا۔ حملہ آوروں نے غالباً کوشی کو چاروں اطراف سے گھیر کر گولیاں برساتی شروع کر دی خفیں۔ گلی منزل سے ایک دو زخمیوں کی کراہتی ہوئی وردت تک پہنچ کر آوازیں بھی سنائی دیں۔ وہ ایک لمحے کو فرش پر چت لیٹا صورت حال پر غور کرتا رہا پھر دیکھ کر تائیں پر کراٹک کرتا ہوا ہر جانے والے زینوں کے قریب پہنچ گیا۔ زینے کی بیرونی سائز پر بلٹ پروف شیشے لگے تھے۔ بیڑیوں پر پہنچ کر اس نے آہنی دو دروازے لاک کیا پھر شیشوں کے قریب جا کر باہر کا جائزہ لیا۔ اندر سے اسے توڑے توڑے وقفے سے شیشے لپکتے نظر آ رہے تھے پھر جلد ہی سکون ہو گیا۔ شاید حملہ آور اسے ہراساں کرنے کی ہم پوری کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ ”کون تھے وہ لوگ؟ کس کے اشارے پر کام کر رہے تھے؟ خوفزدہ کرنے میں ان کا کیا مقصد تھا؟“

خاصی دیر تک وہ ان سوالات پر غور کرتا رہا پھر دو دروازے کھول کر ہال کے چوٹی فرش پر آ گیا۔ دوسرے بیڑیوں سے کئی طے چلے بیڑیوں کی آوازیں ابھریں۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

”امداد کوئی ہو تو ہمارا جانے۔ پولیس کی کمک آگئی ہے۔“

شیخ حامد نے پلک کر ایک پانکے کی آڑ لی پھر زینوں کی لائن آن کی تو پولیس کے باوردی افراد بھی نظر آ گئے۔ سب سے آگے ملحقہ خانے کا اسٹیشن ہاؤس آفیسر تھا جس میں سرکاری ہتھول لیے دکھائی

دیا تو شیخ حامد غصے میں بھرا سانسے آ گیا۔

”اتنی دیر سے تم سب کہاں سرے ہوئے تھے؟“ اس نے ایس ایچ او کو حیرت سے گھورا۔

”ہم دوسرے ایریا میں راولٹر پر تھے سڑب ڈی آئی جی صاحب کی کال موصول ہوئی۔“

”کوئی گرفتاری عمل میں آئی یا نہیں؟“

”وہ... ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔“

”بچے کی کیا پوزیشن ہے؟“ شیخ حامد نے جھلا کر دریافت کیا۔

”سر... آپ کے دو گارڈز بھی ہیں اور ایک ملازم فوت ہو چکا ہے۔ میں نے زخمیوں کے لیے امبولینس کو کال کر دیا ہے۔“

”تمہارے مکان کی ٹوٹ پھوٹ اور نقصان کا تفصیلی اندازہ لگا دو مجھے تمہاری خمری رپورٹ درکار ہوگی۔“ شیخ حامد کا انداز حکمانہ تھا۔ ایس ایچ او کسمسا کر رہ گیا پھر ڈی آئی جی کے آجانے سے اس کی جان بچ گئی۔

”بہت احتیاط سے ہر جگہ کا تفصیلی جائزہ لو۔“ اس نے ایس ایچ او سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ مجرموں کا سراغ اچھا آ جائے۔“

ایس ایچ او دوبارہ اپنی ٹیم کے ساتھ باہر چلا گیا تو ڈی آئی جی نے شیخ حامد سے پوچھا۔ ”آپ کا شہنک لوگوں پر ہے؟“

”میں اس وقت عمل کر رہا ہوں۔ یہ شہنکار نہیں کروں گا لیکن وہ جو بھی ہے اس کا پتا چل جائے گا۔“

”ایک اہم بات دریافت کرنا چاہوں گا۔ جگا کے پولیس کی تحویل میں واپس آنے کی اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟“

”اس سے کیا نتیجہ اخذ کرو گے؟“

”یہ بات ٹاپ سیکرےٹ تھی شیخ صاحب... ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ہو سکتا ہے کہ اس وقت جرحہ لگایا گیا ہے وہ بھی اسی سلسلے کی کوئی اہم کڑی ہو۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شیخ حامد نے ڈی آئی جی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”انی فی الحال میرا کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ ہر حال خدا کا شکر ہے کہ آپ پوری طرح محفوظ ہیں۔“

”تم نے لوہی کی جمنی والی درخواست پر کیا فیصلہ کیا؟“ شیخ حامد نے موضوع بدل دیا۔

ڈی آئی جی ایک لمحے کو کسمسا پھر اس نے دہلی زبان میں کہا۔ ”آپ کے فون کے بعد میں نے لوہی کی جمنی کی درخواست منظور کر دی لیکن اس پر عمل روک دیا گیا۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ شیخ حامد نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”تمہیں کس بات کی مجبوری تھی؟“

”اور سہ اچانک یہی احکامات لے آئے کہ کروڑوں کے سلسلے میں کوئی نئے آؤرنہ جاری کیے جائیں۔“ ڈی آئی جی نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ”ہوسکتا ہے کہ اس میں بھی آپ کے دامن کا ہاتھ شامل ہو۔“

”اورنگ زیب کے بارے میں تم کیا کہو گے؟“

”وہ..... وہ..... ایسا کیوں کرے گا؟“ ڈی آئی جی نے چونک کر فتح حامد کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر ایک کریمہ مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔

”اور کوئی بات کرو۔“ اس نے ہونٹ چپا تے ہوئے ڈی لچہ میں کہا پھر ڈی آئی جی کے ساتھ قدم اٹھاتا پیچھے آگیا جہاں ہر طرف افراتفری میں ٹوٹے ہوئے شیشے گھبرے پڑے تھے۔ بیشتر کھڑکیاں روشندان کے علاوہ اور بھی کئی قیمتی اشیاء گولیوں کی پوجھاڑ کے سبب ضائع ہو گئی تھیں۔ پولیس کا حملہ ایک کونے میں مجرموں کے نشانات تلاش کرتا پھر باہر تھا۔ فتح حامد کی پیشانی پر آؤری تہجی لکیریں ابھرنے لگیں وہ جانتا تھا کہ حملہ کرنے والے کوئی کے اندر داخل نہیں ہو سکے تھے ورنہ وہاں پر بھی ضرور آتے۔ اس نے پولیس مے کے کام میں مداخلت بھی نہیں کی لیکن اس کے دل و دماغ میں اس وقت انتقام کی چنگاریاں سنگ رہی تھیں۔

گالف کلب کی آبادی سے بھی تقریباً ڈیڑھ دو گونہ بڑا واقع تھا۔ وہاں صرف ممبر یا ان کے خاص مہمانوں جن کا پاس کلب کے جرنل میکر ہیڈز کے لیے بھی وقف تھا جہاں صرف وہی لوگ شادی کی تقریب کر سکتے تھے جن کے پاس دولت کی فراوانی ہو اور ذاتی کار ہو سکی اور کشتاب اور دوسری سواروں کو بھی اس ایریا میں داخل ہونے کی ممانعت تھی کبھی کبھی وہاں کے کالٹرس ہال میں حکومت وقت کی خفیہ کالٹرس کی محتاش نکال لی جاتی۔ دوسرے مخصوص وی آئی پیز بھی اسے بیک کر سکتے تھے جس کی کچھ مخصوص شرائط تھیں۔

بہر حال اس روز شام ہی ڈینس کے آبادی والے علاقے سے گالف کلب کی طرف جانے والی سڑک کو کلب کے بورڈ کے قریب سے بلاک کر دیا گیا تھا جہاں فوج کی بکتر بند گاڑیوں کے علاوہ ملٹری کے کچھ افسران بھی موجود تھے۔ کلب تک سڑک کے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اسلحہ بردار فوجی جوان بھی تعینات تھے۔ فوجی چیپ پر موجود چاق و چوبند علامہ بھی چکر لگاتا پھر رہا تھا۔ کلب کو قطر تصور کر کے اس کو تقریباً چاروں اطراف سے تین فلائنگ کے فاصلے تک گھبرے میں لے لیا گیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک مخصوص طیارہ بھی فضا میں چکر لگاتا رہا تھا۔ کلب کی صورت حال ان دنوں معمول کے مطابق تھی اس لیے کلب سے قریب تر بیگوں میں رہنے والے یا تو سکون سے اپنے اپنے روزمرہ کے مشغلوں میں مگن تھے یا پھر ان کا خیال تھا کہ کلب میں فوجی سربراہوں کی کوئی میٹنگ ہو رہی ہوگی۔ شہری آبادی کو اس کا کوئی علم نہیں تھا لیکن.....

ٹھیک اسی وقت رات کے دس بجے ایس بی اورنگ زیب اور ڈی بی سپرٹینڈنٹ سراج ایک بڑی دین کے چھلے ایئر کنڈیشنڈ میں بیٹھے پورنیکل ٹی وی اسکرین پر گالف کلب کی عمارت کے باہر چاروں اطراف کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر لیات سینٹ ریڈی میڈ ایک مپ کیے مخصوص لباس میں پوری طرح محتاط نظر آ رہا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ پر اعشاریہ تین آٹھ کا آؤٹریک بٹول بھی موجود تھا۔ اس کی حفاظت نظریں بار بار دہمیں بائیں گئے ایک ویو کرا پوری طرح توجہ سے جارہے رہی تھی۔

دین کے اندر سراج اور اورنگ زیب کی نظریں پورٹ اسٹیل ٹی وی پر مرکوز تھیں جس پر کلب کے چاروں اطراف کا صرف بیرونی منظر نظر آ رہا تھا۔

”نہیں..... جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس کی اجازت بھی خاصی تنگ و دو کے بعد ملی ہے۔“

سراج نے حیرت کوئی وضاحت نہیں چاہی لیکن پھر بعد جب ایک گاڑی کلب کے مرکزی دروازے کے سامنے رکی اور اس میں سے برآمد ہونے والی چاروں شخصیات کو دیکھ کر چڑھ کر تھا۔ ان سب کا کٹھن صوبے کی پہلی کورٹ سے تھا اس وقت انہوں نے اپنی اپنی ہینڈ کے علقہ لباس پہن رکھے تھے گاڑی سے اتر کر جو حیرت قدم اٹھاے عمارت میں داخل ہو گئے گاڑیاں بھی وہاں سے ہٹائی گئیں۔ اس کے بعد وہ صحن بعد ایک لمبی گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے برآمد ہونے والی شخصیت صوبے کی چیف جسٹس کی گاڑی کے پیچھے دو دھن گاڑیاں اور آٹھ جن میں سے ٹھری کے اہل محمد عید برآمد ہو کر جلدی جلدی کلب کی عمارت میں داخل ہو گئے۔

”ادہ.....“ سراج نے بیڑی کا اٹھار کیا۔

اورنگ زیب جواب دینا چاہتا تھا لیکن پھر اس کی نظریں بھی تی دی اسکر

”یہ سب یہاں کس مقصد سے لائے گئے ہیں؟“

شکول 365 دوم

۱۰ شیمن اور کنول کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ میرا جنس ہماری اعجاز میں سوال کیا لیکن اورنگ زیب کے کہہ سکنے سے پہلے اسے اگلی کڑی کاڑی سے اتارنے والی چار برقع پوش خستہوں کو دیکھ کر اعجاز ہو گیا تھا کہ اس میں سے ایک شیمن اور دوسری کنول بھی ہو سکتی ہے۔ باقی دو کون تھیں؟ اس نے ان کے بارے میں زبان کھولنے کا اعجاز کیا لیکن اسے عملی جلد نہ پہنا سکا اورنگ زیب کے موبائل پر گھٹل ملا تو اس نے فوری طور پر روشنی خمدوں کو دیکھا اور ان کر کے ہلایا۔

”کیا خبر ہے.....؟“

”رائٹ سر.....“

”کیا ہمارے ڈی آئی جی یا وزیر داخلہ بھی اندر موجود ہوں گے؟“

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ سراج نے مجھے توفیق سے دوسرا سوال کیا۔ ”کیا آپ کے آقا کو

”اب بھی میں یہی کہوں گا..... اس لیے کہ درعوں کی حس انسانوں کی بوجہ دور سے محسوس کر لیتی ہے۔“

سراج اور کوئی سوال کرنے کے لیے پرتول رہا تھا کہ ٹی وی کی روشن اسکرین پر پھر اڑنے لگے۔ اسی لمحے اورنگ زیب کا موبائل دوبارہ جاگ اٹھا۔

”یہ رابطہ کیسے ختم ہو گیا؟“ اس نے تیزی سے سوال کیا۔

”بس یحجر نے رسک لے کر ہمارا راستہ ہموار کیا تھا۔ اب اسی کی ہدایت پر پورا سسٹم خاموشی سے چلتا رہا ہے۔“

کنول کے خوا کا مسئلہ بھی مجھے سے کہ نہیں تھا اسے ایک ایسے فرد نے خوا کیا تھا جو ان کا
 وارادات سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا کسی نے اسے مرنے والے کے ہمیں میں اٹھایا تھا۔ وہ کون
 تھا؟ اس ایک سوال کے عقب میں کئی امکانات اس کے ذہن میں کلپا رہے تھے جس نامعلوم تجربے
 چکا کوٹری کے چگل سے نکالنے کا دعویٰ کیا تھا اور کیا صاحب بھی ہو گیا تھا وہ بھی شے کی زمین شاد کیا جا
 سکتا تھا۔ چکا کے سلسلے میں بی بی حامد پر دیا ڈالنے اور اسے حالات سے سمجھوتا کرنے پر مجبور کرنے کی
 خاطر کنول ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی دوسرا شہہ اورنگ زب کی شخصیت کو بھی کسی قدر مشکوک بنا
 رہا تھا۔ وہ خاصی دیک ربک مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا پھر اس نے ہونٹ چاٹے ہوئے کنول کا رہنمائی
 اٹھایا اورنگ زب کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ہیلو..... ایس بی اورنگ زیب آن لائن!“ دوسری جانب سے سنجیدگی سے جواب ملا۔

”میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“

”اوہ..... فیح حامد صاحب! سوری! میں اس وقت ایک ضروری قائل کا مطالعہ کر رہا تھا اس لیے

ہیڈ سیٹ پر آپ کا نام نہیں پڑھ سکا، فرمائیے اس وقت کیسے یا کیا؟“

”میں اس وقت تم سے ایک ذاتی سلسلے میں کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں لیکن..... فون پر

نہیں۔“ فصیح حامد نے سہر سراتے انداز میں کہا۔

”آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”گھر پر..... اگر ممکن ہو تو ابھی آ جاؤ۔“ اس کا انداز بہ دستور حکیمانہ تھا۔

”او۔ نہ۔“ دوسری جانب سے مختصر جواب دینے کے بعد لائن کاٹ دی گئی لیکن آدمی کھٹے

بعد ہی اورنگ زیب اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔

”کیا بیٹا پسند کرو گے؟“

”کچھ ضروری کام نمٹانے میں مصروف تھا۔ آپ کا فون ملا تو علم کی تکمیل میں فوری آ

گیا۔ چائے ڈیو رہی۔“ اور نگ زیب نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔

”آپ فرمائیں۔ میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں؟“

”میں جگا کے سلسلے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ شیخ حامد نے پوچھ توقف کے

کہا۔ ”ستا ہے کہ وہ ملٹری اکیڈمی جیس کے ہاتھوں سے نکل کر پولیس کی تحویل میں آ گیا ہے؟“

”جی.....جی ہاں۔“ اور نگ زیب نے لسمسا کر جواب دیا۔ ”ایک بار لڑکاری اور رہائی کے

بعد اس کا ریکارڈ بالکل صاف تھا، "میرا خیال ہے کہ مٹری الوائری کے بعد اب پوئیس جی اسے جلدی

”میں نے کہا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میری بات نہ کرو۔“

”اور اگر میں یہ چاہوں کہ اسے رہائی نہ ملے تو؟“

”اس سلسلے میں شاید میں آپ کی لونی براہ راست مدد نہ کر سکوں۔ اس لیے کہ جگا کی حرید

چھان بین ڈائرکٹ ڈی آئی جی لوسوپی می ہے۔

”مگر کیوں؟“

”میچر کہتا ہے کہ اندر کارروائی شروع ہونے سے پیشتر کرنل احتشام بخت خود حساس و ذکیٹر سے اندر او باہر کے تمام حفاظتی نظام کو چیک کر گا۔ ابھی تک جو عمرے اور مرغیاں اندر گئے ہیں انہیں ایک طبقہ کرے میں رکھا گیا ہے جہاں کبھی بھی بیرونی ریلوں کو ناہنگن بنانے کی خاطر پادروئل جاسر لگا ہے۔ اصل کارروائی کرنل کے اشارے کے بعد ہی شروع ہوگی۔“

”اوکے..... اب تمہی خاموشی سے نکل جاؤ۔“ اور کب زب نے کہا پھر اس نے بھی سوال پٹٹی دی سیٹ دیگر آلات سمیت کرتے کے ایک کارٹن میں رکھ دیے۔

’اب کیا پرو گرم ہے؟‘ سراج نے سوال کیا۔

”تمہارے گھر چلنے ہیں جہاں الماس بیٹیاں راجی ہوگی۔“ اورنگ زیب نے حجاب ویا
پھر اس نے لیاقت حسین کو واپس چلنے کے بارے میں ہدایت دینے کی خاطر اپنے سائڈ پروف سے
اوپر اٹھ کر نشست کے درمیان مختصر خلا کو کھولنے کی خاطر ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اس سے چشمہ ان کی گاڑی
تیزی سے حرکت میں آگئی۔ اورنگ زیب فوراً طور پر خلا کھولنے کے بعد سوال کیا۔

”کہا مات ہے لیاقت حسین۔ تم نے اچانک گاڑی کیوں چلا دی؟“

”جب ہمارا کام یہاں روک دیا گیا تو اب کوئی خطرہ مول لینے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

لہاقت حسین کے جواب نے اورنگ زیب کے علاوہ سراج کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا۔ شاید وہ

کوئی پراسر قوت ہی تھی جو اب بھی لیاقت حسین کی رہنمائی کر رہی تھی۔ کچھ فاصلہ خاموشی سے طے ہو

کیا پھر سراج نے کسی خیال سے چمکتے ہوئے پوچھا۔

”لوچمن اور دشمنو کے بارے میں ابھی تک آپ نے کچھ نہیں بتایا؟“

”فکرم ت کرد۔ وہ بھی بہت جلد ہماری لپیٹ میں آ جائیں گے۔“

”درست جواب دینے میں کیا پھر کوئی مصلحت آڑے آ رہی ہے؟“

”میں تمہارے اس خیال کی تردید نہیں کروں گا۔“ اور نگ زیب نے دوستانہ انداز میں مسکرا کر

کہا تو سراج نے مزید کوئی کرید مناسب نہیں سمجھی۔

✦✦✦

ایک ایک کر کے مارے پانے لگے پڑ رہے تھے۔ سب حامد کے پاس حالات کے بہم میں

مہوکنے کے لیے فرنٹ لائن ختم ہو جانے کے بعد بھی دوسرے درجے کے بے شمارے جاں نثار موجود

تھے لیکن حالات کی روشنی میں وہ انہیں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ وشنوبل جانتا تو وہ اس کی صلاحیتوں پر

انحصار کر سکتا تھا لیکن وہ جیل سے فرار ہونے کے بعد کسی چھٹا درجے کی طرح نظروں سے اڑھل ہو گیا۔

تھا؛ دشمن اور لوچمن کے سلسلے میں اس کو ملنے والی پولیس ذرائع کی اطلاعات بھی کچھ حوصلہ افزائی

تھیں پولیس کے علاوہ خفیہ ایجنسیاں بھی اب تک لٹی چھاپے مار چکی ہیں مین انہیں بنی کامیابی نہیں

ہوتی تھی۔

”کیا ڈی آئی جی تمہاری بات کو ٹال سکتا ہے؟“ فتح حامد نے اورنگ زیب کو ٹھوٹھیں نظروں سے دیکھا۔

”میرا ذاتی خیال ہے کہ ڈی آئی جی صاحب میری تجویز کے سہائے آپ کے حکم کا زیادہ خیال کریں گے۔“

”آئی۔سی۔ گویا آپ اس کی گلوبکس میں نہیں رہے۔“

”شاید۔۔۔ اورنگ زیب کے چہرے پر ایک رنگ اکڑ کر گیا۔ ”ویسے میں کسی کی پسند نا پسند سے زیادہ اپنے فرائض پر زیادہ نظر رکھتا ہوں۔“

”میں چاہتا ہوں۔۔۔ تمہاری کچھ براہ راست۔۔۔“

”یہ بھی وہی باتیں ہیں۔ اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر غلیبی سے کہا۔ ”وقت اور حالات کی وقت بھی موسم کی طرح بدل سکتے ہیں۔“

فتح حامد کی تقریر پر دستور اورنگ زیب کا منہ کسے کر کے نہیں میں معروف تھیں جب اس کے موبائل پر مشعل موصول ہو اور ڈسٹن اکسپرن پر ہمارا دفتر کے فہرہ دیکھ کر وہ ایک لمبے کوچہ میں گم ہو گیا پھر موبائل آن کر کے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں اس وقت معروف ہوں تم پھر کسی وقت۔۔۔“

”لائن ڈس کنکٹ کرنے کی فطرتی نہ کرنا ہو سکتا ہے کہ پھر میں بھی تمہیں اس خطرے سے بروقت آگاہ نہ کر سکوں جو تمہارے سر پر کسی ہو کے آدم خود گدھ کی طرح مٹلا رہا ہے۔“

”کیا خاص ضرورت تھی آئی جی ہے؟“ فتح حامد نے الجھ کر سوال کیا۔

”ایک دو روز میں تمہارا زور زریعہ مل ڈاگ۔ ڈی آئی جی جو بیٹیلڈ اور افسران کی مشورہ کر کافرٹس منتقل کر رہا ہے وہ تمہارے دھجہ کے پانچ پانچ تائیت میں آخری ٹیل جیجی ثابت ہو سکتی ہے۔“

”پھر؟۔۔۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”اور کچھ نہیں تو فوری طور پر اپنے فرار کا کوئی معقول بندوبست قبل از وقت کر لو ورنہ۔۔۔ پھر شاہ فرعون کی طرح تمہاری لاش کو سمندری جھیلوں میں قبول کرنے سے انکار کریں گی۔“

”ڈھونڈ ڈھنڈی۔۔۔ میں اس وقت تمہارے لیے مزید وقت نہیں نکال سکتا۔“

”میں جانتا ہوں کہ اس وقت تمہاری مصروفیت کیا ہے۔ دوسری جانب سے سرو لہجے میں کہا گیا۔ ”تم جس کوشش میں اٹھائے کی کوشش کر رہے ہو۔۔۔ اس کی اپنی زندگی بھی اس پر پس کافرٹس میں خطرے میں ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ فتح حامد چٹکا۔

”شارٹ ویئر میں فی الحال بھی تباہی کا سکہ ہوں کہ اس پر پس کافرٹس کے سنگین حالات سے دو چار ہونے کے بعد کی ایجنسیاں مل کر تمہاری تلاش میں بڑی دل کی طرح ٹوٹ پڑیں گی۔“

”رہیں۔۔۔ فتح حامد نے تھلا کر کہا۔

”میں خوش فہمی تمہارے وجود کو چاٹ جائے گی میری آخری بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ تمہارے خلاف جو جہت اور تمہارے خاص حراسین کے جو بیانات ریکارڈ ہو چکے ہیں وہ تمہاری موتی گردن میں چمکی کا پچھڑا سی ثابت ہوں گے باقی اطلاعات تمہاری روح کو پہنچانے کی کوشش کروں گا اب اجازت چاہتا۔“

”ون منٹ۔۔۔ فتح حامد نے تیزی سے کہا۔ ”ایک اہم بات چاہتا چاہوں گا۔ تمہیں ان معاملات سے کیا دیکھی ہے؟“

”تم نے جگا کے سلسلے میں ملٹی جنس میں ہونے کی جو تصدیق کی تھی وہ میری گردن پر پہلا اور آخری احساس تھا جس کی ادائیگی کی آخری قسط اس وقت ادا کر رہا ہوں۔۔۔ باقی۔۔۔“

دوسری جانب سے راولہ متعلق ہو گیا تو فتح حامد نے اورنگ زیب پر توجہ دی جس نے اس کے کال میں مصروف ہونے کے بعد دوسری میز پر پڑا ایک فیشن میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی تھی۔ اس کے چہرے پر اس وقت تنہید کی اور بے نیازی کے نئے نئے تاثرات نظر آرہے تھے۔

”مسٹر اورنگ زیب۔ کیا تمہارا ڈی آئی جی میڈیا اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی کوئی پریس کانفرنس کال کرنے والا ہے؟“

”وہاں۔۔۔؟“ اورنگ زیب نے میگزین رکھ کر فتح حامد کو حیرت سے دیکھا پھر سکون سے بولا۔ ”میرے پاس اب بھی ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے۔“

”اوہ۔۔۔ تم شاید کسی وجہ سے اس خبر کی تصدیق مناسب نہیں سمجھ رہے۔“

”یہ سب آپ کا ذاتی خیال ہے۔“

”اس ذاتی خیال کے تحت ایک مشورہ دے رہا ہوں۔ فتح حامد نے اسے کرینے کی خاطر ایک اور طریقہ آزمایا۔ ”تم اس کانفرنس سے دور ہی رہنا ورنہ۔۔۔“

”ورنہ کیا ہو؟“

”اس کا اندازہ تمہیں کانفرنس میں شرکت کے بعد ہی ہو سکے گا۔“

”جیجی اس فار پورایڈ وائس۔ اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر آپ نے صرف جگا کے سلسلے میں مجھے طلب کیا تھا تو ایک بار پھر آپ کو قہقہے دلانا چاہوں گا اس بارے میں آپ براہ راست ڈی آئی جی سے اپنے پرانے اور پھر نقلات کو آزمائے کی کوشش کریں۔ میں معذرت چاہوں گا۔“

”او۔۔۔ کے۔۔۔ فتح حامد ہونٹ چاہتے ہوئے اٹھ کر اورنگ زیب سے رخصتی معافی کیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر نامعلوم اور پراسرار تجزیہ فون کال کے بارے میں سوچتا رہا جو اس کے لیے حیرت انگیز تجزیہ اور حسی نا قابل یقین بھی۔ پھر کبھی اس نے حفظہ بالقدم کی خاطر اپنے اس تیز رفتار ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو کون کرنے میں کوئی تاحیت بھی نہیں محسوس کی جو مینے دو مینے میں محسوس کی

تفریح کے عوض گھر بیٹھے خاصی مشغول تنخواہ ہر مہینے وصول کر رہا تھا۔

فون کال سے سننے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک اسی کال کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے غور کرتا رہا۔ نامعلوم تجربے اس سے بیشتر اسے جو اطلاعات فراہم کی تھیں وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی تھیں لیکن ایک فرق ضرور تھا۔ پہلی اطلاعات شیخ عاکد زکری سے متعلق ہوا کرتی تھیں لیکن اس بار اسے اس کی موت کے خدشات سے آگاہ کیا گیا تھا۔

میوہل کیٹھی کے کانفرنس ہال میں اس وقت خاصی گہما گہما نظر آ رہی تھی۔ دائیں جانب پولیس کے جھگے کے آگے دس سینئر آفیسر سادے لباس میں موجود تھے جبکہ بائیں جانب اردو انگریزی اخباری اداروں کے رپورٹرز اور مشہور صحابیہ نگار بھی موجود تھے جو آپس میں صرف اسی ایک موضوع پر بحث کرتے ہیں مشغول تھے کہ شہر کے حالات میں والے دن کیسٹن کی مصیبت کی وارداتیں آخر تک اورس طرح ختم ہوں گی اور پولیس کی بھاری نفری ابھی تک حالات کو کنٹرول کرنے میں کیوں ناکام ہو رہی ہے؟ یہ چہ گوئیاں خامے دلوں سے گردش کر رہی تھیں مختلف اخبار اس موضوع پر گہما گہما خبریں بھی شائع کر رہے تھے۔ یہاں تک لکھ دیا گیا تھا کہ غالباً پولیس ان وارداتوں کے عقب میں نظر آنے والے مخصوص اور سیاسی حلقوں کے اثر دوسرے کی وجہ سے چشم پوشی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ کچھ کاروباری بڑوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا جنہوں نے اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کی خاطر جرائم پیشہ افراد پال رکھے تھے اور برلا اپنی برتری منوانے کی خاطر اپنے حاکمین کے خلاف آنے دن فٹنڈا گروہ کا بڑے دھڑلے سے انکباب کرتے تھے۔ ان کی افواہوں میں کیا گیا پھر کٹنا نہ عبرت بنا کر اس یقین دہانی کے بعد چھوڑ دیا گیا کہ وہ آئندہ نہ اپنی زبان کو کھولیں گے نہ اپنے سے زیادہ طاقت ور پارٹی سے مقابلے کی کوشش کریں گے۔

تکٹین حالات کا گراف روز بڑھتا جا رہا تھا جبکہ پولیس کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان وارداتوں کے بارے میں اخبارات نے عمل کر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کیا بارے یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ پولیس کو مطلوب خطرناک جرائم پیشہ افراد کی پرورش کون کر رہا ہے؟ ان کی گرفتاری عمل میں کیوں نہیں آئی.....؟ پولیس مفت کی تنخواہ کیوں پرپ کر رہی ہے؟ پھر ایک کی روز انہی مطلوب جرائم پیشہ افراد کی سرد لاشوں کا پکڑا کٹڑی سے براہ ہونا اور سفید پوشوں کا کچرا ہونا کس کے حکماتے میں درجن ہو رہا ہے؟ اس کی ذمے داری اگر پولیس اور اس کے ذیلی اداروں پر نہیں رہی تو پھر کون ان کا سہارا کرے گا؟

اخبارات کے ان سرخ حاشیوں کے بارے میں پولیس مختلف وضاحتیں دیتی رہتی بات کسی نہ کسی طرح دی جاتی لیکن گزشتہ دنوں چند حلقے جیسے بڑے کاروباری حلقے کی کوشی پر بار بار حملے۔ ان کے دفتر کو کنڈر آتش کر دینے کی جو وارداتیں ہوئی تھیں اس نے مرکز کے ذمے داروں کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اخبارات نے برلا اس شے کا اظہار کیا کہ پولیس کے ذمے دار افسران بھی

مختلف گروہوں کے ہاتھوں تک پہنچے ہیں۔ جو سر اٹھانے کی کوشش کر کے اپنی ذمے داری پوری کرنے کی خاطر میدان میں آتے ہیں انہیں کسی نہ کسی دباؤ کی خاطر خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ پولیس نے ان خبروں کی تردید کرنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران دو ایسے انڈر وولٹ سے تعلق رکھنے والے خطرناک افراد جو گرفتار ہونے کے بعد یہ طور خاص پولیس کی بھاری نفری کی خاص نگرانی میں تھے۔ ان کا چانک اس طرح فرار ہوا تھا کہ نہ ان کے اور پولیس کے درمیان مقابلہ ہوا نہ ہی کسی کو ان کے فرار کی پیموش ہوئی اور..... کئی دنوں کے بعد بھی ان کی دوبارہ گرفتاری عمل میں نہ آئی..... یہ ایسا اہم تھا جس کا جواب کھل نگرانی کرنے والے عمل کو عارضی طور پر معطل کر دینا اخبارات کے لیے ناکافی تھا۔ مرکز کے افراد کی طرف سے بھی سوچائی ذمے داروں سے باز پرس شروع ہو گئی تھیں۔ اخبارات نے حواثر شہر خیال لگائی شروع کر دی تھیں۔ یہ بھی مکمل کر لکھا جا رہا تھا کہ نگرانی کا انتظام کرنے والے بڑے پولیس افسران نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی ہے اور میڈیا کے نمائندوں سے ملاقات سے گریز کر رہے ہیں آخر کیوں؟ اس وقت ڈی آئی جی کی کھڑا آنکھوں نے اسی ضمن میں بڑے پیمانے پر پریس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا جس میں ذمے دار افسران بھی ان کے رو برو موجود تھے۔

دونوں ہی گروہوں اپنی اپنی پولیاں بول رہے تھے لیکن پولیس کی جانب سے اور تک نیب اور سربراہ بالکل خاموش تھے۔ اخباری نمائندوں کا سب سے سینئر اور تجربہ کار رپورٹر جس کا تعلق بھی ایک بڑے اخبار سے تھا وہ بھی خلاف توقع کسی گہری سوچ میں تھا جب اس کے برابر بیٹھے ہوئے نمائندے نے سوال کیا۔ ”کیا بات ہے صفدر صاحب! آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں؟“

”میں اہم سوالات کو ذہن میں ترتیب دے رہا ہوں۔“

”آپ نے ایس بی اینس کی اور تک نیب اور ڈی اینس کی سربراہ پر تو شک کیا۔ وجود میں آنے والی یہ نئی جڑی بھی کچھ کم نظر آ رہی ہے جبکہ فرار ہو جانے والے دونوں خطرناک مجرم براہ راست اور تک نیب کی نگرانی میں تھے۔“

ٹیک اسی وقت ڈی آئی جی کی کھڑا اپنی باقاعدہ بیٹیم میں ہال میں داخل ہوا تو سب افراد اٹھ کھڑے ہو گئے ہال میں خاموشی طاری ہو گئی۔ حسب روایت پیلے ڈی آئی جی نے بلائی جانے والی کانفرنس اور اس کی ضرورت پر مختصر تقریر کی پھر اس کے برابر بیٹھے ہوئے سینئر پولیس پریزنٹیشن نے اخباری نمائندوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اب آپ حضرات باری باری سوالات کر سکتے ہیں۔“

سب سے پیشتر ایک انگریزی اخبار کی نمائندے نے اٹھ کر چپچپے ہوئے اعزاز میں کہا کہ میں یہ جانتا ہوں کہ ان کے بعد آپ حضرات تمام خاموشی کا دلی زبان میں اعتراف کر رہے ہیں تو پھر یہ بھی عرض کریں کہ اس کی ذمے داری کس پر عائد ہوتی ہے؟..... میں خاص طور پر حال میں فرار ہونے والے ان دو بین الاقوامی مجرموں کے بارے میں معلوم کرنا چاہوں گا جو ابھی تک دوبارہ گرفتار

نہیں ہو سکے اور یہ بھی کہ اس کی براہ راست ذمہ داری کس کے اوپر عائد ہوتی ہے؟“ سوال کرتے ہوئے اس کی نظریں اندازہ بڑے سختی خیر انداز میں اورنگ زیب کی جانب اٹھی تھیں۔

ڈی آئی جی نے ٹھوڑے توقف سے جواب دیا۔

”پولیس کے ذمہ دار افسران ان کی تلاش میں شب و روز چھاپے مار رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ انہیں بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ براہ راست ذمہ داری کا سوال تو اس کے بارے میں پہلے ہی وضاحت کی جا چکی ہے۔“

”وہ وضاحت ایک سرسری بیان تھا“ اسی نمائندہ نے دوبارہ اٹھ کر ایک بار پھر اورنگ زیب کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے ڈی آئی جی سے کہا۔ ”میں چاہوں گا کہ اس وقت مسٹر اورنگ زیب کو موقع دیا جائے کہ وہ وضاحت کر سکیں ان خرابیوں کی جس کی وجہ سے مجرموں کو فرار ہونے کا موقع ملا۔“

جواب میں ڈی آئی جی نے اورنگ زیب کی طرف اپنا ہاتھ اٹھایا تو اورنگ زیب نے اپنا ہاتھ اٹھ کر اسے روک دیا۔ ”میں مجرموں کے فرار ہونے کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ ان کی تمام تر ذمہ داری میرے اوپر تھی اور میں اس وقت بھی کسی آناکانی کے بغیر اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔ اس امر کی وضاحت اس وقت کرنا پسند نہیں کروں گا کہ ان کے فرار میں کن عوامل کو دخل تھا۔“

”بہت خوب.....“ ایک دوسرے نمائندہ نے تجویز سے اٹھ کر کہا۔ ”آپ اپنی کوتاہی قبول کرنے کے باوجود ان کی وجوہات کو چھپانا چاہتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ کوئی خاص ذاتی مقصد ہے؟“ ”جی ہاں.....“ اورنگ زیب نے اطمینان سے چپچپے ہوئے انداز میں کہا۔ ”سوال جس انداز میں شروع کیا گیا اس کے پیچھے بھی ایک ہاتھ ہے جو انداز کو ڈھونڈ لینے میں بڑی فیضی سے کام لیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے ہی ناپید ہاتھ نے غمراہی کرنے والے کسی ملحد کو بھی فریاد کیا ہو گا جس کی وجہ سے ہمیں تمام غمراہی کرنے والے ملحد کو معطل کرنا پڑا۔ میں اس ہی خاص وجوہات کی بنا پر اس وقت کچھ کہنے سے گریز کروں گا۔“

”آپ غمراہی کرنے والے جس عمل کی بات کر رہے ہیں اس میں آپ کی حیثیت ایک سربراہ کی تھی۔ پھر آپ کو کوئی سزا کیوں نہیں ملی؟“ گھبراہٹ اخبار کے منہ چھٹ نمائندہ نے اپنے مخصوص انداز میں دریافت کیا۔

”اس کی وضاحت میں کرتا ہوں۔“ ڈی آئی جی نے اورنگ زیب کے بولنے سے خوشتر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ بات پولیس کے ذمہ داروں کے علاوہ کبھی بھی ضرور جانتے ہیں کہ مسٹر اورنگ زیب ایک دباؤ مند افسر ہیں۔ میں جانتا ہوں مسٹر اورنگ زیب بہت جلد دونوں مجرموں کو دوبارہ پولیس کتھرے تک لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

تیز رفتار انداز میں سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا جب صفدر علی نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”صبح

حامد کی کوئی پروا بارہ حملہ ہوا۔ ان کے دفتر کے ایک بڑے حصے کو خاک کر دیا گیا۔ کئی چائیں بھی ضائع ہو چکی ہیں۔ آخر وہ کون سا گروپ ہے جو خاص طور پر ایک خاص اور بڑے کاروباری شخص کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے؟“

”اس سلسلے میں کچھ گرفتار یاں بھی عمل میں آئی تھیں جنہیں ضروری تحقیقات کے بعد بے قصور سمجھ کر چھوڑ دیا گیا لیکن..... مجھے یہ یقین ہے کہ فرار ہونے والے دونوں مجرم گرفتاری کے بعد اس کی بہتر طور پر وضاحت کر سکیں گے۔“

سوال اور جواب کے دوران مختلف پولیس افسران اور پریس کے علاوہ تجزیہ نگار بھی اپنی اپنی پولیوں بولتے رہے لیکن سراج کی نظریں اس دوران بار بار صفدر علی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ وہ ذاتی طور پر اس کو بہت قریب سے جانتا تھا لیکن اس وقت اس کے بولنے کا انداز اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اسے مختلف نظر آ رہے تھے۔ وہ کئی بار اسے بے حد حوجہ سے دیکھ چکا تھا اس وقت بھی اس کی نظریں صفدر علی پر مرکوز تھیں جب اورنگ زیب نے اسے ایک مخصوص انداز میں کہنی ماری۔ سراج نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا لیکن اورنگ زیب اس وقت سوال کرنے والے ایک اخباری نمائندہ کی طرف حوجہ سراج اس کہنی مارنے والے مکمل کو اتفاقاً دیکھیں کہ سکنا تھا چنانچہ اس کا ذہن کئی امکانات کے بارے میں غور کرنے لگا اس کی نظریں دوبارہ صفدر علی کا جائزہ لے رہی تھیں جب اس نے ڈی آئی جی کی ایک وضاحت کے بعد تجویز سے اٹھتے ہوئے ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔

”میں آپ کی وساطت سے مسٹر اورنگ زیب اور مسٹر سراج سے ایک اہم بات کی وضاحت چاہوں گا۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے حامد کے علاوہ سیٹھ عثمان اور سر تسلیم آغا خانی گروپوں کو بھی بڑے صنعت کاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے صبح حامد کی کوئی پروا بارہ ہونے والا حملہ کسی کاروباری دہشت گردی کا کوئی ردعمل ہو۔ میں ذاتی طور پر اس بات کی چھان بین کر چکا ہوں کہ سیٹھ عثمان کا خاص ڈرائیور لیاقت حسین جیسے اب ترقی دے کر دفتری عملے میں بھی شامل کر لیا گیا ہے اکثر و بیشتر مسٹر سراج کے منتقلہ پر کئی کئی دن قیام کرتا ہے۔ اس دوران مسٹر اورنگ زیب بھی وہاں اکثر موجود پائے گئے ہیں۔ میں یہ دریافت کرنا پسند کروں گا کہ ایک ڈرائیور کا دو پولیس افسروں سے اتنا گہرا رابطہ و شہد کیا معنی رکھتا ہے؟“

سراج صفدر علی کی زبان سے لیاقت حسین کا حوالہ کر کر بری طرح چونکا۔ کچھ دوسرے پولیس افسران کی نظریں بھی ان دونوں کی طرف گھوم گئیں۔ سوال چونکہ ڈی آئی جی کی وساطت سے کیا گیا تھا اس لیے اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اورنگ زیب نے کچھ توقف کے بعد کسمسا کر کہا۔ ”میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں لیاقت حسین ان شخص سے اس حد تک واقف ہیں کہ وہ سیٹھ عثمان کا ڈرائیور ہے۔ سراج صاحب سے چونکہ یہ آئینہ تعلق ہے اس لیے میں ان کے گھر بھی اکثر و بیشتر آتا جا رہا ہوں جہاں کئی بار لیاقت حسین سے بھی سرسری گفتگو کا موقع ملا۔ رہا یہ سوال کہ مسٹر سراج کے گھر پر

لیاقت حسین کا آنا جانا تو اس کے جواب میں صرف یہی کہوں گا کہ مسٹر عثمان اور مسٹر سراج کسی زمانے میں ہم جماعت بھی رہ چکے ہیں اب بھی ان کے درمیان فیصلہ نہیں ہیں اس لیے لیاقت حسین کو اس کا نفرض یا موجودہ حساس معاملات میں شامل کرنا میرے نزدیک ایک فطری غیر ضروری بحث ہو گی۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی بتانا پسند کروں گا کہ مجھے اور مسٹر سراج کو بھی ایک دو موقعوں پر ٹارگٹ بنایا جا چکا ہے۔“

”پھر آپ کو اس حملے کے پیچھے کس کا ہاتھ نظر آتا ہے؟“ دوسرے نمائندے نے سوال کیا۔

”نو کنکشن.....“ اورنگ زیب نے مختصر جواب دیا۔

”میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ کسی ڈرائیور کو اس وقت اس کا نفرض میں ڈسکنس کرنا مناسب نہیں ہو گا۔“ ڈی آئی جی نے صاف صریح کو خطاب کیا پھر میڈیا گروپس پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا: ”رہا مملوں کا معاملہ تو موجودہ پیچیدہ صورت حال کے پیش نظر حلقہ کی وقت..... کسی پر اور کسی جگہ بھی ہو سکتا ہے اور..... پولیس کو اس وقت اپنی نامعلوم ذمہ داریوں اور حملہ کرنے والوں کو تلاش کرنا ہے جو شہر کے امن و سکون کو بھی برادر کر رہے ہیں۔“

”ان کی تلاش کون کرے گا؟“ شام کو شائع ہونے والے ایک اخبار کے نمائندے نے اپنی زبان میں کہا۔ ”پولیس کا عملہ تو ایک عرصے سے ناکام ہو رہا ہے اور صرف وضاحتی پروگرام کر رہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ شام کو شائع ہونے والے اخبارات کے بارگرم سرخیاں لگانے میں زیادہ چین چین رہتے ہیں۔ ان کی بے بنیاد خبروں میں کتنی صداقت ہوتی ہے اس سے اب حوام بھی واقف ہو گئے ہیں۔ انوائز نا باجبر اور اس کی قسم کی دوسری چٹ پٹی خبریں جن میں حکمت فیادوں پر مرجع مسالہ لک کر حوام کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں لیکن فی الحال میں اس موضوع پر بحث نہیں کروں گا۔ غوری طور پر مجھے اور پولیس کے دوسرے ذمہ دار افسران کو خاص طور پر ان دو خبروں کو فکس کرنا ہے جو بڑی دلیری سے گمراہی کرنے والوں کی نظروں میں دخول جھونک کر فرار..... ار..... ار.....“

ڈی آئی جی کا جملہ مکمل ہونے سے خوشی باہر سے گلیوں کی تڑتارہٹ کی ابھرنے والی آوازوں نے سب ہی کی نظریں مرکزی دروازے کی طرف پھیر دیں۔ ایک منٹ بعد ہی دو نقاب پوش جدید سپر فائزنگ کرنے والی خطرناک راکٹوں سے ایس انداز داخل ہوئے ایک نے خطرناک آواز میں سب کو لٹکارا۔ ”غیر دارو کوئی اپنی جگہ سے اٹھنے یا بچنے کی حماقت نہ کرے ورنہ باہر موجود ہمارے دوسرے ساتھی خود کش حملے کے ساتھ پوری عمارت کو اڑا دیں گے۔“

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی دوسرے نقاب پوش نے براہ راست اورنگ زیب اور سراج کو لٹکارا۔ ”تم دونوں غامضی سے ہاتھ اور پر اٹھا کر ہمارے ساتھ چلو۔ انکار کی صورت میں تمہارے علاوہ کچھ دوسرے بھی موت کی لپیٹ میں آ جا سکیں گے۔“

”تم ایسا مت کرنا۔“ اورنگ زیب اپنی جگہ سے اٹھا۔

”تم ہم دونوں کو نقاب میں ہونے کے باوجود پہچان گیا ہوں۔ میں اور سراج تمہارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہیں۔ ہماری وجہ سے تم بلا وجہ دوسروں کو نشانہ بنانے کی فطری نہ کرنا۔“

اورنگ زیب کی سنجیدگی دیکھ کر سراج نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی پھر وہ دونوں اپنی نشستوں سے اٹھ کر صرف دو چار قدم آگے بڑھا سکے تھے کہ سادہ لباس میں ملیں وہ چار ماہر کمانڈرز جو اوپر گیلیری میں چھپے ہوئے تھے انہوں نے ہلانے کا گہائی کی طرح ایک ساتھ اوپر سے چھلانگ لگا دی دونوں نقاب پوش لڑکھڑائے لیکن کمانڈرز کی گرفت میں پوری طرح آئے بھی انہوں نے راکٹس کے ٹریگر کو دبا دیا۔ ایک ساتھ ہی خوفناک شٹلے لپکے ایک دو افراد کے زخمی ہو کر چلانے کی آوازیں بھی بلند ہوئیں لیکن اسی وقت انتظامی امور پر تعینات حملے کے کسی آدمی نے دو رمانڈس کا مجتہ دیتے ہوئے پوری عمارت کا امن سوچ آف کر دیا۔ کا نفرض میں افراتفری کے سبب بھاگنے والے افراد کے قدموں کی آوازیں کو گونجنے لگیں۔ بس منٹ بعد کمانڈرز نے ایک مخصوص انداز میں گرین سیگنل دیا تو تمام لٹائس دوبارہ رون ہوئیں۔

کمانڈرز نے دونوں نقاب پوشوں کو پوری طرح گرفت میں لینے کے بعد ان کے چہروں سے نقاب ہٹایا تو کئی اخباری فوٹو گرافر کے کیمروں کی فلاش لٹائس ایک ساتھ چمک اٹھیں۔ جن دو حملہ آوروں کی تصویریں ان کے میموری کارڈز پر محفوظ ہوئیں وہ پولیس کو مطلوب خاص مفرد مجرم..... لوچن اور دشتو کے سوا کوئی اور نہیں تھے۔ ان دونوں کو غوری طور پر گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے جایا گیا پولیس افسران بھی ان کے ارد گرد جمع ہونے لگے لیکن..... لوچن یا دشتو کے چہروں پر خوف کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی پولیس نے ان دونوں کو ٹیکو کر جھٹکوا یاں پہنا دیں پھر بھی ان کی خوفناک اٹھنے میں انتظام کی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔

ڈی آئی جی چرٹنڈن سراج کا ذہن یہ دستور صاف صریح کی تحلیل نفسی کرنے میں ابھار رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ لٹائس دوبارہ آواز ہونے کے بعد صاف صریح ہی کمانڈرز کے شانہ بشانہ ہی نظر آیا تھا؟



لوچن اور دشتو دوبارہ گرفتاری کے آدھے گھنٹے بعد ملٹری کا ایک ٹرک کمانڈرز کے ساتھ میونسپل کمپنی کے کا نفرض ہال کے باہر بھیج دیا۔ کرنل احتشام کی ہلٹ پروف گاڑی بھی ٹرک کے ساتھ ہی آ گئی لوچن اور دشتو دونوں کو ملٹری والوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ڈی آئی جی نے اس سلسلے میں مزاحمت نہیں کی۔ دو رمانڈس کا تقاضا بھی یہی تھا۔

ڈی آئی جی کے جانے کے بعد دوسرے پولیس افسران بھی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے اورنگ زیب نے کا نفرض ہال سے باہر آ کر سراج سے کہا۔ ”تم گھر بھیج کر میرا انتظار کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں لیاقت حسین کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔“

”اب ہم کو کہاں جاتا ہے؟“ سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

خجندی کی سے پوچھا۔

”کیا خبر ہے؟“ کیا نہیں یقین ہے کہ وہ مگر پری ہوگا۔ ”آئی“ سی ٹھیک ہے تم لوگ آہستہ آہستہ گھیرا رنگ کر دین میں منٹ میں پہنچنا ہوں۔“

”کوئی نئی خبر؟“ سرانج نے بات ختم ہونے کے بعد سوال کیا۔

”مجھے حیرت ہے کہ کتب حامد امی تک اپنی ٹیٹھی میں ہی موجود ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”میں نے اسے دفتر سے روانہ ہوتے وقت نامعلوم تجر کی حیثیت سے اطلاع دے دی تھی کہ پولیس اس کی گرفتاری کے لیے کسی وقت بھی ریڈ کر سکتی ہے اس کے باوجود آکٹوئیں کا کوٹھی پر ہونا مجھ سے باہر ہے۔“ اورنگ زیب نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔ ”مگن ہے کہ وہ کوئی چدر راستہ اختیار کر لے۔“

”چدر راستہ.....“ سرانج چوٹکا۔ ”میں آپ کا مقصد نہیں سمجھا۔“

”تم حالات سے پوری طرح واقف نہیں ہو.....“ اورنگ زیب نے مکلی بار دہلی زبان میں کہا۔ ”اس شہر میں میرا تھانہ ایک انتہائی خفیہ ایگم کے تحت ہوا تھا جس میں طبری اعلیٰ جنس کا اشارہ بھی شامل تھا۔ جانتے ہو کیوں؟..... طبری کی سیکرٹ انفاٹیشن اگر غلط نہیں ہے تو فیض حامد انڈر گراؤنڈ ورلڈ مانیا کا دوسرا سب سے بڑا فرد ہے جس کی گرفتاری میں انٹر پول بھی ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہم اسے جس چہرے میں دیکھ رہے ہیں وہ اس کا اصل چہرہ نہیں تھا۔ ہمالا کے سربراہ ایک ہی وقت میں کئی ایسے چہرے بدل لیتے ہیں کہ جس کی شناخت ان کے کمر کے افراد بھی نہیں کر پاتے اور اس فیض حامد کے سلسلے میں کمرل احتیاط کا اعزاز درست ہے تو پھر آکٹوئیں کے آف خطنہ ناک اور زہرے پاھوں کی طرح اس کے فرار کے بھی کئی ایسے خفیہ راستے موجود ہوں گے ہمیں جن کا علم ابھی تک نہیں ہو سکا ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خفیہ راستے سے نکل چکا ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہمارا یہ مشن بھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ یہ ناکامی خود میرے لیے بھی بے حد اذیت ناک ہوگی۔ میں نے اب تک اس کے گرد جو مضبوط قلعے تیار کیے تھے وہ سب ایک خواب ہو کر رہ جائیں گے پھر..... شاید ہمیں اپنے مطلوبہ شمار پر ہاتھ ڈالنے کا موقع اتنی آسانی سے.....“

اورنگ زیب اجماع مکمل کرتے کرتے چوٹکا۔ اس نے لیاقت حسین کو کشت لہجے میں مخاطب کیا۔ ”یہ تم جس راستے پر جا رہے ہو؟.....“ اورنگ زیب نے سوال کے بعد ہی سرانج نے بھی محسوس کیا کہ گاڑی فیض حامد کی زہاں گاہ کی سمت جانے کے بجائے کسی سنسان راستے پر فرانسے بھر رہی تھی۔ لیاقت حسین پوری طرح سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اورنگ زیب نے دوسری بار پشت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سوال اٹھایا تو لیاقت حسین نے عجیب اعداد میں بے حد تنبیہ کی سے کہا۔

”فرعون اس وقت ساحل علاقے کی چٹان سے آگاہ کی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن قدرت ایسے گناہ گاروں کو آسانی سے قبول نہیں کرتی۔“

”ہمیں آج ہی آکٹوئیں کو ہر قیمت پر گرفتار کرنا ہے۔ دیر ہوگئی تو وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”اوہ.....“ سرانج چوٹکا۔ ”تو کیا دشمنوں اور لوچن کا اچانک حملہ آپ ہی کے اشارے پر.....“

”وقت کم ہے.....“ اورنگ زیب نے بات کا تار کھینچ کر کہا۔ ”پانچ بعد میں ہی ہوتی رہیں گی۔“

اورنگ زیب کے جانے کے بعد سرانج بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا اس کے ذہن میں اس وقت بھی مضبوطی کا خیال گردش کر رہا تھا اس کے گھر پہنچنے کے دس منٹ بعد لیاقت حسین بھی آگیا۔ اس کا چہرہ کسی قسم کے جذبات سے یکسر عاری تھا۔

”تم کچھ دیر پہلے کہاں تھے؟“ سرانج نے اسے ٹیٹھی نظروں سے دیکھا۔

”اسے کمرے میں..... ابھی ایس بی صاحب کا فون آیا تھا۔ آپ کے ساتھ کھینچ جانے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا ہے۔“

سرانج نے اسے باہر انتظار کرنے کو کہا۔ خود تیار ہونے کے دوران میں بھی وہ لوچن اور دشمنوں کے بارے میں غور کرتا رہا۔ اسے علم تھا کہ اورنگ زیب کی تجر کی حیثیت سے فیض حامد کو احتیاط سے کر ڈرپ کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ لیاقت حسین کا مضبوطی کے روپ میں نظر آ رہی تھی اورنگ زیب ہی کی کسی خفیہ جیم کا ایک حصہ ہو سکتا تھا۔ وہ جس اخبار کے نمبر کے کی حیثیت سے شریک ہوا تھا اس کے مالکان اور اورنگ زیب کے کمرے مرام تھے۔ اس کے علاوہ کمانڈر کے ساتھ ہی مضبوطی کا بھی دشمن اور لوچن کے قریب نظر آتا..... اس کے علاوہ بھی بے شمار خیالات سرانج کے ذہن میں گزرتے ہو رہے تھے۔

حسب وعدہ اورنگ زیب پچیس منٹ بعد میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت خلاف توقع بہت زیادہ سنجیدہ اور جذباتی نظر آ رہا تھا۔ انٹریکٹ سیٹ لیاقت حسین کے حوالے کر کے وہ سرانج کے ساتھ چھٹی نشست پر آگیا۔ لیاقت حسین کو اس نے فیض حامد کو ٹیٹھی کی طرف بلانے کو کہا تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آکٹوئیں آسانی سے گرفتاری دینے کے؟“

”انکار کی صورت میں ہم زبردستی بھی کر سکتے ہیں۔“ اورنگ زیب نے سرسراہے لہجے میں جواب دیا۔ ”اس کے بیشتر آدمیوں کی گواہیاں پہلے ہی اس کے خلاف ریکارڈ ہو چکی ہیں اب دشمن اور لوچن کے افرادی بیان کے بعد اس کے بچاؤ کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں۔“

”مگر یاد رکھ.....“

”ہاں۔ وہ بھی میری پلاننگ کا ایک حصہ تھا۔ وہ ان دونوں کو اتنی آسانی سے گرفتاری نہیں کیا جا سکتا تھا۔“

”کیا ڈی آئی بی کو بھی آپ کی پلاننگ کی خبر ہوگئی؟“

”نہیں..... آکٹوئیں کی گرفتاری کے سلسلے میں تمام قانونی کارروائی کمرل احتیاط نے خفیہ طور پر کی ہے اور.....“

موبائل پر مشکل موصول ہوا تو اورنگ زیب نے جملہ ادھر ادھر چھوڑ کر اسے آن کرتے ہوئے

”تم؟ تم کیا بکواس کر رہے ہو.....؟“ اورنگ زیب کا چہرہ تھا۔ سراج نے دہلی زبان میں کہا۔

”میر جہل سے کام لیں..... ہو سکتا ہے کہ کوئی روحانی قوت لیاقت حسین کی زبانی آپ کے سکھول میں کامیابی کا حقد ڈالنا چاہتی ہو۔“

اورنگ زیب نے پلٹ کر سراج کو دیکھا پھر کسی خیال کے تحت اس نے فوری طور پر گاڑی کے رخ کا اعجاز لگاتے ہوئے کرنل احتشام سے رابطہ قائم کیا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”سرمیر کی اطلاع کے مطابق ہمارا مطلوبہ شکار کسی خفیہ راستے سے نکل کر گڈائی کے ساحل کی طرف جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں چٹانوں پر لپکتی اس کا ٹیبل کا پڑ موجود ہو۔ ہمیں اس کی ناکہ بندی بھی کرنی ہوگی جس کی طرف جا رہا ہوں۔ میں سرزمین جانتا ہوں کہ ناکہ بازی کی صورت میں مجھے جواب دینا ہو گا لیکن آپ بھی میری اعانہ داری سے واقف ہیں۔ یہ میری گزارش ہے سر..... رانٹ میں ہر صورت حال کو ٹھیک کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کا فیصلہ درست ہے سر ہمیں اس کی قیام گاہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اور کہ سر..... حقیقت یہ کہ..... اورنگ زیب نے رابطہ قائم کیا تو اس کے چہرے پر کامیابی اور ناکہ بازی کے ملے جلے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

”کرنل نے کیا کہا.....؟“ سراج نے دہلی زبان میں معلوم کیا۔

”ناکہ بازی کی صورت میں مجھے ذاتی طور پر حکومت کے سامنے جواب دینا ہو گا۔“

سراج جواب میں کسمسا کر رہ گیا۔ لیاقت حسین حیرت انگیز طور پر گاڑی کی رفتار بڑھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ گڈائی کے ساحل پر پہنچے تو وہاں فطری کے گوجان پہلے سے موجود تھے۔ کرنل احتشام کی پہلٹ پر وہ گاڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ اورنگ زیب گاڑی سے اتر کر سراج کے ساتھ اس کے قریب گیا تو کرنل احتشام بھی اُچھٹے آ گیا۔

”سرمیر اورنگ زیب..... جہادری افشاریٹن پر میں نے فوری طور پر ایک بمبلی کا پڑ بھی طلب کر لیا ہے۔ میرے کچھ خاص کامائڈز دور دربار رائٹوں کے ساتھ چٹان پر پہنچ رہے ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری افشاریٹن (fake) ثابت ہوئی تو پھر شاید میں تمہاری جگہ سے لے..... اگر کرنل کا جملہ مکمل نہ ہو سکا بلکہ چٹانوں سے کسی بمبلی کا پڑ کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے ان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اس تیز خور کے ساتھ ایک بمبلی کا پڑ بھی چٹانوں سے بلند ہو کر سمندر کی طرف پرواز کرتا نظر آیا تو کرنل نے ہاتھ ملے ہوئے کہا۔

”اھ..... بھلا وہ..... شاید میرے آدھوں کو وہاں پہنچنے میں دیر ہوئی۔“

اورنگ زیب کی حیرت ہماری نظریں بمبلی کا پڑ پر مرکوز تھیں پھر..... جو کچھ ہوا اس نے کرنل کے علاوہ اورنگ زیب اور سراج کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز کر دیں۔

سمندر کی طرف جاتے ہوئے بمبلی کا پڑ پر ایک سرخ لاش کی تیز روشنی پڑی پھر بیوی ڈیوٹی دور دربار رائٹوں کے شطرنج بھی لپکتے دکھائی دیے۔ سب کی نظریں اسی طرف جمی تھیں جس بمبلی کا پڑ

سے دو افراد سمندر میں چھلاک لگتے نظر آئے۔ اس کے میں سینکڑوں بمبلی کا پڑ ایک دھماکے سے پھٹ گیا وہ یقیناً فائرنگ کی زوئیں آ گیا تھا۔

کرنل کے علاوہ اورنگ زیب کے ساتھ سراج بھی ساحل کی طرف دوڑ پڑے۔ چٹان کے اوپر سے سرخ لاش کا ٹوکس بھی اس طرف کر دیا گیا جہاں دونوں افراد گرے تھے۔ چٹان کے اوپر سے فطری کے بمبلی کا پڑ تیرا کر بھی سمندر میں چھلاک لگتے نظر آئے۔

”یہاں رانٹ سرمیر اورنگ زیب.....“ کرنل نے جاری آپریشن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری اطلاع غلط نہیں تھی..... کاش تم کچھ دیر پہلے مجھے افشاریٹن کو دیتے تو ہم اسے راستے میں ہی دبیوچ لیتے ہاؤ ایروڈائیٹ کیلئے پراڈ آف یو۔“

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کرنل کے کچھ اور راجت بھی اس کے قریب جمع ہونے لگے۔ سب کی نظریں سرخ لاش کی تیز روشنی میں سمندر کی جانب مرکوز تھیں۔

دو گھنٹے تک سرخ آپریشن جاری رہنے کے دوران کرنل نے سواپل پر احکامات جاری کر کے تازہ دم دستہ بھی طلب کر لیا۔ تقریباً چھ پانچ بجے تک سراج آپریشن جاری رہا لیکن بمبلی کا پڑ سے چھلاک لگنے والے دونوں افراد کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

”میرا خیال ہے کہ کچھ گولیاں ان دونوں کو بھی لگی ہوں گی جس کے بعد وہ مر کر سمندر کی تہ میں فریق ہو گئے ہوں۔“ کرنل نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ آپ کا اعجاز درست ہو.....“ اورنگ زیب نے منتھل لہجے میں جواب دیا۔ سرخ آپریشن کے بعد سرخ حامد کی کوئی پر باقاعدہ ریڈ کی گئی جہاں سے ایسے بے شمار کارآمد جوت ملے جو جہاز حاکم جہانی کے پسند سے تک پہنچا سکتے تھے۔ اسی روز اس کے تمام بینک لاکر ڈکھائی جن کی نشان دہی گرفتار ہونے والے فرد نے کی تھی تو ذکر کر ایسے مزید جوت حاصل کر لیے گئے جو ناقابل تردید تھے۔ ایسی شخصیات اور تصاویر بھی تھیں جن کے ذریعے بڑے آدھوں کو بلیک لیک کیا جاتا تھا۔

چوبیس گھنٹوں کے طویل آپریشن سے فارغ ہونے کے بعد کرنل احتشام نے اورنگ زیب سے کہا۔ ”آپ بھی اب گھر جا کر دو تین گھنٹے مکمل ریسٹ کریں پھر فریش ہو کر میرے آفس آ جائیں ہمیں ایک رپورٹ تیار کر کے اور بھی روزانہ کرنی ہے۔“

”رانٹ سر.....“ اورنگ زیب نے اس وقت بھی افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

گھر واپس جاتے وقت سراج نے محسوس کیا کہ اورنگ زیب بدستور کی سوچ میں غرق ہے۔

”میرا مشورہ ہے کہ آپ اب بھی سرخ حامد کو ذہن سے نکال دیں جو سمندر کی تہ میں لپکتی چھلیوں کو اپنے جسم کی غلاف فراہم کر رہا ہو گا۔“ جس کم جہاں پاک.....

”تم ایک بات فراموش کر رہے ہو.....“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ”میں نے اس کا نام آٹو ٹوکس رکھا تھا اور..... آٹو ٹوکس سمندر کا ایسا خطرناک عذاب ہے جو آتی آسانی سے ختم

نہیں ہو سکا کہ آپ کا بڑا بھرم کسی بڑی شاربک کا نشانہ بن گیا ہو؟“

”آپ کی خوشخبری کا ذکر کر رہے تھے اس لیے میں نے سوچا کہ شاید۔۔۔“

”ہلیئر۔۔۔“ ڈی آئی جی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

اب آپ شیخ حامد اور اس کے ساتھ جھلاک لگانے والوں کو بھول جائیں۔“

اورنگ زیب نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے ابھی تک آنکھوں کی موت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ سراج اپنی کرسی پر بدستور خاموش بیٹھا رہا۔

”اس وقت میں نے آپ دونوں کو اس لیے طلب کیا ہے کہ یہ خوشخبری سناؤں کہ بہت جلد فطری ہائی کان ایک تقریب کا بندوبست کر رہی ہے جس میں آپ دونوں کو فطری ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔“

”یہ ہم سب کے لیے ایک اعزاز ہو گا۔“ سراج نے غمی کا اظہار کیا۔

”ہاں لیکن۔۔۔ اس کا سہرا مسز اورنگ زیب کے سر ہو گا۔“ ڈی آئی جی کی نظریں پھر اورنگ زیب پر مرکوز ہو گئیں اس نے ایک ہل کے وقفے سے کہا۔ ”وی آر پراڈ آف پوسٹ اورنگ زیب۔“

”شکر ہے سر۔۔۔“ اورنگ زیب نے سرسری اعزاز میں جواب دیا پھر بولا۔ ”ہمارے لیے یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ بڑی چھلی کے ساتھ ساتھ اس کے گروپ کی چھوٹی چھلیاں بھی اظہارِ اؤٹ ہو گئی ہیں۔ ہمارے آدمی ابھی تک ان مطلوبہ اشتہاری مجرموں کو گرفتار نہیں کر سکے جو کچھ شیخ حامد نے بنادے رہی تھی۔“

”تم آن مسز اورنگ زیب۔“ ڈی آئی جی نے بے تکلفی کا اظہار کیا۔ ”میرا مشورہ مائیں تو آپ کچھ دنوں کسی پر نقصان مقام پر جا کر اچھی طرح ریسکس کریں تاکہ آپ کے ذہن سے آنکھیں اور اس کے گروپ کا خیال جو ہو سکے۔“

اورنگ زیب کوئی جواب دیا جاتا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ڈی آئی جی نے ریسپورڈ اٹھایا۔ اس کی نظریں بدستور اورنگ زیب پر جمی ہوئی تھیں جن میں سانس کے تاثرات نظر آ رہے تھے لیکن۔۔۔ دوسری جانب سے جو گھنٹو ہوئی اس کے بعد ڈی آئی جی کا موڈ ایک دم ہی آف نظر آنے لگا۔

ریسپورڈ والیں کر پڑل پر کھینکے کا انداز بھی ایسا ہی تھا جیسے وہ اندریہ اعدہ حیلں رہا ہو۔

”کیا بات ہے سر۔۔۔؟“ اورنگ زیب نے دہنی زبان میں پوچھا جس کی کال بھی۔۔۔“

”مرکزی وزارت کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ذمے دار لوگ بھی جب غیر ذمے داری کی بات کریں گے تو پچھس کا ٹھکڑ بھی حیلں بن کر رہ جائے گا۔“

”کوئی خاص حکم۔۔۔؟“

نہیں ہوتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”ذہنی طور پر ہو سکا ہے کہ تمہارا خیال درست ہو لیکن۔۔۔ جب تک مجھے شیخ حامد کی لاش کا سراغ نہیں مل جاتا میرے وجود کے اندر ایک نامعلوم ساجس باقی رہے گا۔“

سراج نے اسے غور سے دیکھا لیکن کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ کیاقت حسین بڑے سکون سے ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ واپسی کے وقت اورنگ زیب نے اسے ساحل کی طرف جانے کے سلسلے میں گریڈنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ اسے اسکی کوئی بات یاد نہیں۔ سراج کو گھر چھوڑنے کے بعد اورنگ زیب دروازے ہی سے واپس لوٹ گیا۔

اسی دن شام کے اخبارات نے شیخ حامد کی تصویروں کے ساتھ اس کے خلاف ہونے والے آپریشن کی تفصیلات مختلف اعزاز میں شائع کی تھیں فطری کے علاوہ اس نے اورنگ زیب کی کارکردگی کے بارے میں کئی سرخیاں لگائی تھیں۔

سراج کا ذاتی خیال بھی کرل اشتہام کے مطابق یہی تھا کہ شیخ حامد جو اڈرورڈ کا مالک یا نہرو تھا، اپنے انجام کو پہنچ گیا ہو گا اس خیال کے بعد تمام بائیس مئی دن کوئی نہیں کچھ کرداروں کی تفصیل اور چند واقعات کی وضاحتیں ضرور پیش کردہ گئی تھیں۔ لیکن۔۔۔

اسی ہی اورنگ زیب کو کئی ہفتے گزر جانے کے بعد بھی شیخ حامد اور اس کے ساتھی کے سمندر برد ہو جانے پر یقین نہیں آیا تھا وہ ذاتی طور پر بدستور اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے آنکھیں سے کچھ نکلنے کے امکانات کی چھان بین کر رہا تھا۔۔۔

◆◆◆

اسی ہی اورنگ زیب اور سراج اس وقت بھی ایک ساتھ ہی ڈی آئی جی کے دفتر میں داخل ہوئے تھے۔ ڈی آئی جی نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا وہ کسی سے فون پر گفتگو میں مصروف تھا۔ چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے اچھے موڈ میں ہے۔

”میں نے اس وقت آپ لوگوں کو ایک خوشخبری سنانے کے لیے بلایا ہے۔“ فون کر پڑل پر رکھنے کے بعد اس نے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا شیخ حامد کی لاش برآمد ہوئی؟“ اورنگ زیب نے تیزی سے دریافت کیا۔

”ڈوٹ بی سٹیجیشنل مسز اورنگ زیب۔“ ڈی آئی جی نے پہلو ہٹا دیا۔ ”فطری کے غوطہ خوروں کے علاوہ ہمارے آدمی بھی سمندر کے اس جگہ کو چھان چکے ہیں لیکن۔۔۔“

”کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے سر کہ ان دونوں میں کوئی ایک بھی ہمارے ہاتھ نہیں لگا؟“ اورنگ زیب کسم کس کر رہ گیا۔

”ہو سکتا ہے کہ اب تک وہ چھپیلوں کے پیٹ میں بہ طور خوراک حیلں ہو چکے ہوں۔ آپ یہ کہیں بھول رہے ہیں کہ گڈائی کے ساحل پر زیادہ تر شاربک اور آدم خور چھپیاں پائی جاتی ہیں۔ کیا یہ

”آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ڈی ایس بی لودھی کی سزا کم کرنے کی خاطر اسے دوبارہ شہری حدود میں تعینات کرنے کے احکام جاری کیے تھے لیکن اوپر سے روک دیا گیا اور آج..... پھر اس کو آپ ہی کے کسی پولیس اسٹیشن پر تعینات کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔“ ڈی آئی جی نے سمجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کیا آپ اسے خودی سے قبول کر لیں گے؟“

”یہ لودھی کی کارکردگی پر منحصر ہوگا۔“ جواب بڑی صاف گوئی سے کھر دے لیے جسے دیا گیا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے اصولوں پر کسی قسم کا سودا بھی نہیں کرتا۔ آپ اسے جس پولیس اسٹیشن پر دل چاہے تعینات کر دیں پھر میں اسے ذاتی طور پر دیکھ لوں گا۔“

”لیکن اس طرح اختیارات کا فائدہ اور بے جا استعمال کب تک ہوتا رہے گا؟“ ڈی آئی جی ہونٹ چبانے لگا۔

”میں آپ کی سوچ سے متفق ہوں سر..... خاص طور پر لودھی کا نام بھی ہمارے لیے اہم ہے۔ سب ہی جانتے ہیں وہ دفعہ حامد کا خاص آدمی ہے۔“ اورنگ زیب نے ایک لمحہ توقف کے بعد سر اساتے لیے میں کہا۔ ”شیخ حامد اگر واقعی مرچکا ہے تو پھر لودھی کو خاص طور پر میرے انڈر کیوں دیا جا رہا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں.....“ ڈی آئی جی نے وضاحت طلب انداز میں دریافت کیا۔ آپ کیا نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟“

”لودھی کے ٹرافسنگری بات ایک بار پھر میرے اس شیپے کو تفتیت دے رہی ہے کہ آئی مخلوق میں آکٹوئس کی حیثیت بھی خاص اہمیت کی حامل ہے اس کے آٹھ ہاتھ بڑے سے بڑے خطرہوں سے بھی نکرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے نہیں مٹتا.....“

”پلیز مائی ڈیئر.....“ ڈی آئی جی نے زیر لب سرسرا کر کہا۔ ”آپ اپنے ذہن سے اب شیخ حامد کو کھینچ کر نکال دیں! کرل احتشام کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ ختم کب جہاں پاک ہو چکا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر لودھی کو خاص طور پر میرے ساتھ کیوں بھیجا گیا جا رہا ہے۔“

”ڈونٹ وری.....“ ڈی آئی جی نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”میں دیکھتا ہوں کہ لودھی کے لیے اور کیا صورت نکالی جا سکتی ہے۔“

”نوسر.....“ اورنگ زیب نے بڑی گہری سمجیدگی اور غصے میں جواب دیا۔ ”آپ لودھی کو میرے پاس آنے دیں..... میں خود ہی دیکھوں گا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔“

”ایک لمحے کو کمرے میں پھر خاموشی غاری ہو گئی پھر ڈی آئی جی نے موضوع بدل کر کہا۔

”چانگتیر بن (جگا) اور امداد ولی کو ان کا ریکارڈ صاف ہونے کی وجہ سے رہائی کے آرڈر جاری کر دیے گئے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں سر.....“

”وشٹو اور لوچن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

”وہ دونوں انڈر ورلڈ کے خطرناک لوگ ہیں۔ خاص طور سے رام دیال عرف وشٹو زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ انہیں پولیس کے لوگ اب بھی اس کی تلاش میں ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے کہ ان کی گرفتاری کے بعد کرل احتشام نے ان دونوں کو اپنی تحویل میں لیا ورنہ پولیس کے لیے وہ دوسری مبینی بن سکتے تھے۔“

”سر.....“ سرانج نے پہلی بار ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ہماری حکومت ذاتی طور پر ان دونوں کے خلاف قانونی ایکشن لے گی یا انہیں انہیں پولیس کے سپرد کر دیا جائے گا؟“

”اس کا فیصلہ بھی مرکزی حکومت کرے گی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ ایک سابقہ معاہدے کے تحت کم از کم وشٹو کو ضرور انہیں پولیس کے سپرد کیا جاسکے گا۔“

چاہے آج کے دن سے جھگڑا کر ختم کر دیا گیا ڈی آئی جی نے ایک بار پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ اورنگ زیب بھی یہ ظاہر نہیں نظر آ رہا تھا جب کچھ وہ بعد ڈی آئی جی کے ڈائریکٹ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فوری طور پر کال ریسیو کی لیکن دوسری جانب سے جو اطلاع ملی اسے سن کر وہ بھی پریشان نظر آنے لگا۔

”ڈونٹ وری سر.....“ اس نے طے دلائی اطلاع کے جواب میں بڑی سمجیدگی سے کہا۔ ”میں ابھی سارے علاقے کے ایس بیڑ کو مطلع کیے دیتا ہوں۔ رائلٹ..... اوکے..... جیسا آپ کہہ رہے ہیں دیکھا ہی ہوگا۔“

”کیا بات ہے سر.....“ ڈی آئی جی نے فون ریسیو کرنے کے بعد اورنگ زیب نے سمجیدگی سے دریافت کیا۔

”کس کی کال تھی..... کوئی اہم اطلاع ہے؟“

”جی ہاں.....“ ڈی آئی جی نے کرسی پر گھسٹا ہوا ”وشٹو اور لوچن دونوں کرل احتشام کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ یہ اس روز کی بات ہے جس میں روزانہ دونوں کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ ہیڈ کوارٹر جاتے ہوئے کچھ لوگوں نے اچانک ہنگامہ کر کے ان دونوں کو فرار کا موقع فراہم کر دیا تھا۔“

”اور اس اہم خبر کی اطلاع ہمیں اب دی جا رہی ہے؟“ اورنگ زیب نے تھلا کر کہا۔ ”اب تک وہ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئے ہوں گے۔“

”کرل احتشام نے اس خبر کو اب تک کیوں غصہ رکھا یہ وہی بہتر جانتے ہیں۔ بہر حال اب ہمیں سارے قاتلوں کو وارنٹ دینا ہوگا۔“

ڈی آئی جی نے تمام علاقے کے ایس بیڑ سے رابطے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وشٹو اور لوچن کے فرار کی خبر نے اسے خاصا پریشان کر دیا تھا۔ فون کال سے فرصت پانے کے بعد اس نے اورنگ زیب اور سرانج کو مخاطب کیا۔

کے بچے موجود ہے اس پر کسی کو کال کرنے کی حماقت نہ کرنا۔ جو کال بگ باس کے حوالے سے موصول ہو اس پر بلا کسی چنوچہ اٹھل کرنا۔“

اس پیغام کو پڑھ کر اس کی عقل دھج رہ گئی۔ بگ باس کی موت کی اطلاع وہ بھی اخباروں میں تفصیل سے پڑھ چکی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے خود کو اپنے فلیٹ تک ہی محدود رکھا۔ اور بگ باس کے پاس سے ہٹنے کے بعد وہ جن حالات سے گزر چکی تھی اس کا تقاضا بھی نہیں تھا کہ وہ خود کو ایک ہی غول میں بند رکھے۔

ایک ہفتے تک اس سے موبائل پر کسی نے کال نہیں کی اس دوران وہ افضل خان اور میڈم رسولی کے بارے میں صرف ذہنی چوسنا تک کرتی رہی۔ وہ ایک ہی ماحول میں رہتے رہتے اس کا گہنی کی چپ اس وقت موبائل کھلتا تھا کہ جبکہ وہ ایک پرانے اخبار کو اٹھتے پلٹتے میں معروضہ تھی۔ موبائل کی کھنٹی سن کر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ ایک لمحہ وہ خالی نظروں سے موبائل کو دیکھتی رہی پھر تیسری کھنٹی پر اس نے موبائل اٹھا کر آن کر لیا۔

”شببم بول رہی ہوں.....“ اس نے کپکپاتے آنچ میں کہا۔

”تم نے میرا پیغام پڑھ لیا ہوگا؟“

دوسری جانب سے ایک غیر مانوس آواز ابھری۔

”میں ابھی تک اسی پر عمل کر رہی ہوں لیکن.....“

”لیکن..... اگر..... عمر..... کون اور کیوں کے چکر میں مت پڑو۔“ جھڑک کر سرد لہجے میں کہا گیا۔ ”جو کچھ کہا جائے صرف اسی پر عمل کرو۔“

”ٹھیک ہے.....“ شبنم نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ اس وقت وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ زبان کھولنے کی جرأت کر سکتی۔

”کنول کو جانتی ہو؟“

”جی ہاں.....“

”وہ کسی وقت بے ہوشی کی حالت میں تم تک پہنچا دی جائے گی۔ ہوش آنے پر تم کہل اے اس گھر پہنچا دیتا۔ یہ بھی سمجھا دیتا کہ اسے بھی زبان بند ہی رکھنی ہوگی۔ دوسری فصل میں زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔“

”او۔ کے۔“

”

”میرا ذاتی خیال ہے کہ تمہیں اپنے فلیٹ پر زیادہ سکون مل رہا ہوگا۔“

”جی.....جی ہاں

”یہ سکون بھی اسی وقت تک قائم رہے گا جب تک ہر نئے والی ہدایت پر عمل کرتی رہو گی۔ دوسری صورت میں حالات تمہارے لیے پہلے سے زیادہ بد صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔“

”میں سمجھ رہی ہوں۔“ شبنم نے سر آہ بھر کر جواب دیا۔

”آپ دونوں کو بھی مفروضہ مجرموں کی تلاش میں فوری ضروری اقدام کی ضرورت ہے۔“

”ہم غافل نہیں رہیں گے سر.....“ اور نگ زیب نے اٹھتے ہوئے کہا بھر چکر دی جگلوں کے بعد وہ اور سراج باہر آگئے۔ دونوں ایک ساتھ ہی آئے تھے اس لیے وہابی بھی ایک ساتھ ہی ہوئی۔

ڈرامائیٹک سیٹ پر اورنگ زیب قاضی کی نظریں سامنے سڑک پر مرکوز تھیں۔ اس نے فُی آئی جی آفس سے باہر آنے کے بعد ابھی تک دشمن اور لوہجے کے فرار کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ سراج قاضی دیر تک اس کے چہرے کے تاثرات پر دستار باندھ رہی زبان میں پوچھا۔

”کیا لوہن اور دشمنوں کے فرار کی اطلاع نے آپ کو زیادہ متاثر نہیں کیا؟“

”خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں اس کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔“ اور نگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا پھر سراج سے مسکرا کر پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”آئی سی.....“ سراج نے حرید کریدنے کی خاطر ایک شہجے کا اظہار کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ طہری میڈ کو اور بھیج جانے کے بعد دشمن اور لوچن کو فرار ہونے کا ایسا موقع نہیں مل سکتا تھا جو راستے میں فراہم کر دیا گیا۔“

”میں فی الحال تمہارے اس خیال پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔“ اورنگ زیب نے شانے اچکا کر کہا۔ اس کا جواب مبہم ہونے کے باوجود بہت واضح تھا۔

شہنشاہ کے بے ہوشی کی کیفیت آہستہ آہستہ دور دوری ہو رہی تھی۔ ذہن میں گھب اندھ جڑوں اور شاخیں
شاخیں کی آواز پر کم ہوشوں کو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کو اسے یوں لگا جیسے وہ
کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جس ٹھکانے پر اسے رکھا گیا تھا وہاں سے جبراً اسے ساتھ لے کر اسلم ڈھاکہ کے پاس گیا تھا۔ ان دنوں کے درمیان جو جنگ ہوئی اسے سن کر شبنم کا ذہن ہلکے سے اڑ گیا تھا۔ اب اس کے حکم کے مطابق شبنم کو کوئی راکر اسلم ڈھاکہ کو تھمر رسید کرنا تھا۔ اس کے بعد جبر و شتم کو بھی ختم کر دیتا۔ لیکن اس سے جو شتر اسلم ڈھاکہ اور جبرو کے درمیان شبنم کو مل بٹ کر کھانے کو جو بات ہوئی وہ شبنم کے لیے موت کے کرب سے زیادہ اذیت ناک تھی اس نے ملے کر لیا تھا کہ ہمارے جانے کی لیکن خدو کو برداشت نہیں ہونے دے گی ابھر..... کھیل کا پانسا اچانک پلٹ گیا تھا کچھ نامعلوم افراد امین وقت پر درمیان میں آ گئے تھے۔ اسلم ڈھاکہ اور جبرو دونوں کو دوپٹ لگایا گیا۔ شبنم کو کسی نے اس کی کتلی پر ایک آئزودہ کاری ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا تھا اور اب..... آگ کھلنے پر وہ اپنے قلبت میں موجود تھی ہوش میں آنے کے بعد اس کی نظر اس کاغذ کی گلو سے پر پڑی جو اس کے سینے پر رکھا تھا۔ بیٹام مقرر کرے بعد صحتی خیر تھا۔

”خود کو صرف اپنے قلیٹ تک محدود رکھنے کی کوشش کرنا۔ ہوا میں اڑنے کی کوشش کی تو تمہارا
 اتمام بھسا بیک ہی ہوگا۔ اپنی زبان بند رکھنا“ اسی میں تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔ تمہارا سوا بائل کیے

”تم کچھ سوال کرنا چاہتی تھیں.....“ اس بار قدرے نرم لہجے میں پوچھا گیا۔

”جو خبریں اخبارات میں آچکی ہیں اس کو پڑھنے کے بعد کبک باس کا حوالہ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔“ شبنم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”اخبارات ہمیشہ مربع مسالا کا کروام کو خبریں سناتے رہتے ہیں۔ فی الحال اس چکر میں مت پڑو..... اور کچھ۔“

”افضل خان کے بارے میں۔“

”تمہاری زبان سے افضل خان کا نام سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا۔“ اس کی بات کا تھک سواں ٹکڑا گیا۔

”کیا جاننا چاہتی ہو؟“

”وہ..... بس یونہی خیال آ گیا تھا۔“ اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ ”بہت دنوں سے وہ نظر نہیں آیا۔“

”فی الحال وہ ہسپتال میں ہے۔ اسے اسے اپنی اور کبک زیب نے گولی مار کر زخمی کیا تھا۔“

”کس جرم کی پاداش میں؟“

”تم جانتی ہو کہ مجھے کرید کرنے والے لوگ پسند نہیں ہیں۔“ دوسری جانب سے ناگواری کا اظہار کیا گیا۔

”سوری سر۔“

”آئندہ احتیاط رکھنا۔“ کچھ توقف سے کہا گیا۔

”دیے تم جاہو تو افضل خان سے مل سکتی ہو ہو سکتا ہے مجھے پھر کسی وقت اس کی ضرورت پڑے۔“

”سر..... کیا میں کسی اہم ضرورت کے وقت آپ کو فون کر سکتی ہوں؟“

”نہیں۔ فی الحال ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔“ دوسری طرف سے کال منقطع کر دی گئی تو شبنم بڑی اضطرابی کیفیت میں اٹھ کر کمرے میں چلنے لگی۔ کبک باس کے حوالے سے وہ کال اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اگر وہ زندہ تھا تو کیا اور ملٹری کے افسران کو اس کی اطلاع بھی تھی اور..... اگر وہ مر چکا تھا جس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی رہی تھی تو پھر کبک باس کے حوالے سے فون کرنے والا کون تھا؟



والدین کے آجائے سے جہاں لیاقت حسین اور فرحمن خوش تھے وہاں سرفراز خان بھی بہت زیادہ سرور تھا۔ اس کے اور سیٹھ عثمان کے کاروباری تعلقات خاصے پڑائے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا جب وہ شہر آیا تھا۔ اپنے علاقے کا تاج بان بادشاہ ہونے کی وجہ سے وہ اسی ماحول میں رہنا پسند کرتا تھا۔

لیاقت حسین اور فرحمن یہ دستور دوسرے پچھلے کی انگی میں تھے جبکہ راجیل بیگم نے شوہر کے

مشورے کے بعد سردار سرفراز خان اور اس کی بیوی کے لیے اپنے پچھلے کے مہمان خانے میں رہنے کا بندوبست کیا تھا۔ راجیل بیگم کو لیاقت حسین کی والدہ جہدے پسند آئی تھی۔ وہ سیدی سادی نیک اور عبادت گزار عورت تھی جبکہ سرفراز خان اپنی باپائی حیثیت کے مطابق رکھ رکھاؤ قائم رکھنے کا عادی تھا۔ لیاقت حسین اور فرحمن کا بھی زیادہ وقت سیٹھ عثمان کے پچھلے میں گزرتا تھا۔

سرفراز خان چونکہ پہلی بار شہر آیا تھا اس لیے وہ ان کاروباری افراد سے بھی ملتا رہا جن سے اس کا لین دین تھا۔ ذاتی ملاقاتوں کے سبب اس کو اندازہ بھی ہوا کہ شہر کے تاجر اس سے کس حساب سے مال خریدتے ہیں اور بیرونی منڈیوں میں کس قدر قیمت دامن فروخت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سرفراز خان نے براہ راست سیٹھ عثمان کو اعتماد میں لے کر بات کی تو سیٹھ عثمان نے اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ بھی براہ راست بیرونی منڈیوں سے رابطہ کرے جس میں منافع کی گنجائش مقامی منڈیوں سے دو تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس پر غلط مشورے کے ساتھ ہی سیٹھ عثمان نے اسے ایسے شخص کارندے بھی فراہم کر دیے جو اس کام کا پورا نا تجربہ رکھتے تھے۔

اس وقت بھی سرفراز خان اسے ایک کاروباری شخص سے ملاقات کے لیے لے جا رہے تھے۔ لیاقت حسین نے اسے تیز نگاہ مسجیل رکھا تھا وہ باپ کے سامنے حسب عادت بہت لیے دیے رہتا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر سرفراز خان نے گفتگو کی ابتدا کی۔

”عثمان سیٹھ ذاتی حیرا آدمی ہے تمہارا ماں بھی بہت خوش ہے۔“

”میرے ساتھ بھی سب بالکل اپنے کئے رشتہ داروں کی طرح پیش آتے ہیں۔“ لیاقت حسین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”بیکر صاحب نے تو فرحمن کو بہن بنا رکھا ہے۔“

”تم خوش قسمت ہے جو تم کو ایسے پچھلے لوگ مل گئے روز شہر میں کاروباری لوگ اپنا نفع نقصان سے زیادہ کسی بات کا خیال نہیں رکھتے۔“

”ایک بات پوچھوں بابا.....؟“ لیاقت حسین نے دلی زبان میں کہا۔ ”کیا آپ باہر کی منڈیوں میں کاروبار شروع کرنے کے بعد سیٹھ صاحب کے ساتھ لین دین قائم کر دیں گے؟“

”یہ بات تمہارا دماغ میں کیوں آیا؟“ سرفراز خان نے تیز آواز میں کہا۔

”کیا میں اختراع غرض ہوں کہ جس پچھلے آدمی نے مجھے زیادہ منافع کمانے کا راستہ دکھایا ہے میں اسی کے ساتھ دغا کروں گا۔“

”میرا مطلب بھی یہی تھا کہ۔“

”تم غلط سوچ رہا ہے میری جان۔“ اس بار سرفراز خان نے قدرے محبت بھرا انداز اختیار کیا۔ ”تمہارا سیٹھ عثمان یہی بول رہا تھا کہ میں ذاتی طور پر اپنا کاروبار کروں لیکن میں نے اسے شریک بنانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اسی طرح ہم دونوں کو پہلے کے مقابلے میں دو گنا سے بھی زیادہ منافع ہوگا۔“

”کیا یہ بات یہی ہو گئی ہے۔“

پندرہ منٹ بعد سراج بھی آگیا تو تینوں دوسرے کمرے میں آگئے۔ سرفراز خان کے پاس ایک میبل ٹرس تعمیرات تھا۔ ”کیا یہ پتہ نہیں چلا کر گولی کس نے چلائی تھی؟“ سراج نے ایک غمی سوال کیا۔

”اگر پتا چل جاتا صاحب تو میں اس کو بھی جہنم رسید کرنے میں دیر نہ کرتا۔“ لیاقت حسین کا جذباتی ہونا قدرتی امر تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“

سراج نے سیٹھ حنان سے پوچھا۔

”یہیں سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ ظاہر میں اسے کاروباری رقابت ہی سمجھ رہا ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔“

”سرفراز خان حیرتی منطقیوں سے براہ راست کاروبار کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے

فیصلہ کر رہا تھا جس سے بہت سارے مقامی تاجر بھی متاثر ہوتے اس لیے کہ مارشل کے انکسپورٹ

میں مارشلز آف پرائف بہت زیادہ ہوتے۔ ہو سکتا ہے کچھ جیروں کو یہ بات پسند نہ آئی ہو۔“

”لیکن میرا آپ مر جاتا تو پھر ان کو مال کون سلائی کرتا؟“ لیاقت حسین نے غملا کر سوال کیا۔

”ہمت سے کام لو لیاقت حسین۔۔۔۔۔ سراج نے اسے سمجھایا۔ ”تمہارے والد کے کچھ رقیب

تمہارے علاقے میں بھی ضرور ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی نے اپنے مفاد کی خاطر اس

موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔“

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا وہ قدم اٹھاتا دوبارہ باپ کے کمرے میں چلا گیا۔

”سرفراز خان کو پیش آنے والا حادثہ میرے لیے بھی بڑی شرمندگی کا باعث ہے۔“

سیٹھ حنان نے لیاقت کے جانے کے بعد کہا۔

”میری ذاتی خواہش ہے کہ تم اس معاملے کی خاص طور پر چھان بین کرو۔ مجرم اگر کچ کر لکل

کیا تو دوبارہ کسی اپنی کھٹکی کا ثبوت دینے سے روک لیجئے کہیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ سرفراز خان

کے ہسپتال سے رخصت ہونے کے بعد بھی اسے کچھ جھوٹ میں سمجھا بھگا کر رخصت کر دوں۔“

”مجھے تمہاری پوزیشن کا اعزاز ہے لیکن ابھی جلدی نہ کرنا روزہ لیاقت حسین کو اس کا احساس ہو

گا۔“

سراج نے اپنا جملہ تم کر کے اس علاقے کے ایس ایچ او کو فون کیا جہاں حادثہ پیش آیا تھا لیکن

اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی اس لیے ایس ایچ او نے بھی جواب دیا تھا کہ اس نے بھی محض اس حادثے کی خبر

سنی ہے لیکن۔۔۔۔۔ ابھی تک باقاعدہ رپورٹ نہیں درج کرائی گئی۔

”ٹھیک ہے“ آپ باقاعدہ رپورٹ درج ہونے کا انتظار کرتے رہیں۔“ سراج نے اپنی عقلی

کے اکتہار کے ساتھ ہی رابطہ ختم کر دیا۔

”تمہارے قاتلے والوں کو آخر اپنی ذمہ داری کا احساس کب ہوگا؟“ سیٹھ حنان نے سراج

”وہ شریف آدمی ہے تم نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کی وجہ سے وہ مشترکہ کاروبار سے ہٹ چکا رہا ہے لیکن میں اسے تیار کر لوں گا۔“

باپ بیٹے کے درمیان گفتگو کا سلسلہ اس وقت جاری رہا جب تک ان کی منزل نہیں آ

ئی لیاقت حسین فنیس ماربلز کے شوروم کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جب سرفراز خان اچانک

لوکھڑا کر گیا لیاقت حسین کا خیال تھا کہ غائب اس کا پاؤں اٹھ گیا تھا لیکن جب اس نے باپ کے بائیں

شانے سے خون بہتے دیکھا تو دیوانہ ہو گیا۔ اس کا اعزازہ غلط ثابت ہوا۔ خون جس رفتار سے بہہ رہا تھا

اس سے صاف ظاہر تھا کہ کسی نے بے آواز اور ریماءورائل سے اس پر فائر کیا تھا۔

ماربلز کے شوروم پر کھڑے ہونے ملازم میں دوڑ پڑے تو وہاں کا مالک بھی تیزی سے باہر آ

گیا فوری طور پر لیاقت حسین اپنے باپ کو ایک فرمی اسپتال کے لیے کیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کے

شعبے کی تھدیق کر دی۔ ڈاکٹر نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

”یہ تمہارے باپ کی خوش قسمتی تھی کہ گولی ہڈی سے نہیں ٹکرائی ورنہ اس کا ہاتھ کسی کام کے

لائق نہ رہتا۔“

لیاقت حسین نے بچوں کی طرح سکتے ہوئے پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔ کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟“

”پریشان مت ہو ہم نے گولی جسم سے نکال لی ہے۔ ضروری چیزیں ج کے بعد اسے کمرے میں

نقل کر دیا جائے گا۔ دیے اگر مرلیش دو چار روز اسپتال میں رہے تو ہم اس کی بہتر طور پر دیکھ بھال

کر سکتے ہیں۔“

حادثے کی اطلاع پر کا سیٹھ حنان نے بھی اسپتال پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ شاید ماربلز کمپنی کے

مالک نے انہیں خبر دی تھی انہوں نے ڈاکٹر سے مل کر سرفراز خان کو وہی آئی پی روم میں منتقل کرا

دیا۔ سیٹھ حنان کے جانے سے اسپتال کا عملہ بھی بھڑک کر دیگی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

سرفراز خان کو سکون کی خاطر نیند کا انجکشن لگا دیا گیا۔ سیٹھ حنان لیاقت حسین خان کو تسلی دے

رہے تھے۔

”گھر مت کرو میں نے سرجن سے بھی براہ راست بات کر لی ہے۔ سرفراز خان کو دو روز بعد گھر

منتقل کر دیا جائے گا۔ البتہ ذمہ بھر میں کچھ وقت ضرور لگے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ گولی ہڈی سے نہیں

ٹکرائی۔“

”کیا کوئی بھی خبر ہو گئی ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

سیٹھ حنان نے لیاقت حسین کو سمجھانے کو کوشش کی۔ ”میں نے فی الحال مصلح اس حادثے کی

اطلاع سوائے سراج کے اور کسی کو نہیں دی تم بھی ہمت سے کام لو گھر والوں کو خبر ہوتی تو وہاں بھی

ایک کھرا م بچ جاتا۔“

کو چھیڑا۔

”جس علاقے کا معاملہ ہے وہ میرے اندر نہیں ہے ورنہ ایس اے او ایچ بھاگا چلا آتا۔“ سراج نے بڑی سنجیدگی سے وضاحت کی۔ ”ہمارے خانے کی نظری ہمیشہ متعلقہ اور غیر متعلقہ کے اصولوں پر دم ہلانے کی عادی ہوتی ہے۔ جب تک آپ کا نظام نہیں سدھرے گا چلی سلا پر بھی لوگ اپنا اپنا راگ الاپتے رہیں گے۔“

سراج نے ذاتی طور پر آپریشن کرنے والے سرجن سے ملاقات کر کے اپنا تعارف کرایا پھر وہ کوئی اپنی تحویل میں لے لی جو کسی رائلز ہی کی حیثیت ہوئی تھی۔



”گوئی جس زاویے سے گلی ہے اس سے یہی اندازہ ہے کہ وہ زمین کے بجائے کسی قدرے اونچی جگہ سے چلائی گئی تھی۔“ سرجن نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ چاہیں تو میں اپنی فائینڈنگ (finding) رپورٹ بھی تحریری طور پر دے سکتا ہوں۔“

”بلیئر سرجن میں اس کے لیے ذاتی طور پر آپ کا شکریہ ادا کروں گا۔ ایک ریکویسٹ اور بھی کروں گا۔“

”فرمائیے۔۔۔۔۔“

”آپ اس کیس کی اطلاع اب کسی بھی غیر متعلقہ فرد کو فراہم نہیں کریں گے۔“

”میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں لیکن اسپتال کے متعلقہ خانے کو ایسے معاملات کی رپورٹ دینا بھی میری ذمہ داری ہے۔“

”یہ علاقہ میرے ہی پاس ہے میں آپ کی فائینڈنگ کو باقاعدہ آفیشلی طور پر ریسپورڈ کروں گا۔“

سرجن سے مل کر سراج اور سینٹھ عثمان دوبارہ اسپتال کے دی آئی ٹی روم میں آگئے جہاں دوسرے کمرے میں لیاقت حسین بے چین سے ان کا منتظر تھا۔ اس نے سراج کو دیکھتے ہی سوال کیا۔

”بابا کو تک ہوش آنے کا صاحب؟“

”بہت سے کام لو۔۔۔۔۔“ سراج نے اس کا ہاتھ تھام کر دوستانہ انداز میں سمجھایا۔ ”میں ابھی سرجن سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ تمہارے والد بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ کوئی فوری طور پر نکال لی گئی۔ رہا ہوش آنے کا معاملہ تو اس میں چار چھ گھنٹے ضرور لگیں گے۔ تمہارے والد کو سکون پہنچانے کی خاطر انکشن ضروری تھا۔“

”مجھ سے ایک وعدہ کریں صاحب۔“ لیاقت حسین بھر جڈ پاتی ہوئے لگا۔ ”اگر آپ کو اس حرام کے جرم کے بارے میں کوئی سراغ ملے جس نے میرے باپ کا سایہ اٹھانے کی کوشش کی تھی تو مجھے ضرور خبر کریں۔“

”تم مجھے بہت عزیز ہو لیاقت حسین۔۔۔۔۔ میرا اور تمہارا دشمن الگ الگ کیسے ہو سکتا ہے؟“

لیاقت حسین سراج کا جواب سن کر رنجش اس سے لپٹ گیا۔ سراج سے کئی دینے کی خاطر اس کی ہشت چھتپارہا تھا جب اس کے موبائل کی ٹیون بجتے گئی اس نے آنے والے نمبروں کو غور سے

دیکھا وہ دھیرا اس کے کسی واقف کار کے نہیں تھے پھر بھی اس نے موہاں آن کر کے کانوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”سراج اسپیکنگ.....“

”ناک مر جائے تو اس کے وقار غلام بھی سکون سے نہیں بیٹھے۔“ مرد لہجے میں کہا گیا۔ ”تم تم کو اور تمہارے ایس پی کو بھی سکون کا سانس نہیں لینے دیکھا۔“ سرفراز خان کے ذہنی ہونے کی ہماری طرف سے ایک وارننگ سمجھو۔“

جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

”کس کا فون تھا؟“ سینہ حثان نے سراج کے چہرے کے بدلے تاثرات دیکھ کر غصیدگی سے سوال کیا۔

”جی ایک آفیشل کال۔“ سراج نے لیاقت حسین کی موجودگی میں آنے والی کال کے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا لیکن اس کا ذہن بدستور موصول ہونے والی کال کی کے نشیب و فراز میں الجھا رہا تھا۔

+++

پر تاب بجوٹن اس وقت مندر میں بیٹھا بڑے اٹھاک سے کسی منتر کے بول جا پ رہا تھا جب دروازے پر کسی کی آہٹ سن کر چونکا۔ اس نے ٹیکوں کے درمیان جھری کر کے دیکھا وہ مندر کی سب سے حسین بھانجری سلونی تھی جو ایک بار اس کے پاؤں تک آگئی تھی لیکن بڑے بھاری کی وجہ سے کھل ادرورا چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ رام نام سوت ہو جانے والی بھانجری دھوئے بدقت اسے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب وہی اس کے دروازے پر گئی کھڑی پر تاب بجوٹن کو لگاؤٹ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلونی کی سندرتا کو دیکھ کر پر تاب منتر کے بول بھول گیا۔ اس نے جا پ توڑ کر اسے ٹھوٹی نظروں سے گھورا۔ وہ بڑے بھاری کی خاص رکھیل تھی اس لیے دوسرے پنڈت بھاری بھی اسے دیکھ کر صرف آنکھیں پینکھ پر گزارا کرتے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے سلونی کو مرتاپا غور سے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا۔ ”اس سے یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟“

”جسہیں دیکھ رہی تھی۔“ سلونی نے مسکرا کر جواب دیا پھر ایک ادا سے پوچھا۔ ”کیا جہیں میرا یہاں آتا اچھا نہیں لگا؟“

”بڑے بھاری کو بھیک مل گئی تو اس بار تجھے نہیں کرے گا۔“

”وہ آج سورے سے سورے میری مڑھ پازرا کے لیے چلا گیا ہے ناہی میں ایک مہینہ لگ سکتا ہے اور..... وہ جملہ ادرورا چھوڑ کر ہونٹ چبانے لگی۔“

”چپ کیوں ہو گئی؟“

”اس گرگھنٹال کا دل بھی مجھ سے بھر گیا ہے۔“ اس کے جواب میں عمارت کا رنگ گھٹنے لگا۔ ”جائے جائے آخری بار منہ مارنے کے بعد اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اب میں جس کے ساتھ من چاہے موج سلا کر سکتی ہوں۔“

”کچ کبہ رہی ہے۔“

”کیا جہیں میری بات پر دشاں نہیں آیا؟..... چاہوں تو بھاری دن چند سے پوچھ لو جو بڑے بھاری کی جگہ چند پر چھڑی لگا کر بیٹھ گیا ہے۔“ سلونی نے کوٹے پر ہاتھ رکھ کر شرارتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ بھی کچھ کم..... حرامی نہیں ہے مندر کی لکڑی سنہالتے ہی اس نے سب سے پہلے سر سے پاؤں تک کسی بھوکے کدے کے انوار مجھے جھجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جانے کب سے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا کم ذات۔“ وہ ایک لمحے کو رکھی پھر ادرورا دھڑکے کر بولی۔

”مرو فظ نہیں آری؟“

”وہ..... وہ بھی اپنے گاؤں کا کبہ کر گئی ہے۔“ پر تاب نے جھوٹ کا سہارا لے کر دانہ ڈالا۔ ”دروازے سے گئی کیوں کھڑی ہے؟“ اندر آ جاوڑا سے کٹڑی مار دے۔“

”تم بھی کہیں گئے ہوئے تھے شاید؟“ وہ دروازے کا کچھ کلاک کر پر تاب کے قریب بیٹھ گئی۔

”ہاں۔ ایک ضروری کام چھٹا تھا۔“ پر تاب نے اس کا ہاتھ تمام کر قریب کھینٹ لیا پھر ہینکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ایک بات پوچھوں رانی۔ کچ بتائے گی۔“

”پوچھ کر دیکھ لو۔“ اس نے اٹھلا کر جواب دیا۔

”سندس میں چھڑے چھانٹ بھاریوں کی بھی نہیں ہے پھر..... تو سب کو چھوڑ کر میرے پاس کیوں آ گئی؟“

”بڑے بھاری کا کہنا تھا کہ تم دیوی کے خاص سیوک ہو..... جا پ منتر کے تم نے مہان طقتی بھی پراپت کر لی ہے۔“

”پھر.....“

”میں بھی سدا سے دیوی درشن کی بھوکی ہوں۔“ اس نے گل کر پر تاب کے گلے میں انھیں ڈال دیں۔ تم ایک بار مجھے بھی دیوی درشن کرواؤں سارا جیون تمہارے چروں کی دھول بن کر بتا دوں گی۔“

”دیوی درشن کے لیے بڑی سکھن تپا کر پتی ہے من کو مار کر کیول اسی کو دھوئی رانی پتی ہے۔“

”تم جیسا کہو میں ویسا ہی کروں گی تمہارا.....“ سلونی نے بڑے پیار سے کہا۔

”میں تجھے دھوکے جگہ سے سکا ہوں لیکن ایک شرط ہوگی۔“ پر تاب کے ہاتھ بھانجری کے مندر شریر پر پینکھنے لگے۔ ”تو میرے سوا کسی اور کا من نہیں بھلانے کی۔“

”یہ بات میرے بس میں نہیں ہے تمہارا۔“ اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ ”مندر میں

شکریہ

’سرفراز خان پر حملہ کرنے والوں

”کیا تمہاری عثمان صاحب کے کہنے کے مطابق یہ کسی کاروباری حلقے کی شرارت نہیں ہو

”نہیں.....“ سراج نے دلی زبان میں کہا۔ ”؟؟“ محض عثمان کا خیال ہے۔“

”آکٹوپس کا کوئی سر پھرا چاہنے والا ہی غالباً اب ہیرو بننے کی کوشش کر رہا۔“

”معاملہ ہیرو دہننے کا نہیں بلکہ حکم کی پیروی کرنے کے زیادہ امکانات ہیں۔“

’اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک اس کی ڈیڈ باڈی اپنی نظروں

”گویا آج کی تقریب کی صرف ریہرسل سمجھوں۔“ سراج نے زیر لب مسکرا کر جملہ ادا کیا۔

کا۔ تقریب ٹھیک نو بجے شروع ہوئی، کرنل احتشام نے بذات خود شیخ حامد کی مختلف حیثیتوں کے

دسراج کی کوششوں کو سراہتے ہوئے ڈی آئی جی کے لیے بھی ستائشی جملے ادا کئے پھر اس نے تقریب

برٹنڈنٹ سراج کو ملٹری کی طرف سے تحریری سند بھی پیش کی..... اور جنگ زیب کو تالیوں کی گونج میں

طب کرتے ہوئے کہا۔

”ایک گھنٹہ۔“

سندے نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔ ”کیا آپ نے ابھی تک دونوں لاشوں کا سراغ نہ ملنے کے

۱۰۰ کو پوتاؤں

”جانتا ہوں پر تو اس کی چننا مت کر۔“ پر تباب نے اپنی پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے پھنسی

”تو میرے اشارے پر چلتی رہی تو میں مدھوکو بھی والہس آنے سے روک دوں گا۔“ پر تباب

✦✦✦

ملٹری کا جینڈ خاصی دیر سے فغمہ سراجھا۔ کرقل احتشام بنفس نفیس آنے والے شرکا کا استقبال کر رہا

”تھینک پوسر۔“ اور رنگ زیب اور سراج نے باری باری جواب دیا۔

حاجے تھا تاکہ سب کی نگاہیں آپ کے اقتدار میں ہوتیں۔“

جواب میں کرنل احتشام نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا یا پھر ایک سول آفیسر کے

تھیں، تقریب کا وقت نوے تھا جبکہ ابھی سو آٹھ کے تھے۔

”کیا تم بھول رہے ہو کہ الماس سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“ اور نگ زیب نے مسکرا کر کہا پھر اس

دوم

”میں سمجھا نہیں.....“ سراج سنہل کر بیٹھ گیا۔ ”آپ اس حلقے سے کیا نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟“

”میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔“ سراج سے کسمار کو وضاحت چاہی۔

”میرے فرار خانہ پر ہونے والے حملے کو۔۔۔ لاپتہ حسینی کے لیے بھی ایک وارننگ سی

سمجھو۔۔۔ متعدد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر اس نے ان کو آپس کے معاملات میں مزید دخل

دینے کی کوشش کی تو اس کی سزا۔۔۔ اس کے گھر والوں کو بھی دی جاسکتی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ آئی سی۔۔۔“ سراج نے چونک کر کہا۔

”مسلمان ہونے کے ناتے میں بھی یقین رکھتا ہوں کہ رحمانی قوتوں کے مقابلے میں طاغوتی قوتیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں مگر۔۔۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ جرائم پیشہ افراد اور خاس طور سے ایڈورڈلے کے تعلق رکھنے والوں کا کوئی حرم ایمان سرے سے نہیں ہوتا۔ مجرموں کی یہی خوش بختی ہے۔“

”ہیلو.....“ اور نگ زیب موبائل پر جکتے نمبروں کو دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ ”اس وقت کیسے یاو آئی۔“

”گولڈ میڈل کے حوالے سے میں نے آپ کو ترجیح دی ہے۔“ میڈم روبلی کا لہجہ بھی دوستانہ تھا۔ آپ دونوں اب میرے لیے الگ الگ نہیں رہے۔“

”آج کی تقریب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔“ اوگ زیب نے محتاط انداز میں گول مول جواب دیا۔

”لاش برآمد ہونے کی صورت میں یہی سمجھا جاسکتا ہے۔“ اورنگ زیب نے دوبارہ خوبصورت لفظوں میں تالے کی کوشش کی تو اخباری نمائندہ براسامہ بنا کر چٹھہ گیا وہ پوری طرح مطمئن نظر نہیں آ

تجارت کمال کیا تھا؟ کیا یہ درست ہے؟
”نوشٹس“

”اس کی فائل میں نے یہاں ڈیوٹی رپورٹ کرنے کے بعد ہی پڑھی تھی۔“

”مخترم.....“ انگریزی اخبار کا نمائندہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”آپ کو جس طہری اعزاز سے نوازا

ہو۔ ویسے بات اگر میرے اختیار کی ہوتی تو میں یہ گولڈ میڈل اتار کر اپنے ڈی آئی جی کے کلمے میں انتہائی تعقید سے ڈال دیتا جنہوں نے کبھی میرے کام میں افسرانہ مداخلت نہیں کی۔“

لگے۔ کھانے کے دوران بھی مختلف مہمان اورنگ زیب اور سراج کو مبارکباد دیتے رہے جسے وہ نہایت خندہ پیشانی سے قبول کرتے رہے۔

”آج مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ ایک اچھے سیاستدان بھی بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس انداز میں آپ اخباری نمائندوں کو بہلاتے رہے، میں اسے خاص طور پر نوٹ کر رہا ہوں۔“

تھا۔ میڈل والی بات سن کر ڈی آئی جی کی باپچھیں بھی گل کئی تھیں۔“

”اس عزت افزائی کا شکر یہ اب اگر میں آپ کی مبارکباد کے جواب میں آپ کو بھی مبارکباد پیش کروں تو کیسا رہے گا؟“

”کس بات کی مبارکباد؟“

”گھر بنانے کے سلسلے میں میری اطلاع کے مطابق آپ نے بھی کسی سے آئینوں کا کاغذ لکھ جانے کی شرط لگا رکھی تھی۔“

”خدا کا شکر ہے کہ آج آپ پہلی بار اسے دوستانہ موڈ میں بات کر رہے ہیں ورنہ آپ کے ذہن میں تو شاید افلاطون کی روح نے ڈیرا بٹھا رکھا تھا۔“

”یہ بھی کرم نوازی ہے آپ کی کہ افلاطون کا نام لیا۔ کہیں شیطان کہہ دیا ہوتا تو کوئی برا مان جاتا۔“

”یہ اشارہ کس کی طرف ہے۔۔۔۔۔“

”وہی جو میری ادوار آپ کی گفتگوں کی مجلس ہو رہا ہے۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا پھر موبائل سراج کی طرف بڑھا دیا۔

سرفراز خان کو چہ کھٹے بعد ہی ہوش آ گیا۔ آنکھ کھولنے ہی اس کے اندر جلائی لہر دو گئی۔ اس نے نظریں گھما کر گرد پیش کا جائزہ لیا سیٹھ عثمان کے علاوہ لیاقت حسین بھی اس کے پاس تھا قریب ہی ایک میل زین بھی نظر آ رہا تھا۔

”خدا کا شکر ہے بابا کہ جہیں ہوش آ گیا۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے باپ کا ہاتھ تھام کر بڑی اپنائیت سے کہا۔

سرفراز خان نے سیٹھ عثمان کو دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی لیاقت حسین کی نظروں میں نظریں ڈال کر محسوس لہجے میں بولا۔ ”تمہارا چہرے پر اداوی کسی لیے ہے؟ مرد ہو کر موت سے ڈرتا ہے؟“

”بابا۔۔۔۔۔“ لیاقت چٹکا۔ ”تم اس وقت۔۔۔۔۔“

”جانتا ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے سیٹھ عثمان پر ٹھکانہ نظر ڈالی۔ ”ہمارا دوست نے ہم کو کسی بڑے اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔“

”م۔۔۔۔۔ میں شرمندہ ہوں سرفراز خان کہ یہ ناگہانی حادثہ آپ کو میرا مہمان ہوتے ہوئے پیش آیا۔“ سیٹھ عثمان کے لہجے میں غالت تھی۔

”رذائق باتیں مت کر میرے دوست۔“ سرفراز خان نے سردآہ بھر کر کہا۔ ”جو نقد بریں لکھا ہو وہ پورا ہو کر رہتا ہے لیکن مجھے بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ادھر شہر میں ہمارا کوئی مخالف ہوگا۔“

”فکر مت کرو بابا۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے باپ کی تسلی کی خاطر کہا۔ ”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ جہیں ایک درد میں پھنسی مل جائے گی۔“

”دُخم بھرنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔“ سرفراز خان عجیب انداز میں مسکرایا۔ ”کیا تمہارا نظریہ بھی اس پر نہیں پڑا جس نے حملہ کیا تھا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین علی کھار بولا۔ ”اگر وہ میری نظروں میں آ جاتا تو اس کو جہنم واصل کرنے سے روک لیجی نہ کرتا۔“

”میں نے سراج کو اطلاع کر دی ہے وہ سب معاملہ دیکھ لے گا۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔

”گھر پر کسی کو اطلاع ہوئی۔۔۔۔۔؟“

”میں نے فی الحال منع کر دیا ہے ورنہ سب۔۔۔۔۔ پریشان ہوتے۔“ سیٹھ عثمان نے پھر شرمندگی کا اظہار کیا۔

”دُخم بھرنے اور فوری دیکھ بھال کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم آپ کو آج بھی گھر لے جاسکتے تھے۔“

”مجھے کسی اور کا نہیں لیاقت حسین کی ماں کا گھر ہے دوست۔ اس خدا کی نیک بندی کو ہر بات کا پتا چل جاتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔“

”میں بھی آج تک نہیں سمجھا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ اللہ کی بندی ہمارا حال سے ضرور باخبر ہوگا۔“

سرفراز خان کی ہی بات خود لیاقت حسین کے لیے بھی نئی تھی۔ ماں نے اسے اور فرحمن کو داہیں جاتے وقت صرف اسی کو علیحدہ کمرے میں بلا کر بڑے ناانصافی کا ذکر ضرور کیا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ اسے دور رو کر بھی بات کا علم ہو جاتا ہے۔ لیاقت حسین اب بھی سوچ رہا تھا کہ سرفراز خان نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”تم گھر جاؤ لیاقت سب سے یہی کہنا کہ ہم خدا کا کرم سے روغ موٹ (بھلا چکا) ہے۔ وہ ایک دن اسپتال کے سیر کے داہیں آ جائے گا۔“

”کوئی آنے کی خند کرے تو اسے روکنا نہیں۔“ سیٹھ عثمان نے اس کے جاتے جاتے محبت سے کہا۔ گاڑی لے جاتا میں سراج کے ساتھ آ جاؤں گا۔ وہ آنے کا کہہ کر گیا ہے۔“

لیاقت حسین کے جانے کے بعد سرفراز خان نے سیٹھ عثمان سے دوبارہ کاروباری باتیں شروع کر دیں میل زین انجین لگانے آیا تو اس نے بڑی بے پروائی سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

فرحمن اس وقت راجہ بیگم اور لیاقت حسین کی ماں کے ساتھ ہی بیٹھی تھی جب لیاقت حسین نظریں جھکاتے اندر داخل ہوا ماں نے اسے آنکھ پھر کر دیکھا پھر کھلی دیتے ہوئے کہا۔

”فکر مت کر ماں کی جان جو مصیبت آنا تھا وہ نہ گیا۔ سب اور والے کا کرم ہے۔“

”بابا کو ہوش آیا یا نہیں؟“ فرحمن نے سوال کیا۔

”آگیا ہے۔“

”ابھی..... مٹان کا فون آیا تھا۔“ راجلہ بیگم نے سب کو مطمئن کرنے کی خاطر مسکرا کر کہا۔ ”سرفراز خان صاحب نے ہوش میں آتے ہی تجاوت کا حساب کتاب پچھلانا شروع کر دیا ہے۔“

راجلہ بیگم کے بے حد اصرار کے بعد لیاقت حسین نے کھانا کھا یا لیکن وہ ابھی باپ کو چوں آنے والے حادثے کی وجہ سے پریشان تھا گو لی چلانے والا اس کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا تھا۔ لیاقت حسین کے کھانے کے دوران بھی ادھر ادھر کی چٹھہ بائیں ہوتی رہیں پھر لیاقت حسین کی ماں نے راجلہ بیگم سے کہا۔

”ہمارے آنے سے جنہیں بلا وجہ ایک پریشانی نے گھیر لیا۔ ہم بہت شرمندہ ہے۔“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں.....؟“ راجلہ بیگم نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”مگر میں کسی بزرگ کی موجودگی تو باعث برکت سمجھی جاتی ہے۔ البتہ میں شرمندگی کا اظہار کرنا چاہیے کہ..... یہاں آکر آپ کو پیٹھے پیٹانے ایک صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔“

”سب اوپر والے کا مرضی ہے ہوتا ہے میرا جان..... اس کے اشارے کے بغیر ایک دانہ بھی ادھر سے ادھر حرکت نہیں کر سکتا۔“

”تو فکر مت کر ماں.....“ فرحمن نے ماں کو دلاسا دیا۔

”اسے سراج صاحب کو لی چلانے والے نامراد کو چوبے کے تل سے بھی دھونڈ نکالیں گے۔“ وہی ہوگا میرا جان جو اوپر والے کو منظور ہوگا۔“ ماں نے کہا پھر وہ لیاقت حسین کا ہاتھ تھام کو اٹھتے ہوئے بولی۔ ”تو میرے ساتھ ادھر دوسرے جنگل میں اپنے گھر چل۔ مجھے تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

ماں کا حکم تھا اس لیے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فرحمن اور راجلہ بیگم بھی ایک دوسرے کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھ کر رہیں لیکن کسی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لیاقت حسین خاموشی سے ماں کو لے کر انکسی میں آگیا۔ سانس درست کرنے کی خاطر ماں کچھ دیر ایک کرسی پر بیٹھ کر آرام کرتی رہی پھر لیاقت کا ہاتھ تھام کر اس کو اپنے قریب فرش پر بیٹھالیا۔ ایک سرواہ بھر کر بولی۔

”دشمنوں کا زور تمہارے اوپر نہیں چل سکتا اس لیے اب وہ دوسرا راستہ اختیار کر رہا ہے۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہی ہو..... ماں؟“ لیاقت حسین نے ماں کو حیرت سے دیکھا۔

”میں جو کہہ رہی ہوں اسے دھیان سے سن لیاقت..... اس شہر میں تیرے بابا کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ وہ تجھے یا تو کرنے کی خاطر اوکھے جھنڈے اختیار کر رہے ہیں..... دشمنوں اور ایک کافر کی عورت کا جمل کر مر جانے کا صدمہ کھانے جا رہا ہے۔“

لیاقت حسین چونکا اس نے ابھی تک ماں کو مدعو پتھان (جو فرحمن کا روپ دھار کر آئی تھی) کے جمل کر مرنے کی کوئی خبر نہیں سنائی تھی وہ اس کے چہرے کے بدلنے تاثرات کو حیرت بھری

نظروں سے دیکھتا رہا۔

”جس کا قسمت میں مرنا تھا وہ مر کر جہنم رسیدہ ہو گیا لیکن اس کے بعد جو ہوا وہ اچھا نہیں ہوا۔“

”کیا اچھا نہیں ہوا ماں؟“

”بڑے نانا کا تعویذ تیرے جیسے سے نکل گیا۔ وہ ہوتا تو کوئی کافر کا حکم تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن..... ماں ایک لمحے کو غلامی گھورتی رہی پھر اپنے ہاتھ سے چپٹے لپٹی کے رنگ کے ٹکٹن کی آغوشی کو اتار کر لیاقت حسین کو دیتے ہوئے بولی۔ ”اس کو پہلا فرصت میں کسی سار کارنگر سے اپنا سامنے بڑا کر کے گلے کی انگلی میں ڈال لینا۔ اس کے بعد اوپر والا تیری حفاظت کرے گا۔“

”بابا کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟“ لیاقت حسین نے کسمار سوال کیا۔

”وہ تیرے بابا کا نہیں تیرا دشمن ہے۔“ ماں نے غلامی گھورتے ہوئے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”تو عین موقع پر گاڑی کا رنڈ پھیرا ہوتا تو اس بد بخت کا بھانڈا ابھی نہ پھوٹا۔“

”یہ..... تو کس کی بات کر رہی ہے؟“

”وہی جو آسمان سے گرا اور کہیں گھور میں ایک کرہ رہ گیا ہے۔“ ماں نے کھوئے کھوئے انداز اور سہاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ماں کی نظریں بدستور غلامی کہیں جھٹک رہی تھیں۔ لیاقت حسین اس کا جواب سن کر بری طرح چونکا۔ ایک لمحے وہ ماں کو غالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر دبی زبان میں پوچھا۔

”جو آسمان سے گرا تھا کیا وہ ابھی تک زندہ ہے؟“

”تو جس کا تنک کا رہا ہے لیاقت..... صرف اس کا فکر کر۔“ ماں نے اس بار لیاقت حسین کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا۔ ”جو ٹھیل یہاں شروع ہوا ہے وہ ابھی بہت سارا کر دیش لے گا۔ اس سے دوسری رہو..... یہی تیرے لیے زیادہ مناسب ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں ماں لیکن ان کے بڑے اسمان ہیں میرے اوپر.....“ لیاقت حسین نے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”ان سے اچانک منہ پھیر لیا تو یہ بھی خود غرضی ہوگی۔“

”پھر.....“ ماں نے قدرے الجھ کر سوال کیا۔ ”تو کیا چاہتا ہے؟“

”گاڑی پھرنے والی بات اور تنگ زیب صاحب اور سراج صاحب نے بھی کی تھی لیکن کچھ مجھے یاد نہیں..... اب تو بھی وہی والدہ سے رہی ہے مجھے بتانا کہ بات کیا ہے؟“

”تو اسے بھول گیا جس نے ایک جنگی خاک زین سے اٹھا کر تیرے منہ میں ڈالا تھا پھر وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔“

”وہ..... کون تھا ماں؟“

”تھا خدا کا ایک بندہ جو اوپر والے کے اشارے پر ہی تجھے فوزا گیا تھا۔“ ماں نے رک رک کر

”کھامیرے سر کی قسم کو تو بچ کبہ رہا ہے۔“
 ”میں نے پہلے بھی تجھ سے جھوٹ بولا ہے۔“ لیاقت حسین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھکڑا کیا۔

”نہیں۔ لیکن اس وقت بچ جانے سے کیوں بچ کر رہا ہے۔“
 ”اُس صرف مجھ سے نہیں۔ تجھ سے بھی ناراض ہے جاتی ہے کیوں۔“
 ”کیوں۔ اس کی کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی۔“

”وہ۔ وہ وہ اس وقت یہاں چکن میں کھڑے کھڑے تجھے نہیں سمجھا سکتا۔ بابا کو گھر آ لینے دے پھر اطمینان سے تجھے ایسا سمجھاؤں گا کہ پھر تو بھی مجھے اتنے دنوں فراموش نہیں کرے گی۔“
 ”چل ہٹ۔ مٹی کے خواب میں مجھ پر ہی سارے رہتے ہیں۔“ فرحین نے ایک ادا سے اپنا ہاتھ چڑھایا پھر تیز قدم اٹھائی اُنکی سے چلی گئی۔

لیاقت حسین ماں کے پاؤں دبانے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں پھر ماں کی کبھی ہوئی باتیں صدائے بارگشت بن کر گونجنے لگیں مگر وہ ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکا تھا۔



تھریا حسب معمول صبح کے ناشے کی میز پر میڈم روٹی کے ساتھ موجود تھی۔
 گزشتہ رات اس نے میڈم کو ایس بی اورنگ زیب کو فون کرتے سنا تھا۔ اس وقت وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی لیکن اس وقت ناشے کی میز پر خلاف معمول وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تھریا ایک لمحے تک اس کو مختلف زاویوں سے تو لیتی رہی پھر اس نے دلی زبان میں پوچھا۔

”کیا سوچا رہی ہیں۔؟“
 ”کسی دیرینہ خواہش کی تکمیل نہ ہو سکے تو ایک کسک سی دل میں رہ جاتی ہے۔“
 ”اوہ۔“ تھریا نے اس کا مہموں سمجھ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے جو کچھ ہوا وہ بہتر ہی تھا۔ اس کی لاش اگر مل بھی جاتی تو کیا ہوتا؟“

”میں اس کے منہ سے چرے پر نفرت سے تھوک کر کم از کم اپنے شوہر کی روح کو کچھ تسکین تو پہنچا سکتی تھی۔“

”کول ڈاؤن میڈم۔“ تھریا نے اسے سمجھانے کی خاطر کہا۔ ”اگر آپ اپنی آخری خواہش کی تکمیل کر لیتیں تو اس کی وجہ جان کر کچھ افراد آپ کے دُشمن کو مزید کریدنے کی کوشش بھی ضرور کرتے۔“

میڈم نے تھریا کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کی بات کی گہرائی سمجھ میں آئی تو وہ ایک سرواہ بھر کر بولی۔

”تم۔ تم شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہو لیکن بہر حال میں اس منہ سے مردہ چہرے کو نہ دیکھ سکی جو فرعون بنا ہوا تھا۔“

غصوں انداز میں کہنے ”تیرا منہ ہے جو ایسی بات نکلتا جو تجھے بعد میں یاد نہیں رہتا اس میں بھی اوپر والے کی بہت سی مصلحتیں ہیں جو تم نہیں سمجھتے۔“

”ہاں۔۔۔“ لیاقت حسین نے ماں کا چہرہ دہاتے ہوئے خاص طور پر شیخ حامد کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ ”جو آسان ہے گرا تھا وہ کہاں ہے؟ مگر کیا یا ابھی تک زندہ ہے؟“ لیاقت حسین نے بات جاری رکھی۔ ”وہ اچھا آدمی نہیں تھا اب بڑا خالم تھا۔ اور اس کا تعلق بھی زیر زمین رہنے والی خطرناک شخصیتوں سے تھا۔ وہ سب شیطان اور پلید لوگ ہیں ماں۔“

”تو فکرت کر۔“ اُن نے پھر خلا میں دور نہیں کم ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک پلید۔ دوسرا پلید کی وجہ سے مارا جائے گا۔ اس کے ہاں دیر ہے اندر نہیں ہے۔“
 ”دوسرا پلید کون ہوگا۔؟“ لیاقت حسین نے تیزی سے پوچھا اس کے دل کی دھڑکنیں ماں کو ایک نئے رنگ میں دیکھ کر تیز ہونے لگیں۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ بھی کتنا ہوش میں تھے۔ کچھ تک غرق ہے۔ بد نصیب۔“
 ”اس کا کوئی نام کوئی۔۔۔ اُتاپتا تو ہوگا۔؟“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ ماں کی پکلیں اچانک جھپکے لگیں پھر اُس نے لیاقت کی طرف دیکھ کر ہنسنے چلے انداز میں کہا۔

”فرحین کو بلا کر میرے لیے ایک کپہہ تیار کرو۔ بڑا خواہش ہو رہا ہے۔“
 لیاقت حسین نے ماں کی اچانک تبدیلی ہونے والی کیفیت کو محسوس کیا تو پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ خاموشی سے جا کر فرحین کو بلا لایا جس نے ماں کے لیے قہوہ تیار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔
 ماں نے قہوہ پی کر چھٹے چھٹے انداز میں سر پیچھی کرنے کی خاطر بستر پر لیٹ کر آگھیں بند کر لیں تو فرحین خاموشی سے لیاقت حسین کا ہاتھ تھام کر بچن میں لگئی۔ تنہید کی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے۔“ ماں کی طبیعت ٹھیک تو ہے۔“
 ”ہاں آں۔۔۔ لیکن وہ مجھ سے خفا ہے۔“ لیاقت نے بات بنانے کی خاطر اس لمحے میں

جواب دیا۔

”مجھ سے خفا ہے۔؟“ فرحین نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی۔“
 ”مجھ۔۔۔ بتائی تو تھی لیکن۔۔۔“ لیاقت حسین جملہ امور اور چھوڑ کر خلا میں دیکھنے لگا۔
 ”ایسی کیا بات ہے جو تو مجھ کو بتاتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔“ فرحین اٹھنے لگی ٹھک کر

بولی۔ ”آنے دے سراج صاحب کو۔ میں ان سے تیری شکایت کر دوں گی۔“
 ”سمجھنے کی کوشش کر لیاقت حسین کی جان۔“ لیاقت حسین نے فرحین کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”بابا کو خیریت سے گھر واپس آ لینے دے پھر میں ماں کی شکایت بھی دو کر دوں گا۔“

”مجھے ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔؟“ فرحین نے لیاقت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھتے ہوئے تنہید کی سے کہا۔

”دو ماہ بعد لیکن آپ کو اس وقت لوچن کا خیال کیسے آ گیا؟“ تھریا نے وضاحت چاہی۔
 ”اسے فارغ کرنے میں جلدی نہ کرنا..... ہو سکتا ہے کہ ہمیں اس کی ضرورت پڑے۔“ میڈم نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”کل رات سراج نے مجھے فون کر کے ایک ایسی اطلاع دی ہے جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔“
 ”وہ کیا.....؟“

”سنسز اورنگ زیب کا خیال ہے کہ آکٹوپس ابھی مر نہیں ہے۔“
 ”اس خیال کی کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی۔“ تھریا نے تجب سے دریافت کیا۔
 ”نہیں..... اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ جب تک وہ اس کی کمروہ لاش خود اپنی نظر میں نہ لینی نہیں دیکھ لیتا، مردہ تسلیم نہیں کرے گا۔“ میڈم نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اورنگ زیب ایک تجربے کار ذہن اور ذمہ دار آفیسر ہے۔ اس نے اگر اس شخص کی موت کو تسلیم نہیں کیا تو اس کی کوئی معقول وجہ بھی ضرور ہوگی۔“
 ”آپ ابھی لوچن کی بات کر رہی تھیں۔ تھریا نے میڈم کو یاد دلایا۔“ اس سے کیا کام لینا ہے؟“

”ابھی میرے ذہن میں کوئی واضح پروگرام نہیں ہے پھر بھی اسے چھ مہینے کے لیے اور آج کر لو۔“

”ایز یوش“ تھریا نے کہا پھر وہ ملازموں کو رومزمرہ کے کاموں کی ہدایت دینے کی خاطر اٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد میڈم نے کچھ سوچ کر اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ فوری قائم ہو گیا۔

”غیریت.....؟“ دوسری جانب سے اورنگ زیب کی مائوس آواز سنائی دی۔ ”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”مجھے شیف کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ ایک عرصے سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔“
 ”اوہ.....“ کچھ توقف سے جواب ملا۔ ”میری اطلاع کے مطابق وہ آج کل اپنے ذاتی فلیٹ میں ہی ہے لیکن میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ فی الحال اس سے دور ہی رہیں تو مناسب ہوگا۔“
 ”کوئی خاص وجہ.....؟“

”یہ بات آپ کے علم میں بھی ہے کہ وہ دس کے آفس میں ملازم تھی۔ اس کا اچانک سامنے آ کر اپنے فلیٹ میں موجود ہونا بہت سے شہوک کو جنم دے رہا ہے۔ میرے کچھ خاص آدمی بھی اس کی نقل و حرکت کی نگرانی پر مامور ہیں۔“

”آپ کے آکٹوپس کے مرنے کے بعد اب اسے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟“ میڈم نے آکٹوپس کے نام پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

”فی الحال میں اس موضوع پر فون پر گفتگو کرنے سے گریز ہی کروں گا۔“ سنجیدگی سے جواب

”بھول جائیں..... جس کم جہاں پاک۔“ تھریا نے موضوع بدل دیا۔ ”آپ نے اورنگ زیب اور سراج صاحب کو صرف مبارک باد تو دی ہے لیکن ان کی دعوت کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟“
 ”قیَم نے کیسے سوچ لیا؟“ میڈم نے تھریا کو تجب سے دیکھا۔ ”اب تو الماس بھی میری بہن بن چکی ہے اس رشتے سے بھی سب کو بلانا میرے پروگرام میں شامل ہے۔ تم سے پروگرام بنانے کے بعد ہی ان کو آگاہ کروں گی۔“

دونوں اسی موضوع پر بات کرتے ہوئے ناشے کی میز سے اٹھ کر لاؤنج میں آگئیں جب میڈم کے سوبائل پر سٹیکل موصول ہوا۔ اس نے نمبر دیکھ کر ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر سوبائل آن کر کے بولی۔

”آپ نے پہل کر دی ورنہ میں ابھی آپ ہی فون کرنے کا سوچ رہی تھی۔ کل کی تقریب کے سلسلے میں میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک باد۔“
 ”خدا کا شکر ہے کہ آپ نے از خود مبارک باد سے دی ورنہ میں اس وقت اسی کا مطالبہ کرنے والا تھا۔ دوسری جانب سے ڈی آئی جی نے بے تکلفی سے کہا۔ ”اگر پہلے سے علم ہوتا تو کچھ دیر اور مہر کر لیتا۔“

”تقریب کیسی رہی.....؟“
 ”نہایت شاندار..... بس آپ کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔“
 ”میں بھی نہیں؟..... میری کمی کا احساس آپ کو اس تقریب میں کیسے ہوا کیا.....؟“ میڈم نے زیر لب مسکرا کر سوال کیا۔

”اس خیال سے کہ آپ کو بھی پوری طرح یقین آ جاتا کہ کٹھ خاند کا کانا اب ہمارے درمیان سے نکل چکا ہے۔“ ڈی آئی جی کا لہجہ مثنیٰ خیر تھا۔

”میں آپ کا مقصد سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے پہلو بدل کر صاف گوئی سے کہا۔ ”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن مجھے کچھ وقت درکار ہوگا۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ کم جوقدم اٹھا میں سمجھ کر ہی اٹھاؤں۔“
 ”کسی کی موت کی نہیں بلکہ کسی خطرناک دشمن کی موت کی خوشی میں آپ کی مسز اورنگ زیب اور سراج صاحب اینڈ سنز کی دعوت کرنے کے بارے میں بھی اس وقت تھریا سے ڈسکس کر رہی تھی۔“

”فائن..... مجھے شدت سے انویشن کا انتظار ہے گا۔“
 ڈی آئی جی سے گفتگو ختم ہونے کے بعد میڈم نے فون آف کیا تو تھریا نے کہا۔

”میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ اب آپ کو اپنا گھر بسا لینا چاہیے۔“
 ”اطمینان سے غور کروں گی۔“ میڈم نے موضوع بدل کر کہا۔ ”لوچن کا معاہدہ کب ختم ہو رہا ہے؟“

”میں آپ سب کی مشترکہ دعوت کا پروگرام بناری ہوں۔“ میڈم نے شبنم کا ذکر ختم کر کے بریکٹیل تکڑا کر کہا۔

”ابھی تھریسا سے یہی بات کر رہی تھی۔“

”زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں..... اس لیے ایک کام کر گزرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ اورنگ زیب نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ جواب میں میڈم نے دو چارہ کی باتیں کیں پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے ذہن میں ایک بار پھر شیخ حامد کا تصور کھیلانے لگا جو اورنگ زیب کے خیال کے مطابق مرا نہیں تھا۔

”حقیقت کیا تھی؟“ یہی ایک سوال اس کے ذہن میں بار بار صدائے بازگشت بن کر گونجتا رہا۔



گرے فکری کی وہ ہائی روف اس وقت شہر کے سب سے پوش علاقے کی طرف جانے والی اس سڑک سے گزر رہی تھی جو ستوازی ذیلی سڑک سے تقریباً دو بارہ فاصلہ پر بیٹھتی رہن کی شکل میں بنائی گئی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر سفید روڈی میں لمبوس ایک پست قد شخص بیٹھا تھا اس کے چہرے پر فریج کٹ واڑھی اس کی شخصیت میں ایک اضافہ ہی لگ رہی تھی مگر پر نظر آنے والی کپ پر بھی اسی کمپنی کا مونوگرام بنا تھا یہ اس کا اصل روپ نہیں تھا وہ زیروز پر دو سوین کے اکامات پر عمل کرنے والا مارشل آرٹ کا ماہر کاپٹینز جاسھدہ لوہن تھا اس کا تعلق اس بین الاقوامی ریز میں تنظیم سے تھا جو مدہ مانگے داموں کے عوض ایسے تجربہ کار افراد ایک خاص اور بے شدہ وقت کے لیے فراہم کرتی تھی جو ہر ناممکن کام کو بنانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ لوہن کی مدت پوری ہونے میں صرف دو ماہ اور باقی رہ گئے تھے اس کے ساتھ دو افراد اور بھی ایک جہاز میں آئے تھے جن میں سے دو بارہ جا چکے تھے۔ آپس میں ان تینوں کا تعارف بھی ٹھنک ایک اتفاق کی بنا پر جہاز میں ہوا تھا۔ ورنہ وہ پہلے سے ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ ان کا تعلق بھی الگ الگوں سے تھا۔

حسب معمول لوہن اس وقت بھی بے پروا نظر آ رہا تھا جب پچھلی سیٹ پر نظر آنے والے شخص نے اسے مخاطب کیا۔ وہ بھی وشنو کے سا کوئی اور نہیں تھا۔

”ہمیں اس وقت جگہ سے ملاقات کرنی ہے۔“

”جگا..... وشنو چوٹکا۔“ انہما جگا کے سامنے جانا مناسب ہوگا؟“

”تم اس وین میں بیٹھ کر اپنی گھونٹ کو یاد کرتے رہتا۔“ لوہن نے چپچپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جگا سے صرف مجھے ملاقات کرنی ہے۔“

اس بار پشت سے کچھ نہیں کہا گیا البتہ گھونٹ کے نام پر وہ اندر ہی اندر جھلس کر نہر رد مہی

تھا۔ وہ بھی اس وقت حالات کے تقاضوں کے پیش نظر میک اپ میں تھا ورنہ اس کا تعلق بھی لوہن ہی کے قبیلے کے افراد میں شمار ہوتا تھا وہ رام دیال سے وشنو بن گیا تھا۔ گھونٹ اس کی بیوی تھی خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بے ظاہر و فادار بھی تھی لیکن ایک روز اس کی وفاداری کا بھانڈا بھی اتفاقاً پھوٹ گیا جب رام دیال المعروف وشنو چار روز کا کہہ کر جانے کے دو دن بعد ہی اچانک گھر آ گیا تھا۔ گھونٹ کو اپنے ہی ایک دوست کے ساتھ بے لباس اور قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اپنے دوست کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا لیکن گھونٹ کو کرپان دار مار کر بڑی اذیت ناک موت مارا تھا پھر وہ کچے بارڈر کے راستے سرحد کراس کر کے پڑوسی ملک میں داخل ہوا۔ یہاں بلیک ہائیجر کے ذریعے اس کی رسائی شیخ حامد تک ہوئی تھی۔ لوہن اور اس کی ملاقات جیل میں ایس بی اورنگ زیب کے اشارے پر ہوئی تھی۔ بہر حال اس وقت گھونٹ کے حوالے نے اس کے زخموں پر تنگ کام کیا تھا۔

”کیا بات ہے بانی ڈیئر“ لوہن نے غتب نما آئینے میں وشنو کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم اچانک چپ کیوں ہو گئے؟“

”تم میں سے آخری بار درخواست کر رہا ہوں۔“ وشنو نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”دوبارہ کبھی تم گھونٹ کا نام زبان پر نہیں لاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے.....“ لوہن نے بے دستور بے پروائی سے جواب دیا پھر بیٹھوئی سرخ نما سڑک ختم ہونے کے بعد اس نے وین کا رخ زلی سڑک پر موڑ دیا جہاں کشمیری فریجی کے نام پر جگا نے کاروبار کر رکھا تھا۔ لیکن بارہ یہاں ہاتھ کے ساتھ آیا تھا جو بعد میں مار دیا گیا تھا۔

”کیا تم کو اس وقت جگا سے ملاقات کرنے کی ہدایت ملی ہے؟“ وشنو نے تھوڑے توقف سے دریافت کیا۔

”ہاں..... یہی سمجھ لو۔“

”ہم تم انداز میں ملٹری کی دسترس سے فرار ہوئے ہیں اس کے بعد کیا ہمارا جگا کیا کسی اور ایسے آدمی سے ملنا مناسب ہوگا جو پولیس اور ملٹری اٹلی جنس کی قبرست میں موجود ہے۔“

”تمہارا خیال غلط ہے۔“ لوہن مسکرایا۔ ”ہماری ملٹری اٹلی جنس اتنی بے پروا بھی نہیں ہے کہ ہم آسانی سے فرار ہو جاتے۔“

”پھر.....؟“

”اس کا موقع ہمیں کسی خاص مصلحت کی بنا پر فراہم کیا گیا ہے۔“

وشنو اپنی اشت پر کسمسا کر رہ گیا اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔

لوہن نے وین میں کشمیری فریجی کے شوروم کے سامنے روکی پھر..... نیچے اتر کر سیدھا اس میز کی طرف گیا جس پر یہ میز کی تختی نظر آ رہی تھی۔

دکھ دی پھر اس کے دونوں اینٹرفون (Ear phone) کے تاروں کو ڈیوائس میں لگا کر دوسرے سرے کاٹوں میں لگے۔ ساتھ ہی اس نے میز پر رکھا ہوا پیٹل اور ایک بال پن اٹھا کر بڑی بے تکلفی سے اپنے سامنے رکھا لیتا تھا۔

چکا بڑی سستی خیر اور کھوبی نظروں سے لوچن کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ لوچن کی پوری توجہ اینٹرفون میں ابھرنے والی آوازوں پر مرکوز تھی۔ بجلی آواز کی ٹھنک کی تھی جو بار بار ابھرتی رہی پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ دوسری پار جن نمبروں پر رابطہ قائم کیا گیا۔ ادھر سے بجلی ریکارڈز آواز ابھری تھی کہ ”یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔“

لوچن کی نظروں میں ابھرنے والا ٹھنک گھرا ہوا تھا جب تیسری پار میں مرتبہ ٹیون سٹائی دینے کے بعد کسی نے آواز دے کر پوچھا تھا۔ ”کون ہے؟“

”ایک ضروری بات معلوم کرنے کی۔“ اس بار سوبال کیل کرنے والے نے بھی آواز بنا کر مختصر ایک معنی خیز سوال کیا۔ ”جتنی مشق میں ہمارا جوبڑا جہاز حصہ رہا تھا۔ کیا وہ واقعی ڈوب گیا؟“

”تم نے غلط نمبروں پر ڈائل کیا ہے۔“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کرنے میں غیر معمولی غلبت کا مظاہرہ کیا گیا۔

لوچن پیٹل پر چکھ نمبر درج کرنے میں مصروف تھا جب پھر ایک مالوں ٹیون کی آواز ابھری۔ ”تم نے ابھی کچھ دیر پیشتر جس نمبر پر رابطہ قائم کیا تھا اس کا مقصد کیا تھا؟“

”مجھے اس جہاز کے کپتان کا نائب جمجو۔“ کال اینڈر کرنے والے نے بہ دستور بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

”تمہارے سوال کا جواب۔“ ہاں یا نہیں دیا جا سکتا البتہ ایک اہم بات فور سے سن لو۔“ دوسری سمت سے خشک اور تحملاًنداز انداز میں کہا گیا۔ ”دوبارہ خود سے کسی بھی نمبر کو آزمانے کی حماقت نہ کرنا ضروری احکامات جنہیں ہماری جانب سے ملتے ہیں گے۔“

اس کے ساتھ آوازوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ لوچن نے مختصر ڈیوائس کو دوبارہ سمیٹ کر چڑے کے ایک مختصر پائوچ (pouch) میں رکھا لیٹر پیٹل کا صفحہ ہجاز کر جب میں رکھا پھر اس نے چکا کی سمت دیکھا جو بہ دستور اسے ٹوٹتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا میں تمہارے کاروباری معاملات میں غل ٹوٹیں ہوا؟“

”کس کی کالز سن رہے تھے؟“ چکا نے اس بار مسکرا کر سوال کیا۔

”اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ لوچن نے بے پروائی سے جواب دیا پھر کتے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”خفاقت کے لیے شکاری توکن کا استعمال اب بہت پرانا ہو گیا ہے۔“

”یہ تمہارا خیال ہے دوست لیکن میرا تجربہ اس کے برعکس ہے۔“ چکا نے کتے کے بارے میں

کہ۔ ”میرے مخصوص اشارے پر یہ میرے کسی مخالف کو بل بھرنے اور پہنچا دیتا ہے۔“

”آپ کیا پتا پسند کریں گے؟“ میز کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے شخص نے دانا ڈالنے کی کوشش کی۔ ”فرنجیری لین وین بعد ہوتی رہے گی۔“

”آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ۔“ لیکن میں اس وقت یہاں فرنجیر خریدنے کے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔“

”پھر۔۔۔۔۔“

”مجھے اس وقت تمہارے جوائیکریٹ (چکا) صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔“

”آپ کو کسی نے غلط بتا۔۔۔۔۔“

لوچن نے اس کا جواب پورا ہونے سے پیشتر ایک ایسا کوڈورڈ دلی زبان میں استعمال کیا کہ شیر اپنی نشست پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس نے لوچن کی وردی اور اس کے چہرے کو بے نظر غور دیکھا پھر اٹل کام کا ریسپورڈ اٹھا کر دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے پر آہستہ سے دریافت کیا۔

”کیا حکم ہے جناب۔۔۔۔۔“

”میں نے اسے دیکھ لیا ہے“ آنے دو۔۔۔۔۔“

فیجر کے ساتھ ہی لوچن بھی اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شوروم کے اندر سے مختلف راستوں کے ذریعے گزرنے کے بعد شیر ایک دروازے کے باہر رک گیا۔

”آپ اندر جا سکتے ہیں۔“

لوچن نے مسکرا کر فیجر کو دیکھا پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ چکا سامنے ہی ایک میز پر

بیٹھا نظر آ گیا اس کے بائیں جانب ایک خوشخوار شکاری کتا بھی موجود تھا۔ لوچن کو دیکھ کر اس نے کوئی حرکت نہیں کی لیکن اس کی زبان ضرور کھپکپانے لگی تھی جو اس بات کی غماز تھی کہ وہ چکا کے ایک اشارے پر اس کے شکار کو بھیج دینے میں غیر معمولی پھرتی کا ثبوت دینے سے دریغ نہیں کرے گا۔

لوچن نے ایک نظر میں کرے کا جائزہ لیا پھر مسکراتا ہوا آڑھہ کر ایک غالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو تم اس وقت میک اپ میں ہو اور تمہارا نام۔۔۔۔۔“

”تمہارے اندازے کے سین مطابق لوچن ہی ہے۔“

اس وقت کیسے آتا ہو۔۔۔۔۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم نے جو کوڈ استعمال کیا ہے اس کے پیش نظر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ شاید مجھے کوئی اہم کام سونپا جا رہا ہے۔“ چکا نے کچھ سوچ کر کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ لوچن نے بے پروائی سے شانے لپکا۔۔۔۔۔

”پھر۔۔۔۔۔ کیسے زحمت کی؟“

”مجھے کچھ دیر کے لیے ایک محفوظ مقام کی ضرورت تھی۔ اس وقت میرے یہاں آنے کا صرف یہی مقصد ہے۔“ جواب دینے کے ساتھ ہی لوچن نے سوبال نما کوئی ڈیوائس نکال کر میز پر

”سمندر کے اوپر چلنے والے جہازوں کو اپنی جھنڈوں کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب کوئی سب میرین اپنا کام کر گزرتی ہے۔“ لوچن کے لیے جب پکا سانچہ بنی تھا۔
میرے اور تمہارے درمیان جہاز اور سب میرین ہی جتنا فرق ہے۔“
جگا کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ خود کو سنبھال کر چھٹی آواز میں بولا۔ ”جو بات تجربے کے بغیر کہی جائے اس میں زیادہ وزن بھی نہیں ہوتا۔“
”فی الحال ہم ایک ہی کاروان کے دو فرد ہیں جگا لیکن۔“ لوچن نے کتے کو کھاتر سے دیکھ کر کہا۔ ”تم اگر پاؤ تو میری بات کا ذاتی تجربہ بھی کر سکتے ہو۔ یہ کھیل بھی دوستانہ ماحول میں ہو گا۔“
جگا نے جواب میں لوچن کو مسکرا کر دیکھا پھر میں اس کے اگلے ہاتھ کی درمیانی انگلی اٹھ گئی۔ ”بھاری کتے نے اسے انھیں اشارے کے پائے ہی برق رفتاری سے چلا ٹک لائی تھی لیکن وہ درمیان ہی میں قلابازی کھا کر زمین پر ڈیر ہو گیا۔ جگا پھل کر کھڑا ہو گیا اس کے تیر بدلنے لگے۔
”میں نے کہا تھا کہ میں اس قسم کے کھیل کو پسند کرتا ہوں۔“ لوچن نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ ”پریشان مت ہو سنا صرف بے ہوش ہوا ہے۔ کچھ دیر میں لوٹ پوٹ کر پھر پوری طرح ہوش میں آجائے گا۔“
”تم نے شاید اپنے جہزوں میں مخصوص سونیاں پش فائر (push fire) کرنے والی نگلی چھپا رکھی تھی۔“
”یہ بھی طریقہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ زندگی بھلی پر رکھ کر موت سے بچنے والوں کے پاس اس سے زیادہ موثر اور جدید ٹیکنالوجی موجود ہیں۔“
”پائے ڈاؤن کرک جتنا نہیں کرو گے دوست۔“ جگا نے اس بار دوستانہ لہجے میں دعوت دی۔
”اوصار رہی۔۔۔ پھر کسی اطمینان سے ملاقات ہو گی تو یہ قرض بھی وصول کر لوں گا۔“ جواب میں لوچن نے بھی دوستانہ انداز میں ہاتھ ملایا پھر تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ اور وشنو دوبارہ دین میں سفر کر رہے تھے لیکن دونوں نے چپ سا دھڑک رہی تھی۔ ان کے چہروں سے یہی تاثر عیاں تھا کہ وہ اپنی اپنی کسی گہری سوچ میں غرق تھیں۔
جگا نے لوچن کے جانے کے بعد گھنٹوں کے بل جھک کر اپنے بھاری کتے کو ٹھولا۔ اس کی سانس بہ دستور چل رہی تھی۔



افضل خان کا ذہن بہ دستور گزرے ہوئے واقعات کے تانے بانے میں الجھ رہا تھا۔ اسے صرف اس حد تک انداز ہوا تھا کہ وہ اس وقت کسی پرائیوٹ اسپتال کے کارڈروم میں زیر علاج ہے۔ وہ اسپتال کس علاقے میں تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ وہاں اس کا داخلہ کس نے کیا تھا؟ ملٹری انٹیلی جنس نے یا پولیس کاؤں؟

گزشتہ ایک ہفتے سے یا اس سے کچھ زیادہ مدت سے وہ اسی اسپتال میں زیر علاج تھا۔ ڈاکٹر اور نرس اس کا ہاتھ دنگ سے پورا خیال رکھتے تھے لیکن وہ اس سے گفتگو کرنے سے گریز ہی کرتے تھے۔ کیوں؟

اس کے ذہن میں ماضی کی بہت سے تلخ یادیں آپس میں گٹھ جوڑی تھیں۔ جگہ ہاں نے جس وجہ سے اس سے ناراض ہو کر نظریں پھیر لی تھیں۔ جگہ ہاں اس میں بھی وہ بے قصور ہی تھا پھر جس انداز میں ریڈ کر اس اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے اس سے ایک دن چانک نظریں بدل کر کہا تھا کہ یا تو وہ اپنے علاج کے اخراجات خود برداشت کرے یا پھر کسی خیراتی اسپتال میں داخل ہو جائے اس دن اسے احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ جگہ ہاں کے کام کا مکمل رہا۔

اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد اس نے دل برداشت ہو کر خود کسی کام مسم ارادہ کر لیا تھا جس شہر کے طول وعرض میں جگہ ہاں کا دست راست ہونے کے سبب اس کا ڈنکا بچتا تھا وہاں وہ سر جھکا رکھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اسی ارادے سے قدم اٹھاتا اسپتال سے نکلا تھا جب شبنم سامنے آ کر اسے اپنے ساتھ اپنے قلیت پر لے گئی تھی۔ وہ ذاتی طور پر شبنم کو پسند کرتا تھا کہ جگہ ہاں کے اشارے کے بغیر شبنم بھی اس کے بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھاتی تھی۔۔۔ پھر شبنم ہی کے ذریعہ جگہ ہاں نے اسے رستم علی کا قاتل کیے خلاف استعمال کیا۔ اس خطرناک مہم میں شاعر کا کامیابی حاصل کرنے کے بعد اسے ایک موبہم ی امید تھی کہ وہ اپنا گویا مقام دوبارہ حاصل کر لے گا لیکن حالات کے دھارے سے اسے دور بہا لے گئے تھے۔ وہ منیجر ہاں میں پھنسا رہ کر ڈوبتا ابھرتا رہا پھر حالات اور قسمت نے اسے دوبارہ جگہ ہاں کے زیر نگرین کر کے تک پہنچا دیا تھا۔

آخری بار اسے جگہ ہاں کی نگہبانی میں آنے کے لیے جگا کو قتل کرنا تھا۔ جگا بڑی مچھلیوں میں شہر ہوتا تھا اس لیے اسے بچانے کی خاطر اس کو بے طور چارہ استعمال کیا تھا وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا۔ امداد کے بلانے پر جگا اس علاقے تک آ گیا تھا۔ افضل خان نے ان دونوں پر اس وقت رپوٹ لایا تھا جب وہ آپس میں ٹھٹھکیا ہو رہے تھے۔ جگا امداد کی غماری پر تھلا اٹھا تھا وہ آسانی سے خود کو افضل خان کے حوالے کرنا پر آمادہ نہیں تھا۔ افضل خان اس صورت سے بٹھنے کی خاطر لوچن کو اپنا بنا رہا تھا جب کسی نے پشت سے فائر کیا اور وہ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے گر کر بے ہوش ہو گیا۔

دوسری بار اسے وقت ہوش آیا جب وہ ملٹری انٹیلی جنس کے ہاتھوں میں پوری طرح پھنس چکا تھا وہاں امداد کی اور جگہ بھی تھے جنہوں نے اپنا اپنا ہاتھ صاف ہونے کی وجہ سے سب کچھ صاف صاف اگل دیا تھا۔ ملٹری کے ایک میجر نے ان تینوں کا بیان باقاعدہ ریکارڈ کیا تھا۔ اس کے بعد ان تینوں کو شہر کے کسی دودراز علاقے میں لے جایا گیا۔ جہاں فطوریہ پر عدالت کے ذمہ داروں نے اس کے علاوہ امداد کی اور جگا کا بیان بھی دوبارہ ریکارڈ کیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک کسی ایسے مقام پر رکھا گیا جس کے بارے میں وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا اور اب۔۔۔ اب وہ کچھ دنوں سے

کسی اسپتال کے ایسے کارندوں میں تھا جہاں کے ڈاکٹر اور نرسوں نے بھی اپنی زبانوں پر تالے ڈال رکھے تھے۔

اس وقت بھی وہ اپنے نامساعد حالات کی ابھی ہوئی دُور کو سلجھانے کی کوششوں میں منہمک تھا جب ایک نئی نرس مریم بٹی کا سامان لیے داخل ہوئی۔ افضل خان کی تجربے کار نظروں نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ ظاہر وہ ایک مچی گولی کے مانند نظر آ رہی تھی جسے ایک ذرا سی کوشش کے بعد ہموار کیا جاسکتا تھا۔

جتنی دیر تک نرس خاموشی سے گھٹنے کی پٹی تبدیل کرتی رہی، افضل خان اسے غور سے دیکھتا رہا، اس کی خاموشی بھی اس بات کی غماز تھی کہ اسپتال کے بڑوں نے اسے بھی زبان بند رکھنے کی تاکید کر رکھی ہے۔

”سسر..... تمہارا نام کیا ہے؟“ افضل خان نے اسے سرسری انداز میں مخاطب کیا۔

”ہمارا یہاں کوئی نام نہیں ہوتا۔ سب نرس یا سسر ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔“

”کلی والی نرس۔ سے میں نے ایک ضروری چیز کے لیے درخواست کی تھی۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن شاید اس کی ڈیوٹی.....“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔ اس کا تبادلہ دوسرے وارڈ میں ہو گیا ہے۔“ جواب سادگی سے دیا گیا۔

”دراصل مجھے اپنے عزیز کو، اپنی بیماری کی اطلاع دینی ہے۔ اسی لیے میں نے اس سے کاغذ اور بال چین کی درخواست کی تھی۔“

”ممکن ہے اس نے آپ کو بھانے کی خاطر ہائی بھر لی ہو ورنہ آپ کے کمرے میں آنے والے تمام اسٹاف کو صرف اپنے کام سے کام رکھنے کی سخت ہدایت ملی ہے۔“ نرس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں بھی آپ سے غیر ضروری بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”لیکن یہاں جو میرا علاج ہو رہا ہے..... میں اس کے اخراجات ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ افضل خان نے کسمپاس کرکٹس پر ایک نیا جال ڈالنے کی کوشش کی۔

”اس سلسلے میں بھی آپ کو ڈاکٹر سے بات کرنی چاہیے جو شام کی ڈیوٹی پر راولڈ کرتا ہے۔“

”صرف ایک بات اور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ افضل خان نے ایک آخری کوشش کی، اچھے اور بڑے اسپتال کے عملے کی یونٹیاں پر کوئی نہ کوئی موٹر گرام بھی ہوتا ہے لیکن تمہارے اسپتال میں شاید اس کا رواج نہیں ہے۔“

”اس بارے میں آپ یہاں سے رخصت ہوتے وقت انتظامیہ کو اپنی رائے دے سکتے ہیں۔“ نرس نے اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کہا پھر مسکرا کر بے تکلفی سے بولی۔ ”آپ جیسے پھلے چٹکے آدمی کو موجودہ حالت میں دیکھ کر مجھے دکھ ضرور ہوا مگر..... میں آپ کی کوئی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

نرس اپنا جواب مکمل کر کے خاموشی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی، افضل خان کا ذہن پھر اپنی پوزیشن کا معما حل کرنے کی تحقیر میں الجھ رہا تھا جب ایک ان سے کسی کے قدموں کی آہٹ پا کر دوبارہ دروازے کی سمت دیکھا۔ اسے اپنی نظروں پر شبہ ہونے لگا۔ آنے والی شہین کے سوا کوئی اور نہیں تھی جسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جھنجھکے گئے تھے پلکیں بار بار جھپکا کر وہ اس طرح دیکھتا رہا جیسے اس بات کا یقین کرنا چاہتا ہو کہ وہ ہمیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

”کیسے ہو افضل خان؟“ شہین نے اس کے قریب آ کر درشت لہجے میں پوچھا۔

”خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر جو گولی چلائی گئی تھی وہ گھٹنے کی ہڈی سے نہیں ٹکرائی ورنہ شاید زندگی بھر لنگڑااتا رہتا۔“

”کیا تمہیں اندازہ ہے وہ فائرس نے کیا کیا تھا؟“

”میں یقین سے کہہ نہیں کہہ سکتا مجھے محض ایک اندازہ ہے کہ فائرس.....“ افضل خان روانی میں اپنا جملہ پورا..... کرتے رہا دیکھا پھر اس نے کمرے کے دروازے پر اس طرح نظر دوڑانی شروع کر دی جیسے کسی خاص چیز کی تلاش میں ہو۔

”کیا میرے کمرے تک آتے ہوئے اسپتال کے کسی عملے سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی تھی؟“ افضل خان کے لہجے میں جھجکا۔

”نہیں..... کیوں؟“

”ایک اہم بات اور.....“ وہ بہ دستور سنجیدہ تھا۔

”تمہیں کس طرح علم ہوا کہ میں اس اسپتال میں ہوں؟“

”اوہ.....“ شہین نے بھی ہوش چبائے ہوئے دہی زبان میں کہا۔ ”تم شاید یقین نہ کرو لیکن جس نے تمہارے اسپتال کا پتہ دیا اور ملنے کی اجازت دی اس نے بھی جبک باس کے حوالے سے ہی گفتگو کی تھی۔“

”جگ باس.....“ افضل خان کی پیشانی پر آؤسی ترجمی کلیدوں کا جال پھیل کر گہرا ہونے لگا۔ کچھ توقف سے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی ہمیں ڈبل کر اس کر رہا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں!.....“ شہین نے حیرت سے پوچھا۔

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”جگ باس کا حوالہ دینے والے لوگوں ہو سکتا ہے جبکہ اخبارات کی اطلاعات اور دوسرے معتبر اداروں کا یہی خیال ہے کہ جگ باس سمندر میں ڈوب چکا ہے۔“

”ہاں.....“ اخبارات میں یہی کچھ شائع ہوتا رہا ہے لیکن مجھ سے فون پر رابطہ قائم کرنے والے نے اسی کا حوالہ دیا تھا۔“

”میں اس وقت بھی محتاط طور پر گفتگو کرنی ہوگی۔“

افضل خان نے شہین کو قریب تر بلا کر بڑے مدہم لہجے میں کہا۔

مجھے دروازے پر نوڈیز (no visitors) کا کوئی نوٹس بھی نہیں نظر آیا۔" شبنم نے تیزی سے جواب دیا۔ وہ ڈاکٹر کے کلب دیکھنے سے منع نہیں ہوئی تھی۔

وہ سختی سے ہٹائی۔ "میں اس کے بارے میں بعد میں تفتیش کروں گا لیکن آپ اذراہ مہربانی تو صرف لے جائیں۔"

"ڈاکٹر..." افضل خان نے کچھ سوچ کر مدخلت کی۔ "یہ... یہ میری ہیکٹر ہیں۔"

"ہوسکتا ہے۔ مگر اوپر سے سخت احکامات ہیں کہ کسی کو بھی بغیر اجازت آپ سے ملاقات کی اجازت نہ دی جائے۔"

"پس کس کا حکم ہے؟" شبنم نے وضاحت چاہی۔

ملٹری انٹیلی جنس کا... آپ چاہیں تو اس کی تصدیق براہ راست بھی کر سکتی ہیں۔"

شبنم نے پلٹ کر افضل خان کی طرف دیکھا پھر اس کے اشارے پر ڈاکٹر کو برہم نظروں سے گھورتی باہر چلی گئی لیکن... جب پاس کے حوالے سے فون کرنے والے کے بارے میں بھی اس کا

ذہن پھر سے الجھنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

"جب پاس اگر زندہ ہے تو کیا وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ افضل خان کی ملاقاتوں پر

پابندی عائد ہے؟"



سراج اس وقت اورنگ زیب ہی کے کمرے میں موجود تھا۔ ضلع حاد کے سلسلے میں ابھی تک

اورنگ زیب نے اپنی رائے نہیں بتائی تھی۔ اسی شے کے پیش نظر اس نے کرل احتیاط کے ساتھ

میننگ کے بطور خاص وشنو کو فرما ہونے کا موقع فراہم کرنے کا پلان مرتب کیا تھا۔ لوچن کا معاملہ

اتنا اہم نہیں تھا کہ فروغ کی تحویل میں رہتا لیکن وشنو کے ساتھ اسے بھی فوجی گاڑی میں اسے لیے

رکھا گیا تھا کہ وشنو کا ہتھ سے نہ جانے دے اور اس کے درمیان اعتماد کی جو فضا قائم ہوئی تھی وہ بھی

برقرار رہے۔ اس وقت سراج اورنگ زیب کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" سراج نے اپنے ٹمک شے کا اظہار کیا۔ "کیا وشنو کی بھی صورت میں

ہمارے لیے کارآمد ہوسکتا ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں۔" اورنگ زیب نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم اس پر عمل امتداد نہیں کر سکتے۔"

"میں تمہارے اس خیال کی صدیقہ تائید کرتا ہوں۔ وشنو کی ساتھ ہسٹری سے بھی پوری طرح

واقف ہوں وہ ایسا دوسرا سانپ ہے جو بظاہر ایسا ہے مگر نظر آتا ہے جس سے کسی خطرے کا توقع

نہیں ہوتی لیکن اپنے بیچاؤ کی خاطر دونوں طرف سے ڈنگ مارنے سے روک بھی نہیں

کرتا۔" اورنگ زیب نے نتیجہ کیسے کہا۔

"لوچن کو میں نے اسی لیے اس کے ساتھ رکھا ہے کہ وہ قریب رہے کہ پوری طرح اس کی نگرانی

"میرا خیال ہے کہ اس کمرے میں بھی نہیں نہ گئیں ایسا حساس نظام ضرور موجود ہے جس کے

ذریعہ ہماری گفتگو نہیں دوسری جگہ جاتی ہوگی۔"

شبنم نے افضل خان کی بات سن کر ٹپکٹیں چپکا لیں وہ خود بھی ابھی تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ وہ

اپنے ذاتی فلیٹ تک کس طرح پہنچی تھی ایک ٹائپ شدہ پتہ نام کے ذریعے اسے سختی سے ہدایت ملی تھی

کہ وہ صرف فلیٹ تک دور سے دروازہ دیکھ دیتی ہوگی۔ وہ پتہ نام کی طرف سے تھا؟ وہ

کوئی آخری نتیجہ نہیں قائم کر سکی تھی۔ پھر بھی حالات کے پیش نظر وہ اس ہدایت پر عمل کرنے پر مجبور

تھی۔ وہ ابھی افضل خان کی سرگوشی میں لگی جانے والی بات پر ڈبھتی طور پر ابھی ہوئی تھی جب اس

نے مخصوص اشارے سے شبنم کو حتماً رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے خوشگوار سوزا کہا۔

"کیا چاہیے؟ اور کیا غلط... ہمیں یہ بھول کر حالات کے دھاروں پر چلنا ضروری ہے۔"

"میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے لیکن وہ کون ہے جو ہمیں اپنے اشاروں پر چلا رہا ہے اور... خود

سامنے نہیں آتا؟" شبنم نے بھی دیدہ وادست اپنی اچھن کا اظہار کیا۔

"وہ جو بھی ہے مگر اب اس پوزیشن میں ہے کہ ہمیں پوری طرح کنٹرول کر سکے۔"

"تم نے آج سے پہلے بھی اس قدر مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔"

"وقت اور حالات نے شاید مجھے اس وقت تک کے لیے بزدل بنا دیا ہے جب تک حالات

پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آجاتے، افضل خان نے بات جاری رکھی۔ "وہ جب پاس کی شخصیت

ہو... ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ ہوں یا پولیس کے ذمہ دار افسیر... ہم کو ان تینوں صورتوں میں

نی احوال صرف اس کے اشارے پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔"

"جب پاس کے بارے میں تمہارا ذاتی خیال کیا کہتا ہے؟"

"میں نے کہا تھا کہ فی الحال ہم کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔" افضل خان

کے لہجے سے مایوسی کا اظہار ہوتا تھا۔

"ایک امکان اور بھی ہے..." شبنم نے پرخیاں انداز میں خلا میں گھورا۔

"وہ کیا؟"

"ہوسکتا ہے کہ پہلے کی طرح پھر وہ پارٹیاں ہمیں الجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"پلیز..." افضل خان نے ٹوٹے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ "کوئی اور بات کرو۔"

شبنم نے افضل خان کا مقصد سمجھ کر ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ افضل خان کا ایک

طرف کشکنا دیکھ کر سسکراتے ہوئے اس کے قریب ہی بیٹھ پر ذرا سا لگتی لیکن وہ زیادہ دیر گفتگو

جاری نہ کر سکتے۔

کمرے میں ابھٹال کے بڑے ڈاکٹر اور ڈیوٹی نرس کو آتا دیکھ کر شبنم تیزی سے اٹھ کھڑی

ہوئی۔ ڈاکٹر کے تہہ پر اٹھتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ "خاتون..." اس نے براہ راست شبنم کو مخاطب

کیا۔ "آپ کو میری طرف سے ملنے کی اجازت کس نے دی تھی؟" اس نے اپنی ہتھکی کا اظہار کیا۔

سزا ملتی تو بھی میں کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔“
 ”آئی سی! گویا تمہاری کچھ دیکھی رہیں صبح حامد کے ہاتھ آگئی تھیں؟“

”جی جی ہاں۔“

”لیکن اب تو تمہیں اس کا فطرہ نہیں ہوتا چاہیے اس لیے کہ..... اورنگ زیب نے جان بوجھ کر اپنا جملہ احوال چھوڑ دیا لیکن اس کی نظریں بہ دستور لودھی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔“

”درخت کی جڑ جب تک بنیاد سے نہ اکڑے اس وقت تک کچھ فحش تاثرات بہ دستور باقی رہتے ہیں۔“ لودھی نے دہلی آواز میں جواب دیا۔

”اگر تم میرے ساتھ ایک نیم دور کر کے حیثیت سے کام نہ کرنا پسند کرتے ہو تو پھر کل رات کرو۔ میں صاف گولی کو پسند کرتا ہوں۔“

میرا خیال ہے کہ اب مجھے چاہیے۔“ سراج نے اٹھنا چاہا تو لودھی نے اس کا ہاتھ قدام کر روک لیا کبھی باراس نے اس اعتماد لیجے میں کہا۔

”میں جانتا ہوں مسٹر سراج کہ آپ سر کے کتھے قریب ہیں اس لیے..... اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ باتیں آپ کے بھی علم میں آ جائیں جن کی وجہ سے دردی میں ہونے کے باوجود میں اپنے اختیارات استعمال کرنے سے قاصر ہو گیا تھا۔“

”میں جانتا ہوں کہ ایک پولیس آفیسر کن وجوہات کی بنا پر کسی مجرم کے سامنے دم ہلانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“ اورنگ زیب نے کہا پھر تنبیہ کی۔ پوچھا۔ ”تم نے ابھی کہا تھا کہ درخت کی جڑیں باقی رہ جائیں تو وہ سربراہ نے کی کوشش ضرور کرتی ہیں۔“

”میں نے غلط نہیں کیا تھا سر.....“ لودھی نے مکمل کر کہا۔ ”صبح حامد کا جہاز غرق ہو جانے کے بعد اب اس غمیلے کے کچھ افراد خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اورنگ زیب چٹکا۔

”چار روٹیل کسی نے فون کر کے کہا تھا کہ میرا اتحاد آپ کے پاس ہو جائے گا۔ اس وقت میں اسے محض ایک بھونڈا مذاق سمجھا تھا لیکن اب میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔“

”اب وہ تم سے کیا چاہتے ہیں؟“ اورنگ زیب کے چہرے کیجھے ہونے لگے۔

”وہ اپنے بچے باس کا انتظام کی پلاننگ کر رہے ہیں۔“ لودھی نے مکمل کر کہا۔ ”مجھے دہلی زبان میں یہی مشورہ دیا گیا ہے کہ میں یہ حکا پر آپ کی گڈ بکس (good books) میں آنے کی کوشش کروں لیکن ان کی جانب سے ملنے والی کسی بھی ہدایت سے انکار کرنے کی جرات بھی نہ کروں۔“

”آپ کا شیکنگ افراد پر ہے؟“

”میں نے فون کرنے والے کی آواز پہلی بار سنی تھی اس لیے.....“

”کچھ اور لوگ تو آپ کی نظروں میں ضرور ہوں گے؟“ اورنگ زیب نے اس کے غمیلے کا تھک

کر سکے۔“
 ”خود لوچن کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟“

”جو آرائش.....“ اورنگ زیب نے اسے سناٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایسے لوگ صرف کنٹرول کی مدت تک وفادار رہتے ہیں۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ ان کی تنظیم کے سربراہ کنٹرول کی مدت موت تجویز کرتے ہیں۔ مدت ختم ہونے کے بعد ان پر عائد تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ تم اس ضمن میں میڈم روہی کو بھی قبل از وقت آگاہ کرو۔“

”میری معلومات کے مطابق لوچن کا معاہدہ ختم ہونے میں ابھی غالباً دو یا تین ماہ کی مدت باقی ہے۔“

دو دنوں کے درمیان صبح حامد اور اس کے باقی کرگوں کے موضوع پر گفتگو کا سلسلہ جاری تھا جب ڈیوٹی کا شیبل نے ایک وزٹنگ کارڈ لا کر میز پر رکھ دیا۔ اورنگ زیب نے کارڈ پر نظر ڈالی تو اس کے چہرے پر پرتاؤ کی کیفیت نمودار ہونے لگی۔

”کون ہے.....؟“

”ڈی ایس بی لودھی۔“

”اوہ.....“ سراج نے کسمار کو پوچھا۔ ”کیا آپ اسے یہ طور پر تحت قبول کر لیں گے؟“

”بڑی پچھلیوں کے شکار کے لیے کانٹے میں چھپی پچھلیاں لگانا زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔“

ایک منٹ بعد اورنگ زیب کے ہاتھ پر لودھی اس کے سامنے انٹرنیشنل پوزیشن میں موجود تھا پھر اورنگ زیب نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑی معصوبیت سے پوچھا۔

”اس وقت کیسے آتا ہوا.....؟ میرا مطلب ہے کہ تمہاری پوزٹنگ تو کسی دور دراز علاقے میں ہے۔“

”کل تک قحی سر لیکن اب.....“ لودھی نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”اب نئے آرڈر کے تحت مجھے فوری طور پر آپ کو ڈیوٹی رپورٹ کرنے کو کہا گیا ہے۔“

”فائن.....“ اورنگ زیب نے غمیلے پر انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا تم نے خوشی سے اس تبادلے کو قبول کر لیا ہے؟“

”میں فی الحال اس پوزیشن میں نہیں ہوں سر کہ کچھ کہہ سکوں۔“

”پریشان مت ہو۔“ اورنگ زیب نے نہایت تنبیہ کی۔ ”میں ہمیشہ میڈم روک کو پسند کرتا ہوں۔ تم اگر خوش نہیں ہو تو میں اپنے ذرائع سے تمہارے موجودہ آرڈر کو منسوخ بھی کر سکتا ہوں۔ تم اپنی چڑاس کا علاقہ بتا دو ورنہ روز کے اندر اندر تمہیں میری بات کا تحریری ثبوت بھی مل جائے گا۔“

”ایسی بات نہیں ہے سر۔“ لودھی نے ہونٹ چپا تے ہوئے اپنی پوزیشن کی وضاحت کی۔ ”آپ کو جو اطلاعات ملی تھیں وہ غلط نہیں تھیں، لیکن اس میں میری کچھ ایسی مجبور کو دخل تھا جس کی وجہ سے اس دلدل سے اگر نکلنے کی کوشش کرتا تو شاید میری لاش کا بھی پتا نہ چلتا۔ رعایت سے

کرسوال کیا۔

”میرے پاس شیخ حامد کے خلاف بھی کچھ ایسے ٹھوس ثبوت موجود ہیں جو پولیس کے لیے اب بھی بہت کارآمد ہو سکتے ہیں اُن دستاویزی ثبوت کی بنا پر آپ کچھ ایسے سرکاری ذمہ دار اور باجیت لوگوں کو بھی جک کر سکتے ہیں جو شیخ حامد کے جوام میں اس کی معاونت کرتے رہے ہیں اور ہماری ہماری رہیں اس بخاری کے عوض بخورے رہے ہیں۔“

”کچھ ایسے نام میری فہرست پر بھی پہلے سے موجود ہیں۔“ اورنگ زیب نے حمارت کا اظہار کیا۔

”سہ۔ میرے پاس کچھ ایسی ہوش راورناک تصاویر بھی موجود ہیں جن کے سامنے آنے کے بعد وہ شاید موت ہی کو ترجیح دیں گے۔“

”گڈ۔۔۔۔۔ ایسی صورت میں تو آپ مجرموں کے خلاف میرے لیے ایک کارآمد ثابت ہوں گے۔“

”ایک درخواست کروں گا سہ۔۔۔۔۔“

”فرمائیں۔۔۔۔۔“

”مجھے اپنی کارکردگی اور آپ سے وفاداری ثابت کرنے کے لیے ذیل رول بھی ادا کرنا ہوگا ورنہ مجھے بلک میل کرنے والے مجھے زندہ نہ چھوڑ دیں گے۔“ لودی نے کسمسا کر کہا۔ ”آپ کا اعتماد میرے لیے شرط ہے۔“

”ڈونٹ وری۔۔۔۔۔ میں نے پہلے یہی طے کر لیا تھا کہ تمہاری جوائنٹنگ رپورٹ پر دھنکا کرنے سے پیشتر تمہیں اپنی ذاتی کسوٹی پر ضرور پرکھوں گا۔“

”شکر ہے سہ۔۔۔۔۔“ لودی نے اپنی فائل کھول کر اورنگ زیب کے سامنے رکھ دی۔

سراج خاموش بیٹھا ایک ایک بات نوٹ کر رہا تھا اُنھی تک یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اورنگ زیب کیا واقعی لودی کا کوئی ناخوشی قبول کر لے گا؟ اور لودی کی ڈیوٹی رپورٹ کرنے والی دستاویز پر ایک سادہ کاغذ رکھ کر اس پر کچھ لکھنا شروع کر دیا خود لودی بھی اس وقت کسمسانے لگا تھا۔

سادے کاغذ پر کچھ تحریر کرنے کے بعد اس نے وہ کاغذ لودی کے سامنے رکھ کر اسے محتاط رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اب آپ ایک ٹیم ورکر کے ساتھ کام کریں گے۔“

”رائٹ سہ۔۔۔۔۔ لودی نے جواب دیا لیکن اس کی نظریں سادے کاغذ پر لکھے گئے پیغام کو حیرت سے بار بار دیکھ رہی تھیں پھر اس وقت سراج کے کان بھی کھڑے ہونے لگے جب لودی نے

جبب سے اپنا موبائل نکال کر اورنگ زیب کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”آئی ڈی پائل دی بیٹ۔“ اورنگ زیب نے اٹھ کر لودی سے معنی خیز انداز میں ہاتھ ملایا

پھر وہ سراج کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا اپنے آفس سے باہر آ گیا۔ لودی بھی ساتھ تھا اس کا موبائل اورنگ زیب کے سیدھے ہاتھ میں تھا پھر جو کچھ ہوا۔ اس نے سراج اور لودی کے علاوہ غلطے کے ان افراد کو بھی چھوڑ دیا جو اورنگ زیب کو آفس سے باہر نکلتا دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

اورنگ زیب نے ناپہل کر لودی کے موبائل کو ابھر اُٹھ کر کھنسا میں اچھال دیا۔ پھر موبائل جب بلندی سے نیچے آ کر پختہ فرش سے گر گیا تو ہلکا سا دھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی موبائل نے آگ پکڑ لی۔

لودی جبب سے رومال نکال کر پیشانی کا پیننا پونچھنے لگا۔ سراج نے تعجب سے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

”یہ کیا ہے۔۔۔۔۔“

”جرائم پیشہ افراد کی سازش ہی سمجھو جو ہدایت پر عمل نہ کرنے والوں کے لیے موت کا پیغام بھی بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ موبائل کے اندر ایسی پاورفل ڈیوائس بھی ضرور ہوگی جس کے ذریعے ہماری گفتگو نہیں اور بھی سنی جا رہی ہوگی۔“

”سہ۔۔۔۔۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“ لودی نے کھنسی کھنسی آواز میں پوچھا۔ ”موبائل پر جو جتنی اس سے وہ بھی بولنا تھا۔“

”دروزر آرام کرو۔۔۔۔۔ اس کے بعد میں تمہیں اپنی ٹیم میں شامل کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔“

لودی باقاعدہ سٹیوٹ کر کے چلا گیا تو سراج اورنگ زیب کے ساتھ واپس اس کے دفتر میں آ گیا۔

”میں نے ڈی آئی جی سے پہلے ہی اس شیجے کا اظہار کر دیا تھا کہ لودی کو باقاعدہ کسی پلاننگ کے تحت خاص طور پر میرے پاس ٹرانسفر کیا گیا ہے۔“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے

بڑے زہرے لیے اعزاز میں کہا۔ ”اب یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ لودی کے ٹرانسفر کے احکام کس کی سفارش پر عمل میں آئے تھے۔“

سراج کی پیشانی پر بھی سٹوسٹ ابھرے لگیں۔ وہ جانتا تھا کہ اب لودی کے تہاڑے میں ہمارا کردار ادا کرنے والے والا بھی کسی صورت لودی کو نہیں بچا سکے گا۔ وہ کچھ کہنے کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اورنگ زیب کے سامنے رکھے موبائل کی اسکرین روشن ہو گئی اس نے ایک نظر فہروں کو دیکھا

پھر کال ریسیور کرنے میں خاموشی جلدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خشک لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”میں نے تم سے کہا تھا میرے فہروں کو صرف بہت اہم معاملات کے لیے استعمال کرتا۔۔۔۔۔ کہو۔۔۔۔۔ اوہ!۔۔۔۔۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ایسا کرنے کی یوزن میں ہے؟۔۔۔۔۔ گڈ۔۔۔۔۔ کسی کو

تمہارے اوپر شبہ تو نہیں ہوا؟۔۔۔۔۔ ہاں نہیں یوں طرح واقف ہوں۔ ایک منٹ کے باوجود کبھی کبھی زیادہ خوش بھی بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے تم نے اچھا کیا۔ فگرمت کر ڈیں خطرات سے کھیلنے کا

”کون سا قانونی کام خان صاحب؟“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اگر آپ ایکسپورٹ لائسنس کی بات کر رہے ہیں تو اس کے حصول میں آپ کو کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوگا۔“ دوست ہم تمہارا ٹھکر گزار ہے کرتم نے ہم کو باہر کا منڈی کے بارے میں سارا اونچ نیچ سے آگاہ کیا تھا۔ جگہ کوئی اور ہوتا تو زبان بھی نہ کھولتا لیکن ہم بھی کاروبار کے بارے میں کھرا بات کرنے کا عادی ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ ہمارا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔“

”اطمینان رکھیں انکل۔“ راجیلہ بیگم نے بڑے پیار سے کہا۔ ”آپ جیسا چاہیں گے سب کچھ اسی طرح ہوگا۔“

”تو اس بات کا قانونی کاروباری کارروائی بھی ہمارا جانے سے پہلے مکمل کرالو کہ فائدہ اور نقصان میں ہم دونوں برابر کا شریک ہوگا۔“ سرفراز خان نے براہ راست سیٹھ عثمان کو اپنا دھوکہ فیصلہ سنا دیا۔ ”بجی ہمارا پہلا اور آخری شرط ہے۔“

سیٹھ عثمان کو یہ شرط منظور نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سرفراز خان کا قلعہ قوس اس علاقے سے تھا جہاں انہوں نے اپنی اصل ملک کو بھی نیچا نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک لمحے کو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا پھر ان کی نظر لیاقت حسین پر پڑی تو انہوں نے دل میں ایک فیصلہ کر کے کہا۔ ”سرفراز خان صاحب۔ مجھے آپ کا یہ فیصلہ منظور ہے لیکن ایک شرط پر۔“

”کیسا شرط؟“

”میں اپنا متاع جیسی طرح چاہوں اور جہاں چاہوں خرچ کروں آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو گا؟“ تم جانو اور تمہارا متاع۔“

سیٹھ عثمان کی نظروں اور ان کی باتوں کا مفہوم راجیلہ بیگم نے بھانپ لیا تھا اس لیے انہوں نے فوراً ہی گفتگو کا موضوع بدل کر کہا۔ ”انکل عثمان نے آپ کی شرط مان لی ہے۔ اب میرا بھی آپ پر کچھ حق ہے آپ کو کبھی میری ایک بات ماننی پڑے گی۔“

”کوئی کاروباری بات تو نہیں ہے؟“ سرفراز نے ہنس کر پوچھا۔

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔“

”پھر یو لویا بات ہے تم ہمارا لیے فرمیں سے تم نہیں ہے پھر تمہارا بات کس طرح ہال سکتا ہے۔“

”آپ کو بھی کم از کم ایک ماہ یہاں میری خاطر رکنا ہوگا۔“ راجیلہ بیگم نے اتنی محبت سے کہا کہ سرفراز خان کچھ دیر بظاہر جھانک رہا پھر اس نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے جواب دیا۔ ”بس ہمارا دوست سے ہمارا آدھا سا جھکا بات طے ہو گیا ہے تو تم بھی اپنی ایسا ہی بات کرو۔ ہم تمہارا خواہش سے انکار نہیں کرے گا لیکن تمہارا محبت بھرا اصرار پر پندرہ دن اور درگ جانے گا۔“

”اوپر والے کا کمال ہے جو آج تم نے کسی بات مان لیا اور نہ۔۔۔۔۔“

”یہ ہمارا اور ہماری بیٹی کا معاملہ ہے۔“ سرفراز خان نے بیوی کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”ہم انکار

عادی ہوں۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔“ چانک اورنگ زیب کا لہجہ جھیل ہو گیا اس نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ”میں جو کہتا ہوں اسے کر گزرنے سے دریغ نہیں بھی کرتا۔ ایک بار پھر نوٹ کرلو۔ میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پتھر کی لکیر ہوئے ہیں۔ نہیں ابھی زیادہ جلدی نہ کرنا۔ ہاں آں۔۔۔۔۔ یہ مناسب رہے گا۔ سراج نے موبائل آف کیا تو سراج نے پوچھا۔

”کس کی کال تھی؟“

”اس سلسلے میں راتے میں تفصیل سے بات ہوگی۔۔۔۔۔ میرا اس وقت کرل احتشام سے ملنا ہے حد ضروری ہے۔“ سراج موبائل جیب میں رکھتا ہوا دروازے کی سمت بڑھا تو سراج کو بھی بالکل ناخوش اس کی بیرونی کرنی پڑی۔



سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کی خدمت اور جاں فدا کی عوفی سرفراز خان کے اسپتال سے گھر آنے سے پیشتر ہی اپنے آفس کا ایک کمراس کے برلن کے لیے مختص کر دیا تھا جس پر ”راہل ایکسپورٹرز“ کی تختی بھی آویزاں ہو گئی تھی۔ ایک ایسے تجزیہ کار آدمی کو کبھی رکھ لیا تھا جو ماربل کی ایکسپورٹ میں ماہر تھا۔ لیاقت حسین خوش تھا کہ اب باپ اور ابھی اس کے ساتھ رہیں گے لیکن سرفراز خان نے اسپتال سے گھر آتے ہی واپس جانے کی رٹ لگ رکھی تھی۔

اس وقت بھی رات کے کھانے کے بعد گھر کے سارے افراد لاؤنچ میں بیٹھے سرفراز خان سے اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے لیاقت حسین ماں کے قائلین پر بیٹھا تھا ماں نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے تھے۔ اس نے بھی شوہر کی ضد کے آگے زبان کھولنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی جو بات ایک بار اس کی کھوپڑی میں سا جاسے اس کا ٹھکانا ناممکن ہی تھا۔

”میں نے آپ کے کاروبار کا سارا سیٹ آپ مکمل کر دیا ہے ایک دو روز میں ضروری ایشیئری چھپ کے آجائے تو بیرونی منڈیوں کے تاجروں سے خط کتابت بھی شروع کر دی جائے۔“ مستقل نہ سہی لیکن شروع شروع میں کم از کم سال ہر تھک آپ کا یہاں ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد آپ کو نہیں روکا جائے گا۔“

”پتھرا اپنی ہی جگہ بھاری ہوتا ہے میرا دوست۔“ سرفراز خان نے کسمار جواب دیا۔ ”اگر بھی ہمارا ہمت سارا مخالف ہے لیکن آج تک کسی کا اتنا ہمت نہیں ہوا جو ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔“

”آپ کے ساتھ یہاں جو حادثہ پیش آیا ہم اس کے لیے فرمندہ ہیں لیکن آپ یہاں ہوں گے تو ہمارے سروں پر بھی ایک بزرگ کا سایہ رہے گا۔“ راجیلہ بیگم نے بھی جھاننے کی کوشش کی۔

”خدا تم دونوں کا جوڑی سلامت رکھے میرا بیٹا لیکن ہم نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور لیاقت ہے تمہارا پاس اور اپنا دوست کے ہوتے ہوئے کسی پور پورا اطمینان بھی ہے۔ بس جانے سے پہلے ایک قانونی کام کرنا ضروری ہے۔“

کیسے کر سکتا تھا۔

فرزین لیاقت حسین بھی خوش تھے کہ سر فراز خان نے پندرہ دن رکنے کی بات مان لی تھی اس دوران سیٹھ عثمان نے بھاگ دوڑ کر تمام ضروری کارروائی مکمل کر لی۔ قانونی دستاویز پر دونوں فریق کے اختلاف بھی ہو گئے۔

سر فراز خان کی واپسی کی مدت جیسے جیسے کم ہو رہی تھی فرزین اور لیاقت حسین دونوں کو ان کی جدائی کا احساس دُستار رہتا تھا راجیلہ بیگم ہر وقت مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگی رہتی تھیں۔ لیاقت حسین کی ماں بھی ان کے حسن سلوک کی کڑی مدد ہوئی تھیں ان کا زیادہ زور تھوڑا راجیلہ بیگم کی طرف مگرتا تھا شاید کو دفتر کے اوقات ختم ہونے کے بعد وہ لیاقت حسین کی انکسلی میں آجاتی تھیں جہاں فرزین بھی ان کی خدمت کی ایک موٹی بھی خالص نکال جانے دیتی تھی۔

لیاقت حسین نے کئی بار ماں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع تلاش کیا، لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے ذہن میں ماں کی زبان سے نکلنے والی ایک اجنبی بات سہا کر گئی تھی جس کا مکتوب لگانے کی خاطر وہ بے چین تھا۔ اسے ابھی طرح یاد تھا کہ کچھ دنوں اس نے ماں کی زبان سے ایک بات سنی تھی جو ردہ کہ اس کے ذہن میں بچتی رہتی تھی۔ بزرگ کے ہاتھوں ایک چنگی خاک کھانے والی بات اس کی ماں کو بھی معلوم تھی۔ اسی ضمن میں ماں نے کہا تھا۔

”تیرا منہ سے جو ایسی بات نکلتی ہے جو بعد میں تجھے یاد نہیں رہتا۔ اس میں بھی اوپر والے کا بہت سی مصلحتیں ہیں جو تو نہیں سمجھ سکتا۔ اسی حوالے سے لیاقت حسین نے ماں سے شیخ عابد کے بارے میں اپنا تجسس دور کرنے کی خاطر دریافت کیا تھا۔ ”جو آستان سے گرا تھا وہ کھال ہے؟“ مرگیا یا بھی تک زندہ ہے؟ وہ اچھا آدمی نہیں تھا؟ بڑا ظالم تھا۔ اس کا تعلق بھی دنیا کے خطرناک لوگوں سے تھا۔ وہ سب شیطان اور پلید لوگ تھے۔“

”تو فکر مت کر۔“ ماں نے خلا میں دور کہیں گم ہوتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ”ایک پلید۔ دوسرا پلید کی وجہ سے مارا جائے گا۔ اوپر والے کے ہاں دیر ہے“ اندھیر نہیں ہے۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ بھی کتابوں میں کچھ نکتے غرق ہے۔ بے نصیب۔“

”وہ کون ہے ماں؟ اس کا کوئی نام؟ کوئی اپنا تو ہوگا۔“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ ماں کی پگھلیں کئی بار جھلک کر رہ گئیں پھر۔۔۔ اس نے کیا کہا تھا؟ خود اسے بھی یاد نہیں رہا تھا اس پر بھی وہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اسی ضمن میں وہ ماں کو پھر کریدنا چاہتا تھا۔ قسمت سے اسے باپ کے واپس جانے سے دو دن پہلے ماں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے ماں سے پھر دوسرے پلید کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ ماں اس کی بات سن کر کچھ دیر گم صبر رہی پھر اس نے خلا میں کہیں دور دم ہوتے ہوئے کہا۔

”فرزین کوں کے لیے خدا نے کوئی نہ کوئی موٹی ضرور پیدا کیا ہے۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ جو پر دوں میں چھپ گیا ہے وہ بھی پلید تھا۔ جس کے ہاتھوں اس کا انجام خراب ہو گا۔ وہ بھی پلید ہے اور

اس کا نام۔۔۔ اس کا نام۔۔۔“ ماں پھر اپنی بات مکمل نہ کر سکی اس نے عجیب نظروں سے لیاقت حسین کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم ابھی کیا بات کر رہا تھا؟“

”ہمارا درمیان کی پلید کا بات ہو رہا تھا۔“ لیاقت حسین نے ماں کی بدلتی کیفیت محسوس کرتے ہوئے بہم انداز میں جواب دیا۔

”ہاں۔۔۔ وہ خدا کی عوار پلید ہی تھا جس نے ہمارا بھاگ اور تمہارا سر سے باپ کا سایہ جھینے کا کوشش کیا تھا۔ حضر کے دواں کا انجام بھی خراب ہو گا۔“

”ماں۔۔۔“ لیاقت حسین نے ماں کو مزید کریدنے کا خیال ترک کرتے ہوئے اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر کہا۔ ”تو باپ کوں کے کی کوشش کر رہا تھا جانے کے بعد ہمارا دل بھی بدست ہو گا۔“

”یہ بھی تیرا خوش قسمتی ہے کہ وہ بیگم صاحب کے کہنے پر پندرہ دن کے لیے راضی ہو گیا ورنہ تو بھی واقف ہے کہ اس نے تیرا طرف سے بھی کئی آنکھیں پھیر لی تھیں۔“

”اب تو وہ ہم دونوں سے ناراض نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ ماں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ”تم جانتا تھا کہ فرزین کا خدمت پتھر کو موم کر دے گا۔ تیرا باپ بھی شرمندہ ہے لیکن اپنی زبان سے بھی اس کا اقرار نہیں کرے گا۔“

ماں بچنے کے درمیان گھٹک ہو رہی تھی جب فرزین بھی آئی۔ اس نے ماں سے پیچھے بیٹھ کر اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں پھر لیاقت سے بولی۔ ”اب تو اپنا کام کر۔۔۔ شادی سے پہلے کا اور بات

قانون کا۔ اب ماں پر ایراج نہ زیادہ ہے۔“

”تم دونوں ہی ہمارا دل کا ٹکڑا۔۔۔ اور آنکھوں کا ٹھنڈک ہے۔“ ماں نے دونوں کا دل خوش کرنے کی خاطر کایا پھر فرزین کے سر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”وہ۔۔۔ بچکون کا حق زیادہ ہوتا ہے۔“

فرزین نے ماں کا آخری جملہ سن کر لیاقت حسین کو منہ چڑھایا تو وہ بھی جواب میں سرکڑا لیکن اس کے ذہن میں ابھی تک کچھ ایسے سوال گونج رہے تھے جو حل ہوتے ہوئے رہ گئے تھے۔

”وہ پلید کون تھا جس کے بارے میں ماں کی زبان دوسری بار بھی کوئی وضاحت کرتے کرتے رہ گئی تھی اور۔۔۔ نیکی کا پڑ سے جن افراد نے چھلانگ لگائی تھی۔ ان کا آخر انجام کیا ہوا

تھا؟۔۔۔ وہ زندہ تھے یا قبرا میں ابل چکے تھے؟



میدم روہی کے مشورے کے باوجود دھریا نے پتھلے پر ہی دعوت کا پُر تکلف اہتمام کر لیا تھا۔ دعوت میں ڈی این پی کی کے علاوہ ایس پی او اورنگ زیب، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج اور الماس بھی موجود تھے۔ کھانے سے پیشتر ڈرنگ کا دور چاؤ سب مل کھول کر انجوائے کر رہے تھے جب سراج نے میڈم کو قہقہے خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے چنگی لیے والے انداز میں حشریہ سے دریافت کیا۔

”یہ دعوت کس خوشی کی گئی ہے؟“

”یہ کس مودی کی موت کا کرشمہ ہے جسے آج ہم سب مل کر انجوائے کریں گے۔“

”اور اس کا سہرا سزاورنگ زیب کے سر ہے۔“ میڈم نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔
 ”آپ شاید سہرے کو عام انداز میں استعمال کر رہی ہیں۔“ سراج نے پھر سے چھیڑا۔ ”اصل سہرا تو کسی اور ہی سر کے سر پر نظر آ رہا ہے۔“
 ”کیا ارادت.....؟“ ڈی آئی جی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روہی کو دیکھا۔ ”میرا خیال ہے کہ کھانے کے بعد شاید اس کا اعلان بھی آج کر دیا جائے گا۔“
 ”ڈونٹ وری۔“ تھریبا نے میڈم کو نظریں چراتے دیکھ کر کھڑا کر دیا۔ ”معزز خواتین و حضرات! میں آپ سب کو اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ اصل سہرے کا اعلان کرنے کی ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی ہے۔ اس کا اعلان میں کھانے کے اختتام پر کافی کے دور کے ساتھ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اب..... کچھ مہانوں کا تجسس اور بے چینی دیکھ کر میں یہ بتانا ضروری سمجھ رہی ہوں کہ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ اطلاع عرض ہے کہ ہماری میڈم آپ راک کے ڈی آئی جی بہت جلد نکاح پڑھانے والے قاضی کو بلائے والے ہیں۔“
 میڈم کے علاوہ سب نے تالیاں بجا لیں۔ الماس خوشی کا اظہار کرنے والوں میں پیش پیش تھی۔

پرگھٹ کھانے کے دوران بھی قاضی اور نکاح کے حوالے سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ اورنگ زیب خلاف توقع اچانک کچھ بھابھا بظہار آنے لگا۔ شاید اس لیے کہ اس نے ابھی تک فیغ حامد کی موت کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن اس کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ میڈم روہی کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے۔ کافی کا دور شروع ہوا تو اس نے اپنا کپ ختم کرنے میں بھی خاصی جلجت کا مظاہرہ کیا پھر سراج سے سرگوشی میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے تم الماس کو راز داری سے سمجھا دو کہ وہ رینے کی ضد نہ کرے۔“
 ”اتنی جلدی کیا ہے.....؟“

”سمجھا کرو.....“ اورنگ زیب نے دلی زبان میں کہا۔
 ”میں ڈی آئی جی اور میڈم کو موقع دیتا چاہیے کہ وہ تنہائی میں مکمل کر سہرے اور قاضی کے باقی معاملات بھی طے کر لیں۔“

”مگر.....“ سراج نے بات سمجھ کر جواب دیا پھر اس نے الماس کو اشاروں اشاروں میں صورت حال سے آگاہ کیا تو سب سے پہلے وہی اپنا پرس منبھال کر جانے کے لیے اٹھی تھی۔

”یہ کیا.....؟“ میڈم روہی نے اسے مخاطب کیا۔
 ”تمہیں اچانک اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟“
 ”مجھے گھر پر ایک ضروری کام یاد آ گیا۔“ الماس نے خوشی سے جواب دیا تو میڈم کو اسے چھیڑنے کا موقع مل گیا۔
 ”اب تو تمہاری شادی کو ایک عرصہ ہو گیا۔ کیا اب بھی تمہارا ضروری کام ختم نہیں ہوا.....؟“

”ہاں..... اسی یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت ہمارے جانے کے بعد تم بھی ضروری کام کے سارے معاملات جلد از جلد طے کر لو گنا ہم سب کو پھر سے ڈی آئی جی صاحب اور تم سے الگ الگ دھت کھانے کا موقع ملے۔ آگے۔“

الماس کے بعد سراج اور اورنگ زیب بھی سگرا تے ہوئے اگلے میڈم کو مجبوراً انہیں رخصت کرنا پڑا۔ ان سب کے جانے کے کچھ دیر بعد میڈم بھی کچھ دیر کے لیے اندر کی تو تھریبا نے بڑی سنجیدگی سے ڈی آئی جی سے کہا تھا۔

”اگر میں آپ سے میڈم کے مسئلے میں کوئی اہم بات کروں تو آپ برا تو نہیں متاں گے؟“
 ”آپ کی بات کا اگر برا متاں تو میرے دل کی تر ترائی کون کرے گا۔“ جواب سنی خیر تھا۔
 ”خیرت ہے؟.....“ آپ پولیس والوں کی بحالیاتی حس بھی اتنی تیز ہوتی ہے مجھے پہلے اس کا اندازہ نہیں تھا۔“

”اب انداز ہو گیا ہے تو وہ بات بھی کہہ ڈالیں جو آپ کے ذہن میں شاید بہت دیر سے کھلبلا رہی ہے۔“

”آپ کی بذلہ سنجی نے تو اس تمام سسپنس کو ختم کر دیا جو میں پیدا کر رکھا تھا۔“ تھریبا نے ٹکٹھی سے مسکراتی پھر اس نے مکمل کر کہا۔ ”اب جب چاہیں میڈم کو انجینٹ رنگ پہتا سکتے ہیں اس کے بعد آپ دونوں کی مرضی سے طے شدہ تاریخ پر نکاح کی رسم بھی سادگی سے ادا ہو جائے گی۔“

اور..... اس وقت بھی ڈی آئی جی رات کے دو بجے کے باوجود اپنے بستر پر لیٹا کر دینیں بدل رہا تھا۔ اس کی بیوی کو انتقال کیے آٹھ سال سے زیادہ ہو چکے تھے اس کی کوئی اور دہی نہیں تھی جو مرنے والی کا دکھ بانٹ سکتی۔ جس لمحے سے اس کا تعلق تھا، جس عرصہ سے پردہ فاش تھا اس کا فائدہ اٹھا کر اگر باتوں کو ایک اشارہ کر دیتا تو اس کی راتیں رنگین ہو سکتی تھیں۔ ایک سے ایک خوب صورت لڑکی اور حسین جسم بطور رشوت اس کو پیش کیے جا سکتے تھے لیکن اس نے کم از کم دو باتوں سے خود کو محفوظ رکھا تھا۔ جوئے کے اڈوں سے بچتا لیٹا اور بدنام عورتوں سے خود کو دور رکھتا۔

آٹھ سال کی تنہا زندگی گزارنے کے بعد اس نے میڈم روہی کا خواب دیکھا تھا جس کی تکمیل میں سراج اور تھریبا نے اس کی کسی نہ کسی ذرا بے سے مدد کی تھی اور آج..... آج تھریبا نے ٹکٹھی کی انگوٹھی اور نکاح کا ذکر بھی مکمل کر کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے میڈم سراج وغیرہ کے جانے کے بعد کچھ دیر کو سانسے بہت بھی گھٹی گئی تھی۔ بات بھی اس کی ضمانت تھی کہ تھریبا نے جو پیغام اس تک پہنچایا اس میں میڈم کے ارادے کا بھی دخل ہو گا۔ سب کی موجودگی میں وہ آئی بات کا اظہار کر چکی تھی۔

ڈی آئی جی آنے والے لڑکے کے بارے میں حسین خواب بن رہا تھا جب فون کی ٹکٹھی کی آواز نے اس کے حسین خوابوں کو بکیرہ دیا۔ اس نے جھلا کر فون سوٹ کی طرف دیکھا جو اس کے سرہانے ہی موجود تھا۔ رات کے دو بجے کس کے پیٹ میں مرڈ ہوئی تھی؟ وہ اندر ہی اندر بیچ دتا ب کھانے کے

باوجود کال رسیو کرنے پر مجبور ہو گیا۔

”ہیلو.....“ رسیور اٹھا کر اس نے بے حد خشک اور خشکی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”سر..... میں اس علاقے کا ایس ایچ اے عرض کر رہا ہوں جس میں ڈی ایس بی لودھی صاحب کی رہائش ہے۔ اس وقت ان ہی کے ہنگامے سے فون کر رہا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ کیا لودھی خور رابطہ نہیں کر سکتا تھا؟“ ڈی آئی جی کا بارہ اور چڑھ گیا۔

”میں نے ان ہی کے سلسلے میں اس وقت آپ سے براہ راست رابطہ کرنا ضروری سمجھا تھا.....“

”کیا پریشانی درج ہے؟“

”سر..... لودھی صاحب کی برہنہ اور بری طرح ادھڑی ہوئی لاش ان ہی کی خواب گاہ میں موجود ہے دوسری طرف سے بڑی بوکھلاہٹ میں کہا گیا۔ ”گھر والوں کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں نے پہلے پر تعینات کانسٹیبل کی اطلاع میں پر بذات خود یہاں آ جاؤ لیکن خواب گاہ کے اندر ابھی تک قدم نہیں رکھا۔ اس کی وجہ وہ خون آلود ایک مخصوص علامت ہے جس کی وجہ سے میں نے براہ راست آپ کو اطلاع دینا ضروری سمجھا ہے۔“

”ایسی کون سی علامت ہے جس نے تمہیں تعینات سے روک رکھا ہے؟“

”آکٹوپس سر.....“ جواب سنجیدگی سے دیا گیا۔

”خواب گاہ میں مختلف دیواروں پر یہ خون آلودہ نشانات خاص طور پر بنائے گئے ہیں اس لیے میں نے بذات خود.....“

”ٹھیک ہے..... تم خواب گاہ سے دور رہو..... کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا میں پہنچ رہا ہوں۔“

”خشب کے علاقے میں نشانات اور لودھی کی موت کی اطلاع سن کر ڈی آئی جی وقتی طور پر بوکھلا گیا تھا اس نے وقت ضائع کے بغیر ایس بی اورنگ زیب کو بھی مختصر صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا پھر بڑی جگت میں تیار ہو کر باہر نکلا تھا۔ اس کے لودھی کی خواب گاہ تک پہنچنے کے دن منٹ بعد ہی اورنگ زیب بھی آ گیا۔“

ایس ایچ اے کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ لودھی کی برہنہ لاش اس کے بستے کے قریب ہی فرش پر بکھری پڑی تھی۔ لاش کی ادھڑی ہوئی کیفیت اس بات کی ترجمانی کر رہی تھی کہ اسے بے حد تشدد اور ایذا رسانی کے بعد ہلاک کیا گیا تھا۔ دیواروں پر ہر طرف آکٹوپس کی شبیہ کو مرنے والے کے خون سے بطور خاص اجاگر کیا گیا تھا جس کی سمت اورنگ زیب کی نظر بار بار اٹھ رہی تھی۔

ڈی آئی جی کے براہ راست فون ٹھوکر مارنے سے دوسرے شخص نے شبیہ سے تعلق رکھنے والی ٹیمیں بھی جائے حادثہ پہنچ گئیں۔ مگر پرنس کے مسئلے نے بڑی جانفشانی سے تمام کوئے تھکدوں سے فکڑ پرنس حاصل کر لیے۔ علاقے کے ایس ایچ اے دیگر تمام ضروری تفصیلات تحریر کیں۔ آخر میں

اورنگ زیب نے اپنے مخصوص اور مختصر کیمبرے سے لاش کی تصویریں لیں اور دیوار پر موجود آکٹوپس کی شبیہ کو بھی اپنے اعزاز میں کیمبرے میں محفوظ کیا پھر لودھی کی لاش کو ضروری قانونی کارروائی کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

تمام مکمل قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد ڈی آئی جی نے اورنگ زیب کے مشورے پر خواب گاہ کو فوری طور پر سیل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ڈی آئی جی کو وہ کہانی بھی تفصیل سے سنا دی جو لودھی کے موبائل کے ساتھ پیش آئی تھی۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ اس نے جان بوجھ کر لودھی کی ڈیوٹی رپورٹ کرنے والے کاغذ پر کچھ لکھنے سے کیوں گریز کیا تھا؟

”آئی سی“، ”ڈی آئی جی نے حیرت سے کہا۔ ”گو یا آپ کو اس بات کا شبہ تھا کہ موبائل کے ذریعے آپ کے اور لودھی کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس نے دشمنوں کو بھی بتا کر دیا تھا۔“

”جو صورت اس وقت سامنے آئی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اگر آپ نے مرنے والے کے موبائل کو گواہ نہ کیا ہوتا میں ممکن تھا کہ اس کے ذریعہ ہم.....“

”یہ آپ کا خیال ہے۔“ اورنگ زیب نے زہرے لہجے میں مسکرا کر جواب دیا۔ ”مگر میں اس موبائل کو محفوظ رکھتا تو مجی اسے دوسری جانب سے جلا دیا جاتا..... ہو سکتا ہے کہ اس وقت میں بھی آپ کے سامنے موجود نہ ہوتا۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ ڈی آئی جی نے ایک لمحہ توقف سے کہا پھر ہونٹ چپاتے ہوئے بولا۔ ”شیخ حامد کے سمندر برد ہوجانے کے بعد اب آکٹوپس کی علامت کو استعمال کرنے سے لودھی کے قاتلوں کا کیا مقصد ہے؟“

”میری نظروں میں ایک ہی مقصد ہے.....“ اورنگ زیب نے بڑے معنی خیز اعزاز میں مسکرا کر جواب دیا۔ ”ہر پولیس آفیسر کا اپنا اپنا ایکٹو علیحدہ سوچنے کا انداز ہوتا ہے اور میں..... میں نے بار بار یہی کہا کہ جب تک میں اپنی نظروں سے اس باسٹرڈ کی لاش نہیں دیکھ لیتا اس کو مردہ نہیں سمجھ سکتا۔“

”گو یا آکٹوپس کا نشان.....“

”اسے بھی میں شیخ حامد کی طرف پولیس والوں کے لیے ایک کھلا چیلنج ہی کہوں گا۔“

”اگر میں آپ کی بات تسلیم کر لوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی ہمیں آپ کے آکٹوپس کی ایسی علامتوں سے بار بار سامنا ہو سکتا ہے۔“ ڈی آئی جی پہنے خاصا اچھے کر اورنگ زیب کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”یہ ظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا لیکن اس کے چہرے پر ابھرنے والی تجسس آئینہ سنجیدگی بہ دستور برقرار رہی۔ پھر لودھی کے ہنگامے سے باہر آ کر جب ڈی آئی جی اپنی کار میں بیٹھنے لگا تو اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہم دم آواز میں اسے مخاطب کرتے

میں چھپی تھی۔

پوری خبر پڑھنے کے بعد اس نے منہ دھوا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ سیدہ حائشہ کی میز پر آگیا۔
 ”اورنگ زیب صاحب کا کوئی خون آیا تھا؟“ اس نے الماس سے پوچھا۔
 ”ہیلز۔ مجھے شے کے دوران منہ کھل کر کیں۔“ الماس نے بھی شوہر کے لہجے کی نقل
 کی۔ ”مجھے خود حیرت ہے کہ اورنگ زیب بھائی نے آپ کو رات ہی اطلاع
 کیوں نہیں دی۔“

”ہم“..... سراج نے ہونٹ سمجھ کر چکھو سو چاہر موبائل اٹھا کر ارد گرد زیب کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری جانب سے ٹیون کی آواز ابھری رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی تھی۔ سراج نے دوبارہ ری ڈائل کیا۔ اس بار بھی کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ اس کی توجہ پوری طرح اخبار کی خبردار موبائل پر تھی اس لیے وہ الماس کے لیوٹن پر ابھرنے والی خوش سکسٹا ہٹ کو بھی نہ دیکھ سکا پھر اس نے تیسری بار کال کرنے کا ارادہ کیا تو الماس نے سکسٹا کر پوچھا تھا۔

”یہ کس کے نمبر بار بار ڈائل کیے جا رہے ہیں؟ خلاف معمول ہمارے کسی کی دستاویزی ہے؟“
 الماس کے چہرے ہوئے جیسے بھی خلاف توقع تھے۔ سراج نے اسے اگھور کر دیکھا لیکن اس سے
 پیشتر کہ وہ کچھ کہتا تھا اس کا موبائل ٹھکنانے لگا۔ روشن اسکرین پر اورنگ زیب کے نمبر دیکھ کر اس نے
 موبائل آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے گھوٹ کر کہا۔

”مجھے حیرت ہے کہ آپ نے رات ہی مجھے کال کیوں نہیں کی۔“

”ناشتے کے لیے نہیں بوجھو گے؟“

اور نگ زیب کا جواب موبائل کے ساتھ ساتھ اس کی پشت سے بھی واضح طور پر سنائی دیا تو مہران کو الماس کی سکرپٹ کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ اس نے تیزی سے نظریں گھما کر دیکھا اور نگ زیب نے بڑی اپنائیت سے اس کے شانے پر دبائے پھر اس کے ساتھ ہی ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔

”ڈی آئی جی نے بھی رات مجھے سوئے سے جگا دیا تھا۔ اصل حادثے کا علم مجھے بھی جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد ہی ہوا۔ اس وقت میں نے تم کو ڈسٹر ب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

ناشتے کے دوران اورنگ زیب نے اس کو وہ تمام باتیں بھی تفصیل سے بتا دیں جس کی بھینک اخبار والوں کو نہیں ملی تھی۔

”کیا لودھی کا موہاں ضائع کرتے وقت آپ کو اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ اسے بعد میں قتل بھی کیا جاسکتا ہے؟“

”نہیں.....“ جواب بے حد سنجیدگی سے دیا گیا۔

”اس وقت تک آکٹوپس کا کوئی علامتی نشان میری نظروں کے سامنے نہیں آیا تھا۔“

”اب آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟“

”فی الحال میں کوئی حتمی بات کہنے سے گریز کروں گا لیکن اب بھی مجھے اس کی موت کا یقین

ہوئے کہا تھا۔ ”مجھے آپ سے اب ایک بہت ضروری بات دریافت کرنی ہے..... سر۔“
سر کا لفظ جس انداز میں ادا کیا گیا اس نے ڈی آئی جی کو بھی چونکا دیا تھا۔

”آپ.....آپ کیا اہم بات معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“

”صرف..... وہ نام..... جس نے مرنے والے کا تہلولہ میرے انڈر میں کرنے کی آپ سے سفارش کی تھی۔“

”مم..... میں..... سمجھا نہیں۔“ ڈی آئی جی نے کسمسا کر پوچھا۔ ”اس نام کو جان کر آپ کیا کریں گے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کے ذہن میں خاص طور پر وہی نام کیوں آگیا؟“

”میں نے پہلے ہی آپ سے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ لودھی کو کسی خاص وجہ سے میرے پاس پوسٹ کیا جا رہا ہے۔“ اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر جواب دیا۔ ”خود آپ نے بھی اقرار کیا تھا کہ ایک بار آپ کو بھی اس وقت لودھی کے تہانے کے آؤرڈ منوش کر کے اوپر سے کہا گیا تھا غالباً آپ نے وہ اقدام مرحوم کی سزا میں تخفیف کے ارادے سے لیا تھا۔“

اور نگ زیب کے آخری جلوں کو کن کر ڈی آئی جی اس طرح چٹکتا جیسے اس کا ہاتھ اچانک بجلی کے نکلے تاروں میں دوڑتے ہوئے ہائی وولٹیج کے کرنٹ سے چھو گیا ہو..... چھو لگوں تک خاموشی سے اور نگ زیب کو خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتا ہوا بولا۔

”مم.....مم.....میں وہ نام.....آپ کو ضرور بتا دوں گا لیکن.....اس وقت نہیں۔“

”ایزبووش سر.....“ اورنگ زیب نے معنی خیز اعاز میں مسکرا کر کہا پھر وہ ڈی آلی جی کے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اپنی کار کی سمت قدم اٹھانے لگا۔

✦✦✦

جب معمول سراج اتوار کے دن دیر تک سونے کا عادی تھا لیکن جب ساڑھے آٹھ بجے اس کی چادر کھینٹ کر الماس نے اسے اٹھنے کے لیے کہا تو وہ جھلا گیا۔ پہلے اس نے بکلوں کے درمیان جبری پیدا کر کے قریب رکھی کھڑی پر نظر ڈالی پھر جھلا کر بولا۔

”پیار..... نہیں کرنا مجھے گرم ناشتا اور آج اتوار بھی ہے۔“

”میرا کرم ناشے کی وجہ سے نہیں میں نے آپ کو ایک کرا کر مجری وجہ سے اٹھایا ہے،“
 ”کل سے اخبار بند کر دو۔ مجھے نہیں دیکنا اخبار.....“ اگر کہہ کر مجھے نہیں مٹھی میں بھی نظر آتا تو میں
 اسے کوئی بار دوں گا۔ پلیز سونے دو۔“ اس نے دوبارہ کروت بزنس کے ساتھ چار مینٹہ پر کھیت
 لی۔

-۷-

لیکن..... جب الماس نے صرف اخبار کی سرخی بلند آواز میں سنائی تو وہ اس طرح ہلکا کر اٹھا جیسے کسی بچھوٹے ڈمک مار دیا ہو۔ اس نے جھپٹ کر اخبار الماس کے ہاتھوں سے چھینا پھر اس سرخی پر نظر پڑے ہی وہ پوری طرح حیدر ہو گیا جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی کے وحشت ناک قتل کے بارے

نہیں آسکا ہے۔“

”لودی کے ساتھ جو بھانڈا انداز اختیار کیا گیا ہے وہ ہم سب کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔“ سرانج نے کچھ توقف سے کہا۔ ”بیچ خاند کے ہاتھوں ہمارے بہت سے لوگ کسی نہ کسی انداز میں بکے ہوئے تھے۔ ان سب کے لیے بھی یہ معاملہ ایک لمحہ فکر ہی بہت ہوگا۔“

”ہڈ پانی مت بنو۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ لودی کے قتل کی وجہ وہ موبائل تھا جو اتفاقاً میرے ذہن میں ایک خطرہ بن کر ابھرا تھا۔ اس کے ضائع ہونے کے بعد لودی کا انجام میرے لیے کچھ متوقع نہیں رہا۔ انڈر ورلڈ کے بڑے خدادر کو اس سے کہیں زیادہ دھشیاں انداز میں سسکا سسکا کر مارنے کے عادی ہوتے ہیں۔“

”پلیز۔۔۔۔۔“ الماس نے اپنی نشست پر کسمسا کر کہا۔

”ناشتے کی میز پر مرے والے کی تعظیم کے بیان کریں۔“

”ڈی آئی جی صاحب نے آپ کو اس شخص کا نمبر کیوں نہیں بتایا جس نے لودی کے تباہی کی سفارش کی تھی؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ اورنگ زیب نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر سرانج کو غور سے دیکھا۔ ”کیا تم ڈی آئی جی کو کبھی کسی زاویے سے مشکوک سمجھ رہے ہو؟“

”جی نہیں لیکن۔۔۔۔۔ اس نے نام ظاہر کرنے سے گریز کیوں کیا؟“

”اس لیے کہ وہ قبیح طور پر میرے اس اچانک سوال پر ہنستا گیا تھا۔ اس کا یہ عمل قدرتی تھا۔ ہم کو شاید اس بات کا علم نہیں ہے کہ اس نے لودی کی سزا میں کسی کے بھانے سے جو آرڈر کیے تھے وہ اوپر سے منسوخ کرائے گئے تھے اس وقت ڈی آئی جی صاحب نے کہا تھا کہ لودی کے سلسلے میں کہیں اوپر سے ان کو ایسا کرنے کو کہا گیا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ آرڈر آؤٹ کوئٹس کے اشارے پر جاری کیے جا رہے تھے جو میں نے اتفاقاً علم میں آ جانے کے بعد اوپر سے منسل کرائے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ بات کسی طرح ڈی آئی جی کے علم میں بھی آئی ہو۔“

”آئی جی! گو کیا آپ ڈی آئی جی صاحب زیادہ محتاط ہو گئے ہیں۔“ سرانج نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”ممکن ہے اس بارہ اوپر والوں سے مشورہ کرنے کے بعد آپ کو موجودہ بڑی شخصیت کا نام بتائیں۔“

”وہ نام میرے علم میں پہلے ہی آ چکا ہے۔“ اورنگ زیب نے سادگی سے کہا۔ ”موبائل کا انجام دیکھنے کے بعد ہی میں نے اپنے خاص ذرائع سے معلوم کر لیا تھا۔ اب اگر ڈی آئی جی نے اس سے رابطہ قائم بھی کیا تو وہ اس سیٹ پر نہیں ہوگا جس پر پہلے تعینات تھا۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ کیا ڈی آئی جی اس کے سیٹ پر نہ ہونے کی خبر سن کر چوٹے کا نہیں؟“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اسے پوری طرح اس بات کا احساس ہو جائے کہ میں کسی بھی

حوالے سے آؤٹس کو کا نام درمیان میں آ جانے کے بعد اب کسی کے احکامات کا پابند نہیں ہوں گا۔“

ناشتے کے دوران اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی الماس کی نہ کسی طور ہم عمر رہی لیکن جب وہ اٹھ کر لاؤنج میں آئے تو الماس نے ان کو خوب بات کا رخ بدل کر کہا۔

”میں آپ دونوں کو ایک خوشخبری سنانا چاہتی ہوں۔“ میں نے روٹی کی دعوت سے آنے کے بعد دوسری میز سے فون کیا تھا اس کے بیان کے مطابق اسی ماہ کے آخر تک وہ اور آپ کے ڈی آئی جی صاحب کلاچ کے مرہٹے سے بھی سیکورڈ ہو جائیں گے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ اورنگ زیب نے کہا پھر سرانج کو معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا براہ راست الماس سے مخاطب ہوا۔ ”میڈم روٹی کی شادی کے بعد آپ کے سرانج کا کیا بنے گا؟“

”ان دونوں کی شادی سے میری بہت توقعات تھیں۔۔۔۔۔“ سرانج نے اورنگ زیب پر اصرار کیا۔ ”آپ میرا نام بلا رہے ہیں۔۔۔۔۔ میں اس کی وجہ سے غصے میں آ رہی ہوں۔“

”پریشان نہ ہوں۔“ الماس نے سرانج کو دیکھ کر اسے ہنسایا۔ ”پہلے کی بات اور تھی لیکن اب روٹی سے دوستی کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ بے حد شریف اور رکھ رکھاؤ والی خاتون ہے۔“

”میری یہی سببیں مرے بے محراب سرانج کی شرمیلی ہوئی ہیں۔“ اورنگ زیب نے دوبارہ سرانج کو دیکھ کر کہا۔

”پلیز۔۔۔۔۔ آپ میری خیر نہ ہونے کی وجہ سے اب اس کی شادی سے انکار کر دیں۔“ اورنگ زیب نے ایک ذرا سی غلط فہمی پر میرا دوجا دیکھ کر دے کی مار لیا اور ہوا کو اس کے منہ سے خارج کر دیں۔ ”سرانج کے لیے میں ایسی مصیبت اور جوہن میں تھا کہ اس کی شادی سے انکار کر دینا اورنگ زیب کی بھی نہیں یا پھر بھید کی سے بولا۔ ”الماس کی بات دو جتن روکنے والی تھی۔۔۔۔۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا ہوں۔“

”میں بھی نہیں۔۔۔۔۔“ اس بار الماس نے اورنگ زیب سے سوال کیا۔ ”بھلا روٹی کی شادی کا لودی صاحب کے لیے سے کیا تعلق ہے؟“

”آؤٹس۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”شادی کے سلسلے میں بھی میڈم نے یہی شرط رکھی تھی کہ وہ بیچ خاند کی موت کے بعد ہی اس کا حق فیصلہ کرے گی۔ لیکن ہے کہ لودی کے سلسلے میں اخبار میں شائع ہونے والی تفصیل میں آؤٹس کی شہ کا حوالہ دیکھ کر۔۔۔۔۔“

اورنگ زیب کا جملہ سن کر ہونے سے پہلے ہی سرانج کے موبائل کی روشنی ہونے والی اسکرین پر میڈم روٹی کا نمبر نظر آیا تو سرانج نے اورنگ زیب کی زبان میں ”میڈم روٹی“ کہہ کر کال ریسیو کی۔

”جی۔۔۔۔۔ میں خاکسار سرانج بل رہا ہوں۔۔۔۔۔ ہائی ہائی میں نے خبر پوری تفصیل اور مع حوالہ پڑھ لی ہے۔۔۔۔۔ خانوے کے فیصلہ لوگوں کا بھی خیال ہے کہ وہ شاکر جیپوں کی غذا بن چکا ہے۔ رہا ایک فیصلہ کا معاملہ تو وہ اس وقت ہمارے درمیان ہی موجود ہیں۔ جی۔۔۔۔۔ لڑکھیزا ڈانی بھی نہیں بلکہ ہے کہ آپ براہ راست ان سے چھان بین کریں۔“ سرانج نے منہ کے اظہار کے ساتھ ہی موبائل اورنگ زیب کی طرف بڑھا دیا۔

اورنگ زیب نے بڑی صاف گوئی سے میڈم ردہی سے بھی یہی کہا جب تک وہ شیخ حامد کی لاش کو اپنی نظروں سے نہیں دیکھ لیتا اس کی موت کی تصدیق یا تردید نہیں کر سکتا۔ اس نے دوسری طرف سے اصرار کے باوجود کوئی مشورہ دینے سے بھی معذرت کر لی تھی۔

میڈم سے اورنگ زیب کی گفتگو ختم ہونے کے بعد بھی خاصی دیر تک میڈم اور ڈی آئی جی کی شادی کا معاملہ ہی زیر بحث رہا۔



شیخ حامد کے سمندر میں غرق ہو جانے کی اطلاع سے کاروباری حلقوں میں ایک استحکام سا پیدا ہو گیا تھا۔ بڑے تاجروں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ سرکاری ٹینڈر بھرنے کے مقابلے میں اب وہ صورت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ دوسری جانب ان دلالوں کا کاروبار بھی مندا پڑ گیا جو دونوں فریق سے اندر کی خبریں قبل از وقت پہنچانے کے عوض لمبی لمبی رقمیں بھرتے تھے۔ بہر حال اب مقابلے کی فضا ختم ہونے کے بعد سب ہی بڑے تاجروں نے سکون کا سانس لیا تھا۔



نوٹ: اس پر اصرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات

حصہ سوم میں ملاحظہ فرمائیں

کشمکش

3

Pakistanipoint

Waqar
Azeem

انوار صدیقی

دوسروں کے مقابلے میں رستم علی آغا خانی کے ذہن سے کسی ایسے خطرے کا احساس بھی جاتا رہا جو اسے رہ رہ کر پریشان کرتا رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے آفس میں بیٹھا آنے والی ڈاک دیکھ رہا تھا جب ایک بڑا لفافہ کھولتے ہی اس کا سارا سکون ہل پھر میں غارت ہو گیا۔ بڑے لفافے کے اندر ۱۰۰ ایک ہادی رنگ کے لفافے پر آکٹوپس کی ربر اسٹمپ پر نظر پڑتے ہی اس کے وجود میں کسی الے والے فطرے کی سرد لہر دوڑ گئی۔

آکٹوپس کے بارے میں ایسی پی اورنگ زیب کی ایک پریس کانفرنس کے دوران دی گئی وضاحت بیشتر لوگوں کے علم میں آگئی تھی اورنگ زیب نے اس کانفرنس میں ایک رپورٹر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ شیخ حامد کی شخصیت اس کے اپنے حلقوں کے لوگوں کے لیے بھی اتنی اہمیت رکھتی تھی جتنی پانی کے اندر رہنے والے آکٹوپس کی ہوتی ہے۔

ہادی لفافہ کھولنے سے بیشتر اس نے اپنی لیڈی اسٹینو کی سمت دیکھا جو اس کے کمرے میں کارڈ ٹیبل پر بیٹھی ایک خاص لیٹر ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔ اس کا کمر علیحدہ تھا لیکن جن اہم اراکٹ پر سگھٹ لکھا ہوتا تھا وہ انہیں باس کے حکم کے مطابق اسی کے کمرے میں بیٹھ کر ٹائپ کرتی تھی۔

ایک لمحے کو رستم علی نے سوچا کہ لیڈی اسٹینو کو کچھ دیر کے لیے کسی بہانے سے باہر بھیج دے لیکن پھر اسے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا، ٹیبل پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر اس نے دو لمبے لمبے گھول لیے پھر ریو الونگ چیئر کی پشت سے ٹپک لگا کر آنکھیں بند کر لیں، اس کے ذہن میں ایک الے وال گردش کر رہا تھا۔ کسی کاروباری ڈاک میں آکٹوپس کی ربر اسٹمپ والے لفافے کی..... کیا

۱۹۶۱ء ہوئی ہے؟ وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جب اسٹینو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔
”سر آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو میں اسے یہیں بیٹھ کر لفافے میں بند کر کے میل کر دیتی ہوں۔“

”میز پر چھوڑ جاؤ..... میں تم کو بعد میں بلا لوں گا۔“
”سر“ اسٹینو نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر دبی زبان میں پوچھا۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”آں ہاں۔“ رستم علی نے سنبھل کر کہا۔ ”ایک کاروباری مسئلے پر غور کر رہا تھا۔ آئی

اسیٹو کے جانے کے بعد ہی اس نے بادامی لفاظہ کھولا تو دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہونے لگیں وہ اس کی اور اس کی بیوی کی وہ شرمناک تصویریں تھیں جو اسی کی خواب گاہ میں ریوالبور کی زد پر اتاری گئی تھیں ان تصویروں کے بائیں جانب بھی آنکھوں کی ربراسٹیمپ لگی ہوئی تھی، تصویروں کے ساتھ ایک ٹائپ شدہ پیغام بھی تھا۔ رستم علی نے تصویریں سمیٹ کر دراز میں رکھیں پھر ٹائپ شدہ پیغام پڑھنے لگا۔

”رستم علی آغا خانی..... تم نے آنکھوں کے بارے میں جو اخباری تراشے دیکھے ہیں اسے ذہن سے نکال دو آنکھوں اس کا کردار کے مقابلے میں زیادہ سخت جان ہوتا ہے جو مرنے کے بعد بھی دیر تک اپنی ٹانگیں ہلاتا رہتا ہے۔ تمہاری دفتری مصروفیات کا ایک ایک لمحہ میری نظروں میں ہے۔ اور نگ زیب سے تمہارا میل جول تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ اس دو کوڑی کے ایس پی کے کہنے پر تم نے آنکھوں کے بارے میں جو رپورٹ بھیجی اس کے بارے میں بھی لاعلم نہیں ہوں۔ اپنا اپنے کاروبار اور اپنے گھر والوں کا بھلا چاہتے ہو تو آئندہ کوئی حماقت نہ کرنا ورنہ تمہارا یا تمہارے جوان بیٹے دارا کا انجام بھی ڈی ایس بی لودھی سے زیادہ مختلف نہ ہوگا۔“

خط کی عبارت کے ساتھ ساتھ رستم علی کی دھڑکنیں بھی دل کی گہرائیوں میں ڈوب رہی تھیں۔ اس نے گلاس میں بچا ہوا پانی اٹھا کر ایک ہی سانس میں پی ڈالا۔ آنے والی تصویروں اور ٹائپ شدہ پیغام کو دوبارہ بڑے لفافے میں رکھ کر تیزی سے اٹھا، ملحقہ ریٹ روم میں جا کر اس نے موصول ہونے والی شرمناک تصویروں اور خطرناک پیغام کو اپنی تجوری کے مخصوص خانے میں محفوظ کیا پھر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا، خاصی دیر تک وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالات پر غور کرتا رہا..... تصویریں اور پیغام بھیجے والا کون تھا؟..... کیا شیخ حامد کا منحوس وجود ابھی ختم نہیں ہوا تھا؟..... اگر نہیں تو پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کے ذمے دار افسران نے کس ثبوت کی بنا پر اسے مردہ قرار دے دیا تھا؟ کیا شیخ حامد کے بجائے وہ اس کا کوئی خاص آدمی تھا جو مخرب اخلاق تصویریں ہاتھ آ جانے کے بعد اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا تھا؟ یا دفتر کا کوئی ایسا کارندہ تھا جو کسی مخالف گروپ کے افراد کو اندر کی باتیں بتا رہا تھا؟..... ایس پی اور نگ زیب ایک ایماندار اور نڈر پولیس آفیسر تھا۔ قابل اعتماد بھی تھا..... تو کیا اس سے مل کر صورت حال کے بارے میں گفتگو کرنا مناسب ہوتا لیکن..... اگر اس کی بھینک بھی آنکھوں کی ربراسٹیمپ استعمال کرنے والے کو مل جاتی تو وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنا سکتا تھا؟ موجودہ صورت حال کے پیش نظر کیا خاموشی ہی اس کے حق میں بہتر تھی۔ رستم علی آغا خانی اپنی سوچوں میں غرق تھا جب کسی کے قدموں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، سامنے اس کا جوان بیٹا دارا موجود تھا۔

”کیا بات ہے ڈیڈ.....!“ اس نے کرسی پر بیٹھے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آپ اس وقت.....“

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ رستم علی نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”ایک کاروباری مسئلے پر غور کر رہا تھا۔“

”سوری..... میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔“

”میرا خیال ہے کہ اس وقت تم کوئی خاص بات کرنے کے ارادے سے آئے ہو۔“ رستم علی نے دارا کو مسکرا کر دیکھا۔

”یس ڈیڈ.....“ دارا نے کہا۔ ”دراصل میں دو چار روز کے لیے عاطف کے ساتھ شکار پر جانا چاہتا ہوں، روشا گھر پر ہی رہے گی۔“

”عاطف.....“ رستم علی نے اس نام کو دہرایا پھر کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ”تم شاید ملٹری کے ریٹائرڈ میجر عاطف کی بات کر رہے ہو؟“

”جی ہاں..... اس نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے۔“

”میری طرف سے اجازت ہے لیکن ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”تم مجھے عاطف کا موبائل نمبر دے کر جانا تاکہ میں تم دونوں کی خیریت دریافت کرنا رہوں۔“

دارا نے اس وقت میجر عاطف کے موبائل نمبر کاغذ پر لکھ دیے پھر جانے کے ارادے سے اٹھنے لگا تو رستم علی نے دبی زبان میں پوچھا۔ ”اگر میری اطلاع غلط نہیں ہے تو تم نے شاید ہمارے کسی کاروباری مخالف کے سلسلے میں بھی عاطف کو بیچ میں ڈالا تھا۔“

”یس ڈیڈ.....“ دارا نے سنجیدگی سے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرا ہر اعتبار سے بہترین مخلص اور قابل اعتماد دوست ہے۔“

”ایک دوسری ملاقات میں میں نے بھی اس کے بارے میں یہی اندازہ لگایا تھا۔ ٹھیک ہے تم جاؤ لیکن خیال رکھنا۔“

”ڈونٹ وری ڈیڈ۔“

دارا کے جانے کے بعد رستم علی آغا خانی خاصی دیر تک کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا پھر اس نے میز کے سائڈ میں لگا ہوا سوچ دبا کر باہر دروازے پر لگی سرخ لائٹ کو آن کر دیا جس کا مقصد یہی تھا کوئی بھی شخص اس کے بلائے بغیر اندر نہ آئے۔ اس کے بعد اس نے دراز سے ایک ہی قسم نکال کر دوسرے موبائل میں ڈالی پھر میجر عاطف کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دو گھنٹی کے بعد دوسری جانب سے خود عاطف نے کال ریسیور کی تھی۔

”دارا بتا رہا تھا کہ تم اور وہ شکار پر جا رہے ہو؟“

”گڈ آفٹر نوون انکل.....“ اس بار بڑی سعادت مندی سے کہا گیا۔ ”آپ مطمئن رہیں میں اپنے سے زیادہ دارا کا خیال رکھوں گا۔“

”مائی سن..... میں اس وقت تم سے ایک نئی سم لگا کر بات کر رہا ہوں۔ اس کا علم دارا کو نہیں ہوتا چاہیے۔“

”آئی سی..... میرا خیال اگر غلط نہیں ہے تو آپ نے اس وقت مجھے کسی خاص کام کے لیے کال کیا ہے۔“

”یو آر رائٹ.....“ رستم علی نے بہ دستور مدہم آواز میں کہا۔ ”مجھے یقین تھا کہ نئی سم کے حوالے پر تم ضرور یہی نتیجہ اخذ کرو گے۔“

”آپ حکم دیں انکل..... میں کوشش کروں گا کہ آپ کے لیے دارا سے زیادہ قابل اعتماد ثابت ہو سکوں۔“

”مجھے ایک مخصوص چیز ایک مخصوص آدمی تک پہنچانی ہے۔ مجھے یقین ہے اس کام کے لیے میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں۔“

”ہنڈ ریڈ پرسنٹ“ دوسری طرف سے ٹھوس لہجے میں کہا گیا۔ ”آپ جس وقت حکم دیں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”تم لوگ شکار کے لیے کب روانہ ہو رہے ہیں؟“

”کل صبح نکلنے کا پروگرام ہے۔“

”گڈ..... میں کوشش کروں گا کہ وہ چیز تمہیں کسی ذریعے سے آج ہی پہنچا دوں اور..... اگر جانے سے پہلے تم اسے آج رات ہی کسی وقت مطلوبہ شخص تک پہنچا دو تو زیادہ مناسب ہو گا لیکن..... اسے خاص آدمی تک پہنچانے کے لیے بھی تمہیں کسی خاص اور با اعتماد شخص کا انتخاب کرنا ہو گا۔“

”آئی سی۔“ دوسری جانب سے بے حد سنجیدگی سے پوچھا گیا۔ ”انکل میرا خیال ہے کہ آپ اس وقت کچھ ڈسٹرب ہیں؟“

”ہاں..... لیکن اگر تم میرا کام کرو تو میری پریشانی بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔“

”وہ چیز کسے پہنچانی ہوگی؟“

اس کا نام بھی تمہیں ایک عمدہ لفافہ میں مل جائے گا۔“ رستم علی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”اس کو پڑھ کر اسی وقت ضائع کر دینا اور ایک بات کا خاص خیال رکھنا دارا کو کسی بات کی خبر نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے انکل..... میں آج گھر پر ہی رہوں گا۔ آپ کی بھیجی ہوئی چیز بھی آج رات ہی مطلوبہ آدمی تک پہنچا دی جائے گی۔“

”تھینک یو مائی سن.....“ رستم علی نے لمبی سانس لے کر کہا پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر ایک بار پھر آدمی ترچی لکیروں کے جال ابھرنے اور منٹے لگنے یہ اس کی اضطرابی کیفیت کی دلیل تھی۔



سرفراز خان کے جانے کے بعد سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کی ذمے داریوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب ”ماربل ایکسپورٹرز“ کے دیکھ بھال کی ذمے داری بھی اسی کو سنبھالنا تھی۔ سرفراز خان کے جانے کے دو دن بعد ہی سیٹھ عثمان نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر کہا تھا۔ ”لیاقت حسین میں نے تمہیں ماربل کے کاروبار کے سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کرنے کی خاطر بلایا ہے۔“

”آپ کی مہربانیاں پہلے ہی بہت ہیں میں شاید مرتے دم تک.....“

”نہیں.....“ سیٹھ عثمان نے اسے فوراً ہی ٹوک دیا۔

”دفتر میں صرف کاروباری باتیں کرنا مناسب ہوتا ہے۔ جذباتی گفتگو کرنا کاروباری اصول کے بھی خلاف ہے۔“

”آپ حکم دیں میں کسی بات سے انکار نہیں کروں گا۔“ لیاقت حسین سنبھل کر بیٹھ گیا تو سیٹھ عثمان نے اسے نئی ذمے داری کے سلسلے میں پہلے کچھ اہم باتیں اور ہدایتیں دیں پھر کچھ توقف سے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ سرفراز خان نے میرے ساتھ اس کاروبار میں برابر کے نفع و نقصان کی شرط رکھی تھی جس کے لیے قانونی دستاویز بھی تیار ہو چکی ہے۔“

”میرے خیال میں بابا نے جو کچھ کیا وہی مناسب تھا اس لیے کہ اب آپ نے اپنا ماربل کا کام بھی بابا کے ساتھ شامل کر لیا۔“

”گڈ.....“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں اس وقت یہی خاص بات سمجھانے کی خاطر بلایا ہے..... میرا جو کام پہلے تھا تم اسے اب بھی الگ ہی تصور کرو گے۔“

”میں سمجھا نہیں صاحب۔“

”میں نے اپنے منیجر کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ میرے ماربل کے کاروبار کے سلسلے میں تمہیں تمام باتیں تفصیل سے سمجھا دے گا۔ فی الحال تم یہ سمجھو کہ مجھے اس کاروبار میں جو اوسط منافع ہوتا رہا ہے میں خود کو صرف اسی کا حق دار سمجھوں گا۔ اس کے بعد شرائط کے مطابق جو کل منافع ہو گا اس میں سے میرا اوسط منافع نکالنے کے بعد جو بھی بچے گا وہ تمہارا ہو گا۔“

”لیکن شرط نامے میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے جو آپ بتا رہے ہیں۔“

”تم بھول رہے ہو لیاقت حسین کہ یہ بات تمہاری موجودگی میں طے ہو گئی تھی کہ میں اپنا نفع یا نقصان جسے چاہے دے سکتا ہوں۔“

”آپ مرضی کے مالک ہیں جناب لیکن.....“

”اس سلسلے میں اگر تمہیں مزید کچھ کہنا ہے تو بیگم صاحبہ سے بات کر لینا۔“ سیٹھ عثمان نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے اب تم سے صرف ایک بات کرنی ہے کہ پہلی فرصت میں تم اپنا بینک اکاؤنٹ کھول لو۔“

اس کے بعد بات جاری نہ رہ سکی اس لیے کہ آفس منیجر کچھ کاروباری فائلیں لے کر آ گیا

تھا۔ لیاقت حسین نے بھی فوری طور پر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا یہ بھی جانتا تھا اسے راحیلہ بیگم سے اس ضمن میں بات کرنے کو کیوں کہا گیا تھا؟ ویسے بھی اس نے راحیلہ بیگم سے کھل کر بات کرنی مناسب نہیں سمجھی تھی۔ یہ اس تہذیب کے بھی منافی تھا جس میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔

سیٹھ عثمان کے کمرے سے نکل کر وہ باہر آیا تو چڑاسی نے اسے بتایا کہ راحیلہ بیگم نے اسے کسی کام سے بلایا ہے۔ لیاقت حسین نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی۔ وہ قدم اٹھاتا ہنگلے پر پہنچا تو فرحین دروازے پر ہی بنی ٹھنی کھڑی تھی۔ لیاقت حسین کو دیکھ کر اس نے چھینرنے والے انداز میں منہ بنا کر کہا۔

”تم کدھر تھا ڈر پور..... ہمیں شوپنگ کرنے جانا ہے۔“

”میں آگیا ہوں میڈم آپ ابھی چل کر شاپنگ کا موج میلا کر لو میں رات کو دل پشوری کر لوں گا۔“

راحیلہ بیگم سامنے آگئیں تو وہ دونوں ہی سنبھل گئے تھے۔ شوپنگ سینٹر جاتے ہوئے راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین سے دبی زبان میں کہا۔ ”اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟“

”آپ حکم دیں..... میں آپ کی یا صاحب کی باتوں کا برا مانوں..... یہ کیسے سوچ لیا آپ نے؟“

”فرحین نہیں مانی ورنہ میں اس وقت دوسرے ڈرائیور کو بلا لیتی۔“ راحیلہ بیگم نے محتاط انداز میں اختیار کیا۔ ”اب تمہاری دفتری مصروفیات بڑھ گئی ہیں اس لیے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”اس کا بھی ایک حل ہے میرے پاس۔“ لیاقت حسین نے کسمسا کر بڑی تابعداری سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”میں دفتر سے اپنا کام ختم کر دوں گا اس کے بعد تو آپ کو مجھے بلانا برا نہیں لگے گا؟“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن.....“

”آپ مالکن ہیں جو چاہیں فیصلہ سنا دیں۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے انکار کی جرأت نہیں کروں گا۔“

”تو غلط سمجھ رہا ہے لیاقت بیگم صاحبہ کا مطلب.....“

”تو درمیان میں نہ بول۔“ لیاقت حسین نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میں اور عثمان دونوں تمہاری عزت کرتے ہیں۔ تم نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا کوئی بدل ممکن ہی نہیں ہے مگر دفتر کے دوسرے لوگ..... میں نہیں چاہتی کہ وہ.....“

”میں نے آپ کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولی بیگم صاحبہ لیکن بات میری بھی سن لیں جب تک آپ کے گھر کا دانہ پانی قسمت میں لکھا ہے میں آپ لوگوں کی خدمت سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ میرے ہوتے آپ کسی اور ڈرائیور کے ساتھ جاؤں یہ مجھے منظور نہیں ہے۔“

راحیلہ بیگم لا جواب ہو گئیں۔ لیاقت حسین کے جیلے ان کے ذہن میں گونج رہے تھے اس نے کئی موقعوں پر اپنی جان پر کھیل کر ان کی جان بچائی تھی۔ سیٹھ عثمان بھی اس کی جان نثاری کو کبھی

فراموش نہیں کر سکتے تھے جن حالات سے مقابلہ کر کے وہ ان کی ملازمت پر آمادہ ہوا تھا وہ بھی اس کی خودداری کا ثبوت تھا۔ ملازمت کے دوران اس کے کبھی اپنے والد کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر کو زبان پر نہیں لایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے اندر وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو کسی بچے نیک ایماندار اور کسی عبادت گزار مسلمان کا طرہ امتیاز ہوتی ہیں۔

”ٹھیک ہے لیاقت حسین۔“ انہوں نے لیاقت حسین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میں دوبارہ تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گی۔“

لیاقت حسین راحیلہ بیگم کا جواب سن کر کھل اٹھا۔ فرحین اس موقع پر بھی اسے چھینرنے کی خاطر کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اچانک ہی جو کچھ ہوا اس سے وہ بھی بوکھلا گئی تھی۔

گاڑی اس وقت ایک معروف شاہراہ سے گزر رہی تھی جب بائیں جانب سے گزرنے والی ایک گاڑی نے اچانک ہی خطرناک انداز میں سائڈ ماری پھر اسی رفتار سے بائیں جانب والے قریبی موڑ پر نکل گئی۔ لیاقت حسین بھی اس اچانک رفتار سے گڑبڑا گیا مگر اس کے اوسان خطا نہیں ہوئے تھے ورنہ گاڑی سامنے سے آنے والے ایک لوڈنگ ٹرک سے ٹکرا جاتی۔ اس نے فوری پر اسٹیزنگ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ پھر بھی گاڑی لوڈنگ ٹرک سے رگڑ کھاتی ہوئی کسی بڑے حادثے سے بال بال بچ گئی۔ فرحین کے منہ سے نکلنے والی چیخ بھی بہت زوردار تھی راحیلہ بیگم بھی سہم کر رہ گئیں۔ جو کچھ ہوا وہ اسے اتفاق سمجھنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ جس گاڑی نے سائڈ ماری تھی اس کے بعد فوراً ہی بائیں جانب مڑ کر نظروں سے اوجھل ہونے کا مطلب یہی تھا کہ وہ کسی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا جب اپنے ناپاک ارادے میں کامیابی کے ساتھ ہی فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو جاتا لیکن لیاقت حسین کی مہارت اور بروقت ذہانت ایک بار پھر کام آگئی البتہ ٹک سے معمولی رگڑ کھانے کے بعد بھی گاڑی کی باڈی اور پچھلے پیمبر کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ لیاقت حسین نے اس ہجوم سے نکلنے کے بعد اپنی گاڑی بھی اگلے موڑ سے گھما کر فٹ پاتھ کے ساتھ روک لی۔ نیچے اتر کر وہ گاڑی کی ٹوٹ پھوٹ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے چہرے سے جو کیفیت عیاں تھی وہ اس بات کی ترجمانی کر رہی تھی کہ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ سائڈ مارنے والے ڈرائیور کو گولی مارنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اس بھی یقین تھا کہ کسی دشمن نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے چنانچہ اس نے سب سے پہلے موبائل نکال کر سراج کو اس کی اطلاع دی ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اس حادثے سے قبل اس کے اور راحیلہ کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں لیاقت حسین کہ تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہوگی۔ بہر حال دوبارہ ایسا نہیں ہوگا۔“

”تمہاری حاضر دماغی کے ایک بار پھر میں کسی بڑے حادثے سے بچا لیا۔“

”گناہ گار نہ کریں بیگم صاحبہ..... موت اور زندگی صرف اوپر والے کے اختیار میں ہے۔“

راحیلہ بیگم کچھ اور کہنا چاہتی تھیں کہ ان کے موبائل پر سراج کی کال موصول ہوئی۔

”آپ کو کیسے علم ہوا؟“

”ابھی لیاقت حسین نے بتایا ہے لیکن افسوس کہ وہ گاڑی کے نمبر نہیں نوٹ کر سکا۔“

”میں نے اس کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔“ راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”وہ ڈارک گرے کمر کی نئی ٹیوٹا تھی جس پر شوروم کا عارضی نمبر نظر آ رہا تھا۔“

”گڈ..... میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔ اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”گھر واپس جاؤں گی۔“

”لیاقت حسین نے حادثے کی اطلاع کے ساتھ ہی بڑی محبت سے آپ کی شکایت بھی کی

ہے۔“ سراج نے بے تکلفی سے کہا۔

”اوہ..... مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔“ راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین پر ایک نظر ڈال کر

جواب دیا۔ ”آئندہ خیال رکھوں گی۔“

”ایک درخواست اور کروں گا..... آئندہ جب آپ کو کہیں آنا جانا ہو تو مجھے اس کی اطلاع ضرور

دے دیا کریں، موجودہ حالات میں یہ ضروری ہے۔“

”آئی سی۔“ راحیلہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا آکٹوپس کے بارے میں اورنگ

زیب صاحب کا شبہ درست ثابت ہو رہا ہے؟“

”ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن احتیاط پھر بھی شرط ہے۔“

سراج سے گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد راحیلہ بیگم نے شوہر کو بھی اس حادثے کی اطلاع

دی پھر لیاقت حسین سے بولیں۔ ”مجھے خوشی ہے لیاقت حسین کہ تم نے سراج بھائی سے میری شکایت کی۔ یہ بھی اپنائیت کی دلیل ہے۔“

لیاقت حسین نے محض سر کی جنبش سے اپنے جذبات کا اظہار کیا پھر گاڑی چلانے میں مصروف ہو گیا۔ البتہ فرحین ابھی تک وحشت زدہ سی نظر آ رہی تھی۔



ٹیکسی طزایریا کے درمیان بنے ہوئے ایک دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر روک دی گئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا نوٹ نکال کر ڈرائیور کی جانب بڑھا دیا۔

”میرے پاس چینیج نہیں ہے جناب۔“

”ٹھیک ہے۔“ مسافر نے بے پروائی سے جواب دیا پھر اتر کر نیچے آ گیا۔

اس کے جسم پر جینز کی تنگ پتلون اور چپک کی بوٹرٹ نظر آ رہی تھی۔ نیچے اتر کر اس نے جیب

سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا پھر اس وقت تک وہی رکا رہا جب تک ٹیکسی گھوم کر نظروں سے

اوجھل نہیں ہو گئی اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا دو منزلہ عمارت کی پشت پر آ گیا جہاں زیادہ

ترسروٹ کو اثر ہی تعمیر تھے۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ قریب یا دور کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

وہ مکانوں کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتا رہا پھر ایک ایسے مکان کے سامنے پہنچ کر رک گیا جس کے دروازے پر ایک لیڈ بکس بھی نظر آ رہا تھا۔

اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اس کے بعد نہایت اطمینان سے دو میڑھیاں چڑھ کر دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دینے لگا چند منٹ خاموشی رہی پھر اندر سے کسی نے بھاری آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”ماسٹر.....“ جواب بہت مختصر معنی خیز انداز میں دیا گیا۔

”رات کے گیارہ بجے کے بعد مجھے دروازہ کھولنے سے منع کیا گیا ہے اور اس وقت.....“

”رات کے پونے بارہ بج رہے ہیں۔“ ماسٹر کہنے والے نے سرسراقی آواز میں جواب دیا۔ ”مجھے ایک ضروری کام سے بھیجا گیا ہے۔“

”میں مجبور ہوں ماسٹر..... اوپر کے حکم کو ٹالنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے روکھے لہجے میں کہا گیا۔

”تم جانو..... میں جا رہا ہوں لیکن کام نہ ہونے کی تمام تر ذمہ داری اب تمہارے کاندھوں

پر ہو گی۔“ ماسٹر کہنے والے نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ پھر بڑبڑاتا ہوا واپس لوٹ گیا۔ اب اس کے قدم

مکان کی پشت کی جانب بڑھ رہے تھے۔ پچھلی گلی میں بھی اس وقت سنا ہی تھا۔ مطلوبہ مکان کے

عقب میں پہنچ کر دوسری سگریٹ جلانے کے بہانے رکا۔ کن اکھیوں سے اس نے دائیں بائیں کا

جائزہ لیا پھر اس نے بڑی مہارت سے قدرے جھک کر خود کو اوپر کی جانب اچھالا مکان کی عقبی دیوار

آٹھ فٹ بلندی تک لیکن ایک ہی جست میں وہ اس تک پہنچ گیا چند لمحے وہ دیوار سے چپکا رہا پھر اس

نے لٹکے ہی لٹکے دوبارہ اپنے جسم کو حرکت دی اور پلک جھپکتے میں وہ دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے

بعد دوسرے ہی لمحے وہ مکان کے صحن میں تھا جو اس وقت سنان ہی نظر آ رہا تھا۔ ایک کمرے کے

دروازے پر پڑے پردے کی ایک جھری سے اندر سے مدھم پاور کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ قدم

بڑھاتا پچھلے حصے کے ورانڈے میں کھٹنے والے دروازے کی طرف گیا۔ جب سے اس نے ایک

مخصوص تار نکال کر تالے کے سوراخ میں ڈالا پھر اسے دو تین بار ادھر ادھر کرنے کے بعد ہی ہلکی سی

آواز سن کر اس کے ہونٹوں پر ایک خونریز مسکراہٹ پھیل گئی۔ نہایت آہستہ سے اس نے دروازہ

کھولا۔ ربرسول جو گر کی وجہ سے اس کے قدموں کی آواز بھی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اندر پہنچ کر اس نے

نہایت خاموشی سے دروازہ بند کیا پھر اس دروازے کے قریب جا کر رک گیا جس میں مدھم سی روشنی

نظر آ رہی تھی۔

”سچ بتا..... ابھی کون آیا تھا۔“ کسی عورت کی تجسس بھری آواز آنے والے کے کانوں میں

کھنکی۔

”ایک بار کہہ تو دیا کہ اس نے ماسٹر کا حوالہ دیا تھا لیکن میں نے اوپر کے حکم کا فائدہ اٹھاتے

وہ اسے ٹال دیا۔“ کسی مرد کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”تیری موجودگی کا بھی خیال تھا۔“

”کہیں وہ میرے گھر والے کا کوئی مجر تو نہیں تھا؟“ عورت نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔
 ”کیوں حماقت کی بات کر رہی ہے..... تیرا جھڑپ مرد اس وقت مشینوں سے جتا ہو گا صبح
 سات بجے سے پہلے اس کی واپسی نہیں ہوگی کیوں اپنا اور میرا مزہ کر کر کر رہی ہے۔“
 اندر سے پھر ملی جلی گھٹی گھٹی آوازیں ابھرنے لگیں مرد کی آواز خاص طور پر رفتہ رفتہ بلند ہو رہی
 تھی لیکن پھر دونوں ہی کو جیسے یکھٹ سانپ سونگھ گیا..... تاراج کی تیز روشنی میں دونوں کے حرکت
 کرتے برہنہ جسم اس طرح ساکت ہو گئے جیسے کوئی برقی قوت سے چلنے والی مشین بجلی کے یکھٹ
 چلے جانے سے ایک دم ٹھپ ہو گئی ہو۔ دونوں کی نظریں ایک ساتھ ہی دروازے کی جانب اٹھی
 تھیں۔ عورت نے جلدی سے اپنی اوڑھنی جسم پر ڈال لی، مرد نے چادر کھینٹ کر تہ بند کی طرح لپیٹ لی
 پھر وہ تیزی سے اٹھا۔ ایک لمحے کو خوف زدہ نظر آنے والا اب بڑے اعتماد سے آنے والے کو گھور کر
 بولا۔

”تم شاید وہی شخص ہو جس نے ماسٹر کا حوالہ دیا تھا لیکن..... اس طرح چوروں کے انداز میں
 اندر داخل ہونے کی جرأت تم نے کیسے کی؟“

”ماسٹر کا حوالہ دینے کے بعد تمہارا یہ سوال بھی تمہاری ہی طرح احمقانہ معلوم ہو رہا تھا۔“ آنے
 والے نے سپاٹ لہجے میں کہا پھر تمہارے انداز میں سبھی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورت کو گھورتے ہوئے
 بولا۔ ”اس کم ذات کو ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دو تمہیں وقتی طور پر بے ہوش کرنا میری ذمہ داری ہو
 گی۔“

”تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“ مرد نے مزاحمت کی کوشش کی۔ ”اگر باس کو علم ہو گیا تو وہ تمہیں
 کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

”وقت ضائع کرنے کی حماقت نہ کرو۔“ آنے والے نے غرا کر کہا۔ ”صرف جو کہا گیا ہے
 اس کی تعمیل کرو۔۔۔۔۔۔ ورنہ مجھے تمہاری موت کی بھی کوئی پروا ہی نہیں ہوگی۔“

”تم نے ماسٹر کا حوالہ دیا تو پھر تمہاری آمد کا کوئی خاص مقصد بھی ضرور ہوگا۔“ کوارٹر میں رہنے
 والے نے سوال کیا لیکن..... پھر جو بھی ہوا اتنا آنا فانا ہوا کہ عورت نے بھی اپنی آواز گھونٹنے کے لیے
 سبے ہوئے انداز میں اپنے منہ پر دوسرا ہاتھ بڑی مضبوطی سے جمالیا۔ آنے والے نے اچانک ہی
 برقی رفتاری سے لپک کر ایسا پناہا ہاتھ گھمایا تھا کہ دوسرے فریق کے ہاتھ سے چادر بھی چھوٹ
 گئی۔ وہ بے ہوش ہو کر فرش پر اوندھ گیا تھا۔ پھر اس نے عورت کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں
 خون کے شعلے لپک رہے تھے۔

”نن..... نن..... نن..... مجھے مت مارنا..... تت..... تم جو کہو گے م..... م..... مانوں گی۔“ عورت
 گھٹکیانے لگی۔

جینز والا مسکراتا ہوا اس کے قریب آ گیا اس کی اوڑھنی کھینٹ کر دوبارہ اس کے جسم کو کسی
 کپڑے کی قید سے یکسر آزاد کر دیا۔ چند لمحے تک اس کے ننگے وجود کو حشرات بھری نظروں سے گھورتا

رہا پھر اس کا ہاتھ دوبارہ برقی رفتاری سے گھوما تو عورت بھی منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر اوندھ
 گئی۔

ان دونوں سے فارغ ہو کر جینز والے کو اس زمین دوز کمرے کو تلاش میں زیادہ وقت نہیں لگا
 ہوا ایک خاص میکنیزم سے کھلتا تھا۔ بظاہر وہ ایک دیوار گیر کلاک تھا جس کے اندر اس چور میکنیزم کو تلاش
 کر لینا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں تھا جسے وائر لیس کے اصول پر استعمال کیا جاتا تھا۔

تہ خانے میں ایسی بے شمار چیزیں تھیں جو مرد کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں لیکن جینز
 والے نے صرف ایک مخصوص لفافے پر اکتفا کیا جو ککڑی کے ایک الماری میں رکھے ہوئے کاغذات
 لے ڈھیر کے نیچے پڑا تھا لفافہ کھول کر ایک نظر دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خون خمتانے لگا لیکن اس
 وقت اس نے کسی جذباتی حرکت کا اظہار نہیں کیا جب سے جیب سے لائسنس نکال کر اس نے لفافے اور
 اس کے اندر موجود چار عدد تصویروں کو جلا کر رکھ لیا پھر نہایت اطمینان سے سگریٹ جلا کر اس کا کش
 اگاتا ہوا اوپر آ گیا۔ کوارٹر سے واپسی کے وقت اس نے مکان کا صدر دروازہ ہی استعمال کیا تھا پھر
 وہاں سے مرکزی سڑک تک آنے پر اسے بمشکل پندرہ منٹ لگے تھے۔



لوچن سوتے سے اچانک اس طرح ہڑبڑا کر جاگا تھا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈنگ مار دیا
 ہو، فوری طور پر اس کی نظر وشنو کے خالی پیڈ پر پڑی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے اس نے
 اٹھ کر واش روم میں جھانکا جو خالی ملا۔ فوری طور پر اس نے وشنو کو موبائل پر کال کیا لیکن دوسری
 جانب سے ”پاور ڈ آف“ کا ریکارڈ میسج سننے کے بعد اس کی پیشانی ٹھن آلود ہو گئی۔

وہ اس بات سے یہ خوں واقف تھا کہ وشنو انٹر پول کو بھی مطلوب تھا لیکن ابھی تک وہ ان کے
 ہاتھ نہیں لگا تھا۔ ہر بڑے مجرم کی طرح وہ میک اپ کے فن میں بھی اتنی مہارت رکھتا تھا جس کے بعد
 کہ لے لوگ بھی شاید اس کو شناخت نہ کر سکتے، شیخ حامد کا تحفظ مل جانے کے بعد اسے کسی بات کی فکر
 ہی نہیں تھی۔

لوچن یہ بھی جانتا تھا کہ کڑل احتشام اور ایس پی اورنگ زیب نے اگر ان دونوں کو فرار کا
 وہم و گمان کیا تھا تو ان کی طرف سے غافل بھی نہ ہوں گے، کچھ ماہر کمانڈرز بھی ان کی نگرانی پر ضرور
 مامور ہوں گے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود لوچن کو اس بات کی فکر لاحق تھی کہ وشنو کہاں چلا گیا؟
 اسے ابھی طرح یاد تھا کہ تقریباً ساڑھے نو بجے ڈرائنگ روم سے واپسی کے بعد اس نے وشنو
 کی لاش پر روم سروس سے کافی طلب کی تھی کافی پینے سے قبل وہ منہ دھونے کے ارادے سے واش
 روم میں گیا تھا۔ غالباً اسی دوران وشنو نے کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کافی میں کوئی ایسی خواب آور
 دوا کھلائی تھی جس کی وجہ سے لوچن کافی پینے کے تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہی انا غفلت ہو گیا تھا
 اس وقت جب رات کے ساڑھے بارہ بجے اس کی آنکھ کھلی تو وشنو اپنے بستر پر نہیں تھا لیکن
 وہاں ماماں ہستور الماری میں موجود تھا۔

لوچن پر دشمنو کے فرار کی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی تھی۔ اسے صرف دشمنو کے قریب رہ کر اس کی نقل و حرکت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی جس کی اطلاع وہ اورنگ زیب کو دیتا رہا تھا۔ بہر حال اس کی وقتی جلاہٹ کا سبب صرف اتنا تھا کہ دشمنو اسے ڈاج دے کر صاف نکل گیا تھا۔ اسے اس بات کی امید بھی تھی کہ دشمنو ان لوگوں کو ڈاج نہیں دے سکے گا جو اس کی نگرانی پر مامور ہوں گے لیکن اس کا یہ یقین بھی اس وقت بکھر گیا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر آنے والا دشمنو کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ لوچن کو جانتے دیکھ کر دشمنو کے چہرے پر ایسی ہی مسکراہٹ ابھری تھی جیسے وہ اس کی بے بسی کو دیکھ کر اپنی برتری پر خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔

”کہاں چلے گئے تھے؟“ لوچن نے سرسری انداز میں پوچھا اس نے فوری طور پر کسی رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

”اپنی ایک پرانی مجبوری کو ختم کرنے گیا تھا جو میرے پیروں کی بیڑی بنی ہوئی تھی۔“ دشمنو نے آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ”اب میں کسی کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہوسکوں گا۔“ ”یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے جس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔“ لوچن شانے اچکا کر بولا۔ ”مجھے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں تم ان لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہو جو ہماری نگرانی سے غافل نہیں ہوں گے۔“

”ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہاری اس فکری قدر کرتا ہوں لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میک اپ میں ہماری ماں بھی ہمیں اکثر نہیں پہچان سکتی۔“ دشمنو نے لوچن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں نگرانی کرنے والوں کی ناک کے نیچے سے سینہ تان کر گزر گیا تھا لیکن اس وقت میں ایسے میک اپ میں تھا کہ شاید تم بھی مجھے دشمنو ماننے سے انکار کر دیتے۔“

”اوٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے خود کو سب سے بڑا ہی سمجھتا ہے۔“ جواب میں لوچن نے بھی اسے اپنی برتری کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہاری فکر کسی اور وجہ سے تھی۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ دشمنو نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”اسے ایک اتفاق ہی سمجھو کہ وقت اور حالات نے ہم دونوں کو ملا دیا ہے۔ ان نجات میں یہی چاہوں گا کہ ہم ایک دوسرے پر اپنی سبقت کا اظہار کرنے کے بجائے صرف دوستوں کی طرح رہیں۔“ لوچن کے تہہ تیہ کیے ہوئے۔ ”آئندہ خیال رکھنا۔“

”تم بھی شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“ میں نے بھی کسی کا پابند نہیں سمجھا۔ ”دشمنو نے غلط انداز میں کہا۔“ میں بھی یہی چاہوں گا ہم جب تک ساتھ رہیں ہمارے بیچ دوستی ہی کا سبند رہے۔“

”تم ابھی اپنی کسی ذاتی مجبوری کی بات کر رہے تھے؟“ لوچن نے مسکرا کر دریافت کیا۔ ”ہاں!۔۔۔۔۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“ دشمنو نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ کلونت کی کچھ گندی تصویریں تھیں جو کسی کے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ میں نے اب انہیں جلا کر رکھ کر دیا ہے۔“

”حیرت ہے۔۔۔۔۔“ لوچن نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔ ”جب تم کلونت کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر چکے تھے تو اب تمہیں کس بات کی فکر تھی؟“

”تم۔۔۔۔۔ تم ان باتوں کو۔۔۔۔۔“ دشمنو نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر کہا۔ ”کوئی اور بات کرو میرے دوست۔“

”کافی منگواؤں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ تم کچھ کچھ اداس نظر آ رہے ہو ایسے لمحوں میں کافی سکون بخش ہوتی ہے۔“

”منگالو۔۔۔۔۔“ دشمنو نے چپیتے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”اس بار میں اس میں کوئی ایسی دوا نہیں شامل کروں گا جو تمہیں بے ہوش کر دے میں نے پہلے جو کیا اس پر شرمندہ ہوں مائی ڈیئر لیکن۔۔۔۔۔ وہ میری ضرورت تھی اس کے بغیر غالباً مجھے جانے بھی نہ دیتے۔“

لوچن نے دشمنو کے چہرے کا بہ نظر غور جائزہ لیا۔ کلونت کا نام سن کر وہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی جذباتی ہو گیا تھا اس نے کھلے دل سے اپنی شرمندگی کا اظہار کر دیا تھا۔ لوچن نے ریسیور اٹھا کر روم سرورس کو کافی کا آرڈر دیا پھر اس نے دشمنو کو کریدنے کی خاطر خلا میں گھورتے ہوئے کہا تھا۔

”پولیٹس اور فٹری کے بڑے بڑے دماغ بھی ابھی تک شیخ حامد یا آکٹوپس کے سلسلے میں قیاس آرائی کر رہے ہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔۔۔؟“ دشمنو نے مسکرا کر پوچھا۔

”میری ذاتی معلومات کے مطابق اس کا تعلق بھی انڈر ورلڈ سے تھا۔ وہ زندہ ہے یا مر گیا؟ اس سے میری محبت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”مجھے بھی اپنا ہم خیال ہی سمجھو۔“ دشمنو نے اس بار قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہم اپنی ضرورت ہی کی خاطر دوسروں کے لیے خود کو خطرات میں ڈالتے ہیں۔ مجرم ماں کی ککھ سے جنم نہیں لیتا۔ وقت اور حالات ہی انسان کو اچھے یا برے راستے پر ڈالنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔“

”ایک بات پوچھوں؟“ لوچن سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”ضرور پوچھو۔۔۔۔۔ دشمنو سے غلط بیانی نہیں کرے گا۔“

”اگر آکٹوپس زندہ ہوا تو کیا تم اب بھی اس کے لیے کام کرو گے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ بالکل اسی طرح جس طرح تم کسی معاہدے کو پورا کرنے کی خاطر ایک عورت کے لیے کام کر رہے ہو۔۔۔۔۔ میری بات کو غلط نہ سمجھنا میرے دوست۔ ہم دونوں کا تعلق ان لوگوں میں سے ہے جو کبھی کسی معاہدے کی مدت پوری ہونے سے پیشتر اپنے وعدے سے منہ نہیں پھیراتے۔“

لوچن کوئی معقول جواب دینے کے لیے پرتول رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی دشمنو نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ہوٹل کا کارندہ مطلوبہ کافی لے کر آیا تھا۔ لوچن کافی بنانے میں مصروف ہو گیا لیکن دشمنو کی کہی ہوئی بات کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

دشمنو نے جو کہا وہ غلط بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔!

اس وقت سراج دفتر جانے کے بجائے سیدھا اورنگ زیب کے آفس پہنچا تھا۔ وہ راستے ہی میں تھا جب اسے اورنگ زیب کی کال موصول ہوئی تھی چنانچہ اس نے گاڑی کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ اورنگ زیب اسے باہر ہی منتظر ملا تھا اسی کی فرمائش پر سراج نے اپنی گاڑی ایک طرف پارک کی پھر وہ بھی اورنگ زیب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اورنگ زیب اس وقت یا تو موڈ میں نہیں تھا یا اس کا ذہن کسی اہم دفتری کام کے سلسلے میں الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر سراج نے گفتگو کی ابتدا کی۔

”اس وقت کہاں کا ارادہ ہے؟“

”ڈی آئی جی صاحب نے طلب کیا ہے۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ میں اکیلا ان کی خدمت میں پیش ہوں۔“

”ایسی صورت میں کیا میرا آپ کے ہمراہ جانا.....“

”فکر نہ کرو..... میں خود تمہیں ڈی آئی جی کے کمرے میں نہیں لے جاؤں گا۔“

سراج نے خاموشی اختیار کی۔ اسے علم تھا کہ اورنگ زیب نے اپنے ذاتی معاملات میں کبھی کسی آفیسر کی دخل اندازی قبول نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی اگر اس نے سراج کو ساتھ لیا تھا تو اس کا مقصد بھی ڈی آئی جی کو یہ احساس دلانا ہو گا کہ دفتری احکامات سے ہٹ کر وہ اس کی چودھراہٹ قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ہوا بھی ایسا ہی تھا۔ ڈی آئی جی آفس کے احاطے میں داخل ہو کر اس نے اپنی گاڑی انسپکٹر ٹریفک کے دفتر کے عین سامنے روکی تھی۔ سراج خاموشی سے اورنگ زیب کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ راستے میں اس نے مختصر انداز میں راحیلہ بیگم کی کار کو ٹکڑ مار کر فرار ہونے کی واردات سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

”آپ نے کیوں زحمت اٹھائی سر؟“ ٹریفک انسپکٹر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے انکساری کا اظہار کیا۔ ”کوئی کام درپیش تھا تو ایک فون کر دیتے۔“

”شکریہ انسپکٹر!“ اورنگ زیب مسکرا کر بولا۔ ”میں اس وقت مسٹر سراج کے ساتھ ایک کام سے نکلا تھا کہ ڈی آئی جی کی کال آگئی۔ اس لیے تم میری خاطر مسٹر سراج کی آؤ بھگت کرو۔ میں فارغ ہو کر آتا ہوں۔“

اورنگ زیب ورائٹے میں قدم اٹھاتا ڈی آئی جی کے کمرے کی سمت روانہ ہو گیا، انسپکٹر ٹریفک نے سراج کے ساتھ کچھ وقت گزارنا بھی اپنے لیے اعزاز سمجھا۔ ایک ہی جھکے میں ہوتے ہوئے اسے بخوبی علم تھا کہ سراج بھی اورنگ زیب کی طرح ان ایماندار اور دہنگ افسروں میں شمار کیا جاتا تھا جو اپنے فرائض دیانتداری سے انجام دینے کے عادی تھے۔

دوسری جانب اورنگ زیب حسب معمول باہر کھڑے کانسٹیبل کے سیلیوٹ کا جواب دیتا ہوا ڈی آئی جی کے کمرے میں داخل ہوا جہاں اس وقت تین اخبار کے سینئر رپورٹر بھی موجود تھے۔ تینوں

لے ای آئی جی سے ذاتی مراسم تھے شاید اسی لیے کسی پریس کانفرنس کے بجائے ان تینوں کو کسی خاص مقصد سے بلایا گیا تھا۔

اورنگ زیب کے سلام کا جواب دیتے وقت ڈی آئی جی کے چہرے پر بس ایک ہلکے لیے طراہٹ ابھری پھر..... اس نے اورنگ زیب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے تینوں رپورٹرز کی جانب اچھٹے ہوئے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آکٹوپس..... آکٹوپس..... آکٹوپس!..... اب یہ نام اور اس کی مہر کو دہشت پھیلانے کی خاطر خوف کی علامت کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ چھوٹے موٹے بد معاش بھی اب اس نام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں جس کا فوری تدارک وقت کی اہم ضرورت ہے۔“

”آپ کا خیال درست ہے۔“ ایک رپورٹر نے جواب دیا۔ ”اس کا سدباب اشد ضروری ہے ورنہ دبا بھی کسی متعدی مرض کی طرح پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔“

”لیکن ہم میڈیا کے لوگ اس ضمن میں کیا روک تھام کر سکتے ہیں؟“ دوسرے نے ڈی آئی جی سے سوال کیا۔

”جو خبریں ہمیں اپنے پولیس کے ذرائع سے ملتی ہیں ہم انہی کو تھوڑی سی ترمیم اور اضافہ کے بعد عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔“

”پولیس نے اب تک مسٹر لودھی کے سلسلے میں کیا پیش رفت کی ہے.....؟“ تیسرے نے اپنی معلومات کے لیے دریافت کیا۔

”کچھ مخصوص نام پولیس کے نوٹس میں آئے ہیں جس کی چھان بین کی جا رہی ہے۔“ ڈی آئی جی نے روایتی جواب دیا پھر کرسی پر کسمسا کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر اخبارات آکٹوپس کی ضمن میں خبروں کی اشاعت بند کر دیں تو اس نام سے فائدہ اٹھانے والوں کی حوصلہ شکنی بھی بڑی حد تک ہو جائے گی۔“

”اس کے لیے آپ کو آفیشلی طور پر پریس کانفرنس کرنا ضروری ہے۔“ ایک رپورٹر نے کہا۔ ”صرف ہم تین اخباروں کی خاموشی سے کام نہیں چلے گا، شام کے اخبارات کو اور کھل کر کھیلنے کا موقع مل جائے گا ہمارے مالکان بھی اس کو پسند نہیں کریں گے۔“

ڈی آئی جی کچھ جواب دیتا چاہتا تھا کہ دوسرے رپورٹر نے جھپٹتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”کیا مسٹر لودھی کے علاوہ بھی کسی واردات میں آکٹوپس کا علامتی نشان ملا ہے جو پولیس کے ذرائع ہمیں دینے سے گریز کر رہے ہیں؟“

اورنگ زیب نے سوال کرنے والے رپورٹر کو غور سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں، دستور خاموشی کی طرح بیٹھا رہا۔ ویسے اس کے ذہن میں رستم علی آغا خانی کا وہ بدلفاظ ضرور ابھرا تھا جو براہ راست نہیں بلکہ ملٹری کے ریٹائرڈ میجر عاطف کے خفیہ ذرائع سے اس تک پہنچایا گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ خبر کسی ذریعے سے لیک بھی ہو گئی ہو۔ بہر حال ڈی آئی جی کی موجود جھلاہٹ کی صرف ایک ہی

وجہ اس کے ذہن میں ابھری تھی۔ شاید میڈم روبی نے سراج اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد شادی کے سلسلے میں ایسی کوئی بات ضرور کر دی تھی جو ڈی آئی جی کے ارمانوں پر اس بن کر طاردار گئی تھی۔

”محترم.....“ ڈی آئی جی نے خاص طور پر اس اخباری نمائندے کو مخاطب کیا جس نے پورا ذرائع کی رازداری کے شے کا اظہار کیا تھا۔ ”آپ کے ذہن میں یہ خیال کس وجہ سے ابھرا کہ ہم خبریں..... خاص طور پر آنکلوپس کے سلسلے میں آپ تک نہیں پہنچاتے؟ اگر ایسی بات ہوتی تو میں وقت خصوصی طور پر آپ حضرات کو زحمت نہ دیتا۔“

”ہمارے ذہن بھی انسائیکلو پیڈیا ہوتے ہیں جناب جن میں ساری معلومات محفوظ ہیں۔“ رپورٹر نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے ایک زمانے میں شیخ حامد اور سیٹھ کے درمیان کچھ کاروباری معاملات کی وجہ سے ٹھن گئی تھی۔ کسی ٹرک نے ان کی گاڑی کو اس وقت مار کر تباہ کر دیا تھا جب وہ کچھ دیر پہلے ہی گاڑی سے اتر کر ایک سپراسٹور میں گئے تھے۔ ڈرائیور لیاقت حسین گاڑی کو دور لے گیا تھا اور وہ بھی موت کی لپیٹ میں آتے آتے بال بال تھا۔“ رپورٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہمیں اپنے ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ کل دوبارہ کسی ڈان رجسٹرڈ گاڑی نے اس وقت سیٹھ عثمان کی گھریلو استعمال والی کار کو خطرناک طور پر ایک مصروف روڈ پر سائڈ ماری تھی جہاں کوئی بڑا حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔ اس بار بھی میری ذاتی ا کے مطابق لیاقت حسین ہی گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا جس نے سامنے سے آنے والے لوڈنگ ٹرک کار کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ اب وہ گاڑی ایک ورکشاپ میں کھڑی ہے۔ کیا آپ کو اس کی ا نہیں ملی؟“

”جی نہیں..... میں یہ بات اس وقت آپ ہی کی زبانی سن رہا ہوں۔“ ڈی آئی جی نے راجواب دینے کے بعد اورنگ زیب کی سمت دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا آپ کو اس بات کی اطلاع ہے؟“ ”یہاں سے جانے کے بعد براہ راست سیٹھ عثمان سے کفرم کروں گا۔“ اورنگ زیب دیدہ و دانستہ گول مول جواب دیا۔

”حیرت ہے.....“ رپورٹر نے خاص طور پر اورنگ زیب کی طرف گھوم کر چبھتے ہوئے میں کہا۔ ”یہ بات سب جانتے ہیں کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر سراج اور سیٹھ عثمان کلاس فیلو رہ چکے اور ادھر کچھ عرصے سے آپ اور مسٹر سراج ایک ساتھ ہی نظر آتے ہیں۔“

”میں آپ کی بات سے انکار نہیں کروں گا میرے دوست۔“ اورنگ زیب نے بے تکلف کہا۔ ”لیکن مسٹر سراج کا میرے ساتھ نظر آنا قطعی آفیشل ہے میں مل جل کر کام کرنے کا ہوں۔ دفتری معاملات کے علاوہ سراج سے میری ذاتی دوستی بھی ہے میں اکثر اپنا قاتلو وقت گھر پر گزارتا ہوں آپ اپنی معلومات میں میری نجی مصروفیات کا بھی اضافہ کر لیں۔ میں میڈ کوئی بات چھپانے کا عادی بھی نہیں ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کو شاید اس وقت میری بات اچھی نہیں لگی۔“ رپورٹر نے پہلو بدل لڑکھا۔ ”اگر ایسا ہے تو میں.....“

”پلیز مائی ڈیر.....“ اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”میڈیا کی کوئی تنقید مجھے بری نہیں لگتی بشرطیکہ وہ تحریبی نہ ہو۔ اس جملے کی مزید وضاحت کر دوں کہ ”کالی بھیریں“ ہمارے علاوہ میڈیا گروپس میں بھی ہیں جو بلیک میلنگ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔“

”میں کالی بھیروں کے سلسلے میں آپ کی تفصیلی وضاحت کی قدر کرتا ہوں۔“ رپورٹر کا لہجہ معنی خیز تھا جسے اورنگ زیب نے مسکرا کر ٹال دیا لیکن ڈی آئی جی اپنی کرسی پر کسمسا کر رہ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ رپورٹر کی توجہ اپنی جانب کرنے کی خاطر کہا۔

”آنکلوپس کے معاملے میں میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ پریس کافرنس بلائی جائے۔ بہر حال ملٹری انٹیلی جنس اور پولیس کے بیشتر افسران کا یہی خیال ہے کہ شیخ حامد اور بیلی کا پٹر سے اس کے ساتھ چھلانگ لگانے والا دونوں کا اب کوئی وجود باقی نہیں رہا۔“

”میڈیا نے بھی یہی تشہیر کی تھی لیکن آپ کے مسٹر اورنگ زیب نے ایک سوال کے جواب میں.....“

”یہ میرا قطعی ذاتی خیال ہے جو ممکن ہے غلط بھی ہو۔“ اورنگ زیب درمیان میں بول پڑا۔ ”لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ جب تک میں اپنی نظروں سے اس کی لاش نہیں دیکھ لیتا اس کی موت کا تعین بھی نہیں کر سکتا۔“

”آپ کی اس منطق کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوگی۔“ ایک رپورٹر نے سوال کیا۔ ”میری منطق میرا وہم بھی ہو سکتی ہے مائی ڈیر..... اس کے باوجود میں فی الحال اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔“

کچھ دیر اسی موضوع پر بات ہوتی رہی پھر ڈی آئی جی نے کہیں جانے کا بہانہ کر کے رپورٹر کو رخصت کر دیا اس کے بعد اس نے ایک لمبی سانس لے کر اورنگ زیب کی طرف ڈیکھا مدم لہجے میں بولا۔

”میں نے اس وقت آپ کو دو مقاصد کی خاطر بلایا تھا۔ ایک یہ کہ آپ میری اور میرے پاس آنے والے اخباری نمائندوں کی بات بھی سن لیں دوسرے یہ کہ مجھے ایک ذاتی کام میں آپ کی مدد کی ضرورت بھی درپیش ہے اسی غرض سے میں نے آپ سے تنہا آنے کی درخواست کی تھی۔“

”اگر میں آپ کے کسی کام آسکا تو میری خوش قسمتی ہوگی۔“ اورنگ زیب سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”لوڈھی کے وحشیانہ قتل کے سلسلے میں غالباً میڈم روبی نے مسٹر سراج اور آپ سے بھی گفتگو کی تھی۔“

”آئی۔سی۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو شاید میڈم نے اپنی انجمنٹ کے سلسلے میں آپ سے براہ راست بھی کچھ گفتگو ضرور کی ہے۔“

”یو آر رائٹ.....“ ڈی آئی جی نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”یقین ہے کہ سراج اور ان کی سزاس معاملے میں میڈم کو ہموار کر سکتے ہیں اور..... آکٹوپس کے سیل میں آپ کو بھی میری خاطر اپنے انداز کچھ چلک پیدا کرنی ہوگی۔“

”اگر اجازت ہو تو آپ کے اس ذاتی مسئلے کا ایک ریڈی میڈ حل فوری پیش کر دوں۔“ جوار میں اورنگ زیب نے بھی بے تکلفی سے کہا۔

”پلیز.....“

”آپ ایک دو دن میں کسی بھی تقریب کا بہانہ کر کے میڈم سراج اور الماس کو اپنے دولت خانے پر انوائٹ کر لیں“ آپ کے بے حد اصرار پر میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔ مجھے قوی امید ہے اس پارٹی کے بعد آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

ڈی آئی جی نے اس تجویز کو فوری طور پر قبول کیا تو اورنگ زیب نے اٹھ کر بڑی گرجوٹی سے اس سے ہاتھ ملایا اور..... ”وش یو گڈ لک!“ کہتا ہوا واپسی کی اجازت حاصل کر کے کمرے سے باہر آ گیا۔

”آج آپ کو کس مقصد سے طلب کیا گیا تھا؟“ واپسی میں سراج نے اورنگ زیب کو سنجیدہ دیکھ کر پوچھا۔

”کوئی اہم بات تھی؟“

”اہم نہیں بلکہ سنگین ترین سمجھو.....“

”خیریت.....؟“

”فی الحال یہ سمجھ لو کہ میں اس وقت ایک موٹا تازہ بکرا حلال کر آیا ہوں اس لیے تھکن محسوس ہو رہی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں.....“

جواب میں اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کی میڈم کے سلسلے میں کسپری کی کیفیت کچھ ایسے دل گرفتہ انداز میں بیان کی کہ سراج بھی اپنی بے اختیار ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔

راستے بھر اپنے ذہن کو ریفریش کرنے کی خاطر اورنگ زیب ڈی آئی جی اور میڈم روبی کے موضوع پر مختلف زاویوں سے گفتگو کرتا رہا لیکن دفتر پہنچنے کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے گہری سنجیدگی اختیار کر لی۔ ڈیوٹی کا نشیل کو بلا کر اس نے ملاقات کے لیے آنے والوں کے سلسلے میں کچھ ضروری ہدایتیں دیں پھر اس کے جانے کے بعد سراج سے پوچھا۔

”مسٹر عثمان کو کل جو حادثہ پیش آئے آتے رہ گیا اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں شوروم والے سے ملا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ دو جوان جو ظاہر کھاتے پیتے گھر آنے کے لگتے تھے وہ گاڑیاں دیکھنے آئے تھے۔ ان میں ایک نے گاڑی کی ٹرائی لینے کی بات کی تھی۔ دوسرا بطور ضمانت شوروم پر بیٹھا رہا پھر وہ بھی کارندوں کی نظر بچا کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ بعد میں گاڑی میں بھی

کوئی نوٹ پھوٹ نہیں پائی گئی۔ سوائے اس حصے کو جو لوڈنگ ٹرک سے رگڑ گیا تھا۔“ سراج نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ یہ ایک اتفاقیہ حادثہ ہو جس کے بعد دونوں نوجوان پولیس سے دامن بچانے کی خاطر گاڑی چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں۔ بہر حال میں نے اسٹیزنگ پر ملنے والے نشانات حاصل کر لیے ہیں۔“

”کیا مسز عثمان کا بھی یہی خیال ہے؟“

”انہوں نے کوئی بات یقین سے نہیں کی البتہ لیاقت حسین کا کہنا ہے جو کچھ ہوا وہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا گیا تھا۔“

”میں لیاقت حسین کے خیال کی تائید کروں گا۔“ اورنگ زیب نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر اسٹیزنگ پر وہ نہ ہوتا تو خدا خواستہ جانی نقصان بھی ہو سکتا تھا۔“

”لیکن مسز عثمان کو نقصان پہنچا کر وہ کیا فائدہ حاصل کر سکتے تھے؟“

جواب سن کر اورنگ زیب کے ہونٹوں کو ایک لمحے کو جنبش ہوئی پھر وہ بڑی دیر تک کسی سوچ میں غرق رہنے کے بعد بولا۔ ”سمندر کی تہ میں چھپ کر سکون حاصل کرنے والی مخلوق بھی اکثر جس اور گرمی کی شدت سے گھبرا کر باہر آ جاتی ہے۔ آکٹوپس کو نہایت سخت جان تصور کیا جاتا ہے وہ بھی سمندر کے نچلے حصوں میں رہ کر اپنی خونخوار ٹانگوں سے شکار کرتا ہے مگر میں.....“ اورنگ زیب کچھ کہتے کہتے رکا پھر میز پر دونوں کہنیاں ٹکا کر سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”میں اس وقت جس آکٹوپس کی بات کر رہا ہوں وہ بھی اب سمندر کی تہوں سے نکل کر اوپر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ سراج نے پہلو بدل کر اورنگ زیب کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ جواب میں اورنگ زیب نے اٹھ کر الماری سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ سراج نے اسے کھول کر دیکھا۔ ”برہنہ فوٹوز کو اس نے فوری طور پر پلٹ کر رکھ دیا تھا لیکن اس پر آکٹوپس کی مہر اور پھر ٹاپ شدہ پیغام پڑھنے کے بعد اس کی پیشانی پر بھی آڑی ترچھی لکیریں ابھرنے لگیں۔“

”پہلے لودھی کو اس کی غداری کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد رستم علی کو زبان بند رکھنے اور پولیس سے دور رہنے کی خاطر یہ تصویریں بھیجی گئیں پھر مسز عثمان کو حادثہ بھی پیش آئے آتے رہ گیا..... نہیں مائی ڈیئر سراج نہیں..... واقعات جس تسلسل اور تیزی سے سامنے آ رہے ہیں اسے محض اتفاق نہیں کہا سکتا..... بڑے مجرم پولیس کو اپنی برتری کا احساس دلانے کی خاطر اسی قسم کی چھچھوری حرکتیں کرنے کا عادی ہوتے ہیں۔“

”یہ تصویر اور خط آپ کو کس طرح ملا؟“ سراج نے سوال کیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”مجھے کم از کم رستم علی آغا خانی سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ دریا میں رہ کر براہ راست کسی بڑے مگر مجھ سے بیرمول لینے کی غلطی کر سکتا ہے۔“

”تمہارا اندازہ صد فیصد دوست ہے۔ سر بند لفاظہ مجھے جس شخص کے ذریعے ملا ہے وہ ابھی مجرموں کی نظروں میں نہیں ہے ورنہ آئندہ شکار وہی ہوتا۔“

”آئی سی“ سراج نے ہونٹ کانٹے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب ہمارے بھی جوانی کاروائی کا وقت آگیا ہے۔“

”مجھے تمہارا جواب سن کر خوشی ہوئی..... آکٹوپس یا اس کے کسی ہمزاد کو سامنے لانے کا ایک موثر طریقہ ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”ہمیں ایسے تالابوں کو بانی کو موجودگی سے محروم کرنا پڑے گا جہاں چھپ کر وہ سانس لے رہے۔“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے ایسے جذباتی انداز میں یہ بات کہی کہ سراج بھی کڑبڑ کر رہ گیا اس کی نگاہوں میں مچلنے والی سرخی کچھ خطرناک عزائم کی غمازی کر رہی تھی۔ سراج اس تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر وہ کچھ کہنے کا ارادہ کر رہا تھا جب اورنگ زیب نے دراز سے دوسرا موبائل نکالا جسے وہ اپنے خاص خاص ذرائع سے کوڈورڈز میں بات کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

موبائل پر کسی کے نمبر بیخ کرنے کے بعد وہ خلا میں گھورتا رہا پھر دوسری جانب سے رابطہ قائم ہونے کے بعد یکلخت آواز بدل کر کوڈورڈز میں کہا۔ ”کوایفائنڈ ٹیم از ریکوارڈ..... بات..... کڈنی..... نو..... ویٹ فارٹائنٹ کال..... اور..... کے..... اور۔“

کال ختم کرنے کے بعد بھی اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات میں کھچاؤ کی کیفیت باقی رہی تو سراج نے ماحول کی اس گھٹن اور تناؤ کو دور کرنے کی خاطر بے تکلفی سے پوچھا۔

”آپ کی ہی لاطینی زبان اور مخصوص کوڈز میری سمجھ میں کب آئیں گے؟“

”شاید کبھی نہیں اس لیے..... کہ تم صرف ایک ڈیوٹی مائنڈ پولیس آفیسر ہو۔“

”بات اب بھی میری ناقص عقل میں پوری طرح نہیں سمائی۔“

”پولیس ٹریننگ کے بعد میں نے چھ ماہ تک فوجی ٹریننگ بھی اپنے شوق سے کی تھی۔“ اورنگ زیب نے قدرے ریلیکس ہو کر کہا۔ ”پاسنگ آؤٹ پریڈ کے بعد مجھے بیٹ کیڈٹ کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ اس روز ٹریننگ دینے والے استاد نے مجھے دو باتیں بڑے گرمی بتائی تھیں جو آج بھی عملی زندگی میں میری رہنمائی کرتی ہیں۔ اس سخت ٹرینر کی زبان سے وہ باتیں سن کر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جب تک انسان کسی کی ماں سے رشتہ قائم نہیں کرتا وہ اسے ”باپ“ نہیں کہتا۔ دوسری نصیحت بھی اس وقت میرے لیے ناقابل فہم ہی تھی۔ استاد نے کہا تھا کہ ہتر! اگر دنیا میں لاقانونیت نہ ہوتی تو قانونی محکمے بھی عالم وجود میں نہ آتے۔“

”موجودہ صورت حال سے ان دونوں مثالوں کا کیا تعلق ہے؟“ سراج نے کسمسا کر سوال کیا۔

”فی الحال میں اس کی وضاحت نہیں کروں گا۔“ اورنگ زیب نے موضوع بدل کر کہا۔ ”الماس

”اب خاص خیال رکھنا“ سز عثمان کے بعد اس کا نمبر بھی آسکتا ہے۔ خود اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھنا۔ جو اس کے ذہن میں کسی کن کھجورے کی طرح کلبلا رہی ہے اس کے پیش نظر ہم دونوں بھی کسی کی لاسٹ پر ضرور ہوں گے۔“

”ایک بات کی وضاحت اور چاہوں گا۔“

”پوچھو.....“

”کیا لودمی کے قتل کے بعد جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے مزید جاری رہنے کے امکانات

”امکانات کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں۔“ اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں کندھے اچکا کر جواب دیا پھر وہ اپنے مخصوص موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا جس پر کسی آنے والی کال کی اطلاع کے طور پر نیلی پبلی لائٹ جل بجھ رہی تھی۔

”ہیلو..... اورنگ زیب نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا اس کے چہرے پر پھر سنجیدگی مسلط ہونے لگی زبان سے پھر بے ربط جملے ادا ہونے لگے۔ ”میں سمجھ رہا ہوں..... نہیں ایسا مت کرتا..... ابھی اس کے درمیان میں آنے کی ضرورت نہیں ہے..... ایس او ایس کے اصول کا خیال ہمیشہ کارآمد ثابت ہوتا ہے..... ڈونٹ وری..... اوکے میں خیال رکھوں گا..... نو..... ون بانی ون..... فرنٹ لائن سے دور ہی رہنا..... بانی۔“

سراج ایک بار پھر ہونٹوں کی طرح اورنگ زیب کی شکل دیکھتا رہا۔ کال ختم ہوئی تو اس نے دیدہ و دانستہ مسکرا کر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کا مسئلہ چھیڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے فضا میں بارود کی جومہک محسوس ہو رہی ہے اس کے تحت ضروری ہے کہ ڈی آئی جی کا مسئلہ بھی اونٹ کی طرح کسی کروٹ بیٹھ جائے ورنہ میڈم اور تھتے سے اکھڑی تو پھر آسانی سے نہیں مانے گی۔“

”تم گھر پہنچو گے تو شاید الماس تمہیں اس سلسلے میں کوئی تازہ خبر ضرور سنائے گی۔ ڈی آئی جی اب تک میرے اندازے کے مطابق میڈم اور الماس دونوں کو فون کھڑکا چکا ہوگا۔“

”اس دعوت میں آپ کو خاص طور پر آکٹوپس کے سلسلے میں اپنی رائے میں کچھ ٹک بھی پیدا کرنے پڑے گی۔“

”کوشش کروں گا کہ میں نیوٹرل ہی رہوں۔ ویسے میری ذاتی خواہش ہے کہ اب ان دونوں کا گھر آباد ہو جائے۔“

”میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“ سراج نے دتی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”تم اب آفس جاسکتے ہو میں نے تمہیں خاص طور پر رستم علی کی طرف سے موصول ہونے والا الفاظ دکھانے کی غرض سے بلایا تھا۔“ اورنگ زیب نے جاتے جاتے سراج کو کچھ مخصوص کام بھی سوچنے جن کو سن کر وہ چونکا لیکن کچھ کہے بغیر مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔

تیزی اور تسلسل سے پیش آنے والے حیران کن واقعات نے افضل خان کو ذہنی طور پر بری طرح الجھا رکھا تھا۔ سابقہ باتیں اس وقت بھی اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ اخبارات میں بگ باس کے سمندر برد ہونے کی خبریں کر اس نے سکون ہی کا سانس لیا تھا لیکن ابھی وہ مکمل آزادی نہیں حاصل کر سکا تھا۔

ملٹری اٹلی جنس کے ہاتھوں پھنسنے کے بعد اس نے بھی امداد اعلیٰ اور چکا کی طرح وعدہ معاف گواہ بننا قبول کر لیا تھا اپنا بیان بھی ریکارڈ کر دیا تھا جس کے بعد اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا اور اب اس وقت وہ اس فلیٹ میں تھا جو اسے بگ باس نے دے رکھا تھا۔ اس فلیٹ میں رہائش اختیار کرنے کا حکم اسے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج نے عین اس وقت سامنے آ کر سنایا تھا جب وہ اسپتال سے رخصت ہو رہا تھا۔ سراج نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”افضل خان..... میں تمہیں ایک نئی زندگی کی مبارک باد دیتا ہوں لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو کہ اب تم صرف اور صرف ہمارے کہنے پر عمل کرو گے دوسری صورت میں تمہارا انجام کیا ہو گا یہ تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”مجھے منظور ہے لیکن ایک شرط پر۔“

”سوری.....“ سراج نے زہر خند سے جواب دیا۔

”تم اب اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ کوئی شرط منوا سکو۔“

”آپ اسے میری درخواست سمجھ لیں۔“ افضل خان نے فوری طور پر کینٹنل بدل لی تھی۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں قید رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ مجھے آزاد فضا میں بھی سانس کی اجازت ہونی چاہیے۔“

”میری طرف سے اجازت ہے لیکن یہ بھی بتا دوں کہ تمہارے بگ باس کے کچھ شکاری کتے اب بھی دور دور رہ کر بھونک رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارا پولیس کے لیے کام کرنا پسند نہ کریں۔ ایسی صورت میں تمہاری زندگی میں خطرہ بھی پیش آ سکتا ہے۔“

”یہ میرا مسئلہ ہو گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں خطرات سے کھیلنے کا عادی رہا ہوں۔“

”اوکے“ سراج نے کہا۔ ”دو چار روز تک تم فلیٹ تک ہی محدود رہو۔ میں فائل جواب تمہیں فوری طور پر دینے کی پوریشن میں بھی نہیں ہوں۔“

”ایک بات اور بتا دیں تو ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا۔“ افضل خان نے بل کھا کر دریافت کیا۔

”سائل سمندر پر اس وقت مجھ پر گولی کس نے چلائی تھی جب وہ چکا اور امداد اعلیٰ کو قابو کر چکا تھا۔“

”تم ایک اہم بات بھول رہے ہو افضل خان۔“ سراج نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”محبت اور

جنگ میں تمام حربوں کا استعمال جائز ہوتا ہے وہ فائر بھی تمہارے بگ باس نے تمہیں راستے سے ہٹانے کی خاطر کرایا تھا۔“

”اوہ..... ذیل کر اس۔“ افضل خان کسی زخمی درندے کی طرح بل کھانے لگا۔

”یہ بات تمہیں پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے تھی کہ تمہارا ڈرنٹی بگ باس جن لوگوں کے نام اپنی فہرست سے نکال دیتا تھا ان کو دوبارہ قبول کرنا اس کی سرشت کے منافی تھا۔ حالانکہ تم اس کے دست راست بھی رہ چکے تھے۔“

”اب سارا کیم کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہا ہے لیکن شبینم نے ذیل رول کیوں ادا کیا؟“

”شبینم کو تم غلط مت سمجھو افضل خان۔“ سراج نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”بگ باس کے ہاں ملازمت اس نے کسی اور وجہ سے قبول کی تھی۔“

”اور وجہ..... اور وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“

”میڈم روٹی کی طرح شبینم کا کچھ حساب بھی تمہارے ڈرنٹی بگ باس کی طرف نکلتا تھا لیکن اسے کوئی موقع نہ مل سکا کہ وہ حساب چکنا کر سکتی۔“

”آپ کو اتنے اندر کی باتوں کا علم کس طرح ہوا؟“

”مجھے بہت سی ایسی باتیں بھی معلوم ہیں جن کی گہرائی تک شاید تمہارے فرشتے بھی نہ پہنچ سکیں۔ کل تک شبینم بھی شکاری کتوں کے اشارے پر چلنے کے لیے مجبور تھی لیکن اب اسے تحفظ دینے کی ذمہ داری بھی میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔“ سراج نے کہا۔ ”آج شام تک وہ بھی اپنا ضروری سامان لے کر تمہارے پاس آ جائے گی اور..... تم فکر کرنا..... ہمارے سادہ لباس والے تمہاری گہرائی اور حفاظت پر مامور ہوں گے۔“

افضل خان اس وقت بھی سراج کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا جب دروازے پر کسی نے دستک دی۔ آنے والی شبینم کے سوا کوئی اور نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو بیگ بھی تھے جس میں اس نے شاید اپنی ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں..... اندر آنے کے بعد اس نے افضل خان کو گہری نظروں سے دیکھا پھر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے افضل خان..... حالات کے پیش نظر تم نے سراج صاحب سے جس شے کا اظہار کیا میں اس کے بارے میں تمہارے دل کا میل نہیں دھو سکتی۔ تمہاری طرح فی الوقت میں بھی انہی کے حکم کی تعمیل میں یہاں آئی ہوں۔ کوشش کروں گی کہ تمہارا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کر سکوں۔“

”جب بگ باس کی زندگی میں مجھے اسپتال سے نکالا گیا اس وقت تم کس کے اشارے پر مجھے اپنے فلیٹ پر لے گئی تھیں؟“

”اس وقت تمہاری طرح میں بھی بگ باس کے اشاروں پر عمل کرنے پر مجبور تھی۔“ شبینم نے سال گولی سے جواب دیا۔

”اور اگر انہوں نے بھی سرخ جھنڈی دکھا دی تو.....؟“

”امید پر دنیا قائم ہے۔ ایک ٹرائی کر کے دیکھ لینے میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔“

پھر وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے ایک ٹیکسی آ کر ان کے قریب رکی اس سے اترنے والے دو کانشیل ہی تھے جنہوں نے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی اٹھا رکھا تھا، آنے والے پہرا دیئے والوں کے لیے یا تو سننے تھے یا کسی دوسرے تھانے سے تبادلہ ہو کر آئے تھے۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ دونوں ان کے قریب آ گئے۔ ٹیکسی دور کھڑی رہی۔

”ادھر کیسے آنا ہوا اتنی رات کو؟“ ڈیوٹی دینے والے ایک کانشیل نے آنے والوں سے پوچھا۔

”سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔“ آنے والے نے کہا۔ ”آج ہی دوسری چوکی سے تبدیل ہو کر آئے تھے، کچھ دیر پہلے ہیڈ کانشیل نے ادھر رات کی ڈیوٹی پر بھیج دیا۔ شاید تم نے اس کو کہا ہوگا۔ ہمارا واقف نہیں تھا اس کو اپنا نے ادھر بھیڑ دیا۔ اب تم دونوں جا کر عیش کرو۔“ اس کو اپنا دکھڑا سنانے کے بعد ذرا قریب آ کر کہا۔ ”ٹیکسی والے کو ہم نے قابو کر رکھا ہے، تم اسی پر بیٹھ کر جہاں مرضی چلے جاؤ۔ کرایہ ایک دمڑی بھی نہ دینا سالے کو.....“

”جاتے جاتے اپنی رہائی کی خوشی میں منہ بھی میٹھا کر لو۔“ دوسرے آنے والے نے منٹائی کا ذبہ تھیلے سے نکال کر کہا۔ رات گزارنے کی خاطر ہم اور بھی چیزیں ساتھ لائے ہیں۔“

ڈیوٹی دینے والوں نے بڑے شوق سے لڈو کھائے پھر ایک ہنس کر بولا۔ ”اس کو کہتے ہیں چیر پھاڑ کر دینا۔ ابھی ہم اپنے تبادلے کی بات ہی کر رہے تھے کہ تم آ گئے۔“

”ہم بھی زیادہ دن نہیں رکیں گے دوست۔“ آنے والے نے ایک آنکھ جھپکا کر جواب دیا۔ ”ایس پی کی ایمانداری اپنی جگہ لیکن ہم نے ڈی آئی جی آفس کے ایک وہ بندوں کا بھتہ باندھ رکھا ہے۔ وہ ہمارا کام کرنے سے منہ نہیں موڑ سکتے۔“

چاروں جلد ہی بے تکلف ہو گئے پھر ڈیوٹی دینے والا ایک سیاہی اندر سے اپنا سامان سیننے گیا تو واپس نہیں آیا۔ دوسرا اسے دیکھنے کی خاطر ڈگمگاتا ہوا اٹھا لیکن وہ بھی سنبھل نہ سکا۔ ہاتھ جما کر نیچے ہٹھو گیا لیکن پھر پھر وہ بھی سیدھا ہو کر لمبا لہا لیت گیا۔ آنے والے دونوں سپاہیوں نے ایک دوسرے کو سکرا کر دیکھا پھر ایک نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”ایک مرحلہ تو آسانی سے طے ہو گیا۔ اب ان دونوں کو اٹھا کر ادھر باہر ہی کہیں قریب ڈال دو اس طرح کہ فوری طور پر کسی آنے جانے والے کو نظر بھی نہ آئیں۔“

ٹیکسی ڈرائیور بھی اتر کر دونوں کی مدد کی خاطر آ گیا۔ دونوں بے ہوش کانشیلوں کو ڈنڈا ڈولی کر لے سڑک کی دوسری جانب خالی پلاٹ پر ڈال دیا گیا پھر دراز قد والے نے تھیلا اٹھا کر ٹیکسی ڈرائیور کو ماتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

”تم ادھر باہر کا خیال رکھنا۔ ایک ذرا بھی خطرہ ہو تو مخصوص گنٹل کے ذریعے اشارہ کر دینا۔“

شیخ حامد کی سیل شدہ کوشی پر مستقل رات کی ڈیوٹی کرنے والے دونوں کانشیل اس وقت شکلوں سے بے زار ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ باری باری کوشی کا راؤنڈ لگانے کے بعد کچھ دیر سست کے بہانے ایک ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔ اب بھی وہ راؤنڈ لگانے کے بعد بید کی پرانی کرسیوں پر تو ایک نے اپنی جھلاہٹ کا اظہار کر ہی دیا۔ ”آخر ہم کب تک اس طرح روکھی پھکی حالت میں بھگتاتے رہیں گے؟“

”رات کی مستقبل ڈیوٹی سے میں بھی تنگ آ چکا ہوں۔“ دوسرا بولا۔ ”سب جانتے ہیں کہ مہ تنخواہ سے ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ رات کی ڈیوٹی میں ویسے بھی دس خطرے ہوتے ہیں۔ دن میں چھ گھنٹے کی ڈیوٹی کرنے والے زیادہ عیش کرتے ہیں۔“

”تمہارا کیا مشورہ ہے؟..... کیا ہم اوپر والوں سے بات کریں۔“

”نہیں..... تم بھی جانتے ہو کہ ہماری ڈیوٹی ایس پی صاحب کے اشارے پر لگائی گئی ہے نہ ہوتا تو ہم ہیڈ کانشیل کی مٹھی گرم کر کے بھی ڈیوٹی تبدیل کرا سکتے تھے۔“

”سیل شدہ عمارت کے اندر کون سا قارون کا خزانہ رکھا ہوگا ہم جس کی حفاظت پر تعینات گئے ہیں؟“ دوسرے نے دل برداشتہ انداز میں تمللا کر کہا۔ ”ہم کو آنے میں نمک ملانے کی سزا رہی ہے۔ نمک میں آٹے کی چٹکی ڈال رہے ہوتے تو ایسا نہ ہوتا۔ ہم بھی اس وقت گھروں پر آ، سے ٹانگیں پسارے خراٹے لے رہے ہوتے۔“

”ایک آئیڈیا ہے میرے ذہن میں۔“ پہلے نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ پولہ اسپتال کے بڑے ڈاکٹر کا چہرہ اسی ہماری مشکل آسان کر دے سب جانتے ہیں کہ بیماری کا جو سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لیے ڈاکٹر اسی کے ذریعے رقیں وصول کرتا ہے۔ اس حرام کے ختم نے عہدے اور ضرورت کے اصولوں پر مختلف ریٹ باندھ رکھے ہیں۔“

”ایسی صورت میں بھی ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“

”میرے ذہن میں ایک آئیڈیا اور بھی ہے۔ کیوں نہ ہم اس پر عمل کریں۔“ اس نے اپنی بار جاری رکھی۔

”براہ راست ایس پی صاحب سے مل کر کہیں کہ اب ہماری رات کی مشقت ختم کر کے گھنٹے والی ڈیوٹی لگا دیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن..... دروازے پر جوسل لگی ہے اس کا کیا کرو گے؟“
 ”روشدا انوں کے شیشے زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ انہیں بھی کانٹے کا سامان ہے میرے پاس
 ”دیکھ بھال کر سب کام نمٹاتا۔ باس کا یہی حکم ہے کہ پولیس کا سارا محکمہ کل کبھی اس
 کی تک نہ پہنچ سکے۔ سسٹم پر رینج سیٹ کرنے کا دھیان بھی رکھنا۔ قریب کے بنگلوں کو کوئی نہ
 پہنچے۔“
 ”آخر یہ سب کس مقصد کی خاطر کیا جا رہا ہے؟“ جو ٹیکسی ڈرائیور کی یونیفارم میں تھا
 پہلی بار زبان کھولی۔

”ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کیوں کس لیے اور مقصد جاننے والی بات کر سکیں۔
 والے نے خشک اور سرد لہجہ اختیار کیا۔ ”صرف جو باس نے حکم دیا ہے اس پر عمل کرنے ا
 رکھو۔ کرید کرنے کی ہر ایک باس کے کانوں تک پہنچ گئی تو ہمارا انجام بھی اچھا نہ ہوگا۔“
 اس کے بعد کسی نے زبان کھولنے کی غلطی نہیں کی، درازقند والا ٹیکسی ڈرائیور کا ہاتھ تھا
 کے اندر داخل ہو گیا، باہر نظر آنے والے تیسرے شخص نے صدر پھاٹک کے آس پاس لیفٹ
 شروع کر دی۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے جو قابل غور تھے لیکن وہ بھی
 کہ باس کی طرف سے جاری کیا جانے والا حکم آخری ہوتا ہے اس میں کسی ترمیم اور اضافے کا
 نہیں ہوتا۔ چون و چرا کرنے والوں کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔ اصل باس کون
 انہیں اس کا علم بھی نہیں ہو سکا تھا۔ ان کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ بھی خاصی معقول تھی۔ مہینے میں ایک
 ہی انجام دینے پڑتے تھے لیکن ان کی پلاننگ اتنی مہارت سے کی جاتی تھی کہ ابھی تک پول
 ماہرین بھی اس کا کوئی توڑ دریافت نہیں کر سکے تھے۔

جب تک شیخ حامد زندہ تھا ان کا ایک محتاط انداز یہی تھا کہ وہی اس ٹیم کو خفیہ طور پر اس
 تھا لیکن اس کی موت کی خبر عام ہونے کے بعد ٹیم کے اکثر ورکر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے
 بگ باس مرا نہیں ہے یا پھر اس کی بدروح نے اس کی گدی سنبھال رکھی ہے۔ دونوں صورت
 اوپر سے ملنے والے احکامات کی بجائے آوری ان پر فرض تھی لیکن کچھ باتیں ایسی درمیان
 تھیں جس سے ان کی عقل بھی دنگ رہ جاتی تھی۔

سل بند کوشی اندر سے تباہ کرنے کا فیصلہ بھی اگر شیخ حامد یا اس کی بدروح نے کیا تھا تو
 بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔ ممکن ہے پولیس اور خصوصاً اورنگ زیب کی پوزیشن کا
 نظروں سے گرانے کی خاطر ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ سب کچھ کیا جا رہا ہو؟ وہ اپنے
 سے لہجہ رہا تھا جب اس کے موبائل پر کال ریسپور ہوئی اس نے روشن اسکرین پر نمبر دکا
 ریسپونڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ کال اس درازقند والے کی تھی جو ٹیکسی والے کے ساتھ اندر گیا
 ”کوئی نیا حکم؟“

”میں نے گھوم پھر کر تمام ممکن جگہوں کو کھنگال لیا ہے، بظاہر کسی نہ خانے کا کوئی راستہ

کا۔“

”جانتا ہوں۔“ اس نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ”اگر اس کو تلاش کرنا آسان ہوتا تو
 اب تک پولیس بھی اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکی ہوتی۔“
 ”پھر..... تمہارا کیا مشورہ ہے.....؟“
 ”اوپر والوں سے بات کر کے دیکھ لو.....؟“
 ”تم شاید بھول رہے ہو..... ہمیں کسی کو کال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف اوپر سے ملنے
 والے احکام پر عمل کرنا فرض ہے۔“

”ایسی صورت میں جہاں جہاں شبہ ہو وہاں بھی کام کی چیز فٹ کر کے آجاؤ..... ہو سکتا ہے نہ
 خانے کا راستہ بھی اس کی زد میں آجائے۔“
 ”میرا بھی یہی خیال ہے.....“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

باہر ابوی دینے والا جو اس وقت پولیس کی یونیفارم میں تھا پھر اپنے خیالوں سے الجھنے لگا۔ اگر
 وہ سب شیخ حامد ہی کے خفیہ کارندے تھے تو پھر عمارت میں کسی نہ خانے کا راستہ تلاش کر لینا ان کے
 لیے بھی اتنا ہی مشکل تھا جتنا پولیس کے لیے ثابت ہو چکا تھا ورنہ بگ باس اتنی آسانی سے نظروں میں
 آئے بغیر چھو مٹر ہو کر پہلی کارپٹر تک بھی نہ پہنچا ہوتا۔ اس کے بعد اس کی اور اس کے ساتھی کی لاش کا
 نہ ملنا بھی پولیس کے لیے ایک معما ہی تھا۔ ملٹری کے بڑوں اور پولیس کے ذمے داروں نے اس کی
 موت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ایک ایس پی اورنگ زیب ہی تھا جو مرے کی ایک ٹانگ کی طرح اپنی ضد پر
 قائم تھا۔

چالیس منٹ بعد درازقند والا بھی ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ باہر واپس آ گیا۔ تھیلا اب اس کے
 پاس نہیں تھا، صرف ایک ریوٹ نماڈیو اس تھی جو اس کے ہاتھ میں نظر آ رہی تھی۔
 ”کیا سارا کام مکمل ہو گیا؟“ باہر والے نے اس کے قریب آ کر سوال کیا۔

”ہاں..... ہمیں اب فوری طور پر یہاں سے کچھ دور نکل چلنا چاہیے۔“
 ”ٹھیک ہے لیکن..... تم نے اس بات کا دھیان تو ضرور رکھا ہوگا کہ تباہی صرف اندر اندر
 ہو۔ پاس پڑوس میں صرف افراتفری ہونی چاہیے۔ یہی حکم ملا تھا۔“

درازقند والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاتھوں میں ربڑ کے دستانے ہونے کی وجہ سے یہی
 یقین تھا کہ ان کے فکر پرش کسی کو نہیں مل سکیں گے۔ وہ سب وقت ضائع کیے بغیر ٹیکسی میں بیٹھ گئے
 جس کے بعد وہ بھی حرکت میں آ گئی لیکن تقریباً تین فرلانگ دور جانے کے بعد اسے دوبارہ روک دیا
 گیا۔

درازقند والے نے ادھر ادھر دیکھا، آس پاس کوئی فرد نہیں تھا، رات کے اس پچھلے پہر میں سب
 ہی اپنے نرم و گرم بستر میں پڑے خراٹے لینے میں مصروف ہوں گے۔ اطراف سے پوری طرح
 مطمئن ہونے کے بعد ہی درازقند والے نے ریوٹ نماڈیو اس کا رخ اپنی مطلوبہ عمارت کی طرف کیا

پھر اس کے واحد سرخ بن کو دبا دیا۔ دوسرے ہی پل پے درپے ہونے والے ہماکوں نے بنگلوں اور دوسری رہائشی عمارتوں کی لائیں بھی آن ہونا شروع ہو گئیں۔

ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آنے والے اگلے ہی لمحے گاڑی کو گیر میں ڈالا پھر آہستہ آہستہ لریٹر پر اس کے پیر کا دباؤ بھی بڑھتا ہی رہا۔

یہ پہلا موقع تھا جب سول پولیس کے ساتھ ملٹری انتظامیہ کے ماہرین بھی شیخ حامد کی ہونے والے دھماکے کے سلسلے میں جائے حادثہ سے ضروری شہادتیں حاصل کر رہے تھے۔ جوار کی کوشیوں میں رہائش پذیر افراد بھی سراپا احتجاج بن گئے۔ شیخ حامد کی زندگی میں ان افراد بھی اس کی کوشی کی طرف آنکھ اٹھانے کی بھی غلطی نہیں کی تھی لیکن اب ان سب کا ایک ہی ما کہ اس کوشی کو جڑ سے ختم کر کے وہاں بچوں اور خواتین کا پارک تعمیر کر دیا جائے۔

بہر حال کوشی میں ہونے والے پراسرار دھماکوں نے سب ہی کے ذہنوں میں کوئی سوالیہ نشان بنا دیا تھا۔ دھماکوں کے لیے استعمال ہونے والا آتش گیر مادہ کم طاقت کا تھا جس کوشی کے اندر کے حصوں کو کھنڈر بنانے میں تو موثر کردار ادا کیا تھا لیکن باہر کے ڈھانچے کو زیادہ پھوٹ کا شکار ہونے سے بچا لیا تھا۔ یہ معما بھی سب کے ذہنوں میں کلبلا رہا تھا کہ محض کوشی تباہی کا کیا مقصد تھا؟ اس ضمن میں بھی یہی خیال کیا جا رہا تھا کہ وہاں کوئی ایسی اہم چیز یقیناً موجود تھی جسے تباہ کر دینا ضروری سمجھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی ذہنوں میں کلبلا نا شروع ہو گیا کہ شیخ حامد مرچکا تھا تو پھر اس کے خلاف باقی رہ جانے والے ثبوت بھی پولیس کے لیے کیوں کر سکتے تھے؟

اخباروں نے بھی شیخ حامد کے حوالے سے ان دھماکوں کی خبروں کو بڑھا کر چھاپا تھا؛ ذرا تعینات دونوں کانسٹیبل ہر چند کہ کوشی کے سامنے میدان سے بے ہوشی کی حالت میں ملے تھے ان کو بھی زیر حراست رکھا گیا تھا جو کہانی وہ بتا رہے تھے ان کی روشنی میں بھی بے شمار کہانیاں جنہیں وہی تھیں۔ ایک دو اخبارات نے اورنگ زیب کے اس مفروضے کو بھی باس کی صورت میں صفحہ پر شائع کیا تھا کہ ”آکٹوپس ابھی مرا نہیں..... سمندر کی تہوں میں کہیں چھپا سانس لے رہا تھا۔“

دن بھر کی چھان بین کے بعد کوشی کو دوبارہ لاک کر کے اس پر پھرے کی خاطر پولیس کو میں بھی اضافہ کر دیا گیا تھا اور..... اس وقت آئی جی آفس کے کانفرنس ہال میں بھی پولیس کے وار افسران سر جوڑے بیٹھے اس منحوس کوشی کے بارے میں گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ بننے والے آئی جی نے بھی اس حادثے کا خاص نوٹس لیا تھا۔ ڈی آئی جی اور اس کی ٹیم کے افسران اچھے اچھے نظر آرہے تھے لیکن اورنگ زیب اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح سنجیدہ اور مطمئن نظر تھا۔ چہرے پر ایک ہلکا سا تناؤ بھی نہیں تھا۔

”موجودہ حادثے کی تفصیل آپ تمام حضرات کے علم میں ہے۔“ آئی جی نے ساؤنڈ پر کمرے میں موجود تمام افسران کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس سے بیشتر کہ میں حادثے

سلسلے میں گفتگو کروں آپ حضرات کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ چھٹی سے واپسی کے بعد کچھ ذاتی بنیادوں پر میں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست کی تھی جسے میرے سابقہ بے داغ ریکارڈ کارکردگی اور حکومت کی ترجیحات کی بنا پر قبول نہیں کیا گیا اور مجھے پہلی بار آپ کے صوبے میں تعینات کر دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے لئے میں نیا ہوں لیکن ایک ہی جگہ میں ہونے کے سبب میں بیشتر افسران کے بارے میں خاصی واقفیت رکھتا ہوں۔ ویسے بھی جو افسران اچھی ریپوٹیشن اور نمایاں کام انجام دیتے ہیں ان کے نام حکومت کی لسٹ پر بھی موجود ہوتے ہیں۔“ آئی جی نے میز پر رکھے گلاس سے دو گھونٹ پانی پی کر بات جاری رکھی۔ ”آپ کے صوبے میں ڈیوٹی رپورٹ کرنے سے بیشتر میں نے ایک بار پھر حکومت سے خصوصی درخواست کی ہے کہ میری ریٹائرمنٹ کی درخواست پر از سر نو غور کیا جائے اس لیے عین ممکن ہے کہ میں آپ کے درمیان زیادہ عرصہ نہ رہوں لیکن جب تک ہوں آپ مجھے اپنا دوست ہی سمجھیں اور میرے ساتھ تعاون کریں۔ آپ کے تعاون کے بغیر میری کامیابی بھی سوالیہ نشان بن سکتی ہے۔“

آئی جی نے سامنے بیٹھے ہوئے افسران پر نظر ڈالی پھر تھوڑے توقف سے بولا۔ ”موجودہ حادثے کی تفصیل میں نے اخبارات میں دیکھ لی ہے۔ شیخ حامد کی حقیقت جان لینے کے بعد اسمبلی اور سینٹ میں بھی اس کی گونج اکثر سنائی دیتی ہے بہر حال..... ڈی آئی جی صاحب نے مجھے جو بریفنگ دی ہے اس کے مطابق شیخ حامد کی رہائش گاہ کو ضروری چھان بین کے بعد ہی سیل کر دیا گیا تھا اور پولیس کانسٹیبلوں کی راؤنڈ دی کلاک ڈیوٹی بھی لگا دی گئی تھی۔“

”جی ہاں.....“ ڈی آئی جی نے جو بائیں ہاتھ کی کرسی پر ساتھ ہی بیٹھا تھا دوبارہ تصدیق کی۔ ”شیخ حامد کے کیس کو کون دیکھ رہا تھا؟“ آئی جی نے ڈی آئی جی سے سوال کیا۔

”میرے ساتھ اس ٹیم میں ایس پی اورنگ زیب اور ڈی ایس پی سراج بھی شریک تھے۔ ہمارے یہ دونوں افسران قابل اعتماد اور اچھی کارکردگی کے مالک ہیں۔ ان کی سابقہ ریپوٹیشن بھی بے داغ ہے۔“

گڈ..... آئی جی نے خوشی کا اظہار کیا پھر اس کی نظروں کا زاویہ بدل کر اورنگ زیب کی جانب ہو گیا ”ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس کی براہ راست اورنگ زیب کو مخاطب کیا۔“ آئی ایم پراؤڈ آف یونگ آفیسر..... میں نے آپ کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔“

”تحقیق یوسر.....“ اورنگ زیب نے مختصر جواب دیا۔

”آپ کا اس حادثے کے بارے میں ذاتی خیال کیا ہے.....؟ ایک سیل شدہ کوشی کو جس کی مہمان بین پوری طرح کی جا چکی تھی اسے اندر سے تباہ کرنے سے کسی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“

”یہ حادثہ جیسا کہ سب کے علم میں ہے کل رات پیش آیا ہے۔“ اورنگ زیب نے مائیک میں کہا۔ ”جو سپاہی وہاں تعینات تھے وہ بے ہوشی کی حالت میں ملے ہیں اور اس وقت پولیس اسپتال میں زیر علاج ہیں..... میں خود بھی ابھی کوئی آخری رائے قائم نہیں کر سکا ہوں لیکن ایک دو روز میں

کوئی نہ کوئی کلیو ایسا ضرور مل جائے جو ہماری رہنمائی کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔“
”آئی ایگری و پولیکن ایک سوال پھر یہی ہے کہ کسی کو ایسا کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟“

”میں فوری طور پر اس کا کوئی جواب دینے سے قاصر ہوں۔“ جواب بے حد صاف گوئی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دیا گیا۔

”میں نے اخباروں میں ایک بات اور بھی پڑھی تھی.....“ آئی جی نے دوستانہ انداز میں زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”شاید آپ واحد آفیسر ہیں جس نے ابھی تک شیخ حامد یا آکٹوپس کو مردہ تسلیم نہیں کیا ہے۔“

”میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ وہ زندہ ہے..... صرف یہ کہا تھا کہ جب تک میں اس کی لاش کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں ذاتی طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔“

”انٹرسٹنگ!“ آئی جی جواب سن کر مسکرایا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”آفیسر کی طرح آپ نے فوری طور پر کوئی نہ کوئی رائے قائم کی ہوگی موجودہ حادثے کے بارے میں؟“

”میں اسے صرف وقتی خیال ہی کے طور پر عرض کروں گا۔“ اورنگ زیب سنبھل کر بولا۔ ”یہ بات بیشتر ہائی آفیشل کے علم میں ہے کہ شیخ حامد نے ہمیشہ دہشت گردوں، خطرناک قاتلوں اور پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کی ہے۔ آکٹوپس یا شیخ حامد کا اثر و رسوخ خاصا اور پر تک تھا اس لیے ہمارے آفیسران بھی چشم پوشی سے کام لیتے رہے۔“

ڈی آئی جی اور دوسرے ایس چیز بھی کسمانے لگے۔ اورنگ زیب نے اپنی بات جاری رکھی۔

”ہر شخص کو اپنی کرسی کی فکر ہوتی ہے سر..... بہر حال میرا ذاتی خیال ہے کہ شیخ حامد نے جن خطرناک مجرموں کی پرورش کر رکھی تھی اب شاید وہ پولیس کی توجہ ہٹا کر دوسری طرف واردات کرنے کے پرانے جھکنڈوں کو اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے.....“ آئی جی نے سرسری انداز میں کہا پھر ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کون ہیں؟“

ڈی آئی جی کچھ جواب دینا چاہتا تھا لیکن اورنگ زیب نے دوبارہ اپنا مائیک آن کر کے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”سر..... یہ آپ کی پہلی میٹنگ تھی اس لیے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسز سراج کو ہماری مخصوص ٹیم میں شامل ہونے کے باوجود پروٹوکول آفیسر نے اپنے جائز اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔“

”ویری سیڈ!“ آئی جی نے اپنی نشست پر کسمسا کر ڈی آئی جی کی سمت دیکھا۔
”اس کی اطلاع مجھے یہاں آنے کے بعد ملی تھی۔“ ڈی آئی جی نے وضاحت کی۔ ”پروٹوکول

آفیسر نے اس ضمن میں معذرت بھی کر لی ہے۔“

”آئی سی.....“ آئی جی نے شانے اچکا کر اس موضوع کو بدلتے ہوئے دوبارہ افسران کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اس حادثے کی وجوہات خواہ کچھ ہوں، ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کوشی کی تباہی مسٹر اورنگ زیب کے خیال کے مطابق شیخ حامد کے گرگوں کی حرکت بھی ہو سکتی ہے، ہمیں بہر حال اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی۔ اب شیخ حامد زندہ نہیں ہے اس لیے اس کی اوپر تک رسائی کو بھول کر آپ حضرات اپنے اپنے علاقوں کو کھنگالیں اور پولیس کو مطلوب مجرموں کو جلد از جلد گرفتار کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ میں اس ضمن میں آپ کو تحریری حکم نامہ بھی روانہ کر دوں گا تاکہ آپ کی راہ میں اوپر سے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔“

”میں تمام افسران کی طرف سے آپ کو بھرپور تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔“ ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کی سرپرستی رہی تو کوئی افسر بھی کوتاہی کا ثبوت نہ دے گا۔“

”مگڈ.....“ آئی جی نے خوشی کا اظہار کیا پھر اس نے دوبارہ اورنگ زیب کی جانب دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ آپ کے پاس شیخ حامد کی جرائم پیشہ ٹیم کی کوئی نہ کوئی فہرست ضرور ہوگی۔“

”نوسر.....“ اورنگ زیب نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”لیکن سینٹرل ریکارڈ آفس میں ایسے تمام جرائم پیشہ افراد کی فہرستیں مع تصاویر اور دیگر کوائف کے ضرور مل جائیں گی۔“

”تباہ شدہ کوشی کے سلسلے میں اب آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”ہمیں وہاں اپنی سکیورٹی کے انتظامات کو اور ٹائٹ کرنا پڑے گا، وقتی طور پر میں نے پولیس کی نظری میں اضافہ کر دیا ہے۔“

”ون منٹ.....“ آئی جی نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔ ”کیا شیخ حامد کے کچھ قریبی عزیز دار بھی اس شہر میں موجود ہیں؟“

”ہم بھی سمجھتے ہیں لیکن جب سے میں نے یہاں ڈیوٹی رپورٹ کی ہے ایسا کوئی دور یا قریب کا عزیز دار سامنے نہیں آیا۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”میری اطلاع کے مطابق شیخ حامد کے سلسلے میں ملٹری انٹیلی جنس کے کنٹرل احتشام بھی ذاتی ڈپٹی لے رہے ہیں؟“

”میں سر..... کنٹرل احتشام نے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ شیخ حامد اس وقت انڈورلڈ مافیا کے نمبر نو کی حیثیت سے شمار کیا جاتا ہے۔“

”اوہ..... پھر تو ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ شیخ حامد کے غرق ہونے کے بعد کہیں مافیا کے سرے بڑے تو یہاں اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش نہیں کر رہے؟“ آئی جی نے پہلی بار اپنی

”امانی کا اظہار کیا۔

اٹل وری سر..... جب تک میں موجودہ سیٹ اپ یا اس محکمے میں ہوں ایسا نہیں ہو سکے

گا۔ اورنگ زیب نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”شیخ حامد یا آکنوپس کے بارے میں میں خود کو ایس پی سمجھنے کے بجائے ایسا محب وطن سمجھتا ہوں جو کسی درمیانی رکاوٹ یا قانونی تقاضوں کو یکسر نظر انداز کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔“

”مجھے آپ کا جواب سن کر خوشی ہوئی۔“ آئی جی نے اسے سراہتے ہوئے کہا۔ ”جب تک میں اس سیٹ پر ہوں آپ کو بھی کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوگی۔“

”تھینک یوسر.....“

اورنگ زیب سے گفتگو ختم کرنے کے بعد آئی جی نے باری باری ہر ایس پی سے اس کے علاقے کے بارے میں مختلف سوالات کیے پھر اس نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں چاہوں گا کہ جب تک میری ریٹائرمنٹ کا آخری فیصلہ نہیں ہو جاتا آپ تمام حضرات قانون کی بالادستی کو قائم کرنے میں اپنا اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔ اس ضمن میں اگر آپ میں سے کسی کو کوئی دشواری پیش آئے تو ڈی آئی جی صاحب سے رجوع کرے یا اگر چاہے تو براہ راست مجھے بھی اپنی پریشانیوں سے آگاہ کر سکتا ہے۔“

اس کے بعد ڈی آئی جی نے بھی حسب دستور تمام افسران اور عملے کی جانب سے آئی جی کو اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ پھر وہ ریفرنٹ کے لیے اٹھ رہے تھے جب ڈی آئی جی کے موبائل پر ایک ایس ایچ او کی کال موصول ہوئی۔ ڈی آئی جی نے تمللا کر موبائل آن کر لیا۔ اس وقت اسے کسی ایس ایچ او کا کال کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

”شیخ حامد کی بیوی کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا ہے سر..... اس کی ماں نے شاید مزاحمت کی کوشش کی ہوگی اس لیے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے..... میں اس وقت موقع واردات سے آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں..... اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایس پی اورنگ زیب صاحب کو بھی آگاہ کر دیں۔ انہوں نے یہاں جو آدمی تعینات کیے تھے ان میں سے بھی دو زخمی ہیں ایک کو میں نے فوری طور پر اسپتال روانہ کر دیا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔“

”وہیں ٹھہرو..... میں اورنگ زیب کو بھیج رہا ہوں کسی چیز کو ہاتھ بھی مت لگانا۔“

ایس پی اورنگ زیب اس اطلاع کے ملتے ہی آئی جی سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ آئی جی کے چہرے پر نظر آنے والی سنجیدگی بھی کچھ اور گہری ہو گئی۔

❖❖❖

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج اطلاع ملتے ہی پوش علاقے کے اس پینکے پر پہنچ گیا جہاں سے کنول کو اغوا کیا گیا تھا لیکن تفتیش کا باقاعدہ مرحلہ اورنگ زیب کے آنے کے بعد ہی شروع ہوا..... کاغذات کی تیاری علاقے کا ایس پی او کر رہا تھا۔ ضروری کارروائی کے لیے متعلقہ افراد بڑی احتیاط سے اپنی اپنی کارروائی کرنے میں مصروف تھے۔

اورنگ زیب نے پورے پینکے میں گھوم پھر کر محض سرسری نظر ڈالی تھی۔ اس کی توجہ خاص طور پر کنول کی ماں کی خون آلودہ لاش پر تھی اسے کچھ تشدد کے بعد گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ کنول کے کمرے کی قیمتی اشیاء جوں کی توں ملی تھیں اغوا کرنے والوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

ضابطے کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد اورنگ زیب نے مقتولہ کی لاش اٹھائے جانے سے پہلے اپنے اسپائی کیمرے سے صرف اس کے چہرے کا کلوز اپ لیا تھا اس کے بعد ایس ایچ او نے مکان کو باہر سے سیل کر دیا..... پاس پڑوس کے دور رہائشی افراد کا بیان بھی قلمبند کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی۔ یہ بیان اس بات کی وضاحت کرتا تھا کہ کنول کو اغوا کرنے والوں نے سائمنسٹر لگا ہوا اسلحہ استعمال کیا ہوگا۔

ضروری کارروائی کے بعد اورنگ زیب سراج کے گھر آ گیا۔ الماس کو حسب معمول کافی بتانے کا کہہ کر وہ لاؤنچ کے ایک صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ سراج اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ اورنگ زیب کے چہرے پر طاری تھکن اور سنجیدگی کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ الماس کافی لے کر آئی تو اس نے بھی ایسا ہی محسوس کیا پھر..... سراج کے اشارے پر اورنگ زیب سے گفتگو کا آغاز بھی اسی نے کیا تھا۔

”نئے آئی جی صاحب کی میٹنگ کیسی رہی؟“

”ہر کہ آمد عمارت نو ساخت والی بات سب ہی نے محسوس کی تھی۔“

”مجھے آپ سے ایک شکوہ بھی کرتا ہے۔“ الماس نے شوفی سے کہا۔

”جانتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے خاص طور پر تمہاری شکایت سننے آئی جی کے کانوں تک بھی پہنچا دی تھی۔ پروٹوکول آفیسر نے ڈی آئی جی کے استفسار پر اس کی معذرت بھی طلب کر لی ہے۔“

”کنول کے اغوا کے بارے میں آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟“ سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کنول کے اغوا میں کون لوگ ملوث ہو سکتے ہیں؟“ اورنگ زیب نے سراج کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔

”ہو سکتا ہے کہ اس میں آکنوپس کے کچھ پالتو شکاری کتوں کا ہاتھ ہو جو آکنوپس کی زندگی میں کنول کی طرف نظریں اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے تھے۔“

”اور کچھ.....؟“

”آئی سی۔“ سراج نے اورنگ زیب کے سوال پر چونک کر کہا۔ ”کنول کے اغوا کی واردات میں آکنوپس کا وہ علامتی نشان نہیں ملا جو ادھر تو اتارے نظر آ رہا تھا۔“

”گٹ.....“ اورنگ زیب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر کافی کا ایک گھونٹ لے لیا۔ ”اس بات کو میں نے بھی خاص طور سے نوٹ کیا تھا۔“

”ایک سوال میرے ذہن میں بھی کلبلا رہا ہے۔“ سراج نے پہلو بدل کر دریافت کیا۔ ”آپ

”او۔ کے۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے کسمار جواب دیا۔ ”تمہاری خاطر لپیلا پوتی کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔“

”یہ ہوئی ناپا۔“ الماس کچھ دیر بعد اسی موضوع پر بات کرنے کے بعد کافی برتن سمیٹ کر اٹھ گئی تو سراج اور اورنگ زیب کے درمیان دوبارہ کنول کے انخواس کے امکانات کی گفتگو چھیڑ گئی۔



اس کا سویا ہوا ذہن آہستہ آہستہ جاگنے لگا۔۔۔۔۔ ذہن پر طاری غنودگی چھٹ رہی تھی اس کے دماغ میں گزری ہوئی باتوں کا دھندلا دھندلا عکس ابھر رہا تھا پھر وہ کسی عورت کی کرناک چٹکی کی آواز تھی جسے سن کر اس کی مزاحمت نے دم توڑ دیا آنے والوں نے فوراً ہی جکڑ لیا تھا اس کی ناک پر رومال رکھا گیا جس سے پھوٹنے والی خوشبو اتنی تیز اور زود اثر تھی کہ اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا تھا اور اب۔۔۔۔۔ اس کی ذہنی قوتیں دوبارہ بتدریج بکھرے ہوئے تانے بانے کو جوڑ رہی تھیں۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے جب وہ کھانا کھا کر اوپر جانے کے لیے پل تول رہی تھی۔

”نیچے سو جاؤ بیٹی۔۔۔۔۔“ ماں نے اس سے درو بھری آواز میں کہا تھا۔ ”اوپر کب تک بستر پر کروٹیں بدل بدل کر کسی کا انتظار کرتی رہو گی۔“

”انتظار ہی تو زندگی کا واحد سہارا ہے ماں جس دن یہ بھی ٹوٹ گیا، جسم اور روح کا تعلق بھی ختم ہو جائے گا۔“

”لیکن وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ ماں کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

”تم چپ کیوں ہو گئیں ماں؟“ اس نے سرد آہ پھر کر ماں کو مخاطب کیا۔ ”دل میں جو ہے وہ کہہ ڈالو۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ مر چکا ہے میری بچی۔“ ماں نے ہونٹ چباتے ہوئے مدہم آواز میں کہا۔ ”انسان جو ہوتا ہے ایک نہ ایک دن اسے وہی کاٹنا بھی ہوتا ہے اس کے اعمال کی سزا کا وقت آ گیا تھا اس لیے وہ ایسا غرق ہوا کہ جنازہ بھی نصیب نہ ہوا۔“

”تم اس کے کن اعمال کی باتیں کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ ماں کے قریب آ گئی۔ ”دوسروں کے لیے وہ کیسا ہی سہی لیکن میرے ساتھ اس نے کوئی برائی نہیں کی تھی وہ۔۔۔۔۔ وہ چاہتا تو دوسری لڑکیوں کی طرح میرے ساتھ بھی زبردستی عارضی رشتہ قائم کر سکتا تھا لیکن۔۔۔۔۔ وہ مجھے دلہن بنا کر لایا ہے۔“

”جانتی ہوں۔۔۔۔۔ یہ بھی ایک فریب تھا۔“ ماں کے لہجے میں یکنفت تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ ”باپ کو درندگی کا نشانہ بنا کر بیٹی سے نکاح کرنے والا بالآخر اپنے برے انجام کو پہنچ گیا لیکن میرے دل کی آگ ابھی سرد نہیں پڑی۔“

”یہ۔۔۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماں۔“ اس نے حیرت سے ماں کو منہ دیکھا۔ ”اگر وہ میرے باپ کا قاتل تھا تو پھر تم نے اس سے میری شادی۔۔۔۔۔“

”اس کے گریبان تک پہنچنے کے لیے یہی ایک راستہ نظر آیا تھا مجھے لیکن افسوس میری

نے خاص طور پر مرنے والی کے چہرے کا کھڑاپ ہی کیوں لیا۔۔۔۔۔ جبکہ ہمارے کیمرا میں مختلف زاویوں سے تصاویر لے چکے تھے۔“

اورنگ زیب نے اس سوال پر بھی سراج کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”تم نے شاید ان پٹی پٹی حیران نظروں کے تاثرات پر غور نہیں کیا جو مقتولہ کی نگاہوں میں جم کر رہ گئے تھے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ سراج نے تیزی سے کہا۔ ”شاید کنول کو اغوا کرنے والوں کو دیکھ کر اسے تعجب ہی ہوا ہوگا اور۔۔۔۔۔ غالباً اسی وجہ سے اس غریب کو موت کا شکار ہونا پڑا۔“

”میں تمہاری زبان سے یہی الفاظ سنتا چاہتا تھا۔“ سراج نے انکساری سے کام لیا۔ ”اب لگے ہاتھوں ایک بات اور بتا دیں۔ آکٹوپس کے ہینکے میں ہونے والے پراسرار دھماکوں سے کسی کو کیا حاصل ہو سکتا ہے؟“

”آکٹوپس۔۔۔۔۔ آکٹوپس!۔۔۔۔۔ خدا کے لیے میرے سامنے اب اس کا ذکر نہ کریں ورنہ مجھے رات سوئے میں بھی اس منحوس آبی جانور کی خطرناک سونڈیں ہی لہرائی نظر آئیں گی۔“ الماس نے بے تکلفی سے احتجاج کیا۔ ”ہمارے پاس گفتگو کے لیے اور بھی بہت سارے موضوع ہیں۔“

”یو آر ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ۔“ اورنگ زیب نے بڑی سنجیدگی سے الماس کی بات کی تائید کرتے ہوئے سراج کو گھورا۔ ”میں نے تم کو راستے میں بھی منع کیا تھا کہ آفیشل باتیں گھر پر نہ کیا کرو۔“

”دوسرا کوئی ٹاپک ہے تمہارے ذہن میں؟“ سراج نے الماس سے دریافت کیا۔

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ الماس نے اس بار مسکرا کر کہا۔

”آپ حضرات یہ کیوں فراموش کر رہے ہیں کہ کل ہمیں کسی کی دعوت میں چلنا ہے جہاں گڈے اور گڑیا کی شادی کی تاریخ بھی طے کرنی ہے۔“

گڈے اور گڑیا والی بات سن کر اورنگ زیب بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

”اور کل سب سے زیادہ اہم کردار بھی آپ کو ادا کرنا ہے۔“ الماس نے اورنگ زیب کو مسکرا کر دیکھا۔ ”وہاں کم از کم مرنے کی ایک ٹانگ والی مثال کو کسی کا گھر آباد کرنے کی خاطر فراموش کر دیجیے گا۔۔۔۔۔ اگر آپ نے وہاں بھی منحوس آکٹوپس کے ون پرسنٹ بھی زندہ ہونے کی بات کی تو روٹی ہنڈرڈ پرسنٹ اوس بن کر ڈی آئی جی کے ارا مانوں پر گرے گی۔ یہ سراسر زیادتی ہوگی اس غریب کے ساتھ جو نہ جانے کتنے ارا مانوں سے کل کی دعوت کا اہتمام کر رہا ہوگا۔“

”آپ نہ کریں لیکن روٹی تو اس کے زندہ یا مردہ ہونے کی تصدیق آپ ہی سے کرے گی۔“ الماس نے بڑے بھولپن سے اورنگ زیب کو آمادہ کرنے کی خاطر کہا۔

”کسی دشمن کے زخموں پر بھی محبت سے مرہم لگانا عین عبادت ہے۔ یہاں تو دو گھروں کو آباد کرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔۔۔۔۔ پلیز۔“

حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی لیکن خدا کی لالچی اپنا کام کر گئی۔

ماں کے جھٹلے اس کے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے جب وہ تینوں اجنبی آندھی اور طوفان کی طرح اندر آگئے تھے۔ ایک نے اسے قابو کرنے کی کوشش ایک نے اس کی ماں کو ہاتھ تھام کر بے دردی سے کمرے میں دھکیل دیا۔ تیسرا دروازے پر جما کھڑا رہا۔

”تم.....“ اس نے اپنے اوپر ہاتھ ڈالنے والے کو حقارت سے دیکھا۔ ”نمک حرام..... کتے..... کیا وہ زندہ ہوتے تو..... تو میرے قریب آنے کی کوشش کر سکتا تھا؟“

”اب بھی نہیں کر سکتا لیکن جو حکم دیا گیا ہے اسے ٹال بھی نہیں سکتا۔“ اس نے سرد لہجے میں غرا کر کہا۔

”شرافت سے میرے ساتھ نکل چلو ورنہ ہمیں مجبوراً تمہیں یہاں سے اٹھا کر کہیں اور پہنچانے کا حکم ملا ہے۔“

”اب..... اب اس کے بعد حکم دینے والا کون رہ گیا ہے؟“ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ ”دور ہو جا مجھ سے۔“

”حماقت مت کرو ورنہ تم کو کسی بکری کی طرح دیوبج کر بھی اٹھالے جائیں گے۔“

کنول وہ جملہ نہ کر دیوانی ہو گئی اس نے خود کو آخری دم تک بچانے کی ٹھان لی تھی لیکن اسی لمحے اس کی ماں کی کر بناک چیخ اس کے کانوں میں گونجی وہ جس کے شکبے سے نکلنے کی خاطر جدوجہد کر رہی تھی اس نے اسے بے آواز آتش اسٹے سے گولی مار دی تھی۔ کنول نے دم توڑتی ماں کی پھٹی پھٹی نظروں اور اس کے سینے سے اٹنے والے خون کے فوارے کو دیکھا تو وہ وحشت زدہ ہو گئی۔ ماں کا آخری سہارا بھی اٹھ جانے کے بعد اسے اپنی سونی زندگی کا احساس اتنی شدت سے ہوا کہ اس کا پورا وجود برف کی طرح سرد ہو گیا۔ اسی ایک کمزور لمحے میں آنے والے نے اسے پوری طرح دیوبج لیا پھر..... رومال کی خوشبو نے اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں بھی سلب کر دی تھیں۔

اسے یاد نہیں تھا کہ اس منوں سامنے کو گزرے کتنا وقت گزر چکا ہے لیکن جب اس نے بے ہوشی کا غمار ٹوٹنے کے بعد ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو تیز روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور کچھ دیر بعد دوبارہ آنکھ کھولی تو اس نے خود کو ایک نہایت آرام دہ کمرے میں نرم و گرم بستر پر پایا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اس کے سوا کمرے میں اور کوئی نہیں تھا ایک لمحہ وہ حالات کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو کسی خفیہ مائیک سے ایک زنانی آواز سنائی دی۔

”آپ آرام کریں میڈم۔ ہم آپ کے لیے راحت بخش شربت لارہے ہیں۔“

کنول نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کا ذہن اب جاگ رہا تھا وہ آنے والے سے زور آوری کرنے کا سوچ رہی تھی جب ایک خوب صورت ادھیڑ عمر کی عورت مسکراتی ہوئی سامنے آ گئی۔ اس نے ہاتھ میں جوڑے اٹھا رکھی تھی اس میں ملک شیک کے علاوہ خوب صورتی سے تراشے ہوئے فروٹ بھی موجود تھے۔ کنول کے قریب آ کر ٹرے کو مسبری کے ساتھ والی میز پر رکھ دیا

گیا۔ جس کے قریب دو آرام کرسیاں بھی رکھی تھیں۔

”تم..... تم کون ہو.....؟“ کنول نے اسے مخاطب کیا۔

”آپ کی طرح ایک عورت ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”فی الحال اپنی خادمہ ہی سمجھیں۔“

”مجھے یہاں کس لیے لایا گیا ہے؟“

”اس کا جواب دینے کا اختیار نہیں ہے مجھے۔“ عورت نے سنبھل کر جواب دیا۔

”تم اتنی بے اختیار بھی نظر نہیں آتیں جتنا خود کو ظاہر کر رہی ہو۔“ اس نے حقارت سے ادھیڑ عمر کی عورت کو گھورا۔

”آپ مالک ہیں۔ جو چاہے کہہ سکتی ہیں۔“ عورت نے کنول کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر اگلے قدموں لوٹ گئی۔

وہ عورت کے جانے کے بعد بستر سے اتر کر نیچے آگئی، گزرے ہوئے لمحوں کا ہولناک تصور اور آنے والے لمحوں کا تصور اس کے معصوم خیالوں میں نشتر کے مانند چھ رہا تھا جب مائیک پر پھر وہی لرزتی آواز بھری۔

”آپ نہادھو کر لباس تبدیل کر لیں میڈم۔ فریش ہو کر ہلکا پھلکا ناشتا بھی کر لیں اور..... جو وقت گزر گیا اسے فراموش کرنے کی کوشش کریں۔“

”شٹ اپ.....“ کنول نے نفرت کا اظہار کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ مائیک پر کسی کی آواز سن رہی تھی تو دوسری جانب اس کی آواز بھی ضرور سنی جا رہی ہوگی۔

”آپ کی ناراضگی بجائے میڈم لیکن جو کچھ سامنے پیش آیا آپ اسے ہمارے لوگوں کی مجبوری سمجھ کر درگزر کرنے کی کوشش کریں۔“

”تم کس مجبوری کا رونا روٹے کو کوشش کر رہی ہو.....؟“ کنول نے بہ دستور نفرت سے سوال کیا۔

”آپ کی والدہ کی موت!“ تھوڑے توقف سے جواب ملا۔ ”انہوں نے ہمارے کسی آدمی کو شامت کر لیا تھا۔ اسے چیلنج بھی کیا۔ یہی ان کی غلطی تھی ایسی صورت میں ہم کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑ سکتے تھے جو ہمارے لیے بعد میں دشواریاں پیدا کرے۔“

”تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟“ کنول نے کچھ سوچ کر در یافت کیا۔

”آپ نہادھو کر ناشتہ سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کر لیں پھر..... آپ کو آپ کے بہت سے سوالات کا جواب بھی مل جائے گا۔“

”اگر میں تمہاری پیشکش ٹھکرا دوں تو.....؟“

”ہم پھر بھی آپ کے کسی حکم کو ماننے سے انکار نہیں کر سکتے۔“

کنول نے سختی سے ہونٹ بھیج لیے جو صورت حال درپیش تھی وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھی اسے اتنا کیا کیا گیا تھا؟ کسی مجبوری کے تحت اس کی ماں کا سایہ اس کے سر سے اٹھ لیا گیا؟ اس کی

پوزیشن بظاہر محکوم کی سی تھی پھر..... اس کو حاکموں کی طرح کیوں برتا جا رہا تھا؟ خاصی دیر تک وہ ذہن کی گتھیوں کو سلجھاتی رہی پھر اس نے گھوم پھر کر کمرے کا جائزہ لیا جس میں ایک منچ ہاتھ روم کے ساتھ مختصر ڈریسنگ اسپیس میں کپڑوں کی ایک الماری بھی تھی اس نے یونہی الماری کو کھول کر دیکھا تو دنگ رہ گئی اس میں جتنے لباس تھے سب اس کے پسندیدہ تھے۔

عام حالات میں شاید وہ اس صورت حال کو ضرور انجوائے کرتی لیکن ماں کی موت کے احساس نے اس کو الجھا کر رکھا تھا وہ کمرے میں واپس آ گئی تادیر پہنچتی رہی۔ حالات پر غور کرتی رہی پھر اس نے ذہن کو تازگی بخشنے کی خاطر غسل خانے میں جا کر کپڑوں کی قید سے خود کو آزاد کر کے فوارے کے نیچے کھڑا کر دیا۔ نیم گرم پانی نے اس کے الجھے ہوئے ذہن کو کچھ تازگی بخشی تو اسے زندگی کا احساس ہوا۔ ستر پوشی کی خاطر اس نے الماری سے ایک لباس نکال کر پہنا پھر کمرے میں آ گئی۔ زندگی کو برقرار رکھنے کی خاطر اس نے مختلف فروٹ کے دو چار پیس حلق کے نیچے اتارے شربت کے کچھ گھونٹ لیے پھر دوبارہ اٹھ کر ٹیبلے لگی اسے جن حالات میں رکھا گیا تھا وہ حیران کن تھے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب کسی خدشے کے پیش نظر اس کی ماں کو راستے سے ہٹا دیا گیا تھا۔

”آخروہ کون لوگ تھے؟“ اگر انہیں اس کی ماں سے کوئی خطرہ لاحق ہو گیا تو کیا وہ ان میں کسی کو شناخت کر کے ان کے لیے دشواریاں نہیں پیدا کر سکتی تھی؟ کیا وہ اپنی ماں کے قاتلوں کو فراموش کر سکتی تھی؟ اور..... اس کی ماں نے پہلی بار اس پر ایک عجیب حقیقت کا انکشاف کیا تھا۔ وہ جو اس کا مجازی خدا تھا۔ وہی اس کے باپ کا قاتل بھی تھا؟ لیکن اگر ماں نے سچ کہا تھا تو اس کے رشتے کی ہامی کیوں بھری تھی؟ کیا مقصد تھا اس کا؟ وہ کیا ایسا ہی جانتی تھی؟ کیا اس کے ذہن میں انتقام کا کوئی طریقہ تھا۔ جس پر عمل کرنے سے بیشتر ہی وہ بھی موت کا شکار ہو گئی؟“

کنول کے ذہن میں مختلف سوالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن کسی آخری نتیجے کو اخذ کرنے کی کوشش میں الجھ رہا تھا جب وہ دروازے کی سمت سے ابھرنے والی قدموں کی آواز سن کر چونکی۔ اس نے تیزی سے نظروں کا زاویہ بدل کر اس سمت دیکھا۔ نوادہ کی شخصیت بھی اس کے لیے کسی پراسرار معے سے کم نہیں تھی۔

وہ ادھیڑ عمر کا تھا لیکن اس کی صحت قابل رشک تھی۔ اس کے جسم پر اس وقت نائٹ سوٹ نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر بڑی مقطع چھتھ ڈاڑھی تھی جس کے زیادہ تر بال سفید ہی تھے۔ پیشانی پر سیاہی مائل نشان بھی موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی کنول نے اعلیٰ قسم کی شراب کی خوشبو کمرے میں پھیلتی محسوس کی۔

دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے پھر کنول نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

”کون ہو تم.....؟“

”گھبراؤ مت..... تمہیں میرے ہی اشارے پر یہاں لایا گیا ہے۔“ ادھیڑ عمر والے نے ٹھوس

لہجے میں کہا۔ وہ لب و لہجہ کنول کے لیے مانوس نہیں تھا۔

”اوہ.....“ کنول نے نفرت کا اظہار کیا۔ ”میری بے قصور ماں کو بھی شاید تمہارے ہی اشارے پر مارا گیا ہے؟“

”نہیں!..... وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کا شکار ہوگی۔“

”مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے.....؟“

”اس لیے کہ تم مجھے پسند ہو.....“ آنے والے نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”اور جو چیز پسند ہو

اسے حاصل کر لینا میری فطرت ہے۔“

”تم کسی کمزور عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کو اپنی مردانگی سمجھتے ہو؟“

”فضول بات مت کرو.....“ وہ کنول کو سرتاپا دیکھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”میرا پہلو گرم کرتی

رہو..... اس کے عوض تم بھی لوگوں پر اپنا حکم چلانے کے قابل ہو جاؤ گی۔“

مم..... میں..... بازاری عورت نہیں ہوں۔“ کنول نے اسے حقارت سے مخاطب

کیا۔ ”ہاں ماں کی طرح تم مجھے بھی گولی مارنے کے بعد اپنے ناپاک مقصد میں ضرور کامیاب ہو سکتے

ہو۔“

”ایسا نہیں ہو گا میری جان..... تم ہنستی مسکراتی میری بانہوں میں آؤ گی۔“ وہ قدم اٹھاتا کنول

کے قریب آ گیا۔

”میرا شمار ان شکاریوں میں مت کرو جو چٹان پر بیٹھ کر شکار کھیلتے ہیں۔“

”تم شاید میری حقیقت سے لاپرواہی طرح واقف نہیں ہو؟“ کنول نے سنبھل کر کہا۔ ”میں جس کی

امانت ہوں اگر وہ زندہ ہوتا تو تم شاید میرا تصور کرتے ہوئے بھی خوف سے لرز اٹھتے۔“

”اوہ..... سمجھا، تم شاید آکٹوپس کی بات کر رہی ہو لیکن.....“ اس نے کنول کے کچھ اور قریب آ

کر سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ ایس پی اورنگ زیب نے اس کے بارے میں

کہا کہا تھا؟..... اس نے کہا تھا کہ آکٹوپس سمندر کا ایسا خطرناک عذاب ہے جو آسانی سے ختم نہیں

ہوتا۔“

کنول نے اپنے مقابل کھڑے ہوئے شخص کا آخری جملہ سنا تو اس کے اندر ایک سنسنی سی پھیل

گئی۔ وہ جملہ اس نے بدلی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ وہ آواز کنول کے لیے غیر مانوس بھی نہیں تھی۔ وہ

مہ امد شیخ حامدی کی آواز تھی۔



ای آئی جی نے میڈم روبی سے متگنی کی اس تقریب کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ ڈرائنگ روم کو

گلاب کے پھولوں سے سجایا گیا تھا ڈرائنگ ٹیبل کے درمیان میں بڑے اور نفیس گلدان میں

گلاب کے پھول اور کلیاں نظر آرہی تھیں اس دعوت میں اس نے سراج الماس اورنگ زیب کے

ان کے حوالے سے از خود سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کو بھی مدعو کیا تھا۔

تقریب کا وقت آٹھ بجے تھا لیکن سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم وہاں سب سے پہلے پہنچے تھے مین

ہب ہی بے اختیار ہنسنے لگے۔

کھانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آگئے یہاں بھی بے تکلفی سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری تھا جب راحیلہ بیگم اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ روبی نے جوان کے سامنے والے صوفے پر الماس کے ساتھ بیٹھی تھی حیرت سے پوچھا۔

”یہ آپ کہاں جانے کے لیے پر تول رہی ہیں؟“

”کسی کو گھر لانے کی خاطر تھوڑی بہت رسی دوڑ دھوپ تو کرنی ہی پڑتی ہے۔“ وہ جواب دے کر مسکراتی ہوئی روبی کے قریب گئیں تو روبی اور الماس دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ڈی آئی جی وقتی طور پر اپنی نشست پر کسمسانے لگا۔ راحیلہ بیگم نے پرس کھول کر سبز مخملی کیس سے ہیرے کی ایک قیمتی انگوٹھی نکال کر روبی کو پہناتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

”تمہاری منگنی کی اس خوب صورت تقریب میں ایک بڑی بہن کی طرف سے.....“

الماس کے ساتھ دوسروں نے بھی اٹھ کر تالیاں بجاائیں روبی کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔ اس نے بے اختیار ہو کر راحیلہ بیگم کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ اس موقع پر اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کی طرف دیکھ کر پہلی بار بھیبتی کسی۔

”سر..... پولیس والے تو موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ آپ تو پھر ڈی آئی جی ہیں۔ راحیلہ

بہن نے راہ ہموار کر دی ہے تو آپ بھی پیچھے کیوں رہیں؟“

اورنگ زیب کا جملہ سن کر روبی بھی مسکرا دی ڈی آئی جی بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی ادب سے منگنی کی انگوٹھی نکال لی..... روبی کے قریب جا کر بڑی انکساری سے مسکرا کر پوچھا۔

”اجازت ہے.....؟“

روبی کے جواب دینے سے پہلے ہی راحیلہ بیگم نے اس کا ہاتھ تمام کر ڈی آئی جی کے سامنے کر دیا۔ ای آئی جی نے بڑے ارمانوں سے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تو ڈرائنگ روم سب کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ ڈی آئی جی کے بعد الماس نے بھی ایک انگوٹھی روبی کو پہنائی تھی۔ کچھ دیر تک یہ ہنگامہ جاری رہا پھر سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو میڈم روبی نے سنبھل کر اورنگ زیب کی سمت اٹھا۔ پھر بڑے واضح انداز میں بولی۔



گیٹ پر خود ڈی آئی جی نے ان کا استقبال کیا تھا پھر وہ گیٹ پر ہی تھے جب اورنگ زیب ’سراج‘ الماس بھی آگئے۔ سیٹھ عثمان اور راحیلہ کو وہاں پہلے سے دیکھ کر الماس دوڑ کر راحیلہ بیگم سے۔ تھی ’سراج‘ نے سیٹھ عثمان سے جیسے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔

”آپ اس وقت یہاں کسی ذاتی کام سے آئے ہیں؟“

”نہیں.....“ ڈی آئی جی نے درمیان میں آ کر جواب دیا۔ ”چھوٹے بھائی کی تقریب ہوا وہ بھائی اور بھابی موجود نہ ہوں؟ یہ بھلا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔“

”سر.....“ سراج نے مسکی صورت بنا کر کہا۔ ”یہ کاروباری لوگ ہیں۔ ہم پولیس والوں دوستی بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے.....“

”اگر سراج بھائی یہ کہہ رہے ہیں تو میں اس کی تائید کروں گی۔“ راحیلہ نے شوخ انداز بوجہ سراج کی ٹانگ کھینچی تو سراج لا جواب ہو گیا۔

”ول سیڈ.....“ ڈی آئی جی نے مسکرا کر راحیلہ بیگم کو دیکھا پھر سب اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کر لان میں آگئے جہاں بیٹھنے کا انتظار تھا۔ سراج کی شوخی..... راحیلہ بیگم کا محبت بھرا جواب اور الماس بات بات پر راحیلہ بیگم کی تائید کرتا۔ اس چھیڑ چھاڑ نے ماحول کو خاصا بے تکلف بنا دیا تھا۔

”مسٹر سراج.....“ ڈی آئی جی نے بھی اس نوک جھوک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سرا سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب آپ اپنی ہار تسلیم کر لیں اسی میں بہتری ہے۔“

اورنگ زیب نے اس موقع پر ایک خاص پالیسی اختیار کر لی تھی، کبھی وہ راحیلہ کی بات کی تائید کرتا اور کبھی سراج کا ساتھ دینے کی خاطر اس کی حمایت میں ایک دو جملے کہنے سے بھی گریز کرتا۔ گفتگو کا رنگ جاری تھا جب میڈم روبی کو گاڑی آگئی۔ ڈی آئی جی نے اس کا خیر مقدم بڑے والہانہ انداز میں کیا جسے سب ہی نے محسوس کیا، میڈم کے ساتھ تھریا بھی تھی وہ لان پر آئے تو سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے راحیلہ بیگم نے خاص طور پر میڈم روبی کو گلے لگا کر اپنے قریب ہی بٹھالیا۔ رگ تعارف کے بعد محفل میں دوبارہ بے تکلفی کا رنگ اٹھنے لگا، اس دوران باوردی ہیرے نے ڈرنکس کا ٹرے لا کر سب کو سروس کیا پھر آدھے گھنٹے بعد سب ہنسنے بولتے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ روبی نے سفید شلوار قمیص پر سفید موتیوں کا سیٹ پہن کر رکھا تھا جس میں وہ سب سے منفرد نظر آ رہی تھی۔ کھانے کی میز پر بھی ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہا، لیکن سراج گفتگو سے زیادہ مختلف ڈشوں سے انصاف کرنے میں بھی مگن تھا جب میڈم روبی اسے چھیڑنے کی خاطر کیا۔

”سراج صاحب..... سب لوگ ہنس بول رہے ہیں مگر آپ اس وقت بھی کھانے میں لگے ہیں۔“

”خدا کے لیے.....“ سراج نے کن آنکھوں سے باری باری ڈی آئی جی اور الماس کی طرف دیکھتے ہوئے میڈم سے درخواست کی۔ ”اس وقت تو سراج بھائی کہہ کر مخاطب کریں ورنہ ملازمت کے ساتھ گھر کا سکون بھی خطرے کی زد میں آ جائے گا۔“ جملہ اس معصومیت اور برجستگی سے کہا گیا کہ

دار نہیں تھے جو ان کا غم بانٹ سکتے۔ اس لیے وہ ایک سال کی رخصت کے لیے بیرون ملک چلے گئے تھے۔ وہاں سے وہ بار بار چھٹیاں بڑھواتے رہے اور اب طویل عرصے کے بعد جب سے آئے ہیں وہ کئی بار ملازمت سے استعفیٰ کی درخواست دے چکے ہیں لیکن ان کے سابقہ ریکارڈ کے پیش نظر ابھی تک ان کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔“ آئی جی نے بات جاری رکھی۔ ”یہاں وہ پہلی بار تہا دل ہونے کے بعد آئے ہیں۔ بظاہر پہلی کانفرنس میں بھی موصوف نے تمام افسران کو اکیٹورہ کر کام کرنے کو کہا ہے لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اب وہ ملازمت سے اکتا چکے ہیں۔ ان کے استعفیٰ کی درخواست اب بھی حکومت کے زیر غور ہے۔ واقف کاروں کا بھی یہی خیال ہے کہ ان میں اب وہ پہلی جیسی بات نہیں رہی۔“

”آکٹوپس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے.....؟“

میڈم نے پھر دبی زبان میں کریدنے کی کوشش کی۔

”فی الحال انہوں نے کل کر اس موضوع پر بھی کوئی بات نہیں کی۔“ ڈی آئی جی نے کن انہوں سے اورنگ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ملٹری انٹیلی جنس کے ذمے داروں کا بھی ایک ہی خیال ہے کہ چٹان سے کی جانے والی فائرنگ کی زد میں آکر دونوں ہلاک ہو گئے، پھر ان کی لاشیں سمندر کی تہ میں جا کر گوشت خور مچھلیوں کا شکار ہو گئی ہوں گی۔“

”جن وارداتوں میں آکٹوپس کی شبیہ مل رہی ہے ان کو کیا نام دیں گے آپ؟“

”یہ عوام میں دہشت پھیلانے کا ایک بھونڈا حربہ ہے..... میرا خیال ہے کہ یہ شیخ حامد کے پالتو ہمعاشوں کا ڈھونگ ہے۔“

”انگوٹھی کی رسم ادا ہونے کے بعد اس وقت آکٹوپس کا ذکر بھی نامناسب ہے۔“ راجیلہ نیگم نے روٹی سے کہا۔

”میرا ذاتی خیال ہے کہ اب کوئی تاریخ بھی ملے ہو جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”میں آپ کے اس مبارک خیال کی بھرپور تائید کروں گا۔“ اورنگ زیب نے بھی میڈم کو اسانے کی کوشش کی۔

”میڈم سے اس سلسلے میں میری بات ہو چکی ہے۔“

تھریا نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ یہ نیک کام بھی بہت جلد ہو جائے گا۔ تاریخ کے بارے میں بھی کوئی اعلان دو ایک دن میں کر دیا جائے گا۔“

”آپ اس سلسلے میں کیا کہنا پسند کریں گے؟“ الماس نے ڈی آئی جی کو شوخی سے مخاطب کیا۔

”میں آپ لوگوں کے رحم و کرم پر ہوں۔ میڈم کا جو فیصلہ بھی ہوگا وہ مجھے قبول ہوگا۔“ ڈی آئی جی نے اتنی تابعداری اور انکساری سے یہ جملے ادا کیے کہ سب ہی مسکرا دیے پھر..... کافی کے دور کے بعد جب محفل برخواست ہوئی تو روٹی نے جاتے ہوئے اورنگ زیب کے قریب سے گزرتے وقت ملرا لکھوہ کیا۔

”آپ جانتے ہیں کہ اس معنی کو آخری انجام تک پہنچانے سے بیشتر میں آپ سے کیا سوال کروں گی؟“

”میرا ذاتی مشورہ ہے کہ آپ کو کسی ایک شخص کے واسطے کے مقابلے میں اکثریت کی رائے کو قبول کر لیتا چاہیے۔“

اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہی مناسب بھی ہوگا۔“

”یہ میرا بھی انفرادی معاملہ ہے اس لیے اگر میں آپ سے آکٹوپس کے بارے میں جاننے کی دوبارہ درخواست کروں تو.....؟“

”تو میں آپ کو ایک انتہائی مشورہ بالکل مفت دوں گا۔“ سراج نے کچھ سوچ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”ہمیں آکٹوپس کے لیے جاننے کی خاطر لیاقت حسین سے رابطہ زیادہ کارآمد ثابت ہوگا..... اس کی روحانی قوتوں کا کرشمہ ہم میں سے بیشتر افراد دیکھ چکے ہیں۔“

”میں سراج کی اس بات کی تائید کروں گا.....“ سیٹھ عثمان نے کہا۔ ”زندگی اور موت تو خدا کے اختیار کی بات ہے لیکن دو تین موقعوں پر لیاقت حسین کی روحانی قوتیں مجھے اور راجیلہ کو بھی موت کے منہ سے نکال چکی ہیں۔“

”آپ کو بھی اس کا ذاتی تجربہ ہوگا۔“ سراج نے دوبارہ کہا تو روٹی لا جواب ہو گئی لیکن یہ بات سب ہی نے محسوس کی تھی کہ اسے کی خاموشی اس کا حتیٰ فیصلہ نہیں ہے۔

”آپ کے نئے آئی جی صاحب کس ٹاپ کے ہیں؟“ سیٹھ عثمان نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے موضوع بدل دیا۔

”ابھی تک ان کے بارے میں مجھے کے اکثر افسران بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکے ہیں۔“

”کوئی سبب بھی ضرور ہوگا.....؟“

”جی ہاں.....“ ڈی آئی جی نے پہلو بدل کر کہا۔

”ہماری اطلاع کے مطابق پہلے وہ ایکٹو (active) آفسران کی فہرست میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے لیکن چار سال قبل بیوی کے فوت ہوجانے کے بعد ان کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا جس کے بعد انہیں ملازمت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ سنا ہے خاندان میں بھی قریب کے ایسے رشتے

تھے۔

اس وقت دوپہر کے دو بجے کا عمل تھا جب لیاقت حسین..... مال کی دوسری کھپ بھی شپنگ کمپنی تک پہنچانے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں حاصل ہونے والے مناقق کے سلسلے میں بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں سیٹھ عثمان کے احسانات اس پر بے حساب تھے براہ راست بیرونی منزلوں سے کاروبار کا مشورہ بھی انہوں نے سرفراز خان کو دیا تھا یہ بھی محبت کا ثبوت تھا۔ ان کے پاس عملے کی کمی بھی نہیں تھی وہ چاہتے تو خود بھی کئی طریقے اختیار کر کے اس کام کو براہ راست بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے نہ صرف سرفراز خان کو نیک مشورہ دیا تھا بلکہ دفتر کی جگہ اور تجربہ کار عملہ بھی فراہم کر دیا تھا۔ سرفراز خان نے منافع میں آدھے کی شرط رکھی تھی جسے سیٹھ عثمان نے وقتی طور پر قبول کر لیا تھا لیکن سرفراز خان کے جانے کے بعد انہوں نے لیاقت حسین پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ صرف اپنے سابقہ کاروبار کی حد تک منافع لیں گے باقی سب لیاقت حسین کو براہ راست اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرنا ہوگا۔

لیاقت حسین نے کبھی سیٹھ عثمان کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن اس وقت وہ اسی پہلو پر غور کر رہا تھا کہ کوئی ایسی صورت نکالے کہ سیٹھ عثمان کو کل کاروبار کا نصف لینے پر آمادہ کر سکے۔ وہ ان ہی خیالوں میں مستغرق تھا جب اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھ کی اس انگوٹھی پر پڑی جو اس کی ماں نے تعویذ کم ہو جانے کے بعد اسے دی تھی۔ انگوٹھی پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا۔ اس میں بڑا ہوا چھپے کبھی رنگ کا عقیق اس وقت کسی سرخ رنگ کے انگارے کے مانند دکھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کے ذہن میں کسی آنے والے خطرے کا احساس ابھرا پھر غیر اختیاری طور پر اس نے اسٹیرنگ موڑا لوڈنگ پک اپ اب ایک ویران سڑک پر آنے کے بعد فرمائے بھر رہی تھی۔ لیاقت حسین کی نظریں بہ دستور انگوٹھی کے نگینے پر مرکوز تھیں جب ماں کی آواز کہیں دور سے اس کے کانوں میں گونجی۔

”وہ کون ہے ماں؟“ لیاقت حسین کے ہونٹ آپ ہی آپ متحرک ہو گئے۔

”وہی پلید۔ جس کا خوب صورت عورت تیرے تعویذ کے جال میں پھنس کر جہنم رسید ہو گیا تھا۔“

”وہ..... وہ اس وقت کہاں ہو گا.....؟“

”سب اوپر والے پر چھوڑ دے ماں کا جان..... جس نے اس کا عورت کو چٹ کر دیا اس کو بھی فرق کرے گا۔“

لیاقت حسین کے پیروں کا دباؤ ایسی لریئر پر بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ کوئی غیبی قوت اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ انگوٹھی کی طرف سے نظر ہٹا کر اب وہ سنسان سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے ذہن پر ایک دھند سی طاری تھی وہ کہاں جا رہا تھا؟ کیوں جا رہا تھا؟ اس کا علم اسے نہیں تھا جب ماں کی آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی۔

”الماس کے رشتے سے میرا بھی کچھ حق بنتا ہے آپ پر لیکن اس وقت آپ نے افسری ماتحتی کا زیادہ خیال رکھا.....“

”بات نمک کی آگئی تھی۔“ اورنگ زیب نے برجستہ جواب دیا۔ ”آپ کے ہاں دعوت ہوگی تو مٹھنا آپ ہی کی طرف بھجے گا۔“

”آپ کا گھر ہے جب چاہیں تشریف لے آئیں لیکن ایک بات میری بھی سن لیں۔ جب تک آپ غیر جانبدار ہو کر آکھوں گے بارے میں زبان نہیں کھولیں گے۔ آپ کے ڈی آئی جی کی دال نہیں گلے گی۔“

میڈم نے آخری جملہ بڑی مدہم آواز میں ادا کیا پھر سب سے اجازت طلب کی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد ڈی آئی جی نے بھی سیٹھ عثمان کو رخصت کرتے وقت بڑی گرم جوش سے ہاتھ ملا کر پھر راجیل بیگم سے کہا۔ ”آپ نے جس اپنائیت سے میڈم کو انگوٹھی پہنانے میں پہل کی تھی اسے میں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔“

واپسی پر بھی اورنگ زیب سراج اور الماس کے ساتھ تھا لیکن کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ الماس نے اسے چھیڑنے کی خاطر پوچھا۔ ”میڈم نے جاتے جاتے کیا کہہ دیا جو آپ اس قدر سنجیدہ نظر آ رہے ہیں؟“

”میں اپنے کارڈز قبل از وقت شو کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا پھر کسی خیال میں گم ہو گیا۔ سراج نے اس وقت اسے الماس کی موجودگی میں کریدنا مناسب بھی نہیں سمجھا



ماربل کے ایکسپورٹ کے کام کی وجہ سے لیاقت حسین کی دفتری مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ آفس کے علاوہ اسے اکثر باہر کے کاموں کی نگرانی بھی کرنی پڑتی تھی۔ پہلے گودام سے مال اٹھا کر شپنگ کمپنی تک پہنچانے کا کام کسی اور کے ذمے تھا لیکن اب یہ کام بھی لیاقت حسین خود کرنے لگا تھا۔ سیٹھ عثمان کے مشورے پر اس نے ایک لوڈنگ پک اپ بھی خرید لی تھی۔ شپنگ کمپنی تک مال پہنچانے کا مشورہ بھی اسے سیٹھ عثمان ہی نے دیا تھا۔ پہلے یہ کام جو شخص کرتا تھا اس کے بارے میں کبھی رپورٹ ملی تھی کہ وہ برنس کے راز بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ اس بات کا علم بھی اس وقت ہوا جب ”ماربل ایکسپورٹرز“ کے نام سے اس شعبے کو علیحدہ کیا گیا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی اس ملازم نے اچانک ملازمت بھی چھوڑ دی تھی بعد کی اطلاعات کے مطابق اس نے ماربل کا کام کرنے والی ایک اور فرم میں ملازمت اختیار کر لی تھی جس کا مال بھی سرفراز خان کے بجائے کسی اور کے ذریعے خریدا جاتا تھا۔

بہر حال اب گودام سے مال اٹھانے اور شپنگ کمپنی تک پہنچانے کا سارا کام لیاقت حسین خود دیکھ رہا تھا۔ اس کی ایمانداری سے دوسرے عملے کے افراد بھی واقف تھے اس لیے وہ بھی محتاط ہو گئے

”تو اس کا قریب مت جانا لیاقت..... وہ گندا بد ذات اس قابل بھی نہیں ہے کہ تو اس کو ہاتھ لگائے۔ دور سے اٹکھنی اس کے سامنے کر دینا وہ سارا جنتر منتر بھول جائے گا۔“

”ماں..... وہ کب تک ہمارا پیچھے لگا رہے گا..... کیا بڑے نانا کا طاقت اسے.....“

”تو بہ کر لیاقت..... تو بہ کر.....“ ماں کے لہجے میں خوف کا عنصر بھی گھل گیا۔ ”مارنے اور جلانے کا اختیار صرف اوپر والے کو ہے اس کا اشارے کے بغیر پتھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتا۔“

”پھر..... تو میرے لیے خدا سے دعا مانگ؟“

”پریشان مت ہو لیاقت..... ماں کی دعا تیرے ساتھ ہے..... اوپر والا ہمارا پکار ضرور سنے گا..... کب؟ یہ اس کی مرضی کا بات ہے میری جان..... اس کا ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتا ہے..... فرعون کو بھی اسی نے ڈھیل دے رکھا تھا..... اس طرح غرق کیا کہ اسے کے پلید جسم کو پھیلویں نے بھی نہیں کھایا..... وہ بھی نشان عبرت بن کر رہ گیا۔ وہ غفور الرحیم اس گندے پجاری کو بھی ضرور مارے گا۔ کب؟ اس کے لیے تجھے وقت کا انتظار کرنا ہوگا.....“

لیاقت حسین کے ذہن میں اس وقت سناٹوں کا راج تھا۔ وہ جسمانی طور پر حاضر ہونے کے باوجود ذہنی طور پر غیر حاضر ہی تھا۔ پک اپ کی رفتار بڑھتی گئی پھر..... وہ شہر سے دور سمندر کے ایک ایسے اجاز اور غیر آباد حصے میں پہنچ کر رک گئی جسے ہندو شمشان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

ہندوؤں کے مردے جہاں جلائے جاتے تھے اس کے قریب ہی ایک ٹوٹا پھوٹا مندر بھی تھا۔ پک اپ اسی مندر کے قریب جا کر رکی لیاقت حسین اتر کر نیچے آگیا پھر اس کی نظروں میں پر تاب بھوشن بھی آگیا جو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے منڈل کے درمیان آلتی پالتی مارے بیٹھا نہ جانے کس منتر کے جاپ پڑھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کی نظریں اسے گھور رہی تھیں جب ماں کی آواز نے پھر اس کی رہنمائی کی۔

”لیاقت..... میرا بات غور سے سن..... اس بد ذات اور پلید پجاری کو لاکر اس کا بد بدانا بند کر دے..... اس کا گندا عمل اگر پورا ہو گیا تو اچھا نہیں ہوگا..... اس حرام کے ختم نے جو دائرہ کھینچ رکھا ہے اس کے اندر جانے کا غلطی بھی نہ کرنا۔“ لیاقت حسین نے ماں کی آواز سنی تو اس نے قریب سے دو چار پتھر اٹھا کر پر تاب بھوشن کی طرف پھینکنے شروع کر دیئے اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی ایک پتھر پجاری کے شانوں سے ٹکرایا تو اس نے بدک کر آنکھیں کھول دیں دکتی ہوئی نظروں سے غضب ناک انداز میں نظریں گھما کر لیاقت حسین کو دیکھا تو اس کے گندے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

”تو..... تو آگیا مسلے.....“ پجاری کے لہجے میں گھمنڈ تھا۔ ”میں جانتا تھا کہ دیوی کی شکتی تجھے کھینچ لائے گی۔ آج تو میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا ایسی گھاٹ کھڑی کروں گا کہ تیرے اگلے پچھلے بھی یاد رکھیں گے۔“

”بڑا ناز ہے تجھے اپنی طاقت پر تو مردوں کی طرح خم ٹھونک کر سامنے آ جا..... کون کتنے پانی

ہیں ہے آج اس کا فیصلہ بھی ہو جائے۔“

جواب میں پر تاب بھوشن نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”تیری زبان سے جو شبد نکل رہے ہیں وہی تیری پول بھی کھول رہے ہیں مورکھ آج..... تیری موت ہی تجھے یہاں تک گھسیٹ لائی ہے..... بے بھوانی۔“

”بھوانی نہیں..... تانی کو یاد کر۔“ لیاقت حسین نے گرج کر کہا۔ ”گندی مٹی سے اٹھ کر سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی بھی ہو جائے گا۔“

پر تاب بھوشن کی پیشانی پر سلوٹس جال بننے لگیں وہ غضب ناک ہو کر کھڑا ہو گیا شعلہ انگشتی نظروں سے لیاقت حسین کو دیکھنے لگا لیکن اس نے منڈل سے باہر قدم نہیں نکالا۔

”تیری بچارن کا کیا انجام ہوا تھا پلید پجاری؟..... یاد ہے کہ اتنی جلدی بھول گیا۔“ لیاقت حسین نے یہ دستور سپاٹ آواز میں کہا۔ ”اس دن بھی تیری بھوانی اور دیوی دیوتا بغلیں جھانکتے رہ گئے تھے..... آج بھی تیرا جادو نہیں چلے گا کمین ذات.....“

پر تاب بھوشن دیوی دیوتاؤں کی شان میں استعمال کے جانے والے جملے سن کر پھر گیا۔ غصے میں کانپتا ہوا منڈل سے باہر آگیا اس کی آنکھوں میں آگ کے بھڑکتے شعلوں کا رقص اور تیز ہو گیا۔ ہونٹ پھر تیزی سے جنبش کرنے لگے۔ شاید وہ کسی خطرناک منتر کا جاپ کر رہا تھا جب لیاقت حسین کے کانوں میں پھر ماں کی آواز ابھری۔

”دیر مت کر لیاقت..... اٹکھنی اس پلید کے سامنے کر دے.....“

لیاقت حسین نے ماں کی بات پر عمل کیا تو پر تاب بھوشن کے ہونٹوں کی جنبش تھم گئی اس کی نظریں اٹکھنی کے گھینگے پر پڑیں تو اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی فیر مرنی قوت نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ خاصی دیر وہ اسی کیفیت سے دو چار رہا پھر اس نے بڑی مشکل سے اپنی توجہ گھینگے کی طرف سے ہٹائی ہانپتا ہوا بولا۔

”پلٹ کر بھی دیکھ لے مورکھ..... تیری موت تیرے سر پر کھڑی ہے.....“

لیاقت حسین نے اس جملے پر تیزی سے پلٹ کر دیکھا وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا اس نے بارہ نگاہوں کا زاویہ بدلا لیکن پر تاب بھوشن جہاں کھڑا تھا اب وہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ موقع پا کر نکل چکا تھا۔

”تو اس چنڈال کی بات میں آگیا لیاقت.....“ ماں کی آواز ابھری۔ ”وہ پھر بچ کر نکل

گیا لیکن اوپر والا کی شاید اس میں کوئی مصلحت ہوگی..... اب..... اب تو واپس چلا جا۔“

لیاقت حسین مشینی انداز میں گھوم کر دوبارہ پک اپ میں بیٹھ گیا..... وہاں دفتر پہنچا تو سیٹھ مہمان اس کے منتظر تھے۔ وہ ان کے کمرے میں گیا تو سیٹھ عثمان نے دریافت کیا۔

”تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی لیاقت حسین؟ تمہارے والد کا فون آیا تھا۔ میں نے تمہارے

ہاں پر کال بھی کیا لیکن تم نے وہ بھی اٹینڈ نہیں کیا؟“

”تعب ہے.....“ لیاقت حسین نے خود بھی حیرت سے جواب دیا۔ ”میں تو ماربل شپنگ کمپنی پہنچا کر سیدھا واپس آ رہا ہوں۔“

جواب میں سیٹھ عثمان نے اسے غور سے دیکھا، کچھ دیر خاموش رہے پھر بڑی اپنائیت سے بولے۔

”تم بیٹھو..... میں آپریٹر سے کہتا ہوں کہ تمہارے والد سے رابطہ قائم کرے۔“

لیاقت حسین خاموشی سے بیٹھ گیا..... اسے حیرت تھی کہ سیٹھ عثمان نے اس سے دیر سے آنے کی بات کیوں کی تھی جبکہ اس نے اپنے خیال کے مطابق کہیں دیر نہیں لگائی تھی..... دوسری جانب سیٹھ عثمان بھی لیاقت حسین کے بیان کی روشنی میں کچھ گزری ہوئی حیرت انگیز باتوں پر غور کر رہے تھے۔



دونوں حسب معمول اس وقت بھی ہوٹل کے کمرے میں تھے۔ دونوں کی نظریں ٹی وی پر متحرک ایک مزاحیہ فلم پر مرکوز تھیں جب دشمنو نے بیزاری کا اظہار کیا۔

”ہم کب تک اس طرح کروں میں بند بیٹھے ان مزاحیہ فلموں کو دیکھ کر بور ہو رہے ہیں گے۔“

”کہو تو کوئی رومانوی فلم لگ دوں؟“ لوچن نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایک شرط پڑے۔ تم کسی مخصوص منظر کو دیکھ کر کلونت کی بے وفائی کا شکوہ نہیں کرو گے۔“

جواب میں دشمنو نے لوچن کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی خطرناک چیتا اپنے شکار کو دوپٹے کی خاطر آخری چھلانگ لگانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ ایک لمحے وہ لوچن کو گھورتا رہا پھر پھنکارتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کلونت کا ذکر کسی بھی انداز میں نہ چھیڑا کرو..... آئندہ خیال رکھنا۔“

”جس کو تم نے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا اب اس کے ذکر سے چڑتے کیوں ہو.....؟“ لوچن نے بھی جواب میں سنجیدگی اختیار لی۔

”وہ میرا ذاتی معاملہ ہے لیکن تم.....“

”میرا نام لوچن ہے دشمنو..... میں حکم سننے کا عادی نہیں ہوں۔“ لوچن نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”مرنا اور مارنا میرا پیشہ ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔“

”تم مجھے چیخ کر رہے ہو؟“ دشمنو کے تہور بھی بدلنے لگے۔

”جو چاہے سمجھ لو.....“ لوچن شانے اچکا کر بولا۔ ”میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“

دشمنو کی نگاہوں کی سرخی پھیلنے لگی تھی جب اس کے موبائل پر سکنل موصول ہوا اس نے ہونٹ

چباتے ہوئے فون آن کر لیا پھر دوسری جانب سے جو کوڈ استعمال کیا گیا اسے سن کر اس نے لوچن کو

دیکھا پھر اٹھ کر بالکونی میں چلا گیا۔ لوچن نے بھی دشمنو کے اٹھتے ہی ٹی وی کی آواز کم کر دی۔ اس کی

نظریں بہ دستور ٹی وی پر تھیں پوری توجہ بالکونی کی سمت تھی دشمنو کے چہرے پر ابھرنے والی کسی نا معلوم خوشی نے اسے پوری طرح چوکنا کر دیا تھا۔

”کس لیے فون کیا ہے؟“ دشمنو کی مدھم آواز لوچن کے کانوں میں سنائی دی پھر ایک لمحے بعد اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا۔ ”میں براہ راست اس سے بات کرنا پسند کروں گا..... ہاں تم اسے میری ضد ہی سمجھ لو..... میں جانتا ہوں لیکن پہلے کی بات اور تھی..... نہیں بات پیشے کی نہیں وقت کی نزاکت کی ہے..... ہو بھی سکتا ہے..... ٹھیک ہے، میں اس کا انتظام کروں گا۔“

دشمنو دوبارہ کمرے میں آیا تو لوچن نے آواز کا والیوم بھی بڑھا دیا۔ بظاہر وہ ٹی وی پر متحرک تصویروں میں دلچسپی تک لیتا نظر آ رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں دشمنو کی جانب سے کہے جانے والے جملے گونج رہے تھے وہ ان جملوں کو اپنے تجربے کی روشنی میں ڈی کوڈ کر رہا تھا۔

کلونت کے نام پر وہ جھلا گیا تھا لوچن نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو اس کے تہور بدلنے لگے پھر..... اس کال کے آتے ہی اب وہ خاصے خوش گوار موڈ میں نظر آ رہا تھا..... یقیناً اسے دوسری جانب سے کوئی ایسی خبر ملی تھی جسے سن کر اس نے خلاف توقع کینٹلی بدل لی تھی۔ وہ خبر کیا تھی؟ لوچن اس بات پر غور کر رہا تھا جب دشمنو نے اسے مخاطب کیا۔

”ہم دونوں کے لیے موجود حالات میں یہی بہتر ہے کہ ہم جب تک ایک ساتھ ہیں دوستوں کی طرح رہیں۔ ہماری آپس کی کھینچا تانی دوسروں کے لیے فائدہ مند بھی ہو سکتی ہے۔“

”اگر یہ تمہارا خیال ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ہم دونوں کون ہیں ہمارا تعلق اور مشارکین لوگوں میں ہوتے ہیں تمہیں بھی اس کا خیال رکھنا ہوگا۔ میں زبان پر تالے ڈالنے کا عادی کبھی نہیں رہا۔“

”کلونت میری دکھتی رگ ہے دوست.....“ دشمنو نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر عجیب انداز

میں کہا۔ ”میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے لہو لہان کیا تھا یہاں تک کہ وہ آخری ہچک لے کر دم بھی توڑ

گئی۔ میں اس کے شریر کے ان ٹول اور سندرسوں پر کرپاں چلاتا رہا جن کو کبھی میں بڑے پیار سے

مارتا تھا۔ وہ مرنے کے بعد بھی میری محبت ہے اس لیے میں بقتی کرتا ہوں کہ تم اس کا ذکر نہ چھیڑا

وہ میں اندر سے تڑپ اٹھتا ہوں۔ بھرتے ہوئے زخموں کو بار بار کریدا جائے تو وہ ناسور بن جاتے

اے.....“

”تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں۔“ لوچن نے ٹی وی آف کر کے دشمنو کی طرف دیکھا پھر

مدھم مدھم بدل کر پوچھا۔

”کس کی کال تھی؟“

”کس کا وفادار اور پالتو کتا تھا۔“

”لہذا خبر دے رہا تھا.....؟“ لوچن نے بھی سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔

”وہ..... وہ..... کہہ رہا تھا کہ بل ڈاگ ابھی مرا نہیں زندہ ہے۔“ دشمنو نے سنجیدگی سے جواب

دیا۔ ”میں نے بھی کبھی گولیاں نہیں کھیلیں۔ میں نے براہ راست بات کرنے کی شرط لگا دی ہے۔“

”اگر بات ہوگئی؟“ لوچن نے اسے مسکراتی مگر معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ”کیا تم دوبارہ اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤ گے؟“

”ضروری نہیں ہے لیکن.....“ وشنو کسمسا کر بولا۔

”تم جانتے ہو کہ ہمارا پیشہ نلام کی آخری بولی پر ختم ہوتا ہے۔ جدھر سے زیادہ مال اور سہولت کی آفر ہوئی، میں اسی کو قبول کروں گا۔ تمہارا کیا اصول ہے؟“

”میں جو سودا کر چکا ہوں اس کے ختم ہونے میں ابھی تقریباً دو مہینے باقی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میرا تعلق کس تنظیم سے ہے۔ ہمارے بڑے غداری کی سزا صرف موت ہی تجویز کرتے ہیں۔“

”جانتا ہوں لیکن..... میں کسی کا پابند نہیں ہوں۔“

”ہاں..... آں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر یہ بھی نہ بھولو کہ ملٹری انٹیلی جنس والوں نے ہمیں کسی کے اشارے پر کسی اہم مقصد کے حصول کی خاطر فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ وہ ہماری طرف سے بے خبر بھی نہیں ہوں گے۔“

”اس کے باوجود میں ان کی ناک کے نیچے سے گزر کر نکل گیا تھا۔ کام نمٹا کر ان ہی کی نظروں کے سامنے سے واپس بھی آ گیا۔“ وشنو کے لہجے میں اعتماد جھلک رہا تھا۔ ”نخت یا تختہ..... میں نے شروع سے اسی کہاوت پر عمل کیا ہے۔“

”اعتماد درنگی کی نشانی ہے لیکن کبھی کبھی یہی اعتماد انسان کو دھوکا بھی دے جاتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ وشنو نے پہلو بدل کر وضاحت چاہی۔

”ہو سکتا ہے کہ ملٹری یا پولیس کے کچھ لوگوں نے تمہیں جان بوجھ کر موقع دیا ہو..... اس طرح وہ تمہاری نقل و حرکت کو دیکھنا چاہتے ہوں۔“ لوچن نے پہلو بدل کر بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”زندگی میں میرا واسطہ بھی بڑے بڑے سوداؤں سے پڑ چکا ہے مگر ایس پی اورنگ زیب!..... شطرنج کی بساط پر وہ بڑے ماہر انداز میں مہروں کو استعمال کرتا ہے کیا تم اس حقیقت سے انکار کرو گے؟“

”نہیں.....“ وشنو نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”وہ مرد آدمی ہے۔ زبان کا دھنی بھی ہے، پولیس کی نفری میں ایسے جانباڑ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں لیکن جب انسان موت کو تھیلی پر رکھ لے تو پھر اسے کسی بات کی چٹا بھی نہیں رہتی۔“

”تم جانو.....“ لوچن نے بے پروائی سے شانوں کو جنبش دی۔ ”ہم ایک دوسرے کے پابند بھی نہیں ہیں۔ کیا اچھا ہے؟ کیا برا؟ اس کا فیصلہ بھی ہمیں خود کرنا ہے۔“

”کچھ دیر دونوں کے درمیان ادھر ادھر کی بات ہوتی رہی پھر وشنو نے سنبھل کر پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے..... کیا وہ زندہ ہوگا.....؟“

لوچن نے چونک کر وشنو کو دیکھا۔ سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”اگر زندہ ہو تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔ اس کی موتی گردن پر میرے دو ساتھیوں کی موت کا قرض بھی باقی ہے۔ ہم تینوں ایک ہی جہاز

میں آئے تھے ہماری واقعیت بھی جہاز کے سفر کے دوران ہی اتفاقاً ہو گئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے سے دوستی کا ہاتھ ملایا تھا۔ وہ زندہ ہوا تو میں ان دونوں کی دوستی کا قرض بھی چکتا کر دوں گا۔“

وشنو کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ اس کے موبائل پر پھر سنگٹل موصول ہوا۔ اس بار اس نے بالہونی کی سمت جانے کے بجائے لوچن کے برابر بیٹھے ہی بیٹھے موبائل آن کر لیا۔

”ہاں..... میں وشنو ہی بول رہا ہوں..... اس نے جو کہا وہ وعدہ نہیں تھا براہ راست بات کرنے کی بات میں نے کبھی تھی..... ہاں وہ بھی جانتا ہے کہ وشنو کس چیز کا نام ہے..... یہی سمجھ لہ۔ انجام کی بات دوبارہ کبھی مت کرنا وشنو موت سے کبھی نہیں ڈرا..... اٹل ہی سمجھو۔“

”کس کا فون تھا؟“ لوچن نے بات ختم ہونے کے بعد وشنو کو کریدا۔ ”کیا اسی کی طرف سے کسی نے کال کیا تھا جو ہم سب کے لیے معائن کر رہا ہے؟“

”ہاں.....“ وشنو نے مختصر جواب دیا۔

”وہ کس بات کا اصرار کر رہے ہیں؟“

”ایک دو بندوں کو پھڑکانے کی بات کر رہے ہیں۔“

”کوئی آفر بھی ضرور ہوگی؟“

”بات خطرے کی نہیں میرے دوست، اصول کی ہے۔“ وشنو نے لمبی سانس لے کر صاف گوئی سے کہا۔ ”میں بلاوجہ کسی کے خون سے ہولی کھیلنے کو بھی پاپ ہی سمجھتا ہوں۔“

”اور اگر سربراہ سے تمہاری ڈائریکٹ بات ہو جائے تو.....؟“

”تب..... سوچنا پڑے گا؟“

”کیا تم اس سے بھی انکار کر دو گے؟“

”شاید نہیں.....“ وشنو نے کسمسا کر کہا۔ ”تم بھی جانتے ہو کہ انٹرپول کے شکاری کتے ہر طرف میری ہوسکتھتے پھر رہے ہیں بارڈر کراس کرنے کے بعد اس دیس میں اسی بگ باس نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ وشنو اس کی بات نہیں ٹال سکتا۔“

”تمہاری ایک بات میرے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی۔“ لوچن نے وشنو کو بہت غور سے دیکھا۔ ”جب تم سامنے موجود ہو تو کیا انٹرپول کے شکاری کتے تمہیں نہیں پہچان لیں گے؟“

”پہچان لیا ہوتا تو اب تک الیکٹرونک چیز پر بٹھانے میں دیر بھی نہ کرتے۔“ وشنو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

”کیا بتانا چاہتے ہو.....؟“

”جو وشنو زندہ تھا اس کے اصل چہرے کو آخری بار اس کی کلونت ہی نے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔“

لوچن اس جواب کو سن کر بری طرح چونکا۔ اس کی تجربے کا نظریں وشنو کے چہرے پر لگنے لگیں۔ اگر وہ اس وقت بھی میک اپ میں تھا تو کم از کم لوچن کا ذہن اسے قبول نہیں کر رہا

تھا۔



اسے معلوم تھا کہ اس کی ممبرشپ کی معیاد ختم ہوئے دو ماہ سے اوپر ہو چکے تھے۔ بہر حال اسے کلب کی ریسٹنٹ ماریا تک جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ ماریا کسی سے فون پر بات کرنے میں مصروف تھی، لیکن اس نے آنے والے کو ایسی ہی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

”فرمائیے۔“ اس نے فون کا ریسپورر رکھنے کے بعد آنے والے کو مہذب انداز میں مخاطب کیا۔ ”میری ممبرشپ دو ماہ پیشتر ختم ہو سکتی ہے۔ میں اسے ری نو کرانے آیا ہوں۔“ آنے والے نے سنجیدگی سے کہا پھر اپنا کارڈ نکال کر ماریا کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ماریا نے کارڈ پر نظر ڈالی تو ایک لمبے کوچکی پھر مسکرا بولی۔

”آج کل کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ بہت عرصے بعد نظر آتے ہو۔“ ”مجھے اس وقت ماسٹر مجید سے ملنا ہے۔“ آنے والے نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر وہ بدلائیں ہے تو اس وقت یہیں ہوگا۔“

”اسے بھی ری نو کرو۔۔۔۔۔۔“ اس نے جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر ماریا کے سامنے رکھ دیا۔ ”ہو سکتا ہے دوبارہ پھر بھی ادھر آنے کی ضرورت پڑے۔“

جتنی دیر ماریا ممبرشپ ری نو کرنے میں مصروف رہی، آنے والے کی نظریں وہاں موجود میزوں کے اطراف منزلاتی رہیں پھر وہ ماریا کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ماریا نے وہی پہلا سوال اس سے دوبارہ کیا تھا۔

”فی الحال کسی خاص گروپ کے لیے کام نہیں کر رہا۔“ اس نے کارڈ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ ”مجھ سے چھپا رہے ہو؟“ ماریا نے بے تکلفی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اس وقت جو حلیہ بنا رکھا ہے اسے کیا سمجھوں؟“

”میں نے ماسٹر مجید کے بارے میں دریافت کیا تھا۔۔۔۔۔۔؟“ ایک ممبر قریب آیا تو اس نے ماریا سے پھر ماسٹر مجید کے بارے میں دریافت کیا۔

”میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت بلیئرڈ روم میں ہوگا۔“

اس نے ماریا کو ایک نظر بھر کر دیکھا پھر قدم اٹھاتا بلیئرڈ روم کی طرف چلا گیا، ماریا کا اندازہ غلط نہیں تھا، ماسٹر مجید اس وقت وہیں مل گیا، وہ تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک خوب صورت ممبر بھی تھی۔

نوادرنے لڑکی کی موجودگی میں اسے مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔۔۔۔۔۔ قریب ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ماسٹر مجید کے ساتھ بیٹھی لڑکی کچھ دیر بعد اٹھ گئی تو وہ قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا گیا۔

”مجھے تم سے ایک ضروری بات معلوم کرنی ہے ماسٹر۔“

نوادرنے ٹھوس لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”بگ باس کے گھر کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کس نے کی ہے؟“

”تم۔۔۔۔۔۔“ ماسٹر مجید اس کی آواز سن کر بری طرح چونکا۔ ایک لمحے تک وہ اسے سرتاپا دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”تمہیں اچانک باس کی عزت کا خیال کیسے آ گیا جبکہ باس نے تو تمہیں دودھ کی کمی کی طرح نکال پھینکا تھا۔“

”خود وہ بھی غرق ہو گیا۔“ جواب مسکرا کر دیا گیا۔

”ہمارے کاروبار میں اونچ نیچ اسی طرح ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات تمہیں ضرور یاد ہوگی۔ تم بھی میرے حکم پر دم ہلانے کے عادی تھے۔“

”تم اب اس پوزیشن میں نہیں ہو اس لیے۔۔۔۔۔۔“

ماسٹر مجید اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا، نوادرنے کی گرفت اس کے بائیں بازو پر مگسی آہنی ٹکٹے کی طرح جم گئی تھی۔ دوستانہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے صرف اتنا بتادو کہ وہ کون تھا اور اسے وقت کہاں ملے گا؟ بلاوجہ مجھ سے الجھو گے تو اس کلب میں دوبارہ منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑ دوں گا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں جو کہتا ہوں اسے کر گزرنے سے دریغ نہیں کرتا۔“

”م۔۔۔۔۔۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن۔۔۔۔۔۔“ ماسٹر مجید نے نوادرنے کو۔۔۔۔۔۔ جو افضل خان کے سوا کوئی اور نہیں تھا، دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں جواب دیا۔ ”میں اس گھر کی عزت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں جبر و کچھ نہ کچھ علم ضرور ہوگا۔“

”جبر و۔۔۔۔۔۔“ افضل خان نے ماسٹر مجید کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ ”میری اطلاع کے مطابق اسے اور اسلم ڈنکا کو اس وقت پولیس نے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا جب وہ شبنم کو مل بانٹ کر اطمینان کرنے کی سازش کر رہے تھے۔“

”تمہاری اطلاع غلط نہیں ہے۔ یہ بھی جانتے ہو گے کہ جبر و عورتوں کے معاملے میں کتنا بد نیت آدمی ہے۔ جس ہانڈی میں کھاتا ہے اس میں چھید کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ پولیس نے اسے اور اسلم ڈنکا کو گرفتار کیا تھا، دونوں زخمی تھے اس لیے انہیں اسپتال میں رکھا گیا جہاں اسلم زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا تھا، اسی کی تدفین کے سلسلے میں پولیس کی توجہ ہٹی تو جبر و چھوڑا ہوا ہو گیا۔ ہو سکتا ہے باس نے فرق ہونے کی خبر سن کر اس نے کسی اور کے ساتھ مل کر اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ کام اس نے اکیلے کرنے کی حماقت نہیں کی ہوگی لیکن اب کسی رگڑنے سے بچنے کی خاطر یہیں پوہے کے بل میں چھپا بیٹھا ہوگا۔“

”وہ چوہے کے بل میں کہاں ہو سکتا ہے۔“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر روپوش ہونے کے لیے بنگالی پاڑا سب سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کچے کچے مکانوں اور جھونپڑیوں کی تنگ گلیوں اور بھول بھلیوں میں پولیس بھی پکرا جاتی ہے۔“

”تم اس لباس میں۔۔۔۔۔۔“

”اس کی فکر مت کرو۔ وہاں کے کچھ پیشہ ور کاروباری مجھے جانتے ہیں۔“ افضل خان نے پہلی بار مسکرا کر جواب دیا پھر وہ ریٹوبک میں زیادہ دیر نہیں رکا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے اپنی گاڑی ہکی آبادی کے ایک مکان کے قریب سے گزرنے والی سڑک پر پارک کی پھر وہاں سے وہ پیدل ہی دو چار موڑ کاٹ کر بیگلی پاڑے کی تنگ گلیوں میں داخل ہو گیا جہاں تنگ دھڑنگ بچے اچھل کود کرنے میں مصروف تھے وہ قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا جب وہ آدی ایک موڑ سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آ گئے۔

”کہاں جانا ہے صاحب؟“ ایک نے سرسراتے لہجے میں افضل خان کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے سوال کیا۔ دوسرا دو قدم پیچھے کھڑا افضل خان کو نگاہوں نگاہوں میں تول رہا تھا۔

”مجھے جبرو کی تلاش ہے۔“

”ہم کسی جبرو کو نہیں جانتے۔“ دوسرے نے تیور بدل کر خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”تم غلط جگہ آ گئے ہو صاحب۔“

دونوں جانے کے لیے پلٹے تھے لیکن پھر افضل خان نے اپنی آواز میں انہیں مخاطب کیا تو دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”معاف کرنا صاحب..... ہم نے آپ کو اس جلیے میں پہچانا نہیں تھا۔“ ایک نے معذرت کی۔

”جبرو سے کیا کام پڑ گیا آپ کو۔“ دوسرا بولا۔ ”دوروز پہلے پولیس کے کھوجی بھی اس کی تلاش میں ادھر آئے تھے۔“

”وہ کہاں مل سکے گا؟“ افضل خان نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا تو دونوں ہی اس کو سوالیہ نظروں سے گھورنے لگے۔

”آپ کو جبرو سے ایسا کیا کام پڑ گیا جو ہم نہیں کر سکتے؟“ ایک نے مدہم لہجے میں کہا۔ ”آج کل بیگال سے ایک نئی کھپ آئی ہوئی ہے۔“

”پھر کسی وقت فرصت سے آؤں گا.....“ افضل خان جانے کے لیے مڑا تو وہ دونوں پھر سامنے آ گئے۔

”جبرو کی تلاش آپ کو کس سلسلے میں ہے؟“ پستہ قد والے نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”کہیں آپ بھی پولیس کی طرح اس پر کسی کے اغوا اور قتل کا شبہ تو نہیں کر رہے؟“

افضل خان اس کے جملے کی ساخت پر چونکا۔

”تم نے یہ بات کیوں پوچھی.....؟“ اس نے پستہ قد والے کو حیرت سے دیکھا۔ ”تمہارا اشارہ کس واردات کی طرف ہے؟“

”ہمارا اشارہ اس بڑے مگر مجھ کی مادہ کی طرف ہے جو اٹھائی گئی۔ اس کی ماں کو وارداتیوں نے اوپر کا کٹ بھی کٹا دیا تھا۔“

”تم کیا جانتے ہو اس سلسلے میں؟“

”ایک بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ کم از کم جبرو اتنی اونچی اڑان نہیں اڑ سکتا۔“

”پھر.....؟“

”اپنے دو ایک یار ادھر بھی مچھلیوں کا دھندا کرتے ہیں جدھر مگر کچھ اور اس کا ساتھی ہوائی چرنے (ہیلی کاپٹر) سے کودے تھے فوج اور پولیس کے آدی بھی دو روز تک سمندر کی تہ تک ان دونوں کو گھوجتے رہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔“

”تمہارے آدمیوں کا کیا کہنا ہے؟“

”پولیس اور فوج والوں کی نظریں بچا کر وہ بھی گہرائی تک گئے تھے۔“ جواب سنجیدگی سے دیا گیا۔ ”ان کو پولیس سے انعام ملنے کے لالچ نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا لیکن وہ بھی گوشت کی ایک بوٹی بھی نہیں تلاش کر سکے۔ ان کا یہی خیال ہے کہ جن دونوں نے چھلانگ لگائی تھی وہ پانی کے اندر ہی اندر کہیں اڑن چھو ہو گئے ہوں گے..... مچھلیوں کا شکار ہوتے تو کہیں نہ کہیں ایک آدھ بڈی بوٹی بھی ضرور ملتی۔“

”ہمارا نام بیچ میں نہیں آنا چاہیے صاحب۔“ پستہ قد والے نے پراسرار انداز میں کہا۔ ”کچھ دنوں پہلے جبرو کو کہیں سے لمبی رقم ملی تھی اس روز اس نے نشہ بھی زیادہ کیا تھا۔ نمبروں کی شراب کی چھماتی بوتل خرید کر لایا تھا۔ ہمارا پوچھنے پر اس نے ایک ہی بات کہی تھی کہ اس کا مرا ہوا حرامی باپ دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس کے ایک روز بعد پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپا بھی مارا لیکن شاید اسے چھاپے کی اطلاع بھی پہلے سے مل گئی تھی جو بیچ کر صاف نکل گیا۔“

”اب وہ کہاں مل سکے گا۔“ افضل خان نے پوچھا۔

”تمہیں اس کے ایک دو ٹھکانے تو ضرور معلوم ہوں گے؟“

”آپ فکر نہ کریں..... اپنا موبائل نمبر دے جائیں ہم اسے کھوج کر آپ کو اس کی بخبری کر دیں گے۔“

جواب میں افضل خان نے ایک کاغذ پر اپنا موبائل نمبر لکھ کر اسے دیا۔ ساتھ ہی ایک ایک بڑا نوٹ بھی دونوں کی مٹھیوں میں دبا دیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ سیدھا اپنے فلیٹ پر آیا جہاں شبنم بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

”کیا رہا.....؟ کچھ سراغ ملا؟“

”فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا مگر جو دو چار کلیو ملے ہیں وہ معتبر نہ ہونے کے بادل جو یہی ظاہر کرتے ہیں کہ بگ باس شاید غرق نہیں ہوا۔“

افضل خان نے تھکے تھکے انداز میں رک رک پوری رواداد سنا دی تو شبنم نے اس کے قریب بیٹھے ہوئے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

”کیا موجودہ حالات میں پولیس کے لیے ہمارا کام کرنا مناسب ہوگا؟“

”اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔“ اس نے شبنم کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”اورنگ زیب

اور سراج صاحب کے بارے میں بھی ایک بات میں اپنے تجربوں کی روشنی میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں وہ ہمیں ڈبل کر اس کرنے کی کوشش بھی نہ کریں گے۔“
”اور اگر وہ زندہ ہوا تو.....؟“

”اس نے ہم دونوں کو اپنا کام نکل جانے کے بعد نظروں سے گرا دیا تھا۔“ افضل خان نے بڑے زہریلے انداز میں گل کھا کر کہا۔ ”اگر وہ زندہ ہے تو ہمیں بھی اسے اپنی حیثیت کا احساس ضرور دلانا ہوگا۔ اس کے علاوہ فرار کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔“
شبیم نے کوئی جواب نہیں دیا بڑی گرم جوشی سے افضل خان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

لباس کی تراش خراش اور صورت شکل کے اعتبار سے وہ دونوں ہی مہذب نظر آرہے تھے جس گاڑی میں آئے تھے وہ بھی نئے ماڈل کی کروڑ لاکھوں۔ دونوں نے گاڑی سے اترنے میں بھی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا پھر انہوں نے فرنیچر ہاؤس کے باہر نکلنے والے فیچر کی کو محاط کیا۔ ”شاہ جی پلیز..... ہمیں فوری طور پر ایک بیڈروم سیٹ درکار ہے۔“

دوسرا شخص اس ملازم کے قریب جا کر رکھا جو دکان کا ایک دروازہ بند کرنے لگا تھا۔
”ادھر کچھ دنوں سے پولیس نے وقت کی پابندی میں کچھ زیادہ ایمانداری دکھانی شروع کر دی ہے۔“ فیچر نے کہا۔ ”آپ صبح تشریف لے آئیں۔“
”پاس پڑوس کی کچھ دکانیں تو ابھی تک جگمگا رہی ہیں۔“ آنے والے نے مسکرا کر سوال کیا۔ ”کیا ان پر پولیس کا زور نہیں چلتا؟“

”ان کا لین دین کھلا ہوا ہے جناب لیکن ہم بحث نہیں دیتے اس لیے وقت کی پابندی بھی لازم ہے۔ آپ چاہیں تو کسی اور دکان سے اپنا مطلوبہ فرنیچر خرید لیں۔“
”ہمیں دراصل کشمیری کام کا سیٹ دیکھنا ہے۔“ آنے والے نے قدرے عاجزی سے کہا۔ ”ایسا کرتے ہیں کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنا مطلوبہ فرنیچر دکان کے دروازے بند کر کے اندر ہی دیکھ لیتے ہیں صبح ہماری وین آکر اسے اٹھالے گی۔“

”اتنی جلدی کیا ہے؟“ فیچر نے پوچھا۔
”چٹ مگنی پٹ بیاہ کا معاملہ درپیش آگیا ہے محترم ورنہ ہم آپ کو زحمت بھی نہ دیتے۔“
”ٹھیک ہے.....“ فیچر اس کا جواب سن کر راضی ہو گیا۔
تینوں دکان کے اندر آگئے فیچر کے کہنے پر ملازم نے دروازے اندر سے بھیڑ دیے پھر وہ بھی آنے والوں کو کاروباری انداز میں بیڈروم سیٹ دکھانے لگا۔

”آپ کیا دکان کے مالک ہیں؟“ فرنیچر دیکھنے والوں نے سوال کیا۔
”جی نہیں..... مالک شام پانچ بجے چلے جاتے ہیں۔ میں فیچر ہوں۔“
”اوہ.....“ دوسرے نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔

”قیمت میں کمی بیشی کا اختیار تو آپ کو بھی ہوگا؟“
”سوری جناب۔“ فیچر نے نمایاں طور پر نظر آنے والی اس تختی سمیت اشارہ کیا جو دکان کے درمیان میں اسٹینڈ پر نظر آ رہی تھی۔ ”ہمارے ہاں ایک ہی دام ہوتے ہیں۔ لکھڑ پرائس ٹو بار کہیں۔“

”جہاں گیرٹ صاحب ہوتے تو شاید وہ بھی ہمیں اتنا کھرا جواب نہ دیتے۔“ آنے والے ایک شخص نے تھلا کر کہا۔ آپ فیچر ہو کر سرخ جھنڈی دکھا رہے ہیں۔“
”آپ اگر مالک کے واقف کار ہیں تو فون پر ان سے بات کر لیں۔“ فیچر نے انکاری سے کام لیا۔ ”کی بیشی کا اختیار کم از کم مجھے نہیں ہے۔“

”لیکن ہم با اختیار ہیں میری جان۔“ ایک نے اچانک پستول نکال لیا اگر چاہیں تو اپنی مرضی کے فرنیچر کے ساتھ تمہیں بھی اٹھا کر مفت لے جاسکتے ہیں۔“
”مم..... میں نے..... آپ لوگوں سے کوئی غلط بات بھی نہیں کی جو آپ گرمی دکھا رہے ہیں۔“ فیچر نے ہمت کر کے کہا۔

”زبان بند ہی رکھو میری جان۔“ پستول والے کا لہجہ اچانک سفاک ہو گیا۔ ”اپنے ملازم کو بھی بھادو کہ وہ تمہارے ساتھ ایک طرف پالتو کتے کی طرح دم دبا کر کھڑا ہو جائے۔ ہمارے جانے سے پہلے تمہیں ہمارے اس وقت آنے کا اصل مقصد بھی معلوم ہو جائے گا۔“
فیچر کے جواب دینے سے پہلے ہی ملازم چکراتا ہوا اس کے قریب ہی فرش پر گر تھا دوسرے آدمی نے اس کو اچانک ہی ایسا ناپا تلا ہاتھ مارا تھا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ فیچر کے چہرے لے تاثرات یکھت بدل گئے پھر بھی اس نے ہمت کر کے کہا۔ ”آپ..... یہ اچھا نہیں کر رہے..... جہاں گیرٹ صاحب بھی اینٹ کا جواب.....“

پستول والے کا ہاتھ بھی برق رفتاری سے ٹھوم گیا ضرب اتنی شدید تھی کہ فیچر بھی لڑکھڑا گیا۔
”ہم جانتے ہیں کہ تمہارے جہاں گیرٹ کی اوقات کیا ہے۔“ دوسرے نے عمارت سے فیچر کو کھرا۔ ”دونمبر کے اٹھائی گھرے جگا کا نام سن کر لوگ ضرور خوفزدہ ہوتے ہوں گے لیکن ہم جس کے آدمی ہیں وہ جگا کا بھی باپ ہے۔“

”وقت ضائع مت کرو.....“ پستول والے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”پسندیدہ فرنیچر کا مول دل ہلدی کر لو۔“

اس کے بعد فیچر کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رو گئیں۔ دوسرے شخص نے بڑے بے تپ انداز میں فرنیچر کی توڑ پھوڑ شروع کر دی تھی اس بات کا خیال بھی رکھا تھا کہ آواز برابر کی دکانوں تک نہ لگی۔ فیچر اور ملازم دونوں سہمے کھڑے تھے۔ جب فرنیچر کی مرمت کرنے والے نے سرسراتے لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔

”اتنا لبا کھٹ راگ پالنے کے بجائے اگر کہو تو میں انہیں آگ دکھا دوں۔ جب تک دھواں

مل کر ملازمت سے برطرف کر دیتا۔ کئی بار اس نے کنول کے خوب صورت خدوخال کو سراہا تھا اس جسم کے نشیب و فراز کو بھی ٹٹولا تھا لیکن ایک بات تھی جس وجہ سے اس نے شیخ حامد کے رشتے کو قبول کرنے میں دو رائے کا ثبوت دیا تھا۔ انکار کی صورت میں وہ زبردستی بھی گھر سے اٹھوا کر اپنی اس کا نشانہ بنانے کی قوت رکھتا تھا۔

اس کی ماں نے بھی اس رشتے کو قبول کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا تھا۔ شادی کے بعد شیخ حامد نے اسے جو عزت اور کونھی بٹکے سے نوازا تھا وہ بھی اسے یاد تھا لیکن..... ماں کی دردناک موت کے بعد اس کے وجود کے اندر شیخ حامد کے خلاف نفرت اور انتقام کا جذبہ بڑی شدت سے سر اٹھ رہا تھا مگر..... وہ اس کے اشاروں پر چلنے پر بھی مجبور تھی۔ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب وہ اس سے اپنی ماں کا انتقام لے سکے لیکن شیخ حامد پوری طرح محتاط رہنے کا عادی تھا۔

اس وقت بھی اپنے کمرے میں بیٹھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اخباروں میں شائع ہونے والی خبریں پڑھ چکی تھی سب ہی کی ایک رائے تھی کہ وہ بیلی کا پتر سے گرنے کے بعد سمندر کی تہ میں ڈوب چکا تھا۔ اس نے بھی اس پر صبر کر لیا تھا لیکن موجودہ حالات میں بھی ماں کی دردناک موت اسے سکون نہیں لینے دے رہی تھی۔

شیخ حامد نے اس کی ماں کی موت کا جو جواز پیش کیا تھا ممکن ہے وہ اس کے خیال سے درست ہو لیکن کنول کو ماں کی موت کا غم اندر ہی ڈس رہا تھا۔ شیخ حامد نے اگر اسے اپنی اصلی آواز میں مخاطب نہ کیا ہوتا تو شاید وہ شناخت بھی نہ کر سکتی اسے علم تھا کہ وہ میک اپ کے فن میں ماہر تھا۔ نہ ہوتا تو شاید بالوں اب تک اسے اس کے انجام تک پہنچا چکی ہوتی اب بھی وہ سامنے آنے کے باوجود قانون کے گم ہانوں کی نظروں سے بہت دور تھا۔

دروازے پر قدموں کی آواز ابھری تو کنول نے چونک کر ادھر دیکھا اس وقت شیخ حامد اس کے سامنے سفید ڈانڈھی میں موجود تھا وہ دل پر جبر کر کے بستر سے نیچے آگئی۔ جانتی تھی کہ آنے والا اس مقدمے سے آیا ہے لیکن ماں کی موت کے غم کی وجہ سے اس نے پیش قدمی نہیں کی۔ خاموش کھڑی اس پھرے کو تکتی رہی جس کی مکروہ اصلیت پر تقدس کا طمع بڑی مہارت سے چڑھایا گیا تھا۔ ”میں جانتا ہوں ڈارلنگ کہ وقت اور حالات نے تم کو میرا پہلو گرم کرنے پر مجبور کر دیا ہے ورنہ تمہارے اندر ماں کا غم لینے کی خواہش ضرور چل رہی ہوگی۔“

کنول نے کوئی جواب نہیں دیا..... اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

”گھبراؤ مت۔“ وہ کنول کے قریب آکر بولا۔

”میرے تجربے نے مجھے تمہارے بارے میں دھوکا نہیں دیا تھا تمہارے اندر مرد کے

۱۲۱ لہذا تسکین پہنچانے کی وہ خوبی موجود تھی جو کسی کو بھی دیوانہ کر سکتی ہے لیکن اب تم ماں کے غم کی

۱۲۲ اس صلاحیت کو کھوتی جا رہی ہو۔“

”لہذا کوئی لڑکی اپنی ماں کے غم کو آسانی سے.....“

پہلے گا ہم دونوں نکل چکیں گے صبح جگا کو راکھ کے ڈھیر کے ساتھ اپنے آدمیوں کی روست شدہ لاشیں ملیں گی تو اسے باس کی طاقت کا انداز بھی ہو جائے گا۔ پھر وہ کبھی دم ہلانے کی غلطی نہیں کرے گا۔“

”نہیں.....“ پستول والے نے اپنے ساتھی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”باس نے جتنا حکم دیا ہے ہمیں صرف اسی حد تک کارروائی کرنی ہے۔ جگا کے لیے یہ پہلا سبق اگر کافی نہ ہوا تو پھر جلا دینا بھی ہمیں آتا ہے۔“

”ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جناب۔“ ملازم گھٹکیا نے لگا۔ ”ہم دونوں پر رحم کریں۔“

”منیجر.....“ پستول والے نے منیجر کو خونخوار نظروں سے دیکھا پستول تان کر سوال کیا۔ ”کیا تمہیں ہمارا حلیہ یاد ہے گا؟“

”کچھ نہ کچھ تو جھوٹ بولنا بھی پڑے گا۔“ منیجر نے بے بسی سے مردہ آواز میں کہا۔ ”مالک نے معاف کر دیا تو پولیس کے کارندے..... بھی ہمارا بیخود اڈھڑنے سے گریز نہیں کریں گے۔“

”پھر..... تم کیا پسند کرو گے؟“

”آپ ہم دونوں کے ہاتھ باندھ کر ڈال دیں۔ اس میں ہماری بچت ہے۔“

”کہو تو تم دونوں کی دو چار ہڈیاں بھی توڑ دیں۔ اسپتال میں بھی کچھ دنوں آرام کر لینا۔“

پستول والے نے طنز کیا۔ ”تمہارے جہانگیر بیٹ صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ ہم نے تمہیں زندہ چھوڑ کر ان پر کیا احسان کیا ہے۔“

منیجر کے علاوہ ملازم بھی خاموش رہا۔ جتنی دیر پستول والا ان پر رعب کاغشتا رہا اتنی دیر میں دوسرے آدمی نے بیشتر قیمتی فرنیچر کو خاصا ناکام بنا ڈالا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھی کے قریب آکر

بولا۔

”اب نکل چلو..... جگا کے لیے فی الحال یہی سبق کافی ہوگا۔“

”ان دونوں کا کیا کرتا ہے؟“ پستول والے نے غرا کر کہا۔ ”ہمارے جانے کے بعد یہ نطفہ نا تحقیق بھی شور مچانے سے باز نہیں آئیں گے۔“

”نن..... نہیں.....“ ملازم نے سہم کر ہاتھ جوڑ دیے۔ ”ہم پر رحم کریں۔“

ریوالور والا کچھ دیر ان دونوں کو سفاک نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ساتھی کی صرف بڑھا دیا۔ رومال سے کھور و فام کی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی دوسرے ساتھی نے باری باری منیجر اور ملازم کی ناک پر رومال رکھ کر دیا یا تو دونوں بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد..... بظاہر مہذب نظر آنے والوں نے بھی وہاں رکنے کی غلطی نہیں کی تھی۔



ماں کی موت کا غم لاحق ہونے کے باوجود وہ شیخ حامد کے اشاروں پر چلنے پر مجبور تھی ملازمت کے دوران اس نے بہت قریب سے اس کی قوت کا اندازہ لگایا تھا۔ وہ خوب صورت لڑکیوں کا رسیا تھا لیکن اس نے کبھی کنول کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر چاہتا تو اسے بھی روند اور

”فضول باتیں مت کرو.....“ شیخ حامد نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”میرے لیے اب بھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ غم زدہ لڑکیوں سے بھی کس انداز میں لطف حاصل کیا جاتا ہے۔“

”میں.....“ کنول نے ہچکچا کر کہا۔ ”ہمارے درمیان اب بھی ایک مقدس رشتہ قائم ہے اس لیے.....“

”شٹ اپ.....“ جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔

”میں آج اس رشتے کو بھی ختم کر رہا ہوں۔“ اس نے جیب سے نکاح نامہ نکال کر کھڑے کھڑے کر کے ہوا میں بکھیر دیا۔ بڑے زہریلے انداز میں بولا۔ ”اب تم میری بیوی نہیں ہو..... ایک مجبور لڑکی جو جس کی مجبوری کو میں زبردستی روندوں گا تو اس کی مزاحمت مجھے لطف اندوز کرے گی۔“

”کیا تمہیں میری بے کسی پر رحم نہیں آئے گا؟“ کنول مجسم سوال بن گئی۔

”یہ اس چھت کے نیچے تمہاری آخری رات ہے..... کل پولیس کے شکاری کتے تمہارے ملے ہوئے لباس سے میری مہک کے ذریعے میری تلاش شروع کر دیں گے لیکن کوئی میری گرد کو بھی نہیں پا سکے گا۔“

کنول کے لیے وہ جواب غیر متوقع نہیں تھا کہ لیکن اس کے بعد شیخ حامد نے اس کی مجبوری کو جس بے دردی سے روندادہ بھی کنول کے لیے بڑی اذیت ناک تھا۔ اس نے خود کو بچانے کی خاطر ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن پھرے ہوئے طوفان کے تیز ریلے کے آگے اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔



اورنگ زیب اپنے آفس میں بیٹھا ضروری فائلوں کو دیکھنے میں مصروف تھا جب اسے وکی کی کال موصول ہوئی، فون پر دوسری جانب کی آواز ابھرتے ہی اورنگ زیب کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ وکی عرف پتتھر جگا کا خاص آدمی تھا جسے اس نے بہت عرصہ پہلے حوالات سے رہائی دلائی تھی۔ جب سے وہ اورنگ زیب کے لیے نہایت ایمان داری سے کام کر رہا تھا۔ اسے ہدایت دی گئی تھی کہ صرف اہم معلومات کی خاطر اس سے رابطہ قائم کیا جائے مگر صرف موبائل پر چنانچہ ”ہیلو“ کے بعد وکی نے دوسری جانب سے فوراً ہی فون کرنے کی وضاحت بھی کر دی تھی۔

”آپ اسے میری مجبوری سمجھ لیں صاحب جو میں آپ کو ایک فون بوتھ سے کال کر رہا ہوں۔“

”میرے پاس وقت کم ہے۔“ اورنگ زیب نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اور آئندہ کبھی.....“

”معاملہ اس..... وشنو کا نہ ہوتا صاحب تو ایسا کبھی نہ کرتا.....“

وشنو کا نام سن کر اورنگ زیب سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”کیا خبر ہے؟“

”میں منٹ پہلے آج بھی وہ ہوٹل سے پھر تنہا ہی نکلا ہے، ایک منٹ پہلے وہ ٹیکسی سے اتر کر ”آل ان ون“ سپر اسٹور میں گیا ہے، میرا خیال ہے کہ اسے مجھ پر شبہ ہو گیا ہے، ایسی صورت میں وہ اندر رہ کر بھی چھپ کر کہیں سے میرے بارے میں اپنے شے کی تصدیق ضرور کرے گا۔ اسی غرض سے میں نے موٹر سائیکل سے اتر کر جیب سے موبائل نکالنے کی غلطی نہیں کی۔“

”اب کیا سوچا ہے؟“

”آپ کو اسی لیے فون کر رہا ہوں کہ اب میرا اس کے تعاقب میں جانا مناسب نہیں ہوگا۔“

”گڈ.....“ اورنگ زیب نے اسے کی ذہانت کو سراہا۔ ”تم کال ختم کر کے کسی اور طرف نکل جاؤ۔“

”ٹھیک ہے جناب..... ٹیکسی نمبر وہی ہے جس پر وہ دوبارہ پہلے بھی نظر آچکا ہے۔“

”آئی نو دیٹ۔“ اورنگ زیب نے فون بند کر کے لوچن سے موبائل پر رابطہ کیا۔ ”روم میٹ۔“

لے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“

”وہ باسٹرڈ ابھی آدھا کھٹنے پہلے کمرے سے نکلا ہے۔“ دوسری جانب سے لوچن کی جھلائی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں نے ابھی روم سرورس سے برف کی تھیلی منگوائی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“

”خود کو ٹھنڈا رکھنے کا یہ آخری فارمولا اختیار کر رہا ہوں جناب..... اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ میں خود اس کو اوپر پہنچا دوں۔“ لوچن نے بہ دستور اکھڑے اکھڑے لہجے میں اس کے اصل چہرے کے حوالے سے اس کی بکواس کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ”وہ جیٹا..... تیلی مرچنٹ مجھے بالکل ہی اناڑی سمجھ رہا ہے“ میں اسے زیادہ دنوں برداشت نہیں کر سکتا۔“

”فکرمٹ کرو..... میں اس کی دم سیدھی کرنے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”ایک دن کے لیے مجھے فری ہینڈالاٹ کر دیں۔“ لوچن نے سرسراتی آواز میں جواب دیا۔ ”دوسرے دن سے وہ بلف (bluff) کرنا بھول جائے گا۔“

”اور کچھ.....“

”مخصوص فون کالیں اس کے پاس آتی ہیں۔ اس کے خیال میں اس کا مسلم باپ ابھی زندہ ہے لیکن وہ ہر بار اس سے ڈائریکٹ بات کرنے کی کنڈیشن رکھ کر فون بند کر دیتا ہے۔ کل اس نے ایک اہم بات اور کہی تھی۔“

”وہ کیا.....؟“

”فون کرنے والے جانتے ہیں کہ وہ دو ہندوں کو اور پارسل کر دے..... ممکن ہے اس نے یوں ہی بکواس کی ہو لیکن اس نے یہی کہہ کر ٹال دیا تھا کہ باس سے بات کرنے کے بعد ہی ان کی ڈیمانڈ پوری کرے گا۔“

”اس نے نام نہیں بتائے تھے لیکن لوچن اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہے کہ اگر دو غلے ہندو نے جھوٹ نہیں بولا تو پہلا نمبر ہنڈ ریڈ پرسنٹ آپ ہی کا ہو گا۔“

”میں تم سے ڈس ایگری نہیں کروں گا۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”تمہارے اس خیال کے بعد دوسرا نام بھی میرے ذہن میں آ گیا ہے لیکن تم میری فکرمٹ کرو..... ہو سکتا ہے کہ میں ایک دو دن میں دشمنوں کو کہیں اور شفٹ کرادوں۔“

”میں اس بات سے ایگری نہیں کروں گا جناب.....“ جواب بے حد سنجیدگی سے دیا گیا۔ ”اگر دشمنوں کو ہٹایا گیا تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا شکار..... اگر زندہ ہے تو مزید الٹ ہو جائے گا۔“

”او۔“ میں تمہارے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کروں گا۔“

اورنگ زیب نے ریسیور کرڈیل پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر خون کی تمازت بڑھتی نظر آ رہی تھی..... اگر لوچن نے دشمن کے حوالے سے دو بندے کھڑکانے والی بات غلط نہیں کی تھی تو اس کے خیال میں دوسرا نمبر لیاقت حسین ہی کا ہو سکتا تھا جس کی نایدہ قوتوں نے کئی موقعوں پر آکٹوپس کا کھیل خراب کر دیا تھا۔ اس بات سے اورنگ زیب کے اس خیال کو بھی تقویت پہنچی تھی کہ آکٹوپس سمندر کی تہوں میں کہیں نہ کہیں ضرور سانس لے رہا ہو گا۔ وہ ان ہی خیالوں میں غرق تھا جب اس کے ان لسنڈ نمبروں پر ڈی آئی جی کی کال موصول ہوئی۔

”کیا آج پھر کوئی اہم حادثہ پیش آ گیا ہے؟“ ڈی آئی جی نے دوسری جانب سے اورنگ

زیرب کی آواز سنتے ہی پہلا سوال یہی کیا تھا۔

”جی نہیں..... کم از کم میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے.....“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ڈی آئی جی نے بہ دستور سنجیدہ انداز میں کہا۔ ”ابھی دس منٹ پہلے آئی جی نے مجھے اپنے ہنگامے سے کال کیا تھا۔ پہلے اس نے مجھے اور آپ کو اپنے دفتر آنے کو کہا تھا پھر اس نے صرف آپ کو بھیجنے کی ہدایت کی ہے..... اس وقت پونے گیارہ بجے ہیں آئی جی نے پونے بارہ کا وقت رکھا ہے۔“

”او۔“ کے سر..... میں پہنچ جاؤں گا۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس نے صرف آپ ہی کو کیوں طلب کیا ہے؟“

”اس کا جواب تو میں وہاں سے آنے کے بعد ہی دے سکوں گا۔“

”جب نیا آفسر آتا ہے تو لوگ اس کے کان بھرنے سے بھی باز نہیں آتے..... ہر شخص کا اپنا اپنا پرسنل انٹرسٹ ہوتا ہے لیکن آپ آئی جی سے ملتے وقت ایک بات ذہن میں ضرور رکھیے گا۔“

”آپ حکم دیں سر.....“

”حکم نہیں..... یہ دوستانہ مشورہ ہے۔“ ڈی آئی جی نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ”میرے ہوتے ہوئے آپ کبھی خود کو تنہا نہ سمجھئے گا“ میں ہر حال میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”تھینک یو سر.....“ اورنگ زیب نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔

کال ختم ہونے کے بعد وہ پانچ سات منٹ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر دشمنوں کے بارے میں کچھ غور کرتا رہا پھر اس نے دسی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دو منٹ بعد ہی وہ اپنی کار میں بیٹھا آئی جی آفس کی طرف جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر آئی جی نے صرف اسے تنہا طلب کیا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی اہم سبب بھی ضرور ہو گا۔

ٹھیک پونے بارہ بجے وہ آئی جی کے سامنے تنہا بیٹھا تھا، کچھ دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں پھر آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔

”مسٹر اورنگ زیب! قبل اس کے کہ ہمارے درمیان گفتگو کا آغاز ہو، میں ایک بات واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ جو بات اس وقت ہمارے درمیان ہو وہ لیک آؤٹ نہیں ہونی چاہیے۔“

”آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں..... سر!“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ہر چند کہ مجھے اس ملازمت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی لیکن استعفیٰ منظور ہونے تک میں اپنی اکائی (dignity) برقرار رکھنا پسند کروں گا۔“ آئی جی نے پروقار لہجے میں کہا۔

”میں نے اوپر کے دباؤ کو کبھی کبھی اہمیت نہیں دی..... پھر بھی کچھ پروڈکٹول کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پرسکون انداز میں بیٹھا آئی جی کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

”ویری کانسڈ آف یوسر۔“ اورنگ زیب نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر سلیوٹ کیا اور پھرتی سے باہر نکل گیا۔

❖❖❖

لیاقت حسین کو یاد تھا کہ اس دن ہفتہ ہے لیکن راحیلہ بیگم کی ڈیوٹی پر ہونے کے سبب اسے دیر ہو گئی تھی اسے یقین تھا کہ فرحین کو بھی اس کی اتفاقہ مصروفیت کا علم ضرور ہوگا اس لیے وہ برائیں مانے گی پھر بھی وہ دبے قدموں گھر میں داخل ہوا۔ فرحین کو بستر پر موجود نہ پا کر اس نے سکون کا سانس لیا اس کے ذہن میں فوری طور پر یہی خیال آیا کہ وہ راحیلہ بیگم کی طرف ہوگی۔ اکثر جب عثمان صاحب راحیلہ بیگم ساتھ جاتے تھے تو فرحین کو اپنے گھر پر ہی چھوڑ جاتے تھے۔

اس نے خاموشی سے لباس تبدیل کیا پھر وہ بستر پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں غسل خانے سے پانی گرنے کی مدھم آواز سنائی دی وہ آہستہ سے اٹھ کر قدم بڑھاتا غسل خانے کے قریب چلا گیا پانی کے گرنے کی آواز بہ دستور آ رہی تھی لیکن اندر روشنی نہیں تھی شاید غسل خانے کا بلب فیوز ہو گیا ہو؟

لائٹ کیوں بند کر رکھی ہے میڈم جان.....“ لیاقت حسین نے دروازے کے قریب جا کر اسے پیار سے آواز دی۔

”بیگم جان نہیں..... سواٹ ہئی بولا کر۔“

فرحین کی آواز کے ساتھ ہی باہر کی لائٹ بھی روشن ہو گئی لیاقت حسین نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا پھر..... دیکھتا ہی رہ گیا فرحین جس لباس میں دیکھ کر لیاقت حسین کے سارے بدن میں چیونٹیاں سی ریگنے لگی تھیں۔

وہ تو لیے کا سفید گاؤن تھا جو بڑے گھر کی خواتین نہانے کے بعد پہنتی تھیں گاؤن کے سفید پٹے سے گرہ بھی اس انداز میں لگائی گئی تھی کہ اوپر کا چمکتا دمکتا جسم دعوت نگارہ دے رہا تھا گاؤن کے نیچے کوئی زیر جامہ بھی نہیں تھا جس کی وجہ سے سڈول اور خوب صورت پاؤں بھی رانوں تک نظر آ رہا تھا۔ پیروں میں اسی مناسبت سے سفید ٹاول کی سیلپر تھی۔

لیاقت حسین کی توجہ کے برعکس فرحین ہاتھوں میں برش لیے اپنے لیے بالوں کو سنوار رہی تھی مدھم آواز میں گنگنا نے کا عمل بھی جاری تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے لیاقت حسین کی وہاں موجودگی کا علم ہی نہ رہا ہو۔ لیاقت حسین جانتا تھا کہ یہ لباس بھی اسے راحیلہ بیگم نے لے کر دیا ہو گا۔ وہ ہمیشہ ہی فرحین کا خیال رکھتی تھیں۔ سرفراز خان کے آنے کے بعد تو انہوں نے فرحین کے علاوہ لیاقت حسین بھی گھر کا ایک فرد ہی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ اس لباس میں ہونے اور غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز کا کیا مقصد تھا۔ ناموش کھڑا وہ فرحین کو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی محبت بھری والہانہ نظروں سے دیکھتا رہا، اچھی انداز سے صاف ستھرے ماحول میں وہ پہلے سے زیادہ صحت مند نظر آنے لگی تھی۔

”تین روز میں مجھے اوپر سے دوفون آچکے ہیں اور..... اتفاق سے دونوں آپ ہی کے بارے میں تھے۔“ آئی جی نے تھوڑے توقف سے بات جاری رکھی۔ ”پہلا فون کنول کی بازیابی کے سلسلے میں تھا۔ دوسرے میں کہا گیا کہ میں آپ کو موجودیٹ سے ہٹا دوں۔“

”کنول کی بازیابی کے سلسلے میں متعلقہ تھانے کا انسپکٹر تفتیش کر رہا ہے۔ میں ذاتی طور پر بھی اس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کچھ وقت لگے گا۔“

”کوئی خاص وجہ؟“

”یس سر..... وہ چونکہ شیخ حامد کی منکوحہ ہے اس لیے اسے کسی خاص مقصد کے پیش نظر ہی اغوا کیا گیا ہوگا۔ چھوٹے موٹے مجرموں نے یہ کام نہیں کیا ہوگا۔“

”آئی سی!“ آئی جی نے لمبی سانس لی پھر پہلی بار معنی خیز انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ ”موجودہ سیٹ سے ٹرانسفر کے سلسلے میں آپ کیا کہنا پسند کریں گے؟“

”اس کا فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے لیکن میں جنرل میٹنگ کے دوران بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں کچھ ذمے داریاں جب الوفی کے جذبے کے تحت نبھانے کا عادی ہوں اور جو میرا فرض بھی ہے۔ اس کے لیے کسی مخصوص سیٹ یا عہدے پر ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”گویا اس سیٹ سے ہٹنے کے بعد بھی آپ آکٹوپس کے معاملے سے دستبردار نہیں ہوں گے؟“ آئی جی نے پہلو بدل کر اسے گھورا۔

”ایسا نہیں ہے سر۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ابینسی کی ملازمتوں میں اوپر کے احکامات کی خلاف ورزی بھی جرم کے زمرے میں آتی ہے اس لیے میں پہلی فرصت میں اپنا ریٹائرمنٹ پیش کر دوں گا۔“

”مڈ.....“ آئی جی نے خلاف توقع اسے ستائی نظروں سے دیکھا۔ ”جب تک میں اس کرسی پر ہوں آپ کو موجودیٹ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا، دس ازمانی کمنٹ۔“

”تحقیق یوسر.....“

”بائی داوے۔“ آئی جی نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ”میں نے سنا ہے کہ مرکز کے کچھ بڑے لوگوں سے آپ کے بھی اچھے تعلقات ہیں۔“

”یس سر..... لیکن میں نے ان کو کبھی کس غلط مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔“ اس بار بھی اورنگ زیب نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”کنول کے اغوا کے سلسلے میں اوپر والے ایک دو افراد بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔“ آئی جی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس سلسلے میں انہیں پروگرس سے آگاہ کرتے رہیے گا۔“

”او۔ کے.....“ جواب اختصار سے دیا گیا۔

”رائٹ.....“ آئی جی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آئی وٹ یو آل دی بیسٹ۔“

کچھ لمبے خاموشی سے گزر گئے پھر لیاقت حسین نے اس کے قریب جا کر کہا۔
”آج تو اس لباس میں تو بلیغ لگ رہی ہے۔“

”واٹ.....؟“ فرحین نے اسے دیکھ کر بیگموں والے انداز میں کہا۔ ”ٹم..... ادھر اندر کیسے آیا..... گٹ آؤٹ۔“

”او۔ کے..... ابھی ٹم ادھر سے جاؤ..... کوئی کام ہوگا تو ہم ٹم کو بلا لے گا۔“

”کام تجھے نہیں..... مجھے ہیں میری بلیں۔“ لیاقت حسین نے اسے آگے بڑھ کر اپنے بازوؤں کے حصار میں دیوبچ کراٹھا لیا اسی طرح لیے لیے بستر پر آ گیا۔

”سچ بتا.....“ فرحین نے اپنا گناؤں ٹھیک کرتے ہوئے شوہر کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیسی لگ رہی ہوں اس لباس میں؟“

”تو روز ناول سے لیاقت کی جان ہے..... اگر تو نہ ہوتی میں زندہ بھی نہ رہتا۔“

”چپ کر جالیاقت۔“ فرحین نے سہم کر شوہر کے منہ پر ہاتھوں رکھ دیا۔ ”ایسی بات دوبارہ کبھی مذاق میں بھی نہ بولنا۔“

”نہیں بولوں گا جان۔“ لیاقت حسین نے اس کے گھنے بالوں سے کھیلے ہوئے کہا۔ ”میں تو سمجھا کہ آج دیر ہونے کی وجہ سے تو خفا ہوگی لیکن تو پہلے سے میم بنی ہوئی ہے۔“

”یہ بے شرمی والا لباس ہے لیکن بیگم صاحب نے کہا تھا کہ گھر کے مردوں کو مٹھی میں رکھنے کی خاطر ایسے ہی پہناوے کام آتے ہیں۔“

”اور کیا کہا تھا بیگم صاحبہ نے مردوں کو لمھانے کے لیے؟“ لیاقت حسین نے ہر سراتے نیچے میں پوچھا۔

”بہت سی گر کی باتیں بتائی ہیں لیکن وہ میں تجھے نہیں بتاؤں گی۔“ فرحین نے شوخی سے جواب دیا۔ ”تو پہلے ہی گر وگھٹال ہے۔ سب باتیں بتادیں تو پھر فائدہ کیا ہوگا؟“

”یہ سب بڑے آدمیوں کی بڑی بڑی باتیں ہیں میری جان.....“ لیاقت حسین نے اسے خود سے اور قریب کر لیا، انگریزی کشتی میں وہ مزاح بھی نہیں ہوتا جو اکھاڑے کی اٹھاؤں میں دونوں پہلوانوں کو ملتا ہے سمجھ رہی ہے میری باتیں.....“

”پہلے دن سے سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے شوخی سے کہا۔ ”چل ہٹ ایک طرف میں یہ لباس بدل لوں آج ہی بیگم صاحبہ نے دیا ہے۔“

”اس کی فکر مت کر..... اس کے خراب ہونے اور بار بار دھونے میں بھی بڑا سوا ملتا ہے۔“

”سچ کہہ رہا ہے؟“

”ایک دم سولہ آنے چ.....“

”پرتو نے یہ تجربہ کب اور کہاں کیا؟“ فرحین نے اسے پہلی بار ایک عورت کی نظروں سے دیکھا۔

”شادی کے بعد انسان آہستہ آہستہ سب کچھ آپ ہی آپ سمجھ جاتا ہے۔“ لیاقت حسین نے اس کی آنکھوں میں دور تک جھانکا۔ ”پہلے دن تو بھی بالکل اپناڑی تھی لیکن اب تجھے بھی اکھاڑے کے سارے داؤ بیچ آ گئے ہیں..... رہی سہی کسر بیگم صاحبہ پوری کر رہی ہیں۔“

لیاقت حسین کا جواب سن کر فرحین کسی چھوٹی موٹی کے پودے کی طرح اس کے کشادہ سینے میں سمیٹ گئی۔ لیاقت حسین نے ایک ہاتھ سے اسے سمیٹا۔ دوسرے ہاتھ سے نائٹ بلب کی مدھم روشن بھی آف کر دی۔



جگا کے نام کی پرچی دیکھ کر اورنگ زیب چونکا۔ ایک لمحے میں اس کے ذہن میں بے شمار خیالات گلدنڈ ہو کر رہ گئے۔ جگا نے اس سے پیشتر کبھی اس کے قریب آنے کی غلطی بھی نہیں کی تھی پھر..... اس نے دفتر پہنچ کر سپاہی کے ذریعے اپنے نام کی پرچی اندر بھیجے کی جرات کیسے کی؟

وہ جانتا تھا کہ جگا کے ہاتھ صاف ہیں..... نہ ہوتے تو ملٹری انٹیلی جنس والے آسانی سے اس کا پیچھا بھی نہ چھوڑتے۔ قانون کے ہاتھوں ملنے والی سزا پوری کرنے کے بعد اس نے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اپنے تحفظ کی خاطر اس نے کچھ سر پھرے افراد بھی جمع کر لیے تھے جنہیں وہ ضرورت مندوں کو ان کے تحفظ کے لیے فراہم کرتا تھا مگر ان سب کو بھی اس نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ قتل و غارت گری سے دور ہی رہیں۔

جگا کی رہائی کی سفارش بھی اورنگ زیب نے اس کا سابقہ ریکارڈ دیکھ کر کرٹل احتشام سے کی تھی، لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود اسے کسی بدنام آدمی کا اس طرح اپنے دفتر آنا پسند بھی نہیں تھا۔ شریہند عناصر اس بات کو دوسرا رنگ بھی دے سکتے تھے۔ وہ ایک لمحے تک اپنے خیالوں میں گم رہا پھر کانشیل سے پوچھا۔

”اور کون ہے جہانگیر بٹ کے ساتھ.....؟“

”وہ تنہا آیا ہے سر لیکن.....“ کانشیل نے ہچکچا کر دبی زبان میں کہا۔ ”کسی وجہ سے الجھا ہوا لگ رہا ہے۔“

”اسے اندر بھیج دو..... اور جب تک وہ اندر ہے کسی اور کو نہ آنے دینا۔“

سپاہی اگلے قدموں واپس لوٹ گیا اورنگ زیب کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک منٹ بعد ہی جگا اس کے سامنے موجود تھا سپاہی نے جو کہا تھا وہ بھی غلط نہیں تھا۔ جگا اس وقت کچھ الجھا الجھا سا نظر آ رہا تھا۔ اورنگ زیب نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیسے رحمت کی میرے پاس آنے کی؟“ اورنگ زیب نے کھر دے لہجے میں سوال کیا۔

”میں جانتا ہوں صاحب کہ آپ کو اس وقت میرا یہاں تک آنا.....“

”میرے پاس وقت کم ہے.....“ اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”آپ کا مقصد کیا

جواب میں چگانے چار عدد تصویریں نکال کر اورنگ زیب کے سامنے رکھ دیں۔ وہ تصویریں اس نے خود اتاری تھیں جس میں فرنیچر کی بربادی اور دکان کی تباہ کاری کے سارے مناظر موجود تھے۔ اورنگ زیب نے ان تصویروں کو غور سے دیکھا پھر اس کی نظریں چگا کی سمت اٹھ گئیں۔

”یہ کیا ہے؟“

”یہ چگا کی شرافت اور اس خاموشی کے منہ پر ایک بھرپور تمیز ہے صاحب۔“ چگانے اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس وقت آپ کے پاس نہ آتا تو بعد میں آپ کو بھی مجھ سے شکایت ہی ہوتی۔“

”کس بات کی شکایت.....؟“

”مجھے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا آتا ہے صاحب لیکن.....“ چگانے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کوئی قدم اٹھانے سے پیشتر آپ سے مل لینا ضروری سمجھا ہے۔“

”اگر میں تم کو بدستور برداشت کرنے کا مشورہ دوں تو.....؟“

”تو.....“ چگانے کسمسا کر جواب دیا۔ ”میں انکار نہیں کروں گا صاحب لیکن ایسی صورت میں اس شہر میں کسی کو منہ بھی نہ دکھاؤں گا۔“

”تم نے اس حادثے کی ایف آئی آر درج کرائی؟“

”جی نہیں.....“ چگانے نظریں جھکا کر کہا۔

”کیوں.....؟“

”اس لیے کہ ابھی تک قانون کی نظریں بھی اس کی تلاش میں ہیں جس کے اشارے پر یہ سب کیا گیا ہے۔ ایف آئی آر کا پیٹ بھرنے کی خاطر پھر کس جہانگیرٹ کو بے گناہ پڑ لیا جائے گا۔ میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ شاید وہ بھی زندہ رہنے کی خاطر جیل میں استادوں سے سکھے ہوئے طریقوں کو زندہ رہنے کا ذریعہ بنالے۔ یہ مجھے منظور نہیں ہے۔“

”میری طرف سے سبز جھنڈی دکھائے جانے کے بعد تم کیا کرو گے؟“

”بڑی مچھلی کے حلق میں کاٹنا پھنسانے کی خاطر کچھ چھوٹی مچھلیوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔“ چگانے دبی زبان میں کہا۔ ”میں کچھ ایسے لوگوں پر ہاتھ صاف کروں گا جن لوگوں نے یہ کام کیا ہے..... ہو سکتا ہے میرا دونوں جواب ملنے کے بعد وہ بھی سامنے آجائے جس کے اشارے پر یہ سب کچھ کیا گیا ہو۔“

”تم چاہو تو ان کے نام مجھے بھی بتا سکتے ہو۔“

”قانون ثبوت اور گواہوں کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا جناب۔ جبکہ ایسے معاملات میں غیر قانونی اقدامات زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔“

”تم جس کی سمت اشارہ کر رہے ہو وہ بیشتر لوگوں کے خیال اس دنیا میں نہیں ہے۔“

”سانپ کے بچے بھی سنبولیے ہوتے ہیں صاحب۔“ چگانے مل کھا کر جواب دیا۔ ”خود کو بڑا

منوانے اور اقتدار کی جنگ بھی پشت پشت تک چلتی رہتی ہے۔“

اورنگ زیب نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا اس کی تجربے کا نظریں کچھ دیر چگا کے چہرے پر منڈلاتی رہیں پھر اس نے ریسور اٹھا کر متعلقہ تھانے سے رابطہ کر کے کشمیر فرنیچر پر ہونے والی واردات کی ایف آئی آر درج کرنے کو کہا۔ کچھ ضروری ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی اس بات کی تاکید بھی کی کہ اس معاملے میں بلاوجہ دکان کے مالک کو ہراساں نہ کیا جائے پھر اس نے ریسور رکھ کر چگا سے کہا۔

”تم میرے حکم کے بغیر کوئی قدم فی الحال اٹھانے سے گریز کرو گے۔“

”اگر آپ کا بھی یہی حکم ہے صاحب تو پھر ٹھیک ہے۔“ چگا ضبط کرتے ہوئے اٹھا جانے کے لیے مڑا تو اورنگ زیب نے تیزی سے آواز دی۔

”ون منٹ.....“

اور کیا حکم ہے بڑے صاحب؟“ چگانے پلٹ کر بڑی بے بسی سے پوچھا اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”میں نے تمہیں جو مشورہ دیا ہے اسے دوستانہ ہی سمجھنا، کوئی حماقت نہ کرنا۔“ اورنگ زیب کے لہجے میں اپنائیت کے ساتھ ہی کوئی ایسا پیغام بھی ضرور تھا جسے سمجھ کر چگا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ایک لمحہ وہ خاموش کھڑا اورنگ زیب کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر نظریں جھکا کر خاموشی سے چلا گیا۔



آنے والی ٹیکسی کو ملٹری انٹیلی جنس کے چھانک سے دس گز دور ہی روک لیا گیا۔ ایک آرڈر گارڈ نے اندر دیکھا جہاں پچھلی نشست پر ایک جوان خاتون سر جھکائے بیٹھی تھی ایک لمبے تک گارڈ اس حسین مہمان کو بہت غور سے نگاہوں میں ٹوٹا رہا۔ اس کے جسم پر لباس بھی قیمتی ہی تھا لیکن لباس کے ساتھ ہی خاتون کی حالت میں اداسی اور بیزاری کی کیفیت بھی نظر آرہی تھی۔

”کہاں جانا ہے بی بی.....؟“ گارڈ نے خاتون سے سوال کیا۔

”مجھے کمرل احتشام سے فوری ملنا ہے۔“ خاتون نے جو کنول کے سوا کوئی اور نہیں تھی گارڈ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”میں کام کی نوعیت تمہیں نہیں بتا سکتی اور..... میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔“

”آپ کا نام.....؟“

”کنول.....“

گارڈ نے کنول کی مناسبت سے اسے ایک بار پھر سر سے پاؤں تک دیکھا پھر نڈرے خشک لہجے میں بولا۔

”کمرل صاحب بغیر جنگی اپاءمنٹ کے کسی سے ملاقات نہیں کرتے۔“

”وقت مت ضائع کرو.....“ کنول نے اسے گھور کر کہا۔ ”میں اگر اس وقت کرنل سے ملے بغیر چلی گئی تو تمہاری ملازمت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“

”تم ادھر ہی ٹھہرو۔“ گارڈ نے برا سا منہ بنا کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا پھر اگلے قدموں لوٹ گیا۔ لڑکی نے جس انداز میں اسے ملازمت قائم نہ رہنے کی دھمکی دی تھی وہ ایسی نہیں تھی جیسے وہ نظر انداز کر دیتا۔ بہت سی ایسی خفیہ اور راز کی باتیں ہوتی تھیں جو صرف افسران کو بتائی جاتی تھیں۔

مین گیٹ پر پہنچ کر اس نے ڈیوٹی آفیسر کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ڈیوٹی آفیسر نے اوپر کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی کرنل احتشام سے رابطہ قائم کر کے اسے آنے والی کے نام سے آگاہ کر دیا پھر کہنے کے بجائے خود ہی اٹھ کر گیٹ پر آ گیا۔ اس کے حکم پر ہی ڈیوٹی گارڈ نے ٹیکسی ڈرائیور کو آگے آنے کا اشارہ کیا تھا ٹیکسی گیٹ پر پہنچ کر رکی۔ ڈیوٹی آفیسر کی ہدایت پر ایک گارڈ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ دو تین منٹ بعد ٹیکسی کو ایک بیرک کے سامنے روک دیا گیا۔ ڈیوٹی گارڈ نے نیچے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے لڑکی سے بڑے مہذب انداز میں کہا۔ ”آپ سامنے والے کمرے میں چلی جائیں بی بی..... کرنل صاحب ادھر ہی ہوتے ہیں۔“

وہ ٹیکسی سے اتر کر کرنل کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ درمیان میں کسی نے مداخلت نہیں کی۔ کمرے میں کرنل احتشام کے ساتھ ایک اور جوان بھی یونیفارم میں موجود تھا۔ کنول کرنل کا اشارہ ملنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ چند لمحوں تک کرنل احتشام کنول کی ظاہری کیفیت کا اندازہ لگاتا رہا پھر سنجیدگی سے بولا۔

”پولیس رپورٹ کے مطابق آپ کو دو تین روز قبل اغوا کر لیا گیا تھا؟“

”آپ کی اطلاع غلط نہیں ہے۔“ کنول نے خالی خالی نظروں سے کرنل کو دیکھ کر اداس لہجے میں کہا۔ ”مجھے کہاں لے جایا گیا تھا میں اس کی نشاندہی بھی نہیں کر سکتی گی۔ رہائی کے وقت بھی میری آنکھوں پر بلاسٹڈر چڑھا کر اوپر سے ٹیپ کر لیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے پیشتر مجھے ایک مصروف سڑک کے قریب اتار دیا گیا، میری آنکھوں کی پٹی بھی کھول دی گئی۔“ وہ رکے بغیر بولتی رہی۔ ”وہاں سے ٹیکسی پکڑ کر میں ایک واقعہ کار نیوز رپورٹر کے پاس گئی اسے کچھ تفصیل سے آگاہ کیا پھر اسی کے مشورے پر آپ کے پاس آ گئی۔“

”کیا تم نے اغوا کرنے والوں کو پہچان لیا ہے۔“

”صرف ایک کو..... وہ بھی اس کے حلیے یا صورت سے نہیں بلکہ اس کی آواز سے۔“ کنول کے مردہ ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری اس نے دراز پلکیں جھپکا کر اس انداز میں کرنل کو دیکھا جیسے وہ گہری نیند کی کیفیت سے دو چار ہو۔

”کون تھا وہ.....؟“

”وہ..... وہ..... وہی ہے کرنل جس نے سب کی نیندیں خراب کر رکھی ہیں۔“ کنول زہر خند سے بولی۔ ”اس کے ایک نہیں کئی نام ہیں..... سنگدل..... عیاش..... بد معاش..... قاتل.....“

آکنولپس..... شیخ حامد۔“

”کیا.....؟“ کرنل احتشام نے حیرت سے کنول کو دیکھا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا جب ایس پی اورنگ زیب بھی اندر داخل ہوا کرنل نے کنول کے آنے کی خبر سنتے ہی اسے آگاہ کر دیا تھا۔ کرنل کی نظروں کے تعاقب میں کنول نے بھی اورنگ زیب پر ایک نظر ڈالی پھر ہونٹ چبانے لگی اورنگ زیب کے پیٹھ جانے کے بعد کرنل نے دوبارہ کنول کو مخاطب کیا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شیخ حامد ہی تھا؟“

”میں کل تک اس کی منکوحہ تھی کرنل.....“ کنول نے جمائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”ماں اپنی اولاد اور بیوی اپنے شوہر کو چھونے کے بعد اسے شناخت کرنے میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔“ پھر اس نے شیخ حامد کے آخری جملے بھی تفصیل سے دہرا دیے۔

”تمہاری ماں کے قتل میں جو لوگ ملوث تھے کیا تم ان کی کوئی نشاندہی کر سکتی ہو؟“ اس بار اورنگ زیب نے سوال کیا۔

”وہ..... سب اس کی شکاری اور پالتو کتے تھے..... جو ہمیشہ پولیس کی نظروں سے بچنے کی خاطر میک اپ میں رہنے کے عادی ہیں۔“

”ون منٹ.....“ کرنل احتشام نے کسی فوری خیال کے تحت کنول کو متوجہ کیا۔ ”تم نے ابھی کہا تھا کہ کسی نیوز رپورٹر کے مشورے کے بعد ہی تم یہاں آئی ہو.....؟“

”میں نے غلط نہیں کیا تھا کرنل..... ویسے بھی اس وقت میں کوئی غلط بیانی نہیں کروں گی۔“

”تم نے رپورٹر سے شیخ حامد کے بارے میں کیا کہا تھا؟“

”یہی کہ وہ ابھی مرا نہیں..... زندہ ہے۔“ کنول نے دوبارہ جمائی لی۔ ”میں اس کو اپنا تحریری بیان بھی دے چکی ہوں۔“

”ادنو.....“ کرنل نے تمللا کر کہا۔ ”تم نے ٹھیک نہیں کیا بی بی..... یہ خبر اگر اخباروں میں آ گئی تو وہ باسٹرڈ اور زیادہ ہوشیار ہو جائے گا۔“

کنول نے کرنل کو خوبیدہ نظروں سے دیکھا۔ کوئی جواب نہیں دیا اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ کرنل کے برابر بیٹھا ہوا جوان بوجھ پوری توجہ سے اسے شروع سے واج کر رہا تھا چونکا۔ اس نے منہ قریب کر کے کرنل سے کچھ سرگوشی کی پھر اٹھ کر تقریباً ڈبل مارچ کرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

”کیا بات ہے کرنل؟“ اورنگ زیب نے کرنل احتشام سے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔

”تم..... تم.....“ کرنل نے اپنے ساتھی کے جانے کے بعد کنول کو بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا بی بی..... جب تم نے ہمارے پاس آنے کا ارادہ کر لیا تھا تو پھر تم ہمیں کوئی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

کرنل کا جملہ سن کر اورنگ زیب بھی چونکا اس کی نظریں بھی کنول پر مرکوز ہو گئیں جس کی پلکیں

آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔ اسی وقت لیب کوٹ میں ملبوس ایک ڈاکٹر تیز تیز قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا اس کے پیچھے اسٹریچر لانے والے بھی تھے اورنگ زیب کو صورت حال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔
ڈاکٹر نے تیزی سے قریب آ کر کنول کی الٹی کلائی پر ہاتھ جما کر اس کی نبض ٹٹولی۔

”نو ڈاکٹر..... نو..... پلیز“ کنول نے بڑی مضطرب آواز میں کہا۔ ”اگر تم..... جت..... تم میرے ہمدرد ہو تو مجھے بچانے کی کوشش نہ کرنا..... ہل..... ہل..... ایز.....“ جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی کنول نے میز پر سر فیک دیا اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

”ڈاکٹر.....!“ کرٹل کے ساتھ ہی اورنگ زیب بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نبض بڑی مدہم رفتار میں چل رہی ہے..... پھر بھی میں پوری کوشش کرتا ہوں۔“
کنول کو اسٹریچر پر ڈال کر کمرے سے لے جایا گیا ڈاکٹر جیسی ساتھ ساتھ تھا۔ کرٹل کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خون کی سربخی کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے اورنگ زیب سے کہا۔

”پلیز..... آپ اپنے ذرائع استعمال کریں۔ شیخ حامد کے زندہ ہونے کی خبر پریس میں نہیں آئی چاہیے۔“

اورنگ زیب نے جب سے موبائل نکال کر کیے بعد دیگر چار پانچ فون کیے لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا۔
”بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہے کرٹل..... جو وعدے کیے جا رہے ہیں ان پر یقین بھی نہیں کر سکتا۔“

کرٹل کے چہرے پر بھی اشتعال کی کیفیت گہری ہونے لگی پھر اس نے اورنگ زیب کو تفصیل سے ان باتوں سے آگاہ کر دیا جو اس کے اور کنول کے درمیان ہو چکی تھیں۔

”آئی۔سی۔!“ اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کنول نے جو قدم اٹھایا ہے وہ سوچ سمجھ کر ہی اٹھایا ہوگا۔“

”میں سمجھا نہیں.....؟“ کرٹل نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”جنگل کا قانون بھی یہی ہے۔ شیر جب شکار سے پیٹ بھر کر ایک طرف ہو جاتا ہے تو پھر بھیڑے اور لکڑ بھگے بھی اپنا اپنا حق وصول کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ ہڈیوں پر بچا کچا گوشت بھی گدھ نوح ڈالتے ہیں۔“ اورنگ زیب نے بڑے زنجی لہجے میں وضاحت کی۔ ”آکٹوپس کے طلاق دینے کے بعد اس کی غیرت کو جس طرح مجروح کیا گیا۔ اس کے بعد دو ٹکے کے مجرم بھی اپنا حق وصول سے باز نہ آتے۔“

”یو آر رائٹ۔“ لیکن اگر وہ پریس میں بیان دینے کے بجائے براہ راست ہمارے پاس آ جاتی تو ہم اسے تحفظ بھی فراہم کر سکتے تھے۔ خود وہ بھی ہماری رہنمائی کرنے میں خاصی موثر ثابت ہو سکتی تھی۔“

”آئی ایگری وڈ یو کرٹل لیکن کنول کی جگہ اگر کوئی دوسری شریف لڑکی ہوتی تو شاید وہ بھی خود اپنی نظروں میں گر جانے کے بعد زہر کھانے سے گریز نہ کرتی۔“

”ہو سکتا ہے لیکن..... لٹ اس فورگٹ آل اباؤٹ اٹ۔“ کرٹل نے ہونٹ چپاتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”اب ہمیں کنول کے بیان کی روشنی میں نئے سرے سے اس پاسٹریڈ کو ٹریس کرنے کی خاطر بہت محتاط اور موثر کارروائی کرنی ہوگی۔ اگر وہ زندہ ہے تو اسی شہر میں کہیں نہ کہیں ضرور چھپا ہوگا..... ہمیں ہر ممکن شخص پر نظر رکھنی ہوگی۔“

”ڈونٹ وری کرٹل.....“ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”میں ایک لمحہ بھی اس کی طرف سے غافل نہیں رہا ہوں۔“

کرٹل احتشام کوئی جواب دینا چاہتا تھا جب میڈیکل یونٹ کا ایک میل نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے معذرت کر کے کہا۔ ”سمر..... ڈاکٹر نے آپ کو سلام کہا ہے۔ بیٹھ کر حالت میں کچھ بڑبڑا رہی ہے۔“

کرٹل احتشام اور اورنگ زیب دونوں ایک ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔
ڈاکٹر کا پیغام سننے ہی اورنگ زیب اور کرٹل احتشام میڈیکل وارڈ کے اس سائڈ میں گئے جہاں کنول کو رکھا گیا تھا۔ وہ بستر پر مردوں کی طرح بے سدھ پڑی تھی۔ سینے کے مدہم مدہم انداز میں متحرک ہونے سے ایک شبہ سا ہوتا تھا کہ ابھی جسم اور روح کا رشتہ ختم نہیں ہوا۔ کچھ سانس باقی رہ گئے ہیں جنہیں وہ پورے کر رہی تھی۔

”ڈاکٹر.....“ کرٹل نے ڈاکٹر کے قریب جا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کبھی کبھی یہ بے ہوشی کی حالت میں کچھ بڑبڑانے لگتی ہے۔“

اورنگ زیب کی نظریں بہ دستور کنول کے چہرے پر مرکوز تھیں..... اس کی آنکھوں میں رہ رہ کر پتنگاڑیاں سی چٹکتی لگتی تھیں جس سے اس نفرت اور انتقام کی شدت کا احساس ہو رہا تھا جو اس کے دل میں آکٹوپس کے خلاف سرا بھار رہی تھی۔

کرٹل ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا جب اچانک کنول کے جسم میں کسی دم توڑتے پرندے کی سی ہلچل مچ اٹھ ہوئی۔ اس کے ہونٹوں سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔

”نہیں..... نہیں..... خدا کے لیے..... مت کرو..... ایسا مت کرو..... آہ..... ظالم..... انسانی..... تم تم..... تم میری ماں کے قاتل ہو..... میں..... میں تم سے..... نفرت کرتی ہوں..... تھوکتی ہوں..... چھ..... چھوڑ دو مجھے..... خدا..... کے لیے..... آف..... آہ..... جت..... تم بھی.....“

بے ربط جملوں کے درمیان میں وہ اچانک ہذیانی انداز میں چیختی۔ ”ماں..... ماں..... مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ..... میں..... میں بھی آ رہی..... ہی..... ہوں..... آ آ.....“

پھر اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ دوبارہ اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض ہاتھ رکھ دیا۔

”ڈاکٹر.....“ کرئل احتشام نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”اے بچانے کی کوشش کرو۔“
”نبض کی رفتار تشویشناک حد تک گر رہی ہے۔ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ ہوپ از اوٹلی
نہیں پرسنٹ۔“

ڈاکٹر نے کنول کو ایک اور انجکشن لگایا پھر وہ تینوں باہر آ گئے۔
”ذہن ایک بار مکمل طور پر ڈیپ سلیپ (گہری نیند) کی کیفیت سے دو چار ہوئے تو سکون
بھی ملتا ہے لیکن مریضہ کو کسی نے بہت نارنج کیا ہے۔“

ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔ ”کون تھا وہ؟“
”اے گولی مارو ڈاکٹر۔“ کرئل نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ مریضہ ہر قیمت پر زندہ رہے۔“

”محاذ جنگ پر بھی ہم سب اپنی جیت کے لیے پراسید ہوتے ہیں کرئل لیکن..... ہم فوجی
ہیں..... جیت گئے تو غازی..... مر گئے تو شہید۔ مگر مریضہ فوجی نہیں ہے اور میں..... میں صرف اپنی سی
کوشش کر رہا ہوں۔“

”اوکے ڈاکٹر.....“ کرئل نے طویل سانس لے کر کہا۔ پھر اورنگ زیب کے ساتھ قدم اٹھاتا
دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

”موت اور زندگی خدا کے اختیار کی بات ہے کرئل۔“ اورنگ زیب نے لب کشائی کی ”لیکن
اگر کنول مر گئی تو میں آکٹوپس کو اس کے آخری انجام تک پہنچاتے وقت بھی کسی قانونی تقاضوں کا
احترام نہیں کروں گا۔“

”آئی..... ایگری و دیو.....“ کرئل نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ
مریضہ زندہ رہے۔“

خاصی دیر تک دونوں کنول کی باتیں کرتے رہے پھر دونوں کی نظریں دروازے کی جانب اٹھ
گئیں۔ آنے والا ڈاکٹر کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

”اب کیا پوزیشن ہے ڈاکٹر.....“
”میں نے مریضہ کا تنفس بحال کرنے کے لیے آکسیجن ماسک بھی لگایا ہے لیکن.....“

”لیکن کیا.....“ اورنگ زیب نے بے چینی سے پوچھا۔
”امید کا گراف بڑھنے کے بجائے گرتا ہی جا رہا ہے پھر بھی میں اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش
کرتا رہوں گا۔ ہمارے پروفیشن کا تقاضا بھی یہی ہے مگر اتنی خوب صورت لڑکی کے ساتھ ایسا وحشیانہ
سلوک کرنے والا کون تھا۔“

ڈاکٹر نے پہلی بار سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا وہ پکڑا گیا؟“
”نہیں.....“ کرئل نے جھلا کر کہا۔ ”وہ..... وہی باسٹرڈ ہے جو ہمارے خیال میں ڈوب گیا
تھا۔“

”اوہ..... نو۔“ ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”لیکن اس لڑکی سے اس کا کیا تعلق تھا؟“

”وہی..... جو جنگل میں کسی آدم خور چیتے کا معصوم ہرن سے ہوتا ہے۔“ کرئل نے حقارت
سے جواب دیا۔

اسی وقت وارڈ بوائے نے اندر داخل ہو کر ڈاکٹر سے کچھ کہا تو وہ اٹھ کر تیزی سے کمرے سے
نکل گیا۔

”کرئل.....“ اورنگ زیب نے کچھ دیر بعد اٹھتے ہوئے درخواست کی۔ ”میں آپ سے مریضہ
کی حالت معلوم کرتا رہوں گا۔“

”اوکے۔“ کرئل نے اٹھ کر فوجی انداز میں اورنگ زیب سے مصافحہ کیا پھر اس کے جانے کے
بعد اس نے ریوایلوگ چیز پر بیٹھ کر ریسور اٹھالیا۔ شیخ حامد کے بارے میں پھر اپنی ٹیم کے افراد کو
دوبارہ ایکٹو ہونے کی ہدایتیں دینے لگا۔



دوسرے دن اخباروں نے شیخ حامد کے زندہ ہونے کی خبریں کنول کی تصویر اور اس کے
تحریری حوالے کے ساتھ جلی سرخیوں سے شائع کیں تو متعلقہ حلقوں میں پھر سے بے چینی کی لہر دوڑ
گئی۔ کاروباری لوگوں کے ایک گروپ کا سانس پھر تیز تیز چلنے لگا۔ ان میں سرفہرست رستم علی آغا خانی
تھا۔

میڈم روبی نے جہاں اس خبر کو پڑھ کر متفنی کی انگوٹھی ہاتھ سے اتار کر سیف میں رکھ دی
تھی۔ وہیں ڈی آئی جی بھی تھلا کر رہ گیا تھا۔ صبح صبح اورنگ زیب اور سراج کی پیشی کا مقصد بھی یہی
تھا۔ اسے ایک طرف میڈم روبی کے ساتھ گھر بسانے کا خواب ٹونے کا غم تھا تو دوسری جانب کچھ ذاتی
خداشات بھی اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

”میرا خیال ہے کرئل احتشام نے آپ کو کنول ہی کے سلسلے میں بلایا ہو گا۔“ اس نے اورنگ
زیب سے پوچھا۔

”جی ہاں..... اس کی اطلاع میں آپ کو کل رات بھی مختصر دے چکا ہوں۔“
”اب کنول کس پوزیشن میں ہے؟“

”ڈاکٹر کو اس کے بچنے کی زیادہ امید نہیں ہے۔“ اورنگ زیب نے بہ دستور سنجیدگی برقرار
رہی۔

”میرا ذاتی خیال ہے کہ کنول نے پریس کو اپنا تحریری بیان دے کر کسی دانش مندی کا ثبوت
نہیں دیا۔“ ڈی آئی جی نے پہلو بدل کر کہا۔ ”اس طرح ہمارا شکار اور چوکنا ہو جائے گا۔“

”اس خبر سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ جس
لہجہ سے تعلق رکھتا ہے وہاں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کوئی فکر نہیں کی جاتی۔ آکٹوپس تو اس قبیلے کے
اہل سردار کی حیثیت رکھتا ہے۔“

”صبح سے اوپر والوں نے پھر میری نیند حرام کر رکھی ہے۔“ ڈی آئی جی ہونٹ چباتے ہوئے

بولاً۔ ”ہمیں اس بار پہلے سے زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔“

”میں پہلے بھی محتاط ہی تھا سر لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ ڈی آئی جی نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”میں کسی ایک کی نشاندہی نہیں کروں گا جناب..... لیکن بہت سے ذمے دار حیثیتوں کے مالک بھی آکٹوپس کے سلسلے میں ڈبل رول پلے کرتے رہے ہیں..... اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید.....“

”جو کچھ ہو چکا اب اس کو دہرانے سے کیا فائدہ؟“ ڈی آئی جی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اب آپ کو زیادہ محتاط رہ کر ایسی پلاننگ کرنی ہوگی کہ وہ زیادہ دیر ہاتھ پاؤں نہ چلا سکے۔“ اورنگ زیب خاموش رہا۔

”آپ کے ذہن میں کوئی نہ کوئی پلاننگ تو ضرور ہوگی۔“ ڈی آئی جی نے اس بار الفاظ چبانے ہوئے اسے دیکھا۔ ”خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب آپ نے اسے سرے سے مردہ تصور ہی نہیں کیا تھا۔“

”میں برابر اسی کے بارے میں درک کرتا رہا ہوں..... آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔“

”اس خبر کے اخبارات میں شائع ہونے کے بعد آپ نے کچھ نہ کچھ تو سوچا ہوگا۔“

”ییس سر.....“ اورنگ زیب نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”مجھے بساط پر اپنے کچھ مہروں کی پوریشن تبدیل کرنی ہوگی لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی پلاننگ کو کامیاب ہونے تک زبان سے نہیں نکالوں گا۔“

”کیا مطلب.....؟ کیا آپ مجھے بھی بتانا پسند نہیں کریں گے؟“

”موجودہ حالات میں ایسا کرنا ضروری ہے سر.....“

”آئی۔ سی.....“ ڈی آئی جی تمللا کر رہ گیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ایک لمحے ریسپونڈ کر دیکھا پھر ریسپونڈ اٹھا لیا۔

”ییس.....“

”میں روٹی بول رہی ہوں.....“

”زہے نصیب..... اس وقت کیسے فون کیا؟“ ڈی آئی جی نے نکمکش کا شکار ہو کر بھی دوستانہ لہجے میں بات کی۔

”میرا خیال ہے کہ اخبارات کے ذریعے اب تک.....“

”جی ہاں..... میں بھی اس وقت اپنی ٹیم کے ساتھ سر جوڑے بیٹھا ہوں اس کے علاوہ.....“ ڈی آئی جی نے میڈم کے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے وہ بات بھی خود ہی کہہ دی جو شاید میڈم کہنا چاہتی تھی۔ ”مجھے آپ کی شرط یاد ہے۔“

”مختصر گفتگو کے بعد اس نے دوبارہ اورنگ زیب اور سراج کو باری باری دیکھا۔

”کنول کے بارے میں آخری خبریں کیا ہیں۔ وہ ہمارے لیے خاصی کارآمد ثابت ہو سکتی

ہے۔“

”ملٹری کے ڈاکٹر نے صرف دس فیصد امید دلائی ہے۔“ اورنگ زیب نے کہا۔

”بہر حال.....“ ڈی آئی جی نے اس بار کسی ہارے ہوئے جوارے کے انداز میں دونوں افسران کو مخاطب کیا۔

”میں آپ دونوں کو فری وینڈ دیتا ہوں۔ میری جانب سے آپ کے کسی اقدام میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔“

”شکریہ سر.....“

ڈی آئی جی کے آفس سے فارغ ہو کر دونوں باہر نکلے تو اورنگ زیب سے سراج سے مسکرا کر ہلچا۔

”تم کس نتیجے پر پہنچے؟“

”خوب صورت خواب ٹوٹ جائیں تو پھر آدی مجبوراً کھٹنے ٹیک دیتا ہے۔“ سراج نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین تھا کہ میڈم ان خبروں کو پرکھنے کے بعد متکفی کو کوئی اہمیت نہیں دے گی۔“

”میرے بارے میں کیا کہو گے؟“

”اس وقت ڈیوٹی پر ہوں جناب۔“ سراج نے شوشی سے کہا۔ ”رات کو الماس کی موجودگی میں تفصیلی بات ہوگی۔“

اورنگ زیب ڈی آئی جی کی کیفیت پر خاصا لطف اندوز ہو رہا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل ملا اس نے نمبر دیکھ کر کال اٹینڈ کرنے میں دیر نہیں کی۔

”اب کیا صورت ہے کرنل.....؟“

”ویری سیڈ نیوز فار اس (very sad news for us)“ کرنل احتشام نے اداس لہجے میں کہا۔ ”ڈاکٹر کی کوشش بھی مریضہ کے ساتھ دم توڑ گئیں۔“

”اوہ.....“ اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ ”ڈیڈ باڈی کا کیا ہوگا؟“

”ڈونٹ وری..... ہم مرنے والی کو پورے اعزاز اور احترام سے سپرد خاک کریں گے۔“

دوسری جانب سے جملے کے احتشام کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔

اورنگ زیب کے چہرے کے بدلتے تاثرات..... کرنل اور ڈیڈ باڈی کے حوالے ہی سے سراج نے سمجھ لیا تھا کہ اورنگ زیب کو کنول کے انتقال کی خبر دی گئی ہوگی۔ اس نے فوری طور پر اورنگ زیب سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ خود بھی اس خبر کو سن کر کسی گہری سوچ میں غرق نظر آ رہا تھا۔ دو

ہفت خاموشی سے گزر گئے پھر اورنگ زیب نے موبائل پر کچھ نمبر پینچ کر کے اسے آن کر رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”یسی ہو الماس..... وہاں میں اور سراج اس وقت ڈی آئی جی سے مل کر واپس آفس جا رہے

ہیں۔ بانگ میں سوائے وقت کی بربادی کے اور کیا ہوتا ہے..... ٹھیک ہے لیکن اس وقت میں نے

تمہیں ایک خاص مقصد سے فون کیا ہے.....“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اوپر کا اسٹور روم صاف کرا کر اس میں میرے لیے ایک بیڈ ڈلوا دو..... نہیں..... گیٹ روم مناسب نہیں رہے گا۔ اوکے۔“ اورنگ زیب نے کال ختم کی تو سراج نے دہلی زبان میں پوچھا۔

”کیا آپ بھی.....“

”خطرہ نہیں..... صرف احتیاط سمجھ لو۔ کنول کا بیان اخبارات میں آنے کے بعد آکٹوپس سب سے پہلے میرا شکار کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم لیاقت حسین کو بھی محتاط رہنے کی تاکید کر دو..... افضل خان اور شبیم کی حفاظت کا بھی خاص خیال رکھنا۔ وہ دونوں ابھی ہمارے لیے بہت کارآمد ہیں۔“

اورنگ زیب نے جن خدشات کا اظہار کیا اس کے پیش نظر سراج بھی بے حد سنجیدگی سے حالات کی تحلیل نفسی کرنے لگا۔



ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ باہر آیا تو وہاں موجود ڈیوٹی دینے والے نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

اس وقت وہ جینز کی پتلون اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ ٹی شرٹ کے سامنے کے دو بٹن کھلے تھے جس سے اس کا صحت مند اور کشادہ سینہ نظر آ رہا تھا۔ گلے میں اس نے مصنوعی سونے کی ایک موٹی چین پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جو گرز تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت مائل گندمی تھی۔ عورتیں کے لپیٹے میں رہتی ہوگی۔ وقت اور حالات نے اسے اس قدر مصروف کر رکھا تھا کہ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت ضائع کرتا۔

گاڑی سے باہر نکل کر وہ سیدھا مین گیٹ کی جانب بڑھا جہاں رنگ برنگے لباس میں سر پر کلف شدہ اونچی پگڑی جمائے ایک ملازم آنے جانے والوں کے لیے دروازہ کھولنے پر تعینات تھا۔ نوجوان کو دیکھ کر اس نے دروازہ کھولنے کے بجائے مہذب انداز میں کہا۔

”ہوٹل میں اس قسم کا لباس پہن کر.....“

”میرے پاس مس ڈکسن کا دعوت نامہ موجود ہے۔“ نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس سے ملاقات کے لیے یہ لباس بھی اضافی ہی ثابت ہوگا۔“

ڈیوٹی پر مامور کارندے نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا پھر دروازہ کھول دیا۔ ”وہ جانتا تھا کہ مس ڈکسن ایک عالمی شہرت رکھنے والی مستقبل شاس تھی۔ اس ہوٹل میں مقیم تھی اس کی فیس کی ادائیگی کرنا بھی معمولی لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔“

دروازے سے گزر کر نوجوان سامنے داہنی جانب رکھی ہوئی اس میز کی طرف بڑھا جس پر ایک اڈیٹر عمر کی عورت بیٹھی تھی میز پر مس ڈکسن کے حوالے سے ایک پلے کارڈ دور سے نظر آ رہا تھا جس نے نوجوان کی رہنمائی کے لیے کچھ آسانی بھی کردی۔

وہ میز کے قریب پہنچ کر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مجھے مس ڈکسن سے ملنا ہے۔“

”اوہ.....“ عورت کے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ ابھری۔ ”آپ کا نام؟“

”جونہی.....“

بوڑھی عورت نے سامنے میز پر رکھے پیڈ پر نظر ڈالی اس نے بھی ایک بار جونہی کو بہت غور سے دیکھا۔ فہرست میں جونہی کا نمبر آٹھواں تھا جبکہ مس ڈکسن ایک دن میں سات آدمیوں سے زیادہ پروفیشنل ملاقات نہیں کرتی تھی یہ بات دنیا میں اس کے تمام کلائنٹس کو معلوم تھی کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنا اصول نہیں توڑتی تھی۔

”تم خوش قسمت ہو نوجوان جس نے آج مس ڈکسن کے سالہا سال پرانے اصول کو توڑ دیا ہے۔“ اس نے اپنی بات کی وضاحت کی تو جونہی سے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اسے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں ابھی دس پندرہ منٹ اور انتظار کرنا ہوگا۔“ عورت نے دہلی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”جو کلائنٹ اندر ہے اس کے باہر آتے ہی وہ مجھے کال کر دے گی۔ اس کے بعد تمہیں لفٹ کے ذریعے آخری منزل پر جانا ہوگا جہاں مس ڈکسن نے ایک سوٹ (suite) لے رکھا ہے وہاں جوائنٹنڈنٹ ہوگا وہ تمہاری رہنمائی کر دے گا۔“

”شکریہ.....“ جونہی نے بے پروائی سے جواب دیا پھر آنے جانے والے بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔

اصول کے مطابق مس ڈکسن سے ملنے والوں کو ایک دن پہلے اپنے نام کے ادرنوں نمبروں کے ساتھ کبھی پسندیدہ پھول کا نام لکھ کر دینا پڑتا تھا۔ بعد میں جن لوگوں کو ملاقات کا وقت دیا جاتا تھا انہیں بذریعہ فون آگاہ کر دیا جاتا تھا۔ جونہی نے پسندیدہ پھول کی جگہ ”گو بھی کا پھول“ لکھ دیا تھا اور..... اب وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ مس ڈکسن کس انداز میں اس کی پذیرائی کرے گی؟

پندرہ منٹ بعد میز پر رکھے ہوئے فون کی کھنٹی بجی اڈیٹر عمر کی عورت نے سنبھل کر کال ریسیور کی پھر ”تیس میڈم!“ کہہ کر اس نے ریسیور کیڈل پر رکھتے ہوئے جونہی کو مخاطب کیا۔

”دش یو لڈ لک نوجوان..... تمہارا نمبر آگیا ہے۔“

جونہی مسکراتا ہوا اٹھا۔ لفٹ کے ذریعہ آخری منزل تک پہنچنے کے دوران وہ صرف اور صرف مس ڈکسن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس سے ملاقات کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ اپنے ماضی کے بارے میں وہ باتیں بھی جاننے کا خواہش مند تھا جو اس کے علم میں نہیں تھیں۔ مس ڈکسن کے بارے میں اس نے اخبارات میں یہی پڑھا تھا کہ وہ ملاقات کرنے والوں کو ”گہوارے سے لے کر قبر تک“ کے تمام حالات اس طرح بتا دیتی ہے جیسے وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہی ہو۔

مطلوبہ سوٹ تک پہنچنے میں جونہی کو کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہاں موجود ہوٹل کے اٹینڈنٹ نے ضروری معلومات کرنے کے بعد اسے ملاقات کمرے میں پہنچا دیا جہاں مس ڈکسن ایک صوفے پر

موجود تھی۔ جونی نے اسے سر سے لے نظر آ رہی تھی۔ وہ خوب صورت خدو خال کی مالک تھی۔ اس نے جونی کو بس ایک پل کے لیے غور سے مسکرا دیکھا پھر سنبھل کر بولی۔ ”تم وہ پہلے خوش نصیب ہو جسے میں نے آج پہلی بار آٹھواں نمبر دیا ہے۔“

”یہ بات مجھے بتائی جا چکی ہے۔“ جونی نے محتاط رویہ اختیار کیا۔

”تم..... اپنے بارے میں کیا جانتا چاہتے ہو.....؟“

”ماضی کی وہ تمام باتیں جو سلسلے وار میرے علم میں نہیں ہیں۔“

”تم نے شاید اسی لیے مجھ سے ایک بھونڈا مذاق کیا ہے۔“ مس ڈکسن یلکھت سنجیدہ ہو گئی۔ ”گو بھی کا پھول فلاورز میں شمار نہیں کیا جاتا۔“

”میں معذرت خواہ ہوں.....“ جونی نے اعتراف کرنے میں عار نہیں سمجھا۔

جواب میں مس ڈکسن نے اس کے نام کا لفاظی نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”یہ فیس کی وہ رقم ہے جو تم نے مجھ سے ملاقات کی خاطر پیشگی ادا کی تھی۔“

”گویا مجھے یہاں سے مایوس جانا پڑے گا۔“ جونی لفاظی اٹھایا تو مس ڈکسن نے تھکمانہ لہجے میں کہا۔

”بیٹھ جاؤ جونی..... تم رقم کی واپسی کا غلط مطلب اخذ کر رہے ہو۔ میں ایک دن میں چونکہ صرف سات لوگوں کو وقت دیتی ہوں اس لیے فیس بھی سات افراد سے لیتی ہوں۔ تمہارا نمبر آٹھواں ہے اس لیے میں تم سے فیس کی رقم نہیں لے سکتی۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہوگا۔“

جونی نے پہلی بار مس ڈکسن کے اصول کو دل ہی دل میں سراہا پھر دوبارہ بیٹھ گیا۔ کمرے میں پانچ منٹ تک خاموشی مسلط رہی پھر مس ڈکسن نے پہلو بدل کر دوستانہ انداز میں کہا۔

”تمہارا ماضی کھلی کتاب کی طرح میری نظروں کے سامنے ہے۔“

”کیا آپ میرے ان تمام صفحات کو پڑھ سکتی ہیں جو میں نے ابھی تک نہیں پڑھے؟“

مس ڈکسن نے جونی کے سوال پر اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا پھر اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط ہو گئی۔ اس نے جونی کے چہرے سے نظر ہٹا کر خلا میں گھورتا شروع کیا پھر..... اس کے ہونٹ متحرک ہو گئے۔

”آج سے ٹھیک اسی سال گیارہ ماہ قبل تم نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ تمہاری ماں کے لیے اس کی زندگی کا سب سے منحوس ترین دن تھا۔ تمہاری پیدائش کے بعد تمہارے باپ کی نگاہوں کے زاویے بھی تبدیل ہونے لگے..... وہ..... وہ ایک عیاش اور فریبی شخص تھا جس نے تمہاری ماں کو محبت کا فریب دے کر اس سے رشتہ جوڑا تھا جو تمہارے دنیا میں قدم رکھنے کے بعد کچے دھاگے کی طرح رفتہ رفتہ ٹوٹ گیا۔ شاید اس لیے کہ تمہیں جنم دینے کے بعد وہ غریب عورت وقتی طور پر تمہارے باپ کے لیے کسی کام کی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے دوسری عورتوں سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ تین

سال تک تمہاری ماں کی کشتی ڈنگاتی رہی اس کے بعد تمہارا باپ تم دونوں کو چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا۔“

مس ڈکسن کی نظریں بہ دستور خلا میں چکرار ہی تھیں۔ جونی دھڑکتے ہوئے دل سے اسے دیکھتا رہا۔

”تمہاری ماں بڑے نامساعد حالات میں تمہاری پرورش کا بوجھ اٹھاتی رہی۔ چار سال تک گھریلو ملازمہ کی طرح کام کرتی رہی۔ کسی ایک جگہ نہیں نک سکی اس لیے..... اس لیے کہ وہ خوب صورت تھی۔ بہر حال وہ خود کو ہوس پرست مردوں کے ہاتھوں سے بچاتی رہی لیکن کب تک..... جنگل میں رہنے والی ہرئی بھی کبھی نہ کبھی کسی شیر یا چیتے کی درندگی کا شکار بن جاتی ہے۔ تمہاری ماں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب تم دس سال کے ہوئے تو جس گھر میں وہ ملازمت کرتی تھی وہاں کے ایک مرد نے اس کی عزت طاقت کے بل پر لوٹ لی۔ وہ پاکباز اور خوددار عورت تھی۔ اس نے رسوا ہونے سے بیشتر ہی خودکشی کر لی۔ تم بے سہارا ہو گئے۔“

مس ڈکسن ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

”تمہاری پرورش جس ماحول میں ہوئی وہ نہایت نامناسب تھی۔ مگلی کے کم حیثیت بچوں کے ساتھ کھیل کود کر تمہاری شخصیت مسخ ہوتی رہی پھر..... تمہاری ماں کی موت کے بعد کچھ لوگوں نے تم کو ایک یتیم خانے کے حوالے کر دیا۔ یتیم خانے کے مالکان بظاہر خدمت خلق کے نام پر پیسے بنور رہے تھے۔ درپردہ وہ ناجائز کاروبار میں بھی ملوث تھے۔ جب تمہاری عمر ان کی (un lucky) کے ہندسوں نمبر تیرہ کی تھی اس وقت کسی نے یتیم خانے والوں کے خلاف تجزیہ کر دی۔ پولیس کی ریڈ کے دوران کچھ لوگ پکڑے گئے۔ کچھ فرار ہو گئے۔ اس افراتفری کے عالم میں تمہاری عمر کے کچھ لڑکوں کو بھی فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

سر چھپانے کی خاطر تم کو بھی گھریلو ملازمت کرنی پڑی۔ ماں کی طرح تم نے بھی خود کو بچانے کی کوشش کی لیکن اس بار ایک شادی شدہ عورت نے تمہارے اندر پوشیدہ مرد کو تلاش کیا۔ یہ پہلا دفع تھا جب تم نے ایک انوکھی لذت کا ذائقہ چکھا۔ ماں کی طرح تم نے بھی خوف سے وہ ملازمت چھوڑ دی۔ تمہاری پرورش درست خطوط پر نہیں ہوئی تھی اس لیے تم کو سنبھلنے کا موقع ملا۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد تم آوارہ لڑکوں کی صحبت میں پڑے رہے پھر چار سال بعد اس روز تم کو اپنی قیمت کا اندازہ ہوا جب تم نے پہلی بار بازار حسن کے گندے ماحول میں قدم رکھا۔ تم نے ایک عام گاہک کی طرح ہی اس طوائف زادی کی فیس ادا کر دی تھی۔ بعد میں اس نے تمہیں فیس واپس کرنے کے ساتھ ساتھ چار گنا زیادہ رقم بھی دی..... یہ بھی کہا تھا تم رات کے بجائے دن میں اسے سے ملنے آنا۔ ہر بار وہ تم کو اتنی ہی رقم ادا کرتی رہے گی۔ اس نے ایسا ہی کیا اور..... اس طرح تم اس کے غلام بن گے۔“

مس ڈکسن نے خلا میں گھورتے گھورتے اپنی پلکیں بار بار جھپکائیں پھر اس نے براہ راست

جونى کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے اب تک تمہیں جو کچھ بتایا اس میں کچھ غلط تو نہیں تھا؟“
”نہیں.....“ جونى نے کسمسا کر اقرار کیا۔

”تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ اس کے بعد تم کس طرح شیلا اور ماں تک پہنچے جو بیوٹی پارلر چلا رہی ہے۔“ مس ڈکسن نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔ ”کیا یہ بھی بتا دوں کہ تمہاری ملاقات کے بعد شیلا ورنے اپنے شوہر سے کیوں علیحدگی اختیار کی تھی اور اس تم کس قدر شاہانہ زندگی گزار رہے ہو؟“
”میں اعتراف کرتا ہوں مس ڈکسن کہ تم نے اب تک جو کچھ کہا اس کا ایک حرف بھی غلط نہیں..... لیکن..... میں شیلا ورنے کے اشارے پر جو کام انجام دے رہا ہوں وہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا..... کیا اس کے بارے میں بھی تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟“

”کیوں نہیں.....“ مس ڈکسن نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ ”تمہاری زندگی میرے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تمہارا نام جان محمد تھا جس عورت نے تمہیں پہلی بار برباد کیا اس نے تمہیں جانور کا نام دیا..... بازار حسن میں تم جس طوائف زادی کے پاس گئے اس نے رخصت کرتے وقت تمہیں جونى کہہ کر مخاطب کیا تھا اور اب..... شیلا ورنے نے تمہیں مکمل طور پر جونى کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔“

”میں نام کے بارے میں نہیں بلکہ اس کام کے بارے میں معلوم کرنا پسند کروں گا جو مجھ سے لیا جا رہا ہے۔“ جونى نے پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ”مجھے آئے دن شیلا کے کہنے پر کسی خوب صورت اور کسن لڑکی کو اس کے دیے ہوئے مختلف پتوں پر پہنچانا پڑتا ہے..... میں جانتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو کیا خدمت کرنی پڑتی ہے لیکن وہ..... وہ کون ہے جو لڑکیوں کے عوض منہ مانگی رقم دیتا ہے؟..... ایک لڑکی کا نمبر کبھی دوسری بار نہیں آتا..... کبھی کبھی کوئی لڑکی معصوم ہونے کے باوجود شیلا کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر تباہ ہو جاتی ہے۔“

”آئی ایم سوری جونى..... میں غیر ضروری سوالات کا جواب دینے میں وقت برباد نہیں کرتی پھر بھی..... اتنا بتا سکتی ہوں کہ خود شیلا ورنے بھی نہیں جانتی کہ وہ لڑکیاں کتنے ہاتھوں سے گزر کر کہاں پہنچائی جاتی ہیں لیکن..... ذاتی طور پر میں تم کو ایک ہی مشورہ دے سکتی ہوں۔“
”پلیز..... مس ڈکسن۔“ جونى نے عاجزی سے کہا۔

”جتنی جلدی ممکن ہو شیلا ورنے کو دینا سے نکل کر کہیں دور چلے جاؤ..... کسی ایسی جگہ جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو۔“

”کیا یہ ممکن ہوگا؟“

جواب میں مس ڈکسن نے دوبارہ خلا میں گھورتا شروع کیا پھر لمحوں بعد اس نے جونى کی طرف دیکھ کر پہلی بار بڑے روکھے انداز میں کہا۔

”تم اب جا سکتے ہو..... میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتی.....“

”میں اگر ضد کروں تو.....؟“

”مجھے مجبوراً ہوٹل کی انتظامیہ کو کال کرنا پڑے گا جو تمہیں دھکے دے کر نکال دیں گے۔“ مس ڈکسن ہونٹ چباتے ہوئے انہی۔ ”ناؤ..... پلیز گیٹ لاسٹ.....“

جونى کے لیے اس کا نیا طرز عمل ناقابل فہم تھا لیکن اس نے وہاں رکتا مناسب نہیں سمجھا، مس ڈکسن کو آخری بار گھور کر دیکھا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ شیلا ورنے کے بیوٹی پارلر کی طرف جا رہا تھا جس کے اوپر اس کی رہائش تھی۔ وہ مس ڈکسن کے آخر جملوں اور لیکھت بدلے ہوئے انداز پر غور کرنے میں اتنا منہمک تھا کہ یہ بھی غم دیکھ سکا کہ ایک ٹیکسی ہوٹل سے نکلنے کے بعد ہی کچھ فاصلے سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔



لیاقت حسین کچھ دیر پہلے ہی راحیلہ کی طرف سے ہو کر آیا تھا، کچھ مہمان آئے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے فرحین کو روک لیا تھا اسے خوشی تھی کہ فرحین راحیلہ بیگم کے ساتھ مکمل مل جانے کے بعد شہر کے مہذب طور طریقے بھی سیکھتی جا رہی تھی۔

گھر آ کر لیاقت حسین نے لباس تبدیل کیا پھر وہ کچھ دیر آرام کرنے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا اس لیے اس کی آنکھ بھی لگ گئی، کچھ دیر بعد فرحین ہی نے اسے آواز دے کر جگا یا تھا۔

”میرے بغیر آج تیری آنکھ کیسے لگی؟“ اس نے معصوم انداز میں شکوہ کیا۔

”تیرے ہی خواب دیکھ رہا تھا۔“ لیاقت حسین نے حسب دستور اسے اپنے قریب کر لیا۔ کچھ دیر تک وہ باتیں کرتی رہی۔ آنے والے مہمان خواتین کے رکھ رکھاؤ اور ہنسنے بولنے کے طور طریقے بتاتی رہی۔ لیاقت حسین ہوں ہاں کرتا رہا پھر دوبارہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ کتنی دیر سویا اسے یاد نہیں لیکن کوئی بات تھی جس نے اس سوتے ہی سوتے ایک ڈراؤنے خواب سے دوچار کر دیا تھا۔ ایک متحرک فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چلنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ بنگلے کا چوکیدار گیٹ کے ساتھ ہی اپنی رائفل سمیت فرش پر پڑا ہے شاید وہ بچہ دیر آرام کرنے بیٹھا تھا پھر نیند کے جھوکوں نے اسے کرسی سمیت فرش پر لڑکھا دیا تھا..... اس نے چوکیدار کو ٹولنا مناسب نہیں سمجھا، قدم اٹھاتا آگے بڑھا تو اس کے آفس کا کمر اجے وہ بند کر گیا تھا اس نے دروازے کھلے نظر آ رہے تھے دروازے کے ساتھ ہی ایک انسانی جھولا بھی دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کی نظریں اندر کی جانب تھیں اس لیے وہ لیاقت حسین کو نہیں دیکھ سکا۔

ایک لمحے میں لیاقت حسین نے اپنی پوزیشن تبدیل کی وہ بچوں کے ملن لپکتا ہوا کمرے کی ایک کھڑکی کے قریب پہنچ گیا جہاں دیوار کے ساتھ ہی ایک اور آدمی اونڈھا پڑا تھا لیاقت حسین نے مہل کر اسے دیکھا پھر اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی زمین پر کسی آدمی کی لاش پڑی تھی جس کی گردن پر خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ مل بھر میں ساری چویشن اس کے ذہن میں آگئی۔

وہ یقیناً ڈاکو ہی تھے بنگلے میں کسی نیک ارادے سے نہیں آئے ہوں گے۔ چوکیدار نے

مزاحمت کی ہوگی اس نے کسی کو گولی کا نشانہ بنایا ہوگا پھر خود کوئی سنساتی ہوئی اندھی گولی اس کے وجود کو چاٹ گئی ہوگی۔ آنے والوں نے اپنے ساتھی کی لاش کو سامنے سے ہٹا دیا ہوگا لیکن..... اب وہ لیاقت حسین کے کمرے میں کیا تلاش کر رہے تھے؟..... اس کا ذہن تیزی سے کئی امکانات پر غور کر رہا تھا، ابھی وہ کوئی حتمی نتیجہ قائم نہیں کر سکا تھا۔ جب دروازے پر کھڑا ہوا ہیولا اپنے کسی دوسرے ساتھی کے قریب آ کر مدھم آواز میں بولا۔

”خیال رکھنا..... کوئی بھی سامنے آئے تو ٹھکانے لگانے سے دریغ نہ کرنا۔“

تم لوگ اندر کیا کر رہے ہو؟“ دوسرے گھنے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ ”اے اٹھا کر ساتھ کیوں نہیں لے چلتے۔ موج میلا بھی ہو جائے گا اور باس کا حکم بھی سکون سے پورا کر لیں گے۔“

”نہیں..... ہمیں وہی کرنا ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔“

”تم بھول رہے ہو۔“ پہلے نے تنگ آ کر جواب دیا۔ ”ہمارا ایک ساتھی کام آچکا ہے۔“

”اس کے بدلے میں ہم نے بھی چوکیدار کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا ہے۔“

”لیکن اندر.....“

”وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح پھری ہوئی ہے۔“ پہلے نے کہا۔

”فکر مت کرؤ ہمارے ساتھی اسے قابو کر لیں گے۔“

”اور اگر اتنی دیر میں وہ ادھر آ گیا جو انیکسی میں سو رہا ہے تو.....؟“

”وہی سب سے ٹیڑھی کھیر ہے! باس کا خیال ہے کہ وہ انسان نہیں کوئی جن بھوت ہے جس پر کوئی حربہ اثر نہیں کرتا۔“

”ایسی صورت میں تصویروں سے کیا بنے گا؟“ دوسرا بولا۔ ”اگر یہی خوب صورت بلا اس کی کمزوری ہے تو اسی کو بوری میں سیٹھ لے چلو اس کے پیچھے وہ بھی ہمارے جال میں پھنس جائے گا۔“

”میں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا لیکن باس نے میری بات نہیں مانی۔“

متحرک فلم کے کلائمکس کے بارے میں لیاقت حسین کے سوتے ذہن نے سوچا تو وہ اس طرح

بڑبڑا کر جاگا جیسے کسی زہریلے پھونے ڈنگ مار دیا ہو۔ اس نے پلٹ کر بستر پر نظر ڈالی تو فرحین وہاں

نہیں تھی۔ کمرے کا دروازہ بھی کھلا نظر آ رہا تھا۔ باہر ایک سایہ بھی موجود تھا شاید وہ لیاقت حسین کی

چوکیداری پر مامور تھا۔



اچانک لیاقت حسین کی نظر ماں کی دی ہوئی انگلی کے گھینے پر پڑی جو سرخ ہو رہا تھا دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھ آہستہ سے کھسکا کر سراج کا دیا ہوا پستول تکیے کے نیچے سے نکال لیا۔ لیٹے ہی لیٹے اس نے پوزیشن بدل کر گولی داغ دی دروازے کے ساتھ کھڑا ہوا سایہ ڈکراتا ہوا دروازے کو تھامے تھامے نیچے جھول گیا اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے دوسروں کو بھی غماص کر دیا تھا۔ لیاقت حسین نے یہ سوچ کر اٹھنے میں دیر نہیں کی وہ پستول پر اپنی گرفت مضبوط کیے دروازے تک پہنچ گیا۔ اسی لمحے کسی نے باہر سے سرسراتی آواز میں کہا۔

”لیاقت حسین..... باہر نکلنے کی حماقت نہ کرنا ورنہ آج ہم تمہیں بھی بھون کر رکھ دیں گے۔ یہ

بھی سوچ لو کہ تمہاری گھر والی ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کا کیا انجام ہوگا؟“

”تم..... تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“ لیاقت حسین نے دنگ آواز میں سوال کیا پھر بڑی پھرتی

سے فرش پر لیٹ کر تیزی سے دروازے کی سمت کرائنگ کرنے لگا۔

”فرحین خطرے میں ہے۔“ یہ سوچ کر ہی اس کے وجود میں چنگاریاں چمکنے لگی تھیں لیکن وہ

غماص رہ کر قدم اٹھانے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا۔

”تم فوری طور پر اپنی گھر والی کو لے کر پندرہ روز کے لیے گاؤں چلے جاؤ۔“ تھکمانہ لہجے میں

جواب ملا۔

”اس کے بعد چاہو تو واپس آ جانا۔“

”اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو.....؟“ لیاقت حسین نے دروازے کے قریب پہنچ کر

پوزیشن سنبھالی۔

”تو تمہاری بیوی کی شرمناک تصویریں سینما کے پسٹری طرح شہر کی گلی کو چوں میں نظر آئیں

گی۔“

اس جملے نے جیسے لیاقت حسین کے اندر ٹھہرے بارود کو آگ لگا دی۔ اس نے تڑپ کر اپنے

آدھے جسم کو دروازے کے باہر نکالا اس کے ساتھ ہی اس کے پستول سے خارج ہونے والی گولی اس

سائے کو زمین پر ڈھیر کر گئی جو فرحین کے سلسلے میں شرطیں منوارہا تھا۔ لیاقت حسین کی شعلہ بار نظریں

اپنے آنکس کی طرف اٹھیں۔ اسی لمحے تین آدمی فرحین کو سامنے کیے ہوئے باہر نکلے۔

”اب کوئی دوسری گولی نہ چلانا لیاقت حسین ورنہ ہم تمہاری بیوی کے جیتھوڑے اڑا دیں

گئے۔“ سامنے آنے والوں میں سے ایک نے لٹاکر کہا۔

”تو میری فکر مت کر لیاقت۔“ فرحین نے بے جگری سے کہا۔ ”اپنی غیرت ان کتوں کے ہاتھ فروخت نہ کرنا۔“

نیم تاریکی کے باوجود لیاقت حسین کی نظروں نے فرحین کو بغیر اذہنی کے تین مردوں کے شکنجوں میں پھڑپھڑاتے دیکھا تو دیوانہ ہو گیا۔ ساری احتیاط کے تقاضوں کو فراموش کر کے اس نے ایک اور گولی داغ دی۔ اس کا نشانہ لگا تھا فرحین کے سیدھے ہاتھ والا مرد بغیر آواز نکالے اوندھے منہ سیزمیں پر لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔ باقی دونوں نے فرحین کو گھسیٹ کر اس کی آڑ لے لی۔ اب وہ آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”ہم نے اپنے خاموش پستول تمہاری بیوی کی گردن پر جمار کھے ہیں۔“ دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ ”دروازے پر اپنی گاڑی پر بیٹھنے کے بعد ہم اسے چھوڑ دیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔“

”نہیں لیاقت حسین۔“ فرحین نے پھر نتائج کی پروا کیے بغیر چلا کر کہا۔ ”ان دو غلے کتوں کی گندی زبان پر بھروسہ نہ کرنا۔ تو وار کر۔۔۔۔۔ میں بھی کام آگئی تو پروا نہیں۔“

لیاقت حسین کے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ پوزیشن اب ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی خطرہ مول لیتا۔ دونوں افراد نے پوری طرح فرحین کی آڑ لے رکھی تھی۔ وہ فرحین کو تقریباً گھسٹتے ہوئے پھاٹک کی سمت بڑھ رہے تھے جب فرحین نے اچانک تڑپ کر خود کو چھڑانے کی خاطر زور لگایا۔ اس کا آدھا جسم نیچے کی طرف جھکا تو لیاقت حسین نے ایک گولی اور چلا دی اس بار بھی اسے مایوسی نہیں ہوئی دو میں سے ایک اور کراہتا ہوا نیچے گرا۔ اب صرف ایک رہ گیا تھا جس نے فرحین کو پوری طرح دبوچ لیا تھا۔

”گولی چلا لیاقت۔۔۔۔۔“ فرحین نے احتجاج کیا۔

”یہ خنزیر اگر اٹھا لے گیا مجھے تو ہم دونوں کی غیرت کو داغ لگ جائے گا۔۔۔۔۔ سن رہا ہے۔۔۔۔۔ میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

”فکرت مت کر لیاقت کی زندگی۔۔۔۔۔ تجھے کوئی کہیں نہیں لے جا سکتا۔“ لیاقت حسین نے تیزی سے جگہ بدلتے ہوئے جملہ ادا کیا۔ سرسراتی ہوئی دو گولیاں اس کے قریب ہی فرش سے ٹکرا کر نکل گئیں۔

”لیاقت۔۔۔۔۔“ فرحین ہذیانی انداز میں چیخی۔ ”وہ جاننا چاہتی تھی کہ دشمن کی چلائی ہوئی گولیوں کا انجام کیا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوئے باقاعدہ خود کو چھڑانے کی خاطر زور آزمائی بھی شروع کر دی۔

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی دہکتی ہوئی نظریں کسی موقع کی تلاش میں تھیں۔ وہ طے کر چکا تھا کہ اپنی عزت اور غیرت کو کسی بھی قیمت پر دشمن کے ساتھ نہیں جانے دے گا۔“

”لیاقت۔۔۔۔۔ جواب دے۔“ فرحین پر دیوانگی طاری ہونے لگی۔

اسی لمحے باہر سے کسی گاڑی کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری ایک لمحے بعد ہی ایک دین پھاٹک کے سامنے آ کر رکی کسی نے چلا کر کہا تھا۔

”خطرہ ہے۔۔۔۔۔ نکل چلو۔“

آخری شخص کے لیے بھی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ اپنے باقی ساتھیوں کا انجام دیکھ کر پاگل ہو رہا تھا۔ گاڑی سے خطرے کا سن کر وہ دیوانہ ہو گیا۔ فرحین کو وہ گھسٹتا ہوا پھاٹک تک لے گیا پھر لیاقت حسین کی توجہ ایک لمبے لمبے فرحین کی طرف ہو گئی جو چیخے چیخے یلکھتے کراہتی ہوئی زمین پر گری تھی۔ اسی لمحے آخری شخص سے دور ہوتی چلی گئی۔

لیاقت حسین دیوانوں کی طرح اٹھ کر فرحین کی طرف بھاگا جو فرش پر اوندھی پڑی تھی وہ پاگلوں کی طرح اسے ٹٹولنے لگا اب کے جسم پر خون یا زخم کا کوئی نشان نہیں تھا سانس بھی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ پھر اس نے فرحین کے سر پر ہاتھ پھیرا تو دانت پٹن کر رہ گیا۔ مجرم جاتے جاتے پستول کی پٹ اس کے سر پر مار کر نکل گیا تھا۔

وہ فرحین کو گود میں اٹھا کر اس کے گالوں اور پیشانی کو بار بار چومتا اپنے کمرے تک آیا فرحین کو بستر پر لٹا کر اس نے سب سے پہلے اپنا موبائل آن کر کے سراج کو اطلاع دی۔ سیٹھ عثمان کو بھی پوری سچویشن سے آگاہ کر دیا۔ پھر یلکھتے اسے چوکیدار کا خیال آیا تو اگلے قدموں دوبارہ باہر آ گیا۔ ایک سوال بھی اس کے ذہن میں چکرار ہا تھا۔

”کیا رائلز چلنے کی آواز نے بھی آس پاس کے جنگلوں کے چوکیدار کو نہیں چونکا یا۔۔۔۔۔؟“

چوکیدار کے قریب پہنچ کر اس کو اپنے سوال کا جواب بھی مل گیا۔ اس کی رائفل سے کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ پیشانی پر داغی مٹی کسی پستول کی گولی نے اسے پل بھر میں موت کی نیند سلا دیا تھا۔ آنے والوں میں سے کسی ایک شخص نے اسے کرسی پر بیٹھا دیکھ کر قابو کرنے کی کوشش کی ہوگی وہ غریب فرض کی ادائیگی کی خاطر زندگی کی پروا کیے بغیر اس سے الجھ گیا ہوگا پھر اس کشکول کے دوران وہ خود اپنے پستول سے نکلی ہوئی گولی کا شکار ہو گیا۔ بعد میں پیچھے آنے والوں نے چوکیدار کو بھی گھکائے لگا دیا ہو گا۔ اپنے آدمی کی لاش گھسیٹ کر انہوں نے اسے ایک طرف ڈال دیا پھر اسے واپس لے جانا ان کے مقدر میں نہیں تھا۔

لیاقت حسین نے اتھ اٹھا کر اس جاں نثار کے لیے مغفرت کی دعا کی پھر قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں آ گیا جہاں فرحین بدستور بے ہوشی سے دو چار تھی۔



اورنگ زیب اس وقت رات کے کھانے سے فارغ ہوا تھا جب اسے پینتھر کی کال موصول ہوئی۔ روشن اسکرین پر اس کے نمبر دیکھ کر اورنگ زیب کی پیشانی ٹھن آلود ہونے لگی۔ پینتھر کی کال اب اکثر آنے لگی تھی۔

”میری ایک بات غور سے سنو کی۔“ اس نے قدرے کھردرے لہجے میں ہینتھر کو اصلی نام سے مخاطب کیا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ بلا ضرورت مجھے.....“

”اس وقت بھی میں نے ایک خاص وجہ سے فون کیا ہے جناب۔“ ہینتھر نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اس وقت ہنی مون بیوٹی پارلر کے کیفے کے سامنے بیٹھا زبردستی کافی حلق میں انڈیل رہا ہوں۔“

”ون منٹ۔“ اورنگ زیب کے لہجے میں سختی آگئی۔ ”مجھ سے گفتگو کرتے وقت تم بازاری زبان بولنے سے پرہیز کیا کرو۔“

”سوری سر.....“ ہینتھر نے فوراً ہی عطا کر لی۔

”اس وقت تم اس بدنام پارلر کے قریب کیا کر رہے ہو؟“ اورنگ زیب کا لہجہ بہ ستور خشک تھا۔

”میں نے آپ سے جونی اور شیلما اور ما کے.....“

”وقت مت برباد کرو۔“ اورنگ زیب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں اس قسم کے گندے معاملات میں کبھی نہیں الجھا۔ تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا۔“

”جونی نے دوزور پہلے مس ڈکسن سے ملاقات بھی کی تھی۔“ ہینتھر نے پھر ایک نئی اطلاع دی۔

”اس میں تمہیں کہیں غیر معمولی بات نظر نہیں آئی؟“

”شیلما اور ما کیا خدمات انجام دے رہی ہے اس کا علم بھی ہو گا آپ کو.....؟“

”فضول باتوں سے آئندہ پرہیز ہی کرنا۔“ اورنگ زیب نے جھنجھلا کر کہا۔ ”پولیس کے دانش مند افسران ہمیشہ جوئے کے اڈوں اور عصمت فروشی کا کاروبار کرنے والوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ ان جگہوں سے بھتہ وصول کرنے والوں کا انجام بھی اچھا نہیں ہوتا۔“

”میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں سر.....“

”کہو.....“

لڑکیاں کہاں پہنچائی جاتی ہیں یہ بات شاید جونی کے علاوہ خود شیلما اور ما کو بھی نہیں معلوم۔ ہینتھر نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔

”پھر..... تم اتنی گہرائی میں جانے کی حماقت کیوں کر رہے ہو؟“

”سر..... آپ نے بھی سکندر علی شاہ کا نام ضرور سنا ہو گا؟“

”یہ نام درمیان میں کہاں سے آگیا؟“ اورنگ زیب چونکا۔

”مجھے شبہ ہے کہ اس کے ڈانڈے بھی شیلما اور ما سے ملتے ہیں۔“ ہینتھر نے بات جاری رکھی۔ ”اس کی دوسری بیوی بناؤ سنگھار کرانے کی خاطر اکثر شیلما اور ما کے پارلر پر ہی آتی ہے۔“

اس بار اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ شیلما اور ما اور سکندر علی کی دوسری بیوی کے

حوالے کے بعد وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

”سر.....“ ہینتھر نے اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ وہ بھی شیلما اور ما کے لڑکیوں والے کاروبار میں برابر کی حصہ دار ہے۔“

”اس شبہ کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟“ اورنگ زیب نے پہلی بار سنجیدگی سے پوچھا۔

”میری معلومات کے مطابق اس کا تعلق بھی کسی بڑے خاندان سے نہیں تھا۔ خوبصورتی اور رنگ زیب روپ کی وجہ سے ہتھر سے نگینہ بن گئی۔ جمو پیڑی سے نکل کر محل تک پہنچ گئی۔“

”نگینہ شاید سکندر علی شاہ کی دوسری بیوی کا نام ہے؟“

”جی ہاں سر..... اس کا اصلی نام جمیلہ تھا۔ باپ کسی سرکاری دفتر میں معمولی کلر کی کرتا تھا۔“

ہینتھر نے اپنی معلومات کی تشریح کرتے ہوئے کہا۔ ”قسمت اچھی تھی جو کسی ذریعہ سے سکندر علی شاہ تک پہنچ گئی۔ کچھ دنوں داشتہ رہی پھر بیوی بننے کے ساتھ ساتھ نگینہ بھی بن گئی۔ ایک دو بار میں نے اسے جونی کے اس عارضی کمرے میں بھی جاتے دیکھا ہے جہاں وہ دن بھر رہتا ہے ورنہ..... اس کی اکثر راتیں شیلما اور ما کی خواب گاہ میں ہی بسر ہوتی ہیں۔“

”تم..... اس گندے معاملات میں کیوں الجھے ہوئے ہو.....؟“ اورنگ زیب نے دوبارہ الجھ کر سوال کیا۔

”اس کا کروچ کی کھوج میں ہوں سر..... جو صرف گندی تالیوں ہی میں سکون کی سانس لیتا ہے۔“ اس بار ہینتھر نے معنی خیز انداز میں کا کروچ کی وضاحت کی تو اورنگ زیب چونکے بغیر نہ رہ

کا۔ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

”میں تمہاری بات کسی حد تک سمجھ رہا ہوں۔ جو قدم اٹھانا محتاط رہ کر اٹھانا ورنہ کسی بڑے

لہرے سے بھی دو چار ہو سکتے ہو۔“

”وہ کیا.....؟“

”آپ اپنے کسی خاص بھروسے کے آدمی کو نگینہ کی نگرانی پر لگا دیں۔ جونی اور شیلما اور ما کو میں

منہاں لوں گا۔“

ہینتھر سے بات ختم کرنے کے بعد بھی خاصی دیر تک وہ کا کروچ کے حوالے سے آکٹو نہیں

لے بارے میں غور کرتا رہا پھر بستر پر لیٹے لیٹے اسے سراج کی کال ملی تو اس نے بڑی تیزی سے لباس

تہیل کیا اور سیٹھ عثمان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

✽✽✽

راحیلہ بیگم اور سیٹھ فرحین کو لے کر اسپتال روانہ ہو چکے تھے۔ لیاقت حسین کو قانونی تقاضوں کی

مانہ پری کی خاطر ہنگامے پر ہی رکنا پڑا۔ علاقے کی پولیس کے آنے کے دس منٹ بعد اورنگ زیب اور

ان بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔

نکلنے کے چوکیدار کے علاوہ پانچ لاشوں کا جائے وقوعہ سے ملنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لیاقت

حسین ایک طرف خاموش کھڑا ان لاشوں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں صرف فرحین کا خیال نشتر بن کر چبھ رہا تھا۔ سراج اس کے قریب آیا تو وہ پھٹ پڑا ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

”صاحب..... ان کتے کے پلوں نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی..... مجھے افسوس ہے کہ ایک حرام کا تخم بچ کر نکل گیا۔“

فرحین زخمی تو نہیں ہوئی؟“ سراج نے اس کی دلجوئی کی۔
”وہ بے ہوش ہے صاحب۔ جو شخص میرے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا اسی نے بٹ مار کر فرحین کو بے ہوش کیا تھا ورنہ.....“

”فکرمات کرو..... عثمان اور بھائی اس کے ساتھ گئے ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
دو گھنٹے کی ضروری کارروائی کے بعد لاشوں کی پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ علاقے کا ایس ایچ او سراج کے قریب آ کر بولا۔ ”سر..... مجھے لیاقت حسین کا بیان بھی درکار ہے۔“
کیری آن..... بٹ بی پولائنٹ ہارے۔“ سراج نے اسے انگریزی میں سمجھایا۔
لیاقت حسین کی پیشانی پر ٹکنتیں ابھرنے لگیں اس کے اندر غیرت کا ایک طوفان پھر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

”لیاقت حسین۔“ ایس ایچ او نے اسے براہ راست مخاطب کیا۔ ”تمہیں اس بات کا علم کس وقت ہوا کہ آنے والے تمہاری عورت کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے؟“
”میں سوتے سوتے جاگا تھا.....“ لیاقت حسین نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”اس وقت وہ بستر پر نہیں تھی باہر کا دروازہ بھی کھلا تھا جہاں ایک آدمی کھڑا تھا“ میں اندھیرے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔“

”پھر.....“
”پھر میں نے ایک سالنسر لگا پستول نیکے کے نیچے سے نکالا اور اسے اوپر روانہ کر دیا۔“ لیاقت حسین نے چپختے لہجے میں کہا پھر ایک ہی سانس میں تمام کہانی ڈہراتا چلا گیا۔
”مجرم تمہاری عورت کو کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ انہیں تم سے کیا دشمنی تھی؟“ ایس ایچ او نے مزید وضاحت چاہی۔ ”کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔“
”وہ ولد الحرام زندہ ہوتے تو میں ان سے دریافت کرنے کے بعد ہی تمہارے سوال کا جواب دے سکتا تھا۔“

لیاقت حسین نے حقارت سے جواب دیا۔ اس کے اندر سلگتی آگ پھر بھڑکنے لگی تھی۔ خون کی گردش تیز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی آواز بھی تیز ہونے لگی۔

”کیا بات ہے؟“ اورنگ زیب نے قریب آتے ہی سراج کی سمت دیکھا۔
”اٹ ازال رائٹ۔“ سراج نے جواب دیا پھر وہ براہ راست لیاقت حسین سے مخاطب

ہوا۔ ”مجھے تمہارے جذبات کا خیال ہے لیاقت حسین لیکن کاغذات کی خانہ پری بھی ہماری ضرورت ہوتی ہے۔“

”فرحین صرف تمہاری نہیں ہماری بھی عزت اور وقار کا مسئلہ بن گئی ہے۔“ اورنگ زیب نے لیاقت حسین کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے اب تک پولیس کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ بھی تمہیں یاد ہیں۔“

”مم..... میں کیا بتاؤں صاحب کہ آنے والے جنگی کتے کون تھے..... کس کے اشارے پر بھونک رہے تھے؟“ لیاقت حسین نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے غریب چوکیدار کو بھی نہیں بخشا صاحب..... اب اس کے گھر کا چولہا کون جلانے کا؟ وہ دو بچوں کا باپ تھا۔ میری ہی طرح شہر آ کر اس نے بھی چار پیسے کمانے کی غلطی کی تھی۔ یہاں جو لوٹ مار ہوتی ہے اس کا سوال جواب ہم سے کیوں ہوتا ہے؟ زخم پر مرہم رکھنے کے بجائے اسے سوالوں کے نشتر لگا کر اور گہرا کرنا..... یہ کون سا قانون ہے؟ کہاں کا انصاف ہے؟“

اورنگ زیب اسے سمجھانا چاہتا تھا جب لیاقت حسین کا موبائل منگلتا نہ لگا اس نے جیب سے موبائل نکال کر آن کر لیا، دوسری طرف سے سیٹھ عثمان کی محبت بھری آواز بھری۔
”ڈاکٹر پوری طرح مطمئن ہیں لیاقت حسین ان کا کہنا ہے فرحین کو بیس پچیس منٹ بعد ہوش آ جائے گا۔ تم فکرمات کرو ذرا حیلہ ہے اس کے پاس میں تمہاری طرف واپس آ رہا ہوں۔“

”فرحین کو گہرا زخم تو نہیں آیا.....“ لیاقت حسین نے جذبات انداز میں دریافت کیا۔
”نہیں..... معمولی سی سوجن ہے ایک دو روز میں وہ بھی جاتی رہے گی۔ سراج کہاں ہے؟“
جواب میں لیاقت حسین نے موبائل سراج کی طرف بڑھا دیا۔ اس دوران ایس ایچ او بھی اس کی حیثیت اور اہمیت کا اندازہ لگا چکا تھا چنانچہ اس نے لیاقت حسین کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں اب کچھ کچھ حالات کا انداز لگا چکا ہوں اس لیے آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔ آپ کا بیان پھر کسی وقت.....“

”نہیں..... اورنگ زیب نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔ ”آپ میری موجودگی میں باقی کاغذات بھی مکمل کر لیں۔“

اورنگ زیب کے درمیان میں آن جانے کے بعد لیاقت حسین نے وہ تمام باتیں تفصیل سے بتا دیں جو گزر چکی تھیں بعد میں دستخط بھی کر دیے۔ پولیس کے جانے کے بعد سراج نے فوری طور پر ذاتی اختیارات کا استعمال کیا، دونوں جنگلوں کی دیکھ بھال کے لیے اس نے سادہ لباس میں کچھ افراد کو وہاں طلب کر لیا۔ اسی دوران سیٹھ عثمان بھی آگئے۔ لیاقت حسین فرحین کے لیے پریشان تھا اس لیے وہ سب سے اجازت لے کر اسپتال روانہ ہو گیا۔



دوسری صبح سراج ایس پی اورنگ زیب کے آفس میں موجود تھا۔

”میں ایک دروازے میں اس کی فائل نکلا کر آپ کے حوالے کر دوں گا جس میں کچھ رپورٹیں بھی موجود ہیں۔“

”پلیز.....“ اورنگ زیب نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں اب ہمارے لیے ضروری ہے کہ شیلادورما کے علاوہ جونی اور گنیز کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھی جائے۔“

”ٹھیک ہے میں ایک دو خاص آدمیوں کو اس کام پر لگا دیتا ہوں۔“

”جونی کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”دھندا کرنے والا..... خسرہ.....“ سراج نے حقارت کا اظہار کیا۔ اسی کو دریافت کرنے کے بعد شیلادورما نے شوہر سے طلاق لی تھی۔“

”میرے مخبر کی اطلاع کے مطابق شیلادورما کو خود بھی نہیں معلوم کہ اس کے پارلر سے سپلائی کی ہوئی لڑکیاں کہاں بھیجی جاتی ہیں..... یہ گندا کام بھی جونی انجام دیتا ہے.....“

اورنگ زیب کچھ دیر خاموش رہا پھر معنی خیز انداز میں بولا۔

”موجود گفتگو کے بعد تم آکٹوپس کو کس خانے میں فٹ کرو گے؟“

”میں سمجھا نہیں.....“

”خوب صورت اور نو جوان لڑکیوں کے سلسلے میں اس کی نیت بھی کبھی ٹھیک نہیں رہی۔“

”میں اس سے اتفاق نہیں کروں گا۔“ سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”وہ جن حالات سے گزر چکا ہے اس کے بعد کم از کم ایسے تھرڈ ریٹ لوگوں سے دور رہی رہنے کو ترجیح دے گا۔“

اورنگ زیب کی نظریں سراج پر جمی رہیں پھر اس نے گفتگو کا رخ تبدیل کر دیا۔

”افضل خان اور شبنم کی سیوری سے غافل نہ رہنا۔ وہ دونوں بھی ہمارے لیے اہم ہیں۔“

”میں نے پہلے ہی اس کا خیال رکھا ہے۔“

”اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”کوئی خاص بات.....؟“ اورنگ زیب نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”لیاقت حسین کے حادثے کی تفصیل سننے کے بعد اس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ آپ کا سارا ضروری سامان آپ کو مطلع کیے بغیر سمیٹ کر گھر پہنچا دوں۔“ سراج نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا بھی یہی خیال ہے کہ لیاقت حسین کے بعد مجرم آپ کو بھی خدا نخواستہ نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

”اس خطرے کا اظہار میں بھی کر چکا ہوں۔ اسی لیے میں نے تمہارے بیٹے کے اوپر کا اسٹور روم صاف کرایا ہے لیکن..... میں گھر سے سامان اٹھا کر کسی مجرم کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتا کہ اس سے خائف ہوں۔“

”پھر..... آپ کا کیا حکم ہے.....“ سراج نے معصومیت سے دریافت کیا تو اورنگ زیب کو ہنسی آ

”کیا رپورٹ ہے؟“

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دوپہر تک مکمل ہو جائے گی۔“ سراج نے اپنی گزشتہ رات کی مصروفیت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”جو مارے گئے تھے ان میں سے تین پولیس کو مطلوب خطرناک مجرم تھے باقی دو کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔“

”اوہ.....“ اورنگ زیب نے سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے آنے سے پیشتر ابھی میں نے لیاقت حسین کو بھی موبائل پر کنٹیکٹ کیا تھا‘‘فرحین کے ہوش میں آنے کے بعد اب وہ خاصا ریلیکس ہو گیا ہے۔ اس نے ایک نئی بات بتائی ہے۔ مجرم اس سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ کم از کم پندرہ روز کے لیے گاؤں چلا جائے۔“

”آئی سی“ سراج چونکا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آکٹوپس بھی لیاقت حسین کی مادرائی قوتوں سے خائف ہے۔“

”اس کا تجربہ ہم دونوں کو بھی ہو چکا ہے۔“

”ایک سوال ابھی قابل حل ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”حالات کے پیش نظر مجھے یقین ہے کہ وہ اسی شہر میں کہیں موجود ہے لیکن کہاں؟“

”ہمیں اس کے لیے بھی اپنے کوجیوں سے کام لینا ہوگا۔“

کچھ دیر ان کے درمیان فتح حامد کے بارے میں اہم مشورے ہوتے رہے پھر اورنگ زیب سے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”شیلادورما اور اس کے بیوٹی پارلر کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے؟“

”دونوں بدنام ہیں لیکن آپ کو اس وقت اس کا خیال کیسے آگیا؟“

”کل میرے کسی آدمی نے ایک نئی اطلاع دی ہے۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہاں ”سکندر علی شاہ کی دوسری بیوی گنیز بھی شیلادورما کے بیوٹی پارلر پر آتی جاتی ہے۔ جونی کے خاص کمرے میں بھی اس کا خاصا وقت گزرتا ہے۔“

”یہ اطلاع ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی ہے۔“ سراج نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”جونی اور گنیز دونوں فٹ پاتھ سے اٹھ کر اب عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

”سکندر علی شاہ کے بارے میں میری معلومات کچھ زیادہ نہیں ہیں۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”وہ کس خانے میں فٹ ہوتا ہے؟“

”اس کا شمار..... عثمان اور رستم علی آغا خانی سے اونچی کنٹیکٹ میں کیا جاسکتا ہے۔“ سراج نے مختصر تفصیل بیان کی۔ ”کچھ خاص حالات کی وجہ سے اب وہ صرف محدود سرکل میں اٹھتا بیٹھا ہے۔ اس کے اثر و رسوخ بھی بہت اونچے لیول تک ہیں۔“

”خاص حالات سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

مہنی۔

”تم اپنے آفس جاؤ، میں رات کو الماس سے بات کر لوں گا۔“

”خدا کرے کہ اس کے سر میں آپ کی بات سما جائے۔“ سراج نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ پھر مسکراتا ہوا کمرے سے نکلنے کے لیے پرتول رہا تھا جب اورنگ زیب نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

”آکٹوپس کی عالی شان کوشی کے بارے میں کورٹ نے کیا فیصلہ سنایا ہے؟“

”اسے جتن سرکار ضبط کر لیا گیا ہے بیلٹ (baliff) کی موجودگی میں ایک ہفتے بعد سرکاری آکشنز نیلام کرے گا۔“

”کیا تمہیں اس نیلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی.....؟“ اورنگ زیب کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”میں سمجھا نہیں.....“

”خطرناک جانور جو پناہ گاہ بناتے ہیں اس کے کئی چور راستے ہوتے ہیں جس کا علم اسی قبیلے کے دوسرے جانوروں کو بھی ہو سکتا ہے۔“ اورنگ زیب نے غلام میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”کیا اب بھی تم میرا مقصد نہیں سمجھتے؟“

”رات بھر کا جاگا ہوا ہوں اس وقت میری عقل کام نہیں کر رہی۔“

”پھر گھر جا کر آرام کرو لیکن میں ایک بے حد ضروری کام تمہیں سوچ رہا ہوں۔ اسے رازداری سے کرنا شرط ہے۔“ اورنگ زیب نے مدھم لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے ان لوگوں کی فہرست درکار ہوگی جو اخبارات میں اشتہار آنے کے بعد آکشنز کے پاس اپنا نام اور بڈ (bid) جمع کرائیں گے۔“

”آئی سی۔“ سراج کی آنکھوں میں چمکی ابھری۔ ”اتنی اہم بات میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی۔“

”دماغ کا تعلق بھی نیند ہی سے ہوتا ہے۔“ اورنگ زیب نے بے تکلفی سے جواب دیا پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔



پرتاب بھوشن اپنی کنیا میں پاؤں پارے لیٹا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی شعلہ بار نکلا ہیں اس وقت چھت پر جمی تھیں جبکہ سلونی نیم عریاں حالت میں بیٹھی اس کے پیروں کی چھبی کر رہی تھی اس کے ہاتھ بھی کئی بار جان بوجھ کر رہے تھے لیکن پرتاب کے سر پر جوں تک نہیں رہتی۔

”آج کس دچار میں تم ہو مہاراج.....؟“ اس نے بڑی لگاؤ سے پرتاب کو مخاطب کیا۔

”ججے بتانے کی بات نہیں ہے.....“ پرتاب بھوشن نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”میں کچھ دیر بعد آ جاؤں؟“ سلونی نے اپنی موجودگی کا مقصد بیان کرنے کی خاطر بھرپور انگڑائی لی۔

”کیوں؟ پیر داہتے ہوئے تیری جان نکل رہی ہے؟“

”نہیں..... لیکن میں نے آج تک کبھی کسی کے پیر بھی نہیں دباے۔“ سلونی کے اندر کی عورت جاگنے لگی۔ ”مندر کے تھکے ہوئے پجاری بھی میری سیوا کرنے کی راہ نکلتے رہتے ہیں پر..... تمہاری بات اور ہے۔“

چل..... دفع ہو جا.....“ پرتاب نے اسے جھڑک دیا۔ ”میں بھی ایک نکلوثی کو آٹھ دس بار استعمال کے بعد اتار پھینکتا ہوں۔ کجری نہیں کی۔“

سلونی بل کھا کر ابھی..... کسی ناگن کی طرح پرتاب کو گھورتی لہراتی کنیا کے باہر نکل گئی۔ پرتاب بھوشن کے دماغ میں پھر لیاقت حسین کا خیال کسی بگولے کے مانند چکرانے لگا..... اس نے بھوانی کے لیے کئی بار بے بے جاپ کیے تھے۔ بھوانی نے خوش ہو کر اسے مدھو پجاریں دان کر دی تھی..... وہ کھرا سوتا تھی ہر ایک کو نیا سواد دیتی تھی لیکن لیاقت حسین کو تیار کرنے کے سلسلے میں وہ بھی پراسرار طور پر جل بھن کر راکھ ہو گئی تھی۔ کچھ دنوں پہلے لیاقت حسین کو تھیلی لگانے والی کسی شہتی نے اسے منڈل سے نکال کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بار بار کی شکست نے پرتاب بھوشن کے اندر سلکتی آگ کو اور بھڑکا دیا تھا۔ اس نے پھر بھوانی کو وچن دیا تھا کہ جب تک اس مسئلے کو نوٹ نہیں کر دے گا آرام سے نہیں بیٹھے گا۔

خاصی دیر وہ اسی خیال سے الجھتا رہا پھر کنیا سے نکل کر مندر کے بڑے پجاری مدن چند کی طرف چلا گیا۔

”آج ادھر کیسے آگئے مہاراج؟“ مدن چند کے خاص سیوک نے اسے دروازے پر روک کر پوچھا۔

”مدن ہے اندر.....؟“

”ہاں مہاراج پرتاب..... اس سے.....“

”جانتا ہوں۔“ پرتاب نے اس کے گالوں پر چپت مارتے ہوئے رازداری سے پوچھا۔ ”اس وقت بھی کسی سندری پجاری کی ہنڈیا بھون رہا ہوگا۔“

سیوک نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ پرتاب کو اس کا درمیان میں آنا اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ بڑے پجاریوں نے اسے خاص ڈھیل دے رکھی ہے۔

”سلونی تو نہیں ہے.....؟“ پرتاب بھوشن نے مدھم آواز میں پوچھا۔

”وہ اب ہنڈیا نہیں رہی مہاراج۔“ سیوک نے براسا منہ بنا کر جواب دیا۔ ”آج کل تو اندر سہا کی ایک اپہرا نے اپنا جادو جگا رکھا ہے کسی کو ٹھٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ تتنا مرج کی انوسار ہارے مندر میں کو لہے منکا کی پھرتی ہے سب ہی دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔“

”پھر.....“ پرتاب نے سیوک کے قریب ہو کر رازداری سے پوچھا۔ ”مدن چند نے کون سا نتر پڑھ کر پھونک دیا ہے؟“

”آج پہلی بار کاؤڈ کو کھڑی لگی ہے مہاراج..... اندر کیا ہو رہا ہے یہ کسے معلوم۔“ سیوک نے چٹارالے کر کہا۔

باہر نکلے گی تو اندر کا بھید کھل جائے گا۔“

”نقئی دیر سے اندر ہے؟“

”تمہارے آنے سے بیس منٹ پہلے ہی اندر گئی ہے۔“ سیوک نے کہا۔ ”بڑے پجاری جی اسے گیتا کا پاٹھ بھی پڑھاتے ہیں۔“

اسی لمحے دروازہ کھلا اور پرتاب بھوشن کی نظروں کے سامنے بھی ایک بچی کوند گئی۔ سیوک نے جو کہا تھا وہ جھوٹ نہیں تھا، نئی کسین پجارن کے ایک ایک سے ملتی پھوٹتی تھی اس نے ایک نظر پرتاب بھوشن پر بھی ڈالی پھر اس طرح بچہ کرکٹ لگی جیسے وہ ایک اچھوت ہو۔ پرتاب کے دل پر سانپ لوٹ کر رہ گیا۔

مدن چند نے ہمیشہ کی طرح پرتاب کا سواگت اپنے ہی شدوں سے کیا تھا۔ اسے اپنے برابر بٹھاتے ہوئے بولا۔

”آج ادھر کا راستہ کیسے بھول گئے مہاراج؟“

”تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔“ پرتاب بھوشن نے بڑے پن سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم اس روٹی کا کوئی علاج بتا سکو۔“

”کس روٹی کی بات کر رہے ہو۔۔۔؟“

”وہی مسلا لیاقت حسین۔“ پرتاب نے کہا۔ ”ایک بار چہرہ میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل گیا پرتو میں نے بھی کالی کی سوگند اٹھا رکھی ہے یا تو اس پاپی کو نشت کروں گا یا پھر۔۔۔۔۔“

”تم نے کہا تھا کہ کوئی شکتی ہے جو اس کی بھی سہائتا کر رہی ہے؟“ مدن چند نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہے ایک سایہ جو ابھی تک میری پکڑ میں نہیں آسکا۔۔۔۔۔ وہی کئی بار میرا راستہ کھوٹا کر چکا ہے۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے؟ تمہاری آگیا ہو تو میں بھی کچھ سوچ بچار کروں۔“ مدن چند نے سنجیدگی سے کہا۔

”درگا کے لیے میں نے بھی کئی جا پ کیے ہیں وہی میری سہائتا بھی کرتی ہے۔ اس کی شکتی بھی اپرم پار ہے۔“

”میں اسی کارن آیا تھا۔۔۔۔۔ تم بھی ایک بیٹھک لگا کر اسے کھوج لو ورنہ میں نے اسے قبر تک نہ چھوڑنے کی سوگند اٹھا رکھی ہے۔“

مدن چند نے اسی وقت اٹھن کیا پھر کٹھ لی مار کر بیٹھ گیا اس کے ہونٹ کسی منتر کا جاپ کرنے لگے پرتاب نے نظریں گھما کر اس کے بستر کی طرف دیکھا تو دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ بستر پر اسے

کوئی شکن نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے ایک نظر میں تاز لیا کہ نئی پجارن کے سلسلے میں ابھی تک شاید مدن چند کی دال نہیں گلی تھی ورنہ چادر کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور آڑھا تر چھا نظر آتا۔ وہ نئی پجارن کو دانہ ڈالنے کے بارے میں سوچ بچار میں مصروف تھا جب مدن چند اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ اس کے چہرے پر بڑی گہمیر سنجیدگی مسلط تھی۔

”کیا اشارہ دیا درگا دیوی نے؟“

”پرتاب بھوشن روگ ہمارے بس کا نہیں ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو مدن چند؟“

”درگا دیوی نے یہی اشارہ دیا ہے۔“

”پرتو میں نے کالی دیوی کو دچن دے رکھا ہے اسے کیسے توڑ سکتا ہوں۔“

”یہ تم جالو لیکن۔۔۔۔۔ درگا دیوی بھی پاروتی دیوی ہی کا ایک روپ ہے۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ شکتی کون ہے جو اس مسٹنڈے کی سہائتا کر رہی ہے؟“

”میں بھی نہیں بتا سکتا مگر درگا کا کہا جھوٹ بھی نہیں ہوتا۔“ مدن چند دبی زبان میں بولا۔ ”مجھے کیول یہی اشارہ ملا ہے کہ تم اس شکتی کا کوئی توڑ نہیں کر سکو گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے مدھو کی طرح تم بھی کام آ جاؤ۔“

جواب میں پرتاب بھوشن سنبل کر بیٹھ گیا۔ لمحہ بھر کچھ سوچتا رہا پھر اس طرح ہنسنے لگا جیسے مدن چند نے اس سے کوئی مذاق کیا ہو۔

”میں جانتا تھا کہ یہ بھیمڑا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔“ پرتاب بھوشن نے سینہ تان کر گھمنڈ سے کہا۔

”چھوڑو۔۔۔۔۔ میں خود ہی اس سے منٹ لوں گا۔“

”جیسی تمہاری مرضی مہاراج۔“

”ایک بات اور پوچھوں؟“ اس بار پرتاب بھوشن نے رازداری سے سوال کیا۔

”پوچھو مہاراج۔۔۔۔۔ میں تم سے غلط نہیں کہوں گا۔۔۔۔۔“

”یہ نئی گوریا (چنیا) جو ابھی پڑ پھڑاتی باہر گئی ہے تمہارے جال میں پھنسی یا ابھی دانہ چک چک کر لال جھنڈی دکھا رہی ہے؟“

”اس کو ایک نظر دیکھ کر سبھی کی رال ٹپکتی ہے۔“ مدن چند نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”ابھی نئی نئی آئی ہے تو کچھ دنوں خیرے بھی اوٹ دکھائے گی۔“

”میرا بھی دھیان رکھنا کرو۔“ پرتاب بھوشن نے اٹھتے ہوئے مدن چند کے پٹھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”سلونی میں اب پہلا جیسا سوندھا پن بھی نہیں رہا۔۔۔۔۔“

مدن چند نے مسکرا کر بات ٹال دی۔

❖❖❖

دوروز سے دشنو صرف ہوئل کے کمرے ہی تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ لوچن کو اس کی وجہ بھی معلوم تھی اسی کی شکایت پر ملٹری کا ایک میجر آکر اسے آخری وارنگ دے گیا تھا۔ لوچن انجان ہی بنا رہا۔

اس وقت بھی دشنو بالکونی میں کرسی ڈالے بیٹھا باہر کا نظارہ کر رہا تھا جب اس نے اچانک جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکال کر آن کر لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بس ایک پل کو خوشی سے چونکا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے نظریں گھما کر لوچن کی طرف دیکھا جو بظاہر اس وقت بھی صوفے پر بیٹھا وی دیکھنے میں مصروف تھا پھر بھی دشنو نے مدھم لہجے میں کہا۔

”میں پہلے بھی ایک بات بار بار دہرا چکا ہوں باس سے براہ راست بات کیے بغیر تمہارے کہنے پر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔“

”کیا تم نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے؟“

”اوہ.....“ دشنو مسکرایا۔ ”وہ خبر پولیس کی طرف سے بھی چھپوائی جاسکتی ہے۔“

”میری بات دھیان سے سنو۔“ اس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا گیا۔ ”باس کا حکم ہے کہ تم فوری طور پر اس جینی سے دور ہو جاؤ۔“

”دوروز پہلے ملٹری کے ایک میجر نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔“ دشنو نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”جانتے ہو کیوں؟“

’ہاں..... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم پچاس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگانے کے بعد کسی سرکس کے بازی گر کی طرح قلابازی کھا کر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہو.....“

”میں بھی وہی مطالبہ دہراؤں گا.....“ دشنو نے پھر بگ باس کے ساتھ بات کرنے کی شرط باندھی۔

”ایک منٹ انتظار کرو.....“

دشنو نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی نظریں نیچے سڑک پر ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں جب وہ دوسری جانب سے باس کی مخصوص آواز سن کر خوشی سے اوپھل پڑا۔

”میں..... میں دشنو بول رہا ہوں آپ کا نمک حلال سیوک۔“

”ایک بات دھیان سے سن لو دشنو۔“ دوسری جانب سے کرخت لہجے میں کہا گیا۔ ”دوبارہ تم مجھ سے براہ راست بات کی ضد کبھی نہیں کرو گے۔“

”اب تمہاری آواز سن لی ہے تو تمہارے کتوں کی بات بھی برداشت کر لوں گا۔“ دشنو نے بازاری انداز میں اپنی تابعداری کا یقین دلاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا حکم ہے میرے لیے؟“

”ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ دوسراہ لباس والے تمہاری نگرانی پر مامور کر دیے گئے ہیں۔“ اس بار بھی بولنے والے کے لہجے کی ترشی برقرار رہی۔ ”انہیں کسی کے اشارے پر ہی یہ ڈیوٹی سونپی ہے۔“

”جانتا ہوں۔“ دشنو نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں بھی اسے جان بوجھ کر ڈھیل دے رہا

ہوں چاہتا تو اسی کا روپ دھار کر نو دو گیارہ ہو چکا ہوتا۔ قد کے معمولی فرق کو کون دھیان سے دیکھتا ہے۔“

”ایک لمحے پہلے جو کہا گیا تھا اسی پر عمل کرو.....“ تحکمانہ لہجے میں جواب دیا گیا۔ ”دوسرا حکم بعد میں دیا جائے گا۔“

”مجھے فوری طور پر کچھ رقم کی بھی.....“

”چوبیس گھنٹے کے اندر وہ بھی مل جائے گی۔“ اس جملے کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ دشنو نے موبائل جیب میں رکھا..... بالکونی سے رینگ کے قریب کھڑے ہو کر نیچے کے حالات کا نہایت غور سے پہلی بار جائزہ لیا پھر ٹپکتے ہوئے انداز میں اندر آ کر لوچن کے قریب بیٹھ گیا۔ لوچن نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اس وقت بھی وہ فری اسٹائل کشتی دیکھنے میں مگن تھا۔

”اسی کمرے میں تمہارے ساتھ میں بھی رہتا ہوں۔“ دشنو نے اسے متوجہ کرنے کی خاطر کہا۔ ”جانتا ہوں.....“ لوچن نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔

”یہ بھی ضرور جانتے ہو گے کہ دوروز پہلے فوجی مجھ سے ملاقات کرنے کیوں آئے تھے؟“

”تمہارا کوئی ذاتی معاملہ رہا ہوگا.....“ لوچن کی نظریں بدستور ٹی وی اسکرین پر جمی رہیں۔

”آج کسی نے میرے شہیے کی تصدیق بھی کر دی ہے۔“ دشنو نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔“

لوچن نے ٹی وی بند کر دیا۔ اس کے تئیں بھی اچانک ہی ٹیکھے ہو گئے تھے۔ دشنو کو اس نے تیز نظروں سے گھورا۔

”کھل کر بات کرو..... کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”وہ تمہارے اشارے پر کسی کے کہنے سے ہی آئے تھے۔“ دشنو بے پروائی سے مسکرایا۔

”تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی وہی کرتا جو تم نے کہا۔ ہمارے لیے وفاداری بھی شرط ہوتی ہے لیکن..... تم بھی جانتے ہو کہ میں کس کا آدمی ہوں جیل میں ہماری پہلی ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی فرار ہوئے تھے۔“

”اب کیا بتانا چاہتے ہو.....؟“ لوچن نے سوال کیا اس کے تئیں بھی ٹیکھے ہونے لگے تھے۔

”یہی کہ ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔“ دشنو نے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ ”میں زیادہ دنوں کی پابندی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”کیا باس سے تمہاری بات ہوگئی؟“ لوچن نے شانے اچکا کر سوال کیا۔

”ہاں.....“ دشنو نے جواب دینے میں تاخیر نہیں کی۔ ”اس کی طرف سے اب جو ہدایت ملی اس پر بھی عمل کرنا میرے لیے ضروری ہے۔“

”یہ بھی تمہارا ذاتی معاملہ ہے..... میں تمہیں اس کے حکم پر چلنے سے روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

”کل صبح ميں تمهيں اس هوئل ميں نهيں ملوگا..... اس وقت يهي بتانا چاهتا تھا۔“ دشنو کے ليج ميں ايک خاموش چينچ بيجي تھاجے محسوس کر کے لوچن کی کھوپڑی بھی گرم ہوگئی۔

”چينچ کر رہے ہو؟“ اس نے خطرناک نظروں سے دشنو کو گھورا۔

”نهيں..... ايک بيتی کرنا چاهوں گا۔“ دشنو نے کينچلی بدلنے ميں دير نهيں لگائی۔ ”نہ ميں اچھوت هوں نہ دوسرے کو اچھوت سمجھتا هوں۔ تمہارے ساتھ ايک برتن ميں کھا بھی چکا هوں اس ليے يهي چاهوں گا کہ ہم آئندہ جب بھی مليں جہاں بھی مليں ايک دوسرے کے متر (دوست) بن کر مليں ايک دوسرے کا راستہ کھونا کرنے کی کوشش نہ کریں۔“

”ميں بھی دوستوں کا دوست هوں دشنو مگر..... تم بھی جانتے هو کہ ابھي ميں جس کے ليے کام کر رہا هوں وہاں پونے دو مہينے کا کنزيرکٹ اور رہ گیا ہے ہماری تنظيم کی طرف سے پہلی شرط يهي هوئی ہے کہ کسی بھی حکم کی خلاف ورزی نہ کی جائے اس ليے ميں تم کو زبان نهيں دے سکتا۔“

”مجھے تمہارا جواب سن کر خوشی هوئی۔“ دشنو مسکرانے لگا۔ ”هو تا بھی يهي چاہیے۔ منش جس ہانڈی کا کھائے اس ميں چھید کيھی نهيں کر سکتا..... اور يہ بھی جانتا هوں کہ ايس پي اورنگ زيب نے بھی تمهيں دوست بتا ليا ہے۔“

”اس کے کچھ احسان تم پر بھی هيں۔“ لوچن نے ترکی بہ ترکی جواب ديا۔ ”کيا تم ايس پي کے ساتھ نمک حرامی کا سوچ سکتے هو؟“

”نهيں..... ليکن ميں پوليس والوں کی دوستی پر دشواس نهيں رکھتا۔“ دشنو نے صاف گوئی سے جواب ديا۔

اورنگ زيب بھلا آفير ہے، ميں اس کے احسان کو بھی ياد رکھوں گا۔“

”ميہاں سے تمہارا کلکنا آسان نهيں هوگا۔“ لوچن نے کہا۔ ”ميرامطلب ہے کہ اب ملٹری کے خفیہ لوگ تمہاری طرف سے غافل نهيں هوں گے۔“

”يہ سوچنا ميراکام ہے۔“ دشنو نے شانے اچکا کر بے پروائی سے کہا پھر اٹھ کر مسکراتا هوا دوبارہ بالکونی ميں آگيا۔ اس کی نظریں اب سڑک سے بالکونی کی اونچائی کی پيائش کر رہی تھيں۔



اس وقت رات کے دس کا عمل تھا جب لياقت حسين فرحين کے قریب بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا۔ ”اوپر والے کی مہربانی ہے جو تمہاری جان بچ گئی ورنہ وہ اپنے پانچ آدمیوں کی موت کا بدلہ تم سے بھی لے سکتے تھے۔“

”تمہارے اوپر کوئی الزام تو نهيں آیا۔“ فرحين نے بڑی اپنائیت سے سوال کیا۔

”نهيں..... سب اوپر والے کا کرم ہے۔ سراج صاحب اور ايس پي صاحب کی موجودگی ميں تھانے کا افسر بھی بيگلی بن گیا تھا۔“

”ہم گھر کب چليں گے؟“ فرحين نے پوچھا۔

”ابھي تمهيں ايک دن اور رہنا هوگا۔ آج ميں بھی عثمان صاحب کے ساتھ بڑے ڈاکٹر سے ملا تھا وہ بھی کہہ رہا تھا کہ کل دوپہر کے بعد يہاں سے چھٹی مل جائے گی۔“

”ايک بات پوچھوں لياقت.....؟“ فرحين نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی آنکھوں ميں جھانکا۔ ”اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو.....؟“

”تو لياقت بھی زندہ نہ رہتا.....؟“ لياقت حسين نے اس کا ہاتھ آھستہ سے دبا کر کہا پھر ان کے درميان زيادہ بات نهيں ہو سکی۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے دونوں کو چونکا ديا تھا۔ لياقت حسين نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ آنے والا ايک ميل نرس تھا۔

”مجھے مريضہ کو ايک ضروری انجکشن لگانا ہے۔“

لياقت حسين نے اس کے ليے راستہ چھوڑ ديا ليکن فرحين نے منہ دوسری طرف کر کے لياقت حسين سے کہا۔

”ميں کسی مرد سے يکا نهيں لگواؤں گی..... تم کسی نرس کو بلاؤ۔“

”اس وقت تمہارے وارڈ کی نرس دوسرے کمروں کو ايڈیٹ کر رہی ہے بي بي.....“ ميل نرس نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”انجکشن لگانا ضروری ہے بڑے ڈاکٹر نے خاص طور پر اس کی ہدایت کی ہے۔“

”نهيں.....“ فرحين نے پھر اصرار کیا۔ ”ميں کسی مرد سے يکا نهيں لگواؤں گی۔“

”يہ انجکشن فوراً نہ لگا تو خراب بھی ہو سکتا ہے۔“ ميل نرس نے لياقت حسين سے کہا۔

لياقت حسين فرحين کو شہر کی نزاکتوں سے آگاہ کرنے کی خاطر اس کے قریب گیا۔ اسی وقت اس کی نگاہ ماں کی دی ہوئی انگوٹھی پر پڑی جس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

”خطرہ.....“ لياقت حسين کا ذہن جاگنے لگا۔ ماں کی دی ہوئی اس انگوٹھی کے پکينے نے اسے اس وقت بھی آگاہ کيا تھا جب فرحين کو دشمنوں نے اپنا دھن بنانے کی کوشش کی تھی پانچ افراد بھی اس کے ہاتھوں مارے گيا اور اب..... اب شايد پھر فرحين کی زندگی کسی خطرے سے دو چار تھی..... وہ خطرہ لگا ہو سکتا ہے..... ”انجکشن.....؟“ لياقت حسين کے ذہن ميں انجکشن کا خيال ابھرا تو وہ بھی سمجھ گیا کہ ميل نرس بھی غالباً دشمنوں کے ہاتھ بک گیا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا پھر..... اس نے اپنا پستول نکال کر ميل نرس پر تان ليا۔ قہر آلود ليج ميں بولا۔

”انجکشن کی ٹرے ايک طرف رکھ کر تم بھی ادھر کونے ميں بيٹھ جاؤ۔“

ميل نرس بوکھلا گیا۔ اس نے پہلے قميل کی پھر احتجاج کیا۔

”يہ آپ کيا کر رہے هيں جناب..... مجھے ابھي دوسرے مريضوں کو بھی ايڈیٹ کرنا ہے۔“

”خاموشی سے بيٹھ رہو نهيں تو ميں تمهيں گولی مارنے سے دریغ نهيں کروں گا۔“ لياقت حسين نے ہاريزيشن ليٹنے کے بعد دروازہ بھی اندر سے بند کر ديا تو فرحين بھی چپ نہ رہ سکی۔

”يہ..... يہ تجھے کيا ہو گیا ہے لياقت؟“

لیاقت حسین نے فرحین کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اُلٹے ہاتھ سے موبائل نکال کر براہ راست اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ ہونے پر سنجیدگی سے بولا۔
”صاحب..... آپ ادھر اسپتال آ جاؤ۔ میں نے کسی کو پستول دکھا کر روک رکھا ہے، فرحین کی زندگی شاید پھر خطرے میں ہے۔“
”کون ہے وہ.....؟“ اورنگ زیب نے سوال کیا۔
”یہ بھی آپ آ کر معلوم کر لیتا۔“ لیاقت حسین نے جواب دے کر رابطہ منقطع کیا پھر اس نے سیٹھ عثمان کو بھی وہی اطلاع کر دی۔

میل نرس اس صورت حال سے بری طرح بوکھلا گیا تھا، اس کے چہرے پر خوف کے ساتھ اس خطرے کا احساس بھی منڈلا رہا تھا جس سے وہ خلاف توقع دو چار ہو گیا تھا۔
”آ..... آپ کو..... کس بات کا شہ ہے جناب؟“

میل نرس نے اس بار قدرے بدلے ہوئے تیور سے لیاقت حسین کو گھورا۔
”دونوں ہاتھ سامنے کیے چپ بیٹھے رہو۔“ لیاقت حسین نے بے حد سرد آواز میں کہا۔ ”میں پانچ افراد کو پہلے بھی گولی مار چکا ہوں۔ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“
میل نرس کے چہرے پر موت کے سائے منڈلانے لگے، وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ خود کو بچانے کی خاطر کوئی قدم اٹھانے کا خطرہ مول لیتا، فرحین بھی بے چین نظر آ رہی تھی۔ لیاقت حسین نے اس کی بھی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

بیس منٹ بعد کچھ قدموں کی آواز دروازے کے باہر آ کر تھم گئی۔ کسی نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”میں آ گیا ہوں لیاقت حسین..... دروازہ کھولو۔“

لیاقت حسین نے میل نرس پر سے نظریں ہٹائے بغیر دروازہ کھول دیا، اس نے اورنگ زیب کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ عثمان صاحب کے علاوہ اسپتال کا بڑا ڈاکٹر بھی تھا جو پریشان نظر آ رہا تھا۔ میل نرس کو دیکھ کر وہ بھی ایک لمحے کو چونکا لیکن اس کے بولنے سے بیشتر اورنگ زیب نے سچویشن دیکھ کر لیاقت حسین سے پوچھا۔

”تم نے اس میل نرس کو کیوں پکڑ رکھا ہے؟“
”یہ..... یہ فرحین کو انجکشن دینے آیا تھا صاحب لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ کھرا آدمی نہیں ہے۔“

”کون ہو تم.....؟“ اورنگ زیب سے پہلے ڈاکٹر نے میل نرس کو مخاطب کیا پھر اس نے اورنگ زیب سے انگریزی میں کہا۔ ”یہ میل نرس کے لباس میں ضرور ہے لیکن ہمارے اسٹاف کا آدمی نہیں ہے۔“

”صاحب.....“ لیاقت حسین جذباتی ہونے لگا۔
”آپ اس کا خیال رکھو۔ اب میں وہ انجکشن اسی کو لگاؤں گا جو یہ فرحین کو دینے آیا تھا، سارا

بھید بھی کھل جائے گا۔“

اورنگ زیب کے جواب دینے سے پہلے آئی جی بھی ایک پولیس انسپٹر کے ساتھ اندر آ گیا۔
”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے اورنگ زیب سے سوال کیا۔
”تم..... تم مل کر بھی مجھے ہاتھ نہیں لگا سکو گے۔“ میل نرس نے بڑی بے جگری پے کہا تو سب ہی چونک اٹھے، میل نرس نے بات جاری رکھی۔ ”ہم پولیس تھانے کے چکر میں نہیں پڑا کرتے.....“
”اے گرفتار کر لو.....“ آئی جی نے ساتھ آنے والے انسپٹر کو حکم دیا تو میل نرس سینہ تان کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میرے قریب آنے سے بیشتر میری ایک بات بھی سن لو۔ ہم جس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں اسے ادھورا نہیں چھوڑتے۔“
”پریشان مت ہو۔“ اورنگ زیب نے اس کے ارادے کو بھانپ کر نرمی سے کہا۔ ”پولیس تمہارے ساتھ پورا انصاف کرے گی۔“

”نہیں ایس پی..... میں تمہارے قریب بھی نہیں آؤں گا۔“ میل نرس سنجیدگی سے بولا۔ ”ہم اپنا انصاف بھی خود کرتے ہیں۔ یہی سیدھا اور آسان راستہ ہمارے لیے سب سے بہتر ہوتا ہے۔“
آئی جی کے ساتھ آنے والے پولیس انسپٹر نے اچانک میل نرس کی طرف چھلانگ لگا دی، اسے پلک جھپکتے میں دبوچ لیا۔ ”اب کیا بکواس کرو گے؟“ آئی جی نے غرا کر میل نرس سے سوال کیا۔

میل نرس بے بس ہونے کے باوجود جواب میں حقارت سے ہنسا پھر اس نے اپنے نقلی دانت لے اندر چھپا ہوا زہریلا کپسول نکال کر چبایا، دوسرے ہی لمحے وہ انسپٹر کے شکمے میں بے جان لاش بن کر معمول کیا۔

آئی جی کی نظریں اورنگ زیب کی جانب اٹھیں۔
”مجھے اسی بات کا خدشہ تھا سراسر..... اب ٹرے میں موجود انجکشن ہی ہمارے کسی کام آ سکے گا۔“
پولیس کارروائی سے بیشتر ہی اورنگ زیب اور سیٹھ عثمان کے کہنے پر فرحین کو بھی دوسرے روم میں منتقل کر دیا گیا۔ لیاقت حسین بہ دستور اپنی جگہ کھڑا مرنے والی میل نرس کو حقارت بھری نظروں سے گھور رہا تھا۔

”یہ کون شخص ہے؟“ آئی جی نے اورنگ زیب سے انگریزی میں لیاقت حسین کے بارے میں پتہ پانٹ لیا۔
”یہ وہی شخص ہے جناب جس نے گزشتہ دنوں پانچ افراد کو گولی ماری تھی، ان میں تین پولیس کو شہید کیا، ایک تہائی مجرم تھے۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”مسٹر عثمان کا پارٹنر بھی ہے وفاداری کے طور پر اسے لگاؤں کسی اور کو ڈرا کر نہیں کرنے دیتا۔“
”اوہ آئی جی..... آئی جی نے پھر غجب سے کہا۔“

”لیکن آج اس کو میل نرس پر کس طرح شبہ ہوا؟“
 ”کچھ شبہ تو تین ہیں جو اس کی مدد کرتی ہیں۔ پولیس کو اس سے بیشتر بھی اس کا تجربہ کئی بار ہو چکا ہے۔“ اورنگ زیب نے مختصر تفصیل بتادی۔
 ”گڈ.....“ آئی جی نے لیاقت حسین کو دلچسپ نظروں سے دیکھا پھر باقاعدہ اس سے ہاتھ ملا کر بولا۔

”مجھے تم سے مل کر خوش ہوئی۔“
 ”لیکن مجھے ایک غم ہے صاحب۔“ لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کہا۔ ”شاید ہم نے پولیس کو طلب کر کے اچھا نہیں کیا۔“ اس کی نظریں مردہ میل نرس کی جانب گھوم گئیں۔
 ”جو انجکشن یہ مردود ہماری بیوی کو دینا چاہتا تھا وہ مجھے اسی کو زبردستی لگا دینا چاہیے تھا یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ انجکشن میں کون سا قاتل زہر بھرا تھا۔“
 ”نہیں لیاقت حسین۔“ اورنگ زیب نے اس سے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”جب ہم تمہارے ساتھ ہیں تو آئندہ بھی کبھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے غلطی نہ کرنا۔“
 آئی جی کی موجودگی میں میل نرس کی لاش کو ضروری کارروائی کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا، اصلی میل نرس بھی اسپتال کے میڈیکل ڈریسنگ روم سے بے ہوشی کی حالت میں مل گیا۔ بھرا ہوا انجکشن ایک پلاسٹک بیگ میں محفوظ کر کے اورنگ زیب نے اپنی تحویل میں لے لیا۔
 لیاقت حسین کے فرحین کے پاس جانے کے بعد آئی جی اورنگ زیب اور سیٹھ عثمان کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا جب اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے براہ راست آئی جی سے درخواست کی۔
 ”سر..... اگر یہ واقعہ میڈیا تک پہنچ گیا تو اس اسپتال کی ساکھ پر اچھا اثر نہیں پڑے گا اس لیے میری درخواست ہے کہ اگر آپ.....“
 ”ڈونٹ وری.....“ آئی جی نے مسکرا کر کہا پھر اورنگ زیب نے بھی ڈاکٹر کو تسلی دی تو اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔



بہت عرصے بعد یہ پہلا اتفاق تھا جب قہریمانا شے کی میز پر موجود نہیں تھی۔ اس کی جگہ گھر کی ملازمہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ میڈم نے ایک لمحے کو اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا پھر اسے یاد آ گیا کہ گزشتہ رات قہریمانا اس کے بیڈروم سے رات ایک بجے کے بعد ہی گئی تھی۔ ان کے درمیان شادی کا معاملہ زیر بحث رہا تھا، قہریمانا کا خیال تھا کہ روٹی کو شیخ حامد کے تصور کو بھی گولی مار کر اپنا گھر بسا لینا چاہیے جبکہ میڈم اسی بات پر بضد تھی کہ اسے شادی کی ضرورت کا خیال اپنے مظلوم شوہر کے مرنے کے بعد بھی ایک بار بھی نہیں آیا۔ وہ صرف اور صرف اپنے شوہر کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیکھنے کی خواہش مند تھی جس کے سبب اس نے ڈی آئی جی کے لیے ایک کنڈیشن رکھ دی تھی اور اب اس کو پورا ہوئے بغیر وہ کسی قیمت پر اپنے مرحوم شوہر کی روح کے سامنے شرمندہ ہونے کو تیار نہیں تھی۔

ناشتے کے دوران بھی میڈم روٹی کے ذہن میں وہی قاتل موجود تھا جواب کھلی کر سامنے آ گیا تھا، ایس پی اورنگ زیب نے جو کہا تھا اس کی تصدیق مرنے سے پیشتر کنول نے بھی کر دی تھی۔ الماس کے ذریعے اسے فرحین کو اغوا کرنے والی واردات اور ان لاشوں کی تفصیل بھی معلوم ہو چکی تھی۔ ان تمام باتوں نے میں میڈم روٹی کے وجود میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے شوہر کا قاتل دوبارہ سامنے آ کر کسی زہریلے کن بھجورے کی طرح بلبلانے لگا تھا۔ وہ خود پردے کی آڑ میں تھا لیکن اس کے شکاری کتے پھر بے خوف دندنا تے پھر رہے تھے۔ ایسی حالت میں وہ اپنی شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ حسب معمول لاؤنج میں آ گئی۔ اخبار اٹھا کر بیٹھی تھی کہ الماس کا فون آ گیا جس نے اسے ایک نئی واردات کی اطلاع دی جو گزشتہ رات اسپتال میں ہوئی تھی۔ لیاقت حسین نے اگر بروقت میل نرس پر شبہ نہ کیا ہوتا تو فرحین کا مرجانا یقینی تھا، اصل قاتل اس بار بھی پردے کے پیچھے تھا اس کے ایک اور وفادار کتے نے گرفتاری دینے کے بجائے اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا چراغ گل کر لیا تھا۔

الماس کا فون آ جانے کے بعد میں میڈم روٹی نے اخبار ایک طرف ڈال دیا دوبارہ ملازمہ کو بلا کر قہریمانا کو دیکھنے کو کہا۔ اس کے ذہن میں شیخ حامد کا محسوس تصور پھر کسی بھوت کے تصور جیسا ہو لے کی طرح لہرانے لگا جس کے سلسلے میں خود میڈم کی ذاتی کوشش بھی ابھی تک بار آور ثابت نہیں ہو سکی

تھیں۔ اس نے منہ مانگے داموں کے عوض انڈر ورلڈ سے تعلق رکھنے والے تین افراد کی خدمات حاصل کی تھیں ان میں سے دو..... ڈوما اور ہاشم کام آچکے تھے صرف لوچن باقی رہ گیا تھا۔

میڈم کا ذہن گزرے ہوئے واقعات میں الجھ رہا تھا جب ملازمہ نے قریب آ کر تھریا کے بارے میں ایک پریشان کن اطلاع دی۔ ”وہ کمرے میں موجود نہیں ہیں میڈم..... میں نے کمرے کی حالت سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے لیکن میں نے ڈر کی وجہ سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔“

”کیا بکواس کر رہی ہے۔“ میڈم تملاتی ہوئی اٹھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی تھریا کے بیڈروم میں داخل ہوئی تو اسے بھی کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا۔

تھریا اپنے بستر پر نہیں تھی۔ سمہری کی چادر ایک طرف فرش پر پڑی تھی، کچھ سامان بھی بے ترتیب نظر آ رہا تھا، کمرے میں ایک عجیب سی مہک بھی بسی ہوئی تھی۔ میڈم کے کہنے پر باقی ممکنہ جگہوں پر بھی دیکھا گیا لیکن تھریا کہیں نہیں ملی میڈم نے پچھلے کے گارڈ کو طلب کیا۔ اس نے بھی کسی کے آنے جانے کا شبہ نہیں ظاہر کیا۔ بعد میں پچھلے کے عقب والے حصے میں ڈیوٹی دینے والا گارڈ ایک خالی سروٹ کوارٹر سے بے ہوشی کی حالت میں ملا تو میڈم روہی کے ذہن میں لوہے کے جھکڑے چلنے لگے۔ اس نے سب کو زبان بند رکھنے کی تاکید کی پھر تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے بیڈروم میں آئی۔

”تھریا اغوا کر لی گئی ہے۔“ یہ خیال اس کے وجود میں کسی بے چین پارے کی مانند گردش کر رہا تھا۔ یہ اغوا اس کے لیے بھی دشمن کی طرف سے ایک وارننگ تھی تھریا کے ذریعے اب شاید وہ اسے بھی بلیک میل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ تمام ممکنہ پہلوؤں پر بڑی سنجیدگی سے غور کرتی رہی۔ پولیس کو فوری طور پر اطلاع دینے سے بیشتر وہ ذاتی طور پر اس اغوا کے پس منظر میں منڈلاتے خطروں اور سنجیدگی سے سوچتی رہی۔ یہ خیال بھی اس کے لیے بڑا تلخ تھا کہ پولیس کی بلا دستی کے باوجود ایک مجرم بڑے دھڑلے سے پے در پے واردات کرنے پر کمر بستہ تھا لیکن ابھی تک قانون کے لیے ہاتھ اس کی گرد کو بھی نہیں پاسکے تھے۔ ان وارداتوں کے پیچھے ایسا کوئی نشان بھی نہیں ملا جو قانون کے کام آتا۔ وہ ان ہی خیالات سے الجھ رہی تھی جب اس کے بیڈروم میں موجود مخصوص فون نمبروں پر کسی کی کال موصول ہوئی۔ میڈم نے لپک کر ریسور اٹھا لیا۔ وہ نمبر زیادہ لوگوں کے علم میں نہیں تھا۔

”ہیلو.....“

”ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے ابھی تک پولیس کو درمیان میں لانے کی غلطی نہیں کی۔“ دوسری جانب سے بڑی ڈھٹائی سے کہا گیا۔

”کون بول رہے ہو.....؟“ میڈم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”اسے بے ہاتھوں کی ایک انگلی سمجھ لیں جس کو آپ کے مخصوص نمبر معلوم کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔“

”مقصد بیان کرو.....؟“

”آپ کی لیڈی سیکریٹری ہمارے پاس ابھی تک محفوظ ہے۔ آپ چاہیں تو اسے باعزت واپس بھی کیا جاسکتا ہے۔“

”کیا شرط ہے؟“ میڈم کی کشادہ پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔

”آپ آغا منظور..... یعنی ڈی آئی جی صاحب کے ساتھ شادی کرنے کا خیال ذہن سے کھرچ کر نکال دیں۔“

”یہ میرا قطعی ذاتی اور نجی معاملہ ہے۔“

”میں نے جس ہاتھ کی بات کی ہے وہ بھی آپ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھتا ہے۔“ اس بار بھی کھردرے لہجے میں جواب ملا۔ ”جو پالتو کتے وقت کے ساتھ ساتھ وفاداریاں بھی تبدیل کر دیں..... پاس ان کی پسند نہیں کرتا۔“

”اگر میں تمہاری شرط ماننے سے انکار کر دوں تو؟“

”پہلے نمبر پر آپ کی وفادار سیکریٹری کی عزت کی دھجیاں اڑائی جائیں گی۔ دوسرا نمبر ہمیں اس کے بعد ملے گا۔“

میڈم نے فوراً ہی جواب دیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ دوسرے نمبر کا اشارہ اسی کی طرف تھا۔

”آپ نے کوئی جواب نہیں دیا میڈم۔“ مستحکمہ اڑانے والے لہجے میں کہا گیا۔ ”کیا ہمیں انتظار کرنا ہوگا؟“

”نہیں.....“ میڈم نے اس بار فیصلہ کن جواب دیا۔

”تم تھریا کو باعزت واپس کر دو لیکن اپنے خفیہ ہاتھ سے ایک بات اور کہہ دینا دوبارہ وہ میرے کسی ذاتی معاملے میں الجھنے کی غلطی نہ کرے۔“

”ہم حکم کے غلام ہیں بی بی..... آپ نے جو کہا وہ بھی اور پر تک پہنچا دیں گے۔“

”میری سیکریٹری کی واپسی کب تک ہوگی.....؟“

”آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ویسے ایک درخواست بھی ذاتی طور پر کر رہا ہوں۔ پولیس کے کانوں تک یہ بات نہ پہنچے تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

میڈم نے جواب دینے کے بجائے ریسور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے کی کٹنگنی آنے والی کال سے خاصی متاثر ہوئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے اپنی خواب گاہ تک ہی محدود رہی پھر دروازے پر ہونے والی دستک ہی نے اسے متوجہ کیا تھا۔ اس نے دتی گھڑی پر نظر ڈالی تو کسی خیال سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے میں بھی غفلت کا مظاہرہ کیا۔ اس کا انداز غلط نہیں تھا تھریا اس کے سامنے موجود تھی۔

”آر یوسیف؟ (are you safe)“ میڈم نے تھریا کو سامنے دیکھ کر بڑے جذباتی لہجے میں دریافت کیا۔

جواب میں تھریا بے اختیار اس کے گلے لگ گئی پھر اس نے جو تفصیل بتائی وہ اس دعوے

کے خلاف نہیں تھی جو میڈم روبی سے فون پر کیا گیا تھا۔

سراج کمرے میں داخل ہوا تو اورنگ زیب نے سامنے رکھی فائل بند کر دی۔

”کیا رپورٹ ہے؟“ اس نے سراج سے پوچھا۔

”انجکشن میں ایسا زہر پایا گیا ہے جو فرمین کو اگر لگ جاتا تو ایک گھنٹے کے بعد وہ غنودگی ہی کی

کیفیت میں اوپر پہنچ جاتی۔“ سراج نے بیٹھے ہوئے کہا۔ ”فائل رپورٹ دوپہر تک آ جائے گی۔“

”پوسٹ مارٹم کے بارے میں کوئی پیش رفت ہوئی؟“

”میں نے اس سلسلے میں براہ راست سرجن سے بھی رابطہ کیا تھا لیکن اس نے بھی وہی کھرا

جواب دیا جو ڈاکٹر نے دیا تھا۔“ سراج نے جھلا کر کہا۔ ”اب ایسی رپورٹس سیل بند لگانے میں سرکاری

طور پر متعلقہ آفیسر کو ملا کر دیں گی۔“

”قانون بھی یہی ہے..... بہر حال اس سلسلے میں ڈی آئی جی سے بات کروں گا۔“

”اب آپ میرے لیے فوری طور پر کچھ ریڈی میڈ ناشتا منگا دیں ورنہ میں بھی قانونی طور

پر.....“

سراج اپنا جملہ کھل نہ کر سکا ڈیوٹی کانسٹیبل اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں دو تیس دو ابلے

ہوئے انڈے اور کافی کا سامان موجود تھا وہ ڈرے دوسری میز پر رکھ کر اورنگ زیب کے اشارے پر

چلا گیا تو سراج نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا اب لیاقت حسین کی طرح آپ کے اندر بھی کوئی الہامی (القای) کیفیت پیدا ہو رہی

ہے؟“

”ابھی الماس کا فون آ رہا تھا۔ اس نے تمہاری سفارش کی تھی۔ ورنہ میں آفس میں لچ اور ڈنر

کرنے کے بھی خلاف ہوں۔“

سراج جواب دینے کے بجائے ناشتے کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد سراج کے ایک

سپاہی نے اندر آ کر ایک سیل بند بڑا لفافہ اس کے سامنے رکھ دیا پھر باقاعدہ سیلوٹ کر کے واپس چلا

گیا۔

”یہ وہی سکندر علی شاہ کے اس کیس کی فائل ہے جس میں آپ کو کچھ چونکا دینے والی باتیں بھی

ملیں گی۔“

”مگنڈ..... مجھے خوشی ہے کہ تم نے یہ کام پہلی فرصت میں کر دیا۔“

”اس میں الماس کے بجائے آپ کی اس محبت کا اثر ہے جو آپ نے مجھے دی ہے۔“

”ون منٹ..... یہ آفس ہے مسٹر سراج۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آکٹوپس اب

جس تیزی سے اپنے ہاتھ پاؤں استعمال کر رہا ہے وہ ہمارے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔ کنول کی

موت کے بعد تین دنوں کے اندر فرمین پر دوبارہ حملہ..... تم اسے کس نظر سے دیکھ رہے ہو؟“

”میں آپ کی بات سے صدفہ متفق ہوں مگر اس کا سراغ ملنا بھی ضروری ہے۔“

”ہے ایک طریقہ.....“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ کیا.....؟“

”کسی جانور کو اس کی بنائی ہوئی پیچ در پیچ کھو یا بھٹ سے نکالنے کی خاطر اس کے دہانے پر

آگ بھڑکانا بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔“

”یہاں بات انسانوں کی ہو رہی ہے جہاں کچھ قانونی پیچیدگیاں ہمارے آڑے آ جاتی

ہیں۔“ سراج نے کسماتے ہوئے کہا۔ ”جس وقت وہ ہماری نظروں کے سامنے تھا ہم اس وقت بھی

اسے شکنجوں میں جکڑ کر سب کھایا پیا اگلا سکتے تھے لیکن تب بھی ڈی آئی جی اور مرکزی حکومت کے

کچھ ایسے افسروں نے راستہ روک رکھا تھا جو آکٹوپس کے آنکھوں ہاتھ سے لمبی لمبی رقبیں سمیٹ رہے

تھے۔“

”آئی ایگری وڈیو.....“ اورنگ زیب نے بہ دستور خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر..... کیا ضروری ہے کہ آگ بھڑکانے کی خاطر پیڑول اور ماچس ہی کا استعمال کریں۔ ویسے بھی

اب ایٹمی دور ہے۔“

”کیا مطلب؟“ سراج جھونکا۔

”میں نے تم سے پچھلے دنوں بھی کہا تھا کہ تم صرف ایک ڈیوٹی مائنڈ پولیس آفیسر ہو.....“

اورنگ زیب نے براہ راست سراج کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ”اب بھی یہی

کہوں گا۔“

سراج دوبارہ کرسی پر کسسا یا پھر وہ کوئی جواب دینا چاہتا تھا جب اورنگ زیب کے اس موبائل

نے واہیریت کیا جس میں ان رجسٹرڈ سٹی۔ وہ اسے خاص خاص اور اہم آدمیوں کے لیے استعمال

کرتا تھا..... فوری طور پر اس نے موبائل آن کر لیا۔ دوسری جانب سے ابھرنے والی مدھم آواز سن کر

چلکا۔ ایک نظر سراج پر ڈالی پھر خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔

”تم نے مناسب راستہ اختیار کیا ہے..... گھبراؤ نہیں..... ہاں میں پوری توجہ سے سن رہا

ہوں..... وہاٹ؟“ اورنگ زیب کی نگاہیں کوئی بات سن کر سلگنے لگیں۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی

ہو گا؟“

”ٹھیک ہے..... میں خیال رکھوں گا..... وٹس یو گنڈ لک۔“

”کس کی کال تھی؟“ سراج نے اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر کہا۔ ”کوئی

اہم خبر معلوم ہوتی ہے۔“

”تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔“ اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ”کنول اور

اصین کے بعد کل رات پھر آکٹوپس کے شکاری کتے ایک واردات کر گئے۔“

”وہ کیا.....؟“

”سوری مائی ڈیر۔“ اورنگ زیب نے بڑی اپنائیت سے معذرت کی۔ ”فی الحال میں اس سلسلے میں زبان نہیں کھول سکتا لیکن..... اب ہمارے لیے بھی خاموش تماشائی بنے رہنا ممکن نہیں ہے۔“

”میرے لیے کوئی خدمت.....؟“

”تم نے شیلا اور ماوراجونی کے پیچھے کس کو لگایا ہے؟“

”ہے میرے اعتماد کا ایک خاص آدمی..... اسے پہلے بھی آزما چکا ہوں۔“

”میری ذاتی رائے ہے کہ تم اس آدمی کی جگہ افضل خان کو یہ ذمے داری سونپ دو..... موج حالات میں وہ ہمارے لیے زیادہ موثر ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسا میکا اپ اختیار کرے جسے دیکھ کر شبہ بھی اس کی اصلیت نہ جان سکے۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔“ سراج نے دبی زبان میں سوال کیا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آکٹوپس کے شکاری کتے افضل خان اور شبنم کی نقل و حرکت سے بے خبر ہوں گے۔“

”یو آر رائٹ۔“ اورنگ زیب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”میرا اپنے کسی آدمی کو اس کام پر لگا دیتا ہوں شیلا اور ماوراجونی کی روز و شب کی مصروفیت کا قریب سے جائزہ لیتا ہمارے لیے اب اہم ہو گیا ہے۔“

”میں بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کروں گا۔ ویسے ایک بات میرے لیے ابھی تک معمرہ ہوئی ہے۔“

”اس میں مجھے دالی کیا بات ہے؟“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”دوسروں کی طرح جونی نے بھی مس ڈکسن سے مل کر اپنے مستقبل کے بارے میں ہی جاننے کی کوشش کی ہوگی۔“

پھر..... آئی جی کا فون آنے کی وجہ سے سراج نے خاموشی اختیار کر لی۔

”انجکشن کی زبانی رپورٹ ڈی ایس پی سراج نے ذاتی تعلقات کی بنا پر معلوم کر لیا تھی۔“ اورنگ زیب تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”لاش کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آفیشل راستے سے موصول ہوگی..... سراج نے پولیس سرجن سے بھی رابطہ کیا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوئی..... وہ نیا آدمی ہے اس لیے فی الحال مجھے بڑے قانون پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے..... سوری سراج اس نے مجھے بھی ٹالنے کی بات کی تو میں برداشت نہیں کر سکتا گا..... یہ زیادہ مناسب رہے گا..... جی نہیں ابھی تک اس کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ اشتہاری مجرم نہیں تھا..... ڈونٹ وری سز میں کسی کے دباؤ میں آنے والا آفیسر نہیں ہوں..... ختیک یوسر۔“

گفتگو ختم ہوئی تو سراج نے دریافت کیا۔ ”کوئی نئی اطلاع؟“

”آئی جی کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کچھ باثر لوگ ہمارے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کریں۔“

”وہ ابھی نیا نیا آیا ہے..... اسے اس بات کا خیال کیوں آیا.....؟“

”اس میں نئے پرانے کی بات نہیں ہے مائی ڈیر..... ہر اہم کیس میں کوئی اڑنا کسی نہ کسی صورت میں ضرور لگتا ہے۔“ اورنگ زیب نے جواب دینے کے ساتھ ہی سکندر علی شاہ کی فائل بھی کھول لی تو سراج نے کہا۔

”یہ فائل آپ کو خاصی دیر مصروف رکھے گی۔ اگر اجازت ہو تو اس دوران میں اپنے دفتر کی طرف بھی جھانک لوں۔“

”ٹھیک ہے۔“

سراج اٹھنے لگا تو ان رجسٹرڈ موبائل نے پھر واہیریت کرنا شروع کیا اورنگ زیب نے سراج کو اشارے سے بیٹھے ہوئے کہا پھر اس نے موبائل آن کر لیا۔ دوسری جانب سے لوچن کی آواز ابھری۔

”وہ دوغلا باسٹرڈ آپ کے ملٹری والوں کی نظروں میں بھی دھول جھونک کر چھوڑ دیا گیا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ اگر ملٹری والے اسے اپنی تحویل میں لے کر ڈرائنگ روم ٹریڈنٹ کے دھیان اس کی ایک دوپلی کھکا دیتے تو وہ دوسری منزل سے نیچے چھلانگ لگانے کا رسک بھی نہ لیتا۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”کل رات کی۔“

”اور تم اس کی اطلاع اب دے رہے ہو؟“ اورنگ زیب نے چھلا ہونٹ چباتے ہوئے قدرے درشت انداز میں سوال کیا۔

”اس باسٹرڈ کی چوکیداری میں رات بھر جاگنے کے بعد لمبی تان کر سو گیا تھا۔“ لوچن نے تفصیل بتائی۔ ”اس کے چیلنج کی خاطر میں نے اس پر نظر رکھی تھی۔ وہ رات میں دوبار تھوڑے تھوڑے وقفے سے بالکونی میں گیا تھا۔ میں آنکھوں میں جھری لیے دیکھتا رہا تیسری بار وہ رات کو تقریباً دو بجے پھر بالکونی میں گیا..... جب دیر تک واپس نہیں پلٹا تو میں نے اٹھ کر بالکونی میں مہالکا۔ شاید نیچے دو در در تک سنا تھا میرا خیال ہے کہ وہ کسی سواری کی راہ تک رہا تھا اس کے آنے کے بعد ہی اس نے چھلانگ لگانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ میں نے فوری طور پر باہر نگرانی کرنے والے ایک سادہ لباس سولجر کو اطلاع دی۔ وہ بھی پورا کرا کھٹکالنے کے بعد بغلیں بجاتا چلا گیا۔ اس کے سوا وہ بھی کیا کر سکتا تھا۔“

اورنگ زیب نے جھلا کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وشنو کے فرار ہونے کی خبر سن کر سراج بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اورنگ زیب اب خانہ پری کی خاطر کرنل احتشام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔



سلید رنگ کی اس وین پر ایک مقامی رفاہی ادارے کا نام درج تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جو شخص بیٹھا تھا اس کی شرٹ پر بھی اسی ادارے کا مونو گرام تھا۔ پشت پر ایک جانب مریض کی لمبی نشست تھی دوسری جانب کی پشت پر دو افراد تنگ سیاہ لباس میں ملبوس نظر آ رہے تھے۔ ایک پستہ قد تھا

جس کا جسم بے حد گھٹا ہوا تھا دوسرا درمیانہ قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے ان کے درمیان قدموں میں ایک چاکلیٹی رنگ کا اسکول بیگ تھا جس میں شانوں پر لٹکانے والی بیلٹ بھی موجود تھی۔ دونوں افراد اپنی اپنی جگہ کسی سوچ میں غرق تھے ان کے طرز عمل سے بھی یہی لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے واقف ضرور ہیں لیکن زیادہ بے تکلف نہیں تھے۔

اس وقت رات کے پونے بارہ کا عمل تھا ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے وین کے اوپر لگی سرخ گھومنے والی رائٹ بھی روشن نہیں تھی، مخصوص سائرن کی آواز والا سسٹم بھی آن کیا گیا تھا۔

”یہ پہلا اتفاق ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ کہیں جا رہے ہیں۔“ پستہ آدی نے گفتگو کی ابتدا کی اس کا لب و لہجہ غیر ملکیوں جیسا تھا۔ ”ہمارا پروفیشن بھی ایک جیسا ہے لیکن ہمیں کسی مریض کا علاج کرنے کے معاملے میں بہت محتاط رہنا ہوگا۔۔۔۔۔ ایک ضروری بات اور بتادوں۔۔۔۔۔ میں اپنے کاموں میں غیر ضروری مداخلت بھی برداشت نہیں کرتا۔“

”جانتا ہوں۔“ دوسرے نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے حالات کے پیش نظر اپنے اندر کچھ تبدیلیاں ضرور کر لی ہیں لیکن کوئی دائمی مریض بھی مل جائے تو اس کے علاج سے غافل بھی نہیں رہتا۔۔۔۔۔ البتہ جہاں مخصوص ہدایتیں بڑے ڈاکٹر کی طرف جاری کر دی جائیں گھٹن کا احساس ضرور ہوتا ہے۔“

”اس معاملے میں مجھے بھی اپنا ہم خیال سمجھو لیکن کبھی کبھی مریض کے علاوہ دوسرے صحت مند لوگوں کا خیال رکھنا بھی ہمارا فرض ہے۔“

”میں نے اسی خیال کے پیش نظر ضروری سامان بیگ میں رکھ لیا ہے۔“

دوسرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وین کا سفر دس منٹ بعد ختم ہو گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آنے والے نے درمیانی کمر کی کھول کر کہا۔ ”میں نے احتیاطاً وین کو بنگلوں کے عقبی حصے میں پارک کیا ہے۔“

”تم نے غلط کیا ہے۔“ پستہ قد والے نے ناگواری سے کہا۔ ”گاڑی گھما کر مطلوبہ پینکٹلے کے عقبی پینکٹلے کے آس پاس روک لو۔“

ڈرائیو نے جواب دینے کے بجائے درمیانہ قد والے کی جانب دیکھا تو اس نے اثبات میں کرکوزیشن دی وین دوبارہ حرکت میں آگئی۔ کچھ دیر بعد اسے وہیں روکا گیا جہاں کے لیے کہا گیا تھا۔ پستہ آدی نے وین سے اترنے میں پہل کی پھر اس نے دوسرے سے کہا۔ ”میں تمہیں اندر پہنچنے کے بعد موبائل پر کال کروں گا۔ اس کے بعد ہی تم اس راستے سے اندر آنا جو ہم نے پہلے سے طے کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“

’باس۔۔۔۔۔ اس کے جانے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر نظر آنے والے نے باہر آ کر اندر بیٹھے

ہوئے فحش کو مخاطب کیا۔ ”کیا اس وقت ہمیں اس سوا پانچ فٹے کی ہدایت پر عمل کرنا ہوگا؟“

”تمہارا اندازہ غلط ہے۔“

”یہ جتنا اوپر نظر آتا ہے اتنا ہی زمین کے نیچے بھی ہے ہم سے زیادہ دور اندیش اور تجربے کار بھی ہے۔“

سوال کرنے والا خاموش ہو گیا، درمیانہ قد والا جو جگہ تھا وہ بھی دین سے باہر آ گیا، دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ خلاف معمول اس وقت جگا کی نظریں بھی کس آدم خور چیتے کی طرح چمک رہی تھیں۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سات آٹھ منٹ بعد میں اسے موبائل پر گرین سگنل کا اشارہ مل گیا۔

”تم یہیں ٹھہرو لیکن آنکھیں کھلی رکھنا۔۔۔۔۔ حسب دستور اگر کوئی ایمر جنسی پیش آجائے تو تمہیں ذاتی فیصلے کا مکمل اختیار ہوگا البتہ اس بات کا دھیان رکھنا کہ کوئی بندہ ضائع نہ ہونے پائے۔“

”پھر جواب کا انتظار کیے بغیر جگا بھی مطلوبہ پینکٹلے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ اس کو اس بات کا علم تھا کہ عدالت کے فیصلے کے بعد شیخ حامد کے پینکٹلے کو نیلام کی خاطر دے دیا گیا تھا۔ پولیس کے صرف دو سپاہی وہاں ڈیوٹی دیتے تھے۔ نیلام میں بھی اب چند دن باقی رہ گئے تھے۔

دن کی روشنی میں جگانے لوچن کے ساتھ مطلوبہ کوشی کا چاروں طرف سے گھوم پھر کا جائزہ لے لیا تھا۔ چنانچہ گرین سگنل ملنے کے بعد وہ اسکول بیگ نہا تھیلے کو شانوں سے لٹکا کر اسی سمیت چل پڑا۔ اس کی نظریں اپنے اطراف کا پھر وہ نہایت پھرتی سے آٹھ فٹ اونچی دیوار کو بڑی مہارت سے پھلانگ گیا۔ اگلے ایک منٹ بعد وہ اس عقبی دروازے کے قریب پہنچ گیا جہاں لوچن موجود تھا۔

جگا کے آجانے کے بعد لوچن نے اسکول بیگ اس سے لے لیا۔ اس کے بعد وہ دونوں کو کوشی کی ٹنگی منزل کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے رہے تھے جگا کے وجود کے اندر اس وقت چنگاریاں پوری طرح سنگ رہی تھیں شیخ حامد کے غنڈوں نے اس کے فرنیچر مارٹ کو جس طرح تباہ کیا تھا اس کا خیال اس کے ذہن میں طوفان کی طرح سر اُبھار رہا تھا اگر اورنگ زیب اسے خاموش رہنے کو نہ کہا ہوتا تو وہ اپنی مرضی سے بھی جوابی سے بھی جواب کاروائی کر گزرنے سے دریغ نہ کرتا۔

بیس منٹ تک ایک ایک کونے کھدروں کا جائزہ لینے سے ساتھ ساتھ لوچن اور جگا ان تمام مشکوک جگہوں پر ٹائم بم فٹ کرتے رہے جہاں کسی چور راستے کا احتمال کیا جاسکتا تھا۔ کچھ بم انہوں نے چھت سے بھی چپکا دے۔ اس کام سے فارغ ہونے میں بھی دونوں نے غیر معمولی جلدت سے کام لیا تھا۔

لوچن اپنی کارکردگی کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا جب جگانے اس کے قریب آ کر پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے دوست؟ کیا ان بموں کے بلاسٹ ہو جانے کے بعد بھی یہ عمارت قابل استعمال ہو سکتی ہے؟“

”نہیں.....“ لوچن نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میں ادھورا کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”گنڈ.....“ جگانے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”اگر میرے اختیار میں ہوتا اور قرب وجوار میں بسنے والے بے قصور لوگوں کا خیال نہ ہوتا تو میں اس منحوس کوٹھی کو جڑ بنیاد سے خاک میں ملا دیتا.....“

”یہ جذباتی باتیں ہم دین میں بیٹھنے کے بعد بھی کر سکتے ہیں.....“ لوچن نے دبی گھڑی کے ریڈیم ڈائل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بھی بھی اگر کوئی ڈیوائس پر فیکٹ طریقے پر کام نہ کرے تو جان جانے کا خطرہ بھی لاحق ہو جاتا ہے۔“

جگانے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ دونوں وقفے وقفے سے عمارت کے باہر آئے۔ اس وقت بھی دور دور تک کسی انسان کا سامنا نہیں ہوا۔ دین کے حرکت میں آنے کے بعد ہی جگانے کسی خیال دم سے چونک کر لوچن سے پوچھا۔

”جو کوٹھی کے صدر دروازے پر پہرا دے رہے ہیں ان کو تو کوئی نقصان نہیں ہو گا؟“

”ایک بات پوچھوں۔“ لوچن نے جگانے کے سوال کا جواب نفی میں دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بگ باسٹروں سے کیا پر خاش ہے؟“

”ہے ایک قرض جو آج چکنا ہو جائے گا۔“

”ہو سکتا ہے۔“ لوچن نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ”میں تمہیں ایک ذاتی تجربے کی بات بتا رہا ہوں۔ شیر زخمی ہونے کے بعد آدم خور بھی بن جاتا ہے..... بگ باسٹروں کی طرف سے کسی غلط فہمی میں مبتلا رہنا..... ایسی شکل میں جبکہ وہ قانون کی نظروں سے بھی چھپا ہوا ہے۔“

”اسی بات کا ملال ہے دوست.....“ جگانے زہر خند سے جواب دیا۔ ”اگر وہ سامنے ہوتا تو میں اسے لٹکار کر ہی مارتا..... چنانچہ پر بیٹھ کر شکار کیلینا میری فطرت کے بھی خلاف ہے۔“

”اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں تمہارے بارے میں۔“ اس بار لوچن نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”تم قابل اعتماد نہ ہوتے تو تمہارے آفس میں بیٹھ کر کوئی ضروری کام کبھی انجام نہ دیتا۔“

”تم..... شاید دشمنوں کی بات کر رہے ہو؟“

لوچن جگانے کا جواب سن کر چونکا لیکن کوئی سوال نہ کر سکا..... پے درپے ہونے والے خوفناک دھماکوں کی آواز نے ان دونوں ہی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

آئی جی اپنے آفس میں بیٹھا کسی سوچ میں غرق تھا۔ جب سے اس نے چارج لیا تھا اسے ہر وقت اپنے استعفیٰ کے منظور ہونے کا انتظار رہتا تھا۔ نئی پوسٹ کے بعد ہونے والے واقعات کے سلسلوں نے ذہنی طور پر اسے اور الجھا دیا تھا۔ لیاقت حسین سے مل کر اسے یقیناً خوشی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں دور دراز کے مختصر وقفے کے دوران جوئل ہوئے تھے اس میں سامنے آنے والی لاشوں کی فائلیں بھی سرد خانے سے نکلائی گئی تھیں۔ یہ سب محض اتفاق ہی نہیں رپورٹس بذات خود پڑھی

تھیں، لیکن ان کی موت کسی نہ کسی انداز میں لیاقت حسین کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کی اطلاع کے مطابق لیاقت حسین کے وجود میں کسی بزرگ کی دعا سے کچھ ایسی خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں جو اسے قبل از وقت خطروں سے آگاہ کر دیتی تھیں، کبھی کبھی وہ بات کہہ جاتا تھا جو بعد میں درست ثابت ہوتی تھی لیکن خود اسے یاد نہیں رہتا تھا کہ اس نے کیا کہا تھا۔

اسپتال سے واپسی کے بعد اس نے اورنگ زیب کو بلا کر خاصی دیر اس سے لیاقت حسین کے بارے میں گفت و شنید کی تھی۔ آئی جی کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی کہتا تھا کہ لیاقت حسین ایک کھرا اور نیک آدمی ہے۔

خاصی دیر تک وہ ان ہی باتوں پر غور کرتا رہا پھر اس نے اپنے ڈائریکٹ فون کا ریسپور اٹھا کر مرکز میں اپنے ایک واقف کار سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اس کے دیرینہ دوستوں میں سے تھا۔ رسی گفتگو کے بعد اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”تم نے ابھی تک میری فائل کے قریب ہوتے ہوئے بھی کوئی موثر کام نہیں کیا۔“

”مجھے خود بھی تعجب ہے۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”تمہارا کام جس کے پاس ہے اس پر میرے کچھ احسان بھی ہیں ہر بار وہ وعدہ کرتا ہے لیکن کوئی نہ کوئی دشواری اس کے سامنے آ جاتی ہے۔“

”میری اطلاع کے مطابق ایک سے زیادہ آفیسر میری کرسی کی خاطر دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان کے بھی اثر رسوخ ہوں گے۔“

”یہی بات میری سمجھ میں بھی اب تک نہیں آ سکی۔ جس کے ہاتھ میں تمہاری فائل ہے خود وہ بھی حیران ہے کہ ہر بار تمہاری فائل اٹھارتی تک جاتی ہے لیکن نہ جانے کیوں واپس آ جاتی ہے۔ کیا تم اس کی کوئی خاص وجہ بتا سکتے ہو؟“

”سوری..... میں خود کو بد نصیب کہنے کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔“ آئی جی نے یلخت رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے چہرے پر کسی گہری تشویش کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے کوئی بات ضرور تھی جو اس کو روحانی طور پر الجھا رہی تھی۔ وہ خلا میں دیکھ رہا تھا جب ڈائریکٹ فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے فون سیٹ کو حقارت سے گھورا پھر انٹر کام ریسپور اٹھا لیا۔

”ہیس سر.....“ دوسری جانب سے مہذب انداز میں جواب ملا۔

”کوئی میرے ڈائریکٹ نمبروں پر کال کر رہا ہے۔ میں اس کی لائن باہر دے رہا ہوں..... کہہ دو کہ میں ایک منٹ پہلے کسی کام سے باہر جا چکا ہوں۔“ آئی جی نے سنجیدگی سے کہا پھر فون سیٹ میں اگا ہوا سوئچ ”آؤٹ“ پر کر دیا۔ ایسا وہ اسی وقت کرتا تھا جب دفتر میں موجود نہیں ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کال اسی دوست نے کی ہوگی جس کے سوال کے جواب میں اسے نے صرف ”سوری“ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پرنسلیکریزی سے بات کرنے کے بعد اس نے ایک فائل اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ چپے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ محض وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی ایسی ضروری جواسے الجھا رہی تھی۔

دس منٹ میں فائل کے اوراق الٹا پلٹا رہا پھر انکام کے بڑے اسے چونکا دیا۔
 ”نہیں.....“ اس نے ریسور اٹھا کر ساٹ لہجے میں کہا۔
 ”سر..... مرکزی وزارت داخلہ کے آفس کی کال ہے۔“
 ”کون بات کرے گا؟“

”میں نے پوچھا تھا سر..... لیکن یہی جواب ملا کہ بات کراؤ۔“

”او۔ کے“ آئی جی نے فائل بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی پھر پرسنل سکرٹری نے کال انڈر ٹرانسفر کر کے کچھ کہا تو اس نے ریسور اٹھا لیا۔
 ”آئی جی اسپیکنگ؟“

”آپ کو اپنے ریزگنیشن منظور کیے جانے کی کیا جلدی ہے؟“ دوسری جانب سے سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔

”میرا خیال ہے کہ میں اپنی کچھ نجی پریشانیوں کے سبب اپنے کام کو پوری توجہ سے انجام نہیں دے پا رہا ہوں۔ آئی جی نے سنبل کر جواب دیا۔

”مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن مرکزی وزراء کے لیے دوسرے کام آپ کے استغنے سے زیادہ اہم ہیں اس لیے فی الحال آپ کو کچھ عرصہ.....“

”میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں گا.....“ آئی جی نے بے دھڑک کہا۔ ”دوسرا آپشن بھی ہے میرے پاس۔ میں میڈیکل گراؤنڈ پر دوبارہ لمبی چھٹی پر چلا جاؤں۔“

”تم..... ایسا نہیں کر سکو گے.....“ اس بار دوسری جانب سے تحسانہ انداز میں کہا گیا۔ ”اس وقت تک..... جب تک میں تمہارے حال پر ترس نہ کھاؤں۔“

”کون بول رہا ہے.....؟“ آئی جی نے بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کی پیشانی بھی شکن آلودہ ہونے لگی۔

”کو برا!“ حقارت اور درشت لہجے میں جواب ملا۔ ”تم کو زندگی کی آخری سانسون تک میرے اشارے پر چلنا ہو گا۔“

”اب میرے پاس کیا باقی رہ گیا ہے؟“ آئی جی کے چہرے سے قیمتی برسنے لگی۔ ”سب کچھ تو تم برباد کر چکے ہو۔“

”اسی وجہ سے میں نے تمہیں صاحب اختیار بنوا دیا ہے۔“ اسی بازاری انداز میں کہا گیا۔ ”اب تمہارے اختیارات میرے کام آئیں گے۔“

”نہیں..... شاید اس میں تمہارے لیے صرف ایک کام کر سکتا ہوں۔“ آئی جی نے جھلا کر

کہا۔ ”کوئی ایسا سرلیج التا شیر زہر کھالوں جس پر تمہارا اختیار نہ ہو.....“

”ایسی صورت میں تمہاری روح تم سے زیادہ کرب میں رہے گی۔“ سردمہری سے کہا گیا۔ ”جو

دستاویز اور تصویری ثبوت میرے پاس محفوظ ہیں۔ اگر وہ منظر عام پر آئیں تو تمہاری بیوی کی روح بھی تڑپ اٹھے گی جسے تم نے طبعی موت ظاہر کر کے دفن دیا تھا۔“

”اس میں بھی تمہاری کمینگی کو دخل تھا۔“ آئی جی نے تمللا کر کہا۔ ”مرنے والی میری زندگی کی آخری خوشی تھی جسے تم نے چھین لیا تھا۔“

”میں انکار نہیں کروں گا..... ہو سکتا ہے تمہارے انکار کی صورت میں مجھے کمینگی کے بعد اب گھنٹیا پن بھی اختیار کرنا پڑے۔“ دوسری جانب سے ڈھٹ بن کر کہا گیا۔ ”تم کیا پسند کرو گے؟“

”کیا کام چاہتے ہو.....؟“ آئی جی نے اپنی نشست پر بیزارگی سے کسماتے ہوئے سوال کیا۔

”اس بار میں نے تمہارے ساتھ رعایت کا خیال بھی رکھا ہے۔“ بد دستور جھلسا دینے والا جواب ملا۔ ”آپشن تمہارے اختیار میں ہے..... یا تو لیاقت حسین کو پندرہ روز کے لیے کسی بھی جرم کی پاداش میں آہنی سلاخوں کے پیچھے بھیج دو یا..... پھر فوری طور پر اورنگ زیب کو اس کی موجودہ سیٹ سے ہٹا دو.....“

”ان دونوں سے تمہیں کیا دشمنی لاحق ہو گئی؟“ آئی جی نے حیرت سے سوال کیا۔

”دشمنی کے بھی دورخ ہوتے ہیں..... بلا واسطہ یا پھر بالواسطہ لیکن میں نے تمہیں سوال کرنے کا حق نہیں دیا تھا۔“ اس بار بھی مضحکہ اڑانے والا انداز تھا۔ ”تم صرف آپشن کا حق استعمال کر سکتے ہو..... میرے پاس وقت کم ہے۔“

”اگر میں آپشن استعمال کرنے کے بجائے تم سے ایک نام پوچھوں تو تم کیا جواب دو گے.....“

”میرا جواب تصاویری شکل کی ایک قسط کے طور پر کل کے اخبار بھی آ سکتا ہے۔“

”نہیں..... پلیز۔“ آئی جی نے عاجزی سے کہا۔

”ایسا مت کرنا.....“

”آج کا کام کل پر مت ٹالنا..... دیٹ از آل۔“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

آئی جی ریسور رکھ کر ہونٹ چبانے لگا..... یہ بات سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے تمام کاموں کی جھنک اس فرضی نام ”کو برا“ تک کسی نہ کسی طور پہنچ جاتی ہیں جس کا اصل نام خود اسے بھی نہیں معلوم تھا لیکن کچھ نجی معاملات اتنے نازک اور اہم تھے جس کی وجہ سے وہ کو برا کے کسی حکم سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

تا دیر آئی جی اس نئی صورت حال سے اندر ہی اندر بیچ و تاب کھاتا رہا پھر اس نے اپنے پی اے کو بلا کر ایس پی اورنگ زیب کے ہیڈ کوارٹر میں فوری تبدیلی کے آرڈر ڈکٹیٹ کرائے اس کے ہاتھ یہ بھی کہا۔

تعاون کی درخواست کی تھی۔ کچھ دنوں بعد اس نے اورنگ زیب کو براہ راست آفس بلا کر یہ بھی کہا تھا۔

”جب تک میں اس کرسی پر ہوں آپ کو موجودیٹ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا، اس از مانی کمنٹ (this is my commitment)“ اور اب اسی نے کسی دباؤ میں آ کر اورنگ زیب کا تبادلو کر دیا تھا۔ اشاروں سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اس قدم کو اٹھانے پر مجبور تھا۔ وہ دباؤ کس قسم کا تھا؟ آئی جی جی ہوتے ہوئے اگر وہ کسی کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا تھا تو وہ شخصیت کس کی تھی؟ اورنگ زیب اسی معنی کو حل کرنے میں الجھ رہا تھا۔



شیلا اور اس وقت بھی حسب معمول ٹائٹ سوٹ میں تھی جب جونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر شیلا اور ما کے گداز جسم پر ڈالی اور زش اور خوش خوراکی نے اس کے جسم کے ایک ایک حصے کو صنف مخالف کے لیے خوب صورت ترین سانچوں میں ڈھال رکھا تھا اس کے پرستاروں میں شہر کے بڑے بڑے لوگ شامل تھے لیکن وہ ان کی نظروں کو سینکے کی حد سے کبھی آگے نہیں بڑھی تھی شاید یہی وجہ تھی جو ان پرستاروں کی صف میں کچھ ذاتی دشمنیاں بھی سرابھارنے لگی تھیں لیکن شیلا اور ما صرف جونی کی پرستار تھی جس نے اس کی خواہشات کے ساتھ اس کے بزنس کو بھی چکا رکھا تھا۔

جونی کو دیکھ کر اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی پھر دیوان پر نیم دراز ہو کر اس نے خلاف توقع جونی کے چہرے پر طاری سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے مدھم مگر نشی آواز میں پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ آج تم کس خیال میں گم ہو؟“

”ایک مشورہ دوں مانو گی؟“ جونی نے سنجیدگی سے کہا۔

”مشورہ نہیں۔ تم مجھے حکم بھی دے سکتے ہو۔“ شیلا اور ما نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”مجھے شبہ ہے کہ کسی نہ کسی ایجنسی کے کچھ سادہ لباس والے میرے پیچھے لگ گئے ہیں۔“

”تم صرف ایک نام بتا دو۔۔۔۔۔ باقی بندوبست میں کروں گی۔“ شیلا اور ما نے بڑے پر اعتماد انداز میں کہا۔

”اپنے اور تمہارے راستے کے پتھروں کو ٹھوکر مار کر ہٹانا میرے لیے کچھ دشوار بھی نہیں ہو گا۔“

شیلا اور ما نے جونی کے خشک لب و لہجے کو محسوس کیا تو کسی آدم خور شیرنی کی طرح اٹھ کر خواب گاہ میں ٹھہرنے لگی وہ محسوس کر رہی تھی کہ مس ڈکسن سے ملاقات کرنے کے بعد ہی جونی کے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہو گئی تھیں اس کے ذاتی تجربہ دوسروں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ جونی کی

”ان آرڈر پر میرے فائل دستخط ہونے کے بعد آپ مسٹر اورنگ زیب کو بھی کال کر کے بلا لیں۔ یہ آرڈر میں اسے براہ راست دینا پسند کروں گا۔“

پی اے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن آئی جی کے لب و لہجے کی سختی کو محسوس کر کے اس نے خاموشی سے باہر چلے جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے ٹائپ شدہ فائل آرڈر پر آئی جی کے دستخط ہونے کے بعد کیا پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ایس پی اورنگ زیب سے آئی جی سے فوری ملاقات کرنے کا فون بھی کر دیا۔

پی اے کے جانے کے بعد آئی جی پھر کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ چہرے کے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ اس نے جو بھی قدم اٹھایا ہے اس میں اس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔

ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس نے بیرونی دروازے کی سرخ لائٹ بھی آن کر دی تھی۔

”اس وقت کیسے یاد کیا سر۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے گفتگو کا آغاز کیا۔

آئی جی نے جواب میں ہاتھوں سے ایک مخصوص اشارہ کیا پھر سخت لہجے میں بولا۔

”آپ کے بارے میں ایک دو ایسی رپورٹ موصول ہوئی ہیں جس کے بعد فوری طور پر آپ کو ہیڈ کوارٹر میں پوسٹ کیا جا رہا ہے۔ آپ اپنا چارج ڈی ایس پی سراج کو عارضی طور پر دے کر آج ہی آفٹون (after noon) میں یہاں رپورٹ کریں۔“

”میں نے احکامات کی پیروی سے کبھی انکار نہیں کیا سر لیکن میں یہ ضرور جانتا چاہوں گا کہ میرے خلاف۔۔۔۔۔“

”نو۔ آرگومنٹس (no arguments) پلیز۔۔۔۔۔“

آئی جی نے الٹی آنکھ کی پلک جھپکا کر افسرانہ انداز میں کہا۔

”شکایت کی تفتیش کے بعد آپ کے فائل آرڈر بھی کر دیے جائیں گے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔“

اورنگ زیب کے لیے یہ عجیب صورت حال تھی وہ آئی جی کے اشاروں سے سمجھ رہا تھا کہ اسے نے کسی مجبوری کی بنا پر ایک عارضی قدم اٹھایا ہو گا لیکن۔۔۔۔۔ وہ مجبوری کیا تھی؟ ایسے حالات اچانک کیسے پیدا ہو گئے تھے جس نے آئی جی کو بھی وقتی طور پر عضو معطل بنادیا تھا؟

”تھینک یو سر۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے بھی وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے خشک لہجہ اختیار کیا پھر تیز قدم اٹھاتا آئی جی کے کمرے سے باہر نکل گیا لیکن۔۔۔۔۔ کچھ باتیں تھیں جو اس کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر ابھر رہی تھیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ آئی جی نے اپنی پہلی کانفرنس کے دوران بھی کہا تھا کہ وہ پہلی فرصت میں ملازمت سے باعزت مستعفی ہونے کا منتظر ہے۔ اس کا ریزگنیشن کسی وجہ سے منظور نہیں ہو رہا تھا۔ کانفرنس کے دوران اس نے تمام افسران سے

نقل و حرکت کو بھی واج کرتے تھے..... اسی ذریعہ سے اسے جونی اور مس ڈکسن کی ملاقات کا علم تھا مگر اس نے ابھی تک جونی پر یہ بات ظاہر نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ جونی اس سونے کی کار کبھی تھا جسے وہ نظر انداز بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”ڈونٹ بی سٹی منغل شیلا.....“ جونی نے اس بار بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں نے اس وقت مشورہ دیا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو..... ہمیں مل بیٹھ کر بدلتے حالات پر غور کرنے ضرورت ہے۔“

”تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے.....؟“ شیلا اور ما قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی گئی۔

”ہر اس فرد واحد پر جواب تک ہمارے کاروبار سے منسلک رہا ہے۔“ جونی نے اسے ر کرنے کی خاطر ہاتھ تمام کر قریب بیٹھا لیا۔

”کوئی سرفہرست بھی ضرور ہو گا؟“ شیلا نے جونی کی کمر کے گرد اپنی ہاتھوں کا حصار لیا۔ لگاؤ بھرے انداز میں بولی۔ ”میں محسوس کر رہی ہوں پچھلے کچھ دنوں سے تم نے میری ڈاڑ میں دلچسپی لینی بھی کم کر دی ہے۔“

”یہ تمہارا وہم ہے.....“

”پھر.....“ شیلا اور ما کے اندر کی عورت تملنا اٹھی۔

”حقیقت کیا ہے؟“

”جذبات سے کام نہیں چلے گا ڈارلنگ!“ جونی اس کا ہاتھ تمام کر ڈبل بیڈ پر لے گیا۔ بے تکلفی کی فضا قائم کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا تم واقف ہو کہ جولڑکیاں میرے ساتھ بھیجی جاتی ہیں ان کی آخری منزل کیا ہوتی ہے؟“

”نہیں..... مجھے صرف آم کھانے سے غرض ہوتی ہے پتہ گننے کی ضرورت میں نے کبھی محسوس نہیں کی۔“

”اب کرنی ہوگی.....“

”کیوں؟..... تمہیں کس بات کا خوف ہے؟“ وہ پھر الجھنے لگی۔ ”اس وقت تمہارے ذہن میں کیا گونج رہا ہے؟..... مجھے کھل کر بتاؤ..... میں پہیلیاں بوجھنے کی عادی نہیں ہوں۔“

”ہمارے پارلر سے صرف وہ لڑکیاں طلب کی جاتی ہیں جن کا تعلق پوش علاقوں اور اثر و رسوخ رکھنے والوں سے ہوتا ہے۔ ایسے گھرانوں کی اپنی عزت اور شہرت بھی عزیز ہوتی ہے۔ ماڈرن اور خوب صورت لڑکیاں بھی اس کی اہمیت سے واقف ہیں اسی لیے وہ پہلی بار برباد ہونے کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولتیں..... ضرورت پڑنے پر ان کے والدین خاموشی سے ان کا علاج بھی کہیں نہ کہیں سے مختلف انداز میں تلاش کر لیتے ہیں۔“

”اسی وجہ سے ان کی ڈیمانڈ بھی زیادہ ہے جس کے عوض ہم نہ مانگی قیمت بھی وصول کر لیتے

ہیں۔“

”ان لڑکیوں کی آنکھوں پر پٹی بھی نہیں ہوتی اس لیے وہ شکاری کی شکل و صورت بھی ضرور یاد رکھتی ہوں گی؟“

”تم ایک بات بھول رہے ہو جونی۔“ شیلا نے اس کے اور قریب ہو کر سرسراہٹے لہجے میں جواب دیا۔ ”کسی نئے کا ذائقہ اگر ایک بار منہ کو لگ جائے تو پھر وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ اچھے برے کی تمیز وہی نشہ ختم کر دیتا ہے..... اس کی ایک جیتی جاگتی مثال تمہارے پہلو میں بھی میری شکل میں موجود ہے۔ کیا تم اس بات سے انکار کر سکو گے؟“

”مثلاً تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ جونی نے اپنے ہاتھوں کا حلقہ مزید تنگ کر لیا۔ ”میرے لیے تمہارے علاوہ خود اپنی مثال بھی موجود ہے میں نے جان محمد سے جونی بننے تک جو منزلیں طے کی ہیں تم بھی ان سے ناواقف نہیں ہو۔ یہی تجربات زندگی کا ٹھنڈا ہوتے ہیں ہماری مختلف ایجنسیوں کے افسران بھی ان باتوں سے لاعلم نہیں ہوں گے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ایک اور مثال بھی ہماری زندگی کے لیے اہم ہے۔“

”کیا.....“

”پانچوں انگلیاں برابر بھی نہیں ہوتیں۔“ جونی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”جس وقت میں یتیم خانے میں تھا اس وقت تیرہ سال کا ہونے کے باوجود مجھے اس کے تقدس کا احترام تھا۔ بے سہارا بچوں کی پرورش کی آڑ میں جو مذموم کاروبار ہو رہا تھا اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب کسی ایک فرض شناس افسر نے وہاں ریڈ (raid) کی تھی اسی بھگدڑ میں شامل ہو کر میں بھی فرار ہو گیا۔ میرے پاس سر چھپانے کا کوئی کمزور سہارا بھی نہیں تھا لیکن وقت کی رفتار نے آج مجھے تمہارے اس بیڈروم تک پہنچا دیا جہاں کل تک کوئی اپنا جائز حق استعمال کر رہا تھا۔ اب اس کی جگہ جو ہو رہا ہے کیا تم اسے جائز ثابت کر سکو گی؟“

”واٹ نان سینس!“ شیلا جونی کے ہاتھوں کے حصار ٹپ کر باہر نکل گئی اسے گھورتے ہوئے بڑے تلخ انداز میں بولی۔ ”اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی تمہاری مردانہ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ کیا یہ غلط ہے.....؟“

”میں نے کب انکار کیا مائی سوئٹ ہنی۔“ جونی نے اس کا ہاتھ تمام کر دوبارہ اپنے پہلو میں کھسک لیا خواہشات کے نازک ساز کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے اس نے اپنی بات بھی کہہ ا لی۔ ”یتیم خانے پر پریڈ کرنے والا ایماندار افسر دنیا میں تنہا نہیں تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی ہم ہمال اب بھی کہیں نہ کہیں سانس لے رہا ہو گا۔“

”اوہ..... آئی سی۔“ شیلا نے اس بار جونی کے کشادہ سینے میں سر چھپا کر پہلی بار سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں اب تمہاری باتوں کی گہرائی تک پہنچ رہی ہوں لیکن اس وقت نہیں جونی بلکہ روشنی کی باتیں اندھیروں میں اچھی بھی نہیں لگتیں.....“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے کمرے میں پارٹیشن بنا کر اپنی میز بھی یہیں شفٹ کر لوں۔“ سراج نے اورنگ زیب کے کمرے میں داخل ہو کر رسی علیک سلیک کے بعد کہا۔ حسب معمول وہ اورنگ زیب کا فون ملے ہی سارے کام چھوڑ کر آگیا تھا۔

”تم اس وقت کوئی اور دعا مانگتے تو شاید وہ بھی قبول ہو جاتی.....“ اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

”قبولیت کی گھڑیاں بار بار نہیں آتیں.....“

”کیا مطلب.....؟“

”مجھ پر بھروسہ ہو تو چارج رپورٹ پر آنکھ بند کر کے دستخط کر دو۔“ اورنگ زیب نے جو چارج رپورٹ تیار کر رکھی تھی اس کی فائل سراج کے سامنے رکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”میرا فوری تبادلہ ہیڈ کوارٹر میں دیا گیا ہے۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ سراج بے حیرت کا اظہار کیا۔

”جو کہوں گا سچ کہوں گا..... سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔“ اورنگ زیب نے اس بار عدالتوں میں حلف لینے والا انداز اختیار کیا۔ ”کچھ نہ معلوم رپورٹس کی بنا پر آئی جی نے جو آرڈر کیے ہیں اس کی نقل بھی فائل میں موجود ہے۔“

”لیکن.....“ سراج شپٹا گیا۔ ”یہ سب کچھ اس قدر اچانک کیسے ہو گیا.....؟“

”گردشیں انوی نیشن دے کر نہیں آتیں۔ اسی طرح اچانک آتی ہیں اس لیے پریشان مت ہو۔ چارج رپورٹ پر دستخط کر کے میری کرسی سنبھالو۔ مجھے آج ہی آفونون میں ڈیوٹی میں رپورٹ کرنے کا حکم ملا ہے۔“

”کیا اس اچانک تبدیلی میں بھی آکٹوپس کا ہاتھ ہوگا جو مر کر دوبارہ زندہ ہو گیا ہے؟“

”اور بھی بہت کچھ ممکن ہے۔“ اس بار اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس موضوع پر رات تمہارے ڈرائنگ روم میں بات ہوگی۔ تم فکر مت کرو جو آرڈر کہیں اوپر سے آئے ہیں وہ میری ایک فون کال پر کسی کی وساطت سے فوری منسوخ بھی ہو سکتے تھے لیکن فی الحال میں نئے آئی جی کے آرڈر کی تکمیل کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔“

”اس میں کیا مصلحت ہے؟“ سراج نے اسے وضاحتی نظروں سے دیکھا۔

”وہ تین روز اور ذہنی جتنا شک کر لو..... اس کے بعد جو بھی ہوگا سب کے سامنے آ جائے گا۔“

سراج جواب میں کسمسا کر رہ گیا۔ فائل دیکھنے کے بعد اس نے اورنگ زیب کے اصرار پر دستخط کرنے سے گریز نہیں کیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اورنگ زیب کے اچانک تبادلے نے اسے اندر سے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

”اب ایک سلسلے میں وقتی طور پر رسا ہی سہی لیکن مجھے تمہاری آفیشل اجازت بھی درکار ہے۔“ اورنگ زیب نے سراج کی دلی کیفیت محسوس کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔

”جو فائل تم نے فراہم کی تھی اس میں اپنے ساتھ لے جانے پسند کروں گا تاکہ کل تک اس کا تفصیلی مطالعہ بھی کر لوں۔“

”کیا آپ کو اجازت کی ضرورت ہے.....؟“ سراج کی آواز ابھرتے مگلی تو اورنگ زیب نے اسے بڑی اپنائیت سے ڈانٹا۔ ”حفاظت نہیں میں واپسی کے آرڈر کرانے میں تین روز سے زیادہ نہیں لوں گا۔ ایس پی کے عہدے سے زیادہ مجھے ان مجرموں کی فکر ہے جو اندر ہی اندر اپنی سازشیں جاری رکھنے کی خاطر گھٹیا چال چل رہے ہیں۔ میں ان کے سامنے آخری سانس تک گھسنے نہیں ٹیکوں گا۔“

کچھ دفتری امور کی ضروری باتیں سمجھانے کے بعد اورنگ زیب چارج رپورٹ کی کاپیاں لینے کے بعد سراج کے ساتھ ہی باہر نکلا..... اس نے سراج کو بھی منع کر دیا تھا کہ دفتری اسٹاف سے فوری طور پر اس تبادلے کے بارے میں گفتگو نہ کرے۔

”او کے سراج۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”الماس سے کہنا رات کے کھانے پر اپنی پسند کی کوئی سوئٹ ڈش ضرور تیار کر لے کھانے کے بعد تم سے تفصیلی باتیں ہوں گی۔“

اورنگ زیب کی کار پھانک سے گزر جانے کے بعد بھی سراج دو چار منٹ اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر دوبارہ کمرے میں آگیا لیکن..... اس نے عارضی طور پر بھی اورنگ زیب کی خالی کرسی پر بیٹھنا گوارہ نہیں کیا۔



کے سوار ہیں، جیسے تو بھی ساتھ ساتھ اور اگر ڈوبنے لگے تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم اس سوال کو اب تک کئی انداز میں دہرا چکے ہو افضل۔“ شبیم نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ ”کچھ دنوں اور انتظار کر لو صرف دو چار دن اس کے بعد جب تم کہو گے میں تم سے کورٹ میرج کر لوں گی۔“

”دو چار دن میں کیا ہو جائے گا.....؟“

”میں اپنے آپ کو سیٹھنے کی کوشش کر دوں گی۔ مگر رے ہوئے نشیب و فراز نے ذہن کو الجھا دیا ہے۔“

جواب میں افضل خان نے شبیم کو شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کر لیا اس کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں کل بھی تمہارا تھا..... آج بھی تمہارا ہوں اور کل بھی تمہارا ہی رہوں گا۔“

”لیکن یہ نہیں بتاؤں گا کہ اس وقت کہا جا رہا ہوں۔“ شبیم نے اس بار ایسے خوب صورت انداز میں اپنا سوال کیا کہ افضل خان اس سے بے اختیار لپٹ گیا پھر فوراً سنبھل کر بولا۔

”تم نے دشمن کا نام بھی سنا ہے.....؟“

”ہاں..... تم نے لوچن کے معاملے میں اس کا بھی ذکر کیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ وہ اور لوچن ملٹری انٹیلی جنس کے پہرے میں کسی ہوٹل میں مقیم ہیں۔“

”اپنی معلومات میں ایک بات کا اضافہ اور کر لو.....“ افضل خان نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

”دشمن جب اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد بارڈر کر اس کر کے یہاں آیا تھا تو کسی نہ کسی طرح بلیک ٹائیگر کے ذریعہ اس کی رسائی بگ باس تک ہو گئی تھی پھر..... بلیک ٹائیگر کی موت کے بعد بگ باس اس کو خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتا رہا..... بعد میں لوچن اور دشمن کی ملاقات کسی وجہ سے اورنگ زیب کی وساطت سے ہوئی۔ دونوں ایک ساتھ ہی جیل سے فرار بھی ہوئے تھے۔ دشمن آج بھی انٹرپول کو مطلوب ہے۔ لیکن میک اپ کی مہارت اور اپنی صلاحیت کی بنا پر ابھی تک بچتا رہا۔ ایس پی اورنگ زیب کے اشارے پر ان دونوں کو اس وقت فرار کا موقع فراہم کیا گیا جب ملٹری کا ایک ٹرک انہیں اپنے ہیڈ کوارٹر لے جا رہا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ دشمن کو ایک زینہ بنا کر بگ باس کو جکڑا جاسکے۔ لیکن کل رات دشمن تمام پہرے داروں کو ڈانچ دے کر نکل گیا۔ نگرانی کرنے والوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ دشمن پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی سے بھی چھلانگ لگا کر نکل جائے گا..... صبح سے مختلف ایجنسی کے افراد کو ناکوتا جھانک رہے ہیں۔“

”پھر..... تم بھی کیا کر لو گے؟“ شبیم نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”تم ماسٹر مجید اور جبرو کو کیوں بھول رہی ہو۔“ افضل خان نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر

افضل خان واش روم سے باہر نکلا تو شبیم اسے دیکھ کر چوکی۔ وہ اس وقت افضل خان کے بجائے کوئی لالہ بالی اینگوائڈین لگ رہا تھا، شبیم اٹھ کر تیزی سے اس کے قریب چلی گئی۔

”تم..... اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“ افضل خان نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“

”میری بات سمجھنے دل سے سنو۔“ وہ شبیم کو لے کر صوفے پر آ گیا۔ ”بگ باس کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہمارے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی کی خاطر اب یہ زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ایس پی اورنگ زیب اور مسٹر سراج کا ساتھ دیں۔ مر گئے تو شہید..... زندہ رہے تو غازی۔“

”میں سمجھ رہی ہوں کہ اس وقت ہم نہایت نازک پوزیشن سے گزر رہے ہیں، لیکن اس وقت تم اس طے میں کہاں جا رہے ہو؟“ شبیم نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس سوال کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ ہم دونوں ہی کبھی بگ باس کی بساط کے اہم ترین مہرے رہ چکے ہیں اس کے آدی ہماری نقل و حرکت سے بے خبر بھی نہیں ہوں گے۔“

”میں تمہارے خیال سے صد فیصد متفق ہوں، لیکن تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ مسٹر سراج نے اگر ہمیں یہاں رکھا ہے تو اس کے کچھ سادہ لباس والے بھی ہماری طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔“

”جانتی ہوں لیکن تمہاریا کے ساتھ جو صورت حال پیش آ چکی ہے اس میں میڈم رو بی جیسی محتاط خاتون کا تمام اختیار کا حصار ٹوٹ کر بکھر گیا تھا.....“ شبیم نے ہونٹ چباتے ہوئے مدہم آواز میں کہا۔ ”ہم دونوں کے غم مشترک ہیں اس لیے تمہاریا والی بات کا ذکر بھی اس نے میرے علاوہ صرف الماس سے کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ الماس نے مسٹر سراج سے بھی اس خبر کو پوشیدہ رکھا ہو۔“

”پھر الماس کو بھی درمیان میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میڈم نے براہ راست ایس پی اورنگ زیب کو فون کرنا کسی وجہ سے مناسب نہیں سمجھا تھا۔“ شبیم نے جملہ مکمل کر کے پھر اپنا سوال دوہرایا۔ ”کیا تم بھی کسی خاص وجہ سے نہیں بتانا چاہتے کہ اس وقت.....“

”ایسا دوبارہ کبھی نہ سوچنا۔“ افضل خان نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اب ہم ایک ہی کشتی

کہا۔ ”مجھے بھی کسی ذریعے سے بھنک ملی ہے کہ دشمن اس وقت کہاں اور کس پھیس میں بیٹھا سکون کے سانس لے رہا ہے۔“

”اوہ.....“ شبنم چونکی۔ ”کیا تم نے ایس بی اورنگ زیب کو اطلاع کر دی ہے؟“

”ابھی نہیں.....“ اس بار افضل خان میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”دشمن کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کے بعد میں بھی ایجنسی والوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلانا پسند کروں گا۔ شاید اس طرح ہمیں زیادہ آسانیاں بھی مل جائیں۔“

”اس میں خطرہ بھی زیادہ ہے۔“

”فکر مت کرو میں نے بھی اسی دشت کی سیاحت کی ہے..... کام آگیا تو گناہوں کا کفارہ بھی ادا ہو جائے گا۔“

”میں تمہیں روکوں گی نہیں لیکن..... ایک درخواست ضرور کروں گی۔“ شبنم نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”دشمن سے منٹ لو تو جبر و کبھی معاف نہ کرنا.....“

”تم نہ بھی کہتیں تو بھی جبر و میری فہرست پر پہلے نمبر پر ہی رہتا..... اسلم ڈنکا کی قسمت اچھی تھی جو وہ اسپتال ہی میں زخموں کو تاب نہ لا کر چل بسا لیکن جبر..... میں اسے سکا سکا کر بڑی اذیت ناک موت ماروں گا۔“ افضل خان اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد رکائیں تیزی سے اٹھا پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔



ہیڈ کوارٹر میں ڈیوٹی رپورٹ کرتے وقت اورنگ زیب پھر آئی جی کے سامنے موجود تھا اس نے چارج رپورٹ کی ایک کاپی آئی جی کے سامنے رکھ دی جس کے اوپر ایک تحریری چٹ بھی موجود تھی۔

”وقت پر ہمیشہ وہی کام آتے ہیں جن پر انسان اعتماد کرے۔ میں ہر حال میں آپ کی خاطر کوئی بھی خطرہ مول لے سکتا ہوں۔ جب چاہے آزما کر دیکھ لیں۔“

آئی جی نے چٹ پڑھنے کے بعد اسے گولی بنا کر جیب میں ڈال لیا تو اورنگ زیب نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ کے آرڈر کی تعمیل میں آج ہی رپورٹ کر رہا ہوں لیکن ہو سکتا ہے کہ میں یہاں زیادہ وقت نہ دے سکوں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ آئی جی کا لہجہ بھی روکھا تھا۔

”یہاں کام کرنے کی صورت میں میں یہ جاننا چاہوں گا سر..... کہ میرے خلاف کس نے اور کس قسم کی رپورٹ کی ہے؟“

”ضروری نہیں کہ ہر کیس میں چارج شیٹ ایٹھ کی جائے۔“ آئی جی نے تیزی سے جواب دیا۔ ”آپ کے خلاف جو رپورٹیں ہیں ان کی انکوائری میں ذاتی طور پر بھی کر سکتا ہوں۔“

”ایز یوش سر.....“ اورنگ زیب نے یہ دستور سرد انداز میں کہا..... ”میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ ہر پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے۔“

”تم.....“ آئی جی قدرے اونچی آواز میں بولا۔

”مجھے چیخ کر رہے ہو؟“

”جی نہیں.....“ جواب میں اورنگ زیب کی آواز بھی تیز ہو گئی۔ ”میں نے ڈپلن کی خلاف ورزی کبھی نہیں کی مگر دوسروں کی طرح مجھے بھی اپنی عزت عزیز ہے۔ آپ نے جس انداز میں میرا تہادہ کیا وہ آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ میں اب اسے جاننے کی کوشش بھی نہیں کروں گا لیکن جو ذمے داریاں مجھے سونپی جا چکی ہیں ان کو پورا کرنے سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”میں شیخ حامد کی بات کر رہا ہوں..... جس کو میں اپنی زبان میں آکٹوپس کہتا ہوں۔“

”میں اسے مداخلت بے جا سمجھوں گا۔“ آئی جی نے درشت لہجے میں کہا۔ ”آپ جو کرسی چھوڑ چکے ہیں اب اس سے متعلق کسی فائل کو ہاتھ لگانا بھی آپ کے اختیار میں باقی نہیں رہا۔“

”یو آر رائٹ سر۔“ اورنگ زیب نے طنزیہ آواز میں کہا۔ ”اسی لیے میں بھی اسی سیٹ پر واپس جانے کی کوشش کروں گا۔“

”او کے گیٹ لاسٹ.....“ آئی جی نے غصے سے کہا پھر مسکرانے لگا۔ اورنگ زیب نے اسے سلام کیا۔ چہرے پر سنجیدگی طاری کیے باہر آ گیا۔



فائیو اسٹار ہوٹل کے رجسٹر میں ضروری کوائف درج کراتے وقت اس غیر ملکی سیاح نے اپنا انٹرنیشنل پاسپورٹ کاؤنٹر کلرک کے سامنے رکھ دیا تھا جس پر اس کی تصویر بھی چسپاں تھی۔ اس کا نام ہنری براؤن تھا، تعلق نارٹھ امریکا سے تھا وہ سیاحی کی غرض سے آیا تھا۔

ضروری کارروائی کے بعد ہوٹل کے پورٹرنے اس کو لفٹ کے ذریعے دوسرے فلور کے روم نمبر دوسو اکیس تک پہنچا دیا تھا بعد میں اس کا مختصر سامان رکھ کر جانے لگا تو ہنری براؤن نے اسے ڈالر کی شکل میں انعام بھی دیا..... پورٹرنے کے جانے کے بعد اس نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا جو ہر اعتبار سے آرام دہ تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے روم سروس کو کال کر کے اپنے لیے کلب سینڈویچ اور بلیک کافی کا آرڈر دیا پھر ایک صوفے پر بیٹھ کر اس نے ٹی وی کا سوچ آن کر کے اینیل پلینٹ کا جیمیل لگا لیا تھا۔

روم سروس کو آرڈر دینے کے بیس منٹ بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ ہنری نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک خوب صورت ہوشیئر ٹرے لیے اس کے سامنے موجود تھی۔ ہنری ایک طرف ہو گیا۔ ہوشیئر نے ٹرے درمیانی میز پر رکھی پھر اس نے بڑے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے ہنری سے کہا۔

”آپ کو اپنے لیے جس چیز کی ضرورت ہو آپ روم سروس کو آرڈر کر دیں، ہم آپ کی مطلوبہ فرمائش پوری کرنے میں خوشی محسوس کریں گے۔ یہ ہماری ڈیوٹی میں شامل ہے۔“

”اگر میں تم سے کچھ دیر کہنی دینے کو کہوں تو.....؟“ ہنری نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”سوری سر.....“ ہوٹسٹیس نے بہ دستور مسکرا کر نفی میں جواب دیا۔ ”اس ہوٹل میں یہ کام نہیں ہوتا.....“

”بھری ہوئی سگریٹ؟ جو عام طور پر سیاحوں کو مرعوب ہوتی ہے.....“ اس بار ہنری نے مدہم آواز میں کہا۔

”میں اب اجازت چاہوں گی سر۔“ ہوٹسٹیس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی پھر اٹلے قدموں کمرے سے نکل گئی۔

ہنری نے اس کے جاتے وقت ہلکی سی سیٹی بجائی پھر وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنے دیے ہوئے آرڈر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس کی نظریں اب ٹی وی اسکرین پر تھیں جہاں ایک چیتا گھاس کے درمیان آہستہ آہستہ حرکت کرتا اس ہون کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا جو سستانے کی غرض سے ایک درخت کے تنے کے قریب بیٹھا تھا چیتے کی حرکت جاری تھی جب ہرن چونکا۔ کسی خطرے کو محسوس کر کے تیزی سے اٹھا پھر چیتے کی حرکت جاری تھی جب ہرن چونکا۔ کسی خطرے کو محسوس کر کے تیزی سے اٹھا پھر چیتے کو دیکھتے ہی حسب عادت موت سے فرار حاصل کرنے کی خاطر تیز تیز دوڑنے کے درمیان لمبی لمبی قلائفیں بھرنے لگا۔ دونوں کا ایکشن جاری تھا جب ہنری نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر پڑجوش انداز میں کہا۔ ”کم آن..... گٹ دی ڈیئر۔“ وہ بار بار اسی جملے کو دہرا رہا تھا جب چیتے نے بالآخر ایک لمبی جست لگا کر ہرن کو دبوچ لیا جس کے زخروے کو منہ میں دبائے رہا ہرن کچھ دیر موت اور زندگی کی کشمکش سے دو چار رہا پھر اس کا بدن ساکت ہو گیا۔ دو چار منٹ اپنا سانس درست کرنے کے بعد چیتا بڑی بے دردی سے اس کا مردہ جسم بھینچوڑ رہا تھا۔

”لیس ڈس شڈ بی دی ریل ایک (حملہ اسی انداز میں ہوتا چاہیے)“ ہنری نے ایک قہقہہ لگا کر کہا اس کے بعد اس نے چیمبل بدل دیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے ٹرے ایک طرف رکھی۔ ٹی وی بند کیا پھر بستر پر آگیا اب وہ نیچے پشت پر رکھ کر اس پر ٹیک لگائے اپنے خیالوں میں کہیں کم تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ ہنری چونکا۔ ”روم سروس کی خوب صورت میزبان کو اتنی جلدی نہیں آتا چاہیے تھا۔“ اس نے سوچا پھر وہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتا دروازے تک آگیا دروازہ پورا نہ کھل سکے اس لیے اس نے جھٹیل کی مضبوط سیٹھی چین کو دروازے کے ساتھ لگایا پھر چوکھٹ اور پڑے کے درمیان پیدا ہونے والے تین چار انچ کے خلا سے اس نے باہر کھڑے ہوئے اینگلو انڈین کو سر تا پا دیکھ کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”دشمن نہیں ہوں ورنہ..... اتنی جگہ ہوتے ہی کسی سائلنسر لگے ہتھول سے تمہارا جسم چھلنی کر دیتا۔“

”تم شاید غلط روم پر آگئے ہو دوست.....“ ہنری نے مہذب انداز میں کہا۔ ”میں تمہیں نہیں جانتا۔“

”میں..... باس کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“ اس بار اینگلو انڈین نے دہلی زبان میں جواب دیا۔ ”اے خوشی ہے کہ تم نے اپنی موجودہ حیثیت میں ایک اچھے ہوٹل کا انتخاب کیا ہے۔“

ہنری ایک لمحے کو خاموش رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت بے جگری سے اپنا جرمن ساختہ اعشاریہ دو پانچ کا ہتھول رومال سمیت جیب سے نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ اینگلو انڈین نے ایک نظر کمرے کے اندرونی حصے پر ڈالی پھر وہ آگے بڑھ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد ہنری بھی اس کے سیدھے ہاتھ پر آگیا رومال کے ساتھ ہی اس نے ہتھول بھی اپنے کولہے سے لگا کر رکھ لیا تاکہ بروقت بہ آسانی استعمال کر سکے۔

”میرا خیال ہے کہ اب ہم اپنی اپنی زبان میں بات کریں۔“ اینگلو انڈین نے مسکرا کر کہا۔ ”انگریزی بولتے وقت مجھے ہمیشہ ایسا ہی لگتا ہے جیسے کسی نے ہماری آزادی ہم سے چھین لی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تمہارا نام کیا ہے.....؟“ ہنری نے روانی سے دہلی زبان میں سوال کیا۔

”باس تم سے بہت خوش ہے مائی ڈیئر لیکن..... اس کے خیال میں تم نے ایک اور سنہری موقع ہاتھ سے ضائع کر دیا۔“

”اوہ.....“ ہنری نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں اسے غلطی نہیں بلکہ دانش مندی سمجھتا ہوں۔ باس نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں پہلی فرصت میں اس چینی کی چھٹی کروں..... اس وقت بھی میں نے باس کی بات سے اتفاق نہیں کیا تھا..... بہر حال تم اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔“

”اتنی جلدی کیا ہے تمہیں.....“

”جب تک مکمل تعارف نہ ہو جائے میں کسی پر بھروسہ بھی نہیں کرتا اور..... تم اس وقت میک اپ میں ہو اس لیے میں یہی کہوں گا کہ میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

اینگلو انڈین نے جواب میں ہنری کو سنجیدگی سے دیکھا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”کنول نے زہر کھانے سے بعد میڈیا والوں کے پاس جا کر جو حماقت کی اس نے باس کو بہت زیادہ محتاط کر دیا ہے ورنہ شاید اس وقت وہ تمہارے پاس خود ہی آتا.....“

”اسی احتیاط کے پیش نظر میں نے کسی کو کرپان سے چھلنی کر کے اوپر پہنچا دیا تھا اس کا غم مجھے آج بھی ہے مگر اب اس کے علاوہ کوئی میری کھوج میں نہیں رہتا.....“ ہنری نے اپنا جملہ مکمل کر کے پھر اینگلو انڈین کو تیز نظروں سے دیکھا۔ ”ویسے میرا خیال ہے کہ تم باس کو زیادہ نہیں جانتے..... وہ خود سے کسی کے پاس چل کر کبھی نہیں جاتا.....“

”تم نے بھی لیاقت حسین کا نام سنا ہے؟“ اینگلو انڈین جو افضل خان کے سوا کوئی اور نہیں تھا اپنی دہلی گھڑی پر ایک بار نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”وہ کئی بار اس کا راستہ کاٹ چکا ہے۔“

”پھر.....؟“ ہنری نے بھی جو شنو کا نیا روپ تھا مختصر سوال کیا۔

”باس چاہتا ہے کہ لیاقت حسین کا پتا کچھ دنوں کے لیے صاف ہو جائے تو مناسب وہ ہے گا۔“

”اس سے کیا خطرہ ہے؟“ ہنری نے منہ بنا کر دریافت کیا۔

”کچھ نا دیدہ قوتیں اس پر مہربان ہیں جو وہ خطرے کی بو بھانپ لیتا ہے۔“

”مگر تمہیں میرا نام معلوم ہے تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ ہماری ماتحتا لوجی میں سب سے اونچا

استحان بھی وشنو دیوتا کو حاصل ہے۔ کیا تمہارے ہاں بھی لیاقت حسین کا کوئی نام.....“

”کام کی بات کرو.....“ اینگلو انڈین نے اس بار اپنی اہمیت جتانے کی خاطر کہا پھر دوبارہ دہی

گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ”باس نے جو کہا تھا وہ کام میں نے تمہارے

کان میں ڈال دیا۔“

”وقت کی کیا کمی ہے تمہارے پاس جو تم بار بار گھڑی دیکھ رہے ہو؟“ وشنو نے جملہ مکمل کرنے

کے ساتھ ہی نہایت سرعت سے پستول اٹھا کر برابر بیٹھے ہوئے اینگلو انڈین پر تان لیا۔ خونخوار انداز

میں پھنکار کر بولا۔ ”دو منٹ میں سب کچھ اگل دو ورنہ میرے نکل جانے کے بعد پھر روم سروس کو

تمہاری لاش اٹھانے کے ساتھ ساتھ پورے کمرے کی صفائی بھی کرنی پڑے گی۔“

”میں افضل خان ہوں.....“

ادھ.....“ وشنو زہر خند لہجے میں بولا۔ ”افضل خان..... لیکن میری اطلاع کے مطابق باس نے

تمہیں کسی ناکارہ پرزے کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔ اب تم کس مقصد سے آئے ہو.....؟“

”ناکارہ ہونے کے باوجود میں نے تمہیں ملٹری انٹیلی جنس یا پولیس فورس سے پہلے تلاش

کر لیا۔“ افضل خان نے بے ہنگامی سے جواب دیا۔ ”کیا تم بھی اس بات کا اعتراف نہیں کرو گے کہ

ابھی تک انٹروپول والے بھی تمہاری تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔“

”گڈ..... تمہاری معلومات انتہائی خطرناک حد تک درست ہیں۔“ وشنو کی انگلی ٹریگر تک ریٹنگ

گئی۔ ”میں تمہاری تعریف ضرور کروں گا لیکن اب تمہیں مارنا بھی میری ترجیحات میں پہلا نمبر اختیار کر

گیا ہے۔“

”یہ شوق بھی پورا کر لو لیکن..... اب تم یہاں سے فرار نہیں ہو سکو گے۔“

کمرے میں ہلکی سی ”کھک“ کی آواز ابھری لیکن..... یہ آواز وشنو کے پستول کے ٹریگر کی نہیں

تھی وشنو نے بھی تیزی سے گردن گھما کر دو دروازے کی طرف دیکھا۔ جو تین مسلح افراد برق رفتاری سے

اندر داخل ہوئے وہ وشنو کے لیے ملٹری انٹیلی جنس کے دیکھے بھالے چہرے تھے۔ انہوں نے یقیناً

ہوٹل مینجمنٹ سے کمرے کی ڈپٹی کیٹ چابی حاصل کی تھی ورنہ وشنو نے افضل خان کے اندر آنے کے

بعد اندر سے گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر مسکرا کر اپنا پنول فرنی قالین پر اچھال کر بڑی دیدہ دلیری سے

افضل خان سے بولا۔

”تم ذہین ہی نہیں..... چالاک اور دو اندیش بھی ہو میری جان لیکن..... وشنو کو دھوکا دے کر تم

نے اچھا نہیں کیا۔“

”تمہاری طرح میں بھی دشمن کو لٹا کر مارنے کا عادی ہوں وشنو مہاراج..... ورنہ کمرے میں

داخل ہوتے ہی تمہیں ختم کر سکتا تھا۔“ افضل خان نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تم بھی کسی اگلی ملاقات کے وقت میری اس کرپا (مہربانی) کو بھول نہ جانا۔“

جواب میں وشنو کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ کھیلنے لگی پھر اس نے خود کو ملٹری انٹیلی

جنس والوں کے حوالے کرنے میں کسی حیل و حجت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔



اورنگ زیب ٹھیک آٹھ بجے سراج کے گھر پہنچا تو الماس نے بتایا کہ وہ ابھی تک واپس نہیں

آیا تھا۔

”ایسا کیا کام پیش آگیا.....؟“

”انہیں آپ کے سینٹ چھوڑنے کا غم بھی لاحق ہے۔“

الماس نے کہا۔ ”ہونا بھی چاہئے آپ نے جو پیار ہمیں دیا ہے وہ پہلے کبھی کسی پولیس آفیسر

سے نہیں ملا۔“

”جبتی دیر میں تم نے یہ جملہ کہہ کر وقت ضائع کیا اتنی دیر میں ایک گلاس ٹھنڈا پانی بھی لاسکتی

تھیں۔“

اورنگ زیب نے اس کی رسمی باتوں سے بچنے کی خاطر کہا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ سراج کے دل

میں اس کی کس قدر عزت و احترام ہے۔ خود اورنگ زیب بھی ان دونوں سے بہت جلد مانوس ہو گیا

تھا۔ پھر جبتی دیر میں الماس پانی لاتی سراج بھی آگیا۔ اس وقت وہ سادہ لباس ہی میں تھا اس لیے

سیدھا اورنگ زیب کے قریب آگیا۔ ”کیا ڈیل ڈیوٹی سے ایک دن میں ہی.....“

”جی نہیں.....“ سراج نے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔

”آپ کے جانے کے بعد میں بھی وہاں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں رکا تھا۔“

”پھر اتنی دیر کہاں ہو گئی.....؟“

”ڈی آئی جی نے اپنی دم میں باندھ رکھا تھا۔ وہ آپ کے تباہی کے لڑکے کو ایک منہ سمجھ رہا ہے۔ جن

دوسرے افسروں کو بھونک ملی ہے وہ بھی چہ گوئیاں کر رہے ہیں۔ دیر سے آنے کی ایک اہم وجہ اور بھی

ہے جس نے مجھے الجھا دیا ہے۔“ سراج نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں بھی کل کسی

پرائیوٹ ڈاکٹر کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کر کے چار روز کی چھٹی.....“

”ایسی حماقت بھول کر بھی مت کرنا۔“ اورنگ زیب نے اسے محبت سے سمجھایا۔ ”میں دوسروں

کو ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔“

”میں بھی آئی جی کی باتوں پر خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو گیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ اورنگ زیب آئی جی کا نام سن کر چونکا۔ ”کیا اس نے تمہیں بلایا تھا؟“

”جی ہاں..... صرف یہ ہدایت دینے کی خاطر کہ فی الوقت جو بھی چارج میرے پاس ہے اس کی کسی فائل کو آپ کے حوالے نہ کروں..... اور ہاتھ بھی لگانے کی اجازت نہ دوں۔“

”گڈ.....“ اورنگ زیب نے خوشی کا اظہار کیا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئی جی اب حالات کے پیش نظر دوراندیشی سے کام لے رہا ہے۔“

”اس میں دوراندیشی کیا خاک ہے۔“ الماس نے درمیان میں اپنے جذبات کا اظہار بھی ضروری سمجھا۔

”اتنی جلدی کوئی پالتو جانور بھی منہ نہیں بھیرتا جتنا یہ نیا آئی جی.....“

”ون منٹ پلیز.....“ اورنگ زیب نے ہاتھ اٹھا کر دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”آئی جی نے جو بھی کیا ٹھیک ہی کیا ہے، موجودہ صورت حال میں سچویشن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ میں اور آئی جی دونوں ایک دوسرے سے ظاہری طور پر برسر پیکار رہیں۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“ سراج نے وضاحت چاہی۔ ”کیا جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب نوراشتی ہے؟“

”یہی سمجھ لو لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ اس کی بھبک بھی گھر سے باہر نہ جانے پائے۔“ اورنگ زیب نے دبی زبان میں کہا۔ ”تم دونوں جذباتی نہ ہوتے تو شاید اس وقت میں تم دونوں کو یہ بات نہ بتاتا۔“

”اچھا ہوا آپ نے یہ بات میرے کان میں ڈال دی ورنہ.....“

”خود کو میری طرح ٹھنڈا رکھو.....“ اورنگ زیب نے اس بار معنی خیز انداز میں الماس کی طرف دیکھتے ہوئے سراج سے کہا۔ ”بہت سی باتیں ایسی ہیں جو الماس نے مجھ پر اعتماد کر کے بتائی ہیں لیکن میں تمہیں ان باتوں سے بھی بے خبر رکھتا ہوں۔“

”یہ آپ دونوں کا ذاتی معاملہ ہے.....“ سراج نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آپ دونوں حضرات اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لیں۔ میں کھانا لگانے جا رہی ہوں۔“ الماس نے وہاں سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی اورنگ زیب نے جو جملہ اس کے متعلق کہا تھا وہ اسے سن کر صرف مسکرا دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تھریسا کے اغوا اور واپسی کی جو بات اس نے اورنگ زیب کو اعتماد میں لے کر بتائی تھی اس کا ذکر بھی اس نے سراج سے نہیں کیا ہوگا۔ خود میڈم روبی نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کا ذکر اورنگ زیب کے سوا اور کسی سے نہ کیا جائے۔

کھانے کے دوران زیادہ تر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں الماس نے میٹھے میں اورنگ زیب کی پسند کی ڈش خوبانی کا میٹھا تیار کیا تھا۔ سراج نے اسے کھانا شروع ہونے سے پیشتر ہی اٹھا کر اورنگ زیب کے سیدھے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ کھانے کے بعد جتنی دیر میں الماس کافی تیار کرنے گئی اورنگ زیب لاؤنج میں بیٹھا سراج کو دبی زبان میں حالات کی اونچ نیچ سمجھانے کے ساتھ کچھ ضروری ہدایات دیتا رہا پھر کافی ختم کرنے کے بعد وہ اس شاپنگ بیگ کو لے کر اپنی

خواب گاہ میں چلا گیا جس میں سکندر علی شاہ کی فائل موجود تھی۔ کراہند کرنے کے بعد اس نے ایک سرسری نظر پوری فائل پر ڈالی پھر دو بادی لفاظ فائل سے الگ کر لیا جس پر ”مائی فائنڈنگس“ (my findings) کے ساتھ سب انسپٹر رانا حمید کا نام درج تھا۔ یہ رپورٹ تقریباً ساڑھے تین صفحے پر مشتمل تھی جس کی پہلی ہی لائن نے اورنگ زیب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ پوری توجہ سے رپورٹ پڑھنے لگا۔ سب انسپٹر رانا حمید نے لکھا تھا۔

”جس روز سکندر علی شاہ کی فائل ایس پی اینٹی کرپشن نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر میرے حوالے کی میں نے اسی دن سمجھ لیا تھا کہ اب میری بد قسمتی کے دن زیادہ دور نہیں ہیں۔ میری کیفیت فائل لیتے وقت اس بچے سے مختلف نہیں تھی جس کی عمر آٹھ نو سالہ رہی ہو..... جو کسی پارک میں بیٹھا ماحول سے خوش ہو رہا ہو پھر جب کپڑے جھاڑ کر اٹھے تو اپنی پشت پر کسی خوفناک قندار ایسے رچھو کو دیکھ لے جو دو ٹانگوں پر سیدھا کھڑا اس بچے کو دبوچ لینے کے لیے تیار ہو۔“

”جب فائل مجھے ملی اس وقت اس کا نام صرف سکندر علی تھا۔ شاہ کا اضافہ اس نے دنیا کی نظروں میں دھول جمونے کی خاطر بعد میں کیا تھا۔ اس کا تعلق ایک درمیانہ درجے سے تھا، اس کا باپ بچوں کے ریڈی میڈ کپڑوں کا کاروبار کرتا تھا۔ بعد میں کسی کی مہربانی سے وہ انہیں ایک قریبی ملک کو بھی ایکسپورٹ کرنے لگا۔ اس کا نام دلدار علی تھا جو ایمانداری سے کام کرتا تھا۔ نیک آدمی تھا اس لیے قدرت نے اسے برائی میں پڑنے سے پیشتر ہی اوپر بلا لیا۔“

”باپ کی وفات کے بعد سکندر علی نے اس کاروبار کو سنبھالنے کو کوشش کی لیکن وہ شروع سے جس رنگ ڈھنگ کا عادی تھا اس کی وجہ سے اس میں سمجھ بوجھ کا فقدان بھی شامل تھا، ایک دو ماہ تک وہ گھائے کا سودا کرتا رہا پھر کسی نے ترس کھا کر یا اپنی کسی ضرورت کے پیش نظر اسے ہر طرح سے اتنا سپورٹ کیا کہ وہ جو درمیانہ درجے کے ایک مکان میں رہتا تھا، پوش علاقے کے پچھلے تک پہنچ گیا۔“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ خود سکندر علی بھی اس کی اصلی شخصیت تک رسائی حاصل نہیں کر سکا جس کے آدمی اسے سپورٹ کر رہے تھے۔ بہر حال وہ تیزی سے کاروبار میں ہونے والی ترقی اور پھیلاؤ کے سبب کروڑ پتی کے بعد ارب پتی بن گیا، اس کی فحش زندگی کی مصروفیات جو اخلاق سے گری ہوئی تھیں، دولت کی فراوانی کے ساتھ بڑھتی گئیں۔ بدنامی سے بچنے کی خاطر اس نے شہر کے مضافاتی علاقے میں بہت بڑی زمین خرید کر وہاں اپنا فارم ہاؤس کے اندر دو ریٹ ہاؤس تھے، ایک سکندر علی کے لیے مخصوص تھا دوسرا..... ان اٹھ دس سو روپے رکھنے والے افراد اور سرکاری افسروں کے لیے تھا جو سکندر علی کی پشت پناہی کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ فارم ہاؤس میں ایک داخلی راستہ تھا جہاں سکندر علی کے خاص اعتماد کے نمک حلال ملازم پہرا دیتے تھے۔ بعد میں اندرونی ریٹ ہاؤس اور داخلی دروازے پر پہرا دینے والوں کا انچارج اس گونگے کو بنادیا گیا جو صرف سن سکتا تھا لیکن قوت گویائی سے یکسر محروم تھا۔“

”گوگے کی بھی ایک الگ کہانی ہے۔ فارم ہاؤس کا انچارج بنائے جانے سے قبل وہ سکندر علی

کے ڈرائیور کی حیثیت میں خدمات انجام دیتا رہا تھا، سکندر علی کے بیان کے مطابق وہ گونگا اس کے کسی عزیز کا لاوارث تھا جس کی پرورش سکندر علی نے ترس کھا کر کی تھی..... جو کس فائل میرے حوالے کی گئی وہ سکندر علی کے ایک ملازم کی نو بیاہتا بیوی سے متعلق تھی جسے پہلی ہی رات مردہ حالت میں اس کے کوارٹر سے پایا گیا۔ سکندر علی نے پولیس پر یہی شبہ ظاہر کیا تھا کہ اس کی موت میں ملازم کا ہاتھ تھا۔ اس بیان کی وجہ بتاتے ہوئے سکندر علی نے کہا تھا کہ ملازم نے ایک موقع پر اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس شادی کو روکا دے اس لیے کہ وہ کسی اور لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ سکندر علی نے ملازم کو جھڑک کر ٹال کر دیا۔ یہ بیان ملازم (جسے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا) کے بیان سے قطعی مختلف تھا، قتل کے جرم میں گلے گلے پھنسنے کے بعد ملازم نے چچ پتچ کر پولیس کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اس کے خلاف کسی دھمن نے سازش کی ہے..... اس نے کہا تھا کہ سہاگ رات منانے سے قبل وہ کوشی کے کسی کام کو کھنسا رہا تھا جب دو آدمیوں نے اسے اچانک پیچھے سے نہ صرف دیوچ لیا بلکہ اس کے سر پر گلے تک کوئی سیاہ غلاف ڈال دیا جس کے سبب وہ کچھ نہیں دیکھ سکا، اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر زبان بند رکھنے کا حکم دیا گیا..... دو گھنٹے بعد اسے سیاہ غلاف سمیت اس کے کوارٹر میں دھکیل دیا جہاں اس کی نو بیاہتا دلہن مردہ حالت میں پڑی تھی۔ اس کا عروسی جوڑا مہکا مہکا نظر آ رہا تھا۔ ملازم نے شور مچایا تو اس کے ساتھ کام کرنے والوں نے اسے پکڑ کر سکندر علی کے روبرو پیش کیا جس نے پولیس کو طلب کر کے اپنے مندرجہ بالا بیان کے ساتھ ملازم کو پولیس کی تحویل میں دے دیا..... ملازم کا احتجاج تھا رخانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گیا۔ ملازم پر تین سو دو کی دفعہ عائد کی گئی اس لیے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بھی یہی درج تھا کہ مقتولہ کو گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔

”کیس عدالت کے روبرو کیا تو ملازم کے سرکاری وکیل نے بھی سکندر علی اور ایک بڑے بیرسٹر کے آگے زیادہ بولنے کی حماقت نہیں کی چنانچہ اندھے قانون نے ملازم کو وکیلوں کی بحث اور سکندر علی کے بیان کی روشنی میں مجرم قرار دے کر عمر قید کو سزا سنائی..... میری ذاتی تحقیقات کی روشنی میں مقتولہ اور ملازم دونوں مظلوم تھے جن کو ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت کسی نے ٹریپ کیا تھا..... کس نے؟..... میں یہ کھل کر نہیں کہہ سکتا۔

”جس روز میں پہلی بار سکندر علی کوشی پر تفتیش کے ارادے سے گیا اسی روز میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ خود میری حیثیت بھی اس تنکے سے مختلف نہیں تھی جو سمندر کے درمیان پھری ہوئی سرکش موجوں کی زد میں آ کر قطعی بے بس ہو جاتا ہے۔ مجھے خلاف توقع بڑی آسانی سے کوشی کے ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا گیا، شاید سرکاری وردی کا کرشمہ تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا لیکن زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ ڈرائنگ روم میں میرے بیٹھے کے بعد سکندر علی بھی آ گیا۔ میرا تجربہ گواہی دے رہا تھا کہ اس وقت بھی وہ نشے میں تھا اس نے مجھے حقارت بھری نظروں سے دیکھا پھر..... اس سے چوتھرے میں مقتولہ کے سلسلے میں سوال جواب کا آغاز کرتا ایک بہکی ہوئی نو خیز بھی ڈرائنگ روم میں آ کر سکندر علی کا پہلو گرمانے لگی یہ میری سرکاری وردی کے ساتھ سکندر علی کا پہلا حربہ

تھا..... میں نے خود کو سنبھال کر ایک تفتیشی آفیسر کی حیثیت میں ڈھالنے کو کوشش کی لیکن پہل سکندر علی نے کی۔

”کس لیے وقت برباد کرنے یہاں تک آ گئے.....؟“ یہ سکندر علی کی طرف سے گفتگو کا آغاز تھا جو اس نے پہلو میں بیٹھی ہوئی خوب صورت لڑکی کو خود سے قریب تر کرتے ہوئے کیا تھا۔

”میں آپ کے ملازم کی بیوی کے قتل کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنے کی غرض سے.....“

”میرے پاس بہت کم فالٹو وقت ہوتا ہے سب انہیں! اس نے خشک لہجے میں بھنویں سکڑ کر کہا۔ ”میں اپنا بیان پہلے ہی دے چکا ہوں، جب کیس عدالت کے روبرو جائے گا تو میرے وکیل عدالت سے بھی نمٹ لیں گے..... اور کچھ کہنا ہے تمہیں؟“

”میرے لیے کاغذات کی خانہ پڑی ضروری ہے جناب۔“ کبھی کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو وقت لے کر آ جانا، میں تمہیں دھمکاروں گا بھی نہیں۔“

پھر سکندر علی حینہ کو پہلو میں لیے لیے ڈرائنگ روم سے واپس چلا گیا۔ میں اپنا سامنہ بنا کر فائل سمیت باہر نکلا تو ایک منشی نے سامنے آ کر ایک لغافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے اپنی اہمیت کا بھی احساس دلایا۔

”اس میں مالک کی طرف سے کرائے کے ہزار روپے موجود ہیں..... پہلے وزٹ پر کسی باوردی آفیسر کی یہی فیس ادا کی جاتی ہے۔“

میرا دل چاہا کہ جواب میں منشی کے منہ پر نفرت سے تھوک دوں لیکن میں نے یہ غلطی نہیں کی۔ اپنی بزدلی کا مظاہرہ کر کے خاموشی سے لغافہ لیا اور کوشی سے باہر نکل کر سکون کا سانس لیا..... اس کے بعد مجھے ایس پی اینٹی کرپشن نے بھی اپنے دفتر بلا کر دہلی زبان میں ایک غیر متوقع مشورہ دیا تھا.....

”کاغذات کا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی ایسی ہی رپورٹ لکھنا جو حالات کی روشنی میں تم اپنے لیے بھی مناسب سمجھو.....“ میں نے حالات کا رخ بھانپ لینے کے بعد اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ سرکش موجوں کے ساتھ تیرنے کی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کروں۔ اس کے بعد میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ شام کے اخبارات کچھ دنوں تک سکندر علی کے کیس کی سرخیاں لگاتے رہے..... جب انہیں بھی فیس مل گئی تو وہ بھی خاموش ہو گئے۔ عدالتی فیصلہ آنے کے بعد مجھے یہ فائل داخل دفتر کرانے کے آرڈر بھی مل گئے، جس کی تکمیل کے ساتھ میں اپنی فائنڈنگس بھی علیحدہ سے لگا رہا ہوں۔ لیکن کیس بند ہو جانے کے بعد بھی میرے ذہن میں ایک انجانے خوف کا احساس ہر وقت کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ کسی دن اندھیرے میں سنسناتی ہوئی کوئی انجان گولی مجھے بھی ختم نہ کر دے۔“

”آخر میں یہ بھی لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ عدالت کا فیصلہ حق میں آ جانے کے بعد سکندر علی نے بزرگوں کے مزار پر پابندی سے حاضری دینی شروع کر دی تھی جس کی خبریں خاص طور سے اخبارات میں شائع ہوتی رہیں، سکندر علی نے خود کو ایک نئے خول میں روپوش کرنے کی خاطر اپنی نجی مصروفیات بھی فام ہاؤس تک محدود کر دیں۔ اپنے نام کے ساتھ ”شاہ“ کا اضافہ کر کے وہ سکندر علی

سے سکندر علی شاہ بن گیا دنیاوی دکھاوے کے لیے کچھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ گوئے کو بھی ڈرائیور کی ذمہ داریوں سے ہٹا کر فارم ہاؤس بھیج دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ ان پڑھ ہے۔ سب کچھ سن سکتا ہے دیکھ بھی سکتا ہے لیکن کچھ کہنے کی صلاحیتوں سے یکسر محروم تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ گوئے کے پیچھے بھی کوئی ایسی ہی ملتی جلتی کہانی ہوگی جیسی اس بد نصیب ملازم کی قسمت میں لکھ دی گئی جو مظلوم ہونے کے باوجود مجرم اور قاتل ثابت ہو گیا تھا۔۔۔۔۔

اورنگ زیب نے پوری توجہ سے سب انسپکٹر کی پرسنل فائنڈنگس کو پڑھا پھر اس نے دوسرے کا غذات کا مطالعہ شروع ہی کیا تھا کہ دروازے پر دستک سن کر فائل نکلیے کے نیچے رکھ کر اٹھنا پڑا۔ دروازے پر سراج موجود تھا۔ اس نے اپنا ایک موبائل اورنگ زیب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کرنل احتشام کی کال ہے۔“

”ہیلو کرنل.....“ اورنگ زیب نے موبائل لے کر کہا۔ ”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”کچھ اہم اور ضروری اطلاع دینی ہے۔“ کرنل نے اپنا جملہ جاری رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے افضل خان کی صلاحیتوں کے بارے میں جو خیال ظاہر کیا تھا..... وہ اس سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا ہے۔“

”کوئی خاص بات؟“

یس مائی ڈیر..... اس نے دشمن کو دوبارہ ہمارے حوالے کرنے کی خاطر جو جال بنا تھا میں اس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ اس کی طے شدہ ساری ٹائٹلس بھی ایک دم پرفیکٹ تھیں، تیس سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو شاید دشمن باسٹرڈ ایک کارآمد آدمی کو شوٹ کر چکا ہوتا۔۔۔۔۔ پھر کرنل نے ساری تفصیل دہراتے ہوئے کہا۔ ”ایک اطلاع اس سے زیادہ اہم ہے جو آپ کو بھی کچھ دیر میں مل جائے گی.....“

”وہ بھی بیان کر دیں.....“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ کا لگھوری اپارٹمنٹ اس وقت کسی کھنڈر کا نقشہ پیش کر رہا ہے وہاں سے آکٹوپس کا علامتی نشان بھی ملا ہے۔“

”اوہ.....“ اورنگ زیب چونکا۔ ”آپ وہاں تک کیسے پہنچ گئے؟“

”افضل خان کی کارکردگی سنانے کی خاطر میں نے پہلے آپ کو اپارٹمنٹ کے نمبروں پر ٹرائی کیا تھا۔ جب لائن زیادہ دیر تک مصروف ملی تو محض ایک شے کی بنا پر کچھ آدمی ادھر بھیج دیئے۔ ان کی رپورٹس کے مطابق جو سادہ لباس والے وہاں نگرانی پر تعینات تھے وہ بھی مدھوشی کی حالت میں پائے گئے ہیں۔“

”یہ خبر میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے۔“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے سرد لہجے میں

جواب دیا۔

”مجھے آپ سے ایک ذاتی شکایت ہے۔“ کرنل نے شکوہ کیا۔ ”ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کرنے سے پیشتر اگر آپ نے صرف ایک کال کر دی ہوتی تو آئی جی کے فورفارڈرس..... تک بھی کوئی ایسا قدم اٹھانے کی جرات نہ کرتے..... اب بھی دیر نہیں ہوئی، میری ذاتی کوشش یہی ہوگی کہ کل شام تک آپ کو دوبارہ اپنی سیٹ پر منتقل کر دیا جائے۔“

”ابھی مناسب نہیں ہوگا کرنل.....“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے جان بوجھ کر اس کے آرڈر کی تکمیل ضروری سمجھی تھی۔“

”اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے.....؟“

”یہ میں آپ کو تفصیل سے بتانا چاہوں گا۔“

”اوکے آپ کل شام کی چائے میرے ساتھ پیئیں۔“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

سراج کے ذریعے اپارٹمنٹ کی تباہی کی خبر الماس کو ملی تو وہ بھی آگئی بڑی دیر تک پھر ان کے درمیان گفتگو کا ایک ہی موضوع رہا..... ”آکٹوپس.....“

دوسری شام اورنگ زیب کرنل احتشام کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا دروازے کی ریڈ لائٹ روشن ہونے کے بعد کسی کے انداز آنے کے امکانات بھی ختم کر دیے گئے تھے۔ دونوں کے درمیان سنجیدگی سے اہم ترین گفتگو ہو رہی تھی اورنگ زیب نے سکندر علی شاہ کی مکمل فائل کی ورق گردانی بھی کر لی تھی۔ اس کے اہم نکات بھی اس کے ذہن میں تھے لیکن سب سے پہلے اس نے اپنے تبادلے اور آئی جی کی پوزیشن کا ذکر مناسب سمجھا۔

کرنل اس کی بات کو توجہ سے سن رہا تھا۔ مکمل تفصیل سننے کے بعد اس نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئی جی کا تبادلہ بھی اس صوبے میں کسی مقصد کے تحت ہی کیا یا کرایا گیا ہوگا۔“

”آئی اے جی دوپو.....“ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”ہمارے ملک میں کالی بھیڑوں کی تعداد بھی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں۔“

”جانتا ہوں مسٹر اورنگ زیب لیکن حالات کے پیش نظر میں بھی آپ کو ایک دوستانہ حکم دینا چاہوں گا۔ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے۔؟“

”جو قدم ملک کی بہتری کے لیے ہو اس میں خود بھی اپنے آپ کو حالات کا باندہ ہی سمجھتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے کرنل احتشام کا اشارہ بھانپ کر کہا۔ ”تبادلے کے بعد بھی میں کسی صورت بھی آکٹوپس کو زندہ یا مردہ قانون کے حوالے کرنے کی ذمہ داری سے خود کو سبکدوش نہیں سمجھوں گا۔“

”میں بھی یہی درخواست کرنا چاہتا تھا۔“ کرنل احتشام نے پہلو بدل کر کہا۔ ”ایک بات اب

اور بھی ہمارے لیے اہم ہوگئی ہے..... یہ معلوم کرنا کہ آئی جی کس کے اشاروں پر عمل کرنے پر مجبور ہے۔“

”میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اپنے دفتر میں زبان کھولنے کی حماقت نہیں کرے گا..... غالباً اس کی تمام کالوں کو کہیں سنا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے مجھے بھی قابل اعتماد سمجھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرنے کے بعد ہی سخت لہجے میں گفتگو کی تھی۔“

”پھر..... آپ کے ذہن میں اس کی زبان کھولانے کا کیا طریقہ ممکن ہو سکتا ہے؟“

”آپ کسی اہم آفیشل کال کے ذریعے سے اپنے ہیڈ کوارٹر طلب کر سکتے ہیں۔ گفتگو کے دوران سرسری طور پر میرے تہاڑے کا ذکر چھیڑ دیں ہو سکتا ہے کہ وہ از خود اپنی پوزیشن واضح کر دے۔“

”گلد..... یہی مناسب ہوگا.....“

اورنگ زیب نے آئی جی کے سلسلے میں گفتگو ختم ہونے کے بعد محتاط لہجے میں کہا۔

”ایک اہم نام اور گھر سامنے آیا ہے..... سکندر علی شاہ۔“

”میری فائل پر بھی اس کا نام ہے لیکن یہ رپورٹ بھی موجود ہے کہ کسی قتل میں ملوث ہونے کے شے میں عدالت کی طرف سے بے گناہ قرار دیے جانے کے بعد اس نے خود کو محدود کر لیا ہے۔“

”یہ ظاہر ایسا ہی ہے۔“ اورنگ زیب نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”میں نے فائل کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہ اب بھی قانون کی توجہ کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور نام بھی میری فہرست پر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔“

”اوہ.....“ کرٹل چونکا۔ ”آپ کو میرے علاوہ اوپر سے بھی فری پیڈ ملا ہوا ہے۔ پھر رکاوٹ

کس بات کی ہے؟“

”وقت کی نزاکت بہت اہم ہے کرٹل..... اگر میں دشمنوں کا شکار ہو گیا تو سارے کا نفیڈ نشلو بھی میرے ساتھ دفن ہو جائیں گے اس لیے میں گزارش کروں گا کہ آپ کے کمائنڈر ذمہ آپ کے اشارے پر میرا کچھ ہاتھ بٹائیں تو آکٹوپس کو تھلا کر سمندر کی سطح پر اوپر بھی لایا جاسکتا ہے۔“

”مجھے آپ کا یہ جملہ سن کر دکھ ہوا مائی ڈیئر.....“ کرٹل کا لہجہ حد درجہ دوستانہ تھا۔ ”قوم کے دشمنوں کو بے نقاب کرنے کی خاطر ایسی گزارشات کیا ہمیں زیب دیتی ہیں؟..... آپ مجھے حکم دیں..... کیا کرنا ہے۔“

اس کے بعد اورنگ زیب نے زبان نہیں ہلائی۔ سامنے رکھے پیڈ کو اٹھا کر اس پر کچھ لکھتا رہا پھر اسے کرٹل کی طرف بڑھایا۔ کرٹل احتشام نے اس کی لکھی ہوئی عبارت غور سے پڑھی۔ پہلے اس کاغذ کو ضائع کیا پھر مسکرا کر بولا۔

”آپ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ شاید آپ کو میرے دفتر کے فون بھی ٹیپ کیے جانے یا کہیں سنے جانے کا اندیشہ لاحق ہے؟“

”یہ بھی احتیاط کا ایک انداز ہے۔“ اورنگ زیب نے بھی اشاروں میں جواب دیا پھر وہاں زیادہ دیر نہیں رکا۔ اسے خوشی تھی کہ کرٹل احتشام نے نہ صرف اس کی تحریر کردہ گزارشات پر عمل کرنے کا اشارہ دیا تھا بلکہ اس نے اورنگ زیب کے علاوہ سراج، افضل خان، میڈم روبی اور لیاقت حسین وغیرہ کی نگرانی پر اپنے خاص دستے کے سادہ لباس والے تعینات کر کے انہیں مکمل اختیار کے علاوہ فوری اور بروقت ایکشن لینے کا حکم نامہ بھی جاری کر دیا تھا۔

ہنی مون بیوٹی پارلر پک اینڈ ڈراپ وین میں اس وقت جونی تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک سولہ سترہ سال کی خوب صورت معصوم اور بھرے ہوئے خدو خال کی لڑکی بھی تھی۔ جونی ایک بار اسے پہلے بھی پوش علاقے کے ہنگلے سے لاپکا تھا اس بار بھی لڑکی کو وین میں اس کے ہنگلے پر بیجا گیا تھا لیکن اس وقت اسے شیلار مانے جونی کو واپسی سے قبل اپنے آفس میں بلا کر مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

جاننے ہو یہ لڑکی کون ہے؟“

”میں نے یہ جاننے کی کوشش پہلے بھی نہیں کی۔“ جونی نے بے پروائی سے کہا۔ ”صرف کام سے کام رکھتا ہوں۔“

”اس کی مالیت میرے لیے دو لاکھ ہے۔“ تمہارا کمیشن بھی اسی اعتبار سے ملے گا۔“

”کہاں پہنچاتا ہے؟“

”یہ بات مجھے بھی نہیں معلوم بہر حال اس کی پہلی منزل کے سلسلے میں جو حوالہ دیا گیا ہے وہ میرے لیے بھی حیران کن ہے۔“

”جوبات تم مجھ سے کہتی رہی ہو..... آج خود سے بھی کہہ ڈالو..... آم کھانے سے غرض رکھو بیڈ گننے سے کیا فائدہ؟“

”یو آر اسٹ۔“ شیلانے شانے چکا کر کہا۔ ”تم اسے لے کر پوش علاقے جاتے ہوئے راستے میں پڑنے والے نجم سپر سٹور کی پارکنگ میں روکے لڑکی سے یہی کہنا کہ تمہیں کوئی ضروری چیز خریدنی ہے..... جس نے سپلائی کا آرڈر دیا ہے اس کے آدی خود ہی لڑکی کو وین سے اٹھالے جائیں گے..... یہ تمہارے لیے بھی سیف (safe) رہے گا اس قسم کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔“

”جانتا ہوں۔“ جونی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا پھر باہر آ کر دین میں بیٹھ گیا۔

لڑکی جس کا نام بیٹا تھا وہ پچھلی نشست پر بیٹھی ایک فیشن میگزین کے اوراق میں ممتھی یہ پہلا موقع تھا جب جونی کو وہ لڑکی پسند آئی تھی اس کی نظریں بار بار ایک ویپورمر کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس نے کئی بار سوچا کہ لڑکی کو مخاطب کرے مگر..... اس نے دل پر جبر کر کے اپنی زبان بند ہی رکھی۔ یہ محض اس کی خوش قسمتی تھی کہ بیٹا نے از خود اسے مخاطب کیا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جونہی“ اس نے مختصر اُکھا۔

”کر سچ ہو.....؟“ پینا نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”کتنے تو نہیں.....!“

”مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ کبھی میرا نام جان محمد تھا پھر حالات نے کئی تبدیلیوں کے بعد مجھے

جونہی بنا دیا۔“

”انٹرسٹنگ“ پینا نے مصعومیت سے کہا پھر بولی۔ ”وین سپراسٹور پر ایک منٹ کے لیے روک

لینا، مجھے ایک چیز لینی ہے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“

جونہی مسکرا دیا اسے جس ہدایت پر عمل کرنا تھا اسے پینا نے از خود آسان بنا دیا تھا۔ اس نے

وین سپراسٹور کے باہر پارکنگ سے ڈرامٹ کر روک دی پینا نے اپنا پرس اٹھا کر شانے پر ڈالا پھر اتر

کر سپراسٹور میں چلی گئی۔ جونہی کی نظریں بہ دستور پینا پر مرکوز تھیں جب اس کے ذہن میں اچانک مس

ڈکسن کا کہا ہوا ایک جملہ صدائے بازگشت بن کر گونجا۔

”جتنی جلدی ممکن ہو شیلا درما کی دنیا سے کہیں دور چلے جاؤ..... کسی ایسی جگہ جہاں تک اس کی

رسائی ممکن نہ ہو.....“

جونہی نے اس جملے کو ذہن سے جھٹکنا چاہا لیکن پھر سپراسٹور کے اندر اور باہر ہونے والی ہلچل

نے اس کو اپنی صرف متوجہ کر لیا، تین افراد آپس میں دست و گریبان ہو کر۔

سپراسٹور سے باہر نکلے تھے ان کے پیچھے کچھ تماشا کی بھی تھے باہر کھڑے لوگ بھی لڑنے

والوں کے قریب جمع ہو رہے تھے جب جونہی کی نگاہ پینا پر پڑی وہ تنہا نہیں تھی اس کے ساتھ دو جوان

بھی تھے جو دائیں بائیں چل رہے تھے۔

جونہی پینا کے چہرے پر نظر آنے والی بے بسی دیکھ کر بھانپ گیا کہ وہ کسی مخصوص دھمکی کے بعد

ہی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جونہی کی نظریں پینا اور دونوں جوان افراد پر جمی رہیں وہ تیز تیز قدم

اٹھاتے باہر آئے پھر ایک گاڑی کا دروازہ کھول کر آگے پیچھے عقبی نشست پر بیٹھ گئے۔ اس وقت بھی

پینا کو درمیان میں رکھا گیا تھا۔ ان کے بیٹھے ہی گاڑی بھی تیزی سے حرکت میں آگئی۔

شیلا درما کے بیان کے عین مطابق دو لاکھ آفر کرنے والے فرد کے ہر کاری پینا کی ڈیلیوری

سپراسٹور سے لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جونہی ایک لمحے تک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا پینا کے

بارے میں سوچتا رہا جو کسی مصعوم کبوتر کی طرح عقابوں کے چنگل میں پھنس چکی تھی پھر..... اس نے

دین کو گیسٹر میں ڈال کر واپس جانے میں دیر بھی نہیں لگائی لیکن کوئی احساس تھا..... کسی ناویدہ خطرے

کا الارم تھا جو اس کے وجود میں پہلی بار گونج رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد.....

سلور کار کی وہ نسیان سیلون اس وقت ملٹری انٹیلی جنس کے احاطے میں کھڑی تھی۔ سوئڈ بوئڈ

دونوں جوان اور پینا انٹروکیشن روم کے ساؤنڈ پروف کمرے میں علیحدہ علیحدہ کرسیوں پر ایک

دوسرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے اس کے برابر ایک اور شخص تھا جس کے چہرے سے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ میک اپ میں ہے اس میک اپ میں وہ بظاہر کوئی غیر ملکی ہی لگ رہا تھا۔ بیرونی دروازے پر دو خفراز انٹیشن پوزیشن میں موجود تھے۔

کرنل احتشام کی تیز نظریں باری باری سامنے موجود دونوں جوانوں اور پینا کے چہرے کا

ایکسرے کرنے میں مصروف تھیں۔ پینا بری طرح سبھی اور گھبراہٹ گھبراہٹ نظر آ رہی تھی اس کے برعکس

دونوں جوان کرنل احتشام کو وضاحتی نظروں سے اسی طرح دیکھ رہے تھے جیسے انہیں اس بات

پر حیرت تھی کہ ان دونوں کو کسی جرم کی پاداش میں وہاں لایا گیا ہے۔

انٹروکیشن روم میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر کرنل احتشام نے پینا کو مخاطب کیا۔

”تمہارا نام.....؟“

”پینا.....“ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں مختصر جواب دیا اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی

خوف اور آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔

”گھبراؤ مت.....“ کرنل نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔ ”تم اب محفوظ ہاتھوں میں ہو لیکن

موجود حالات کے پیش نظر تمہارے بارے میں ضروری معلومات اور بے خوف بیان کی ضرورت

ہے۔ ایک بات اور ذہن نشین کرو تم میرے لیے بیٹی کی طرح ہو، ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ بھی سوچ

کچھ کر ہی اٹھایا ہے۔“

پینا کے لیے کرنل کی بات تازہ زخم پر مرہم ثابت ہوئی اس نے ایک بار کرنل کے چہرے کو

تشکرانہ نظروں سے دیکھا پھر نظریں جھکا کر بلا کم و کاست پوری تفصیل سناتی چلی گئی۔ وہ خاموش ہوئی

تو کرنل نے ایک جوان کی طرف دیکھا۔

”تم کیا کہو گے.....؟“

”یہ لڑکی جھوٹی ہے۔“ جوان نے تمللا کر جواب دیا۔ ”ہمیں پھنسانے کی خاطر اپنی مصعومیت کا

دھوکہ چارہی ہے۔“

”پھر..... سچ کیا ہے؟“

”اس نے ہم سے لفٹ مانگی تھی۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہم نے اسے مصعوم سمجھا اور ترس

کھا کر لفٹ دے دی۔“

”تم بھی کچھ کہنا پسند کرو گے؟“ کرنل نے دوسرے کو مخاطب کیا۔

”میں اپنے پارٹنر کی بات کی تائید کروں گا۔“ دوسرے نے بھی ڈھٹائی سے کہا۔ ”ہم بزنس مین

ہیں حکومت کو باقاعدہ ٹیکس ادا کرتے ہیں جس سپراسٹور پر سب کچھ ہوا اس کا مالک بھی ہم سے

واقف ہے۔ آپ اس سے بھی ہمارے بارے میں دریافت کر سکتے ہیں۔“

کرنل کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے قریب بیٹھے ہوئے ساتھی کی طرف دیکھا

اس نے زبان کھولنے کے بجائے صرف مسکرا کر یہ اظہار کیا کہ دونوں جوان دروغ گوئی کر رہے

ہیں۔ کرنل نے دوبارہ باری باری دونوں جوانوں کو دیکھا پھر اس کے لہجے میں تناؤ آ گیا۔

”کیا تم شرافت سے زبان نہیں کھولو گے؟“

”یہ سراسر زیادتی ہے کرنل صاحب۔“ ایک نے احتجاج کیا۔ ”آپ کو اگر ہم پر شبہ ہے تو معاملہ عدالت کے حوالے کر دیں ہمارا وکیل.....“

”سٹ اپ.....“ کرنل نے کرخت آواز میں کہا۔ ”ہم کیس واپس ہاتھ میں لیتے ہیں اس کا فیصلہ بھی خود کرتے ہیں۔ کیا سچ ہے کیا جھوٹ؟ ہمیں اس کو اگلوانا بھی آتا ہے۔“

”پلیز سر.....“ پینا نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ میرے گھر بھیج دیں.....“

کرنل نے ساتھ بیٹھے ہوئے فرد کو دیکھا تو وہ خاموشی سے اٹھا۔ اس کے اشارے پر پینا بھی اٹھی پھر دونوں آگے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئے۔

”یہ بھی ایک طرفہ کارروائی ہے۔“ ایک جوان نے جھلا کر کہا۔ ”جو فساد کی جڑ تھی آپ نے اسے جانے دیا۔ ہمیں کس مقصد سے روکا گیا ہے.....؟“

”ہم فوجی لوگ ضرور ہیں مائی ڈیئر لیکن اتنے بے مروت بھی نہیں کہ گھر آئے مہمانوں کو کسی خاطر و مدارت کے بغیر جانے دیں۔“ کرنل نے زہر خند سے کہا پھر اس نے دروازے پر موجود مسلح جوانوں کو اشارہ کیا تو وہ ان دونوں کو ان کی چیخ و پکار کے باوجود گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ کرنل نے ان کے جانے کے بعد گاڑی کے ڈرائیور کو طلب کیا۔

”تم ان جوانوں کے پاس کب سے ملازم ہو.....؟“

”آج تیسرا دن ہے جناب۔“

”اس سے پہلے کہاں کام کرتے تھے.....؟“

ڈرائیور نے جو حوالہ دیا کرنل نے فون پر فوری طور پر اس کے بیان کی تصدیق بھی کر لی۔ ڈرائیور نے جو کہا وہ غلط نہیں تھا۔ ”اس لڑکی کو سپراسٹور سے اٹھانے کے سلسلے میں تم کیا کہو گے.....؟“ کرنل نے دوستانہ لہجے میں اسے مزید کریدنے کی کوشش کی۔

”میں خود بھی کچھ نہیں سمجھ سکا بڑے صاحب۔“ ڈرائیور نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔ ”مجھ سے یہی کہا گیا تھا ان کی بہن گھر سے بھاگ کر اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی ہے جسے وہ واپس گھر لانا چاہتے تھے لیکن راستے میں ان دونوں نے لڑکی سے جو باتیں کہیں وہ کوئی بھائی اپنی بہن سے نہیں کر سکتا..... میں غریب آدمی ہوں جناب جھوٹ نہیں بولوں گا“ آپ کو اپنا تحریری بیان بھی دینے کو تیار ہوں..... یہاں نہ لایا گیا ہوتا جب بھی میں پہلی فرصت میں ملازمت چھوڑنے کا عہد کر چکا تھا۔“

”گڈ.....“ کرنل نے ڈرائیور کو ستائی نظروں سے دیکھا پھر اسے ایشینو کو بلا کر اس کا بیان لکھوایا جس پر ڈرائیور نے اپنے ٹوٹے پھوٹے دستخط کے علاوہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات بھی بہ خوشی لگا دیے۔

چالیس منٹ بعد دونوں جوانوں کو ضروری ٹریڈنٹ کے بعد کرنل کے روبرو پیش کیا گیا تو ان کا

سارا ”کلف“ بھی اتر چکا تھا ان دونوں نے تسلیم کیا کہ ان کی خدمات صرف اسی غرض سے حاصل کی گئی تھیں کہ وہ لڑکی کو سپراسٹور سے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے ایک مطلوبہ کوٹھی تک پہنچا دیں۔ اس کام کے لیے انہیں دس ہزار فی کس دینے کا معاوضہ ملے ہوا تھا۔

کرنل نے ان کے تحریری بیان حاصل کرنے کے بعد انہیں تمام ضروری دستاویز اور اسلحہ جات کے ساتھ سول پولیس کے حوالے کر دیا۔ یہ ہدایت بھی کر دی کہ اسے تمام کارروائی اور اس کے نتائج سے بھی باخبر رکھا جائے۔



سکندر علی شاہ اس وقت اپنے ڈرائنگ روم سے ملحقہ حجرے میں بیٹھا تین چار عقیدت مندوں سے گفتگو میں مصروف تھا جب اس کے موبائل کی ٹیون کی آواز ابھری اس نے روشن اسکرین پر نمبر دیکھے پھر لائن کاٹ دی وہ نمبر اس کے جانے پہنچانے نہیں تھے۔ موبائل اس نے گاؤں کے ساتھ تخت پر بچھے قیمتی قالین پر واپس رکھ دیا۔ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوبارہ اس شخص کی جانب دیکھا جو بدستور سامنے فرش پر بیٹھا بڑی عقیدت مندانہ نظروں سے سکندر علی شاہ کو دیکھ رہا تھا۔

”کون تھا حضرت؟“ اس نے دہی زبان میں دریافت کیا۔

”ہو گا کوئی اللہ کا ضرورت مند بندہ۔“ سکندر علی شاہ نے تسبیح کے دانوں پر انگلیاں گھماتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم نے ابھی جو دکھڑا سنا یا تھا..... اس کی وجہ جانتے ہو.....؟“

”میں تمہارے جواب کو بھی عقیدے کی کمزوری کہوں گا..... انسان جب خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستوں کو بھول کر اپنی من مانی شروع کر دے تو پھر اسے بلائے ناکہانی سے واسطہ تو پڑتا ہے سمجھ رہے ہوتا میری بات؟“

”آپ بجا فرما رہے ہیں حضرت۔“ عقیدت مند نے انکساری سے کہا۔ ”یہ سب ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے لیکن..... اب آپ ہی میری پریشانیوں کا..... کوئی حل بھی بتا دیں میں بڑی عقیدت سے آپ کے قدموں میں حاضر ہوا ہوں۔“

”تم..... مجھے گناہ گار کر رہے ہو۔“ سکندر علی شاہ نے پہلو بدل کر پاٹ دہر آواز میں جواب دیا۔ ”سوائے اللہ کے کوئی دوسری طاقت بندے کی مشکل حل نہیں کر سکتی..... اس کا درمطلق کے ننانوے ناموں میں بھی بڑی برکت ہے۔ تم باقاعدگی سے اس کے حضور سجدہ کرو۔ اپنے گناہوں کی معافی طلب کرو اور صبح و شام نمازوں کی پابندی کرتے رہو۔ ان شاء اللہ اسی کے کرم سے تمہاری سبھی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔“

”بڑی مہربانی حضرت۔“

ایک عقیدت مند کے جانے کے بعد سکندر علی شاہ نے دوسرے کی طرف توجہ دی اسی وقت موبائل پر دوبارہ ٹیون سنائی دی اس بار بھی وہی نمبر تھے جو پہلے نظر آئے تھے۔ سکندر علی شاہ نے منہ ہٹا کر موبائل آن کر لیا، ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں سکندر علی شاہ بول رہا ہوں۔ آپ کی تعریف؟“
”اپنے ماضی میں جھانک کر دیکھو..... دوسری جانب سے رعب دار آواز ابھری۔“ ہو سکتا ہے کہ تم کو اپنی اوقات بھی نظر آجائے۔“

”بہار شاد لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں.....“ سکندر علی شاہ نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔
”تمہارے سامنے آ جاؤ تب بھی نہیں پہچان سکو گے۔“ اس بار بولنے والے کا لہجہ درشت ہو گیا۔ ”ویسے اپنی شناخت کے لیے تمہیں صرف ایک حوالہ دے سکتا ہوں..... شکریہ۔“

”اوہ..... آپ! سکندر علی شاہ! شکریہ کے حوالے پر چونکا اس کے چہرے کا کھنچاؤ ایک لمحے میں ختم ہو گیا۔“ میں حجرے سے اٹھ کر اندر تھلے میں جا رہا ہوں وہیں سے بات ہو سکے گی۔“

اس نے حجرے میں موجود باقی عقیدت مندوں سے معذرت کی پھر اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ شکرے کے حوالے کے بعد اس کے ذہن میں ماضی کے بہت سارے پردے یکے بعد دیگر سرکتے چلے گئے۔ ڈرائنگ روم میں آ کر اس نے پہلی فرصت میں آنے والی کال کے نمبروں کو آزمایا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی بڑی عاجزی سے بولا۔

”آپ نے بڑے طویل عرصے کے بعد یاد کیا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں آپ ہی کی وجہ سے ہوں لیکن افسوس کہ آپ نے ابھی مجھے قریب آنے کی اجازت نہیں دی۔“

”اب بھی نہیں دوں گا لیکن ایک بات یاد رکھنا سکندر علی..... تم کل بھی..... ہر لمحہ میری نظروں کے سامنے تھے اور آج بھی تمہارا ایک ایک لمحہ میری عقابانی نظروں سے اوجھل نہیں ہے.....“ اس بار تمنا نہ لہجے میں جواب ملا پھر بات جاری رکھی گئی۔ ”اس وقت میں تم سے اس لڑکی کے بارے میں دریافت کروں گا جو تمہارے شکاری کتوں کے ہاتھ آ کر نکل گئی۔“

”مجھے اس کی اطلاع مل چکی ہے جناب اور میں.....“

”کیا اس میں سنا چاہتا.....“ دوسری جانب سے اس کی بات کاٹ کر حقارت سے سوال کیا گیا۔ ”جس طرح سپراسٹور پر کچھ آدمیوں نے جھگڑے کا ڈراما رچا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف کر لی تھی اسی طرح تمہارے شکاری کتوں کو بھی پکڑے جانے کے بعد اپنی زندگی ختم کر لینی چاہیے تھی۔ ملٹری انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر تک جانے کو نوبت کیوں آئی؟“

”یہ حکم ابھی ان دونوں تک پہنچا دیا جائے گا سکندر علی شاہ نے عاجزی سے دریافت کیا۔“ لڑکی کے لیے کیا حکم ہے؟“

”معلوم کرو کہ اس نے پولیس کو کیا بیان دیا ہے؟ ایک بات اور گرہ سے باندھ لو میں دوبارہ اس قسم کی غفلت برداشت نہیں کروں گا..... یہ بھی یاد رکھنا تم جو بھی بارود کے اس ڈھیر پر بیٹھے ہو اس کو اڑا دینے کا ریموٹ میرے پاس ہے۔“

”جج..... جانتا ہوں۔“ سکندر علی شاہ نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔
”تجلیہ کو بھی ٹھیک ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اس کا بیوٹی پارلر آنا جانا فوری بند کرو..... یہ بھی کہہ

دینا کہ اب وہ بھی کسی دوسری جگہ بھی جونی سے ملاقات کرنے کی غلطی نہ کرے۔“
”میں سمجھ رہا ہوں.....“

”جن نمبروں پر تم نے اس وقت کال کیا ہے اس کو بھول جاؤ..... میں ایک نمبر کو بار بار استعمال کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”ایک بات میں بھی عرض کرنا چاہوں گا؟“
”کہو.....“

”بیوٹی پارلر اور خوب صورت لڑکیوں کا معاملہ میں نے جس کے سپرد کر رکھا ہے وہ بھی مجھے نہیں جانتا۔ اس کو ہدایت بھی کوئی اور دیتا ہے۔ یہ احتیاط بھی آپ کے اشاروں کی روشنی میں کی گئی تھی۔“

”کیا یہ کہنا چاہ رہے ہو.....؟“ سرد اور پاٹ دار لہجے میں دریافت کیا گیا۔
”کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم کچھ عرصے کے لیے.....“

”کس بات سے خوف زدہ ہو.....؟“ اس کی بات کاٹ کر سوال کیا گیا۔
”میں نے محض احتیاط کی خاطر.....“

”نہیں.....“ دوسری جانب سے بہ دستور جھڑک کر کہا گیا۔ ”کیا صحیح ہے..... کیا غلط۔ یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔“

سکندر علی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”جو دو آدمی اس وقت پولیس کی تحویل میں ہیں ان کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟“
”وہ..... وہ..... میرا خیال ہے کہ اس خطرے کو جڑ سے ختم کرادوں۔“

”گڈ..... تم نے اس وقت وہی جواب دیا جو میں چاہتا ہوں۔“
”اور کوئی حکم.....!“

”میرا ایک ہیرا کہیں پھنس گیا ہے لیکن وہاں تک جانا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔“

”آپ کہہ کر تو دیکھیں..... سکندر علی..... ایک بار صرف اس وقت مایوس ہوا تھا جب اس کے ہاپ کا سایہ سر سے اٹھا تھا اس کے بعد آپ نے جو قوت بخشی اس نے مجھے کسی معاملے میں ہارنے نہیں دیا۔“

”چاہتا ہوں..... اور یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری اڑان کہاں تک ہے..... بس وہیں تک محدود رہو۔“

”میں انکار یا اصرار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ سکندر علی شاہ نے بڑی چرب زبانی سے کہا۔

”آپ کا ایک تصوراتی عکس ہے جو میرے ذہن میں پارے کی مانند چمکتا رہتا ہے کبھی کبھی تجلی کا احساس بھی بڑھ جاتا ہے۔“

”مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے..... جو کہا گیا ہے اس پر فوری عمل ضروری ہے۔ جو نہیں

کہا..... اس پر غور کرنے کی حماقت نہ کرتا۔“ دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔

سکندر علی نے سکون کا سانس لیا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنی کمتری کا احساس بھی بڑی شدت سے ہوا تھا ایک لڑکی کے سلسلے میں اس کے غلاموں کے زرخیز کتوں سے جو غلطی ہوئی اس نے اسے آسمان کی بلندیوں سے اٹھا کر منہ کے بل زمین پر پھینک دیا تھا۔ پہلے کی تمام خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا مگر..... وہ مجبور تھا ذہن میں متحرک کسی خیالی ہونے سے ٹکراتا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ سامنے ہوتا تو بھی شاید وہ اس کی جرأت نہ کر سکتا جو سوچ رہا تھا۔ ملازم کو ہدایت دینے کے بعد اس نے موبائل پر ایک نمبر ملایا۔ اس عمل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پیشانی پر ابھرنے والی ٹکٹیں بھی دوچند ہو گئی تھیں۔

”خادم بول رہا ہوں سر.....“ دوسری جانب سے کال ریسیو کرنے والے نے نہایت عاجزی سے دریافت کیا۔

”کوئی نئی خدمت؟“

”نہیں.....“ سکندر علی شاہ نے بدلی ہوئی آواز اور کرخت لہجے میں کہا۔ ”ان کتوں کا کیا ہوا جو فی الوقت پولیس کی حراست میں ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ انہیں ان کی غلطی کی سزا ملنا ضروری ہے۔“

”بکواس مت کرو..... میں نے تم سے کوئی تجویز نہیں مانگی۔“

”سوری سر.....“

”میرا حکم غور سے سنو۔“ سکندر علی شاہ نے غرا کر کہا۔

”پہلی فرصت میں انہیں اوپر پہنچا دو۔ دیٹ از آل۔“ اس حکم کے ساتھ اس نے موبائل کو آف کر دیا پھر وہ اس خواب گاہ میں آ گیا جہاں اس کی دوسری بیوی نگینہ ابھی تک ڈریسنگ گاؤں پہنے لیٹی کسی فلمی رسالے کے اوراق الٹ پلٹ رہی تھی۔ اس نے سکندر علی شاہ کو دروازے پر کھڑا دیکھا تو ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر اٹھی۔ خراماں خراماں چلتی اس کے قریب آ گئی آنکھوں سے بجلیاں گراتے مترنم آواز میں پوچھا۔

”آج مریدوں سے اتنی جلدی چھٹی مل گئی؟“

”تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”ضروری بات اور..... اس وقت۔“ اس نے پھر بازاری انداز میں سکندر علی شاہ کی نظروں میں جھانکا۔ ”کیا دروازہ بند کرو؟“

”ہاں..... لیکن خواب گاہ کا نہیں۔“ سکندر علی نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس دروازے کی بات کر رہا ہوں جو تم نے جونی کے لیے کھول رکھا ہے آئندہ تم جونی سے کہیں ملنے کی حماقت نہیں کرو گی۔ بیوی پارلر جانا بھی بند کر دو..... میرا اشارہ شیلا کے بیوی پارلر کی طرف ہے۔“

”جونی شیلا درما کے ہاں فنجری حیثیت سے کام کرتا ہے اس لیے کبھی کبھی اس سے آمانا سنا بھی ہو جاتا ہے۔“ نگینہ نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”کسی نے آپ کے کان بھر دیے ہیں..... کون ہے وہ؟“

”وہی جس کے کہنے پر میں نے جنہیں داشتہ سے بیوی بنالیا تھا۔“ سکندر علی شاہ نے نگینہ کو زبان کھولنے سے بیشتر اس کی حیثیت کا احساس بھی دلا دیا۔ ”یہ بھی مت بھولو کہ تم اسی کے اشارے پر جھونپڑے سے نکل کر محلوں تک آ گئیں۔ اسی کے اشارے پر تمہاری واپسی کا سفر بھی ناممکن نہیں ہو گا۔“

”میں نے جونی کے سلسلے میں صرف وضاحت کی تھی ڈارلنگ۔“ نگینہ نے موقع کی نزاکت بھانپ کر چولا بدلا۔

”تمہاری خاطر تو میں جونی اور شیلا درما کیا..... پوری دنیا کو لات مار سکتی ہوں۔“

”اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔“

”تم اس وقت تھکے تھکے لگ رہے ہو۔“ اس نے سکندر علی شاہ کے قریب جا کر اس کی گردن میں بائیں ڈال دیں۔ ”تمہیں صرف آرام اور سکون کی ضرورت ہے جو میرے پاس ہے۔ پلیز اس وقت میری خاطر انکار نہ کرنا۔“

سکندر علی شاہ جواب دینے کے بجائے قدم بڑھاتا قیمتی دیوان پر جا کر نیم دراز ہو گیا۔ نادیہ محسن کی کال نے اسے اندر سے چھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا..... نگینہ نے خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کیا پھر..... ڈریسنگ ٹیبل کی ایک خفیہ دراز کو چور میکینزم سے کھول کر پلاسٹک کی گول ڈبیا نکالی، لہراتی مل کھاتی سکندر علی شاہ کے قریب آ گئی۔ ڈبیا کھول کر اس نے اندر موجود پاؤڈر کی ایک چمکی نکالی اسے سکندر علی شاہ کی پیشانی پر رکھ کر اسے پھیلانے لگی۔ سکندر علی شاہ کی نظریں نگینہ پر مرکوز تھیں۔ پاؤڈر کا اثر فی الفور ہوا۔ دو منٹ بعد ہی اس کا ذہن کسی تیز نشے کی وجہ سے ہواؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ نگینہ نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر ڈبیا ایک طرف رکھ کر اس نے سکندر علی شاہ کے سر کو اپنے سینے میں چھپا لیا..... دو چار منٹ تک سکندر علی کا ہاتھ نگینہ کے جسم کو ٹٹولتا رہا پھر وہ دنیا مانہا سے بے خبر ہو گیا..... نگینہ نے آہستہ سے اس کے حصار سے خود کو آزاد کیا۔ کھڑے ہو کر اس کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا پھر مسکراتی ہوئی دوبارہ اپنے بستر پر آ گئی..... خود اس کے ذہن میں بھی اس وقت کسی مرد کی ہنسی، سانس گونج رہی تھیں جس نے اپنے آدمیوں سے اسے اغوا کر کے پہلی بار گھپ اندھیرے میں اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔



دشمنوں اس وقت بھی پر سکون ہی نظر آ رہا تھا۔ گرفتاری کے بعد اسے دوبارہ ملٹری انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر لا کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا..... مسلح افراد اس پر تعینات کر دیے گئے تھے..... نہ کیے گئے ہوتے تب بھی وہ سنگین پہروں سے

نکل کر فرار ہوتے وقت کسی گولی کا نشانہ بننا کبھی پسند نہ کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ کس وقت کیا قدم اٹھانا اس کے لیے زیادہ مناسب ہوگا۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن لینے کے بعد بھی وہ دیوار سے ٹیک لگائے نیچے فرش پر بیٹھا رہا۔ آنے والے دو مسلح افراد تھے ایک ہاتھ میں دبی کرسی رکھ کر چلا گیا۔ دوسرا پوزیشن سنبھال کر کھڑا ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد کرنل احتشام خالی کرسی پر بیٹھا اسے تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ جواب میں دشمنوں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ کرنل پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ دوبارہ اس کے جال میں پھنس جانے کے باوجود وہ مرنے سے بھی خوفزدہ نہیں ہے۔

”تم..... بالآخر دوبارہ یہاں آگئے؟“ کرنل نے کرخت لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”آپ کیا کہو گے؟“

”جو سفر میں نے بارڈر کراس کرنے کے بعد کیا تھا وہ زندگی کی آخری سانسوں تک شاید کبھی ختم نہ ہو.....“ دشمنوں نے بے پروائی سے کہا۔

”تمہارا یہ سفر پھانسی کے پھندے پر بھی ختم ہو سکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ تم اب بھی انٹر پول کو مطلوب ہو۔“ کرنل نے اسے مرعوب کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ ”جسٹ کی ایک ہی صورت ہے..... تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ اس کا نام اور تفصیل کھل کر بتا دو جو تمہاری پشت پر ہے۔“

”کسی کو وہ چن دے کہ اس کے ساتھ دھوکا کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔“

”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“ کرنل کے تیور بدلتے لگے۔

”تمہاری قید میں ہوں..... جو چاہو سوچ لو لیکن ایک بات میری بھی سن لو۔“

”کہو.....“

”تم مسلمان اور میں ہندو.....“ دشمنو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”تم آدھا گون کو نہیں مانتے۔ ہمارے دھرم کی کتابوں میں لکھا ہے کہ منٹس مرکرو دوبارہ جنم لیتا ہے..... مجھے بھی اس پر وشواس ہے۔“ دشمنوں نے ٹھنڈی سانس لے کر بات جاری رکھی۔ ”جو دشمنو کا جیون تھی جسے میں نے مار ڈالا..... وہ بھی وشواس رکھتی تھی میں مرکرنیا جنم لوں گا تو وہ بھی کسی نہ کسی روپ میں آکھ کھولے گی..... میں دوبارہ اپنی کلونت کے ساتھ آگنی کے پھیرے لگا کر دنیا بنالوں گا..... تمہارا پھانسی کا پھندا بھی ہمارا راستہ نہیں.....“

”بکومت.....“ کرنل نے گرج کر کہا۔ ”میں اس وقت تم سے دھرم کرم کی بات کرنے نہیں آیا.....“

”میں بھی کوئی کہانی نہیں سناؤں گا کرنل.....“ دشمنوں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”جو بیان پہلے دے چکا ہوں اسی کو بار بار دہراتا رہوں گا۔ تمہیں جس کی کھوج ہے..... میں نے بھی اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھا۔ صرف اس آواز سے پہچانتا ہوں جو میں نے پہلی بار سنی تھی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے بھی ایک بار مرکرو دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ سب کی نیندیں بھی حرام ہو گئی ہیں۔“

”وہ بھی ہمارے ہاتھوں سے نہیں بچے گا۔“ کرنل نے تمللا کر کہا۔ ”جس طرح تم پچاس فٹ

سے چھلانگ لگا کر فرار ہونے کے بعد اس وقت دوبارہ میرے سامنے ہو اسی طرح ایک دن وہ بھی ہماری گرفت میں ہوگا۔“

جواب میں دشمنوں نے صرف شانے اچکانے پر اکتفا کیا۔

”تم جن چہروں سے واقف ہو اس کے بارے میں ہمیں تفصیل بتا دو.....“ کرنل نے کہا۔ ”آخری سرا ہمیشہ پہلا سرا ہاتھ آنے کے بعد ہی ملتا ہے..... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”میں تمہیں اس معنی کی مثال دوں گا کرنل جسے تم لوچن کے نام سے جانتے ہو..... وہ جس کے لیے کام کر رہا ہے اس کی شکل اس نے کبھی نہیں دیکھی..... ایک پاس ورڈ پر عمل کرنے کا پابند ہے..... جو چھوٹے موٹے لوگ اس کی راہ میں آتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی مجبوری کا شکار ہوتے ہیں۔ اس پر ہاتھ ڈال کر تم بھی اپنا سے برباد کر چکے ہو۔ پھر میں کسی مجبور کا نام کیوں لوں؟“

کرنل نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا، کوئی فیصلہ کر کے اٹھا۔ دشمنو کو قہر آلودہ نظروں سے دیکھتا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد دشمنو کو کرنل کے ماتحت ایک بار پھر اسی ٹارچر سیل میں لے گئے جو دشمنوں کے لیے نیا بھی نہیں تھا۔



پٹ..... نہ کر دے سکون کا سانس نہیں لے گا مگر..... بار بار اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ وہ صرف یہی جان سکا تھا کہ کوئی پرچھائیں ہے جو لیاقت حسین کی مدد کر رہی ہے اس جنگ میں پر تاب بھوشن کو مددو پھارن سے بھی ہاتھ دھو نہ پڑے جو اسے دیوی نے دان کی تھی۔

مندر سے آنے جانے والے پجاری قریب سے گزرتے وقت پر تاب بھوشن سے ”رام..... رام..... جے رام۔“ کرتے رہے لیکن وہ صرف لیاقت حسین کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں کیول ایک ہی بات رہ رہ کر کھٹک رہی تھی۔ ”بھوانی کی چاپ میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کمی ضرور رہ گئی تھی جو وہ ابھی تک ایک مسئلے کے مقابلے میں سہل (کامیاب) نہیں ہو سکا تھا۔“ خاصی دیر تک وہ اسی ایک پہلو پر دھیان جمائے رہا پھر اس نے دوبارہ کسی دیرانے میں جا کر بھوانی کے لیے ایک کٹھن چاپ کرنے کی ٹھان لی تھی من چنڈو بھی بتا دیا تھا۔

وہ سیزھیوں کے چپوترے سے اٹھ کر اپنی کٹیا میں آگیا اپنے سامان کی پوٹلی تیار کرنے میں جت گیا۔ اس وقت اس کے من میں مددو پھارن کا دھیان بھی بچل رہا تھا جو پورے تن من دھن سے اس کی سیوا کرتی تھی جس نے بھی کسی بات سے منہ نہیں موڑا تھا اسی کے اشارے پر وہ سبھی سبھی لیاقت حسین کے گھر تک چلی گئی تھی جہاں اس کا سندر شریر جل کر راکھ ہوا پھر ایک تیز ہوا کا جھونکا اس راکھ کو سیٹ کر شاید دوبارہ بھوانی کے چروں میں واپس لے گیا تھا۔ پر تاب اپنے خیالوں میں گم تھا جب شہد میں ڈوبی ایک آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اس نے چونک کر کٹیا کے دروازے کی طرف دیکھا پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ جس غبی اور کسن پجاری کو اس نے من چند کے کمرے سے چنگ منک کر کے نکلتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی کٹی کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس وقت بھی دوسرے پاؤں تک قیامت نظر آ رہی تھی۔

پر تاب بھوشن جب دو دن پہلے بڑے پجاری من سے ملے گیا تھا اس وقت من چند کے خاص سیوک نے سلونی کا نام سن کر برا سامنہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

”وہ اب ہنڈیا نہیں رہی مہاراج..... آج کل تو اندر سجا کی ایک اپرا نے اپنا جادو جگا رکھا ہے۔ کسی کوٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ تیار مرچ کے الو سار پورے مندر میں کو لہے منکائی پھرتی ہے۔ سب ہی دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔“

خود پر تاب بھوشن نے بھی من چند سے دبی زبان میں کہا تھا۔ ”جب یہ ہرنی تمہارے جال میں پھنس جائے تو میرا دھیان بھی رکھنا..... اکیلے اکیلے ہڑپ نہ کرنا۔“

اس وقت..... وہی تیار مرچ اپنی بھر پور طرح سے ابھرتی، چمکتی جوانی اور اپنے قدموں کو سنبھالے پر تاب بھوشن کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟“..... ”پر تاب بھوشن نے دل میں لڈو پھونسنے کے باوجود اپنا بڑا پن جتانے کے کارن غبی پجاری کو سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔“ اس سے ادھر کیا کرنے آگئی.....؟ کون ہے تو؟“

”وہی پجاری ہوں مہاراج جس کو تم نے بڑے چاؤ سے بڑے پجاری کے کمرے سے“

پر تاب بھوشن اس وقت مندر کی سیزھیوں کے اوپر چپوترے پر بیٹھا لیاقت حسین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے جب دنیا کو چھوڑ کر بھوانی سے ناتا قائم کیا تھا اسے بھی کسی کے آگے کھٹنے نہیں ٹیکنے پڑے تھے لیکن ایک لیاقت حسین تھا جو کئی بار اس کی شکستوں کے جال میں پھنستے پھنستے نکل گیا تھا۔ آخری بار لیاقت حسین پر مہربان کسی قوت نے اس وقت اسے مندر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا جب اس کو پورا دشواں تھا کہ بھوانی ہی اسے کھینچ کر پر تاب بھوشن کے چروں تک لائی ہو گی، لیکن پانسا پلٹ گیا تھا۔

پچھلی باتیں اس کے ذہن میں کسی پچھو کے ڈنگ کے مانند چھ رہی تھیں لیکن وہ دھن کا پکا تھا۔ جب سے اس نے کندا علم سیکھا تھا وہ خود کو سب سے مہان سمجھتا رہا، کالی اور بھوانی کو راشی رکھنے کی خاطر کسی سچے سیوک کی طرح اس نے برف پوش پہاڑوں کی گہھاؤں، خطرناک جنگلوں اور پرانے شمشان گھاٹوں پر بیٹھ کر لمبے لمبے چاپ کیے تھے۔ بھوانی نے ہر بار اسے دشمنوں کے مقابلے میں جیت سے ہمکنار کیا تھا، مندر کے بڑے بڑے پجاری بھی اس کی آؤ بھگت کرتے تھے لیکن سب سے پہلے اسے لیاقت حسین نے اس کے ایک خطرناک جنتر منتر کا توڑ کر کے اس کی شہتی کو لکا رکھا تھا۔

لیموں کا وہ قصہ پر تاب بھوشن کو آج بھی یاد تھا جو اس نے کسی کے دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنے کی خاطر اکیس روز تک ایک ویران علاقے کے گندے جو ہڑ میں صرف ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر تیار کیا تھا۔ ہر تین روز بعد وہ ایک نئی سوئی پہ منتر پھونکتا تھا، ان سات سوئیوں کی اس نے ایک نیو میں بھوانی کا نام لے لے کر پوری طرح آرا پار کر دیا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ ایک مہاجن سے منہ مائی رقم لے کر اس کے دشمن کو مارنے کے کارن کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دوبارہ بھوانی کا شہ نام لے کر اس پر جان لیوا عمل کو کر چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے کے گندے عمل سے پھونگی گئی سوئیاں دشمن کو چھلی کرتی رہیں گی پھر وہ خون تھوک تھوک کر مر جائے گا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ ان سوئیوں کو لیموں سے نکالنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن لیاقت حسین نے ان سوئیوں کو کسی کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیموں سے نکال دیا تھا، ان خون آلود سوئیوں کے نکلنے کے بعد پر تاب بھوشن کا شکار بھی شمشان گھاٹ جانے سے بچ گیا تھا۔ لیاقت حسین نے بھی لیموں کو جوتے تلے چل کر پھینک دیا تھا۔

پر تاب بھوشن نے بھوانی کے نام پر سوگند اٹھائی تھی کہ جب تک وہ لیاقت حسین کو چٹ

سے دیکھا تھا۔ ”پجاریاں نے مصومیت سے کہا۔ ”اتنی جلدی بھول گئے؟“
 ”نئی جان پڑتی ہے۔“ پر تاب بھوشن کے لہجے میں نرمی آنے لگی۔ ”کیا نام ہے تیرا؟“
 ”ماتا پتانے بڑے چاؤ سے چکوری کا نام دیا تھا، پرتو یہاں مندر میں جس کا من چاہتا ہے
 ایک نیا نام لے کر کھسک پھر کرتا ہے۔“

”مجھ سے کچھ کام تھا۔“ پر تاب نے نگاہوں نگاہوں میں اس کے ہمید بھاؤ کو اپنی کسوٹی پر
 پرکتے ہوئے پوچھا۔

”مدن چند مہاراج نے بتایا تھا کہ تم پھر دیوی کے لیے کوئی جاپ کرنے کو جا رہے ہو۔“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ تو؟“ پر تاب بھوشن نے حیرت سے دریافت کیا۔ ”تو کیوں پوچھ رہی ہے؟“
 ”مجھے بھی اپنے سنگ لے چلو مہاراج۔۔۔۔۔ ادھر مندر میں بھانت بھانت کے پجاری اپنی
 بولیاں سناتے ہیں۔ تمہاری سیوا کروں گی تو شاید تمہاری وجہ سے مجھے بھی من کی شانتی مل جائے۔“
 ”کچھ پانے کے کارن منش جات کو کچھ کھانا بھی پڑتا ہے۔ جانتی ہے؟“ پر تاب بھوشن نے
 اسے کھانگالنے کی خاطر کہا۔

”تم جیسا کہو گے ویسا ہی کروں گی مہاراج۔۔۔۔۔ کسی بات سے منہ نہیں موڑوں گی۔“ چکوری
 نے مصومیت سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ رات کو اپنی پوٹلی لے کر ادھر آ جانا۔۔۔۔۔ بھور ہوتے ہی نکل چلیں گے۔“
 ”تن ڈھانکنے کے لیے تین جوڑے ہیں مہاراج۔۔۔۔۔ اور کوئی بوجھ نہیں۔“ چکوری نے اس بار
 نظریں جھکا کر دبی زبان میں کہا۔ ”من کا کچھ بوجھ تمہارا راستہ دکھانے کا مول سمجھ کر بڑے پجاری
 نے اتار دیا تھا۔ اب صرف تمہاری سیوا کرنا کچھ مشکل بھی نہیں ہو گا۔“
 چکوری اپنا جملہ مکمل کر کے چلی گئی تو پر تاب بھوشن کے اندر لٹو پھوٹنے لگے۔ دل ہی دل میں
 اس نے مدن چند کو پیار سے ایک موٹی گالی بھی سنا دی۔



سکندر علی کے فارم پر اس کے اپنے گیٹ ہاؤس کے خوب صورت دروازے میں جو لڑکی
 ساحل پر استہمال کی جانے والی رنگ برنگی فولڈنگ چیز پر نیم دراز تھی وہ یقیناً خوب صورت خدو خال
 کی مالک تھی، بھرا بھرا گداز جسم اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ سے کچھ کم
 ہی نظر آ رہی تھی۔ اس کا نام ماروی تھا۔ وہ یہ جانتی تھی کہ اسے فارم ہاؤس پر کس مقصد کے لیے لایا گیا
 تھا۔

ایک بار زبردستی لٹ جانے کے بعد دوسری بار بیس ہزار کی رقم اس کے لیے خاصی پرکشش آفر
 تھی۔ اسے ماں کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت بھی تھی باپ کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ اتنی کافی نہیں تھی کہ
 گھر کا خرچ چلانے کے ساتھ وہ ایک موڈی مرض کے علاج کی خاطر کسی بڑے ڈاکٹر کی فیس ادا کر
 سکتی۔

وہ کالج میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی جہاں اس کی کلاس فیلو نے دوست بن کر اس کے وجود
 میں زہر گھول دیا تھا۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی کلاس فیلو کے ایک گھٹاؤ نے جرم کو تصویروں
 کی شکل میں دیکھ چکی تھی۔ وہ محض ایک اتفاق تھا، اس نے اپنی کلاس فیلو سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی زبان
 بند رکھے گی۔ کلاس فیلو نے اسے اس تصویر کے پس منظر میں اپنی بے بسی کی بڑی دردناک کہانی سنائی
 تھی جو محض ایک جھوٹ تھا۔ وقتی طور پر اس لڑکی نے جس کا تعلق ایک ماڈرن گھرانے سے تھا۔ ماروی
 کی بات مان لی تھی لیکن اس کے بعد اس نے ماروی کو اپنے جال میں پھنسا کر اس طرح اپنے بوائے
 فرینڈ کے ہاتھوں برباد کر دیا کہ ماروی زبان کھولنے کے قابل بھی نہیں رہی۔ وہ لڑکی ایک دوبار ماروی
 کے گھر آ چکی تھی اس کی ماں کے مرض سے بھی واقف ہو گئی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ ماروی کے باپ کی
 اتنی حیثیت نہیں تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ اخراجات برداشت کر سکے۔ اسی نے ماروی کی پہلی بنگ بھی کی
 تھی۔ آدمی رقم بھی اپنی وقف لینڈ ڈاکٹر کے پاس لے جائے گی جو سیاہ کو سپید اور سپید کو سیاہ کرنے کی
 ماہر تھی۔ ماروی کے بچکانے پر اس نے ماروی کی بھی جب اپنی جیسی حیلہ موڈ تصویر دکھائی تو ماروی اندر
 ہی اندر سہم کر رہ گئی۔ وہ تصویر کب کبھی گئی اسے یاد نہیں تھا اس لیے کہ پہلی بار وہ نیم بے ہوشی کے
 عالم میں کلاس فیلو کے بچائے ہوئے حال میں پھنسی تھی۔ اسی کیفیت میں اس کی بے بسی کو رو دیا گیا
 تھا۔

تصویر دیکھنے کے بعد ماروی کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ کلاس فیلو کی بات
 مان لے۔ اسے یہ بھی شبہ تھا کہ جو رقم اس کے عوض حاصل کی گئی وہ بھی اسے بتائی جانے والی رقم سے
 بلقینا زیادہ ہی ہوگی۔ کلاس فیلو نے اس کی ایک مشکل اور آسان کر دی تھی اس نے کیا تھا وہ اس کے
 والدین کو یہی کہے گی کہ وہ رقم اس نے اپنے ذاتی جیب خرچ سے ایک سیکلی کی ماں کو اپنی ماں سمجھ کر
 دی ہے۔

بہر حال۔۔۔۔۔ ماروی اس وقت اپنی ڈمگاتی کیفیت کو سنبھالنے کی کوشش میں خود کو فارم ہاؤس
 لے ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھی جب ایک ادھیڑ عمر کا ہٹا کٹا ملازم اس کے
 قریب آ کر بڑے ادب سے بولا۔

”آپ اس وقت کیا بیٹا پسند کریں گی۔۔۔۔۔؟“

”کوئلڈ ڈریک۔۔۔۔۔“ اس نے ملازم سے کہا پھر دوبارہ نظریں پھیر لیں۔

”ایک بات اور عرض کرنی تھی۔“ ملازم دبی زبان میں نظریں جھکا کر بولا۔ ”یقینی بات ابھی
 لوں گی جاسکتی لیکن۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ مالک رات کو نہ آسکیں اس لیے آپ رات کے کھانے کے
 لیے بھی اپنی پسند بتا دیں اور۔۔۔۔۔ ایک گزارش بھی کروں گا۔ رات کو خواب گاہ کا دروازہ اندر سے
 مالک کے سوا کوئی دوسرا بند نہیں کرتا۔“

”کھانے میں میری کوئی خاص پسند نہیں ہے۔ جو بھی یہاں کا دستور ہو تم اسی پر عمل کرنا۔“
 ماروی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو ملازم ہاتھ باندھ کر لٹے قدموں چلا گیا۔ اس کے

جانے کے کچھ دیر بعد ہی ایک دوسرا شخص سوئمنگ پول کے دوسری سمت والے گیٹ ہاؤس سے نکلا کر سامنے آیا۔ اس نے ایک نیکی پتلون اور پوری آستین والی اسپورٹنگ شرٹ پہن رکھی تھی وہ بچہ ادھیڑ عمر اور صحت مند جسم کا مالک تھا لیکن اس کی ظاہری حیثیت ملازموں سے کچھ مختلف نظر آ رہی تھی۔ گیٹ ہاؤس سے نکلنے وقت اس کی نظر بھی ماروی پر پڑی تھی۔ ایک لمحے تک وہ اسے نفرت بھری نظروں سے گھورتا رہا پھر ٹھٹھا ہوا گیٹ کی طرف جانے لگا۔ ماروی نے اس کی نظروں میں ابھرنے والی نفرت کو دور سے ہی بھانپ لیا تھا۔ اس نے اپنی خاموش نفرت کا اظہار کیوں کیا تھا؟ کچھ دیر وہ اس پر غور کرتی رہی پھر دوبارہ اپنا ذہن بنانے کی خاطر ماحول میں گم ہو گئی۔

دس منٹ بعد ملازم اس کے لیے کولڈر تک اور اس کے ساتھ میوہ جات کی دو تین پلیٹیں رکھ چلا گیا۔ ماروی کو اس مہمان نوازی پر فخری آگئی۔ فارم ہاؤس کے ملازموں کو بھی یہ بات ضرور معلوم ہو گئی کہ وہ وہاں کس مقصد کے لیے لائی گئی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کا احترام کرتی رہی تھی۔ سوسائٹی کے اس رکھ رکھاؤ کا انداز بھی اس کے لیے اٹوٹھا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی حیثیت اور ملازموں کے اخلاق کے بارے میں سوچا پھر سالش بادام کے چار چھ پیس لینے کے ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کا خوب صورت اور قیمتی گلاس بھی اٹھا لیا۔ کچھ وقت اور گزر گیا۔ اس کے بعد وہی شخص پھر اس کے سامنے سے سر جھکائے گزرتا نظر آیا جس نے پہلی دفعہ میں اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا۔

”ون منٹ پلیز.....“ ماروی نے غیر ارادی طور پر اسے مخاطب کیا تو رک گیا۔ ایک بار پھر اس نے ناگوار انداز میں ماروی کو دیکھا پھر قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا۔ رو برو کھڑا ماروی کو سپاہی نظروں سے گھورتا رہا۔

”غو..... غا..... غو..... غو..... غا..... غا.....“ جواب میں اس نے سیدھا ہاتھ اٹھا کر ماروی سے اشاروں اشاروں میں یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ ”تم..... اپنے کام سے..... کام رکھو۔“ پھر وہ اٹے قدموں منہ میں کچھ بد بداتا چلا گیا ماروی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ شہر کو گھومتا تھا لیکن وہ اس کی حیثیت کا اندازہ پھر بھی نہ لگا سکی۔ رات کے کھانے کے وقت پہلا ملاز ثرائی لے کر کمرے میں آیا تو اس نے تجسس کو دور کرنے کی خاطر پوچھ لیا۔

”کیا یہاں کوئی گونگا مہمان بھی موجود ہے؟“

”وہ.....“ ملازم نے دائیں بائیں دیکھ کر مدھم لہجے میں کہا۔ ”وہ ملازم نہیں..... مالک کا دو پرے کا کوئی عزیز ہے۔ یہاں اس کی حیثیت گمران اعلیٰ کی ہے..... کوئی بھی اس کے حکم سے انکار کا جرات نہیں کرتا..... مالک بھی اس کا خیال رکھتے ہیں۔“

”اوہ.....“ ماروی نے لمبی سانس لے کر بات بدل دی۔ ”تمہارے مالک کے آنے کا پروگرام ہے؟“

”مالکوں کی بات مالک ہی جانتے ہیں..... آپ ساڑھے دس تک انتظار کر لیں پھر چاہیں تو۔“

ہائیں لیکن دروازہ بند کرنے والی بات یاد رکھیے گا.....“ ملازم نے تھوڑے توقف سے نظریں جھکا کر کہا۔ ”ساتھ والے کمرے میں کھانے پینے کی اور بھی ضروری لباس بھی موجود ہے۔ سونے کے لیے کسی لباس کی پسند بھی آپ کی مرضی پر ہے۔“

ملازم چلا گیا تو ماروی کو فحشی آگئی۔ اس نے ایک خلاف توقع قیمت کے عوض جو سودا بزدلی قبول لیا تھا۔ اس کی پہلا تجربہ بھی اس کے لیے ایک معما ہی تھا۔ ”طلسم ہو شرابا“ کسی داستان کی طرح..... کھانا کھانے کے بعد اس نے دوسرے کمرے میں جا کر جو بھی دیکھا وہ اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا، شیشے کی ایک الماری میں شراب کی مختلف اعلیٰ اقسام بوتلیں اور قسم قسم کے خوبصورت اور نازک پیانے موجود تھے دوسری الماری میں شب خوابی کے بے شمار جوڑے تھے۔ اس نے نفرت سے ایک پاجامہ اور ڈریسنگ اٹھا لیا پھر اس کو پہن کر اس نے خود کو قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا کیا تو شرما کر نظریں جھکا لیں۔ خواب گاہ میں واپس آ کر اس نے دروازہ اندر سے بھیڑ لیا۔ رات ساڑھے دس تک وہ جاگتی رہی پھر اس نے لائش آف کر دیں نرم گرم مسہری پر لیٹ کر اس نے ایک شال اپنے جسم پر ڈال لی پھر سہمی سہمی لیٹی رہی۔ کب اس کی آنکھ لگی؟ اس کو وقت کا اندازہ نہیں ہوا پھر..... دوبارہ اس کی نیند اسی وقت اجاٹ ہوئی جب کسی کے ناگوار قرب نے اسے ہوشیار کیا تھا۔

میں ہزار کی رقم کی ادائیگی کے کھیل کا آغاز کب ہوا۔ ماروی کو اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب کسی نے اس کے جسم کو دوسری بار ٹھوٹا تھا۔ وہ نفرت سے دل پر جبر کیے اندھیرے میں کلبلائی رہی۔ ایک ذرا سی غلطی نے اسے جس راستے پر ڈال دیا تھا اب وہ اس پر چلنے پر مجبور تھی۔ ماں سے لسی سیملی کے ساتھ رات بھر اسٹڈی کرنے کا بہانہ کر کے آئی تھی۔ آدھی رات کے بعد واپسی کا راستہ اختیار کرنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ گیٹ ہاؤس پر ملازموں اور کسی گونگے کی موجودگی میں وہ بھاگنا چاہتی تو بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ خاص طور سے گونگے نے اسے پہلی نظر دیکھ کر جس نفرت اور حقارت کا اظہار کیا..... جس انداز میں اس کو جواب دیا وہی اس کو خوفزدہ کرنے کے لیے بہت تھا۔ وہ آنکھ کھول کر اس کی صورت دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی جو اپنی رقم وصول کر رہا تھا۔

دم سادھے وہ دانت پر دانت جمائے خاموش پڑی رہی..... طوفان کی شدت جوں جوں زور پکڑتی رہی اس کا کمزور وجود بھی اس کی سرکش موجوں پر ڈوبتا ابھرتا رہا..... دلی دلی سسکیاں بھی اس کے اپنے وجود کی نفرت انگیز گہرائیوں میں بتدریج دفن ہوتی رہیں..... طوفان گزر گیا تو کسی نے اس سے جدا ہوتے وقت بے حد سرد اور سفاک لہجے میں کہا تھا۔

”کسی سے کچھ نہ کہنا..... زبان کھولنے کی حماقت کبھی نہ کرنا ورنہ تمہاری موٹ بھی بڑی مہرتاک ہوگی۔ کون آیا؟ کون گیا؟ اسے یاد کرنے کی غلطی کی تو بوری بند لاش کسی کچرا کنڈی ہی سے دریافت ہوگی..... ڈیوی انڈر اسٹینڈ؟“

تھیں جب سترہ سال کی ایک معصوم لڑکی مسکراتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ماں کو کسی ملاقاتی کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس نے مہذب انداز میں اور نگریب کو سلام کیا پھر ماں سے بولی۔
”میں سٹڈی کے لیے.....“

”بیٹھ جاؤ.....“ سرجن زینب نے بیٹا سے کہا پھر اس کے بیٹھنے کے بعد سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”دو تین روز قبل تم بیوٹی پارلر گئی تھیں، لیکن واپس آنے کے بعد تم نے مجھ سے کسی بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔“

بیٹا کے چہرے کی رنگت ہل بھر میں اڑ گئی جسے سرجن زینب نے بھی محسوس کیا۔ بیٹا نے ماں کا سوال سن کر اورنگ زیب کی سمت دیکھا پھر..... ماں نے جب اورنگ زیب کا تعارف کرایا تو بیٹا کی نظریں بھی جھک گئیں۔

”کم آن بیٹا.....“ اورنگ زیب نے کسی مشفق بزرگ کی طرح اسے مخاطب کیا۔ ”اس وقت میں ایک دوست کی حیثیت سے تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز تم مجھے پولیس افسر کے بجائے اگر انکل سمجھ کر تعاون کرو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی.....“

بیٹا بہ دستور سر جھکائے ہونٹ چباتی رہی تو سرجن زینب نے اسے کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔
”تم جانتی ہو کہ مجھے خاموشی سے نفرت ہے..... جو بات ہے اسے کھل کے بیان کرنے میں تم کیوں ہچکچا رہی ہو؟ میں تمہاری خاموشی کو کیا سمجھوں.....“

”پلیز سرجن.....“ اورنگ زیب نے بیٹا کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے سلیجے ہوئے انداز میں لڑکا پھر رک رک کر پوری تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”کرنل احتشام کے سلسلے میں بھی آپ مطمئن رہیں۔“

پھر ماں کے اصرار پر بیٹا نے پوری تفصیل سے تمام باتیں بیان کر دیں۔
”کون تھے وہ باسٹرڈ.....“ سرجن زینب نے اورنگ زیب سے پوچھا۔ ”اس وقت وہ کہاں ہیں؟“ تفصیل سن کر سرجن زینب کا آپے سے باہر ہو جانا قدرتی بات تھی۔

”پلیز سرجن.....“ آپ پریشان نہ ہوں۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”وہ دونوں پولیس کی تحویل میں ہیں، لیکن جو کچھ ہو چکا اس میں براہ راست ان کے ارادوں کو بھی دخل نہیں تھا۔ کسی اور نے قیمت چکا کر ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ کرنل احتشام نے ذاتی طور پر انہیں پولیس کے حوالے کیا ہے..... مس بیٹا کا نام کہیں بھی درمیان میں نہیں آیا۔“

”پھر.....“ آپ اس وقت کیا معلوم کرنے آئے ہیں.....؟“
”مس بیٹا.....“ اورنگ زیب نے سرجن زینب کا سوال نظر انداز کر کے براہ راست بیٹا کو مخاطب کیا۔ ”کیا بیوٹی پارلر کی دین کے ڈرائیور نے تم سے کوئی بات کی تھی؟“
”جی نہیں.....“

”سپر اسٹور پر دین کیوں روکی گئی تھی؟“

ایس پی اورنگ زیب اس وقت پوش علاقے کے ایک بنگلے کے ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا سنجیدگی سے کسی کی آمد کا منظر تھا۔ بنگلے کے باہر سرجن زینب حسن کی تختی آویزاں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری تھی وہ بھی معنی خیز تھی۔ گیٹ کے چوکیدار نے اس کا کارڈ دیکھ کر انٹرکام پر اندر اطلاع کر دی۔ جس کے بعد اسے ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا گیا تھا۔

آٹھ دس منٹ کے انتظار کے بعد لیڈی ڈاکٹر سرجن زینب حسن اس کے سامنے موجود تھی۔ ”اس نے مسکرا کر اورنگ زیب سے دریافت کیا۔“ کیا کوئی آفیشل معاملہ ہے؟“
”ہے بھی اور نہیں بھی.....“ جواب بھی اورنگ زیب نے بھی مسکرا کر کہا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ میری آمد کا مقصد جان کر زیادہ خوش نہ ہوں، لیکن اس کے باوجود.....“

”کم آن آفیسر.....“ زینب حسن نے بات کاٹ کر کہا۔ ”جس پروفیشن سے ہم وابستہ ہیں اس میں اس قسم کے تکلفات کا دخل نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک.....“ اس وقت آپ کی صاحبزادی مس بیٹا کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہوں گا۔“

”اوہ.....“ سرجن زینب یلکھت سنجیدہ ہو گئی۔ ”بیٹا سے آپ کو کیا کام پڑ گیا؟“
”تکلف برطرف.....“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس بیوٹی پارلر کو پسند کرتی ہیں اور آخری بار وہاں کب گئی تھیں؟“

”کیا آپ یہ باتیں آفیشل طور پر معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“
”جی نہیں..... فی الحال میں اس بات کو ان آفیشل ہی رکھنا پسند کروں گا۔ اس لیے کہ مجھے آپ کے اسٹیش اور بیٹا کے مستقبل کا بھی خیال ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ سرجن زینب نے کڑوے انداز میں کھری باتیں کی۔ ”آپ کی باتیں.....“
”پلیز سرجن۔“ اورنگ زیب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی پھر پہلو بدل کر پوچھا۔ ”کیا آپ کے علم ہے کہ تین روز قبل مس بیٹا اپنی ضرورت کے پیش نظر ہینی مون بیوٹی پارلر گئی تھیں؟“

”جی ہاں.....“ مگر اس میں قانون درمیان میں کیسے آگیا؟ کیا بیوٹی پارلر جانا کوئی جرم ہے؟“
”آئی سی.....“ گویا مس بیٹا نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔“

اورنگ زیب کا جواب سن کر سرجن زینب کے چہرے پر کچھ ناگوار سلوٹیں ابھرنا شروع ہوئی

اس کی درخواست میں نے کی تھی..... مجھے ایک دو چیزیں خریدنی تھیں۔“
”جن افراد نے تمہیں لے جانے کی کوشش کی تھی کیا تم نے ان کو پہلے بھی کبھی دیکھا ہے؟“

”جی نہیں.....“

”شیلہ ورما کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

میرا مطلب ہے کہ کیا اس نے بھی تمہارے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی.....“
”بھی نہیں.....“ پینا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں صرف اس کے نام سے واقف ہوں۔ کبھی اس سے ملاقات کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔“

”گڈ.....“ اورنگ زیب نے بہ دستور دوستانہ انداز میں کہا پھر اس نے سرجن زینب کو مخاطب کیا۔

”آپ فکر نہ کریں..... آپ کا یاس پینا کا نام درمیان میں نہیں آئے گا۔“

”شکریہ آفیسر لیکن وہ دوسرے افراد جو پولیس کی تحویل میں ہیں، کیا ان کی زبان بھی بند رہیں گی؟“

اورنگ زیب ایک لمحے کے تامل کے بعد کوئی جواب دینا چاہتا تھا جب اس کے موبائل پر سنگٹل موصول ہوئے۔ سرجن زینب سے معذرت طلب کر کے اس نے موبائل آن کیا۔ دوسری جانب سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی آواز ابھری۔

”آپ کو ایک ضروری اطلاع دینی ہے۔ کنٹرل احتشام نے جن دو افراد کو پولیس کی تحویل میں دیا تھا آج ان کو ہمارے آئی جی صاحب نے اپنے دفتر طلب کیا تھا۔ غالباً کنٹرل احتشام کے کہنے پر ہی وہ ذاتی طور پر ان دونوں کو زبان کھلوانا چاہتے تھے، لیکن اب ان کی بوکھلاہٹ بھی قابل دید ہے۔“

”گٹ شاٹ.....“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”دونوں نے آئی جی کے سامنے ہی دانتوں کے درمیان رکھے ہوئے زہریلے کپسول چبا لیے ان کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی گئی ہیں۔ اب آپ کی تلاش ہو رہی ہے مجھ سے بھی دریافت کیا گیا تھا۔“

”تم نے کیا کہا؟“

”میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ محترم آئی جی کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔“

”ڈونٹ وری۔“ اورنگ زیب نے سلسلہ منقطع کر کے سرجن زینب سے کہا۔ ”آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ جو دو آدمی پولیس کی حراست میں تھے انہوں نے آئی جی کے کمرے میں خودکشی کر لی ہے۔“

”اوہ..... لیکن..... انہوں نے ایسا کیوں کیا.....؟“

”میں اب اجازت چاہوں گا۔“ اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ اگر ”مس پینا“ دوسرے گھرنیک محمد ودر ہیں تو مناسب ہوگا۔“

”اوکے لیکن کیا آپ مجھے خدمت کا.....“

”اس وقت میں جلدی میں ہوں۔“ اورنگ زیب نے پینا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
”پھر کسی وقت آپ سے کلینک میں ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا۔“

اورنگ زیب کے جانے کے بعد سرجن زینب نے پینا کی طرف دیکھا جو صوفے پر کسی ایسی معصوم ہر نی کی طرح سہمی بیٹھی تھی جو کسی بھوکے درندے کے چنگل سے بچ جانے کے بعد دل کی بے ترتیب دھڑکنیں سنبھال رہی ہو۔



شیلہ ورما اس وقت اپنی خواب گاہ میں کسی بھوکے شیرنی کی طرح ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار ابھرنے والا تجسس اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ کسی الجھن کا شکار ہے۔

حسب معمول اس نے اس وقت بھی شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا، لیکن خواب گاہ کی تنہائی اسے کسی زہریلے ناگ کی طرح ڈس رہی تھی۔ اس کی الجھن کا سبب جو نی تھا جو دور دوز سے کہیں چھوٹتر ہو گیا تھا۔ ان دو دونوں میں شیلہ ورما نے اس کے موبائل فون پر ان گنت کالز کی تھیں، لیکن دوسری طرف سے ہر بار اسے پاورڈ آف کا ریکارڈ مسیج ہی ملتا تھا۔

یہ پہلا اتفاق نہیں تھا۔ اس سے پیشتر بھی ایک دو خالص موقعوں پر خود شیلہ ورما نے اسے بیوٹی پارلر سے دور رہنے کے لیے کہا تھا، لیکن دور رہنے کے باوجود وہ موبائل کے ذریعے برابر رابطہ قائم رکھتا تھا۔ مگر اس بار جو نی نے از خود پارلر سے دوری اختیار کر لی تھی اور رابطہ بھی نہیں کیا تھا اس کا سبب یقیناً پینا ہی تھی جو شکاریوں کے جال میں پھنس جانے کے باوجود کسی طرح انگوٹھ کرنے والے دونوں افراد کے ساتھ ملٹری ایجنسی کے دفتر تک پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے پینا کو جانے کی اجازت مل گئی تھی، دونوں افراد کو پولیس کی تحویل میں دینے کی اجازت مل گئی تھی، دونوں افراد کو پولیس کی تحویل میں دینے کی اطلاع..... پھر آئی جی کے روبرو ان کی خودکشی کی پوری تفصیل بھی شیلہ ورما کو اس کے معتبر ذرائع سے مل گئی تھی، لیکن جو نی کے بارے میں وہ ابھی تک قطعی لاعلم تھی۔ پریشانی اس بات کی تھی کہ جو نی نے خلاف توقع اسے اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔

ٹھٹلے ٹھٹلے اس نے درمیان میں رکھی گول میز کے قریب جا کر گلاس میں پچی شراب بھی اٹھالی، ایک ہی سانس میں اسے حلق کے نیچے اتارنے کے بعد اس نے دوبارہ دتی گھڑی کی طرف دیکھا، پھر وہ دل ہی دل میں جو نی کو مغلظات سنا کر اپنے غصے کو ٹھنڈا کر رہی تھی جب اس کے موبائل نے واہبرٹ کرنا شروع کیا۔ شیلہ ورما نے نمبر دیکھے بغیر بڑی عجلت میں کال ریسیو کی لیکن دوسری جانب سے گھمبیر کی آواز سن کر اس کی جھنجھلاہٹ دو چند ہو گئی۔

”اس وقت کس مقصد سے کال کیا ہے؟“ اس نے تمللا کر دریافت کیا۔
”مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ دوسری جانب سے گلینہ کی سرسراتی آواز ابھری۔ ”کسی دشمن نے سکندر علی شاہ کے کان میں ہمارے خلاف بھردیے ہیں مجھے علم دیا ہے کہ میں تمہارے بیوٹی پارلر کی طرف بھول کر بھی رخ نہ کروں۔“

”تمہارا شبہ کس پر ہے۔۔۔۔۔“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ گلینہ نے مدہم لہجے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ شیدا درمانے روکے انداز میں اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔ ”تمہارے نہ آنے سے پارلر کے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا“ لیکن جو کام تمہارے ذمے ہے اس کی طرف غافل نہ ہوتا۔“

”کوشش کروں گی، لیکن میرا خیال ہے کہ سکندر علی شاہ کے پالتو شکاری کتے اب مجھے پہلے کی طرح آزادی سے کہیں آنے جانے کا موقع نہیں دیں گے۔“
”یہ سوچنا تمہارا ذاتی مسئلہ ہے۔ لیکن نجی کاروبار کے لیے لڑکیوں کی تلاش تمہیں ہر قیمت پر جاری رکھنی ہوگی۔“

یہ بھی نہ بھولنا کہ تم گلینہ بننے سے پہلے کس حیثیت کی مالک تھیں۔ میں تمہیں اس کا معقول معاوضہ بھی پیشگی دے چکی ہوں اس کے علاوہ میرے پاس تمہارے سلسلے میں کچھ ایسے ٹرمپ کارڈز بھی ہیں جو تمہیں محلوں سے نکال کر دوبارہ۔۔۔۔۔“

”کیا بات ہے شیدا۔۔۔۔۔“ گلینہ نے بات کاٹ کر بے تکلفی سے دریافت کیا۔ ”تم اس وقت کچھ الجھی الجھی لگ رہی ہو۔ سب خیر تو ہے؟“

”میں اپنے ذاتی معاملات صرف خود تک محدود رکھنے کی عادی ہوں۔“ شیدا درمانے بہ دستور ساٹ لہجے میں جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”کیا تم بتا سکو گی کہ اس وقت جونی کہاں ہوگا؟“

”کیا مطلب؟ جونی کو کیا ہو گیا؟“

”وہ دودن سے غائب ہے۔۔۔۔۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“

”معصوم مت بنو۔۔۔۔۔“ شیدائے تمللا کر جواب دیا۔

”میں تمہارے اور اس کے مراسم سے بھی ناواقف نہیں ہوں، ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہاری طرح اور بھی دو چار ہانڈیوں میں منہ مارنا شروع کر دیا ہو لیکن دو روز کی غیر حاضری جونی کو بھی مہنگی پڑے گی۔۔۔۔۔ محبت اور جنگ میں ہر قسم کے ہتھیار استعمال کرنے کی چھوٹ ہوتی ہے۔“

”جانتی ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ جونی کہاں ہے۔“

”اپنے موبائل سے رابطہ قائم کر کے دیکھو۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے تمہارے پاس اس کا کوئی خاص نمبر ہو۔“ شیدا کے لب و لہجے میں شیطاں لپک رہے تھے۔

”ایسا نہیں ہے شیدا۔۔۔۔۔ میری بات کا یقین کرو۔“

”ٹھیک ہے لیکن میری ہدایت کا خیال رکھنا۔۔۔۔۔“

نئے جینکے دکتے اور تروتازہ ہیروں کی تلاش میں تمہاری کس کوتاہی کو براشت نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ گڈ بائی۔“ شیدائے جملہ مکمل کر کے رابطہ بھی ختم کر دیا پھر وہ نیا گلاس تیار کرنے کے ارادے سے کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر ہونے والی مخصوص دسک کی آواز سن کر وہ تیزی سے اٹھ گئی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا۔۔۔۔۔ سامنے جونی کھڑا تھا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ شیدائے اس کی نظروں میں دور تک جھانکتے ہوئے شکوہ کیا۔ ”تم دو روز سے کہاں گم تھے؟“

”سپر اسٹور سے اٹھائی جانے والی لڑکی جہاں پہنچ گئی تھی اس کے بعد احتیاط شرط تھی۔“

”مجھے کم از کم فون تو کر سکتے تھے؟“

”حالات سنگین ہوں تو انسان کو اپنی پرچھائیں سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔“ جونی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”آج ان دونوں کی خودکشی کی اطلاع کے بعد ہی میں نے سکون کا سانس لیا ہے لیکن تمہارے لیے ایک نئی اطلاع بھی ہے۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“

”جو لڑکی شکار ہونے سے بچ گئی اس کی ماں بڑی حیثیت کی مالک ہے اور آج۔۔۔۔۔ ایس پی اورنگ زیب بھی اس سے ملنے گیا تھا۔ ہمیں کچھ دنوں بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانا ہوگا۔“
”اس وقت نہیں جونی۔۔۔۔۔ اس بارے میں صبح بھی سوچا جا سکتا ہے۔“ شیدا درمانے نشلی آواز میں جواب دیا۔ پھر اس نے جونی کی گردن میں بانٹیں ڈالنے سے پہلے خواب گاہ کی روشنی میں گل کر دی تھی۔



تھریا کو پیش آنے والے حادثے کے بعد میڈیم روبی نے اپنے گھر کی سکیورٹی مزید بڑھا دی تھی۔ اب وہ خود بھی پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔

تھریا کی واپسی سے پیشتر جو کال اسے ملی تھی وہ اس وقت بھی اس کے ذہن میں کچھ کے لگا رہی تھی۔ جب ناشتے کے بعد وہ اخبار کے صفحات الٹ پلٹ رہی تھی تھریا بھی اس کے قریب بیٹھی اس کے چہرے کے تاثرات کے اتار چڑھاؤ کو پڑھ رہی تھی۔

انہو اکرنے والوں نے اسے باعزت چھوڑ دیا تھا، لیکن وہ تجربہ بھی اتنا ہولناک تھا کہ تھریا خود بھی ابھی تک اسے فراموش نہیں کر سکی تھی۔ جن لوگوں نے اسے میڈیم کی رہائش گاہ سے اتنی ہوشیاری سے انہو کیا تھا کہ گھر کے ملازموں اور گیٹ کے چوکیداروں کو بھی اس کا علم نہیں ہو سکا تھا وہ اسے اپنی کمین گاہ تک لے جانے کے بعد مل بانٹ کر بے آبرو کرنے کے لیے بھی قدم اٹھا سکتے تھے لیکن میڈیم سے اپنا ایک مطالبہ منوانے کے بعد انہوں نے اسے باعزت طور پر واپس کر دیا تھا۔

نظر آتا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میڈم روبی نے سرسراتے انداز میں پوچھا۔ ”کون ہو سکتا ہے وہ بلیک میل؟“

”اس کا علم شاید آئی جی کو بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”مجھے تم سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔۔۔۔۔“

”میں سمجھی نہیں۔۔۔۔۔“ الماس نے کھوجنے والے انداز میں کہا۔ ”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“

”تم فرحین اور لیاقت حسین کو پیش آنے والے حادثات کو کیوں فراموش کر رہی ہو۔“ میڈم

روبی نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”ان تمام وارداتوں کے پیچھے ایک ہی ہاتھ

ہے۔۔۔۔۔ آکٹوپس!“ میڈم نے بات جاری رکھی۔ ”لیاقت حسین کی پر اسرار غیبی قوتیں کئی بار اس

کا راستہ کھٹا کر چکی ہیں، باقی کسراورنگ زیب صاحب پوری کر رہے ہیں جنہیں ایک لمحے کے لیے

بھی اس کی موت کا یقین نہیں آیا تھا۔ کنول کے اغواء اور اس کی ماں کی موت کے بھی یقیناً اسی موذی

کے ہاتھ ہوگا۔“

”تمہاری بات میں وزن ہے۔۔۔۔۔ اس کی روشنی میں تھریا کے اغواء کو بھی اسی کے خانے میں

ڈالا جاسکتا ہے۔“

”میں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔۔۔۔۔“ دوسری طرف سے الماس نے اس کی تائید کرتے

ہوئے کہا۔

”تمہیں شاید ابھی ایک تازہ واردات کی اطلاع نہیں ملی۔۔۔۔۔“

اگر تمہارا اشارہ اورنگ زیب صاحب کے گلوڑی اپارٹمنٹ کی طرف ہے تو یہ اطلاع تمہارے

سراج صاحب مجھے دے چکے ہیں۔“ میڈم نے مسکرا کر کہا۔ ”انہوں نے یہ تاکید بھی کی تھی کہ یہ

اطلاع اپنی ذات تک محدود رکھوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم عورتیں مفت میں بدنام ہیں۔“ دوسری جانب سے الماس کی کھٹکتی

ہوئی آواز ابھری۔ ”یہ مرد حضرات ہم سے زیادہ پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں۔ ایک طرف مجھے بھی

زبان بند رکھنے کو کہا تھا اور دوسری طرف خود تمہیں بتا دیا۔“

”سوری الماس!“ میڈم روبی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں سراج بھائی کے خلاف کوئی بات

سننے کو تیار نہیں ہوں۔“

”آج شام کو تمہارا کیا پروگرام ہے۔“ الماس نے کہا۔ ”اگر فارغ ہو تو میری طرف آ جاؤ۔ شام

کی چائے بھی اپنے سراج بھائی کے ساتھ لی لیتا۔“

”او کے۔“ میڈم نے ہامی بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے بھی اورنگ زیب صاحب اور

سراج بھائی سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں۔۔۔۔۔ خاص طور پر سمندر کے موذی جانور کے سلسلے میں۔“

”کیا ارادے ہیں۔۔۔۔۔“

تھریا کے اغواء میں گھر کی ایک ملازمہ شامل تھی، جو لاپتا ہو گئی تھی۔ میڈم نے اس کی کھوج لگانے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی۔ وہ اس حادثے کو شہرت نہیں دینا چاہتی تھی، لیکن اس کے ساتھ اسے اس بات کا احساس بھی ہو گیا تھا کہ تھریا کو کس مقصد کی خاطر اٹھایا گیا تھا؟ جو لوگ اسے ڈی آئی جی سے شادی نہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے ان کی پشت پر یقیناً شیخ حامد یا اس کے زر خرید شکاری کتوں کا ہاتھ شامل ہوگا۔ کنول کا اغواء کا خیال بھی اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔ اورنگ زیب کے گلوڑی اپارٹمنٹ کی بر بادی کا حال بھی اسے سراج نے فون پر بتایا تھا اور یہ تاکید بھی خاص طور پر کی تھی کہ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر رکھے۔

میڈم بہ دستور وقت کی اس گردش پر غور کر رہی تھی جو یکفخت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جب قریب

رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ کال تھریا نے وصول کی پھر اسے میڈم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میڈم الماس کی کال ہے۔“

”اس وقت کیسے یاد کیا؟“ میڈم نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔ ”سب خیریت تو ہے؟“

”تھریا نے کچھ بتایا کہ اسے کن لوگوں نے غواء کیا تھا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ میڈم نے تھریا کی موجودگی کی وجہ سے بات گھما کر جواب دیا۔ ”آج کل کوئی

چیز بھی اپنی اصل شکل میں نظر نہیں آتی۔ ظاہر و باطن میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔“

”سمجھ گئی۔۔۔۔۔ شاید وہ اس وقت بھی تمہارے قریب ہی موجود ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔“ میڈم نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”سراج صاحب کا

کیا حال ہے؟“

”سنے آئی جی کی وجہ سے سراج کے علاوہ اورنگ زیب صاحب بھی الجھے ہوئے ہیں۔“

”کوئی نئی اطلاع۔۔۔۔۔؟“

جواب میں الماس نے پینا کے اغواء اور اس کے اغواء کرنے والوں کی خودکشی کی تفصیل سنائی تو

میڈم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”پینا کو تو کچھ نہیں ہوا۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ اسے کرٹل احتشام نے خاموشی سے گھر بھیج دیا تھا لیکن اس کو اغواء کرنے والوں

نے آئی جی کے سامنے خود کو موت کی نیند سلا دیا جس کی وجہ سے وہ خود بھی بوکھلا گیا ہے۔“

”کچھ پتلا چلا کہ اغواء کرنے والے کون تھے۔۔۔۔۔؟“

”ان کے پاس سے کوئی ایسی شے برآمد نہیں ہوئی جس سے کچھ پتا چلتا۔ کرائے کے غنڈے

رہے ہوں گے۔“

”سراج بھائی اور اورنگ زیب صاحب کی الجھن کا کیا سبب ہے۔۔۔۔۔؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی، لیکن سراج کی کچھ باتوں سے یہ اندازہ ضرور ہوا ہے کہ کچھ ایسے

نامعلوم افراد ہیں جو آئی جی کو بھی اس کی کسی خاص کمزوری کے سبب بلیک میل کر رہے ہیں۔“ الماس

نے تھوڑے تو قف سے کہا۔ ”اورنگ زیب صاحب کے تبادلے کے پیچھے بھی اسی بلیک میل کا ہاتھ

”اینٹ کا جواب اگر پتھر سے نہ دیا جائے تو دشمن اور شیر بن جاتے ہیں۔“ میڈم نے اس بار ہونٹ چباتے ہوئے کہا پھر شام کی چائے کا پروگرام پکا کرنے کے بعد ریسیور کیڈل پر رکھ دیا۔
تھریبا بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے میں مشغول تھی۔



ماربل کے ایک کنسانٹ کو جہاز راں کمپنی کے حوالے کرنے کے بعد لیاقت حسین ڈبل کمین پک اپ میں بیٹھا اس روڈ سے گزر رہا تھا جہاں اس وقت زیادہ ٹریفک نہیں تھا، عام طور پر اس سڑک کو صرف بندرگاہ جانے آنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب یا تو کھلا میدان تھا یا پھر کہیں کہیں مچی آبادی کے کچھ ٹکڑے اور میلے پھیلے مکانات ان لوگوں کی غربت کی داستان سناتے نظر آتے تھے جن کے لیے سر چھپانے کے لیے کوئی باقاعدہ ٹھکانا نہیں تھا، بہر حال اس راستے کی خوب صورتی کی خاطر سڑک کے دونوں جانب کچھ مخصوص فاصلوں سے ایسے درخت بھی لگا دیئے گئے تھے جو اپنا پانی خود زمین کی تہہ سے کشید کرتے تھے۔ مینے میں ایک دو بار کارپوریشن والے وائر ٹینک بھی ان درختوں کی مزاج پرسی کے لیے آ جاتے تھے اسی بہانے وہ مچی آبادی کے خانہ بار بادلوگوں کو اونے پونے پانی بھی فروخت کر دیتے تھے۔

حسب معمول لیاقت حسین اس وقت بھی ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا، جنہوں نے اس کی انگیسی میں داخل ہو کر فرصین کو اغواء کرنے کی جسارت کی تھی۔ انگیسی کے چوکیداروں کو ان لوگوں نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ لیاقت حسین نے بھی جواب میں ان کے پانچ افراد کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ ایک دو آدمی نکل بھی گئے تھے۔ لیاقت حسین پر ایک ذرا آنچ نہیں آئی تھی سیٹھ عثمان کے علاوہ اورنگزیب اور سراج نے بھی اسے پولیس کی دوسری کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی لیکن..... لیاقت حسین اس وقت اس میل نرس کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دشمنوں کا ایجنٹ تھا۔ اسپتال کی وردی جہن کر فرصین کو زہریلا انجکشن لگانا چاہتا تھا۔ قدرت کی غیبی امداد نے اس کی نشاندہی کر دی تھی، مگر لیاقت حسین کو اب بھی اس بات کا افسوس تھا کہ اس نے میل نرس کے سلسلے میں ایس پی اورنگ زیب کو اطلاع دے کر غلطی کی تھی اگر وہ خود اس کے ہاتھ تو ذکر دشمنوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیتا تو شاید انہیں بھی اعزازہ ہو جاتا کہ لیاقت حسین کی زندگی میں فرصین ان کے لیے ترنوالہ بن سکتی تھی۔

اسپتال سے واپسی کے بعد زاحیلہ نیگم نے فرصین کو کچھ دنوں مکمل آرام کی خاطر اپنے پاس روک لیا تھا۔ انگیسی کے لیے دوسرا چوکیدار گل خان کی وساطت سے رکھا گیا تھا، اس لیے اس پر اعتبار کیا جاسکتا تھا۔ سراج نے بھی اسے دہلی زبان میں اشارہ دیا تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس کے کچھ سادہ لباس والے بھی اس کی رہائش پر تعینات کر دیئے گئے ہیں۔ ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود لیاقت حسین کو اس بات کا غم تھا کہ اس نے دشمنوں کو وہ سبق نہیں دیا جو دینا چاہیے تھا۔ باپ کی طرح وہ بھی اس بات کا قائل تھا کہ چان پر بیٹھ کر شکار کرنیوالوں کو اصل شکاری نہیں کہا جاسکتا۔ مرد شکاری وہ ہوتا ہے جو شکاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دے۔

لیاقت حسین نے اپنے باپ کی حویلی میں بھی شیر کی کھال دیوار پر لگی دیکھی تھی، شیر کا سر بھی تھا جس میں اس کی آنکھوں کی درندگی بھی موجود تھی، لیکن سردار سرفراز خان نے اس درندے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر موت کی نیند سلا دیا تھا، جس کی تصویر بھی البم میں محفوظ تھی۔ تصویر میں سرفراز خان اس جنگل کے بادشاہ کے سر پر ایک پیر جمائے سینہ تانے کھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہی تصویر اس وقت لیاقت حسین کے ذہن میں بار بار ابھر رہی تھی۔ جب اس کی نظریں کچھ دیر بعد معمول کے مطابق عقی شیشے کی طرف اٹھیں۔ ایک فاصلے سے آنے والے لوڈنگ ٹرک، دیکھ کر اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، لیکن جب اس نے ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کے نگینے پر نظر ڈالی تو چونک اٹھا..... کسی خطرے کے احساس نے اسے کسی ماہر شکاری کی طرح چوکنا کر دیا۔

اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی، لیکن یہ بات بھی نوٹ کرتا رہا کہ ٹرک آہستہ آہستہ اس کے قریب آنے کی خاطر رفتار بڑھا رہا تھا سڑک کا وہ حصہ دونوں طرف سے ویران تھا، ٹرک کے پیچھے بھی سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔

لیاقت حسین پوری طرح سنبھل کر بیٹھ گیا، سیدھے ہاتھ سے اس نے سراج کا دیا ہوا آٹو بیگ ریوالور نکال کر گود میں رکھ لیا پھر وہ بھی اپنی رفتار اس انداز میں کم کرتا ہوا روڈ کنارے ہونے لگا جیسے کسی انسانی ضرورت نے اسے مجبور کر دیا ہو۔ گاڑی روک کر اس نے انگیسی سے چابی بھی نکال لی۔ آٹو بیگ ریوالور کو سینے میں اڑس کر وہ گاڑی سے اتر ا اور ڈھلان سے گزر کر ایک جھاڑی کی آڑ میں چلا گیا۔ انکڑوں بیٹھ کر اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کا اعزازہ غلط نہیں نکلا۔

تقاب میں آنے والا ٹرک اس کی گاڑی کے عقب میں آ کر رک گیا۔ یکے بعد دیگرے تین افراد کو دیکھ کر نیچے آ گئے۔ ایک کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ چوتھا شخص جو گاڑی چلا رہا تھا وہ بھی نیچے اتر ا۔ اس نے فوری طور پر لیاقت حسین کی گاڑی کے قریب جا کر اندر جھانکا پھر پلٹ کر ساتھیوں کو گرین سگنل بھی دیدیا۔ لیاقت حسین کے وجود میں چھپا دلیر شکاری بیدار ہونے لگا اس نے بیٹھے ہی بیٹھے رائفل والے کو نشانہ بنایا پھر کسی آدم خور چیتے کی طرح اچھل کر سامنے آ گیا۔ رائفل والا ڈھیر ہو چکا تھا باقی تینوں افراد ابھی صورت حال کا پوری طرح جائزہ بھی نہیں لے سکے تھے جب لیاقت حسین نے گرج کر کہا۔

”خبردار..... کوئی غلطی نہ کرنا ورنہ تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ اپنے ہاتھ بھی اٹھا دو ورنہ.....“
سڑک کے کنارے کھڑے تینوں افراد کے ہاتھ فضا میں بلند ہو گئے۔ اپنی ساتھی کا انجام دیکھنے کے علاوہ انہیں لیاقت حسین کے ہاتھ میں دبا آٹو بیگ ریوالور بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک ساتھی کے جہنم رسید ہو جانے کے بعد انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ان کی ایک ذرا سی غفلت ان کے لیے مہموت بن کر سامنے آ سکتی ہے۔

”تت..... تم..... غلط سمجھ رہے ہو دوست۔“ تینوں میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم بھی تمہاری طرح فارغ ہونے کے ارادے سے رکے تھے۔ تم نے ہمارے ایک ساتھی کو گولی مار کر جلد بازی کا

ثبوت دیا ہے۔“

”سر پر خون سوار ہو تو پھر قاتل بھی اندھا ہو جاتا ہے تم نے اگر سیدھی طرح میرے سوال کا جواب نہ دیا تو تم تینوں کا انجام زیادہ عبرت ناک ہوگا۔“ لیاقت حسین نے حقارت سے جواب دیا۔

”یہ تمہاری دوسری حماقت ہوگی۔“ دوسرے نے قدرے جھلا کر کہا۔

”شرافت سے اگل دو کہ تم کس کے شکاری کتے ہو.....؟ لیاقت حسین کے تیز خطرناک ہونے لگے۔

”رائفل والے کے انجام پر غور مت کرنا..... میں تم تینوں کو مار دوں گا، نہیں..... اس طرح زندہ چھوڑوں گا کہ تم خود اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ ایک بات اور سن لو..... وقت کم ہے..... اس سے پہلے کہ کوئی دوسری گاڑی آئے یا لوگ جمع ہوں، پالتو کتوں کی طرح میرے اشارے پر دم ہلانا شروع کر دو..... تم کس کے آدمی ہو؟“

”ہمارے بارے میں تمہارا اندازہ.....“ دوسرے شخص نے لیاقت حسین کو گھورتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر وہ بھی حلق پھاڑ کر چیخا ہوا سڑک پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ لیاقت حسین کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا، دوسرے شخص کے داہنی کھٹنے کی ہڈی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔

”خنزیر کے بچہ.....“ لیاقت حسین کی قہر آلود آواز پھر فضا میں بلند ہوئی۔ ”تم کس کے آدمی ہو؟ کون ہے وہ نامزد جو کل کر خود سامنے نہیں آتا؟“

”ہم اس کا نام نہیں جانتے۔“ دو آدمی جو کسی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوئے تھے ایک ساتھ ہی بول پڑے۔ ”ہمیں فون پر تمہیں قابو کر کے ایک مقام پر پہنچانے کا حکم ملا تھا۔“

”فون کرنے والا کون تھا؟“ لیاقت حسین کی نگاہوں میں خون اگلنے لگا۔ ”کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوگا جس ولد الحرام سے تم واقف ہو گے؟“

”ہاں..... لیل..... لیکن ہم نے زبان کھول دی تو وہ بھی ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”پھر میرا انتقام تم کتوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہے، میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔“ لیاقت حسین نے زہر خند لہجے میں کہا۔ پھر اس کے آٹو بیک ریوآلور سے تیسرا فائر ہوا۔ اس بار ایک شخص چیخا ہوا زمین پر آگرا۔ کھٹنے کی ہڈی چور چور ہونے کے بعد وہ بھی ماہی بے آب کی طرح ترپ رہا تھا۔ لیاقت حسین کی نگاہوں کا زاویہ تبدیل ہوا تو تیسرا آدمی خوف سے ہکھلنے لگا۔

”نن..... نن..... نن..... گولی مت چلانا..... ہم..... میں تم کو اس کا نام بتاتا ہوں..... لیل..... لیکن وہ جس حیثیت کا مالک ہے تم یا پولیس اس پر شبہ بھی نہیں کر سکتے۔“

”تقریر نہیں..... نام اگل ڈالو کم ذات ورنہ.....“

لیاقت حسین اپنا جملہ عمل نہیں کر سکا۔ آخری شخص نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی۔ لیاقت حسین کو اس کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کو وہ بھی چھلانگ لگانے والے کے ساتھ ہی گرد میں لوٹ پوٹ ہو گیا لیکن پھر وہ اسے بھی قابو کر کے اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ پہلی

فرمت میں اس نے پستول والا ہاتھ فضا میں بلند کر کے پستول کے دسٹے کو اس کے سر پر پوری قوت سے مارا۔ اس نپے تلے وار نے اس کے مقابل کو بھی بے ہوش کر دیا۔ لیاقت حسین نے تیزی سے سنبھل کر پوزیشن سنبھالی پھر اس نے بے ہوش ہونے والے شخص کے کھٹنے پر بھی ایک گولی داغ دی۔ بے ہوشی کے باوجود اس کا جسم پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔

سڑک پر دور دور تک ٹریفک کا کوئی نشان نہیں تھا۔ لیاقت حسین چاہتا تو اپنی گاڑی پر بیٹھ کر وہاں سے نکل جاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ مرنے والے کے علاوہ اس نے تینوں زخمیوں کو بھی گھسیٹ گھساٹ کر اپنی ڈبل کیبن کے پچھلے حصے میں ڈال لیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ علاقے کے پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ تینوں افراد بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ لیاقت حسین انہیں گاڑی میں چھوڑ کر دو پھول والے ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا۔

”تم.....“ ایس ایچ او نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تم لیاقت حسین ہوتا.....؟“

”آپ کیسے جانتے ہو صاحب؟“ لیاقت حسین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”تمہیں یاد نہیں لیکن میں تمہیں ایک بار ایس پی اورنگ زیب صاحب کے دفتر میں دیکھ چکا ہوں۔“ ایس ایچ او نے سامنے رکھ ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں سوال کیا۔

”اس وقت یہاں کیسے آنا ہوا.....؟“

”میں آپ سے ایک درخواست کروں گا.....“

لیاقت حسین نے کرسی پر بیٹھے بغیر سنجیدگی سے درخواست کی۔

”اس وقت آپ میرے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنا..... اور..... اور میں کسی اورنگ زیب یا سراج صاحب کو نہیں جانتا..... وہ معزز افسران ہیں صاحب اور میں.....“

”کیا تم لیاقت حسین نہیں ہو؟ ایس ایچ او نے اسے غور سے گھورتے ہوئے دوبارہ دریافت کیا۔

”میرا نام لیاقت حسین ہی ہے صاحب لیکن اس وقت میں مجرم کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ ایس ایچ او چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیا جرم کیا ہے تم نے.....؟“

”اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا صاحب۔“ لیاقت حسین نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ”باہر میری ڈبل کیبن کے پچھلے حصے میں ایک لاش اور تین اپناج پڑے ہیں۔ مجھے حراست میں لینے کے بعد ان کو بھی لپھ لیں۔“

ایس ایچ او حیرت سے اچھل پڑا۔ اس نے کھنٹی بجا کر اپنے عملے کے افراد کو بلا کر تعہد یق کی تو لیاقت حسین کو بھی فوری طور پر پھنکڑی پہنا دی گئی۔ لیاقت حسین نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

لاش اور تینوں زخمیوں کو نمٹانے کے بعد وہ دوبارہ اپنے دفتر میں داخل ہوا جہاں وہ مسلح سپاہی لیاقت حسین کے دائیں بائیں موجود تھے۔ کمرے میں آنے سے پیشتر اس نے اورنگ زیب کو کبھی حالات سے باخبر کرنا ضروری سمجھا تھا۔ دوسری طرف سے ملنے والی ہدایات کے بعد ہی اس نے لیاقت حسین کو سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔

”تم نے جو اقدام جرم کیا ہے اس کی وجہ کیا تھی؟“

جواب میں لیاقت حسین نے فرمین کے انٹیکسی سے انخواہ ہونے والی تفصیل کے ساتھ میل نرس کی خودکشی کی پوری کہانی بھی دہرا دی۔

”اب تمہیں مرنے والے اور زخمیوں پر کسی قسم کا شبہ ہوا تھا؟..... کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہو گی؟“

”اس کی تفصیل بھی اپناج ہونے والے ہی بتا سکیں گے صاحب۔“ لیاقت حسین نے بہ دستور بے پروائی سے کہا۔ ”ان کو ہوش میں آنے دیں..... پھر آپ جانو اور آپ کا قانون۔“

”ون منٹ.....“ ایس ایچ او نے کسی فوری خیال کے پیش نظر کسمسا کر دریافت کیا۔ ”تم نے ان کو کس اسلحے سے قابو کیا تھا؟“

”معاف کرنا صاحب.....“ لیاقت حسین نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”پستول میری جیب میں ہے، آپ اسے بھی برآمد کر لیں۔“

ایس ایچ او کے اشارے پر ایک سپاہی نے لیاقت حسین کی جیب سے پستول بھی نکال لیا۔

”سزا اور جزا کا حساب تو صرف اوپر والے کا کھرا ہوتا ہے صاحب..... ہم سب تو کٹھ پتلی ہیں۔“

”تم.....“ ایس ایچ او نے تھوڑے توقف کے بعد سوال کیا۔ ”موجودہ واردات میں خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے بعد کیا تم کسی کو اطلاع نہیں دو گے؟“

”نہیں.....“ لیاقت حسین نے پہلی بار ہونٹ کاٹنے ہوئے کہا۔

”میری معلومات کے مطابق تم سیٹھ عثمان کے خاص آدمی ہو..... کیا میں انہیں صورت حال سے آگاہ کر دوں؟“

”پہلے مجھے حوالات میں بند کر دو صاحب پھر..... جو مرضی آئے کرتے رہنا۔“

لیاقت حسین جواب دینے کے ساتھ ہی باہر جانے کے لیے گھوما تو دونوں مسلح سپاہی بھی اس کے ساتھ باہر نکل گئے..... ایس ایچ او کے چہرے پر غور فکر کے تاثرات پھیل کر اور گہرے ہوتے چلے گئے۔



اورنگ زیب کے دفتر میں داخل ہوتے ہی محلے کے ایک فرد نے اسے بتایا تھا کہ آئی جی بہت دیر سے اسے یاد کر رہا ہے وہ سیدھا آئی جی کے کمرے میں چلا گیا۔ سراج کے ذریعے اسے اطلاع

مل چکی تھی کہ پٹنا کے انخواہ میں ملوث دونوں آدمیوں نے آئی جی کے سامنے ہی خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔

حسب توقع آئی جی کے چہرے پر اس وقت بھی زلزلے کے تاثرات باقی تھے۔ اورنگ زیب نے سر کی خفیف جنبش سے اسے سلام کیا پھر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ آئی جی نے اسے جن نظروں سے دیکھا اس سے بھی جلاہٹ ہی ٹپک رہی تھی۔

”آپ نے مجھے یاد کیا تھا؟“

”ڈیڑھ گھنٹے پہلے کی بات ہے۔“ آئی جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”آپ شاید آج دیر سے دفتر آئے ہیں۔“

”میں نے اس سے پیشتر بھی کبھی حاضری رجسٹر کی طرف توجہ نہیں دی۔“ اورنگ زیب نے شانے اچکائے۔

”پولیس کے محکمے میں حادثات کبھی انوی ٹیشن دے کر نہیں آتے۔ اچانک ہی کوئی واردات ہوتی اور اہلکار حرکت میں آ جاتے ہیں۔“

”آپ کس حادثے کی تفتیش میں معروف تھے.....؟“

آئی جی نے پہلو بدل کر معلوم کیا۔ چہرے کی رنگت بتا رہی تھی کہ اسے اورنگ زیب کا جواب پسند نہیں آیا تھا۔

”میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے اپنے عہدے اور ملازمت سے زیادہ ایسے معاملات سے دلچسپی ہوتی ہے جو ہمارے معاشرے کو کھوکھلا کر رہے ہیں..... اس وقت بھی ایک ایسا ہی معاملہ درپیش تھا۔“

آئی جی نے الجھنے کی غلطی نہیں کی۔ ایک لمحے تک اورنگ زیب کو نگاہوں نگاہوں میں تولتے ہوئے بولا۔ ”کل مجھے کرنل احتتام نے چائے پر بلایا تھا..... آپ کا ذکر بھی درمیان میں آیا تھا۔“

”کرنل بھی ایک محب وطن آفیسر ہے..... آفیشل معاملات میں میری اور کرنل کی ملاقاتیں بھی اکثر ہوتی رہتی ہیں۔“

”کیا آپ نے کرنل سے اپنے ہیڈ کوارٹر میں تہاڑے کا ذکر کیا تھا؟“

”جی ہاں..... میں نے اس کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”کرنل سے گفتگو کے دوران مجھے اس بات کا اندازہ ہوا تھا کہ آپ کے پاس غالباً کوئی ایسا ہم نامہ موجود ہے جس کی بنا پر آپ کسی بھی معاملے میں چھان بین کر سکتے ہیں۔“

”آفس آنے سے کچھ دیر پیشتر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج نے مجھے اطلاع دی تھی کہ انخواہ کے ایس میں ملوث دو مجرموں نے آپ کے سامنے خودکشی کی ہے۔“ اورنگ زیب نے موضوع بدل کر

پہما۔ ”کون تھے وہ.....؟“

”اس اغواء کے معاملے میں بھی کڑل احتشام نے مجھ سے کہا تھا کہ براہ راست دونوں مجرموں سے تفتیش کروں لیکن انہوں نے زبان کھولنے کے بجائے خود کو موت کے حوالے کر دیا۔“
 ”فرحین کو انجکشن لگانے کے لیے آنے والے میل نرس نے بھی زبان کھولنے کے بجائے موت کو ترجیح دی تھی۔“ اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”صاف ظاہر ہے کہ ان مجرموں کی پشت پر کوئی ایسی بااثر شخصیت ہے جو زبان کھولنے کی صورت میں اپنے شکاری کتوں کو زیادہ اذیت ناک انجام تک پہنچاتی ہوگی۔“

”آئی، ایگری دو پولیٹکن..... ہمارے علم میں صرف ایک ہی نام ہے۔ آکنولیس، جو مرکر بھی زندہ ہو گیا ہے لیکن..... ابھی تک صرف شبہات سامنے آ رہے ہیں..... اس کا پتا اور ٹھکانا کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔“

”آپ کنول کے اغواء اور اس کی ماں کی موت کو کس خانے میں ڈالیں گے؟“
 ”ہو سکتا ہے کہ وہ شیخ حامد کے ہسٹری میٹر غنڈوں کی حرکت ہو۔“ آئی جی نے جزیز ہو کر جواب دیا۔ ”میں نے اس سلسلے میں کڑل احتشام کو بھی نٹولنے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے بھی کنول کے بارے میں کچھ کہنے سے گریز ہی کیا۔“

”کڑل کا تعلق ٹٹری کے حساس شعبے سے ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس نے رازداری سے کام لیا ہو۔“

”ایک بات اور دریافت کرنا چاہوں گا۔“ آئی جی نے اس بار دوستانہ انداز میں کہا۔ ”جن آدمیوں نے میرے سامنے خود کشی کر لی انہوں نے کس لڑکی کو اغواء کیا تھا؟“
 ”اس کا علم بھی کڑل ہی کو ہوگا۔“ اورنگ زیب نے بڑی خوب صورتی سے جواب دیا۔ ”میری اطلاع کے مطابق اس نے صرف دونوں اغواء کنندگان کو سول پولیس کے حوالے کیا تھا لڑکی کا ذکر درمیان میں نہیں آیا تھا۔“

”آکنولیس کے بارے میں اب آپ کا کیا خیال ہے؟“
 ”میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں کہ جب تک اس کی لاش کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں مردہ نہیں کہوں گا..... اب تو کنول نے بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کی زندگی کی تصدیق کر دی ہے۔“
 ”میں نے اس ضمن میں بھی کڑل سے بات کرنی چاہی تھی، لیکن اس نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا۔“

اورنگ زیب کچھ کہنا چاہتا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل ملے۔ آئی جی سے اشارے میں معذرت طلب کرنے کے بعد اس نے موبائل آن کر لیا۔ دوسری جانب سے بنگرگاہ کے علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او بول رہا تھا اس نے لیاقت حسین کے بارے میں جو اطلاع دی اسے سن کر اورنگ زیب بھی وقتی طور پر بوکھلا گیا تھا۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لیاقت حسین ہی ہے؟“
 ”نہیں سر..... میں اسے مسٹر سراج کے ساتھ بھی دیکھ چکا ہوں۔“
 ”آپ پرچہ کانٹے میں جلّت کا مظاہرہ نہ کریں، میں پہنچ رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا پھر اس نے آئی جی کے استفسار پر اسے بھی ملنے والی اطلاع دے دی۔
 ”کیا میں آپ کے ساتھ چلوں؟“

”شکریہ سر.....“ اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ضرورت ہوئی تو آپ کو بھی زحمت دوں گا۔“

اورنگ زیب کے جانے کے بعد آئی جی کسی سوچ میں غرق تھا جب ٹیلی فون کی کھنٹی بجی، آئی جی نے اس کی لائن لیڈی سیکریٹری کی طرف کردی۔ ایک منٹ بعد ہی لیڈی سیکریٹری نے اندر داخل ہو کر کہا تھا۔

”سر..... کوئی ضروری کال ہے لیکن فون کرنے والے نے نام نہیں بتایا۔“

”میں دیکھتا ہوں.....“ آئی جی نے کچھ سوچ کر جواب دیا پھر لیڈی سیکریٹری کے جاتے ہی اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

”آئی، جی..... اسپیکنگ!“

”کوبرا بول رہا ہوں.....“ دوسری جانب سے سرو لہجے میں کہا گیا۔ ”تمہارے اور اورنگ زیب کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ مجھ تک پہنچ گئی ہے..... تمہارے پرسنل آفس میں ایک سوئی بھی گرے تو اس کی آواز میرے کانوں تک آ جاتی ہے۔“

”جانتا ہوں لیکن اب تم کیا چاہتے ہو؟“ آئی جی کے لہجے سے بے بسی چمک رہی تھی۔

”ہمارے اشاروں پر دم ہلاتے رہو۔ اسی میں تمہاری خیریت ہے۔“

”وہاٹ نان سنس۔“ آئی جی تملّا اٹھا۔ ”کیا صرف یہی کہنے کی خاطر اپنا اور میرا وقت برباد کیا ہے؟“

”بکواس نہیں.....“ دوسری جانب سے بولنے والے کا لب ولہجہ مزید سرد ہو گیا۔ ”ہم تمہاری ماقبت بھی خراب کرنے کی پوزیشن میں ہیں..... تمہاری ایک ذرا سی حکم عدولی بھی تمہیں ان افراد کی طرح خود کشی پر مجبور کر سکتی ہے جس کا ذکر ابھی تم اورنگ زیب سے کر رہے تھے.....“

آئی جی جواب دینے کے بجائے کرسی پر کسمسا کر رہ گیا۔

”لیاقت حسین نے اب جو قدم اٹھایا ہے اس کی اطلاع تمہیں اپنے ہونہار ایس پی سے مل چکی ہے۔“

”ہاں لیکن ابھی پوری تفصیل.....“

”تفصیل کے پکر میں پڑنے کی حماقت بھی نہ کرنا.....“ کرخٹ اور سفاک لہجے میں جواب ملا۔ ”اس بارے لیاقت حسین کو پولیس کے ہاتھوں رہائی نہیں ملنی چاہیے..... سن رہے ہو..... میں کیا

کہہ رہا ہوں؟“

”کیا میرے مرنے والے تمہارے.....“

”شٹ اپ.....“ دوسری جانب سے حقارت سے کہا گیا۔ ”جو کچھ کہا گیا ہے صرف اس پر عمل کرو..... اس کے سوا تمہارے پاس کوئی دوسرا آپشن بھی نہیں ہے.....“

جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔ آئی جی نے ہونٹ چباتے ہوئے ریور کو کریڈل پر رکھنے کے بجائے فضا میں اچھال دیا۔

✦✦✦

سکندر علی شاہ اس وقت بستر پر لیٹا کسی خیال میں گم تھا۔ نگینہ اس کے ساتھ مسہری کی پشت سے ٹپک لگائے بیٹھی آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ کچھ دیر پیشتر دونوں نے ناشابو خواب گاہ میں کیا تھا۔ سکندر علی شاہ ناشتے کے بعد ہی مسہری پر نیم دراز ہو گیا۔ ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب وہ کسی خاص معاملے میں الجھا ہوتا تھا، ان لمحوں میں نگینہ اسے اپنے وجود کی گرمی سے بہلاؤ رہتی تھی، آج بھی اس نے ابھی تک شب خوابی کے لباس کو بدلنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ ایسی صورت میں سکندر علی کے ہاتھ بھی حسب ضرورت اس کے جسم سے توانائی کشید کرتے رہتے تھے، لیکن آج وہ کسی الجھن سے دوچار تھا۔ نگینہ کچھ دیر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہی پھر دبی زبان میں بولی۔

”کیا سوچ رہے ہیں.....؟“

”وہی..... جو اکثر تمہارے ذہن پر بھی اندھیرے کے بھوت کی طرح سوار ہو جاتا ہے۔“ سکندر علی شاہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”دشمن اندھیرے میں ہو تو اس پر کاری ضرب لگا: انسان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔“

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں.....“ نگینہ نے سکندر علی شاہ کا اشارہ سمجھ کر جواب دیا۔ ”میں مجھ اندھیرے میں ہی شکار ہوئی تھی۔“

”ہماری چھوٹی سے چھوٹی حرکتیں بھی اس کے علم میں آ جاتی ہیں، مگر میں کوئی جوابی کارروائی کرنے سے قاصر ہوں..... یہ بھی سچ ہے کہ آج میں جس مقام پر ہوں اس میں بھی اسی کا مالی تعاون شامل ہے اس کے آدمیوں نے داسے، درے، سٹے میری مدد کی تھی لیکن وہ خود بھی سامنے نہیں آیا۔“

”پھر..... اب سوچنے سے بھی کیا حاصل ہوگا؟“ نگینہ نے اس کے اور قریب ہوتے ہوئے کہا۔ سکندر علی شاہ نے بھی ذہنی الجھن سے چھٹکارا پانے کی خاطر نگینہ کی طرف کروٹ بدلی لیکن اسی وقت فون کی گھنٹی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

”ہیلو..... کون؟“ سکندر علی شاہ نے ریور اٹھا کر حسب معمول بھاری لہجے میں دریافت کیا۔

”تمہاری دلربا.....“ دوسری جانب سے مدہم لہجے میں ایک مترنم آواز ابھری۔

”ون منٹ.....“ سکندر علی شاہ نے نگینہ کو اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ سکندر

علی شاہ کی اس عادت سے واقف تھی کہ اپنے خاص کارندوں سے ہمیشہ تنہائی میں گفتگو کرنے کا عادی تھا

”میں نے تم سے کہا تھا کہ موبائل پر کال کیا کرو..... وہ بھی کسی خاص موقع پر۔“ نگینہ کے جانے کے بعد سکندر علی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ دلربا کی آواز اس کے لیے غیر مانوس نہیں تھی۔ وہ ایک بار خود شکار ہونے کے بعد اب سکندر علی شاہ کے لیے نئے نئے تازہ شکار فراہم کرتی تھی۔ اسی خدمت کے عوض اسے خاصی چھوٹ دے دی گئی تھی.....!!

”مجھے تم سے ایک شکوہ کرنا ہے۔“ اس بار بھی بیکتی آواز میں کہا گیا۔ ”کسی پرندے کو ذبح کرنے کے بعد اس کی کھال بھی احتیاط سے اتارتے ہیں لیکن ماروی بتا رہی تھی کہ تم نے تو اس غریب سے کوئی رومانی گفتگو کیے بغیر کسی بھوکے درندے کی طرح بھنبھوڑ کر رکھ دیا..... یہ بھی بتا رہی تھی کہ تم نے خواب گاہ سے جاتے وقت زبان بند رکھنے کی دھمکی بھی بڑے خوفناک لہجے میں دی تھی.....“

سکندر علی شاہ دوسری جانب سے کہی جانے والی بات سن کر ہونٹ چبانے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی نے اس کے اگلے کپڑوں پر گندگی اچھال دی ہو چنانچہ اس کی زبان کا لٹکھڑا جانا بھی قدرتی امر تھا۔

”اور کیا کہا تھا اس..... نے؟“

”کیا ہوا میرے راجا..... تم اس قدر برہم کیوں ہو گئے؟“ حیرت سے دریافت کیا گیا۔

”وہ حرا حرا دی بکواس کرتی ہے۔“ سکندر علی شاہ نے یہ دستور بگڑے ہوئے تہرے سے کہا۔ ”میں اس روز ایک ضروری کام میں مصروفیت کی وجہ سے فارم ہاؤس نہیں گیا تھا..... وہ آئی ضرور تھی لیکن دوسری صبح واپس چلی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے تم سے جھوٹی بکواس کر دی ہو.....“

”نہیں میرے راجا..... ماروی مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اور اگر تم معلومات کر کے اس کی تصدیق کر دو تو میں معاوضے کی دو گنی رقم واپس کرنے کو تیار ہوں..... ہو سکتا ہے کہ تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے کسی کارندے کی نیت اس پر خراب ہو گئی ہو۔“

”بکومت.....“ سکندر علی شاہ نے اس بار جھلا کر کہا۔

”میرے کارندے جانتے ہیں کہ میرے کسی حکم کے خلاف پلکیں جھپکانے کی سزا بھی موت ہوتی ہے۔ تم جو خیال ظاہر کر رہی ہو اس کے بارے میں کوئی سوچنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔“

”اوکے..... اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کل تک تمہاری رقم واپس کر دی جائے گی لیکن ماروی کی غلط بیانی بھی اسے بہت مہنگی پڑے گی..... میں اس سے ایک کی جگہ دس وصول کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔“

”جلدی نہیں.....“ سکندر علی شاہ نے دوسری جانب سے ملنے والے جواب پر غور کرتے ہوئے ہاٹ لہجے میں کہا۔ ”تمک حرام ماں کے پیٹ سے نہیں نکلتے..... ضرورت اور ہوس بھی بد ذاتوں کو ٹھک حرای پر مجبور کر دیتی ہے..... اگر تم کو لڑکی کی بات پر یقین ہے تو پھر مجھے بھی اپنے پالتو کتوں کو

چیک کر لینے دو..... ممکن ہے کسی حرامزادے کی موت نے اس کی نیت خراب کر دی ہو۔“
”میرے لیے کوئی نیا حکم.....“ سکندر علی شاہ کا جواب سن کر دوسری جانب سے گفتگو کرنے والی کے لہجے میں پھر ہلکے آگیا۔

”ابھی نہیں لیکن..... میں تمہیں جلد ہی خدمت کا موقع دوں گا۔“

ریسور کرڈیل پر رکھنے کے بعد سکندر علی شاہ کچھ دیر ہونٹ چباتا رہا پھر وہ اٹھ کر لباس تبدیل کر رہا تھا جب نگینہ لہرائی تل کھاتی دوبارہ اجازت لے کر اندر آگئی۔

”اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“

”ایک ضروری کام پیش آ گیا ہے۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے؟“ نگینہ نے اس کی نظروں میں دور تک جھانکتے ہوئے ایک ادا سے

سوال کیا۔

”لباس تبدیل کر لو..... ہو سکتا ہے کہ مجھے آنے میں دیر ہو جائے۔“

پھر.....! حویلی سے نکل کر سیدھا فارم ہاؤس کا رخ کیا تھا پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر وہ دلربا کی شکایت پر غور کرتا رہا۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ ہی اس کا گن مین بھی براجمان تھا۔ حسب معمول کچھ فاصلے سے ایک وین بھی پیچھے پیچھے تھی جس میں اس کے چھ مسلح محافظ موجود تھے۔

فارم ہاؤس کے کارندے بھی خلاف توقع اس کی آمد پر چوکنے ہو گئے۔ سکندر علی شاہ کسی بے تاج بادشاہ کی طرح ملازموں کے سلام کے جواب میں سر ہلاتا اپنے مخصوص ریٹ ہاؤس میں جا کر ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا پھر باری باری ڈیوٹی پر موجود کارندوں اور گیٹ کے چوکیداروں کو بلا کر ان سے تفتیش شروع کر دی۔ سب کا ایک ہی بیان تھا کہ مہمان لڑکی کی سرشام ہی فارم آگئی تھی۔ ملازموں نے خاطر خواہ اس کی مہمان نوازی کی تھی۔ صبح وہ واپس ہو گئی تھی۔ مخصوص ریٹ ہاؤس کے ملازم نے کہا تھا کہ وہ چراغ جلنے کے بعد اسے یہ تاکید کر کے چلا گیا تھا کہ خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے نہ بند کیا جائے۔ گیٹ کے چوکیدار نے بھی یہی بیان دیا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر چوکس تھا۔ اس کی ڈیوٹی ماروی کے جانے کے بعد ختم ہوئی تھی، اس دوران نہ کوئی اندر آیا نہ باہر گیا۔

سکندر علی شاہ پوری توجہ سے سب کے بیان سن رہا تھا اس نے آخر میں گونگے کو طلب کیا۔ حسب معمول گونگے نے سکندر علی شاہ کو دیکھ کر سلام کیا پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ سکندر علی شاہ اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس نے اس بات کو بار بار محسوس کیا تھا کہ گونگا ان دنوں زیادہ خوش تھا جب وہ ڈرائیور کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا تھا۔ فارم ہاؤس کی نگران اعلیٰ ہونے کے بعد سے وہ کچھ گھٹا نظر آتا تھا لیکن اس نے کبھی اس کا شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔

سکندر علی شاہ نے اپنے مخصوص انداز میں گونگے سے بھی ماروی کے بارے میں تحقیق کی۔ گونگا غوں..... غاں..... کر کے جواب دیتا رہا۔ کسی عورت یا لڑکی کے بارے میں گفتگو کرتے وقت گونگے کے چہرے سے اس وقت بھی بیزار ہی عیاں تھی۔ سکندر علی شاہ نے روز اول سے اس کی اس فطرت

کو نوٹ کیا تھا..... پھر بھی سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔

”فارم ہاؤس میں تمہاری حیثیت منظم اعلیٰ کی ہے۔ رات کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے راؤنڈ

لگاتا بھی تمہاری ذمہ داری ہے..... کیا کل رات تم نے لڑکی کی موجودگی کے دوران کسی کو ادھر آتے

جاتے دیکھا تھا؟“

جواب میں گونگے نے نفرت سے شانے اچکا کر یہی کہا تھا کہ اس نے کسی کو نہیں دیکھا۔

”پھر.....“ یکھت سکندر علی شاہ نے جھلا کر بلند آواز میں کہا۔ ”اگر کوئی ادھر نہیں آیا تو کیا

بدروحوں نے یہاں آکر لڑکی کو بے آبرو کیا تھا۔“

گونگے نے دوبارہ بے پروائی سے شانے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو سکندر علی شاہ نے

جھلا کر اس کے گھٹنے پر ایسی ٹھوک ماری کہ وہ لوکھڑا کر رہ گیا۔ ایک لمحے کو اس کی نگاہوں میں جوابی

کارروائی کے انتقامی شعلے لپکے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سکندر علی شاہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کے

چہرے سے پھر تیشی ٹپکنے لگی۔

”چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مجھے وہ حرامی درکار ہے جس نے میری امانت میں خیانت کی ہے۔

ناکامی کی صورت میں تمہارے علاوہ میں دوسروں کی چوڑی بھی ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔“ سکندر علی شاہ نے

قہر آلود نگاہوں سے گونگے کو دیکھا۔ ”سب نمک حراموں تک میرا پیغام پہنچا دو..... کسی ایک کو بچانے

کی کوشش کی تو تم سب کا انجام خطرناک ہی ہوگا۔“

گونگا سہم کر رہ گیا۔ وہ ایک بار پھر غوں..... غاں..... کر کے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی

کوشش کر رہا تھا جب موبائل پر سنگٹل ملا۔ روشن اسکرین پر نظر آنے والے نمبر سکندر علی شاہ کے لیے نیا

تھا پھر بھی اس نے کسی خیال کے تحت موبائل آن کر کے بھاری بھر کم لہجے میں پوچھا۔

”کون ہے؟“

”نئے نمبرز دیکھ کر تیزی سے دم ہلانے کی عادت چھوڑ دو سکندر علی شاہ۔“ دوسری طرف

سے ”شکرہ“ کا حوالہ دینے کے بعد سردمہری سے کہا گیا۔

”تمہاری زندگی کا ایک لمحہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں دور رہ کر بھی تمہاری سانسوں کی

رفتار اور اس کے اتار چڑھاؤ سے باخبر رہتا ہوں۔“

”معذرت خواہ ہوں۔“ سکندر علی شاہ نے پل بھر میں کینچلی بدل کر اپنی صفائی پیش کرنے کی

کوشش کی۔ ”اس وقت کسی معاملے کی چھان بین کرنے کی وجہ سے میں ذرا الجھا ہوا تھا.....“

”جانتا ہوں..... اسی لیے تمہیں فون بھی کیا ہے۔“ اس بار سرد لہجے میں کہا گیا۔ ”تم ایک گونگے

پر اپنی مردانگی کا اظہار کر رہے ہو..... جس نے لڑکی کو داغدار کیا وہ گونگا نہیں ہے۔“

”پھر..... پھر..... وہ کون تھا؟“

”فی الحال حویلی جا کر آرام کرو..... مجرم جو بھی ہے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اس کی اطلاع

بھی کسی نہ کسی ذریعے سے تمہیں مل جائے گی۔“

”میں آپ کے اس احسان کو بھی فراموش نہیں کروں گا.....“ سکندر علی شاہ نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔ ”میری جگہ آپ ہوتے تو شاید آپ بھی.....“

”نہیں.....“ اس بار دوسری جانب سے بولنے والے نے گرج کر تنبیہ کی۔ ”دوبارہ کبھی زمین کی خاک کو آسمان سے ملانے کی حماقت بھول کر بھی نہ کرنا.....“

”میں پھر معذرت خواہ ہوں۔“ سکندر علی شاہ نے دل پر جبر کر کے انکساری سے کام لیا۔

”ایک بات اور سن لو..... تم نے گونگے کو ڈرا نیوہری سے ہٹا کر فارم ہاؤس کیوں منتقل کیا تھا اس کی وجہ سے مجھے معلوم ہے..... کیا تم گڑھے مردوں کو دوبارہ اکھاڑنا پسند کرو گے؟“

”جج..... جج..... جی..... نہیں۔“ جواب میں سکندر علی شاہ کسی وجہ سے ہٹلا کر رہ گیا پھر وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

سکندر علی شاہ نے موبائل آف کر کے گونگے کو نفرت سے گھورا لیکن اس کے اظہار سے گریزی مناسب سمجھا۔



اورنگ زیب کے چہرے پر بڑی کبمیر سنجیدگی مسلط تھی۔ تھانہ انچارج نے اسے لیاقت حسین کے سلسلے میں جو تفصیل بتائی وہ ایسی نہیں تھی جسے شانے کی ایک جہش سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ انکیسی سے فرحین کے اغواء کے وقت جو پانچ لاشیں سامنے آئی تھیں اس کا معاملہ کچھ اور تھا لیکن کسی ثبوت کے بغیر ایک آدمی کو گولی مار کر ہلاک کر دینا اور تین کو اپنا ج کر دینے والی بات سنگین نوعیت کی تھی۔ اگر ایس ایچ او واقف نہ ہوتا..... اطلاع دیے بغیر وہ ضابطے کی کارروائی کر گزرتا تو کاغذات میں رد و بدل کی گنجائش بھی ممکن نہیں تھی۔

اسے علم تھا کہ کچھ غیبی قوتیں لیاقت حسین کو قبل از وقت خطرے سے آگاہ کر دیتی ہیں۔ فتح حامد کے فرار ہوتے وقت اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے بھی لیاقت حسین ہی نے گاڑی کا رخ اچانک گڈانی کے ساحلی علاقے کی طرف پھیر دیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے صرف ایک جملہ کہا تھا جس کی تصدیق بعد میں ہو گئی تھی، لیکن اس نے گاڑی کا رخ کیوں موڑا تھا؟ کیا جملہ کہا تھا؟ یہ باتیں بعد میں اسے بھی یاد نہیں تھیں۔ سراج بھی اس کا گواہ تھا لیکن عدالت ان باتوں کو نہیں مانتی۔ وہاں گواہی، شہادت اور محسوس ثبوت کی بنیادوں پر معاملے نمٹائے جاتے ہیں۔ محض شک کی بنیاد پر سرعام فائرنگ کر کے چار آدمیوں پر گولیاں برسانے والی منطق کسی جج کے حلق کے نیچے نہیں اتر سکتی تھی۔

اس وقت بھی وہ سوچ میں گم تھا جب اس نے آئی جی کے دفتر سے نکلنے کے بعد سراج کو اس کے دفتر سے پک کیا تھا۔ گاڑی کے دوبارہ حرکت میں آنے کے بعد سراج نے اورنگ زیب کے چہرے پر سنجیدگی اور غور و فکر کے گہرے تاثرات دیکھے تو اس نے دبی آواز میں کہا۔

”معاملہ کچھ سنگین معلوم ہوتا ہے؟“

اورنگ زیب نے جواب نہیں دیا وہ بدستور لیاقت حسین کے بچاؤ کے سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔

”ہم اس وقت کہاں چل رہے ہیں؟“ اس بار سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کچھ دیر پیشتر بندرگاہ کے علاقے کے ایس ایچ او نے اطلاع دی ہے کہ ایک شخص نے محض اسکان کی بنا پر ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور تین افراد کو اس انداز میں گولی ماری ہے کہ وہ تمام زندگی اپنا ج رہیں گے۔“

”پھر..... ہم وہاں کس مقصد سے جا رہے ہیں.....؟ سراج نے سوال کیا۔“ ہمارا اس معاملے

سے کیا آفیشل تعلق ہے؟“

”ایس ایچ اوکا واقف کار ہوگا.....“ سراج نے ہونٹ چباتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

”عجرب نے ایس ایچ او کو تمہارے نام کا حوالہ بھی دیا ہے.....“ اورنگ زیب نے سراج کی

جانب دیکھا۔ ”اب کیا کہو گے.....؟“

”آپ کا اشارہ کیا لیاقت حسین کی طرف ہے؟“ سراج نے اورنگ زیب کے جواب اور

بندرگاہ جانے والی روڈ کے حوالے سے چونک کر لیاقت حسین کا نام لیا تو اورنگ زیب مسکرا دیا۔ پھر

اس نے ایس ایچ او کی جانب سے ملنے والی سنگین اطلاع سراج کو بھی سنا دی۔ تفصیل سننے کے بعد

سراج بھی ہونٹ چبانے لگا۔ اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

”چپ کیوں ہو گئے.....؟“

”مجھے یقین ہے کہ اگر معاملہ لیاقت حسین کا ہے تو اسے پھر غیبی قوتوں کی طرف کوئی نہ کوئی

اشارہ ضرور ہوگا۔“ سراج نے سنجیدگی سے اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا خیال ہے؟..... کیا

ایس ایچ او ہماری سفارش پر اتنی سنگین واردات کے سلسلے میں لپٹا پوتی پر آمادہ ہو جائے گا؟“

”نہیں..... میرے کہنے پر اس نے پرچہ کاٹ دیا ہے۔ لاش اور تینوں زخمیوں کو بھی پولیس

سرجن کے آفس روانہ کیا جا چکا ہوگا لیکن..... لیاقت حسین ایس ایچ او کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ

نہیں ہے۔“

”کیا مطلب.....؟ سراج چونکا۔

”صورت حال کا اندازہ تھانے پہنچنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔“

سراج کسمسا کر رہ گیا۔ اورنگ زیب کی زبانی تفصیل سننے کے بعد وہ بھی گھبرا گیا۔ پندرہ منٹ

بعد وہ واپس ایس ایچ او نے ایک بار پھر تمام رام کہانی تفصیل سے دہرا ڈالی۔ یہ بھی بتا دیا کہ اس نے

لیاقت حسین کی ضد کے بعد ہی اسے لاک اپ میں بند کیا ہے۔

”تم نے جو تعاون کیا ہے میں ذاتی طور پر اس کا شکر گزار ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی

سے کہا۔

”آپ شرمندہ کر رہے ہیں سر..... میں آپ ہی کی وجہ سے آج اس سیٹ پر ہوں۔“

رہی باتوں کے بعد لیاقت حسین کو سامنے لایا گیا.....

اس نے ایک نظر اورنگ زیب اور سراج پر ڈالی پھر نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ سراج اپنی جگہ

سے اٹھ کر لیاقت حسین کے پاس گیا، دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”لیاقت حسین..... میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا خاص آدمی سمجھا ہے، الماس کے حوالے سے تمہارا

ایک احسان میرے اوپر بھی ہے..... میں جانتا ہوں کہ تم نے محض تفریحاً گولیاں نہیں چلائی ہوں

گی..... کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔“

”مجھے کچھ نہیں معلوم صاحب..... لیکن میں نے جو کچھ کیا میں اس کا اقرار کر چکا ہوں۔“ لیاقت

حسین نے عجیب انداز میں جواب دیا۔ چاہتا تو فرار بھی ہو سکتا تھا لیکن میں بزدل نہیں ہوں صاحب..... میرا تعلق جس جگہ سے ہے وہاں عزت کی حفاظت کی خاطر زبان کے بجائے گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ جن لوگوں نے فرصین پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی کی ہے میں ان کے پورے خاندان کو بھی برباد کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔ جس پر شبہ ہوگا اس کو آخری سانس لینے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔“

”جو شخص مارا گیا۔ تین افراد جو زخمی ہوئے۔ ان پر تمہیں کیا شبہ ہوا تھا.....؟“

میں نہیں جانتا صاحب.....“ لیاقت حسین نے بڑی مصومیت سے کہا۔ ”بس میرے دل میں

ایک خیال آیا تھا کہ وہ کسی کے اشارے پر میرے پیچھے آ رہے ہیں پھر..... جو کچھ ہوا میں نے مردوں

کی طرح اس کا اقرار بھی کر لیا ہے۔“

”تم..... میری ایک بات مانو گے.....؟ سراج نے اس کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے

زری سے سوال کیا۔

”حکم دوا صاحب..... آپ میرے محسن ہو..... آپ کے حکم پر اپنی گردن کاٹ کر آپ کے

قدموں پر بھی رکھ سکتا ہوں۔“

”قانون اندھا ہوتا ہے لیاقت حسین..... اس کا پیٹ بھرنے کی خاطر انسان کو وقت

اور حالات کی نزاکتوں کا خیال بھی رکھنا ہوتا ہے..... تم بھی اسی دنیا میں رہتے ہو اس لیے تم کو بھی

انہی اصولوں پر قدم اٹھانا ہوگا۔“

”قانون کی باتیں آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں صاحب..... مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟ لیاقت

حسین نے سراج کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم نے جو قدم اٹھایا وہ کسی مصلحت کی بنا پر اٹھایا ہوگا لیکن اب..... اب

قانون کا پیٹ بھرنے کی خاطر تمہیں میرے مشورے پر اپنا بیان بدلنا ہوگا۔“

”میں سمجھا نہیں صاحب..... میں نے کیا غلط بیان دیا ہے جسے اب بدلنا ہوگا؟“

”تم شاید بھول رہے ہو کہ جس شخص کو تم نے پہلے گولی ماری اس کے ہاتھ میں رائفل بھی تھی۔“

”ٹھیک ہے صاحب..... وہ رائفل بھی میں نے ادھر تھانے میں جمع کرادی ہے۔“

”جانتا ہوں لیکن.....“ سراج نے اس بار سرگوشی کی۔

’رائفل والے نے پہلے تم پر فائر کیا تھا..... تم نے اپنی جان بچانے کی خاطر جوابی کارروائی کی

تھی جس کے نتیجے میں.....“

”ایسا نہیں ہوا تھا صاحب۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا۔ ”میں نے اس کو فائر کرنے کی

مہلت ہی نہیں دی تھی۔“

”میں قانون کا پیٹ بھرنے کی بات کر رہا ہوں۔“

سراج نے وضاحت کی۔ ”اگر رائفل سے پہلے فائر نہیں ہوا تو اب کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں کچھ نہ

کچھ تو جواز پیش کرنا ہوگا۔ تم صرف میرے کہنے پر اپنا سابقہ بیان تبدیل کر دو۔ اس کے بعد قانونی معاملات کو ہم سنبھال لیں گے۔“

”میں اپنا بیان تبدیل نہیں کروں گا صاحب۔“ لیاقت حسین نے ہونٹ چباتے ہوئے نظریں جھکا کر کہا۔ ”آپ اور ایس بی صاحب دونوں میرے محسن ہو..... میں اپنی وجہ سے آپ لوگوں کو کسی امتحان میں نہیں ڈال سکتا۔ یہ نمک حرامی ہوگی۔“

”دوسری شکل میں جانتے ہو کیا ہوگا.....؟ سراج نے جھلا کر لیاقت حسین کو گھورا۔

”پھانسی.....“ لیاقت حسین نے نظریں اٹھا کر بے پروائی سے جواب دیا پھر اس نے سراج کا ہاتھ تھام کر ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک عاجزانہ درخواست بھی کر ڈالی۔ ”مجھے پھانسی ہونے کے بعد آپ میری فرمین کو عزت سے اس کے گھر چھوڑ آنا صاحب..... بابا سے بھی یہی کہنا کہ اس کا لیاقت حسین بزدل نہیں تھا..... اس نے خود کو بچانے کی خاطر کسی دھوکے یا فریب کا سہارا بھی نہیں لیا..... یہ بات سن کر بابا کا سر بھی اونچا ہو جائے گا۔ فرمین بھی مجھ پر فخر کرے گی..... ہمارے علاقے میں ایسا ہی ہوتا ہے صاحب۔“

”یہ..... تم پر کسی قسم کا دورہ پڑا ہے لیاقت حسین؟ اس سے پیشتر تمہاری یہ کیفیت کبھی نہیں ہوئی۔“

”اس سے پہلے کسی قسم کا دورہ پڑا ہے لیاقت حسین؟ اس سے پیشتر تمہاری یہ کیفیت کبھی نہیں ہوئی۔“

”اس سے پہلے کسی نے فرمین کے بدن کو ہاتھ لگانے کی غلطی بھی کی تھی..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو صاحب۔“ لیاقت حسین نے سر دلچے میں کہا پھر قدم اٹھاتا دوبارہ حوالات کی طرف چلا گیا۔ اورنگ زیب ایس ایچ او کے ساتھ بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کا طرز عمل اس کے لیے تعجب خیز نہیں تھا۔ سراج قریب آیا تو اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اب سر عثمان یا فرمین لیاقت حسین کی گرم کھوپڑی کو ٹھنڈا کرنے کے کام آسکتی ہیں۔“

آپ فکر نہ کریں سر..... ایس ایچ او نے کہا۔ ”جو کچھ ممکن ہو میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔ لیکن لیاقت حسین کو بہر حال ہمارا ساتھ دینا پڑے گا، اگر عدالت میں بھی اس نے وہی کیا جو اس وقت کہہ رہا ہے تو پھر.....“

فون کی کھنٹی بجی تو ایس ایچ او نے معذرت کر کے ریسیور اٹھا لیا۔ کچھ دیر ”ہوں..... ہاں..... سر..... ایس سر..... رائٹ سر۔“ کہہ کر دوسری طرف سے بولنے والے کو جواب دیتا رہا پھر اس نے اورنگ زیب سے پوچھا۔

”آپ کا کیا حکم ہے میرے لیے؟“

”ہم کوشش کریں گے کہ پولیس سرجن کی رپورٹ اور زخمیوں کے بیان دینے سے پیشتر لیاقت

حسین کو قانونی تقاضوں سے پوری طرح آگاہ کر سکیں۔“ اورنگ زیب کے بجائے سراج نے ایس ایچ او سے کہا۔ ”میں صرف ایک درخواست کروں گا۔ آپ لیاقت حسین کا خیال رکھیں۔ اسے دوسرے قیدیوں سے الگ رکھیں۔ میں ضمانت دیتا ہوں کہ وہ فرار نہیں ہوگا۔ اگر ہتھکڑی کھول دی جائے تو بھی وہ قحانے سے باہر نہیں جائے گا۔“

”میں جانتا ہوں سر.....“ ایس ایچ او نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”اگر اسے فرار ہونا ہوتا تو یہاں آنے کی حماقت ہی نہ کرتا لیکن..... میں ہتھکڑی کھولنے اور اسے پیچھے کمرے میں رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا۔“

”اوہ.....“ اورنگ زیب نے جوفون ریسیور کرنے کے بعد سے ایس ایچ او کی کیفیت کا جائزہ لے رہا تھا، بے حد سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ ”میں تمہاری مجبوری سمجھ رہا ہوں۔ قحانے کے عملے میں بھی کالی بیٹھڑیں ضرور ہوتی ہیں جو ایک لمحے کی خرابی سے ادھر پہنچاتی رہتی ہیں۔“

”آپ میرے محسن بھی ہیں سر..... اور تجربے کا رہی، میری مجبوری کو ضرور سمجھ رہے ہوں گے۔“

”اسی لیے میں تم سے یہی کہوں گا کہ لیاقت حسین کے ساتھ کوئی ایسی رعایت نہ کرنا جو تمہارے لیے بھی مشکل پیدا کر دے۔“ اپنی بات کہتے وقت اورنگ زیب نے اپنے ہاتھ پر بال بین سے کچھ لکھ کر ایس ایچ او کے سامنے کر دیا۔ ایس ایچ او نے اٹھاتے میں سر کو جنبش دی پھر معنی خیز انداز میں بولا۔

”جو صورت حال ہے اس کے پیش نظر مجھے امید تھی کہ آپ مجھے یہی مشورہ دیں گے۔“

سراج تھملا کر رہ گیا، وہ براہ راست ایس ایچ او سے کچھ کہنا چاہتا تھا جب اورنگ زیب نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر دوبارہ ایس ایچ او سے قدرے افسرانہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے پولیس سرجن کی رپورٹ اور زخمیوں کے بیان کی نقل درکار ہوگی۔ یہ گزارش میں لیاقت حسین کے ایک واقف کار کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔“

پھر ایس ایچ او کے جواب دینے سے پیشتر ہی وہ سراج کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گیا۔ اس کے تہور کی اچانک تبدیلی سراج نے بھی محسوس کی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے دہلی زبان میں دریافت کیا۔

”آپ نے اچانک جو یوٹرن لیا۔ کیا اس کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں۔“

”ایس ایچ او کو اوپر سے جو ہدایت ملی ہے اس کے بعد وہ مجبور ہو گیا ہے۔“ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”تم نے شاید نوٹ نہیں کیا کہ کسی کا فون آجانے کے بعد وہ محتاط ہو گیا تھا۔“

”آپ نے ہاتھ پر کیا لکھ کر اس کو دکھایا تھا؟“

”آئی جی.....“

”اوہ.....“ سراج نے ہونٹ چبائے۔ ”گو یا لیاقت حسین کو گھیرنے والے آکھپوس ہی کے

افراد تھے؟“

”نہیں..... آکٹوپس کی جگہ جس نے بھی لی ہے۔ آئی جی اس کا حکم لانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ تم میرے تبادلے کی بات کیوں فراموش کر رہے ہو؟“

”پھر..... اب آپ نے کیا سوچا ہے؟“ سراج نے پہلو بدل کر بنجیدگی سے کہا۔ ”ہم لیاقت حسین کو موجودہ صورت حال میں بے یار و مددگار بھی نہیں چھوڑ سکتے۔“

اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات غمازی کر رہے تھے کہ وہ بھی کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ سراج اس کی کیفیت کا اندازہ لگا رہا تھا جب اورنگ زیب نے موبائل نکال کر کسی کے نمبر پر کال کی۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے بغیر کسی تمہید کے سرسراتے لہجے میں کہا تھا۔

”اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہوگا۔“

”کوئی نئی سچویشن.....“ دوسری جانب سے کرنل احتشام کی آواز ابھری۔ جواب میں اورنگ زیب نے لیاقت حسین کی پوری کہانی دہراتے ہوئے کہا۔

”اس بار بھی کسی نے اوپر سے ہمارے بگ باس کو اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کی ہے۔“

”ڈونٹ وری..... میں لیاقت حسین کے کیس کو ذاتی طور پر بھی بینڈل کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔“ کرنل احتشام نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کے تبادلے کے آرڈر بھی پندرہ منٹ میں تبدیل کرادوں گا۔“

”نوسر..... یہ مناسب نہیں رہے گا۔“ اورنگ زیب نے تیزی سے جواب دیا۔ ”جو چہرے نقاب میں چھپے ہیں انہیں سامنے لانے کی خاطر ہمیں دور اندیشی سے کوئی پلان مرتب کرنا ہوگا۔“

”سول پولیس اور ہمارے کام کرنے کے انداز میں یہی فرق ہے۔“ کرنل احتشام نے الجھ کر کہا۔ ”ضمن سامنے ہو تو ہم پہلی فرصت میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں..... ڈھیل دینے کی صورت میں بازی اکثر چلت جاتی ہے۔“

”آئی ایگری و دیو لوسر..... لیکن اس وقت ہم ایک نہیں دو محاذ پر جنگ لڑ رہے ہیں اور..... ضمن بھی پردے میں ہے..... اسے سامنے لانے کی خاطر مجھے آپ سے کچھ تعاون درکار ہے۔“

”توفار ملٹی“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ ”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”جو ممبر آپ کی تحویل میں ہے آپ اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کریں۔ جو سانپ سامنے نہیں ہے اب اسے سامنے لانے کی خاطر ہمیں بھی حالات کے پیش نظر کچھ غیر قانونی عمل کرنے کی ضرورت ہے۔“

”گڈ..... میں بھی آپ کو یہی مشورہ دوں گا..... کوئی دشواری پیش آئے تو آپ بلا جھجک میرا حوالہ دے سکتے ہیں۔ جو بھی صورت حال ہوئی میں اسے سنبھال لوں گا۔“

”تھینکس..... سر! اورنگ زیب نے موبائل بند کیا تو سراج نے بنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کیا آپ کو امید ہے کہ دشمنو آسانی سے زبان کھول دے گا؟“

”اس کا جواب مجھے کرنل سے بعد میں معلوم ہوگا۔“

”جو شخص آئی جی کو اشارے پر چلنے پر مجبور کر رہا ہے اس کے بارے میں بھی ہمارے پاس کوئی کلیوٹینس ہے۔“

”اب ہمیں دو اور دو پانچ کے فارمولے پر عمل کرنا پڑے گا۔“ اورنگ زیب نے سڑک پر نظریں جمائے جمائے جواب دیا۔

”کیا مطلب.....؟“

”ابھی ہوئی ڈور کو سلجھانے میں کچھ وقت ضرور ضائع ہوتا ہے مائی ڈیر۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے کہا۔ ”پہلے جگہ کے فرنچیز مارٹ کی تباہی..... رستم علی آغا خان کو بلیک میل کرنے کی کوشش..... ڈیٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی کی موت..... آکٹوپس کی رہائش گاہ کی کھنڈر میں تبدیلی پھر..... میرے لکڑی فلیٹ پر حملہ اور توڑ پھوڑ..... ہنی مون بیوٹی پارلر میں ہونے والے لڑکیوں کے مذموم کاروبار کی تفصیل اور..... سکندر علی شاہ کی وہ فائل جسے سرد خانے کے حوالے کر دیا گیا تھا..... اب یہ باتیں میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہیں..... ان تمام وارداتوں کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے ضرور ملتے ہیں.....“

”ہو سکتا ہے لیکن آپ نے کرنل سے کس غیر قانونی عمل کی بات کی تھی۔“

”ہاں.....“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”سرجن بھی جانتا ہے کہ ہر آپریشن کا مایاب نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود وہ سرجری کرتا ہے..... اب ہمیں بھی اسی فارمولے پر عمل کرنا ہوگا۔“

”آپ کے ذہن میں کیا پلان ہے؟“

”سب سے پیشتر ہنی مون بیوٹی پارلر میں معمولی نوعیت کی توڑ پھوڑ اور ہنگامہ۔“

”آئی سی.....“ سراج چونکا۔ ”کیا آپ شیلا اور ماو جونی.....“

”نہیں.....“ اورنگ زیب نے سراج کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ”یہ دونوں مہرے ہیں لیکن..... ایک نام میرے ذہن میں چبھ رہا ہے۔ سکندر علی شاہ کی دوسری بیوی گلیڈ۔ میری اطلاع کے مطابق شیلا ورماسے میل جول کے علاوہ جونی سے بھی اس کے تعلقات تھے مگر کچھ دنوں سے اس نے بھی بیوٹی پارلر آنا جانا ترک کر دیا ہے..... کسی وجہ سے جونی بھی دو دنوں تک انڈر گراؤنڈ رہنے کے بعد سامنے آگیا ہے۔“

”یہ اطلاعات مجھے بھی مل چکی ہیں مگر میرا خیال ہے کہ اگر ہم نگیہ کو اہمیت دینے کے بجائے براہ راست سکندر علی شاہ کا پوسٹ مارٹم کریں تو نتائج امید افزا بھی ہو سکتے ہیں.....“

”میں تمہارے خیال کی تردید نہیں کروں گا.....“

اس کے ہونٹ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آتنا سامنا ہونے کے بعد خود دشمن بھی پہلی نظر میں افضل خان کو نہیں پہچان سکا تھا۔ جب پہچانا..... اس وقت دیر ہو چکی تھی پھر..... وہ افضل خان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر دوبارہ کرل احتشام کے چنگل میں آ گیا تھا۔

افضل خان کے حوالے سے دشمن کے ذہن میں ایس پی اورنگ زیب کا نام بھی گونج رہا تھا۔ اپنے تجربے کی روشنی میں اس نے اورنگ زیب کو دوسرے پولیس افسروں سے بہت مختلف پایا تھا۔ یقیناً اسی کے اشارے پر افضل خان بھی پوری طرح متحرک تھا جس کی وجہ سے دشمن ایک بار پھر پھنس گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس بار کرل نے بھی نگرانی کا سخت انتظام کیا ہوگا۔ اس کے تجربے کا کمانڈوز پوری طرح محتاط ہوں گے۔ ان کے حصار کو توڑ کر نکل جانا آسان نہیں ہوگا مگر..... دشمن کا شاطر ذہن اس وقت بھی ناممکن کو ممکن بنا دینے کے امکانات پر غور کر رہا تھا جب کمرے کے بند دروازے پر ایک ڈرامی آہٹ سن کر وہ پوری طرح محتاط ہو گیا اور اب وہ خود کو اتنا مطمئن ظاہر کرنے لگا جیسے کسی بات کی قطعی پروا نہ ہو۔

کمرے میں داخل ہونے والا ایک میجر تھا۔ دشمن اسے کئی بار کرل احتشام کے ساتھ دیکھ چکا تھا، اس کا تعلق دشمن کے خیال کے مطابق ملٹری کے کسی ایسے شعبے سے تھا جہاں زبان کے بجائے ذہن اور تجربے کا نظروں سے دوسرے کو پرکھا جاتا ہے..... بعد میں اس کی تحریری رپورٹ تیار کی جاتی ہوگی۔ اسی کی روشنی میں کوئی حتمی فیصلہ بھی کیا جاتا ہوگا۔

میجر کے سامنے آنے کے بعد دو مسلح سپاہی بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں فولڈنگ چیز تھی۔ میجر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی روشن اور چمکدار نظریں اپنے تجربے کی روشنی میں دشمن کے تاثرات کو پرکھنے لگیں۔ ایک لمحے تک دشمن خاموش رہا پھر اس نے میجر کو اپنی فیس ریڈنگ کا سوچ نہیں دیا۔ مسکرا کر بولا۔

”میں اس وقت میک اپ میں نہیں ہو میجر.....“

تمہارے آدمیوں نے میرا اصل روپ دیکھنے کے کارن جوشن استعمال کیا تھا اس نے میرے سارے روپ بھر روپ دھو ڈالے ہیں..... ابھی تک اس کی جلن میرے چہرے پر چھوٹنے کی طرح ایک مار رہی ہے۔“

میجر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم بھی ابھرا تھا۔

”تم اپنا اور میرا سے برباد مت کرو افسر۔“ دشمن نے اس کی نظروں کا توڑ کرنے کی خاطر پھر اس کی توجہ میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ ”جو من چاہے سوال کرو..... میں تم سے کوئی بات غلط نہیں کہوں گا۔ دو کوڑی کے ملازموں سے جو تالات کھانے کے بعد جو مجرم فر فر بوتے لگتے ہیں میرا شمار ان میں نہ کرو..... جب تک تمہاری قید میں ہو..... تم مالک ہو اور میں مجبور..... جس دن یہاں سے چھوڑا ہو گا..... میں مالک ہوں گا اور تم مجبور..... چور سپاہی کا ناک اسی طرح چلتا رہتا ہے۔“

میجر بہ دستور مہر بہ لب رہا البتہ ساتھ میں کھڑے دونوں کمانڈوز کے توجہ بدلنے لگے۔

میرے پلان میں سکندر علی شاہ کا فارم ہاؤس بھی ہے جہاں ہمارے بڑے بڑے افسران اور حکومت کے ذمہ دار عہدے داروں کو بھی داد و پیش کے موقع فراہم کیے جاتے ہیں لیکن جب تک ڈور کا ایک سرا ہاتھ نہ آجائے ہم جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔“

”آپ کیا خیال ہے.....؟ سراج نے پوچھا۔“ کیا میڈم کی لیڈی سیکرٹری کا انواء بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے؟“

”ہو بھی سکتی ہے.....“

”بیوٹی پارلر پر ہنگامے کے لیے آپ نے کس کا انتخاب کیا ہے؟..... افضل خان اس کام کو بہتر طور کر سکتا ہے۔“

”مجھے تم سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔“ اورنگ زیب نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”تم یہ کیوں فراموش کر رہے ہو کہ دشمن کی دوبارہ گرفتاری میں افضل خان نے کلیدی کردار ادا کیا تھا..... ایسی صورت میں دشمن کی ہٹ لسٹ پر بھی وہ سرفہرست ہوگا..... اس کی حفاظت کی ذمہ داری سے غافل نہ ہونا.....“

”آئی جی کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں.....“ اورنگ زیب نے شانے اچکا کر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”حالات کی بساط پر اس کی حیثیت زیادہ اہم نہیں ہے..... کسی دھمکی رگ کے سبب وہ خود بھی بے بس ہے۔“

پھر گفتگو کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا..... موبائل پر کسی کال کے آجانے کے سبب اورنگ زیب نے روشن اسکرین پر نمبر دیکھ کر اسے فوراً ہی آن کر دیا تھا۔

دوسری جانب سے بولنے والا خاص ”میجر“ ”میجر“ کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ سراج کی نظریں بہ دستور اورنگ زیب کے چہرے پر مرکوز تھیں۔



دشمن اس وقت بھی ملٹری اٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں نیچے فرش پر بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک نام رہ رہ کر گونج رہا تھا.....

”افضل خان۔“

پچاس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا کر وہ لوچن کی نظروں میں بھی دھول جھونک کر نکل گیا تھا، کرل احتشام کے سادہ لباس والے بھی اس کی ہوا نہیں پاسکتے تھے..... بعد میں اس کے فرار کی اطلاع نے سب کو ششدر کر دیا ہوگا۔ دشمن اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا، ہنری براؤن کا میک اپ کرنے کے بعد اسے پورا دشمن تھا کہ اب اسے تلاش کرنے والے ٹاپے رہ جائیں گے۔ اس نے طے کیا تھا کہ بگ باس سے رابطہ ہونے کے بعد وہ پہلی فرصت میں کسی اور زیادہ محفوظ مقام پر منتقل ہو جائے گا لیکن افضل خان نے درمیان میں آ کر اس کے سارے خوب صورت سپنوں کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔

دشمن کو یقین تھا کہ افضل خان بھی ذاتی طور پر اس کی نگرانی ضرور کرتا رہا ہوگا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ

”وشنو کو قایم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے.....“
وشنو نے میجر کو مسکرا کر بے پروائی سے مشورہ دیا۔ ”کوئی زہریلا انجکشن..... پھر نہ رہے گا بانس
نہ باجے کی بانسریا..... اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ کام نہیں کرے گا۔“

”بولتے رہو.....“ میجر نے پہلی بار زبان کھولی۔
”تمہاری باتیں بھی میرے لیے کارآمد ہوں گی۔“

”تمہاری مرضی.....“ وشنو نے شانے اچکائے پھر بے نیازی سے آنکھیں موند لیں۔
دس پندرہ منٹ تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی پھر دروازہ دوبارہ کھلنے کے ساتھ ہی کسی کے
قدموں کی آہٹ ابھری تو وشنو نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ آنے والا کرٹل احتشام تھا جسے دیکھ کر
میجر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا.....؟ کرٹل احتشام نے میجر سے دریافت کیا لیکن اس کی قہر آلود نظریں وشنو پر ہی
مرکز تھیں۔

”میکسی م ڈوز (MAXIMUM DOSE) میجر نے مختصر جواب دیا۔
”تم نے کیا فیصلہ کیا ہے.....؟“ کرٹل نے وشنو کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”کیا تم شراف سے
زبان نہیں کھولو گے؟“

”تھوڑی بہت تو ٹی پھوٹی گٹ پٹ میں بھی کر لیتا ہوں۔“ وشنو نے سنبھل کر کہا۔ ”آپ اپنا
آخری ارمان بھی پورا کر لو لیکن میرا جواب وہی ہوگا..... مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو جس کی تلاش ہے وہ
کہاں ملے گا..... میری اس کی بات صرف موبائل ہوتی ہے..... ہر بار وہ نئے نمبر سے کال کرتا ہے
..... وہ سب میں اگل چکا ہوں..... اور کیا معلوم کرتا ہے؟“

”آخری بار تم سے کہاں ملے تھے.....؟“

”ملنے ہی کے کارن موت کے کنویں سے چھلانگ لگا کر گیا تھا مگر ایک چھوٹی سی بھول ہو گئی جو
پھر تمہارے سامنے موجود ہوں۔“ وشنو نے مل کھا کر جواب دیا۔

”پہلی فرصت میں ایک گولی اس کی کھوپڑی میں داغ کر دو گیارہ ہو جاتا تو.....“
”سٹ اپ.....“ کرٹل گرج اٹھا۔ ”یہ کہانی میں پہلے بھی سن چکا ہوں..... زندگی چاہتے ہو تو
اس کا ہاتھ بٹا دو..... ورنہ تمہارے ساتھ اب جو ہوگا..... اچھا نہیں ہوگا.....“

”یہ دمکی بھی میرے لیے نئی نہیں ہے.....“ وشنو نے سپاٹ لہجے میں زہر خند سے جواب
دیا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہاں کی آخری خوداک کا تجربہ بھی کر لیں.....“

”بائسٹڈ.....“ کرٹل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا پھر اس نے اپنے کمانڈر کو حکم دیا۔ ”اسے
ٹارچر سیل میں لے جاؤ..... اس وقت تک ڈوز دیتے رہو جب تک یہ زبان کھولنے پر آمادہ نہ ہو جائے
.....“

وشنو کرٹل کا فیصلہ سن کر مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا پھر اس نے مسلح کمانڈرز کے ساتھ جانے میں بھی

’اں ہانگھا ہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

وشنو کے جانے کے بعد کرٹل اپنے آفس میں آ گیا، میجر بھی اس کے ساتھ تھا، اپنی سیٹ پر
بٹنے کے بعد اس نے میجر سے پوچھا۔ ”آپ کی فائل ریڈنگ کیا ہے.....؟“

”سخت جان مجرم ہے..... آسانی سے زبان کھولنے کی امید نین پر سنٹ بھی نہیں ہے۔“ میجر
لے ہات جاری رکھی۔ ”ویسے میرا تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ وہ اصل مجرم کے ٹھکانے سے واقف نہیں
.....“

”آپ نے اس کی فائل بھی ضرور دیکھی ہوگی.....“

کرٹل نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ایسے مجرموں کی موت بھی ہمارے لیے کسی نقصان کا
مہب نہیں ہوگی۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے.....“

میجر کچھ دیر بعد چلا گیا تو کرٹل نے کچھ سوچ کر آئی جی سے کال ملائی، اس کے چہرے کے
تاثرات میں جو فوری تبدیلی رونما ہوئی تھی وہ بھی معنی خیز تھی۔

”اس وقت کیسے یاد کیا؟“ رابطہ ہونے پر آئی جی کی آواز ابھری۔

”میری اطلاع کے مطابق ایس پی اورنگ زیب غالباً آج کل پھر کسی اہم کام میں مصروف
.....“

”یو آر رائٹ۔“ آئی جی نے کچھ توقف سے کہا۔ ”وہ ایک ذاتی معاملے میں دلچسپی لے رہا
.....“

”میری رپورٹ کے مطابق وہ شاید کسی ایسے شخص کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے جو اس سے
پہلے بھی پانچ آدمیوں کو شوٹ کر چکا ہے۔ ان میں تین پولیس کو مطلوب مجرم بھی تھے۔“

”آپ کی انفارمیشن صحیح ہے کرٹل..... مسٹر اورنگ زیب اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا خیال ہے کہ
پلم ٹیپی تو تین اس شخص کو قبل از وقت خطروں سے آگاہ کر دیتی ہیں۔ ایک بار میں بھی اس شخص سے مل
.....“

”آئی جی نے اسپتال میں میل نرس اور زہریلے انجکشن کی تفصیل دہراتے ہوئے جواب
دیا۔ ”میرے لیے وہ سب کچھ حیرت انگیز ہی تھا لیکن اس بار لیاقت حسین نامی شخص نے ہنص شیعہ کی
اہلاد پر ایک آدمی کو ہلاک اور تین کو شدید زخمی کر دیا ہے..... عدالت ایسی کہانی کو آسانی سے مضم نہیں
لے گی۔“

”ایسی صورت میں پولیس کے محکمے کی ساکھ بھی ضرور متاثر ہوگی۔“ پہلی بار کرٹل کے لہجے میں
لہجہ آ گیا۔

”جانتا ہوں لیکن.....“ آئی جی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا بات ہے.....؟ کرٹل نے پوچھا۔ ”آپ اپنے محکمے کے سربراہ ہیں..... اگر کوئی مجبوری
.....“

پہ تو کھل کر کہیں۔“

”پچھلی ملاقات میں، میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ بھی مسٹر اورنگ زیب پر مہربان ہیں اس کے علاوہ غالباً کوئی مخصوص حکم نامہ بھی ہے جس کی بنا پر اسے لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔“
”اوہ.....“ کرٹل نے سنبھل کر جواب دیا۔

”میرے اور آپ کے ایس پی کے تعلقات بے شک ہیں لیکن صرف ذاتی مراسم کی حد تک، مجھے کے سربراہ کی حیثیت سے میں اپنے آفیشل معاملات میں چلک پیدا کرنے کا عادی ہوں۔ کبھی کبھی اوپر والوں کا دباؤ بھی آڑے آسکتا ہے..... ایسی صورت میں کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے..... میری اور ایس پی کی دوستی کے علاوہ آپ پر اوپر والوں یا کسی اور کا دباؤ تو نہیں ہے؟“

”جی..... جی نہیں.....“ آئی جی نے دباؤ والی بات کو کسی کڑی گولی کی طرح حلق کے نیچے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ ”آئی جی کی حیثیت سے میں بھی سیاہ و سپید کا مالک ہوں۔“
”مگڈ.....“ کرٹل نے کہا۔ ”اگر آپ کا یہی خیال ہے تو پھر اورنگ زیب کو لیاقت حسین کی بے جا حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ آپ اسے تحریری طور پر اس معاملے سے الگ رہنے کے احکام جاری کرویں۔ اس کے بعد ساری ذمہ داری اسی کی ہوگی۔“

”وشنو کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا.....“
آئی جی نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”کیا اس نے شیخ حامد کے سلسلے میں.....“
”سوری مائی ڈیئر..... میں جس سیٹ پر ہوں اس پر زبان بند رکھنا پہلی شرط ہے۔“ کرٹل نے اس بار بھی بڑی خوب صورتی سے بات بتائی پھر دو چار رسمی باتیں کرنے کے بعد رابطہ ختم کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر پھر معنی خیز تبسم ابھرنے لگا۔ اورنگ زیب کی زبان یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد کہ آئی جی کی تمام فون کالز سنئی جاتی ہیں اس نے جان بوجھ کر اسی وقت ایسی باتیں کی تھیں جو کال سننے والوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکیں..... یہ جاننا بھی مقصود تھا کہ آئی جی اورنگ زیب کے سلسلے میں کوئی قانونی قدم اٹھائے گا یا نہیں.....؟



موبائل پر موصول ہونے والی کال ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی تھی جسے شبتم نے ریسیو کیا تھا۔
”افضل خان کہاں ہے.....؟ اس کا موبائل مصروف مل رہا ہے.....“
”وہ کسی سے بات کر رہا ہے سر۔“ شبتم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”ہمارے لائق کوئی خدمت؟“

”افضل سے بات کراؤ..... اسے کچھ ضروری ہدایات دینی ہیں۔“
پھر شبتم کے اشارے پر ہی افضل خان نے اپنی کال ختم کر کے شبتم کا موبائل لے لیا۔
”تم اس وقت کس سے بات کر رہے تھے.....؟“
”ذاتی نوعیت کی کال تھی جناب..... آپ حکم دیں۔“

افضل خان نے کہا۔

”تم اور شبتم دونوں فلیٹ تک ہی محدود رہنا.....“

سراج نے سپاٹ لیچے میں جواب دیا۔ ”جب تک ہماری طرف سے کوئی اشارہ نہ ملے محتاط رہنے کی ضرورت ہے..... یہ بھی بتا دوں کہ ہمارے سادہ لباس والوں کے علاوہ ملٹری کے کمانڈرز بھی تم دونوں کی حفاظت پر مامور کر دیئے گئے ہیں۔“

”آپ کی مہربانی ہے جناب..... میں بھی سمجھتا ہوں کہ وشنو کو ہتھی لگانے والوں کو بھی اس کا دوبارہ جال بھی پھنس جانا اچھا نہیں لگا ہوگا۔ باہر زندہ آنے کے بعد خود وہ بھی مجھے شکار کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”تمہارا انداز غلط نہیں۔“ سراج نے اس کے شیعے کی تائید کی۔ ”اسی وجہ سے تم کو کال بھی کیا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں.....“ افضل خان نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”جو مر کر زندہ ہوا ہے..... اور اس کے گرے بھی بخوبی جانتے ہیں کہ میں نے بھی اسی دشت کی سیاحت میں زندگی گزارا ہے۔“

”ہم بھی جانتے ہیں مگر..... یہ بھی مت بھولو کہ انسان کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بھی اس کے لیے کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے..... اندھیرے سے چھپ کر چلائی جانے والی گولی روشنی میں رہنے والوں کا لحاظ بھی نہیں کرتی..... پلک جھپکتے میں آتی جاتی سانس کا سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔“ سراج نے اس بار قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”جو کچھ کہا گیا اس کی خلاف کوئی قدم اٹھانے کی غلطی نہ کرنا۔“

دوسری جانب سے رابطہ منقطع کیا گیا تو افضل خان نے بے پروائی سے مسکراتے ہوئے موبائل شبتم کو واپس کر دیا۔ ”کوئی خاص بات.....؟ شبتم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہاں..... ہمارے سول میرج کے پروگرام کے درمیان کچھ رکاوٹیں پیش آگئی ہیں۔“
”ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو.....؟“

”نہیں..... سچ کہہ رہا ہوں۔“ افضل خان نے شبتم کا ہاتھ تھام کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے سرد آہ بھری۔ ”ہمیں کچھ دنوں تک فلیٹ میں بند رہنے کا حکم ملا ہے۔“

”سراج صاحب کا فون نہ آتا تو میں بھی تمہیں یہی مشورہ دیتی..... تم نے وشنو پر ہاتھ ڈال کر جو خطرہ مول لیا ہے وہ آسانی سے ختم نہیں ہوگا..... آکٹوپس جہاں بھی ہے اسے بھی یہ اطلاع ضرور مل گئی ہوگی..... اس کے شکاری کتے بھی ہمیں سکون سے نہیں رہنے دیں گے۔“ شبتم نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اس سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود بھی یہ بات اس کے حلق سے نیچے نہیں اترے گی کہ ہو لوگ اس کے ملازم رہ چکے ہوں وہ اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت بھی کر سکیں۔“

”سمجھ گیا.....“ افضل خان نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”تمہیں اس بات کی زیادہ خوشی ہوگی کہ سول میرج والی بات فی الحال.....“

”ایسا مت سوچو.....“ شبنم نے قدرے شرما کر کہا۔

”تم میڈم روبی کو کیوں بھول رہے ہو؟ میں اگر اس سے درخواست کروں تو وہ اس پوزیشن میں ہے کہ کسی مجسٹریٹ کو ہمارے فلیٹ پر بھی بھیج دے..... سول میرج کی قانونی خانہ پری یہاں بھی ہو سکتی ہے۔“

”جانتا ہوں لیکن اس کے علاوہ بھی ایک شخص ہمارے تمہارے درمیان رکاوٹ بنا ہوا ہے۔“ وہ کون ہے.....؟ شبنم نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

”جبرو.....“ افضل خان نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ”تم نے بھی یہی درخواست کی تھی کہ جبرو کو معاف نہ کرنا۔ تمہیں اپنانے سے پہلے میں اسے اتنی اذیت ناک موت ماروں گا کہ پھر کوئی تمہاری طرف میلی نظر ڈالنے کی بھول بھی نہ کر سکے۔“

”اپنا خیال بھی رکھنا افضل.....“ شبنم نے اس کا ہاتھ تھام کر جذباتی انداز میں درخواست کی۔ ”تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بالکل تمہارہ جاؤں گی.....“

جواب میں افضل خان نے شبنم کو شانوں سے تھام کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تو شبنم نے بھی بے اختیار اس کے کشادہ سینے میں سر چھپالیا۔



لیاقت حسین کے اقبالی بیان کے بعد پولیس کی درخواست پر عدالت نے اسے ایک ہفتے کے لیے پولیس کسٹڈی میں دے دیا تھا۔ ریمانڈ گرانٹ کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ابھی تک کسی تھانے میں مرنے والے کے لواحقین کی جانب سے کوئی ایف آئی آر درج کرائی گئی تھی نہ ہی تینوں زخمی اس پوزیشن میں تھے کہ عدالت کے روبرو پیش ہو کر کوئی بیان دے سکتے۔

متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او چکی کے دو پاٹوں کے درمیان سینڈ ویج بن گیا تھا۔ نہ وہ آئی جی کے حکم کی خلاف ورزی کر سکتا تھا نہ ہی اورنگ زیب کی سابقہ مہربانیوں کو نظر انداز کر دینا اس کے ضمیر کو گوارا تھا۔ ریمانڈ حاصل کرنے کے بعد ہی اس نے پہلی فرصت میں اورنگ زیب کو اس کی اطلاع بھی دے دی تھی۔

اس وقت لیاقت حسین پھر اس کے سامنے موجود تھا حسب معمول وہ پوری طرح مطمئن نظر آ رہا تھا لیکن آنکھوں کے تاثرات اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ اس کے وجود کے نہاں خانوں میں کہیں کچھ ٹوٹ پھوٹ بھی ہو رہی ہے۔

”میری بات توجہ سے سنو لیاقت حسین۔“ ایس ایچ او نے سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تمہیں یہ جو ایک ہفتے کی مہلت ملی ہے اسے بھی غنیمت جانو، اس کے بعد اگر زخمیوں نے تمہارے خلاف زہرا لگاتو تمہارے بچاؤ کے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔“

”جانتا ہوں.....“ لیاقت حسین نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

”پھر بھی تم ہماری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے..... ہمارا نہیں تو اپنے عزیزوں کا خیال

کر۔ کوئی نہ کوئی تو ایسا ضرور ہوگا جو تمہیں سزا ہو جانے کے بعد تمہاری کمی کو بڑی شدت سے محسوس کرے گا۔“

”تم صرف قانون کی بات کرو صاحب۔“ لیاقت حسین نے پہلی بار جھلا کر جواب دیا۔ ”رشتے ناتوں کے چکر میں مت پڑو۔ جو مر جاتا ہے اسے بھی لوگ رو پیٹ کر صبر کر لیتے ہیں..... جو مقدر میں کیا لکھا ہے اسے کوئی نہیں جانتا۔“

”پھر سوچ لو..... ریمانڈ ختم ہونے کے بعد تمہیں سوائے بچھتا دوں کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“

لیاقت حسین جواب میں مسکرا دیا وہ سمجھ رہا تھا کہ پولیس کی یہ تمام رعایتیں اسے اورنگ زیب اور سراج کی وجہ سے مل رہی تھیں ورنہ پولیس تو ان لوگوں سے بھی ڈنڈے کے زور پر اقبال جرم کرا لیتی ہے جو مطلق بے گناہ ہوتے ہیں۔ اس وقت کسی بے قصور کو بھی یہ سوچنے کی مہلت نہیں ملتی کہ کس جرم کی پاداش میں اس کی ہڈیاں پکلی جا رہی ہیں پھر..... اس کے لیے صرف یہی مناسب ہوتا ہے کہ سچ کے روبرو بھی پولس کا زبردستی یاد کرایا ہوا سابق فر فر دہرا دے۔ باقی فیصلہ اندھا قانون سنا دیتا ہے، بے قصور قید و مشقت بھگتنے کے لیے جیل چلا جاتا ہے۔ اصل مجرم کھلی ہوا میں دندناتا پھرتا ہے۔

”تم چپ کیوں ہو.....؟ ایس ایچ او نے سوال کیا۔

لیاقت حسین کھرا جواب دینے کی خاطر پرتول رہا تھا جب ایک سپاہی نے اندر داخل ہو کر ایس ایچ او سے کچھ سرگوشی کی۔ ”ان لوگوں کو بیٹھاؤ..... میں آتا ہوں۔“

سپاہی اگلے قدموں چلا گیا تو ایس ایچ او بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لیاقت حسین سے کہا۔ ”کچھ واقف کار تم سے ملاقات کیلئے آئے ہیں..... میرے ساتھ چلو.....“

لیاقت حسین نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر ہونٹ چباتا ہوا ملاقاتی کمرے میں آ گیا جہاں سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم اس کے منظر تھے۔ لیاقت حسین نے کچھ کہنے کے بجائے نظریں جھکا لیں۔ کپکپاتے لہجے میں آہستہ سے بولا۔

”آپ..... عزت دار لوگ ہیں۔ میرے محسن بھی ہیں لیکن آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”تم بات نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی خالی ہاتھ واپس جائیں گے۔“

راحیلہ بیگم کی بھرائی ہوئی آواز لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی تو وہ تڑپ اٹھا، اس نے دوبارہ نظریں اٹھا کر دیکھا، سیٹھ عثمان خاموش کھڑے تھے لیکن ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ حالات نے ان کو بھی جھنجھوڑ دیا ہے۔ راحیلہ بیگم اس طرح بے چین اور مضطرب تھیں جیسے ان کا کوئی اپنا جیل میں جھٹکریاں پہنے کھڑا ہو۔

”آپ..... آپ کیا حکم دیں گی بیگم صاحب۔“

لیاقت حسین نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں نے آج تک آپ کے کسی حکم کو نہیں ٹالا..... آج..... آج بھی نہیں ٹالوں گا۔“

”وہ جن حالات سے گزر چکی ہے اس کے بعد تمہاری دوری کے احساس نے اسے بھی گم سم کر دیا ہے۔“ راحیلہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”اور کسی کا نہ سہی فرحین کا تو خیال کر لیاقت حسین سہارے چمن جاگیں تو اچھا بھلا آدمی بھی لڑکھڑا جاتا ہے۔“

”آپ..... ٹھیک کہہ رہی ہیں بیگم صاحب۔“ لیاقت حسین اندر رہی اندر گھٹ کر رہ گیا۔

”پھر..... تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ سیٹھ عثمان نے دریافت کیا۔

”ابھی ایک ہفتہ ہے صاحب..... زنجیوں کا بیان ہو جانے دیں پھر میں اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کر لوں گا۔ ہو سکتا ہے وہ بد ذات اپنی زبان سے اپنا جرم قبول کر لیں..... اوپر والے کے ہاں بھی دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔“

”میں تمہاری بات مانتی ہوں لیکن اب ایک آخری فیصلہ میرا بھی سن لو۔“ راحیلہ بیگم نے بڑے اعتماد سے کہا ”اگر زنجیوں نے اس بات کا اقرار نہ کیا کہ وہ تمہارے تعاقب میں تھے یا ان کا مقصد تمہیں نقصان پہنچانا تھا تو پھر وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ تم نے پھر بھی اپنی ضد نہ چھوڑی تو میں یہی سمجھوں گی کہ تمہاری نظروں میں میری کوئی.....“

”آگے کچھ نہ کہنا بیگم صاحب۔“ لیاقت حسین نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ کے کسی حکم کو ٹال کر نمک حرامی کا ثبوت نہیں دوں گا۔“

”مجھے یقین تھا لیاقت حسین کہ تم میرا کہا نہیں ٹالو گے۔“ راحیلہ بیگم نے پرسکون سانس لے کر مسکراتے ہوئے کہا پھر کچھ دیر بعد وہ واپس چلی گئیں تو لیاقت حسین کو دوبارہ ایس ایچ او کے کمرے میں آگیا جو کسی کے فون پر بات کرنے میں مصروف تھا لیکن اب اس کی نظریں لیاقت حسین کے چہرے کا جائزہ بھی لےنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔

”سیٹھ عثمان اور ان کی بیگم سے ملاقات کے بعد تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ کال ختم ہونے کے بعد اس نے لیاقت حسین سے دریافت کیا۔

”زنجیوں کا بیان ہو جائے پھر فیصلہ ہو جائے گا۔“

”میں نے اس وقت پولیس اسپتال سے ہی رابطہ کیا تھا۔ عملے کا اندازہ ہے کہ دو ایک گھنٹوں میں وہ بھی ہوش میں آجائیں گے۔ مگر..... تمہیں ان کے بیان سے کیا سروکار ہے؟ ایس ایچ او نے وضاحت طلب نظروں سے لیاقت حسین کو گھورا۔

”اوپر والا سب سے بڑا کارساز ہے۔ اس کا جو فیصلہ ہوگا اسے ہم مل کر بھی نہیں ٹال سکتے۔“ لیاقت حسین نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ پھر سر پر تعینات سپاہی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ایس ایچ او نے شانے اچکائے۔ کچھ سوچ کر وہ ایس پی اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔



سکندر علی شاہ اس وقت اپنی اسٹڈی میں تنہا موجود تھا۔ وہاں اس کے سوا کسی اور کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے گہرے تاثرات دھوپ چھاؤں کی طرح بدل رہے

”کوئی اور بھی ہمارے ساتھ آنے کو چل رہا تھا لیکن ہم نے اسکا یہاں آنا ناپسند نہیں کیا۔ راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین کے قریب آکر مدھم لہجے میں کہا۔

”آپ نے اچھا کیا..... یہ جگہ آپ لوگوں کے قابل نہیں ہے۔“

”پھر..... تم یہاں رہنے کی ضد کیوں کر رہے ہو؟“

”میں نے کیا کیا.....“ لیاقت حسین پھر جذباتی ہونے لگا۔ ”جو سچ ہے وہی بار بار دہرا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کیا کہوں؟“

”سراج بھائی نے تمہیں جو مشورہ دیا تھا وہ اب بھی مان لو.....“ راحیلہ بیگم نے سرگوشی کی۔ ”جو مر گیا اور جو لوگ زنجی ہیں ان کا سابقہ ریکارڈ بھی مل گیا ہے۔ سب افراد مجرم ہیں۔ اب ان مجرموں کو قانون کے جال میں پھنسانے کی خاطر اگر تم بھی مصلحت سے کام لو تو یہ بھی نیکی ہوگی۔“

”راحیلہ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیاقت حسین.....“ سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کی ذہنی کشش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”دردنوں کو بھی قابو کرنے کی خاطر ان کی راہ میں خندقیں کھودی جاتی ہیں۔ مضبوط جال بنے جاتے ہیں۔“

”میں نے بھی ایسا ہی کیا تھا صاحب.....“ لیاقت حسین نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”اگر وہ مر جاتے تو ان کا پرانا حساب کتاب میرے حق میں گواہی دیتا..... وہ زندہ ہیں تو میں مجرم کیسے بن گیا؟“

”تمہارا تعلق اگر پولیس کے محکمے یا قانون نافذ کرنے والی کسی ایجنسی سے ہوتا تو اور بات تھی لیکن محض شکوک و شبہات کی بنیاد پر اگر عام آدمیوں کو یہ حق دے دیا جائے تو پھر عدالتوں کے لیے ایسے مقدموں کو نمٹانا بھی آسان نہیں ہوگا۔“

”کل سرفراز خان صاحب کا بھی فون آیا تھا۔“ لیاقت حسین کے کوئی جواب دینے سے پیشتر راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”وہ بھی آنے کو کہہ رہے تھے لیکن ہم نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ہم بھی تمہارے لیے کوئی غیر نہیں ہیں۔“

”بابا نے مجھے برا بھلا تو نہیں کہا.....؟ لیاقت حسین نے سوال کیا۔

”نہیں.....“ سیٹھ عثمان نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ تم نے جو کیا وہی مردوں کا شیوہ ہے۔ جس کی پشت پر گولی لگے اسے مرد میدان نہیں کہتے۔“

”بابا نے سچ کہا ہے صاحب۔“ لیاقت حسین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”ہمارے علاقے کا یہی دستور ہے۔“

”جانتا ہوں لیکن..... تم اس وقت شہر میں ہو جہاں کے طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ عقلمندی یہی ہے کہ جیسا دیس دیا بھیجیں کے فارمولے پر عمل کیا جائے۔“

”فرحین نے ہمارے بارے میں کیا کہا ہے؟“

لیاقت حسین نے نظریں جھکا کر راحیلہ بیگم سے دریافت کیا۔

تھے۔ کئی سوال ابھرا بھر کر آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

”فارم ہاؤس میں جو لڑکی اس کے لیے لائی گئی تھی اس پر ہاتھ صاف کرنے کی جرأت کس نے کی تھی.....؟ لڑکیاں فراہم کرنے والی دربار نامی لڑکی نے جو اطلاع اسے دی تھی وہ سچ بھی تھی یا نہیں..... اگر نہیں تو اس نے اس قدر سنجیدگی سے جھوٹ بولنے کی جرأت کیوں کی.....؟ فارم ہاؤس کے تمام معاملات کی نگرانی گونگے کے ذمے تھی۔ اسے ملازموں پر سختی یا نرمی کرنے کے پورے اختیارات بھی حاصل تھے..... پھر وہ کون تھا جس نے گونگے کی سخت گیر طبیعت کو نظر انداز کر کے شیر کے شکار پر منہ مارنے کی غلطی کی تھی؟

سکندر علی شاہ گونگے کی فطرت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ شروع ہی سے عورت ذات سے نفرت کرنے کا عادی تھا۔ ایسی ہی ایک اہم وجہ سے وہ خود بھی لاوارث ہو گیا تھا پھر ایک عورت ہی کے سبب اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے بعد اسے سکندر علی شاہ کے عتاب کا شکار ہونا پڑا تھا۔ سکندر علی شاہ نے اس کو اپنے ذرا نیور ہونے کی اہم ذمہ داری سے ہٹا کر فارم ہاؤس بھیج دیا تھا۔ اس موقع پر بھی گونگے کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ اسے پھر ایک عورت کی وجہ سے شہر کے ہنگاموں سے دور ہٹا کر صرف فارم ہاؤس تک محدود کر دیا گیا تھا اور..... جب سکندر علی شاہ نے کچھ دیر پہلے پھر ایک لڑکی کی خاطر اسے ذمہ دار قرار دے کر اس کے گھٹنے پر ٹھوکر ماری تھی تو گونگے نے لڑکھڑا کر گرتے گرتے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس نے نگاہوں میں احتجاج کے ساتھ ساتھ نفرت کے شعلے بھی لپکے تھے مگر اپنی مجبوریوں کی خاطر اس نے پھر سکندر علی شاہ کے قدموں میں پناہ لی تھی۔ یہ باتیں سکندر علی شاہ کے لیے نئی نہیں تھیں لیکن گونگے کی حمایت ”شکرہ“ کے فون اور دھمکی آمیز گفتگو نے سکندر علی شاہ کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکی تھی کہ ”شکرہ“ کو اچانک گونگے سے کیا ہمدردی پیدا ہو گئی؟ اس نے کڑھے مردے اکھاڑنے والی بات کہہ کر بھی سکندر علی شاہ کو چونکا دیا تھا۔ یہ ایسی ہی اہم بات تھی جو سکندر علی شاہ کے خیال میں اس کے علاوہ کسی اور کے علم میں نہیں تھی۔ پھر ”شکرہ“ کا کوڑو رد استعمال کرنے والے کو اس کا علم کس طرح ہو گیا؟ وہ کس طرح واقف ہو گیا تھا کہ لڑکی کو کس نے روندنا تھا.....؟ گونگے کی حمایت اس نے دھمکی آمیز انداز میں کیوں کی تھی؟ کیا ہمدردی تھی اسے گونگے سے؟ اور..... اس نے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر لڑکی کی عزت لوٹنے والے کی لاش کی اطلاع دینے کا دعویٰ کس بنیاد پر کیا تھا؟ کیا وہ گھر کا کوئی بھیدی تھا جو..... سکندر علی شاہ کی ایک ایک نقل و حرکت سے واقف تھا..... یا..... کوئی بدروح تھی جس نے سکندر علی شاہ کو فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچانے میں مدد کی تھی اور اس کے بدلے وہ اسے اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر رہی تھی.....؟

چوبیس گھنٹے کے دعوے کی مدت ختم ہونے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا جب فون کی کھنٹی کی آواز نے سکندر علی شاہ کو چونکا دیا۔ ایک لمحے تک وہ فون کو گھورتا رہا پھر ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

”سکندر علی شاہ بول رہا ہوں۔“ اس نے حسب معمول بھاری آواز میں کہا۔

”سلام مالک.....“ دوسری جانب سے بڑی انکساری سے جواب ملا۔ ”میں آپ کا نمک خوار برکت بول رہا ہوں۔“

برکت فارم ہاؤس کے تین چوکیداروں میں سے ایک کا نام تھا..... کسی اہم ضرورت کے بغیر وہ فون کو ہاتھ لگانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا..... سکندر علی شاہ اس کا نام سن کر چونکا۔

”کس لیے فون کیا ہے.....؟“

”ایک ضروری اطلاع دینی تھی مالک.....“ اس بار بھی سہمی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ ”فضلو چوکیدار نے خودکشی کر لی ہے۔ دس منٹ پہلے شیر اس کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ کھڑا ہے۔“

سکندر علی شاہ کے لیے کسی ملازم کی موت کی اطلاع کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن شکرہ کے حوالے سے وہ فضلو کی خودکشی کی خبر سن کر ہونٹ چبانے لگا..... مرنے والا اس کے اعتماد کا ملازم تھا، گزشتہ تین سال سے وہ بھی دوسرے پالتو کتوں کی طرح دم ہلا رہا تھا پھر اس نے اچانک خودکشی کیوں کر لی؟ کیا شکرہ نے کسی لاش کی اطلاع ملنے کا جو دعویٰ کیا تھا اس کا کوئی تعلق فضلو کی موت سے بھی تھا؟ ایک لمحے کو متعدد خیال ذہن میں ابھرے پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”خودکشی کا اندازہ تمہیں کیسے ہوا.....؟“

”اس کے منہ سے جھاگ اٹھ رہے ہیں مالک۔ سارا جسم نیلا پڑ گیا ہے۔ ہاتھ میں ایک پرچہ بھی دبا ہے۔ ہم نے ابھی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا.....“

”ہاتھ کا پرچہ نکال کر پڑھو۔ اس میں کیا لکھا ہے“ سکندر علی شاہ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ایک منٹ بعد ہی دوسری جانب سے برکت کی آواز ابھری..... ”مالک..... وہ..... فضلو نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”پرچے میں یہی لکھا ہے مالک کہ جو..... لڑکی یہاں آئی تھی اسے.....“

”میرا علم غور سے سنو.....“ سکندر علی شاہ نے لڑکی کا حوالہ سننے کے بعد تیزی سے کہا۔ ”پرچے کو احتیاط سے رکھو اور..... فضلو کو خاموشی سے دفن دو..... اس کی اطلاع فارم ہاؤس سے باہر نہیں جانی چاہیے۔“

”نہیں جائے گی مالک.....“

سکندر علی شاہ ریسیور کرپڈل پر رکھ کر اٹھ گیا۔ فضلو کی موت کا سن کر شکرہ کے آخری جیلے پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ یہ خیال بھی بار بار کسی نیون سائن کے مانند اندھیرے اور اجالے کا تاثر پیش کر رہا تھا کہ جو بات فارم ہاؤس کے ملازموں کے علم میں بھی نہیں تھی اس کی جھنک فارم ہاؤس سے نکل کر شکرہ تک کس طرح پہنچ گئی.....؟ فضلو نے کس کے خوف سے خودکشی کر لی جبکہ کسی دوسرے ملازم کو لڑکی کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے سکندر علی شاہ کے اندر سلگنے والے بارود کو اور ہوا دے دی..... سب جانتے تھے کہ اسٹڈی میں اسے ڈسٹرب کرنا کسی سنگین جرم سے کم نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ کسی زنجی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دروازے کی طرف لپکا..... ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا..... سامنے نگینہ کھڑی تھی۔

”تم.....“

”سوری ڈارلنگ.....“ نگینہ نے اس کے تہور دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”جو خبر مجھے ملی ہے وہ بھی آپ تک پہنچانی ضروری تھی۔“

”اب کون مر گیا.....؟“ خشک لہجے میں سوال کیا گیا۔

”شیلا درما کی کال آئی تھی..... وہ آپ سے براہ راست بات کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے اسٹڈی کا نمبر نہیں دیا۔“

”اچھا کیا.....“ سکندر علی شاہ نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ ”میں ایسی عورتوں کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دیتا۔“

”جانتی ہوں لیکن اس نے مجھے آپ کے کانوں تک ایک خبر پہنچانے کی ذمہ داری سونپی ہے۔“

”کیا خبر ہے.....؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے اس کے بیوٹی پارلر پر کچھ نامعلوم لوگوں نے توڑ پھوڑ کی ہے۔ شیلا درما کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی دے گئے ہیں۔“

”پھر..... میں کیا کروں؟“ سکندر علی شاہ نے بہ دستور لاطعلقی کا اظہار کیا پھر اس نے اسٹڈی کا دروازہ بند کر لیا لیکن..... اب اس کے ذہن میں ایک سوال گونج رہا تھا۔

لڑکی بے آبرو کرنا..... شکرہ کا کال اور اب..... ہنی مون بیوٹی پارلر پر ہنگامہ ان سب کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟



جوننی ماضی کے جن راستوں اور نشیب و فراز سے گزر کر شیلا درما تک پہنچا تھا وہی اس کے معلم تھے۔ وہ قبل از وقت خطروں کی بوسنگھ لینے کا عادی تھا، لیکن مستقبل کا لکھا اسے بھی نہیں معلوم تھا۔ البتہ خدشات کے پیش نظر عقلی گھوڑے دوڑانا ایک عام آدمی کی طرح اس کا بھی حق تھا۔

اس تقابل میں وہ ایسی ہی سچویشن سے دو چار تھا۔

یہ پہلا اتفاق تھا جب اسے پولیس کے کسی ڈی ایس پی نے اپنے دفتر میں طلب کیا تھا۔ وہ حکم کے مطابق ٹھیک ساڑھے نو بجے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کے اس دفتر پر پہنچ گیا جہاں اس سے قبل ایس پی اورنگ زیب تعینات تھا۔ جوننی ان دنوں پولیس افسران کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ بیوٹی پارلر سے روانہ ہوتے وقت شیلا درما نے جہاں اسے یہ کہا تھا ”کسی بات کی پروا نہ کرنا“ وہاں یہ بھی باور کر دیا تھا کہ وہ دونوں سے محتاط رہ کر گفتگو کرے۔ خود جوننی بھی ان دونوں کے بارے میں خاصی معلومات رکھتا تھا۔ وہ اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ بیوٹی پارلر پر ہونے والے حادثے کی اطلاع پولیس کو دی جائے، لیکن شیلا درما نے کسی کے اشارے پر ہی باقاعدہ شکایت کرادی تھی۔

جوننی نے سراج کے آفس پہنچ کر ایک سپاہی سے اپنی آمد کی اطلاع کرانی چاہی تھی۔

”ڈپٹی صاحب ابھی نہیں آیا۔“ سپاہی نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ ”انتظار کرو.....“

”مجھے ساڑھے نو بجے آنے کا حکم ملا تھا۔“

”بولانا..... انتظار کرو.....“ اس بار پولیس والے نے جوننی کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا۔ جوننی خاموشی سے دروازے میں پڑی ایک بیچ پر بیٹھ گیا اس کے ذہن میں بیوٹی پارلر پر ہونے والے ہنگامے کا خیال ابھرنے لگا۔



شام ٹھیک پانچ بجے اس کی آنکھ معمول کے مطابق کھل گئی تھی۔ حسب دستور اس نے بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے ذریعے باہر جھانکا تھا۔ پارلر کے سامنے روزمرہ کی طرح نئے نئے ماڈل کی قیمتی گاڑیاں پارک تھیں۔ وہ شانے اچکا کر بیچ باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ پر پانی کا چھینا ڈال کر اس نے لباس تبدیل کیا پھر اپنا پسندیدہ پرفیوم اپنے لباس پر اسپرے کر رہا تھا جب اس کے کانوں میں ایک ام آئی پیچ کی آواز سنائی دی تھی۔ جوننی لپک کر دوبارہ کھڑکی کے قریب آ گیا۔ پارلر سے سبھی ہوئی مرنیں اور لڑکیاں کھل کھل کر اپنی گاڑیوں میں بیٹھ رہی تھیں۔ جوننی خطرے کی بوسنگھ کر باہر جانے

”ڈونٹ وری.....“ شیلا ورمانے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میں ان..... کو چھوڑوں گی نہیں۔“
”کیا تم ان کو.....“

”میں نہیں جانتی کہ وہ سن آف دی بچ son of the bitch کون تھے لیکن اب پولیس ان کو ان کی قبروں سے بھی ڈھونڈ نکالنے کا کام انجام دے گی۔“
”ریٹکس..... جونی نے شیلا کے قریب جا کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔“ ان کے آنے کا کوئی مقصد بھی ضرور ہوگا۔“

”ہاں۔ وہ..... ایک لاکھ روپے ماہانہ کے بھتے کی ڈیمانڈ کر رہے تھے۔“
”تم نے کیا سوچا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آنے والوں کے خلاف کیا کرے گی۔“ جونی نے سفیدگی کا مظاہرہ کیا۔ ”اگر ان سے واقف ہو تو پولیس کے پاس جانے سے پہلے مجھے بتا دو..... وہ جو بھی ہوئے جونی انہیں پالتو کتوں کی طرح گلے میں زنجیریں پہنا کر تمہارے قدموں تک گھسیٹ لائے گا۔“

”جھینکس جونی.....“ شیلا نے جونی کو گلے لگا کر جذباتی انداز میں کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم شیلا کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہو لیکن..... میں نے تمہیں بہت کچھ کھو کر پایا تھا۔ اب پا کر کھونے کی غلطی نہیں کروں گی۔“
”کچھ دیر وہ جذباتی باتیں کرتی رہی پھر وہ فون کے قریب گئی تو جونی نے اس کے ارادے کو مہانپ کر دیا۔ ”کس کو کال کر رہی ہو.....؟“
”سکندر علی شاہ کو۔“

”اوہ.....“ جونی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا تم سکندر علی شاہ کو جانتی ہو؟“
”نہیں.....“ لیکن میں اسے جو حوالہ دوں گی اس کے بعد وہ میری مدد کرنے سے انکار بھی نہیں دے گا۔“

”سوچ لو..... وہ جیری مریدی کرنے والا بندہ ہے۔“
”جانتی ہوں..... وہ مریدوں کو مرید کرتا ہے مگر خود خوبصورت عورتوں کا مرید ہے۔ تم نگینہ کو یہاں فراموش کر رہے ہو۔“ شیلا ورمانے کے لہجے میں کٹ تھی۔ ”دنیا کا ہر مرد خوبصورت عورتوں کا مرید ہوتا ہے۔“

”نگینہ کا حوالہ درمیان میں آ جانے کے بعد جونی نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس کے بعد وہی ۱۱ جیلا ورمانے کہا تھا۔ سکندر علی شاہ نے مختلف حوالوں کے بعد شیلا ورمانے کی نہ صرف رام کہانی سن لی بلکہ اسی نے شیلا ورمانے کی طرف سے پولیس کو بیوی پارلر پر ہونے والے حملے اور اس کی تفتیش کی خاطر لون بھی کرا دیا تھا۔ جونی بھی اس وقت بلائے جانے کے بعد سراج کے دفتر تک آ گیا تھا۔ لیکن اس نے انہیں مستقبل کا حال بتانے والی مس ڈکسن کا ایک جملہ گونج رہا تھا۔ ”جتنی جلدی ممکن ہو شیلا ورمانے دنیا سے کہیں دور چلے جاؤ۔ کسی ایسی جگہ جہاں تک اس کی رسائی بھی ممکن نہ ہو۔“

کے راستے کی جانب لپکا پھر کیے بعد دیگرے دو فائر ہونے کی آواز سن کر وہ محتاط ہو گیا دوبارہ پلٹ کر وہ کھڑکی کے قریب آیا۔

باہر سڑک پر ایک وین پارلر کے عین سامنے کھڑی تھی۔ وین کے قریب ایک آدمی منہ پر ڈھانٹا باندھے راکٹل لیے موجود تھا۔ فائرنگ کی آواز سن لینے کے بعد ہی نیچے بھگدڑ بھی مچ گئی تھی۔ سامنے شاپنگ سینٹر کی دکانوں کے شیشے گرا لیے گئے تھے۔ پارلر کے اندر سے کسی کے چیخ چیخ کر باتیں کرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ قیمتی شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار بھی گواہ تھی کہ پارلر میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

جونی کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں غور کر رہا تھا جب دو افراد شیلا ورمانے کو کھینچتے ہوئے پارلر سے باہر نکال لائے، دونوں کے ہاتھ میں پستول موجود تھے۔

”یہ..... یہ تمہارے لیے پہلی وارننگ ہے میڈم شیلا!“ ایک شخص ڈنگ آواز میں شیلا ورمانے کو نفرت سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”آج ہم نے صرف تمہارے پارلر کا نقشہ تبدیل کیا ہے۔ دوسری بار آئے تو تمہاری بیوی میں بھی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ کاروبار جاری رکھنا ہے تو ہر ماہ ہماری مطلوبہ رقم تیار رکھنا۔ ہم انکار سننے کے عادی نہیں ہیں۔“

شیلا ورمانے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے میک اپ کا پچکارنگ اور ہونٹوں کی پھیلی لپ اسٹک بھی گواہی دے رہی تھی کہ دھمکی دینے والوں نے اس کے ساتھ تفریحا کچھ چھڑ خانی ضرور کی ہوگی۔ وہ خاموش تھی، لیکن اس کی آنکھوں کی سرخی اس بات کی غمازی بھی کر رہی تھی کہ وہ ان کے جانے کے بعد طوفان اٹھانے سے بھی باز نہیں آئے گی۔ جونی بھی جانتا تھا کہ جو کاروبار وہ کر رہی تھی اس میں اس کے ہاتھ بہت دور دراز تک پھیلے ہوئے تھے۔

”ہماری وارننگ کا خیال رکھنا ہے بی بی؟“ دوسرے آدمی نے شیلا ورمانے کو مسکرا کر آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ماہانہ ادائیگی کے علاوہ ہم کبھی کبھی تمہیں ذاتی خدمت کرنے کے کام بھی لاتے رہیں گے۔“

پھر وہ دونوں وین میں بیٹھ کر چلے گئے۔ جونی پہلی فرصت میں دوبارہ نیچے کی طرف لپکا۔ اس نے آنے والوں کے چہروں کو نظر میں رکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ جانتا تھا کہ انہوں نے میک اپ کا سہارا لینے کے بعد ہی واردات کی ہوگی۔ وہ تیزی سے نیچے پہنچا تو شیلا ورمانے وہاں نہیں تھی۔ فوری طور پر اس نے پارلر کے اندر کا نقشہ دیکھا۔ آنے والوں نے سب کچھ درہم برہم کر دیا تھا۔ دس منٹ بعد جونی شیلا ورمانے کے پاس اس کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ جہاں وہ کسی چوٹ کھائی ہوئی زخمی شیرنی کی طرح ٹہل رہی تھی۔ جونی کو سامنے دیکھ کر وہ رک گئی۔

”تم کہاں تھے؟“
”میں سو رہا تھا..... جب آنکھ کھلی تو سیدھا نیچے گیا لیکن.....“ جونی نے بڑی خوبصورت باری کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہ سب کچھ اچانک کیسے ہو گیا؟ بات کیا ہوئی تھی جو.....“

جونى اپنے خيالوں میں گم تھا جب ورائڈے میں موجود سپاہى نے اسے بتايا کہ ڈپٹى سپرنٹنڈنٹ آگئے ہیں اور اسے بلایا گیا ہے۔ جونى دھڑکتے دل سے اٹھا پھر خود کو سنبھالتا اس کمرے میں داخل ہوا جہاں سراج اس کا منتظر تھا۔ اس نے جونى کو سر سے پاؤں تک ایک نظر ٹھٹھا پھر اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ خود سامنے رکھی فائل کے اوراق اٹھنے پلٹنے لگا۔ پانچ سات منٹ کمرے میں مکمل خاموشی رہی پھر سراج نے فائل بند کرنے کے بعد ہی جونى کو مخاطب کیا۔

”نیوٹن پارلر میں ہونے والے توڑ پھوڑ کے سلسلے میں ہمیں اوپر سے یہی ہدایت ملی ہے کہ اس کے ذمہ داروں کو پہلی فرصت میں گرفتار کر کے سخت سزا دی جائے۔ میں نے تمہیں اسی سلسلے میں طلب کیا ہے..... کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ لوگ کون تھے؟“

”جی نہیں.....“ جونى نے سادگی سے جواب دیا۔ ”میں اس وقت اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ جب مس درمانے مجھے بلایا تو مجرم جا چکے تھے لیکن مس درما توڑ پھوڑ کے وقت پارلر ہی میں موجود تھیں۔“

”مس درما کا بیان ہے کہ وہ بھی ان سے واقف نہیں ہیں۔ یہ بھی شبہ ہے کہ آنے والے اپنی اصل شکل میں نہیں تھے۔ ایسی صورت میں فوری طور پر کسی کی گرفتاری بھی ممکن نہیں لیکن فکر پریش کی رپورٹ آ جانے کے بعد ہو سکتا ہے کہ کوئی سراغ ہاتھ آئے۔“

جونى نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم وہاں کیا کام کرتے ہو.....“

”پارلر کی وین کا ڈرائیور ہوں سر.....“ جونى نے انکساری سے جواب دیا۔ ”مس درما کی گاڑی چلانے کی خدمت بھی انجام دیتا ہوں۔“

”مس درمانے بھی یہی بتایا ہے۔ یہ بھی خاص طور پر کہا کہ تم اس کے سب سے زیادہ وفادار اور قابل اعتماد درکار ہو۔“

”ان کی مہربانی ہے سر۔“

”کب سے ملازم ہو؟“

”لگ بھگ تین سال سے۔“ جونى نے مختصر جواب دیا۔

”گڈ۔“ سراج نے اس بار قدرے بے تکلفی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم ہماری مدد کر سکو۔“

”آپ کی تابعداری سے بھی انکار نہیں کروں گا سر۔“

”گڈ..... مس درما سے کہنا کہ کسی وقت میں ان سے بھی ملاقات کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“

”کیا پتا پسند کرو گے..... چائے یا کولڈ ڈرنک۔“

سراج نے دوستانہ انداز میں جونى سے دریافت کیا۔

”آپ نے اس قابل سمجھا یہی میرے لیے بہت ہے سر۔“ جونى نے کسمسا کر جواب دیا۔

”تم کو اس وقت بلانے کا ایک ہی مقصد تھا۔“ سراج نے مسکرا کر کہا۔ ”تم چونکہ مس درما کے خاص آدمی ہو اس لیے ان کو یقین دلانا کہ ہم ان کی رپورٹ کے سلسلے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیں گے۔“

”میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”تم..... اب جا سکتے ہو۔ ضرورت ہوئی تو دوبارہ تکلیف دوں گا۔“

جونى خاموشی سے اٹھا اور سر جھکا کر کمرے سے نکل گیا۔ سراج کے ہونٹوں پر اس کے جانے کے بعد بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھری تھی۔



تینوں زخیموں کو جو وکیل فراہم کیا گیا تھا اسی کی درخواست پر ان کو چیمبر میں طلب کیا گیا تھا۔ عدالت کے روبرو پیش ہونے کی خاطر انہیں پولیس کے دو دو کارندوں نے ڈنڈا ڈولی کر کے کمرے تک پہنچایا تھا وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔

چیمبر میں لیاقت حسین بھی تھا۔ حوالات کی پولیس اسے ہتھ کڑی پہنا کر لائی تھی۔ تینوں زخیموں کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر جو زخمی مسکراہٹ ابھری اسے وہاں موجود سب ہی افراد نے دیکھا تھا۔

”تم یہاں کوئی حماقت کا ثبوت نہیں دو گے۔“ متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او نے مدھم آواز میں لیاقت سے کہا۔

”آپ فکر مت کرو صاحب۔ مجھے قانون کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔ میں کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا۔“

”ایک بات اور بتا دوں۔“ ایس ایچ او نے سرسرا تے لہجے میں کہا۔ ”باہر سیٹھ عثمان اور ان کی بیگم بھی موجود ہیں۔“

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں پھر تینوں زخیموں پر مرکوز ہو گئیں جو بے مد کسپری کی حالت سے دوچار تھے۔

مجسٹریٹ چیمبر میں داخل ہوا تو سنبھل گئے۔ تینوں زخیموں کا باری باری بیان ہوا۔ تینوں نے ایک ہی بات کہی تھی کہ اگر لیاقت حسین پہل نہ کرتا تو وہ پھر اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ لیتے۔

”تم تینوں کو لیاقت حسین سے کیا دشمنی ہے؟“

سرکاری وکیل نے دریافت کیا۔

”بات دشمنی کی نہیں۔ اس حکم کی ہے جو ہمیں دیا گیا تھا۔“ ایک زخمی نے ہونٹ چباتے ہوئے

واب دیا۔ ”ہمیں اس کام کے عوض معقول رقم بھی پیشگی مل گئی تھی۔“

”اوہ..... گویا تم اقرار کر رہے ہو کہ تم تینوں اجرتی قاتل ہو۔“

”آپ کی جو مرضی آئے سمجھ لیں۔“

”ون منٹ.....“ مجسٹریٹ نے سرکاری وکیل سے کہا پھر اس نے براہ راست زنجیوں سے سوال کیا۔ ”لیاقت حسین کو مارنے یا زخمی کرنے کا حکم تمہیں کس نے دیا تھا؟“

”ہم اسے نہیں جانتے۔“

”رقم کس نے ادا کی تھی؟“ مجسٹریٹ کی کشادہ پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ”اسی کا نام اور پتا بتا دو۔“

”وہ بھی پہلی بار سامنے آیا تھا۔“ زنجیوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میک اپ میں ہو۔“

”نان سینس!“ مجسٹریٹ جھلا کر بولا پھر اس کے اشارے پر سرکاری وکیل نے زنجیوں سے سوال کیا۔

”کیا تم لوگ اس سے پہلے بھی واردات کرتے رہے ہو؟“

”ہم نے لیاقت حسین کے بارے میں اقبال جرم کر لیا ہے جناب۔ آپ گڑے مردے کیوں اکھاڑنے کی کوشش.....“

”یہ عدالت ہے۔“ مجسٹریٹ نے میز پر ہاتھ مار کر زنجیوں کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”جو پوچھا جائے صرف اس کا جواب دو۔“

”کیا لیاقت حسین سے پہلے بھی تم کسی نامعلوم شخص کے کہنے پر منہ مانگی اجرت حاصل کرنے کے بعد واردات کرتے رہے ہو؟“ سرکاری وکیل نے اپنا سوال دہرایا۔

”ہاں.....“ ایک زخمی نے مختصر جواب دیا۔

”کتنی وارداتیں کر چکے ہو؟“

”ہمیں یاد نہیں۔ حساب کتاب رکھنا ہمارے پیسے کے لوگوں کی عادت نہیں ہوتی۔“

”کبھی پہلے بھی گرفتار ہو چکے ہو؟“

”جی نہیں۔ یہ پہلا اتفاق ہے۔“ زخمی شانے اچکا کر بے پروائی سے بولا۔

”بہر حال تم اقرار کرتے ہو کہ اگر لیاقت حسین تم پر حملہ کرنے میں پہل نہ کرتا تو تم اس پر قاتلانہ حملہ کرنے سے گریز کرتے۔“

”جی ہاں۔“ زنجیوں نے باری باری ایک ہی بات کہی۔ ”اقبال جرم کے بعد ہم ایک درخواست اس عدالت سے بھی کریں گے..... ہمیں جیل میں بھی دوسرے قیدیوں سے الگ تھک رکھا جائے ورنہ ہماری موت یقینی ہے۔“

”وہاٹ.....“ مجسٹریٹ نے تینوں کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”تمہیں جیل میں کس بات کا خطرہ ہے؟“

”جس نے ہمیں خریدا تھا وہ اور اس کے کارندے اپنے پیچھے کوئی ثبوت یا کسی شہادت کا نشان چھوڑنے کے عادی نہیں ہیں۔ اگر اتنے شاطر نہ ہوتے تو ہم جو موت کے دہانے پر کھڑے ہیں ان کو

بھاگنے سے دریغ بھی نہ کرتے۔ وہ اگر اناڑی ہوتے تو قانون کا ہاتھ بھی ان کے گریبان تک پہنچ چکا ہوتا۔“

ایک لمبے کوچیبر میں مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ لیاقت حسین کے ہونٹوں پر بھی جیسے چھڑی جم گئی۔ زنجیوں نے جو بیان دیا وہ اس کے لیے غیر متعلقہ ہونے کے باوجود قابل غور تھا۔ مجسٹریٹ کی نظریں بھی بار بار زنجیوں کے چہروں پر منڈلا رہی تھیں پھر اس کی آواز ابھری۔

”میں تم لوگوں کی پوزیشن کچھ سمجھ رہا ہوں لیکن آخر کب تک تم اصل مجرم کی نظروں سے روپوش رہو گے؟ موجودہ کیس کی سزا سمجھنے کے بعد باہر آؤ گے تو پھر نادیدہ قاتلوں کے ہاتھ تمہاری ہونیاں ادھیڑ ڈالیں گے۔“

زنجیوں کے ہونٹوں پر ایک پچکا سا تبسم ابھر کر نڈھال ہو گیا۔ ایک نے شانے اچکا کر مجسٹریٹ کو طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کسی سائے یا پرچھائیں کو تھکڑی پہنانا قانون کے اختیار میں بھی نہیں ہوتا۔“

”تم خود کسی شے کا اظہار کرو۔ اصل مجرم تک پہنچنا پولیس کا کام ہوگا۔“ مجسٹریٹ نے انہیں اکسانے کی کوشش کی۔

”شے..... ایک زخمی نے کراہ کر جواب دیا۔ ”ہمیں کسی ایسی ہی بڑی مچھلی پر شبہ ہے جس کے طاقتور ہاتھ حکومت کی جڑوں سے بھی ملے ہوئے ہیں۔ قانون ان پر ہاتھ ڈالنے کی.....“

’شٹ اپ.....‘ مجسٹریٹ نے جھلا کر کہا پھر اس نے لیاقت حسین کی طرف دیکھا۔ ”تم اپنے سابقہ بیان میں کہہ چکے ہو کہ تم نے محض شے کی وجہ سے آتشیں اسلحہ استعمال کیا تھا۔“

”یاد ہے صاحب اور۔ اب میں بھی اپنا بیان نہیں بدلوں گا۔“ لیاقت حسین نے سفیدی سے جواب دیا۔

”شے کی کیا وجہ تھی؟“

”میں اس کی تفصیلی وجہ بھی پچھلے بیان میں بتا چکا ہوں۔“ لیاقت حسین نے کھل کر کہا۔ ”کسی مسلمان سڑک پر تین چار افراد ہاتھ میں اسلحہ لیے ایک تنہا آدمی کو گھیریں تو اس کا وہی مطلب ہوتا ہے جو میری عقل میں آیا تھا۔ اس نے پیشتر بھی ان کتوں کو گھیر کر موت کے حوالے کر دیا تھا جنہوں نے میری عزت پر ڈاکا ڈالنے کی غلطی کی تھی۔“

”میں تمہاری فائل تفصیل سے پڑھ چکا ہوں لیکن جو لوگ تمہارے دشمن ہیں، ان کی دشمنی کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی۔ تمہیں بھی کسی نہ کسی پر شبہ ہوگا۔“

”غم تو اس بات کا ہے صاحب کہ وہ بزدلوں کی طرح چھپ کر وار کرتا ہے۔ ایک بار کھل کر ماننے آجائے تو میں قبر تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے بعد پھانسی کا پھندا خود اپنے ہاتھوں لگے میں ڈالنے سے بھی ہچکچاؤں گا نہیں۔“

مجسٹریٹ نے لیاقت حسین کے چہرے کے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا پھر اس کے

اشارے پر سوائے متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او کے باقی سب لوگ باہر چلے گئے۔
 ”آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ ذبیٰ افراد جان بوجھ کر زبان کھولنے۔
 گریز کر رہے ہیں؟ لیاقت حسین کا بار بار ایک ہی بیان پر قائم رہنا بھی کیا اس بات کی نشاندہی نہ ہو
 کرتا کہ کہیں ایسی کوئی وجہ ہے جو ابھی تک پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آئی؟“
 ”میں بھی ابھی تک اصل معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکا سر۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”جہاں تک
 میری ذاتی تفتیش کا تعلق ہے تو میں یہی کہوں گا کہ لیاقت حسین نے جو کارروائی کی وہ سیلف ڈیفینس
 میں تھی۔“

”میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ذبیوں کے اقرار جرم کے بعد لیاقت حسین کو باعزت رہا کر
 بھی قانون کی ذمہ داری ہے جسے پورا کرنے سے دریغ نہیں کروں گا لیکن..... ایک بات قابل غور
 ہے۔“ مجسٹریٹ نے کچھ توقف سے بات جاری رکھی۔ ”وہ کون سے بااثر لوگ ہیں جو ہر قیمت
 صرف ایک بات کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ لیاقت حسین کو رہا نہ کیا جائے۔“
 ”سر.....“ ایس ایچ او نے چونک کر مجسٹریٹ کو دیکھا۔ ”کیا آپ کو بھی اپروچ کیا گیا ہے؟“
 ”یہ بات بھی آپ کو آف دی ریکارڈ بتا رہا ہوں۔ فی الحال اس کا ذکر بھی کسی اور سے نہ کیجیے
 گا۔“

پھر ایس ایچ او کی موجودگی ہی میں ذبیوں کا تحریری بیان حاصل کرنے کے بعد مجسٹریٹ نے
 لیاقت حسین کو باعزت طور پر رہا کرنے کا مختصر فیصلہ بھی سنایا تھا لیکن.....
 دوسری صبح اسے اس کی خواب گاہ میں مردہ حالت میں پایا گیا۔ پولیس سرجن نے اس موت
 سبب سانپ کا زہر قرار دیا تھا۔



ہوم منسٹر کے آفس میں اس وقت آئی جی، ڈی آئی جی، ایس پی اورنگزیب، ڈی ایس پی سرار
 کے علاوہ بندرگاہ کے علاقے کا ایس ایچ او بھی موجود تھا۔ پولیس سرجن کی وہ عارضی رپورٹ بھی ہوم
 منسٹر کے سامنے رکھی گئی تھی جس میں مجسٹریٹ کی موت کی وجہ درج تھی۔
 اس وقت جو ہنگامی میٹنگ کال کی گئی تھی وہ بھی مجسٹریٹ کی پراسرار موت سے متعلق تھی۔

”مرحوم کی بیوہ نے جو بیان دیا ہے وہ ہم سب کے لیے قابل غور ہے۔“ ہوم منسٹر نے ٹھہرے
 ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”مرحوم کل جس وقت گھر پہنچا اس وقت خلاف فطرت بہت سنجیدہ
 تھا۔ بیوہ نے اس کا سبب دریافت کیا تو مرحوم نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اب ہمارے تمام
 ذمے دار اور بڑے بڑے عہدوں پر تعینات افسران نے بھی اپنی شخصیتوں پر فارسیل (for
 sale) کی تختی لگا رکھی ہے۔ بیوی نے وضاحت چاہی تو مرحوم بات کو ہنس کر ٹال گیا اور
 اب۔“ کمرے میں ایک لمبے خاموشی رہی پھر ہوم منسٹر نے براہ راست آئی جی کو مخاطب کیا۔ ”کیا
 آپ کو مرحوم کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے؟“

”جی ہاں۔ صبح کے اخبار میں بھی یہ خبر موجود تھی لیکن.....“
 ”اب لیکن کے آگے ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔“ ہوم منسٹر نے ہونٹ چباتے ہوئے
 کہا۔ ”مجرم گرفتار بھی ہو گئے تو مرنے والا واپس نہیں آ سکتا۔ ہم سب پھر روزمرہ کے کاموں میں
 مصروف ہو جائیں گے۔ کاغذات کی خانہ پری کر کے انہیں بھی داخل دفتر کر دیا جائے گا۔ مرنے
 والے کے پس ماندگان بھی روپیٹ کر ممبر کر لیں گے۔“

کمرے میں دوبارہ سکوت طاری ہو گیا۔ ہوم منسٹر نے دوسری بار ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔
 ”میری رپورٹ کے مطابق آپ کی موجودگی میں مرحوم نے کیس اپنے چیئرمین نمٹایا تھا۔“
 ”نہیں سر۔“ ایس ایچ او نے اقرار کیا پھر اس نے تمام تفصیل سناتے کے بعد دبی زبان میں
 کہا۔ ”آخر میں چیئرمین میرے اور مرحوم کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس وقت..... لیاقت حسین کی
 رہائی کا مختصر فیصلہ لکھنے سے قبل دبی زبان میں یہ بھی کہا تھا کہ کچھ لوگ بااثر مرحوم پر اس بات کا پریشر
 ال رہے تھے کہ لیاقت حسین کو رہا نہ کیا جائے۔“
 ”آئی جی،“ ہوم منسٹر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”لیاقت حسین کا نام میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ کون
 ہے یہ شخص؟“

”لیاقت حسین ہمارے ایک صنعتکار سیٹھ عثمان کا ڈرائیور ہے۔“ ڈی آئی جی نے جواب دینے
 میں پہل کی۔ ”میری ذاتی رپورٹ کے مطابق وہ بے حد کھرا، ایماندار اور وفادار ملازم ہے۔ اس کے
 علاوہ بھی ایک بات اس کے بارے میں مشہور ہے جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا
 لیکن مشر اورنگ زیب اور ڈی ایس پی سرانج کو کچھ موقعوں پر اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔“
 ہوم منسٹر نے ڈی آئی جی کی بات سن کر اورنگ زیب کی سمت دیکھا۔
 ”آپ کیا کہنا پسند کریں گے۔“

”فی الحال میں مختصر ایسی عرض کروں گا کہ کوئی روحانی قوت ہے جو لیاقت حسین کو قبل از وقت
 اطروں سے آگاہ کر دیتی ہے۔ دو موقعوں پر مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ میں نے لیاقت حسین سے
 ہی دریافت کیا تھا لیکن وہ ایسی کیفیت میں جو کچھ زبان سے کہتا یا کر گزرتا ہے وہ بعد میں اسے بھی
 یاد نہیں رہتا۔“

”انٹرسٹنگ!“ ہوم منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے ڈی آئی جی سے سوال کیا۔ ”مرحوم مجسٹریٹ
 لے رہا وہ اس کا کیا کیس تھا؟“

جواب میں ڈی آئی جی کے علاوہ علاقے کے ایس ایچ او نے بھی شروع سے آخر تک تمام
 المصیل دہرائی۔

”بہر حال..... یہ بات طے ہے کہ کوئی مرحوم پر لیاقت حسین کو باعزت طور پر رہا نہ کرنے کا
 اہل مال رہا تھا کون ہو سکتا ہے وہ؟“

ہوم منسٹر نے باری باری دفتر میں موجود تمام افراد پر نظر ڈالی۔ سب خاموش رہے تو ہوم منسٹر

نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔ ”جن زخیوں کو لاک اپ کیا گیا ہے ان کا کیا کہنا ہے؟“
”انہوں نے اقرار جرم کر لیا ہے سر، سرکاری وکیل اور میری موجودگی میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا پھانسی کا پھندا ان کے لیے زیادہ پرسکون موت ہوگی ورنہ ان کو خریدنے والے جس انجام سے دوچار کریں گے وہ پھانسی کے پھندے سے زیادہ اذیت ناک ہوگا۔“

”مسٹر اورنگ زیب۔“ ہوم منسٹر نے ایک بار پھر اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ آپ کی کارکردگی اور مرکز کی طرف سے جو رپورٹس میرے علم میں ہیں ان کی روشنی میں، میں آپ سے ایک سوال کروں گا۔۔۔۔۔۔ مرحوم مجسٹریٹ کی پراسرار موت کے سلسلے میں ہم پریس کو کیا جواب دیں گے؟“
”پریس کے قلم پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا سر۔۔۔۔۔۔ وہ تفتیشی افسروں کی حتیٰ رائے معلوم کرنے کے باوجود زندوں کے مردہ ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ دیتے ہیں۔“ اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”موجودہ حالات کی روشنی میں پولیس کو پریس سے زیادہ اپنی کارکردگی کا گراف بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں سر جوڑ کر کام کرنا ہوگا۔ دوسروں کے اختیارات میں دخل انداز ہونے والے ایسے افسران پر نظر رکھنی ہوگی جنہیں قانون کی پاس داری سے زیادہ اپنی عزت بچانے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔“

اورنگ زیب کی کھری گفتگو سن کر آئی جی اپنی نشست پر کسمایا، ہوم منسٹر کی پلکیں بھی تیز تیز جھپکنے لگیں۔ اس نے کچھ توقف سے کہا۔ ”کیا آپ جانتے ہیں کہ لیاقت حسین کے سلسلے میں مجسٹریٹ پر کس نے دباؤ ڈالا تھا؟“

”سوری سر۔۔۔۔۔۔ میں اس ضمن میں زبان کھولنے سے قاصر ہوں۔ محض شبہ کی بنا پر کسی کے اجلے دامن پر کچھڑا چھانا میرے اصول کے خلاف ہے لیکن یہاں اکثر معاملات میں اوپر کی مداخلت ہمیں ایسے لوگوں کے سامنے بھی سر جھکانے پر مجبور کر دیتی ہے جو انتہائی گھناؤنے کردار کے مالک ہوتے ہیں۔“

ہوم منسٹر کی نظریں اورنگ زیب کے چہرے پر منڈلاتی رہیں۔ اورنگ زیب کی کھری کھری باتوں نے خود سراج کو بھی الجھن میں ڈال دیا تھا۔

”مسٹر اورنگ زیب۔۔۔۔۔۔“ ہوم منسٹر نے طویل خاموشی کے بعد پنے تلے لہجے میں زبان کھولی۔ ”میں اس میٹنگ کے بعد آپ سے علیحدگی میں ملنا پسند کروں گا۔“
”میں آپ کے حکم سے انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوسکتا لیکن میں علیحدگی میں کچھ مصلحتوں کی بنا پر زبان نہیں کھول سکتا۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“

آئی جی اور ڈی آئی جی کے علاوہ اورنگ زیب کا جواب سن کر ہوم منسٹر کے چہرے پر بھی اپنی کرسی کی اہمیت کا احساس نمایاں ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے مسکرا کر کہا۔
”آفیشل گفتگو نہ سہی لیکن آپ میرے ساتھ کچھ وقت گزاریں گے۔“
”ایز یوش سر!“

”موجودہ کیس میں مجھے آپ کی ذاتی فائنڈنگس چوبیس گھنٹوں کے اندر درکار ہوگی۔“ اس بار ہوم منسٹر نے ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔ ”ٹاپ سیکریٹ اور کانفیڈنشل رپورٹ جو صرف میری ذات تک محدود رہے گی۔“

”رائٹ سر۔“ ڈی آئی جی کے پاس انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔
”ایک بات اور بھی حیرت انگیز ہے۔“ آئی جی نے دبی زبان میں کہا۔ ”اگر فاضل مجسٹریٹ پر کسی نے دباؤ ڈالا تھا تو اسے کم از کم یہ بات اپنے افسران کو بتا دینی چاہیے تھی۔ خود مرنے والے نے اپنی بیوہ سے بھی کھل کر کچھ نہیں کہا۔“

”کیا اہم سوال اور بھی ہے۔“ ہوم منسٹر نے کہا۔ ”واردات کرنے والا اس قدر خاموشی سے آیا اور اپنا کام کر کے فرار ہو گیا کہ گھر میں موجود دو بیٹیوں اور بیٹے کو بھی کان کان خبر نہ ہو سکی۔ مکان کا داخلی دروازہ بھی صبح اندر سے بند ہی ملا تھا۔ اس کے علاوہ گھر میں داخل ہونے کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔“

”ماہر نقب لگانے والے کنکریٹ کی دیوار میں خلا پیدا کرنے میں بھی ماہر ہوتے ہیں سر۔“ اورنگ زیب نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”تالوں کو ایک مخصوص تار کے ذریعے بہ آسانی کھولا اور بند کیا جاسکتا ہے۔“

آدھے گھنٹے کے بعد میٹنگ برخاست ہو گئی تو اورنگ زیب کے سوا تمام افسران واپس چلے گئے۔ سراج کو باہر گاڑی میں بیٹھ کر اورنگ زیب کا انتظار کرنا پڑا۔

اورنگ زیب نے سب کی موجودگی میں ہوم منسٹر سے کھل کر جو باتیں کی تھیں اس کے بعد سراج ذاتی طور پر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی مخصوص پروگرام بھی ضرور ہوگا ورنہ برملا افسران کے بارے میں وہ ہمیشہ کھل کر بات کرنے سے پرہیز ہی کرنے کا عادی تھا۔ وہ مخصوص پروگرام کیا تھا؟ اس کے بارے میں سراج ذہنی جناسنگ میں مشغول تھا جب بیس منٹ بعد اورنگ زیب بھی آ گیا۔

”ہوم منسٹر سے بند کمرے میں ملاقات کا تجربہ کیسا رہا؟“ سراج نے راستے میں دریافت کیا۔
”خلاف توقع ماحول خوشگوار ہی رہا ورنہ تم شاید واقف نہیں ہو کہ ہوم منسٹر کے ذاتی تعلقات بھی مرکزی حکومت کے اہم ذمے داروں تک ہیں۔“ اورنگ زیب نے پہلے ہی بریفنگ کر دی تھی اس لیے ملاقات خوشگوار ماحول ہی میں ہوئی۔“

”آج آپ نے میٹنگ کے دوران ذمے دار افسروں پر جو تنقید کی وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔“

”اس لیے کہ تم صرف پولیس آفیسر ہو۔“ اورنگ زیب نے بے تکلفی سے کہا۔ ”سانپ اور بزمی کا کھیل بچے بھی کھیل لیتے ہیں مگر جو ماہر ہوتے ہیں وہ پانسا پھینکنے میں بھی پوری مہارت رکھتے ہیں۔“

”ڈونٹ لی سنٹی منٹل (Dont be Sentimental) اورنگ زیب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”کچھ دن اور انتظار کرلو۔ ابھی میں بھی محض امکانات کو ترتیب دے رہا ہوں۔“

جواب میں سراج نے اورنگ زیب کو ٹھوٹی نظروں سے دیکھا پھر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا جب اورنگ زیب نے اپنا موبائل آن کر لیا۔ ”ہیلو..... اس نے مختصر اُ کہا۔ ”مختصر بول رہا ہوں سر۔ ایک ضروری اطلاع دینی ہے۔“

”سن رہا ہوں۔“

”کچھ دنوں قبل ماروی نام کی ایک لڑکی فارم ہاؤس پر گئی تھی۔ اس کے دوسرے دن شاہ جی بھی وہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے ملازموں کو ماروی کے بارے میں سخت سست کہا تھا۔ سب ہی خائف تھے۔ میری اطلاع کے مطابق ماروی پر کسی ملازم نے ہاتھ صاف کر دیا تھا جس نے شاہ جی کا پارہ چڑھا دیا اس لیے.....“

”فضول تفصیل نہیں۔“ اورنگ زیب نے اسے ٹوکا۔ ”کام کی بات کیا ہے؟“

”شاہ جی کے آنے کے بعد رات کسی وقت فارم ہاؤس کے ایک چوکیدار نے خودکشی کر لی۔ اس نے ایک تحریر بھی چھوڑی تھی جس میں لڑکی کو بے آبرو کرنے کا اعتراف بھی تھا۔ چوکیدار کی خودکشی کی اطلاع پولیس کو نہیں دی گئی۔ اس کو خاموشی سے دفنا دیا گیا۔ اب فارم ہاؤس کے تمام ملازموں نے زبان پر تالے ڈال رکھے ہیں۔“

”کام کی کیا بات ہے اس میں؟“

”سر..... میرا خیال ہے کہ ماروی کے پاس کوئی نہ کوئی کام کی بات بھی ضرور ہوگی۔“

”سمجھ گیا۔“ اورنگ زیب نے اس بار سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”اس کا پتا ہے تمہارے پاس؟“

”جی سر.....“

پھر دوسری جانب سے جو پتا بتایا گیا اسے ذہن میں محفوظ کرنے کے بعد اورنگ زیب نے موبائل آف کر دیا۔

”کس کا فون تھا؟“ سراج نے پوچھا۔

”تھا ایک مخبر۔ اس نے ایک کام کی اطلاع دی ہے تم ایسا کرو مجھے کمرشل مارکیٹ کے قریب پھوڑ دو۔ باقی گفتگو رات کو ہوگی۔“

سراج نے محض شکایتی نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھا پھر اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بعد وہ دفتر چلا گیا۔



سیٹھ عثمان جیل کسٹڈی سے لیاقت حسین کو لے کر سیدھے گھر ہی آئے تھے، راحیلہ بیگم

”میں سمجھا نہیں۔“

”تم جونی کو کیوں بھول رہے ہو؟ اگر میں تمہیں قبل از وقت ٹھنڈا رہنے کی تاکید نہ کرتا تو کیا تم اسے برداشت کر سکتے تھے؟“

”جونی تو پہلے ہی سے بیگلی ملی بن کر میرے سامنے پیش ہوا تھا لیکن شیدا ورما.....“ سراج نے تمللا کر جواب دیا۔ ”اگر آپ کا خیال نہ ہوتا تو شاید میں نتائج کی پروا کیے بغیر اسے بھون کر رکھ دیتا۔“

”اوہ..... گویا تم اس سے بھی ملاقات کر چکے ہو۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر رد یافت کیا۔

”آپ ہی کے اشارے پر ملنے گیا تھا۔“ سراج نے بہ دستور الجھ کر کہا۔ ”بیوٹی پارلر کی آڑ میں جو کاروبار ہو رہا ہے وہ آپ کے علم میں بھی ہے۔ ملاقات کے وقت وہ جس طرح اٹھلا اٹھا کر مجھے اپنی اہمیت کا احساس دلا رہی تھی اسے میں نے کس طرح برداشت کیا؟ یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔“

”اس کے اور قریب ہونے کی کوشش کرو۔“

اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا پھر فوراً ہی مسکرا کر بولا۔ ”الماس کی فکر نہ کرتا..... میں اسے سمجھا دوں گا۔“

”آپ شیدا ورما کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟“

”وہ سیزمی ہے سراج صاحب۔ اس سے گزر کر شاید ہم سانپ تک بھی پہنچ جائیں گے۔“ اورنگ زیب نے متنی خیز انداز میں جواب دیا۔

”کیا مطلب.....“ سراج چونکا۔ ”کیا آپ کے آکٹوپس کا کوئی سرا شیدا ورما سے بھی ملتا ہے؟“

”بلا واسطہ نہیں تو بلا واسطہ اس کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں۔“

”درمیان میں کوئی منجائش سکندر علی شاہ کی بھی نکلتی ہوگی؟“ سراج نے کریدنے کی کوشش کی۔

”اتنی جلدی کوئی آخری نتیجہ قائم کرنے کی کوشش مت کرو۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”حالات جس تیزی سے کروٹیں بدل رہے ہیں اس میں یہ بھی امکان ہے کہ شبنم اغواء ہو جائے۔“

”یہ شبنم اچانک درمیان میں کس طرح آگئی؟“

سراج نے حیرت کا اظہار کیا۔

”وشنو آکٹوپس کا اہم مہرہ تھا جسے افضل خان نے دوبارہ کرٹل احتشام تک پہنچا دیا۔“ اورنگ زیب نے دھستے لہجے میں جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ افضل خان کو قابو کرنے کے لیے شبنم کو ہدف بنایا جائے۔ میں ایک امکانی بات کر رہا ہوں مگر یہ طے ہے کہ آکٹوپس اینٹ کا جواب پتھر سے ضرور دے گا۔“

”کیا آپ مجھے کھل نہیں بتا سکتے کہ آپ کے ذہن میں کیا شبہات جنم لے رہے ہیں یا ہمیں کس راستے پر قدم بڑھانا ہے؟“ سراج نے شکوہ کیا۔ ”آپ کو کیا اب بھی میری ذات پر اعتماد.....“

گرفت سے آزاد کر الیا تھا۔ دروازہ بن کر کے وہ پلٹا تو فرحین اپنی جگہ کھڑی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لیاقت حسین قدم بڑھاتا اس کے قریب گیا تو فرحین بے اختیار اس کے سینے سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

”یہ..... یہ کیا ہو گیا تجھے؟“ لیاقت حسین نے اس کو ہاتھوں میں سمیٹ کر اس کے چہرہ دیکھا جو آنسوؤں سے تر تھا۔ ”اب کس بات پر رو رہی ہے۔؟“

”یہ خوشی کے آنسو ہیں لیاقت، تو نہیں سمجھے گا“ خوشی اور غم کے ملے جلے احساس میں گندمی فرحین کی آواز اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھری۔ ”اگر..... اگر خدا نہ کرے تجھے سزا ہو جاتی تو میں زندہ نہ رہتی۔“

”پھر..... تیرے بنا میں کیا کرتا؟“ لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

”تو! تو مرد ہے۔“ فرحین نے منہ بنا کہا۔

”چالیسویں تک منہ بنائے رہتا پھر میری جگہ کسی دوسری کو لے آتا۔“

”اور اگر کبھی میں تجھ سے پہلے.....“

”ایسی بات دوبارہ منہ سے نہ نکالنا لیاقت۔“ فرحین جذباتی ہو کر دوبارہ شوہر سے لپٹ گئی۔ ”تیری بات اور ہے لیکن عورت۔ اگر اس میں کھوٹ نہ ہو تو وہ ایک مرد کے بعد کسی دوسرے کا خیال کرنا بھی گناہ سمجھتی ہے۔“

لیاقت حسین فرحین کو بازوؤں میں بھر کر بستر پر لے آیا۔ اس کی پیشانی پر لہراتے بالوں کی ایک لٹ کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ ”میں بھی تیرا دیوانہ تھا فرحین جو بابا کی حویلی چھوڑ کر ادھر آ گیا تھا۔ صرف ماں کی دعا کی میرے ساتھ تھیں۔“

”جانتی ہوں اور..... آج اسی کی ماں کی قسم کھا کر تجھے ایک وعدہ بھی کرنا ہوگا۔“

”کیسا وعدہ؟“ لیاقت اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔

”دوبارہ کبھی تو جذباتی ہو کر لوگوں پر گولیاں نہیں برسائے گا۔“

”وہ میرے دشمن تھے لیاقت کا جان..... اگر میں انہیں ڈھیل دیتا تو پھر وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑتے۔“

”اور اس دن تجھے کیا ہو گیا تھا جب تو نے ادھر بیٹکے میں تین چار آدمیوں کو مار دیا تھا۔“ اس بار فرحین نے لیاقت حسین کو چھیڑنے کی خاطر سوال کیا۔

”ہاں..... اس دن مجھ سے غلطی ہو گیا تھا۔“ لیاقت حسین نے دل پر جبر کر کے جواب دیا۔ ”وہ

مجھے اٹھا کر لے جاتے تو میں چالیس روز تیرا غم منانے کے بعد دوسری.....“

”تم..... میں تیرا خون کر دوں گی لیاقت۔“ فرحین تڑپ اٹھی۔ ”تو نے میری زندگی میں ایسا

ہا بھی کیوں؟“

”چل پھر کوئی اور بات کرتے ہیں۔“ لیاقت حسین نے فرحین کو دوبارہ ہانپوں میں سمیٹ لیا۔

دروازے پر موجود تھیں۔ ”خدا کا شکر ہے کہ تم باعزت طور پر رہائی پا کر واپس آ گئے۔“

”یہ سب آپ لوگوں کی دعائیں ہیں بیگم صاحب۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا۔ اس کی نظریں فرحین کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ راحیلہ بیگم نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

”فرحین ہوتی تو وہ بھی بہت خوش ہوتی۔ اندر آ جاؤ۔ میں فون پر اسے اطلاع دیتی ہوں۔“

”وہ..... وہ کہاں چلی گئی؟“ لیاقت حسین نے اندر آ کر بیٹھتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔ سیٹھ عثمان بیوی کا مقصد سمجھ کر دروازے ہی سے سیدھے آفس چلے گئے تھے۔

”تم دونوں کے ساتھ پے در پے جو حادثات پیش آرہے تھے اس نے فرحین کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ اب تمہارے نہ ہونے سے وہ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ یہاں رہتی تو اس کی طبیعت اور خراب ہو جاتی اس لیے میں نے اسے گاؤں بھیج دیا۔ وہ آخری وقت یہیں رکنے کی ضد کر رہی تھی۔“ راحیلہ بیگم نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”تم بیٹھو میں تمہارے لیے ناشا لاتی ہوں۔“

”مجھے اس وقت خواہش نہیں ہے بیگم صاحب۔“

لیاقت حسین نے کہا، فرحین کے چلے جانے کا سن کر اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔

”پریشان مت ہو۔“ راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”تم گھر جا کر نہا دھو کر تازہ دم ہو لو پھر ہفتہ دس دن کے لیے تم بھی فرحین کے پاس چلے جانا۔ عثمان کا بھی یہی مشورہ ہے۔“

ٹھیک ہے۔“ لیاقت حسین دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کر دوسرے بیٹکے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں فرحین کا خیال چل رہا تھا۔ انیسویں میں داخل ہو کر وہ سامنے بچے پلٹ پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر کے فرحین کے تصور میں گم تھا جب یکفخت اسے خیال آیا کہ انیسویں کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بڑا کر اٹھا تو ایک آواز نے اس کے وجود کے سناٹوں میں گونجی۔

”تجھے کیا فرحین سے زیادہ کھلے دروازے کی فکر ہے۔“

لیاقت حسین کے دل کی دھڑکنیں ایک پل کو ختم گئیں، اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ فرحین اس کے سامنے کھڑی جسم انتظار نظر آرہی تھی پھر اس نے لیاقت حسین کو پہل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ خود ہی بھاگ کر اس کے کشادہ سینے میں سما گئی تھی، جواب میں لیاقت حسین کے مردانہ بازوؤں کا شکنجہ بھی تنگ ہونے لگا۔ فرحین کو اچانک اس طرح سامنے دیکھ کر وہ بھی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اسے خود اپنے پاگل پن پر ہنسی آ گئی۔ حالات نے اتنا الجھا رکھا تھا کہ وہ یہ بھی نہ سوچ سکا کہ فرحین اس کو قید میں چھوڑ کر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ راحیلہ بیگم نے جو کچھ کہا اس میں یقیناً فرحین کی شرارت کا بھی دخل رہا ہوگا۔ لیاقت حسین نے سرشاری کے عالم میں بازوؤں کا حلقہ مزید تنگ کیا تو فرحین کسمسا کر بولی۔

”میرا دم گھٹ رہا ہے لیاقت اور..... ادھر دروازے کے سامنے کوئی کھڑا ہے۔“

لیاقت حسین نے فرحین کو چھوڑ کر دروازے کی سمت دیکھا پھر فرحین کی ہنسی کی آواز سن کر ہی اسے احساس بھی ہو گیا کہ فرحین نے بڑی خوبصورتی سے کھلے دروازے کا بہانہ کر کے خود کو اس کی

”تو..... تو ہمیشہ اپنی مرضی چلاتا ہے۔“ فرحین نے دیدہ دانستہ کی پھر وہ لیاقت حسین کے وجود میں کم ہوتی چلی گئی۔



پرتاب بھوشن کی نگاہیں قریب بیٹھی پچارن چکوری پر منڈلا رہی تھیں لیکن اس کے ذہن میں لیاقت حسین کا نام کسی کاٹنے کی طرح رہ رہ کر چھ رہا تھا۔

لیاقت حسین سے پہلے اسے کسی کام میں اتنے پاپڑ نہیں بیٹے پڑے تھے۔ وہ کالی کا کھرا پجاری تھا۔ دیوی کوراشی کرنے کی خاطر اس نے کئی جاپ کر رکھے تھے۔ اس نے پرتاب بھوشن کو سچا سیوک جان کر نراش بھی نہیں کیا۔ پرتاب نے جو چاہا وہ دیوی کی نادیہ شتی نے پورا کر دیا اسی ایک دشا اس نے پرتاب بھوشن کو قد آور کر رکھا تھا لیکن لیاقت حسین کسی ہڈی کی طرح اس کے گلے میں انک کر رہ گیا تھا۔ کوئی پرچھائیں تھی جو ہر بار لیاقت حسین کو اس کے جنت منتر سے بچا لیتی تھی۔

مندر سے چلتے وقت وہ بڑے پجاری مدن چند سے بھی ملا تھا۔ مدن چند نے بھی آنکھیں بند کر کے بہت دیر اندھیروں میں کھونچنے کے بعد یہی کہا تھا کہ۔ ”میرا کہا مانو تو تم اس مسئلے کا پچھا چھوڑ دو۔ درگاہ دیوی نے یہی اشارہ دیا ہے کہ وہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ جو چھایا اس کی سہائتا کر رہی ہے تم اس کا توڑ نہیں کر پاؤ گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدھو پچارن کی طرح تم بھی کام آ جاؤ۔“

لیاقت حسین کے تصور کے ساتھ مدن چند کے کہے ہوئے جملے بھی اس کے وجود میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے اس کے ساتھ ہی بیٹی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں۔

”تم..... کس وجہ میں کم ہو مہاراج۔“ کسن پچارن چکوری نے اس کی نگاہوں کی تپش سے بچنے کی خاطر پوچھا۔ ”دوروز سے تم نے بھوجن بھی نہیں چکھا۔ کیول پانی پی کر دن بتا رہے ہو۔ بڑے پجاری نے کہا تھا کہ تمہاری شتی اپرم پار ہے۔ پھر تمہیں کیا چتا آن پڑی ہے؟“

”تیرا من اس ویرانے میں نہیں لگتا تو واپس پلٹ زیادہ دور بھی نہیں آئے ہیں اور کبھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ ایک بار فیصلہ کر لے۔“

”تم غلط سمجھ مہاراج۔“ چکوری نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارا خیال رکھنے کے کارن ہی ساتھ آئی ہوں تو آدھے راستے سے کیسے پلٹ سکتی ہوں۔ تم میری باتوں سے ناراض ہوتے ہو تو پھر زبان پر تالنے بھی ڈال لوں گی۔“

”نہیں۔“ پرتاب نے اس کے گالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تیری باتیں مجھے بری نہیں لگتیں لیکن کسی پجاری کو گیان دھیان کرتے سے اپنے من کو مارنا پڑتا ہے۔ ابھی تو ان باتوں کو نہیں سمجھ گئی۔“

”تمہارے ساتھ رہوں گی تو آہستہ آہستہ سمجھنے لگوں گی مہاراج۔ تم نے بھی یہی کہا تھا کہ منش کو کچھ پانے کے کارن کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔“

”میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا..... تو میری سیوا کرتی رہی تو تجھے بھی کندن بنا دوں گا۔“

”میں دیوی درشن کی بھی پیاسی ہوں مہاراج۔“ چکوری نے معصومیت سے پرتاب کی اگاہوں میں نگاہیں ڈال کر کہا۔ ”ایک بار مجھے بھی دیوی کے درشن کرا دو۔ پھر سارا جیون تمہارے چرنوں میں بتا دوں گی۔“

”دھرج رکھ میری بلبل!“ پرتاب بھوشن اسے اسے بازوؤں کے حصار میں لے کر کہا۔ ”دیوی درشن کے علاوہ اور بھی بہت سی گر کی باتیں تجھے سکھا دوں گا۔ پر ایک بات دھیان میں رکھنا، اگر گرتے کبھی میرے ساتھ دھوکا کیا تو.....“

”میں وچن دیتی ہوں مہاراج۔“ چکوری نے اس بار بھی معصومیت سے جواب دیا۔ ”تمہارے چرنوں کی دھول بن کر رہوں گی۔ من میلا ہوتا تو پھر تمہارا ہاتھ کیوں تھامتی۔ ادھر مندر میں بہت سارے بٹے کٹے پجاری تھے جو مجھے دانہ ڈالنے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ میں اگر ہڈیوں پر مسکان سجالتی تو سب میرے چرنوں میں لوٹ پوٹ ہو جاتے۔“

پرتاب بھوشن اس کا جواب سن کر چونکا۔ اس نے چکوری کو کھٹکالنے کی خاطر سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ ”مدن چند نے بھی تجھے دانہ ڈالنے کی کوشش کی تھی؟“

”چھوڑو مہاراج۔ اب میں تمہارے ساتھ آگئی تو بیٹی باتوں کو کھونچنے سے کیا قاعدہ؟“

”کھیلی کو دی جان پڑتی ہے؟“ پرتاب بھوشن نے اس کے شانوں پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا تو چکوری نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

”یہ تم کہہ رہے ہو مہاراج؟ کیا تمہیں بھی کمرے کھونٹے کی پچکان نہیں۔ چھڑنے اور آنکھیں سینکنے کی بات اور نہ لیکن سب سے پہلے تم ہی نے میرے شریر کو ہاتھ لگایا ہے۔“

”تیری طرح تیری باتیں بھی سوندھی سوندھی لگتی ہیں۔“ پرتاب بھوشن نے اس کو پوری طرح دیوبج کر کہا۔ ”میں تیری زبان سے سنا چاہتا تھا۔ تو کیا ہے میرے سوا اور کون جان سکتا ہے۔ تیری سیوا کے بدلے میں بھی تجھے بہت کچھ دان کر دوں گا۔“

”تم ایسے ہی ہنستے بولتے رہا کرو مہاراج۔ اپنے دھیانوں میں کم ہو جاتے ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”ابھی تو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکے گی۔“ پرتاب بھوشن کے ذہن میں پھر لیاقت حسین کا تصور کلبلایا تو اس نے چکوری سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ”دیوی کوراشی کرنے کے کارن مجھے منڈل میں دھج کر جنت منتر پڑھنے ہوتے ہیں تو دیوی کے سوا کوئی اور سامنے نہیں ہوتا۔ پجاری کا دھیان ایک ذرا اگر کا جائے تو پھر دیوی بھی نظریں پھیر لیتی ہے۔“

”مدن چند نے تو کہا تھا کہ تم مہان شتی کے مالک ہو پھر..... اب کیا چتا آن پڑی ہے جو تم پھر دھونی رما کر بیٹھنے کا سوچ رہے ہو؟“

”ہے ایک پانی جو بابا میرا راستہ کاٹ دیتا ہے۔“

اسے قابو کرنے کے کارن مجھے ایک بار پھر دیوی کا آشیر واد لینا ہوگا۔“ پرتاب بھوشن نے غلا

میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”اے نشت کردوں تو پھر چین سے بیٹھوں گا۔“

”کون ہے وہ..... مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”ہے ایک مسلا.....“ پرتاب بھوشن بل کھا کر بولا۔ ”اس نے میرے ایک منتر کا انجانے میں توڑ کر دیا تھا۔ مجھے دشواس تھا کہ دیوی کی کرپا سے میں نے اسے پھونک بھی ماری تو وہ جل بھن کر راکھ ہو جائے گا پر تو ایسا نہیں ہوا۔ ہے کوئی چھایا جو بار بار اس کے آڑے آ جاتی ہے۔ میں نے سو گند اٹھائی ہے کہ جب تک اسے نیچا نہ دکھا دوں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“

”کیا میں تمہارے کسی کسی کام نہیں آ سکتی؟“ چکوری نے سوالیہ نظروں سے پرتاب بھوشن کو دیکھا۔

”نہیں.....“ پرتاب بھوشن کے ذہن میں مدھو پجارن کے جل کر راکھ ہونے کا دھیان ابھرا تو اس کے اندر سانپ لوٹنے لگے چلا ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ”وہ تیرے بس کا روگ نہیں ہے۔ مسلا ہے اس لیے کسی ناری کا جادو بھی اس پر نہیں چلتا۔“

”مجھے ایک موقع تو دو مہاراج۔ تمہارے اشارے پر میں کسی بات سے انکار نہیں کروں گی۔“

”زیادہ چننا مت کر!“ پرتاب بھوشن نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا۔ ”مجھے کسی شہ گھڑی کا انتظار ہے۔ وہ نظر آجائے تو میں پھر دیوی کے جاپ میں لگن ہو جاؤں گا۔ اس بات کا دشواس بھی ہے کہ دیوی مجھے نراش نہیں کرے گی۔“

”میں بھی تمہاری کامیابی کے لیے بھگوان سے ہی پرارتا کروں گی۔“

پرتاب بھوشن نے چکوری کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اس کی نظریں پھر چکوری کے خدو خال پر بھوکے گدھ کی طرح منڈلانے لگیں۔ وہ لیاقت حسین کے تصور سے وقتی طور نجات حاصل کر کے کسن پجارن کے کندن جیسے دکتے شریر سے پھیڑ خانی پر غور کر رہا تھا لیکن وہ پوری طرح مائل نہ ہو سکا۔

لیاقت حسین کا خیال کسی کن کھجورے کی طرح اس کے وجود میں ڈنک مارتا رہا۔



دارار ستم علی اس وقت ٹینس کھیلنے میں لگن تھا۔ روشنا میجر عاطف اور کلب کے دوسرے ممبروں کے ساتھ لان میں ایک میز پر بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ اس کی نظریں بار بار شوہر کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

”تم اس وقت شاید پوری طرح ہمارے ساتھ شامل نہیں ہو۔“ روشنا کی دوست مسز خانزادہ نے اسے چھیڑا۔

”میں تمہاری بات سے انکار نہیں کروں گی۔“ روشنا نے شوخی سے جواب دیا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں جرمن ہوں اور جرمن خاتون کے لیے ایک عام کہات مشہور ہے کہ وہ دنیا کی تمام خواتین سے زیادہ بہتر بیوی ثابت ہوتی ہے۔“

”یہ بات میں پہلے بھی تمہاری زبان سے سن چکی ہوں لیکن یہ جرمنی نہیں ہے۔“

”جانتی ہوں لیکن فطرت مقامات کی تبدیلی سے بھی نہیں بدلتی۔“ روشنا کا جواب سن کر مسز خانزادہ لا جواب ہو گئی۔

”موسم کے اعتبار سے اگر اس وقت کوئلہ کافی منگالی جائے تو.....“

”ایسی باتیں پوچھنے کے بجائے نیکی کما لینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ میز پر موجود ایک ممبر نے بے تکلفی سے میجر عاطف کا جملہ اچک لیا۔

”روشنا سے اور دریافت کر لیں۔“ مسز خانزادہ نے مسکرا کر کہا۔ ”جرمن خاتون کیا دارا کے بغیر کافی پی لیں گی؟“

میز پر موجود سب افراد مسکرا دیے پھر کافی پینے کے دوران میں میجر عاطف نے دارا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”میرا خیال ہے آج میچ کا فیصلہ مکمل پانچ سیٹ کے بعد ہی ہو سکے گا۔“

”جیتے گا کون؟“

”شہزاد.....“ مسز شہزاد نے روشنا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”جیت اور ہار کھیل کا حصہ ہوتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔“ روشنا نے بے تکلفی سے ایک خوبصورت جواب دیا۔ ”جو ہارنے سے کتراتے ہیں وہ جیت کر بھی مطمئن نہیں ہوتے۔“

”میرا خیال ہے کہ آج روشنا سے جیتنا مشکل ہے اس لیے شوہروں کا موضوع چھوڑ کر کوئی اور بات کی جائے۔“ میجر عاطف نے کہا تو سب ہی مسکرا دیے پھر وہ کافی کے دوران ہنس بول رہے تھے:

”ہیلو.....“ اس نے موبائل پر سگنل موصول ہوئے۔

”ملی آنا خانی کی لیڈی سیکریٹری کے سوکسی اور کا نہیں تھا۔“

”مسٹر دارا اس وقت کہاں ہیں؟“

”ٹینس کھیل رہے ہیں تم بولڈ کرو، میں.....“

”نہیں.....“ دوسری جانب سے بات کاٹ کر کہا گیا۔ ”آپ مسٹر دارا کو اطلاع دیے بغیر ہی کمر آ جائیں.....“

”باس نے مجھے یہی ہدایت دی ہے۔“

”کوئی خاص بات؟“ روشنا نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ ”سب خیریت تو ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن باس آپ دونوں کو علیحدہ علیحدہ کوئی سرپرائز دینا چاہتے

ہیں۔ ارا نیور اور گاڑی کلب کے باہر موجود ہے آپ کے لیے بس یہی پیغام ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ روشنا نے موبائل آف کر دیا۔ اس کے ذہن میں سرپرائز کے حوالے سے کئی

فکرات ابھرتے پھر اس نے ذہن پر زیادہ زور بھی نہیں دیا۔ جانے کے ارادے سے اس نے اپنا

ہینڈ بیگ اٹھایا تو میجر عاطف نے پوچھا۔ ”اچانک کہاں جا رہی ہیں۔ کس کی کال تھی؟“
 ”فادران لاکہ سیکرٹری کی۔ مجھے فوری مگر بلایا ہے، کوئی سرپرائز ہے ہم دونوں کے لیے لیکن
 علیحدہ علیحدہ۔“ روشنا نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”باہر گاڑی بھی موجود ہے۔“
 ”میں چلوں آپ کے ساتھ؟“ میجر عاطف نے پیشکش کی۔ ”چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔“
 ”میں دارا کی گاڑی نہیں لیجا رہی۔“ روشنا نے وضاحت کی۔ ”فادران لانے گاڑی اور ڈرائیور
 بھی بھیجا ہے۔“

روشنا کلب سے باہر نکلی تو اسے رستم علی آغاز خانی کے دفتر میں استعمال کی جانے والی گاڑی بھی
 نظر آ گئی۔ ڈرائیور نے روشنا کو دیکھتے ہی نیچے اتر کر سلام کیا۔ وہ قدم بڑھاتی گاڑی کے قریب
 گئی۔ ایک ہل کے لیے اسے ڈرائیور کی ایک معمولی سی غفلت کا احساس تو ضرور ہوا تھا۔ ”اس نے
 صرف سلام پر اکتفا کیا تھا، پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنا بھول گیا تھا اس کا چہرہ بھی ستا سا نظر آ رہا
 تھا۔ ”ممکن ہے کام کی زیادتی کا سبب ہو۔“ روشنا نے دل ہی دل میں خیال کیا پھر دروازہ کھول کر اندر
 بیٹھنے ہی اسے ڈرائیور کی غفلت اور چہرے پر نظر آنے والی ٹھکن کا سبب بھی اس وقت معلوم ہوا جب
 وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھی کہ واپس نیچے اتر سکتی۔

اس کے نشست پر بیٹھنے ہی دوسری جانب کا دروازہ کھول کر ایک شخص بڑی پھرتی سے اندر
 آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ”شور مچانے یا کسی حادثے کا سوچنا بھی مت ورنہ میں تمہیں
 اوپر پارسل کرنے میں بچکچاؤں گا نہیں۔“ بولنے والا جو کچھ کہہ رہا تھا وہ کرگزر نے سے بھی گریز نہ
 کرتا۔ اس کے لب و لہجے سے بھی سفائی فیک رہی تھی۔

روشنا کے کوئی جواب دینے سے پیٹر ایک اور نووارد ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر آ کر بیٹھ
 گیا۔ اس نے بھی روشنا کو جن نظروں سے گھورا تھا اس میں کسی شرافت کے آثار دور دور تک موجود نہیں
 تھے۔ ڈرائیور کو شاید وہ پہلے ہی کوئی مؤثر ڈوز دے چکے تھے۔ وہ اگلی نشست پر بیٹھنے والے کے بعد
 ہی بڑی تیزی سے گاڑی کھاتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔

”تم لوگ مجھے سے کیا چاہتے ہو؟“ روشنا نے سچویشن کو پوری طرح سمجھنے کے بعد برابر بیٹھے
 شخص کی طرف دیکھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ شانے اچکا کر بولا۔ ”صرف اتنا تعاون درکار ہے کہ تم چپ چاپ بیٹھی
 رہو۔ ہمیں تم کو ایک مخصوص جگہ تک زندہ سلامت پہنچانے کا کام سونپا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ جانیں
 اور ان کا کام۔“

روشنا نے دوبارہ کوئی سوالی نہیں کیا۔ خاموش بیٹھی خود کو آنے والے حالات سے مقابلے کے
 لیے تیار کرتی رہی مگر اتنا سمجھ گئی تھی کہ جن لوگوں نے رستم علی آغاز خانی کی لیڈی سیکرٹری اور ڈرائیور کو
 پوری طرح اپنے اشاروں پر چلنے کی خاطر مجبور کر دیا تھا وہ اس کے ساتھ کسی ڈنر پر بیٹھے انتظار نہیں
 کر رہے ہوں گے۔ یہ بات بھی زیر غور تھی کہ اس کی آنکھوں پر کوئی پٹی بھی نہیں باندھی گئی تھی۔ وہ جن

مراستوں سے گزر رہی تھی ان کو پوری توجہ سے ذہن نشین کر رہی تھی۔ بعد میں اس کی نشاندہی بھی
 پولیس کر سکتی تھی پھر اس وقت اسے مزید تعجب ہوا جب گاڑی سول لائنز ایریا کے ایک ایسے پنگلے کے
 احاطے میں روکی گئی جس کے باہر پولیس کے ریٹائرڈ ڈی آئی جی علیم احمد کے نام کی تختی لگی تھی۔

گاڑی سے اتار کر روشنا کو خوبصورت پنگلے کے ایک بیڈروم تک پہنچا دیا گیا۔ جو دو افراد اسے
 لے کر آئے تھے وہ باہر ہی سے رخصت کر دیے گئے۔ ان کی جگہ دو اور آدمیوں نے لے لی
 تھی۔ صورت و شکل سے وہ یہ ظاہر مہذب ہی نظر آ رہے تھے۔ بیڈروم میں پہنچ کر روشنا نے ایک بار
 پھر حالات کا جائزہ لیا۔ ریٹائرڈ ڈی آئی جی علیم احمد کے بارے میں اس کی معلومات زیادہ نہیں تھیں
 لیکن اتنا ضرور سن رکھا تھا کہ وہ ایماندار اور نڈر آفیسر ہونے کے علاوہ مذہبی حیثیت سے بھی جانے
 پہچانے جاتے تھے۔

خواہ گاہ میں اس وقت روشنا کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ دونوں افراد اسے وہاں پہنچا کر دروازہ باہر
 سے بند کر کے چلے گئے تھے۔ اچانک روشنا کو اپنے موبائل کا خیال آیا۔ ابھی تک کسی نے اس کی
 جامہ تلاشی نہیں لی تھی، ایسی صورت میں اس کے وجود میں امید کی ایک کرن پھوٹی وہ کم از کم دارا کو
 حالات سے مختصر آگاہ کر سکتی تھی اس خیال کے آتے ہی روشنا نے اپنا موبائل نکالا لیکن پھر اس کے
 ارادوں پر اوس پڑ گئی۔ کسی کی کرخت آواز اس کے کانوں کے عقب سے ابھری ”ایسی کوئی غلطی بھول
 کر بھی نہ کرنا جو تمہاری موت کا سبب بن جائے۔“

روشنا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ درمیانہ قد اور ادھیڑ عمر کا شخص تھا لیکن قابل رشک صحت کا مالک تھا
 اس کی آنکھوں کی چمک کسی زہریلے ناگ سے زیادہ خطرناک لگ رہی تھی۔ جسم پر یہ ظاہر ایک لائٹ
 براؤن کلر کا لمبا ٹاول گاؤن ہی نظر آ رہا تھا۔

”کون ہو تم اور..... مجھے یہاں کس مقصد سے لایا گیا ہے؟“ روشنا نے بے جگری سے سوال
 کیا۔

”باسٹڈ رستم علی آغاز خانی کی سیکرٹری نے تم سے ہی کہا تھا کہ تمہارے لیے ایک سرپرائز
 ہے۔“ جواب زہریلے انداز میں دیا گیا۔ ”رہا میرا نام تو پولیس کے شکاری کتوں نے میزے بہت
 سے نام رکھ لیے ہیں۔ آکٹوپس، کاروچ، کوبرا، شکرہ وغیرہ۔“

”تت..... تت..... تم شیخ حامد ہو؟“ روشنا کے سر سے پاؤں تک خوف کی ایک سرد لہر دوڑ
 گئی۔ ایک لمحے میں اس کا سارا سکون اور خود اعتمادی کا عزم ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی خوفزدہ
 نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

”گھبراؤ مت.....“ سامنے کھڑے شخص نے عجیب انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”تم یہاں کیوں لائی
 گئی ہو صرف اس ایک بات کو ذہن نشین کر لو۔ میں نے تمہارے باسٹڈ فادران لاکہ چھت کے نیچے
 اس کی بلیو پرنٹ تیار کرائی تھی۔ یہ وعدہ بھی لیا تھا کہ وہ ہمیشہ پالتو کتوں کی طرح دم ہلاتا رہے
 گا۔ تمہاری ملازمت گلاہوں نے میرے آدمیوں کی رہنمائی کی تھی لیکن..... رستم علی نے میری بات نہیں

مائی۔ میں نے اسے ایک موقع دے کر حکم دیا تھا کہ وہ ایس پی اورنگ زیب سے دور رہے۔ ایک لغافہ بھی تھا جس میں اس کے بیڈ روم کی کچھ تصویریں تھیں۔ تمہارے باسٹرو فادر ان لانے میجر عاطف کو اعتماد میں لے کر میری وارننگ کا پیغام اورنگ زیب تک پہنچا دیا اور اب..... اب شاید دارا خود تمہاری ویسی ہی بلیو پرنٹ دیکھ کر خودکشی کر لے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی میجر عاطف کو کمزور سہارا تلاش کرے۔“ وہ ایک لمحہ توقف کے بعد روشنا کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے انتہائی بے پروائی سے بولا۔ ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم دونوں سوسائڈ کرلو۔ دوسری صورت میں مجھے ایک موقع پھر تمہارے باسٹرو فادر ان لا کو دینا پڑے گا۔“

”تم میرے سلسلے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“ روشنا نے بکھرے ہوئے ذہن اور اعتماد کو کسی قدر سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”میں مر جاؤں گی لیکن تمہیں قریب نہیں آنے دوں گی۔“

”یہی جملہ لیڈی میکرنری نے بھی کہا تھا لیکن اب وہ بھی ہمارے اشاروں پر ناپچنے پر مجبور ہو گئی ہے۔“

روشنا جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کمرے میں موجود شخص نے تالی بجائی۔ اس کے بعد دو مرد اور ایک عورت سامنے آ گئے۔ دونوں مرد روشنا کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ عورت جس نے اپنا ہاتھ پشت پر رکھا تھا عقب میں چلی گئی۔ گاؤن میں ملبوس شخص نے روشنا سے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”تم نے ابھی تک شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔ میں بتاتا ہوں، یہ خوبصورت کوٹھی ریٹائرڈ ڈی آئی جی عظیم احمد کی ہے۔ وہ بھی بکنے اور سر جھکانے کا عادی نہیں تھا۔ جب تک ڈیوٹی پر رہا اس کی گردن کڑی کمان کی طرح اکڑی رہی۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد اس کے تیور نہیں بدلے مگر اب..... اب اس کی لاش اسٹور روم میں پڑی ہے۔ صبح پولیس کے ماہرین بھی نہیں جان سکیں گے کہ اس نے خودکشی کیوں کی؟ مرنے کے لیے بیڈ روم کے بجائے اسٹور روم کا انتخاب کیوں کیا؟“

روشنا کے اندر خوف کا احساس سر اٹھانے لگا۔ اس نے دوبارہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن پھر جو کچھ ہوا وہ اس قدر اچانک اور برق رفتاری سے ہوا کہ اسے بچاؤ کا موقع بھی نہ ملا۔ دائیں بائیں کھڑے آدمیوں نے بڑی تیزی سے اس کے ہاتھ جکڑ لیے تھے پھر پشت پر سے اپنی گردن کے جوڑ میں کسی سوئی کی چھن کا احساس ہوا۔ اس کے بعد وہ بہ مشکل دو منٹ تک زور آزمائی کرنے کے بعد اس طرح پرسکون ہو گئی جیسے دشمنوں کے درمیان نہیں، دوستوں کے بیچ موجود ہو۔ ڈریسنگ گاؤن والے کے اشارے پر وہ تینوں خاموشی سے دوبارہ کمرے سے چلے گئے۔

”ہم تمہارے دوست ہیں روشنا۔“ ڈریسنگ گاؤن والے نے اس کے قریب آ کر سرسراہٹے لہجے میں کہا۔ ”مل بانٹ کر کھانا پرانی عادت ہے۔ اچھا شکاری وہی ہے جو شکار کا کچھ حصہ اپنے شکاری کتوں کے آگے بھی ڈال دے۔“

”کک..... کک..... کیا..... آ..... روشنا نے ڈوبتے ذہن کو سنبھالتے ہوئے خوابیدہ سے لہجے میں کہا۔“ تت..... تم..... کک..... کک..... بک..... بک..... کس..... کس.....“

”اؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں اپنی بانہوں میں لے کر سلا دوں۔“ ڈریسنگ گاؤن والے نے روشنا کو اپنی مضبوط بانہوں میں لے لیا۔ پھر بیڈ تک پہنچتے پہنچتے روشنا شعوری طور پر بھی خوابوں کی دنیا میں گم ہو کر رہ گئی۔ اسے اپنا ادھورا جملہ ملل کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔

❖❖❖

تھریا اس وقت بھی کھٹی کھٹی محسوس ہو رہی تھی جب میڈم نے دوپہر کے کھانے کے بعد اسے اپنی خواب گاہ میں بلایا تھا۔ اغواء اور رہائی کے بعد سے اس کے اعصاب ابھی تک پوری طرح اپنی ڈگر پر نہیں آ سکے تھے۔ ایک ہی جھٹکے نے اس کی خود اعتمادی کو بڑی شدید ٹھیس پہنچائی تھی۔

میڈم رروڈی نے حسب دستور اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی پھر سنجیدگی سے کہا۔

”لوچن کی طرف سے ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی؟“

”پولیس کے اعلیٰ دماغ بھی وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“ تھریا نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ابھی تک وہ بھی چور اور سپاہی والا کھیل کھیل رہے ہیں۔ جی مون بیوٹی پارلر پر حملہ کیا گیا وہ بھی پولیس والوں کے لیے درد سر بن رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میڈم نے چونک کر وضاحت چاہی ”شیلڈ ورما کے پارلر کا ذکر درمیان میں کیسے آ گیا؟“

”لوچن سے میں نے کل اس بات کا تقاضا کیا تھا کہ وہ ہمارے مطلوبہ آدمی کو جلد از جلد ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے۔ اسی نے جواب میں شیلڈ ورما کا حوالہ بھی دیا تھا اس بات کا شبہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ سکندر علی شاہ اس کا آلہ کار ہو جس کی ہمیں تلاش ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔ سکندر علی شاہ اور شیخ حامد کے درمیان کیا تعلق ہے؟“

”میں نے بھی لوچن سے یہی سوال کیا تھا۔ جواب میں اس نے ایک ہی جواز پیش کیا..... بڑے اور دور اندیش مجرم ہمیشہ ایسے آدمیوں کو ٹریس کرتے ہیں، پولیس جن پر آسانی سے ہاتھ نہ ڈال سکے۔“ تھریا نے کسمسا کر بات جاری رکھی۔ ”سکندر علی شاہ کو جہاں شہر کے معززین میں شمار کیا جاتا ہے کچھ لوگ نگینہ کے سلسلے میں اس پر انگلیاں بھی اٹھاتے ہیں جو شادی سے قبل جمیلہ کی حیثیت سے جمو پڑیوں میں پٹی بڑھی تھی۔ اب محلوں میں عیش کر رہی ہے۔“

”لوچن کا نگینہ یا جمیلہ کی ذات سے کیا تعلق ہے؟“

میڈم نے الجھ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے لیکن یہ بات بھی آپ کے علم میں ہے کہ لوچن نے معاہدہ بڑھانے سے انکار کرتے وقت اس بات کا عہد بھی کیا تھا کہ جب تک وہ ہمارے مطلوبہ آدمی کو قبر تک نہیں پہنچا دیتا۔ سکون سے نہیں بیٹھے گا۔“ تھریا نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کے دوست بھی شیخ حامد ہی

کے شکاری کتوں نے ہلاک کیے تھے۔“

”یہ سب سوچنا ہمارا دوسرا نہیں ہے۔“ میڈم نے بات مختصر کرنے کی کوشش کی۔ ”اس بات کو بھی ذہن میں رکھو کہ معاہدے کی مدت ختم ہو جانے کے بعد وہ ہمارے حکم کا پابند نہیں رہے گا۔“

”آئی سی۔“ تھریا نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ ”میں لوچن کو دوبارہ کال کرتی ہوں۔“

کال ملانے کے ساتھ ہی اس نے موبائل کا لاؤڈ اسپیکر بھی آن کر دیا تھا۔ دوسری جانب سے کال ریسیو ہونے کے بعد تھریا کا لب و لہجہ بھی حسب سابق حیرت انگیز طور پر بدل گیا۔

”تم نے سکندر علی شاہ کا ریفرنس دینے کے بعد اب کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ کل ہمارے درمیان.....“

”مجھے سب یاد ہے لیکن میں بھی تمہاری طرح اپنے اصولوں کی پابند ہوں۔“ تھریا نے بات کاٹ کر گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”معاہدہ ختم ہونے کے بعد میں تمہارے کنٹیکٹ نمبر بھی اپنے پاس رکھتا ہوں۔“

”اسی ریفرنس سے ایک بات میری بھی سن لیں۔“ جواب میں لوچن کی آواز ابھری۔ ”ہاشم اور ڈونا سے میرا کوئی بلڈ ریلیشن نہیں تھا، پہلی بار ایک دوسرے سے ہمارا تعارف بھی حسب ذیل ہوا تھا۔ ہم پیشہ ہونے کے اعتبار سے ہمارے درمیان ایک دوسرے سے ایک تعلق بھی قائم ہو گیا تھا۔ اب وہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کل میری غفلت سے چلائی گئی ایک اندھی گولی میرے وجود کو بھی ختم کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں اپنے ساتھیوں کا انتقام لیے بغیر میں بھی یہاں سے جانا پسند نہیں کروں گا۔ معاہدے کی رقم سے زیادہ مجھے بھی اپنے اصولوں پر قدم اٹھانا لازم ہے۔“

”گڈ.....“ تھریا نے اسے سراہا پھر نرم لہجے میں بولی۔ ”میں نے بھی تم لوگوں کی خدمات کچھ سمجھ کر ہی حاصل کی تھیں۔ اس وقت کال کا مقصد یہی دریافت کرنا تھا کہ اصل آدمی کے انڈر گراؤنڈ شکانے تک پہنچنے کے لیے تم کون سا شارٹ کٹ اختیار کرو گے؟“

”میرے تجربے نے فی الحال دو کو نوکس کیا ہے۔ نمبر ون سکندر علی شاہ۔ نمبر ٹو ڈرنی شیا۔“

”سنجیدگی سے جواب ملا۔“ پارلر کے ہنگامے نے ایک کو ٹارگٹ کر لیا۔ وہ بھی کوئی دل جلا ہو گا۔ اب سکندر علی شاہ کو چھینڑنا بھی ضروری ہے۔ زخمی ہونے کے بعد جنگی جانور بھی اپنے شیشے کی طرف جاتا ہے اگر سکندر علی شاہ کا تعلق بھی موسٹ وائٹ سے ہوا تو میری مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔“

”تم نے کل عجیبہ ذکر بھی کیا تھا۔ اسے کس خانے میں فٹ کرو گے؟“

”وہ بھی ایک اہم کڑی ہے سکندر علی شاہ چاہتا تو دوسری لڑکیوں کی طرح اسے بھی لٹو پیپر کی طرح ہاتھ صاف کرنے کے بعد ڈسٹ بن میں ڈال دیتا۔ شادی کرنے پر ممکن ہے اسے کسی خاص مجبوری کی وجہ سے آباد ہونا پڑا ہو۔“

”یو آر رائٹ!“ تھریا نے بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اگر ضرورت محسوس کرو تو تم ایس بی اورنگ زیب سے بھی میرا حوالہ دے کر مدد لے سکتے ہو۔“

”وہ ایک کھرا پولیس آفیسر ہے لیکن..... پولیس والوں کے ساتھ دوستی بڑھانا ہمارے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کے اصول کے خلاف ہے۔“

”ایز یوش.....“ تھریا نے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا تو میڈم نے کچھ سوچ کر کہا۔

”سمندر کی کوئی لہر سر کے اوپر کچھ دیر مسلط رہے تو اچھے اچھے تیراک بھی بوکھلا جاتے ہیں لیکن ان کا حوصلہ بھی پست نہیں ہوتا۔ اچھا تیراک وہی ہے جو لہروں کے منہ زور تھیزوں کو برداشت کر کے ساحل تک پہنچنے کی کوشش سے باز نہیں آتا۔ بیچ منہ حار میں حوصلہ ہار دینے والے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ کل جو تمہارے ساتھ ہوا وہ..... اس سے پہلے میرے اوپر بھی گزر چکا ہے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔“

تھریا نے میڈم روبی کے جملے میں چھپے ہمدردی اور اپنائیت کے جذبول کو محسوس کیا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر بے اختیار اس کے گلے لگ گئی۔

❖❖❖

اورنگ زیب دو گھنٹے بعد ہی واپس آ گیا تھا خلاف توقع وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں غرق تھا جب الماس نے بھاپ اڑاتا ہوا کافی کا کپ اس کے سامنے رکھا تھا۔

”سراج کہاں ہے؟“ اس نے الماس سے دریافت کیا۔

”ان کا کوئی دوست لندن سے واپس آ رہا ہے، آدھے گھنٹے قبل ایئر پورٹ کا کہہ کر گئے ہیں۔ میں ابھی نہیں اطلاع دیتی ہوں۔“

”نہیں۔ میں بھی کچھ دیر اوپر جا کر آرام کروں گا۔“ اورنگ زیب نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ”کچھ ضروری باتوں پر غور بھی کرتا ہے۔“

”مجھے آپ سے ایک شکایت بھی ہے۔“ الماس نے اس کی سنجیدگی دور کرنے کی خاطر بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”آپ نے مجھے بہن بھی بنایا ہے پھر بھی غیریت سے کام لیتے ہیں۔“

”غیریت، تمہیں میری غیریت کا اندازہ کس بات سے ہوا؟“

”نیچے مہمانوں کا کرا خالی ہے۔ آپ وہاں بھی رہ سکتے ہیں۔“ الماس نے قدرے جذباتی انداز اختیار کیا۔ ”میں سراج سے بھی کئی بار اصرار کر چکی ہوں لیکن.....“

”وہ تو خود نہیں چاہتا کہ میں نیچے رہوں۔“ اورنگ زیب نے بھی الماس کو خوش کرنے کی خاطر مصنوعی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تم بہن ہو اس لیے تمہیں احساس ہوتا ہے مگر سراج.....“

”میں اب آپ کی باتیں سمجھنے لگی ہوں۔ سراج تو خود مجھ سے بار بار کہہ چکے ہیں کہ آپ سے نیچے آنے کا اصرار کروں۔“ الماس نے سنجیدگی سے کہا۔

”فی الحال مجھے اوپر ہی رہنے دو۔ وہاں مجھے تنہائی میں سکون سے بہت ساری باتوں پر غور کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔“

پھر کافی ختم کرنے کے بعد وہ اوپر چلا گیا دو گھنٹے آرام اور غسل کرنے کے بعد نیچے آیا تو سراج

بھی الماس کے ساتھ ہی لاؤنج میں موجود تھا۔ الماس کچھ دیر بعد کچن کی طرف چلی گئی تو سراج نے پوچھا۔

”کسی خبر کی اطلاع کے بعد آپ کمرشل ایریا کس کام سے گئے تھے؟“

”آج میں نے ماروی نامی ایک لڑکی سے بڑی تفصیلی ملاقات کی ہے۔ وہ آخری لڑکی تھی جو منجر کی اطلاع کے مطابق فارم ہاؤس گئی تھی۔ ایک رات گزارنے کے بعد واپس بھی آگئی۔“ اورنگ زیب نے سکندر علی شاہ کے دوسرے دن فارم ہاؤس جانے اور چوکیدار کی موت کی باتیں بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”اہم بات یہ ہے کہ چوکیدار نے خودکشی کیوں کی؟ اس کی لاش کو پولیس کے علم لائے بغیر کیوں دفن کیا گیا؟ اس کے علاوہ بھی کبھی دو اور دو چار کرنے کی خاطر بہت سارے اہم اشارے میرے ذہن میں کلبلا رہے ہیں۔“

”کیا ماروی ان باتوں سے واقف نہیں ہے یا جان بوجھ کر.....“

”ماروی کی بنگ کسی اور لڑکی نے کی تھی جس کا نام وہ میرے اصرار کے باوجود زبان تک لانے سے گریز کرتی رہی۔ کوئی خوف ہے جو اس نے زبان نہیں کھولی۔ میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا البتہ فوری طور پر میں نے دو سادہ لباس والوں کو ماروی کی حفاظت پر مامور کر دیا ہے ہو سکتا ہے کہ سکندر علی شاہ کو میرے وہاں جانے کی اطلاع بھی مل چکی ہو۔“

”سکندر علی شاہ کے بارے میں ماروی نے کیا کہا؟“

سراج نے زہر خند سے پوچھا ”کیا وہ بھی مریدوں کی صف میں شامل ہو گئی ہے۔“

”دلچسپ بات تو یہ ہے کہ سکندر علی شاہ اس رات فارم ہاؤس نہیں گیا تھا۔“

”اوہ..... سراج نے چونک کر سوال کیا۔“ کیا فارم ہاؤس کے چوکیدار کی خودکشی کا تعلق ماروی

سے بھی ہو سکتا ہے؟“

”یہی سب سے اہم نکتہ ہے۔“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا

..... ”بہر حال اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اب سکندر علی شاہ ہمارے لیے سب سے زیادہ اہمیت

اختیار کر چکا ہے۔“

”آپ پھر بھی براہ راست اس پر ہاتھ ڈالنے سے گریز ہی کریں گے۔“ سراج نے پہلو بدل

کر اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”یو آر رائٹ! میں نے سکندر علی شاہ کو ابھی پہلا زینہ قرار دیا ہے۔ اس بات کا یقین بعد کے

حالات پر منحصر ہے کہ اس کا کوئی لنک آکٹوپس سے بھی ہو سکتا ہے۔“

”ایک بات میں بھی آپ کی اجازت سے کہنا چاہوں گا۔“ سراج نے کسمسا کر کہا۔ ”کنول کا

اغواء، اس کی ماں کی موت پھر کرنل احتشام کے سامنے جانے سے پہلے اس کا پرپس کو بھی یہ بیان دینا

کہ شیخ حامد زندہ ہے کہیں ان تمام باتوں کے باوجود اس بات میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ آپ کا

آکٹوپس زندہ ہے۔“

”جب سب نے اس کے غرق ہو جانے کا یقین کر لیا تھا اس وقت بھی میں نے یہی کہا تھا کہ جب تک اس کی لاش کو نہ دیکھ لوں گا اس کی موت کا یقین بھی نہ کروں گا۔“

”آپ کے اسی یقین کی روشنی میں یہ کہنے کی اجازت چاہی تھی کہ اگر آکٹوپس زندہ ہے تو

ہمارے درمیان کہیں نہ کہیں تو ضرور چھپا ہوگا۔“ سراج نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”کیا فارم ہاؤس اس

کے لیے بہترین پناہ گاہ نہیں ہو سکتی؟“

”فی الحال میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ایک بات کا شبہ ضرور ہے۔ کسی نہ کسی زاویے

سے سکندر علی شاہ اور آکٹوپس کا لنک بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ سراج نے پہلو بدل کر سوال کیا۔ ”کیا کوئی لنک ہونے کے باوجود سکندر علی

شاہ کو کسی اعتبار سے آکٹوپس کے کام آ رہا ہے؟“

”ایسا بھی ہو سکتا ہے اور تمہارے شبہ کرنے سے پہلے بھی فارم ہاؤس پر میری نظر تھی مگر ایک

بار پھر بڑے اعتماد سے کہوں گا کہ سکندر علی شاہ براہ راست آکٹوپس سے واقف نہیں ہے۔“

”اس اعتماد کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی۔“

”تم نے شاید سکندر علی شاہ والی فائل کو کبھی غور سے نہیں پڑھا۔ جس شخص کی وجہ سے آج وہ اس

مقام پر ہے خود وہ بھی اس سے ناواقف ہی ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آکٹوپس ہی وہ گمنام شخص رہا ہوگا؟“

”ہو بھی سکتا ہے۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”آکٹوپس کے بارے میں مستند کتابوں میں یہی

درج ہے کہ وہ آٹھ ہاتھ رکھتا ہے جس کے ڈنک اتنے زہریلے ہوتے ہیں جو شکار کو اس کی جسامت کا

لحاظ کیے بغیر غفلت سے دو چار کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی شہرت کے جرائم پیشہ افراد اپنے

لہکانوں کا اہتمام بھی قبل از وقت سوچی سمجھی اسکیم سے ضرور کر لیتے ہیں۔ ڈان کی حیثیت رکھنے والے

میک اپ کے فن میں اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ ان کی شریک حیات بھی ان کو شناخت نہیں کر

پاتیں۔“

سراج اور اورنگ زیب کے درمیان ماروی اور آکٹوپس کا ذکر جاری تھا چپ فون کی کھنٹی

بئی۔ سراج نے کال ریسیو کی تھی پھر اس کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

”کیا خبر ہے؟“ اورنگ زیب نے پوچھا۔

”ہمارے سابقہ ڈی آئی جی عظیم احمد کی لاش ان کے بیگلے کے اسٹور روم سے ملی ہے۔ علاقے

لے تھانے انچارج کا فون تھا۔ وہ کسی گمنام آدمی کے فون کے بعد ہی وہاں پہنچا ہے۔“

”سیڈ نیوز۔“ اورنگ زیب بھی سراج کے ساتھ ہی جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔



شبم بالکونی میں ایزی چیئر پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں غرق تھی جب افضل خان بھی اس کے

قرب آ گیا۔ کچھ دیر شام کی چائے دونوں نے ساتھ ہی پی پھر افضل خان اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ آج تم کچھ اداس اداس ہی ہو۔“ افضل خان نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ”کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں۔“ شبنم نے بھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”آج ہی کے دن میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔“

”سچی برتھ ڈے۔“ افضل خان نے بے تکلفی سے کہا پھر وہ باہر جانے کی خاطر پلٹا تھا لیکن شبنم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کہاں جا رہے ہو۔“

”تمہاری سالگرہ منا کر مجھے خوشی ہوگی۔ نیچے سے ہو کر ابھی آتا ہوں۔“

”نہیں، شبنم کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔“ آج کا دن میرے لیے بے حد اذیت ناک ہوتا ہے۔ جب ماں زندہ تھی تو وہ بڑے ارمانوں اور دھوم دھام سے سالگرہ مناتی تھی لیکن.....“

”اوہ.....“ افضل خان نے اسے اس بار کچھ توقف سے کہا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں تمہاری اداسی کا سبب لیکن کاش تم نے اس وقت بھی مجھے اپنا سمجھا ہوتا جب ہم ایک ساتھ کام کرتے تھے۔“

”جو فرض میرے ذمے تھا اسے میں خود ادا کرنا چاہتی تھی پھر چاہیے انجام کچھ بھی ہوتا لیکن مجھے کوئی مناسب موقع نہیں ملا۔“

”اب یہ ذمے داری مجھے سونپ دو۔ میں اس کی ادائیگی سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

”جانتی ہوں لیکن اب وقت اور حالات نے اسے بھی انڈر گراؤنڈ رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پہلے کے مقابلے میں وہ زیادہ محتاط اور خطرناک ہو گیا ہے۔ میڈم کو بھی اس سے اپنا قرض چکنا کرنا ہے۔ پولیس اور ملٹری اٹھیلی جنس کے ذمہ دار افسران بھی اس کی تلاش میں ہیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“

”تمہارے اداس رہنے سے کیا وہ سامنے آجائے گا؟ افضل خان نے اتنی جھلاہٹ سے یہ جملہ ادا کیا کہ شبنم کو ہنسی آگئی۔

”اب مسکرا دی ہو تو کچھ میرے بارے میں بھی غور کرو۔“ افضل خان نے شونہ سے کہا۔ ”ایک ہی گئی پر ہم دونوں کب تک دور دور لٹکے رہیں گے؟“

”سراج صاحب سے پوچھ لو۔ میں تمہارے ساتھ کورٹ تک جانے سے انکار نہیں کروں گی۔“

”افضل خان نے کرسی کھسکا کر اس کے کچھ اور قریب کر لی لیکن اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ موبائل اسکرین روشن ہونے کے بعد جو نمبر نظر آیا اسے دیکھ کر اس نے موبائل آن کرنے میں دیر نہیں کی۔ سنجیدگی سے پوچھا۔

”کوئی تازہ خبر؟“

”آپ کو جس کی تلاش تھی آج وہ خود چل کر بنگالی پاڑے میں آگیا ہے ہو سکتا ہے کہ ایک رات یہیں رہے، یہ بھی ممکن ہے گھنٹا دو گھنٹا گزار کر واپس چلا جائے۔“

”میں سمجھا نہیں، کیا وہ کسی خاص کام سے آیا ہے؟“

”سندر بن کے دیس سے جھرتا، نام کی ایک تازہ مچھلی آئی ہے جو اسے بھگا کر لایا ہے وہ بھی جبرو کا پرانا واقف ہے۔“

”سمجھ گیا۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر پہنچ رہا ہوں۔ تم دور سے اشارہ کر دینا۔ باقی کام کرنا میرا ذاتی مسئلہ ہے۔“

”کوئی نشانی بھی بتادیں۔“ دوسری جانب سے سوال کیا گیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ اصلی حلیے میں نہیں ہوں گے۔“

”جینز اور بلیک کلر کی ٹی شرٹ۔ ہاتھ میں لائٹ گرے رنگ کا موبائل بھی ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں مگلی کے سامنے ہی انتظار کروں گا۔ کچھ فاصلے سے آپ کو مطلوبہ جگہ کا اشارہ کر کے نکل جاؤں گا۔“

افضل خان موبائل بند کر کے اٹھنے لگا تو شبنم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اس وقت کہاں جا رہے ہو۔ کس کا فون تھا؟“

”تمہاری ایک فرمائش پوری کرنی ہے۔ اگر وہ ہاتھ سے نکل گیا تو ہماری شادی بھی کھٹائی میں پڑ جائے گی۔“

”جبرو.....؟ شبنم نے نفرت سے کہا۔

”ہاں..... پریشان مت ہو، میں جلدی لوٹ آؤں گا۔“

”کیا سزا دو گے اسے؟“

”جو تم کہو.....“ افضل خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

”اسے جان سے نہ مارنا لیکن..... اس بات کا احساس ضرور دلا دینا کہ اب میں تمہا نہیں ہوں۔ تم بھی میرے وجود کا ایک حصہ ہو۔“

افضل خان نے شبنم کے دونوں ہاتھ بڑی اپنائیت سے تھام لیے۔ چند لمحے وہ دل کی دھڑکنیں شمار کرتا رہا پھر شونہ سے بولا۔ ”اجازت ہو تو بنگالی پاڑے سے کوئی قاضی بھی پکڑ لاؤں۔“

شبنم نے مسکرا کر پلکیں جھکا لیں۔ افضل خان غسل خانے میں چلا گیا پندرہ منٹ بعد باہر نکلا، ریڈی میڈ میک اپ نے اس کا حلیہ بھی تبدیل کر دیا تھا۔ شبنم دروازے تک اس کے ساتھ گئی۔

”سراج نے کہا تھا کہ کچھ لوگ ہماری نگرانی پر بھی مامور ہیں ان کے سائے سے بھی محتاط رہنا۔“

”ڈونٹ وری۔“ افضل خان کا لب ولہجہ بنگالیوں جیسا ہو گیا۔ ”تم ایک دم بھکر مت کرو۔ ہم ادھر ادھر کا بھی کھیاں رکھے گا۔“

حسب پروگرام وہ ٹھیک پندرہ بیس منٹ میں بنگالی پاڑے پہنچ گیا۔ مطلوبہ آدمی اسے مگلی کے سامنے ہی نظر آگیا۔ افضل خان کو دیکھ کر وہ اندر جانے والے تنگ اور نامہوار کچے راستوں پر چل پڑا۔ وہ کچی گلیاں ایسی بھول بھلیاں تھیں جہاں کوئی اجنبی پہلی بار بھٹک جاتا تو واپس آنے کا راستہ نہیں

تلاش کر سکتا تھا۔

تقریباً چار منٹ بعد آگے جانے والے نے رک کر سگریٹ جلائی۔ بھیجی ہوئی تیلی کو اس نے دانے ہاتھ والے کچے کچے مکان کی طرف اچھالا پھر کش لگا تا آگے نکل گیا۔
افضل خان کے لیے وہ اشارہ کافی تھا۔ وہ بھی مطلوبہ مکان کے سامنے جا کر رکا، جیب سے کنکھی نکال کر اس نے بال درست کیے۔ اس دوران میں اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ گلی ویران پڑی ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی جانب والے مکان کے دروازے پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے دستک دی چند لمحوں بعد کسی نے اندر سے پوچھا ”کون ہے؟“

جواب میں افضل خان نے کچھ کہنے کے بجائے کھٹکرنے پر اکتفا کیا۔ یہ ٹرمپ کار ڈھبی کام آگیا۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ سامنے جبرو ہی دھوئی باندھے کھڑا تھا لیکن اس کو پھر سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ افضل خان نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پتلی گردن پر اپنی گرفت مضبوط کی پھر دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔ دروازہ بند کرنے میں بھی اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”تت..... تت..... تم.....“ جبرو نے کوئی سوال کرنا چاہا لیکن افضل خان اسے مھسیٹ کر کمرے کے اندر لے گیا جہاں ایک لڑکی نے حالات کو بھانپ کر اپنے اوپر چادر کھینچ لی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی خوف ہی خوف نظر آ رہا تھا۔

”نہیں جبرو..... اس وقت زبان کھولنے کی حماقت نہ کرنا ورنہ تو جانتا ہے کہ میں شکار کو تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔“ افضل خان نے اس کا گریبان تھام کر انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

”پر..... تم..... میرا قصور کیا ہے؟“
”اسلم ڈنکا یاد ہے تجھے؟ تو اس کے پاس کسی لڑکی کو لے کر گیا تھا۔“ افضل خان نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

”تم شاید شبنم کی بات کر رہے ہو۔“ جبرو نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”وہ بگ باس کا حکم تھا اور تم نے بھی اس کے اشارے پر چلنے سے بھی انکار نہیں کیا۔“
”مانتا ہوں لیکن تو نے اسلم ڈنکا کے ساتھ کھیل کھیلنے کی کوشش کی تھی اس کا حکم تجھے کس نے دیا تھا؟“

”اوہ، اب سمجھا۔“ جبرو نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”ماسٹر جمید بتا رہا تھا کہ آج کل تم دونوں ساتھ ہی..... ادغ..... غو.....“

جبرو جملہ پورا کرنے کے بجائے بلبلانے لگا..... افضل خان نے سیدھے کھٹنے کو زخم دے کر اس کے پیٹ اور رانوں کے بیچ اس نے نچی تلی ضرب لگائی تھی کہ جبرو خود کو سنبھالتے سنبھالتے زمین پر بیٹھ گیا۔ افضل خان نے دوسری ٹھوکرا اس کے چہرے پر ماری تو ناک سے خون ابل پڑا۔ جبرو کے ہاتھ ناک کی طرف گئے تو افضل خان نے دوبارہ اس کے جسم کے نازک حصے پر بھرپور ٹھوک ماری۔ جبرو کی سانس اکھڑنے لگی۔ وہ کچے فرش پر ٹانگیں جوڑے مائی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

”میں پھر کسی وقت تیری خیریت دریافت کرنے آؤں گا حرام کے بچے!“ افضل خان نے سرد اور شفاک لہجے میں کہا۔ ”اپنی گندی زبان سے دوبارہ شبنم کا نام لانے کی غلطی نہ کرنا ورنہ تیری بوئیاں بھی کتوں کے آگے پڑی ہوں گی۔“

جبرو بہ دستور تڑپتا رہا۔ افضل خان نے ایک اچھٹی نظر چادر میں سمٹی سہی لڑکی پر ڈالی پھر تیز قدم اٹھاتا دروازے سے باہر نکل گیا۔



ہوش آنے کے بعد ڈرائیور کو خود کو اسٹیرنگ پر ہی پایا تھا۔ غنودگی کی کیفیت اس پر اس وقت بھی طاری تھی لیکن برابر والی سیٹ پر لیڈی سیکرٹری کو اس نے جس حالت میں دیکھا اس نے اس کی ساری غنودگی پل بھر میں دور کر دی۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں گٹھڑی بنی نظر آ رہی تھی۔ لیڈی سیکرٹری کو اس حالت میں دیکھنے کے بعد اس کی نظریں کسی خیال سے پشت والی سیٹ پر پڑیں جس کے بعد رہی سہی غنودگی بھی جاتی رہی۔ چھوٹی مالکن بھی بکھری پڑی تھیں۔ سیٹ کے درمیان ان کا ہینڈ بیگ بھی پڑا تھا۔

ڈرائیور نے سنبھل کر دائیں بائیں دیکھا۔ آس پاس کوئی موجود نہ تھا۔ بیرونی پھانک بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں گاڑی اسٹارٹ کی۔ پتھلے سے باہر نکلتے نکلنے اس نے گھر جانے کے بجائے اس اسپتال کا رخ کیا جہاں رستم علی آغا خانی کا ڈرائیور ہونے کی حیثیت سے اسے بھی جانا پہنچانا جاتا تھا۔ یہی واقعیت اور حوالہ اس کے کام آ گیا۔ روشا کو فوری طور پر وی آئی پی روم میں لے جایا گیا، سیکرٹری کیلئے بھی اسٹریچر آ گیا۔ اسپتال کا عملہ اس کو لے گیا تو ڈرائیور نے سب سے پہلے جیب ٹٹولی۔ اغوا کرنے والوں نے اس کا موبائل شاید بعد میں واپس کر دیا تھا۔ فوری طور پر اس نے دارا سیٹھ کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسرے مایوسی کے بعد تیسری بال کال مل گئی۔

”تم..... کہاں ہو اور.....“

”میں ادھر اسپتال میں ہوں صاحب۔“ ڈرائیور نے اپنا فرض پورا کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا۔

”ٹھیک ہے تم وہیں انتظار کرو۔“

پندرہ منٹ بعد دارا بھی اسپتال پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیدھا بڑے ڈاکٹر کے پاس پہنچا جو راہداری ہی میں مل گیا تھا۔

”روشنا کی کیا پوزیشن ہے؟ سب ٹھیک تو ہے؟“

”میں لیڈی ڈاکٹر کو اندر چھوڑ آیا ہوں۔“ ڈاکٹر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اس کے معائنے کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔ فی الحال روشا بیہوشی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ ہوش میں آنے میں کچھ وقت لگے لگا۔ جزل کنڈیشن کسی خطرے سے باہر ہی ہے۔ مگر یہ سب اچانک کیسے ہوا؟ رستم علی صاحب کی لیڈی سیکرٹری بھی بے ہوشی کی حالت میں یہاں آئی ہے۔“

دارا ڈاکٹر کے سوال کے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا، اس کی یہ مشکل اس لیڈی ڈاکٹر نے آسان کر دی جو روشنا کے کمرے سے باہر آگئی تھی۔ ڈاکٹر قدم بڑھاتا لیڈی ڈاکٹر کے قریب چلا گیا۔ کچھ دیر میں باتیں کرتے رہے۔ دارا دور کھڑا ہونٹ چباتا رہا۔

کلب میں میجر عاطف سے روشنا کے جانے کے اطلاع پا کر وہ سیدھا گھر پہنچا تھا۔ اس کے بعد اسے اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ روشنا اور لیڈی سیکرٹری کسی خطرے سے دو چار ہوں گی اور اب وہ دور کھڑا اسپتال کے بڑے ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ گھر سے چلتے وقت اس نے سب کو زبان بند رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ بڑے ڈاکٹر نے لیڈی ڈاکٹر سے گفتگو کرنے کے بعد دارا کے قریب آ کر کہا پھر وہ اسی فلور کے اس وی آئی پی روم میں چلے گئے جو روشنا کے نام پر بک کیا گیا تھا۔ ”کیا رپورٹ ہے ڈاکٹر۔“ دارا نے اکیلے میں دوبارہ بے چینی کا اظہار کیا۔ ”لیڈی ڈاکٹر کے معائنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”مسٹر رستم علی کی لیڈی سیکرٹری کو بھی.....“ ڈاکٹر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا، ایک لمبے کے توقف سے بولا۔ ”اغواء کرنے والوں کی نیت اچھی نہیں تھی۔“

”اوہ!“ دارا ہونٹ چبانے لگا۔ کچھ دیر سوچتا رہا کہ دشمن کون ہو سکتا ہے پھر اس نے دوبارہ ڈاکٹر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”روشنا کی کیفیت اب کیسی ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا لگے لگا۔ اس کے علاوہ میں آپ کو ایک مشورہ اور دوں گا۔“ ڈاکٹر نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”روشنا کو ہوش میں آنے کے بعد آپ کے سوا کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ آپ کا اس کے ساتھ ہونا بھی ضروری ہے۔“ میٹل شک کے بعد مریض کو ہوش آئے تو اس کا ذہن پھر کڑی ہوئی بات میں الجھ جاتا ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے؟ جو کچھ میں نے بتایا ہے اس کا ذکر بھی.....“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ دارا نے خود کو کنٹرول کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ روشنا کو ایک نظر دیکھنے کے بعد باہر نکلا تو ڈرائیور پنڈ بیگ لیے کھڑا تھا۔

”اس میں چھوٹی مالکن کی ضرورت کی چیزیں بھی رہتی ہیں اس لیے میں اوپر لے آیا۔“

”ٹھیک ہے۔“ دارا نے بیگ لے کر ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ”کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تم.....“

”میں نے آپ لوگوں کا نمک کھایا ہے صاحب پھر..... نمک حرامی کیسے کر سکتا ہوں؟“

”کیا تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟“

”نہیں مالک۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سب اجرتی بد معاش تھے کوٹھی تک پہنچانے کے بعد وہ

واپس چلے گئے تھے۔“ ڈرائیور نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”ایک بات اور بھی مالک، وہ جس کوٹھی میں

لے گئے تھے وہ بھی ریٹائرڈ وی آئی جی علیم صاحب کی تھی۔ گیٹ پر جوتھی لگی تھی اس پر بھی بھی لکھا تھا۔“

”تم نیچے ٹھہرو۔ میں کسی وقت تمہیں دوبارہ کال کروں گا۔“

ڈرائیور چلا گیا تو دارا دوبارہ وی آئی پی روم کے اندر آ گیا۔ اس نے روشنا کے پنڈ بیگ کو کھول کر دیکھا تو اس کی رگوں میں دوڑتا خون کھولنے لگا۔ ڈاکٹر نے لیڈی ڈاکٹر کے حوالے سے جس بات کا دہلی زبان میں اظہار کیا تھا اس کا ثبوت پنڈ بیگ میں پڑا ویڈیو کیسٹ میں بھی ہو سکتا تھا جس پر..... گفت فارستم علی، کی ٹائٹ شدہ چٹ کے علاوہ آکٹوپس، کا علامتی نشان بھی نظر آ رہا تھا۔

دارا نے پنڈ بیگ بند کر کے الماری میں رکھا پھر وہ کسی زخمی درندے کی طرح ٹپٹنے لگا اس کی نظریں بار بار روشنا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ دس پندرہ منٹ وہ اپنے وجود میں اٹھنے والے طوفان کو برداشت کرتا رہا۔ پھر اس نے جیب سے موبائل نکال کر ایس پی اورنگ زیب کے نمبر ملائے۔ تیسری گھنٹی پر کال ریسپونڈ کی گئی تو دارا نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”میں دارا رستم علی بول رہا ہوں آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”آفیشل ڈیوٹی پر ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ ”تمہیں اس وقت میری کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”ہے کوئی کام جو فون پر نہیں بتا سکتا.....“

”اس وقت کہاں سے بات کر رہے ہو؟“

”ڈونٹ وری..... میں دوبارہ کال کر لوں گا۔“ دارا نے جواب دینے کے ساتھ ہی لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

روشنا کے قریب بیٹھ کر وہ اس کی کیفیت پر غور کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے جسم میں حرکت شروع ہو رہی تھی۔ دارا نے اس کے قریب ہو کر آہستہ سے پوچھا۔ ”اب کیسی ہو۔ کیسا ٹیل کر رہی ہو؟“

”روشنا نے کوئی جواب نہیں دیا غالباً پوری طرح اس کے اوسان بحال نہیں ہوئے تھے۔ دارا پھر ہونٹ چبانے لگا۔ آکٹوپس کے حوالے سے اس کے ذہن میں کچھ بھولی بسری باتیں بھی ابھر رہی تھیں جب اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہو گئی۔ نظر آنے والے نمبر اس کے لیے نئے تھے پھر بھی

اس نے موبائل آن کر کے پوچھا۔

”کون ہے؟“

”میں نے روشنا کی خیریت دریافت کرنے کی خاطر فون کیا تھا..... اب کیسی ہے؟“

”ابھی تک پوری طرح ہوش نہیں آیا۔“ دارا نے روانی میں جواب دیا پھر سنجیدگی سے

پوچھا۔ ”آپ کون بول رہے ہیں؟“

”اپنا ہمدردی سمجھو۔“ سپاٹ لہجے میں جواب ملا۔ ”ایک دوستانہ مشورہ بھی دے رہا ہوں

راشنا کے ساتھ ساتھ تم بھی ہوش میں آ جانا۔ وہ غلطی نہ کرنا جتہا را باپ کر چکا تھا۔ میجر عاطف

اور ایس بی اورنگ زیب مل کر بھی میری گردنوں میں پہنچ سکتے۔“
 ”تم.....“ دارا تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا، اس کی رگوں میں جوان خون بھی جوش مارنے لگا۔ حقارت سے بولا۔ ”اگر مرد کے بچے ہوتو سامنے آ کر بات کرو۔“
 ”میرا مردانگی کا ثبوت تمہاری بیوی کے بیگ میں پڑے ویڈیو کیسٹ میں بھی مل جائے گا۔ وہ میرے شکاری کتے تھے۔ ان کی درندگی دیکھ کر تم میری طاقت کا اندازہ بھی لگا لینا۔ دس پونڈ لک..... بن آف بچ۔“

دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ دارا کے پاس ہونٹ چبانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ پھر زخمی درندے کی طرح کمرے میں ٹپٹنے لگا جب بڑا ڈاکٹر ایک نرس کے ساتھ اندر آ گیا۔ روشنا کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے دارا سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب یہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہوش میں آ جائیں گی لیکن میں نے جو مشورہ دیا ہے اسے یاد رکھیے گا۔ ایسی کیفیت میں مریض کو ہمدردی اور محبت کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ مریض کو ہوش میں آنے کے بعد ایک دو روز تک تنہا نہ چھوڑیے گا۔ یہ بھی بطور احتیاط کہہ رہا ہوں۔“
 ”میں سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر۔ روشنا کو اس وقت ذہنی سکون کی ضرورت بھی ہوگی۔ میں ہر طرح خیال رکھوں گا۔“

ڈاکٹر چلا گیا۔ دارا کے ذہن میں آنکلوپس پھر کبلانے لگا۔ تقریباً پچاس منٹ بعد روشنا کے جسم کو حرکت ہوئی۔ اس نے دو ایک بار گردن ادھر ادھر ہلائی پھر اس طرح ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے جاگی ہو، دارا تیزی سے اس کے قریب آ گیا۔
 ”تم..... میں کہا ہوں؟“ روشنا نے مدھم لہجے میں کہا پھر اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں، اس کی پلکوں کے درمیان سے نکلنے والے آنسو کے قطرے اور چہرے میں کرب کے نمایاں ہونے والے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ ہوش میں آ چکی ہے۔
 ”حوصلے سے کام لو ڈاکٹر لنگ۔ دارا کل بھی تمہارا تھا، آج بھی تمہارا پرستار ہے۔“

”سچ کہہ رہے ہو۔“ روشنا کی آواز بھرا گئی وہ مجسم کرب نظر آ رہی تھی۔
 ”کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟“ دارا اس کی پیشانی چومنے کے بعد بڑی محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”اگر محبت ہے تو کہیں سے تھوڑا سا زہرا دو۔ م..... میں اب کسی کو منہ دکھانے.....“
 ”ریلیکس روشنا۔ پلیز ریلیکس!“ دارا نے اسے دیوانوں کی طرح سینے میں چسپایا۔ ”تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی بے بس ہی رہتا۔ میرے اندر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو جاتی تو کیا تم اپنے دارا سے نظریں پھیر لیتیں؟“

روشنا سسکیاں بھرتی رہی، دارا اس کی دلجوئی کرتا رہا۔ ماحول کو بدلنے کی خاطر اس نے نرس کو کال کی۔ پھر دارا کے کہنے پر وہ بڑے ڈاکٹر کو بلا لائی۔ دارا نے روشنا کو پیار سے سہارا دے کر دو

تکیوں پر لٹکا دیا۔ بیڈ کو بھی سرہانے سے اونچا کر دیا۔ روشنا اس سے نظریں ملانے کے بجائے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی جب ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اس نے روشنا کی نبض دیکھی پھر مسکرا کر بولا۔ ”آپ کو بے ہوشی کا انجکشن دیا گیا تھا اس کا اثر بڑی حد تک زائل ہو چکا ہے چوتیس گھنٹوں کے بعد آپ گھر بھی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی شکر ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو کڈ نیپ کیا تھا وہ صرف جیولری اور کیش لے کر بھاگ گئے۔“

”اور کوئی پراہم تو نہیں ہے؟“ دارا نے ڈاکٹر سے پوچھا، وہ ڈاکٹر کی کہی ہوئی بات سمجھ کر روشنا کو بھی یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس نے ڈاکٹر کو اس کی وقتی گمشدگی کے بارے میں کیا بتایا تھا! ڈاکٹر کچھ دیر بعد چلا گیا تو روشنا نے پہلی بار دارا کو ایسی نظروں سے دیکھا جس میں بے شمار سوالات چل رہے تھے۔

”کیا تمہیں دارا کی محبت پر اب بھی یقین نہیں ہے؟“
 دارا نے اس کے ہاتھ تھام کر بڑی اپنائیت سے سوال کیا۔
 جواب میں روشنا دارا کی نظروں کی گہرائیوں میں دور تک کچھ تلاش کرتی رہی پھر بے اختیار اس کے گلے لگ کر دوبارہ سکنے لگی۔

دارا نے اپنی محبت کا یقین دلانے کی خاطر اپنے ہاتھوں کا حلقہ اور تنگ کر لیا۔ اس وقت بھی اس کے وجود میں آنکلوپس کے زہریلے ڈنک چبھ رہے تھے جب روشنا نے خود پر کسی حد تک قابو پاتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

”تمہاری بات اور ہے دارا مگر..... میں لیڈی سیکرٹری اور ڈرائیور کو کس طرح فیس کر سکوں گی؟“

”ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ تم کو کچھ دنوں کے لیے باہر لے جاؤں۔“ دارا نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”وہاں ہمارے آفس میں بھی کام بڑھ رہا ہے، میں ڈیڈ سے کہہ کر وہاں سیٹل ہو جانے کی بات بھی کر لوں گا۔“

”نہیں.....“ روشنا نے دارا کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں ڈیڈ اور می کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ وہاں ان کے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔ وہ بھی ہماری کی ضرورت محسوس کریں گے۔“

”روشنا۔ پو آر گریٹ!“ دارا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی عقیدت سے کہا۔
 ”گریٹ میں نہیں ہوں۔ تم ہو جو تم نے مجھے.....“

”پلیز..... اب یہ بات دوبارہ زبان پر نہ لانا۔“ دارا نے اسے اپنے کشادہ سینے کی گہرائیوں میں پھسایا پھر بولا۔ ”یہ بھی ممکن ہے کہ میں ڈرائیور اور لیڈی سیکرٹری کو باہر بھیج دوں۔“

”صرف ڈرائیور کو..... لیڈی سیکرٹری کو دفتر تک محدود کر دو۔ وہ بھی میری ہی وجہ سے حالات کا.....“

”ہوئی تھی۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے۔“ روشنا نے بڑی صداقت سے جواب دیا۔
 ”جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا لیکن پلیز اب صرف آرام کرو۔ ریلیکس مانی ڈیر۔“

”صرف ایک بات اور کہنا چاہوں گی۔“

”وہ کیا.....؟“

”مجھے..... یہ یقین تھا کہ تم مجھے مظلوم سمجھ کر معاف کر دو گے۔“ روشنا کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

”یو آر گرینٹ۔ مائی لو۔“ دارا نے اسے بھر اپنے وجود میں چھپا لیا۔ دل کی دھڑکنوں میں جہاں سچائی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔



دشمنوں کو قتل احتشام کے حکم کے مطابق ایک لمحہ بھی سونے کا موقع نہیں دیا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اسے ملٹری زبان میں فل ڈوز بھی مل رہی تھی۔ مختلف آلات کے ذریعے اسے اذیتیں دینے میں کوئی رعایت نہیں کی گئی تھی مگر دشمنوں نے اپنی زبان پر تالے ڈال رکھے تھے شاید اس لیے کہ اس کے واحد جواب ”تم جس کے بارے میں مجھے ادھیڑ رہے ہو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ نے قتل احتشام اور اس کے کارندوں کو مطمئن نہیں کیا تھا۔ ٹارچہ کرنے والوں کا سرغنہ ہر بار اس کو اپنی زبان میں یہی سمجھاتا تھا۔

”کتوں کی طرح بار بار ایک ہی آواز میں بھونکنا چھوڑ دے۔ جوج ہے وہ اگل دے ورنہ اسی کمرے سے تیری رام رام ست بھی ہو جائے گی۔“

دشمنوں کی بات سن کر مسکرا دیتا۔ سرغنہ کے اشارے پر پھر دشمنوں کی دھناتی شروع ہو جاتی۔ اس وقت بھی وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا تھا جب تشدد کرنے والوں کے ہاتھی مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ اسے اب اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے ڈوز کتنی دیر بعد ملتی ہے۔

دشمنوخت جان تھا لیکن جو لوگ اسے ٹارچہ کر رہے تھے وہ بھی تجربہ کار تھے ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ جلد از جلد کرٹل کی نگاہوں میں سرخرو ہو سکیں۔ اس کوشش میں دشمنوں کے برداشت کی ہمت بھی آہستہ آہستہ جواب دینے لگی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر ایک دو روز اور اس پر جبر و تشدد ہوا تو قوت برداشت کے ساتھ وہ خود بھی دم توڑ جائے گا۔ اس کا ذہن ہر وقت فرار کے راستوں کی ہر ممکن تدبیر پر غور کرتا رہتا لیکن ابھی تک اسے ایک پل کے لیے بھی تنہائی کا موقع نہیں ملا تھا۔ رات اور دن کا تصور بھی مٹ چکا تھا۔ کمرے میں ہر وقت ہائی پاور کی روشنی اس کے اور نیند کے درمیان حائل رہتی۔ رات کی ڈیوٹی پر مامور جلا دھبی اس کو ایک پل کے لیے آنکھ موندنے کا موقع نہیں دیتا۔ اس کے فوجی جوتے کی ایک شدید ٹوکری اتنی شدید ہوتی تھی کہ نیند کا جھوٹا بھی اب دشمنوں کے قریب آنے سے روکھ گیا تھا۔

ٹارچہ روم میں تشدد اور برداشت کی آنکھ پھولی جاری تھی جب دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ کسی کے قدموں کی آہٹ بھی ابھری۔ تشدد کرنے والوں کے ہاتھ بھی اس آہٹ کی آواز پر مشینی انداز میں رک گئے تھے۔ دشمنوں نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر دروازے کی سمت دیکھا۔ دروازے پر کرٹل احتشام ڈاکٹر کے نائب کے ساتھ موجود تھا۔ کرٹل کی شعلہ انگلی نظریں دشمنوں پر مرکوز تھیں۔

”اب اس باسٹرڈ کا کیا جواب ہے؟“ اس نے ٹارچہ کر نیوالوں کے سرغنہ کو مخاطب کیا۔

”سر..... میرا تجربہ کہتا ہے کہ ایک دو روز اور فل ڈوز کا سلسلہ جاری رکھنا پڑے گا۔ اس کے بعد اس کی زبان فرفر چلے گی۔“

”تم.....“ کرٹل نے ہونٹ چباتے ہوئے براہ راست دشمنوں کو مخاطب کیا۔ ”تم اب کیا کہو گے؟“

”پرانے راگ کے ساتھ ایک بات اور تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“ دشمنوں نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”تم ملٹری انٹیلی جنس کے بڑے ہو..... جب تم اس کی کھوج ابھی تک نہیں پاسکے تو میں کیا سیوا کر سکتا ہوں۔“

”اس نے تمہیں پناہ دی تھی۔ تم اس کے خاص آدمی ہو۔ اس لیے یہ جانتے ہو گے کہ وہ کس بھٹ میں چھپا بیٹھا ہے۔“

”تمہاری مرضی۔ جو چاہے سوچ لو۔“

”یو..... ڈرنی ڈاگ۔“ کرٹل کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ”کیا تم اپنا گندا منہ کھول کر بچ نہیں بولو گے۔“

دشمنوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن دوسرے ہی لمحے کرٹل کے سیدھے ہاتھ کو جنبش ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی جو ٹھوکرا چاک و شنو کے منہ پر لگی وہ اتنی شدید تھی کہ اس کے ہونٹوں سے خون اگلنے لگا۔

”تمہارے جسم اور روح کا رشتہ ختم ہونے تک ہم تمہیں دوبارہ کھلی ہوا میں نہیں جانے دیں گے۔“ کرٹل نے گرج کر کہا۔ ”سانس بند ہو گئی تو آخری چانس بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

دشمنوں نے جواب میں کرٹل کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایک لمحے کو ایسا لگا تھا جیسے وہ زبان کھول دے گا، ہمت کر کے وہ دیوار کے ساتھ بیٹھ بھی گیا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوئیں پھر سر کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی ننگے فرش پر ڈھلک گیا اس طرح بکھر گیا جیسے اس میں جان باقی نہ رہی ہو۔ کرٹل نے قریب کھڑے ہوئے نائب ڈاکٹر سے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”اس کی نبض ٹٹلو۔“

جواب میں نائب ڈاکٹر دشمنوں کے قریب جا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ خاصی دیر تک وہ دشمنوں کے ہاتھ اور پاؤں کے مختلف حصوں پر نبض کی رفتار ٹٹوتا رہا پھر اس نے گلے میں لٹکے ہوئے آلے سے مدد کی لیکن آتی جاتی سانسوں کا کوئی سراغ نہ تلاش کر سکا۔ دل کی دھڑکنیں بھی رفتہ رفتہ معدوم ہو رہی تھیں۔

”کیا ہوا.....؟“ کرٹل کی آواز کمرے کے سکوت کو توڑتی ہوئی ابھری۔

”اس کی سانس مکمل طور پر بند ہو رہی ہے۔ دل کی رفتار بھی ٹائل سے کم ہوتی جا رہی ہے۔“ نائب ڈاکٹر نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”دو گھنٹے بعد دوبارہ دیکھنا پڑے گا۔“ پھر.....

دو گھنٹے بعد جب کرٹل احتشام کو دشمنوں کے سانس بند ہو جانے کی رپورٹ بھی مل گئی تو اس نے اپنے ماتحت کو بلا کر ضروری مشورہ کیا۔ ”تم کیا رائے دو گے؟“

”میرا خیال ہے کہ اسے خاموشی سے کسی ہندو تنظیم کے حوالے کر دیا جائے۔“ ماتحت نے کہا۔ ”ایک واقف کار ہے میرا جو مرنے والے کی چتا کو آگ بھی لگا دے گا۔ دوسری شکل میں ہمیں انٹر پول والوں کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ لاش کو ٹھکانے لگانے کا کام ہمارے لیے کسی طور مناسب نہیں ہوگا۔“

”کیا تمہارا واقف کار قابل اعتماد ہے؟“

”نہیں.....“ ماتحت نے جواب دیا۔ ”ایک بار لاش جل کر راکھ ہو گئی تو وہ بھی زبان کھولنے کی پوزیشن میں نہیں رہے گا۔“

کرتل نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک وہ بھی دشمن کی حیثیت پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”آئی۔ ایگری و دیو۔“

اسی رات کرتل کے ماتحت نے دشمن کو ہندو تنظیم کے اس ادارے تک پہنچا دیا جو مرنے والوں کا کریاکرم بھی کرتا تھا۔



سیواساج کی میت گاڑی اس وقت شمشان گھاٹ جانے والے راستے پر رواں تھی۔ اس وقت رات کے دو بجے کا عمل تھا، ہڑک پر ٹریفک نام کو بھی نہیں تھا۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے برابر میں ہندو تنظیم کا نائب پرشوتم بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ جب ڈرائیور نے آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اسے مخاطب کیا۔

”اتنی رات گئے کس کی ارٹھی کو آگ لگانا ضروری ہے؟“

پرشوتم نے چونک کر ڈرائیور کو دیکھا، کسمسا کر بولا۔

”تجھے کس بات کی چتا ویاکل کر رہی ہے؟“

”راستے میں پولیس چوکی بھی پڑتی ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”وہ بھی یہی سوال کر سکتے ہیں۔“

”اس کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔“ پرشوتم نے اس بار بھی روکھے لہجے میں جواب دیا اور فوراً ہی کینپلی بدل کر بولا۔ ”مرنے والا فوجی افسران کی قید میں تھا۔ ان ہی کہنے کے انوسار ہمیں اس وقت چتا کو آگ دکھانی ہوگی۔ رہا پولیس چوکی کا معاملہ تو اس کی بات میں نے پہلے ہی کر لی ہے گھاٹ پر ہمارے آدمیوں نے چتا بھی تیار کر لی ہوگی۔“

”کون غریب تھا جو فوجیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا؟“

”آم کھانے کی بات کیا کر۔“ پرشوتم نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”زیادہ کھوجنے کی گھات نہ لگایا کر۔“

”ٹھیک ہے۔“ ڈرائیور نے بے پروائی سے کہا۔ ”کل کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو پھر میں سب کو وہی بیان دوں گا جو میرا من چاہے گا۔“

”زیادہ لمبی چوڑی باتیں کرنی چھوڑ دے۔“ پرشوتم نے چمک کر کہا۔ ”تیری ڈیوٹی کیوں گارڈ والی پسند کی ہے۔ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو اس سے بھی تیرا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“

ڈرائیور نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ پرشوتم کی بات اسے اچھی نہیں لگی۔ شاید اس لیے کہ پرشوتم کوئی چار میہ پہلے سیواساج کا نائب بنا تھا جب کہ ڈرائیور دو سال سے اپنی پوری ڈیوٹی ایمان داری سے نبھا رہا تھا۔

راستے میں گاڑی کو پولیس چوکی پر پوچھ گچھ کے لیے روکا گیا۔ پرشوتم نیچے اتر کر چوکی کے اندر چلا گیا پھر دو منٹ بعد واپس بھی آگیا اور چوکی سے ایک سادہ لباس والا گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔

”کوئی خاص بات؟“

”یس سر، چتا کو آگ لگانے کے بعد گھنے درختوں کی طرف سے ایک فائر کی آواز ابھری تھی لیکن جس خرگوش پر کوئی داغی گئی تھی وہ بچ کر نکل گیا۔ میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“

”رات پولیس چوکی پر گزارنا۔“ تھما نہ لےجے میں کہا گیا۔ ”میں نے ڈیوٹی آفیسر سے بات کر لی ہے۔“

”رائٹ سر۔“

”ایک بات اور..... کسی کے سوال کا کوئی جواب مت دینا۔ اپنی زبان بند ہی رکھنا۔“ اس بار بھی سپاٹ لےجے میں کہا گیا پھر لائن منقطع کر دی گئی۔

❖❖❖

بکدوش ہونے والے ڈی آئی جی عظیم احمد کے قتل کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی تو ایک بار پھر عوام میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں میں بھی اوپر سے نیچے تک مچلی مچ گئی۔ اس ضمن میں آئی جی نے بھی مداخلت کرتے ہوئے دارالسران کے علاوہ اورنگ زیب اور سراج کو بھی طلب کر لیا تھا۔

بند کمرے میں خاصی دیر تک مختلف پہلوؤں پر بنیادی جمع خرچ ہوتی رہی لیکن قتل کے اسباب کیا تھے؟ قاتل کون تھا جس نے صرف مرحوم کو بندوق سے قتل کیا پھر سارا قیمتی سامان چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ پولیس کو کوشش بسیار کے باوجود جانے دوڑ سے کسی قسم کے فکر پریش یا دوسرا ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ قتل کے اسباب کیا تھے؟

متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او بھی میٹنگ کے دوران صرف اپنی تفتیشی رپورٹ دہراتا رہا جس سے کوئی نتیجہ نہیں اخذ کیا جاسکتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کسی نامعلوم شخص نے اسے فون کر کے حادثے کی اطلاع دی تھی۔ اس کے بعد ہی ایس پی اورنگ زیب اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج نے بھی ایس ایچ او کو جوائن کیا تھا۔

”آپ کی کیا فائنڈنگس (Findings) ہیں؟“

آئی جی اورنگ زیب سے سوال کیا۔

”میں ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ شاید اس لیے کہ مجرموں نے بڑے شاطر انداز میں واردات کی ہے۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”عظیم احمد صاحب نے میری اطلاع کے مطابق ریٹائرڈ ہونے کے بعد ہی گاڑ ڈیوٹی کے عمل کو فارغ کر دیا تھا ایک ملازم تھا جو سارے کام انجام دیتا تھا۔ واردات کرنیوالوں نے اسے پہلے ہی بے ہوش کر کے سروٹ کوارٹر میں ڈال دیا تھا۔“

”گویا اب اس شہر میں کسی کی جان و مال کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔“ آئی جی نے الجھ کر کہا پھر دوبارہ ایس ایچ او سے مخاطب ہوا۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا کہتی ہے؟“

”آج شام تک وہ بھی مل جائے گی۔ میں ڈاکٹر سے ملا تھا لیکن اس نے رپورٹ سے قبل کوئی

ششمان گھاٹ پر پرشوتم کے کہنے کے مطابق سیوا سماج کے تین آدمی پہلے سے موجود تھے۔ چتا بھی تیار کر لی گئی تھی۔ چتا کے ساتھ تیل کا وہ کنسٹر موجود تھا جسے لکڑیوں پر چھڑک کر آگ دکھانی تھی۔ گاڑی رکنے کے بعد سادہ لباس والا کچھ دور اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں درختوں کا جھنڈ تھا۔ گھاٹ پر موجود تینوں آدمیوں نے مل کر بانسوں کی بنی وہ ارچی بھی گاڑی سے نکال لی جس پر دشنو اکڑا ہوا جسم پڑا تھا۔ سب نے مل کر دس بارہ بار رام ست ہے کے نعرے بلند کیے۔ ارچی کو لکڑیوں کے ڈھیر کے اوپر رکھ دیا گیا۔ کنسٹر کا تیل لکڑیوں کے ڈھیر پر چاروں طرف چھڑک دیا گیا پھر سب خاموش کھڑے ہو گئے تو پرشوتم نے دھرم کے انوسار کوئی اشلوک پڑھا، اس کے بعد پرشوتم نے چتا کو آگ بھی لگا دی۔

آگ آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ جب درختوں کے جھنڈ کے دوسری جانب سے فائر کی آواز ابھری جسے سن کر سب ہی چوٹے تھے۔ ڈرائیور نے اس بار بھی درختوں کے سمت جانے کی کوشش کی تھی جب پرشوتم نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دم لمبے میں کہا۔

”ادھر جھاڑیوں کے بیچ خرگوش نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔ چھیروں کی بستی کے لوگ اکثر رات گئے ان کا شکار کرنے آ جاتے ہیں۔“ ڈرائیور نے ایک نظر پرشوتم کو گھورا تو وہ بھی سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ چتا کی آگ پوری طرح بھڑک رہی تھی۔ فائر کی آواز پر بس ایک لمحے کو سب ہی کی توجہ اس طرف ہو گئی تھی لیکن پھر وہ اس وقت تک سر جھکا کھڑے رہے جب تک چتا کی آگ سرد نہیں ہو گئی۔ سادہ لباس والا جو درختوں کے پاس چلا گیا تھا دوبارہ قریب آ کر پرشوتم سے بولا۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“

”دو کنسٹر پانی گرم راگھ پر ڈال کر واپس چلیں گے۔“

”کیا مرنے والے کی راگھ نہیں لو گے؟“ سادہ لباس والے نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”سنا ہے

اس راگھ کو پتیل کی لٹیا میں جمع کر کے کسی شیعہ گھڑی میں دریا میں بہا دیتے ہیں؟“

”ٹھیک سنا ہے۔ پر تنو یہ کام مرنے والے کے کہنے والے کرتے ہیں۔“ پرشوتم نے سپاٹ لےجے میں جواب دیا۔

”جوانا تھ (لاوارث) ہوتا ہے اس کے لیے ہم یہ روگ نہیں پالتے۔“

”مرنے والے کی لاش تمہیں کہاں سے مل گئی؟“

سادہ لباس والے کے لےجے میں تجسس تھا۔

”اتنا تھ اشرم ہی کا ایک سیوک تھا جس کے آگے پیچھے کوئی اور نہیں تھا۔“

”اوہ۔“ سادہ لباس والے نے شانے اچکا کر کہا پھر واپسی کے وقت بھی وہ گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوئے۔

”اس وقت کہاں ہو؟“ دوسری جانب سے سوال کیا گیا۔

”سارا کر یا کر م ہو گیا سر۔ ہم اب واپس لوٹ رہے ہیں۔“

رائے نہیں ظاہر کی۔“

”جائے وقوعہ سے کوئی اور کلیو بھی ملا؟“

”نوسر۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”ہم نے کوشی کا ہر حصہ کھنگال ڈالا ہے۔“

”اخبار کو اس واردات کی خبر کس طرح مل گئی؟ آئی جی نے تمللا کر سوال کیا۔

”جن لوگوں نے ایس ایچ او کو اطلاع دی ان کو اخبارات کے دفتر میں بھی فون کرنے سے کون

روک سکتا تھا۔“ ایس ایچ او کے بجائے اورنگ زیب نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”قانون کی

بالادستی بھی اب محض برائے نام رہ گئی ہے۔“

آئی جی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اورنگ زیب کے تلخ جواب کو وہ حلق کے نیچے

اتارنے کی کوشش کر رہا تھا جیسی فون کی کھنٹی نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

”ہیلو۔“ اس نے ریسپورڈ اٹھا کر خشک لہجے میں کہا۔

”آئی جی اسپیکنگ“

”ہوم نمٹر بھی ہوتے تو میری صحت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔“ دوسری جانب سے کہا

گیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تمہارے آفس میں جو افسران جمع ہیں وہ بھی تمہاری طرح وقت برباد کر رہے

ہیں۔“

”کون بول رہا ہے؟“ آئی جی جھنجھلا گیا۔

”آکٹوپس.....“ سرسراتے لہجے میں جواب ملا۔

اپنے ہونہار ایس پی کو بھی ہوشیار کر دینا۔ ابھی تک میں نے اسے ڈھیل دے رکھی ہے جس دن

یہ مدت ختم ہو گئی اس کو بھی چیونٹی کی طرح مسل کر پھینک دوں گا۔“ جملے کے اعتتام کے ساتھ ہی رابطہ

ختم کر دیا گیا۔

آئی جی نے جس انداز میں ریسپورڈ کر ڈیل پر رکھا اسے سب ہی نے محسوس کر لیا تھا لیکن کسی

نے کچھ کہنے کی جسارت نہیں کی۔ خود آئی جی بھی کچھ دیر ہونٹ چباتا رہا پھر اس نے دوبارہ اورنگ

زیب کو مخاطب کیا۔

”کسی نامعلوم فرد نے کال کی تھی اور..... اس نے خاص طور پر آپ کے سلسلے میں کوئی نازیبا

بات کی ہے۔“

”یقیناً کی ہوگی۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔

”مجرم جب کسی سے خوفزدہ ہوتا ہے تو اس کو مرعوب کرنے کی خاطر ایسے ہی بھونڈے راستے

اختیار کرتا ہے۔ ایسی باتوں سے مجھے ہمیشہ اپنی کارکردگی اور برتری کا احساس ہوتا ہے۔“

آئی جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک علیم احمد کے قتل کیس کو مختلف زاویوں کو کھنگال گیا

پھر آئی جی نے مجرم کی گردن تک جلد از جلد پہنچنے کے احکامات صادر کر کے سب کو رخصت کر دیا۔

اورنگ زیب، سراج کے ساتھ آئی جی کے کمرے سے باہر نکلا تو اس کے چہرے کے تاثرات

اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ کوئی خاص نکتہ ہے جو اس کے اندر اپنا حجم بڑھا رہا تھا۔

”اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟“ سراج نے پوچھا۔

”جن کی پوسٹنگ ہیڈ کوارٹر میں ہوتی ہے ان کے پاس کرسی توڑنے کھیاں مارنے کے سوا اور

کوئی خاص کام نہیں ہوتا لیکن اس وقت میں ان دو کاموں کو انجام دینے کے موڈ میں ہرگز نہیں

ہوں۔“

”پھر؟“

”سنا ہے ریڈ کراس اسپتال میں آج کل کچھ بڑے لوگ ایڈمٹ ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ سراج نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

سراج کو اس کی بات کا جواب نہیں مل سکا۔ اورنگ زیب نے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد

اشارہ کیا تو سراج بھی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی احاطے سے باہر نکلی تو سراج نے پھر

وہی سوال کیا۔

”ریڈ کراس اسپتال میں کون بڑے لوگ موجود ہیں؟“

”دارا رحم علی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک ہی نام کلبلا رہا ہے..... روشنا۔“ اورنگ

زیب نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اس وقت آپ کے ذہن میں دارا کہاں سے آگیا؟“

”علیم احمد کی کوئی بیٹی تھی اسی کی کال ریسپو ہوئی تھی۔ دارا کسی کام کے سلسلے میں مجھ سے فوری

ملنا چاہتا تھا۔ اس کی گفتگو کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی حیجانی کیفیت سے دوچار ہے۔“

”پھر.....“

”میں نے کسی خیال کے تحت معلوم کرنا چاہا تھا کہ وہ کہاں سے بول رہا ہے لیکن اس نے

دوبارہ کال کرنے کا کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔“

”لیکن اس گفتگو میں ایسی کون سی بات ہے کہ آپ کے ذہن میں ریڈ کراس اسپتال ابھر

آیا؟“

”آئی جی کا وہ جملہ بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے جو اس نے کسی کی کال ریسپو کرنے کے

بعد مجھ سے کہا تھا۔“ اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”جس نے میرے لیے کچھ نازیبا

بات آئی جی کے ذریعے کہلوائی وہ..... وہ..... آکٹوپس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔“

”ریڈ کراس اسپتال کے بعد آکٹوپس..... آپ کی باتیں.....“

”ذہن پر زور دو تو دو اور دو چار آسانی سے ہو جائیں گے۔“ اورنگ زیب نے جملہ منقطع

کر کے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب تک ہمارے اور آکٹوپس کے درمیان بے جان چیزوں کی تباہی کا جو

سلسلہ جاری تھا اس نے شاید اب جان دار چیزوں کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ نہیں..... کوئی سوال نہیں

صرف غور سے سنتے رہو۔ علیم احمد کا قتل ہمارے لیے جنگ کا آغاز ہے۔ اس کی موت کے ساتھ ہی

”اتنی جلدی آخری رائے نہ قائم کرو۔ دارا سے مل لینے کے بعد ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔“
اورنگ زیب نے گاڑی ریڈ کر اس اسپتال کے پارکنگ لاث سے ہٹ کر ایک جگہ پارک کی
پھر سراج سے بولا۔ ”مقاطر ہٹا۔“ گاڑی دوبارہ حرکت میں آئی تو اس نے پوچھا۔
”کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟“

”میں نے جس شے کا اظہار کیا تھا وہ غلط نہیں تھا۔“ اورنگ زیب نے سڑک پر نظریں جمائے
جمائے جواب دیا۔ ”شبیم کے بجائے روشنا کو دھوکے سے اغواء کر کے علیم احمد کی کوٹھی پر لایا گیا
تھا۔ وہاں روشنا کے ساتھ کیا سلوک ہوا، دارا نے اس ضمن میں زبان نہیں کھولی لیکن جس آدمی نے
روشنا سے ملاقات کی تھی اس کا حلیہ ایک فی صد بھی آکٹوپس سے مختلف نہیں کہا جاسکتا۔“
”روشنا کو اغواء کرنے کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوگا؟“ سراج نے استفسار کیا۔

”پہلا مقصد یہ تھا کہ روشنا کے ذریعے بھی مجھے یہی پیغام دیا جائے کہ میں اس کے مقابلے میں
کامیاب نہیں ہو سکتا۔“ اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ”میرے فلیٹ کی تنہائی سے پہلے غالباً وہ
فائل بھی اس کے ہاتھ لگ گئی ہوگی جو رستم علی آغا خانی نے سیمجر عاطف کے ذریعے مجھ تک بھیجی تھی،
اس کے علاوہ..... علیم احمد کی موت کے بعد اس کی خالی کوٹھی بھی بطور پناہ گاہ وقتاً فوقتاً استعمال کی جاسکتی
ہے۔“

”دارا نے یہ نہیں بتایا کہ وہ آپ سے فوری طور پر کیوں ملنا چاہتا تھا؟“
شاید اسے بعد میں احساس ہو گیا ہو کہ جذباتی لمحوں میں اصل بات بھی زبان سے نکل جاتی
تو وہ بھی کسی کومنڈ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔“
”کیا مطلب؟“ سراج چونکا۔ ”کیا رستم علی آغا خانی کے بعد اب روشنا کو بھی بلیک میل کرنے
کی خاطر وہی ناپاک کھیل دہرایا گیا ہے؟“

”تمہاری جگہ کوئی ذہین بچہ ہوتا تو وہ بھی یہی رائے قائم کرتا۔“ اورنگ زیب نے بدستور
سنجیدگی سے کہا۔ ”صرف مجھے پہنچانا اصل مقصد ہوتا تو پھر علیم احمد کو راستے سے ہٹانے اور روشنا کو اغواء
کرنے بعد وہاں تک لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ ایک مقصد اور بھی ہو سکتا ہے۔“
”وہ کیا؟“

”ہو سکتا ہے آکٹوپس نے یہ سب کچھ ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کی خاطر کیا ہو۔“
”میں ایک بار پھر اپنی کند ذہنی کا اقرار کرتا ہوں۔“

سراج نے تملکار کر پوچھا۔ ”غلط راستے پر ڈالنے سے آپ کا اشارہ کس بات کی طرف ہے؟“
”میں نے ایک امکانی بات کہی تھی۔ ماروی کے سلسلے میں اب جو لڑکی ہماری ہٹ لسٹ پر آئی
ہے۔ اسے کھنگالنے کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔“

”سمجھ گیا۔“ سراج نے بڑی معصومیت سے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ ”آئندہ آپ کو کریدنے سے
گریز کروں گا۔“

خالی کوٹھی میں کچھ اور کھیل تماشے بھی ضرور ہوئے ہوں گے۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو لیکن اسی کوٹھی میں
تفتیش کے دوران دارا کی کال اس کے بدلے ہوئے تھوڑے سے یہ کہنا کہ مجھ سے فوری ملاقات کرنا
چاہتا ہے پھر اس کی خاموشی..... نہیں سراج صاحب۔ یہ سارے امکانات بے ربط نہیں ہو سکتے۔ کہیں
نہ نہیں۔ کوئی نہ کوئی کڑی ایک دوسرے سے ضرور ملتی ہوگی۔“

”آئی سی۔“ سراج نے کچھ توقف سے کہا۔ ”آپ کی باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں لیکن ریڈ کر اس
اسپتال.....“

”اس کی اطلاع مجھے میرے خیر نے دی ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ روشنا بھی وہاں دی آئی پی روم
میں ایڈمنٹ ہے۔“ اورنگ زیب نے یہ بات جاری رکھی۔ ”دارا فوری جذباتی کیفیت سے دو چار ہوگا
پھر اس نے دوبارہ رابطہ قائم نہیں کیا۔ اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔“

”ایسی صورت میں وہ اس وقت بھی زبان نہیں کھولے گا۔“ سراج نے ایک امکانی بات کہی۔
”تکلیف کی شدت معلوم کرنے کی خاطر زخم کوٹھیس پہنچانا بھی ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتا
ہے۔ قبل از وقت یقین سے.....“ اورنگ زیب نے جملہ ادھورا چھوڑ کر موبائل آن کر لیا۔ اسکرین پر
نظر آنے والا مخصوص نمبر اور ڈیل اکس کا کوڈ دیکھ کر اس نے بے حد سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”اس وقت کیسے فون کیا؟ گڈ..... میری بات غور سے سنو، جب تک میرا کوئی دوسرا آدمی تم
سے رابطہ نہ کرے تم سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہو..... نہیں، فی الحال ایسی کوئی غلطی نہ
کرنا۔ اس کی فکر مت کرو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کی آنے جانے والی کالوں کا ریکارڈ بھی تیار
ہوتا رہے۔“

”شاید آپ کے مخبر کی کال تھی۔“ سراج نے پوچھا۔
”کوئی اہم اطلاع؟“

”اہم ترین کہو۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”اس لڑکی کا نام اور پتہ بھی مل گیا ہے جس نے ماروی
کو فارم ہاؤس جانے کے لیے بک کیا تھا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہ لڑکی شرافت سے زبان کھول دے گی؟“

”تم بھول رہے ہو سراج، میں نے تم سے شیلا ورما کے بیٹی پارلر کی توڑ پھوڑ کے سلسلے میں
ایک اہم بات کہی تھی۔ آکٹوپس اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا عادی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں
نے شبیم کے اغواء کے امکانات کی بات بھی کی تھی مگر شبیم کے بجائے شاید روشنا کو کسی وجہ سے اغواء کر
لیا گیا اور اب..... اب ضروری ہو گیا کہ میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی پالیسی
کو اپنالوں۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے بات جاری رکھی۔ ”اب جو لڑکی ماروی کے حوالے سے
سامنے آئی ہے وہ ہمارے لیے پہلی سیزمی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔“

”میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ آپ کے آکٹوپس کے لیے فارم ہاؤس بہترین پناہ ہو سکتی
ہے۔“

جواب میں اورنگ زیب نے بڑی اپنائیت سے ہاتھ بڑھا کر سراج کے شانے چھتھپانے پر اکتفا کیا۔



سکندر علی شاہ مریدوں سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں آیا تو اس کے چہرے سے معصومیت، سادگی اور بردباری کا وہ طبع اتر گیا جو پیری مویدی کے دوران وہ دنیا دکھاوے کے لیے چڑھائے رکھتا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں جاوہ و جلال کی سرخی اترنے لگی تھی۔ کچھ دیر وہ کسی گہری سوچ میں غرق رہا پھر اس نے ریسپور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔ اس دوران بھی اس کے ذہن میں فارم ہاؤس کے اس چوکیدار کا خیال کلبلا رہا تھا جس نے ماروی کو بے عزت کرنے کا اقرار نامہ لکھ کر خودکشی کر لی تھی۔ اس کے حکم سے چوکیدار کی لاش کو خاموشی سے دفن دیا گیا تھا لیکن وہ اپنے ایک ایک ملازم سے واقف تھا۔ مرنے والا نمک حلال اور بے داغ کردار کا مالک تھا پھر..... اس نے گس کے اشارے پر اقرار جرم کی تحریر چھوڑ کر خودکشی کر لی تھی؟

”ہیلو۔“ دوسری جانب سے کسی کی بھاری اور کھردری آواز سنائی دی۔ ”کون بول رہا ہے؟“
”تمہارا ناجائز باپ۔“ سکندر علی شاہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ غرا کر کہا۔ ”نچلے سروں میں بات کیا کرورنہ.....“

”سوری سر لیکن آپ کا نمبر.....“
”کام کی بات کرو۔“ سکندر علی شاہ نے جھڑک کر کہا۔ ”تو جانتا ہے کہ میں نمبر بدلتا رہتا ہوں۔“

”حکم دیں مالک۔“
”ماروی کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“
”پولیس کے بھاڑو سے ملاقات کے بعد ابھی تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلی۔ میں نے ایک بندہ اس پر لگا دیا ہے۔ آپ کی دی ہوئی رقم بھی اس کو پہنچا دی گئی ہے۔“

”دوسری پر بھی نظر رکھنا۔“ سکندر علی شاہ نے پیشانی بریل ڈال کر حکم دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ جس کو توڑنے بھڑوے کے بجائے بھاڑو کہا ہے وہ اس سے بھی ملنے کی کوشش کرے۔“

”ایک بات میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں مالک۔“
”جلدی بھونک ڈال۔ میرے پاس وقت کم ہی ہوتا ہے۔“

”آپ صرف اشارہ کر دیں، ہم اس خطرے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے جو آپ کا راستہ کاٹنے کی غلطی بار بار کرتا ہے۔“
”نہیں۔“ سکندر علی شاہ نے حقارت سے کہا۔

”شکاری کتوں کا پورا غول ہوتا ہے۔ ایک کو گولی مار دی جائے تو اس کے دوسرے ساتھی بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔“

”پھر جیسا آپ کہیں۔“
”جتنا کہا گیا ہے اسی کا دھیان رکھنا۔ میں غفلت برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ سکندر علی شاہ نے سلسلہ منقطع کیا پھر دوسرے فون کا ریسپور اٹھا کر اس نے دلربا کے نمبر ڈائل کیے۔
”زہے نصیب۔“ دوسری جانب سے کال خود دلربا نے وصول کی تھی۔ ”آج آپ نے خود سے کال کیا ہے میرے لائق کوئی خدمت؟“
”تم نے ماروی کو ٹٹولنے کی کوشش کی تھی؟“ سکندر علی شاہ نے سنجیدگی برقرار رکھی۔

”جو لڑکیاں میری فہرست میں ہوں میں ان سے غافل نہیں ہوتی۔“ دلربا نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ایس پی اورنگ زیب نے اسے ہر طرح ٹٹولنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے میرے بارے میں زبان نہیں کھولی۔ آئندہ بھی ایسی غلطی نہیں کرے گی۔“

”فارم ہاؤس جانے کے سلسلے میں اس نے کوئی نہ کوئی وجہ تو بیان کی ہوگی؟“
”اس سلسلے میں بھی ماروی نے بڑی جرأت سے کام لیا، اس نے کھل کر اپنے گھریلو حالات اور کسی ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کی خاطر یہ اقرار کر لیا کہ وہ مجبور ہو کر کال گرل بن گئی ہے۔ فارم ہاؤس جانے کے سلسلے میں بھی اس نے دور اندیشی سے کام لیا ہے۔ ایس پی کو یہی بیان دیا ہے کہ ایک درمیانی آدمی اسے ساتھ لے گیا تھا جس نے اسے فارم ہاؤس پر چھوڑ دیا تھا۔ وہاں اسے رات کے اندھیرے میں کس نے لوٹا۔ وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھ سکی۔ دوسری صبح وہی درمیانی آدمی اسے.....“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ سکندر علی شاہ کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔ ”کیا اس گھاگ..... نے ماروی کی فرضی کہانی آسانی سے ہضم کر لی ہوگی؟“

”میں یقین سے کہہ نہیں سکتی لیکن آپ کو کس بات کی پریشانی ہے؟“
”دلربا.....“ سکندر علی شاہ کے لہجے میں پہلی بارتناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ”فارم ہاؤس کے حوالے سے پولیس کے ذہن میں میرا نام بھی ضرور ابھرا ہوگا اور میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ پولیس میری حویلی تک آئے۔“

”میں سمجھ رہی ہوں لیکن فارم ہاؤس میں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری مجھ پر یا ماروی پر عائد نہیں ہوتی۔“

”جانتا ہوں لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔“ سکندر علی شاہ نے بہ دستور خشک لہجے میں کہا۔ پولیس کے چھوٹے موٹے ایس پی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی نہ کسی ذریعے سے ایس پی اپنے شکاری کتوں کی مدد سے تم تک بھی پہنچ جائے۔“

”اگر وہ آتا ہے تو آنے دو۔“ بے پروائی سے جواب دیا گیا۔ ”میری رسائی بھی کچھ ایسے لوگوں تک ہے جن کا نام سن کر ہی ایس پی کو بھی پسینا آ جائے گا۔“

”قبل از وقت کسی خوش فہمی کا شکار ہونے کے بجائے میری بات غور سے سنو۔ تم سرے سے اس بات کو قبول کرنے سے منکر ہو جانا کہ تم ماروی نام کی کسی لڑکی سے واقف ہو۔ باقی حالات میں

سنبھال لوں گا۔ ایک اہم بات اور نوٹ کرلو، دوبارہ جب تک میں نہ کہوں تم میرے کسی نمبر پر کال کرنے کی غلطی بھی نہ کرنا۔“ سکندر علی شاہ نے سر دلچے میں ہدایت دی پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔
دربار سے گفتگو کے بعد پانچ سات منٹ تک وہ کسی سوچ میں ڈوبا رہا پھر دوسرے فون سیٹ کا ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

لیاقت حسین نے کچھ دن آرام کرنے کے بعد دوبارہ کام سنبھال لیا تھا۔ اس وقت وہ سیٹھ عثمان کے کمرے میں بیٹھا دفتری امور پر گفتگو کر رہا تھا جب انٹر کام پر کٹنل ملا۔ سیٹھ عثمان نے ریسیور اٹھا کر سیکرٹری کی بات سنی پھر ادا کے کہہ کر ریسیور اٹھا دیا۔
”خدا کا شکر ہے لیاقت حسین کے ہمارے مارٹل کے ایکسپورٹ کا کام روز بہ روز ترقی کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں تمہارے والد سے بھی گفتگو ہوتی رہی ہے۔ وہ بھی خوش ہیں۔“
”بابا مجھ سے بار بار ایک ہی بات کہتے ہیں۔“ لیاقت حسین نے پہلو بدل کر کہا۔ ”ففتی ففتی کے معاملے میں دیانت سے کام لینا، ابھی تک انہیں اس بات کا علم نہیں ہوا کہ میں نے آپ کے کہنے سے اپنی فرم کا اکاؤنٹ بھی کھول لیا ہے لیکن کب تک..... بابا جب بھی آئے ان کا نزلہ مجھ پر ہی گرے گا۔“

”فکر مت کرو۔“ سیٹھ عثمان نے مسکرا کر کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ سرفراز خان کے ساتھ سردار کا دم چھلا بھی لگا ہوا ہے۔ انہیں اپنی پگ کے شیلے کو اونچا رکھنے کی فکر بھی لاحق رہتی ہے تم فکر مت کرو۔ وہ جب بھی آئے میں انہیں سنبھال لوں گا۔ تمہارے اوپر نزلہ نہیں گرنے دوں گا۔“
”میری غیر حاضری میں کچھ نئے آرڈر بھی جمع ہو گئے ہیں۔“ لیاقت حسین نے موضوع بدلا۔ ”ان کی ڈیوری بھی پہلی فرصت میں کرنی ضروری ہے۔ کاروبار میں وقت کی پابندی بھی اہمیت رکھتی ہے۔“

”فرحین اب کیسی ہے؟“

”آپ لوگوں کا احسان اور اوپر والے کا کرم ہے۔“

بیگم صاحبہ نے اسے میری کی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

”تم اس وقت کیا کام کر رہے تھے؟“

”نئے آرڈر کی فائل دیکھ رہا تھا۔“

”ضرور دیکھ لو۔ ویسے تمہاری عدم موجودگی میں وقتی طور پر دفتر کا ایک اور کارندہ سب کچھ دیکھ رہا تھا بہر حال اس قوت تمہیں راحیلہ نے کسی کام سے یاد کیا ہے۔ یہاں سے اٹھ کر ان سے ضرور مل لینا۔“

تقریباً چالیس منٹ بعد لیاقت حسین، راحیلہ بیگم کے سامنے موجود تھا، راحیلہ بیگم کے ساتھ دوسرے صوفے پر بیٹھی تھی۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ راحیلہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے دریافت کیا۔
”خدا کا شکر ہے ہٹا کٹا آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔“ لیاقت حسین نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”پولیس والوں نے جو ڈیل کرائی وہ ان کی دوسری تھی، میں حق پر تھا اس لیے میں نے غم پالنے کی غلطی بھی نہیں کی۔“

”جانتی ہوں لیکن تمہیں ابھی کچھ دنوں اور آرام کی ضرورت تھی۔“

اس بار لیاقت حسین نے فرحین کی طرف دیکھا اس لیے کہ اس نے بھی آرام کا مشورہ دیا تھا۔
”نہیں لیاقت حسین۔“ راحیلہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

”فرحین نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تمہاری باعزت رہائی کی خبر سن کر یہ تو اپنا غم بھول کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔“

”رہنے دیں بیگم صاحب۔“ فرحین نے لیاقت حسین کو چھیننے کی خاطر راحیلہ بیگم کے اور قریب ہو کر کہا۔ ”بیوی کتنے ہی جتن کر لے لیکن مرد اس پر یقین نہیں کرتا، ہمیشہ اپنی مونچھ پر تاؤ دیتا رہتا ہے۔“

”آپ نے مجھے کسی کام سے بلایا تھا؟“ لیاقت حسین نے فرحین کے جملے کو نظر انداز کر کے راحیلہ بیگم سے دریافت کیا۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ اب تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟“ راحیلہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے سوال کیا۔
”جب آپ مجھے بھائی سمجھتی ہیں تو میں بھی آپ کو بہن ہی کہنے کی جرأت کروں گا۔“ لیاقت حسین نے عقیدت مندی سے جواب دیا۔

”یہ بھی بتا دے کہ چھوٹی بہن سمجھتا ہے یا بڑی بہن؟“
فرحین نے درمیان میں لقمہ دیا تو لیاقت حسین نے غور سے دیکھا پھر براہ راست راحیلہ بیگم کو مخاطب کیا۔

”آپ نے اسے بہت زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے۔ پہلے اسے بولنا نہیں آتا تھا، اب اس کی زبان بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہے۔“

”میں نے اس وقت تمہیں عثمان کے کہنے پر بلایا ہے۔“

راحیلہ بیگم نے کچھ توقف سے کہا۔ ”وہ اگر کوئی بات کہتے تو تم شاید اسے ماننے سے گریز کرتے۔ اس لیے یہ ذمے داری بھی مجھے ادا کرنی ہے۔“

”آپ حکم دیں میں انکار کی جرأت نہیں کروں گا۔“

”جس راستے پر خطرے لاحق ہوں اسے چھوڑ دینا چاہیے لیاقت حسین۔“ راحیلہ بیگم نے وضاحت کی۔ ”جو دشمن ایک بار ناکام ہو گیا ہو وہ دوسری بار اپنی غلطیوں کو نہیں دہرائے گا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ لیاقت حسین نے کسماتے ہوئے جواب دیا۔ ”دشمن تو دشمن ہی ہوتا ہے۔ اس سے دوستی کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی لیکن اس وقت.....“

”وقت ہی سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ایک بار ہاتھ سے نکل جائے تو پلٹ کر واپس نہیں آتا۔“ راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”عثمان کے علاوہ میرا بھی یہی مشورہ ہے کہ اب سامان کی ڈلیوری جہاز راں کھینچی کو کرنے کی خاطر تم بندرگاہ نہیں جاؤ گے۔ یہ ذمے داری ہم نے ایک دوسرے ڈرائیور کو سونپ دی ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“

”ذمہ اے میری بزدلی کا نام بھی دے سکتے ہیں لیکن میں آپ کے حکم سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔“ لیاقت حسین نے سر جھکا کر جواب دیا پھر خاموشی سے اٹھ کر واپس چلا گیا۔



لوچن اس وقت جس حلیے میں تھا اس میں بھی وہ چائینز ہی لگ رہا تھا لیکن ہوٹل سے روانہ ہوتے وقت جب اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا تو خود ذاتی طور پر بھی اپنے آپ کو لوچن کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکا تھا۔ کلب جانے کی خاطر اس نے ریٹ اے کار کی گاڑی استعمال کی تھی۔ ہوٹل کے منیجر کی سفارش کے بعد اسے گاڑی کے حصول میں بھی کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ تھری پیس سوٹ میں بھی کسی شخصیت نے کار کے ڈرائیور کو بھی مرعوب کرنے میں خاصا نمایاں کردار ادا کیا تھا لیکن رین بولکلب کے داخلی دروازے پر اسے بہر حال رکنا پڑا۔ آن ڈیوٹی شخص نے اسے بڑے مہذب انداز میں کہا تھا۔

”یہاں ممبران کے علاوہ کسی اور کو اندر جانے کی.....“

”نان سینس۔“ لوچن نے جھلا کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔ ”کیا تمہارے کلب میں غیر ملکیتوں کے ساتھ بھی شرافت کا سلوک نہیں ہوتا؟“

”سوری سر۔“ آپ نے میری بات نہیں سنی۔“ لوچن کو روکنے والے نے وضاحت کی۔ ”آپ عاضی طور پر گیٹ کارڈ حاصل کر سکتے ہیں۔ کارڈ کے حصول کے لیے آپ کو کلب کی ریسپشن سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔“

پھر کلب کے اسی ملازم نے ماریا تک اس کی رہنمائی بھی کر دی تھی۔ لوچن کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے تاثرات بہ دستور قائم تھے۔

”ہیلو سر۔“ ماریا نے ہونٹوں پر پروفیشنل مسکراہٹ سجا کر لوچن کو خوش آمدید کہا۔ ”اگر آپ کو کوئی زحمت ہوئی ہے تو ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔“

”نیور مائنڈ۔“ جواب میں لوچن نے بھی مسکرا کر کہا پھر عاضی ممبر شپ کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ فوری طور پر اس نے ایک کارزنر ٹیبل کا انتخاب کیا تھا جو دو سیٹ ہونے کی وجہ سے خالی تھی۔ اس وقت کلب میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اپنی نشست پر بیٹھا وہ ہال میں موجود ہتھتے ہوئے ممبران پر سرسری نظر ڈالتا رہا پھر کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کلب کے مختلف حصوں کا چکر لگانے کے بعد کورڈ سوئنگ پول کے اس گوشے تک آگیا جہاں کچھ ممبران پول کے اندر لطف اندوز ہو رہے تھے، کچھ دور دور رکھی ہوئی میزوں پر سر جوڑے پیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہاں اسے نگینہ بھی نظر آگئی جو ایک خوب

صورت لڑکی کے ساتھ کسی مشروب سے دل بہلا رہی تھی۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لباس کی تراش خراش سے اس کا تعلق کسی ماڈرن خاندان ہی سے لگتا تھا۔ چہرے کے خدو خال نے بھی اس کی خوب صورتی میں اضافہ کیا تھا۔ لوچن نے پہلی نظر میں اپنے تجربے کی روشنی میں لڑکی کے متعلق اس بات کا اندازہ بھی لگا لیا کہ ماڈرن ہونے کے باوجود بدکردار یا فلرٹ کرنے کی عادی نہیں تھی۔

لوچن نے اپنی جگہ رک کر دوسری میزوں کا جائزہ لیا پھر وہ قدم اٹھاتا ہوا سیدھا اسی میز پر جا کر بیٹھ گیا جہاں نگینہ اور لڑکی بیٹھی تھیں۔ دونوں ہی نے لوچن کو غور سے دیکھا پھر گفتگو کی پہل نگینہ نے کی۔

”آپ کی تعریف؟“ اس کے لہجے میں خفگی کے اظہار کے علاوہ برتری کا رکھ رکھاؤ بھی تھا۔

”پروفیسر چنگ لائی فارچون۔“ لوچن نے ادھر ادھر دیکھ کر مدہم لہجے میں کہا۔ ”میں یہاں کسی کے بلانے سے آیا تھا۔ اس نے بڑی منت کی تھی، ملنے کی..... فیس بھی منہ مانگی دی تھی لیکن..... شاید اس نے میرے ساتھ ایک بھونڈا مذاق کیا ہو مگر..... عنقریب اس کو سزا بھی ضرور ملے گی لائی فارچون کے خاندان کے کسی فرد کی زبان سے نکلے ہوئی کوئی بھی بات بھی غلط نہیں ہوتی۔“

”آپ.....“ لڑکی نے بڑی دلچسپی سے لوچن کو مخاطب کیا۔ ”آپ کا لائی فارچون سے کیا تعلق ہے؟ میں نے ان کے بارے میں سن رکھا ہے۔ انہیں شاید نوٹیل ایوارڈ بھی.....“

”نہیں۔“ لوچن نے حقارت سے جواب دیا۔

”مگر ریڈ قادر نے وہ انعام قبول نہیں کیا تھا۔“

”پلیز۔“ لڑکی نے بڑی اپنائیت سے درخواست کی۔ ”کیا آپ میرا ہاتھ دیکھ لیں گے؟“

”ہاتھ نہیں سویٹ گرل۔“ لوچن نے اس بار بزرگانہ انداز اختیار کیا۔ ”ہم چہرہ دیکھ کر ہی مستقبل میں جھانک لیتے ہیں۔“

”میرے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“ لڑکی کی دلچسپی بڑھنے لگی۔

”تم..... تم.....“ لوچن کی نظریں لڑکی کے چہرے پر منڈلانے لگیں پھر وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”خواب دیکھنا چھوڑ دو سویٹ گرل۔ اپنی مرضی کے بجائے اپنے پیرئس کا کہا قبول کر لیا کرو او..... فرینڈز سرکل بڑھانے میں احتیاط سے کام لو ورنہ.....“

”پروفیسر۔“ نگینہ نے فوری طور پر لوچن کی توجہ اپنی جانب تبدیل کرانے کی کوشش کی۔ ”کیا آپ میرے لیے بھی کچھ وقت نکال سکیں گے؟ میں آپ کو ایڈوانس دینے کو تیار ہوں۔“

لوچن نے نظریں گھا کر نگینہ کے چہرے پر نظر ڈالی پھر اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے جیب سے موبائل نکال کر جگا کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری جانب سے جگا کی آواز سن کر اس نے جملائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم نے جس کی سفارش کی تھی وہ نہیں آیا۔ دوبارہ کسی کو رکھنا نہ کرنا۔“

اس کے ذہن میں کئی سوالات بھی ابھرے تھے۔ لوچن جگا کو دیکھ کر اٹھا تو نگینہ بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر آ کر جگانے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ لوچن، نگینہ کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تو جگانے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے پروفیسر؟“

”کسی ایسی جگہ جہاں کوئی اور مجھے ڈسٹرب نہ کر سکے۔ مجھے اس لڑکی کو تفصیل سے اس کے فیوچر کے بارے میں سب کچھ بتانا ہے۔“ لوچن نے جگا سے اس بار بھی ایسے انداز میں کہا جیسے وہ اس کے خاص مداحوں میں سے ہے پھر اس نے نگینہ کا ہاتھ بے تکلفی سے تھام لیا، نگینہ بھی مستقبل کا حال جاننے کے شوق میں لوچن کے اور قریب ہو گئی۔ چند لمحوں لوچن نگینہ کے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے ہاتھ کی انگوٹھی کو نگینہ کے بازو پر رکھ کر اس کا سیاہ رنگ کا تعین کیا پھر آہستہ سے دبایا۔ نگینہ کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے اس کے بازو میں کسی چیونٹی نے کاٹ لیا ہو، بس ایک لمبے لمبے کے چہرے پر تکلیف کا تاثر ابھرا پھر دوبارہ مسکرانے لگی لیکن یہ مسکراہٹ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ جچمن کے احساس کے تیس سیکنڈ بعد وہ شدید غنودگی کی کیفیت سے دوچار ہو کر لوچن پر ڈھلک گئی۔ لوچن کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری وہ بھی اس کی جیت کی علامت تھی۔ اس نے نگینہ کو جگہ دے کر نشست پر ہی گڈمڈ کر دیا پھر اپنی اصلی آواز میں جگا سے بولا۔

”تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے ایک ساتھ ہی بگ باسٹرڈ کی کٹھی کو بموں سے اڑا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا تھا۔ یہ خوب صورت ناگن اسی قرض کی دوسری قسط ہے جو ہمیں سکندر علی شاہ فراڈیے کو ادا کرنی ہے۔“

”نہیں سمجھا؟“ جگانے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا۔ ”سکندر علی شاہ کا شیخ حامد سے کیا تعلق ہے؟“

”میری پھٹی حس کہتی ہے کہ سکندر علی شاہ کسی نہ کسی زاویے سے بگ باسٹرڈ تک پہنچنے کے لیے ایک چور راستہ ثابت ہوگا۔“

جگا کی نگاہوں میں ایک چمک سی ابھری کچھ توقف سے بولا۔

”دوسری قسط کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہوگا؟“ جگانے اپنا جملہ ادا کرنے کے ساتھ ہی گاڑی کا رخ بھی ساحلی علاقے میں موجود اپنے ایک محفوظ ٹھکانے کی طرف موڑ دیا تھا۔

”تمہاری طرح میں بھی خوبصورت عورتوں کو مہلک جراثیم سمجھ کر ان سے دور ہی رہنے کا عادی ہوں۔“ لوچن نے بڑی مہارت اور پھرتی سے خود کو اگلی نشست تک پہنچانے کے بعد بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ایس پی کا خیال اب مفروضہ نہیں رہا۔ آکٹوپس مرکز دوبارہ زندہ ہو گیا تو کہیں نہ کہیں ہماری نظروں سے چھپا سانس ضرور لے رہا ہوگا۔ تمہارے فرنیچر مارٹ کی تباہی، ڈی ایس پی لودھی کی موت، ایس پی کے لکڑی فلیٹ کا کباڑ خانہ ہونا، کنول کا کڈنیپ، اس کی ماں کی موت، سیٹھ تم علی

لے بعد دارا کی سز کا اغوا اور..... اور..... انڈر ورلڈ سے تعلق رکھنے والے میرے دو فرینڈز ہاشم اور

”تم.....؟“ جگانے محتاط لہجے میں پوچھا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”رین بولکب ہی آنے کو کہا تھا اس نے۔ میں یہیں جھک مار رہا ہوں۔ اوکے، سوئمنگ پول پر۔“

”کوئی خطرہ؟“ جگانے دریافت کیا۔

”رہسپشن پر صرف پروفیسر چنگ لائی کا حوالہ دینا۔ وہ تمہیں مجھ تک پہنچا دیں گے۔“ لوچن نے جواب دینے کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا پھر اس نے کچھ توقف سے نگینہ کو مخاطب کیا۔

”تمہارا پاسٹ، پریزنٹ اور فیوچر سب میری نظروں میں ہے۔ تم کیا جانا پسند کرو گی؟ جو گزر گیا یا جو آنے والا ہے؟“

”آپ اس وقت کہاں جا میں گئے؟“ نگینہ نے کسمسا کر کہا۔؟؟ کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں؟“

شکار کو خود جال میں پھنستا دیکھ کر لوچن دل ہی دل میں مسکرا دیا لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کچھ سوچ کر بولا۔ ”میں بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا اور تم..... تمہارے ساتھ دوسرا مسئلہ ہے۔“

”ڈونٹ ڈری پروفیسر۔“ نگینہ نے بات سمجھ کر کہا۔

”میں ڈرائیور کو گھر جانے کا کہہ دوں گی۔ آپ سے فارغ ہو کر اسے دوبارہ کال کر لوں گی۔“

”تمہاری واپسی کا بندوبست کر دوں گا لیکن.....“ لوچن نے لڑکی کی طرف دیکھ کر ڈھکے چھپے انداز میں کہا۔ ”کچھ شکی لوگ بلاوجہ بھی چھان بین کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔“

”میں سمجھ رہی ہوں مگر اس کے باوجود میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“ نگینہ نے اشارہ سمجھ کر کہا پھر وہ موبائل پر ڈرائیور سے رابطہ قائم کرنے لگی۔

”پروفیسر۔“ لڑکی نے دوبارہ لوچن کو بڑی معصومیت سے مخاطب کیا۔ ”میں بھی آپ سے اطمینان سے ملاقات کرنے کی خواہش مند ہوں۔“

”میں نے تمہیں سویٹ گرل کہا ہے تو ذہن میں بھی محفوظ رکھوں گا۔ فی الحال ایک ضروری مشورہ دوں گا۔ جو ہے اسی پر قناعت کرو۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ختم کر دو ورنہ جو ہے وہ بھی نہ ہے گا۔“

”مجھے آپ سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔“ لڑکی نے بڑی اپنائیت سے درخواست کی۔ ”پلیز..... پروفیسر۔“

”پھر ایسا کرو، مجھے اپنا موبائل نمبر دے دو جب بھی فرصت ہوئی تمہیں کال کر لوں گا۔“

”اوہ..... اوہ.....“ ٹھنکس پروفیسر۔“ لڑکی نے اپنا کارڈ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”یو آر گریٹ۔“

پندرہ منٹ بعد جگا بھی سامنے آ گیا۔ وہ بھی میک اپ میں تھا۔ لوچن کو نگینہ کے ساتھ دیکھ کر

کوسیدھے شانے سے لٹکا کر وہ اوپر جانے والی سیزھیاں طے کرنے لگا۔ تین منزلیں طے کرنے کے بعد اس نے لڑکی جیکے لیٹر بکس نما ڈبے سے چھت پر جانے والے پھانک کی چابی نکالی۔ بے پروائی سے پہلے اس نے پھانک کو اندر سے بند کر کے اس کی کنڈی بھی لگا دی تھی۔

عمارت کی کشادہ چھت پر موبائل کمپنیز کے دو ٹاور موجود تھے لیکن اس نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی۔ قدم اٹھاتا پھرا پٹ وال (para pet wall) کے اس حصے کی طرف آگیا جو پراسٹور والی مرکزی شاہراہ پر تھا۔ روڈ کی دوسری جانب بھی تجارتی اور رہائشی فلیٹس کی عمارتیں موجود تھیں۔ اس کی نظر ایک عمارت کے رہائشی فلیٹ پر مرکوز ہو گئی جہاں دودھیاناٹ بلب روشن تھا۔ بالکونی یا سامنے کے حصے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحے وہ غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے پلٹ کر ایک نظر چھت کے پھانک کی سمت دیکھا اس کے بعد دونوں گھنٹوں کے بل چھت پر بیٹھ کر اس نے چرمی تھیلا کھولا اور دو مارمنی رائفل کے مختلف ٹکڑے نکال کر جوڑنے لگا۔ سائمنسر والی رائفل کو اصل شکل میں لانے میں اسے یہ مشکل چار پانچ منٹ لگے تھے۔ دوبارہ کھڑے ہو کر اس نے رائفل کے جیمبر میں تین گولیاں ڈالیں پھر مطلوبہ فلیٹ پر نظر جما کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ اتنی بلندی سے چلائی گئی گولیوں کا شور بڑی حد تک کھلی ہوا میں تحلیل ہو جائے گا نہ ہوتا تب بھی وہ کسی کے وہاں تک آنے سے پہلے ہی نکل سکتا تھا۔ سات منٹ گزر گئے اس فلیٹ کے خالی حصے کو گھورتے ہوئے کسی زہریلے ناگ کی طرح تملکا کر خود کلائی کے انداز میں کہا۔

”باسنڈ..... تو نے جو چال میرے ساتھ چلی تھی میں اس کا توڑ کر کے پھر آزاد فضا میں کھڑا ہوں لیکن تو اور تیرے ساتھ جو بھی ہو، اب میرے ہاتھوں نہیں بچیں گے۔ میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ پھر کوئی میرے اوپر ہاتھ ڈالنے کی بھول بھی نہیں کرے گا۔ فی الحال میں تجھے موت (م۔و۔ت) کے تین حروف کا پیغام تین گولیوں سے دے رہا ہوں۔ یہ بھی بات کی گواہی دیں گی کہ نامردوں کی طرح چھپ کر نہیں، لاکڑ کر تجھے موت کے گھاٹ اتاروں گا۔“

اپنے جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی اس مطلوبہ فلیٹ کے بند دروازے اور کھڑکیوں پر کسی ماہر نشانہ باز کی طرح تین فائر کیے۔ دوبارہ پھرتی سے بیٹھ کر اس نے سائمنسر لگی رائفل کو پھر مختلف ٹکڑوں میں منتقل کر کے چرمی تھیلے میں ڈالا اور نیچے جانے والے زینوں کی سمت تیر تیز قدم اٹھانے لگا۔

”اتنی جلدی فارغ ہو گئے؟“ چوکیدار نے پھر اسے دوستانہ انداز میں مخاطب کیا۔
”زیادہ بڑا فالت نہیں تھا۔“ اس نے شانے اچکا کر کہا پھر مورس میں بیٹھ کر ٹریفک کے بہاؤ کا ایک حصہ بن گیا۔

سڑک پر آنے کے بعد اس نے اس بات کا اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ بلندی پر کھلی چھت سے کئے گئے فائر کی سن گرنے سے پہلے تک نہیں پہنچی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ سوال بھی نہیں ابھرا کہ اس کی مورس کے حرکت میں آنے کے بعد کسی شخص نے سپراسٹور سے باہر آ کر اپنی وار سائیکل کس مقصد سے اشارت کی تھی۔

ڈوما کی پراسرار موت..... نہیں جگما مائی فرینڈ، نہیں..... میں نے جس کام کے لیے تمہیں انوائٹ کیا وہ تنہا بھی کر سکتا تھا لیکن میں..... میں کل واپس چلا جاؤں گا۔ تم کو اسی شہر میں زندگی گزارنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد بھی تم بگ باسنڈ کے سامنے سراٹھا کر چلو، جو لوگ وقت اور نزاکتوں کا خیال نہیں رکھتے وہ سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پینٹنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے، کوڑے کے ڈھیر سے کسی مطلوبہ چیز کو تلاش کرنے کی خاطر پورا ڈسٹ بن کھڑکھڑانا پڑتا ہے۔ ایک ڈسٹ بن بلیک شپ سکنڈر علی شاہ بھی ہے۔“

”تگینہ کا کیا کرو گے؟“ جگانے استفسار کیا۔

”اس کا ڈریس اتار کر کسی چیرٹی فنڈ میں دے دیں گے۔“ لوچن نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ ”فیکڈ ہاڈی کا گفٹ پیک بنا کر سکنڈر علی شاہ کو بھیج دیں گے۔ ایک دو ٹریپ کارڈز اور بھی ہیں، بگ باسنڈ کو سامنے لانے کی خاطر باری باری ان کو بھی استعمال کرنا پڑے گا۔“
”ایمن بی صاحب کا حکم ہوتا تو میں اس سے اپنا حساب کتاب پہلے ہی چلتا کر دیتا۔“ جگانے لوچن کا ہاتھ تھام کر غصے آواز میں کہا۔ ”مجھے اپنے سے الگ مت سمجھنا۔“
جواب میں لوچن نے بھی اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ تگینہ بچھلی نشست پر بے سدھ پڑی تھی۔



ورائٹی سپراسٹور کے ساتھ ہی وہ سیزھیاں بھی تھیں جو اسی عمارت کے رہائشی فلیٹس تک جاتی تھیں۔

رات کے دس کا عمل تھا جب ایک پرانی مورس سیزھیوں کے سامنے آ کر روک دی گئی۔ اس میں سے جو شخص اتر اس نے ملیشیا ٹکڑے کی پتلون اور ڈھیلی ڈھالی فل آستین کی بش شرٹ پہن رکھی تھی۔ گاڑی سے اتر کر اس نے بچھلی نشست سے چڑے کا پرانا بیگ نکالا پھر وہ سیزھیوں کے قریب پہنچا تو چوکیدار نے محض اس کے چلنے کی وجہ سے دریافت کر لیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ کس سے ملنا ہے؟ ورنہ چھ لکڑی فلیٹس کے کمینوں اور آنے جانے والوں کی تعداد اتنی تھی کہ اس نے شاذو نادری کسی کو روکنے ٹوکنے کی غلطی کی تھی۔

”چھت پر نشریاتی کمپنی کا ایک سگنل ٹاور کچھ خراب ہو گیا ہے کسی کی شکایت پر ہی آیا ہوں۔“ آنے والے نے جھلا کر کہا۔ ”ورنہ اس وقت میں بھی گھر پر پڑا آرام کر رہا ہوتا۔“
”ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے میرے یار۔“ چوکیدار ہنس کر بولا۔ ”دور روز سے نائٹ شفٹ بھگتا رہا ہوں۔ میں چلوں تمہارے ساتھ؟“

”تم اپنی ڈیوٹی دو، میں جانتا ہوں کہ چھت پر جانے کے لئے لوہے کا پھانک لگا ہے۔ اس کی چابی بھی باہر لکے کنڈی کے ڈبے میں رکھی ہوتی ہے۔“
چوکی دار نے پھر مسکرا کر کچھ کہا لیکن آنے والے نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ چرمی تھیلے

افضل خان اس وقت اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا جبرو کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ شبنم کے اصرار پر اس نے جبرو کو جان سے نہیں مارا تھا۔ کسی اعتبار سے ناکارہ ضرور کر دیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جبرو کا تعلق بھی انہی زر خرید پالتوں کتوں میں سے تھا جو کسی نہ کسی زاویے سے شیخ حامد کے لیے خدمت انجام دیتے تھے۔ کنول کے انگوٹھ اور پریس میں اس کا بیان آ جانے کے بعد یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ شیخ حامد مرانہیں، زندہ تھا۔

جبرو کا تعلق جس خطے سے تھا وہاں کے بیشتر لوگ پیسوں کے عوض بک جانے کے عادی تھے۔ ہو سکتا تھا کہ ایک خوبصورت حسینہ کی موجودگی میں جبرو بھی اپنی بے عزتی برداشت نہ کرتا۔ بنگالی پاڑے کے لفتکوں سے بھی اس کا پرانا پارا نہ تھا۔ وہ ان لفتکوں اور اچکوں کے ساتھ مل کر کوئی جوابی کارروائی بھی کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھی بھی کبھی کبھل کر سامنے آنے کی غلطی نہ کرتے۔ چھپ کر بزدلانہ وار پر ہی اکتفا کرتے تھے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ افضل خان یہ بھی جانتا تھا کہ بنگالی پاڑے کے لفتکے بھی اس کی برتری کو تسلیم کرتے تھے مگر شیخ حامد سے علیحدگی کے بعد اس کی سوچ بھی بدل سکتی تھی۔

خاصی دیر تک وہ حالات پر غور کرتا رہا۔ اسے خود سے زیادہ شبنم کی فکر لاحق تھی۔ جبرو اگر کسی انتقامی کارروائی کی جرات کرتا تو وہ بھی براہ راست افضل خان سے مقابلہ کرنے کے بجائے شبنم کو ہدف بنانے پر غور کرتا۔ اس نکتے کے بار بار ذہن میں ابھرنے کے بعد افضل خان نے کچھ سوچ کر موبائل پر کسی کے نمبر ملانے شروع کر دیے۔

”اس وقت کیسے یاد کیا؟“ رابطہ قائم ہونے پر دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”جبرو کی کیا خبر ہے؟“

”وہ جو جھمراٹا کو لایا تھا اس نے جبرو کو خاموشی سے ایک خیراتی اسپتال میں داخل کر دیا ہے اس کا خیال ہے کہ جبرو کی ہڈیوں کی مائش کرنے والے بھی شاید سندھ بن سے آ گئے ہیں۔“

”جبرو نے خود کیا کہا؟“ افضل خان نے اسے کریدا۔

”اس نے بھی زبان بند کر رکھی ہے۔ جھمراٹا بھی ابھی تک چڑیا کی طرح سہمی بیٹھی ہے۔ اس کو چھو منتر کر کے لانے والے نے بھی اسے فوری طور پر کسی دوسری محفوظ جگہ پہنچا دیا ہے۔“

”ایک کام کرو گے؟“ افضل خان نے سرد لہجے میں بات جاری رکھی۔ ”جبرو کو کسی بھی ذریعے سے یہ پیغام پہنچا دو کہ اگر اس کی زبان سے میرا نام نکلا تو میں کتوں ہی کی موت ماروں گا اسے۔“

”تمہاری خاطر یہ بھی کوشش کروں گا لیکن ادھر سب بھاڑے کے ٹٹو ہیں اور میں خود یہ کام

.....

”سمجھ رہا ہوں کل تک تمہیں کسی نہ کسی ذریعے سے کچھ رقم بھی مل جائے گی۔“

”اور کوئی خدمت؟“

”جبرو اسپتال سے فارغ ہو کر کہاں آتا ہے، کہاں جاتا ہے اس کی بھی خبر رکھتا۔“ افضل نے رابطہ منقطع کر دیا پھر دوبارہ بستر پر لیٹنے کا ارادہ مکمل نہ کر سکا۔ ہانگنی کی سمت سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر اس نے نیکے کے نیچے سے اپنا پستول نکال لیا محتاط قدم سے دروازے تک پہنچا تھا کہ شبنم کی سہمی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”تم کہاں ہو افضل خان؟ یہ آواز کیسی تھی؟“

”سامنے آنے کی غلطی نہ کرنا، میں سوچ بند کر کے تمہاری طرف آتا ہوں۔“

دس منٹ بعد وہ لائٹ دوبارہ آن کرنے کے بعد شبنم کے کمرے میں گیا۔ وہ دروازے کے قریب ہی سہمی کھڑی تھی۔

”فکر مت کرو۔“ افضل خان نے سچویشن سمجھنے کے بعد دہلی زبان سے کہا۔ ”ہمارے کسی دشمن نے فوری طور پر ہمیشہ کی طرح اپنی بزدلی کا ثبوت دیا ہے۔ بالکوئی کے دروازے اور کھڑکیوں کے شیشوں کو کہیں سے فائر کر کے توڑا گیا ہے۔“

”یہ..... ہمارے لیے کسی آئندہ پیش آنے والے بڑے خطرے کی وارننگ بھی ہو سکتی ہے۔“ شبنم نے افضل خان سے استفساد کیا۔ ”وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”آرام سے سو جاؤ۔ اس بات پر صبح بھی غور کیا جاسکتا ہے۔“

”تم ایک اہم بات بھول رہے ہو۔ پولیس کے سادہ لباس والوں کے علاوہ ملٹری انٹیلی جنس والے بھی ہماری نگرانی پر مامور ہیں کیا فائرنگ کرنے والا ان کی نظروں میں نہیں آیا ہوگا۔“

”اوہ.....!“ افضل خان چونکا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں وقت ضائع کیے بغیر اس حادثے کی اطلاع مسٹر سراج کو دینی چاہیے۔“ جملہ پورا کرنے کے دوران ہی اس نے فون بک سے سراج کے نمبر نکال کر کال کا بٹن دبا دیا۔ دوسری گھنٹی کے بعد دوسری جانب سے سراج کی آواز سنائی دی۔

”کوئی خاص بات؟“

جواب میں افضل خان نے شیشہ ٹوٹنے والے واردات کے ساتھ اس شبہ کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ ممکن ہے فائرنگ سامنے والی عمارت کے کسی فلیٹ سی کی گئی ہو۔

”کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ میں ملحقہ تھانے کے آن ڈیوٹی آفیسر سے رابطہ کرتا ہوں۔“

اس رات افضل خان اور شبنم پولیس کی ضروری چھان بین کی وجہ سے ایک پل بھی سکون کا سانس نہ لے سکے۔

سکندر علی شاہ کسی بھوکے درندے کے مانند اپنی اسٹیدی میں ٹہل رہا تھا شام کے چھ بجے سے وہ اب تک ٹکینہ کو ہر ممکن جگہ ٹیلی فون کر کے تلاش کر چکا تھا۔ جواب ہر جگہ سے نفی میں ملتا تھا۔ خود ٹکینہ کا ذاتی نمبر بار بار ایک ہی جواب دے رہا تھا کہ وہ بند ہے۔

گنہیہ چار بجے گھر سے نکلی تھی اسے کچھ ضروری شاپنگ پر جانا تھا۔ اس روز سے قبل وہ ہمیشہ ماگنی ہوئی مہلت سے پہلے ہی آجانے کی عادی تھی لیکن اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔

سکندر علی شاہ کے ذہن میں گنہیہ کے ماضی کے حوالے سے کئی منفی خیالات بھی ابھرے لیکن اس نے ان سب کو یکے بعد دیگرے رد کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ ایک بار سکندر علی شاہ سے وابستہ ہو جانے کے بعد وہ جال میں آئے ہوئے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا تو سکتی تھی لیکن جال تو زکراڑ جانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ یہی خود اعتمادی اس وقت اسے اور الجھار ہی تھی جب اسے ڈرائیور کا خیال آیا جو اپنے بیان کے مطابق گنہیہ کو رین بولکلب میں چھوڑ کر ٹھیک پانچ بجے واپس آ گیا تھا۔ رین بولکلب کے حوالے سے سکندر علی شاہ کا ذہن پھر الجھ گیا تھا۔

”شاپنگ کا بہانہ کر کے وہ رین بولکلب کیا کرنے گئی تھی؟ اس نے ڈرائیور کو واپسی کا حکم دے کر حویلی واپس جانے کو کیوں کہا تھا؟“

سکندر علی شاہ نے ڈرائیور کو دوبارہ طلب کیا۔ وہ سامنے آیا تو اس کے چہرے پر بھی خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ہاتھ باندھے کھڑا تھا جب سکندر علی شاہ نے اسے کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔

”کمبخت تو رین بولکلب کیوں گیا تھا؟“

”بب..... بب..... بیگم صاحبہ کا حکم تھا مالک۔“

ڈرائیور نے ہٹکا کر صفائی پیش کی تو خود سکندر علی شاہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”ٹھیک ہے لیکن تو واپس کیوں آ گیا؟ میں نے حکم دیا تھا کہ ہمیشہ گنہیہ کے ساتھ رہنا۔“

”ان کے ساتھ کلب تک گیا تھا لیکن م..... م..... میں اندر تو نہیں جاسکتا تھا۔“

”باہر تو رک سکتا تھا؟“ سکندر علی شاہ نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

”معاف کر دیں مالک۔ ل..... لیکن آپ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ بیگم صاحبہ کے حکم پر انکار نہ کروں ورنہ آپ کھال کھینچ کر بھوسا بھر دیں گے۔“

”گنہیہ کے ساتھ اور کون تھا؟“

”وہ..... وہ کلب تک گاڑی میں اکیلی تھیں مالک۔“

ڈرائیور نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔

”راستے میں اس نے کسی سے موبائل پر بات کی تھی؟“

”نہیں مالک۔“

”پھر..... وہ اب تک کہاں مری ہوئی ہے؟ سکندر علی شاہ نے پھر بہک کر ڈرائیور پر غصہ اتارنے کی کوشش کی۔

ڈرائیور کیا جواب دیتا۔ سہا کھڑا تھا جب سکندر علی شاہ کے موبائل پر گنٹل ملا، گنہیہ کے نمبر دیکھ کر

اس کی پیشانی پر نظر آنے والی سلوٹیں بھی دو چند ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو واپس جانے کا حکم دیا پھر غرا کر سوال کیا۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”جس کے بارے میں تم سوال کر رہے ہو وہ اس وقت پوری ہوش میں نہیں ہے۔“ دوسری جانب سے مردانہ آواز سن کر سکندر علی شاہ چونکا۔

”کون بول رہا ہے؟“ اس نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔

”دوست ہوتا تو گنہیہ اس وقت میرے قبضے میں نہ ہوتی۔“

”تم شاید غلط فہمی کا شکار ہو۔“ سکندر علی شاہ نے نزاکت بھانپ کر سنہلنے کی کوشش کی۔

”میرے آدمی سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔“

”تم بھی خوش فہمی کا شکار ہو شاہ جی۔“ جواب سرد لہجے میں ملا۔ ”جب سورج ڈھل جائے تو سائے بھی اپنی اصلیت بدل دیتے ہیں۔“

”فون کرنے کا کیا مقصد ہے؟“

”گنہیہ تم کو کچھ دیر بعد مل جائے گی۔ جس حالت میں ملے گی اس سے تم میری طاقت کا اندازہ بھی لگا لو گے۔“ بات جاری رکھی گئی۔ ”اس کے بعد بھی..... اگر تم نے میرے کسی دشمن کی مدد جاری رکھی تو پھر تم بھی گنہیہ ہی جیسی کیفیت میں شہر کے کسی مصروف چوک پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکتے ہو۔“

”میرے بارے میں تم یقیناً کسی خوش فہمی کا شکار ہو۔“ سکندر علی شاہ نے تمللا کر کہا۔ ”مرد ہوتے تو لڑاکا کر سامنے آتے..... اس وقت ایک دوسرے کی طاقت کا فیصلہ بھی ہو جاتا۔ بہر حال، میں تم سے دو باتیں معلوم کرنا چاہوں گا..... گنہیہ کو اغواء کرنے کا مقصد اور اس دشمن کا نام جو تمہارے ذہن میں کسی غلط فہمی کی جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔“

”گنہیہ جس حالت میں تمہیں ملے گی اس سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ اب تمہاری عزت اور شہرت دونوں کا بھرم ہماری مٹھی میں ہے، دشمن کا نام ایس پی اورنگ زیب نے آکٹوپس رکھا ہے۔ میں اپنی زبان میں اب بھی اسے شیخ حامد کہوں گا۔“ اس بار بھی دوسری جانب سے تحارت بھرا انداز اختیار کیا گیا۔

”تم یقیناً کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں نے شیخ حامد کا نام ضرور سنا ہے لیکن اسے کسی زاویے سے بھی نہیں جانتا۔“

”اتنی جلدی فیصلہ مت کرو..... گنہیہ کے وصول ہونے کے بعد شاید تمہیں کچھ یاد آ جائے۔“ سرد مہری سے جواب دینے کے بعد دوسری جانب سے سلسلہ بھی منقطع کر دیا گیا۔

سکندر علی شاہ کا چہرہ غصے سے تھمارا ہوا تھا۔ فون کرنے والے نے گنہیہ کے نمبر استعمال کیے تھے تو یہ بھی اسی بات کی دلیل تھی کہ وہ بھی فون کر نیوالے کے قبضے میں ہوگی۔ اسے کیوں اغواء کیا گیا؟ اس

اس کے علاوہ اور بھی کئی سوالات تھے جو سکندر علی شاہ کے ذہن میں ابھر رہے تھے لیکن آدھی رات گزرنے کے بعد جب ملازموں نے سفید دودھیا رنگ کا مولے پلاسٹک کا تابلو نما تھیلا لاکر اس کے سامنے رکھا تو سکندر علی شاہ کے ذہن میں فون کرنے والے کی باتیں گونجنے لگیں اس نے ملازموں کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ یہ حکم بھی پورے جلالی انداز میں سنا دیا کہ وہ اس تھیلے کے بارے میں اپنی زبانیں بند ہی رکھیں گے۔ خواب گاہ کو اندر سے بند کر کے اس نے تھیلا کھولا تو نگینہ سر تاپا کسی لباس کے بغیر بے ہوش ملی۔ اس کے برہنہ جسم کو دیکھ کر سکندر علی شاہ کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ جن افراد نے نگینہ کو ان حالات سے دوچار کیا ہوگا انہوں نے اس کی شرمناک تصاویر بھی ضرور محفوظ کر لی ہوں گی جن کے ذریعے وہ سکندر علی شاہ کو اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور بھی کر سکتے تھے۔ اس خیال نے اس کے وجود میں جیسے دہکتی چنگاریاں بھر دیں..... نگینہ کو اسی کیفیت میں چھوڑ کر وہ دبیز قالین پر بے چینی کی کیفیت دور کرنے کی خاطر ٹپٹلے لگا۔ خاصی دیر تک وہ اسی سوچ میں غرق رہا کہ کون سا ایسا طریقہ اختیار کرے جو خود کو کسی کے ہاتھوں بلیک میل ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔ اس کا ذہن مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا پھر اچانک اس نے گھوم کر دوبارہ نگینہ کے وجود پر ایک گہری نظر ڈالی وہ بلاشبہ ایک خوبصورت کھلونا تھی جو منتشر ذہن کو سکون پہنچانے کا موثر ذریعہ بھی تھی لیکن اب حالات نے اس کی غرض و غایت بدل دی تھی۔ ”اگر اسے خاموشی سے کسی اندھے کنویں میں یا سمندر میں پھینک دیا جاتا تو پھر دشمنوں کی بلیک میلنگ کا خطرہ نکل جاتا۔“ سکندر علی شاہ کے ذہن میں خیال جڑ پکڑ رہا تھا جب فون کی کھنٹی کی آواز سن کر وہ اس طرح چونکا جیسے سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی ہو۔

”اس وقت کس کا فون آ سکتا ہے؟“ اس نے کچھ لمحے ذہن پر زور ڈالا پھر چوتھی کھنٹی پر ہاتھ بڑھا کر سیوریہ اٹھالیا۔

”کون ہے؟“ اس نے اپنی آواز سے ایسی جھلاہٹ کا اظہار کیا جیسے سوتے سے جاگا ہو۔
 ”شکرہ۔“ دوسری جانب سے سرسراتے لہجے میں کہا گیا۔ ”میں تم سے کبھی دور نہیں رہتا۔ اس وقت بھی تمہاری کیفیت سے ناواقف نہیں ہوں۔ تمہاری پریشانی کا احساس مجھے بھی ہے لیکن تم بتاؤ..... تم نے نگینہ کے سلسلے میں کیا سوچا ہے؟“

سکندر علی شاہ کی کشادہ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھرنے لگے۔ ہچکچا کر بولا۔ ”اگر اسے دریا برد کر دیا جائے تو.....“

”نہیں۔“ بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”شکرہ تمہاری پشت پر ہے تو دوبارہ کبھی بزدلی کی باتیں نہ کرنا۔“

”وہ..... وہ مجھ سے جس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں..... میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“

”کوئی نام بھی ہوگا اس کا؟“

کے انگوٹے سے شیخ حامد کا کیا تعلق تھا جبکہ ذاتی طور پر سکندر علی شاہ نے کبھی اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

خاصی دیر تک ذہنی جتناںک..... کرنے کے باوجود وہ فون کرنے والے کے بارے میں کوئی آخری نتیجہ نہیں اخذ کر سکا مگر بہر حال اتنا سمجھ گیا تھا کہ نگینہ کو رین بوکلب سے ہی انگوٹے کیا گیا ہوگا۔ انگوٹے نیا لوں کے اشارے پر ہی اس نے ڈرائیور کو واپس جانے کی ہدایت کی ہوگی۔ اس بات کی مزید چھان بین کرنے کے لیے اس نے اپنے مخصوص موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے نگینہ کے سلسلے میں جو بات کی وہ بھی مختصر تھی۔

”فوری طور پر معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ نگینہ کی ملاقات رین بوکلب میں کس سے ہوئی تھی۔ وہاں کتنی دیر ٹھہری رہی اور پھر واپسی کس طرح ہوئی؟“

”سر..... کیا نگینہ صاحبہ اپنی گاڑی پر.....“

”نان سینس.....“ سکندر علی شاہ نے جھلا کر کہا۔ ”جو حکم دیا گیا ہے کہ اس کی معلومات کر کے جواب دو۔“

”رائٹ سر۔“

سکندر علی شاہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کا ذہن بری طرح وسوسوں کا شکار تھا۔ روز اول سے وہ نگینہ کے سلسلے میں محتاط ہی رہا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کس قماش کی تھی شادی سے پہلے بھی اس کے ساتھ ہٹ اینڈ رن (HIT & RUN) کا کھیل، کھیل سکتا ہے لیکن شکرہ اس کا محسن تھا۔ اسی کے اشارے پر اس نے نگینہ کو اپنا لیا تھا پھر روز اول ہی سے اس نے نگینہ کو اس بات کا احساس بھی دلا دیا تھا کہ اگر اس کو حویلی میں گزر بسر کرتا ہے تو سکندر علی شاہ کے اشاروں پر چلنا ہوگا۔ خود نگینہ کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ اگر اسے حویلی چھوڑنی پڑی تو زندگی کوٹھی کے بجائے شاید کسی کوٹھے پر ہی بسر ہوگی۔ کوٹھی میں اس کی حیثیت سر کے تاج جیسی تھی کوٹھے پر جاتی تو پاؤں کی جوتی بن کر رہ جاتی۔ اس نے خود کو حالات کے سانچے میں ڈھالنے کی خاطر اپنی سابقہ زندگی کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔ سکندر علی شاہ کے دل میں جگہ بنائی تھی جس کا احساس خود سکندر علی شاہ کو بھی تھا لیکن آج..... آج خلاف توقع وہ کسی کے سنہری جال میں پھنس گئی تھی۔

فون کرنے والے کے سرد اور سفاک لہجے نے بھی سکندر علی شاہ کے وجود میں جیسے چنگاریاں بھری دی تھیں۔ وہ ابھی تک یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے نگینہ کو فریب دے کر انگوٹے کیا تھا۔ ان کا مقصد کیا تھا؟ درمیان میں ایک ایسے آدمی کا نام کیسے آگیا جو اس کی اطلاع کے مطابق پولیس کے علاوہ فوجی انٹیلی جنس والوں کو بھی درکار تھا۔ ایک بار تمام اخبارات میں یہی خبر آئی تھی کہ شیخ حامد اپنے بیلی کا پٹر سمیت گڈانی کے ساحل کے قریب کھلے سمندر میں غرق ہو گیا پھر ان ہی اخبارات نے اس کے دوبارہ زندہ ہونے کی اطلاع بھی دی تھی ایسے بدنام زمانہ مجرم کا نام نگینہ کے ساتھ کس حوالے سے آگیا؟

”شیخ حامد جو ایس پی اورنگ زیب کے حوالے سے آکٹوپس کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔“
”میں نے اس کا نام بھی سن رکھا ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ریٹائرڈ ڈی آئی جی علیم احمد کے قتل کے بعد پولیس کے اعلیٰ آفیسر بھی بوکھلا گئے ہیں۔ اس حادثے کے بھی کئی پہلو ہیں جس میں آکٹوپس کا علاقہ نشان بھی ملا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب بھی بغلیں جھانک رہا ہے مگر..... تم پریشان نہ ہو..... جو لوگ گنیز کو اٹھالے گئے تھے وہ بھی میری نظر میں آگئے ہیں۔“

”کون ہیں وہ جنہوں نے سکندر علی شاہ سے لکھانے کی.....“ سکندر علی شاہ کی پیشانی پر پھر ٹکٹیں جال بننے لگیں۔

”جوش سے نہیں..... ہوش سے کام لو۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ گنیز کو صرف حویلی تک محدود کر دو۔ اب بھی یہی کہوں گا۔ رہا انگو اکرنے والوں کا معاملہ تو میں اسے بھی دیکھ لوں گا۔ شیخ حامد کے بارے میں تم سے جو پوچھا جائے تو وہی جواب دینا جو تم پہلے دے چکے ہو۔“

”وہ آسانی سے میرا جواب ہضم نہیں کریں گے۔“

سکندر علی شاہ نے بے بسی کا اظہار کیا۔

”جانتا ہوں..... دو چار دن اور صبر کرو..... میں دوبارہ تم سے رابطہ قائم کروں گا۔“ اس جواب کے ساتھ لائن بھی ڈس کنکٹ کر دی گئی۔

سکندر علی شاہ نے جھلا کر ریسور رکھا پھر دوبارہ گنیز کو گھورنے لگا جس کے سینے کا زیروم اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

❖❖❖

آبادی سے دور اور جنگل کے قریب وہ چھوٹا سا تالاب بھی چکوری کے لیے بڑا سندر تھا۔

پرتاب بھوشن اسی تالاب سے ذرا فاصلے پر برگد کے پرانے درخت کے تنے کے نیچے آلتی پالتی مارے بیٹھا اپنے چاب میں گن تھا۔ چکوری نے تھوڑے فاصلے پر زمین صاف کر کے اپنے گوارے لائق جگہ بنالی تھی۔ پرتاب بھوشن نے کہا تھا کہ وہ اکیس روز سورج کے ڈوبنے تک اپنے منڈل میں بیٹھا دیوی کے دھیان میں گن رہے گا۔ چکوری ایک ایک دن گن کر گزار رہی تھی۔ کچھ دنوں تک روکھا سوکھا حلق کے نیچے اتارنے میں اسے دشواری ضرور ہوئی پھر رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی بھی ہو گئی تھی۔

اس نے پرتاب بھوشن کو تن من دھن سے اپنا لیا تھا۔ ادھر مندر میں اس کے چاہنے والے بہت تھے۔ بڑا بچاری بھی اسے دانہ ڈالنے میں پیش پیش تھا لیکن چکوری جانتی تھی کہ اگر اس نے ایک کو ڈھیل دی تو پھر سب ہی اس سے پیچ لڑانے کو اپنا ادھیکار سمجھ لیں گے۔ وہ دیوی درشن کی آس لیے مندر میں جیون بتانے گئی تھی۔ من چند ہی نے اسے بتایا تھا پرتاب دیوی کا سچا بچاری ہے لیکن یہ بتا کر اس نے خود اپنے پیروں پر کھڑی ماری تھی۔

پہلی نظر میں پرتاب چکوری کو اچھا نہیں لگا تھا لیکن دیوی درشن کی پیاس نے آہستہ آہستہ اسے پرتاب کے قریب کر دیا۔ وہ اسی کا ہاتھ تھام کر مندر سے نکل پڑی تھی۔ اور اب اس ویران علاقے میں بھی اس انتظار میں بیٹھی تھی کہ پرتاب منڈل سے باہر آئے تو وہ پھر ہاتھ باندھ کر دیوی کے درشن کرانے کی ہمتی کرے گی۔

گزرتے دنوں کا حساب لگانے کے کارن، اس نے اکیس کنکری گن کر رکھ لی تھیں۔ روز سورج ڈھلتا تو وہ ایک کنکری ایک ڈھیری سے نکال کر دوسری طرف رکھ دیتی۔ وقت دے قدموں گزرتا رہا۔ صبح اٹھ کر وہ تالاب کے پانی سے منہ پر دو چار چھینٹا مار کر اڑھنی سے پونچھ لیتی۔ دن بچ کر کے وہ ایک جوڑا اتار کر ادھر ادھر کی گن لینے کے بعد اسے دھو کر کسی جھاڑی پر ڈال دیتی پھر نہا کر دوسرے جوڑے سے تن ڈھانپ لیتی۔ شروع شروع میں اسے بڑی لاج آتی تھی۔ دل یہ سوچ کر ڈھونڈنے لگتا کہ کہیں قریب کوئی چھپ کر اس کے کندن بدن کو لپٹائی نظروں سے تو نہیں دیکھ رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ ڈھیری دل سے نکل گیا۔ آہستہ آہستہ وہ ہر بات کی عادی ہو گئی۔ وقت کے دھارے میں زندگی گزارنے کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ اگر تعجب تھا تو اس بات پر کہ پرتاب بھوشن بغیر کچھ دانہ پانی کھائے اپنے منڈل میں آلتی پالتی مارے، آنکھیں بند کیے بیٹھا دیوی کے چاب میں اتنا گم تھا کہ اسے کسی اور بات کا ہوش نہیں تھا۔

چکوری روز ایک کنکری ادھر سے ادھر کرتی رہی پھر..... جب اس نے آخری کنکری دوسری ڈھیری پر ڈالی تو کسی پھول کی طرح کھل اٹھی۔ اس روز اس نے سورج ڈھلنے سے پہلے تالاب کے پانی سے اپنا بدن خوب رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ سوکھا ہوا جوڑا تن پر چڑھا کر وہ منڈل کے قریب آ کر کسی بچارن کی طرح بیٹھ گئی۔ جیسے جیسے سورج ڈھلتا جاتا اس کے اندر دیوی درشن کی پیاس بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

سورج دیوتا کی آخری کرن بھی آکاش میں ڈوب گئی تو پرتاب بھوشن نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا گرد آلود چہرہ خوشی سے ہنستا رہا تھا۔ چند لمحے وہ آسمان پر نظریں جمائے کسی سوچ میں گم رہا پھر اس نے نظریں گھما کر چکوری کو دیکھا جو منڈل کے قریب گھنٹوں کے بل ہاتھ جوڑے بیٹھی اسے شیلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”مہاراج.....“ وہ پرتاب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کھل اٹھی۔ ”میں نے ایک ایک دن گن کر بتائے ہیں۔ دیوی سے یہی پراہنا کرتی رہی ہوں کہ وہ تماری بھکتی کو سیوکار کر لے..... ایسی شکتی دان کر دے کہ تمہارا دشمن خود چل کر تمہارے چروں تک آئے..... تم سے ہاتھ باندھ کر شاکر دینے کی بھیک مانگے اور تم..... تم اس پانی کو جلا کر بھسم کر دو۔“

پرتاب بھوشن قدم اٹھاتا منڈل سے باہر آیا۔ اس نے آکاش کی گہرائیوں پر نظر ڈالی پھر چکوری کو بانہوں میں سمیٹ کر اس کے پھول جیسے ہونٹ چوم کر بولا۔

”تو نے دیوی سے جو مانگا ہے وہ اب اوش پورا ہوگا۔ مجھے بھی یہی اشارہ ملا ہے کہ اب مسئلے کا

پر تاب بھوشن نے برگد کے تنے سے ٹک لگا کر اسے بھی اپنے قریب کھینچ لیا۔ ”دیوی کے بچاری دھرتی کے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کو راضی کرنے کے کارن جنگل، پہاڑوں اور برف کے گھاؤں میں دھونی رما کر بیٹھے چاٹ کرتے رہتے ہیں۔ پرتو سب کو اس کا آشیر باد نہیں حاصل ہوتا..... کامیاب وہی ہوتے ہیں جن کی لگن سچی ہو، جس کے گیان دھیان میں کوئی لوبھ..... کوئی کھوٹ نہیں ہوتی۔“

”ایک بات پوچھوں مہاراج؟..... تمہیں اس مسئلے سے کیا پیر (دھمنی) ہے؟“

”اس نے ایک بار میرے کسی منت کا انجانے میں توڑ کر دیا تھا۔“

”پھر..... اب تک وہ تمہارے کشت سے کیسے بچا؟“

”ہے کوئی چھایا جو اس کی سہانچا کر رہی ہے۔“

”تم نے اس چھایا کا کھوج لگایا؟“

”یہ دھرم کرم اور دیوی دیوتاؤں کی باتیں ہیں مورکھ..... ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ پر تاب بھوشن نے الجھ کر جواب دیا پھر چکوری کے قرب کی تپش سے اپنی ابھمن کا توڑ کرنے میں مگن ہو گیا..... چالیس دنوں کی تھکن بھی اتارنی تھی۔



ایس پی اورنگ زیب اس وقت بھی اپنے آفس میں بیٹھا کھیاں مار رہا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کی پوسٹنگ کو وہ صرف ایک کال میں ختم کرا کے دوبارہ اپنی سیٹ پر واپس جاسکتا تھا۔ کرٹل احتشام نے بھی اس سلسلے میں اپنی مدد کا یقین دلایا۔ لیکن اورنگ زیب نے اسے بھی منع کر دیا تھا وہ کچھ دنوں دشمنوں کو بھی اس بات کا یقین دلانا چاہتا تھا کہ فی الحال عتاب میں ہے۔ اس طرح دورہ کر وہ سکون سے بیٹھا ہر بات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے کارندے ایک ایک پل کی خبر دے رہے تھے، کسی قانونی رکاوٹ کو دور کرنے کی خاطر سراج کا بھرپور تعاون بھی اسے حاصل تھا۔ صرف ایک آئی جی تھا جس کو وہ اپنی مرضی کیخلاف بھگت رہا تھا۔ یہ بات بھی اس کے علم میں آچکی تھی کہ خود آئی جی بھی کسی کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا ہے اور وہ کون تھا؟ یہ بات خود کسی کے علم میں نہیں تھی۔

اس وقت بھی اورنگ زیب ایک پرانی فائل کے اوراق پوئی الٹ پلٹ رہا تھا جب اسے پینتھر کی کال ملی۔

”کیا خبر ہے؟“ فائل بند کر کے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”وہ صرف اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نگرانی کرنے والے راؤنڈ دی کلاک پوری طرح چوکس ہیں۔ ابھی تک گھریلو ملازم یا ایک دو پڑوسی عورتوں کے سوا کسی اور کو اندر آتے جاتے نہیں دیکھا گیا۔“

”تمہارا ذاتی تجربہ کیا کہتا ہے؟“

”شاید اسے کہیں سے کوئی ہینک ضرور مل گئی ہے ورنہ آپ کے ماروی سے معاملات کرنے

آخری سے قریب آ رہا ہے۔ اب کی بار میرا اس پاپی کا آسنا سامنا ہوا تو اسے بھی چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔“

”مجھے بھی دیوی درشن کی پیاس ہے مہاراج۔“ چکوری نے من کی گہرائیوں سے کہا۔ ”ایک بار اس کے درشن ہو جائیں تو میری اچھا (خواہش) بھی پوری ہو جائے گی۔“

”اوش ہوگی۔“ پرتاب نے اس کو بازوؤں میں سمیٹ کر کہا۔ ”پر..... دیوی درشن بالکوں کا کھیل نہیں ہے مورکھ..... اس کے لیے من کی آنکھوں کو روشن کرنا پڑتا ہے رات دن اس کے دھیان کو من میں بسائے رکھنا بھی ضروری ہے اور..... جس کو تو گرو مان لے پھر اس کی ہر آگیا (حکم) کا پالن بھی کرنا پڑتا ہے۔“

”میں نے تم کو گرو مان لیا ہے مہاراج نہ مانا ہوتا تو اتنی دور چل کر تمہارے ساتھ کیوں آتی؟“ چکوری نے بڑی نشیلی آنکھوں سے پرتاب کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ادھر مندر میں رک جاتی تو بہت سارے بچاری مجھے دیوی مان کر میرے چہنوں میں بیٹھ کر مجھے پوجتے..... میرے شریر کے ایک ایک انگ کو چوتے، میری ایک مسکان پر وہ اپنا دھرم کرم بھول کر کسی پالتو جانور کی طرح دم ہلاتے رہتے۔“

”چڑھتی ندی پر اتنا مان بھی نہ کیا کر سندی.....“

پرتاب بھوشن نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر جواب دیا۔ ”ندی اتر جائے تو پھر کیڑے بھی ادھر ادھر ٹھکانا ڈھونڈ لیتے ہیں۔ پرانے درخت تلے پاؤں پسار کر پڑی رہے گی تو اس کی چھاؤں بھی تیرے کام آئے گی..... سمجھ رہی ہے میری بات۔“

”میں دیوی درشن کی پیاسی ہوں مہاراج..... ایک بار اس کے درشن کرا دو تمہاری بڑی کرپا ہوگی۔“ چکوری نے پھر ہاتھ باندھ لیے۔

”دھیر ترق رکھ..... میں نے وجہ دیا تو دیوی بھی تجھے درشن اوش دے گی لیکن اس کے لیے تجھے ابھی بہت پاپڑ پیلنے پڑیں گے۔“ پرتاب نے خلا میں گھور کر بڑے کسمیر لہجے میں کہا۔ ”میری مثال تیرے سامنے ہے۔ ایک وٹل کوڑکھ میں جھونکنے کے کارن مجھے بھی بہت سے بیت گیا، بار بار دیوی کے لیے چاٹ کرنا پڑا ہے..... اسی مدھ میں مدھو بچارن بھی ماری گئی تھی، اس کا بوجھ بھی ہے میری چھاتی پر..... وہ بھی اتارنا ہے..... ادھر مندر میں بیٹھا دن چند چمین کی بنسری بجا رہا ہے اس نے کہا تھا کہ میں مسئلے کا دھیان من سے نکال دوں، نہیں تو مدھو کی طرح میں بھی کام آ جاؤں گا..... اسے بھی بتانا ہے مجھے کہ پرتاب بھوشن کس شکتی کا نام ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں مہاراج کہ تم اسی مسئلے کے دھیان میں الجھے ہوئے ہو..... میرا من بھی یہی کہتا ہے کہ دیوی تمہیں نراش نہیں کرے گی، جوتن من دھن سے اس کے کارکن بھوکا پیاسا رہ کر دھرتی کی سندر تا سے بھی منہ موڑ لے پھر وہ اسے نراش کیوں کرے گی؟“

”تیری باتیں بھی تیری ہی طرح سندر ہیں چکوری۔“

سے پیشتر وہ روزانہ باہر آتی جاتی رہی تھی۔

”میں تمہاری اس بات کی تردید نہیں کروں گا۔“ اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اس کے پاس آنے جانے والی فون کا لڑکا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔“

”وہ تو تجربہ کار لڑکی ہے سر، جس دھندے میں ملوث ہے اس میں بھی فون کے بجائے اب موبائل کا استعمال بڑھ گیا ہے۔“

”چھتے سے شہد نکالنے کا طریقہ جانتے ہو؟ اورنگ زیب نے اس بار سنجیدگی سے سوال کیا۔

”آپ حکم دیں سر، دھواں دینے کے علاوہ بھی کچھ ایسے طریقے جانتا ہوں جو کسی زہریلی ناگن کو بھی بلبل کر بل سے نکلنے پر مجبور کر دیں۔“

”مٹڈ۔“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر کہا۔ ”فی الحال ہلکی ڈوز دینے کی کوشش کرو۔“

”ٹھیک ہے۔“

اورنگ زیب نے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد کچھ سوچا پھر اس نے ریسپور اٹھا کر سکندر علی شاہ کے نمبر ملائے۔

دوسری جانب سے فون ریسپور کرنے والے نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

”کون بول رہا ہے؟“

”مجھے سکندر علی شاہ سے بات کرنی ہے۔“ اورنگ زیب نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

”کیا نام ہے؟“

”ایس پی اورنگ زیب بول رہا ہوں شاہ جی۔“

اورنگ زیب نے سنبھل کر اصل مقصد کا اظہار کیا۔ ”یہ بھی عرض کر دوں کہ میں اپنی آفیشل حیثیت میں نہیں ذاتی اور باہمی دلچسپی کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہوں.....“ کچھ توقف سے جواب ملا۔ ”میں مصروف آدمی ہوں، زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔“

”جانتا ہوں شاہ صاحب، اسی لیے فون کیا ہے کہ آپ جو وقت دیں اسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔“

”اگر میری اطلاع غلط نہیں ہے تو آج کل آپ کی پوسٹنگ ہیڈ کوارٹر میں ہے۔“

”جی ہاں۔“

”اوہ۔“ اس بار دوسری جانب سے برتری کا اظہار کیا گیا۔ ”آپ چاہیں تو میں آپ کے نئے پوسٹنگ آرڈر ایک فون کال پر بھی کروا سکتا ہوں۔“

”یہ بھی جانتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے بہ دستور صبر سے کام لیا۔ ”لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ ملاقات کی نوعیت آفیشل نہیں ہے۔“

”ہوں۔“ پھر کچھ توقف کے کہا گیا۔ ”آج شام پانچ بجے میں حویلی پر چائے آپ کے ساتھ

ہی پیوں گا۔“

”عزت افزائی کا بیٹنگی شکریہ۔“

دوسری جانب سے لائن کاٹ دی گئی۔ اورنگ زیب نے بھی ریسپور رکھ دیا۔ اس کی پیشانی پر بس ایک ہل کے لیے کچھ سلوٹیں ابھریں پھر وہ مسکرا کر دوبارہ پرانی فائل کے اوراق پلٹ کرنے لگا۔

ٹھیک پانچ بجے وہ سکندر علی شاہ کی خوب صورت حویلی کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ پانچ بج کر دس منٹ پر سکندر علی شاہ بھی اس کے سامنے موجود تھا۔ فیروزے کی تسبیح کے دانوں پر اس کی انگلیاں بھی متحرک تھیں۔ دو منٹ کی رکی گفتگو کے بعد اورنگ زیب نے سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

میں اس وقت آپ کے پاس اپنے لیے خصوصی دعا کی درخواست کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔“

”حیرت ہے۔“ سکندر علی شاہ نے پہلو بدل کر کہا۔ ”آپ کو میری مریدی کا شوق کیسے ہو گیا؟“

”پہلے نہیں تھا لیکن آپ کے حلقے میں میرے ایک دو واقف کار بھی حاضری دیتے رہتے ہیں۔ ان کو آپ کی دعاؤں سے جو فائدہ ہوا اس نے مجھے بھی متاثر کیا ورنہ.....“

”آپ پولیس والے تو ہر مرض کا علاج ڈنڈے کے زور سے کر لیتے ہیں۔“

اورنگ زیب نے سکندر علی شاہ کے طنز کو محسوس کیا مگر اس نے بدستور انکساری سے کام لیا۔ ”آپ نے مجھے صرف پانچ منٹ کا وقت دیا ہے شاہ جی، اس لیے میں چاہوں گا کہ آپ میری درخواست پر سنجیدگی سے غور کریں۔“

”دعا کی ضرورت کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟“

”ذہنی سکون۔“ اس بار اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ اس کے چہرے سے اندرونی کرب اور الجھن کے تاثرات بھی نمایاں ہونے لگے۔

سکندر علی شاہ ایک لمحے خاموش رہا، اس کی عقابانی نظریں اورنگ زیب کے چہرے سے اس کی کبھی ہوئی بات کا اندازہ لگا رہی تھیں جب اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہو گئی۔ نظر آئے والے نمبر دیکھ کر وہ چونکا تھا جسے اورنگ زیب نے بھی بطور خاص محسوس کیا پھر اس کی نظریں بھی یہ دستور سکندر علی شاہ کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

”ہیلو۔“ سکندر علی شاہ نے موبائل آن کر کے جس انداز میں بات شروع کی وہ بھی اس بات کی لمبائی کر رہا تھا کہ فون کرنے والا کسی خاص اہمیت کا مالک تھا۔

”شکرہ بول رہا ہوں۔“ دوسری سمت سے سرسراتی آواز ابھری۔ ”میں نے نگینہ کے سلسلے میں بھی تم سے یہی کہا تھا کہ میں تم سے بھی دور نہیں رہتا۔ جس پودے کو میں نے بڑی محنت سے کھا

اور پانی دے کر تیار کیا ہوا اس کو ہمیشہ اپنی نظروں میں رکھتا ہوں۔ اس وقت تم غالباً ایس پی اورنگ

زیب سے گفتگو میں مصروف ہو؟“

”کیا کروں مرید تو دعا کی خاطر آتے ہی رہتے ہیں۔“

”ایس بی جتنا زمین کے اوپر ہے اس سے دس گنا زیادہ گہرا ہے۔ محتاط ہو کر بات کرنا۔“

”ایک ضروری بات اور سن لو۔“ پہلے سے زیادہ گھمبیر لہجے میں کہا گیا۔ ”ایس بی کے بارے میں کچھ اندرونی معلومات میرے پاس بھی ہیں۔ ایسی بات جو عام لوگوں کے علم میں نہیں ہے۔ تم بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔“

”گلد میں سن رہا ہوں۔“ سکندر علی شاہ نے پہلو بدل کر جواب دیا۔

”محبت کی شادی اگر دو چار روز چل کر پرانی کار کی طرح ٹھپ ہو جائے تو ایک عام آدمی بھی فرسٹریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایس بی کی زندگی کا یہ حادثہ اب قصہ پارینہ بن چکا ہے، اس کا علم چند ایک افراد کے علاوہ کسی کو نہیں۔“ بات سنجیدگی سے جاری رکھی گئی۔ ”بہی احساس محرومی ہے جس نے ایس بی کو سخت گیر طبیعت کا مالک بنا دیا ہے جس عہدے پر ہے اس کی رعایتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی ایک ناکامی کو عام زندگی کی کامیابیوں سے تسلی دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم نے جو فقروں کا نقاب اپنے کمروہ چہرے پر سجا رکھا ہے اس میں میری فراہم کردہ معلومات ایس بی کو چونکا دینے کے لیے کافی ہوں گی۔ تم اپنی شعبہ بازی سے ایس بی کو کسی طرح فارم ہاؤس تک لانے کی کوشش کرو۔ ایک بار اس کے خلاف کوئی غیر اخلاقی ثبوت ہمارے ہاتھ آگیا تو پھر پوری طرح اپنی گرفت میں ہوگا۔“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا تو سکندر علی شاہ نے اورنگ زیب سے کہا۔

”تھا ایک مرید جو اپنی چتا سنا رہا تھا۔“

”شاہ جی، مجھے آپ کے قیمتی وقت کا احساس ہے اس لیے.....“

”نہیں۔“ سکندر علی شاہ نے بات کاٹ کر فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں پولیس والوں سے ہمیشہ دور رہنے کا عادی ہوں لیکن آپ جس ضرورت کے لیے آئے ہیں اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔“

”یہ بھی آپ کی ذرہ نوازی ہے۔“

”ابھی آپ نے ذہنی سکون کے بارے میں کہا تھا۔“ سکندر علی شاہ نے بے حد سنجیدگی سے اورنگ زیب کے چہرے پر نظریں جم کر دریافت کیا۔ ”کیا آپ بتانا پسند کریں گے، آپ جس ذہنی انتشار کا شکار ہیں اس کا وجہ کیا ہے؟“

”کام کی مصروفیت اور احساس ذمہ داری۔“ اورنگ زیب کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پھیل کر گہرے ہونے لگے۔ ”جس جھگڑے میں ہوں وہاں کسی افسر کی ناکامی کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اور کامیابی کے حصول کے ناپسندیدہ ہتھکنڈوں کو بھی اپنانا پڑتا ہے۔ ہیڈ کوارٹر کی پوسٹنگ کو میں بھی ایک فون کال میں منسوخ کروا سکتا ہوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔“

”آپ نے صاف گوئی سے کام لیا ہے تو میں بھی ایک بات عرض کر دوں۔ شفا دینے والی

ذات اوپر والے کی ہے۔ میں اپنے مریدوں سے بھی یہی کہتا ہوں پھر بھی وہ اصرار کرتے ہیں کہ میں مقدس کتاب کی کوئی آیت پڑھنے کا مشورہ دے دیتا ہوں اس کے حق میں دعا بھی کرتا ہوں، خدا کا کرم ہے کہ وہ اس فقیر کی لاج رکھ لیتا ہے۔“

”مجھے کوئی مفید مشورہ دے کر میرے حق میں دعا کریں۔“ اورنگ زیب نے عاجزی کا اظہار کیا۔

”میں پھر حیرت کا اظہار کروں گا۔“ سکندر علی شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ جیسا کامیاب اور شہرت یافتہ پولیس آفیسر کسی فقیر سے دعا کی درخواست کرے..... کچھ عجیب سا لگتا ہے۔“

”اور کوئی وجہ ہوتی تو میں آپ کو زحمت نہ دیتا۔ فون پر میں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ کچھ ذاتی اور باہمی دلچسپی کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

سکندر علی شاہ نے تسبیح ایک طرف رکھ کر اورنگ زیب سے کہا۔ ”ذاتی دلچسپی کا اتنا کر دیا، آپ سے چائے پینے کے دوران میں کچھ باہمی دلچسپی کی باتیں بھی کرنا پسند کروں۔“

سکندر علی شاہ نے ملازم کو چائے لانے کا حکم دینے کے بعد کہا۔ چائے کے دوران سکندر علی شاہ کی عقابانی نظریں شکرہ کی فراہم کردہ اطلاع کی روشنی میں اورنگ زیب کو ٹٹوتی رہیں۔ پھر چائے کے برتن واپس جانے کے بعد اس نے قدرے بے تکلفی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”میرے فارم ہاؤس کے بارے میں قومی اور صوبائی محکموں کے اعلیٰ عہدیدار بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔ وہ وہاں آ کر ایک دو دن کیوں گزارتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ آپ بھی واقف ہوں لیکن مجھے اس کی پروا کبھی نہیں ہوتی۔ ذاتی طور پر بھی میں خوب صورت لڑکیوں کی موجودگی میں کچھ وقت اپنے مخصوص ریست ہاؤس میں گزارتا ہوں۔ مقصد نفس کشی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ ماروی بھی میری مہمان بن کر وہاں آئی تھی۔ بعد میں کیا ہوا اور کیا نہیں اس کا علم آپ کو ماروی سے ملاقات کے دوران ضرور ہوا ہوگا۔ بال کی کھال نکالنے کی خاطر آپ کے جھکے نے کچھ اور لڑکیوں پر بھی پھرے بٹھا دیے ہیں۔ میری صحت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا مگر..... میں آپ سے ایک دوست کی حیثیت سے یہ ضرور معلوم کرنا پسند کروں گا کہ خود ماروی نے آپ کو کیا کہانی سنائی ہے۔“

”آپ نے درست کہا ہے تو میں بھی بے تکلفی سے ہی بات کروں گا۔“ اورنگ زیب نے سنبھل کر کہا۔ ”جس دن ماروی فارم ہاؤس گئی اس روز آپ وہاں سرے سے نہیں گئے تھے۔ آپ کی غیر موجودگی میں کس نے فائدہ اٹھایا۔ خود ماروی بھی اس کی شکل نہیں دیکھ سکی البتہ اسے بے آبرو کرنے والے نے زبان بند رکھنے کی خوف ناک دھمکی ضرور دی تھی۔ ماروی نے روانی میں اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ وہ اپنی سبیلی کے کہنے پر ایک رات کے لیے فارم ہاؤس گئی تھی پھر..... ماروی نے کسی خوف سے اپنی زبان بند کر لی۔ اس رات کے بعد کون جیا، کون مرایہ بھی میرے علم میں ہے مگر میں نے اس کی تفتیش میں بوجہ نہیں کی۔“

”اگر میں اس کی وجہ دریافت کرنا چاہوں تو؟“ سکندر علی شاہ کی پیشانی پر ایک لمحے کو پسینے کی

نمی محسوس ہوئی پھر وہ بھی غائب ہو گئی۔

”ذاتی طور پر میرا مشاہدہ ہے کہ وہ پولیس آفیسر بہت جلد بدنام ہو جاتے ہیں جو قحبہ خانوں یا جوئے کے اڈوں سے بھتا وصول کرنا شروع کر دیں“ اورنگ زیب نے ایک لمحے توقف سے بات جاری رکھی۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ کو بھی اس چوکی دار کی خودکشی کی خبر سن کر اس بات کا یقین نہیں آیا ہوگا کہ وہ آپ کے اعتماد کو دھوکہ دے سکتا ہے۔“

”پھر.....“ سکندر علی شاہ چوکی دار کے سلسلے میں اورنگ زیب کا جواب سن کر چونکا۔ ”اگر وہ ذمے دار نہیں تھا تو پھر اس نے خود کو موت کی آغوش میں کیوں سوئپ دیا؟ کس نے اسے مجبور کیا ہوگا جب کہ وہاں کا سارا عملہ میرے اعتماد کا ہے۔“

”میں معذرت خواہ ہوں شاہ جی! اس سلسلے میں کچھ عرض نہیں کر سکوں گا۔“

”آپ کس وجہ سے معذرت خواہ ہیں؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس وقت بھی پولیس کی کوئی مصلحت آپ کے آڑے آ رہی ہے۔“

جواب میں اورنگ زیب نے جیب سے بال پین نکال کر اپنی ہتھیلی پر دو لفظ۔ ”یہاں نہیں۔“ لکھ کر سکندر علی شاہ کو دکھایا پھر اسی سنجیدگی سے بولا۔ ”محض کسی شے کی بنا پر جس کی کوئی وجہ بھی میرے علم میں نہ ہو۔ میں زبان کھولنا پسند نہیں کرتا۔ آپ سے یہی درخواست کروں گا کہ ذہنی سکون حاصل کرنے کی خاطر مجھے کوئی تجویز کر دیں۔“

”جب تک ذہنی انتشار کی اصل وجہ نہ معلوم ہو کوئی وظیفہ یا دعا کارگر نہیں ہوگی۔ مرض کی تشخیص بنیادی شرط ہے۔“

”میں اسے پولیس کی ملازمت اور اپنی اصول پسندی پر قائم رہنے کی وجہ ہی کہوں گا۔“

”قیافہ شناسی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“ سکندر علی شاہ نے جس کے ذہن میں اورنگ زیب کی ہتھیلی پر لکھے لفظ بار بار ابھر رہے تھے مختاط انداز میں سوال کیا۔

”ذاتی طور پر میں علم الاعداد، قیافہ شناسی یا علم نجوم پر اعتقاد نہیں رکھتا۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اور اگر میں آپ کو آپ کے ذہنی انتشار کی نفسیاتی وجہ بتا دوں تو آپ کیا کہیں گے؟“

”م..... میں سمجھا نہیں۔“ اورنگ زیب نے وضاحت طلب انداز اختیار کیا۔ ”آپ کی قیافہ شناسی کیا کہتی ہے؟“

”ماضی کا احاطہ خاصا وسیع و عریض ہوتا ہے، آپ کس مخصوص بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟“

”انسان کسی کو دل سے چاہے، چاہ کر بڑے ارمانوں سے اپنائے اور پھر..... دوسرا فریق خلاف توقع روٹھ کر ناتا توڑے تو دل پر جو زخم گلتا ہے وہ ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ آپ مضبوط اعصاب کے مالک ہیں جواب میں عملی زندگی میں مضبوطی سے قدم جمائے ہیں ورنہ ذہنی سکون کا انتشار بڑھ کر دیوانگی کی حد سے بھی گزر جاتا۔“

اورنگ زیب اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا لیکن ذہن میں ایک سوال ضرور گونج رہا تھا کہ وہ مخصوص بات جو اس کے بیشتر عزیز داروں کے علم میں بھی نہیں تھی جسے گزرے برسوں بیت گئے تھے۔ فاصلے بھی اتنے زیادہ بڑھ گئے تھے کہ اس نے خود بھی پلٹ کر کبھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ بات سکندر علی شاہ کے علم میں کیسے آگئی؟ سکندر علی شاہ کون تھا کیا تھا؟ اورنگ زیب اس کی رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ مریدوں کی علت اس نے محض دنیا دکھاوے کے لیے پال رکھی تھی۔ فارم ہاؤس میں آئے دن نئی اور خوب صورت لڑکیوں سے دل بہلانے والا، بااثر افسروں کو بلیک میل کرنے کی خاطر ان کو عیش و عشرت کے جال میں پھنسانے والا بہرہ و پیا محض آنکھ بند کر کے کسی کے ماضی میں جھانک سکے..... یہ بات اورنگ زیب کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔

”کس سوچ میں گم ہو گئے؟“ سکندر علی شاہ نے مسکرا کر سوال کیا پھر اپنے مکروہ چہرے پر کسی بزرگ کا ملمع چڑھا کر بولا۔ ”کیا میں نے کچھ غلط کہا؟“

”مرض کی تشخیص کرنی ہے تو اس کا علاج بھی عرض کر دیں۔“ اورنگ زیب نے دوبارہ خود کو سنجویشن کے سانچے میں ڈھال لیا مگر اس کے ساتھ اس کے ذہن میں وہ کال بھی ابھرنے لگی جو کچھ دیر پہلے سکندر علی شاہ نے منہ بنا کر ریسپو کی تھی۔ یہ بات بھی اس کے ذہن میں تھی کہ سکندر علی شاہ حلقے اور کسی سے ملاقات کے دوران موبائل کالوں کو ریسپو کرنے کا عادی نہیں تھا پھر..... وہ کون تھا جس کی کال کو اس نے چہرے سے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اٹینڈ کر لیا تھا۔

”بہرے کو ہیرا ہی کا شتا ہے اور زہر کا موثر علاج بھی زہری ہے۔“ سکندر علی شاہ کچھ اور کھل گیا۔ ”آپ نے ایک کو محبت سے حاصل کیا پلکوں پر بیٹھایا لیکن وہ ساتھ چھوڑ گئی۔ کسی دوسری کو پیسوں یا طاقت کے زور سے مسل کر رکھ دیں تو یہ انتقام کھل تو نہ ہوگا لیکن جنون کی شدت میں کمی ضرور واقع ہو جائے گی۔“

”یہ..... یہ مشورہ آپ دے رہے ہیں؟“ اورنگ زیب نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”ڈاکٹر جو دوا بھی تجویز کرتے ہیں ان میں بھی الکھول استعمال ہوتی ہے ذرا مختلف انداز میں۔ بالکل اسی طرح آپ کے علاج کی بنیادی وجہ علاج ہی ہوگی۔ اسے عیاشی نہیں کہا جائے گا۔“

”اوہ۔“ اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ ”لیکن جہاں میرے ہزاروں دوست ہیں وہاں کچھ

دشمن بھی ہیں پل پل کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ اگر کسی کو علم ہو گیا تو میری سادھ.....“

”آپ اس وقت سکندر علی شاہ کے پاس ایک دوست کی حیثیت سے آئے ہیں تو مجھ پر دوست بن کر اعتماد بھی کریں۔ فارم ہاؤس تک میرے ملازموں کے سوا کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ بے شمار اعلیٰ عہدیدار وہاں محض تفریح کی غرض سے بھی آتے ہیں۔ ان کے لیے بھی کسی ایسے وقت کا انتخاب کیا جاتا ہے جب بات کسی اور کان تک نہ پہنچے۔“ سکندر علی شاہ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”کسی پر نیچر ہی اچھائی ہو تو اس کے سوا دوسرے ہتھکنڈے بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ ایک تجربہ کار اور ذمے دار پولیس آفیسر کی حیثیت سے آپ کے علم میں بھی ایسی بے شمار مثالیں موجود ہوں گی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی عرض کر دوں۔“ سکندر علی شاہ کے لہجے میں اچانک تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ”جو لوگ میرے اعتماد کو دھوکا دیں یا ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو ٹھکانے لگانے میں دیر بھی نہیں کرتا۔ محبت اور جنگ میں تمام حربے استعمال کرنے والی مثال آپ نے بھی سنی ہوگی۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں لیکن ابھی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ نے جو شخص کیا ہے وہ سو فی صد درست ہے مگر اس کے علاج کے بارے میں جلد ہی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

”مسئلہ آپ کا ہے اس لیے میں اصرار نہیں کروں گا۔“

سکندر علی شاہ نے بے پروائی سے جواب دیا پھر موضوع بدل کر کہا۔ ”شیلادوما کے بیوٹی پارلر کے سلسلے میں میرے فون کے بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے جو طرز عمل اختیار کیا میں اس کی تعریف کروں گا۔ بائی دی وہ کیا حملہ کرنے والوں کے بارے میں کوئی اطلاع یا خبر آپ کے پاس ہے؟“

”میں اور سراج ایک ہی ہیں۔“ اورنگ زیب نے کھل کر کہا۔ ”در پردہ میرے ہی مشورے پر عمل کر رہا ہے۔“

”لیکن آپ کی پوسٹنگ.....“

”ہیڈ کوارٹر میں ہے۔“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”پولیس کے ایس پی کی حیثیت اور اختیار کے علاوہ میرے پاس بہت اوپر سے جاری کیا گیا ایک مخصوص اجازت نامہ بھی ہے جس کی رو سے مجھے لاکھوں اختیارات حاصل ہیں۔“

”اوہ..... پھر تو آپ سے دوستی اور بڑھائی پڑے گی۔“ سکندر علی شاہ نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کہا پھر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ”آپ دوبارہ جب بھی آنا چاہیں بلا تکلف آسکتے ہیں۔ میں دشمنی کے ساتھ دوستی کے زیریں اصولوں پر عمل کرنے میں کبھی تکلف سے کام نہیں لیتا۔“

پھر کھڑے کھڑے کچھ رسمی حیلوں کے بعد اورنگ زیب حویلی سے باہر آ گیا لیکن اس وقت بھی اس کے ذہن میں وہی موبائل کال سوالیہ نشان بن کر بار بار ابھر رہی تھی جسے سکندر علی شاہ نے ریسو کرتے وقت برا سامنہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی چھ رہی تھی کہ جس راز کو اس نے طویل عرصے سے سینے میں دفن کر رکھا تھا اس کی ہوا کسی اور کو کیسے لگی؟ سکندر علی شاہ کی قیافہ شناسی والی

بات اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکی پھر..... کیا جس کی کال درمیان میں آئی تھی وہ اس راز سے واقف تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو کون تھا جس کا علم اورنگ زیب کو بھی نہیں تھا؟

کچھ ضمنی سوالات اور تھے جو تا دیر اورنگ زیب کے ذہن کو کچھ کے لگاتے رہے۔ بیس بائیس سال پرانی یادیں جنہیں وہ خود بھی سینے کی گہرائیوں میں دفن کر کے فراموش کر چکا تھا، آہستہ آہستہ پھر سر ابھارنے لگیں۔



ایک بار کشمیر فرنیچر کی تباہی کے بعد جگانے اسے دوبارہ ماڈرن طور پر ڈیکوریٹ کرنے کے ساتھ ہی وہاں ایک گاڑ کا بھی بندوبست کر لیا تھا ایک کے بجائے اندر گاڑوں کو اٹینڈ کرنے کی خاطر ایک ملازم کا اضافہ بھی کر لیا تھا جو اس کے اپنے ہی گروہ کا ایک تجربہ کار آدمی تھا اسے علم تھا آکٹوپس کے زرخیز کسے بھی ادھر کی ٹوہ ضرور لیتے ہوں گے۔

اورنگ زیب کے اشارے کے بعد جگانے شیخ حامد سے بدلہ لینے کا ارادہ ضرور وقتی طور پر ملتوی کر دیا تھا لیکن اس کے وجود کے اندر انتقام کی سلگتی چنگاریاں کم نہیں ہوئی تھیں۔ شیخ حامد کی کوٹھی کی بربادی میں اس نے لوچن کے ساتھ مل کر دل کو جھوٹی تسلی بھی دے لی تھی لیکن وہ حساب چکنا کرنے کی خاطر براہ راست اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کا خواہش مند تھا۔ اسی غرض سے اس نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے کسی ڈائریکٹ ایکشن کے بجائے اورنگ زیب کو فرنیچر کے دکان کی تباہی کی اطلاع دی تھی۔ ایک بار لمبی سزا بھگت لینے کے بعد وہ دوبارہ اپنا پولیس ریکارڈ مزید خراب کرنے کی بھول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے جیل سے واپس آنے کے بعد ایک بار سوچا ضرور تھا کہ ان کے بد معاشوں کا روپ دھار لے جن پر ہاتھ ڈالنے سے پولیس بھی کتراتے ہی لیکن اس کے پڑوسی امداد علی نے جو پولیس کا سابق ہیڈ کانسٹیبل تھا اس کی مالی مدد کر کے اسے فرنیچر کے کاروبار کا مشورہ دیا تھا چنانچہ جگانے جرائم کی دنیا میں دوبارہ قدم رکھنے سے توبہ کر لی تھی۔ یہ اس کی کوششوں اور ایمان داری کا نتیجہ تھا کہ فرنیچر کے کاروبار میں خدا نے اس کی مدد کی۔ امداد علی کی رقم اس نے پہلی فرصت میں پائی پائی کر کے ادا کر دی تھی اور کاروباری حلقوں میں اپنی سادھ بھی بنائی تھی۔ اسی اچھی سادھ کی بنیاد پر اسے قانونی اداروں سے تعلق رکھنے والوں نے رعایت بھی دی تھی۔ کچھ ذمے دار حلقوں میں اسے جانا پہچانا جانے لگا تھا لیکن شیخ حامد کے ساتھ وہ رعایت کرنے کو تیار نہیں تھا اس کی خاموشی کو بزدلی اور نامردانگی کا نام بھی دیا جاسکتا تھا ایک بار وہ نظریں جھکا لیتا تو پھر دشمن کے کرائے کے ٹنڈ بھی اس کے سامنے سینہ تان کر چلنے کے عادی ہو جاتے۔ وقت اور حالات کی نزاکت کو بھانپ لینے کے بعد ہی اس نے لوچن سے بھی دوستی کا ہاتھ ملا لیا تھا۔ گلینے کے اغواء اور پھر اس کی سکندر علی شاہ تک واپسی میں بھی اس نے بھرپور حصہ لیا تھا ہر چند کہ اس بار لوچن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اسے خود بھی اس بات کا شبہ تھا کہ شیخ حامد نے مرنے کے بعد دوبارہ منظر عام پر آ کر جس دیدہ دلیری سے کنول کو اغواء کر دیا اس کی ماں کو مر دیا پھر کنول کو بھی بے عزت کر کے دھنکار دیا تھا وہ محض

تفریح کی غرض سے نہیں کیا ہوگا۔ اس کا مقصد ایک بار پھر وہی ہوگا جو پہلے تھا وہ پولیس کے علاوہ کاروباری حلقوں میں بھی اپنی حیثیت کا سکھ جانے کا خواہش مند تھا۔ کنول کے بیان کی اشاعت کے بعد ہر فرد کو یقین آ گیا تھا کہ وہ ان ہی کے درمیان کہیں سانس لے رہا ہے خود کو پولیس کی دسترس سے محفوظ رکھنے کی خاطر اس نے کسی محفوظ اور مضبوط جگہ اور شخصیت کا انتخاب بھی ضرور کیا ہوگا۔ مگینہ کے حوالے پر جگا کے ذہن میں بھی سکندر علی شاہ کا نام سوالیہ نشان بن کر ابھر رہا تھا اسی سبب اس نے لوچن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا تھا پھر خود بھی پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ فرنچیز ہاؤس کے عقبی مکان میں اپنے آفس میں بیٹھا ایک کاروباری آدمی سے فرنچیز کے موضوع پر کاروباری گفتگو کر رہا تھا جب اس کے سامنے دروازے پر لگا بیڑی ساز کا سرخ بلب روشن ہو گیا۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ جگا نے فوری طور پر دفتر میں موجود فرد سے کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے اجازت چاہی پھر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندرونی راستے کی سمت بڑھا جو فرنچیز ہاؤس کی طرف جاتا تھا۔

سرخ بلب نے جس خطرے کی اطلاع دی تھی اس کا اندازہ اسے گودام میں قدم رکھتے ہی ہو گیا۔ شوروم میں اس کے کارندوں کے علاوہ دو تین آدمی اور بھی موجود تھے۔ جگا محتاط قدم اٹھاتا بند دروازے کے قریب چلا گیا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارا مالک ہماری اطلاع کے مطابق اس وقت بھی اندر موجود ہوگا۔“ کسی کی کرخت آواز گونجی۔

”آپ کا خیال غلط ہے جناب۔“ ملازم نے جواب دیا۔ ”وہ اس وقت بازار کی طرف گئے ہیں۔ اگر ہوتے جب بھی مول بھاؤ کی تمام ذمہ داری انہوں نے منیجر کے سپرد کر رکھی ہے۔“

”اور اگر ہم تمہارے منیجر کو منہ لگانے سے انکار کر دیا تو؟ اس بار بھی غیر مہذب لہجے میں سوال کیا گیا۔

”آپ کی مرضی ہے جناب لیکن جہانگیر بٹ صاحب کے بارے میں جو بات میں نے آپ سے کہی ہے وہ بھی غلط نہیں ہے۔“

”پھر سوچ لو..... تمہاری حیثیت ہماری نظروں میں شطرنج کے پیادوں سے زیادہ نہیں ہے اور ہم بادشاہ کا سر نیچا کرنے کے ارادے سے آئے ہیں ایک بار تمہارے اس کاروباری نام تو بڑے کا جو حشر ہو چکا ہے وہ بھی تمہارے علم میں ضرور ہوگا۔ اب اگر بات بڑی تو پھر حد سے گزر جانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔“ جواب دینے والے کے لہجے میں گھن گرج کے علاوہ کھلچٹ بھی تھا۔

جگا نے دروازے کی جھری سے دوسری طرف دیکھا تو چونک اٹھا۔ اس کے سامنے جو آدمی موجود تھے وہ ایک مفرو اور پولیس کو مطلوب مجرم تھا اس کے دوسرے آدمی نے فیجر کے سامنے سینہ تان رکھا تھا۔ تیسرا شخص دروازے کے قریب موجود باہر کی سن گن لے رہا تھا۔ گارڈ کو شاید وہ پہلے ہی

قابو کر چکے تھے۔ جگا کے گردہ کا آدمی بھی سامنے نظر نہیں آ رہا تھا۔

سچویشن کا اندازہ لگا کر جگا نے کسی زخمی درندے کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا اس نے سائلنسر لگے پستول پر اپنی گرفت پوری طرح جمائی، ایک ہل میں وہ سچویشن پر قابو پا سکتا تھا لیکن دکان میں لاشوں کی موجودگی سے اس کی کاروباری ساکھ کے علاوہ اس کی ذاتی حیثیت بھی متاثر ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف آنے والے پوری تیاری سے آئے تھے۔ باہر ان کے دوست بھی موجود ہو سکتے تھے۔ جگا نے فوری طور پر جیب سے موبائل نکال کر اورنگ زیب کو بھی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اب اس کی آنکھوں کی سرخی رفتہ رفتہ گہری ہو رہی تھی جب سامنے کھڑے آدمی نے دروازے پر موجود اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

”یہ لوگ شرافت کی زبان نہیں سمجھ رہے ہیں تمہارا کیا حکم ہے؟“

”میرا نہیں، باس کا حکم یاد رکھو، اس نے یہی کہا تھا کہ اصل آدمی کے بیچے ادھیڑ کر اسے برہنہ حالت میں کسی بھی کوڑے دان میں ڈال دو جس میں وہ پیدا ہوا تھا اس کے بعد کیا ہوگا کیا نہیں، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔“

”اب تمہارا کیا جواب ہے؟“ سامنے موجود جرائم پیشہ نے سرسراتے لہجے میں ملازم کو گھورا۔ ”شرافت سے بچ اگل دو ورنہ تم بھی کام آ جاؤ گے۔“

”میرا جواب جو پہلے تھا اب بھی.....“

ملازم اپنا جملہ پورا نہ کر سکا، پیشہ ور مجرم کا ہاتھ برق رفتاری سے گھوما تو وہ کسی کئے ہوئے شہتیر کی طرح لڑکھڑا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ منیجر نے بوکھلا کر اٹھنے کی کوشش کی تو ایک نپی تلی ضرب نے اسے بھی زمین بوس کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی باہر کہیں موجود دو تین آدمی اور دکان میں آ گئے۔ جگا نے ان کو بھی چہرے بشرے سے پہچان لیا۔ سب کے ہاتھ جیبوں میں تھے جو اس بات کا نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ اسلحہ سے بھی ضرور لیس ہوں گے۔

خطرے کی یقینی بڑھتی جارہی تھی جگا نے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کی۔ ملازم سے چھٹکارا پانے والا اب دروازے کی سمت بڑھ رہا تھا جگا سامنے سے ہٹ کر دیوار سے چمٹ گیا پھر جیسے ہی وہ اندر آیا۔ جگا نے الٹا ہاتھ اس کی گردن میں پھنسا کر پستول اس کی کمر سے لگا دیا۔

”آواز نکالنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کر دوں گا۔“

”بہتر ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“ بے بسی کے باوجود جگا کی گرفت میں پھنسے ہوئے شخص نے بے جگری سے کہا۔ ”جو لوگ تمہیں سامنے نظر آ چکے ہیں ان کے علاوہ بھی ہمارے ساتھی باہر دین میں موجود ہیں ہم خالی ہاتھ واپس جانے کے ارادے سے نہیں آئے ہیں۔“

جواب میں جگا نے اسے گھسیٹ کر ایک طرف کیا پھر اس نے بڑی پھرتی سے پستول کا دستہ اس کے سر پر پوری قوت سے مارا وہ لہرا کر گرا لیکن گرتے گرتے اس کا ہاتھ دروازے سے ٹکرایا تو باہر والے بھی ہوشیار ہو گئے۔ اس کے بعد جو چال انہوں نے چلی وہ جگا کے لیے قابل غور تھی۔

”ایسے نہیں میرے یار۔“ جگا نے لوچن سے کہا۔
”ان لوگوں کو بھی ہاتھ چلانے کا موقع دو۔“

اس کے بعد فرنیچر کا شور دم میدان جنگ بن گیا آنے والے بھی سکہ بند بد معاش تھے۔ وہ بھی سر سے کفن باندھ کر مرنے مارنے پر تل گئے۔ ایک نے جگا سے الجھ کر گھٹنوں کا استعمال کیا تو جگا کراہ کر دھرا ہو گیا شدید تکلیف نے جگا کے اندر بھی چنگاریاں بھردیں اس نے اچانک اپنے مقابل کے پیٹ پر سر کی ٹکر ماری تو وہ بلبل کر رہ گیا پھر جگا نے اسے مزید سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ دیسی کشتی کا ایک آزمودہ داؤ آزما یا تو وہ چاروں خانے چت گرا۔ اس کے گرتے ہی جگا کے بوٹ کی ٹھوک اس کے منہ پر لگی تو خون ابل پڑا۔ دوسری طرف لوچن نے دو آدمیوں کو اپنے ہاتھوں کے حصار میں اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑ رہی تھیں۔ آنے والے دو آدمی اپنے تین آدمیوں کا انجام دیکھ کر شکر کھولنے کی خاطر لپکے تھے ایک کو لوچن نے بروقت ٹانگ درمیان میں ڈال کر اوندھے منہ گرا دیا۔ دوسرے کو جگا نے جست لگا کر دبوچ لیا۔ دونوں جنگی بھینسوں کی طرح ایک دوسرے سے زور آزمائی کرنے لگے۔ لوچن نے اپنے بازوؤں کا حلقہ پوری قوت سے یلکھت تنگ کیا تو اس کا شکار بھی بے ہوش ہو کر جمول گئے۔ جگا کے پنے تلے ہاتھ بھی مسکینی انداز میں حرکت کر رہے تھے۔ جب باہر سے شکر کو دوبارہ کھولا گیا۔

آنے والا اورنگ زیب کے سوا کوئی اور نہیں تھا اس کے ساتھ ہی ملحقہ تھانے کی نفری بھی تھی جنہوں نے مجرموں کو قابو کر لیا۔ ایس آئی لوچن کی طرف بڑھا تھا لیکن اورنگ زیب نے اسے روک دیا۔ اس نے اشارے سے لوچن کو وہاں سے چلے جانے کی ہدایت کی۔ لوچن مسکراتا ہوا دکان سے باہر نکل گیا۔

”سر..... یہ کون تھا؟“ ایس آئی نے دہلی آواز میں اورنگ زیب سے دریافت کیا۔
”خبر۔“ اورنگ زیب نے مختصر جواب دیا پھر اس کی ہدایت پر ایس آئی نے ضابطے کی کارروائی شروع کر دی۔

باہر سڑک پر پاس پڑوس کے دکانداروں کے علاوہ کچھ راہ گیر بھی جمع ہونے لگے تھے کارروائی مکمل ہونے کے بعد اورنگ زیب نے لوگوں کو یہی بتایا کہ آنے والے ڈاکا مارنے کے ارادے سے آئے تھے جس کی خبر بروقت تھانے کو مل گئی تھی پھر اورنگ زیب کے اشارے پر جگا بھی دکان بند کر کے اورنگ زیب کے ساتھ ہی اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔



چار سو گز پر تعمیر بنگلوں کی چار دیواریاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ ایک فوت شدہ قومی لیڈر کے نام پر چائیس بنگلوں کا بلاک ایک ہی تعمیراتی کمپنی نے بنایا تھا اس لیے اس کے نقشے بھی ایک ہی جیسے تھے زیادہ تر بنگلے ون پونٹ تھے لیکن بعد میں ان کے مالکان نے کچھ ترمیم بھی کر لی تھی۔ ان بنگلوں میں رہنے والے درمیانے درجے کے وہ لوگ تھے جو زمین خرید کر از خود تعمیراتی اخراجات

فرنیچر شاپ کا شٹر اندر سے گرا لیا گیا پھر کسی نے باہر سے کرخت سی آواز میں کہا۔
”جگا..... ہاتھ اٹھا کر سامنے آ جاؤ۔ تمہیں چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے تم مر گئے تب بھی ہم تمہاری لاش کو گھسیٹ کر لے جائیں گے بلا وجہ تمہارے کچھ پڑوسی بھی کام آ جائیں گے۔“
جگا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ زیادہ بہتر پوزیشن میں تھا۔ ہسٹول میں آٹھ گولیوں کی میگزین بھری ہوئی تھی۔ وہ اندر آنے والوں کو بڑی آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا لیکن حتی الامکان وہ خون خرابے سے بچنا چاہتا تھا زیادہ محتاط روی اس کے اپنے حق میں بھی خطرناک ہو سکتی تھی۔
”ہم صرف پانچ گھنٹیں گے اس کے بعد جو بھی صورت حال ہوئی اس کی ذمہ داری تمہارے کاندھوں پر ہوگی۔ ایک.....“ باہر سے گنتی شروع ہو گئی۔

”دو..... تین.....“

جگا نے تملکا کر ہسٹول کا رخ باہر کی سمت کر لیا۔ اب مرنے یا مار ڈالنے کے سوا کوئی تیسرا آپشن بھی نہیں تھا باہر سے بلند آواز میں ”چار“ کہا گیا پھر گرنے شکر کو کسی نے باہر سے کھڑکھڑایا۔ گنتی رک گئی کسی نے شکر کے قریب جا کر پوچھا۔
”کون ہے؟“

جواب میں کیا کہا گیا۔ جگا نہیں سن سکا لیکن شکر کھول دیا گیا پھر جو بھی ہوا جگا کی توقع کے خلاف ہی تھا آواز دینے والا اندر آیا۔ اس نے پلٹ کر شکر دوبارہ گرا دیا پھر ایک مانوس آواز جگا کے کانوں میں گونجی۔

”کسی قسم کی ہوشیاری دکھانے کے بجائے اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ چوہوں کی طرح کچل کر رکھ دوں گا۔“

جگانے آڑ سے جھانکا تو آنے والے کے قد و قامت کو دیکھ کر اس کی دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ اس وقت بھی وہ میک اپ میں تھا اور کوئی مقامی بد معاش لگ رہا تھا لیکن اس کی آواز اس کی شناخت کے لیے کافی تھی۔ وہ لوچن تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے سائز کی ری پیٹر رائفل دیکھ کر سب ہی کے ہاتھ جیبوں سے باہر آ کر فضا میں بلند ہو گئے تھے۔ جگا بھی لپک کر سامنے آ گیا۔ سب سے پہلے ان کی جیبوں میں رکھا اسلحہ نکال کر فرنیچر کے ڈھیر پر اچھال دیا پھر اس نے لوچن سے کہا۔

”میں اورنگ زیب کو فون کر چکا ہوں۔ ان کے آنے میں دیر بھی نہیں لگے گی لیکن تم اس وقت.....“

”دوستی کا ہاتھ ملانے والے ایک دوسرے سے بھی کبھی غافل نہیں رہتے۔“ لوچن نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ایس پی کے آنے سے پہلے مہمانوں کی کچھ خدمت بھی کر لیں ورنہ ان کو بھی ہماری حیثیت اور مہمان نوازی سے شکایت ہی رہے گی۔“

اپنے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی لوچن کی رائفل بھی حرکت میں آ گئی۔ ایک فحش کراہتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

یکشت نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ پہلے ایڈوانس پھر تعمیری مرحلوں کے مختلف طے شدہ پروگرام کے تحت رقوم کی ادائیگی اور قبضہ حاصل کرنے کے بعد دو سال کے اندر مکمل ادائیگی ہر چند کے کچھ زیادہ مہنگی ضرور پڑتی تھی لیکن تنگی ترشی سے بہر حال افوار ڈبھی کی جاسکتی تھی۔

درمیانے درجے کے لوگوں کے علاوہ اس بلاک میں ایک چوتھائی رہائش ان سرکاری افسران کی بھی تھی جو اپنی کرسی کی اوپر کی آمدنی سے ہزار گز کے عالی شان مکان بھی تیار کر سکتے تھے لیکن انہی کرپشن والوں کے خطرے سے وہ بھی اپنی جائز آمدنی سے زیادہ حیر پھیلانے سے گریز ہی کرتے تھے۔ اوپر کی آمدنی وہ گورنمنٹ کی مختلف اسکیموں میں غریب رشتے داروں یا فرضی نام سے انویسٹ کر کے فائدہ وصولیے رہتے تھے۔

دلربا اسی بلاک کے بنگلہ نمبر 1 فورٹین میں رہتی تھی اس کے والد کو فوت ہوئے آٹھ سال گزر چکے تھے ماں جو ایک اسکول میں ٹیچر تھی اس کی عمر بھی زیادہ بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔ گزرتے وقت اور شوہر کی جدائی نے اس کی کسرتوڑ دی تھی۔ والد کی پنشن اور اسکول کی تنخواہ پر گھر کا گزارہ چل رہا تھا۔ دلربا نے جیسے تیسے کر کے بارہ جماعتیں پڑھ لی تھیں۔ میٹرک پاس کرنے تک اسے اپنی تنگ دامن کا احساس بھی نہیں ہوا لیکن کالج میں قدم رکھتے اسے اپنی غربت کا احساس اس قدر شدت سے ہوا کہ وہ اپنے ڈمگاتے قدم سنبھال نہ سکی۔ مادر پدر آزاد تہذیب اور ماڈرن فیشن کے تقاضے اس کی آنکھوں میں چکا چونڈ پیدا کرتے رہے۔ ہم جماعت سہیلیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ حسین خدو خال کی مالک ہونے کے علاوہ ذہین بھی تھی۔ دلربا کی ان خوبیوں کو سب سے پہلے اس کی ہم جماعت سہیلی نے بھانپ لیا جو بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ لڑکوں سے بھی فلت کر کرنے کی عادی تھی پھر ایک بوائے فرینڈ کے بے حد اصرار پر اس لڑکی نے دلربا سے بھی دوستی کی پیشگی بڑھائی شروع کر دی۔ اس کے پاس نئے ماڈل کی چمچاتی کار تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ دلربا نے جب پہلی بار اس کے ساتھ کالج سے واپسی کا سفر کیا تو یوں لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

مہینے دو مہینے کی ملاقاتوں کے بعد وہ فریال نامی لڑکی سے اس حد تک کھل مل گئی کہ اس کے ساتھ بڑے بڑے ریٹورنٹ میں بھی جانے لگی۔ گیارہویں جماعت کے امتحان کے دوران دلربا کی ملاقات فریال کے بوائے فرینڈ نجم سے بھی ہوئی جو خود بھی بڑے باپ کا بیٹا تھا فریال دلربا کی موجودگی میں بھی نجم سے خاصی بے تکلفی سے ملتی تھی۔ دلربا ان کی گفتگو میں زیادہ حصہ نہیں لیتی تھی لیکن نجم کی مردانہ وجاہت اور برجستہ چہرے جھلنوں سے وہ بھی متاثر ہوتی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ دلربا کے ذہن میں روشن معاشرے کی تہذیب کے جراثیم بھی داخل ہوئے تو اسے اپنی غربت کا احساس زیادہ شدت سے ہونے لگا۔ فریال نے دلربا کی اس کمزوری کو بھانپ کر اسے بڑی خوبی سے شیشے میں اتارنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس پر پوری طرح حاوی ہو گئی۔ گیارہویں جماعت کے دوران ہی ایک روز اس نے دلربا سے کہا تھا۔

”تم جو زندگی گزار رہی ہو مجھے اس کا احساس ہے لیکن دنیا ایسے لوگوں کو بیک ورڈ کہتی

ہے۔ وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی خاطر دولت کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ تم کسی پرائیویٹ فرم میں ملازمت کیوں نہیں کر لیتیں؟“

”ملازمت؟“ دلربا نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”سروس حاصل کرنے کے لیے تجربے کے علاوہ ڈگریوں کی بھی ضرورت پیش آتی ہے وہ میں.....“

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ نجم کے والد جس عہدے پر ہیں ان کا صرف ایک فون ہی تمہیں دس ہزار روپے کی پارٹ ٹائم جاب دلوا سکتا ہے ایک سال کا تجربہ اور ایف ایس سی کی سند حاصل کرنے کے بعد تم کو اچھی ملازمت بھی مل جائے گی۔“

دلربا نے اس پیشکش کو چند لمحوں کی کمزور ہچکچاہٹ کے بعد قبول کر لیا۔ ملازمت کے لیے وہ تین گھنٹے نکالنے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ کام بھی زیادہ نہیں تھا لیکن ماں کی اجازت لینے کے لیے اس کو منت سماجت کرنی پڑی تھی پہلی تنخواہ ملنے پر اس نے فریال اور نجم کو ایک چائینر ہوٹل میں دعوت دی تھی۔ اس موقع پر ملے بے کرنے میں نجم نے جلدی کی۔ دلربا کی بے حد خند کے بعد نجم نے فریال کے کہنے پر اس بات کی پیش کی کہ دلربا دوبارہ باربی دے تو وہ مل کی ادائیگی خود کر دے۔

یوں دلربا اور نجم کی بے تکلفی بڑھنے لگی۔ نجم کے علاوہ اس کے باپ کی سفارش کا ہی نتیجہ تھا کہ دلربا کو تین گھنٹے پارٹ ٹائم کا معاوضہ پندرہ ہزار مل رہا تھا پک اینڈ ڈراپ کی سروس نے بھی اس کے دفتر آنے جانے میں آسانی کر دی تھی۔ دلربا ان حالات سے بہت خوش تھی۔ نجم نے اسے یقین دلایا تھا کہ ایف ایس سی کر لینے کے بعد وہ فل ٹائم جاب بھی دلوا سکتا ہے جس کی تنخواہ بھی چالیس پینتالیس ہزار سے زیادہ ہو سکتی تھی ملازمت کے ساتھ ہی پرائیویٹ امتحان دے کر وہ بی اے بھی کر سکتی تھی۔

دلربا کی ماں کو احساس تھا کہ بیٹی نے زندگی گزارنے کی خاطر جو راستہ اختیار کیا وہ غلط ہے۔ وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑانے لگی تو ماں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ وہ بوڑھی ہو چکی تھی۔ گھر میں کوئی اور بڑا نہیں تھا جو دلربا کو وقت اور حالات کے نشیب و فراز سے آگاہ کر سکتا۔ وہ عمر کی اس منزل پر تھی جہاں خواہشات کا سمندر ہمیشہ ٹھانٹیں مارتا رہتا تھا۔ خواہشات، امنگوں اور آرزوؤں کے تقاضے کم ہونے کے بجائے ہبک ہبک کر سر ابھارتے رہتے تھے۔

دلربا پر ملازمت دلوانے کے بعد نجم کی نوازشیں بھی بڑھنے لگیں۔ پہلے وہ فریال اور نجم اکٹھا آتے جاتے تھے۔ اب وہ اکثر نجم کے ساتھ شاپنگ پر چلی جاتی تھی۔ فریال نے بھی اعتراض بھی نہیں کیا۔ نجم اسے آئے دن کسی نہ کسی بہانے سے کوئی قیمتی چیز گفٹ کے طور پر دیتا رہتا پھر ایک دن دلربا اس کے ساتھ ساحلی علاقے میں اس کی ہٹ تک بھی چلی گئی جس کا علم اسے پہلے سے نہیں تھا۔ نجم نے بھی صرف سمندر کے کنارے ننگے پاؤں گھومنے کو کہا تھا۔ جب وہ اپنی ہٹ کے قریب جا کر رکا تو دلربا نے اس ہٹ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کس قدر خوب صورت ہٹ ہے۔ خاص طور پر اوپری حصے کا ٹیرس۔ لوگ یہاں آ کر کیا کرتے ہیں؟ کیا یہ فضول خرچی نہیں ہے؟“

”یہ بڑے آدمیوں کے شوق ہیں۔“ نجم نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک ہفتے کی شہری زندگی کی ہلچل اور شور و غل سے تھک کر وہ یہیں پرسکون ساحل پر آکر ایک دن سکون سے گزارتے ہیں۔“

”تم یہاں آکر رک کر کیوں گئے؟“ دلربا نے احساس کمتری کا کھل کر اظہار کیا۔ ”لوگ کیا سوچیں گے؟ یہی کہیں گے کہ ہم اندر نہیں جاسکتے تو اس کے کھلے دروازے کی چھت کے نیچے بیٹھ کر کچھ وقت ہی گزار لیں گے۔“

”پھر کیا فرق پڑے گا۔“

”مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ لوگ ہمارے بارے میں کوئی ایسی دلی باتیں کریں۔“

”وہ اس کے علاوہ بھی تو کچھ سوچ سکتے ہیں۔“ نجم کا جملہ معنی خیز تھا۔

”کیا؟“ دلربا نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا سوچ سکتے ہیں وہ؟“

”یہی کہ ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے جو ہم یہاں بے تکلفی سے محو رہے ہیں۔“

”اوہ.....“ دلربا مطلب سمجھ کر قدرے شرمائی۔

”میں لوگوں کی زبان بند کرنے کی خاطر اس خوب صورت ہٹ کے تالے بھی توڑ سکتا ہوں تمہارے لیے۔“

نجم نے قدرے جذباتی انداز میں کہا پھر ہٹ کے دروازے میں گیا تو دلربا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”نہیں نجم پلیز نہیں، یہ اچھی بات نہیں ہوگی اگر..... اگر پکڑے گئے تو مفت کی بدنامی علیحدہ ہو گی۔“

”اوہ اگر میں یہ کہوں کہ اس ہٹ کے تالے تم توڑ دو.....“

”میرے باپ کی توبہ۔“ دلربا نے مسکرا کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔

نجم نے اس کی جمیل نما نظروں کی گہرائی میں ڈوب کر دیکھا پھر جب اس نے جیب سے کی چین نکال کر ہٹ کا لاک کھولا تو دلربا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اندر جا کر اس نے وہاں کے قیمتی فرنیچر پر غور کیا تو دنگ رہ گئی۔ تعجب اور تجسس کی نظروں سے نجم کو دیکھا تو وہ کسی خیال سے شرما کر رہ گئی۔ ایسے میں نجم نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تو دلربا کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو نے لگیں۔ اس نے دور ہونے کی کوشش کی تو نجم کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ سرسراتے لہجے میں بولا۔

”تم نے جس سوسائٹی کو اپنا لیا ہے وہاں تکلف سے کام نہیں لیا جاتا۔ کم ان سویٹ ہارٹ۔“ نجم کی نگاہوں میں نشہ گھٹنے لگا۔ دلربا کے اندر خوف کی ایک لہر ابھری۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن وہ خود کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ طوفان گزر گیا تو نجم نے اس کی ہانسی پکڑ لی۔

”گھبراؤ مت ہر کام پہلی بار مشکل نظر آتا ہے پھر آسان ہو جاتا ہے فریال کا بھی پہلی بار یہی حال ہوا تھا۔ اب تو وہ اکثر ویک اینڈ پر یہاں آنے کی خود فرمائش کرتی ہے۔“

اس وقت بھی دلربا کے ذہن میں زندگی کا وہی پہلا موڑ سراجا رہا تھا جب وہ ہاتھ روم سے

بچکے جسم کو ٹاول کے ڈریسنگ گاؤن میں لپیٹے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی۔ اس پہلے موڑ نے اسے زندگی کی جس بلندی پر پہنچا دیا تھا اس کا تصور اکثر لڑکیوں کے لیے صرف ایک خواب بن کر رہ جاتا ہے۔

دلربا کے بعد فریال بھی کئی بار نجم کی ہٹ میں اس کے ہمراہ گئی تھی۔ وقت نے اسے بے باک اور بے حجاب کر دیا تھا۔ کالج کے امتحان کے بعد ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو دلربا کو اپنی تنہائی کا احساس بھی ہوا لیکن اب اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کا اس نے کبھی خواب دیکھا تھا۔

فریال کی معرفت ہی اس کی رسائی سکندر علی شاہ تک ہوئی جو پہلی ہی نظر میں اس کی خوبصورتی کا دیوانہ ہو گیا تھا اس نے دلربا کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ اسے زندگی کی وہ تمام آسائشیں مہیا کر دیں جن کا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے عوض دلربا کا کام سکندر علی شاہ کے لیے لڑکیاں فراہم کرنا تھا۔ شروع شروع میں اسے اس کام میں دشواری ہوئی لیکن پھر اس نے معصوم لڑکیوں کی خوبصورتی اور غربت کو دولت کے سنہری جال میں شکار کرنے کا فن بھی سیکھ لیا تھا جس کے عوض اسے دنیا کی ہر آسائش مل گئی تھی۔ اب فریال اور نجم بھی اس کے قریب آنے سے ڈرتے تھے۔ سکندر علی شاہ کا نام ہی خوف کی علامت بھی تھا جس نے دلربا کو ہر قسم کا تحفظ فراہم کر رکھا تھا۔

ماں کی زندگی میں ایک ذرا سی نگاہوں کی روک ٹوک جو تھی وہ بھی اس کے مرنے کے بعد ختم ہو گئی۔ نیچے کا کمر اس نے اپنی ماڈرن ملازمہ کو دے رکھا تھا جو رات دن اس کے ساتھ ہی رہتی تھی کچن کے علاوہ نیچے کے سارے کام اسی کے ذمے تھے۔ گارڈ اور ڈرائیور کی کارکردگی کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی تھی۔ دلربا کی آنکھوں کے اشاروں کو سمجھنا ان پر عمل کرنا بھی اسے آتا تھا۔ خوب صورت خدو خال کی مالک بھی اسی لیے دیکھنے والے بھی اسے دلربا کی سیکرٹری ہی سمجھتے تھے۔ نو جماعتیں بھی پڑھ رکھی تھیں۔ اس لیے گھر کا سارا حساب کتاب بھی رکھنے کے سلیتے سے بہ خوبی واقف تھی لیکن دلربا کی اجازت کے بغیر اس نے کبھی اوپر جانے کی جرأت بھی نہیں کی تھی۔

گزرے وقت اور سکندر علی شاہ کی مہربانیوں نے دلربا کو بڑے اور بے فکرے لوگوں کی طرح زندگی گزارنے کا فن بھی سکھا دیا تھا۔ وہ اپنے معمول پر عمل کرنے کی عادی تھی۔ صبح گیارہ بجے سو کر اٹھنا اور رات کو ساڑھے دس بجے غسل کر کے ڈنر کرنا اس کی عادت تھی۔ اپنے بیڈ روم کو اندر سے لاک رکھنا بھی اس کی پرانی عادت تھی۔ اس وقت بھی رات کے ساڑھے دس بجے وہ سفید ٹاول کے گاؤن میں ہاتھ روم سے نکل کر سیدی ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ برش سے بالوں کو سنوارنے کے علاوہ اپنے نیم عریاں جسم پر بھی اس کی مسکراتی نگاہیں بھٹک رہی تھیں جب دروازے کے لاک سے ہلکی سی ٹک کی آواز سن کر چونکی پھر اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ آنے والا چہرے بشرے سے بھی خطرناک نظر آ رہا تھا اس کے ہاتھ میں موجود اعشاریہ دو پانچ کے پستول نے بھی یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا ہوگا۔

”کون ہو تم؟“ دلربا نے خود کو سنبھال کر آنے والے کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”یہاں آنے کی

جرات کیسے کی؟“

”خوب صورت چہروں اور تراشیدہ جسوں کی تصویریں رکھنا میری ہابی ہے۔“ آنے والے نے جیب سے اپنا قیمتی موبائل نکال لیا۔ ”یہاں تک جان پہچانی پر رکھ کر آنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ اگر تم نے بات مان لی تو صرف ایک دو تصویریں اتار کر چلا جاؤں گا انکار یا شور مچانے کی حماقت کی تو پھر بات بگڑ بھی سکتی ہے۔ سوچ لو، جب تمہارے گاڑی مجھے یہاں تک آنے سے نہیں روک سکے تو تم بھی کیا کر سکو گی؟“

بات دلربا کی سمجھ میں آگئی اس نے پھر بھی کشیدہ لہجے میں کہا۔ ”تصویروں کے ذریعے تم لڑکیوں کو بلیک میل کرتے ہو گے؟“

”سیدھی انگلی سے کھی نکل آئے تو تصویروں سے لگا ہیں سینکڑا ہوں دوسری شکل میں ان تصویروں کی اچھی خاصی قیمت بھی مل جاتی ہے۔ اس کے بعد میں درمیان سے ہٹ جاتا ہوں۔“ آنے والے نے بے پردائی سے کہا۔ ”جو فیصلہ کرنا ہے جلدی کرو۔ میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ گاؤں کا اوپر حصہ ذرا کشادہ کر کے ایک تو بہ شکن انگڑائی کا پوز بنا لو۔ میں دو تصویریں لے کر اگلے قدموں واپس چلا جاؤں گا۔“

دلربا چند لمحے اسے تیز نظروں سے گھورتی رہی اس کے پاس حکم بجالانے کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ مطلوبہ پوز کی فرمائش پوری کر دینے کی صورت میں وہ اسے بعد میں فیشن ماڈلنگ کا نام بھی دے سکتی تھی۔ اس نے سچویشن کو بھانپنے کے بعد آنے والے کی بات مان لی۔ اس کے انگڑائی لیتے ہی روشنی کے دو پلکے جھماکے ہوئے پھر دلربا نے گاؤں ٹھیک کر کے اسے دوبارہ سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

”تم اگر چاہو تو تصویروں کو میرے سامنے ڈیلیٹ کر کے اچھی خاصی رقم بھی حاصل کر سکتے ہو۔“

”پروفیشنل ہوتا تو منہ مانگی قیمت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ وصول کر لیتا لیکن تمہاری تصویریں میری کلیکشن میں صرف اضافہ ہی کریں گی۔ اسے میری ہابی ہی سمجھو۔“

وہ اپنا جملہ مکمل کر کے تیزی سے باہر نکل گیا۔ دلربا نے اپنی ڈولتی سانسوں کو سنبھالا اور پھر وہ نیچے گئی جہاں ڈرائنگ روم میں خاص ملازمہ اس کی منتظر تھی۔ دلربا نے دو قدم بڑھا کر باہر کی سمت بھی جھانکا۔ ڈیوٹی گاڑی بھی چوکس نظر آ رہا تھا۔ دلربا ڈرائنگ نیبل پر آگئی۔ کھانے کے دوران اس کے ذہن میں دو ہی باتیں ابھر رہی تھیں۔

”یا تو آنے والا محققہ بنگلوں کا کوئی رہائشی تھا جو اوپر کی تقریباً پھتوں کے ذریعے اس کی خواب گاہ تک آسانی سے پہنچ گیا تھا یا پھر کسی اجنبی نے بھی ان ہی آسان راستوں کو استعمال کیا ہو گا مگر وہ کون تھا؟ دو ہاف نیوڈ (Half Nude) تصویریں اتارنا کیا واقعی اس کی ہابی تھی۔ یا اصل مقصد کچھ اور بھی تھا؟“



دکان پر ہونے والی تھوڑی بھڑ اور حملہ آوروں کی جسارت نے جگا کے ذہن میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ کبھی وہ ایک، دس پر بھاری تھا لیکن حلال رزق کمانے اور سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی تھی۔

وہ اورنگ زیب کے برابر والی نشست پر بیٹھا دل ہی دل میں حملہ آوروں کے بارے میں بیچ و تاب کھا رہا تھا، وہ اسے ذہنی کی عام واردات نہیں سمجھ رہا تھا۔ جو بھی تھے کسی خاص منصوبے کے تحت آئے تھے۔ نیچر اور ملازم کو قابو کر لینے کے بعد وہ جگا تک ضرور پہنچے پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اندر آنے والے اگر جگا کا شکار بھی ہو جاتے تو باہر جو نفری موجود تھی وہ بھی ان کی جگہ لینے سے دریغ نہیں کرتی۔

پتول کی گولیاں ختم ہو جاتیں تو شاید جگا کو دوبارہ اسے بھرنے کا موقع بھی نہ ملتا لیکن لوچن نے بردقت پشت سے آکر کھیل کی بساط پلٹ دی تھی۔ اگر لوچن نہ آ جاتا تو جگا کے ہاتھ پھر خون آلود ہو جاتے۔ قانون کے رکھوالے پھر گڑے مردے اکھاڑنے پر آمادہ ہو جاتے۔ اس کی پرانی فائل بھی سرد خانے سے نکل کر سامنے آ جاتی۔ ماضی کی طرح ایک بار پھر وہ حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا جاتا۔ بنی بنائی کاروباری سا کھ بھی تباہ ہو جاتی۔

جگا کے ذہن میں یہی خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے جب اورنگ زیب کی آواز اس کے کانوں سے گزرائی۔ ”کیا سوچ رہے ہو.....؟“

جگانے چونک کر اورنگ زیب کی سمت دیکھا، کسمسا کر بولا۔

”سر..... آج دوسری بار کسی نے اچانک میری شرافت کو داغ لگانے کی کوشش کی ہے اور آج..... آج بھی آپ کے درمیان میں آ جانے سے کھیل ادھورا رہ گیا اور نہ.....“

”تمہارا شبہ کن لوگوں پر ہے.....؟“ اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر سوال کیا۔

”کوئی پرانا دشمن ہی ہو سکتا ہے“ جگانے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

”لوچن کیا اچانک درمیان میں آ گیا تھا؟“

جگا اس سوال پر چونکے بغیر نہ رہ سکا پھر اس کے ذہن میں نگینہ کو رینو کلب سے اغوا کرنے اور اس کا گفٹ پیک بنا کر سکندر علی شاہ کو روانہ کرنے کی کہانی گونجنے لگی۔ لوچن نے بھی اس شبہ کے پیش نظر نگینہ کے ذریعہ سکندر علی شاہ کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی کہ اسے بھی شیخ حامد سے کچھ پرانے حساب بے باقی کرنے تھے۔ لوچن کا خیال تھا کہ شیخ حامد تک پہنچنے کے لیے سکندر علی شاہ بھی ایک موثر

ذریعہ ثابت ہو سکتا تھا۔

”تم خاموش کیوں ہو گئے؟“ اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ ”تمہاری دکان

پر حملہ کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ..... کہا جاسکتا ہے لیکن لوچن کی اسی وقت آمد کو کیا کہا جائے گا؟“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ صاحب لیکن ایک بات میں بھی دریافت کرنا چاہوں گا۔“ جگا

نے بات جاری رکھی۔ ”کیا سکندر علی شاہ کے ڈانڈے بھی آپ کے آکٹوپس سے ملتے ہیں؟“

اس بار اورنگ زیب کے چونکنے کی باری تھی۔ اس نے جگا کو غور سے گھورتے ہوئے سپاٹ

لہجے میں دریافت کیا۔ ”تمہارے دماغ میں یہ سوال کیوں ابھرا؟“..... جواب میں جگا کے گلینہ کے

اغوا اور اس کے گفٹ پیک کی کہانی تفصیل سے بیان کی تو اورنگ زیب کے تجسس میں ایک برقی لہر

دوڑ گئی۔ اس کے ذہن میں میں پہلا نام سراج کا ابھرا..... اس نے بھی سکندر علی شاہ کے فارم ہاؤس

کے علاوہ خود سکندر علی شاہ پر بھی اس شہجے کے امکانات کی بات کی تھی، لوچن بھی اسی لائن پر قدم اٹھا

رہا تھا اور..... سکندر علی شاہ نے بھی پہلی ملاقات میں اورنگ زیب کی ایک کم گشتہ کہانی کو دہرا کر اسے

چونکا دیا تھا؟

”کیا یہ سب محض اتفاق تھا.....؟“

”ملاقات کے دوران سکندر علی شاہ نے منہ بنا کی کس کی کال ریسیو کی تھی؟ پھر دوسری جانب

سے جو آواز ابھری اسے سن کر وہ ایک ہل میں موم کیوں ہو گیا تھا؟“

”فون کرنے والا کون تھا؟“

”اور..... اس فون کے آنے کے بعد ہی سکندر علی شاہ نے پرانے زخموں کو کرید کر اورنگ زیب

کو فارم ہاؤس میں نفسیاتی علاج کا مشورہ کیوں دیا تھا.....؟“

اورنگ زیب کے ذہن میں مختلف سوالات ابھر کر آپس میں گلدنڈ ہوتے رہے۔ جگانے اس

کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ کچھ دیر بعد اورنگ زیب نے گاڑی

سڑک کے کنارے روک دی۔ جگا سے اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

”آئندہ سے جلد بازی میں میک اپ کرنے کی غلطی نہ کرنا..... گلینہ کی نگرانی پر کچھ اور لوگ بھی

ضرور تعینات ہوں گے جنہوں نے لوچن کو نہیں لیکن تمہیں ضرور شناخت کر لیا تھا۔“

”پھر؟ کیا میں وقتی طور پر کاروبار بند کر دوں؟“ جگا کو پھریری آگئی۔ ”صرف آپ کا خیال

ہے صاحب ورنہ.....“

”کھاری سوڈے کی بوتل کی طرح ایک دم ابل پڑنے کی عادت ترک کر دو.....“ اورنگ زیب

نے سرزنش کی۔ ”میرا مشورہ ہے کہ محتاط رہو، دکان کی نگرانی اب میرا ذمہ ہے۔“

”آپ کا ملازم ہوں صاحب..... جیسا حکم دیں گے ویسا ہی کروں گا۔“ جگا خاموشی سے اتر گیا

تو اورنگ زیب کی گاڑی دوبارہ حرکت میں آگئی۔ جگا کے بیان کی روشنی اور سکندر علی شاہ سے پہلی

ملاقات کے سلسلے میں بے شمار سوالات ابھرتے رہے۔ خاصی دیر تک وہ ڈور کا آخری سرا تلاش کرتا

رہا پھر اس نے موبائل نکال کر میڈم روبی کے نمبر ملائے۔ دوسری جانب سے خود میڈم روبی نے کال

ریسیو کی تھی۔

”اورنگ زیب بول رہا ہوں۔“

”زہے نصیب.....“ میڈم نے خوش گوار انداز میں کہا۔ ”اس وقت کیسے یاد آگئی؟“

”ایک درخواست کرنی تھی.....“ اورنگ زیب نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”کوئی ایسا قدم جو

قانونی نکتہ نگاہ سے اہم ہو، اس کے بارے میں دوستوں سے مشورہ کر لینا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔“

”آپ کا اشارہ کس سمت ہے.....؟“

”لوچن اور گلینہ.....“

”اوہ.....“ میڈم نے بات سمجھ کر کہا۔ ”اگر بات قانونی اعتبار سے الجھ گئی ہے تو معذرت

چاہوں گی لیکن جو شخص مرکز زندہ ہو گیا ہے اس نے ماضی کے کچھ زخم بھی تازہ کر دیے ہیں۔ میرے

مرحوم شوہر نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ روبی مجھ سے وعدہ کر دو..... تم ان زخموں کا حساب گن گن

کر چکنا کرنا جو میرے جسم اور میری روح کو پہنچائے گئے ہیں۔ مجھے ذہن کرنے کے بعد میری اس

آخری خواہش کو فراموش نہ کر دینا.....“ میڈم کی آواز رنڈھنے لگی۔ ”میں نے اس خواہش کے احترام

میں پوسٹ مارٹم کرائے بغیر ہی اپنی زندگی کی تمام خوشیوں کو بھی خاموشی سے دفن کر دیا تھا..... اور آج بھی

مرنے والے کا آخری مطالبہ میرے کانوں میں سوتے جاگتے صدائے بازگشت بن کر گونجتا رہتا

ہے۔“

”آئی ایم سوری۔“ اورنگ زیب نے میڈم کی سسکیوں کی آواز سن کر وضاحت کی۔ ”آکٹوپس

کو کیفر کردار تک پہنچانا میری زندگی کا بھی ایک اہم فریضہ ہے۔ میں بھی اسے نظر انداز نہیں کروں گا

لیکن میں نے صرف اتنا عرض کیا ہے کہ ایسا قدم اٹھانے سے پیشتر دوستوں سے.....“

”اس کے لیے میں معذرت کر چکی ہوں۔“ میڈم نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب

دیا۔ ”آئندہ خیال رکھوں گی۔“

”آپ کے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔“ اورنگ زیب نے میڈم کے زخموں پر مرہم رکھنے

کے خیال سے کہا۔ ”لوچن نے گلینہ کے سلسلہ میں جو قدم اٹھایا ہے۔ اس کے بعد آکٹوپس کے ملنے

کے کچھ امکانات روشن ہوتے نظر آ رہے ہیں۔“

”پھر..... ایک درخواست میں بھی کروں گی۔ اگر وقت اور موقع اجازت دے تو مجھے بھی مرحوم

کی خواہش پوری کرنے کا کچھ وقت ضرور دیجئے گا۔“

”حالات اگر میرے اختیار میں ہوئے تو آپ کو باپس بھی نہیں کروں گا۔“ اورنگ زیب نے

جواب دیا پھر چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

کچھ ضروری کام نمٹانے کے بعد وہ سراج کی رہائش گاہ پر پہنچا تو الماس اور سراج دونوں شام

کے کھانے پر اس کے منتظر تھے، سراج خلاف توقع کچھ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اورنگ زیب نے صورت

حال معلوم کرنے کی خاطر الماس سے مسکرا کر پوچھا۔
 ”خیریت تو ہے..... اس وقت موسم کچھ بدلا بدل نظر آ رہا ہے؟“
 ”درجہ حرارت عام سطح سے کچھ زیادہ ہی ہے۔“
 الماس نے دبی زبان میں کہا پھر سراج کو محبت سے دیکھتے ہوئے چائے لینے چلی گئی۔
 ”کوئی خاص بات؟“

”آج کل آپ بڑے بڑے فیصلے بھی تنہا کرنے لگے ہیں۔“ سراج نے شکورہ کیا۔ ”میں ماتحت ہوں اس لیے.....“
 ”حمایت نہیں۔“ اورنگ زیب نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات لیکن وہاں جانے کا خیال بس اچانک ہی ذہن میں آ گیا تھا۔
 ”آپ کو دیکھ کر اسے حیرت تو ہوئی ہوگی۔“

”میں اس سے وقت لے کر گیا تھا۔ ملاقات بڑے دوستانہ ماحول میں ہوئی..... اور میرا خیال ہے کہ میرا وقت ضائع نہیں ہوا۔“ اورنگ زیب نے جگا کی دکان پر حملے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا، نگینہ کے اغوا والی کہانی بھی دہرا دی۔

”میں نہیں سمجھتا کہ سکندر علی شاہ آپ کو اپنی حویلی میں دیکھ کر خوش ہوگا۔“ سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ آپ کی ملاقات کو بھی نگینہ کے سلسلہ کی ایک کڑی سمجھ رہا ہوگا۔“
 ”میں تمہارے خیال کی تردید نہیں کروں گا لیکن مجھے بھی جگا سے نگینہ والی بات بعد میں معلوم ہوئی ہے۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ”تمہارے لیے ایک اور چونکا دینے والی خبر بھی ہے میرے پاس..... سکندر علی شاہ نے مجھے فارم ہاؤس آنے کی باقاعدہ دعوت بھی دی ہے۔“
 ”وہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی ہوگا آپ کے علم میں؟“

”دعوت بھی مع لوازمات کے دی گئی ہے اور میں نے قبول بھی کر لی ہے لیکن سوچنے کے لیے کچھ وقت بھی لے لیا ہے۔“
 ”کوئی خاص مصلحت؟“

جواب میں اورنگ زیب نے پوری تفصیل بتائی تو سراج بھی سنجیدہ ہو گیا۔ الماس چائے لے کر آگئی تھی اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ چائے پینے کے بعد سراج اور اورنگ زیب لاؤنج میں آگئے۔ الماس گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔
 ”آپ نے اپنی ذہنی کیفیت کی کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی، اس رنگے سیار کو؟“ سراج نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”ہاں.....“ اورنگ زیب نے بات بنائی۔ ”کام کی مصروفیات اور کچھ ذاتی پریشانیاں۔“
 ”جو فون درمیان میں آیا..... وہ کس کا ہو سکتا ہے؟“
 ”یہی بات میرے ذہن میں بھی چھ رہی ہے..... تمہارے رنگے سیار نے اس فون کے آنے

کے بعد ہی مجھے فارم ہاؤس کا انویٹیشن دیا تھا۔“
 ”گو یا میرا انداز درست بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جگہ آپ کے آکنولیس کے لیے بھی بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے۔“
 ”ہاں..... لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ کم از کم سکندر علی شاہ براہ راست شیخ حامد سے واقف نہیں ہوگا۔“

اورنگ زیب نے موضوع بدل کر پوچھا۔ ”افضل خان کے فلیٹ پر ہونے والے حملے کے بارے میں کیا رپورٹ ہے۔“
 ”فائرنگ ورائٹی سپراسٹورز کے چھت سے کی گئی تھی۔ بلڈنگ کے چوکیدار کا بیان ہے کہ کوئی ملکیت کسی سگنل ٹاور کو ٹھیک کرنے کا کہہ کر چھت پر گیا تھا۔ پلیٹیا کے لباس میں ہونے کی وجہ سے وہ کسی ادارے کا درکر ہی نظر آ رہا تھا۔ چھت سے رائفل میں استعمال کی جانے والی گولیوں سے تین خول بھی مل گئے ہیں۔“

”کون تھا وہ؟“..... اورنگ زیب نے سوال کیا۔
 ”ابھی ہمارے محکمے کے پاس الدین کا کوئی ایسا جادوئی چراغ نہیں ہے جسے گھسے ہی.....“
 ”میرے پاس اس کے علاوہ طلسمانی انگوٹھی بھی ہے۔“ مائی ڈیہ..... ”اورنگ زیب نے بے تکلفی سے کہا۔ ”جس نے گولی چلائی وہ بھی مرکز دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔“
 ”میرا اشارہ و شنو کی طرف ہے جو چتا کی آگ میں، لوگوں کے خیال کے مطابق جل کر راکھ ہو چکا ہے۔“

”آپ.....“ سراج نے پلکیں جھپکاتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ”کیا آپ مجھ سے.....“
 ”مذاق نہیں..... حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ”شیشاں گھاٹ جاتے وقت جس گاڑی میں وشنو کی اڑتی رکھی تھی اس میں راستے کی پولیس چوکی سے میرا ایک آدمی بھی سوار ہو گیا تھا۔ چتا کی آگ بھڑکنے سے پہلے اس نے قریبی جھاڑیوں میں جا کر فائر کیا تھا۔ لوگوں کی توجہ ادھر گئی تو وشنو کا مردہ چھلانگ لگا کر اندھیرے میں فرار ہو گیا تھا۔“
 ”بات ابھی واضح نہیں ہوئی..... اگر آپ کا سادہ لباس والا فائر نہ کرتا تو.....؟“

”دوسری شکل میں بھی وشنو آگ میں جلنا پسند نہ کرتا..... میں نے یہ محض ایک شبے کی تصدیق کی بنا پر ایسا کہا تھا جسکا فائدہ وشنو جیسے عیار مجرم کو مل گیا..... جس وقت کرنل احتشام نے اس کے مرنے کی اطلاع دی تھی اس وقت میرے ذہن میں جس دم کا خیال ابھرا تھا..... یہ ہندو جوگیوں کا ایک عمل ہے جس میں وہ سانس روکنے کی مشق کرتے ہیں اور پھر حیرت انگیز صلاحیتوں کے بعد سے میرا ایک آدمی برابر سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ورائٹی سپراسٹور کے باہر بھی موجود تھا۔ اس کے بعد وشنو وہاں سے نکل کر کہاں گیا اور اس وقت کہاں ہے یہ بھی میرے علم میں ہے۔“
 ”فائن.....“ سراج نے قدرے طنزیہ انداز اختیار کیا۔ ”اگر اس بدذات کی چلائی ہوئی گولیاں

افضل خان اور شبنم کو چاٹ جاتیں تو پولیس کے علاوہ ملٹری انٹیلی جنس والے بھی ہاتھ ملتے رہ جاتے..... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں..... میں تم سے انگری (Agree) کرتا ہوں مگر ہم پولیس والوں کو بھی علم غیب نہیں آتا..... سسٹان زینوں پر دشمنوں کا تعاقب میرے آدمی کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن اب..... اب میں نے ایک آخری فیصلہ کر لیا ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”جس کی زندگی بچ گئی وہی دشمنوں کے حق میں ملک الموت بھی ثابت ہوگا۔“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے بڑے گھبر لہجے میں جواب دیا۔ ”جنگ نے گنبد کے سلسلے میں جو تفصیلات بتائی ہیں۔ اب اس کی کچھ گہریں بھی کھلتی جا رہی ہیں۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ دشمنوں آکنوہس کے لیے کتنا اہم ہے۔ شمشان گھاٹ پر اگر میں اپنے شہیہ کی تصدیق کا تجربہ نہ کرتا تو آکنوہس کے زرخیز شکاری کتنے اسے فراکار موقع فراہم کر دیتے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں لیکن کیا اب آکنوہس کے آدمی بھی آپ کے سادہ لباس والے کا تعاقب نہ کر رہے ہوں گے؟“

”یقیناً کر رہے ہوں گے..... میں نے اسے بھی تمہارے اس خدشے سے آگاہ کر دیا ہے۔“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر کہا۔ ”موجودہ صورت حال کی روشنی میں شاید میں بھی منظر عام سے غائب ہو جاؤں۔“

”یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ سراج نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”میری زندگی میں آپ کو کوئی.....“

”جلدی بازی میں نتائج اخذ کرنے سے پرہیز کرنے کی عادت ڈالو..... میں تم سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ تم صرف ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہو.....“ اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”قانون شکنوں کو کٹہرے تک پہنچانے کی خاطر اکثر حالات کے پیش نظر کچھ غیر قانونی اقدام بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔“

سراج کچھ جواب دینا چاہتا تھا جب کرنل احتشام کی کال آگئی اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔



تین روز سے سکندر علی شاہ صرف حویلی میں اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ان تین دنوں میں اس نے کسی بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ پہلی بیوی کے پاس جاتے ہوئے اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ جسے اس نے ایک عرصے سے نظر انداز کر رکھا ہے وہ اس کے بارے میں کیا خیال کرے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس معصوم مشرقی عورت نے کل سکندر علی شاہ سے کسی بات کا شکوہ کیا تھا۔ اس نے دوبارہ آنے پر کسی نفرت کا اظہار کیا تھا۔ ایک گھریلو عورت کی طرح شوہر کی پذیرائی میں تن من دھن سے لگ گئی تھی۔ پہلی رات سکندر علی شاہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ اس کے احساسات کا خیال تھا

اور کچھ نگینہ کا خیال تھا جس نے اسے حالات کے ایسے دوراہے پر لاکھڑا کیا تھا جہاں اسے خود بھی کسی سمت کا یقین کرنا دشوار تھا۔

ایک طرف اس کا ذاتی فیصلہ تھا، نگینہ کے گند کو ہمیشہ کے لیے ہمیشہ سے کہیں ایسی جگہ دفنا دے جہاں سے دنیا کا کوئی فرد بھی اس کا کوئی سراغ حاصل نہ کر سکے۔ یہی ایک طریقہ تھا جس کو اختیار کر کے وہ نگینہ کے اغوا کرنے والوں کی بلیک میلنگ سے بچ کر بھی اپنی پیری مریدی کے ڈھونگ کو برقرار رکھ سکتا تھا لیکن اس کا نامعلوم محسن اس کے فیصلے میں حائل ہو گیا ہے۔ وہ سامنے ہوتا تو شاید سکندر علی شاہ اس سے بھی دو ہاتھ کرنے سے گریز نہ کرتا لیکن وہ نہ صرف اندھیرے میں تھا بلکہ سابقہ مہربانیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی باور کرا چکا تھا کہ وہ طاقت میں بھی سکندر علی شاہ سے زیادہ زور آور ہے۔

دوسری طرف سکندر علی شاہ نے اپنے محسن کی بات مان کر جو خطرہ مول لیا تھا وہ اس کے ذہن میں ایک ہلچل سی عمارت بنا رہا تھا۔ نگینہ سے شادی کے بعد اس نے دربار کے علاوہ نگینہ کو بھی اپنے لیے دلچسپی کا سامان تلاش کرنے کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی، خود نگینہ بھی جانتی تھی کہ سکندر علی شاہ کی نظروں سے گرنے کے بعد اس کی تمام حیثیت پانی کے پیلے کی طرح جھاگ بن کر رہ جاتی لیکن حالات نے اسے بھی شکار کر کے بے بس کر دیا تھا۔

سکندر علی شاہ اس وقت پہلی بیوی کے کمرے میں دیوان پر لیٹا حالات کی کشمکش سے دوچار تھا۔ اس کی پہلی بیوی جسے وہ بھی پیار سے گل کہہ کر مخاطب کرتا تھا اس کے دیوان کے قریب بیٹھی اس کا سر سہلا رہی تھی۔ خاصی دیر تک وہ شوہر کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا سراغ لگاتی رہی پھر دبی زبان میں بولی۔

”آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ سکندر علی شاہ نے اسے نیکی نظروں سے گھورا۔

”کوئی الجھن ہے جو آپ کے چہرے سے جھلک رہی ہے۔“ گل نے دل پر جبر کر کے بڑی حسرت سے کہا۔ ”کبھی میں نے بھی آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔“ آج بھی احساس ہے کہ آپ ہنسنے بولنے کے عادی ہیں۔ پہلے بھی اگر کبھی خاموش ہوتے تھے تو آپ سے یہی سوال کرتی تھی۔ اس وقت آپ اپنے دل کا حال کھل کر بتا دیتے تھے، ہم مل کر اس کا حل تلاش کر لیتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ میں آج بھی آپ کے کسی کام آسکوں۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہوگی۔

سکندر علی شاہ کی تجربہ کار نظروں نے گل کے سراپا پر نظر ڈالی۔ اس میں تازہ گلاب اور ٹہنی پر کھلے پھول کی مہک نہیں تھی لیکن اس کی اصلیت اور تازگی میں کہیں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ ایک ہی چھت کے نیچے دور ہو جانے کے باوجود اس نے کبھی کوئی شکوہ..... کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ جب بھی بھولے جیسے کبھی شوہر کا سامنا ہوتا تو وہ اس کے احترام میں دوپٹا سر پر ڈال لیتی۔ سب کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود اس نے کبھی بیزاری کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

”تم کس دھات کی بنی ہوئی عورت ہو؟“ سکندر علی شاہ نے نرم لہجے میں سوال کیا۔
 ”میں آپ کے سوال کا مقصد نہیں سمجھ سکی۔“ گل نے معصومیت سے جواب دیا۔
 ”تم..... تم میرے شب و روز کے مشاغل سے واقف ہو، پھر بھی تمہیں میری پریشانی کا احساس ہو رہا ہے۔“

”کیا نہیں ہوتا چاہیے؟.....“ گل کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔
 سکندر علی شاہ کے دل کا پتھر پگھلنے لگا۔ گل کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔
 ”تکینہ کے بارے میں تم کیا ہوگی.....؟“

”وہ..... وہ شرعی اعتبار سے آپ کی دوسری بیوی ہے۔“
 ”اور دوسری لڑکیاں جو آتی رہتی ہیں.....؟“
 ”وہ سب کھلونا ہیں.....“ گل نے نظریں جھکا کر کہا۔

”بچے بھی یہی کرتے ہیں..... ایک کھلونے کے بعد دوسرا بازار سے خرید لاتے ہیں جن کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی۔“

”تم اپنی حیثیت کے بارے میں کیا ہوگی؟“

”مجھے آپ کی منکوحہ بیوی ہونے پر فخر ہے۔ گل بھی تھا..... آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا.....“ گل کے لہجے میں صداقت تھی۔
 ”تمہاری یہی خوبی ہے جو آج بھی اس حویلی میں عزت سے بیٹھی ہو..... لیکن.....“ سکندر علی شاہ روانی میں کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

گل نے اس کے جملے کی نزاکت اور پختہ خاموشی کو محسوس کر کے قدرے سہے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ”کیا آپ کو تکینہ سے کہیں کوئی شکایت تو نہیں پیدا ہو گئی؟“
 ”تمہارے ذہن میں تکینہ کا نام کیوں ابھرا.....؟“

”آپ..... آپ بھول رہے ہیں کہ اس وقت آپ گل کی خواب گاہ میں ہیں۔“
 ”سکندر علی شاہ لا جواب ہو گیا۔ تا دیر گل کو نگاہوں میں ٹٹولنے کے بعد بولا۔“
 ”فرض کر لو کہ تکینہ کے بارے میں تمہارا خیال درست ہو تو..... تو کم تیار مشورہ دو گی؟“
 ”پودوں اور درخت میں فرق ہوتا ہے۔“ گل نے اپنا مفہوم بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا۔

”پودوں میں اگر کسی طرف جھکاؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس کو صحیح کرنے کے لیے بند لگا کر اس کی بندش مضبوط کر دی جائیں تو.....“

”ڈھکے چھپے الفاظ میں نہیں..... کھل کر بیان کرو۔“

”میرا خیال ہے کہ اس وقت آپ کو صرف سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔“ گل نے اپنائیت سے کہا۔ ”آپ ادھر جا کر مسہری پر آرام کریں۔ صبح تروتازہ ہو کر انہیں گے تو پھر بات

ہوگی۔“

”تم کہاں لیٹو گی.....؟“ سکندر علی شاہ نے گل کو ترچھی نظروں سے گھورا۔

”جہاں آپ حکم دیں گے.....“ گل نے نظریں جھکا لیں لیکن آنسوؤں کے ان قطروں کو نہ روک سکی جو بے اختیار ہو کر اس کی پلکوں سے ڈھلک گئے تھے۔

سکندر علی شاہ آہستہ سے اٹھا۔ اس نے گل کا ہاتھ تھام کر سوچا۔ مسافر تھکا ہوا تو کسی پرانے درخت کا سایہ بھی اس کے لیے سکون بخش ہوتا ہے..... ”تم اور میں آج پھر ایک ہی مسہری پر رات گزاریں گے۔“

گل خاموشی سے شوہر کے حکم کے احترام میں اس کے ساتھ بستر پر چلی گئی۔ اس رات سکندر علی شاہ کو ایک عرصے بعد وقتی نہیں بلکہ قطعی سکون حاصل ہوا تھا۔ دوسری صبح وہ بیدار ہوا تو اس کے ذہن میں پھر تکینہ کا خیال کلبلائے لگا۔ ناشا اس نے گل کے ساتھ ہی کیا پھر وہ تہوہر بدل کر تکینہ کے کمرے میں گیا جو حسب معمول سفید ٹاول کے ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھی۔ اس کے چہرے پر آج وہ شوشی نہیں تھی جو سکندر علی شاہ کو مائل کر لیا کرتی تھی۔ دو راتوں کی دوری ہی نے اس کو ضرورت سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔

سکندر علی شاہ کو دیکھتے ہی اسے اپنے اغوا کی کہانی بھی ڈسنے لگی۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ پروفیسر چنگ لائی فارچون سے اس کی ملاقات رینیو کلب میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ سکندر علی شاہ کے لیے ایک خوب صورت شکار کو دانہ ڈالنے میں مصروف تھی۔ پروفیسر کی باتوں نے اس کو اس حد تک متاثر کیا تھا کہ وہ اپنے بارے میں سب کچھ جان لینے کے لیے بے چین ہو کر اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئی تھی پھر راستے میں جب پروفیسر چنگ لائی نے اس کا ہاتھ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اس کے بازو کو تھاما تو تکینہ کو ایک چہن کا احساس بھی ہوا جو اتنا شدید بھی نہیں تھا کہ وہ سنجیدگی سے اس پر غور کرتی لیکن اس کے بعد وہ ذہن پر طاری ہونے والی برقی رفتار غنودگی کو بھی نہیں کنٹرول کر سکتی تھی..... بے ہوشی کے بعد اسے کہاں لے جایا گیا؟..... لے جانے والے دونوں افراد نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا یہ بھی اس کے علم نہیں تھا مگر دوبارہ ہوش آنے پر اس نے خود کو اپنی ہی خواب گاہ میں جس حالت میں فرش پر پڑا پایا تھا وہی بہت سی کہانیوں اور اندیشوں کو جنم دینے کے لیے کافی تھا۔ دو روز بعد سکندر علی شاہ کے سامنے آتے ہی وہ سہم کر رہ گئی تھی۔ سکندر علی شاہ اس کے چہرے پر بدلتے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

”تم جس حالت میں ہوش میں آئی ہو یاد ہے تمہیں.....؟“

تکینہ تھوک نکل کر رہ گئی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔

”تم رینیو کلب کیوں گئی تھیں.....؟“

”آپ کے لیے ایک نئے ہیرے کی تلاش میں..... وہ ایک دو ملاقات کے بعد میرے جال

میں.....“

”بکومت.....“ سکندر علی نے گرج کر کہا۔ ”تم وہاں سے کس کے ساتھ گئی تھیں؟..... ڈرائیور کو کیوں واپس کر دیا تھا؟ کون تھے وہ پرانے آشنا جن کی خاطر تم نے میری اجازت کے بغیر قدم اٹھالیا؟“

گنہگار نے تھم تھم کر پوری روداد بیان کرنی شروع کر دی۔ سکندر علی شاہ خوشخوار نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ اس کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ گنہگار غلط بیانی نہیں کر رہی مگر خود گنہگار کا ماضی اس کے آڑے آ رہا تھا۔

”اب تم نے خود اپنے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“ سکندر علی شاہ نے فیصلہ کن انداز میں دریافت کیا۔

”میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ خود کوئی فیصلہ کر سکوں..... آپ کا جو حکم ہوگا اس سے انکار بھی نہیں کروں گی۔“ گنہگار نے ہتھیار ڈال دیے۔

”گنہگار عورت..... جس کی وجہ سے میں نے تجھے اپنا یا تھا اسی نے کہا ہے کہ اب تم بغیر اجازت اس خواب گاہ سے بھی باہر قدم نہیں نکالو گی۔“ سکندر علی کا طیش بڑھتا گیا۔ ”اسی خواب گاہ میں اب تیری موجودگی میں اپنا شغل بھی نئی تتلیوں سے جاری رکھوں گا..... تیری پیشانی پر کبھی کوئی تل آیا تو پھر اس حویلی میں تیری قبر بھی میرے ہی ہاتھوں بنے گی.....“

”مجھے اب آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ گنہگار نے آگے جھک کر سکندر علی شاہ کے گھٹنوں کو چھو کر اس کے کشادہ سینے پر سر ٹکایا تو سکندر علی شاہ کے اندر چھپے شیطان کے قدم پھر ڈمگانے لگے۔



ماربل کے ایک سپورٹ کا کاروبار روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لیاقت حسین کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ بندرگاہ تک شپمنٹ کا کام راحیلہ بیگم کے فیصلے کے بعد دوسرے ڈرائیور کو سونپ دیا گیا تھا لیکن مقامی مارکیٹ میں آنا جانا۔ آرڈر وصول کرنا اور مال کو جہازراں کمپنی کے حوالے کرانے کی خاطر اپنی نگرانی میں لوڈ کرنا اسی کی ذمہ داری میں شامل تھا۔

اس وقت بھی دن بھر کا تھکا ماندہ شام کو پانچ بجے وہ گھر پہنچا تھا۔ ایسے موقع پر وہ فرحین کو محبت سے سینے لگا کر اپنی دن بھر کی تھکن دور کر لیتا تھا مگر اتفاق سے اس وقت فرحین گھر پر نہیں تھی۔ چونکہ کیدار نے بتایا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے ہی راحیلہ بیگم کی طرف گئی ہے۔ جلدی آنے کا بھی بول گئی تھی۔

لیاقت حسین نے واش روم میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلا تو تھکن اتارنے کی غرض سے بستر پر لیٹ گیا، تھکن کے سبب اس کا پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا تاکہ فرحین کے آنے پر خود کو سوتا ظاہر کر سکے۔ اس کے ذہن میں فرحین کا تصور تھا۔ وقتی طور پر وہ اسی معصوم تصور سے دل بہلانے میں مصروف تھا جب اس کا ذہن غنودگی کی کیفیت سے دوچار ہونے لگا۔ اس نے خود کو بیدار رکھنے کی خاطر اٹھنے کی کوشش کی لیکن غنودگی اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ وہ اپنے

ارادے پر عمل نہ کر سکا پھر..... اس نے اپنی آنکھوں سے ایک عجیب منظر دیکھا۔

اس کا دوست گل خان لیاقت حسین کو ایک گندے عمل کرنے کا توڑ کرنے کے بعد جس بزرگ کے پاس لے گیا تھا۔ اس وقت لیاقت حسین اسی کے سامنے دو زانوں بیٹھا تھا۔ بزرگ نے پہلی بار دیکھے بغیر زمین سے خاک کی ایک چنگی اٹھا کر اس کے منہ میں ڈال دی تھی لیکن اس وقت اسی بزرگ نے نظریں اٹھا کر لیاقت حسین کو دیکھا۔ ایک لمحے تک دیکھتا رہا پھر اس کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

”لیاقت حسین!“ اس نے سحر کن لہجے میں کہا۔ ”مجھے اس وقت تمہارا ہی انتظار تھا۔ ایک بات ذہن نشین کر لو۔ بزرگوں کی دعائیں ضرور کام آتی ہیں لیکن تعویذ گندے اور علاقائی نشانات سب فریب ہیں۔ کچے عقیدے کے لوگ خدا کے نام پر دکان داری چکانے والوں کے قرب میں مبتلا ہو جاتے ہیں پھر جو اللہ کو چھوڑ کر بندوں کے سامنے جھولی پھیلاتا ہے وہ کبھی سرخرو نہیں ہوتا۔ ٹھوکریں اس کے مقدر میں رقم کر دی جاتی ہیں۔ دنیا اور آخرت دونوں غارت ہو جاتی ہیں۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں محترم لیکن آپ نے خاک کی جو چنگی.....“ ”نہیں.....“ بزرگ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ ”تم جو سمجھ رہے ہو وہ غلط ہے..... خاک کی جو چنگی میں نے تمہارے منہ میں ڈالی تھی وہ بھی مشیت ازدی کا اشارہ تھا۔ اس میں جو اثر تھا اور ہے..... وہ بھی اسی مالک دو جہاں کا فیض کرم ہے..... وہی ایک وحدہ لا شریک لہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے لیکن انسان کی نظریں اس کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتیں۔ مقدس کتاب میں بھی یہی درج ہے کہ وہ جس کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہتا ہے..... ہو جا..... اور وہ کام ہو جاتا ہے۔“

”یہی حق ہے محترم.....“ ”اس وقت بھی تم اسی کے اشارے پر میرے پاس موجود ہو۔“ بزرگ نے اس بار قدرے جلالی انداز میں کہا سارے جسم کے کپکپاتے ہوئے بولے۔ ”یہ دنیا ایک امتحان کا کرا ہے جہاں تمام جنس و ملک اپنا اپنا پرچہ حل کر رہے ہیں۔ اسی دنیا میں شیطان مردود بھی ہے جو انسانوں کو بہکا تا ہے اور انسان بہک کر شیطان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتا ہے۔ لیکن اللہ ہر فرعون کے لیے کوئی نہ کوئی موتی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ نیکی کا انجام دینا بھی سعادت ہے۔ اس سعادت کے لیے بھی تمہارا انتخاب کیا گیا ہے۔“

”میں..... میں سمجھا نہیں محترم؟“ لیاقت حسین نے سادگی سے سوال کیا۔ ”فی الحال کچھ سمجھنے کی کوشش نہ کرو..... میرے ساتھ چلو۔ جو نظر آئے، اسے ذہن میں رکھنا..... جب تک اجازت نہ ہو اس کے بارے میں زبان بھی نہ کھولنا..... ہر کام کے لیے قدرت ہی وقت کا انتخاب کرتی ہے..... ہم تم دونوں اسی کے محتاج ہیں۔“

لیاقت حسین پھر کچھ دریافت کرنا چاہتا تھا جب بزرگ نے اس کا ہاتھ تھام لیا، لیاقت حسین کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کی غنودگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے

قابل نہیں تھا لیکن اس کی نظروں کے سامنے سے جب دوبارہ تاریکی چھنی تو اس نے ایک خوب صورت اور کسن لڑکی کو سرکاری کوارٹر نما مکان سے نکلتے دیکھا..... اس کے جسم کا لباس بھی اس کی غربت کی کہانی سنا رہا تھا۔

شام کے اندھیرے پھیل چکے تھے۔ لڑکی نے کوارٹر سے نکل کر سر پر دوپٹا ڈالا۔ سہی ہوئی نظروں سے دائیں باتیں دیکھا پھر وہ کوارٹروں کی دیوار عبور کرنے کے بعد جیسے ہی آگے بڑھی، دوپٹے کئے آدمیوں نے لکھتے اسے لپک کر دیوبج لیا۔ لڑکی کے منہ پر ہاتھ جما کر اسے گھسیٹے ہوئے اس وین کے عقبی حصے میں لے گئے جہاں ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔

”اس وین کے ڈرائیور کی شکل کو ذہن میں محفوظ رکھنا۔“ بزرگ کی آواز لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی.....

لیاقت حسین نے ڈرائیور پر یہ غور نظر ڈالی پھر منظر تبدیل ہو گیا۔ جس کسن لڑکی کو اغوا کیا جا رہا تھا وہ وین کی پشت پر بیٹھی اغوا کرنے والوں سے رو رو کر اور ہاتھ جوڑ کر فریاد کر رہی تھی۔

”تمہیں خدا اور اس کے محبوب کا واسطہ! مجھے چھوڑ دو..... میں یتیم ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگاؤ..... مجھ پر رحم کرو۔“

”تم کہاں جا رہی تھیں.....؟“ ایک بٹے کئے جوان نے اس کو لپچائی ہوئی نظروں سے سرتاپا دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”م..... میں ماں کی ایک واقف کار خاتون سے کچھ قرض لینے کی خاطر نکلی تھی۔“

”ہم تم کو ایسی ہی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں تم کو قرض نہیں بلکہ ہیرا سمجھ کر تمہاری قیمت ادا کی جائے گی۔“

دوسرے نے مسکرا کر کہا۔ ”ایسی قیمت جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

”نہیں..... خدا کے لیے نہیں۔“ لڑکی نے پھر التجائی۔ ”میں گناہ آلود ہونے سے پہلے مرجانا پسند کروں گی..... مجھے واپس جانے دو۔“

”خاموش رہو ورنہ..... ہمیں تمہارے ہونٹوں کو بند کرنے کا طریقہ بھی آتا ہے۔“

تیسرے کے لہجے میں ایسی دھمکی تھی کہ لڑکی سہم کر رہ گئی۔ دل ہی دل میں خدا سے فریاد کرنے لگی۔

لیاقت حسین کی نظریں روز روشن کی طرح سب کچھ دیکھ رہی تھیں..... لڑکی کا سفر ایک عورت کے پاس جا کر ختم ہوا، اس نے تنہائی میں عورت سے بھی وفاداری کی۔ عورت اسے تسلیاں دیتی رہی۔ دلاسا دیتی رہی کہ اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اسی عورت کے کہنے پر لڑکی نے مجبوراً غسل کیا پھر اس کا دیا ہوا لباس بھی مجبوراً پہن لیا۔ عورت نے اسے سوسو کے دونٹ بھی دیے پھر بولی۔

”اسے خاموشی سے رکھ لو اور غور سے میری بات سنو..... جو لوگ تمہیں اٹھا کر لائے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ شکر کرو کہ تم میرے پاس آ گئی ہو..... اب میں تمہیں ایک نیک اور بااثر آدمی

تک پہنچا دوں گی جو تم کو تمہاری ماں کے پاس واپس بھیج دے گا۔ ایک نصیحت اور ذہن نشین کرلو..... وہ آدمی جو کہے اس سے انکار بھی نہ کرنا.....“

”تم..... تم.....“ لڑکی عورت کا جواب سن کر بڑے معصوم لہجے میں بولی۔ ”تم تو خود ایک عورت ہو..... کیا عورت ہو کر بھی تم مجھے یتیم کو کسی کے ہاتھوں فروخت کر دو گی۔“

”وقت اور حالات کا تقاضا سمجھ لو.....“ عورت نے سرد آواز میں کہا..... ”میں نے تمہیں جو مشورہ دیا ہے وہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے..... دوسری صورت میں..... میں بھی تمہارے کسی کام نہ آسکوں گی..... تم حالات کا شکار ہو کر کھلوتا بن جاؤ گی۔“

”اس عورت کی شکل کو بھی اپنے حافظے میں محفوظ کرلو.....“ بزرگ کی آواز پھر لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی۔

لیاقت حسین جو کچھ دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا رہا، اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے عورت کی صورت و شکل کو بزرگ کی ہدایت پر ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اسی لمحے منظر بھی تبدیل ہو گیا۔

کسن لڑکی اب ایک دوسرے کمرے میں کسی مرد کے سامنے موجود تھی جس کی آوارہ نظریں لڑکی کے جسمانی نشیب و فراز پر متحرک تھیں۔ لڑکی اس وقت بھی کسی معصوم پرندے کی طرح ایک چنجرے میں بند اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی جب مرد نے قریب آ کر بٹکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم یقیناً ایک ہیرا ہو جسے تراش خراش کر میرے پاس بھیجا گیا ہے اور میں..... میں ہیرے کی قدر و قیمت جانتا ہوں..... تمہیں کل صبح میرے آدمی تمہاری ماں تک بہ حفاظت پہنچا دیں گے اور..... تمہیں ایک رات کی قیمت بھی ہزاروں مل جائے گی..... ہو سکتا ہے کہ میں دوبارہ پھر کبھی تمہیں بلا لوں.....“

”م..... میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔“ لڑکی نے ہونٹ چباتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”تم..... میری صرف ایک خواہش پوری کر دو.....“

”خواہش نہیں..... تم حکم دو جان من..... میں تمہیں واپس نہیں کروں گا.....“ مرد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر خود سے قریب تر کر لیا۔ ”کیا چاہتی ہو.....؟“

”تھوڑا سا زہر..... اس کے بعد تم اپنی خواہش بھی پوری کر لینا.....“ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

پھر..... جو کچھ ہوا اس نے لیاقت حسین کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گردش کو تیز سے تیز کر دیا لیکن..... اس وقت وہ عمل کر گزرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، کسی نا دیدہ ہاتھ کی سر گرفت نے اسے پوری طرح اپنے قبضے میں رکھا تھا..... وہ خاموش تماشائی بنا رہا۔

مرد نے لڑکی کی خواہش سن کر قہقہہ لگایا پھر وہ معصوم اس کے بوجھ تلے پھڑ پھڑانے کے سوا کچھ نہ کر سکی..... خاصی دیر تک ایک مجبور لڑکی ایک مرد کی درندگی کا شکار ہوئی رہی پھر وہ اسے تنہا چھوڑ کر

مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

لڑکی خود اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہی پھر اس نے کسی خیال کے بغیر اپنے جسم کو لباس میں چھپایا۔ ہاتھ میں پرانی دوکانی کی چوڑیوں کو اتار کر ایک گوشے میں رکھی سنگ مرمر کی کارزنمیل پر لے جا کر گل دان سے پگھلا پھر اسے چبانے لگی۔

جتنی دیر شیطانی کھیل جاری رہا، لیاقت حسین خاموش تماشا بنی رہا پھر وہ اس معصوم لڑکی کی عبرتناک موت کو پچھلی پچھلی نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ چوڑیوں کے ذرات چبانے کے بعد کچھ دیر قیمتی قالین پر پڑی مایہ بے آب کے مانند تڑپتی..... اس کے منہ سے خون ابلتا..... اس کے معصوم جسم کو دو چار جھٹکے لگے پھر وہ موت کی ابدی نیند سو گئی۔

”جس درندے نے اس معصوم کلی کو روندنا اس کے چہرے کو بھی یاد رکھنا۔“ بزرگ کی آواز لیاقت حسین کی سماعت سے ٹکرائی پھر منظر یکھت تبدیل ہو گیا۔

ایک ویرانے میں دو چار بے حس افراد لڑکی کے جسم کو زمین میں دفنا رہے تھے۔ لیاقت حسین کے دل میں ان افراد کو زندہ درگور کرنے کی خواہش ابھری لیکن وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا..... عمل کرنے سے قاصر تھا۔

”اس قبر کی نشاندہی بھی تمہیں کرنی ہوگی۔“ بزرگ کی آواز پھر ابھری تو لیاقت حسین نے کہا۔

”میرے محترم..... اگر وقت آنے میں دیر لگی..... اس معصوم کی لاش کو کیڑے کھا گئے تو میں بھی بے بس ہو جاؤں گا۔“

”تم حافظ ہو لیاقت حسین..... فرعون کے روشن واقعے پر غور کرو..... اس شیطان نے بھی موت کو سامنے دیکھ کر خدا پر یقین لانا چاہا..... مگر وقت گزر چکا تھا..... جو مہلت اسے دی گئی وہ ختم ہو چکی تھی..... خدا نے کہا تھا..... میں تیری لاش کو دنیا والوں کے لیے عبرت بنا دوں گا..... سمندر کی گوشت خور مچھلیوں نے بھی فرعون کے جسم کو منہ نہیں مارا..... اس رب کریم کا کہا کبھی غلط نہیں ہوا..... فرعون کی لاش برسوں بعد بھی محفوظ رہی..... جو مشرک مقدس کتاب کے اس واقعے کی تردید کرتے تھے..... خود انہوں نے فرعون کی لاش بھی تلاش کی..... اس کے فرعون ہونے کی تصدیق بھی کی۔ آج دنیا کے لوگ اس مردود کی اکڑی ہوئی لاش کا مشاہدہ دنیا کے گوشوں گوشوں میں سائنسی ایجادوں کے ذریعے کر رہے ہیں..... مشرکین بھی انگشت بدنداں ہیں..... اسی خدا نے اگر چاہا تو اس معصوم بچی کی لاش کو بھی صحیح وسلامت رکھ سکتا ہے..... کل کیا ہوگا؟ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا..... تم صرف ان راستوں اور چہروں کو ذہن میں محفوظ رکھو..... جب مالک دو جہاں کو منظور ہوا وہ خود تمہارے لیے ساری مشکلات دور کر دے گا..... میری ذمہ داری پوری ہوئی.....“

”میرے محترم..... کیا میں آپ سے.....“ لیاقت حسین اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

وہ فرحین کی آواز ہی تھی جس نے اسے سوتے سے جگا دیا تھا۔ اس نے پلٹ کر فرحین کو دیکھا جو قریب کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

”تو کب آئی.....؟“ لیاقت حسین نے اسے پورے ہوش و حواس میں فرحین کو مخاطب کیا۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا وہ اس کے ذہن میں کہیں گم ہو کر رہ گیا۔

”میری چھوڑ..... تو بتا کہ مجھے ڈرانے کی خاطر کیا ڈراما کر رہا تھا؟“ لاش..... قبر..... اکے دفنانے کی بات کر رہا تھا؟ کیا فرحین سے تیرا دل بھر گیا؟ تجھے میری جان کی قسم ہے..... سچ بتا کہ تو ابھی کیا بک بک کر رہا تھا؟

لیاقت حسین کا خیال تھا کہ فرحین مذاق کر رہی ہوگی لیکن جب فرحین سنجیدہ نظر آئی تو اسے خیال آیا۔ ”ممکن ہے کچھ دیر کو میری آنکھ جھپک گئی ہو۔ میں دن میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“ ایک لمبے تک وہ فرحین کو دیکھتا رہا پھر بڑی معصومت سے بولا۔ ”تو یقین نہیں کرے گی میں لاش، قبر اور دفنانے کی بات کیوں کر رہا تھا۔“

”چل اب بتا دے..... کیا چکر ہے؟“

”وہ..... سب میں اپنے ارمانوں اور بے چینی کے لیے کہہ رہا تھا۔“ لیاقت حسین دیدہ و دانستہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”تو نہیں ہوتی تو میں بے چین ہو جاتا ہوں، یہ بے چینی کہیں دیوانگی کی شکل نہ اختیار کر لے اس لیے میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ اپنے ارمانوں کی لاش اور بے چینی کو قبر میں دفنا دوں۔ پھر تو بھی یہ شکایت نہ کرے گی کہ میں تیرے قرب کے لیے اتنا ندیدہ کیوں بنا رہتا ہوں۔“

”دماغ چل گیا ہے تیرا۔“ فرحین نے اس کا جواب سنا تو مسکراتے ہوئے قریب آگئی۔ ”وہ سب تو پیار میں کہتی ہوں۔“

”کبھی کبھی تو برا بھی ضرور لگتا ہوگا۔ تیری جگہ میں ہوتا تو شاید.....“

”بس..... چپ ہو جا۔“ فرحین نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تو نہیں ہوتا تو میں بھی بے چین ہو جاتی ہوں اور آج..... آج تو میں تجھے ایک نئی بات بتانے کی خاطر بے چین تھی۔“ فرحین کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑنے لگی۔

”وہ کیا.....؟“

”بیگم صاحبہ نے بلایا تو ادھر چلی گئی، میرا خیال تھا کہ ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے تو اندر اکیلی ہی ہوں گی، میں منہ اٹھائے بے دھڑک اندر گئی تو میرا دل دھک سے رہ گیا..... چپ سادھ کر دبے قدموں واپس آگئی اور..... ان دونوں کو خبر تک نہ ہوئی۔“

”کیا دیکھ لیا تو نے ایسا انوکھا تیرا دل دھک سے رہ گیا.....؟“

”وہ..... وہ..... تیرے صاحب بیگم صاحبہ کو انگریزوں والا پیار کر رہے تھے۔“

”اور یہ انگریزوں کے پیار والی بات تجھے کیسے معلوم ہوئی؟“

”بیگم صاحبہ نے..... مجھے کمرے میں آتے دیکھ لیا تھا۔“ فرحین نے شرم کر کہا تو لیاقت حسین نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ کسی بھونرے کی طرح پھول کی پنکھڑیوں کا رس چوسنے لگا تو فرحین نے اسے یاد دلایا۔

”دروازہ تو بند کر لے انگریزی بندر.....“

”لیاقت نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا پھر ان دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکنے شروع ہو گئے۔ اس روز فرحین کی خود سپردگی میں کچھ نئے رنگ کھل گئے تھے۔“

✦✦✦

اورنگ زیب اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

وشنو کا فرار ہو جانا اس کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک شہرے کی تصدیق کی خاطر اس نے جو قدم اٹھایا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنے ایک خاص آدمی کو وشنو کے پیچھے لگا دیا تھا جو پل پل کی خبر دے رہا تھا۔ وشنو کے سلسلے میں اورنگ زیب سے جو ایک غلطی سرزد ہوئی تھی اس کا احساس بھی اسے اس وقت پوری شدت سے ہوا جب اس نے سپر اسٹور والی چھت سے افضل خان کے فلیٹ پر گولیاں چلائی تھیں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وشنو نے کس جذباتی وجہ سے شکار سامنے نہ ہونے کے باوجود گولیاں داغ دی تھیں۔ وہی گولیاں اگر دیوار کا پلستر ادھیڑنے کے بجائے افضل خان یا شبنم میں سے کسی ایک کی بھی زندگی کا چراغ گل کر دیتیں تو اورنگ زیب خود کو کبھی معاف نہ کر پاتا۔

اسے علم تھا کہ وشنو کے ملزئی انٹیلی جنس والوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد افضل خان ہی نے دوبارہ اس کی گرفتاری کا جال تیار کیا تھا۔ ایسی صورت میں وشنو کا افضل خان کے خطرے کو درمیان سے ہٹانا قدرتی امر تھا۔ بہر حال افضل خان اور شبنم دونوں محفوظ تھے۔

وشنو کے علاوہ اور بھی کئی وجوہات تھیں جس کے پیش نظر اس نے سکندر علی شاہ سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہاں جو صورت حال پیش آئی اس نے اورنگ زیب کے خدشات کو اس کی توقع سے زیادہ حیران کر دیا۔ سکندر علی شاہ کا ملاقات کے دوران کسی فون پر بات کرنا بھی خلاف معمول تھا پھر اس نے اورنگ زیب کے اوراق زندگی کے ایک باب کو الٹ کر اسے چونکا دیا تھا جسے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ خود اورنگ زیب بھی فراموش کر چکا تھا۔ اس ضمن میں سکندر علی شاہ نے غالباً اسے ٹریپ کرنے کی خاطر اپنے فارم ہاؤس آنے کا انویٹیشن بھی دیا تھا۔ ذہنی سکون کے لیے اس کو مخصوص دوا کی فراہمی کا اشارہ بھی کیا تھا۔ جو کھیل فارم ہاؤس کے دونوں ریسٹ ہاؤس میں ہو رہا تھا اورنگ زیب اس سے بھی ناواقف نہیں تھا۔ سراج نے بھی آکٹوپس کے لیے خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اسی فارم ہاؤس کو ایک مناسب جگہ قرار دیا تھا لیکن اورنگ زیب نے ذاتی اور خفیہ معلومات کی بنیاد پر یہ بات تسلیم نہیں کی تھی۔ اس نے سراج کو بار بار یہی جواب دیا تھا کہ سکندر علی شاہ براہ راست شیخ حامد سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اس یقین کی وجہ اورنگ زیب کی ذاتی اور خفیہ تفتیش کی رپورٹیں تھیں اس نے شیخ حامد کو آکٹوپس کا نام بھی اسی وجہ سے دیا تھا۔ آکٹوپس کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا میں یہی پڑھا تھا کہ وہ ایک خطرناک سمندری مخلوق ہے۔ اس حد تک محتاط رہتا ہے کہ اس سمندری کیکڑے کے آٹھ زہریلے ہاتھ بھی ایک ہی وقت میں مختلف ارادوں سے دشمن کی سمت جھپٹتے ہیں لیکن ایک کی حرکت کا علم دوسرے کو بھی نہیں ہوتا۔ وہ بیک وقت کئی دشمنوں کو اپنے ظالمانہ انداز میں شکار کر لیتا ہے۔

شیخ حامد سمندری مخلوق نہیں۔ وہ ذی ہوش اشرف المخلوقات میں شمار ہوتا تھا اس لیے حالات کے پیش نظر سکندر علی شاہ جیسے مختلف فطرت کے انسان پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ ”یہ ممکن تھا کہ وہ سامنے آئے بغیر سکندر علی شاہ سے رابطہ رکھتا ہو؟“ اس سوال کے ذہن میں آتے ہی اورنگ زیب کے ذہن میں وہ کال بھی ابھری جو ملاقات کے دوران سکندر علی شاہ کو موصول ہوئی تھی جسے مجبوراً سنا گیا تھا۔ اگر وہ شیخ حامد ہی کی کال تھی تو سکندر علی شاہ اس کو کس حیثیت سے جانتا تھا.....؟

اورنگ زیب کے ذہن میں ایک کے بعد ایک سوالات ابھر رہے تھے..... اگر سراج کی بات تسلیم بھی کر لی جائے تو یہ سوال بھی تھا کہ آکٹوپس وہاں کس حیثیت سے اور کس شکل میں چھپا ہے؟ چھپنے کی وہ جگہ ایسی کہاں ہے جس کا علم خود سکندر علی شاہ کو بھی نہ ہو؟..... اس مفروضے کی تردید روشنا کے اغوا اور بالجبر کے معاملے سے بھی تھی تھی۔ روشنا کے سلسلے میں دارا نے بھی بے حد اصرار پر مجرم کا جو حلیہ بیان کیا وہ بھی حیرت انگیز طور پر آکٹوپس سے ملتا تھا؟..... کیا فارم ہاؤس میں آمد و رفت کے باوجود سکندر علی شاہ کے شکاری کتنے کسی اجنبی کی یونہی سو گھ سکے تھے؟

ذہن میں یکے بعد دیگرے مختلف سوالات ابھر رہے تھے جب اورنگ زیب کے ذہن میں جگا اور لوچن کا خیال آیا۔ لوچن نے کسی مستقبل شناس کا روب دھار کر نگینہ کو شکار کیا تھا مگر..... جگا کو یقیناً میک اپ کے باوجود شناخت کر لیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو اس کے فرنیچر ہاؤس پر منظم حملہ نہ ہوتا..... اس واردات کے پس پردہ بھی سکندر علی شاہ کی شخصیت سامنے آئی تھی..... نگینہ کا تعلق اس کی بیوی کی حیثیت سے تھا۔ لوچن نے اس کا ”برہنہ گفت پیک“ سکندر علی شاہ کو کیوں روانہ کیا تھا؟..... اسکا جواب میڈم روبی سے بات کرنے کے بعد مل گیا تھا؟..... اس کی وضاحت کے مطابق لوچن کو بھی کسی وجہ سے یہی شبہ لاحق تھا کہ سکندر علی شاہ کو بلیک میل کرنے کے بعد ہی..... شیخ حامد تک اس کی رسائی ممکن ہو سکتی تھی۔

ان بکھری ہوئی کڑیوں کو ملانے کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب کو اس بات کا یقین تھا کہ اس کی نقل و حرکت پر بھی وشنو کی نظر ہوگی۔ اس نکتے کے ذہن میں ابھرنے کے بعد ہی اس نے سوچا تھا کہ وقتی طور پر کچھ عرصے چھٹی لے کر منظر عام سے ہٹ جائے۔

اسی خیال کے تحت اس نے ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست لکھی پھر اٹھ کر آئی جی کے کمرے میں جانے کے لیے پرتول رہا تھا کہ پینتھر کی کال آگئی۔

”اس وقت کیسے فون کیا؟“ اس نے موبائل آن کر کے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کوئی اہم اطلاع؟“

”جی ہاں..... چتا سے فرار ہونے والے نے کچھ دیر پہلے اپنا ٹھکانا بدل دیا ہے۔“

”اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے تمہارے خیال میں؟“

”محض احتیاط.....“ دوسری سمت سے جواب ملا۔ ”یہ میرا ذاتی خیال ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اس کی نگرانی پر کڑی نظر رکھنا۔ ایک بات اور بھی نوٹ کر لو۔“

”آپ حکم دیں۔“

”چور پتا اگر ختم کر دیا جائے؟“ اورنگ زیب نے سرسراہے مگر مدہم لہجے میں سوال کیا۔

”بہت مناسب رہے گا۔“ آپ اشارہ کر دیں، ایک گھنٹے کے اندر اندر۔“

”نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ نیک کام کوئی مستحق افراد ہی کرے گا۔“ اورنگ زیب نے جملہ کاٹ کر کہا پھر

موبائل آف کر کے وہ آئی جی کے کمرے کی جانب بڑھا۔ دو منٹ کے مختصر انتظار کے بعد اس کی طلبی

بھی ہو گئی۔ آئی جی کی نظریں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہیں۔ اورنگ زیب کے بیٹھ

جانے کے بعد ہی اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”اس وقت کیسے زحمت کی۔“

جواب میں اورنگ زیب نے اپنی درخواست اس کے سامنے رکھ دی۔ آئی جی نے درخواست

کو غور سے پڑھا پھر پہلو بدل کر بولا۔

”اچانک آپ کو طویل رخصت کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”کچھ ذاتی اور نجی معاملات نمٹانے ہیں۔“ اورنگ زیب نے سادگی سے جواب دیا۔

”میں آپ کے دفتری اوقات کی پابندی میں نرمی بھی کر سکتا ہوں۔“

”جانتا ہوں لیکن ذاتی کام کے ساتھ اسی بہانے کچھ آرام بھی کر لوں گا۔“

”آرام۔۔۔۔۔۔ آئی جی نے مسکرا کر سوال کیا۔ ”یہ آپ کہہ رہے ہیں۔“

”جی ہاں، میں بھی انسان ہوں۔“

”سوری۔۔۔۔۔۔ آئی جی نے سادہ کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب آپ غلط

سمجھے۔“ جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی اس نے کاغذ بھی آگے بڑھا دیا۔

اورنگ زیب نے کاغذ پڑھا۔ آئی جی نے لکھا تھا۔ ”مجھے کسی وقت آپ کی ضرورت بھی پہنچتی

ہے، حالات ابھی معمول پر نہیں آئے۔“

”ٹیکنالوجی نے اب بہت ترقی کر لی ہے سر۔۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے خشک لہجے میں کہا۔ ”جو

لوگ دور بیٹھ کر آوازیں سن سکتے ہیں وہ کسی دوسری ڈیوائس کے ذریعے ایک ایک نقل و حرکت کا جائزہ

لینے سے بھی غافل نہیں ہوتے۔“

آئی جی جواب سن کر ہنر بڑا گیا۔ اسے شاید اورنگ زیب سے اس جواب کی توقع نہیں

تھی۔ پہلو بدل کر بولا۔

”آپ درخواست چھوڑ جائیں، میں بعد میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔“

”ایز یوش۔۔۔۔۔۔ لیکن میں اپنی درخواست میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کروں گا۔“ اورنگ زیب

نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

”وہاٹ۔۔۔۔۔۔ آئی جی کو اپنے عہدے اور اختیارات کا خیال آ گیا۔“ اگر میں نے آپ کی

درخواست نام منظور کر دی تو۔۔۔۔۔۔“

اورنگ زیب جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا جب آئی جی کی میز پر رکھا موبائل گنگنا نے لگا، اس

نے بدستور اورنگ زیب کو دیکھتے ہوئے موبائل آن کر کے کہا۔

”آئی جی آن لائن۔۔۔۔۔۔“

”کو برا بول رہا ہوں۔ تمہارا باپ۔“ دوسری جانب سے سرد اور سفاک لہجے میں کہا گیا۔ ”میں

تمہاری اور ایس پی کی بات سن چکا ہوں، ایس پی کی درخواست منظور نہیں ہونی چاہیے۔“

”سمجھ رہا ہوں۔“ آئی جی نے ہونٹ چباتے ہوئے دوستانہ لہجہ اختیار کیا۔ ”میرا ذاتی پروگرام

بھی یہی ہے لیکن دوسری پارٹی۔۔۔۔۔۔“

”اسے پرانی سیٹ پر واپس جانے کا دانہ ڈال کر دیکھو، شاید یہ آخر اس کا ارادہ تبدیل کر

دے۔“ اس بار زیادہ سفاک انداز اختیار کیا گیا۔ ”اس کے بعد بھی وہ انکار کرے تو پھر مجھے اپنے

طرفے سے راستہ صاف کرنا پڑے گا۔“ جیلے کے ساتھ ہی لائن بھی کاٹ دی گئی۔

آئی جی نے موبائل واپس رکھ دیا پھر اورنگ زیب سے خوشگوار لہجے میں بولا۔

”کچھ پارٹیاں ہر کام اپنی مرضی کے مطابق چاہتی ہیں۔ اس وقت بھی ایک واقف ایسی ہی

سفارش کر رہا تھا۔“

”ہم جس سیٹ پر بیٹھے ہیں وہاں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔“ اورنگ زیب

نے بھی لہجہ بدل کر جواب دیا۔

”کیا آپ لانگ لیو کے بارے میں اب بھی سنجیدہ ہیں۔“

”کچھ مجبوریاں نہ ہوتیں تو میں اصرار بھی نہ کرتا۔۔۔۔۔۔“

”او کے۔۔۔۔۔۔ ایک درمیانہ راستہ اور بھی ہے۔“ آئی جی نے کوبرا کے حکم پر عمل کرنے کی خاطر

کہا۔ ”میں آپ کا فوری تبادلہ اسی سیٹ پر کر دیتا ہوں جہاں آپ پہلے تھے۔ وہاں آپ کو آؤٹ

ڈور اور ان ڈور کا مکمل اختیار بھی ہوتا ہے۔“

اورنگ زیب نے آئی جی کو حیرت سے دیکھا۔ اس کے ذہن میں موبائل پر موصول ہونے والی

کال کھٹکی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے نارٹل ہو کر کہا۔ ”آپ اگر لمبی چھٹی دینے پر رضامند نہیں ہیں تو

صرف ایک ہفتے کی منظوری دے دیں۔ بہر حال میں پرانی سیٹ کی آفر فی الحال مناسب نہیں

سمجھتا۔۔۔۔۔۔“

”آپ کی درخواست میں ترمیم کرنا بھی نامناسب ہے۔“ آئی جی نے درخواست کو پرزے

پرزے کر کے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے بڑے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”میں آپ کو دفتر کی تمام

پابندیوں سے آزاد کرتا ہوں۔ اسٹازمانی پراس (it is my promise)“

اورنگ زیب نے کچھ سوچ کر آئی جی کی بات مان لی۔ کچھ دیر بعد وہ گاڑی میں بیٹھا کرتل

احتشام کے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ چھٹی کی درخواست آئی جی نے جس انداز میں موبائل کال آنے

کے بعد ٹالی تھی وہ بھی قابل غور تھا لیکن یہ سوال بھی ذہن میں ابھر رہا تھا کہ موبائل پر کس نے کال کی

تھی؟..... وہ یقیناً وہی تھا جس نے آئی جی کو اس کی کسی دکھتی رگ کی وجہ سے قابو کر رکھا تھا مگر..... اورنگ زیب کی چھٹی کی درخواست سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا تھا.....؟

یہی ایک سوال ذہن میں تادیر چبھتا رہا پھر اورنگ زیب کے ہونٹوں پر ابھرنے والی معنی خیز مسکراہٹ پھیل کر گہری ہوتی چلی گئی..... کچھ کڑیاں تھیں جو از خود ایک دوسرے سے مربوط ہو رہی تھیں.....



بھگے بالوں کو تولیے سے لپیٹے وہ غسل خانے سے نکلی تو افضل خان کی نظریں کسی وجہ سے مسکرانے لگیں۔ شبنم اپنے کمرے میں جاتے جاتے رک گئی۔ افضل خان اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ والہانہ انداز میں نگاہوں میں نگاہیں ڈالے دیر تک اسے سمکھتا رہا تو شبنم نے سنبھل کر پوچھا۔

”کیا میں کچھ بدل گئی ہوں.....؟“

”نہیں.....“

”پھر اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟..... کیا پہلے کبھی نہیں دیکھا؟“

”اس وقت کچھ عجیب سا خیال آ گیا تھا۔“ افضل خان نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ ”تمہیں ایک خاص انداز میں دیکھ کر بھی اس زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ تمہیں برا تو نہیں لگا۔“

”نہیں.....“ شبنم نے اس کے لہجے کی گرمی کو محسوس کر کے قدرے شرما کر کہا۔ ”اس دن تم راجو کی خاطر بنگالی پاڑہ گئے تھے لیکن واپسی میں تنہا تھے۔ جس کو ساتھ لانے کا کہہ کر گئے تھے۔ اس کو لاتے تو میں انکار بھی نہ کرتی۔“

”جانتا ہوں.....“

”پھر اب کس بات پر غور کر رہے ہو.....؟“ کیا نہائی دھوئی میں تمہیں اچھی نہیں لگ رہی ہوں۔“ شبنم کے لہجے میں شوخی کھلنے لگی۔

”سچ بتا دوں.....“ افضل خان نے اس کے بازو تھام کر اس کی نظروں میں جھانکا۔ ”برائو نہ مانو گی؟“

”سامنے دروازہ کھلا ہے.....“ شبنم نے بالکونی کی سمت اشارہ کیا۔ ”کوئی سنسناتی ہوئی گولی آگئی تو.....“

”پہلی میری پشت پر لگے گی پھر..... پھر میں تمہیں بچانے کی خاطر ہاتھوں کے حصار میں لے کر ابدی نیند سو جاؤں گا۔“

”پلیز افضل.....“ شبنم یکھت سنجیدہ ہو گئی۔ ”ایسی بری فال مذاق میں بھی منہ سے نہ نکالا کرو۔“

افضل خان کچھ جواب دینا چاہتا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دتی گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔ ”اس وقت کون آ سکتا ہے؟“

”یہاں کھڑے کھڑے نظر نہیں آئے گا۔“ شبنم نے مسکرا کر کہا۔ ”دن کی روشنی میں خطروں کی گنجائش کم ہوتی ہے۔“

جواب میں پتول کی موجودگی کو ٹٹول لینے کے بعد ہی افضل خان دروازے کی سمت بڑھا۔ شبنم لاؤنج میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں بھی دروازے ہی کی جانب تھیں۔

”اس نمبر پر فوری کال کر لیں۔“ کسی مرد کی ٹھوس آواز ابھری پھر افضل خان دروازہ بند کر کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا لیے شبنم کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ کاغذ پر لکھے نمبروں کو وہ بار بار پڑھ رہا تھا۔

”کون تھا.....؟“

”میرا خیال ہے کہ نگرانی پر مامور کوئی سادہ لباس والا ہوگا لیکن یہ نمبر..... مجھے یاد نہیں آ رہا کہ یہ کس کے نمبر ہیں؟“

جواب میں شبنم نے بھی ان نمبروں کو دیکھا۔ اس کے لیے بھی وہ انجانے ہی تھے۔ افضل خان ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے سامنے میز سے اپنا موبائل اٹھا کر نمبر ملائے۔ دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔

”کون بول رہا ہے؟.....“ کسی نے بھاری بھر کم آواز میں سوال کیا۔

”یہ نمبر مجھے کسی نے دروازہ ناک کر کے دیے ہیں۔“ افضل خان بہ دستور محتاط تھا۔

”ادہ افضل خان..... میں کرٹل احتشام بول رہا ہوں۔“

”خیریت تو ہے سر..... اس وقت خادم کو کیسے یاد کیا.....؟“ افضل نے نرمی سے دریافت کیا۔

”تمہیں وہ انڈین وشنو تو یاد ہوگا جسے تم نے دوبارہ گرفتار کرانے میں میری مدد کی تھی۔“

”وہ میرا فرض تھا جناب..... اپنے اور قوم کے دشمنوں کی طرف سے میں کبھی غافل نہیں رہتا۔“

”اچھی عادت ہے لیکن انسان سے کبھی کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں سر.....“

”وہ باسٹرڈ میری قید میں مر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی جس کے بعد میں نے اس کی لاش ہندوؤں کے ایک مقامی ادارے کے حوالے کر دی تھی۔ انہوں نے بھی اس کی ڈرنٹی باؤی کو ٹکڑیوں کے ڈھیر پر رکھ کر آگ لگا دی تھی۔ جب تک آگ راکھ نہیں ہوگئی وہ ایک لمحے کو بھی وہاں سے نہیں ہٹے تھے۔“

”بہی رسم ہے جناب۔“ افضل خان نے کہا۔ ”آگ سرد ہونے کے بعد وہاں سے راکھ جمع کر کے دریا میں بہا دیتے ہیں۔“

”اس کی نوبت نہیں آئی، اس لیے کہ..... وہ باسٹرڈ جس دم کا ماہر تھا، سانس روک کر اس نے ہم سب کو دھوکا دیا تھا پھر وہ آگ لگنے کے بعد ہی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب بھی ہو گیا.....“

”سر.....“ افضل خان نے کسمسا کر کہا۔ ”آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔“ کرٹل کی بات پر اسے یقین نہیں آیا تھا۔ ”جس نے تمہارے فلیٹ پر فائرنگ کی..... وہ بھی وہی تھا۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ افضل خان بری طرح چونکا۔ شبیم اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے میں مصروف تھی۔

”یہ تمام باتیں ایس پنی اورنگ زیب کے علم میں بھی ہیں..... تم کو اپنا نمبر بھیجئے کا بھی ایک خاص مقصد تھا جس کو تم نے دوبارہ ہمارے حوالے کیا تھا اب اس کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلانے کا کام بھی میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔“

”میں اسے بھی ایک اعزاز سمجھوں گا سر..... لیکن اب اس کا ہاتھ آنا آسان نہیں ہوگا۔“

”میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اس وقت وہ باسٹرڈ کہاں اور کس میک اپ میں ہے۔“ دوسری طرف سے سنجیدگی سے کہا گیا پھر جو تفصیل بیان کی گئی اسے افضل خان بڑی توجہ سے سنتا رہا اور ذہن نشین کرتا رہا۔ ”تم اپنی ذمہ داری نبھاتے وقت کسی بات کی فکر نہ کرنا۔ میرے سادہ لباس والے بھی تمہارے آس پاس ہی موجود ہوں گے۔“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی سر..... میں چچان پر بیٹھ کر شکار کرنے کا عادی بھی نہیں ہوں۔“

”جانتا ہو..... ایک بات اور سن لو..... تمہارا کام صرف اسے ٹھکانے لگانا ہے، اس کی ڈیڈ باڈی کو میرے آدمی سنبھال لیں گے۔“

دوسری جانب سے کال ختم کا گنل ملا تو افضل خان نے موبائل آف کر کے رکھ دیا۔ شبیم نے بے چینی سے پوچھا۔

”کس کا فون تھا؟“

”کرنل احتشام کا.....“ نام بتانے کے ساتھ ساتھ افضل خان نے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بھی بیان کی تو شبیم بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ فلیٹ پر فائرنگ کرنے والا شاید ہمیں لٹاکر مارنے کا خواہش مند رہا ہوگا ورنہ وہ بلاوجہ گولیاں بھی ضائع نہ کرتا۔ مگر دشمنو.....“

”تم فکر مت کرو..... میں بھی اسے لٹاکر ہی موت کے گھاٹ اتاروں گا۔“ افضل خان کسی فولادی ارادے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”وہ بھی ضرور جانتا ہوگا کہ افضل خان کس درندے کا نام ہے۔“

شبیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ افضل خان لپکتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سننے لگی۔ اس نے خوشی سے افضل خان کا ہاتھ تھام کر زندگی کا ہم سفر بنانے کا پروگرام طے کیا تھا لیکن حالات کے اس اچانک موڑ پر اس کے اندر ایک عجیب سی گھبراہٹ اور بے قراری کی کیفیت سرا بھار رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی..... ”اگر خدا نخواستہ افضل خان کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی..... کیا دونوں کے ارمان دل کے دل ہی میں گھٹ کر دم توڑ دیں گے؟“

اپنے خیالات کے تانے بانے میں الجھ کر شبیم کو وقت کا احساس بھی نہ رہا..... وہ اس وقت چونگی

جب افضل خان دوبارہ اپنے کمرے سے ایسے میک اپ میں برآمد ہوا کہ وہ ایک لمحے کو چونگی پھر اس کے قرب جا آہستہ سے پوچھا۔

”تمہاری واپسی کب تک ہوگی.....؟“

”گھبراؤ مت..... میں جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

”مم..... میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ شبیم نے قدرے جھجک کر کہا پھر اس نے افضل خان کا سیدھا ہاتھ تھام لیا۔ بڑے جذباتی انداز میں بولی۔ ”افضل میں پہلے بھی تمہاری امانت تھی اور اب..... اب میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر تم کو اپنا ہم سفر بھی تسلیم کر رہی ہوں۔ اس وقت تم بھی میرے ساتھ ایجاب و قبول کی رسم پوری کر لو..... بعد میں نکاح کی سنت ادا کر کے ہمارے درمیان کوئی فاصلہ بھی نہیں رہے گا۔“

جواب میں افضل خان نے بھی شبیم کا ہاتھ تھام کر اسے اپنا تسلیم کر لیا پھر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”پریشان مت ہونا۔ دشمنو کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں براہ راست کرنل احتشام سے کسی قاضی کے بندوبست کی درخواست کروں گا..... فی الحال تم سے ایک اجازت درکار ہے۔“

”وہ کیا..... شبیم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ایک پیار.....“

جواب میں شبیم نے اسے شوخ نظروں سے دیکھ کر سر جھکا کر پیشانی اس کے سامنے کر دی۔ افضل خان نے اس کی پیشانی کو چوما پھر اس کو جلد واپسی کی تسلی دیتا ہوا لمبے لمبے قدم اٹھاتا فلیٹ سے باہر چلا گیا۔



میں اسے حویلی بھیجا گیا وہ بھی پہلے سے پلان کیا ہوگا۔ حالات کے نشیب و فراز سے کھیلی کودی گئینہ کو یقین تھا کہ بے ہوشی کے دوران بھی لے جانے والوں نے محض اپنے کام سے کام رکھا ہوگا۔ اس کے جسم کو روندنا نہیں گیا..... مگر کیوں؟..... ایسا کیا مقصد تھا جس کے پیش نظر چنگ لائی سامنے آیا تھا..... کون تھا وہ.....؟ کیا چاہتا تھا؟

اس وقت بھی اس کا ذہن اسی ایک سوال کو سلجھانے میں الجھ رہا تھا کسی حد تک وہ اس راز کو پا گئی تھی کہ جن لوگوں نے اسے غوا کیا وہ سکندر علی شاہ سے اپنی کوئی بات منوانے کے خواہش مند ہوں گے..... یہ بھی جانتی تھی کہ سکندر علی شاہ کسی کے دباؤ میں آنے والی اسامی نہیں تھی..... وہ گئینہ جیسی سو لڑکیاں کو بھی اپنی ضد پر قربانی کا بکرا بنانے سے بھی گریز نہ کرتا۔

اور بھی کئی سوالات تھے جو گئینہ کے ذہن میں کلبلا رہے تھے جب اس کے کمرے کے فون کی گھنٹی بجی۔ سکندر علی شاہ کچھ دیر پہلے ہی کسی کام کا کہہ کر حویلی سے باہر گیا تھا اس نے گئینہ کو صرف خواب گاہ تک محدود کر دیا تھا۔ عام حالات میں سکندر علی شاہ اپنے فون خود ہی انٹیک کرتا تھا دوسروں کو اس کی اجازت نہیں تھی۔

گئینہ کے کانوں میں گھنٹی کی آواز تو بجتی رہی پھر بند ہو گئی لیکن دو منٹ بعد پھر سے نئے سرے سے گونجنے لگی۔ اس بار بھی گئینہ نے فون سیٹ کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن جب تیسری بار پھر گھنٹی کی آواز ابھری تو گئینہ نے یہ سوچ کر فون اٹھا لیا کہ شاید خود سکندر علی شاہ اسے چیک کرنا چاہتا ہو یا کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہو۔ دوسرا کوئی ہوتا تو اتنی جلدی جلدی کال کرنے کی حماقت بھی کبھی نہ کرتا۔

”ہیلو.....“ اس نے ریسپور اٹھا کر مدھم آواز میں کہا۔

”گئینہ بول رہی ہو.....؟ ایک اجنبی لہجے نے سوال کیا۔

”آپ کون ہیں، کس سے بات کرنی ہے؟“ اس نے بد دستور مہذب لہجے میں پوچھا۔

”میں..... پروفیسر چنگ لائی بول رہا ہوں سویٹ ہنی..... دوسری جانب سے بے تکلفی سے جواب ملا۔ ”فون بند کرنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ مجھے کچھ نایاب تصویریں بھی سکندر علی شاہ کو بھیجی پڑیں گی۔“

”شاہ صاحب اس وقت حویلی میں نہیں ہیں..... پھر کسی وقت کال کرنا.....“ اس نے نفرت سے جواب دیا۔

”وہ رنگا سیار نہیں ہے یہی معلوم کرنے کے بعد تمہیں کال کیا ہے۔“ اس بار سنجیدگی سے کہا گیا۔

”اب کیا کام ہے مجھ سے.....؟“

”وہی کام جس کے لیے تمہیں اغوا کیا گیا تھا..... اور کوئی کام ہوتا تو.....“

”مطلب کی بات کرو.....“ گئینہ نے بے رخی اختیار کی۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

حالات کے پیش نظر گئینہ حسب ہدایت اپنی خواب گاہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ سکندر علی شاہ کے حکم کے علاوہ اسے خود بھی اپنی غلطی کا احساس تھا۔ پروفیسر چنگ لائی نے یقیناً اس کے ساتھ فراڈ کیا تھا۔ وہ اس کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنے ماضی کو دوبارہ تازہ کر دینے اور مستقبل کا حال جاننے کی خاطر اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئی تھی۔ اس کا پکا یقین اس وقت ہو گیا تھا جب اس نے خود کو سرتا پا بے بس دیکھا تھا۔ ماضی میں شکار ہونے والی گئینہ وقت سے پہلے پکی عورت بن گئی تھی۔ سکندر علی شاہ کی حویلی میں جب وہ سرخ جوڑا پہن کر داخل ہو گئی تو اسے اپنے مقدر پر یقین نہیں آیا تھا۔ ایک بار کسی کی درندگی کا شکار ہونے کے بعد کسی نے اسے سکندر علی شاہ کی ہوس کا نشانہ بننے پر مجبور کر دیا تھا اس روز اس نے یہی سوچا تھا کہ اب اس کی زندگی کسی ایک مرد کی آغوش میں نہیں گزرے گی لیکن پھر جس نے اسے سکندر علی شاہ کے پاس بھیجا تھا اسی کے اشارے پر سکندر علی شاہ نے پاؤں کی جوتی کو سر کا تاج بھی بنا لیا تھا پھر گئینہ نے زندگی کی آسائش ملنے کے بعد سوچا تھا کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی سکون سے گزار دے گی لیکن سکندر علی شاہ کی فطرت آئے دن ایک تازہ شکار کرنے کی عادت تھی۔ شیلہ ورما کے بیوٹی پارلر جانے اور خود کو حویلی کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کا مشورہ بھی سکندر علی شاہ نے دیا تھا۔ باقی کسر شیلہ ورما نے پوری کر دی۔

گئینہ کے ماضی کی بھٹک مل جانے کے بعد خود شیلہ ورما کے اشارے پر جوتی نے اسے شکار کیا پھر شیلہ ورما نے عین موقع پر سامنے آ کر گئینہ کو ایک بار پھر اس کی نظروں میں مجرم بنا دیا۔ بعد ازاں جب گئینہ کو کئی لڑکیاں شکار کرنے کا کام سونپا گیا تو اس کے اندر کی مظلوم عورت جو پہلی بار خود حالات کے جال میں پھنس کر پھڑ پھڑانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی اپنی ہم جنس دوسری لڑکیوں کی مجبوریوں سے اپنا انتقام لینے لگی۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ سکندر علی شاہ گئینہ کی کارکردگی سے خوش تھا لیکن اسے اپنے مرتبے کا احساس بھی شدت سے تھا گئینہ کے جسمانی نشیب و فراز اسے بار بار کے استعمال کے بعد بھی پسند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ ایک ہی بستر پر سونے کا عادی ہو گیا۔ گئینہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھی لیکن.....

پروفیسر چنگ لائی نے بھی یقیناً اسے کسی مقصد کے تحت شکار کیا ہوگا۔ جس انداز میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے وہ گہری غنودگی کا شکار ہوئی۔ وہ بھی یقیناً پہلے سوچتی سمجھتی کوئی سازش رہی ہوگی۔ جس حالت

”ہم بھی وقت ضائع کرنے سے گریز ہی کرتے ہیں۔“ دوسری جانب سے بولنے والے کا لہجہ اور کھردرا ہو گیا۔ ”تم سے صرف ایک کام کی بات معلوم کرنی ہے..... شیخ حامد کہاں مل سکے گا؟“

”میں..... کسی شیخ حامد کو نہیں جانتی۔“

”بکواس مت کرو.....“ جواب میں گرجتی ہوئی آواز ابھری۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم اس نام سے اسے نہ جانتی ہو لیکن میرا اشارہ اسی شخص کی جانب ہے جس نے تمہیں پہلی بار کھلی سے پھول بنا دیا تھا۔ اسی نے شاید تمہارے شاہ صاحب کی دم پر پاؤں بھی رکھا ہوا ہے۔ ورنہ وہ تم جیسی استعمال شدہ عورت کو جھوپڑی کی جیلہ کے بجائے حویلی کی نگینہ کی حیثیت بھی نہ دیتا۔“

نگینہ خون کا گھونٹ پی کر ان فحش جملوں کو پی گئی۔ انخواہ کرنے والے اس کی زندگی کی بہت سے کہانیاں جانتے تھے۔ جس مقصد کے لیے اسے انخواہ کیا گیا تھا اب وہ مکمل گیا مگر..... وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جس شخص کے بارے میں معلوم کیا جا رہا ہے خود سکندر علی شاہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا نام کیا ہے؟..... وہ کون ہے؟..... کہاں ہے؟..... نگینہ کوئی زندگی بھی اسی کے حکم سے ملی تھی ورنہ سکندر علی شاہ اپنی عزت کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر نگینہ کو اسی حالت میں کسی نامعلوم جگہ دفنانے کا مہم ارادہ بھی کر چکا تھا

”تم خاموش کیوں ہو گئیں؟“ ریسپور پر جھلا کر سوال کیا گیا۔ ”کیا میں نے کوئی مشکل سوال کر دیا ہے؟“

”میں نے کہا ناں کہ میں کسی شیخ حامد کو نہیں جانتی۔“ وہ پھر تمللا کر رہ گئی لیکن خود پر فوراً قابو پا کر بولی۔ ”میں صرف ایک ایسے فرد کو جانتی ہوں جو کبھی سانسے نہیں آیا لیکن..... شاہ جی بھی اس کے حکم سے کبھی انکار نہیں کرتے۔“

”اس کا کوئی نام بھی ہوگا؟.....“

”نہیں..... فون بھی وہی کرتا ہے..... شاہ جی کے پاس اس کا کوئی مخصوص نمبر نہیں ہے۔“

”مخصوص نمبر سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”وہ جو بھی ہے ضرورت سے زیادہ دور اندیش اور محتاط ہے..... ہر بار نئے نمبروں سے کال کرتا ہے۔“

”گڈ.....“ اس بار دوسری جانب سے دوستانہ لب و لہجہ اختیار کیا گیا۔ ”تمہارے اور شاہ جی کی طرح ہمیں بھی اس کا کچھ پرانا قرض ادا کرنا ہے..... اس بات کا یقین بھی ہے ہمیں کہ سکندر علی شاہ کو موجودہ حیثیت تک پہنچانے والا بھی وہی تھا۔ بہر حال تم ہمارے ساتھ تعاون کر سکتی ہو.....“

”مجھے جو معلوم تھا بتا دیا..... اب اگر شاہ جی کو تمہارے فون کی بھینک بھی مل گئی تو.....“

”ڈونٹ وری..... میں تمہیں پبلک بوتھ سے فون کر رہا ہوں..... تم ایسا کرو کہ کسی طرح تمام نمبروں کو نوٹ کر کے ہمیں بتا دو جو تمہارے خیال میں نئے ہوتے ہیں۔ باقی کام ہم خود کر لیں گے۔“

”نہیں.....“ نگینہ نے ادھر ادھر دیکھ کر سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں اتنی ہمت نہیں

کر سکتی۔ ایک معمولی سا شبہ بھی میری اذیت ناک موت کا سبب بن جائے گا۔“

”تم کوشش کرو.....“ نرم لہجے میں دھمکی کی آمیزش بھی شامل تھی۔ ”میں پھر کبھی اسی وقت ہی فون کروں گا جب تمہارا دوغلا پیر حویلی سے باہر ہوگا۔“

”مم..... میں ایک چیز نوٹ کر کے تمہیں بتا سکتی ہوں۔“ نگینہ نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ ”وہ وقت جب اس کی کال آتی ہے..... نمبروں کو معلوم کرنا تمہارا کام ہوگا۔“

”فی الحال یہی کرتی رہو.....“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

نگینہ نے سکون کا بڑا مختصر سانس لیا۔ فون کا رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آئی تھی لیکن انخواہ کرنے والوں کے خطرے کی تلوار اس کے سر پر بہ دستور منڈلاتے رہنے کا خدشہ باقی تھا۔ وہ فون کے قریب ہی رکھے دیوان پر نیم دراز ہو کر اس برے وقت کے بارے میں سوچ رہی تھی جب وہ ایک خوب صورت اور نازخیز لڑکی کو شکار کرنے کی خاطر رینو کلب گئی تھی۔ لڑکی اس کے جال میں پوری طرح نہیں پھنسی تھی لیکن کسی نامعلوم شخص نے پروفیسر لائی کا روپ دھار کر اسے نہایت خوب صورتی سے اپنے بچھائے ہوئے سنہری جال میں پھانس لیا تھا۔ اب نگینہ کے پاس اسے برداشت کرنے کے سوا کوئی اور راستہ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ ”آسمان سے گرا بھور میں اٹکا“ کی جیتی جاگتی مثال بن کر رہ گئی تھی۔ جو نیا موڈ ایک بار پھر انخواہ کرنے والوں نے پیدا کر دیا تھا اس میں فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔



شہر سے قریب وہ بھی ایک خالی میدان تھا جس میں وقت کے ساتھ ضرورت مندوں نے جھوٹی بڑی عارضی رہائش گاہیں بنا رکھی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس میدان کے بجائے غریبوں کے کچے کچے مکانوں پر مشتمل ایک بستی وجود میں آ گئی۔ آہستہ آہستہ سیاسی جوڑ توڑ کرنے والوں نے اس بستی میں بجلی اور پانی کی ضرورت بھی گھروں میں مہیا کر دی۔ متعدد بار اس مہنگی زمین کو خالی کرانے کا مسئلہ زیر غور آیا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے اس پر سیاسی دباؤ نے پردہ ڈال دیا۔

افضل خان نے یہاں تک سفر ایک بس میں طے کیا تھا۔ جس سے اتر کر وہ کچھ دیر بعد اس بستی میں داخل ہو گیا وہ پہلے بھی ایک دو بار یہاں آچکا تھا اس لیے جو پتا اسے دیا گیا تھا وہاں تک پہنچنا اس کے لیے زیادہ دشوار بھی نہیں تھا۔ میک اپ کے اعتبار سے وہ بھی اسی بستی کا کوئی رہائشی نظر آ رہا تھا۔

مختلف جگہوں سے گزرتا ہوا اس مکان کے سامنے سے بھی گزر گیا جو اسے مطلوب تھا۔ اس نے دیدہ دانستہ ایسا کیا تھا کچھ دور آگے جانے کے بعد وہ اس طرح رک کر جیتیں ٹٹولنے لگا جیسے جلدی میں کوئی چیز یاد آگئی ہو پھر وہ پلٹ کر قدم اٹھانے لگا۔ مقصد کسی ممکنہ تعاقب سے آگاہ ہونا تھا۔ گلیوں میں دو چار بچوں کے سوا کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آیا جس پر وہ شبہ کر سکتا۔ اطمینان سے اقدام اٹھاتا وہ مطلوبہ مکان کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ دروازے کی کنڈی دوبارہ کھڑکھڑانے کے بعد وہ قدرے آڑ میں ہو گیا تھا تا کہ اندر سے اسے دیکھا نہ جاسکے۔

”کون ہے؟.....“ دروازے کے دوسری جانب سے کسی نے کھانتے ہوئے دریافت کیا۔
”ماسٹر جی کے گھر آج شام فاتحہ ہوگی.....“ افضل خان نے آواز بنا کر کہا۔ ”اطلاع دیتا پھر رہا ہوں۔“

دوسری جانب سے دوبارہ صرف کھانسی کی آواز بہ طور تصدیق ابھری۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ افضل خان نے دائیں بائیں دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ نگاہیں چار ہوئیں تو بوڑھے نے سیدھا اٹکھٹا اٹھا کر اپنی شناخت بھی کر دی۔ جواب میں افضل خان نے بھی وہی اشارہ کیا پھر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بجلی کا کھمبا تھام کر اسے دی جانے والی دائرے کے شکل والی سینٹ کی سپورٹ پر قدم جما کر کھڑا ہو گیا۔ مطلوبہ مکان کی دیوار کا فاصلہ دو فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ اس نے محتاط انداز میں جسم کو قدرے لوچ دے کر چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیوار تک پہنچ گیا۔ سامنے کچھ محن میں موجود شخص چونکا۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو افضل خان نے اس کے قد و قامت سے اندازہ لگا لیا کہ وہی وشنو ہوگا۔ پلک چپکاتے ہی اس نے جیب سے آٹو بینک پستول نکال کر میک اپ میں نظر آئے فرد پر تان لیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”اب میں تمہیں دوبارہ جس دم کا مظاہرہ کرنے کا موقع بھی نہیں دوں گا.....“ جملے کی ادائیگی کے ساتھ ہی اس نے سیدھے ہاتھ کے شانے کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ محن میں موجود شخص جو وشنو کے سوا کوئی اور نہیں تھا لڑکھڑا گیا مگر اس سے پیشتر کہ افضل خان جھپ لگا تیا دوسرا فائر کرتا۔ وشنو پھرتی سے اٹھ گیا۔ تیزی سے بہتا ہوا خون اس کے لباس کو سرخ کر رہا تھا پھر بھی وشنو نے الٹا ہاتھ افضل خان کے پستول پر ڈال دیا۔ کسی زخمی ساند کی طرح اس نے افضل خان کو ہاتھوں کے حصار میں لینے کی کوشش کی۔ دونوں ہی لڑکھڑا کر کچے فرش پر گر کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر زور لگانے لگے۔

افضل خان دوسرا فائر کرنے کے لیے زور لگا کر موقع تلاش کر رہا تھا لیکن وشنو بار بار اس کی کوشش کا توڑ کر رہا تھا ”تم زیادہ دیر خود کو موت سے نہیں بچا سکو گے وشنو..... اس بار تمہارا کر یا کرم بھی کروں گا۔“

”میں بھی گولیاں ضائع کرنے کے بجائے کسی دوسرے سے (وقت) کی راہ دیکھ سکتا تھا لیکن میں مرد ہوں.....“ وشنو نے زور لگاتے ہوئے غوغا لہجے میں جواب دیا۔ ”تم کا زہر جو تم نے چھپ کر وار کیا..... میں تمہیں آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“

افضل خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا..... کچھ دیر پیشتر وہ دیوار پر جس پوزیشن میں تھا اگر وہیں اسے اس نے وشنو کے جسم پر چیمبر میں موجود گولیاں تڑتڑادی ہوتیں تو تھیل اسی وقت ختم ہو جاتا۔ اس وقت بھی زخمی وشنو پر ایک اعتبار سے بھاری تھا۔ مگر وہ کسی کیلکڑے ہی کی طرح اس کے جسم کو اپنے زخمی ہاتھوں اور پیروں کی گرفت میں لینے کی خاطر پورا زور لگا رہا تھا جب دروازے پر کسی نے زور سے بوٹ کی ٹھوک مار کر کہا تھا۔

”دروازہ کھولو..... ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے.....“

وشنو کی توجہ ایک پل کو آواز کی سمت گئی، خطرے کا نیا احساس بھی اس کے ذہن میں ضرور ابھرا ہوگا۔ اسی دوران افضل خان نے اس کے جسم کے نازک حصے پر گھٹنوں کی ضرب لگائی تو وشنو کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وقت ضائع کیے بغیر افضل خان نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار گولی وشنو کے سینے کے بائیں جانب لگی تو وہ تڑپ کر چاروں خانے چٹ ہو گیا۔ افضل خان پھرتی سے اٹھا۔ آگے قدم بڑھا کر اس نے اٹلے ہاتھ سے دروازے کی کنڈی کھولی پھر اس نے تیسرا فائر کیا جس نے وشنو کے سیدھی ران کو خون سے تر بتر کر دیا۔ وہ ربر کی کسی گیند کی طرح اچھلا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

دروازہ کھلتے ہی دو آدمی تیزی سے اندر آ گئے۔ دروازہ دوبارہ اندر سے بند کر لیا گیا۔
”آپ نکل جائیں صاحب.....“ ایک سادہ لباس والے نے افضل خان سے کہا۔ ”ہم حکم کے مطابق اس ولد الحرام کو ڈنڈا ڈولی کر کے کرٹل صاحب کے روبرو پیش کر دیں گے۔“
”نہیں.....“ افضل خان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”کرٹل صاحب نے مجھے اس کو اوپر پہنچانے کا کام سونپا تھا۔“
وشنو نے پلٹ کر خون آلود نظروں سے افضل خان کو گھورا پھر فرش پر حقارت سے تھوک دیا لیکن اس کے بعد وہ موت کے بے رحم ہاتھوں سے خلاصی بھی نہیں کر سکا۔ افضل خان نے اس بار اس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا، وشنو منہ کے بل فرش پر اوندھ گیا، اس کا بھیجا نکل کر باہر آ گیا، وہ دم توڑ چکا تھا لیکن افضل خان نے پستول سے پچی ہوئی بانی گولیاں بھی اس کے جم میں اتار دیں۔ پھر وہ..... وشنو کے مردہ جسم پر آخری نظر ڈال کر جانے کے ارادے سے پلٹا تو ایک سادہ لباس والے نے ہاتھ میں دبا موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کرٹل صاحب کی کال ہے۔ آپ کے لیے.....“
”سر.....“ افضل خان نے موبائل لے کر فاتحانہ انداز میں کہا۔ ”میں نے آپ کے مطلوبہ مفروضہ مجرم کی کھوپڑی کے ٹکڑے اڑا دیے ہیں..... اور کوئی حکم؟.....“
”یو آر گریٹ ینگ مین.....“ کرٹل کی آواز ابھری۔ ”اب تم وہاں سے نکل جاؤ..... میرے سادہ لباس والے اس باسٹری کی ڈیڈ باڈی بھی اٹھالیں گے۔“
”رائٹ سر.....“ افضل خان نے موبائل سادہ لباس والے کے سپرد کر دیا۔ دروازے سے باہر نکلا تو وہاں ایک سادہ لباس والا اور موجود تھا۔

”میرے پیچھے پیچھے آ جائیں جناب..... آپ کو آپ کے اپارٹمنٹ تک بہ حفاظت پہنچانے کی ذمہ داری بھی ہماری ہے۔“

افضل خان نے انکار نہیں کیا۔ وہ سادہ لباس والے کے ساتھ گلی عبور کر کے تیزی سے اس راستے کی سمت بڑھنے لگا۔ جہر لباس والا اس کی رہنمائی کر رہا تھا..... وشنو کا قصہ پاک کرنے کے بعد اس کے ذہن میں شبہ کے آخری الفاظ کے ساتھ نکاح کی سنت ادا کرنے کا خیال ابھرا تو اس کی ساری تھکن بھی دور ہو گئی۔

شام کی چائے سراج نے اورنگ زیب سے فون پر بات کرنے کے بعد ہی پی تھی۔ اورنگ زیب نے جلدی واپس آنے کی بات بھی کی تھی لیکن وہ رات کے کھانے کے وقت تک نہیں آیا تھا۔ سراج کے علاوہ خود الماس بھی اسی کی راہ تک رہی تھی جب سراج نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم کھانا کھالیں.....“ اس کی لہجے میں جھلاہٹ تھی جسے محسوس کر کے الماس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”آپ کس بات پر الجھ رہے ہیں؟..... فون کر کے معلوم کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اہم کام میں مصروف ہوں۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ منظر عام سے غائب ہو گئے ہوں.....“

”ایسی بری فال زبان سے کیوں نکال رہے ہیں؟“

الماس نے سراج کو ٹوکا۔

”یہ میرے نہیں..... خود ان ہی کے الفاظ ہیں.....“

سراج نے یہ دستور الجھ کر جواب دیا پھر حالات کی کڑیاں ملانے لگا۔

دشنو کے افضل خان کے فلیٹ پر فائرنگ کے بعد جب سراج نے یہ کہا تھا کہ ”ہو سکتا ہے آکٹوپس کے شکاری کتے بھی آپ کے سادہ لباس والوں کا تعاقب کر رہے ہوں۔“ اس وقت اورنگ زیب نے کچھ سوچ کر بے حد کمبیر لہجے میں کہا تھا کہ..... ”موجودہ حالات کی روشنی میں شاید مجھے بھی منظر عام سے ہٹنا پڑے۔“ پھر سراج کی وضاحت پر اس نے حسب معمول وہی پرانی بات کہی تھی کہ..... ”تم صرف ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہو جبکہ قانون شکنی کرنے والوں کو حوالات کے پیچھے تک پہنچانے کی خاطر کبھی قانونی کارندوں کو بھی غیر قانونی حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔“

اس کے علاوہ صبح سے سراج اسے کئی بار فون کر چکا تھا۔ اورنگ زیب نے اسے بھی یہ بتایا تھا کہ آئی جی نے اس کی طویل چھٹی کی درخواست منظور نہیں کی۔ اس کے بعد وہ آفس سے نکل کر کرٹل احتشام کی طرف گیا تھا یہ بھی کہا تھا کہ واپسی پر وہ تفصیل سے بہت سی اہم باتیں بتائے گا لیکن اس کے بعد اسے اب تک نہ وہ آیا تھا نہ ہی اس نے فون کیا تھا اسی نے تاکید کی تھی کہ خود سراج بھی اسے بار بار فون کرنے سے گریز کرے۔

سراج بڑی دیر تک حالات کے تانے بانے ملاتا رہا۔ کرٹل احتشام نے دشنو کو مردہ سمجھ کر اس کی لاش کو ہندو تنظیم کے حوالے کر دیا تھا پھر چپٹا کی آگ جل کر راکھ ہو جانے کے بعد دشنو کی کریا کر م کرنے والے بھی اس راز سے بے خبر ہی رہے کہ جس کو جلا کر راکھ کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے وہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گیا تھا اگر اورنگ زیب نے اپنے شے کی تصدیق کی خاطر ذہانت سے کام نہ لیا ہوتا تو شاید یہ سوال بھی تشنہ رہ جاتا کہ افضل خان کے فلیٹ پر گولیاں کس نے چلائی تھیں؟

”آپ کیا سوچے جا رہے ہیں؟“ الماس کی آواز کانوں میں گونجی تو سراج کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ”کچھ مجھے بھی بتائیں کہ بھائی اورنگ زیب نے منظر سے ہٹ جانے والی بات کیوں کہی تھی.....؟“

”کچھ مجرموں کو ہتھکڑیاں پہنانے کی خاطر وہ بھی غیر قانونی اقدامات کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔“

”آپ انہیں فون کر کے معلوم کر لیں پلیز۔“ الماس نے بڑی اہمیت سے کہا۔ ”اتنی دیر تو وہ بتائے بغیر کبھی آپ سے دور نہیں رہے.....“

ٹھیک اسی وقت اورنگ زیب قدم اٹھاتا اندر آ گیا۔ اس نے شاید الماس کی بات سن لی تھی۔ کرسی پر سراج کے برابر بیٹھنے کے بعد اس نے بڑی مصیبت سے پوچھا۔

”کون گم ہو گیا..... کس کو فون کرنے کی بات ہو رہی تھی.....؟“

”ہیں ان کے ایک چہیتے بھائی صاحب جنہوں نے مجھے بھی بھوکا مار دیا ہے۔“ سراج نے بچوں کی طرح بے صبری کا مظاہرہ کیا تو الماس اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

”تمہارے لیے ایک گرم اطلاع ہے۔“ اورنگ زیب نے سراج سے کہا۔ ”دشنو مار دیا گیا..... میری خواہش پر خود کرٹل نے فون کر کے افضل خان کو یہ نیک کام انجام دینے کی تاکید کی تھی۔“

”گڈ.....“ سراج نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”کیا اس بار یقین کر لیا گیا ہے کہ دشنو نے جس دم کے بجائے کوئی دوسرا داؤ تو نہیں آزمایا؟“

”اب اس کے امکانات نہیں ہیں..... دشنو کا بھیجا بھی اس کی کھوپڑی سے باہر نکل چکا ہے۔“ اورنگ زیب نے شروع سے آخر تک کی تمام تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”کرٹل احتشام نے اس بار دشنو کو میری نگرانی میں سپرد خاک کیا ہے۔ اس کا چپٹر (chapter) اب ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا.....“

الماس کھانے کے ساتھ خود بھی آگئی تو سب کھانے میں محو ہو گئے۔

”آپ آئندہ کبھی اتنی دیر نہیں کریں گے۔“ الماس نے براہ راست ڈی اہمیت سے اورنگ زیب سے درخواست کی۔ ”میرے علاوہ کچھ اور لوگ بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔“

”تمہاری شکایت بجا ہے مگر آج کچھ مجبوری تھی جو میں فون کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔“

کھانے کے دوران الماس اورنگ زیب مل جل کر ڈھکے چھپے لفظوں میں سراج پر حملہ کرتے رہے جبکہ سراج سنجیدگی سے بھوک کے ساتھ انصاف کرنے میں مگن رہا..... کھانے کے بعد حسب معمول کافی بنانے لگی تو سراج اور اورنگ زیب لاؤنج میں آ گئے۔ ”آئی جی نے آپ کی چھٹی کی درخواست کیوں نامنظور کر دی؟“

”تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ وہ آئی جی ہونے کے باوجود کسی نامعلوم شخص کے زیر اثر ہے۔ اس کی کہانی تم بھی جانتے ہو۔“ اورنگ زیب نے قدرے سنجیدگی سے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”آج

کسی کا فون میری موجودگی میں آئی جی نے سنا تھا..... اس کے بعد اس نے میری درخواست کی نامتووری کے عوض مجھے میری پرانی سیٹ پر پوسٹ کرنے کی آفر بھی دی ہے۔“
”خدا کا شکر ہے.....“ سراج نے سکون کا سانس لیا۔

”میں بھی اب اس اضافی چارج سے تنگ آنے لگا ہوں۔“
”اس خیال کو ذہن سے نکال دو۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے اس پیشکش سے دو ٹوک انکار کر دیا ہے۔“
”کوئی مصلحت؟.....“

”مصلحت استعمال کرو۔ کسی کو میرا نظروں سے دور رہنا گوارہ نہیں ہے۔“
”آئی سی.....“ سراج نے اپنی غلطی تسلیم کی پھر پہلو بدل کر بولا۔ ”حالات کی روشنی میں آج ایک خیال میں بھی غاہر کروں گا۔“
”کیا.....“

”اب تک آکنو پیس ہر موقع پر شکوہ اور جواب شکوہ کے اصول پر عمل کرتا رہا ہے۔..... وشنو کے قیمتی نقصان کے بعد اب ہمارا بھی کوئی اہم مہرہ ہی خطرے کی زد میں آئے گا۔“
”مگنڈ..... اورنگ زیب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ”پہلی بار تم نے دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ مہرے کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی نام بھی ہوگا۔“
”وہ..... وہ ہم دونوں میں سے کوئی ہو سکتا ہے۔“
سراج نے کچھ توقف سے جواب دیا۔

”ایسا نہیں ہوگا۔“ اورنگ زیب نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”آکنو پیس فی الحال اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ براہ راست ہمارے اوپر ہاتھ ڈالنے کی حماقت کرے..... تم روشما کے اغواء کی گہرائی کو کیوں نظر انداز کر رہے ہو.....؟“

”اس کی وضاحت بھی آپ کر دیں.....“
”میں نے روشما کے بجائے شبنم اور افضل خان پر ہونے والے کسی امکانی حملے کا اظہار کیا تھا لیکن آکنو پیس نے روشما کو شکار کیا۔ اس کی وجہ بھی سن لو.....“ اورنگ زیب نے خلا میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز اختیار کیا۔ ”ریٹائرڈ، ڈی آئی جی عظیم احمد کی موت اور اس کی کونجی کا استعمال ہمیں فریب دینے کے لیے کیا گیا..... آکنو پیس جہاں چھپا ہے اس جگہ کو بدل کر اس نے ہمیں محض غلط راستوں پر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔“

”کیا اب بھی آپ سکندر علی شاہ کے فارم ہاؤس کے بارے میں میرے شیعے پر غور نہیں کریں گے؟“

”میں نے اس کے امکانات کو رد بھی نہیں کیا..... جگا کی دکان پر حملہ پھر اس کی زبانی تنگینہ کو اغواء کرنے کی روداد کے علاوہ میں تم کو سکندر علی شاہ سے ملاقات کی ضروری تفصیل بھی سنا چکا ہوں اور

اب..... اب میں نے ایک اہم فیصلہ بھی کر لیا ہے..... میں کسی وقت بھی سکندر علی شاہ کی دی ہوئی دعوت قبول کر لوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی بہانے تمہارے شیعے کی تصدیق بھی ہو جائے۔“
”شیر کی کچھار میں گھس کر تنہا شکار کھیلنا بھی دانش مندی نہیں ہے۔“

”تم چاہو تو سکندر علی شاہ تمہارے ذہنی سکون کا بندوبست خوشی سے کر دے گا۔ کیا خیال ہے؟“
”آپ کو آپ کے ارادوں سے باز رکھنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ایک ناقص مشورہ ضرور دوں گا۔“ سراج نے بات جاری رکھی۔ ”اگر لیاقت حسین بھی میک اپ کرنے کے بعد آپ کی گاڑی کے ڈرائیور کا کام کرے تو زیادہ مناسب رہے گا..... ہو سکتا ہے کہ اس کی غیبی قوتیں اس موقع پر بھی آپ کو مشکلات میں کسی کام آجائیں۔“

”اچھا مشورہ ہے.....“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔
سراج اس کے چہرے کے تاثرات کو بڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جب الماس کے ساتھ ملازمہ بھی کافی کی ٹرائی لیے آگئی۔ گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔



لیاقت حسین اس وقت نیند میں غرق تھا جب ماں کی مانوس آواز تمام رکاوٹوں کو توڑتی ہوئی اس کے کانوں میں ابھری۔ ”لیاقت..... میں تیری ماں بول رہی ہوں۔“
”ماں..... ہم..... میں تیری آواز سن رہا ہوں۔“
لیاقت حسین کے لبوں پر جنبش ہوئی۔

”میرا بات دھیان سے سن بیٹا..... جو موذی دشمن راستے سے وقتی طور پر ہٹ گیا تھا وہ پلید کافر پھر سامنے آ گیا ہے..... اس کی طرف سے محتاط رہنا میرے جگر کے ٹکڑے۔“
”فکر نہ کر ماں..... تیری دی ہوئی انگوٹھی خدا کے حکم سے میری مدد کرے گی۔“
”ماں کی دعائیں بھی تیرے ساتھ ہوں گی لیکن اس بار اس کافر کو فرار ہونے کا راستہ نہ دینا۔ تیرے نانے بھی خواب میں یہی بولا ہے.....“

”زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے ماں..... وہی پروردگار میری مدد کرے گا۔“
”وہ پلید ہے لیاقت..... تجھے چھانسنے کے لیے اب وہ بھی کوئی نیا جال بن رہا ہوگا۔ اس کو اپنی مہتری مورتیوں اور دیوی دیوتاؤں پر گھمنڈ ہے.....“ ماں نے کہا۔ ”گندا آدمی ہے اس لیے گندراستہ بھی اختیار کرے گا..... تیرے نانے ایک بات اور بھی بولا تھا..... اس بار فیصلہ بھی ہو جائے گا لیکن.....“

”ماں کچھ کہتے کہتے رک گئی تو لیاقت حسین نے بے چینی سے پوچھا۔ ”تو..... تو چپ کیوں ہو گئی ماں..... نانے نے فیصلہ کے بارے میں کیا بولا تھا؟“

”وہ بات میرا سمجھ میں نہیں آیا تھا..... تو گھبرانا نہیں..... اوپر والا کے ساتھ ماں کی دعائیں بھی تیری مشکل میں کام آئیں گی۔“

”میرے سینے میں اللہ پاک کا کلام بھی محفوظ ہے ماں..... وہ بھی کسی کافر کو غرق کرنے کو کافی ہوگا۔“

”یہی مسلمان کا ایمان ہے..... جس کا ایمان سلامت ہو اسے نیلی چھتری والا بھی مایوس نہیں کرتا..... مقدس کتابوں میں جو لکھا ہے وہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔“

”وہ کافر..... پلید کا خم اس وقت کہاں ہے؟“ لیاقت حسین کی آواز نیند میں ابھری۔

”م..... میں..... میرا بات کا دھیان رکھنا لیاقت..... خدا تیرا نگہبان۔“

ماں کے چہرہ پر گھب اندھیروں میں چھپ گیا تو لیاقت حسین ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ فرحسین اس کے قریب ہی بے خبر سو رہی تھی۔ ماں کے کہے ہوئے جملے لیاقت حسین کے ذہن میں تادیر صدائے بازگشت بن کر گونجنے رہے۔



وہ بہت خوب صورت اور دلکش خدوخال کا مالک تھا۔ دراز قد، چوڑا سینہ، خوب صورت اور مسکراتی ہوئی آنکھیں، کشادہ پیشانی، تازہ کلمے گلاب کی طرح ہمیشہ شاداب نظر آنے والی اس کے جسم کی رنگت، خود اعتمادی سے مدھم مگر پرکشش لہجے میں گفتگو کرنے کا انداز، ہمیشہ سلیقے سے بنے ہوئے بال اور ان پر سونے پر سہاگا تھری ٹیپس سوٹ۔

خوب صورت اور وجہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بے انتہا دولت مند بھی تھا۔ قیمتی اور نایاب پتھروں کے کاروبار نے اسے جو عروج بخشا تھا وہ اس کے مقابلے میں کسی اور کو نہیں تھا، بیرونی منڈیوں میں اسے قیمتی پتھروں کا بے تاج بادشاہ تسلیم کیا جاتا تھا، دنیا کے بیشتر ممالک کے بینکوں میں اس کے کروڑوں اور اربوں روپے کے اکاؤنٹ بھی موجود تھے۔

خود خوب صورت تھا اس لیے ایک خوب صورت ساتھی کو زندگی کا ہم سفر بنانے کا انتخاب بھی اس نے خود کیا تھا ان کی جوڑی مثالی تھی، جس محفل میں جاتے جان محفل بن جاتے، انہیں ہمیشہ بہترین کپل (Best couple) کے خطاب سے نوازا جاتا۔ خود بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے دو جان ایک قالب کی زندہ مثال تھے۔ ان کی زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی جب ان کا ملاپ کسی کی نظروں میں کاننے کی طرح کھٹکنے لگا۔ وہ ایک بدقماش اور بدنام شخصیت کا مالک تھا جس کے کئی روپ تھے۔ سانپ کی طرح کینچلی بدلنے کا عادی تھا۔ یہ بات قیمتی پتھروں کے تاجر خالد ریاض کے علم میں تھی لیکن اس نے اپنی شریک حیات کو جسے وہ پیار سے میڈم روٹی کہتا تھا، اس بات سے آگاہ نہیں کیا تھا، شاید ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی اس لیے کہ بیشتر لوگ ان کے پیار کو حریص نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ کس کس کی نظر پر بندش عائد کرتا لیکن ایک موقع پر جب وہ پہلی بار پتھروں کی بین الاقوامی نمائش میں شرکت کے لیے جا رہا تھا اس نے روٹی کو شیخ حامد کے نام اور کاروبار کے سلسلے میں دینی زبان میں کچھ ضروری خطرات سے بھی آگاہ کر دیا تھا ہوشیار رہنے کی تاکید بھی کی تھی۔

خالد رضا کے جانے کے بعد میڈم روٹی شیخ حامد کے بارے میں اپنے ذرائع سے بھی مختلف

کوائف جمع کرتی رہی۔ خالد ریاض نے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ بہت کم تھیں۔ میڈم روٹی نے سوچ رکھا تھا کہ شوہر کے آنے کے بعد وہ اسے کسی نہ کسی طرح اس بات پر رضا مند کر لے گی کہ وہ مستقل طور پر کہیں منتقل ہو جائیں۔ اسے یقین تھا کہ خالد ریاض اس کی بات سے انکار نہیں کرے گا مگر..... قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ ایک دن اسے اچانک خالد ریاض کے ساتھ کانے والے ایک کارندے نے اطلاع دی کہ خالد ریاض کسی بزنس کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہا تھا جب ایک کارائیکڈنٹ میں فوت ہو گیا۔

میڈم روٹی کو شوہر کی موت کی اندوہناک اطلاع ملی تو وہ دیوانی ہو گئی۔ پہلی فلائٹ سے باہر جا کر شوہر کی لاش وطن واپس لانے کی خاطر پہنچ گئی۔ غیر ملکی ایجنسیوں نے میڈم روٹی شوہر کی لاش واپس لیجانے سے پہلے پوسٹ مارٹم کرانے کا قیمتی مشورہ دیا تھا لیکن اس نے ان مشوروں پر عمل نہیں کیا۔ لاش کو چارٹرڈ طین کے ذریعے واپس لانے کے بعد اسلامی رسم و رواج کے مطابق سپرد خاک کر دیا گیا۔

بہت عرصے تک شوہر کی جدائی کا سوگ مناتی رہی۔ اس کی زندگی کی ساری خوشیاں بھی شوہر کے ساتھ دفن ہو گئی تھیں۔ صرف ایک خیال بار بار اس کے ذہن میں ابھرتا رہا۔ ”جس کار سے خالد ریاض کی کار کی ٹکر ہوئی تھی وہ کون چلا رہا تھا؟..... پولیس کوشش بسیار کے باوجود اسے کیوں تلاش نہیں کر سکی؟“ اسی سوال کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں شیخ حامد کا نام بھی جڑ پکڑتا گیا پھر..... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذاتی تجربوں، مشاہدوں اور حالات کی روشنی میں یہ شبہ بھی پختہ ہو گیا کہ وہ بد خواہ کوئی اور نہیں..... شیخ حامد ہی تھا جس نے خالد ریاض کو اپنے راستے سے ہٹا کر میڈم روٹی کے دل میں جگہ بنانے کی مذموم کوشش کی تھی۔

وہ ہر رات شوہر کی فریم شدہ تصویر کو چومنے کے بعد سونے کی عادی تھی۔ سوتے جاتے ہر وقت شوہر کا تصور کہیں نہ کہیں اس کے آس پاس ضرور منڈلاتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خواب میں مسکراتا ہوا چانک سامنے آ گیا تھا۔ میڈم روٹی کی نظریں اس کی پرستش کرنے میں مصروف تھیں جب اس کے شوہر کی مانوس آواز کہیں دور سے ابھرنی ہوئی سنائی دی۔

”تم..... کب تک میرے انتظار میں خوابوں کی دنیا آباد کرتی رہو گی..... ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو۔“

”تمہارا مشورہ ہمیشہ میرے لیے کارآمد ہی ثابت ہوا ہے..... اب کیا حکم ہے؟“

”زندگی گزارنے کے لیے ایک تنہا عورت کو کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے..... تم..... تم بھی اپنا گھر بسالو۔“

”میں تنہا کب ہوں۔“ میڈم روٹی نے شکوہ کیا۔ دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ”تم ہمیشہ میرے بہت قریب رہتے ہو۔ اس وقت بھی ہو۔“

”اس عارضی اور ہمہ سہارے کو دل سے نکال دو..... جانے والے بھی واپس نہیں آتے۔“

”پھر میری ایک خواہش بھی پوری کر دو.....“ وہ مجسم التجاہ بن گئی۔ ”مجھے بھی اپنے پاس بلا لو۔“
جواب میں خالد ریاض کی نگاہوں میں ایک حسرت بھری چمک پیدا ہوئی اور اس کے بعد وہ کسی کھٹکے کی آواز ہی تھی جو میڈیم روپی کے کانوں میں گونجی۔ اس کے ساتھ سہانا خواب بھی کرجی کر پچی ہو گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے نظریں گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ خواب گاہ میں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اپنی وحشت کو دور کرنے کی خاطر اس نے بیڈ سے لگی کال تیل کو دبا کر تھریا کو کال کیا پھر وہ دروازہ کھولنے کے ارادے سے اٹھ رہی تھی جب تھریا دروازہ کھولنے کے ارادے سے اندر آگئی۔ میڈیم روپی نے چونک کر سوال کیا..... ”کیا دروازہ بند نہیں تھا.....؟“
”نہیں.....“ تھریا نے مسکرا کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ آپ نے سونے سے پیشتر ارادہ کیا ہو پھر بھول ہو گئی ہوں۔“
”شاید ایسا ہی ہوا ہو.....“ میڈیم نے سر جھٹک کر شانے اچکائے پھر دوستانہ لہجے میں پوچھا۔ ”تم سو نہیں رہی تھی؟“
”سوتے میں بھی میرا ذہن آپ کی کال تیل کا خیال رکھتا ہے۔“ تھریا کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”اس وقت کیسے یاد کیا؟“
”نیند نہیں آ رہی تھی شاید سوتے میں آنکھ کھل گئی ہو۔“ میڈیم نے خواب بتانے سے گریز کیا۔
”کافی بنا کر لاؤں.....“
”نہیں..... فی الحال تمہاری موجودگی ہی کافی ہے۔“ تھریا نے نیند کو خیر باد کہہ دیا..... میڈیم روپی اس کی وہ محنت بھی تھی جس نے اسے دشمنوں کے چنگل میں پھنس کر بے آبرو ہونے سے بچایا تھا۔ وہ مقام دیا تھا جس کو تھریا کسی صورت فراموش نہیں کر سکتی تھی۔
خاصی دیر تک میڈیم روپی اور تھریا کے درمیان ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی پھر اس نے جمائی لیتے ہوئے تھریا سے کہا۔ ”تم اب جا کر آرام کرو..... میں بھی سونے کی کوشش کرتی ہوں۔“
”میرے سامنے اٹھ کر حسب معمول دروازہ بھی اندر سے لاک کر لیں۔ کہیں نیند کے جھوٹے میں دوبارہ بھول جائیں۔“

میڈیم روپی نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا..... اس وقت بھی اسے بات کا مکمل یقین نہیں آیا تھا کہ وہ دروازہ کھول کر سو گئی ہوگی۔ ایسا کرنا اس کے روزمرہ کے اہم معلومات میں سرفہرست تھا۔ تھریا کے اغواء کے بعد اس نے اپنے گاڑڈ میں بھی اسی احتیاط کے پیش نظر اضافہ کر دیا تھا کہ جو حادثہ تھریا کو پیش آچکا تھا کہیں اس کے سلسلے میں بھی نہ اختیار کیا جائے۔
بستر پر دوبارہ سونے کے ارادے سے لیٹنے کے بعد اس نے بیڈ سوچ کے ذریعے نائٹ بلب کے علاوہ تمام لائٹس آف کر دیں لیکن..... اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی ممکن نظر نہیں آیا تھا۔ نائٹ بلب کے روشن ہونے کے بہ مشکل ایک منٹ پر لمحہ ڈریسنگ روم کی روشنی

آن ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی کی سرسراہٹ کی آواز بھی واضح طور پر ابھری۔
”کوئی حماقت یا چالاکي نہ کرنا ورنہ تمہاری گئی جتنی سانسیں بھی ختم کر دوں گا۔“
”میڈیم روپی نے دوبارہ اٹھ کر سہمی سہمی نظروں سے ڈریسنگ روم کی جانب دیکھا وہاں جو بھی تھا اس کے جسم پر گاڑڈ کی یونیفارم بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ درمیانے قد اور قابل رشک صحت کا مالک تھا۔
”میں وہ نہیں..... جو تم سمجھ رہی ہو.....“ خواب گاہ میں موجود شخص قدم اٹھاتا میڈیم روپی کے قریب آ گیا۔

آنے والے کی نظروں میں کسی زہریلے ناگ جیسی چمک اور سرخی اس بات کی علامت تھی کہ اس کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ ہڑبڑا کر بیدار ہونے اور خواب گاہ کا دروازہ کھلے رہ جانے کا مسئلہ بھی میڈیم روپی کے سمجھ میں آ گیا۔ وہ اسے حیرت سے گھورتی رہی خود کو اپنی ہی حماقت کے نیچے سنبھالنے کا حوصلہ دے رہی تھی۔
”اس قدر غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟“ درمیانہ قد اور گھٹے ہوئے جسم کے مالک اجنبی نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

”کون ہو تم؟.....“
”میں نے کہا ناں کہ وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو.....“
”چوروں کی طرح یہاں گھس آئے ہو تو اس کا کچھ مقصد بھی ہوگا؟“ میڈیم نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”تمہاری اس جرأت کی قیمت میں سکوں کی صورت میں دینے کو تیار ہوں..... ایک شرط پر..... جس طرح دبے قدموں آئے ہو اسی طرح خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔“
”مجھے تمہاری آفر منظور نہیں ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔
”یہ مت بھولو کہ ابھی باہر میرے کچھ گاڑڈ بھی موجود ہوں گے..... کسی ہنگامے کی صورت میں تمہاری واپسی ممکن نہیں ہوگی۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے جان من.....“ اس نے میڈیم روپی کو سرتا پاغور سے دیکھا۔ ایک لمحے دیکھتا رہا پھر بے حد دردمانک لہجے میں بولا۔ ”تم خوشی سے مسکراتے ہوئے ایک بار میری آغوش میں آ جاؤ پھر..... تمہارے کہنے پر میں موت بھی گوارہ کر لوں گا۔“
”جانتے ہو تم کس سے مخاطب ہو؟“ میڈیم نے تمللا کر سوال کیا، اس کے ساتھ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں جانتا ہوں اور اب..... اب تم بھی جان لو کہ میں کس حیثیت کا مالک ہوں۔“
آنے والے نے ہاتھ بڑھا کر اپنے چہرے سے ایک باریک جھلی اتاری تو میڈیم روپی کے دل کی دھڑکنیں یکلخت ناقابل برداشت ہوئے لگیں..... گاڑڈ کی یونیفارم میں نظر آنے والا کوئی اور نہیں..... شیخ حامد تھا..... چہرے سے ماسک اتار دینے کے بعد وہ نڈر اور بے خوف ہی نظر آتا رہا۔
”حیران ہو رہی ہوں ناں.....“ شیخ حامد نے مسکرا کر کہا پھر اس کا لہجہ یکلخت تبدیل ہو گیا۔ ”میں

”تمہارا کیا خیال ہے.....“ میڈم روبی نے حقارت سے تھوک کر کہا۔ ”کیا میں تمہاری یہ خواہش پوری کروں گی؟“

”آج نہیں توکل.....“ شیخ حامد نے مسکرا کر کہا۔

”میں ایسے حالات پیدا کروں گا کہ تم مجبور ہو جاؤ گی۔“

”اپنی کمینی ذہنیت کا ثبوت دے چکے ہو تو خاموشی سے میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ..... ورنہ.....“

”ایسی کوئی غلطی نہ کرنا.....“ شیخ حامد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مفت میں تمہارے بہت سے گارڈز زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“

”اور کیا بکواس کرنا باقی رہ گیا ہے.....؟“

”جس طرح میں تمہاری خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اسی طرح تمہیں زبردستی دبوچ کر اپنی بھوک بھی مٹا سکتا تھا۔ کیا تم میرا یہ احسان نہیں مانو گی؟“

”نہیں.....“ میڈم روبی نے ٹل کھا کر نفرت کا اظہار کیا۔ ”جو کچھ کمینگی کا ثبوت تم دیتے ہو وہ تمہاری دیرینہ خواہش کی تکمیل نہ ہوتی۔“

”ایک آخری بات اور سن لو..... میں اس وقت جس گارڈ کی وردی میں ہوں وہ میرا نہیں..... بے ہوشی کی حالت میں تمہیں زندہ مل جائے گا..... میرا ایک پیغام اپنے چہیتے ایس پی تک بھی پہنچا دینا..... وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لے..... یہی اس کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا اور..... دوبارہ جب میں تمہارے سامنے آؤں گا تو تم میری خواہش کی تکمیل سے انکار کی پوزیشن میں نہیں ہوگی۔“

میڈم روبی نے جواب میں پھر حقارت سے تھوک دیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ شیخ حامد زبردستی اس کے ساتھ دست درازی نہیں کرے گا۔ جواب میں وہ سینہ تانے کھڑا چند لمحوں کے جسمانی نشیب و فراز کو دیکھتا رہا پھر..... بجلی کی تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے میڈم روبی کو سیدھے ہاتھ سے دبوچا..... الٹا ہاتھ جس میں اس کا رومال تھا اس کے ناک اور منہ پر رکھ دیا۔

ناگوار خوشبو کے احساس نے میڈم روبی کو صورتِ حات کا احساس دلایا تو اس نے خود کو شیطانی گرفت سے آزاد کرانے کی خاطر بھرپور مزاحمت کرنی چاہی لیکن رومال سے پھوٹنے والی مہک نے اس کے پورے وجود پر غودگی کی کیفیت طاری کر دی۔ اس کا ذہن گھب اندھیروں میں ڈوب گیا..... پھر دوبارہ ہوش آنے پر اس نے خود کو جس حالت میں پایا اس نے شیخ حامد کے آخری جملوں کے مفہوم بھی واضح کر دیئے..... اس کا اوپری جسم بالکل برہنہ تھا جہاں ایک ٹائپ شدہ پیام بھی کاغذ کے کٹڑے پر موجود تھا۔ میڈم روبی نے اپنے برہنہ جسم کو چھپا کر اس پیغام کو پڑھا۔

دوبارہ میری خواہش پوری ضرور کرنا ورنہ..... تمہاری تصاویر اخباروں میں آگئیں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہو گی.....“ اس پیغام کے نیچے آکٹوپس کی شبیہ والی مہر بھی موجود تھی۔

جانتا ہوں کہ تم نے خالد ریاض کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیوں نہیں کرایا تھا..... اس نے غالباً تمہیں میرے بارے میں کسی خدشے سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ اس کا اندیشہ غلط بھی نہیں ثابت ہوا۔ تم یہاں اس کی واپسی کی راہ تک رہی تھیں جب وہ ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گیا۔ پولیس آج تک قاتل کار ڈرائیور کا سراغ نہیں لگا سکی۔ تم اس کی ڈیڈ باڈی لے کر آئی تھیں۔ تمہارے درمیان کوئی بات نہیں ہو سکی تھی لیکن.....“ شیخ حامد نے میڈم روبی کے چہرے پر ابھرنے والے نفرت اور حقارت کے تاثرات کو غور سے دیکھا پھر بے پروائی سے بولا۔ ”اس کو دفنانے کے بعد تمہارے ذہن میں مجھ سے انتقام لینے کا خیال اتنی شدت سے ابھرا کہ تم نے مرنے والے کی ایک آخری خواہش کو فرضی طور پر رٹ لیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔“

”تم..... تم میرے خیال میں دنیا کے سب سے گھٹیا اور بچ ترین شخص ہو۔“ میڈم نے نفرت کا کھل کر اظہار کیا۔

”میں تمہارے اس خیال کی تردید نہیں کروں گا.....“ جواب ڈھینٹ لہجے میں مسکرا کر دیا گیا۔ ”سب سے پہلے تم نے میرے نمک حرام ثابت ہو جانے والے ایک پالتو کتے افضل خان کو مرنے والے کی من گھڑت آخری خواہش سنا لی لیکن اس وقت وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ میرے سامنے نظرس ادا بھی کر کے بات کر سکتا۔ آج بھی نہیں ہے۔ میں جب چاہوں ایک اشارے پر ختم کر سکتا ہوں لیکن..... میں ایسا نہیں کروں گا..... مجھے اپنے تعاقب میں پائل کتوں کی چیخ و پکار اچھی لگتی ہے۔“

”ڈی آئی جی..... باسٹرڈ آفا منظور کے سامنے بھی تم نے یہی شرط رکھی تھی کہ اپنی آنکھوں سے میری لاش دیکھ لینے کے بعد تم اس سے شادی کر لو گی لیکن.....“ شیخ حامد کے مکروہ چہرے پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ ”میری زندگی میں تو کیا..... مرنے کے بعد بھی میرے کچھ وفادار کتے تمہیں آفا منظور سے شادی نہیں کرنے دیں گے۔ سن رہی ہو جان من؟..... میں کیا دعویٰ کر رہا ہوں؟“

میڈم روبی نے کوئی جواب نہیں دیا، بہ دستور حقارت بھری نظروں سے اپنے بدترین دشمن کو دیکھتی رہی۔

”اب میدان میں صرف ایک آخری سر بھر باقی ہے جسے میں دیدہ دانستہ ڈھیل دے رہا ہوں..... تمہارے خوابوں کی تکمیل کرنے والا آخری سر بھرا..... میں ایس پی اور تک زیب کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے دن گئے چنے رہ گئے ہیں۔“

”تم اس وقت یہاں کس مقصد سے آئے ہو.....؟“

میڈم روبی نے مدغم لہجے میں سوال کیا۔

”ایک بار تم میرے گھر میں آئی تھیں..... میں چاہتا تو اس وقت بھی تمہارے بدن سے کھیل سکتا تھا مگر نہیں.....“ جواب پھر زہر خند سے دیا گیا۔ ”تم دنیا کی وہ واحد خوش نصیب عورت ہو جس کے بارے میں میں میری تمنا ہی ہے کہ وہ ہنسی مسکراتی میری آغوش کی زینت بنے۔“

لوچن اس وقت بھی میک اپ میں تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کی مخصوص چائیز علامتوں کو گلر گلاس کے پیچھے چھپانے کی خاطر چشمہ بھی لگا رکھا تھا اس نے نگینہ سے جو معلومات حاصل کی تھیں وہ کافی نہیں تھی اس لیے وہ اب از خود سکندر علی شاہ کے گھر کے دو نمبروں کو خاص طور پر ایک جدید ڈیوائس کے ذریعے چیک کر رہا تھا۔ دور سے دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ اس نے جب میں پاکٹ سائز ٹرانسمیٹر رکھا ہوا ہے اور کانوں میں اسی کا ایئر فون لگا رکھا ہوگا لیکن یہ ایک مخصوص ڈیوائس تھی جسے لوچن نے بہت عرصے قبل یہودیوں کے ایک خفیہ ایجنٹ سے منہ مانگے داموں کے عوض اس وقت خریدا تھا جب وہ کسی مہم میں زخمی ہونے کے بعد ایک اسپتال میں معذور پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس ایجنٹ کو کھل کر بتا دیا تھا کہ وہ زندگی میں اب دوبارہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اس ڈیوائس کی خصوصیت یہ تھی کہ اگر اس کے دوسرے کلب نما مختصر حصے کو ایئر فون کے جنکشن کبس کے قریب مطلوبہ لائن پر لگا دیا جائے تو ایک مخصوص فاصلے کے دوری کے باوجود اس لائن پر ہونے والی گفتگو ایئر فون پر سنی جاسکتی تھی جس کے تاروں سے منسلک دوسرے لپ اسٹک سائز کے سیلڈ بند حصے کو جب میں رکھا جاتا تھا۔

نگینہ سے ہونے والی گفتگو کے بعد لوچن نے اپنی رہائش بھی فوری طور پر تبدیل کر دی تھی۔ اس تبدیلی کی وجہ چکا بھی تھا جو اس کے خیال میں دوسری پارٹی کی نظر میں آگیا تھا۔ یہ شبہ اسے ریبنو کلب میں اس وقت ہوا تھا جب وہ نگینہ کو دھوکا دے کر ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اکثر عورتوں کی طرح اپنے مستقبل کے بارے میں قبل از وقت جان لینے کی خاطر نگینہ نے بھی اسے کوئی مستقبل شناس سمجھ کر اس کے ساتھ جانا منظور کر لیا تھا۔ چکا کے بارے میں اس کا شبہ اس وقت درست ثابت ہوا جب چکا کے فرنیچر مارٹ پر حملہ ہوا تھا۔ اگر لوچن نے بروقت سامنے آ کر بازی نہ پلٹی ہوتی تو چکا تنہا ان دشمنوں کا مقابلہ بھی نہ کر پاتا جو اسے دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کرنے کی خاطر بڑے منظم طریقے سے آئے تھے اسی بہانے چکا سے اس کی دوستی کی بنیادیں بھی زیادہ مستحکم ہو گئی تھیں۔

لوچن اس وقت ایک اور کس وکین کار میں تنہا بیٹھا اس کے اسٹیرنگ پر اس انداز میں انگلیاں چلا رہا تھا جیسے کانوں میں گونجتے کسی نغمے کی دھن کو انجوائے کر رہا ہو لیکن اس کا ذہن خاص طور پر اس فون لائن سے ابھرنے والی آوازیں سن رہا تھا جو سکندر علی شاہ اور نگینہ کی مشترکہ خواب گاہ میں تھا۔ دو تین کالیں اس کے مقصد کی نہیں تھیں۔ لوچن کو کوئی جلدی بھی نہیں تھی پھر اتفاق سے اسے زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً پچاس منٹ کے انتظار کے بعد جو کال اس نے سنی اسے سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ حسب معمول فون سکندر علی شاہ نے ریسیو کیا تھا، لیکن پھر دوسری جانب سے اسے جس لب ولہجے میں مخاطب کیا گیا وہ کسی مرید یا دوست کا نہیں تھا۔

”میں نے اس وقت تم کو ایک اہم اطلاع دینے کیلئے فون کیا ہے۔ کان کھول کر سن لو میری

ہدایت کو نوٹ کرو۔۔۔۔۔“ کسی نے ایسی آواز میں گفتگو کا آغاز کیا جیسے کوئی بڑا آفیسر اپنے کسی چہڑا سی سے مخاطب ہو۔

”سن رہا ہوں۔۔۔۔۔“ سکندر علی شاہ کی آواز ابھری جس میں گھٹن کا احساس بھی تھا۔

”نگینہ اب قابل اعتماد نہیں رہی۔۔۔۔۔ تمہارا کیا اندازہ ہے اس سلسلے میں؟“

”ریبنو کلب سے اغواء کیے جانے کے بعد وہ جس حالت میں ملی تھی میں نے اسی وقت کہا تھا کہ اب اسے فارغ کر دیا جائے۔“ سکندر علی شاہ نے بے حد بیزارگی سے جواب دیا۔

”وہ وقت مناسب نہیں تھا۔۔۔۔۔ لیکن اب۔۔۔۔۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد سوال کیا گیا۔ ”اس وقت وہ کہاں ہے؟“

”نہیں چار منٹ پہلے شاور لینے کے ارادے سے غسل خانے میں گئی ہے۔۔۔۔۔“

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے پہلے تمہیں اس کے بارے میں برداشت کرنے کو کیوں کہا تھا اور اب۔۔۔۔۔ اسے ناقابل اعتماد کیوں اور کس وجہ سے کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔“

”جس سے نفرت ہو جائے میں اس پر زیادہ توجہ بھی نہیں دیتا۔“

”تم بھول رہے ہو کہ اس وقت کس سے مخاطب ہو۔۔۔۔۔ اس بار دوسری جانب سے تنبیہی انداز میں کہا گیا۔

”اب کیا حکم ہے میرے لیے۔۔۔۔۔؟“

”اسی انداز میں آئندہ بھی گفتگو کرنے کی عادت ڈالو۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا ہے تو بگاڑ بھی سکتا ہوں۔“

”جانتا ہوں۔۔۔۔۔“ سکندر علی شاہ نے بے بسی کا اظہار کیا۔

”جن لوگوں نے نگینہ کو اغواء کیا تھا۔ ان کا ایک مہرہ پٹے پٹے بال بال بچ گیا۔ جب میں چاہوں گا اسے بھی کسی چپوٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔“

”نگینہ نے کیا نمک حرامی کی ہے؟ کیا اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ دوسری طرف سے بولنے والے نے تھکمانہ لہجے میں کہا۔ ”اسے طلاق دے کر پہلی فرصت میں حویلی سے نکال دو۔۔۔۔۔ اس کے بعد میرے اپنے آدمی اس کے ایک ایک لمحے پر نظر رکھیں گے۔ ہو سکتا ہے جو دوسرا آدمی ہاتھ سے نکل گیا اسی بہانے وہ بھی بے نقاب ہو جائے۔“

”کچھ کہنے کی اجازت چاہوں گا۔“

”کہو۔۔۔۔۔“

”حویلی سے نکلنے کے بعد میری بدنامی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔“

”دوسری تجویز کیا پیش کرو گے۔۔۔۔۔؟“

”اسے ایک دو روز بعد تفریح کے بہانے کہیں بیرون ملک روانہ کر دیا جائے۔“ سکندر علی شاہ نے مدہم آواز میں تجویز پیش کی۔ ”وہاں کوئی بھی اچانک حادثہ اس کو کانٹنے کی طرح نکال سکتا ہے۔“

”صرف میری بات غور سے سنتے رہیں۔ کیا سراج اور ان کی مسز بھی موجود ہیں۔“
”جی ہاں.....“ اورنگ زیب نے آواز سن کر سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”الماس بھی ساتھ ہی موجود ہیں۔“

”میرا نام متا شا کرم یاد رکھیں۔ الماس کو بھی بتادیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اورنگ زیب نے موبائل بند کر کے سراج کو تیز نظروں سے گھورا۔ یہ متا شا کرم کون خاتون ہیں؟“

”پلیز.....“ سراج نے ہلکی نظروں سے درخواست کی۔ ”آپ گھر آباد نہیں کرتے نہ کریں لیکن میرا گھر.....“

”کیا بات ہے؟“ الماس نے متا شا کرم سن کر براہ راست اورنگ زیب سے پوچھا۔ ”نام سے ایرانی لگتی ہے۔“

مجھے تم سے اس حماقت کی امید نہیں تھی۔“ اورنگ زیب بہ دستور سراج سے بولا۔ ”کم از کم کسی خاتون کو گھر بلانا، نازیبا حرکت ہے۔“

پھر جب اس نے بیرون گیٹ سے رابطہ قائم کر کے یہ ہدایت دی کہ ٹیڈ گلاس کی جو گاڑی آ رہی ہے اس کے لیے پھاٹک بغیر کس باز پرس کے کھول دینا۔ خاص مہمان ہیں..... اورنگ زیب نے گیٹ پر ہدایت دینے کے بعد ہی الماس سے کہا تھا۔ ”متا شا کرم نے ایک گرما گرم کافی کی فرمائش کی ہے..... ضرور تیار کر دینا۔“

خدا کے لیے پلیز.....“ سراج نے دوبارہ اورنگ زیب سے کہا۔ ”بھائی ہو کر بہن کے دل میں بدگمانی تو نہ پیدا کریں۔“

”آپ نے بتایا نہیں۔“ الماس کچھ کچھ سنجیدہ ہونے لگی۔ ”کون خاتون آ رہی ہیں؟“
اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ موبائل پر دوسری جانب سے مختصر بات ہونے کے بعد وہ بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ پھر اس وقت سراج بھی بوکھلا گیا جب ایک دروازہ قد برق پوش اندر داخل ہو کر اسی کی طرف آگئی۔ الماس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی اور اس وقت تو اس کا خون بھی کھول گیا جب برق پوش نے بڑے پیار سے سراج کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

سراج ہڑبڑا کر اٹھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے علاوہ الماس بھی ششدر رہ گئی۔ برق کے نقاب پلٹنے کے بعد جو چہرہ نظر آیا وہ کرنل احتشام کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔ سراج بھی چوٹے بغیر نہ رہ سکا۔ کرنل نے برق اتار کر ایک طرف رکھا پھر براہ راست الماس کی طرف دیکھا۔ ”اگر آپ ہی الماس اور مسز سراج ہیں تو آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”آپ تشریف رکھیں، میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔“

”نوافار مالینی.....“ کرنل نے کہا۔ ”میں ایک اشد ضروری کام سے آیا ہوں۔ فوجی زندگی میں ایسے مواقع کم ملتے ہیں جب انسان آن ڈیوٹی رہ کر گھوٹو زندگی انجوائے کر سکے..... کرنل احتشام کے

”اچھا خیال ہے.....“ سراج نے ہوائے انداز میں کہا گیا۔ ”ایک دو روز اور انتظار کر لو اس کے بعد ہی میں کوئی حتمی فیصلہ کر کے تم کو آگاہ کر دوں گا۔“

کال ختم ہوئی تو لوچن نے ایئر فون کو کان سے علیحدہ کر دیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ محض وقت گزارنے کی خاطر ایک سپراسٹور پر گیا۔ عقی آئینے میں کسی تعاقب کے اندیشے کو بھی چپک کر تار پھر واپس ہونے کے کمرے میں آ گیا۔ پہلی فرصت میں اس نے موبائل کی سم تبدیل کر کے جگا کو کال کی۔ ”ہیلو.....“ کال جگا ہی نے اینڈ کی تھی

”پروفیسر چنگ لائی فار چون.....“ لوچن نے کہا۔ ”ایک ضروری کام پیش آ گیا ہے تم اپنے ذاتی مصروفیات کی بنا پر اسے آسانی سے کر سکو گے۔“

”تکلف نہیں..... جب دوستوں کے انداز میں ہاتھ ملایا ہے تو اپنا حق سمجھ کر بات کرو..... میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔“

”ایک کال میں نے کچھ دیر پیشتر کسی ذریعے سے سنی ہے..... جس نمبر پر کال کی گئی تھی اس کا نمبر اور وقت نوٹ کر لو۔“

لوچن نے کہا۔ ”دوسری طرف سے کال کرنے والے کا نمبر اور ایڈریس تمہیں اپنے ذرائع سے معلوم کرنا ہے۔“

”یہ میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا..... حالات کے پیش نظر میں نے آپکے آدی کو خرید رکھا ہے..... تمہارا مطلوبہ کام پورا کرنے کے بعد ہی تمہیں کام کروں گا۔“

”میں اسی سم پر تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔“

لوچن نے موبائل بند کر دیا۔ نگینہ نے جو اطلاع دی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ جس نے سکندر علی شاہ سے بات کی تھی اس پر شیخ حامد ہونے کا شبہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ لوچن کے اندر ایک ہانچل سی جاری تھی۔ اگر جگا کال کرنے والے کا نمبر اور پتا بتا دیتا تو وہ اپنے اسے شے کی تصدیق میں بھی احتیاط ہی سے کام لیتا لیکن..... تقریباً سوا گھنٹے بعد جگا نے اپنے ذرائع کو استعمال کرنے کے بعد جو معلومات فراہم کیں وہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ سکندر علی شاہ کو کسی پبلک بوتھ سے کال کیا گیا تھا۔ اس علاقے کا نام بھی جگا نے بتا دیا تھا مگر.....

لوچن سمجھ رہا تھا کہ صرف علاقے کے نام سے کال کرنے والے کو ٹریس نہیں کیا جاسکتا تھا اورنگ زیب نے جس کا نام آنکھوں سے رکھا تھا وہ بھی اتنا عیار اور دور اندیش تھا کہ اس نے بھی اپنے رہائشی علاقے کے کسی پبلک فون کو استعمال کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا ہوگا۔



چھٹی کا دن تھا اس لیے سب ایک ساتھ بیٹھے اطمینان سے ناشتا کر رہے تھے جب اورنگ زیب کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی۔

”ہیلو.....“ اورنگ زیب نے کال ریسیو کی۔

نام کے حروف سے ”نتاشا کرم“ میں دو ایک بار پہلے بھی دوستوں سے بہ طور مذاق استعمال کر چکا ہوں..... اس نام میں کرٹل کا ”لام ساکن“ رہ جاتا ہے۔ آپ اسے مجبوری سمجھ لیں۔“

کرٹل سے بے تکلفی اور ملنساری کو دیکھ کر الماس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ سکی۔ وہ کافی تیار کرنے کے لیے کچن میں گئی۔ کرٹل نے اورنگ زیب سے کہا۔ ”میں نے اسے وقت جو گاڑی استعمال کی ہے ابھی اس کی رجسٹریشن بھی نہیں ہوئی، کام کی نوعیت ٹاپ پرائیویٹ جیسی تھی اس لیے میں ادھر ہی آ گیا۔“

”بات کیا ہے.....؟“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کیا ہم یہاں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“

”اوپر والے کمرے میں آ جائیں وہ جگہ زیادہ سیف ہے۔“ اورنگ زیب کے ساتھ سراج بھی اٹھ گیا۔ اوپر کے کمرے میں پہنچنے کے بعد کرٹل نے کہا۔ ”مج میری آنکھ فون کال پر کھلی تھی۔ میڈم روبی نے پہلی مرتبہ آپ کے حوالے سے کال کیا تھا۔ نام میرا سنا ہوا تھا اس لیے میں نے توجہ سے بات سنی.....“ کرٹل نے پہلو بدل کر کہا۔ ”گذشتہ رات کے دوسرے پہر کسی نے اسے آنکھوں کے نام سے کال کر کے دھمکی دی تھی کہ میڈم کو ایک ہفتے کے اندر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ فون پر یہ چیلنج بھی دیا گیا ہے کہ تمام تر حفاظتی اقدام کے باوجود وہ خود کو موت سے نہیں بچا سکے گی..... اسی کی درخواست پر میں نے اس کے پرائیویٹ گاڑڈز کو ہٹا کر اپنے بہترین اور تجربہ کار کمانڈوز کو تعینات کر دیا ہے۔ ایک پاس ورڈ بھی بتا دیا ہے تاکہ کسی ایمرجنسی میں میڈم براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کر سکے۔“

”حیرت ہے کہ اس نے مجھے یا سراج کو کال نہیں کیا.....؟ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”اس کی وجہ بھی مجھے بتادی ہے..... اسے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ لوگوں کی کال ٹیپ نہ کی جارہی ہو..... مجھ سے بھی یہی درخواست کی ہے کہ میں رات کی بات صرف اپنی ذات تک محدود رکھوں۔“

”میرا ذاتی خیال ہے کہ اصل بات کچھ اور ہوگی۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ”بہر حال جب اس نے سیکریسی سے کام لیا ہے تو ہم بھی اسے کریدنے کی غلطی نہیں کریں گے۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس باسٹرڈ آنکھوں نے ہماری توجہ اصل لائن آف ایکشن سے ہٹانے کی خاطر بلف کیا ہو۔“

”اس کے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

”اب آپ کی پلاننگ کیا ہوگی.....؟“

”فوری مگر محتاط ایکشن۔“ اورنگ زیب نے جواب دیا پھر اس نے درخواست کی۔ ”آپ آئی جی کو اپنی ذاتی حیثیت سے فون کر دیں کہ مجھے مرکز کی ملٹری ہائی کمان کی طرف سے کوئی اہم کام سونپا

گیا ہے اس لیے وہاں سے ریلیز ہونے کے بعد ہی ڈیوٹی جوائن کر سکیں گے۔“

کرٹل نے اسی وقت آئی جی کو فون کر کے اورنگ زیب کی درخواست کی تکمیل بھی کر دی۔ الماس کافی کیڑے کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو کرٹل نے ایک بار پھر اس سے نتاشا کرم والے وقتی مذاق سے معذرت چاہی۔

”اس کی معافی ایک شرط پر ہوگی۔“ الماس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”اب آگئے ہیں تو آئندہ بھی ملاقات کا سلسلہ جاری رکھیے گا۔“

”اوکے..... اٹ ازمائی پراس۔“

کافی کے دوران ہلکی ہلکی گھریلو باتیں ہوتی رہیں، الماس کے علاوہ سراج بھی بہت جلدی کرٹل سے بے تکلف ہو گیا۔ کافی پینے کے بعد کرٹل فوراً ہی جانے کے لیے اٹھ گیا۔ اورنگ زیب نے اشارے سے سراج کو روکا پھر خود اٹھ کر کرٹل کو رخصت کرنے دروازے تک آ گیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب مجھے فوری طور پر اپنے پلان پر عمل کرنا ہوگا۔“ اس نے تنہائی میں کرٹل سے کہا۔ ”اس موقع پر آپ کے کچھ کمانڈوز کو بھی دور دورہ کر وہاں کی نگرانی اس طرح کرنی ہوگی کہ وہ کسی کی نظروں میں بھی نہ آئیں اور ضرورت کے وقت فوری ایکشن بھی کر سکیں۔“

”ڈونٹ وری..... یہ خیال مجھے پہلے سے ہے..... میں نے لوکیشن کی سرائونڈنگ کو بھی پوری طرح اسٹڈی کر لیا ہے آپ کو تحفظ دینا ہمارا کام ہوگا۔“

پھر رخصت ہوتے وقت بھی کرٹل برقع پہن کر ہی باہر نکلا تھا۔



لیاقت حسین کچھ دیر پہلے ہی سیٹھ عثمان کو ان کے بیٹکے پر ڈراپ کر کے گھر آیا تھا یہ اطلاع بھی اسے مل گئی تھی کہ فرحین راحیلہ بیگم کے پاس ہے۔ ایک بار خطرے سے دوچار ہونے کے بعد لیاقت حسین کے مشورے پر ہی فرحین کا یہ معمول ہو گیا تھا وہ تنہا گھر پر رہنے کے بجائے راحیلہ کی طرف چلی جاتی تھی۔

لیاقت حسین شاور لینے کے بعد کمرے میں آ گیا۔ اس وقت شام کے پانچ کا وقت ہو رہا ہوگا۔ وہ کمریدمی کرنے کی خاطر لینا تو سراج کی کال آگئی۔

”کیسے ہو لیاقت حسین۔“

”آپ کی دعا ہے صاحب..... اس وقت خادم کو کیسے یاد کیا۔“

”تمہیں ایک بہت اہم ذمہ داری سونپنے کا پروگرام بنایا ہے جس کے لیے تمہارا پلاسٹک میک اپ بھی ضروری ہوگا۔“

”آپ کے لیے لیاقت حسین کی جان بھی حاضر ہے صاحب..... کسی دشمن کو غرق کرنے کی خاطر زندگی داؤ پر لگا دینا بھی ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ لوگوں کے کسی کام آگیا تو یہ بھی میری خوش نصیبی ہوگی۔“

”اس بار تمہارے ساتھ صرف ایس پی صاحب ہوں گے۔“ سراج نے کہا۔

”آپ دونوں جس وقت حکم دیں گے میں سر سے کفن باندھ کر خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“
کچھ دیر بعد گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا تو لیاقت حسین دوبارہ لیٹ گیا۔ اس وقت اسے ایک کپ چائے کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔ وہ خود بھی بنا سکتا تھا لیکن فرحین کے ہاتھ کا ڈانٹہ اس کے منہ کو لگ گیا تھا۔ وہ فرحین کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر کسی کی آہٹ ابھری۔ لیاقت حسین بھڑے ہوئے دروازے کو کھولنے کی خاطر اٹھا۔ اسے تعجب تھا کہ فرحین اسے خود کھول کر اندر کیوں نہیں آگئی؟..... لیاقت حسین کچھ سوچ کر مسکراتا ہوا دبے قدموں اٹھا۔ اس نے دروازہ کھول کر فرحین کو ڈرانے کا سوچا تھا، لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ خود بھی ہکا بکا رہ گیا۔

”تم..... لیاقت حسین کے وجود میں یکلخت شعلے بھڑک اٹھے۔

”ہاں..... میں..... تمہاری موت.....“ جواب حقارت سے دیا گیا۔

لیاقت حسین کے ذہن میں وہ باتیں گونجنے لگیں جو ماں نے اسے خواب میں آکر بتائی تھیں۔ اس کے وجود میں طوفان ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس نے آنے والے کو دیکھ کر حقارت سے تھوک دیا۔

دروازے پر جو سینہ تانے کھڑا تھا۔ وہ پر تاب بھوشن کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس کی ویران نگاہوں میں اعتماد جھلک رہا تھا..... اس اعتماد میں شیطانی قوتیں بھی شامل تھیں.....



لیاقت حسین نے حقارت سے فرش پر تھوکا تو پر تاب بھوشن نے مسکرا کر کہا۔
”تو نے میری ایک مشکل خود آسان کر دی سورکھ..... آج اپنا تھوکا تجھے خود ہی چاٹنا ہوگا۔“
لیاقت حسین کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ ”تو کوئی بار میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل گیا مگر آج..... آج میں تجھے قبر تک پہنچانے کا کام بھی خود انجام دوں گا۔“
”اب پسند کیجنا چھوڑ دے سٹلے۔“ پر تاب بھوشن کے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں مالا کے دانوں پر گردش کرنے لگیں۔ ”دیوی نے اس بار جو فحشٹی اپنے سیوک کو دان کی ہے اس کے سامنے تیری کسی چھایا کا زور نہیں چلے گا۔“

”تم..... تم دو ٹکے کے مداری ہو.....“ لیاقت حسین تمللا کر بولا۔ ”اپنے ہاتھوں سے مٹی اور گارا تھوپ تھاپ کر جو صورت بناتے ہو اس کو رنگ بھنگ لگا کر اسی کے آگے سر جھکا دیتے ہو۔ تمہاری کھوپڑیوں میں دماغ کے بجائے دنیا جہاں کا گند بھرا ہے جو تم کو سیدھا اور سچا راستہ کبھی نظر نہیں آتا۔“
”بول لے..... اور اونچے سروں میں تیری کھات کھڑی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ تیرے ہوتے سوتے بھی کیا یاد کریں گے تو نے کس فحشٹی سے پنچہ لڑانے کی بھول کی تھی۔“ پر تاب بھوشن نے بل کر کہا پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ”آج وہ تیری سندری نظر نہیں آ رہی۔ وہ ہوتی تو میں اس سے بھی ایک بدلہ چکنا کر دیتا۔“

”زبان کو لگام دے او دلدار الحرام۔“ لیاقت حسین آپے سے باہر ہونے لگا۔ ”تیری زبان پر دوبارہ اس کا نام آیا تو کتے سے بدتر موت ماروں گا..... وہ میری ہم سفر ہے..... تیرے مندروں کی پجاریں نہیں جس کو سارے چھوٹے بڑے پنڈت پجاری پر ساد سمجھ کر منہ مارتے ہیں اور پھر اسی منہ سے رام رام بھی کرتے ہیں۔“

”کتے کی جب موت آتی ہے تو شمشان کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیتا ہے.....“
پر تاب بھوشن نے بل کہا کر جواب دیا۔ ”ہماری پوتر پستکوں میں اس کی موت کی یہی نشانی لکھی ہے..... تو بھی آخری بار پھونک لے۔ اس کے بعد میں تجھے بتاؤں گا کہ دیوی کا پر ساد کیا ہوتا ہے..... تیرے بعد میں تیری سندری کا نمبر بھی ترنت آجائے گا۔ جانتا ہے کیوں؟..... تیرے کارن میری مدحو بہارن کی ہتیا ہوئی تھی۔ اس کا حساب تیری گھر والی چکنا کرے گی۔“

فرحین کے سلسلے میں پر تاب بھوشن کی گندی زبان لیاقت حسین کے لیے ناقابل برداشت

کے لیے بچھایا گیا ہے۔“

”پھر..... میں کیا کروں؟..... فرحین میرے قدموں کی بیڑی بن رہی ہے۔“

”یہ بھی فریب ہے..... خدا کا نام لے کر اسے توڑ دو.....“

لیاقت حسین کو ایسا لگا جیسے وہ ایک لمحے کسی گہری غنودگی میں غرق رہنے کے بعد بیدار ہوا ہے..... جیسے جو اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے تھے..... صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے۔ اس نے فرحین کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ کھل رہا تھا۔ اس نشے کے عقب میں فریب کا کوئی جال تھا۔ لیاقت حسین نے جھپٹ کر فرحین کے گلے کے گرد اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس اچانک رد عمل پر پرتاب بھوش بھی شپٹا گیا فرحین کی صورت بھی حیرت انگیز طور پر بدل گئی۔ وہ پرتاب بھوش کو آواز دے رہی تھی۔

”مہاراج..... تمہاری شہتی اپرم پار ہے..... میں نے سب کو چھوڑ کر کیوں تمہارا ہاتھ تھاما تھا..... بھگون کے لیے..... اپنی چکوری کو اس سسلے کے گندے ہاتھوں سے بچا لو.....“

چکوری کا نام سن کر لیاقت حسین بھی چونکا..... اس نے غور سے دیکھا، اس کے ہاتھوں کی گرفت میں فرحین کی نہیں کسی مندر کی پچارن کی گردن تھا..... لیاقت حسین کی گرفت یلکھت ڈھیلی پڑ گئی۔ پرتاب بھوش کی خوشی بھی معدوم ہونے لگی۔ اسی لمحے ایک آواز کہیں دور سے لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی۔

”سنبلو لیاقت حسین..... ماں کی دعاؤں نے تمہیں اس وقت ایک موڑی کے چنگل میں پھنسنے پھنسنے بچالیا۔“

لیاقت حسین دو قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ پرتاب بھوش کی سرسراتی ہوئی آواز دوبارہ اس کے کانوں میں گونجی۔

”میں سمجھ رہا ہوں..... کوئی چھاپا پھر تجھے تھیلی لگانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن بھوانی نے جو کہا ہے وہ بھی اوش پورا ہوگا۔ تیرا انت بھوانی کی کرپا سے میرے ہی ہاتھوں ہوگا..... جے بھوانی۔“

پرتاب بھوش نے نعرہ لگا کر ایک اور منتر پھونکا۔ گرم ہواؤں کی گردش لیاقت حسین کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی جب کسی کے سرد ہاتھوں نے اس کی کلائی تھام لی۔ کسی نے رجمائی کی۔

”لیاقت حسین..... ماں نے جو کہا تھا اسے یاد کرو..... تمہاری انگلی میں جو بزرگوں کی دی ہوئی کراماتی انگلی ہے وہ آج خدا کے حکم سے تمہارے کام آئے گی.....“

لیاقت حسین کی قوت سماعت میں وہ جیسے گونجنے لگے جو ماں تے خواب میں کہے تھے۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ تیز نظروں سے اس نے پرتاب بھوش کو گھورا جس کے ہونٹ کسی منتر کا جاپ پڑھ رہے تھے..... چکوری پچارن موقع پا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔ ”پرتاب بھوش“ لیاقت حسین نے خدا کا نام لے کر اسے لگا مارا..... ”تیرے کالے کرتوت اور جنت منتر آج تیرے کسی کام نہیں آئیں گے۔ میری بات غور سے سن لے نادان..... تیرا وقت پورا ہو رہا ہے..... آخری چند سانسون کا شمار

ہو رہی تھی۔ اس نے دشمن کو کھکانے لگانے کی ٹھان کر قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی جب فرحین اچانک ہی کھلے دروازے سے اندر آگئی۔ وہ پرتاب بھوش کے قریب سے گزر کر آئی تھی لیکن اس نے شاید اس کی موجودگی پر غور نہیں کیا تھا..... لیاقت حسین اس بات پر غور کر رہا تھا جب پرتاب بھوش کی آواز ابھری ”تو جو دکھ رہا ہے وہ سننا نہیں ہے مورکھ..... یہ دیوی کی دان کی ہوئی اٹھول شہتی کا چٹکار ہے کہ تیری سندری مجھے دیکھ نہیں سکی۔ یہ میری آواز بھی نہیں سن سکے گی۔“

لیاقت حسین کے دل و دماغ پر برف جنسنے لگی۔ پرتاب بھوش نے جو کچھ کہا تھا اسے سن کر فرحین نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے لیاقت حسین سے حیرت سے پوچھا تھا۔

”یہ تو یہاں کھڑا کھلے دروازے کی طرف کیا دیکھ رہا ہے؟“

”تو..... لیاقت حسین کے لیے وہ صورت حال پریشان کن تھی۔ وہ مرد تھا، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جان دے سکتا تھا لیکن فرحین اس کا پیار تھی محبت تھی جسے وہ کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ جس ناقابل یقین سچویشن سے دوچار تھا وہ بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس نے فوری طور پر فرحین کو وہاں سے ہٹا دینا ہی مناسب سمجھا..... تو..... بیگم صاحبہ کی طرف واپس چلی جا..... مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“

”یہ کیسی دل توڑنے والی بات کر رہا ہے لیاقت..... فرحین نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔“ کیا میرے علاوہ اور بھی کوئی زیادہ ضروری کام ہو سکتا ہے تجھے.....“ کہا نا..... مجھے کہیں کام سے جانا ہے.....“ لیاقت حسین کو وقت کی نزاکت نے بری طرح الجھا دیا تھا۔

”کیوں دل توڑ رہا ہے مورکھ اپنی گھر والی کا..... مرد ہے تو بانہوں میں سمیٹ کر دو گھڑی کے لیے اس کی پیاس بجھا دے..... شریر غنڈا پڑ جائے تو پھر کام نہیں پڑتا.....“ پرتاب بھوش نے سینہ تان کر کہا۔ ”اسے بھی میری کرپا سمجھ لے جو تجھے جیون میں آخری بار موج میلا کرنے کا سہ دے رہا ہوں۔“

”کیا سوچ رہا ہے لیاقت.....؟ فرحین نے بڑی لگاؤ سے کہا۔“ چل..... دروازہ بند کر لے..... آج میں تجھے کچھ نئی باتیں بتاؤں گی..... بیگم صاحبہ نے بتائی تھیں.....“ لیاقت حسین کا ذہن بری طرح الجھنے لگا..... ایک طرف اس کا بدترین دشمن اس کے سامنے کھڑا اسے موت کی دھمکی دے رہا تھا اور دوسری جانب فرحین دروازہ بند کرنے کی دعوت دے رہی تھی۔ لیاقت حسین نے اس مشکل مرحلے پر خدا کو یاد کیا تو ایک آواز کہیں دور سے ابھری۔

”بے شک وہ تمہاری رگ جاں سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے..... تم اسے دل کی گہرائیوں سے پکارو تو وہ تمہیں کبھی مایوس نہیں کرے گا۔“

”مم..... میں..... اس وقت غیر یقینی حالات سے دوچار ہوں..... لیاقت حسین کے دل کی دھڑکنیں مجسم سوال بن گئیں۔“

”جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ فریب ہے..... سحر ہے..... خوب صورت جال ہے جو تمہیں پھانسنے

لگا۔ لیاقت حسین کھلی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پر تاب بھوشن کی چیخیں ہر لمحہ تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ مایہ بے آپ کی طرح تڑپ رہا تھا جب اس کے حلق سے گاڑھے گاڑھے خون کے لوتھڑے نکلنے لگے۔ وہ بار بار ہنگی لے رہا تھا۔ پھٹی پھٹی سی نظروں سے لیاقت حسین کو دیکھ رہا تھا جو ایک طرف خاموش تماشا کی بنا کھڑا تھا۔

پر تاب بھوشن کے مکروہ جسم نے خون تھوکتے تھوکتے کئی جھٹکے کھائے پھر اس کے بدن سے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس کا جسم راکھ کے ڈھیر کی صورت اختیار کرنے لگا۔ پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ساری راکھ کو سمیٹ لے گیا۔

”یہ ہے انسان کی ناپائیدار زندگی“ جس پر وہ خوابوں کے محل تعمیر کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ آج کے دھوکے میں جتلا ہو کر کل کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ دور سے ایک آواز پھر لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی کلائی بھی سرد گرفت سے آزاد ہو گئی۔

لیاقت حسین پر رقت طاری ہونے لگی۔۔۔۔۔ ماں کا خواب غلط نہ تھا۔ اس نے جو کہا تھا وہ پورا ہو گیا۔۔۔۔۔ پر تاب بھوشن جو اس کے راستے کی دیوار تھا جل کر خاک ہو گیا۔

”لیاقت۔۔۔۔۔“ اس کے کانوں میں فرحین کی مانوس آواز ابھری۔۔۔۔۔ ”یہ تو پھوٹ پھوٹ کر کیوں رو رہا ہے۔ کیا ہوا تجھے؟“

لیاقت حسین نے دیکھا۔ فرحین اس کی نظروں کے سامنے موجود تھی۔ اچانک لیاقت حسین کو ماں کی دی ہوئی انگلی کا خیال آیا۔۔۔۔۔ اس نے ہاتھ پر نظر ڈالی۔ انگلی اُسے نظر نہیں آئی۔۔۔۔۔ یہ تصدیق بھی اس بات کی تھی کہ اس کی نظروں نے کچھ دیر پیشتر جو کچھ دیکھا وہ غلط نہ تھا۔۔۔۔۔ سچ ہی تھا۔

”تو چپ کیوں ہے۔“ فرحین نے اس کے اور قریب آ کر بڑی اپناٹ سے پوچھا۔ ”سچ بتا۔۔۔۔۔ تو رو کیوں رہا تھا۔ کس بات کی پریشانی ہے؟“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ ماں نے جو انگلی دی تھی بڑے پیار سے۔۔۔۔۔ وہ کہیں گم ہو گئی ہے۔“ لیاقت حسین نے معصومیت سے جواب دیا تو فرحین مسکرا کر بے اختیار اس کے چوڑے چٹکے سینے میں سمٹ گئی۔



کرل احتشام نے اسے جو تحفظ فراہم کیا تھا وہ یقیناً پائیدار ہی رہا ہوگا۔

وہ فوج کا اعلیٰ عہدیدار اور تجربہ کار فرد تھا جو دشمنوں کے لیے محاذ جنگ پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر سرحدوں کی حفاظت کرتے تھے۔ ان کے لیے ایک پتھلی کی حفاظت بائیں ہاتھ کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہوگی لیکن فتح حامد نے میڈم روبی کی روح کو جو دوسرا گھاؤ پہنچایا تھا وہ اسی وقت مندل ہو سکتا تھا جب وہ پوری طرح کھل کر اپنی مرضی سے اس کمینگی کا منہ توڑ جواب دے سکتی۔

اپنی خواب گاہ میں بیٹھی وہ بہ ظاہر اخبار پڑھتی نظر آ رہی تھی لیکن اس کے ذہن میں ایک تنہا عورت کی وہ کمزوری مچل رہی تھی جو اخلاق سوز تصویروں کی صورت میں موجود تھی۔۔۔۔۔ جو کچھ

کر لے۔ اس کے بعد زندگی میں تجھے کبھی خواب دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”مسئلے۔۔۔۔۔“ جواب میں پر تاب بھوشن بھی گرج اٹھا۔ ”تو بھی کان کھول کر سن لے۔۔۔۔۔ میں بھی بھوانی کا سچا اور کھرا سیوک ہوں جس نے جیون میں کبھی ہارنا نہیں سیکھا۔ میرے تیرے جیون میں کسی کانت آج اوش ہوگا۔“

جملہ پورا کرنے کے ساتھ ہی پر تاب بھوشن نے الٹا ہاتھ نفا میں بلند کر کے جھٹکا تو سیاہ سنگریزوں کی بارش ہو گئی۔ لیاقت حسین نے ماں کی دی ہوئی انگلی اتار کر مضبوطی سے گرفت میں لے لی۔ کوئی سرد اور رخ بستہ ہاتھ اب بھی اس کی کلائی پر موجود تھا۔ وہ قدم بجا کر پر تاب بھوشن کی سمت بڑھنے لگا۔

پر تاب بھوشن ایک کے بعد دوسرے جھتر پھونکتا رہا۔ ایک لمحے کو لیاقت حسین کے قدم کی روانی ختم مئی۔ وہ پھٹی نظروں سے اس کھائی کو دیکھنے لگا جو اس کے اوپر پجاری کے درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔ اس میں شعلوں کا قعر ہو رہا تھا۔ شعلوں کے درمیان مردہ انسانوں کی سالخوردہ کھوپڑیاں ادھر ادھر اچھلتی نظر آ رہی تھیں۔

”یہ بھی نظروں کا فریب ہے۔۔۔۔۔“ ایک سرگوشی پھر لیاقت حسین کے کانوں میں ابھری تو نظر آنے والا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ پر تاب بھوشن اور اس کا درمیانی فاصلہ دوبارہ بتدریج کم ہونے لگا۔

”جہاں ہے وہیں رک جا سکتے۔۔۔۔۔“ پر تاب بھوشن نے بڑے گھن گرج سے لکارا۔ بھوانی کا کہا اوش پورا ہوگا۔ تیرے بعد تیری سندی بھی جیوت نہیں رہے گی۔ اس کے گرم خون سے ہولی کھیلنے کے بعد مدھو پجاری کی آتما بھی شانت ہو جائے گی۔

”جو گرجتے ہیں وہ رستے نہیں لیاقت حسین۔۔۔۔۔ ایک بات ہمیشہ پیش نظر رکھنا۔۔۔۔۔ جو قدرت نے لکھ دیا وہ اٹل ہے۔۔۔۔۔ جو گمان کیا جائے وہ وہم۔۔۔۔۔ فتح اسی کی ہوتی ہے جو کھرے دل سے خدا کو یاد رکھے۔۔۔۔۔ سارے معاملات اسی کے حوالے کر دے۔ یہ یقین لے کر وہ جو بھی کرتا ہے اس میں انسان کی کوئی نہ کوئی بھلائی بھی ضرور ہوتی ہے۔“

لیاقت حسین خدا کا نام لے کر قدم بڑھاتا رہا۔ کسی کے سرد ہاتھ کی گرفت اسے حوصلہ دے رہی تھی۔ ماں کے کہے ہوئے جملے اس کے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر ابھر رہے تھے۔ دوسری جانب پر تاب بھوشن بھی آخری بازی کھیلنے کی خاطر بھوانی کا نام لے کر قدم بجائے کھڑا تھا جب لیاقت حسین نے قریب پہنچ کر ماں کی انگلی اس کے جسم سے لگا دی۔ پھر جو کچھ ہوا اس کا یقین خود پر تاب بھوشن کو بھی نہیں آ سکا۔۔۔۔۔ ایسا ہی لگا تھا جیسے اس کے ننگے بدن کے ایک ایک انگ پر انگارے دھک اٹھے ہوں۔۔۔۔۔ اس کے حلق سے کریناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ خود کو اس آفت ناگہانی سے بچانے کی خاطر اس نے کئی جتن کیے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

چند لمحے پیشتر وہ کامیابی کے سنہرے خواب دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی الٹی تعبیر اس کے جسم کو شعلوں سے داغ رہی تھی۔ خود اپنے ہی ہاتھوں سے سر پیٹتا ہوا وہ لہرا کر فرش پر گرا اور لوٹنے

ہوا..... وہ طاقت کے بل پر ہوا لیکن اس کا جواب بہ زور طاقت نہیں دیا جا سکتا تھا۔ تصویروں کے سلسلے میں اس کے پاس اپنی صفائی کے لیے کوئی جواز نہیں تھا۔ جو تیر کمان سے نکل جائے اس کی واپسی ناممکن ہوتی ہے۔

صرف ایک صورت تھی..... کمان اور تیر جس کے قبضے میں تھے اسے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا جاتا مگر..... وہ شخص جو پولیس اور فوج کے ذہن و دماغوں اور ان کی ماہرانہ صلاحیتوں کے باوجود چھوڑتا ہو رہا تھا۔ اسے تلاش کرنا ایک عورت کے بس میں بھی نہیں تھا۔

اس کے ذہن میں تیز آگے کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بجلیاں کوند رہی تھیں انتقام کی آگ شعلوں کا روپ اختیار کر رہی تھی جب اپنی بے بسی کے احساس کے ساتھ ہی ایک پھڑپھڑے ہوئے ساتھی کی آواز اس کے کانوں میں ابھری۔

”مجھے تمہاری پریشانیوں کا احساس ہے..... جب میں مرد ہو کر اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا..... تم سے بچھڑ گیا تو تم..... تم ایک عورت ہو کر کیا کر لو گی؟“

”میں اس مرد کی آنکھوں کو ان کے حلقوں سے نکال کر پیروں تلے روند دوں گی جنہوں نے مجھے بے لباس دیکھا ہے۔“

”تم اس وقت ہوش میں نہیں تھیں۔“

”اب بھی میرے ہوش و حواس میرا ساتھ نہیں دے رہے مگر..... میں نے تمہارہ کبھی ہار نہیں مانی..... اب بھی زندگی کی آخری سانسوں تک حالات کے سامنے کھٹنے نہیں ٹیکوں گی۔“

”میری ایک بات مانو گی۔“

”تمہارا ایک اشارہ بھی میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے..... کہو۔“

”جو شہر..... جو ملک تم جیسی معصوم اور وفا شعار کو تحفظ نہیں دے سکا اس کو چھوڑ کر کہیں دور چلی جاؤ.....“

”نہیں.....“ میڈم روبی کی روح تڑپ اٹھی۔

”یہاں تم ہو..... تمہارے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی حسین یادیں دفن ہیں میں ان سے دور نہیں جا سکتی.....“

”پھر..... ایک ہی طریقہ ہے.....“ آواز اور لہجہ دونوں حسرت زدہ ہو گیا..... ”جو تمہیں سہارا دے سکے..... اس کا ہاتھ تمہاں لو۔“

”وہ بھی ایک مرد ہو گا.....“ میڈم روبی نے تڑپ کر کہا۔ ”مرد..... جو سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن جب عورت کی مجبوریاں تنگی تصویروں کی شکل میں سامنے آجائیں تو وہ بھی سارے رشتے بھول کر جذباتی بن جاتا ہے۔ دوسرے مرد سے انتقام لینے کے بجائے اپنی بیوی کو ہی مجرم کہتا ہے۔“

”دنیا بہت وسیع ہے روبی..... ساری اگلیاں برابر نہیں ہوتیں..... میرا مشورہ مان لو..... وقت کا یہی تقاضا ہے۔“

”جانتی ہوں لیکن تمہاری بات ماننے سے پہلے میں اسی موذی ناگ کا پھن کپلوں گی جو کسی پیرے کی طرح مجھے اپنی بین کی دھن پر نچانے کے خواب دکھا رہا ہے۔“

میڈم روبی شوہر کے تصور سے باتوں میں غرق تھی جب کسی نے ٹھوہ کیا۔

”ایسی بھی کیا بے مروتی کہ میں اتنی دیر سے کھڑی ہوں اور تم خبروں میں گم ہو.....“

میڈم روبی نے پلٹ کر دیکھا اس کے سامنے الماس کھڑی تھی۔

”تم کب آئیں.....؟“ اس نے تیزی سے اٹھ کر بے تکلفی سے الماس کا ہاتھ تھاما اور اس کے ساتھ باہر لاؤنج میں آگئی جہاں تھریا پہلے سے موجود تھی۔

”کیا بچو گی.....؟“ میڈم نے اس کے ساتھ ایک ہی صوفے پر بیٹھ کر بے تکلفی سے پوچھا۔

”جائے یا سلاٹس پر بات نہیں ٹلے گی..... راستے میں مردوں کو فٹ پاتھ پر سبکی میزوں پر گرم گرم پوریاں کھاتے دیکھ کر تمہاری طرف آگئی، حالانکہ بازار سے ضروری سامان لینے نکلی تھی.....“ الماس نے ایک ہی سانس میں جملہ مکمل کیا پھر تھریا سے بولی۔ ”تم کس مرض کی دوا ہو۔ جلدی سے آلو کی چٹ پٹی ترکاری، گرم گرم پوریاں اور تھوڑا سا سوچی کا حلوہ بنا کر فٹ سجا دو..... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”گڈ آئیڈیا.....“ میڈم روبی نے بھی بے تکلفی سے کہا۔ ”بہت عرصے سے میں نے بھی حلوہ پوری کا ناشا نہیں کیا۔“ پھر جب اس نے تھریا سے اہتمام کرنے کو کہا تو اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”سب کچھ گرم گرم اور ریڈی میڈ تیار ہے..... میں میز لگانے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لوں گی۔“

تھریا چلی گئی تو میڈم روبی نے شکایتی نظروں سے الماس کو دیکھا۔

”تم نے تکلف سے کام لیا..... یہاں آ کر فرمائش کر دیتیں تو ملازم جا کر سب کچھ لے آتا۔“

”رہک لیتا میری عادت نہیں ہے..... الماس نے یہ دستور شوشی سے جواب دیا۔ ”مرد حضرات جس انداز میں ہاتھ صاف کر رہے تھے اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ تمہارے پاس آتے آتے حلوائی کڑا ہی بھی دھلوا چکا ہو گا۔“

”سراج بھائی کو یونینک مل گئی تو وہ ضرور برا مانیں گے۔“ میڈم روبی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب صاف ہے۔ تم اول تو یہ کہ عورت ہو اور پولیس کی یونیفارم میں بھی نہیں ہو اس لیے حلوائی نے حلوہ پوری کے دام بھی.....“

”خبردار جو تم نے میرے شوہر پر مفت خوری کا الزام لگایا۔“ الماس نے روایتی عورت کی طرح برا مان کر کہا۔ ”میرا گھر والا پولیس میں ضرور ہے لیکن جھین جھپٹ کر کھانے والا نہیں..... پہلے پیسے منہ پر مارتا ہے پھر تھیلا اٹھاتا ہے۔“

کچھ دیر الماس اور میڈم روبی کے درمیان اسی قسم کے دلچسپ مکالمے جاری رہے پھر الماس

نے ناشتے کی میز پر بیٹھنے کے بعد سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”آج باہر جو لوگ پہرا دے رہے ہیں انہوں نے میری گاڑی بھی وہ جگہ رکوائی تھی..... سب خیریت تو ہے؟“

”قہریمانے ایک کہنی سے معاہدہ کیا ہے۔“ میڈم روہی نے خوب صورتی سے بات بتائی پھر اس نے باتوں کا موضوع بدل دیا۔ الماس نے اسی بات کو ملحوظ خاطر رکھا تھا کہ خود سے یہ ظاہر نہ کرے کہ اسے حالات کا علم کرل احتشام سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ وہ سراج کے مشورے پر ہی اس وقت آئی بھی تھی۔

ناشتے کے بعد میڈم روہی الماس کے ساتھ دوبارہ لاؤنج میں آگئی۔
 ”اب میں تمہیں کھانے کے بعد ہی جانے دوں گی.....“ اس نے بڑی اپنائیت سے الماس کو دعوت دی۔

”سوچ لو..... اگر سراج کو میرے گھر سے لاپتا ہونے کی بھنک مل گئی تو وہ پہلی فرصت میں ایف آئی آر بھی درج کروا سکتے ہیں۔“

جواب میں میڈم روہی نے موبائل اٹھا کر سراج کے نمبر ڈائل کیے پھر مائیک بھی آن کر دیا۔
 ”خیریت..... اس وقت کیسے یاد کیا.....؟“ دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔
 ”بہت روز سے آپ نے بھی کال نہیں کیا..... کیا الماس نے پابندی لگا دی ہے؟“
 ”یہ کیسے سوچ لیا آپ نے.....؟“ سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب تو وہ سکی بہنوں کی طرح آپ کی عزت کرتی ہے۔“

”پھر بھی آپ کبھی اسے ساتھ لے کر غریب خانے پر تشریف نہیں لائے۔“ میڈم روہی نے شکورہ کیا۔

”ڈبل چارج کے باوجود سر اٹھانے کی فرصت ملی تو ضرور آؤں گا۔“
 ”ایک انفارمیشن دینی ہے آپ کو..... میں نے ابھی الماس کو فون کیا تھا لیکن ملازمہ نے بتایا کہ وہ گھنٹے بھر سے کہیں گئی ہوئی ہے۔“

”پریشان مت ہوں.....“ سراج نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”مجھے الماس پر مکمل اعتماد ہے“

”ابھی تک آپ کے اورنگ زیب صاحب نے میرے کام کے سلسلے میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا۔“ میڈم روہی نے گفتگو کا رخ بدلا۔ ”کوئی سراغ ملا ان کو آکٹوپس کا.....؟“

”سوری فون پر میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔“

سراج بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”فی الحال اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ وہ جس مجرم کے پیچھے پڑ جائیں اسے قبر تک پہنچانے کے بعد ہی سکون کا سانس لیتے ہیں۔“
 ”مجھے اس لمحے کا بڑی شدت سے انتظار رہتا ہے.....“ اس بار میڈم کے جذبات میں ہلچل کی

ایک لہر بھی ابھری تھی لیکن اس نے الماس کی موجودگی میں خود کو سنبھال کر کہا۔ ”میں ہمیشہ اورنگ زیب صاحب کے حق میں کامیابی کی دعا کرتی رہوں گی۔“
 ”یہ میری حق تلفی بھی ہوگی..... سراج نے شکوہ کیا تو الماس نے جھپٹ کر موبائل میڈم کے ہاتھ سے لے لیا۔“

”میں سب سن رہی ہوں اور آپ بھی کان کھول کر سن لیں کہ آپ کے جملہ حقوق صرف الماس کے پاس محفوظ ہیں..... اس کے علاوہ آپ کا حق بھی صرف مجھ پر چلتا ہے..... دوسروں سے کیسے کھل مل کر حق کی بات کی جاتی ہے۔“

”آئی ایم سوری الماس۔“ سراج نے دیدہ و دانستہ سوری کہا وہ سمجھ گیا تھا کہ مائیک آن ہوگا۔
 ”صرف سوری سے کام نہیں چلے گا..... مجرم رنکے ہاتھوں پکڑا جائے تو اسے جان بچانے کی خاطر فوری طور پر کم مکا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس ویک اینڈ پر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کا وعدہ کر لیں تو تھانہ پچھری سے بھی بچ جائیں گے..... پولیس..... منظور یا نہیں۔“
 ”اورنگ زیب صاحب کے رشتے سے دھونس دے رہی ہو تو منظور ہے.....“ سراج نے سرد آہ بھر کر تو الماس کے علاوہ میڈم روہی بھی مسکرا دی۔ فون کا رابطہ بھی ختم کر دیا گیا۔



کرل احتشام اور آئی جی کے درمیان فون پر گفتگو ہو جانے کے بعد اورنگ زیب نے ایک دو روز تک خود کو گھر کی حد تک محدود رکھا پھر اس نے بلیک پیئسٹھر کو کال کیا۔ دوسری جانب سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد بے حد سنجیدگی سے بولا۔

”دلربا کی اہمیت قانون کی نظروں میں بھی ہے اس لیے اس کی طرف سے تم ذاتی طور پر بھی غافل نہ ہوتا۔“

”بہتر ہے..... اور کوئی حکم.....؟“

”ایک پاس ورڈ اور نوٹ کرو..... ریکور (Recover)“

”اس کی کوئی اہمیت بھی ہوگی..... دوسری جانب سے پوچھا گیا۔“

”ہاں..... اس پاس ورڈ کو میرے علاوہ جو بھی استعمال کرے اس کے فوراً بعد تمہیں قانونی اہمیت کو موجودہ جگہ سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ تمہاری ذاتی نگرانی میں رہے گی۔“ اورنگ زیب نے ہدایت دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔ دس منٹ بعد اس نے سکندر علی شاہ کے خاص نمبر ملائے۔

”ہیلو.....“ کال خود سکندر علی شاہ نے ریسیو کی تھی۔
 ”دوست بول رہا ہوں.....“ اورنگ زیب نے بے تکلفی سے کہا
 ”زہے نصیب..... اس وقت آپ ہی کو یاد کر رہا تھا۔“

”میرے لیے کوئی حکم؟“

”ہم دوستوں کو حکم نہیں دیا کرتے۔ صرف ان کی خیریت دریافت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ بے تکلفی سے کہا گیا۔“ آپ کی ذہنی الجھن کا کیا حال ہے؟۔
”آپ نے جو مشورہ دیا ہے اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنبھل کر جواب دیا۔

”آئی جی چھٹی دینے کے موڑ میں نہیں تھا اس کی خاطر مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔۔۔۔۔۔ فی الحال دس بارہ روز تک وہ مجھے کال نہیں کرے گا۔“

”پھر۔۔۔۔۔۔ کب ہمارے سہمان بن رہے ہیں؟“
”آنے والے ہفتہ کے دن کا سوچ رہا تھا لیکن آپ کا مصروفیت کا خیال بھی ہے۔“
”ہفتے میں ابھی چار دن باقی ہیں۔ میری طرف سے ڈن (Done) سمجھیں۔“

”ایک درخواست کروں گا۔۔۔۔۔۔ اس بار اورنگ زیب نے کچھ ایسا لب و لہجہ اختیار کیا کہ اپنا مفہوم بھی ظاہر کر دیا۔“

”جب میں نے آپ کو دوست کہا ہے تو دوستی کے تقاضے بھی پورے کروں گا۔۔۔۔۔۔“ جواب بھی دوستانہ لہجہ میں دیا گیا۔ ”آپ مطمئن رہیں۔ فارم ہاؤس میں میرے ایسے نمک حلال موجود ہیں جو زبان رکھتے ہوئے خود سے بولنے کی جرأت نہیں کرتے“

”جانتا ہوں لیکن ماروی کے ساتھ۔۔۔۔۔۔“
”وہ اتفاق ہی تھا۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد سے میں نے جو سختی کی ہے اس نے سب کو محتاط کر دیا ہے۔“

”میرے ساتھ ایک جزوقتی ڈرائیور بھی ہوگا۔ جو با اعتماد بھی ہے پہلے بھی خاص معاملات میں آنا چکا ہوں۔“

اورنگ زیب نے کہا۔ ”دراصل میں اس موقع پر ذاتی گاڑی کا استعمال بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ کسی اور گاڑی کو ڈرائیو کرنے کی صورت میں خود کو لوگوں کی نظروں سے محفوظ رکھنا بھی مشکل ہوگا۔۔۔۔۔۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے۔“

”جیسا آپ مناسب خیال کریں۔۔۔۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“
”علاج کے لیے جو دوا استعمال کی جائے اگر وہ غیر ملکی ہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔“ اورنگ زیب نے قدرے ہچکچاتے ہوئے دلی زبان میں کہا۔

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔۔۔۔۔۔ ہمارے یہاں بازاری دوا میں استعمال نہیں کی جاتیں۔۔۔۔۔۔ ہمارے کارندے بڑی حکمت سے سیل بند دوا میں فراہم کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔“
”اوکے پھر ہفتہ کو ملاقات ہوگی۔“

”آنے سے پیشتر ایک کال کر دیجئے گا تاکہ میں فارم ہاؤس پر آپ کو خوش آمدید کہہ سکوں۔ نفس کشی کی خاطر مجھے بھی وقت گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ اہتمام کرنا ہوگا۔“

”جیسا آپ کا حکم۔۔۔۔۔۔ اورنگ زیب نے چند رسی جملوں کے بعد سلسلہ منقطع کیا تو اس کے ہونٹوں پر بڑا تلخ مگر معنی خیز تبسم بھی پھیل کر گرہا ہوتا گیا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب اس نے شیر کی کچھار میں گھس کر اسے شکار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔



افضل خان بالکونی میں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا جب شبنم نے اسے پشت سے مخاطب کیا۔
”پلیز اندر آ جاؤ۔۔۔۔۔۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔“

افضل خان پلٹ کر اندر آ گیا لیکن وہ اس وقت بھی سنجیدہ ہی تھا۔ چہرے پر ایک عجیب سی کشمکش طاری تھی جو بے وجہ بھی نہیں تھی۔ اس بار اسے براہ راست کرنل احتشام نے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر فلیٹ سے قدم باہر نہ نکالے۔

شبنم چائے کی ٹرے لے آئی جب بھی وہ اپنے خیالوں میں گم رہا۔ شبنم اس کی جھلاہٹ کی وجہ جانتی تھی۔ وشنو کی موت کے بعد ہی کرنل نے اسے فلیٹ تک محدود ہو جانے کا حکم دیا تھا۔

وشنو معمولی حیثیت کا مالک نہیں تھا۔ وہ انٹر پول کو مطلوب ہونے کے علاوہ شیخ حامد کا بھی خاص مہرہ تھا اور افضل خان نے شیخ حامد کے ہاں سے نکالے جانے کے بعد کچھ ایسے اقدامات کیے تھے جو پسندیدہ نہیں تھے لیکن اب وشنو کا مہرہ پٹ جانے کے بعد وہ زخم بھی دوبارہ تازہ ہو گئے ہوں گے۔ کرنل بھی ان باتوں کو ضرور سمجھ رہا ہوگا اسی لیے اس نے افضل خان کی زندگی بچانے کی خاطر بندشیں عائد کی ہوں گی۔

”کیا سوچ رہے ہو۔۔۔۔۔۔؟“ شبنم نے چائے کا کپ افضل خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی اپنائیت سے دریافت کیا۔

افضل خان نے اسے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے گھورا۔
”کم ان پلیز۔۔۔۔۔۔“ شبنم نے مسکرا کر کہا۔ ”حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابھی آکٹوپس کے زخم تازہ ہوں گے اسی لیے کرنل نے تمہاری بہتری کے لیے وقتی طور پر ایک فیصلہ صادر کیا ہے۔“
”پھر تم کرنل سے ایک فرمائش اور کر دو۔۔۔۔۔۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔۔؟“
”تم کرنل سے کہو کہ وہ فوری طور پر کسی قاضی کو یہاں بھیج دے، پھر۔۔۔۔۔۔ یہ قید خانہ میرے لیے جملہ عروسی سے کم نہ ہوگا۔“ اس بار افضل خان نے شبنم کی آنکھوں میں دور تک جھانکا تو وہ شرما کر بولی۔

”یہ درخواست تم بھی کر سکتے ہو۔۔۔۔۔۔ کرنل کا تعلق بھی تمہاری جنس سے ہے ممکن ہے وہ تمہاری مشکل حل کر دے۔“

افضل خان نے شبنم کو غور سے دیکھا پھر اس نے موبائل بھی آن کر لیا لیکن قبل اس کے وہ کسی کے نمبر ڈائل کرتا اسے کسی کی کال موصول ہوئی۔۔۔۔۔۔ افضل خان نے اسکرین پر نظر ڈالی وہاں کوئی نام

نہیں تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ لفظ نمبر نہیں تھا ایک لمحے تک اس نے غور کیا پھر چوتھی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کرنے کا بٹن دبا دیا۔

”ہیلو.....“

”تم شاید افضل خان بول رہے ہو؟“

”جہیں کس سے بات کرنی ہے؟“ افضل خان نے آواز بدل کر پوچھا۔

”جس منجرے میں تم موجود ہو وہاں افضل خان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟“ مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا گیا۔ ”تمہاری بلبل کے ساتھ کوئی اور ہو..... یہ بات تمہیں بھی گوارا نہ ہوگی۔“

”مطلب کی بات کرو..... افضل نے سرسراتے لہجے میں کہا۔“ میں تم کو اس سننے کا عادی نہیں ہوں۔“

”شبتم نے چونک کر افضل خان کو دیکھا تھا۔“

”ہمارے پاس بھی فالتو وقت نہیں ہے۔“ کرخت انداز میں جواب ملا۔ ”ایک بات غور سے سن لو کرل اور اورنگ زیب کے علاوہ چاہے فوج کی پوری بٹالین اور پولیس کا محکمہ بھی تمہارے ساتھ ہو لیکن تمہاری زندگی کے سات دنوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ان سات دنوں میں تم دل بھر کی موج میلا کر لو۔ ساتویں دن ہم تمہیں اوپر پارسل کر دیں گے۔“

”اگر تم افضل خان سے واقف ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں نے کبھی اپنا تعاقب کرنے والے بھونکتے کتوں کی پروا نہیں کی.....“ افضل خان نے بے پروائی سے جواب دیا ”یہ بات اسے بھی بتا دینا جس نے تم کو خریدا ہے۔“

”جس کے دن گئے جتنے رہ گئے ہوں ہم اس کی بات کا برا نہیں مانتے..... ہم تمہیں روز بتاتے رہیں گے کہ تمہاری زندگی کے کتنے دن گھٹتے جا رہے ہیں۔“

”جو خود اندھڑوں میں ہو وہ دوسروں کو روشنی نہیں دکھا سکتا۔“ افضل خان نے حقارت سے کہا۔ ”تم زر خرید کتے ہو جسے خریدنے والا ذاتی طور پر بھی زخموں کی طرح سات پردوں میں چھپا بیٹھا ہے۔“

”دنوں کا شمار کل سے ہوگا..... بائی۔“

دوسری جانب سے کال منقطع کر دی گئی۔ افضل خان آنے والے نمبروں کو دیکھنے میں مشغول تھا جب شبتم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”میرا خیال ہے کہ کال ہمارے کسی نادیدہ دشمن کی تھی۔“

”ہاں.....“ افضل خان نے موبائل رکھ کر چائے کا ایک گھونٹ لیا ”مجھے صرف سات روز زندہ رہنے کا پرمٹ ملا ہے۔“

”اوہ.....“ شبتم فکر مند ہو گئی۔ ”کرل نے شاید اسی لیے.....“

”ڈونٹ وری۔ مجھے ان گیدڑ بھکیوں کی کبھی کوئی فکر لاحق نہیں ہوئی“ افضل خان نے بڑے

رومانٹک انداز میں کہا۔ ”مجھے فون کرنے والے کی اس بدذوقی پر رونا آ رہا ہے جنہوں نے مجھے سات روز موج میلا کرنے کو کہا ہے جبکہ میرے خیال میں موج اور میلا کے لیے سات مہینے بھی کم ہوتے ہیں۔“

”پلیز افضل.....“ شبتم بدستور سنجیدہ تھی۔ ”تمہیں اس فون کے بارے میں فوری طور پر کرل

اور ایس پی اورنگ زیب صاحب کو اطلاع دینی چاہیے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے.....“ کیا دھمکی دینے والے فوجی کمانڈرز کے گھیرے کو بھی توڑ سکتے ہیں؟ ہماری حفاظت پر پولیس کے سادہ لباس والے بھی تعینات ہیں۔

”جانتی ہوں لیکن..... اس کے باوجود کم از کم اورنگ زیب صاحب کو اطلاع دینی ضروری ہے۔“ شبتم نے یہ بدستور سنجیدگی سے کہا۔ پھر افضل خان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اپنا موبائل اٹھا کر اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کیے۔ ایک منٹ بعد ہی وہ اسے افضل خان کو کسی نامعلوم افراد کی جانب سے ملنے والی دھمکی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”جس نمبر سے فون کیا گیا ہے وہ مجھے ایس ایم ایس کر دو۔“

”کیا کرل احتشام کو بھی.....“

”میں نمبر چیک کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔“ دوسری جانب سے جواب دینے کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔

شبتم نے مطلوبہ نمبر ایس ایم ایس کرنے میں دیر نہیں کی۔

❖❖❖

تھریا نے میڈم روبی کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اسے دیکھا تو اس کا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔ میڈم سہری کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے اس طرح آنکھ بند کیے لیٹی تھی جیسے نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو۔ اگر اس کا سونے کا ارادہ ہوتا تو حسب معمول وہ دروازہ بند کر چکی ہوتی پھر شاید تھریا اسے جگانے کے بجائے دروازے سے ہی پلٹ جاتی لیکن..... وہ محسوس کر رہی تھی کہ میڈم الماس کے ساتھ بھی زبردستی ہنسنے مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی داپسی کے فوراً ہی بعد وہ لپکتے سنجیدہ ہو گئی تھی..... مگر کیوں؟

کرل کے خفیہ آدمیوں کی تعیناتی کی وجہ بھی تھریا کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ اس نے وہ ایک بار سوچا بھی تھا کہ میڈم روبی سے اس تبدیلی کا سبب دریافت کرے گی لیکن ہر بار یا تو میڈم کے موڈ کی وجہ سے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا یا کوئی ایسی مصروفیت آئے آگئی کہ اس نے از خود اس ذکر کو چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا لیکن الماس کے جانے کے بعد اس نے میڈم روبی کے موڈ میں جو نمایاں تبدیلی محسوس کی وہ اس بات کی غماز تھی کہ وہ اندر ہی اندر کسی گھٹن کا شکار تھی۔

چند لمحے وہ دروازے کے پتھوں بچ کھڑی میڈم روبی کے افسردہ چہرے کو دیکھتی رہی پھر اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ واپس لوٹ جائے لیکن خواب گاہ میں موجود فون سیٹ جاگ اٹھا اس کی آواز

سن کر میڈم نے بھی ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ تقریباً کسی خیال سے آڑ میں چلی گئی۔

”ہیلو.....“ میڈم نے ریسور اٹھا کر کال اٹینڈ کی۔

”خادم بول رہا ہوں۔“ دوسری جانب سے ڈی آئی جی کی مانوس آواز ابھی۔ ”میں آپ کے آرام میں خلل تو نہیں ہوا؟“

”جی نہیں.....“ میڈم نے سنبھل کر جواب دیا۔

”میں رات ساڑھے نو بجے لائن آف کرتی ہوں۔ اس کے بعد آنے والی کوئی کال اٹینڈ نہیں کرتی۔“

”ایک خاص بات دریافت کرنا تھی..... میں نے سنا ہے کہ آج کل آپ کی رہائش گاہ پر کچھ فوجی کمانڈرز بھی تعینات ہیں۔“

”جی ہاں..... اس کی درخواست خود میں نے کرنل احتشام سے کی تھی.....“

اس درخواست کا کوئی سبب بھی ضرور ہوگا.....؟“

”ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کی شرارت ہو لیکن مجھے فون پر جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔“

”آپ کا کیا خیال ہے.....؟ کیا دی جانے والی دھمکی شرارت بھی ہو سکتی ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ آپ شاید کسی سے اصل بات بتانے سے گریز کر رہی ہیں۔“ ڈی آئی جی نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جو لوگ کسی کو جان سے مار دینے کا ارادہ کر لیتے ہیں وہ اسے انتہائی خاموشی اور رازداری سے ٹھکانے لگانے میں دیر نہیں کرتے..... دعوت دے کر آنے کی حماقت کبھی نہیں کرتے۔“

”مجھے خوشی ہے کہ آپ یہ بات اپنا سمجھ کر کہہ رہے ہیں۔“ میڈم نے اپنائیت کا اظہار کیا۔

”ویسے مجھے آپ سے ایک شکایت بھی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”کرنل احتشام کے بجائے آپ مجھے بھی خدمت کا موقع دے سکتی تھیں۔“

”میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔“

”کیا مطلب.....؟“ دوسری جانب سے حیرت کا اظہار کیا گیا۔

”سمجھنے کی کوشش کریں۔“ میڈم نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ”آپ کے علاوہ میں نے مسٹر

اورنگ زیب اور سراج بھائی کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی..... جن کو میں اپنا سمجھتی ہوں ان کو خطروں سے بھی دور ہی رکھتی ہوں۔“

”اپنا سمجھنے کا شکریہ..... اب یہ بھی عرض کر دیں کہ دھمکی دینے والوں کے بارے میں آپ کا

کیا اندازہ ہے؟“

”ریاض کی موت کے بعد سے دنیا میں ہر شخص نے مجھے سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ سوائے ایک

کے..... آپ بھی اس ایک سے واقف ہیں۔“

”فتح حامد.....“

”جی ہاں.....“ میڈم نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ روز اول سے میری خوشیوں کا دشمن رہا ہے..... اس کا ایک قرض بھی واجب ہے مجھ پر..... جب تک اسے ادا نہ کر لوں گی مجھے سکون کی سانس بھی میسر نہیں ہوگی۔“

”اس کا اظہار آپ ایک شرط عائد کر کے بھی کر چکی ہیں۔“ ڈی آئی جی نے میڈم کے جواب پر اپنی پسند کا حوالہ بھی دے ڈالا۔ ”میری خوشی کے درمیان بھی اس کی منہوں شخصیت آڑے آ رہی ہے۔“

میڈم نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی وجہ تقریباً بھی ہو سکتی تھی جو دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔

”آپ کے لیے ایک اطلاع میرے پاس بھی ہے.....“

ڈی آئی جی نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ ”مسٹر اورنگ زیب کو مرکزی حکومت کی جانب سے کوئی اہم ذمے داری سونپی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ آئی جی آفس میں ڈیوٹی کے بھی پابند نہیں رہے۔“

”اس اطلاع میں میرے لیے کیا خاص بات ہے؟“

”آکٹوپس..... ڈی آئی جی نے جواب دیا۔“

”میری ذاتی اطلاع یہی ہے کہ کرنل احتشام کو اسی لیے درمیان میں ڈالا گیا ہے تاکہ آئی جی کو اس کی جھک نہ ملے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھی.....“

”مسٹر اورنگ زیب کو آکٹوپس کی نقل و حرکت کے بارے میں کچھ معلومات ہوئی ہیں۔ وہ

اب پوری توجہ سے اس موڈی جانور کے تعاقب میں لگا ہوگا۔“

”گنڈ.....“ میڈم نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”میں آپ کے ایس پی کی کامیابی کے لیے دعا کروں گی۔“

”اس کی کامیابی میری زندگی میں بھی اجالا بکھیر دے گی..... آپ کا کیا خیال ہے۔“

”بار بار اس کا حوالہ نہ دیا کریں.....“ میڈم نے دبی آواز میں جواب دیا۔ ”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔“

”آئندہ کوئی خدمت ہو تو مجھے بھی فراموش نہ کیجئے گا۔“

”آپ کی یہ فرمائش بھی نوٹ کر لی ہے“ میڈم نے جواب کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا تو

تقریباً نے قریب آ کر کہا۔ ”شاید ڈی آئی جی کا فون تھا؟“

”تم ابھی تک اپنے کمرے میں نہیں گئیں؟“ میڈم روبی نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے

پوچھا۔

”آپ کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر ادھر آگئی تھی۔“ تھریا قریبی کرسی پر بیٹھ گئی پھر اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی بات ایسی ہے جو آپ کو ڈسٹرب کر رہی ہے الماس کی موجودگی میں بھی میں یہی محسوس کر رہی تھی۔“

”میں تمہارے خیال کی تردید نہیں کروں گی۔“

میڈم روبی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”جب تک صبح حاملہ زندہ ہے میں سکون کی نیند نہیں لے سکتی۔“

”کوئی خاص بات.....؟“

”آں..... ہاں۔“ میڈم نے جلدی سے بات بتاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تمہارے ڈی آئی جی صاحب بھی یہی روتا رو رہے تھے کہ آکٹوپس کی وجہ سے ان کی خوشیاں بھی درمیان میں لٹکی ہوئی ہیں۔“

”آپ ایک بات بھول رہی ہیں کہ میں کتنے عرصے سے آپ کے ساتھ ایک ہی جھت کے نیچے سانس لے رہی ہوں۔“

”اور میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا ہی سمجھا ہے، کبھی غیریت کا احساس نہیں ہونے دیا۔“

”اسی بنیاد پر کہہ رہی ہوں کہ آپ کوئی اہم بات مجھ کو بتانے سے گریز کر رہی ہیں۔“ تھریا نے کریدنے کی کوشش کی۔ ”ہمارے گارڈز کی جگہ اب کرنل احتشام کے خاص آدمی ڈیوٹی دے رہے ہیں آپ نے اگر کرنل سے درخواست کی تھی تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔“

”ہاں.....“ میڈم نے بڑی خوب صورتی سے بات بتائی۔ ”میرے دشمن نے فون کر کے مجھے بھی جہماری طرح اغوا کرنے کی دھمکی دی تھی میں نے حفظ مقدمہ کے پیش نظر کسی کے مشورے پر کرنل سے سکیورٹی فراہم کرنے کی درخواست ضروری سمجھی تھی۔“

تھریا نے اس کے بعد مزید نہیں کریدا کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی گئی لیکن وہ قلبی طور پر مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ میڈم کی خاص بات کے اظہار سے گریز کر رہی تھی۔



سکندر علی شاہ کی دعوت قبول کر لینے کے بعد سے اورنگ زیب نے خود کو سراج کے گھر تک محدود کر لیا تھا، آکٹوپس کے شکار کے لیے اسے ذہنی سکون کے علاوہ موثر پلاننگ کی بھی ضرورت تھی۔ اس نے گزشتہ دو روز سے خود کو بالائی منزل تک محدود کر لیا تھا تاکہ سراج کے ملازموں کو بھی گھر میں اس کی موجودگی کا علم نہ ہو۔ کامیابی کے حصول کے لیے راز داری بھی شرط تھی جس کے پیش نظر وہ ناشتے اور کھانے کے لیے بھی نیچے نہیں آتا تھا۔ خود الماس بھی ملازموں کی موجودگی میں اوپر جانے سے گریز کرتی تھی۔

سراج کا زیادہ وقت بھی اوپر ہی گزرتا تھا۔ اس وقت بھی اوپر ہی بیٹھا فارم ہاؤس میں آکٹوپس کی موجودگی کے امکانات کے شے کے بارے میں ضروری چھان بین کی گفتگو میں جھوٹا جب اسے

ڈی آئی جی کی کال وصول ہوئی۔ ”میرا خیال ہے آپ کسی خاص پروجیکٹ پر ضرورت ہے زیادہ مصروف ہیں جو دفتر میں آپ کی سیٹ خالی ہوتی ہے؟“

”ییس سر۔“ سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”میرا مقصد غیر حاضری کی تفتیش نہیں تھا۔“ ڈی آئی جی نے کہا۔ ”کچھ دیر بیشتر مجھے رسم علی آغا خانی کی کال موصول ہوئی تھی، ان کا کہنا ہے کہ کوئی بلا وجہ انہیں فون پر تنگ کر رہا ہے..... ایک بار دہلی زبان میں یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر اس کا مطالبہ پورا نہ ہوا تو انجانے میں کسی نامعلوم سمت سے آنے والی سنسنائی گولی اس کی موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔“

”کسی پر شہجے کا اظہار کیا گیا؟“ سراج نے دریافت کیا۔

”نہیں.....“ ڈی آئی جی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”صرف اس شہجے کا خیال سرسری طور پر کیا تھا کہ ممکن ہے کوئی دیرینہ دشمن اپنی برتری کا احساس دلانے کی خاطر اوجھے جھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔“

”اس کی کوئی وجہ بھی ضرور بتائی ہوگی۔“

”ہاں..... رقم کی ادائیگی میں رسم علی نے فون کرنے والے کو ٹریپ کرنے کی خاطر ایک آفر دی تھی۔ یہ شرط بھی عائد کی تھی کہ رقم کی ادائیگی وہ براہ راست کریں گے..... جگہ اور طریق کار کا تعین انہوں نے دوسری پارٹی پر چھوڑ دیا تھا مگر اس کے بعد لائن کاٹ دی گئی..... دو گھنٹے بعد پھر کال آئی رقم کا مطالبہ کرنے والے نے اس بار ایک انوکھی ہدایت دے کر کہا تھا کہ وہ مطلوبہ رقم ایک لفافے میں بند کر کے دفتر کے ٹائٹ شفٹ کے چوکیدار کے حوالے کر دے اور اسے تاکید کر دے کہ جو شخص بھی ملاقات کے بعد ”خفیہ بزنس“ کا کوڈ استعمال کرے چوکیدار وہ لفافہ اس کے حوالے کر دے..... رسم علی آغا خانی نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا..... اس گفتگو کے ایک گھنٹے بعد انہیں پھر کسی نئے آدمی کی کال موصول ہوئی جس نے صرف ایک جملہ کہہ کر لائن کاٹ دی تھی..... مرنے کے لیے بروقت تیار رہنا.....“ ڈی آئی جی نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ”میں نے کچھ سادہ لباس والوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے لیکن آپ بھی کسی وقت رسم علی سے مل لیں..... ممکن ہے کوئی ایسی بات بھی موجود ہو جو وہ فون پر بتانے سے گریز کر رہا ہے۔“

”رائٹ سر..... میں کل دوپہر میں ملاقات کر لوں گا۔“

”اورنگ زیب صاحب کے بارے میں کیا اطلاع ہے.....؟“

”دودن سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی سر۔“ سراج نے پہلو بدل کر کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ آکٹوپس پر جال ڈالنے کی خاطر کوئی آخری حربہ تیار کر رہے ہوں گے۔“

دوسری جانب سے صرف ”ہوں.....“ کی بہم آواز سنائی دی پھر رابطہ ختم ہو گیا۔

”کس کا فون تھا..... اورنگ زیب نے سوال کیا پھر تفصیل جاننے کے بعد کہا۔“ تمہارا کیا خیال ہے اس کال کے بارے میں؟“

”آپ کے اچانک پردہ نشین ہو جانے کی وجہ سے آئی جی کے پیٹ میں بھی مروڑ ہو رہی ہوگی..... شاید ڈی آئی جی صاحب کو یہ شکایت لاحق ہو کر آپ نے اپنی روپوشی کے سلسلے میں انہیں بھی مطلع نہیں کیا۔“

”میں رستم علی آغا خانی کو موصول ہونے والے فون کے بارے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔“

”اس کا اندازہ تو اس سے ملاقات کے بعد ہی ہو سکے گا۔“

”یہ جواب پولیس کا ایک عام کارندہ بھی دے سکتا تھا لیکن تم اس بات کو فراموش کر رہے ہو کہ ہمارا مقابلہ آکٹوپس سے ہے جو ایک ہی وقت چھ سات دشمنوں میں نہایت آسانی سے ہلچل پیدا کر سکتا ہے۔“

”آکٹوپس کا بلیک میٹنگ یا سرمایہ داروں سے چمٹکیں وصول کرنے کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تم بھول رہے ہو مائی ڈیئر..... اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔“ ایک ایسے ہی موقع پر میں نے شبیہ کے اغوا ہونے کا خیال ظاہر کیا تھا مگر روشنا کو اغوا کر کے بے عزت کیا گیا..... سابقہ ڈی آئی جی علیم احمد کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا..... وہ زخم ابھی ہمارے لیے تازہ ہے.....“ اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ”اس بار بھی میرا خیال ہے کہ افضل خان کو دھمکی دینے والا ہماری توجہ ایک سمت کر کے دوسری جگہ وار کرے گا۔ رستم علی آغا خانی کو فون بھی اسی بچکانا اسکیم کے تحت کیا گیا ہوگا۔“

”پھر..... اصل نشان کون بنے گا.....؟“

”قبل از وقت یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا اور..... یہ بھی ممکن ہے کہ اس بار بیک وقت کئی دھماکے ہوں۔“

”اس خیال کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

اورنگ زیب کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا جب اس کا موبائل روشن ہو گیا۔ اسکرین پر مینتھر کے نمبر نظر آرہے تھے۔ ”کیا خبر؟“ اورنگ زیب نے موبائل فون آن کر کے دریافت کیا۔

”میں قانونی اہمیت والی ہستی پر پوری طرح چوکس ہوں۔“ سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”لیکن ایک بات قابل حیرت“ پہیلیاں نہیں..... کھل کر فون کرنے کا مقصد بیان کرو.....“

”آپ جانتے ہیں کہ میں جگا کا پروردہ ہوں..... اب بھی اس کی سرپرستی مجھے حاصل ہے..... یہ بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں وہ لنگوٹ کا پکا ہے اس کے تنگی ساتھی بھی ادھر ادھر منہ مارنے سے گریز ہی.....“

”فون کرنے کا اصل مقصد بیان کرو۔“ اورنگ زیب نے قدرے ترش لہجہ اختیار کیا۔

”سوری سر لیکن۔ ابھی چندہ منٹ پیشتر میں نے استاد کو دلربا کے بیٹے میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ مجھے دلربا کی ایک جھلک بھی نظر آئی جس نے دردازے پر آکر بات کی بھی پھر دونوں اندر چلے

گئے..... یہ بھی عرض کر دوں کہ جو گاڑی نظر آئی وہ بھی استاد کے استعمال میں بھی نہیں رہی.....“

”میرے فون کا انتظار کرو..... ایک لمحے کے لیے بھی موجودہ سچوشن سے غافل نہ ہونا..... اورنگ زیب نے رابطہ ختم کر کے دوسرے موبائل پر جگا کے نمبر ڈائل کیے۔

”آپ کا خادم بول رہا ہوں جناب۔“ ابھرنے والی آواز جگا کے سوا کسی اور کی نہیں تھی۔ ”میرے لائق کوئی خدمت.....“

”تم اس وقت کہاں ہو.....؟“

”اپنی رہائش گاہ پر..... آپ حکم کریں.....“

”دلربا نامی کسی لڑکی کا نام سنا ہے؟“

”لڑکی..... دلربا..... اور جگا؟“ اس بار زیادہ سنجیدگی سے جواب ملا..... ”آپ کو کسی دشمن نے غلط اطلاع دی ہوگی جناب..... میں اس لائن کا آدمی نہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... میں نے کسی وجہ سے تصدیق کی تھی..... آرام کرو۔“ اورنگ زیب نے جگا سے رابطہ ختم کیا پھر اس نے دوسرے موبائل پر دوبارہ مینتھر کو کال کی۔

”مینتھر آن دی لائن.....“ کال فوراً ہی اٹینڈ کی گئی۔

”جو شخص نظر آیا وہ جگا نہیں..... کوئی اور ہے.....“

”میرا ذاتی خیال بھی.....“

”میری بات غور سے سنو.....“ اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں ہدایت کی۔ ”وہ جو بھی ہو اسے جان سے نہ مارنا لیکن زخمی کرنا ضروری ہے۔ اس کام کے لیے اپنے کسی خاص آدمی کو مامور کر دو..... یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ زخمی ہونے کے بعد کہاں جاتا ہے..... میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔“

”اورنگ زیب نے رابطہ ختم کیا تو سراج نے اسے کریدا۔“

”آپ کی باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آکٹوپس کے کچھ شکاری کتے بھی میدان میں آگئے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے اس کے اشارے پر اس کا کوئی خاص آدمی عمل کر رہا ہو.....“

”کون ہو سکتا ہے..... سکندر علی شاہ؟“

”اس کا بھی مجید بہت جلد کھل جائے گا.....“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا پھر اٹھ کر ٹیبلے لگا سراج نے اس حالت میں مزید کوئی سوال نہیں کیا مگر..... وہ محسوس کر رہا تھا کہ اورنگ زیب کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کسی زلزلے کا پیش خیمہ بھی ہو سکتے تھے۔



تکینہ کے ذہن میں اس وقت ایک لاوا پھٹ پڑنے کو چل رہا تھا لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اس کا اظہار کر سکتی..... وقت اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل چکا تھا۔ اس نے بہت

کچھ کھو کر جو مقام حاصل کیا تھا جس بلندی پر پہنچی تھی وہ محض ایک خواب بن کر رہ گئی تھی۔ اس خواب کی اب کوئی تعمیر نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو وہ اس قدر بھیا تک تھی کہ اس کے تصور ہی سے وہ کانپ اٹھتی تھی۔

کل وہ گناہ تھی، ایک جمو پڑی میں زندگی گزار رہی تھی جہاں پاس پڑوس کے رہائشی بھی وہاں ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے لیکن اب وہ اس جمو پڑی سے نکل کر محلوں میں آگئی تھی جہاں کے درو دیوار کی زینت بھی دور دور تک مشہور تھی۔ سکندر علی شاہ بذات خود بھی صاحب حیثیت تھا۔ اس سے منسوب ہونے کا تصور اس نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا مگر وہ خواب ایک حقیقت میں ڈھل چکا تھا۔ پہلے وہ فنٹ پاتھ کے کنارے پر ایک تنگ تاریک جمو پڑی میں جیلہ کے نام سے رہتی تھی اب وہ محل میں آکر گھینہ بن گئی تھی جس کی چمک دور دور تک پھیل گئی تھی۔

گزرے وقت کی تلخ باتیں اس کے وجود میں نشتر بن کر چھ رہی تھیں۔ سب سے پہلے ایک مرد نے اسے زبردستی کلی سے پھول بنا دیا تھا پھر اسی مرد کی سفارش پر وہ سکندر علی کی بیوی بن گئی تھی؟ وہ مرد کون تھا؟ اس کا علم اس کے علاوہ خود سکندر علی شاہ کو بھی علم نہیں تھا۔ اگر وہ نامعلوم مرد سفارش نہ کرتا تو وہ سکندر علی شاہ کی ہوس کا نشانہ بننے کے بعد ایک مرد کی آغوش سے نکل کر کسی اور کی گود تک پہنچ جاتی۔ پھر اس کی منزل کوٹھی کے بجائے بالا خانہ ہوتی جہاں اس کو خریدنے والی اس کی قیمت مقرر کر دیتی۔ اس قیمت کو چپکا کرنے کے بعد کوئی بھی اس کے جسم کو روکنے کا ہتھار بن سکتا تھا لیکن قسمت نے اس کی یادری کی تو سکندر علی شاہ سے منسوب ہو گئی اور اب..... اب جس مرد نے اسے پہلی بار بے آبرو کیا تھا..... جس کی سفارش پر سکندر علی شاہ نے اسے طوعاً و کرہاً بیوی کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ اسی مرد کے حکم پر اسے دوبارہ کوئی سزا ملنے والی تھی۔ اس سزا کے تصور نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔ ایک بار مار دیا جاتا تو زندگی کا خاتمہ ہو جاتا لیکن وہ زندگی میں بار بار مر کر زندہ ہوتی رہی تھی اور شاید آئندہ بھی اس کے نصیب میں ٹھوکریں ہی لکھ دی جاتیں۔

سکندر علی شاہ نے بیوی کی حیثیت سے قبول کرنے کے بعد اسے اپنے خاص کمرے کی زینت بنا دیا تھا۔ پہلی بیوی کو یکسر اعزاز کر کے وہ ہر رات گھینہ کی خواب گاہ میں اس کے ساتھ رہتا تھا لیکن پھر ایک مرد ہی نے اسے بڑی خوب صورتی سے ٹریپ کر لیا تھا۔

ریٹو کلب سے سکندر علی شاہ کے لیے ایک نوخیز کلی کو شیشے میں اتارنے کے دوران وہ خود ایک سنہری جال میں پھنس گئی تھی..... وہ کون لوگ تھے؟ کیا چاہتے تھے؟ وہ اس راز سے قطعی لاعلم تھی لیکن انہوں نے جس حالت میں اسے سکندر علی شاہ تک پہنچایا تھا اسے دیکھنے کے بعد کوئی مرد اسے بحیثیت بیوی قبول نہ کرتا۔ سکندر علی شاہ نے بھی اس کا برہنہ گفت پیک دیکھ کر اس پر قہقہہ دیا تھا..... شاید وہ اسے راز داری سے اپنے آدمیوں کے ہاتھ مروا کر کہیں دفن کرا دینے سے بھی گریز نہ کرتا لیکن پھر وہی مرد آڑے آ گیا جس نے پہلی بار اسے برباد کیا تھا..... اس کی کسی ہدایت کے بعد ہی سکندر کا عذاب نازل ہوتے ہوتے رہ گیا اور اب سارا منظر ہی اس کی توقع کے خلاف بدل گیا تھا..... کل تک وہ

سکندر علی کی خواب گاہ میں صونے پر لیٹی کسی اور لڑکی کی عزت کی دجیاں اڑتے دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی..... آج ایک اور لڑکی سکندر علی شاہ کی آغوش گرم کرتے وقت اسے نفرت اور حقارت بھری نظروں سے گھور کر مکافات عمل کے معنی سمجھا رہی تھی۔

ہاتھ میں آئے ہوئے تمام سنہری موٹے گھینہ کے ہاتھوں سے ریت کے ذروں کی طرح ایک ایک کر کے کھل گئے تھے لیکن وہ بہر حال ایک عورت تھی۔ حسین اور خوب صورت بھی تھی۔ وقت کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اس بات کا اندازہ بھی خوب ہو گیا تھا کہ عورت اگر مہربان ہو تو گھر کی دوزخ کو بھی جنت بنا سکتی تھی اور..... اگر تریاٹ پر اتر آئے تو اسی جنت کو جہنم میں بھی تبدیل کر سکتی تھی۔

اس وقت بھی اپنی خواب گاہ کے کونے میں لیٹی تھی جہاں سکندر علی شاہ اپنی قیمتی مسہری پر ایک نوخیز کلی سے چمپیر چھاڑ میں معروف تھا۔ سکندر علی شاہ نے اسے یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ آنکھیں بند نہ کرے لیکن..... وہ صرف گھینہ کے جسم کو قابو کر سکتا تھا..... اپنی ہر بات زور زبردستی منوا سکتا تھا لیکن اس کی سوچوں پر پابندی لگانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

گھینہ بڑی سنجیدگی سے آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وقت نے اسے زندگی کے بہت سارے نشیب سے آگاہ کر دیا تھا..... سکندر علی شاہ کی کوٹھی میں اب اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ سر کے تاج سے پاؤں کی جونی بن چکی تھی جسے کسی وقت بھی کچرا کٹڈی میں پھینکا جا سکتا تھا۔ سکندر علی شاہ کو بس کسی نامعلوم شخص کے اشارے کا انتظار تھا..... لیکن اگر وہ وقت کے آنے سے پیشتر ہی کسی طرح اس کی قید سے نکل بھاگتی تو پھر زندگی کو کسی نہ کسی طور پر برقرار رکھنے کی خاطر ہاتھ پاؤں چلا سکتی تھی..... ابھی تک کوٹھی کے ملازموں کو اس کی گرتی ہوئی حیثیت کی بھینک نہیں ملی تھی۔ وہ کسی کو بھی پیسوں سے خرید کر ایک بار فرار ہو جاتی تو پھر..... بے بسی کی ان کیفیتوں سے کسی نہ کسی طرح بچتا رہا بھی حاصل کر سکتی تھی۔

دو روز بعد قدرت نے اسے ایک خاص موقع فراہم کر دیا۔ سکندر علی شاہ اس کو خواب گاہ میں بند کر کے کہیں چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے یہ دھمکی بھی دے گیا تھا کہ اگر گھینہ کوئی غلط قدم اٹھانے کا ارادہ کیا تو اس کا انجام بھی ایک ہوگا۔

تنہائی کے اس موقع پر گھینہ کے ذہن میں کئی نام ابھر رہے تھے۔ شیلادورما کا نام بھی ابھر تھا وہ بھی سکندر علی شاہ کے لیے ترو تازہ مال فراہم کرنے کی خدمت انجام دیتی تھی بیوٹی پارلر میں جونی سے دو چار ملاقاتوں کے بعد وہ اس کی آغوش کی زینت بن چکی تھی۔ شیلادورما کے مقابلے میں جونی مختلف سوچ کا مالک تھا لیکن اتنا قابل اعتماد بھی نہیں تھا کہ آنکھ بند کر کے اس پر بھروسہ کیا جاسکتا۔ کوٹھی کے ملازم بھی سکندر علی شاہ کے عتاب کی وجہ سے اس کی مدد کو بھی آمادہ نہ ہوتے۔

خاصی دیر تک گھینہ اندر اندر رہی ابھی رہی پھر یلکھت ایک نام اس کے ذہن میں اندھیرے میں کسی جگہ کی طرح چمکا، دوسرے ہی لمحے اس نے کمرے میں تنہا ہونے کے باوجود خوفزدہ نظروں

سے ادھر ادھر دیکھا پھر اس نے الماری کھول کر اپنا موبائل نکال لیا جس کا علم سکندر علی شاہ کو بھی نہیں تھا۔ یہ موبائل اسے جونی نے پہلی بار ہونے والی تنہائی کی تفصیلی ملاقات کے بعد گفٹ کیا تھا۔ نگینہ نے اسے یادگار سمجھ کر محفوظ کر لیا تھا۔ اس وقت وہی موبائل اس کے لیے دنیا میں سب سے بڑی نعمت بن گیا۔ بیٹری لگانے کے بعد اس نے آن کیا پھر ایک نمبر جو اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا تھا اس کو ڈائل کر کے اپنی قسمت کو آزمایا۔ دوسری جانب سے گھنٹی کی آواز ابھرتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ دوسری بار بھی اسے ناکامی ہوئی لیکن تیسری بار کسی نے سرد لہجے میں کال ریسیو کر لی۔ جھلائے ہوئے لہجے میں سوال کیا گیا۔

”کون ہے.....؟“

”مجھے پروفیسر چنگ لائی فارچون سے بات کرنی ہے..... اٹ از جنت“

”تم نے غلط جگہ فون کیا ہے یہیں اس نام کا.....“

”پلیز..... رابطہ منقطع نہ کرنا۔“ نگینہ نے گھبرا کر کہا۔

”میں پروفیسر سے ایک بار ملاقات کر چکی ہوں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ بغیر کسی سفارش کے کسی کا ہاتھ نہیں دیکھتا لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے..... پلیز تم اسے بتا دو میرا نام نگینہ ہے۔“

دوسری جانب سے کوئی جواب دیے بغیر لائن کاٹ دی گئی تو نگینہ کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی۔ امید کی جو ایک کرن اسے تاریکی میں نظر آئی تھی۔ گھپ اندھیروں میں ڈوبنے لگی لیکن تقریباً دس منٹ بعد موبائل کی روشنی بزر کے ساتھ نظر آئی تو نگینہ نے اسے آن کر لیا۔

”ہیلو..... میں نگینہ بول رہی ہوں۔“

”کون نگینہ.....؟“ آواز کچھ مانوس لگ رہی تھی اس لیے نگینہ نے وقت ضائع کیے بغیر ریڈیو کلب کے حوالے سے اپنا مختصر تعارف بھی کر دیا۔

”سمجھ گیا۔ تمہاری آواز بھی سن چکا ہوں لیکن تم شاید مجھے دوبارہ دیکھو تو پروفیسر کی ایک جھلک بھی تلاش نہ کر سکو گی۔“ اس بار بے تکلفی سے کہا گیا۔

”جانتی ہوں..... لیکن اس کے باوجود اس وقت مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔“

”یہ بھی جانتا ہوں کہ سکندر علی شاہ کو تمہارا گفٹ پیک کھول کر آٹھ سو اسی روپے کا جھٹکا ضرور لگا ہوگا لیکن یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم اب تک اس کے عتاب سے محفوظ کس طرح رہیں؟“

”اسی نامعلوم شخص کا حکم سکندر علی شاہ کے ارادوں کے آڑے آگیا جس کی تلاش تم کو بھی ہے۔“ نگینہ نے جسم التماہن کر جواب دیا ”لیکن میں زیادہ دنوں محفوظ نہیں رہ سکوں گی۔“

”پھر..... کچھ نہ کچھ تو سوچا ہوگا؟“ ساٹ اور کھردری آواز میں پوچھا گیا۔

”ایک ہی آخری تدبیر ہے..... میں کسی طرح یہاں سے فرار ہو جاؤں۔“ نگینہ نے گڑگڑا کر درخواست کی۔ ”تم نے مجھے جب ریڈیو کلب سے اغوا کیا تھا وہ میری موت کا پہلا دن تھا۔ اب میں تم

ہی سے زندگی کی بھیک مانگ رہی ہوں..... میری بات کا یقین کرو میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا

آپشن (Option) نہیں ہے۔“

دوسری جانب سے کچھ توقف کے بعد پوچھا گیا..... ”کیا تم کو یقین ہے کہ سکندر علی شاہ کی قید سے فرار ہو سکتی ہو۔“

”اذیت ناک موت مرنے سے پہلے ہر ذی نفس پھڑپھڑا کر زندگی کی آرزو کرتا ہے۔ ایک کوشش میں بھی کروں گی لیکن تمہارے سوا میں کسی اور کے سامنے جھولی بھی نہیں پھیلا سکتی۔“

”ایک بات میری غور سے ذہن نشین کر لو..... اس بار سرد و سفاک لہجے میں جواب ملا۔“ پروفیسر چن لائی کے علاوہ بھی میرے بہت سارے روپ ہیں۔ تم نے اگر دھوکا دینے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھ اور بھی کچھ لوگ کام آجائیں گے۔

”انسان جب موت کے دہانے پر کھڑا ہو تو کسی سے فریب کرنا اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی..... میں اس وقت صرف تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔“ نگینہ کی بے بس آواز آنسوؤں میں بھرا گئی۔ ”پلیز مجھے مایوس مت کرنا.....“

”ڈونٹ وری..... میں نے اپنے تجربے کی روشنی میں تمہاری آواز ہی سے تمہاری کیفیت کا اندازہ لگا لیا ہے..... میری بات غور سے سنو..... کوئی قدم جلد بازی میں اٹھانے کی ایسی غلطی نہ کرنا جس کے بعد تمہارے تمام راستے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔“

”مجھے خود بھی اس کا اندازہ ہے۔“

”کوشی سے نکل کر تم ٹیکسی پکڑ کر ساحلی علاقے کی طرف جاؤ گی..... بے حد سنجیدگی سے ہدایت ملی۔“ راستے میں اگر کوئی تم کو لفٹ دینے کی کوشش کرے تو اس کو قبول کر لینا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے لیکن..... اگر تم لفٹ دینے والے کی کوئی شناخت بتا دو تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”تم اس وقت بار گیسٹنگ کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ جتنا کہا گیا ہے اسی کو ذہن نشین کر لو۔“ دوسری جانب سے اس جواب کے ساتھ لائن منقطع کر دی گئی۔

نگینہ کو اندھیرے میں کہیں دور ایک امید کی کرن ٹھٹھاتی نظر آ رہی تھی۔



اورنگ زیب کو بڑی شدت سے بیتھنصر کے فون کا انتظار تھا جگا سے گفتگو کرنے کے بعد اس کے ذہن میں متعدد خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ دلربا جس پیٹھے سے منسلک تھی وہاں اس کے دروازے تک کوئی بھی جا سکتا تھا لیکن سکندر علی شاہ کے لیے وقت ہو جانے کے بعد اس نے کسی سے بھی ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ ماروی کے ساتھ ریٹ ہاؤس میں پیش آنے والے سامنے کے بعد سکندر علی شاہ نے بھی اسے باہر آنے جانے سے روک دیا تھا۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ پولیس کے سادہ لباس والے بھی اورنگ زیب کی ہدایت پر دلربا کے بیٹھکے کی نگرانی پر مامور ہیں خود اورنگ زیب نے بھی ماروی سے ملنے کے بعد دلربا سے براہ راست ملنے سے گریز کیا۔ اس میں اس کی بہت ساری مصیبتیں تھیں۔ بیتھنصر نے بھی یہی کیا تھا کہ نگرانی کے بعد سے دلربا نے بھی گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا

کی اطلاع کے مطابق وہ اس وقت نواجی بستی کے ایک مکان میں موجود ہیں..... میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ میرے دوسرے فون کا انتظار کیے بغیر وہ اس مکان سے دور نہ رہے۔

”گڈ.....“ اورنگ زیب نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بڑی تفصیل سے اس علاقے اور اس مکان کا پتا معلوم کر کے ذہن میں محفوظ کیا پھر لائن کاٹ کر سراج سے بولا۔

”مجھے دیکھنا ہوگا کہ زخمی نے خاص طور پر جگا کا روپ اختیار کرنے کی حماقت کیوں کی تھی۔“

”پھر..... کیا پروگرام ہے.....؟“ سراج نے اٹھتے ہوئے کہا ”وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمارے لیے فوری اقدام کرنا ضروری ہے۔“

”تم نہیں..... میں اکیلے جاؤں گا۔“ اورنگ زیب نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا پھر سراج کے سمجھانے کے باوجود اس نے اٹھ کر ایک ریڈی میڈ میک اپ اختیار کیا اور جینکے کے عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ ٹیکسی سے اتر کر اس بستی میں داخل ہو رہا تھا جہاں پینتھر کی اطلاع کے مطابق زخمی موجود تھا۔ وہاں زیادہ تر مکان اسی اور سوگز پر تعمیر تھے۔ جس مکان میں اسے جانا تھا وہ سڑک کے قریب ہی بستی میں تعمیر شدہ مکانوں کی دوسری لائن میں واقع تھا۔ اورنگ زیب نے ایک جگہ رک کر پھر کسی سے موبائل پر رابطہ قائم کیا۔ ”اب اندر کی کیا پوزیشن ہے۔“

”زخمی کے علاوہ اندر دو آدمی اور بھی ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ ان کا تعلق ایسے ہی گروہ سے ہے جو منہ مانگی رقم کے عوض خود اپنا گلا کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔“

”اور کچھ۔“

”میری ذاتی معلومات کے مطابق اس گروہ کا سربراہ ناگی ہے جو کئی بار سرکاری مہمان بھی رہ چکا ہے۔ پولیس کے کچھ اہلکار بھی در پردہ اس کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ جو زخمی ہوا ہے اس کو سب جتنوں کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔“

”میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“ اورنگ زیب نے موبائل آف کر کے جیب میں ڈالا پھر وہ کن انکھیں سے دائیں بائیں دیکھتا مطلوبہ مکان کے دروازے کے سامنے جا کر رکھا..... دروازے پر ایک مخصوص انداز میں دوبار دستک دی پھر اس کا سیدھا ہاتھ جیب میں ریگ گیا جہاں اس کا آٹو ٹیک پستول موجود تھا۔

دوبارہ مخصوص دستک دینے کے بعد دروازہ اندر سے کھول دیا گیا۔

”کس سے ملنا ہے.....؟“ سامنے آنے والے نے سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔

”مجھے جینکو کی خیریت دریافت کرنی ہے..... اسے فوری طور پر یہاں سے کسی اور ٹھکانے پر پہنچانا ہے۔“

اورنگ زیب نے بدلی ہوئی آواز میں خاص پولیس والوں کا لہجہ اختیار کیا۔

”تم نے اپنا نام نہیں بتایا.....“ دروازہ کھولنے والے نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

پھر ایسی صورت میں خاص طور پر جگا کو روپ اختیار کر کے وہاں کون گیا ہوگا؟ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ وہاں جانے والا جگا کا ہم شکل تھا یا اس میک اپ کی پشت پر بھی کوئی سوچی سمجھی اسکیم کارفرما تھی۔

جگا کے تردید کرنے کے بعد اب آپ کس پہلو پر غور کر رہے ہیں؟ ”سراج نے کچھ توقف سے سوال کیا۔“ کیا اس میں بھی آکنو پس یا سکندر علی شاہ کا ہاتھ شامل ہوگا؟

”کم از کم آکنو پس ایسی جگہ تا حرکت کبھی نہیں کر سکتا..... رہا سکندر علی شاہ تو میرے خیال میں تو اس کے امکانات بھی کم ہیں۔“

”پھر اور کون ہوگا.....؟“

”ممکن ہے وہ دلربا کا کوئی پرانا آشنا ہو جس سے خود دلربا بھی واقف ہو۔“ اورنگ زیب نے ایک امکانی بات کہی۔ ”اگر واقف نہ ہوتی تو وہ اسے مکان کے اندر لے جانے کی غلطی نہ کرتی مگر..... اہم بات یہ ہے کہ اس ملاقاتی نے جگا کا میک اپ کیوں اختیار کیا.....؟“

ہمیں غلط لائن پر ڈالنے کی خاطر یہ سب کچھ بھی بہر حال کسی نہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوگا۔ ”سراج نے پہلو بدل کر کہا۔“ ممکن ہے آکنو پس کے وہ شکاری کتے ہوں جنہوں نے جگا کے شوروم پر اسے گھیرنے کی کوشش کی تھی لیکن لوچن اور آپ کے بروقت پہنچنے کے سبب انہیں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

اورنگ زیب نے جواب دینے کے بجائے سراج کو غور سے دیکھا، کچھ سوچتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”اگر تمہارا یہ اندازہ درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلربا اس کہانی کے بیچ کی طرح شامل ہوئی؟“

سراج نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت اورنگ زیب کے موبائل پر سنگل موصول ہوئے۔ اورنگ زیب نے نمبر دیکھ کر آن کر لیا۔

”کیا خبر ہے.....؟“

”آپ کے کہنے کے مطابق میرے ایک آدمی نے جگا کے ہم شکل کو باہر نکلنے کے کچھ دیر بعد زخمی کر دیا تھا..... کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا ہوا۔ اس کے کچھ ساتھی بھی کہیں قریب موجود تھے جو لوگوں کے متوجہ ہونے سے پہلے ہی اسے ایک پک اپ میں ڈال کر لے گئے تھے۔“ پینتھر نے بات جاری رکھی۔ ”میں ان لے جانے والوں میں سے کسی کو شناخت نہیں کر سکا۔“

”بہر حال..... وہ جو کوئی بھی تھا۔ ہاتھ آکر نکل گیا.....“ اورنگ زیب نے الجھن کا اظہار کیا۔

”ایسا بھی نہیں ہے.....“ پینتھر نے فوراً ہی جواب دیا۔ آپ کے معاملات میں..... میں ہمیشہ محتاط رہتا ہوں..... استاد کی شکل اختیار کرنے والے نے مجھے چونکا دیا تھا اسی لیے میں نے یہی فیصلہ کر لیا تھا کہ آنے والے کو زخمی ہونے کے بعد بھی ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔“

”کیا بتانا چاہتے ہو.....؟“ اورنگ زیب جواب سن کر چونکا۔

”جو لوگ زخمی کو لے گئے تھے میرے ایک ساتھی نے موٹر سائیکل پر ان کا تعاقب کیا تھا۔ ان

جواب میں اورنگ زیب نے علاقہ پولیس کے ایک بدنام ہیڈ کانسٹیبل کا نام لیا تو اس کو روکنے والا ایک جانب ہٹ گیا۔ اورنگ زیب قدم بڑھاتا اندر داخل ہوا..... وہاں دو آدمی اور بھی موجود تھے ان کی نظریں بھی اورنگ زیب کو کرید رہی تھیں لیکن وہ رکے بغیر سامنے والے کمرے میں چلا گیا جہاں سامنے پیچھے ایک تخت پر ایک زخمی بڑا کراہ رہا تھا۔

پہلی نظر میں اس کی صورت دیکھ کر خود اورنگ زیب کو بھی اس پر چکا ہونے کا شبہ ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ دو آدمی اس کے پیچھے آکر پوزیشن سنبھال چکے تھے تیسرا باہر ہی رہا تھا اورنگ زیب نے پلٹ کر ان دونوں کو مخاطب کیا۔

”اس سے پیشتر کہ پولیس یہاں پہنچے تمہیں جگنو کو لے کر کسی بھی دوسرے ٹھکانے تک پہنچنا ہے۔ میں یہی اطلاع دینے آیا ہوں۔“

”ہم تم سے براہ راست واقف نہیں ہیں۔“ ایک نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”تم نے جس ہیڈ کانسٹیبل کا حوالہ دیا ہے وہ بے شک ہمارا قیمتی آدمی ہے لیکن ہم استاد کے حکم کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔“

”تم جانو.....“ اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”مجھے جو اطلاع دی تھی وہ دے دی آگے تمہاری مرضی۔“

”اس ہمدردی کے باوجود تم بھی واپس نہیں جا سکتے۔“

دوسرا سینہ تان کر بولا۔ ”استاد کی اجازت کے بغیر تم کو بھی ہم جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔“

جواب میں اورنگ زیب کچھ چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا اس کی گرفت پستول کے دسے پر جمی تھی وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان دونوں کو قابو کرنے کے بعد تیسرے کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا..... مگر دوسرے ہی لمحے جو صورت حال پیش آئی اس نے اورنگ زیب کے ہاتھ آئی بازی کو بھی پلٹ دیا۔

تیسرا آدمی جو باہر موجود تھا لکھنت اندر داخل ہو کر فرش پر اوندھے منہ گرا۔ اس کے ساتھ اورنگ زیب کے علاوہ باقی دو آدمیوں کی نظریں بھی دروازے کی سمت اٹھیں جہاں ناگی ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔

”اپنے ہاتھ جیب سے واپس نکال لو ایس پی!“ ناگی نے براہ راست اورنگ زیب کو مخاطب کیا۔ ”کوئی چال بازی نہ کرنا ورنہ تمہارا کھیل بھی تمہارے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔“

اورنگ زیب کے لیے موجودہ پوزیشن میں کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں تھا اس نے خاموشی سے ہاتھ جیب سے نکال لیے لیکن اس کی نظریں بدستور ناگی کو گھور رہی تھیں۔

”بہت دنوں بعد ناگی کے ہاتھ آئے ہو ایس پی۔“

آج تمہاری تھوڑی بہت خاطر مدارات کرنا بھی ہمارا حق ہے اس کے بعد تمہیں بھی اندازہ

ہو جائے گا کہ ناگی کس درندے کا نام ہے۔“

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تیسرا آدمی جو اندر آکر گرا تھا وہ یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا اس نے ناگی کے مزید عتاب سے بچنے کی خاطر دیدہ و دانستہ آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ دوسرے دو آدمیوں نے بڑے غوغو اور انداز میں اپنے ہتھیار نکال کر اورنگ زیب پر تان لیے تھے۔

”نہیں.....“ ناگی نے اپنے مسلح آدمیوں سے کہا۔

”ایک شے آدمی پر تین تین ہتھیار اٹھانا مردانگی نہیں ہے۔ تم دونوں اپنا اسلحہ ایک طرف ڈال دو..... ایس پی صاحب کے لیے خادم موجود ہے اور آپ.....“ اس بار ناگی نے اورنگ زیب کی جانب دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ اپنے قوت بازو سے میرے دو سائڈوں کی گردن توڑ کر جاسکتے ہو تو میں روکوں گا بھی نہیں۔“

ان دونوں کے علاوہ اورنگ زیب نے بھی ناگی کے اشارے پر اپنا پستول نکال کر اسی کی طرف اچھال دیا۔ اسے کسی ایک موقع کی تلاش تھی جس کے بعد وہ بازی پلٹ سکتا۔

بستر پر پڑا زخمی بھی حقارت بھری نظروں سے اس کھیل تماشے کو دیکھ رہا تھا جو اورنگ زیب اور اس کے دونوں ساتھیوں کے درمیان شروع ہو چکا تھا۔ ناگی بہ بدستور دروازے پر جما کھڑا تھا۔ اورنگ زیب کے لیے ناگی کی وہ انوکھی پیشکش ایک نیا تجربہ تھی۔ ناگی کے بارے میں اس کو یہی معلوم تھا کہ وہ کسی دشمن کے ساتھ رعایت کرنے کا عادی نہیں تھا۔ گولیوں کی آواز میں دشمنوں سے بات کرنا اس کا پہلا اصول تھا۔ نفری گنتا اور دشمن کو فرار ہونے کا موقع دینا ایک عام بد معاش بھی پسند نہیں کرتا..... ناگی تو محض ایک معمولی شے کی بنا پر لاشیں گرانے کا عادی تھا۔

بہر حال اورنگ زیب اس وقت ان دونوں آدمیوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا جو اسے گھیر کر دوپٹے کی کوشش میں بار بار جھکا کر دے رہے تھے۔ اورنگ زیب نے بھی کچھ گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جو ڈو کرانے کے علاوہ مارشل آرٹ کے بھی تمام داؤ بیچ سے پوری طرح واقف تھا۔

کچھ دیر تک تینوں دائرے کی صورت میں جگہ تبدیل کرتے رہے پھر ایک نے اچانک جست لگا دی اورنگ زیب پوری طرح چوکس تھا اس نے چھلانگ لگانے والے کو ڈانٹ دے کر سیدھے پاؤں کے جوتے کی نوک سے اس پر ایسی نپٹی تھوکر لگائی جس کے بعد وہ رانوں کے بیچ دونوں ہاتھ رکھ کر اس طرح مابی بے آپ کی طرح فرش پر لوٹنے لگا جیسے کسی لمحہ بھی سانس اکھڑنے والی ہو..... اس کا دوسرا ساتھی صورت حال دیکھ کر سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا جب اورنگ زیب نے ایک پاؤں زمین پر جما کر کسی پھر کی طرح فضا میں گھوم کر دوسرے پاؤں کی تھوکر اس کی گردن پر ماری وہ بھی ایک لمحہ چکرا گیا۔ کرتے کرتے سنبھلا پھر سنبھلنے کے بعد جیسے دیوانہ ہو گیا ہو..... کسی زخمی گینڈے کی طرح اس نے اورنگ زیب پر چھلانگ لگائی تھی اورنگ زیب نے پوزیشن بدل کر جوابی وار کیا تو اس کی ناک سے بھل بھل خون اگلنے لگا۔ وہ جواب میں وحشیوں کی طرح حملہ آور ہوا لیکن اس بار ہوا میں اچھلتا ہوا سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ دوبارہ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اسے

مدمقابل کی مہارت اور قوت کا اندازہ ہو چکا تھا۔

دلوں سے چمٹکارا پانے کے بعد اورنگ زیب نے دروازے پر کھڑے ناگی کو تیز نظروں سے گھورا۔ ناگی کی نظریں چمک رہی تھیں۔ اس چمک میں خوشی کا ایک عکس بھی نمایاں تھا۔ اورنگ زیب ناگی سے کچھ کہنا چاہتا تھا جب ناگی نے برق رفتاری سے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول سے ایک گولی خارج کر دی۔ اورنگ زیب نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر دیکھا۔ تخت پر پڑا زخمی تڑپ کر فرش پر اوندھ گیا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک شکاری چاقو پڑا تھا اپنے دوساھیوں کا انتقام لینے کی خاطر اس نے شاید اورنگ زیب کو عقب سے نشانہ بنانا چاہا تھا لیکن ناگی کا عتاب اس کے آڑے آ گیا۔ یہ صورت حال اور ناگی نے اگلا قدم اٹھایا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا پستول اورنگ زیب کے قریب اچھال دیا جذباتی انداز میں بولا۔

”مجھے یقین تھا صاحب کہ تم ان دو کوڑی کے کتوں کے قابو میں نہیں آؤ گے۔“

”اورنگ زیب اس آواز کو سن کر دم بخود رہ گیا پھر ناگی نے اپنے چہرے سے ریڈی میڈ میک اپ اتارا تو شبہ کی کوئی گنجائش بھی باقی نہیں رہ گئی۔ اب تک جو ناگی کا رول ادا کر رہا تھا وہ جگا کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔“

”اب یہاں سے نکل چلو صاحب۔۔۔۔۔ باقی کہانی میں آپ کو راستے میں سنا دوں گا۔“

”ان کی فکر نہ کرو صاحب۔۔۔۔۔ میرے آدمی باہر موجود ہیں۔۔۔۔۔ وہ ان دم توڑتے کتوں کو بھی سمیٹ کر ایک ٹھکانے تک پہنچا دیں گے۔“

اورنگ زیب جگا کے ساتھ قدم اٹھاتا باہر آ گیا کچھ فاصلے پر سیاہ رنگ کی ایک پرانی شیور لیٹ کھڑی تھی۔ گاڑی کو بستی سے نکال لے جانے کے ساتھ ہی جگا نے اصل صورت حال کی کہانی بھی شروع کر دی۔

”مجھے خوشی ہے کہ وہی (پینتھر) نے آپ کے ساتھ دغا بازی نہیں کی۔ دلربا کے بنگلے پر میرے ہم شکل کو دیکھ کر اس نے پہلے آپ ہی سے رابطہ کیا تھا پھر اسے زخمی کرنے کے بعد اس نے مجھے بھی ساری سچویشن سمجھا دی تھی۔ معاملے کی تیز تک پہنچنے کے بعد ہی میں نے ناگی کا روپ اختیار کیا تھا۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ بھی ضرور ہوگی۔“

”آپ کو یاد ہوگا صاحب کہ ایک بار میرے شوروم پر بڑا منظم حملہ ہوا تھا لو جن بھی بروقت آ گیا تھا پھر آپ نے درمیان میں آ کر میرے قدموں میں برداشت کرنے کی بیڑی ڈال دی تھی۔“ جگا نے کہا۔ ”اس روز ناگی کے کچھ بھاڑو ہی کسی کے اشارے پر مجھے مارنے آئے تھے اور اب انہوں نے میرا روپ اختیار کر کے پھر میری غیرت کو لٹکا رہا تھا اس لیے میں نے بھی ناگی ہی کا روپ اختیار کر کے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا مناسب سمجھا۔ میری اس حرکت سے آپ کو اگر شکایت ہو تو میں معافی ہی طلب کروں گا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر سامنے والے نے شطرنج کی بساط کے کچھ مہرے ادھر ادھر کر دیے ہوں گے تو مجھے کچھ دشواریوں کا سامنا ہوگا۔“

”آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟“

”دلربا میرے لیے خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔“ اگر تم نے مجھے پہلے صورت حال بتا دی ہوتی تو میں کم از کم اسے ہاتھ سے نکلنے کا کوئی موقع نہ دیتا۔ میرا خیال ہے کہ ناگی کے دہاں جانے اور زخمی ہونے کی اطلاع سکندر علی شاہ تک بھی ضرور پہنچ گئی ہوگی۔“

”شطرنج کی چالیں کچھ کچھ مجھے بھی آتی ہیں صاحب۔“ جگا نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”امداد علی نے میری مدد نہ کی ہوتی تو جیل یا تارا کر کے واپسی کے بعد میں بھی ناگی کی طرح کوئی روپ اختیار کر لیتا۔ مگر اوپر والے کا کرم تھا جو سیدھے راستے پر لگ گیا لیکن وقت کی نزاکت اوپر والے کا خیال رکھنا میرے لیے بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی کسی اور کے لیے ضروری ہوتی ہے۔“ جگا نے بات جاری رکھی۔ ”یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں کہ دلربا کی کیا حیثیت ہے اور وہ قانون کی نظروں میں کیا اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے میں نے بھی موقع کی نزاکت بھانپ کر وہی (پینتھر) کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ پہلی فرصت میں اسے چھوڑ کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دے۔“

”گڈ۔۔۔۔۔ لیکن کیا پینتھر کا سیاب ہو گیا ہے۔“

”ابھی معلوم کیے لیتا ہوں۔“ جگا نے موبائل نکال کر مطلوبہ نمبر ملائے پھر اپنی مخصوص زبان میں یہ بات بھی کنفرم کر لی کہ دلربا کو نہایت خاموشی سے اس کے بنگلے سے نکال کر دوسری محفوظ جگہ پر محفوظ کر دیا گیا ہے۔

اورنگ زیب نے جگا کو سائنسی نظروں سے دیکھا پھر وہ ناگی کے سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا جب اس کے موبائل پر سنسل ملے۔ اورنگ زیب اسکرین پر ابھرنے والے نمبر کو دیکھ کر چونکا پھر بڑے مہذب لہجے میں بولا۔

”اس وقت خادم کو کیسے یاد کر لیا؟“

”چند ناگزیر حالات کی وجہ سے آپ کے ساتھ جو پروگرام طے ہوا تھا اس میں کچھ تبدیلی کرنی ضروری ہو گئی ہے۔“ دوسری جانب سے سکندر علی شاہ کی آواز ابھری۔

”میں ایک دو روز بعد آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گا۔“

”کیا میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں۔“

”جب دوست کہا ہے تو کبھی آپ کو بھی ضرور آزماؤں گا لیکن فی الحال ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”بہر حال۔۔۔۔۔ آپ نے میرے علاج کے لیے جو وعدہ کیا تھا اسے فراموش نہ کر دیجئے گا۔“ اورنگ زیب نے دیدہ و دانستہ عاجزی سے کہا۔

”ڈونٹ وری۔۔۔۔۔“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ اورنگ زیب کے ہونٹوں پر

ایک مسکراہٹ ابھر کر گہری ہوتی چلی گئی۔

گنبد کے فرار ہو جانے کی اطلاع سکندر علی شاہ کے لیے کسی ایسی دھماکے سے کم ہولناک نہیں تھی۔ کسی زخمی درندے کی طرح اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا دروازے پر موجود اس کا خاص آدمی بھی سر جھکائے کھڑا تھا۔

گنبد کی حیثیت سکندر علی شاہ کے لیے پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہم نہیں تھی جنہیں وہ دو ایک بار استعمال کر کے یا تو پھینک دیتا ہے یا کسی دوسرے ضرورت مند کے حوالے کر دیتا ہے۔ گنبد گدڑی کا لعل تھی جسے پہلی بار استعمال کرنے کے بعد سکندر علی شاہ نے اس کے قریب کی گرمی سے متاثر ہو کر دو تین بار مزید اپنے بستر کی زینت بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا بھی وہی انجام ہوتا جو دوسروں کا ہوتا تھا جب شکرہ کے حکم پر سکندر علی شاہ کو مجبوراً اس کے ساتھ نکاح کرنا پڑا۔ یہ اور بات تھی کہ بیوی کی حیثیت حاصل ہونے کے بعد گنبد نے اپنے معصوم اداؤں اور خود سپردگی کے والہانہ انداز سے سکندر علی شاہ کی نظروں میں ایک مقام ضرور بنا لیا تھا پھر جب گنبد نے سکندر علی شاہ کے لیے شیلا ورما اور جونی کے ساتھ ساتھ گانڈھ کر کے تازہ راشن کی فراہمی میں ہاتھ بٹانا شروع کیا تو سکندر علی شاہ نے بھی اسے ڈھیل دے دی تھی مگر.....

رینبو کلب سے گنبد کے اغوا کی اطلاع کے بعد جب اسے اس کا برہنہ گنڈ پیک ملا تو سکندر علی شاہ نے اس خوب صورت فینے کو ٹکڑوں میں منقسم کرنے کے بعد سکندر برد کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے اغوا کیا تھا وہ گنبد کے حوالے سے اسے بلیک میل بھی کر سکتے تھے ان کے جال کو توڑنے کی خاطر یہی مناسب تھا کہ گنبد کے قصے کو یکسر ختم کر دیا جاتا جس کے بعد اغوا کرنے والے اس کی رعایت سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے لیکن شکرہ نے درمیان میں آ کر کچھ دن انتظار کرنے کو کہا تھا اور اب.....

گنبد کوٹھی سے فرار ہو کر اس کی پہنچ سے کہیں دور نکل گئی تھی۔

سکندر علی شاہ ٹپٹے ٹپٹے رک گیا اس نے دروازے پر موجود اپنے خاص کارندے جابر پر سرسراتے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”میری غیر موجودگی میں تجھے نگاہیں کھلی رکھنی چاہیے تھیں۔“

”صرف کوٹھی کے باہر کی حد تک۔“ کارندے نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”زنان خانے میں دوسروں کی طرح میرا داخلہ بھی منع ہے..... اس کے علاوہ آپ کے حکم کے بموجب میں صدر دروازے سے گزر کر آنے جانے والوں پر نگاہ رکھنے کا پابند ہوں۔ کوٹھی کے عقبی حصے میں ملازموں کے کوارٹر ہیں شاہ جی..... اس لیے میں اس طرف جانے سے بھی پرہیز کرتا ہوں۔“

”تیرا شبہ کس پر ہو سکتا ہے“ سکندر علی شاہ نے عقبی راستے کے حوالے پر ہونٹ چباتے ہوئے دریافت کیا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن..... میری معلومات کے مطابق چھوٹی بیگم صاحبہ کے ساتھ

رانی کا میل جول دوسروں کے مقابلے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔“

پھر..... سکندر علی شاہ کے حکم پر جابر نے..... جس کا اصل نام جبار خان تھا رانی کو بھی لا کر پیش کر دیا جو بڑی سہی سہی نظر آرہی تھی۔

”کوٹھی سے ایک نفری کم ہو گئی ہے؟“ سکندر علی شاہ نے غضب ناک انداز میں سوال کیا۔ ”اس کے بارے میں تو کیا کہے گی؟“

”میں دھوکا کھا گئی.....“ رانی نے موقع کی نزاکت بھانپ کر ہاتھ جوڑ لیے۔ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”چھوٹی بیگم نے مجھے جو کہانی سنائی وہ شاید غلط ہی تھی۔“

”کھل کر سب کچھ اگل دے حرافہ.....“ سکندر علی شاہ نے الٹا ہاتھ رسید کیا تو رانی گرتے گرتے بچی پھر اس کی زبان بھی فر فر چلنے لگی۔

رانی کی کہانی کے مطابق گنبد بیگم نے اسے موبائل پر کال کر کے طلب کیا تھا۔ خواب گاہ کا دروازہ بھی باہر سے بند تھا جسے رانی نے کھولا تھا۔ گنبد نے اس کے بعد جو کچھ اس پر بھی رانی کو آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنا پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایک مرید شاہ جی کو کسی بہانے سے لے گیا ہے اسی نے باہر سے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ گنبد نے سکندر علی شاہ کو واپس لانے کی خاطر ضروری بندوبست اور اپنے ذرائع کو استعمال کرنے کی بات کہی تھی۔ یہ بھی حکم دیا تھا کہ اس بات کی بھٹک کسی اور کو نہ ملے۔ وہ رانی کے ساتھ ہی عقبی دروازے کی طرف گئی تھی۔ گاڑی نہ لے جانے کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ دشمنوں کو اس کی نقل و حرکت کا سراغ نہ ملے۔

”بکواس بند کر.....“ سکندر علی شاہ گرج کر بولا۔ ”کیا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ کوئی مجھے اغوا کر کے لے جاتا اور میرے شکاری کتوں کو اس کی بھٹک بھی نہ ملتی۔“

جواب میں رانی تھوک نکل کر رہ گئی۔ ہاتھ باندھے کھڑی خوف سے کپکپا رہی تھی جب سکندر علی شاہ کی گھن گرج دوبارہ اس کی قوت ساعت سے ٹکرائی۔ اس بار اس نے جابر کو مخاطب کر کے فیصلہ کن انداز میں حکم دیا۔

”تم اس زمین کو لے جا کر جگہ اگوانے کی کوشش کرو۔ جو ہاتھ سے نکل گئی انہی کے لیے تم بھی اپنے آدمیوں کو اطلاع کر دو میں بھی اپنے ذرائع استعمال کرتا ہوں۔“

”جو حکم سرکار.....“ جابر خان، رانی کا ہاتھ تھام کر باہر گھسیٹ کر لے گیا۔ وہ گنبد کے ماضی اور اس کے کردار سے بھی ناواقف نہیں تھا، یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ شیلا ورما اور جونی کے ساتھ کھیل کود کرنے کے بعد کتنی گہرائی میں اتر چکی ہے رانی کے بیان کے مطابق اسے فرار ہوئے دو گھنٹے ضرور گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں اس کی مدد کرنے والوں نے بھی سکندر علی شاہ کے خوف سے کہیں نہ خانے میں چھپا دیا ہوگا جہاں تک رسائی میں کسی آسانی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ فی الحال وہ اس بات پر خوش تھا کہ رانی کو اس کے حوالے کیا گیا تھا جس کو حاصل کرنے کی خواہش اس کے دل میں ایک مدت سے

ترپ رہی تھی۔

سکندر علی شاہ جابر کے جانے کے بعد بھی ذہنی طور پر الجھتا رہا۔ ایک ذرا سی غلطی اس کی ساکھ اور بنی بنائی شہرت کو ملیا میٹ کر سکتی تھی۔ نگینہ کو واپس لانے یا اس کا قصہ ختم کر دینے کی خاطر کسی فوری اقدام کی ضرورت تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر ایک خاص آدمی کو فون کیا۔

”آپ کا خادم بول رہا ہوں شاہ جی۔“ دوسری جانب سے خادمانہ لہجے میں جواب ملا۔

”تم اس وقت کہاں ہو۔۔۔۔۔؟“

”آپ حکم کریں میں قلیل میں تاخیر نہیں کروں گا۔“

”ایک قیمتی چیز ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اگر وہ فوری واپس نہ ملی تو بلا وجہ کی پریشانی ہوگی۔“

”اشارہ کریں۔۔۔۔۔ میں آپ کا پرانا تابعدار ہوں۔“

”نگینہ۔۔۔۔۔“ سکندر علی شاہ نے مدغم لہجے میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”وہ تقریباً دو گھنٹے سے غائب ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ دوسری جانب سے بھی تشویش کا اظہار کیا گیا۔ ”وقت زیادہ ہو گیا پھر بھی۔۔۔۔۔ آپ

کو کسی نہ کسی پر تو شبہ ہوگا۔“

”شبہ ہوتا تو اب تک اسے جہنم رسید کر چکا ہوتا لیکن۔۔۔۔۔“ سکندر علی شاہ نے غصہ ضبط کرتے

ہوئے کہا۔

”تم اسے کوئے کھدروں میں بھی تلاش کرنا شروع کر دو۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اسے کچھ اچھے

آدمی نے فرار کا راستہ نہیں دکھایا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے شاہ جی۔۔۔۔۔ میں اپنے بندوں کو بھی۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ سکندر علی شاہ نے اس کا جملہ درمیان سے اچانک اچک لیا۔ ”بات پھیلی تو میری

بدنامی بھی ہوگی۔“

”یہ مجھ پر چھوڑ دیں جناب۔۔۔۔۔ میں نے جو کتے پالے ہیں وہ میری مرضی کے بغیر دم ہلانے کی

بھی غلطی نہیں کرتے۔“

”ایک آخری ہدایت بھی نوٹ کر لو۔ وہ جہاں بھی ملے اسے وہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر

دینا۔“ سکندر علی شاہ نے بے حد سفاک لہجے میں کہا۔ ”کانڈ جل جائے تو پھر اس کی راکھ بھی ہوا میں

اڑا دیتا۔ میں اپنے دامن پر کوئی داغ دھبا برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”بے فکر ہو جائیں۔۔۔۔۔ ایک بار وہ مل جائے پھر ہم اس کے حمایتیوں کی کھٹیا اٹھانے سے بھی

دریغ نہیں کریں گے۔“

سکندر علی شاہ نے موبائل بند کر کے دوبارہ ٹھہلنا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن میں آنندھیاں چل

رہی تھیں۔ ایک ہی سوال رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ نگینہ کو پھیل لگانے والے کون ہو سکتے ہیں؟۔۔۔۔۔ وہ اس

منحوس گھڑی کو گالیاں سن رہا تھا جب اس نے شکرہ کے دباؤ میں آکر نگینہ کو پال لیا تھا جواب پتارے

سے نکل جانے کے بعد پلٹ کر اسے ڈسنے کی کوشش بھی ضرور کرے گی۔۔۔۔۔ خیالات کا ایک ہجوم تھا جو گرم ہوا کے تند جھونکوں کی طرح اس کے وجود میں چھ رہا تھا جب اس کے فون کی گھنٹی کی آواز ابھری۔ ٹھٹھٹے ٹھٹھٹے اس نے چونک کر فون کو گھورا پھر لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

”سکندر علی شاہ بول رہا ہوں۔۔۔۔۔“

”جانتا ہوں کہ اب تمہاری خواب گاہ میں کوئی دوسرا فون ریسیور کرنے والا نہیں رہا۔۔۔۔۔ چپے

ہوئے لہجے میں دوسری جانب سے شکرہ کی آواز ابھری۔“ میں تمہیں پہلے بھی متعدد بار بتا چکا ہوں کہ

تمہاری کوئی کسی کوئے میں ریٹکنے والے کیڑے کی سرسراہٹ کی آواز بھی میرے کانوں تک پہنچ

جاتی ہے۔۔۔۔۔ شکرہ بلند یوں پر پرواز کے دوران سمندر تک تہوں میں چپے اپنے شکار سے بھی کبھی غافل

نہیں رہتا۔

”جانتا ہوں۔“ سکندر علی شاہ نے پہلی بار جھلاہٹ کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ ”جس روز

اس بدکردار کا گفت پیک ملا تھا۔ میں نے اسی دن اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کا فیصلہ کر لیا

تھا لیکن۔۔۔۔۔“

”ہوش میں رہنے کی کوشش کرو سکندر علی شاہ۔“ دوسری جانب سے بولنے والے کا لہجہ یلخت

تبدیل ہو گیا۔ ”تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ مجھ سے شکایت کی جرات کر سکو۔۔۔۔۔ دوبارہ کبھی بھول کر

خواب میں بھی ایسی جرأت نہ کرنا۔“

”میرا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ۔۔۔۔۔“

”کوئی وضاحت مت کرو۔۔۔۔۔ صرف اپنی کھال کے اندر رہنے کی عادت ڈالو۔“ اس بار بھی

درشت لہجے میں پھکارا گیا تو سکندر علی شاہ کی پیشانی پر ٹھکنوں کا جال پھیل گیا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب

کسی نے اسے حقارت اور نفرت سے مخاطب کیا تھا۔ وہ ابھی خود پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف

تھا جب شکرہ کی تیز آواز دوبارہ ابھری۔

”تم نے میرے اس وقت فون کرنے کا مقصد نہیں پوچھا۔۔۔۔۔؟“

”میں نے اپنے ایک وفاداری شکاری کتے کو نگینہ کو کسی بھی قیمت پر تلاش کرنے اور جہنم رسید

کرنے کی ہدایت جاری کر دی ہے۔ سکندر علی شاہ نے غصہ بہ مشکل ضبط کر کے جواب دیا۔“

”میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت ایس بی کی ہے۔“ شکرہ نے اس بار سنجیدگی سے

کہا۔ ”اس کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہی میں سکون کا سانس لوں گا۔“

”اس کی سانسیں بھی اب گنی رہ گئی ہیں کل وہ میرے پروگرام کے مطابق فارم ہاؤس

آنے کے لیے بھی شدت سے بے چین ہوگا۔“

”اسے تو نالہ سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ فارم ہاؤس آنے کے لیے بھی وہ کسی

منصوبے کی پلاننگ میں مصروف ہو لیکن وقتی طور پر اب پروگرام کینسل کر دو۔“

”کوئی خاص وجہ۔۔۔۔۔؟“ سکندر علی شاہ نے تعجب سے پوچھا۔

”وجہ کی ذمہ داری بھی تم ایس بی پر ڈال سکتے ہو.....“ کچھ توقف سے کہا گیا۔ ”میری اطلاع کے مطابق ایس بی کو بھی ابھی تک کسی پھنسی کے جال سے نکل جانے کی خبر نہیں ملی۔“

”میں نگینہ کو اتنا اہم نہیں سمجھتا کہ ایس بی.....“

”غلط اندازہ لگایا تم نے..... میں نگینہ کی نہیں دلربا کی بات کر رہا ہوں..... وہ بھی تمہاری دسترس سے دور جا چکی ہے۔“

دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ دلربا کے ہاتھ سے نکل جانے کی اطلاع سکندر علی شاہ کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی پھر..... شکرہ کی ہدایت پر ہی اس نے اورنگ زیب سے پروگرام کی تبدیلی کی بات کی تھی۔



ساحلی علاقے کی ایک اوسط درجے کی ہٹ میں پہنچنے کے بعد نگینہ نے سکون کا سانس ضرور لیا تھا لیکن کچھ باتیں تھیں جو اسے الجھا رہی تھیں۔ جن حالات میں وہ سکندر علی شاہ کی کوشی تک پہنچی تھی اور جس طرح اسے نکاح میں قبول کیا گیا تھا وہ محض ایک خواب ہی تھا ورنہ یہ بات اسے بھی معلوم تھی کہ سکندر علی شاہ پاؤں کی جوتیاں بھی صبح و شام بدلنے کا عادی تھا۔ جس نے اسے شادی کرنے کا حکم دیا تھا وہ ابھی ایک معما تھا..... خود سکندر علی شاہ بھی براہ راست اس سے واقف نہیں تھا لیکن کوئی راز ایسا ضرور تھا جو وہ اس کی کسی بات سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بات بھی سکندر علی شاہ کی زبان ہی سے ایک دن نکل گئی تھی کہ..... ”جس نے تمہیں پہلی بار روٹا تھا اسی کے کہنے پر میں نے تم کو گھر کی زینت بنالیا ہے۔“

نگینہ کے ذہن میں بھی اس کی بس ایک دھندلی سی نامکمل شکل تھی جو ماضی کے پردوں پر کبھی کبھی پر چھائیں بن کر ابھرتی تھی۔ اس نے کبھی اس کے بارے میں غور و خوض کرنے کی کوشش بھی نہیں کی مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ سکندر علی شاہ کی ایک ایک رگ کو اچھی طرح پہچاننے لگی تھی۔

حالات کے پیش نظر اس نے خود کو اسی ماحول کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ خوب صورت لڑکیوں کی تازہ کھپ تلاش کرنے میں بھی اس نے کبھی ہچکچاہٹ نہیں کی تھی۔ یہ بات بھی سچ تھی کہ اس راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے کبھی کبھی اس کے پاؤں بھی ڈمگ گئے تھے۔ شیدا ورما کے بیوی پارلر میں آنے جانے کے دوران جونی سے بھی اس کی بے تکلفی ہو گئی تھی اس کے بعد جو ہوا اس کی خبر شیدا ورما کو بھی مل گئی تھی لیکن سکندر علی شاہ کی وجہ سے شیدا ورما نے کھل کر کسی بات کی سرزنش نہیں کی تھی..... صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے اپنا بہت کچھ کھو کر جانی کو پایا ہے اور..... اب اسے پالینے کے بعد کسی بھی قیمت پر رکھو دینے کو تیار نہیں تھی۔ یہ ایک اشارہ ہی نگینہ کے لیے بہت تھا۔ اس نے جونی سے ملے جلے میں کمی کر دی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ سکندر علی شاہ کے بارے میں بھی جان گئی تھی کہ اس نے محض اچھی شہرت حاصل کرنے کی خاطر پیری مریدی کا ڈھونگ رچا رکھا تھا ورنہ عام زندگی میں کسی شیطان

سے کم نہیں تھا۔ اسی فطرت کے پیش نظر وہ گھر میں کام کرنے والی عام ملازماؤں پر بھی کڑی نگرانی رکھتا تھا کون کہاں اٹھتی ہے؟..... کہاں بیٹھتی ہے؟ کہاں آتی جاتی ہے؟..... کس کس سے ملتی ہے؟..... اس ملاقات کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

اپنی عزت کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر اس نے بہت سخت اصول بنا رکھے تھے۔ ایسی صورت میں نگینہ کا ہاتھ سے نکل جانا وہ کس طرح منظور کر سکتا تھا؟..... کیا اس کو علم نہیں ہوگا وہ کس وقت گھر سے نکلی تھی؟..... اس وقت کہاں تھی؟.....

ساحلی علاقے کی ہٹ میں بیٹھی اس وقت بھی اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو گون رہی تھی..... کچھ دوسو سے تھے جو اس کے ذہن کی گہرائیوں میں چبھ رہے تھے..... جن حالات کے پیش نظر اس نے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا وہ غلط بھی نہیں تھا..... اس بات کو وہ سمجھ چکی تھی کہ ”برہنہ گفٹ پیک“ ملنے کے بعد وہ سکندر علی شاہ کی نظروں سے گر چکی تھی کسی کا حکم آڑے نہ آ جاتا تو شاید وہ نگینہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سمندر برد کرنے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہ کرتا لیکن اسی نامعلوم آدمی کے مشورے پر اس کا عتاب وقتی طور پر ٹل گیا تھا۔ منسوخ نہیں کیا گیا تھا..... اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک انتہائی قدم اٹھالیا تھا۔

بہت غور و خوض کرنے کے بعد ہی اس نے پروفیسر چنگ لائی فار چون کو فون کیا تھا جس نے اسے ریٹنولک سے اغوا کرنے کے بعد موت کی آخری سرحد تک پہنچا دیا تھا۔ وہ جو بھی تھا اس نے بھی کسی خاص مصلحت کی بنا پر سکندر علی شاہ کو بلیک میل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا..... اس کے بعد آنے والی فون کالز کے بعد نگینہ کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ پروفیسر چنگ لائی کا ڈھونگ رچانے والے کو بھی اسی نامعلوم شخص کی تلاش تھی جس نے سکندر علی شاہ کو اپنے اشاروں پر ناچنے مجبور کر دیا تھا۔ اسی کے مشورے پر وہ کوشی سے نکلی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے باہر نکلتے ہی ایک خالی ٹیکسی بھی مل گئی جس میں بیٹھ کر وہ ساحلی علاقے کی سمت جاری تھی جب ایک موٹر سائیکل سوار کئی بار اس کی ٹیکسی کے قریب آیا تھا۔ ایک بار نگینہ کی نظریں اس سے چار ہوئیں تو اس نے بہت واضح طور پر کسی عیاش آدمی کی طرح آنکھ مار کر ساتھ چلنے کا اشارہ دیا تھا۔ وہ اسے پہلی دفعہ ٹال گئی لیکن دوسری بار جب وہ ٹیکسی کے قریب آیا تو نگینہ کو وہ ہدایت یاد آگئی جو اسے پروفیسر چنگ لائی نے دی تھی..... اس نے فوری طور پر ٹیکسی والے کو روکنے کو کہا تھا۔

ٹیکسی رکنے کے بعد میٹر پر نظر آنے والی رقم سے کچھ زیادہ رقم دے کر اترنے کی خاطر اس نے دروازہ کھولا تو ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی بردباری سے ایک جملہ دبی زبان میں کہا تھا۔

”آج کل نوجوان نسل بگڑتی جا رہی ہے..... دوسروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہے۔“

وہ اس جیلے پر خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی تھی۔ ٹیکسی کے آگے بڑھ جانے کے بعد وہی نوجوان موٹر سائیکل اس کے قریب لے آیا تھا۔

”تشریف رکھیں.....“ اس نے نگینہ کو معنی خیز نظروں سے گھور کر ایک خاص انداز میں دعوت دی

تھی جو وہ انکار بھی نہ کر سکی لیکن اب وہ بڑی سنجیدگی سے غور کر رہی تھی کہ کہیں غلط باتوں میں تو نہیں پھنس گئی..... اس کی وجہ بھی معقول تھی۔

جس نے اسے لفٹ دی تھی وہ بہر حال وہ نہیں تھا جسے اس نے فون کیا تھا نگینہ اس نکتے پر غور کر رہی تھی جب نوجوان جو اسے ہٹ میں چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا دوبارہ اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ ہٹ کا چوکیدار تھا جس نے ایک ٹرے میں ڈرائی فروس اور ڈرگس کے سر بند گتے کے ڈبے اٹھار کھے تھے۔ ٹرے درمیانی میز پر رکھ کر وہ نظریں جھکا کر واپس چلا گیا تو نوجوان نے ٹرے کی سمت اشارہ کر کے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تم پہلے فریش ہو لو پھر دوسری باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“

”کیا میں تمہارا نام معلوم کر سکتی ہوں؟“ اس نے نوجوان کو خالی خالی نظروں سے گھورتے ہوئے سنبھل کر پوچھا۔

”اس کا خیال تمہیں اتنی دیر میں کیوں آیا.....؟“

”کچھ اتفاق ہی سمجھ لو جو میں آگئی ورنہ.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”جانتا ہوں۔“ نوجوان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے دوسری جانب سے ملنے والی ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔“

”لیکن تم وہ نہیں ہو جس کو میں نے.....“

”مشاطر کھلاڑی وہی ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے..... ورنہ کبھی کبھی گوٹ پھنس بھی جاتی ہے۔ تم جس کا حوالہ دے رہی ہو وہ عالمی شہرت کا مالک ہے..... راستے کو ہموار دیکھ لینے کے بعد وہ بھی یہاں آنے میں دیر نہیں کرے گا..... ایک بات گرہ سے باندھ لو..... میں بھی اس کا جزوقتی کارندہ ہوں میں نے کبھی اس کی اصل شکل نہیں دیکھی صرف اس کے حکم پر عمل کرنے کا عادی ہوں۔“

نوجوان نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”تم جس کوٹھی سے نکل کر آئی ہو وہاں کیاری میں پودوں کی بھی پوری طرح نگرانی ہوتی ہے تم تو پھر نگینہ ہو جس کے گم ہو جانے کے بعد وہ ڈبا پیر بھی سکون سے نہیں بیٹھا ہوگا۔“

بات نگینہ کی سمجھ میں آگئی تو وہ الجھن بھی دور ہو گئی..... نوجوان نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔ تین کھنٹے بعد پروفیسر چنگ کے قد و قامت کا ایک شخص بھی آ گیا۔ ”تم نے فرار کا جو راستہ اختیار کیا ہے میں اس کی وجہ بھی جانتا ہوں۔“

نوجوان کے جانے کے بعد اس نے بے حد سنجیدگی سے نگینہ کو مخاطب کیا۔ ”یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے شاہ جی کے دل و دماغ پر بھی بجلیاں کوند رہی ہوں گی۔ وہ شپٹا رہا ہوگا جس نے وقتی طور پر تمہاری حمایت کی تھی۔“

”ایسی صورت میں کیا یہ ہٹ میرے لیے محفوظ ثابت ہوگی؟“ نگینہ نے سہی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

”نہیں..... یہاں کے چوکیدار بھی مٹھی گرم کیے جانے کے بعد اپنی وفاداری فروخت کر دیتے ہیں..... یہاں تم محفوظ نہیں ہو لیکن پریشان مت ہو۔ تم نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے تو میں بھی تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔“

آنے والا جو لوچن کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ کچھ دیر تک نگینہ سے سکندر علی شاہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا پھر اس نے موبائل فون نکال کر..... نمبر بیچ کیے اور کان سے لگا لیا۔

”کس سے بات کرنی ہے؟“ ریسپورڈ پر ایک بالوں نسوانی آواز ابھری۔

”سیون اشارا“ لوچن نے مخصوص کوڈ بتانے پر اسکا کیا۔

”کیا وہ جال میں پھنس گیا.....؟“

”نہیں..... اسی کا تعاقب کرتے ہوئے ایک کام کی چیز ہاتھ آگئی ہے جو سونے کی چڑیا ہی ثابت ہوگی۔“

”فالتو نہیں..... صرف کام کی بات کرو..... روکھائی سے کہا گیا۔“

”میں سکندر علی شاہ کی ماڈرن بیوی نگینہ کی بات کر رہا ہوں جو اپنے کسی عبرتناک انجام سے بچنے کی خاطر ہمارے پاس آگئی ہے۔ اس نے شکار کے بارے میں پہلے بھی ایک دو کام کی باتیں بتائی تھیں..... اس وقت بھی کچھ اشارے ایسے آئے ہیں جو شکار پر جال ڈالنے کی خاطر بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام ہے..... اس بار ٹھوس لہجہ اختیار کیا گیا تھا۔“ میں تمہیں منہ مانگا انعام پیشگی بھی ادا کر سکتی ہوں لیکن ہمارا مطلوبہ آدمی زندہ یا مردہ ہر صورت میں ہاتھ آنا شرط ہے۔

”میرے سینے پر اپنے دونوں ساتھیوں ڈوما اور قاسم کا بوجھ بھی ہے وہ حساب میرے لیے کسی انجام کی لالچ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔“

”اس وقت فون کرنے کا اصل مقصد کیا ہے؟“

”نگینہ کے لیے کسی محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہے..... شکاری کتے اس کی بوسہ لگتے پھر رہے ہوں گے۔“

لوچن نے مطلب کی بات کی۔ ”میں اس کو زیادہ دیر کہیں چپا کر نہیں رکھ سکتا۔“

”او کے..... میری کال کا انتظار کرو میں کوئی حل نکالتا ہوں۔“

”دوسری جانب سے سلسلہ ختم ہوا تو لوچن نے ایک بار پھر نگینہ کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ اس کے وجود پر اس وقت بھی موت کے کرناک سائے کپکپا رہے تھے۔ لوچن نے کچھ توقف کے بعد دوبارہ کریدا۔

”سکندر علی شاہ کیا واقعی اس آدمی سے واقف نہیں ہے جس کے آگے دم ہلاتا رہتا ہے۔“

”ہاں، مجھے کا اس کا یقین ہے..... اگر واقف ہوتا تو اس سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا پانے کی

کوشش ضرور کرتا۔“

”اسے کسی نہ کسی پر شک تو ہوگا؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی.....“ گلینہ نے طویل سانس لے کر جملہ پورا کیا۔ ”وہ بہت گہرا آدمی ہے کسی پر اعتماد کرنا اس کی سرشت کے خلاف ہے۔“

”پندرہ بیس منٹ تک ان کے درمیان آنکھوں کے حوالے سے بات ہوتی رہی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا..... پھر مطلوبہ کال بھی آگئی..... مخصوص کوڈ ورڈ کے حوالے کے بعد کہا گیا۔“

”تم گلینہ کو آج رات گیارہ اور بارہ کے درمیان مس جوزف کے پرائیویٹ وومن ہاسٹل کی انچارج کے دفتر تک پہنچا دو..... اسے صرف خفیہ دستاویز کا حوالہ دینا..... اس سے زیادہ کسی بات کا جواب نہ دینا..... میں نے بات کر لی ہے۔“

لوچن کو پرائیویٹ وومن ہاسٹل کی تجویز نہایت مناسب معلوم ہوئی تھی۔ شہر میں اس ٹائپ کے اور بھی رہائشی ہاسٹل موجود تھے جہاں لڑکیوں کی رہائش کی آڑ میں اور بھی کئی مذموم کام ہو رہے تھے لیکن مس جوزف کے ہاسٹل کے بارے میں ایسی کوئی افواہ نہیں پھیلی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک کروڑ پتی بیوہ تھی۔ اس کے علاوہ ایک مقامی گرلز کالج میں پروفیسر بھی رہ چکی تھی جو دوسروں کے مقابلے میں سرفہرست تھیں۔ وہاں کا ایڈمنسٹریشن بھی اتنا سخت تھا کہ کالج کی تمام لڑکیوں کی سرگرمیوں پر پوری طرح نظر رکھتا تھا۔

مس جوزف کا ہاسٹل دوسروں کے مقابلے میں کچھ مہنگا ضرور تھا لیکن لڑکیوں کے لیے نہایت محفوظ خیال کیا جاتا تھا شاید اس لیے کہ مس جوزف صبح سات بجے سے شام سات بجے تک بذات خود وہاں کے تمام شعبوں میں پھر کی طرح ناچتی رہتی تھی۔ ہر بات کا خاص خیال رکھتی تھی۔ اصول کے معاملے میں وہ کسی سے سمجھوتا کرنے کی عادی نہیں تھی اس کے باوجود اسی فیصد طالبات اور رہائشی لڑکیاں نہ صرف اس سے مطمئن تھیں بلکہ پرسکون ماحول میں رہتی تھیں سات بجے کے بعد مس جوزف کی ایک قریبی رشتہ دار وہاں ٹائٹ ڈیوٹی کے لیے پوری طرح چوک رہتی تھی۔ تمام خارجی راستوں پر گارڈز موجود رہتے تھے جو مس جوزف کے مخصوص اجازت نامے کے بغیر کسی کو بھی وہاں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

حکومت وقت نے بھی اس ہاسٹل کی افادیت اور ریپوٹیشن پر کھنے کے بعد اسے سالانہ مالی گرانٹ دینے کی کوشش کی تھی جسے مس جوزف نے نہایت شکریہ کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا۔



رات کے کھانے پر اورنگ زیب اور سراج کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ الماس نے بتایا تھا کہ وہ ڈی آئی جی کے کہنے کی وجہ سے رستم علی آغا خانی کی طرف چلا گیا تھا کچھ اور ضروری کام بھی نمٹانے تھے۔ اورنگ زیب بھی ڈنچی اور جگا کے بارے میں مختلف پہلوؤں پر الجھا ہوا تھا۔ اسے دلربا کا خیال بھی تھا جسے جگا کی اطلاع کے مطابق اس کے بنگلے سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر منتقل کر دیا تھا لیکن

ابھی تک ہینتھر نے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔

”آپ تو کھانا کھالیں..... الماس نے کہا۔“ میں سراج کو فون کرتی ہوں۔

”نہیں..... اسے کام کرنے دو۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر اپنے ٹھکے ہوئے ذہن کو سکون پہنچانے کی خاطر کہا۔

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری وجہ سے اب اس نے تنہا اپنے ہاتھ پاؤں چلانا کم کر دیا ہے۔“

”پھر آپ ایسا کریں..... نہادھو کر فریش ہو لیں۔ اتنی دیر میں آپ کے لیے کافی تیار کر دیتی ہوں۔“

اورنگ زیب بھی تھکن اتارنے کے ارادے سے اپنے رہائشی کمرے کی طرف جا رہا تھا جب اسے ہینتھر کی کال ملی۔

”مجھے تمہاری ہی کال کا انتظار تھا..... قانونی اہمیت کے سامان کو کہاں منتقل کیا ہے؟“

”سب سے پہلے معذرت چاہوں گا جناب کہ میں نے آپ سے براہ راست بات ہونے کے باوجود استاد کے کہنے پر قدم اٹھا لیا۔ استاد نے کہا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ ہی کسی معاملے میں مصروف تھا۔“

”مطلب کی بات کرو.....“ اورنگ زیب نے بات کو طول دینے سے گریز کیا۔

”میں نے اپنی تمام تر احتیاطی تدبیریں اختیار کرنے کے بعد ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے اس وقت بھی اسی کمرے کے باہر موجود ہوں جسے وہ اندر سے دیوانوں کی طرح توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”اسے زبردستی حماقت سے باز رکھنے کی کوشش کرو..... کسی کو بھینک بھی مل گئی تو کھیل خراب ہو جائے گا۔“

”اسی لیے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے..... دو چار گھنٹے کے لیے بے خبر کرنے کی ڈوز دے دوں۔“

”ٹھیک ہے.....“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ تم تنہا ہو یا کوئی اور بھی تمہارے ساتھ ہے؟ ”نی الجال میں نے آپ کی اجازت کے بغیر کسی کو ساتھ رکھنے کی غلطی نہیں کی۔“

”اچھا کیا لیکن..... اب میں تمہاری مدد کے لیے دو آدمیوں کو ہدایت جاری کر رہا ہوں..... ان سے زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”رائٹ سر.....“

ہینتھر کی کال موصول ہونے کے بعد اس نے اپنے دو خاص سادہ لباس والوں کو ضروری ہدایت دی پھر کسی خیال کے پیش نظر اس نے فوری طور پر سکندر علی شاہ کے نمبر ملائے۔

”اس وقت اس پیر فقیر کا خیال ذہن میں کیسے آگیا؟.....“ سکندر علی شاہ نے فون ریسیو کرنے

کے بعد خود پر قابو پاتے ہوئے بڑے خوشگوار موڈ میں دریافت کیا تھا ورنہ نگینہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس کے سینے پر بھی سانپ لوٹ رہے تھے۔

”آپ کے علم میں ہے کہ میں نے بھی دلربا کی گھرانی پر ایک آدمی مامور کر رکھا تھا۔“

”جانتا ہوں..... آپ کے تسلیم کر لینے کے بعد میں نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔“

”اس وقت دلربا گھر پر نہیں ہے.....“ اورنگ زیب نے دیدہ و دانستہ دوستانہ انداز میں بے

چینی کا اظہار کیا۔

”مجھے کچھ دیر پہلے اطلاع ملی تھی کہ کچھ نامعلوم افراد نے دلربا کے گھر میں داخل ہونے کی جبراً کوشش کی تھی میرے آدمی نے مداخلت کی تو وہ اسے بھی زخمی کر کے دلربا کو اٹھالے گئے۔ پاس پڑوس والوں میں سے کسی نے سامنے آنے کی کوشش بھی نہیں کی۔“

”آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟“ سکندر علی شاہ کے لہجے میں یقین تھا وہ پیدا ہو گیا۔

”جی نہیں بلکہ اس اطلاع کے ساتھ ہی اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔“

”میں آپ کو دوست تسلیم کرنے کے بعد کسی قسم کا شبہ بھی نہیں کر سکتا..... یہ بھی جانتا ہوں کہ جس وقت میں نے آپ کو پروگرام منسوخ کرنے کی اطلاع دی تھی اس وقت آپ کہاں موجود تھے

اور..... ون منٹ ہو لڑ کریں..... دوسرے نمبروں پر کسی کی کال آ رہی ہے۔“ سکندر علی شاہ نے غالباً

مائیک پر ہاتھ رکھ کر دوسری کال اٹھینڈ کی تھی پھر تین منٹ بھی اس کی آواز ابھری جس میں جھلجھل بھی

شامل تھی۔ ”آپ کی اطلاع کی تصدیق ہو گئی ہے میرے دو سادہ لباس والے بھی بے ہوش ملے

ہیں..... میں دیکھتا ہوں کہ کس کی موت آئی ہے جس نے براہ راست مجھ سے گھرانے کی حفاظت کی

ہے۔“

”کیا میں اپنی ذاتی حیثیت میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟“

”شکریہ.....! میں اپنے نجی معاملات کو سرکاری وردیوں سے دور ہی رکھتا ہوں۔“ سکندر علی شاہ

نے سر دلچسپی میں کہا۔ ”وہ جو بھی ہے اس نے مجھے لگا کر اپنی موت ہی کو دعوت دی ہے۔“

دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا..... اورنگ زیب نے سکون کا سانس لیا پھر نہانے کے بعد

تازہ دم ہو کر نیچے آیا تو سراج ڈائیننگ ٹیبل پر ہی اس کا منتظر تھا۔ الماس میز سجانے میں مصروف تھی۔

”کیا معلومات حاصل ہوئیں رستم علی آغا خانی سے؟“

ظاہر ہے کہ وہ فون پر دھمکیاں دینے والوں کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا جو ان کی نشاندہی کرنے کی

پوزیشن میں ہوتا..... بہر حال، میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ دارا اور روشنا کے بیرون ملک منتقل ہو جانے

کے بعد فرسٹریشن کا شکار بھی ہے۔

”میں سمجھا نہیں..... کیا دارا اور روشنا مستقل طور پر باہر چلے گئے؟“

”روشنا جانے کے لیے آمادہ نہیں تھا لیکن دارا.....“ سراج نے کسمسا کر کہا۔ ”اسے شاید اپنی

عزت زیادہ عزیز تھی جو وہ روشنا کو لے کر ہنگاموں سے دور چلا گیا..... یہاں رہتا تو روشنا کو برباد

کرنے والے اس کو سکون سے نہ رہنے دیتے۔“

الماس نے کھانے کی طرف توجہ دلائی تو اورنگ زیب بھی کھانے میں مشغول ہو گیا۔ چگا کا

کردار اور کارکردگی دونوں ہی اس کے لیے خلاف توقع ثابت ہوئی تھیں وہ کھانے کے دوران اسی

بات پر غور کر رہا تھا جب اسے میڈم روبی کی کال موصول ہوئی..... اورنگ زیب نے دوستانہ انداز

میں اسے کھانے پر آنے کی پیشکش کی۔

”سوٹ ڈش میں کیا ہے.....؟“ بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

”مکس فروٹ کے ساتھ ٹرائفل جو سراج کو زیادہ مرغوب ہے۔“

”اور میں نے آپ کی خاطر خالص دیسی مرغیوں کے تازہ انڈوں کی پڈنگ کا بندوست کیا

ہے..... چکنے سے پہلے ڈش کو دیکھتے ہی آپ ہماری کارکردگی اور مہارت کی داد دیے بغیر بھی نہیں رہ

سکیں گی۔“

پھر..... جب سوٹ ڈش کے حوالے کے بعد میڈم روبی نے اسے نگینہ کے بارے میں تفصیل

سے آگاہ کیا تو اورنگ زیب کے لیے وہ اطلاع دلربا کے بعد دوسرے کسی ایسی دھماکے سے کم بھی نہیں

تھی..... کھانے کے بعد اس نے چٹائی میں سراج کو دلربا اور نگینہ کے بارے میں بتایا تو وہ بھی ششدر

رہ گیا..... خاصی دیر تک وہ اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔

لیاقت حسین کی مصروفیات دفتر میں زیادہ بڑھ گئی تھیں ماربل ایکسپورٹ کا کاروبار اس وجہ سے

بھی فائدہ مند ثابت ہوا کہ سردار سرفراز خان نے اپنے علاقے میں کچھ نئے پہاڑوں کے پتھر خرید

لیے تھے۔ یہ سودا اس وقت ہوا جب پہاڑ بیچنے والوں کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اندر سے کس قسم

اور ڈیزائن کا مال برآمد ہوگا۔ یہ سرفراز کی قسمت تھی کہ جو ماربل نکالنا صرف وہ نئے اور خوب صورت

ڈیزائن کا تھا بلکہ قیمتی بھی تھا۔ ضروری پروسیسنگ اور پالشنگ کے بعد اس کے نمونے بیرونی منڈی

روانہ کیے گئے تو تمام آرڈرز میں خاطر خواہ اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ نئے خرید رہی لسٹ پر

آگئے سیٹھ عثمان کو اپنے حصے کی مناسبت سے بھی فائدہ پہنچ رہا تھا۔

اس وقت لیاقت حسین دفتر میں بیٹھا نئے آرڈرز کی تکمیل کے کاغذات تیار کر رہا تھا جب

سرفراز خان کا فون آگیا اس نے بھی کام کی نوعیت کی بات کی پھر دوسری جانب سے ماں کی ممتا ابھری

آواز ابھری۔

”تو اب کیسا ہے لیاقت؟ فرحین کیسی ہے؟“

”سب تیری دعاؤں میں ہیں ماں۔ تیری دعاؤں سے کاروبار بھی ترقی کر رہا ہے۔ اس کا فر پلید

سے بھی چھٹکارا مل گیا ہے لیکن انگوٹھی کم ہو جانے کا دکھ بھی ہے۔“

”سب کچھ خدا کے حکم اور انگوٹھی کے کرشمے سے ہوا..... اس کا دکھ مت کر۔ جو پلید مر گیا وہ

میرے تیرے لیے جی کا جنجال بنا ہوا تھا، تیرے بڑے نانانے جو کہا تھا وہ بھی سچ نکلا لیکن اب بھی

تجھے دیکھ بھال کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔“
”جس اللہ نے پہلے مدد کیا تھا وہ اب بھی ہر مصیبت میں ہمارا حفاظت کرے گا۔“ لیاقت حسین نے سادگی سے کہا۔

”وہی آخری سہارا بھی ہے مگر تیرے بڑے ناتانے ایک بات اور بھی کہا تھا۔ بڑا طوفان گزر جانے کے بعد چھوٹے چھوٹے جھٹکے بھی آتے رہیں گے۔“
”میں سمجھا نہیں ماں۔“

”جو پلید غرق ہو گیا۔ جل کر راکھ ہو گیا وہ بڑی شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔“ ماں نے دہی زبان میں اپنا مدعا سمجھانے کی کوشش کی۔ ”پتھر کی مورتی ٹوٹ جائے تو اس کے ٹھیکرے بھی پتھروں تلے چبھتے ہیں۔ تیرا ایک بڑا خطرہ اللہ کے حکم سے دور ہو گیا لیکن تو اپنا اور فرحین کا بہت خیال رکھنا میری دعا میں بھی تم دونوں کے ساتھ ہیں۔“

”میرے اور فرحین کے لیے اللہ کے بعد تیری دعائیں ہی سب سے بڑی نعمت ہیں۔۔۔۔۔ مقدس کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے کہ موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہیں۔“
”وقت طور پر جو پریشانی آتی ہیں وہ انسان کے اپنے کسی نہ کسی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔“

”سب کو میرا دعا اور سلام بولنا۔ تیرے لیے ایک خوش خبری اور بھی ہے۔“ ماں نے بات جاری رکھی۔ ”تیرا باپ نے ادھر پہاڑوں کے قریب ایک پرانا مکان خرید لیا ہے۔ اس کا نیا سرے سے مرمت کر رہا ہے۔ یہی بھی کہا تھا کہ اب کی بار تم دونوں کو بلا کر ادھر ہی رکھے گا۔۔۔۔۔ بڑا خوبصورت جگہ ہے۔“

لیاقت حسین ماں کی باتیں سن رہا پھر فون بند کر کے وہ دوبارہ ضروری کام کرنے میں مصروف ہوا تو۔۔۔۔۔ سیٹھ عثمان کا بلاوا آ گیا۔ انہوں نے بیرونی منڈیوں سے ماربل کے سلسلے میں نئے ڈیزائن کے سلسلے میں جو آرڈر حاصل کیے تھے اس میں قیمت کے اضافے کی بات بھی کی تھی جو تاجروں نے تھوڑی رو بد بدل کے بعد منظور کر لی تھی۔ سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو ان قیمتوں کے حساب سے بل بنانے کو کہا تھا تو لیاقت حسین کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

”آج میں جو کچھ بھی ہوں آپ کی بدولت ہوں صاحب۔“ لیاقت حسین نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”آپ نے ملازمت اور سر چھپانے کا ٹھکانہ نہ دیا ہوتا تو اس وقت نہ جانے کہاں ہوتا۔۔۔۔۔“
”تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تمہاری قربانیاں بھی ہمارے گھر کے لیے بہت کام آئی ہیں۔“
”میں نے جو کیا وہ میرا فرض تھا صاحب۔“

”فرض کی ادائیگی ہی سب سے بڑی صفت ہے لیاقت حسین قدرت ہر شخص کو زندگی میں ایک موقع ضرور دیتی ہے۔ جو دیکھ بھال کر قدم اٹھاتا ہے وہی کامیاب بھی رہتا ہے۔ تم نے جو مقام حاصل کیا ہے اس میں بھی تمہاری صلاحیتوں کو زیادہ دخل ہے۔“
کچھ دیر تک کاروباری باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران سیٹھ عثمان کو کاروباری فون بھی آتے

رہے۔ لیاقت حسین فارغ ہو کر جانے کے لیے اٹھا تو سیٹھ عثمان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”راہیلہ کا خیال ہے کہ اب بچکے کی انیکسی میں ماربل کے کاروبار کو منتقل کر دیا جائے۔“
”اچھا مشورہ ہے صاحب۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے خوشی کا اظہار کیا۔
”وہ تو ہے لیکن پھر تم اور فرحین کہاں رہو گے۔“ سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کی سادگی سے متاثر ہو کر کہا پھر بولے۔ ”فی الحال اس پروگرام پر فوری عمل نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ راہیلہ ہی کے مشورے پر میں اس بچکے کے اوپر دو کمرے اور ڈرائیونگ ڈائننگ کا نقشہ دیکر ضرورتوں کے ساتھ منظور کرا لیا ہے دس پندرہ روز میں کنسٹرکشن کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔ تعمیر مکمل ہونے کے بعد تم اور فرحین اوپر شفٹ ہو جاؤ گے تو پھر انیکسی میں ماربل کے علیحدہ آفس کا کام بھی آہستہ آہستہ ہوتا رہے گا۔“
”یہ بیگم صاحبہ اور آپ کی مہربانی ہے صاحب ورنہ ہمارے لیے وہ انیکسی بھی بہت ہے۔“
”تم جانتے ہو کہ میں راہیلہ کی کسی فرمائش سے انکار نہیں کرتا۔۔۔۔۔ اس لیے تمہیں جو بھی کہنا ہو اسی سے کہنا۔“

سیٹھ عثمان نے مسکرا کر بات ختم کی پھر لیاقت حسین اجازت لے کر جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کا یلکھت لڑکھڑا گیا۔ صرف وہی نہیں کمرے کے دروہام اور فرنیچر بھی ہل کر رہ گئے تھے۔۔۔۔۔ باہر ہونے والا دھماکا کچھ اتنا شدید تھا کہ ایک لمبے کوسب ہی ششدر رہ گئے۔

لیاقت حسین کے ساتھ ہی سیٹھ عثمان بھی آفس سے باہر آ گئے۔ گیٹ کا چوکیدار اسے چارنٹ دور زمین پر پڑا نظر آیا گیٹ کے دونوں پلر بھی منہدم ہو چکے تھے اس حصے میں اب بھی دھول اڑتی نظر آ رہی تھی۔

”خدا خیر کرے۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے چوکیدار کے خون آلود جسم کو دیکھ کر آگے جانے کی کوشش کی تو سیٹھ عثمان نے اسے ٹوکا۔

”رک جاؤ لیاقت حسین۔۔۔۔۔ ادھر خطرہ ہے۔“

”جو خطرے کی زد میں آچکا ہے اسے بچانا بھی ہمارے لیے ضروری ہے صاحب۔“
”لیاقت حسین جواب دیتا ہوا تیزی سے چوکیدار کے قریب پہنچا لیکن اسی وقت قریب ہی دوسرا دھماکا ہوا۔ گرد و غبار کے ساتھ ہی سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو بھی دو تین فٹ بلند ہوتے دیکھا تو ان کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔“

”یا اللہ مدد۔۔۔۔۔“ سیٹھ عثمان نے دل سے لیاقت حسین کے لیے دعا کی۔۔۔۔۔ پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا خود ان کی حالت بھی غیر ہونے لگی تھی۔



فاصلے پر تھے۔“ سادہ لباس والے نے نوجوان کو حقارت سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”ڈی ایس بی صاحب کا حکم آڑے نہ آجاتا تو ہم اسے گولی مارنے سے دریغ نہ کرتے لیکن اب یہ سب کھایا پیا اگل دے گا۔ میں نے صاحب کو بھی اس کی اطلاع کر دی ہے۔“

”اویے حرام کے ختم.....“ دوسرے سادہ لباس والے نے پشت سے نوجوان کی گدی پر بھر پور مکار کر کرخت لہجے میں سوال کیا۔ ”زندگی چاہتا ہے تو سیدھی طرح اگل دے کہ تو کس کا آدمی ہے ورنہ کتوں کی موت مارا جائے گا۔“

”م..... میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا۔“ نوجوان نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”میں ادھر آ رہا تھا جب اس نے پچھلے موڑ پر مجھے روک کر ایک آنفری تھی۔ دو ہزار پینٹی رقم کے عوض مجھے یہ حکم بھی دیا تھا کہ میں ٹینس کے وہ وزنی کو لے اس پینٹلے کے اندر پھینک کر نکل جاؤں۔“

”اور تو نے اس کو اپنا باپ سمجھ کر ہائی بھر لی تھی۔“ سادہ لباس والے کا ہاتھ دوبارہ گھوم گیا۔ نوجوان لڑکھڑایا پھر اس نے سادہ لباس والے کو حقارت سے گھورتے ہوئے کہا۔

”جو جیج تھا وہ میں نے بتا دیا۔ اگر مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے تو تم بے شک مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔“

”ہم تھانے اور پکھری کا روگ نہیں پالتے شہزادے۔“ دوسرے سادہ لباس والے نے اس کی گردن دیوچ کر اٹھائے ہاتھ کا بھر پور تھپڑ رسید کیا۔ ”کورٹ پکھری میں کیا ہوتا ہے یہ ہم بھی جانتے ہیں اس لیے موقع واردات پر ہم خود ہی کیس بھی نمٹا دیتے ہیں۔“

”تمہاری مرضی۔“ نوجوان نے بے پروائی سے کہا۔ ”جو بیان میں نے ایک بار دے دیا اس میں تبدیلی نہیں کروں گا۔“

دس منٹ تک سادہ لباس والے نوجوان کی زبان کھلوانے کی کوشش کرتے رہے پھر سراج کے آجانے کے بعد وہ سلیوٹ کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے یہ بھی کہہ گئے کہ نوجوان شرافت سے زبان نہیں کھول رہا۔

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ ٹینس کے دونوں بال میں نے ہی ایک معقول رقم ملنے کے بعد یکے بعد دیگرے اندر پھینکے تھے میں ایسا کرنے پر مجبور تھا ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“ سراج نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”میری ایک مجبوری ان کے ہاتھ میں ہے جس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

”مجبوری کیا ہے؟“

”وہ..... وہ..... بات میں زبان تک نہیں لاؤں گا۔“ نوجوان نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

”دس منٹ کا موقع مجھے بھی دیں صاحب۔“ لیاقت حسین نے سرسراہٹے لہجے میں درخواست کی۔ اس کی زبان کھلوانے کی ذمہ داری پھر میری ہوگی۔

چوکیدار زمین پر پڑا آنکھیں پھاڑے خلا میں شاید اس افتاد کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو بلائے ناگہانی بن کر اچانک نازل ہوئی تھی۔ لیاقت حسین اس کی مدد کی خاطر دوڑا تھا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ چوکیدار کو سنبھالتا کچھ فاصلے پر دوسرا دھماکا ہوا جس کے باعث لیاقت حسین بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ خود بھی زمین سے دو تین فٹ اچھلا تھا جب ماں کی محبت بھری آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”اللہ خیر۔“ پھر کسی نا دیدہ قوت نے جیسے اسے سنبھالا دے کر زمین پر کھڑا کر دیا تھا۔ ایک پل میں جیسے کوئی آفت آتے آتے رہ گئی تھی۔ چوکیدار کے چہرے کی رنگت اور زرد ہو گئی۔ اس نے کراہتے ہوئے مردہ سی آواز میں لیاقت حسین سے پوچھا۔

”یہ..... یہ..... سب کیا تھا؟“

”کسی بزدل نے نامردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔“ لیاقت حسین نے اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ”مرد ہوتا تو سامنے آکر مقابلہ کرتا۔“

سیٹھ عثمان کے علاوہ دفتر کے عملے کے اور افراد بھی لیاقت حسین کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔ انکیسی سے فرمین کی آنکھیں بھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

”آندر آجاؤ لیاقت حسین۔“ سیٹھ عثمان نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”میں سراج کو فون کرتا ہوں۔“

”خطرہ ٹل گیا ہے صاحب لیکن باہر تو سادہ لباس والے بھی ڈیوٹی دے رہے تھے پھر.....“ لیاقت حسین جملہ پورا نہ کر سکا۔ ایک جیب کے آنے سے سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس میں سے دو نوجوان اترے جن کو لیاقت حسین کی اطلاع کے مطابق سراج اور اورنگ زیب نے دور دور رہ کر نگرانی کا فرض سونپا تھا۔ وہ تباہ نہیں تھے ایک بائیس تیس سال کا جوان بھی ان کے ساتھ تھا جو بار بار اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

سادہ لباس والوں نے جیب کے ڈرائیور کو کچھ ضروری ہدایات دیں پھر وہ نوجوان کو لے کر اندر آ گئے۔

”کون ہے یہ؟“ سیٹھ عثمان نے سادہ لباس والوں کو مخاطب کیا۔

”ٹینس کے بال نما دو بار دو گولے اس حرام زادے نے پھینکے تھے۔ ہم اس وقت تھوڑے

”فکرمت کرو لیاقت حسین۔“ سراج نے کہا۔ ”پولیس مجرموں کی رگ رگ سے واقف ہوتی ہے ایسے جدید طریقے بھی قابل عمل ہو گئے ہیں جس کے بعد مردہ بھی بولنا شروع کر دیتا ہے۔“

”یہ آپ کا ذاتی خیال ہے جناب ورنہ میں نے جو بیان دیا ہے وہی سچ ہے۔“

”ایک آخری موقع اور دے رہا ہوں پھر سوچ لو..... پولیس کے ٹارچر سیل میں جانے کے بعد ہو سکتا ہے کہ تمہیں اور بھی بہت سارے جرائم کا اقبال جرم کرنا پڑے۔“

”ایسی صورت میں ایک خواہش کا اظہار ہی باقی رہ جاتا ہے۔“

”بکو۔“

”آپ جو بیان کہیں وہ میں تحریر کر کے اس پر دستخط کر دوں گا۔“ نوجوان نے بے زاری کا اظہار کیا۔

”یہ شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا صاحب“ لیاقت حسین نے نوجوان کو گھورتے ہوئے سراج سے کہا۔ ”لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔“

سراج نے نوجوان کو بغور دیکھا۔ اس کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ نوجوان عادی مجرم نہیں ہے۔ کوئی مجبوری ضرور تھی جو وہ کسی اپنے گروہ کے ہاتھوں چڑھ گیا تھا جو اسے استعمال کر رہا تھا لیکن وہ کون لوگ تھے؟ ان کا سرغہ کون تھا؟ اور خاص طور پر سیٹھ عثمان ہی کو دہشت زدہ کرنے کی کیا وجہ تھی؟ نوجوان نے جو آخری جملہ کہا تھا وہ بھی اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ کسی مجبوری کے تحت ہی موجودہ صورت میں ملوث ہوا ہے۔

ایک لمحے تک سراج کی نظریں نوجوان کے چہرے پر منڈلاتی رہیں پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

”مجرموں کے علاوہ سارے پولیس والے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس لیے میں تم سے آخری بار پوچھ رہا ہوں کہ سچ کیا ہے؟ بات یہاں سے نکل کر تھانے پہنچی گئی تو پھر اس کا نتیجہ تمہاری توقع کے خلاف ہی ہوگا۔“

”اس بات کی ضمانت میں بھی لیتا ہوں کہ حقیقت بیان کر دینے کے بعد تمہارے ساتھ عادی مجرموں جیسا برتاؤ نہیں ہوگا۔“ سیٹھ عثمان نے نوجوان سے سنبھلی ہوئی زبان میں بات کی تو ایک لمحے تک وہ خاموش رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے برف پگھل رہی ہے پھر اس نے دہی زبان میں کہا۔

”میرا اس دنیا میں ایک بہن کے علاوہ اور کوئی ہے۔ پچھلے دنوں اس کی شادی کے سلسلے کی بات ہو رہی تھی لیکن اب..... نوجوان نے بڑی دل گرفتہ آواز میں بات مکمل کی۔“ اب وہ ان ہی کے قبضے میں ہے جن کے حکم پر میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

”تم کسی نہ کسی کو تو ضرور جانتے ہو گے؟ مجھے اسی کا نام بتا دو پھر شاید میں تمہارے کام بھی آسکوں۔“ سراج نے سنجیدگی سے کہا لیکن جو جواز نوجوان نے پیش کیا تھا وہ اس کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔

”مم..... میں..... اس کا نام زبان تک نہیں لاؤں گا۔“ نوجوان نے سہے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”ان کو ایک رتی برابر بھی شک ہو گیا تو میری بہن کو بے آبرو کر کے اوپر پہنچانے میں بھی دیر نہیں کریں گے۔“

”تمہارا نام کیا ہے، کہاں رہتے ہو؟ یہی بتا دو تا کہ تمہارے بیان کی تصدیق ہو سکے؟ سیٹھ عثمان نے کہا تو نوجوان کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں سراج کو مخاطب کیا۔“

”میں اپنے جرم کا اقرار کر رہا ہوں صاحب۔ آپ نے مجھے اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہنی۔“

سراج کو اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ نوجوان کا بار بار قلابازی کھانا اب اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ وہ دیدہ و دانستہ خود کو مظلوم اور مصوم ظاہر کرنے کی خاطر کینٹلی بدل رہا تھا۔ ایک لمحے بعد سراج کے اس خیال کی تصدیق بھی اور تک زیب کو آنے والی کال نے کر دی۔

”جوں جو ان کا ہاتھ لگا ہے اس پر وقت نہ ضائع کرو۔ اسکی جزیں زمین کے اندر ہی اندر کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں تم اس کا اندازہ تک نہیں کر سکتے۔“

”اس کے ڈسپوزل کا طریقہ بھی بتا دیں؟ سراج نے مبہم انداز میں پوچھا۔“

”جو سادہ لباس والے تعینات ہیں ان کے حوالے کر کے واپس آ جاؤ میں نے ان کو ضروری ہدایت دے دی ہے۔“

دوسری جانب سے اتنی عجلت میں سلسلہ منقطع کیا گیا کہ سراج بھی الجھ گیا۔ اس نے وہی کیا جو اور تک زیب نے کہا تھا۔ ذاتی طور پر اس نے حفظ ماقدم کے طور پر سادہ لباس والوں کو یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ اس کا نام درمیان میں نہ لیا جائے۔



پرانے ماڈل کی وہ موٹریں ایک سابقہ وزیر کے بنگلے کے عقبی حصے کی طرف جا کر رکی تھیں۔ اس پر سوار دونوں افراد نیچے اترے، کچھ دیر تک وہ بونٹ اٹھا کر انجن پر جھکے رہے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی خرابی تلاش کر رہے ہوں۔ ان کے درمیان سرگوشی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

”کیا یہ جگہ مناسب رہے گی؟“ پتہ قد والے نے اپنے ساتھی سے سوال کیا۔

”پورا علاقہ سنسان پڑا ہے۔“ دوسرے نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ہمارا مطلوبہ بنگلہ بھی یہاں سے قریب ہی ہے۔ اس طرح گاڑی لے جانا بھی مناسب نہیں ہوگا۔“

”تم جانو۔“ پہلے نے شانے اچکائے۔ ”میرے لیے رات اور دن دونوں برابر ہیں۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر موت سے کھینا میرا پیشہ بھی ہے۔“

”جانتا ہوں دوست لیکن دنیا کے کسی بھی پیشے میں احتیاط اور آنکھیں کھلی رکھنا بھی شرط ہے۔“ دوسرے نے سکرا کر جواب دیا پھر وہ گاڑی کا بونٹ کھلا ہی چھوڑ کر پیدل چل پڑے تھے۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اس وقت ہاتھ آ جائے گا؟“ کچھ توقف کے بعد پتہ قد والے نے

سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا پھر تیزی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ دنیا کے ہر پیشے میں نفع اور نقصان کے چانسز فتنی فتنی ہوتے ہیں لیکن شیر اور ہرن کے شکار میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے شیر زخمی ہو کر نکل جائے تو آدم خور بن جاتا ہے۔ ہرن میں شیر جیسی حس نہیں ہوتی اس لیے دوبارہ بھی جال میں پھنس جاتا ہے۔“

”میرے آدمی بھی سب نمک حلال ہیں۔“ دوسرے نے قدم بڑھاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھ کر جواب دیا۔ ”ان کی اطلاع یہی تھی کہ چالیس منٹ پہلے وہ ہمارے مطلوبہ پتے کے لیے موجود تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔“

ان تینوں کے علاوہ پتے کے لیے اور ہاشمی بھی ضرور ہوں گے؟

”ہو سکتا ہے لیکن ہمیں پتے کے آؤٹ ہاؤس میں جانا ہے جو عام طور سے خالی ہوتا ہے۔“
”کیا مطلب؟“ پستہ قد آدمی چونکا۔ ”کیا پتے کے رہائشی بھی آؤٹ ہاؤس میں غیر متعلقہ آدمیوں کی آمدورفت سے بے خبر ہوں گے۔“

”نہیں، سب سے زیادہ باخبر وہی ہیں۔“ دوسرے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ہمارا مطلوبہ پتہ ایک مقامی صنعت کار نے کرائے پر لے رکھا ہے جہاں صرف اس کی دوسری بیوی رہتی ہے گھریلو ملازم نوپچے کے بعد اپنے کوارٹروں سے باہر نہیں نکلتے۔“

”آئی سی۔“ پستہ قد والے نے سیٹی بجاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”وہاں شاید ہٹ اینڈ رن کا ڈرنی ٹیم کھیلا جاتا ہوگا۔“

دونوں محتاط انداز میں قدم اٹھاتے رہے کچھ دیر بعد وہ ایک سنگل اسٹوری پتے کی پشت پر پہنچ کر رک گئے۔ اس وقت رات کے گیارہ کا عمل تھا جبکہ اس پوش علاقے کے کئین نوپچے کے بعد اپنی اپنی خواب گاہوں کے دروازے بند کر لیتے تھے۔ صرف چوکیدار گیٹ پر پہرہ دینے نظر آتے تھے۔
مطلوبہ پتے کی عقبی سڑک بھی ویران تھی۔ سنائے میں کبھی کبھی چوکیدار کی سیٹی کی آواز ضرور سنائی دے رہی تھی۔

دونوں افراد نے بڑے محتاط انداز میں سچویشن کا جائزہ لیا پھر یکے بعد دیگرے عقی دیوار کی آٹھ فٹ بلندی کو ایک دوسرے کی مدد سے پھلانگ کر دوسری طرف اندر کود گئے۔ آؤٹ ہاؤس کے ایک کمرے کی کھڑکی کے شیشے روشن تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔ پستہ قد آدمی نے اپنا آٹو بیگ پستول جب سے نکال لیا۔

دوسرے نے بھی اس کی پیروی کی۔ دونوں ہی میک اپ میں تھے اور انہوں نے اس قدر مہارت سے ظاہری شکل میں ایسی ردو بدل کی تھی کہ کوئی پرانا واقف کار بھی انہیں جگایا لوچن کی حیثیت سے شناخت نہ کر پاتا۔

چند لمحوں کے بعد دیوار کے ساتھ بیٹھے قریب و جوار کی سن گن لیتے رہے پھر محتاط انداز میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کھڑکی تک پہنچ گئے۔ جگانے ایک پٹ پر دباؤ ڈالا لیکن کھڑکی اندر سے بند

تھی۔ لوچن دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ جگانے بھی اس کی پیروی کی اس بار لوچن نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا زور لگایا۔ دروازہ بند نہیں تھا اس لیے تھوڑا سا خلا پیدا ہو گیا۔

سامنے بیڈ پر ایک حسین اور جوان عورت موجود تھی جس کی عمر اٹھائیس اور تیس سال کے درمیان تھی اس کے جسمانی نشیب و فراز میں قیامت سی کشش موجود تھی۔ لباس کی جگہ اس نے نائی مہین رکھی تھی جو ستر پوشی کے لیے بھی ناکافی تھی۔ جنس مخالف کے لیے اس کے اندر تمام رعنائیاں موجود تھیں لیکن اس وقت اس کی خوب صورت غلافی آنکھوں میں شدید نفرت اور الجھن کے تاثرات نمایاں تھے بیڈ پر رکھے ہوئے گلاس بوتل کے ساتھ نظر آرہے تھے دو گلاسوں میں شراب کی کچھ مقدار باقی تھی لیکن کرسیاں خالی تھیں۔

لوچن اور جگانے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر دونوں بیک وقت اپنا اپنا آٹو بیگ پستول اٹھائے برق رفتاری سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ پل بھر میں دونوں کو اندازہ ہو گیا کہ کمرے میں عورت کے سوا کوئی نہیں ہے۔ عورت نے ان دونوں کو حقارت سے دیکھ کر گلاس میں پینگی ہوئی شراب بھی حلق کے اندر انڈیل لی پھر نفرت سے بولی۔ ”تم نے ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال کر اچھا نہیں کیا۔“

”رنگ تو نظر آرہا ہے ہنی لیکن بھنگ..... لوچن نے اسے خشک اور سرد لہجے میں مخاطب کیا۔ ”وہ کہاں گیا؟“

”تمہیں جس کی تلاش ہے وہ بھی آنکھیں کھلی رکھنے کا عادی ہے۔ اس کے ساتھی بھی دشمنوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔“

”تم کس کی بات کر رہی ہو؟“ جگانے سوال کیا۔

”میرا اور اپنا وقت مت ضائع کرو۔“ عورت نے بہ دستور جھلا کر کہا۔ ”چاہو تو دوسرے کمرے میں جھانک لو پھر جتنی خاموشی سے آئے ہو اتنی ہی خاموشی سے اٹنے قدموں واپس چلے جاؤ۔“

”اور اگر ہم اس کو خبر کر دیں کہ جس نے تمہاری صورت میں ناگن پال رکھی ہے۔“ لوچن نے دھتکی رگ کو چھیڑنے کی کوشش کی تو عورت نے لات مار میز کو مع لوازمات کے فرش پر الٹ دیا۔ کسی زخمی ناگن کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم جس کو خبر کرنے کی بات کر رہے ہو وہ بھی بے خبر نہیں ہے لیکن وہ زبان کھولنے کی جرأت کبھی نہیں کرے گا۔ موت سے وہ بھی گھبراتا ہے۔“

”پیاس شدت اختیار کر جائے تو مرد بھی تڑپ اٹھتا ہے۔“ لوچن نے مسکرا کر کہا۔ ”تم تو پھر عورت ہو لیکن ہمارا وہ ٹائپ نہیں ہے اگر ہوتا تو بھی ہم باسی مال پر ہاتھ نہ ڈالتے۔“

”بات بڑھانے کی کوشش مت کرو۔“ عورت نے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔ اگر مرد ہو تو اس کے تعاقب میں جاؤ جس کی تلاش میں تم یہاں نازل ہوئے تھے۔

”وہ اصل مرد ہے جو چوروں کی طرح چھپ کر کسی کو نہیں مارتا۔ ہمیشہ لٹاکر موت کے گھاٹ

اتارتا ہے۔“
”تم جس مرد کے کھونٹے پر لال پھلی ہو رہی ہو اس کا نام لینے سے کیوں کتر رہی ہو؟“ جگانے بہ دستور بدلی ہوئی آواز میں عورت کے غصے کو ہوا دی تو وہ حلق کے بل چیخ کر بولی۔

”میں ناگی کی بات کر رہی ہوں..... وہ ناگی جس نے پولیس کے کچھ افسروں کو بھی خرید رکھا ہے جو پالتو کتوں کی طرح اس کے اشاروں پر دم ہلاتے رہتے ہیں۔ اسی نے اس عزت دار صنعت کار کو بھی مجھ سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا جس نے دھوکے سے مجھے بے آبرو کیا تھا اور اب وہی باعزت صنعت کار یہ بھی جانتا ہے کہ میں ناگی کے اشارے پر کسی کو بھی گلے لگا سکتی ہوں اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟“

”ناگی کی صحبت نے تمہیں قبل از وقت بہت سمجھدار بنا دیا ہے۔“ لوچن نے چپختے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”جب ناگی یہاں سے فرار ہوا تو اس نے تمہیں ہمارے نام بھی ضرور بتا دیے ہوں گے۔“ ”نہیں۔“ عورت بہ دستور جذباتی انداز میں بولی۔

”اس کے کسی تجربے نے یہی اطلاع دی تھی کہ دو نئے ہمیں بدل کر ادھر آ رہے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد ناگی نے میری رہائش گاہ پر خون خرابا پسند نہیں کیا بلکہ خون کے گھونٹ پی کر چلا گیا۔“ ”گڈ۔“ جگانے مسکرا کر کہا۔ پھر تو تم اس مچھلی کو پکڑنے کی خاطر بطور چارابھی ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی ہو۔ کیا خیال ہے؟

”تمہارے اس ارادے کی اطلاع بھی ناگی تک پہنچ گئی ہوگی۔“ عورت نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔“

لوچن کے چہرے پر اس آدم خور چیتے کی چمک ابھری جو اپنے شکار کو دیکھ کر ابھرتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے لپک کر عورت کو لائے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ کر اس کے منہ پر ہاتھ کی گرفت بھی مضبوطی سے جمادی۔ گردن بھی ہاتھوں کے حصار میں تھی اسی لیے عورت پنجرے میں پھنسنے پنچھی کی طرح پھڑپھڑانے لگی۔

”تم نے کچی گولیاں کھیلی ہوتیں تو ہمیں کسی خطرے سے آگاہ کرنے کی قطعی غلطی کبھی نہ کرتیں۔“

پھر اس سے پیشتر کہ جگانے کوئی سوال کرتا لوچن نے عورت کی داہنی کپٹی پر کسی خاص نس پراگٹوٹھے کو ایسے ماہرانہ انداز میں دبایا کہ عورت بے ہوش ہو کر جمول گئی۔ اسے فرش پر ڈالنے کے بعد لوچن نے جگانے کا ہاتھ تمام کمر سرسراتے لہجے میں کہا۔

”نکل چلو دوست ورنہ ہم پنجرے میں پھنس کر شکار بھی ہو سکتے ہیں۔“
”تمہیں اچانک اس کا اندازہ کیسے ہوا؟“ جگانے اس کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔
”ڈرنی وومن کے آخری جیلے پر غور کرو۔“ لوچن قدم مارتا ہٹکے کی عقبی دیوار تک پہنچ گیا۔ ”ہم جس کا شکار کرنے آئے تھے وہ بھی یہیں کہیں چھپا ہے اس باسٹرڈ نے ہماری باتیں بھی ضرور سنی۔“

لوچن جملہ مکمل نہ کر سکا کیے بعد دیگر تین فائر ہوئے تھے گولیاں لوچن اور جگانے کے قریب ہی چار دیواری پر لگی تھیں۔ دونوں بڑی سرعت سے زمین پر بیٹھ گئے لوچن نے آنے والی گولیوں کی سمت کا اندازہ کر کے دو فائر کیے پھر دونوں ہی نے اپنی پوزیشن بدل دی۔ ایک لمحے کی تاخیر کی موت کا سبب بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

”گولیاں چلانے والے چھت پر موجود ہیں۔“ لوچن کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ ”شاید ان باسٹرڈ کے پاس نارنج نہیں ہے ورنہ وہ اندھیرے میں گولیاں ضائع کرنے کی حماقت نہ کرتے۔ فائرنگ کی آواز ہٹکے کے چوکیداروں نے بھی ضرور سنی ہوگی۔ وہ بھی کسی وقت آ سکتے ہیں۔“ ”لوچن کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اندھیرے کے باوجود اس نے ایک چوکیدار کو اس کی یونیفارم کی وجہ سے پہچان لیا تھا۔ اس کی گرجتی ہوئی آواز ابھری۔“

”تھنیا چھینک کر سامنے آ جاؤ ورنہ ہم تمہیں بھون کر رکھ دیں گے۔“ ”بلف کر رہا ہے بارنگ ڈوگ۔“ لوچن نے سرگوشی کی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے ہم رسک لے کر دیوار بھلانگ کر نکل چلیں یا پھر بازی پلٹنے کی کوشش کریں۔ ایڑیووش۔“

”جگانے کی نظریں اس آواز کی سمت تھیں جہاں سے تھنیا چھینکنے کی وارنگ دی گئی تھی۔ لوچن کی بات کا جواب دینے سے قبل ایک نارنج بھی روشن ہوئی وہ جو بھی تھا سامنے دیوار کے کونے میں پوزیشن لیے ہوئے تھا۔ جگانے اندازے سے روشن نارنج لیے ہوئے فحش پر فائر کیا۔ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ روشن نارنج زمین پر گر کر نشیب کی طرف لڑھک گئی ساتھ ہی کسی کے کراہنے کی تیز آواز بھی ابھری۔ جگانے کے ساتھ ہی لوچن نے بھی پوزیشن تبدیل کرنے میں دیر نہیں کی۔“

”لوپر فائن۔“ لوچن نے مدھم لہجے میں کہا۔ ”اب وہ باسٹرڈ قریب آنے کا رھک نہیں لیں گے۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں مخالف سمت سے گزر کر عمارت کے سامنے کی طرف پہنچانا چاہیے ناگی یہاں مقابلہ کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔“

”وش آل دی بیسٹ۔“ لوچن نے جواب دیا پھر وہ دونوں ہی لپک کر عمارت کی دیوار تک گئے اور آہستہ آہستہ محتاط انداز میں قدم اٹھانے لگے۔

دس پندرہ منٹ تک کسی کی آواز نہیں سنائی دی پھر زخمی ہونے والا چوکیدار شاید دوبارہ اٹھ گیا تھا اس کی مانوس آواز پھر ابھری۔

”تم جہاں بھی ہو نکل کر سامنے آ جاؤ ہم نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ مرنے سے بہتر ہے گرفتاری دے دو۔“

جگانے لوچن کسی نے جواب نہیں دیا۔ جگانے کے بل چل رہا تھا۔ اس نے اپنی حرکت تیز کر دی لیکن دس بارہ قدم بڑھنے کے بعد اسے رکنا پڑا۔ کوئی انسانی وجود زمین سے چپکا ہوا چار دیواری کی سمت تیزی سے رینگ رہا تھا۔ جگانے پستول والا ہاتھ فضا میں بلند کیا پھر رینگنے والے کی ٹانگ کا

نشانہ لے کر ٹرگر دبا دیا۔ ایک چیخ کی آواز کے ساتھ ریٹکتا ہوا وجود رک گیا پھر چیخ کر بولا۔ ”گولی مت چلانا تمہارا اصلی شکار نکل چکا ہے۔“
جگا نے تیزی سے پوزیشن تبدیل کی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دو منٹ بعد لوچن بھی اس کے قریب آگیا۔

”میرا خیال ہے کہ چوکیدار اور تمہاری گولی سے زخمی ہونے والے کے علاوہ اب اور کوئی عمارت میں موجود نہیں ہے ہمیں اب اس چوہے دان سے فوری نکلنا چاہیے۔“
”زخمی کا کیا کریں۔“

”کوئک ڈسپوزل۔“ لوچن نے نشانہ لے کر زخمی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کے بعد جگا کا ہاتھ تھام لیا پھر وہ عقی دوار پھلانگ کر کچھ ہی دور گئے تھے کہ پولیس موبائل کے مخصوص سائرن کی آواز بھی سنائے میں گونجنے لگی۔



افضل خان نے شبیم کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا وہ اس بات کو نوٹ کر رہا تھا کہ سات روز کی وارننگ ملنے کے بعد سے شبیم کچھ فکر مند رہنے لگی تھی۔ اس وقت شام کے ناشتے کے وقت بھی چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد بالکوئی سے باہر کی سمت کچھ دیکھ رہی تھی جب افضل خان نے اسے سنجیدگی سے مخاطب کیا۔
”کیا سوچ رہی ہو۔“

”میں تمہارے بارے میں فکر مند ہوں۔“
”خود کو بلا وجہ ہلکان مت کرو۔ تم میرے ماضی سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔“ افضل خان نے کہا۔ ”میں نے اس وقت بھی کبھی غم پالنے کی غلطی نہیں کی تھی۔“
”جانتی ہوں لیکن اس وقت ہم دونوں کو جس کا تحفظ حاصل تھا اب وہی دشمن ہے۔ وہ دشمن کی موت کو آسانی سے ہضم نہیں کرے گا۔“ شبیم نے بات جاری رکھی۔ ”تم بھی واقف ہو گے اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں ابھی تک قانون بھی اس کا کوئی سراغ پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“
”شاید اس وجہ سے کل تک جو سینیٹان کر سامنے پھرتا تھا اب وہ بھی کسی خوف کی وجہ سے چوہے کے بل میں چھپا کہیں بیٹھا ہے۔“

”اس لیے وہ محفوظ ہے لیکن ہم سامنے ہیں اور اندھیرے سے چلائی جانے والی کوئی گولی خدا نہ کرے ہم دونوں کے لیے ہی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔“
”یہ بھی اچھا ہے کہ جینے کے علاوہ ہمارا مرنا بھی ایک ساتھ ہوگا۔“ افضل خان نے شبیم کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے کہا۔

”تمہیں جو مہلت ملی ہے اس میں دو دن باقی رہ گئے ہیں۔“
”پلیز.....“ افضل خان یکھٹ سنجیدہ ہو گیا۔ ”تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ پولیس کے سادہ لباس

والوں کے علاوہ کرٹل احتشام کے کچھ خاص لوگ بھی ہماری حفاظت پر مامور ہیں۔“
افضل خان مزید کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس کے موبائل کی سکرین روشن ہو گئی۔ کرٹل احتشام کے نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کر لیا۔ سنجیدگی سے دریافت کیا۔
”کوئی نئی ہدایت؟“

”نہیں..... حالات کی روشنی میں تمہارا اور شبیم کا ایک ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔“ دوسری جانب سے سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”ایس پی اورنگ زیب کی بھی یہی رائے ہے کہ تمہیں کہیں اور شفٹ کر دیا جائے۔ اس کے بعد تم ہمارے لیے کارآمد بھی ہو سکتے ہو۔“
”سوری کرٹل۔“ افضل خان نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”میں نے شبیم کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کر لینے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔“
”مگڈ نیوز..... کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے۔“

”ابھی تک کسی قاضی کا بندوبست نہیں ہو سکا ورنہ میں ایک ہل کی دیر بھی نہیں کرتا۔“
”اور اگر میں تمہاری یہ پراہم حل کر دوں تو؟“
”اوکے، میں تمہارے لیے یہ نیک کام ضرور کروں گا لیکن اس کے بعد تمہیں ایک اہم ذمہ داری سنبھالنا ہوگی۔“
”آپ حکم دیں۔“
”وشنو کے سلسلے میں تمہاری کارکردگی شاندار رہی ہے اس لیے ہائی کمان نے تمہیں ایک اور کام کے لیے منتخب کیا ہے۔“

”میں زبان دے کر پیچھے ہٹنے کا عادی نہیں ہوں۔ آپ صرف ایک اشارہ کریں۔“
”ناگی کو جانتے ہو؟“
”کسی ناگ ہی کی طرح زہریلا اور خطرناک بھی ہے۔“ افضل خان نے کھل کر بات کی۔
”یہ بھی گوش گزار کر دوں کہ پولیس کی کچھ کالی بھیڑیں بھی اس کی پشت پناہی کرتی ہیں۔“
”ہمارے پاس بھی یہی انفارمیشن ہے لیکن ناگی کو پٹارے میں بند کرنے کے لیے تمہیں پولیس کے مقابلے میں ہماری پروفیکشن حاصل رہے گی۔ ایس پی سے بھی میری بات ہو گئی ہے۔“
”مجھے ایک شبہ اور بھی ہے۔ افضل خان نے کہا۔“ اسے سکندر علی شاہ کے علاوہ ممکن ہے شیخ حامد کی بھی حمایت حاصل ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اور بڑے لوگوں نے بھی اس کی خدمات حاصل کر رکھی ہوں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں کوشش کروں گا کہ اسے لکار کر ہی ماروں۔“

”مگڈ۔“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔
”وشنو کے بعد اب کرٹل نے شاید تمہیں ناگی کے لیے آمادہ کیا ہے؟“ شبیم نے کال ختم ہونے کے بعد افضل خان کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
”تمہارا خیال درست ہے۔“ افضل خان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جانتی ہو مجھے اس کام کا کیا

معاوضہ ملے گا؟“

”میں تمہاری پوری بات توجہ سے سن رہی تھی۔ سمجھ رہی ہوں کہ کرنل نے تم سے کیا وعدہ کیا ہے۔“

”تم میرے لیے بہت قیمتی ہو افضل۔“ شبنم نے ہونٹ چباتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ”میں نے تمہیں بڑی مشکلوں سے پایا ہے اب پا کر دوبارہ کھونا نہیں چاہتی۔“

”پا کر کھونا اور..... کھو کر پانا بھی تو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔“

”کرنل نے شاید تم سے کوئی اور اہم بات بھی کی تھی؟ غالباً وقتی طور پر مجھ سے دور رہنے کی؟“

”یہ وقتی دوریاں ہی انسانی رشتوں کو ایک دوسرے سے زیادہ مربوط کرتی ہیں۔“ افضل خان نے شبنم کے قریب ہو کر اس کو بڑی احتیاط اور محبت سے بانہوں میں سمیٹا تو شبنم بھی کسمسا کر رہ گئی۔



سکندر علی شاہ کسی زخمی دردندے کے انداز میں اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔

فارم ہاؤس میں ماروی کے ساتھ شروع ہونے والی کہانی سے لے کر دلربا کے اغوا ہو جانے تک کے تمام واقعات و کئی چنگاریوں کے مانند اس کے وجود میں چمچ رہے تھے۔ اس کا ذہن ان کی بکھری ہوئی کڑیوں کو ملانے کے سلسلے میں اور الجھتا جا رہا تھا۔

ماروی کو بے آبرو کرنے کے سلسلے میں چوکیدار کی خودکشی اور اس کے ساتھی کا بیان بھی ابھی تک اس کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ مرنے والا کھرا آدمی تھا ہمیشہ سکندر علی شاہ کے اعتماد پر پورا اترتا تھا۔ پھر اس نے کس کے خوف سے خودکشی کر لی؟ وہ کون تھا؟ فارم ہاؤس میں کس طرح داخل ہوا؟ کس طرح سب کی نظروں میں دھول جھونک کر نکل گیا؟ حالات کی کڑیاں ملاتے ہوئے اس کے ذہن میں گونگے کا خیال ابھرا تھا۔ وہ مجرد زندگی گزار رہا تھا ممکن ہے ماروی کو دیکھ کر اس کے جذبات بھڑک اٹھے ہوں لیکن اس شے کی تردید دلربا کے بیان سے ہو گئی۔ دلربا نے کہا تھا کہ ماروی کو بے آبرو کرنے والے نے بڑا جارحانہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ اپنی پیاس بجھانے کے بعد اس نے ماروی کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولنے کی جرأت کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا پھر چوکیدار کی خودکشی اور اعتراف جرم کے بعد سکندر علی شاہ نے بھی اس کہانی کو کریدنے کی کوشش نہیں کی مگر اب.....

اب حالات نے پے در پے جو رخ بدلا تھا وہ اس کے لیے قابل برداشت نہیں تھے۔ نگینہ اس کے لیے زیادہ اہم نہیں تھی۔ جس وقت ریڈو کلب سے اغوا کیے جانے کے بعد اس کا برہنہ گفت پیک ملا تھا اس وقت سکندر علی شاہ نے اس کے کٹڑے کر کے سمندر برد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اگر شکرہ بروقت آڑے نہ آ جاتا تو اب تک آدم خور مچھلیاں بھی اس کو ہضم کر چکی ہوتیں۔ اپنے انجام کا اندیشہ خود نگینہ کو بھی تھا جو موقع ملے ہی فرار ہو گئی لیکن حویلی سے نکل کر کہاں گئی؟ کسی نہ کسی نے اسے پناہ دی ہوگی

اسے..... وہ کون تھا؟

دلربا کے اغوا کی اطلاع اسے پہلے شکرہ نے دی پھر ایس بی اورنگ زیب نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ سکندر علی شاہ کو علم تھا کہ ماروی سے ملاقات کے بعد دلربا بھی ایجنسی کے لوگوں کی نظروں میں آگئی تھی اورنگ زیب کے سادہ لباس والے اس کی خفیہ نگرائی پر مامور تھے لیکن شکرہ کو اس کے اغوا کی خبر کہاں سے ملی؟ اگر اس کے کچھ شکاری کتے بھی دلربا کے تعاقب میں دم ہلا رہے تھے تو انہوں نے اس کے اغوا میں مزاحمت سے گریز کیوں کیا؟

”شیلا درما اور جونی۔“ سکندر علی شاہ کے ذہن میں یہ دونوں نام گونجنے تو اس کے اندر اہلٹا ہوالا دھچ پڑا۔ جونی اور نگینہ کے تعلقات کا شہ اسے پہلے بھی تھا۔ اب اس شے نے ایک نئے زاویے سے سرا بھارا تو اس نے جھپٹ کر فون اٹھالیا۔ اسے علم تھا کہ بیوٹی پارلر کی آڑ میں شیلا درما کیا دھندا کر رہی تھی۔ ایک بار شکرہ نے بھی کہا تھا کہ نگینہ کو جونی اور بیوٹی پارلر سے دور رکھا جائے۔ شیلا درما کے نمبر ڈائل کرتے وقت بھی سکندر علی شاہ اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

”ہیلو۔“ رابطہ قائم ہونے پر شیلا درما کی سرلی آواز ابھری۔

”سکندر علی شاہ بول رہا ہوں، جونی کہاں ہے؟“

”آپ حکم دیں جونی سے کیا کام پڑ گیا؟“ اس بار بڑی اپنایت سے دریافت کیا گیا۔

”جہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہاری سفارش پر جونی کو.....“

”میں احسان فراموش نہیں..... آپ کی غلام ہوں۔“ شیلا درما نے بات کاٹ کر اعتراف کیا۔

”آپ کی خدمت کرنا میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ جونی سے آپ کو کیا کام پڑ گیا؟“

”تم جونی پر کس حد تک اعتبار کرتی ہو؟“

”اوہ.....“ شیلا درما نے اس بار سکندر علی شاہ کے لہجے کی تلی کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”میرا خیال ہے کہ شاید آپ کو جونی سے کوئی شکایت ہو گئی ہے؟“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ سکندر علی شاہ نے جھلا کر کہا۔ ”کیا وہ کبھی نمک حرامی کا ثبوت دے سکتا ہے؟“

”اسے اپنا یا تو کتنا ہی سمجھیں شاہ جی۔“ شیلا درما نے جواب دیا۔ ”آپ کے اشارے پر وہ دم ہلانے کے علاوہ اور کسی بات کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

”تم جانتی ہو کہ جونی اور نگینہ کے درمیان کس قسم کے مراسم تھے؟“

”میں کسی قسم کی صفائی نہیں پیش کروں گی۔ صرف ایک عرض کر دوں گی کہ نگینہ نے اسے مجبور کیا تھا۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ نگینہ پہلے کیا تھی۔“

”اوقات سے بڑھنے کی کوشش دوبارہ کبھی نہ کرنا۔“ سکندر علی شاہ نے حقارت آمیز اور درشت لہجہ اختیار کیا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”میں جس کی بات کر رہا ہوں وہ اب میرے کام کی نہیں رہی۔ اسے ہر قیمت پر تلاش کر کے ڈسپوز کرنا ہے۔“

”اوہ..... میں سمجھ گئی، آپ مطمئن رہیں۔ میں ذاتی طور پر بھی آپ کے کام آنے کی کوشش

کروں گی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اس معاملے سے جونی کو الگ رکھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔“
”ٹھیک ہے مگر ایک بات ذہن نشین کرلو۔۔۔۔۔ یہ بات دوسروں کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے۔“

”سکندر علی شاہ نے دہلی زبان میں وارنگ دینے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا پھر اس کا ذہن دوبارہ حالات کی بھری ہوئی کڑیاں ملانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر شکرہ اورنگ زیب اور فارم ہاؤس کا ٹکون چکرا رہا تھا۔ گینہ اور دلربا سے زیادہ اسے اپنی عزت اور حیثیت کا احساس تھا۔“

اس نے اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا تھا وہ جس مقام تک پہنچا تھا اس میں کسی نامعلوم آدمی نے اندھیرے میں رہ کر کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اب وہ شکرہ کے نام سے خود کو تعارف کروا چکا تھا لیکن شکرہ ایک فرضی نام تھا۔ اس کی اصلیت کیا تھی؟ وہ کون تھا؟ پردے میں بیٹھ کر وہ کس مقصد سے حکم چلا رہا تھا دلربا اور گینہ میں دلچسپی لینے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ ماروی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بعد جب سکندر علی شاہ نے گوئٹے سے باز پرس کی تھی اس وقت بھی شکرہ نے گوئٹے کی حمایت کی تھی۔ یہ بھی کہا تھا کہ اصلی مجرم چوبیس گھنٹے تک کیفر کردار تک پہنچ جائے گا اس فون کال کے بعد ہی ایک چوکیدار نے خودکشی کر لی تھی مرنے سے پیشتر اس نے ماروی کو بے آبرو کرنے کا اعتراف بھی کیا تھا۔

سکندر علی شاہ کو مرنے والے پر پورا اعتماد تھا اس لیے وہ اس کی خودکشی کو ہضم نہیں کر سکا مگر اب یہ خیال اس کے ذہن میں رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ شکرہ کو اطلاع کس طرح پہنچ جاتی تھی؟ وہ حویلی کے اندر ہونے والی سرگوشیوں سے بھی واقف ہو جاتا تھا۔

اورنگ زیب کو فارم ہاؤس بلا کر بلیک میلنگ کا پروگرام بھی شکرہ کا منصوبہ تھا لیکن دلربا کے اغوا کے بعد اس نے پروگرام کو وقتی طور پر ملتوی کر دیا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا دلربا کے اغوا سے اورنگ زیب کو جال میں پھانسنے کا تعلق تھا؟ شکرہ کے بعد اورنگ زیب نے بھی دلربا کے اغوا کی تصدیق کر دی تھی سکندر علی شاہ کو کبھی اس بات کا علم تھا کہ اورنگ زیب کے سادہ لباس والے دلربا کی نگرانی پر مامور تھے پھر انہوں نے دلربا کے اغوا کو ناکام بنانے میں کیا کردار ادا کیا؟

اگر وہ خاموش تماشائی بنے رہے تو پھر نگرانی کا کیا جواز ہو سکتا تھا؟ اس زاویے سے شکرہ اور اورنگ زیب کی شخصیتوں کو بھی یا تو ایک ہی تصویر کے دورخ کہا جاسکتا تھا یا پھر ان دونوں کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا؟ مگر اس تعلق کی نوعیت کیا تھی؟

سکندر علی شاہ کے وجود میں شکوک و شبہات کا یہ سلسلہ جاری تھا جب فون پر اسے شکرہ کی کال موصول ہوئی۔ جس کے سبب اس کی پیشانی پر نفرت کی کھنٹیں بھی پھیل کر گہری ہوئی چلی گئیں۔

”اس وقت کیسے یاد کیا؟“ وہ روانی میں کہہ گیا۔
”تم۔۔۔۔۔ دوسری جانب سے شکرہ کی آواز میں تناؤ کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔“ مجھ سے گفتگو

کرتے وقت محتاط انداز اختیار کیا کرو۔ میں بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔“ جواب میں سکندر علی شاہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

”دلربا کے بارے میں تم نے کیا معلومات حاصل کیں؟“
”ابھی میں نے اس معاملے میں زبان کھولنا مناسب نہیں سمجھا۔“
”کیوں؟“

”مجھے اپنی حیثیت کا خیال بھی لاحق ہے۔“ سکندر علی شاہ نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”میڈیا کے بلیک میلر ایسی کہانیاں کواچھالنے میں دیر نہیں کرتے۔“
”میں تمہارے خیال سے متفق ہوں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ تم نے کچھ لوگوں کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔“
”آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟“

”پالتو کتوں کو کبھی دن میں ایک دو بار زنجیر پہنانی ضروری ہوتی ہے۔ ورنہ وہ بھی اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔“ شکرہ نے سرد لہجے میں بات جاری رکھی۔ ”میں ناگی کی بات کر رہا ہوں جسے تم اپنا دست راست سمجھتے ہو۔“

”اس وقت ناگی درمیان میں کیسے آگیا؟“
”سیٹھ احمد ان کا نام ضرور سنا ہوگا؟“

”یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا اصل نام احمد عدنان تھا۔ ایک آبرو باختہ ایرانی عورت ثمرہ شیرازی سے شادی کرنے کے بعد وہ احمد عدنان سے حمدان بن گیا۔“

”اب میری بات کان کھول کر سنو۔“ اس بار شکرہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”احمد عدنان یا حمدان نے ناگی کے زور دینے کے بعد ہی فاحشہ سے شادی کی تھی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا جب دو شکاری کتے ناگی کا تعاقب کرتے ہوئے اس کو بھی تک پہنچ گئے تھے جہاں تمہارا ناگی اسی عورت کے ساتھ موجود تھا۔ اتفاق ہی سمجھو کہ وہ بروقت وہاں سے بچ نکل گیا اگر مار دیا جاتا تو شاید تمہاری دلربا کا اغوا بھی نہ ہوتا۔“

”دلربا کا اس عورت سے کیا تعلق تھا؟“ سکندر علی شاہ نے چونک کر سوال کیا۔
”کچھ بھی نہیں، لیکن ناگی نے ان دونوں بد معاشوں کو ڈیپ کرنے کی خاطر اپنے کسی ہم شکل کو ایک بد معاش کے میک اپ میں دلربا کے پاس بھیجا تھا۔ تم بھی واقف ہو گے کہ ماروی سے ملاقات کے بعد ایس پی کے سادہ لباس والے دلربا کی نگرانی پر مامور تھے۔ ناگی ان کی نظر میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد ناگی کے دو تین آدمی بھی مارے جا چکے تھے اسی وقت دلربا کا اغوا بھی عمل میں آ گیا۔“

”اس کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہے؟“
”میرا شبہ ایس پی پر ہی ہے لیکن تم صرف ناگی کے گلے میں زنجیر ڈالنے کی کوشش کرو۔“
”کیا ہم دشمن کو اسی کے جال میں پھانسنے کی کوشش نہیں کر سکتے؟“ سکندر علی شاہ نے مشورہ

دیا۔ ”اگر ہم ایس پی کو فارم ہاؤس بلا کر ٹریپ کریں تو پھر وہ بھی ہمارے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”ایس پی کا پروگرام میں نے دقیق طور پر ملٹوی کر دیا ہے۔“ شکرہ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”تم ناگی کو ٹکیل ڈالنے کی فکر کرو۔ ورنہ مجھے ایس پی کے ساتھ ساتھ اسے بھی بساط سے ہٹانا پڑے گا۔ ایک بات اور..... آئندہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی اوقات کا خیال ضرور رکھنا۔“ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو سکندر علی شاہ کے اندر دبی ہوئی چنگاریاں پھر شعلوں کا روپ اختیار کرنے لگیں۔ شکرہ کے آخری جملوں نے جیسے جلتے توے پر پانی کے ایک چھینے کا ہی کام کیا تھا۔

سکندر علی شاہ نے جس مقام کو حاصل کیا تھا اس میں شکرہ کی مالی امداد کے علاوہ خود اس کی ذاتی صلاحیتوں کا بھی دخل تھا۔ حکومت کے بلند ترین حلقوں میں دور دور تک اس کی پہنچ تھی۔ ڈبا پیر ہونے کے باوجود اس کے مریدوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ مالی حیثیت سے بھی وہ اس پوزیشن میں تھا کہ کسی بھی چیز کو خرید کر اسے حقارت سے کسی چکرا کنڈی میں پھینک سکتا تھا۔ کسی مخالف کی سمت ایک اشارہ بھی کر دیتا تو اس کے مرید ہی اس کی ٹکا بوٹی کرنے کے لیے کافی ہوتے۔ سرکاری مشینری بھی حرکت میں آ جاتی لیکن وہ ہواؤں سے نہیں لو سکتا تھا۔ اندھیروں میں کسی دشمن کو تلاش کرنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا اور شکرہ..... وہ جو بھی تھا ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسی صورت میں سکندر علی شاہ کی بے بسی بھی کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ وہ اس نادیدہ دشمن کی شان میں مغلطات بکرا رہا پھر اس نے موبائل پر ناگی سے رابطہ قائم کیا۔

”خادم بول رہا ہوں شاہ جی۔“

”شرہ شیرازی کا نام بھی سنا ہے۔“

”سیٹھ حمدان کی دوسری بیوی ہے لیکن اس کا ماضی.....“

”تم اسے کس حیثیت سے جانتے ہو؟“

”شادی سے پہلے اس کے میرے ساتھ بھی کچھ مراسم رہ چکے ہیں۔“ ناگی نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”اب بھی ہیں؟“ سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ بھی جانتا ہوں کہ ابھی حال ہی میں تمہارے کچھ پرانے رقیب شرہ شیرازی کی کوٹھی تک پہنچ گئے تھے۔“

”میں انکار نہیں کروں گا شاہ جی۔ شرہ کی کوٹھی نہ ہوتی تو میں ان سے اپنا کچھ پرانا حساب بھی چمکتا کر دیتا۔“

”مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے لیکن ایک اور بات کی تصدیق بھی کرنی ہے۔“

”میں اس کے لیے بھی معذرت خواہ ہوں۔“ ناگی نے خود ہی اعتراف کر لیا۔ ”میں نے اپنے

حلیے میں کسی خاص آدمی کو دلربا کی رہائش گاہ تک بھیجا تھا مقصد ان ہی دشمنوں کو پھانسا تھا لیکن اس

کوشش میں میرے دو تین بندے بھی ضائع ہو گئے۔“

”لخت بھیجوان پر۔“ سکندر علی شاہ نے تملکا کر کہا۔ ”مجھے دلربا کے اغوا کی فکر ہے تم حماقت نہ

کرتے تو شاید ایسا نہ ہوتا۔“

”میں معافی چاہتا ہوں شاہ جی۔ یہ عرض کر دوں کہ میرے آدمی دلربا کی تلاش میں کوٹا کوٹا

چھاننے پھر رہے ہیں.....“

”کوئی سراغ ملا یا نہیں؟“

”ہو سکتا ہے کہ میری اطلاع غلط ہو لیکن میرا خیال ہے کہ اس اغوا کے پیچھے کسی نہ کسی ایجنسی کا

ہاتھ بھی ہو سکتا ہے جس نے اغوا کر کے کہیں انڈر گراؤنڈ کر دیا ہے۔“

”ناگی.....“ اس بار سکندر علی شاہ نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں یہ آخری وارننگ

دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک حکم اور سن لو مجھے دلربا ہر قیمت پر واپس چاہیے۔ ناگی کی بات

زبان پر نہ لانا ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ میرا ایک اشارہ ہی تمہارے لیے کافی ہوگا۔“ پھر سکندر علی شاہ

نے جواب کا انتظار کیے بغیر لائن کاٹ دی۔ اس کے ذہن میں ایک بار پھر شکرہ کا تصور ڈنک مارنے

لگا جو اندھیرے میں ہونے کی وجہ سے اس کی دسترس سے باہر تھا۔

❖❖❖

اورنگ زیب نے اب تک خود کو سراج کے مکان تک محدود کر رکھا تھا لیکن باہر کیا ہو رہا تھا؟

ایک ایک پل کی اطلاع اسے پہنچتی اور دوسرے سادہ لباس والوں کے ذریعے مل رہی تھی۔ اس وقت

بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھا حالات کے تیزی سے بدلتے گراف کا اندازہ لگا رہا تھا جب سراج

آگیا۔ اس کے چہرے سے الجھن مٹ کر تھی۔

”خیریت؟“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”آپ کی غیر حاضری سے ہمارے آئی جی صاحب کے پیٹ میں کچھ زیادہ مروڑ اٹھ رہے

ہیں۔ آج بھی دو بار فون آیا تھا۔“

”پریشان مت ہو۔ تم بھی واقف ہو کہ وہ کسی نادیدہ دشمن کے اشاروں پر کھیل رہا ہے۔“

”لیکن جو لوگ سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہیں کیا وہ اس بات سے واقف نہیں ہوں

گے کہ آپ کہاں ہیں؟“

”ضرور واقف ہوں گے لیکن وہ یہاں تک آنے کی غلطی نہیں کریں گے۔“

”وہ کیوں؟“ سراج نے پہلو بدل کر حیرت کا اظہار کیا۔

”مجھے خود سے زیادہ خبر اور الماس کا خیال بھی ہے اس لیے میں نے چاروں طرف اپنے سادہ

لباس والے کمانڈوز کو تعینات کر دیا ہے۔ ویسے بھی وہ ابھی براہ راست مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی

نہیں کریں گے۔“

”کیا یہ آپ کی خوش فہمی نہیں ہے؟“

آپ کو اطلاع دے دوں۔“

”ٹھیک ہے، میں اس سے مل لوں گا۔“

”لیاقت حسین بھی آپ کی طرف گیا ہے شاید اسے آپ کے اورنگ زیب صاحب نے کسی خاص کام کی وجہ سے طلب کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ سراج نے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اورنگ زیب کو نگینہ کے فون کے بارے میں بتایا پھر جب لیاقت حسین کی بات کی تو اورنگ زیب نے حیرت کا اظہار کیا۔

”میں نے لیاقت حسین کو فون نہیں کیا تھا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ میڈم روبی نے براہ راست فون کرنے سے گریز کیوں کیا۔ کیا اسے پھر کسی قسم کا خطرہ لاحق ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ یکے بعد دیگرے نگینہ اور دلربا کے اغوا نے سکندر علی شاہ کے علاوہ کچھ اور لوگوں کو بھی ضرور چونکا دیا ہوگا۔ آپ کے ریٹ ہاؤس جانے والا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا۔“

”اور لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”آپ کا آکٹوپس جو بلا واسطہ یا بالواسطہ سکندر علی شاہ کو اپنے اشاروں پر نچاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کے اشارے پر ریٹ ہاؤس والا پروگرام بھی التوا کا شکار ہو گیا ہو۔“

”کسی وقت الماس سے اپنی نظر اتروا لینا۔“ اورنگ زیب نے ستاشی انداز میں کہا پھر لیاقت حسین کے آنے کی اطلاع پا کر وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

”کیسے ہو لیاقت حسین؟“ سراج نے اسے مخاطب کرنے میں پہلی کی۔

”اللہ کا کرم ہے جو بھلا چنگا ہوں۔“

”ہمیں وقتی طور پر پھر تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں دو چار دن ہمارے ساتھ ہی رہنا پڑے۔“ اورنگ زیب نے کہا۔

”آپ خدمت کا موقع دیتے ہیں یہ بھی میری عزت افزائی ہے۔“

”تمہیں معلوم تو ہوگا اس وقت ہمیں کہاں چلنا ہے؟“ سراج نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

”مجھے صرف آنے کا حکم ملا تھا۔“ اس نے اورنگ زیب کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ ”کسی جگہ کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، میں تیار ہو کر آتا ہوں۔“ اورنگ زیب اٹھ کر اندر چلا گیا۔ دو منٹ بعد اس نے سراج کو بلا لیا پھر بڑے معنی خیز انداز میں بولا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ہو سکتا ہے لیاقت حسین کو مس جوزف کے دو منٹ ہاسٹل کا خیال آ جائے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ سراج نے وضاحت طلب انداز میں دریافت کیا۔

”تم نے بتایا تھا کہ کچھ فیملی طاقتیں لیاقت حسین کی رہنمائی کرتی ہیں۔ میرے فون کے بغیر لیاقت حسین نے میرا حوالہ دیا ہے تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے۔“ سراج نے پر خیال انداز میں جواب دیا۔ کچھ دیر بعد سراج اور اورنگ زیب

”ہو بھی سکتی ہے لیکن جو اللہ نے لکھ دیا ہے وہ کبھی ٹل نہیں سکتا۔“ اورنگ زیب نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

”جس نوجوان کو عثمان کے آفس میں لیاقت حسین کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا اس نے کیا اگلا؟“

”وہ ناگی کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ اپنی بہن کے اغوا کے بعد ناگی کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہو گیا مگر پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ عادی مجرم بھی بن گیا۔“

”کیا اس کی بہن واپس مل گئی؟“

”ہاں لیکن اب اس کے خلاف جو ثبوت ناگی کے پاس ہیں اس کے پیش نظر وہ ہر حکم ماننے پر مجبور ہے۔“

”سکندر علی شاہ نے جو پروگرام عارضی طور پر ملتوی کیا ہے اس کی بھی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے وہ دلربا اور نگینہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد الجھ گیا ہو۔ ممکن ہے کہ اس نے آکٹوپس کے اشارے پر ایسا کیا ہو۔“

”گویا آپ تسلیم کر رہے ہیں کہ سکندر علی شاہ اور آکٹوپس ایک دوسرے سے واقف ہیں۔“

”نہیں۔“ اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں اب بھی یہی کہوں گا کہ سکندر علی شاہ براہ راست اس بات سے واقف نہیں ہے کہ آکٹوپس کس چیز کا نام ہے۔“ سراج کچھ کہنا چاہتا تھا کہ راحیلہ بیگم کا فون آ گیا۔

”آپ کیسی ہیں اور عثمان؟“

”عثمان کل رات سے غائب ہیں۔“ راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ اور آپ اس کی اطلاع مجھے اس وقت دے رہی ہیں؟

”پولیس اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ عثمان مجھ سے خفا ہو کر گئے ہیں۔“

”کیا بات ہو گئی؟“ سراج نے پوچھا۔ ”وہ تو ہمیشہ آپ کے گن گاتا ہے۔“

”اصل سبب بھی آپ ہی ہیں۔“ اس بار راحیلہ نے بڑی مصومیت سے شکایت کی۔ ”آپ اتنے دنوں سے کہاں غیر حاضر ہیں؟“

”میں اپنا جرم تسلیم کرتا ہوں لیکن کچھ سرکاری کام کی مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں نکال سکا۔“

”میں نے بھی اس وقت ایک اہم بات کے لیے فون کیا ہے۔ کل رات نگینہ کا فون ہاسٹل سے آیا تھا۔ اس نے اس بات کا شبہ ظاہر کیا ہے کہ وہاں بھی اس کی زندگی کو خطرہ ہے یہ بات مجھے میڈم روبی نے بتائی ہے کسی خاص وجہ سے انہوں نے براہ راست آپ کو فون نہیں کیا۔“

”کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی؟“

”نہیں لیکن وہ خاصی پریشان لگ رہی تھیں۔ میڈم کا بھی اصرار تھا کہ میں پہلی فرصت میں

باہر آکر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ لیاقت حسین نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اورنگ زیب نے مس جوزف کے ہاسٹل کے علاقے میں واقع ایک معروف سپراسٹور پر چلنے کو کہا تو گاڑی حرکت میں آگئی۔ راستے میں ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا پھر اس وقت سراج کو بھی تعجب ہوا جب لیاقت حسین نے سپراسٹور کے سامنے سے گزرنے کے بعد گاڑی مس جوزف کے ہاسٹل کے برابر بنے ہوئے ایک میڈیکل اسٹور پر روکی اور تیزی سے نیچے اتر کر اس آدمی کے قریب چلا گیا جو میڈیکل اسٹور کے باہر اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ لیاقت حسین نے اس کے قریب پہنچ کر اچانک اسے اپنی گرفت میں لے لیا تو اورنگ زیب اور سراج بھی گاڑی سے اتر کر قریب چلے گئے۔

”خزیر کا قہم، بولو تم ادھر کس کا انتظار کر رہا ہے؟“

”تہذیب سے بات کرو تم کون ہو؟“

”ہم تمہارا باپ ہے ولد الحرام۔“ لیاقت حسین نے اس کے منہ پر زور دار تھپڑ رسید کر کے کرخت لہجے میں کہا۔

”تم بتاؤ، تم ادھر کس کا انتظار کر رہا ہے؟“

”لیاقت حسین جس انداز میں نوجوان سے دست وگریباں ہوا تھا اسے دیکھ کر کچھ راغبیر بھی رک گئے۔ میڈیکل اسٹور کے ملازموں کے علاوہ قریب ہی کھڑا ایک کانشیل بھی قریب آ گیا۔ وہ لیاقت حسین کی طرف بڑھ رہا تھا جب سراج نے اسے روک دیا۔ اپنی شناخت کروائی تو کانشیل نے سلیوٹ کرنے کے بعد کہا۔“

”میرے لیے کوئی حکم؟“

”اس بات کا خیال رکھو کہ یہاں مجمع نہ ہونے پائے۔“ اورنگ زیب نے حکمانہ لہجے میں کہا پھر وہ قدم اٹھاتا لیاقت حسین کے قریب جا کر بولا۔

”یہ کون آدمی ہے لیاقت حسین؟“

”آپ ہاسٹل کے اندر جاؤ صاحب۔“ لیاقت حسین نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ”جس کو یہاں جان بچانے کے لیے رکھا گیا اس عورت کا زندگی خطرے میں ہے اور یہ..... بدذات بھی اس عورت کا ساتھی ہے جو یہاں کام کرتی ہے۔“

”اورنگ زیب کے ذہن میں جھماکا ہوا وہ سراج کو رکسنے کا اشارہ کرتا ہوا تیزی سے مس جوزف کے ہاسٹل میں داخل ہوا۔ مس جوزف تک رسائی حاصل کرنے میں اسے بہ مشکل پانچ منٹ لگے تھے۔ اورنگ زیب نے تعارف کروایا تو مس جوزف خود اس کے ساتھ اٹھ کر فرسٹ فلور کے اس کمرے تک گئی جہاں نگینہ کو رکھا گیا تھا مگر اندر قدم رکھتے ہی وہ ٹھنک کر رک گئی۔ نگینہ اپنے بستر کے بجائے فرش پر چت پڑی تھی۔ اس کے منہ سے خارج ہونے والا جھاگ بتا رہا تھا جو سریلج التامیز زہر اسے دیا گیا تھا وہ اپنا کام کر چکا تھا کچھ دیر بعد ہاسٹل کی ریڈیڈنٹ لیڈی ڈاکٹر نے بھی اس کی

تصدیق کر دی۔ اس کے بعد اس لیڈی ورکر کو حراست میں لے لیا گیا جو فرسٹ فلور پر رہائشی لڑکیوں کے کمرے کا خیال رکھتی تھی۔ تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اس نے بھی اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ یہ بھی انکشاف کیا کہ جو شخص باہر موجود ہے اسی کے کہنے پر اس نے وہ دو انگینہ کو پلائی تھی۔ یہ بھی اقرار کیا کہ اگر وہ اس کا حکم نہ مانتی تو خود اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔“

اورنگ زیب نے مس جوزف کے آفس میں آکر ملحقہ تھانے کے انچارج کو طلب کیا۔ ساری صورت حال بتانے کے بعد یہ تاکید بھی کر دی کہ اس کا اور سراج کا نام کہیں درمیان میں نہ آنے پائے۔ تھانہ انچارج نے باہر موجود نوجوان کو بھی حراست میں لے لیا۔ مس جوزف نے بھی تھانہ انچارج سے یہی درخواست کی تھی کہ اس کے ہاسٹل کا نام درمیان میں نہ آنے پائے ورنہ اس کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔

”میں کوشش کروں گا لیکن وعدہ نہیں کر سکتا۔“

اورنگ زیب تھانہ انچارج کو علیحدگی میں کچھ مزید ہدایات دینے کے بعد باہر آیا تو سراج اس کا بے چینی سے منتظر تھا۔ لیاقت حسین ڈرائیونگ سیٹ پر بڑے سکون سے بیٹھا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے جو کچھ ہو چکا اس کے بارے میں اسے مطلق کوئی علم نہیں تھا۔ پولیس کے آجانے سے باہر مجمع بھی منتشر ہو چکا تھا۔

اورنگ زیب اور سراج کے گاڑی میں گھر جانے کے بعد بھی لیاقت حسین گم صم ہی رہا پھر اس نے حسب پروگرام سپراسٹور پر گاڑی روکی تو اورنگ زیب نے کوئی اعتراض نہیں کیا، سراج کو لے کر سپراسٹور میں چلا گیا۔

”یہ سب کچھ میرے لیے حیرت انگیز ہے۔ لیاقت حسین کا خالق نیلی چھتری والا ہے۔“ سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اور اس کی مصلحتیں اس کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا جن و ملک بھی اس کے آگے لا جا رہیں۔ میں نے اسی وجہ سے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ فارم ہاؤس جائیں تو لیاقت حسین کو ضرور ساتھ رکھیں۔“ اورنگ زیب نے اثبات میں سر ہلایا پھر اس نے موبائل نکال کر سکندر علی شاہ کے نمبر ڈائل کیے، دوسری گھنٹی پر رابطہ قائم ہو گیا تو اس نے بڑی رازداری سے کہا۔

”آپ کا دوست بول رہا ہوں۔“

”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے دوست تسلیم کر لیا۔“

”میں آپ سے نگینہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں اگر براہ راست بات ہو جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے ابھی تک کھلے دل سے مجھے اپنا دوست تسلیم نہیں کیا۔“ اورنگ زیب کے لہجے میں کاٹ تھی۔

”میں سمجھا نہیں۔“ سکندر علی شاہ نے اس بار بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیا تو اورنگ زیب نے

کھل کر کہا۔

”مجھے اس بات کا علم تھا کہ وہ گھر سے فرار ہو گئی تھی۔ بعد میں یہ بھی سراغ مل گیا کہ اس نے مس جوزف کے دوسن ہاسل میں پناہ لی ہے۔ میں اس وقت وہیں سے آ رہا ہوں۔“

”یہ بات ایسی نہیں تھی کہ میں آپ کو بتاتا۔ بدنامی کا اندیشہ ہی سمجھ لیں لیکن میں اب مس جوزف کو بھی دیکھ لوں گا جس نے اسے پناہ دی تھی۔“

”اب وقت آپ کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے شاہ جی۔“ اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”ہاسل کی ایک لیڈی درکار نے کسی کے اشارے پر اسے زہر دے کر ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے۔“

”گڈ۔ میں بھی اس بدنامی کے داغ کو دھونا چاہتا تھا لیکن ایک دوست کی حیثیت سے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس موت میں میرا ہاتھ شامل نہیں ہے۔“

”یہ بھی جانتا ہوں اسی لیے میں نے معاملہ تھانہ انچارج کے حوالے کر کے یہ تاکید کر دی ہے کہ میرا آپ کا نام کہیں درمیان میں نہ آنے پائے۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ سکندر علی شاہ کے لہجے میں اس بار اپنائیت ہی اپنائیت تھی۔

”میرا مشورہ ہے کہ ہم دونوں کو اس سلسلے میں خاموش رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا۔“ اورنگ زیب نے اپنا جملہ مکمل کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔



دور درگزر گئے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

اس وقت بھی وہ سرمستی کے عالم میں بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ نیم غنودگی کے عالم میں اس کا ہاتھ بستر پر دوڑتک رینگا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بستر کی شکنیں گواہ تھیں کہ کٹرل احتشام نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا بھی کر دیا تھا۔ دو راتوں سے شبنم اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ اب ان دونوں کی خواب گاہ ایک تھی لیکن شبنم اس وقت بستر پر موجود نہیں تھی۔ اس نے دتی گھڑی پر نظر ڈالی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔

کچن سے انڈا تلنے کی آواز سن کر وہ تیزی سے لپکتا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔ جلدی جلدی غسل کر کے نکلا تو شبنم ناشنے کی میز پر اس کی منتظر تھی۔

”آج آپ نے اٹھنے میں پھر دیر کر دی۔“ شبنم نے بڑی محبویت سے شکوہ کیا۔ ”کل آپ نے وعدہ کیا تھا کہ نوبے اٹھ جائیں گے۔“

”اس میں بھی تمہاری غلطی ہے۔“ افضل خان نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”تم نے محبت سے جگا دیا ہوتا تو.....“

”تو آپ پھر اپنی من مانی شروع کر دیتے۔“ شبنم روانی میں کہہ گئی پھر اس نے ناشتے کی طرف اشارہ کیا۔ ”چلیے اب جلدی سے ناشتا کر لیجئے پھر شاید یہ بھی ممکن ہے کہ.....“

”تم خود سے مجھ پر مہربان ہو جاؤ۔“ افضل خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”بلی کے خواب میں مجھ پھڑے۔“ شبنم نے شوخی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”کٹرل احتشام کا فون دوبارہ آچکا ہے۔“ پھر ان کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ کٹرل کا فون پھر آگیا۔

”افضل بول رہا ہوں سر۔“

”دش یو پیپی ہنی مون ٹو بٹھ آف یو۔“ کٹرل نے بڑے غلوں سے کہا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”جو لوگ ایکٹو سروس میں ہوتے ہیں ان کی زندگی خود سے زیادہ قوم کی امانت ہوتی ہے۔“

”جانتا ہوں سر لیکن دنیا داری بھی.....“

”تمہیں یہی بتانا چاہ رہا تھا یگ مین کہ قوم کی ضرورت دنیا داری سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔“ کٹرل نے بات جاری رکھی۔ ”جس دن میری آنکھ منٹ ہوئی تھی اس کے دو دن بعد ہی مجھے فرنٹ لائن پر جانے کے آرڈر بھی مل گئے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں دو دن ڈسٹرب نہیں کیا لیکن اب..... تمہیں پہلی فرصت میں ناگی کی مہم کو سر کرنا ہے۔ دشمن کو ڈھیل دینا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔“

”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے کٹرل۔ میں آپ کو واپس نہیں کروں گا صرف ایک درخواست ہے۔“

”سمجھ رہا ہوں..... شبنم۔“ کٹرل نے ذہانت کا ثبوت دیا۔ ”ڈونٹ وری یگ مین، تمہاری غیر موجودگی میں میرے آدمی زیادہ الرٹ رہیں گے۔“

”شکریہ کٹرل۔“

”ایک بات کا خیال رکھنا، ناگی کسی کو برا سے بھی زیادہ خطرناک اور زہریلا ہے۔ تمہیں ہر قدم پر محتاط رہنا ہوگا۔“

”جان پر بیٹھ کر کسی درندے کو شکار کرنا بھی میری عادت کے خلاف ہے۔“ افضل خان نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ”جیت ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے جو موت کی پروا کیے بغیر خطروں سے کھیلنے کا عادی ہو۔“

”دش یو گڈ لک۔“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ افضل خان نے موبائل آف کر کے شبنم کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”تم سے دور رہنا میرے لیے آسان نہیں ہوگا۔“

”جو لوگ دل میں رہتے ہوں، آنکھوں میں بے ہوں، کبھی ایک دوسرے سے دور نہیں رہتے۔“ جواب میں افضل خان نے شبنم کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا پھر دوبارہ ناشتا کرنے میں مصروف ہو گیا۔



”دلربا نے جس زندگی کا آغاز کیا تھا اس میں آئے دن حادثات اور چھوٹے موٹے خطرات

پیش آتے رہتے تھے۔ ان سے چھکارا حاصل کرنے کی خاطر ہی اس نے خود کو سکندر علی شاہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا پھر سکندر علی شاہ کے بعد اسے ناگی جیسے آدمی کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی مگر اب وہ جن حالات سے دوچار تھی وہ اس کے لیے بھی حیران کن تھی۔

اغوا کرنے والوں نے ابھی تک کوئی ایسی ویسی بات بھی نہیں کی تھی۔ ایک صاف سترے کمرے میں رکھا گیا تھا جہاں فوری ضرورت کی ہر آسائش میسر تھی۔ تینوں وقت اسے پابندی سے خوراک بھی مل رہی تھی۔ جو شخص پہرے پر موجود تھا وہ بھی کڑیل جوان تھا لیکن اس نے بھی دلربا کی طرف میلی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کا موبائل بھی اس کے پاس موجود تھا یہ اور بات کہ دلربا نے ابھی تک اس کو استعمال نہیں کیا تھا۔ وجہ معقول تھی، اسے اندیشہ تھا کہ شاید موبائل پر ہونے والی گفتگو کسی خفیہ ڈیوائس کے ذریعے دوسری جانب سے سن لی جائے۔ اس کے ذہن میں اس وقت بھی متعدد خیالات ابھر رہے تھے۔ اسے اغوا کرنے والے کون تھے اگر ان کا مقصد غلط نہیں تھا تو پھر اسے کیوں اٹھا لیا گیا تھا؟ وہ کیا چاہتے تھے۔ کس بات کا انتظار کر رہے تھے؟

اس وقت بھی وہ ان ہی خیالوں سے الجھ رہی تھی جب پہلی بار اس کے موبائل پر سکنل ملا، روشن اسکرین پر جو نمبر ابھرے وہ اس کے لیے نئے تھے۔ ہل بھر کے لیے اس نے کچھ سوچا پھر موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔ سپاٹ اور خشک لہجے میں سوال کیا۔ ”کون بول رہا ہے۔“

”اپنا ہمدردی سمجھو؟“

”اس ہمدردی کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔“ دلربا کی خوب صورت پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”حماقت بھی کہہ سکتی ہو۔“ جواب میں تلخ لہجہ اختیار کیا گیا۔ ”تم جس جال میں پھنسنے والی تھیں وہ شاید تمہاری جیسی خاتون کے لیے زیادہ حسب حال ہوتا۔“

”کیا مطلب؟“

”تم ابھی تک یہاں عزت سے ہو۔“ اس بار بڑے سرد لہجے میں جواب ملا۔ ”اگر ناگی تم کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید تمہارے سارے انجمن پر ڈھیلے پڑ چکے ہوتے۔ سکندر علی شاہ کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوتا کہ آستین کے سانپ نے تمہیں ڈس لیا ہے۔“

”ناگی کو تم کس طرح جانتے ہو؟“ نگینہ نے قدرے سنبھل کر پوچھا۔

”اس کا کچھ قرض مجھ پر واجب الادا ہے اسے بھی چکنا کرنا تھا۔“ بدستور تلخ اور تند انداز میں جواب ملا۔

”تمہاری جیسی افسول چیز کے گم ہو جانے کے بعد اب وہ پاگل کتوں کے مانند کونے کھدے چھانتا پھر رہا ہے۔“

”کیا سکندر علی شاہ کو اس کا علم ہے کہ ناگی.....“

”تم اس سلسلے میں براہ راست شاہ جی سے بات کر سکتی ہو۔“ اس بار دلربا کا جملہ کاٹ کر کہا

”کیا۔“ میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ آخری بار اس کے کسی آدمی نے جگنا نامی بد معاش کا روپ اختیار کر کے تم سے ملاقات کی تھی وہ غلطی بھی ناگی کو بہت بھاری پڑ رہی ہے۔“

”کیا تم جگنا کے آدمی ہو؟“ دلربا نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

”حماقت کے سوالات کرنے سے گریز کرو۔ چاہو تو اپنے شاہ جی سے فون پر بات کرلو۔ ناگی کی اصلیت کی بھنک میرے خیال میں ان کو بھی مل چکی ہوگی۔“

”تم شاہ جی کو کیسے جانتے ہو؟“

”مجھے بھی ان کا معتقد سمجھ لو لیکن میری اصلیت سے وہ بھی ناواقف ہے۔“

”کیا میں تمہارے نمبروں پر دوبارہ رابطہ قائم کر سکتی ہوں۔“

”نہیں..... یہ سم میں حسب ضرورت استعمال کرتا ہوں۔ ایک دو روز بعد میں دوبارہ کال کر لوں گا۔ ایک بات اور سن لو شاید تمہارے لیے وہ بھی کارآمد ہو.....“ بات جاری رکھی گئی۔ ”نگینہ بھی اوپر جا چکی ہے۔ اس کی موت میں بھی ناگی کا خفیہ ہاتھ شامل ہے لیکن تم اس کا حوالہ شاہ جی کو نہ دینا۔ وہ خود بھی ایک نادیہ ہمدرد و دشمن کے ہاتھوں بے بسی کا شکار ہیں۔“

”تمہاری معلومات میرے لیے حیرت انگیز ہیں۔“ دلربا نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”تمہیں ان باتوں کا کیسے علم ہوا جس کے بارے میں شاہ جی نے کبھی مجھ سے تذکرہ بھی نہیں کیا۔“

”ضروری نہیں کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔“

”مجھے کس مقصد سے یہاں رکھا گیا ہے؟“

”شاہ جی کا مرید ہونے کی وجہ سے تمہاری حیثیت بھی میرے لیے اہم تھی ورنہ مجھے تم جیسی لڑکیوں سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔“

”صرف ایک سوال اور کروں گی۔“ دلربا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر شاہ جی کہیں تو کیا تم مجھے آزاد کر دو گے؟“

”ہاں..... لیکن تم آزاد ہونے کے بعد کسی بھی ایسی بات کا حوالہ نہیں دو گی جو اس وقت میرے اور تمہارے درمیان ہوئی ہیں۔“

”کیا ناگی پر شبہ کا اظہار کر سکتی ہوں؟“

”ناگی کا تذکرہ کرنا اہم ہے اس لیے کہ اسی کی نیت تم پر خراب ہو گئی تھی۔“ دوسری طرف سے جواب دینے کے بعد رابطہ بھی ختم کر دیا گیا۔ دلربا کچھ دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر اس نے براہ راست سکندر علی شاہ کے نمبر ڈائل کیے۔

”تم.....“ پہلی گھنٹی کے بعد ہی سکندر علی شاہ کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”مجھے اس کا اندازہ نہیں ہے۔“

”اس..... کا نام بتاؤ جس نے تمہیں اغوا کیا ہے۔ میں اسے قبر سے بھی برآمد کر لوں گا۔“

”میں اس کے بارے میں صرف ایک شبہ ظاہر کر سکتی ہوں کہ وہ ناگی کا آدمی ہوگا۔“
 ”یہ..... یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو۔“
 ”اس کا کوئی کارندہ آخری بار مجھ سے جگا بد معاش کے میک اپ میں ملا تھا۔“
 ”تم..... جگا کو کس طرح جانتی ہو؟“

”جو آدمی ہمیں بدل کر ملے آیا تھا اس نے جگا کا نام بھی لیا تھا۔“ دلربا نے خوب صورتی سے بات بنائی۔ ”میرا موبائل بھی اغوا کرنے والوں نے آج ہی واپس کیا ہے۔ یہ بھی اسی نے بتایا ہے کہ ناگی کی نیت میرے اوپر خراب ہو گئی تھی۔ پہلا فون میں نے آپ کو کرنا مناسب سمجھا۔“
 ”اچھا کیا لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہاری گفتگو کہیں اور بھی سنی جا رہی ہو۔“
 ”ہو سکتا ہے کہ وہی سن رہا ہو جس نے موبائل واپس کیا ہے۔“ دلربا نے اس بار بھی دور اندیشی سے جواب دیا۔ ”اسی نے کہا تھا کہ میں موبائل پر آپ سے علاوہ کسی سے بات کرنے کی غلطی نہ کروں..... ایک بات اور بھی کہی تھی“

”وہ کیا؟“

”مجھے آزاد کیا جاسکتا ہے صرف آپ کے اشارے پر۔“
 ”میں نہیں سمجھا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے اور اسے میرے اشارے کا علم کس طرح ہوگا۔“
 ”وہ کل مجھے دوبارہ فون کرے گا۔“

”مم..... میں تمہیں ہر قیمت پر دوبارہ حاصل کرنے کو تیار ہوں۔“ دوسری طرف سے سنجیدگی سے جواب ملا۔ ”اس کے بعد تمہاری حفاظت کا ایسا بندوبست کروں گا کہ کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔“

”ایک درخواست اور کروں گی۔ جب تک میں یہاں سے آزاد نہ ہو جاؤں آپ ناگی سے کوئی تذکرہ نہیں کریں گے۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ سکندر علی شاہ نے جواب دیا پھر اس نے موبائل آف کر دیا۔
 دلربا کا فون غلاف توقع آنے کے بعد سکندر علی شاہ کے شاطر ذہن میں بہت سارے شبہات سرا بھا رہے تھے۔ ایک نام شکرہ کا بھی تھا جو سکندر علی شاہ کے لیے سوہان روح جتنا جا رہا تھا۔

❖❖❖

رستم علی آغا خانی اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا لیڈی اسٹینو کو ایک کاروباری خط ڈکلیٹ کروا رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی، ایک لمحے کو وہ الجھ گیا۔ اس نے اپنی پرسنل سیکرٹری کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ جب وہ کسی دفتری کام میں مصروف ہو تو کال اندر ٹرانسفر نہ کی جائے۔ بہر حال یہ سوچ کر اس نے ریسپونڈر اٹھا لیا کہ ممکن ہے کہ وہ کوئی اہم کال ہو۔ اس کا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا۔
 ”ہیلو ڈیڈ، آپ کیسے ہو؟“ دوسری جانب سے دارا کی آواز سنائی دی۔
 ”ٹھیک ہوں۔“ رستم علی آغا خانی نے کہا۔ ”تمہارے چلے جانے کی وجہ سے کاروباری

مصروفیات کا سارا بوجھ مجھے اکیلے ہی سنبھالنا پڑتا ہے؟“
 ”امی کی طبیعت کیسی ہے؟“

”وہ تمہاری اور روشنا کی کمی شدت سے محسوس کرتی ہے۔“

”مجھے اس کا احساس ہے لیکن یہاں بھی ہماری غیر موجودگی کے سبب کاروباری دیکھ بھال صحیح طور پر نہیں ہو رہی ہے۔ ایک دو ورکر کی چھانٹی بھی کرنی پڑی۔“
 ”کاروبار میں ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم وہاں دو چار مہینے گزار کر واپس آ جاؤ۔“

”سوری ڈیڈ.....“ اس بار دارا نے دلی زبان میں کہا۔ ”میں نے جن وجوہات کی بنا پر شفٹنگ کی ہے اسے زبان تک نہیں لاسکتا۔ ہو سکے تو آپ ماما کو لے کر دو تین مہینے کے لیے یہاں آ جائیں۔“
 ”تمہاری ماما کا بھی یہی پروگرام تھا لیکن تجارتی پالیسی کی کچھ تبدیلیوں کے باعث فی الحال سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ہے۔ جیسے ہی موقع ملا کچھ وقت ضرور نکال لوں گا۔ روشنا کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”خود کو حالات سے ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ وہ مستقل طور پر یہاں سے جانے کے حق میں نہیں تھی لیکن تم نے نہ جانے کیوں اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا۔“

”سوری ڈیڈ۔“ دارا نے دلی زبان میں کہا۔ ”سچ ہے کہ روشنا اب بھی بار بار واپسی کی ضد کرتی رہتی ہے لیکن وہاں رہنا اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔“

”تم چاہتے تو میجر عارف سے بھی مدد لے سکتے تھے وہ تم دونوں کا دوست بھی ہے۔“

”اس کا فون بھی آتا رہتا ہے لیکن میں نے اس کو یہی بتایا ہے کہ میرا اور روشنا کا آنا ناگزیر تھا۔“

”ماں سے بات کی تم نے؟“

”ان کا فون انجینج تھا اس لیے آپ سے کال ملالی۔“

”اچھا کیا روشنا کو ہماری طرف سے دعا دینا اور اپنا خیال رکھنا۔“

”رستم علی آغا خانی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ لیڈی اسٹینو کو فارغ کرنے کے بعد اس کے ذہن نے ان وجوہات کو کھوجنا شروع کر دیا جس کے سبب دارا اچانک روشنا کو لے کر بیرون ملک منتقل ہو گیا تھا۔ خاصی دیر وہ مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا پھر انٹر کام کے بزرگی آواز نے اسے چونکا دیا۔“
 ”ہیں۔“ اس نے ریسپونڈر اٹھا کر لیڈی سیکرٹری سے رابطہ قائم کیا۔

”سر، سیکرٹری انڈسٹریز کے ایک ورکر آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہیں۔“

”کیا نام ہے؟“

”کسی وجہ سے وہ نام نہیں بتا سکتے لیکن کاروباری معاملہ ہے۔“ لیڈی سیکرٹری نے کہا۔ ”نئی

تجارتی پالیسی کے سلسلے میں کچھ بات کرنی ہے۔
”ٹھیک ہے، بھیج دو۔“

”دوست بعد جو آدمی اندر داخل ہوا وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ پست قد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے رستم علی آغا خانی سے ہاتھ ملایا پھر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔“

”میرا خیال ہے کہ میں آپ سے پہلی بار مل رہا ہوں۔“ رستم علی آغا خانی نے گفتگو کا آغاز محتاط انداز میں کیا۔ ”کیسے زحمت کی؟“
”سب سے پہلے میں ایک غلط بیانی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میرا تعلق انڈسٹریز سے نہیں اسٹاک مارکیٹ سے ہے۔“

”آئی سی..... کوئی خاص انفارمیشن؟“
”دور در بعد امریکہ اپنی نئی ڈیفنس پالیسی کا اعلان کرنے والا ہے جس کے بعد ڈالر کا ریٹ کم از کم پندرہ پرسنٹ بڑھ جانے کی توقع ہے۔“

”سوری..... میں کرنسی کے معاملات میں ہاتھ ڈالنے کا عادی نہیں ہوں۔“
”حیرت ہے، پندرہ پرسنٹ کچھ کم نہیں ہوتے۔“
”میرے پاس وقت کم ہے۔“ جواب بے زاری سے دیا گیا۔ ”اور کوئی بات؟“
”اب آپ کے آفس تک آگیا ہوں تو خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔“ نووارد نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”کچھ نہ کچھ سودا تو ضرور کروں گا۔“

”میرا خیال ہے تم اپنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہو۔“
”ایک قیمتی آئٹم اور بھی ہے میرے پاس۔ ایک نظر اسے بھی دیکھ لو سینیٹر ہو سکتا ہے کہ بات بن جائے۔“ نووارد نے اس بار سرسراتے لہجے میں کہا پھر ایک لفاظی نکال کر سامنے رکھ دیا۔

رستم علی آغا خانی کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔ اس نے فوری طور پر یہی سوچا تھا کہ خفیہ کال تیل کو دبا کر اپنے خاص آدمیوں کو طلب کرے اور نووارد کو ڈنڈا ڈولی کر کے باہر بھیج دے لیکن پھر اس نے کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ نووارد کی نگاہوں میں جو اعتماد نظر آ رہا تھا وہ اس قدر معنی خیز تھا کہ رستم علی آغا خانی نے ایک نظر اس لفاظی پر بھی ڈالنی ضروری سمجھی جو اس کے سامنے رکھا ہوا تھا پھر جب اس نے لفاظی کھول کر اندر موجود پہلی تصویر دیکھی تو اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ دارا اور روشنا کے فوری طور پر مل جانے کا ایک اصلی سبب اس کے سامنے موجود تھا۔ وہ روشنا کی ایک برہنہ تصویر تھی جس کا جسم لباس کی قید سے نکل کر آزاد تھا۔

”ایسے تین چار شاہکار اور بھی ہیں میرے پاس۔“ نووارد مسکرایا۔
”کیا چاہتے ہو؟“ رستم علی آغا خانی نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔
”ٹیکنیکل سمیت تمام تصویروں کی واپسی کے عوض تمہارے لیے خاص رعایتی قیمت میں لاکھ، وہ

بھی فوری ادائیگی کی صورت میں۔“ نووارد زہر خند سے بولا۔ ”تمہاری کاروباری ساکھ اور خاندانی عزت کے لیے یہ رقم کچھ اتنی زیادہ بھی نہیں ہے۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم کوئی ثبوت اپنے پاس نہیں رکھو گے؟“

”تمہیں میری زبان پر اعتبار کرنا پڑے گا، کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔“

”کیا تم سب کچھ ساتھ لائے ہو؟ رستم علی آغا خانی نے سوال کیا۔“

”نہیں۔“ نووارد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”فوری طور پر تمہیں کم انکم دولاکھ ادا کرنے ہوں

مے نقدی کی صورت میں۔ باقی رقم بھی نقدی ہی کی صورت میں تیار رکھنا۔ میں کسی وقت بھی آکر

تصویروں اور ٹیکنیکل تمہارے حوالے کر کے وصول کر لوں گا۔“

رستم علی آغا خانی کے لیے خاندانی عزت بچانے کے لیے یہ سودا اتنا مہنگا بھی نہیں تھا۔ اس نے

اٹھ کر سیف سے رقم نکال کر نووارد کے سامنے رکھ دی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

”مجھے یہاں آتے وقت پورا یقین تھا کہ تم میری آفر قبول کر لو گے۔“

”تت..... تم اب جا سکتے ہو۔“ رستم علی آغا خانی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”اپنا وعدہ یاد

رکھنا میں حسب وعدہ رقم تیار رکھوں گا۔“

”تم نے ابھی تک میرا نام دریافت نہیں کیا۔“

”نووارد نے بڑی بے پروائی سے رقم جیب میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔“

”مجھے نام کی نہیں کام کی ضرورت ہے۔“

”نام بھی ضروری ہے۔“ نووارد نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں دوبارہ آؤں تو کسی اور طبقے میں

آؤں۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ رستم علی آغا خانی چونکا۔

”فی الحال اتنا سمجھ لو کہ تم نے میرے ساتھ مفت کا سودا کیا ہے۔ تصویروں کے حصول سے

پہلے ممکن ہے کہ دارا بھی روشنا کو ساتھ لے کر ہمیشہ کے لیے واپس لوٹ آئے۔“

”کون ہو تم؟“

”جواب دینے سے پہلے نووارد نے بڑی سرعت سے اپنا بے آواز آٹو بیک ریو لور جیب سے

نکال کر رستم علی آغا خانی پر تان لیا پھر بدلی ہوئی آواز میں بولا۔“

”تمہاری موت کے بعد تمہاری بیوہ کو دارا کی ضرورت ہوگی۔ اس ضرورت کو دارا بھی نظر انداز

نہیں کرے گا۔“

”تت..... تت..... تم.....“ رستم علی آغا خانی اس طرح چونکا جیسے بے خیالی میں اس کا ہاتھ بجلی

کے نیچے تاروں سے چھو گیا ہو۔ وہ چھٹی چھٹی نظروں سے نووارد کو گھور رہا تھا۔

”ہاں یہ میں ہوں..... تمہارا پرانا واقف کار..... شیخ حامد تم جاہو تو آکنولپس بھی کہہ سکتے

ہو۔“ اس کے بعد رستم علی آغا خانی کو بولنے کا موقع نہیں ملا۔ ٹچ..... ٹچ..... ٹچ کی مدد آواز کے ساتھ ہی وہ

✦ ✦ ✦

”ایک بات اور بھی ممکن ہے۔“ پہلے ایس بی نے جواز پیش کیا۔ ”ممکن ہے کہ شیخ حامد اور

”لیڈی سیکرٹری نے جو حلیہ بیان کیا ہے اور جس ماہرانہ انداز میں واردات کی گئی ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ حامد ایک بار پھر ہمیں بدل کر متحرک ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔“ سراج نے سنسنیل کر جواب دیا۔ ”مقتول کو پہلے بھی دھمکی دی جا چکی تھی، ہم نے سادہ لباس والے مقتول کے آفس پر تعینات کیے تھے ان کا بے ہوشی کی حالت میں پایا جانا بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بھی قاتل کی نظروں میں آچکے تھے۔“

”مسٹر اورنگ زیب کا قیام شاید آپ ہی کے ساتھ ہے؟“ ڈی آئی جی نے مسکرا کر رازداری سے دریافت کیا۔

”جی ہاں لیکن تمام تر ذاتی مراسم کے باوجود وہ خاص طور پر آکٹوپس کے بارے میں کوئی بات کھل کر نہیں کرتے۔“

”یہی ان کی ذہانت کی دلیل ہے۔ بات زبان سے نکل جائے تو پرانی ہو جاتی ہے۔“ ڈی آئی جی نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ آکٹوپس بھی مسٹر اورنگ زیب کو اپنے لیے سب سے اہم خطرہ محسوس کرتا ہوگا۔“

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے ذہن میں ایک سوال گردش کر رہا تھا۔ رستم علی آغا خانی کی موت سے شیخ حامد کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟ کیا یہ کسی پرانی دشمنی کا قرض تھا جسے چمکا کر دیا گیا تھا یا قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے کھلا چیلنج۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی اس کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ ڈی آئی جی کا فون اس نے اورنگ زیب کی موجودگی میں ریسو کیا تھا لیکن حسب معمول یہی کہا تھا کہ اورنگ زیب اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے۔

فون پر رابطہ ختم ہونے کے بعد اس کی اورنگ زیب سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ بھی ذہن میں گونج رہی تھی اورنگ زیب نے یہی کہا تھا کہ شیخ حامد کسی وجہ سے بوکھلا کر دوبارہ سامنے آ گیا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی کہا تھا کہ دارا اور روشنا کے باہر چلے جانے کے بعد ہی اس نے کسی اہم کام کے سلسلے میں رستم علی آغا خانی سے بھیس بدل کر ملاقات کی ہوگی۔ کوئی ایسا مطالبہ کیا ہوگا جو منظور نہیں کیا گیا جس کی پاداش میں رستم علی آغا خانی کو موت کی سزا سنائی پڑی۔ سراج کا ذہن ان ہی باتوں پر غور کر رہا تھا جب ڈی آئی جی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”جی..... وہ..... میں اورنگ زیب صاحب کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ آپ کی کال آنے کے بعد میں نے یہاں آتے وقت دو تین بار ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے موبائل سے پاور ڈرافٹ کی سیٹج ہی سنائی دیتا رہا۔“

”ہو سکتا ہے کہ کسی خاص وجہ سے ایسا کیا گیا ہو۔“ ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ڈونٹ وری، مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت بھی کسی نہ کسی آفس ڈیوٹی کو سرانجام دے رہا ہوگا۔“ پھر ڈی آئی جی کے ساتھ ہی سراج بھی اٹھ گیا تھا۔



سکندر علی شاہ کی نظر س بار بار دستی گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ جس انداز میں وہ اس وقت اپنی خواب گاہ میں بیچھے قیمتی قالین کو قدموں تلے روند رہا تھا وہ بھی اس کی کسی ذہنی الجھن اور پریشانی کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے گنبد کی موت کا کوئی ملال نہیں تھا۔ اس خبر کو سن کر اسے خوشی ہوئی تھی لیکن دلربا کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اسے جن حالات میں اغوا کیا گیا تھا اور جو تفصیل خود دلربا نے موبائل پر بتائی تھی وہ بھی سکندر علی شاہ کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ کئی پیچیدہ سوالات تھے جو اس کو الجھا

رہے تھے۔

”وہ کون تھا جس نے دلربا کو اغوا کیا تھا؟ اگر وہ ناگی یا اس کا کوئی آدمی تھا تو دوسرا فرد کون تھا جس نے دلربا کو درمیان سے اچک لیا تھا؟ دلربا کے بیان کے مطابق اگر وہ کوئی عقیدت مند مرید تھا تو براہ راست بھی اس کی اطلاع سکندر علی شاہ کو دے سکتا تھا پھر اغوا کر کے دلربا کو کہاں رکھا گیا؟ اس کا موبائل کیا صرف اسی مقصد کے پیش نظر واپس کیا گیا تھا کہ وہ سکندر علی شاہ کو ناگی کی نمک حرامی کی اطلاع دے یا اس میں کوئی خاص چال تھی؟“

بہر حال سکندر علی شاہ اس وقت اضطرابی کی کیفیتوں سے دوچار تھا جب اس کے موبائل نے گنگناتا شروع کر دیا۔ روشن اسکرین پر جو نمبر نظر آئے اسے دیکھتے ہی اس نے موبائل آن کر لیا۔ وہ اسی سم کے نمبر تھے جو سکندر علی شاہ نے اپنے خاص آدمی کو دی تھی جو دلربا کو بازیاب کرنے گیا تھا۔

”ہیلو..... کون؟“ سکندر علی شاہ نے محتاط انداز میں سوال کیا۔

”دلربا بول رہی ہوں۔“

”اس وقت کہاں ہو؟“

”کیا مطلب؟“ دوسری جانب سے حیرت سے دریافت کیا گیا۔ ”جو آدمی مجھے فائیو اسٹار ہوٹل کے باہر ملا تھا کیا آپ نے اسے یہ ہدایت نہیں دی تھی کہ مجھے چوبیس گھنٹے اسی ہوٹل میں قیام کرنا ہے؟“

”اس نے جو کہا وہ بھی درست ہے لیکن جن لوگوں نے تمہیں میرا مرید ہونے کی وجہ سے آزاد کروایا ہے مجھے ابھی تک ان کے بارے میں پوری طرح اطمینان نہیں ہوا ہے۔“ سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی تمہیں اغوا کرنے والوں کی کوئی مصلحت ہو۔ بہر حال میں چوبیس گھنٹے بعد تمہیں ایسی جگہ منتقل کر دوں گا جہاں تم پوری طرح محفوظ رہو گی۔“

”اگر آپ کا شبہ کسی خاص فرد یا گروہ کی طرف ہے تو کیا وہ لوگ چوبیس گھنٹوں کے بعد میری طرف سے غافل ہو جائیں گے؟“

”تم ان باتوں پر غور نہ کرو۔“ سکندر علی شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی اٹھایا ہے۔ میرے آدمی بھی پوری طرح محتاط ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں چوبیس گھنٹوں سے پہلے ہی دوسری جگہ شفٹ کر دیا جائے۔“

”ناگی کے بارے میں آپ نے کیا معلوم کیا؟“

”تم سے جس شبہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ بھی میرے کسی دشمن کی چال ہو سکتی ہے لیکن اگر ناگی ہی نے اپنی موت کو دعوت دی ہے تو اس کا انجام بھی عبرتناک ہی ہوگا۔“

”گنبد کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

”کیا مطلب؟“ سکندر علی شاہ بری طرح چونکا۔ تمہیں اس وقت خلاف توقع گنبد کا خیال کیسے

”جس نے مجھے آزاد کیا ہے اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ نگینہ بھی اوپر پہنچادی گئی ہے اور اس کی موت میں بھی ناگی کا ہی خفیہ ہاتھ شامل ہے۔“

”نگینہ کے بارے میں پولیس بھی تفتیش کر رہی ہے۔“ سکندر علی شاہ نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کی لاش مس جوزف کے دوسن ہاسٹل کے ایک کمرے سے ملی تھی۔ جس عورت پر اسے قتل کرنے کا شبہ ہے وہ اس اس کے ایک ساتھی کو بھی پولیس نے حراست میں لے رکھا ہے۔“

”آپ پر تو کوئی بات نہیں آئی، میرا مطلب ہے کہ نگینہ مس جوزف کے ہاسٹل میں.....“

”تم پریشان نہ ہو سب خیریت ہے.....“

”ایک سوال اور کروں گی۔“

”پوچھو؟“

”ایک لمحے کو دوسری جانب خاموشی طاری رہی پھر دلربا نے محتاط انداز میں پوچھا۔“

”کیا آپ بھی اپنے کسی نادیدہ مگر ہمدرد دشمن کے ہاتھوں بے بسی کا شکار ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ وہ آپ سے رابطے میں ہے لیکن کبھی کھل کر سامنے نہیں آیا؟“

سکندر علی شاہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ دلربا کا آخری جملہ سن کر اس کے ذہن میں کئی نام ابھرے تھے۔ سرفرست نام شکرہ کا تھا، جس نے ناگی اور نگینہ دونوں کے بارے میں اسے سرزدش کی تھی۔ دلربا کے اغوا کی خبر پہلی بار اسی نے دی تھی جس کی تصدیق بعد میں اورنگ زیب نے بھی کر دی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ دلربا کی آواز دوبارہ ابھری۔ ”آپ خاموش کیوں ہو گئے؟“

”جب ملاقات ہوگی تو تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ فی الحال تم آرام کرو جسٹ ریلیکس۔“ سکندر علی شاہ نے جواب دینے کے بعد موبائل آف کر دیا۔ دلربا نے نگینہ اور نادیدہ دشمن کے حوالے سے جو بات کی تھی اسے سن کر سکندر علی شاہ کے ذہن میں ایک بار پھر سوالات کی یلغار شروع ہو گئی۔

نگینہ کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی لیکن کسی نادیدہ دشمن والی بات سکندر علی شاہ کے سوا کسی اور کو نہیں معلوم تھی پھر دلربا نے یہ سوال کیوں کیا تھا؟ کیا یہ محض اتفاق تھا یا اسے اغوا کرنے والوں نے نادیدہ دشمن کے حوالے سے کوئی کلیو دیا تھا۔ ان باتوں کے تسلسل میں ایک خیال اور بھی اس کے ذہن میں چکرانے لگا۔ ”کیا دلربا کو خود شکرہ نے کسی خاص مقصد کے پیش نظر اغوا کیا تھا؟“

اور بھی کئی باتیں سکندر علی شاہ کے ذہن میں گڈ مڈ ہو رہی تھیں جب فون کی گھنٹی کی آواز ابھری۔ سکندر علی شاہ نے تین گھنٹیوں کے بعد ریسیور اٹھالیا۔ سلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”سکندر علی شاہ بول رہا ہوں۔“

”دلربا کے بارے میں تم نے اب کیا غور کیا ہے؟“

”دوسری جانب سے شکرہ کی آواز ابھری۔“

”مم..... میں سمجھا نہیں۔“ سکندر علی شاہ نے اس اچانک سوال پر چونک کر کہا۔ ”وہ..... وہ.....“

”وہ جہیں واپس مل گئی ہے۔ اس وقت جہاں ہے وہ بھی جانتا ہوں لیکن اس کا ہوٹل میں رہنا مناسب نہیں ہے۔“

”اب میں اسے کسی محفوظ مقام پر ہی منتقل کروں گا۔“

”جانتے ہو اسے کس نے اغوا کیا تھا؟“

”اس کی اطلاع سب سے پہلے مجھے آپ ہی نے دی تھی۔“

”اب یہ اطلاع بھی میں ہی دے رہا ہوں کہ اس کے اغوا اور دوبارہ واپسی میں ایس پی کا ہاتھ شامل ہے۔“

”لیکن وہ.....“

”بحث نہیں۔“ دوسری جانب سے بات کاٹ کر قدرے درشت لہجے میں کہا گیا۔ ”ایس پی کو میں نے جو مہلت دی اس کا کچھ مقصد بھی تھا لیکن اب تم اسے اگلے ویک اینڈ پر فارم ہاؤس میں بلا لو۔“

”ٹھیک ہے۔“

”ایک بار پھر ہدایت دے رہا ہوں کہ ایس پی سے محتاط رہنا۔“ سرسراتے لہجے میں کہا گیا پھر رابطہ ختم ہو گیا۔



رستم علی آغا خانی کے قتل کی اطلاع اورنگ زیب کو تھا نہ انچارج نے دی تھی۔ دیگر تفصیل سے بھی آگاہ کیا تھا۔

قاتل کا حلیہ بھی لیڈی سیکرٹری کے بیان کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا تھا لیکن سب سے اہم بات آنکھوں کے علامتی نشان کی تھی جس کے بعد یہ بات مکمل کروا دیا ہوگی تھی کہ شیخ حامد کسی وجہ سے دوبارہ میدان عمل میں آ گیا تھا۔ تفصیل ملنے کے بعد یہی سوال سراج نے بھی کیا تھا۔

”فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ اس کی وجہ روشنا اور دارا کے غیر ملک چلے جانے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتی ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ روشنا کے اغوا میں بھی کسی نہ کسی زاویے سے اسی کا ہاتھ ہوگا۔“

”یہ بات ایک عام آدمی کے ذہن میں بھی آسکتی تھی۔“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر کہا۔ ”بنیادی سوال یہ ہے کہ جب روشنا کی برہنہ تصویریں مجرم کے پاس تھیں تو عدالت جیسے سنگین جرم کے ارتکاب کی کیا ضرورت تھی۔“

”آپ کا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟“

”فی الحال انتظار کرو۔“

”سوری۔“ سراج نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں بھول گیا تھا کہ آپ مجھ سے بھی اپنے دل کا حال بتانے سے گریز کرتے ہیں۔“

”غلط خیال ہے تمہارا۔“ اورنگ زیب نے بدستور سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ ”میں خود بھی ابھی تک کوئی آخری نتیجہ اخذ نہیں کر سکا ہوں۔ اس قتل کی واردات کے دو ہی مقاصد ہو سکتے ہیں کسی وجہ سے دارا کو واپس آنے پر مجبور کرنا یا پھر پولیس کو غلط راستے پر ڈالنا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس واردات کے تسلسل میں کچھ اور لوگ بھی آکٹوپس کی بوکھاٹ کا نشانہ بن جائیں۔“

”اور لوگ کون ہو سکتے ہیں؟“ سراج نے چونک کر سوال کیا۔
”پریشان مت ہوئی الحال آکٹوپس مجھے نشانہ بنانے کی غلطی نہیں کرے گا۔“
”اس یقین کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟“

”پہلی وجہ یہ ہے کہ اپنی سیٹ سے دور کر دیا گیا ہوں اس کے پس پشت بھی آکٹوپس کا ہاتھ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ کہ اگر اس کا مقصد مجھے نشانہ بنانا ہوتا تو وہ پہلا وار کسی اور کے بجائے براہ راست مجھ پر کرتا۔“

اس کے بعد سراج اور اورنگ زیب کے درمیان دوسرے متعدد پہلوؤں پر بھی غور ہوتا رہا۔ جب ڈی آئی جی کی میٹنگ کے لیے کال آئی اس وقت بھی سراج اورنگ زیب کے ساتھ ہی تھا لیکن اس نے اورنگ زیب کے اشارے پر ہی کہا تھا کہ وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے۔ سراج کیے جانے کے بعد اورنگ زیب کا ذہن رستم علی آغا خانی کے قتل کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا الماس کافی لے کر آئی جب بھی وہ اپنے خیال میں مستغرق تھا۔

”خیریت؟“ الماس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“
”یونہی کچھ دفتری معاملات کے بارے میں غور کر رہا تھا۔“

الماس کے جانے کے بعد اس نے کافی ختم کی پھر خود بھی ڈی آئی جی کے آفس جانے کا فیصلہ کر لیا لیاقت حسین کو اس نے موبائل پر اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے وہ گاڑی لیے تیار کھڑا تھا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اورنگ زیب نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بڑی یکسوئی سے شیخ حامد کے اچانک سامنے آ جانے کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ رستم علی آغا خانی کے قتل کو محض پرانی تجارتی دشمنی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ روشا اور دارا کا بیرون ملک چلے جانا بھی اس قتل کا محرک ہو سکتا تھا۔ شیخ حامد نے خود کو منظر عام پر دوبارہ اجاگر کرنے کی خاطر بطور خاص رستم علی آغا خانی کا انتخاب کر کے قانون کو بھی اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کی ہوگی کہ وہ سامنے رہ کر بھی اس کی دسترس سے دور ہی ہوگا۔ اس واردات سے اس کا بنیادی مقصد اورنگ زیب کو بھی چیلنج کرنا تھا جسے اس کی سیٹ سے ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں آئی جی کی پوزیشن کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھی کسی نامعلوم دشمن کے اشارے پر عمل کرنے پر مجبور تھا اور بھی کئی پہلو کیے بعد دیگرے اورنگ زیب کے ذہن میں

ابھر رہے تھے جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوا۔ روشن اسکرین پر نظر آنے والے نمبرز نئے تھے پھر بھی اس نے موبائل آن کر لیا۔

”ہیلو۔“ اس نے محض ہیلو کہنے پر اکتفا کیا۔
”تمہارا ایک پرانا واقف کار بول رہا ہوں۔“

دوسری جانب سے بولنے والے نے آواز بدلنے کی کوشش کی تھی۔
”میرے واقف کاروں کی فہرست بہت طویل ہے۔“ اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”میرے واقف کار یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے پہیلیاں بوجھنے کا شوق بھی نہیں رہا۔“
”کیا رستم علی آغا خانی کا حوالہ کافی نہ ہوگا؟“

”اودہ..... تم۔“ اورنگ زیب شیخ حامد کی آواز پہچان کر محتاط لہجے میں بولا۔ ”میں اسے تمہارا کارنامہ نہیں بلکہ بزدلی کا نام دوں گا۔ بہادر ہوتے تو براہ راست میرے اوپر وار کرنے کی کوشش کرتے۔“

”تمہاری حیثیت محض ایک ایس پی کی ہے جسے میں نے پاؤں کی جوتی سے زیادہ کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔“ جواب حقارت سے دیا گیا۔ ”رستم علی آغا خانی کوئی الحال کسی آنے والی فلم کا ٹریلر ہی سمجھو۔ اصلی فلم بھی بہت جلد شروع ہو جائے گی۔“
”کیا صرف یہی بکواس کرنے کی خاطر فون کیا تھا؟“ اورنگ زیب نے دبنگ لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں..... یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ آکٹوپس ایک وقت میں کئی شکار کر سکتا ہے۔ یہ نام بھی تم نے ہی دیا ہے۔ یہ بھی سن لو کہ میں تم کو کسی رینگنے والے حقیر کیڑے سے زیادہ کمزور سمجھتا ہوں تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی باور کروادوں کہ میں پولیس والوں کی طرح ڈبل گیم کھیلنے کا ہادی نہیں ہوں۔ قبل از وقت یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ وہ وقت دور نہیں جب تم بھی پالتو کتوں کی طرح میرے قدموں میں لوٹو گے۔ اسے میرا چیلنج ہی سمجھو۔“

جواب میں اورنگ زیب نے کچھ کہنا چاہتا تھا جب دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا پھر دوبارہ اس وقت چونکا جب لیاقت حسین نے گاڑی سکندر علی شاہ کی کوشی کے دروازے پر روکی تھی۔

”یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟“ اس نے لیاقت حسین سے سوال کیا۔
”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ آپ نے مجھے یہیں آنے کا حکم دیا تھا۔“ لیاقت حسین نے سادگی سے کہا۔ ”مجھے تعجب ہی ہوا تھا کہ آپ پیری مریدی کے چکر میں کہاں پھنس گئے۔“
”تم جانتے ہو سکندر علی شاہ کو؟“
”نام سنا ہے ملنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔“

کوشی کے چکیدار نے گاڑی میں جھانکا اورنگ زیب کو دیکھ کر اس نے بڑے ادب سے سلام کیا پھر پھانک کھول دیا۔ کچھ دیر بعد اورنگ زیب سکندر علی شاہ کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اس وقت وہاں اس کی آمد میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ شیخ حامد کا فون بھی اسے خلاف توقع ہی موصول ہوا تھا۔ وہ گھر سے ڈی آئی جی کے آفس جانے کے لیے نکلا تھا لیکن لیاقت حسین نے اسے سکندر علی شاہ کی کوشی پر پہنچا دیا تھا۔ آخر کیوں؟

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ڈی آئی جی آفس چلنے کی ہدایت دی تھی۔ اس وقت وہ ذہنی طور پر صرف اور صرف رستم علی آغا خانی کے قتل کے بارے میں مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا ڈی آئی جی کی میٹنگ میں بھی اس نے سراج کو بھیج دیا تھا پھر اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ میٹنگ کے دوران کچھ نئی معلومات سامنے آجائیں وہ خود بھی گھر سے روانہ ہوا تھا راستے میں شیخ حامد کا فون آنے کے بعد وہ اسی کی ویدہ دلیری کے بارے میں غور کر رہا تھا اب وہ سکندر علی شاہ کے خوب صورت ڈرائیونگ روم میں موجود تھا۔

آج سے پویشتر وہ اتنا بے خبر بھی نہیں ہوا تھا۔ ہر قدم پر آنکھیں کھلی رکھنے کا عادی تھا یہی اس کی ڈیوٹی کا تقاضا بھی تھا۔ سب سے زیادہ تعجب اسے لیاقت حسین کی بات پر ہوا تھا۔ وہ ان ہی اتفاقات پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ جب سکندر علی شاہ نے ڈرائیونگ روم میں داخل ہو کر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا تھا۔

”اس وقت کیسے آتا ہوا؟“

”اگر آپ معروف ہیں تو پھر کسی وقت.....“ اورنگ زیب نے بھیجی ہوئی آواز میں کہا۔

”ایسا بھی نہیں ہے، جب ہم نے ایک دوسرے کو دوست کہا ہے تو پھر رسی باتوں کی گنجائش بھی نہیں رہی۔“

”بات دراصل یہ ہے شاہ جی کہ میں ادھر چند دنوں سے ذہنی طور پر کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا ہوں۔“

”اگر یہ معاملہ ہے تو آپ بروقت آئے ہیں۔“

سکندر علی شاہ نے پہلو بدل کر کہا۔ ”میں بھی آپ کے علاج کی طرف سے غافل نہیں تھا، لیکن درمیان میں کچھ مصروفیات ایسی پیش آئیں کہ میں نے وقتی طور پر قارم ہاؤس والا پروگرام منسوخ کر دیا تھا مگر آج..... آج آپ نہ آتے تو میں خود آپ کو کال کرتا۔“

”سب خیریت تو ہے؟“ اورنگ زیب نے بڑی معصومیت سے دریافت کیا۔

”جی میں نے اس ویک اینڈ کا پروگرام تیار کر لیا۔“ سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”سارے انتظامات بھی مکمل کر لیے ہیں۔“

”پھر غور کر لیں شاہ جی۔“ اورنگ زیب نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”اگر بات کسی ذریعے سے بھی فارم ہاؤس کے باہر آگئی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ ساری بنی بنائی عزت

خاک میں مل جائے گی۔“

”دوست کہا ہے تو پھر دوست پر اعتماد بھی کریں۔“ سکندر علی شاہ نے اس بار خالص کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا انداز اختیار کیا۔ ”میں نے آپ کے لیے جو علاج طے کیا ہے وہ موثر ہی ثابت ہوگا۔ نفسیاتی طور پر وہ گرہ کھٹکنی ضروری ہے جو آپ کے تحت اشعور میں پوری طرح جڑ چکوتی جا رہی ہے۔“

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خود کو ذہنی الجھن کا شکار ہی ظاہر کرتا رہا۔ سکندر علی شاہ اسے کمزور سمجھ کر اس پر اپنی روحانی قوتوں کا سکہ جماتا رہا۔ اورنگ زیب بھی یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ اس کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک ملازم لوازمات کی ٹرائی لیے داخل ہوا تو سکندر علی شاہ نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

خاصی دیر بعد جب اورنگ زیب جانے کی اجازت لے کر اٹھا تو سکندر علی شاہ پہلی بار اسے باہر تک چھوڑنے آیا جہاں لیاقت حسین گاڑی کے ساتھ موجود تھا۔ گاڑی کوشی سے باہر نکلی تو اورنگ زیب نے سکون کا سانس لیا لیکن اس کا یہ سکون بھی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ گاڑی اچالے سے نکلنے کے دو منٹ بعد ہی لیاقت حسین نے کچھ عجیب انداز میں پوچھا۔

”یہ جو باہر تک آیا تھا، کون تھا؟“

”سکندر علی شاہ، جس کے ہزاروں عقیدت مند ہر وقت اس کے آگے پیچھے لگے رہتے ہیں۔“

”نہیں۔“ لیاقت حسین نے بدستور خلا میں گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”میں نے اس کو پہچان لیا ہے۔ یہی ملعون ہے جس نے ایک معصوم اور مجبور لڑکی کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ جب اس مظلوم لڑکی نے آبرو بچانے کی خاطر خودکشی کر لی تو اس نے اپنے زر خرید کتوں کے ذریعے اسے دفن کروا دیا۔ میں اس قبر کو دیکھ چکا ہوں جہاں وہ ایک عرصے سے دفن ہے۔“

”لیاقت حسین..... اورنگ زیب نے حیرت سے دریافت کیا۔“ یہ تم کس کی بات کر رہے ہو؟

”خدا کی لاشی ہے آواز ہوتی ہے اس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ اس غریب اور بے سہارا لڑکی کی لاش اس وقت تک اپنی اصلی حالت میں محفوظ رہے گی جب تک مجرم کو پھانسی نہیں لگ جاتی۔ یہی مشیت ایزدی بھی ہے۔“

”لیاقت حسین کی آواز میں نفرت اور حقارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، کچھ دیر پویشتر اس نے کہا کہ صرف سکندر علی شاہ کا نام سنا ہے ملنے کی کوشش نہیں کی لیکن اب وہ شاید کسی غیبی قوت کے زیر اثر تھا جو غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے کچھ اہم انکشافات کروا رہی تھی۔ اس بات کا تجربہ سراج کے علاوہ اورنگ زیب بھی ایک دو موقعوں پر کر چکا تھا اور..... اس وقت بھی غالباً لیاقت حسین اسی غیبی قوت کے اشارے پر ڈی آئی جی آفس جانے کے بجائے اورنگ زیب کو سکندر علی شاہ کی کوشی پر لے آیا تھا۔ کچھ دیر بولنے کے بعد لیاقت حسین خاموش ہو گیا لیکن اورنگ زیب بدستور انہی باتوں کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جو لیاقت حسین کی زبان سے ادا ہوئی تھی۔“

یہ بات بھی زیادہ حیرت انگیز نہیں تھی کہ واپسی کے بعد خود لیاقت حسین بھی ان باتوں کو کبکسر بھول چکا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی اسے زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔



ساحلی علاقے میں پھیروں کی وہ قدیم بستی جو کبھی خاصی گنجان آباد تھی اب وہاں گنتی ہی کے کچھ کچے پکے مکانات رہ گئے تھے۔ اس کی وجہ وہ قبرستان تھا جو رفتہ رفتہ خاصا پھیل گیا تھا۔ پھیروں نے اس قبرستان سے متعلق بہت ساری پراسرار کہانیوں کی وجہ سے ہجرت کر کے نئی بستی آباد کر لی تھی۔ لیکن پندرہ بیس کچے پکے مکانات اب بھی باقی تھے۔ ایک دوکانیں بھی تھیں جہاں روزمرہ کی ضرورت کا سامان مل جاتا تھا۔

پہلے اس ساحلی علاقے پر پکنک منانے کے لیے لوگ بھی آیا کرتے تھے لیکن اب ان کی تعداد بھی کم ہوئی تھی پھر بھی کچھ پرانے مچھلی کے شکاری تھے جو اب بھی وہاں آتے رہتے تھے شاید اس لیے کہ سمندر کے اس حصے میں آبادی ختم ہونے کے بعد مچھلیوں کے شکار کی سہولت زیادہ ہو گئی تھی۔ اس وقت شام کے جھٹ پنے کا وقت تھا جب ایک پرانے ماڈل کی کار آبادی کے قریب آ کر رکی تھی۔ اس میں سے جو شخص اترا وہ ادھیڑ عمر ہی کہا جاسکتا تھا۔ کار کے رستے ہی آبادی کے دو تین افراد اس کے قریب آ گئے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ تازہ مچھلی کے حصول کے لیے اب بھی پرانے گا ہک ادھر آتے رہتے تھے۔

”کیا چاہیے صاحب؟“ ایک پھیرے نے قریب آ کر سوال کیا۔
”مجھے وہ خاص مچھلی درکار ہے جو مجھ جیسے لوگوں کے لیے بڑی کارآمد ہوتی ہے۔“ ادھیڑ عمر کے شخص نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔ ”بھلا سا نام بتایا ہے کسی واقف کار نے..... مگر..... یا پھر مگر۔“
”سمجھ گیا صاحب۔“ سوال کرنے والے نے معنی خیز انداز میں آنے والے کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر بڑی صاف گوئی سے بولا۔

”ہم وہ مچھلی فروخت نہیں کرتے۔“
”میں تمہیں منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں۔“
”معافی چاہتا ہوں صاحب۔“ پھیرے نے کہا۔ ”ایک دو پرانے گاہوں کے علاوہ ہم اسے کسی اور کو نہیں دیتے۔ تم جس مچھلی کی بات کر رہے ہو وہ مشکل ہی سے جال میں پھنستی ہے۔ تم شاید پہلی بار ادھر آئے ہو۔“

”کیا مطلب؟“ کیا اس طرف کسی نئے آدمی کا آنا منع ہے؟“ آنے والے نے قدرے ناگوار لہجہ اختیار کر لیا۔

”ایسی بات نہیں ہے صاحب لیکن ہم وہ مچھلی.....“
”پھیر اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اس کی وجہ اس کا وہ نوجوان ساتھی تھا جو سامنے آ گیا تھا۔“
”تم کو اس مچھلی کے بارے میں جو معلوم ہوا ہے وہ غلط بھی نہیں ہے لیکن تمہیں اس عمر کے بعد

اس کا نام کس نے بتا دیا۔“ نوجوان نے آنے والے کو سپاٹ لہجے میں مخاطب کیا۔
”کیوں..... کیا اس کا نام بتانا جرم ہے؟“ آنے والے کے تیور بھی بدل گئے۔

”میں تمہیں، تمہاری مطلوبہ مچھلی فراہم کر سکتا ہوں۔“

نوجوان نے اس بار بھی سنجیدگی سے کہا۔

”کیا قیمت دے سکو گے اس کی۔“

”جو تم مانگو۔“ آنے والے نے جیب سے اپنا پرس نکال لیا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ نوجوان نے اس بار کاروباری لہجہ اختیار کیا۔ ”پہلے اپنی مطلوبہ مچھلی دیکھ لو پھر..... سودا بھی طے ہو جائے گا۔“

”نوجوان اور ادھیڑ عمر والا آگے پیچھے بستی میں داخل ہوئے۔ ادھیڑ عمر والا منہ ہی منہ میں کچھ بڑا بڑا ہاشا یہ اسے نوجوان کا انداز گفتگو پسند نہیں آیا تھا۔“

بستی میں داخل ہونے کے بعد نوجوان مختلف راستوں کے بیچ خنم کرتا رہا پھر وہ ایک نیم پختہ مکان کے سامنے رک گئے جہاں اس کا کوئی ساتھی موجود تھا۔ اس نے بھی ادھیڑ عمر والے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر نوجوان سے پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“

”اسے گرم مچھلی کی تلاش ہے۔“ نوجوان نے جواب دیا پھر ادھیڑ عمر والے کو ساتھ لے کر مکان میں داخل ہو گیا۔ ایک کمرے سے گزر کر وہ دوسرے کمرے میں پہنچا جہاں ایک پھیرے بدن کا فرد پہلے سے موجود تھا۔ نوجوان کے ساتھ ادھیڑ عمر والے کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر سٹوٹیں نمایاں ہو گئیں۔ آنکھوں میں کسی سانپ جیسی ہی چمک بھی ابھری تھی۔ ایک لمحے تک وہ آنے والے کو تیز نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے نوجوان کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”استاد۔“ نوجوان نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”اسے گرم مچھلی منگوایا مگر کی تلاش ہے صحیح نام کیا ہے یہ خود بھی نہیں جانتا۔“

”اوہ.....! چھیرے بدن والے نے نظر بھر کر سوال کیا۔ کسی مچھلی کے حصول کے لیے تمہیں بھیس بدلنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”یہ..... یہ میں نے شرمندگی سے بچنے کی خاطر.....“
”نہیں افضل خان۔“

چھیرے بدن والے نے جوناگی کے سوا کوئی اور نہیں تھا، افضل خان کو حقارت سے گھورا۔
”کوئی حماقت نہ کرنا ورنہ تمہاری لاش کے ٹکڑے بھی نہیں ملیں گے۔“

آنے والا ہونٹ چبانے لگا۔ اس کی نظریں بھی ناگی پر جمی ہوئی تھیں۔ خود کو پہچان لیے جانے کے بعد بھی وہ خوف زدہ نہیں تھا لیکن اس وقت اس کے کانوں میں شبنم کا کہا ایک جملہ ضرور صدائے بازگشت بن کر گونج رہا تھا۔

بدلنے لگے۔
 ”کچھ دیر پہلے تم نے اپنے آدمی سے کہا تھا کہ مجھے سانس لینے کا موقع دیا جائے۔ افضل خان نے طنز کیا۔“ مرد ہو کر اتنی جلدی اپنا وعدہ بھول گئے۔
 ”تمہاری سانسیں اب گنتی جتنی رہ گئی ہیں۔ اس کا شکوہ مجھ سے نہیں اوپر والے سے کرو۔“ ناگی نے انتہائی سرد لہجے میں کہا پھر اس کی انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھنے لگا۔
 افضل خان نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا، اس کی نظریں بدستور ناگی پر مرکوز تھیں لیکن دل کی دھڑکیں بھی تیز ہونے لگی تھیں۔ کرل احتشام کا ایک جملہ اس کے ذہن میں گونجنے لگا۔
 ”ناگی کسی کو برا سے زیادہ خطرناک اور زہریلا ہے۔ تمہیں ہر قدم پر محتاط رہنا ہوگا۔“



”تم میرے لیے بہت قیمتی ہو افضل میں نے تمہیں بڑی مشکلوں سے پایا ہے پا کر دوبارہ کھونا نہیں چاہتی۔“
 ”کس سوچ میں کم ہو گئے؟“ ناگی نے سرسراتے انداز میں پوچھا۔
 ”سوچ رہا ہوں کہ تم جیسا نامی گرامی بھی کبھی کبھی خوف زدہ ہو کر ویرانوں میں چھپنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“
 افضل خان کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔
 ”حالات پر منحصر ہے۔“
 ناگی زہر خند سے بولا۔
 ”تم بھی ہمیشہ سینہ تان کر چلنے کے عادی تھے لیکن شمع حامد کے روپوش ہونے کے بعد اب چہرے پر نقاب سجانے پر مجبور ہو گئے ہو، کیوں غلط کہہ رہا ہوں؟“
 ”ہالتو اور شکاری کتوں سے بچنے کا یہی ایک جدید طریقہ ہے۔“
 ”افضل خان کا جواب سن کر قریب کھڑے نوجوان کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا تھا جب ناگی نے اسے روکا۔“
 ”نہیں، گھر آئے مہمان کی خاطر مدارات کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ اسے سانس درست کرنے کا کچھ موقع دو۔“
 نوجوان نے ناگی کی بات سن کر دوبارہ افضل خان کو خونخوار نظروں سے دیکھا پھر ہونٹ چباتا ہوا باہر نکل گیا۔ ناگی کی نگاہیں پھر افضل خان کے چہرے پر جم گئیں۔
 ”کس کے اشارے پر آئے ہو؟“
 ”جو سوال کرنے کا عادی رہا ہو وہ جواب نہیں دیا کرتا۔“ افضل خان نے بے پروائی سے کہا۔
 ”اپنا نہیں تو اس نئی نویلی ذہن کا خیال کرو جسے تمہاری واپسی کی امید ضرور ہوگی۔ ناگی مسکرایا۔“
 ”مرد ہو تو صرف مردوں کی بات کرو۔ عورت کا سہارا نہ لو۔“
 ”اوہ.....“ ناگی مل کھا کر رہ گیا۔ ”تم شاید شرافت کی زبان نہیں سمجھو گے۔“
 ”ناگی۔“ افضل خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم یہاں سے باہر چل کر کسی کھلی فضا میں بات کریں۔“
 ”اب اس وہم کو ذہن سے نکال دو۔ آنا تمہارے اختیار میں تھا واپسی کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔“
 ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو۔ میں خالی ہاتھ جانے کے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔“
 ناگی بڑے زہریلے انداز میں مسکرایا پھر اس نے جیب سے اپنا پستول نکال لیا۔ اس کے تیور

سکتا۔

”ایس بی اورنگ زیب۔“

”اس کے بھی کئی احسان ہیں لیکن اس وقت مجھے کسی اور نے یہاں بھیجا ہے۔“

ناگی کی پیشانی پر آدھی ترچھی سلوٹیں ابھرنے لگیں۔

اس کی گرفت پستول پر مضبوط ہونے لگی۔ قدرے درشت لہجے میں بولا۔ ”افضل خان یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم یہاں سے میری اجازت کے بغیر زندہ جاسکوں گے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ قریب ہی ایک پرانا قبرستان بھی ہے۔ یہاں نئی قبر کھودنے کا رسک ہمارے آدی بھی نہیں لیتے۔ کسی بوسیدہ قبر میں ایک اور لاش دفن کرنے کی گنجائش بھی آسانی سے نکل آتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے تم سچ کہہ رہے ہو لیکن مجھے شعر و شاعری سننے کا شوق نہیں رہا۔“

”کیا یہ تمہارا آخری جواب ہے؟“ ناگی کے چہرے پر سرخی کی لہر گہری ہونے لگی۔

”ہاں، یہی سمجھ لو۔“ افضل خان نے شانے اچکا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

ناگی نے اپنا پستول دوبارہ بلند کیا لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے خطرناک ارادے کی تکمیل کرتا ایک بوڑھا میلے کپڑوں میں سر پر پھٹی پٹرن کا جال ڈالے دروازے پر آگیا۔ ناگی کی تیز نظریں اس پر جم گئیں ایک لمحے اسے گھورنے کے بعد اس نے قدرے ترش انداز میں سوال کیا۔

”سردار اس وقت تم ادھر کیا لینے آ گئے؟“

”یہ..... اجنبی کون ہے؟“ سردار نے کھانتے ہوئے افضل خان پر ایک اچھٹی نظر ڈال کر دریافت کیا۔

”یہ..... موت کی تلاش میں آگیا ہے اور میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔“

”نہیں ناگی، میں تجھے اس کی اجازت نہیں دوں گا۔“ آنے والے نے کہا۔ ”تو بے شک اسے مار دے لیکن ہماری ہستی سے دور لے جا کر یہی میرا حکم ہے۔“

”یہ حکم تو کس حیثیت سے دے رہے ہو؟“ ناگی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”سردار کی.....“

”بکواس بند کرو پستہ قد بدیسی کتے۔“ ناگی نے گرج کر کہا۔ ”میں تمہاری اصلیت جان چکا ہوں۔“

”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔“ اس بار سردار نے جولوچن کے سوا کوئی اور نہیں تھا، بے جگری سے کہا۔

”میں بدیسی کتا ہی ہوں لیکن اعلیٰ نسل کا تمہاری طرح کا لینڈی ڈاگ نہیں ہوں جو سیٹھ حمان کی کوٹھی پر شمرہ کو پیاسا چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ اب پستول نیچے کر لو اس لیے کہ تمہارا مقامی باپ جگا بھی میرے ساتھ ہے۔ پھر لوچن کا جملہ ختم ہونے سے پیشتر جگا بھی ہلکے میک اپ میں سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سالٹنسر لگا پستول تھا افضل خان بھی جگا کو دیکھ کر چونکا۔“

”ناگی نے اپنا پستول فرش پر اچھال دیا، پھر بدستور دبنگ لہجے میں کہا۔“ میں تمہارے ساتھ

افضل خان کی نظریں پستول پر مرکوز تھیں۔ ناگی کی انگلی کے دباؤ کے ساتھ ہی موت اور زندگی کا فاصلہ بھی گھٹتا جا رہا تھا پھر ناگی کی انگلی ٹریگر سے دور ہو گئی۔ اس نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں واپس جانے کا موقع دے سکتا ہوں لیکن ایک شرط پر.....“

”وہ بھی بتا دو۔“

”تم آئندہ میرے سائے سے بھی دور رہو گے۔“

”کیوں منظور ہے؟“

”اس کا جواب میں دوبارہ کسی ملاقات پر ہی دے سکوں گا۔“

”اس وقت کیوں نہیں؟“

”میں بزدلی کا مظاہرہ کرنے کا عادی نہیں رہا۔“

”افضل خان نے بے پروائی سے جواب دیا۔“

”جانتا ہوں اس لیے ایک اور موقع دے رہا ہوں۔“ ناگی نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے ایک ایسے لمحے کی تلاش تھی جب وہ پھرتی کا مظاہرہ کر کے بازی پلٹ سکتا۔“

”کس بات پر غور کر رہے ہو؟“ ناگی نے زہر میں بجھے انداز میں مسکرا کر سوال کیا۔ شاید وہ اس کی خاموشی کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔

”میں تمہارے شکاری کتوں کی نظروں میں اپنی حیثیت کم نہیں کر سکتا۔“

”اوہ۔“ ناگی پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ”جواب معقول ہے لیکن ایک دوسری صورت بھی ہے۔ میں اپنے آدمیوں کو بلا کر ان کے سامنے دوستی کا ہاتھ ملا سکتا ہوں مگر شرط وہی ہوگی۔ تم دوست بن کر رہو گے، ہم ایک اور ایک مل کر گیارہ بھی ہو سکتے ہیں، کیوں؟“

”تمہیں یہ آفر دینے میں دیر ہوگئی اس لیے میں دوستی کے رشتے پر غور نہیں کر سکتا۔“

”اب کیا مشکل درپیش ہے؟“

”ہم تم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں جس کا نمک کھا لیتے ہیں اسی کے اشارے پر چلنا ہم دونوں کا شیوہ بھی ہے۔“ افضل خان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”تم سکندر علی شاہ کے خاص آدی ہو اور میں جس کے اشارے پر یہاں آیا ہوں اس کا نام بھی کئی مصلحتوں کی وجہ سے زبان تک نہیں لا

جب تمہاری عمر تیرہ کے بدقسمت ہندسوں میں تھی اس وقت پولیس کی ریڈ کے دوران تم بھی کچھ دوسرے لڑکوں کی طرح یتیم خانے سے بھاگ نکلے پھر ایک شادی شدہ عورت نے تمہیں زبردستی اپنے کٹنوں میں جکڑ کر ایک انوکھی لذت کا ذائقہ چکھادیا۔ اس کے عوض اس نے خاصی معقول رقم بھی دی تمہاری پرورش چونکہ اچھے ماحول میں نہیں ہوئی تھی اس لیے وقت نے تمہیں بہت جلد میل پر دستی ٹیوٹ (Male Prostitution) بنا دیا۔ اس کے بعد تم کس طرح شیلا اور مائیک پہنچے اور اس نے اپنے شوہر سے کیوں چھٹکارا حاصل کیا اس کی وجہ بھی تمہیں معلوم ہے۔ ”پھر مس ڈکسن کے آخری جیلے جونی کے کانوں میں گونجنے لگے۔“

”جتنی جلدی ممکن ہو شیلا اور مائیک دنیا سے نکل کر کہیں دور چلے جاؤ۔ کسی ایسی جگہ جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو۔“

جونی کی نظریں شیلا اور مائیک کے گداز جسم پر ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں جب جونی کا موبائل واٹس ایپٹ کرنے لگا۔

موبائل آن کر کے جونی نے کان سے لگایا۔

”ہیلو۔“

”ساحلی علاقے سے اکبر مائیک بول رہا ہوں۔ تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔“ بولنے والے نے بات جاری رکھی۔ ”استاد کو کسی نے گولی داغ کر اوپر پہنچا دیا ہے۔ ہمارے دوسامی اور بھی مارے گئے ہیں۔“

”تمہارا شبہ کس پر ہے؟“ جونی، ناگی کے قتل ہونے کی اطلاع پر اس طرح چونکا جیسے اس کے ہاتھ بجلی کے شنگے تاروں سے چھو گئے ہوں۔

”ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس مرڈر کے پیچھے کوئی بڑا ہاتھ ضرور شامل ہے۔ تم کو اس لیے اطلاع دے رہا ہوں کہ اب دائیں بائیں دیکھ کر ہی قدم اٹھانا۔“ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ جونی کے ذہن میں ایک بار پھر مس ڈکسن کے آخری جیلوں کی گونج ہو رہی تھی۔ جب شیلا اور مائیک نے خوابیدہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”جو..... جونی تم اتنی دور کیوں ہو؟“

”ابھی میرے موبائل پر ایک کال آئی تھی۔“

”نان سینس۔“ شیلا اور مائیک نے فحشی آنکھیں کھول کر جونی کو دیکھا پھر قریب ہو کر اس کو اپنے ہاتھوں کے حصار میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے جھنجھلا کر بولی۔ ”اس وقت کوئی اور بات مت کرو۔“

”اکبر مائیک کا فون آیا تھا۔ ناگی اور اس کے دوساتھیوں کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔“

”کیا!“ شیلا اور مائیک نے بھی ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ”تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“

”تم چاہو تو اپنے شاہ جی کوفون کر کے حقیقت معلوم کر لو۔“

”نہیں..... میں اس وقت سکندر علی شاہ کوفون نہیں کروں گی، لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ

چلنے کو تیار ہوں مگر یہ سوچ لو کہ ناگی تمہاری قید میں زیادہ دیر نہیں رہے گا۔ میرے گھر کے بھی انتقام لیتا جانتے ہیں۔

”اتنی جلدی کوئی آخری فیصلہ نہ کرو۔“ لوچن کی نگاہوں میں چنگاریاں لپکتی لگیں۔

”افضل خان۔“ جگا نے افضل خان کو چہیتے ہوئے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”تم اب نکل لو، جاؤ باہر کرل کے سادہ لباس والے موجود ہیں۔ جاتے جاتے ایک بات اور سن لو..... ایک بار تم نے کسی کے اشارے پر مجھے ٹھیکر نے کی کوشش کی تھی، لیکن قدرت کے کسی شبی ہاتھ نے مجھے زندگی عطا کر دی تھی۔ آج میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تم کو معاف کر رہا ہوں۔“ افضل خان کو کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

”پارنٹرم نے کیا سوچا ہے؟“ جگا نے اس بار لوچن سے پوچھا۔

”میں کھڑاک پالنے کا عادی نہیں ہوں، کوئیک ڈسپوزل کانسٹریٹ سب سے آسان بھی ہوتا ہے۔“ اپنے جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی لوچن کے اشارے پر جگا کے پستول سے دو بار میچ کی مدھم آواز ابھری۔ ناگی کسی کئے ہوئے شبیر کے مانند فرش پر ڈھیر ہو گیا پھر لوچن نے بھی باہر کی سمت قدم بڑھائے جہاں ناگی کے دوساتھیوں کی لاشیں بھی موجود تھیں۔

❖❖❖

اس روز اتوار کی چھٹی تھی اس لیے جونی حسب معمول اس وقت بھی شیلا اور مائیک کی خواب گاہ میں اس کے بستر پر موجود تھا۔ اس نے ایک نظر شیلا اور مائیک پر ڈالی جو ابھی تک شب خوابی کے لباس میں بستر پر کسی مدھوش شرابی کی طرح بکھری پڑی تھی۔ جونی نے اس کے نیم عریاں جسم کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی تو اسے خود اپنی قسمت پر رشک آنے لگا مگر اس کی نظر سائڈ ٹیبل پر موجود کیلنڈر پر پڑی تو یلکھت اسے مستقبل شناس مس ڈکسن یاد آگئی جس نے تیرہ کے ہندے کو اس کی زندگی کا سب سے منحوس دن قرار دیا تھا۔ جونی کے ماضی کی کتاب کو اس نے جس انداز سے دہرایا تھا وہ جونی کے لیے حیران کن ہی تھا۔ مس ڈکسن کے کہے ہوئے جیلے جونی کے ذہن میں گونجنے لگے اس نے کہا تھا۔

”تمہارا باپ ایک عیاش اور فریبی شخص تھا۔ اس نے فریب کی بنیاد پر ہی تمہاری ماں سے رشتہ جوڑا تھا لیکن تمہاری پیدائش کے بعد اس کی نگاہوں کے زاویے بدل گئے، وہ دوسری عورتوں کے ساتھ دل بہلانے لگا پھر تمہاری ماں کو تین سال تک تنہائی کے فریب سے دو چار رکھنے کے بعد اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ تمہاری ماں نہایت پاکباز عورت تھی۔ تمہاری پرورش کی خاطر اس نے ایک گھر میں ملازمت کر لی۔ وہاں بھی وہ نظریں جھکا کر کام کرتی رہی۔ خود کو ہوس پرست مردوں کی بھوک نظروں سے دس سال تک کسی نہ کسی طرح بچاتی رہی لیکن ایک دن جب گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے اسی گھر میں آنے جانے والے ایک مرد کے ہاتھوں درندگی کا شکار ہو گئی۔ وہ پاکباز عورت تھی، کسی رسوائی سے بچنے کی خاطر اس نے خودکشی کر لی۔ تم بے سہارا ہو گئے۔ لوگوں نے ترس کھا کر تمہیں ایک یتیم خانے کے سپرد کر دیا۔“

ناگی کی پشت پر اسی کا مضبوط ہاتھ تھا پھر..... قتل کرنے والے کون تھے؟
”میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر اس وقت تمہیں سنجیدگی سے ایک مشورہ ضرور دوں گا۔“
”کیا؟“

”ماہر ترین ملاح بھی ہوا کا رخ بھانپ کر اپنی کشتی کنارے کے قریب لے آتے ہیں۔“
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مستقل نہ سہی لیکن وقتی طور پر تم بھی صرف بیوٹی پارلر کی حد تک محدود ہو جاؤ۔“
شیلہ اور مانے کوئی جواب نہیں دیا لیکن چہرے کے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ
ناگی کے قتل کی اطلاع نے اسے بھی اندر سے جھنجھوڑ دیا ہے۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ جونی نے دلی زبان میں اسے کریدنے کی کوشش کی۔

”ناگی کا قتل سکندر علی شاہ کے لیے بھی ایک کھلا چیلنج ہے۔“

”ہاں۔“ جونی کچھ توقف سے بولا۔ ”اگر اس قتل کے پیچھے شاہ جی کا ذاتی ہاتھ.....“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ شیلہ اور مانے جونی کی بات درمیان سے اچک کر کہا۔ ”وہ شاہ جی کا

خاص مہرہ تھا۔“

”یہ بھی جانتا ہوں لیکن شطرنج کا ماہر کھلاڑی کبھی کبھی ڈھائی گھر چلنے والے گھوڑے کو پہچانے کی
خاطر وزیر کو پٹوا دیتا ہے۔ سیاست کے میدان میں بھی اسی اصول کو اپنانے والا کامیاب رہتا ہے۔“
”آں..... ہاں۔“ جواب ہچکچا کر دیا گیا۔ ”یہ بھی ممکن ہے لیکن اس کا تعلق بیوٹی پارلر کے

دوسرے دھندوں سے کیا ہو سکتا ہے؟“

”ہر فساد کے پیچھے زر، زن اور زمین میں سے کسی نہ کسی کا تعلق بھی ضرور ہوتا ہے۔“ جونی نے
سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نگینہ کی موت کو کیوں بھول رہی ہو؟ رینو کلب سے اغوا کیے جانے کے بعد وہ
جس حالت میں گھر واپس آئی تھی اس کی تفصیل بھی تم ہی نے بتائی تھی۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن نگینہ اور ناگی کی حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔“

”کبھی کبھی انسانی خواہشات بھی اس فرق کو مٹا دیتی ہیں۔“ جونی نے کھنچاؤ کی فضا کو دور کرنے
کی خاطر مسکرا کر جواب دیا پھر اس نے شیلہ اور مانے کو جن نظروں سے دیکھا ان نے اس کی بات کا مفہوم
بھی واضح کر دیا تھا۔

”کیا مطلب؟“ شیلہ نے ادائے خاص سے اسے گھورا۔ ”کیا تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟“

”صرف خوش نہیں..... بہت زیادہ مطمئن بھی ہوں۔“ جونی کی نظریں شیلہ اور مانے کے گداز جسم پر

بھینکنے لگیں۔

”پھر بھی اتنی دور بیٹھے ہو۔“ شیلہ اور مانے ایک تو بہ شکن انگڑائی لے کر نشی نظروں سے جونی کو

دیکھا تو جونی نے بے اختیار ہو کر پھر اسے اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا۔

وقت کے بہاؤ میں ڈوب کر جونی مس ڈکسن کے ایک آخری مشورے کو پھر بھول گیا۔

❖❖❖

سکندر علی شاہ خاصی دیر تک اپنی خواب گاہ میں ٹھہلتا رہا۔ بار بار اس کی نظریں خالی بستر کی
جانب اٹھ رہی تھیں۔

اسے نگینہ کی موت کا غم نہیں بلکہ خوشی ہوئی تھی مگر وہ بستر پر تنہا سونے کا عادی نہیں تھا۔ چاہتا تو
دلربا کے پاس چلا جاتا جسے ہوٹل سے ایک علیحدہ رہائش گاہ پر منتقل کر دیا تھا۔ اس کے لیے دو تین
گارڈز کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ سب کام اس نے بہت رازداری سے کیے تھے تاکہ کسی کو اس
کی بھینک تک نہ ملے۔ رات گئے وہاں جانے اور علی الصبح واپسی کی صورت میں گارڈ کو بھی دلربا اور اس
کے تعلقات پر شبہ ہو سکتا تھا۔ بہت دیر تک وہ ذہنی طور پر الجھتا رہا پھر پہلی بیوی کے کمرے کی جانب
چلا گیا۔

گل اپنے بستر پر لیٹ چکی تھی لیکن شوہر کو آتا دیکھ کر مشینی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ سکندر علی
شاہ نے گل کو ایک نظر دیکھا پھر آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ گل قریب آ کر اس کے قدموں میں بیٹھ
گئی۔

”تم.....“ سکندر علی شاہ نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

”نیچے کیوں بیٹھ گئیں؟“

”مجھے آپ کے قدموں میں زیادہ سکون ملتا ہے۔“

گل نے بڑی عقیدت سے جواب دیا پھر قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”گھر سے
رخصتی کے وقت ماں نے جو جملے کہے تھے وہ آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس نے کہا تھا تم
ڈولی میں بیٹھ کر اپنے گھر جا رہی ہو وہاں سے تابوت میں لیٹ کر ہی واپس نکلتا۔“

”گل.....!“ سکندر علی شاہ نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں تم سے شرمندہ ہوں۔“

”پلیز..... ایسا نہ کہیں۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر شوہر کے برابر بیٹھ گئی۔ پہلی بار خود اس کے شانوں

سے گل کر بڑی حسرت سے بولی۔ ”آپ کی کوٹھی میں تنہا بستر پر لیٹ کر مجھے جو سکون ملتا ہے دنیا میں

کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اس سکون پر صرف اور صرف میرا حق ہے جو میں کسی اور کو نہیں دے سکتی۔“

سکندر علی شاہ پر خلوص جلوں کی گرمی سے کسی موم کی طرح پگھلنے لگا۔ اس نے گل کو ایک نظر

بھر کر دیکھا پھر اسے لے کر بستر پر آ گیا۔ ہانہوں میں لٹا کر بڑی دیر تک محبت بھری باتیں کرتا

رہا۔ گل کو ان قیمتی لمحات پر رشک آ رہا تھا جب موبائل پر سگنل ملا۔ سکندر علی شاہ نے اسے آن کر کے

سنجیدگی سے کہا۔

”ہیلو..... میں.....“

”جانتا ہوں کہ تم سکندر علی شاہ بول رہے ہو۔“

دوسری جانب سے شکرہ کی آواز ابھری۔ ”تم نے دلربا کو ہوٹل سے کہاں منتقل کیا ہے؟“

”کسی ایسی جگہ جہاں کوئی دوسرا اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔“

”بیٹھی شکر یہ۔“ سکندر علی شاہ نے جواب دینے کے ساتھ سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے بادل منڈلانے لگے تھے۔

”میں آپ کے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ گل نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”کوئی پریشانی لاحق ہو تو کافی بھی سکون پہنچانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔“

”کافی سے زیادہ عورت کا قرب بھی مرد کے لیے بڑا پرسکون ہوتا ہے۔“

سکندر علی شاہ نے جواب دینے کے ساتھ ہی گل کو اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا۔ گل کو شوہر کا وہ انداز اپنا نہیں بلکہ اجنبی سا محسوس ہوا لیکن اس نے خود سپردگی میں کسی پس و پیش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ گل کو آغوش میں لینے کے بعد بھی سکندر علی شاہ کے ذہن میں ایک ہی شبہ کسی بھڑکی طرح ڈنک مار رہا تھا۔

”دربار کے اغوا کی اطلاع بھی پہلے شکرہ نے دی تھی پھر اورنگ زیب نے اس کی تصدیق کی تھی۔ ناگی کے قتل کے بارے میں بھی شکرہ نے از خود فون کر کے اسے خبر دی۔ جس کے بعد انیس اورنگ زیب نے ہی اس کی تصدیق کر دی۔ شکرہ اور اورنگ زیب کیا ایک ہی تصویر کے دو مختلف رخ ہیں یا ان کے درمیان کوئی سہرا تعلق بھی ہے؟“



فرحین کا تعلق جہانگیرہ کے ساتھ والے گاؤں ”نودیہ نوے کلی“ سے تھا جسے جہانگیرہ کا ایک حصہ ہی سمجھا جاتا تھا اس لیے کہ دونوں کا درمیانی فاصلہ محض ایک کلومیٹر یا اس سے کچھ ہی زیادہ تھا۔ فرحین ماں باپ کی چیتھی تھی لیکن ماں نے اسے شروع ہی سے کھانا پکانے اور سینے پروانے کی معقول تربیت بھی خصوصی طور پر دی تھی۔ فرحین کو مکی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ بہت پسند تھا جسے وہ بے حد شوق سے پکاتی تھی۔ اس معاملے میں بھی اس کی اور لیاقت حسین کی پسند ایک ہی تھی۔

شہر آنے کے بعد بھی وہ اکثر چھٹی والے دن یہی کھانا پکاتی تھی۔ ایک دن وہ ڈرتے ڈرتے ایک پلیٹ میں ایک روٹی اور ساگ لے کر راحیلہ کے بنگلے میں چلی گئی تھی۔

راحیلہ بیگم کا تعلق جس سوسائٹی سے تھا وہاں گاؤں کی وہ ڈش ایک نئی چیز تھی۔ راحیلہ بیگم نے فرحین کا دل رکھنے کی خاطر اس کے اصرار پر ایک لقمہ بنا کر کھالیا پھر اس کا ذائقہ چب منہ کو لگا تو وہ آدمی پلیٹ کھا گئیں۔ آدمی شوہر کے لیے رکھ دی۔ اس دن کے بعد سے وہ اکثر فرحین سے فرمائش کر کے اس ڈش کو پکوانے لگیں۔

آج بھی فرحین راحیلہ بیگم کے کچن میں کھڑی سرسوں کا ساگ بنا رہی تھی جب اسے لیاقت حسین کی یاد بڑی شدت سے آئی۔ لیاقت حسین کو سراج کی طرف گئے تین چار دن ہی ہوئے تھے۔ اس کے فون برابر آتے رہتے تھے لیکن اس وقت ہانڈی پکاتے ہوئے اسے وہ دن یاد آگئے جب شادی سے پہلے وہ اور لیاقت حسین کہیں چوری چھپے بیٹھ کر اس کھانے کا مزہ لیتے تھے۔

فرحین نے کچن کے دروازے کے قریب آ کر باہر جھانکا۔ راحیلہ بیگم شاید اپنے کمرے میں

”شکرہ کی نگاہیں آسمان کی بلندیوں سے بھی اپنے شکار پر مرکوز رہتی ہیں۔ میں اس بات سے بھی واقف ہوں کہ دلربا کو تم نے اب کہاں رکھا ہے۔“ سکندر علی شاہ نے جواب نہیں دیا دانت پیتا رہا۔

”میں نے ناگی کے سلسلے میں بھی تم سے کہا تھا کہ اسے محتاط رہنے کی وارننگ دے دو۔“

”میں نے اسے ہدایت کر دی تھی۔“ جواب بے زاری سے دیا گیا۔

”جانتے ہو کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟“ سرد لہجے میں دریافت کیا گیا۔

”نہیں۔“

”اے مجھے گیند کے پاس روانہ کر دیا گیا ہے۔ بستی والوں کو بھی اس کی اطلاع بعد میں ملی۔“

”ناگی کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“ سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”یقین سے ابھی نہیں بتا سکتا لیکن زیادہ دیر وہ بھی پردے میں نہیں رہ سکے گا۔ میں نے تمہیں

یہی اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

”کے قتل کر دیا گیا؟“ گل نے دہی زبان میں دریافت کیا۔

”تھا میرا ایک خاص بندہ۔“ سکندر علی شاہ نے سرسری انداز میں جواب دیا پھر کچھ توقف کے

بعد اس نے اورنگ زیب کے نمبر کو ڈائل کیا۔

”خادم بول رہا ہوں۔“ ایک لمبے بعد دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز ابھری۔

”خادم نہیں بھائی۔“ سکندر علی شاہ نے اپنائیت سے کہا۔

”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”میرا ایک خاص بندہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ سوچا کہ آپ کے ذریعے اسے تلاش کروں۔“

”آپ شاید ناگی کی بات کر رہے ہیں؟“ دوسری جانب سے بات جاری رکھی گئی۔ ”اے

ساحلی علاقے میں مجھیروں کی قدیم بستی میں کسی نے قتل کر دیا ہے۔ دو لاشیں اور بھی ملی ہیں۔ بستی کے

سردار نے انہیں ناگی کے ساتھی قرار دیا ہے۔“

”آپ میرا ایک کام کر سکیں گے؟“

”حکم دیں، میں انکار نہیں کروں گا۔“

”مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔“ سکندر علی شاہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں یہ جانتا

چاہتا ہوں کہ ناگی کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟“

”آپ کا شبہ کس پر ہے؟“

”ناگی میرا خاص خادم تھا یہ بات سب جانتے ہیں۔“ سکندر علی شاہ نے سرسراتے لہجے میں

کہا۔ ”اور ناگی کو راستے سے ہٹانے میں بھی کسی آستین کے سانپ کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں علاقے کے تھانے کو ضروری ہدایت دے دیتا ہوں۔ جیسے ہی قاتل بے

نقاب ہوا اس کی اطلاع پہلی فرصت میں آپ کو مل جائے گی۔“

تھیں۔ میدان صاف دیکھ کر فرحین نے موبائل پر لیاقت حسین سے رابطہ کیا۔ جب لیاقت حسین نہیں ہوتا تھا تو راحیلہ بیگم اسے انیکسی کے بجائے اپنے ہنگلے پر روک لیتی تھیں۔ لیاقت حسین سے دوری کے یہ دو چار دن بھی فرحین کو زہر لگتے تھے اس کا اندازہ لیاقت حسین کو بھی تھا۔

”خیریت؟“ دوسری جانب سے لیاقت حسین کی تعجب بھری آواز ابھری۔ ”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”کیا مطلب؟“ فرحین نے فرضی ناراضگی کا اظہار کیا۔

”کیا اب تجھ سے بات کرنے کے لیے وقت لینا پڑے گا۔“

”ناراض نہ ہو لیاقت کا جان۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا۔ ”تیرے بغیر یہاں میرا دل بھی نہیں لگ رہا لیکن سراج صاحب اور اورنگ زیب صاحب کے جو احسان ہیں میں اس کی وجہ سے ان کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔“

”چل چھوڑ ان باتوں کو۔“ فرحین نے بڑی لگاؤ سے کہا۔ ”میں اس وقت بیگم صاحبہ کے کچن سے بول رہی ہوں۔ اب تجھے یہ پوچھنا ہے کہ میں کچن میں کیا پکا رہی ہوں؟“

”بیگم صاحبہ کے کچھ مہمان آگئے ہوں گے ان کے لیے ناشتا بنا رہی ہوگی۔“

”نہیں۔“ فرحین نے مدہم لہجے میں جواب دیا۔

”ایک اور خاص بات ہے۔“

”سمجھ گیا۔“ لیاقت حسین نے بڑے رومانی انداز میں جواب دیا۔ ”کچن میں بیٹھ کر تو مجھے یاد کر رہی ہوگی۔“

”وہ تو میں ہر وقت ہر جگہ کرتی ہوں۔“

”پھر..... اور کیا خاص بات ہے؟“

”وہ جگہ یاد کر لیاقت حسین جب شادی سے پہلے ہم بڑوں کی نظروں سے چھپ کر دوپہر کو ملتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ساتھ دوپہر کا کھانا کبھی.....“

”کئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ بنا رہی ہے۔“

لیاقت حسین نے جملہ کاٹ کر کچھ ایسے انداز میں کہا کہ فرحین کو بھولے سرے دنوں کی یاد آگئی۔ منہ بنا کر بولی۔

”بیگم صاحبہ کی فرمائش تھی اس لیے مجبوراً بنا رہی ہوں لیکن تیرے بنا ایک نوالہ بھی میرے لیے زہر ہوگا۔“

”دیوانی ہو گئی ہے۔“ لیاقت حسین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بیگم صاحبہ اور صاحب کیا سمجھیں گے۔“

”جوجی میں آئے سمجھیں لیکن میں نے جو کہہ دیا وہ کہہ دیا۔“

اسی وقت باہر سے راحیلہ بیگم کی آواز سنائی دی تو فرحین موبائل بند کر کے باہر آگئی۔ باہر لاؤنج

میں راحیلہ بیگم موجود تھیں۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”جانتی ہو فرحین میں نے آج کئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کیوں تیار کر دیا ہے؟“

”کوئی خاص بات ہے؟“ فرحین نے راحیلہ بیگم کو وضاحتی نظروں سے دیکھا۔

”ہاں آج میری شادی کی سالگرہ کا دن ہے جسے عثمان اکثر بھول جاتے ہیں۔“

”فکر ہی نہ کریں۔“ فرحین نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”میں کسی نہ کسی بہانے صاحب کو یاد کروا دوں گی۔“

”لیاقت حسین کو یاد رہتا ہے تمہاری سالگرہ کا دن؟“

”وہ..... وہ تو دو تین دن پہلے ہی مجھے چھیڑنا شروع کر دیتا ہے۔“ فرحین نے لجا کر کہا پھر جلدی

سے بات گھما کر بولی۔ ”صاحب تو آپ کو اس موقع پر کوئی قیمتی تحفہ بھی ضرور دیتے ہوں گے؟“

”ہاں ہم دونوں ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں۔“ راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”پہلے باقاعدہ دوستوں کو بھی بلایا کرتے تھے لیکن اب ادھر دو تین سالوں سے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ سالگرہ کا دن میاں بیوی کو اکیلے ہی منا کر زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ بلا وجہ کا ہنگامہ ہوتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیاقت حسین بھی ایسا ہی کرتا ہے۔“

”تم نے لیاقت کا نام اچھا یاد دلایا۔“ راحیلہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ ”آج مجھے اس وقت اس سے ایک ضروری کام بھی ہے۔“

”آپ یا صاحب فون کریں تو بھاگا چلا آئے گا۔“

”اور اگر تم فون کرو تو انکار کر دے گا؟“

”پتا نہیں۔“ فرحین نے معصومیت سے جواب دیا۔

”غلط خیال ہے۔“ راحیلہ بیگم نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”میں جانتی ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے کو کتنا پیار کرتے ہو۔ لیاقت حسین تمہیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔“

”آپ نے اسے بھائی بنا لیا ہے اس لیے ایسا کہہ رہی ہیں ورنہ سارے مرد ایک جیسے بھی نہیں ہوتے۔“

”یہ بات تم دل سے کہہ رہی ہو؟“

”دل کی بات ہر ایک کو نہیں بتانی چاہیے۔“ فرحین نے شوخی سے کہا۔ ”لیاقت کہتا ہے کہ اس سے دوسروں کی نظر لگ جاتی ہے۔“

”اور اگر کوئی دل کی بات زبان سے سن لے تو؟“

اس بار راحیلہ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ فرحین نے چونک کر پوچھا۔

”بیگم صاحبہ کی فرمائش تھی اس لیے مجبوراً مٹی کی روٹی اور سروس کا ساگ بنا رہی ہوں لیکن تیرے بنا ایک نوالہ بھی میرے لیے زہری ہوگا۔“ راجیلہ بیگم نے فرحین کا موبائل پر کہا ہوا جملہ دہرایا تو فرحین کا چہرہ تپ کر گلزار ہو گیا۔ بے اختیار وہ راجیلہ بیگم کے پہلو میں ہی سمٹ کر رہ گئی۔



لوچن اس وقت ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے تھریڈ فلور پر صوفے پر بیٹھائی دی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں اسکرین پر تھیں لیکن ذہن میں ایک نام ہی رہ رہ کر گونج رہا تھا۔ شیخ حامد..... اس نام کے پس منظر میں دو نام اور بھی تھے۔ ڈوما، جس کا تعلق بیروت سے تھا اور ہاشم جو جنوبی افریقہ کے ایک قبیلے کا پراسرار فرد تھا۔ لوچن سے ان دونوں کی ملاقات ہوائی جہاز میں ہوئی تھی۔ لوچن کی صرح ان دونوں کا تعلق بھی انڈر ورلڈ کے ان نامی گرامی لوگوں میں سے تھا جن کی لغت میں ناکامی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان تینوں کو ایک بہت بڑی اور منہ مانگی قیمت پر ہار کیا گیا تھا۔ صرف ایک مخصوص کوڈ سیون اسٹار بتایا گیا تھا جس پر ملنے والی ہدایات پر انہیں عمل کرنا تھا۔ ان کو ایک ہی ٹارگٹ دیا گیا تھا۔ شیخ حامد کو کسی بھی طرح موت کے گھاٹ اتارنا۔ شیخ حامد کوئی عام آدمی نہیں تھا اس کا شمار ہی ڈان گردپ کے خطرناک ترین افراد میں کیا جاتا تھا۔

پھر اس جنگ میں ڈوما اور ہاشم دونوں ہی کام آگئے تھے لیکن شیخ حامد ایک بار مردہ مشہور ہونے کے بعد پھر زندہ ہو گیا تھا مگر اس طرح انڈر گراؤنڈ ہو کر رہ گیا تھا کہ اس کا سراغ لگانا لوچن کے بس میں بھی نہیں تھا۔ اس کے معاہدے کی مدت بھی ختم ہو رہی تھی جسے سیون اسٹار کی جانب سے بڑھانے کی پیشکش بھی ہوئی تھی مگر لوچن نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ وہ ذاتی طور پر بھی شیخ حامد یا آکٹوپس کو اپنے لیے چیلنج سمجھتا ہے اور اس مشن کو پورا کیے بغیر واپس نہیں جائے گا۔

اس وقت بھی لوچن کا ذہن شیخ حامد کی موت کی پلاننگ میں مصروف تھا۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ سکندر علی شاہ اور شیخ حامد کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں ضرور ملتے ہیں۔ فارم ہاؤس ایسی جگہ تھی جہاں شیخ حامد روپوش ہو سکتا تھا لیکن کس حیثیت میں؟ اس سوال کے جواب کے بغیر لوچن کے لیے ادھر کا رخ کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ وہ مختلف زاویوں پر غور کر رہا تھا جب دروازے پر کسی نے دستک دی۔ لوچن کسی آدم خور چیتے کی طرح چونکا شاید اس لیے کہ وہ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنے کا عادی تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر اس کی ہول سے باہر جھانکا دروازے پر ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی۔

”کون ہے؟“ لوچن نے کھردرے لہجے میں سوال کیا۔

”روم ہوٹلیس۔“ مختصر جواب ملا۔

لوچن نے اس حوالے پر دروازہ کھول دیا۔ کمرے کی صفائی اور بیڈ فیش کا بدلنا معمول کی

بات تھی جس کی خاطر ہوٹل کی لڑکیاں آتی جاتی رہتی تھیں لیکن آنے والی لڑکی کو دیکھ کر لوچن کے ذہن میں ایک شبہ سا ابھرا اس کی وجہ شاید یہ تھی اس لڑکی کے شانوں پر ہوٹلیس کا مخصوص بیج نہیں تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ لڑکی نے اندر آ کر لوچن کو بھرپور نظروں سے دیکھا تھا پھر کمر کو بل دیتے ہوئے آگے بڑھ کر خالی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ لوچن نے حفظ ماتقدم کے طور پر دروازے کو اندر سے لاک کیا پھر لڑکی کے سامنے آ کر خشک لہجے میں پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”ہوٹلیس ہی سمجھیں۔“ لڑکی بے شرمی سے مسکرائی۔ ”آپ دروازے سے یہاں مقیم ہیں اس لیے میں یہ سوچ کر آ گئی کہ شاید آپ کو کسی سائیکس کی ضرورت ہو۔“

”کال گرل ہو؟“ لوچن کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔

”یہی سمجھ لیں۔“ لڑکی نے اس بار ایک توبہ شکن آنکرائی لے کر جواب دیا۔

”گیٹ لاسٹ۔“ لوچن نے حقارت سے اسے دھتکارا۔ ”میرا وہ ٹائپ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ میں تمہاری شکایت براہ راست ہوٹل مینجمنٹ سے کروں گا۔“

”ایسی بھی کیا بے مروتی۔“ لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہارا ٹائپ کیا ہے میں نے سن لیا ہے مگر کیا ایک کپ کافی کو بھی نہیں پوچھو گے؟“

”نہیں۔“ لوچن کے تہور اور جارحانہ ہو گئے۔

”وقت مت ضائع کرو ورنہ میں تمہیں بالکونی میں لے جا کر نیچے پھینکنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ آؤٹ ڈرنی فٹ۔“ آخری جملہ لڑکی کے لیے کھلا چیلنج تھا مگر وہ اس طرح مسکرائی جیسے اس جملے کا اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

لوچن ایک خوب صورت اور بے غیرت لڑکی کے ساتھ بات بڑھا کر ہوٹل میں تماشا بھی بن سکتا تھا۔ اس نے لڑکی کو کھانے والی نظروں سے دیکھا پھر بستر کے قریب میز پر رکھے فون کا ریسیور اٹھا کر براہ راست منیجر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن فون کی لائن ڈیڈ تھی۔ وہ جھلا کر لڑکی کی طرف پلٹا جو نہایت پھرتی سے خود کو عریاں کر چکی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر لوچن کا خون کھول اٹھا۔ اس نے لپک کر لڑکی کا ہاتھ تھاما اور گھسیٹ کر دروازے تک لے آیا لیکن پھر جو کچھ ہوا اس نے لوچن کو بھی بوکھلا دیا۔

دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر ہوٹل کے منیجر اور ایک باوردی اے ایس آئی پر پڑی۔ لڑکی نے ایک دم ہی چلنا شروع کر دیا۔ لوچن کی طرف اشارہ کر کے ہدایاتی انداز میں بولی۔

”یہ..... یہ جنگلی مجھے زبردستی اپنے کمرے میں گھسیٹ لایا اس کی نیت اچھی نہیں تھی۔“

”شی از..... تان سنس۔“ لوچن نے جھنجھلا کر اے ایس آئی سے کہا پھر منیجر سے کچھ کہنا چاہتا تھا جب اے ایس آئی نے انتہائی کرخت انداز میں کہا۔

”تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”کس جرم میں؟“ لوچن نے تمللا کر سوال کیا۔
 ”اس لڑکی کی سبیلی نے باقاعدہ تھانے میں رپورٹ درج کروائی ہے کہ تم نے اس وقت اسے پکڑ کر کمرے میں تھسٹ لیا جب یہ اپنے کسی مہمان سے ملنے آئی تھی۔“
 ”یہ..... یہ بکواس کرتی ہے۔ شی ازاے پر اسٹی ٹیوٹ۔“
 ”پلیز مسٹر لوچن۔“ نیجر شائستہ مگر سرد لہجے میں بولا۔
 ”یہ ہمارے ہوٹل کی عزت کا بھی سوال ہے۔ آپ پولیس کے ساتھ تعاون کریں۔ کیا سچ ہے کیا جھوٹ اس کا فیصلہ اب پولیس کرے گی۔“
 ”ڈونٹ وری نیجر۔“ اے ایس آئی نے نیجر سے کہا۔ ”میں تمہارے ہوٹل کی بدنامی کی وجہ سے وین لایا ہوں۔“
 ”لڑکی بدستور اے ایس آئی کے قریب اس طرح سہی کھڑی تھی جیسے وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتی ہو۔ وہ جو بھی تھی پروفیشنل اداکارہ ہی لگ رہی تھی۔“
 ”ٹریپ.....!“ لوچن کے ذہن میں ایک فوری شبہ نے سرا بھارا۔ اس کے ساتھ کئی سوال اور بھی گونجنے لگے۔

لڑکی جس انداز میں آئی تھی وہ سو فیصد اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ کال گرل ہے۔ خود لڑکی نے بھی انتہائی بے شرمی سے اس کا اعتراف کر لیا تھا پھر جتنی دیر میں لوچن نیجر کو فون کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خود کو نیم عریاں بھی کر لیا تھا۔ فون کی لائن بھی خلاف توقع ڈیڈ تھی اور جب لوچن لڑکی کو دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر نکالنے کا ارادہ کر چکا تھا تو ہوٹل کا نیجر اور ایک اے ایس آئی اسے دروازے پر ہی ملے تھے۔ لوچن اتنے سارے اتفاقات کو بیک وقت ہضم کرنے کو تیار نہیں تھا۔
 جو صورت حال درپیش تھی اس میں کئی جھول تھے جسے کم از کم لوچن جیسا جہان دیدہ شخص فوراً ہضم کرنے کو تیار نہیں ہو سکا۔ جن حالات سے وہ گزر رہا تھا اس میں بھی ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا اس کے پیچھے کا تقاضا بھی تھا۔
 ”پلیز مسٹر لوچن۔“ نیجر نے اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا پھر درخواست کی۔ ”آپ کا تعاون ہمارے ہوٹل کی ساکھ کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے میں ذاتی طور پر بھی آپ کا شکر گزار ہوں گا۔“

”یہ لڑکی فراڈ ہے۔“ لوچن نے اس بار لڑکی کو خونخوار نظروں سے گھورا۔ ”اس نے پولیس کو جو بیان دیا وہ بھی فراڈ ہے۔“
 ”اس کا فیصلہ تھانے جا کر ہی.....“
 ”نہیں پولیس آفیسر۔“ لوچن نے اے ایس آئی کو بھی تیز لہجے میں مخاطب کیا۔ ”میں تمہارے ملک کا ایک عام شہری نہیں ہوں جسے تم کسی بناوٹی ڈرامے میں بحیثیت مجرم پھانس لیتے ہو، میرا تعلق ایک غیر ملکی سفارت خانے سے ہے۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“

”آپ درست فرما رہے ہیں جناب۔“ اے ایس آئی کا رویہ یکنخت تبدیل ہو گیا پھر بھی اس نے دبی زبان میں کہا۔ ”یہاں بات اگر خراب ہو گئی تو.....“
 ”میں نے بھی آپ سے تعاون کی درخواست کی تھی سر۔“ نیجر بھی سنبھل کر بولا۔ ”ورنہ ہمیں بھی آپ کی حیثیت کا احساس ہے۔“
 ”اس ڈیڑی گرل کی جس فریڈ نے تھانے میں شکایت کی تھی اسے بھی یہاں لاؤ۔“ لوچن نے بدستور خفگی کا اظہار کیا۔ ”میں اپنے وکیل کو کال کر دیتا ہوں۔ قانونی مشوروں کے بغیر میں بھی کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔“
 ”جیسا آپ مناسب سمجھیں مسٹر لوچن لیکن میں بھی اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کا پابند ہوں۔“ اے ایس آئی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

لوچن نے اس بار جواب دینے کے بجائے لڑکی کو حقارت سے گھورا پھر اس نے کمرے میں آکر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کا ذہن اس وقت بھی پیش آنے والی صورت حال کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ جس مشن پر تھا اس میں سرفہرست صرف ایک ہی نام شیخ حامد، وہی آکٹوپس۔

پندرہ سے بیس منٹ تک لوچن کا ذہن الجھتا رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر جگا کے نمبر ملائے۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے کمرے میں آنے والی لڑکی اور بعد کی تمام تفصیل ایک ہی سانس میں دہرا دی۔
 ”تم نے ذاتی طور پر کیا اندازہ لگایا؟“ جگا نے پوری صورت حال معلوم کرنے کے بعد سوال کیا۔

”کہیں نہ کہیں دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔“
 ”میرا مشورہ مانو تو پہلی فرصت میں اورنگ زیب صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو۔“ جگا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”جو صورت حال تم نے بیان کی ہے اس میں مجھے شروع سے آخر تک بارود ہی کی بو محسوس ہو رہی ہے۔“
 ”اوہ..... تم شاید صحیح کہہ رہے ہو۔“ لوچن نے پر خیال انداز میں جواب دیا۔

”یہ معاملہ نمٹ جائے تو موجودہ ہوٹل کی رہائش بھی فوری طور پر ترک کر دینا۔“ وٹس پو آل دا بیسٹ۔“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ لوچن نے جگا کے مشورے پر دوبارہ موبائل پر ایس بی اورنگ زیب کے نمبر شیخ کیے لیکن نمبر مصروف ہے کا ریکارڈ ڈ جواب سن کر جھلا گیا پھر اسے رابطہ قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دروازے پر ہونے والی دستک سن کر لوچن جھلا کر اٹھا۔ آنے والا وہی اے ایس آئی تھا، لیکن اس بار اس کے ساتھ لڑکی یا نیجر کے بجائے ایک سوئڈ بوئڈ مرد نظر آیا جس نے آنکھوں پر مرمری گلاسز والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ فرنج کٹ ڈاڑھی اور قد رے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کی شخصیت بھی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

”آپ کی تعریف؟“ لوچن نے نووارد پر ایک نظر ڈال کر اسے ایسی آئی سے سوال کیا۔

”یہ میرے بگ باس ہیں۔ نیجری کی درخواست پر آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

”لوچن کوئی جواب دینا چاہتا تھا جب نووارد نے کہا۔“

”دروازے پر نہیں اندر بیٹھ کر اطمینان سے گفتگو کرتے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے جس لڑکی

نے آپ کو ڈسٹرب کیا اس کا تعلق بھی ریڈ لائٹ ایریا سے ہوگا۔“

”کمرے میں داخل ہو کر نووارد بڑے سکون سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ لوچن کی نظریں بدستور اس کی شخصیت کو کھوج رہی تھیں جب باوردی اسے ایسی آئی دروازہ بند کر کے نووارد کی پشت پر آکر کھڑا ہو گیا۔“

”میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ہی کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔“ نووارد نے براہ راست لوچن کی پرتجسس نظروں میں دور تک جھانکتے ہوئے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب سے باہر آگیا جس میں ساٹنسر لگا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا پستول بھی موجود تھا۔

لوچن کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا یہ پہلا اتفاق تھا جب اس نے اپنی پیشہ دارانہ زندگی میں کسی مطلوبہ شخص کو پہچاننے میں غفلت سے کام لیا تھا۔ اس کے سارے تن بدن میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔

”تم.....!“ لوچن نے بڑے سکون سے نووارد کو دیکھا جو شیخ حامد کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

”میں تم جیسے چھوٹے لوگوں کو زیادہ منہ لگانے کا عادی نہیں ہوں۔“ شیخ حامد زہر آلود لہجے میں

بولتا۔ ”ویسے بھی تمہارا وقت اب پورا ہو گیا، اوپر ڈوما اور ہاشم بھی تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے..... کبھی یاد آتی ہے ان کی؟“

لوچن نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاشم اور ڈوما کے حوالے کے بعد اسے یقین آگیا تھا کہ خوب صورت لڑکی کو بطور چارا استعمال کیا گیا تھا۔ موت اور زندگی کا کھیل کھیلتے اس کی عمر گزری تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے بھی دشمن کے جال میں پھنس سکتا تھا یہ بات کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو پروفیسر چنگ لائی فار چون؟“ شیخ حامد نے اس کا مذاق اڑایا۔ ”اب ستاروں کی چال تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔“

”پستول ہاتھ میں ہوتو نیچڑا بھی مرد بن جاتا ہے۔“ لوچن نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”مرد ہوتو پنچہ لڑا کر دیکھ لو تمہیں بھی لوچن کی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔“

”تم ہوٹل سے باہر ہوتے تو تمہیں اس کا موقع بھی ضرور دیتا لیکن فی الحال میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔“ شیخ حامد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”حالات اور موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس وقت میں بھی تمہارے ہی پسندیدہ فارمولے کو ٹیک ڈسپوزل کے فارمولے کو اپنانا پسند کروں گا، کیا

خیال ہے؟“

لوچن نے جواب دینے کے بجائے پچھلے کے بل بیٹھ کر کسی پھر کی طرح چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے۔ اس کی حسرت دل کی دل میں ہی رہ گئی پستول سے نکل ہوئی گولی اس کی گردن میں بیوست ہوئی تو وہ پکڑا کر فرش پر لیٹ گیا۔

شیخ حامد سینہ تان کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے یکے بعد دیگرے مزید دو قافز کیے تو لوچن کے کو ٹیک ڈسپوزل میں اسے کوئی دشواری بھی نہیں ہوئی۔

”یہ..... یہ آپ نے کیا کیا؟“ اسے ایسی آئی نے شیخ حامد سے کہا۔ ”یہاں سے کسی لاش کا چوری چھپے ہوٹل سے باہر نکال کر لے جانا آسان نہیں ہوگا۔ میری آفیشل پوزیشن بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔“

”فکرت کرو، ہوٹل منتقلین جہیں بھی لاش ہی کی صورت میں کسی نہ کسی طرح ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر دیں گے۔ میں باوردی شکاری کتوں کو بھی زیادہ دیر نہیں پالتا۔“

جواب میں اسے ایسی آئی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسے مہلت نہیں ملی۔ شیخ حامد نے پستول کے میگزین کی باقی گولیاں اس جسم میں اتار دیں پھر اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ ایک وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور رنگ زیب سے بات کر رہا تھا۔

”کوئی نئی اطلاع؟“ دوسری جانب سے ایسی پی کی آواز ابھری۔

”ہاں..... تمہارا ایک ٹریینی شکاری کتا مار دیا گیا۔“ شیخ حامد نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”میں لوچن کی بات کر رہا ہوں۔ اس کی اور تمہارے جھگڑے کے ایک بکاؤ غدار کی لاشیں اس وقت بھی شہر کے واحد قانونی اسٹار ہوٹل میں موجود ہیں۔ تم اپنے ذرائع سے بھی اس کی تصدیق کروالو۔“

”میں جواب میں صرف ایک ہی بات کہوں گا۔“ اورنگ زیب کی طرف سے سپاٹ اور خشک لہجے میں جواب ملا۔ ”گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ ہمیشہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔“

”دنیا اب بہت آگے نکل چکی ہے ایسی پی اور تم ابھی تک گھسے پٹے محاوروں کو دہرا رہے ہو۔“

”اس کے علاوہ اور بھی کوئی بکواس کرنی ہے؟“

”درشت انداز میں پوچھا گیا“

”کچھ دن اور انتظار کرو اس کے بعد تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ خشکی کا آکٹوپس سمندری آکٹوپس کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔“ شیخ حامد نے بڑے سرد اور سفاک انداز میں جواب دیا پھر رابطہ بھی ختم کر دیا۔ اس وقت اس کی نگاہیں خون آشام درندوں ہی کی مانند چمک رہی تھیں۔



شبم چائے کی ٹرے لیے کمرے میں آئی تو افضل خان اس وقت بھی اپنی کسی سوچ میں غرق تھا۔ شبم نے اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا لیکن وہ ادھر کچھ دنوں سے یہ ضرور محسوس کر رہی تھی کہ

افضل خان اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے کسی سوچ میں گم ہو جاتا تھا۔
”ہیلو.....!“ اس نے افضل خان کو بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ اس

کمرے میں موجود ہوں۔“
جواب میں افضل خان نے معمول کے مطابق شبینم کو پیار بھری نظروں سے دیکھا پھر اس کی نظر ٹرے میں رکھے تازہ تیار کردہ کیک پر پڑی تو اس نے شبینم کو چھینرنے کی خاطر پوچھا۔
”آج یہ کس خوشی میں تیار کیا گیا ہے؟“

”کوئی نیا مہمان.....“
”ہلی کو خواب میں چھپھڑے۔“ شبینم خوشی سے بولی۔ ”تم مردوں کو شادی کے بعد ہمیشہ نئے

نئے مہمانوں کے خواب آتے رہتے ہیں۔“
”قدرتی بات ہے۔“ افضل نے شبینم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنائیت سے جواب دیا۔ ”انسان جب کوئی خواب دیکھتا ہے تو اس کی تعبیر کے بارے میں ضرور سوچتا ہے۔“
”اوکے۔“ شبینم نے پیار سے کہا۔ ”ایک اشارہ دیتی ہوں۔ اس کے ذریعے بوجھنے کی کوشش

کرو۔ یہ کیک بھی کسی ایسے خواب کی تعبیر ہے جو پورا ہو گیا ہے۔“
”کوئی اتا پتا؟“ افضل خان نے بچوں کی طرح دریافت کیا۔
”پہلے کیک کاٹ لو ورنہ چائے بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ شبینم نے ٹرے چھری اٹھا کر افضل

خان کی طرف بڑھائی۔ افضل خان کو اچانک یاد آ گیا کہ آج اس کی سالگرہ تھی۔ جواب میں اس نے شبینم کا ہاتھ تھام کر کیک کاٹتے ہوئے بڑی رازداری سے کہا۔
”میں ہار گیا تم جیت گئیں لیکن یہ تقریب کیا صرف کیک کاٹنے تک محدود نہیں رہے گی؟“
”ایک شرط پر۔“ شبینم نے خوشی سے جواب دیا پھر چائے بناتے ہوئے اس نے افضل خان

سے کہا۔ ”میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ادھر کچھ دنوں سے بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو جاتے ہو کوئی خاص بات ہے؟“
”ہاں، ناگی کی موت۔“ افضل خان پھر کسی خیال میں ڈوب گیا۔
”ناگی کا شمار ہمارے دوستوں میں نہیں دشمنوں میں تھا۔“ شبینم نے پرچس انداز اختیار کیا۔ ”اور پھر ناگی کے لیے کرٹل احتشام نے تمہیں آمادہ کیا تھا۔“
”ہاں، لیکن اس دن کسی نے ایک ایسی بات کہی تھی جس نے میری روح کو زخمی کر دیا۔“

”کون تھا وہ؟“
”جہانگیر بیٹ عرف چچا۔“ افضل خان نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک موقع پر کسی دشمن نما دوست کے کہنے پر اسے گھبرنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی کی مداخلت پر وہ بچ گیا تھا۔ ناگی کی موت سے کچھ دیر پیشتر اس نے اس بات کا طعنہ دے کر مجھے وہاں سے نکل جانے کا موقع فراہم کیا تھا۔“

”اوہ۔“ شبینم یلکھت سنجیدگی ہو گئی۔ ”چکا کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں ہیں لیکن اتنا ضرور پتا ہے کہ وہ با اصول آدمی ہے اور تم جس شخصیت کا حوالہ دے رہے ہو اس نے ایک بار مجھے بھی تمہیں شکار کرنے کو کہا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تم اس کے ملازم نہیں تھے۔“
”جانتا ہوں۔“ افضل خان نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے مجھے شیلٹر فراہم کرنے میں خاصا رسک بھی لیا تھا۔“
”کیا مطلب؟“

”میڈم کے شوہر کے علاوہ اسی کینے نے میرے سر سے ماں کا سایہ بھی چھین لیا تھا۔ شبینم سرد آہ بھر کر بولی۔ ”میں نے اس کی فرم میں ملازمت بھی اسی وجہ سے اختیار کی تھی کہ کسی موقع پر ماں کی موت کا قرض چکنا کروں، مگر مجھے کوئی مناسب موقع ہی نہیں مل سکا۔“

”فکر مت کرو۔“ افضل خان نے شبینم کا ہاتھ تھام کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”پولیس کے علاوہ مجھے بھی اس کی تلاش ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی ملا میں اسے موت کے گھاٹ اتارنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کروں گا۔ یہ بھی قدرت کا کھیل ہے کہ کل تک جو سینہ تان کر دندا پھرتا تھا آج چوروں کی طرح کوئے کھدروں میں چھپتا پھر رہا ہے۔“

”جلد بازی میں یہ نہ بھول جانا افضل کہ اب تم تنہا نہیں ہو میرا مستقبل بھی تمہارے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔“ جواب میں افضل خان نے قریب کھسک کر شبینم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اس وقت شبینم کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے تپتی دھوپ میں اسے کوئی تناور اور سایہ دار درخت مل گیا ہو۔



چھپلے دس پندرہ دنوں سے آنے والے تمام کالوں کو میڈم روبی کے بجائے لاؤنج میں رکھے ہوئے آپریٹر سیٹ پر براہ راست تحریر یا ہی وصول کرتی تھی۔ اس نے میڈم سے اس تبدیلی کی وجہ دریافت نہیں کی تھی، لیکن بدلتے حالات کے پیش نظر وہ سمجھ سکتی تھی کہ کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور تھی جس کے پیش نظر میڈم نے کرٹل احتشام کو فون کر کے گھر کے تحفظ کی درخواست کی تھی۔ کرٹل احتشام نے ملٹری کے کچھ کمانڈرز بھی سادہ لباس میں تعینات کر دیئے تھے۔ پولیس کی نفری بھی آنے جانے والوں پر نظر رکھتی تھی صرف خاص خاص لوگوں کو اندر آنے کی اجازت دی جاتی تھی۔

تحریر یا نہ کبھی اس بات کی جرأت بھی نہیں کی تھی کہ وہ میڈم سے ان تبدیلیوں کی وجہ دریافت کرتی لیکن اس موقع پر تحریر یا بھی ان جانے دشمنوں کے ہاتھوں میں پھنس گئی تھی۔ جو افراد اس کی گمرانی پر مامور تھے وہ بھی اچھے فٹاش کے نہیں تھے۔ تحریر یا کے سامنے وہ بیہودہ مذاق کیا کرتے، جوش حرکتیں کرتے لیکن وہ شاید گیدڑ تھے۔ اس بات کے منتظر تھے کہ پہلے شیر یا چیتا اسے شکار کر لے پھر وہ بھی اس کی آبرو کی ٹکا بولی کرنے میں دیر نہ کرتے، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ میڈم کی سفارش پر اسے باعزت طور پر واپس کر دیا گیا تھا۔

”وہ کون لوگ تھے؟ میڈم کی سفارش پر وہ پتھر سے موم کیوں پڑ گئے تھے؟ میڈم کا ان سے

کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور ہوگا؟ اس تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ وہ کس بات کی لالچ تھی جس نے انہیں تحریر یا کو چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور اب..... کیا مجبوری تھی جس نے میڈم کو صرف گھرتک محدود کر دیا تھا۔ اس نے فون کا لڑ بھی ریسیور کرنی بند کر دی تھیں مکان پر کمانڈوز تعینات کر دے تھے۔“

ان تمام باتوں کے پس منظر میں تحریر یا کے ذہن میں صرف ایک ہی نام ابھرتا تھا، شیخ حامد۔ جو میڈم کے شوہر کا قاتل تھا پڑائی سے انتقام لینے کی خاطر میڈم نے انڈر ورلڈ کے تین آدمیوں کی خدمات حاصل کی تھیں جنہیں سیون اسٹار کوڈ ورڈ سے احکامات جاری کیے جاتے تھے۔ ان تینوں میں سے دو مارے جا چکے تھے صرف لوچن باقی رہ گیا تھا جس نے معاہدے کی مدت میں توسیع کے لیے رقم لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ بذات خود بھی اپنے دوستوں کا انتقام لیے بغیر واپس نہیں جائے گا، لیکن اس کے بعد کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ضرور ہوا تھا جس نے میڈم کو بھی خود اپنے خول کے اندر بند رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ کیا بات تھی؟ اس وقت بھی تحریر یا ان ہی خیالات میں الجھ رہی تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔ تحریر یا کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ دوسری گھنٹی کے بعد بنے اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”میڈم سے بات کراؤ۔“ دوسری جانب سے بڑا تھکسا نہ لہجہ اختیار کیا گیا۔

”آپ کا نام؟“ تحریر یا نے مہذب لہجے میں سوال کیا۔

”وہی جس نے میڈم کی درخواست پر نہیں برباد کیے بغیر واپس کر دیا تھا۔“ حقارت سے کہا

گیا۔ ”کیا یہ حوالہ تمہارے لیے کافی نہ ہوگا؟“

تحریر یا کے سارے وجود میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ جو حوالہ دیا گیا تھا وہ نامکمل ہونے کے باوجود بہت واضح تھا۔ تحریر یا ہونٹ چبانے لگی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ بدستور خشک لہجے میں سوال کیا گیا۔

”میڈم اس وقت آرام کر رہی ہیں۔“ تحریر یا نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”بیڈروم کا دروازہ

بھی اندر سے بند ہے۔“

”میں جس دن اپنی ضد پر آ گیا اس روز سارے بند دروازے کھل جائیں گے۔“ دوسری جانب سے بیہودہ انداز میں کہا گیا۔ ”فی الحال اپنی میڈم کو ایک ضروری اطلاع دے دینا۔ اس کے آخری شکاری کتے کو بھی میں موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں، میں لوچن کی بات کر رہا ہوں۔“

”مم..... میں کسی لوچن کو.....“

”کھال سے باہر نکلنے کی کوشش دوبارہ نہ کرنا ورنہ تم بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوگی۔“ اس جملے کے اختتام کے ساتھ ہی دوسرے جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

تحریر یا نے ایک طویل سانس لے کر فون کا ریسیور کریڈل پر واپس رکھ دیا۔ آنے والی کال اور لوچن کے حوالے سے اس کے ذہن میں پھر ایک ہی نام ابھرا..... شیخ حامد کچھ لمحے وہ گم سم بیٹھی رہی

پھر وہ میڈم کو آنے والے فون کے بارے میں بتانے کی خاطر اپنی جگہ سے اٹھی ہی تھی جب اس کی نظر الماس پر پڑی جو اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔

”آپ..... کب آئیں؟“

”زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“ الماس نے مسکرا کر کہا۔ ”تم فون پر باتیں کر رہی تھیں اس لیے میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کس کی کال تھی؟“

”میڈم کی۔“ تحریر یا نے مختصر جواب دیا۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ الماس کو آنے والی کال کی تفصیل بتا دے لیکن الماس تیز تیز قدم اٹھاتی میڈم کے کمرے میں چلی گئی جہاں میڈم روپی نے اس کا استقبال بڑے پر جوش انداز میں کیا تھا۔

”آج راستہ کیسے بھول گئیں؟“

”تم تیار ہونے میں کتنی دیر لگاؤ گی۔“ الماس نے سوال کیا۔

”خیریت؟“

”کچھ شاپنگ کرنے کا ارادہ ہے۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ لے لوں۔“

”اوہ۔“ میڈم نے شوخی سے پوچھا۔ ”کیا سراج بھائی نے کہیں لمبا ہاتھ مارا ہے؟“

”ارادہ تو تھا لیکن میرے درمیان میں آ جانے سے اب رشتے کی نوعیت بھائی کی بہن جیسی ہو گئی ہے۔“ اس نے سرد آہ بھر کر ترکی جواب دیا۔ ”بہ ظاہر تو یہی نظر آتا ہے۔ دلوں کا حال اللہ جانے۔“

”خدا ہی سمجھے تم سے۔“ میڈم نے مسکرا کر کہا پھر اس نے تیار ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ دونوں کمرے سے باہر آ گئیں تو تحریر یا نے دبی زبان میں کہا۔

”میڈم، آپ کے لیے ایک کال آئی تھی لیکن میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”اچھا کیا۔“ میڈم نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر وہ الماس کے ساتھ باہر آ گئی جہاں لیاقت حسین نے ان کو دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

تین منٹ بعد الماس اور میڈم روپی شہر کے سب سے بڑے سپر اسٹور میں موجود تھیں۔ الماس نے ساتھ لائی فہرست نکال لی تھی۔ میڈم نے بھی دو چار روز مرہ کے استعمال کی چیزیں لے لیں پھر الماس کی نظر کاؤنٹر کی طرف اٹھی تو وہ شیلا ورما کو دیکھ کر چونکی۔ چونکنے کا سبب وہ لڑکی تھی جس کی عمر اٹھارہ سال کے پیٹے میں تھی۔ شیلا ورما اور لڑکی کے سامنے اچھا خاصا سامان جمع تھا۔ وہ پرس کھول کر بڑے بڑے نوٹ نکال رہی تھی۔ الماس نے کہنی مار کر میڈم روپی کو کاؤنٹر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا پھر دبی زبان میں پوچھا۔

”جانتی ہو یہ عورت کون ہے؟“

”ہاں، ہنی مون بیوٹی پارلر چلاتی ہے۔“ میڈم نے سرسری جواب دیا۔ ”ایک دو بار میں بھی گئی تھی لیکن تم اسے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“

”میں اس کے ساتھ کھڑی اس معصوم لڑکی کے تباہ ہوتے ہوئے مستقبل کے بارے میں غور کر رہی ہوں۔“

”کیا مطلب؟ کون ہے یہ لڑکی؟“ میڈم نے چونک کر دریافت کیا۔

”کوئی نیا شکار لگ رہی ہے۔“ الماس نے مدھم لہجے میں شیلا ورما کے مذموم کاروبار کے بارے میں مختصراً بتاتے ہوئے کہا۔ ”میرا بس چلے تو اس عورت کو پہلی فرصت میں گولی مار دوں نہ جانے کتنی معصوم کلیوں کو پھول بنا چکی ہے۔“

”کیا اورنگ زیب صاحب اور سراج بھائی کو اس کے بارے میں نہیں معلوم؟“ میڈم نے سوال کیا۔

”بہت کچھ معلوم ہے لیکن وہ دونوں جوئے کے اڈوں اور عورت کے کالے کرتوتوں کے دھندوں میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ شاید اس لیے کہ ایسے کاروبار میں ٹوٹ لوگوں کے تعلقات بہت اوپر تک ہوتے ہیں۔“

”پھر ہم تم بھی کیا کر سکتے ہیں۔“ میڈم نے سرسری جواب دیا لیکن اس کی نگاہیں بھی اسی لڑکی پر مرکوز تھیں۔

”جب لڑکیوں کے والدین نے خود انہیں کئی پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈولنے کی آزادی دے رکھی ہے تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“ الماس نے تملاکر کہا پھر میڈم کا ہاتھ تھام کر اسٹور کے دوسرے حصے کی طرف چلی گئی لیکن اس کے کچھ دیر بعد جو کچھ ہوا اس نے الماس اور میڈم کو بھی کاؤنٹر کے قریب آنے پر مجبور کر دیا جہاں لیاقت حسین نے شیلا ورما کی گردن کو دبوچ رکھا تھا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ خود شیلا ورما کو بھی اپنا دم گھٹا محسوس ہو رہا تھا۔

”تم..... تم ادھر سے دفع ہو جاؤ۔“ لیاقت حسین نے لڑکی کو قہر آلود لہجے میں دھمکی دی تو وہ اپنا ویٹی بیگ اٹھا کر جلدی سے بجوم میں گم ہو کر باہر کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ سپراسٹور کے دو ملازم لیاقت حسین کی گرفت سے شیلا ورما کو آزاد کروانے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ ہیڈ کانسٹیبل بھی دو سپاہیوں کے ساتھ ان کے قریب آ گیا۔

”چھوڑ دو خاتون کو، ہیڈ کانسٹیبل نے لیاقت حسین کو مخاطب کیا۔ ”ورنہ تمہارا بھی تھانے لے جا کر حشر نشر کر دیں گے۔“

”نہیں چھوڑوں گا اس ناگن کو۔“ اس نے الماس کو بھی پریشان کر دیا۔ وہ کس طرح ہیڈ کانسٹیبل سے رابطہ کر کے اسے اپنے اور لیاقت حسین کے بارے میں بتانا چاہتی تھی لیکن بجوم کی وجہ سے وہاں تک اس کی پہنچ ممکن نہیں تھی لیکن میڈم روبی نے پہلی فرصت میں سراج کو موبائل پر آگاہ کر دیا جس کے کچھ دیر بعد سپراسٹور کی انتظامیہ بھی حرکت میں آ گئی۔ لیاقت حسین اور شیلا ورما کو سپراسٹور کا مالک اپنے آفس میں لے گیا۔ میڈم روبی نے الماس کو فون کی بابت بتایا تو وہ مطمئن ہو کر باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے کچھ دیر بعد لیاقت حسین بھی آ گیا جس کے چہرے پر بدستور سنجیدگی

طاری تھی۔ الماس نے اس وقت اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا لیکن میڈم روبی نے اپنے گھر پر گاڑی سے اترنے سے پہلے لیاقت حسین سے دبی زبان میں پوچھ ہی لیا۔

”لیاقت حسین تم نے شیلا ورما کے بارے میں یہ بات یقین سے کیسے کہی تھی کہ اس کے پرس میں جعلی کرنسی موجود ہوگی؟“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ لیاقت حسین نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔“

”پھر تم نے شیلا ورما کو گٹے سے کیوں دبوچ رکھا تھا؟“ الماس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ جواب میں لیاقت حسین کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔

”یہ وہی بے غیرت عورت ہے جس نے ایک معصوم اور یتیم لڑکی کو بتا سنوار کر زبردستی ایک شیطان فطرت کے حوالے کیا تھا لیکن قدرت نے اسے بے آبرو ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس کی لاش ابھی تک قبر میں اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے۔ جب تک خدا کی بے آواز لاشی حرکت میں نہیں آتی اس مجبور اور بے کس لاش کی بھی فرشتے حفاظت کریں گے۔“

”وہم.....“ الماس کے علاوہ میڈم روبی بھی لیاقت حسین کا جواب سن کر سکتے ہیں آگئی پھر اس نے لیاقت حسین سے پرتجسس لہجے میں سوال کیا۔ ”کون تھی وہ لڑکی، اس کی لاش کہاں دفن ہے۔“

لیاقت حسین جواب میں اس طرح خاموش بیٹھا رہا جیسے اس نے میڈم کی آواز سرے سے سنی ہی نہیں۔ وہ پوری توجہ سے گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر طاری تناؤ کی کیفیت آہستہ آہستہ معمول پر واپس آ رہی تھی۔

میڈم روبی کو اس کے گھرواہیں چھوڑنے کے بعد الماس نے دوبارہ لیاقت حسین سے پوچھا۔

”تم جب اندر گئے تھے تو وہاں کیا ہوا؟ کیا شیلا ورما کے پرس سے جعلی کرنسی ہی برآمد ہوئی تھی؟“

”مجھے خود حیرت ہے کہ میں وہاں کیسے پہنچ گیا!“ لیاقت حسین نے بڑی سادگی سے کہا۔ ”اگر کوئی غیر قانونی حرکت کرتا ہے تو اس سے میرا کیا تعلق وہ لوگ مجھے کاغذی کارروائی پر بطور گواہ دستخط کرنے کو کیوں کہہ رہے تھے؟ میں نے ایس پی صاحب سے شکایت کی تو پھر کسی نے اصرار نہیں کیا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جعلی کرنسی برآمد ہونے کے باوجود انہوں نے شیلا ورما کو چھوڑ دیا تھا؟“ الماس جواب میں کسمسا کر رہ گئی۔ اس نے لیاقت حسین سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

شیخ حامد کی کال نے اورنگ زیب کے دماغ میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ جو صورت حال درپیش تھی اس کی بساط پر لوچن سب سے اہم مہرہ تھا جو پیٹ دیا گیا تھا۔ شیخ حامد نے بیانگ دہل اقرار کیا تھا کہ اس نے لوچن اور پولیس کے ایک اے ایس آئی کو فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کی کال کے کچھ دیر بعد ہی اورنگ زیب کو جگا کی کال بھی موصول ہوئی تھی جس نے باقی کہانی بھی پوری کر دی تھی۔

ذہن میں اور بھی کچھ شبہات ابھر رہے تھے جب سراج نے کمرے میں قدم رکھا، اس کے چہرے پر بھی الجھن نظر آرہی تھی۔

”کیا بات ہے۔ کچھ پریشان نظر آرہے ہو؟“ اورنگ زیب نے سراج کو نٹولنے کی کوشش کی۔
 ”اب صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔“ سراج نے سر جھٹک کر جواب دیا۔ ”یا تو آپ مجھے اوپر سے کوئی مخصوص اجازت نامہ خود مختاری دلوادیں یا پھر میں ملازمت سے استعفیٰ دے دوں۔“
 ”ہوا کیا ہے؟“

”آئی جی صاحب آپ کے بعد اب مجھ پر نزلہ گرانے لگے ہیں۔ سراج نے سپر اسٹور پر لیاقت حسین اور شیدا ورما کے معاملے کو مختصر روداد سناتے ہوئے کہا۔ ”الماس کے کہنے پر میں نے سپر اسٹور کے مالک کو خوش اسلوبی سے معاملہ رفع دفع کرنے کو کہہ دیا تھا جس کی بجائے نہ جانے آئی جی کو کیسے مل گئی۔ انہوں نے براہ راست مجھے فون کر کے ایسے معاملات سے دور رہنے کی سرزنش کی ہے۔“

”آئی جی کی جگہ اگر میں ہوتا تو شاید تمہارے ساتھ زیادہ سختی سے پیش آتا۔“ اورنگ زیب کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
 ”ہاں۔“ اورنگ زیب نے بدستور چپچپے ہوئے انداز میں کہا۔ ”شیدا ورما جیسی خاتون کے معاملات میں تمہارا دلچسپی لینا مجھے بھی پسند نہیں ہے۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ لیاقت حسین کی زبان سے شیدا ورما کے پاس موجود جعلی کرکسی کی جو بات نکلی وہ غلط بھی نہیں تھی۔“
 الماس کے بعد لیاقت حسین نے مجھے بھی فون کیا تھا اور میں نے شیدا ورما کو کسی تکھیڑے میں پڑنے سے بچالیا۔

”گویا وہ خوب صورت شجر جو میرے لیے ممنوعہ ہے آپ کے لیے جائز ہے۔“
 ”سیاست اسی کو کہتے ہیں مائی ڈیز۔“ اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ”سکندر علی شاہ نے مجھے براہ راست فون کر کے شکریہ بھی ادا کیا ہے۔“

”آئی سی، گویا میرے خلاف آئی جی کے کان بھی سکندر علی شاہ نے بھرے تھے۔“
 ”ہو بھی سکتا ہے لیکن.....“ اورنگ زیب نے موضوع بدل دیا۔ ”اس وقت تمہارے لیے ایک اور اہم خبر موجود ہے۔ آکٹوپس نے تمہاری میڈم کے آخری مہرے لوچن کو بھی بساط سے باہر کر دیا ہے۔“ پھر اورنگ زیب نے آکٹوپس کے فون کی تفصیل بیان کی تو سراج بھی پہلو بدل کر رہ گیا۔
 ”شیخ حامد کی اس جسارت کو اب آپ کس خانے میں فٹ کریں گے؟“

”حمایت اور بوکھلاہٹ.....“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”شیر جب کچھار سے نکل کر باہر آجائے تو پھر موت اس کا تعاقب شروع کر دیتی ہے۔“
 ”کچھار سے آپ کی مراد شاہ جی کا فارم ہاؤس تو نہیں ہے؟“

”لوچن مجھ سے رابطہ قائم نہیں کر سکا تھا۔“ اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہارے لیے یہ اطلاع بھی یقیناً اہم ہوگی کہ لوچن اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“
 ”یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں صاحب؟“ جگانے حیرت کا اظہار کیا۔

”لوچن کی موت کی اطلاع مجھے براہ راست آکٹوپس نے دی تھی۔“ اورنگ زیب نے جگانے کو تفصیل بتاتے ہوئے سوال کیا۔ تم پوری کہانی سننے کے بعد کیا نتیجہ اخذ کرو گے؟“
 ”وہ لنگوٹ کا پکا تھا صاحب۔“ جگانے اپنے رائے کا اظہار کیا۔ ”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اب میں صرف ایک ہی بات کہوں گا کہ دال میں کہیں نہ کہیں کچھ کالا ضرور شامل ہے۔“
 ”وہ کیا؟“

”جو اے ایس آئی مارا گیا اس کے علاوہ ہوٹل کے منیجر پر بھی شبہ کیا جاسکتا ہے۔“ جگانے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ”جولائی سامنے آکر نکل گئی اگر وہ مل جائے تو ڈور کا دوسرا سرا بھی ہاتھ آجائے گا۔ بڑے ہوٹلوں میں ایسے کاروبار بھی زیادہ ہتھکے داموں میں ہوتے ہیں صاحب ہو سکتا ہے اے ایس آئی کے علاوہ تھانہ انچارج بھی ملوث ہو۔“

”اور بھی بہت کچھ ممکن ہے لیکن اب میں زیادہ محتاط رہنے کی تاکید کر رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے کہا۔ ”وقتی طور پر کہیں انڈر گراؤنڈ ہو جاؤ مگر مجھ سے رابطے میں رہنا۔“
 ”جس نے تم ٹھونک کر لوچن کو شکار کیا ہے اس کے بارے میں مجھے کیا حکم دیں گے؟“
 ”وقت کا انتظار کرو۔“

اورنگ زیب نے رابطہ ختم کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ حالات کے نشیب و فراز پر غور کرتا رہا پھر اس نے براہ راست متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او کو کال کیا۔
 ”فائینو اسٹار ہوٹل میں کسی رہائشی کے علاوہ پولیس کا ایک اے ایس آئی بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔“ اورنگ زیب نے افسرانہ لہجے میں بات جاری رکھی۔ ”آپ نے بھی جائے وقوعہ کا معائنہ کیا ہوگا ہوٹل کے منیجر کا کیا بیان ہے۔“
 ”وہ..... وہ ابھی تک خود کو نیوٹرل ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ جواب گول مول انداز میں دیا گیا۔

”جولائی کمرے میں مئی تھی اس کے بارے میں منیجر کا کیا کہنا ہے۔“
 ”سوری سر۔“ اس بار ایس ایچ او نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ”میں اس واردات کے بارے میں کوئی تفصیلی بات نہیں کر سکتا۔“
 ”کیا مطلب؟“ اورنگ زیب کی پیشانی پر سلوٹیں ابھرنے لگیں۔

”آئی جی صاحب کی یہی ہدایت ہے کہ ابھی پریس کو بھی اندھیرے میں رکھا جائے ورنہ میں کم از کم آپ سے.....“
 اورنگ زیب نے جھلا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ آئی جی کا حوالہ درمیان میں آجانے سے اس کے

”تم اس کا شبہ متعدد بار کر چکے ہو اور میں نے ہر بار ایک ہی جواب دیا ہے۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب بھی یہی کہوں گا کہ سکندر علی شاہ بھی اس کی اصلیت سے واقف نہیں ہے۔“ ”لوچن کے بعد جگا کا نمبر بھی آسکتا ہے۔“ سراج نے کہا۔ ”اس کی حفاظت کے لیے ہمیں قتل از وقت کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے۔“

”میں اسے انڈر گراؤنڈ ہو جانے کا مشورہ دے چکا ہوں، مگر میرا خیال ہے کہ آکنوہس اب کوئی زیادہ لمبا ہاتھ مارنے کی کوشش کرے گا۔“ ”لبے ہاتھ سے آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟“

اورنگ زیب کچھ جواب دینا چاہتا تھا جب الماس بازار سے واپس آگئی۔ وہ یقیناً کوئی خاص بات جو تھی جو اس کا پرس بھی ابھی تک شانے پر موجود تھا۔ اورنگ زیب نے الماس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر دبی زبان میں دریافت کیا۔

”تم اس وقت کچھ ابھی نظر آرہی ہو، کوئی خاص بات؟“ ”میں میڈم کے ساتھ سپر اسٹور گئی تھی۔ وہاں جو کچھ ہوا اس کا علم آپ دونوں کو بھی ہوگا۔“ الماس نے ایک صوفے پر بیٹھ کر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیاقت حسین نے سب کے سامنے بر ملا کہا تھا کہ شیلا ورما کس قسم کے کاروبار میں ملوث ہے بعد میں لیاقت حسین کی جعلی کرنسی والی بات بھی سچ نکلی تھی مگر آپ لوگوں کے فون پر ہی سارا معاملہ رنچ دغ کر دیا گیا تھا۔“

”جو کچھ بھی ہوا وہ اچھا ہی ہوا۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے سکندر علی شاہ کی وجہ سے شیلا ورما کی سفارش کی تھی ورنہ میں ایسے معاملات میں کبھی ملوث ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔“ ”تم کس لیے ہلکان ہو رہی ہو؟“ سراج نے مسکرا کر کہا۔ ”میری اطلاع کے مطابق تمہارا یا میڈم کا نام کہیں درمیان میں نہیں آیا۔“

”مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ لیاقت حسین کو جعلی کرنسی کے بارے میں کیسے علم ہو گیا؟“ الماس نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ”اس نے جو کچھ کہا تھا اس کی تصدیق آپ لوگوں نے بھی کر لی ہوگی لیکن واپسی پر لیاقت حسین نے میڈم کے استفسار پر جو بات کہی وہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کیا کہا تھا لیاقت حسین نے؟“ اورنگ زیب نے سوال کیا۔ ”کیا وہ بات بھی شیلا ورما سے متعلق تھی؟“

”جی ہاں۔“ الماس نے جواب میں دبی زبان میں جب کسی یتیم لڑکی کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے بے آبرو ہونے سے بچنے اور اس کی لاش محفوظ ہونے والی بات کہی تو اورنگ زیب اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ جیسے کسی بھولی کہانی کا کوئی گمشدہ حصہ دوبارہ ذہن میں تازہ ہو گیا ہو۔ سراج نے الماس کو اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔ سراج نے اس کے جانے کے بعد اورنگ زیب کے قریب جا کر پوچھا۔

”کیا لڑکی کی کہانی سے پھر کوئی کلیو آپ کے ہاتھ آگیا؟“ ”کبھری ہوئی کڑیاں خود بخود ملتی چلی جا رہی ہیں۔“ اورنگ زیب نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ ”سکندر علی شاہ کے بارے میں بھی لیاقت حسین نے ایسی ہی ایک بات کہی تھی جسے وہ خود بعد میں بھول گیا تھا۔“

ویک اینڈ آنے میں اب صرف دو دن باقی رہ گئے ہیں۔ فارم ہاؤس جانے کے بعد ہو سکتا ہے اصل شکار بھی ہمارے ہاتھ آجائے۔ لیاقت حسین اب کیا کردار ادا کرے گا یہ قبل از وقت طے نہیں کیا جاسکتا، لیکن ایک بات میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ آکنوہس جہاں بھی ہے وہ بھی سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“ سراج نے وضاحت چاہی۔

”اے کس بات کی پریشانی لاحق ہوگی؟“ ”لوچن کو راستے سے ہٹا کر اس نے مجھے کیوں اطلاع دی تھی؟“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”پولیس کو راستے سے بھٹکانے کی خاطر مجرم اسی قسم کے کھیل تماشے کرتے ہیں۔ کچھ افراد لوچن سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ کیا عجب ہے کہ وہ بھی لپیٹ میں آجائیں۔“

”آپ کا اشارہ کس خاص سمت ہے؟“ ”میڈم کو کیوں فراموش کر رہے ہو۔ لوچن کو اسی نے ابھینچ کیا تھا۔“ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”آکنوہس کے دوبارہ زندہ ہو جانے کی خبر نے میڈم اور ڈی آئی جی کی خوشیوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ کوئی خاص وجہ رہی ہوگی جو میڈم نے براہ راست کرٹل احتشام کو فون کر کے اپنے مکان پر کمانڈوز کو تعینات کروایا ہوگا۔ اس کا سبب بھی آکنوہس ہو سکتا ہے۔ ناگی کی موت کے بعد افضل خان اور شبنم بھی اس کی ہٹ لسٹ پر آسکتے ہیں اور خود ہمیں بھی اب محتاط رہنا ہوگا۔“

”پھر..... آپ نے کیا سوچا ہے؟ ہمیں کس کی حفاظت پر خاص ترجیح دینی ہوگی؟“ ”الماس سے کہو کہ میرے لیے بغیر دودھ کی کافی بناوے۔“ اورنگ زیب نے سراج کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت مجھے شدید سکون کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“

سراج خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ اورنگ زیب کی باتوں نے اسے بھی الجھا دیا تھا۔ سراج کے کمرے سے نکلنے ہی اورنگ زیب نے جیب سے اپنا موبائل نکال کر کم بدل پھر وہ مرکزی حکومت کی اس بڑی شخصیت کے نمبر بیچ کرنے لگا جس کے اشارے پر حکومت نے اورنگ زیب کو مخصوص اجازت نامہ جاری کیا تھا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اسی نے دبی زبانی میں سراج کے حوالے سے آئی جی شکایت کی تھی جو کسی خاص وجہ سے اس سیٹ کے مخالف ہو گیا تھا جو پہلے اورنگ زیب کے پاس تھی۔ خاص طور پر یہ درخواست کی تھی کہ آئی جی کو ان افسروں کے معاملات میں مداخلت سے روکا جائے جو صحیح معنوں میں اپنے فرائض کو انجام دیتے ہیں۔



ساحل سمندر کے کنارے بنی ہوئی عمارت جو بارہ فلور پر مشتمل تھی ہر اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔ خاص طور پر عمارت کی چھت پر بنا ہوا تین کمروں کا وہ بیضوی شکل کا پینٹ ہاؤس ہر اعتبار سے حسین ترین کہلانے کا مستحق تھا۔ جس سے پورے شہر کے طول و عرض کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اس پینٹ ہاؤس میں داخلے کے لیے علیحدہ آہنی دروازہ تھا جس کو بیڑی آپریٹڈ ایک ڈیوائس کے ذریعے کھولا اور بند کیا جاتا تھا۔ آہنی دروازے پر سکندر علی شاہ نے اپنا ایک خاص گارڈ بھی سادہ لباس میں تعینات کر دیا تھا۔

دربار کو رہائش کی یہ جگہ ہر اعتبار سے بے حد پسند آئی تھی۔ سکندر علی شاہ نے اسے پچھلی رات ہی بڑی خاموشی سے اور احتیاط سے وہاں منتقل کیا تھا۔ یہ بھی باور کروادیا تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے کچھ خاص آدمی بھی تعینات کر دیے گئے تھے جس کے بعد اسے کسی قسم کا خطرہ لاحق ہی نہیں تھا۔ کھانے پکانے کے لیے بھی اسے کسی علت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پینٹ ہاؤس کے گراؤنڈ فلور پر ایک جدید طرز کا ہوٹل تھا جس میں روم سروس کے لیے بیرے اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ اس سروس کو حاصل کرنے والوں کے لیے ایک مختصر مگر خوب صورت موبائل دیا جاتا تھا جس کا رابطہ براہ راست ہوٹل کی روم سروس سے تھا۔ اس سروس کے ذریعے رات دن کسی وقت بھی آرڈر کی تعمیل کی جاتی تھی۔

دربار نے وہ رات بڑے سکون سے گزاری۔ صبح بیدار ہو کر کھلی چھت پر آئی تو ساحل کی طرف سے آنے والی ہوا کے خشک جمبوکوں نے اس کا استقبال کیا۔ پینٹ ہاؤس کی چھت پر چاروں طرف گھومتی رہی پھر کمرے میں آکر اس نے روم سروس سے ناشتے کو کہا۔ یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ سروس کسی خاتون ہوٹیس کے ذریعے کی جائے۔

جتنی دیر میں وہ ہاتھ روم سے شاور لے کر ڈریسنگ گاؤن پہنے باہر آئی اتنی دیر میں ہوٹل کا دیا ہوا وہ موبائل بھی منگنانے لگا جس سے ناشتے کا آرڈر دیا گیا تھا۔ دربار نے موبائل آن کیا تو دوسری جانب سے ایک سرپلی آواز ابھری۔

”آپ کا ناشتا تیار ہے میڈم۔“

”ٹھیک ہے، بھیج دو۔“ دربار نے بڑی تمکنت سے جواب دیا۔ پانچ منٹ بعد اس نے روم سروس کی کال پر وہ آہنی دروازہ کھول دیا جس سے گزر کر آنے والی خاتون ہوٹیس نے کمرے میں داخل ہو کر ناشتے کو میز پر چن دیا پھر بڑے ادب سے بولی۔

”میرے لیے اب کیا حکم ہے۔“

”تم جاسکتی ہو۔ ناشتے کے برتن میں گارڈ سے بھجوا دوں گی۔“ دربار نے کھلے بالوں کو ایک خاص ادا سے جھٹک کر جواب دیا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ خاتون ہوٹیس نے کہا۔ ”آپ گارڈ سے برتن دروازے کے باہر ہی رکھوا دیں، روم سروس کے بیرے اسے خود سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔“

دربار نے بڑے اطمینان سے ناشتا کیا۔ دانتوں کو حسب معمول دوبارہ برش کرنے کے بعد وہ بیڈ روم کے آرام دہ بستر پر لیٹ گئی۔ پچھلے دنوں وہ جس صورت حال سے دوچار تھی اس نے اس کے ذہن کو خاصا مکدر کر دیا تھا۔ ان ہی خیالوں میں گم ہو کر کسی وقت اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا اسے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ ساحل پر چلنے والی ہوا کے جمبوکوں نے اسے اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ وہ اٹھ کر لباس پہن سکتی۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ دیوار گیر گھڑی پر نظر پڑی تو یہ احساس بھی جاگ اٹھا کہ وہ ملکہ اندھیرا دن ڈوب جانے کے بعد شام آنے کا اعلان کر رہا تھا۔ نیند اتنی گہری تھی کہ اسے دوپہر کے کھانے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ بستر سے اٹھ کر وہ سیدھی ملحقہ ہاتھ روم میں گئی۔ دوبارہ فریش ہو کر باہر آئی تو اسے سردی کا تھوڑا تھوڑا احساس ہوا۔ کمرے اور ڈریسنگ کی لائٹ آن کرنے کے بعد وہ لباس تبدیل کرنے کے بارے میں غور کر رہی تھی جب باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری۔ وہ جلدی سے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی ایک دروازے کی آڑ میں ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ آنے والا سکندر علی شاہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوگا لیکن اس کا وہ اعتماد زیادہ دیر بحال نہیں رہ سکا۔ جس شخص نے بڑی دل جگری سے اندر قدم رکھا تھا وہ کم از کم سکندر علی شاہ نہیں تھا، لیکن جس انداز میں وہ اندر آیا تھا وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ اس طرح ایک ایڑی چپڑ پر بیٹھ گیا جیسے وہ پینٹ ہاؤس اس کے باپ دادا کی جاگیر ہو۔ تھری پیس سوٹ میں اس کی شخصیت بھی کسی مالدار کروڑ پتی ہونے کا اعلان کر رہی تھی لیکن چہرے پر خود رو پودوں کی طرح بڑھی ہوئی بنا تراش خراش دائمی اس کی شخصیت سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

”کون ہو سکتا ہے؟“ دربار نے دل ہی دل میں سوچا ایک لمحے میں کئی خیال اس کے ذہن میں گھڑے ہوئے لیکن پھر سکندر علی شاہ کی اعلیٰ شخصیت اور دروازے پر موجود گارڈ کا خیال آیا تو اس نے خود کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

”آنے والا سکندر علی شاہ کا کوئی خاص نمائندہ ہی ہوگا جسے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوگا۔“ خود کو اس خیال سے تسلی دینے کے بعد وہ لباس تبدیل کرنے کی خاطر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی تھی جب ایک کھنکھارتی ہوئی مردانہ آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”تم جس لباس میں ہو وہ وقت اور ضرورت کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے۔“

”دربار جھجکی۔ کسی اجنبی کے منہ سے ایک لچر قسم کا جملہ سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال بھی تیزی سے ابھرا۔ چھانک پر سکندر علی شاہ کا مسلح گارڈ بھی سادہ لباس میں موجود تھا۔ چھانک کھولنے کی مخصوص ڈیوائس بھی دربار کی تحویل میں تھی پھر..... اگر آنے والا کوئی اجنبی تھا تو اتنی رکاوٹیں عبور کر کے اندر کس طرح آگیا؟“

”میرے بارے میں اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔“ آنے والے نے بے پروائی سے

کہا۔ ”تمہارا سکندر علی شاہ بھی میرے لیے پالتو کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔“
”کک..... کون ہو تم؟“ دربار نے شاہ جی کے حوالے پر آنے والا رکیک جملہ سن کر دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ ”یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟“

”اس کہانی کو انجام تک پہنچانے آیا ہوں جو فریال نے شروع کی تھی۔“
”تت..... تت..... فریال کے حوالے پر دربار کے دل میں ہول اٹھنے لگے۔“

”میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں تمہارے بارے میں۔“ نووارد تیزی سے اٹھ کر دربار کے سامنے کھڑا ہو گیا جو اپنے گاؤن کو سینے پر برابر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”نجم تو یاد ہوگا تمہیں۔ وہی جس سے تم فریال ہی کے ذریعے ملی تھیں۔“

اس نے پہلی بار تمہیں کلی سے پھول بنایا تھا پھر..... فریال نے تمہارا تعارف سکندر علی شاہ سے کروا دیا۔ اب تم اس کے لیے کیا خدمت انجام دے رہی ہو یہ بھی جانتا ہوں۔“ آنے والا نفرت بھری نظروں سے دربار کو گھور رہا تھا۔ اس نفرت کی آڑ میں اس کی ہوس کے اشارے بھی شامل تھے۔“

”لل..... لیکن..... تت..... تم یہ سب کچھ مجھے کیوں یاد دلا رہے ہو؟“ دربار نے سہے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“
”تم نے نہ سہی لیکن جن لوگوں نے تمہیں اپنی تحویل میں باعزت طور پر رکھا تھا ان کا کچھ قرض باقی ہے مجھ پر۔“ نووارد نے آگے بڑھ کر دربار کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ دربار کی نظروں میں خوف کے سائے لرزے لگے۔ آنے والے نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے ہی خوب صورت وجود کو اس کے لیے بطور تحفہ پیش کرنا پسند کروں گا۔“

”دربار نے مزاحمت کی تا کام کوشش کی لیکن نووارد اسے گھسیٹ کر اس کے بستر پر لے گیا۔“
”مم..... میں..... نہیں سمجھ سکی کہ تم مجھ سے کس بات کا انتقام لے رہے ہو؟“ دربار نے ہتھیار ڈالتے ہوئے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ”تم جو چاہتے ہو میں اس سے انکار بھی نہیں کروں گی۔“
”تم اب انکار کرنے کی پوزیشن میں ہو بھی نہیں۔“ نووارد نے ایک جھٹکے سے دربار کا گاؤن بھی اتار کر ایک طرف پھینک دیا، کچھ دیر وہ اس کے وجود کو سرسراتی نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے جیب سے سائلنسر لگا پتول نکال لیا۔

”مم..... مم..... میں..... تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ دربار نے رندھی ہوئی آواز میں التجا کی۔ ”مجھے جان سے نہ مارو..... میرا جسم تمہارے لیے.....“
”کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“ نووارد کا لہجہ سرد تھا۔

”باسی اور جھوٹا کھانا میری فطرت کے خلاف ہے۔“ پھر دربار کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ نووارد کے پتول سے یکے بعد دیگرے دو بار ٹچ کی مدھم آواز ابھری اس کے ساتھ ہی دربار کا

خوب صورت جسم پھڑپھڑا کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

نووارد کے ہونٹوں پر حقارت بھرا تبسم ایک لمحے کو جاگا پھر اس نے جیب سے موبائل نکال کر ایس پی اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے بڑے دنگ لہجے میں کہا۔
”لوچن کے بعد اب تمہارے اور سکندر علی شاہ کے لیے دربار کی لاش کی شکل میں ایک مشترکہ تحفہ ساحل سمندر کی نئی تعمیر شدہ عمارت کے پینٹ ہاؤس میں موجود ہے لیکن..... یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا، جاری رہے گا۔“

اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد اس نے دوسری جانب سے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ دربار کے جسم پر ایک آخری نظر ڈال کر وہ پینٹ ہاؤس کے باہر آیا جہاں سکندر علی شاہ کا متعین کردہ سادہ لباس والا گارڈ بھی فرش پر اوندھا پڑا تھا۔



مگل اس وقت اپنی خواب گاہ میں بیٹھی خلا میں اس طرح گھوری تھی جیسے کوئی بھولا بسرا خواب یاد آ رہا ہو۔ ایک رات پہلے شوہر کا از خود اس کے پاس آنا ایک خوب صورت خواب ہی تھا ورنہ ایک ہی گھر میں، ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی اس کا شوہر سے آنا سنا مانا بہت کم ہی ہوتا تھا۔

گزشتہ روز سکندر علی شاہ نے جس وحشیانہ انداز میں اسے آغوش میں دبوچا تھا وہ اسے پسند نہیں آیا تھا۔ حق زوجیت ادا کرنے میں اس نے کسی مزاحمت کا اظہار بھی نہیں کیا لیکن یہ احساس بھی بڑا کر یہ تھا کہ شوہر نے وقتی طور پر دل بہلانے کی خاطر گینہ جیسی آبرو باختہ عورت کا متبادل سمجھ کر محض ایک وقتی کمی کو پورا کرنے کی خاطر استعمال کیا تھا۔

اس وقت بھی ایک مقدس رشتے کا احساس اس کے ذہن کے گوشوں میں کلبلارہا تھا جب شوہر کو دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اسی طرح چوکی جیسے جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہو لیکن وہ خواب نہیں، حقیقت تھی جسے محسوس کر کے وہ دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی شوہر کی پذیرائی کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

سکندر علی شاہ گل کود کچھ کر بڑی اپنائیت سے قدم اٹھاتا جب ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا تو گل نے بڑے پیار سے کہا تھا۔ ”آپ بیٹھیں میں ملازمہ سے چائے لانے کو کہتی ہوں۔“
”اس کی زحمت نہ کرو۔“ سکندر علی شاہ نے اسے قریب آ کر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ملازمہ کو ہدایت دے کر آیا ہوں کہ اب روزانہ شام کی چائے میں تمہارے ساتھ ہی اسی کمرے میں پیا کروں گا۔“

”سکندر علی شاہ کا محبت بھرا جملہ سن کر گل کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔ وہ قدم اٹھاتی ہوئی شوہر کے پہلو میں جا کر بیٹھ گئی۔ دل کی دھڑکنیں اس کے اختیار سے باہر ہونے لگیں۔“

”کل.....!“ سکندر علی شاہ نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام کر مدھم لہجے میں کہا۔ ”مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا۔“

”پلیز..... ایسا نہ کہیں۔“ گل نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بے اختیار جواب دیا۔ ”شادی کے بعد آپ نے کبھی مجھے اپنے قدموں سے دور نہیں کیا میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔“

”یہ تم نہیں تمہارے والدین کی دی ہوئی تربیت بول رہی ہے۔“ سکندر علی شاہ نے اس کے اور قریب ہو کر سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایک بات تم بھی سمجھتی ہو..... منزل کی تلاش میں اکثر مسافر جھٹک جاتے ہیں لیکن کبھی نہ کبھی اپنے گھر ضرور واپس لوٹتے ہیں۔ مرد کی فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عارضی چمک دمک کو بہت جلدی قبول کر لیتا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اسے یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ بازار کے کھانے چمچٹے اور صاف سحرے مسالوں سے تیار کی ہوئی ڈش کا ذائقہ بہر حال منفرد ہوتا ہے۔“

گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شریا کر گردن جھکالی۔ شوہر کی بات کا اصل مفہوم بھانپ کر اس کے اندر کی مشرقی عورت بھی مستکنا نہ لگی تھی۔ جب ملازمہ چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی۔ اس کے آجانے سے حسین خواہوں کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا۔ گل چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔

سکندر علی شاہ اسے والہانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

چائے کے دوران بھی سکندر علی شاہ گل سے محبت بھری باتیں کرنے میں مصروف تھا جب اس کے موبائل پر سنگٹل ملا، روشن اسکرین پر نظر آنے والے نمبر اس کے جانے پہچانے تھے اس لیے اس نے موبائل آن کرنے میں دیر نہیں کی۔

”اس وقت کیسے یاد آگئی؟“ اس نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔

”سب سے پہلے مجھے ویک اینڈ کا پروگرام کنفرم کرنا ہے۔“ دوسری جانب سے ایس پی اورنگ زیب کی آواز ابھری۔ ”اس بار تو پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی؟“

”بالکل نہیں۔ میں نے سارے انتظامات بھی مکمل کر لیے ہیں۔“

”اور کوئی نئی خبر؟“

”نئی نئی خبریں آپ حضرات کے علاوہ اور کس کے پاس ہوتی ہیں۔“

”میرے پاس اس وقت آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔“ سنجیدگی سے جواب ملا تو سکندر علی شاہ نے بے پروائی سے پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں؟“

”آپ سے دلربا کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟“

”آخری ملاقات.....!“ سکندر علی شاہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ ”آپ کیا بتانا چاہ رہے ہیں؟“

”مجھے افسوس ہے شاہ جی کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ میری اطلاع کے مطابق قاتل نے وہاں بھی آکنوہس کا ایک نشان چھوڑ کر پولیس کو اپنی برتری کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔“

”کون ہے یہ آکنوہس؟“ سکندر علی شاہ تمللا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پیشانی پر آڑھی ترچھی ٹھنٹیں بھی ابھرنے لگیں جو اس کے وجود کے اندر اٹھنے والے لاوے کی ترجمان تھیں۔

”حوصلے سے کام لیں شاہ جی ورنہ مجرم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔“

”آپ نے دوست کہا ہے تو پھر دوستوں کی طرح کھل کر بات کریں۔“ سکندر علی شاہ نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”آپ کے جواب سے میں یہی اندازہ لگا رہا ہوں کہ شاید کسی نہ کسی زاویے سے آپ مجرم سے واقف ہیں۔ صرف اشارے میں ہی شبہ ظاہر کریں وہ جو بھی ہوا میں اسے سمندر کی تہ میں بھی زندہ نہیں چھوڑ دوں گا۔“

”میں بھی یہی جواب دوں گا کہ کسی نہ کسی طور پر آپ بھی غائبانہ طور پر اس کو جانتے ہیں لیکن..... اس کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں۔“

”آپ کا جواب میرے لیے کسی معنی سے کم نہیں ہے۔ کیا آپ اس کی وضاحت کھل کر نہیں کریں گے؟“

”فی الحال میں اس کی وضاحت میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجرم مجھے راستے سے ہٹانے کا خواہش مند ہے مگر وہ ایک تیر سے بیک وقت دو شکار کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔“

”دوسرا شکار کون ہے؟“

”صرف ایک دن اور انتظار کر لیں..... تفصیلی بات فارم ہاؤس پر ہوگی۔“ اورنگ زیب نے افسرانہ انداز میں کہا۔ ”ایک بات اور غور سے سن لیں اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے گا ورنہ پھر سارا بتا دیتا ہوں۔“

”جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔“ سکندر علی شاہ اس آخری جیلے کی تلخی کو برداشت نہیں کر سکا تو ہونٹ چبانے لگا۔

”کس کی کال تھی؟“ گل نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

”ہے ایک نچلے درجے کا افسر جو اس وقت اچانک ادنیٰ آواز میں بول رہا تھا۔“ سکندر علی شاہ نے حقارت سے جواب دیا۔ ”اس کے دن بھی اب گئے چنے رہ گئے ہیں۔“

”آپ کے اور اس کے درمیان کسی مجرم کی بات بھی ہو رہی تھی؟“ گل نے جسارت کر کے پوچھا۔

”گل کے سوال پر سکندر علی شاہ کو دلربا کا خیال آیا جسے اورنگ زیب کی اطلاع کے مطابق قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے وجود کے اندر شعلے بھڑکنے لگے۔ اس نے کچھ سوچ کر دوبارہ اورنگ زیب سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اسی وقت موبائل پر پھر سنگٹل ملا، سکندر علی شاہ نے موبائل آن کرنے میں خاصی غلط سے کام لیا۔“

”ہیلو۔“

”تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔“ دوسری جانب سے شکرہ کی آواز ابھری۔ ”دلربا کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا۔“

”اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“ سکندر علی شاہ نے چونکنے کی اداکاری کی لیکن اس کے وجود کے اندر اب چنگاریاں بجھنے لگی تھیں۔

”اس کے اغوا کے سلسلے میں بھی میں نے ایس پی پرشبہ ظاہر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اسی نے کسی مصلحت کی بنا پر ایک انتہائی قدم اٹھالیا ہو لیکن اس واردات میں ناگی کے کسی آدمی کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”ناگی تو مارا جا چکا۔“

”عقل سے کام لو۔“ دوسری جانب سے سرزنش کرنے والا انداز اختیار کیا گیا۔ ”تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ دو بد معاشوں نے احمد عدنان کی ایرانی کھیل شرہ شیرازی کے ہنگلے پر ناگی کو گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا انتقام لینے کی خاطر ناگی نے اپنے کسی ہم شکل کو میک اپ میں دلربا کے مکان پر بھیجا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ناگی کے کسی سر بھرے ساتھی نے اس کا انتقام لینے کی خاطر دلربا کو نشانہ بنادیا ہو۔“

”اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن میں دلربا کی موت کو فراموش نہیں کروں گا۔“ سکندر علی شاہ نے کسی ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے جس پرشبہ ہوا اس کو کتے سے بدتر موت ماروں گا۔“

”فی الحال میں تمہیں کسی جلد بازی کی اجازت نہیں دوں گا۔“ تحسمانہ انداز میں کہا گیا۔ ”ایس پی کو فارم ہاؤس میں آ لینے دو پھر ممکن ہے کہ اس کے مٹی میں آ جانے کے بعد بہت سے اہم رازوں سے پردہ اٹھ جائے۔“

”ایک بات میرے ذہن میں بھی الجھ رہی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میں نے دلربا کو نہایت رازداری سے پیٹھ ہاؤس تک پہنچایا تھا۔ وہاں جو آدمی تعینات کیا تھا وہ بھی بکنے والا بندہ نہیں تھا پھر..... قاتل وہاں تک کیسے پہنچ گیا؟“

”پولیس کے شکاری کتے جب کسی کے پیچھے لگ جائیں تو بدن کے لباس کی خوشبو سے بھی اس تک پہنچ جانے کی مہارت رکھتے ہیں۔“

”ایسی صورت میں تو ناگی کا کوئی آدمی خارج از امکان ہو جاتا ہے۔“ سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہمارے ذہن میں صرف ایک ہی نام رہ جاتا ہے..... ایس پی“

”فکر مت کرو، بکرے کی ماں کتنے دنوں خیر منائے گی۔“ جواب بڑے ٹھوس لہجے میں دیا گیا

اور پھر رابطہ بھی ختم ہو گیا۔

گل..... خاموش تماشائی کی حیثیت سے قریب کھڑی سکندر علی شاہ کے بدلنے تاثرات کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ دوسری کال کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد اس نے دبی زبان میں کہا۔

”گھینے کے بعد دلربا..... کون آپ کی خوشیوں کا دشمن ہو سکتا ہے؟“

”یہی ایک سوال میرے ذہن میں بھی صدائے بازگشت بن کر گونج رہا ہے۔“ سکندر علی شاہ جواب دینے کے بعد جانے کے ارادے سے اٹھا تو گل نے بڑی اپنایت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”اس وقت آپ کو صرف سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔“ گل نے شوہر کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”میری درخواست ہے کہ آپ کچھ دیر بستر پر آنکھ بند کر کے لیٹے رہیں۔ میں آپ کے سر میں تیل لگا دیتی ہوں۔ دلربا کی ٹھیکر و ٹھیکن کا کام آپ کے کارندے بھی انجام دے سکتے ہیں۔“

جواب میں سکندر علی شاہ نے گل کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا پھر اس نے گل کے مشورے پر عمل کرنے سے انکار نہیں کیا لیکن اس وقت بھی اس کے ذہن میں شکرہ اور ایس پی اور تک زیب کے کہے ہوئے کچھ جملے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔



حسب معمول رات ساڑھے نو بجے بیوی پارلر کو تالا لگانے کے بعد جونی نے اپنے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کیا پھر حسب معمول وہ شیارہ درما کے پاس اس کی خواب گاہ میں گیا جہاں وہ خلاف معمول کسی خیال میں ڈوبی نظر آ رہی تھی۔ شب خوابی کا لباس بھی اس کے جسم پر نہیں تھا۔ جونی دروازے پر ہی ٹھنک کر رک گیا۔ سپراسٹور میں پیش آنے والی کہانی جونی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ شیارہ درما کے تمام راز سے واقف تھا۔ اس کے دھندوں میں بھی برابر کا شریک تھا لیکن جعلی کرنسی والی بات اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کے کاروبار میں اسے جو رقم ملتی تھی وہ بھی ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔ ہنی مون بیوی پارلر کا بینک اکاؤنٹ علیحدہ تھا جس میں لاکھوں کا بیننس موجود تھا پھر شیارہ درما کو جعلی کرنسی کے کام کی کیا ضرورت تھی اور اگر کہانی سچ تھی تو بھی شیارہ درما نے جونی کو کان دکان اس کی بھنک بھی نہیں گئے دی تھی۔ ذاتی طور پر جونی کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ اگر اسے کوئی فکر تھی تو لیزڈی ڈکسن کی اس پیشین گوئی کی تھی جس کے مطابق اسے شیارہ درما سے دور چلے جانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

دروازے پر کھڑا وہ اپنے خیالوں میں محو تھا جب شیارہ درما نے اس کی طرف دیکھا پھر ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔ ”دروازے پر کیوں جم کر رہ گئے ہو، میرے قریب آؤ۔ آج مجھے شدت سے تمہارا انتظار تھا۔“

”غلط۔“ جونی نے بڑی مہارت سے اسے اپنے چہرے کے تاثرات بدل کر کہا۔ ”انتظار کی صورت میں تمہارے جسم پر ہمیشہ نائٹ گاؤن ہوتا ہے لیکن آج تم نے لباس بھی نہیں تبدیل کیا۔“

”دروازہ بند کر لو پھر میں یہ لباس بھی اتار کر پھینک دوں گی۔“

جونی نے خواب گاہ کا دروازہ بند کر دیا لیکن وہ اس وقت بھی محسوس کر رہا تھا کہ شیارہ درما بڑی خوب صورتی سے کسی بات کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وہ شیارہ درما کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ شیارہ درما نے ایک بار پھر توبہ شکن انگڑائی لے کر اپنے مہکتے وجود کو جونی کی کشادہ سینے میں چھپانے کی کوشش کی۔

”میں آج بہت تھکی ہوئی ہوں جونی ڈیر تم مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بستر تک لے چلو۔“

”شیلا۔“ جونی نے اس کی زلفوں کو چھیڑتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔ ”تھکن کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی؟“

”تم کیا سوچ رہے ہو؟“ شیلا درمانے جونی کے سوال پر چونک کر اس کی نگاہوں میں جھانکا۔ ”کل تک میں فٹ پاتھ پر تھا اور آج تمہاری خواب گاہ میں ہوں۔“ جونی نے سمجھانے والے لہجے میں جواب دیا۔ ”میری جگہ پہلے اس خواب گاہ میں بھی کسی اور کا راج تھا۔ مرد کے مقابلے میں عورت جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اب جونی کی جگہ بھی کوئی اور.....“

”شٹ اپ۔“ شیلا درما بھلا کر اٹھ گئی۔ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”دوبارہ اپنی زبان پر قابو رکھنا ورنہ.....“

”چپ کیوں ہو گئیں؟“ جونی نے دیدہ و دانستہ راکھ میں دبی چنگاری کو ہوا دی۔ ”ورنہ کیا ہوگا؟“

”میں بچوں کی طرح کھلونوں سے دل بھر جانے کے بعد اس کی جگہ دوسرے کی ضد نہیں کرتی۔“ شیلا درمانے ہونٹ چباتے ہوئے تھملا کر کہا۔ ”انہیں توڑ دینے کی عادی ہوں اور یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“

”میں اس کے علاوہ بھی کچھ جاننے کی خواہش کر رہا ہوں۔“ جونی نے بے پروائی سے جواب دیا

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ شیلا درمانے بھڑک کر سوال کیا۔

”جلی کرئی کے کاروبار والی بات کہاں تک سچ ہے؟“ جونی نے کھل کر سوال کیا۔

شیلا درما اس طرح چونگی جیسے بارڈر کر اس کرتے وقت رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جونی کو تیز نظر سے گھورا۔

”میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتی۔ دوبارہ اپنی حدود کو پھلانگنے کی کوشش مت کرنا۔“

”اس وقت میرے لیے کیا حکم ہے؟“ جونی نے شیلا درما کے سخت جواب کو مشکل سے ہضم کیا پھر اس کے سراپے پر ایک نظر ڈال کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تمہارا موڈ بدلنے کا انتظار کروں یا.....“

”گیسٹ لاسٹ۔“ شیلا درمانے پھر کر کہا پھر ہونٹ چبانے لگی۔

”مس ڈکسن نے مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔“ جونی نے لمبی سانس بھر کر سپاٹ لہجے میں بات جاری رکھی۔ ”اس نے کہا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو میں تمہاری دنیا سے کہیں دور چلا جاؤں۔“

”اس کے علاوہ اور کیا بکواس کی تھی اس حرافہ نے؟“ شیلا درما کی آنکھیں سلگنے لگیں۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے بستر کے قریب چلی گئی۔

”میں نے اس سے پوچھنے کی متعدد کوشش کی تھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔“ جونی نے اس بار سرد مہری سے جواب دیا۔

”سچ کہہ رہے ہو یا کسی وجہ سے مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ شیلا درما کا لب و لہجہ بہ دستور تلخ تھا۔

”میں اب کسی ٹال مٹول سے کام لینے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کروں گا۔“ جونی نے بے نیازی کی کیفیت میں معنی خیز انداز اختیار کیا۔ ”ہمارے راستے بھی الگ الگ ہوں گے۔“

”وہاٹ۔“ شیلا درما کو جیسے پچھو نے ڈک مار دیا ہو۔ اس نے جونی کو کسی بھوکے شیرینی کی نظروں سے دیکھا۔ سچ کر ہڈیانی انداز میں سوال کیا۔ ”راستے الگ الگ ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”میں کل تمہاری دنیا سے چلا جاؤں گا۔“ جونی نے بہ دستور سرد انداز میں کہا۔ ”حالات سازگار نہ ہوں تو انسان کو فوری طور پر راستہ بدل دینا چاہیے۔“

”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“

”ہاں، اس لیے کہ اب شاید تمہیں میری ضرورت نہیں رہی۔“

”تم ایسا نہیں کر سکو گے جونی۔“ شیلا درمانے پھر کر جواب دیا پھر اس نے بستر پر رکھے نیچے کے نیچے سے اپنا لیڈیز آئوٹیک پستول بھی نکال لیا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے قفس کر رہے تھے۔

”تم.....“ جونی نے اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کی طرف غور سے دیکھا۔ تم شاید اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو۔

”اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو۔“ شیلا درمانے سچ کر کہا۔ ”تمہاری حیثیت میری نظروں میں کسی پالتو کتے سے زیادہ نہیں ہے پھر بھی تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ میرے پاؤں پکڑ کر پر اس کرو جونی کہ تم یہاں سے جانے کا خواب بھی نہیں دیکھو گے۔“

”کون روکے گا مجھے؟“ جونی کے تیور بھی بدلنے لگے۔

”تمہاری موت.....“ شیلا درما کی گرفت آئوٹیک پستول کے دستے پر اور مضبوط ہو گئی۔ ”میں نے ابھی تم سے کہا تھا کہ میں کھلونے بدلنے کے بجائے انہیں توڑ دینے کی عادی ہوں۔“

”اس کے بعد جونی کو جواب دینے کی مہلت نہیں ملی۔

شیلا درما کی کپکپاتی انگلی کا دباؤ اس وقت تک ٹریگر پر بڑھتا گیا جب تک گولیوں کا جیسر خالی نہیں ہو گیا۔ جونی کسی کئی ہوئی شاخ کے مانند فرش پر گرا پھر اس کی دھڑکنیں ہمیشہ کے لیے اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔“

”شیلا درمانے مشینی انداز میں آئوٹیک پستول ایک طرف پھینک دیا۔ خواب گاہ کا دروازہ کھولنے کے بعد اس نے انٹر کام سسٹم کے ذریعے سڑک سے اپنے بیڈ روم تک آنے کے تمام داخلی دروازے یکے بعد دیگرے کھول دیے۔ مشینی انداز میں اس نے فون اٹھا کر پولیس کو جونی کے قتل کی

اطلااع دی پھر دیوانوں کی طرح جونی کی لاش سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اس وقت تک وہ اس ہڈیانی کیفیت سے دوچار رہی جب تک پولیس نے آکر اسے زبردستی پکڑ کر جونی کی لاش سے علیحدہ نہیں کیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر ایک ہی جملہ دہرا رہی تھی۔“

”میرے پاؤں پکڑ کر پراس کرو جونی تم شیدا درما کو چھوڑ کر جانے کا خواب کبھی بھول کر بھی نہیں دیکھو گے۔“



سراج کرے میں داخل ہوا تو اورنگ زیب کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

”کیا آج ناشتہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟“ اس نے اورنگ زیب کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”الماس بھی آپ کی منتظر ہے۔“

”سوری۔“ اورنگ زیب نے چونک کر دتی گھڑی کی سمت دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ سراج کے ساتھ ہی کرے سے باہر نکلا تھا۔

”کل کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”سراج نے دبی زبان میں سوال کیا“ کیا موجودہ حالات میں بھی آپ پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے؟

”تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟“

”پہلے گلینہ پھر دلبر با اور اب جونی..... شیدا درما نے بھی اعتراف جرم کر لیا ہے۔ کیا سکندر علی شاہ پران پے در پے ہونے والے حادثات کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا؟“

”یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔“ اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”گلینہ اور دلبر با کی بات اور تھی لیکن شیدا درما کے بارے میں میری شروع سے ایک ہی رائے تھی، وہ سیکس سمبل تھی۔ تفتیش کرنے والے افسر نے بھی یہی رائے قائم کی ہے۔ اخباری رپورٹرز نے بھی ڈھکے چھپے جملوں میں بیوٹی پارلر کے آڈ میں ہونے والے مذموم کاروبار کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سکندر علی شاہ پر بھی اس حادثے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ میں بھی آپ کے ساتھ.....“

”ڈونٹ بی چائلڈش۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”کرنل احتشام کے سادہ لباس والے بھی آس پاس ہی موجود ہوں گے۔ لیاقت حسین کو بھی میں نے تمہاری خواہش پر ساتھ رکھا ہے۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے نیچے آئے تو الماس نے ملازمہ کو چائے لانے کو کہا پھر براہ راست اورنگ زیب سے بولی۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ کل آپ اپنے مقدمہ میں ضرور کامیاب ہوں گے۔“

”سنا تم نے۔“ اورنگ زیب نے ڈائینگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے سراج سے کہا۔ ”الماس پولیس میں نہیں ہے لیکن اس کا جذبہ تمہارے مقابلے میں زیادہ قابل ستائش ہے۔“

”میں اس بات سے بھی انکار نہیں کروں گا کہ گھٹنا ہمیشہ پیٹ ہی کی طرف جھکتا ہے۔“ سراج نے برجستہ جواب دیا۔

ناشتے کے دوران اسی قسم کی نوک جھوک جاری تھی جب سراج کے موبائل پر سنگٹل ہوا۔ دوسری جانب سے جو اطلاع دی گئی اسے سن کر سراج کے چہرے کے تاثرات اچانک بدل گئے۔ موبائل آف کرنے کے بعد اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اورنگ زیب کو بھی اس اطلاع سے آگاہ کیا۔

”ہمیں فوری طور پر ریڈ کراس اسپتال پہنچنا چاہیے۔ ڈی آئی جی صاحب اس وقت آپریشن تھیٹر میں ہیں۔“

”خیریت؟“

”ان کے آفس میں کوئی بم بلاسٹ ہوا ہے جس کے فوراً بعد انہیں اسپتال منتقل کر دیا گیا۔“

سراج کے ساتھ اورنگ زیب نے بھی میز سے اٹھنے میں غلت کا مظاہرہ کیا۔ بیس چکیں منٹ بعد ہی وہ اسپتال پہنچے جہاں آپریشن تھیٹر کے باہر آئی جی بھی بہ نفس نفیس دوسرے کچھ افسران کے ساتھ موجود تھا۔ اورنگ زیب کو رسی پروٹوکول کے پیش نظر اس کے قریب جانا پڑا۔

”یہ اچانک کیا ہو گیا سر؟“ اس نے آئی جی سے دریافت کیا۔

”اچانک نہیں..... یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم اور بڑی پلاننگ سے ہوا ہے۔“ آئی جی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”پلاسٹک بم کو میز کے داہنی دراز کے نیچے ٹیپ سے چپکایا گیا تھا جسے بعد میں کسی ڈیوائس کے ذریعے مین اس وقت بلاسٹ کیا گیا جب ڈی آئی جی مجھ سے ملاقات کے بعد اپنے دفتر جا کر کرسی پر بیٹھ رہے تھے۔ جس کا نشیبل پر شبہ کیا جاسکتا تھا، اسے بھی راستے سے ہٹا دیا گیا۔“

”سرجن کی کیا رپورٹ ہے؟“

”ابھی اس نے کوئی یقینی بات نہیں کہی۔“

آپریشن تھیٹر کے باہر موجود دوسرے افسران بھی اس اچانک حادثے کے بارے میں چہ گوئیاں کر رہے تھے۔ آئی جی کی طرح دوسروں کی بھی متفقہ رائے یہی تھی کہ بم پلاسٹ میں ڈی آئی جی کا کوئی دشمن ہی شامل ہوگا۔ مشترکہ شبہ اسی کا نشیبل پر کیا جا رہا تھا جس کے جسم پر موجود لباس سے اس کی موت کے بعد بھاری رقم برآمد ہوئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد سرجن آپریشن روم سے باہر نکلا پھر وہ آئی جی کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اپنے دفتر میں چلا گیا۔ اورنگ زیب نے سراج کو رکنے کا اشارہ کیا پھر آئی جی کے پیچھے پیچھے وہ بھی اندر چلا گیا۔ آئی جی کے چہرے کے تاثرات ترجمانی کر رہے تھے کہ اسے اورنگ زیب کا اندر آنا اچھا نہیں لگا لیکن وہ اس وقت اس کا برملا اظہار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

سرجن اپنے دفتر کے انٹیچڈ ہاتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو آئی جی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”سوری سر۔“ اورنگ زیب نے اس بار سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”قبل از وقت میں اس ضمن میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”جو کام آپ آج کل منہا رہے ہیں اس میں ابھی اور کتنے دن لگیں گے؟“

”حالات پر منحصر ہے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“

اورنگ زیب جواب دینے کے بعد اٹھا پھر پروٹوکول نبھانے کی خاطر اس نے آئی جی کو سلیوٹ کیا اور باہر آ گیا جہاں سراج اس کا منتظر تھا۔

واپسی میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر سراج نے گفتگو میں پہل کی۔

”ڈی آئی جی کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

”جس کانسٹیبل کو راستے سے ہٹا دیا گیا، میری اطلاع کے مطابق وہ بکاؤ نہیں تھا۔“

”پھر.....؟“ سراج نے چونک کر وضاحت طلب لہجے میں سوال کیا۔ ”اس کو کس نے ٹھکانے لگا دیا؟“

”کسی کیس میں پیچیدگی پیدا کرنے کی خاطر اسی قسم کے ہتھکنڈے اکثر اختیار کیے جاتے ہیں۔“ اورنگ زیب نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس معاملے میں بھی کسی نہ کسی زاویے سے شیخ حامد ہی کا ہاتھ شامل ہو۔“

”اگر آپ کا اندازہ درست ہے تو میں ڈی آئی جی کے بچ جانے کو ایک معجزہ ہی کہوں گا۔“ سراج نے حیرت کا اظہار کیا۔

”معجزوں کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور کارفرما ہوتی ہے۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر اس نے موبائل پر آنے والی کال وصول کی۔ معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”کیا پروگرام میں کوئی تبدیلی تو نہیں کرنی؟“

”یہی سوال میں آپ سے کرنے والا تھا؟“ دوسری جانب سے سکندر علی شاہ کی آواز ابھری۔ ”ڈی آئی جی کو جو حادثہ پیش آیا ہے اس کی اطلاع مجھے بھی مل چکی ہے۔“

”میں اس وقت اسپتال ہی سے آ رہا ہوں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”گویا پروگرام پکا ہے؟“

”ہنڈ رڈ پرسنٹ۔ میں سورج ڈھلتے ہی پہنچ جاؤں گا لیکن ایک بار پھر وہی پرانی درخواست دہراؤں گا۔“

”ڈونٹ وری۔“ دوسری جانب سے جملہ منقطع کرتے ہوئے کہا گیا۔ ”آپ کو دوست کہا ہے تو آپ کی عزت کا خیال رکھنا بھی میرا فرض ہے۔“

رابطہ ختم ہوا تو اورنگ زیب نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی الجھی ہوئی ڈور سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

سراج نے اس وقت اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ ڈی آئی جی کو پیش آنے والے حادثے

”فوری طور پر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ سرجن نے کچھ توقف سے کہا۔ ”مریض کے ہوش آنے پر ضروری ٹیسٹ اور بھی ہوں گے۔ انکارزلٹ آنے کے بعد ہی صورت حال کا اندازہ ہوگا۔“

”فی الحال مریض کی کیا پوزیشن ہے؟“ آئی جی نے سوال کیا۔

”موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے لیکن موجودہ آپریشن کے بعد میرا خیال ہے کہ مریض کو چالیس منٹ سے لے کر ایک گھنٹے تک ہوش آجائے گا مگر.....“ سرجن نے جملہ ادھورا چھوڑا تو اورنگ زیب نے دبی زبان میں سوال کیا۔

”آپ کچھ کہتے کہتے رک گئے، کیا مریض کو کوئی اور خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے۔“

”ہاں..... آں..... اس کے امکانات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

”کوئی خاص بات؟“ آئی جی نے پوچھا۔

”مریض کے جسم کا اوپری حصہ بڑی حد تک محفوظ ہے لیکن نچلا دھڑ زیادہ متاثر ہوا ہے۔“

”کوئی نہ کوئی رائے تو قائم کی ہوگی آپ نے۔“ آئی جی نے دوبارہ وضاحت چاہی۔

”معجزوں کا ہونا قدرت کے اختیار میں ہے لیکن.....“ سرجن نے ذرا رک کر جملہ مکمل کیا۔ ”میرا ذاتی تجربہ اور مریض کی موجودہ کنڈیشن کو دیکھ کر یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کا نچلا دھڑ مفلوج بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیا اس امکان سے بچنے کے لیے کوئی فوری علاج ممکن نہیں ہے؟“ اورنگ زیب نے کرسی پر کسمسا کر دریافت کیا۔

”اس کا انحصار مریض کے ہوش میں آنے کے بعد ہونے والے ضروری ٹیسٹ کے نتائج پر منحصر ہے۔“

”ڈی آئی جی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں سرجن۔“ آئی جی نے کہا۔ ”آپ کوشش کریں کہ وہ صحت مند ہونے کے بعد بھی اپنی ڈیوٹی انجام دے سکیں۔“

”ڈونٹ وری، آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ۔“

”مریض کے ہوش میں آنے کے بعد کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں؟“ اورنگ زیب نے پوچھا۔

”آئی ایم سوری۔“ سرجن نے صاف گوئی سے کہا۔ ”مریض کو ابھی ایک دو دن مکمل آرام کی ضرورت ہے۔“

”آپ کو اس حادثے کی اطلاع کیسے مل گئی؟“ اس بار آئی جی نے اورنگ زیب سے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔ ”آپ تو شاید کسی مخصوص اجازت نامہ کی بنیاد پر.....“

”مرکزی حکومت کے ایک انتہائی خفیہ مشن پر کام کر رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اس حادثے کی اطلاع مجھے ڈی ایس پی سراج نے فون پر دی تھی۔“

”آکھو پس کے بارے میں کوئی اطلاع؟“

کے بعد اس کے ذہن میں بہت سارے سوالات گونج رہے تھے۔

آنے والے وقت کے بارے میں کوئی بھی یقین سے ایک حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ امکانات کے بارے میں سوچنا انسان کی سرشت میں داخل ہے چنانچہ اورنگ زیب بھی اس وقت لیاقت حسین کے ساتھ فارم ہاؤس کی سمت جاتے ہوئے امکانات پر بڑی بنیدگی سے غور کر رہا تھا۔

پچھلے دنوں سے جو حادثات تواتر سے پیش آرہے تھے وہ اس بات کی نشاندہی کرنے کے لیے بہت کافی تھے کہ شیخ حامد کی خاص وجہ سے بوکھلاہٹ کا شکار ہے ورنہ انڈر ورلڈ کے ڈان اس انداز میں کھلے عام نہ تو واردات کرتے ہیں نہ ہی اس کی تشہیر کرنے کی حماقت کرتے ہیں۔

سامنے ہونے کے باوجود سات پردوں میں روپوش رہنا ان کے مشن کا اہم مقصد ہوتا ہے۔ کبھی یہ ساری خاصیتیں شیخ حامد میں بھی تھیں۔ وہ ایک کاروباری شخصیت کی حیثیت سے شناخت کیا جاتا تھا۔ اس کے گرگے اور زرخیز کرائم پیشہ جو واردات کرتے وہ خود بھی اس بات سے لاعلم ہوتے کہ ان وارداتوں کے پس پردہ کس کا ہاتھ ہوتا تھا۔ معاشرے میں شیخ حامد نے اپنی جو حیثیت منوائی اور جو مقام حاصل کیا تھا اس کے پیش نظر پولیس کو ابھی اس کی اصلیت کا علم نہیں تھا۔

جن افراد کو شبہ بھی ہوتا وہ بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن وقت اور معاملات کا گراف ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رخ بھی بدلتا رہتا ہے۔ شیخ حامد سے بھی ماضی میں کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں سرزد ہوئی تھیں جو بے قدموں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

اس کی بنیادی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ جس چیز کو پسند کر لیتا اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کرنا اس کے لیے ایک چیلنج بن جاتا۔ ان خواہشات کی تکمیل کی..... راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو ہمیشہ کے لیے دور کر دینا اس کی سرشت میں داخل تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صوبے اور مرکز کی تمام بڑی بڑی شخصیتیں اس کے حلقہ احباب میں شامل تھیں۔

جڑیں مضبوط ہوں تو درخت کے تناور ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی لیکن آسمانی بجلی جس شاخ پر ایک نظر غلط انداز ڈال دے وہ زیادہ سرسبز بھی نہیں ہوتی۔ یہ قانون قدرت ہے جس کے آگے انسانی قوتیں ہمیشہ سرنگوں رہی ہیں، خون بھی اپنا رنگ ضرور دکھاتا ہے۔

میڈم روبی کے حصول کی خاطر شیخ حامد نے اس کے مظلوم شوہر کو کھٹکانے لگا کر خدا کے قہر کو للکارا تھا۔ ماں کی موت کے بعد شبنم کی آہ نے بھی دے قدموں شیخ حامد کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ وقت اور حالات نے افضل خان کو کبھی اس کا مخالف کر دیا لیکن وہ اب بھی برملا اپنی طاقت کا اظہار کرنے کی حماقتیں کر رہا تھا۔ ڈی آئی جی کو پیش آنے والا حادثہ بھی ایک اہم کڑی تھی۔

ایک بار مرنے کی اطلاع گرم ہونے کے بعد وہ دوبارہ سامنے آیا تو پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا۔ ایسی کسی جگہ روپوش ہو کر بیٹھا جس کا علم کسی کو نہ چل سکا۔ سب سے پہلے سراج نے سکندر علی شاہ کے فارم ہاؤس پر شبہ کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے اس کے شبہ کی تردید کھل کر نہیں

کی لیکن اتنا ضرور کہا تھا کہ خود سکندر علی شاہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے واقف نہیں ہوگا۔ بہر حال اس نے ڈور کا وہ سرا تھام لیا تھا پھر جب ایک دن سکندر علی شاہ نے اورنگ زیب سے دو بدو گفتگو کے دوران نہ صرف اس کی سابقہ شادی کے بارے میں حیرت انگیز طور پر زبان کھولی بلکہ کسی کا فون آنے کے بعد اسے فارم ہاؤس آکر کسی لڑکھ سے دل بہلانے کی تجویز بھی پیش کی تو اورنگ زیب کا ماتھا آنے والے فون سے ٹھٹکا تھا اور اسی ایک شبہ کی بنیاد پر اس نے سکندر علی شاہ کی دعوت کو قبول کر لیا تھا۔ اپنی حفاظت کے لیے اس نے کرل احتشام کو بھی اعتماد میں لے کر سارے معاملات طے کر لیے تھے۔

اس وقت بھی اورنگ زیب کا ذہن آنے والے لمحات کے بارے میں تانے بانے جوڑنے میں مصروف تھا جب لیاقت حسین کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اس نے دبی زبان میں کہا تھا۔ ”صاحب آپ کو فارم ہاؤس میں کیا کام پیش آگیا۔“ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جگہ خاصی بدنام ہو چکی ہے۔

”پولیس ہمیشہ ایسی جگہوں کا کھوج لگاتی ہے لیاقت حسین۔“ اورنگ زیب نے اسے ٹٹولنے کی خاطر پوچھا۔

”سکندر علی شاہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ کسی مظلوم اور یتیم لڑکی کا قاتل بھی ہو سکتا ہے۔“

”اس کا علم بھی خدا کو ہوگا صاحب۔“ لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ”میں یقین سے کیسے کہہ سکتا ہوں۔“

اورنگ زیب نے دوبارہ لیاقت حسین کو نہیں کرید مگر اس سے پیشتر اس نے جو جملے سکندر علی شاہ کو پہلی بار دیکھ کر کہے تھے اور سپر اسٹور پر جو واقعہ شیدا وراما کے ساتھ پیش آیا تھا وہ اورنگ زیب کے ذہن میں اس وقت بھی گردش کر رہا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد گاڑی فارم ہاؤس کے دروازے پر پہنچی تو اسے بغیر کسی پوچھ گچھ کے کھول دیا گیا۔ سکندر علی شاہ سامنے ایک تناور درخت کے نیچے بڑی ایزی چیئر پر بیٹھا تھا۔ لیاقت حسین نے نیچے اتر کر گاڑی کا دروازہ کھولا تو سکندر علی شاہ بھی اٹھ کر قریب آگیا۔ فارم ہاؤس کے سامنے ملازم روپوش ہی کے انداز میں پوری طرح محتاط تھے۔

اورنگ زیب کے ذہن میں ایک لمحے کو یہ خیال آیا کہ کہیں سکندر علی شاہ کو دیکھ کر لیاقت حسین کی خداداد قوتیں دوبارہ اس کی زبان پر نہ آجائیں لیکن ایسا کچھ بھی نہیں۔ سکندر علی شاہ کے اشارے پر اس کے آدمی لیاقت حسین کو آرام کرنے کی غرض سے سروٹ کو ارٹری کی طرف لے گئے۔ اورنگ زیب نے سکندر علی شاہ کے گیٹ روم کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے درخواست کی۔

”میں آپ کے مشورے پر یہاں تک آتو گیا ہوں شاہ جی لیکن.....“

”اب آپ یہاں تک آگئے ہیں تو ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈالیں۔ پوری طرح انجوائے

کریں۔“ سکندر علی شاہ نے اورنگ زیب کا ہاتھ تھام کر بے تکلفی سے کہا۔ ”آپ کے لیے جو بدلی تیلی منگوائی ہے اسے دیکھ کر ہی آپ کا آدھا مرض ختم ہو جائے گا۔“

اورنگ زیب مسکرا کر خاموش ہی رہا لیکن اس کی نظریں فارم ہاؤس کے ایک ایک چپے پر جھنک رہی تھیں جو ماحول، بناوٹ اور سجاوٹ کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ برقی قلموں کی روشنی سونے پر سہاگے کا کام انجام دے رہی تھی۔ سکندر علی شاہ نے اس کی محویت بھانپ کر سرسراتے لہجے میں کہا۔

”مجھے خوشی ہے کہ یہ چھوٹا سا فارم ہاؤس آپ کو پسند آگیا۔“

”آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جنگل میں منگل منانے والا محاورہ آپ کے فارم ہاؤس کی خوبصورتی کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔“

دونوں قدم اٹھاتے ہوئے گیٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔ سکندر علی شاہ نے دروازے پر رک کر پھر بے تکلفی سے کہا۔ ”اب آپ آج رات کھل کر انجوائے کریں، صبح ملاقات ہوگی۔“

اورنگ زیب نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا پھر سکندر علی شاہ کے جانے کے بعد اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو اس خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا جو مختصر لباس میں سامنے کھڑی قدرے جھک کر اس کو خوش آمدید کہنے کی کوشش میں کھلے گلے کی فراک سے اپنے اندرونی جسم کی نمائش بھی کر رہی تھی۔ شکل و صورت اور نشست و برخاست سے وہ غیر ملکی ہی لگ رہی تھی لیکن اس نے گفتگو کی ابتدا بڑی شستہ اردو بولتے ہوئے کی۔

”میں بڑی بے چینی سے آپ کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ شاہ جی نے مجھے جو قیمت ادا کی ہے وہ میرے مطالبے سے کہیں زیادہ ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہ ہو۔“

”گڈ۔“ اورنگ زیب نے بے تکلفی سے کہا پھر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”آپ شاید یہاں پہلے بھی آتی رہی ہیں؟“

”جی نہیں۔“ لڑکی نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بھی کبھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھی۔“

”پھر شاہ کی دعوت آپ نے کیسے قبول کر لی؟“

”آپ اسے میری مجبوری یا.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر اپنی تہذیب کا برملا مظاہرہ کرتے ہوئے بے تکلفی سے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے جو خشک ٹاپک چھیڑا ہے اگر ہم اس سے ہٹ کر گفتگو کریں تو زیادہ انجوائے کر سکتے ہیں۔“

”ایک ان جانے مرد کے ساتھ کسی گیٹ ہاؤس کے کمرے میں رات گزارنے کا مطلب سمجھتی ہیں آپ؟“ اورنگ زیب نے اسے ٹٹوتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”ہمارے معاشرے میں اسے زیادہ معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔“ اس نے اورنگ زیب کے

قریب آتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اکثر لڑکیاں شادی کے بعد بھی اپنے شوہر کی موجودگی میں اپنے بوائے فرینڈ سے ملتی جلتی ہیں۔ مرد کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔“

”آپ نے ابھی تک اپنا خوب صورت نام نہیں بتایا۔“ اورنگ زیب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”میرے واقف کار مجھے ایکی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو کسی اور نام سے یاد کر لیں، میں اعتراض نہیں کروں گی۔“ ایکی نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اورنگ زیب کا ہاتھ تھام لیا پھر اس میز تک لے گئی جو ایک گوشے میں رکھی تھی۔ میز پر دو تین گلاسوں کے علاوہ اعلیٰ برانڈز کی دو بوتلیں بھی موجود تھیں۔

”آپ کیا پینا پسند کریں گے؟“ ایکی نے کرسی پر بیٹھ کر بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

”میں کوئٹل پینے کا عادی نہیں ہوں۔“ اورنگ زیب نے ایکی کو خواہیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جب آپ موجود ہیں تو پھر کسی دوسری شراب کی کیا ضرورت ہے؟“

جواب میں ایکی کھل کر ہنسی پھر وہ اپنے لیے ایک جام تیار کرنے لگی۔ اورنگ زیب کی تجربہ کار نظریں کمرے کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لے رہی تھیں پھر وہ چھت کے درمیان لٹکے ہوئے فانوس پر پڑیں جہاں خفیہ کیمروں کے ذریعے پورے کمرے کی تصاویر لینے یا مودی بنانے کے خاصی گنجائش موجود تھی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ شاید اسے فارم ہاؤس تک لانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ قابل اعتراض تصویریں حاصل کرنے کے بعد اسے بلیک میل کیا جاسکے۔ اس خیال کے ابھرتے ہی شیخ حامد کا نام بھی بجلی بن کر کوندا تھا۔

اورنگ زیب نے غیر ملکی کسن لڑکی کی جانب دیکھا جسے ایک بڑی مچھلی کو پھانسنے کی خاطر بطور چارے کے استعمال کیا گیا تھا۔ وہ نامعلوم شخص بھی ذہن میں کاٹنا بن کر اورنگ زیب کو اس کے ماضی کے بارے میں بتانے کے ساتھ اس کا وہ علاج بھی تجویز کیا تھا جس کے پیش نظر وہ اس وقت فارم ہاؤس کے گیٹ روم میں ایک خوب صورت تیلی کے ساتھ موجود تھا۔ سراج کے کچھ شبہات بھی اس کے ذہن میں کھلبلائے گئے۔

اورنگ زیب نے سچویشن کے عین مطابق خود کو درپیش صورت حاصل کے سامنے میں ڈھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایکی سے کھل کر لگاؤٹ کی باتیں کرنے لگا جو دو پیگ پینے کے بعد ہی نشے کی کیفیت سے دو چار ہو چکی تھی۔

”تم خاموش کیوں ہو ڈارلنگ؟“ اس نے مخمور نظروں سے اورنگ زیب کو گھورتے ہوئے نشیل آواز میں کہا۔ ”ابھی تو ہمیں اسی چھت کے نیچے پوری رات ایک ساتھ گزارنی ہے۔“

”کیا تم اسے ایک مجبوری سمجھ رہی ہو؟“ اورنگ زیب نے پہلی بار رو مانٹک لہجہ اختیار کیا۔

”نہیں۔“ لڑکی نے گلاس میں ہنسی شراب کو حلق میں انڈ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم وہ پہلے مرد ہو جو مجھے ہر اعتبار سے اچھے لگے ہو۔ تمہارے ساتھ رات گزار کر مجھے خوشی ہوگی۔“ ایکی نے کھل کر

”کیا یہ رات میز کرسی پر بیٹھ کر گزارنے کا ارادہ ہے؟“

”جواب میں ایلی نے ایک توہ شکن انگڑائی کی پھر وہ اورنگ زیب کا ہاتھ تمام کراس بستر پر آگئی جو مشرقی کونے میں تھا۔ خاصی دیر تک وہ اورنگ زیب سے لگاؤ کی باتیں کرتی رہی پھر بڑھتے ہوئے نئے نے اس کو ضرورت سے کچھ زیادہ بے خود بھی کر دیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی فراک اتار کر ایک طرف پھینکی پھر کرسی جو تک ہی کی طرح اورنگ زیب سے چٹ گئی۔“

”اورنگ زیب کے لیے وہ لمحات بڑے صبر آزمائے تھے۔ ایک خوب صورت بدلیسی لڑکی کا عریاں جسم اسے گرما رہا تھا لیکن آنکھوں کا تصور بار بار اس کے آڑے آ رہا تھا۔“

”تم..... تم کیا سوچ رہے ہو ڈارلنگ؟“ ایلی نے مخمور لہجے میں اورنگ زیب کو اکسانے کی کوشش کی۔ ”کم آن..... لیٹ اس انجائے“ بڑے جذباتی انداز میں اورنگ زیب کے وجود سے نوچ کھسٹ کرنے لگی۔ اس کی اصلیت بڑی تیزی سے بے نقاب ہو رہی تھی۔ وہ معصوم نہیں پرورشش ہی تھی جو اس قدر بے شرمی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

اورنگ زیب نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی جو نصف رات ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ ایلی کی جذباتی کیفیت کے باوجود اورنگ زیب کے ذہن میں وہ مقصد ابھرا آیا جو اسے فارم ہاؤس تک لایا تھا۔ اس نے بڑی بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے ایلی سے کہا۔

”آئی ایم سوری ہنی، شاہ جی تمہیں بک کرتے وقت شاید اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا۔ میں مردانہ صلاحیتوں سے یکسر محروم ہوں۔“

”واہ..... نان سینس۔“ ایلی نے اس بار بڑی حقارت سے اورنگ زیب کو گھورا۔ ”تم..... میرے ساتھ ایک گھنیا مذاق کر رہے ہو۔ یو..... شٹ.....“

”ڈونٹ شاؤٹ۔“ اورنگ زیب نے جھلا کر جواب دیا۔ ”تمہیں ایک رات کی ایڈوانس پے منٹ کی جا چکی ہے۔ تم کوئی پروٹیسٹ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“

”ایس پی مسٹر اورنگ زیب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

کمرے میں دروازے سے دبے قدموں اندر داخل ہو کر سکندر علی شاہ نے سرسراتے انداز میں ایلی سے کہا۔ ”تم اپنا کردار نبھا چکیں اس لیے اب جاسکتی ہو۔“

اورنگ زیب نے چونک کر سکندر علی شاہ کو دیکھا جو یقیناً کسی ڈپٹی کیٹ چابی نئے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک مخبوط الحواس صورت ملازم بھی موجود تھا۔

”شاہ جی..... آپ.....“ اس نے حیرت کا اظہار کیا پھر ایک ہی جھٹکے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جو صورت حال درپیش تھی وہ اورنگ زیب کے لیے زیادہ تعجب خیز بھی نہیں تھی۔

”ڈونٹ وری ایس پی۔“ سکندر علی شاہ نے بائیں آنکھ جھپکا معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”تمہاری اور ایلی کی جو فلم اور تصاویر بنی ہیں اس کے بعد میں بھی تمہیں دوست ہی کہوں گا البتہ یہ بھی حقیقت ہے

کہ اب تم پوری طرح میری مٹھی میں آگئے ہو۔“

”آئی سی۔“ اورنگ زیب نے بل کھا کر کہا۔ ”گویا تم نے میرے ساتھ دغا بازی کی ہے۔“

”دغا بازی نہیں..... سیاست کہو۔“ سکندر علی شاہ نے فاتحانہ انداز اختیار کیا۔ ”زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے فارمولے کو منوانے کے لیے میں نے جو کچھ کیا اسے میں سیاست ہی کا نام دوں گا۔“

”غوں..... غاں..... غاغا.....“ سکندر علی شاہ کے ساتھ موجود ملازم نے حلق سے آوازیں نکال کر اس کی بات کی تائید کا اعلان غوں غا اور غاغا سے کیا تو اورنگ زیب کے ذہن میں سب انسپکٹر رانا حمید کی اس فائل کے مکمل اندراج تازہ ہو گئے جو سکندر علی شاہ کی اصلیت اور اس کے گونگے ملازم سے متعلق تھے۔ اس مظلوم ملازم کی کہانی بھی یاد آگئی جس کی نوبیا ہتا بیوی کو پہلی رات کسی اور نے بے آبرو کر کے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس کے قتل کے الزام میں ملازم کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ کمرہ عدالت میں آخری وقت اپنے بے گناہ ہونے کا جھج جھج کر اعلان کرتا رہا لیکن اندھے قانون نے اس کی کوئی دادریا نہیں سنی۔

اورنگ زیب خاموش کھڑا فائل کے اندراجات کی روشنی میں سکندر علی شاہ کا مکروہ چہرہ گھورتا رہا۔ اس کے اندر نفرت اور حقارت کا جذبہ ٹھانٹیں مار رہا تھا لیکن وہ چہرے کے تاثرات سے اپنی بے بسی کا اظہار ہی کرتا رہا۔

”کیا سوچ رہے ہو ایس پی؟“ سکندر علی شاہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ ”جو ہونا تھا وہ ہو چکا، گیا وقت واپس بھی نہیں آتا۔ اب صرف ایک صورت ہے تم میرے مجالدات میں زیادہ ہاتھ پیر چلانے کی حماقت کبھی نہ کرنا، اس کے عوض تمہیں زر اور زن دونوں حاصل ہوتے رہیں گے۔“

اورنگ زیب کی قوت برداشت اس کے اختیار سے باہر ہونے لگی۔ اس کے لیے جوڑیپ تیار کیا گیا تھا اس کی طے شدہ پلاننگ ہی سے ایک فائل میں درج کر کے ملٹری انٹیلی جنس پہلے ہی سے ایک فائل میں درج کر کے ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ کرنل احتشام کے حوالے کی جا چکی تھی۔ اس وقت بھی کرنل احتشام کے سادہ لباس کمانڈر فارم ہاؤس کے اطراف میں موجود تھے۔ اورنگ زیب جیب میں رکھے ہوئے موبائل کے دو نمبر دباتا تو کمانڈر اپنا ایکشن کرنے میں دیر نہ کرتے۔ سکندر علی شاہ کی ساری خوش فہمی بھی دور ہو جاتی لیکن اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی جو ہوا وہ کچھ بھی کچھ کم تعجب انگیز نہیں تھا۔

لیاقت حسین کسی چھلاوے ہی کی طرح اندر داخل ہوا۔ سکندر علی شاہ کے بجائے اس نے گونگے کی گردن دبوچ لی۔

”غوں..... غاں..... آآں..... غوں.....“ گونگا ہاتھ پاؤں چلانے لگا، سکندر علی شاہ اچانک اس افتاد سے بوکھلا کر ہٹا پھر اس حکمانہ انداز میں اورنگ زیب سے کہا۔

”اپنے اس نام معقول ڈرائیور سے کہو کہ یہ میرے ملازم کو چھوڑ دے ورنہ.....“

✦ ✦ ✦

پارٹی میں حسب سابق راحیلہ بیگم پیش پیش تھیں۔

”تم بھول رہے ہو ایس پی کہ میں ڈان بھی ہوں اور ڈان پھانسی کے پھندے تک جانے کی حماقت کبھی نہیں کرتے۔ ذلت آمیز صورت حال سے بچنے کی خاطر ہمیشہ موت کو ترجیح دیتے ہیں۔“ شیخ حامد نے بے پروائی سے جواب دیا پھر اس کے آگے کچھ کہنے کی حسرت اس کے دل میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ لیاقت حسین نے بجلی سے چلنے والے کسی روبوٹ کی طرح چھلانگ لگا کر شیخ حامد کو ہاتھوں

ان کا ایک ہی مقصد تھا کہ میڈم روہی اور ڈی آئی جی کی شادی ہو جائے۔ سیٹھ عثمان نے اس ضمن میں بیوی کو احتیاط سے کوئی آخری فیصلہ کرنے کی تلقین کی تھی اس لیے کہ ڈی آئی جی کے سلسلے میں پولیس سرجن نے بھی یہ بات کھل کر واضح کر دی تھی کہ اب وہ شادی کے قابل نہیں رہا تھا۔

سارے مہمان جمع ہو گئے تو بارود دی بیرے بھی کھانے پینے کی ٹالیاں لان پر لے آئے۔ ڈی آئی جی مہمانوں کے ساتھ ہی اپنی وکیل چیر پر بیٹھا حسب معمول خوش گپیوں میں مصروف تھا جب اچانک آئی جی بھی آگیا اس کو خوش آمدید کہنے کے لئے سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میرے اس وقت یہاں آنے کے دو مقاصد تھے۔ اول تو یہ کہ میں شہر میں ہونے والے ہنگاموں اور تقریبات کے معاملے میں بے خبر نہیں رہتا اور دوسرے آپ کو شیخ حامد کے سلسلے میں خراج تحسین بھی پیش کرنا تھا۔ آپ نے بہت سی رکاوٹوں کے باوجود جو کارنامہ انجام دیا ہے میں اس پر آپ کو اپنی اور سب کی جانب سے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یو آر ریلی گریٹ۔“

آئی جی کی گفتگو کے بعد سب نے مل کر مخصوص انداز میں تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد سراج نے سنجیدگی سے لیکن دبی زبان میں آئی جی سے کہا۔ ”سراگر آپ مسٹر اورنگ زیب کو دوبارہ ان کی سیٹ سوپ دیں تو میں ڈبل ڈیوٹی کی پریشانی سے بھی بچ جاؤں گا۔“

”فی الحال میں اس کی مخالفت کروں گا۔“ کرل احتشام نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”آکٹوپس یا شیخ حامد سے جنگی مہم میں انہوں نے جو گرفتار کیا میاں حاصل کی ہے اس کے بعد ان کو مجھے کی جانب سے انعام کے علاوہ کم از کم دو ماہ کی چھٹی بھی ملنی چاہیے۔ ذاتی طور پر میں مسٹر اورنگ زیب کے لیے اپنے مجھے کی جانب سے گولڈ میڈل کا اعلان کرتا ہوں جس کی تقریب کا اہتمام بھی ملے ہو چکا ہے۔“

اس اعلان کے بعد سب نے تالیاں بجا کر اورنگ زیب کو خراج تحسین پیش کیا۔ تالیوں کی گونج ختم ہوئی تو اورنگ زیب نے سب کا شکریہ ادا کیا پھر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

”شیخ حامد یا آکٹوپس کے سلسلے میں مجھے جو کامیابی ملی ہے اس میں خدا کی مرضی کے ساتھ کچھ لوگوں کی بددعائیں بھی شامل تھیں۔ میرا اشارہ ان افراد کی طرف ہے جو شیخ حامد سے نفرت کرنے کے باوجود اس کے کسی اشارے کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے اس لیے کہ ان کی کوئی نہ کوئی دھتکی رگ اس بے غیرت کے ہاتھ میں تھی جس کا کوئی دین و ایمان نہیں تھا، لیکن اصلی گونگے کو گیسٹ روم کے جس زمین دوز کمرے سے برآمد کیا گیا وہاں سے وہ تمام دھتکی رگیں بھی کسی نہ کسی شکل میں میرے ہاتھ لگ گئیں.....“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے کہا۔ ”جہنم رسید ہونے والے نے کچھ مخصوص لوگوں کے لیے اپنے نام کو برا اور شکرہ جیسے رکھ لیے تھے۔ ایسی خرب اخلاق تصاویر بھی ہاتھ آئیں جن کی وجہ سے کوئی اس کے خلاف زبان نہیں کھول سکتا تھا اور حسب حیثیت اپنی عزت بچانے کی خاطر کچھ نہ کچھ دفاعی صورتیں اختیار کرنے پر مجبور تھا، مگر میں نے وہ تمام بلیک اسٹف ضائع کر دیا ہے۔ اس لیے اب نہ تو کسی کو اپنی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت ہوگی نہ ہی اپنے تحفظ کے لیے کسی کا محتاج ہونا پڑے گا۔“

اورنگ زیب کے کوبرا اور تحفظ کے حوالے پر آئی جی اور میڈم روہی دونوں ہی اپنی اپنی نشستوں پر کسمپاس کر رہ گئے۔

”ایک خاص بات اور کہنا چاہوں گا۔“ اس بار اورنگ زیب نے لیاقت حسین کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں اپنی کامیابی کے سلسلے میں خاص طور پر لیاقت حسین کا شکر گزار ہوں جس نے ہمارے لیے مگر انقدر خدمات انجام دی ہیں۔“

لیاقت حسین کی تعریف سن کر فرحین بھی کھل اٹھی۔ اس موقع پر الماس نے مسکرا کر شکایتی انداز میں اورنگ زیب سے کہا۔

”آپ نے مجھے بہن بنایا ہے، لیکن میرے میاں کی تعریف نہیں کی جو آپ کے آنے سے پہلے ہی شیخ حامد جیسے خطرناک مجرم کو قاتلون کے گٹھنوں میں جکڑنے کی خاطر دن رات ایک کر رہا تھا۔“

”آئی انگری وویو۔“ کرل احتشام نے الماس کی حمایت کی۔ ”ایسے موقع کے لیے دو محاورے اردو لغت میں بھی موجود ہیں۔ اندھا بانے ریوڑیاں اور اپنوں ہی کو دے اور گھر کی مرغی دال برابر۔“

”میں نے مرغی نہیں اپنے مرغی کی بات کی تھی۔“

الماس نے برجستہ کہا تو سب ہی بے اختیار ہنس پڑے۔

خاصی دیر تک سب کے درمیان اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ جاری رہی پھر راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

”اس موقع پر جب ہم سب اکٹھے ہیں اور یہ بھی ملے ہو گیا ہے کہ شیخ حامد اب مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہوگا، میں مس روہی کو ان کا ایک وعدہ یاد دلانے کی کوشش کروں گی۔“

”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔“ میڈم روہی نے کن آنکھوں سے ڈی آئی جی کو دیکھتے ہوئے راحیلہ بیگم سے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”کیا آپ اس بار بھی انگوٹھی بنوا کر لائی ہیں۔“

جواب میں راحیلہ بیگم نے اپنے بیگ سے سرخ مخملی ڈبیا نکال کر میڈم روہی کے حوالے کی تو ڈی آئی جی نے ڈبل چیر پر پہلو بدل کر میڈم روہی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے بارے میں میڈیکل رپورٹ کا علم سب کو ہے ایسی صورت میں.....“

”آئی آجیکٹ۔“ کرل احتشام نے ڈی آئی جی کو جملہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ”قربانی کے بکرے کو بولنے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے آپ خاموش ہی رہیں۔“

”آپ سمجھنے کی کوشش کریں کرل۔“ ڈی آئی جی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ ایک دو دن نہیں پوری زندگی کا معاملہ ہے۔“

”نو آرگیمینٹس۔“ کرل نے فوجی لب و لہجہ میں کہا۔ ”محاذ جنگ لڑنے والے ہمیشہ ڈو اور ڈائی کے فارمولے پر عمل کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مجھے شعرو شاعری سے بھی کوئی شوق نہیں لیکن اقبال کے بہت سارے سنے سنائے اشعار ضرور یاد ہیں۔ جنگ کے حوالے سے اقبال کا ایک شعر ابھی تک یاد ہے۔“

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کرل نے روانی میں ایک مصرعہ پڑھ دیا لیکن اس نے محفل میں موجود تقریباً ہر فرد کو معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھا تو خود بھی شرمندگی مٹانے کے لیے زوردار قہقہہ لگانے لگا۔

راحیلہ بیگم، میڈم روبی کا ہاتھ تھام کر ڈی آئی جی کی طرف بڑھیں تو اس نے پھر ایک بار دبی زبان میں میڈم روبی سے کہا۔ ”آپ ایک وعدے کو پورا کرنے کی خاطر پوری زندگی داؤ پر لگانے کی غلطی کریں گی۔“

”آپ غلط سوچ رہے ہیں۔“ میڈم روبی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”ہم دونوں کو تنہائی دور کرنے کی خاطر ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔“

پھر میڈم روبی نے بلا جھجک انگوٹھی پہنانے کی رسم پوری کی تو سب ہی اسے اور ڈی آئی جی کو مبارک باد دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈی آئی جی کا چہرہ خوشی سے دھنکے لگا۔

راحیلہ بیگم اور الماس کے بعد لیاقت حسین کے اشارے پر فرحین نے بھی اٹھ کر میڈم روبی کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ اس کے بعد باوردی بیرے نے سویٹ ڈش کی سروس بھی شروع کر دی۔ راحیلہ بیگم نے دو روز بعد باقاعدہ نکاح کے اعلان کے ساتھ یہ بھی کہا کہ نکاح کی تقریب ان کے گھر پر ہوگی۔

اسی رات گھر پہنچنے پر فرحین نے لیاقت حسین سے پوچھا تھا۔ ”کرل صاحب نے وہ اقبال، مومن اور بے تیغ والا سپاہی کا کیا بات بولا تھا؟“

”وہ.....“ لیاقت حسین نے فرحین کی نظروں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”وہ بے تیغ والا سپاہی تھا لیکن تیرا لیاقت تیغ والا سپاہی ہے۔“

”کیا مطلب؟ یہ تو اپنے کو درمیان میں کیوں لے آیا؟ میں نے اس شعر کا مطلب پوچھا تھا۔“

”میں تجھے ابھی تفصیل سے سمجھاتا ہوں۔“ لیاقت حسین نے بے اختیار فرحین کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا پھر کمرے کی روشنی بھی بند کر دی۔